فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ.
(۹-التوبہ:۱۲۲)

فتاویٰ فلاحیہ
(جلد اول)

از: حضرت مفتی احمد ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ

سابق شیخ الحدیث وصدر مفتی: دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، گجرات، صدر جمعیۃ علماء ہند، گجرات شاخ، وبانی دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی

ناشر:
حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات صاحب
خادم: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا۔ فون: 1905 966 4141

تفصیلات

نام: **فتاویٰ فلاحیہ** جلد اول

صاحب فتاویٰ: حضرت مفتی احمد بن ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ

مرتب: مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی

بہ اہتمام: دار العلوم فلاح دارین، ترکیسر

ناشر: حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات

(خادم: مسجد عمر ہیملٹن، کینیڈا)

سن طباعت: ربیع الاول ۱۴۳۶ھ، موافق: ۲۰۱۵ء

ملنے کے پتے:

(۱) دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی، انکلیشور، بھروچ، گجرات	02646 274243
(۲) حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات صاحب، خادم: مسجد عمر ہیملٹن، کینیڈا	905 578 2547
(۳) مفتی بیمات اکیڈمی، روشن سوسائٹی، انکلیشور، بھروچ، گجرات	9427 640250
(۴) مدنی ویلفیئر ٹرسٹ، کوسمبا، سورت، گجرات	9408 746664
(۵) ادارۂ صدیق، ڈابھیل، ضلع: نوساری، گجرات	09904 886188
(۶) مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، یوپی	01336 22329
(۷) جے ایم سی انڈیا پبلشر پرائیویٹ لمیٹیڈ، جھاہاؤس، ویسٹ نظام الدین	011 24352220
(۸) مدرسہ اسلامیہ عربیہ، آزادویل، ساؤتھ افریقہ	114 132786
(۹) مدرسہ تعلیم الدین، اسپنکو بیچ، ڈربن، ساؤتھ افریقہ	273 19029916
(۱۰) اظہر اکیڈمی لمیٹیڈ، 60 لٹل ایلفورڈ لین، مائنر پارک، لندن، یو-کے	0208 9119797

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست فتاویٰ فلاحیہ جلد اوّل

باب الإيمان باللہ (۴۷-۶۴)

باب التقدیر (۶۵-۸۰)

(تقدیر کا بیان)

مایتعلق باللّٰہ وصفاتہ (۸۱-۹۰)

إشراك بالله (۹۱-۱۰۶)

استمداد بغير الله (۱۰۷-۱۱۲)

ما يتعلق بعلم الغيب (۱۱۳-۱۳۶)

حاضر وناظر (۱۳۷-۱۴۲)

سیرت وشمائل (۱۴۳-۱۷۰)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ - چند سوالات وجوابات)

مایتعلق بالأنبیاء وأتباعھم (۱۷۱-۲۱۸)

نبوت (۲۱۹-۲۲۴)

توسل في الدعاء (۲۲۵-۲۲۸)

علامات قیامت (۲۲۹-۲۳۴)

باب الجزاء والعقوبة وباب الجنة ونعيمها (۲۳۵-۲۴۰)

(جزاوسزا - جنت اوراس کی نعمتوں کا بیان)

(جنت اوراس کی نعمتوں کا بیان)

باب الفرق (۲۴۱-۲۶۲)

(فرق باطلہ کے مخصوص اعمال)

باب الکفریات (۲۶۳-۳۲۸)

(اعمال کفر و شرک)

باب تکفیر المسلم (۳۲۹-۳۴۴)

(تکفیر مسلم کا بیان)

باب استخفاف الدین والشریعة (۳۴۵-۳۵۰)

[استخفاف دین وشریعت]

باب احکام المرتدین (۳۵۱-۳۶۰)

(مرتد کا حکم)

باب السنة والبدعة (۳۶۱-۴۸۲)

(سنن و بدعات)

تقلید کا بیان (۴۸۳-۵۰۰)

تبلیغ دین اور تصوف (۵۰۱-۵۲۶)

سلوک وتصوف

تعویذ کا بیان (۵۲۷-۵۳۴)

کتاب العلم (۵۳۵-۵۸۴)

علم اور متعلقات علم

باب ما یتعلق بالقرآن والحدیث (۵۸۵-۶۲۰)

قرآن کریم اور احادیث نبویہ

علمی اصطلاحات (۶۲۱-۶۲۸)

باب الکتب المعتمدۃ وغیرھا (۶۲۹-۶۵۴)

معتبر اور غیر معتبر کتابیں

باب تعبیر الرویا (۶۵۵-۶۶۸)

خواب اور اس کی تعبیر

تقریظ وتائید

مفکر گجرات حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم: من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ في الدین.

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں، تو اُس کو دین کا فہم نصیب فرماتے ہیں، دین کا فہم اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے گجرات کی سرزمین پر چودہویں صدی ہجری کے اواخر اور پندرہویں صدی ہجری کے اوائل میں بہترین فقہاء پیدا ہوئے، جنھوں نے مختلف مدارس میں بیٹھ کر اُمت کی فقہی ضرورتوں کو پورا فرمایا اور اُن کی شرعی رہنمائی فرمائی۔ فجزاھم اللہ أحسن الجزاء.

حضرت مولانا **مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ** کے فتاویٰ ''فتاویٰ رحیمیہ'' نے ہند و بیرونِ ہند میں زبردست مقبولیت حاصل کی، اُس کے بعد حضرت **مفتی احمد خانپوری** مدظلہ العالی کے فتاویٰ ''محمود الفتاویٰ'' شائع ہوئے، **مفتی اسماعیل واڈی والاؒ** کے فتاویٰ اُردو زبان میں طبع ہوئے، **مفتی اسماعیل کچھولوی مدظلہ** کے فتاویٰ ''فتاویٰ دینیہ'' کے نام سے پانچ جلدوں میں شائع ہو کر مقبول ہوئے، **مولانا مرغوب احمد لاجپوریؒ** کے فتاویٰ ''مرغوب الفتاویٰ'' اور **مفتی اسماعیل بسم اللہ** کے ''فتاویٰ بسم اللہ'' جلد اول بھی زیور طبع سے آراستہ ہو گئے ہیں، **مفتی اسماعیل بھڑکودرویؒ** کے فتاویٰ ''زبدۃ الفتاویٰ'' اور ''لباب الفتاویٰ'' کے نام سے چھپ چکے ہیں، فللّٰہ الحمد والمنۃ.

اب حضرت مولانا **مفتی احمد بیماتؒ** کے فتاویٰ ''فتاویٰ فلاحیہ'' کے نام سے اُن کے فرزند گرامی حافظ احمد بیمات کی مساعیٔ جمیلہ اور **مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی** مدظلہ کی تحقیق وتخریج کے ساتھ طباعت کے لیے تیار ہیں۔

حضرت **مفتی احمد بیمات** بہترین مدرّس، حق گو عالم اور تجربہ کار مفتی تھے، ڈابھیل اور ترکیسر میں چالیس سال تک فقہ و حدیث کی خدمت انجام دیتے رہے، دار العلوم فلاحِ دارین کے مفتی کی حیثیت سے بہت بڑی تعداد میں فتاویٰ لکھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کے فرزندگرامی **حافظ اسجد صاحب مدظلہ** کو توفیق اور ہمت عطا فرمائی کہ انہوں نے اپنے والدِ محترم کی گجراتی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا، اور فتاویٰ کے اہم کام کے لیے جدو جہد فرما رہے ہیں۔

مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی مدظلہ، جو مدنی دار التربیت کے اُستاذِ حدیث ہیں، فنِ فقہ سے خاص مناسبت رکھتے ہیں، اُنہوں نے انتہائی جاں فشانی سے اِن فتاویٰ کے حوالے کتبِ معتبرہ سے لکھے ہیں اور بہت عمدہ تعلیقات فرمائی ہیں، جس کی وجہ سے اِن فتاویٰ کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوگیا ہے، اور علماء اور اصحابِ فتاویٰ کے لیے قیمتی تحفہ بن گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ تقریباً دس جلدوں میں یہ قیمتی سرمایہ طبع ہوگا، اور اُمت کے لیے فقہی رہنمائی میں مددگار ثابت ہوگا، صاحبِ فتاویٰ حضرت **مفتی احمد صاحب** ۱۹۴۲ء میں جامعہ ڈابھیل میں داخل ہوئے، اور بندہ نے ۱۹۴۴ء میں داخلہ لیا تھا، موصوف اپنی جماعت میں محنتی اور شوقین طلبہ میں شمار ہوتے تھے، پھر ازہر الہند دار العلوم دیوبند میں داخل ہو کر اُس دور کے اساطینِ علم وفضل سے کسبِ فیض فرمایا، جس کی تفصیل اُن کے سوانحی خاکہ میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ والہانہ تعلق کے سبب دین کے مختلف شعبوں میں مخلصانہ جدو جہد کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اِسی لیے زندگی کے آخری لمحہ تک تعلیمی، تبلیغی، تنظیمی اور اصلاحی کاموں میں مصروفِ عمل رہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اِن گراں قدر خدمات کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اُن کو بہترین بدلہ عطا فرمائے، نیز اِن فتاویٰ کے کاموں میں جن جن حضرات نے محنت فرمائی ہے، اُن سب کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ اللّٰھم تقبل منا، إنك أنت السمیع العلیم.

فقط، والسلام

احقر عبد اللہ غفرلہٗ کاپودروی

۱۵/محرم الحرام ۱۴۳۵ھ

تقریظ: حضرت مولانا ومفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی دامت برکاتہم

مفتی اعظم: دارالعلوم، دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين، و الصلاة و السلام على سيد الأنبياء و المرسلين، محمد بن عبد الله الأمين، و على آله و صحبه أجمعين، و على من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أما بعد!

اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ فتویٰ نویسی سب سے مشکل اور اہم کام ہے، اور جتنا یہ وقیع، عظیم اور عمیق ہے، اتنا ہی نازک، پیچیدہ اور حزم واحتیاط کا متقاضی ہے، اس کے لیے مفتی کے اندر رسوخ فی العلم، رسوخ فی الدین، حدود ومقاصد شریعت سے آگہی اور اصول اربعہ پر فروعی مسائل وحوادث کے تطابق کا علم ضروری ہے، نیز اصول فقہ پر گہری نظر، فقہی جزئیات، مسائل کا وسیع مطالعہ، کسی ماہر استاذ مفتی کی شاگردی اور اس کی طویل صحبت اور احوال زمانہ سے واقفیت بھی ضروری ہے، علماء راسخین اور فقہاء کرام نے شریعت کے رموز وغوامض کی نقاب کشائی کے ساتھ کتاب وسنت کی بنیاد پر متنوع مسائل وحوادث، مختلف جزئیات اور حالات وطبائع کے تغیرات کوملحوظ رکھتے ہوئے ہمیشہ احکام صادر فرمائے ہیں۔

امت کی رہنمائی کے لیے اور ان میں شرعی احکام سے آگاہ کرنے کے لیے پیش آمدہ مسائل میں مفتیان کرام فتویٰ دیتے رہے ہیں، خدا کا شکر اور احسان ہے کہ یہ مبارک سلسلہ جاری ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ جاری رہے گا، فتاویٰ فلاحیہ بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے، حضرت **مولانا مفتی احمد ابراہیم بیمات صاحب** گجراتی مرحوم، جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے، موصوف ذی استعداد اور صاحب صلاحیت مفتی تھے، انہوں نے فراغت کے بعد جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل میں ایک عرصہ تک تدریس کی خدمات انجام دیں، گاہے گاہے فتویٰ بھی لکھا کرتے تھے، اس کے بعد دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر (گجرات) میں ایک عرصہ تک تدریس وافتا کی خدمت انجام دیتے رہے، اس کے بعد اپنے قائم کردہ مدرسہ دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی (انکلیشور، ضلع: بھروچ، گجرات) میں درس وتدریس اور فتاویٰ نویسی کی خدمات انجام دیں، سب سے زیادہ فتاویٰ ''فلاح دارین'' میں رہ کر لکھے

ہیں، اسی مناسبت سے فتاویٰ فلاحیہ کے نام سے اس مجموعہ کو موسوم کیا گیا ہے۔

متعدد اہل علم حضرات نے اس کا احساس فرمایا کہ حضرت **مفتی احمد بیمات** کی تمام تر کاوش کا نفع انفرادی لازم اور سائل و مفتی تک محدود نہ رہے، اگر ان کا یہ علمی ذخیرہ منصۂ شہود پر آجائے، تو ایک ایک مسئلہ سے سینکڑوں اور ہزاروں افراد مستفید ہو سکتے ہیں، لہٰذا انھیں حضرت **مفتی احمد بیمات** کے صاحب زادے جناب **حافظ اسجد بیمات** صاحب نے منظر عام پر لانے کا عزم کیا، اکثر فتاویٰ گجراتی زبان میں تھے، ان کا اردو ترجمہ کیا گیا، پھر اس کی ترتیب وتبویب اور تحقیق وتعلیق کا کام **مدنی دار التربیت، کرمالی** کے چند لائق اساتذہ کرام کے سپرد کیا گیا، انہوں نے محنت شاقہ اور عرق ریزی کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیا، یہ لوگ قابل ستائش اور لائق مبارک باد ہیں، بالخصوص عزیز محترم **مفتی مجتبیٰ حسن صاحب قاسمی** (استاذ: مدرسہ مدنی دار التربیت، کرمالی) بہت ہی قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے سب ہی مسائل کی تخریج بڑی تحقیق کے ساتھ کی اور تمام فتاویٰ کو عربی کتب متداولہ کے حوالوں سے مزین کیا، اور مفتی صاحب کے فتاویٰ میں جان ڈال دی، اور اس کی افادیت کو دوبالا کر دیا، ماشاء اللہ بڑی مہارت وحذاقت، دیدہ ریزی اور محنت وسلیقہ اور حوصلے کے ساتھ کیا، اس علمی تحقیق وتدقیق پر اللہ تعالیٰ انہیں بہت بہت جزائے خیر عطا فرمائے، اور ان کے علم میں برکت عطا فرمائے۔

دلی دعاء ہے کہ یہ مجموعہ، جو افادہ عام کے لیے شائع کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت سے نوازے، اس کے فیض کو عام وتام بنائے، حضرت مفتی صاحب مرحوم کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے، اور جن جن اساتذۂ کرام نے اس کی ترتیب وتبویب اور تخریج وتعلیق میں علمی وتحقیقی تعاون پیش کیا ہے، ان سب کو بہت بہت جزائے خیر عطاء فرمائے، آمین، ایں دعاء از من واز جملہ جہاں آمین باد، فقط۔

حبیب الرحمن خیرآبادی عفا اللہ عنہ

مفتی دار العلوم دیوبند

۲۷ ؍صفر ۱۴۳۶ھ

دعائیہ کلمات

صاحب زادہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد طلحہ کاندھلوی دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب الحاج حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ کئی ماہ سے بیمار چل رہا ہے، اللہ کے فضل اور اس کے کرم سے اس بیماری میں حج تو نصیب ہو گیا، مگر یہاں آنے کے بعد سے گھٹنے میں ایسی تکلیف ہے کہ نماز کو بھی نہیں جا پاتا، گھر پر ہی جماعت کرتا ہوں، گھر اور خانقاہ ملی ہوئی ہے، اس لیے فجر کے بعد ذکر کی مجلس خانقاہ ہی میں ہوتی ہے اور عصر کے بعد کتاب کی مجلس بھی، اور مہمانوں کا کھانا بھی دونوں وقت یہیں ہوتا ہے۔

اس وقت کچھ مہمان (جناب مفتی مجتبیٰ حسن، عبد اللہ اسجد بیمات اور عاصم بن زین العابدین صاحبان) آئے ہوئے ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ مولانا و مفتی احمد بیمات صاحبؒ کے لڑکے حافظ اسجد بیمات صاحب، اپنے والد گرامی کے فتاویٰ شائع کر رہے ہیں، اس پر مختلف علماء سے کچھ لکھوانا ہے، اس فہرست میں بندہ کا بھی نام ہے، بندہ پڑھنے پڑھانے کا آدمی نہیں ہے، لیکن آپ کے والد نور اللہ مرقدہ سے تعلق کی وجہ سے تعمیل ارشاد میں چند سطریں لکھوا رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ آپ کے کام کو ترقی عطا فرمائے، بزرگوں کی کتابیں آپ مہیا کر کے امت میں عام کریں، اردو کا بھی ذخیرہ ہو، گجراتی کا بھی ذخیرہ ہو، اگر گنجائش ہو، تو آپ درسی کتابیں بھی مہیا کریں، ذکر کی نسبت پر، دعوت کی نسبت پر اور علم کی نسبت پر بزرگوں کی جو کتابیں آ رہی ہیں، آپ کے ذریعے عام ہوں، اللہ تعالیٰ ''مفتی بیمات اکیڈمی'' کو ترقیات سے نوازے، اخلاص عطاء فرمائے، بندہ دل سے دعاء کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان جگہوں سے تعلق برقرار رکھنے کی توفیق عطا فرمائے، جن جگہوں سے آپ کے والد صاحبؒ کا تعلق تھا، فقط۔

محمد طلحہ کاندھلوی

۲۸/صفر ۱۴۳۶ھ

عرض ناشر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ احقر کو ابتداء ہی سے والد صاحبؒ کی خصوصی محبت، شفقت اور توجہات حاصل رہیں، ۱۹۹۹ء میں تقریباً ۲۰؍ ماہ والد صاحب کے ساتھ مدنی دار التربیت، کرمالی، بھروچ میں گذارنے کی سعادت میسر آئی، اس دوران والد صاحب جب کبھی بیرونی سفر پر جاتے، مدرسے کی ذمے داری احقر کے سپرد کر جاتے، اس عرصے میں والد ماجدؒ سے بہت سی بیش بہا باتیں سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ہاتھ لگا، کچھ باتیں تو اب تک کانوں میں گونج رہی ہیں، مثلاً آپؒ فرمایا کرتے تھے: ''انسان کو کوئی کام کرنا ہو، تو ضروری ہے کہ عزائم اعلیٰ، حوصلہ بلند اور کردار اچھے ہوں، مکمل اخلاص کے ساتھ کام انجام دے اور اللہ تعالیٰ کی جانب ہمہ تن متوجہ رہے۔

والد صاحب کی تصانیف چوں کہ گجراتی زبان میں تھیں، اس لیے احقر انہیں اردو کا جامہ پہنانے کا خواہش مند تھا، والد صاحب کی حیات میں کئی مرتبہ اس خواہش کا اظہار بھی کیا؛ لیکن آپ منع فرما دیتے اور کہتے: ''ہمارے انتقال کے بعد کرتے رہنا''۔ والد ماجد کے دنیا سے رخصت فرمانے کے بعد یہ جملہ میرے دل پر دستک دیتا رہا، اس کا تذکرہ میں نے برادر محترم حضرت **مولانا امجد صاحب** مدظلہ سے بھی کیا؛ لیکن حضرت والا گوناں گوں مشغولیات اور اہتمام کی مصروفیات کے سبب اس کے لیے فارغ نہ ہو سکے۔ احقر نے خصوصاً اس عظیم کام کی انجام دہی اور نظم ونسق کے لیے کینیڈا سے ہندوستان کا سفر کیا اور مسلسل تگ و دو اور جد و جہد کے بعد اس منصوبے کی تکمیل کی تیاری شروع ہوگئی، بفضلہ تعالیٰ تین سال کے عرصے میں چھوٹی بڑی تیس کتابیں اردو زبان میں طبع ہو کر منصۂ شہود پر آئیں، جنھیں ملک اور بیرون ملک میں بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، عوام وخواص ہر ایک نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اساتذۂ کرام اور دیگر علماء نے کافی سراہا اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ سے دست بہ دعا ہوں کہ ربّ کریم قبولیت سے نوازے اور ہم سب کے لیے ذریعۂ نجات بنادے، میں ان تمام حضرات کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے گجراتی سے اردو زبان میں منتقل کرنے کے لیے اپنے قیمتی اوقات صرف کیے۔

جس وقت کتابوں کے اردو ترجمے کا کام چل رہا تھا، دل میں ایک داعیہ پیدا ہوا کہ اگر والد ماجدؒ کے

فتاویٰ بھی طبع ہوکر منظر عام پر آجاتے، تو کیا ہی اچھا ہوتا، امت مسلمہ کے ہاتھوں میں ایک قیمتی علمی سرمایہ آجاتا، جس سے رہتی دنیا تک لوگ مستفید ہوتے رہتے، والد ماجدؒ نے چوں کے ایک طویل عرصے تک **فلاح دارین، ترکیسر** میں تدریسی اور فتاویٰ نویسی کی خدمات انجام دی تھی، اس لیے فتاویٰ کے بیشتر رجسٹر وہیں محفوظ تھے۔ احقر نے مناسب سمجھا کہ اس جانب قدم بڑھانے سے قبل محسن ومربی جناب حضرت **مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی** صاحب دامت برکاتہم کے سامنے اس نیک عزم کا اظہار کرکے، آپ کے صلاح ومشورے کے مطابق منزل کی جانب رواں ہونا نہایت مناسب اور خیر وبرکت کا سبب ہوگا، اس مقصد کی خاطر احقر نے حضرت مولانا مدظلہ سے ٹورنٹو میں خصوصی ملاقات کی اور اپنے عزائم حضرت والا کے سامنے بیان کیے، آپ نے سن کر بے انتہا مسرت کا اظہار فرمایا، حوصلہ افزائی فرمائی، دعائیں دیں اور فرمایا: ''میں شوال المکرم میں ہندوستان جارہا ہوں، آپ کاپودرہ آیئے، ہم سب ایک ساتھ ترکیسر جائیں گے''۔ حسب امر میں نے حضرت سے کاپودرہ میں ملاقات کی، آپ نے **فلاح دارین** سے فتاویٰ کے رجسٹر دلوائے، زیرعکس (زیراکس) کر کے اصل رجسٹر **دارالعلوم فلاح دارین** کو واپس دے دیے گئے، اور اگلے مرحلے کے لیے کوششیں شروع ہوگئیں، اس طرح فتاویٰ کے کام کا آغاز ہوگیا۔

میں گجرات دینی تعلیمی بورڈ کے سکریٹری جناب **مولانا یعقوب تواگامی** کے احسان کو فراموش نہیں کرسکتا، کہ جب میں نے ان کے سامنے اس مقصد کا ذکر کیا، تو انہوں نے بڑی مسرت وشادمانی ظاہر فرمائی اور فلاح دارین کے رکن کمیٹی **مولانا الحاج خلیل راوت** صاحب اور مہتمم صاحب سے ملاقات کی۔

والد صاحب چوں کہ **جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل** میں بھی تعلیمی خدمات انجام دے چکے تھے، بعض اوقات آپ نے وہاں بھی فتاویٰ نویسی کی خدمات انجام دیں؛ اس لیے وہاں کی فائل مرحمت فرمانے پر میں حضرت **مولانا احمد بزرگ صاحب** مہتمم جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کا بھی تہ دل سے شکر گذار ہوں۔

گجرات میں عموماً لوگ چوں کہ یہاں کی صوبائی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں، اس لیے فتاویٰ گجراتی ہی زبان میں لکھے جانے کا معمول رہا ہے، والد صاحبؒ کے اکثر فتاویٰ بھی گجراتی ہی زبان میں تھے، فتاویٰ کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے سب سے پہلے ضروری یہ تھا کہ اسے اردو کے قالب میں ڈھال دیا جائے، اس سلسلے میں میری نظر دارالعلوم مدنی دارالتربیت کے سابق استاذ حضرت **مولانا اسعد صاحب**

پالن پوری پر پڑی، میں نے یہ ذمے داری ان کے سپرد کردی، حضرت مفتی صاحب نے بشاشت کے ساتھ قبول فرمایا اور ہمہ تن جٹ گئے۔ ان کے علاوہ تقریبا پندرہ مفتیان کرام اور ہیں، جن کی شبانہ روز قربانیوں کے نتیجے میں فتاویٰ کو اردو میں منتقل کرنے کا مشکل مرحلہ طے پایا، اگلا مرحلہ کمپوزنگ کا تھا، اس کے لیے **مولانا رشید احمد آچھودی** صاحب نے دین کا کام اور دینی خدمت سمجھ کر بہت مختصر وقت اور قلیل صرفے میں کمپوز کر کے دے دیا، اللہ ان کو اپنی شایان شان اجر جزیل عطا فرمائے، آمین۔

اسی طرح میں **حافظ محمد الیاس جھانجھی** صاحب اور اپنے بھانجے **حافظ ازہد گوری** کا بھی بے حد ممنون ہوں، جنہوں نے دن رات، سردی گرمی کا خیال کیے بہ غیر، ہر وقت فتاویٰ کے کام کی مختلف ضروریات کے لیے اپنے قیمتی اوقات صرف کیے، ساتھ ہی اپنے بھتیجے عزیزم **مولانا عبدالرحمٰن** سلمہ کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے بھی جب کبھی کمپیوٹر خراب ہوا، اپنا وقت فارغ کر کے اس کی ریپیرنگ کرتے رہے۔ ٹنکاریہ کے **مولانا ہارون کاٹھیاواڑی** کا احسان بھی بھلایا نہیں جاسکتا کہ موصوف بھی کمپوز کر کے وقت پر کام دیتے رہے۔

اب تک الحمد للہ دو مرحلے (اردو میں ترجمہ اور کمپوزنگ) سے فراغت ہوگئی؛ لیکن آخری مرحلہ ترتیب وتبویب اور زبان کی تصحیح کا تھا، اس کے لیے میری نظر میرے مدرسہ ''دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی'' کے استاذ حدیث وفقہ **مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی** صاحب پر پڑی، مفتی صاحب نے میری درخواست کو بہ خوشی قبول فرمایا، مولانا کے ذمہ پانچ اسباق ہیں، ان کا پڑھانا اور مطالعہ کرنا ایک مستقل کام تھا، الحمد للہ تدریسی مصروفیات کے ساتھ انہوں نے خارجی اوقات میں، دن رات ایک کر کے، عصر بعد، مغرب بعد اور رات کے دو دو بجے تک، بڑی جاں فشانی کے ساتھ اس مرحلے کو بہ حسن وخوبی انجام دیا، اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی جمیع مساعی کو شرف قبولیت سے نوازے اور دارین میں کام یابی نصیب فرمائے، اللہ تعالیٰ ان کی نیک اور جائز تمنا پوری فرمائے، مفتی صاحب کا اس کام کے دوران ایکسیڈنٹ بھی ہوگیا تھا، کافی چوٹیں آئی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ہمت عطا فرمائی اور کام کرتے رہے، میں انہیں صرف دعا دے سکتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہم تمام کی ٹوٹی پھوٹی کاوش کو قبول فرمائے، آمین۔

میں اس موقع پر دار العلوم مدنی دار التربیت کے قابل قدر استاذ **حضرت مولانا حسین احمد قاسمی** صاحب کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنا گراں قدر علمی تعاون پیش کیا، اللہ قبول فرمائے، آمین۔

اخیر میں میں ان تمام علماء کرام کا مشکور ہوں، جو اپنی قیمتی آراء اور مفید مشوروں سے نوازتے

رہے، خصوصاً حضرت **مفتی** سلمان صاحب **منصور پوری**، استاذ حدیث وفقہ جامعہ شاہی مراد آباد کا، جنھوں نے نہایت ہی کارآمد مشورے دیے، جو فتاوی کی ترتیب کے مرحلے میں بڑے کارآمد ثابت ہوئے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں ان اہل خیر حضرات کا شکریہ ادا نہ ہوں، جنھوں نے اپنی جائز آمدنی اور حلال مال سے ہمارا تعاون فرمایا، اللہ ہر ایک کی جائز تمنائیں پوری فرمادے اور فتاویٰ فلاحیہ کو مفتی صاحب کی دیگر تصانیف کی طرح شرف قبولیت سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

یکم ربیع الاول ۱۴۳۶ھ

موافق: ۲۴؍دسمبر ۲۰۱۴ء

حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات
رکن منتظمہ: دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی، بھروچ، گجرات
خادم: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا
Emai : hafizasjed@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مرتب

الحمد للہ رب العالمین، و الصلاۃ و السلام علی سید الأنبیاء و المرسلین، و علی آلہ و صحبہ أجمعین، أما بعد!

فتاویٰ فلاحیہ کی پہلی جلد پیش خدمت ہے، شکر گذاری کے اس موقع پر احقر بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہے کہ اس نے اس کم ترین کو اس اہم علمی کام کی توفیق بخشی، ورنہ تو یہ کسی بھی لائق نہیں ہے، دعا ہے کہ جس نے توفیق بخشی ہے، وہی اسے قبولیت بھی عطا فرمادے، اور بقیہ جلدوں کی تکمیل کی ہمت بھی، و ما ذلك علیہ بعزیز۔

اس جلد میں کتاب الایمان و العقائد سے متعلق ۲۲/ابواب ہیں، کتاب العلم اور اسی کے تحت باب ما یتعلق بالقرآن والحدیث بھی ہے۔ ان شاء اللہ العزیز دوسری جلد بھی جلد ہی اہل علم کی خدمت میں پیش کی جائے گی اور یہ سلسلہ شاید سات (۷) جلدوں پر جا کر مکمل ہوگا۔

اس موقع فتویٰ کی تعریف اور اس کا تاریخی تسلسل، علماء ہند کے فتاویٰ کی خصوصیات اور عظیم مصلح و معلم، صاحب فتاویٰ حضرت مفتی احمد ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ کے طرز فتاویٰ اور ان کی خصوصیات پر ایک تفصیلی تحریر لکھنے کا ارادہ تھا، لیکن کام کی مشغولیت اور یہ سمجھ کر کہ خواہ مخواہ قارئین پر حقیر کی تحریر بوجھ بنے گی، اسے ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بس ذیل میں وہ تفصیلات پیش کی جارہی ہیں، جن کا فتاویٰ فلاحیہ میں خاص خیال رکھا گیا ہے:

کچھ اصل فتاویٰ سے متعلق:

حضرت مفتی احمد ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۳۲-۲۰۰۴ء) کے اکثر فتاویٰ اصلاً گجراتی زبان میں تھے، جنہیں پہلے مرحلے میں گجرات کے باصلاحیت علماء نے اردو زبان میں منتقل کیا اور اکثر مسائل پر عناوین بھی قائم کردیے، دوسرے مرحلے میں ترتیب وار (۱) زبان کی سلاست، (۲) مسائل کی تخریج اور (۳) ''تخریج مسائل'' و ''عناوین'' پر نظر ثانی کا کام درج ذیل تفصیلات کے مطابق انجام دیا گیا ہے:

فتاویٰ کی زبان سے متعلق:

(۱) سوال و جواب کی زبان عام فہم اور سلیس رکھی گئی ہے، مناسب تعبیر اور پرکشش اسلوب اختیار کیا

گیا ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ فتویٰ کی زبان' قانونی زبان ہو کہ کوئی لفظ نہ تو مفہوم سے زائد ہو، اور نہ ہی کم، تاکہ مفہوم پر مکمل دلالت کرے اور اسے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

(۲) چوں کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی بھی مواد کی منتقلی انتہائی مشکل کام ہے (کہ ہر زبان کی اپنی اپنی نزاکت ہوتی ہے) اور فتاویٰ کی منتقلی تو اور بھی دشوار ہے؛ کیوں کہ فتاویٰ کی زبان قانونی ہوتی ہے، اس لیے اگر اس مجموعہ میں زبان کے لحاظ سے کہیں نقص اور کمی نظر آئے، تو اسے مترجم و مرتب کی غلطی تصور کریں، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی گیرائی و گہرائی اس بات کی بالکل اجازت نہیں دیتی کہ اس نقص کو ان کی جانب منسوب کیا جائے۔

(۲) سوال یا جواب میں جہاں کہیں مشکل یا ایسے اصطلاحی الفاظ آئے ہیں، جن کا شیوع عام نہیں ہے، حاشیہ میں ان کی وضاحت کردی گئی ہے۔

(۳) ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک سوال کئی مسئلوں پر مشتمل رہا ہے، اگر وہ (متعدد مسائل) مختلف باب اور مختلف عنوان سے متعلق رہے ہیں، تو سوال اور اس کے جواب کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کرکے' ان کے موقع کی مناسبت سے ذکر کیا گیا ہے۔

مسائل کی تخریج سے متعلق:

(۱) آیت کریمہ اور احادیث نبویہ (علی صاحبھا الصلوۃ و السلام) کی مکمل تخریج کی گئی ہے، آیت کریمہ کے حوالہ میں اولاً سورت نمبر، پھر سورت کا نام اور آیت نمبر درج کیا گیا ہے۔ مثلاً: **(۸-الأنفال: ۳۳)**

اسی طرح حدیث پاک کے حوالے میں کتاب کا نام، اکثر جگہ صفحہ اور جلد کی تفصیل، حدیث نمبر، باب اور کتاب، کتاب کے مصنف و محقق کا نام، مطبع اور سن طباعت کی وضاحت کی گئی ہے، مثلاً: (۱۔ **مسند الإمام أحمد بن حنبل** (م: ۲۴۱ھ): ۱۴/ ۷۷، رقم الحدیث: ۸۳۳۱، ت: **شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون**، ط: **مؤسسة الرسالة**، طبع اول ☆ ۲۔ **سنن الترمذي**: ۱/ ۳۱، رقم: ۱۱۵، باب في المذي يصيب الثوب، أبواب الطهارات، ط: مكتبة البدر، ديوبند)

(۲) ہر ہر مسئلے کی؛ بل کہ مسئلے کے ہر ہر جزء کی کتب فقہ سے تفصیلی تخریج کی گئی ہے، تخریج میں اولاً نصوص کے ذکر کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، پھر فقہاء کی عبارت لکھی گئی ہے، کتب فقہ میں اولاً شامی، بدائع

الصنائع، البحر الرائق، فتح القدیر، اور ہدایہ کی جانب رجوع کیا گیا ہے، ثانیاً عالم گیری، تاتارخانیہ اور دیگر کتب فقہ کی عبارت ذکر کی گئی ہے۔ (حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ ماشاء اللہ کافی وشافی ہیں، تفصیلی تخریج کا مقصود صرف یہ ہے کہ فتویٰ محقق ہوجائے اور کوئی بات بغیر حوالہ کے نہ رہ جائے)

(۳) ہر جزء کی تخریج میں صریح جزئیہ نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اگر وہی جزئیہ دوسری کتابوں میں موجود ہے، تو اس کا بھی حوالہ دیا گیا ہے، عبارت صرف ایک کتاب کی نقل کی گئی ہے، اگر کسی جواب میں کسی خاص قید کے لیے ایک عبارت کو کافی نہیں سمجھا گیا ہے، تو دوسری عبارت کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔

(۴) حوالہ لکھنے میں کتاب کا نام، بعض جگہ مصنف کا نام، سن پیدائش و وفات، جلد نمبر، صفحہ نمبر، باب اور کتاب، محقق کا نام، مطبع اور سن طباعت کی صراحت کی گئی ہے۔ مثلاً: (الفتاوی الهندية:۱/ ۴۵، كتاب الطهارة، الباب السابع في النجاسة وأحكامها، ط: دار الفکر طبع دوم: ۱۳۱۰ء ☆بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۱/ ۲۷-۲۸، فصل بيان ما ينقض الوضوء، ط: دار الكتب العلمية، الطبعة الثانية: ۱۴۰۶ھ-۱۹۸۶ء)

عنوان سے متعلق:

(۱) عناوین قائم کرنے میں سوال وجواب کے تمام اجزاء کو ملحوظ رکھا گیا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ عنوان سے اصل مسئلہ کی طرف مکمل رہنمائی حاصل ہوجائے۔

ملحوظات:

☆ہر باب کے عنوان پر مستقل نمبر لگایا گیا ہے، جس سے مقصود ہر باب کے مسائل کو شمار کرنا ہے، جب کہ سوال پر لگائے گئے نمبرات کل مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں۔

☆ چند کتابوں کا حوالہ لکھنے میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ایک حوالے کی تکمیل کے بعد نشان ستارہ (☆) دے کر دوسرا حوالہ لکھا گیا ہے، اس کے لیے نئی سطر کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔

☆ترتیب کے سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہے کہ یہ کام انتہائی عجلت میں انجام دیا گیا ہے؛ اس لیے ایسا ہوسکتا ہے کہ بعض عنوان ایسے باب میں مذکور ہوں، جنہیں عموماً دوسرے مرتبین اس میں ذکر نہیں کرتے، تاہم جہاں بھی ایسا ہے، وہ کسی نہ کسی مناسبت کی وجہ سے ہے۔

نیز ایمان وعقائد میں مذکورتمام ابواب کسی نہ کسی مناسبت کی وجہ ہیں، ورنہ تو بعض ابواب ایسے ہیں، جنھیں مرتبین دوسرے ابواب میں ذکر کرتے ہیں، مثلا ایصال ثواب کے مسائل ''کتاب الجنائز'' میں باب ''إهداء الثواب للميت'' کے تحت ذکر کیے جاتے ہیں، اس حقیر نے اسے ''باب السنة والبدعة'' کے تحت ذکر کیا ہے، کہ ایصال ثواب میں عموماً رسومات وبدعات درآئے ہیں۔

☆تخریج کا ایک اہم مقصد اہل علم کو سہولت فراہم کرنا ہے، اس لیے حوالے کی بعض عبارتیں مکرر نظر آئیں گی۔ جہاں بالکل قریب میں وہ عبارت گذری ہے، وہاں تو اس کی طرف صرف اشارہ کر دیا گیا ہے؛ لیکن جہاں حوالے کی عبارت بہت پہلے گزر چکی ہے، وہاں مکمل عبارت کو درج کیا گیا ہے۔

☆مکررات کو حذف کرنے سے دو وجہ سے گریز کیا گیا ہے:

۱-عموماً وہ جواب کسی نہ کسی اہم فائدے پر مشتمل ہے۔صرف اس حصے کو ذکر کرنا اور دوسرے حصے کو حذف کرنا سوال وجواب کے تسلسل کو ختم کر دیتا ہے۔

۲- ملتے جلتے سوال کا جواب گرچہ نتیجہ کے اعتبار سے ایک ہوتا ہے؛ لیکن جواب کے تفصیل واجمال کا اختلاف جہاں سائل کی ضرورت کی وجہ سے ہوتا ہے، وہیں مفتی کے نشاط کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے، اس کی وجہ سے طرز بدلتے رہتے ہیں، ایک سوال کا متعدد انداز میں جواب دیا جاسکتا ہے۔حضرت مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ میں ایسی مثالیں بہ کثرت ملیں گی، اس کی وجہ سے نوجوان علماء ومفتیان کرام کو بڑا فائدہ ہوگا، کہ ان کو ایک جواب کو متعدد طرز پر لکھنے کے لیے نمونہ فراہم ہوگا۔اس وجہ سے بھی مکررات کو حذف نہیں کیا گیا ہے۔

☆اردو کے جدید املا کا بہ طور خاص خیال رکھا گیا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ رموز واوقاف کی مکمل رعایت ہو۔

اس فتاویٰ کی مقبولیت کے لیے نیک فالی یوں لی جاسکتی ہے کہ اس ناچیز نے جب اس کی تفصیل صاحب زادہ شیخ الحدیثؒ حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی دامت برکاتہم کو بتلائی، تو نہ صرف دعائیں دیں، بل کہ اپنی جیب خاص سے پانچ ہزار روپے عنایت فرمائے اور یوں کہا ''اسے پیشگی رکھیے، جب چھپ کر آجائے، تو اس رقم کے عوض جس قدر فتاویٰ ہوں، میرے نام بھیج دیجیے گا''۔اس ناچیز نے روپے لینے میں جھجک محسوس کیا، تو فرمانے لگے: ''مولوی صاحب! برکت والا ہے، لے لو''۔ایک صاحب دل بزرگ اور

مسلمہ شخصیت کی جانب سے ایسی حوصلہ افزائی کو راقم الحروف نیک فال سمجھتا ہے اور بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے مقبول اور نافع بنائے، آمین، وماذلك على الله بعزيز.

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے میرے محسن وکرم فرما جناب **حافظ امجد مفتی احمد بیمات** صاحب کو، کہ انھوں نے اپنے والد ماجد کے فتاویٰ کی نشر واشاعت کا بیڑا اٹھایا، انھوں نے اس کام کے لیے احقر سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، جسے احقر نے قبول کرنا سعادت سمجھا، اور جو کچھ بن پڑا، پیش خدمت ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس میں جو کچھ خوبی ہے، وہ ان کے نیک جذبات کی وجہ سے ہے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمت کو قبول فرمائے، آمین، ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم. آمين، يارب العالمين.

مجتبیٰ حسن قاسمی
خادم حدیث: دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی
برائے رابطہ: 09409518452
Email: qasmimujtaba@gmail.com

سوانحی خاکہ:

حضرت مفتی احمد ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ

(۱۹۳۲-۲۰۰۴ء)

از: مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی
(استاذ حدیث: دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی)

نام: حضرت مفتی احمد بن ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: ۶ر جنوری ۱۹۳۲ء

جائے ولادت: کرمالی، وایا: پانولی، تعلقہ: انکلیشور، ضلع: بھروچ، گجرات

ابتدائی تعلیم: وطن مالوف، کرمالی

ابتدائی دور کے اساتذہ: حافظ محمد موسیٰ حافظ جی، مولانا اسحاق گنگات پانولی اور حافظ اسحاق درسوت

ثانوی تعلیم: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

سن داخلہ: ۱۳۶۲ھ

ڈابھیل کے اساتذہ: مولانا محمد ایکھلو یا ڈابھیلی، مولانا احمد امیجی کاچھوی، مولانا عبد القادر، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، مولانا اسماعیل کاسوجی، مولانا احمد پٹیل، مولانا محمد مالک اور مولانا شمس الدینؒ۔

اعلیٰ تعلیم و تربیت افتا: دار العلوم دیوبند

سن داخلہ: ۲۲ر شوال المکرم ۱۳۶۸ھ

دیوبند کے اساتذہ: شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ (بخاری و ترمذی) حکیم الاسلام مولانا و قاری محمد طیب قاسمیؒ (مشکوۃ المصابیح) حضرت مولانا محمد حسین ملا بہاریؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی اور حضرت مولانا سید مہدی حسنؒ (مشق فتاویٰ و تربیت افتاء)

سن فراغت: ۱۳۷۰ھ موافق: ۱۹۵۰ء (اعلیٰ نمبرات کے ذریعے کامیابی)

افتاء: ۱۳۷۱ھ موافق ۱۹۵۱ء

اصلاحی تعلق: حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ (دار العلوم دیوبند میں دوران تعلیم وابستگی، ۹ر سال تک)، حضرت مدنیؒ کی وفات کے بعد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

کی جانب رجوع، ان کی خانقاہ میں ۱۸؍ رمضانوں میں حاضری۔

تدریس کی ابتدا: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل (۱۳۷۲ھ تا ۱۳۸۸ھ)

ڈابھیل میں مدت تدریس: ۱۷؍ سال

ڈابھیل میں زیر درس کتابیں: شرح عقائد، مشکوٰۃ المصابیح، طحاوی شریف، شرح تہذیب اور عارضی طور پر کچھ دنوں کے لیے مسلم شریف۔

ڈابھیل سے ترکیسر تشریف آوری: شوال ۱۳۸۸ھ موافق: ۹؍ جنوری ۱۹۶۹ء

ترکیسر میں مدت تدریس: ۲۲؍ سال (تا ۴؍ مارچ ۱۹۹۰ء)

کل مدت تدریس ڈابھیل و ترکیسر: ۴۰؍ سال

ترکیسر میں زیر درس کتابیں: مسلم شریف، ابوداود، ابن ماجہ، مشکوٰۃ المصابیح، شرح نخبۃ الفکر، شعبۂ افتا، طحاوی شریف اور ۱۹۷۱ء سے بخاری شریف تا مدت قیام ۱۹۹۰ء (۲۰؍ سال)

عہدے، مناصب اور خدمات: ۱۔ بانی دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی (۵۰۰ طلباء زیر تعلیم ہیں، از ابتداء تا دورۂ حدیث اور افتاء تک کی معیاری تعلیم کا نظم ہے) ۲۔ بانی جامعۃ الصالحات، پانولی (اس ادارے میں ۳۰۰؍ سے زائد یتیم بچیاں تعلیم حاصل کررہی ہیں) ۳۔ شیخ الحدیث وصدر مفتی دار العلوم فلاح دارین، ترکیسر (گجرات کا معیاری ادارہ) ۴۔ صدر گجرات دینی وتعلیمی بورڈ ۱۹۸۷ء تا ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۵ء تا وفات (کل مدت: ۲۶؍ سال) ۵۔ محکمۂ شرعیہ صوبۂ گجرات کے صدر، کچھ عرصہ جنرل سکریٹری، یکے از بانیان محکمۂ شرعیہ ۶۔ رکن مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند (مسلسل ۳۰؍ سال) ۷۔ امیر شریعت گجرات (۵؍ صفر المظفر ۱۴۲۳ھ موافق: ۱۹؍ اپریل ۲۰۰۲ء تا وفات) ۸۔ صدر جمعیۃ علماء گجرات (۲؍ سال) ۹۔ صدر جمعیۃ علماء سورت (۱۶؍ سال)

اسفار: مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کینیڈا، ساؤتھ افریقہ، ری یونین اور ایک درجن سے زائد بیرونِ ملک کا بہ قصد اصلاح معاشرہ سفر۔

تصنیفات: تقریباً ۴۰؍ بہ زبان گجراتی، ایک رسالہ بہ زبان اردو، ۱۳؍ کتابوں کے انگریزی ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور اکثر کتابوں کا اردو ترجمہ ان کے سعادت مند فرزند حافظ احمد مفتی احمد بیمات صاحب کی کوشش سے جاری ہے، بیشتر کتابوں کے اردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

وفات: ۱۲؍ فروری ۲۰۰۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عظیم مصلح و معلم حضرت مفتی احمد بیمات رحمہ اللہ تعالیٰ

{۱۹۳۲ء-۲۰۰۴ء}

از: مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی
استاذ حدیث: دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی

گجرات کی علمی فضاء پر جن شخصیات نے انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں، بے مثال اور لازوال قربانیوں سے معاشرے میں صالح انقلاب برپا کیا ہے اور اپنی اصلاحی کوششوں سے پورے صوبۂ گجرات کو فیض پہونچایا ہے، ان کی اگر انتہائی مختصر فہرست بھی تیار کی جائے، تو ان میں نمایاں طور پر "فقیہ وقت، صاحب دل بزرگ، بانی دارالعلوم مدنی دارالتربیت کرمالی حضرت **مفتی احمد ابراہیم بیمات**" کا نام ضرور شامل ہوگا۔

آپ بہ یک وقت اعلیٰ درجے کے محدث، زمانہ شناس فقیہ، معاشرہ میں انقلاب پیدا کردینے والے واعظ وخطیب، قابل تقلید منتظم اور زمانہ کی ضروریات کے مطابق مختلف اور ہمہ گیر موضوعات پر، تاثیر سے پر، دل کش اور موثر تحریر کے ذریعے عوام الناس کی رہنمائی کرنے والے بے مثال مصنف تھے۔ بلاشبہ آپ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔

ولادت اور ابتدائی تعلیم: آپ بھروچ ضلع کے ایک گاؤں "کرمالی" کے دین دار گھرانہ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد محترم ابراہیم بیمات کو علماء کرام کی صحبت حاصل تھی، علم دین کی قدر و قیمت سے واقف تھے؛ اس لیے بلا تردد آپ کو گاؤں کے مکتب میں داخل کردیا گیا، آپ نے یہیں سے اپنے علمی سفر کا آغاز کیا، ایسا آغاز کہ پھر اس کی انتہاء زندگی کی آخری سانس پر ہوئی۔

ثانوی تعلیم: ثانوی تعلیم کے لیے ۱۹۴۲ء میں جامعہ ڈابھیل کا رخ کیا، جہاں امام العصر علامہ کشمیریؒ اپنے قابل فخر رفقاء کے ساتھ خیمہ زن تھے اور ڈابھیل کی علمی فضاء ان انفاس قدسیہ کی موجودگی کی باعث اپنی قسمت پر نازاں و فرحاں تھی، ڈابھیل کی ایسی فضاء میں حضرت مفتی بیمات صاحبؒ نے کامل جدوجہد، اعلیٰ درجہ کی دل چسپی و رغبت اور پوری محنت و لگن کے ساتھ اپنی علمی تشنگی بجھائی، حصولِ علم کی خاطر آپؒ نے اپنی پوری توانائی صرف فرمائی، اس طرح آپ نے ڈابھیل کے زمانۂ قیام میں ہی نحو، صرف،

منطق، فلسفہ، عربی زبان وادب اور علوم بلاغت میں درجۂ کمال حاصل کرلیا۔

اعلیٰ تعلیم: علم کی نہ بجھنے والی پیاس اور آپ کی اخاذ طبیعت نے اسی پر بس نہیں کیا؛ بل کہ مزید تعلیم کے لیے آپؒ نے عظیم مرکزِ علم وفن: دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا، جہاں اس وقت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کی علمی اور روحانی مجلس کا چرچا تھا، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ کی بزم آرائی تھی، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا وقاری محمد طیب قاسمی صاحبؒ، حضرت علامہ محمد حسین بہاریؒ اور فقہ وحدیث میں کامل دسترس رکھنے والے مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں آبادیؒ جیسے ماہرین علوم وفنون کی ایک بڑی تعداد سے دار العلوم دیوبند کی علمی فضا مشک بار تھی، حضرت مفتی بیمات صاحبؒ نے ان مشائخ کبار کے دامن سے اپنے آپ کو وابستہ کردیا اور دریائے علم سے مسلسل سیراب ہوتے رہے، حتیٰ کہ تفسیر، حدیث اور فقہ اسلامی میں درک حاصل کیا۔

حضرت مفتی بیمات صاحبؒ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھنے کا شرف حاصل کیا، ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں اعلیٰ نمبرات کے ساتھ سند فراغت حاصل کی، فقہ اسلامی میں مزید اختصاص ومہارت پیدا کرنے کے لیے شعبۂ افتاء میں داخلہ لیا اور حضرت مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوری رحمۃ اللہ علیہ کی زیر نگرانی ۱۹۵۱ء مطابق ۱۳۷۱ھ میں فتاویٰ نویسی کی مشق وتمرین کی، جس کے نتیجے میں آپ کو فقہ وفتاویٰ میں ایک مقام حاصل ہوا اور ہندوستان کے معتبر ومستند ارباب افتاء میں آپ کا شمار ہوا۔

اصلاحی تعلق: ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ آپ باطنی علوم یعنی تزکیۂ نفس کے لیے بھی ابتدا سے ہی کوشاں رہے، چناں چہ آپؒ نے دار العلوم دیوبند کے زمانۂ قیام میں ہی اپنے ہر دل عزیز، استاذ محترم، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ سے اصلاحی تعلق قائم فرمالیا تھا اور یہ اصلاحی تعلق صرف رسمی نہیں تھا؛ بل کہ انتہائی سوچ سمجھ کر کیا جانے والا فیصلہ تھا، چناں چہ حضرت مدنیؒ جب تک بہ قید حیات رہے، حضرت مفتی احمد بیماتؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے، اصلاح نفس کے لیے ہدایات حاصل کرتے رہے، ان ہدایات پر عمل کرنے کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے رہے، مفتی بیمات صاحبؒ کو اپنے شیخ سے دیوانگی کی حد تک عشق تھا، عشق ومحبت کے جو تقاضے ہیں، ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ محب حقیقی اپنے محبوب کی ہر ہر ادا کو اپنی زندگی کا جزء بنالے، اس حوالہ سے حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی یقیناً حضرت شیخ

الاسلامؒ کی زندگی کا عکسِ جمیل تھی، آپؒ نے اپنے شیخ کی ہر ہر ادا کو اپنی زندگی کا جزء بنایا۔

حضرت مدنیؒ کی ۷۷ ۱۳ھ موافق ۱۹۵۷ء میں رحلت کے بعد مفتی بماتؒ نے اپنے آپ کو اپنے شیخ کے شیدائی اور عاشق زار شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے حوالے کر دیا، ان کی خدمت میں رہ کر سلوک وتصوف کی منزلیں طے کرتے رہے اور حضرت شیخ الحدیث کی خدمت ومعیت اور نگرانی میں ۱۷ رمضان المبارک گزارنے کا شرف حاصل کیا۔

تدریس: حضرت مفتی بماتؒ نے ۱۹۵۲ء میں گجرات کے معیاری ادارہ ''جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین'' ڈابھیل سے اپنا تدریسی سفر شروع کیا، ابتداءً متوسطات تک کی کتابیں زیر درس رہیں، پھر آپ کی اعلیٰ تدریسی صلاحیت کو دیکھ کر اربابِ انتظام نے جلد ہی درجہ علیا کے لیے ترقی دے دی، برسوں مسلم، طحاوی اور مشکوٰۃ شریف سمیت مختلف فنون کی متعدد کتابیں پوری دل جمعی اور انتہائی موثر انداز میں پڑھاتے رہے، آپ کی تدریس مثالی تھی، افہام وتفہیم کا انداز بہت نرالا تھا، مشکل سے مشکل عبارت کو عام فہم مثالوں کے ذریعہ بہت جلد طلبہ کے ذہن میں اتار دیتے تھے، اکابر کے واقعات انتہائی مزے لے لے کر سناتے، آپؒ کا درس صرف کتابی ہی نہیں ہوتا تھا، بل کہ دوران درس حالات حاضرہ سے بھی طلبہ کو واقف کراتے جاتے تھے، فرق ضالہ کی تردید احادیث کی روشنی میں مدلل انداز میں بیان فرماتے، دھیرے دھیرے آپ کے درس کی شہرت پورے گجرات میں ہوگئی۔

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل کی سترہ (۱۷) سالہ کامیاب تدریس کے بعد جوہر شناس، مشہور عالم دین، حضرت **مولانا عبداللہ کاپودروی** دامت برکاتہم کی خواہش پر ۱۹۶۸ء میں اس وقت کے ابھرتے ہوئے ادارہ: جامعہ فلاح دارین، ترکیسر تشریف لائے، مشکوٰۃ شریف سے درس کی ابتدا کی، بعد میں بخاری شریف بھی آپ سے متعلق ہوئی اور شیخ الحدیث کے باوقار منصب پر فائز کیے گئے، دو دہائی (۲۰ سال) تک آپ نے جامعہ فلاح دارین کے منصبِ شیخ الحدیث کو زینت بخشا، جامعہ ڈابھیل ہی کی طرح یہاں بھی فتاویٰ نویسی کی اہم ذمہ داری بھی آپؒ انجام دیتے رہے، حضرتؒ کے فتاویٰ انتہائی مدلل ہوتے تھے، نہ صرف گجرات بل کہ پورے ہندوستان میں آپ کے فتاویٰ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، جدید مسائل میں آپ کے فقہی آراء انتہائی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے تھے، جدید مسائل کے حل کے لیے معتبر ادارہ: ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' کے فقہی سمینار میں نہ صرف یہ کہ آپ کی شرکت ہوتی تھی؛ بل کہ تجویز کمیٹی کے بھی آپ ایک اہم رکن

ہوتے تھے، اسی طرح جمعیۃ علماء ھند کی زیر نگرانی قائم ''ادارۃ المباحث الفقہیۃ'' کے سمینار میں بھی حاضری ہوتی تھی، اس کے بحث ومباحثہ میں حصہ لیتے اور علمی تعاون فرمایا کرتے تھے۔

خوشی کی بات ہے کہ حضرت والا کے فتاویٰ کی جمع وترتیب کا کام بفضلہٖ تعالیٰ ان کے لائق وسعادت مند فرزند: حافظ احمد بیمات کی خصوصی دل چسپی کی وجہ سے شروع کردیا گیا ہے، اندازہ ہے کہ ڈابھیل، ترکیسر اور مدنی دارالتربیت کے تمام فتاویٰ کم از کم دس (۱۰) ضخیم جلدوں میں شائع ہوسکیں گے، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اہم کام کو حسن وخوبی کے ساتھ جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ (آمین)

جامعہ فلاح دارین، ترکیسر میں آپ نے بائیس (۲۲) سال تک تسلسل کے ساتھ فنِ حدیث سمیت متعدد فن کی تدریس کی خدمت بہ خوبی انجام دی۔ جامعہ ڈابھیل اور جامعہ فلاح دارین میں آپؒ سے فیض پانے والے دور اندیش علماء، زمانہ شناس فقہاء، باکمال محدثین، کامیاب مدرسین اور حسنِ انتظام سے متصف مہتممین کی بڑی تعداد ہے، جن کی انتہائی مختصر فہرست کے لیے بھی یہ چند صفحات ناکافی ہیں، خلاصہ یہ کہ موجودہ گجرات کے تمام بڑے مدارس میں آپ کے بلاواسطہ یا بالواسطہ فیض یافتہ مختلف انداز سے دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں، خواہ مولانا غلام محمد وستانوی (سرپرست: جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا) ہوں یا مفتی عبد اللہ پٹیل مظاہری (مہتمم: دارالعلوم مظہر سعادت، ہانسوٹ) بزرگ عالم دین مولانا ابرار دھولیویؒ ہوں کہ مفتی اسماعیل کچھولوی، جامعہ علوم القرآن، جمبوسر کے مہتمم مفتی احمد دیولوی ہوں یا دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر کے شیخ الحدیث حضرت مولانا یوسف ٹنکاروی۔ یہ تمام حضرات اس وقت آسمانِ رشد وہدایت کے آفتاب اور علم وفن کے ماہتاب ہیں، جو مفتی بیماتؒ رحمۃ اللہ علیہ کے پروردہ اور فیض یافتہ ہیں۔

حضرت مفتی بیماتؒ اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے ہمیشہ مربوط ومنسلک رہے؛ جس کے نتیجے میں حضرت مدنیؒ ہی کی طرح قومی وملی مسائل سے آپ کا کافی گہرا لگاؤ رہا، چناں چہ مسلم مسائل کے حل کے لیے ہندوستان کے سب سے معتبر پلیٹ فارم: ''جمعیۃ علماء ھند'' کی وساطت سے ملت کے الجھے ہوئے مسائل کی گتھیوں کو سلجھاتے رہے، پورے گجرات میں ''جمعیۃ علماء ھند'' کا شان دار تعارف کرایا، تیس (۳۰) سال تک ''جمعیۃ علماء ھند'' کے رکنِ عاملہ رہے، سولہ (۱۶) سال تک جمعیۃ علماء، ضلع سورت کی مسندِ صدارت کو زینت بخشا اور آخری دو سالوں میں ''جمعیۃ علماء ھند'' صوبۂ

گجرات کے عالی وقار صدر محترم بھی رہے، اس پلیٹ فارم سے بے شمار رفاہی کام کیے، کتنے ہی اجڑے ہوئے لوگوں کے نشیمن آباد کیے، کتنے ہی ضرورت مند افراد کی ضرورت پوری فرمائی، کتنی ہی بیواؤں کو سہارا دیا۔

۱۹۷۶ء میں حضرت مولانا احمد اشرف راندیری اور حضرت مولانا رضاء احمد اجمیری کے تعاون سے ''محکمۂ شرعیہ ھند'' کی بنیاد ڈالی، جس کے پہلے جنرل سکریٹری اور بعد میں اس کے امیر شریعت کے باوقار عہدہ پر آپ تاحیات فائز رہے۔

حضرت مفتی صاحب نے ''محکمۂ شرعیہ ھند'' کے توسط سے معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائی کی روک تھام کی انتھک کوشش فرمائی، رسوم و بدعات کی خرابیوں کو اجاگر کیا، لوگوں کے دلوں میں گناہوں کی نفرت کو جاں گزیں فرمایا، وراثت کے حوالہ سے پائی جانے والی کوتاہیوں کو دور فرمایا، غرض کہ معاشرہ میں صالح انقلاب پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش فرماتے رہے۔ آہ! کہ عظیم دینی، ملی اور اصلاحی خدمات انجام دیتے ہوئے علم وعمل کا یہ آفتاب ۲۰؍ ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ مطابق ۱۲؍ فروری ۲۰۰۴ء بروز جمعرات ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ اللہ مغفرت فرمائے اور صدیقین، شہداء اور صالحین کی معیت عطاء فرمائے۔ (آمین) ☆☆☆

☆☆☆ نوٹ: اس مضمون کی بیشتر معلومات دارالعلوم مدنی دارالتربیت کرمالی کے سابق استاذ و شیخ الحدیث حضرت مولانا و مفتی اشرف بھانا سارودی کے مفتی صاحبؒ کی حیات و خدمات پر مشتمل ایک مضمون سے لی گئی ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ
وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١٣٦﴾ [٤-النساء:١٣٦]

باب الإيمان

(اللہ کی ذات وصفات، رسول اللہ ﷺ، کتاب اللہ، انبیاء کرام اور ضروریات دین پر ایمان کا بیان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایمانیات

[۱] کفر اور کافر کے معنیٰ

۱-سوال: کفر اور کافر کے درمیان کیا فرق ہے؟ کیا کفر کے معنیٰ انکار کرنے کے علاوہ اور بھی کچھ ہیں؟ غیر مسلم کو کافر کیوں کہتے ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

''کفر'' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنیٰ ہیں: انکار کرنا، ناشکری کرنا، یعنی احسان کا انکار کرنا۔ کفر اختیار کرنے والے کو کافر کہتے ہیں، جس کے معنیٰ ہیں: ناشکری کرنے والا۔

چوں کہ کافر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استعمال کرتا ہے، جس کا تقاضا تھا کہ وہ اس کا شکر ادا کرے، یعنی بہ جذبۂ اعتراف ایمان لائے؛ لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان نہ لاکر گویا اپنے اوپر کی گئی نعمتوں کا انکار کرتا ہے، اس لیے اسے کافر کہتے ہیں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) والكفر لغة: ستر النعمة، وأصله الكَفر بالفتح وهو الستر، ومنه قيل للزارع ولليل "كافر". ولكمام الثمرة كافور. وفي الشرع: إنكار ما علم بالضرورة مجيء الرسول صلى الله عليه وسلّم به. (أنوار التنزيل وأسرار التأويل- ناصر الدين أبو سعيد عبد الله بن عمر بن محمد الشيرازي البيضاوي (م: ۶۸۵هـ): ۱/ ۴۱، بذيل قوله تعالى: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ. (۲-البقرة: ۶)، ت: محمد عبد الرحمن المرعشلي - بيروت، ط: دار إحياء التراث العربي)

معنى الكفر هو الستر والتغطية والمواراة، يقال: كفر درعه بثوبه إذا غطاها به ولبسه فوقها، فيقال لمثل هذا الرجل: "كافر"؛ لأنه ستر فطرته وغطاها بغطاء من الجهل والسفاهة. (الإسلام أصوله ومبادئه-محمد بن عبد الله: ۱/ ۱۷۵، المبحث الأول: معنى الكفر، ط: دار الإعلام☆الموسوعة الفقهية الكويتية: ۳۵/ ۱۳، ط: وزارة الأوقاف-الكويت)

[۲] غیر مسلم کو مسلمان بنانے کا طریقہ

۲-سوال: ایک غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہونا چاہتے ہیں، ان کو کس طرح مسلمان بنایا جائے؟ اور کیا ان کا ختنہ کرانا ضروری ہے؟

الجواب حامداومصليا:

جو شخص اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں، وہ پہلے جس مذہب پر تھے، اس سے توبہ واستغفار اور براءت کا اظہار کریں، اس کے بعد انہیں ایمان مفصل، ایمان مجمل اور کلمۂ شہادتین کا معنیٰ سمجھا کر اس سے اس کا اقرار کروالیا جائے، جب وہ اقرار کرلیں، تو ایمان میں داخل ہوجائیں گے۔[۱] ختنہ شعار اسلام میں سے ہے۔[۲] لہٰذا اگر اس کی استطاعت ہو اور صحت بھی ہو تو بہتر ہوگا کہ کروالیا جائے؛ لیکن اگر ضعف اور کمزوری ہو، تو نہ کروانے کی بھی گنجائش ہے۔[۳] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ
۹/ ۴/ ۱۹۷۷ء

[۳] کلمے کتنے ہیں؟

۳-سوال: حضرت مفتی بیمات صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

---

(۱) وفي حديث جبرئيل: قال: فأخبرني عن الإيمان، قال: «أن تؤمن بالله، وملائكته، وكتبه، ورسله، واليوم الآخر، وتؤمن بالقدر خيره وشره». (صحيح مسلم: ۱/ ۲۷، رقم الحديث: ۱-(۸)، كتاب الإيمان، باب معرفة الإيمان، والإسلام والقدر... الخ، ط: البدر، ديوبند)

(۲) وعلامة المسلمين أربعة أشياء: الختان والخضاب، ولبس السواد، وحلق العانة. (بدائع الصنائع: ۱/ ۳۰۳، كتاب الصلاة، فصل: شرائط وجوب الغسل، ط: دار الكتب العلمية)

والختان سنة، وهو من شعائر الإسلام، وخصائصه، فلو اجتمع أهل بلدة على تركه حاربهم الإمام. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۲/ ۷۴۴، كتاب الخنثى، مسائل شتى، ط: دار إحياء التراث العربي☆ رد المحتار مع الدر: ۲/ ۲۰۰، كتاب الجنائز، باب: صلاة الجنازة، ط: دار الفكر - بيروت، وانظر ايضاً: ۶/ ۷۵۱، مسائل شتى)

(۳) فلايترك إلا لعذر. (الدر المختار مع الرد: ۶/ ۷۵۱، مسائل شتى)

وكذا جاز ترك ختان. (شيخ أسلم وقال أهل النظر لا يطيق الختان) للعذر الظاهر. (مجمع الأنهر: ۲/ ۷۴۴، كتاب الخنثى، مسائل شتى)

ہم سب ساتھی یہاں (سعودی عرب میں) اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور آپ جیسے مخلص وباعمل علماء کی دعاء سے خیر و عافیت کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعاء اور امید قوی ہے کہ آپ بھی خیر وعافیت کے ساتھ ہوں گے۔

ہم سعودی عرب میں ''بُریدہ'' نامی جگہ میں رہ رہے ہیں، جہاں ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے احباب ہیں۔ ''اسلام کے کلمے کتنے ہیں''؟ اس موضوع پر آج ہمارے درمیان بحث چھڑ گئی، ہم نے کہا کہ اسلام کے کلمے کی تعداد پانچ ہے، جب کہ پاکستانی احباب کہہ رہے ہیں کہ کلمے چھ ہیں، انہوں نے ایک کتاب میں بھی چھ کلمے لکھے ہوئے دکھائے، ہم دونوں نے درج ذیل تفصیل کے مطابق کلمے بتائے:

(ہندوستانی)	(پاکستانی)
(۱) اول کلمۂ طیبہ	(۱) اول کلمۂ طیبہ
(۲) دوم کلمۂ شہادت	(۲) دوم کلمۂ شہادت
(۳) سوم کلمۂ تمجید	(۳) سوم کلمۂ تمجید
(۴) چہارم کلمۂ توحید	(۴) چہارم کلمۂ توحید
(۵) پنجم کلمۂ ردِ کفر	(۵) پنجم کلمۂ استغفار
....	(۶) کلمۂ ردِ کفر

پنجم کلمۂ استغفار (جس کا پاکستانی احباب نے اضافہ کیا ہے) یہ ہے: **أستغفر الله ربي من كل ذنب أذنبته عمداً أو خطأً، سراً أو علانيةً، وأتوب إليه من الذنب الذي أعلم، ومن الذنب الذي لا أعلم؛ إنك أنت علام الغيوب، وستار العيوب وغفار الذنوب، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم.**

سوال یہ ہے کہ کن کی بات درست ہے، نیز ان کلموں کا مفہوم کیا ہے؟ آپ گجراتی اور اردو؛ ہر دو زبان میں جواب تحریر فرمادیں، اللہ آپ کو جزاء خیر دے، ہمیں اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

کلموں کی ترتیب یہ ہے: ۱-کلمۂ طیبہ، ۲-کلمۂ شہادت، ۳-کلمۂ تمجید، ۴-کلمۂ توحید، ۵-کلمۂ ردِ کفر، ۶-سید الاستغفار۔ پانچ کلمے تو سب کے نزدیک متفق ہیں، علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ان کلموں کا مفہوم یہ ہے:

۱-ایمان میں داخل ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور بندگی کا دل سے یقین کرنا اور زبان سے اقرار کرنا۔

۲- دل کے یقین کو زبان سے ظاہر کرنا، جس سے دوسرے لوگ سمجھ سکیں کہ فلاں شخص مسلمان ہے۔

۳- تیسرے کلمے میں اللہ کی پاکی بیان کی گئی ہے۔

۴- چوتھے کلمے میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا اعتقاد رکھنے کے ساتھ ساتھ اللہ کی دوسری صفات: ملک واقتدار، زندگی اور موت دینا اور سب بھلائیوں اور برائیوں کا مالک ہونا وغیرہ کا بھی یقین رکھتا ہوں۔

۵- پانچویں کلمے میں اس بات کا ذکر ہے کہ ایک ایمان قبول کرنے والا یہ کہتا ہے کہ میں نے کفر و شرک کے زمانے میں جو شرکیہ اعمال کیے تھے یا ان باتوں پر جو میرا یقین اور عقیدہ تھا، میں ان سب سے بے زاری اور لاتعلقی کا اظہار کرتا ہوں۔ ایک مسلمان مذکورہ کلمات پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین کامل رکھ کر اس بات کی درخواست کرتا ہے کہ اے اللہ! آپ نے جو اپنے فضل سے ایمان کی عظیم الشان نعمت اور دولت عطا فرمائی ہے، اس کو موت تک قائم ودائم رکھیے، قصداً یا سہواً جو بھی گناہ مجھ سے سرزد ہو جائے، یا کفر وشرک کا کوئی لفظ میری زبان سے نکل جائے، تو میں ان سب سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں اور آپ کی معافی کا خواست گار ہوں، کہ کہیں ان کی نحوست سے ایمان کی عظیم دولت سے محروم نہ ہو جاؤں۔

پانچوں کلموں کے الفاظ متفق علیہ ہیں، چھٹا کلمہ جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، وہ حقیقت میں دعا اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست ہے۔ ایمان میں داخل ہونے کے لیے مذکورہ (چھٹے) کلمے کا کوئی تعلق نہیں ہے، ایک مسلمان کا یہ معمول ہونا چاہیے کہ جب بھی اس سے کوئی گناہ قصداً یا سہواً سرزد ہو جائے، تو وہ فوراً اللہ کی جانب رجوع کرے اور ندامت کے چند آنسو بہا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ لے؛ چناں چہ اللہ کے رسول ﷺ - باوجودیکہ آپ ﷺ معصوم ہیں - امت کی تعلیم کے غرض سے ایک دن میں ستر (۷۰) یا سو (۱۰۰) مرتبہ استغفار کیا کرتے تھے۔[1] خلاصہ یہ کہ مسلمان ہونے کے لیے چھٹے کلمے کا

---

(۱) قال أبو هريرة رضي الله عنه: سمعت رسول الله - صلى الله عليه وسلم يقول: "والله إني لأستغفر الله وأتوب إليه في اليوم أكثر من سبعين مرة. (صحيح البخاري: ۲/ ۹۳۳، رقم الحديث: ۶۳۰۷، كتاب الدعوات، باب استغفار النبي - صلى الله عليه وسلم - في اليوم والليلة، ط: البدر - ديوبند)

إن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: "إنه ليغان على قلبي، وإني لأستغفر الله، في اليوم مائة مرة. (صحيح المسلم: ۲/ ۳۴۶، رقم الحديث: ۴۱- (۲۷۰۲)، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب استحباب الاستغفار والاستكثار منه، ط: البدر - ديوبند)

پڑھنا ضروری نہیں ہے؛ بل کہ وہ اسلام میں داخل ہوجانے کے بعد گناہوں سے توبہ واستغفار کے الفاظ ہیں؛ غالباً اسی لیے چھٹے کلمے کے الفاظ میں بڑا فرق ہے، چناں چہ احادیث مبارکہ میں غور کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ گناہ سے معافی مانگنے کے بارے میں جو الفاظ حضور ﷺ سے مروی ہیں، ان کے الفاظ مختلف ہیں۔ (عمدۃ الفقہ : ۱/ ۵۵، ط: کراچی)[۲] سید الاستغفار کے الفاظ - جو نبی اکرم ﷺ سے منقول ہیں - درج ذیل ہیں:

شداد بن أوس رضي الله عنه: عن النبي - صلى الله عليه وسلم -: "سيد الاستغفار أن تقول: اللهم أنت ربي لا إله إلا أنت، خلقتني وأنا عبدك، وأنا على عهدك ووعدك ما استطعت، أعوذ بك من شر ما صنعت، أبوء لك بنعمتك علي، وأبوء لك بذنبي فاغفر لي، فإنه لا يغفر الذنوب إلا أنت". (صحیح البخاری: ۲/ ۹۳۲)[۳]

پانچوں کلموں کے الفاظ میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، وحدانیت، عبادت اور بندگی میں کسی کے اللہ کا ہمسر اور شریک نہ ہونے کا اعتقاد اور اس پر یقین رکھنا تمام علماء کے نزدیک لازم اور ضروری ہے، البتہ چھٹے کلمے میں چوں کہ ماضی کے کفر وشرک سے بے زاری کا اظہار کیا گیا ہے، اسلام میں داخل ہونے کے لیے چھٹے کلمے کی چنداں ضرورت نہیں ہے؛ اسی لیے ہندوستان کی عقائد کی بعض کتابوں میں چھٹا کلمہ مذکور ہے اور بعض میں نہیں؛ لہٰذا یہ ایسی بات نہیں کہ جس کی وجہ سے آپس میں اختلاف کیا جائے، ہر مسلمان کے لیے مناسب ہے کہ چھٹا کلمہ یاد کرکے اس کو پڑھنے کا معمول بنائے، اس لیے کہ اس میں گناہوں سے معافی مانگی گئی ہے، نیز استغفار کرنے والوں کے لیے احادیث میں بہت زیادہ ثواب مروی ہے۔[۴]

مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ذات اور اس کی تمام صفات میں ایک اور یکتا

---

(۲) عمدۃ الفقہ: ۱/ ۶۷، کتاب الایمان، شش کلمہ کا بیان، ط: مکتبۂ تھانوی، دیوبند۔

(۳) صحيح البخاري: ۲/ ۹۳۲، رقم الحديث: ۶۳۰۶، كتاب الدعوات، باب أفضل الاستغفار، البدر - دیوبند۔

(۴) بلال بن يسار بن زيد، مولى النبي صلى الله عليه وسلم، قال: سمعت أبي، يحدثنيه عن جدي، أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "من قال: أستغفر الله الذي لا إله إلا هو الحي القيوم، وأتوب إليه، غفر له، وإن كان قد فر من الزحف". (سنن أبي داؤد، ص: ۲۱۲، رقم الحديث: ۱۵۱۷، كتاب الصلاة، باب في الاستغفار، ط: البدر - ديوبند)

عن شداد بن أوس، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "سيد الاستغفار: اللهم أنت ربي، لا إله إلا أنت، خلقتني وأنا=

مانے، عبادت اور بندگی کا اسی کو سزاوار جانے اور اس میں کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے، اور محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا سچا اور برحق رسول ہونے کا اعتقاد رکھے، یہی مضمون پانچوں کلموں میں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۴] نومسلم خاتون کا اپنے غیر مسلم نام کے دستاویز پر بہ حالت جبر دستخط کرنا موجب کفر نہیں

۴-سوال: ایک غیر مسلم لڑکی نے اپنی خوشی سے اسلام قبول کر کے ایک مسلمان لڑکے سے نکاح کیا، لیکن لڑکی کے رشتہ داروں نے اُس نکاح کو پسند نہیں کیا اور لڑکی کو اٹھا کر لے گئے، ظلم وزیادتی کر کے اُسے نکاح ختم کرنے پر مجبور کیا، لڑکی نے انکار کیا تو اُس پر اُنہوں نے دھمکی دی کہ وہ اُس کے شوہر کو مار ڈالیں گے، لڑکی مجبور تھی، اس لیے اُس نے ''ہندو مذہب کی قبولیت سے متعلق'' حلف نامہ کے کاغذات (Affidavit) پر دستخط کر دیا، اُس وقت لڑکی ہوش وہواس میں نہیں تھی، اور اُس کاغذ میں اُس نے اپنے ہندو نام سے دستخط کیے تھے، حالاں کہ اُس سے پہلے اسلام قبول کرنے کے بعد اُس نے اِقرار کیا تھا کہ اب وہ مسلمان نام سے پہچانی جائے گی، یہ دستخط اور حلف نامہ (Affidavit) گھر ہی پر تیار ہوا تھا، کورٹ یا مجسٹریٹ کے سامنے نہیں ہوا تھا، بعد میں اسی طرح لڑکی والوں نے لڑکے سے بھی دستخط لیے، لڑکا بھی اُس وقت ہوش میں نہیں تھا، تو اِس سے نکاح فسخ ہوا یا نہیں؟

(۲) اِس لڑکی کو اُس کے رشتہ دار نے ایک طرح سے قید کر رکھا تھا اور طرح طرح سے تکلیف دیتے، اور لڑکے کے متعلق بھی بھی باتیں کرتے، اس دوران اُن لوگوں نے ایک دن اُس لڑکی سے زبردستی ہندو مذہب قبول کروایا، اور لڑکی نے دل سے ''لا إلہ إلا اللہ'' کا کلمہ ہی جاری رکھا، صرف لڑکے کی جان کی حفاظت کے خاطر دستخط کیے، تو وہ لڑکی ہندو کہلائے گی یا مسلمان؟

(۳) کچھ دنوں میں پھر وہ لڑکی لوگوں سے چھپ کر لڑکے کے پاس آ گئی، اُس کے دل میں لڑکے کی محبت تھی، اس لیے وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر لڑکے کے پاس آ گئی، اِس صورت میں لڑکے کو شرعاً کیا

=عبدك، وأنا على عهدك ووعدك ما استطعت، أعوذ بك من شر ما صنعت، أبوء لك بنعمتك علي، وأبوء لك بذنبي فاغفر لي، فإنه لا يغفر الذنوب إلا أنت. قال: ومن قالها من النهار موقنا بها، فمات من يومه قبل أن يمسي، فهو من أهل الجنة، ومن قالها من الليل وهو موقن بها، فمات قبل أن يصبح، فهو من أهل الجنة. (صحيح البخاري: ۲/ ۹۳۲، رقم الحديث: ۶۳۰۶، كتاب الدعوات، باب أفضل الاستغفار، ط: البدر- ديوبند)

اقدام کرنا چاہیے، اگر لڑکی کو اُس کے گھر والوں کے پاس واپس بھیجتے ہیں، تو اس صورت میں لڑکی کی جان کا خطرہ ہے، اس لیے کوئی مناسب حل بتا کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلّیاً:

اسلام قبول کرنے کے بعد کسی کے ظلم سے بچنے کے لیے یا جان کی حفاظت کی خاطر کفر وشرک کا عمل کر لینے کی وجہ سے کوئی اسلام سے خارج نہیں ہوتا، مسلمان ہی رہتا ہے، اس لیے لڑکی نے اگر اپنی رضا و رغبت سے اسلام قبول کیا ہے اور صرف جان بچانے کی خاطر ہندو مذہب کی قبولیت کے اقرار نامہ (ایفی ڈیوٹ) پر دستخط کیا ہے، تو پہلا نکاح برقرار رہے گا، دوبارہ نکاح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (۱)

مذہب اختیار کرنا لڑکی کا ذاتی معاملہ ہے، والدین یا دیگر رشتہ داروں کا اُس میں مداخلت کرنا یا جھگڑا کرنا حکومتی قانون کے اعتبار سے بھی غلط ہے۔

ابھی کچھ دِنوں پہلے اخبار میں آیا تھا کہ بعض (بدقسمت) مسلمانوں نے اجمیر شریف کے قریب ہندو مذہب اختیار کر لیا تھا، تو اُس کی وجہ سے کسی مسلمان کو جھگڑا یا فساد کرنا جائز نہیں ہے، اسلام میں جبر و اکراہ نہیں ہے۔ (۲) اور حکومتی قانون سے بھی کوئی زور وزبردستی نہیں ہے، اس لیے لڑکی یا لڑکے کو مارنے یا قتل کی دھمکی دینا قانوناً جرم ہے، آپ قانون کو ہاتھ میں نہ لیں؛ بلکہ حکومتی قانون کے مطابق ہی اس مسئلہ کا حل نکالیں۔ (۳)

پس مذکورہ صورت میں عورت نکاح سے خارج نہیں ہوگی، نکاح علی حالہ باقی رہے گا۔ (۴)

واللہ اعلم بالصواب

---

(۱) مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ إِيْمَانِهٖٓ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْإِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝. [۱۶-النحل:۱۰۶]

(۲) لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝. [۲-البقرة:۲۵۶]

(۳) ولكن يمنع من ذلك لكونه مخالفة لأولي الأمر، إذا كانت الحكومة إسلامية، ولكونه عرضا للنفس لعقوبات قانونية، إذا كانت الحكومة غير إسلامية. (تكملة فتح الملهم: ۱/۵۹۰، كتاب المساقاة والمزارعة، باب الربا، حكم الأوراق النقدية، ط: دار العلوم كراتشي)

طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض. (رد المحتار: ۴/۲۶۴، كتاب الجهاد، باب البغاة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۴) ماثبت بيقين لايرتفع إلا بيقين... ماثبت يكون باقيا مالم يوجد الدليل المزيل. (قواعد الفقه: ص ۱۱۴، رقم القاعدة: ۲۸۷-۲۸۹، ط: دار الكتاب-ديوبند)

[۵] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رِسالت پر ایمان نہ لانے والا مسلمان شمار ہوگا یا نہیں؟

۵-سوال: ایک شخص مسلمان ہے، کلمہ گو ہے، لیکن صرف "لا إله إلا الله" پڑھتا ہے، "محمد رسول الله" نہیں پڑھتا، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول ہونا نہیں مانتا، تو وہ مسلمان کہلائے گا یا نہیں؟ اگر وہ اسلام سے خارج ہوگیا ہے، تو اُس کی بیوی اُس کے نکاح میں رہے گی یا نہیں؟ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ وہ پاگل بھی نہیں ہے۔ بینوا تو جروا۔

الجواب حامداً ومصلياً:

بر تقدیرِ صحتِ مسئلہ کہ مذکورہ شخص پاگل نہیں ہے، عقل وسمجھ کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور پیغمبری کا انکار کرتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی آخر الزمان ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتا، تو یہ اسلام سے خارج ہوگیا، کیوں کہ مسلمان ہونے کے لیے جس طرح اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے، اِسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا عقیدہ اور یقین رکھنا بھی ضروری ہے، جو شخص یہ عقیدہ نہ رکھتا ہو، وہ مرتد ہے۔[1] اور اُس کا حکم چاروں ائمۂ مجتہدین امام ابوحنیفہؒ[2] امام شافعیؒ[3] امام مالکؒ[4] امام احمد بن حنبلؒ[5] اور جمہور فقہاء کی

---

(۱) قال الله تعالى: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝ [-۴النساء:۱۳۶]

ابن عمر، رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "بني الإسلام على خمس: شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، وإقام الصلاة، وإيتاء الزكاة، والحج، وصوم رمضان". (صحيح البخاري:۱/۶، رقم الحديث:۸، كتاب الايمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم بني الإسلام على خمس، ط:البدر-ديوبند)

عن أنس، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: «لا يؤمن أحدكم، حتى أكون أحب إليه من والده، وولده، والناس أجمعين. (صحيح البخاري:۱/۷، رقم الحديث:۱۵، كتاب الايمان، باب حب الرسول صلى الله عليه وسلم من الإيمان، ط:البدر-ديوبند)

(۲) (وارتداد أحدهما) أي الزوجين (فسخ) فلا ينقص عددا (عاجل) بلا قضاء. (الدر المختار). قال ابن عابدين: أي بلا توقف على قضاء القاضي. (رد المحتار:۳/۱۹۳، كتاب النكاح، باب نكاح الكافر، ط:دار الفكر ☆ البحر الرائق:۳/۲۳۰، كتاب النكاح، باب نكاح الكافر، ط:دار الكتب الإسلامي)

(۳) قال أبو حنيفة ومالك يتعجل الفرقة مطلقا سواء كان الارتداد قبل الدخول أو بعده، وقال الشافعي وأحمد إن كان الارتداد قبل الدخول تعجلت الفرقة، وإن كان بعده وقفت على انقضاء العدة. (جواهر العقود-شمس الدين محمد بن أحمد، المنهاجي، الشافعي (م:۸۸۰هـ):۲/۲۷، ت:مسعد عبد الحميد محمد السعدني ط:دار الكتب العلمية بيروت، الطبعة:الأولى، ۱۴۱۷هـ-۱۹۹۶م) =

رائے کے مطابق یہ ہے کہ اس شخص کی بیوی اُس کے نکاح سے فوراً نکل جائے گی۔ اور اُس میں کسی حاکم کے حکم کی ضرورت نہیں ہے، نکاح ہوا ہے اور مہر باقی ہے، تو پورے مہر اور عدت کا خرچ لینے کی وہ حق دار ہے۔

ضروری نوٹ: یہ حکم اُس وقت ہے جب کہ سوال میں لکھی ہوئی پوری حقیقت صحیح اور سچ ہو۔ (دیکھیے: الحیلۃ الناجزۃ: ۹۳-۹۲)، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] نصرانی عورت کو مسلمان بنانے کا طریقہ

۶-سوال: نصرانی عورت کو مسلمان بنانا ہو، تو صحیح طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً

غسل کرے، کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت کے معنیٰ کو سمجھے اور اس پر یقین کرے، نیز ایمانِ مجمل ومفصل کا معنیٰ سمجھ کر یقین کرے، اور اسے پڑھ لے، تو مسلمان ہو جائے گی، اور جس مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا ہے، اُس سے بے زاری کا اظہار کرے۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=(۴) أن ارتداد أحد الزوجين يقطع العصمة فيما بينهما، قال فيها: وتكون تطليقة بائنة، وهو معنى قوله في هذه الرواية، وابن الماجشون يرى أن ارتداد أحد الزوجين فسخ بغير طلاق. (البيان والتحصيل - أبو الوليد محمد بن أحمد بن رشد القرطبي (م: ۵۲۰هـ): ۴۳۶/۱۴، كتاب المرتدين والمحاربين، مسألة: ارتداد أحد الزوجين يقطع العصمة فيما بينهما، ت: د محمد حجي وآخرون، ط: دار الغرب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثانية ۱۴۰۸هـ-۱۹۸۸م)

(۵) (وإن ارتد أحد الزوجين) أو هما معا (قبل الدخول انفسخ النكاح) في قول عامتهم؛ لقوله تعالى: [ولا تمسكوا بعصم الكوافر] [الممتحنة: ۱۰]؛ ولأنه اختلاف دين يمنع الإصابة، فأوجب فسخ النكاح ... (وإن كانت الردة بعد الدخول، فهل تتعجل الفرقة أو تقف على انقضاء العدة؟ على روايتين). (المقنع في شرح المقنع - إبراهيم بن محمد بن، ابن مقلح، أبو إسحاق، برهان الدين (م: ۸۸۴هـ): ۱۸۳/۶، كتاب النكاح، باب نكاح الكافر، ط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة: الأولى، ۱۴۱۸هـ-۱۹۹۷م)

اس صفحہ کا حاشیہ: (۱) وفي شرح الطحاوي سأل أبو يوسف كيف يسلم؟ فقال: أن يقول أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله ويقر بما جاء من عند الله، ويتبرأ من الذي انتحله، وقال لم أدخل في هذا الدين قط وأنا بريء منه. (البحر الرائق - زين الدين بن إبراهيم، المعروف بابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۱۳۸/۵، كتاب السير، توبة الزنديق، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(وإسلامه أن يتبرأ عن الأديان) سوى الإسلام (أو عما انتقل إليه) بعد نطقه بالشهادتين. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲۲۶/۴، كتاب السير، باب المرتد، ط: دار الفكر)

[۷] قرآن کریم کو شاعروں کے تخیلات کی قبیل سے ماننا

۷-سوال: زید کا کہنا ہے کہ تخیلات شاعروں کا طریقہ ہے، اسی سے مہا بھارت، رامائن، ایلیڈ اینڈ آڈیسین اور قرآن اور میگھ دوت (بارش کا فرشتہ) سا نکوتل بنا۔

تخیلات ہی سے ''لیونارڈھی ونس'' نے ''مونالیزا'' کی عجیب وغریب ہنستی ہوئی تصویر بنائی، ایک عمدہ اور بلند خیال ہی نے شاعر کالی داس کے دماغ میں وہمی خیالات کی فرضی تصویر بنائی، وہمی خیالات ہی نے تان سین کے ستار کے تار میں رعشہ پیدا کیا۔

زید کے مذکورہ قول کے مطابق کیا قرآن کریم ان سب کے برابر گردانے کی کتاب ہے؟ کیا قرآن کریم وہمی خیالات پر مبنی ہے؟

الجواب حامداومصليا:

اگر زید اللہ کے کلام کو شاعر کے تخیلات جیسا سمجھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ قرآن کریم محمد ﷺ کا کلام ہے، معنی اور مضمون اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کے دل ودماغ میں القاء کیے گئے اور پھر اس مضمون کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، تو اس عقیدہ کی وجہ سے زید ایمان سے خارج ہو چکا ہے، وہ مرتد ہے۔[۱] یہود ونصاریٰ کا قرآن کریم کے متعلق ایسا ہی عقیدہ ہے؛ لہٰذا اس کو چاہیے کہ توبہ کرے اور نکاح کی تجدید کرے، اگر توبہ سے انکار کرے، تو مسلمان اس کا بائیکاٹ کریں۔ (الدرالمختار)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿٣﴾. (۳۲-السجدة:۳)
وقال اللہ تعالی: قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ﴿٨٨﴾. [۱۷-الإسراء:۸۸]

وإن القرآن كلام الله، منه بدا بلا كيفية قولا، وأنزله على رسوله وحيا، وصدقه المؤمنون على ذلك حقا، وأيقنوا أنه كلام الله تعالى بالحقيقة، ليس بمخلوق ككلام البرية، فمن سمعه فزعم أنه كلام البشر فقد كفر، وقد ذمه الله وعابه وأوعده بسقر، حيث قال تعالى: {إن هذا إلا قول البشر} [المدثر:۲۵]، علمنا وأيقنا أنه قول خالق البشر، ولا يشبه قول البشر".... وأيضا فإن الله قد كفر من جعله قول البشر، ومحمد صلى الله عليه وسلم بشر، فمن جعله قول محمد، بمعنى أنه أنشأه، فقد كفر. (شرح العقيدة الطحاوية- صدر الدين محمد، ابن أبي العز الحنفي، الأذرعي الصالحي الدمشقي (م:۷۹۲ھ) ص:۱۶۸، ۱۷۵، القرآن كلام الله تعالى، ط: دار السلام، الطبعة المصرية الأولى)
(۲) (وارتداد أحدهما) أي الزوجين (فسخ)، فلا ينقص عددا (عاجل)، بلا قضاء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۱۹۳، كتاب النكاح، باب نكاح الكافر، ط: دار الفكر)

[۸] جنت وجہنم کو فرضی گمان کرنا

گزشتہ سے پیوستہ

۸-سوال: زید کا کہنا ہے کہ مذہبی کتاب قرآن مجید میں بڑے خوب صورت انداز میں جنت وجہنم کا خیالی تصور پیش کیا گیا ہے؟ اس سلسلے میں زید کے اس قول کو کیا سمجھا جائے؟

الجواب حامداومصلیا:

زید اگر جنت کو محض فرضی جنت سمجھتا ہو اور اس کا عقیدہ ہو کہ جنت کی کوئی حقیقت نہیں ہے، صرف خوش کرنے کے لیے فرض کر لی گئی ہے، تو زید کو توبہ کرنی چاہیے، فی الحال جنت موجود ہے، اس بات کا اعتقاد ضروری ہے، اگر زید اس کو ماننے سے انکار کرے گا، تو مرتد شمار ہوگا۔(1) فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔

[۹] قرآن وحدیث سے ثابت شدہ اسلامی قوانین کو نہ ماننے والا خارج از اسلام ہے

گزشتہ سے پیوستہ

۹-سوال: زید کا کہنا ہے کہ مطلقہ عورت کو نان ونفقہ ملنا چاہیے، آج کے دور میں عورتوں کے ساتھ طلاق کے نام پر جو بے انصافی ہوتی ہے، اس سے عورت کو تحفظ فراہم کرنا چاہیے۔

زید کا عقیدہ ہے کہ اسلام نے عورت کو حقوق تو دیے ہیں، مگر اس میں چور دروازے تلاش کیے گئے اور اصل باتوں کو ختم کر کے اپنے مطلب کی بات بیان کر کے عورت کو انصاف سے محروم کر دیا، اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی عورت برائے نام شادی کرے اور غلط طریقہ سے شوہر کے ساتھ جھگڑا کر کے اس سے طلاق لے لے اور دوسری شادی نہ کرے اور اگلے شوہر سے نان ونفقہ لیتی رہے، تو کیا یہ گناہ نہیں ہے؟ اس لڑکی کو دوسری شادی کیوں نہیں کرنی چاہیے؟

الجواب حامداومصلیا:

چور دروازے تلاش کرنے کی کوئی بات ہی نہیں، مذہب اسلام میں نکاح کی حقیقت ایک عقد کی

---

(۱) والجنة حق والنار حق، مخلوقتان الآن موجودتان باقيتان لاتفنيان ولا يفنى أهلهما. (العقائد النسفية مع شرح التفتازاني-عمر بن محمد بن أحمد بن إسماعيل، أبو حفص، نجم الدين النسفي (م: ۵۳۷ھ) ص: ۱۰۳-۱۰۶، ط: یاسر ندیم-دیوبند)
والجنة، والنار مخلوقتان، لا تفنيان أبدا، ولا تبيدان. (عقيدة الطحاوي- أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة المصري المعروف بالطحاوي (م: ۳۲۱ھ) ص: ۷۳، ط: المكتب الإسلامي- بيروت، الطبعة: الثانية، ۱۴۱۴ھ)

ہے، چناں چہ جب تک کسی عورت کے ساتھ اس طرح کا عقد نہ ہوا ہو، اس وقت تک نان ونفقہ واجب نہیں ہوتا (اور دوسرے مذاہب میں بھی یہی حکم ہے) جب مرد وعورت کے درمیان اس طرح کا عقد ہو گیا، تو دونوں کے حقوق ایک دوسرے پر واجب ہو گئے اور مسلمان عورت جانتی ہے کہ اسلام کا قانون ہے کہ اس عقد سے علاحدہ کرنے کا حق شوہر کو ہے، تو اب جب کہ عقد ٹوٹ گیا اور عورت عقد سے علاحدہ ہو گئی اور مرد کا کوئی حق عورت پر باقی نہ رہا، تو مرد پر عقد کے ختم ہو جانے کے بعد عورت کا نان نفقہ اور دوسرے حقوق کیوں کر باقی رہیں گے، اسلام نے عورت کو دوسری شادی کرنے کی رخصت دی ہے، ہاں! جب تک وہ عدت میں ہے، دوسرا نکاح نہیں کر سکتی، کیوں کہ عدت شوہر کا حق ہے، جس کا ایک مقصد یہ ہے کہ عورت رحم خالی ہے یا نہیں، وہ معلوم ہو جائے۔[1] اسی وجہ سے جب تک عدت ختم نہیں ہوتی، عورت، شوہر کے عقد سے پوری طرح نہیں نکلتی؛ لہٰذا شوہر پر عورت کی عدت کا نان نفقہ واجب ہے۔[2]

عدت کے بعد جب وہ بیوی ہی نہ رہی، تو مرد پر شوہر ہونے کی حیثیت سے کیسے اعتماد کیا جائے، یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے اور اسلامی قوانین قرآن وحدیث سے ثابت ہیں، اگر یہ قانون زید کو قبول نہ ہو، تو وہ ایمان سے خارج ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۱۰] کیا اسلام نے بیوہ خاتون کے نان ونفقہ کا انتظام نہیں کیا ہے؟

گزشتہ سے پیوستہ

۱۰-سوال: زید کا کہنا ہے اور اس نے لکھا ہے کہ آج کے دور میں عورت کے ساتھ جو بے انصافی ہو رہی ہے، اس سے اس کو تحفظ فراہم کیا جانا چاہئے (اس کو ختم کر کے عورت کو انصاف دلانا چاہیے) تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ مطلقہ عورت اگر شوہر سے نان ونفقہ مانگتی ہے، تو بیوہ عورت یہ خرچ کس کے پاس مانگ سکتی ہے؟

---

(۱) لأن النكاح في العدة حرام بالإجماع. (مجمع الأنهر - عبد الرحمان بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۳۶۹، كتاب النكاح، باب نكاح الكافر، ط: دار إحياء التراث العربي)
أن هذه العدة وجبت للتعريف عن براءة الرحم. (بدائع الصنائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۳/ ۱۹۴، كتاب الطلاق، فصل في بيان مقادير العدة وما تنقضي به، ط: دار الكتب العلمية، الطبعة: الثانية، ۱۴۰۶هـ-۱۹۸۶م)

(۲) المعتدة عن الطلاق تستحق النفقة والسكنى كان الطلاق رجعيا أو بائنا، أو ثلاثا حاملا كانت المرأة، أو لم تكن. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۵۵۷، كتاب الطلاق، الفصل الثالث في نفقة المعتدة، ط: دار الفكر، الطبعة: الثانية، ۱۳۱۰هـ)

الجواب حامداومصلیا:

اللہ رزاق ہے، جب وہ لنجے، لنگڑے، نابینا، بے سہارا لوگوں اور جانوروں کو روزی دیتا ہے، تو وہی اوروں کو بھی رزق دے گا، عورت کا شوہر کے ساتھ رزق دینے کا عقد (قرار) نہیں ہوا ہے، لہٰذا یہ بے ہودہ اور گمراہ کن بات ہے کہ طلاق کے بعد یا موت کے بعد عورت کا کیا ہوگا، مسلمانوں کو اس بات کا اعتقاد رکھنا چاہیے کہ روئے زمین پر جو بھی ہے، اس کے رزق کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے۔[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] قرآن کی آیت اور گیتا کی عبارت کے مطلب میں یکسانیت کا دعویٰ

گزشتہ سے پیوستہ

۱۱-سوال: زید کا کہنا ہے کہ گیتا میں ہے کہ جب بھی بد دینی بڑھتی ہے، تو سادھو اور بھلے انسانوں کی حفاظت کے لیے میں جنم لیتا ہوں، یعنی سَنت اور بزرگ پیدا ہوتے ہیں (گیتا ۷۔۴) قرآن کریم میں بھی فرمایا گیا ہے: ہر قوم کو راستہ بتلانے کے لیے رسول یعنی پیغمبر تشریف لاتے ہیں (سورۂ یونس: ۴۷، سورۂ رعد: ۷)[2] اب دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا رسول خود تشریف لاتے ہیں یا اللہ تعالیٰ ان کو مبعوث فرماتے ہیں، کیا مذکورہ الصدر دونوں چیزوں (گیتا اور قرآن) کی یکسانیت کے دعویٰ کو صحیح کہہ سکتے ہیں؟ زید کے اس عقیدے کو کیا سمجھا جائے؟

الجواب حامداومصلیا:

گیتا میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی خرابی بڑھ جاتی ہے، تو اصلاح کرنے والے تشریف لاتے ہیں اور قرآن کریم کی آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ رسول اور نبی بھیجے گئے، پیدا ہونے اور پیدا کرنے میں تو کوئی فرق نہیں، ہمارے نبی پیدا ہوئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے پیدا فرمایا اور اللہ نے مبعوث فرمایا اور یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کسی کی نبوت قرآن وحدیث سے معلوم ہوئے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔[3] کسی کتاب کی چند باتیں قرآن کریم کے موافق ہو جائیں، تو اس سے اس کے حق اور صحیح ہونے پر

---

(۱) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ ﴿۶﴾ [۱۱-هود: ۶]

(۲) قال الله تعالى: وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَآءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۴۷﴾ (۱۰-يونس: ۴۷)
وقال الله تعالى: وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۗ إِنَّمَآ أَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿۷﴾ (۱۳-الرعد: ۷)

(۳) إن النبوة لا تثبت بالعقول ولا بخبر الواحد الذي لا يحصل به العلم ولا يثبت أيضا بقرينة الحال ولا تحميل الأعمال ... فإن قيل فإذا لم تصح النبوة من هذه الوجوه فمن أين تصح، قلنا تصح من وجهين: أحدهما أن يأتي النبي في زمان تصح فيه النبوة، فيدعي النبوة ويتحدى الناس بالمعجزة، فيفعلها الله له على وفق دعواه، أو ينص على نبوته =

استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۱۲] گیتا کا تقابل قرآن کریم سے کرنا

گزشتہ سے پیوستہ

۱۲-سوال: زید کا عقیدہ ہے کہ شری کرشن نے ارجن کو پیغام دیا، اور شری ویاس جی نے اسے جمع کیا، اس طرح تحقیقی علم کی کتاب تیار ہوئی، جس کا نام ہے ''شری مدبھاگوت گیتا''۔

محمد صاحب نے اپنی حیات مبارکہ میں زندگی گزارنے کی ساری تفصیل اپنے قریبی صحابہ کو بتلائیں، ان صحابہ میں آپ ﷺ کے قریبی دوست، خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ نے ہی لکڑیاں، چمڑے اور پتھر وغیرہ پر لکھی ہوئی قرآن کی آیتوں کو جمع کیا اور چھ ہزار آیتوں کو تیس حصوں میں تقسیم کیا، جس کا نام ہے ''قرآن کریم''۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ زید کا قرآن کریم اور گیتا کے درمیان تقابل کرنا درست ہے؟ جس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا شرک ہے؟ تو نبی کے ساتھ یا قرآن کے ساتھ کسی کو شریک کرنا شرک نہیں ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

سوائے قرآن کریم کے کوئی بھی آسمانی کتاب تصحیف وتحریف سے محفوظ نہیں ہے، ان تمام میں تحریف ہوچکی ہے، کرشن نے ارجن کو جو باتیں کہیں، وہ حقیقت پر مبنی ہے یا نہیں؟ یہی ثابت نہیں، جب کہ قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری تو اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے، نیز قرآن کریم کلام الٰہی ہے، جب کہ گیتا کے ماننے والے بھی اس کو کلام الٰہی نہیں گردانتے، پھر برابری کیسے ہوسکتی ہے۔ اور تقابل کیوں کر روا ہوگا[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= نبي آخر نصا متواترا لا يحتمل التأويل كما نص الله تعالى في محكم كتابه على الستة والعشرين الذين أولهم آدم، وآخرهم محمد عليهم الصلاة والسلام، فهؤلاء هم الأنبياء الذين من أنكر نبوة واحد منهم أو قدح فيها قدحا يخل بشرط من شروط نبوتهم فهو كافر حلال الدم والمال، مخلد في نار جهنم بالإجماع المتواتر، فهؤلاء هم الأنبياء حقا ومن أثبت نبوة غيرهم على التعيين فعليه الدليل. (تنزيه الأنبياء عما نسب إليهم حثالة الأغبياء - أبو الحسن علي بن أحمد السبتي الأموي المعروف بـ »ابن خمير« (م: ٦١٤هـ) ص: ١٣١، ت: محمد رضوان الداية، ط: دار الفكر المعاصر - لبنان، الطبعة: الأولى، ١٤١١هـ - ١٩٩٠م)

الفصل في الملل والأهواء والنحل - أبو محمد علي بن أحمد بن سعيد بن حزم الأندلسي القرطبي الظاهري (م: ٤٥٦هـ): ١/ ٨٦، الكلام على اليهود وعلى من أنكر التثليث من النصارى، ط: مكتبة الخانجي - القاهرة.

(١) إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ. [١٥- الحجر: ٩]

[۱۳] قرآن کریم فرمانِ الٰہی ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں

گزشتہ سے پیوستہ

۱۳-سوال: زید کا عقیدہ ہے، اس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مذہب اسلام اپنے اصول (عقائد) اور مساوات و برابری اور اخوت و بھائی چارگی کی اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے دنیا بھر میں پھیلا ہے اور اس کی مذہبی کتاب، جو چودہ سو سال پہلے لکھی گئی، قرآن کریم ہے، اس کے لکھنے والے محمد (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، کسی اسکول و مدرسہ میں انہوں نے تعلیم حاصل نہیں کی، اس کے باوجود عمدہ اشعار کے انداز میں انہوں نے قرآن کریم کا عطیہ دیا ہے۔

دوسری جگہ لکھتا ہے کہ خدا کی رہنمائی کی وجہ سے ان کے خیالات عمدہ اور معاشرہ کی اصلاح کے لیے مفید تھے، کبھی ان کے بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی اور اس کے بعد وہ بولتے، تو اسے قرآن کا نام دیا جاتا، بعد میں اسے جمع کیا گیا۔ یہی ہے ''قرآن کریم''۔

قرآن کریم تو اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہیں لکھا ہے، لہٰذا زید کا مذکورہ عقیدہ شریعت کی رو سے کیسا ہے؟ اس عقیدے کے لحاظ سے زید کو کیا سمجھا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

یہ عقیدہ باطل ہے، قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام کہنے والا مرتد ہے، اس کو چاہیے کہ توبہ کرے اور اس کے کلامِ الٰہی اور کتابِ ہدایت ہونے پر یقین کرے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿۳﴾ [۳۲-السجدة: ۳]
وقال اللہ تعالی: قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ﴿۸۸﴾ [۱۷-الاسراء: ۸۸]

وإن القرآن كلام الله، منه بدا بلا كيفية قولا، وأنزله على رسوله وحيا، وصدقه المؤمنون على ذلك حقا، وأيقنوا أنه كلام الله تعالى بالحقيقة، ليس بمخلوق ككلام البرية، فمن سمعه فزعم أنه كلام البشر فقد كفر، وقد ذمه الله وعابه وأوعده بسقر، حيث قال تعالى: {إن هذا إلا قول البشر} [المدثر: ۲۵]، علمنا وأيقنا أنه قول خالق البشر، ولا يشبه قول البشر"... وأيضا فإن الله قد كفر من جعله قول البشر، ومحمد صلى الله عليه وسلم بشر، فمن جعله قول محمد، بمعنى أنه أنشأه، فقد كفر. (شرح العقيدة الطحاوية- صدر الدين محمد بن علاء الدين علي بن محمد ابن أبي العز الحنفي، الأذرعي الصالحي الدمشقي (م: ۷۹۲ھ) ص: ۱۶۸، ۱۷۵، القرآن كلام الله تعالى، ط: دار السلام، الطبعة المصرية الأولى، ۱۴۲۶ھ-۲۰۰۵م)

[۱۴] سرودھرم سد بھاؤنا (وحدت ادیان) کا اعتقاد رکھنے والے کا کیا حکم ہے؟

گزشتہ سے پیوستہ

۱۴-سوال: زید کا عقیدہ ہے، جس کا اس نے اظہار کیا ہے کہ دھرم یعنی دھارن کرنا (اختیار کرنا)، جمع کرنا، تاکہ تمام مذاہب کا اصل مقصود ایک ہو، زید سرودھرم سد بھاؤنا (تمام مذاہب برابر ہیں) کا عقیدہ بھی رکھتا ہے؟ ''سرودھرم سد بھاونا'' کے موضوع پر اس نے ایک کتاب بھی لکھی ہے، تو زید کی اس کتاب کو کیا سمجھا جائے؟

الجواب حامداو مصلیا:

اللہ تعالی نے قرآن شریف میں فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾. (۳-آل عمران: ۸۵)

ترجمہ: اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا، سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔ (ترجمہ ماجدی)[۱]

لہٰذا ''سرودھرم سد بھاونا'' کے عقیدے سے زید کو توبہ کرنی چاہیے، اس آدمی کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے، اگر نہ سمجھے اور توبہ نہ کرے، تو اس کی بیوی کو اس سے علاحدہ ہو جانا چاہئے۔[۲] اگر توبہ کرنے

---

(۱) اس آیت کے ذیل میں مشہور مفسر حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (م: ۱۳۹۵ھ = ۱۹۷۵ء) رقم فرماتے ہیں:

(آیت) ''الاسلام''۔ سے یہاں کھلی ہوئی مراد ''اصطلاحی دین'' اسلام ہے۔ ورنہ لفظی معنی کے لحاظ سے تو کائنات کا ذرہ ذرہ مسلم ہے۔ اعلم ان ظاہر هذه الاية يدل علی ان الايمان هو الاسلام (کبیر) (آیت) ''ان الدين عند الله الاسلام''۔ وغیرہ متعدد آیتوں میں یہ مضمون صاف صاف بیان ہو چکا ہے کہ سچا اور مقبول دین صرف یہی دین ہے۔ جس کی کتاب قرآن مجید ہے۔ اور جس کے لانے والے اور سکھانے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس ایک دین کے علاوہ اور جتنے بھی دین و مذہب چلے ہوئے ہیں، سب کی مثال کھوٹے اور جعلی سکوں کی سی ہے، کہ کہنے کو سکے وہ بھی ہیں؛ لیکن جب چل نہ سکے، تو ان کا سکہ ہونا نہ ہونا برابر۔ یہ آیت اس حقیقت کو اور زیادہ مؤکد و آشکارا کر رہی ہے۔ دوسرے ادیان و مذاہب کو بھی اس دین حق کی طرح سچا سمجھنا، ہر دین مذہب کو نجات کے لیے کافی سمجھنا، سب مذہبوں کو ملا جلا کر ان کا ایک ''ملغوبہ'' تیار کرنا، یا یہ کہنا کہ دیر و حرم، کعبہ و کلیسا سب یکساں ہیں، ضلالت و بے دینی کی انتہائی شکلیں ہیں۔ اکبر، دارا شکوہ، وغیرہ ان ناکام کوششوں کے لیے بجا طور پر بدنام ہو چکے ہیں، اور بڑے قلق کا مقام ہے کہ ہمارے زمانہ میں بھی بعض اہل قلم ایسی ہی نامراد کوششیں کر چکے ہیں۔ (تفسیر ماجدی)

(۲) (وارتداد أحدهما) أي الزوجين (فسخ) فلا ينقص عددا (عاجل) بلا قضاء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۱۹۳، کتاب النکاح، باب نکاح الکافر، ط: دار الفکر)

کے لیے تیار ہو جائے، تو لازم ہے کہ جتنی کتابیں اس نے اس طرح کے مضامین پر لکھی ہے، تمام سے رجوع کرے اور جس طرح غلط باتوں کو پھیلایا ہے، اسی طرح ان باتوں سے توبہ کو بھی شائع کرے، تب جا کر ہی اس کی توبہ قبول ہوگی، جب تک کھلم کھلا طور پر اپنی کتابوں کے باطل ہونے کا اقرار نہ کرے، تب تک اس کی توبہ کو سچا نہ سمجھا جائے۔ (۳) اگر ایسا شخص توبہ نہ کرے، تو اسلام میں اس کی سزا قتل ہے۔ (۴) مگر چوں کہ یہاں اسلامی عدالت نہیں ہے؛ لہٰذا اس کا بائیکاٹ کیا جائے۔ (۵) واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۳) قال العلماء: التوبة واجبة من كل ذنب، فإن كانت المعصية بين العبد وبين الله تعالى لا تتعلق بحق آدمي فلها ثلاثة شروط: أحدها: أن يقلع عن المعصية. والثاني: أن يندم على فعلها. والثالث: أن يعزم أن لا يعود إليها أبدا. فإن فقد أحد الثلاثة لم تصح توبته. (رياض الصالحين - أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م:٦٧٦هـ)، ص:۹، باب التوبة، ط: دار الريان للتراث)

وأما المعاصي... فما كان من ذلك بينه وبين الله تعالى من حيث لا يتعلق بمظلمة العباد كنظر إلى غير محرم، وقعود في مسجد مع الجنابة، ومس مصحف بغير وضوء، واعتقاد بدعة، وشرب خمر، وسماع ملاه، وغيره ذلك، مما لا يتعلق بمظالم العباد، فالتوبة عنها بالندم والتحسر عليها.... الخ. (إحياء علوم الدين - أبو حامد محمد بن محمد الغزالي الطوسي (م:٥٠٥هـ): ۴/ ۳۵، كتاب التوبة، الركن الثالث في تمام التوبة وشروطها، ط: دار المعرفة - بيروت)

(۴) (من ارتد عرض) الحاكم (عليه الإسلام استحبابا وتكشف شبهته ويحبس ثلاثة أيام إن استمهل فإن أسلم فبها (وإلا قتل) لحديث «من بدل دينه فاقتلوه». (الدر المختار مع رد المحتار: ۴/ ۲۲۶، كتاب الجهاد، باب المرتد، ط: دار الفكر)

(۵) وأجمع العلماء على أن من خاف من مكالمة أحد وصلته ما يفسد عليه دينه أو يدخل مضرة في دنياه يجوز له مجانبته وبعده، ورب صرم جميل خير من مخالطة تؤذيه. وفي النهاية: يريد به الهجر ضد الوصل، يعني فيما يكون بين المسلمين من عتب وموجدة، أو تقصير يقع في حقوق العشرة والصحبة دون ما كان من ذلك في جانب الدين، فإن هجرة أهل الأهواء والبدع واجبة على مر الأوقات ما لم يظهر منه التوبة، والرجوع إلى الحق، فإنه صلى الله عليه وسلم لما خاف على كعب بن مالك وأصحابه النفاق حين تخلفوا عن غزوة تبوك أمر بهجرانهم خمسين يوما، وقد هجر نساءه شهرا وهجرت عائشة ابن الزبير مدة، وهجر جماعة من الصحابة جماعة منهم، وماتوا متهاجرين. (مرقاة المفاتيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م:۱۰۱۴هـ): ۸/ ۳۱۴۷، تحت رقم الحديث: ۵۰۲۷، كتاب الآداب، باب ما ينهى عنه من التهاجر والتقاطع واتباع العورات، ط: دار الفكر، بيروت، الطبعة: الأولى، ۱۴۲۲هـ - ۲۰۰۲م)

مزید ملاحظہ فرمائیں، احسن الفتاویٰ: ۵/ ۵۲۹، کتاب الحدود والتعزیر، ط: دار الاشاعت، پاکستان۔

□

عن عبد الله بن عمرو بن العاص، قال: سمعت رسول الله -صلى الله عليه وسلم- يقول: " كتب الله مقادير الخلائق قبل أن يخلق السمٰوات والأرض بخمسين ألف سنة، قال: وعرشه على الماء". (مسلم:١٦-٢٦٥٣)

باب التقدير

(تقدیر کا بیان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[تقدیر کا بیان]

[۱] انسان پر حالات کی تبدیلی، تقدیر کی وجہ سے ہے یا اُس کے اعمال کی وجہ سے؟

۱۵-سوال: کسی جگہ اقوالِ زریں کے تحت ہم نے یہ پڑھا تھا کہ "خیر وشر کو اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کرتا، وہ تو صرف رہنمائی کرنے والا ہے، خیر وشر تو انسان کے اعمال پر موقوف ہے"۔ یعنی یہ کہ انسان پر اچھے یا بُرے احوال کا آنا انسان کے نیک وبد اعمال پر موقوف ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ کیا اس سلسلہ میں تقدیرِ خداوندی کا کوئی دخل نہیں ہے؟ تمام احوال صرف انسان کے اعمال ہی پر موقوف ہیں؟ اس بارے میں ہمارا عقیدہ کیا ہونا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً

ساری کائنات میں جو کچھ بھی اچھا یا بُرا ہوتا ہے، وہ تقدیرِ خداوندی کے مطابق ہی ہوتا ہے، انسان کو پیش آنے والے تمام احوال میں بھی تقدیرِ خداوندی ہی کو دخل ہے۔ (۱) اب ان احوال میں سے بعض تو انسان کے اچھے یا بُرے اعمال کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجے جاتے ہیں۔ (۲) اور بعض احوال کے پیش آنے کی حکمتوں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، مثلاً کسی کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ولادت کے وقت ہی سے کوئی مرض ہو، یا کسی کو اللہ تعالیٰ نے محتاج وتنگ دست بنایا ہو، تو اللہ تعالیٰ کے اِس فیصلہ کی حکمتیں صرف

(۱) ولا يكون في الدنيا ولا في الآخرة شيء أي موجود حادث، في الأحوال جميعها إلا بمشيته، أي: مقرونا بإرادته، وعلمه وقضائه، أي: حكمه وأمره، وقدره أي بتقديره، وكتبه أي: وكتابته، في اللوح المحفوظ، أي: قبل ظهور أمره. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۴۹، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۲) وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۝. [۴۲-الشوریٰ: ۳۰]

اور صرف وہی جانتا ہے۔ (۳) جب کہ بعض بُرے احوال کے پیش آنے میں انسان کی بداعمالیاں بھی مؤثر ہوتی ہیں، اور اُن احوال کے ذریعہ مؤمن بندے کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ (۴) بعض مصائب کی وجہ سے اُس کے درجات بھی بلند ہوتے ہیں۔ (۵) اور بعض مصائب اُس کے لیے ذخیرۂ آخرت بھی ہوتے ہیں، غرض یہ کہ تمام کائنات میں جو کچھ بھی عقل انسانی کو اچھا یا برا معلوم ہوتا ہے، وہ تقدیر خداوندی ہی کی کارفرمائی کا نتیجہ ہوتا ہے، اُس کے احاطے سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] تقدیر خداوندی پر توکل کا صحیح مطلب کیا ہے؟

۱۶-سوال: بہت سے لوگوں کو ہم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ بندے کو چاہیے کہ وہ اسباب پر تکیہ نہ کرے، تقدیر میں جو لکھا جا چکا ہے، وہ ہو کر رہے گا، اگر کوئی دکان بند کر کے گھر میں بیٹھ جائے گا، تب بھی اسے اس کے مقدر کا رزق مل ہی جائے گا۔

تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اسباب پیدا فرمائے ہیں اور سبب کو اختیار کرنا بھی بندے پر واجب قرار دیا ہے، مثلاً رزق اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوتا ہے؛ لیکن بندہ حصول رزق کے لیے سبب یعنی کسبِ حلال کا مکلف ہے، اسباب کو اختیار کیے بغیر سیدھے آسمان سے تو روزی ملنے سے رہی، لہٰذا آپ وضاحت فرما دیں کہ تقدیر پر توکل کا صحیح مطلب کیا ہے؟ اور ہمارا اس سلسلے میں کیا عقیدہ ہونا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے، یعنی اِس بات کا یقین رکھنا کہ جو کچھ ہوگا، اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے

---

(۳) وفعله قط لا يخلو عن الحكمة عرفنا وجه الحكمة أو لم نعرف. (كشف الأسرار شرح أصول البزدوي-عبد العزيز بن أحمد، علاء الدين البخاري الحنفي (م: ۷۳۰هـ): ۴/۱۷۱، أصول الشرع ثلاثة، الخ، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۴) عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «ما يصيب المسلم، من نصب، ولا وصب، ولا هم، ولا حزن، ولا أذى، ولا غم، حتى الشوكة يشاكها، إلا كفر الله بها من خطاياه». (صحيح البخاري: ۲/ ۸۴۳، رقم الحديث: ۵۶۴۱، كتاب المرضى، باب ما جاء في كفارة المرض، ط: البدر-ديوبند)

(۵) عن عائشة رضي الله عنها قالت: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "ما يصيب المسلم شوكة فما فوقها إلا رفع بها درجة، أو حط عنه بها خطيئة". (شرح مشكل الآثار-أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة الأزدي الحجري المصري المعروف بالطحاوي (م: ۳۲۱هـ): ۵/ ۴۷۵، رقم: ۲۲۲۶، ط: مؤسسة الرسالة)

شدة المرض ترفع الدرجات وتحط الخطيئات أيضا حتى لا يبقى منها شيء. (فتح البارى-ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲هـ): ۱۰/ ۱۱۲، كتاب المرضى، باب وجوب عيادة المريض، ط: دار المعرفة-بيروت)

مطابق ہی ہوگا، اُس کے فیصلہ کے خلاف کائنات میں کسی بھی قسم کا معمولی سے معمولی تغیر بھی رونما نہیں ہوسکتا، ہماری عقل جسے اچھا یا برا سمجھے سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی منشا کے موافق ہوتا ہے، لہٰذا اُس پر ایمان لانا ضروری ہے۔(۱) اسی طرح رزق کا بھی معاملہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے متعین کردہ مقدار کے مطابق ہی ملے گا، نہ اُس مقدار میں کمی ہوگی اور نہ زیادتی اور اللہ تعالیٰ کے سوا دنیا کی کوئی طاقت اُس میں ذرہ برابر کمی بیشی نہیں کرسکتی۔(۲)

لیکن اُس رزق کے حصول کی کوشش کرنا بھی من جانب اللہ ہی فرض ہے کہ بندوں کو چاہیے کہ وہ کوشش کریں۔(۳) اُن کی کوشش کے ذریعہ میری جانب سے متعین کردہ رزق اُنہیں ملے گا، نیز اس کوشش کے لیے اللہ تعالیٰ نے بندے کو استطاعت واختیار بھی دیا ہے۔(۴) بندہ جب کسی سبب کو اختیار کرے گا، تو اپنے ارادہ سے کرے گا، مجبور ہوکر نہیں، اِس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے دارالاسباب بنایا ہے، جس میں ہر کام کے

---

(۱) ولا یکون في الدنیا ولا في الآخرة شيء أي موجود حادث، في الأحوال جمیعها إلا بمشیته، أي: مقرونا بإرادته، وعلمه وقضائه، أي: حکمه وأمره، وقدره أي بتقدیره، وکتبه أي: وکتابته، في اللوح المحفوظ، أي: قبل ظهور أمره...ومجمل الأمر أن القدر وهو مایقع من العبد المقدر في الأزل من خیره، وشره، وحلوه، ومره، کائن عنه سبحانه وتعالی بخلقه وإرادته ماشاء کان، ومالا، فلا. (شرح الفقه الأکبر، ص: ۴۹، ط: یاسر ندیم-دیوبند)

(۲) وقدر الأرزاق والآجال في الأزل. (کتاب المواقف-عضد الدین الإیجي (م: ۷۵۶هـ): ۱/ ۱۲، ت: عبد الرحمن عمیرة، ط: دار الجیل-لبنان)

(۳) عن عبد الله، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: «کسب الحلال فریضة بعد الفریضة». (مسند الشهاب-أبو عبد الله محمد بن سلامة القضاعي المصري (م: ۴۵۴هـ): ۱/ ۱۰۴، رقم الحدیث: ۱۲۱، ت: حمدي بن عبد المجید السلفي، ط: مؤسسة الرسالة-بیروت)

وقال البیهقي: تفرد به عباد، وهو ضعیف، قال أبو أحمد الفرا: سمعت یحیی بن یحیی یسأل عن حدیث عباد في الکسب، فإذا انتهی إلی رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: إن کان قاله، وله شواهد... وبعضها یؤکد بعضا، لا سیما وشواهدها کثیرة. (المقاصد الحسنة في بیان کثیر من الأحادیث المشتهرة علی الألسنة-شمس الدین أبو الخیر محمد بن عبد الرحمن بن محمد السخاوي (م: ۹۰۲هـ)، ص: ۵۰۵، رقم: ۸۰۰، حرف الکاف، ت: محمد عثمان الخشت، ط: دار الکتاب العربي-بیروت)

عن أنس بن مالك، عن النبي صلی الله علیه وسلم قال: «طلب الحلال واجب علی کل مسلم». (المعجم الأوسط-سلیمان بن أحمد، أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰هـ): ۸/ ۲۷۲، رقم: ۸۶۱۰، ت: طارق بن عوض الله، عبد المحسن بن إبراهیم الحسیني، ط: دار الحرمین - القاهرة ☆المعجم الکبیر: ۱۰/ ۷۴، رقم الحدیث: ۹۹۹۳، ☆شعب الإیمان-أبو بکر البیهقي (م: ۴۵۸هـ): ۱۱/ ۱۷۵، رقم الحدیث: ۸۳۶۷)

عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: «طلب الحلال جهاد». (مسند الشهاب: ۱/ ۸۳، رقم: ۸۲)

(۴) وللعباد أفعال إختیاریة. (شرح عقائد، ص: ۸۱، ط: یاسر ندیم-دیوبند)

لیے بندہ اولاً کسی سبب کو اختیار کرتا ہے، جسے متکلمین کی اصطلاح میں ''کسب'' کہا جاتا ہے۔[۵] اور اُس کے بعد اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُس کسب کے نتیجے میں ثمرہ مرتب ہوتا ہے، جسے خلق کہا جاتا ہے۔[۶] مثلاً یہ کہ اگر کوئی شخص اولاد حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اُس کے لیے اُس کے سبب کو اختیار کرنا ہوگا، کہ وہ نکاح کرے، پھر نکاح کے بعد تقدیر خداوندی کے مطابق اس کے مقدر میں اولاد ہے، تو اس کی آنکھیں اولاد سے ٹھنڈی ہوں گی، ورنہ دس مرتبہ نکاح کے بعد بھی وہ اولاد سے محروم ہی رہے گا؛ لیکن اس کی وجہ سے بندہ صرف تقدیر پر ہی آنکھ بند کر کے بھروسہ کرلے کہ بغیر نکاح کے اولاد حاصل کروں گا، تو یہ اُس کی نادانی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی تقدیر کا فیصلہ بندے کے کسب کے ساتھ رکھا ہے، بغیر کسب کے نہیں۔

حدیث شریف میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ تم اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے کوشش کرلو، پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو کہ روزی دینا اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ چاہے گا تو ملے گی، اور وہ جتنی چاہے گا، اُسی قدر ملے گی۔[۷] اب اللہ تعالیٰ نے تو کسی بندے کو اطلاع نہیں دی ہے کہ اُس کی قسمت میں روزی ہے یا نہیں، اگر ہے تو کتنی ہے؟ کم ہے یا زیادہ، تو جب بندہ ان امورِ تقدیر سے مکمل ناواقف ہے، تو پھر وہ یہ سمجھ کر مایوس کیسے بیٹھ سکتا ہے کہ جب اس کی قسمت میں روزی ہی نہیں ہے تو پھر اسے کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یا یہ کہ اس کی قسمت میں جو روزی ہے، وہ اسے مل ہی جائے گی، اس لیے اسے کوشش نہ کرنی چاہیے، عالم اسباب میں عادۃ اللہ یہی جاری ہے کہ بندہ اولاً اسباب اختیار کرے، پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے، جانوروں کو بھی رزق اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ملتا ہے؛ لیکن تلاش تو انہیں بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔[۸] حاصلِ کلام یہ کہ بندہ اپنی جانب سے اسباب اختیار کرے، اس کے بعد تقدیر خداوندی کے مطابق مسبَّب کا وجود امورِ عادیہ میں سے ہے۔

لیکن بعض مرتبہ کچھ مخصوص احوال میں کسی خاص بندے کے لیے خرقِ عادت کے طور پر کسی سبب کو

(۵) إن صرف العبد قدرته وإرادته إلى الفعل كسب. (شرح عقائد، ص: ۸۳)

(۶) وإيجاد الله تعالى الفعل عقيب ذلك خلق. (المصدر السالف)

(۷) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إنكم لو توكلون على الله حق توكله، لرزقكم كما يرزق الطير تغدو خماصا، وتروح بطانا". ـــــــ قال الإمام أحمد رحمه الله تعالى: "وليس في هذا الحديث دلالة على القعود عن الكسب؛ بل فيه ما يدل على طلب الرزق؛ لأن الطير إذا غدت فإنما تغدو لطلب الرزق وإنما أراد - والله تعالى أعلم - لو توكلوا على الله تعالى في ذهابهم ومجيئهم وتصرفهم ورأوا أن الخير بيده ومن عنده لم ينصرفوا إلا سالمين غانمين كالطير تغدو خماصا، وتروح بطانا؛ لكنهم يعتمدون على قوتهم، وجلدهم، ويغشون، ويكذبون، ولا ينصحون وهذا خلاف التوكل". (شعب الإيمان-أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۲/ ۴۰۵، رقم: ۱۳۹۹، ط: مكتبة الرشد، الرياض)

(۸) انظر: رقم الهامش السابق.

اختیار کیے بغیر بھی اللہ تعالیٰ نے رزق دیا ہے، مثلاً یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر اُن کی اُمت کے چند افراد کے لیے آسمان سے دسترخوان نازل ہونا۔(۹) حضرت مریم علیہا السلام کے لیے بے موسم پھل مہیا ہونا۔(۱۰) اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے لیے قید خانہ میں پھلوں کا دستیاب ہونا۔(۱۱) اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اولیاء اُمت کے بارے میں ایسے قصے مشہور ہیں کہ انہوں نے اسبابِ عادیہ میں سے کسی سبب کو اختیار نہیں کیا، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں رزق دیا، تو ایسے امور کو ''خوارقِ عادات'' کہا جاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے لیے مخصوص احوال میں بطورِ اُن کے اکرام کے رونما ہوئے؛ لیکن بندہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خوارقِ عادات کے انتظار کرنے کا مکلف نہیں ہے؛ بل کہ اسباب کے اختیار کرنے کا مکلف ہے اور ساتھ میں اس عقیدے کا بھی کہ میرے اسباب اختیار کرنے کے بعد فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے، اور اس پر رضا مندی ضروری ہے۔(۱۲) اسی وجہ سے علماء نے فرمایا ہے کہ مؤمن بندے کا ایمان بھی خوف اور اُمید کے درمیان ہونا چاہیے کہ اعمالِ صالحہ کر لینے کے بعد صرف اُن ہی پر بھروسہ نہ کرلے اور نہ تو تقدیر کا بہانہ کر کے مایوس ہو کر اعمال چھوڑ دے۔(۱۳)

---

(۹) قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِينَ ۝ قَالَ اللّٰهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ. الآية (۵-المائدة: ۱۱۴-۱۱۵)

(۱۰) كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ أَنّٰى لَكِ هٰذَا ۚ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝. (۳-آل عمران: ۳۷)

(۱۱) والله ما رأيت أسيرا قط خيرا من خبيب، والله لقد وجدته يوما يأكل من قطف عنب في يده، وإنه لموثق في الحديد، وما بمكة من ثمر، وكانت تقول: إنه لرزق من الله رزقه خبيبا. الحديث. (صحيح البخاري: ۲/ ۴۲۸، كتاب الجهاد، باب: هل يستأسر الرجل ومن لم يستأسر الخ، رقم: ۳۰۴۵، ط: البدر - ديوبند☆المصنف - أبو بكر عبد الرزاق بن همام الحميري اليماني الصنعاني (م: ۲۱۱هـ): ۵/ ۳۵۳، كتاب المغازي، وقعة هذيل بالرجيع، والرجيع موضع، ت: المحدث الكبير حبيب الرحمن الأعظمي، ط: المكتب الإسلامي - بيروت☆مسند الإمام أحمد: ۱۳/ ۶۰-۳۵۹، رقم: ۸۰۹۶☆صحيح ابن حبان، رقم: ۷۰۳۹)

(۱۲) لأن الرضاء بالقضاء واجب. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۴۹، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۱۳) والجمع بين الخوف والرجاء واجب شرعا. (التمهيد لشرح كتاب التوحيد- دروس صالح بن عبد العزيز بن محمد بن إبراهيم آل الشيخ: ۱/ ۳۸۴، ط: دار التوحيد)

بل المطلوب الجمع بين الخوف والرجاء، فلا يخاف حتى يقنط، ولا يرجو حتى يأمن من مكر الله، بل يكون متعادلاً، ولهذا يقول العلماء: "المؤمن بين الخوف والرجاء كالطائر بجناحين لو اختل جناح من الأجنحة سقط الطائر، كذلك المؤمن إذا اختل خوفه أو رجاؤه سقط". (إعانة المستفيد بشرح كتاب التوحيد- صالح بن فوزان بن عبد الله الفوزان: ۱/ ۷۹، الباب الثالث: من حقق التوحيد دخل الجنة، ط: مؤسسة الرسالة- بيروت)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک جنازہ کو لے کر مدینہ منورہ کے قبرستان بقیع میں آئے ہوئے تھے، وہاں نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور قبر کے تیار ہونے تک آپ ﷺ ہمارے پاس بیٹھ گئے، ہم بھی آپ ﷺ کے اردگرد بیٹھ گئے، آپ ﷺ اپنے عصاء مبارک کے ذریعہ زمین کریدنے لگے اور فرمانے لگے کہ دنیا کے تمام انسانوں کا جنت یا جہنم میں ایک ٹھکانہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تیار ہے اور ہر ایک کے لیے لکھ دیا گیا ہے کہ وہ جنتی ہے یا جہنمی، اُس پر ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ تو کیا پھر ہم اپنی تقدیر پر بھروسہ کر کے بیٹھے جائیں اور عمل ترک کردیں؟ (کیوں کہ جنتی کو جنت مل ہی جائے گی اور جہنمی جہنم ہی میں جائے گا) تو نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص جنتی ہے، اس کے لیے اہلِ جنت کے اعمال آسان کردیے جائیں گے اور جو جہنمی ہے، اس کے لیے اہل جہنم کے اعمال آسان کردیے جائیں گے۔ (یعنی یہ کہ دارومدار اعمال پر ہوگا) بندے کو چاہیے کہ وہ عمل کرتا رہے، جنتی کو اعمالِ صالحہ کی توفیق ملتی رہے گی، اور جہنمی اہلِ جہنم جیسے اعمال کریں گے، پھر آپ ﷺ نے آیتِ کریمہ کی تلاوت فرمائی:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى ۝ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ [۹۲-اللیل:۵-۱۰]

یعنی: جو شخص اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بعد اللہ سے ڈرے گا اور خیر کے راستے کو اختیار کرے گا تو ہم اُسے آسان عمل (اعمالِ اہل جنت) کی توفیق دیں گے، اور جو بخیلی کرکے بے نیاز بنے گا اور خیر کو ٹھکرائے گا، تو ہم اُسے سختی کے راستہ (اعمالِ اہل نار) پر ڈال دیں گے۔ (مسلم شریف: ۲/۳۳۳)(۱۴) واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] علم نجوم کے متعلق چند سوالات کے جوابات

۱۷- سوال: ''اسلامی محمدی بڑی تقویم'' نامی سالانہ رسالہ ممبئی سے نکلتا ہے، جس میں بعض انبیاءِ کرام

(۱۴) عن علي، قال: كنا في جنازة في بقيع الغرقد، فأتانا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقعد وقعدنا حوله، ومعه مخصرة فنكس فجعل ينكت بمخصرته، ثم قال: »ما منكم من أحد، ما من نفس منفوسة، إلا وقد كتب الله مكانها من الجنة والنار، وإلا وقد كتبت شقية أو سعيدة« قال فقال رجل: يا رسول الله! أفلا نمكث على كتابنا، وندع العمل؟ فقال: »من كان من أهل السعادة، فسيصير إلى عمل أهل السعادة، ومن كان من أهل الشقاوة، فسيصير إلى عمل أهل الشقاوة« فقال: »اعملوا فكل ميسر، أما أهل السعادة فييسرون لعمل أهل السعادة، وأما أهل الشقاوة فييسرون لعمل أهل الشقاوة« ، ثم قرأ: {فأما من أعطى واتقى. وصدق بالحسنى. فسنيسره لليسرى. وأما من بخل واستغنى. وكذب بالحسنى فسنيسره للعسرى} [الليل: ٦]. (صحيح مسلم: ٢/ ٣٣٣، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي في بطن أمه وكتابة رزقه، رقم الحديث: ٦-(٢٦٤٧)، ط: البدر- ديوبند)

اور خلفاء راشدین اور بزرگان دین کے واقعات کے بعد مندرجہ ذیل باتیں لکھی ہیں:

۱- ستارہ کے خاص برج میں ہونے سے کسی کی پیدائش پر اثر

۲- اعضاء کے کھجلانے کی تاثیر:

۱- پیشانی کے کھجلانے سے عزت بڑھتی ہے۔ ۲- ہتھیلی کی پشت کے کھجلانے سے ذہن کا نقصان ہوتا ہے۔ ۳- سینہ کے کھجلانے سے اولاد کے حوالے سے تکلیف اور پریشانی ہوتی ہے۔

۳- نقشہ دوستی ودشمنی ومساوات وسیارگان

۴- ہر ایک نام کے پہلے حرف سے راز یعنی برج یعنی گیارہ سیارہ اور منزل اور اس کے قدم معلوم کرنے کا نقشہ

۵- فال نامہ حاملہ عورت کو لڑکا ہوگا یا لڑکی

۶- خطرناک تاریخی زلزلے

۷- چور کے نام کا پہلا حرف معلوم کرنے کا نقشہ

۸- چاند کی منزلوں کا بیان

۹- انسانوں کے اعضاء جسم کے پھڑکنے کا نتیجہ

۱۰- چہروں سے قسمت کا حال معلوم کرنا

۱۱- تعبیر نامہ فرقانی

۱۲- کیفیت بارش

۱۳- ہاتھ پر کامیابی کی لکیریں، بیس شکلیں اور ان کے اثرات

الجواب حامدا ومصلیا:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝[1]

ارشاد خداوندی ہے: وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ.[2]

(۱) ۳۷- الصافات: ۶-۷۔

(۲) ۶- الأنعام: ۹۷۔

بخاری شریف (۱/ ۴۵۴) میں امام بخاریؒ نے ایک باب قائم کیا ہے: "باب في النجوم"، جس میں آیت ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح الآیۃ سے استدلال کرتے ہوئے حضرت الامامؒ نے ستاروں کے تین فوائد ذکر فرمائے ہیں: (۱) آسمان کے لیے باعث زینت۔ (۲) شیطان وجنات کے مارنے کے لیے کوڑا۔ (۳) راستہ چلنے والے راہ رو کے لیے علامات؛ تاکہ لوگ ان کے ذریعہ (جنگل ودریا) میں راستہ پاسکیں۔

مذکورہ فوائد ذکر کرنے کے بعد حضرت قتادہؒ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ان تین باتوں کے سوا کوئی اور غرض بیان کی، تو اس نے خطا کی، اپنا حصہ ضائع کیا اور اس چیز میں تکلف کیا، جس کو وہ نہیں جانتا۔ (۳)

بخاری شریف (۱/ ۱۴۱، باب الاستسقاء) میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مذکور ہے کہ مقام حدیبیہ میں جب کہ رات میں بارش ہو چکی تھی، فجر کی نماز کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو، اللہ نے کیا فرمایا؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ میرے بندوں نے آج اس حال میں صبح کی کہ بعض تو مجھ پر ایمان لائے اور بعض نے کفر کیا، چناں چہ جس شخص نے یہ کہا: ہم پر اللہ تعالی کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی، تو وہ مجھ پر ایمان لایا اور ستاروں کے ساتھ کفر کیا اور جس شخص نے کہا کہ فلاں ستارے کے طلوع ہونے اور فلاں ستارے کے غروب ہونے کی وجہ سے ہم پر بارش ہوئی، تو اس نے میرے ساتھ کفر کیا اور ستاروں پر ایمان لایا۔ (۴)

مذکورہ بالا آیات مبارکہ واحادیث نبویہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ستاروں سے کچھ نہیں ہوتا، اللہ تعالی قادر مطلق ہیں، جو کچھ ہوتا ہے، صرف ان کے فضل وکرم سے ہوتا ہے، کبھی بادل اور بارش کی علامات ظاہر ہونے کے باجود بارش نہیں ہوتی؛ لہٰذا ہر مؤمن کا یہ اعتقاد اور یقین ہونا چاہیے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، محض اللہ کے

(۳) وقال قتادة: {ولقد زينا السماء الدنيا بمصابيح} [الملك: ۵] خلق هذه النجوم لثلاث: جعلها زينة للسماء، ورجوما للشياطين، وعلامات يهتدى بها، فمن تأول فيها بغير ذلك أخطأ، وأضاع نصيبه، وتكلف ما لا علم له به. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۵۴، كتاب بدء الخلق، باب في النجوم، ط: البدر - ديوبند)

(۴) عن زيد بن خالد الجهني، أنه قال: صلى لنا رسول الله - صلى الله عليه وسلم - صلاة الصبح بالحديبية على إثر سماء كانت من الليلة، فلما انصرف النبي صلى الله عليه وسلم أقبل على الناس، فقال: "هل تدرون ماذا قال ربكم؟" قالوا: الله ورسوله أعلم، قال: "أصبح من عبادي مؤمن بي وكافر، فأما من قال: مطرنا بفضل الله ورحمته، فذلك مؤمن بي كافر بالكوكب، وأما من قال: بنوء كذا وكذا، فذلك كافر بي مؤمن بالكوكب". (صحيح البخاري: ۱/ ۱۴۱، رقم الحديث: ۱۰۳۸، كتاب الاستسقاء، باب قول الله عز وجل: "وتجعلون رزقكم أنكم تكذبون"، ط: البدر - ديوبند)

فضل اور اسی کی مہربانی کا نتیجہ ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسری طاقت نہیں ہے، جو نظام کائنات میں پر مار سکے۔

(۱) آدمی کی جس دن پیدائش ہوئی، اس دن ستارہ فلاں برج میں تھا، اس طرح کے اعتقاد کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، ان کنڈلیوں سے انسان کی تقدیر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

(۲) ا، ۲، ۳، عضو کے کھجلانے پر کسی فائدے یا نقصان کا مرتب ہونا خلاف شرع عقیدہ ہے، انسان کی گھڑی ہوئی چیز ہے، شریعت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے؛ لہٰذا مذکورہ عقیدہ بے بنیاد اور غلط ہے۔

(۳) ستاروں کے ذریعہ لوگ متعین کرتے ہیں کہ اتنے دوست ہوں گے اور اتنے دشمن ہوں گے، یہ سب غلط اور لغویات ہے، جس طرح انسان دنیا میں علاج ومعالجہ کرتا ہے اور اس کے ذریعے اسے فائدہ ہوتا ہے، ایسے ہی عامل بھی دوستی ودشمنی بغض وعداوت کی تعویذ بناتے ہیں، اس سے بھی فائدہ ہوسکتا ہے؛ لیکن یہ یاد رہے کہ تعویذ یا دوا سے فائدہ تو ہوتا ہے، مگر مؤثر حقیقی اللہ ہی ہے، تعویذ ودوا اسباب کے درجہ میں ہیں، جو ان کو مؤثر حقیقی سمجھے گا اور یہ خیال کرے گا کہ شفایاب ہونے میں دوا کی تاثیر کا دخل ہے، تو اس کا ایمان تعویذ یا دوا پر ہے، اللہ کی ذات پر نہیں ہے، ایسا شخص ایمان سے نکل جائے گا، اس لیے دوستی یا دشمنی کے نقشہ کو مؤثر حقیقی سمجھنے سے ایمان سے خارج ہوجائے گا۔ (۵)

(۴) کسی بھی نام کے پہلے حرف سے انسان کے راز کی باتیں متعین کرنا، خلاف شریعت ہے، شریعت میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

(۵) حاملہ عورت کو لڑکا ہوگا یا لڑکی، یہ کوئی نہیں جان سکتا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: پانچ چیزوں کا علم اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں ہے۔ (۶) جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی؛ لہٰذا فال نامہ کی مدد سے کسی

---

(۵) عن جابر عن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- أنه قال: "لكل داء دواء، فإذا أصيب دواء الداء برأ بإذن الله عز وجل". (صحيح المسلم: ۲/ ۲۲۵، رقم الحديث: (۶۹-۲۲۰۴)، كتاب الآداب، باب: لكل داء دواء واستحباب التداوي. ط: البدر-ديوبند)

(بإذن الله) أي بتيسيره وإرادته وإنما قيده به لئلا يتوهم أن الدواء مستقل في الشفاء وفسرته رواية الحميدي ما من داء إلا وله دواء، فإذا كان كذلك بعث الله عز وجل ملكا معه شراب ومعه ستر، فجعله بين الداء والدواء فكلما شرب المريض من الدواء لم يقع على الداء، فإذا أراد الله برأه أمر الملك فرفع الستر ثم يشرب المريض فينفعه الله تعالى به. (مرقاة المفاتيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۷/ ۲۸۶۱، كتاب الطب والرقى، تحت رقم الحديث: ۴۵۱۵، ط: دار الفكر-بيروت، الطبعة: الأولى، ۱۴۲۲ھ-۲۰۰۲م)

(۶) إِنَّ اللهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ، وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ، وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ، وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا، وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ، إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ۝ [لقمان: ۳۴-۳۱]

حاملہ کے متعلق اس طرح کی پیش گوئی دینا جائز نہیں۔

(۶) کتابوں میں لکھا ہے کہ جب انسان بہ کثرت گناہ کا ارتکاب کرنے لگے گا، تو زلزلے آئیں گے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے، اللہ تعالیٰ کا غضب وغصہ جوش میں آئے گا، جس کی وجہ سے دنیا میں زلزلے کی کثرت ہوگی۔[۷] اس لیے ستارے کے ساتھ زلزلہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۷) چوری کو ثابت کرنے کے لیے گواہوں کی گواہی کا اعتبار ہوگا، بغیر گواہ کے فال یا تعویذ سے چوری ثابت کرنا اور اس پر یقین کرنا جائز نہیں ہے۔[۸] لہٰذا چور کے نام کے پہلے حرف سے چوری کا پتہ لگانا صحیح نہیں ہے، ناجائز و حرام ہے، شریعت کے بیان کردہ اصول کے بالکل خلاف ہے۔

(۸) چاند کی منزلوں کے متعلق امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ چاند ستارے اور سورج کی چال ورفتار کا علم انسان کو ہونا چاہیے۔[۹] تاکہ اللہ کی قدرت اور ایمان کا استحضار نصیب ہو اور اس کا ایمان تازہ ومضبوط ہو، امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے پاس چاند کی منزلوں کا علم نہیں، وہ اللہ کی پہچان میں نامکمل رہے گا؛ لیکن اس کے برج سے انسان کی تقدیر یا دنیا میں سردی گرمی، بارش کا ہونا، نفع ونقصان کا وجود میں آنا، صحت و بیماری، گرانی یا ارزانی، حکومت بننا وغیرہ کو جوڑنا زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کا شیوہ تھا، مذہب اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ لہٰذا جو شخص یہ عقیدہ رکھے گا کہ ستارے کے فلاں برج میں جانے کی وجہ سے ایسا ایسا ہوا؛ تو وہ ایمان سے خارج ہوجائے گا۔

(۹) انسان کے عضو کے متعلق آپ نے لوگوں کے جس عقیدے کا تذکرہ کیا ہے، اللہ کے رسول ﷺ کی لائی ہوئی شریعت میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

(۱۰) انسان کا چہرہ دیکھ کر کوئی کسی کی قسمت معلوم نہیں کرسکتا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "واختلاف

---

(۷) (فليحذر الذين يخالفون عن أمره) أي: أمره وصلته، وقيل: معناه: يعرضون عن أمره، وينصرفون عنه بغير إذنه أن تصيبهم فتنة، أي: قتل، عن ابن عباس، عطا: الزلزال والأهوال. (تفسير الثعلبي: ۷/ ۱۲۱، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(۸) أو شهد رجلان ولو عبدا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۴/ ۸۶، كتاب السرقة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۹) وتعلم منازل القمر من المهمات للمريد، حتى يطلع به على مقادير الأوقات بالليل وعلى الصبح. (إحياء علوم الدين - أبو حامد محمد بن محمد الغزالي الطوسي (م: ۵۰۵هـ): ۱/ ۱۹۳، القسم الأول: ما يتكرر بتكرر الأيام والليالي، ط: دار المعرفة - بيروت)

السنتکم والوانکم.[10] دنیا میں نہ جانے کتنے انسان ہیں، سب کے چہرے ایک دوسرے سے جدا ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر واضح دلیل ہے؛ لہٰذا چہرہ دیکھ کر قسمت بتانا ناجائز و حرام ہے۔

(١١) آپ نے جس تعبیر نامہ کا ذکر کیا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے بعض الفاظ مقرر ہوتے ہیں، اس کے اوپر لوگ اپنا ہاتھ رکھتے ہیں اور اپنی تقدیر کا عدد نکالتے ہیں، یہ خلاف شریعت ہے، لہٰذا فرقانی یا دوسرا کوئی فال نامہ ہو، اس کے ذریعہ انسانی تقدیر کا معلوم کرنا صحیح نہیں، حرام ہے۔

(١٢) آپ کا سوال سمجھ میں نہیں آیا، آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں، تفصیل سے لکھیں۔

(١٣) ہاتھ کی لکیروں سے قسمت اور آئندہ کی باتوں کا جاننا، شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، خلاف شرع اور حرام ہے۔ آپ میری کتاب عقائد اسلام[11] اگر غور سے پڑھ لیتے، تو مذکورہ مسئلہ حل ہو جاتا، آج کل نادان، بھولے بھالے اور ان پڑھ مسلمانوں کو اسلام کے نام پر مختلف طریقے سے گمراہ کیا جا رہا ہے؛ لہٰذا کسی کتاب کے اوپر اسلامی لیبل دیکھ کر دھوکہ نہ کھانا چاہیے، اگر اس کا مولف صحیح العقیدہ ہے اور اس کتاب کے مضامین شریعت کے مطابق ہیں، تب تو قابل قبول ہے، اس کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اگر اس میں شریعت کے خلاف باتیں مذکور ہیں، تو ایسی کتاب ناقابل قبول اور مردود ہوگی، اس کے مطالعے سے احتراز بے حد ضروری ہے۔

آپ کا لکھنا بالکل درست ہے، ''اسلامی محمدی تقویم'' نامی رسالہ میں جو باتیں لکھی ہیں، وہ شریعت کے خلاف ہیں، غیر مسلم راشی اور نجومی وغیرہ اندازے سے انسان کے مستقبل کی باتوں کو بیان کرتے ہیں، اس وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ علم نجوم، کہانت وغیرہ حرام ہے۔[12] مسلمانوں کے ایمان کو کمزور اور کھوکھلا کرنے والی ہے؛ لہٰذا مذکورہ تقویم میں، یا تعویذ اور فال نامہ کی دیگر کتابوں میں مذکورہ سوال کے مثل جو کچھ لکھا ہے، اس پر اعتقاد رکھنا اور اسے صحیح ماننا حرام ہے۔[13] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات

---

(١٠) ٣٠-الروم: ٢٢.

(١١) عقائد اسلام (اردو) ترجمہ از: مولانا ارشد صاحب فلاحی، ناشر: حافظ امجد بیات صاحب، کینیڈا۔

(١٢) الكاهن والساحر والمنجم إذا ادعى العلم بالحوادث الآتية فهو مثل الكاهن ... و ما يعطى هؤلاء حرام بالإجماع. (شرح الفقه الأكبر-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ١٠١٤ھ)، ص: ١٨٢، ط: یاسر ندیم-دیوبند)

(١٣) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نظام الفتاویٰ-مفتی نظام الدین، اعظمی: ١/ ٨١، ط: تاج پبلشنگ، دیوبند۔

[۴] تقدیر اور تدبیر کے درمیان فرق

۱۸-سوال: تقدیر اور تدبیر کے درمیان کیا فرق ہے۔؟

الجواب حامداو مصلیا:

تقدیر: ہر شئے کی انجام وہی کا مخصوص نقشہ، جو اللہ کے علم میں ہے، تقدیر کہلاتا ہے۔ جب کہ تدبیر نام ہے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اسباب اختیار کرنے کا، کہ انسان اپنی استطاعت کے مطابق اسباب کو اختیار کرے اور فیصلہ اللہ پر چھوڑ دے۔ [۱]

انسان کو حکم ہے تدبیر اختیار کرنے کا، تقدیر کے بھروسہ بیٹھے نہ رہنا چاہیے۔ [۲]

تقدیر کی دو قسمیں ہیں، تقدیر مبرم: یعنی اٹل فیصلہ جو بدلتا نہیں، دوسرا معلق: لکھ دیا گیا ہے کہ صلہ رحمی کرے گا تو روزی یا عمر میں برکت ہوگی، عمر بڑھادی جائے گی، اس کا وقوع لازمی نہیں ہے، اگر شرط پائی جائے، تو مشروط کا وجود ہوگا۔ [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) والمراد أن الله تعالى علم مقادير الأشياء، وأزمانها، قبل إيجادها، ثم أوجد ما سبق في علمه أنه يوجد، فكل محدث صادر عن علمه، وقدرته، وإرادته، هذا هو المعلوم من الدين بالبراهين القطعية، وعليه كان السلف من الصحابة وخيار التابعين ،إلى أن حدثت بدعة القدر في أواخر زمن الصحابة.(فتح الباري-العسقلاني (م:۸۵۲ھ): ۱/ ۱۱۸، كتاب الإيمان، باب سؤال جبريل عن الإيمان والإسلام . . . إلخ، ط: دار المعرفة- بيروت)

(۲) عن علي رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم: أنه كان في جنازة فأخذ عودا ينكت في الأرض، فقال: ما منكم من أحد إلا وقد كتب مقعده من النار أو من الجنة. قالوا: يا رسول الله، أفلا نتكل؟ قال: اعملوا فكل ميسر. فأما من أعطى واتقى . وصدق بالحسنى . الآية (صحيح البخارى: ۲/ ۷۳۸، رقم الحديث: ۴۹۴۶، كتاب التفسير، باب فسنيسره لليسرى [الليل]، ط: البدر- ديوبند)

(۳) فإن قلت: الآجال مقدرة، وكذا الأرزاق لا تزيد ولا تنقص، فإذا جاء أجلهم، لا يستأخرون ساعة، ولا يستقدمون، قلت: أجيب عن هذا بوجهين: (أحدهما): أن هذه الزيادة بالبركة في العمر بسبب التوفيق في الطاعات ،وصيانته عن الضياع، وحاصله أنها بحسب الكيف لا الكم. (والثاني) أن الزيادة على حقيقتها، وذلك بالنسبة إلى علم الملك الموكل بالعمر ،وإلى مايظهر له في اللوح المحفوظ بالمحو والإثبات فيه يمحو الله ما يشاء ويثبت كما أن عمر فلان ستون سنة إلا أن يصل رحمه، فإنه يزاد عليه عشرة وهو سبعون، وقد علم الله عز وجل بما سيقع له من ذلك، فبالنسبة إلى الله تعالى لا زيادة ولا نقصان، ويقال له القضاء المبرم، وإنما يتصور الزيادة بالنسبة إليهم، ويسمى مثله بالقضاء المعلق... الخ. (عمدة القارى شرح البخارى: ۲۲/ ۹۱ ،باب من بسط له الرزق،=

[۵] توکل کی حقیقت

۱۹-سوال: دعا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جو مانگنا ہو، مجھ سے مانگو، میرے خزانہ میں کوئی کمی نہیں ہے اور دعا کے ذریعہ انسان اللہ سے مانگتا بھی ہے، مگر اللہ کا قانون ہے کہ وہ آسمان سے بہ راہ راست کوئی چیز نہیں ڈال دیتا ہے؛ بل کہ اس کے حصول کے لیے سبب اختیار کرنا پڑتا ہے، تو اس طرح سبب اختیار کرنا کہ مثلاً مخلوق میں سے کسی کو سبب کے طور پر اپنانا اور خود اس سبب کو اختیار نہ کرنا، کیا اللہ پر توکل کے خلاف ہوگا؟ میرے سوال کا سادہ مطلب یہ ہے کہ اللہ سے مانگنے کے بعد ذریعہ (سبب) اختیار کرنا واجب ہوگا یا نہیں؟ اگر انسان اسباب اختیار نہ کرے، تو کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

توکل کا اصل اور اعلیٰ درجہ- جو اللہ پاک کے نبیوں اور برگزیدہ بندوں کو حاصل ہوتا ہے، دوسروں کو حاصل نہیں ہوتا اور دوسرے لوگوں کو ایسے توکل کا حکم بھی نہیں ہے، اگر عام آدمی ان کی نقل کرے گا، تو ٹھوکر کھائے گا -یہ ہے کہ رزق کے معاملے میں صرف اللہ پر بھروسہ کرو، کسی سے کچھ نہ مانگو اور رزق کے لیے حرکت نہ کرو۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسباب کو اختیار کرو اور بھروسہ اللہ پر رکھو، اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرو اور جو کچھ مل جائے اس پر قناعت کرو، کسی سے سوال نہ کرو، تمام لوگوں کے لیے یہی حکم ہے۔(۱)

=ط: دار إحياء التراث العربي ☆ مرقاة المفاتيح: ۱/ ۱۴۸، كتاب الإيمان، باب الإيمان بالقدر، ط: دار الفكر - بيروت)

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں: تقدیر حقیقۃً ایک ہی قسم کی ہے، جو کہ اٹل ہے، جس کو عربی میں مبرم کہتے ہیں، اور دوسری جو قسم بعض عبارات میں ملتی ہے، وہ بندوں کے اعتبار سے ہے، جس کو معلق کہتے ہیں، نہ کہ علم الٰہی کے اعتبار سے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱/ ۲۱۱، تقدیر مبرم اور معلق، ما يتعلق بالقدر، ط: اشرفی بک ڈپو، دیوبند)

(۱) التوكل على ثلاثة مقامات، عام وخاص عام وخاص خاص، فمن دخل في الأسباب واستعمل العلم وتوكل على الله تعالى ولم يتحقق باليقين فهو عام، ومن ترك الأسباب وتوكل على الله وحقق في اليقين فهو خاص عام، ومن خرج من الأسباب على حقيقته لوجود اليقين، ثم دخل في الأسباب فتصرف لغيره فهذا خاص خاص، وهذا وصف الطبقة العليا من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم العشرة وغيرهم. (قوت القلوب في معاملة المحبوب - محمد بن علي بن عطية الحارثي، أبو طالب المكي (م: ۳۸۶هـ): ۲/ ۳۶، ذكر التكسب والتصرف في المعايش، ت: د. عاصم إبراهيم الكيالي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت، الطبعة: الثانية، ۱۴۲۶هـ-۲۰۰۵م)

الدرجة الأولى ما ذكرناه وهو أن يكون حاله في حق الله تعالى والثقة بكفالته وعنايته كحاله في الثقة بالوكيل الثانية=

اللہ پاک آسمان سے روزی بھیجنے پر قادر ہے، اور ایسا واقع بھی ہوا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک قانون رکھا ہے کہ کوشش ومحنت کرو اور کھاؤ، پرندوں کو بھی رزق تلاش کرنا پڑتا ہے۔ (۲) یہی طریقے اللہ کے انبیاء واولیاء سے بھی ثابت ہیں، سوال نہ کرنا چاہیے، جس آدمی میں کمانے کی طاقت ہو اور ایک دن پیٹ بھرنے کے لیے کچھ ہو، اس کے لیے دوسرے سے سوال کرنا حرام ہے، ایسے شخص کے بارے میں سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ (۳)

=وهي أقوى أن يكون حاله مع الله تعالى كحال الطفل مع أمه فإنه لا يعرف غيرها ولا يفزع إلى أحد سواها ولا يعتمد إلا إياها فإذا رآها تعلق في كل حال بذيلها ولم يخلها وإن نابه أمر في غيبتها كان أول سابق إلى لسانه يا أماه وأول خاطر يخطر في قلبه أمه... الثالثة وهي أعلاها أن يكون بين يدي الله تعالى في حركاته وسكناته مثل الميت بين يدي الغاسل لا يفارقه إلا في أنه يرى نفسه ميتاً تحركه القدرة الأزلية كما تحرك يد الغاسل الميت وهو الذي قوي يقينه بأنه مجري للحركة والقدرة والإرادة والعلم وسائر الصفات وأن كلاً يحدث جبراً فيكون بائناً عن الانتظار لما يجري عليه ويفارق الصبي فإن الصبي يفزع إلى أمه ويصيح ويتعلق بذيلها ويعدو خلفها بل هو مثل صبي علم أنه وإن لم يزعق بأمه فالأم تطلبه وأنه وإن لم يتعلق بذيل أمه فالأم تحمله وإن لم يسألها اللبن فالأم تفاتحه وتسقيه وهذا المقام في التوكل يثمر ترك الدعاء والسؤال منه ثقة بكرمه وعنايته وأنه يعطي ابتداء أفضل مما يسئل فكم من نعمة ابتدأها قبل السؤال والدعاء وبغير الاستحقاق والمقام الثاني لا يقتضي ترك الدعاء والسؤال منه وإنما يقتضي ترك السؤال من غيره فقط. (إحياء علوم الدين- أبو حامد محمد بن محمد الغزالي الطوسي (م:٥٠٥هـ): ٢٦١/٤، كتاب التوحيد والتوكل، بيان حال التوكل، ط: دار المعرفة- بيروت)

(٢) قال رسول الله- صلى الله عليه وسلم: لو أنكم توكلتم على الله حق توكله، لرزقكم كما يرزق الطير، تغدو خماصا، وتروح بطانا. (سنن ابن ماجة، ص: ٣٠٧، رقم الحديث: ٤١٦٤، كتاب الزهد، باب التوكل واليقين، ط: البدر- ديوبند)

قال علي القاري: وفي قوله: تغدو إيماء إلى أن السعي بالإجمال لا ينافي الاعتماد على الملك المتعال، كما قال تعالى جل جلاله: {وكأين من دابة لا تحمل رزقها الله يرزقها وإياكم} [العنكبوت: ٦٠] فالحديث للتنبيه على أن الكسب ليس برازق، بل الرازق هو الله تعالى، لا للمنع عن الكسب فإن التوكل محله القلب فلا ينافيه حركة الجوارح، مع أنه قد يرزق أيضا من غير حركة، بل بتحريك غيره إليه يصل رزق الله ببركته كما يستفاد العموم من قوله تعالى: {وما من دابة في الأرض إلا على الله رزقها} [هود: ٦]. (مرقاة المفاتيح - علي بن (سلطان) محمد، الملا الهروي القاري (المتوفى: ١٠١٤هـ): ٨/ ٣٣٢٠، ط: دار الفكر- بيروت، الطبعة: الأولى، ١٤٢٢هـ - ٢٠٠٢م)

(٣) عن عبد الله، قال: قال رسول الله- صلى الله عليه وسلم: »من سأل وله ما يغنيه، جاءت يوم القيامة خموش، أو خدوش، أو كدوح في وجهه«، فقال: يا رسول الله، وما الغنى؟، قال: »خمسون درهما، أو قيمتها من الذهب. (سنن أبي داؤد، ص: ٢٢٩، رقم الحديث: ١٦٢٦، كتاب الزكاة، باب من يعطي من الصدقة وحد الغنى، ط: البدر- ديوبند)=

پھر دوسرے کے سامنے تقاضہ کرنے کا توکل سے کیا تعلق؟ توکل کا نام لینا اور کسی کی جیب پر نظر رکھنا کہ وہ کچھ دے گا، توکل کا مذاق اڑانا ہے اور اللہ کے ساتھ فریب کرنے کے مساوی ہے۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

=عن حبشي السلولي، قال: سمعت رسول الله- صلى الله عليه وسلم يقول: »من سأل الناس ليثري به ماله، فإنه خموش في وجهه، ورضف من جهنم يأكله يوم القيامة، وذلك في حجة الوداع. (المصنف- أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵ھ): ۲/ ۴۲۵، رقم الحديث: ۱۰۶۷۴، من كره المسألة ونهى عنها وشدد فيها، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد- الرياض، الطبعة: الأولى، ۱۴۰۹)

قال: (ومن كان له قوت يومه لا يحل له السؤال) لقوله- عليه الصلاة والسلام-: »من سأل الناس وهو غني عما يسأل جاء يوم القيامة ومسألته خدوش أو خموش أو كدوح في وجهه« ولأنه أذل نفسه من غير ضرورة وأنه حرام. قال- عليه الصلاة والسلام-: »لا يحل للمسلم أن يذل نفسه«. (الاختيار لتعليل المختار- عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳ھ): ۴/ ۱۷۶، كتاب الكراهية، فصل في الكسب، ط: مطبعة الحلبي- القاهرة)

(۴) عن ابن عباس قال كان اهل اليمن يحجون، فلا يتزودون، ويقولون: نحن متوكلون، فاذا قدموا مكة، سالوا الناس- وقال البغوي: إنما يفضي حالهم إلى النهب والغضب- فأنزل الله تعالى: وتزوّدوا، يعني تزودوا ما تبلغون به وتكففون وجوهكم، فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوى. (التفسير المظهري- المظهري، محمد ثناء الله (م: ۱۲۲۵ھ): ۱/ ۲۳۴، ت: غلام نبي التونسي، ط: مكتبة الرشدية- الباكستان)

□

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪

[۴۲-الشوریٰ:۱۱]

باب الإيمان بالله وصفاته

(اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان

[۱] ”اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے“ کہنا کیسا ہے؟

۲۰-سوال: ہمارے پاس ایک کتاب ”انوار الحدیث“ مولانا جلال الدین احمد امجدی، مفتی فیض الرسول، براؤن شریف، ضلع بستی کی لکھی ہوئی موجود ہے، اس کے کتاب الایمان میں ایک عنوان ہے: ”خدا تعالیٰ کے لیے مکان ثابت کرنا کیسا ہے؟“ اس عنوان کے تحت عقائد نسفی [۱] اور عالم گیری [۲] کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ کسی جگہ رہتا ہے اور نہ اس پر کوئی زمانہ طاری ہوتا ہے۔ مزید لکھا ہے کہ فتاویٰ عالم گیری: ۲/۲۳۶ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جگہ ثابت کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے، ”پس اگر کسی نے کہا: خدا تعالیٰ سے کوئی جگہ خالی نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ ہر جگہ رہتا ہے، تو وہ کافر ہو جائے گا“۔

تو سوال یہ ہے کہ ہم تو بات بات میں یہ کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر وناظر ہے، اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی جگہ خالی نہیں، تو مذکورہ عبارت تو اس جملے کے قائل کا کافر ہونا ثابت کرتی ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

عقائد نسفی اور عالم گیری میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی جگہ متعین نہیں ہے کہ وہ اسی جگہ میں موجود ہو، (جیسا کہ انسان کے وجود کے لیے جگہ کا ہونا ضروری ہے) اور نہ وہ اپنے وجود میں کسی جگہ کا محتاج ہے کہ وہ زمین اور آسمان کے درمیان لٹکتا نہیں ہے، الغرض اللہ تعالیٰ اپنے وجود کے لیے کسی

---

(۱) ولا یتمکن في مکان. (شرح عقائد: ۳۹، یاسر ندیم - دیوبند)

(۲) یکفر بإثبات المکان للہ تعالی، فلو قال: ”از خدا ہیچ مکان خالی نیست“ یکفر. (الفتاوی الهندية: ۲/ ۲۸۳، کتاب السیر، باب في أحکام المرتدین، ومنها ما یتعلق بذات اللہ تعالی، ط: دار الکتب العلمية- بیروت)

خاص اور متعین جگہ کا محتاج نہیں ہے۔[(۱)] اسی طرح بعض چیزیں خاص وقت میں ہی موجود ہوتی ہیں، اس وقت سے پہلے یا بعد میں (آگے پیچھے) نہیں ہوسکتی ہیں، یعنی وہ چیز اپنے وجود میں اس ''خاص وقت'' کی محتاج ہوتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے وجود کے لیے اس طرح وقت اور زمانہ کا محتاج نہیں ہے۔[(۲)] ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حاظر وناظر ہے اور وہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ قرآن مجید میں ہے: {ونحن أقرب إليه من حبل الوريد}[(۳)] ہم (اللہ تعالیٰ) انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ پس سوال میں بیان کردہ عقیدہ صحیح ہے اور شریعت کے موافق ہے، اس طرح کا جملہ کہنے سے کوئی صاحب ایمان کافر نہیں ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] فرشتوں کا اللہ رب العزت کو دیکھنا

۲۱-سوال: کیا اللہ تعالیٰ کو فرشتوں نے دیکھا ہے؟ احادیث میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ ''میرے بندے کیا چاہتے ہیں''؟ فرشتے جواب دیتے ہیں: ''جنت چاہتے ہیں'' پھر اللہ تعالیٰ سوال کرتے ہیں کہ ''کس چیز سے پناہ چاہتے ہیں''؟ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ ''جہنم سے''[(۴)] ان تمام

---

(۱) "ولاشيء مثله" هذه الجملة قد دلت علي نفي المثل عن الله، وأنه لا فقيل له من خلقه، ودليل ذلك قوله تعالى: ليس كمثله شيء" وهذا نص في نفي مشابهة المخلوق للخالق، فلاشيء يماثله سبحانه. (شرح العقيدة الطحاوي-عبد الرحمن بن ناصر البراك، ص: ۳۰، نفي المثل عن الله تعالى، ط: دار التدمرية، الطبعة الأولى: ۱۴۲۹هـ-۲۰۰۸ء)

(۲) "ولايجري عليه زمان" قالو: وجوده تعالى ليس في الزمان ومعني كونه في الزمان أن لايمكن حصوله إلا في الزمان (نبراس ص: ۱۱۶، ط: مكتبة تهانوي-ديوبند)

(۳) -۵۰ق: ۱۶.

وهذا القرب قرب العلم والقدرة، وأمعاض الإنسان يحجب البعض البعض ولايحجب علم الله شيء. (الجامع لأحكام القرآن-شمس الدين القرطبي (م: ۶۷۱هـ): ۱۹/۳۳۶، ت: د.عبد الله بن عبد المحسن التركي، ط: مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى: ۱۴۲۷هـ-۲۰۰۶ء)

(۴) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن لله ملائكة يطوفون في الطرق يلتمسون أهل الذكر، فإذا وجدوا قوما يذكرون الله تنادوا: هلموا إلى حاجتكم" «قال: فيحفونهم بأجنحتهم إلى السماء الدنيا» قال: "فيسألهم ربهم، وهو أعلم منهم، مايقول عبادي؟ قالوا: يقولون: يسبحونك، ويكبرونك، ويحمدونك، ويمجدونك" قال: "فيقول: هل رأوني؟" قال: "فيقولون: لا والله ما رأوك؟" قال: "فيقول: وكيف لو رأوني؟" قال: "يقولون: لو رأوك كانوا أشد لك عبادة، وأشد لك تمجيدا وتحميدا، وأكثر لك تسبيحا" قال: "يقول: فما يسألوني؟" قال: «يسألونك الجنة» قال: "يقول: وهل رأوها؟" قال: "يقولون: لا والله يا رب ما رأوها" قال: "يقول: فكيف لو أنهم رأوها؟" قال:" يقولون: لو أنهم رأوها كانوا أشد عليها حرصا، وأشد لها طلبا، وأعظم فيها رغبة، قال: فمم يتعوذون؟ =

باتوں سے کیا سمجھا جائے؟

الجواب حامداومصلیا:

بات کرنے اور بات کو سمجھنے کے لیے دیکھنا شرط نہیں ہے، صاحب ایمان' آخرت میں اللہ رب العزت کی زیارت کریں گے، یہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔ (شرح فقہ اکبر،ص:۱۰۰-شرح عقائد،ص:۵۸)[1]
واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۳] کیا قیامت کے روز فرشتے بھی ہلاک ہوجائیں گے؟

۲۲-سوال: کیا قیامت کے دن تمام فرشتے بھی نابود ہوجائیں گے؟ اگر نابود ہوجائیں گے تو پھر حضرت عزرائیل کی روح کون قبض کرے گا؟

الجواب حامداومصلیا:

قیامت کے روز تمام چیزیں فناء ہوجائیں گی، اللہ رب العزت قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں: {كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ}[۲] کہ'ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے'۔

ایک جگہ ارشاد ہے: {كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ}[۳] کہ'جتنے روئے زمین پر موجود ہیں، سب فنا ہوجائیں گے۔

لہٰذا فرشتے بھی فنا ہوجائیں گے؛ یعنی تھوڑی دیر کے لیے ان پر بھی بے ہوشی طاری ہوگی؛ البتہ آٹھ چیزیں فنا ہونے سے محفوظ رہیں گی: (۱) عرش الٰہی (۲) کرسی (۳) لوح محفوظ (۴) قلم (۵) جنت (۶) جہنم

="قال: "يقولون: من النار" قال: "يقول: وهل رأوها؟" قال: "يقولون: لا والله يارب ما رأوها" قال: "يقول: فكيف لو رأوها؟" قال: "يقولون: لو رأوها كانوا أشد منها فرارا، وأشد لها مخافة" قال: "فيقول: فأشهدكم أني قد غفرت لهم. (صحيح البخاري: ۲/ ۹۴۸، كتاب الدعوات، باب فضل ذكر الله تعالى، رقم الحديث: ۶۴۰۸، ط: مكتبة البدر ديوبند☆مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۱۲/ ۳۸۹-۳۹۰، رقم: ۷۴۲۴، مسند أبي هريرة، ط: مؤسسة الرسالة. ☆صحيح ابن حبان: ۳/ ۱۳۷-۱۳۸، رقم: ۸۵۶، مؤسسة الرسالة، بيروت☆الدعاء-الطبراني: ۱/ ۵۳۰، رقم: ۱۸۹۴، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) ويراه المؤمنون وهم في الجنة بأعين رؤسهم بلا تشبيه. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۱۰۰، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)
مزید دیکھیے: (شرح عقائد، ص: ۷۰، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی دیوبند)

(۲) ۳-آل عمران: ۱۸۵☆۲۱-الأنبياء: ۳۵☆۲۹-العنكبوت: ۵۷۔

(۳) ۵۵-الرحمن: ۲۶۔

(۷) صور (۸) ارواح۔[1] اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ عزرائیل بھی فنا ہو جائیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۱۱/۶/ ۱۹۷۷ء۔

[۴] جبرئیل امین علیہ السلام اس وقت کس کام پر مامور ہیں؟

۲۳- سوال: کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا پیغام ان کے پیغمبروں اور رسولوں تک لانے کا کام انجام دیتے تھے، لیکن اب تو یہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے، تو اس وقت وہ کون سی ڈیوٹی پر مقرر ہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

ان کی ڈیوٹی ابھی کیا ہے؟ اس کے متعلق کتابوں میں کوئی بات نہیں دیکھی گئی ہے، معلوم ہونے پر انشاء اللہ العزیز بتادیا جائے گا۔[2] واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ (۱۱/۶/ ۱۹۷۷ء)

[۵] اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا

۲۴- سوال: اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا یا نہیں۔ ''لا تدركه الابصار'' آیت کا کیا مطلب ہے؟۔

---

[۱] والمستثنى من الهلاك والفناء ثمانية أشياء نظمها السيوطي في قوله:

ثمانية حكم البقاء يعمها		من الخلق والباقون في حيز العدم
هي العرش والكرسي ونار وجنة		وعجب وأرواح كذا اللوح والقلم

(مراح لبيد لكشف معنى القرآن المجيد- محمد بن عمر نووي الجاوي البنتني من فقهاء الشافعية (م:۱۳۱٦ھ) ۲/ ۲۰۹، سورة القصص الآية: ۸۸، ت: محمد امين الصناوی، ط: دار الكتب العلمية)

نوٹ: اس میں روح کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس کے بجائے ''عجب'' ہے۔

ولا تهلك الجنة والنار وما فيها ولا العرش ولا الكرسي. (الدر المنثور: ٦/ ٤٤٧، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) قال السيوطي- رحمه الله: ما اشتهر على الألسنة أن جبرائيل- عليه الصلاة والسلام- لا ينزل إلى الأرض بعد موت النبي- صلى الله تعالى عليه وسلم- فهو شيء لا أصل له، ومن الدليل على بطلانه، ما أخرجه الطبراني: أن جبرائيل يحضر موت كل مؤمن يكون على طهارة، وأخرج أبو نعيم في الفتن: قال- صلى الله تعالى عليه وسلم: " »يمر الدجال بالمدينة فإذا هو بخلق عظيم فقال: من أنت؟ قال: أنا جبرائيل بعثني لأمنع حرم رسوله« " انتهى. (مرقاة المفاتيح: ۸/ ۳٤٧٠، كتاب الفتن، باب العلامات بين يدي الساعة وذكر الدجال، رقم الحديث: ٥٤٨١، ط: دار الفكر- بيروت)

الجواب حامدا ومصليا:

اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا میں بیداری کی حالت میں نہیں ہوسکتا۔(١) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات اللہ کو دیکھا تھا یا نہیں؟ اس میں صحابۂ کرام اور علماء عظام کا اختلاف ہے۔(٢)

جو حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تھا، وہ یہ کہتے ہیں کہ دل کی آنکھ سے دیدار ہوا تھا، اور جو لوگ قائل نہیں، وہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: ''اے اللہ! میں آپ کا دیدار کرنا چاہتا ہوں: رب أرني. تو اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا تھا: "لن تراني ولكن انظر إلى الجبل فإن استقر مكانه" کہ پہاڑ کی طرف دیکھ، میں اپنی تجلی نازل کر رہا ہوں، اگر وہ اپنی جگہ پر قائم رہے، تو تم میرا دیدار کر سکتے ہو، چناں چہ جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے تجلی فرمائی، پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوگئے۔(٣) معلوم ہوا کہ کوئی بھی شخص

---

(١) قال عبدالله بن عمر: فقال رسول الله -صلى الله عليه وسلم- في الناس ... وقال: تعلموا أنه لن يرى أحد منكم ربه عز وجل حتى يموت. (صحيح المسلم: ٢/٣٩٩، رقم الحديث: ١٦٩، كتاب الفتن، باب ذكر ابن صياد، ط: البدر-ديوبند)

أما رؤية الله في الدنيا فممكنة، ولكن الجمهور من السلف والخلف من المتكلمين وغيرهم على أنها لا تقع في الدنيا. (عمدة القاري-أبو محمد محمود بن أحمد الحنفي، بدر الدين العيني (م: ٨٥٥هـ): ١٨/ ١٧٢، كتاب تفسير القرآن، باب قوله تعالى: إن الله لا يظلم مثقال ذرة. ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

فما نفى الشرع إلا رؤية الله في الدنيا يقظة. (تفسير القاسمي-محمد جمال الدين بن محمد سعيد بن قاسم الحلاق القاسمي (م: ١٣٣٢هـ): ٤/ ٢٥٢، ت: محمد باسل عيون السود، ط: دار الكتب العلمية-بيروت الطبعة: الأولى-١٤١٨هـ)

(٢) وأما رؤيته صلى الله عليه وسلم لربه جل وعز، فاختلف السلف فيها، فأنكرته عائشة رضي الله عنها. .. وقال جماعة بقول عائشة رضي الله عنها، وهو المشهور عن ابن مسعود، ونقله عن أبي هريرة أنه قال: إنما رأى جبرئيل، واختلف عنه، وقال بإنكار هذا وامتناع رؤيته في الدنيا جماعة من المحدثين، والفقهاء، والمتكلمين. وعن ابن عباس رضي الله عنهما أنه رآه بعينه، وروى عطاء عنه أنه رآه بقلبه، وعن أبي العالية عنه رآه بفؤاده مرتين، وذكر ابن إسحاق أن ابن عمر أرسل إلى ابن عباس رضي الله عنهما يسأله هل رأى محمد ربه؟ فقال: نعم، والأشهر عنه أنه رأى ربه بعينه. (الشفاء بتعريف حقوق المصطفى-عياض بن موسى بن عياض بن عمرون اليحصبي السبتي، أبو الفضل (م: ٥٤٤هـ): ١/ ٢٠١، فصل: وأما رؤيته صلى الله عليه وسلم لربه ... الخ، ط: دار الفكر-بيروت)

(مرقاة المفاتيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ١٠١٤هـ): ٩/ ٧٦٣، كتاب الفتن، باب رؤية الله تعالى، ط: دار الفكر-بيروت)

قال ابن عباس، وأبو ذر، وإبراهيم التيمي: رآه بقلبه، وعلى هذا رأى بقلبه ربه رؤية صحيحة، وهو أن الله تعالى جعل بصره في فؤاده أو خلق لفؤاده بصرا حتى رأى ربه رؤية صحيحة. (مرقاة المفاتيح: ٩/ ٣٢٦، كتاب الفتن، باب رؤية الله تعالى)

(٣) وَلَمَّا جَآءَ مُوسٰى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ ۙ قَالَ رَبِّ أَرِنِيٓ أَنظُرْ إِلَيْكَ ۚ قَالَ لَن تَرٰىنِي وَلٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرٰىنِي ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ أَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٤٣﴾ [الأعراف: ١٤٣]

ان فانی آنکھوں سے اللہ کا دیدار نہیں کرسکتا۔

اور جو لوگ دیدار کے قائل ہیں، وہ معراج والی روایت پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نور أني أراه“ نور کے مانند ہے، میں دیکھ سکا تھا۔ (حدیث) (۴)

آپ ﷺ کے علاوہ کوئی انسان اس دنیا میں فانی آنکھوں سے اللہ کا دیدار نہیں کرسکتا؛ البتہ خواب میں دیدار کے متعلق علماء نے صراحت کی ہے کہ خواب میں اللہ کا دیدار ہوسکتا ہے۔ (۵)

امام ابوحنیفہ نے ۱۰۰ مرتبہ اللہ کا خواب میں دیدار کیا ہے، امام احمدؒ فرماتے ہیں: میں نے خواب میں اللہ کا دیدار کیا، تو میں نے پوچھا کہ آپ کا قرب حاصل کرنے کے لیے سب سے بہتر کون سا عمل ہے؟ تو مجھے جواب ملا کہ تلاوت قرآن، پھر حضرت امام احمدؒ نے پوچھا کہ سمجھ کر یا بغیر سمجھے، تو جواب ملا کہ جس طرح بھی پڑھے۔ (۶)

رہا جنت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کا مسئلہ، تو یہ علماء اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ اہل جنت اپنی آنکھوں سے جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے اور اس بارے میں بہت سی نصوص موجود ہیں: چناں چہ مسلم شریف (جلد۱، ص:۱۰۱) میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”تم اپنے پروردگار کو اسی طرح دیکھو گے، جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو، اس پروردگار کو دیکھنے میں تم کوئی رکاوٹ اور پریشانی محسوس نہیں کرو گے۔ (حدیث نبوی) (۷)

بعض گمراہ فرقے مثلاً خوارج وغیرہ جنت میں اللہ کے دیدار کا انکار کرتے ہیں، دلیل کے طور پر لا تدرکه الابصار (۸) وغیرہ آیات پیش کرتے ہیں، جواب یہ ہے کہ یہاں مطلقاً دیدار کی نفی نہیں ہے؛ بل کہ اس دیدار کی نفی کی گئی ہے، جو احاطے کے طور پر ہو؛ لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آنکھیں اللہ کا احاطہ نہیں

---

(۴) عن أبي ذر رضي الله عنه قال: سألت رسول الله -صلى الله عليه وسلم- هل رأيت ربك؟ قال: نور أني أراه. (صحيح المسلم: ۱/۹۹، رقم الحديث: ۲۹۱-(۱۷۸)، كتاب الإيمان، باب معنى قول الله عز وجل: ولقد رآه نزلة أخرى، ط: البدر - ديوبند)

(۵) وأما الرؤية في المنام فقد حكيت عن كثير من السلف، ولا خفاء في أنه نوع مشاهدة يكون بالقلب، دون العين.
(شرح العقائد النسفية - سعد الدين مسعود بن عمر التفتازاني (م: ۷۹۳هـ)، ص: ۷۵، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۶) فعن الإمام الأعظم أنه رأى مائة مرة، ... وعن الإمام أحمد قال: رأيت الله سبحانه في المنام، فسألته عن أفضل العبادات، فقال: تلاوة القرآن. (نبراس شرح، شرح العقائد - العلامة محمد عبد العزيز الفرهاري، ص: ۱۴۹، ۱۷۰، ياسر نديم - ديوبند)

(۷) عن جرير بن عبد الله، قال: كنا عند النبي صلى الله عليه وسلم، فنظر إلى القمر ليلة - يعني البدر - فقال: "إنكم سترون ربكم، كما ترون هذا القمر، لا تضامون في رؤيته، فإن استطعتم أن لا تغلبوا على صلاة قبل طلوع الشمس وقبل غروبها فافعلوا" ثم قرأ: {وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل الغروب} (صحيح البخاري: ۱/۷۸، رقم الحديث: ۵۵۴، كتاب مواقيت الصلوة، باب فضل صلوة العصر، ط: البدر - ديوبند)

(۸) لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (۱۰۳) (الأنعام: ۱۰۳)

کرسکتیں اور اللہ نگاہوں کا احاطہ کرسکتا ہے۔[9] دنیا میں ایک شخص زید، بکر وغیرہ کو دیکھتا ہے؛ لیکن پورے بدن کا احاطہ نہیں کرسکتا، اس کے پیچھے کیا ہے، انسان اس کو نہیں جان سکتا ہے، تو پھر اللہ تعالی کا احاطہ کیسے ہوسکتا ہے؛ لیکن اللہ ہر عالم کا احاطہ کیے ہوا ہے۔ (مشکوٰۃ: جلد ۲، ص: ۵۰۱،۵۰۰)[10]

اس لیے جو لوگ جنت میں اللہ تعالی کے دیدار کا انکار کرتے ہیں اور وہ بھی صرف عقلی دلیلوں کی بنیاد پر، ایسے لوگ سخت گمراہی میں مبتلا ہیں؛ کیوں کہ یہ عقیدہ بہت سی قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] ''اللہ تبارک وتعالی بے مثل ہیں'' کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

۲۵-سوال: اللہ تبارک وتعالی بے مثل ہیں، اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قرآن وحدیث کا آپ کو زیادہ علم نہیں ہے، لہذا آپ کو صرف اتنا جان لینا چاہیے کہ اللہ تبارک و تعالی کی دنیوی اشیاء کی طرح کوئی شکل وصورت اور جسم وہیئت نہیں ہے۔[11] اس کی پوری تفصیل علم کلام میں ہے، آپ کے گاؤں میں علم کا دریا بہتا ہے۔ (یعنی وہاں ایک علمی ادارہ ہے) وہاں جاکر علماء سے رجوع کیجیے، ان شاء اللہ وہ سمجھا دیں گے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] صاحب قبر کی طاقت میں کسی کو نقصان پہونچانا نہیں ہے

۲۶-سوال: پہلے ہمارے یہاں قبرستان نہیں تھا، آبادی بھی کم تھی، اس وقت لوگ گھر کے باڑے میں مردوں کو دفن کرتے تھے، اس زمانہ کی کوئی قبر ہو، جس پر ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گذر گیا ہو، اب ایسی قبر کے پاس کوڑا کرکٹ یا نالی کا پانی جاتا ہو، تو اس میں مدفون نیک آدمی، صاحب مکان کو نقصان پہونچا سکتا ہے؟ اور کیا ایسی صورت میں اللہ کی طرف سے کوئی عذاب صاحب مکان پر آسکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کسی نیک ولی کی قبر ہو، جن کا بدن قبر میں صحیح سالم ہو اور ان کی قبر میں گندگی جارہی ہو، تو اللہ کی طرف

---

(۹) وأقوى شبههم من السمعيات قوله: "لا تدركه الأبصار..."، والجواب بعد تسليم كون الأبصار للاستغراق وإفادته عموم السلب لا سلب العموم وكون الإدراك هو الرؤية مطلقا لا الرؤية على وجه الإحاطة بجوانب المرئي، أنه لا دلالة فيه على عموم الأوقات والأحوال. (شرح العقائد النسفية-سعد الدين مسعود بن عمر التفتازاني (م: ۷۹۳ھ) ص: ۷۴، ط: یاسر ندیم-دیوبند)

(۱۰) مشكاة المصابيح: ۲/۵۰۱، ۵۰۲، رقم الحديث: ۵۶۶، باب رؤية الله تعالى، ط: فيصل-ديوبند.

(۱۱) قال الله تعالى: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ⑪ [۴۲-الشورى: ۱۱]

سے کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے؛ لیکن اس ولی کے قبضہ میں کسی کو نقصان پہونچانے کی طاقت نہیں۔ [۱] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] اللہ کی معرفت کی حقیقت

۲۷-سوال: اکثر و بیشتر بیان اور تقریر میں یہ سنا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہچاننا سیکھو، جس نے اللہ کو پہچان لیا، کام یاب ہو گیا اور جس نے تمام علوم وفنون حاصل کیے؛ مگر اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچان سکا، علم رکھتے ہوئے بھی اس کا علم کارآمد نہیں، تو اللہ کی ذات کو پہچاننے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس کا طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداومصلیا

اللہ کی ذات کو پہچاننا سیکھو'' اللہ کی پہچان بہت مشکل ہے، جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے، تو وہ ولی بن جاتا ہے، ''پہچان ومعرفت'' ایک لفظ ہے، اس کی ایک حقیقت ہے، جو صرف بولنے اور معنیٰ ومطلب سمجھنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ معرفت کی حقیقت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، بس جس آدمی کو اللہ کی پہچان ہو جاتی ہے، وہ کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتا، جیسے انبیاء کرام، کہ ان سے کوئی بھی گناہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، صادر نہیں ہوتا، (البتہ نبی اور ولی میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ نبی گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں، جب کہ ولی گناہ سے معصوم نہیں ہوتے) ان کے علاوہ اولیاء اللہ سے اگر کوئی گناہ ہو جائے، تو وہ جب تک توبہ نہیں کر لیتے، چین نہیں آتا اور دل کو سکون اور قرار حاصل نہیں ہوتا؛ لہٰذا جس آدمی کو یہ کیفیت حاصل ہو جائے، تو سمجھ لیجیے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو گئی۔

زبان سے تو ہر مسلمان کہتا ہے کہ اللہ ہمارا مالک ہے، اس نے ہم کو پیدا کیا، وہ ہمارا رب ہے، وغیرہ؛ لیکن جب کسی کے ساتھ جھگڑا ہو اور غصہ آجائے، وارث کا مال تقسیم کرنے کا وقت آجائے، شریعت کے مطابق تجارت کرنے کے لیے کہا جائے، غیر شرعی طریقے سے جو نفع حاصل کیا ہے، سب کو بلا نیت ثواب صدقہ کرنے کا حکم دیا جائے، اس وقت شریعت کی معرفت ہے یا نہیں؟ اس کا امتحان ہوتا ہے، شریعت کے ہر ایک حکم کو پورا کرنا ہی معرفت ہے، شریعت اور معرفت الگ چیز نہیں ہے، جب امتحان کا موقع آتا ہے تو گنجائش کا، مصلحت کا سہارا تلاش کیا جاتا ہے، اخیر میں یوں کہہ کر دل کو سمجھایا جاتا ہے کہ شدت پسند علماء سختی کرتے رہتے ہیں، سب کچھ چلتا ہے، اللہ معاف کر دے گا، یہ معرفت نہیں بل کہ جہالت ہے۔

(۱) عن عبد الله بن عباس، أنه حدثه: أنه ركب خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم يوما، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: "يا غلام، إني معلمك كلمات: احفظ الله يحفظك، احفظ الله تجده تجاهك، وإذا سألت فاسأل الله، وإذا استعنت فاستعن بالله، واعلم أن الأمة لو اجتمعوا على أن ينفعوك، لم ينفعوك إلا بشيء قد كتبه الله لك، ولو اجتمعوا على أن يضروك، لم يضروك إلا بشيء قد كتبه الله عليك، رفعت الأقلام، وجفت الصحف. (مسند الإمام أحمد بن حنبل (م: ۲۴۱ھ): ۴/ ۴۰۹، رقم الحديث: ۲۶۶۹، مسند عبد الله بن العباس، ط: مؤسسة الرسالة)

ایک یہودی عالم آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اے محمد (یا اے ابوالقاسم)! بے شک اللہ تعالی قیامت کے دن آسمان کو ایک انگلی پر، زمین کو دوسری پر، پہاڑوں اور درختوں کو تیسری پر، پانی اور نمناک مٹی کو چوتھی انگلی پر اور دوسری تمام مخلوقات کو پانچویں انگلی پر رکھ کر انگلیوں کو ہلائیں گے اور یوں کہیں گے: ''میں بادشاہ ہوں، میں ہی بادشاہ ہوں''۔ تو نبی کریم ﷺ اس یہودی عالم کی بات پر تعجب کرتے ہوئے ہنس پڑے اور اس کی تائید میں قرآن پاک کی آیت تلاوت کی "وما قدروا اللہ حق قدرہ" (اللہ کی جیسی عظمت کرنی چاہیے، ویسی عظمت یہ یہودی نہ کر سکے)

مطلب یہ ہے کہ ایسا علم رکھنے کے باجود اللہ کے ایک سچے نبی کو ماننے اور ان پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہے، تو انہوں نے اللہ کی کیا قدر پہچانی؟ کیا صرف اتنا جان لینے سے اللہ پاک راضی ہو جائیں گے؟ صرف جان لینا ہی اللہ کا حق ہے؟ نہیں، اصل حق تو فرماں برداری اور معرفت ہے۔ (مسلم شریف، ج:۲، ص:۳۷۰)[1]

[۹] ہر حال میں رازق اللہ ہے

۲۸-سوال: زمین فروخت کرنے کی شدید ضرورت ہے، اگر زمین فروخت ہوگئی، تو میری اولاد کے حصہ میں کوئی چیز باقی نہیں رہے گی اور وہ کسان شمار نہیں ہوں گے، پھر کیسے گذارہ کریں گے، اس کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا کوئی غلط طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، تاکہ زمین فروخت کرنے کی نوبت نہ آئے؟

الجواب حامداومصلیا:

زمین بک جائے گی، تب بھی اللہ تعالی رازق ہے، روزی روٹی کا ضامن اللہ ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں: وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا.[2] (ترجمہ: اور کوئی (رزق کھانے والا) جان دار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو) اس لیے اللہ پر بھروسہ کریں اور کوئی غلط طریقہ اختیار نہ کریں، ساتھ ہی دعاء کریں، اللہ تعالی کوئی سبیل پیدا فرما دیں گے، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن عبد اللہ بن مسعود، قال: جاء حبر إلی النبي -صلی اللہ علیہ وسلم، فقال: یا محمد أو یا أبا القاسم إن اللہ تعالی یمسك السماوات یوم القیامة علی إصبع، والأرضین علی إصبع، والجبال والشجر علی إصبع، والماء والثری علی إصبع، وسائر الخلق علی إصبع، ثم یهزهن، فیقول: أنا الملك، أنا الملك، فضحك رسول اللہ- صلی اللہ علیہ وسلم تعجبا مما قال الحبر، تصدیقا له، ثم قرأ: {وما قدروا اللہ حق قدرہ والأرض جمیعا قبضته یوم القیامة والسموات مطویات بیمینه سبحانه وتعالی عما یشرکون}. (صحیح المسلم: ۲/۳۷۰، رقم الحدیث: ۱۹-(۲۷۸۶)، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، ط: البدر-دیوبند) ————— (۲)-۱۱ ھود: ۶.

□

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ
يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ (۴-النساء:۴۸)

باب الإشراک باللّٰہ

(اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[شرک کا بیان]

[۱] الفاظ شرک کی ادائیگی اور توبہ

۲۹-سوال: میرے اوپر کسی نے جادو کر دیا تھا، اس لیے علاج کی غرض سے کئی مرتبہ مختلف مزاروں پر جانا ہوا، میں مزار کے اردگرد گھومتا تھا اور اس قسم کے الفاظ بولتا تھا ''اس کو ختم کر دو، جلا دو''۔

میں نے مزارات پر اس طرح کے جو بھی الفاظ کہے، وہ صرف یہ سمجھ کر کہے کہ صاحب مزار بزرگ اپنی کرامت کے سبب اس کو دفع کر دیں گے، لیکن مجھے ان الفاظ کے بولنے پر شرح صدر نہ تھا، دل میں یہ بات برابر کھٹکتی رہی کہ کہیں یہ شرکیہ الفاظ تو نہیں ہیں، اور معلوم نہیں میری توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟ میں نے اس سلسلے میں تحقیق کرتے کرتے درج ذیل باتیں پڑھیں:

(۱) ''مرنے کے بعد کیا ہوگا'' کتاب کے مصنف: مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ ہیں، مولانا میرٹھیؒ کتاب میں ایک جگہ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث بیان فرماتے ہیں کہ: اللہ کے رسول کی شفاعت صرف ان لوگوں کے ہی حق میں مفید ہوگی، جنھوں نے شرک نہ کیا ہو۔ (۱)

(۲) کلام پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میں شرک کے علاوہ تمام گناہوں کو بخش دوں گا''۔ (۲)

(۳) ''بہشتی زیور، گجراتی'' میں لکھا ہے کہ ''توبہ کا مطلب کفر اور شرک سے توبہ نہیں ہے؛ بل کہ

---

(۱) قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: أشهد كم أن شفاعتي لكل من مات لا يشرك بالله شيئا. (جامع معمر بن راشد-معمر بن أبي عمرو راشد الأزدي (م: ۱۵۳ھ): ۱۱/ ۴۱۳، رقم الحديث: ۲۰۸۶۵، باب من يخرج من النار، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، ط: المجلس العلمي - باكستان، الطبعة: الثانية، ۱۴۰۳ھ)

(۲) إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا [النساء: ۴۸]

دوسرے گناہوں سے توبہ ہے، جب کہ ایمان کا مطلب کفر سے توبہ کر کے اسلام میں داخل ہونا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ میری توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟ میرے لیے شریعت کا کیا حکم ہے، میں مسلمان باقی رہا یا نہیں؟ اور میں مستحق شفاعت ہوں یا نہیں؟ اس سلسلے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں میرا کیا حکم ہے؟۔ تشفی بخش جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداومصلیا:

آپ نے صرف ایک دو حدیثیں پڑھی ہیں، حدیث کی دوسری کتابوں پر آپ کی نظر نہیں ہے؛ اسی لیے آپ کو شکوک وشبہات ہو رہے ہیں۔

آپ علاج کی غرض سے مزار پر گئے تھے، وہاں اگر آپ نے دعا اس طرح مانگی تھی کہ اے اللہ! میں اس صاحب مزار کے وسیلے سے تجھ سے دعاء کرتا ہوں کہ تو میرا جادو، میری بیماری اور میری تمام تکلیفیں دور فرما دے، تو آپ مسلمان ہیں، اسلام سے نہیں نکلے۔ (۱) لیکن اگر آپ نے مزار کا طواف کیا، اور وہاں بیماری سے شفاء کی دعا اس عقیدے سے مانگی کہ صاحب مزار ولی میری تمام پریشانیوں اور بیماریوں کو دور کردیں گے، اور آپ کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اولیاء اللہ بیماریوں سے شفاء دیتے ہیں، تو اس عقیدے کی وجہ سے آپ مرتد ہو گئے۔ (۲) البتہ اس کے بعد اگر آپ نے توبہ واستغفار کر لیا، اور اپنے گناہ سے ندامت وپشیمانی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی اور دوبارہ کلمہ پڑھ کر آپ نے اپنا عقیدہ درست کرلیا کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں، کسی کا بیمار ہونا یا شفایاب ہونا، بس اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہی ہوتا ہے، تو آپ دوبارہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ (۳) لیکن بیوی سے ازسرنو نکاح کرنا ضروری ہوگا۔ (۴)

---

(۱) وإن التوسل بالنبي وبأحد من الأولياء العظام جائز، بأن يكون السؤال من الله تعالى، ويتوسل بوليه ونبيه. (امداد الفتاوی: ۶/ ۳۳۷، کتاب العقائد والکلام، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند)

(۲) إن الناس قد أكثروا من دعاء غير الله تعالى من الأولياء الأحياء منهم والأموات وغيرهم، مثل يا سيدي فلان أغثني، وليس ذلك من التوسل المباح في شيء، واللائق بحال المؤمن عدم التفوه بذلك وأن لا يحوم حول حماه، وقد عدّه أناس من العلماء شركاً وأن لا يكنه، فهو قريب منه ولا أرى أحداً ممن يقول ذلك إلا وهو يعتقد أن المدعو الحي الغائب أو الميت المغيب يعلم الغيب أو يسمع النداء ويقدر بالذات أو بالغير على جلب الخير ودفع الأذى وإلا لما دعاه ولا فتح فاه. (روح المعاني-شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م: ۱۲۷۰هـ): ۳/ ۲۹۸، سورة المائدة، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت، الطبعة: الأولى: ۱۴۱۵هـ)

(۳) ثم اعلم أن من أراد أن يكون مسلما عند جميع طوائف الإسلام، فعليه أن يتوب من جميع الآثام صغيرها وكبيرها، سواء يتعلق بالأعمال الظاهرة أو بالأخلاق الباطنة، ثم يجب عليه أن يحفظ نفسه في الأقوال والأفعال والأحوال من الوقوع في الارتداد... وإن قدر الله عليه وصدر عنه ما يوجب الردة فيتوب عنها ويجدد الشهادة،=

جن کافروں کی موت شرک پر ہوئی ہو، ان کے لیے کسی کی شفاعت مفید نہیں ہوگی، آپ تو زندہ ہیں، کفر و شرک کے کاموں سے توبہ کر رہے ہیں، تو آپ کو شفاعت سے فائدہ ہوگا، ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ (۴-النساء:۴۸) لہٰذا ہر ایک مسلمان کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ جس کا انتقال شرک پر ہوا ہے، اس کی مغفرت نہیں ہوگی، اس کے علاوہ جن کی مغفرت اللہ کرنا چاہیں، کردیں گے۔

حالت نزع کے شروع ہونے سے پہلے پہلے جو شخص بھی اپنے کفر و شرک سے توبہ کرے گا، تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔[5] توبہ کا دروازہ قیامت تک ہر ایک شخص کے لیے حالت نزع سے پہلے پہلے تک کھلا ہوا ہے۔[6] ۱۲۴۰۰۰ لوگ (صحابۂ کرام) اسلام قبول کرنے سے پہلے کفر و شرک کی تاریکیوں میں تھے؛ لیکن جب ان پر اسلام کی تابناک کرنیں پڑیں اور انھوں نے ماضی کے اعمال سے توبہ کی، تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور تا قیامت اپنی رضامندی کا پروانا عطا کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ قیامت تک توبہ کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا ہوا ہے؛ اس لیے آپ کو بھی توبہ کرنے کی ضرورت ہے، ان حضرات نے بھی حالت نزع سے پہلے پہلے اسی دنیا میں توبہ کی ہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] تعدیہ امراض کا اعتقاد اسلام کے منافی ہے

۳۰-سوال: میرا ایک دوست ہے، جس کے دو بیٹے ہیں۔ تین سال سے اس کی بیوی کو سفید کوڑھ (برص) کی بیماری ہوگئی ہے، میرے دوست کا خیال ہے کہ یہ بیماری خاندانی ہے؛ اس لیے وہ مارے خوف

= ليرجع له السعادة. (شرح الفقه الأكبر، ص:۱۹۸، بحث التوبة، ط: ياسر نديم - ديوبند)

و إسلامه أن يتبرأ عن الأديان سوى الإسلام أو عما انتقل إليه بعد نطقه بالشهادتين. (الدر المختار مع رد المحتار: ۴/۲۲۶، كتاب السير، باب المرتد، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۵/۱۲۹، كتاب السير، باب أحكام المرتدين، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۴) وارتداد أحدهما أي الزوجين فسخ، فلا ينقص عددا عاجل بلا قضاء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۱۹۳، كتاب النكاح، باب نكاح الكافر، ط: دار الفكر - بيروت)

اس صفحہ کا حاشیہ (۵) عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: "إن الله يقبل توبة العبد ما لم يغرغر". (سنن الترمذي: ۲/ ۱۹۴، رقم الحديث: ۳۵۳۷، أبواب الدعوات، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۶) عن أبي هريرة - رضي الله عنه - قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: "من تاب قبل أن تطلع الشمس من مغربها، تاب الله عليه". (صحيح المسلم: ۲/۳۴۶، رقم الحديث: ۴۳-(۲۷۰۳)، كتاب الذكر والدعاء، باب استحباب الاستغفار، ط: البدر - ديوبند)

کے مزید بچوں کی ولادت نہیں چاہتا، اس کے لیے وہ مانع حمل ادویات کا استعمال تو نہیں کرتا؛ لیکن جماع کے وقت بہ وقت انزال عزل کر لیتا ہے۔ کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟ اس طرح بچوں کی پیدائش روکنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: لاعدوی.[1] مطلب یہ کہ "چھوت یعنی کسی بیماری کا ایک سے دوسرے کو لگنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا"۔

عام لوگوں کا خیال تھا کہ بعض بیماریاں مثلاً: کھجلی، چیچک، آنکھ دکھنا اور آب و ہوا کی تبدیلی سے جو بیماری لاحق ہوتی ہے، نیز ہیضہ (کالرا: CHOLERA) وغیرہ، وہ متعدی ہوتی ہے، کسی ایک کو اگر ہو جائے، تو اس کی مجالست ومخالطت سے دوسرے کو بھی ہو جاتی ہے۔

چناں چہ ایک دیہاتی صحابی - جو اپنے مشاہدے اور تجربہ کی بنا پر خارش کو متعدی مرض سمجھتے تھے - اللہ کے رسول ﷺ سے عرض کیا: "یارسول اللہ! ہم بعض اونٹ کو دیکھتے ہیں، جو اپنی تندرستی اور اپنی کھال کی صفائی ستھرائی کے اعتبار سے ہرن کی مانند ریگستان میں دوڑے پھرتے ہیں، لیکن جب کوئی خارشی اونٹ ان میں مل جاتا ہے، تو وہ دوسروں کو بھی خارش زدہ بنا دیتا ہے؟ (گویا کھجلی متعدی مرض ہے) آں حضرت ﷺ نے فرمایا: اچھا تو یہ بتائیے کہ پہلے اونٹ کو کس نے خارش زدہ بنایا؟[2]

یعنی خارش پیدا ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی سے اڑ کر لگے؛ لہٰذا جس طرح ان تندرست اونٹوں میں آملنے والے خارش زدہ اونٹ میں خارش کا پیدا ہونا بہ تقدیر الٰہی ہوتا ہے؛ اسی طرح دوسرے اونٹوں کا خارش زدہ ہونا بھی حکم الٰہی کے تحت اور نظام قدرت کے مطابق ہوتا ہے، اللہ کے حکم کے بغیر کوئی بیماری کسی کو نہیں لگ سکتی، صرف مجالست ومخالطت سے ایسی بیماری بھی کسی میں پیدا نہیں ہو سکتی، جن کے

(۱) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا عدوی، ولا طیرة، ولا هامة، ولا صفر، وفر من المجذوم كما تفر من الأسد. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۵۰، كتاب الطب، باب: الجذام وباب لا هامة، رقم الحديث: ۵۷۰۷، عن أبي هريرة، ط: البدر، ديوبند☆صحيح المسلم: ۲/ ۲۳۰، رقم: ۱۰۲-(۲۲۲۰)، كتاب الآداب، باب لا عدوى، ولا طيرة، ولا هامة... الخ، فيصل - ديوبند)

(۲) إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا عدوى، ولا صفر، ولا هامة، فقال أعرابي: يا رسول الله، فما بال إبلي، تكون في الرمل كأنها الظباء، فيأتي البعير الأجرب فيدخل بينها فيجربها؟ فقال: «فمن أعدى الأول؟» (صحيح البخاري: ۲/ ۸۵۱، كتاب الطب، باب: لا صفر، وهو داء يأخذ البطن، رقم: ۵۷۱۷، ط: البدر - ديوبند☆صحيح المسلم: ۲/ ۲۳۰، رقم الحديث: ۱۰۱-(۲۲۲۰)، كتاب الآداب، باب لا عدوى، ولا طيرة، ولا هامة... الخ)

بارے میں عام خیال ہے کہ یہ متعدی ہوتی ہے۔ (عینی، فتح الباری)[۳]

اس لیے مسلمان کا عقیدہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی بیماری نہیں ہوگی۔

تاہم انسان کمزور ہے؛ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے انسانی طبیعت اور اس کی فطرت کا بھی خیال رکھتے ہوئے اسے حکم دیا ہے کہ مجذوم (صاحب برص) سے اسی طرح بھاگو، جس طرح تم شیر سے بھاگتے ہو۔ اس حکم کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ انسان کا ایمان کمزور نہ ہو جائے، اور توحید کے سلسلے میں وہ شک وشبہ میں نہ مبتلا ہو جائے۔[۴]

یعنی انسان خارش زدہ یا صاحب برص کے ساتھ رہتے ہوئے اگر اس بیماری میں مبتلا ہو جائے گا تو کمزور عقیدہ والا کہے گا کہ کھجلی اور برص والے کی صحبت کی وجہ سے مجھے یہ بیماری لگی ہے؛ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس سے دور رہو؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کا عمل یہ ہے کہ ایک جذامی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اس پیالہ میں کھاؤ، اللہ پر بھروسہ کرو۔ تو اس نے مذکورہ پیالہ میں کھایا۔[۵]

اسی طرح طاعون وپلیگ کی بیماری کے تعلق سے فرمایا کہ جس شہر میں طاعون پھوٹ پڑا ہو، وہاں مت جاؤ، اور اگر پہلے سے اس شہر میں ہو تو وہاں سے باہر نہ جاؤ۔[۶] کیوں کہ شہر میں جانے سے اگر وہ بیماری بہ تقدیر الٰہی لاحق ہوگئی، تو کمزور ایمان والا سمجھے گا کہ فلاں شخص شہر میں آیا؛ اس وجہ سے بیماری لگ گئی اور اس کا عقیدہ خراب ہوگا،

---

(۳) انظر: فتح الباري - ابن حجر العسقلاني: ۲۴۱/۱۰، كتاب الطب، باب: لا هامة، ط: دار المعرفة - بيروت.
عمدة القاري - بدر الدين العيني: (م: ۸۵۵هـ): ۲۸۸/۲، كتاب الطب، باب: لا عدوى، ط: دار إحياء التراث العربي.

(۴) انظر رقم الهامش: (۱).

(۵) عن جابر بن عبد الله، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم: أخذ بيد رجل مجذوم فأدخلها معه في القصعة، ثم قال: كل، ثقة بالله وتوكلا على الله. (سنن ابن ماجة، ص: ۲۵۳، رقم: ۳۵۴۲، كتاب الطب، باب المجذوم، ط: فيصل ديوبند ★ المصنف في الأحاديث والآثار - أبو بكر بن أبي شيبة (م: ۲۳۵هـ): ۱۴۱/۵، رقم: ۲۴۵۳۶، كتاب الأطعمة، الأكل مع المجذوم، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد - الرياض ☆ شرح معاني الآثار - أبو جعفر أحمد بن محمد الطحاوي (م: ۳۲۱هـ): ۳۰۹/۴، رقم: ۷۰۴۳، كتاب الكراهة، باب الرجل يكون به الداء هل يجتنب أم لا؟ ط: عالم الكتب)

(۶) يسأل أسامة بن زيد، ماذا سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم في الطاعون؟ فقال أسامة: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الطاعون رجس أرسل على طائفة من بني إسرائيل، أو على من كان قبلكم، فإذا سمعتم به بأرض، فلا تقدموا عليه، وإذا وقع بأرض، وأنتم بها فلا تخرجوا، فرارا منه». قال أبو النضر: «لا يخرجكم إلا فرارا منه». (صحيح البخاري: ۴۹۳/۱، كتاب أحاديث الأنبياء، باب حديث الغار، رقم: ۳۴۷۳، ط: البدر - ديوبند ☆ صحيح المسلم، رقم: ۹۰-(۲۲۱۸)، كتاب الآداب، باب الطاعون، والطيرة، والكهانة، ونحوها)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیدہ کی خرابی سے بچانے کے لیے سد باب کے طور پر اس شہر میں جانے سے ہی منع فرمادیا۔ (۷)

الغرض بیماری متعدی نہیں ہوتی، یہ سمجھنا کہ بیماری متعدی ہوتی ہے، اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

لہٰذا اگر آپ کا دوست جذام کو متعدی مرض مانتا ہے، تو اسے اپنے اس خیال سے توبہ کرنی چاہیے کہ یہ غیر اسلامی ہے۔

لیکن اگر وہ وحدانیت میں پختہ ہے، اس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان مضبوط ہے؛ لیکن یہ سوچتا ہے کہ میں کمزور ہوں، اگر میری اولاد کو جذام ہوگیا، تو کہیں میرے عقیدے میں اضمحلال نہ پیدا ہوجائے؛ اس لیے وہ مزید بچے کے نہ ہونے کی تدبیر اختیار کرتا ہے، تو جائز ہے، تاہم ایسی ہی تدبیر اختیار کرے، جو شریعت میں جائز ہو، اگر وہ اپنی بیوی کی اجازت سے عزل کرتا ہے، تو جائز ہوگا۔ (۸) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] پیر کی درگاہ پر پکوان پیش کرنا اور ان پکوانوں کو کھانے کا شرعی حکم

۳۱-سوال: ہمارے پڑوس میں ایک ''کولیاد'' نام کا گاؤں ہے وہاں :: قاسم شاہ مٹھوشاہ'' نامی کسی پیر صاحب کی درگاہ ہے، لوگ ان کے نام کی منتیں مانگ کر دال، پلاؤ اور گوشت کی دیگیں پیش کرتے ہیں اور وہاں آنے والوں کو پیر صاحب کے نام پر نذر کی گئی اشیاء میں سے کھلاتے ہیں، ہمارے یہاں ایک امام صاحب ہیں، وہ اپنی ذات میں بہت ہی پرہیزگار ہیں، وہ بھی وہاں گئے تھے اور ان کو بھی چڑھاوا کھلایا گیا، تو کیا ان کے لیے اس کا کھانا جائز ہے؟ عبدالقادر

الجواب حامداً ومصلیاً:

''قاسم شاہ مٹھوشاہ'' یا کسی بھی پیر صاحب کی درگاہ پر جاکر منتیں مانگنا اور چڑھاوا چڑھانا جائز نہیں، حرام ہے۔ نذر صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے، اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے نذر ماننا، کسی اور سے منت

---

(۷) وأما الأمر بالفرار من المجذوم فمن باب سد الذرائع، لئلا يتفق للشخص الذي يخالطه شيء من ذلك بتقدير الله تعالى ابتداء، لا بالعدوى المنفية، فيظن أن ذلك بسبب مخالطته، فيعتقد صحة العدوى، فيقع في الحرج، فأمر بتجنبه حسما للمادة. والله أعلم. (نزهة النظر شرح نخبة الفكر-الحافظ العسقلاني (م: ۸۵۲ھ)، ص: ۹۲، ط: مطبعة سفير، بالرياض)

(۸) ويكره للزوج أن يعزل عن امرأته الحرة بغير رضاها؛ لأن الوطء عن إنزال سبب لحصول الولد، ولها في الولد حق، وبالعزل يفوت الولد، فكأنه سببا لفوات حقها، وإن كان العزل برضاها لا يكره؛ لأنها رضيت بفوات حقها. (بدائع الصنائع: ۲/ ۳۳۴، كتاب النكاح، فصل المعاشرة بالمعروف، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

مانگنا جائز نہیں۔(۱) اس لیے درگاہ پر پیر صاحب کے نذر کا دال پلاؤ اور گوشت وغیرہ کھلانا جائز نہیں، جولوگ اس کھانے میں شرکت کریں گے، وہ گنہ گار ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ (۲۳/۱/۷۷ء)

[۴] غوث پاک کے نام پر بکرا ذبح کرنا اور اس کو کھانا

۳۲-سوال: غوث پاکؒ کے نام کا بکرا ذبح کرکے نذر و نیاز کا کھانا پکا کر لوگوں کو کھلانا، یا مالیدہ بنانا اور غوث پاکؒ کے نام کے چڑھاوے چڑھانا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصليا:

بکرا یا کسی دوسرے حلال جانور کا اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کرنا ضروری ہے۔(۲) اگر غوث پاک کے نام پر بکرے کو ذبح کیا گیا ہے، یا نام تو اللہ تعالیٰ کا ہی لیا گیا ہو، لیکن ذبح غوث پاک کے لیے کیا گیا ہو، ہر دو صورت میں اس کا گوشت کھانا جائز نہیں، نیز ان کے نام کا مالیدہ اور نذر و نیاز کا کھانا' کھانا بھی جائز نہیں ہے۔[۳] واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ (۵/۱۰/۷۷ء)

---

(۱) واعلم أن النذر الذي يقع للأموات من أكثر العوام وما يؤخذ من الدراهم، والشمع، والزيت، ونحوها إلى ضرائح الأولياء الكرام تقربا إليهم، فهو بالإجماع باطل وحرام، مالم يقصدوا صرفها لفقراء الأنام، وقد ابتلي الناس بذلك. (قوله تقربا إليهم) كأن يقول يا سيدي فلان إن رد غائبي أو عوفي مريضي أو قضيت حاجتي فلك من الذهب أو الفضة أو من الطعام أو الشمع أو الزيت كذا. بحر. (قوله باطل وحرام) لوجوه: منها أنه نذر لمخلوق والنذر للمخلوق لايجوز؛ لأنه عبادة والعبادة لاتكون لمخلوق. ومنها أن المنذور له ميت والميت لايملك. ومنه أنه إن ظن أن الميت يتصرف في الأمور دون الله تعالى واعتقاده ذلك كفر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۴۳۹، كتاب الصوم، مطلب في صوم الست من شوال، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/۳۲۰-۳۲۱، كتاب الصوم، فصل ما يوجبه العبد على نفسه، ط: دار الكتاب الاسلامي ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱ھ) ص: ۶۹۳-۶۹۴، كتاب الصوم، باب ما يلزم الوفاء به، ت: محمد عبدالعزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت - الطبعة الأولى: ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۷م)
سجدۂ سہو کردن بسوئے قبور انبیاء و اولیاء، وطواف گرد قبور کردن ودعا از آنہا خواستن ونذر برائے آنہا قبول کردن حرام است؛ بل کہ چیزہا از اں بہ کفری رسانند، پیغمبر-صلی اللہ علیہ وسلم- برآنہا لعنت گفتہ واز اں منع فرمودہ وگفتہ کہ قبر مرا بت نہ کنند۔ (مالابد منہ ص: ۶۷، ط: اقراء بک ڈپو، دیوبند)

(۲) قال الله تعالى: وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ. (۶-الأنعام: ۱۲۱)
وما أهل لغير الله به أي رفع الصوت لغير الله تعالى عند ذبحه، والمراد بالإهلال هنا ذكر ما يذبح له كاللات والعزى. (روح المعاني: ۳/۲۳۱، المائدة، ط: دار الكتب العلمية)

[۳] (ذبح لقدوم الأمير) ونحوه كواحد من العظماء (يحرم) لأنه أهل به لغير الله (ولو) وصلية (ذكر اسم الله=

[۵] مورتی کی پوجا کرنے اور اس کے گلے میں پھول کا ہار چڑھانے والے کا حکم

۳۳-سوال: باڑولی میں گن پتی وسرجن (الوداعی) کے موقع پر جب غیر مسلموں کا گن پتی کا جلوس نکلا، تو ایک مسلمان نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑا، پوجا کی اور اس کے گلے میں پھول کے ہار پہنائے، سوال یہ ہے کہ اس عمل سے شرک و کفر لازم آئے گا یا نہیں؟ اگر شرک لازم آئے، تو اس سے کفر بھی لازم آئے گا یا نہیں؟ اگر کفر لازم آئے، تو اس کی بیوی اس کے نکاح میں علی حالہ باقی رہے گی یا نہیں؟ ایسے آدمی کے ساتھ گاؤں والوں کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ اگر گاؤں والے اس شخص کے اس قبیح شرکیہ عمل پر خاموشی اختیار کریں، تو انہیں گناہ ہوگا یا نہیں؟ اسماعیل یوسف مالکدا

الجواب حامداً ومصلیاً:

گن پتی کو پھول کا ہار پہنانے اور غیر مسلموں کی طرح اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بہ رضاء و رغبت بندگی اور پوجا کرنے سے آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے؛ کیوں کہ عبادت و بندگی اللہ رب العزت کے علاوہ کسی اور کی جائز نہیں ہے۔[۱]

اسی طرح غیر مسلموں کے مذہبی تہوار کی تعظیم کرنے اور اس کو اچھا سمجھنے سے بھی آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے۔[۲]

=تعالى). (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۳۰۹، كتاب الذبائح، ط: دار الفكر)

قال العلماء: لو أن مسلما ذبح ذبيحة، وقصد بذبحها التقرب إلى غير الله صار مرتدا وذبيحته ذبيحة مرتد. (التفسير الكبير للرازي: ۵/ ۱۹۲، المائدة: ۳، ط: دار احياء التراث العربي، بيروت)

ومثله ما يقع من المعتقدين للأموات من الذبح على قبورهم، فإنه مما أهل به لغير الله، ولا فرق بينه وبين الذبح للوثن. (فتح القدير - الشوكاني: ۱/ ۱۹۶، البقرة: ط: دار ابن كثير، دمشق، بيروت)

(۱) قال الله تعالى: وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ. [۲- البقرة: ۱۶۳]

وقال تعالى: اِتَّخَذُوْٓا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ أُمِرُوْٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا إِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ. [۹- التوبة: ۳۱]

وقال تعالى: وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهٗ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. [۲۸- القصص: ۸۸]

وقال تعالى: هُوَ الْحَيُّ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ. [۴۰- غافر: ۶۵]

(۲) وفي الفتاوى الصغرى: من تقلنس بقلنسوة المجوس، أي لبسه، وتشبه بهم فيها، أو خاط خرقة صفراء على العاتق، أي وهو من شعارهم، أو شدّ في الوسط خيطا كفر، إذا كان متشابها بخيطهم أو ربطهم، أو سماه زنارا... ولو تشبه نفسه باليهود والنصارى، أي صورة أو سيرة على طريق المزاح أو الهزل، أي ولو على هذا المنوال كفر. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۲۲۷-۲۲۸، ط: ياسر نديم ديوبند)

خلاصۃ الفتاوی میں ہے کہ ''اگر مجوسیوں کے تہوار کے موقع پر کسی مجوسی نے کسی مسلمان کو انڈے ہدیے میں دیے، تو قبول کرنے والا کافر ہو جائے گا، کیوں کہ اس نے انڈا قبول کر کے کفر پر اس کی مدد کی یا ان دنوں میں ان کی مشابہت اختیار کی''۔ (۳)

مجمع النوازل میں ہے کہ ''مجوسی لوگ اپنے نیروز کے تہوار کے موقع پر کسی جگہ جمع ہوئے ہوں، ان کو دیکھ کر کوئی مسلمان یہ کہے کہ ''یہ بہت ہی اچھا تہوار اور کیا ہی عمدہ طریقہ ہے''، تو اس طرح کہنے کی وجہ سے وہ ایمان سے نکل جائے گا''۔ (۴)

فتاویٰ صغریٰ میں ہے کہ ''اگر کوئی مسلمان غیر مسلم، مجوس یا یہود و نصاری کے تہوار کے موقع پر کوئی چیز بابرکت سمجھ کر خریدے یا اس دن کو باعظمت سمجھ کر خریدی کرے، تو ایمان سے نکل جائے گا''۔ (۵)

مذکورہ بالا فتاویٰ سے یہ بات بہ خوبی معلوم ہوئی کہ جو شخص غیر مسلموں کے مذہبی تہوار کی تعظیم کرے، اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھے یا ان دنوں کا خاص طور پر احترام کرے اور ان دنوں کو بابرکت سمجھ کر آپس میں لین دین کرے، تو اس کا ایمان جاتا رہے گا۔

غیر مسلموں کے یہاں گن پتی کو خدا کا اوتار سمجھا جاتا ہے، اس پر پھول کے ہار چڑھانا اور اس کے سامنے غیر مسلموں کی طرح ہاتھ جوڑ کر عبادت کا طریقہ اپنانا؛ کفر اور شرک کے کام ہیں؛ لہٰذا مذکورہ کام کرنے والا شخص ایمان سے نکل جائے گا اور اس کی وجہ سے اس کی بیوی بھی اس کے لیے حرام ہو جائے گی۔ اس لیے اس کو از سر نو کلمہ پڑھ کر ان کاموں سے توبہ کر کے نئے سرے سے نکاح کرنا ضروری ہوگا۔ (۶)

گاؤں والوں کے لیے ضروری ہے کہ اس شخص کو صحیح عقائد سمجھائیں تا کہ وہ اپنی اس نازیبا اور غلط

---

(۳) وفي الخلاصة: من أهدى بيضة إلى المجوس يوم النوروز، كفر، أي لأنه أعانه على كفره وإغوائه، أو تشبه بهم في إهدائه. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۲۲۹، فصل في الكفر صريحا و كناية، لا يحرم كل . . . الخ، ط: ياسر نديم ديوبند)

(۴) وفي مجمع النوازل: اجتمع المجوس يوم النوروز، فقال مسلم: سيرة حسنه وضعوها، كفر، أي لأنه استحسن وضع الكفر مع تضمن استقباحه سيرة الإسلام. (المصدر السابق)

(۵) وفي الفتاوى الصغرى: ومن اشترى يوم النوروز شيئا، ولم يكن يشتريه قبل ذلك، أراد به تعظيم النوروز، كفر، أي لأنه عظّم عيد الكفرة. (المصدر السابق)

(۶) (وارتداد أحدهما) أي الزوجين (فسخ) فلا ينقص عددا (عاجل) بلا قضاء. (الدر المختار)

قال ابن عابدين الشامي: (قوله بلا قضاء) أي بلا توقف على قضاء القاضي، وكذا بلا توقف على مضي عدة في المدخول بها كما في البحر. (رد المحتار: ۳/ ۱۹۳ - ۱۹۴، باب نكاح الكافر، ط: دار الفكر -بيروت)

حرکت پر ندامت کا اظہار کر کے کلمہ پڑھ لے اور از سرِ نو نکاح کر کے اسلامی شریعت کے مطابق زندگی گزارے، اگر وہ شخص گاؤں والوں کی بات کو قبول کر لیتا ہو، تو بڑی اچھی بات ہے، ورنہ لازم ہوگا کہ گاؤں والے اس سے اپنے تعلقات ختم کر دیں۔

اس بات کا بھی خیال رہے کہ اللہ رب العزت سورۂ کافرون میں فرماتے ہیں کہ ”تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین“۔(۱) لہٰذا اگر غیر مسلمین اپنے مذہب کے مطابق کوئی کام کرتے ہیں، تو کسی مسلمان کو اس میں دخل دینا یا فتنہ کھڑا کرنا حرام اور ناجائز ہے؛ ہاں! مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عقائد، دین اور شعائرِ دین پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں، جانی یا مالی مفاد کی خاطر اس طرح کا ڈھونگ نہ کریں، کہ اس کی وجہ سے ان کا ایمان ضائع ہو جائے گا، اللہ رب العزت ہم سب کو نیک کاموں کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] ایک قوالی کے چند اشعار کا حکم

۳۴-سوال: آج کل پاکستانی قوال: غلام فرید و غلام مقبول کی درج ذیل قوالی بہ کثرت سنی جا رہی ہے:

(۱) بھر دے جھولی میری یا محمد لوٹ کر میں نہ جاؤں گا خالی

(۲) ”غوث“ کے چاہنے والوں کو خدا ملتا ہے......

(۳) حقیقت میں وہ لطف زندگی پایا نہیں کرتے جو یادِ مصطفےٰ سے دل کو بہلایا نہیں کرتے

ان میں خدا کے ساتھ غیر اللہ کو شریک کیا گیا ہے، جو توحید کے تقاضے کے بالکل خلاف ہے؛ لہٰذا ان اشعار کا پڑھنا اور سننا کیسا ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً

(۱) پہلے شعر میں اگر شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو جھولی بھرنے والا سمجھتا ہے، تو ایمان سے خارج ہو جائے گا؛ اس لیے کہ نفع و نقصان، ترقی و تنزلی اور غربت و دولت؛ غرضیکہ ہر چیز کا فیصلہ خدا کی ہی طرف سے ہوتا ہے، اور ہر چیز خدا کی جانب سے ہی ملتی ہے۔(۲) اللہ کو منظور نہ تھا' تو ابو طالب کو ایمان نصیب نہیں ہوا،

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ: لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۝ [۱۰۹-الکافرون:۶]

(۲) قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝ [۷-الاعراف:۱۸۸]

وقال تعالیٰ: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۝ (۳۵-فاطر:۱۵)

حالاں کہ رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ وہ ایمان لے آئیں؛ لیکن اللہ کی مرضی نہیں تھی؛ اس لیے وہ ایمان نہیں لا سکے، اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں یہ آیت نازل فرمائی: إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ.(۱) اے پیغمبر! آپ جس کو چاہیں، ہدایت نہیں دے سکتے۔ ہاں! اللہ جس کو ہدایت سے سرفراز کرنا چاہتے ہیں، انھیں ہدایت مل جاتی ہے۔

لہٰذا شاعر اگر ''جھولی بھرنے والا'' رسول اللہ ﷺ کو سمجھے گا، تو خارج از اسلام ہوگا اور اگر اس کی مراد یہ ہے کہ رسول ﷺ سبب ہیں، ورنہ درحقیقت ہر چیز اللہ کی جانب سے ہی ملتی ہے، تو یہ جائز ہے۔

(۲) جو غوث کو چاہے، انہیں کو اللہ ملتا ہے، ان کے بغیر اللہ تعالیٰ تک رسائی نہیں ہو سکتی، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ جو لوگ شرعی اصول وضابطے کے مطابق، بغیر افراط وتفریط کے غوث پاکؒ سے محبت کرتے ہیں اور ان کے بتلائے ہوئے راستہ پر چلتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں، اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کا مقرب ومحبوب بن جاتا ہے، اگر یہ مطلب ہو، تو صحیح ہے؛ اس لیے کہ ولی وہی راستہ بتلاتے ہیں، جس کی نبی کریم ﷺ نے امت کے لیے نشان دہی فرمائی ہے اور اللہ کی معرفت اتباع سنت ہی سے ہو سکتی ہے کہ بغیر اتباع سنت کے اللہ تعالیٰ تک رسائی مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ پس جو لوگ سنت رسول ﷺ کی اتباع نہیں کرتے، وہ اللہ تک پہنچ بھی نہیں سکتے ہیں۔

(۳) اس کا معنی بالکل صحیح ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۷] قبروں پر پھول اور ناریل وغیرہ چڑھانا حرام ہے

۳۵-سوال: اولیاء اللہ کے مزارات پر بہت سی چیزیں لوگ چڑھاتے ہیں، مثلاً: ناریل، پیسے، اگربتی وغیرہ، اسی طرح مزارت پر کھانے بھی تیار کیے جاتے ہیں، تو کیا چڑھائے گئے ناریل کا کھانا، وہاں سے پیسوں کا اٹھالینا، اور وہاں تیار کیے کھانے کا کھانا درست ہے یا نہیں؟ اگر وہاں تیار کیے گئے کھانے کا کھانا درست نہیں ہے، تو اس خوف سے کہ کوئی دوسرا نہ کھائے، اس کو پھینک دیا جائے، یا ضائع ہونے سے بچانے کے لیے، کوئی شکل ہے؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامدا ومصلیا:

قبروں پر اگربتی اور ناریل وغیرہ چڑھانا جائز نہیں ہے۔ فقہاء نے اس کو **''ما أهل به لغير الله''** میں شمار کیا ہے۔

(۱) ۲۸-القصص: ۵۶۔

بزرگوں کی قبروں پر لوگ مختلف چیزوں کا چڑھاوا چڑھاتے ہیں، اس اعتقاد کے ساتھ کہ صاحب قبر بزرگ خوش ہوکر میری مشکلات آسان کردیں گے، میرے الجھے ہوئے کاموں کو سلجھادیں گے، اور میری حاجت روائی کریں گے، لوگوں کا اس طرح کا اعتقاد رکھنا اور اولیاء اللہ کے مزارات کے ساتھ اس قسم کی عقیدت قطعاً جائز نہیں حرام ہے۔[1]

قبر پر چڑھائی گئی چیزیں چڑھانے والوں کی ملکیت ہی میں رہتی ہیں، محض چڑھانے کی وجہ سے ان کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتی ہیں؛ لہٰذا کوئی دوسرا شخص خواہ وہ مجاور ہی کیوں نہ ہو، مالک کی اجازت کے بغیر ان اشیاء کا نہ خود استعمال کرسکتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو دے سکتا ہے، اور نہ کھلا سکتا ہے، ان چیزوں کو وہیں چھوڑ دیا جائے۔[2] واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۸] قبروں پر چڑھائی گئی چیزیں لینا درست نہیں ہے

۳۶-سوال: اگر کوئی شخص کسی کو کوئی چیز مثلاً: پھول، اگربتی، ناریل وغیرہ درگاہ پر چڑھانے کے لیے دے، تو کیا اس آدمی (جس کو دیا جارہا ہے) کے لیے جائز ہے کہ مذکورہ چیزوں کو لے کر کھالے، یا پھینک دے یا کسی اور کو دے دے؟

الجواب حامداومصلیا

چڑھاوا چڑھانے کے لیے کوئی چیز لینا جائز نہیں ہے، گناہ کے کام پر مدد کرنا ہے، اس سے احتراز لازم ہے۔[3] فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

---

(۱) واعلم أن النذر الذي يقع للأموات من أكثر العوام، وما يؤخذ من الدراهم، والشمع، والزيت، ونحوها إلى ضرائح الأولياء الكرام تقربا إليهم، فهو بالإجماع باطل وحرام، مالم يقصدوا صرفها لفقراء الأنام، وقد ابتلي الناس بذلك. (الدر المختار) قال ابن عابدين: (قوله تقربا إليهم) كأن يقول يا سيدي فلان إن رد غائبي، أو عوفي مريضي، أو قضيت حاجتي فلك من الذهب، أو الفضة، أو من الطعام، أو الشمع، أو الزيت، كذا في البحر. (قوله باطل وحرام) لوجوه: منها أنه نذر لمخلوق، والنذر للمخلوق لا يجوز لأنه عبادة، والعبادة لا تكون لمخلوق. ومنها أن المنذور له ميت والميت لا يملك. ومنه أنه إن ظن أن الميت يتصرف في الأمور دون الله تعالى واعتقاده ذلك كفر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۴۳۹/۲، كتاب الصوم، مطلب في النذر الذي يقع للأموات من أكثر العوام... الخ، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۳۲۰/۲، كتاب الصوم، فصل: ماهو جبر العبد على نفسه، ط: دار الكتاب الاسلامي)

(۲) تقدم تخريجه۔ ———— (۳) قال الله تعالى: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. (۵-المائدة: ۲)

[۹] اولیاء اللہ کا اپنی موت کے بعد اپنے مریدین کو فیض پہنچانا

۳۷-سوال: جب کسی شخص کی موت ہو جاتی ہے، تو اُس کے تمام اعمال کا سلسلہ وہیں ختم ہو جاتا ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ اپنی موت کے بعد اپنے مریدین کو کوئی فیض پہنچا سکتے ہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

کوئی بھی پیر و مرشد اور ولی کامل صرف اللہ تعالیٰ ہی کے اذن سے فیض پہنچا سکتے ہیں، اُن کے بارے میں لفظِ موت کا اطلاق پسند نہیں کیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. (۱)

یعنی اللہ کے راستے میں شہید ہونے والوں کے متعلق تم یہ نہ کہو کہ وہ مردہ ہیں، بل کہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم اُس زندگی کو محسوس نہیں کر سکتے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] لاعلمی میں نجومی کے پاس جانے کے بعد توبہ کرنا

۳۸-سوال: آپ کی تصنیف کردہ کتاب عقائد اسلام (۳) میرے ایک دوست کی طرف سے میرے پاس آئی ہے، اس میں آپ نے جو کفر اور شرک کے متعلق لکھا ہے، اسے پڑھ کر میرے دل میں ایک سوال پیدا ہوا، وہ یہ کہ میں ایک لمبے زمانے تک نجومی کے پاس جا کر شادی، تجارت اور بچہ وغیرہ کے متعلق پوچھتا رہتا تھا، اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ یہ کفر کا سبب اور گناہ کبیرہ ہے، نیز اس کے بارے میں وارد

---

(۱) - ۲البقرۃ: ۱۵۴۔

(۲) فتاویٰ رشیدیہ میں ہے: سوال: مزاراتِ اولیاء رحمہم اللہ سے فیض حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر ہوتا ہے تو کس صورت میں؟ جواب: مزاراتِ اولیاء سے کاملین کو فیض ہوتا ہے، مگر عوام کو اُس کی اجازت دینی ہرگز جائز نہیں ہے، اور تحصیل فیض کا طریقہ کوئی خاص نہیں ہے، جب جانے والا اہل ہوتا ہے، تو اُس طرف سے حسب استعداد فیضان ہوتا ہے، مگر عوام میں ان امور کا بیان کرنا کفر و شرک کا دروازہ کھولنا ہے۔ (تحت عنوان: مزاراتِ اولیاء سے فیض، ط: مکتبۃ الحق، جوگیشوری، بمبئی، فتاویٰ رشیدیہ مع تالیفاتِ رشیدیہ، ص: ۱۰۵)
حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: ''اسبابِ فیض کے متعدد ہیں، من جملہ اُن کے تصرفاتِ شیخ بھی ہیں، اُن میں سے یک سوئی کے ساتھ توجہ قلب بھی ہے، اور اس کے علاوہ بھی ہیں، یہ سب افراداً فرداً بھی کافی ہو جاتے ہیں اور اجتماع سے تو اور قوت بڑھ جاتی ہے، بعد وفات کے تصرفات کا ثبوت منصوص گو نہیں، گو اشارۃً مستنبط ہو سکتا ہے؛ لیکن کسی نص سے منفی بھی نہیں، اور مشاہدہ اہل کشف و ذوق کا خود اثبات کے لیے کافی ہے، لہٰذا قائل ہونا اُس کا جائز ہے، البتہ دوام ولزوم نہیں ہے۔ (امداد الفتاویٰ ۵/ ۱۵۹، کتاب السلوک، تحت عنوان: فیض کے متعدد اسباب اور ثبوت فیض و تصرف بعد ممات۔ ط: ادارہ تالیفاتِ اولیاء، دیوبند)

(۳) عقائد اسلام، مترجم اُردو، ترجمہ: مولانا ارشد، پالن پوری، ناشر: حافظ احمد بیمات، کینیڈا۔

شدہ وعیدوں کا بھی مجھے علم نہیں تھا، بعد میں جب مجھے علم ہوا، تو میں نے فوراً سچے دل سے توبہ کرلی؛ لیکن میرے دوست نے مجھے بتلایا کہ اللہ نے قرآن کے تیسرے پارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ "جو ایمان لانے کے بعد کافر ہوگیا اور کفر میں بڑھتا رہا، تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔[۱] تو مذکورہ صورت حال میں شریعت کا میرے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کا دوست دین اور احکام دین سے ناواقف ہے، قیامت کی علامات میں سے ہے کہ دین وشریعت سے ناواقف لوگ عوام کو غلط سلط باتیں بتائیں گے، خود بھی گم راہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گم راہ کریں گے۔[۲] اگر ان کو قرآن وحدیث کا کچھ بھی علم ہوتا تو اس طرح کی بات نہ کہتے، کیوں کہ آیت کریمہ کا جو ترجمہ لکھا ہے، اسی میں آپ کا جواب موجود ہے۔ "ایمان لانے کے بعد کفر کیا اور کفر میں بڑھتا گیا"؛ لیکن آپ بڑھے نہیں، صحیح عقائد کا علم ہوتے ہی آپ نے توبہ کرلی اور گناہ سے معافی مانگ لی اور عقیدہ درست کرلیا؛ اس لیے آپ کی توبہ ان شاء اللہ قبول ہوگی اور آپ مسلمان ہیں؛ لیکن آپ ہی اپنے بارے میں فیصلہ کیجیے کہ اگر اس سے پہلے آپ کا ایمان سے خارج ہونے کا عقیدہ تھا، ستارے اور چاند کو مانتے تھے، تو اسلام سے خارج ہونے کی بناء پر نکاح فسخ ہوجاتا ہے۔[۳] اس لیے گھر کے ۵، ۶ آدمی کے سامنے تجدید نکاح کرلینا ضروری ہے، حدیث کی کتابوں میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ سکرات کی حالت تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔[۴]

لہٰذا آپ نے جو توبہ کی ہے، وہ اللہ کے دربار میں اس کے فضل سے قبول ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ. (- سورۃ آل عمران: ۹۰)

(۲) عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال: سمعت رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم يقول: "إن الله لا يقبض العلم انتزاعا ينتزعه من العباد، ولكن يقبض العلم بقبض العلماء، حتى إذا لم يبق عالما اتخذ الناس رءوسا جهالا، فسئلوا فأفتوا بغير علم، فضلوا وأضلوا. (صحيح البخاري: ۱/۲۰، رقم الحديث: ۱۰۰، كتاب العلم، باب: كيف يقبض العلم؟، ط: البدر - ديوبند)

(۳) وارتداد أحدهما فسخ عاجل. (تنوير الأبصار مع الدر المختار وفي ذيله رد المحتار: ۳/ ۱۹۳، كتاب النكاح، باب نكاح الكافر، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) عن عبد الله بن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "إن الله عز وجل ليقبل توبة العبد ما لم يغرغر. (سنن ابن ماجة، ص: ۳۱۴، رقم الحديث: ۴۲۵۳، باب: ذكر التوبة، ط: فيصل - ديوبند)

[۱۱] سورج اور چاند گہن کی وجہ

۳۹-سوال: سورج اور چاند گہن کی شرعی نقطۂ نظر سے اصل وجہ کیا ہے؟ ذرا تفصیلی جواب دے کر آپ مسلمانوں کی غلط فہمیاں دور فرمائیں گے۔

ایم رحمٰن خلیل لاجپوری

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند حضرت ابراہیمؓ کی وفات ہوئی، اس دن سورج گہن ہوا، تو غلط عقیدے کی وجہ سے لوگ کہنے لگے کہ سورج گہن کسی بڑے آدمی کے انتقال کی وجہ سے ہوتا ہے وغیرہ، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکور عقیدے کی تردید فرمائی اور یہ فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ رب العزت کی بڑی نشانیوں میں سے ہیں؛ اللہ رب العزت اس کا نور سلب کر کے مخلوق کو ڈراتے ہیں۔ (بخاری شریف)[۱] جو لوگ ان کو بڑا سمجھ کر ان کی عبادت کرتے ہیں، ان کو بتلایا جاتا ہے کہ یہ مخلوق ہیں، کسی بھی طرح بندگی کے لائق نہیں، ان کا نور بھی اللہ رب العزت کا دیا ہوا ہے، ان کے اندر نفع ونقصان کی کوئی طاقت نہیں، اللہ رب العزت جب چاہتے ہیں، ان کا نور سلب کر لیتے ہیں؛ اس لیے یہ بندگی کے لائق نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

---

(۱) عن المغيرة بن شعبة، قال: كسفت الشمس على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم مات إبراهيم، فقال الناس: كسفت الشمس لموت إبراهيم، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن الشمس والقمر لا ينكسفان لموت أحد ولا لحياته، فإذا رأيتم فصلوا، وادعوا الله". (صحيح البخاري: ۱/ ۱۴۲، رقم الحديث: ۱۰۴۳، كتاب الكسوف، ط: البدر - ديوبند)

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ.

(۵۱-الذاریات:۵۱)

باب الاستمداد بغیر اللّٰہ

(غیر اللہ سے مدد مانگنا)

O

[غیر اللہ سے مدد مانگنا]

[۱] یارسول اللہ اور یاغوث وغیرہ کہنا

۴۰-سوال: مکرمی جناب مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ذیل کے دو مسئلے کے بارے میں:

(۱) ایک شخص چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے یارسول اللہ، یاغوث، یاپیر، یاخواجہ بولتا ہے، تو کیا یہ جائز ہے؟ اور ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

[۲] انبیاء اور اولیاء کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ پکارنے پر فوراً حاضر ہوجاتے ہیں، کیسا ہے؟

۴۱-سوال: کیا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، اسی طرح دیگر انبیاء کرام اور اولیاء عظام کو اتنی قدرت دی ہے کہ انھیں جس جگہ پکارا جائے، وہ وہاں حاضر ہوجاتے ہیں؟ کیا یہ بات اجماع امت سے ثابت ہے؟ اور کیا امام اعظم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھتے بیٹھتے یارسول اللہ کہہ کر پکارا ہے؟ یا پھر امام صاحب سے کوئی ایسی بات عربی کتب میں ثابت ہے کہ یارسول اللہ اور یاغوث کہنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱-۲): شرک فی الذات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں غیر کو شریک مانا جائے، جیسے: دو یا تین خدا ماننا؛ خواہ یہ کسی پیغمبر کو خدائی کے درجے تک پہنچا کر ہو، جیسا کہ نصاریٰ؛ عیسیٰ، مریم اور اللہ؛ تینوں کے مجموعے کو خدا کہتے ہیں، یا دیگر مخلوق کو الوہیت کا درجہ دے دیا جائے، جیسا کہ مذاہب باطلہ کے پیروکار دیوتاؤں کو

اللہ کے درجہ تک پہنچا دیتے ہیں۔[۱]

شرک فی الصفات یہ ہے کہ اللہ کی وہ صفات، جو اسی کے ساتھ خاص ہیں، ان کو غیروں کے لیے مانا جائے۔[۲] مثلاً: انبیاء ورسل اور اولیاء کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ ہر حاضر وغائب چیز کے جاننے والے ہیں، ہر مکان میں ہر وقت حاضر ہیں، ہر بات کو سننے والے، یا جاننے والے ہیں۔ اس کو شرک فی العلم، شرک فی السمع اور شرک فی البصر بھی کہہ سکتے ہیں، جس کی وجہ سے انسان ایمان سے نکل جاتا ہے۔

لہٰذا اگر کوئی شخص یارسول اللہ، یا خواجہ غریب نواز! اس عقیدہ کے ساتھ کہتا ہے کہ رسول اور خواجہ میری ہر بات کو سنتے اور جانتے ہیں اور ہمارے حاجت روا ہیں تو وہ ایمان سے نکل جائے گا، پھر جب مومن نہیں رہا، تو ایسے شخص کے پیچھے نماز جائز نہیں ہوگی، ایسے کو امام بنانا جائز نہیں ہے۔[۳] واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] مزارات کی زیارت کے آداب اور صاحب مزار سے دعاء کی ممانعت

۴۲-سوال: میں اجمیر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں، وہاں جا کر کس طرح زیارت کرنی چاہیے،

---

(۱) القسم الأول: الشرك في الربوبية: أحدهما: شرك التعطيل، وهو أقبح أنواع الشرك، كشرك فرعون. إذ قال: {وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ}؟، النوع الثاني: شرك من جعل معه إلها آخر ولم يعطل أسماءه وصفاته وربوبيته، كشرك النصارى الذين جعلوه ثالث ثلاثة، وشرك المجوس القائلين بإسناد حوادث الخير إلى النور وحوادث الشر إلى الظلمة. (تيسير العزيز الحميد: ۱/ ۲۶، أقسام الشرك وأنواعه، ت: زهير الشاويش ط: المكتب الإسلامي، الطبعة الأولى: ۱۴۲۳ھ-۲۰۰۲ء)

(۲) الشرك في الصفات، وهو إثبات صفة من صفات الله تعالى لغيره سبحانه كاعتقاد هم الغيب في غيره تعالى. (جهود علماء حنفية في إبطال عقائد القبورية: ۱/ ۱۳۹۳-ط: دار الصميعي، الطبعة الأولى ۱۴۱۶ھ-۱۹۹۶ء)

وفي الفوز الكبير: والشرك: أن يثبت لغير الله تعالى شيئاً من الصفات المختصة به تعالى، كا لتصرف في العالم بالإرادة - الذي يعتبر عنه بـ كن فيكون، أو العلم الذاتي، ... أو الإيجاد لشفاء المريض، أو اللعن على شخص، والسخط عليه حتى يقدر عليه الرزق، أو يمرض أو يشقى بسبب ذلك السخط أو الرحمة لشخص حتى يبسط له الرزق ويصح بدنه ويسعد بسبب هذه الرحمة. (الفوز الكبير، ص: ۲۱، بيان الشرك، ط: مكتبہ حجاز، ديوبند)

(۳) قلت: ويلتحق به من وجه شرك غلاة عباد القبور الذين يزعمون أن أرواح الأولياء تتصرف بعد الموت، فيقضون الحاجات، ويفرجون الكربات، وينصرون من دعاهم، ويحفظون من التجأ إليهم، ولاذ بحماهم، فإن هذه من خصائص الربوبية. (تيسير العزيز الحميد في شرح كتاب التوحيد الذي هو حق الله على العبيد-سليمان بن عبد الله بن محمد بن عبد الوهاب (م: ۱۲۳۳ھ): ۱/ ۲۷، أقسام الشرك وأنواعه)

حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر جا کر اس طرح دعاء کر سکتے ہیں کہ ''آپ اللہ رب العزت سے ہمارے لیے دعاء کر دیجیے تا کہ ہمارا کام بن جائے''؟

الجواب حامداومصلیا:

اولیاء اور بزرگان دین اللہ رب العزت کے نیک اور صالح بندے تھے، اللہ رب العزت کی بندگی کی اور اس کی خوش نودی حاصل کر کے دنیا سے چل بسے، یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہم ان کے نام بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ لیتے ہیں، یہ تمام بزرگان دین وسنت کی اتباع کر کے اللہ کے ولی بنے ہیں، آج کل مزاروں پر قوالی، ناچ گانا، بے حیائی اور بے شرمی کا ماحول گرم رہتا ہے اور عورتیں بے پردہ مزاروں پر آ کر مذہب اسلام کو بدنام کرتی ہیں، اس لیے ان تمام وجوہات کی بنیاد پر وہاں جانا بہتر نہیں ہے۔[1] بالخصوص جب عرس ہوتا ہو۔[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خود اپنی قبر پر عرس کرنے اور عید منانے سے منع فرمایا ہے۔[3] اس وجہ سے اولیاء اللہ اور بزرگان دین کی قبروں پر عرس منانا۔[4] وہاں حاضر ہو کر منتیں ماننا اور چڑھاوے چڑھانا وغیرہ؛ یہ تمام امور ناجائز اور حرام ہیں۔[5] ہاں اگر موقع ملے، تو وہاں عرس کے علاوہ دیگر اوقات

(١) وعن أبي قلابة: " لا تجالسوا أهل الأهواء، ولا تجادلوهم؛ فإني لا آمن أن يغمسوكم في ضلالتهم، ويلبسوا عليكم ما كنتم تعرفون ". (الاعتصام -الشاطبي،ص:١١٣، الباب الثاني في ذم البدع... الخ،فصل:ماجاء عن السلف الصالح في ذم البدع وأهلها، ط:دار ابن عفان السعودية)

(٢) الأعراس: وهي تعني زيارة القبور والاجتماع عليها من مثل عرس الشيخ الشاه وارث في بلدة ديوه، وعرس الخواجة معين الدين جشتي، حيث يجتمع له الملايين ويختلط فيه الرجال بالنساء، وتحصل فيه بعض المفاسد المحرمة شرعاً. (الموسوعة الميسرة في الأديان والمذاهب والأحزاب المعاصرة:١/٣٠٠، طرق الصوفية، البريلوية، ط:دار الندوة العالمية)

(٣) قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: «لا تجعلوا بيوتكم قبورا، ولا تجعلوا قبري عيدا، وصلوا علي؛ فإن صلاتكم تبلغني حيث كنتم». (سنن أبي داؤد:١/٢٧٩، رقم:٢٠٤٢، كتاب المناسك، باب زيارة القبور، ط:البدر- ديوبند)

(٤) اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لاتجعلوا قبري عيدا'' کہ میری قبر کو عید نہ بنانا۔ عید میں تین چیزیں ضروری ہیں: ایک اجتماع، دوسرے تعیین وقت، تیسرے فرحت۔ تو ممانعت کا خلاصہ یہ ہوا کہ میری قبر پر کسی یوم معین میں سامان فرحت کے ساتھ اجتماع نہ کرنا، ہاں! اگر خود بخود کسی وقت کسی غرض سے اجتماع ہو جاوے، تو اور بات ہے...... پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر ایسا اجتماع جائز نہیں، تو دوسروں کی قبر پر ایسا اجتماع کیوں کر جائز ہوگا۔ (اشرف الجواب-حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، ص:١٠٨، ط:دار الکتاب، دیوبند)

(٥) ويكره عند القبور كل مالم يعهد من السنة، والمعهود منها ليس إلا زيارتها، والدعاء عندها قائما يفعل -صلى=

میں حاضر ہونا۔[۱] اوران بزرگان دین کے وسیلے سے دعائیں کرنا جائز ہے؛لیکن ان سے براہ راست مانگنا جائز نہیں ؛ کیوں کہ وہ لوگ کسی حاجت اور ضرورت کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں ۔[۲] واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۳۱/ ۷/ ۱۹۷۷ء

[۴] اولیائے کرام کے مزار پر حاضر ہوکر ان سے دعاء کی درخواست کرنا

۴۳-سوال: کیا اولیائے کرام کے مزارات پر جا کر دعا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اوران سے یہ کہہ سکتے ہیں یا نہیں کہ آپ اللہ تبارک وتعالی سے ہمارے لیے دعاء کر دیجئے ،تا کہ ہمارا فلاں کام ہو جائے ؟

الجواب حامداًومصلیاً

ان کے وسیلے اور واسطے سے اللہ سے دعائیں کر سکتے ہیں ۔[۳]

=اللہ علیہ وسلم-في الخروج إلى البقيع. (البحر الرائق:۲/ ۲۱۰، کتاب الجنائز ،الصلاة علی المیت في المسجد، ط: دار الکتاب الإسلامي ☆ فتح القدير -ابن همام:۲/ ۱۴۲، کتاب الصلاة ،باب الشهيد، ط: دار الفکر)

واعلم أن النذر الذي يقع للأموات من أكثر العوام وما يؤخذ من الدراهم والشمع والزيت ونحوها إلى ضرائح الأولياء الكرام تقربا إليهم فهو بالإجماع باطل وحرام. . . وقد ابتلي الناس بذلك. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۳۹، کتاب الصوم،مطلب في صوم الست من الشوال،ط: دار الفکر☆البحر الرائق:۲/ ۳۲۱،کتاب الصوم،فصل في مايوجبه العبد على نفسه☆ الفتاوی الهندية:۱/ ۲۱۶، کتاب المناسك، الباب الاول، في تفسير الحاج.....الخ،ط: دار الفکر)

(۱)ولا بأس . . . بزيارة القبور . . . ويقول: السلام عليكم دار قوم مؤمنين، وإنا إن شاء الله بكم لاحقون. (الدر المختار مع الرد)قال ابن عابدين: (قوله بزيارة القبور) أي لا بأس بها؛ بل تندب. . .وتزار في كل أسبوع. . .إلا أن الأفضل يوم الجمعة والسبت والإثنين والخميس. (رد المحتار:۲/ ۲۴۲،کتاب الجنائز، مطلب في زيارة القبور ☆البحر الرائق:۲/ ۲۱۰، کتاب الجنائز ،الصلاة علی المیت في المسجد،ط: دار الکتاب الإسلامي)

(۲)وإن التوسل بالنبي وبأحد من الأولياء العظام جائز ،بأن يكون السوال من الله تعالى، ويتوسل بوليه وبنبيه صلى الله عليه وسلم. (امداد الفتاوی:۶/ ۳۲۷،ط: ادارہ تالیفات اولیاء،دیو بند☆ نظام الفتاوی: ج:۱،جز:۲،ص:۲۷، ط: تاج کمپنی،دیوبند)

(۳)وأن التوسل بالنبي وبأحد من الأولياء العظام جائز ،بأن يكون السؤال من الله تعالى، ويتوسل بوليه ونبيه صلى الله عليه وسلم. (إمداد الفتاوی:۶/ ۳۲۷، كتاب العقائد والكلام، ط: ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند)

لیکن صاحب مزار کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر ان سے دعاء کرنا ناجائز اور شرکیہ عمل ہے۔ (۱)

واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

(۱) إن الناس قد أكثروا من دعاء غير الله تعالى من الأولياء -الأحياء منهم والأموات- وغيرهم، مثل يا سيدي فلان أغثني، وليس ذلك من التوسل المباح في شيء. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني-شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م:۱۲۷۰ھ): ۳/ ۲۹۷، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ومنهم من يقول للغائب أو الميت من عباد الله تعالى الصالحين: يا فلان ادع الله تعالى ليرزقني كذا وكذا، ويزعمون أن ذلك من باب ابتغاء الوسيلة، ويروون عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال- إذا أعيتكم الأمور فعليكم بأهل القبور، أو فاستغيثوا بأهل القبور- وكل ذلك بعيد عن الحق بمراحل. (المصدر السابق: ۳/ ۲۹۳)

□

إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي
الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ
بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۳۴﴾ (۳۱-لقمان:۳۴)

باب ما يتعلق بعلم الغيب

(علم غیب کا بیان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[علم غیب کا بیان]

[۱] پندرہویں صدی کے شروع ہونے پر کیا کیا اہم واقعات پیش آئیں گے؟

۴۴-سوال: چودہویں صدی ہجری کے ختم ہونے اور پندرہویں صدی کے شروع ہونے کی کیا شرعاً کوئی اہمیت ہے؟ کوئی اہم واقعہ پیش آنے والا ہو یا بزرگانِ دین کی اس کے متعلق کوئی پیشین گوئی ہو، تو اس سے مطلع فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

چودہویں صدی ہجری کے ختم ہونے سے متعلق کوئی ''خاص خبر'' حدیث شریف میں نہیں ہے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ ہر سو سال پر اللہ تعالیٰ دین کی تجدید کے لیے ایک مجدد پیدا کریں گے، جو دین میں در آئی خرابیوں، رسوم وبدعات اور خرافات کو ختم کر کے اسلام کے صحیح احکام لوگوں کے سامنے پیش کریں گے۔ (۱)

اہم واقعات کا پیش آنا صرف چودہویں صدی کے ختم ہونے کے ساتھ خاص نہیں ہے، حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علامات قیامت کی وضاحت فرمائی ہے، یہ علامات کبھی بھی پیش آسکتی ہیں، اس میں سال کی کوئی تعیین نہیں ہے، علامات قیامت کے تعلق سے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے (قتادہ) سے کہا: (آج) میں تم سے ایک ایسی حدیث بیان کروں گا کہ میرے بعد

---

(۱) عن أبي هريرة، فيما أعلم، عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قال: إن الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها. (سنن أبي داؤد: ۲/۵۸۹، رقم الحديث: ۴۲۹۱، كتاب الملاحم، باب مايذكر في قرن المائة، ط: البدر، ديوبند)

کوئی تم سے بیان نہیں کرے گا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے: قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ "علم" کم ہوجائے گا اور "جہل" غالب آجائے گا اور "زنا" اعلانیہ ہونے لگے گا اور عورتوں کی کثرت اور مردوں کی اس حد تک قلت ہوجائے گی، کہ پچاس پچاس عورتوں کا تعلق صرف ایک مرد سے ہوگا۔ (۲)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے عرض کیا: قیامت کب آئے گی؟ جواباً آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس سے سوال کیا گیا ہے، وہ سوال کرنے والے سے اس بات کا زیادہ جاننے والا نہیں ہے، ہاں! میں تمہیں اس کی علامات بتاتا ہوں: [۱] جب لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی، یہ قیامت کی علامات میں سے ہے۔ [۲] جب ننگے بدن اور ننگے پاؤں رہنے والے لوگوں کے سردار ہو جائیں گے، یہ بھی قیامت کی علامت ہے۔ [۳] جب اونٹوں کے چرواہے اونچی اونچی عمارتیں بنا کر فخر کریں گے۔ یہ بھی قیامت کی علامات میں سے ہے۔ (آپ ﷺ نے مزید فرمایا:) قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (سورہ لقمان کی) آیت مبارکہ (۳) تلاوت فرمائی۔ (۴)

(۲) عن قتادة، عن أنس بن مالك، قال: لأحدثنكم حديثا لا يحدثكم أحد بعدي، سمعت رسول الله - صلى الله عليه وسلم - يقول: "من أشراط الساعة: أن يقل العلم، ويظهر الجهل، ويظهر الزنا، وتكثر النساء، ويقل الرجال، حتى يكون لخمسين امرأة القيم الواحد". (صحيح البخاري: ۱/ ۱۸، رقم الحديث: ۸۰-۸۱، كتاب العلم، باب رفع العلم وظهور الجهل، ط: ديوبند☆صحيح مسلم: ۲/ ۳۴۰، رقم الحديث: ۸-(۲۶۷۱)، كتاب العلم، باب رفع العلم وقبضه وظهور الجهل والفتن في آخر الزمان، ط: ديوبند☆سنن الترمذي: ۲/ ۴۴، رقم الحديث: ۲۲۰۵، أبواب الفتن، باب ما جاء في أشراط الساعة، ط: ديوبند)

(۳) إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿۳۴﴾ (لقمان: ۳۴) ترجمہ: بے شک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے اور وہی مینہ برساتا ہے اور وہی جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا عمل کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کہاں مرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ سب باتوں کا جاننے والا باخبر ہے۔ (ترجمہ بیان القرآن)

(۴) قال: يا رسول الله، متى الساعة؟ قال: "ما المسئول عنها بأعلم من السائل، ولكن سأحدثك عن أشراطها: إذا ولدت الأمة ربها، فذاك من أشراطها، وإذا كانت العراة الحفاة رءوس الناس، فذاك من أشراطها، وإذا تطاول رعاء البهم في البنيان، فذاك من أشراطها في خمس لا يعلمهن إلا الله، ثم تلا صلى الله عليه وسلم: إن الله عنده علم الساعة الآية. (صحيح مسلم: ۱/ ۲۹، رقم الحديث: -۵ (۹) كتاب الإيمان، باب الإيمان ما هو وبيان خصاله، ط: البدر، ديوبند☆صحيح البخاري: ۱/ ۱۲، رقم الحديث: ۵۰، كتاب الإيمان، باب سؤال جبريل النبي - صلى الله عليه وسلم - عن الإيمان، والإسلام، والإحسان، وعلم الساعة، ورقم: ۱۲۱۷، كتاب الفتن، باب خروج النار، ط: البدر - ديوبند)

کیا آج ہمیں مذکورہ علامتیں نظر نہیں آ رہی ہیں؟

(۳) اہم واقعات کے سلسلے میں بزرگوں کی ذاتی رائے قابل قبول نہیں، ہمارے لیے قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ مشعل راہ ہیں، بزرگوں کی اپنی باتیں حجت ودلیل نہیں ہیں، کسی بزرگ کا الہام بھی حجت نہیں ہے۔ [(۵)] اس صدی میں کیا کیا ہونے والا ہے؟ اس کی خبر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ ہاں! قرآن کریم اور حدیث مبارک کی روشنی میں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جو وقت دور نبوت سے جتنا دور ہوتا جاتا ہے، وہ اپنے ماقبل سے بہتر نہیں ہے۔ [(۶)] اس میں دینی ودنیوی فتنے زیادہ سے زیادہ ہوں گے، آفتیں، مصیبتیں، بیماریاں اور پریشانیاں کثرت سے آئیں گی، انسان پریشان ہوکر قبرستان میں جاکر موت کی تمنا کرے گا۔ [(۷)] لیکن اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو اللہ کی طرف سے خاص مدد ورحمت حاصل ہوگی، اور اس کے لیے مجددین معین ومددگار ثابت ہوں گے، اور دین واحکام دین کو قوم کے سامنے صحیح انداز میں پیش کریں گے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۵) وأما الإلهام فلأنه لا يثق به صاحبه مالم يعلم أنه من الله تعالى وذلك بالنظر وإن لم يقدر على العبارة عنه. (شرح المقاصد في علم الكلام - سعد الدين التفتازاني (م: ۷۹۳هـ): ۱/ ۳۶، أول الكتاب، ط: دار المعارف النعمانية، باكستان)

والإلهام المفسر بالقاء المعنى في القلب بطريق الفيض... ليس من أسباب المعرفة بصحة الشيء عند أهل الحق... ثم الظاهر أنه أراد أن الإلهام ليس سببا يحصل به العلم لعامة الخلق ويصلح للإلزام على الغير. (نبراس ص: ۷۰، ۷۲، ط: مكتبة تهانوي، ديوبند)

وكذلك من يعتقد أن الإلهام حجة موجبة للعلم لا تقبل شهادته. (المبسوط - شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱۶/ ۱۳۳، كتاب الشهادات، باب من لا تجوز شهادته، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: جلاء العينين في محاكمة الأحمدين - نعمان بن محمود، أبو البركات خير الدين، الآلوسي (م: ۱۳۱۷هـ): ۱/ ۱۲۲، الصوفي المنحرف، الفصل الرابع الخ، ط: مطبعة المدني)

(۶) عن الزبير بن عدي، قال: أتينا أنس بن مالك، فشكونا إليه مانلقى من الحجاج، فقال: اصبروا، فإنه لا يأتي عليكم زمان إلا الذي بعده شر منه، حتى تلقوا ربكم، سمعته من نبيكم صلى الله عليه وسلم. (صحيح البخاري: ۲/ ۱۰۴۷، رقم الحديث: ۷۰۶۸، كتاب الفتن، باب لا يأتي زمان إلا الذي بعده شر منه، ط: البدر - ديوبند)

(۷) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: "والذي نفسي بيده لا تذهب الدنيا حتى يمر الرجل على القبر فيتمرغ عليه، ويقول: ياليتني كنت مكان صاحب هذا القبر، وليس به الدين إلا البلاء". قال المحقق فؤاد عبد الباقي: (البلاء) أي إن الحامل له على التمني ليس الدين بل البلاء وكثرة المحن والفتن وسائر الضراء. (صحيح مسلم: ۲/ ۳۹۴، رقم الحديث: ۵۴ - (۱۵۷) كتاب الفتن، باب: لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل بقبر الرجل... الخ، ط: البدر - ديوبند ☆ سنن ابن ماجة: ۲۹۲، رقم الحديث: ۴۰۳۷، أبواب الفتن، باب شدة الزمان، ط: البدر، ديوبند)

[۲] کیا مشائخ کو اپنے مریدوں کے احوال کی اطلاع ہو جاتی ہے؟

۴۵-سوال: کیا پیروں کو اپنے مریدوں کی باتوں کی خبر ہو جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر اللہ تعالیٰ خبر دینا چاہے، تو کشف والہام کے ذریعے خبر ہو سکتی ہے، ورنہ تو غیب کی بات اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر وناظر اور عالم الغیب کے عقیدے کا شرعی حکم

۴۶-سوال: ایک جگہ اعلان میں اس طرح کا اشتہار[۲] تھا: ''اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب باعلام اللہ، سید البشر افضل البشر، ہمارے جیسے نہیں، اور حاضر وناظر بقدرت اللہ ہیں۔

کیا یہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے؟ سوال کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کا اشتہار در حقیقت دیوبندی علماء کے دستخط کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

''عالم الغیب باعلام اللہ، سید البشر افضل البشر ہمارے جیسے بشر نہیں، حاضر وناظر بقدرۃ اللہ'' یہ

---

(۱) قال اللہ تعالی: ﴿وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا﴾. [۶-الأنعام:۵۹] ———— وقال ثناء اللہ في التفسير المظهري تحت تفسير هذه الآية: يعني لايعلم شيئاً من المغيبات إلا الله تعالى ولايعلم غيره فيها إلا بتوقيفه. (التفسير المظهري: ۲۴۵/۳، ت: غلام نبی التونسي، ط: مكتبة الرشيد، باكستان، الطبعة: ۱۴۱۲ھ)

وبالجملة العلم بالغيب أمر تفرد به الله تعالى لاسبيل إليه للعباد إلا باعلام منه او إلهام بطريق المعجزة أو الكرامة أو ارشاد إلى الاستدلال بالامارات فيمايمكن فيه ذلك. (شرح العقائد النسفية-عمر بن محمد بن أحمد بن إسماعيل، أبو حفص، نجم الدين النسفي (م: ۵۳۷ھ) ص: ۱۷۰، ط: ياسر نديم-ديوبند)

ويكفر بقوله: أرواح المشائخ حاضرة تعلم. (مجمع الأنهر: ۶۹۱/۱، كتاب السير، باب المرتد، ألفاظ الكفر أنواع: ط: دار إحياء التراث العربي)

(۲) اس اشتہار کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتاویٰ محمودیہ: ۴۷۳/۱، مایتعلق بعلم الغیب، عالم الغیب اور افضل البشر کی تشریح، ط: مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند۔

عبارت اہل سنت والجماعت کے عقائد کی ترجمان نہیں ہے؛ کیوں کہ حاضر وناظر اللہ ہی کی ذات ہے۔ (۱) اللہ کے سوا کوئی نہیں، علم غیب کے خداوند قدوس کے ساتھ اختصاص پر قرآن مجید کی بے شمار آیات دال ہیں؛ اللہ رب العزت کلام پاک میں ارشاد فرماتے ہیں:

۱- وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا. (۲)

۲- قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ. (۳)

۳- عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (۴)

۴- عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰي غَيْبِهٖٓ اَحَدًا. (۵)

۵- وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ③. (۶)

ان تمام آیات قرآنیہ سے معلوم ہوا کہ اللہ رب العزت کے سوا کوئی غیب کا عالم نہیں اور اس ذات کے سوا دوسرا کوئی حاضر وناظر نہیں ہے۔

''سید البشر افضل البشر صلی اللہ علیہ وسلم ہم جیسے بشر نہیں'' مراد اس سے اگر ذات کی نفی ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر اور گروہ انسانی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں، تو بالکل غلط ہے؛ کیوں کہ اللہ رب العزت ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

لَقَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ: هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ㉒. (۵۹-الحشر: ۲۲) وقال اللہ تعالیٰ: وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ㊹. (۳-آل عمران: ۴۴) وقال اللہ تعالیٰ: لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ③. (۳۴-السبا: ۳) وقال اللہ تعالیٰ: اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ㊴. (۴۱-فصلت [حم سجدۃ]: ۵۴)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کی نماز جنازہ پڑھاتے تو دعا پڑھتے: «اللّٰهم اغفر لحينا وميتنا، وشاهدنا وغائبنا، وصغيرنا وكبيرنا، وذكرنا وأنثانا». (سنن الترمذي: ۱/ ۱۹۸، رقم: ۱۰۲۴، كتاب الجنائز، باب مايقول في الصلاة على الميت، ط: البدر- ديوبند)

اگر کچھ لوگ آپ سے غائب ہوتے تھے، جن کے لیے آپ دعا کر رہے ہوتے، تو آپ بھی ان سے غائب ہوتے ہوں گے۔ (فرقہ بریلویت پاک وہند کا تحقیقی جائزہ، ص: ۲۵۰، ط: مکتبہ مدنیہ، دیوبند)

(۲) -۶ الأنعام: ۵۹۔ ——— (۳) -۲۷ النمل: ۶۵۔

(۴) -۶۴ التغابن: ۱۸۔ ——— (۵) -۷۲ الجن: ۲۶۔ ——— (۶) -۶ الانعام: ۳۔

رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٨﴾ (۷)

"مِنْ أَنفُسِكُمْ" کی تفسیر میں علمائے مفسرین نے تفصیلاً وضاحت کی ہے کہ "جنس انسان سے اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو پیدا فرمایا ہے، نہ جنات سے اور نہ فرشتوں سے۔ جس کو حسب ذیل تفسیر میں دیکھا جاسکتا ہے: ۱-تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۴۰۳۔ [۸] ۲-تفسیر قرطبی: ۳۰۱/۸۔ [۹] ۳-تفسیر رازی: ۳۳۶/۱۶، [۱۰] ۴-روح المعانی: ۵۲/۱۱، [۱۱] ۵-تفسیر بیضاوی: ۲/ ۲۲۴۔ [۱۲]

"مِنْ أَنفُسِكُمْ" أي: مِن جنسِكُم ومِن نسبِكُم عربي وقريشي." (تفسیر کشاف: ۳۲۵/۲۔ [۱۳] تفسیر قدیر: ۴۱۹/۲۔ [۱۴] تفسیر بحر محیط: ۱۱۷/۵۔ [۱۵]

---

(۷)-۹ التوبة: ۱۲۸۔

(۸) أي: من جنسهم وعلى لغتهم، كما قال إبراهيم، عليه السلام: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ [البقرة: ۱۲۹]. كما قال جعفر بن أبي طالب للنجاشي، والمغيرة بن شعبة لرسول كسرى: إن الله بعث فينا رسولا منا، نعرف نسبه وصفته، ومدخله ومخرجه، وصدقه وأمانته. (تفسير ابن كثير: ۲۴۱/۴، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

(۹) والخطاب للعرب في قول الجمهور، وهذا على جهة تعديد النعمة عليهم في ذلك، إذ جاء بلسانهم وبما يفهمونه، وشرفوا به غابر الأيام. وقال الزجاج: هي مخاطبة لجميع العالم والمعنى: لقد جاءكم رسول من البشر، والأول أصوب. قال ابن عباس: ما من قبيلة من العرب إلا ولدت النبي صلى الله عليه وسلم فكأنه قال: يا معشر العرب لقد جاءكم رسول من بني إسماعيل. والقول الثاني أوكد للحجة أي هو بشر مثلكم لتفهموا عنه وتأتموا به. (تفسير القرطبي: ۳۰۱/۸، ط: دار الكتب المصرية، القاهرة، ت: أحمد البردوني، إبراهيم اطفيش)

(۱۰) قوله: من أنفسكم وفي تفسيره وجوه: الأول: يريد أنه بشر مثلكم... المقصود أنه لو كان من جنس الملائكة لصعب الأمر بسببه على الناس. (مفاتيح الغيب، المعروف بـ "تفسير الرازي": ۱۷۸/۱۶، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت)

(۱۱) أي من جنسكم ومن نسبكم عربي مثلكم... ومعنى كونه عليه الصلاة والسلام من أنفسهم أنه من جنس البشر. (روح المعاني: ۴۸/۶، ت: علي عبد القادر عطيه ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۱۲) من أنفسكم من جنسكم عربي مثلكم. (أنوار التنزيل وأسرار التاويل، المعروف بـ "تفسير البيضاوي": ۱۰۳/۳، ت: محمد عبد الرحمن المرعشلي، ط: دار إحياء التراث)

(۱۳) تفسير كشاف: ۳۲۵/۲، ط: دار الكتاب العربي، الطبعة الثانية: ۱۴۰۷ھ)

(۱۴) والمعنى: لقد جاءكم رسول من جنسكم في البشرية. (فتح القدير -الشوكاني: ۴۷۶/۲، ط: دار ابن كثير، دار الكلم الطيب، دمشق-بيروت)

(۱۵) ألم يأتكم رسل منكم: أي من جنسكم، تفهمون ما ينبئونكم به، وسهل عليكم مراجعتهم. (البحر المحيط: ۲۲۴/۹، ت: صدقي محمد جميل، ط: دار الفكر-بيروت)

مذکورہ تمام تفسیر کی تفصیلی بحث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ انسانوں میں سے تھے، نکاح کے ذریعہ پیدا ہوئے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام تک کسی واسطے میں زنا کا عنصر شامل نہیں ہے۔[16]

لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ یہ رسول دریتیم کیسے انسانوں میں سے ہیں، ان کو تو جن یا فرشتہ ہونا چاہیے تھا، تو اللہ رب العزت نے آیت شریفہ نازل فرمائی: {أكان للناس عجباً أن أوحينا إلى رجل منهم}[17] ترجمہ: کیا لوگوں کو اس بات پر تعجب ہورہا ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک آدمی پر وحی بھیجی۔ (یعنی لوگوں کو تعجب نہیں کرنا چاہیے، یہ ہماری کمال قدرت میں سے ہے کہ ہم انسانوں میں سے جس کو چاہتے ہیں، صلاح وتقوی کی اعلیٰ قوت سے نواز دیتے ہیں) إنما أنا بشر مثلكم يوحى إلي[18] ترجمہ: میں تو محض تمہاری طرح ایک انسان ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ (اس آیت شریفہ میں خود آپ ﷺ کا اقرار منقول ہے)

لقد من الله على المؤمنين إذ بعث فيهم رسولاً من أنفسهم.[19] ترجمہ: اللہ رب العزت نے احسان کیا مومنین پر کہ اس نے ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا۔

لہٰذا دستخط کرنے والوں کا مطلب اگر یہ ہے کہ "رسول اللہ ﷺ ہم جیسے انسان نہیں؛ بل کہ ہماری جنس اور نوع سے بالکل علاحدہ کوئی اور جنس اور نوع میں سے ہیں، تو یہ صحیح نہیں ہے اور یہ بات اہل سنت والجماعت کے مسلمہ عقیدے کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۱۱/۱/۱۹۷۷ء

[۴] اعلان مذکور اہل سنت والجماعت کے عقائد کے خلاف ہے = أيضاً

۴۷-سوال: مذکورہ اشتہار میں کون سا جملہ اہل سنت والجماعت کے عقائد کے خلاف ہیں؟

(۱۶) عن علي، أن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: «خرجت من نكاح، ولم أخرج من سفاح، من لدن آدم إلى أن ولدني أبي وأمي». (المعجم الأوسط -الطبراني: ۵/۸۰، رقم: ۴۷۲۸، ط: دار الحرمين القاهرة☆ المعجم الكبير: ۱۰/۳۲۹، رقم: ۱۰۸۱۲، أبو الحويرث عن ابن عباس، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية - القاهرة☆ الشريعة- أبو بكر محمد بن الحسين بن عبد الله الآجُرِّيُّ البغدادي (م: ۳۶۰هـ): ۳/۱۴۱۷، رقم الحديث: ۹۵۷، ت: د. عبد الله بن عمر بن سليمان الدميجي، ط: دار الوطن - الرياض - السعودية، الطبعة الثانية: ۱۴۲۰هـ)

(۱۷) ۱۰-یونس: ۲۔

(۲۰) ۱۸-الکہف: ۱۱۰۔

(۱۹) ۳-آل عمران: ۱۶۴۔

الجواب حامداو مصلیا:

اگر ''ہم جیسے بشر نہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اخلاق ہم جیسوں کی طرح نہیں ہیں؛ بل کہ اللہ رب العزت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ اخلاق و کردار عطا کیا ہے۔ (۱) تمام اہل سنت والجماعت کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً بشر (انسان) ہیں؛ لیکن اللہ رب العزت نے آپ کو عظیم الشان اخلاق وعادات سے نوازا تھا، تب تو یہ عبارت ٹھیک ہے، لیکن اس مطلب پر یہ عبارت صراحت کے ساتھ دلالت نہیں کرتی ہے، بل کہ عوام تو اس سے یہی سمجھیں گے کہ نبی اخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ہم جیسے انسان نہیں ہیں، یعنی نور ہیں، بشر نہیں، الغرض مذکورہ عبارت بہت زیادہ شکوک وشبہات پیدا کرنے والی ہے۔

''عالم الغیب باعلام اللہ'' کی مراد اگر یہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کلی علم غیب حاصل ہے، تو یہ عقیدہ قرآن مجید کی ذکر کردہ آیات کے خلاف ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جتنے علوم عطا کیے ہیں، کسی انسان یا نبی کو اتنے علوم عطا نہیں کیے گئے۔ (۲) لیکن اللہ تعالیٰ کا علم اس سے کہیں زیادہ ہے، اسی وجہ سے صرف اللہ تعالیٰ کو ''عالم الغیب'' کہا جاتا ہے، اللہ کی ذات کے علاوہ کسی کو عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا۔ عوام اس جملہ سے یہی سمجھیں گے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب ہیں، وہ ''باعلام'' کا مطلب نہیں سمجھ پائیں گے؛ اس لیے اس سے اجتناب کی ضرورت ہے۔

''حاضر وناظر بقدرۃ اللہ'' اس عبارت میں ''بقدرۃ اللہ'' کی قید لگا کر دستخط کنندگان اپنی جان بچانا چاہتے ہیں، لیکن اس تعبیر سے عوام یہی سمجھے گی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر وناظر ہیں۔

الغرض ان تمام جملوں سے عوام کے گمراہی میں پڑنے کا قوی اندیشہ ہے؛ لہٰذا ایسی عبارت سے احتراز بے حد ضروری ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفر لہ
۱۱/۱/۱۹۷۷ء

---

(۱) وَإِنَّكَ لَعَلىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ. [۶۸-القلم:۴]
وقال عطية: لعلى أدب عظيم. (تفسير ابن كثير: ۸/۱۸۸، ط: دار طيبه للنشر والتوزيع)
عن سعد بن هشام، قال: سألت عائشة، فقلت: أخبريني عن خلق رسول الله صلى الله عليه وسلم. فقالت: "كان خلقه القرآن". (مسند الإمام أحمد: ۴۲/۱۸۳، رقم الحديث: ۲۵۳۰۲، مسند الصديقة عائشة رضي الله عنها، ط: مؤسسة الرسالة ☆ كنز العمال: ۷/۲۲۲، رقم الحديث: ۱۸۷۱۸، باب شمائل الأخلاق، ط: مؤسسة الرسالة)
(۲) إن أتقاكم وأعلمكم بالله أنا. (صحيح البخاري: ۱/۷، رقم الحديث: ۲۰، كتاب الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: »أنا أعلمكم بالله«، وأن المعرفة فعل القلب، ط: البدر - ديوبند)

[۵] بہ درجۂ مجبوری مذکورہ عبارت کی تائید میں دستخط کرنا = أیضاً

۴۸-سوال: کیا کسی مصلحت کی بناء پر یا مجبوری کی وجہ سے علماء حضرات کے لیے ایسی عبارت کی تائید میں دستخط کرنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اکراہ کی حالت میں جان بچانے کی خاطر توریہ کی اجازت ہے، مگر اولیٰ اور انسب نہیں ہے۔ (۱)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۱۱/۱/۱۹۷۷ء

[۶] سائنسی ترقیات کی بنیاد پر علمِ غیب کے متعلق اشکال

۴۹-سوال: غیب کی باتیں صرف اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، ان کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا، مثلاً رحم مادر میں کیا ہے؟ بارش کب اور کہاں ہوگی؟ موت کب اور کہاں آئے گی؟ آئندہ کل کیا ہوگا؟ وغیرہ، ان تمام امور کے متعلق قرآنِ پاک میں ارشاد ہے کہ اُن کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ (۲)

لیکن اب ان میں سے بعض امور سائنسی ترقیات کی وجہ سے معلوم ہوجاتے ہیں، مثلاً سونوگرافی کے

---

(۱) قال الله تعالى: ﴿إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾ . [النحل: ۱۰۶] والحال أن قلبه مطمئن بالإيمان لم تتغير عقيدته... والمراد هنا السكون، والثبات على ما كان عليه بعد إزعاج الإكراه... والآية دليل على جواز التكلم بكلمة الكفر عند الإكراه، وإن كان الأفضل أن يتجنب عن ذلك إعزاز اللدين ولو تيقن القتل... وليس ذلك من إلقا النفس إلى التهلكة؛ بل هو كالقتل في الغزوة... وإلا فمتى أمكنه نحو التعريض أو إخراج الكلام على نية الاستفهام الإنكاري لم يجب عليه تعريض النفس لذلك إجماعا. (روح المعاني: ۷/ ۴۷۲، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ثم هذه التقية رخصة فلو صبر على إظهار إيمانه حتى قتل كان له بذلك أجر عظيم. (لباب التاويل في معاني التنزيل المعروف بـ "تفسير الخازن": ۱/ ۲۳۷، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ أنظر: فتح القدير -الشوكاني: ۳/ ۲۳۵، ط: دار الكلم الطيب -بيروت)

وعن الحسن بن أبي الحسن قال: إنما التقية رخصة، والفضل القيام بأمر الله. (مصنف ابن ابي شيبة: ۶/ ۴۷۴، رقم الحديث: ۳۳۰۴۸، باب: ماقالوا في المشركين يدعون المسلمين إلى غير الخ، ط: مكتبة الرشد، الرياض ☆ بدائع الصنائع: ۳/ ۴۷۴، كتاب الإكراه، فصل إن أكره على أن يأكل الخ، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۲۲۴، كتاب الجهاد، باب المرتد، ط: دار الفكر -بيروت)

(۲) ﴿إِنَّ اللهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (۲۱-لقمان: ۳۴)

ذریعہ یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ رحم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی۔ اسی طرح موسمیات کے ماہرین کی جانب سے بارش کے متعلق پیشگی خبریں دی جاتی ہیں، جو درست ثابت ہوتی ہیں، نیز ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ بچہ کی ولادت کے مراحل طے ہوتے ہیں، تو کیا اس کی وجہ سے علم غیب کا عقیدہ متاثر نہیں ہوتا ہے؟

الجواب حامداً و مصلیا:

غیب کی باتیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، سائنسی ترقیات کی وجہ سے بارش وغیرہ کے متعلق جو پیشگی اطلاعات اور خبریں موصول ہوتی ہیں، اُن میں اسّی فی صد غلط ثابت ہوتی ہیں، خود اُن خبر دینے والے ماہرین کا اعتراف ہے کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک ۷۵ سے ۸۰ فی صد خبریں غلط ثابت ہوئیں، جب ان کی بتائی ہوئی خبر غلط ثابت ہوتی ہے، تو وہ مختلف بہانے بناتے ہیں کہ ہوا شمال سے جنوب کی جانب چل گئی، اس لیے بارش نہیں ہوئی، لہٰذا خارجی قرائن کے ذریعہ کسی چیز کی پیشگی اطلاع دینا علم غیب میں داخل نہیں ہے۔[1] بل کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ قرائن بندوں کو مطلع کرنے کے لیے دکھائے جاتے ہیں، چناں چہ بارش کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے: وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ. [۷-الأعراف:۵۷]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (بارش) سے پہلے ہواؤں کو بندوں کے لیے (بارش کے متعلق) خوش خبری دینے والی بنا کر بھیجتا ہے۔"

اب ظاہری بات ہے کہ ہواؤں کی خصوصیت اور ان کے مزاج کی وجہ سے بندوں کو بارش کے آنے کا علم ہوتا ہے، لہٰذا ان ہواؤں کی وجہ سے بارش کی خبر دینے کو علم غیب نہیں کہا جاسکتا۔

اسی طرح سونوگرافی کے ذریعہ لڑکے یا لڑکی کی جنس کا معلوم ہونا بھی علمِ غیب (جو اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے) کا مصداق نہیں ہے؛ کیوں کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود ڈاکٹر استقرارِ حمل کے چند مہینوں کے بعد ہی بتا پاتے ہیں کہ رحم مادر میں کیا ہے، انہیں تمام جزئی احوال کی خبر نہیں ہو پاتی، نیز ان کی بتائی ہوئی باتوں پر لوگوں کو؛ بل کہ خود انہیں بھی یقین کامل نہیں ہوتا کہ انہوں نے جو کچھ بتایا ہے، وہ صد فی صد

---

(۱) وأما ما علم بحاسة أو ضرورة أو دليل، فليس بغيب، ولا كفر في دعواه، ولا في تصديقه على الجزم في اليقيني والظن في الظني عند المحققين. (نبراس شرح، شرح عقائد، ص: ۳۴۳، ط: یاسر ندیم، دیوبند)

وفي موضع آخر منه: إن العلم الاستدلالي ليس من علم الغيب الخاص بالحق سبحانه. (المصدر السابق)

(مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: معارف القرآن، شفیع: ۷/ ۵۳، ط: اشرفیہ-دیوبند)

درست اور صحیح ثابت ہوگا۔ جب کہ اللہ تعالیٰ - جو صفت غیب کے ساتھ متصف ہے - استقرار حمل سے بھی پہلے تمام جزئیات و کیفیات کے ساتھ ازل میں بھی واقف تھا اور آئندہ بھی تمام تر تفاصیل سمیت استقرار حمل کے بعد بھی واقف ہے کہ لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی، اُس کی شکل وصورت کیسی ہوگی؟ نیک ہوگا یا بد؟ عمر کتنی ہوگی؟ کتنا رزق پائے گا؟ عالم ہوگا یا جاہل؟ حاکم ہوگا یا محکوم؟ غرض اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم تمام کلیات وجزئیات کو محیط اور شامل ہے، جس کا عشرِ عشیر بھی بندوں کو نصیب نہیں۔ (۱)

الحاصل دنیا کا کوئی بھی ماہر طبیب یا اعلیٰ معیار کی مشین مغیبات (جن کا صرف اللہ تعالیٰ کو ہی علم ہے) کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتی؛ لہٰذا ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ قرآن مجید میں مذکور ان پانچوں امور کے متعلق یہ پختہ عقیدہ رکھے کہ اُن کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، کسی پیر ومرشد یا فقیر وولی کو بھی ان چیزوں کا علم نہیں ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فإن قلت: قد أخبر الأنبياء، والأولياء بشيء كثير من ذلك فكيف الحصر؟ قلت: الحصر باعتبار كلياتها دون جزئياتها، قال تعالى: { عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۝ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ }. [۷۲-الجن: ۲۶-۲۷] (مرقاة المفاتيح: ۱/ ۶۶، كتاب الإيمان، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) عن قتادة [إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ...] الآية، أشياء من الغيب، استأثر الله بهن، فلم يطلع عليهن ملكا مقربا، ولا نبيا مرسلا [إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ] فلا يدري أحد من الناس متى تقوم الساعة، في أي سنة، أو في أي شهر، أو ليل، أو نهار (وينزل الغيث) فلا يعلم أحد متى ينزل الغيث، ليلا أو نهارا ينزل؟ [وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ] فلا يعلم أحد ما في الأرحام، أذكر أو أنثى، أحمر أو أسود، أو ما هو؟ [وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا] خير أم شر، ولا تدري يا ابن آدم متى تموت؟ لعلك الميت غدا، لعلك المصاب غدا؟ (وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ) ليس أحد من الناس يدري أين مضجعه من الأرض في بحر أو بر أو سهل أو جبل، تعالى وتبارك. (جامع البيان في تأويل القرآن-محمد بن جرير الآملي، أبو جعفر الطبري (م: ۳۱۰ھ): ۲۰/ ۱۵۹-۱۶۲، ت: احمد محمد شاكر، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)

مزید دیکھیے: روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني-شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م: ۱۲۷۰ھ): ۱۱/ ۱۰۸، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ فتح القدير-محمد بن علي الشوكاني اليمني (م: ۱۲۵۰ھ): ۴/ ۲۸۲، ط: دار ابن كثير، دار الكلم الطيب-دمشق ☆ البحر المحيط في التفسير-أبو حيان محمد بن يوسف، أثير الدين الأندلسي (م: ۷۴۵ھ): ۸/ ۴۲۵، ت: صدقي محمد جميل، ط: دار الفكر-بيروت ☆ تفسير القرآن العظيم-أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (م: ۷۷۴ھ): ۶/ ۳۵۲، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع ☆ زاد المسير في علم التفسير-جمال الدين أبو الفرج الجوزي (م: ۵۹۷ھ): ۳/ ۴۳۶، ت: عبد الرزاق المهدي، ط: دار الكتاب العربي-بيروت ☆ في ظلال القرآن-سيد قطب إبراهيم حسين الشاربي (م: ۱۳۸۵ھ): ۵/ ۲۷۹۹، ط: دار الشروق-بيروت)

[۷] علم غیب اور کشف: اشکال وجواب

۷-سوال: ''کشف'' کے معنیٰ لغت میں ''غیب کی باتوں کا اظہار کرنا'' لکھا ہے۔(۱) جب کہ غیب کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی خاص ہے، تو پھر کشف کے یہ معنیٰ کیوں کر درست ہو سکتا ہے، جب کہ بزرگوں کی جانب بہت سے ''کشف'' منسوب ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

علمِ غیب اور کشف میں بڑا فرق ہے، اللہ تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام کائنات کے احوال سے ہر گھڑی واقف رہتے ہیں، کائنات کی غیر متناہی جزئیات میں سے کوئی بھی جزیہ ان کے علم سے باہر نہیں، یہاں تک کہ تحت الثراء میں چلنے والے ادنیٰ سے ادنیٰ کیڑا کے پیر کا نقش بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور اُس کی آہٹ بھی اللہ سے مخفی نہیں ہے۔(۲) پھر اس علم کے لیے وہ کسی سبب کا محتاج نہیں ہے، اور کبھی اُس کا علم واقع کے خلاف نہیں ہوتا، یعنی اس میں غلطی نہیں ہوتی۔

اُس کے برخلاف کشف کوئی مستقل علم نہیں ہے، بل کہ یہ ایک قسم کی اٹکل اور اندازے کا نام ہے۔(۳) یعنی کسی امر کے متعلق دل میں ایک بات آجائے، جس کا کوئی بھی مطلب نکالا جا سکتا ہو، جیسے خواب میں بھی ہوتا ہے، پھر اس اٹکل اور اندازے میں اگر کوئی غلطی نہ ہو اور اُس کا صحیح مطلب سمجھا گیا ہو، تو اُس کی حقیقت واقعی اور سچی ہوتی ہے، ورنہ نہیں ہوتی؛ لیکن یہ بات ضروری نہیں کہ ہر کشف کا مطلب سمجھ میں بھی آجائے، یا اُس کی حقیقت بھی واقعی اور صحیح ہو، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے سچا کون ہو سکتا ہے؟ لیکن اُن کی وفات کے متعلق اُن کا کشف کلی طور پر صحیح ثابت نہ ہوا، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ آج پیر کا دن

---

(۱) کشف: عربی، مذکر (۲) غیب کی باتوں کا اظہار، جامع فیروز اللغات، ص:۱۰۱۵، ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)

(۲) وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿٥٩﴾. (۶-الأنعام: ۵۹) وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿١٢﴾. (۶۵-الطلاق: ۱۲)

(۳) الكشف في اللغة رفع الحجاب وعند الصوفية هو الإطلاع على وراء الحجاب من المعاني الغيبية والأمور الحقيقية وجودا أو شهودا. (قواعد الفقه -عميم الاحسان، البركتي، ص: ۴۴۳، القسم الثالث، مافيه خلاف بين الطرفين، الخ، ط:الصدف پبلشرز-کراچی ☆ وانظر كذلك: الالفاظ والمصطلحات المتعلقة بتوحيد، ص: ۴۶۱، ط:السعودية)

ہے، مجھے اُمید ہے کہ رات تک میں اللہ کی رحمت میں پہنچ جاؤں گا؛ لیکن وفات منگل کی شام کو ہوئی۔ (بخاری شریف: ۱/ ۱۸۱)[۱]

علماء نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی وفات کے متعلق کشف ہوا، لیکن وقت کے سمجھنے میں غلطی ہوئی، تو جب ''خلیفۃ النبی بلا فصل'' کے کشف کا یہ حال ہے تو پھر غیر صحابی کے کشف کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے؟ اسی لیے کوئی بھی ایسا کشف، جو خلاف شرع حقائق پر مشتمل ہو، قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ (۲) کشف ایک ایسا ادراکِ خفی ہے، جو ظنی ہونے کی وجہ سے انسان کے علم کا بھی مقابل نہیں بن سکتا، چہ جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علمِ غیب کے قریب ہو، لہٰذا مخلوق کے کسی بھی علم و ادراک کا اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاصہ سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ (۳) فقط، واللہ اُعلم بالصواب۔

[۸] کیا حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کا عقیدہ رکھنا درست ہے؟

۵۱-سوال: 　　　　ملک سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''الاصلاح'' میں حضرت مولانا اسماعیل

(۱) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: دخلت على أبي بكر رضي الله عنه، . . . قال لها: في أي يوم توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ قالت: «يوم الإثنين» قال: فأي يوم هذا؟ قالت: «يوم الإثنين» قال: أرجو فيما بيني وبين الليل، . . . فلم يتوف حتى أمسى من ليلة الثلاثاء، ودفن قبل أن يصبح. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۸۶، رقم: ۱۳۸۷، كتاب الجنائز، باب موت يوم الإثنين، ط: البدر-ديوبند)

(۲) لأنه صرح العلماء أن الإلهام ليس من أسباب المعرفة بالأحكام وكذلك الرؤيا خصوصاً إذا خالف الكتاب وسنة سيد الأنام عليه أفضل الصلاة والسلام. (جلاء العينين في محاكمة الأحمدين-نعمان بن محمود، أبو البركات خير الدين، الآلوسي (م: ۱۳۱۷ھ) ص: ۱۲۲، الفصل الرابع: الصوفي المنحرف، ط: مطبعة المدني)

الإلهام والكشف منه ماهو حق وصواب، ومنه ما هو باطل وضلال، الإلهام الحق هو الذي توفرت فيه وفي صاحبه هذه الأمور: (أ) الاعتصام بكتاب الله وسنة رسوله ظاهراً وباطناً، وكمال الانقياد لها والتحلّي بالتقوى والإخلاص والمتابعة. . . . (ج) أن يكون موافقا للكتاب والسنة، وغير متعارض معهما. (حقيقة البدعة وأحكامها-سعيد بن ناصر الغامدي: ۱/ ۲۰۵، القسم الثاني: من شبه الأدلة، ط: مكتبة الرشد-الرياض)

(۳) إن الإلهام وما يراه النائم فيحقق في اليقظة، ليس من قبيل علم الغيب، لا من قريب ولا من بعيد. (هامش البراهين الإسلامية في رد الشبة الفارسية-عبد اللطيف بن عبد الرحمان آل الشيخ، ص: ۶۷، ط: المكتبة الهداية)

والإلهام المفسر بإلقاء معنى في القلب بطريق الفيض ليس من أسباب المعرفة بصحة الشي عند أهل الحق. (شرح عقائد نسفی، ص: ۲۲، ط: زکریا، دیوبند)

منوبریؒ رقم طراز ہیں کہ جس شخص کا عقیدہ حضورِ پاک ﷺ کے متعلق یہ ہو کہ آپ ﷺ تمام باتوں کو سنتے اور جانتے ہیں، وہ کافر ہے، جب کہ ہمارے یہاں بھادی گاؤں کی مسجد میں ۲۴/۵/۱۹۹۱ء بروز جمعہ دارالعلوم مرکزِ اسلامی، انکلیشور سے تشریف لائے ہوئے ایک مولانا نے بیان میں فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اُن کا جنازہ اُن کی وصیت کے مطابق حضورِ پاک ﷺ کی قبرِ اطہر کے پاس لے جایا گیا، اور قبر مبارک کے پاس جنازہ رکھ کر یہ اجازت مانگی گئی کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ کے ساتھی ابوبکرؓ آپ کے پاس دفن ہونے کی اجازت چاہتے ہیں، یہ سنتے ہی زنجیریں ٹوٹ گئیں، دروازہ کھل گیا اور آواز آئی کہ ''میرے ساتھی کو میرے پاس دفن ہونے کی اجازت ہے، میں اُن کے انتظار میں ہوں''۔ (۱)

مولانا کے ذکر کردہ اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی قبر مبارک میں دفن کی اجازت کے طلب کیے جانے کو سنا اور جواب بھی دیا، جب کہ کتاب ''الاصلاح'' میں اس طرح عقیدہ رکھنے کو کفر کہا گیا ہے، ایسا جواب عنایت فرمائیں کہ ان دونوں باتوں کے درمیان تعارض رفع ہو جائے۔

الجواب حامداً ومصلياً:

حضرت مولانا اسماعیل منوبریؒ نے ''الاصلاح'' میں جو لکھا ہے، اُس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص آپ ﷺ کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ ''آپ ﷺ، اللہ تعالیٰ کی طرح حاضر و ناظر ہیں اور تمام باتوں کو سنتے اور

(۱) وقد روي عن أبي بكر الصديق رضي الله عنه أنه لما حضرته الوفاة، قال لهم: إذا مت وفرغتم من جهازي، فاحملوني حتى تقفوا بباب البيت الذي فيه قبر النبي صلى الله عليه وسلم، فقفوا بالباب وقولوا: السلام عليك يا رسول الله، هذا أبو بكر يستأذن، فإن أذن لكم وفتح الباب، وكان الباب مغلقا، فأدخلوني فادفنوني، وإن لم يؤذن لكم فأخرجوني إلى البقيع وادفنوني. ففعلوا فلما وقفوا بالباب وقالوا هذا، سقط القفل وانفتح الباب، وسمع هاتف من داخل البيت: أدخلوا الحبيب إلى الحبيب، فإن الحبيب إلى الحبيب مشتاق. (الشريعة-أبو بكر محمد بن الحسين الآجُرِّيُّ (م: ۳۶۰هـ): ۵/ ۲۳۸۲، رقم: ۱۸۶۱، باب ذكر دفن أبي بكر وعمر رضي الله عنهما، ت: الدكتور عبد الله بن عمر بن سليمان الدميجي، ط: دار الوطن - الرياض ☆ كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال-علاء الدين علي بن حسام الدين الهندي البرهانفوري، الشهير بالمتقي الهندي (م: ۹۷۵هـ): ۱۲/ ۵۳۸، رقم الحديث: ۳۵۷۲۹، باب فضائل الصحابة، فضل الصديق ووفاته رضي الله عنه، ت: بكري حياني - صفوة السقا، ط: مؤسسة الرسالة)

جانتے ہیں، تو وہ کافر ہے"۔[1] مولانا نے جمعہ کے بیان میں جو قصہ بیان فرمایا ہے، اُسے روایاتِ حدیث میں ائمہ جرح وتعدیل نے منکر قرار دیا ہے۔[2] جو قابل اعتماد نہیں۔ البتہ مختلف احادیث میں اس قسم کے خوارقِ عادات منقول ہیں، اس سے کسی کو انکار نہیں، ہم اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ اپنی قبر مبارک میں باحیات ہیں۔[3] اور بہت سے اولیاء اللہ کو بہ طور خرقِ عادت اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن کی کرامت کے طور پر روضۂ اقدس پر اُن کی جانب سے پیش کردہ سلام کے جواب کی آواز بھی سنائی دی ہے، اس کو "امر خارق للعادۃ" کہا جاتا ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو کسی خاص وقت میں خاص شخص کو یہ آواز سنا سکتے ہیں؛ ورنہ ظاہر بات ہے کہ اس طرح سے کئی من مٹی کے نیچے سے آواز باہر تک سنائی دینا عادۃً ممکن نہیں ہے؛ لیکن اس سے یہ

---

(۱) قال اللہ تعالی: ﴿وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ﴾. (۳-آل عمران: ۴۴)
حاضر وناظر... یہ دونوں عربی کے لفظ ہیں، جن کے معنی ہیں "موجود اور دیکھنے والا" اور جب ان دونوں کو ملا کر استعمال کیا جاتا ہے، تو اس سے مراد ہوتی ہے "وہ شخص جس کا وجود خاص جگہ میں نہیں" بل کہ اس کا وجود بہ یک وقت ساری کائنات کو محیط ہے اور کائنات کی ایک ایک چیز کے تمام حالات اول سے آخر تک اس کی نظر میں ہیں، میرا عقیدہ یہ ہے کہ "حاضر وناظر" کا یہ مفہوم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر صادق آتا ہے اور یہ صرف اسی کی شان ہے۔ (اختلاف امت اور صراط مستقیم، ص: ۳۷، دیوبندی- بریلوی اختلاف، حاضر وناظر، ط: مکتبۂ مدنیہ دیوبند)

(۲) قال ابن عساكر بعد ذكر هذه الرواية: هذا منكر وراويه أبو الطاهر موسى بن محمد بن عطاء المقدسي وعبد الجليل مجهول. (تاريخ دمشق-أبو القاسم علي بن الحسن المعروف بـ"ابن عساكر" (م: ۵۷۱هـ): ۳۰/ ۴۳۶، حرف العين، ت: عمرو بن غرامة العمروي، ط: دار الفكر -بيروت★ر: الخصائص الكبرى- جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱هـ): ۲/ ۴۹۲، ذكر آيات وقعت على إثر وفاة النبي صلى الله عليه وسلم، الخ، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆شرف المصطفى- عبد الملك بن محمد النيسابوري الخركوشي، أبو سعد (م: ۴۰۷هـ): ۵/ ۴۱۳، جامع أبواب الفضائل والمناقب، فصل في فضل أبي بكر رضي الله عنه، ط: دار البشائر الإسلامية-مكة المكرمة)

(۳) حياة النبي صلى الله عليه وسلم في قبره هو وسائر الأنبياء معلومة عندنا، علما قطعيا لما قام عندنا من الأدلة في ذلك وتواترت [به] الأخبار. (الحاوي للفتاوى-جلال الدين السيوطي: ۲/ ۱۷۸، مبحث النبوات، أنباء الأذكياء بحياة الأنبياء، ط: دار الفكر- بيروت)

قال المتكلمون المحققون من أصحابنا: إن نبينا -صلى الله عليه وسلم- حي بعد وفاته. (المصدر السابق: ۲/ ۱۸۰)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی (م: ۱۰۵۲ھ) فرماتے ہیں: حیات انبیاء متفق علیہ است، ہیچ کس را در وے خلافے نیست۔ (اشعۃ اللمعات: ۱/ ۶۱۳، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ الفصل الثانی، ط: المکتبۃ الرشیدیۃ، سرکی روڈ، کوئٹہ، پاکستان)

ومما هو مقرر عند المحققين أنه صلى الله عليه وسلم حي يرزق ممتع بجميع الأعمال والعبادات، غير أنه حجب عن أبصار القاصرين عن شريف المقامات. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح: ص: ۲۸۳، كتاب الحج، في زيارة النبي، صلى الله عليه وسلم، ط: المكتبة العصرية)

بات ثابت نہیں ہوتی کہ مردہ شخص زندہ لوگوں کی آواز کو اپنے اختیار سے جب چاہے سن سکتا ہے، لہٰذا حضرت مولانا اسماعیل صاحبؒ کی بات بالکل درست ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کفر ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اختیار سے جب چاہیں، تمام بندوں کی آواز سن سکتے ہیں"۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں ہیں

۵۲-سوال: بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کا علم نہیں تھا اور دوسری طرف یہ حدیث بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہ بن مالک کو خوش خبری دی کہ میں تمہارے ہاتھوں میں قیصر و کسریٰ کے کنگن دیکھ رہا ہوں، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب نہیں تھا، تو آپ نے کیسے یہ پیشین گوئی فرمادی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض اہم امور کا اجمالی علم عطا فرمادیا تھا، اس کو بنیاد بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عالم الغیب ہونے کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے، جس طرح اگر کسی کو قرآن کی ایک، دو سورت یاد ہو، اسے حافظِ قرآن نہیں کہہ سکتے، اسی طرح بعض اہم امور کے اجمالی علم کے عطا ہونے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر "عالم الغیب" کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا ہے، جزوی علم سے کلی علم کو ثابت کرنا صحیح نہیں ہے۔ [۱] نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش گوئی فرمانا، اللہ تعالیٰ کے آپ کو وحی کے ذریعے اطلاع دینے کی وجہ سے تھا؛ لہٰذا اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ لفظ "عالم الغیب" کا استعمال اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ غیب کی تعریف بھی یہی ہے کہ بہ غیر کسی واسطے کے ہر چیز کا علم ہو؛ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ [۲] واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) ثم اعلم أن الأنبياء لم يعلموا المغيبات من الأشياء إلا ما أعلمهم الله أحيانا، وذكر الحنفية تصريحا بتكفير باعتقاد أن النبي صلى الله عليه وسلم يعلم الغيب، لمعارضة قوله تعالى: "قل لا يعلم من في السموت والأرض الغيب إلا الله". (شرح الفقه الأكبر-علي بن (سلطان) محمد، الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۸۵، ط: ياسر نديم-ديوبند)

(۲) والتحقيق أن الغيب ما غاب عن الحواس والعلم الضروري والعلم الاستدلالي، وقد نطق القرآن بنفي علمه عمن سواه تعالى ... وأما ما علم بحاسة أو ضرورة أو دليل، فليس بغيب، ... وبهذا التحقيق اندفع الإشكال في الأمور التي يزعم أنها من الغيب، وليست منها، لكونها مدركة بالسمع أو البصر أو الضرورة أو الدليل، فأحدها أخبار الأنبياء، لأنها مستفاد من الوحي، و من خلق العلم الضروري فيهم، أو من انكشاف الكوائن على حواسهم. (نبراس-العلامة محمد عبد العزيز الفرهاري، ص: ۳۴۳، ط: تھانوی-دیوبند)

والغيب: وهو ما لم يقم عليه دليل ولا اطلع عليه مخلوق. (مدارك التنزيل-أبو البركات عبد الله بن أحمد بن محمود حافظ الدين النسفي (م: ۷۱۰هـ)، ۲/۶۱۷، ت: يوسف علي بديوي، ط: دار الكلم الطيب-بيروت)

[۱۰] نبی اکرم ﷺ کے ''عالم الغیب'' ہونے کا دعویٰ کرنا

۵۳-سوال: اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے بارے میں علم غیب کا عقیدہ رکھتا ہو، تو وہ کبیرہ گناہ کرنے والوں میں شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

آپ ﷺ کے بارے میں عالم الغیب ہونے کا دعویٰ کرنا کبیرہ گناہ ہے؛ بل کہ ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر میں اس سے بڑھ کر فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ رکھنا کفر ہے؛ اس لیے کہ یہ قرآن کی آیت "قل لا یعلم من فی السموٰت والأرض الغیب الا اللہ" کے خلاف ہے۔[۱] اور جان بوجھ کر قرآن کریم کی خلاف ورزی، انکار ہے اور قرآن کریم کا انکار کفر ہے؛ لہٰذا اس طرح کا عقیدہ رکھنے والا کافر ہوگا۔ شرح فقہ اکبر میں ہے: ''ثم اعلم أن الأنبياء لم يعلموا المغيبات من الأشياء إلا ما أعلمهم الله تعالى أحيانا و ذكر الحنيفة تصريحا بالتكفير باعتقاد أن النبي صلى الله عليه وسلم يعلم الغيب لمعارضة قوله تعالى:'' قل لا يعلم من في السموات والأرض الغيب إلا الله. (ص:۱۸۵)[۲]

مذکورہ بالا تحریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آپ ﷺ کے بارے میں علم غیب کا عقیدہ رکھنے والا کافر ہوجاتا ہے۔

[۱۱] کیا حضور ﷺ عالم الغیب تھے، علمِ غیب کسے کہتے ہیں اور اس کے بارے میں مسلمانوں کو کیا عقیدہ رکھنا چاہیے؟

۵۴-سوال: حضور ﷺ عالم الغیب تھے یا نہیں؟ (۲) علمِ غیب کسے کہتے ہیں؟ (۳) مسلمانوں کو علمِ غیب کے متعلق کیا عقیدہ رکھنا چاہیے؟

(۴) ہمارے یہاں ایک عالم صاحب کا کہنا ہے کہ حضور ﷺ عالم الغیب نہیں تھے، لیکن آپ

---

(۱) ۲۷-النمل: ۶۵.

(۲) شرح الفقہ الأکبر، ص: ۱۸۵، ط: یاسر ندیم-دیوبند.

ﷺ کو علم غیب وافر مقدار میں حاصل تھا، تو علم غیب اور عالم الغیب میں کیا فرق ہے؟ حضورِ پاک ﷺ کی نسبت اِس طرح کہنا درست ہے کہ آپ ﷺ عالم الغیب نہیں تھے؟ لیکن آپ ﷺ کو علم غیب حاصل تھا، مذہب حنفی کے مطابق مذکورہ سوالات کے جوابات دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) رسولِ اکرم ﷺ عالم الغیب نہیں تھے، کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے یا اس طرح کہے کہ آپ ﷺ عالم الغیب تھے، تو وہ ایمان سے نکل جائے گا۔[۱] کیوں کہ مشرک اُسی شخص کو کہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی خاص صفات میں دوسروں کو شریک ٹھہرائے[۲]، ''عالم الغیب'' صرف اللہ تعالیٰ ہیں، قرآنِ پاک میں اِرشادِ ربانی ہے:

"وعنده مفاتيح الغيب لا يعلمها إلا هو"[۳]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہی کے پاس علمِ غیب کی کنجیاں ہیں، جنھیں صرف وہی جانتا ہے۔ (شرح فقہ اکبر: ۱۸۵،[۴] فتاویٰ رشیدیہ: ۳۱/۳)[۵]

اِس لیے جو شخص آں حضرت ﷺ کو عالم الغیب جانے مانے، وہ ایمان سے خارج ہو جائے گا۔

(۲) شرح عقائد صفحہ: ۱۰ پر لکھا ہے کہ مخلوق (انسان، فرشتہ اور جنات) کے حصولِ علم کے تین ذرائع ہیں: (۱) حواسِ ظاہر۔ (۲) خبرِ صادق۔ (سچی خبریں) (۳) عقل۔ پہلی چیز کے ماتحت پانچ چیزیں ہیں: (۱) قوتِ سامعہ (کان)۔ (۲) قوتِ شامہ (ناک)۔ (۳) قوتِ لامسہ (چھونے کے ذریعہ کسی چیز کا

---

(۱) ثم اعلم أن الأنبياء لم يعلموا المغيبات من الأشياء إلا ما أعلمهم الله أحيانا، وذكر الحنفية تصريحا بتكفير باعتقاد أن النبي صلى الله عليه وسلم يعلم الغيب، لمعارضة قوله تعالى: "قل لا يعلم من في السموٰت والأرض الغيب إلا الله". (شرح الفقه الأكبر-علي بن (سلطان) محمد، المعروف بالملا علي القاري الهروي (م: ۱۰۱۴ھ): ۸۵، ط: ياسر نديم-ديوبند)

(۲) والشرك أن يثبت لغير الله من الصفات المختصة به تعالى. (الفوز الكبير - الإمام أحمد بن عبد الرحيم المعروف بـ"الشاه ولي الله الدهلوي" (م: ۱۱۷۶ھ)، ص: ۲۱، الباب الأول، الفصل الأول، بيان الشرك، ط: مكتبه حجاز ديوبند)

(۳) - ۶ الأنعام: ۵۹.

(۴) شرح الفقه الأكبر، ص: ۱۸۵، الأنبياء لا يعلمون الغيب، ط: ياسر نديم-ديوبند.

(۵) حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب نہ تھا، نہ کبھی اس کا دعویٰ کیا، اور کلام اللہ شریف اور بہت سی احادیث میں موجود ہے کہ آپ عالم الغیب نہ تھے اور یہ عقیدہ رکھنا کہ آپ کو علم غیب تھا صریح شرک ہے۔ (فتاوی رشیدیہ مع تالیفات رشیدیہ-مولانا رشید احمد گنگوہی (م: ۸/ جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ موافق ۱۱/ اگست ۱۹۰۵ء)، ص: ۱۰۴، کتاب الایمان والکفر، ط: مکتبۃ الحق، جوگیشوری)

سخت، نرم، گرم یا سرد ہونا معلوم ہو)۔ (۴) قوتِ ذائقہ (زبان)۔ (۵) قوتِ باصرہ (آنکھ)۔ [٦]

یہ حواس پورے بدن میں ہر شخص میں کم وبیش موجود ہیں، ان اشیاء ثلاثہ کے ذریعہ علم حاصل ہوتا ہے، یہ سبب اور وسیلہ کے درجہ میں ہیں، علمِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتا ہے۔

(۳) علم غیب: جن باتوں تک حواس، عقل اور دلیل کی رسائی نہ ہو اور اُس کا علم حاصل ہو، آنکھ سے کسی چیز کو دیکھ لیا، یا کان سے سن لیا، عقل کے ذریعہ کسی بات کے نتیجہ تک پہنچ گئے، یہ علم غیب نہیں ہے، تھرمامیٹر سے گرمی کا علم ہوا، یا مشین کے ذریعہ عورت کے پیٹ میں دیکھ لیا کہ لڑکا ہے یا لڑکی، یا ہوا کے دباؤ اور ٹھنڈک دیکھ کر بارش کی آمد کا پیشگی علم، علم غیب نہیں ہے۔

عالم الغیب: وہ ہے جو بغیر اسباب و وسائل کے غیب کی باتوں کو جاننے والا ہو، اسباب و وسائل کی اُسے ضرورت نہ ہو، [٧] جیسے ایک عالم کو عالم اُس وقت کہتے ہیں کہ جب وہ کسی دار العلوم میں پڑھ کر دینی مسائل وغیرہ سمجھا ہو اور قوم کو سمجھانے کی قدرت بھی رکھتا ہو، کسی کو ڈاکٹر اُسی وقت کہتے ہیں کہ جب کسی یونی ورسٹی میں کورس مکمل کر کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد بیماری کے علاج کی قدرت رکھتا ہو، اگر کوئی جاہل شخص بہشتی زیور پڑھ لے، تو لوگ اُسے عالم نہیں کہیں گے، دو سو یا پانچ سو مسائل یاد کر لینے والے کو عالم نہیں کہا جاتا، کورٹ کے پانچ سو یا ہزار قوانین کے جاننے والے کو وکیل یا جج نہیں کہا جاتا، اسی طرح علمِ غیب سے مراد اس علم کا حاصل ہونا ہے، جو حواس اور عقل میں آنے والی نہ ہو، لہٰذا ہزاروں باتوں کے جاننے کی وجہ سے کوئی شخص عالم الغیب نہیں ہوگا اور اُس کو عالم الغیب کہنا صحیح نہیں ہوگا، البتہ آپ ﷺ علمِ غیب

---

(٦) وأسباب العلم للخلق ثلاثة: الحواس السليمة، والخبر الصادق، والعقل. فالحواس خمس: السمع والبصر والشم والذوق واللمس. (العقائد النسفية مع شرحه للتفتازاني - عمر بن محمد بن أحمد بن إسماعيل، أبو حفص، نجم الدين النسفي (م: ۵۳۷ھ)، ص: ۱۰-۱۳، ط: یاسر ندیم - دیوبند)

(٧) والتحقيق أن الغيب ما غاب عن الحواس، والعلم الضروري، والعلم الاستدلالي، وقد نطق القرآن بنفي علمه عمن سواه تعالى ... وأما ما علم بحاسة، أو ضرورة، أو دليل، فليس بغيب، ... وبهذا التحقيق اندفع الإشكال في الأمور اللتي يزعم أنها من الغيب، وليست منها، لكونها مدركة بالسمع أو البصر، أو الضرورة، أو الدليل، فأحدها أخبار الأنبياء، لأنها مستفاد من الوحي، ومن خلق العلم الضروري فيهم، أو من انكشاف الكوائن على حواسهم. (نبراس - العلامة محمد عبد العزيز الفرهاري، ص: ۳۴۳، ط: تھانوی - دیوبند)

والغيب: وهو ما لم يقم عليه دليل ولا اطلع عليه مخلوق. (مدارك التنزيل - أبو البركات عبد الله بن أحمد بن محمود حافظ الدين النسفي (م: ۷۱۰ھ): ۲/ ۶۱۷، ت: يوسف علي بديوي، ط: دار الكلم الطيب - بيروت)

جانتے تھے، اُس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بہت سی ماضی اور مستقبل کی باتیں بتائی ہیں، یہ صحیح ہے، اُس کا کوئی منکر بھی نہیں۔ (۸)

لیکن ایسی باریک باتیں عام لوگوں کے سامنے بیان کرنا، علماء کا باہمی بحث ومباحثہ کرنا اور عوام کو اُس کی ترغیب دینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، اس سے عوام گمراہ ہوتے ہیں، زمانہ نازک ہے، عوام کو مہماتِ عقائد معلوم نہیں ہیں، ہزاروں لوگ ایمان سے خارج ہورہے ہیں، ایسے وقت میں اس طرح کی باتیں کرنا، کوئی دین ومذہب کی خدمت نہیں ہے۔

اسی لیے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فتاویٰ رشیدیہ، جلد: ۳ص: ۳۱، میں لکھا ہے کہ کوئی شخص اِس طرح کہے کہ ہر چیز کا علمِ غیب رسول اللہ ﷺ کا ذاتی وصف نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے، اِس طرح کہنا باطل، غلط اور واہیات باتیں ہیں، میدانِ محشر میں آں حضرت ﷺ کچھ لوگوں کو حوضِ کوثر کا پانی پلانے کے لائق سمجھیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا کہ اے محمد! آپ نہیں جانتے کہ آپ کی وفات کے بعد ان لوگوں نے کیسی کیسی نئی باتیں دین میں پیدا کی تھیں۔ (۹)

---

(۸) قال اللہ تعالی: عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝. [۷۲-الجن:۲۶-۲۷]

(ولا أعلم الغيب) أي ولا أقول لكم إني أعلم الغيب، إنما ذاك من علم الله عز وجل، ولا أطلع منه إلا على ما أطلعني عليه. (تفسير ابن كثير: ۳/ ۲۳۱، سورة الأنعام، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

فالله سبحانه وتعالى عالم كل غيب وحده، فلا يطلع على ذلك المختص علمه به تعالى اطلاعا كاملا أحدا من خلقه، ليكون أليق بالتفرد، وأبعد عن توهم مساواة علم خلقه لعلمه سبحانه، وإنما يطلع جل وعلا إذا اطلع من شاء على بعضه مما تقتضيه الحكمة التي هي مدار سائر أفعاله عز وجل، وما نفيت عني العلم به مما لم يطلعني الله تعالى عليه لما أن الاطلاع عليه مما لا تقتضيه الحكمة التشريعية التي يدور عليها فلك الرسالة بل هو مخل بها. (روح المعاني-شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م: ۱۲۷۰ھ): ۱۵/ ۱۰۷، سورة الجن، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية، الطبعة: الأولى، ۱۴۱۵ھ)

ثم إن الأنبياء يعلمون كثيرا من الغيب بتعريف الله تعالى إياهم. (تفسير القرطبي-أبو عبد الله محمد بن أحمد الأنصاري الخزرجي شمس الدين القرطبي (م: ۶۷۱ھ): ۱۴/ ۸۲، سورة لقمان، ت: أحمد البردوني وإبراهيم أطفيش، ط: دار الكتب المصرية-القاهرة، الطبعة: الثانية، ۱۳۸۴ھ-۱۹۶۴م)

(۹) اور جو یہ کہتے ہیں کہ علم غیب جمیع اشیاء آں حضرت کو ذاتی نہیں؛ بل کہ اللہ تعالیٰ کا عطا کیا ہوا ہے، سو محض باطل اور خرافات میں سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محشر میں بھی بعض لوگوں کے قابل سقی ماء کوثر ہونے کا احتمال ہوگا اور باری تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوگا: "إنك لا تدري ما أحدثوا بعدك. (فتاوی رشیدیہ مع تالیفات رشیدیہ، ص: ۹۱، کتاب الایمان والکفر، ط: مکتبۃ الحق، جوگیشوری)

تزکیۃ الایمان صفحہ: ۳۰۷ میں لکھا ہے کہ جو الفاظ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہوں، ایسے الفاظ کو دیگر کسی کے لیے استعمال کرنا کسی بھی تاویل سے شرک کے وہم سے خالی نہیں ہے۔[۱۰] اس لیے علمِ غیب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے، اس طرح کے الفاظ کے استعمال سے بچنا ضروری ہے، اس لیے جو عالم انکار کرتے ہیں، اُن کا انکار کرنا صحیح ہے، ایسی گمراہ کن باتوں سے احتراز کرنا چاہیے، ورنہ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جن باتوں کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا تھا، دنیا میں کسی اور نبی یا رسول کو نہیں دیا گیا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یوں کہنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم علمِ غیب جانتے تھے

۵۵-سوال: زید تعلیم یا تقریر میں عوام کو مخاطب بنا کر کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم علمِ غیب جانتے تھے، اس طرح کہنا کیسا ہے؟ فتاویٰ رشیدیہ میں لکھا ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے نماز جائز نہیں ہوتی، اور اُس سے تعلق رکھنا بھی حرام ہے۔[۱] صحیح جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اس طرح کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علمِ غیب جانتے تھے، لوگوں کو گمراہ کرنے کے برابر ہے، اس طرح کے الفاظ کا استعمال کرنا تقریر وتحریر میں جائز نہیں ہے، اس طرح کے الفاظ بولنے والے عالم کا عقیدہ اگر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی غیب کا جاننے والا نہیں ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی غیب کی باتوں کا علم حاصل تھا[۲] تو اُس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے، اور ہر قسم کا تعلق رکھنا بھی جائز ہے۔[۳] لیکن

---

(۱۰) لم أقف علی ذلك الكتاب.

(۱) جو شخص اللہ جل شانہ کے سوا علمِ غیب کسی دوسرے کو ثابت کرے اور اللہ تعالیٰ کے برابر کسی دوسرے کا علم جانے، وہ بے شک کافر ہے۔ اس کی امامت اور اس سے میل جول، محبت، مودت: سب حرام ہیں۔ (فتاویٰ رشیدیہ مع تالیفات رشیدیہ- مولانا رشید احمد گنگوہی، (م: ۸/ جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ موافق ۱۱/ اگست ۱۹۰۵ء)، ص: ۴۷، کتاب الایمان والکفر، ط: مکتبۃ الحق، جوگیشوری)

(۲) ثم إن الأنبياء يعلمون كثيرا من الغيب بتعريف الله تعالى إياهم. (تفسير القرطبي- أبو عبد الله محمد بن أحمد الأنصاري الخزرجي شمس الدين القرطبي (م: ۶۷۱ھ): ۱۴/ ۸۲، سورة لقمان، ت: أحمد البردوني وإبراهيم أطفيش، ط: دار الكتب المصرية- القاهرة، الطبعة: الثانية، ۱۳۸۴ھ- ۱۹۶۴م)

(۳) پس اگر عقیدہ زید کا اس سبب سے ہے کہ آپ کو حق تعالیٰ نے علم دیا تھا، تو ایسا سمجھنا خطا صریح ہے اور کفر نہیں اور جو یہ عقیدہ ہے کہ خود بہ خود آپ کو علم تھا بدوں اطلاع حق تعالیٰ کے، تو اندیشہ کفر ہے؛ لہٰذا پہلی شق میں امامت درست ہے، دوسری شق میں امام =

متولی اور ٹرسٹی حضرات کی ذمہ داری ہے کہ ایسے عالم کو تاکید کرے کہ وہ اس طرح سوئے ہوئے فتنوں کو جگا کر لوگوں کو مصیبتوں میں مبتلا نہ کرے، دین کی خدمت کے اور بھی شعبے ہیں، اُن شعبوں کے ذریعے دینی خدمت انجام دے، اس طرح کی باریک، نازک اور علمی باتوں - جن سے لوگوں کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے- سے دور رہے، عوام میں اِس طرح کی باتیں کرنا بند کردے، اور دیگر علماءِ کرام بھی اُن سے بحث ومباحثہ کو چھوڑ دیں، اور خدمتِ دین میں لگے رہیں، فتاویٰ رشیدیہ سے جو بات نقل کی ہے اُس کا حوالہ لکھیں، پھر جواب دیا جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] کیا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے؟

۵۶-سوال: ذیل میں لکھے گئے سوال وجواب کو احقر نے یہاں (دیوا) کی مسجد کے بلیک بورڈ پر لکھا ہے، لکھنے کا قصد یہ تھا کہ میں نے تعلیم میں علمِ غیب کے مسئلہ کو ذکر کیا تھا، لیکن کچھ لوگوں کی طرف سے غلط بات پھیلنے کی وجہ سے احقر نے مذکورہ مسئلہ کو سوال جواب کی صورت میں بلیک بورڈ پر لکھ دیا ہے، گذارش یہ ہے کہ مذکورہ مسئلہ صحیح ہو، تو تصدیق فرمائیں، اور اگر اصلاح کی ضرورت ہو، تو اصلاح فرمائیں!

سوال: کیا سرورِ کائنات رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے؟

جواب: عالم الغیب تو صرف اللہ تعالیٰ ہیں، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور کوئی بھی مخلوق عالم الغیب نہیں ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے شمار غیب کی باتیں بتلائی تھیں، لیکن اُس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں ہو سکتے ہیں، وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، قرآن وحدیث سے یہی ثابت ہے، بزرگانِ دین، سلفِ صالحین اور بڑے اساتذۂ کرام کا بھی یہی عقیدہ ہے، حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرتے دم تک اِس عقیدے پر قائم رکھے۔ آمین۔ فقط، والسلام۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ مسئلہ جس کسی کتاب سے نقل کیا ہو، صحیح ہے؛ لیکن اس طرح کی باتیں کہ رسول اللہ

=نہیں بنانا چاہیے، اگر چہ کافر کہنے سے بھی زبان کو روکے اور تاویل کرے۔ (فتاویٰ رشیدیہ مع تالیفات رشیدیہ- مولانا رشید احمد گنگوہی، (م: ۱۳۲۳ھ- ۱۹۰۵ء)، ص: ۱۰۲، کتاب الایمان والکفر، ط: مکتبۃ الحق، جوگیشوری)

الغرض سائل نے جس بات کی نسبت عالم ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی جانب کی ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔

ﷺ کو بہ ذریعۂ وحی بہت سی غیب کی باتیں بتائی گئی تھیں، لیکن اُس کی وجہ سے آپ ﷺ کا عالم الغیب ہونا ثابت نہیں ہوتا، (۱) اُس کو ہر مسلمان جانتا ہے، اِس طرح کی باتوں کو عوام میں ظاہر کرنا خوابیدہ فتنوں کو بے دار کرنے کے برابر ہے، اس لیے اس طرح کی باتوں سے بچنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

---

(۱) قال اللہ تعالى: ﴿قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ﴾. (۲۷-النمل: ۶۵)

عن عائشة رضي الله عنها، قالت: "من حدثك أن محمدا صلى الله عليه وسلم رأى ربه، فقد كذب، وهو يقول «: {لا تدركه الأبصار} [الأنعام: ۱۰۳] ، »ومن حدثك أنه يعلم الغيب، فقد كذب، وهو يقول «: لا يعلم الغيب إلا الله ". (صحيح البخاري: ۲/ ۱۰۹۸، رقم الحديث: ۷۳۸۰، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالى: {عالم الغيب فلا يظهر على غيبه أحدا}، ط: البدر - ديوبند)

وبالجملة علم الغيب بلا واسطة كلا أو بعضا مخصوص بالله جل وعلا، لا يعلمه أحد من الخلق أصلا. (روح المعاني - شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م: ۱۲۷۰ھ): ۱۰/ ۲۲۳، سورة النمل، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت، الطبعة: الأولى، ۱۴۱۵ھ)

لو تزوج بشهادة الله ورسوله لا ينعقد، ويكفر لاعتقاده أن النبي يعلم الغيب. (البحر الرائق: ۳/ ۹۴، كتاب النكاح، ط: دار الكتاب الاسلامي)

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۖ وَمَا كُنْتَ
لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿۴۴﴾ (۳-آل عمران:۴۴)

باب مایتعلق بالحاضر والناظر

(حاضر وناظر کی بحث)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[حاضر و ناظر کی بحث]

[۱] جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر نہیں مانتا ہے، وہ ''یا محمد'' کہہ سکتا ہے؟

۵۷-سوال: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر ناظر نہیں مانتا ہوں، میرا عقیدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں قبر اطہر میں آرام فرما رہے ہیں، تو کیا میں ''یا محمد'' کہہ سکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکور شرط کے موافق محبت میں (محض تخیل کے طور پر) کہنا جائز ہے۔(۱)

[۲] عشاء کی نماز کے بعد مولود کا پروگرام رکھنا اور سلام پڑھنا

۵۸-سوال: بہت سے گاؤں میں رات کو عشاء کی نماز کے بعد مولود کا پروگرام رکھا جاتا

---

(۱) یا ارادۂ استعانت واستغاثہ یا باعتقاد حاضر و ناظر ہونے کے منہی عنہ ہے، اور بدون اس اعتقاد کے محض شوقاً واستلذاذاً مأذون فیہ ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۵/ ۳۸۵، کتاب العقائد والکلام، یا رسول اللہ کہنا، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند)

جب انبیاء علیہم السلام کو علم غیب نہیں تو ''یا رسول اللہ'' کہنا بھی ناجائز ہوگا، اگر یہ عقیدہ کر کے کہے کہ وہ دور سے سنتے ہیں بسبب علم غیب کے، تو خود کفر ہے، اور جو یہ عقیدہ نہیں، تو کفر نہیں، مگر کلمہ مشابہ بہ کفر ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ، ص: ۹۲، کتاب ایمان اور کفر کے مسائل، ''یا رسول اللہ'' پکارنا، ط: تھانوی، دیوبند)

(مزید دیکھیے: کفایت المفتی: ۱/ ۱۹۹، کتاب العقائد، ط: دار الاشاعت کراچی، پاکستان)

حضرت مفتی عبد الرحیم صاحب فرماتے ہیں: نیز حاضر و ناظر کے بغیر فقط جوش محبت میں یا رسول اللہ کہا جائے، یہ بھی جائز ہے، کبھی غایت محبت اور شدید غم کی حالت میں حاضر و ناظر کے تصور کے بغیر غائب کے لیے لفظ ندا بولتے ہیں، یہ بھی جائز ہے، کبھی صرف تخیل کے طریقے کے ساتھ شاعرانہ وعاشقانہ خطاب کیا جاتا ہے، اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۲/ ۱۰۹، کتاب السنۃ والبدعۃ، ط: دار الاشاعت-کراچی ☆ امداد الفتاویٰ: ۵/ ۳۸۵، کتاب العقائد والکلام ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند)

ہے، جس میں گاؤں کے مولوی حضرات یکے بعد دیگرے کھڑے ہوکر نظم پڑھتے ہیں، اس کے بعد وعظ ہوتا ہے یا کسی کتاب کی تعلیم ہوتی ہے، پھر تمام حاضرین 'بہ شمول مولوی حضرات' کھڑے ہوکر سلام پڑھتے ہیں، کوئی ایک مولوی صاحب حاضرین کو پڑھاتے ہیں اور ان کی تلقین پر دوسرے حضرات پڑھتے ہیں اور سلام کے الفاظ یہ ہیں: یا نبی سلام علیک، یا رسول سلام علیک، یا حبیب سلام علیک، صلوات اللہ علیک، اسی طرح پورا سلام پڑھتے ہیں، اس کے متعلق شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مولود شریف یعنی نبی کریم ﷺ کی مبارک سیرت کو بیان کرنا بڑے ثواب کا کام ہے اور جس مجلس میں آپ ﷺ کا ذکر مبارک ہو، وہ بڑی برکت والی مجلس ہوتی ہے۔[1] لیکن اس میں قیام کرنا اور دوسروں کو قیام (کھڑے ہونے) کے لیے مجبور کرنا[2] اور یہ سمجھنا کہ ہماری اس مجلس میں آں حضرت ﷺ تشریف لاتے ہیں؛ یہ سب ناجائز امور ہیں۔[3] البتہ حاضر وناظر کا اعتقاد رکھے بغیر محبت

---

(۱) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تحریر فرماتے ہیں: ذکر ولادت شریف نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مثل دیگر اذکار خیر کے ثواب اور افضل ہے اگر بدعات اور قبائح سے خالی ہو، اس سے بہتر کیا ہے۔

قال الشاعر: وذكرك للمشتاق خير شراب	وكل شراب دونه كسراب.

(امداد الفتاویٰ: ۵/ ۲۴۹، کتاب البدعات، محفل مولود شریف، ط: ادارہ تالیفات اولیا، دیوبند)

(۲) سادساً: وقت ذکر ولادت کے کھڑے ہوتے ہیں، پھر اس میں بعض کا عقیدہ تو یہ کہ جناب رسول اللہ ﷺ اس وقت تشریف رکھتے ہیں یہ تو بالکل شرک ہے، اگر علم یا قدرت بالذات کا عقیدہ ہو، ورنہ کذب وافترا علی اللہ والرسول ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۵/ ۲۵۰)

''مجلس مولود'' مجلس خیر وبرکت ہے، درصورت کہ ان قیودات مذکورہ سے خالی ہو، فقط بلا قید ووقت معین وبلا قیام وبغیر روایت موضوع مجلس خیر وبرکت ہے، صورت موجودہ جو مروج ہے، بالکل خلاف شرع ہے اور بدعت ضلالہ ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ، ص: ۱۱۴، محمد خلیل الرحمن، ط: تھانوی، دیوبند)

عن أبي أمامة، قال: خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم متوكئا على عصا فقمنا إليه فقال: «لا تقوموا كما تقوم الأعاجم، يعظم بعضها بعضا». (سنن أبي داود: ۲/ ۷۱۰، رقم: ۵۲۳۰، كتاب الأدب، باب الرجل يقوم للرجل، ط: المكتبة الأشرفية- ديوبند)

(۳) اللہ کے رسول ﷺ کے مجلس میں موجود ہونے کا عقیدہ گمراہی ہے، جیسا کہ اس پر مندرجہ ذیل قرآنی آیات ونبوی ارشادات دال ہیں:

قال اللہ تعالی: ﴿وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۖ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ﴾ (۳- آل عمران: ۴۴)=

میں کبھی کبھار 'یارسول اللہ' کہنا جائز ہے۔[۴] واللہ اعلم بالصواب

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ
۲۸/ ۳/ ۱۹۷۷ء

[۳] حاضر و ناظر کون ہیں؟

۵۹-سوال: تاریخ: ۱/ ۳/ ۸۳ء کو شہر آنند میں مولوی مدنی کچھولوی رضاخانی کا بیان ہوا، جس میں انہوں نے اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف باتیں لوگوں کے سامنے پیش کیں، مثلاً '' شیطان

= من صلى علي عند قبري وكل بها ملك يبلغني، وكفي أمر دنياه، وآخرته، وكنت له يوم القيامة شفيعا أو شهيدا. (أمالي ابن سمعون الواعظ- ابن سمعون الواعظ، أبو الحسين البغدادي (م: ۳۸۷ھ)، ص: ۲۲۸، رقم الحديث: ۲۵۶، أول المجلس السادس عشر، ت: د. عامر حسن صبري، ط: دار البشائر الإسلامية- بيروت)
و قال البيهقي بعد ذكر هذا الحديث بهذا اللفظ: هذا لفظ حديث الأصمعي، وفي رواية الحنفي قال: عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: " من صلى علي عند قبري سمعته، ومن صلى علي نائيا أبلغته ". (شعب الإيمان- البيهقي: ۳/ ۱۴۰، رقم: ۱۴۸۱، تعظيم النبي صلى الله عليه وسلم و إجلاله الخ ط: مكتبة الرشد- الرياض ☆ حياة الأنبياء صلوات الله عليهم بعد وفاتهم- البيهقي، ص: ۱۰۳، رقم الحديث: ۱۸، ت: د. أحمد بن عطية الغامدي، ط: مكتبة العلوم و الحكم - المدينة المنورة ☆ الترغيب و الترهيب- أبو القاسم، الملقب بقوام السنة (م: ۵۳۵ھ): ۲/ ۳۱۷، رقم: ۱۶۶۲، باب الصاد، باب الترغيب في الصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم، ت: أيمن بن صالح بن شعبان، ط: دار الحديث -القاهرة:)

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: فليبلغ الشاهد الغائب. (صحيح البخاري: (ص)، رقم الحديث: ۱۷۳۹، كتاب المناسك، باب الخطبة أيام منى، عن ابن عباس رضي الله عنهما، ط: مكتبة البدر- ديوبند)
اس حدیث میں اللہ کے نبی نے بعد میں آنے والوں کو اپنے سے غائب کہا ہے؛ اگر آپ حاضر و ناظر ہوتے، تو دوسروں کو خود سے غائب کیوں کہتے؟؟؟

(۴) حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب رقم فرماتے ہیں: حاضر و ناظر کے عقیدے کے بغیر فقط جوشِ محبت میں '' یارسول اللہ '' کہا جائے، یہ بھی جائز ہے، کبھی غایت محبت اور شدید غم کی حالت میں حاضر و ناظر کے تصور کے بغیر غائب کے لیے لفظ ندا بولتے ہیں، یہ بھی جائز ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۲/ ۱۰۹، یارسول اللہ کہنا کیسا ہے؟ ط: دار الاشاعت، کراچی، پاکستان)
فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلے میں رقم طراز ہیں: '' یارسول اللہ '' اس عقیدے سے کہنا کہ حضور ﷺ اس آواز کو خود سنتے ہیں، ناجائز ہے، اور اس عقیدے سے کہنا کہ ملائکہ آپ ﷺ کو اس کی اطلاع کرتے ہیں، درست ہیں؛ لیکن عوام کے عقائد میں ضرور اس سے فساد آتا ہے، لہٰذا اس سے بچنا چاہیے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱/ ۳۴۷-۳۴۸، ما یتعلق بالاستمداد بغیر اللہ، انبیائے کرام کو پکارنا، ط: اشرفی بک ڈپو، دیوبند)

حاضر و ناظر ہے، آپ ﷺ حاضر و ناظر ہیں؛ لیکن اللہ تعالی حاضر و ناظر نہیں ہیں۔ (نعوذ باللہ من ذلک) اس نے اپنی بات کو مدلل کرتے ہوئے کہا کہ مذکورہ عقیدے کا ذکر بہت سی قرآنی آیات اور احادیث رسول (ﷺ) میں موجود ہے، مزید اس نے علماء دیوبند اور مبلغین دین سے بہت سے چیلنج کیے، جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ نہایت پریشان اور شک وشبہ میں مبتلا ہیں، اب آپ سے دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

کیا اللہ تعالی حاضر و ناظر نہیں ہے؟ اور کیا رسول اور شیطان حاضر و ناظر ہیں؟ قرآن کریم اور حدیث پاک کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداو مصليا:

آپ نے سوال میں جس عقیدے کا ذکر کیا ہے، وہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے، اس کی تردید میں شروع ہی سے بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے، اس سلسلے میں میں اپنی ایک کتاب "عقائد اسلام"(۱) بھیج رہا ہوں، اس کے مطالعہ سے حق واضح ہوجائے گا، اس کتاب کی روشنی میں لوگوں کے اصلاح کی فکر کیجیے اور ان کی غلط فہمی دور کیجیے، ان شاء اللہ نفع ہوگا۔

حاضر و ناظر کا صحیح مطلب سمجھیے! حاضر کے معنی کسی جگہ یا مکان میں موجود ہونا۔(۲) یہ صرف اللہ کے لیے خاص ہے، ارشاد ہے: نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ.(۳) ناظر کے معنی ہے: دیکھنا اور دیکھ کر علم حاصل کرنا۔(۴) یہ بھی صرف اللہ تعالی ہی کے ساتھ مخصوص ہے، ارشاد ہے: "عَالِمُ

(۱) عقائد اسلام، مترجم اردو، سن طباعت: ۱۴۳۴ھ، ۲۰۱۳ء، ناشر: حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات صاحب

(۲) موجود...... جو سامنے موجود ہو۔ (جامع فیروز اللغات، ص: ۵۶۱، ط: نعیمیہ، دیوبند)

(۳) ۵-ق: ۱۶۔

(۴) ناظر: (عربی) دیکھنے والا۔ (جامع فیروز اللغات، ص: ۱۳۴۲، ط: نعیمیہ، دیوبند)

(حاظر و ناظر) یہ دونوں عربی لفظ ہیں، جن کے معنی ہیں "موجود اور دیکھنے والا" اور جب ان دونوں کو ملا کر استعمال کیا جاتا ہے، تو اس سے مراد ہوتی ہے: "وہ شخصیت جس کا وجود کسی خاص جگہ میں نہیں؛ بل کہ اس کا وجود بہ یک وقت ساری کائنات کو محیط ہے اور کائنات کی ایک ایک چیز کے تمام حالات اول سے آخر تک اس کی نظر میں ہیں"...... "حاضر و ناظر" کا یہ مفہوم صرف اللہ تعالی کی ذات پر صادق آتا ہے اور یہ صرف اسی کی شان ہے، (اختلاف امت اور صراط مستقیم: ۱/۷۳، دیوبندی، بریلوی اختلاف، حاضر و ناظر، ط: مکتبہ مدنیہ اردو بازار لاہور)

الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ. (۵)، ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: "قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللهُ". (۶) اسی طرح اور دوسری آیات میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے، ان کی تفسیر پڑھ لیجیے، عقائد اسلام میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

آپ ﷺ عالم الغیب نہیں ہیں۔ (۷) ہر جگہ حاضر و ناظر بھی نہیں ہیں۔ (۸) مدنی صاحب نے جس بے بنیاد اور گمراہ کن عقیدے کا اپنے بیان میں ذکر کیا ہے، اس کو ماننے سے انسان ایمان سے محروم ہوسکتا ہے، اس نے اپنی بات کو مدلل کرتے ہوئے جو یہ کہا ہے کہ اس عقیدے پر بہت سی قرآنی آیات اور احادیث رسول (ﷺ) موجود ہے، تو سوال یہ ہے کہ بخاری شریف میں مکررات چھوڑ کر تقریباً ۳۰۰۰ تین ہزار احادیث ہیں، حدیث پاک کی دوسری کتابوں میں سے صرف اسی ایک کتاب کی کوئی ایک ہی حدیث پیش کی جائے، جس میں عقیدہ مذکورہ کا ذکر ہو۔ ان کا یہ دعویٰ غلط اور بے بنیاد ہے، جسے قرآن کریم کی کسی آیت مبارکہ یا کسی حدیث پاک سے ثابت نہیں کیا جاسکتا، بل کہ بہت سی آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ سے یہ بات صراحت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے کہ "حاضر و ناظر" صرف اللہ عز وجل کی ذات ہے، اللہ تعالیٰ سب کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۵) ۶۴ - التغابن: ۱۸ ☆ ۶۲ - الجمعة: ۸ ☆ ۵۹ - الحشر: ۲۲ ☆ ۳۹ - الزمر: ۴۶ ☆ ۳۲ - السجدة: ۶ ☆ ۲۳ - المؤمنون: ۹۲ ☆ ۱۳ - الرعد: ۹ ☆ ۹ - التوبة: ۹۴ ☆ ۶ - الأنعام: ۷۳۔

(۶) ۲۷ - النمل: ۶۵۔

(۷) ثم إعلم أن الأنبياء لم يعلموا المغيبات من الأشياء إلا ما أعلمهم الله تعالى أحياناً، وذكر الحنفية تصريحاً بالتكفير باعتقاد أن النبي - عليه الصلاة والسلام - يعلم الغيب، لمعارضة قوله تعالى: - قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللهُ. (شرح فقه اکبر: ص ۱۸۵، الناس في حق رجال الغيب ثلثة أحزاب، ط: یاسر ندیم - دیوبند)

(۸) انظر رقم الهامش: ۴.

□

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ (۳۳-الاحزاب:۲۱)

باب السیرۃ والشمائل

(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارکہ]

[۱] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک معاہدہ میں شرکت اور غیر مسلموں سے عام خیر خواہی کا معاہدہ

۶۰-سوال: بعض واعظین کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رسالت سے پہلے ایک معاہدہ میں شرکت کی تھی، تو کیا اس کی کوئی اصل ہے؟ اور کیا غیر مسلموں سے محلہ، گاؤں، یا ملکی سطح پر کسی قسم کا معاہدہ جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت سے قبل ایک معاہدہ میں شرکت فرمائی تھی، اس معاہدہ کو ’’حلف الفضول‘‘ کہا جاتا ہے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ۲۵ / سال تھی۔[۱] چناں چہ حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں عبداللہ بن جدعان کے گھر منعقد ہونے والے معاہدہ میں شریک رہا ہوں، مجھے اس معاہدہ کے بدلے میں سرخ اونٹ بھی پسند نہیں ہیں۔ اور اگر اسلام میں مجھے دوبارہ اس معاہدہ کے لیے آواز دی جائے، تو میں ضرور لبیک کہوں گا۔[۲]

(۱) قال المحقق: قالوا: وكان حلف الفضول قبل المبعث بعشرين سنة في شهر ذي القعدة، وكان بعد حرب الفجار بأربعة أشهر. (الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان- محمد بن حبان، التميمي، أبو حاتم، الدارمي، البستي (م: ۳۵۴هـ): ۱۰/ ۲۱۸، برقم الحديث: ۴۳۷۳، ترتيب: الأمير علاء الدين علي بن بلبان الفارسي (م: ۷۳۹هـ) ت: شعيب الأرنؤوط، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت)

(۲) عن طلحة بن عبد الله بن عوف، أن رسول الله- صلى الله عليه وسلم -قال: "لقد شهدت في دار عبد الله بن=

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام میں جاہلیت کا حلف نہیں ہے، ہاں جو حلف زمانہ جاہلیت کے ہیں (اور وہ نیکی اور بھلائی پر مشتمل ہیں) اسلام ان کو مزید قوت بخشتا ہے اور مضبوط کرتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید ارشاد فرمایا: دار الندوہ میں جو عہد و معاہدہ ہوا تھا، اس کے توڑنے پر مجھے سرخ اونٹ بھی دیے جائیں، تو خوشی نہیں ہوگی۔ (۳)

قرآن شریف میں ہے: {وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۔ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ} (۴) تم ایک دوسرے کی تقویٰ اور نیکی کے کام میں مدد کرو اور گناہ اور ظلم کے کام میں مدد نہ کرو۔ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں غرباء و مساکین کی امداد کا حکم ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دار الندوہ کے معاہدہ پر خوشی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا: ''اگر اس کے توڑنے پر سرخ اونٹ بھی مل جائیں، تو مجھے یہ پسند نہیں''؛ کیوں کہ وہ معاہدہ جاہلیت کے ایک رواج کے موافق غریب، مسکین، یتیم اور بیوہ کی مدد کے سلسلہ میں تھا۔ اور یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسالت کے بعد ارشاد فرما رہے ہیں۔ ان تمام نصوص سے ظاہر ہے کہ اگر کافر، مشرک، یہود یا نصاریٰ کے ساتھ اس قسم کا معاہدہ محلہ، گاؤں یا ملکی سطح پر کیا جائے، تو جائز ہے، اس میں کوئی ممانعت نہیں۔ (۵) فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

=جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم، ولو أدعى به في الإسلام لأجبت ". (السنن الكبرى-أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۵۹۶/۶، رقم الحديث: ۱۳۰۸۰، كتاب قسم الفيء والغنيمة، باب إعطاء الفيء على الديوان ومن يقع به البداية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۳) عن ابن عباس، قال: قال رسول الله-صلى الله عليه وسلم-: «لا حلف في الإسلام، وكل حلف كان في الجاهلية لم يزده الإسلام إلا شدة، وما يسرني أن لي حمر النعم، وأني نقضت الحلف الذي كان في دار الندوة. (الأحاديث المختارة-ضياء الدين المقدسي (م: ۶۴۳هـ): ۲۵۱/۱۲، رقم الحديث: ۲۸۱، باب: محمد بن عبد الرحمن أبو الأسود أو غيره عن عكرمة، ط: دار خضر للطباعة والنشر والتوزيع-بيروت)

(۴)-۵ المائدة: ۲

(۵) وقال الإمام النووي: المنفي حلف التوارث، وما يمنع منه الشرع، وأما التحالف على طاعة الله، ونصر المظلوم، والمؤاخاة في الله تعالى، فهو أمر مرغوب فيه. (فتح الباري-ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲هـ): ۵۰۲/۱۰، باب الإخاء والحلف، كتاب الأدب، ط: دار المعرفة، بيروت ☆ شرح النووي على صحيح مسلم: ۳۰۸/۲، كتاب الفضائل، باب مواخات النبي-صلى الله عليه وسلم-الخ، ط: البدر-ديوبند)

[۲] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جادو کے تجربے کا انتساب کرنے والے کا شرعی حکم

۶۱-سوال (۱): ایک صاحب نے یہ کہا ہے کہ ''ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی جادو کی مشق کرتے تھے'' اس طرح کی بکواس کرنے والے کے متعلق شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

[۳] قرآنی آیات سے جادو سیکھنے کے قائل شخص کا حکم

۶۲-سوال (۲): اللہ رب العزت کے پاک کلام 'قرآن مجید' میں جادو کا ذکر ہے۔ (نعوذ باللہ) اور آیات قرآنی سے جادو سیکھا جاسکتا ہے۔ ایک سند یافتہ عالم نے یہ بات کہی ہے، اس کے متعلق شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟ امید ہے کہ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں گے۔

(عبد الرشید مولوی عبد الجلیل)

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱-۲) جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جادو کی مشق کرنے والا گردانتا ہو، وہ کافر ومرتد ہے۔ (۱) نیز جو شخص یہ کہتا ہو کہ قرآن مجید میں جادو کا بیان ہے اور اس کی آیات سے جادو سیکھ سکتے ہیں، اگر اس کی مراد اس جملے سے یہ ہو کہ نعوذ باللہ قرآن کریم میں جادو سیکھنے کے طریقے بیان کیے گئے ہیں، اور اس کی آیتوں سے جادو سیکھے جاسکتے ہیں، تو ایسا کہنے والا شخص کافر ومرتد ہے۔ (۲)

---

(۱) اعلم وفقنا اللہ وإياك أن جميع من سب النبي -صلى الله عليه وسلم- أو عابه أو ألحق به نقصا في نفسه أو نسبه، أو دينه، أو خصلة من خصاله، أو عرض به، أو شبهه بشيء على طريق السب له، أو الإزراء عليه، أو التصغير لشأنه، أو الغض منه والعيب له فهو ساب له. والحكم فيه حكم الساب يقتل... وكذلك من لعنه أو دعا عليه، أو تمنى مضرة له، أو نسب إليه ما لا يليق بمنصبه على طريق الذم، أو عبث في جهته العزيزة بسخف من الكلام، وهجر ومنكر من القول وزور. وهذا كله إجماع من العلماء وأئمة الفتوى من لدن الصحابة رضوان الله عليهم إلى هلم جرا. (الشفاء بتعريف حقوق المصطفى لقاضي عياض: ۲/ ۲۱۴، الباب الأول في بيان ما هو في حقه -صلى الله وليه وسلم-... الخ، ط: دار الفكر بيروت ★الصارم المسلول على شاتم الرسول: ۱/ ۵۲۵، المسئلة الثانية أنه يقتل ولا يستتاب، الخ، ط: الحرس الوطني السعوية، ت: محمد محي الدين عبد الحميد)

(۲) کیوں کہ اس جملے سے قرآن کریم کی جانب عیب کی باتوں کو منسوب کرتا ہے، جو کفر ہے: أو تسخر باية من القرآن... أو عاب كفر. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۶۶، كتاب السير، مطلب في موجبات الكفر أنواع، منها: ما يتعلق بالقرآن، ط: دار الفكر، بيروت)

ان کی عورتیں بھی نکاح سے نکل گئیں، دوبارہ کلمہ پڑھ کر اس عقیدے سے توبہ کرے، پھر نکاح کی تجدید کرے۔ (۱) اور اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ جادو کے متعلق بیان ہے، جس طرح کہ قرآن مجید میں کافر، مشرک منافق، چور اور زانی وغیرہ کا بیان ہے، تو ایمان سے نہیں نکلے گا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ
۱۹۷۶/۱۰/۷

رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ - چند سوالات و جوابات

[۴] حضور ﷺ سے چشمہ پہننا ثابت نہیں ہے

۶۳-سوال: کیا رسول اللہ ﷺ عینک (چشمہ) پہنتے تھے؟ اگر پہنتے تھے، تو اُس کی تفصیل مطلوب ہے۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

رسول اللہ ﷺ کی مبارک آنکھیں طبعی نور سے بھرپور تھیں، صحیح بخاری کی روایت ہے جس کو ''مرقاۃ شرح مشکوٰۃ'' میں بھی نقل کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ اپنی چشمِ پرنور سے پیچھے کی جانب بھی اسی طرح دیکھتے تھے، جس طرح آگے کی جانب دیکھتے تھے۔ (۳) لہٰذا آپ ﷺ کو عینک (چشمہ) وغیرہ کی

---

(۱) ثم إن كانت نية القائل الوجه الذي يمنع التكفير، فهو مسلم، وإن كانت نيته الوجه الذي يوجب التكفير لا تنفعه فتوى المفتي، ويؤمر بالتوبة والرجوع عن ذلك وبتجديد النكاح بينه وبين امرأته. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۸۳، كتاب السير، قبيل الباب العاشر في البغاة، ط: دار الفكر، بيروت)

(۲) ثم إن كانت نية القائل الوجه الذي يمنع التكفير، فهو مسلم. (المصدر السابق)

(۳) عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: هل ترون قبلتي ها هنا فو الله ما يخفى علي خشوعكم ولا ركوعكم إني لأراكم من وراء ظهري. (صحيح البخاري: ۱/ ۵۹، رقم: ۴۱۸، كتاب الصلوة، باب عظة الإمام الناس في إتمام الصلاة، وذكر القبلة☆ ورقم: ۷۱۹، كتاب الأذان، باب إقبال الناس على الإمام ...الخ☆ ورقم: ۷۲۵، كتاب الأذان، باب إلزاق المنكب بالمنكب والقدم بالقدم في الصف، ط: البدر، ديوبند)

انظر مرقاة المفاتيح - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۲/ ۶۷۰، كتاب الصلوة، باب صفة الصلوة، و ۳/ ۸۲۹، كتاب الصلوة، باب تسوية الصف، ط: دار الفكر - بيروت)

کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۵] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ٹوپی پہننا ثابت ہے

۶۴-سوال: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی ٹوپی پہنی ہے؟ اگر پہنی ہے، تو اُس کی تفصیل مطلوب ہے۔

الجواب حامداً و مصلیا:

حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعتِ مبارکہ میں انتہائی درجہ لطافت تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے سر مبارک میں تیل لگایا کرتے تھے، پھر اُس پر مثل پٹی کے ایک کپڑا باندھ دیتے، پھر اُس کپڑے کے اوپر ٹوپی اور اُس پر عمامہ پہنتے تھے، محدثین نے لکھا ہے کہ چوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ کثرت تیل لگایا کرتے تھے؛ اس لیے بال مبارک پر اولاً کپڑا باندھ لیا کرتے تھے؛ تاکہ ٹوپی اور عمامے پر تیل نہ لگ جائے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ٹوپی پہنتے تھے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام کی کیفیت

۶۵-سوال: کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کھڑے رہنے کے متعلق کچھ تفصیل مروی ہے؟

الجواب حامداً و مصلیا:

محض کھڑا رہنا کوئی اہم مقصدِ زندگی نہیں ہے، میری نظر سے اس طرح کا کوئی ذکر نہیں گزرا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم غفرلہ

---

(۱) عن أنس بن مالك، قال: «كان رسول الله- صلى الله عليه وسلم- يكثر دهن رأسه، وتسريح لحيته، ويكثر القناع، كأن ثوبه ثوب زيات» (شرح السنة-محيي السنة، أبو محمد الحسين بن مسعود البغوي الشافعي (م: ۵۱۶ھ): ۱۲/ ۸۲، رقم: ۳۱۶۴، كتاب اللباس، باب ترجيل الشعر و تدهينه، ت: شعيب الأرنؤوط- محمد زهير الشاويش، ط: المكتب الإسلامي- دمشق، بيروت)

قال الملاعلي القاري في شرحه: (القناع) خرقة تلقى على الرأس تحت العمامة بعد استعمال الدهن وقاية للعمامة من أثر الدهن واتساخها به. (مرقاة المفاتيح: ۷/ ۲۸۲۳، كتاب اللباس، باب الترجل، ط: دار الفكر-بيروت)

[۷] حضور ﷺ کا غصہ

۲۶-سوال: کیا آپ ﷺ کبھی غضب ناک ہوتے تھے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

دین کے خلاف کسی بھی کام کو آپ ﷺ دیکھتے، تو لوجہ اللہ غضب ناک ہوجاتے، ورنہ عام احوال میں آپ ﷺ کی بردباری کا یہ عالم تھا کہ روایات میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کی خاطر کسی سے انتقام نہیں لیا۔ [۱] کچھ ایسے لوگ جو دین سے ناواقف ہیں؛ غصہ کو مطلقاً معیوب سمجھتے ہیں، یہ غلط ہے، جب دینی امور کی اعلانیہ پردہ دری ہورہی ہو اور مفاہمت کسی طرح کارآمد ثابت نہ ہو، اُس وقت غصے کا اظہار کرنا اور حسبِ استطاعت اُس منکر کو روکنے میں اپنی مقدور بھر طاقت صرف کرنا ایمانی تقاضہ ہے، روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غضب ناک ہوتے، تو آپ ﷺ کا چہرۂ انور ایسا سُرخ ہوجاتا گویا اُن پر انار کے دانے نچوڑ دیے گئے ہوں۔ [۲]

ایک طویل حدیث میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے سامنے تورات کا کوئی مضمون پڑھ رہے تھے، جس سے آپ ﷺ غضب ناک ہوئے، حضرت ابوبکرؓ نے فوراً محسوس کرلیا اور حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اے عمر! کیا آپ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھتے نہیں کہ آپ کے تورات پڑھنے سے آپ ﷺ پر کیا اثر ہورہا ہے؟ چناں چہ حضرت عمرؓ فوراً متنبہ ہوئے اور پڑھنا بند کردیا معذرت کے ساتھ یہ عرض کرنے لگے کہ "**رضينا بالله ربا، و بالإسلام دينا، و بمحمد-صلى الله عليه وسلم- نبيا**"۔ (یعنی ہم اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مان کر، دین اسلام کو اپنا دین مان کر اور حضرت محمد ﷺ کو اپنا نبی

---

(۱) عن عائشة-رضي الله عنها- أنها قالت: ما خير رسول الله-صلى الله عليه وسلم- بين أمرين إلا أخذ أيسرهما، ما لم يكن إثما، فإن كان إثما، كان أبعد الناس منه، وما انتقم رسول الله-صلى الله عليه وسلم- لنفسه إلا أن تنتهك حرمة الله فينتقم لله بها. (صحيح البخاري: ۱/ ۵۰۳، رقم: ۳۵۶۰، كتاب المناقب، باب صفة النبي صلى الله عليه وسلم، ط: البدر - ديوبند ☆ ورقم: ۶۱۲۶، كتاب الأدب، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: يسروا ولا تعسروا. ☆ صحيح مسلم: ۲/ ۲۵۶، رقم: ۷۷-(۲۳۲۷)، كتاب الفضائل، باب مباعدته صلى الله عليه وسلم للآثام واختياره من المباح... الخ، ط: البدر-ديوبند)

(۲) خرج رسول الله-صلى الله عليه وسلم-على أصحابه، وهم يختصمون في القدر، فكأنما يفقأ في وجهه، حب الرمان من الغضب،... (الحديث) (سنن ابن ماجة-أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني (۲۰۹-۲۷۳ھ)، ص: ۹، رقم: ۸۵، باب في القدر، ط: فيصل-ديوبند)

مان کر خوش ہیں) یہ سن کر آپ ﷺ کا غصہ ختم ہوا۔ (۳)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب العلم میں اس کے متعلق مستقل باب قائم فرمایا ہے اور اُس کے ماتحت تین روایتیں ذکر فرما کر یہ ثابت کیا ہے کہ جب کوئی استاذ درس کے دوران اپنے شاگرد کی کسی ناشائستہ حرکت کو دیکھے، تو اُس کے لیے تنبیہ کے خاطر غضب کا اظہار کرنا درست ہے۔ (۴)

اِس سے ثابت ہوا کہ دینی امور کے پیش نظر حدود میں رہ کر نیک نیتی کے ساتھ غصہ کرنا جائز ہے؛ لیکن ساتھ میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ آپ ﷺ کا ایسا فعل جو بہ حالتِ غضب صادر ہوا ہو، وہ بھی ادلہ شرعیہ میں شمار ہوگا۔ (۵) یہ مرتبہ افرادِ امت میں سے کسی کے لیے نہیں ہے؛ لہٰذا فقہاء نے لکھا ہے کہ قاضی کے لیے بہ حالتِ غضب کوئی فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ (۶) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۳) عن جابر، أن عمر بن الخطاب أتى رسول الله -صلى الله عليه وسلم- بنسخة من التوراة فقال: يا رسول الله هذه نسخة من التوراة. فسكت فجعل يقرأ ووجه رسول الله -صلى الله عليه وسلم- يتغير، فقال أبو بكر: ثكلتك الثواكل، أما ترى ما بوجه رسول الله -صلى الله عليه وسلم-؟ فنظر عمر إلى وجه رسول الله -صلى الله عليه وسلم- فقال: أعوذ بالله من غضب الله ومن غضب رسوله، رضينا بالله ربا وبالإسلام دينا وبمحمد نبيا. فقال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: »والذي نفس محمد بيده لو بدا لكم موسى فاتبعتموه وتركتموني لضللتم عن سواء السبيل، ولو كان حيا وأدرك نبوتي لاتبعني. (سنن الدارمي (م: ۲۵۵هـ): ۱/ ۴۰۳، رقم: ۴۴۹، باب ما يتقى من تفسير حديث النبي -صلى الله عليه وسلم، ت: حسين سليم أسد الداراني ط: دار المغني-السعودية)

(۴) ر: صحيح البخاري: ۱/ ۲۰، كتاب العلم، باب الغضب في الموعظة والتعليم، وإذا رأى ما يكره، رقم الحديث: ۹۰، ۹۱، ۹۲، ط: البدر-ديوبند.

إن المعلم إذا رأى منهم ما يكرهه يغضب عليهم وينكر عليهم. عمدة القاري: ۲/ ۱۰۵، ط: دار إحياء التراث العربي.

(۵) عن عبد الله بن عمرو قال: كنت أكتب كل شيء أسمعه من رسول الله -صلى الله عليه وسلم- أريد حفظه فنهتني قريش وقالوا أتكتب كل شيء تسمعه ورسول الله -صلى الله عليه وسلم- بشر، يتكلم في الغضب والرضا، فأمسكت عن الكتاب، فذكرت ذلك لرسول الله -صلى الله عليه وسلم- فأومأ بأصبعه إلى فيه، فقال: اكتب، فو الذي نفسي بيده ما يخرج منه إلا حق. (سنن أبي داؤد، ص: ۵۱۴، كتاب العلم، كتابة العلم، رقم: ۳۶۴۶، ط: البدر-ديوبند)

(انظر صحيح ابن خزيمة-أبو بكر، ابن خزيمة النيسابوري (م: ۳۱۱هـ): ۴/ ۲۶، رقم: ۲۲۸۰، كتاب الزكاة، باب النهي عن الجلب عند أخذ الصدقة... الخ، ت: د. محمد مصطفى الأعظمي، ط: المكتب الإسلامي-بيروت)

(۶) ويقال: أراد البخاري الفرق بين قضاء القاضي وهو غضبان، وبين تعليم العلم وتذكير الواعظ، فإنه بالغضب أجدر، وخصوصا بالموعظة. (عمدة القاري: ۲/ ۱۰۵، ط: دار إحياء التراث العربي)

عن عبد الرحمن بن أبي بكرة قال: كتب أبي وكتبت له إلى عبيد الله بن أبي بكرة وهو قاض بسجستان أن لا تحكم=

[۸] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور گھڑی

۶۷-سوال: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گھڑی پہننا ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

گھڑی اُس زمانے میں نہیں تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی گھڑی نہیں پہنی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نماز اشراق

۶۸-سوال: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اشراق کی کتنی رکعت پڑھتے تھے؟

الجواب حامداومصلیا:

اشراق کی دو یا چار رکعت پڑھنا مسنون ہے۔ (زاد المعاد: ۱/ ۹۳)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صلاۃ اوابین

۶۹-سوال: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوابین کی کتنی رکعت پڑھتے تھے؟

=بين اثنين وأنت غضبان فإني سمعت رسول الله -صلى الله عليه وسلم- يقول: لا يحكم أحد بين اثنين وهو غضبان.
(صحيح مسلم: ۲/ ۷۷، كتاب الأقضية، باب كراهة قضاء القاضي وهو غضبان، رقم: ۱۶-(۱۷۱۷)، ط: البدر-ديوبند)
(وانظر أيضا: سنن النسائي، كتاب اداب القضاة، ذكر ما ينبغي للحاكم أن يجتنبه، رقم: ۵۴۰۶☆مسند أحمد: ۳۴/ ۱۱۲، رقم: ۲۰۳۶۷)

فإن عرض له أي للقاضي هم أو نعاس أو غضب ... كف عن القضاء. (مجمع الأنهر: ۲/ ۱۶۰، كتاب القضاء، فصل في الحبس، ط: دار إحياء التراث العربي)

(وأيضا البحر الرائق: ۶/ ۳۰۳، كتاب القضاء، تقليد القضاء من السلطان العادل ... الخ، دار الكتاب الإسلامي)

(۱) عن معاذ بن أنس الجهني أن رسول الله- صلى الله عليه و سلم- قال: من قعد في مصلاه حين ينصرف من صلاة الصبح حتى يسبح ركعتي الضحى لا يقول إلا خيرا، غفر الله له خطاياه وإن كانت مثل زبد البحر. (زاد المعاد في هدي خير العباد -ابن القيم الجوزية (م: ۷۵۱هـ): ۱/ ۳۳۵، فصل في هديه صلى الله عليه و سلم، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت☆سنن أبي داؤد، ص: ۱۸۲، كتاب الصلاة، باب صلاة الضحى، رقم: ۱۲۸۷، ط: البدر-ديوبند)

عن نعيم بن همار قال: سمعت رسول الله -صلى الله عليه و سلم- يقول: قال الله -عز و جل-: يا ابن آدم لا تعجزن عن أربع ركعات في أول النهار أكفك آخره. (زاد المعاد: ۱/ ۳۳۶، ☆سنن الترمذي: ۱/ ۱۰۸، عن أبي الدرداء، أبواب الوتر، باب ماجاء في صلوة الضحى، رقم: ۴۷۵، ط: یاسر ندیم-دیوبند)

الجواب حامداً ومصلیاً:

اوّابین کی کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعت پڑھنا ثابت ہے۔ (زاد المعاد: ۱/ ۲۱۸)[۱]

[۱۱] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افطاری

۷۰-سوال: آپ صلی اللہ علیہ وسلم سحر و افطار میں کیا کھاتے تھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سحر و افطار کے لیے کسی بھی چیز کا کوئی خاص اہتمام یا التزام نہیں فرماتے تھے، بروقت جو بھی چیز میسر ہو جاتی، اُسی کو تناول فرما لیتے ،عمومی احوال میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ یہی تھی، امام بخاریؒ نے ثابت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پانی اور کھجور کے ذریعہ یا جو کوئی بھی چیز میسر ہو جاتی، اُسی سے افطار فرما لیتے تھے؛ البتہ کھجور یا چھوہارے کو پسند فرماتے تھے، نیز مستدرکِ حاکم، ترمذی شریف، فتح الباری شرح بخاری شریف اور مشکوۃ المصابیح (۲) میں بھی اس طرح کی روایات ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ اگر کھجور موجود ہوتیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن میں سے تین کھجوروں کے ذریعہ افطار فرماتے، ورنہ ایسی چیز سے افطار فرماتے جو آگ پر پکائی نہ گئی ہو۔ (بخاری شریف: ۱/ ۲۶۲)[۳] واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن أنس مرفوعا "من صلى الضحى ثنتي عشرة ركعة، بنى الله له قصرا من ذهب في الجنة". (زاد المعاد: ۱/ ۳۳۶، ط: مؤسسة الرسالة☆سنن الترمذي: ۱/ ۱۰۸، أبواب الوتر، باب ما جاء في صلاة الضحى، ط: ياسر نديم- ديوبند☆سنن ابن ماجة، كتاب إقامة الصلاة، والسنة فيها، باب ما جاء في صلاة الضحى، رقم: ۱۳۸۰)

(۲) عن أنس بن مالك قال كان النبي صلى الله عليه وسلم يفطر قبل أن يصلي على رطبات، فإن لم تكن رطبات، فتميرات، فإن لم تكن تميرات، حسا حسوات من ماء. (سنن الترمذي: ۱/ ۱۵۰، أبواب الصوم، باب ما جاء ما يستحب عليه الإفطار، رقم: ۶۹۶، ۶۹۳، ط: ياسر نديم- ديوبند)

(مشكاة المصابيح، ص: ۱۷۵، كتاب الصوم، باب: الفصل الثاني، رقم: ۱۹۹۱، ط: فيصل- ديوبند)

(المستدرك على الصحيحين - الحاكم النيسابوري: ۱/ ۵۹۶، رقم: ۱۵۷۴، كتاب الصوم، و أما حديث شعبة)

(صحيح ابن حبان: ۸/ ۲۸۱، رقم: ۳۵۱۴، ذكر الإخبار عما يستحب للصائم الإفطار عليه، باب الإفطار و تعجيله)

(فتح الباري - ابن حجر العسقلاني: ۴/ ۱۹۸، ط: دار المعرفة- بيروت)

(۳) باب: يفطر بما تيسر بالماء و غيره.

عبد الله بن أبي أوفى - رضي الله عنه- قال: سرنا مع رسول الله - صلى الله عليه وسلم - وهو صائم فلما غربت الشمس، قال انزل فاجدح لنا، قال: يا رسول الله! لو أمسيت، قال: انزل فاجدح لنا. قال: يا رسول الله! إن عليك نهارا. قال:=

[۱۲] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور نوافل

۷۱-سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون کون سی سنن ونوافل گھر میں پڑھتے تھے؟

الجواب حامداومصلیا:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز کے علاوہ دوسری تمام سنن ونوافل گھر ہی میں پڑھتے تھے، اور فرماتے تھے کہ ''تم اپنے گھروں میں بھی نمازیں پڑھتے رہو اور اُن کو قبرستان نہ بناؤ'' (زاد المعاد: ۱/ ۸۲)(۱)

یعنی قبرستان میں جس طرح مُردے کوئی عمل نہیں کر سکتے؛ اس طرح اپنے گھروں کو عبادت سے خالی نہ رکھو؛ بل کہ نماز کے ذریعہ اُنہیں آباد رکھو۔ البتہ موجودہ دور میں مسجد ہی میں سنن ونوافل پڑھنا بہتر ہے، اس لیے کہ اگر گھر میں پڑھنے کے لیے کہا جائے، تو اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ آدمی فرض نماز کے بعد مسجد سے نکل کر دنیوی مشاغل میں لگ جائے، اور سنن ونوافل سے بالکل غافل ہو جائے، نتیجہ یہ ہو کہ نہ گھر میں پڑھ سکے اور نہ مسجد میں۔(۲) واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسواک

۷۲-سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسواک کب فرماتے تھے؟ صرف صبح میں یا ہر نماز کے وقت؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خصوصی طور سے ہر نماز کے لیے وضو فرض تھا، اُس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم

=انزل فاجدح لنا. فنزل، فجدح، ثم قال: إذا رأيتم الليل أقبل من ها هنا، فقد أفطر الصائم، وأشار بإصبعه قبل المشرق. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۶۲، كتاب الصوم، رقم: ۱۹۵۶، البدر - ديوبند)

(۱) أيها الناس صلوا في بيوتكم؛ فإن أفضل صلوة المرء في بيته، إلا المكتوبة. (زاد المعاد: ۱/ ۳۰۵، فصول في هديه- صلى الله عليه وسلم- في العبادات، فصل: في هديه- صلى الله عليه وسلم- في السنن والرواتب، ط: مؤسسة الرسالة- بيروت)

عن ابن عمر عن النبي- صلى الله عليه وسلم- قال: صلوا في بيوتكم ولا تتخذوها قبورا. (صحيح مسلم: ۱/ ۲۶۵، رقم: ۲۰۹- (۷۷۷) كتاب الصلوة، باب استحباب صلاة النافلة في بيته، ط: البدر - ديوبند)

(۲) وفي الدر المختار: والأفضل في النفل غير التراويح المنزل إلا لخوف شغل عنها، والأصح أفضلية ما كان أخشع وأخلص. قال ابن عابدين: وحيث كان هذا أفضل يراعى ما لم يلزم منه خوف شغل عنها لو ذهب لبيته، أو كان في بيته ما يشغل باله ويقلل خشوعه، فيصليها حينئذ في المسجد؛ لأن اعتبار الخشوع أرجح. (رد المحتار مع الدر المختار: ۲/ ۲۲، كتاب الصلوة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الفكر - بيروت)

کے لیے ہر نماز سے پہلے مسواک لازم قرار دیا گیا۔(۱) اس کے علاوہ قرآن پاک پڑھنے کے لیے، سونے سے پہلے، نیند سے بیدار ہونے کے بعد اور گھر میں داخل ہوتے وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسواک کرنا ثابت ہے۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ناشتہ

۷۳-سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت ''ناشتہ'' کرتے تھے؟ اگر کرتے تھے، تو اُس

(۱) إن رسول الله صلى الله عليه وسلم أمر بالوضوء لكل صلاة، طاهرا، وغير طاهر، فلما شق ذلك عليه، أمر بالسواك لكل صلاة. (سنن أبي داؤد: ۱/ ۷، رقم: ۴۸، كتاب الطهارة، باب السواك، ط: البدر-ديوبند☆ وانظر: شرح معاني الآثار: ۱/ ۴۲، رقم: ۲۲۴، باب الوضوء هل يجب لكل صلاة أم لا؟ ط: عالم الكتب☆ السنن الكبرى-ابو بكر البيهقي: ۷/ ۷۹، رقم: ۱۳۳۲۸)

(۲) عن حذيفة أن رسول الله-صلى الله عليه وسلم- كان إذا قام من الليل يشوص فاه بالسواك. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۸، رقم الحديث: ۲۴۵، كتاب الوضوء، باب السواك، ط: البدر- ديوبند☆ رقم: ۸۸۹، كتاب الجمعة، باب السواك يوم الجمعة☆ و رقم: ۱۱۳۶، كتاب الجمعة، باب طول القيام في صلاة الليل☆ صحيح مسلم: ۱/ ۱۲۸، رقم: ۴۶-(۲۵۵)، و ۴۷-(۲۵۵) كتاب الطهارة، باب السواك، ط: البدر- ديوبند☆ سنن أبي داود: ۱/ ۸، رقم: ۵۵، كتاب الطهارة، باب السواك لمن قام من الليل، ط: البدر-ديوبند)

عن المقدام بن شريح، عن أبيه، قال: سألت عائشة، قلت: بأي شيء كان يبدأ النبي صلى الله عليه وسلم إذا دخل بيته؟ قالت: بالسواك. (صحيح مسلم: ۱/ ۱۲۸، رقم: ۴۳-(۲۵۳)، كتاب الطهارة، باب السواك، ط: البدر- ديوبند☆ سنن أبي داود: ۱/ ۸، رقم: ۵۱، كتاب الطهارة، باب في الرجل يستاك بسواك غيره، ط: البدر-ديوبند☆ سنن النسائي، رقم: ۸، كتاب الطهارة، السواك في كل حين)

ويستحب لتغير الفم، والقيام من النوم، وإلى الصلوة، ودخول البيت، واجتماع الناس، وقراءة القرآن. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح-حسن بن عمار الشرنبلالي (م: ۱۰۶۹ھ)، ص: ۳۲، كتاب الطهارة، فصل: في سنن الوضوء، ط: المكتبة العصرية)

عبد الله بن عباس قال: بت ليلة عند النبي صلى الله عليه وسلم فلما استيقظ من منامه، أتى طهوره، فأخذ سواكه، فاستاك ثم تلا هذه الآيات { إن في خلق السموات والأرض واختلاف الليل والنهار لآيات لأولي الألباب } حتى قارب أن يختم السورة أو ختمها، ثم توضأ فأتى مصلاه، فصلى ركعتين، ثم رجع إلى فراشه، فنام ما شاء الله ثم استيقظ ففعل مثل ذلك ثم رجع إلى فراشه، فنام ثم استيقظ، ففعل مثل ذلك، ثم رجع إلى فراشه فنام، ثم استيقظ ففعل مثل ذلك، كل ذلك يستاك ويصلي ركعتين ثم أوتر. (سنن أبي داؤد: ۱/ ۸، رقم: ۵۸، كتاب الطهارة، باب السواك لمن قام بالليل، ط: البدر-ديوبند)

وقت کیا تناول فرماتے تھے؟

الجواب حامداومصلیا:

رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی کے تیرہ سال اور ہجرت کے بعد سات سال آپ ﷺ پر بہت تنگی اور تکالیف ومصائب کے گزرے ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بسااوقات تین تین مہینے کا طویل عرصہ گزر جاتا؛ مگر گھر میں چولہا نہ جلتا تھا، صرف ''اسودین'' یعنی کھجور اور پانی پر آپ ﷺ گذر بسر فرما لیتے، گھر میں اناج یا غلہ وغیرہ کوئی چیز نہ ہوتی' جسے پکایا جائے، آپ ﷺ کے فقرِ اختیاری کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی صحابیؓ کھجور یا دودھ وغیرہ لے آتے، تو اُسے تناول فرما لیتے۔[۱] اور یہی حال ازواجِ مطہرات کا بھی تھا، کہ آپ ﷺ اُن تمام کو سالانہ اخراجات کے لیے جو کچھ بھی دیتے، اکثر ازواجِ مطہرات اُس کو غرباء اور حاجت مندوں میں خرچ فرما دیتیں، آپ ﷺ کی سخاوت کا بحرِ ذخار تو اُس سے بھی کہیں بڑھ کر تھا، اس لیے کسی بھی چیز کی ذخیرہ اندوزی آپ ﷺ کو پسند نہ تھی۔[۲] چائے اور ناشتہ تو درکنار؛ ضروری کھانے پینے کے لیے بھی آپ ﷺ کوئی خاص انتظام نہیں فرماتے تھے، وقت پر جو کچھ بھی میسر ہوتا، اُسے بہ خوشی تناول فرماتے، چائے کا رواج اُس زمانے میں نہ تھا، میرے علم کے مطابق چائے کی ایجاد تقریباً دوصدی قبل کی ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ چائے کی کمپنی کے ملازمین مجھے چائے کے پیکٹ بیچنے کے لیے دیتے اور چائے بنا کر مفت پلاتے تھے، ہندوستان میں اُسے آئے سو/ ۱۰۰ سال ہوئے ہوں گے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں چائے کا وجود ہی نہ تھا، صبح میں بھی آپ ﷺ کی جانب سے کوئی کھانا پہلے سے طے نہ ہوتا، جو کچھ بھی میسر ہوتا، آپ ﷺ تناول فرما لیتے۔

---

(۱) عن عائشة رضي الله عنها، أنها قالت لعروة: ابن أختي »إن كنا لننظر إلى الهلال، ثم الهلال، ثلاثة أهلة في شهرين، وما أوقدت في أبيات رسول الله -صلى الله عليه وسلم- نار « . فقلت يا خالة: ما كان يعيشكم؟ قالت: "الأسودان: التمر والماء، إلا أنه قد كان لرسول الله -صلى الله عليه وسلم- جيران من الأنصار، كانت لهم منائح، وكانوا يمنحون رسول الله -صلى الله عليه وسلم- من ألبانهم، فيسقينا". (صحيح البخاري: ۱/ ۳۴۹، كتاب الهبة، رقم: ۲۵۶۷، ۶۴۵۹، ط: البدر- ديوبند)

(۲) عن أنس قال: كان النبي -صلى الله عليه وسلم- لا يدخر شيئا لغد. (سنن الترمذي: ۲/ ۶۱، رقم: ۲۳۶۲، أبواب الزهد، باب ما جاء في معيشة النبي -صلى الله عليه وسلم- وأهله، ط: ياسر نديم- ديوبند)

''مختصر شمائل ترمذی''، صفحہ نمبر: ۱۷۲ر پڑھیں، تمام تفصیلات مذکور ہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوقات کی تقسیم

۷۴-سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اوقات کی تقسیم کس طرح فرماتے تھے؟

الجواب حامداومصلیا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم فرمایا تھا، ایک حصہ اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص تھا، دوسرا حصہ اہل وعیال کے حقوق کی ادائیگی کے لیے، جس میں ازواجِ مطہرات کی خبر پرسی، اُن کے ساتھ نشست وبرخاست اور دیگر امورِ خانہ داری میں اُن کا تعاون فرماتے اور تیسرے حصے میں سے کچھ وقت آرام فرماتے، اور بقیہ وقت تبلیغ دین اور ارشادِ امت کے لیے وقف تھا، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم حاجت مندوں کی حاجت، دینی مسائل کے متعلق سوال کرنے والوں کے تشفی بخش جوابات اور مسلمانوں کے دینی و دنیوی اہم امور کے متعلق صحابۂ کرامؓ کی خاص جماعت سے مشورہ فرماتے۔ (نفح الطیب)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی

۷۵-سوال: بعثت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کسبِ معاش کے لیے کیا کیا؟

الجواب حامداومصلیا:

بعثت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسبِ معاش کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں فرمایا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تفریح

۷۶-سوال: آپ صلی اللہ علیہ وسلم تفریح کے لیے کہاں تشریف لے جاتے تھے؟

الجواب حامداومصلیا:

انسان کو تھکن دور کرنے اور اکتاہٹ ختم کرنے کے لیے تفریح کی ضرورت ہوتی ہے، اور حضور

---

(۱) شمائل ترمذی گجراتی (از: صاحب فتاویٰ حضرت مفتی احمد ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ) کا اردو ترجمہ صاحب زادۂ محترم جناب حافظ اسجد صاحب (خادم مسجد عمر، کینیڈا) کی کوشش سے مکمل کرلیا گیا ہے اور طباعت کے مرحلے میں ہے۔
[۲] کتاب نہیں ملی۔

پاک ﷺ کی شان یہ تھی کہ آپ ﷺ کو ایک روایت کے مطابق تیس جنتی [۱] اور ایک روایت کے مطابق چالیس جنتی آدمی کی طاقت دی گئی تھی۔ [۲] اور اہل جنت میں سے ایک آدمی کی طاقت ایک سو عام انسانوں کے برابر ہے۔ [۳] لہٰذا آپ ﷺ کے قویٰ اس اعتبار سے تین یا چار ہزار آدمیوں کے قویٰ کے برابر ہوئے، حاصل یہ ہے کہ جس شخصیتِ عظمیٰ میں اتنی طاقت ہو، اُسے تھکن یا اکتاہٹ چھو بھی نہیں سکتی؛ پھر تفریح کی ضرورت ہی کیا ہے۔

دیگر یہ کہ آپ ﷺ کے تمام اوقات ذکرِ الٰہی اور ارشادِ انام میں صرف ہوتے تھے، مخلوق کی رہنمائی کے بعد جو بھی وقت ملتا، آپ ﷺ اُسے ''توجہ الی الخالق'' میں صرف فرماتے، چناں چہ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ **"جعلت قرة عيني في الصلاة"**. [۴] یعنی نماز تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے،

---

(١) أنس بن مالك قال: كان النبي -صلى الله عليه وسلم- يدور على نسائه في الساعة الواحدة، من الليل والنهار، وهن إحدى عشرة. قال: قلت لأنس أو كان يطيقه؟ قال: كنا نتحدث أنه أعطي قوة ثلاثين. وقال سعيد، عن قتادة، إن أنسا، حدثهم: تسع نسوة. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۱، رقم: ۲۶۸، كتاب الغسل، باب إذا جامع ثم عاد، ومن دار على نسائه في غسل واحد، ط: البدر - ديوبند ☆ انظر مسند الإمام أحمد: ۲۱/ ۲۷۴، رقم: ۱۳۱۰۹، مسند المكثرين من الصحابة، مسند انس بن مالك رضي الله تعالى عنه)

(۲) عن ابن طاوس، عن أبيه، قال: أعطي رسول الله -صلى الله عليه وسلم- قوة أربعين رجلا في الجماع. (بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث-أبو محمد الحارث بن محمد المعروف بابن أبي أسامة (م: ۲۸۲هـ): ۲/ ۸۷۷، كتاب علامات النبوة، باب فيما فضله الله به وأجله صلى الله عليه وسلم، ت: د. حسين أحمد صالح الباكري، ط: مركز خدمة السنة والسيرة النبوية - المدينة المنورة ☆ انظر: كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال-علاء الدين المتقي الهندي (م: ۹۷۵هـ): ۱۱/ ۴۰۶، رقم: ۳۱۸۹۶، ۳۱۸۹۷، حرف الفاء، ت: بكري حياني-صفوة السقا، ط: مؤسسة الرسالة)

عن مجاهد قال: أعطي رسول الله-صلى الله عليه وسلم- قوة بضع وأربعين رجلا، كل رجل من أهل الجنة. (بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث: ۲/ ۸۷۸، رقم: ۹۴۴، كتاب علامات النبوة)

(۳) عن زيد بن أرقم قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الرجل من أهل الجنة ليعطى قوة مائة رجل في الأكل والشرب والجماع والشهوة... الخ ☆ مصنف ابن أبي شيبة: ۷/ ۳۳، ما ذكر في الجنة وما فيها مما أعد لأهلها، رقم: ۳۳۹۹۴، ط: مكتبة الرشد- رياض ☆ مسند الإمام أحمد: ۳۲/ ۱۹، رقم: ۱۹۲۶۹، ط: موسسة الرسالة- بيروت ☆ وسنن الدارمي: ۳/ ۱۸۶۵، رقم: ۲۸۶۷، باب: في أهل الجنة ونعيمها. ط: دار المغني-السعودية)

(۴) الآثار-أبو يوسف يعقوب بن إبراهيم الأنصاري (م: ۱۸۲هـ): ۵۷، رقم: ۲۸۳، باب السهو، ت: أبو الوفا، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ المعجم الكبير-أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰هـ): ۲۰/ ۴۲۰، رقم: ۱۰۱۲)

جسے یادِ الٰہی میں اس قدر مزہ آرہا ہو، اُسے تفریح کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسفار

۷۷-سوال: کیا ہجرتِ مدینہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ملک کا سفر فرمایا تھا؟

الجواب حامداومصلیا:

ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفرِ جہاد کے علاوہ اور کوئی سفر نہیں فرمایا، جہاد کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیبر [۱] (جسے اب خُبر کہا جاتا ہے) اور تبوک [۲] (جو ملک شام کی جانب ہے) کا سفر کرنا ثابت ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۱۹] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اونٹ اور خچر پر سواری کرنا

۷۸-سوال: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے علاوہ گھوڑے یا خچر پر سواری فرمائی ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے علاوہ گھوڑے اور خچر پر بھی سواری فرمائی ہے، گھوڑوں کے رنگ اور خصوصیات کے اعتبار سے اُن کے نام بھی روایات میں مذکور ہیں، ایک روایت میں دس اور دوسری میں

---

(۱) فقال معاذ: غزونا مع رسول الله -صلى الله عليه وسلم- خيبر، فأصبنا فيها غنما، فقسم فينا رسول الله -صلى الله عليه وسلم- طائفة، وجعل بقيتها في المغنم. (سنن أبي داؤد، ص: ۳۷۰، رقم: ۲۷۰۷، كتاب الجهاد، باب في بيع الطعام إذا فضل عن الناس في أرض العدو، ط: البدر- ديوبند، السنن الكبرى-أبوبكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۹/ ۱۰۳، رقم: ۱۸۰۰۳، كتاب السير، باب ما فضل في يده من الطعام و العلف في دار الحرب، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)
(انظر مسند الشاميين-أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰هـ): ۲/ ۱۸۳، رقم: ۱۱۵۴، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)
(۲) عن أبي حميد الساعدي، قال: غزونا مع النبي -صلى الله عليه وسلم- غزوة تبوك، ... الحديث. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۰۰، رقم: ۱۴۸۱، كتاب الزكاة، باب خرص التمر، ط: البدر- ديوبند)
عن مصعب بن سعد عن أبيه أن رسول الله-صلى الله عليه و سلم- خرج إلى تبوك، و استخلف عليا ... الحديث. (صحيح البخاري: ۲/ ۶۳۳، رقم: ۴۴۱۶، كتاب المغازي، باب غزوة تبوك وهي غزوة العسرة، ط: البدر- ديوبند)

پندرہ گھوڑوں پر سواری کا بیان ہے۔ (زاد المعاد: ۱/ ۳۴)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات

[۲۰] حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور پنکھا

۷۹-سوال: کیا گرمی کی شدت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پنکھے کا استعمال کیا ہے؟ اگر استعمال منقول ہے، تو وہ پنکھا کیسا تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جواب: پنکھے کے متعلق احادیث میں کہیں کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"ما بين بيتي و منبري روضة من رياض الجنة". (۲)

یعنی میرے گھر اور منبر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغات میں کا ایک ٹکڑا ہے، اب غور کیجئے کہ جب جنت میں گرمی نہیں ہے، تو اس جگہ بھی گرمی نہیں ہو سکتی، لہذا پنکھے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم (یعنی تمام گناہوں سے پاک) تھے، علماء نے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معصوم ہونے کی وجہ سے جنتی آدمی کی طرح دنیا میں بھیجا گیا

---

(۱) فمن الخيل: السكب. قيل: وهو أول فرس ملكه، وكان اسمه عند الأعرابي الذي اشتراه منه بعشر أواق الضرس، وكان أغر محجلا طلق اليمين كميتا. وقيل كان أدهم.ـــــــ والمرتجز، وكان أشهب وهو الذي شهد فيه خزيمة بن ثابت. ـــــــ واللحيف، واللزاز، والظرب، وسبحة، والورد. فهذه سبعة متفق عليها،... وقيل: كانت له أفراس أخر خمسة عشر، ولكن مختلف فيها، وكان دفتاسرجه من ليف.

وكان له من البغال دلدل، وكانت شهباء أهداها له المقوقس. وبغلة أخرى. يقال لها: "فضة". أهداها له فروة الجذامي، وبغلة شهباء أهداها له صاحب أيلة، وأخرى أهداها له صاحب دومة الجندل، وقد قيل: إن النجاشي أهدى له بغلة فكان يركبها.ـــــــ ومن الحمير عفير وكان أشهب، أهداه له المقوقس ملك القبط، وحمار آخر أهداه له فروة الجذامي. وذكر أن سعد بن عبادة أعطى النبي صلى الله عليه وسلم حمارا فركبه. (زاد المعاد في هدي خير العباد - ابن القيم الجوزية (م:۷۵۱هـ): ۱/ ۱۲۸ - ۱۲۹، فصل في دوابه صلى الله عليه وسلم، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت)

(۲) صحيح البخاري: ۱/ ۱۵۹، رقم: ۱۱۹۵، كتاب العمل في الصلاة، باب فضل ما بين القبر والمنبر، عن عبد الله بن زيد المازني، ط: البدر - ديوبند ☆ انظر صحيح مسلم، رقم: ۵۰۰ - (۱۳۹۰) و ۵۰۱ - (۱۳۹۰) باب ما بين القبر والمنبر روضة من رياض الجنة ☆ سنن الترمذي، رقم: ۳۹۱۶، أبواب المناقب، باب ما جاء في فضل المدينة)

تھا۔ [۱] اور جنتی کو جنت میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی نہایت سادہ تھی، جو امت کے لیے سادگی کا سبق تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی سادگی کے ساتھ زندگی بسر فرمائی کہ روایات میں منقول ہے کہ سخت کھردرے بچھونے کے اثرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک پر نمایاں بھی ہوجاتے۔ [۲] لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نرم گدا یا تکیہ وغیرہ استعمال نہیں فرمایا، لہٰذا پنکھے کے استعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فقط، واعلم بالصواب۔

[۲۱] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گرم پانی استعمال کرنا

۸۰-سوال: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی گرم پانی سے غسل فرمایا ہے؟ اور وہ گرم پانی کتنا ہوتا تھا؟

الجواب حامداومصلیا:

پانی کے گرم ہونے کی صراحت میری نظر سے نہیں گذری ہے، البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں دو رطل پانی استعمال فرماتے تھے۔ (ابوداود: ۱/ ۱۳، ترمذی: ۱/ ۹) [۳]

اور غسل میں آٹھ رطل پانی استعمال فرماتے تھے۔ (ابوداود: ۱/ ۱۳، بخاری: ۱/ ۳۹، ترمذی: ۱/ ۹) [۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) لم أجده.

(۲) الحديث طويل، والجزء المقصود منه ... فلما بلغت حديث أم سلمة تبسم رسول الله -صلى الله عليه وسلم- وإنه لعلى حصير ما بينه وبينه شيء، وتحت رأسه وسادة من أدم حشوها ليف، وإن عند رجليه قرظا مصبوبا، وعند رأسه أهب معلقة، فرأيت أثر الحصير في جنبه فبكيت، فقال: »ما يبكيك؟« فقلت: يا رسول الله إن كسرى وقيصر فيما هما فيه، وأنت رسول الله، فقال: »أما ترضى أن تكون لهم الدنيا ولنا الآخرة«. (صحيح البخاري: ۲/ ۷۳، رقم: ۴۹۱۳، كتاب التفسير، باب قوله تعالى: قد فرض الله... الخ، ط: البدر-ديوبند)

(۳) عن أنس، قال: كان النبي -صلى الله عليه وسلم- يتوضأ بإناء يسع رطلين، ويغتسل بالصاع. قال أبو داود: ... وسمعت أحمد بن حنبل، يقول: الصاع خمسة أرطال، وهو صاع ابن أبي ذئب، وهو صاع النبي صلى الله عليه وسلم. (سنن أبي داود: ۱/ ۱۳، رقم: ۹۵، كتاب الطهارة، باب ما يجزئ من الماء في الوضوء، ط: البدر-ديوبند)
(سنن الترمذي: ۱/ ۱۸، رقم: ۵۶، أبواب الطهارة، باب الوضوء من المد، ط: ياسر نديم-ديوبند)

(۴) المصادر السابقة.
قال سمعت أبا سلمة يقول دخلت أنا وأخو عائشة على عائشة فسألها أخوها عن غسل النبي -صلى الله عليه وسلم- فدعت بإناء نحوا من صاع، فاغتسلت وأفاضت على رأسها وبيننا وبينها حجاب. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۹، =

[۲۲] حضور اکرم ﷺ اور شکار

۸۱-سوال: کیا رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی جانور کا شکار کیا تھا؟ اگر کیا تھا، تو کون سے ہتھیار سے؟

الجواب حامداو مصلیا:

شکار کے متعلق روایات میں کوئی ثبوت نہیں ملتا؛ البتہ آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اونٹ کی قربانی فرمائی ہے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] حضور اکرم ﷺ گھر سے وضو فرما کر مسجد جاتے تھے

۸۲-سوال: رسول اللہ ﷺ وضو گھر میں کرنے کے بعد مسجد میں جاتے تھے، یا مسجد میں وضوء فرماتے تھے؟

الجواب حامداو مصلیا:

آپ ﷺ ہمیشہ گھر سے وضو کر کے مسجد تشریف لاتے، اُس وقت عام مسجدوں میں یا مسجدِ نبوی کے باہر وضو کے لیے کوئی باقاعدہ نظم نہیں تھا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] حضور اکرم ﷺ نے وعظ کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں فرمایا تھا

۸۳-سوال: کیا رسول اللہ ﷺ نے وعظ و نصیحت کے لیے کوئی وقت مقرر فرمایا تھا؟

=رقم:۲۵۱، کتاب الغسل، باب الغسل بالصاع ونحوه، ط:البدر-دیوبند)

(وانظر:صحیح مسلم:۱/۱۴۸، رقم:۵۱-(۳۲۵)، كتاب الحيض، باب القدر المستحب من الماء في غسل الجنابة. . . الخ ☆سنن النسائي، رقم:۳۲۶، كتاب المياه، باب القدر الذي يكتفي به الإنسان من الماء للوضوء والغسل)

(۱) في حديث طويل: ثم انصرف إلى المنحر، فنحر ثلاثا وستين بيده، ثم أعطى عليا، فنحر ما غبر. (صحيح مسلم: ۱/۳۹۹، رقم:۱۴۷-۱۲۱۸، كتاب الحج، باب حجة النبي صلى الله عليه وسلم، ط:البدر-ديوبند)

نوٹ: آپ ﷺ سے مینڈھے کی قربانی کرنا بھی ثابت ہے، ملاحظہ ہو:

عن أنس قال ضحى النبي -صلى الله عليه وسلم- بكبشين أملحين، فرأيته واضعا قدمه على صفاحهما، يسمي ويكبر فذبحهما بيده. (صحيح البخاري، رقم:۵۵۵۸، كتاب الأضاحي، باب من ذبح الأضاحي بيده، ط:البدر-ديوبند)

الجواب حامداً ومصلیاً:

وعظ ونصیحت کے لیے آپ ﷺ کی جانب سے کوئی وقت مقرر نہیں تھا، امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں اس کے متعلق دو باب قائم فرمائے ہیں:

(۱) باب ما كان النبي -صلى الله عليه وسلم- يتخولهم بالموعظة والعلم، كي لا ينفروا. (۱)

(۲) باب من جعل لأهل العلم أياما معلومة. (۲)

پہلے باب میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور دیگر صحابۂ کرامؓ سے متعدد روایات منقول ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرامؓ کے نشاط کا خیال رکھتے ہوئے کچھ دن ناغہ کرتے اور کچھ دن نصیحت فرماتے تھے۔ (۳) دوسرے باب میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ ان سے ایک تلمیذ نے یہ درخواست کی کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ سے روزانہ نصائح سنیں، تو آپؓ نے فرمایا کہ میں تمہارے نشاط کا خیال رکھتے ہوئے کچھ دن ناغہ کرتا ہوں، جیسا کہ آپ ﷺ بھی اسی طرح ہمارے نشاط کا خیال رکھتے ہوئے وقتاً فوقتاً نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ (۴) واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۲۵] حضور ﷺ کا بنیان پہننا ثابت نہیں ہے

۸۴-سوال: کیا آپ ﷺ بنیان پہنتے تھے؟

---

(۱) صحيح البخاري: ۱/۱۶، ط: البدر - ديوبند.

(۲) المصدر السالف.

(۳) عن ابن مسعود قال: كان النبي -صلى الله عليه وسلم- يتخولنا بالموعظة في الأيام، كراهة السآمة علينا. (صحيح البخاري: ۱/۱۶، رقم: ۶۸، كتاب العلم، باب: ما كان النبي -صلى الله عليه وسلم- يتخولنا ... الخ، ط: البدر - ديوبند)

(۴) عن أبي وائل، قال: كان عبد الله يذكر الناس في كل خميس، فقال له رجل: يا أبا عبد الرحمن لوددت أنك ذكرتنا كل يوم؟ قال: أما إنه يمنعني من ذلك أني أكره أن أملكم، وإني أتخولكم بالموعظة، كما كان النبي -صلى الله عليه وسلم- يتخولنا بها، مخافة السآمة علينا". (صحيح البخاري: ۱/۱۶، رقم: ۷۰، كتاب العلم، باب من جعل لأهل العلم أياما معلومة، ط: البدر - ديوبند)

الجواب حامداو مصليا:

بڈیان پہننا آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] حضور ﷺ سے لنگوٹ پہننا ثابت نہیں ہے

۸۵-سوال: کیا آپ ﷺ چڈی یا لنگوٹ پہنتے تھے؟

الجواب حامداو مصليا:

چڈی یا لنگوٹ پہننا بھی ثابت نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] حضور ﷺ کا بیٹھ کر نماز پڑھنا

۸۶-سوال: رسول اللہ ﷺ کون سی نفل بیٹھ کر پڑھتے تھے؟

الجواب حامداو مصليا:

آپ ﷺ نے بہ حالت مرض فرض نماز بیٹھ کر پڑھی ہے، نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کمزور ہو گئے تھے، تو بیٹھ کر نوافل پڑھتے تھے۔ (بخاری شریف)[۱]

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے۔[۲] لیکن آپ ﷺ نے تعلیم امت کے خاطر بھی بیٹھ کر نماز پڑھی ہے، لہٰذا آپ ﷺ کو اُس نماز کا پورا ثواب ملے گا۔[۳] وتر کے

---

(۱) عن عائشة أم المؤمنين أنها قالت: صلى رسول الله -صلى الله عليه وسلم- في بيته وهو شاك، فصلى جالسا وصلى وراءه قوم قياما، فأشار إليهم أن اجلسوا، فلما انصرف قال: »إنما جعل الإمام ليؤتم به، فإذا ركع، فاركعوا، وإذا رفع، فارفعوا، وإذا صلى جالسا، فصلوا جلوسا«. (صحيح البخاري: ١/ ٩٥، رقم الحديث: ٦٨٨، كتاب الأذان، باب: إنما جعل الإمام ليؤتم به... الخ، ط: البدر - ديوبند)

(۲) عن عمران بن حصين، قال: سألت النبي -صلى الله عليه وسلم- عن صلاة الرجل وهو قاعد، فقال: »من صلى قائما فهو أفضل، ومن صلى قاعدا فله نصف أجر القائم، ومن صلى نائما فله نصف أجر القاعد«. (صحيح البخاري: ١/ ١٥٠، رقم: ١١١٦، كتاب تقصير الصلوة، باب صلاة القاعد بالإيماء، ط: البدر - ديوبند)

(۳) يستثنى منه صاحب الشرع -صلى الله عليه وسلم- كما ورد عنه صلى الله عليه وسلم؛ فإن أجر صلاته قاعدا كأجر صلاته قائما، فهو من خصوصياته. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح -أحمد بن محمد الطحطاوي الحنفي (١٢٣١هـ)، ص: ٤٠٣، فصل في صلاة النفل جالسا... الخ، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

بعد کی دو رکعات کے بارے میں بعض علماء نے فرمایا ہے کہ ان کو اگر کوئی اس نیت سے بیٹھ کر پڑھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح پڑھی ہے، تو اُسے پورا ثواب ملے گا۔[١] اور بعض فرماتے ہیں کہ اُسے آدھا ثواب ملے گا۔[٢] واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[٢٨] کیا نبیٔ پاک ﷺ کا سایہ نہیں تھا؟

٨٧-سوال: کیا آپ ﷺ کا سایہ نہیں تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول اللہ ﷺ کے سایہ نہ ہونے کے بارے میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے، اور جس روایت سے ثابت ہے، وہ روایت مرسل اور ضعیف ہے، مزید تفصیل کے لیے مطالعہ کریں: (فتاویٰ دار العلوم :٥-٦/١٠٦-١٠٥)[٣] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

---

(١) بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ اگر کوئی متبع سنت وتر کے بعد کی دو رکعات گاہے گاہے اس نیت سے بیٹھ کر پڑھے کہ آں حضرت ﷺ بیٹھ کر ادا فرماتے تھے، تو عجب نہیں کہ اُس کو اُس کی نیت کے مطابق پورا اجر و ثواب ملے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ٥/ ٢٢٣، کتاب الصلوۃ، باب النوافل والسنن، ط: دار الاشاعت کراچی)

یہی رجحان حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، مالا بدمنہ میں ہے: ''وبعد وتر دو رکعات نشستہ خواندن مستحب است''۔ (مالا بدمنہ، کتاب الصلوۃ، فصل در نوافل)

اور یہی حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ کی رائے ہے، فیض الباری میں ہے:

و ركعتين جالسا ... أن الجلوس فيهما اتفاقي أو قصدي؟ فاختار النووي رحمه الله تعالى الأول، وعندي المختار هو الثاني؛ لأنهما لم تثبتا عنه قائما قط. فحمل فعله في جميع عمره على الاتفاق مما يصادم البداهة. (فيض الباري: ٢/ ٣٢٦، كتاب التهجد، باب المداومة على ركعتي الفجر، ط: تحت إشراف المجلس العلمي بدابيل-سورت)

(٢) انظر رقم الهامش: (٢) ص: ١٦٣۔

(٣) حضرت تھانوی فرماتے ہیں: ''سایہ نہ ہونے کی ایک روایت صریح بھی نہ گزری، صرف بعض نے ''واجعلني نورا'' سے استدلال کیا ہے کہ نور کا سایہ نہیں ہوتا؛ کیوں کہ سایہ ظلمت ہے، مگر ضعف اس کا ظاہر ہے، شاید حضور ﷺ کے سر پر ابر رہنا اس کی اصل ہو؛ کیوں کہ اس صورت میں ظاہر ہے کہ سایہ نہ ہوگا؛ لیکن خود صحاح میں روایت ہے کہ آپ ﷺ کے سر مبارک پر بعض اوقات سفر میں صحابہ کپڑے کا سایہ کیے ہوئے تھے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابر کا رہنا بھی دائمی نہ تھا۔ (امداد الفتاوی-مولانا اشرف علی تھانوی (م: ١٢٨٠ھ): ٥/ ٣١١، کتاب العقائد والکلام، حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی تحقیق، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند)

سایۂ نبوی (ﷺ) کی مکمل و مدلل تحقیق کے لیے ملاحظہ فرمائیں، کفایت المفتی: ١/ ٨٦، ٨٧، کتاب العقائد، حضور اکرم ﷺ کے سایہ کی تحقیق، ط: دار الاشاعت، کراچی۔

[۲۹] کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کا سایہ زمین پر پڑتا تھا

۸۸-سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا، کیا یہ صحیح بات ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور آپ کی خصوصیات میں یہ ہے کہ دھوپ اور چاندنی رات میں آپ کا سایہ نہیں پڑتا تھا؛ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب ''مدارج النبوۃ''[(۱)] میں، علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی کتاب ''خصائص کبری''[(۲)] میں اور ملا علی قاریؒ نے اپنی کتاب ''شرح شفاء''[(۳)] میں لکھا ہے، ان کی تحریر کا مدار دو احادیث پر ہے، جن میں ایک روایت حکیم ترمذی کی ہے، ان کی اس روایت میں ایک راوی (عبد الملک بن عبد اللہ بن الولید) کے متعلق ''نوادر العلوم'' میں لکھا ہے کہ وہ مجہول ہے اور دوسرے راوی (عبدالرحمان بن قیس)[(۴)] مطعون (جن کے

(۱) مدارج النبوۃ ۱/ ۲۶،

(۲) اخرج الحكيم الترمذي عن ذكوان أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- لم يكن يرى له ظل في شمس، ولا قمر. قال ابن سبع من خصائصه أن ظله كان لا يقع على الأرض، وأنه كان نورا، فكان إذا مشى في الشمس، أو القمر، لا ينظر له ظل. قال بعضهم: ويشهد له حديث قوله -صلى الله عليه وسلم -في دعائه واجعلني نورا. (الخصائص الكبرى- عبد الرحمان بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م:۹۱۱ھ):۱/ ۱۱۶، ذكر المعجزات والخصائص في خلقه الشريف صلى الله عليه وسلم، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۳) (حتى أظلته وما ذكر) أي ومن ذلك ما ذكره الحكيم الترمذي في نوادر الأصول عن عبد الرحمن بن قيس وهو مطعون عن عبد الملك بن عبد الله بن الوليد وهو مجهول عن ذكوان (من أنه كان لا ظل لشخصه في شمس ولا قمر لأنه كان نورا) أي بنفسه والنور لا ظل له لعدم جرمه، وهذا معنى ما في النوادر، ولفظها لم يكن له ظل في شمس، ولا قمر ونقله الحلبي عن ابن سبع أيضا. (شرح الشفا- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م:۱۰۱۴ھ):۱/ ۷۵۵، فصل: ومن ذلك ما ظهر من الآيات عند مولده عليه الصلاة والسلام، ط: دار الكتب العلمية - بيروت، الطبعة: الأولى، ۱۴۲۱ھ)

(۴) عبد الرحمن بن قيس الضبي بصري يعرف بأبي معاوية الزعفراني. عبد الله بن أحمد سألت أبي عن عبد الرحمان بن قيس الزعفراني، فقال ليس بشيء، كان جارا لحماد بن مسعدة يحدث، عن ابن عون قد رأيته بالبصرة، وقدم علينا إلى بغداد وكان واسطيا، وليس حديثه بشيء، حديثه حديث ضعيف، ثم خرج إلى نيسابور، وهو متروك الحديث. (الكامل في ضعفاء الرجال- أبو أحمد بن عدي الجرجاني (م:۳۶۵ھ):۵/ ۴۷۴، ت: عادل أحمد عبد الموجود - علي محمد معوض، ط: الكتب العلمية - بيروت، الطبعة: الأولى، ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۷م)

دینی امور ٹھیک نہ ہو) ہے؛ دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی سند سے ہے، جس کو علامہ خفاجی نے ''شرح شفاء'' میں نقل کیا ہے۔ (۵) لیکن اس کی سند کے متعلق معلومات نہ ہو سکی۔ (کفایت المفتی: ۱/ ۸۶) [۶]

اس لیے اس مسئلہ میں صحیح حدیث کے نہ ہونے کی وجہ سے شک پیدا ہو گیا ہے، اگر مذکور بات صحیح ہوتی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اصحاب اس کو بیان کرتے؛ لہٰذا اس مسئلہ میں زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں ہے؛ اگر کوئی کہتا ہے کہ '' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ تھا'' تو یہ ضعیف روایت کی روشنی میں ہوگا اور اگر کوئی اس کا انکار کرتا ہے، تو اس سے کفر لازم نہیں آئے گا؛ کیوں کہ صحیح احادیث سے یہ ثابت نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔
۱۱/ ۲/ ۱۹۷۷ء

[۳۰] موئے مبارک کی زیارت کرنا

۸۹-سوال: بہت سے لوگ موئے مبارک کی زیارت کرتے ہیں ان کا یہ عمل کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ بال حقیقۃً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور صحیح سند ہو، تو زیارت کرنا جائز ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر حلق کروا کر ایک جانب کے بال حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو دیے تھے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیے تھے اور ان سے حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ تک پہونچے تھے۔ اور دوسری جانب کے بال دوسرے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تقسیم فرمائے تھے۔ (بخاری شریف)۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۵) وفي حديث ابن عباس قال: لم يكن لرسول الله - صلى الله عليه وسلم - ظل، ولم يقم مع شمس قط إلا غلب ضوءه ضوء الشمس، ولم يقم مع سراج قط إلا غلب ضوءه ضوء السراج، ذكره ابن الجوزي. (جمع الوسائل في شرح الشمائل - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۱/ ۱۷۶، باب ما جاء في مشية رسول الله صلى الله عليه وسلم، ط: المطبعة الشرفية - مصر)

(۶) کفایت المفتی - مفتی کفایت اللہ، دہلوی: ۱/ ۸۶، ۸۷، کتاب العقائد، دوسرا باب: انبیاء علیہم السلام، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ کی تحقیق، ط: دار الاشاعت، کراچی۔

(۱) عن ابن سيرين، قال: قلت لعبيدة «عندنا من شعر النبي صلى الله عليه وسلم أصبناه من قبل أنس أو من قبل أهل أنس، فقال: لأن تكون عندي شعرة منه أحب إلي من الدنيا وما فيها. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۹، رقم الحديث: ۱۷۰، كتاب الوضوء، باب الماء الذي يغسل به شعر الإنسان، ط: البدر - ديوبند)

عن ابن سيرين، عن أنس، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم «لما حلق رأسه كان أبو طلحة أول من أخذ من شعره. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۹، رقم الحديث: ۱۷۱، كتاب الوضوء، باب الماء الذي يغسل به شعر الإنسان، ط: البدر - ديوبند) =

[۳۱] ابوجہل آپ ﷺ کا چچا نہیں تھا

۹۰-سوال: کیا ابوجہل آپ ﷺ کا حقیقی چچا تھا یا آپ ﷺ کے خاندان میں ہونے کی وجہ سے کسی دور کے رشتے سے چچا تھا؟

الجواب حامداومصلیا:

ابو لہب تو نبی کریم ﷺ کا حقیقی چچا تھا؛ لیکن ابوجہل چچا نہیں تھا، اس کا نسب نبی ﷺ کے پردادا کے اوپر سے ملتا ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ۔

=فإن النبي - صلى الله عليه وسلم - حلق رأسه وأعطى نصفه لأبي طلحة، ونصفه قسمه بين الناس. (الفتاوى الكبرى - أبو العباس أحمد بن عبد الحليم بن عبد السلام ابن تيمية الحراني الحنبلي الدمشقي (م:۷۲۸ھ): ۱/ ۲۷۳، كتاب الطهارة، مسألة في السواك وتسريح اللحية في المسجد، ط: دار الكتب العلمية)

فتاوی رحیمیہ - (م: ۱۴۲۲ھ): ۳/ ۴۰-۴۲، کتاب الانبیاء والاولیاء، ط: دار الاشاعت، کراچی۔

(۲) واسم أبي جهل عمرو بن هشام بن المغيرة بن عبد الله بن عمر بن مخزوم بن يقظة بن مرة بن كعب بن لؤي القرشي المخزومي. (الاستيعاب في معرفة الأصحاب - أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمري القرطبي (م: ۴۶۳ھ): ۳/ ۱۰۸۲، عكرمة بن ابي جهل، ط: دار الجيل - بيروت)

محمد بن عبد الله بن عبد المطلب بن هاشم بن عبد مناف بن قصي بن كلاب بن مرة بن كعب بن لؤي بن غالب بن فهر بن مالك بن النضر بن كنانة بن خزيمة بن مدركة بن إلياس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان. إلى هنا معلوم الصحة. (مختصر سيرة الرسول صلى الله عليه وسلم - محمد بن عبد الوهاب بن سليمان التميمي النجدي (م: ۱۲۰۶، قصة الفيل، ط: وزارة الشئون الإسلامية والأوقاف - المملكة العربية السعودية)

پیش نظر عبارت سے واضح ہے کہ ابوجہل کا نسب ساتویں پشت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے، اسی لیے کسی بھی معتبر سیرت کی کتاب میں آپ ﷺ کے چچا کے ناموں میں ابوجہل کا نام مذکور نہیں ہے۔

وكان له اثنا عشر عما بنو عبد المطلب أبوه صلى الله عليه وسلم ثالث عشر هم: الحارث وأبو طالب واسمه عبد مناف والزبير ويكنى أبا الحارث وحمزة وأبو لهب واسمه عبد العزى والغيداق والمقوم وضرار والعباس وقثم وعبد الكعبة وحجل ويسمى المغيرة، وقيل كانوا إحدى عشر فأسقط المقوم، وقيل هو عبد الكعبة، وقيل عشرة وأسقط الغيداق وحجلا، وقيل تسعة، ولم يذكر ابن قتيبة وابن إسحق وأبو سعيد غيره فأسقط قثم. (ذخائر العقبى في مناقب ذوى القربى - محب الدين أحمد بن عبد الله الطبري (م: ۶۹۴ھ) ص: ۱۷۲، أولاد عبد المطلب بن هاشم، ط: مكتبة القدسي - القاهرة)

[۳۲] ''نام احمد تو وہ نام ہے'' ان اشعار کا پڑھنا کیسا ہے؟

۹۱-سوال: ہمارے یہاں ایک مدرسہ کے جلسہ میں ایک نعت پڑھی جاتی ہے، اس میں کچھ اشعار میں مستقبل کا زمانہ مذکور ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے؛ اس لیے ان اشعار کو پڑھنا کیسا ہے؟

نام احمد تو وہ نام ہے اگر		بے ارادہ بھی منہ سے نکل جائے گا
راہ کے سنگ ریزے بکھر جائیں گے		اھل بے داد کا دل پگھل جائے گا
آمنہ کی گود ذرا بھرنے تو دو		ساری دنیا کا نقشہ بدل جائے گا
سنتے ہی آیت بت شکن کی خبر		کفر ایمان کے سائے میں ڈھل جائے گا

آگے نعت بہت لمبی ہے، اس میں خط کشیدہ شعر مستقبل کو بتاتا ہے، حالاں کہ آپ کی پیدائش ہو چکی ہے، اس میں انکار نبوت کا شائبہ تو نہیں ہے، لہٰذا ان اشعار کا پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ اشعار میں انکار نبوت کا شائبہ نہیں ہے؛ اس لیے کہ وہ حقیقت بن چکی ہے اور شاعر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا مطالعہ کر کے جو تورات اور انجیل میں لکھا ہے، ان دونوں زمانوں (زمانہ جاہلیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد) کا نقشہ کھینچا ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں سال بھر کی جو تھی؟

۹۲-سوال: بعد از سلام آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پورے سال کی جو بھری ہوئی تھی یا نہیں؟ ایک شخص نے یوں بیان کیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کسی وقت پورے سال کا اناج بھرا ہوا تھا؛ لہٰذا اس کا جواب مرحمت فرمائیں۔ اس شخص نے حدیث بیان کی ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک گھر میں سال کا نہیں، مہینہ کا نہیں، ہفتہ کا بھی نہیں، حتی کہ شام کے

کھانے کے لیے اناج نہیں ہوتا تھا۔[1] وقت پر اللہ تعالی جو دیتے، اسے کھا کر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے، یا فاقہ کشی کرتے؛ البتہ ازواج مطہرات کا خرچ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ فرض تھا؛ اس لیے ہر بیوی کو ان کا سال بھر کا نان ونفقہ دے دیتے تھے؛ لیکن وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس کی برکت سے سارا مال صدقہ وخیرات کر دیتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اسٹاک نہیں کیا، بل کہ جو کچھ آ جاتا، اسے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ وخیرات کر دیتے تھے۔[2] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۳۴] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی ضروریات کے تمام طریقے بیان کردیے ہیں

۹۳-سوال: اکثر علماء سے سنا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے زندگی کے ہر شعبہ کا عمل بتلا دیا ہے؛ حتی کہ بیت الخلاء میں آنے جانے کا طریقہ بھی بتلا دیا ہے، تو اب سوال ہے کہ سردی یا گرمی میں پیشاب کس طرح سے کیا جائے؟ اس کا طریقہ بیان فرما دیں۔

الجواب حامداومصلیا:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو زندگی کے ہر شعبے کا طریقہ بتلا دیا ہے؛ لیکن پیشاب کا طریقہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمل کر کے بتاتے، تو ناجائز امر کا ارتکاب لازم آتا، اس لیے کہ اس میں کشف ستر ہے اور یہ حرام ہے اور اگر زبان سے بیان کرتے، تو اس کو سمجھنا دشوار ہوتا؛ لہذا اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصول بتا دیا کہ گرمی ہو یا سردی بہر صورت اس طریقہ پر پیشاب کیا جائے کہ اس کے چھینٹے بدن یا کپڑے پر

---

(۱) عن أنس رضي الله عنه: أنه مشى إلى النبي صلى الله عليه وسلم بخبز شعير، وإهالة سنخة، ولقد «رهن النبي صلى الله عليه وسلم درعا له بالمدينة عند يهودي، وأخذ منه شعيرا لأهله» ولقد سمعته يقول: «ما أمسى عند آل محمد صلى الله عليه وسلم صاع بر، ولا صاع حب، وإن عنده لتسع نسوة. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۷۸، رقم الحديث: ۲۰۶۹، كتاب البيوع، باب شراء النبي صلى الله عليه وسلم بالنسيئة، ط: البدر-ديوبند)

(۲) عن عمر، قال: «كانت أموال بني النضير مما أفاء الله على رسوله، مما لم يوجف عليه المسلمون بخيل ولا ركاب، فكانت للنبي صلى الله عليه وسلم خاصة، فكان ينفق على أهله نفقة سنة، وما بقي يجعله في الكراع والسلاح، عدة في سبيل الله. (صحيح المسلم: ۲/ ۸۹، رقم الحديث: ۴۸- (۱۷۵۷)، كتاب الجهاد والسير، باب الفئ، ط: البدر-ديوبند)

قال الإمام النووي في شرح الحديث المذكور: وقوله ينفق على أهله نفقة سنة أي يعزل لهم نفقة سنة ولكنه كان ينفقه قبل انقضاء السنة في وجوه الخير فلا تتم عليه السنة ولهذا توفي صلى الله عليه وسلم ودرعه مرهونة على شعير استدانه لأهله ولم يشبع ثلاثة أيام تباعا وقد تظاهرت الأحاديث الصحيحة بكثرة جوعه صلى الله عليه وسلم وجوع عياله. (المصدر السابق)

نہ اڑیں، جیسا کہ مشکوۃ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے، اور نرم زمین پر حاجت پوری فرمائی، پھر قضائے حاجت سے واپس لوٹے، تو فرمایا: جب تم میں سے کوئی قضائے حاجت کے لیے آئے، تو ایسی ہی جگہ حاجت پوری کرے۔ (۱) مذکورہ حدیث سے ثابت ہوا کہ پیشاب ایسی جگہ کیا جائے کہ اپنے بدن یا کپڑے پر چھینٹے نہ اڑنے پائیں؛ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **استنزهوا من البول فإن عامة عذاب القبر منه.** (۲) واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) لما قدم عبد الله بن عباس البصرة، فكان يحدث عن أبي موسى، فكتب عبد الله إلى أبي موسى يسأله عن أشياء، فكتب إليه أبو موسى: إني كنت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات يوم فأراد أن يبول، فأتى دمثا في أصل جدار فبال، ثم قال صلى الله عليه وسلم: "إذا أراد أحدكم أن يبول فليرتد لبوله موضعا". (سنن ابی داؤد، ص: ۲، رقم الحديث: ۳، كتاب الطهارة، باب الرجل يتبوأ لبوله، ط: البدر - ديوبند)

مشكاة المصابيح، ص: ۴۲، رقم الحديث: ۳۴۵، كتاب الطهارة، باب اداب الخلاء، الفصل الثاني، ط: فيصل - ديوبند.

(۲) سنن الدار قطني - أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي البغدادي الدار قطني (م: ۳۸۵هـ): ۱/ ۲۳۲، رقم الحديث: ۴۶۴، كتاب الطهارة، باب نجاسة البول، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت.

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ
مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ط. (۴۰-غافر:۷۸)

باب الأنبياء وأتباعهم

(انبیاء کرام اور ان کے متبعین)

٥
انبیاء کرام اور ان کے متبعین

[۱] کیا ہندو مذہب کے پیشوا رام اور لکشمن نبی تھے؟

۹۴-سوال: ہندو مذہب کی مقدس ہستی ''شری رام چندر جی'' اور ''شری لکشمن'' نبی تھے؟ اگر تھے، تو کس زمانے میں تھے، بعض حضرات ان کو نبی ماننے پر اصرار کرتے ہیں، اس سلسلے میں ہمیں کیا عقیدہ رکھنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے ان کا نبی ہونا ثابت نہیں ہے؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء انسانوں کی ہدایت کے لیے آئے''۔ (حدیث)[1] قرآن کریم میں

---

(۱) قال: قلت: یا رسول الله، کم وفی عدة الأنبیاء؟ قال: "مائة ألف وأربعة وعشرون ألفا الرسل من ذلك ثلاث مائة وخمسة عشر جما غفیرا". (مسند أحمد: ۶۱۹/۳۶، رقم: ۲۲۲۸۸، حدیث أبي أمامة الباهلي، ورواه الطبراني في المعجم الكبير، برقم: ۷۸۷۱، والبيهقي في السنن الكبرى برقم: ۱۷۷۱۱، والجزء الاخيرة عنده: قلت: كم المرسلون منهم؟ قال ثلاثمائة وثلاثة عشر، وفي شعب الإيمان، برقم: ۱۳۱)

وورد في مسند أحمد أنه عليه الصلاة والسلام سئل عن عدد الانبياء، فقال: مائة ألف وأربعة وعشرون ألفا، والرسل منهم ثلث مائة وثلاثة عشر، أولهم ادم وأخرهم محمد - صلى الله عليه وسلم - وهو لاينافي قوله تعالى: ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾. فإن ثبوت الاجمال لاينافي في تفصيل الأحوال، نعم الأولى أن لا يقتصر على الأعداد، فإن الاحاد لا تفيد الاعتماد في الاعتقاد، بل يجب كما قال الله تعالى: ﴿كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ﴾. أن يؤمن إيمانا إجماليا من غير تعرض لعدد الصفات، وعدد=

ہے کہ ہر قوم میں نبی ان کی زبان میں بھیجا گیا۔ (قرآن کریم)[1]

اب قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی روشنی میں غور کرنے سے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک میں لوگوں کی ہدایت کے لیے کیا انبیاء کرام کی بعثت ہوئی یا نہیں؟ اس سلسلے میں علماء فرماتے ہیں کہ ہندو حضرات جن کو بزرگ مانتے ہیں، ان کی تعلیم میں بھی سچائی، ہمدردی اور خدا کی بندگی کی تعلیمات موجود ہیں اور قرآن کریم میں ہے کہ امم سابقہ نے اپنے نبیوں کی تعلیم کو بدل دیا ہے۔[2] اس لیے ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ بھی نبی ہو؛ لیکن یقینی طور پر ان کی نبوت کا ثبوت نہیں ہے، اس لیے ان کے تعلق سے کفّ لسان (کسی طرح کا تبصرہ کرنے سے پرہیز کرنا) لازم ہے۔ فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۲] کیا شری کرشن اور گوتم بودھ نبی تھے؟

۹۵-سوال: قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: {ولکل أمۃ رسول} ہر امت میں اللہ پاک نے پیغمبر بھیجے ہیں۔ (۱۰-یونس: ۴۷)

سورۂ ابراہیم (آیت: ۴) میں ہے: وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهِۦ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ.

''میں نے (اللہ نے) تمام قوموں اور امتوں میں صحیح راستہ بتلانے کے لیے انہیں کی زبان میں پیغمبروں کو بھیجا ہے؛ تاکہ وہ پیغمبران ہی کی زبان میں (حق کی باتیں) کھول کھول کر سمجھا سکیں''۔

ان آیات کے پیش نظر یقیناً ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک میں بھی کوئی نہ کوئی نبی ضرور تشریف لائے ہوں گے؛ اور اس ملک کو توحید کی تعلیم سے روشناس کرایا ہوگا، اس لیے امکان ہے کہ شری کرشن اور گوتم بودھ (ذوالکفل) پیغمبر ہوں۔

مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری اپنی کتاب ''شری ویدیک درشن'' کے صفحہ/۶ پر لکھتے ہیں'' دہلی

= الملائکۃ، والکتب، والأنبیاء، وأرباب الرسالۃ من الأصفیاء. (شرح الفقہ الأکبر، ص۲۹، یاسر ندیم- دیوبند)

(ورسلہ) بأن تعرف أنہم بلغوا ما أنزل اللہ إلیہم، وأنہم معصومون، وتؤمن بوجودہم فیمن علم بنص، أو تواتر تفصیلا، وفي غیرہم إجمالا. (مرقاۃ المفاتیح: ۵۸/۱، کتاب الإیمان، ط: دار الفکر، بیروت ☆ شرح العقائد النسفیۃ، ص: ۱۳۸، ط: یاسر ندیم- دیوبند)

(۱) وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهِۦ. [۱۴-ابراھیم: ۴]

(۲) مِّنَ ٱلَّذِينَ هَادُواْ يُحَرِّفُونَ ٱلۡكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِۦ. [۴-النساء: ۴۶ و ۵-المائدۃ: ۱۳]

میں ایک ولی حضرت شاہ عبدالعزیز گذرے ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ شری رام چندر جی اور شری کرشن جی بھی پیغمبر تھے، ہمارے زمانے میں مولانا آزاد سبحانی نے ہمیں بتلایا تھا کہ انہوں نے (مولانا سبحانی نے) بہ ذریعہ کشف شری کرشن کو دیکھا ہے، جو سورج کی طرح روشن تھے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ دونوں پیغمبر ہیں یا نہیں؟ کیا ہم انہیں نبی مان سکتے ہیں یا نہیں؟

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بت پرستی کی مخالفت اور توحید کی حمایت کی بھی بہت ساری باتیں مذکور ہیں اور چاروں ویدوں میں یہ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس روئے زمین پر پوری قوم کے ایک بڑے رہبر و رہنما بن کر تشریف لائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ہر گھر میں پہنچے گا، آپ کے خاص صحابی دس ہوں گے، تین سو تیرہ آپ کے منتخب وفادار فوجی ہوں گے، آپ کی بارہ ازواج (مطہرات) ہوں گی، آپ ریگستان میں پیدا ہوں گے، اونٹ پر سواری کریں گے"۔ اس طرح کی پیشین گوئیاں چاروں ویدوں میں مذکور ہیں؛ لہٰذا ممکن ہے کہ یہ وید بھی کوئی ہندوستان میں پیدا ہونے والے سنکرت زبان والے پیغمبر کا کلام ہو، تو وید کی ایسی باتیں، جو اسلام سے قریب ہوں، کیا ان کی تعلیم دی جاسکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

یہ بات تو صحیح ہے کہ ہر قوم اور ہر ملک میں پیغمبر آئے ہیں، تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں تشریف لائے ہیں، ان میں سے تین سو تیرہ رسالت کے درجہ پر فائز تھے۔ (۱)

قرآن وحدیث میں ان میں سے صرف بعض کے ناموں کا تذکرہ ہے، بعض کے نام اور مقام کو نہیں بتلایا گیا۔ (۲)

---

(۱) قال: قلت: یا رسول الله، کم وفی عدة الأنبياء؟ قال: "مائة ألف وأربعة وعشرون ألفا الرسل من ذلك ثلاث مائة وخمسة عشر جما غفيرا". (مسند أحمد: ۳۶/ ۶۱۹، رقم: ۲۲۲۸۸، حديث أبي أمامة الباهلي، ورواه الطبراني في المعجم الكبير، برقم: ۷۸۷۱، والبيهقي في السنن الكبرى برقم: ۱۷۷۱۱، والجزء الاخيرة عنده: قلت: كم المرسلون منهم؟ قال ثلاثمائة وثلاثة عشر، وفي شعب الإيمان، برقم: ۱۳۱)

(۲) إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ﴿﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿﴾ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿﴾ [النساء: ۱۶۳ - ۱۶۵]

مگر کسی بھی شخص کو اللہ کا نبی وپیغمبر کہہ دینا بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے، لہٰذا کسی متعین شخص کو قطعی طور پر نبی وپیغمبر تسلیم کرلینا اس وقت تک درست نہیں، جب تک قرآن وحدیث سے ان کی نبوت وپیغمبری ثابت نہ ہوجائے؛ کیوں کہ جب حلال وحرام اور دین کے دوسرے عقائد بغیر صحیح دلیل کے قابل قبول نہیں ہوتے، تو نبوت جیسے اہم عقیدے کو بغیر ثبوت اور قوی دلیل کے کیسے تسلیم کرلیا جائے۔ (۳)

لہٰذا مجملاً ایمان کافی ہے کہ ہم اللہ کے تمام پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں، کسی خاص شخص کے لیے نبوت ثابت کرنے کی نہ تو کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی بلا دلیل اس کی اجازت، اسی طرح کسی خاص شخص سے یقین کے ساتھ نبوت کی نفی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ وغیرہ کے حوالہ جات، جو آپ نے دیے ہیں، وہ صحیح ہیں، اس سے انکار نہیں، اس کے علاوہ ایک حوالہ اور بھی ہے، وہ یہ کہ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ اور دیگر بزرگان دین کا کشف ہے کہ گنگا ندی جہاں سے نکلتی ہے، اس جگہ کسی نبی کی قبر ہے اور وہاں پانی میں اس کے انوار بھی محسوس ہوتے ہیں۔ (۴)

ممکن ہے ہندوؤں کا گنگا کے پانی کے متبرک ہونے کے بارے میں جو عقیدہ ہے، اس کا تعلق بھی اسی حقیقت کے ساتھ ہو۔ نیز حضرت مرزا جان جاناںؒ نے اپنے مکتوب (خط) میں اپنا یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ ہندوؤں کو بھی اہل کتاب کہا جاسکتا ہے۔ (۵) اگرچہ درحقیقت اہل کتاب تو صرف تورات، زبور اور انجیل والے ہی ہیں۔

مذکورہ تفصیل سے پتہ چلا کہ شری کرشن، گوتم بودھ اور زرتشت کی نبوت کا ہم قطعیت کے ساتھ انکار بھی نہیں کرسکتے اور قطعیت کے ساتھ ان کی نبوت کا فیصلہ بھی نہیں کرسکتے، بزرگوں کا کشف قطعی دلیل (مضبوط

---

(۳) وورد في مسند أحمد أنه عليه الصلاة والسلام سئل عن عدد الانبياء، فقال: مائة ألف وأربعة وعشرون ألفا، والرسل منهم ثلث مائة وثلاثة عشر، أولهم ادم وأخرهم محمد - صلى الله عليه وسلم - وهو لاينافي قوله تعالى: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ. فإن ثبوت الاجمال لاينافي تفصيل الأحوال، نعم الأولى أن لا يقتصر على الأعداد؛ فإن الاحاد لا تفيد الاعتماد في الاعتقاد؛ بل يجب كما قال الله تعالى: كُلٌّ آمَنَ بِاللهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ. أن يؤمن إيمانا إجماليا من غير تعرض لتعدد الصفات، وعدد الملائكة، والكتب والانبياء، وأرباب الرسالة من الأصفياء. (شرح الفقه الأكبر ص۶۹، ياسر نديم - ديوبند)

(ورسله) بأن تعرف أنهم بلغوا ما أنزل الله إليهم، وأنهم معصومون، وتؤمن بوجودهم فيمن علم بنص، أو تواتر تفصيلا، وفي غيرهم إجمالا. (مرقاة المفاتيح: ۱/۵۸، كتاب الإيمان، ط: دار الفكر، بيروت ☆ شرح العقائد النسفية، ص: ۱۳۸، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۴-۵) لم أقف عليهما؛ لأن الكتب المتعلقة بهما لم توجد عندي.

دلیل) نہیں ہے کہ جس سے کسی کی نبوت کو ثابت کیا جا سکے، ہاں اہل کشف کے لیے اپنے کشف کے مطابق عمل کرنے کی گنجائش ہے؛ مگر دوسرے لوگوں کے لیے کشف، حجت (دلیل شرعی) نہیں ہے، وید کے بارے میں بھی صرف اتنا کافی ہے کہ ہم تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، وید بھی اگر ان میں سے ہو، تو اس کی حق باتوں پر ہمارا ایمان ہے؛ لہٰذا نہ تو تعظیم کی ضرورت ہے اور نہ توہین کی حاجت۔ (۲) فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۳] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ایک واقعہ کی تحقیق

۹۶-سوال: تبلیغی جماعت سے منسلک ایک شخص نے درج ذیل واقعہ بیان کیا ہے:

''ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے دربار میں تشریف لے جا رہے تھے، تو ایک مریض نے کہا: آپ اللہ تعالیٰ کے پاس جا رہے ہیں، ان کی خدمت میں میرا اسلام عرض کر دیجیے گا اور کہیے گا کہ ''وہ مجھے موت دے دے''۔

موسیٰ علیہ السلام گئے اور اللہ کو اس مریض کا پیغام پہنچایا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اس مریض سے کہو کہ ابھی تیری شادی باقی ہے، جب تیری شادی ہو جائے گی، تب تجھے موت آئے گی اور پہلی ہی رات میں تیری بیوی بیوہ ہو جائے گی، تو شادی سے قبل نہیں مرے گا۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے اعلان کیا کہ کون ہے، جو اس مریض کو اپنی لڑکی دے گا؟ لیکن یاد رہے کہ وہ پہلی ہی رات میں بیوہ ہو جائے گی، ایک لڑکی تیار ہو گئی، لڑکی کے باپ نے انکار کیا، تو لڑکی نے کہا: کہ موسیٰ علیہ السلام پیغام لے کر آئے ہیں، اس لیے انکار کی گنجائش نہیں۔ مجبوراً بیٹی کے باپ راضی ہو گئے۔ پھر لڑکی کی شادی ہوئی، لڑکی شوہر کی خدمت کر رہی تھی کہ ایک فقیر آیا، اس نے صدا لگائی، چناں چہ لڑکی اپنا ہار دینے گئی۔ فقیر نے پوچھا: لڑکی! کیوں غمگین ہو؟ لڑکی نے جواب دیا کہ ''میری آج شادی ہوئی اور آج رات کو ہی میں بیوہ ہو جاؤں گی''۔ اس فقیر نے دعا کی، جس کے نتیجے میں اس کا بیمار شوہر اچھا ہو گیا۔

---

(۲) (وكتبه) أي: ونعتقد بوجود كتبه المنزلة على رسله تفصيلا فيما علم يقينا كالقرآن، والتوراة، والزبور، والإنجيل، وإجمالا فيما عداه، وأنها منسوخة بالقرآن... قيل: الكتب المنزلة مائة وأربعة كتب، منها عشر صحائف نزلت على آدم، وخمسون على شيث، وثلاثون على إدريس، وعشرة على إبراهيم، والأربعة السابقة، وأفضلها القرآن. (مرقاة المفاتيح: ۱/۵۸، كتاب الإيمان، ط: دار الفكر، بيروت☆شرح العقائد النسفية، ص: ۱۳۸، ط: ياسر نديم - ديوبند)

کیا یہ واقعہ صحیح ہے؟ تبلیغی احباب بہت سی مرتبہ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، تو مخالفین کو اختلاف واعتراض کا موقع ملتا ہے۔

الجواب حامداو مصلیا:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی واقعہ ہے، قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”یہودیوں نے تورات کی بہت سی باتوں کو تبدیل کر دیا ہے“۔ [1] اس لیے ہم نہ تو اس کی تکذیب کریں گے اور نہ ہی تصدیق۔

مذکورہ قصے سے تقدیر پر اشکال واعتراض لازم آتا ہے، تقدیر بدلتی نہیں ہے۔ [2] فقیر تو موسیٰ علیہ السلام سے بھی بڑھ گیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خرابیاں ہیں۔ اس لیے ماننے کے لائق نہیں۔ آپ کا لکھنا صحیح ہے، بعض جہال ایسے بے اصل قصوں کو بیان کرتے رہتے ہیں۔ جن کی وجہ سے تبلیغی احباب کو اعتراض کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لوگوں کو اس جانب متوجہ کرنے کی ضرورت ہے، ان کے ذہن میں یہ بات بٹھادی جائے کہ لوگوں کی ترغیب وترہیب کے لیے قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی تعلیمات کافی ہیں، بس ان کو ہی بیان کیا جائے اور بے اصل واقعات کو بالکل نہ بیان کیا جائے، کہ اس سے غلط بات کو راہ ملتی ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] حضرت داؤد علیہ السلام پر غیر موزوں تبصرہ

۷۹-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین؛ اس شخص کے بارے میں؛ جو حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ”ان کا امتحان دراصل اس بات میں تھا کہ انھوں نے ایک دن عبادت کے لیے اس طرح خاص کرلیا تھا کہ اُس دن وہ مخلوق سے بے تعلق ہوجاتے تھے۔ ایک صوفی مرتاض کی ایسی گوشہ نشینی

---

(۱) مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّھُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَھُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا [۴-النساء: ۴۶]

(۲) {وكان أمر الله قدرا مقدورا} . . . أي: حكما مقطوعا بوقوعه، وقال المهلب: غرضه في الباب أن يبين أن جميع مخلوقات الله عز وجل بأمره بكلمة: كن، من حيوان أو غيره وحركات العباد واختلاف إرادتهم وأعمالهم من المعاصي أو الطاعات كل مقدر بالأزمان والأوقات، لا زيادة في شيء منها، ولا نقصان عنها، ولا تأخير لشيء منها عن وقته، ولا يقدم قبل وقته. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م: ۸۵۵ھ): ۲۳/ ۱۵۰، كتاب القدر، باب: وكان أمر الله قدرا مقدورا، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

اور ترک علائق کو تو پسندیدہ کہا جاسکتا ہے؛ لیکن ایک خلیفۂ وقت اور مسلمانوں کے سیاسی امور کے ذمہ دار کے لیے اس طرح کی گوشہ نشینی اور وہ بھی پورے ایک دن کے لیے، کسی طرح موزوں نہیں کہی جاسکتی‘‘۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

سورۂ ص، پارہ نمبر: ۲۳، رکوع نمبر: ۲ میں آیتِ کریمہ {وَهَلْ أَتٰـكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ} کی تفسیر کے تحت ’’روح المعانی ۲۳/ ۱۶۲‘‘ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا وہ اثر منقول ہے۔(۱) جس کو آپ نے اجمال کے ساتھ تحریر کیا ہے۔(۲) اور اس کو عقیدہ ہونا بتلایا ہے؛ لیکن تقسیم اوقات کی وجہ سے انقطاع عن الخلق (مخلوق سے کٹ جانے) پر جب حضرت داؤد علیہ السلام کو من جانب اللہ تنبہ ہوا، تو بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوئے اور استغفار فرمایا، جس کو اللہ تعالیٰ نے شرفِ قبولیت سے نواز کر ان کو ان کی ذمہ داری یاد دلائی؛ چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: {إِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْأَرْضِ. الآية} اس

(۱) قال ابن عباس: جزأ زمانه أربعة أجزاء: يوما للعبادة، ويوما للقضاء، ويوما للاشتغال بخواص أموره، ويوما لجميع بني إسرائيل، فيعظهم ويبكيهم. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني - شهاب الدين محمود الالوسي [م: ۱۲۷۰ھ]: ۲۳/ ۱۷۸، ط: دار الإحياء التراث العربي، بيروت، لبنان)

(۲) اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے تقسیم کار کے پیش نظر اپنے معمولات کو چار دنوں پر اس طرح تقسیم کر دیا تھا کہ ایک دن خالص عبادت الٰہی کے لیے، ایک دن فصل مقدمات کے لیے، ایک دن ذاتی امور کی انجام دہی کے لیے اور ایک دن بنی اسرائیل کی اصلاح اور رہنمائی کے لیے عام تھے (حوالۂ سابق) حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ تقسیم ایام اگرچہ زندگی کے نظم و نسق اور تقسیم کار کے لحاظ سے ہر طرح قابل ستائش تھی؛ لیکن اس میں ایک دن کو عبادت الٰہی کے لیے اس طرح خاص کر لینا کہ ان کا تعلق خلق خدا سے منقطع ہو جائے ’’منصب نبوت‘‘ اور ’’منصب خلافت‘‘ کے منافی تھا، چناں چہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اس روش کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمائش میں اس طرح مبتلا کر دیا کہ دو شخص - جن کے درمیان خاص مناقشہ تھا - عبادت کے خاص دن میں حجرہ کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے، حضرت داؤد علیہ السلام نے اچانک خلاف عادت اس طرح دو انسانوں کو موجود پایا، تو بہ تقاضائے بشری گھبرا گئے۔ دونوں نے صورت حال کا اندازہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ خوف نہ کریں، ہمارے اس طرح داخل ہونے کی وجہ یہ قضیہ (معاملہ) ہے اور ہم اس کا فیصلہ چاہتے ہیں، تب حضرت داؤد علیہ السلام نے واقعات کو سنا...... الغرض فریقین کا فیصلہ کرنے کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کو فوراً تنبہ ہوا کہ مجھ کو خدا تعالیٰ نے آزمائش میں کس لیے ڈالا ہے اور وہ حقیقتِ حال کو سمجھ کر خدا کی بارگاہ میں سر بسجود ہوئے اور استغفار کیا اور اللہ تعالیٰ نے استغفار کو شرف قبولیت عطا فرما کر ان کی عظمت کو اور دو بالا کر دیا اور پھر یہ نصیحت فرمائی کہ اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے: اس لیے تمہارا فرض ہے کہ خدا کی اس نیابت کا پورا حق ادا کرو اور یہ خیال رکھو کہ اس راہ میں عدل و انصاف بنیادی کار ہے اور صراط مستقیم سے ہٹ کر کبھی بھی افراط و تفریط کی راہ اختیار نہ کرو۔ (قصص القرآن: ۲/ ۹۰-۸۸)

کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام نے اس ذمہ داری کو بہ حسن وخوبی ادا فرمایا۔ یہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا اثر ہے، یہ موجب کفر نہیں ہے۔ (قصص القرآن: ۲/۹۰-۸۸)

مگر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ امتی ہونے کی حیثیت سے انبیاء علیہم السلام کی پاکیزہ زندگی کے خلاف اس قسم کے عقائد- جو موجب تنقیص ہوں- رکھنا کیا ہمیں زیب دیتا ہے؟ لہٰذا ہمارے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ کسی نبی ورسول کو ایک معمولی انسان کا درجہ دیں اور انھیں خلیفۂ وقت اور مسلمانوں کے صرف سیاسی امور کے ذمہ دار کی حیثیت سے تحریر کریں، یہ بالکل غلط ہے؛ بل کہ ہم جیسے نا اہل (جو صبح سے شام تک گناہوں میں ملوث رہتے ہوں، اتباع سنت سے کوسوں دور ہوں اور فاسق وفاجر کی طرح زندگی بسر کرتے ہوں) کو ہرگز ہرگز زیب نہیں دیتا کہ قاضی، مفتی اور مجسٹریٹ بن کر انبیاء علیہم السلام کی مقدس زندگانی پر ناموزوں تبصرہ کرتے رہیں، العیاذ باللہ۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] حضرت حسین کے متعلق غلط عقیدہ رکھنا اور شادی میں ناچ گانے کو جائز بتلانا

۹۸-سوال: ایک شخص اصرار کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ نواسۂ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ بچپن میں قرآن شریف پر بیٹھ گئے تھے، ان کے اس عمل پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نکیر نہیں کی، جب صحابہؓ نے اس سلسلے میں دریافت کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ خود قرآن ہے۔ (لہٰذا ان کے قرآن پر بیٹھنے سے قرآن کی بے ادبی نہیں ہوگی)

یہ شخص اس طرح کی غلط روایت بیان کر کے لوگوں کے عقائد خراب کرتا ہے۔ اس کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ شادی بیاہ میں گانا بجانا اور ناچنا؛ سب کچھ جائز اور درست ہے، اس پر وہ حدیث سے دلیل پیش کرتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے مدینہ آئے، تو دف بجا کر لڑکیوں نے ان کا استقبال کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دف بجانا، ناچنا اور گانا؛ سب کچھ درست ہے۔

ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ اور دف بجانے والی روایت کا صحیح مصداق کیا ہے؟ جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جن لوگوں کے عقیدے کی بنیاد ''خواہشات'' پر ہو اور غلط وبے بنیاد طریقے سے لوگوں کو گم راہ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہوں، ان کی اصلاح بہت مشکل ہے؛ لہٰذا احقر کا مشورہ ہے کہ ایسے لوگوں سے الجھنے

کی ضرورت نہیں ہے۔

ا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ آمد پر اظہار خوشی کے لیے بچیوں کا دف بجانا اور اشعار گانا ثابت ہے۔[(۱)] نیز شادی کو موقع سے بھی دف بجانا صحیح روایت سے ثابت ہے۔[(۲)]

اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ شادی بیاہ اور خوشی کے موقع پر دف بجانے کی گنجائش ہے۔[(۳)] البتہ رقص اور ناچ تو ہر حال میں حرام ہے۔[(۴)]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ تشریف آوری اور حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء کی شادی کے موقع پر دف بجایا گیا؛ لیکن ان روایات سے بالغ لڑکیوں کے گانے اور ناچنے پر کیسے استدلال درست ہوسکتا ہے؟[(۵)]

---

(۱) وأخرج الحاکم... عن أنس فخرجت جوار من بني النجار يضربن بالدف وهن يقلن: نحن جوار من بني النجار، يا حبذا محمد من جار. وأخرج أبو سعيد في شرف المصطفى... منقطعا لما دخل النبي -صلى الله عليه وسلم- المدينة جعل الولائد يقلن: طلع البدر علينا من ثنية الوداع وجب الشكر علينا ما دعا لله داع. (فتح الباري-ابن حجر العسقلاني(م: ۸۵۲ھ): ۲۶۱/۷، باب مقدم النبي -صلى الله عليه وسلم- وأصحابه المدينة، بذيل، رقم الحديث: ۳۹۵۴، ط: دار المعرفة، بيروت)

(۲) قالت الربيع بنت معوذ ابن عفراء: جاء النبي -صلى الله عليه وسلم- فدخل حين بني علي، فجلس على فراشي كمجلسك مني، فجعلت جويريات لنا، يضربن بالدف ويندبن من قتل من آبائي يوم بدر. (صحيح البخاري: ۷۷۳/۲، رقم الحديث: ۵۱۴۷، كتاب النكاح، باب ضرب الدف في النكاح والوليمة، ط: مكتبة البدر-ديوبند)

(۳) وفي المعراج: الملاهي نوعان: محرم، وهو الآلات المطربة من غير الغناء... والنوع الثاني مباح وهو الدف في النكاح وفي معناه ما كان من حادث سرور... وهو مكروه للرجال على كل حال للتشبه بالنساء اهـ. (البحر الرائق: ۸۸/۷، كتاب الشهادات، باب من تقبل شهادته ومن لا تقبل، ط: دار الكتاب الإسلامي)

دف کی اجازت ہے، بہ شرطے کہ اس میں جلاجل (جھانجھ) نہ ہو اور ہیئت تطرب پر نہ بجایا جائے: وفي السراجية هذا إذا لم يكن له جلاجل ولم يضرب على هيئة التطرب اهـ. (رد المحتار: ۳۵۰/۶، قبيل فصل في اللبس ☆ البحر الرائق: ۸۶/۳، أول كتاب النكاح ☆ فتاویٰ محمودیہ: ۲۱۷/۱۱، باب ما يتعلق بالرسوم عند الزفاف)

(۴) (قوله وكره كل لهو) أي كل لعب وعبث فالثلاثة بمعنى واحد كما في شرح التأويلات والإطلاق شامل لنفس الفعل، واستماعه كالرقص والسخرية والتصفيق وضرب الأوتار من الطنبور والبربط والرباب والقانون والمزمار والصنج والبوق، فإنها كلها مكروهة لأنها زي الكفار. (رد المحتار: ۳۹۵/۶، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: بيروت)

(۵) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بخاری شریف کی حدیث ربیع بنت معوذ سے ثابت ہوتا ہے کہ چند نابالغ لڑکیوں نے بعد زفاف کے دف بجایا تھا، اس حدیث سے بالغ عورتوں کا بجانا ثابت کر کے جواز سمجھنا ثابت اور صحیح کیوں کر ہوسکتا ہے؟ کیوں کہ لڑکیاں (تو) غیر مکلف تھیں۔ (امداد الفتاویٰ: ۲۴۸/۲، کتاب النکاح، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند)

۲۔ یہ کہنا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ قرآن شریف پر بیٹھ گئے تھے؛ سراسر بہتان اور الزام ہے؛ کیوں کہ یہ بات کہیں سے ثابت نہیں ہے، اور بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ قرآن شریف کا موجودہ نسخہ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں سامنے آیا، وہ بھی چند نسخوں میں۔ (۶)

در اصل عہد نبوت میں قرآن کریم کی بیشتر آیات چمڑے کے پارچوں، پتھر کی سلوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، ایسا کم ہوتا تھا کہ اسے کاغذ پر لکھا جائے؛ کیوں کہ عرب میں کاغذ کم یاب تھا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تحریک پر اس کو جمع فرمایا (۷) اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ایک خاص مقصد کے پیش نظر اس کے متعدد نسخے تیار کروائے۔ (۸)

---

(۶) واختلفوا في عدة المصاحف التي أرسل بها عثمان إلى الآفاق، فالمشهور أنها خمسة، وأخرج ابن أبي داود في كتاب المصاحف من طريق حمزة الزيات قال أرسل عثمان أربعة مصاحف . . . قال ابن أبي داود: سمعت أبا حاتم السجستاني يقول: كتبت سبعة مصاحف إلى مكة، وإلى الشام، وإلى اليمن، وإلى البحرين، وإلى البصرة، وإلى الكوفة، وحبس بالمدينة واحدا. (فتح الباري - العسقلاني (م: ۸۵۲ھ): ۹/۲۰، كتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، ط: دار المعرفة - بيروت)

(۷) عن عبيد بن السباق، أن زيد بن ثابت - رضي الله عنه - قال: أرسل إلي أبو بكر مقتل أهل اليمامة، فإذا عمر بن الخطاب عنده، قال أبو بكر - رضي الله عنه -: إن عمر أتاني فقال: إن القتل قد استحر يوم اليمامة بقراء القرآن، وإني أخشى أن يستحر القتل بالقراء بالمواطن، فيذهب كثير من القرآن، وإني أرى أن تأمر بجمع القرآن، قلت لعمر: كيف تفعل شيئا لم يفعله رسول الله - صلى الله عليه وسلم -؟ قال عمر: هذا والله خير. فلم يزل عمر يراجعني حتى شرح الله صدري لذلك، ورأيت في ذلك الذي رأى عمر، قال زيد: قال أبو بكر: إنك رجل شاب عاقل لا نتهمك، وقد كنت تكتب الوحي لرسول الله صلى الله عليه وسلم، فتتبع القرآن فاجمعه. فوالله لو كلفوني نقل جبل من الجبال ما كان أثقل علي مما أمرني به من جمع القرآن. قلت: كيف تفعلون شيئا لم يفعله رسول الله - صلى الله عليه وسلم -؟ قال: هو والله خير. " فلم يزل أبو بكر يراجعني حتى شرح الله صدري للذي شرح له صدر أبي بكر وعمر رضي الله عنهما، فتتبعت القرآن أجمعه من العسب واللخاف، وصدور الرجال . . . وكانت الصحف عند أبي بكر حياته، حتى توفاه الله عز وجل، ثم عند عمر حياته، حتى توفاه الله، ثم عند حفصة بنت عمر. (صحيح البخاري: ۲/۷۴۵، رقم الحديث: ۴۹۸۶، كتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن)

(۸) حذيفة بن اليمان، قدم على عثمان وكان يغازي أهل الشأم في فتح أرمينية، وأذربيجان مع أهل العراق، فأفزع حذيفة اختلافهم في القراءة، فقال حذيفة لعثمان: يا أمير المؤمنين! أدرك هذه الأمة قبل أن يختلفوا في الكتاب اختلاف اليهود والنصارى، فأرسل عثمان إلى حفصة: أن أرسلي إلينا بالصحف ننسخها في المصاحف، ثم نردها=

ایسے لوگ (جن کے عقیدے کی بنیاد خواہشات پر ہوتی ہے) غلط قصے اور واقعات پیش کرتے ہیں، جو کسی بھی طرح لائق اعتبار نہیں ہوتے، اس طرح کے واقعات پیش کر کے درحقیقت ''دین'' اور ''قرآن کریم'' کی بے ادبی پر لوگوں کو ابھارنا ہوتا ہے، مسلمانوں کو خوب ہوشیار رہنا چاہیے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] حضرت علیؓ کی قبر کی جگہ کہاں ہے؟

۹۹-سوال: مسلم معاشرے میں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت علیؓ کی قبر مبارک اس دنیا میں نہیں ہے، ان کی نعش مبارک اونٹنی پر کہیں غائب ہوگئی تھی، جس کا آج تک کوئی پتہ نہیں چلا؛ تو کیا یہ بات صحیح ہے؛ اور اگر ان کی قبر ہے، تو کہاں ہے؟ جواب مرحمت فرمائیں۔

(ایم رحمن پٹیل، لاجپوری)

الجواب حامداً ومصلیاً:

تاریخ کی مشہور کتاب ''البدایہ والنہایہ'' میں حضرت علیؓ کی قبر کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، کوفہ شہر (جو کہ اس وقت دار الخلافہ تھا) میں دفن کیے گئے، یہی مشہور ہے۔(۱) اس کے علاوہ بھی بعض اقوال ہیں، مثلاً حضرت جعفر صادق فرماتے ہیں کہ ''رات کے وقت کوفہ کی جامع مسجد کے قریب دفن کیے گئے تھے''۔ حضرت ابو جعفر فرماتے ہیں کہ ''رات کے وقت کوفہ میں دفن کیے گئے تھے؛ مگر جگہ یاد نہ رہی''۔ علامہ واقدی فرماتے ہیں کہ ''مشہور یہ ہے کہ دار الامارۃ میں آپؓ کو دفن کیا گیا''۔(۲) خطیب

= إليك، فأرسلت بها حفصة إلى عثمان، فأمر زيد بن ثابت، وعبد الله بن الزبير، وسعيد بن العاص، وعبد الرحمن بن الحارث بن هشام فنسخوها في المصاحف. وقال عثمان للرهط القرشيين الثلاثة: إذا اختلفتم أنتم وزيد بن ثابت في شيء من القرآن فاكتبوه بلسان قريش، فإنما نزل بلسانهم. ففعلوا حتى إذا نسخوا الصحف في المصاحف، رد عثمان الصحف إلى حفصة، وأرسل إلى كل أفق بمصحف مما نسخوا، وأمر بما سواه من القرآن في كل صحيفة أو مصحف، أن يحرق. (صحيح البخاري: ۲/۷۴۶، رقم الحديث: ۴۹۸۷، كتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن ☆ جمع قرآن کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: مقدمہ معارف القرآن، از: مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم، ۱/۳۷ تا ۴۳، ط: دیوبند ☆ علوم القرآن- مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم، باب پنجم، تاریخ حفاظت قرآن، ط: مکتبہ نعیمیہ- دیوبند)

(۱) والمقصود أن عليا- رضي الله عنه- لما مات صلى عليه ابنه الحسن فكبر عليه تسع تكبيرات ودفن بدار الإمارة بالكوفة خوفا عليه من الخوارج أن ينبشوا عن جثته، هذا هو المشهور. (البداية والنهاية: ۷/۳۶۵، ت: علي شيري، ذكر مقتل امير المؤمنين علي بن ابي طالب، الخ، سنة أربعين من الهجرة، صفة مقتله رضي الله عنه، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۲) ان تمام اقوال کا حاصل ایک ہی ہے۔

بغدادیؒ کی ایک نقل کے مطابق آپ کو حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے مدینہ منورہ میں حضرت فاطمہؓ کے پڑوس میں دفن کیا تھا۔[۱] یہ بھی ایک روایت ہے کہ ''اونٹنی پر آپ کی نعش مبارک کو رکھا گیا، بعد میں وہ اونٹنی گم ہوگئی''۔[۲] تاہم اس روایت پر نقد کرتے ہوئے ابن کثیر دمشقیؒ نے فرمایا ہے کہ ''یہ عقل ونقل کے خلاف ہے؛ اس لیے قابل قبول نہیں ہے''۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۷] قرآن کریم میں صرف چند انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کیوں؟

۱۰۰-سوال: یہ بات مشہور ہے کہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب ہے۔[۴] لیکن قرآنِ پاک میں صرف چند انبیاء کرام ہی کا ذکر ہے، اُن کے علاوہ کا ذکر کیوں نہیں ہے؟ انگریز اور یہود کہتے ہیں کہ ویٹر، سیموئیل اور جون وغیرہ ہمارے نبی تھے، بت پرست ہنود کہتے ہیں کہ رام اور کرشن ہمارے نبی تھے، اسی طرح مجوسی آتش پرست لوگوں کا کہنا ہے کہ زرتشت ہمارے نبی تھے، تو ان لوگوں کے رد میں ہمارے پاس کیا دلائل ہیں؟

(۱ - ۲) عن إسحاق بن عبد الله بن أبي فروة قال: سألت أبا جعفر محمد بن علي الباقر... قلت: أين دفن؟ قال: دفن بالكوفة ليلا وقد غبي عن دفنه. وفي رواية عن جعفر الصادق... وقد قيل إن عليا دفن قبلي المسجد الجامع من الكوفة. قاله الواقدي، والمشهور بدار الإمارة. وقد حكى الخطيب البغدادي عن أبي نعيم الفضل بن دكين، أن الحسن والحسين حولاه فنقلاه إلى المدينة فدفناه بالبقيع عند قبر فاطمة، وقيل إنهم لما حملوه على البعير ضل منهم فأخذته طيء يظنونه مالا، فلما رأوا أن الذي في الصندوق ميت ولم يعرفوه دفنوا الصندوق بما فيه فلا يعلم أحد أين قبره، حكاه الخطيب أيضا. وروى الحافظ ابن عساكر عن الحسن قال: دفنت عليا في حجرة من دور آل جعدة. وعن جعفر بن محمد الصادق: قال: صلي على علي ليلا ودفن بالكوفة وعمي موضع قبره ولكنه عند قصر الإمارة. (البداية والنهاية: ۷/ ۳۶۵-۳۶۶)

(۳) ومن قال إنه حمل على راحلته فذهبت به فلا يدري أين ذهب فقد أخطأ وتكلف ما لا علم له به ولا يسيغه عقل ولا شرع. (البداية والنهاية: ۷/ ۳۶۵، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۴) الحديث طويل والجزء المقصود منه: قلت يا نبي الله، فأي الأنبياء كان أول؟ قال: "آدم". قال: قلت يا نبي الله: أو نبي كان آدم قال: "نعم. نبي مكلم خلقه الله بيده، ثم نفخ فيه روحه، ثم قال له: يا آدم قبلا". قال: قلت: يا رسول الله، كم وفى عدة الأنبياء؟ قال: "مائة ألف وأربعة وعشرون ألفا الرسل من ذلك ثلاث مائة وخمسة عشر جما غفيرا".

(مسند الإمام احمد بن حنبل: ۳۶/ ۶۱۹، رقم: ۲۲۲۸۸، عن أبي أمامة، ط: مؤسسة الرسالة ٭ المعجم الكبير - أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۸/ ۲۱۷، رقم: ۷۸۷۱، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية - القاهرة ☆ المستدرك على الصحيحين - أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله النيسابوري (م: ۴۰۵ھ)=

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام کا بیان قرآنِ پاک میں ہوتا، تو قرآنِ پاک قصہ وکہانی کی کتاب بن کر رہ جاتا، جب کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن کا نزول بطورِ کتابِ ہدایت ہوا ہے۔ (۱) لہٰذا اُس میں اولو العزم انبیاء کا ذکر کیا گیا اور دیگر بہت سے انبیاء کا ذکر نہیں ہے، اُسے ایک مثال سے سمجھیے کہ ''وہورا سوسائٹی'' کا سنگِ بنیاد مثلاً ۱۹۶۴ء میں ڈالا گیا، اب بعد میں جب بھی تاریخ مرتب ہوگی، تو اُس میں اِس تنظیم کے صدر اور خاص لوگوں ہی کا ذکر ہوگا، عام افراد کا ذکر چھوڑ دیا جائے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بندوں کی ہدایت کے لیے جن انبیاء کرام علیہم السلام کے ذکر کو ضروری سمجھا، اُن کو بیان فرمایا، چناں چہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ. (۲)

اِس آیتِ کریمہ میں اللہ کے رسول ﷺ کو کہا جارہا ہے کہ بعض انبیاء کرام کے احوال آپ کے سامنے بیان نہیں کیے گئے۔

اس کی اصل حکمت صرف اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، اسی وجہ سے انبیاء کرام کی تعداد کے متعلق اجمالی ایمان ہی کافی ہے، کسی ایک عددِ خاص کا ذکر کرنا صحیح نہیں ہے، بہت سے غیر مسلمین جن کو نبی مانتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ نبی ہوں؛ لیکن چوں کہ اُن کے بارے میں کوئی نص قطعی مروی نہیں ہے: اِس لیے ہم نہ اِس باب میں اُن کی تصدیق کریں گے اور نہ تکذیب؛ بل کہ اِس میں توقف بہتر ہے۔ (۳)

=: ۲/ ۶۵۴، رقم: ۴۱۶۶، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ السنن الكبرى-أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۹/ ۷، رقم: ۱۷۷۱۱، كتاب السير، باب مبتدأ الخلق، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

قال الملا علي القاري: ورد في مسند أحمد أنه -عليه الصلاة والسلام- سئل عن عدد الأنبياء، فقال: مائة ألف وأربعة وعشرون ألفا، والرسل من هم ثلاث مائة وخمسة عشر، أولهم آدم وآخرهم محمد صلى الله عليه وسلم. وهو لا ينافي قوله تعالى: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ. فإن ثبوت الإجمال لا ينافي تفصيل الأحوال، نعم الأولى أن لا يقتصر على الأعداد؛ فإن الآحاد لا تفيد الاعتماد في الاعتقاد؛ بل يجب كما قال الله تعالى: كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ أن يؤمن إيمانا إجماليا من غير تعرض متعدد الصفات وعدد الملائكة والكتب والأنبياء وأرباب الرسالة من الأصفياء. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۶۹، ط: یاسر ندیم-دیوبند ☆ مزید دیکھیے: شرح عقائد نسفی، ص: ۱۳۸، ط: یاسر ندیم-دیوبند)

(۱) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ. (۲-البقرة: ۱۸۵)

(۲) ۴۰-غافر: ۷۸۔

(۳) [ورسله] بأن تعرف أنهم بلغوا ما أنزل الله إليهم، وأنهم معصومون، وتؤمن بوجودهم فيمن علم بنص، أو تواتر تفصيلا، وفي غيرهم إجمالا. (مرقاة المفاتيح: ۱/ ۵۸، كتاب الإيمان، ط: دار الفكر-بيروت)

اللہ تعالیٰ نے تمام ادیانِ سماویہ میں بنیادی عقائد یعنی توحید و رسالت اور بعث بعد الموت جیسے امور پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا ہے، نیز باہمی اخلاق و مروت کی پابندی بھی ہر دین سماوی میں لازم ہوتی ہے، غرض یہ کہ تمام ادیانِ سماویہ کی تعلیمات اچھی ہوتی ہیں، یہ تعلیمات اگلی اُمتوں کو جن انبیاء کے ذریعہ پہنچیں، مرورِ زمانہ کے ساتھ اُن انبیاء اور صلحاء کے بارے میں اُن کی اُمتوں کا عقیدہ اعتدال پر قائم نہیں رہا، چناں چہ نصاریٰ نے اپنے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہہ دیا۔(۱) اور بعض نصاریٰ ان ہی کو خدا ماننے لگے۔(۲) اسی طرح یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں حدود کی پاسداری نہیں کی اور ان کو اللہ کا بیٹا قرار دیا۔(۳) الحاصل کوئی بھی اُمت اپنے اصل عقائد و احکام پر برقرار نہیں رہی، تمام نے اپنی نبوی تعلیمات کو بدل دیا۔(۴) لہٰذا اُن کے عقائد کا کوئی اعتبار نہیں، ہنود کا اپنے صلحاء کے متعلق کہنا کہ وہ نبی تھے، اُس کی کوئی اصل نہیں ہے، بل کہ اُن کے متعلق وہ جن کرامات کو بیان کرتے ہیں؛ اُن سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنات ہوں گے۔(۵) اسی طرح یہود و نصاریٰ جن کے متعلق نبی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اُن کا ذکر کسی نص قطعی میں نہ ہو، ہم اُن کے انکار کی وجہ سے گنہگار نہیں ہوں گے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] حضرت آدم علیہ السلام کی وِلادت کب ہوئی تھی؟

۱۰۱-سوال: حضرت آدم علیہ السلام کی ولادت کو اب تک کتنے سال گذر چکے ہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

اِس سلسلے میں کوئی آیتِ قرآنی یا حدیثِ صحیح مروی نہیں ہے، لہٰذا تعیین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا

(۱) وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ. (۹-التوبة: ۳۰)

(۲) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۔ الآية (۵-المائدة: ۱۷)

(۳) وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ. (۹-التوبة: ۳۰)

(۴) مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ. (۴-النساء: ۴۶)

(۵) ومن هاهنا يظهر أن ما يدعو أهل الهند من البرازخ ويسمونهم أوتارا ويذكرون في تواريخهم ألوف ومائة ألوف من السنين لعلهم كانوا من الجن برازخ مبعوثين إلى الجن، ولعل لأهل الهند دين منزل من الله تعالى على الجن استفاد منهم الأنس قبل لأجل كونهم مولودين من بطن الجنية منسوخ بشرائع منزلة بعد ذلك، فإن أصول دينهم يوافق الكتاب والسنة غالبا وما يخالف منه فهو من عمل الشيطان مردود. والله أعلم. (التفسير المظهري- المظهري، محمد ثناء الله (م: ۱۲۲۵هـ): ۳/۲۸۹-۲۹۰، تحت قوله تعالى: يا معشر الجن والإنس ألم يأتكم رسل منكم. الآية (۶-الأنعام: ۱۳۰)، ت: غلام نبي التونسي، ط: مكتبة الرشدية-الباكستان)

کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت کب ہوئی تھی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] اسلام سے قبل ہر ملک کے لیے مستقل نبی کی ضرورت تھی یا نہیں؟

۱۰۲-سوال: پہلے زمانے میں ایک ہی وقت میں مختلف علاقوں میں متعدد نبی ہوا کرتے تھے، مثلاً ملکِ شام، عراق، مصر، یمن اور حجاز وغیرہ میں مستقل نبی تھے، تو سوال یہ ہے کہ کیا اُس وقت ان ممالک کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی نبی کی ضرورت تھی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

دنیا کے مختلف خطوں میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رشد وہدایت کے لیے ضرورت کے مطابق انبیاء

---

(۱) تاہم مستدرک حاکم کی مندرجہ ذیل روایت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم کی ولادت کو چودھویں صدی ہجری تک کم بیش ۶۲۰۰ سال گزر چکے ہیں، روایت ملاحظہ ہو:

عن ابن عباس، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «كان عمر آدم ألف سنة» قال ابن عباس: «وبين آدم ونوح ألف سنة، وبين نوح وإبراهيم ألف سنة، وبين إبراهيم وموسى سبع مائة سنة، وبين موسى وعيسى خمس مائة سنة، وبين عيسى ومحمد صلى الله عليه وسلم ست مائة سنة». المستدرك على الصحيحين: أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله النيسابوري (م: ۴۰۵ھ): ۲/ ۲۵۴، رقم: ۴۱۶۲، كتاب تواريخ المتقدمين من الأنبياء والمرسلين، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

اس روایت میں حضرت آدم علیہ السلام سے آپ ﷺ تک ۴۸۰۰/سال ہوئے، اس کے ساتھ قبل ہجرت ۵۳/سال اور چودھویں صدی ہجری تک کے ۱۴۰۰/سال کو شامل کر لیا جائے تو ۶۲۰۰/سال سے کچھ زیادہ ہوئے۔

طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرت آدم کو زمین پر آئے، چودھویں صدی ہجری تک ۶۸۶۹/سال ہو گئے، اور حضرت آدم کی عمر ۱۰۰۰/سال تھی، جیسا کہ مستدرک حاکم کی روایت بالا میں مذکور ہے، اس لحاظ سے حضرت آدم کی ولادت کو ۷۸۶۹/سال گذر گئے، روایت ملاحظہ ہو:

عن أبيه عن عكرمة قال: كان بين آدم ونوح عشرة قرون، كلهم على الإسلام. قال: أخبرنا محمد بن عمر بن واقد الأسلمي عن غير واحد من أهل العلم قالوا: كان بين آدم ونوح عشرة قرون، والقرن مائة سنة. وبين نوح وإبراهيم عشرة قرون. والقرن مائة سنة. وبين إبراهيم وموسى بن عمران عشرة قرون. والقرن مائة سنة. قال: أخبرنا هشام بن محمد بن السائب عن أبيه عن أبي صالح عن ابن عباس قال: كان بين موسى بن عمران وعيسى ابن مريم ألف سنة وتسعمائة سنة، ولم تكن بينهما فترة. وأنه أرسل بينهما ألف نبي من بني إسرائيل سوى من أرسل من غيرهم. وكان بين ميلاد عيسى والنبي- عليه الصلاة والسلام- خمسمائة سنة وتسع وستون سنة. (الطبقات الكبرى-أبو عبد الله محمد بن سعد البصري، البغدادي المعروف بـ "ابن سعد" (م: ۲۳۰ھ): ۱/ ۴۴، ذكر القرون والسنين التي بين آدم ومحمد، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

مبعوث فرمائے تھے، اللہ تعالیٰ انسانوں کی ضرورت سے بہ خوبی واقف ہیں، لہٰذا مختلف خطوں میں رسولوں کے بھیجنے اور کتبِ سماویہ کے نازل کرنے میں بھی حکمتِ الٰہیہ کو خاص دخل ہے، خواہ ہماری ناقص عقل وفکر کی رسائی اس حکمت تک نہ ہو۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] قرآنِ پاک میں کتنے انبیاء کا ذکر ہے؟ اور ان کے نام کیا ہیں؟

۱۰۳-سوال: قرآنِ پاک میں کتنے انبیاء کا ذکر ہے؟ اور ان کے نام کیا ہیں؟ اُن کے علاوہ دیگر انبیاء کے بارے تفصیلات معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

قرآن پاک میں مندرجۂ ذیل انبیاءِ کرام علیہم السلام کا ذکر ملتا ہے:

حضرت آدم، حضرت ادریس، حضرت نوح، حضرت ھود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت اسماعیل، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت ایوب، حضرت شعیب، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت یونس، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت الیاس، حضرت الیسع، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت ذوالکفل علیہم الصلاۃ والسلام اور سردار دوجہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۸۵) (۲)

نبوت ورسالت وہبی شئے ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے، اپنے فضل سے نبی بناتا ہے۔ (۳) اُس میں بندے کے کسب کا کوئی دخل نہیں ہوتا، یعنی بندہ جس طرح اپنے کسب واختیار سے عبادت و ریاضت کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتا ہے، اِس طرح اپنے کسب واختیار سے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی محنت وریاضت کے باوجود نبی نہیں بن سکتا، نبی بنائے جانے میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی مشیت کار فرما ہوتی ہے، وہ جسے چاہے نبی بنائے۔ چوں کہ نبوت مکمل طور پر امروہبی ہے، اس لیے کوئی متعین شخصیت نبی ہے یا نہیں، اس کا علم قرآن وحدیث کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے نہیں ہوسکتا، لہٰذا قرآن کریم اور حدیث پاک

---

(۱) وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. (۴-النساء: ۱۷)

(۲) الإتقان في علوم القرآن- جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱ھ): ۴/ ۶۴-۷۷، النوع التاسع والعشرون فيما وقع في القرآن من الاسماء والكنى والألقاب، ط: الهيئة المصرية العامة للكتاب☆ر: تفسير القرآن العظيم- ابن كثير القرشي (م: ۷۷۴ھ): ۲/ ۴۱۷، النساء: ۱۶۳، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۳) قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ. (۱۴-ابراهيم: ۱۱)

میں جن انبیاء کرام کا ذکر ہے، اُن کے علاوہ کسی اور کو نبی نہیں مان سکتے؛ اِسی لیے تمام انبیاء کرام کی تعداد کے متعلق اجمالی ایمان ہی لازم ہے۔(۱) ورنہ غیر نبی کو نبی ماننا یا اُس کے برخلاف نبی کی نبوت کا انکار لازم آئے گا۔ واللہ اُعلم بالصواب۔

[۱۱] قرآنِ پاک میں مذکور انبیاء کے علاوہ دیگر انبیاء کے حالات کیسے معلوم کیے جائیں؟

۱۰۴-سوال: قرآنِ پاک میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ اُس نے ہر قوم کی جانب نبی بھیجا ہے۔(۲) اور قرآن پاک میں جن انبیاء کا ذکر ہے، اُن میں سے اکثر مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں مبعوث تھے، تو اُن کے علاوہ دیگر ممالک میں مبعوث انبیاء کے حالات کیسے معلوم ہو سکتے ہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

احادیثِ مبارکہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے۔(۳) لیکن اُن میں سے تمام انبیاء کرام کے متعلق تفصیلی حالات مروی نہیں ہیں کہ وہ

---

(۱) [ورسله] بأن تعرف أنهم بلغوا ما أنزل الله إليهم، وأنهم معصومون، وتؤمن بوجودهم فيمن علم بنص، أو تواتر تفصيلا، وفي غيرهم إجمالا. (مرقاة المفاتيح: ۱/۵۸، كتاب الإيمان، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝ (۳۵-فاطر: ۲۴)

(۳) الحديث طويل و الجزء المقصود منه: قلت يا نبي الله، فأي الأنبياء كان أول؟ قال: "آدم". قال: قلت يا نبي الله: أو نبي كان آدم قال: "نعم. نبي مكلم خلقه الله بيده، ثم نفخ فيه روحه، ثم قال له: يا آدم قبلا". قال: قلت: يا رسول الله، كم وفى عدة الأنبياء؟ قال: "مائة ألف وأربعة وعشرون ألفا الرسل من ذلك ثلاث مائة وخمسة عشر جما غفيرا".
(مسند الإمام احمد بن حنبل: ۳۶/۶۱۹، رقم: ۲۲۲۸۸، عن أبي أمامة الباهلي، ط: مؤسسة الرسالة ★ المعجم الكبير - أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۸/۲۱۷، رقم: ۷۸۷۱، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية - القاهرة ☆ المستدرك على الصحيحين: أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله النيسابوري (م: ۴۰۵ھ): ۲/۶۵۲، رقم: ۴۱۶۶، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ السنن الكبرى - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۹/۷، رقم: ۱۷۷۱۱، كتاب السير، باب مبتدأ الخلق، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

قال الملا علي القاري: ورد في مسند أحمد أنه - عليه الصلاة والسلام - سئل عن عدد الأنبياء، فقال: مائة ألف وأربعة وعشرون ألفا، والرسل من هم ثلاث مائة وخمسة عشر، أولهم آدم وآخرهم محمد صلى الله عليه وسلم. وهو لا ينافي قوله تعالى: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ. فإن ثبوت الإجمال لا ينافي تفصيل الأحوال، نعم الأولى أن لا يقتصر على الأعداد؛ فإن الآحاد لا تفيد الاعتماد في الاعتقاد؛ بل يجب كما قال الله تعالى: كُلٌّ آمَنَ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ أن يؤمن إيمانا إجماليا من غير تعرض متعدد الصفات وعدد الملائكة والكتب والأنبياء وأرباب الرسالة من الأصفياء. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۲۹، ط: یاسر ندیم - دیوبند ☆ مزید دیکھیے: شرح عقائد نسفی، ص: ۱۳۸، ط: یاسر ندیم - دیوبند)

کہاں کب اور کس قوم کی جانب مبعوث ہوئے، البتہ بعض انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں کچھ تفصیلات قرآنِ پاک میں اور کچھ احادیثِ مبارکہ میں ملتی ہیں، قرآنِ پاک میں اللہ رب العزت نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ کے سامنے بعض انبیاء کرام کی تفصیل بیان نہیں کی گئی ہے۔ (۱) لہٰذا اُن تفصیل کے معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، تمام انبیاء کرام پر اجمالی ایمان ہی کافی ہے، اگر تفصیل ضروری ہوتی، تو اللہ تعالیٰ خود بیان فرمادیتے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] غیر مسلمین جن کو اپنا نبی مانتے ہیں، اُن کے متعلق ہمارا عقیدہ کیا ہونا چاہیے؟

۱۰۵-سوال: بعض غیر مسلم اقوام کا اپنے قومی رہبروں کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ وہ نبی تھے، مثلاً مجوس کا عقیدہ زرتشت کے متعلق، چینی لوگوں کا عقیدہ کنفیوشس کے متعلق، ہنود کا عقیدہ رام اور کرشن کے متعلق، جین لوگوں کا عقیدہ مہاویر کے متعلق اور بودھ مت والوں کا عقیدہ گوتم بودھ کے متعلق یہ ہے کہ وہ نبی تھے، تو شریعتِ مطہرہ کے حکم کے مطابق ان کے بارے میں ہمارا عقیدہ کیا ہونا چاہیے؟

الجواب حامداً و مصلیا:

یہ بات حق ہے کہ پچھلی بہت سی اقوام میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے تھے، اُن پر کتابیں اور صحائف بھی نازل ہوئے تھے؛ لیکن بعد میں آنے والے لوگوں نے اُن میں تحریف سے کام لیا، جیسا کہ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتبِ سماویہ: تورات و انجیل میں تحریف کر دیا۔ (۲) اور اصل تعلیماتِ نبویہ سے دور ہو گئے، جس کی وجہ سے اُن کے عقائد، عبادات اور معاملات؛ تمام چیزوں میں ایسا فساد آ گیا کہ اُن کے دین اور غیر سماوی ادیان میں کوئی فرق ہی نہیں رہا، اس قدر تحریف کے بعد اُن کی کوئی بھی روایت اور خبر کیسے صحیح مانی جا سکتی ہے؟ لہٰذا نصوصِ قطعیہ میں جن انبیاء کا ذکر ہے، اُن کے علاوہ دیگر تمام انبیاء کے متعلق ہمارا اجمالی ایمان اس طرح ہونا چاہیے کہ "میں اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تمام انبیاء و رسل پر ایمان رکھتا ہوں"۔ (۳) تا کہ کسی نبی کی نبوت کا انکار بھی نہ ہو، اور کسی غیر نبی کو نبی ماننا بھی لازم نہ آئے، نیز ہمیں اُن کے ان بزرگوں کی

---

(۱) وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ. (۴۰-غافر ۷۸)

(۲) مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ (۴-النساء: ۴۶)

(۳) [ورسله] بأن تعرف أنهم بلغوا ما أنزل الله إليهم، وأنهم معصومون، وتؤمن بوجودهم فيمن علم بنص، أو تواتر تفصيلا، وفي غيرهم إجمالا. (مرقاة المفاتيح: ۱/۵۸، كتاب الإيمان، ط: دار الفكر-بيروت)

توہین بھی نہیں کرنی چاہیے؛ کیوں کہ امکان ہے کہ وہ واقعۃً نبی ہوں۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] انبیاءِ کرام علیہم السلام کو اُن کی موت سے پہلے اختیار دیا جاتا ہے

۱۰۶-سوال: حضرت مفتی احمد بیمات صاحب کی ایک گجراتی کتاب ”موت، قبر؟ اور برزخ کے احوال“ میں حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ اُن کی موت ایک فرشتہ کے پروں پر آسمان میں ہوئی۔[۲] اِسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام،[۳] حضرت زکریا علیہ السلام[۴] اور حضرت یحییٰ

(۱) ومن هاهنا يظهر أن مايدعو أهل الهند من البرازخ ويسمونهم أوتارا ويذكرون في تواريخهم ألوف ومائة ألوف من السنين لعلهم كانوا من الجن برازخ مبعوثين إلى الجن، ولعل لأهل الهند دين منزل من الله تعالى على الجن استفاد منهم الأنس قبل لأجل كونهم مولودين من بطن الجنية منسوخ بشرائع منزلة بعد ذلك، فإن أصول دينهم يوافق الكتاب والسنة غالبا وما يخالف منه فهو من عمل الشيطان مردود. والله أعلم. (التفسير المظهري- المظهري، محمد ثناء الله (م: ۱۲۲۵هـ): ۳/ ۲۸۹-۲۹۰، تحت قوله تعالى: يا معشر الجن والإنس ألم يأتكم رسل منكم. الآية (-۶ الأنعام: ۱۳۰)، ت: غلام نبي التونسي، ط: مكتبة الرشدية- الباكستان)

(۲) وأخرج ابن أبي حاتم عن ابن عباس في قوله: {ورفعناه مكانا عليا} قال: كان إدريس خياطا، وكان لا يغرز إلا قال: سبحان الله فكان يمسي حين يمسي وليس في الأرض أحد أفضل منه عملا، فاستأذن ملك من الملائكة ربه، فقال: يا رب إئذن لي فاهبط إلى إدريس. فأذن له، فأتى إدريس فسلم عليه وقال: إني جئتك لأحدثك فقال: كيف تحدثني وأنت ملك وأنا إنسان، ثم قال إدريس هل بينك وبين ملك الموت شيء، قال الملك: ذاك أخي من الملائكة، فقال: هل يستطيع أن ينسئني عند الموت قال: أما أن يؤخر شيئا أو يقدمه فلا ولكن سأكلمه لك فيرفق بك عند الموت، فقال: اركب على جناحي، فركب إدريس، فصعد إلى السماء العليا، فلقي ملك الموت إدريس بين جناحيه، فقال له الملك إن لي إليك حاجة، قال: علمت حاجتك تكلمني في إدريس وقد محي اسمه من الصحيفة ولم يبق من أجله إلا نصف طرفة عين فمات إدريس بين جناحي الملك. (الدر المنثور في التفسير بالمأثور- عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱هـ): ۵/ ۵۱۸-۵۱۷، تحت آية: ورفعناه مكانا عليا. (مريم: ۵۷)، ط: دار الفكر- بيروت☆ ر: المصنف- أبو بكر بن أبي شيبة (م: ۲۳۵هـ): ۶/ ۳۴۱، رقم: ۳۱۸۸۳، ماذكر من فضل إدريس، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد- الرياض)

(۳) عن ابن عباس- رضي الله عنهما- قال: " مات سليمان بن داود -عليهما السلام- وهو قائم يصلي، ولم تعلم الشياطين بذلك حتى أكلت الأرضة عصاه، فخر، وكان إذا نبتت شجرة سألها لأي داء أنت؟ قال: فتخبره». الحديث، هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه. (المستدرك على الصحيحين- أبو عبد الله الحاكم النيسابوري المعروف بابن البيع (م: ۴۰۵هـ): ۲/ ۴۵۹، رقم: ۳۵۸۳، تفسير سورة سبأ، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆ مزید دیکھیے: الدر المنثور في التفسير بالمأثور: ۶/ ۶۸۲، ط: دار الفكر- بيروت☆ البداية والنهاية- أبو الفداء إسماعيل بن كثير القرشي (م: ۷۷۴هـ): ۲/ ۳۰، باب ذكر جماعة من أنبياء بني=

علیہ السلام (۵) کو بھی مہلت نہیں دی گئی، جب کہ ایک دوسری کتاب ''موت کا منظر'' میں بخاری شریف کے حوالے سے ایک حدیث شریف ذکر کی گئی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تمام انبیاء کو اُن کی وفات سے قبل اختیار دیا جاتا ہے کہ اگر وہ چاہیں، تو دنیا میں رہنا پسند کریں یا ملأ اعلیٰ کو ترجیح دیں؛ سوال یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی کتاب میں مذکور چاروں انبیاء کے قصوں میں انہیں مہلت کیوں نہیں دی گئی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کتاب ''موت کا منظر'' میں جو حدیث لکھی گئی ہے، وہ بالکل صحیح ہے، بخاری شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ بہ حالتِ صحت فرمایا کرتے تھے کہ کسی بھی نبی کی موت اُس وقت تک نہیں آتی، جب تک کہ وہ جنت میں اپنا ٹھکانہ نہ دیکھ لے، اُس کے بعد نبی کو اختیار دیا جاتا ہے کہ اگر وہ چاہیں، تو دنیا میں رہنا پسند کریں یا آخرت کو اختیار فرمائیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر جب آپ ﷺ پر حیاتِ مبارکہ کے اخیری وقت غشی طاری ہوئی، اس وقت آپ ﷺ کا سر مبارک میری گود میں تھا، آپ ﷺ نے جب غشی سے افاقہ پایا، تو چھت کی جانب چہرۂ انور اٹھا کر یہ دعاء فرمائی: ''اللّٰهم الرفيق الأعلى'' (اے بلند و بالا مرتبہ والے اللہ! میں تیرے پاس رہنا پسند کرتا ہوں) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں یہ دعاء سن کر سمجھ گئی کہ اب حضورِ اکرم ﷺ ہمارے ساتھ رہنا پسند نہیں فرمائیں گے اور یہ وہی بات ہے، جسے آپ ﷺ اپنی حیاتِ مبارکہ میں صحت کی حالت میں فرمایا کرتے تھے، یہ دعاء حضورِ پاک ﷺ کی زبانِ مبارک سے نکلا ہوا اخیری کلمہ تھا۔ (بخاری شریف: ۲/ ۶۴۱)(۱)

=إسرائيل، قصة سليمان، ذكر وفاته، الخ)

(۴-۵) عن وهب بن منبه أنه قال: هرب من قومه فدخل شجرة، فجاءوا، فوضعوا المنشار عليهما، فلما وصل المنشار إلى أضلاعه أنّ، فأوحى الله إليه لئن لم يسكن أنينك لأقلبن الأرض ومن عليها، فسكن أنينه حتى قطع باثنتين. (البداية والنهاية: ۲/ ۵۲، قصة زكريا ويحيى عليهما السلام، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) أخبرني سعيد بن المسيب، في رجال من أهل العلم: أن عائشة قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم يقول وهو صحيح: «إنه لم يقبض نبي حتى يرى مقعده من الجنة، ثم يخير» فلما نزل به، ورأسه على فخذي غشي عليه، ثم أفاق فأشخص بصره إلى سقف البيت، ثم قال: «اللهم الرفيق الأعلى». فقلت: إذا لا يختارنا، وعرفت أنه الحديث الذي كان يحدثنا وهو صحيح، قالت: فكانت آخر كلمة تكلم بها: «اللهم الرفيق الأعلى». (صحيح البخاري: ۲/ ۶۴۱، رقم: ۴۴۶۳، كتاب المغازي، باب آخر ما تكلم النبي صلى الله عليه وسلم، ط: البدر - ديوبند)

''موت، قبر اور برزخ کے احوال'' نامی گجراتی کتاب میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اُس کی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ قبض روح کے لیے جس وقت فرشتہ آ پہنچا، اُس وقت مہلت نہیں دی گئی، البتہ اُس سے پہلے اختیار دیا گیا تھا، اور اُس اختیار کے موقع پر کسی بھی نبی نے دنیا میں رہنا پسند نہیں فرمایا اور اُن کی روح قبض ہوگئی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] کیا عورت نبی ہوسکتی ہے؟ حضرت مریم علیہا السلام نبیہ تھیں یا نہیں؟

۱۰۷-سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین مندرجۂ ذیل مسائل کے متعلق کہ

(۱) کیا عورت نبی ہوسکتی ہے؟

(۲) کیا حضرت مریم علیہا السلام نبی تھیں؟

(۳) کیا ابن حزمؒ عورتوں کے نبی ہونے کے قائل تھے؟ اِس باب میں جمہور کی رائے کیا ہے؟

(۴) کسی عورت کے پاس وحی آئی ہو، تو کیا اُس سے اُن کی نبوت ثابت ہوتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) حضرت مریم علیہا السلام نبی تھیں یا نہیں، اس بارے میں بحث وکلام عہد صحابہؓ وتابعینؒ کے بعد ہوا۔[۱] مفسرین کرام اور محدثین عظام میں اختلاف رہا ہے، کچھ لوگ حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے قائل ہیں۔

حضرت امام نوویؒ اور ملا علی قاریؒ نے بعض علماء سے حضرت مریم علیہا السلام کی عدم نبوت پر اجماع نقل کیا ہے۔[۲] لیکن دیگر مفسرین اور شراح حدیث نے اس اجماع کے

(۱) قال أبو محمد: هذا فصل لا نعلمه حدث التنازع العظيم فيه إلا عندنا بقرطبة وفي زماننا. (الفصل في الملل والأهواء والنحل-أبو محمد علي بن أحمد ابن حزم الأندلسي القرطبي (م:۴۵۶ھ): ۵/۱۲، نبوة النساء، ط: مكتبة الخانجي- القاهرة)

(۲) وقد نقل جماعة الإجماع على عدمها، والله أعلم. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج المعروف بـ حاشية النووي- أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م:۶۷۶ھ) :۲/۲۸۴، رقم الحديث: ۲۴۳۱، كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خديجة، ط: البدر- ديوبند)

ملا علی قاریؒ (م:۱۰۱۴ھ) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: وذلك لما نقل العلماء من الإجماع على عدم نبوة النساء، ولما يدل عليه قوله تعالى: {وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا} [يوسف: ۱۰۹]. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۹/۳۶۵۸، باب بدء الخلق، وذكر الانبياء، تحت رقم الحديث: ۵۷۲۴، ط: دار الفكر بيروت)

نقل کرنے کو قابل اشکال قرار دیا ہے۔ (۳)

بہر حال حضرت مریم علیہا السلام کی نبوّت کے قائلین کی دلیل درج ذیل آیت کریمہ ہے:

(۱) وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ. (۴)

اس آیت کریمہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام پر وحی آئی ہے اور یہ نبوّت کی دلیل ہے۔

(۲) ان حضرات کی دوسری دلیل یہ حدیث پاک ہے:

عن أبي موسى رضي الله عنه، قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: "كمل من الرجال كثير، ولم يكمل من النساء: إلا آسية امرأة فرعون، ومريم بنت عمران، وإن فضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام". (۵)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مردوں میں سے بہت سے لوگ درجۂ کمال کو پہنچے، اور عورتوں میں سے سوائے فرعون کی بیوی آسیہ اور حضرت عمران کی بیٹی حضرت مریم کے علاوہ کوئی کمال کو نہیں پہنچیں، اور عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی فضیلت تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسی کہ ثرید کی فضیلت بقیہ کھانوں پر۔

حضرت مریم علیہا السلام کی نبوّت کے اثبات میں علامہ ابو عبداللہ القرطبیؒ (صاحب تفسیر الجامع لاحکام القرآن معروف بہ تفسیر قرطبی) پیش پیش ہیں، اس لیے ابو محمد علی بن احمد القرطبی الظاہری معروف بہ ابن حزم ظاہریؒ بھی یہ مذہب رکھتے ہوں تو بعید نہیں۔ علامہ قرطبیؒ کے پیش پیش ہونے کی وجہ فتح الباری شرح بخاری سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ مسئلہ ان کے زمانہ میں ظہور پذیر ہوا۔ (۶) اور ابن حزمؒ کا رجحان

---

(۳) ذهب بعض العلماء إلى أن الله أنعم على بعض النساء بالنبوة، فمن هؤلاء أبو الحسن الأشعري والقرطبي وابن حزم. (الرسل والرسالات - عمر بن سليمان بن عبد الله الأشقر العتيبي، ص: ۸۲، الباب الأول، الرسل والأنبياء، ط: مكتبة الفلاح - الكويت)

(۴) (۳-آل عمران: ۴۲)

(۵) صحيح البخاري: ۱/ ۴۸۴، رقم: ۳۴۱۱، ۳۴۳۳، ۳۷۶۹، ۵۴۱۸، كتاب الأنبياء، باب قول الله عز وجل: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا ... إلى قوله: وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ: ط: البدر - ديوبند)

(۶) وذكر ابن حزم في الملل والنحل: أن هذه المسألة لم يحدث التنازع فيها إلا في عصره بقرطبة. (فتح الباري - ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲هـ): ۶/ ۴۴۷، كتاب الجهاد، باب قوله تعالى: وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ. ط: دار المعرفة - بيروت)

بھی اس باب میں نبوّت کی طرف ہے۔ (۷)

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ صحیح یہی ہے کہ صور پھونکے جانے یعنی قیامت تک کی سبھی عورتوں پر حضرت مریم علیہا السلام کو برگزیدہ بنایا، پھر مذکورہ بالا حدیث کو بہ طریق مسلم ذکر فرما کر رقم طراز ہیں کہ "کمال کے معنی کسی شئے کا اپنی نہایت اور حد کو پہنچ کر پورا ہو جانا ہے" ، کمالِ مطلق تو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ثابت ہے؛ لیکن اس میں شک نہیں کہ بنی نوعِ انسان میں اکمل' انبیاء پھر اولیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں، تو حدیث شریف میں حضرت مریم علیہا السلام کی جانب جو کمال منسوب ہے، اس سے نبوت مراد ہے اور صحیح یہی ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نبیہ ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کے واسطے سے اُن تک وحی بھیجی، جس طرح بقیہ نبیوں پر بھیجی۔ (۸)

علامہ قرطبیؒ نے مذکورہ روایت کے علاوہ بھی بعض روایت حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت سے متعلق ذکر فرمائی ہے، جن میں ایک روایت یہ بھی ہے، جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے:

---

(۷) اس سوال کا حاشیہ نمبر ۳۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(۸) وقيل: " على نساء العالمين " أجمع إلى يوم الصور، وهو الصحيح ... وروى مسلم عن أبي موسى قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: (كمل من الرجال كثير ولم يكمل من النساء غير مريم بنت عمران وآسية امرأة فرعون وإن فضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام.)

قال علماؤنا رحمة الله عليهم: الكمال هو التناهي والتمام. . . والكمال المطلق إنما هو لله تعالى خاصة. ولا شك أن أكمل نوع الإنسان الأنبياء، ثم يليهم الأولياء؛ من الصديقين والشهداء والصالحين. وإذا تقرر هذا فقد قيل: إن الكمال المذكور في الحديث يعني به النبوة . . . والصحيح أن مريم نبية؛ لأن الله تعالى أوحى إليها بواسطة الملك كما أوحى إلى سائر النبيين. . . وروي من طرق صحيحة أنه - عليه السلام - قال فيما رواه عنه أبو هريرة: (خير نساء العالمين أربع مريم بنت عمران وآسية بنت مزاحم امرأة فرعون وخديجة بنت خويلد وفاطمة بنت محمد). ومن حديث ابن عباس عن النبي صلى الله عليه وسلم: (أفضل نساء أهل الجنة خديجة بنت خويلد وفاطمة بنت محمد ومريم بنت عمران وآسية بنت مزاحم امرأة فرعون. (وفي طريق آخر عنه:) سيدة نساء أهل الجنة بعد مريم فاطمة وخديجة. ـــــــــــ فظاهر القرآن والأحاديث يقتضي أن مريم أفضل من جميع نساء العالم من حواء إلى آخر امرأة تقوم عليها الساعة، فإن الملائكة قد بلغتها الوحي عن الله - عز وجل - بالتكليف والإخبار والبشارة كما بلغت سائر الأنبياء، فهي إذا نبية والنبي أفضل من الولي فهي أفضل من كل النساء: الأولين والآخرين مطلقا. ثم بعدها في الفضيلة فاطمة، ثم خديجة، ثم آسية. وكذلك رواه موسى بن عقبة عن كريب عن ابن عباس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: (سيدة نساء العالمين مريم ثم فاطمة ثم خديجة ثم آسية). وهذا حديث حسن يرفع الإشكال. وقد خص الله مريم بما لم يؤته أحدا من النساء، . . . ولذلك روي أنها سبقت السابقين مع الرسل إلى الجنة. (تفسير القرطبي: ۴/ ۸۲-۸۴، (-۱۳آل عمران: ۴۲-۴۳) ط: دار الكتب المصرية- القاهرة)

»سیدات نساء أهل الجنة، بعد مریم ابنة عمران: فاطمة و خدیجة، ثم آسیة امرأة فرعون«۔[9]

پس ظاہر قرآن وحدیث کا تقاضہ یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام، حضرت حوا علیہا السلام سے لے کر قیامت تک آنے والی تمام عورتوں سے افضل ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی، فرشتوں نے بحیثیت تکلیف (نماز کا حکم) "یمریم اقنتی لربك" اور بحیثیت اخبار بشارت، دیگر انبیاء کرام کی طرح آپ تک پہنچائی ہے؛ لہٰذا آپ نبیہ ہیں، اور دنیا کی تمام عورتوں سے افضل ہیں، ان کے بعد حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، پھر حضرت آسیہؓ کا مقام ہے:

عن ابن عباس قال قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم- "سيدة نساء أهل الجنة مريم بنت عمران، ثم فاطمة، ثم خديجة، ثم آسيا امرأة فرعون.[10]

علامہ قرطبی اس حدیث کو ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث حسن ہے، جس سے اشکال خود بہ خود رفع ہو جاتے ہیں"۔

علامہ قرطبی مزید فرماتے ہیں کہ "بنی آدم میں کوئی عورت ایسی نہیں جس کو حضرت مریم کی مانند مناقب حاصل ہوں، نیز یہ کہ وہ انبیاء و رسل کے زمرہ میں دخولِ جنت کے وقت شریک ہوں گی، غرض اُنہوں نے حدیث شریف وغیرہ سے اس بات پر پر زور استدلال کیا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نبیہ ہیں۔

علامہ قرطبیؒ کے ہم نواؤں میں حضرت حافظ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ بھی ہیں، جو علامہ قرطبیؒ کے زورِ استدلال سے متاثر ہیں، بل کہ حدیثِ مذکور پر اُنہوں نے ایک بات ایسی بھی لکھی ہے جس سے وہ علامہ قرطبیؒ سے بھی آگے معلوم ہوتے ہیں، کہ قائلینِ نبوّت کا استدلال اس طرح سے ہو رہا ہے کہ حدیث شریف میں مذکورہ عورتوں کے علاوہ کسی اور کے کمال تک نہ پہنچنے سے مراد نبوّت کے مقام تک نہ پہنچنا ہے؛ کیوں کہ اگر

(۹) المعجم الاوسط- أبو القاسم الطبراني (م:۳۶۰ھ): ۲/ ۲۳، رقم:۱۱۰۷، من اسمه أحمد، ت: طارق بن عوض الله، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين - القاهرة ☆ المعجم الكبير: ۱۱/ ۴۱۵، رقم: ۱۲۱۷۹، كريب عن ابن عباس، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية - القاهرة ☆ كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال- علاء الدين علي بن حسام الدين الهندي البرهانفوري، الشهير بالمتقي الهندي (م:۹۷۵ھ): ۱۲/ ۱۴۵، رقم الحديث: ۳۴۴۰۹، ت: بكري حياني - صفوة السقا، ط: مؤسسة الرسالة)

(۱۰) تاريخ دمشق- أبو القاسم علي بن الحسن المعروف بابن عساكر (م: ۵۷۱ھ): ۷۰/ ۱۰۷، رقم: ۱۳۸۰۳، ت: عمرو بن غرامة العمروي، ط: دار الفكر - بيروت)

اُس سے صدیقیت یا ولایت کی دیگر اقسام مراد ہوں، تو حدیث شریف کے حصر سے یہ لازم آئے گا کہ مذکورہ فی الحدیث عورتوں کے علاوہ کوئی بھی عورت مقامِ صدیقیت و ولایت کو نہیں پہنچی، حالاں کہ کئی عورتیں اِس مقام پر سرفراز ہوئی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہاں ''کمال'' سے ''نبوت'' ہی مراد ہے۔ اُس کے بعد وہی روایات پیش کی ہیں، جن کو علامہ قرطبی نے ذکر فرمایا ہے، یہ تمام روایات افضلیت مریم علیہا السلام، وفاطمہؓ وخدیجہؓ رضی اللہ عنہن پر دلالت کرتی ہیں، اس کے بعد حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے خواتین کے لیے عدمِ نبوّت کے قائلین کی ایک دلیل ذکر فرما کر اُس کا رد فرمایا ہے۔

آخر میں حافظؒ نے علامہ ابن حزمؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی نبوّت کے بارے میں صریح دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے بلا تامل اُس بچہ کو وحی کی بنیاد پر دریا میں ڈال دیا، اور حضرت مریم علیہا السلام کا انبیاء کے ساتھ ذکر فرما کر ''**أولئك الذين أنعم الله عليهم من النبيين**'' فرمایا۔ اس میں حضرت مریم علیہا السلام کی نبوّت پر دلیل اس طور پر ہے کہ لفظ ''**أولئك**'' کے عموم میں حضرت مریم بھی داخل ہیں۔(۱۱)

خلاصہ یہ کہ حافظ ابن حجرؒ نے عدمِ نبوّت کے قائلین کی حمایت میں کچھ نہیں کہا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا رجحان بھی علامہ قرطبیؒ اور ابن حزمؒ کے قول کی طرف ہے، اگر چہ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ جمہور کے خلاف ہیں، بل کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس باب میں توقف کو پسند کرتے ہیں۔ (فتح الباری: ۶/ ۴۴۷)(۱۲)

---

(۱۱) ر: الفصل في الملل والأهواء والنحل - ابن حزم الظاهري: ۵/ ۱۳، نبوة النساء، ط: مكتبة الخانجي، القاهرة)

(۱۲) قوله: ولم يكمل من النساء إلا آسية امرأة فرعون ومريم بنت عمران. استدل بهذا الحصر على أنهما نبيتان؛ لأن أكمل النوع الإنساني الأنبياء، ثم الأولياء، والصديقون، والشهداء، فلو كانتا غير نبيتين، للزم ألا يكون في النساء ولية، ولا صديقة، ولا شهيدة، والواقع أن هذه الصفات في كثير منهن موجودة، فكأنه قال: ولم ينبأ من النساء إلا فلانة وفلانة ولو قال لم تثبت صفة الصديقية أو الولاية أو الشهادة إلا لفلانة وفلانة لم يصح؛ لوجود ذلك في غيرهن إلا أن يكون المراد في الحديث كمال غير الأنبياء فلايتم الدليل على ذلك لأجل ذلك. والله أعلم. (ثم سرد الروايات الواردة في فضائل مريم وخديجة وفاطمة - رضي الله عنهن) . . . وحجة المانعين قوله تعالى: وما أرسلنا من قبلك إلا رجالا. قال وهذا لا حجة فيه، فإن أحدا لم يدع فيهن الرسالة، وإنما الكلام في النبوة فقط، قال وأصرح ما ورد في ذلك قصة مريم وفي قصة أم موسى ما يدل على ثبوت ذلك لها من مبادرتها بالقاء ولدها في البحر بمجرد الوحي إليها بذلك قال وقد قال الله تعالى بعد أن ذكر مريم والأنبياء بعدها أولئك الذين أنعم الله عليهم من النبيين، فدخلت في عمومه، والله أعلم. (فتح الباري - ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲هـ): ۶/ ۴۴۷، كتاب الجهاد، باب قول الله تعالى: وضرب الله مثلا للذين آمنوا امرأة فرعون إلى قوله وكانت من القانتين. ط: دار المعرفة - بيروت)

حضرت علامہ بدالدین عینیؒ نے حافظ ابن حجرؒ کے استدلال کو رد فرمایا ہے، اور فرمایا کہ کمال کے معنیٰ وہی ہیں، جو علامہ قرطبیؒ و ابن حجرؒ نے بیان کیے ہیں، مگر اُس سے نبوّت کا مراد ہونا لازم نہیں آتا؛ اِس لیے کہ ہر شئے کا تمام وکمال اُس کی شایانِ شان ہوتا ہے، اِس لیے اِس جملے (کمل من النساء الخ) سے عورتوں کے ساتھ جو کمالات مخصوص ہیں، اُن کی نہایت کو پہنچنا مراد ہے۔ (اور نبی ہونا اُن کمالات میں سے نہیں' جو عورتوں کی شایانِ شان ہو) اس لیے اس سے نبوت مراد نہیں ہوسکتی۔ ـــــــ ظاہر ہے کہ یہ مصادرت علی المطلوب ہے؛ اس لیے علامہ عینیؒ کے مذکورہ استدلال کو قوی نہیں کہا جاسکتا۔ [۱۳]

علامہ عینیؒ نے بھی امام ابوالحسن اشعریؒ اور علامہ قرطبیؒ کے اقوال کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے، اُن کا پر زور رد نہیں فرمایا، البتہ انہوں نے حضرت فاطمہؓ اور حضرت خدیجہؓ کا افضل النساء ہونا متعدد روایات سے ثابت کیا ہے؛ لیکن آخر میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی درج ذیل روایت ذکر فرمائی ہے:

فاطمة سيدة نساء أهل الجنة، إلا ما كان من مريم بنت عمران. (مسند أحمد)

کہ حضرت فاطمہ حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ دیگر تمام جنتی عورتوں کی سردار ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ اس سے کم از کم حضرت مریم علیہا السلام کے ساتھ' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مساوات ثابت ہوتی ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کی صحت ثابت ہوجائے تو پھر حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت حضرت فاطمہؓ پر متعین ہوجاتی ہے، لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہا ہی کی یہ روایت واوِ عطف کے ساتھ بھی مروی ہے، جو درج ذیل ہے:

سيدة نساء أهل الجنة مريم بن عمران و فاطمة و خديجة و آسية امرأة فرعون.

اِس لیے فضیلت حضرت مریم علیہا السلام کی تعیین مشکوک ہوجاتی ہے۔ فیصلہ کن بات نہیں فرمائی، غالباً یہ بھی توقف کرتے ہیں۔ (عینی: ۵/۳۰۹) [۱۴]

(۱۳) المصادرة على المطلوب: تطلق على قسم من الخطاء في البرهان لخطاء مادته من جهة المبنى وهي جعل النتيجة مقدمة من مقدمتي البرهان بتغير ما. (قواعد الفقه - عميم الإحسان: ص ۴۸۹، ط: الصدف - باكستان)

(۱۴) قال العيني: بعد ذكر مستدلات ابن حجر و القرطبي رداعليهما: و منع بأنه لا يلزم من لفظها الكمال نبوتهما إذ هو يطلق على إتمام الشيء و تناهيه في بابه، فالمراد تناهيهما في جميع الفضائل التي للنساء،... و روى الإمام أحمد من حديث أبي سعيد، قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: (فاطمة سيدة نساء أهل الجنة إلا ما كان من مريم بنت عمران). و هذا يدل على أن فاطمة و مريم أفضل هذه الأربع، ثم يحتمل الاستثناء أن تكون مريم أفضل من =

قائلین عدمِ نبوّت میں حضرت امام نوویؒ نے بہ صراحت رد فرمایا ہے، چناں چہ آپؒ قاضی عیاضؒ کے نبوت کے قول کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ ''غریب ضعیف''، نیز فرماتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کی عدم نبوت پر ایک جماعت نے اجماع نقل کیا ہے۔ (۱۵)

علامہ سید محمود آلوسی بغدادیؒ (صاحب تفسیر روح المعانی) نے اس بات کی تردید کی ہے کہ مریم علیہا السلام کی عدمِ نبوّت پر اجماع ہے، بل کہ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی نبوّت کا قول مشہور ہے اور شیخ تقی الدین سبکی اور ابن سید الناس نے بھی اس قول کو ترجیح دی ہے۔ (۱۶) البتہ حضرت مریم علیہا السلام کی نبوّت کے قول کی تردید فرمائی ہے، اور اللقانی کا قول نقل فرمایا ہے کہ ''اس پر اجماع ہے کہ غیر نبی سے فرشتوں کا کلام ثابت ہے اور جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ محض فرشتہ کے کلام کی بنا پر یا محض وحی کی بنا پر نبوّت ثابت ہو جاتی ہے، تو وہ جادۂ مستقیم سے ہٹا ہوا ہے''۔ (۱۷)

=فاطمة، ويحتمل أن تكونا على السواء في الفضيلة، لكن ورد حديث، إن صح عين الاحتمال الأول، وهو ما روي: أن ابن عباس قال: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: (سيدة نساء أهل الجنة مريم بنت عمران، ثم فاطمة، ثم خديجة، ثم آسية امرأة فرعون). رواه ابن عساكر، فإن كان هذا اللفظ محفوظا: بثم، التي للترتيب فهو مبين لأحد الإحتمالين اللذين دل عليهما الاستثناء، ويقدم على ما تقدم من الألفاظ التي وردت: بواو العطف التي لا تقتضي الترتيب ولا تنفيه. (عمدة القاري: ۱۵/ ۳۰۹، تحت رقم الحديث: ۱۱۴۳، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت)

(۱۵) والجمهور على أنهما ليستا نبيتين؛ بل هما صديقتان، ووليتان من أولياء الله تعالى... قال القاضي: فإن قلنا هما نبيتان فلا شك أن غيرهما لا يلحق بهما، وإن قلنا وليتان لم يمتنع أن يشاركهما من هذه الأمة غيرهما. هذا كلام القاضي وهذا الذي نقله من القول بنبوتهما "غريب ضعيف". وقد نقل جماعة الإجماع على عدمها. والله اعلم. (شرح النووي على صحيح مسلم: ۲/ ۲۸۴، باب: من فضائل خديجة كتاب الفضائل، ط: البدر - ديوبند)

(۱۶) ومن الناس من استدل على عدم استنباء النساء بالإجماع، وبقوله تعالى: ﴿وما أرسلنا قبلك إلا رجالا﴾ [۲۱-الأنبياء: ۷] ولا يخفى ما فيه، أما أولا: فلأن حكاية الإجماع في غاية الغرابة؛ فإن الخلاف في نبوة نسوة: كحواء، وآسية، وأم موسى، وسارة، وهاجر، ومريم -موجود خصوصا مريم؛ فإن القول بنبوتها شهير؛ بل مال الشيخ تقي الدين السبكي في الحلبيات، وابن السيد إلى ترجيحه، وذكر أن ذكرها مع الأنبياء في سورتهم قرينة قوية لذلك. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني -شهاب الدين محمود الألوسي (م: ۱۲۷۰هـ): ۲/ ۱۳۹، تفسير سورة آل عمران: ۴۲، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية -بيروت)

(۱۷) واستدل بهذه الآية من ذهب إلى نبوة مريم؛ لأن تكليم الملائكة يقتضيها، ومنعه اللقاني بأن الملائكة قد كلموا من ليس بنبي إجماعا... وادعى أن من توهم أن النبوة مجرد الوحي ومكالمة الملك فقد حاد عن الصواب. (روح المعاني: ۲/ ۱۳۸-۱۳۹)

پھر صاحب روح المعانیؒ نے اُن روایات پر بحث فرمائی ہے جو علامہ قرطبیؒ، ابن حجرؒ اور عینیؒ نے ''فضیلت حضرت مریم علیہا السلام بر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا'' کے سلسلہ میں پیش فرمائی ہیں، لیکن ان روایات کے ساتھ ابن عساکرؒ کی وہ روایت پیش کی ہے، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور اس میں حضرت فاطمہ کی علی الاطلاق افضلیت کی تصریح ہے، روایت ہے:

أربع نسوة سادات عالمهن، مريم بنت عمران، و آسية بن مزاحم، و خديجة بنت خويلد، و فاطمة بنت محمد، و أفضلهن عالما فاطمة. (۱۸)

اس کے بعد صاحب روح المعانیؒ نے حارث بن اُسامہ کی روایت مرسلاً سندِ صحیح کے ساتھ ذکر کر کے لکھا ہے کہ ابوجعفر ائمہ اہلِ بیت میں سے مشہور شخصیت ہیں، اُن کا مذہب یہی ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام اپنے زمانہ کی عورتوں کے لحاظ سے افضل ہیں۔

صاحبِ روح المعانیؒ مزید فرماتے ہیں کہ راجح یہی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اگلی پچھلی تمام عورتوں سے افضل ہیں، حتیٰ کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی افضل ہیں، اس حیثیت سے کہ وہ سرورِ کائنات ﷺ کے جسدِ اطہر کا ایک ٹکڑا ہیں، جس کے مقابل میں کسی شئے کو نہیں سمجھتا؛ بل کہ وہ ''بضعة الرسول'' ہونے کی حیثیت سے حضرت مریم علیہا السلام سے بھی افضل ہیں، اگر حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کو مان لیا جائے، تب بھی حیثیت کے لحاظ سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت مسلم ہے۔ (۱۹) سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اِس لحاظ سے جملہ بناتِ نبی ﷺ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

آخر میں آپؒ حضرت مریم کی حضرت فاطمہ پر فضیلت کے تعلق سے فیصلہ کن بات فرماتے ہیں کہ فضیلتِ مطلقہ کے لحاظ سے حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے درمیان فیصلہ سے توقف

---

(۱۸) ر: روح المعانی: ۱۴۹/۲۔

(۱۹) وإلى هذا (افضلية مريم) ذهب أبو جعفر - رضى الله تعالى عنه - عن أئمة أهل البيت - والذى أميل إليه - أن الفاطمة البتول أفضل النساء المتقدمات والمتأخرات من حيث أنها بضعة رسول الله - صلى الله تعالى عليه وسلم - بل ومن حيثيات أخر أيضاً . . . وهذا سائغ على القول بنوة مريم أيضاً إذا البضعية من روح الوجود وسيد كل موجود لا أراها تقابل بشيء. (المصدر السالف)

کرتا ہوں، تائید میں ذکر کرتے ہیں کہ قاضی ابو جعفر اور ابن جماعہ سے بھی توقف مروی ہے؛ بل کہ ابن جماعہ نے اسی قول کو ''بہتر واسلم'' قرار دیا ہے۔ (۲۰)

(فیصلہ کن بات)

البتہ عماد الدین اسماعیل ابن کثیرؒ اس باب میں فیصلہ کن اور دوٹوک بات کہی ہے کہ آیت کریمہ ''و ما أرسلنا من قبلك إلا رجالا . . . الخ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف مردوں ہی کو اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے، عورتوں میں سے کسی کو نبوّت نہیں ملی اور یہی جمہور کا قول ہے؛ کیوں کہ آیتِ کریمہ کا سیاق یہی تقاضہ کرتا ہے۔

بعض لوگوں نے حضرت سارہ امرأۃ خلیلؑ، اُم موسیٰ اور مریم بنت عمران کو 'نبیہ' کہا ہے، اور حضرات ملائکہ کے کلام وسلام یا بشارت ومطلق وحی سے استدلال کیا ہے۔ لیکن ان تمام چیزوں کے اُن خواتین کو حاصل ہونے کے باوجود یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کو نبیات قرار دیا جائے، اگر نبوّت سے مراد قائلین نبوت کی صرف اس قدر ہے کہ ایک دو مرتبہ کلامِ ملائکہ سے مشرف ہوگئیں، تو شرافت کے حصول میں تو کوئی کلام نہیں؛ لیکن کیا صرف اس قدر کلام، سلسلۂ نبوت کی لڑی میں شامل ہوجانے کے لیے کافی ہے؟؟؟

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ عورتوں میں کوئی نبیہ نہیں ہیں، چناں چہ وہ شیخ ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعریؒ سے نقل کرتے ہیں:

أنه ليس في النساء نبية، وإنما فيهن صديقات، كما قال تعالى مخبرا عن أشرفهن مريم بنت عمران حيث قال: ﴿مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ [المائدة: ۷۵] فوصفها في أشرف مقاماتها بالصديقية، فلو كانت نبية لذكر ذلك في مقام التشريف والإعظام، فهي صديقة بنص القرآن.

کہ عورتوں میں کوئی نبی نہیں ہیں، اُن میں صرف صدیقات ہیں، چناں چہ اُن عورتوں میں سے جن

(۲۰) وبعد هذا كله الذي يدور في خلدي أن أفضل النساء فاطمة، ثم أمها، ثم عائشة؛ بل لو قال قائل: إن سائر بنات النبي -صلى الله تعالى عليه وسلم- أفضل من عائشة لا أرى عليه بأسا، وعندي بين مريم وفاطمة توقف نظر اللأفضلية المطلقة . . . وإلى التوقف مال القاضي أبو جعفر السروشني منا- وذهب ابن جماعة إلى أنه المذهب الأسلم.
(روح المعاني: ۱۵۰/۲، ط: دار الكتب العلمية)

کے متعلق نبوت کا خیال ہے، اُن میں سب سے اعلیٰ مقام حضرت مریم علیہا السلام کا ہے، اُن کو قرآن کریم نے صدیقہ کے لقب سے نوازا، چناں چہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسیح ابن مریم صرف نبی ہیں، اُن سے پہلے بہت سے رسول گزرے، اور اُن کی ماں صدیقہ ہیں، دونوں عام انسانوں کی طرح کھانا کھاتے تھے، تو اس اظہارِ عظمت و شرافت کے مقام میں حضرت مریم علیہا السلام کے اعلیٰ مقامات میں سے جس رتبہ کا ذکر فرمایا، وہ یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام صدیقہ ہیں، اگر وہ نبیہ ہوتیں، تو اس مقامِ مدح میں اُنہیں ضرور نبیہ کہا جاتا، پس وہ نصِ قرآنی سے صدیقہ ٹھہرتی ہیں۔ (۲۱)

بندہ کی ناقص رائے میں علامہ ابن کثیرؒ کی یہ بات آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور فیصلہ کن بات ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نبیہ نہیں ہیں، ان کی ذکر کردہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کسی عورت کو کبھی نبوت نہیں ملی، اگر صرف کلامِ ملائکہ کا نام نبوّت ہے، تو اگر چہ اُس کو نبوّت کہا جائے؛ لیکن اُس سے مراد نبوّتِ تشریعی نہیں ہے، اور نہ کسی عورت کے لیے اُس کا ثبوت ہے، قائلین نبوت صاحب روح المعانی، حافظ ابن حجرؒ اور علامہ قرطبیؒ نے مذکورہ بالا آیت سے عدم نبوت نساء پر استدلال کو رد کیا ہے کہ یہاں آیت میں رسالت کو مردوں کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے، اور عورتوں سے رسالت کی نفی کی گئی ہے، لیکن خاص

(۲۱) يخبر تعالى أنه إنما أرسل رسله من الرجال لا من النساء، وهذا قول جمهور العلماء، كما دل عليه سياق هذه الآية الكريمة أن الله تعالى لم يوح إلى امرأة من بنات بني آدم وحي تشريع.

وزعم بعضهم أن سارة امرأة الخليل وأم موسى ومريم بنت عمران أم عيسى نبيات، واحتجوا بأن الملائكة بشرت سارة بإسحاق ومن وراء إسحاق يعقوب، وبقوله: وأوحينا إلى أم موسى أن أرضعيه [القصص: ۷] الآية. وبأن الملك جاء إلى مريم فبشرها بعيسى عليه السلام، وبقوله تعالى: إذ قالت الملائكة يا مريم إن الله اصطفاك وطهرك واصطفاك على نساء العالمين يا مريم اقنتي لربك واسجدي واركعي مع الراكعين [آل عمران: ۴۲-۴۳].

وهذا القدر حاصل لهن، ولكن لا يلزم من هذا أن يكن نبيات بذلك، فإن أراد القائل بنبوتهن هذا القدر من التشريف، فهذا لا شك فيه، ويبقى الكلام معه في أن هذا هل يكفي في الانتظام في سلك النبوة بمجرده أم لا؟ الذي عليه أهل السنة والجماعة، وهو الذي نقله الشيخ أبو الحسن علي بن إسماعيل الأشعري عنهم أنه ليس في النساء نبية، وإنما فيهن صديقات، كما قال تعالى مخبرا عن أشرفهن مريم بنت عمران حيث قال تعالى: ما المسيح ابن مريم إلا رسول قد خلت من قبله الرسل وأمه صديقة كانا يأكلان الطعام [المائدة: ۷۵] فوصفها في أشرف مقاماتها بالصديقية، فلو كانت نبية لذكر ذلك في مقام التشريف والإعظام، فهي صديقة بنص القرآن. (تفسير القرآن العظيم-أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي (م: ۷۷۴هـ): ۴/ ۳۶۲، سورة يوسف، وما ارسلنا من قبلك الخ (الآية: ۹)، ت: محمد حسين شمس الدين، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

کی نفی عام کی نفی کو مستلزم نہیں، چناں چہ عورتوں سے نبوت کی نفی اس آیت سے ثابت نہ ہوگی۔ (۲۲)

لیکن آیتِ کریمہ کو رسالت بہ مقابلہ نبوت کے معنیٰ میں لے کر نبوت کو "أرسلنا" کے مفہوم سے خارج قرار دینے پر کوئی دلیل نہیں ہے، کیا قرآنِ کریم میں جہاں "أرسلنا" کا لفظ آیا ہے، وہاں صرف رسول ہی مراد لیے گئے ہیں؟ نبی مراد نہیں لیے گئے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

چناں چہ آیتِ کریمہ: وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝. [۴-النساء: ۱۶۴-۱۶۵]

اور ایسے پیغمبروں کو (صاحب وحی بنایا) جن کا حال اس کے قبل ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں اور ایسے پیغمبروں کو، جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور موسیٰ سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام فرمایا۔ (ان سب کو) خوش خبری دینے والے اور خوف سنانے والے پیغمبر بنا کر (اس لیے بھیجا) تا کہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہے اور اللہ تعالیٰ پورے زور والے ہیں، بڑی حکمت والے ہیں۔ (ترجمہ بیان القرآن)

تو کیا جن کا تذکرہ قرآن کریم میں آیا ہے یا احادیث نبویہ میں، وہ سب کے سب رسول تھے؟؟؟ کیا ان میں کوئی صرف نبی نہیں تھے، کیا حضرت یسع اور حضرت یحییٰ (علیہما السلام) رسول ہیں؟ ذوالکفل علیہ السلام رسول ہیں، یہ ظاہر ہے کہ رسول کی اصطلاحی تعریف مختلف فیہ ہے، اور یہ حضرات اس معنیٰ کر رسول نہیں ہیں۔ (۲۳) پھر رسلاً میں وہ بھی شامل ہیں، جن کا بیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہیں کیا گیا، ظاہر بات ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار میں سے جن کا بیان نہیں آیا، وہ سب اصطلاحی معنیٰ میں رسول ہیں، ہرگز نہیں۔

---

(۲۲) وأما ثانیا فلأن الاستدلال بالآیة لا یصح؛ لأن المذکور فیها الإرسال، وهو أخص من الاستنباء علی الصحیح المشهور، ولا یلزم من نفي الأخص نفي الأعم. (روح المعاني: ۱۴۹/۲، ط: دار الکتب العلمیة- بیروت)
وانظر: فتح الباري: ۴۴۷/۶، کتاب الجهاد، قوله باب: قول الله تعالی: وضرب الله مثلاً. ط: دار المعرفة- بیروت ☆ الرسل والرسالات: ۸۶/۱، الباب الأول الرسل والأنبیاء، ط: مکتبة الفلاح- الکویت ☆ الفصل في الملل والأهواء والنحل: ۱۲/۵، نبوة النساء، ط: مکتبة الخانجي- القاهرة)
(۲۳) والرسول: انسان بعثه الله تعالی إلی الخلق لتبلیغ الأحکام وقد یشترط فیه الکتاب، بخلاف النبي فانه أعم. (شرح عقائد نسفي ص: ۱۶، ط: یاسر ندیم- دیوبند)

"رسلاً مبشرین و منذرین" میں بھی خاص رسول مراد نہیں، لہٰذا قرآنِ کریم میں "رسلاً" کے لفظ کے تحت انبیاء و رسل سب شامل ہو سکتے ہیں، تو پھر "أرسلنا" کے صیغہ میں نبوت کے عدمِ شمول پر کوئی حجت ضرور چاہیے، بلا قرینہ انبیاء کو "أرسلنا" کے صیغہ سے خارج کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

اسی طرح علامہ ابن حزمؒ کا استدلال کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل کے واقعات سورۂ مریم میں ذکر فرمائے ہیں:

فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ. (۲۴)

اِس آیتِ کریمہ میں لفظِ أولئك کے عموم میں حضرت مریم علیہا السلام بھی داخل ہیں، اور انبیاء کے ساتھ تذکرہ اُن کی نبوت کے دلیل ہے۔ (۲۵)

ابن حزم کا یہ کہنا کہ اِس آیت کے عموم میں حضرت مریم علیہا السلام داخل ہیں۔"(۲۶) تو عرض ہے کہ مشار الیہ میں اُن کا دخول تغلیباً ہے، اثباتِ نبوت کے لیے ایسا ضعیف اشارہ کافی نہیں، پھر نہ تو فرشتہ نے حضرت مریم علیہا السلام سے کہا کہ آپ نبیہ ہیں، نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارے میں بھی خود کے نبی ہونے کی خبر دی، (۲۷) لیکن اپنی والدہ کے نبی ہونے کے بارے میں کچھ نہیں کہا، نہ اُس زمانہ کے لوگوں نے جانا کہ حضرت مریم علیہا السلام نبیہ ہیں، ورنہ وہ لوگ حضرت مریم علیہا السلام پر بدگمانی کیوں کرتے؟ نیز سورۂ مریم میں جب انبیاء کا تذکرہ آیا، تو اللہ تعالیٰ نے "وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا" فرمایا، (۲۸) اسی طرح ہر پیغمبر کے بارے میں اُن کے رسول و نبی ہونے کی

(۲۴) ۴-النساء:۶۹۔

(۲۵) ابن حزمؒ نے سورہ نساء کی مذکورہ آیت سے استدلال نہیں کیا ہے، بل کہ سورہ مریم کی آیت: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا.(۱۹-مریم:۵۸) سے استدلال کیا ہے، ملاحظہ ہو: الفصل في الملل والأهواء والنحل: ۱۳/۵، نبوة النساء، ط: مكتبة الخانجي-القاهرة)

(۲۶) ووجدنا الله تعالى قد قال وقد ذكر من الأنبياء عليهم السلام في سورة كهيعص ذكر مريم في جملتهم ثم قال عز وجل {أولئك الذين أنعم الله عليهم من النبيين من ذرية آدم وممن حملنا مع نوح} وهذا هو عموم لها معهم لا يجوز تخصيصها من جملتهم. (الفصل في الملل والأهواء والنحل-ابن حزم الأندلسي(م:۴۵۶): ۱۳/۵، نبوة النساء، ط: مكتبة الخانجي، القاهرة)

(۲۷) قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا۝[۱۹-مریم:۳۰]

(۲۸) ۱۹-مریم:۴۱۔

صراحت فرمائی، مگر سیاق وسباق میں "واذکر فی الکتاب مریم إنها کانت نبیة" کا موقع ہوتے ہوئے کیوں اس طرح ذکر نہیں کیا گیا؟ معلوم ہوا کہ وہ نبیہ نہیں ہیں۔ ہمارا استدلال ابن حزمؒ کے اشارہ کے استدلال سے قوی ہے۔ (۲۹)

دوسرا استدلال علامہ ابن حزمؒ کا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے فرشتہ کی وحیٔ محض پر اپنے بچے کو دریا میں ڈال دیا، یہ اُن کے نبیہ ہونے کی دلیل ہے۔ (۳۰)

اول تو مذکورہ وحی کی قسم جان لینا ضروری ہے کہ وہ بہ ذریعہ مَلَک (فرشتہ) تھی یا الہام کی صورت میں تھی؟ اگر الہام کی صورت میں تھی اور یہی ظاہر ہے۔ (۳۱) تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی والدہ کے دل میں یہ بات پختہ کر دی گئی کہ ہو نہ ہو، میرا یہی لڑکا نبی ہوگا، جس کی طلب وجستجو میں سینکڑوں بچے ذبح کیے جا چکے ہیں، بچہ کی شکل وصورت، اُس کی تندرستی اور بے عیب ہونا - جو نبی کی شان ہوتی ہے - دیکھ کر حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے دل میں یہ بات پختہ ہوگئی کہ یہی رسولِ موعود ہے، جب یہ رسولِ موعود ہے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ اُس کی حفاظت کریں گے اور وہ ضائع نہ ہوگا، اس لیے فرعون کے ہاتھوں ذبح ہونے کے بہ نسبت اُس کو دریا میں بہ طورِ تدبیر کے ڈال دینا مناسب ہوگا۔ بس، یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں آئی، اس لیے پورے سکون کے

(۲۹) کما أشار إلیه ابن کثیر في تفسیره. انظر: ۴/ ۲۲ ۳، (۲۰ ا یوسف: ۹) ط: دار الکتب العلمیة - بیروت.

(۳۰) ووجدنا أم موسی - علیهما الصلاة والسلام - قد أوحی الله إلیها بالقاء ولدها في الیم، وأعلمها أنه سیرده إلیها، ویجعله نبیا مرسلا، فهذه نبوة لا شك فیها، وبضرورة العقل یدري کل ذي تمییز صحیح أنها لو لم تکن واثقة بنبوة الله -عز وجل- لها، لکانت بالقائها ولدها في الیم برؤیا تراها، أو بما یقع في نفسها، أو قام في هاجسها في غایة الجنون والمرار الهائج، ولو فعل ذلك أحدنا لکان غایة الفسق أو في غایة الجنون، مستحقا لمعاناة دماغه في البیمارستان، لا یشك في هذا أحد، فصح یقینا أن الوحي الذي ورد لها في إلقاء ولدها في الیم کالوحي الوارد علی إبراهیم في الرؤیا في ذبح ولده، لکنه ذبح ولده لرؤیا رآها أو ظن وقع في نفسه لکان بلا شك فاعل ذلك من غیر الأنبیاء فاسقا في نهایة الفسق أو مجنونا في غایة الجنون، هذا ما لا یشك فیه أحد من الناس، فصحت نبوتهن بیقین. (الفصل في الملل والأهواء والنحل: ۵/ ۱۳، ط: مکتبة الخانجي)

(۳۱) عن قتادة قوله: (وأوحینا إلی أم موسی) وحیا جاءها من الله قذف في قلبها، ولیس بوحي نبوة. (تفسیر القرآن العظیم - ابن أبي حاتم الرازي (م: ۳۲۷هـ): ۹/ ۲۹۳۱، رقم: ۱۶۶۸۱، ت: أسعد محمد الطیب، ط: مکتبة نزار مصطفی الباز - المملکة العربیة السعودیة)

وهذا وحي إلهام بلا خوف. (تفسیر القرآن العظیم - أبو الفداء، ابن کثیر القرشي، الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۳/ ۲۲۴، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طیبة للنشر والتوزیع)

ساتھ اُنہوں نے بچے کو دریا میں ڈال دیا۔ فرعون کے خوف و دہشت کی وجہ سے کوئی نامناسب حرکت سرزد نہ ہو جائے، اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں تسکین پیدا کر دی گئی تھی۔

اور اگر فرشتہ نے کلام کیا تھا۔ (۳۲) تب بھی تسکین قلبی اُس وحی کی بنا پر تھی، دونوں صورتوں میں اُس سے نبوت ثابت نہیں ہو سکے گی، جیسا کہ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ صرف اتنی وحی سے کوئی نبی کی فہرست میں داخل نہیں ہو سکتا۔ (۳۳)

اور اگر نبی مانا جائے، تو یہ نبوت' غیر تشریعی ،تکوینی ہوگی، جیسا کہ بعض حضرات قائل ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت غیر تشریعی ،تکوینی تھی۔ (۳۴) لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی وحی تکوینی تھی، کہ بچہ کو دریا میں ڈال دیا جائے، جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام کی وحی کہ کشتی کو توڑ دی جائے، کھیلتے بچے کو قتل کر دیا جائے، اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کی وحی بھی تکوینات میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو بلند مقام عنایت فرمایا ہے، تمہارے بطن سے بغیر شادی کے بچہ پیدا ہوگا، اس عجیب حالت کی بنا پر اپنے آپ کو کسی بلا و آفت میں مبتلا نہ سمجھنا، قرار حمل، فرشتہ کا دم کرنا وغیرہ حالات سب تکوینات میں سے ہیں، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایک دو مرتبہ اس قسم کی تکوینی وحی یا الہام سے وہ مقام مل جائے جو حضرت خضر علیہ السلام کا ہے۔

---

(۳۲) وقالت فرقة: كان بملك يمثل لها. تفسير القرآن العظيم - ابن أبي حاتم الرازي (م: ۳۲۷هـ): ۹/ ۲۹۳۱، رقم: ۱۶۶۸۲، ☆ تفسير الماوردي = النكت والعيون - أبو الحسن علي بن محمد، الشهير بالماوردي (م: ۴۵۰هـ): ۴/ ۲۳۵، ت: السيد ابن عبد المقصود، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ تفسير السمعاني - أبو المظفر السمعاني (م: ۴۸۹هـ): ۵/ ۳۵/ ۱۲۲، ت: ياسر بن إبراهيم وغنيم بن عباس، ط: دار الوطن - الرياض)

(۳۳) انظر: تفسير ابن كثير: ۴/ ۳۶۲، ط: دار الكتب العلمية - بيروت.

(۳۴) والجمهور على أن الخضر نبي، وكان علمه معرفة بواطن قد أوحيت إليه، وعلم موسى الأحكام والفتيا بالظاهر. (البحر المحيط في التفسير - أبو حيان الأندلسي (م: ۷۴۵هـ): ۷/ ۲۰۴، ت: صدقي محمد جميل، ط: دار الفكر - بيروت)

ياموسى! إني على علم من الله، علمنيه لا تعلمه، يريد: علم الباطن، وأنت على علم من الله علمكه الله، لا أعلمه، يريد: علم الظاهر. (الجواهر الحسان في تفسير القرآن - أبو زيد عبد الرحمن بن محمد بن مخلوف الثعالبي (م: ۸۷۵هـ): ۳/ ۵۳۵، ت: محمد علي معوض وعادل أحمد عبد الموجود، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

علم خضری تکوین سے متعلق ہے، جس کو طریقت و شریعت سے کوئی تعلق نہیں، اور وہ علوم ولایت سے ادنیٰ درجہ کا شعبہ ہے اور علم موسوی تشریع سے متعلق ہے، جس میں طریقت و شریعت سب آ گئی، اور اُس میں وہ علوم ہیں جو علوم ولایت کے اعلیٰ شعبوں میں سے ہیں۔ (امداد الفتاویٰ: ۵/ ۱۴۷، کتاب السلوک، ط: ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند)

علامہ قرطبیؒ اور جن حضرات نے حدیث ''کمل من الرجال کثیر، ولم یکمل من النساء إلا مریم بنت عمران و أسیة امرأة فرعون . . . الخ'' سے نبوت پر استدلال فرمایا ہے، وہ آسیہ امرأۃِ فرعون کی نبوت کے قائل نہیں ہیں، چناں چہ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ آسیہ کی نبوت کا قائل ہونا ضروری نہیں اور وہ نبیہ نہیں ہیں۔ (۳۵)

تو اب عرض ہے کہ حدیثِ مذکور میں جب حضرت آسیہ کا نبوت سے استثناء ہو گیا، تو آسیہ کے لیے کون سا کمال ثابت ہوا، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے لیے کمالِ صدیقیت یا ولایت ثابت ہوا، لہٰذا حضرت مریم علیہا السلام کے لیے کمالِ نبوت مراد لینے کے لیے حدیثِ مذکور کافی نہ ہوئی؛ بل کہ ملائکہ کے کلام کو پیشِ نظر رکھ کر کمالِ نبوت مراد لیا گیا، تو پھر استدلال کا مدار '' آیتِ کریمہ'' اور '' وحی کا آنا'' بن گیا، آیتِ کریمہ کے بارے میں روح المعانی کی بحث گزر چکی ہے کہ نساء العالمین سے مراد حضرت مریم علیہا السلام کے دور کی عورتیں ہیں۔ (۳۶) اور اگر پورے عالم کی عورتیں مراد ہوں، تو بہ حیثیت بضعۃ سید المرسلین ہونے کے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ترجیح حاصل ہے۔ (۳۷)

لیکن جس طرح کہ پوری بحث سے معلوم ہوا کہ اگر حضرت مریم علیہا السلام اپنی خصوصی منقبت کی بنا پر حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے افضل ہوں، تو افضلیت کمالِ صدیقیت کی بنا پر ہے، اُس سے حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت ثابت نہیں ہو سکتی، حالاں کہ عام طور پر محدثین و مفسرین کرام دونوں میں سے کسی ایک کو مطلق افضل قرار دینے میں توقف کرتے ہیں۔ (۳۸) اور یہی اصلح ہے، تو مدارِ استدلال صرف وحی و کلام رہ جاتا ہے، اور اُس کا بطلان ظاہر ہے کہ بنصِ قرآنِ پاک جب اُن کو صدیقہ کہا گیا (۳۹) تو اصطفاء کے معنیٰ متعین ہو جاتے ہیں کہ اُس سے مقامِ صدیقیت ہی مراد ہے۔

(۳۵) وأما اسیة فلم یرد ما یدل علی نبوتها دلالة واضحة، بل علی صدیقیتها وفضلها. (تفسیر القرطبي: ۴/ ۸۳، ط: دار الكتب المصرية-القاهرة)

(۳۶) قیل: نساء عالمها، فلا یلزم منه أفضلیتها علی فاطمة رضي الله عنها. (روح المعاني: ۲/ ۱۴۹، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۳۷) والمراد من نساء العالمين قيل: جميع النساء في سائر الأعصار، واستدل به على أفضليتها على فاطمة، و خديجة، وعائشة رضي الله تعالى عنهن، والذي أميل إليه أن فاطمة البتول أفضل النساء المتقدمات والمتأخرات من حيث إنها بضعة رسول الله صلى الله عليه وسلم؛ بل ومن حيثيات أخر أيضاً، وهذا سائغ على القول بنبوة مريم أيضاً إذ البضعية من روح الوجود وسيد كل موجود لا أراها تقابل بشيء. (المصدر السالف)

(۳۸) وعندي بين مريم و فاطمة توقف نظراً للأفضلية المطلقة. (المصدر السالف) =

خلاصۂ بحث یہ کہ وحی، کلامِ ملک اور اصطفاء سے مطلقاً نبوت کا اثبات نہیں ہوسکتا، کیوں کہ یہ سب ظنیات ہیں، اور آیتِ کریمہ "و أمه صديقة"(۴۰) قطعی ہے، اس وجہ سے ترجیح قطعی دلیل کو دی جائے گی۔

نیز کسی آیت اور حدیث شریف میں جب نبوتِ مریم کی صراحت نہیں ہے، تو نبوت جیسے قطعی اور اہم منصب کا اثبات اس طرح تخمیناً کسی متعین شخصیت کے بارے میں نہیں کیا جاسکتا، نبوت کے اثبات کے لیے ضروری ہے کہ کتاب اللہ یا سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی طور پر ثابت ہو، یا کم از کم اجماعِ اُمت ہو، نبوت کا منصب قیاس سے بھی ثابت نہیں ہوسکتا، ولایت تو ایک مکتسب کمال ہے؛ لیکن نبوت ایک وہبی کمال ہے۔(۴۱) اُس کو اکتساب سے کیا واسطہ؟ اور وہبی کمالِ نبوت کے بارے میں جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے کلام یا نبی کے دعویٰ کی تائید معجزہ کے ذریعہ سے نہ ہو جائے، اس وقت تک کسی کی نبوت ثابت نہیں ہوسکتی۔

آخر میں عورت کے نبیہ نہ ہونے پر عرض ہے کہ عورت امارت وخلافت کے لائق نہیں۔(۴۲) جس پر اُمت کا اجماع ہے؛ کیوں کہ عورت کی ولایت ناقصہ ہے؛ اس لیے تنہا عورت کی شہادت بھی کافی نہیں۔(۴۳) نیز عورت ناقصۃ العقل بھی ہے، جیسا کہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔(۴۴) تو مقامِ نبوت وولایت تو لازم و ملزوم ہے، پھر ولایتِ تامہ کے بغیر نبوت کیسے حاصل ہوگی؟ امارت وخلافت تو نبوت کی فرع ہے، نبی کے لیے جب اللہ تعالیٰ جسمانی عیب بھی پسند نہیں کرتے کہ ہر نبی صحیح سالم اور بے عیب ہوتا ہے، تو نقصانِ عقل وولایت جیسا عیب نبوت میں کیسے متصور ہوسکتا ہے؟ فقط، واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب۔

(۳۹-۴۰) وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ۔ [۵-المائدة:۷۵]

(۴۱) قال اللہ تعالى: اَللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ۔ [۶-الأنعام:۱۲۴]

(۴۲) ويشترط أن يكون (الخليفة) من أهل الولاية المطلقة الكاملة، أي: مسلما، حرا، ذكرا، عاقلا، بالغا... والنساء ناقصات عقل ودين. (شرح العقائد النسفية، ص:۱۵۸، ط: یاسر ندیم-دیوبند)

(۴۳) إن شهادة المرأة الواحدة ليست بحجة أصلية. (المبسوط- شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۶/ ۱۰۲، باب من الطلاق، ط: دار المعرفة-بيروت)

وإنما أقيمت المرأتان مقام الرجل لنقصان عقل المرأة. (تفسير ابن كثير: ۱/ ۵۶۱، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۴۴) عن عبد الله بن عمر عن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- أنه قال: يا معشر النساء تصدقن، وأكثرن الاستغفار؛ فإني رأيتكن أكثر أهل النار « فقالت امرأة منهن جزلة: وما لنا يا رسول الله أكثر أهل النار؟ قال: »تكثرن اللعن، وتكفرن العشير، وما رأيت من ناقصات عقل ودين أغلب لذي لب منكن « قالت: يا رسول الله، وما نقصان العقل والدين؟ قال: "أما نقصان العقل: فشهادة امرأتين تعدل شهادة رجل فهذا نقصان العقل، وتمكث الليالي ما تصلي، وتفطر في رمضان فهذا نقصان الدين". (صحيح مسلم: ۱/ ۶۰، رقم: ۱۳۲-(۷۹) كتاب الإيمان، باب بيان نقصان الإيمان بنقص الطاعات، ط: البدر-ديوبند)

[۱۵] حقانی صاحب پر دیوبند سے کفر کے فتوے کا خلاصہ

۱۰۸-سوال: پالن حقانی صاحب پر دارالعلوم دیوبند کے مفتی سید احمد علی سعید (نائب مفتی دارالعلوم، دیوبند) اور سید مفتی مہدی حسن صاحب (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) نے کفر کا فتوی دیا ہے، ایسا لوگ کہتے ہیں؛ کیا یہ بات سچی ہے؟ اس کا جواب دے کر احسان فرمائیں گے۔

مجیب عثمان بڑوڈیلی

الجواب حامداو مصلیا:

دیوبند کے کسی بھی مفتی صاحب نے ان پر کفر کا فتوی نہیں لگایا ہے اور گجرات کے تمام مفتیان کرام نے بھی بیان دیا تھا، اس میں میں بھی شریک تھا، اس کتاب میں کوئی بھی مضمون کفر اور شرک کا نہیں، اسی طرح اس میں اولیاء کرام کی بھی کوئی بے عزتی کا مواد نہیں کہ مصنف پر کفر کا فتوی عائد کیا جائے؛ مذکورہ سارے جھوٹے الزامات اہل بدعت کی طرف سے لگائے جاتے ہیں، تاکہ اس کے ذریعہ ان کو اور ان کی کتاب کو بدنام کیا جائے اور ان کی کتابوں سے لوگ فائدہ نہ اٹھائیں؛ اس لیے مذکورہ ساری جھوٹی باتوں کی طرف دھیان دینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] حضرت نوح کا دین کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں تکلیف برداشت کرنے کی حقیقت

۱۰۹-سوال: حضرت نوح علیہ السلام نے دین کی نشر واشاعت اور اس کی تبلیغ کے لیے بہت ہی دکھ درد اور تکالیف برداشت کیں، یہ تو اپنی جگہ پر ٹھیک ہے اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ان کو ان کی قوم اس قدر تکلیف پہنچاتی تھی اور اتنے پتھر مارتی تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام پتھروں کے نیچے دب جاتے تھے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام آکر پتھر ہٹاتے تھے، پھر ہوش آنے پر آپ دوبارہ دین کا کام شروع کر دیتے، کیا یہ حقیقت ہے، قرآن وحدیث اور بزرگوں کے اقوال سے ثابت اور صحیح ہے؟ فرشتے کا آنا اور پتھروں کا دور کرنا، یہ کہاں تک صحیح ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

حضرت نوح علیہ السلام کو پتھر سے مارنے کی مذکورہ روایت کہیں نظر سے گذری نہیں؛ البتہ قرآنی

آیات اور صحیح روایات سے اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی قوم ان کو بہت ستاتی تھی اور پتھروں سے مارتی تھیں۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] جنت میں حضرت ابراہیم وآدم علیہما السلام کی ڈاڑھی؟

۱۱۰-سوال: ایک صاحب کہتے ہیں کہ جنت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کی ڈاڑھی ہوگی، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

حدیث شریف میں ہے کہ جب جنتی جنت میں داخل ہوں گے، تو حضرت آدم علیہ السلام کے قد کی طرح ان کا قد ہوگا، یعنی ساٹھ ذراع ہوگا، حسن حضرت یوسف جیسا ہوگا اور عمر ۳۳ سال ہوگی۔ (اتنی ہی عمر میں حضرت عیسیٰ کو نبوت ملی ہے) اور زبان ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یعنی عربی ہوگی، سب بے ریش ہوں گے، سر کے علاوہ بدن کے کسی حصہ پر بال نہ ہوں گے اور آنکھیں سرمگیں ہوں گی، لہٰذا یہ بات کہ حضرت ابراہیم وآدم علیہما السلام کو ڈاڑھی ہوگی، صحیح

---

(۱) قال عبد الله: كأني أنظر إلى النبي صلى الله عليه وسلم يحكي نبيا من الأنبياء، ضربه قومه فأدموه، فهو يمسح الدم عن وجهه، ويقول: »رب اغفر لقومي فإنهم لا يعلمون. (صحيح البخاري: ۲/ ۱۰۲۳، رقم الحديث: ۶۹۲۹، كتاب استتابة المعاندين والمرتدين، ط: البدر-ديوبند)

عن مجاهد قال: كانوا يضربون نوحا حتى يغشى عليه، فإذا أفاق، قال: رب اغفر لقومي، فإنهم لا يعلمون ... عن مجاهد عن عبيد بن عمير قال إن كان نوحا ليضرب حتى يغشى عليه، ثم يفيق فيقول اهد قومي فإنهم لا يعلمون. وقال شقيق: قال عبد الله: لقد رأيت النبي (صلى الله عليه وسلم) وهو يمسح الدم عن وجهه، وهو يحكي نبيا من الأنبياء، وهو يقول: اللهم اهد قومي، فإنهم لا يعلمون... عن الضحاك عن ابن عباس أنه قال: إن نوحا كان يضرب ثم يلف في= لبد، فيلقى في بيته يرون أنه قد مات، ثم يخرج فيدعوهم حتى إذا يئس من إيمان قومه، جاءه رجل ومعه ابنه، وهو يتوكأ على عصا، فقال: يا بني انظر هذا الشيخ لا يغرنك قال: يا أبت أمكني من العصا، فأخذ العصا، ثم قال: ضعني في الأرض فوضعه فمشى إليه بالعصا، فضربه فشجه شجة موضحة، وسالت الدماء، قال نوح: رب قد ترى ما يفعل بي عبادك، فإن يك لك في عبادك حاجة، فاهدهم، وإن يك غير ذلك فصبرني إلى أن تحكم وأنت خير الحاكمين. الخ. (تاريخ دمشق-أبو القاسم علي بن الحسن بن هبة الله المعروف بابن عساكر (م: ۵۷۱ھ): ۶۲/ ۲۴۸-۲۴۷، حرف النون، نوح بن لمك بن متوشلخ بن إدريس بن يرد، ت: عمرو بن غرامة العمروي، ط: دار الفكر)

فتح الباري-ابن حجر: ۱۲/ ۲۸۲، تحت رقم الحديث: ۶۹۲۹، ط: دار المعرفة.

نہیں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] حضرت شیث علیہ السلام کہاں مدفون ہیں؟

۱۱۱-سوال: حضرت شیث علیہ السلام کہاں مدفون ہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

حضرت شیث علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے اوران کی وفات کے بعد ان کے جانشین تھے، خود آدم علیہ السلام کے بارے میں علماء ومؤرخین کا اختلاف ہے بعض نے ہند میں ان کا مدفن بتلایا ہے۔ بعض نے مکہ میں جبل ابی قبیس کو اور بعض نے کہا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کے جسد اطہر کو کشتی میں سوار کیا اور طوفان کے بعد بیت المقدس میں دفن کردیا۔ (البدایہ جلد ۱، صفحہ ۱۰۸)[۲]

---

(۱) وقال أبو بكر بن أبي الدنيا: ...... حدثنا الأوزاعي عن هارون بن رئاب عن أنس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يدخل أهل الجنة الجنة على طول آدم ستين ذراعا بذراع الملك! على حسن يوسف، وعلى ميلاد عيسى ثلاث وثلاثين سنة، وعلى لسان محمد جرد، مرد مكحلون. (تفسير ابن كثير - أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۸/ ۲۳،ت: محمد حسين شمس الدين،ط: دار الكتب العلمية،الطبعة: الأولى - ۱۴۱۹هـ)

(صفة الجنة- ضياء الدين أبو عبد الله محمد بن عبد الواحد المقدسي (م: ۶۴۳هـ): ص: ۱۲۰، رقم الحديث: ۱۰۷، ذكر صفة أهل الجنة وصفة كلامهم نسأل الله الجنة بفضل رحمته،ت: صبري بن سلامة شاهين،ط: دار بلنسية - الرياض ،الطبعة: الأولى ۱۴۲۳هـ - ۲۰۰۲م)

(۲) واختلفوا في موضع دفنه، فالمشهور أنه دفن عند الجبل الذي أهبط منه في الهند. وقيل بجبل أبي قبيس بمكة. ويقال: إن نوحا عليه السلام لما كان زمن الطوفان، حمله هو وحواء في تابوت، فدفنهما ببيت المقدس. حكى ذلك ابن جرير وروى ابن عساكر عن بعضهم أنه قال رأسه عند مسجد إبراهيم، ورجلاه عند صخرة بيت المقدس. (البداية والنهاية- أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۱/ ۹۸، ذكر وفاة آدم ووصيته إلى ابنه شيث عليه السلام،ط: دار الفكر)

وعن مجاهد قال: أول جبل وضعه الله على الأرض حين مادت أبو قبيس ثم حدثت منه الجبال...، وقبر آدم فيه على ما قال وهب بن منبه في غار يقال له: غار الكنز، وهو غير معروف الآن. وقيل: إن قبره بمسجد الخيف بعد أن صلى عليه جبريل عند باب الكعبة حكاه الفاكهي عن عروة بن الزبير، وذكره ابن الجوزي في "درياق القلوب" وقال "دفنته الملائكة به. وقيل: عند مسجد الخيف ذكره الذهبي، وفي منسك الفارسي. وقيل: عند منارة مسجده، وقيل: قبره في الهند في الموضع الذي أهبط إليه من الجنة. وصححه الحافظ ابن كثير. (تاريخ مكة المشرفة والمسجد الحرام والمدينة الشريفة والقبر الشريف-محمد بن أحمد بن الضياء محمد القرشي الحنفي، بهاء الدين أبو البقاء، المعروف بابن الضياء (م: ۸۵۴هـ): ۱/ ۹۱،فصل: في ذكر الأماكن المباركة بمكة المشرفة وحرمها،ت: علاء إبراهيم ،أيمن نصر ،ط: دار الكتب العلمية-بيروت ،الطبعة: الثانية، ۱۴۲۴هـ - ۲۰۰۴م)

تاریخ سے اس قدر تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات ہند کے قریبی علاقے میں ہوئی ہے، حضرت شیث علیہ السلام نے ان کی صلاۃِ جنازہ پڑھائی ہے؛ اس لیے حضرت شیث علیہ السلام کا مسکن بھی یہی علاقہ ہوگا، ان کے مدفن کے بارے میں کوئی روایت نہیں ہے، اس لیے کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی جاسکتی، بہرحال ہند یا اطراف ہند میں مدفون ہیں۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[١٩] حضرت آدم علیہ السلام کو ڈاڑھی تھی یا نہیں؟

١١٢-سوال: ایک جماعت آسٹریلیا گئی تھی، وہاں دو تین مسجد میں امام کی داڑھی نظر نہ آئی، تو جماعت کے امیر صاحب نے امام صاحب سے پوچھا کہ تمھیں کیا عذر ہے کہ تم داڑھی نہیں رکھتے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی داڑھی نہیں تھی، اس لیے میں داڑھی نہیں رکھتا، اگر چہ یہ جواب لغو ہے؛ کیوں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت ان کے زمانے تک قابل عمل تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی پر اسلامی شریعت پر عمل کرنا لازم ہے؛ لیکن اس بارے میں پوچھنا یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی داڑھی تھی یا نہیں؟ ایک جگہ پڑھا گیا کہ چار چیزیں تمام انبیاء کی سنت رہی ہے: (١) داڑھی (٢) مسواک (٣) خوش بو (٤) نکاح۔ [2]

---

(١) لما مات آدم عليه السلام قال شيث لجبرئيل صلى الله عليهما: صل على آدم، قال: تقدم أنت فصل على أبيك... وقيل: إنه -شيث- لم يزل مقيما بمكة يحج ويعتمر إلى أن مات، ... وقيل: ان شيثا لما مرض أوصى ابنه أنوش ومات، فدفن مع أبويه في غار أبي قبيس. (تاريخ الطبري - محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي، أبو جعفر الطبري (م: ٣١٠هـ): ١/ ١٦١، ١٦٢، ط: دار التراث - بيروت، الطبعة: الثانية - ١٣٨٧هـ)

وفي أبي قبيس على ما قيل: قبر شيث بن آدم وأمه حواء كذا ذكر الذهبي في جزء ألفه في تاريخ مدة آدم وبنيه، لأنه قال: ودفن شيث مع أبويه في غار أبي قبيس. (تاريخ مكة المشرفة والمسجد الحرام: ١/ ٩١، فصل: في ذكر الأماكن المباركة بمكة المشرفة وحرمها)

(٢) چار چیزیں تمام انبیاء کی سنت رہی ہیں، ان چار چیزوں کے شمار میں تین چیزیں: خوش بو، مسواک اور نکاح، تو اس سلسلے کی تمام روایتوں میں مذکور ہیں، البتہ چوتھی چیز کے بارے میں روایات مختلف ہیں، کسی میں "حیاء" کا ذکر ہے، تو کسی میں "حناء" کا، اور کسی میں "ختان" کا؛ لیکن کسی میں بھی داڑھی کا ذکر احقر کو نہیں مل سکا۔ بالترتیب روایات ملاحظہ فرمائیں، ترمذی شریف میں ہے:

عن أبي أيوب قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "أربع من سنن المرسلين: الحياء، والتعطر، والسواك، والنكاح. (سنن الترمذي: ١/ ٢٠٦، رقم الحديث: ١٠٨٠، أبواب النكاح، باب ما جاء في فضل التزويج، والحث عليه، ط: البدر - ديوبند * مسند الإمام أحمد بن حنبل - (م: ٢٤١هـ): ٣٨/ ٥٥٤، رقم الحديث: ٢٣٥٨١، حديث أبي أيوب الأنصاري، ت: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة، الطبعة: الأولى) =

الجواب حامداً ومصلیاً:

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش جنت میں ہوئی تھی، وہ جنتی آدمی تھے، اس بناء پر انہیں داڑھی آئی (اُگی) ہی نہ تھی، جن انبیاء ورسل کو داڑھی اُگی تھی، ان کا طریق داڑھی رکھنے کا تھا۔ (طبقات ابن سعد، جلد ۲، ص: ۲۲)

[۲۰] حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا جانا کتھا نہیں، حقیقت ہے

۱۱۳-سوال: زید کا کہنا ہے کہ ہندو دھرم کے "پہلا د" کے والد "ہرنے کشیپ" خود کو بھگوان کہتے تھے اور اپنی عبادت کرواتے تھے، تو اس کے بیٹے پہلاد نے اس کی مخالفت کی، جس ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی، مگر اس میں پہلاد کا بچاؤ ہوا، اسی کتھا سے ملتی جلتی اسلام کی ایک کتھا ہے، کہ آزر خود کو خدا کہلواتا تھا، اس کے بیٹے حضرت ابراہیم پیغمبر علیہ السلام نے اس کی مخالفت کی، جس کی وجہ سے آزر نے اپنے بیٹے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈلوادیا، مگر حضرت ابرہیم علیہ السلام کا عجیب طریقہ سے بچاؤ ہوا، وہ بھی محرم کی دسویں تاریخ کا دن تھا، تو سوال یہ ہے کہ زید کی یہ بات صحیح ہے یا غلط؟ حضرت ابراہیم کا واقعہ ایک کتھا[۱] ہے یا حقیقت؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

حضرت ابراہیم کا قصہ ایک حقیقت ہے، کتھا نہیں۔[۲] ممکن ہے پہلاد وغیرہ کی کہانیاں حضرت ابراہیم

= قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: أربع من سنن المرسلين: التعطير، والنكاح، والسواك، والحناء. (مصنف ابن ابي شيبة - أبو بكر بن أبي شيبة العبسي (م: ۲۳۵هـ): ۱/۱۵۶، رقم الحديث: ۱۸۰۲، ما ذكر في السواك، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد - الرياض، الطبعة: الأولى، ۱۴۰۹)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «أربع من سنن المرسلين، الختان والسواك والتعطر والنكاح. (أمالي المحاملي - رواية ابن يحيى البيع - أبو عبد الله البغدادي الحسين بن إسماعيل بن محمد المحاملي (م: ۳۳۰هـ)، ص: ۳۸۵، رقم الحديث: ۴۴۴، مجلس يوم الأحد لثلاث بقين من شهر ربيع الأول، ت: د. إبراهيم القيسي، ط: المكتبة الإسلامية، دار ابن القيم - عمان - الأردن، الطبعة: الأولى، ۱۴۱۲)

(۱) کتھا: (۱) بیان، مقولہ، بات، (۲) قصہ، کہانی، افسانہ، (۳) ذکر، روایت، (۴) وعظ، پند، مذہبی، اپدیش۔ (فیروز اللغات، ۹۹۱، ک-ت)

(۲) قرآن کریم کا بیان ہے جو صرف حقیت ہی بیان کرتا ہے: قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ. قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَى إِبْرَاهِيمَ. [۲۱- الأنبياء: ۶۸-۶۹]

علیہ السلام کے واقعہ سے متاثر ہو کر بنائی گئی ہو یا حضرت ابراہیم ہی کو پہلاد کے روپ میں بتلایا گیا ہو اور بعد میں اس قصہ میں ردو بدل کر کے ایک کتھا بنائی گئی ہو، کسی مذہب کی کوئی بات مذہب اسلام سے ملتی جلتی نظر آئے، تو اس سے اس کا حق ہونا ثابت نہیں ہو جاتا، جب تک کہ اسلام کے تمام عقائد کو قبول نہ کرے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] کسی کا ذکر قرآن کریم میں نہ ہونا ان کے نبی نہ ہونے کی دلیل نہیں

۱۱۴-سوال: قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آسمانی کتب: توریت، زبور اور انجیل کا ذکر کیا گیا ہے، متعدد انبیاء و رسل کا بھی تذکرہ اس میں موجود ہے، ساتھ ہی آسمانی صحیفوں کے بارے میں بھی بتلایا گیا ہے۔ قرآن میں خطاب اس طور پر کیا گیا ہے: یآ ایھا الذین آمنوا (اے ایمان والو!) (یعنی عمومی طور پر خطاب ہے) یٰسین، مدثر اور مزمل وغیرہ القاب کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنایا گیا ہے، سورۂ رحمٰن میں بھی جن و انس کو خطاب کیا ہے، (الغرض اس قدر وسعت کے ساتھ قرآن کریم نے متعدد چیزوں کا ذکر کیا ہے) تو پھر اس میں گیتا جیسی کتاب اور شری کرشن جیسے پیغمبر کا تذکرہ کیوں نہیں ہے؟

اور گیتا اگر اللہ کی آسمانی کتاب ہے، تو توریت، زبور، انجیل اور قرآن کریم میں مذکور انبیاء و رسل کا اور آسمانی کتابوں کا تذکرہ کیوں نہیں ہے؟ شری کرشن نے گیتا میں صرف ارجن ہی کو کیوں نصیحت کی؟ قرآن کریم کی طرح کل مخلوق کو کیوں نہیں خطاب کیا؟ گیتا ارجن کے لیے ہے یا پوری مخلوق کے لیے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

گیتا کس کے لیے ہے، یہ تو اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، مگر کسی کا ذکر قرآن کریم میں نہ ہونا، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ نبی نہیں ہے، یہ کوئی اصول نہیں ہے، بہت سے پیغمبروں اور صحیفوں کے نام قرآن کریم اور حدیث شریف میں نہیں ہیں؛ حالاں کہ ان کی نبوت ثابت ہے۔ (۱) البتہ جن کی نبوت دلیل سے ثابت نہ ہو، ان کو نبی ماننا درست نہیں ہے، بس اجمالی ایمان کافی ہے کہ ہم تمام انبیاء کرام پر ایمان لاتے ہیں۔ (۲)

قرآن کریم کل کائنات کے لیے کتاب ہدایت ہے؛ اس لیے اس میں عمومی خطاب ہے، گیتا میں ایسا

---

(۱) قال اللہ تعالی: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ. [۴۰-غافر: ۷۸]

(۲) (ورسله) بأن تعرف أنهم بلغوا ما أنزل الله إليهم، وأنهم معصومون، وتؤمن بوجودهم فيمن علم بنص، أو تواتر تفصيلاً، وفي غيرهم إجمالاً. (مرقاۃ المفاتیح: ۱/ ۵۸، کتاب الإیمان، دار الفکر، بیروت ☆ شرح العقائد النسفیۃ ص: ۱۳۸، ط: یاسر ندیم-دیوبند)

کیوں نہیں ہے؟ اگر اس کو آسمانی کتاب فرض کرلیا جائے، تو اس کی وجہ اللہ ہی جانتے ہیں، تاہم صحیح بات یہ ہے کہ کسی کتاب کو آسمانی کتاب ماننے کے لیے نص صریح اور قوی دلیل کی ضرورت ہے، گیتا کے آسمانی کتاب ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، اس کی کسی بات کا قرآن کریم کی کسی آیت کے موافق ہونا اس کے آسمانی کتاب ہونے کی دلیل کافی نہیں ہے؛ اس لیے کتب سماوی پر اجمالاً ایمان کے ساتھ کسی بھی کتاب (جس کے بارے میں دعویٰ کیا جائے کہ یہ آسمانی کتاب ہے) کے سلسلے میں کف لسان لازم ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] حضرت نوح علیہ السلام کا اصل نام ''جبار'' نہیں تھا

۱۱۵-سوال: ایک صاحب کا کہنا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا اصل نام جبار تھا؛ لیکن آپ علیہ السلام اپنی امت کی اصلاح کے خاطر رات بھر روتے (نوحہ کرتے) تھے، اس وجہ سے ان کا صفتی نام ''نوح'' ہوگیا۔

الجواب حامداومصليا:

''جبار'' تو اللہ کی صفت اور ان کا نام ہے۔[2] لہذا یہ کسی نبی کا نام نہیں ہوسکتا، حضرت نوح علیہ السلام کا جو نام قرآن وحدیث سے ثابت ہے، وہ نوح ہی ہے، کوئی دوسری زبان میں دوسرا نام ہوسکتا ہے؛ لیکن ان کا ''جبار'' نام نہیں ہوسکتا، عبد الجبار کہہ سکتے ہیں؛ لیکن کسی بھی معتبر تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ان کا نام نوح نہیں تھا، معتبر مؤرخین ان کے نسب نامے میں ان کے باپ دادا کے نام کے ساتھ بھی نوح ہی لکھتے ہیں؛ لہذا معتبر یہی ہے کہ نوح نام پہلے ہی سے تھا۔ (البدایہ جلد ۱ ص: ۱۱۰، ابن سعد)[3] واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) (وكتبه) أي: ونعتقد بوجود كتبه المنزلة على رسله تفصيلا، فيما علم يقينا كالقرآن، والتوراة، والزبور، والإنجيل، وإجمالا فيما عداه، وأنها منسوخة بالقرآن، وأنه لا يجوز عليه نسخ، ولا تحريف إلى قيام الساعة، لقوله تعالى: {إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون} [الحجر: ۹] .... قيل: الكتب المنزلة مائة وأربعة كتب، منها عشر صحائف نزلت على آدم، وخمسون على شيث، وثلاثون على إدريس، وعشرة على إبراهيم، والأربعة السابقة، وأفضلها القرآن. (مرقاة المفاتيح: ۱/ ۵۸، كتاب الإيمان، ط: دار الفكر، بيروت)

(۲) هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ. (-۲۸الحشر: ۲۳)

(۳) هو نوح بن لامك بن متوشلخ بن خنوخ. وهو إدريس بن يرد بن مهلاييل بن قينن بن أنوش ابن شيث بن آدم أبي البشر عليه السلام. (البداية والنهاية- أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۱/ ۱۰۱، قصة نوح ﷺ، ط: دار الفكر)

الطبقات الكبرى- أبو عبد الله محمد بن سعد بن منيع الهاشمي بالولاء، البصري، البغدادي المعروف بابن سعد=

[۲۳] حضرت حسنؓ وحسینؓ وغیرہ کے نام سے پہلے امام لکھنا

۱۱۶-سوال: فرقہ اثناء عشریہ امامی شیعہ کی مذہبی کتابوں میں ان کے ائمہ کی روایات ہوتی ہیں۔ جیسے امام جعفر صادق، امام باقر، امام حسنؓ، امام حسینؓ کی روایات، وغیرہ۔ کیا اہل سنت والجماعت ان کے ناموں کے ساتھ ''امام'' یا ''رضی اللہ عنہ'' یا ''رحمۃ اللہ علیہ'' جیسے القاب کا اضافہ کر سکتے ہیں، عام طور پر سنی مسلمانوں کی تصنیفات میں امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، تو کیا اس طرح لکھ سکتے ہیں؟

=(م: ۲۳۰ھ): ۱/ ۳۴، ذکر نوح النبي، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الکتب العلمیة - بیروت.

نوٹ: مختلف کتابوں میں حضرت نوح کے کئی ایک نام منقول ہیں، مثلاً: (۱) السکن۔ (۲) شاکر۔ (۳) فرج۔ (۴) الشکر۔ (۵) عبد الجبار۔ اور اس نام (نوح) اور اس کے وجہ تسمیہ کا بھی ذکر موجود ہے، جسے محققین نے ذکر کیا ہے، عبارات ملاحظہ فرمائیں:

قال النقاش: اسم نوح عبد الجبار، وقال ابن الكلبي: اسمه فرج، ووصفه ب »الشكر« لأنه كان يحمد الله في كل حال وعلى كل نعمة على المطعم والمشرب والملبس والبراز وغير ذلك صلى الله عليه وسلم، قاله سلمان الفارسي وسعيد بن مسعود وابن أبي مريم وقتادة. (المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز - أبو محمد عبد الحق بن غالب بن عبد الرحمان الأندلسي المحاربي (م: ۵۴۲ھ): ۳/ ۲۳۷، ت: عبد السلام عبد الشافي محمد، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

وقال في البستان كان اسم نوح شاكرا وانما يسمى نوحا لكثرة نوحه وبكائه من خوف الله. (روح البيان: - إسماعيل حقي بن مصطفى الإستانبولي الحنفي الخلوتي، المولى أبو الفداء (م: ۱۱۲۷ھ): ۴/ ۶۵، ط: دار الفكر - بيروت)

قال أبو سليمان الدمشقي: اسم نوح: السكن، وإنما سمي نوحا، لكثرة نوحه. وفي سبب نوحه خمسة أقوال: أحدها: أنه كان ينوح على نفسه، قاله يزيد الرقاشي. والثاني: أنه كان ينوح لمعاصي أهله، وقومه. والثالث: لمراجعته ربه في ولده. والرابع: لدعائه على قومه بالهلاك. والخامس: أنه مر بكلب مجذوم، فقال: اخسأ يا قبيح، فأوحى الله إليه: أعبتني يا نوح أم عبت الكلب؟. (زاد المسير في علم التفسير - جمال الدين أبو الفرج عبد الرحمان بن علي بن محمد الجوزي (م: ۵۹۷ھ): ۱/ ۴۲۷، ت: عبد الرزاق المهدي، ط: دار الكتاب العربي - بيروت)

وكان اسم نوح السكن. وإنما سمي السكن، لأن الناس بعد آدم سكنوا إليه. (تفسير القرطبي - أبو عبد الله محمد بن أحمد بن أبي بكر الأنصاري الخزرجي شمس الدين القرطبي (م: ۶۷۱ھ): ۱۳/ ۳۳۳، ت: أحمد البردوني وإبراهيم أطفيش، ط: دار الكتب المصرية - القاهرة)

مزید دیکھیے: لباب التأويل في معاني التنزيل - علاء الدين علي بن محمد بن إبراهيم بن عمر الشيحي أبو الحسن، المعروف بالخازن (م: ۷۴۱ھ): ۱/ ۲۳۹، ت: تصحيح محمد علي شاهين، ط: دار الكتب العلمية - بيروت.

الدر المنثور - عبد الرحمان بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱ھ): ۳/ ۴۸۰، ط: دار الفكر - بيروت

تاريخ دمشق - أبو القاسم علي بن الحسن بن هبة الله المعروف بابن عساكر (م: ۵۷۱ھ): ۶۲/ ۲۴۲، ت: عمرو بن غرامة العمروي، ط: دار الفكر)

کتنی نسل تک آل رسول کو اہل بیت میں شمار کر سکتے ہیں؟ اثنا عشریہ شیعہ بارہ امام کو اہل بیت میں شمار کرتے ہیں بارہویں امام مہدی غائب امام ہے، یہ ان کا مذہبی عقیدہ ہے، اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ ہستیاں عظیم ترین ہیں، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ تو صحابی ہیں اور دوسرے تابعین ہیں؛ لہٰذا ان کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' اور ''رحمۃ اللہ علیہ'' لکھنا چاہیے؛ بل کہ مستحب ہے۔[1] اور ان کے نام کے ساتھ اچھے اچھے القاب کا اضافہ کرنا بہتر ہے، لفظ ''امام'' بھی ایک لقب ہے؛ لیکن لفظ ''امام'' مذکورہ ہستیوں کے لیے شیعہ حضرات ایک خاص مطلب کو سامنے رکھ کر بولتے ہیں اور یہ شیعوں کی ایک خاص علامت ہے؛ اس لیے اہل سنت والجماعت کو لفظ ''امام'' استعمال نہ کرنا ہی بہتر ہے؛ کیوں کہ شیعوں کے ساتھ مشابہت ہو جاتی ہے اور یہ مناسب نہیں۔[2] آل رسولؐ کی فضیلت اپنی جگہ پر ہے اور اہل بیت کا لفظ خاص طور پر آپ ﷺ کی صاحب زادی حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ اور ان کی اولاد پر بولا جاتا ہے۔[3] اور

---

(۱) يستحب الترضي والترحم على الصحابة والتابعين فمن بعدهم من العلماء والعباد وسائر الأخيار، فيقال: رضي الله عنه، أو رحمه الله، ونحو ذلك، وأما ما قاله بعض العلماء: إن قوله: رضي الله عنه مخصوص بالصحابة، ويقال في غيرهم: رحمه الله فقط، فليس كما قال، ولا يوافق عليه، بل الصحيح الذي عليه الجمهور استحبابه، ودلائله أكثر من أن تحصر. فإن كان المذكور صحابيا ابن صحابي قال: قال ابن عمر رضي الله عنهما، وكذا ابن عباس، وابن الزبير، وابن جعفر، وأسامة بن زيد ونحوهم لتشمله وأباه جميعا. (الأذكار - أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ٦٧٦هـ)، ص: ١١٩: كتاب الصلاة على رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب الصلاة على الأنبياء وآلهم تبعا لهم صلى الله عليه وسلم، ط: دار الفكر - بيروت)

ويستحب الترضي للصحابة والترحم للتابعين ومن بعدهم من العلماء والعباد وسائر الأخيار، وكذا يجوز الترحم على الصحابة والترضي للتابعين ومن بعدهم من العلماء والعباد. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمان بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ١٠٧٨هـ): ٤/ ٣٥٧، مسائل شتى، ط: دار إحياء التراث العربي)

رد المحتار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ١٢٥٢هـ): ٦/ ٧٥٣، مسائل شتى، ط: دار الفكر - بيروت.

(۲) وأما إذا أفرد غيره من أهل البيت بالصلاة فمكروه وهو من شعائر الروافض. تفسير النسفي (مدارك التنزيل - أبو البركات عبد الله بن أحمد بن محمود حافظ الدين النسفي (م: ٧١٠هـ): ٣/ ٣٤، ط: دار الكلم الطيب - بيروت)

(۳) س: من أهل بيت النبي صلى الله عليه وسلم ومن أفضلهم وما الواجب نحوهم؟

ج - هم الذين حرمت عليهم الصدقة وهم آل علي وآل جعفر وآل عقيل وآل عباس وبنو الحارث بن عبد المطلب وكذلك أزواجه صلى الله عليه وسلم من أهل بيته كما دل عليه سياق آية الأحزاب وأفضلهم علي وفاطمة والحسن=

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام نسلوں کو آل نبی کہا جاتا ہے۔[1] اور اہل بیت صرف پہلی نسل کو کہا جاتا ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

[۲۴] حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام دنیا میں کون سی جگہ اترے تھے؟

۱۱۷-سوال: حضرت آدم وحوا علیہما السلام دنیا میں کون سی جگہ اترے تھے؟

الجواب حامدا ومصليا:

حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان (سری لنکا) سراندیپ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ''جبل نوذ'' پر اترے تھے اور حضرت حوا 'جدہ' میں اتری تھیں۔ (طبقات الکبری ج:۱،ص:۳۵)۔[2] واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] حضرت علیؓ کی تدفین عراق میں کیوں ہوئی؟

۱۱۸-سوال: اسلام کے چوتھے خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تدفین مدینہ سے اتنی دور عراق میں کیوں ہوئی؟

الجواب حامدا ومصليا

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جو فتنے اٹھے، تو مدینہ کی سرزمین پر جنگ وجدال اور

= والحسين الذين أدار عليهم الكساء وخصهم بالدعاء والواجب نحوهم هو محبتهم وتوليهم وإكرامهم لله ولقرابتهم من رسول الله صلى الله عليه وسلم ولإسلامهم وسبقهم وحسن بلائهم في نصرة دين الله وغير ذلك من فضائلهم. (مختصر الأسئلة والأجوبة الأصولية على العقيدة الواسطية- أبو محمد عبد العزيز بن محمد بن عبد الرحمان (م:۱۴۲۲ھ)، ص:۱۳۷، ط:دار الفكر)

(۱) (وعلى آله) اختلف في المراد بهم في مثل هذا الموضع؛ فالأكثرون أنهم قرابته - صلى الله عليه وسلم - الذين حرمت عليهم الصدقة على الاختلاف فيهم، وقيل جميع أمة الإجابة، وإليه مال مالك، واختاره الأزهري والنووي في شرح مسلم، وقيل غير ذلك. شرح التحرير. وذكر القهستاني أن الثاني مختار المحققين. (رد المحتار :۱/ ۱۳، ط:دار الفكر-بيروت)

(۲) فأهبط آدم على جبل بالهند يقال له نوذ. وأهبطت حواء بجدة. (الطبقات الكبرى-أبو عبد الله محمد بن سعد بن منيع الهاشمي بالولاء، البصري، البغدادي المعروف بـ "ابن سعد" (م:۲۳۰ھ):۱/ ۳۰،ذكر من ولد رسول الله صلى الله عليه وسلم من الأنبياء، ط:دار الكتب العلمية-بيروت)

خون ریزی نہ ہو، اس وجہ سے اور بعض دوسری سیاسی وجوہات سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی راجدھانی (دار الخلافہ) کوفہ کو بنالیا تھا، ان کی شہادت وہاں ہوئی، اس لیے وہیں مدفون ہوئے۔ (۱)
واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] کیا حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک حسین عورت سے شادی کرنا حدیث سے ثابت ہے؟

۱۱۹-سوال: کیا حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک خوب صورت عورت کو دیکھ کر اس کے ساتھ نکاح کرلیا تھا، یہ بات صحیح حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق آپ نے جو پوچھا ہے، یہ صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ اہل سنت و الجماعت کا عقیدہ ہے کہ انبیاء چھوٹے بڑے ہر طرح کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں، یہ اسرائیلی روایت ہے، جو قابل قبول نہیں ہے، امام رازیؒ، اور دوسرے مفسروں کا کہنا ہے کہ ''یہ سب جھوٹ ہے اور آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہے''۔ (۲) واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) أن عليا رضي الله عنه لما مات صلى عليه ابنه الحسن فكبر عليه تسع تكبيرات ودفن بدار الإمارة بالكوفة خوفا عليه من الخوارج أن ينبشوا عن جثته، هذا هو المشهور. (البداية والنهاية- أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (م: ۷۷۴ھ): ۷/ ۳۲۹، صفة مقتله رضي الله عنه، ط: دار الفكر)

(۲) أن داود عشق امرأة أوريا، فاحتال بالوجوه الكثيرة حتى قتل زوجها ثم تزوج بها فأرسل الله إليه ملكين في صورة المتخاصمين في واقعة... وعرضا تلك الواقعة عليه. فحكم داود بحكم لزم منه اعترافه بكونه مذنبا، ثم تنبه لذلك فاشتغل بالتوبة. والذي أدين به وأذهب إليه أن ذلك باطل ويدل عليه وجوه... عن سعيد بن المسيب أن علي بن أبي طالب عليه السلام قال: »من حدثكم بحديث داود على ما يرويه القصاص جلدته مائة وستين... فثبت بهذه الوجوه التي ذكرناها أن القصة التي ذكروها فاسدة باطلة. التفسير الكبير -فخر الدين الرازي خطيب الري (م:۶۰۶ھ) :۲۶/ ۳۷۷، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

تفسير القرطبي- أبو عبد الله محمد بن أحمد بن أبي بكر شمس الدين القرطبي (م :۶۷۱ھ): ۱۵/ ۱۶۶، ط: دار الكتب المصرية- القاهرة.

□

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾ (۳۳-الاحزاب:۴۰)

باب ما يتعلق بالنبوة

(نبوت کی بحث)

0

[نبوت کی بحث]

[۱] مدعی نبوت اور منکر ختم نبوت کا حکم

۱۲۰-سوال: سلام مسنون کے بعد عرض یہ ہے کہ ''بھاؤنگر'' میں ''یعقوب'' نامی ایک شخص رہتا ہے، ذات کے اعتبار سے گھانچی ہے، پنج وقتہ نمازوں کا پابند ہے، بہ ظاہر شریعت کے احکام کی پیروی کرتا ہے؛ لیکن وہ کہتا ہے کہ میں محمد ہوں اور جو پہلے گذر گئے ہیں، وہ احمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم تھے، یعنی جن کو ہم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں ان کو یعقوب بھائی احمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں، نیز یعقوب بھائی کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ (محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم) صرف ملک عرب کے نبی تھے اور میں پوری دنیا کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

وہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ مجھ پر ایمان نہ لانے والے لوگ حیران و پریشان ہوں گے۔ الغرض اس طرح کی غلط باتیں اس کے دل و دماغ پر مسلط ہیں، ایسے شخص کا کیا حکم ہے، تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔

قریشی حیدر، رام پورا، بھاؤنگر

الجواب حامدا ومصلیا:

امت مسلمہ کا عقیدہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پوری دنیا کے لیے نبی اور رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔[1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی اور رسول قیامت تک آنے والا نہیں ہے۔[2] حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا

---

(۱) قال اللہ تعالی: وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۸﴾ (۲۲-سبا: ۲۸) قال اللہ تعالی: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلٰكِن رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۴۰﴾ (۲۲-الأحزاب: ۴۰)

(۲) وقد أخبر تعالی في كتابه، ورسوله في السنة المتواترة عنه: أنه لا نبي بعده، ليعلموا أن كل من ادعی هذا المقام=

اقرار کیے بغیر کوئی شخص اسلام کے اندر داخل ہو ہی نہیں ہوسکتا۔ [۳] جو شخص حضور ﷺ کو رسول نہ مانے، یا رسول تو مانے، مگر آخری رسول نہ مانے، تو وہ کافر ہے۔ [۴] اسی طرح جو شخص محمد ﷺ کو پوری دنیا کے لیے رسول نہ مانے، صرف ملک عرب ہی کے لیے ان کی رسالت کو تسلیم کرے، وہ بھی مسلمان نہیں، کافر ہے۔ [۵] جو شخص اپنے رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، وہ نبی کریم ﷺ کو آخری رسول تسلیم نہیں کرتا؛ اس لیے اس کے مرتد وکافر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، علماء امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ نبی کریم ﷺ کی رسالت کے بعد جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے، وہ کافر ہے۔ [۶] مسلمان جن کو محمد ﷺ کے نام سے جانتے ہیں اور جن کے آخری نبی ہونے پر ان کا ایمان ہے، قرآن مجید میں ان کو ''محمد'' (ﷺ) کے نام سے پکارا گیا ہے، سورۂ احزاب میں ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔ [۷]

ترجمہ: حضرت محمد (ﷺ) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔

مذکورہ آیت شریفہ میں آپ ﷺ کو ''محمد'' کہا گیا ہے اور ''رسول'' اور ''خاتم النبیین'' بھی۔

=بعده فهو كذاب آفاك، دجال ضال مضل. (تفسير ابن كثير: ٦/ ٤٣٠، ت: سامي محمد بن سلامة، ط: دار طيبة، للنشر والتوزيع) قال الطيبي: أغلق باب الوحي وقطع طريق الرسالة وسد. (مرقاة المفاتيح: ٩/ ٣٦٧٦، باب فضائل سيد المرسلين، ط: دار الفكر بيروت-لبنان)

(٣) وقال: يا محمد أخبرني عن الإسلام، فقال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: «الإسلام أن تشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله صلى الله عليه وسلم. الحديث. (صحيح مسلم: ١/ ٢٧، رقم الحديث: ١-(٨)، باب معرفة الإيمان، والإسلام، والقدر، كتاب الإيمان، ط: البدر-ديوبند)

(٤) إذا لم يعرف الرجل أن محمدا -صلى الله عليه وسلم- آخر الأنبياء عليهم وعلى نبينا السلام، فليس بمسلم كذا في اليتيمة. (الفتاوى الهندية: ٢/ ٢٦٣، كتاب السير، مطلب في موجبات الكفر، أنواع منها ما يتعلق بالإسلام والإيمان، ط: دار الفكر بيروت)

(٥) دیکھیے حاشیہ نمبر: ۱۔

(٦) ودعوى النبوة بعد نبينا -صلى الله عليه وسلم- كفر بالإجماع. (شرح فقه اكبر لملا علي القاري: ص ٢٠٢، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی دیوبند)

(٧) -٣٣ الأحزاب: ٤٠.

''خاتم'' کا معنی ہوتا ہے ''آخری''[۸] حضرت محمد ﷺ سلسلہ نبوت کو ختم کرنے والے ہیں، تمام نبیوں کے آخر میں تشریف لانے والے ہیں، آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے انتقال کے بعد جن لوگوں (مثلاً: اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب وغیرہ) نے نبوت کا دعویٰ کیا، صحابہ کرامؓ نے ان کو کافر اور مرتد گردانا اور ان کے ساتھ جہاد کیا۔[۹] عقیدۂ ختم نبوت کے سلسلے میں صحابہ کرام کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہوا؛ اس لیے قرآن کریم اور حدیث پاک کی روشنی میں پوری امت کا غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی نبی اور کوئی رسول آنے والا نہیں ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت کریمہ پر غور کریں:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا.[۱۰]

ترجمہ: آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا، اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کر لیا۔ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

مذکورہ دونوں آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ یہ امت قیامت تک رہے گی اور اس کی ہدایت کے لیے محمد عربی ﷺ ہی نبی ہیں، دوسرا کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اگلی امتوں کے لیے اس طرح کی کوئی خوش خبری اور دین و مذہب کی تکمیل کی بشارت نہیں تھی، ان کا دین ناقص تھا، جب کہ دین اسلام کامل و مکمل ہے، اور یہ دین اسی وقت کامل و مکمل ہوگا، جب کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہ آئے، رسول اللہ ﷺ کی احادیث

---

(۸) والخاتم اسم آلة لما يختم به كالطابع لما يطبع به فمعنى خاتم النبيين الذي ختم النبيون به ومآله آخر النبيين. (روح المعاني: ۱۱/ ۲۱۳، ط: دار الكتب العلمية، بيروت - لبنان)

(۹) وقد ظهر مصداق ذلك في آخر زمن النبي - صلى الله عليه وسلم - فخرج مسيلمة باليمامة، والأسود العنسي باليمن، ثم خرج في خلافة أبي بكر طليحة بن خويلد في بني أسد بن خزيمة، وسجاح التميمية في بني تميم، وفيها يقول شبيب بن ربعي - وكان مؤذنها -: أضحت نبيتنا أنثى نطيف بها وأصبحت أنبياء الناس ذكرانا. وقتل الأسود قبل أن يموت النبي - صلى الله عليه وسلم وقتل مسيلمة في خلافة أبي بكر (قتله وحشي قاتل حمزة يوم أحد، وشاركه في قتل مسيلمة يوم اليمامة رجل من الأنصار) وتاب طليحة ومات على الإسلام على الصحيح في خلافة عمر، ونقل أن سجاح أيضا تابت وأخبار هؤلاء مشهورة عند الإخباريين. (فتح الباري: ٦/ ٦١٧، رقم: ٣٦٠٩، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ فتح المجيد شرح كتاب التوحيد - عبد الرحمن الهيثمي (م: ١٢٨٥هـ)، باب ماجاء أن بعض هذه الأمة يعبد الأوثان، ص: ٢٧٥، ط: مطبعة المحمدية، القاهرة - مصر)

(۱۰) - (المائدة: ٣)

مبارکہ میں عقیدۂ ختم نبوت کا بالکل واضح بیان موجود ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میری مثال اگلے انبیاء کے مقابلے میں ایسی ہے، جیسے کسی شخص نے کوئی مکان بنایا اور اس کی تعمیر خوب اچھے انداز میں کرائی، البتہ اس کے ایک کونے میں صرف ایک اینٹ کے برابر جگہ چھوڑ دی، لوگوں نے چکر لگاتے ہوئے اسے دیکھا اور کہا کہ یہاں ایک اینٹ کے برابر جگہ کیوں چھوڑ دی ہے؟' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مثال کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ آخری اینٹ میں ہوں، مجھے خاتم النبیین بنا کر بھیجا گیا ہے، میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے''۔ (بخاری شریف: ۱/ ۵۰۱)[۱۱]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں محمد ہوں، میں ماحی ہوں، میرے ذریعہ اللہ رب العزت کفر کو مٹائے گا، میں حاشر ہوں، لوگ میرے اٹھنے کے بعد اٹھیں گے، میں عاقب ہو، میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ (بخاری شریف: ۱/ ۵۰۱)[۱۲]

الغرض عقیدۂ ختم نبوت کے سلسلے میں احادیث متواتر ہیں، جن سے یقین کا فائدہ ہوتا ہے۔ [۱۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی مبارک نام ہیں، ان ناموں میں سے محمد اور احمد بھی ہیں اور خاتم النبیین بھی۔ بہر حال یعقوب نامی شخص، لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے، وہ کافر اور مرتد ہے، اس سے خود بھی دور رہیں اور لوگوں کو بھی دور رہنے کی تلقین کریں۔

ترمذی شریف میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبوت اور رسالت ختم ہوگئی ہے،

---

(۱۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: إن "مثلي ومثل الأنبياء من قبلي، كمثل رجل بنى بيتا فأحسنه وأجمله، إلا موضع لبنة من زاوية، فجعل الناس يطوفون به، ويعجبون له، ويقولون هلا وضعت هذه اللبنة؟ قال: فأنا اللبنة وأنا خاتم النبيين". (صحيح البخاري: ۱/ ۵۰۱، رقم الحديث: ۳۵۳۵، كتاب المناقب، باب خاتم النبيين صلى الله عليه وسلم، ط: البدر - ديوبند)

(۱۲) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لي خمسة أسماء: أنا محمد، وأحمد وأنا الماحي الذي يمحو الله بي الكفر، وأنا الحاشر الذي يحشر الناس على قدمي، وأنا العاقب". (صحيح البخاري: ۱/ ۵۰۱، رقم: ۳۵۳۲، باب ما جاء في أسماء رسول الله صلى الله عليه وسلم ط: البدر - ديوبند * صحيح مسلم، رقم: ۲۳۵۴، باب في اسمائه صلى الله عليه وسلم ☆ سنن الترمذي، رقم: ۲۸۴۰، أبواب الأدب، باب ما جاء في أسماء النبي صلى الله عليه وسلم ☆ ومصنف ابن شيبة: ۶/ ۳۱۱، رقم: ۳۱۶۹۱، الفضائل، باب ما أعطى الله تعالى محمدا صلى الله عليه وسلم)

(۱۳) فالأول: المتواتر المفيد للعلم اليقيني بشروطه. (نخبة الفكر ص: ۲۱، ۲۷، ت: عصام الصبابطي، عماد الصيد، ط: دار الحديث القاهرة)

میرے بعد کوئی نبی اور رسول آنے والا نہیں ہے۔ (۱۴)

واضح رہے کہ جو لوگ مرزا غلام احمد قادیانی کو پیغمبر مانتے ہیں، وہ بھی کافر اور مرتد ہیں، ان کے متعلق مختلف ممالک کے معتبر و مستند علماء کرام نے دو سال قبل یہی فتویٰ دیا ہے۔ اس شخص (یعقوب) کا حال بھی ویسا ہی ہے، اس لیے یہ خود بھی مرتد ہے اور اس کے ماننے والے دیگر لوگ بھی کافر و مرتد ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۱۵/۱۲/۱۹۷۵ء

---

(۱۴) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «لا تقوم الساعة حتى تلحق قبائل من أمتي بالمشركين، وحتى يعبدوا الأوثان، وإنه سيكون في أمتي ثلاثون كذابون كلهم يزعم أنه نبي وأنا خاتم النبيين لا نبي بعدي». (سنن الترمذي برقم الحديث: ۲۲۱۹، باب ماجاء لاتقوم الساعة، حتى يخرج كذابون)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ.

(۵-المائدۃ:۳۵)

باب التوسل في الدعاء

(وسیلے سے دعاء مانگنا)

0

[وسیلے سے دعاء مانگنا]

[۱] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعاء کا حکم

۱۲۱-سوال: دعاء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ اختیار کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی دعاء میں یہ کہنا کہ ''اے اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ اور آپ کے صدقہ میں تو ہماری دعاؤں کو قبول فرما'' کیوں کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ قرآن مجید میں وسیلہ کے متعلق جو آیت [۱] نازل ہوئی ہے، اس میں وسیلہ سے مراد ''اعمال صالحہ کا وسیلہ ہے''، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعاء کرنا جائز نہیں ہے، تو کیا یہ بات صحیح ہے؟

مولوی ادریس کوسمبا

الجواب حامداومصلیا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے دعاء کرنا جائز ہے: قال العلامة السبکي: بحسن التوسل بالنبي- صلی اللہ علیہ وسلم- إلی ربه ولم ینکره أحد من السلف والخلف إلا ابن تیمیة. (شامی: ۵/ ۳۵۰) [۲]

اور اللہ رب العزت کے فرمان: ﴿وَابْتَغُوٓا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ﴾ کی تفسیر میں بعض حضرات مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد آداب دعاء ہے۔ [۳] دعاء میں اللہ کے نیک، متقی اور پرہیزگار بندوں کا بھی وسیلہ

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ. (۵-المائدة: ۳۵)

(۲) ردالمحتار: ۶/ ۳۹۷، کتاب الصلاة، فصل في البیع، ط: دار الفکر- بیروت.

(۳) وکأن المعنی حینئذ اطلبوا متوجهین إلیه حاجکم فإن بیده عز شأنه مقالید السماوات والأرض ولا تطلبوها متوجهین إلی غیره فتکونوا کضعیف عاذ بقرملة. (روح المعاني: ۳/ ۲۹۳، (-۵سورة المائدة: ۳۵) ط: دار الکتب العلمیة- بیروت)

اختیار کرنا جائز ہے۔[۴] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ قحط سالی کے زمانہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالی عنہ کے وسیلہ سے دعاء کرتے تھے اور بارش ہوجاتی تھی۔ (بخاری شریف: ۱/ ۱۳۷)[۵]

علامہ عینیؒ نے لکھا ہے: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے نیک، متقی، صالح اور پرہیزگار لوگوں کا دعاء میں وسیلہ اختیار کرنا جائز ہے۔ (عمدۃ القاری: ۲/ ۳۴۳)[۶]

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات بہ خوبی واضح ہوگئی کہ دعاء میں وسیلہ اختیار کرنا جائز ہے؛ لہٰذا بعض لوگوں کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ دعاء میں وسیلہ اختیار کرنا جائز نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۲۸/ ۹/ ۱۹۷۷ء

[۲] ولی اللہ کے وسیلے سے دعا مانگنا

۱۲۲- سوال: کیا اولیاء کے مزار پر اس طرح دعاء کر سکتے ہیں: اے اللہ! تو اپنے دوست کی بزرگی اور ان کے اعمال کے طفیل ہماری دعا قبول فرما، یا صاحب مزار سے یہ کہا جائے کہ "اے ولی اللہ! آپ ہمارے لیے دعاء کر دیجیے کہ اللہ ہماری فلاں فلاں دعاء قبول فرمائیں"۔ اس طرح دعاء مانگنا جائز ہے یا نہیں؟ سوال کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس میں غیر اللہ سے مدد مانگنا لازم آتا ہے، حالاں کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا منع ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب حامدا ومصليا:

مذکورہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ پہلی صورت کی طرح دوسری صورت میں بھی دعاء کرنے والا اللہ ہی

---

(۴) وإن التوسل بالنبي وبأحد من الأولياء العظام جائز بأن يكون السوال من الله تعالى ويتوسل بوليه ونبيه صلى الله عليه وسلم. (امداد الفتاوی: ۷/ ۲۳۲، ط: ادارہ تالیفات اولیاء- دیوبند)

(۵) عن أنس بن مالك، أن عمر بن الخطاب رضي الله عنه، كان إذا قحطوا استسقى بالعباس بن عبد المطلب، فقال: «اللهم إنا كنا نتوسل إليك بنبينا فتسقينا، وإنا نتوسل إليك بعم نبينا فاسقنا»، قال: فيسقون. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۳۷، رقم الحديث: ۱۰۱۰، كتاب الاستسقاء، باب سؤال الناس الإمام الاستسقاء إذا قحطوا، ط: البدر، ديوبند)

(۶) مذکورہ حدیث پاک کے تحت علامہ عینی رقم طراز ہیں: وفيه من الفوائد: استحباب الاستشفاع بأهل الخير والصلاح وأهل بيت النبوة، الخ. (عمدة القاري: ۷/ ۳۲، رقم الحديث: ۱۰۱۰، ط: دار إحياء التراث العربي)

سے مدد مانگتا ہے اور اپنی دعائیں اللہ کے دربار ہی میں پیش کرتا ہے اور قبول ہونے کے لیے ولی اللہ کا وسیلہ اختیار کر رہا ہے، صاحب مزار ولی اللہ قبر میں زندہ ہیں، اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں کہ جو لوگ اللہ کے راستہ میں جہاد، دینی خدمت، اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر وغیرہ) میں قربان ہوتے ہیں، ان کو مردہ مت کہو؛ بل کہ وہ زندہ ہیں۔ [پارہ ۲ رکوع ۳][(۱)]

اس لیے ولی اللہ سے کہنا آپ ہماری اللہ سے سفارش کریں کہ اللہ ہماری فلاں فلاں دعاء قبول فرمائے، یہ جائز ہے (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝ . (۲-البقرة: ۱۵۴)

(۲) وإن التوسل بالنبي وبأحد من الأولياء العظام جائز بأن يكون السؤال من الله تعالى ويتوسل بوليه ونبيه صلى الله عليه وسلم. (امداد الفتاوی: ۶/ ۳۱۲، کتاب العقائد والکلام، ط: ادارہ تالیفات أولیاء - دیوبند)

عن أنس بن مالك، أن عمر بن الخطاب رضي الله عنه، كان إذا قحطوا استسقى بالعباس بن عبد المطلب، فقال: »اللهم إنا كنا نتوسل إليك بنبينا فتسقينا، وإنا نتوسل إليك بعم نبينا فاسقنا« ، قال: فيسقون. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۳۷، رقم الحديث: ۱۰۱۰، كتاب الجمعة، باب سؤال الناس الإمام الاستسقاء إذا قحطوا، ط: البدر - ديوبند)

قال ابن حجر بذيل شرح الحديث المذكور: ويستفاد من قصة العباس استحباب الاستشفاع بأهل الخير والصلاح وأهل بيت النبوة. (فتح الباري - ابن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي (م:): ۲/ ۴۹۷، ط: دار المعرفة - بيروت)

عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن من أشراط الساعة: أن يرفع العلم ويثبت الجهل، ويشرب الخمر، ويظهر الزنا". (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۸۰)

باب علامات القيامة

(قیامت کی نشانیاں)

O

[قیامت کی نشانیاں]

[۱] حضرت مہدیؒ کا ظہور: ثبوت وعلامات

۱۲۳-سوال: ہم نے سنا ہے کہ امام مہدیؒ دنیا میں آنے والے ہیں، تو کیا یہ صحیح بات ہے؟ اور اگر یہ بات صحیح ہو، تو ان کے ظہور کی کیا علامات ہیں؟ کتاب کے حوالہ کے ساتھ تحریر فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی بدعت شروع ہو جائے؛ اس لیے ہم نے رسول اللہ ﷺ سے (اس سلسلے میں) دریافت کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: میری امت میں ایک مہدی آئے گا، جو پانچ سات یا نو سال تک حکومت کرے گا۔ پھر اس کے پاس ایک شخص آئے گا اور کہے گا: اے مہدی! مجھے دیجیے، مجھے دیجیے، پس وہ اسے اتنے دینار دیں گے، جتنا اس میں اٹھانے کی استطاعت ہوگی۔ (ترمذی شریف: ۲/۴۶)[۱]

''لمعات'' میں شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اولاد میں سے ہوں گے۔[۲] بعض علماء نے لکھا ہے کہ حسنی (حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل

---

(۱) عن أبي سعيد الخدري قال: خشينا أن يكون بعد نبينا حدث فسألنا نبي الله صلى الله عليه وسلم فقال: إن في أمتي المهدي يخرج يعيش خمسا أو سبعا أو تسعا. - زيد الشاك - قال: قلنا: وما ذاك؟ قال: سنين. قال: "فيجيء إليه رجل فيقول: يا مهدي! أعطني أعطني" قال: فيحثي له في ثوبه ما استطاع أن يحمله. (سنن الترمذي: ۲/۴۷، رقم الحديث: ۲۲۳۲، أبواب الفتن، باب في المهدي، ط: البدر - ديوبند☆سنن ابن ماجة، ص: ۳۰۰، رقم الحديث: ۴۰۸۳، كتاب الفتن، باب خروج المهدي، ط: البدر، ديوبند☆مسند أبي يعلي: ۲/ ۳۷۴-۳۷۵، رقم الحديث: ۹۸۷، من مسند أبي سعيد الخدري، ت: حسين سليم أسد، ط: دار المأمون للتراث بيروت)

(۲) عن أم سلمة قالت: سمعت رسول الله - صلى الله عليه وسلم - يقول: المهدي من عترتي، من ولد فاطمة. (سنن أبي داؤد، ص: ۵۸۸، رقم الحديث: ۴۲۸۴، كتاب الفتن و الملاحم، كتاب المهدي، ط: البدر، ديوبند ☆ المستدرك على الصحيحين - الحاكم: ۴/۶۰۱، رقم الحديث: ۸۶۷۲، كتاب الفتن و الملاحم، و أما حديث عقيل بن خالد، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

سے) ہوں گے۔ [۳] بعض نے لکھا ہے کہ حسینی (حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نسل سے) ہوں گے۔
(حاشیہ: ۲/ترمذی شریف: ۲/ ۷ ۴، ابواب الفتن، باب ما جاء فی المہدی، ط: البدر- دیوبند) [۴]

جب دنیا فسق، بلاء، محن و پریشانیوں سے بھر جاوے گی، اس وقت ان کا ظہور ہوگا۔ [۵] عوام (پبلک) ان کو اپنے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرنے پر مجبور کریں گے، وہ خود عوام کو بیعت پر مجبور نہیں کریں گے۔ [۶] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] جھوٹ کا عام ہو جانا علاماتِ قیامت میں سے ہے

۱۲۴-سوال: ادھر کچھ دنوں سے ایک خبر لوگوں کے درمیان گردش کر رہی ہے کہ قرآن پاک کے

---

(۳) عن أبي إسحاق، قال: قال علي رضي الله عنه، ونظر إلى ابنه الحسن، فقال: «إن ابني هذا سيد كما سماه النبي -صلى الله عليه وسلم-، وسيخرج من صلبه رجل يسمى باسم نبيكم، يشبهه في الخلق، ولا يشبهه في الخلق -ثم ذكر قصة- يملأ الأرض عدلا. (سنن أبي داؤد، ص: ۵۸۹، رقم الحديث: ۴۲۹۰، كتاب المهدي، كتاب الفتن والملاحم.
قال الملا علي القاري في شرح هذا الحديث: فهذا الحديث دليل صريح على ما قدمناه من أن المهدي من أولاد الحسن، ويكون له انتساب من جهة الأم في الحسين جمعا بين الأدلة. (مرقاة المفاتيح: ۱۰/ ۱۰۱، كتاب الفتن، باب أشراط الساعة، في ذيل: رقم الحديث: ۵۴۶۲، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۴) واختلف في أنه من بني الحسن، أو من بني الحسين، ويمكن أن يكون جامعا بين النسبتين الحسنيين، والأظهر أنه من جهة الأب حسني، ومن جانب الأم حسيني. (مرقاة المفاتيح: ۱۰/ ۹۰، كتاب الفتن، باب أشراط الساعة شرح: رقم الحديث: ۵۴۵۲، ت: الشيخ جمال عيتاني، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۵) عن أبي سعيد الخدري، قال: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: "لا تقوم الساعة حتى تمتلئ الأرض ظلما وعدوانا" قال: "ثم يخرج رجل من عترتي -أو من أهل بيتي- من يملؤها قسطا وعدلا، كما ملئت ظلما وعدوانا".
(مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۱۷/ ۴۱۶، رقم الحديث: ۱۱۳۱۳، مسند أبي سعيد الخدري رضي الله عنه، مسند المكثرين من الصحابة، ت: شعيب الأرنؤوط، عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة☆سنن أبي داؤد، ص: ۵۸۸، رقم الحديث: ۴۲۸۲، كتاب المهدي، ط: البدر- ديوبند☆جامع معمر بن راشد: ۱۱/ ۳۷۲، باب المهدي، رقم الحديث: ۲۰۷۷۰، ت: الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، ط: المكتب الإسلامي☆المستدرك للحاكم: ۵/ ۱۹، كتاب الفتن والملاحم، رقم الحديث: ۸۷۳۳۰، ط: دار الحرمين للطباعة والنشر)

(۶) عن أم سلمة، زوج النبي صلى الله عليه وسلم، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «يكون اختلاف عند موت خليفة، فيخرج رجل من أهل المدينة هاربا إلى مكة، فيأتيه ناس من أهل مكة فيخرجونه وهو كاره، فيبايعونه بين الركن والمقام. -الحديث- (سنن أبي داؤد، ص ۵۸۹، رقم الحديث: ۴۲۸۶، كتاب المهدي)
قال الطيبي: وهو المهدي بدليل إيراد هذا الحديث أبو داؤد في باب المهدي. (مرقاة المفاتيح: ۱۰/ ۹۲، كتاب الفتن، باب أشراط الساعة، دار الفكر-بيروت)

صفحات کے درمیان سے بال نکل رہے ہیں، اور بمبئی میں ایک داڑھی والے بچے کا تولد ہوا، جس نے یہ کہا تھا کہ قرآنِ پاک سے بال نکلیں گے، پھر تین دنوں میں اُس کا انتقال ہوگیا، ایسی جاہلانہ خبروں کے متعلق حکمِ شرعی کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

علاماتِ قیامت میں سے یہ بھی ہے کہ لوگ ایسی جھوٹی باتیں پھیلائیں گے، جسے سلف صالحین نے کبھی نہیں سنا ہوگا۔[1] اس طرح کی خبریں صرف شیطانی دھوکے ہیں، بچے کا داڑھی والا پیدا ہونا ایک نامعقول بات تو ہے ہی، مزید برآں جب اُس کے بال قرآنِ پاک میں سے نکلے، تو وہ بغیر داڑھی کے مرا، اور ایسا شخص کبھی ولی نہیں ہوسکتا، علاوہ ازیں مردار انسان کے بال امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق ناپاک ہیں۔[2] تو ناپاک چیز قرآنِ پاک میں کیسے آسکتی ہے؟ اس قسم کی جھوٹی خبریں ۱۹۴۵ء میں بھی شائع ہوئی تھیں، جو ہرگز قابلِ تسلیم نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] جہتِ مغرب کی تعیین

(قربِ قیامت سورج جہتِ مغرب سے نکلے گا تو کیا وہی جہتِ مغرب مراد ہے، جو ہمارے ذہن میں ہے؟)

۱۲۵–سوال: قیامت کے دِن سورج مغرب سے طلوع ہوگا، عوام یہ سمجھتے ہیں کہ سائنسی تحقیقات کے مطابق جو جہتیں مقرر ہیں، وہی مشرق ومغرب ہیں، یہی جہتیں ہمارے اذہان میں راسخ ہوچکی ہیں، تو اب میں دریافت یہ کرنا چاہتا ہوں کہ قیامت کے دِن کیا اُسی جہتِ مغرب سے سورج طلوع ہوگا، یا مغرب سے کوئی اور جہت مراد ہے؟ برائے کرم احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں اصل مشرق ومغرب کے معنیٰ اور اُس کی حقیقت واضح فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مشرق ومغرب کی حقیقت وہی ہے، جو ہمارے ذہنوں میں ہے، مشرق یعنی طلوعِ شمس کی جہت اور مغرب یعنی غروبِ شمس کی جہت، اُس کے علاوہ اور کوئی معنیٰ نہیں ہے، قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ

---

(۱) عن أبي هريرة، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، أنه قال: سيكون في آخر أمتي أناس يحدثونكم ما لم تسمعوا أنتم، ولا آباؤكم، فإياكم وإياهم. (صحيح المسلم: ۹/۱، رقم: ۶-(۶)، مقدمة الإمام مسلم، باب النهي عن الرواية عن الضعفاء... الخ، ط: البدر-ديوبند☆مسند الإمام أحمد: ۱۹/۱۴، رقم: ۸۲۶۷، ط: مؤسسة الرسالة☆ مسند أبي يعلى الموصلي: ۴۷۰/۱۱، رقم: ۶۳۸۴، مسند ابي هريرة، الأعرج عن أبي هريرة، ط: دار المأمون للتراث-دمشق، واللفظ لمسلم)

(۲) قال الشافعية: أما لو أخذ (أي الشعر والصوف والريش ووبر الحيوان) بعد الموت فنجس. (الفقه الإسلامي وأدلته-الزحيلي: ۲۵۱/۱، الباب الأول: الطهارات، المبحث السادس، ط: دار الفكر)

''رب المشرق والمغرب''، دوسری جگہ ''رب المشرقین ورب المغربین'' اور تیسری جگہ ''رب المشارق والمغارب'' فرمایا ہے، ان تمام آیتوں میں یہی معنیٰ مراد ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کے فرمان کہ قربِ قیامت آفتاب مغرب سے طلوع ہوگا اُس میں بھی یہی معنیٰ مراد ہے۔ (۱)

آپ کو شاید اِس بات سے غلط فہمی ہوگئی ہے جو حدیث میں منقول ہے کہ ''قیامت کے دِن آفتاب مغرب سے طلوع ہوگا''۔ واضح رہے کہ آفتاب قیامت کے دِن مغرب سے طلوع نہیں ہوگا؛ بل کہ قربِ قیامت غروب ہوکر فوراً بہ حکمِ خداوندی مغرب سے طلوع ہوگا، اور جہتِ مغرب سے طلوع ہونے کے بعد توبہ، ایمان واسلام کا دروازہ بند ہوجائے گا، پھر نہ کسی بندے کی توبہ قبول ہوگی نہ ایمان واسلام، جیسا کہ بخاری شریف کی ایک طویل روایت میں اس کا ذکر ہے، مختصراً اس کا ایک جزء نقل کرتا ہوں:

حتی تطلع الشمس من مغربها، فإذا طلعت و رآها الناس أمنوا أجمعين، فذلك حين لا ينفع نفسا إيمانها لم تكن أمنت من قبل، أو كسبت في إيمانها خيرا. (مشكوة المصابيح: ۴۹۵)[۲]

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه: بادروا بالأعمال ستا، الدخان، والدجال، ودابة الأرض، وطلوع الشمس من مغربها. (رواه مسلم)[۳]

حشر کے میدان میں آفتاب کے طلوع وغروب یا جہت کو بیان نہیں کیا ہے، بل کہ آفتاب کے قرب کو

---

(۱) (رب المشارق والمغارب)، وقال في موضع: {رب المشرقين ورب المغربين} [الرحمن: ۱۷] وقال في موضع: {رب المشرق والمغرب} [الشعراء: ۲۸] فكيف وجه التوفيق بين هذه الآيات؟ قيل: أما قوله: {رب المشرق والمغرب} [الشعراء: ۲۸] أراد به جهة المشرق وجهة المغرب. وقوله: {رب المشرقين ورب المغربين} [الرحمن: ۱۷] أراد مشرق الشتاء ومشرق الصيف، وأراد بالمغربين: مغرب الشتاء ومغرب الصيف. وقوله: {برب المشارق والمغارب} [المعارج: ۴۰] أراد الله تعالى أنه خلق للشمس ثلثمائة وستين كوة في المشرق وثلثمائة وستين كوة في المغرب على عدد أيام السنة، تطلع الشمس كل يوم من كوة منها، وتغرب في كوة منها، لا ترجع إلى الكوة التي تطلع الشمس منها من ذلك اليوم إلى العام المقبل، فهي المشارق والمغارب، وقيل: كل موضع شرقت عليه الشمس فهو مشرق، وكل موضع غربت عليه الشمس فهو مغرب، كأنه أراد رب جميع ما شرقت عليه الشمس وغربت. (مختصر تفسير البغوي: ۸۹۱/۵، سورة الصافات، ط: دار السلام للنشر والتوزيع - الرياض)

[۲] مشكوة المصابيح، ص: ۴۶۵، باب الملاحم، الفصل الأول، ط: فيصل پبليكشنز ديوبند.

(۳) عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: "بادروا بالأعمال ستا: الدجال، والدخان، ودابة الأرض، وطلوع الشمس من مغربها، وأمر العامة، وخويصة أحدكم. (صحيح مسلم: ۴۰۶/۲، رقم الحديث: ۱۲۹ - (۲۹۴۷)، كتاب الفتن، باب في بقية من أحاديث الدجال، ط: البدر - ديوبند)

بیان کیا گیا ہے کہ آفتاب مقدار میل دور ہوگا، جس کی گرمی سے شدید تپش ہوگی، اور لوگ اپنے گناہوں کے بہ قدر پسینے میں غرق ہوں گے:

عن المقداد قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: تدنى الشمس يوم القيامة من الخلق، حتى تكون منهم كمقدار ميل فيكون الناس على قدر أعمالهم في العرق، فمنهم من يكون إلى كعبيه، و منهم من يكون إلى ركبتيه، و منهم من يكون إلى حقويه، و منهم من يلجمهم العرق إلجاما، و أشار رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده إلى فيه. رواه مسلم. (مشکوۃ شریف: ۴۸۳، باب الحشر) [۴]

حشر کے میدان میں قیامت کے دن آفتاب قریب ہوگا، اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے، طلوع وغروب کو بیان نہیں فرمایا، لہٰذا جہت مغرب سے طلوع ہونے کو قرب قیامت کی علامات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے، اور وہ قیامت کی آخری نشانیوں میں سے بڑی نشانی ہوگی، جس پر توبہ، ایمان و اسلام کی قبولیت بند ہوجائے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] کیا علامات کبریٰ کے ظہور سے پہلے قیامت قائم ہوسکتی ہے؟

۱۲۶-سوال: آج کل گناہ اپنی انتہا کو پہونچ چکے ہیں، دن بہ دن گناہ: چوری، زنا، عریانیت، بے حیائی اور بے شرمی بڑھتی جارہی ہے، اسی طرح علی الاعلان دین کے احکام توڑے جارہے ہیں اور دین کا مذاق اڑایا جاتا ہے، تو کیا قیامت کی بڑی نشانیوں: یاجوج ماجوج کا نکلنا، حضرت عیسیٰؑ کا آسمان سے اترنا، حضرت امام مہدیؑ کا ظاہر ہونا؛ وغیرہ کے ظاہر ہونے سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ قیامت قائم کرسکتے ہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ آج قیامت قائم کردے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے پہلے سے طے کردیا ہے کہ یہ سب کچھ ہوجانے کے بعد قیامت قائم ہوگی اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ خوب گناہ اور نافرمانی ہوگی، یعنی جو کچھ طے شدہ ہے وہ ہو کے رہے گا، اس کے بعد قیامت قائم کی جائے گی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۴] مشكاة المصابيح ص: ۴۸۳، باب الحشر، الفصل الأول، ط: فيصل ديوبند☆ صحيح مسلم: ۲/ ۳۸۴، برقم الحديث: ۶۲-(۲۸۶۴)، كتاب الجنة وصفة نعيمها و أهلها، باب في صفة يوم القيامة أعاننا الله على أهوالها، ط: البدر- ديوبند)

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ.

(۶-الأنعام: ۱۶۴)

باب الجزاء والعقوبة

باب الجنة ونعيمها

(جزا وسزا - جنت اور اس کی نعمتوں کا بیان)

○

[جزاوسزا]

[۱] کیا ایک آدمی کے گناہ کی سزا دوسرے کو ہوسکتی ہے؟

۱۲۷-سوال: ایک آدمی کے گناہ کی سزا کیا اس کے علاوہ کسی دوسرے کو ہوسکتی ہے یا صرف اسی کو ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے یا کسی گناہ کا سبب بنتا ہے، تو اس کا گناہ اسی کو ہوگا، اس کے گناہ کی سزا کسی دوسرے کو نہیں ہوگی، اللہ تبارک وتعالی قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾ (۱)

ترجمہ: اور جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے، وہ اسی کے ذمہ پر رہتا ہے اور کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] نابالغ بچے کو گناہ کا کام کرنے پر عذاب کا حکم

۱۲۸-سوال: نابالغ بچہ اگر کوئی گناہ کا کام بے خبری اور لاعلمی میں کرلے تو اس کو کوئی عذاب لاحق ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نابالغ بچہ اگر نا سمجھی میں کوئی گناہ کا کام کرلے، تو اس پر کوئی سزا عائد نہیں ہوگی، اللہ تبارک وتعالی اس

---

(۳)-۶ الأنعام: ۱۶۴.

کو عذاب نہیں دیں گے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۳] کیا والدین کے گناہ کی وجہ سے اولاد کا مؤاخذہ ہوگا؟

۱۲۹-سوال: کسی شخص کو اس کے ماں باپ کے گناہ کی سزا دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر کسی مرد وعورت نے زنا کا ارتکاب کیا، جس کے نتیجے میں لڑکے کی ولادت ہوئی، تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا اسے منصب امامت پر فائز کیا جاسکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

ماں باپ کے گناہ کی وجہ سے اولاد کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، لڑکا اگر عاقل بالغ، حافظ قرآن اور عالم ہے، نیز صحیح قرآن مجید پڑھنے والا ہے، تو اس کا امامت کرنا بھی جائز ہے (جب کہ اسے معاشرے میں حقیر نہ سمجھا جاتا ہو) اور اس کے نیک اعمال بھی عند اللہ مقبول ہوں گے (ان شاء اللہ)۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) عن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: "رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتى يستيقظ، وعن الصبي حتى يحتلم، وعن المجنون حتى يعقل". (سنن أبي داود: ص:۲۰۶، رقم الحديث: ۴۴۰۳، وبمعناه برقم:۴۳۹۸☆۴۴۰۱☆۴۴۰۲، كتاب الحدود، باب في المجنون يسرق أو يصيب حدا، ط: البدر - ديوبند☆سنن الترمذي:۱/ ۲۶۳، رقم الحديث: ۱۴۲۳، كتاب الحدود، باب ما جاء فيمن لا يجب عليه الحد، ط: البدر - ديوبند☆سنن ابن ماجة، ص:۱۴۷، رقم الحديث:۲۰۴۱، كتاب الطلاق، باب طلاق المعتوه والصغير والنائم، ط: البدر - ديوبند)

(۲) وينبغي أن يكون كذلك في العبد وولد الزنا، إذا كان أفضل القوم فلا كراهة إذا لم يكونا محتقرين بين الناس لعدم العلة للكراهة. (البحر الرائق:۱/ ۳۶۷، إمامة العبد والأعرابي الخ، ط: دار الكتاب الإسلامي)

"وولد الزنا" الذي لا علم عنده ولا تقوى فلذا قيده مع ما قبله بقوله "الجاهل" إذ لو كان عالما تقيا لا تكره إمامته، لأن الكراهة للنقائص. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح: ۱۱۵، فصل في الأحق بالإمامة، ط: المكتبة العصرية)

وقال ابو حنيفة رضي الله عنه: لا باس بان يؤم ولد الزنا إذا كان فقيها، قارئا للقران، وأن يؤم غيره أحب إلي. (الحجة على أهل المدينة- أبو عبد الله محمد بن الحسن الشيباني (م:۱۸۹هـ):۱/ ۱۲۹، باب متابعة الامام في الجلوس والقيام، ت: مهدي حسن الكيلاني القادري، ط: عالم الكتب - بيروت)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: الأصل المعروف بالمبسوط- أبو عبد الله محمد بن الحسن الشيباني : ۱/ ۲۰، كتاب الصلاة، باب افتتاح الصلاة وما يصنع الإمام، ت: أبو الوفا الأفغاني، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية- كراتشي.

[۴] حیلۂ گناہ کا حکم

۱۳۰-سوال: "حیلہ" کے وقت گیہوں، رقم اور قرآن مجید رکھنے میں کلام مجید نہ ہو، تو اس کا ہدیہ لیتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟ (حیلہ، گناہ کی معافی کا ایک طریقہ ہے، جس میں گناہ کرنے والا کسی کو گیہوں، کچھ رقم اور قرآن کریم دیتا ہے، تاکہ اس کے گناہ کا وہ ذمہ دار ہو جائے اور اس کا بوجھ اپنے سر لے لے)

الجواب حامدا ومصليا:

مذکور صورت ناجائز ہے، حرام ہے، ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا، حیلہ کرنے سے کوئی کسی کا گناہ اپنے سر نہیں لے سکتا ہے، جو کرے گا، وہی بھرے گا، اس طرح کا حیلہ کرنا، کرانا حکم قرآنی کے خلاف ہے۔[۱]

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا تزر وازرة وزر أخرى."[۲] پس اس حرام کام سے بچنا ضروری ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فالحاصل: أن ما يتخلص به الرجل من الحرام أو يتوصل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن، وإنما يكره ذلك أن يحتال في حق لرجل حتى يبطله، أو في باطل حتى يموهه، أو في حق حتى يدخل فيه شبهة، فما كان على هذا السبيل، فهو مكروه، وما كان على السبيل الذي قلنا أولا، فلا بأس به. (المبسوط للسرخسي - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۳۰/۲۱۰، كتاب الحيل، ط: دار المعرفة - بيروت)

[۲] ۶- الأنعام: ۱۶۴.

مایتعلق بالجنۃ ونعیمھا

(جنت اور اس کی نعمتوں کا بیان)

[۱] کیا پہلی بیوی سے جنت میں ملاقات ہوگی؟

۱۳۱-سوال: میری پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا، اب اگر میں دوسری شادی کروں، تو جنت میں مجھے پہلی بیوی کی ملاقات نصیب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیاً:

آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، جنت میں ایسی ایسی نعمتیں ملیں گی، جن کا ہم اور آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر جنتی شخص کو جنت میں چار ہزار کنواری، آٹھ ہزار ثیبہ اور سو بڑی آنکھوں والی حوریں ملیں گی۔ أبو نعیم فی الحلیۃ. (ترغیب: ۶/ ۳۱۱)[۱]

بیہقی کی ایک روایت میں ہے کہ چار ہزار کنواری، آٹھ ہزار ثیبہ اور پانچ سو حور ملیں گی۔[۲]

ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ رب العزت بہتر حوروں کو بہ طور خاص پیدا کریں گے اور دنیا کی

---

(۱) یزوج کل رجل من أهل الجنة أربعة آلاف بکر، وثمانية آلاف أيم، ومائة حوراء. الحدیث. (الترغیب والترهیب- المنذري: ۶/ ۵۳۸، رقم الحدیث: ۵۶۶۷، ط: دار إحیاء التراث العربي)

نوٹ: ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ کی حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء میں احقر کو مذکورہ حدیث تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملی، ہاں یہ حدیث درج ذیل تفصیل کے ساتھ ان کی کتاب صفۃ الجنۃ میں موجود ہے:

عن ابن أبي أوفی، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم: یزوج الرجل من أهل الجنة أربعة آلاف بکر، وثمانية آلاف أيم ومائة حوراء. الحدیث. (صفة الجنة - أبو نعیم أحمد بن عبد الله بن أحمد بن إسحاق بن موسی بن مهران الأصبهاني (م: ۴۳۰ھ): ۲/ ۲۱۲، رقم الحدیث: ۳۷۸، ذکر نکاح أهلها وتعانقهم حورها وسکان مقاصیرها، الخ ☆ ۲/ ۲۶۹، رقم الحدیث: ۴۳۱، ذکر حبور أهلها واجتماعهم علی الغناء والطرب، ت: علي رضا عبد الله، ط: دار المأمون للتراث - دمشق)

(۲) عن عبد الله بن أبي أوفی، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: «إن الرجل من أهل الجنة لیزوج خمس مائة حوراء، وأربع آلاف بکر، وثمانية آلاف ثیب، یعانق کل واحدة منهن مقدار عمره في الدنیا». (البعث والنشور للبیهقي: ۱/ ۲۲۳، باب ما جاء في صفة حور العین، والولدان، والغلمان، رقم الحدیث: ۳۷۳، ت: الشیخ عامر أحمد حیدر، ط: مرکز الخدمات والأبحاث الثقافیة- بیروت ☆ الترغیب والترهیب - المنذري: ۶/ ۵۳۲، ط: دار إحیاء التراث العربي)

عورتوں میں سے دو عورتیں جنتی کو ملے گی اور یہ دونوں عورتیں اپنے حسن و جمال اور عبادت و بندگی کی وجہ سے حورعین پر بھی فوقیت رکھتی ہوں گی۔[۳]

اس لیے آپ اگر دوسری شادی کریں گے، تو بھی ان شاء اللہ العزیز آپ کی ملاقات اپنی بیوی کے ساتھ ہوگی؛ لہٰذا دوسری شادی ضرور کریں، تاکہ امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام) میں اضافہ ہو۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ (۲۵/۴/۱۹۷۹ء)

[۲] جنت میں نیک عورت کو کون سی شئے ملے گی؟

۱۳۲- سوال: نیک مرد کو جنت میں حوریں ملیں گی، تو نیک عورت کو کون سی شئے ملے گی؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

نیک عورت اپنے جنتی شوہر کے ساتھ رہے گی اور شوہر کو ملنے والی حوروں کی سردار ہوگی۔(۱) مردوں کے متعلق یہ بات مذکور ہے کہ حوریں اور دنیا کی دو دو عورتیں ملیں گی۔ (فتح الباری شرح بخاری: ۷/ ۸۳۳)[۲]

---

(۳) فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: والذي بعثني بالحق ما أنتم في الدنيا بأعرف بأزواجكم ومساكنكم من أهل الجنة بأزواجهم ومساكنهم، فيدخل رجل منهم على ثنتين وسبعين زوجة مما ينشىء الله وثنتين من ولد آدم لهما فضل على من أنشأ الله لعبادتهما الله في الدنيا. (الترغيب والترهيب - المنذري (م: ٦٥٦هـ): ٦/ ٥٣٤، رقم الحديث: ٥٦٥٦، كتاب صفة الجنة والنار، فصل في وصف نساء أهل الجنة، ط: دار إحياء التراث العربي، ورواه البيهقي في البعث والنشور، برقم الحديث: ٤٠٩)

(۱) عن ابن أنعم عن حبان بن أبي جبلة قال: "إن نساء الدنيا من دخل منهن الجنة، فضلن على العين بما عملن في الدنيا وروى مرفوعا: إن الأدميات أفضل من الحور العين بسبعين ألف ضعف. (التذكرة بأحوال الموتى وأمور الآخرة - أبو عبد الله محمد بن أحمد بن أبي بكر بن فرح الأنصاري الخزرجي شمس الدين القرطبي (م: ٦٧١هـ)، ص: ٩٨٧، باب منه في الحور العين وكلامهن وجواب نساء الآدميات وحسنهن، ت: د. الصادق بن محمد بن إبراهيم، ط: مكتبة دار المنهاج - الرياض، الطبعة: الأولى، ١٤٢٥هـ)

(۲) كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "والذي بعثني بالحق، ما أنتم في الدنيا بأعرف بأزواجكم ومساكنكم من أهل الجنة بأزواجهم ومساكنهم، فيدخل كل واحد منهم على اثنتين وسبعين زوجة مما ينشئ الله عز وجل، واثنتين آدميتين من ولد آدم. (الأحاديث الطوال - سليمان بن أحمد، الشامي، أبو القاسم الطبراني (م: ٣٦٠هـ) ص: ٢٦٦، رقم الحديث: ٣٦، حديث الصور، ت: حمدي بن عبدالمجيد السلفي، ط: مكتبة الزهراء - الموصل، الطبعة: الثانية، ١٤٠٤-١٩٨٣)

☆صفة الجنة - ضياء الدين أبو عبد الله محمد بن عبد الواحد المقدسي (م: ٦٤٣هـ)، ١٤٢، رقم الحديث: ١٤٠، ذكر نساء أهل الجنة، ت: صبري بن سلامة شاهين، ط: دار بلنسية - الرياض، الطبعة: الأولى ١٤٢٣هـ-٢٠٠٢م.

☆فتح الباري - أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي: ٦/ ٣٢٥، باب ما جاء في صفة الجنة وأنها مخلوقة، ط: دار المعرفة - بيروت.

تفرقت اليهود على إحدى وسبعين أو اثنتين وسبعين فرقة، والنصارى مثل ذلك، وتفترق أمتي على ثلاث وسبعين فرقة.

(سنن الترمذی: ۲۶۴۰)

باب الفرق

(فرق باطلہ کے مخصوص اعمال)

[باب الفرق]

[۱] قادیانی اور ہندو کو دل سے چاہنا

۱۳۳-سوال: قادیانی یا ہندوؤں میں سے کسی کو دل سے اچھا سمجھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قادیانی اور ہندو دونوں ہی کافر ہیں، البتہ مسلمان کے لیے قادیانی ہندو کے مقابلے میں زیادہ ضرر رساں ہیں؛ اس لیے کہ ہندو کو ہر شخص کافر سمجھتا ہے اور اس سے دوری اختیار کرتا ہے، جب کہ قادیانی اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کو فریب دیتا ہے، بسا اوقات بھولے بھالے مسلمان اس کے دام فریب میں آجاتے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی عقیدے کے لحاظ سے اچھا سمجھنا جائز نہیں ہے، اگر کوئی شخص کسی کافر کو خواہ وہ قادیانی ہو یا ہندو یا کوئی اور؛ دل سے اچھا سمجھے اور اس کے کفر کے تعلق سے دل میں کسی طرح کی نفرت محسوس نہ کرے، تو یہ اس کے لیے بالکل ناجائز ہے؛ اس لیے کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں، جن سے دلی دوستی نہایت خطرناک امر ہے۔[1] ہاں! اگر اس کے کفر کو دل سے برا سمجھے؛ لیکن وطنی یا انسانی برادری کی

---

(۱) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَتُرِيدُونَ أَن تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا. [۴-النساء: ۱۴۴]

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ. [۵-المائدۃ: ۵۷]

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا. (۳-آل عمران: ۱۱۸)

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تکلیف پہونچانے والے کفار اور مشرکین سے دلی دوستی رکھنے والوں کو ظالم قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. [۶۰-الممتحنۃ: ۹]

وجہ سے اس کے ساتھ حسن سلوک اور ہمدردی کا برتاؤ کرے، تو شرعاً جائز ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، الا یہ کہ وہ مسلمانوں کو ضرر پہونچانے والوں کا تعاون کرتا ہو۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] تعزیہ نکالنا اور اس میں ناچ گانے کی محفل سجانا

۱۳۴-سوال: ہمارے یہاں محرم کے مہینہ میں تعزیہ کا جلوس نکالا جاتا ہے، جس میں اکثر بھیڑیا، بھالو اور بندر کے ناچ کے ساتھ ڈھول وباجا بھی بجایا جاتا ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ ایسا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی یہ کھیل کھیلا جاتا تھا؛ لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے، نیز اس میں مدد کرنا کیسا ہے؟ آپ دلائل کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں تعزیہ نہیں تھا، یہ تو بعد کے لوگوں نے رسم ورواج کے طور پر دین میں داخل کر دیا ہے۔[2] یہ لوگ درحقیقت اسلام کے دشمن ہیں، جو اسلام کو بدنام کر رہے ہیں؛ لہٰذا ایسی کسی بھی رسم وبدعت میں شامل ہونا درست نہیں ہے۔ نیز اس میں جانی ومالی کسی بھی طرح کی مدد کرنا

---

(۱) لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. [۶۰-الممتحنة:۸]

وقال تعالی: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔـا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا. [۴-النساء:۳۶]

عن أبي شريح، أن النبي -صلی اللہ علیہ وسلم- قال: واللہ لا يؤمن، واللہ لا يؤمن، واللہ لا يؤمن، قيل من يا رسول اللہ، قال: الذي لا يأمن جاره بوائقه. (صحيح البخاري: ۲/۸۸۹، رقم: ۶۰۱۶، كتاب الأدب، باب إثم من لا يؤمن جاره بوائقه)

عن أبي هريرة، أن رسول اللہ -صلی اللہ علیہ وسلم- قال: لا يدخل الجنة من لا يأمن جاره بوائقه. (صحيح المسلم: ۱/۵۰، رقم الحديث: ۷۳-(۴۶) كتاب الإيمان، باب بيان تحريم إيذاء الجار، ط: البدر- ديوبند)

(۲) تعزیہ داری کی ایجاد ۳۵۲ھ کے شروع میں ہوئی، اس کا سبب یہ ہوا کہ معز الدولہ نے حکم دیا کہ ۱۰ر محرم کو حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے غم میں تمام دکانیں بند کر دی جائیں، بیع وشراء (خرید وفروخت) بالکل بند رہے (وغیرہ وغیرہ)... شیعوں نے اس حکم کی بہ خوشی تعمیل کی؛ مگر اہل سنت دم بخود اور خاموش رہے؛ کیوں کہ شیعوں کی حکومت تھی، آئندہ سال ۳۵۳ھ میں پھر اسی حکم کا اعادہ کیا گیا... اس کے بعد شیعوں نے ہر سال اس رسم کو زیر عمل لانا شروع کیا اور آج تک اس کا رواج ہندوستان میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ (ملخص از: تاریخ اسلام-مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی: ۲/۵۱۹، ط: مکتبہ علیہ، سہارن پور، سن اشاعت: ۲۰۰۱ء)

حرام ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] صحابہ کرام -رضوان اللہ علیہم أجمعین- قابلِ تعظیم ہیں

۱۳۵-سوال: صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق ہمارا عقیدہ کیا ہونا چاہیے؟ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جو جنگ ہوئی ہے، اسے کیا سمجھا جائے اور مودودی صاحب نے بہت سے صحابہؓ کے متعلق گستاخانہ الفاظ استعمال کیے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً:

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم انبیاء کی طرح معصوم تو نہیں ہیں، مگر نبی کریم ﷺ کی صحبت بابرکت اور آپ ﷺ کی پاکیزہ تعلیم وتربیت کی وجہ سے ان میں ایسی صفائی آگئی تھی کہ وہ نیک کاموں کی طرف سبقت کرتے تھے اور برے کاموں سے دور رہتے تھے۔

ان کا کوئی کام اگر ہم کو بظاہر گناہ معلوم ہوتا ہو، تو ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ انہوں نے جان بوجھ کر اسے انجام نہیں دیا ہے؛ بل کہ وہ مجتہد تھے اور اجتہاد میں ان سے چوک ہوگئی ہوگی، اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''مجتہد کبھی غلطی کرتا ہے، تو کبھی صحیح راہ پر چلتا ہے، اور غلطی میں بھی اس کو ثواب ملتا ہے۔''[2] (صحیح بخاری، حدیث: ۶۸۰۵، أجر الحاکم إذا اجتهد) لہٰذا حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان جو جنگ ہوئی، اس کو اجتہادی غلطی پر محمول کیا جائے گا۔

شارح مسلم امام نوویؒ نے علامہ مازریؒ کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ معصوم صرف انبیاء علیہم السلام ہیں؛ لیکن ہم کو صحابہؓ کے ساتھ صحیح اور اچھا گمان رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، کہ صحابہ تمام خرابیوں اور برائیوں سے محفوظ تھے، اگر کوئی روایت ایسی ہو، جس سے صحابہؓ کی کوئی برائی ثابت ہوتی ہو، تو اس کی صحیح تاویل کی جائے گی اور اسے

---

(۱): وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ يعني لا تعاونوا على ارتكاب المنهيات، ولا على الظلم. (التفسير المظهري- محمد ثناء الله المظهري: ۲/ ۵۱۲، ت: غلام نبي التونسي، ط: مكتبة الرشدية- الباكستان: ۱۴۱۲هـ)

(۲) عن عمرو بن العاص، أنه سمع رسول الله - صلى الله عليه وسلم - يقول: إذا حكم الحاكم فاجتهد ثم أصاب فله أجران، وإذا حكم فاجتهد ثم أخطأ فله أجر. (صحيح البخاري: ۲/ ۱۰۹۲، رقم الحديث: ۷۳۵۲، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب أجر الحاكم إذا اجتهد فأصاب أو أخطأ، ط: فیصل پبلیکیشنز، دیوبند * صحيح مسلم: ۲/ ۷۶، رقم الحديث: ۱۵-(۱۷۱۶)، كتاب الأقضية، باب: بيان أجر الحاكم إذا اجتهد الخ، ط: فیصل پبلیکیشنز، دیوبند)

اچھے معنیٰ پر محمول کیا جائے گا، اگر تاویل نہ ہو سکے تو وہ روایت قابل رد ہوگی۔ (نووی شرح مسلم: ۱/ ۹۰)[1]

غور کیجیے! امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ صحابہؓ کے ساتھ صحیح عقیدہ رکھنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''میرا ہر صحابی ستارے کے مانند ہے''۔ (۲) ایک روایت میں ہے: ''میرے صحابہ کی بدگوئی و بدگمانی سے بچو''۔ (۳) نیز صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ بہت سے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی تھی۔ (۴) اور بھی بہت سی روایتیں صحابہؓ کے فضائل کے سلسلہ میں منقول ہیں۔ (۵) ان ساری تفصیلات کو ذہن میں رکھیے اور سوچیے کہ امت کو صحابۂ کرامؓ کے متعلق کیسا عقیدہ رکھنا چاہیے۔

---

(۱) ولسنا نقطع بالعصمة إلا للنبي -صلى الله عليه وسلم- ولمن شهد له بها لكنا مأمورون بحسن الظن بالصحابة رضي الله عنهم أجمعين ونفي كل رذيلة عنهم وإذا انسدت طرق تأويلها نسبنا الكذب إلى رواتها. (شرح النووي على صحيح المسلم: ۲/ ۹۰، كتاب الجهاد والسير، باب: حكم الفيء، ط: مكتبة البدر - ديوبند)

(۲) عن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنما أصحابي بمنزلة النجوم، فأيهم أخذتم بقوله اهتديتم. (الإبانة الكبرى - ابن بطة العكبري (م: ۳۸۷ھ): ۲/ ۵۶۳، رقم الحديث: ۷۰۲و۷۰۱، باب التحذير من استماع كلام قوم يريدون... الخ، ط: دار الراية للنشر و التوزيع - الرياض☆ وأخرجه الآجري في الشريعة بلفظ " أصحابي كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم، رقم الحديث: ۱۱۶۶، باب ذكر فضل جميع الصحابة، ت: الدكتور عبد الرحمن بن عمر ولديجي، ط: دار الوطن - الرياض ☆أخرجه القاضي عياض عن حذيفة بن اليمان في الشفاء بسند حسن، الشفاء: ۱/ ۱۱۸، الفصل السادس توقير أصحابه، ط: دار الفيحاء، عمان. (ضعف هذا الحديث كثير من العلماء مع تعدد طرقه)

(۳) عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه، قال: قال النبي - صلى الله عليه وسلم - : لا تسبوا أصحابي، فلو أن أحدكم أنفق مثل أحد، ذهبا ما بلغ مد أحدهم، ولا نصيفه. (صحيح البخاري: ۱/ ۵۱۸، رقم الحديث: ۳۶۷۳، كتاب المناقب، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: لو كنت متخذا خليلا، ط: فیصل پبلیکیشنز، دیوبند☆ صحيح مسلم: ۲/ ۳۱۰، رقم الحديث: ۲۲۱-(۲۵۴۰)، كتاب الفضائل، باب تحريم سب الصحابة، ط: فیصل پبلیکیشنز، دیوبند ☆سنن الترمذي: ۲/ ۲۲۵، رقم الحديث: ۳۸۶۱، أبواب المناقب، باب فيمن سب أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، ط: فیصل پبلیکیشنز، دیوبند)

(۴) عن عبد الرحمن بن عوف، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «أبو بكر في الجنة، وعمر في الجنة، وعثمان في الجنة، وعلي في الجنة، وطلحة في الجنة، والزبير في الجنة، وعبد الرحمن بن عوف في الجنة، وسعد في الجنة، وسعيد في الجنة، وأبو عبيدة بن الجراح في الجنة. (سنن الترمذي: ۲/ ۲۱۵، رقم الحديث: ۳۷۴۷، أبواب المناقب، باب مناقب عبد الرحمن بن عوف، ط: فیصل پبلیکیشنز، دیوبند)

(۵) منها: ما روي عن عبد الله بن مغفل، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الله الله في أصحابي، لا تتخذوهم غرضا بعدي، فمن أحبهم فبحبي أحبهم، ومن أبغضهم فببغضي أبغضهم، ومن آذاهم فقد آذاني، ومن آذاني فقد آذى الله، ومن آذى الله فيوشك أن يأخذه. (سنن الترمذي: ۲/ ۲۲۵، رقم الحديث: ۳۸۶۲، أبواب المناقب، باب في من سب أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، ط: فیصل پبلیکیشنز، دیوبند)

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی جان، مال، عزت، آبرو اور وطن؛ سب کچھ رسول اللہ ﷺ پر قربان کر دیا تھا اور دین اسلام کی مدد کی تھی، انہوں نے براہ راست رسول اللہ ﷺ سے تعلیم وتربیت حاصل کی تھی، تو کیا استاذ کامل کی صفات کا سایہ ان پر نہیں پڑا ہوگا؟

نیز یہ بھی سوچیے!! صحابہ کرام آپس میں ایک دوسرے کی کیسی قدر کرتے تھے، حضرت عمر فاروقؓ اکثر رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام لے کر بیان کرتے تھے کہ انہوں نے یہ کام کیا، فلاں کام کیا وغیرہ، (حالاں کہ خود بھی اس کام میں برابر کے شریک ہوتے تھے؛ لیکن غایت درجہ کا ادب تھا کہ اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں چھپاتے تھے) اور ان کے کام کو بہ غرض حجت پیش کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان غنیؓ سے شیخین (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) کے طریقہ ونہج پر حکومت کرنے کے وعدہ پر بیعت لی گئی تھی۔ (۱)

مزید غور کیجئے کہ صحابہؓ حضور ﷺ کی صفات میں کیسے رنگے ہوئے تھے، ان کے تقویٰ، طہارت، زہد وغیرہ کے تفصیلی واقعات سیرت کی کتابوں میں دیکھنے سے معلوم ہوں گے۔ لہٰذا صحابہؓ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ وہ ہر قسم کی برائی وخرابی سے دور رہتے تھے، جو لوگ صحابہؓ کے متعلق بدگوئی کرتے تھے یا ان کو پریشان کرتے تھے، ان کا کیا حشر ہوا؟ دو تین نمونے پیش کرتا ہوں:

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تہمت لگانے والوں کا کیا حال ہوا؟ جس کو حضرت سعد نے بددعا دی تھی۔ (دیکھیے: صحیح بخاری: ۱/ ۱۰۴) [۲] اسی طرح حضرت سعید بن زید بن نوفل پر جھوٹا دعویٰ کرنے والی

(۱) فلما اجتمعوا تشهد عبد الرحمن، ثم قال: أما بعد، يا علي إني قد نظرت في أمر الناس، فلم أرهم يعدلون بعثمان، فلا تجعلن على نفسك سبيلا. فقال: أبايعك على سنة الله ورسوله، والخليفتين من بعده، فبايعه عبد الرحمن، وبايعه الناس المهاجرون والأنصار، وأمراء الأجناد والمسلمون. (صحيح البخاري: ۲/ ۱۰۷۰، رقم الحديث: ۷۲۰۷، كتاب الأحكام، باب: كيف يبايع الإمام الناس، ط: البدر، دیوبند)

[۲] طویل حدیث کا جزء ہے: جس کا حاصل ہے کہ جب حضرت سعدؓ کی شکایت کی گئی اور واقعات کی تحقیق کے لیے متعدد لوگ کوفہ پہونچے، تو اسامہ بن قتادہ نامی ایک شخص نے حضرت سعدؓ کی غلط شکایت کی، تو حضرت سعدؓ نے بددعا دی اور وہ حرف بہ حرف اس کا مصداق بنا، تفصیل درج ذیل ہے: فقام رجل منهم يقال له أسامة بن قتادة يكنى أبا سعدة قال: أما إذ نشدتنا فإن سعدا كان لا يسير بالسرية، ولا يقسم بالسوية، ولا يعدل في القضية، قال سعد: أما والله لأدعون بثلاث: اللهم إن كان عبدك هذا كاذبا، قام رياء وسمعة، فأطل عمره، وأطل فقره، وعرضه بالفتن، وكان بعد إذا سئل يقول: شيخ كبير مفتون، أصابتني دعوة سعد، قال عبد الملك: فأنا رأيته بعد، قد سقط حاجباه على عينيه من الكبر، وإنه ليتعرض للجواري=

عورت کا کیا حشر ہوا! دیکھیے: مسلم شریف (۲/ ۳۳)[1] علامہ بدر الدین عینیؒ فرماتے ہیں کہ: میں نے معتمد لوگوں سے سنا ہے کہ بعض شیعہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق بدگوئی کرتے تھے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے مرنے سے پہلے ان کا چہرہ گدھے اور خنزیر جیسا بنا دیا تھا، آگے لکھتے ہیں: جو لوگ ماں باپ کی نافرمانی کرتے ہیں اور ان کو گدھا، سور یا کتا کہتے ہیں، ان کی بھی شکل وصورت اللہ تعالیٰ گدھے کی طرح بنا دیتے ہیں۔ [2] حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ تحریر فرماتے ہیں: جو لوگ حضرت عثمان غنیؓ سے بغض رکھتے ہیں، ان کو قبر میں فتنۂ دجال میں مبتلا کیا جائے گا۔ [3] اس سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ سے بغض، عداوت، دشمنی اور ان کے متعلق غلط خیالات کا اثر قبر تک پہنچتا ہے۔

ان واقعات سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے حق میں گستاخانہ الفاظ کا استعمال کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔ فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

=في الطرق يغمزهن. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۰۴، رقم الحديث: ۷۵۵ تا ۷۵۸، كتاب الأذان، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم، ط: فیصل پبلیکیشنز، دیوبند☆ صحيح مسلم: ۱/ ۱۸۶، رقم الحدیث: ۱۵۸ - (۴۵۳) مختصراً، كتاب الصلاة، باب القراءة في الظهر والعصر، ط: فیصل پبلیکیشنز، دیوبند)

(۱) اروی نامی ایک خاتون نے سعید بن زیدؓ سے گھر کے ایک حصے کے سلسلے میں مخاصمت کیا، تو آپؓ نے ان کو بدعا دیتے ہوئے کہا: اے اللہ! اگر یہ جھوٹی ہے، تو اسے اندھی کر دے اور اس کی قبر اس کے گھر میں بنا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے اسے اندھی اور دیواروں کو ٹٹولتے دیکھا اور کہتی تھی: مجھے سعید بن زید کی بددعا پہنچی ہے۔ ایک دن وہ گھر میں چل رہی تھی، جب گھر میں کنوئیں کے پاس سے گزری، تو اس میں گر پڑی اور وہی کنواں اس کے لیے قبر بن گیا: عن سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل، أن أروى خاصمته في بعض داره، فقال: دعوها وإياها، فإني سمعت رسول الله -صلى الله عليه وسلم- يقول: من أخذ شبرا من الأرض بغير حقه، طوقه في سبع أرضين يوم القيامة. اللهم إن كانت كاذبة فأعم بصرها، واجعل قبرها في دارها، قال: فرأيتها عمياء تلتمس الجدر تقول: أصابتني دعوة سعيد بن زيد، فبينما هي تمشي في الدار مرت على بئر في الدار، فوقعت فيها، فكانت قبرها. (صحيح مسلم: ۲/ ۳۳، رقم الحديث: ۱۳۸ - (۱۶۱۰)، كتاب المساقاة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرهما، ط: فیصل پبلیکیشنز، دیوبند☆ صحيح البخاري: ۱/ ۴۵۴، رقم الحدیث: ۳۱۹۸، كتاب بدء الخلق، باب ما جاء في سبع أرضين، ط: فیصل پبلیکیشنز، دیوبند)

(۲) وسمعنا من الثقات أن جماعة من الشيعة الذين يسبون الصحابة قد تحولت صورتهم إلى صورة حمار وخنزير عند موتهم، وكذلك جرى على من عق والديه، وخاطبهما باسم الحمار أو الخنزير أو الكلب. (عمدة القاري: ۵/ ۲۲۴، كتاب الأذان، باب إثم من رفع رأسه قبل الإمام، ط: داراحیاء التراث العربی)

(۳) قال الكشميري: حتى رأيت في "البدور السافرة" رواية: أن من كان في قلبه بغض من عثمان -رضي الله تعالى عنه- فإنه لا يأمن في قبره من فتنة الدجال". فتبين أن أثر تلك الفتنة تسري إلى القبور أيضاً. (فيض الباري: ۲/ ۳۱۳، كتاب الصلاة، باب الدعاء قبل السلام، ط: المجلس العلمي - دابهيل، سورت، الطبعة الثانية: ۱۴۱۰ھ - ۱۹۸۹ء)

[۴] اسماعیلی فرقہ اور اس کے ماننے والوں کا شرعی حکم

۱۳۶-سوال: ہمارے یہاں اسماعیلی فرقہ کے ایک شخص کا انتقال ہوا؛ اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی، ہندو مذہب کے لوگ حاضر ہوئے، رام اور لکشمن کے نام کے بھجن گائے گئے، پھر اسے قبر کے پاس لے جایا گیا، قبر کے پاس دو بڑے ٹب لائے گئے، ایک خالی تھا اور دوسرے میں مٹی بھری ہوئی تھی، وہاں پر موجود تمام لوگوں نے مٹی پر دم کیا اور اسے خالی ٹب میں ڈال دیا، پھر اس مٹی کو لوگوں نے قبر میں ڈالا، وہاں پر موجود ہر ہندو بھائی نے ایک برتن میں پانی لے کر قبر پر سر کی جانب سے پیر تک ڈالا، میں بھی وہاں موجود تھا؛ لیکن میں نے ان سارے کام میں کوئی حصہ نہیں لیا، میرے ان کے اس کام میں حصہ نہ لینے کی وجہ سے وہ لوگ مجھ سے ناراض بھی ہو گئے، کیا یہ فرقہ مسلمان کہلائے گا؟ امید ہے کہ اس کا جواب عنایت فرمائیں گے۔

(غلام جسات، یوگانڈا)

الجواب حامداو مصلیاً:

اسماعیلی فرقہ اپنے آپ کو مسلمان گردانتا ہے؛ لیکن ان کے عقائد اسلامی عقائد سے بالکل الگ ہیں۔[۱] اگر وہ لوگ رام اور لکشمن کے نام لیتے ہوں، (جیسا کہ آپ نے لکھا ہے) ان کو خدا کے اوتار[۲] مانتے ہوں، تو وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اسی طرح اگر وہ لوگ اپنے امام کو بھی خدا کا مرتبہ دیتے ہوں کہ اگر ہمارا

---

(۱) الطرف الثالث بيان معتقدهم في الإمامة: وقد اتفقوا على أنه لا بد في كل عصر من إمام معصوم قائم بالحق يرجع إليه في تأويل الظواهر وحل الإشكالات في القرآن والأخبار والمعقولات، واتفقوا على انه المتصدي لهذا الأمر وان ذلك جار في نسبهم لا ينقطع أبد الدهر ولا يجوز أن ينقطع إذ يكون فيه إهمال الحق وتغطيته على الخلق وإبطال قوله عليه السلام كل سبب ونسب ينقطع إلا سببي ونسبي وقوله ألم أترك فيكم القرآن وعترتي واتفقوا على أن الإمام يساوي النبي في العصمة والاطلاع على حقائق الحق في كل الامور الا انه لا ينزل اليه الوحي وانما يتلقى ذلك من النبي فانه خليفته وبازاء منزلته. الخ (فضائح الباطنية-أبو حامد محمد بن محمد الغزالي الطوسي (م:۵۰۵ھ)، ص:۴۲، الباب الرابع في نقل مذاهبهم جملة وتفصيلا، ت: عبد الرحمن بدوي، ط: مؤسسة دار الكتب الثقافية-الكويت)

وشیعہ خصوصا امامیہ و اسماعیلیہ گویند کہ عصمت از خطا در علم واز گناہ در عمل بمعنیٰ امتناع صدور کہ خاصۂ انبیاء است شرط امامت است۔ (تحفۂ اثنا عشریہ، ص:۱۷۸، باب ہفتم در امامت، ط: سہیل اکیڈمی، لاہور)

(۲) اوتار ہندی لفظ ہے، ہندوؤں کے عقیدے میں خدا کا کسی جسم میں داخل ہو کر مخلوق کی اصلاح کے لئے دنیا میں آنا۔ (جامع فیروز اللغات: ص۱۳۵، ط: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)

امام کسی کے لیے اللہ کے نام ایک خط لکھ دے گا اور سرٹیفکیٹ دے دے گا، تو اللہ اس کو بخش دیں گے، اللہ کے فرشتے اس سے کسی قسم کا کوئی سوال نہیں کریں گے۔ اگر یہ لوگ اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہیں، تو مسلمان نہیں ہیں۔ (۱)

اسماعیلی اور آغاخانی فرقے بھی جناب نبی کریم ﷺ کو نبی نہیں مانتے ہیں، اس لیے یہ لوگ بھی مسلمان نہیں ہیں، اسماعیلی فرقہ اسماعیل بن جعفر کو اپنا امام مانتا ہے اور ان کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ان کا انتقال نہیں ہوا ہے، ان کو آسمان پر اٹھالیا گیا ہے، یہ فرقہ ''فرقۂ باطنہ'' کی شاخ ہے۔ (۲) علماء نے لکھا ہے کہ ''یہ فرقہ یہود و نصاریٰ اور مجوس کے مقابلہ میں بھی مسلمانوں کے لیے زیادہ مضرت رسا اور نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ (۳)

اس لیے آپ نے جو بھی کیا، یعنی وہاں سے الگ رہے اور تدفین کے کام میں اور مٹی پر دم کرنے میں آپ نے شرکت نہیں کی یہ اچھا کام کیا اور آئندہ بھی ایسے کاموں میں بالکل شرکت نہ کریں، عزت و ذلت کا مالک اللہ رب العزت ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔

---

(۱) قال الله تعالى: فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ (-۸۵ البروج: ۱۶) أي: لا يعجزه شيء يريده. (تفسير البغوي، الفراء البغوى: ۵/ ۲۳۷، ت: عبد الرزاق المهدي، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)
وقال الله تعالى: وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ ... الآية. (-۳۴ سبا: ۲۳)
وقال تعالى: وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ. (۴۳: الزخرف: ۸۶)
(۲) الإسماعيلية: وهم يزعمون أن الإمامة صارت من جعفر إلى ابنه إسماعيل وكذبهم في هذه المقالة جميع أهل التواريخ لما صح عندهم من موت إسماعيل قبل أبيه جعفر وقوم من هذه الطائفة يقولون بإمامة محمد بن إسماعيل وهذا مذهب الإسماعيلية من الباطنية. (التبصير في الدين وتمييز الفرقة الناجية عن الفرق الهالكين - طاهر بن محمد الأسفراييني، أبو المظفر (م: ۴۷۱هـ): ۱/ ۳۸، الإسماعيلية، ت: كمال يوسف الحوت، ط: عالم الكتب - لبنان، الطبعة الأولى: ۱۴۰۳هـ - ۱۹۸۳م)
ان جعفرا نصب ابنه إسماعيل للإمامة بعده... وإلى هذا القول مالت الاسماعيلية من الباطنية. (الفرق بين الفرق وبيان الفرقة الناجية: عبد القاهر بن طاهر بن محمد بن عبد الله البغدادي التميمي، ص: ۴۶، ط: دار الآفاق الجديدة - بيروت)
(۳) اعلموا - أسعدكم الله -! ضرر الباطنية على فرق المسلمين أعظم من ضرر اليهود والنصارى والمجوس عليهم؛ بل أعظم من مضرة الدهرية وسائر أصناف الكفرة عليهم؛ بل أعظم من ضرر الدجال. (الفرق بين الفرق وبيان الفرقة الناجية: ص ۲۶۵، الفصل السابع عشر)

میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کرنا سنت ہے۔[1] البتہ ایک ہی آدمی گھڑا دو گھڑا پانی ڈال دے، اس سے نیک فالی لی جاسکتی ہے کہ پانی اللہ رب العزت کی رحمت ہے، جس سے اللہ تعالیٰ اس میت پر اپنی رحمت نازل کرے گا۔

نیز پانی ڈال دینے سے مٹی بھی سخت ہو جائے گی، جس کی وجہ سے کوئی جانور بھی قبر کو کھود نہیں سکے گا، ہر شخص کا پانی ڈالنا معروف اسلامی طریقے کے خلاف ہے، اللہ رب العزت سب کو ایمان کے ساتھ، دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے اور سب کا ایمان مضبوط بنائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۱۹۷۹/۱۱/۱۸

[۵] غیر مقلدین کے بعض اعتراضات اور ان کے جوابات

۱۳۷-سوال: حضرت مفتی صاحب! اس وقت میں آپ کی خدمت میں ''مجموعہ فتاویٰ'' کے بعض مسائل اس مقصد سے بھیج رہا ہوں کہ آپ ان پر فرصت کے اوقات میں نظر فرمالیں۔

'مجموعہ فتاویٰ' کے صفحہ نمبر چھ اور صفحہ نمبر چھتیس کے مسائل کے نیچے لکیر کھینچ دی گئی ہے، تاکہ ملاحظہ کرنے میں سہولت ہو، ان مقامات کے علاوہ پوری کتاب میں مذہب احناف پر اعتراضات بھی ہیں، قراءت

---

(۱) عن جعفر بن محمد، عن أبيه: أن النبي - صلى الله عليه وسلم - رش على قبر ابنه إبراهيم ووضع عليه حصباء. [الرش: تفريق الماء، والحصباء: الحصى، ومعلوم أن إبراهيم مات طفلاً، لا وزر عليه، وإنما يفعل ذلك الرسول تعليماً لنا] (مسند الإمام الشافعي - رتبه على الأبواب الفقهية: محمد عابد السندي: ۲۱۵/۱، رقم: ۵۹۹، الباب الثالث والعشرون في صلاة الجنائز وأحكامها، ط: دار الكتب العلمية، بيروت - لبنان، عام النشر: ۱۳۷۰ھ-۱۹۵۱ء)

عن عامر بن ربيعة رضي الله عنه أن النبي - صلى الله عليه وسلم - قام على قبر عثمان بن مظعون بعدما دفنه وأمر برش الماء. (مسند البزار المنشور باسم البحر الزخار - أبو بكر أحمد بن عمرو العتكي المعروف بـ البزار (م: ۲۹۲ھ): ۲۷۳/۹، ما أسند عامر بن ربيعة عن النبي صلى الله عليه وسلم، ط: مكتبة العلوم والحكم - المدينة المنورة☆ كشف الأستار عن زوائد البزار - نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي: رقم الحديث: ۲۲۴۹، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، كتاب الجنائز، باب رش الماء على القبر، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت☆ السنن الكبرى - البيهقي: ۵۷۶/۳، رقم الحديث: ۶۷۳۹، باب رش الماء على القبر ووضع الحصباء عليه، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(ولا بأس برش الماء عليه) حفظا لترابه عن الاندراس. قال الشامي: بل ينبغي أن يندب. (رد المحتار: ۲۳۷/۲، كتاب الجنائز، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

فاتحہ خلف الامام کے مسئلے میں بھی ہمارے اکابر؛ مثلاً: حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ[1] اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ[2] وغیرہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کی اجازت دی ہے۔

وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''باپ کے مقابلہ میں بیٹا پہلے''؛ یعنی: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں امام ابوحنیفہؒ کی بات مقلدین حضرات زیادہ مانتے ہیں اور اکثر مسئلوں میں صحیح حدیث کو چھوڑ کر ضعیف حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی بے بنیاد باتیں کہتے ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ــــــــــــــــــــــ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے دیوبندی علمائے کرام ان کے جواب دینے پر قادر نہیں ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

فتاویٰ میں مذکور تمام اعتراضات کے جوابات مختلف انداز سے دیے گئے ہیں۔[3] اس لیے اب اس کی ضرورت نہیں ہے، کہ ان کے اعتراضات کے جوابات دیے جائیں۔ چوں کہ غیر مقلدین حضرات رات دن ان ہی بے جا کاموں میں لگے رہتے ہیں؛ اس لیے آئے دن وہ اس طرح کی بات کرتے رہتے ہیں، ان کے اعمال ان کے ساتھ رہیں گے، آپ ان باتوں کے پیچھے نہ پڑیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ)
۲۶/۱۱/۱۹۷۶ء

(۱) مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی طرف سے اس بات کی نسبت غلط ہے؛ کیوں کہ حضرت کے فتاویٰ میں ہے: مذہب قوی حنفیہ کا یہ ہے کہ مقتدی کو فاتحہ پڑھنا جہریہ سکتات میں اور سریہ میں مطلقاً مکروہ ہے اور بندہ کے نزدیک بہ حسب دلیل یہی مذہب قوی ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ: ص ۳۰۹، نماز کی کیفیت کا بیان، مقتدی کا سورۂ فاتحہ پڑھنا، ط: مکتبہ تھانوی دیوبند)

(۲) قال الشيخ ولي الله الدهلوي: وإن كان مأموما وجب عليه الإنصات والاستماع، فإن جهر الإمام لم يقرأ إلا عند الإسكاتة، وإن خافت فله الخيرة، فإن قرأ فليقرأ الفاتحة قراءة لا يشوش على الإمام، وهذا أولى الأقوال عندي. (حجة الله البالغة: ۲/ ۲۳، من أبواب الصلاة، باب: أذكار الصلاة... الخ، مقدار القراءة وسره، ت: المفتي سعيد أحمد البالن بوري، ط: مكتبة حجاز ديوبند)

(۳) ان جوابات کے لیے ملاحظہ فرمائیں ''ارمغانِ حق'': ۱/ ۱۱، مکتبہ اشرفیہ، قاسمی منزل، سیدواڑہ، غازی پور، یوپی، انڈیا ☆ مطالعہ غیر مقلدیت: ۲/ ۳۹ - ۱۱۳، از: مولانا محمد صفدر صاحبؒ ط: مکتبۃ الحق، ماڈرن ڈیری، جوگیشوری ممبئی ☆ تجلیات صفدر: ۱/ ۱۰۷ - ۱۶۹، ط: مکتبہ مدنیہ دیوبند۔

[۶] محرم کے تعزیوں کے جواز کی ایک دلیل کا جائزہ

۱۳۸-سوال: یہ بات تو ہم بھی مانتے ہیں کہ محرم کی رسمیں قابل ترک ہیں، ان پر عمل کرنا جائز نہیں؛ البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ محرم کے دس دنوں میں جو لوگ تعزیہ بناتے ہیں اور کچھ کھیل کھیلتے ہیں مثلاً: ایک آدمی دوسرے کو تلوار سے وار کرتا ہے، اس کا وار خالی بھی نہیں جاتا؛ لیکن سامنے والے کو کچھ نہیں ہوتا ہے؛ بل کہ بعض جگہ تو ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ تعزیہ منانے والے لوگ آگ کے اندر چلتے ہیں اور جسم سے گردن کو بھی الگ کر دیتے ہیں، اس کے باوجود ان کو کچھ نہیں ہوتا۔ اس طرح کی کیفیت صرف محرم کے مہینے میں ہوتی ہے، دیگر مہینوں میں بالکل نہیں ہوتی؛ بل کہ حال یہ ہوتا ہے کہ اگر ان مہینوں میں ذرا بھی خراش آجائے، تو جان نکل جاتی ہے۔ ان ساری تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ محرم منانا اور تعزیہ وغیرہ بنانا جائز ہے۔

الجواب حامداو مصليا:

کسی کام کے جائز و ناجائز ہونے کے لیے شرعی دلیل کا ہونا ضروری ہے، دلیل یا تو کتاب اللہ سے ہو، یا سنت رسول (علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام) سے یا اجماع امت یا قیاس سے۔[۱]

ادلۂ اربعہ میں سے کسی سے تعزیہ بنانے اور محرم منانے کا جواز ثابت نہیں ہوتا ہے۔[۲] تعزیہ بنانے

---

(۱) اعلم أن أصول الشرع ثلثة: الكتاب، والسنة، وإجماع الامة، والأصل الرابع القياس. (المنار مع نور الأنوار ص: ۷، ط، یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

(۲) بل کہ قرآن پاک میں اس کے خلاف دلیل موجود ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ. (۲۰-الصافات: ۹۵) ترجمہ: کیا تم لوگ ان چیزوں کی پوجا (اور بندگی) کرتے ہو، جن کو تم خود (اپنے ہاتھوں سے تراش) تراش کر بناتے ہو؟

ظاہر ہے کہ آدمی تعزیہ اپنے ہاتھ سے بانس کو تراش کر بناتا ہے، پھر اس سے منت مانگی جاتی ہے، اس سے مرادیں مانگی جاتی ہیں، اس کے سامنے اولاد کی صحت کی دعائیں کی جاتی ہیں، سجدہ کیا جاتا ہے اور اس کی زیارت کو حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت تصور کیا جاتا ہے۔ یقیناً یہ سب اسلامی تعلیمات کے خلاف اور کفر و شرک والے اعمال ہیں۔

تعزیہ داری در عشرۂ محرم یا غیر آں، و ساختن ضرائح و صورت قبور، و علم تیار کردن وغیرذلک: ایں ہمہ امور بدعت است، نہ در قرن اول بود، نہ در قرن ثانی، نہ در قرن ثالث۔ (مجموعۃ الفتاویٰ مع خلاصۃ الفتاویٰ: ۴/ ۳۴۴، كتاب الكراهية، باب ما يستحل استعماله و ما لا يحل، ط: امجد اکیڈمی، لاہور)

تعزیہ داری کی رسم سرتا سر ناجائز ہے، اس میں بعض چیزیں حرام اور بعض افعال شرک اور بعض بدعت محدثہ ہیں، یہ رسم واجب الترک ہے۔ (کفایت المفتی: ۱/ ۲۴۰، کتاب العقائد، نواں باب، بدعات اور اقسام شرک، تعزیہ داری کی رسم ناجائز ہے، جواب نمبر: ۲۴۳، ط: دارالاشاعت، کراچی)

اور محرم منانے والے کی تلوار، چھری، برچھی اور بھالوں کے لگنے سے اثر کا نہ ہونا ان کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہے، احادیث کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیجیے، دجال قیامت کے قریب نکلے گا، اس کے پاس روٹیوں کے پہاڑ ہوں گے۔ (۳) جنت اور جہنم دکھائے گا۔ (۴) مردوں کو زندہ کرنے کا دعویٰ کرے گا اور شیاطین مردوں کی شکل میں زندہ ہو کر آئیں گے۔ (۵) تو کیا ان تمام باتوں سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ دجال حق پر ہے؟

اسی طرح ہاتھ کی چالاکی کرنے والے اپنے ہاتھوں پر شکرین (ایک قسم کی میٹھی چیز ہے) لگا کر

---

(۳) عن المغيرة بن شعبة، قال: ما سأل رسول الله صلى الله عليه وسلم أحد عن الدجال أكثر مما سألته عنه، فقال لي: «أي بني وما ينصبك منه؟ إنه لن يضرك» قال قلت: إنهم يزعمون أن معه أنهار الماء وجبال الخبز، قال: «هو أهون على الله من ذلك». (صحيح مسلم: ۲/ ۲۱۰، رقم الحديث: ۳۲-(۲۱۵۲)، كتاب الاداب، باب جواز قوله لغير ابنه: يا بني واستحبابه للملاطفة، ط: مكتبة البدر- ديوبند☆مسند الإمام أحمد: ۳۰/ ۱۰۲، رقم الحديث: ۱۸۱۲۷، حديث المغيرة بن شعبة☆صحيح ابن حبان: ۱۵/ ۲۱۱، رقم الحديث: ۶۸۰۰، ذكر خبر قد يوهم غير المتبحر في صناعة العلم أنه مضاد، الخ)

(۴) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «الدجال أعور العين اليسرى، جفال الشعر، معه جنة ونار، فناره جنة وجنته نار». (صحيح مسلم: ۲/ ۴۰۰، رقم الحديث: ۱۰۴، ۱۰۵-(۲۹۳۴-۲۹۳۵)، عن حذيفة رضي الله تعالى عنه، كتاب الفتن، باب ذكر الدجال وصفته وما معه، ط: البدر، ديوبند)

(۵) في حديث طويل: أنه يأتي الأعرابي فيقول: أرأيت إن أحييت لك إبلك، ألست تعلم أني ربك فيقول: بلى، فيتمثل له الشيطان نحو إبله كأحسن ما كانت ضروعا وأعظمها أسنمة، ويأتي الرجل قد مات أخوه ومات أبوه، فيقول: أرأيت إن أحييت لك أباك وأحييت لك أخاك ألست تعلم أني ربك؟ فيقول له: بلى، فيتمثل له الشيطان نحو أبيه ونحو أخيه. (المعجم الكبير- الطبراني: ۲۴/ ۱۵۸، رقم الحديث: ۴۰۴-۴۰۶، مسند النساء، باب الالف☆مسند الإمام أحمد: ۴۵/ ۵۶۰، رقم الحديث: ۲۷۵۷۹، من حديث أسماء بنت يزيد، ط: مؤسسة الرسالة☆شرح السنة- البغوي (م: ۵۱۶هـ) ۱۵/ ۶۰، رقم: ۴۲۶۳، كتاب الفتن باب الدجال لعنه الله، ت: شعيب الأرنؤوط- محمد زهير الشاويش، ط: المكتب الإسلامي- دمشق، بيروت)

قال الملا علي القاري: قد تبين لنا بإخبار الصادق المصدوق- صلوات الله تعالى وسلامه عليه- أن الدجال يبعث معه من المشبهات، ويفيض على يديه من التمويهات ما يسلب عن ذوي العقول عقولهم، ويخطف من ذوي الأبصار أبصارهم، فمن ذلك تسخير الشياطين له، ومجيئه بجنة ونار، وإحياء الميت على حسب ما يدعيه، وتقويته على من يريد إضلاله، تارة بالمطر والعشب، وتارة بالأزمة والجدب، ثم لا خفاء بأنه أسحر الناس. (مرقاة المفاتيح: ۸/ ۳۴۵۹، رقم الحديث: ۵۴۷۴، باب علامات بين يدي الساعة وذكر الدجال، ط: دار الفكر- بيروت)

شربت بنانے کا دعوی کرتے ہیں۔اسی طرح ہاتھ پاؤں پر ایک مخصوص قسم کا مسالہ لگا کر آگ میں چلنے کا بھی بعض لوگ دعوی کرتے ہیں،تو کیا یہ سب لوگ سچے ہیں؟ کیا آپ ان کو سچا سمجھیں گے؟نہیں، ہرگز نہیں۔

اسی طرح محرم الحرام کے موقع سے کیا جانے والا سارا کھیل جادو،نظر بندی، ہاتھ کی چالاکی اور شیطانی دھوکہ ہوتا ہے،جن سے کسی بھی طرح ان کے برحق ہونے پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔آج بھی اولیاء اللہ کے مزارات (جو شراب نوشی ،ناچ، گانے، زناکاری اور گانوں باجوں کے اڈے بن چکے ہیں) پر جوڈھونگ ہوتے ہیں،کیا وہ ان (صاحب قبر اولیاء اللہ) کی کرامات ہیں؟نہیں ہرگز نہیں؛یہ سب شیطانی دھوکے ہیں،انسانوں نے جن غلط عقائد کو اپنی طرف سے گڑھ لیا ہے،شیطان یہ چاہتا ہے کہ انسان ان میں برابر پھنسا رہے،اس کے لیے وہ (شیطان) ہمیشہ کوشش کرتا رہتا ہے،اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ غیروں کے یہاں کسی کے انتقال کے بعد ان کے غلط عقائد کی بنیاد پر رسم ورواج ہوتے ہیں ،جو درحقیقت شیطانی پھندے ہیں، کچھ اسی طرح کے پھندوں میں شیطان مسلمانوں کو پھنساتا ہے۔

ان ہی امور میں (جن میں شیطانی رہنمائی اور اس کی پوری محنت وکوشش ہوتی ہے) اولیاء اللہ کے مزارات پر ہونے والے عرس ہیں۔تعزیہ بنانے والے اور ان کی تعظیم کرنے والے بھی انہی لوگوں میں سے ہیں،جن کو شیطان نے گمراہ کرنے کے لیے اپنا جال بچھا رکھا ہے،جس کو وہ اپنے غلط عقائد کی بنیاد پر صحیح سمجھتے ہیں؛اس لیے تعزیہ بنانے اور محرم منانے سے اپنے آپ کو بچانا بہت ہی ضروری ہے،شیطانی کرتب کرنے والے کو نقصان نہ پہنچنے کی وجہ سے اس کو جائز سمجھنا صحیح نہیں ہے،حرام ہے اور تعزیوں کے متعلق بعض عقائد سے ایمان سے بھی نکل جاتا ہے۔[۶] فقط،واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۱۹۷۶/۱۲/۱۹

[۷] محرم میں کھیلے جانے والے تلواری کرتب کی حقیقت = ایضاً

۱۳۹-سوال: دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے اس سلسلہ میں متعدد علمائے کرام سے پوچھا،انہوں نے جواب دیا کہ یہ لوگ اس طرح کا کام نظر بندی سے کرتے ہیں؛لیکن اس جواب سے دل

(۶) مثلاً تعزیہ سے منتیں ماننا،تعزیہ گاہ میں کلام پاک کی تلاوت کرنا،جس سے قرآن کی اہانت ہوتی ہو،تعزیہ کے آگے سجدہ کرنا۔

کو اطمینان اور تسلی نہیں ہوئی؛ کیوں کہ اگر یہ نظر بندی اور جادو کا اثر ہوتا، تو اس کام کو سب لوگ انجام نہ دے پاتے؛ بل کہ کچھ لوگ ہی کے بس میں ہوتا، اس لیے کہ جادو اور نظر بندی ہر ایک نہیں جانتا، جب کہ یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے؛ بڑے تو کیا، چھوٹے بچے بھی تلواروں سے کھیلتے ہیں، ایک دوسرے پر وار کرتے ہیں، مگر انہیں کچھ نہیں ہوتا۔

الجواب حامداومصلیا:

آپ کا دعویٰ ہے کہ چھوٹے، بڑے تمام لوگ اس کام کو انجام دیتے ہیں، تو آپ بھی محرم کے دنوں میں شیطانی تدبیر اختیار کیے بغیر تعزیہ کی مجلس میں شرکت کیجیے اور اپنے ہاتھ پیر پر مسالہ اور اس سلسلے کی دوسری دوا استعمال کیے بغیر آگ میں چل کر اپنا تجربہ کر لیجیے اور پھر میرے نام خط لکھیے۔

آپ کا یہ لکھنا بالکل غلط ہے کہ اس طرح کا کام سب کے بس میں ہے اور سب لوگ اس کام کو کرتے ہیں۔ جب آپ خود اس کے متعلق معلومات حاصل کریں گے اور اس گہرائی میں اتریں گے، تو معلوم ہوگا کہ اس طرح کام کرنے والے محرم کا چاند نظر آتے ہی اپنے ناپاک علم کی بنیاد پر اپنا عمل شروع کر دیتے ہیں، شیاطین کو راضی کرنے کے لیے ان کے نام کے وظیفے پڑھتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں، سرکش جن کو مالیدے کھلاتے ہیں، غرضیکہ ہر طرح سے تحفظ کا سامان مہیا کر کے اس میدان میں آتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہر چھوٹا بڑا تلواری کرتب دکھاتا ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۱۹۷۹/۱۲/۱۶ء

[۸] ان دس دنوں کے ساتھ ہی ان کا عمل خاص کیوں ہے؟ أیضاً

● ۱۴۰-سوال: تیسری بات یہ ہے کہ اگر یہ لوگ نظر بندی اور جادو ہی سے اس طرح کے کام انجام دیتے ہوں، تو محرم کے دس دنوں ہی کے ساتھ اس کی تخصیص کیوں ہے؟ دوسرے دنوں میں بھی تو تلوار اور چھری وغیرہ سے کرتب دکھا سکتے ہیں؟ لیکن عام مشاہدہ ہے کہ دوسرے دنوں میں وہ کرتب نہیں دکھا پاتے، بل کہ اس طرح کھیلنے سے زخمی ہو جاتے ہیں، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تعزیہ بنانا اور محرم کے پہلے عشرہ میں ماتم کرنا جائز ہے، گناہ کا کام نہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مدد نہیں ہوتی۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

جوازِ ماتم وتعزیہ پر آپ کی یہ دلیل بھی صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ لوگ اپنا یہ ناپاک علم صرف انہی دنوں کے لیے تازہ کرتے ہیں۔ احادیث نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام) کی روشنی میں بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بعض اوقات اور بعض دنوں میں شیطانی اثرات زوروں پر رہتے ہیں، شیطانؔ ان دنوں میں اپنے اثرات زیادہ دکھاتے ہیں، اسی وجہ سے سورج کے طلوع، غروب اور استواء کے وقت فرائض ونوافل کا پڑھنا مکروہ ہے۔ (۱) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم لوگ استنجاء خانہ میں جاتے وقت دعاء پڑھ لیا کرو؛ کیوں کہ ان جگہوں پر شیاطین رہتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمھیں نقصان پہنچائیں۔ (۲)

مذکورہ تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بعض دنوں میں اور بعض جگہوں پر شیاطین کے اثرات زیادہ ہوتے ہیں؛ اور شیطانی علوم کے حاملین ان دنوں میں شیطانی اثرات کے ظاہر ہونے کی وجہ سے شیطانی کام انجام دیتے ہیں، دوسرے دنوں میں چوں کہ شیطانی اثرات ظاہر نہیں ہوتے؛ اس لیے ان دنوں میں اس

---

(۱) "ثلاث ساعات كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهانا أن نصلي فيهن، أو نقبر فيهن موتانا: حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع، وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل، وحين تضيف الشمس للغروب حتى تغرب ". (سنن الترمذي: ۱/۲۰۰، رقم: ۱۰۳۰، أبواب الجنائز، باب ماجاء في كراهية الصلاة على الجنازة عند طلوع الشمس وعند غروبها، ط: البدر - ديوبند☆ مسند البزار المنشور باسم البحر الزخار - أبو بكر أحمد بن عمرو العتكي المعروف بالبزار (م: ۲۹۲هـ): ۳/۸۶، رقم الحديث: ۸۵۸، ومما روى أبو إسحاق الهمداني، عن الحارث، عن علي، ت: محفوظ الرحمن زين الله، ط: مكتبة العلوم والحكم - المدينة المنورة ☆ مسند أبي يعلى الموصلي (م: ۳۰۷هـ): ۸/۳۹۰، رقم: ۴۹۷۷، ت: حسين سليم أسد، ط: دار المأمون للتراث - دمشق☆ شرح مشكل الآثار - أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة الأزدي الحجري المصري المعروف بالطحاوي (م: ۳۲۱هـ): ۱۰/۱۳۱، رقم: ۳۹۷۰، باب بيان مشكل ما روي عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - من نهيه عن الصلاة بعد طلوع الخ، ت: شعيب الأرنؤوط، ط: مؤسسة الرسالة)

(۲) عن زيد بن أرقم، عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قال: " إن هذه الحشوش محتضرة، فإذا أتى أحدكم الخلاء فليقل: أعوذ بالله من الخبث والخبائث ". (سنن أبي داؤد: ۱/۵، رقم الحديث: ۶، كتاب الطهارة، باب مايقول الرجل إذا دخل الخلاء، ط: المكتبة الأشرفية - ديوبند☆ سنن ابن ماجة: ۲۶، رقم الحديث: ۲۹۶، كتاب الطهارة وسننها، باب ما يقول إذا دخل الخلاء، ط: فيصل ديوبند ☆ مسند ابن أبي شيبة - أبو بكر بن أبي شيبة (م: ۲۳۵هـ): ۱/۳۵۲، رقم: ۵۱۵، حديث زيد بن أرقم، عن النبي صلى الله عليه وسلم، ت: عادل بن يوسف العزازي و أحمد بن فريد المزيدي، ط: دار الوطن - الرياض، الطبعة الأولى: ۱۹۹۷م)

طرح کے کام انجام دینے کی ان کو قدرت نہیں ہوتی ہے۔ تاہم یہاں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ ان ہی ایام میں شیطانی اثرات ظاہر کیوں ہوتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شیطانی علوم کے سیکھنے والے اپنے شیطانی علوم کی مدد سے ان کے اثرات کے ظاہر ہونے کے لیے انہی ایام کی تحدید کر دیتے ہیں۔

الغرض تعزیہ کے جواز کی جتنی بھی عقلی دلیلیں آپ نے ذکر کی ہیں، ان میں سے کسی دلیل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ تعزیہ بنانا اور محرم منانا جائز ہے؛ اس لیے تعزیہ بنانا، اس میں ساتھ دینا، اس کے لیے چندہ کرنا اور اس میں شرکت کرنا بالکل حرام ہے۔[۳] نیز تعزیہ سازی کا دل سے عقیدہ رکھنے والا ایمان سے بھی نکل جاتا ہے۔[۴] لہٰذا اس سے بچنا ضروری ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ
۱۹/۱۲/۱۹۷۶ء

[۹] اہل سنت والجماعت سے علاحدہ ہو کر شیعیت اختیار کرنے والے کا حکم

۱۴۱-سوال: ہمارے بڑے بھائی پہلے اہل سنت والجماعت یعنی دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے؛ لیکن فی الحال اُنہوں نے مجھے ایک خط کے ذریعہ اطلاع دی ہے کہ اب اُنہوں نے شیعیت اختیار کر لی ہے، اور ایران میں آیت اللہ روح اللہ خمینی والے اثنا عشری جعفری فرقے میں شامل ہو گئے ہیں اور اُسی فرقے کے داعی بن چکے ہیں، اُن کی اِس حالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مندرجۂ ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) ایسے شخص کا معاشرتی بائیکاٹ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

(۲) اگر ایسا شخص بیمار ہو، تو عیادت کے لیے یا مر جائے تو غم خواری کے طور پر اُس کے گھر جا سکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) ایسے شخص کے ساتھ مکمل قطعِ تعلق ضروری ہے؟

(۴) ایسا شخص مر جائے اور اُس نے وصیت کی ہو کہ مجھے اہل سنت والجماعت کے قبرستان میں دفنایا

---

(۳) قال اللہ تعالیٰ: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. (۵-المائدۃ: ۲)

(۴) تعزیہ داری کی رسم سرتا سر ناجائز ہے، اس میں بعض چیزیں حرام اور بعض افعال شرک اور بعض بدعت محدثہ ہیں، یہ رسم واجب الترک ہے۔ (کفایت المفتی: ۱/ ۲۴۰، کتاب العقائد، نواں باب، بدعات اور اقسام شرک، ط: دار الاشاعت، کراچی)

جائے، تو کیا اُسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا؟ اگر اُس نے تدفین کے بارے میں کوئی وصیت نہ کی ہو، تو کیا کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

جو شخص اہل سنت والجماعت کا مذہب چھوڑ کر اثنا عشری بن چکا ہو، وہ سخت گنہ گار ہے، اور اُس کے کفر کا اندیشہ ہے، اگر یہ شخص صحابۂ کرامؓ کو برا بھلا کہتا ہو یا حضرت عائشہؓ کی شان میں گستاخی کرتا ہو، اُن کی عفت و پاک دامنی کا قائل نہ ہو، تو وہ خارج از اسلام ہے، ایسے شخص کے ساتھ قطعِ تعلق کرنا اور اُس کا معاشرتی بائیکاٹ کرنا جائز ہے۔ (شامی: ۳۴۸/۶) [۱]

(۲) اگر ایسا شخص بیمار ہو، تو اُس کی عیادت کے لیے جانا جائز ہے، اسلام عمدہ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، حسن اخلاق کی ترغیب دیتا ہے؛ لیکن کسی دینی مقتدیٰ کو اُس کی عیادت کے لیے نہیں جانا چاہیے، کہ اُس میں فاسق کی تعظیم ہے، اور اندیشہ ہے کہ عوام کا عقیدہ خراب نہ ہو جائے، وہ اس گمان میں رہیں گے کہ اُس آدمی کے عقائد درست ہیں، تب ہی تو اتنے بڑے عالم اُس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں؛ لہٰذا اس سے پرہیز اولیٰ ہے۔ (درمختار) [۲]

(۳) ایسے شخص کا مکمل معاشرتی بائیکاٹ جائز ہے۔

(۴) ایسے شخص نے اگر مرنے کے بعد شیعہ کے قبرستان میں دفن ہونے کی وصیت کی ہو، تو اُن ہی کے سپرد کر دیا جائے، اور اگر کوئی وصیت نہ کی ہو، تو پھر اُس کے احوال دیکھے جائیں کہ اگر اخیری دم تک وہ اپنے غالی تشیع پر قائم رہا تھا، اور توبہ نہیں کی تھی تو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔ [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) إن الرافضي إن كان ممن يعتقد الألوهية في علي، أو إن جبرئيل غلط في الوحي، أو كان ينكر صحبة الصديق، أو يقذف السيدة الصديقة، فهو كافر؛ لمخالفة القواطع المعلومة من الدين بالضرورة. (ردالمحتار على الدر المختار: ۴۶/۳، كتاب النكاح، فروع طلق امرأته... الخ، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) وجاز عيادته (أي الذمي) بالإجماع، وفي عيادة المجوسي قولان، وجاز عيادة فاسق على الأصح؛ لأنه مسلم، والعيادة من حقوق المسلمين. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳۸۸/۶، فصل في البيع، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) فتاویٰ رحیمیہ: ۴۷/۷، کتاب الجنائز، مسلمانوں کے قبرستان میں روافض کو دفن کرنا، ط: دار الاشاعت، کراچی۔

[۱۰] بوہروں کے ذبیحے اور ان کی دعوت کا حکم

۱۴۲-سوال: بوہرے لوگوں کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھانا درست ہے یا نہیں؟ جب کہ انہوں نے "بسم اللہ، اللہ اکبر" کہہ کر ذبح کیا ہے، ہم نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا تھا کہ تم کیا پڑھ کر ذبح کرتے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم ذبح کے وقت "بسم اللہ، اللہ اکبر" پڑھتے ہیں۔ عقائد میں یہ لوگ شیعہ سے بھی زیادہ خراب اور گندے ہیں، نیز ان کی دعوت قبول کرنا اور انہیں سلام کرنے میں پہل کرنا چاہیے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

اگر کسی شخص یا فرقے کے متعلق یہ یقینی طور پر معلوم ہوجائے کہ یہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا منکر ہے، تو وہ شخص فرقہ اسلام سے خارج شمار کیا جائے گا، اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا، جو کفار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ چند ضروریات دین یہ ہیں: قرآن کریم کا مکمل صحیح سالم غیر محرف ہونا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا، حضرت عائشہؓ کی عفت و پاک دامنی کا اعتقاد رکھنا، اس بات کا ماننا کہ کوئی انسان الوہیت کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا؛ اب اگر اس کے خلاف کوئی اعتقاد رکھے، تو اسے ضروریات دین کا منکر کہا جائے گا اور ایسا شخص ایمان سے نکل جائے گا، مثلاً: تحریف قرآن کا عقیدہ، حضرات شیخینؓ کی خلافت کا انکار، حضرت عائشہؓ پر (نعوذ باللہ) بدکاری کی تہمت، یا حضرت علیؓ کے متعلق الوہیت کا اعتقاد، یا یہ کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے وحی لانے میں غلطی کی۔ [۱]

شیعہ کے ۲۲/ بائیس فرقے ہیں (مظاہر حق: ۱/ ۸۷)۔ [۲] ان میں سے ایک یا دو فقط مسلمان ہیں، بقیہ فرقے مذکورہ باتوں کی بنا پر ایمان سے خارج ہیں، ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے گا، جو مرتدین اور کفار کے ساتھ کیا جاتا ہے، "عالم گیری" میں ہے "**وهؤلاء القوم خارجون عن الاسلام، وأحكامهم أحكام المرتدين**". [۳]

---

(۱) وبهذا ظهر أن الرافضي إن كان ممن يعتقد الألوهية في علي، أو أن جبريل غلط في الوحي، أو كان ينكر صحبة الصديق، أو يقذف السيدة الصديقة فهو كافر لمخالفته القواطع المعلومة من الدين بالضرورة، بخلاف ما إذا كان يفضل عليا أو يسب الصحابة فإنه مبتدع لا كافر. (رد المحتار: ۳/ ۴۶، كتاب النكاح، فروع: طلق امرأته تطليقتين ...الخ، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) مظاہر حق جدید: ۱/ ۲۳۲، بہتر گمراہ فرقوں کا اجمالی تذکرہ، ط: ادارۂ اسلامیات، دیوبند۔

(۳) وهؤلاء القوم خارجون عن ملة الإسلام وأحكامهم أحكام المرتدين. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۶۴، كتاب السير، الباب التاسع في أحكام المرتدين، مطلب في موجبات الكفر، ط: دار الفكر - بيروت)

لہٰذا ان سے ملاقات کے وقت سلام میں پہل نہ کرنا چاہیے۔ (۴) اور جواب میں بھی قدر ضرورت پر اکتفا کرنا چاہیے۔ (۵) سلام کے علاوہ کوئی فعل تعظیم وہ خود کریں، تو اس کی مکافات بہ قدر مشروع کرنا چاہیے، نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اگر چہ "بسم اللہ، اللہ اکبر" پڑھ کر ذبح کریں۔ (۶) نہ ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ (۷) اور نہ ان سے نکاح کیا جائے گا۔ (۸)

ایسے ہی عیادت، تعزیت، تہنیت و مبارک بادی اور دعوت قبول کرنے میں صرف اسی قدر مکافات اور برابری کا لحاظ رکھنا چاہیے، جس کی شریعت نے اجازت دی ہے، یہی حکم دوسرے عام کافروں کے بارے میں ہے اور یہی حکم خوارج اور نواصب کے بارے میں بھی ہے۔ "شامی" میں ہے: "لا شك في تكفير من قذف السيدة عائشة - رضي الله تعالى عنها - أو أنكر صحبة الصديق، أو اعتقد الألوهية في علي أو أن جبريل غلط في الوحي، أو نحو ذلك من الكفر الصريح المخالف للقرآن. (۹) نیز "عالم گیری" میں ہے: الرافضي إذا كان يسب الشيخين ويلعنهما والعياذ بالله، فهو كافر، وإن كان يفضل عليا - كرم الله تعالى وجهه - على أبي بكر - رضي الله تعالى عنه - لا يكون كافرا إلا أنه مبتدع ... ولو قذف عائشة - رضي الله تعالى عنها - بالزنا كفر بالله ... من أنكر إمامة أبي بكر الصديق - رضي الله

---

(۴) عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "لا تبدءوا اليهود، والنصارى بالسلام، وإذا لقيتم أحدهم في الطريق فاضطروهم إلى أضيقه. (سنن الترمذي: ۱/ ۲۸۹، رقم الحديث: ۱۶۰۲، أبواب السير، باب ما جاء في التسليم على أهل الكتاب، ط: البدر - ديوبند)

(۵) إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "إذا سلم عليكم أهل الكتاب، فقولوا وعليكم". (صحيح المسلم: ۲/ ۲۱۴، رقم الحديث: ۶ - (۲۱۶۳)، كتاب الأدب، باب النهي عن ابتداء أهل الكتاب بالسلام ... الخ، ط: البدر - ديوبند)

(۶) (لا) تحل (ذبيحة) غير كتابي من (وثني ومجوسي ومرتد). (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۲۹۸، كتاب الذبائح، ط: دار الفكر)

(۷) وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ فَٰسِقُونَ (۸۴) (التوبة: ۸۴)

(۸) وَلَا تَنكِحُوا۟ ٱلْمُشْرِكَٰتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنكِحُوا۟ ٱلْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا۟ ۚ (البقرة: ۲۲۱)

(۹) رد المحتار: ۴/ ۲۳۷، كتاب الجهاد، مطلب توبة اليأس مقبولة دون إيمان اليأس، ط: دار الفكر - بيروت.

عنه -، فهو كافر، وعلى قول بعضهم هو مبتدع وليس بكافر والصحيح أنه كافر، وكذلك من أنكر خلافة عمر - رضي الله عنه - في أصح الأقوال. (۱۰) (اکثرھا نقلاً عن جواھر الفقہ :۱/ ۶۰ ☆ فتاویٰ عزیزیہ، ص:۳۶۹)

[۱۱] رفاعی فرقہ کی حقیقت

۱۴۳-سوال: ہمارے یہاں ''دنیادار فقیر'' مسلم قوم کی ایک جماعت رہتی ہے، وہ اپنے آپ کو رفاعی فرقہ میں شمار کرتے ہیں اور رفاعی فرقہ میں داخل ہونے والے کے لیے سر سے لے کر پاؤں تک بدن کے بال لینے ہوتے ہیں؛ حتی کہ ابرو کے بال بھی کھینچ لینے ہوتے ہیں؛ حالاں کہ ابرو کے بال کھینچنا شرعاً حرام ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

حضرت شیخ رفاعیؒ اللہ کے ولی اور بزرگ ہیں، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے زمانہ میں گزرے ہیں عمر میں حضرت غوث اعظم سے بڑے تھے۔ حضرت غوث اعظم بھی ان کا لحاظ کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت شیخ رفاعیؒ نے مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس پر سلام پیش کرکے کہا کہ یا رسول اللہ مجھے آپ کی دست بوسی کی تمنا ہے، تو قبر اطہر سے ایک نورانی ہاتھ باہر نکلا اور حضرت شیخ نے اس کا بوسہ لیا، اس وقت موجود سب لوگوں نے یہ منظر دیکھا، غوث اعظم بھی موجود تھے، خود انہوں نے یہ قصہ بیان کیا ہے۔ (۱)

جن لوگوں کا نسب نامہ ان بزرگ سے صحیح طور پر ثابت ہے، یا جو لوگ ان کے سلسلۂ بیعت میں شامل ہیں، ان کو رفاعی کہا جاتا ہے؛ لیکن آج ان کی اولاد اور سلسلہ والے راہ حق پر قائم نہیں رہے اور جیسا کہ قرآن کریم میں اگلے انبیاء اور اولیاء کی تعریف کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **فخلف من بعد**

---

(۱۰) الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۶۴، كتاب السير، باب أحكام المرتدين، مطلب موجبات الكفر أنواع، منها: ما يتعلق بالإيمان والإسلام، ط: دار الفكر.

(۱) وفي بعض المجاميع: حج سيدي أحمد الرفاعي فلما وقف تجاه الحجرة الشريفة أنشد: في حالة البعد روحي كنت أرسلها ... تقبل الأرض عني فهي نائبتي، وهذه نوبة الأشباح قد حضرت ... فامدد يمينك كي تحظى بها شفتي، فخرجت اليد الشريفة من القبر الشريف فقبلها. (الحاوي للفتاوي - عبد الرحمان بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱هـ): ۲/ ۳۱۴، تنوير الحلك في إمكان رؤية النبي والملك، ط: دار الفكر - بيروت)

هم خلف اضاعوا الصلوٰة واتبعوا الشهوات فسوف يلقون غيا. (سورمریم)[۱]

(پھران انبیاء واولیاء کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے، جنہوں نے نماز (عبادت) کوضائع کیااور خواہشات کی پیروی کی، ایسے لوگ عنقریب جہنم کے گڑھے میں گریں گے)

ایسا ہی ان لوگوں نے بھی کیا؛ لہٰذا مذکورہ فرقہ جن کے مذکورہ عقائد ہیں، وہ حق پر قائم نہیں ہے، اور اس طرح بال منڈانے کا طریقہ رفائی سلسلہ کا نہیں ہے اوراس طرح کرنا جائز بھی نہیں ہے۔ فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۱۲] شیعہ اور سنی کی وضاحت

۱۴۴-سوال: شیعہ اور سنی کی وضاحت فرما دیجیے؟

الجواب حامداومصليا:

سنی: وہ جماعت ہے، جو نبی کریم ﷺ کے طریقہ اور آپ کے بعد آپ کے اصحاب کے طریقے پر چلے۔[۲]

شیعہ: وہ فرقہ ہے، جو صحابہ کو نبی کریم ﷺ کے طریقہ پر نہیں مانتا، خصوصاً خلفائے راشدین، نبی کریم ﷺ کے خاص اصحاب اور جانشین چار صحابہؓ میں سے تین کو جانشین نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے خلافت کا حق حضرت علیؓ سے چھین لیا، خلافت بلافصل کے اصل حق دار حضرت علیؓ تھے۔[۳] یہ بنیادی طور پر شیعہ مانتے ہیں، پھر ان کے بہت سے فرقے ہیں، ہر ایک کے عقائد جدا ہیں۔[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (۱۹-مریم: ۵۹)

(۲) عن عبد الله بن عمرو، قال: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم: »ليأتين على أمتي ما أتى على بني إسرائيل حذو النعل بالنعل، حتى إن كان منهم من أتى أمه علانية لكان في أمتي من يصنع ذلك، وإن بني إسرائيل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة، وتفترق أمتي على ثلاث وسبعين ملة، كلهم في النار إلا ملة واحدة«، قالوا: ومن هي يا رسول الله؟ قال: »ما أنا عليه وأصحابي. (سنن الترمذي: ۲/ ۹۲، رقم الحديث: ۲۶۴۱، أبواب الايمان، باب افتراق هذه الأمة، ط: البدر-ديوبند)

(۳) فإن أول أصولهم (الشيعة) أن عليا رضي الله عنه أفضل الكل يفرعون عليه أنه أشبه الصحابة بالنبي صلى الله عليه وسلم فهو الخليفة وان مذهبه هو الحق لا مذهب غيره وان الصحابة ظلموه حيث استخلفوا غيره مع أنه أفضل وأعلم وأشجع. (نبراس، شرح شرح العقائد-عبد العزيز الفرهاري، ص: ۳۰۲، ط: ياسر نديم-ديوبند)

(۴) شیعہ کے بائیس فرقے ہیں۔ (مظاہر حق جدید، ص: ۲۳۲، بہتر فرقوں کا اجمالی تذکرہ، ط: ادارہ اسلامیات-دیوبند)

ولا يخرج العبد بالإيمان إلا بجحود ما أدخله فيه.

(عقیدۃ الطحاوی:۶۱،بیروت)

باب الکفریات

(اعمال کفر وشرک)

○

اعمال کفر وشرک

[۱] مسلمان کا راکھی بندھوانا اور ٹیکا لگوانا

۱۴۵-سوال: ہندوؤں کا ''رکشابندھن'' نامی ایک تہوار ہوتا ہے، جس میں بہن اپنے بھائی کے ہاتھ پر ''راکھی'' (ایک قسم کا دھاگہ) باندھتی ہے، اس تہوار میں اتفاق سے ایک مسلمان شخص اپنے ہندو دوست کے یہاں گیا، تو اس کی بیوی نے اس مسلمان کے ہاتھ پر راکھی باندھ دی اور ساتھ ہی اس کی پیشانی پر ہندوانہ رسم کے موافق سندور کا ایک ٹیکا بھی لگا دیا اور کہنے لگی کہ میرا بھائی بہت دور ہے؛ اس لیے میں تجھے اپنے بھائی کی حیثیت سے راکھی باندھتی ہوں۔ اس مسلمان نے ماتھے کے ٹیکے کو تو پندرہ منٹ میں مٹا دیا؛ لیکن ''راکھی'' سات آٹھ گھنٹے تک باندھے رکھی، پھر نکال دی؛ حالاں کہ اس مسلمان نے اس سے پہلے (جب یہ ہندو گھرانا اس کے محلہ میں رہتا تھا) کبھی بھی اس طرح کا کام نہیں کیا تھا، تو اب سوال یہ ہے کہ اس عمل سے کیا وہ شخص ایمان سے خارج ہو جائے گا؟ اس سلسلہ میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ دلائل کی روشنی میں تفصیل سے بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

کسی آدمی کے مسلمان ہونے کے لیے اصل چیز ہے: اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا زبان سے اقرار اور دل سے یقین رکھنا۔[1] پھر اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جو احکامات بتلائے ہیں، ان پر عمل کرے، حرام امور سے اجتناب کرے اور کفار، یہود اور نصاریٰ کے اعمال سے دور رہے، خصوصاً جو چیزیں ان کے مذہب کی پہچان ہیں، ان سے قطعی طور پر گریز کرے۔ اگر کوئی مسلمان ایسے امور کا ارتکاب کرے، مثلاً

---

(۱) الایمان هو الإقرار باللسان والاعتقاد بالجنان وذلك أن يقروا بوحدانية الله تعالى وصفاته الأزلية وبجميع ما جاء من عنده من كتب ويعتقد بقلبه ذلك. (البحر الرائق: ۸/ ۲۰۵، كتاب الكراهية، ط: دار المعرفة-بيروت)

ایسا لباس پہنے، جو غیر قوم کے لیے مخصوص ہے (یعنی ان کا مذہبی لباس ہے) اور وہ لباس ان کی پہچان ہے، تو وہ ایمان سے خارج ہوجائے گا، جیسے مجوس کی ٹوپی، کافروں کا زنار، اسی طرح یہود و نصاریٰ کا کوئی مخصوص (مذہبی) لباس پہنے گا، تو ایمان سے نکل جائے گا۔ (۲)

شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے کہ جس مسلمان نے مجوس کی ٹوپی پہنی، یا پیلا دھاگا باندھا اور یہ چیز ان لوگوں کی مذہبی پہچان ہے، تو اس سے وہ مشرک ہوجائے گا۔ (صفحہ:۲۲۷) اسی طرح یہود و نصاریٰ کی (مذہبی) شکل و صورت اختیار کرے؛ خواہ مزاحاً ہو (جیسا کہ ایکٹر کرتا ہے) تب بھی کافر ہوجائے گا، ہاں شرط یہ ہے کہ یہ کام اپنی رضا اور رغبت سے کیا ہو، اگر جبر و اکراہ سے اپنی جان بچانے کی خاطر بادل ناخواستہ کیا ہو تو کافر نہ ہوگا۔ (صفحہ ۲۲۸)

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر اس شخص نے اپنی رضامندی سے ماتھے پر ٹیکا لگوایا اور ہاتھ پر راکھی بندھوائی، تو چوں کہ یہ ہندوؤں کی مذہبی پہچان ہے؛ اس لیے وہ ایمان سے خارج ہوجائے گا۔ (۳)

صوبہ ایم، پی (راجپور) سے بھی اس طرح کا ایک سوال آیا ہے، جس میں لکھا ہے کہ ایک تھالی میں جلتا ہوا چراغ، ناریل، کنکوم (سرخ سفوف) اور راکھی لے کر ہندو عورت آتی ہے اور سب سے پہلے راکھی باندھتی ہے، پھر کنکوم سے ماتھے پر ٹیکا کرتی ہے، اس کے بعد ہاتھ میں ناریل پکڑاتی ہے، اس سے دونوں بھائی بہن بن جاتے ہیں، تو جاننا چاہیے کہ یہ سب کفریہ امور ہیں، اگر کوئی مسلمان بالاختیار کرے گا، جب کہ جان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ (۴) تو ایمان سے خارج ہوجائے گا اور مشرک بن جائے گا، اس کی بیوی نکاح

(۲-۳) من تقلنس بقلنسوة المجوس، أي لبسها، و تشبه بهم فيها، أو خاط خرقة صفراء على العاتق أي و هو من شعارهم، أو شد في الوسط خيطا كفر، إذا كان متشابها بخيطهم أو ربطهم أو سماه زنارا . . . و لو شد الزنار على وسطه، أو وضع الغل على كتفه فقد كفر، أي إذا لم يكن مكرها في فعله. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۲۲۷-۲۲۸، فصل في الكفر صريحا و كناية، ط: ياسر نديم - ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۷۶، كتاب السير، باب في أحكام المرتدين موجبات الكفر أنواع، و منها: ما يتعلق بتلقين الكفر و الأمر بالارتداد. الخ، ط: دار الفكر☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق: ۵/ ۱۳۳، باب أحكام المرتدين، كتاب السير، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر: ۱/ ۶۹۸، ألفاظ الكفر أنواع، باب المرتد، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۴) اگر جان کا خطرہ ہو تو جائز ہے: وإن أكره على الكفر بالله تعالى أو سب النبي - صلى الله عليه وسلم - بقتل أو قطع رخص له إظهار كلمة الكفر و السب، فإن أظهر ذلك و قلبه مطمئن بالإيمان فلا يأثم، وإن صبر حتى قتل كان مثابا. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۴۸، كتاب الإكراه، باب فيما يحل للمكره أن يفعل، ط: دار الكتب العلمية بيروت- لبنان، الطبعة الأولى: ۱۴۲۱ھ-۲۰۰۰م)

سے نکل جائے گی۔ (۵) پھر سے کلمہ پڑھ کر توبہ کر کے نئے سرے سے اس عورت کو نکاح میں لائے گا، تب وہ اس مرد پر حلال ہوگی۔ (۶) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] ہندو مسلم اتحاد کے لیے مسلمانوں کا راکھی بندھوانا اور ماتھے پر ٹیکا لگوانا

۱۴۶-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل صورت میں کہ ہندوستان میں ہندو قوم میں راکھی باندھنے کا تہوار منایا جاتا ہے، جس میں بعض ہندو عورتیں مسلمانوں کو بھی راکھی باندھتی ہیں اور بھائی بناتی ہیں، راکھی باندھنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایک تھالی ہوتی ہے، اس تھالی میں ایک ناریل، راکھی، جلتا ہوا چراغ اور ٹیکا لگانے کے لیے لال رنگ کا کنکو (کنکوم) ہوتا ہے، وہ عورت پہلے راکھی باندھتی ہے، پھر سر پر ٹیکا لگاتی ہے، پھر ناریل ہاتھ میں دیتی ہے، اس کے بعد مسلمان (راکھی بندھوانے والا) اس تھالی میں روپیہ ڈالتا ہے، اس طرح سے وہ ہندو عورت اور مسلمان جس کو راکھی باندھی گئی ہے، بھائی بہن بن جاتے ہیں۔ ہندو-مسلم اتفاق قائم رکھنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مومن کی شان یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے۔ (۱) جان، مال، عزت وآبرو اور نفع ونقصان کا مالک اللہ کو جانے۔ (۲) اس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ (۳) الغرض مسلمان کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا چاہیے۔

مسلمان کفر یا شعار کفر (شعار کفر کا معنی ہے: وہ چیز جس سے کافر کی پہچان ہو، جیسے زنار باندھنا، راکھی بندھوانا،

---

(۵) ومنها: ردة أحد الزوجين؛ لأن الردة بمنزلة الموت... لأنها سبب مفض إليه والميت لايكون محلا للنكاح، ولأنه لاعصمة مع الردة وملك النكاح لايبقى مع زوال العصمة. (بدائع الصنائع: ۲/ ۳۳۷، كتاب النكاح، فصل بيان ما يرفع حكم النكاح، ط: دار الكتب العلمية، بيروت-لبنان، الطبعة الثانية: ۱۴۰۶ھ-۱۹۸۶ء)

(۶) وتوبته أن يأتي بالشهادتين، ويبرأ عن الدين الذي انتقل إليه. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ۷/ ۱۳۵، كتاب السير، فصل بيان أحكام المرتدين، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

(۱) قال الله تعالى: يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا أَطِيعُوا ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ. (-۱۸ الأنفال: ۲۰)

(۲) قال الله تعالى: وَتُعِزُّ مَن تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَآءُ ۖ بِيَدِكَ ٱلْخَيْرُ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ. (-۳ آل عمران: ۲۶)

(۳) قال الله تعالى: وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِى ظُلُمَٰتِ ٱلْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِى كِتَٰبٍ مُّبِينٍ. (-۶ الأنعام: ۵۹)

پیشانی یا سر پر ٹیکا لگانا اور سر پر چوٹی رکھنا وغیرہ) کا ارتکاب بہ خوشی کرے، تو ایمان سے خارج ہوجائے گا۔ شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے کہ مجوس کی ٹوپی یا زنار (جو مذہبی پہچان ہے) پہنے گا، تو ایمان سے خارج ہوجائے گا، ہاں اگر مجبوری ہو یا جان کا خوف ہو، پھر ان امور کا ارتکاب کرلے، تو ایمان سے خارج نہیں ہوگا۔ (شرح فقہ اکبر ص: ۲۲۷)[۴]

لہٰذا جن مسلمانوں نے یہ کام کیا ہے، ایمان سے نکل جائیں گے، ان کے لیے لازم ہے کہ ایمان کی تجدید کر کے نکاح کی تجدید کریں؛ کیوں کہ ایمان سے نکل جانے کی وجہ سے ''نکاح'' ٹوٹ گیا۔[۵] لہٰذا تجدید نکاح ضروری ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] مصلحت کی بناء پر کسی غیر مسلم کی ''آخری رسم'' میں شرکت موجب کفر ہے؟

۱۴۷-سوال: ہمارا ملک ساؤتھ افریقہ فی الوقت سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے نہایت سنگین حالات سے گذر رہا ہے، ملک کی اکثریت سیاہ فاموں (کالوں) کی ہے، جو تقریباً ۹۳ ر فی صد ہیں؛ تقریباً چار سو سال تک سفید فاموں (گوروں) نے حکومت کی اور کالوں پر ظلم واستبداد کی انتہاء کردی، گوروں نے ایک قانون بنایا تھا، جس کے تحت ملک پر گورے ہی حکومت کر سکتے تھے، کالوں سے حق رائے دہی بھی سلب کرلیا گیا تھا، اسکولوں اور کالجوں میں بھی کالوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا تھا، ملک کے بڑے بڑے اور زرق برق شہر صرف گوروں کے لیے خاص تھے، بے چارے کالوں کو وہاں گھر بسانا تو دور، سر شام ٹھہرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔

بہر کیف اس وقت ملک عبوری دور سے گذر رہا ہے، موجودہ حالات ایک نئے انقلاب کی پیشین گوئی کر رہے ہیں اور امید ہے کہ قریبی مدت میں عام انتخاب عمل میں آئے، جس میں ملک کے ہر طبقے کو یکساں حقوق حاصل ہوں، عام انتخاب میں حصہ لینے والی پارٹیوں میں ایک پارٹی ای این سی (E.N.C) ہے، مستقبل کو دیکھتے ہوئے ملک کے بعض علماء اس پارٹی کی تائید کر رہے ہیں، آزادی کی تحریک چلانے کے جرم میں گوروں نے اس پارٹی کے ایک اہم لیڈر کو قتل کردیا، جس کی وجہ سے پورے ملک میں ایک شور برپا ہوا، اس

(۴) تفصیل تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں: مسلمان کا راکھی بندھوانا اور ٹیکہ لگوانا، ص: ۲۶۵۔

(۵) ومنها ردة أحد الزوجين؛ لأن الردة بمنزلة الموت... والميت لا يكون محلاً للنكاح، ولأنه لا عصمة مع الردة، وملك النكاح لا يبقى مع زوال العصمة. (بدائع الصنائع: ۲/ ۳۳۷، كتاب النكاح، فصل: بيان ما يرفع حكم النكاح، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

کے "آخری رسوم" میں شرکت کے لیے بلا تفریق ہر طبقے کے لوگوں کو مدعو کیا گیا، مصلحتاً اس میں بعض علمائے کرام نے بھی شرکت کی؛ تاکہ آئندہ اگر اس کی حکومت بن گئی، جیسا کہ حالات سے کچھ ایسا ہی اندازہ ہو رہا ہے، تو مسلمانوں کو دشمن سمجھ کر انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ پہونچائیں، جب کہ ملک کے دوسرے علمائے کرام کافر کے اس "آخری رسم" میں علماء کی اس شرکت کو لے کر سخت موقف اختیار کیے ہوئے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ کافر کے جنازے میں شرکت حرام اور کفر ہے، جو لوگ جنازے میں شریک ہوئے، انہیں اپنے ایمان اور نکاح دونوں کی تجدید کرنا چاہیے، قرآن کریم کا صاف حکم ہے ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾[۱] جہاں تک مسلمانوں کے تحفظ کی بات ہے، تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ پر اعتماد رکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حفاظت کے لیے کافی ہے۔

بہرحال اس مسئلے میں یہاں مسلمانوں میں شدید انتشار ہے کہ علماء کا کون سا گروہ حق پر ہے؟ کس جماعت کی بات تسلیم کی جائے؟ اطمینان بخش جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

جواب کو سمجھنے کے لیے تمہیدی طور پر دو فقہی اصول کا سمجھنا ضروری ہے، وہ اصول یہ ہیں: [۱] "الیقین لایزول بالشک"[۲] یعنی جس چیز کا ثبوت یقینی اور قطعی دلیل سے ہو، اسے محض شک کی بنیاد پر کالعدم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ [۲] "الإسلام یعلو ولا یعلی"[۳] اسلام غالب ہی رہتا ہے، اس پر کوئی چیز غالب نہیں آسکتی۔

مذکورہ دونوں اصولوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ جن لوگوں نے غیر مسلم لیڈر کے جنازے میں

(۱) ۹-التوبة: ۱۱۳۔

(۲) الأشباه والنظائر علی مذهب أبي حنيفة النعمان-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ)، ص: ۴۷، القاعدة الثالثة: اليقين لايزول بالشك، ط: دار الفكر بيروت-لبنان.

(۳) صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب إذا أسلم الصبي فمات، هل يصلى عليه؟ وهل يعرض على الصبي الإسلام، عن ابن عباس تعليقاً ☆ مسند الروياني-أبو بكر محمد بن هارون الرّوياني (م: ۳۰۷ھ)، ۲/۳۷، رقم: ۷۸۳، عن عائذ بن عمرو، ت: أيمن علي أبو يماني، ط: مؤسسة قرطبة - القاهرة ☆ سنن الدارقطني (م: ۳۸۵ھ): ۴/۳۷۱، رقم: ۳۶۲۰، تحقيق وتعليق: شعيب الارنؤوط، حسن عبد المنعم شلبي وغيرهما، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)

شرکت کی ہے، ان کا اس میں شامل ہونا ملی مصلحت کے پیش نظر ہے، اگر بالفرض کوئی مصلحت ان کے پیش نظر نہ ہوتی، تو بھی ان کے اس طرز عمل کو مذکورہ اصول کی روشنی میں گناہ کا کام تو ضرور قرار دیا جائے گا؛ البتہ انہیں کافر نہیں قرار دیا جاسکتا؛ اس لیے کہ ان کا ایمان قطعیت کے ساتھ ثابت ہے اور کافر کے جنازے میں شریک ہونے میں بہت سے احتمالات ہیں۔ اور محض احتمال کی وجہ سے کوئی قطعی الثبوت شئے کالعدم قرار نہیں دی جاسکتی، "اليقين لايزول بالشك"۔ کیوں کہ کفر آخری درجے کا گناہ ہے اس کے بعد کوئی گناہ نہیں جیسا کہ اس کی سزا آخری درجے کی ہے اور آخری درجے کے گناہ کا تحقق محض شک کی وجہ سے نہیں ہوگا۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ تکفیر کا معاملہ انتہائی نازک ہے، اگر کسی کے اندر ننانوے احتمالات کفر کے ہوں اور صرف ایک احتمال ایمان کا ہو، تو بھی اسے مومن ہی سمجھا جائے گا؛ اس لیے کہ "الإسلام يعلو ولا يعلى عليه" اسلام غالب ہی رہتا ہے، اس پر کوئی چیز غالب نہیں آسکتی۔

حالاں کہ ان علمائے کرام نے غیر مسلم لیڈر کی "آخری رسم" میں ملی مفاد کی خاطر شرکت کی ہے، جس کا مقصد بھی نیک ہے، وہ یہ کہ مسلمانوں کو عمومی ضرر سے محفوظ رکھا جائے، اور ان کے جان و مال کے تحفظ کا سامان فراہم کیا جائے۔ شریعت اسلامی میں اکراہ کے موقع پر کلمۂ کفر اور اعمال کفر کی بھی اجازت ہے۔[۳] بشرطیکہ دل ایمان سے مطمئن ہو؛ لہٰذا ان حضرات کے لیے کافر کے آخری رسوم میں شرکت کی گنجائش ہے، ممنوع نہیں ہے، ان کی شرکت کو موجب کفر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

---

(۳) مسئلۂ مذکورہ کی نظیر میں اکراہ کے مسئلے کو پیش کرنا قابل غور معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ کلمۂ کفر زبان پر لانے کی اجازت صرف اکراہ کامل کی صورت میں دی گئی ہے، فقہائے کرام نے اکراہ کامل کی جو تعریف لکھی ہے، وہ تعریف صورت مسئول میں مفقود ہے، اکراہ کامل کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب بدائع نے تحریر فرمایا ہے: "إنه نوعان، نوع يوجب الإلجاء والاضطرار طبعا كالقتل والقطع والضرب يخاف فيه تلف النفس أو العضو قل الضرب أو كثر" (بدائع الصنائع: ۷/۱۷۵، كتاب الإكراه، فصل في بيان أنواع الإكراه، ط: دار لكتب العلمية- بيروت) اکراہ اگر اس قسم کا ہو، تو زبان سے کلمۂ کفر کا تکلم کرنے کی اجازت ہے، جب کہ دل ایمان پر مطمئن ہو، صاحب بدائع علامہ کاسانیؒ مزید لکھتے ہیں: "أما النوع الذي هو مرخص: فهو إجراء كلمة الكفر على اللسان مع اطمئنان بالإيمان، إذا كان الإكراه تاما وهو محرم في نفسه مع ثبوت الرخصة. (المصدر السابق)

تاہم خیال ہوتا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے صرف اس مقصد سے یہ نظیر پیش کی ہے کہ "مخصوص حالات" احکام کی تبدیلی کا سبب ہوتے ہیں، جیسا کہ دونوں مسئلے کے حکم سے واضح ہے۔

اب زیادہ سے زیادہ حدیث پاک **"من كثر سواد قوم فهو منهم"**[۴] اور **"من تشبه بقوم فهو منهم"**[۵] سے اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ حدیث اول میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص کسی مجمع کی کثرت کا سبب بنے، وہ ان ہی میں سے ہے۔ دوسری حدیث میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ ان ہی میں سے ہے۔ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ جو بھی کسی قوم کی کثرت کا سبب بنے یا ان کی مشابہت اختیار کرے، ان کا شمار ان ہی میں ہوگا۔ کافر کی آخری رسم میں شرکت ان کے مجمع میں کثرت کی موجب ہے اور ساتھ ساتھ ان کی مشابہت بھی اختیار کرنا ہے؛ لہٰذا ایسے لوگوں کو ان ہی میں شمار کیا جانا چاہیے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی ممنوعات ضرورت کے وقت اور کسی نیک مقصد کے تحت مباح ہوجاتی ہیں جیسا کہ فقہ کا ایک اصول ہے **"الضرورات تبيح المحظورات"**[۶] یعنی ضرورت کی وجہ سے بعض ممنوع چیزیں مباح ہوجاتی ہیں۔ ایک دوسرا اصول ہے **"الأمور بمقاصدها"**[۷] یعنی بعض کاموں کے جواز اور عدم جواز کا تعلق ان کے مقاصد سے ہے، اگر مقصد نیک ہے، تو وہ کام بھی جائز اور درست ہے، اور مقصد صحیح نہیں ہے تو وہ کام بھی ناجائز ہے۔

آیت پاک {مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾}[۸] میں جو ممانعت آئی ہے، وہ ممانعت دراصل کافر کے لیے دعاء و استغفار سے کی گئی ہے، یعنی ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ کافر کے لیے دعاء و استغفار کرے۔

جہاں تک کفار کے قبور پر جانے اور زیارت کا مسئلہ ہے، تو اس سلسلے میں خود علماء کے درمیان اختلاف ہے، لہٰذا اس کا ارتکاب موجب کفر کیسے ہوسکتا ہے؟ صاحب روح المعانی علامہ آلوسی لکھتے

---

(۴) جامع الأحاديث-السيوطي (م:۹۱۱ھ): حرف الميم قسم الأقوال برقم: ۲۳۶۹۹، طبع على نفقة: د حسن عباس زكي.

(۵) سنن أبي داؤد: ۲/۵۵۹، برقم الحديث: ۴۰۳۱، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة، ط: مكتبة الاتحاد-ديوبند ☆ جامع الأحاديث، رقم: ۲۰۴۷۸، حرف الميم قسم الأقوال، عن ابن عمر وحذيفة رضي الله تعالى عنهما، ط: دار الفكر للنشر والطباعة-بيروت.

(۶) الأشباه والنظائر-ابن نجيم، ص: ۳۷، تحت القاعدة الخامسة: الضرر يزال.

(۷) الأشباه والنظائر: ۲۳، القاعدة الثانية.

(۸)-۹ التوبة: ۱۱۳.

ہیں: ''احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ کافر کی قبر کی زیارت نہ کرے۔ (۹)

خلاصہ یہ کہ جن علماء نے غیر مسلم سیاسی لیڈر کے آخری رسوم کی ادائیگی میں شرکت کی ہے، انہوں نے دینی اور ملی تقاضے کی بنیاد پر یہ کام کیا ہے، ان کی یہ شرکت شرعاً جائز ہے، بلا وجہ ان کی تکفیر اور تفسیق ناجائز ہے، اس سے قطعی احتراز کرنا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] شعائر کفر کی تشہیر جائز نہیں

۱۴۸-سوال: میرے ایک دوست ہیں، جن کی دکان ہے، وہ ہر سال کیلنڈر چھپوا کر اپنے گاہکوں کو مفت میں تقسیم کرتے ہیں، گاہکوں میں مسلم اور ہندو؛ دونوں ہوتے ہیں، مسلمانوں کو اسلامی شعائر: کعبہ، مساجد وغیرہ کی تصویر والا کیلنڈر دیتے ہیں، جب کہ ہندوؤں کو ہندوانہ شعائر مثلاً: مندر، گن پتی، سائیں بابا اور دوسری مورتیوں کی تصویر والا کیلنڈر دیتے ہیں، تو ان کا یہ فعل شرعاً کیسا ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟ جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

ناجائز ہے، کفر اور شعائر کفر کا اشتہار بھی حرام ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۹) والاحتياط عندي عدم زيارة قبور الكفار. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني- شهاب الدين محمود الآلوسي (م: ۱۲۷۰هـ): ۵/ ۳۳۳، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) وقال ابن تيمية (۶۶۱-۷۲۸هـ): وقال ابن تيمية: هذا الحديث (أي: من تشبه بقوم فهو منهم) أقل أحواله أن يقتضي تحريم التشبه بأهل الكتاب، وإن كان ظاهره يقتضي كفر المتشبه بهم، فكما في قوله تعالى {ومن يتولهم منكم فإنه منهم}، وهو نظير قول ابن عمرو من بنى بأرض المشركين، وصنع نيروزهم ومهرجانهم، وتشبه بهم؛ حتى يموت حشر يوم القيامة معهم، فقد حمل هذا على التشبه المطلق؛ فإنه يوجب الكفر ويقتضي تحريم أبعاض ذلك، وقد يحمل منهم في القدر المشترك الذي شابههم فيه، فإن كان كفرا أو معصية أو شعارا لها كان حكمه كذلك. (فيض القدير شرح الجامع الصغير -زين العابدين المناوي (م: ۱۰۳۱هـ): ۶/ ۱۰۴، رقم: ۸۵۹۳، ط: المكتبة التجارية الكبرى - مصر ☆ واقتضاء الصراط المستقيم لمخالفة أصحاب الجحيم- ابن تيمية (م: ۷۲۸هـ): ۱/ ۲۷۱، باب التشبه مفهومه ومقتضاه، ط: دار عالم الكتب، بيروت)

[۵] گانے کی تعریف کرنا

۱۴۹-سوال: ریڈیو پر گانا آرہا تھا، ایک شخص نے کہا: "واہ! کتنا بہترین گانا ہے، دل خوش ہوگیا"۔ اس طرح گانے کی تعریف کرنا یا کسی بھی گناہ کے کام کی تعریف کرنا شرعاً کیسا ہے؟ اس سے ایمان میں کوئی خرابی تو نہیں آئے گی؟ تسلی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

گناہ کے کاموں کی تعریف کرنا گناہ ہے، اور اہل سنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ آدمی گناہ کی وجہ سے ایمان سے خارج نہیں ہوتا؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں وہ شخص ایمان سے خارج نہ ہوگا۔ ایمان تو بہت ہی قوی شئے ہے، اگر کوئی شخص گناہِ صغیرہ (چھوٹے گناہ) کا ارتکاب کرلے یا گناہِ کبیرہ کا 'گناہ اور حرام سمجھ کر مرتکب ہوجائے، تو وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوگا۔[۱] البتہ گناہوں کا ارتکاب کرنا بہت ہی بری چیز ہے، اللہ کی ناراضگی کو دعوت دینے والی ہے، اس سے اجتناب حددرجہ ضروری ہے، اگر کبھی ارتکاب ہوجائے، تو فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا چاہیے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولا نكفر أحداً من أهل القبلة بذنب مالم يستحله... ولايخرج العبد من الإيمان إلا بجحود ما أدخله فيه. (العقيدة الطحاوية-أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة الأزدي المصري المعروف بالطحاوي (م: ۳۲۱هـ)، ص: ۲۱ ط: دار ابن حزم، الطبعة الأولى: ۱۴۱۶هـ-۱۹۹۵ء)

روى الطحاوي عن أصحابنا: لا يخرج الرجل من الإيمان إلا بجحود ما أدخله فيه ثم ما تيقن أنه ردة يحكم بها وما يشك أنه ردة لا يحكم بها إذ الإسلام الثابت لا يزول بالشك مع أن الإسلام يعلو وينبغي للعالم إذا رفع إليه هذا أن لا يبادر بتكفير أهل الإسلام... وفي الفتاوى الصغرى: الكفر شيء عظيم فلا أجعل المؤمن كافراً متى وجدت رواية أنه لا يكفر اهـ وفي الخلاصة وغيرها: إذا كان في المسألة وجوه توجب التكفير، ووجه واحد يمنعه فعلى المفتي أن يميل إلى الوجه الذي يمنع التكفير تحسينا للظن بالمسلم. زاد في البزازية إلا إذا صرح بإرادة موجب الكفر فلا ينفعه التأويل. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۲۲۴، كتاب الجهاد، باب المرتد، ط: بيروت ☆ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: شرح عقائد، ص: ۱۲۶ ☆ شرح المقاصد في علم الكلام- التفتازاني (م: ۷۹۳هـ): ۲/ ۲۷۰، ط: دار المعارف النعمانية - پاکستان ☆ البحر الرائق: ۵/ ۱۳۲، باب أحكام المرتدين، ط: دار المعرفة-بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۸۳، كتاب السير، الباب العاشر في البغاة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) عن أنس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كل بني آدم خطاء، وخير الخطائين التوابون. (سنن ابن ماجة، ص: ۳۱۳، رقم الحديث: ۴۲۵۱، أبواب الزهد، باب ذكر التوبة ☆ مسند أبي يعلى-الموصلي (م: ۳۰۷هـ): =

[۲] فال نکالنا اور اس کے مقتضا پر عمل کرنا

۱۵۰-سوال: ایک گھر میں خوشی کا موقع تھا، رشتہ دار اور اڑوس پڑوس کے بہت سے لوگ جمع تھے، اس موقع پر گھر سے ایک سامان کی چوری ہوگئی، گھر والوں نے چور کا نام معلوم کرنے کے لیے فال نکلوایا، جس میں دو شخص کا نام آیا، وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم نے چوری نہیں کی ہے۔ گھر والے کہنے لگے: ہم تمہیں درگاہ پر لے جا کر بیڑی پہنائیں گے، اگر تمہاری بات سچ اور صحیح ہوگی، تو بیڑی چھوٹ جائے گی، ورنہ یہ بیڑی تمہارے گوشت پوست میں پیوست ہوجائے گی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس طرح کا عقیدہ رکھنا اور فال نکالنا اور اس کے موافق عمل کرنا شرعاً جائز ہے؟ یہ عقیدہ لوگوں میں گھر کر گیا ہے، کیا اس سے ایمان اور نکاح میں کوئی فرق آئے گا؟ تفصیل سے جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

فال دیکھنا اور دکھانا حرام ہے اور فال کی بات کو سچ جاننا جائز نہیں، زمانہ جاہلیت میں ''کہانت، ''نجوم'' اور ''عرافہ'' کا علم جاری تھا، رسول اللہ ﷺ نے ان تینوں کے متعلق ہدایت دی کہ یہ لائق اعتبار نہیں اور ان چیزوں پر یقین کرنے والا محمد (ﷺ) کے لائے ہوئے دین کا (گویا) منکر ہے۔ (۱)

''کہانت'' کہتے ہیں: شیطان کی مدد سے مستقبل میں ہونے والی باتوں کو بتلانا۔ اور ''نجوم'' کہتے

=۵/۳۰۱، رقم: ۲۹۲۲، مسند أنس بن مالك، قتادة عن أنس، ت: حسين سليم أسد، ط: دار المأمون للتراث-دمشق ☆سنن الدارمي: ۳/ ۱۷۹۳، رقم الحديث: ۲۷۶۹، باب في التوبة، ط: دار المغني-السعودية)

(۱) عن عبد الله أنه قال: من أتى عرافا أو ساحرا أو كاهنا فسأله فصدقه بما يقول، فقد كفر بما أنزل على محمد صلى الله عليه وسلم. (مسند أبي يعلى الموصلي: ۹/ ۲۸۰، رقم الحديث: ۵۴۰۸، مسند عبد الله بن مسعود، ت: حسين سليم أسد، ط: دار المأمون للتراث، دمشق، طبع اول☆ مسند أحمد بن حنبل: ۱۵/ ۳۳۱، رقم الحديث: ۹۵۳۶، مسند أبي هريرة، ت: شعيب الأرنؤوط، عادل مرشد، ط: مؤسسة الرسالة☆سنن أبي داؤد: ۲/ ۵۴۵، رقم الحديث: ۳۹۰۵، كتاب الطب، باب النهي عن إتيان الكهان، ط: مكتبة الاتحاد، ديوبند☆سنن الترمذي: ۱/ ۳۵، رقم الحديث: ۱۳۵، باب ماجاء في كراهية إتيان الحائض، أبواب الطهارة، ط: ديوبند)

عن ابن عباس، قال: قال رسول الله- صلى الله عليه وسلم-: من اقتبس علما من النجوم، اقتبس شعبة من السحر زاد ما زاد. (سنن أبي داؤد: ۲/ ۵۴۵، رقم الحديث: ۳۹۰۵، كتاب الطب، باب في النجوم، ط: مكتبة الاتحاد- ديوبند☆ سنن ابن ماجة، ص: ۲۶۴، رقم الحديث: ۳۷۲۶، كتاب الأدب، باب تعلم النجوم، ط: مكتبة الاتحاد- ديوبند)

ہیں: ستاروں اور برجوں کی چال دیکھ کر مستقبل میں ہونے والی باتوں کو جاننا اور دوسروں کو بتلانا۔ عراف کہتے ہیں: زمانہ ماضی (گزشتہ زمانہ) میں ہونے والے واقعات اور امور کو جاننے کے لیے کوئی علم حاصل کرنا، کہ کس نے چوری کی تھی؟ فلاں چیز گم ہوگئی، وہ کس کے پاس ہے؟ بھاگا ہوا لڑکا کہاں ہے؟ وغیرہ، غرض اس طرح کی چیزوں کو جاننے کے لیے شیطانی علم سیکھنا۔ ان تینوں علوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناجائز کہا ہے۔ (۲)

فال کا تعلق ''عرافہ'' سے ہے، فال نکالنے والا (عریف) ماضی میں ہونے والی کسی بھی

---

(۲) قال العلماء: إنما نهي عن إتيان الكهان؛ لأنهم يتكلمون في مغيبات قد يصادف بعضها الإصابة فيخاف الفتنة على الإنسان بسبب ذلك؛ لأنهم يلبسون على الناس كثيرا من أمر الشرائع وقد تظاهرت الأحاديث الصحيحة بالنهي عن إتيان الكهان وتصديقهم فيما يقولون . . . وهو حرام بإجماع المسلمين وقد نقل الإجماع في تحريمه جماعة . . . وقال الخطابي -رحمه الله تعالى-: كان في العرب كهنة يدعون أنهم يعرفون كثيرا من الأمور فمنهم من يزعم أن له رئيا من الجن يلقي إليه الأخبار ومنهم من يدعي استدراك ذلك بفهم أعطيه ومنهم من يسمى عرافا وهو الذي يزعم معرفة الأمور بمقدمات أسباب استدل بها كمعرفة من سرق الشيء الفلاني ومعرفة من يتهم به المرأة ونحو ذلك ومنهم من يسمي المنجم كاهنا قال والحديث يشتمل على النهي عن إتيان هؤلاء كلهم والرجوع إلى قولهم وتصديقهم فيما يدعونه هذا كلام الخطابي وهو نفيس. (شرح النووي على مسلم: ۱/ ۲۰۳، كتاب الصلاة، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب تحريم الكلام في الصلاة ونسخ ما كان من إباحته. مزید دیکھیے: كتاب البيوع، كتاب المساقاة والمزارعة، باب تحريم ثمن الكلب وحلوان الكاهن الخ: ۲/ ۱۹، البدر، ديوبند☆لسان العرب-ابن منظور الأنصاري الرويفعي الإفريقي (م: ۷۱۱ھ): ۱۳/ ۳۶۳، مادة: كهن، ط: دار صادر-بيروت)

قال الطيبي: الفرق بين الكاهن والعراف: أن الكاهن يتعاطى الأخبار عن الكوائن في المستقبل، والعراف يتعاطى معرفة الشيء المسروق ومكان الضالة ونحوهما، ومن الكهنة من زعم أن جنيا يلقي إليه الأخبار، ومنهم من يدعي إدراك الغيب بفهم أعطيه وأمارات يستدل بها عليه. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۲/ ۷۷۷، كتاب الصلاة، باب ما لا يجوز من العمل في الصلاة وما يباح منه، ط: دار الفكر-بيروت☆تحفة الأحوذي بشرح جامع الترمذي-أبو العلاء محمد عبد الرحمن المباركفوري (م: ۱۳۵۳ھ): ۴/ ۴۱۳، أبواب البيوع، باب ما جاء في ثمن الكلب، في ذيل حديث: ۱۲۷۵، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

قال ابن عابدين: والحاصل أن الكاهن من يدعي معرفة الغيب بأسباب وهي مختلفة فلذا انقسم إلى أنواع متعددة كالعراف. والرمال والمنجم: وهو الذي يخبر عن المستقبل بطلوع النجم وغروبه، والذي يضرب بالحصى، والذي يدعي أن له صاحبا من الجن يخبره عما سيكون، والكل مذموم شرعا، محكوم عليهم وعلى مصدقهم بالكفر. وفي البزازية: يكفر بادعاء علم الغيب وبإتيان الكاهن وتصديقه. وفي التتارخانية: يكفر بقوله أنا أعلم المسروقات أو أنا أخبر عن إخبار الجن إياي اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۲۴۲، مطلب في الكاهن والعراف، كتاب الجهاد، ط: بيروت)

بات (مثلاً: چوری کرنے والا کون ہے؟ فلاں لڑکا کہاں بھاگ گیا؟ وغیرہ) کو شیطان کی مدد سے بتلاتا ہے، اور یہ حرام ہے؛ کیوں کہ شیطان غیب کی باتوں کو نہیں جانتا۔ [۳] شیطان کس طرح بتا سکتا ہے کہ چوری کرنے والا کون ہے؟ حضرت حفصہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے "عـــریـــف" کے پاس جاکر کسی چیز کے جاننے کی کوشش کی (اس سے کسی چیز کے متعلق استفسار کیا) تو اس کی چالیس دنوں کی نماز قبول نہیں ہوگی۔ (مسلم شریف: ۲/ ۲۹۳) [۴] حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جو شخص کاہن یا عریف کے پاس گیا اور اس کی بتائی ہوئی باتوں کو سچ جانا، تو اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارے ہوئے احکامات کا انکار کیا۔ (مشکوۃ: ۱/ ۱۷۱) [۵]

پس مذکورہ احادیث کی بنا پر صورت مسئولہ میں فال نکالنے والے کے پاس جاکر اس کی کہی ہوئی باتوں کو سچ جاننا حرام ہوگا، اس کی بتائی ہوئی باتوں پر یقین کرنے والے کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی، اور جس کسی نے اس کے سچ ہونے کا یقین کیا، تو اس کے دائرۂ اسلام سے نکل جانے کا اندیشہ ہے۔

فال نکالنے والے کی بتائی ہوئی باتوں کو سچ جاننا اس لیے حرام ہے کہ کسی پر چوری کا جرم ثابت کرنے کے لیے مدعی کا دو گواہ پیش کرنا ضروری ہے، جب کوئی گواہ نہیں ہے، تو بغیر کسی دلیل شرعی کے کسی کو چور کہنا اور اس پر چوری کا الزام لگانا درحقیقت اس کی عزت وآبرو سے کھلواڑ کرنا ہے؛ جو حرام اور ناجائز ہے۔

نیز شیطان یا فال نکالنے والے کی بات کے سچ ہونے کا یقین کرنا تو اور ہی خطرناک بات ہے، اس سے ایمان سے نکل جانے کا قوی اندیشہ ہے۔ [۶]

پھر اسی فال کی بناء پر مزید دوسرے گناہ کا ارتکاب بھی لازم آتا ہے، اس طور پر کہ متعلقہ شخص کو درگاہ پر اس نیت سے لے جایا جاتا ہے کہ صاحب قبر اس کے چور ہونے کی اطلاع دیں گے؛ حالاں کہ اولیاء غیب

(۳) قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُوْنَ أَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ. (۲۷- النمل: ۶۵)

(۴) عن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: من أتى عرافاً فسأله عن شيء لم تقبل له صلاة أربعين ليلة. (صحيح مسلم: ۲/ ۲۳۳، رقم الحديث: ۱۲۵-(۲۲۳۰)، كتاب السلام، باب تحريم الكهانة وإتيان الكهان، ط: ديوبند ☆المعجم الكبير-الطبراني: ۲۳/ ۲۱۵، رقم الحديث: ۳۹۱، ط: مكتبة ابن تيمية، ت:: حمدى عبد المجيد السلفي)

[۵] دیکھیے اسی جواب کا حاشیہ نمبر: ۱۔

(۶) وتصديق الكاهن بما يخبره عن الغيب كفر. (شرح عقائد نسفی ص: ۱۷۰، ط: دیوبند)

کی باتوں کو نہیں جانتے ہیں۔ (۷) پس درگاہ پر اس نیت سے کسی کو لے جانا بھی حرام ہے، یہ کام شیطان کی طرف سے ہے، جو انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے، شیطان بہت سی بے بنیاد باتوں کو پھیلا کر لوگوں کے ایمان کو برباد کرتا ہے، لہٰذا بیڑی پہنا کر چوری کی حقیقت جاننا ہرگز جائز نہیں ہے۔

''بیڑی پہنا کر چور کو جاننے کا طریقہ'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتلایا ہے، بل کہ یہ نبوی تعلیم کے خلاف ہے۔

چور کے معلوم کرنے کے مذکورہ بالا طریقے میں ولی کو عالم الغیب سمجھنا لازم آتا ہے اور کسی ولی کو عالم الغیب سمجھنا' ایمان سے نکل جانے کا سبب ہے، اور جب کوئی ایمان سے نکل جائے (مرتد ہو جائے) تو اس کی بیوی بھی نکاح سے نکل جائے گی اور دوبارہ ایمان لا کر تجدید نکاح ضروری ہوگا۔ (۸)

بہت سی قبروں پر جو خرافات اور کرشماتی کام ہوتے ہیں، وہ یا تو شیطانی کام ہوتے ہیں یا مجاورین کی ہاتھ صفائی ہوتی ہے، شیطان انسان کو گمراہ کرنے اور اس کے ایمان کو برباد کرنے کے لیے مختلف حربے اپناتا ہے، لہٰذا بیڑی پہنا کر چوری کی تفتیش کرنا حرام ہے۔

فی زماننا قبروں پر جو شرکیہ وکفریہ خرافات ہوتے ہیں، ان کو دیکھ کر اس طرح کے کرشماتی چیزوں کو اولیاء کی کرامات کہنا بہت مشکل ہے، یہ تو شیطانی ہتھکنڈے ہیں، جن سے وہ انسان کو گمراہ کرتا ہے، لہٰذا ان چیزوں سے قطعاً دور رہنے کی ضرورت ہے، ورنہ ایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

نوٹ: اس سلسلے کی مزید تفصیل کے لیے میری کتاب ''عقائد اسلام'' کا مطالعہ کریں۔ (۹)

---

(۷) قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ. (۲۷-النمل: ۶۵)

(۸) وفي شرح الوهبانية للشرنبلالي: ما يكون كفرا اتفاقا يبطل العمل والنكاح وأولاده أولاد زنا، وما فيه خلاف يؤمر بالاستغفار والتوبة وتجديد النكاح. (الدر المختار مع رد المحتار: ۴/۲۴۶، كتاب الجهاد، باب المرتد، مطلب توبة اليأس مقبولة دون إيمان اليأس، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۸۳، كتاب السير، الباب العاشر في البغاة، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق - زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۵/ ۱۳۴، كتاب السير، باب أحكام المرتدين، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۶۸۸، كتاب السير، باب المرتد، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۹) یہ کتاب گجراتی میں تھی، الحمد للہ صاحب زادہ محترم حافظ اسجد بیات صاحب کے زیر اہتمام اب اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔

[۷] فال معلوم کروانا جائز ہے یا نہیں؟

۱۵۱-سوال: اِس وقت جو لوگ فال کھولتے[۱] ہیں، خواہ مسلمان ہوں یا کفار، فال کھلوانا جائز ہے یا نہیں؟ جیسے غیر مسلم اناج کے دانے سے فال کھولتے ہیں، اسی طرح مسلمان بھی یہ عمل کرتے ہیں، اور بعض مسلمان چھوٹے بچے کو بٹھا کر ناخون میں دیکھتے ہیں، یا اس طرح کا شیشہ رکھتے ہیں، جس میں چوری کرنے والے یا بھاگنے والے کی تصویر دکھاتے ہیں، ان چیزوں کی کیا حقیقت ہے؟ شریعت میں ان چیزوں کا اعتبار ہے یا نہیں؟ اور نہ ماننے میں کیا فوائد ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

مذکور فی السوال کاموں میں (درج ذیل) تین قسم کے لوگ مشغول ہیں، یہ سب کام حرام ہیں، اور بعض کام اُن میں وہ ہیں، جن کی وجہ سے آدمی خارج از اسلام ہو جاتا ہے، اس طرح کے لوگوں کی صحبت میں رہنے والے بہت سے بھولے بھالے مسلمان اپنے ایمان برباد کر لیتے ہیں۔

(۱) نجومی: چاند اور ستاروں کی گردش اور اُس کے برجوں سے مستقبل کی باتیں بتاتے ہیں، بارش کے لیے پیشین گوئی کرتے ہیں، غلہ و اناج کے بھاؤ کی گرانی و ارزانی کو بتاتے ہیں، اگر ان لوگوں کا اعتقاد یہ ہو کہ یہ سب چاند اور ستارے ہی کے دنیا میں اثر انداز ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے تو اس طرح کا اعتقاد رکھنے والا مسلمان دین اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اُس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں سے چند درج کرتا ہوں:

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان سے برکت (بارش) برساتے ہیں، تو کچھ لوگ کافر بن جاتے ہیں، جن لوگوں کا کہنا ہوتا ہے کہ فلاں ستارہ فلاں برج میں تھا، اس لیے بارش ہوئی ہے۔ (مسلم شریف)[۲]

---

(۱) فال دیکھنا، فال کھولنا، فال لینا: (اردو-محاورہ) کسی کتاب یا پانسے وغیرہ کے ذریعے نیک اور بدشگون معلوم کرنا، غیب کی بات دریافت کرنا۔ (فیروز اللغات: ۹۲۳، ف-ا، ط: فیروز سنز پرائیوٹ لمٹیڈ، کراچی، پاکستان)

(۲) عن أبي هريرة، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "ما أنزل الله من السماء من بركة إلا أصبح فريق من الناس بها كافرين، ينزل الله الغيث فيقولون: الكوكب كذا و كذا. (صحيح مسلم: ۱/۵۹، رقم الحديث: ۷۲، كتاب الإيمان، باب بيان كفر من قال: مطرنا بالنوء، ط: البدر - ديوبند)

دوسری حدیث میں ہے کہ مقامِ حدیبیہ کے موقع پر فجر کی نماز کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا کہا؟ صحابۂ کرامؓ نے جواب دیا کہ اللہ اور اُس کے رسول ہی خوب جانتے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے بعض بندے مسلمان رہے، اور بعض کافر ہوئے، جن لوگوں نے کہا کہ اللہ کے حکم اور فضل و رحمت سے بارش ہوئی، تو وہ لوگ مجھ پر ایمان لائے، اور ستاروں کا انکار کیا، اور جن لوگوں نے کہا کہ ستاروں کی وجہ سے بارش ہوئی، تو وہ لوگ ستاروں پر ایمان لائے اور میرا انکار کیا۔ (بخاری شریف، مسلم شریف)[۳]

اور ایک روایت میں آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پانچ سال تک بارش کو روکے رکھیں، پھر بارش ہو تو کچھ لوگ کافر ہو جائیں گے، کیوں کہ وہ یہ کہنے والے ہوتے ہیں کہ فلاں ستارے کی وجہ سے ایسا ہوا۔ (نسائی شریف)[۴]

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت کا انکار کر کے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ستاروں کی وجہ سے دنیا میں بارش ہوئی ہے، اسی طرح قحط سالی، سردی، گرمی، یا گرانی اور ارزانی میں ستاروں کو مؤثر مانتے ہیں، تو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کرتے ہیں اور اُس کی قدرت و طاقت میں دوسروں کو شریک گردانتے ہیں، اس سے اُن کا ایمان باقی نہیں رہتا اور ایمان سے خارج ہو جاتے ہیں۔

(۲) کاہن: یہ لوگ شیاطین و جنات سے تعلق رکھ کر اُن کی بتائی ہوئی باتیں لوگوں کو بتاتے ہیں، یہ

---

[۳] عن زيد بن خالد الجهني، قال: صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاة الصبح بالحديبية في إثر السماء كانت من الليل، فلما انصرف أقبل على الناس فقال: هل تدرون ماذا قال ربكم؟ قالوا: الله ورسوله أعلم، قال: "قال: أصبح من عبادي مؤمن بي وكافر، فأما من قال: مطرنا بفضل الله ورحمته، فذلك مؤمن بي كافر بالكوكب، وأما من قال: مطرنا بنوء كذا وكذا فذلك كافر بي مؤمن بالكوكب. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۱۷، رقم الحديث: ۸۴۶، كتاب الإيمان، باب يستقبل الإمام الناس إذا سلم، ط: البدر - ديوبند)

(وكذا في صحيح مسلم: ۱/ ۵۹، رقم الحديث: ۷۱، كتاب الإيمان، باب بيان كفر من قال: مطرنا بالنوء، ط: البدر - ديوبند)

(۴) عن أبي سعيد الخدري، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لو أمسك الله عز وجل المطر عن عباده خمس سنين ثم أرسله، لأصبحت طائفة من الناس كافرين يقولون: سقينا بنوء المجدح. (سنن النسائي: ۳/ ۱۶۵، رقم الحديث: ۱۵۲۶، كتاب الاستسقاء، كراهية الاستمطار بالكوكب، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب ☆ وراجع إلى النسخة الهندية: ۱/ ۱۷۲، ط: البدر - ديوبند)

بھی حرام ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو لوگ کاہنوں کے پاس جا کر اُن کی باتوں کو سنتے اور مانتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئے ہیں، اُن کا انکار کرنے والے ہیں۔ (احمد وابوداؤد)[۵]

پس جو لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جناتوں نے اس طرح بتایا ہے، چناں چہ ایسا ہی ہوگا، تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے انکار کی وجہ سے اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

(۳) **عریف:** تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں، جو دانوں یا ناخون میں دیکھ کر چور کی نشان دہی کرتے ہیں یا بیماری کا علاج کرتے ہیں، نیز اس کے ذریعہ بھوت پریت وغیرہ دور کرتے ہیں، یہ سب چیزیں بھی حرام ہیں، اِن لوگوں کو "عریف" کہا جاتا ہے، شریعت میں کسی کو چور ثابت کرنے کے لیے گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔[۶]

دانے دیکھ کر بتانے میں بہت سے اچھے لوگوں پر بھی شک ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں بدظنی، فتنہ، فساد اور دشمنی پیدا ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو شخص عریف کے پاس گیا اور اُس سے کسی بارے میں سوال کیا، اُس کی چالیس دن کی نماز قبول نہیں ہوگی۔ (مسلم شریف)[۷]

---

(۵) عن أبي هريرة، والحسن، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من أتى كاهنا، أو عرافا، فصدقه بما يقول، فقد كفر بما أنزل على محمد. (مسند أحمد: ۱۵/ ۳۳۱، رقم الحديث: ۹۵۳۶، مسند أبي هريرة رضي الله عنه، ط: مؤسسة الرسالة)
وفي سنن أبي داؤد: عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من أتى كاهنا فصدقه بما يقول أو أتى امرأته في دبرها فقد برئ مما أنزل على محمد. (سنن أبي داؤد: ۲/ ۵۳۵، رقم الحديث: ۳۹۰۴، كتاب الطب، باب النهي عن إتيان الكاهن، ط: المكتبة الأشرفية - ديوبند)

(۶) والعراف: هو الذي يدعي معرفة الشيء المسروق، ومكان الضالة، ونحوهما من الأمور، هكذا ذكره الخطابي في معالم السنن. (شرح النووي على صحيح مسلم: ۱۰/ ۲۳۲، باب تحريم ثمن الكلب وحلوان الكاهن، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)
ومنهم من كان يزعم أنه يعرف الأمور بمقدمات أسباب يستدل بها على مواقعها من كلام من يسأله أو فعله أو حاله وهذا يخصونه باسم العراف كالذي يدعي معرفة الشيء المسروق ومكان الضالة ونحوهما. (عمدة القاري شرح البخاري: ۱۸/ ۲۰۷، باب ثمن الكلب، دار الكتاب، بيروت)

(۷) عن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: من أتى عرافاً فسأله عن شيء، لم تقبل له صلاة أربعين ليلة. (صحيح مسلم: ۲/ ۲۳۳، رقم الحديث: ۱۲۵-(۲۲۳۰)، كتاب السلام، باب تحريم الكهانة وإتيان الكهان، ط: ديوبند
☆ المعجم الكبير - الطبراني: ۲۳/ ۲۱۵، رقم الحديث: ۳۹۱، ط: مكتبة ابن تيمية، ت: : حمدى عبد المجيد السلفي)

الحاصل اس قسم کے افراد کے پاس جانا اور فال نکلوانا یا اپنی حاجات اُن سے حل کروانا جائز نہیں ہے۔فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] صوفی کی صوفیت پر مذاق اڑانا

۱۵۲-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ زید پابند صوم وصلاۃ ہے، عمامہ باندھتا ہے اور ہاتھ میں عصا بھی لیے رہتا ہے، خالد اس پر ہمیشہ ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ ''ماشاء اللہ آپ تو صوفی صاحب ہیں، بڑے عابد وزاہد معلوم ہوتے ہیں، لگتا ہے آپ سفر معراج سے تشریف لائے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ کہنا جائز ہے یا ناجائز؟ ایسے الفاظ استعمال کرنے والے شخص کے بارے میں شریعت کیا کہتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں دیکھا جائے گا کہ ان الفاظ کے کہنے سے زید کا استہزاء مقصود ہے یا اس کی تعریف، عصا، عمامہ اور سنت ودین کے استخفاف کی نیت ہے یا کچھ اور؟ یعنی زید یہ الفاظ کیوں کہتا ہے؟ اگر نفس زید کا استہزاء مقصود ہے، تو یہ ناجائز ہے، قرآن کریم میں ہے کہ ''ایک قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے'' ہوسکتا ہے کہ جس کا مذاق اڑایا جارہا ہے، وہ مذاق اڑانے والوں سے بہتر ہو'' (سورۂ حجرات)[۱] اس آیت کے تحت صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ ''جس کا تمسخر ہو رہا ہے، اس کو تنقیص کی نگاہ سے دیکھنا بھی جائز نہیں''۔ اور علامہ قرطبی کا قول نقل کیا ہے کہ تمسخر سے مراد استحقار اور توہین ہے، یعنی مسخور منہ (جس کا مذاق اڑایا جارہا ہے) کی غلطی یا اس کی شکل وصورت پر ہنسنا یا قولاً، فعلاً، اشارۃً وایماءً اس کو تکلیف دینا ہے اور یہ سب ناجائز ہیں۔ (روح المعانی)[۲] اور احکام القرآن میں ہے کہ مسلمان کو اذیت دینا فسق ہے اور فسق ناجائز ہے، وأذية

---

(۱) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَى أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَى أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ. [۴۹-الحجرات: ۱۱]

(۲) وفي الزواجر: النظر إلي المسخور منه بعين النقص، وقال القرطبي: السخرية الاستحقار والاستهانة والتنبيه علي العيوب والنقائص بوجه يضحك منه، وقد تكون بالمحاكاة بالفعل والقول أو الإشارة أو الإيماء أو الضحك علي كلام المسخور منه إذا تخبط فيه أو غلط أو علي صنعته أو قبيح صورته. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني-شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م: ۱۲۷۰ھ): ۱۳/ ۳۳۰، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت، الطبعة الأولي: ۱۴۱۵ھ)

المسلم فسوق و ذلك لايجوز. (احکام القرآن)[۳] لہٰذا ایسا شخص فاسق وگنہگار ہوگا، اس کو اپنے اس فعل شنیع سے توبہ کرنا چاہیے اور اس سے باز آنا چاہیے۔

اور اگر قائل کا مذکورہ قول سے عصا، عمامہ اور سنت ودین کا استہزاء مقصود ہے، تو یہ کفر ہے، ملا علی قاریؒ نے ظہیریہ سے نقل فرمایا ہے: "من قال لفقيه أخذ شاربه ما أعجب قبحاً أو أشد قبحاً أخذ الشارب ولف طرف العمامة تحت الذقن يكفر يعني وهو مستلزم لاستخفاف الانبياء لأن العلماء ورثة الانبياء وقص الشارب من سنن الأنبياء فتقبيحه كفر بلااختلاف بين العلماء". (شرح الفقه الأكبر - ملاعلي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۲۱۳، فصل في العلم والعلماء، ط: یاسر ندیم - دیوبند)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ انبیاء کی سنتوں میں سے کسی بھی سنت کا استخفاف کفر ہے اور عصا، عمامہ وغیرہ حضور اکرم ﷺ کی سنت ہے؛ لہٰذا ان کا استخفاف بھی کفر ہوگا، مسایرہ میں ہے: "ولاعتبار التعظيم المنافي للاستخفاف كفر الحنفية بألفاظ كثيرة وأفعال تصدر من المتهتكين لدلالتها على الاستخفاف بالدين كالصلاة بلا وضوء عمدا ،بل بالمواظبة على ترك سنة استخفافا بها، بسبب أنه إنما فعلها النبي - صلى الله عليه وسلم - زيادة أو استقباحها كمن استقبح من آخر جعل بعض العمامة تحت حلقه أو إحفاء شاربه اهـ. (البحر الرائق: ۵/۱۱۹، باب أحكام المرتدين، ط: دار الكتاب الإسلامي)

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ سنت کو برا سمجھنا کفر ہے، عمدۃ الفقہ میں ہے کہ: "ہمارے امام صاحب امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس (کفر وعدم کفر) کا ضابطہ یہ ہے کہ سنت، حدیث قولی وفعلی یا حضرت ﷺ کے کسی حال شریف کو کوئی شخص حقارت یا انکار کرے تو کافر ہوجاتا ہے" ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: "کسی نبی کی اہانت مثلاً اس کی کسی بات پر عیب لگایا یا اس کے کسی فعل پر ہنسی کی ...... الی قولہ، ان سب صورتوں میں کافر ہوگیا۔ (عمدۃ الفقہ: ۱/۵۹)[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۳) المسألة الثالثة قوله: {بئس الاسم الفسوق بعد الإيمان} [الحجرات: ۱۱] يعني أنك إذا ذكرت صاحبك بما يكره فقد آذيته، وإذاية المسلم فسوق، وذلك لا يجوز. (أحكام القرآن - القاضي أبو بكر بن العربي المعافري الاشبيلي المالكي (م: ۵۴۳ھ): ۴/۱۵۵، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية-بيروت، الطبعة الثالثة: ۱۴۲۴ھ- ۲۰۰۳م)

[۴] "عمدۃ الفقہ: ۱/۴۷، کتاب الایمان، کلمات کفر اور اس کے موجبات، ط: مکتبہ تھانوی - دیوبند۔

[۹] بدعات پھیلانے والے اور اکابر دیوبند کو کافر کہنے والے امام کا حکم

۱۵۳-سوال: ہمارے یہاں بڑودہ کی جامع مسجد میں ایک عالم دین، جمعہ اور عیدین کے خطیب و امام ہیں، نیز وہ اپنے محلہ کی مسجد میں پنج وقتہ نماز کے امام بھی ہیں؛ لیکن ان کے عقائد اہل سنت والجماعت کے عقائد سے مختلف ہیں۔

۱۹۷۱ء میں بڑودہ میں جب پہلی مرتبہ جماعت اسلامی کا جلسہ ہوا، تو ان امام صاحب نے اس میں کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مدعوئین میں ان کا نام سرفہرست تھا اور وہ اس میں شریک بھی ہوئے۔ اور نومبر ۱۹۸۳ء میں جماعت اسلامی نے ایک کانفرنس کی تھی، اس میں بھی ان کو دعوت دی گئی، ان کے محلہ ہی میں جماعت اسلامی کا یہ پروگرام تھا، اس میں تقریر کرنے والوں کی فہرست میں ان کا نام تھا؛ لیکن کسی عذر کی وجہ سے وہ شریک نہیں ہو سکے اور اپنی جگہ اپنے ایک لڑکے کو بھیجا، چناں چہ ان کے لڑکے نے اپنے والد کے بدلہ میں تقریر کی۔

گجرات کے علماء نے جماعت اسلامی کے دینی انحراف اور اعتقادی کج روی کے بارے جو متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے، مذکورہ امام اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں، علاوہ ازیں جن چیزوں کو علمائے حق، دلائل کی روشنی میں بدعت کہتے ہیں، ان کو یہ شخص جائز سمجھتے ہیں اور اپنی تقریر میں بھی بہت سی بدعات کو بیان کر کے ان کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت تھانویؒ اور مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ وغیرہ بزرگان دین کو کھلے عام کافر کہتے ہیں اور ان کے کفر کے متعلق متعدد مرتبہ فتویٰ بھی دے چکے ہیں، جس پر ہمارے پاس گواہ بھی موجود ہیں، ان سب احوال کے پیش نظر مندرجہ ذیل سوالات کا حل مطلوب ہے:

(۱) مذکورہ اوصاف کا حامل شخص پنج وقتہ نماز اور جمعہ وعیدین کی امامت کراتا ہو، تو اس کی امامت کے متعلق کیا حکم ہے؟

(۲) اگر کوئی شخص ان سب حالات کی وجہ سے اس کے پیچھے نماز نہ پڑھے اور دوسری مسجد میں کسی صحیح العقیدہ امام کے پیچھے نماز پڑھے، تو کیا اس میں کوئی حرج ہے؟

(۳) مسئلہ جاننے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس کے پیچھے نماز پڑھے، تو گنہ گار ہوگا یا نہیں؟ اور اس کے لیے نماز کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟

(۴) مقامی علماء اور دین دار طبقہ شخص مذکور کی امامت سے خوش نہیں ہیں، ایسی صورت میں ان کا امام

بننا شرعاً کیسا ہے؟

(۵) متقی، پرہیزگار اور متبع سنت علماء کو کافر کہنا کیسا ہے؟ اس سلسلہ میں شریعت کی حدود کیا ہیں؟ امید ہے کہ بہ حوالہ تمام سوالوں کے جوابات عنایت فرمائیں گے۔

فاروق آئی شیخ (بڑودہ)

الجواب حامداًومصلياً:

(۱) جس شخص کا عقیدہ اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے خلاف ہو اور ایسی جماعت کا متبع اور حامی ہو، جس کے اصول "ما أنا عليه و أصحابي" کے خلاف ہوں، اس جماعت کے اجلاس میں شریک ہو کر تقریر کرتا ہو اور غیر اسلامی احکام کو صحیح جانتا ہو، تو وہ فقہ کی اصطلاح میں بدعتی ہے۔[۱]

جو بات قرآن کریم، احادیث نبویہ اور قرون مشہود لہا بالخیر (وہ عہد جس کے بہتر ہونے کی خبر خود نبی کریم ﷺ نے دی ہو) سے ثابت نہ ہو، اس کی ترویج و اشاعت کرنے والا بدعتی ہی ہو سکتا ہے اور بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے؛ لہٰذا دوسری مسجد میں جا کر جمعہ اور عیدین کی نماز ادا کرنا چاہیے، ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا اور اس کی اقتداء کرنا درحقیقت اس کی عزت کرنا ہے، جب بدعتی کی تعظیم و تکریم ممنوع ہے۔[۲] (عالم گیری: ۱/ ۱۰۸، عمدۃ الفقہ: ۱/ ۲۰۱، بدائع الصنائع: ۱/ ۱۵۷)[۳]

---

(۱) وأما المبتدع فهو صاحب البدعة وهي كما في المغرب اسم من ابتدع الأمر إذا ابتدأه وأحدثه كالرفقة من الارتفاق والخلفة من الاختلاف ثم غلبت على ما هو زيادة في الدين أو نقصان منه اهـ۔۔۔ وعرفها الشمني بأنها ما أحدث على خلاف الحق المتلقى عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - من علم أو عمل أو حال بنوع شبهة واستحسان وجعل دينا قويما وصراطا مستقيما اهـ. (البحر الرائق: ۱/ ۳۷۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتب الإسلامي)

و قال الحصكفي [م: ۱۰۸۸هـ]: (ومبتدع) أي صاحب بدعة وهي اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول لا بمعاندة بل بنوع شبهة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۶۰-۵۶۱، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

(۲) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من وقر صاحب بدعة فقد أعان على هدم الإسلام. (الشريعة-أبو بكر محمد بن الحسين بن عبد الله الآجُرِّيُّ البغدادي (م: ۳۶۰هـ): ۵/ ۲۵۴۳، رقم الحديث: ۲۰۴۰، باب ذكر هجرة أهل البدع والأهواء، ت: د. عبدالله بن عمر بن سليمان الدميجي، ط: دار الوطن - الرياض / السعودية)

(۳) والصحيح أنه (المبتدع) إن كان يكفر لا تجوز، وإن كان لا يكفر تجوز مع الكراهة. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۵۷، كتاب الصلاة، فصل: بيان من هو حق بالإمامة وأولى بها، ط: دار الكتب العلمية ☆ عمدة الفقه: ۲/ ۵۵، ط: مكتبه تهانوي - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۴، كتاب الصلاة، الفصل الثالث: في بيان من يصلح إماما لغيره، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) متبع سنت امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے زیادہ ثواب حاصل ہوگا؛ اس لیے اسی مسجد میں نماز پڑھنی چاہیے، جس کا امام صحیح العقیدہ اور متبع سنت ہو۔

(۳) جو نماز کراہت تحریمی کے ساتھ ادا ہوئی ہو، اسے دوبارہ پڑھنا چاہیے۔ (عمدۃ الفقہ: ۱/۲۰۱)[۴] فاسق کے پیچھے ادا کی گئی نماز کا اعادہ واجب ہے۔(۵) ہاں اگر وقت نکل گیا، تو اعادہ کرنا واجب نہیں ہے، اور بدعتی تو فاسق سے بھی زیادہ گنہ گار ہے؛ لہٰذا اس کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز کا اگر وقت باقی ہو، تو لوٹانا ضروری ہے۔ اگر دوسری مسجد ہے، تو وہاں نماز پڑھیں، اگر دوسری کوئی مسجد نہ ہو، تو اسی کے پیچھے پڑھ لیں، مقتدیوں کو جماعت کا ثواب مل جائے گا۔(۶) مسجد کے متولیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ متبع سنت اور صحیح العقیدہ امام کا تقرر کریں اور ایسے امام کو مسجد کی امامت سے علاحدہ کردیں، البتہ اگر اس میں فتنہ کا اندیشہ ہو، تو ذمہ داران ومتولیان گنہ گار نہ ہوں گے۔ تاہم گھر میں نماز ادا کرنے کے بجائے مسجد میں اس امام کی اقتدا میں نماز ادا کی جائے، تاکہ جماعت کے ثواب سے محرومی نہ ہو۔(۷)

(۴) جس امام میں دینی اعتبار سے کوئی خرابی ہو اور لوگ اس سے ناراض ہوں، تو اس کی ذمہ داری ہے کہ منصب امامت سے سبک دوش ہوجائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تین شخصوں کی نماز قبول نہیں ہوتی ہے: ایک وہ شخص ہے ''جو امامت کراتا ہو اور لوگ اس کے کسی دینی امر پر ناراض ہوں'' (ابوداؤد شریف)[۸]

---

(۴) عمدۃ الفقہ: ۲/۵۶، تحت عنوان: قضا نماز کو پڑھنے کا بیان، ط: مکتبہ تھانوی - دیوبند۔

(۵) عمدۃ الفقہ: ۲/۵۶، تحت عنوان: جن لوگوں کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔

(۶) دیکھیے: عمدۃ الفقہ: ۲/۵۶، تحت عنوان مذکور۔

(۷) صلي خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۵۶۲، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت ☆البحر الرائق: ۱/۳۷۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/۱۳۴، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: المطبعة الأميرية - القاهرة)

(۸) عن عبد الله بن عمرو، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول: »ثلاثة لا يقبل الله منهم صلاة، من تقدم قوما وهم له كارهون، ورجل أتى الصلاة دبارا« والدبار: أن يأتيها بعد أن تفوته، »ورجل اعتبد محرره«. (سنن أبي داؤد: ۸۸، رقم الحديث: ۵۹۳، كتاب الصلاة، باب الرجل يؤم القوم وهم له كارهون، ط: البدر - ديوبند ☆سنن ابن ماجة، ص: ۶۹، رقم الحديث: ۹۷۰، كتاب الصلاة، باب من أم قوما وهم له كارهون، ط: البدر - ديوبند ☆المعجم الكبير - سليمان بن أحمد، أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰هـ): ۱۳/۱۷، رقم الحديث: ۱۷۶، عمران بن عبد المعافري، عن عبد الله بن عمرو، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية - القاهرة)

دوسری حدیث میں ہے کہ: تین شخصوں کی نماز ان کے سر سے اوپر نہیں جاتی ہے: ایک وہ شخص ہے: جو امامت کرائے اور لوگ اس کی کسی دینی بات پر ناراض ہوں۔ (ابن ماجہ)[۹] پس ایسے امام کے لیے ضروری ہے کہ امامت سے الگ ہوجائے، اگر وہ خود استعفیٰ نہیں دیتا ہے، تو متولی اس کو علاحدہ کردے؛ البتہ اس کا خیال رکھے کہ فتنہ وفساد پیدا نہ ہو۔ (۱۰)

(۵) کسی مسلمان کو کافر کہنا جائز نہیں، حرام ہے، جب تک وہ کسی دینی عقیدے یا ضروریات دین میں سے کسی کا انکار نہ کرے۔ (۱۱) اور متقی و پرہیزگار اور متبع سنت علماء پر- جنھوں نے اپنی زندگی دین کی خدمت کے لیے وقف کردی ہو- ان کی عبارتوں میں تحریف وترمیم کرکے کفر کا فتویٰ لگانا تو سخت حرام ہے؛ بل کہ ایسے فتویٰ لگانے والے کے ایمان کا خطرہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہے، تو یہ کفر کا لفظ دونوں میں سے کسی کی طرف لوٹے گا، یا تو جس کو کہا گیا اس کی طرف (جب کہ وہ واقعی کافر ہو) اور اگر وہ کافر نہ ہو، تو کہنے والے کی طرف (کہ اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا)۔ (مسلم شریف: ۱/۵۷)(۱۲) اس لیے کسی بھی مسلمان پر کفر کا فتویٰ لگانا حرام ہے اور اس میں خود فتویٰ دینے والے کے کفر کا اندیشہ ہے۔

شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے کہ اگر کوئی مسلمان ایسا لفظ بولے، جس میں کفر اور غیر کفر دونوں کا احتمال

---

(۹) عن ابن عباس، عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: "ثلاثة لا ترفع صلاتهم فوق رءوسهم شبرا: رجل أم قوما وهم له كارهون، وامرأة باتت وزوجها عليها ساخط، وأخوان متصارمان". (سنن ابن ماجة، ص:۶۹، رقم الحديث: ۹۷۱، كتاب الصلاة، باب من أم قوما وهم له كارهون، ط: البدر-ديوبند)

(۱۰) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: فتاویٰ رحیمیہ: ۲/۱۳۹-۱۴۰، ط: دارالاشاعت کراچی- پاکستان۔

(۱۱) ولانخرج العبد من الإيمان إلا بجحود ما أدخله فيه. (عقيدة الطحاوي، ص: ۹۳، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

(۱۲) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "أيما امرئ قال لأخيه: يا كافر، فقد باء بها أحدهما، إن كان كما قال، وإلا رجعت عليه". (الصحيح لمسلم: ۱/۵۷، رقم الحديث: ۶۰، باب بيان حال إيمان من قال لأخيه المسلم: يا كافر، كتاب الإيمان، ط: البدر - ديوبند☆صحيح البخاري، رقم الحديث: ۶۱۰۳-۶۱۰۴، كتاب الأدب، باب من كفر أخاه بغير تأويل فهو كما قال، *شعب الإيمان-أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۹/۴۳، رقم الحديث: ۶۲۳۷، تحريم اعراض الناس وما يلزم من ترك الوقوع فيها☆مسند الإمام أحمد بن حنبل (م: ۲۴۱ھ): ۹/۳۷، رقم الحديث: ۵۰۳۵، ت: شعيب الأرنؤوط- عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة)

ہو، تو اس کو مسلمان ہی تسلیم کیا جائے گا۔ [١٣] کہ ایک ہزار کافر کو کفر پر باقی رکھنا سہل ہے بہ مقابلہ اس بات کے، کہ ایک مسلمان پر بلاوجہ کفر کا حکم لگایا جائے۔

علماء دیوبند-جن کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے-رات و دن اللہ تعالیٰ کی یاد میں رہتے تھے، اللہ کے احکام کے پابند اور رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کے متبع اور نوافل و مستحبات کے خوگر تھے، آپ ﷺ سے والہانہ تعلق اور آپ ﷺ کے ایک ایک قول وفعل پر اپنی ساری کائنات فدا کر دینے والے تھے، جیسا اس پر ان کی لکھی ہوئی قرآن کریم کی تفاسیر، احادیث کی شرحیں اور مختلف فنون کی قیمتی تصنیفات شاہد عدل ہیں، ان کے متعلق کفر کا فتویٰ صادر کرنے والے کے کفر کا اندیشہ ہے۔

شرح مسلم میں لکھا ہے کہ تم ظاہر کے مکلف ہو اور دل کی باتیں اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں، پس آدمی زبان سے جو کچھ بولے، اس پر اعتماد کرلو اور جو کلمہ پڑھ لے، اس پر مسلمان ہونے کا حکم لگادو۔(نووی:١/٦٨) [١٤]

لہٰذا مذکورہ بزرگان دین کی کتابوں کی عبارتوں کو توڑ مروڑ کر غلط اعتراض کرنا اور ان پر کفر کا فتویٰ لگانا حرام ہے، جو امام ایسا کرے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[١٠] کسی کو محض اردوداں ہونے کی وجہ سے ''مفتی سخن'' کا لقب دینا

١٥٤-سوال: ''انجمن ترقی اردو'' سورت کی جانب سے ١٧/اگست ١٩٧٥ء کو منعقد مشاعرہ میں مجھے ''مفتی سخن'' کا خطاب دیا گیا، یہاں مخالفین حضرات لفظ ''مفتی'' کے لغوی معنی کا سہارا لے کر اعتراض

---

(١٣) وقد ذكروا أن المسئلة المتعلقة بالكفر إذا كان لها تسع وتسعون احتمالا للكفر واحتمال واحد في نفيه فالأولى للمفتي والقاضي أن يعمل بالاحتمال النافي؛ لأن الخطأ في إبقاء ألف كافر أهون من الخطأ في افناء مسلم واحد. (شرح الفقه الأكبر-الملا علي القاري،ص:١٩٩،ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی دیوبند☆رد المحتار: ٦/٣٦٧، كتاب الجهاد، باب المرتد، ط:دار الفكر-ديوبند)

(١٤) ومعناه أنك إنما كلفت بالعمل بالظاهر وما ينطق به اللسان، وأما القلب فليس لك طريق إلى معرفة ما فيه... يعني وأنت لست بقادر على هذا، فاقتصر على اللسان فحسب يعني ولا تطلب غيره. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج المعروف بـ"حاشية النووي على مسلم"-: أبو زكريا النووي (م:٦٧٦هـ):١/٦٨-٦٩، بذيل حديث باب تحريم قتل الكافر بعد قوله لا إله إلا الله، ط:البدر- ديوبند☆ فتح الملهم-العلامة شبير أحمد العثماني: ١/٢٦٠، ط:المكتبة الأشرفية-ديوبند)

کرتے ہیں کہ انجمن کے اراکین نے مفتی کے ساتھ ''سخن'' کا لفظ شامل کر کے تخصیص کر دی ہے کہ آپ دینی معاملات کے فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں؛ بل کہ صرف شعر و شاعری کے معاملات کے فیصلہ کرنے والے ہیں؛ اس لیے خواہش ہے کہ درج ذیل سوال کا مفصل جواب تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

سوال یہ ہے کہ کسی شاعر کو محض اس کی فنی معلومات کی بنیاد پر ''مفتی سخن'' کا خطاب دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ''مفتی سخن'' سے ''سخن اور شعر و شاعری میں فیصلہ کرنے والا'' مراد ہے، ایسا خطاب حاصل کرنے یا دینے سے ایمان پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا؟ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(عامر سورتی، سید پورہ، سورت)

الجواب حامداومصلیا:

اگر کسی شاعر کو محض اس کی فنی معلومات کی بنیاد پر ''مفتی سخن'' کا خطاب دیا گیا ہے، تو اس سے نہ تو خطاب دینے والوں کے ایمان پر کوئی منفی اثر پڑے گا اور نہ شاعر کے ایمان پر۔ البتہ لفظ ''مفتی'' کا شریعت کی اصطلاح میں ایک مخصوص معنی پر اطلاق ہوتا ہے۔ (۱) لہٰذا اس قسم کے اصطلاحی الفاظ کو ''سخن'' کے ساتھ لاحق نہیں کرنا چاہیے، اس سے احتراز کی ضرورت ہے، ورنہ آپ مطمئن رہیں، آپ نے اور آپ کے رفقاء نے کوئی گناہ کا کام نہیں کیا، جس سے آپ کے یا ان کے ایمان میں کوئی خلل واقع ہو۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۱۱] مکمل ملکیت پر تنہا قبضہ جمانے والا وارث کافر ہے؟

۱۵۵-سوال: ایسا سننے میں آیا ہے کہ مختلف ورثاء کی موجودگی میں کوئی ایک وارث پوری ملکیت اور زمین و جائداد پر تنہا غاصبانہ قبضہ کر لے اور دوسرے ورثاء کو ان کا حق دینے سے انکار کر دے، تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

سید عبدالرحمن سید نصیر الدین، انکلیشور

---

(۱) علامہ نوویؒ شرح مہذب میں تحریر فرماتے ہیں: شرط المفتي كونه مكلفا، مسلما، ثقة، مأمونا، متنزها عن أسباب الفسق و خوارم المروءة فقيه النفس سليم الذهن رصين الفكر صحيح التصرف والاستنباط متيقظا. (المجموع شرح المهذب- النووي (٦٧٦هـ): ١/٤١، باب اداب الفتوى والمفتي والمستفتي، ط: دار الفكر بيروت)

نوٹ: - دور حاضر میں اس شخص کو مفتی کہا جاتا ہے، جس نے ماہر فن علماء کی نگرانی میں افتا کے مخصوص کورس کی تکمیل کی ہو۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ایسا شخص کافر تو نہیں ہوگا۔ (۱) البتہ اس طرح حرام کام کرنے، دین کی بے عزتی کرنے اور رات دن اسی فکر میں رہنے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ وہ کہیں ایمان سے نہ ہاتھ دھو بیٹھے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ

۲۹/۱/۱۹۶۹ء

[۱۲] غیروں کی مشابہت اختیار کرنے والے کا شرعی حکم

۱۵۶-سوال: ہمارے گاؤں میں ایک بہروپیہ (نقال ومکار) ہے، جو غیر مسلموں کے تمام کام اور ان کے رسوم ورواج وغیرہ ادا کرتا ہے اور ہندوانہ لباس بھی پہنتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا وہ مسلمان ہے؟ اگر اس کے یہاں کسی کا انتقال ہوجائے، تو تعزیت کے لیے جانا، اس کی میت کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا اور اس پر جنازہ کی نماز پڑھنا کیسا ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کے یہاں میت میں نہیں جانا چاہیے، میرے مطالعے میں یہ بات آئی ہے کہ جو شخص جس قوم کی مشابہت اختیار کرے گا، قیامت کے دن وہ اسی قوم کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ تو اس سلسلے میں آپ سے جواب مطلوب ہے۔

احمد محمد ماسٹر، اولاڑی، بلساڑ

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب کوئی مسلمان اپنی مرضی سے ہندوانہ لباس پہنے، غیروں کی مشابہت اختیار کرے اور ان کے جیسا کام کرے، تو وہ اسلام سے نکل جائے گا۔ (۲)

اس کی عورت اس کے لیے حرام ہوجائے گی، ان تمام کاموں سے توبہ کرے اور دوبارہ کلمہ پڑھے، تو اسلام میں داخل ہوگا اور نئے نکاح کرے گا، تو بیوی دوبارہ نکاح میں آئے گی۔ (۳)

---

(۱) ولا يخرج العبد من الإيمان إلا بجحود ما أدخله فيه. (العقيدة الطحاوية: ص۶۱، ط: المكتب الإسلامي- بيروت)

(۲) فيكفر... بوضع قلنسوة المجوسي على رأسه على الصحيح... وبشد الزنار في وسطه. (البحر الرائق: ۵/ ۱۳۳، باب أحكام المرتدين، ط: دار الكتاب الإسلامي☆الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۷۶، كتاب السير، مطلب في موجبات الكفر أنواع، منها: ما يتعلق بالإيمان والإسلام، ط: دار الفكر- بيروت☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۶۹۸، كتاب السير، باب المرتد، ألفاظ الكفر أنواع، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۳) وإن كانت نيته الوجه الذي يوجب التكفير لا تنفعه فتوى المفتي، ويؤمر بالتوبة والرجوع عن ذلك وبتجديد=

شرح فقہ اکبر میں ہے کہ ”اگر کوئی مسلمان مذاق میں یا لوگوں کو ہنسانے کی لیے یہود و نصاریٰ کا لباس پہنے، تو وہ کافر ہو جائے گا، اسی طرح وہ مجوسیوں کی ٹوپی پہنے، تو بھی کافر ہو جائے گا اور کافروں کا زنار باندھے، تو بھی کافر ہو جائے گا۔“[1]

اس لیے مذکور آدمی کافروں جیسا کام کرنے کی وجہ سے دائرۂ اسلام سے نکل گیا ہے، اس کے یہاں اگر کسی کا انتقال ہو گیا اور وہ لوگ کافروں جیسا کام نہیں کرتے تھے، تو وہ اپنے اسلام پر باقی رہیں گے، اس کی بیوی اور بچے اگر اس طرح کا کام نہیں کرتے تھے، تو وہ بھی دائرۂ اسلام سے نہیں نکلیں گے، چھوٹے نابالغ بچے اپنے والدین میں سے جس کا مذہب بہتر ہوگا، اس کے تابع مانے جائیں گے۔[2] لہٰذا ان کو مسلمان سمجھ کر ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ کیا جائے گا، ان کے انتقال کے بعد ان کو مسلمانوں کے طریقے کے مطابق غسل بھی دیا جائے گا، کفن بھی پہنایا جائے گا اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن بھی کیا جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ
۲۶/۱۰/۱۹۷۷ء

[۱۳] مذہبی جلوس میں استعمال کے لیے غیر مسلم کو قرآن مجید دینا

۱۵۷-سوال: ”حسن موڑ والا“ نامی ایک مسلمان نے قرآن مجید ایک غیر مسلم کو دیا اس مقصد

=النکاح بینه وبین امرأته کذا في المحیط. (الفتاوی الهندیة: ۲/ ۲۸۳، کتاب السیر، الباب العاشر في البغاة) (وارتداد أحد الزوجین) أي تبدل اعتقاد الإسلام بالکفر حقیقة علی أحدهما کما إذا تمجس، أو تنصر، أو حکما کما إذا قال بالاختیار ما هو کفر بالاتفاق (فسخ) أي رفع لفقد النکاح حتی لا ینتقص به عدد الطلاق سواء کانت موطوءة، أو غیرها (في الحال). [مجمع الأنهر في شرح ملتقی الأبحر-عبد الرحمن بن محمد المدعو بـ"شیخي زاده" و یعرف بـ"داماد أفندي" (م:۱۰۷۸ھ): ۱/ ۵۴۶-۵۴۷، کتاب النکاح، باب نکاح الکافر، ط: مکتبة فقیه الأمة-دیوبند ☆ رد المحتار علی الدر المختار: ۳/ ۷۳، کتاب النکاح، باب الولي)

(۱) وفي الفتاوی الصغری: من تقلنس بقلنسوة المجوس أی: لبسها وتشبه بهم فیها، أو خاط خرقة صفراء علی العاتق أي وهو من شعارهم أو شد في الوسط خیطا کفر إذا کان متشابها بخیطهم أو ربطهم أو سماه زناراً... ولو شبه نفسه بالیهود والنصاری أی صورة أو سیرة علی طریق المزاح والهزل أي: ولو علی هذا المنوال کفر. (شرح الفقه الأکبر، ص: ۲۲۷، ۲۲۸، فصل في الکفر صریحا وکنایة، ط: یاسر ندیم-دیوبند)

(۲) لأن الولد یتبع خیر الأبوین دینا. (رد المحتار علی الدر: ۲/ ۲۲۹، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۰۵، کتاب الجنائز، الصلاة علی المیت في المسجد، ط: دار الکتاب الإسلامي ☆ بدائع الصنائع: ۷/ ۱۰۴، کتاب السیر، فصل: في بیان ما یعترض من الأسباب المحرمة... الخ، ط: دار الکتب العلمیة)

سے دیا کہ وہ گوکوڑ آٹھم (ایک مورتی کا نام) اور گنیش کی مورتی کا جب جلوس نکالے، تو اس کی کھٹیا (جس پر مورتی کو رکھا گیا ہو) میں اسے (قرآن کریم کو) رکھ دے۔ وہ شخص اپنے اس عمل کی وجہ سے مسلمان رہے گا یا دائرہ اسلام سے خارج مانا جائے گا؟

حاجی محمد سلیمان بوڑیات، دوسا

الجواب حامداً ومصلیاً:

جو غیر مسلم قرآن مجید، عقائد اسلام اور دینی احکام کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہو، اس کو قرآن مجید اس شرط کے ساتھ دینا جائز ہے کہ وہ اس کی بے حرمتی اور بے ادبی نہیں کرے گا، اس کا احترام کرے گا، اس کو ادھر ادھر نہیں پھینکے گا۔[۱]

لیکن جو مسلمان قرآن مجید کی خود بے ادبی کرے یا دوسروں سے بے ادبی کروائے۔ (مثلاً وہ عمل، جس کا ذکر آپ نے سوال میں کیا ہے) تو وہ ایمان سے نکل جائے گا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہٗ
۹/۱۱/۱۹۷۷ء

[۱۴] جھوٹے عاملوں اور پیروں کو ماننا اور ان کی باتوں پر عمل کرنا

۱۵۸-سوال: ہمارے پرکھوں نے جن باپوؤں اور پیروں کی باتوں کو مانا اور ان پر عمل کیا ہے، کیا ہمارے لیے جائز ہے کہ ہم بھی ان کی باتوں کو مانیں اور ان پر عمل کریں؟

---

(۱) والحاصل مما سبق أن وقوع المصحف بأيدى الكفار إنما يمنع منه إذا خيف منهم إهانته، أما إذا لم يكن مثل هذا الخوف فلا بأس بذلك لا سيما لتعليم القرآن وتبليغه، والله أعلم. (تكملة فتح الملهم: ۳/۳۸۶، باب النهي أن يسافر بالمصحف... الخ، ط: المكتبة الأشرفية - ديوبند)

(۲) من استخف بالقرآن... كفر. (شرح الفقه الأكبر ص: ۲۰۵، فصل: في القراءة والصلاة، ط: ياسر نديم - ديوبند)
وفي الفتح: من هزل بلفظ كفر ارتد وإن لم يعتقده للاستخفاف فهو ككفر العناد. (الدر المختار) قال ابن عابدين الشامي: (قوله من هزل بلفظ كفر) أي تكلم به باختياره غير قاصد معناه، وهذا لا ينافي ما مر من أن الإيمان هو التصديق فقط أو مع الإقرار؛ لأن التصديق، وإن كان موجودا حقيقة، لكنه زائل حكما، لأن الشارع جعل بعض المعاصي أمارة على عدم وجوده كالهزل المذكور، وكما لو سجد لصنم أو وضع مصحفا في قاذورة فإنه يكفر، وإن كان مصدقا، لأن ذلك في حكم التكذيب، كما أفاده في شرح العقائد،... ويظهر من هذا أن ما كان دليل الاستخفاف يكفر به، وإن لم يقصد الاستخفاف. (رد المحتار على الدر: ۴/۲۲۲، كتاب الجهاد، باب المرتد، ط: دار الفكر - بيروت)

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ عاملوں (باپوؤں)، پیروں اور سادھوؤں؛ سب سے آپ مکمل کنارہ کشی اختیار کریں؛ کیوں کہ یہ لوگ ناجائز اور حرام کاموں کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں، اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے میری کتاب عقائد اسلام [1] اگر مل جائے، تو اس کا ضرور مطالعہ کیجیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] مندر کے باپو، جوگی اور سادھوسنت سے علاج کرانا جائز ہے یا نہیں؟

۱۵۹-سوال: ایک جگہ ایک بھگت (غیر مسلم باپو) کئی بیماریوں کا علاج کرتا ہے، بہت سے مسلمان بھی اس کے پاس علاج کے لیے جاتے ہیں، وہ باپوان کو پڑھ کر کچھ دانے دیتا ہے، اور مندر میں ہندو رسم ورواج کے مطابق عمل کراتا ہے، جیسے ناریل پیسے رکھواتا ہے، اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ان سے رکھواتا ہے، جو مسلمان علاج کے لیے جاتے ہیں، وہ اس مندر کے باپو کو پیسے بھی دیتے ہیں، تو کیا اس سے ان مسلمانوں کا ایمان سلامت رہے گا؟ اگر نہیں، تو دوبارہ ایمان میں داخل ہونے کے لیے ان کو کلمہ پڑھنا پڑے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورتِ مسئولہ میں بھگت خود اگر دھاگے یا پانی پر دم کر کے دیتا ہے اور مسلمان کچھ بھی نہیں کرتے ہیں، تو وہ ایمان سے خارج نہیں ہوں گے، اس لیے ان کو دوبارہ کلمہ پڑھنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ [2] لیکن ایک مسلمان کا مندر میں جا کر غیر اسلامی اور شرکیہ کام کرنا؛ مثلاً: وہاں جا کر ناریل چڑھانا یا مندر میں پیسے دینا سب ناجائز ہے، اس سے ایمان کا خطرہ ہے، ان کاموں سے ایک مسلمان کا بچنا ضروری ہے۔ [3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عقائد اسلام، مترجم اُردو (ترجمہ: محمد ارشد پالن پوری فلاحی) ناشر: حافظ امجد کینیڈا۔

(۲) وفيه إشارة إلى أن المريض يجوز له أن يستطب بالكافر فيما عدا إبطال العبادة. (رد المحتار: ۲/ ۴۲۳، كتاب الصوم، فصل في العوارض المبيحة لعدم الصوم، ط: دار الفكر-بيروت)

رقية فيها اسم صنم أو شيطان أو كلمة كفر أو غيرها مما لا يجوز شرعا، ومنها مالم يعرف معناها. (مرقاة المفاتيح: ۸/ ۳۱۸، كتاب الطب والرقى: ط: رشيديه، كوئٹه)

(۳) لايتخذ المؤمنون الكافرين أولياء من دون المؤمنين. [۳-ال عمران: ۲۸]

أن كل ما عداه العرف تعظيما وحسبه المسلمون موالاة فهو منهي عنه، ولو مع أهل الذمة، لاسيما إذا أوقع شيئا في قلوب ضعفاء المؤمنين. (روح المعاني: ۳/ ۱۲۰، سورة آل عمران: ۲۸، دار إحياء التراث العربي-بيروت) =

[۱۶] نامناسب کلمہ کا بے اختیار زبان سے نکل جانا
[۱۷] محرم کے پہلے عشرہ میں شادی کرنے کا حکم
[۱۸] تعزیہ بنانا

۱۶۰-سوال: کاٹھیاواڑ کے شرک وبدعت کے علاقہ میں ایک مولانا صاحب شرک وبدعت کے خلاف تقریر فرمارہے تھے، تقریر کا موضوع "حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سیرت" تھا، اپنی تقریر میں مولانا صاحب یزید کے دربار میں عبد اللہ بن زیاد کے منہ سے سانپ نکلنے کا واقعہ (۱) بیان کررہے تھے، تو ان کی زبان سے غلطی سے یہ جملہ نکل گیا کہ سانپ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے منہ سے نکلا۔ ایک ذمہ دار شخص نے کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے منہ سے سانپ ہرگز نہیں نکل سکتا، اس کے بعد اس ذمہ دار شخص نے مولوی صاحب سے اپنے اعلان کی تصدیق کراتے ہوئے دریافت کیا کہ یہ صحیح ہے یا نہیں؟ تو جواب

=وفي الفتاوى الصغرى: من تقلنس بقلنسوة المجوس، أي لبسه، و تشبه بهم فيها، أو خاط خرقة صفراء على العاتق، أي وهو من شعارهم، أو شد في الوسط خيطا كفر، إذا كان متشابها بخيطهم أو ربطهم، أو سماه زنارا. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۲۲۷-۲۲۸، ط: یاسر ندیم - دیوبند)

وعن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم. (سنن أبي داؤد، ص: ۵۵۹، رقم: ۴۰۳۱، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة، ط: البدر - دیوبند)

(۱) عن يزيد بن أبي زياد قال: لما جيء برأس ابن مرجانة (أي ابن زياد) وأصحابه طرحت بين يدي المختار، فجاءت حية رقيقة، ثم تخللت الرؤوس حتى دخلت في فم ابن مرجانة، وخرجت من منخره، ودخلت في منخره، وخرجت من فمه، وجعلت تدخل وتخرج من رأسه من بين الرؤوس. (البداية والنهاية - ابن كثير الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۳۱۵/۸، مقتل المختار بن أبي عبيد على يدى مصعب بن الزبير، ت: علي شيري، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت ☆ تاريخ دمشق - ابو القاسم ابن عساكر (م: ۵۷۱هـ): ۴۶۱/۳۷، عبد الله بن زياد بن عبيد المعروف بابن أبي سفيان، ت: عمرو بن غرامة العمروي، ط: دار الفكر - بيروت)

عن عمارة بن عمير، قال: "لما جيء برأس عبيد الله بن زياد وأصحابه نضدت في المسجد في الرحبة، فانتهيت إليهم وهم يقولون: قد جاءت، قد جاءت، فإذا حية قد جاءت تخلل الرءوس، حتى دخلت في منخري عبيد الله بن زياد فمكثت هنيهة، ثم خرجت فذهبت حتى تغيبت. ثم قالوا: قد جاءت، قد جاءت، ففعلت ذلك مرتين أو ثلاثا. «هذا حديث حسن صحيح». (سنن الترمذي: ۲۱۸/۲، رقم: ۳۷۸۰، أبواب المناقب، باب مناقب أبي محمد الحسن بن علي بن أبي طالب والحسين بن علي بن أبي طالب، ط: یاسر ندیم - دیوبند)

ملا: جی ہاں! بالکل صحیح ہے، ساتھ یہ بھی کہا کہ اگلے بیان میں اس کا اعلان ہوگا اور مزید باتیں ہوں گی، ان شاء اللہ۔

دوسرے دن بیان میں مولوی صاحب نے خود ہی صاف صاف اعلان کیا کہ ''سانپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے منہ سے نہیں نکلا ہے؛ بل کہ عبد اللہ بن زیاد کے منہ سے نکلا'' یہ بات اس نے تین مرتبہ کہی۔

مذکورہ مولوی صاحب نے کبھی کسی صحابی یا ولی یا بزرگ یا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی نہیں کی، اس کے باوجود بعض لوگ ان کو فاسق و فاجر اور کافر قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی'' آپ سے درخواست ہے کہ مندرجہ بالا تفصیلات کے پیش نظر درج ذیل سوالات کے جوابات مدلل طور پر عنایت فرمائیں:

(۱) کیا مذکورہ مولوی صاحب شرعی اعتبار سے فاسق و کافر ہیں یا نہیں؟

(۲) اگر فاسق یا کافر نہیں ہیں، تو کیا ان کے پیچھے نماز ہوگی یا نہیں؟

(۳) کسی مسلمان کو کافر کہنے کا کیا حکم ہے؟ ماہ محرم کے اول عشرہ میں شادی کرنا کیسا ہے؟ حرام یا جائز؟

(۴) تعزیہ وغیرہ بنانا کیسا ہے؟ اس کو دیکھنا اس کی منت ماننا وغیرہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

آپ کے مذکورہ سوالات کو پڑھ کر دکھ اور افسوس ہوا کہ آخر مسلم قوم کب جہالت و ضلالت کی تاریکیوں سے نکل کر سنت و ہدایت کے راستہ پر گامزن ہوگی۔

مذکورہ سوالات کے جوابات تحریر کرنے سے قبل بعض بنیادی باتیں تحریر کر رہا ہوں:

(۱) انسان کسی پر کفر کا فتویٰ لگانے کے لیے صرف اٹکل و اندازے اور عقل سے کام لے اور فقہاء نے جو قیود و شرائط لکھی ہیں، ان کا لحاظ نہ کرے، یہ قطعاً جائز نہیں، حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی نے اپنے بھائی کو کہا اے کافر! تو یہ جملہ دونوں میں سے کسی ایک کی طرف لوٹے گا۔ (مسلم شریف) [۱]

یعنی جس کے لیے کفر کا لفظ استعمال کیا ہے، اگر وہ واقعتاً کافر ہے، تو ٹھیک، ورنہ تو اسی کہنے والے ہی

(۱) عن عبد اللہ بن عمر رضي اللہ عنهما: أن رسول اللہ - صلی اللہ علیه وسلم - قال: «أیما رجل قال لأخیه یا کافر، فقد باء بها أحدهما». (صحیح البخاري: ۲/ ۹۰۱، رقم الحدیث: ۶۱۰۴، کتاب الأدب، باب من کفر أخاه بغیر تاویل فهو کما قال، ط: البدر - دیوبند☆صحیح مسلم: ۱/ ۵۷، رقم الحدیث: ۱۱۱ - (۶۰)، کتاب الإیمان، باب بیان حال إیمان من قال لأخیه المسلم: یا کافر، ط: البدر - دیوبند)

کی طرف لفظ کفر لوٹ آئے گا؛ اس لیے جو لوگ لفظ ''کافر'' کو اپنا تکیہ کلام بنا لیتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر کفر کا فتویٰ داغتے رہتے ہیں، ایسے لوگوں کو حدیث میں بیان کی ہوئی وعید سے ڈرنا چاہیے؛ کیوں کہ اس نے جس کے لیے کفر کا لفظ استعمال کیا ہے، اگر اس نے کفریہ کام نہیں کیا ہے؛ تو کہنے والے کی طرف وہ لفظ واپس لوٹے گا۔ چناں چہ فقہاء لکھتے ہیں کہ کسی نے کوئی ایسا لفظ استعمال کیا، جس کے ننانوے احتمالات کفر کے ہیں اور صرف ایک ایمان کا، تو اس صورت میں بھی اس کے مسلمان ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔ عقائد کی کتاب ''شرح فقہ اکبر'' میں لکھا ہے کہ ایک ہزار کافروں کو اپنی حالت پر باقی رکھنا نسبتاً آسان ہے، اس سے کہ کسی مسلمان کو کافر کہا جائے۔ [۲] لہٰذا کسی مسلمان کو کافر کہنا بہت بری چیز ہے، جب تک کفر کی صریح اور واضح دلیل موجود نہ ہو، کسی کو کافر نہیں کہہ سکتے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: میری امت سے غلطی اور نسیان کو اٹھالیا گیا ہے۔ (ابن ماجہ، بیہقی، مشکوۃ) [۳]

خطا: انسان بولنا کچھ چاہے اور زبان سے کچھ اور ادا ہو جائے۔ [۴] مثلاً یہاں کہنے کا ارادہ تھا کہ

---

(۲) وقد ذكروا أن المسئلة المتعلقة بالكفر إذا كان لها تسع وتسعون احتمالا للكفر واحتمال واحد في نفيه، فالأولى للمفتي والقاضي أن يعمل بالاحتمال النافي لان الخطأ في إبقاء ألف كافر أهون من الخطا في افناء مسلم واحد. (شرح الفقه الأكبر: ص ۱۹۹، المسئلة المتعلقة بالكفر، الخ، ط: ياسر نديم - ديوبند)

ويكفر... بقوله لمسلم يا كافر عند البعض... والمختار للفتوى أن يكفر إن اعتقده كافرا إلا إن أراد شتمه. (البحر الرائق: ۵/ ۱۳۳، كتاب السير، باب أحكام المرتدين، ط: دار الكتاب الإسلامي☆رد المحتار: ۴/ ۶۹، كتاب الحدود، باب التعزير، فرع: من عليه التعزير لو قال لرجل، الخ، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) «إن الله قد تجاوز عن أمتي الخطأ، والنسيان، وما استكرهوا عليه». (سنن ابن ماجة، ص: ۱۴۷، رقم: ۲۰۴۳ و ۲۰۴۵، كتاب الطلاق، باب طلاق المكره الناسي، ط: فيصل - ديوبند☆شرح معاني الآثار - أبو جعفر الطحاوي (م: ۳۲۱هـ): ۳/ ۹۵، رقم الحديث: ۴۶۴۹، كتاب الطلاق، باب طلاق المكره، ط: عالم الكتب☆صحيح ابن حبان: ۱۶/ ۲۰۲، برقم: ۷۲۱۹، كتاب التاريخ، باب فضل الأمة، ذكر الإخبار عما وضع الله بفضله عن هذه الأمة، مؤسسة الرسالة☆ورواه ابن ابي شيبة في مصنفه، برقم: ۱۸۰۳۶، ۱۹۰۵۱، والطبراني في المعجم الأوسط، برقم: ۲۱۳۷، ۸۲۷۳، وفي المعجم الصغير، برقم: ۷۶۵، وفي الكبير برقم: ۱۱۲۷۴، ۱۴۳۰)

(۴) (قوله: ومنها الخطأ، وهو أن يفعل فعلا من غير أن يقصده قصدا تاما)، وذلك أن تمام قصد الفعل بقصد محله، وفي الخطأ يوجد قصد الفعل دون قصد المحل، وهذا مراد من قال: إنه فعل يصدر بلا قصد إليه عند مباشرة أمر مقصود سواء. (شرح التلويح على التوضيح - سعد الدين التفتازاني (م: ۷۹۳هـ): ۲/ ۳۸۸، باب المحكوم عليه، العوارض المكتسبة من نفسه، الخطأ، ط: مكتبة صبيح - مصر)

سانپ عبد اللہ بن زیاد کے منہ سے نکلا؛ لیکن سبقت لسانی کی وجہ سے زبان سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نام نکل گیا، تو اس کو خطا کہیں گے، اس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں مواخذہ نہیں ہوگا۔

انسان ضعیف و ناتواں اور غلطیوں کا پتلا ہے، کبھی کبھی بے اختیار اس کی زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں، اس پر گناہ نہیں ہوتا ہے۔

(۳) انسان سے غلطی ہو جاتی ہے، مولانا صاحب نے جان بوجھ کر نہیں کہا ہے، دلیل اس کی یہ ہے کہ مولانا صاحب نے اس کے بعد اعلان کر کے اپنی غلطی کا اقرار کر لیا؛ لہٰذا لوگوں کو ان کی بات قبول کرنا چاہیے، مولانا موصوف کے بارے میں بدظن ہونا اور ان کے لیے کفر و فسق جیسے الفاظ کا استعمال کرنا ہرگز درست نہیں؛ حرام ہے۔

(۱) سوال میں ذکر کردہ تفصیل کے لحاظ سے مولانا صاحب گنہ گار نہیں ہوں گے، انہوں نے غلطی کا اقرار کیا ہے، لوگوں کے لیے اس کا قبول کرنا ضروری ہے، فاسق و فاجر تو وہ لوگ ہوں گے، جو مولانا صاحب پر کفر کا فتویٰ لگا رہے ہیں۔

(۲) مولانا موصوف کے پیچھے نماز جائز ہے، مذکورہ وضاحت کے مطابق انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔[۵] بعض لوگ پھر بھی اس کو گناہ سمجھتے ہوں، حالاں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نزدیک گناہ نہیں ہے، تو لوگوں کی اس سمجھ کا اعتبار نہیں ہوگا۔

(۳) بغیر کسی شرعی وجہ اور قوی دلیل کے کسی کو کافر کہنا حرام ہے، جن جن لوگوں نے مولانا موصوف کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں، ان کے لیے مولانا سے معافی مانگنا لازم ہے۔

(۴) محرم کے پہلے عشرہ میں شادی بیاہ کرنا جائز ہے۔[۶] آج کل لوگ محرم کے پہلے عشرہ میں شادی

---

(۵) فقد صرح قاضي خان في فتاواه بأن الخاطئ إذا جرى على لسانه كلمة الكفر خطأً، لم يكن ذلك كفراً عند الكل. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۱۹۹، ط: یاسر ندیم، دیوبند)

(۶) اہل بدعت محرم میں اس لیے شادی نہیں کرتے ہیں کہ یہ سوگ کا مہینہ ہے، اسی مہینہ میں حضرت حسین کو شہید کیا گیا تھا؛ لیکن یہ استدلال قطعاً غلط ہے، حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو خویش و اقارب کی موت پر تین دن اور شوہر کی موت پر بیوی کو چار مہینے دس دن سوگ منانے کی اجازت دی ہے: «لا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر أن تحد فوق ثلاث، إلا على زوج أربعة أشهر وعشرا». (صحیح مسلم: ۱/ ۴۸۶، کتاب الطلاق، باب انقضاء عدة المتوفى عنها زوجها، الخ، رقم: ۵۹-(۱۴۸۶)، ط: البدر، دیوبند)

اس کے علاوہ شریعت میں سوگ کا کوئی تصور نہیں ہے، نیز اس میں اعتقاداً یا عملاً محرم میں شادی کو ناجائز سمجھنا ہے، جو جائز نہیں: قال اللہ =

کرنے کو برا خیال کرتے ہیں، اور اس کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے تقاضۂ محبت کے خلاف گردانتے ہیں؛ لہٰذا جو شخص اس مہینے کے پہلے عشرہ میں شادی کر کے مذکورہ رسم ورواج کو ختم کرے گا اور اسلام کی حقیقی تصویر لوگوں کے سامنے پیش کرے گا، وہ عند اللہ اجر عظیم کا مستحق ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص میری امت کے فساد وبگاڑ کے زمانہ میں میری ایک سنت کو زندہ کرے گا، تو اس کو ۱۰۰ ر شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ (۷)

(۵) تعزیہ بنانا، اس کے لیے چندہ وصول کرنا اور اس کا دیکھنا؛ سب ناجائز وحرام ہیں۔ (۸)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی منت ماننے، تعزیہ وغیرہ کے نیچے سے نکلنے اور اس کو مؤثر بالذات سمجھنے سے ایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ (۹) ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ نفع و نقصان، عزت وذلت صحت ومرض اور اولاد دینا؛ وغیرہ غرض سب کچھ کرنے والی ذات اللہ کی ہے، کسی ولی کو

=تعالى: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ. (۵-المائدة: ۸۷)
قال المظهري: ويجوز أن يراد به ولا تعتدوا حدود ما أحل الله لكم إلى ما حرم عليكم. (التفسير المظهري- المظهري، محمد ثناء الله (م: ۱۲۲۵هـ): ۳/ ۱۵۷، فضابط البدعة المكفرة: ... أو إحلال محرم أو تحريم حلال. ت: غلام نبي التونسي، ط: مكتبة الرشدية - الباكستان ☆ معارج القبول بشرح سلم الوصول إلى علم الأصول- حافظ بن أحمد بن علي الحكمي (م: ۱۳۷۷هـ): ۳/ ۱۲۲۸، البدع كلها مردودة، ت: عمر بن محمود أبو عمر، ط: دار ابن القيم- الدمام)

(۷) عن يحيى، رفعه قال: «المتمسك بسنتي عند فساد أمتي له أجر مائة شهيد». (الإبانة الكبرى لابن بطة- أبو عبد الله العُكبري المعروف بابن بطّة العكبري (م: ۳۸۷هـ): ۱/ ۳۴۲، رقم: ۲۱۴، ط: دار الراية، الرياض)

(۸) قال الله تعالى: أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ. (۳۷-الصافات: ۹۵) أي أتعبدون أصناما أنتم تنحتونها بأيديكم تنجرونها. (الجامع لأحكام القرآن = تفسير القرطبي- شمس الدين القرطبي (م: ۶۷۱هـ): ۱۵/ ۹۶، ت: أحمد البردوني وإبراهيم أطفيش، ط: دار الكتب المصرية- القاهرة)
تعزیہ بت ہے۔ (فتاوی رشیدیہ: ص ۲۶، ط: مکتبہ تھانوی، دیوبند)
تعزیہ کے ساتھ جو معاملے کیے جاتے ہیں، ان کا معصیت وبدعت؛ بل کہ بعض کا قریب بہ کفر وشرک ہونا ظاہر ہے، اس لیے بنانا بلا شک ناجائز ہوگا اور چوں کہ معصیت کی اعانت معصیت ہے؛ اس لیے اس میں باچہ یعنی چندہ دینا...... اس میں شرکت کرنا؛ سب ناجائز ہوگا، بنانے والا اور اعانت کرنے والا دونوں گنہگار ہوں گے۔ (امداد الفتاویٰ: ۵/ ۲۸۷، کتاب البدعات، حکم تعزیہ، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند)
مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو امداد الاحکام: ۱/ ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۹، کتاب السنۃ والبدعۃ، ط: زکریا، دیوبند)

(۹) اور اگر یہ لوگ اشیاء کو یا اصحاب اشیاء کو ایسا مؤثر مانتے ہیں کہ حق تعالیٰ ان کے ہاتھ میں اختیارات دے دیتے ہیں، تو اس صورت میں یہ لوگ ایمان سے بھی باہر ہو جائیں گے، تجدید ایمان اور نکاح لازم ہوگا۔ (حوالہ سابق)

تصرف کا اختیار نہیں ہے، کسی بھی چیز کو دینے کی طاقت ان میں نہیں ہے؛ اس لیے ان سے منتیں مانگنا ایمان سے نکلنے کا سبب ہے، پس جو لوگ مذکورہ عقیدے کے خلاف حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر اولیاء اللہ سے نفع ونقصان کے اعتقاد کے ساتھ منتیں مانیں گے، وہ ایمان سے خارج ہو جائیں گے، ان کے لیے از سر نو کلمہ پڑھ کر ایمان میں داخل ہونا ضروری ہوگا اور ارتداد کی وجہ سے نکاح ٹوٹ جائے گا، نئے سرے سے اپنی بیوی سے نکاح کرنا لازم ہوگا۔ (۱۰) فقط، اللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۱۹] سودی بینک کا افتتاح قرآن خوانی سے کرنا

۱۶۱-سوال: ہمارے پیش امام صاحب نے مدرسہ کے وقت میں ایک سودی بینک کا افتتاح قرآن خوانی سے کروایا، کیا یہ جائز ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

امام صاحب کا مذکورہ فعل حرام ہے اور اگر قرآن خوانی اس نیت سے کروایا ہے کہ اس سے سودی بینک میں برکت ہوگی، تو اس کی وجہ سے ایمان سے بھی نکل جانے کا خطرہ ہے۔ شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے کہ کوئی شخص بسملہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) پڑھ کر جوا کھیلے، یا شراب پیے یا زنا کرے، تو وہ کافر ہو جائے گا۔ (صفحہ ۲۰۸)[۱] اسی طرح ڈھول، باجہ وغیرہ کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کی جائے، تو بھی کافر ہو جائے گا، نیز کوئی شخص ذکر اللہ پر تالیاں بجائے، تو اس کی وجہ سے بھی خارج از اسلام ہو جائے گا۔ (صفحہ ۲۰۵)[۲]

غیر اسلامی بینک-جس کا صبح سے شام تک کا پورا کاروبار ''ربا'' پر مبنی ہوتا ہے- اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، اسی طرح سود لینے، دینے اور اس میں مددگار بننے والوں پر بھی اللہ کے رسول ﷺ

---

(۱۰) (وارتداد أحدهما) أي الزوجين (فسخ) فلا ينقص عددا (عاجل) بلا قضاء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۱۹۳، كتاب النكاح، باب نكاح الكافر، ط: دار الفكر - بيروت)

وإن كانت نيته الوجه الذي يوجب التكفير لا تنفعه فتوى المفتي، ويؤمر بالتوبة والرجوع عن ذلك وبتجديد النكاح بينه وبين إمرأته. (الهندية: ۲/ ۲۸۳، الباب العاشر في البغاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) من قال عند ابتداء شرب الخمر أو الزنا أو كل الحرام بسم الله كفر. (شرح الفقه الأكبر - ملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ)، ص: ۲۰۸، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۲) من قرأ القرآن علي ضرب الدف والقضيب يكفر. (شرح الفقه الأكبر ص: ۲۰۵، ط: ياسر نديم - ديوبند)

نے لعنت فرمائی ہے۔ (۳) اس طرح کے حرام کاموں کے افتتاح کے موقع سے قرآن خوانی کرانا حرام ہوگا۔

امام صاحب نے اس فعل کو انجام دے کر گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے اور حرام کام کو انجام دینے کے لیے انہوں نے اپنی ذمہ داری سے بھی پہلوتہی کی ہے، جس کی وجہ سے معصوم بچوں کا تعلیمی نقصان ہوا ہے؛ لہٰذا توبہ واستغفار کرنا ضروری ہے۔ البتہ ان پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا۔ شامی میں لکھا ہے کہ کوئی شخص جہالت کی وجہ سے کسی کلمۂ کفر کا تلفظ کرلے، تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک کافر نہ ہوگا اور بعض کے نزدیک کافر ہوجائے گا۔ (۴)

علامہ شامیؒ کی مذکورہ تحریر اور علماء کی یہ صراحت: کہ ''کوئی شخص ایک کلمہ کا تکلم کرے، جس میں کفر کے ننانوے احتمالات ہوں، اور عدم کفر کا صرف ایک احتمال ہو، تب بھی اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی''۔ لہٰذا امام صاحب پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا۔ (۵) لیکن چوں کہ حرام فعل کا ارتکاب کیا ہے؛ اس لیے توبہ واستغفار کرنا ضروری ہے۔ نیز جو لوگ اس میں شریک تھے، وہ بھی گنہ گار ہوں گے، ان کو بھی توبہ واستغفار کرنا چاہیے۔ (۶) فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

---

(۳) عن جابر، قال: لعن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (صحيح مسلم: ۲/ ۲۷، رقم: ۱۰۶ -(۱۵۹۸)، باب الربا، ط: البدر - ديوبند☆ ورواه أبو داؤد في سننه برقم: ۳۳۳۳، كتاب البيوع، باب في اكل الربا، ومؤكله☆ والترمذي في سننه برقم: ۱۲۰۶، أبواب البيوع، باب ماجاء في اكل الربا)

(۴) ومن تكلم بها اختيارا جاهلا بأنها كفر ففيه اختلاف. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۲۲۴، كتاب الجهاد، باب المرتد، ط: دار الفكر - بيروت)

ومن تكلم بها اختيارا جاهلا بأنها كفر ففيه اختلاف، والذي تحرر أنه لا يفتى بتكفير مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن، أو كان في كفره اختلاف، ولو رواية ضعيفة. (البحر الرائق: ۵/ ۱۳۴، كتاب السير، باب أحكام المرتدين، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۵) إذا كان في المسألة وجوه توجب التكفير ووجه واحد يمنعه فعلى المفتي أن يميل إلى الوجه الذي يمنع التكفير تحسينا للظن بالمسلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۲۲۴، كتاب الجهاد، باب المرتد، ط: دار الفكر☆ البحر الرائق: ۵/ ۱۳۴، كتاب السير، باب أحكام المرتدين☆ شرح فقہ اکبر، ص: ۱۹۹، ط: یاسر ندیم - دیوبند)

(۶) أنه يأثم في الإعانة على المعصية. (البحر الرائق: ۸/ ۲۳، كتاب الاجارة، أخذ أجر الحجام، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ المحيط البرهاني: ۷/ ۴۸۱، كتاب الإجارات، الفصل الخامس عشر: في بيان مايجوز، الخ، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۲۰] بُت پرستی کرنے اور بتوں کے نام خرچ کرنے والے کا حکم

۱۶۲-سوال: زید مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، حالاں کہ اس نے گن پتی (کفار کے مشہور بت) کی با قاعدہ پرستش کی، پھر اس کے بعد اُن بتوں کے نام پر کچھ خرچ (دان) بھی کیا، تو ایسا کرنے والے کے متعلق شریعتِ مطہرہ کا حکم کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جو شخص، غیر مسلم کی طرح کسی بھی عملِ شرک وکفر کا ارتکاب جان بوجھ کر کرے، یا ان اعمال کا ارتکاب جان بوجھ کر کرے، جو شعارِ کفر وشرک مانے جاتے ہیں، یعنی جن اعمال وافعال کے ذریعہ کسی مخصوص قوم و مذہب کو پہچانا جاتا ہے، تو ایسا شخص ایمان واسلام سے خارج ہو جائے گا۔ [۱] اس کی بیوی بھی اس کے نکاح سے نکل جائے گی، خواہ وہ عملِ کفر وشرک اُس نے صرف دکھلاوے کے لیے کیا ہو یا حقیقتاً کیا ہو، اِکراہ کے علاوہ تمام صورتوں میں اعمالِ کفر وشرک کی حرمت علی حالہٖ رہے گی، لہٰذا ایسے شخص کو چاہیے کہ کلمۂ توحید پڑھ کر تجدیدِ نکاح کرے اور توبہ کرے۔

ثم قال في البحر والحاصل: أن من تكلم بكلمة للكفر هازلا، أو لاعبا كفر عند الكل، ولا اعتبار باعتقاده، كما صرح به في الخانية. ومن تكلم بها مخطئا، أو مكرها، لا يكفر عند الكل. ومن تكلم بها عامدا عالما كفر عند الكل. ومن تكلم بها اختيارا، جاهلا بأنها كفر، ففيه اختلاف. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: باب المرتد) [۲]

المرتد عرفا هو الراجع عن دين الإسلام كذا في النهر الفائق وركن الردة إجراء كلمة الكفر على اللسان بعد وجود الإيمان. (الفتاوى الهندية، الباب التاسع في أحكام المرتدين) [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) وفي الفتاوى الصغرى: من تقلنس بقلنسوة المجوس أي لبسها، وتشبه بهم فيها، أو خاط خرقة صفراء على العاتق أي وهو من شعارهم، أو شد في الوسط خيطا كفر، إذا كان متشابها بخيطهم أو ربطهم أو سماه زنارا ... ولو شبه نفسه باليهود والنصارى أي صورة أو سيرة على طريق المزاح والهزل أي ولو على هذا المنوال كفر. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۲۲۷، فصل: في الكفر صريحا وكناية، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۲) رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۲۲۴، كتاب الجهاد، باب المرتد، ط: دار الفكر - بيروت☆البحر الرائق شرح كنز الدقائق - زين الدين بن إبراهيم، ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۵/ ۱۳۴-۱۳۵، باب أحكام المرتدين، ط: دار الكتاب الإسلامي.

(۳) الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۵۳، الباب التاسع: في أحكام المرتدين، ط: دار الفكر - بيروت.

[۲۱] مالی مفاد کی خاطر اسلامی نام میں تبدیلی کرنا اور اولاد کو اسلامی تعلیم سے روکنا

۱۶۳-سوال: ایک عیسائی شخص نے اسلام قبول کیا، داخلِ اسلام ہونے کے پانچ سال بعد ایک مسلمان نے اس سے متاثر ہوکر اپنی لڑکی اُس کے نکاح میں دی، دس گیارہ سالہ ازدواجی زندگی کے دوران اُس کے یہاں ایک لڑکی اور دو لڑکے کی ولادت ہوئی، فی الحال بڑی لڑکی کی عمر گیارہ سال اور چھوٹے لڑکے کی عمر سات یا آٹھ سال ہے، پہلے وہ ان بچوں کو دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدرسہ بھیجتا تھا؛ لیکن اخیری دو تین سال سے مدرسہ بھیجنا بند کر رکھا ہے اور بچوں کے اسلامی نام تبدیل کر کے عیسائی اسکول میں بھیجنا شروع کر دیا ہے، پوچھے جانے پر وہ یوں کہہ رہا ہے کہ میں اپنے پراویڈنٹ فنڈ (P.F) اور وراثتی حقوق حاصل کرنے کے لیے صرف دِکھلاوے کے طور پر اس طرح کر رہا ہوں، مزید تحقیق کرنے پر یہ بھی معلوم ہوا کہ ہسپتال جیسی بہت سی ایسی جگہوں پر- جہاں بیوی کا نام لکھوانے کی ضرورت ہوتی ہے- اپنی جانب سے عیسائی نام لکھواتا ہے، نیز اس کے عیسائی رشتہ داروں کی جانب سے بارہا یہ مطالبہ ہوا کہ تیرے بچوں کو ہم اپنے مذہب میں شامل کرنے کے لیے تیار ہیں؛ لہٰذا تو بھی عیسائی بن جا، ان کے جواب میں کبھی یہ شخص کسی ردِ عمل کا اظہار تک نہیں کرتا، اسی طرح بسا اوقات گھریلو جھگڑوں کے دوران کفریہ کلمات بھی بولتا ہے۔

اس تفصیل کے مدنظر اس کا اسلامی نکاح برقرار رہے گا یا نہیں؟ اولاد کے اسلامی نام بدل کر غیر اسلامی نام رکھنے کے متعلق حکمِ شرعی کیا ہے؟ نکاح ٹوٹنے کی صورت میں اگر حکومت اولاد کو باپ کے حوالے کر دے، تو اُن بچوں کے ایمان کا کیا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

بچوں کو مدرسہ نہ بھیجنا ان کی دینی تعلیم میں رکاوٹ ڈالنا ہے، ہسپتال یا دواخانہ میں بہ غرضِ علاج بھی اسلامی نام تبدیل کر کے غلط نام لکھوانا دھوکہ ہے؛ لہٰذا یہ دونوں کام ناجائز ہیں۔ (۱)

کلماتِ کفر صراحۃً سوال میں نہیں لکھے گئے ہیں، ان کلمات کے معلوم ہونے پر حکم لگایا جا سکتا ہے،

---

(۱) ابن عمر يقول سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن لكل غادر لواء يعرف بقدر غدرته وإن أكبر الغدر غدر أمير عامة. (مسند الإمام أحمد: ۱۰/۲۶۱، رقم الحديث: ۶۰۹۳، ط: مؤسسة الرسالة)

اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے وراثتی حق ختم نہیں ہوتا۔[۲] اسلام قبول کرنے والا مذکورہ شخص اگر عیسائی انجمن

(۲) حضرت مفتی صاحبؒ کی یہ بات محل نظر ہے؛ اس لیے کہ جب کسی نے اسلام قبول کرلیا اور مسلمان ہوگیا، تو وہ اپنے کافر رشتہ دار کا وارث نہیں ہوگا؛ کیوں کہ مسلمان' کافر کا وارث نہیں ہوتا، جس طرح کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا:

عن أسامة بن زيد رضي الله عنهما: أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم. (صحيح البخاري: ۲/۱۰۰۱، رقم: ۶۷۶۴، كتاب الفرائض، باب: لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم... الخ، ط: البدر-ديوبند ☆صحيح مسلم: ۲/ ۳۳، رقم: ۱- (۱۶۱۴)، كتاب الفرائض، البدر- ديوبند ☆ سنن أبي داود: ۲/ ۴۰۳، رقم: ۲۹۰۹، كتاب الفرائض، باب هل يرث المسلم الكافر؟، المكتبة الأشرفية- ديوبند ☆ سنن الترمذي: ۲/۳۱، رقم: ۲۱۰۷، أبواب الفرائض، باب ما جاء في إبطال الميراث بين المسلم والكافر، ط: البدر- ديوبند ☆سنن ابن ماجة، ص: ۱۹۵، رقم: ۲۷۲۹-۲۷۳۰، كتاب الفرائض، باب ميراث أهل الإسلام من أهل الشرك، ط: البدر-ديوبند)

واختلاف الدينين أيضا يمنع الإرث، والمراد به: الاختلاف بين الإسلام والكفر. (الفتاوى الهندية: ۶/ ۴۵۴، الباب السادس في ميراث أهل الكفر، ط: دار الفكر-بيروت)

فلا يرث الكافر من المسلم إجماعا، ولا المسلم من الكافر على قول علي وزيد وعامة الصحابة، لقوله عليه السلام: لا يتوارث أهل الملتين شيء. (هامش السراجي: ۷، ط: فيصل، ديوبند)

مسئلہ تو یہی ہے کہ جس طرح کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا، اسی طرح مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوگا، تاہم اسلامک فقہ اکیڈمی -انڈیا نے اپنے تیسویں فقہی سیمینار (منعقدہ: ۱-۳، مارچ ۲۰۱۴ء، جامعہ علوم القرآن، جمبوسر، گجرات) میں اس کو موضوع بحث بنایا تھا کہ "اس وقت غیر مسلم ممالک میں ایک صورت یہ درپیش ہے کہ بعض دفعہ مسلمان مورث کی حیثیت میں ہوتے ہیں، اور کسی غیر مسلم سے اس کی ایسی قرابت ہوتی ہے، کہ اگر وہ مسلمان ہوتا تو اسے بھی حق میراث حاصل ہوتا، قانون کے ذریعے اس مسلمان کے مال سے اس غیر مسلم رشتہ دار کو متروکہ دیا جاتا ہے، اسی طرح اگر مورث غیر مسلم ہو، اور اس کا مسلمان قرابت دار ہو، تو قانون اسے ترکہ میں حق دلاتا ہے، اگر وہ نہ لے تو ترکہ دوسرے غیر مسلم قرابت داروں میں تقسیم ہوجائے گا، تو کیا ایسی صورت میں جب کہ مسلمان کے مال سے غیر مسلم کو ترکہ دلایا جاتا ہو، مسلمان بھی اس قانون سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ وہ اس کے لیے کوشش کر سکتے ہیں، یا قبول کر سکتے ہیں۔

سوال نامہ میں یہ بھی مذکور تھا کہ اس مسئلہ کی دعوتی نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہمیت ہے کہ اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہوجائے کہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے وہ اپنے صاحب ثروت والد یا والدہ کے ترکہ سے بالکل محروم ہوجائے گا، تو مادیت کے غلبہ کی وجہ سے یہ بات قبول اسلام میں اس کے لیے رکاوٹ بن سکتی ہے۔

اس سوال کے جواب میں متعدد حضرات نے لکھا ہے کہ اگر ان ملکوں میں غیر مسلم رشتہ دار کے مسلم رشتہ داروں کی جائداد سے فائدہ اٹھانے کا قانون ہو، تو مسلمانوں کے لیے بھی دعوتی مصالح، ملکی حالات اور قانونی دشواری کی وجہ سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہوگی۔ (واضح رہے کہ اس صورت میں مال کا لینا بہ طریق وراثت نہیں ہوگا؛ بل کہ ملکی قانون سے فائدہ اٹھانے کی ایک شکل ہوگی۔ (اس رائے کے دلائل اور حدیث: "لا یرث المسلم الکافر" کی وجہ اس پر وارد ہونے والے اعتراض کے تفصیلی جواب کے لیے ملاحظہ فرمائیں، تلخیص مقالات بابت: وصیت نامہ کے ذریعہ ورثاء کے شرعی حصص اور حقوق کا تعین، از: مفتی احمد نادر القاسمی، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)

=

کے جانب سے ملنے والی مالی امداد کے بند ہونے پر افسوس کرتا ہے اور مالی امداد حاصل کرنے کے لیے اپنا عیسائی نام لکھواتا ہے، تو وہ ایمان سے خارج ہوجائے گا۔ (شرح فقہ اکبر/صفحہ: ۲۲۲)[۳]

اِس صورت میں مذکور شخص کی بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی، مسلمان بیوی کا اس کے ساتھ رہنا جائز نہیں ہوگا۔ [۴] اور اِس صورت میں اولاد ''خیر الابوین'' کے تابع ہوگی، یعنی والدین میں سے چوں کہ ماں مسلمان ہے؛ لہٰذا بچے اُس کے تابع شمار ہوں گے۔ [۵] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] عالم کا کسی کو یہ جواب دینا کہ ''ایسے موقع پر شریعت ایک طرف رکھ دینی پڑتی ہے''

۱۶۴-سوال: ایک صاحب عالم اور دین دار ہیں، کسی معاملہ میں جب اُن سے کہا گیا کہ ''یہ تو شریعت میں بالکل ناجائز اور حرام ہے'' اِس کے جواب میں اُس عالمِ دین نے کہا کہ ''ایسے موقع پر تو شریعت ایک طرف رکھ دینی پڑتی ہے'' (العیاذ باللہ) تو ان الفاظ کے کہنے والے کے بارے میں حکمِ شرعی کیا ہے؟ اس کے لیے تجدیدِ نکاح ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

''یہ تو بالکل ناجائز اور حرام ہے'' کے جواب میں یہ کہنا کہ ''ایسے موقع پر شریعت ایک طرف رکھ دینی پڑتی ہے'' اِس جملے میں دو باتیں ہیں، ایک تو ناجائز اور حرام کے ارتکاب پر جرأت وبے باکی، دوسرا شریعت کا استخفاف۔

= خیال ہوتا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی یہ بات کہ ''اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے وراثتی حق ختم نہیں ہوتا'' ان ممالک کے لیے ہے، جہاں اس طرح کا قانون ہے، سوال کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل نے اسی طرح کے کسی ملک کے مسئلہ کے سلسلے میں سوال کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مجتبیٰ حسن قاسمی

(۳) وفي الخلاصة: من قال: حين مات أبوه على الكفر، وترك مالا ـــ ليت هو أي الولد نفسه لم يسلم إلى هذا، أي هذا الوقت، ليرث أباه الكافر، كفر؛ لأنه تمنى الكفر، وذلك كفر. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۲۲۲، فصل في الكفر صريحا وكناية، ط: ياسر نديم-ديوبند)

(۴) (وارتداد أحدهما) أي الزوجين (فسخ) فلا ينقص عددا (عاجل) بلا قضاء. قال الشامي: أي بلا توقف على قضاء القاضي، وكذا بلا توقف على مضي عدة في المدخول بها، كما في البحر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۱۹۳، كتاب النكاح، باب نكاح الكافر، ط: دار الفكر-بيروت)

(۵) والولد يتبع خير الأبوين دينا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۱۹۶، كتاب النكاح، مطلب الولد يتبع خير الأبوين دينا، ط: دار الفكر-بيروت)

اگر کوئی شخص، شئے حرام کی حرمت کا منکر نہ ہو؛ لیکن اس کا ارتکاب جرأت و بے باکی سے کر لیتا ہو، تو ایسے شخص کے فاسق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔(۱)

دوسری بات کے معنیٰ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ شخص شریعت کو نہیں مانتا، اس صورت میں تو کفر لازم آئے گا، اور یہ معنی بھی نکل سکتے ہیں کہ وہ اس موقع پر شریعت کے حکم کے مطابق عمل کرنا نہیں چاہتا، اور ایک مسلمان کے بارے میں ہم یہی حسنِ ظن رکھیں کہ اس نے دوسرا معنی ہی مراد لیا ہوگا، تو یہ شریعت کا استخفاف ہے، اور اِس صورت میں اندیشۂ کفر غالب ہے۔(۲)

فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ اگر مرد نے عورت سے کہا کہ یہ حکم شریعت کا ہے، تو عورت نے ڈکار لیتے ہوئے کہا کہ شریعت کو رکھ دے، تو وہ خارج از اسلام ہوگی۔ فتاویٰ عالم گیری میں ہے کہ اگر کسی شخص کے سامنے ائمۂ دین کا کوئی فتویٰ پیش کیا گیا اور اُس نے کہا کہ یہ کیا فتاویٰ پلیدہ لے آئے؟ تو کفر لازم آئے گا، اِس لیے کہ اُس نے حکمِ شرعی کو رد کر دیا۔(۳) سوال میں مذکور جملہ اِسی قسم کے جزئیات سے ملتا جلتا ہے، اِس لیے اگر چہ کفر نہیں؛ تاہم اندیشۂ کفر سے خالی بھی نہیں، اور ایسے مواقع جہاں کفر کا شک ہو، کفر کا حکم نہیں لگتا۔ (تکفیر نہیں کی جاتی) لیکن تجدیدِ نکاح کا حکم ہوگا، اِس جملہ کے بولنے والے کو چاہیے کہ وہ تجدید نکاح کر لے، یہی احوط ہے، تا کہ گناہ میں مبتلا نہ رہے، اور چاہیے کہ وہ استغفار بھی کرے۔ (فتاویٰ قاضی خان: ۳۲۸)[۴]، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فَسَقَ فلان: خرج عن حجر الشرع، وذلك من قولهم: فَسَقَ الرُّطَبُ، إذا خرج عن قشره، وهو أعمّ من الكفر. والفِسقُ يقع بالقليل من الذنوب وبالكثير، لكن تعورف فيما كان كثيرا، وأكثر ما يقال الفاسق لمن التزم حكم الشرع وأقرّ به، ثم أخلّ بجميع أحكامه أو ببعضه. (المفردات في غريب القرآن-أبو القاسم الحسين بن محمد المعروف بـ'الراغب الأصفهاني' (م:۵۰۲ھ)، رقم:۶۳۶، مادہ:"فسق"، ت: صفوان عدنان الداودي، ط: دار القلم، الدار الشامية - دمشق، بيروت ☆ تاج العروس من جواهر القاموس-محمّد بن محمّد بن عبد الرزّاق الحسيني، أبو الفيض، الملقّب بمرتضى، الزَّبيدي (م:۱۲۰۵ھ):۲۶/۳۰۲، مادہ"ف س ق"، ط: دار الهداية)

(۲) من هزل بلفظ الكفر ارتد، وإن لم يعتقده للاستخفاف، فهو ككفر العناد. (الدر المختار مع رد المحتار: ۴/۲۲۲، كتاب الجهاد، باب المرتد، ط: دار الفكر، بيروت)

(۳) رجل عرض عليه خصمه فتوى الأئمة، فردها، وقال: "چه بارنامه فتوى آورده" قيل: يكفر؛ لأنه رد حكم الشرع. (الفتاوى الهندية: ۲/۲۷۲، كتاب السير، الباب التاسع في أحكام المرتدين، مطلب في موجبات الكفر أنواع، ط: دار الفكر-بيروت)

(۴) وما فيه خلاف يؤمر بالاستغفار، والتوبة، وتجديد النكاح. (الدر المختار مع رد المحتار: ۴/۲۴۷، كتاب الجهاد، مطلب توبة اليأس مقبولة... الخ، ط: دار الفكر-بيروت)

[۲۳] کسی مسلمان شخص کا یہ کہنا کہ ''اس علاقہ میں اللہ کے بعد میں ہوں''

۱۶۵-سوال: ایک شخص نے اپنی زبان سے یہ کلمات بطورِ دھمکی کے کہے کہ ''اس علاقہ میں اگر خدا کے بعد کوئی ہے تو وہ میں ہوں'' شریعتِ مطہرہ میں اِن کلمات کے بولنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً و مصلیا:

''اس علاقہ میں اگر خدا کے بعد کوئی ہے تو وہ میں ہوں'' اس جملے میں چند معانی کا احتمال ہے، پہلا یہ کہ اس علاقہ میں اللہ کے حکم کے بعد میرا حکم چلتا ہے، سارا انتظام میرے منشا کے مطابق ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت کے بعد میری قدرت چلتی ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ کے بعد سب سے بڑا میں ہوں، حاصل یہ ہے کہ اس طرح کے جملے کہنا مناسب نہیں ہے، پہلے معنی کے مطابق اگر یہ جملہ بولنے والا اُس علاقہ کا حاکم یا بڑا عہدے دار ہو، تو وہ یوں کہنا چاہتا ہے کہ اس علاقہ میں میرے علاوہ کسی کو دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے، حاکم اپنے اختیار کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہے؛ لیکن اس جملے میں ناز یا گھمنڈ، تکبر اور بڑائی معلوم ہوتی ہے، جو اللہ کے نزدیک سب سے بری چیز ہے، اگر یہ شخص حاکم نہ ہو، تو اُس کے لیے یہ تکبر بھی غلط ہوگا، بقیہ دونوں معانی میں بھی صریح تکبر پایا جاتا ہے، اس لیے چاہیے کہ کسی بھی حال میں اس طرح کے کلمات نہ بولے جائیں، اور اگر غلطی سے یہ کلمات زبان سے نکل گئے ہوں، تو اُس شخص کو چاہیے کہ توبہ اور استغفار کر لے۔ (فتاویٰ عالمگیری: ۲/ ۲۵۸)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] ''تمہارا ڈر اللہ تعالیٰ کے ڈر کے برابر ہونا چاہیے'' بولنے سے کفر کا حکم

۱۶۶-سوال: شوہر نے اپنی بیوی کو ایک شادی میں شرکت سے منع کیا، تو بیوی نے کہا کہ ''آپ کا ڈر اللہ تعالیٰ کے ڈر کے برابر ہونا چاہیے''، تو کیا اس جملے کے بولنے سے نکاح پر کوئی منفی اثر تو نہیں پڑا۔ اسی طرح اس جملے کے بولنے سے پہلے اور بعد میں، جو نیک اعمال کیے ہیں، ان کا کیا حکم ہے؟ نیز اس

---

(۱) يكفر إذا وصف الله تعالى بما لا يليق به، أو سخر باسم من أسمائه، أو بأمر من أو امره، أو أنكر وعده و وعيده، أو جعل له شريكا، أو ولدا، أو زوجة، أو نسبه إلى الجهل، أو العجز، أو النقص. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۵۸، كتاب السير، مطلب في موجبات الكفر أنواع، ط: دار الفكر-بيروت)

جملے کی ادائیگی کے بعد میاں بیوی کے وظیفہء زوجیت کے بارے میں شریعت کیا کہتی ہے اور اس جیسے الفاظ کا بولنا شرعاً کیسا ہے؟ برائے کرم تشفی بخش جواب مرحمت فرما کر، احقر کو ممنون و مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداو مصلیا:

مذکورہ جملے کا زبان سے ادا کرنا ایک مسلمان کے لیے مناسب نہیں ہے، گفتگو میں بے حد احتیاط کرنا چاہیے، تاہم بیوی ایمان سے خارج نہیں ہوگی، وجہ یہ کہ علماء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر کسی کے کلام میں کئی وجوہات کفر کی ہوں اور صرف ایک وجہ ایمان کی ہو، تو ہم اس کو مسلمان ہی کہیں گے، اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔ مزید لکھا ہے کہ ایک ہزار کافر کو کفر پر باقی رکھنا سہل و آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک مسلمان کو ایمان سے خارج کر دیا جائے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۲۵] بلا وضو نماز پڑھنا موجبِ کفر نہیں ہے

۱۶۷-سوال: میمونہ یہ بات جانتی ہے کہ بلا وضو عمداً و قصداً نماز پڑھنا گناہ کبیرہ ہے؛ مگر اس کے باوجود کاہلی و سستی کی بنا پر بغیر عذر شرعی کے جان بوجھ کر بلا وضو نماز پڑھتی ہے، تو طہارت کی فرضیت کی آیت: **فاغسلوا وجوهكم.** الآية کا عملاً انکار لازم آتا ہے، اور نیز فرمان نبوی ﷺ **"الطهور شطر الإيمان"** ودیگر احادیث کا انکار عملی لازم آتا ہے اور قرآن کے قطعی امور کا انکار کفر ہے؛ لہٰذا بعض علماء کا قول ہے کہ جان بوجھ کر بلا وضو نماز پڑھنا کفر ہے، جب یہ تہدید عظیم جس میں خوف کفر ہے، بلا وضو نماز پڑھنے میں وارد ہوئی ہے۔ تو کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین، اس مسئلہ کے بارے میں، جو اس سے متفرع ہوتا ہے۔ یہی میمونہ عمداً و قصداً جنابت کی حالت میں بھی نماز ادا کرتی ہے، اور ایسا مسلسل تین ماہ پندرہ روز تک کیا ہے، اگر اس صورت میں کفر کا فتویٰ ہو، تو نکاح میں کچھ خلل واقع ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر خلل واقع ہوتا ہو، تو تجدید نکاح ضروری ہے یا نہیں؟ اور اگر عورت زانیہ ہو، تو کیا حکم ہے؟

اور اس سے حائضہ کا مسئلہ بھی متفرع ہوتا ہے، یعنی تین ماہ پندرہ دن کی مدت (جن میں میمونہ نے بلا

---

(۱) وقد ذكروا أن المسئلة المتعلقة بالكفر إذا كان لها تسع و تسعون احتمالا للكفر واحتمال واحد في نفيه، فالأولى للمفتي والقاضي أن يعمل بالاحتمال الثاني؛ لأن الخطأ في إبقاء ألف كافر أهون من الخطأ في إفناء مسلم واحد. (شرح الفقه الأكبر-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۱۹۹، ط: ياسر نديم، ديوبند)

غسل و وضو کے نماز پڑھی ہے) ایام حیض بھی گزرے ہیں اور حیض اکثر مدت یعنی دس روز سے کم میں بند ہوگیا اور حائضہ کی کوئی عادت مستمرہ بھی نہیں، کبھی سات دن، کبھی پانچ دن اور حنفیہ کا مسلک ہے کہ اکثر مدت سے کم میں حیض بند ہوگیا ہو، تو بغیر طہارت کے شوہر سے وطی جائز نہیں ہے، جب کہ میمونہ نے تین ماہ پندرہ دن تک مطلق طہارت ہی حاصل نہیں کی اور مرد اس کے ساتھ جماع کرتا ہے اور مرد حقیقت سے بے خبر ہے، تو اس سے بھی قرآن شریف کی آیت "لاتقربوهن حتى يطهرن" کا انکار عملی لازم آتا ہے، اور مندرجہ بالا سطور میں گزر چکا ہے کہ قرآن کی قطعیت کا انکار کفر ہے، تو اس سے بھی نکاح میں کوئی خلل واقع ہوگا یا نہیں؟ اور اس حالت میں جو اولاد قرار پائے گی۔ تو اس کو ناجائز قرار دیا جائے گا یا نہیں؟ اور اب اس عورت کا شرعی امور میں اعتبار کریں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

سستی یا جہالت سے یا فرضیت کا اقرار کرتے ہوئے بغیر وضو کے نماز پڑھی، تو کافر نہیں ہوگی، اسی پر فتوی ہے؛ مگر وضو کی فرضیت کا کوئی انکار کرتا ہے یا نماز کے ساتھ استہزاء کرتا ہے، یا نماز کو حقیر سمجھتے ہوئے بغیر وضو کے پڑھتا ہے، تو کافر ہوجائے گا، یہی مفتی بہ ہے۔ (شامی ج ۱ ص ۵۷)[1]

اسی طریقہ سے وطی حالتِ حیض میں کرنا گناہ کبیرہ ہے، حرام سمجھتے ہوئے وطی کی، تو کافر نہیں ہوگا؛ لیکن حلال سمجھتے ہوئے وطی کی، تو کافر ہوگا۔ (شامی ج ۱ ص ۲۷) کیوں کہ نص قطعی کا انکار کرتا ہے اور یہ انکار کرنا کفر ہے۔[2]

علم کلام کی مشہور کتاب شرح عقائد (ص: ۸۳، ط: دیوبند) میں اہل سنت والجماعۃ کے مذہب کو بیان کیا ہے کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا کافر نہیں ہوگا، اگر گناہ کبیرہ کو حلال سمجھ کر کرتا ہے، یا دین اور

---

(۱) وبه ظهر أن تعمد الصلاة بلا طهر غير مكفر كصلاته لغير القبلة أو مع ثوب نجس، وهو ظاهر المذهب كما في الخانية. (الدر المختار) و قال ابن عابدين الشامي (م: ۱۲۵۲ھ): (قوله: كما في الخانية) حيث قال بعد ذكره الخلاف في مسألة الصلاة بلا طهارة وأن الإكفار رواية النوادر. وفي ظاهر الرواية لا يكون كفرا، وإنما اختلفوا إذا صلى لا على وجه الاستخفاف بالدين، فإن كان وجه الاستخفاف ينبغي أن يكون كفرا عند الكل. (رد المحتار: ۱/۸۱، کتاب الطہارت، ط: دار الفکر-بیروت)

(۲) (و) وطؤها (يكفر مستحله) كما جزم به غير واحد. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۲۹۷، باب الحیض، ط: دار الفکر-بیروت)

احکام دین کو ہلکا سمجھتا ہے، تو کافر ہوگا؛ اس لیے کہ احکام شریعت کو جھٹلانے والا ہے۔

آپ کا یہ تحریر کرنا کہ انکار عملی سے کفر لازم آئے گا وغیرہ وغیرہ، اہل سنت والجماعت کے مذہب کے خلاف ہے، عملاً گناہ کا کام کرنے سے کوئی شخص دین اسلام سے نہیں نکلے گا ورنہ تو نماز نہ پڑھنے والا بھی کافر ہوگا۔

رہ گیا تجدید نکاح کا مسئلہ، اگر اس نے گناہ سمجھتے ہوئے یہ کام کیا ہے، تو تجدید نکاح کی ضرورت نہیں، ورنہ تجدید نکاح کرنا ہوگا، علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں جہاں عدم علم سے ایسے ایسے کلمات زبان سے ادا ہو جاتے ہیں، جو موجب کفر ہیں اور بولنے والے کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ میں کیا زبان سے ادا کرتا ہوں، تو ایسے لوگوں کے لیے مستحب یہ ہے کہ تجدید نکاح کرتے رہیں۔ (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] غیر مسلموں کے مذہبی میلوں میں شرکت اور خرید و فروخت

۱۶۸-سوال: ہنود کے مذہبی تیوہار "گوکول اشٹمی" کے میلے میں جانا اور وہاں لگی ہوئی دوکانوں سے کوئی چیز خریدنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

ایسے میلوں میں جانا جائز نہیں ہے، گناہ کبیرہ ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ) [۲]

اِن میلوں میں جا کر کوئی چیز خریدنا یا بیچنا بھی جائز نہیں ہے، حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اِس طرح کی کھیل کود کی جگہوں میں جانا بھی حرام ہے، کوئی مسلمان ایسی چیزوں سے راضی رہے اور اُسے اچھی سمجھے تو یہ اُس کے کفر کا سبب ہوگا۔ (۳)

اِس لیے گوکول آٹھم کے میلے میں جانا، اس میں کسی چیز کو خریدنا جائز نہیں ہے، یہ ان کے تیوہار کو پسند کرنا اور اس کو فروغ دینے اور کفار کی مدد کرنے کے مترادف ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) لأنك تسمع كثيرا من العوام يتكلمون بما يكفر وهم عنها غافلون، والاحتياط أن يجدد الجاهل إيمانه كل يوم ويجدد نكاح امرأته عند شاهدين في كل شهر مرة أو مرتين، إذ الخطأ وإن لم يصدر من الرجل فهو من النساء كثير. (رد المحتار: ۱/ ۴۲، مقدمة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) فتاویٰ رشیدیہ: ۵۵۴، جواز وحرمت کے مسائل، ط: دارالاشاعت کراچی)

(۳) مجموعہ فتاویٰ عبدالحی: ۵۴۲، مسائل متفرقہ، (مترجم مولانا خورشید عالم صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند، ط: مکتبہ تھانوی دیوبند)

[۲۷] ''وندے ماترم'' گیت کے بارے میں حکم شرع

۱۶۹-سوال: ذیل میں وندے ماترم گیت کے الفاظ کے سامنے اُس کا ترجمہ لکھا جاتا ہے، شرعاً اس گیت کی کیا حقیقت ہے؟ اس سے آں جناب ہمیں مطلع فرمائیں۔

وندے (سلام) نمسکار کرنے کا ایک لفظ

ماترم (ماتا کو یعنی ماں کو)

سجلام (اچھے پانی والی)

سفلام (خوب صورت اچھے پھل والی)

ملیجئی (چندن یعنی صندل جیسی خوشبو والی)

شیتلہ (ٹھنڈی)

سستی (اناج، غلہ)

شیاملہ (سیاہ ہے)

شبھر جیوتسنا (سفید چاندی)

پلکِت (کھلی ہوئی)

یامین (راتوں والی)

فُل کسومِت (کھلے ہوئے پھول اور پھل والی)

درم دل (درختوں کے جنگلوں سے)

شوبھینی (دیدہ زیب)

سُہاسینی (خوبصورت ہنسی والی، خوشنما دکھائی دینے والی)

سومدھور بھاسنی (میٹھی زبان والی)

سکھدا (آرام اور چین دینے والی)

وردا (ارادہ اور مرضی کے مطابق دینے والی)

ماترم (ماتا، ماں نے)

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ نے وندے ماترم کے معانی لکھے ہیں، یہ صرف ملکی ترانہ نہیں ہے، بل کہ اُس میں ہندو مذہب کا رنگ غالب ہے، جو اسلامی عقائد اور تعلیم کے خلاف ہے، اسلام کا جو مزاج ہے، اُس میں بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، اور اُس کی صفات میں کوئی شریک نہیں ہے۔ (۱)

اس ترانہ میں بھومی (زمین) کو ماں کہہ کر تمام صفات اور خوبیوں کو اُسی کے لیے ثابت کیا جارہا ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی کے متعلق ان صفات کے حامل ہونے کا عقیدہ رکھنا کفر ہے، اس میں ایسے الفاظ ہیں، جن سے کفر وشرک کا وہم پیدا ہوتا ہے، اس لیے مسلم اساتذہ اور طلبہ کا اس ترانہ کو پڑھنا، پڑھانا جائز نہیں ہے، اور عام مسلمانوں کو بھی اُس کے گانے سے احتراز ضروری ہے، بل کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ حکومت کی طرف سے مسلم اساتذہ، بچوں اور عام مسلمانوں کو اُس کے گانے سے قانوناً وعملاً مستثنیٰ کروائیں۔ (۲)

دیوبند اور سہارن پور کا فتویٰ بھی اس کے متعلق ہے، ملاحظہ فرمائیں:

الجواب: الحمد للہ رب العالمین، و الصلوۃ و السلام علی سید المرسلین، و علی آلہ و صحبہ أجمعین، أما بعد:

اسلام نے جہاں توحیدِ ذاتی کی تعلیم دی ہے، وہاں توحیدِ صفاتی کی بھی تعلیم دی ہے، لہٰذا اللہ جل شانہٗ

(۱) إن الله واحد لا شريك له، واحد في أسمائه وصفاته، واحد في ربوبيته، واحد في إلهيته. (شرح العقيدة الطحاوية: ۱/۱۱، عقيدة أهل السنة إفراد الله عز وجل في ألوهيته... الخ، ط: دار الكتاب - لبنان)

(۲) بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں بہ تدریج فرقہ پرستی کا غلبہ ہوتا جارہا ہے، فرقہ پرست سیاسی جماعتیں برسرِ اقتدار آرہی ہیں اور انہوں نے بعض ریاستوں میں ایک ایسے ترانہ کو پڑھنے کا لزوم عائد کردیا ہے، جو مشرکانہ تصور پر مبنی ہے، میری مراد "وندے ماترم" سے ہے، یہ سنسکرت زبان کا فقرہ ہے اور اس کے معنی یہ ہے کہ "میں اپنے مادرِ وطن کا پرستار ہوں اور اس کی عبادت کرتا ہوں"۔ حب الوطنی بری چیز نہیں اور اگر انصاف کے دائرہ میں ہو، تو اسلام اسے پسند کرتا ہے، یہ ایک فطری جذبہ ہے اور خدا ہی کی طرف سے ہر انسان کے اندر ودیعت ہے، لیکن اسلام میں خدا کے سوا کسی کی پرستش نہیں کی جاسکتی اور بندگی صرف خدا ہی کے لیے ہے، اس لیے اسلامی نقطۂ نظر سے اس طرح کے اشعار کا پڑھنا اور ان کو قبول کرنا جائز نہیں۔ (جدید فقہی مسائل- حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ: ۱/ ۳۱۵، متفرقات امارت وقضاء وندے ماترم، ط: زمزم)

(وکذا فی کفایت المفتی: ۹/ ۲۸۵، کتاب السیاسات، مسلمان بچوں سے ہندوؤں کا گیت گانے پر احتجاج کیا جائے، دار الاشاعت- کراچی)

کی ذات باصفات میں شرکت کفر وشرک ہے۔

''وندے ماترم'' کا پہلا جملہ اے میری ماں، اسلام کے بنیادی عقیدے کے منافی ہے، کیوں کہ اُس میں خطاب ملک ہند کو ہے، اُس کو ماں کہا گیا ہے، بعد اُس کے لیے تمام صفات کمالیہ ثابت کی گئی ہیں، حالاں کہ تمام تعریفیں اللہ رب العزت کے لیے مخصوص ہیں، ماسویٰ اللہ کے لیے ایسا عقیدہ رکھنا کفر جلی ہے۔

اس لیے بندہ کے نزدیک یہ ترانہ مسلم طلبہ اور اساتذہ کے لیے بہت ہی خطرناک ہے، اگر متکلم یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے تو اُس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

احقر عبدالعزیز (مدرسہ عربیہ، سہارنپور)

الجواب: اول تو یہ ترجمہ اصل ترانہ کے انگریزی ترجمہ کا ترجمہ ہے، جب تک ترانہ کے اصل الفاظ سامنے نہ ہوں، کوئی قطعی وحتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔

پیش نظر ترجمہ کے الفاظ کا جہاں تک تعلق ہے، دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترانہ محض سیاسی انداز کا نہیں ہے، بل کہ اس میں مذہبی رنگ غالب ہے، جو اسلامی عقائد ونظریات سے میل نہیں کھاتا، بلکہ متصادم ہے، اور اسلام جو مزاج بنانا چاہتا ہے، اُس کے خلاف ہے، اور بعض جملوں میں وہم شرک بھی ہے، اس لیے مسلمانوں کو اُس سے اجتناب اور پرہیز لازم ہے، بلکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ حکومت کی طرف سے مسلمانوں کو اُس سے قانوناً وعملاً مستثنیٰ کرائیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ الاحقر محمود غفرلہ
(دارالعلوم دیوبند)

[۲۸] ابھی منیو کی قربانی کو حضرت حسینؓ کی قربانی کی طرح قرار دینا

۱۷۰- سوال: زید کا کہنا ہے اور وہ لکھتا ہے کہ کورووں اور پانڈووں کی مذہبی جنگ میں شری کرشن کا نوجوان بھانجا ''ابھی منیو'' شہید ہوتا ہے اور بہن ''سوبھدرا'' کی بے قراری اس سے دیکھی نہیں جاتی، تو اس وقت شری کرشن کہتا ہے کہ بہن! تیرے بیٹے اور میرے بھانجے کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی، بل کہ وہ مذہب کو اور زیادہ مضبوط کرے گی، اسی طرح کربلا کے میدان میں امام حسین اور ان کا خاندان شہید ہوا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے تھے کہ میرے نواسوں کی شہادت اسلام کی بنیاد کو مزید پختہ کرے گی۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ''ابھی منیو'' اور حضرت حسینؓ یکساں ہیں؟ زید، شری کرشن اور محمد پیغمبر ﷺ کو یکساں سمجھتا ہے، تو کیا یہ درست ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

اگر سوال میں مذکور واقعہ حقیقت کے مطابق ہو، تو اس سے آج کا ہندو و مذہب کیسے حق ثابت ہوسکتا ہے؟ پھر جب یہ حقیقت کربلا میں پیش آئی ہے، تو ہندوؤں کو کربلا کو حق سمجھنا چاہیے اور مذہب اسلام کو حق سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے، نہ یہ کہ کوئی مسلمان اپنے مذہب کی صحیح حقیقت - جو قریب میں پیش آچکی ہے - کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کی ہزاروں سال پہلے کی ایک کہانی (کتھا) یا حقیقت کی طرف نظر کرے، یہ تو ایسا ہوا گویا اپنے باپ کی سلطنت کو بھول کر سینکڑوں سال پہلے کی فرعون کی سلطنت کو یاد کرے۔

ایسا ہوسکتا ہے کہ سوال میں مذکور کہانی' واقعہ کربلا سے متاثر ہو کر بنائی گئی ہو، یہ سمجھنا کہ ابھی منیو اور شری کرشن بہ منزلہ حضرت حسین اور نبی کریم ﷺ کے ہیں، یہ صریح گمراہی ہے، آپ ﷺ کی نبوت صریح دلائل سے ثابت ہے، آپ واجب الاتباع ہیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی واقعۂ قربانی، قابل تقلید ہے، چوں کہ شری کرشن کی نبوت کا کوئی شرعی ثبوت نہیں ہے، اور ابھی منیو کے تحقیقی احوال تک سے لوگ ناواقف ہیں؛ اس لیے ایک کو دوسرے کے مماثل قرار دینا غیر معقول ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] یوگی اور راہ سلوک کے مسافر کو ایک جیسا سمجھنا

۱۷۱-سوال: زید کا عقیدہ ہے کہ اگر ایک ہندو بھائی یوگ (ہندوانہ مذہبی ورزش) اختیار کرے اور ایک مسلمان بھائی صوفیاء کی تعلیم اختیار کرے، تو باہم کوئی نفرت وتعصب اور بھید بھاؤ باقی نہ رہے گا، تو پوچھنا یہ ہے کہ کیا زید کا یہ عقیدہ صحیح ہے؟ اگر زید کا عقیدہ ٹھیک نہیں ہے، تو اسے کیا سمجھا جائے؟ کیا ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں؟ ایمان وکفر میں کوئی فرق نہیں ہے؟ کیا شریعت اسے قبول کرے گی؟ علمائے دین اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟ یوگی یوگ اختیار کرنے کی وجہ سے مسلمان کہلائے گا؟

الجواب حامداومصلیا:

تصوف کے کچھ طریقوں کے مماثل (ملتے جلتے) ہونے کی وجہ سے مقصد میں اتحاد پیدا نہیں ہوتا، یوگی اپنے عقیدے کے مطابق مقصد حاصل کرنے لیے ریاضت کرے گا تو وہ شیطان کی راہ چل کر جہنم میں

جائے گا اور صوفی اسی طریقے سے اپنے عقیدہ کے مطابق ریاضت کرے گا، تو وہ جنت میں پہونچے گا، طریقے ایک ہونے سے مقصد ایک نہیں ہوتا، اگر زید کا عقیدہ یہ ہے کہ صوفی اور یوگی دونوں حق پر ہیں اور یوگی بھی جنت میں جائے گا، تو زید ایمان سے خارج ہے، توبہ کرے اور نکاح کی تجدید کرے۔[1]

فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۳۰] پوری انسانیت کو اللہ کی اولاد قرار دینا

۱۷۲-سوال: زید کا کہنا اور ماننا ہے کہ گیتا اور قرآن کو دیکھنے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ خدا ایک ہی ہے، کرنے دھرنے والی ذات وہی ہے، پیدا کرنے والا اور پالنے والا وہی ہے۔ زید یہ بھی کہتا ہے کہ پوری انسایت ایک ہی باپ (ایشور) اللہ کی معنوی اولاد ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن کریم میں سورۂ اخلاص میں تو فرمایا گیا کہ نہ اللہ کسی کی اولاد ہے، نہ اللہ کی کوئی اولاد ہے[1] تو پھر زید کے اس عقیدہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

محض ایشور کو ایک ماننے کی وجہ سے توحید ثابت نہیں ہوجاتی، جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے، اس وقت عرب کے مشرکین بھی اس بات کے قائل تھے کہ رب اور خالق اللہ تعالیٰ ہے، مگر بت پرستی بھی کرتے تھے۔[2] اگر گیتا کی تعلیم واقعۃً قرآن کریم جیسی ہی ہے، تو تمام گیتا کے ماننے والوں کو گیتا چھوڑ کر قرآن کریم کو اپنا لینا چاہیے، مگر کوئی ہندو تو ایسا نہیں ہے، جو یہ کہے کہ قرآن کریم میں وہی ہے، جو گیتا میں ہے (لہٰذا تم مذہب اسلام کو قبول کرلو یا کم از کم مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھو) مگر مسلمانوں میں ایک طبقہ ہے، جس کے پاس سورج کی

---

(۱) قال اللہ تعالی: مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا أَفَلَا تَذَكَّرُونَ. [۱۱- ہود: ۲۴]

(۲) قال اللہ تعالی: قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝ [۱۱۲- الاخلاص: ۱-۴]

(۳) قال اللہ تعالی: وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ. (۲۹- العنکبوت: ۶۱)

قال اللہ تعالی: وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّن نَّزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِن بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ. [۲۹- العنکبوت: ۶۳]

قال اللہ تعالی: وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ قُلْ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ إِنْ أَرَادَنِيَ اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّهِ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ رَحْمَتِهِ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ. [۳۹- الزمر: ۳۸]

روشنی ہے، اس کے باوجود وہ ستاروں کی روشنی کا طالب ہے، اور غیر مسلم کے ساتھ تعلق قائم کرنا چاہتا ہے، یاد رکھیے! اللہ تعالیٰ نے غیر مسلموں سے دوستی کو منع فرمایا ہے۔ [1] اس لیے اس طبقہ کو اپنے افکار پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ اگر زید کا واقعۃً یہ عقیدہ ہے کہ پوری انسانیت حقیقت میں اللہ کی اولاد ہے، تو وہ ایمان سے خارج ہے۔ [2] فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۳۱] پیر کی تصویر کو چراغاں کرنا اور اسے گھر میں رکھنا

۱۷۳-سوال: ایک شخص پیران پیر صاحب کی تصویر گھر میں رکھتے ہیں اور اس کے سامنے چراغاں

---

(۱) لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَن تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً. (-۳آل عمران: ۲۸)

قال أبو بكر الجصاص (م: ۳۷۰ھ): وقوله تعالى: لا يتخذ المؤمنون الكافرين أولياء من دون المؤمنين الآية. فيه نهي عن اتخاذ الكافرين أولياء؛ لأنه جزم الفعل، فهو إذا نهي، وليس بخبر. قال ابن عباس: نهى الله تعالى المؤمنين بهذه الآية أن يلاطفوا. ونظيرها من الآي قوله تعالى: لا تتخذوا بطانة من دونكم لا يألونكم خبالا. وقال تعالى لا تجد قوما يؤمنون بالله واليوم الآخر يوادون من حاد الله ورسوله ولو كانوا آباءهم أو أبناءهم الآية. وقال تعالى: فلا تقعد بعد الذكرى مع القوم الظالمين. وقال تعالى: فلا تقعدوا معهم حتى يخوضوا في حديث غيره إنكم إذا مثلهم. وقال تعالى: ولا تركنوا إلى الذين ظلموا فتمسكم النار. وقال تعالى: فأعرض عن من تولى عن ذكرنا ولم يرد إلا الحياة الدنيا. وقال تعالى: وأعرض عن الجاهلين. وقال تعالى: يا أيها النبي جاهد الكفار والمنافقين واغلظ عليهم. وقال تعالى: يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء بعضهم أولياء بعض. وقال تعالى: ولا تمدن عينيك إلى ما متعنا به أزواجا منهم زهرة الحياة الدنيا لنفتنهم فيه. فنهى بعد النهي عن مجالستهم وملاطفتهم عن النظر إلى أموالهم وأحوالهم في الدنيا... الخ. (أحكام القرآن: ۲/۲۸۸ - ۲۸۹، آل عمران: ۲۸، ت: محمد صادق القمحاوي، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۳۵۲ھ- ۱۹۳۴ء) آل عمران کی آیت نمبر ۲۸ر کے تحت رقم طراز ہیں:

کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملے ہوتے ہیں: موالات، یعنی دوستی۔ مدارات، یعنی ظاہری خوش خلقی۔ مواساۃ، یعنی احسان ونفع رسانی، موالات تو کسی حال میں جائز نہیں، اور مدرات تین حالتوں میں درست ہے۔ ایک دفع ضرر کے واسطے، دوسرے اس کافر کی مصلحت دینی یعنی توقع ہدایت کے واسطے، تیسرے اکرام ضیف کے لیے، اور اپنی مصلحت ومنفعت مال وجان کے لیے درست نہیں، اور مواسات کا حکم یہ ہے کہ اہل حرب کے ساتھ ناجائز ہے اور غیر اہل حرب کے ساتھ جائز۔ (بیان القرآن: ۲۰۴، ط: المکتبۃ الاشرفیہ، دیوبند)

(۲) قال اللہ تعالیٰ: قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝ [۱۱۲-الاخلاص: ۱-۴]

کرتے ہیں، اس کو حاجت روا سمجھتے ہیں اور دونوں ہاتھ چراغ پر رکھ کر اس کو اپنے منہ وغیرہ پر پھیرتے ہیں، اس کے متعلق شریعت میں کیا حکم ہے؟ اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

پیر، ولی یا نبی کی تصویر گھر میں رکھنا جائز نہیں ہے، حرام ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: قیامت کے دن تصویر بنانے والے سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔[۱]

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ: جن گھروں میں تصویریں ہوتی ہیں، ان میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔[۲]

اس قسم کی تصویروں کے سامنے مرادیں مانگنا اور اپنی حاجات پیش کر کے ان کو حاجت روا سمجھنا اسلام سے محرومی کا باعث ہے۔[۳] مزید معلومات کے لیے ''عقائدِ اسلام'' اور ''مصیبتوں کے اسباب'' جیسی گجراتی کتب کا مطالعہ کریں۔[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن مسلم، قال: كنا مع مسروق، في دار يسار بن نمير، فرأى في صفته تماثيل، فقال: سمعت عبد الله، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابا عند الله يوم القيامة المصورون. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۸۰، رقم الحديث: ۵۹۵۰، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة، ط: البدر-ديوبند)

(۲) عن عائشة ... فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ... إن البيت الذي فيه الصور، لا تدخله الملائكة. (المصدر السابق)

(۳) وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللهِ مَنْ لا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلى يَوْمِ الْقِيامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعائِهِمْ غافِلُونَ. (۴۶- الأحقاف: ۵) ———— أي هو أضل من كل ضال، حيث ترك دعاء المجيب، القادر، المستجمع، لجميع صفات الكل، كما يشعر بذلك الاسم الجليل، ودعا من ليس شأنه الاستجابة له، وإسعافه بمطلوبه إلى يوم القيامة ...{ وَهُمْ عَن دُعَائِهِمْ }... أي والذين يدعون من لا يستجيبون لهم عن دعائهم إياهم { غافلون } لا يسمعون ولا يدرون، أما إن كان المدعو جماداً فظاهر، وأما إن كان من ذوي العقول، فإن كان من المقبولين المقربين عند الله تعالى، فلاشتغاله عن ذلك بما هو فيه من الخير، أو كونه في محل ليس من شأن الذي فيه أن يسمع دعاء الداعي للبعد كعيسى عليه الصلاة والسلام اليوم. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني - شهاب الدين محمود الألوسي (م: ۱۲۷۰ھ): ۱۳/ ۱۶۴، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۴) حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دونوں کتاب بزبان اردو 'عقائدِ اسلام' اور 'اسبابِ مصیبت اور ان کا حل' کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔

[۳۲] حکومتی قانون سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا

۱۷۴-سوال: ایک غیر مسلم مرد وعورت' موجودہ حکومت کے قانون سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کررہے ہیں، مذہب اسلام سے حقیقت میں ان کو کوئی دل چسپی نہیں ہے، غیر مسلم کے لیے ہندوستانی قانون کے مطابق دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے؛ اس لیے یہ دونوں (غیر مسلم مرد وعورت) دوسری شادی کرنے کے لیے مذہب اسلام کو اختیار کررہے ہیں، مقصود صرف اپنی شادی کو قانونی جواز فراہم کرنا ہے، تو کیا ان کو مسلمان سمجھا جائے گا؟

الجواب حامداو مصليا:

مذہب اسلام کی بنیاد مخصوص عقائد پر ہے۔[۱] عبادت وبندگی کی بنیاد اخلاص پر ہے۔[۲] اور اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی کام اللہ کو راضی کرنے کے لیے کیا جائے، دنیوی منفعت اور اپنے غلط مقصد کے حصول کے لیے جو بھی کام کیا جائے گا، وہ اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہوگا۔

جس شخص کے دل میں کفروشرک کی گندگی بھری ہوئی ہو اور ظاہر میں اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے مسلمان بتلاتا ہو، ایسا شخص منافق کہلائے گا۔[۳] جس کی قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں بڑی سخت

---

(۱) العقائد: مايقصد فيه نفس الاعتقاد دون العمل. (كتاب التعريفات-علي بن محمد بن علي الزين الشريف الجرجاني، باب القن، ص: ۱۵۲، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) عن محمود بن لبيد، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "إن أخوف ما أخاف عليكم الشرك الأصغر" قالوا: وما الشرك الأصغر يا رسول الله؟ قال: "الرياء، يقول الله عز وجل لهم يوم القيامة: إذا جزي الناس بأعمالهم: اذهبوا إلى الذين كنتم تراءون في الدنيا فانظروا هل تجدون عندهم جزاء". (مسند الإمام أحمد: ۳۹/۳۹، رقم الحديث: ۲۳۶۳، ط: مؤسسة الرسالة☆المعجم الكبير - الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۴/۲۵۳، رقم: ۴۳۰۱، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية - القاهرة☆شعب الايمان- أبوبكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۹/۱۵۴، رقم: ۶۴۱۲، اخلاص العمل لله عز وجل وترك الرياء، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون مع الدار السلفية بيومباي بالهند☆ شرح السنة-محيي السنة، البغوي الشافعي (م: ۵۱۶ھ): ۱۴/۳۲۴، رقم: ۴۱۳۶، ت: شعيب الأرنؤوط-محمدزهير الشاويش، ط: المكتب الإسلامي-دمشق-بيروت)

(۳) المنافق: هو الذي يضمر الكفر اعتقادا ويظهر الإيمان قولا. (كتاب التعريفات-علي بن محمد بن علي الزين الشريف الجرجاني (م: ۸۱۶ھ): ۲۳۵، باب الميم، ط: دار الكتب العلمية بيروت-لبنان)

سئل حذيفة: من المنافق؟ قال: «الذي يصف الإسلام ولا يعمل به». (مصنف ابن شيبة: ۷/۴۸۳، رقم: ۳۷۴۱۵،=

وعیدیں وارد ہوئی ہیں؛ چناں چہ اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ (۴)

ترجمہ: اور ان (کافروں) میں سے بعضے ایسے بھی ہیں، جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر اور (حالاں کہ) وہ بالکل ایمان والے نہیں ہیں۔ چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے' جو ایمان لا چکے ہیں (یعنی محض چال بازی کی راہ سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں) اور وہ واقعی میں کسی کے ساتھ بھی چال بازی نہیں کرتے، بہ جز اپنی ذات کے' اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں (بڑا) مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض اور ان کے لیے سزائے دردناک ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

اسی طرح ''سورۂ منافقون'' میں بھی منافقین کا تفصیلی بیان آیا ہے۔ (۵) احادیث مبارکہ میں بھی ان کے متعلق بڑی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ (۶)

= كتاب الفتن، من كره الخروج في الفتنة الخ، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد - الرياض)

هو إبطان الكفر وإظهار الإسلام. (مرقاة المفاتيح: ۱/ ۱۲۷، كتاب الايمان، باب الكبائر، وعلامات النفاق، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) - ۲ البقرة: ۸ تا ۱۰۔

(۵) إِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ۗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝. (۶۳ - المنافقون: ۱ تا ۳)

ترجمہ: جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم (دل سے) گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں اور یہ تو اللہ کو معلوم ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں (اس میں تو ان کے قول کی تکذیب نہیں کی جاتی) اور (باوجود اس کے) اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین (اس کہنے میں) جھوٹے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی قسموں کو (اپنی جان و مال بچانے کے لیے) سپر بنا رکھا ہے پھر یہ لوگ (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، بیشک ان کے یہ اعمال بہت ہی برے ہیں۔ (اور ہمارا) یہ (کہنا کہ ان کے اعمال بہت برے ہیں) اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ (اول ظاہر میں) ایمان لائے، پھر (کلمات کفریہ کہہ کر) کافر ہو گئے، سو ان کے دلوں پر مُہر کر دی گئی تو یہ (حق بات کو) نہیں سمجھتے۔

(۶) وأما الكافر - أو المنافق - فيقول: لا أدري، كنت أقول ما يقول الناس، فيقال: لا دريت ولا تليت، ثم يضرب =

اس لیے ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذہب اسلام کو سچے دل سے قبول کریں، صرف ملکی قانون سے بچنے کے لیے اپنے اسلام کا اظہار نہ کریں، صحیح معنوں میں اسلام لانے کے بعد مرد اپنی پرانی بیوی کو بھی اسلام کی دعوت دے، اگر وہ اسلام قبول کرلیتی ہے، توان کا سابق نکاح اپنے حال پر باقی رہے گا اور اسلام قبول کرنے سے انکار کردے، توان کا نکاح ختم ہوجائے گا، پھر اپنا دوسرا نکاح کرنے میں عجلت سے کام نہ لے، تاکہ مذہب اسلام بدنام نہ ہو۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۱۹۷۷/۹/۴ء

[۳۳] علامات کفر پائے جانے کی صورت میں ختنہ دلیل ایمان نہیں

۱۷۵-سوال: ہمارے یہاں آج سے تقریباً ۲۵ سال سے کسی دوسری جگہ کا ایک آدمی رہتا ہے، وہ کوئی بھی زبان نہیں بول سکتا، اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ ہندو ہے، وہ کسی مذہب کی پیروی نہیں کرتا اور اس کا دماغی توازن درست نہیں ہے، ہمارے ساتھ رہ کر ہماری زبان سیکھ گیا ہے اور جب اذان ہوتی ہے تو اس طرح کے الفاظ بولتا ہے ''اللہ باوا کی جے'' اب تقریباً چھ مہینے سے وہ آدمی بیمار ہے۔

اگر اس آدمی کا انتقال ہوجائے، تو ہم کیا کریں؟ جب یہ آدمی ہمارے پاس رہنے کے لیے آیا تھا، اس وقت اس کی عمر ۲۲ رسال تھی، فی الحال اس کی عمر ۴۵ سے ۴۷ سال ہے، تو اس کو دفن کریں یا پھر دوسری قوم کے حوالہ کردیں؟ اس آدمی کو اپنا نام بھی ٹھیک سے یاد نہیں، جب اس کے گاؤں کا نام پوچھتے ہیں، تو

=بمطرقة من حديد ضربة بين أذنيه، فيصيح صيحة يسمعها من يليه إلا الثقلين ". (صحيح البخاري:۱/۱۷۸، رقم الحديث: ۱۳۳۲، كتاب الجنائز، باب خفق النعال، ط: البدر، ديوبند)

عن عبد الله في قوله تعالى: {إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ} [النساء: ۱۴۵] الأسفل من النار. قال: «في توابيت من حديد مبهمة عليهم». (الزهد- أبو السَّرِي هَنَّاد بن السَّرِي الكوفي (م: ۲۴۳هـ): ۱/۱۹۱، باب الخلود في النار، رقم: ۲۲۳، ت: عبد الرحمن عبد الجبار الفريوائي، ط: دار الخلفاء للكتاب الإسلامي - الكويت)

قال ابن مسعود: أي أهل النار أشد عذابا؟ فقال رجل: المنافقون، قال: صدقت. قال: فهل تدري كيف يعذبون. قال: يجعلون في توابيت من حديد، تطبق عليهم، ثم يجعلون في الدرك الأسفل من النار، في تنانير أصغر من الزج، يقال له جب الحزن، فيطبق على أقوام بأعمالهم آخر الأبد. (النهاية في الفتن والملاحم -أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي (م: ۷۷۴هـ): ۲/۱۷۶، ألوان من عذاب اهل النار، ت: محمد أحمد عبد العزيز، ط: دار الجيل - بيروت)

صرف رانجی بتلاتا ہے اور اس کا نام پوچھتے ہیں، تو ''کنک سنگھ'' کہتا ہے اور باپ کا نام ''پریتم'' بتلاتا ہے، جب وہ آیا، اس وقت بالکل مادرزاد ننگا تھا، جب اسے کپڑے دیے جاتے، تو پھاڑ ڈالتا تھا، فی الحال کپڑے پہنتا ہے اور جب سے یہاں آیا تھا، اسی وقت سے ختنہ شدہ ہے، اب ہم کیا سمجھیں؟ اگر اس آدمی کا اچانک انتقال ہو جائے، تو دفن کردیں یا دوسری قوم کو سپرد کردیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کی ذکر کردہ تفصیل کے مطابق مذکورہ آدمی اپنے باپ کا نام کافروں جیسا بتلاتا ہے، تو ختنہ کی وجہ سے اس کے مسلمان ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا؛ کیوں کہ غیر مسلم حضرات بھی صحت وتندرستی کے لیے ختنہ کرواتے ہیں اور اذان کو سن کر جو لفظ وہ بول رہا ہے، اس سے بھی کفر کی بو آرہی ہے؛ لہٰذا آپ اس کے پاس کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت عربی، اردو یا گجراتی میں سمجھا کر بلوالیں، وہ اپنی رضامندی سے کہہ دے گا، تو مسلمان سمجھا جائے گا۔[1] ورنہ اسے مسلمان نہیں شمار کیا جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۴] کورووں اور پانڈووں کی جنگ کو جنگ بدر وکربلا کے ساتھ تشبیہ دینا

۱۷۶-سوال: مہابھارت کے پانڈووں اور کورووں کے درمیان کی جنگ کو بدر (جو کہ حق و باطل کے درمیان کی مذہبی معرکہ آرائی تھی) اور جنگ کربلا کی طرح قرار دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ کورووں اور پانڈووں کا وجود ہوا ہے یا نہیں؟ اور ان کی جنگ کی حقیقت دنیا میں رونما ہوئی ہے یا نہیں؟ اور ان کا کہنا کیا تھا؟ بدر اور کربلا کے مقصد کے ساتھ اس کو تشبیہ کس بنیاد پر دی جائے؟ کورووں اور پانڈووں کی جنگ کو جنگ بدر اور معرکہ کربلا سے تشبیہ دینا غلط ہے، اس سے اجتناب ضروری ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] صرف کافر بننے کا ارادہ کرنے سے کوئی کافر نہیں ہوگا

۱۷۷-سوال: ایک آدمی غصہ میں ان الفاظ کا تکلم کیا کہ جب فیملی اور خاندان والے نیز رشتہ دار

---

(۱) ... فقال: ما الإيمان؟ قال: «الإيمان أن تؤمن بالله وملائكته، وكتبه، وبلقائه، ورسله وتؤمن بالبعث. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲، رقم الحديث: ۵۰، كتاب الايمان، باب سؤال جبريل. الخ، ط: البدر-ديوبند)

اور دوست واحباب میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے اور میرے ساتھ سلام وکلام کا معاملہ بھی نہیں رکھتے اور مسلمان نہیں سمجھتے، تو میرے مسلمان رہنے سے کیا فائدہ؟ لہٰذا اب میں ان کی اذیتوں سے عاجز آکر دو چار دن میں مذہب بدلنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں، تو کیا ان الفاظ کی وجہ سے مذکورہ آدمی ایمان سے نکل جائے گا؟

(۲) اگر واقعی وہ ایمان سے نکل گیا، تو کیا اس کی بیوی بھی ایمان سے نکل جائے گی؟ ان دونوں کے لیے شریعت کا کیا حکم ہے؟ اور آئندہ کیا کیا جائے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

ایمان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہے، ہر ایمان والے کو اس نعمت پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے اور اس نعمت کے چھین جانے سے ڈرتے بھی رہنا چاہیے، امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں اس کے متعلق عنوان قائم کرکے اس میں احادیث اور آیات نقل کی ہے: "باب خوف المؤمن أن يحبط عمله وهو لايشعر"[1] (مومن کو اس بات سے ڈرتے رہنا چاہیے کہ اس کے اعمال برباد ہو جائیں اور اسے خبر بھی نہ ہو)

دنیا میں ہر شخص حالات سے پریشان ہے، حالات سے مایوس ہوکر اور طیش میں آکر تبدیلیٔ مذہب کے بارے میں سوچنا بہت ہی خطرناک چیز ہے، حقیقتاً یہ ایک شیطانی وسوسہ ہے اور گناہوں کی نحوست ہے؛ لہٰذا توبہ اور استغفار کرنا ضروری ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ ایمان والوں کی جانب سے ایک مومن کو اتنا عاجز و پریشان کر دیا جائے کہ وہ مذہب بدلنے کی (نعوذ باللہ) سوچ لے، یہ بہت ہی دکھ کی بات ہے، اگر کسی آدمی سے بھول ہوگئی ہو، تو اس کو تھوڑی بہت سرزنش کی جائے، اگر کوئی آدمی مالی پریشانی کی وجہ سے ایسی خراب بات سوچ رہا ہو، تو مسلمانوں پر اس کی مدد کرنا ضروری ہے اور اگر ذاتی یا بال بچوں کی بیماری وغیرہ کی وجہ سے ایسا خیال کرے، تو اس کی امداد کرنی چاہیے، کسی کو اس حد تک پریشان کرنا کہ وہ ایمان چھوڑ دینے کے بارے میں سوچنے لگے، جائز نہیں ہے؛ لہٰذا دونوں فریق کو بہت ہی زیادہ توبہ واستغفار کرنے کی ضرورت ہے، شامی میں ہے: "لا يخرج الرجل من الإيمان إلا جحود ما أدخله فيه، ثم ما تيقن أنه ردة يحكم بها، وما يشك أنه ردة لا

(۱) صحيح البخاري: ۱/ ۱۲، كتاب الإيمان، ط: البدر - ديوبند.

يحكم بها، إذ الإسلام الثابت لا يزول بالشك مع أن الإسلام يعلو وينبغي للعالم إذا رفع إليه هذا أن لا يبادر بتكفير أهل الإسلام مع أنه يقضي بصحة إسلام المكره... وفي الفتاوى الصغرى: الكفر شيء عظيم فلا أجعل المؤمن كافرا متى وجدت رواية أنه لا يكفر اهـ وفي الخلاصة وغيرها: إذا كان في المسألة وجوه توجب التكفير ووجه واحد يمنعه فعلى المفتي أن يميل إلى الوجه الذي يمنع التكفير تحسينا للظن بالمسلم. زاد في البزازية إلا إذا صرح بإرادة موجب الكفر فلا ينفعه التأويل حينئذ. وفي التتارخانية: لا يكفر بالمحتمل، لأن الكفر نهاية في العقوبة فيستدعي نهاية في الجناية، ومع الاحتمال لا نهاية اهـ والذي تحرر أنه لا يفتى بكفر مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن أو كان في كفره اختلاف ولو رواية ضعيفة، فعلى هذا فأكثر ألفاظ التكفير المذكورة لا يفتى بالتكفير فيها ولقد ألزمت نفسي أن لا أفتي بشيء منها. (رد المحتار: ۴/ ۲۲۳، ۲۲۴، كتاب الجهاد، باب المرتد، ط: دار الفكر)

مطلب یہ ہے کہ ایمان اصل میں دل سے یقین کرنے کا نام ہے اور محض شک وشبہ کی وجہ سے ایمان ختم نہیں ہوتا، مذکورہ شخص نے مذہب تبدیل نہیں کیا ہے، صرف ایسا سوچ رہا ہے، اس کی وجہ سے وہ آدمی کافر نہیں ہوگا؛ البتہ یہ سوچ بھی بہت بری ہے؛ لہٰذا خوب توبہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مذکور آدمی کافر نہیں ہوا؛ لہٰذا اس کی بیوی اس کے نکاح سے نہیں نکلے گی۔ فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ
۲۹ رجب ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۶/۱۰/۲۰۰۱ء

[۳۶] آتما، نفس اور روح کو برابر قرار دینا درست ہے؟

۱۷۸-سوال: زید کا کہنا ہے کہ آتما امر ہے، وہ تین طرح کے اوصاف سے متصف ہے: (۱) ستیہ گون۔ (۲) رجوگون۔ (۳) تموگون، ریاضت، سخاوت، خدمت، عبادت، یہ سب ستیہ گون سے کرنا چاہیے، تب ہی عمدہ ہے، یہی بات قرآن کریم میں محمد صاحب نے فرمائی ہے کہ نفس، روح، آتما امر ہے اور وہ تین اقسام پر ہے:

(۱) نفس امارہ، (رجوگونی آتما) جو ظلمت میں لپٹا ہوا ہے۔

(۲) نفس لوامہ، تموگونی آتما

(۳) نفس مطمئنہ، ستیہ گونی آتما، جو اچھے کاموں کا خیال رکھ کر اللہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کام کرتا ہے،

اس طرح کرنے سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ قرآن کریم میں بات محمد صاحب کرتے ہیں یا اللہ تعالیٰ؟ زید کا آتما، نفس اور روح کو برابر قرار دینا درست ہے؟ کیا زید کا یہ عقیدہ صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اس بحث میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، روح اور نفس میں فرق ہے یا نہیں، یہ بات ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ [1] اس میں بہت سارے اقوال ہیں۔

گیتا میں جو بات لکھی ہے وہ بہت اچھی ہے، انکار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، پھر جب قرآن کریم میں یہی بات ہے، تو قرآن کریم حق ہے، اسے مان لینا چاہیے اور دو چند باتوں میں مماثلت کی وجہ سے دونوں کتابوں میں مماثلت ثابت نہیں ہوتی، تورات، زبور، انجیل بھی تو اللہ ہی کی کتابیں ہیں، ان کی بھی بہت سی باتیں باہم ملتی جلتی ہیں، تو کیا اس وقت بجائے قرآن کے توریت کو قابل عمل گردانا جاسکتا ہے؟ بس مختصر یہ کہ قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے بعد ہمیں کسی کی ضرورت نہیں۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۳۷] شری کرشن کو نبوت میں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے مماثل قرار دینا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۷۹–سوال: زید کے دوستوں کا کہنا ہے کہ زید ہندو مذہب کا اعتقاد رکھتا ہے اور اس نے ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں سے ہندو مذہب کی کتابوں کا علم حاصل کر کے PHD کی ڈگری بھی حاصل کی ہے اور ہندو مذہب پر کتابیں بھی لکھی ہیں، ان کتابوں میں اس نے قرآن کریم کو عجیب وغریب طریقے پر بیان کیا ہے، اللہ تعالیٰ اور آقائے نامدار حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمارے بزرگوں کے ساتھ شری کرشن کو شریک کیا ہے، (ان کو ایک جیسا قرار دیا ہے) سوال یہ ہے کہ ایسے عقیدے کا حامل شخص دائرۂ اسلام میں داخل سمجھا جائے یا خارج؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

''قرآن کریم کو عجیب وغریب طریقے پر بیان کیا ہے'' اس کی کوئی مثال سوال میں مذکور نہیں ہے۔

---

(۱) وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا. (۱۷- الاسراء: ۸۵)

(۲) وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ. (۳- آل عمران: ۸۵)

کتاب (زید کی کتاب) سے اس کی کوئی مثال پیش کر کے سوال کرنا چاہیے؛ تا کہ صحیح جواب دیا جا سکے، اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر بزرگانِ دین کے ساتھ شری کرشن کو شریک کیا ہے، اس کا مطلب بھی بغیر مثال کے سمجھنا مشکل ہے، اتنی بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص قرآن کریم کو اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب نہیں مانتا، وہ دائرۂ ایمان سے خارج اور مرتد ہے۔[1] اسی طرح تاج دار انبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرشن جیسے شخص کو (جس کی نبوت بہ طریق صحت ثابت نہیں) شریک کرنا انتہائی بے ادبی و گستاخی ہے۔

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۳۸] شری کرشن کو نبی اور گیتا کو آسمانی کتاب ماننا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۸۰-سوال: زید کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کی آیتوں اور گیتا کے شلوک میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں ہی برابر ہیں، گیتا آسمانی کتاب ہے، جو شری کرشن جیسے نبی پر اللہ نے نازل کی ہے؛ لہٰذا تمام مسلمانوں پر گیتا کو آسمانی کتاب اور شری کرشن کو انبیاء میں سے ماننا لازم ہے۔ زید کے اس خیال سے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ اور مذکورہ اعتقاد رکھنے والے اور اس خیال کو لوگوں میں عام کرنے والے لوگوں کو کیا سمجھا جائے؟ تفصیلی جواب سے نوازیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

''قرآن کریم اور گیتا میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں برابر ہے'' اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ایک درجے کی آسمانی کتابیں ہیں، تو اس طرح کا اعتقاد رکھنے والا اور شری کرشن کو نبی ماننے والا اور دوسروں کو نبی ماننے کی دعوت دینے والا سخت گنہگار ہے؛ کیوں کہ گیتا کا آسمانی کتاب ہونا ثابت نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وإن القرآن كلام الله منه بدا بلا كيفية قولا وأنزله على رسوله وحيا وصدقه المؤمنون على ذلك حقا وأيقنوا أنه كلام الله تعالى بالحقيقة ليس بمخلوق ككلام البرية فمن سمعه فزعم أنه كلام البشر فقد كفر وقد ذمه الله وعابه وأوعده بسقر حيث قال تعالى (سأصليه سقر) [المدثر: ٢٦] فلما أوعد الله بسقر لمن قال: (إن هذا إلا قول البشر) [المدثر: ٢٥] علمنا وأيقنا أنه قول خالق البشر ولا يشبه قول البشر. (العقيدة الطحاوية-أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة الأزدي المصري المعروف بالطحاوي (م:٣٢١ھ) ص:٤٠-٤١، شرح وتعليق: محمد ناصر الدين الألباني، ط: المكتب الإسلامي-بيروت)

(۲) إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (-١٢ يوسف:٢)

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ط وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا. (-٣٣ الأحزاب:٤٠)

[۳۹] شری کرشن، گوتم بودھ اور رام کو نبی ماننا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۸۱-سوال: زید کہتا ہے کہ شری کرشن کے ساتھ گوتم بودھ اور رام کو بھی نبی (پیغمبر) ماننا لازم ہے، زید کے اس اعتقاد کے سلسلے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

یہ گمراہی ہے، اس سے توبہ کرنی چاہیے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۰] شری کرشن کو خدا اور گیتا کو اللہ کا کلام ماننا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۸۲-سوال: زید کا یہ عقیدہ ہے اور اس نے لکھا ہے کہ شری کرشن فنا فی اللہ ہونے کی حالت میں جو کچھ بولتے ہیں، وہی گیتا ہے اور گیتا کا پیغام دینے والے شری کرشن وحدۃ الوجود کی حالت میں خود بھگوان یا اشور (اللہ) بولتے ہیں، تو زید کا یہ عقیدہ کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

اس سے تو ثابت ہورہا ہے کہ زید کرشن کو خدا اور گیتا کو اللہ کا کلام مانتا ہے؛ حالاں کہ یہ صریح کفر ہے۔ (۲) کرشن اگر خدا ہے، تو پیغمبر کیسے ہو سکتے ہیں؟ نیز وحدۃ الوجود کا عقیدہ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۱] عباس علی تائی کے معافی نامہ کے متعلق چند سوالات

۱۸۳-سوال: تاریخ ۱ر جنوری ۱۹۹۳ء کے ماہ نامہ ''طیبہ'' میں سونواڑی کے باشندے عباس علی بھائی نے جو ''معافی نامہ'' شائع کروایا، اسی طرح اسی ماہ یعنی جنوری ۱۹۹۳ء کو آنند سے شائع ہونے والے ماہ نامہ ''التبلیغ'' میں ڈاکٹر تائی کا ''معافی نامہ'' شائع ہوا، جس سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے؛ چناں چہ بہت

---

(۱) قال اللہ تعالیٰ: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ. (۴۰-غافر: ۷۸) تفصیل کے لیے دیکھیے: باب ما یتعلق بالانبیاء واتباعہم۔

(۲) وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ. (لقمان: ۱۳)

سے لوگوں کے ہمارے دارالاشاعت میں خطوط آئے ہیں، ان کے جوابات کے لیے ہم آپ کو اس بات کی زحمت دیتے ہیں کہ درج ذیل ۳؍سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں؟

سوال: ہندی اشعار میں ''شری کرشن کے مختلف پہلو'' کے عنوان پر ایک بڑا مضمون لکھ کر مضمون نگار نے P.H.D کی ڈگری حاصل کی ہے، جس میں انہوں نے اسلام پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ اس کے علاوہ دوسری کتابیں یہ ہیں: (۱) ہندی اشعار میں شری کرشن کا بال روپ (۲) ہندی اشعار میں کرشن راجہ کا دھرم راج (۳) ہندی اشعار میں کرشن کا درشنک روپ؛ وغیرہ، ان کتابوں کی وجہ سے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے، اور آج وہ اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر اور مصنف جیسے القاب لکھتے ہیں، سوال یہ ہے کہ ان کے ان عقائد کو کیسا سمجھنا چاہیے؟ اور اس ڈگری کو کینسل کرنا ان کے لیے لازم ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کسی بھی مسلمان پر کفر کا حکم لگانے میں شرعاً حتی الامکان احتیاط کا حکم ہے۔[1] پہلی مرتبے کی گفتگو کے متعلق عباس بھائی نے جو معافی نامہ لکھا ہے، خواہ معافی کے بعد ان کے دل میں کچھ ہو، ان کے ایمان سے خارج ہونے کا حکم نہیں لگا سکتے، اگر انہوں نے دھوکے بازی کی ہے، تو اس کا وبال ان پر ہوگا۔

ان کو اپنے بے بنیاد عقیدے اور مضمون نگاری کی بنا پر جو ڈگری ملی ہے، اسے ٹھکرا دینا چاہیے، ورنہ وہ

---

(۱) لا یفتی بالکفر بشيء منها إلا فیما اتفق المشایخ علیه کما سیجيء قال في البحر: وقد ألزمت نفسي أن لا أفتي بشيء منها.. (الدر المختار) روی الطحاوي عن أصحابنا لا یخرج الرجل من الإیمان إلا جحود ما أدخله فیه ثم ما تیقن أنه ردة یحکم بها وما یشك أنه ردة لا یحکم بها إذ الإسلام الثابت لا یزول بالشك مع أن الإسلام یعلو وینبغي للعالم إذا رفع إلیه هذا أن لا یبادر بتکفیر أهل الإسلام مع أنه یقضي بصحة إسلام المکره... وفي الفتاوی الصغری: الکفر شيء عظیم فلا أجعل المؤمن کافرا متی وجدت روایة أنه لا یکفر وفي الخلاصة وغیرها: إذا کان في المسألة وجوه توجب التکفیر ووجه واحد یمنعه فعلی المفتي أن یمیل إلی الوجه الذي یمنع التکفیر تحسینا للظن بالمسلم زاد في البزازیة إلا إذا صرح بإرادة موجب الکفر فلا ینفعه التأویل ح وفي التتارخانیة: لا یکفر بالمحتمل، لأن الکفر نهایة في العقوبة فیستدعي نهایة في الجنایة ومع الاحتمال لا نهایة اهـ والذي تحرر أنه لا یفتی بکفر مسلم أمکن حمل کلامه علی محمل حسن أو کان في کفره اختلاف ولو روایة ضعیفة فعلی هذا فأکثر ألفاظ التکفیر المذکورة لا یفتی بالتکفیر فیها ولقد ألزمت نفسي أن لا أفتي بشيء منها. (رد المحتار: ۴/ ۲۲۳، ۲۲۴، کتاب الجهاد، باب المرتد، ط: دار الفکر)

البحر الرائق - ابن نجیم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۵/ ۱۳۵، باب احکام المرتدین، ط: دار الکتاب الإسلامي.

گنہ گار ہوں گے؛ لیکن اگر اس گمان سے اپنی ڈگری رد نہ کرتے ہوں کہ یہ ڈگری مجھے میری محنت اور لیاقت کی بنا پر ملی ہے، تو بھی ان کے ایمان سے خارج ہونے کا حکم نہیں لگا سکتے؛ کیوں کہ اس عقیدے سے متعلق وہ معافی مانگ چکے ہیں؛ لیکن جو ڈگری (عہدہ) اپنے ایمان کے بارے میں لوگوں کو شک میں مبتلا کرتی ہو، اسے چھوڑ دینا چاہیے، اسلام کا تو یہ حکم ہے کہ تہمت کی جگہ سے دور رہو۔ [1] اگر کوئی آدمی تھیٹر کے پاس چکر لگاتا رہتا ہو، جس کی وجہ سے کوئی اس کو فاسق سمجھ بیٹھے، تو فاسق سمجھنے والوں کی اس میں غلطی نہیں ہے؛ بل کہ خود اس کی غلطی ہے؛ لہٰذا اس ڈگری کو (اپنے نام سے) ہٹا دینا چاہیے، ورنہ تو معافی میں شک وشبہ رہے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۲] ڈاکٹر عباس علی تائی کی معافی کے متعلق چند سوالات = ایضاً

۱۸۴-سوال: ذیل میں پوچھے گئے سوالات (مسئلہ) کے متعلق علماء دین، مفتی صاحبان شریعت کی رو سے کیا فرماتے ہیں؟ برائے کرم تفصیل سے جواب دیجیے۔

ڈاکٹر عباس علی تائی نے اپنی متعدد تصنیفات میں ایسی باتیں لکھی ہیں، جو اسلامی نقطۂ نظر سے بہت ہی بری ہیں، اس کے متعلق کچھ سوالات بھیج رہا ہوں، جواب عنایت فرمائیں۔

سوال: ڈاکٹر عباس علی تائی نے اتنی بڑی غلطی کے سلسلے میں صرف سرسری وضاحت پیش کر کے مسلم معاشرہ میں اپنے خلاف ابھرنے والے ہنگامہ کو دبانے کی ناپاک کوشش کی ہے، جب کہ اس نے جھوٹ بول کر، لوگوں کی غلط رہ نمائی کر کے شریعت کے حسین چہرے کو داغ دار کرنے کی نامسعود سعی کی ہے، میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ دین کا اتنا بڑا باغی، اتنا بڑا گنہ گار اپنے بچاؤ کے لیے صرف اتنی وضاحت پیش کرے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، تو اس کی معافی اور توبہ قابل قبول ہے یا نہیں؟

(الف) ان کی لکھی ہوئی صرف دو ہی کتابیں نہیں ہیں، تقریباً ۲۲ کتابیں ہیں، جن میں سے ہمارے مطالعہ سے گذرنے والی تقریباً ۸ سے ۱۰ کتابوں میں گستاخانہ تحریریں موجود ہیں اور وہ کتابیں

---

(۱) قال عمر بن الخطاب رضي الله عنه: «من أقام نفسه مقام التهمة، فلا يلومن من أساء به الظن. (مكارم الأخلاق - أبو بكر محمد بن جعفر بن محمد الخرائطي السامري (م: ۳۲۷هـ)، ص: ۱۶۱، رقم الحديث: ۳۷۷، باب ما يستحب للمرء من التحرز أن يساء به الظن، ط: دار الآفاق العربية، القاهرة)

کثیر تعداد میں غیر مسلموں کے درمیان تقسیم کی گئی ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جب تک یہ کتابیں لائبریری یا خانگی اداروں میں یا لوگوں کے پاس رہیں گی، آنے والی نسلوں کو گمراہ اور بدظن کرتی رہیں گی اور غیر قوم حوالے کے طور پر اسے مسلمانوں کے سامنے پیش کرے گی، تو اتنے عظیم گناہ کے بارے میں صرف اتنا کہنا کہ ''مجھ سے غلطی ہوگئی، میں معافی مانگتا ہوں'' معافی کے لیے کافی ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

وہی بات جو آپ کے خط کے جواب میں پہلے لکھ چکا ہوں، وہ یہ کہ جناب عباس بھائی نے اپنا جو معافی نامہ امارت شرعیہ کے سامنے پیش کیا ہے، اسے پوری طرح شائع کرنا ضروری ہے، اگرچہ میں امارت شرعیہ میں حاضر نہ تھا اور مجھے خبر بھی نہیں تھی کہ عباس بھائی امارت شرعیہ کے روبرو معافی نامہ پیش کرنے کے لیے جانے والے ہیں اور وہ گئے ہیں یا نہیں، اس کی بھی مجھے خبر نہیں، مگر امارت شرعیہ کی جانب سے معافی نامہ کی نقل جو مجھے ملی ہے، اس کی بنا پر اس فیصلہ کو میں تسلیم کرتا ہوں، آپ کا خط ملا تھا اور اس کے جواب میں بھی میں نے یہی لکھا تھا کہ پورا معافی نامہ شائع کرنا ضروری ہے۔ اس مختصر وضاحت کے بعد آپ کے سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں۔

(الف) جتنی بھی کتابیں لکھی ہیں، معافی نامہ کو شائع کرنے سے وہ سب رد و باطل شمار ہوں گی اور معافی نامہ کا امارت شرعیہ کا قبول کرنا ضمناً تمام مسلمانوں کا قبول کرنا شمار ہوگا، توبہ کا تعلق دل سے ہے اور توبہ قبول کرنا اور نہ کرنا اللہ کے اختیار میں ہے۔[1] جب کوئی آدمی ظاہر میں توبہ کرلے، تو اسے قبول کرلیا جاتا ہے، ہاں اس کے بعد اگر اس کا عمل توبہ کے خلاف ہو، تو وہ آدمی پھر مسلم شمار نہیں ہوگا۔

اب اس مذکور توبہ کے بعد اگر وہ پرانی کتابیں چھپوائے، یا چھاپنے میں مدد کرے، یا چھاپنے پر راضی رہے، تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس کی توبہ غلط ہے، اس سے پہلے نہیں کہہ سکتے، جو کتابیں چھپ چکی ہیں، اس میں سے جو کتابیں مصنف کے اختیار میں ہیں، اسے آئندہ تقسیم نہ کرے۔[2] اور جو کتابیں دوسروں کے

---

(۱) وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ. (۴۲-الشوری:۲۵)

(۲) قال العلماء: التوبة واجبة من كل ذنب، فإن كانت المعصية بين العبد وبين الله تعالى لا تتعلق بحق آدمي، فلها ثلاثة شروط: أحدها: أن يقلع عن المعصية. والثاني: أن يندم على فعلها. والثالث: أن يعزم أن لا يعود إليها أبدا. فإن فقد أحد الثلاثة لم تصح توبته. (رياض الصالحين-أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م:۶۷۶ھ): ۳۳، باب التوبة، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)

ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں، اگر وہ مسلمان ہیں، تو معافی نامہ شائع ہوجانے کے بعد انہیں چاہیے کہ وہ اسے نہ پڑھیں، اس پر مصنف کا کیا اختیار ہے؟ اور جو کتابیں لائبریری اور غیر مسلموں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں، ان پر مصنف کا کوئی اختیار نہیں، وہ (مصنف) اس پر کر بھی کیا سکتا ہے؟ کیا ایک آدمی جس نے مندر بنایا اور ہندوؤں کو سونپ دیا، پھر وہ اسلام قبول کرتا ہے، تو کیا اس سے یہ کہا جائے گا کہ تو پہلے اپنے مندر کو توڑ، اس کے بعد ہی تمہارا اسلام قبول کیا جائے گا؟ نہیں ایسا نہیں کہا جائے گا؛ بل کہ لازم ہے کہ اسی وقت اس کی توبہ قبول کر کے اسلام میں داخل کیا جائے پھر اگر اس کے اختیار میں ہوگا، تو مندر توڑوائے گا، ورنہ اس کے اسلام میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اسلام ماضی کے تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔ (۳) مذکورہ شخص کے بارے میں یوں سمجھ لیں کہ وہ مرتد ہو چکا تھا، مگر جب توبہ کر لی، تو توبہ قبول کر لی جائے گی، اب جہاں تک اس کے بس میں ہے، وہ ان کتابوں کو بند کرنے کی کوشش کرتا رہے، اس کے آگے کا وہ مکلف نہیں۔ فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۴۳] عباس علی تائی کے لیے کیا پی ایچ ڈی کی ڈگری واپس کرنا ضروری ہے؟ = ایضاً

۱۸۵-سوال: ''شری کرشن کے وِودھ روپ'' کے نام کا ایک مضمون لکھ کر اس نے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، اس میں بھی اسلام کے خلاف تحریر ہوگی، ایسا شبہ ہے، یہ مضمون بھی کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے، مذکورہ مضمون علماء ومفتیان کرام کو پڑھا کر یونیورسٹی کو اپنی غلطی کی خبر دے کر اپنی ڈگری کینسل کروانا چاہیے یا نہیں، اگر اس میں اسلام کے خلاف کوئی مضمون ہے، تو اس کی معافی کب معتبر ہوگی؟

الجواب حامداومصلیا:

اسلام کے خلاف مضمون ہوگا، ایسا شبہ ہے، تو ایسا شبہ معافی نامہ شائع ہونے سے معاف ہو جائے گا؛ لیکن اگر مستقبل میں اس کو شائع کروانا ہو، تو علماء کی رائے اور مشورے کے بغیر چھپوانا جائز نہیں ہے۔

---

(۳) قال (صلی اللہ علیہ وسلم): «أما علمت أن الإسلام يهدم ما كان قبله؟ وأن الهجرة تهدم ما كان قبلها؟ وأن الحج يهدم ما كان قبله؟». (صحیح المسلم: ۷۶/۱، رقم الحديث: ۱۹۲-(۱۲۱) كتاب الايمان، باب كون الإسلام يهدم ما قبله وكذا الهجرة والحج، ط: البدر-ديوبند)

پی ایچ ڈی P.H.D کی ڈگری واپس کرنا ضروری نہیں ہے، ڈگری دینے والے ادارے کو مطلع کر دینا ضروری ہے کہ ڈگری دلانے والی کتاب میں جو باتیں میں نے لکھی ہیں، ان سے میں رجوع کرتا ہوں اور اس سے میں متفق نہیں ہوں۔ [1] پھر اس کی وجہ سے اگر وہ ادارہ ڈگری واپس لے، تو مصنف کو افسوس بھی ہونا نہیں چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) قال العلماء: التوبة واجبة من كل ذنب، فإن كانت المعصية بين العبد وبين الله تعالى لا تتعلق بحق آدمي، فلها ثلاثة شروط: أحدها: أن يقلع عن المعصية. والثاني: أن يندم على فعلها. والثالث: أن يعزم أن لا يعود إليها أبدا. فإن فقد أحد الثلاثة لم تصح توبته. (رياض الصالحين - أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م:٦٧٦هـ)، ص:٣٣، باب التوبة، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت)

وقد ذکرو أن المسئلة المتعلقة بالكفر إذا كان لها تسع وتسعون احتمالا للكفر واحتمال واحد فی نفيه فالأولى للمفتى والقاضی أن يعمل بالاحتمال النافی ؛ لأن الخطاء فی إبقاء ألف كافر أهون من الخطاء فی افناء مسلم واحد. (شرح فقہ اکبر، ص:۱۹۹)

باب تكفير المسلم

(تکفیر مسلم کا بیان)

0

[تکفیر مسلم کا بیان]

[۱] علماء دیو بند کے جواب کے باوجود بریلوی رہنما اپنی تکفیری مہم سے کیوں باز نہیں آتے؟

۱۸۶-سوال: بریلوی مکتب فکر کے علماء؛ مشائخ دیو بند؛ خصوصاً: حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا الیاس کاندھلویؒ وغیرہ کے متعلق کہتے ہیں کہ ''وہ گستاخ رسول ہیں'' اور ان کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور حوالے میں ان کی کتابوں کے نام اور صفحات بھی ذکر کرتے ہیں اور عوام کے سامنے مؤثر انداز میں اپنی بات پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سب کافر ہیں اور ان کو مسلمان کہنے والا بھی کافر ہے۔

تو اس سلسلے میں معلوم یہ کرنا ہے کہ صحیح بات کیا ہے؟ اگر یہ علماء لوگوں کو غلط بات بتلاتے ہیں، تو ان پر قانونی کاروائی کیوں نہیں کی جاتی؟ آج تک یہ علماء مشائخ دیو بند کو برا بھلا کہتے آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں؛ مگر دیو بندیوں کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا، آخر اس کا راز کیا ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھ کر آپ صحیح اور سچ بات لکھ کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

آپ نے جن علمائے دیو بند کا تذکرہ کیا ہے (اللہ تعالیٰ ان کو اجر جزیل عطا فرمائے اور ان کی قبروں کو نور سے بھر دے) انھوں نے سنتوں کو زندہ کرنے اور بدعات کو مٹانے میں انتھک محنتیں کی ہیں اور اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں، جن میں بریلویوں کے اعتراضات اور بکواسوں کے

جوابات بھی دیے ہیں۔(۱) اور حق یہ ہے کہ ان کو لاجواب کر دیا ہے، اسی بنا پر بریلوی حضرات ان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں؛ لیکن جوابات سے اصلاح ان کی ہوتی ہے، جن میں کچھ سنجیدگی ہو اور سنت وبدعت کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہوں؛ مگر جن کو سمجھنا ہی نہ ہو اور ہٹ دھرمی ہی ان کا شیوہ ہو، ان کی اصلاح انتہائی مشکل ہے۔

دیکھیے! کفار ومشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسے کیسے سوالات کیے اور قرآن کریم نے ان کے جوابات دیے؛ یہاں تک کہ ان کے فرمائشی معجزہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے؛ مگر اس کے باوجود وہ لوگ ایمان نہیں لائے اور یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ ان کا جادو تو چاند پر بھی چل گیا!(۲)

اسی طرح بریلویوں کی موشگافیوں کے بھی جوابات دیے گئے ہیں اور آج بھی دیے جاتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ان کو یوں ہی چھوڑ دیا جاتا ہو؛ مگر بات دراصل یہ ہے کہ ان کے دل مردہ ہو گئے ہیں، توبہ کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہیں، ہٹ دھرمی پر اتر آئے ہیں؛ اسی وجہ سے ان کو صحیح راستہ نہیں مل پا رہا ہے۔(۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) دیکھیے: المهند على المفند، از: حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ (م: ۱۳۴۶ھ)، الطين اللازب على الأسود الكاذب، رسائل چاند پوری، عبارات اکابر اور رسائل مولانا سرفراز خاں صفدر، محاضرات علمیہ بر موضوع ردّ رضاخانیت از مفتی محمد امین صاحب پالن پوری، استاذ: دار العلوم دیو بند۔

(۲) وسبب نزولها (سورة القمر) أن مشركي قريش قالوا للرسول - صلى الله عليه وسلم - : إن كنت صادقا فشق لنا القمر فرقتين، ووعدوه بالإيمان إن فعل. وكانت ليلة بدر، فسأل ربه، فانشق القمر نصف على الصفا ونصف على قيقعان. فقال أهل مكة: آية سماوية لا يعمل فيها السحر. فقال أبو جهل: اصبروا حتى تأتينا أهل البوادي، فإن أخبروا بانشقاقه فهو صحيح، وإلا فقد سحر محمد أعيننا. فجاءوا فأخبروا بانشقاق القمر، فأعرض أبو جهل وقال: سحر مستمر. (تفسير البحر المحيط - أبو حيان الأندلسي [م: ۷۴۵هـ]: ۸/ ۱۷۱-۱۷۲، ت: عادل احمد الموجود، علي محمد معوض، ورفيقاه، ط: دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، طبع اول: ۱۴۱۳ھ = ۱۹۹۳، وروح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني - شهاب الدين محمود الآلوسي [م: ۱۲۷۰هـ]: ۲۷/ ۷۴، ط: دار الإحياء التراث العربي، بيروت، لبنان. والدر المنثور في التفسير بالمأثور للسيوطي [۸۴۹-۹۱۱هـ]: ۱۴/ ۶۸، سورة القمر، ت: الدكتور عبدالله بن عبد المحسن التركي، ط: دار هجر - مصر، الطبعة الأولى: ۱۴۲۴ھ = ۲۰۰۳ء۔

(۳) القلب الحي هو الذي يعرف الحق ويقبله ويحبه ويؤثره على غيره فإذا مات القلب، لم يبق فيه إحساس ولا تمييز بين الحق والباطل، ولا إرادة للحق وكراهة للباطل. (شفاء العليل في مسائل القضاء والقدر والحكمة والتعليل - أبو بكر ابن قيم الجوزية [۶۹۱-۷۵۱هـ]: الباب الخامس عشر: في الطبع والختم والقفل والغل، ط: دار المعرفة، بيروت، لبنان، طبع اول: ۱۳۹۸ھ = ۱۹۷۸ء۔

[۲] علمائے دیوبند کو زبردستی کافر کہلوایا جائے، تو کیا حکم ہے؟

۱۸۷-سوال: محترم حضرت مفتی صاحب　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون پہلے یہ مضمون ملاحظہ فرمائیں:

''میں دل سے اقرار کرتا ہوں کہ میں اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا صاحب فاضل بریلویؒ کے مسلک کے موافق سنی مسلمان ہوں اور سنی مذہب پر مکمل ایمان رکھتا ہوں۔ دیوبندی، وہابی اور تبلیغی جماعت کے پیشواؤں نے 'جن کتابوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کی ہے، وہ کتابیں درج ذیل ہیں: (۱) تقویۃ الایمان (۲) صراط مستقیم (۳) فتاویٰ رشیدیہ (۴) تحذیر الناس (۵) براہین قاطعہ (۶) حفظ الایمان (۷) بہشتی زیور۔ ان کتابوں میں اسلامی عقائد کے خلاف' مسائل لکھے گئے ہیں، ان کی بہت سی تحریروں کو کفریہ ثابت کر کے مدینہ منورہ اور ہندوستان کے علماء نے ان کے لکھنے والوں کو کافر اور مرتد قرار دیا ہے، جس کی تفصیل ''حسام الحرمین'' نامی کتاب میں درج ہے، اس کو میں بھی تسلیم کرتا ہوں اور میں مذکورہ فتویٰ کے بہ موجب ان سب کو- جن کا ذکر ابھی اوپر آیا ہے- کافر سمجھتا ہوں، اتنا ہی نہیں؛ بل کہ وہابی، دیوبندی اور تبلیغی جماعت والوں سے بالکل بیزاری کا اظہار کرتا ہوں اور ان سے دور رہنے کی ضمانت دیتا ہوں، میرے اس اقرار کو بوقت ضرورت برسر عام کیا جائے، اس میں مجھے کوئی حرج نہیں ہوگا، انتہی۔

حضرت مفتی صاحب! ہم اگر اس مضمون پر دستخط نہیں کرتے ہیں، تو ہماری اولاد کا رشتہ بھی نہیں ہوتا ہے اور جن کا ہو گیا ہے، وہ ٹوٹ جاتا ہے؛ بل کہ جماعت کی طرف سے ہمارا بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے اور بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؛ لہٰذا آپ ہماری بلا تاخیر رہنمائی فرمائیں کہ ایسی صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اگر ہم مجبوراً، بادل ناخواستہ اس پر دستخط کریں، تو کیا ہمارے ایمان میں کوئی نقصان آئے گا؟ امید ہے کہ جلد جواب عنایت فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

سوال میں مذکور تمام کتابیں' عقائد کی رو سے صحیح ہیں، ان میں نبی کریم ﷺ یا کسی ولی کی ذرا بھی بے ادبی نہیں کی گئی ہے؛ بل کہ اولیاء کرام کی شان کے موافق ان کتابوں میں وہ باتیں موجود ہیں، جو بریلویوں کی کسی کتاب میں نہیں مل سکتی۔ ان کتابوں کے مصنفین کو کافر کہنا جائز نہیں، حرام ہے،

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو شخص اپنے بھائی کو کافر کہتا ہے، تو دونوں میں سے ایک ضرور کافر ہو جاتا ہے، یا تو وہ شخص جس کو کافر کہا گیا ہے (اگر وہ حقیقت میں کافر ہو) یا وہ لفظ پلٹ کر کہنے والے کی طرف چلا جاتا ہے۔ (مسلم شریف: ۱/ ۵۷)[۱] لہٰذا جو لوگ مذکورہ کتابوں کے مصنفین کو- جو بڑے عالم دین ،صوفی اور ولی اللہ تھے- کافر کہتے ہیں اور دوسروں کو اس پر مجبور کرتے ہیں اور نہ کہنے پر اسے ہر طرح سے ستاتے اور بائیکاٹ کرتے ہیں، ان پر کفر کا اندیشہ ہے، یہ ان کی حد درجہ جہالت اور شرارت ہے، اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت نصیب فرمائے، آمین۔

ان کتابوں کے مصنفین کو کافر کہنا ہرگز جائز نہیں، حرام ہے؛ البتہ اگر جان کا خطرہ ہو، تو مجبوراً کہنے کی گنجائش ہے۔(۲) لیکن اس وقت بھی مذکورہ بزرگان دین کو کافر کہنے کے بجائے اس طرح کے الفاظ کہے: ''اگر مذکورہ کتابوں میں نبیوں، رسولوں اور اولیاء کرام کی شان میں گستاخی کی گئی ہے، تو ان کے لکھنے والے کافر ہیں'' اس طرح سمجھداری سے کہے گا، تو چھٹکارے کا راستہ مل جائے گا؛ کیوں کہ ظاہر ہے کہ ان سب کتابوں میں ذرا بھی گستاخی نہیں کی گئی ہے؛ لہٰذا اس قول کے قائل کے مطابق حقیقت میں ان کتابوں کے لکھنے والے کو کافر کہنا لازم نہیں آئے گا۔

اور بھلا ایسے حضرات کافر کیسے ہو سکتے ہیں، جو ہزاروں نہیں؛ بل کہ راہ ہدایت سے بھٹکے ہوئے لاکھوں انسانوں کی ہدایت اور ان کے اسلام کا سبب بنے ہیں، اللہ تعالیٰ صحیح سمجھ عطا فرمائے اور صراط مستقیم پر استقامت نصیب فرمائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) عن عبد الله بن دينار أنه سمع ابن عمر، يقول: قال رسول الله- صلى الله عليه وسلم-: "أيما امرئ قال لأخيه: يا كافر، فقد باء بها أحدهما، إن كان كما قال، وإلا رجعت عليه". (صحيح مسلم: ١/ ٥٧، رقم الحديث: ٦٠-(٢٦)، باب بيان حال إيمان من قال لأخيه المسلم: يا كافر، ط: المكتبة الأشرفية- ديوبند)

(۲) قال الله تعالى: إلا من أكره، وقلبه مطمئن بالإيمان، الآية...، و إن أكره على الكفر و السب بقيد أو حبس أو ضرب، لم يكن ذلك إكراها حتى يكره بأمر يخاف على نفسه أو على عضو من أعضائه يرخص له ذلك. (الفتاوى الهندية: ٥/ ٣٨، كتاب الإكراه، باب في ما يحل للمكره أن يفعل، ط: دار الكتب العلمية بیروت، طبع اول: ١٤٢١ھ- ٢٠٠٠ء، ☆رد المحتار على الدر المختار: ٦/ ١٣٤، كتاب الإكراه، ط: دار الفكر- بیروت، طبع دوم: ١٤١٢ھ- ١٩٩٢ء)

[۳] قرآن میں ولید بن مغیرہ کی مذمت - اور بریلویوں کی ہرزہ سرائی

۱۸۸-سوال: کیا قرآن کریم میں ولید بن مغیرہ - جو رسول اللہ کا دشمن تھا - کا تذکرہ اس طرح آیا ہے کہ اس کی دس برائیاں بیان کی گئیں، پھر جب اس کو اطلاع ہوئی، تو اس نے کہا: نو برائیاں تو مجھے معلوم ہے، مگر ایک برائی (میرا حرامی ہونا) معلوم نہیں تھی، پھر اس نے اپنی ماں کے سر پر تلوار رکھ کر پوچھا کہ سچ بتلا: میں حرامی ہوں یا حلالی؟ تو اس کی ماں نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا وہ سچ ہے، دراصل تیرا باپ ایک مال دار شخص تھا، مگر ساتھ ہی وہ عنین (نامرد) بھی تھا، مجھے اس کے مال کا کوئی وارث مطلوب تھا، اس لیے میں نے دوسرے کے ساتھ زنا کروایا، جس کی تو اولاد ہے اس لیے تو حرامی (ناجائز اولاد) ہے۔ بریلوی حضرات کہتے ہیں: قرآن کریم میں یہ واقعہ موجود ہے، تو کیا یہ بات صحیح ہے؟ اگر موجود ہے، تو کس سورت میں ہے، وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔ مجھے کسی بریلوی نے سورت اور آیت کی بھی نشان دہی کی تھی، مگر اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے۔

بریلوی حضرات، دیوبندیوں کے متعلق یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ولید بن مغیرہ کی اولاد ہیں؛ اس لیے ان میں وہ سب صفات ہیں، جو اُس میں تھیں، تو گویا دیوبندیوں کا تذکرہ قرآن میں برائی سے کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں آں جناب سے مفصل باحوالہ جواب کی درخواست ہے۔

الجواب حامداً ومصلياً:

مذکورہ واقعہ سورۂ ''ن والقلم'' کی آیت نمبر: ۱۰ تا ۱۳ میں مذکور ہے۔ (۱) تفسیر مدارک اور تفسیر حقانی میں ان آیات کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ولید بن مغیرہ کے بارے میں ہیں، قرآن شریف میں اس کا نام نہیں ہے، البتہ ان آیات کا شانِ نزول اسی کے متعلق ہے۔ (۲) مزید لکھا ہے کہ ۱۸ر سال کے بعد اس کے باپ نے اس

---

(۱) وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ﴿﴾ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ﴿﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ﴿﴾ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ﴿﴾. [-۲۸ القلم: ۱۰ تا ۱۳]

(۲) {مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ} بخيل والخير المال أو مناع أهله ... والمراد الوليد بن المغيرة عند الجمهور ... {زَنِيمٍ} دعي وكان الوليد دعيا في قريش ليس من سنخهم ادعاه أبوه بعد ثمان عشر سنة من مولده، وقيل بغت أمه ولم يعرف حتى نزلت هذه الآية ... روي أنه دخل على أمه وقال إن محمدا وصفني بعشر صفات وجدت تسعا في، فأما الزنيم فلا علم لي به فإن أخبرتني بحقيقته وإلا ضربت عنقك، فقالت: إن أباك عنين وخفت أن يموت فيصل ماله إلى غير ولده، فدعوت راعيا إلى نفسي فأنت من ذلك الراعي. (تفسير النسفي (مدارك التنزيل وحقائق التأويل) - أبو البركات عبد الله بن أحمد بن محمود حافظ الدين النسفي (م: ۷۱۰ھ): ۳/ ۵۲۰، ت: يوسف علي بديوي، ط: دار الكلم الطيب، بيروت)

مزید دیکھیے: تفسیر حقانی: ۷/ ۱۸۶، ط: دار الاشاعت، دہلی۔

بات کا دعویٰ کیا تھا کہ یہ میرے نطفے سے ہے۔ بچہ کے حرامی ہونے کے متعلق ماں ہی جان سکتی ہے کہ اس نے کہاں منھ کالا کیا ہے، باپ کو کیا علم ہو سکتا ہے؟

البتہ بریلویوں کا دیوبندیوں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ولید کی اولاد ہیں صحیح نہیں ہے، وہ (ولید) تو کافر تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا دشمن تھا، جب کہ دیوبندی مسلمان ہیں اور اسلام کے سچے خادم اور اور سنت کی اتباع کرنے والے ہیں۔ بریلوی حضرات جو ہرزہ سرائی کرتے ہیں، ان کے پیچھے نہ پڑیں، کل قیامت کے دن ظاہر ہو جائے گا کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] تکفیر میں احتیاط سے کام لیں

۱۸۹-سوال: ایک مسلمان ہے، کلمہ پڑھتا ہے، نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، حج کرتا ہے اور متقی و پرہیزگار ہے؛ لیکن شرک کرتا ہے، کیا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا؟

مسلمانوں میں یہ بات رائج ہے کہ امت محمدیہ میں ۷۳ ر فرقے ہوں گے، ایک کے سوا ۷۲ ر فرقے جہنم میں جائیں گے، کیا یہ بات درست ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

کیا شرک کرتا ہے، یہ تو آپ نے لکھا ہی نہیں، اس سے مطلع کریں، تو جواب دیا جائے گا۔

۷۲ ر فرقے جہنم میں جائیں گے، صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا، یہ حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔ (ترمذی، احمد، ابوداؤد، مشکوۃ ص ۳۰)[۱] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن عبد اللہ بن عمرو، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم... إن بني إسرائيل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة، وتفترق أمتي على ثلاث وسبعين ملة، كلهم في النار إلا ملة واحدة، قالوا: ومن هي يا رسول الله؟ قال: ما أنا عليه وأصحابي. (سنن الترمذي: ۲/ ۹۲، رقم الحديث: ۲۶۴۱، أبواب الإيمان، ما جاء في افتراق هذه الأمة، ط: البدر - ديوبند)
(هكذا في سنن أبي داؤد: ۲/ ۶۳۰، رقم الحديث: ۴۵۹۷، كتاب السنة، باب شرح السنة، ط: فيصل - ديوبند ☆ وفي مسند أحمد: ۱۹/ ۲۴۱، رقم الحديث: ۱۲۲۰۸، مسند أنس بن مالك، ط: مؤسسة الرسالة)
حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ متقدمین ومتاخرین علماء کا اتفاق ہے کہ جب تک کوئی شخص صاف صاف شرک نہ کرے، اس پر کفر کا فتوی نہیں لگایا جائے گا۔ قرآن وحدیث کو سمجھنے کی غلطی کی ہو تو اسے فاسق تو کہہ سکتے ہیں۔ (مرقاۃ شرح مشکوۃ ج ۱ ص ۱۴۸)
شرح عقائد میں علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں کہ اپنی غلطیوں پر جو لوگ قرآن وحدیث سے غلط استدلال کرتے ہیں، وہ فاسق کہلائیں گے، =

[۵] دینی امور کی ترغیب دینے والے کے جواب میں "لا اکراہ في الدین" کہنا کیسا ہے؟

۱۹۰-سوال: ایک شخص کو دین کی باتوں کی ترغیب دی گئی اور نماز کی تلقین کی گئی، تو اس نے جواب میں کہا کہ "لا إکراہ في الدین" (یعنی دین میں کوئی زبردستی نہیں) تو ایمان لانے کے بعد ایک مسلمان کے لیے اس طرح کا جواب دینا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

"لا إکراہ في الدین"(۱) (دین میں زبردستی نہیں) یہ ان لوگوں کے لیے ہے، جنہوں ں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا۔(۲) مگر جو لوگ مسلمان ہیں، ان کے لیے تمام فرائض وواجبات کو ادا کرنا اور تمام قسم کی نافرمانیوں سے بچنا ضروری ہے؛ لہٰذا نماز اور دیگر فرائض کی دعوت کے جواب میں مذکورہ آیت پڑھنا مناسب نہیں، اگر جواب دینے والا اس سے مراد یہ لیتا ہے کہ میں نماز کو فرض نہیں مانتا، تو اس پر کفر کا فتوی لگایا جائے گا۔(۳) اور اگر یہ مراد لیتا ہے کہ ٹھیک ہے، میں نماز پڑھوں گا، مگر آپ کو زور وجبر کرنے کا کوئی حق نہیں

= کافر نہیں، ص ۶۴۔ شامی میں ہے کہ ان کی گواہی بھی قبول کی جائے گی۔ وخروج مرتکب الکبیرۃ والرؤیۃ لا یصلح عذرا، لوضوح الأدلۃ من الکتاب والسنۃ الصحیحۃ، لکن لا یکفر، إذ تمسکہ بالقرآن أو الحدیث أو العقل، وللنهي عن تکفیر أهل القبلۃ والإجماع علی قبول شهادتهم. (ردالمحتار: ۱/۵۶۱، باب الإمامۃ، ط: دار الفکر-بیروت)

اشعۃ اللمعات میں (۱/۱۵۰) میں لکھا ہے کہ گمراہ جماعت کو کافر نہیں کہیں گے، قرآن وحدیث کے سمجھنے میں غلطی کی ہے، کفر نہیں کیا ہے۔ اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائیں گے، ہاں جن کے عقائد کفر تک پہنچ گئے ہوں، اور دین کی ضروری چیزوں کا انکار کرتے ہوں، ان کو کافر شمار کیا جائے گا، وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

التعلیق الصبیح (۱/۴۶) میں لکھا ہے: جو اللہ اور رسول پر ایمان لایا، ایسا کوئی بھی ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں جائے گا۔

(۱)- ۲البقرۃ: ۲۵۶.

(۲) لا إکراہ في الدین ... عن ابن عباس رضي اللہ تعالی عنهما »أن رجلا من الأنصار من بني سالم بن عوف یقال له الحصین کان له ابنان نصرانیان، وکان هو رجلا مسلما، فقال للنبي صلی اللہ تعالی علیه وسلم: ألا أستکرههما فإنهما قد أبیا إلا النصرانیۃ؟ فأنزل اللہ تعالی فیه ذلك«. وأل في الدین للعهد، وقیل: بدل من الإضافۃ أي دین اللہ وهو ملۃ الإسلام. (روح المعاني - شهاب الدین الألوسي (م: ۱۲۷۰هـ): ۲/۱۳، ت: علي عبد الباري عطیۃ، ط: دار الکتب العلمیۃ-بیروت، الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۵هـ)

(۳) (هي فرض عین علی کل مکلف)... (ویکفر جاحدها) لثبوتها بدلیل قطعي. (الدر المختار: ۱/۳۵۱-۳۵۲، کتاب الصلاۃ، ط: دار الفکر)

اور دعوت دینے میں آپ کا یہ زور و جبر والا طریقہ ٹھیک نہیں، تو اگر چہ یہ جواب مناسب نہیں ہے، مگر اس سے کفر لازم نہیں آتا اور اگر یہ مراد لے رہا ہو کہ میں نماز نہیں پڑھوں گا، تو کون ہے مجھے کہنے والا؟ تو سخت گنہ گار ہوگا اور اگر مقصد یہ ہو کہ آپ کو دعوت دینے کا طریقہ نہیں آتا، زبردستی مت کرو، تو اس میں کوئی گناہ بھی نہیں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] گناہ کی وجہ سے کسی کا بائیکاٹ کرنا

۱۹۱-سوال: ہمارے گاؤں کی جماعت، لوگوں کو ان کی ہر چھوٹی بڑی غلطیوں کی وجہ سے اصلاح کا موقع دیئے بغیر جماعت سے خارج کر دیتی ہے، اس کے یہاں خوشی غمی کے موقعوں پر شرکت نہیں کرتی؛ حتی کہ ایک شخص کی موت کے موقع پر جنازہ اور غسل کا تختہ دینے سے بھی انکار کر دیا، تو کیا گاؤں کی جماعت کسی مسلمان کو برطرف کر کے اس طرح کا برتاؤ کر سکتی ہے؟ اور ایسا فیصلہ کرنے والے متولی یا ٹرسٹ کے افراد کس قدر گنہ گار ہوں گے اس کے متعلق مع حوالہ جواب عنایت فرمائیں، نیز مفتیان کرام کے فتاویٰ کو اہمیت نہ دینے والا کتنا بڑا گنہ گار ہوگا، اور اس کے لیے کیا وعیدیں ہیں؟ وہ بھی بیان فرمائیں۔

الجواب حامداومصلیا:

گناہوں کا مرتکب مثلاً شرابی جوا کھیلنے والا، بے نمازی، لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھانے والا، اسی طرح شریعت کے خلاف کام کرنے والا ان جیسے لوگوں کو برطرف کیا جائے، تو جائز ہے جب کہ یہ اصلاح کی نیت سے ہو۔ (۲) اگر اصلاح کی امید نہ ہو یا برطرف کرنے سے زیادہ گمراہ ہونے کا اندیشہ ہو، تو برطرف

---

(۱) عمر بن الخطاب رضي الله عنه على المنبر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: »إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها، أو إلى امرأة ينكحها، فهجرته إلى ما هاجر إليه«. (صحيح البخاري: ۱/ ۲، رقم الحديث: ۱، باب بدء الوحي، ط: البدر - ديوبند)

(۲) عن عبد الله بن مغفل، أنه كان جالسا إلى جنبه ابن أخ له، فخذف، فنهاه، وقال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عنها وقال: »إنها لا تصيد صيدا، ولا تنكي عدوا، وإنها تكسر السن، وتفقأ العين« قال: فعاد ابن أخيه يخذف فقال: أحدثك أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عنها، ثم عدت تخذف، لا أكلمك أبدا. (سنن ابن ماجة، ص: ۳، رقم الحديث: ۱۷، باب تعظيم حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم، والتغليظ على من عارضه، ط: البدر - ديوبند)

عن عبد الله بن عمر، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "لا يمنعن رجل أهله أن يأتوا المساجد"، فقال ابن لعبد الله بن عمر: فإنا نمنعهن، فقال عبد الله: "أحدثك عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وتقول هذا"، قال: فما كلمه عبد الله=

کرنا ٹھیک نہیں؛ لیکن بر طرف کرنے کی صورت میں بھی اتنی سختی کرنا کہ غسل کے لیے تختہ نہ دینا اور قبرستان میں دفن نہ کرنے دینا مناسب نہیں ہے۔ (۱)

کسی دنیوی امر کی وجہ سے بائیکاٹ کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اور مناسب بھی نہیں کیوں کہ بعض ذمہ دار لوگ اپنا رعب ودبدبہ بٹھانے کے لیے اس طرح کا معاملہ کرکے لوگوں کو پریشان کریں گے، اور اسلام میں اس طرح غلط طریقے سے دباؤ ڈالنا جائز نہیں ہے۔ (۲)

مفتیوں کے فتاوی کو اہمیت نہ دینا، اور نظر انداز کرنا سخت گناہ کا کام ہے اور بعض صورتوں میں ایسے شخص کا ایمان بھی خطرے میں آسکتا ہے۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب

=حتی مات. (مسند الإمام أحمد بن حنبل - أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني (م: ۲۴۱هـ): ۸/ ۲۷،۵، رقم الحديث: ۴۹۳۳، مسند عبد الله بن عمر رضي الله عنهما، ط: مؤسسة الرسالة)

قال الخطابي: رخص للمسلم أن يغضب على أخيه ثلاث ليال لقلته، ولا يجوز فوقها إلا إذا كان الهجران في حق من حقوق الله تعالى، فيجوز فوق ذلك. قال: وأجمع العلماء على أن من خاف من مكالمة أحد وصلته ما يفسد عليه دينه أو يدخل مضرة في دنياه يجوز له مجانبته وبعده، ورب صرم جميل خير من مخالطة تؤذيه. وفي النهاية: يريد به الهجر ضد الوصل، يعني فيما يكون بين المسلمين من عتب وموجدة، أو تقصير يقع في حقوق العشرة والصحبة دون ما كان من ذلك في جانب الدين، فإن هجرة أهل الأهواء والبدع واجبة على مر الأوقات ما لم يظهر منه التوبة والرجوع إلى الحق، وهجرت عائشة ابن الزبير مدة، وهجر جماعة من الصحابة جماعة منهم، وماتوا متهاجرين. (مرقاة المفاتيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۸/ ۳۱۴۷، باب ما ينهى عنه في التهاجر والتقاطع واتباع العورات، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) حضرت کعب بن مالک کا جب بائیکاٹ کیا گیا تھا، تو ان کو نماز میں لوگوں کے ساتھ شریک ہونے اور بازار جانے سے منع نہیں کیا گیا تھا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ بائیکاٹ میں زیادہ سختی مناسب نہیں، ملاحظہ فرمائیں:

وأما أنا، فكنت أشب القوم وأجلدهم فكنت أخرج فأشهد الصلاة مع المسلمين، وأطوف في الأسواق ولا يكلمني أحد، وآتي رسول الله صلى الله عليه وسلم فأسلم عليه وهو في مجلسه بعد الصلاة، فأقول في نفسي: هل حرك شفتيه برد السلام علي أم لا؟ ثم أصلي قريبا منه، فأسارقه النظر، فإذا أقبلت على صلاتي أقبل إلي، وإذا التفت نحوه أعرض عني. (صحيح البخاري: ۲/ ۶۳۴، رقم الحديث: ۴۴۱۸، كتاب المغازي، باب حديث كعب بن مالك، ط: البدر - ديوبند)

(۲) اسی سوال کا حاشیہ نمبر ایک (۱) ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وفي الفتاوى الصغرى "من قال أي شيء أعرف العلم كفر يعني حيث يستخف العلم أو اعتقد أنه لا حاجة إلى العلم. (شرح الفقه الأكبر - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ)، ص: ۲۱۴، فصل في العلم والعلماء، ط: ياسر نديم - ديوبند)

[۷] یزید بن معاویہ پر لعنت کرنا؟

۱۹۲-سوال: کیا یزید بن معاویہ اور حجاج بن یوسف کو لعنت وملامت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا یزید نے اپنی حکومت میں بہن سے نکاح کو جائز قرار دیا تھا؟

(۲) یزید بن معاویہ بحر قسطنطنیہ کی لڑائی میں شریک ہوا تھا جس کی پیشن گوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں کی تھی اور اسی وجہ سے اس کو کافر وملعون کہنا جائز نہیں، کیا یہ بات صحیح ہے؟

(۳) چاروں اماموں نے حضرات امام حسین رضی اللہ عنہ اور یزید بن معاویہ کی مابین لڑائی میں کیا فیصلہ دیا؟ خصوصاً امام اعظم نے اس بارے میں کیا فرمایا ہے؟

الجواب حامداومصليا:

(۱) حتمی طور پر یزید یا حجاج بن یوسف کو جہنمی کہنا اور ان پر لعن طعن کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے والے، اہل سنت والجماعت کا عقیدہ رکھنے والوں پر لعنت کرنے سے منع فرمایا ہے، شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے کہ یزید ابن معاویہ کا ایمان تواتر سے ثابت ہے؛ لیکن اس کے کفریہ افعال تواتر سے ثابت نہیں ہیں، دل کے احوال اللہ جل شانہ زیادہ جاننے والے ہیں؛ لہٰذا یزید کو کافر کہنا اور اس کے ایمان سے خارج ہونے کا حکم لگانا جائز نہیں ہے۔ (ص:۸۸-۸۷)[1]

قتل حسین رضی اللہ عنہ کی وجہ سے وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے اور گناہ کبیرہ کا مرتکب اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایمان سے خارج نہیں ہوتا ہے؛ لہٰذا اس کو کافر کہنا اور لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔[2]

نکاح مع الاخت کی حلت کی نسبت کرنا یزید کی طرف یہ تہمت ہے، اگر یہ بات ثابت ہوجائے کہ یہ

---

(۱) ذكر في الخلاصة وغيرها أنه لا ينبغي اللعن عليه أي ولا على اليزيد ولا على الحجاج ؛لأن النبي -صلى الله عليه وسلم نهى عن لعن المصلين ومن كان أهل القبلة... فقد علم مما تقدم انه كان مسلما ولم يثبت عنه ما يخرجه عن كونه مؤمنا ... ولا يخفى ان إيمان يزيد محقق ولايثبت كفره بدليل ظني فضلا عن دليل قطعي فلايجوز لعنه بخصوصه. (شرح الفقه الأكبر -، ص:۸۸،۸۷، اختلفوا في اللعن على اليزيد، ط:ياسر نديم -ديوبند)

(نبراس -عبد العزيز ،الفرهاري، ص:۳۳۱، ط:ياسر نديم -ديوبند)

(۲) ولأن الأمر بقتل الحسين لايوجب الكفر فإن قتل غير الأنبياء كبيرة عند أهل السنة والجماعة إلا أن يكون مستحلا. (شرح الفقه الأكبر ،ص:۸۷، ط:ياسر نديم -ديوبند)

حکم یزید نے دیا تھا، تو اس کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے، اس لیے کہ قرآن نے بہن کو حرام قرار دیا ہے اور قرآن کی ایک آیت کا منکر بھی کافر ہے۔ (۳) اگر یزید یہ حکم کرتا تو ائمۂ اربعہ اس پر کفر کا حکم لگاتے؛ لیکن امام ابوحنیفہ وشافعی نے یزید پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا ہے؛ لہٰذا جواز نکاح مع الاخت کی نسبت یزید کی طرف تہمت ہے، جو حضرات یزید پر لعنت کے جواز کے قائل ہیں، وہ حضرات استدلال کرتے ہیں کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل پر خوشی کا اظہار کیا، اہل بیت وخاندان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کی اور ظاہر بات ہے کہ اہانت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور توہین خاندان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کفر ہے۔ (۴) ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تواتر سے یہ بات ثابت نہیں ہے اس وجہ سے کسی مسلمان کے بارے میں گناہ کبیرہ کی وجہ سے خارج عن الاسلام ولعنت کے جواز کا حکم نہیں لگائیں گے۔ اخبار آحاد سے یہ بات ثابت ہے کہ یزید حضرت حسین کی شہادت پر ناراض ہوا اور ابن زیاد اور ان کے مددگاروں پر عتاب کیا؛ لہٰذا اس پر لعن طعن جائز نہیں ہوگا۔ (۵) بعض علماء کبار نے اس کے بارے میں توقف کیا ہے؛ کیوں کہ بعض روایات سے اس کا اسلام سے خارج ہونا معلوم ہوتا ہے اور بعض روایات سے مسلمان ہونا؛ لہٰذا ہم اس کے بارے میں جواز لعنت و عدم جواز لعنت کا فیصلہ نہیں کر سکتے؛ بل کہ تعارض کی وجہ سے توقف کرنا واجب ہے اور راجح بھی یہ ہے کہ عدم جواز لعنت کا ہی حکم لگایا جائے۔ (۶)

(۴) یزید بن معاویہ پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے اس کی وجوہات میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ جنگ

---

(۳) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ .(۴-النساء:۲۳)

(۴) وبعضهم أطلق اللعن عليه أي على اليزيد لما أنه كفر حين أمر بقتل الحسين .(شرح الفقه الأكبر ،ص:۸۷، ط:یاسر ندیم-دیوبند)

وبعضهم أطلق اللعن عليه منهم ابن الجوزي المحدث ومنهم الإمام أحمد بن حنبل مستدلا بقوله تعالى: فهل عسيتم ان توليتم ان تفسدوا في الأرض وتقطعوا أرحامكم أولئك الذين لعنهم الله .ومنهم القاضي ابو يعلى مستدلا بقوله عليه الصلاة والسلام :من أخاف أهل المدينة ظلما أخافه الله تعالى شانه وعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين. (نبراس ،ص:۳۳۱،ط:یاسر ندیم-دیوبند)

(۵) قال الغزالي: ولا يجوز أن يقال أمر بقتله أو رضي به، لأنه لا يجوز نسبة المؤمن إلى كبيرة أو كفر من غير تحقيق بل الذى تولى قتاله هو أمير الكوفة عبيد الله بن زياد وكان يزيد على مسافة شهر ذهابا ورجوعا فلا يمكن أن يأتي أمره في ذلك الزمن القليل وروي أن يزيد أنكر على ابن زياد وقال زرعت لي العداوة في قلب كل بر وفاجر وقال رحمك الله يا حسين رضي الله عنه لقد قتلك رجل لم يعرف حق رحم .(نبراس ،ص:۳۳۱،ط:یاسر ندیم-دیوبند)

(وكذا في شرح الفقه الاكبر ،ص:۸۷،ط:یاسر ندیم-دیوبند)

(۶) وحقيقة الأمر التوقف فيه ومرجع أمره إلى الله سبحانه (شرح الفقه الاكبر ،ص:۸۸،ط:یاسر ندیم-دیوبند)

قسطنطنیہ میں شرکت وعدم شرکت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، شرح فقہ اکبر کی تحریر اوپر لکھ چکا ہوں کہ اکثر علماء عدم کفر وعدم جواز لعنت کے قائل ہیں، صرف امام احمد کا جواز لعنت کے متعلق قول ہے۔ (۷) ہوسکتا ہے ان کے نزدیک یہ بات تواتر سے ثابت ہوئی ہوگی، قسطنطنیہ کے غزوے کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اور شریک ہونے والوں کو "فی سبیل اللہ" فرمایا (بخاری) (۸) (مسلم شریف) (۹)

مسلم شریف میں "فی زمن معاویۃ" کا لفظ ہے۔

نوویؒ شرح مسلم شریف (۱۰) اور عمدۃ القاری: ج، ۱۴ ص: ۸۶۔ (۱۱) میں ہے کہ وہ بحری غزوہ، جس

---

(۷) انظر رقم الهامش: ۴، بذیل هذا السوال.

(۸) قال: عمير، فحدثتنا أم حرام: أنها سمعت النبي صلى الله عليه وسلم، يقول: »أول جيش من أمتي يغزون البحر قد أوجبوا« ، قالت أم حرام: قلت: يا رسول الله أنا فيهم؟ قال: »أنت فيهم« ، ثم قال النبي صلى الله عليه وسلم: »أول جيش من أمتي يغزون مدينة قيصر مغفور لهم« ، فقلت: أنا فيهم يا رسول الله؟ قال: »لا. (صحيح الخاري: ۱/ ۴۰۹، رقم الحديث: ۲۹۲۴، كتاب الجهاد، باب ما قيل في قتال الروم، ط: البدر - ديوبند)

(۹) عن أنس بن مالك، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يدخل على أم حرام بنت ملحان فتطعمه، وكانت أم حرام تحت عبادة بن الصامت، فدخل عليها رسول الله صلى الله عليه وسلم يوما، فأطعمته، ثم جلست تفلي رأسه، فنام رسول الله صلى الله عليه وسلم، ثم استيقظ وهو يضحك، قالت: فقلت: ما يضحكك يا رسول الله؟ قال: »ناس من أمتي عرضوا علي، غزاة في سبيل الله، يركبون ثبج هذا البحر، ملوكا على الأسرة« ، أو »مثل الملوك على الأسرة« يشك أيهما - قال: قالت: فقلت: يا رسول الله، ادع الله أن يجعلني منهم، فدعا لها، ثم وضع رأسه، فنام، ثم استيقظ وهو يضحك، قالت: فقلت: ما يضحكك يا رسول الله؟ قال: »ناس من أمتي عرضوا علي، غزاة في سبيل الله، كما قال في الأولى، قالت: فقلت: يا رسول الله، ادع الله أن يجعلني منهم، قال: »أنت من الأولين« ، فركبت أم حرام بنت ملحان البحر في زمن معاوية، فصرعت عن دابتها حين خرجت من البحر، فهلكت. (صحيح المسلم: ۲/ ۱۴۱، رقم الحديث: ۱۶۰- (۱۹۱۲) كتاب الامارة، باب فضل الغزو في البحر، ط: البدر - ديوبند)

(۱۰) واختلف العلماء متى جرت الغزوة التي توفيت فيها أم حرام في البحر وقد ذكر في هذه الرواية في مسلم أنها ركبت البحر في زمان معاوية فصرعت عن دابتها فهلكت قال القاضي قال أكثر أهل السير والأخبار إن ذلك كان في خلافة عثمان بن عفان رضي الله عنه وأن فيها ركبت أم حرام وزوجها إلى قبرس فصرعت عن دابتها هناك فتوفيت ودفنت هناك وعلى هذا يكون قوله في زمان معاوية معناه في زمان غزوه في البحر لا في أيام خلافته قال وقيل بل كان ذلك في خلافته قال وهو أظهر في دلالة قوله في زمانه. (شرح النووي على صحيح المسلم: ۲/ ۱۴۲، كتاب الامارة، باب فضل الغزو في البحر، ط: البدر - ديوبند)

(۱۱) وقال ابن جرير: قال بعضهم: كان ذلك في سنة سبع وعشرين، وهي غزوة قبرص في زمن عثمان بن عفان، رضي الله تعالى عنه، وقال الواقدي: كان ذلك في سنة ثمان وعشرين، وقال أبو معشر: غزاها في سنة ثلاث وثلاثين، =

کے بارے میں محسن کائنات ﷺ نے ام حرام کی شرکت کی پیشین گوئی فرمائی تھی، وہ زمانہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا نہیں؛ بل کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے کا ہے اور لشکر کے قائد حضرت معاویہؓ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بحری غزوہ کی اجازت طلب فرمائی، مگر حضرت نے عمر رضی اللہ عنہ نے راکب بحر کے متعلق سوال فرمایا، تو حضرت معاویہؓ کے جواب کے بعد اس کی اجازت نہیں دی۔

پھر بعد میں حضرت عثمانؓ نے بحری غزوے کی اجازت دی اور امیر معاویہؓ کی قیادت میں بحری غزوہ ہوا، جس میں حضرت معاویہؓ شریک تھے، ۲۷، ۲۸ھ میں یہ غزوہ ہوا؛ لہٰذا یزید پر عدم جواز لعنت کا تعلق اس واقعہ سے نہیں ہے، بل کہ بعد کے واقعہ سے ہے۔ حجۃ الاسلام امام غزالی نے احیاء العلوم میں فرمایا ہے کہ یزید کے متعلق منقولات 'اخبار احاد کی قبیل سے ہے؛ اس لیے شخص معین کو لعنت کرنا جائز نہیں ہے، جب تک یزید کے حقیقی احوال معلوم نہ ہوں، اس وقت تک ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ (شرح فقہ اکبر)[۱۲] اس لیے ائمہ ثلاثہ نے احتیاط برتا اور عدم جواز کے قول کو پسند فرمایا۔

(۳) چاروں اماموں کی نقل علم کلام میں متفرق طریق سے ہے۔ حضرت حسین مظلوم شہید ہوئے، وہ حق پر تھے اور یزید اور اس کے رفقاء صراط مستقیم سے دور تھے اور یزید اور اس کے مددگار

=وكانت أم حرام معهم، وقال ابن الجوزي في (جامع المسانيد): أنها غزت مع عبادة بن الصامت فوقصتها بغلة لها شهباء، فوقعت فماتت، وقال هشام ابن عمار: رأيت قبرها ووقفت عليه بالساحل بفاقيس. (عمدة القاري - أبو محمد محمود بن أحمد بن موسى الحنفي بدر الدين العيني (م: ۸۵۵ھ): ۱۴/۱۹۸، كتاب الجهاد، باب ما قيل في قتال الروم، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

قال الشاه ولي الله الدهلوي: تمسك بعض الناس بهذا الحديث في نجاة يزيد؛ لأنه كان من جملة هذا الجيش الثاني بل كان رأسهم ورئيسهم على ما يشهد به التواريخ والصحيح أنه لايثبت بهذا الحديث إلا كونه مغفورا له ماتقدم من ذنبه على هذه الغزوة؛ لأن الجهاد من الكفارات وشان الكفارات إزالة أثار الذنوب السابقة عليها لا الواقعة بعدها نعم لو كان معنى هذا الكلام أنه مغفور إلى يوم القيامة يدل على نجاته وإذ ليس فليس؛ بل أمره مفوض إلى الله تعالى فيما ارتكبه من القبائح بعد هذه الغزوة من قتل الحسين عليه السلام وتخريب المدينة والإصرار على شرب الخمر إن شاء عفى عنه وإن شاء عذبه كما هو مطرد في سائر العصاة. (شرح تراجم أبواب البخاري من شاه ولي الله الدهلوي (في بداية صحيح البخاري)، ص: ۳۱، كتاب الجهاد، ط: البدر - ديوبند)

(۱۲) فقد قال حجة الإسلام في الإحياء: "فإن قيل هل يجوز لعن يزيد لكونه قاتل الحسين أو امر به؟ قلنا: هذا مما لم يثبت أصلا فلا يجوز أن يقال انه قتله أو أمر به فضلا عن لعنه ولأنه لا يجوز نسبة مسلم إلى كبيرة من غير تحقيق. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۸۷، ط: ياسر نديم - ديوبند)

امداد الفتاوی: ۵/۴۳۱، کتاب العقائد والکلام، تحقیق لعن یزید، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند

غلط کار تھے، ظالم تھے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] یزید کو برا بھلا کہنا از روئے شرع کیسا ہے؟

۱۹۳-سوال: یزید کو برا بھلا کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ میں نے مفتی مہدی حسن صاحب کی کتاب ''حقیقت یزید'' پڑھی ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ یزید بالاتفاق کافر نہیں ہے۔؛ بل کہ متفقہ طور پر فاسق ہے۔ یزید نے حضرت حسین ؓ کے قتل کا حکم دیا۔ یزید پر قسطنطینہ کی بشارت والی حدیث منطبق نہیں ہوتی؛ لیکن بشر بن علی ارطاۃ پر چسپاں ہوتی ہے۔ یزید صحابی نہیں ہے، وہ حضرت عثمان ؓ کے دور خلافت میں پیدا ہوا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ یزید کا حضرت حسین ؓ کے قتل کا حکم دینا ثابت نہیں ہے، بل کہ اس میں شک ہے؛ لہٰذا یزید پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔ (۱) کلمہ گو سے جب تک کھلم کھلا کفر ثابت نہ ہو جائے، اس وقت تک اسے کافر کہنا اور لعنت وملامت کرنا جائز نہیں ہے۔ (شرح فقہ اکبر، ص: ۸۷) (۲)

کسی مسلمان کو کافر کہنا سخت گناہ ہے، اس پر بڑی سخت وعید ہے۔ اور میرے استاذ مفتی مہدی حسن نے جو لکھا ہے، وہی اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے میری کتاب ''عقائد اسلام''۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فقد قال حجة الإسلام في الإحياء: "فإن قيل هل يجوز لعن يزيد لكونه قاتل الحسين أو امر به؟ قلنا: هذا مما لم يثبت أصلا فلا يجوز أن يقال انه قتله أو أمر به فضلا عن لعنه ولأنه لا يجوز نسبة مسلم إلى كبيرة من غير تحقيق. (شرح فقه الأكبر، ص: ۸۷، ط: ياسرت نديم-ديوبند)

(۲) ذكر في الخلاصة وغيرها أنه لا ينبغي اللعن عليه أي ولا على اليزيد ولا على الحجاج؛ لأن النبي-صلى الله عليه وسلم نهى عن لعن المصلين ومن كان أهل القبلة... فقد علم مما تقدم انه كان مسلما ولم يثبت عنه ما يخرجه عن كونه مؤمنا ... ولا يخفى ان إيمان يزيد محقق ولا يثبت كفره بدليل ظني فضلا عن دليل قطعي فلايجوز لعنه بخصوصه. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۸۷، ۸۸، اختلفوا في اللعن على اليزيد، ط: ياسر نديم-ديوبند)

قال الغزالي: ولا يجوز أن يقال آمر بقتله أو رضي به؛ لأنه لا يجوز نسبة المؤمن إلى كبيرة أو كفر من غير تحقيق بل الذى تولى قتاله هو أمير الكوفة عبيد الله بن زياد وكان يزيد على مسافة شهر ذهابا ورجوعا فلا يمكن أن يأتي أمره في ذلك الزمن القليل وروي أن يزيد أنكر على ابن زياد وقال زرعت لي العداوة في قلب كل بر وفاجر وقال رحمك الله ياحسين رضي الله عنه لقد قتلك رجل لم يعرف حق رحم. (نبراس، ص: ۳۳۱، ط: ياسر نديم-ديوبند)

[۹] واضح دلائل کے باوجود یزید کے بارے میں توقف کیوں؟

گزشتہ سے پیوستہ

۱۹۴-سوال: ''یزید کو امیر المؤمنین کہنے والے کو کوڑے مارے گئے'' پھر اس کے آخر میں مولانا تھانوی وغیرہ کے فتاوی ہیں جس میں لکھا ہے کہ یزید کے بارے میں توقف کیا جائے، تو سوال یہ ہے کہ اوپر کی مذکورہ حقیقت بالکل عیاں ہوجانے کے باوجود توقف کیوں؟ بعض فضلاء نے اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی بناء پر کہا کہ مفتی کی بات کو مت دیکھو، قرآن وحدیث کو دیکھو، مذکورہ بات تو شیعوں نے گھڑی ہے۔

الجواب حامدا ومصليا:

امیر المؤمنین کہنے والے پر کوڑے برسانا، معاشرتی جنگ ان لوگوں کا کام ہے، جو یزید سے نفرت کرتے ہیں، لہٰذا وہ دلیل وحجت نہیں بن سکتے؛ اسی لئے شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے کہ یزید کو کافر کہنا اور اس پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے، یہی مسلک احتیاط پر مبنی ہے۔ اور یہی اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) انظر الهوامش تحت عنوان: یزید کو برا بھلا کہنا از روئے شرع کیسا ہے؟
نظام الفتاوی-مفتی نظام الدینؒ (م: ۱۴۲۰ھ): ۱/۲۷، یزید پر لعنت کی شرعی تحقیق، ط: تاج پبلشنگ، دیوبند

وفی الخلاصة : من أبغض عالما من غير سبب ظاهر خيف عليه الكفر، قلت: الظاهر أنه يكفر. (شرح فقہ اکبر: ۲۱۳)

باب استخفاف الدين والشريعة

[استخفاف دین وشریعت]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

[استخفاف دین وشریعت]

[۱] مسلمانوں سے ہر معاملہ میں اختلاف کرنے والا شخص

۱۹۵-سوال: ایک مسلمان حاجی ہے، اس کے باوجود داڑھی منڈاتا ہے۔ اس کے گھر میں غیر شرعی لباس پہنے جاتے ہیں۔ قوم کے ساتھ مل کر نہیں رہتا، ہر معاملہ میں قوم کی، قوم کے ذمہ دار حضرات اور علماء حضرات کی مخالفت کرتا ہے؛ اس نے ذمہ دار حضرات (قوم کے لیڈر اور متولی) پر کورٹ میں کیس بھی کیا ہے۔

شریعت کی رو سے فاسق و فاجر کس کو کہتے ہیں۔ کیا وہ آدمی فاسق و فاجر کہلانے کے لائق ہے یا نہیں۔ جواب جلدی تحریر فرمائیں، کرم ہوگا۔ احقر سلیمان قاسمی

الجواب حامدا ومصلیا:

مذکورہ شخص اگر قوم، متولی حضرات اور علماء کرام کی مخالفت کسی شرعی وجہ کے بغیر کرتا ہے، تو وہ فاسق ہوگا۔ [۱] اور اگر مخالفت، دین سے نفرت کی وجہ سے ہے، تو ایسا شخص دین اور شعار دین سے عداوت و دشمنی اور دین سے بے زاری کی وجہ سے دین سے نکل جائے گا۔ [۲]

اگر اس کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ متعلقہ ذمے دار اپنی ذمے داری نہیں نبھارہے ہیں، تو اس کی بات کو بہ غور سن کر کوئی قابل عمل حل نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ داڑھی منڈانے پر اصرار کرتا ہے، تو اس کے

(۱) وأكثر ما يقال الفاسق لمن التزم حكم الشرع وأقر به ثم أخل بجميع أحكامه أو ببعضه. (المفردات في غريب القرآن-أبو القاسم ،الراغب الأصفهاني (م:۵۰۲ھ) ،ص:۶۳۶ ،(فسق)، ت: صفوان عدنان الداودي، ط: دار القلم، الدار الشامية-دمشق)

(۲) وفي الخلاصة: من أبغض عالما من غير سبب ظاهر خيف عليه الكفر ، قلت: الظاهر أنه يكفر، لأنه إذا أبغض العالم من غير سبب دنيوي أو أخروي فيكون بغضه لعلم الشريعة، ولا شك في كفر من أنكره، فضلا عمن أبغضه. (شرح الفقه الأكبر ،ص: ۲۱۳ ،فصل في العلم والعلماء، ط: ياسر نديم-ديوبند)

فاسق وفاجر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] حدیث کے منکر اور اس پر بے جا اشکال کرنے والے کا حکم

۱۹۶-سوال: اگر کوئی مسلمان یہ کہے کہ "میں احادیث کو نہیں مانتا ہوں" یا یہ کہے کہ "ذخیرۂ احادیث جھوٹ کا مجموعہ ہے" تو کیا اس کو کافر کہا جا سکتا ہے؟ حالاں کہ وہ کبھی کبھی نماز بھی پڑھتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

احادیث متواترہ ومشہورہ کا انکار کرنے والا ایمان سے نکل جائے گا، تاویل کے بعد خبر واحد کا منکر فاسق ہے۔ [2] اور ان میں سے کسی بھی قسم کی حدیث کا تمسخر اور استہزا کرنے والا بھی کافر ہو جائے گا۔ [3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] شعائر اسلام کی توہین کرنے والے کا حکم

۱۹۷-سوال: دو آدمی کے درمیان جھگڑا ہوا، ان میں سے ایک باشرع (صاحب لحیہ) حافظ قرآن، مدرسے کا مدرس اور مسجد کا امام ہے اور دوسرا شخص داڑھی منڈا (بے ریش) ہے، دونوں کے درمیان

---

(۱) وأما الاخذ منها وهي دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة، ومخنثة الرجال فلم يبحه أحد، وأخذ كلها فعل يهود الهند ومجوس الاعاجم. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۱۸، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط: دار الفكر - بيروت)

قال ابن الكمال: لأن الصغيرة تأخذ حكم الكبيرة بالإصرار. (ردالمحتار: ۵/ ۴۷۳، كتاب الشهوات، باب من يجب قبول شهادته على القاضي، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) أما متواترا، وهو ما رواه جماعة لا يتصور تواطئهم على الكذب، فمن أنكره كفر، ومشهور، وهو ما رواه واحد عن واحد، ثم جمع عن جمع لا يتصور توافقهم على الكذب، فمن أنكره كفر عند الكل، إلا عيسى بن أبان، فإن عنده يضلل ولا يكفر، وهو الصحيح.

وخبر الواحد، وهو أن يرويه واحد عن واحد، فلا يكفر جاحده، غير أنه يأثم بترك القبول إذا كان صحيحا أو حسنا. (شرح الفقه الأكبر ص: ۲۰۳-۲۰۴، قبيل عنوان: لا يصلى على غير الأنبياء والملائكة، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۳) وفي الفتاوى الظهيرية: من روي عنده عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: ما بين بيتي ومنبري أو ما بين قبري ومنبري روضة من رياض الجنة، فقال الآخر: "أرى المنبر والقبر ولا أرى شيئا" أنه يكفر، وهو محمول على أنه أراد به الاستهزاء والإنكار. (شرح الفقه الأكبر ص: ۲۰۴، ط: ياسر نديم ديوبند)

جھگڑے کی شدت اس حد تک پہنچی کہ ''داڑھی منڈے'' نے داڑھی والے (صاحب لحیہ) امام صاحب سے کہا کہ تم داڑھی منڈوالو، اور مدرسے کی خدمت اور امامت چھوڑ دو۔

سوال یہ ہے کہ اس شخص کے اس طرح کہنے والے کے ایمان پر کوئی زد تو نہیں پڑے گی؟ تفصیل سے جواب مطلوب ہے۔

حافظ رفیق احمد مُنشی

الجواب حامداً ومصلیاً:

قائل نے ان الفاظ کا کیوں استعمال کیا ہے؟ قائل کا اپنی زبان سے اس طرح کی خطرناک بات نکالنے کی بنیاد کیا ہے؟ کیا اس مولانا صاحب نے مذہب کے خلاف کوئی کام کیا ہے یا اس کے علاوہ دوسری کوئی اور وجہ ہے، تفصیل لکھنے کے بعد ہی اس کا جواب لکھا جاسکتا ہے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] حق شرعی کے مطالبہ پر کسی عورت کا یہ جواب دینا کہ ''میں کسی فتویٰ کو نہیں مانتی''

۱۹۸-سوال: ایک بیوہ نے اپنے مرحوم خاوند کی تمام جائداد پر قبضہ کر رکھا ہے، دوسرے ورثاء کا حق دینے سے انکار کر رہی ہے، ورثاء نے جب اپنے حق کا مطالبہ کیا، تو اُس نے جواب میں یہ کلمات کہے کہ '' آپ کے ہندوستان میں ہر گھر میں فتوے ہوتے ہیں، میں کسی فتویٰ کو نہیں مانتی، میں اسلام فسلام کی کسی بات کو نہیں سمجھتی''۔ تو ان کلمات کے بولنے والے کے متعلق حکمِ شرعی کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر کوئی مسلمان یوں کہے کہ میرے آگے شریعت نہیں چلے گی، یا شریعت کی تدبیر نہیں چل سکے گی، یا میں شریعت کا کیا کروں؟ تو وہ کافر ہے، اگر کسی کے سامنے کوئی شرعی فتویٰ پیش کیا گیا، اُس نے جواب میں کہا کہ یہ کیسا فتاویٰ کی گٹھری اٹھا کر لے آئے؟ اور اس طرح اُس نے اُن فتاویٰ کو رد کر دیا، تو وہ بعض فقہاء کے نزدیک کافر ہے، اسی طرح فتویٰ کو اگر زمین پر ڈال کر کہا کہ یہ کیا شریعت ہے؟ تب بھی کافر ہے، نیز فتویٰ کے پیش کیے جانے پر اگر یہ کہا کہ فتویٰ میں جو کچھ ہے، غلط ہے، یا میں اُس پر عمل نہیں

---

(۱) والذي تحرر أنه لا يفتي بتكفير مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن، أو كان في كفره اختلاف، ولو رواية ضعيفة ،فعلى هذا فأكثر ألفاظ التكفير المذكورة لا يفتى بالتكفير بها، ولقد ألزمت نفسي أن لا أفتي بشيء منها. (البحر الرائق: ۵/ ۱۳۵، كتاب السير ،باب أحكام المرتدين، ط: دار الكتاب الإسلامي)

کروں گا، تو سزا کا مستحق ہوگا۔ (۱)

اِن مسائل کی روشنی میں مسئلۂ مذکورہ کا حکم بالکل واضح ہے کہ جب اُس عورت نے کہا کہ میں اُن فتاویٰ کو نہیں مانتی، یا میں ''اسلام فسلام کی باتوں کو نہیں سمجھتی''، تو اِن کلمات کے ذریعہ اُس نے دین و مذہب کی توہین کی ہے، اور مذاق اڑایا ہے، اِس کو ''شریعت اسلامیہ کا انکار'' بھی کہا جاسکتا ہے، لہٰذا یہ کلماتِ کفر ہیں، اگر اِس عورت نے جہالت کی بنا پر غصہ میں آکر یہ کلمات کہے ہوں، تو اُسے چاہیے کہ وہ توبہ و استغفار کر کے کلمۂ توحید پڑھے۔ (۲) اور اگر وہ توبہ سے منکر ہے، تو اسلام سے خارج ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] قصداً نماز ترک کرنا گناہِ کبیرہ ہے یا نہیں؟

۱۹۹-سوال: نماز نہ پڑھنا گناہِ کبیرہ ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

قصداً نماز ترک کرنا سخت گناہِ کبیرہ ہے، حدیث پاک میں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر نماز چھوڑ دیتا ہے، وہ کفر سے قریب ہوجاتا ہے۔ (۳) اسلامی حکومت میں ترکِ صلوٰۃ کی عادت بنانے والے کے لیے قتل کی سزا ہے۔ (درمختار) [۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولو قال: بامن شريعت واين حيلها سود ندارد، أو قال: بيش نرود، أو قال: مراد بوس هست شريعت جكنم، فهذا كله كفر . . . رجل عرض عليه خصمه فتوى الأئمة، فردها، وقال: جه بار نامه فتوى آورده، قيل يكفر، لأنه رد حكم الشرع، وكذا لو لم يقل شيئا لكن ألقى الفتوى على الأرض، وقال أين جه شرع است كفر . . . إذا جاء أحد الخصمين إلى صاحبه بفتوى الأئمة، فقال صاحبه: ليس كما أفتوه، أو قال: لا نعمل بهذا، كان عليه التعزير، كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۷۲، كتاب السير، الباب التاسع في أحكام المرتدين، مطلب في موجبات الكفر، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) (قوله وإسلامه أن يتبرأ عن الأديان كلها أو عما انتقل إليه) أي إسلام المرتد بذلك، ومراده أن يتبرأ عن الأديان كلها سوى دين الإسلام... وفي شرح الطحاوي: سأل أبو يوسف كيف يسلم، فقال أن يقول أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، ويقر بما جاء من عند الله ويتبرأ من الذي انتحله. (البحر الرائق: ۵/ ۱۳۸، كتاب السير، باب أحكام المرتدين، توبة الزنديق، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۳) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من ترك الصلاة متعمدا فقد كفر جهارا. (المعجم الأوسط - أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۳/ ۳۴۳، رقم: ۳۳۴۸، ط: دار الحرمين - القاهرة ؛ تعظيم قدر الصلاة - أبو عبد الله محمد بن نصر بن الحجاج المَرْوَزِي (م: ۲۹۴ھ): ۲/ ۸۸۹، رقم: ۹۱۹، باب ذكر إكفار تارك الصلاة، ت: د. عبد الرحمن عبد الجبار الفريوائي، ط: مكتبة الدار - المدينة المنورة)

(۴) (ويكفر جاحدها) لثبوتها بدليل قطعي (وتاركها عمدا مجانة) أي تكاسلا فاسق (يحبس حتى يصلي)؛ لأنه=

[۶] نماز کے منکر اور داعیانِ دین کو حقیر سمجھنے والے کے ساتھ دشمنی رکھنا

۲۰۰-سوال: اگر کوئی شخص دین کا دشمن ہو، نماز کا منکر ہو اور دعوت وتبلیغ کا کام کرنے والوں کو حقیر سمجھتا ہو، تو اُسے حقیر سمجھنا اور اُس کے ساتھ دشمنی رکھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

دین سے دشمنی رکھنے والے اور دعوت وتبلیغ کے مخالفین سے نفرت کرنا ایمانی غیرت کا تقاضہ ہے، حدیثِ پاک میں وارد ہے کہ جس شخص میں تین خصلتیں ہوں گی، وہ ایمان کی لذت محسوس کرے گا، پہلی خصلت یہ ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول اُسے ساری مخلوق سے زیادہ محبوب ہو۔ دوسری یہ کہ وہ جس کسی بندے سے محبت رکھے، صرف دین کے خاطر محبت رکھے۔ تیسری یہ کہ وہ کفر سے ایسی نفرت کرے، جیسی کہ وہ آگ میں ڈالے جانے سے نفرت کرتا ہے۔ (بخاری شریف: ۱/ ۷)[1]

اس سے معلوم ہوا کہ بے دین ملحد شخص سے اُس کے الحاد کی وجہ سے ناراضگی کا اظہار کرنا درست ہے، تاہم اُسے حقیر نہ سمجھنا چاہیے۔[2] اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کو بالکل پسند نہیں ہے، اور بندوں میں سے کوئی کسی کے انجام سے باخبر نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس بے دین اور ملحد کو توفیق سے نواز دے اور وہ توبہ کرلے، اور اُسے حقیر سمجھنے والے کا مؤاخذہ ہوجائے۔ فقط، واللہ أعلم بالصواب۔

=يحبس لحق العبد فحق الحق أحق، وقيل يضرب حتى يسيل منه الدم. وعند الشافعي: يقتل بصلاة واحدة حدا، وقيل: كفرا. (الدر المختار - الحصفكي (م: ۱۰۸۸ھ): ۱/ ۳۵۳، كتاب الصلوة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) عن أنس بن مالك - رضي الله عنه - عن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: "ثلاث من كن فيه وجد حلاوة الإيمان: أن يكون الله ورسوله أحب إليه مما سواهما، وأن يحب المرء لا يحبه إلا لله، وأن يكره أن يعود في الكفر كما يكره أن يقذف في النار". (صحيح البخاري: ۱/ ۷، باب حلاوة الإيمان، و: ۱/ ۸ كتاب الإيمان، باب من كره أن يعود في الكفر ... الخ، رقم: ۱۶، ۲۱، ۶۹۴۱، ط: البدر - ديوبند☆ صحيح مسلم، ۶۷، ۶۸ - (۴۳)، كتاب الإيمان، باب بيان خصال من اتصف بهن وجد حلاوة الإيمان)

(۲) عن زيد بن أسلم، أن رسول الله عليه السلام قال: المؤمن على المؤمن حرام، دمه، وماله، وعرضه، المؤمن أخو المؤمن، لا يخذله، ولا يظلمه، التقوى هاهنا، وأشار إلى صدره، حسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المؤمن. (الجامع في الحديث - ابن وهب، أبو محمد عبد الله بن وهب المصري القرشي (م: ۱۹۷ھ): ۱/ ۳۱۲، الإخاء في الله، رقم: ۲۱۴، ت: د مصطفى حسن حسين محمد أبو الخير، ط: دار ابن الجوزي - الرياض)

وَمَنۡ يَّرۡتَدِدۡ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَيَمُتۡ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِي الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ۝.

(۲-البقرۃ:۲۱۷)

باب أحكام المرتدين

(مرتد کا حکم)

O

[مرتد کا حکم]

[۱] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والا واجب القتل ہے

۲۰۱-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک مسلمان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی اور گالی کے الفاظ مسلمانوں کے سامنے استعمال کیے، اس سلسلہ میں درج ذیل سوال کے جواب مطلوب ہیں:

۱-ایسا شخص مسلمان باقی رہے گا یا مرتد ہو جائے گا؟

۲-اگر ایسا شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہو گیا، تو اس سے مسلمانوں کو نکاح، جنازہ اور مسجد میں داخل ہونے اور ان جیسے امور میں قطع تعلق کر لینا ضروری ہے یا نہیں؟

۳-اگر یہ شخص مرتد ہو گیا ہے، تو اس کے لیے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟ اور اس قبیح فعل کی تلافی کی کوئی شکل ہے یا نہیں؟

۴-ایک مفتی صاحب کا کہنا ہے: ''اگر یہ شخص توبہ کر بھی لے، تو عند اللہ اس کی توبہ قبول ہوگی، عند الناس نہیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو بڑے بخشنے والے اور بڑے معاف کرنے والے ہیں؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینا' حق العباد کا ضیاع ہے، جس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں''۔ سوال یہ ہے کہ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

۱-رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر تہمت لگانا اور آپ کی شان میں

گستاخی کرنا شدید ترین گناہ ہے، ایسا شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہوجائے گا۔ (۱)

۲-ایسے شخص کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنا جائز نہیں، حرام ہے۔ (۲) نہ تو اس کے جنازہ کی نماز پڑھی جائے گی اور نہ ہی اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا، حتی کہ اسے مساجد میں آنے سے بھی روک دیا جائے گا۔ (۳)

۳-ایسے شخص کے لیے توبہ وتلافی کی شکل یہ ہے کہ عوام کے سامنے اپنے فعل پر ندامت کا اظہار کرے، اس فعل پر اللہ سے معافی مانگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسے تعریفی کلمات عوام کے سامنے کہے کہ عوام کو یقین ہوجائے کہ وہ حقیقتاً اپنی گستاخانہ حرکت پر نادم وپشیماں ہے اور واقعتاً اپنے

---

(۱) اتفق العلماء على أن الاستخفاف بالأنبياء حرام، وأن المستخف بهم مرتد، وهذا فيمن ثبتت نبوته بدليل قطعي؛ لقوله تعالى: ﴿وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ﴾ الآية. [۹-التوبة: ۶۱]، وقوله تعالى: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا﴾. [۳۳-الأحزاب: ۵۷] وقوله تعالى: ﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ . لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ﴾ الآية. [۹-التوبة: ۶۶-۶۵]. وسواء أكان المستخف هازلا أم كان جادا، لقوله تعالى: ﴿قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ. لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ﴾. (۹-التوبة: ۶۵-۶۶). (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۳/۲۴۹، حكم الاستخفاف بالأنبياء، مادہ: استخفاف، ط: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية - الكويت ☆ مزید دیکھیے: السيف المسلول على من سب الرسول: ۱۳۳، أدلة وجوب قتل الساب من الكتاب الخ، ☆ الصارم المسلول على شاتم الرسول، ص: ۳، المسألة الأولى: أن من سب النبي صلى الله عليه وسلم من مسلم أو كافر فإنه يجب قتله. ط: الحرس الوطني السعودي، المملكة العربية السعودية ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۴/۲۳۱-۲۳۳، كتاب الجهاد، باب المرتد، مطلب مهم في حكم ساب الأنبياء، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) فإن هجرة أهل الأهواء والبدع واجبة على مر الأوقات ما لم يظهر منه التوبة والرجوع إلى الحق، فإنه - صلى الله عليه وسلم - لما خاف على كعب بن مالك وأصحابه النفاق حين تخلفوا عن غزوة تبوك أمر بهجرانهم خمسين يوما، وقد هجر نساءه شهرا وهجرت عائشة ابن الزبير مدة، وهجر جماعة من الصحابة جماعة منهم، وماتوا متهاجرين. (مرقاة المفاتيح: ۸/۷۵۹، باب ما ينهي عنه من التهاجر. الخ، الفصل الأول، ت: محمد جميل العطار، ط: بنگلا اسلامک اکیڈمی دیوبند)

(۳) أما المرتد فيلقى في حفرة كالكلب. (الدر المختار) قال ابن عابدين: (قوله فيلقى في حفرة) أي ولا يغسل، ولا يكفن؛ ولا يدفع إلى من انتقل إلى دينهم، بحر عن الفتح. (رد المحتار: ۲/۲۳۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب مهم إذا قال: إن شتمت فلانا في المسجد. الخ، ط: دار الفكر - بيروت)

گناہ سے توبہ کر رہا ہے۔ [۴] تو توبہ کرنے کے بعد (اگر وہ شادی شدہ ہے، تو) بیوی سے تجدید نکاح ضروری ہوگا؛ کیوں کہ پہلا نکاح (اس کے مرتد ہونے کی وجہ سے) ختم ہوگیا تھا۔ [۵]

۴- مفتی صاحب کی بات تقریباً صحیح ہے، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک پیغمبر اسلام ﷺ کو گالی دینے والا انسان معافی کے قابل نہیں، اس کی توبہ کسی حال میں قبول نہیں ہوگی، اگر اسلامی سلطنت ہے، تو اسے قتل کیا جائے گا۔ [۶] چناں چہ شامی میں ہے کہ وہ معافی کے قابل نہیں ہے، اگر اسلامی سلطنت ہے، تو ایسا شخص قتل کا مستحق ہوگا؛ لیکن اس کی توبہ آخرت کے معاملہ میں قبول ہوگی اور آخرت کے عذاب سے نجات حاصل کرلے گا؛ لیکن اس کا دنیوی معاملہ معافی کے قابل نہیں ہے: **(قوله فانه يقتل حداً) . . . أفاد أنه حكم الدنيا، أما عند الله فهي مقبولة كما في البحر. (شامي: ۴/ ۲۳۲، باب المرتد، كتاب الجهاد، ط: بيروت)** [۷] واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

---

(۴) (قوله وإسلامه أن يتبرأ عن الأديان كلها أو عما انتقل إليه) أي إسلام المرتد بذلك ومراده أن يتبرأ عن الأديان كلها سوى دين الإسلام وتركه لظهوره ولم يذكر الشهادتين، وصرح في العناية بأن التبرؤ بعد الإتيان بالشهادتين وفي شرح الطحاوي: سئل أبو يوسف كيف يسلم؟ فقال: أن يقول أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله ويقر بما جاء من عند الله ويتبرأ من الذي انتحله. (البحر الرائق: ۵/ ۲۱۹، كتاب السير، باب أحكام المرتدين، ط: دار الكتاب - ديوبند)

(۵) وفي شرح الوهبانية للشرنبلالي: ما يكون كفرا اتفاقا يبطل العمل والنكاح وأولاده أولاد زنا، وما فيه خلاف يؤمر بالاستغفار والتوبة وتجديد النكاح. (الدر المختار مع رد المحتار: ۴/ ۲۴۶، كتاب الجهاد، باب المرتد، مطلب توبة اليأس مقبولة دون إيمان اليأس، ط: دار الفكر - بيروت☆الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۸۳، كتاب السير، الباب العاشر في البغاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۶) إن مشهور مذهب مالك وأصحابه وقول السلف وجمهور العلماء أنه لاتقبل توبته وأنه يقتل حداً. (السيف المسلول على من سب الرسول - تقي الدين السبكي (۶۸۳-۷۵۶ھ)، ص: ۱۶۱، الفصل الثاني في توبته واستتابته، ط: دار الفتح - عمان)

(۷) جو شخص نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرے اور آپ کو برا بھلا کہے، نعوذ باللہ گالی دے، وہ واجب القتل ہے، لیکن اگر وہ توبہ کرلے، تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی یا نہیں؟ راجح قول یہ ہے کہ احناف کے نزدیک اس کی توبہ مقبول ہوگی، علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیل سے بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ توبہ سے قبل اس کو قتل کردیا جائے گا، لیکن اگر وہ توبہ کرلے، تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی، اصل میں اس مسئلہ میں صاحب بزازیہ کو امام ابوحنیفہؒ کا مذہب نقل کرنے میں تسامح ہوا ہے، اور بعض لوگوں نے ان ہی کے نقل پر اعتماد کرکے یہ لکھ دیا کہ احناف کے نزدیک بھی شاتم رسول ﷺ کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، جب کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ علامہ حصکفیؒ اور علامہ شامیؒ کی درج ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں: =

[۲] توبہ کا وقت غرغرہ سے پہلے ہے

۲۰۲-سوال: (۱) مجھ پر ایک سفلی سحر (جادو) کیا گیا ہے، شفا کے لیے میں نے دو مرتبہ ایک مزار کا طواف کیا اور وہاں یہ الفاظ کہے کہ: اس کو ختم کردو، اس کو جلادو وغیرہ۔ یہ جو کچھ بھی میں نے کیا ہے، یہ سمجھ کر کیا ہے کہ صاحبِ مزار بزرگ مجھے اپنی کرامت سے ٹھیک کردیں گے۔

پھر میں اپنے اس عمل کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کی تحقیق کرتا رہا، بالآخر مجھے مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ کی ایک کتاب ''مرنے کے بعد کیا ہوگا؟'' ہاتھ لگی، جس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث شریف

= قال الحصكفي: (وكل مسلم ارتد فتوبته مقبولة إلا)... (الكافر بسب نبي) من الأنبياء فإنه يقتل حدا ولا تقبل توبته مطلقا... ومن شك في عذابه وكفره كفر، وتمامه في الدرر في فصل الجزية معزيا للبزازية... وفيها: من نقص مقام الرسالة بقوله بأن سبه - صلى الله عليه وسلم - أو بفعله بأن بغضه بقلبه قتل حدا كما مر التصريح به، لكن صرح في آخر الشفاء بأن حكمه كالمرتد، ومفاده قبول التوبة كما لا يخفى، زاد المصنف في شرحه: وقد سمعت من مفتي الحنفية بمصر شيخ الإسلام ابن عبد العال أن الكمال وغيره تبعوا البزازي، والبزازي تبع صاحب [السيف المسلول] عزاه إليه ولم يعزه لأحد من علماء الحنفية وقد صرح في النتف ومعين الحكام وشرح الطحاوي وحاوي الزاهدي وغيرها بأن حكمه كالمرتد ولفظ النتف من سب الرسول - صلى الله عليه وسلم - فإنه مرتد وحكمه حكم المرتد ويفعل به ما يفعل بالمرتد انتهى.

قال ابن عابدين: (قوله والبزازي تبع صاحب السيف المسلول) الذي قاله البزازي إنه يقتل حدا، ولا توبة له أصلا، سواء بعد القدرة عليه والشهادة أو جاء تائبا من قبل نفسه كالزنديق لأنه حد وجب، فلا يسقط بالتوبة ولا يتصور فيه خلاف لأحد لأنه تعلق به حق العبد إلى أن قال ودلائل المسألة تعرف في كتاب [الصارم المسلول على شاتم الرسول] اهـ. وهذا كلام يقتضي منه غاية العجب، كيف يقول لا يتصور فيه خلاف لأحد بعد ما وقع فيه اختلاف الأئمة المجتهدين مع صدق الناقلين عنهم كما أسمعناك وعزوه المسألة إلى كتاب [الصارم المسلول] وهو لابن تيمية الحنبلي يدل على أنه لم يتصفح ما نقلناه عنه من التصريح بأن مذهب الحنفية والشافعية قبول التوبة في مواضع متعددة، وكذلك صرح به السبكي في السيف المسلول والقاضي عياض في الشفاء كما سمعته مع أن عبارة البزازي بطولها أكثرها مأخوذ من الشفاء.

فقد علم أن البزازي قد تساهل غاية التساهل في نقل هذه المسألة وليته حيث لم ينقلها عن أحد من أهل مذهبنا بل استند إلى ما في الشفاء والصارم أمعن النظر في المراجعة حتى يرى ما هو صريح في خلاف ما فهمه ممن نقل المسألة عنهم ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم. فلقد صار هذا التساهل سببا لوقوع عامة المتأخرين عنه في الخطأ حيث اعتمدوا على نقله وقلدوه في ذلك ولم ينقل أحد منهم المسألة عن كتاب من كتب الحنفية، بل المنقول قبل حدوث هذا القول من البزازي في كتبنا وكتب غيرنا خلافه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۴/۲۳۱-۲۳۵، كتاب الجهاد، باب المرتد، مطلب توبة اليأس مقبولة دون إيمان اليأس، ط: دار الفكر - بيروت)

مذکور ہے کہ: میری شفاعت اس کے حق میں مفید ہوگی، جس نے شرک نہیں کیا ہے۔ (۱)

(۲) اسی طرح قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں شرک کے علاوہ تمام گناہوں کو معاف کر دوں گا۔ (۲)

(۳) اور گجراتی بہشتی زیور میں لکھا ہوا ہے کہ توبہ سے کفر اور شرک کی توبہ مراد نہیں ہے؛ بل کہ دوسرے گناہوں سے توبہ مراد ہے، اب اشکال یہ ہے کہ ایمان کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ کفر و شرک سے توبہ کر کے اسلام میں داخل ہو جائے؛ لہٰذا آپ سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اس انداز میں جواب مرحمت فرمائیں کہ مذکورہ اشکال رفع ہو جائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) ایسا لگتا ہے کہ آپ کی نظر سے صرف ایک دو حدیث ہی گذری ہے، آپ نے کتابوں کا تفصیلی مطالعہ نہیں کیا ہے؛ اس لیے آپ کو خلجان پیدا ہوا ہے، اگر آپ نے مزار پر جا کر یہ دعا کی کہ ''یا اللہ اس بزرگ کے وسیلہ سے میرے سحر کو ختم کر دیجیے اور مجھے شفاء عطا فرما دیجیے'' تو آپ مسلمان ہیں، اسلام سے نہیں نکلے۔ (۳)

---

(۱) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: »أشهدكم أن شفاعتي لكل من مات لا يشرك بالله شيئا«. (جامع معمر بن راشد (منشور كملحق بمصنف عبد الرزاق) - معمر بن أبي عمرو راشد الأزدي (م: ۱۵۳هـ): ۱۱/ ۴۱۳، باب من يخرج من النار، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، ط: المجلس العلمي - باكستان، وتوزيع المكتب الإسلامي - بيروت ☆ مسند أبي داود الطيالسي - أبو داود سليمان بن داود بن الجارود الطيالسي البصرى (م: ۲۰۴هـ): ۳۳۹/۲، رقم الحديث: ۱۰۹۱، ت: د. محمد بن عبد المحسن التركي، ط: دار هجر - مصر ط: دار هجر - مصر)

(۲) قال الله تعالى: إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا. [۴- النساء: ۴۸]

(۳) قال ابن عابدين: (قوله لأنه لا حق للخلق على الخالق) قد يقال: إنه لا حق لهم وجوبا على الله تعالى، لكن الله سبحانه وتعالى جعل لهم حقا من فضله، أو يراد بالحق الحرمة والعظمة، فيكون من باب الوسيلة، وقد قال تعالى: {وابتغوا إليه الوسيلة} [۵- المائدة: ۳۵] وقد عد من آداب الدعاء التوسل على ما في الحصن، وجاء في رواية: »اللهم إني أسألك بحق السائلين عليك، وبحق ممشاي إليك، فإني لم أخرج أشرا ولا بطرا« الحديث اهـ ط عن شرح النقاية لمنلا علي القاري. (رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۶/ ۳۹۷، الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر - بيروت)

پس انبیاء و اولیاء کے ساتھ توسل جائز ہے، ہاں استعانت جائز نہیں۔ (امداد الاحکام: ۱/ ۱۳۴، ط: زکریا بکڈپو، دیوبند ☆ نظام الفتاوی ۱/ ۷۱، ط: تاج پبلشنگ ہاؤس - دیوبند)

اور اگر آپ نے مزار کا طواف کیا اور کہا: ''اے اللہ کے ولی! آپ اس تکلیف کو دور کر دیجئے'' اور یہ عقیدہ رکھا کہ تکلیف کو دور کرنے والے صاحب مزار ہی ہیں، تو اس عمل کی وجہ سے آپ دائرہ اسلام سے خارج ہو کر مرتد ہو گئے۔[1] البتہ اس کے بعد آپ نے توبہ واستغفار کیا اور کلمہ پڑھ لیا اور اللہ تعالیٰ سے گناہ کی معافی مانگ لی اور عقیدہ صحیح کر لیا کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، تو آپ اسلام میں دوبارہ داخل ہو گئے؛ لیکن اب بیوی سے نکاح کی تجدید لازم ہے۔[2]

(۲) مشرکین میں جو شرک پر مر گئے، ان کو سفارش سے فائدہ نہیں ہوگا، آپ تو زندہ ہیں اور شرک سے توبہ کر رہے ہیں؛ آپ کو اس سے فائدہ ہوگا۔[3] اس لیے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ

---

(۱) قال العلامة الوسي في تفسيره: إن الناس قد أكثروا من دعاء غير الله تعالى من الأولياء الأحياء منهم والأموات وغيرهم، مثل يا سيدي فلان أغثني، وليس ذلك من التوسل المباح في شيء، واللائق بحال المؤمن عدم التفوه بذلك وأن لا يحوم حول حماه، وقد عدّه أناس من العلماء شركا ... ولا أرى أحدا ممن يقول ذلك إلا وهو يعتقد أن المدعو الحي الغائب أو الميت المغيب يعلم الغيب أو يسمع النداء ويقدر بالذات أو بالغير على جلب الخير ودفع الأذى وإلا لما دعاه ولا فتح فاه، وفي ذلك بلاء من ربكم عظيم، فالحزم التجنب عن ذلك وعدم الطلب إلا من الله تعالى القوي الغني الفعال لما يريد... لم يشك في أن الاستغاثة بأصحاب القبور - الذين هم بين سعيد شغله نعيمه وتقلبه في الجنان عن الالتفات إلى ما في هذا العالم، وبين شقي ألهاه عذابه وحبسه في النيران عن إجابة مناديه والإصاخة إلى أهل ناديه - أمر يجب اجتنابه ولا يليق بأرباب العقول ارتكابه. ولا يغرنك أن المستغيث بمخلوق قد تقضى حاجته وتنجح طلبته؛ فإن ذلك ابتلاء وفتنة منه عز وجل، وقد يتمثل الشيطان للمستغيث في صورة الذي استغاث به فيظن أن ذلك كرامة لمن استغاث به، هيهات هيهات إنما هو شيطان أضله وأغواه وزين له هواه. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني-شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م: ۱۲۷۰ھ): ۳/ ۲۹۷-۲۹۸، المائدة: ۳۵، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

توسل کیا جا سکتا ہے؛ لیکن خود ان سے حاجت طلب کرنا حرام ہے۔ (فتاویٰ عثمانی: ۱/ ۷۳، کتب خانہ نعیمیہ - دیوبند☆ نظام الفتاویٰ: ۱/ ۷۰، ط: تاج پبلشنگ - دیوبند)

(۲) إذا كان في المسألة وجوه توجب الكفر، ووجه واحد يمنع، فعلى المفتي أن يميل إلى ذلك الوجه كذا في الخلاصة. في البزازية إلا إذا صرح بإرادة توجب الكفر، فلا ينفعه التأويل حينئذ كذا في البحر الرائق. ثم إن كانت نية القائل الوجه الذي يمنع التكفير، فهو مسلم، وإن كانت نيته الوجه الذي يوجب التكفير لا تنفعه فتوى المفتي، ويؤمر بالتوبة والرجوع عن ذلك وبتجديد النكاح بينه وبين امرأته كذا في المحيط.. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۸۳، كتاب السير، الباب العاشر في البغاة☆ الفتاوى التاتارخانية: ۵/ ۴۵۸، كتاب احكام المرتدين، ط: ادارة القرآن - پاکستان☆ رد المحتار على الدر: ۳/ ۱۹۳-۱۹۴، كتاب النكاح، باب نكاح الكافر، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) عن ابن عمر، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: »إن الله يقبل توبة العبد ما لم يغرغر« . (سنن ابن ماجة=

فرماتے ہیں: إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ. [۵] ہر مسلمان کا اس بات پر ایمان ہے کہ جس کا انتقال شرک پر ہوا ہے، اس کی مغفرت نہیں ہوگی۔

(۳) اور جب تک آدمی سکرات کی حالت میں نہ پہنچا ہو، اس کی کفر سے توبہ قبول ہوگی، خواہ وہ کافر ہو یا یہودی وعیسائی، توبہ کا دروازہ غرغرہ سے پہلے پہلے ہر انسان کے لیے قیامت تک کھلا ہوا ہے۔ [۶] پس کافر کی کفر سے توبہ قبول ہوگی، ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد (صحابہ کرام ؓ) نے [۷] نبی ﷺ کے زمانہ میں کفر سے توبہ کی اور ایمان میں داخل ہوئے اور ان کی توبہ قبول کی گئی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] مسلمان لڑکی کسی ہندو کے ساتھ بھاگ کر مذہب بدل لے تو کیا اس کو قتل کرنا جائز ہے؟

۲۰۳-سوال: ہمارے گاؤں میں ایک مسلمان وہرا سماج کی لڑکی کو ہندو ہریجن لڑکے کے

=ص: ۳۱۴، = رقم الحديث: ۴۲۵۳، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، ط: البدر - ديوبند☆مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۱۰/ ۳۰۰، رقم الحديث: ۶۱۶۰، مسند عبد الله بن عمر رضي الله تعالى عنه☆سنن الترمذي: ۲/ ۱۹۴، رقم الحديث: ۳۵۳۷، أبواب الدعوات، باب: بعد باب في فضل التوبة والاستغفار وما ذكر من رحمة الله بعباده، ط: البدر - ديوبند)

(۵) (۴-النساء: ۴۸)

(۶) دیکھیے حاشیہ نمبر: ۴۔

(۷) صحابہ کی صحیح تعداد کی کوئی حتمی تعیین نہیں، البتہ بعض عبارت سے ایک لاکھ چوبیس ہزار کا پتہ چلتا ہے:

وأما عددهم على القول الأكثر فروي أنه سار عام فتح مكة في عشرة الآف مسلم، وفي حنين في اثنى عشر ألفا، وفي حجة الوداع في أربعين ألفا، وكانوا عند وفاته مائة ألف وأربعة وعشرين ألفا. (تاريخ ابن الوردي - عمر بن مظفر بن عمر بن محمد ابن أبي الفوارس، أبو حفص، زين الدين ابن الوردي المعري الكندي (م: ۷۴۹هـ): ۱/ ۱۳۲، ذكر أصحابه" ط:: دار الكتب العلمية - بيروت)

وأما عدد أصحاب النبي - صلى الله عليه وسلم - فمن رام حصر ذلك رام أمرا بعيدا، ولا يعلم ذلك حقيقة إلا الله عز وجل لكثرة من أسلم من أول البعث إلى أن مات رسول الله - صلى الله عليه وسلم -. . . . وقد ورد أنه سار عام الفتح في عشرة الآف من المقاتلة، وإلى حنين في اثني عشر ألفا، وإلى حجة الوداع في أربعين ألفا، وإلى تبوك في سبعين ألفا.

وقد روي أنه قبض رسول الله - صلى الله عليه وسلم - عن مائة ألف وأربعة وعشرين ألفا، والله أعلم بحقيقة ذلك. (جامع الأصول في أحاديث الرسول - مجد الدين أبو السعادات المبارك بن محمد الشيباني الجزري ابن الأثير (م: ۶۰۶هـ): ۱۲/ ۱۱۸، الباب الثالث في ذكر العشرة من الصحابة، ط: مكتبة الحلواني - مطبعة الملاح - مكتبة دار البيان)

ساتھ عشق ہوگیا اور وہ اس کے ساتھ بھاگ گئی ہے، سننے میں آیا ہے کہ اس لڑکی نے مذہب بھی بدل لیا ہے اور ساڑی پہننا اور تلک لگانا شروع کر دیا ہے، اس کو تلاش کیا گیا؛ لیکن اب تک اس کا سراغ نہیں ملا ہے۔ اس کے گھر والوں کا کہنا ہے کہ وہ جب بھی گاؤں میں قدم رکھے گی، تو اس کو جان سے ختم کر دیں گے، اب سوال یہ ہے کہ اگر وہ مرتد لڑکی مل جائے، تو کیا اس کو قتل کرنا جائز ہوگا؟ جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مسلمان لڑکی نے جو کیا ہے، بہت ہی غلط، خراب اور گناہ کا کام کیا ہے، کہ تلک لگانے اور کفار کے مذہبی عمل کو اختیار کرنے سے ایمان بھی ختم ہوگیا اور زنا کا گناہ مستزاد ہے۔ البتہ ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کے لیے اس لڑکی کو مار ڈالنے کی اجازت نہیں ہوگی، اگر اسلامی حکومت ہوتی، تو مقدمہ (کیس) قاضی کی عدالت میں پیش کر کے ان کی ہدایات کے مطابق عمل کرنا ضروری ہوتا؛ لیکن یہاں اسلامی حکومت نہیں ہے، تو قانون اپنے ہاتھ میں لے کر کسی کا از خود قتل کرنا جائز نہیں، حرام ہے، اس میں دین و دنیا دونوں کا نقصان ہوگا، پس ماں باپ یا رشتہ داروں کا اس لڑکی کو مار ڈالنے کی فکر کرنا جائز نہیں۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] کلمۂ کفر کا تکلم کرنے کے بعد نکاح کی تجدید کا حکم

۲۰۴-سوال: اگر کسی عورت نے کلمۂ کفر کا تکلم کیا، تو کیا حکم ہے؟ کیا اس کی وجہ سے اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا، نکاح میں واپس لانے کے لیے کیا کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کفریہ عقائد کا ماننا یا کفریہ اعمال کا ارتکاب کرنا، اسلام سے محرومی کا سبب ہے، خواہ ارتکاب کرنے

(۱) وأما شرائط جواز إقامتها، فمنها ما يعم الحدود كلها، ومنها ما يخص البعض دون البعض، أما الذي يعم الحدود كلها فهو الإمامة: وهو أن يكون المقيم للحد هو الإمام أو من ولاه الإمام، وهذا عندنا... وبيان ذلك أن ولاية إقامة الحد إنما ثبتت للإمام؛ لمصلحة العباد وهي صيانة أنفسهم وأموالهم وأعراضهم... والإمام قادر على الإقامة؛ لشوكته ومنعته وانقياد الرعية له قهرا وجبرا، ولا يخاف تبعة الجناة وأتباعهم؛ لانعدام المعارضة بينهم وبين الإمام، وتهمة الميل، والمحاباة، والتواني عن الإقامة منتفية في حقه، فيقيم على وجهها فيحصل الغرض المشروع له الولاية بيقين. (بدائع الصنائع: ۷/۵۷، كتاب الحدود، فصل في شرائط جواز إقامة الحدود، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

والا مرد ہو یا عورت؛ اس سے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوکر مرتد ہوجاتا ہے، ارتداد کی وجہ سے نکاح بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ (۱)

صورت مذکورہ میں جب کہ کسی عورت نے کلمہ کفر کا تکلم کیا ہے، تو اولاً کلمہ شہادت، ایمان مجمل اور ایمان مفصل پڑھ کر اپنے ایمان کی تجدید کرے اور کفر سے براءت کا اظہار کرے۔ (۲) تجدید ایمان کے بعد دو گواہوں کی موجودگی میں اپنے سابق شوہر سے نکاح کرے۔ (۳) اور بہتر یہ ہے کہ مسجد میں اعلان کر دیا جائے اور دوبارہ گواہوں کی موجودگی میں نکاح کیا جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (وارتداد أحدهما) أي الزوجين (فسخ) فلا ينقص عددا (عاجل) بلا قضاء. (الدر المختار)
قال ابن عابدين الشامي: (قوله بلا قضاء) أي بلا توقف على قضاء القاضي، وكذا بلا توقف على مضي عدة في المدخول بها كما في البحر. (رد المحتار: ۳/ ۱۹۳-۱۹۴، باب نكاح الكافر، ط: دار الفكر-بيروت)
(۲) (وإسلامه أن يتبرأ عن الأديان) سوى الإسلام (أو عما انتقل إليه) بعد نطقه بالشهادتين. (الدر المختار مع الرد: ۴/ ۲۲۶، باب المرتد، ط: دار الفكر-بيروت)
انظر للتوسع: البحر الرائق: ۵/ ۱۳۸، توبة الزنديق، ط: دار الكتاب الإسلامي. والمبسوط للسرخسي: ۱۰/ ۹۹، باب المرتدين، ط: دار المعرفة-بيروت.
(۳) (وشرط حضور شاهدين) قال الشامي: أي يشهدان على العقد. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۲۱، كتاب النكاح، ط: دار الفكر-بيروت)

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۵۹-الحشر:۷)

باب السنة والبدعة

(سنن و بدعات)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[سنن وبدعات]

[۱] سنت چھوٹ جانے سے دِل کا غمگین اور پریشان ہونا

۲۰۵-سوال: سنت چھوڑ دینے یا چھوٹ جانے کی وجہ سے دل میں خلش پیدا ہوتی ہے، دل غمگین اور پریشان ہوجاتا ہے، جیسے جیب میں مسواک ہے؛ مگر مسواک کرنا بھول گیا، یا سوتے وقت قبلہ رُخ نہیں سویا، دسترخوان نہیں بچھایا، پانی پیتے وقت برتن ہی میں سانس لیا، اس بارے میں کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلّیاً:

سنت کے چھوٹنے پر دل کا پریشان اور مضطرب ہونا ایمانِ کامل کی علامت ہے۔[1] اللہ تعالیٰ سنتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] بدعت کسے کہتے ہیں؟ کیا فضائل اعمال کی تعلیم بدعت ہے؟

۲۰۶-سوال: بدعت کسے کہتے ہیں؟ کیا فضائل اعمال کی تعلیم بدعت نہیں ہے؟ فضائل اعمال

---

(۱) سأل رجل النبي -صلى الله عليه وسلم- فقال: ما الإثم؟ فقال: " إذا حك في نفسك شيء فدعه ". قال: فما الإيمان؟ قال: " إذا ساءتك سيئتك، وسرتك حسنتك فأنت مؤمن ". (مسند أحمد بن حنبل:۳۶/ ۴۸۴، رقم: ۲۲۱۵۹، عن أبي أمامة رضي الله تعالى عنه، ط: مؤسسة الرسالة)

عن أنس قال قال النبي صلى الله عليه وسلم: لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من والده، وولده، والناس أجمعين. (صحيح البخاري:۱/ ۷، رقم الحديث: ۱۵، حب الرسول -صلى الله عليه وسلم- من الإيمان، ط: البدر-ديوبند)

ومن محبته وحقه نصرة سنته، والذب عن شريعته، وقمع مخالفيها، وامتثال أوامره، وتمني إدراكه في حياته، ليبذل نفسه وماله دونه، والحديث صريح في أن محبة الرسول من أمور الإيمان، والناس فيها متفاوتون وهو يستلزم زيادة الإيمان ونقصانه. (مرعاة المفاتيح شرح مشكوة المصابيح-عبيد الله الرحماني المباركفوري (م: ۱۴۱۴هـ): ۱/ ۱۷۴، دار الكتاب، بيروت)

کی تعلیم کے بجائے درس قرآن یا درس حدیث کا سلسلہ کیوں شروع نہیں کیا جاتا؟ جواب دے کر ممنون و مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

بدعت کے لغوی معنی ''نئی اور انوکھی چیز'' کے ہیں اور اصطلاح شرع میں ہر وہ کام بدعت ہے، جسے دین سمجھ کر انجام دیا جائے، حالاں کہ اس کا ثبوت نہ تو قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے صراحۃً یا کنایۃً ہو اور نہ ہی وہ اجتہاد امت سے ثابت ہو۔ (مرقاۃ المفاتیح: ۲۷/۴)[۱]

آں حضرت ﷺ کے مبارک زمانے میں ہمارے زمانے کی طرح دار العلوم (مدارس و مکاتب) کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا؛ البتہ یہ بات ثابت ہے کہ آں حضرت ﷺ سے صحابۂ کرام مسجد نبوی ﷺ کے صفہ نامی چبوترے پر تعلیم حاصل کرتے تھے۔[۲]

آں حضرت ﷺ کے زمانے میں ہمارے زمانے کی طرح کورٹ کچہری یا اسمبلی نہیں تھی؛ البتہ احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ آں حضرت ﷺ مدعی اور مدعا علیہ کی فریاد کو مسجد نبوی میں سنتے تھے اور فیصلہ صادر فرماتے تھے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے امور کی انجام دہی کے لیے مسجد میں مشورے ہوا کرتے تھے۔

آں حضرت ﷺ کے زمانے میں صرف و نحو کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی، کیوں کہ آپ ﷺ کے اصحاب (رضوان اللہ علیہم اجمعین) عربی زبان کے بڑے ماہر ہوتے تھے؛ البتہ ہمارے زمانے میں عربی زبان پر قدرت کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کا سیکھنا فرض کفایہ قرار دیا گیا؛ کیوں کہ اس کے بغیر قرآن و احادیث کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔[۳]

---

(۱) قال النووي: البدعة كل شيء عمل على غير مثال سبق، وفي الشرع: إحداث ما لم يكن في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم. (مرقاة المفاتيح: ۲۲۳/۱، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، دار الفكر - بيروت)

ما أحدث على خلاف الحق المتلقى عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - من علم أو عمل أو حال، بنوع شبهة واستحسان، وجعل دينا قويما وصراطا مستقيما. (رد المحتار: ۵۶۰/۱، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) وقال ابن الأثير في ذكر أهل الصفة: هم فقراء المهاجرين ولم يكن لواحد منهم منزل يسكنه فكانوا يأوون إلى موضع مظلل في مسجد المدينة يسكنونه. (عمدة القاري - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۸۱/۷، باب صلوٰة الكسوف جماعة. ط: دار إحياء التراث العربي)

(۳) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: فتاویٰ رحیمیہ: ۱۹۰/۲، کیا ہر نئی چیز بدعت ہے؟ ط: دار الاشاعت دیوبند۔

(ومبتدع) أي: صاحب بدعة، قال الشامي: أي: محرمة، وإلا فقد تكون واجبة، كنصب الأدلة للرد على أهل =

اسی طرح دین اور احکام دین پر عمل کی ترغیب دینے کے لیے اگر فضائل اعمال کی تعلیم کی جائے، تو اس سے عبادت و بندگی کا ثواب حاصل ہوگا؛ کیوں کہ اس میں اعمال صالحہ کی فضیلت کا بیان اور بدعملی یا کوتاہی پر وعید کا ذکر ہے، اس کتاب کے پڑھنے سے انسان میں اعمال صالحہ کی انجام دہی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور منکرات سے بچنے کا حوصلہ ملتا ہے؛ البتہ اسی کتاب کے پڑھنے کو لازم اور ضروری سمجھنا اور نہ پڑھنے والے کو برا بھلا کہنا، دوسری کتاب کے پڑھنے والے کو روکنا، اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنا غلط اور بدعت ہے، جس سے احتراز لازمی ہے۔

قرآن مجید کی تفسیر کرنا صرف ذی استعداد عالم اور مفسر کا حق ہے، یہ عظیم منصب انہیں کے ساتھ خاص ہے، کسی ڈاکٹر یا وکیل کا قرآن مجید کا ترجمہ کر کے اپنی مرضی کے مطابق اس کا مطلب بیان کرنا حرام ہے، ایک حدیث میں آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''کوئی شخص قرآن مجید کی تفسیر اپنی عقل اور رائے سے کرے، تو اس کو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالینا چاہیے''۔ (۴)

اس لیے آپ کسی عالم کو مناسب وظیفہ دے کر قرآن مجید کی تفسیر کا انتظام کیجیے، یہ بڑے ثواب کا

=الفرق الضالة، وتعلم النحو المفهم للكتاب والسنة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۶۰، كتاب الصلوة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

البدعة: طريقة ابتدعت على غير مثال تقدمها من الشارع، ... وبهذا القيد انفصلت عن كل ما ظهر لبادي الرأي أنه مخترع مما هو متعلق بالدين، كعلم النحو والتصريف، ومفردات اللغة، وأصول الفقه، وأصول الدين، وسائر العلوم الخادمة للشريعة، فإنها وإن لم توجد في الزمان الأول، فأصولها موجودة في الشرع، ... فعلى هذا لا ينبغي أن يسمى علم النحو أو غيره من علوم اللسان أو علم الأصول أو ما أشبه ذلك من العلوم الخادمة للشريعة بدعة أصلا. (الاعتصام - إبراهيم بن موسى اللخمي الغرناطي الشهير بـ 'الشاطبي' (م: ۷۹۰ھ): ۱/ ۵۱ - ۵۳، تعريف البدعة ومعناها، ت: سليم بن عيد الهلالي، ط: دار ابن عفان، السعودية)

(۴) عن ابن عباس، عن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: اتقوا الحديث عني إلا ما علمتم، فمن كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار، ومن قال في القرآن برأيه فليتبوأ مقعده من النار. هذا حديث حسن. (سنن الترمذي: ۲/ ۱۲۳، رقم الحديث: ۲۹۵۱، أبواب تفسير القران، باب ما جاء في الذي يفسر القرآن برأيه☆السنن الكبرى - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳ھ): ۷/ ۲۸۶، رقم الحديث: ۸۰۳۱، كتابة القران، باب من قال في القرآن بغير علم، ت: حسن عبد المنعم شلبي، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت☆شرح السنة - : محيي السنة، أبو محمد، البغوي الشافعي (م: ۵۱۶ھ): ۱/ ۲۵۸، رقم: ۱۱۸، كتاب العلم، باب من قال في القرآن بغير علم، ت: شعيب الأرنؤوط - محمد زهير الشاويش، ط: المكتب الإسلامي - دمشق، بيروت)

کام ہے، جماعت کے احباب اپنی صلاحیت اور لیاقت کے مطابق فضائل اعمال کی تعلیم کرتے ہیں، یہ ان کے لیے جائز ہے، اس میں نہ تو کوئی حرج ہے، نہ بدعت ہے، بل کہ دین سیکھنے اور سکھانے کے لیے موثر اور مجرب طریقہ ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] مروجہ صلاۃ وسلام پڑھنے کا حکم

۲۰۷-سوال: ہمارے گاؤں میں تین سال قبل مسجد بنی ہے، اب کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس میں صلاۃ وسلام پڑھنا چاہیے، تو سوال یہ ہے کہ مسجد میں مروجہ صلاۃ وسلام پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جلد جواب عنایت فرمائیں۔

(مولوی) ابراہیم منصوری

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ عالم ہیں، اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ (۱) لوگوں کو ان کتابوں کے ذریعہ سمجھائیں۔ ایسا کون مسلمان ہوگا، جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت اور پاک زندگی پر بیان، وعظ، نعت اور درود شریف پڑھنے اور سننے کی خواہش نہ ہو؛ بل کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد اور اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔ (بخاری شریف: ۱/۷)[۲]

اس میں کوئی شک نہیں کہ "ذکر رسول" بہت ہی ثواب کا کام ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک ذکر سن کر اپنے ایمان میں تازگی محسوس کرتا ہے۔ (۳) لیکن موجودہ دور میں

(۱) دیکھیے: مروجہ محفل میلاد۔

(۲) عن أنس، قال: قال النبي -صلى الله عليه وسلم-: لا يؤمن أحدكم، حتى أكون أحب إليه من والده، وولده، والناس أجمعين. (صحيح البخاري ۱/۷، باب: حب الرسول صلى الله عليه وسلم من الإيمان، كتاب الإيمان، رقم: ۱۵، ط: البدر - ديوبند ☆ صحيح مسلم: ۱/۴۹، كتاب الإيمان، باب وجوب محبة رسول الله -صلى الله عليه وسلم- أكثر من الأهل والولد والوالد، ط: البدر - ديوبند)

(۳) جیسا کہ عربی شاعر کہتا ہے: وذكرك للمشتاق خير شراب... وكل شراب دونه كسراب

امداد الفتاویٰ میں ہے: ذکر ولادت شریف نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مثل دیگر اذکار خیر کے ثواب اور افضل ہے، اگر بدعات اور قبائح سے خالی ہو۔ (۵/۲۴۹، کتاب البدعات، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند)

مندرجہ ذیل قباحتوں کی وجہ سے علماء مروجہ صلاۃ وسلام کی اجازت نہیں دیتے ہیں:

۱- بہت سے لوگ نماز، روزہ اور حج وغیرہ اہم عبادات کو چھوڑ کر صرف ذکر مولود کو ہی نجات کا ذریعہ مانتے ہیں۔ (۴)

۲- اس کام کے لیے لوگوں سے جبراً چندہ لیا جاتا ہے، جو درحقیقت ظلم ہے۔ (۵)

۳- اس کے انتظام میں بہت سے لوگ فرض نماز بھی ادا نہیں کرتے ہیں۔ (۶)

۴- بے پردہ عورتیں اس میں شریک ہوتی ہیں، جو حرام ہے۔ (۷)

(۴) عن الأسود قال: قال عبد الله (بن مسعود): لا يجعل أحدكم للشيطان شيئا من صلاته، يرى أن حقا عليه أن لا ينصرف إلا عن يمينه، لقد رأيت النبي صلى الله عليه وسلم كثيرا ينصرف عن يساره. (صحيح البخاري: ۱/۱۱۸، رقم الحديث: ۸۵۲، كتاب الأذان، باب الانفتال والانصراف عن اليمين والشمال)

قال ابن حجر في شرحه: قال ابن المنير: فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها؛ لأن التيامن مستحب في كل شيء، أي من أمور العبادة، لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه، أشار إلى كراهته، والله أعلم. (فتح الباري- ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲هـ) : ۲/۳۳۸، قوله باب الانفتال والانصراف عن اليمين والشمال، رقم الحديث: ۸۵۲، ط: دار المعرفة- بيروت، ۱۳۷۹)

(۵) قال الله تعالى: ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم، الآية (النساء: ۲۹) وقال النبي صلى الله عليه وسلم: لايحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (مسند أحمد: ۳۴/۲۹۹، رقم: ۲۰۶۹۵، ت: شعيب أرناؤط، ط: مؤسسة الرسالة عام ۱۴۲۱ھ)، ومسند أبويعلى: ۳/۱۴۰، رقم: ۱۵۰۷، ت: حسين سليم، ط: دار المأمون للتراث- دمشق عام ۱۴۰۴ھ)

قال المظهري في تفسير "الباطل" أي بوجه ممنوع شرعاً، كالغصب، و السرقة، و الخيانة، والقمار، والرباء، و العقود الفاسدة. (التفسير المظهري: ۲/۲۹۸، ت: أحمد عزو عناية، ط: زكريا- ديوبند)

(۶) بلا عذر اور فضول کاموں میں مشغول ہو کر نماز کا چھوڑنا گناہ کبیرہ ہے، احادیث میں اس پر بڑی وعید وارد ہوئی ہے، كما روي عن جابر بن عبد الله يقول: سمعت رسول الله- صلى الله عليه وسلم- يقول: بين الرجل وبين الشرك والكفر ترك الصلاة. (صحيح مسلم: ۱/۶۱، رقم: ۸۲، كتاب الإيمان، باب بيان إطلاق اسم الكفر على من ترك الصلاة، البدر- ديوبند)

(۷) عن عبد الله عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: المرأة عورة، فإذا خرجت استشرفها الشيطان. (سنن الترمذي: ۱/۲۲۲، رقم: ۱۱۷۳، أبواب الرضاع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب المرأة عورة، قبيل أبواب الطلاق واللعان، ط: فيصل- ديوبند)

وفي الدر المختار: (وتمنع) المرأة الشابة (من كشف الوجه بين الرجال) لا لأنه عورة، بل (لخوف الفتنة) كمسه وإن أمن الشهوة؛ لأنه أغلظ. وقال ابن عابدين في حاشيته: والمعنى تمنع من الكشف لخوف أن يرى الرجال وجهها فتقع الفتنة؛ لأنه مع الكشف قد يقع النظر إليها بشهوة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۷۹، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، مطلب في ستر العورة، ط: دار عالم الكتب، الرياض، طبع خاص: ۱۴۲۳ھ= ۲۰۰۳ء)

۵- اس کام میں اسراف اور فضول خرچی کی جاتی ہے، جو حرام ہے۔ (٨)

٦- رسول اللہ ﷺ کو حاضر و ناظر تصور کر کے، اس میں قیام کرتے ہیں، جو کفریہ عقیدہ ہے۔ (٩)

٧- جو لوگ قیام نہیں کرتے ہیں، انھیں برا بھلا کہا جاتا ہے، جو حرام ہے۔ (١٠)

٨- رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں جب باحیات تھے، تو اپنے لیے قیام کو پسند نہیں فرماتے تھے، جس کی وجہ سے صحابہ کرام (جنھیں آپ علیہ السلام سے بے پناہ محبت تھی) آپ ﷺ کو دیکھ کر کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ (١١)

٩- آپ ﷺ کے مبارک دور میں قیام نہیں تھا؛ بل کہ جہالت کی وجہ سے بعد کے لوگوں نے اس

---

(٨) وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ. (٦-الأنعام: ١٤١) وقال الالوسي: وقال الزهري: المعنى لا تنفقوا في معصية الله تعالى... وعن مجاهد أنه قال: لو كان أبو قبيس ذهبا فأنفقه رجل في طاعة الله تعالى، لم يكن مسرفا، ولو أنفق درهما في معصية الله تعالى كان مسرفا. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني: ٣٨/٨، إحياء التراث العربي، بيروت، لبنان)

(٩) حاضر و ناظر کا عقیدہ اہل سنت والجماعت کے عقائد کے خلاف ہے، قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں اس کی سختی سے نفی کی گئی ہے۔ قال الله تعالى: وَمَا كُنتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَٰكِن رَّحْمَةً مِّن رَّبِّكَ. (القصص: ٤٦) و قال تعالى: وَمَا كُنتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ. (القصص: ٤٤) و قال تعالى: وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ. (آل عمران: ٤٤) قال ابن كثير: أي: ما كنت حاضرا لذلك، ولكن الله أوحاه إليك. (تفسير القرآن العظيم: ٢٤٠/٦، سورة القصص: ٤٤، ط: دار طيبه للنشر و التوزيع، طبع دوم: ١٤٢٠ھ-١٩٩٩ء)

نیز حدیث میں خود اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے آپ کو غائب کہا ہے، جو عقیدۂ حاضر و ناظر کے خلاف ہے، مسند بزار میں یہ واقعہ مفصلاً مذکور ہے، اس میں حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے لیے واقعہ کا شاہد اور اپنے لیے لفظ غائب کا استعمال فرمایا ہے۔ (مسند البزار: ٢٣٧/٢، رقم الحدیث: ٦٣٤، ط: مکتبۃ العلوم والحکم، مدینہ منورہ، طبع اول: ١٩٨٨ء)

(١٠) عن عبد الله قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: سباب المسلم فسوق وقتاله كفر. (صحيح البخاري: ١٢/١، رقم: ٤٨ و ٦٠٤٤، باب خوف المؤمن من أن يحبط عمله وهو لا يشعر، كتاب الإيمان، ط: البدر-ديوبند ☆ صحيح مسلم: ٥٨/١، رقم الحديث: ١١٦-٦٤، باب بيان قول النبي صلى الله عليه وسلم: سباب المسلم فسوق وقتاله كفر، كتاب الإيمان، ط: فيصل-ديوبند)

(١١) عن أنس قال: لم يكن شخص أحب إليهم من رسول الله صلى الله عليه وسلم، وكانوا إذا رأوه لم يقوموا لما يعلمون من كراهيته لذلك. (سنن الترمذي: ١٠٤/٢، رقم: ٢٧٥٤، باب ماجاء في كراهية قيام الرجل للرجل، ط: مكتبة الاتحاد-ديوبند)

کو دین میں داخل کر دیا ہے، جو قطعاً حرام ہے۔ (۱۲)

۱۰- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جو کوئی اس دین میں نئی چیز پیدا کرے، تو وہ مردود ہے۔ (۱۳)

مذکورہ بالا برائیوں اور قباحتوں کی وجہ سے مروجہ صلاۃ وسلام پڑھنا قطعاً جائز نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] جمعہ کے روز ''إِنَّ اللهَ وَمَلٰئِكَتَهُ يُصَلُّونَ الآية'' پڑھنا

۲۰۸-سوال: کئی گاؤں میں جمعہ کے روز جمعہ کی نماز کے بعد بہت سے لوگ "إن الله و ملائکته یصلون... الآیة" پڑھتے ہیں، اس کا پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جمعہ کے روز جمعہ کی نماز کے بعد "إن الله و ملائکته یصلون الآیة" پڑھنا ایک نیا امر ہے، جو شرعاً ثابت نہیں ہے؛ اس لیے بدعت ہے۔ (۱) اور اگر اس کے پڑھنے سے نمازیوں کی نماز میں خلل ہوتا ہو، (اور یقیناً ہوتا ہے، جیسا کہ مشاہدہ ہے) تو اس کا پڑھنا مکروہ تحریمی ہوگا اور بدعت کے ساتھ ساتھ نمازیوں کی نماز میں خلل پیدا کرنے کا بھی گناہ ہوگا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱۲) عن أبي أمامة قال: خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم متوكئا على عصا فقمنا إليه فقال: لا تقوموا كما تقوم الأعاجم، يعظم بعضها بعضا. (سنن أبي داؤد: ۵/ ۲۲۲، رقم الحديث: ۵۱۸۷، كتاب الأدب، باب في قيام الرجل للرجل، ت: محمد عوامة، ط: موسسۃ الریان، بیروت، طبع اول: ۱۴۱۹ھ-۱۹۹۸ء، وفی النسخ الہندیۃ: ۲/ ۷۱۰، باب الرجل يقوم للرجل يعظمه بذلك)

(۱۳) عن عائشة - رضي الله عنها - قالت: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود ☆ صحيح مسلم: ۲/ ۷۷، رقم الحديث: ۱۷-(۱۷۱۸)، كتاب الحدود، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور، ط: فيصل - ديوبند)

(۱) عن عائشة - رضي الله عنها - قالت: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، كتاب الصلح ★ صحيح مسلم: ۲/ ۷۷، رقم الحديث: ۱۷-۱۷۱۸، كتاب الحدود، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور)

(۲) وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَى فِي خَرَابِهَا أُولَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ=

[۵] گیارہویں اور مولود شریف کا حکم

۲۰۹-سوال: گیارہویں اور مولود شریف پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

گیارہویں کا تعلق ایصال ثواب سے ہے، جو کہ فی نفسہ جائز ہے؛(۱) مگر چوں کہ 'التزام مالایلتزم' کے قبیل سے ہے کہ اس میں حتمی طور پر تاریخ متعین ہوتی ہے، آگے پیچھے کرنا' جائز تصور نہیں کیا جاتا؛ اس لیے درست نہیں ہے۔[۲]

رسول اللہ ﷺ کا ذکر مبارک' بلاشبہ قابل ثواب اور ایمان افروز عمل ہے؛ لیکن اس میں اس طرح اشتغال کہ دیگر اعمال نبویہ اور فرائض اسلام: نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ کو ترک کر کے محض اسی پر بھروسہ کر کے نجات کی امید رکھنا سخت گمراہی ہے، نیز ذکر ولادت مبارک میں اس طرح لگنا کہ اس میں فرائض کا ترک ہو، امر مندوب کی خاطر فرائض کا ترک کرنا ہے، جو سخت جہالت اور نادانی کی بات ہے، علاوہ ازیں ذکر مولود شریف میں قیام ہوتا ہے اور خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی مبارک زندگی میں اپنی ذات اقدس کے لیے کسی دوسرے کے کھڑے ہونے کو گوارہ نہیں فرمایا اور سختی سے اس پر نکیر فرمائی، تو سوچنے کی بات ہے کہ محض

=لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ.(۲-البقرة:۱۱۴)قال محمد بن جرير الآملي، أبو جعفر الطبري (م:۳۱۰ھ) :إن كل مانع مصليا في مسجد لله- فرضا كانت صلاته فيه أو تطوعا- وكل ساع في إخرابه فهو من المعتدين الظالمين.(جامع البيان في تأويل القرآن المعروف بـ تفسير الطبري:۲/۴۴۶،ت:د:عبد الله بن عبدالمحسن التركي،ط:دار هجر للطباعة والنشر والتوزيع والإعلان،طبع اول:۱۴۲۲ھ-۲۰۰۱ء)

(۱) فتاویٰ رشیدیہ میں ہے:اور ایصال ثواب بروح حضرت قدس سرہ (عبدالقادر جیلانی) درست ہے اور تعیین تاریخ کہ پس وپیش نہ کرے، بدعت ہے۔(فتاویٰ رشیدیہ،ص:۱۳۹،ط:تھانوی،دیوبند)

(۲) یعنی جو چیز شریعت میں لازم نہ ہو، اسے اپنے اوپر لازم وضروری سمجھنا شریعت کے منشاء کے خلاف ہے:عن أبي هريرة قال: خطبنا رسول الله -صلى الله عليه وسلم- فقال:أيها الناس قد فرض الله عليكم الحج، فحجوا، فقال رجل: أكل عام يا رسول الله؟فسكت حتى قالها ثلاثا، فقال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: "لو قلت: نعم لوجبت، ولما استطعتم"، ثم قال: ذروني ما تركتكم، فإنما هلك من كان قبلكم بكثرة سؤالهم واختلافهم على أنبيائهم، فإذا أمرتكم بشيء، فأتوا منه ما استطعتم، وإذا نهيتكم عن شيء فدعوه.(صحيح مسلم:۱/۴۳۲،رقم الحديث:۷-۱۳۳۷-۴۱۲،كتاب الحج،باب فرض الحج مرة في العمر،ط:البدر-ديوبند)

ذکرِ رسول پر قیام کس قدر امرِ منکر ہوگا! اس لیے یہ ایک الگ بدعت ہے، پس مروجہ ذکرِ مولود متعدد گناہ کبیرہ کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] گیارہویں شریف اور اس کی دعوت کا حکم

۲۱۰-سوال: بڑے پیر صاحب کی گیارہویں شریف میں شرعی طور پر کیا اعتراض ہے؟ نیز گیارہویں کی دعوت کھانا اور اس کو رواج دینا کیسا ہے؟ اور اس کھانے پر حق کس کا ہے؟ تفصیل سے جواب مطلوب ہے۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

اس سوال کے جواب میں تین باتیں جان لینی چاہیے:

(۱) گیارہویں کا کھانا 'خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا؛ دونوں جائز نہیں؛ کیوں کہ اس کے متعلق جواز کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ (۱) جن پیر کے نام سے کھانا کھلایا جاتا ہے، وہ تو ولی کامل تھے، سنت کی پیروی کرنے والے اور اس کے موافق زندگی گزارنے والے تھے اور ان کے مقابل میں ہمارے آباء و اجداد- جو گنہ گار تھے- ایصالِ ثواب کے زیادہ مستحق ہیں، پہلے ان کو ثواب پہنچانا چاہیے۔ (جب کہ اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دیتا ہے)

(۲) گیارہویں کو ضروری سمجھ کر کیا جاتا ہے؛ لہٰذا بدعت ہے۔ (اس سلسلے میں مکمل تفصیل کے لیے میری کتاب: احکامِ میت [سکرات سے فاتحہ تک کی سنن و بدعات] ملاحظہ کیجیے۔ (۲)

(۳) ایسی دعوت 'جس میں ایصالِ ثواب مقصود ہو، غریبوں، مسکینوں اور یتیموں (یعنی مستحقین) کو

---

(۳) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے عنوان: مروجہ صلاۃ و سلام کا حکم۔

(۱) اس لیے کہ گیارہویں منانے والوں کے یہاں دن، تاریخ اور مہینہ؛ سب متعین ہوتے ہیں اور کسی چیز کو محض اپنی طرف سے اس طرح متعین کر لینا کہ لوگ اس کے خلاف کرنے کو برا سمجھتے ہوں؛ بدعت ہے۔ حضرت مفتی عبد الرحیم لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ ایک لمبی بحث کے بعد تحریر فرماتے ہیں: "رہا ایصالِ ثواب، تو جائز طریقے پر بلا تعیین تاریخ و یوم و ماہ کے جب چاہے، کر سکتے ہیں ہمیشہ کے لیے ایک ہی تاریخ متعین کرنا کہ کبھی بھی اس کے خلاف نہ کیا جائے، تو یہ اپنی طرف سے زیادتی اور ایجاد فی الدین ہے"۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۲/۷۷، ط: دار الاشاعت، کراچی، پاکستان۔ مزید دیکھیے: فتاویٰ رشیدیہ، ص: ۱۶۴، ط: مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

(۲) یہ کتاب "احکامِ میت" کے نام سے صاحب زادۂ محترم جناب حافظ احمد بیات صاحب کی کوشش سے اردو میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

کھلانا ضروری ہوتا ہے۔ (۳) حالاں کہ دیکھا جاتا ہے کہ عموماً اس پر عمل نہیں ہوتا ہے؛ بل کہ زیادہ تر اس دعوت میں مال داروں کو شریک کیا جاتا ہے؛ لہٰذا اختلاف شریعت عمل کرنے کی وجہ سے اس پر کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

اگر ایصال ثواب ہی مقصود ہو، تو سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ کوئی دن و تاریخ طے کیے بغیر بجائے کھلانے پلانے کے رقم ہی کسی مدرسہ یا غرباء و یتامیٰ کو دے دی جائے، کہ اس میں ثواب زیادہ ملے گا۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] ربیع الاول اور ربیع الآخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پیران پیر کے نام پر دعوت کرنا

۲۱۱-سوال: ہمارے گاؤں میں ۱۲-۱۳/ سال سے ربیع الاول کے مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں دن اور تاریخ کی تعیین کے بغیر کھانا پکا کر امیر اور غریب سب کھاتے رہے ہیں، اس دعوت کے لیے لوگوں میں چندہ بھی کیا جاتا ہے، اسی طرح ربیع الآخر میں بھی اس قسم کی دعوت پیران پیر رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر کی جاتی رہی ہے؛ لیکن حال ہی میں ایک صاحب - جو ’ڈربن‘ سے آئے ہیں - کا کہنا ہے کہ ہمارے یہاں ’ علمائے کرام اس قسم کی دعوت سے منع کرتے ہیں، ہمارے یہاں کے علماء کا کہنا ہے کہ چندہ کر کے کھانا پکانا اور لوگوں کی دعوت کرنا جائز نہیں، کوئی ایک دو شخص اپنی رضامندی سے لوگوں کو کھلائے، تو اس میں حرج نہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان کی یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟ اور اب تک بارہ تیرہ سال سے امیر غریب سب لوگوں نے مل کر جو کھانا کھایا ہے اور گھر میں بھی عورتوں کو بھیجا گیا ہے، اس سلسلہ میں شرعاً کیا حکم ہے؟ تفصیل سے جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

---

(۳) وإن اتخذ طعاما للفقراء كان حسنا، إذا كانت الورثة بالغين، فإن كان في الورثة صغير، لم يتخذوا ذلك من التركة، كذا في التتارخانية. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۴۴، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا و الضيافات، ط: دار الكتب العلمية، بيروت، طبع اول: ۲۰۰۰=۱۴۲۱، ☆رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۱۴۸، باب في صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت، ط: دار عالم الكتب، الرياض، طبع خاص: ۱۴۲۳ھ = ۲۰۰۳ء)

(۴) کیوں کہ اس میں دین اور طالبانِ علم دین کی اعانت ہے اور شہرت و نام و نمود اور ریا سے دوری بھی: وقال أبو هريرة رضي الله عنه عن النبي - صلى الله عليه وسلم - ورجل تصدق بصدقة فأخفاها حتى لا تعلم شماله ما صنعت (تنفق) يمينه وقال الله تعالى [وإن تخفوها وتؤتوها الفقراء فهو خير لكم. البقرة: ۲۷۱] (رواه البخاري تعليقا: ۱/ ۱۹۱، كتاب الزكاة، باب صدقة السر، ط: البدر - ديوبند)

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ذکر دلوں میں نور اور ایمان میں تازگی پیدا کرتا ہے؛ تاہم امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) کی اہم ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کرنا ہے۔(۱) سنت کی راہ چھوڑنے سے گمراہی پھیلتی ہے، اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ کوئی سنت اگر (اپنی حیثیت سے بڑھ کر) بدعت بن جائے، تو اس کو چھوڑ دینا ضروری ہے۔(۲)

۱۲ ربیع الاول کو چندہ کر کے امیر وغریب سب کو کھلانا جائز نہیں ہے؛ جس کی مختلف وجہ ہے:

۱۔ چندہ دینے والے نے اگر غریب کی نیت سے دیا ہے یا صدقۂ واجبہ ادا کیا ہے، تو اس کا مال داروں کے لیے کھانا جائز نہیں ہوگا۔(۳)

---

(۱) أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قال: من أحيا سنة من سنتي، فعمل بها الناس، كان له مثل أجر من عمل بها، لا ينقص من أجورهم شيئا، ومن ابتدع بدعة، فعمل بها، كان عليه أوزار من عمل بها، لا ينقص من أوزار من عمل بها شيئا. (سنن ابن ماجة، ص: ۱۹، رقم الحديث: ۲۰۹، ۲۱۰، المقدمة، باب من أحيا سنة قد أميتت، ط: مكتبة الاتحاد، ديوبند ☆ سنن الترمذي: ۹۲/۲، رقم الحديث: ۲۶۷۷، ۲۶۷۸، أبواب العلم، باب ما جاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع، ط: فيصل پبليكيشنز ديوبند)

(۲) وقد صرح بعض علمائنا وغيرهم بكراهة المصافحة المعتادة عقب الصلوات مع أن المصافحة سنة، وما ذاك إلا لكونها لم تؤثر في خصوص هذا الموضع، فالمواظبة عليها فيه توهم العوام بأنها سنة فيه، ولذا منعوا عن الاجتماع لصلاة الرغائب التي أحدثها بعض المتعبدين؛ لأنها لم تؤثر على هذه الكيفية في تلك الليالي المخصوصة وإن كانت الصلاة خير موضوع. (رد المحتار على الدر المختار: ۲۳۵/۲-۲۳۶، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: بيروت)

(۳) قال الله تعالى: إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ. الآية (۹- التوبة: ۶۰)

وعن عبد الله بن عمرو، عن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: لا تحل الصدقة لغني، ولا لذي مرة سوي. (سنن أبي داؤد، ص: ۲۳۱، رقم الحديث: ۱۶۳۴، كتاب الزكاة، باب من يجوز له أخذ الصدقة وهو غني، ط: البدر، ديوبند ☆ سنن الترمذي: ۱۴۱/۱، رقم الحديث: ۶۵۲، كتاب الزكاة باب من لا تحل له الصدقة، ط: البدر، ديوبند.

وفي الدر المختار: (الوصية المطلقة) كقوله هذا القدر من مالي أو ثلث مالي وصية (لا تحل للغني) لأنها صدقة، وهي على الغني حرام (وإن عممت) كقوله: يأكل منها الغني والفقير؛ لأن أكل الغني منها إنما يصح بطريق التمليك والتمليك إنما يصح لمعين والغني لا يعين ولا يحصى. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶۹۸/۶، كتاب الوصايا، باب الوصية بالخدمة والسكنى الخ، فروع أوصى بثلث ماله للصلوات، ط: بيروت ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام - ملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۴۳۶/۲، فصل وصايا الذمي، كتاب الوصايا، ط: دار إحياء الكتب العربية)

۲۔ عموماً اس طرح کی دعوت کے لیے عام لوگوں سے زبردستی چندہ لیا جاتا ہے، حالاں کہ چندہ میں کسی پر دباؤ ڈالنا اور مجبور کرنا جائز نہیں ہے۔ (۴)

۳۔ جو رسم سالوں سے چلی آ رہی ہو، آہستہ آہستہ لوگ اسے ضروری سمجھنے لگیں گے اور اسے فرض اور واجب کا درجہ دینے لگیں گے، جس کی ہمارے پاس بہت سی مثالیں ہیں کہ شروع میں تو ایک چیز کو غیر ضروری سمجھ کر کیا جاتا تھا؛ لیکن جوں جوں دن گذرتے گئے، لوگوں نے اسے ضروری سمجھنا شروع کر دیا اور نہ کرنے والوں پر لعن طعن کرنے لگے؛ لہٰذا اس دعوت کو ترک کر دینا ضروری ہے، تعجب ہے کہ اس قسم کے کاموں میں حصے لینے والوں کو جب کہا جاتا ہے کہ: ''رسول اللہ ﷺ کی یاد مناتے ہو، تو آپ ﷺ کی سنتوں پر بھی عمل کرو''، تو ان کو اس سے نفرت ہوتی ہے۔ یہ کیسی یاد اور کیسی محبت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے نفرت ہے!!!

لہٰذا مذکورہ کام رسم ورواج میں داخل ہے، اس سے اجتناب لازم ہے، البتہ اگر کوئی شخص اپنے مال سے اس مہینے میں غریبوں، مسکینوں، ضرورت مند یتیموں اور بیواؤں کو کچھ پکا کر کھلائے، تو جائز ہے؛ لیکن کھلانے کے بجائے کچا اناج دے دیا جائے، تو زیادہ بہتر ہے اور زیادتیٔ ثواب کا باعث بھی، کہ اس عمل سے غرباء ومساکین کے تئیں ہمدردی ہوتی ہے، جو نبی کریم ﷺ کی اہم سنت ہے؛ لہٰذا اس عمل سے رسول اللہ ﷺ کی سنت کو زندہ کرنے کا ثواب بھی حاصل ہوگا، نیز کچا اناج دینے میں اخلاص بھی باقی رہے گا، پکا کر کھلانے اور دعوت کرنے میں شہرت کی وجہ سے اخلاص ختم ہونے کا اندیشہ ہے، الغرض جو بھی کام کیا جائے، صحیح طریقے سے کیا جائے، نام ونمود اور رسم و رواج سے بچنا بے حد ضروری ہے۔ (۵)

---

(۴) عن عمرو بن يثربي الضمري، قال: شهدت خطبة رسول الله -صلى الله عليه وسلم- بمنى، فكان فيما خطب به أن قال: "ولا يحل لامرئ من مال أخيه إلا ما طابت به نفسه". (مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۲۳۹/۲۴، رقم: ۱۵۴۸۸، حديث عمرو بن يثربي☆السنن الكبرى-ابوبكر البيهقي(م:۴۵۸ھ):۱۶۰/۶، برقم:۱۱۵۲۵، كتاب الغصب، باب لا يملك أحد بالجناية شيئاً، ط: بيروت)

(۵) اس لیے کہ کچے اناج کو فقراء حسب ضرورت اپنی ضرورتوں میں پکا کر یا فروخت کر کے صرف کر سکتے ہیں: کما يستفاد من عبارة الحسامي: وكذلك جواز الإبدال في باب الزكاة. الخ (حسامی: ۹۹ بحث القياس، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی دیوبند) نیز اس میں اخفاء بھی ہے، جو شرعاً مطلوب ہے: قال الله تعالى: وإن تخفوها وتؤتوها الفقراء فهو خير لكم. الآية (-۲البقرة:۲۷۱) و عن أبي هريرة -رضي الله تعالى عنه- عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: سبعة يظلهم الله في ظله، يوم لا ظل إلا ظله: . . . ورجل تصدق، أخفى حتى لا تعلم شماله ما تنفق يمينه. (صحيح البخاري: ۹۱/۱، برقم الحديث: ۶۶۰، كتاب الأذان، باب من جلس في المسجد ينتظر الصلاة، ط: فيصل پبليكيشنز، ديوبند)

اسی طرح ربیع الآخر کے مہینے میں پیران پیر کے نام پر جو دیگیں پکتی ہیں اور کھانے پینے کی مجلسیں جمتی ہیں، وہ بھی جائز نہیں ہے، ان کاموں کو لوگوں نے اپنے عمل سے ''امر مباح'' سے بڑھا کر ''بدعت'' کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ ذرا سوچیے کہ پیران پیر تو اللہ تعالیٰ کے بڑے ولی، نیک، متقی اور پرہیزگار تھے، جب کہ ہمارے رشتے داران کے درجے سے انتہائی کم درجہ کے ہیں، تو ان سے زیادہ تو ہمارے مرحومین ورشتے دار ایصال ثواب کے محتاج ہیں، مگر انہیں کوئی یاد نہیں کرتا ہے، لہٰذا اپنے خیالات اور عمل کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۸] مولود اور اس کے لیے کسی ملکیت کو وقف کرنا

۲۱۲-سوال: مولود درست ہے یا نہیں، اور مولود کے لیے اگر کوئی ملکیت وقف کی جائے، تو یہ وقف صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہو، تو پھر اس کی آمدنی کو مولود کے علاوہ کسی دوسری چیز، مثلاً: افطار پارٹی، مسجد یا مدرسہ کی تعمیر اور ملازمین کی تنخواہ میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر وقف صحیح نہ ہو، تو یہ ملکیت واقف کے ورثاء کو مل سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مولود یعنی نبی کریم ﷺ کی ولادت کا تذکرہ کرنے کے لیے کسی مجلس کا منعقد کرنا اگر رسم ورواج کے طور پر نہ ہو، تو جائز ہے۔ (۱) اس مقصد کے لیے اگر کوئی اپنی ملکیت وقف کرے، تو صحیح ہے؛ کیوں کہ صحت وقف کی شرائط میں سے یہ ہے کہ مصرف وقف (جس چیز کے لیے وقف کیا گیا ہو) باقی رہنے والی کوئی شئے ہو۔ (مجمع الانہر: ۱/ ۷۳۴)[۲]

اس کی آمدنی کو واقف کی شرط کے موافق ''مولود'' کے علاوہ کسی دوسری چیز میں استعمال کرنا

---

(۱) عن أنس، قال: قال النبي -صلى الله عليه وسلم-: لا يؤمن أحدكم، حتى أكون أحب إليه من والده، وولده، والناس أجمعين. (صحيح البخاري، ۱/ ۷، رقم: ۱۵، باب: حب الرسول صلى الله عليه وسلم من الإيمان، كتاب الإيمان، ط: البدر، ديوبند ☆ صحيح مسلم: ، كتاب الإيمان، باب وجوب محبة رسول الله - صلى الله عليه وسلم - أكثر من الأهل والولد والوالد)

امداد الفتاویٰ میں ہے: ذکر ولادت شریف نبوی ﷺ مثل دیگر اذکار خیر کے ثواب اور افضل ہے، اگر بدعات اور قبائح سے خالی ہو، قال الشاعر: وذكرك للمشتاق خير شراب ... وكل شراب دونه كسراب

(۵/ ۲۴۹، کتاب البدعات، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند)

[۲] (ومنها) أن يجعل آخره بجهة لا تنقطع أبدا عند أبي حنيفة ومحمد، فإن لم يذكر ذلك لم يصح عندهما. (بدائع الصنائع: ۶/ ۲۲۰، كتاب الوقف والصدقة، ط: دار الكتب العلمية بيروت ☆ البناية شرح الهداية - بدر الدين العينى (م: ۸۵۵هـ): ۶/ ۹۰۳، كتاب الوقف، ط: دار الفكر - بيروت) =

درست نہیں ہوگا؛ کیوں کہ واقف کی شرط نص شارع کی طرح ہوتی ہے جب کہ خلاف شرع امر پر مشتمل نہ ہو۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] کسی کے مرنے پر مخصوص دنوں میں قرآن خوانی اور دعوت کرنا

۲۱۳-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ: ہم گجرات میں کھیڑا ضلع کے رہنے والے ہیں، ہمارے یہاں برادری میں جب کسی رشتہ دار کی موت ہوجاتی ہے، تو تدفین کے تیسرے، چوتھے یا دسویں دن "زیارت" کے عنوان سے دوسرے گاؤں کے رشتہ داروں کو خط کے ذریعہ بلایا جاتا ہے، فی الحال اس کو "زیارت" کے بجائے "مغفرت کی دعا" کا نام دیا ہے، اس میں مقامی لوگوں کو بھی دعوت دی جاتی ہے، اور قرآن خوانی کر کے میت کے لیے مغفرت کی دعا کی جاتی ہے، اس کے بعد میت کے گھر والوں کی طرف سے سب کو کھانا کھلایا جاتا ہے، کھانے میں امیر، غریب، چھوٹے، بڑے، مرد، عورت، مقامی اور بیرونی سبھی حضرات شریک ہوتے ہیں، تو اس طرح کا پروگرام کرنا اور اس کو کسی دن کے ساتھ خاص کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ اس بہانے سے لوگ جمع ہوجاتے ہیں اور قرآن خوانی اور میت کے لیے دعاء مغفرت کر لیتے ہیں، اگر اس کو بھی بند کر دیا جائے، تو پھر میت کے لیے نہ کوئی ایصال ثواب کرے گا اور نہ ہی دعائے مغفرت؛ لہٰذا یہ جو ہو رہا ہے، وہ صحیح ہے، لوگوں کو اس سے روکنا نہیں چاہیے۔

قران خوانی کے بعد کسی عالم کی تقریر بھی رکھی جاتی ہے، اسی طرح کے ایک پروگرام میں ایک عالم کی

=وشرط لتمامه ذكر مصرف مؤبد. (ملتقى الأبحر) وفي مجمع الأنهر: فعلم من هذا: أن التابيد شرط البتة. (مجمع الأنهر: ۲/ ۵۷۳، كتاب الوقف، ط: مكتبة فقيه الأمة، ديوبند)

(۳) إن شرائط الواقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع وهو مالك، فله أن يجعل ماله حيث شاء ما لم يكن معصية وله أن يخص صنفا من الفقراء، وكذا سيأتي في فروع الفصل الأول أن قولهم شرط الواقف كنص الشارع أي في المفهوم والدلالة، ووجوب العمل به. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۳۶۶، كتاب الوقف، مطلب في وقف المنقول قصدا، ط: بيروت)

وفي الخانية: لو جعل حجرته لدهن سراج المسجد ولم يزد صارت وقفا على المسجد إذا سلمها إلى المتولي وعليه الفتوى وليس للمتولي أن يصرف الغلة إلى غير الدهن اهـ. (البحر الرائق: ۵/ ۲۳۲، كتاب الوقف، الاستدانة لأجل العمارة في الوقف، ط: دار الكتاب الإسلامي)

تقریر تھی ، انہوں نے تقریر میں کہا کہ '' اس طرح کی تقریب میں آنے والے مہمانوں کو جو کھانا کھلایا جاتا ہے، اس میں مہمانوں کا اکرام ہے، اس لیے یہ بلاشبہ جائز ہے''۔ یہ عالم جب بھی ''زیارت'' کے موقع پر بیان کرتے ہیں، تو اس میں یہی بات کہتے ہیں، تو ان کا یہ کہنا کیسا ہے؟ اور ایسے عالم کو امام بنانا اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ صورت میں دعائے مغفرت کے عنوان سے لوگوں کو دعوت دے کر رسم ورواج؛ بل کہ نیا لیبل لگا کر ایک بدعت کو جاری کرنا ہے۔ خود بریلوی حضرات کے پیشوا امام احمد رضا خاں صاحب نے بھی احکام شریعت (حصہ سوم) میں اس کو حرام لکھا ہے۔

میں نے اپنی ایک کتاب ''سکرات سے فاتحہ تک کی سنتیں، رسمیں، بدعتیں''[1] میں اس کے ناجائز ہونے کی دس وجوہات بیان کی ہے۔ جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) ان مولانا صاحب سے (جو اس طرح کے پروگراموں کے انعقاد کے قائل ہیں اور نہ کرنے پر لعن وطعن کی بوچھاڑ کرتے ہیں) پوچھنا چاہیے کہ میت سے اتنی ہمدردی تھی، تو مرنے کی خبر سنتے ہی ہر ایک رشتہ دار نے اپنی جگہ پر اس کے لیے دعائے مغفرت کیوں نہیں کی؟ دعاء مغفرت کے لیے اس دعوت کا انتظار کیوں کیا؟

(۲) آنے جانے کا گاڑی کرایہ خرچ کرنے کے بجائے بیوہ یا کسی محتاج غریب کو خیرات کردیتے، تو ثواب ملتا۔

(۳) ایسی دعوت میں ہر قسم کے لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے، جن میں مسٹنڈے (ہٹے کٹے افراد) ڈاڑھی منڈے اور بے نمازی بھی شریک ہوتے ہیں؛ بل کہ یہی لوگ پیش پیش رہتے ہیں کیا ان کو کھانا کھلانے سے ثواب ملے گا؟ صحیح یہ ہے کہ ایسے شخص کو بجائے ثواب کے گناہ ہوگا۔

(۴) میت کے ترکہ سے عموماً اس دعوت کا نظم کیا جاتا ہے، جس سے وارث کا حق متعلق ہو چکا ہے، وارث میں یتیم بچے بھی ہوتے ہیں، یتیم کے مال سے مہمانی کرنے کی اجازت بیوہ اور بڑی اولاد کو بھی نہیں

(۱) صاحب فتاویٰ کی یہ کتاب اصلاً گجراتی زبان میں تھی، بحمد اللہ بہ زبان اردو 'احکام میت (سکرات سے فاتحہ تک کی سنن و بدعات) کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ اس قسم کی دعوت کی ممانعت کی تمام وجوہات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں صاحب فتاویٰ کی مذکورہ کتاب، ص: ۲۵۔

ہے۔ یتیم کا مال ناحق کھانے والا اپنے پیٹ میں آگ کے انگارے بھرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا۔ [۲] بھلا اس رقم سے دعوت کی جائے گی، تو میت کو کہاں سے ثواب ملنے کی امید ہوگی۔ [۳]

(۵) اس طرح کی دعوت میں عورتیں بے پردہ آتی ہیں اور چوں کہ دعوت دینے والا اس کا سبب بنا ہے؛ اس لیے وہ بھی گنہ گار ہوگا۔ [۴]

(۶) میت کو دفن کرنے کے لیے مدد کی ضرورت آج (دفن کے دن) ابھی ہے، تیسرے، چوتھے دن اس کو کسی مدد کی ضرورت نہیں؛ تیسرے، چوتھے یا مخصوص دن میں اس دعوت کا اہتمام کرنا' درحقیقت ایک نئی بدعت کو جاری کرنا ہے۔

(۷) میت کے گھر میں غمی کا موقع ہوتا ہے، دعوت تو خوشی کے مواقع پر ہوا کرتی ہے۔ [۵] لوگوں کے دل کتنے سخت ہو گئے ہیں کہ بیوہ کے گھر دعوت کھائے بغیر میت کے لیے دعا بھی نہیں کر سکتے۔

لہٰذا مذکورہ دعوت ناجائز ہے، جو امام جائز بتلاتا ہے، وہ گنہ گار اور فاسق ہے، اس کو امامت سے الگ

---

(۲) ۴-النساء: ۱۰۔

(۳) وإن اتخذ طعاما للفقراء كان حسنا اهـ وأطال في ذلك في المعراج. وقال: وهذه الأفعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها لأنهم لا يريدون بها وجه الله تعالى. اهـ. وبحث هنا في شرح المنية بمعارضة حديث جرير المار بحديث آخر فيه »أنه - عليه الصلاة والسلام - دعته امرأة رجل ميت لما رجع من دفنه فجاء وجيء بالطعام«. أقول: وفيه نظر، فإنه واقعة حال لا عموم لها مع احتمال سبب خاص، بخلاف ما في حديث جرير. على أنه بحث في المنقول في مذهبنا ومذهب غيرنا كالشافعية والحنابلة استدلالا بحديث جرير المذكور على الكراهة، ولا سيما إذا كان في الورثة صغار أو غائب، مع قطع النظر عما يحصل عند ذلك غالبا من المنكرات الكثيرة كإيقاد الشموع والقناديل التي توجد في الأفراح، وكدق الطبول، والغناء بالأصوات الحسان، واجتماع النساء والمردان، وأخذ الأجرة على الذكر وقراءة القرآن، وغير ذلك مما هو مشاهد في هذه الأزمان، وما كان كذلك فلا شك في حرمته وبطلان الوصية به، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم. (رد المحتار: ۲/ ۲۴۱-۲۴۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت، ط: دار الفكر-بيروت)

(۴) قال الله تعالى: لا تعاونوا على الإثم والعدوان. (۵-المائدة: ۲) أي: لا يعن بعضكم بعضا على شيء من المعاصي والظلم. (روح البيان: ۲/ ۳۶۹، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۵) ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من أهل الميت لأنه شرع في السرور لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة. =

کرکے کسی دین دار کو عہدۂ امامت سپرد کرنا چاہیے۔[۶] البتہ اگر میت کا کوئی عاقل بالغ لڑکا، یا بھائی، بھتیجہ وغیرہ کسی دن کو خاص کیے بغیر' میت کے لیے دعائے خیر کرائے، تو جائز ہے، منع نہیں، مگر کسی دن کو خاص کرنا جائز نہیں ہے۔[۷] فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۱۰] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایصال ثواب کے لیے تیار کیا گیا کھانا' مال داروں کو کھلانے کا حکم

۲۱۴-سوال: چند حضرات نے پیسے جمع کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایصال ثواب کے لیے غریبوں کو کھلانے کے واسطے کچھ رقم بھیجی ہے، تو اس رقم سے کھانا پکا کر غریبوں اور ان کے بچوں کو کھلانا کیسا ہے؟ نیز اگر کھانا بچ جائے، تو کیا مال دار اس کو کھا سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ صورت میں دن اور مہینہ طے کیے بغیر[۱] غریبوں اور ان کے بچوں کو کھلانے میں کوئی حرج نہیں، پکا کر کے بھی کھلا سکتے ہیں اور پکائے بغیر' ویسے بھی ان کو اناج اور غلہ وغیرہ دے سکتے ہیں۔[۲] لیکن

=وروى الإمام أحمد وابن ماجه بإسناد صحيح عن جرير بن عبد الله قال "كنا نعد الاجتماع إلى أهل الميت وصنعهم الطعام من النياحة". اهـ. وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع. (رد المحتار: ۲/ ۲۴۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت☆مراقي الفلاح، ص: ۲۲۳، كتاب الصلاة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۶) (والأحق بالإمامة)... (الأعلم بأحكام الصلاة) فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة. (رد المحتار على الدر المختار-ابن عابدين، محمد أمين بن عمر الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۱/ ۵۵۷، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۷) وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الإخلاص. والحاصل أن اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لأجل الأكل يكره. (حواله سابق)☆حاشية الطحطاوي علي مراقي الفلاح، ص: ۶۱۷، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۱) تقدم تخريجه عن رد المحتار وحاشية الطحطاوي تحت عنوان: کسی کے مرنے پر خاص دن میں قرآن خوانی و دعوت کرنا۔

(۲) پکائے بغیر اناج ہی دے دینا افضل ہے: كما سبق فيما تقدم في ذيل عنوان: ربیع الاول اور ربیع الآخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پیران پیر کے نام پر دعوت کرنا۔

مال دار کے لیے خود اس کھانے کو کھانا' یا دوسرے مال داروں کو کھلانا جائز نہیں ہے۔[۳] (اس لیے کہ بھیجنے والے نے یہ رقم صرف غرباء کے لیے بھیجی ہے۔) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] ایصالِ ثواب کے لیے تیار کیا گیا کھانا' امیر وغریب سب کو کھلانا

۲۱۵-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہم بعض افراد نے مل کر کچھ رقم جمع کی ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایصالِ ثواب کے لیے کچھ پکا کر مدرسہ یا ''گلشنِ معصوم'' کے بچوں یا عوام کو کھلائیں اور جو کچھ بچ جائے، اس کو لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ تو یہ درست ہے یا نہیں؟ جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

صورتِ مسئولہ میں آپ لوگوں نے جو نیت کی ہے، اس کے موافق کھلانا جائز ہے، یہ مصرفِ صدقۂ نافلہ میں شمار ہوگا، لہٰذا اس میں غریب و امیر سب کو شامل کرنا اور کھانا کھلانا درست ہے۔[۱] لہٰذا اس میں صدقۂ واجبہ کی رقم دینا درست نہیں ہے، اگر کوئی دے گا، تو اس کا واجب صدقہ ادا نہ ہوگا۔[۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۳) تقدم تخريجه: تحت عنوان متقدم.

(۱) وأما صدقة التطوع فيجوز صرفها إلى الغني؛ لأنها تجري مجرى الهبة. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع- علاء الدين، أبو بكر بن مسعود الكاساني الحنفي (م:۵۸۷هـ): ۲/ ۴۷، كتاب الزكوة، فصل الذي يرجع إلي المؤدي إليه، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الجوهرة النيرة- أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م:۸۰۰هـ): ۱/ ۱۵۸، كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقة إليه ومن لا يجوز، ط: مکتبہ حقانیہ، ملتان، پاکستان)

(۲) وكما لا يجوز صرف الزكاة إلى الغني لا يجوز صرف جميع الصدقات المفروضة والواجبة إليه... لعموم قوله تعالى {إنما الصدقات للفقراء} [-۹ التوبة: ۶۰] وقول النبي - صلى الله عليه وسلم -: لا تحل الصدقة لغني، ولأن الصدقة مال تمكن فيه الخبث لكونه غسالة الناس لحصول الطهارة لهم به من الذنوب، ولا يجوز الانتفاع بالخبيث إلا عند الحاجة والحاجة للفقير لا للغني. (بدائع الصنائع: ۲/ ۴۷، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلي المؤدي إليه، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الجوهرة النيرة: ۱/ ۱۵۸، كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقة إليه ومن لا يجوز، ط: مکتبہ حقانیہ، پاکستان)

[۱۲] مولود کے نام پر پکایا ہوا کھانا، غریب و مال دار؛ ہر ایک کو کھلانا

۲۱۶-سوال: کسی دن اور تاریخ کو خاص کیے بغیر چندہ کر کے مولود کے نام پر کھانا بنایا جائے، تو اس کا کھانا اور کھلانا کیسا ہے؟ یہ کھانا مال دار بھی کھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مولود کے نام پر جو کھانا کھلایا جاتا ہے، وہ ثواب کی نیت سے کھلایا جاتا ہے اور چندہ دینے والے بھی (غرباء کو) صدقہ اور خیرات کی نیت سے ہی چندہ دیتے ہیں، لہٰذا یہ کھانا صرف غرباء کو کھلایا جائے، مال داروں کے لیے اس کا کھانا جائز نہیں۔ (کفایت المفتی: ۱/ ۱۴۴)[1]

اور کھلانا اور کھانا بھی اسی وقت جائز ہے، جب کہ اس کے لیے کوئی مہینہ اور دن مقرر و لازم نہ کیا جائے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] جشنِ مولود کے لیے زبردستی چندہ وصول کرنا

۲۱۷-سوال: مولود کے نام پر کھانا پکانے کے لیے چندہ جمع کرنا کیسا ہے؟ جب کہ چندہ وصول کرنے میں بعضوں سے زبردستی زیادہ پیسے بھی لیے جاتے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

چندہ دینے کے لیے کسی شخص کو مجبور کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔[3] اگر زور زبردستی سے چندہ کیا گیا ہوگا، تو اس رقم سے میلاد کی محفل منعقد کرنا اور کھلانا کھانا کچھ بھی جائز نہ ہوگا۔ ہاں! اگر برضاء و رغبت سب نے

---

(۱) کفایت المفتی: ۱/ ۱۵۱، کتاب العقائد، آٹھواں باب، ط: جید برقی پریس دہلی طبع دوم: ۱۴۰۲ھ- ۱۹۸۲ء۔

(۲) عنوان: تقدم تخریجہ تحت: کسی کے مرنے پر خاص دن میں قرآن خوانی اور دعوت رکھنا۔

(۳) عن عمرو بن يثربي الضمري، قال: شهدت خطبة رسول الله صلى الله عليه وسلم بمنى، فكان فيما خطب به أن قال: "ولا يحل لامرئ من مال أخيه إلا ما طابت به نفسه". (مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۲۴/ ۲۳۹، رقم: ۱۵۴۸۸، حديث عمرو بن يثربي ☆السنن الكبرى-أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۶/ ۱۶۰، رقم: ۱۱۵۴۵، كتاب الغصب، باب: لا يملك أحد بالجناية شيئاً، ط: بيروت)

چندہ دیا ہو، تو گنجائش ہے۔[۴] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] کسی شخص کے انتقال کے تین دن یا چالیس دن کے بعد قرآن خوانی کرانا

۲۱۸-سوال: کسی شخص کے مرنے کے تین دن یا چالیس دن بعد قرآن خوانی کا نظم کیا جاتا ہے، قرآن خوانی کے بعد کچھ میٹھی چیز تقسیم کی جاتی ہے، تو کیا اس کا ثواب پڑھنے والے کو ملے گا؟ برائے مہربانی جواب باحوالہ تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔ فقط والسلام (المستفتی: محمد علی یوسف)

الجواب حامداً ومصلیاً:

انتقال کے تیسرے دن، چالیسویں دن، یا چھ مہینے کے بعد، فاتحہ اور قرآن شریف کی تلاوت کے نام سے، جو دعوت اور کھلانے پلانے کا پروگرام منعقد کیا جاتا ہے، یہ سب بدعت اور ناجائز ہے۔[۱] اس قسم کی

---

(۴) جب کہ دن، تاریخ اور مہینہ کی تعیین نہ ہو، لیکن فی زماننا احتراز اولیٰ اور احوط ہے؛ کیوں کہ اس کو واجب اور فرض کا درجہ دے دیا گیا ہے، اور اس قسم کی محفل منعقد نہ کرنے والوں اور اس میں شریک نہ ہونے والوں پر لعن وطعن کی بوچھاڑ کی جاتی ہے؛ بل کہ ان کو کافر تک کہنے سے گریز نہیں کیا جاتا ہے، جب کہ کسی امر مباح کو اس کے درجے سے بڑھا دینا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے، شارح بخاری علامہ ابن حجر عسقلانیؒ (م: ۸۵۲ھ) رقم طراز ہیں: قال ابن المنير: فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها لأن التيامن مستحب في كل شيء أي من أمور العبادة، لكن لما خشي بن مسعود أن يعتقدوا وجوبه أشار إلى كراهته. والله أعلم. (فتح الباري شرح صحيح البخاري: ۲/ ۳۳۸، كتاب الصلاة، باب الفتال و الانصراف عن اليمين، ط: دار المعرفة- بيروت)

(۱) ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من أهل الميت؛ لأنه شرع في السرور لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة: وروى الإمام أحمد وابن ماجة بإسناد صحيح عن جرير بن عبد الله قال: "كنا نعد الاجتماع إلى أهل الميت وصنعهم الطعام من النياحة". وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الإخلاص. والحاصل أن اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لأجل الأكل يكره. (رد المحتار: ۲/ ۲۴۰، باب صلاة الجنازة، مطلب في الثواب على المصيبة، ط: دار الفكر- بيروت)

(حاشية الطحطاوی على مراقی الفلاح-أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي-(م۱۲۳۱ھ)، ص: ۶۱۷، كتاب الصلاة، فصل فی حملها و دفنها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت- لبنان، الطبعة الأولى ۱۴۱۸ھ- ۱۹۹۷م)

دعوتوں میں شریک ہونا، ناجائز ہے، تفصیل کے لیے میری کتاب ''احکام میت'' (سکرات سے فاتحہ تک کی سنن وبدعات)[۱] کا مطالعہ کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۱۵] تیجہ اور چالیسواں کرنا

۲۱۹-سوال: ہمارے یہاں کسی رشتہ دار کے انتقال کے کچھ دنوں مثلاً: تین دن یا چالیس دن کے بعد قرآن خوانی رکھی جاتی ہے اور اس میں میٹھی چیز کھلائی جاتی ہے، تو کیا اس طرح قرآن خوانی سے پڑھنے والوں کو کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ اس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً

تیسرے یا چالیسویں دن یا تین یا چھ مہینے کے بعد یعنی دن اور مہینے کا التزام کر کے جو فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی کی جاتی ہے، وہ جائز نہیں نیز اس میں کھانا کھلانا بھی جائز نہیں ہے۔[۲] پس فاتحہ کے نام پر دعوت اور اس میں شرکت درست نہیں۔ مزید معلومات کے لیے میری کتاب: احکام میت [سکرات سے فاتحہ تک کی سنن وبدعات] کا مطالعہ کیجیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

۸/۲/۱۴۰۳ھ موافق: ۱۴/۱۱/۱۹۸۲ء

[۱۶] ذوالفقار علی بھٹو کے لیے ایصال ثواب کی مجلس قائم کرنا

۲۲۰-سوال: جمعہ کے دن اعلان کر کے مدرسہ میں ''ذوالفقار علی بھٹو'' کے ایصال ثواب کے لیے ختم قرآن رکھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

''ذوالفقار علی بھٹو'' مسلمان تھے، وہ مسلم ہونے کا دعویٰ بھی کرتے تھے، اور کسی مسلمان کے انتقال

---

(۱) یہ کتاب اصلاً گجراتی زبان میں تھی، اب اس کا اردو ترجمہ بنام: ''احکامِ میت- سکرات سے فاتحہ تک کی سنن وبدعات'' صاحب زادۂ محترم حافظ اسجد بیمات کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے۔

(۲) ویکره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع، ونقل الطعام إلى القبر في المواسم. (رد المحتار: ۲/ ۲۴۰، باب صلاة الجنازة، مطلب في الثوب على المصيبة، ط: دار الفكر- بيروت☆حاشية الطحطاوي: ۱/ ۶۱۷، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

پر قرآن ختم کرنا اور کرانا (جب کہ اس میں منکرات نہ ہوں) جائز ہے۔[1] آپ کے شک کی وجہ شاید یہ ہے کہ مرحوم کو مسلمانوں کے ملک میں ایک مسلمان کو قتل کرنے کی وجہ سے پھانسی دی گئی ہے، تو ان کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کیوں کر درست ہوسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں شریعت کی رو سے چند امور قابل غور ہیں:

(۱) بھٹو نے کسی کے قتل کا حکم دیا تھا، تو کیا اس پر کوئی شرعی گواہ موجود ہے؟

(۲) کیا اسلام میں پھانسی ہے؟ اسلام میں تو شرعی گواہوں کے ثبوت سے قتل کا بدلہ قتل ہے، تلوار سے گردن کاٹ لی جائے گی، پھانسی تو اسلامی سزا نہیں ہے۔

(۳) ہاں بعض جرائم میں لوگوں کی عبرت اور تشہیر کے لیے پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا جائے، تو اس کی اجازت ہے۔[2] (لیکن اس میں اخلاص اور اصلاح کی نیت ہونی چاہیے)

(۴) حقیقت یہ ہے کہ ہم دوسرے ملک میں رہتے ہیں، جس ملک کا یہ واقعہ ہے، وہاں کے ملکی، قومی، دینی اور سیاسی حالات کا ہمیں صحیح علم نہیں ہے، حق پر کون ہے؟ جنرل ضیاء یا بھٹو مرحوم؟ وہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

---

(۱) صرح علماؤنا في باب الحج عن الغير بأن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوما أو صدقة أو غيرها كذا في الهداية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۲، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة للميت وإهداء ثوابها له. ط: بيروت ☆ شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور - عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱ھ): ۱/ ۳۰۲، باب في قراءة القرآن للميت أو على القبر، ت: عبد المجيد طعمه حلبي، ط: دار المعرفة - لبنان، ۱۴۱۷ھ ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۲۹۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۲) الصلب قتلة معروفة، وهي أن يرفع المراد قتله على جذع أو شجرة أو خشبة قائمة، وتمد يداه على خشبة معترضة، وتربط رجلاه بالخشبة القائمة، ويترك عليها هكذا حتى يموت. وقد تسمر يداه ورجلاه بالخشب. وقد يقتل أولا، ويصلب بعد زهوق روحه على الخشبة للتشهير به. وكانت هذه القتلة شائعة في الأمم السابقة كالفرس والرومان ومن قبلهم. ونص القرآن على أنها كانت من فعل فرعون بأعدائه... وقد حرم الإسلام هذه القتلة لما فيها من التعذيب الشديد والمثلة والتشهير،... ويستثنى من هذا الأصل جرائم محددة جعلت عقوبتها الصلب بعد القتل لعوارض خاصة اقتضتها. (ومنها) الإفساد في الأرض. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۱۲/ ۸۵، مادة: تصليب، ط: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية - الكويت ☆ تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - فخر الدين الزيلعي: ۳/ ۲۳۷، كتاب السرقة، باب قطع الطريق، ط: المطبعة الكبرى - القاهرة)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی کی ہے کہ ایسا فتنہ پیدا ہوگا، جو بہرا، گونگا اور اندھا ہوگا۔ [۳]

اس حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ کو بہرے، گونگے اور اندھے انسان سے تشبیہ دی ہے۔ جس کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ بہرہ انسان دیکھتا ہے کہ سامنے والا بول رہا ہے، مگر وہ سنتا نہیں ہے اور جب تک انسان نہیں سنے گا، تو اس کو پوری حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی اور گونگا انسان دیکھتا ہے؛ لیکن بول نہیں سکتا، اسی طرح قیامت کے قریب فتنوں پر پردے ڈال دیے جائیں گے کہ انسان حق بات بول ہی نہ سکے، جو حق بات بولے گا، اس کے لیے جیل کی کوٹھری مقدر ہوگی یا کوئی اور سزا، ان حالات میں انسان حق بات کیوں کر بول پائے گا؟ اسی طرح فتنہ اندھا ہوگا، اور اندھا انسان نہ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی کسی اجنبی کو پہچان سکتا ہے، تو فتنہ کے زمانہ میں باتیں پھیلیں گی، افواہیں اڑیں گی، خوب پروپیگنڈہ وشہرت ہوگی؛ لیکن فتنہ کی لگام جن کے ہاتھ میں ہوگی، وہ نظر نہیں آئیں گے؛ اسی لیے آج دنیا میں گروپ بندی، تفرقہ بازی اور ایک دوسرے پر بہتان تراشی ہوتی ہے اور دیکھنے اور کافی غور وخوض کے بعد بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اصل مجرم کون ہے؟

لہٰذا مذکورہ فتنہ کی تہہ میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جو مر گیا اس کو برا نہ کہو، اس نے جو کیا ہوگا، اس کا بدلہ اسے مل جائے گا۔ (بخاری) [۴] لہٰذا مذکورہ صورت میں بنا بحث کیے کہ

---

(۳) عن أبي هريرة، أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قال: ستكون فتنة صماء، بكماء، عمياء، من أشرف لها استشرفت له، وإشراف اللسان فيها كوقوع السيف. (سنن أبي داؤد: ۲/ ۵۸۶، رقم الحديث: ۴۲۶۴، كتاب الفتن والملاحم، باب في كف اللسان، ط: فيصل پبليكيشنز، ديوبند)

عن أبي هريرة، ذكر النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه كان يقول: "ويل للعرب من شر قد اقترب من فتنة عمياء صماء بكماء، القاعد فيها خير من القائم، والقائم فيها خير من الماشي، والماشي فيها خير من الساعي، ويل للساعي فيها من الله يوم القيامة. (صحيح ابن حبان: ۱۵/ ۹۸، رقم الحديث: ۶۷۰۵، كتاب التاريخ، باب أخباره - صلى الله عليه وسلم - عما يكون في أمته من الفتن والحوادث، ذكر البيان بأن الفتن.. الخ، ت: شعيب الأرنؤوط، ط: مؤسسة الرسالة، الطبعة الثانية: ۱۴۱۴ھ - ۱۹۹۳ء)

(۴) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: قال النبي - صلى الله عليه وسلم -: «لا تسبوا الأموات، فإنهم قد أفضوا إلى ما قدموا. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۸۷، رقم الحديث: ۱۳۹۳، كتاب الجنائز، باب: ما ينهى من سب الأموات، ط: فيصل پبليكيشنز، ديوبند☆ سنن النسائي: ۱/ ۲۱۳، رقم الحديث: ۱۹۳۶، كتاب الجنائز، باب النهي عن سب الأموات، ط: فيصل پبليكيشنز، ديوبند☆ صحيح ابن حبان: ۷/ ۲۹۱، رقم الحديث: ۳۰۲۱، كتاب الجنائز، فصل في الموت وما يتعلق به، ذكر بعض العلة التي من أجلها.. الخ، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت)

گنہ گار کون ہے اور اس واقعہ کی حقیقت کیا ہے اور ختم پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جس طرح ایک مسلمان کے ایصال ثواب کے لیے ختم قران کرنا اور کرانا جائز ہے، اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو کے لیے بھی جائز ہے۔

(۶) قبر میں مذکور چیزوں کا سوال نہ ہوگا، لہٰذا ایک بے کار چیز میں بحث ومباحثہ کر کے اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہیے، قبر میں فقط تین سوال ہوں گے، ان کی تیاری کرنی چاہیے، آخرت میں جو کام فائدے کے ہیں، ان کی تیاری ضروری ہے۔(۵) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] چودہویں صدی ختم ہونے پر مرحومین کے لیے ایصال ثواب کا پروگرام

۲۲۱-سوال: ہمارے یہاں کوسمبا میں ۱۴۰۰ھ آنے پر (یعنی چودہویں صدی کے اختتام پر) تمام مسلمان مرحومین کے لیے نیاز کا پروگرام رکھنے کا ارادہ ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے موقع پر اس طرح ایصال ثواب کا پروگرام رکھنا شرعی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

دن اور تاریخ کے التزام کے بغیر مرحومین کے ایصال ثواب کے لیے کوئی نیک کام کیا جائے، یا قرآن شریف ختم کیا جائے، تو اس کی گنجائش ہے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۵) قال: فتعاد روحه في جسده، فيأتيه ملكان، فيجلسانه، فيقولان له: من ربك؟ فيقول: ربي الله، فيقولان له: ما دينك؟ فيقول: ديني الإسلام، فيقولان له: ما هذا الرجل الذي بعث فيكم؟ فيقول: هو رسول الله صلى الله عليه وسلم الحديث (مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۵۰۰/۳۰، رقم الحديث: ۱۸۵۳۴، حديث البراء ابن عازب، ت: شعيب الأرنؤوط وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة بيروت☆مصنف ابن شيبة: ۳۶۸/۷، رقم الحديث: ۱۲۱۸۵، كتاب الجنائز، باب: في نفس المؤمن كيف تخرج ونفس الكافر، ت: محمد عوامة، ط: شركة دار القبلة، الطبعة الأولى)

(۱) دن اور تاریخ طے کر کے ایصال ثواب کرنا بدعت ہے، چناں چہ علامہ شامی رقم طراز ہیں: ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من أهل الميت، لأنه شرع في السرور لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة: وروى الإمام أحمد وابن ماجه بإسناد صحيح عن جرير بن عبد الله قال: كنا نعد الاجتماع إلى أهل الميت وصنعهم الطعام من النياحة. اهـ. وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع. (رد المحتار: ۲۴۰/۲، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت☆مراقي الفلاح، ص: ۲۲۸، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ط: المكتبة العصرية، بيروت)

بریلوی حضرات کے پیشوا مولانا احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں: میت کے پہلے یا تیسرے دن یا ہفتے کے بعد جو کھانے =

[۱۸] پندرہویں صدی ہجری کے استقبال میں پروگرام رکھنا

۲۲۲-سوال: (۱) اسلامی تاریخ کے حساب سے ''چودہویں صدی ہجری'' ختم ہو رہی ہے، اس موقع پر گاؤں کے کچھ حضرات کا ارادہ ہے کہ لوگوں سے بہ طور چندہ 'صرف ''للہ رقم'' جمع کر کے' کھانے کی عام دعوت کریں، جس میں غریب اور مال دار بھی حضرات شریک ہوں، ساتھ میں قرآن خوانی کا بھی پروگرام ہو اور اب تک جتنے مسلم حضرات انتقال کر گئے ہیں، ان کو ایصال ثواب کیا جائے، تو اس طرح کا پروگرام رکھنا شرعی نقطہ سے جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اخبار کے توسط سے معلوم ہوا ہے کہ بہت سے اسلامی ممالک اور خود ہندوستان' چودہویں صدی ہجری کے الوداع اور پندرہویں صدی کے استقبال کی مناسبت سے پروگرام رکھنے والے ہیں، یعنی حکومتی سطح پر الوداع واستقبال کا پروگرام منایا جائے گا، تو اس سلسلہ میں شریعتِ اسلامی کا کیا نظریہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱-۲) اسلام میں نفل نماز، خیر خیرات، اور کھانے وغیرہ کی دعوت کے سلسلے میں کسی مخصوص دن اور تاریخ کو مقرر نہیں کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لیے کسی پر زور وزبردستی کیے بغیر[۱] پیسہ جمع کر کے جب چاہیں' کھانے وغیرہ کی دعوت کر سکتے ہیں، اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے، چودہ سو سال کے مرحومین کے ایصال ثواب کے لیے بھی کوئی دن مقرر نہیں ہے، یہ کام تو آج ہی کرنا چاہیے، ابھی تو چودہویں صدی ختم ہونے میں گیارہ مہینے اور ستائیس دن باقی ہیں، اس نیک کام میں اتنا انتظار کیوں؟ مرحومین تو ایصال ثواب اور دعاؤں کے ہر وقت محتاج ہیں، ان کے لیے کسی دن کو خاص کرنے کا کیا معنیٰ؟[۲]

= تیار کیے جاتے ہیں، سب مکروہ وممنوع ہیں، مزید لکھتے ہیں کہ اس دعوت کا کھانا بھی ممنوع ہے۔ (جلی الصوت، ص: ۳)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اما ایں اجتماع مخصوص روز سوم وارتکاب تکلفات دیگر وصرف اموال بے وصیت از حق یتامیٰ بدعت است وحرام۔ (سفر السعادۃ: ۲۷۳)

(۱) کسی سے زبردستی چندہ وصول کرنا جائز نہیں ہے اور اس طرح حاصل کیا ہوا مال حلال نہیں ہوگا: عن عمرو بن يثربي الضمري، قال: شهدت خطبة رسول الله صلى الله عليه وسلم بمنى، فكان فيما خطب به أن قال: " ولا يحل لامرئ من مال أخيه إلا ما طابت به نفسه ". (مسند الإمام احمد بن حنبل: ۲۳۹/۲۴، رقم: ۱۵۴۸۸، حديث عمرو بن يثربي☆السنن الكبرى أبو بكر البيهقي: ۱۹۰/۶، رقم: ۱۱۵۲۵، كتاب الغصب، باب: لا يملك أحد بالجناية شيئاً، ط: بيروت)

(۲) وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع... واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن =

اگر یہ منظور نہیں ہے اور اسی دن پروگرام رکھنا ہے، تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ صرف ریاکاری یعنی دکھاوا اور شہرت کے لیے ہے، اس میں اخلاص نہیں ہے۔ [۱] اور اللہ تعالیٰ ایسے کام کو پسند نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی اس پر کوئی ثواب ملے گا۔ اور کسی ملک؛ حتی کہ اسلامی ملک کا عمل بھی اس سلسلہ میں حجت نہیں ہے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] عید میلاد پر ایک واقعہ سے استدلال

۲۲۳-سوال: چند دن پہلے ایک عالم صاحب کے بیان میں یہ بات سنی کہ ابولہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی خبر دینے والی باندی کو آزاد کر دیا تھا اور چوں کہ اس نے آزاد کرتے وقت شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا تھا؛ اس لیے جہنم میں ہر پیر کو- جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا دن ہے- اس کی وہ انگلی برف کے مانند ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور وہ اس انگلی کو چوس کر پورے بدن میں ٹھنڈک حاصل کرتا ہے۔ [۳]

= وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الإخلاص .... وأطال في ذالك في المعراج، وقال: وهذه الأفعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها لأنهم لا يريدون بها وجه الله تعالى. (رد المحتار: ۲/ ۲۴۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت ☆ مراقي الفلاح ص: ۲۲۸، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ط: المكتبة العصرية، بيروت)

(۱) عن محمود بن لبيد، أن رسول الله- صلى الله عليه وسلم- قال: "إن أخوف ما أخاف عليكم الشرك الأصغر" قالوا: وما الشرك الأصغر يا رسول الله؟ قال: "الرياء، يقول الله- عز وجل- لهم يوم القيامة: إذا جزي الناس بأعمالهم: اذهبوا إلى الذين كنتم تراءون في الدنيا فانظروا هل تجدون عندهم جزاء. (مسند أحمد بن حنبل: ۳۹/ ۳۹، رقم الحديث: ۲۳۶۳۰، مسند محمود بن لبيد رضي الله عنه، ط: مؤسسة الرسالة)

(۲) بل کہ مسلمانوں کے لیے اللہ کی کتاب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت حجت ہے: مالك، أنه بلغه أن رسول الله- صلى الله عليه وسلم- قال: تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما: كتاب الله وسنة نبيه. (موطأ الإمام مالك: ۳۶۳، رقم الحديث: ۸/ ۶۷۸، ۳۳۳۸، كتاب القدر، باب النهي عن القول بالقدر، ط: مكتبة ملت- ديوبند)

قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم -: عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدي، عضوا عليها بالنواجذ. (شرح مشكل الآثار: ۳/ ۲۲۳، رقم الحديث: ۱۱۸۶، باب بيان مشكل ما روي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الزمان الذي يجب على الناس... الخ، ت: شعيب الأرنؤوط، ط: مؤسسة الرسالة)

(۳) قال عروة: وثويبة مولاة لأبي لهب: كان أبو لهب أعتقها، فأرضعت النبي -صلى الله عليه وسلم-، فلما مات أبو لهب، أريه بعض أهله بشر حيبة، قال له: ماذا لقيت؟ قال أبو لهب: لم ألق بعدكم غير أني سقيت في هذه بعتاقتي ثويبة. (صحيح البخاري: ۲/ ۷۶۴، رقم الحديث: ۵۱۰۱، كتاب النكاح، باب وأمهاتكم اللاتي أرضعنكم)

قال السهيلي: وفي رواية غيره (اي غير الأصيلي والمذكور هو رواية الأصيلي) قال: ما لقيت بعدكم راحة غير أني=

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد اس عالم صاحب نے یہ سمجھایا کہ جب ابولہب جیسے شخص کو حضور ﷺ کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کرنے کی وجہ سے اس عظیم اعزاز سے نوازا گیا، تو کیا ہم اس سے بھی گئے گذرے ہیں کہ آپ ﷺ کی پیدائش پر کچھ بھی خوشی کا اظہار نہ کریں، پھر حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا معمول بیان کیا کہ وہ ہر سال میلاد کے موقع پر زردہ پلاؤ بنا کر غرباء کو کھلاتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ کھانا حضور ﷺ کی پیدائش کی خوشی میں کھلاتا ہوں۔

ان دونوں واقعات کو بیان کر کے ہم لوگوں سے کہا: ہمیں بھی حضور ﷺ کی پیدائش کے دن لوگوں کو کھانا کھلانا چاہیے اور خوشی کا اظہار کرنا چاہیے، نہیں تو کم از کم وعظ ونصیحت کا جلسہ رکھ کر دودھ اور نان کھٹائی تقسیم کرنی ہی چاہیے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس سلسلے میں فقہاء امت کیا فرماتے ہیں؟ تفصیل کے ساتھ مدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

رسول اللہ ﷺ کے یوم ولادت پر نام ونمود اور ریاء وشہرت کے بغیر وعظ کی محفل منعقد کرنا، جب کہ اس میں حرام امور اور رسم ورواج کا ارتکاب نہ ہو، جائز ہے۔ [1] زردہ، پلاؤ اور دودھ ونان کھٹائی وغیرہ کا بھی تقسیم کرنا' جب کہ استطاعت کے موافق ہو اور کوئی امر قبیح نہ ہو، درست ہے؛ لیکن استطاعت سے زیادہ

=سقيت في مثل هذه، وأشار إلى النقرة بين السبابة والإبهام بعتقي ثويبة، وفي غير البخاري أن الذي رآه من أهله هو أخوه العباس، قال: مكثت حولا بعد موت أبي لهب لا أراه في نوم، ثم رأيته في شر حال، فقال: ما لقيت بعدكم راحة إلا أن العذاب يخفف عني كل يوم اثنين، وذلك أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - ولد يوم الاثنين، وكانت ثويبة قد بشرته بمولده، فقالت له: أشعرت أن آمنة ولدت غلاما لأخيك عبد الله؟ فقال لها: اذهبي، فأنت حرة فنفعه ذلك وهو في النار. (الروض الأنف في تفسير سيرة النبوية لابن هشام-أبو القاسم عبد الرحمن السهيلي (م: ۵۸۱هـ): ۹۸/۳-۹۹، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس-حسين بن محمد بن الحسن الدِيار بكري (م:۹۶۶هـ): ۲۲۲/۱، ذكر ارضاع الاظآر وعددها وما وقع عند حليمة، ط: دار صادر - بيروت ☆ نهاية الإيجاز في سيرة ساكن الحجاز -رفاعة رافع بن بدوي بن علي الطهطاوي (م:۱۲۹۰هـ)، ص:۴۸، ط: دار الذخائر -القاهرة)

(۱) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ذکر ولادت شریف نبوی -صلی اللہ علیہ وسلم- مثل دیگر اذکار خیر کے ثواب اور افضل ہے۔ اگر بدعات وقبائح سے خالی ہو، اس سے بہتر کیا ہے، البتہ جیسے ہمارے زمانے میں قیودات وشنائع کے ساتھ مروج ہے، اس طرح بے شک بدعت ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۲۴۹/۵، کتاب البدعات، محفل مولود شریف، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند)

کی کوشش کرنا، یہاں تک کہ اس کے لیے سودی قرض لینا بالکل جائز نہیں، حرام ہے۔ (۲)

حاصل یہ کہ شرعی حدود میں رہ کر مجلس مولود منعقد کرنا اور استطاعت کے موافق غرباء و مساکین اور ضرورت مندوں کو کھلانا پلانا جائز ہے، لیکن اگر ان چیزوں کو شرعی حد سے تجاوز کر کے کیا جائے، تو اجازت نہیں ہوگی۔ کسی مباح اور مستحب چیز کو "ضروری سمجھنا" بھی حد سے تجاوز کرنا ہے، مجلس مولود کو عوام لازم اور فرض و واجب سمجھتی ہے اور اس کے منعقد نہ کرنے اور اس میں شریک نہ ہونے والوں کو تنقید کا نشانہ بناتی ہے؛ اس لیے علماء اس سے منع کرتے ہیں۔ (۳) نیز بہ کثرت یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس کے انتظام و انصرام میں نمازوں کا ترک کرنا یا قضا ہونا بھی پایا جاتا ہے۔ (۴)

---

(۲) بلا ضرورت قرض لینا شریعت میں ناپسندیدہ ہے؛ بل کہ ایک روایت کے مطابق کفر کے برابر ہے: عن أبي سعيد يقول: سمعت رسول الله -صلي الله عليه وسلم- يقول: أعوذ بالله من الكفر والدين. قال رجل: يارسول الله؟ أتعدل الدين بالكفر فقال رسول الله صلي الله عليه وسلم: نعم. (سنن النسائي، ص: ۲۶۸، رقم الحدیث: ۵۴۷۳ و ۵۴۷۴، كتاب الإستعاذة، باب الاستعاذة من الدين، ط: مكتبة البدر، ديوبند)

اسی طرح سودی لین دین کرنے والوں پر نبی کریم ﷺ نے لعنت بھیجی ہے: عن جابر قال: لعن رسول الله- صلى الله عليه وسلم- آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (صحيح مسلم: ۲/۲۷، رقم الحدیث: ۱۰۶-(۱۵۹۸)، کتاب البیوع، باب الربا، ط: مکتبۃ البدر، دیوبند)

(۳) عن الأسود، قال: قال عبد الله: لا يجعل أحدكم للشيطان شيئا من صلاته يرى أن حقا عليه أن لا ينصرف إلا عن يمينه، لقد رأيت النبي -صلى الله عليه وسلم- كثيرا ينصرف عن يساره. (صحيح البخاري: ۱/۱۱۸، رقم الحديث: ۸۵۲، باب الانفتال والانصراف عن اليمين والشمال، كتاب الآذان)

قال ابن حجر في شرح هذا الحديث:: قال ابن المنير: فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها؛ لأن التيامن مستحب في كل شيء أي من أمور العبادة؛ لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه أشار إلى كراهته. والله أعلم. (فتح الباري (م: ۸۵۲هـ): ۲/۴۳۰، كتاب الآذان، باب الانفتال والإنصراف على اليمين والشمال، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

قال الطيبي: وفيه أن من أصر على أمر مندوب، وجعله عزما، ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال فكيف من أصر على بدعة أو منكر؟ وجاء في حديث ابن مسعود: "إن الله - عز وجل - يحب أن تؤتى رخصه كما يحب أن تؤتى عزائمه" اهـ. (مرقاة المفاتيح: ۳/۲۶، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، في ذيل رقم الحديث: ۹۴۶، الفصل الأول، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

(۴) اور ترک صلاۃ اور قضاء دونوں ہی صلاۃ بڑا گناہ ہے: عن جابر، قال: قال رسول الله- صلى الله عليه وسلم-: بين العبد، وبين الكفر ترك الصلاة. عن بريدة قال: قال رسول الله- صلى الله عليه وسلم-: العهد الذي بيننا وبينهم الصلاة، فمن تركها فقد كفر. (سنن ابن ماجة، ص: ۷۵، كتاب إقامة الصلاة، والسنة فيها، باب ماجاء فيمن ترك الصلاة، رقم=

پھر زردہ، پلاؤ غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کو تو کھلانے میں ثواب ہے، مال داروں کو کھلانے میں کون سا ثواب ہے؟(۵) انہی سب امور کی وجہ سے مفتیان کرام اسے ممنوع قرار دیتے ہیں؛ لیکن اگر دائرۂ حدود میں ہو، تو اس کی اجازت ہے؛ بل کہ وعظ و نصیحت اور سیرت وشمائل کی محفل قائم کرنا تو ثواب کا کام ہے اور آج دنیا اس کی پیاسی ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اخلاق کا بیان کرنا بھی بے حد ضروری ہے، تا کہ لوگ اسے سن کر ہدایت حاصل کریں اور اپنی زندگی کو سنواریں، اسی طرح یتیموں اور غریبوں کی امداد کرنا بھی نہایت ضروری اور اہم ہے، ان کے گھر میں جو حق دار ہیں، انہیں کھانا وغیرہ پہنچائیں اور اس طرح خرچ کریں کہ اپنے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔(۶) مذکورہ تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر دن اور تاریخ طے کیے بغیر شرعی حدود میں رہ کر کیا جائے، تو جائز؛ بل کہ مستحب ہے؛ لیکن عموماً شرعی حدود و خطوط کا خیال نہیں رکھا جاتا؛ اس لیے لوگوں کو اس سے منع کیا جاتا ہے۔(۷) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] ختم قرآن کا مروجہ طریقہ اور اس کے بعد تقسیم کردہ چیز کا حکم

۲۲۴-سوال: عام طور پر اکثر دیہاتوں میں ایصال ثواب کے لیے ''ختم قرآن کریم'' کی

=الحديث: ۸۰۷۸-۱۰۷۹، ط: البدر-دیوبند☆سنن أبي داؤد، ص: ۶۴۳، رقم الحديث: ۴۶۷۸، باب في رد الإرجاء، كتاب السنة، ط: البدر-دیوبند ☆سنن الترمذي، ۹۰/۲، رقم الحديث: ۲۶۲۰، باب ما جاء في ترك الصلاة، أبواب الإيمان، ط: البدر-دیوبند)

(۵) یعنی مذکورہ چیزیں کھلانا اگر بہ طور نفل ہو، تو مال داروں کو بھی کھلا سکتے ہیں، مگر اس میں غریبوں کو کھلانے جیسا ثواب نہ ملے گا: وأما صدقة التطوع فيجوز صرفها إلى الغني؛ لأنها تجري مجرى الهبة. (بدائع الصنائع: ۴۸/۲، كتاب الزكوة، فصل الذي يرجع إلى المؤدي إليه، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۶) عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: " سبعة يظلهم الله تعالى في ظله يوم لا ظل إلا ظله: إمام عدل، وشاب نشأ في عبادة الله... ورجل تصدق بصدقة فأخفاها حتى لا تعلم شماله ما تنفق يمينه ". (صحيح البخاري: ۱۹۱/۱، رقم الحديث: ۱۴۲۳، كتاب الزكاة، باب الصدقة باليمين، ط: مكتبة البدر، ديوبند ☆صحيح مسلم: ۳۳۱/۱، رقم الحديث: ۹۱-(۱۰۳۱)، كتاب الزكاة، باب فضل اخفاء الصدقة، ط: مكتبة البدر-ديوبند)

(۷) نوٹ: أجاب الشيخ التهانوي الاستدلال بالحديث المذكور على الميلاد النبوي المعهود قائلاً: جواب اس کا بھی ظاہر ہے کہ ہم نفس فرحت کے منکر نہیں ہیں؛ بل کہ اس پر ہر وقت عامل ہیں، گفتگو تو اس ہیئت کذائیہ میں ہے۔ (أشرف الجواب: ۱۳۳/۲، اہل بدعت کے شبہات کے جوابات، ط: دار الکتاب، دیوبند)

صورت یہ ہوتی ہے کہ پہلے تو لوگوں کی اطلاع کے لیے مسجد میں بلیک بورڈ پر اعلان لکھ دیا جاتا ہے، اس کے بعد مغرب یا عشاء کی نماز میں بھی ایک شخص زبانی اعلان کرتا ہے، پھر مسجد میں ختم قرآن کے بعد چائے، دودھ یا اور کوئی شیرینی تقسیم کی جاتی ہے، اور مذکور اشیاء کا تقسیم کرنا ایک عام رواج بن گیا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح سے ''ختم قرآن'' کرنا شرعاً کیسا ہے؟ نیز ختم کے بعد تقسیم کی گئی مٹھائی کے کھانے کا کیا حکم ہے؟ اور ایصال ثواب کا بہتر طریقہ کیا ہے؟

مستفتی: یعقوب اسماعیل، کراچی
۲۵/۳/۱۹۷۵ء

الجواب حامداومصلیا:

ایصال ثواب کے لیے ختم قرآن کی اولاً اطلاع دینا' تاکہ عوام، حفاظ اور علمائے کرام؛ سب جمع ہوکر مرحوم کو ایصال ثواب کریں، دن اور تاریخ کے التزام کے بغیر جائز ہے۔ (۱) اسی طریقے سے ضروری سمجھے بغیر مرحوم کا کوئی بالغ وارث اپنی کمائی کے مال سے شیرینی کا انتظام کرے، تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ مگر موجودہ دور میں رسوم ورواج نے جگہ پکڑلی ہے، اس لیے اس سے منع کیا جاتا ہے، پھر ایصال ثواب کے لیے تیسرے دن کا انتظار کرنا (گویا خاص دن وغیرہ کو لازم سمجھنا) [۲] شیرینی کا التزام (۳) اور نابالغ ورثاء کے ہوتے ہوئے

---

(۱) فللإنسان أن يجعل ثواب عمله بغيره عند أهل السنة والجماعة صلاة، أو صوما، أو حجا، أو صدقة، أو قراءة قرآن، أو الأذكار، أو غير ذلك من أنواع البر، ويصل ذلك إلى الميت وينفعه. (مراقي الفلاح،ص:۲۲۹، فصل في زيارة القبور،ط: المكتبة العصرية☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، مطلب في زيارة القبور،ط: دار الفكر بيروت)

(۲) ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الإخلاص... وأطال في ذلك في المعراج. وقال: وهذه الأفعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها لأنهم لا يريدون بها وجه الله تعالى. (رد المحتار: ۲/ ۲۴۰-۲۴۱، باب الجنائز، مطلب في الثواب على المصيبة،ط: دار الفكر-بيروت)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: سوم ودہم وچہلم وغیرہ ہمہ بدعات وماخوذ از کفار ہنود است۔ (امداد الفتاویٰ: ۵/ ۲۶۰، کتاب البدعات، فاتحہ رسمی، ط: دارہ تالیفات اولیاء دیوبند)

(۳) چوں کہ شیرینی کی تقسیم اس رسم کا لازمی جزء ہے اور لوگوں کے درمیان مشہور ہے؛ لہٰذا ''المعروف کالمشروط'' کے تحت یہ پڑھنے کی اجرت ہوگی، جو ناجائز ہے:

قال ابن عابدين: ولا معنى أيضا لصلة القاري؛ لأن ذلك يشبه استئجاره على قراءة القرآن، وذلك باطل، ولم يفعل ذلك أحد من الخلفاء. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۵۷، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على المعاصي،ط: دار الفكر-بيروت)

بالغ ورثاء یا بیوہ کا بے دریغ اسراف کرنا؛ اوراس جیسی بہت سی خرابی پائی جاتی ہے۔[۴] ان وجوہات کی بناء پر یہ بدعت اور ناجائز ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ
۱۹۷۵/۱۲/۲۵

[۲۱] میت کے لیے ایصال ثواب کا حکم

۲۲۵-سوال: یہاں عرب سے کچھ حضرات آکر یہ تبلیغ کرتے ہیں کہ میت کو ایصال ثواب کرنا لاحاصل ہے، اس سے میت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے، کیا ایسے لوگ گمراہ ہیں؟

(غلام محمد جسات)

الجواب حامداومصلیا:

کوئی انسان اپنے نیک عمل کا ثواب میت کو پہنچا سکتا ہے یا نہیں؟ فرقۂ معتزلہ (جو ایک گمراہ فرقہ ہے) اس کا منکر ہے، جب کہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ بدنی عبادت، مثلا: تلاوت قرآن اور حمد وثنا کا ثواب میت کو نہیں پہنچایا جا سکتا ہے، البتہ مالی عبادت مثلا: صدقات وخیرات اور حج وغیرہ کا ایصال ثواب کیا جا سکتا ہے۔[۱] حنفی اور حنبلی مذہب کے مطابق بدنی اور مالی ہر طرح کی عبادت کا ایصال ثواب کیا جا سکتا ہے۔[۲]

عرب شیوخ اگر مالکی اور شافعی مذہب کے ہوں، تو انہیں گمراہ نہیں کہا جا سکتا، وہ اہل سنت والجماعت کا اٹوٹ حصہ ہیں، البتہ اس مسئلے میں ان کا مسلک، حنفی مسلک سے مختلف ہے۔ اس لیے ان کو گمراہ کہنا جائز نہیں۔ (شامی: ۱/ عمدۃ القاری: ۶/ ۱۱۸) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

---

(۴) قال اللہ تعالی: ﴿وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ﴾ . (-۴النساء: ۲) وقال تعالی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا﴾. (-۴النساء: ۱۰)

(۱) قال في الدر: الأصل: أن كل من أتى بعبادة ما، له جعل ثوابها لغيره. قال ابن عابدين في شرحه: (قوله له جعل ثوابها لغيره) أي خلافا للمعتزلة في كل العبادات، ولمالك والشافعي في العبادات البدنية المحضة كالصلاة، والتلاوة، فلا يقولان بوصولها بخلاف غيرها كالصدقة والحج. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۹۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر بيروت-لبنان)

(۲) فللإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره عند أهل السنة والجماعة، صلاة، أو صوما أو حجا أو صدقة أو قراءة قرآن أو الأذكار أو غير ذلك من أنواع البر يصل ذلك إلى الميت وينفعه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، =

[۲۲] بعد نماز فاتحہ خوانی جائز ہے یا ناجائز؟

۲۲۶-سوال: میں اپنے گاؤں میں نماز پڑھاتا ہوں؛ مقتدی حضرات بدعتی خیال کے ہیں؛ اس لیے فاتحہ پڑھنا پڑتا ہے؛ لیکن یہ کام (فاتحہ خوانی) میں دل سے نہیں کرتا ہوں، اگر فاتحہ نہ پڑھوں، تو لوگوں کے ساتھ مل جل کر کام نہیں کرسکتا، تو کیا اس عمل کی وجہ سے میں گنہ گار رہوں گا؟

(جی ایچ ایم ملاں لاجپڈ یا سابر کانٹھا)

الجواب حامداو مصليا:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بدعت کے کام حرام ہیں۔ (۱) البتہ آپ' لوگوں کے ساتھ میل ملاپ رکھ کر 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' کا فریضہ انجام دیتے رہیں، اللہ رب العزت کی ذات سے امید ہے کہ پانچ، چھ مہینے میں آپ کی یہ محنت اور کوشش بارآور ثابت ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ (۲)

حضرت مولانا سید مفتی مہدی حسن صاحبؒ اس صورت حال کے تعلق سے فرمایا کرتے تھے کہ بدعت کا ماحول دیکھ کر اور بدعت کہہ کر آپ اپنی ملازمت اور خدمت چھوڑ کر چلے جائیں گے، تو دین کا کام

=مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر بيروت)

وفي كلام القاضي: إذا جاز أن تقع أفعاله التي فعلها بنفسه عن غيره وهو الحج والصدقة، جاز أن يقع الثواب لغيره؛ لأن الثواب تبع للفعل، فإذا جاز أن يقع المتبوع لغيره، جاز أن يقع التبع. (النكت والفوائد السنية على مشكل المحرر - برهان الدين ابن مفلح من قضاة الحنابلة: ١٠/ ٢١٠، الصلاة على الميت، ط: مكتبة المعارف، الرياض ☆ عمدة القاري: ٩/ ١٢٦، باب وجوب الحج وفضله، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(١) فإن كل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة. (سنن أبي داود: ٢/ ٦٣٥، رقم الحديث: ٤٦٠٧، باب لزوم السنة، عن العرباض رضي الله تعالى عنه، ط: المكتبة الأشرفية - ديوبند)

(٢) قال القسطلاني: وفيه دليل على ارتكاب أيسر الضررين دفعا لأكبرهما؛ لأن قصور البيت أيسر من افتتان طائفة من المسلمين ورجوعهم عن دينهم... وقال الحافظ: وفيه من الفوائد... وفيه تقديم الأهم فالأهم، من دفع المفسدة وجلب المصلحة، وأنهما إذا تعارضا بدئ بدفع المفسدة. (أوجز المسالك إلى موطا الإمام مالك: ٧/ ٣٣٦ - ٣٣٧، كتاب الحج، ماجاء في بناء الكعبة، رقم الحديث: ٧٩٦، ت: د: تقي الدين الندوي، ط: دار القلم - دمشق: وانظر للتفصيل، فتح الباري - ابن حجر العسقلاني: ٣/ ٤٤٨، باب فضل مكة وبنيانها، الخ، ط: دار المعرفة، بيروت)

کس طرح ہوگا؟[1] اس لیے آپ مذکورہ کام کے بدعت ہونے کے متعلق لوگوں کو سمجھاتے رہیں، نصیحت کرتے رہیں اور اپنی محنت بھی جاری رکھیں، ان شاء اللہ کامیابی ملے گی اور آپ گنہ گار بھی نہیں ہوں گے؛ لیکن اس کے لیے محنت شرط ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ
۲۸/۱۱/۱۹۷۶ء

[۲۳] ایصال ثواب کے بعد کھانے کی دعوت کا شرعی حکم

۲۲۷-سوال: مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے کوئی شخص اپنے گھر میں محلے کے لوگوں کو اور اپنے رشتے داروں کو جمع کرے اور قرآن مجید ختم کروا کر دعوت کا پروگرام رکھے، تو یہ کھلانا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

دن اور تاریخ کے التزام کے بغیر[2] اگر کسی کے ایصال ثواب کے لیے قرآن مجید ختم کروایا جائے، تو جائز ہے۔[3] مرحومین کو اس کا ثواب پہنچ جائے گا، البتہ عورتوں کا بغیر پردے کے آنا اور نامحرم کے ساتھ بات چیت کرنا حرام ہے۔[4] جب آپ ایصال ثواب کے لیے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی بلائیں گے، تو ان حرام اور ناجائز امور کا ارتکاب ہوگا؛ اس لیے ایصال ثواب کے لیے اس طرح کی مجلس کا منعقد

---

(۱) حضرت مفتی مہدی حسن رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی اس عبارت سے استدلال کیا جا سکتا ہے: وفيه تقديم الأهم فالأهم، من دفع المفسدة وجلب المصلحة، وأنهما إذا تعارضا بدئ بدفع المفسدة. (حوالہ سابق)

(۲) وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع... واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الإخلاص. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۰، كتاب الجنائز، مطلب في الثوب على المصيبة، ط: دار الفكر-بيروت☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۶۱۷، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۳) فللإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره عند أهل السنة والجماعة سواء كان المجعول له حيا أو ميتا من غير أن ينقص من أجره شيء. (حاشية الطحطاوي، ص: ۶۲۲، كتاب الجنائز، فصل في زيارة القبور☆ رد المحتار: ۲/ ۲۴۳، باب صلاة الجنائز، مطلب في زيارة القبور☆ الهداية: ۱/ ۲۷۶، كتاب الحج، باب الحج في الغير، ط: مكتبة الاتحاد-ديوبند)

(۴) عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: «المرأة عورة، فإذا خرجت استشرفها الشيطان». (سنن الترمذي: ۱/ ۲۲۲، رقم الحديث: ۱۱۷۳، أبواب الرضاع، قبيل أبواب الطلاق واللعان، ط: ياسر نديم، ديوبند)

کرنا جائز نہیں ہے۔ [1] البتہ آپ اپنے رشتہ داروں کی عورتوں ہی کو دعوت دیں اور ہر طرح کے تمام حرام کاموں سے بچنے کا اہتمام کریں، تو اجازت ہے؛ لیکن عموماً اس کا خیال نہیں رکھا جاتا؛ اس لیے اس سے اجتناب ہی بہتر ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ)
۱۰/۱۲/۱۹۷۶ء

[۲۴] عید الاضحیٰ کے دنوں میں فاتحہ دینے کا شرعی حکم

۲۲۸-سوال: عید الاضحیٰ کے دنوں میں کس کو فاتحہ دینا چاہیے اور فاتحہ دینے میں کوئی حرج ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

روزانہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر مرحومین کو ایصال ثواب کرنا جائز ہے۔ [2] البتہ کسی مخصوص دن اور تاریخ کا التزام کرنا اور اس کو ضروری سمجھنا ناجائز اور حرام ہے۔ [3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] تیجہ اور چالیسواں کا شرعی حکم

۲۲۹-سوال: تیجہ اور چالیسواں کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

مرنے والے پر کسی دن کی تعیین کیے بغیر اگر کوئی شخص اپنی حلال کمائی سے فی سبیل اللہ غریبوں

---

(۱) لأن الأصل أن سبب الحرام حرام. (فتح القدير - ابن الهمام: ۱۰/ ۴۷، كتاب الكراهية، فصل في الاستبراء وغيره، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) فللإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره عند أهل السنة والجماعة سواء كان المجعول له حيا أو ميتا من غير أن ينقص من أجره شيء. (حاشية الطحطاوي، ص: ۶۲۲، كتاب الجنائز، فصل في زيارة القبور ☆ رد المحتار: ۲/ ۲۴۳، باب صلاة الجنائز، مطلب في زيارة القبور ☆ الهداية: ۱/ ۲۷۶، كتاب الحج، باب الحج في الغير، ط: مكتبة الاتحاد - ديوبند)

(۳) وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع... واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الإخلاص. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۰، كتاب الجنائز، مطلب في الثوب على المصيبة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۶۱۷، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

،یتیموں اور بیوگان پر صدقہ کرے، تو اس کو ثواب ملے گا۔ [1] البتہ دوسرے ورثہ کی رضامندی کے بغیر، یا اپنے آپ کو مال دار ظاہر کرنے کے لیے، دوسرے مال داروں کو دکھانے [2] اور ان کو کھلانے کے لیے [3] اس طرح کی دعوت کرنے سے ثواب نہیں ملے گا اور پہلے سے کسی دن کو متعین کر لینے سے بدعت اور حرام کا ارتکاب کرنا لازم آئے گا۔ [4] واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۰۸/۱۲/۱۹۷۹

[۲۶] متعدد افراد کو ایصال ثواب کرنے کی صورت میں کیا ثواب تقسیم کیا جاتا ہے؟

۲۳۰-سوال: میں روزانہ قرآن مجید کی آیتیں تلاوت کرتا ہوں، پھر دو رکعات نفل پڑھتا ہوں اور اس کے بعد اس طرح دعا کرتا ہوں کہ "اے اللہ! قرآن کریم کی تلاوت اور نفل نماز کا ثواب رسول اللہ ﷺ کی مبارک روح کو پہنچائیے، آپ ﷺ کے بعد ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، اور دیگر ازواج مطہرات کو، ان کے بعد حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو، ان کے بعد دیگر صحابۂ کرامؓ اور خلفائے اربعہؓ کو، ان کے بعد شہدائے کربلا کو، ان کے بعد شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور خواجہ معین

---

(۱) و الأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوما أو صدقة أو غيرها عند أهل السنة والجماعة. (الهداية: ۱/ ۲۷۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مكتبة الاتحاد، ديوبند☆ فتح القدير - كمال الدين ابن الهمام: ۳/ ۱۴۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) قال الله تعالى: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ. الآية. (۲-البقرة: ۲۶۴)

قال النبي -صلى الله عليه وسلم-: «من سمع سمع الله به، ومن يرائي يرائي الله به». (صحيح البخاري: ۲/ ۹۶۲، رقم الحديث: ۶۴۹۹، كتاب الرقاق، باب الرياء والسمعة، ط: مكتبة البدر ديوبند)

(۳) اس لیے کہ صدقہ فقراء کا حق ہے، اللہ کا ارشاد ہے: إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ. الآية. (التوبة: ۹)

وفي الشامي: لأنها صدقة، وهي على الغني حرام. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۶۹۸، كتاب الوصايا، فروع أوصى بثلاث ماله لصلوات) وأوضح سبب الحرمة في موضع آخر عنه قائلا: لأن الصدقة على الغني هبة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۵، كتاب الزكاة، فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر، بيروت)

(۴) ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول، والثالث، وبعد الأسبوع... وهذه الأفعال كلها للسمعة، والرياء، فيحترز عنها؛ لأنهم لا يريدون بها وجه الله تعالى. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۰، كتاب الجنائز، مطلب في الثواب على المصيبة، ط: دار الفكر - بيروت)

الدین چشتی اور تمام اولیائے کرام کو"۔

اخیر میں یہ کہتا ہوں کہ "اس پورے وظیفہ کا ثواب میرے مرحوم والدین کو پہنچائیے، ان کے بعد میرے قریبی رشتہ داروں کو اور تمام مسلمان مردوں کو"۔

میں جب بھی قرآن مجید پورا کر لیتا ہوں، تو دوسرے لوگوں کی طرح نہ تو کوئی میٹھی چیز سامنے رکھتا ہوں اور نہ اس کو دوسروں کے ذریعہ تقسیم کرواتا ہوں، صرف عبادت بدنی کا ثواب ان مردوں کو پہنچاتا ہوں، تو کیا اس سے مردوں کو ثواب ملے گا یا نہیں؟ اور اس طرح مختلف حضرات کو ایصال ثواب کرنے سے میرے مرحوم والدین کے ثواب میں سے کوئی کمی تو نہیں ہوگی؟

الجواب حامداومصلیا:

صورت مذکورہ میں میت کو ثواب پہنچتا ہے۔[۱] البتہ ثواب کس طرح پہنچتا ہے اس میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ جو کچھ پڑھا ہے، اس کا پورا ثواب سب کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ دوسرا قول یہ ہے کہ ہر ایک کو پورا پورا ثواب ملتا ہے، کسی کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی، گویا کہ ثواب کو تقسیم نہیں کیا جاتا ہے۔[۲]

---

(۱) والأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوما أو صدقة أو قراءة قرآن أو ذكرا أو طوافا أو حجا أو عمرة أو غير ذلك عند أصحابنا للكتاب والسنة. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري (م:۹۷۰ھ): ۳/ ۹۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مزید دیکھیے: حاشية الطحطاوي، ص ۹۲۲، كتاب الجنائز، فصل في زيارة القبور ☆ رد المحتار: ۲/ ۲۴۳، باب صلاة الجنائز، مطلب في زيارة القبور ☆ الهداية: ۱/ ۲۷۶، كتاب الحج، باب الحج في الغير، ط: مكتبة الاتحاد-ديوبند)

(۲) وفي كتاب الروح للحافظ أبي عبد الله الدمشقي الحنبلي الشهير بابن قيم الجوزية ما حاصله: . . . ويوضحه أنه لو أهدى الكل إلى أربعة، يحصل لكل منهم ربعه، فكذا لو أهدى الربع لواحد وأبقى الباقي لنفسه اهـ ملخصا. قلت: لكن سئل ابن حجر المكي عما لو قرأ لأهل المقبرة الفاتحة هل يقسم الثواب بينهم أو يصل لكل منهم مثل ثواب ذلك كاملا. فأجاب بأنه أفتى جمع بالثاني، وهو اللائق بسعة الفضل. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۴۳-۲۴۴، كتاب الصلاة، مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر، بيروت)

وفي التتارخانية عن المحيط الأفضل لمن يتصدق نفلا أن ينوي لجميع المؤمنين والمؤمنات؛ لأنها تصل إليهم ولا ينقص من أجره شيء اهـ. (رد المحتار: ۲/ ۲۴۳، باب صلاة الجنائز، مطلب في زيارة القبور)

نص عليه الإمام أحمد في رواية محمد بن يحيى الكحال، ووجه هذا أن الثواب ملك له فله أن يهديه جميعه وله أن يهدي بعضه، ويوضحه أنه لو أهداه إلى أربعة مثلا يحصل لكل منهم ربعه، فإذا أهدى الربع وأبقى لنفسه الباقي جاز =

نوٹ: مروجہ فاتحہ خوانی حرام ہے، اس سے ثواب نہیں ملے گا۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ
۲۲/۲/۱۹۷۷ء

[۲۷] نذر و نیاز کا کھانا کسے کھلایا جائے؟

۲۳۱-سوال: نذر و نیاز کا کھانا کن کو کھلانا چاہیے؟ اگر کسی مال دار نے کھالیا، تو کیا اس پر ثواب ملے گا اور کیا میت کو اس کا ایصال ثواب کر سکتے ہیں؟

احقر حبیب خان

الجواب حامداومصلیا:

نذر و نیاز کے کھانے کے حق دار غریب اور محتاج لوگ ہیں، مال داروں کو کھلانا جائز نہیں ہے۔[۱] اور مال دار کو کھلانے سے کوئی ثواب بھی نہیں ملے گا؛ بل کہ نذر و نیاز اگر رسم و رواج کے طور پر ہوگا، تب بھی ثواب نہیں ملے گا؛ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ کھانا پکا کر کھلانے کے بجائے کچا اناج رشتہ داروں اور غریبوں میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ کسی کو پتہ نہ چلے تا کہ ریا، شہرت اور نام و نمود کی وجہ سے ثواب ختم یا کم نہ ہو جائے۔[۲] کچا اناج بغیر نام و نمود کے دیا جائے، تو اخلاص بھی باقی رہے گا اور ثواب کی بھی کثرت ہوگی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ
۱۷/۱۱/۱۹۷۷ء

كما لو أهداه إلى غيره. (كتاب الروح لابن القيم الجوزية: ٢/ ٣٧٤، المسألة السادسة عشرة: وهي هل تنتفع أرواح الموتى بشيء من سعي الأحياء أم لا؟ فصل وأما قولكم لو ساغ ذلك لساغ إهداء نصف الثواب وربعه إلى الميت الخ، ت: د. بسام علي سلامه العموش، ط: دار ابن تيمية للنشر والتوزيع والاعلام، الرياض)

(٣) تقدم تخريجه.

(١) (الوصية المطلقة) (لا تحل للغني) لأنها صدقة، وهي على الغني حرام، لما قالوا: إن الصدقة على الغني هبة، ولا يمكن جعلها هبة له بعد موت الموصي. (الدر المختار مع رد المحتار، بتقدم وتاخر يسير: ٦/ ٦٩٨، كتاب الوصايا، فروع، أوصى بثلث ماله للصلوات، ط: دار الفكر-بيروت ☆ وأيضاً: البحر الرائق: ٢/ ٢٦٣، كتاب الزكاة، دفع الزكاة إلى الأب والجد أو الولد... الخ، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(٢) في البخاري: باب صدقة السر وقال أبو هريرة رضي الله عنه: عن النبي صلى الله عليه وسلم: «ورجل تصدق بصدقة فأخفاها، حتى لا تعلم شماله ما صنعت يمينه» وقوله: ﴿إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ﴾ [٢- البقرة: ٢٧١]. (١/ ١٩، كتاب الزكاة، باب صدقة السر، ط: البدر، ديوبند)

[۲۸] عاشورہ کے دن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نام کا کھانا لوگوں کو کھلانا

۲۳۲-سوال: یوم عاشورہ یعنی دس محرم الحرام کو حضرت حسینؓ کے نام پر نیاز کا کھانا؛ مثلاً: کھچڑا اور شربت وغیرہ اپنے محلے والوں اور پڑوسیوں کو اور دوست احباب کو دینا کیسا ہے؟ اور جن کو دیا گیا ہے، ان کے لیے یہ کھانا کھانا کیسا ہے؟ نیز اس طرح کے نیاز کے کھانوں کے لیے لوگوں سے چندہ حاصل کرنا کیسا ہے؟ مفصل جواب مطلوب ہے، اس لیے کہ یہ تمام حرکتیں میرے ایک بھائی نے کی ہے، میں اس کو آپ کا تحریر کردہ جواب پڑھاؤں گا، تاکہ اس کو ہدایت ملے اور وہ اپنی ان حرکتوں سے باز آجائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

عاشورہ کے روز حضرت حسینؓ کی شہادت کے عنوان سے جتنے کام بھی کیے جاتے ہیں، وہ سب حرام اور ناجائز ہیں۔ (۱) کیوں کہ ان میں غلط عقائد اور متعدد رسومات وبدعات شامل ہیں:

(۱) ان کاموں کے لیے پہلے ہی سے ایک وقت متعین کیا جاتا ہے، یہ التزام مالا یلزم ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ (۲)

(۲) امیر وغریب سب کو کھلایا پلایا جاتا ہے۔

(۳) نذر ونیاز کا کھانا مال داروں کے لیے کھانا جائز نہیں ہے۔ (۳)

(۴) اس میں چندہ نہ دینے والے کو لعن طعن کیا جاتا ہے۔

(۵) اس سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ کسی یتیم، مسکین، غریب اور بیوہ عورت کی مدد کی جائے، ان کی

---

(۱) تعزیہ داری در عشرۂ محرم، وساختن ضرائح وصورت وغیرہ درست نیست، زیرا کہ تعزیہ داری عبارت ازیں است کہ ترک لذائذ وترک زینت کند وصورت محزون وغمگین نماید...... ایں ہم بدعت است...... بل کہ بدعت سیئہ است ۔ (فتاوی عزیزی (فارسی) ۱/ ۵۷، مسئلہ تعزیہ داری محرم وصورت، ط: کتب خانہ رحیمیہ دیوبند)

(۲) قال الطيبي: وفيه أن من أصر على أمر مندوب، وجعله عزما، ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال فكيف من أصر على بدعة أو منكر؟. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح-الملاعلي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۲/ ۷۵۵، رقم الحديث: ۹۴۶، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، ط: دار الفكر، بيروت-لبنان)

(۳) (الوصية المطلقة لا تحل للغني) لأنها صدقة، وهي على الغني حرام. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۶۸۹، كتاب الوصايا، فروع أوصى بثلث ماله للصلوات، ط: دار الفكر-بيروت)

بہت سی ضروریات ہیں، اس کے باوجود لوگ ان کے کاموں کے لیے چندہ دینے سے دور بھاگتے ہیں، لہٰذا ضروری کاموں کو چھوڑ کر غیر ضروری کاموں میں مال کو خرچ کرنا فضول خرچی ہے، جو شرعاً حرام ہے۔ (۴)

(۶) حضرت حسین ؓ عظیم المرتبت اور مقرب بارگاہ ہیں؛ اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ تم اپنے مال کے ذریعہ والدین، دادا، دادی اور نانا، نانی کو ثواب پہنچاؤ، تو وہ ان کاموں کے لیے خرچ کرنے میں پس وپیش کریں گے، جب کہ یہ لوگ تمہارے محسن ہیں اور وہ تمہاری طرف سے ایصال ثواب اور نیکی کرنے کے زیادہ محتاج ہیں۔

البتہ کوئی شخص پہلے سے کسی دن اور تاریخ کو متعین کیے بغیر کھلا پلا کر حضرت حسین ؓ کی روح مبارک کو اس کا ثواب پہنچائے، تو جائز ہے۔ (۵)

نیز آپ نے سوال میں یہ لکھا ہے کہ ''جواب تفصیل سے مطلوب ہے، تاکہ میں اپنے بھائی کو پڑھاؤں اور اس کو ہدایت ملے'' سو یاد رکھیں کہ ہدایت دینا اللہ رب العزت کا کام ہے۔ (۶) انسان اپنی جانب سے کوشش کرتا رہے۔ مزید تفصیل کے لیے میری کتاب ''احکام میت'' (۷) پڑھ کر انہیں سنائیں، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت سے نوازے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۴) إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ﴿٢٧﴾ (۱۷-الإسراء: ۲۷)

وقال ابن مسعود: التبذير: الإنفاق في غير حق. وكذا قال ابن عباس. وقال مجاهد: لو أنفق إنسان ماله كله في الحق لم يكن مبذرا. ولو أنفق مدا في غير حقه كان تبذيرا. (التفسير الوسيط - الطنطاوي: ۸/ ۳۳۳، سورة الاسراء، ط: دار نهضة مصر للطباعة والنشر والتوزيع، الفجالة - القاهرة)

(۵) پس ایصال ثواب اگر اس طور پر کرے...... کہ نہ دن اور تاریخ کی تخصیص کرے، نہ کسی خاص چیز کی، اور اغنیاء اور گھر والوں کو نہ دے اور اعلان کرکے نہ دے اور کھانا وغیرہ سامنے رکھ کر کچھ نہ پڑھے، اور یہ عقیدہ نہ رکھے کہ حضرت ہماری مدد فرمائیں گے، اور یہ نیت نہ رکھے کہ اس عمل کی برکت سے ہمارے مال اور اولاد میں برکت وترقی ہوگی۔ (امداد الفتاویٰ ۵/ ۳۰۱، کتاب البدعات، ط: ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند)

فإن للعمل المتقبل شرطين، أحدهما: أن يكون خالصا لله وحده، والآخر: أن يكون صوابا موافقا للشريعة. فمتى كان خالصا، ولم يكن صوابا لم يتقبل؛ ولهذا قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من عمل عملا ليس عليه أمرنا فهو رد". رواه مسلم من حديث عائشة، عنه، عليه السلام. (تفسير القرآن العظيم - ابن كثير القرشي، الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۱/ ۳۸۵، البقرة: ۱۱۳، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

(۶) لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ. [۲-البقرة: ۲۷۲]

(۷) احکام میت (سکرات سے فاتحہ تک کی سنن وبدعات) اردو ترجمہ، باہتمام: حافظ امجد بیات کینیڈا، ناشر: مدنی دار التربیت، کرمالی۔

[۲۹] محرم، میلاد النبی اور گیارہویں کو کھانا پکانا

۲۳۳-سوال: محرم الحرام کی بارہویں تاریخ کو زیارت کا پروگرام رکھا جاتا ہے، نیز بارہ ربیع الاول اور بارہ ربیع الاخر کو جو نیاز کا کھانا بنایا جاتا ہے، اس میں مارے شرم کے 'مجبوراً پیسے دینے پڑتے ہیں اور اگر پیسے نہیں دیئے، تو جھگڑے کا اندیشہ ہوتا ہے، تو ان حالات میں ہمیں شرعاً کیا کرنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

محرم اور ربیع الاول اور ربیع الاخر کے مہینوں کی مخصوص تاریخ میں نیاز کے نام پر جو کھانا پکایا جاتا ہے، وہ جائز نہیں ہے۔ [۱] کیوں کہ یہ آپ ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین سے ثابت نہیں ہیں اور نیاز کا کھانا پکانے والے لوگوں کا 'پیسہ نہ دینے والے لوگوں پر دباؤ ڈالنا اور ان کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنا، ان کو برے الفاظ سے مخاطب کرنا اور ان کی بے عزتی کرنا نا جائز اور حرام ہے؛ البتہ کوئی صاحب خیر' دن اور مہینہ کے التزام کے بغیر اپنی جانب سے یتیموں اور غریبوں کو کھانا پکا کر کھلائے، تو اس کو ثواب ملے گا۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] آپ ﷺ کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کرنا

۲۳۴-سوال: حضور ﷺ کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

---

(۱) ویکرہ اتخاذ الضیافۃ فی أیام المصیبۃ؛ لأنہا أیام غم، فلایلیق فیہا مایختص باظہار السرور، وإن اتخذ طعاما للفقراء کان حسناً۔ (الفتاوی البزازیۃ مع الہندیۃ: ۶/ ۳۷۹، کتاب الکراہیۃ، رشیدیہ کوئٹہ)

وفي البزازیۃ: ویکرہ اتخاذ الطعام في الیوم الأول و الثالث و بعد الأسبوع... الخ. (رد المحتار مع الدر: ۲/ ۲۴۰، مطلب في الثواب علی المعصیۃ، ط: دار الفکر - بیروت)

(۲) پس ایصال ثواب اگر اس طور پر کرے...... کہ نہ دن اور تاریخ کی تخصیص کرے، نہ کسی خاص چیز کی، اور اغنیاء اور گھر والوں کو نہ دے اور اعلان کر کے نہ دے اور کھانا وغیرہ سامنے رکھ کر کچھ نہ پڑھے، اور یہ عقیدہ نہ رکھے کہ حضرت ہماری مدد فرمائیں گے، اور یہ نیت نہ رکھے کہ اس عمل کی برکت سے ہمارے مال اور اولاد میں برکت وترقی ہوگی۔ (امداد الفتاویٰ ۵/ ۳۰۱، کتاب البدعات، ط: ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند)

الجواب حامداً و مصلیاً:

انسان کوئی بھی نیک کام کر کے اس کا ثواب دوسرے کو بخش سکتا ہے۔[۱] اس لیے قرآن پڑھ کر اس کا ثواب آپ ﷺ کی ذات اقدس کو پہنچانا جائز ہے؛ مگر بہتر یہ ہے کہ انبیاء و رسل کے ساتھ ساتھ دیگر مرحومین اور اپنے رشتہ داروں کو ایصال ثواب کیا جائے؛ اس لیے کہ یہ لوگ اس کے زیادہ محتاج ہیں۔

آپ ﷺ کے ایصال ثواب کے لیے اذان کے بعد پابندی سے "اذان کے بعد کی دعا" پڑھنا چاہیے۔[۲] فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۳۱] غوث پاک کی گیارہویں منانا' بدعت ہے

۲۳۵-سوال: اس زمانہ میں لوگ غوث پاکؒ کی گیارہویں بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں؛ حالاں کہ غوث پاک کی اس مہینہ کی اس تاریخ کو وفات نہیں ہوئی ہے، گیارہویں منانے والے بہ طور دلیل یہ کہتے ہیں کہ غوث پاک اپنے شیخ کی گیارہویں منایا کرتے تھے۔

آپ سے دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا غوث پاکؒ اپنے شیخ کی گیارہویں مناتے تھے؟ اگر مناتے تھے، تو کیوں؟ نیز انہوں نے گیارہویں منانے کے سلسلے میں کوئی وصیت یا تاکید فرمائی ہے؟ باحوالہ مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

---

(۱) أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة، أو صوما ،أو صدقة، أو غيرها عند أهل السنة و الجماعة. (الهداية شرح بداية المبتدي:۱/ ۲۹۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير ،ط:مكتبة الاتحاد-ديوبند☆ البحر الرائق: ۳/ ۶۳ ، كتاب الحج، باب الحج عن الغير ، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ رد المحتار مع الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، كتاب الجنائز، مطلب: في زيارة القبور ،ط: دار الفكر - بيروت☆ تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق-فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ هـ): ۲/ ۸۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير ،ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق-القاهرة)

(۲) عن جابر بن عبد الله: أن رسول الله صلى الله عليه و سلم قال: " من قال حين يسمع النداء: اللهم رب هذه الدعوة التامة، و الصلاة القائمة، آت محمدا الوسيلة و الفضيلة، و ابعثه مقاما محمودا الذي وعدته، حلت له شفاعتي يوم القيامة". (صحيح البخاري:۱/ ۸۶، رقم الحديث: ۶۱۴ ، كتاب الاذان، باب الدعاء عند النداء، و رقم الحديث: ۴۷۱۹، كتاب تفسير القران ،باب قوله: {عسى أن يبعثك ربك مقاما محمودا} [الإسراء: ۷۹] ،ط: البدر - ديوبند☆ سنن أبي داود، رقم الحديث: ۵۲۹، كتاب الصلاة،باب ما جاء في الدعاء عند الأذان☆سنن الترمذي،رقم الحديث: ۲۱۱ ،أبواب الصلاة،باب بعد:باب ما يقول إذا أذن المؤذن)

الجواب حامداً و مصلیاً:

غوث پاکؒ کی گیارہویں منانا فضول اور بے بنیاد کام ہے۔ [1] اولیاء اللہ سے اس قسم کی کوئی بات ثابت نہیں ہے۔ ان نیکوکار اور صالحین کی زندگی اتباع سنت رسول (ﷺ) میں گذری ہے؛ لہٰذا بہتر تو یہ ہے کہ ہم گیارہویں پر خرچ کیے جانے والے سارے پیسے اپنے آباء واجداد- جو اولیاء اللہ کے مقابلے میں گنہ گار تھے- کے ایصال ثواب میں خرچ کریں، کیوں کہ اولیاء اللہ تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بتلائی ہوئی باتوں پر عمل کر کے اپنی دنیا و آخرت سنوار گئے، لازم ہے کہ ہم بھی ان کی طرح زندگی بسر کر کے دنیا اور آخرت میں سرخ روئی حاصل کریں، اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لیے میری کتاب: احکام میت (سکرات سے فاتحہ تک کی سنن و بدعات) کا مطالعہ کریں۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] زیارت کی بدعات کو روکنے کے لیے میت کے گھر مجلس وعظ میں شرکت

۲۳۶-سوال: ہمارے ضلع کھیڑا میں ۵۰ رسال قبل موت کے بعد میت کے گھر مہمانی کا رواج عام تھا، جس میں دور دراز سے میت کے رشتہ دار اور متعلقین آکر شریک ہوتے تھے، اس رسم میں ریاکاری اور فضول خرچی بھی تھی، اصلاح کی کوشش کرنے سے آہستہ آہستہ یہ رسم تو بند ہوگئی؛ لیکن ابھی بھی انتقال کے تیسرے دن زیارت کی رسم جاری ہے، اس میں سو، دو سو یا تین سو خطوط روانہ کر کے میت کے رشتہ داروں اور متعلقین کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ طے شدہ دن صبح نو بجے تشریف لاکر مسجد میں قرآن خوانی کی مجلس میں

---

(۱) پس ایصال ثواب اگر اس طور سے کرے، جس میں فساد عقیدہ کا احتمال نہ ہو تو مضائقہ نہیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ نہ دن اور تاریخ کی تخصیص کرے نہ کسی خاص چیز کی اور اغنیاء اور گھر والوں کو نہ دے اور اعلان کر کے نہ دے اور کھانا وغیرہ سامنے رکھ کر کچھ نہ پڑھے اور عقیدہ نہ کرے کہ حضرت ہماری امداد فرمائیں گے اور یہ نیت نہ رکھے کہ اس عمل کی برکت سے ہمارے مال واولاد میں برکت وترقی ہوگی، محض یوں سمجھے کہ انہوں نے ہم پر دین کا احسان کیا ہے، کہ سیدھا راستہ کتابوں میں بتلائے گئے، ہم ان کو نفع پہنچاتے ہیں کہ ثواب سے ان کے درجات بلند ہوں گے، بس اس طرح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (امداد الفتاویٰ: ۳۰۱/۵، کتاب البدعات، پیران پیر کی گیارہویں، الخ، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند)
مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۷۶/۲-۷۷)

(۲) احکام میت [سکرات سے فاتحہ تک کی سنن اور بدعات]، مترجم اردو، سن طباعت: ربیع الاول: ۱۴۳۴ھ، موافق = فروری: ۲۰۱۳ء)

(۳) فتاویٰ رحیمیہ میں فتاویٰ سمرقندی کے حوالہ سے منقول ہے: قراءة الفاتحة والإخلاص والكافرون على الطعام بدعة. (فتاوى رحيمية: ۱۱۶/۲، كتاب السنة والبدعة، ط: دار الاشاعت، کراچی)

بیٹھیں یا مجلسِ وعظ میں شامل ہوں، پھر دعاء کے بعد میت کے گھر کھانا کھائیں، یہ رسم بالکل لازمی تھی، اور آج بھی کچھ نہ کچھ جاری ہے۔

آخری چار پانچ سال سے ایک دین دار طبقے نے اصلاح کی غرض سے لوگوں کو یہ بات سمجھائی کہ اس ''زیارت'' کی رسم میں کئی مرتبہ صغیر اور یتیم کا مال بھی خرچ ہوتا ہے، جو حرام ہے، اس کے علاوہ دیگر کئی خرافات ہوتے ہیں، غرض اِس زیارت کے کھانے کے خلاف گویا ایک تحریک چلائی گئی اور یہ طے ہوا کہ اِس کے بجائے میت کے گھر بعد ظہر ۲؍ بجے سے ۴؍ بجے تک قرآن خوانی کی جائے، اب یہ مجلس کسی کے انتقال کے بعد پانچ یا سات دِنوں ہی میں کوئی ایک دِن طے کر کے رکھی جاتی ہے، جس کے لیے خطوط روانہ کیے جاتے ہیں، مردوں کے علاوہ اُس میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں، اس قرآن خوانی کی مجلس میں کھانے کا کوئی موقعہ نہیں رہتا۔

اب اِس مجلس میں شریک تمام لوگ تلاوت ہی کریں، یہ ممکن نہ تھا، نیز عورتیں اِس موقع پر فضول باتیں اور غیبت وغیرہ میں اپنا وقت ضائع کرتی تھیں؛ اس کے بجائے ایک نیک مخلص آدمی نے علماء حق میں سے ایک عالم کو دعوت دے کر مجلس وعظ منعقد کی، جس میں عورتوں کے لیے علاحدہ نشست کا انتظام بھی کیا گیا، تمام لوگوں کو یہ مجلس اچھی معلوم ہوئی، اور اب اس طرح سے لوگ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک علماء حق سے دین کی باتیں سنتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کے اکثر و بیشتر خاندان ایسے ہیں جن کے رشتے داروں میں کچھ اہل بدعت بھی ہیں؛ لیکن رشتہ داری کی وجہ سے وہ لوگ بھی میت کے گھر آتے ہیں اور اِس موقع پر دو گھنٹے تک علماء حق کی تقاریر سنتے ہیں، جس کا یہ فائدہ بھی دیکھا گیا کہ اُن میں سے بہت سے لوگوں کی اہل سنت والجماعت کے متعلق غلط فہمیاں دور ہوئیں، اور حق بات سمجھ کر اُس کا اعتراف بھی کیا۔

تقریر کی صورت اب بھی جاری ہے، اس کو بند کرنے کے لیے بھی دین دار طبقے کی جانب سے فہمائش کی گئی، جس پر عوام کا کہنا یہ ہے کہ ہم زیارت کے نام پر کھانا کھلانے کی بدعات تو کرتے نہیں؛ پھر یہ کیا غلط ہے کہ ایک دِن تقریر کے لیے متعین ہو، جس میں تمام رشتہ دار جمع ہو جائیں، اگر اس طرح نہیں کیا گیا، تو

چالیس دن تک متفرق طور پر میت کے رشتہ دار آتے رہیں گے، جس کی وجہ سے ہمارے روزانہ کے معاشی مشاغل میں پریشانی کھڑی ہوگی؛ لہٰذا سہولت اِسی میں ہے کہ اس تقریر کی رسم کے لیے ایک ہی دن متعین ہو جائے، اور تمام لوگ اُسی میں شرکت کرلیں۔

تاہم دین دار حضرات کا ایک بڑا طبقہ اس رسم کو بھی پسند نہیں کرتا اور حکمت و مصلحت کے ساتھ عوام کو سمجھا کر اس رسم کو بھی بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے، الحمدللہ! کافی حد تک کامیابی بھی ملی، اُن کی فہمائش کی وجہ سے بہت سے دیہاتوں میں میت کے رشتہ داروں نے اس رسم کو چھوڑ دیا؛ لیکن اب اصل مصیبت علاقے کی مساجد کے ائمہ کے لیے کھڑی ہوگئی ہے، ایک عالم کا کہنا ہے کہ یہ رسم صرف رسم نہیں؛ بلکہ بدعت ہے، اور بدعتی کو حوضِ کوثر سے آپ ﷺ کے ہاتھوں جامِ کوثر نصیب نہ ہوگا اور جسے جامِ کوثر نصیب نہیں ہوگا، اُسے جنت میں داخلہ بھی نصیب نہ ہوگا، لہٰذا علماء، ائمہ مساجد اور مدرّسین مدرسہ میں سے کسی کے لیے جائز نہیں کہ اس قسم کی مجلسِ وعظ میں شرکت کریں، یہ مجلس غیر شرعی اور منکر (گناہ) کی مجلس ہے۔

اگر اس بات کو مان کر علماء حق اس تقریر کی رسم میں جانا چھوڑ دیں گے، تو بڑے فتنے اور خرافات کا اندیشہ ہے، جس گاؤں یا جس محلے میں ائمہ وعلماء بستے ہیں، اُن کے لیے مشکلات کھڑی ہوں گی؛ بل کہ بعض جگہوں پر تو فتنے رونما ہو چکے ہیں، یعنی علماء حق کے اس قسم کی مجلس میں شرکت نہ کرنے کی وجہ سے متبادل کے طور پر اہلِ بدعت کے علماء سو پہنچ گئے ہیں، جن کے عقائد صحیح نہیں ہیں، ابھی جس وقت یہ تحریر لکھی جارہی ہے، اُسی دوران ۱۰۰ رفٹ کے فاصلے پر ایک سوسائٹی میں سے ایک بدعتی عالم کی تقریر کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

لہٰذا یہ تو ہوگا نہیں کہ علماء حق کے شرکت نہ کرنے کی وجہ سے یہ رسم بالکلیہ بند ہو جائے؛ کیوں کہ اُن کی جگہ غلط قسم کے لوگ بیان کریں گے، لہٰذا ہم نے مناسب سمجھا کہ علماء حق اس قسم کی مجالس میں جائیں؛ البتہ حکمت و مصلحت کے ساتھ اپنے گاؤں یا محلہ کی اصلاح کرتے رہیں، اور وقتاً فوقتاً جب بھی کسی کا انتقال ہو، تو میت کے رشتہ داروں کے پاس جا کر سمجھانے کی کوشش کریں کہ اگر یہ مجلس منعقد نہ کریں، تو بہتر ہوگا، اگر وہ مان جائیں، فبہا، ورنہ مجلسِ وعظ میں شریک ہوں، اس طرح کی فہمائش سے ماضی قریب ہی میں تین گاؤں کے لوگ مان گئے اور مجلس منعقد نہیں ہوئی، تاہم ابھی کافی محنت اور اصلاحی جدوجہد کی ضرورت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسلم عوام میں سے کوئی شخص علماءِ حق میں سے کسی عالم کو پورے اکرام کے ساتھ اس مجلسِ وعظ میں تقریر کی دعوت دے، تو کیا اُس عالم کے لیے اصلاح کی نیت سے اُس مجلس میں شریک ہونا درست ہے؟ شریک ہونے پر اُسے کوئی گناہ ہوگا؟ کیا اس بدعت کے اختیار کرنے کی وجہ سے وہ جنت سے محروم ہوگا؟ برائے کرم شرعی رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

شریعت میں جس چیز کا ثبوت نہ ہو، اس کو دین سمجھ کر انجام دینا بدعت ہے؛ اس لیے آج کل وہ اعمال، جو حزن وغم کے مواقع پر ثواب سمجھ کر کیے جاتے ہیں، بدعت ہیں۔ (١) اُن کے برخلاف شادی، ختنہ اور عقیقہ جیسے خوشی کے مواقع پر کیے جانے والے افعال، کہ وہ بدعت میں شامل نہیں ہیں، وجہ یہ ہے کہ خوشی و مسرت کے موقع پر انجام دیے جانے والے اعمال درحقیقت لہو ولعب کی قبیل سے ہوتے ہیں اور انہیں کوئی دین کا حصہ نہیں سمجھتا، جب کہ حزن وغم کے موقع پر کیے جانے والے اعمال کو ہر شخص دین کا حصہ سمجھتا ہے، حالاں کہ ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، جیسا کہ محدث العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"و البدعة عندي: ما لا تكون مستندة إلى الشرع، و تكون ملتبسة بالدّين، و لذا يقال: إن الرسوم التي جرت في المصائب بدعة، دون التي في مواضع السرور، كالانكحة وغيرها؛ فإن الأولى تعد كأنها من الدين، فتلتبس به، بخلاف الثانية، و السر فيه: أن رسوم المسرات أكثرها تكون من باب اللّهو و اللعب، فلا تلتبس بالدين عند سليم الفطرة، بخلاف رسوم نحو الموت، فإن غالبها يكون من جنس العبادات، فيتحقق فيها الالتباس." (فيض الباري شرح صحيح البخاري، كتاب العلم، باب من جعل لأهل العلم أياما معلومة.) (٢)

سوال میں ذکر کردہ احوال کے پیشِ نظر اگر علماءِ حق اصلاح کی نیت سے اِس جیسی مجالس میں شریک

(١) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ١/ ٣٧١، رقم الحديث: ٢٦٩٧، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، ط: البدر - ديوبند ☆ صحيح مسلم، ٢/ ٧٧، ١٨-(١٧١٨)، كتاب الحدود، باب نقض الأحكام الباطلة، ورد محدثات الأمور ☆ سنن أبي داود: ٢/ ٦٣٥، رقم الحديث: ٤٦٠٦، كتاب السنة، باب في لزوم السنة، مكتبة الاتحاد - ديوبند)

(٢) فيض الباري: ١/ ٢٠٧، كتاب العلم، باب من جعل لأهل العلم أياما معلومة، ط: المجلس العلمي بدابيل - سورت) و قد تقدم تخريجه عن: (رد المحتار على الدر المختار: ٣/ ٢٤٠، كتاب الجنائز، مطلب في الثواب على المصيبة، بيروت ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: ص ٦١٧، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، بيروت)

ہوں، تو جائز ہے، اِس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔''(۳)

لہٰذا میں اہلِ سنت والجماعت کے اُن علماء اور برادرانِ قوم وملت سے توقع رکھتا ہوں، جو ہمہ وقت قوم وملت کی دینی فکر میں مشغول ہیں؛ کہ ان مجالس میں اگر شرکت کرنی ہی پڑے، تو اپنے گھر سے کھانے وغیرہ کی تمام ضروریات سے فارغ ہو کر جائیں، یا دوسری شکل یہ بھی اختیار کی جاسکتی ہے کہ میت کے گھر اور رشتہ داروں کے علاوہ اور کسی متعلق کے گھر ان مجالس کا انتظام کیا جائے، بہر صورت اس بات کی مکمل کوشش کی جائے کہ عوام غلط قسم کے لوگوں کو اپنا مقتدیٰ بنا کر اُن کی پیروی نہ کریں، علماء حق کے شریک نہ ہونے کی وجہ سے غلط قسم کے لوگ ان مجالس کو ذریعہ بنا کر عوام کو گمراہ کریں گے، لہٰذا علماء حق کو چاہیے کہ اصلاح کی نیت سے شرکت کر کے عوام کے ساتھ جڑے رہیں، اور وقتاً فوقتاً مناسب موقع پر اُن کی فہمائش کرتے رہیں، ان شاء اللہ کامیابی ضرور ملے گی، جس کے بعض مثبت نتائج آپ نے خود محسوس بھی کیے ہیں۔

ذکر کردہ احوال کے پیش نظر اگر کوئی بھی عالم برحق اور امام مسجد اس جیسی مجلس میں بہ غرضِ اصلاح شرکت کر کے تقریر کرے، تو وہ گنہگار نہ ہوگا؛ البتہ اِس بات کا خوب خیال رہے کہ اس مجلسِ وعظ کی وجہ سے میت کے گھر پر کسی قسم کا بوجھ نہ آئے، ان شاء اللہ آپ حضرات کی دینی جدوجہد ضرور رنگ لائے گی۔ فقط، و اللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] میت کے گھر قرآن خوانی کا حکم

۷۳۳-سوال: بہت سے گھروں میں جب کسی کا انتقال ہوجاتا ہے، تو میت کے رشتے داروں کی جانب سے کچھ حفاظ وعلماء کو بلا کر میت کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کروائی جاتی ہے، جب حضور پاک ﷺ اور خلفاءِ راشدین کی وفات پر اس طرح کی قرآن خوانی صحابہ کرامؓ نے نہیں کی، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے؛ بل کہ اُس کے بدعت ہونے کا وہم ہوتا ہے، تو کیا اِس طرح یہ

(۳) عمر بن الخطاب رضي الله عنه على المنبر قال: سمعت رسول الله -صلى الله عليه وسلم- يقول: إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى. (صحيح البخاري: ۲/۱، رقم الحديث: ۱، باب بدء الوحي، ط: البدر-ديوبند ☆صحيح مسلم، رقم الحديث: ۱۵۵-(۱۹۰۷)، كتاب الإمارة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: إنما الأعمال بالنية... الخ ☆سنن أبي داود: ۳۰۰/۱، رقم: ۲۲۰۱، كتاب الطلاق، باب فيما عني به الطلاق والنيات، ط: مكتبة الاتحاد-ديوبند)

غرضِ ایصالِ ثواب قرآن خوانی جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب کسی دن یا تاریخ کو لازم نہ کیا جائے۔(۱) کھانے پینے کا مستقل انتظام نہ کیا جائے، نیز اُسے ایسا ضروری اور لازم نہ سمجھا جائے کہ اُس قرآن خوانی میں شریک نہ ہونے والے پر طعن و تشنیع کی جائے، تو بہ غرضِ ایصالِ ثواب جائز ہے۔(۲) اس لیے کہ ایصالِ ثواب کا ثبوت متعدد احادیث پاک سے ہے۔(۳) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

---

(۱) تقدم تخريجه عن: (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۰، كتاب الجنائز، مطلب في الثواب على المصيبة، بيروت ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: ص ۶۱۷، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، بيروت)

(۲) إن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره، صلاة، أو صوما، أو صدقة، أو غيرها عند أهل السنة والجماعة. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۲۷۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: الاتحاد- ديوبند)

(۳) أنس بن مالك، قال: سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم بأبي وأمي يا رسول الله، إنا لندعوا لموتانا ونتصدق ونحج عنهم فهل يصل ذلك إليهم؟ فقال: (إنه يصل إليهم ويفرحون به كما يفرح أحدكم بالطبق إذا أهدي إليه). (هدية الأحياء للأموات وما يصل إليهم من النفع والثواب على ممر الأوقات- أبو الحسن عليّ بن أحمد الهكّاري (م: ۴۸۶ھ) ص: ۱۷۷، باب الدليل على أن ثواب قراءة القرآن ... الخ، ★ الكلام على وصول القراءة للميت- محمد بن إبراهيم، ابن أبي السرور المقدسي الحنبلي (م: ۶۷۶ھ) ص: ۲۲۳، ☆ نفحات النسمات في وصول إهداء الثواب للأموات- أحمد بن إبراهيم السروجي، (م: ۷۱۰ھ) ص: ۲۹۱) یہ تینوں رسالے "أبو عبد الرحمن شوكت بن رفقي شحالتوغ" کی تحقیق کے ساتھ "الدار الأثرية" سے شائع کیے گئے ہیں، جو اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں ایصالِ ثواب پر متعدد دلائل جمع کیے گئے ہیں، فمن شاء التفصيل يطالع ثمة.)

(مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م: ۸۵۵ھ): ۳/ ۱۱۹، كتاب الوضوء، باب بعد: باب الوضوء من غير حدث، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت ☆ فتح القدير- ابن همام: ۳/ ۱۴۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر- بيروت)

إن سعد بن عبادة رضي الله عنه توفيت أمه وهو غائب عنها، فقال: يا رسول الله، إن أمي توفيت وأنا غائب عنها، أينفعها شيء إن تصدقت به عنها، قال: نعم، قال فإني أشهدك أن حائطي المخراف صدقة عليها. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۸۶، كتاب الوصايا، باب إذا قال: أرضي أو بستاني صدقة، ط: البدر- ديوبند)

(وانظر سنن أبي داؤد: ۲/ ۳۹۹، رقم: ۲۸۸۲، كتاب الوصايا، باب ما جاء فيمن مات عن غير وصية يتصدق عنه، ط: مكتبة الاتحاد- ديوبند ☆ سنن الترمذي: ۱/ ۳۵، رقم: ۶۶۹، أبواب الزكاة، باب ما جاء في الصدقة عن =

[۳۴] قرآن خوانی کے بعد ناشتہ کروانا

۲۳۸-سوال: بہت سی جگہوں پر ایصالِ ثواب کے لیے ختم قرآن کی مجلس کے بعد قرآن پڑھنے والوں کو دودھ اور بسکٹ وغیرہ کا ناشتہ کرایا جاتا ہے، قرآن خوانی کروانے والا اگر پڑھنے کا عوض سمجھ کر نہ کھلائے، بل کہ اپنے گھر کا مہمان سمجھ کر کھلائے، تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ناشتہ اگر کسی خاص رسم کی بنیاد پر نہ ہو اور میت کے مال میں سے بھی نہ ہو؛ بل کہ عاقل، بالغ آدمی اپنی مرضی سے اپنے مال سے غرباء کو یہ ناشتہ کروا رہا ہو، تو جائز ہے، تاہم بہتر یہی ہے کہ قرآن خوانی کی مجلس میں اس طرح کھانے پینے اور کھلانے پلانے سے احتراز کیا جائے؛ اس لیے کہ یہ موقع غم وحزن کا ہے؛ خوشی و مسرت کا نہیں ہے، اور کھانا پینا خوشی ومسرت کے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔(۱) اگر ناشتہ وغیرہ نہ کروا کر اتنی رقم تنگدستوں، یتیموں اور بیواؤں پر بہ نیت ایصالِ ثواب صدقہ کر دے، تو زیادہ بہتر ہوگا، ناشتہ اور اس طرح کی غیر ضروری چیزیں ہی آگے چل کر معاشرے میں غلط رسومات کا سبب بن جاتی ہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] مجلس مولود میں عورتوں کی شرکت

۲۳۹-سوال: میلاد النبی ﷺ کے دن چند عورتیں جمع ہو کر میلاد پڑھتی ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ اگر سلام پڑھتی ہوں اور زور سے پڑھتی ہوں، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نماز جیسی عبادت کے لیے حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ عورت کی نماز اس کے گھر میں ہی

= الميت، ط: فيصل - ديوبند ☆ سنن ابن ماجة: ص ۱۵۴، رقم: ۲۱۳۲- ۲۱۳۳، كتاب الكفارات، باب من مات وعليه نذر، ط: مكتبة الاتحاد - ديوبند)

عن أبي طلحة أن النبي - صلى الله عليه وسلم - ضحى بكبشين أملحين، فقال عند الذبح الأول: "عن محمد و آل محمد" وقال عند الذبح الثاني: "عمن آمن بي و صدق من أمتي". (مسند أبي يعلى الموصلي: ۳/۱۱، رقم: ۱۴۱۷، ط: دار المامون - دمشق ☆ انظر المعجم الكبير للطبراني، رقم: ۴۷۳۶، و كنز العمال، رقم: ۱۲۶۹۵)

(۱) و يكره اتخاذ الضيافة من الطعام من أهل الميت؛ لأنه شرع في السرور، لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۰، باب صلاة الجنازة، مطلب في الثواب على المصيبة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ مراقي الفلاح، ص: ۲۲۸، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ط: المكتبة العصرية)

بہتر ہے۔ (۱)

تو میلا د وغیرہ کے لیے، جس کا ثبوت شریعت میں نہیں ہے، عورت کا نکلنا کیسے جائز ہو سکتا ہے، جب کہ اس میں بے شمار مفاسد ہیں۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۶] عبد الوہاب نجدیؒ اور بدعات سے متعلق بعض سوالات

۲۴۰-سوال: جماعت المسلمین قصبہ سنگمیشور ضلع: رتنا گیری، شافعی جماعت) اس جماعت میں چند لوگوں میں تفرقہ بازی ہو چکی ہے اور گاؤں کی حالت بہت نازک ہے۔ اس جماعت میں چند لوگ حاجی ہیں، تفرقہ کی وجہ چند امور ہیں، جنہیں نیچے درج کر رہا ہوں، مجھے قوی امید ہے کہ حضرت والا ان سوالوں کے جواب دے کر جھگڑے ختم فرمائیں گے، واضح رہے کہ یہ جھگڑے آپ کے جواب ہی کی وجہ سے مٹ سکتے ہیں۔ یہاں کی آبادی کم سے کم چھ سو ہے۔ آپ جواب دے کر ممنون و مشکور فرمائیں گے:

(۱) وہابی مذہب کیا ہے؟ (۲) مذہب کی کون سی کتاب پڑھنا چاہیے؟ کتاب لکھنے والوں کے نام اور اگر وہ ممبئی سے خریدی جائیں، تو کہاں سے خریدنا چاہیے، اس کی صراحت فرمادیں۔ (۳) ولی اللہ کا عرس، نیاز کرنا، منت مانگنا، گانا بجانا (سماع) کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور عرس کرنا ہو، تو کیا نکالنا چاہیے؟ (۴) گاؤں کے امام صاحب کا ولی کی درگاہ پر جا کر نیاز کرنا (یعنی لوگوں کے لائے ہوئے ناریل اور مٹھائی پر فاتحہ دینا یعنی

---

(۱) عن عبد الله، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: صلاة المرأة في بيتها أفضل من صلاتها في حجرتها، وصلاتها في مخدعها أفضل من صلاتها في بيتها. (سنن أبي داؤد: ۱/ ۸۴، رقم الحديث: ۵۷۰، باب التشديد في ذلك، ط: البدر - ديوبند)

(۲) ثم انظر رحمنا الله وإياك إلى مخالفة السنة ما أشنعها، ألا ترى أنهم لما ابتدعوا فعل المولد على ما تقدم، تشوفت نفوس النساء لفعل ذلك، وقد تقدم ما في مولد الرجال من البدع والمخالفة للسلف الماضين - رضي الله عنهم - أجمعين فكيف إذا فعله النساء لا جرم أنهن لما فعلنه ظهرت فيه عورات جملة ومفاسد عديدة، فمنها ما تقدم في مولد الرجال من أنه يكون بعض النساء ينظر إلى الرجال، فيقع ما يقع من التشويش بين الرجل وأهله بسبب ذلك كما تقدم.

الوجه الثاني: أنهن اقتدين بالرجال في الذكر جماعة برفع أصواتهن كما يفعل الرجال. وقد تقدم منع ذلك في أول الكتاب بأدلته سيما وأصوات النساء فيها من الترخيم، والنداوة، ما هو فتنة في الغالب في الواحدة منهن فكيف بالجماعة فتكثر الفتنة في قلوب من يسمعهن من الرجال أو الشبان وأصواتهن عورة... الخ. (المدخل - ابن الحاج: ۲/ ۱۰-۱۱، المرتبة الثانية، فصل في مولد النبي والبدع المحدثة فيه، ط: دار التراث)

عرس کے دن ایک قسم کی مجاورگیری کرنا) درست ہے یا نہیں؟ اور ان کے پیچھے نماز درست ہوگی یا نہیں؟ (۵) ولی اللہ کی درگاہ پر جانا درست ہے یا نہیں؟ اور اگر جانا درست ہے، تو وہاں جا کر فاتحہ پڑھنا یا کوئی دعا پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ (۶) میت کو قبر میں اتارنے کے بعد قل کی مٹی دینا کیسا ہے؟ درست ہے یا سنت ہے یا واجب ہے یا ممنوع؟ (۷) میت کو کفن میں باندھنے کے بعد دوبارہ کفن کھول کر میت کا دیدار کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور قبر میں اترنے سے پہلے کفن کھول کر دیدار کرنا درست ہے یا نہیں؟ (۸) قبر پر پھول چڑھانا، پانی ڈالنا، فاتحہ دینا یا کسی قسم کا پودا لگانا درست ہے یا نہیں؟ (۹) محرم میں تعزیہ نکالنا، ناچنا، بجانا درست ہے یا نہیں؟ ان سوالوں کا جواب برائے مہربانی آسان اردو میں دیں، تاکہ ہم سب بہ آسانی سمجھ سکیں، اردو ہماری مادری زبان نہیں ہے، ہماری مادری زبان مراٹھی ہے؛ اس لیے آسان اردو کا سمجھنا ممکن ہے، مجھے امید ہے کہ آپ ان سوالوں کے جواب جلد از جلد دیں گے اور جو نیچے پتے لکھے ہوئے ہیں، ان سبھوں کے نام ایک ایک کاپی روانہ کرنا آپ کی عین نوازش ہوگی۔ میں اس خط کے ہمراہ پوسٹ کے ٹکٹ بھی روانہ کر رہا ہوں، اگر اس سے بھی زیادہ خرچہ ہو، تو اطلاع دینا۔ پیسہ روانہ کردوں گا۔

اسحاق بالاسوزک

الجواب حامداومصلیا:

اللہ تعالیٰ نے آپ حضرات کو حق کی تحقیق کی توفیق بخشی؛ اس کے لیے آپ حضرات قابل مبارک باد ہیں، آپ کے سوالات کے جوابات کو نمبر وار لکھنے سے پہلے ایک تمہید بیان کرتا ہوں، امید ہے کہ حق تعالیٰ حق تک پہنچنے کی توفیق عنایت فرمائیں گے، آمین۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے ۷۳ر فرقے ہوں گے، تمام جہنم میں جائیں گے، صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا۔ صحابہ نے پوچھا کہ وہ کون سا فرقہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ جس پر میں اور میرے صحابہ قائم ہیں۔ (مشکوۃ صفحہ ۳۰)[1]

دوسری حدیث طویل ہے، جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو میرے بعد

[۱] عن عبد اللہ بن عمرو، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم... إن بني إسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملة، وتفترق أمتي علی ثلاث وسبعین ملة، کلهم في النار إلا ملة واحدة. قالوا: ومن هي یا رسول اللہ؟ قال: ما أنا علیه وأصحابي. (سنن الترمذي: ۲/ ۹۲، رقم الحديث: ۲۶۴۱، أبواب الإيمان، ما جاء في افتراق هذه الأمة، ط: البدر-دیوبند☆سنن أبي داؤد: ۲/ ۶۳۱، رقم الحديث: ۴۵۹۷، کتاب السنة، باب شرح السنة، ط: الأشرفیة-دیوبند)

زندہ رہے گا، وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا، تو اس وقت تم لوگ میرے اور خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑنا اور مضبوطی سے تھامے رکھنا اور نئے کاموں کے ایجاد کرنے سے بچنا؛ کیوں کہ ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (مشکوۃ صفحہ ۳۰)

حضرت عائشہؓ رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ جو ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کرے، تو وہ مردود ہے۔ (بخاری صفحہ ۲۷ مشکوۃ مالک بن انسؓ)[۲]

موطا امام مالکؒ میں مرسلاً روایت ہے کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، جب تک انہیں پکڑے رہوگے، گمراہ نہیں ہوگے: (۱) کتاب اللہ (۲) میری سنت (مشکوۃ صفحہ ۳۱)[۳]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص سنت کی پیروی کرنا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ جو لوگ وفات پاگئے ہیں ان کے طریقے کو اختیار کرے؛ اس لیے کہ جو لوگ زندہ ہیں، ان سے ہم لوگ مامون نہیں ہیں کہ کہیں وہ فتنہ میں مبتلا نہ ہوجائیں، وہ کون لوگ ہیں وفات پانے والے؟ رسول اللہ کے اصحاب ہیں، ان کی بتائی ہوئی راہ کو لازم پکڑو۔ (مشکوۃ)[۴]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو خرابی، بربادی اور ہلاکت سے محفوظ رکھنے کے لیے تاکید کے ساتھ مختلف طریقوں سے یہ بات بیان فرمائی ہے کہ قرآن مجید اور میری سنت کو

(۲) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور، فالصلح مردود، ط: البدر - ديوبند)

(۳) عن مالك أنه بلغه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: تركت فيكم أمرين، لن تضلوا ما تمسكتم بهما: كتاب الله وسنة نبيه. (موطا امام مالك: ۲/ ۸۹۹، كتاب القدر، باب النهي عن القول بالقدر)

(۴) عن ابن مسعود - رضي الله عنه - قال: من كان مستنا، فليستن بمن قد مات، فإن الحي لا تؤمن عليه الفتنة، أولئك أصحاب محمد - صلى الله عليه وسلم - كانوا أفضل هذه الأمة: أبرها قلوبا، وأعمقها علما، وأقلها تكلفا، اختارهم الله لصحبة نبيه، ولإقامة دينه، فاعرفوا لهم فضلهم، واتبعوهم على أثرهم، وتمسكوا بما استطعتم من أخلاقهم وسيرهم، فإنهم كانوا على الهدى المستقيم. (مشكوة المصابيح: ۱/ ۳۲، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، بحوالہ رزين، ط: فيصل پبليكيشنز، ديوبند☆حلية الأولياء وطبقات الأصفياء-أبو نعيم الأصبهاني (م: ۴۳۰هـ): ۱/ ۳۰۵، مواظبته على قيام الليل، عن ابن عمر رضي الله عنه، ط: السعادة - بجوار محافظة مصر☆شرح السنة-البغوي: ۱/ ۲۱۴، رقم: ۱۰۵، كتاب الإيمان، باب رد البدع والأهواء)

اور اصحاب کے طریقہ کو لازم پکڑو، ان پر عمل کرنے سے تم ہلاکت سے بچ سکتے ہو، میرے طریقے کو چھوڑ کر ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔

(۱) قبروں کی زیارت کی رسول اللہ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی ہے کہ یہ آخرت کی یاد دلاتی ہے اور دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرض الموت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت فرمائے؛ کیوں کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد بنالیا (بخاری)[۵]

پس قبروں کی زیارت اس لیے کی جائے کہ عبرت و نصیحت حاصل ہو، تو جائز ہے، قبرستان میں جا کر کھانا، پینا یا قبروں کو بوسہ دینا یا سجدہ کرنا؛ یہ تمام مکروہ تحریمی ہے۔ (۶)

عرس کا ثبوت رسول اللہ ﷺ، صحابہ، تابعین اور ائمہ اربعہ میں سے کسی سے نہیں ہے، حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اپنے گھروں کو قبر مت بنانا اور میری قبر کو عید مت بنانا۔ (نسائی شریف)[۷]

اس حدیث کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ میری قبر کی زیارت کو عید کے مانند مت بناؤ کہ عید تو خوشی ہے اور زیارت سے مقصد آخرت کو یاد دلانا ہے، پس عرس کرنا، عرس میں جانا اور عرس کرنے والوں کی مدد کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ (۸)

---

[۵] عن عائشة رضي الله عنها، عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال في مرضه الذي مات فيه: لعن الله اليهود والنصارى، اتخذوا قبور أنبيائهم مسجدا. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۷۷، رقم الحديث: ۱۳۳۰، باب ما يكره من اتخاذ المساجد على القبور، ط: البدر - ديوبند)

(۶) والمستحب في زيارة القبور أن يقف مستدبر القبلة مستقبلا بوجهه الميت وأن يسلم ولا يمسح القبر ولا يمسه ولا يقبله فإن ذلك من عادة النصارى. (إحياء علوم الدين - أبو حامد محمد بن محمد الغزالي الطوسي (م: ۵۰۵هـ): ۴/ ۴۹۱، بيان زيارة القبور والدعاء للميت وما يتعلق به، ط: دار المعرفة - بيروت)

[۷] عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تجعلوا بيوتكم قبورا، ولا تجعلوا قبري عيدا. (سنن النسائي: ۲/ ۲۱۸، رقم الحديث: ۲۰۴۲، باب زيارة القبور، ط: المكتبة العصرية، صيدا - بيروت)

(۸) ولا تجعلوا قبري عيدا هو واحد الأعياد، أي لا تجعلوا زيارة قبري عيدا، أو لا تجعلوا قبري مظهر عيد، فإنه يوم لهو، وسرور، وحال الزيارة خلاف ذلك. (مرقاة المفاتيح: ۴/ ۱۲، باب الصلاة على النبي وفضلها)

(۱) محمد بن عبد الوہاب نجد میں پیدا ہوئے، مذہبا حنبلی تھے، مزاج میں شدت تھی؛ اس لیے خوارج کی طرح اکثر مسلمانوں کو مشرک کہتے تھے اور ان کی جان اور ان کے مال کو مباح قرار دیتے تھے۔ (۹)

(۲) ہماری مذہبی کتاب تو قرآن مجید ہے اور اس کے بعد احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ان کی روشنی میں بہت سے علماء نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، بچوں کو پڑھانے کے لیے تعلیم الاسلام (مؤلفہ: مفتی کفایت اللہ صاحبؒ) بہشتی زیور (از: حضرت تھانویؒ صاحب) اور تاریخ اسلام (از مولانا محمد میاںؒ) عمدہ کتابیں ہیں۔

(۳) ناجائز اور حرام ہے، تمہیدی بیان سے بات سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ (۱۰)

(۴) مجاوری کرنا درست نہیں، ناجائز ہے، ایسا امام فاسق ہے، ایسے امام کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے، اگر اس سے اچھا امام موجود ہو، ورنہ مکروہ بھی نہیں۔ (۱۱)

---

(۹) فتاویٰ رشیدیہ میں ہے: محمد عبد الوہاب کو لوگ وہابی کہتے ہیں، وہ اچھا آدمی تھا، سنا ہے کہ مذہب حنبلی رکھتا تھا اور عامل بالحدیث تھا، بدعت وشرک سے روکتا تھا، مگر تشدد اس کے مزاج میں تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ رشیدیہ از تالیفات رشیدیہ، مسائل منثورہ، محمد عبد الوہاب نجدی کا مذہب، ص: ۲۴۱-۲۴۲، ادارہ اسلامیات لاہور)

قال الشامي: كما وقع في زماننا في أتباع عبد الوهاب الذين خرجوا من نجد، وتغلبوا على الحرمين، وكانوا ينتحلون مذهب الحنابلة، لكنهم اعتقدوا أنهم هم المسلمون، وأن من خالف اعتقادهم مشركون، واستباحوا بذلك قتل أهل السنة، وقتل علمائهم حتى كسر الله تعالى شوكتهم وخرب بلادهم، وظفر بهم عساكر المسلمين، عام ثلاث وثلاثين ومائتين وألف. (رد المحتار: ۴/ ۲۶۲، كتاب الجهاد، باب البغاة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱۰) ثم انظر رحمنا الله وإياك إلى مخالفة السنة ما أشنعها ألا ترى أنهم لما ابتدعوا فعل المولد على ما تقدم تشوفت نفوس النساء لفعل ذلك، وقد تقدم ما في مولد الرجال من البدع والمخالفة للسلف الماضين - رضي الله عنهم - أجمعين، فكيف إذا فعله النساء لا جرم أنهن لما فعلنه ظهرت فيه عورات جملة ومفاسد عديدة فمنها ما تقدم في مولد الرجال من أنه يكون بعض النساء ينظر إلى الرجال فيقع ما يقع من التشويش بين الرجل وأهله بسبب ذلك كما تقدم.

الوجه الثاني: أنهن اقتدين بالرجال في الذكر جماعة برفع أصواتهن كما يفعل الرجال. وقد تقدم منع ذلك في أول الكتاب بأدلته سيما وأصوات النساء فيها من الترخيم، والنداوة ما هو فتنة في الغالب في الواحدة منهن فكيف بالجماعة فتكثر الفتنة في قلوب من يسمعهن من الرجال أو الشبان وأصواتهن عورة... الخ. (المدخل-ابن الحاج: ۲/ ۱۰-۱۱، المرتبة الثانية، فصل في مولد النبي والبدع المحدثة فيه، ط: دار التراث)

(۱۱) وكره إمامة العبد والأعرابي والفاسق والمبتدع والأعمى وولد الزنا... وفي السراج الوهاج، فإن قلت: فما الأفضلية أن يصلي خلف هؤلاء أو الانفراد؟ قيل أما في حق الفاسق فالصلاة خلفه أولى لما ذكر في الفتاوى كما=

(۵) وقت مقرر کیے بغیر مسنون طریقہ پر دعاء و فاتحہ خوانی جائز ہے۔ [۱۲]

(۶) ناجائز ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ [۱۳]

البتہ میت کو تختے یا پتھر سے ڈھانکنے کے بعد تدفین میں شریک لوگوں کو تین لپ بھر کر منقول دعا کے ساتھ مٹی ڈالنا مسنون ہے۔ [۱۴]

(۷) جائز ہے، مگر اس پر اہتمام غلط بات ہے۔ [۱۵]

(۸) پانی ڈالنا جائز ہے تا کہ برابر ہو جائے۔ [۱۶]

(۹) تعزیہ داری حرام ہے۔ [۱۷] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=قدمناه، وأما الآخرون فيمكن أن يكون الانفراد أولى لجهلهم بشروط الصلاة، ويمكن أن يكون على قياس الصلاة خلف الفاسق والأفضل أن يصلي خلف غيرهم اهـ.

فالحاصل أنه يكره لهؤلاء التقدم، ويكره الاقتداء بهم كراهة تنزيه، فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم، فهو أفضل، وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد، وينبغي أن يكون محل كراهة الاقتداء بهم عند وجود غيرهم وإلا فلا كراهة كما لا يخفى. (البحر الرائق: ۱/ ۳۶۹-۳۷۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۱۲) الأصل في هذا الباب أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوما أو صدقة أو غيرها عند أهل السنة والجماعة. (الهداية: ۱/ ۱۷۸، باب الحج عن الغير، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۱۳) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح ... الخ)

(۱۴) ويستحب لمن شهد دفن ميت أن يحثو في قبره ثلاث حثيات من التراب بيديه جميعا، ويكون من قبل رأس الميت، ويقول في الحثية الأولى {منها خلقناكم}، وفي الثانية {وفيها نعيدكم}، وفي الثالثة {ومنها نخرجكم تارة أخرى}. (الجوهرة النيرة: ۱/ ۱۰۹، باب الجنائز، ط: المطبعة الخيرية)

(۱۵) من أصر على أمر مندوب وجعله عزما، ولم يعمل بالرخصة، فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال، فكيف من أصر على بدعة أو منكر. (مرقاة المفاتيح: ۳/ ۳۱، باب الدعاء في التشهد، رشيديه كوئته)

(۱۶) (قوله ولا بأس برش الماء عليه) بل ينبغي أن يندب لأنه - صلى الله عليه وسلم - فعله بقبر سعد كما رواه ابن ماجة وبقبر ولده إبراهيم كما رواه أبو داود في مراسيله وأمر به في قبر عثمان بن مظعون كما رواه البزار. (رد المحتار: ۲/ ۲۳۷، كتاب الجنائز، مطلب في دفن الميت) پھول نہ ڈالے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۹/ ۱۷۱)

(۱۷) تعزیہ داری در عشرۂ محرم یا غیر آں، و ساختن ضرائح و صورت قبور، و علم تیار کردن و غیر ذالک ایں ہمہ امور بدعت است، نہ در قرن اول بود، نہ در قرن ثانی، نہ در قرن ثالث۔ (مجموعۃ الفتاوی علی ہامش خلاصۃ الفتاوی، کتاب الکراہیۃ، باب ما یحل استعمالہ وما لا یحل: ۴/ ۳۴۴، ط: امجد اکیڈمی لاہور☆ وکذا فی فتاویٰ عزیزی (فارسی) ۱/ ۵۷، مسئلہ تعزیہ داری محرم و صورت، ط: کتب خانہ رحیمیہ - دیوبند)

[۳۷] نیاز کا کھانا اور اس کے لیے چندہ کرنا

۲۴۱-سوال: ہمارے گاؤں میں عیدِ میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دیگر بزرگوں کے نیاز کے طور پر کھانے کا انتظام ہوتا ہے، اُس کے لیے لوگوں میں چندہ کیا جاتا ہے، بعض لوگ اُس میں زکوۃ کی رقم دیتے ہیں، یا پہلے غریب کو دے کر واپس خود لے لیتے ہیں، پھر چندہ میں لکھواتے ہیں، اور اُس کھانے کے پروگرام میں مال دار اور سید لوگ بھی شریک ہوتے ہیں، تو وہ اُس کو کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامدًا ومصلّیا:

دن اور تاریخ طے کر کے نیاز کھلانا جائز نہیں ہے، حرام ہے، اُس کے لیے چندہ لینا اور دینا جائز نہیں ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۸] ستائیس رمضان المبارک کی شب میں شیرینی تقسیم کرنا

۲۴۲-سوال: ستائیسویں رمضان کو شیرینی تقسیم کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامدًا ومصلّیا:

ثواب سمجھ کر تقسیم کی جائے، تو بدعت ہے، ورنہ کسی بھی دن شیرینی تقسیم کی جا سکتی ہے، عوام ستائیسویں کو قرآنِ پاک ختم کرنے اور شیرینی تقسیم کرنے کو ضروری خیال کرتے ہیں، اس لیے یہ چیزیں جائز نہیں ہیں۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قال ابن الهمام: ويكره اتخاذ الضيافة من آهل الميت؛ لأنه شرع في السرور لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة. (فتح القدير: ۲/ ۱۴۲، قبیل باب الشهيد، ط: دار الفكر - بيروت)

سوم و دہم و چہلم وغیرہ بدعات و ماخوذ از کفار ہنود است ۔ ۔ ۔ ترک چنیں رسوم واجب است کہ: "من تشبه بقوم فهو منهم" و ہرگاہ طعام بہ چنیں بدعات متلبس شد، بہتر آں کہ ایں چنیں طعام نہ خوردہ شود کہ: "دع ما يريبك إلى ما لا يريبك". (امداد الفتاویٰ: ۲۶۰-۲۶۱، کتاب البدعات، عنوان "فاتحہ رسمی")

(۲) كل مباح يؤدي إلى زعم الجهال سنية أمر، أو وجوبه فهو مكروه، كتعيين السورة للصلاة، وتعيين القراءة لوقت. (تنقيح الفتاوى الحامدية: ۲/ ۳۶۷، ط: حاجي عبد الغفار، قندهار، افغانستان)

وكذا الحكم في الإصرار على المندوب: كما في المرقاة على شرح المشكاة: ۳/ ۲۶، باب الصلوة، تحت حديث ابن مسعود رضي الله تعالى عنه، في التزام الانصراف عن اليمين بعد الصلوة، ط: مكتبه فيصل - ديوبند)

[۳۹] فاتحہ خوانی، چہلم کرنا اور اس کے کھانے کے بعد دعا کرنا

۲۴۳–سوال: چہلم کرنا اور اُس کے کھانے کے بعد دعا کرنا کیسا ہے؟ فاتحہ خوانی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

چہلم کرنا، کھانا کھلانے کے بعد دعا کرنا، اُس کے لیے مجبور کرنا اور مروجہ فاتحہ کرنا؛ یہ تمام امور ناجائز ہیں، صدقات وخیرات کے لیے فاتحہ اور دعاء کی ضرورت نہیں ہوتی اور بغیر فاتحہ کے بھی ثواب ملتا ہے، اسی طرح دِن اور تاریخ کو خاص کیے بغیر کھانا کھلانے سے بھی ثواب پہنچ جاتا ہے، اس لیے تاریخ ودِن کو خاص کرنا اور اُس کے بعد فاتحہ اور دعا کرنا؛ یہ ایسے امور ہیں جو لازمی اور ضروری نہیں ہیں، لہٰذا لزوم والتزام کی وجہ سے بدعت میں داخل ہو کر حرام ہوں گے۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۰] تدفین کے بعد دعوت اور فاتحہ خوانی

۲۴۴–سوال: میت کی تدفین کے بعد دعوت کرنا اور فاتحہ پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جتنے لوگ میت کے غسل دینے میں شریک ہوں، ان کو کھلانا جائز ہے اور جو باہر سے آنے والے مہمان ہیں، ان کو بھی کھلانا جائز ہے۔ [۲] البتہ میت کے مرنے کے بعد جو مال موجود ہے، اس مال

---

(۱) ويكره اتخاذ الضيافة في أيام المصيبة؛ لأنها أيام غم، فلايليق فيها مايختص باظهار السرور، وإن اتخذطعاما للفقراء كان حسناً. (الفتاوى البزازية على هامش الهندية: ٦/ ٣٧٩، كتاب الكراهية، رشيديه- كوئته)

وقال في البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول، والثالث، وبعد الأسبوع. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ٣٣٩، فصل في حملها، و دفنها)

قال العلامة المناوي رحمه الله تعالى تحت حديث: من أحدث في أمرنا هذا": أي أنشأ واخترع وأتى بأمر حديث من قبل نفسه... (ماليس منه) أي رأياليس له في الكتاب، أو السنة، عاضد ظاهر أو خفي، ملفوظ أو مستنبط (فهورد) أي مردود على فاعله لبطلانه. (فيض القدير: ١١/ ٥٥٩٢، رقم الحديث: ٨٣٣٣، مكتبة نزار مصطفى الباز- رياض)

(۲) حضرت مفتی نظام الدین اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: دفن کے لیے باہر سے آنے والے اگر محض اتفاق سے یا اہل میت کی دل جوئی کے لیے ان کے کھانے وغیرہ میں شریک ہو جاویں، تو گنجائش ہو سکتی ہے؛ لیکن اعزہ کا دور دور سے آ کر قیام پذیر ہونا، جیسا کہ رواج ہے، مثل دعوت سرور مجتمع ہونا؛ یہ سب مکروہ وبدعت ہے۔ (نظام الفتاویٰ: ۱/ جز ۲، ص: ۱۳۶، ط: تاج پبلشنگ ہاؤس، دیوبند)

میں سے وارثین کی اجازت کے بغیر کھلانا پلانا جائز نہیں۔ [۱] اسی طرح مذکورین کے علاوہ کو میت کا کوئی رشتہ دار خود کے مال سے کھلائے تو بھی جائز نہیں۔ [۲] اور فاتحہ کا جو رواج ہے، اس میں بھی کھانا کھلانا جائز نہیں۔ [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۱] کسی بزرگ کے نام کی فاتحہ خوانی کر کے شیرینی تقسیم کرنا

۲۴۵-سوال: ایک شخص ہر جمعرات کو ایک بزرگ کے نام کی فاتحہ پڑھتا ہے، اس کے بعد وہ شیرینی تقسیم کرتا ہے، تو کیا اس طرح فاتحہ خوانی کرنا اور لوگوں میں شیرینی تقسیم کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

سورہ فاتحہ یا قرآن کریم کی کسی آیت کو پڑھ کر مرحومین کو اور بالخصوص بزرگان دین کو ایصال ثواب کرنا جائز ہے۔ [۴] لیکن اس کے لیے کسی دن یا تاریخ کو پہلے سے متعین کر لینا درست نہیں ہے۔ [۵] اس موقع پر شیرینی تقسیم کرنے کا کیا مطلب؟؟؟ اگر تقسیم کرنے والا یہ سمجھتا ہو کہ شیرینی تقسیم کیے بغیر مرحومین

---

(۱) اس لیے کہ اس مال سے ورثاء کا حق متعلق ہو چکا ہے اور کسی کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف جائز نہیں، ارشاد نبوی ہے: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفسه. (سنن الدار قطني-أبو الحسن علي بن عمر البغدادي الدارقطني (م:۳۸۵ھ): ۳/ ۴۲۴، كتاب البيوع، رقم الحديث: ۲۸۸۵، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت، الطبعة الأولى: ۱۴۲۴ھ-۲۰۰۴ء ☆مسند أبي يعلى-أبو يعلى أحمد بن علي التميمي، الموصلي (م:۳۰۷ھ): ۳/ ۱۴۰، رقم الحديث: ۱۵۷۰، مسند عم أبي حرة الرقاشي، ط: دار المأمون للتراث، دمشق ☆مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۳۴/ ۲۹۹، رقم الحديث: ۲۰۶۹۵، مؤسسة الرسالة)

(۲) ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من أهل الميت؛ لأنه شرع في السرور لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة. (رد المحتار: ۲/ ۲۴۰، باب صلاة الجنائز، مطلب في الثواب على المصيبة، ط دار الفكر، بيروت، الطبعة الثانية: ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء ☆مراقي الفلاح، باب أحكام الجنائز وفصل في حملها ودفنها، ط: المكتبة العصرية، الطبعة الأولى)

(۳) دیکھئے نظام الفتاویٰ: ۱/ جزء ۲ ص: ۱۴۵، ط: تاج پبلشنگ ہاؤس دیوبند۔

(۴) والأصل فيه: أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوما أو صدقة أو قراءة قرآن أو ذكرا أو طوافا أو حجا أو عمرة أو غير ذلك عند أصحابنا للكتاب والسنة. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري (م:۹۷۰ھ): ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆مزید دیکھیے: حاشية الطحطاوي: ص ۶۲۲، كتاب الجنائز، فصل في زيارة القبور ☆رد المحتار: ۲/ ۲۴۳، باب صلاة الجنائز، مطلب في زيارة القبور ☆الهداية: ۱/ ۲۷۶، كتاب الحج، باب الحج في الغير، ط: مكتبة الاتحاد ديوبند)

(۵) تقدم تخريجه عن: (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۰، كتاب الجنائز، مطلب في الثواب على المصيبة، بيروت ☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: ص ۶۱۷، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، بيروت)

اور بزرگان دین کو ثواب پہنچ ہی نہیں سکتا ہے، تو ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے؛ مرحومین کے ایصال ثواب کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کچھ پڑھ کر ان کو اس کا ثواب پہنچا دیا جائے۔(۱) اور اگر مال و اسباب صرف کر کے ثواب پہنچانا ہے، تو اس کے لیے مصرف یتامیٰ، غرباء، مساکین اور بیوگان ہیں۔(۲) کہ ان کو خاموشی کے ساتھ کچھ دے دیں۔(۳) اس سے ثواب بھی مل جائے گا، مال و دولت اور روپے پیسوں پر فاتحہ خوانی کر کے ان کی خیرات کرنا صحیح نہیں ہے، نیز اگر کوئی شخص شیرینی پر فاتحہ خوانی کو ضروری سمجھ کر کرے، تو اس کا یہ عمل ناجائز ہے۔(۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ (۱۱/ ۶/ ۱۹۷۷ء)

(۱) اگر مرحوم کے ثواب کی نیت سے پڑھے تو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر بغیر نیت کے پڑھے، تو بعد میں یہ دعاء کرے: اے اللہ! اس کا ثواب فلاں مرحوم کو پہنچا دیجیے:

السنة لم تشترط التلفظ بالإهداء في حديث واحد بل أطلق -صلى الله عليه وسلم- الفعل عن الغير كالصوم والحج والصدقة ولم يقل لفاعل ذلك وقل اللهم هذا عن فلان بن فلان، والله سبحانه يعلم نية العبد وقصده بعمله، فإن ذكره جاز، وإن ترك ذكره واكتفي بالنية والقصد وصل إليه ولا يحتاج أن يقول اللهم إني صائم غدا عن فلان بن فلان. (كتاب الروح -ابن قيم: ۲/ ۴۹۶، المسألة السادسة عشرة، هل تنتفع أرواح الموتى بشيء من سعي الاحياء أم لا؟ فصل فان قيل فهل تشترطون في وصول الثواب الخ، ط: دار ابن تيمية للنشر والتوزيع، الرياض)

(۲) (الوصية المطلقة لا تحل للغني. (الدر المختار) لأنها صدقة، وهي على الغني حرام. (رد المحتار: ۶/ ۶۹۸، كتاب الوصايا، فصل في وصايا الذمي وغيره، فروع أوصى بثلث ماله للصلوات، ط: دار الفكر -بيروت)

(۳) قال النبي -صلى الله عليه وسلم-: «من سمع سمع الله به، ومن يرائي يرائي الله به». (صحيح البخاري: ۲/ ۹۶۲، رقم الحديث: ۶۴۹۹، كتاب الرقاق، باب الرياء والسمعة، عن جندب رضي الله تعالى عنه، ط: البدر - ديوبند)

وأخرج أيضا عن ابن عمرو قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا تصدق أحدكم بصدقة تطوعا، فليجعلها عن أبويه فيكون لهما أجرها ولا ينتقص من أجره شيئا. (شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور- جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱هـ): ص: ۳۰۰، رقم الحديث: ۳۹، في نبذ من أخبار من رأى الموتى في منامه، باب ما ينفع الميت في قبره، ت: عبد المجيد طعمة حلبي، ط: دار المعرفة -لبنان)

وأخرج أبو محمد السمرقندي في فضائل {قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ} عن علي مرفوعا: من مر على المقابر، وقرأ {قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ} إحدى عشرة مرة، ثم وهب أجره للأموات أعطي من الأجر بعدد الأموات. (المصدر السالف: ۳۰۳، باب في قراءة القرآن للميت أو على القبر، رقم الحديث: ۴)

(۴) حضرت مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلیؒ "مروجہ فاتحہ" کے سلسلے میں رقم فرماتے ہیں: ایں طور مخصوص نہ در زمان آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بود، و نہ در زمان خلفاء، بل کہ وجود آں در قرون ثلاثہ کہ مشہود لہا بالخیر اند منقول نہ شدہ، و حالاً در حرمین شریفین- زادھم اللہ تعالی شرفا- عادت خواص نیست، ...... و ایں را ضروری دانستن مذموم است۔ (مجموعۃ الفتاویٰ علی حاشیہ خلاصۃ الفتاویٰ: ۱/ ۱۹۵، کتاب الصلاۃ، ابواب الجنائز، ط: امجد اکیڈمی، لاہور)

[۴۲] فاتحہ خوانی کرنا

۲۴۶-سوال: قران خوانی کے بعد، دعاء سے پہلے سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، جو شخص سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے وہ لفظ ''الفاتحہ'' سے آغاز کرتا ہے، اس وقت دوسرے موجود لوگوں کو کیا پڑھنا چاہیے۔ فاتحہ کا مکمل صحیح طریقہ تحریر فرمادیجیے، علاوہ ازیں اگر ہم اکیلے ہی فاتحہ پڑھنا چاہتے ہوں، اس وقت ہمیں اس سے پہلے اور بعد میں کیا پڑھنا چاہیے؟ کیا فاتحہ پڑھنے کے وقت کوئی میٹھی چیز، اگربتی، لوبان کی دھونی دینا اور پانی رکھنا ضروری ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

اسلام بے جا تکلفات سے دور، ایک سادگی پسند مذہب ہے، عبادت اور بندگی میں ہر انسان کو اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کی پابندی کرنی چاہیے، عبادت کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس کی ادائیگی میں کسی دوسرے کے حکم کا انتظار کیا جائے کہ جب تک وہ حکم نہ دے، اس وقت تک اسے ادا ہی نہ کیا جائے، سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ایک عظیم عبادت ہے، اس عبادت اور بندگی کے ادا کرنے کے لیے یہ قطعاً ضروری نہیں کہ دوسرا شخص ''الفاتحہ'' کے ذریعے شروع کرے، اسی وقت آپ بھی پڑھیں، اس طرح کی بے جا قیدو پابندی اور وقت کی تعیین قرآن کریم اور حدیث پاک سے ثابت نہیں ہے، دعائے ثانی کے وقت، ختم قرآن کے وقت، نماز جنازہ کے بعد، دفن کے بعد: ''الفاتحہ'' ثابت نہیں ہے، اس لیے جو شخص مذکورہ اوقات کے ساتھ سورۂ فاتحہ کو خاص کرے گا، اسے ثواب کے بہ جائے الٹا گناہ ہوگا، آپ کو سورۂ فاتحہ اور دوسری جو بھی سورتیں یا دعائیں یاد ہوں، پڑھتے رہیے، ان شاء اللہ ثواب ملے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۳] فجر کی نماز کے بعد فاتحہ خوانی

۲۴۷-سوال: ہمارے یہاں اہل سنت والجماعت میں تفرقہ پیدا ہوگیا ہے، چند حضرات یہ چاہتے ہیں کہ نماز فجر کے بعد دعاء میں فاتحہ پڑھی جائے اور چند اس کے بالکل مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بدعت ضالہ ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ فرمان نبوی کی روشنی میں اس مسئلہ کے جواز وعدم جواز سے مطلع فرمائیں، تاکہ ہمارے درمیان اختلاف رفع ہوسکے۔

الجواب حامداو مصلیا:

خداوند قدوس کا حکم ہے: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا.[1]

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام تم کو دیے ہیں، اس کو پکڑے رکھو اور جس سے روکا ہے، اس سے رک جاؤ، قرآن شریف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، انسان اور اللہ کے درمیان واسطہ ہیں، لہٰذا جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم سے انسان کو معلوم ہو، اس پر عمل کرے اور اللہ کی خوشنودی حاصل کر کے اصلی مقام ''جنت'' کو حاصل کرے۔ حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس نے ہمارے دین کے معاملہ میں کوئی نئی چیز ایجاد کی، تو وہ مردود ہے''۔ (بخاری شریف، مسلم شریف، مشکوٰۃ شریف ص ۲۷)[۲]

اور بھلا وہ انسان– جو دین میں نئی چیز ایجاد کرے– مردود کیوں نہ ہو، جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

الیوم أکملت لکم دینکم و أتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الإسلام دیناً. [۵- المائدۃ: ۳]

کہ آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل و مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام سے میں راضی ہو گیا۔

نئی چیز کا ایجاد کرنے والا دعوے دار ہے کہ شریعت محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) میں نقص و کمی ہے، جس کی میں نے تکمیل کر دی، بتاؤ کیا حکم ہونا چاہیے اس شخص کا، جو دین محمدی میں نقص و کمی کا دعوے دار ہے۔ مردود کے علاوہ اس کا اور کوئی مقام نہیں ہو سکتا، حضرت عرباض بن ساریہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور ہماری طرف متوجہ ہوئے اور بلاغت کے ساتھ بڑی موثر انداز میں نصیحت فرمائی کہ آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے اور دل ڈر گئے، تو ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! یہ تو ایسی نصیحت تھی کہ کوئی رخصت کرنے والا آخری بات نصیحت کے طور پر کہتا ہے، تو آپ ہمیں وصیت کریں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی، اس وصیت کا آخری ٹکڑا ہے: جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا، وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا، اس وقت میرے طریقہ اور خلفاء راشدین– جو راہ راست پر چلنے والے ہوں گے– کے طریقہ کو لازم پکڑنا اور دانتوں سے کسی چیز کو پکڑنے کے مانند پکڑے رکھنا اور تم لوگ نئی بات کے ایجاد

(۱) ۵۹-الحشر: ۷.

[۲] عن عائشة رضي الله عنها، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، ط: البدر- ديوبند)

کرنے سے بچنا؛ اس لیے کہ نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مشکوۃ شریف ص: ۳۰) [۳]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کا آخری جملہ ملاحظہ ہو: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے، تمام کے تمام دوزخی ہوں گے، مگر ایک فرقہ۔ صحابہ کرامؓ نے سوال کیا: وہ کون سا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب عنایت فرمایا کہ جس راستہ پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ (ترمذی، مشکوۃ شریف ص ۳۰)

تو ان احادیث سے واضح ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بتائے ہوئے اور اختیار کیے ہوئے راستہ کے خلاف جو راستہ اختیار کیا جائے گا، وہ راستہ ضلالت و گمراہی اور اللہ کی لعنت کا موجب ہوگا۔ (۴)

اب دیکھیے! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "مروجہ فاتحہ" پڑھی ہے؟ حجۃ اللہ البالغہ (۱۲/۲) میں شاہ ولی اللہؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے بعد کی مختلف دعاؤں کو نقل کرنے بعد لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۳] حدثني عبد الرحمن بن عمرو السلمي، وحجر بن حجر، قالا: أتينا العرباض بن سارية، وهو ممن نزل فيه {ولا على الذين إذا ما أتوك لتحملهم قلت لا أجد ما أحملكم عليه} فسلمنا، وقلنا: أتيناك زائرين، وعائدين، ومقتبسين، فقال العرباض: صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات يوم، ثم أقبل علينا، فوعظنا موعظة بليغة، ذرفت منها العيون، ووجلت منها القلوب، فقال قائل: يا رسول الله، كأن هذه موعظة مودع، فماذا تعهد إلينا؟ فقال أوصيكم بتقوى الله والسمع والطاعة، وإن عبدا حبشيا، فإنه من يعش منكم بعدي، فسيرى اختلافا كثيرا، فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء المهديين الراشدين، تمسكوا بها، وعضوا عليها بالنواجذ، وإياكم ومحدثات الأمور، فإن كل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة. (سنن أبي داؤد: ۲/ ۶۳۵، رقم الحديث: ۴۶۰۷، كتاب السنة، باب في لزوم السنة، ط: البدر - ديوبند)

(وكذا في سنن الترمذي: ۲/ ۹۶، رقم الحديث: ۲۶۷۶، أبواب العلم، باب ما جاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع، ط: البدر - ديوبند)

(وفي سنن ابن ماجة: ص: ۶، رقم الحديث: ۴۲، باب اجتناب البدع والجدل، مقدمة، ط: ديوبند)

(وفي مسند أحمد: ۲۸/ ۳۷۷، رقم الحديث: ۱۷۱۴۲، مسند الشاميين، ط: مؤسسة الرسالة)

(۴) عن عبد الله بن عمرو، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ... إن بني إسرائيل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة، وتفترق أمتي على ثلاث وسبعين ملة، كلهم في النار إلا ملة واحدة. قالوا: ومن هي يا رسول الله؟ قال: ما أنا عليه وأصحابي. (سنن الترمذي: ۲/ ۹۳، رقم الحديث: ۲۶۴۱، أبواب الإيمان، ما جاء في افتراق هذه الأمة، البدر، ديوبند)

(هكذا في سنن أبي داؤد: ۲/ ۶۳۱، رقم الحديث: ۴۵۹۷، كتاب السنة، باب شرح السنة، ط: البدر - ديوبند)

مختلف اوقات میں مختلف طریقے سے دعائیں مانگتے تھے، تاکہ صحابہ کسی ایک دعاء کو لازم نہ سمجھیں، ان میں کسی جگہ بھی فاتحہ کا ذکر نہیں، بل کہ آپ ﷺ نے دعاؤں اور ذکر اللہ میں بھی مختلف طریقے اختیار فرمائے ہیں، تاکہ صحابہ ضروری نہ سمجھ لیں۔ (۵)

فجر اور عصر کی نماز کے بعد بیٹھنا اور ذکر کرنا اور دعا مانگنا جائز ہے، مگر امام کو چاہیے کہ اپنا چہرہ بدل دے، دائیں یا بائیں مڑ جائے، فاتحہ کا ذکر نہ کرے، سورہ فاتحہ لوگ جب چاہیں، پڑھیں، مگر ضروری سمجھنا اور امام کا ''الفاتحہ'' کہنا بدعت ہے۔ (۶) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۴] نمازِ جنازہ کے بعد فاتحہ پڑھنا

۲۴۸-سوال: ہمارے یہاں امام صاحب نمازِ جنازہ کے بعد جہراً فاتحہ پڑھ کر دعا کرتے ہیں، شرعی اعتبار سے اُس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نمازِ جنازہ کے بعد فاتحہ پڑھ کر دعا کرنا اور اس کو ضروری سمجھنا بدعت ہے۔ (۱) رسول اللہ ﷺ سے

---

(۵) ...فيأتي بالأذكار، لئلا يظن الظان أن الأذكار من الصلاة، ومنها أنه كان حينا بعد حين يترك الأذكار غير هذه الكلمات يعلمهم أنها ليست فريضة، وإنما مقتضى كان وجود هذا الفعل كثير لا مرة، ولا مرتين، ولا المواظبة. (حجة الله البالغة: ۱/ ۲۳۹، أذكار الصلاة وهيأتها المندوب إليها، ط: دار الكتب الحديثة-مكتبة المثنى)

(۶) ويستحب للإمام بعد سلامه أن يتحول إلى يمين القبلة. (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي: ۱/ ۳۱۳، فصل: في صفة الأذكار، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

وسجدة الشكر: مستحبة، به يفتى لكنها تكره بعد الصلاة؛ لأن الجهلة يعتقدونها سنة أو واجبة، وكل مباح يؤدي إليه فمكروه. (الدر المختار) وقال ابن عابدين: (قوله فمكروه) الظاهر أنها تحريمية، لأنه يدخل في الدين ما ليس منه. (رد المحتار: ۲/ ۱۲۰، آخر باب سجود التلاوة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) إن رسول الله-صلى الله عليه-قال: من عمل عملا ليس عليه أمرنا، فهو رد. (صحيح المسلم: ۲/ ۷۷، رقم: ۱۸-(۱۷۱۸)، كتاب الأقضية، باب: نقض الأحكام الباطلة، ورد محدثات الأمور، ط: البدر-ديوبند)

ولا يقوم الرجل بالدعاء بعد صلاة الجنازة، لأنه قد دعا مرة، لأن أكثر صلاة الجنازة الدعاء. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن امازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۰۵، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ولا يدعو للميت بعد صلاة الجنازة لأنه يشبه الزيادة في صلاة الجنازة. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۳/ ۱۲۱۳، كتاب الجنائز، المشي بالجنازة والصلاة عليها، ط: دار الفكر-بيروت)

ثابت نہیں ہے۔[1] مزید تفصیل کے لیے میری گجراتی کتاب ''احکام میت'' کا مطالعہ فرمائیں۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۵] حرام آمدنی سے قرآن خوانی کروانا

۲۴۹-سوال: زید ناجائز کاروبار کرتا ہے، جب کبھی اس کا قرآن خوانی کرانے کا ارادہ ہوتا ہے، تو وہ مؤذن صاحب کو یہ کہہ کر سو روپے دیتا ہے کہ ''اس کی شرینی لے آیئے اور قرآن خوانی کروا کر اسے سب لوگوں میں تقسیم کر دیجیے''۔ چوں کہ زید کی آمدنی ناجائز ہے، اس لیے مؤذن صاحب قرآن خوانی کرنے کے لیے یہ حیلہ اختیار کرتے ہیں کہ کسی سے سو روپے قرض لے کر قرآن خوانی کروا دیتے ہیں اور بعد میں زید کے دیے ہوئے سو روپے قرض خواہ کو ادا کر دیتے ہیں، تو اب سوال یہ ہے کہ کیا مؤذن صاحب کا یہ عمل درست ہے؟ حیلہ کر کے قرآن خوانی کرانا شرعی اعتبار سے درست ہے یا نہیں؟ حرام کام کی آمدنی سے قرآن خوانی کرنا اور اس کو کارِ ثواب سمجھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

حرام اور ناجائز کمائی سے قرآن خوانی کرنا، کروانا اور اس کو ثواب کا کام سمجھنا قطعاً جائز نہیں۔[3] مؤذن صاحب کا ایسے حرام کاروبار کرنے والے شخص کو مذکورہ حیلہ کی رہنمائی کرنا بھی جائز نہیں ہے۔[4] شیرینی لینے والے کے لیے تو گنجائش ہے، البتہ مؤذن صاحب کے لیے ایسا حیلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتاویٰ رحیمیہ ۷/۱۰۹، کتاب الجنائز، ط: دار الاشاعت، کراچی۔

(۲) احکام میت (سکرات سے فاتحہ تک کی سنن اور بدعات) مترجم اُردو، ناشر: حافظ اسجد بیات، مقیم: کینیڈا۔

(۳) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أیها الناس! إن اللہ طیب، لا یقبل إلا طیبا... الخ. (الصحیح لمسلم: ۱/۳۲۶، رقم: ۶۵-(۱۰۱۵)، کتاب الزکوۃ، باب بیان أن إسم الصدقة یقع علی کل... الخ، ط: البدر دیوبند)

قال شیخنا: ویستفاد من کتب فقهائنا کالهدایة وغیرها: أن من ملك بملك خبیث، ولم یمکنه الرد إلی المالك، فسبیله التصدق علی الفقراء... قال: إن المتصدق بمثله ینبغي أن ینوي به فراغ ذمته، ولا یرجو به المثوبة. (معارف السنن: ۱/۳۴، أبواب الطهارة، باب ما جاء لا تقبل صلاة بغیر طهور، م: سعیدیه)

إنما یکفر إذا تصدق بالحرام القطعي. قال الشامي: أي مع رجاء الثواب الناشي عن استحلاله. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۹۲، کتاب الزکاة، باب زکاة الغنم، ط: دار الفکر - بیروت)

(۴) وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [۵-المائدة: ۲]

فالحاصل: أن ما یتخلص به الرجل من الحرام أو یتوصل به إلی الحلال من الحیل فهو حسن، وإنما یکره ذلك أن یحتال في حق لرجل حتی یبطله أو في باطل حتی یموهه أو في حق حتی یدخل فیه شبهة فما کان علی هذا السبیل فهو مکروه، وما کان علی السبیل الذي قلنا أولا فلا بأس به. (المبسوط للسرخسي - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۳۰/۲۱۰، کتاب الحیل، ط: دار المعرفة - بیروت)

[۴۶] میت کی تدفین کے بعد قبر پر دعا کا طریقہ

۲۵۰-سوال: میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر فاتحہ پڑھنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ با حوالہ جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔ قاسم یعقوب وہورا جی بڑا ور اچھا

الجواب حامداًومصلیاً:

میت کو دفن کرنے کے بعد سرہانے کی جانب کھڑے ہوکر ''پوری سورۂ فاتحہ'' اور سورۂ بقرہ ''الف، لام، میم'' (الٓمٓ) سے ''هم المفلحون'' تک پڑھے اور پاؤں کی طرف کھڑے ہوکر سورۂ بقرہ کا آخری رکوع ''آمن الرسول'' سے اخیر تک پڑھے، اس کے بعد دو یا تین گھنٹے تک دعا میں مشغول رہے؛ تدفین کے بعد کا یہ عمل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔[۱] ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ کو ذبح کرکے اس کے گوشت کو تقسیم کرنے کے وقت کے برابر میت کے لیے قبر پر دعاء میں مشغول رہا کرتے تھے۔[۲]

---

(۱) عن عثمان بن عفان، قال: كان النبي -صلى الله عليه وسلم- إذا فرغ من دفن الميت، وقف عليه، فقال: »استغفروا لأخيكم، وسلوا له بالتثبيت، فإنه الآن يسأل« . (سنن أبي داود: ۲/ ۴۵۹، رقم الحديث: ۳۲۲۱، كتاب الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت الانصراف، ط: البدر - ديوبند☆السنة-الإمام أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني (م: ۲۴۱ھ): ۲/ ۵۹۸، رقم: ۱۲۲۵، سئل عن عذاب القبر وفتنة القبر، ت: د. محمد سعيد سالم القحطاني، ط: دار ابن القيم - الدمام☆إثبات عذاب القبر وسؤال الملكين- أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ)، ص: ۱۲۵، رقم الحديث: ۲۱۱-۲۱۲، ت: د. شرف محمود القضاة، ط: دار الفرقان - عمان الأردن)

وجلوس ساعة بعد دفنه لدعاء، وقراءة بقدر ما ينحر الجزور ويفرق لحمه. قال الشامي: لما في سنن أبي داؤد ''كان النبي -صلى الله عليه وسلم- إذا فرغ من دفن الميت وقف على قبره وقال: استغفروا لأخيكم، واسألوا الله التثبيت؛ فإنه الآن يسأل، وكان ابن عمر يستحب أن يقرأ على القبر بعد الدفن أول سورة البقرة وخاتمها. وروي أن عمرو بن العاص قال -وهو في سياق الموت-: ... ثم أقيموا حول قبري قدر ما ينحر الجزور ويقسم لحمها حتى أستأنس بكم... الخ. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۳۷، كتاب الصلوة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر - بيروت ☆الجوهرة النيرة على مختصر القدوري: ۱/ ۱۱۰، باب الشهيد، ط: المطبعة الخيرية)

عن ابن عمر رضي الله عنهما يقول: سمعت النبي -صلى الله عليه وسلم- يقول: إذا مات أحدكم فلاتحبسوه وأسرعوا به إلى قبره، وليقرأ عند رأسه بفاتحة الكتاب، وعند رجليه بخاتمة البقرة في قبره. ولفظ الخلال: وليقرأ عند رأسه بفاتحة البقرة، وعند رجليه بخاتمتها في قبره. (المعجم الكبير - أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۱۲/ ۴۴۴، رقم: ۱۳۶۱۳ ☆شعب الإيمان - البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۱۱/ ۴۷۱، الصلوة على من مات من أهل القبلة، رقم: ۸۸۵۴، ط: مكتبة الرشد - رياض ☆القراءة عند القبور - أبو بكر بن الخلال الحنبلي (م: ۳۱۱ھ)، ص: ۸۸، إذا مات أحدكم فلاتجلسوا... الخ، ط: دار الكتب العلمية بيروت)

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل اس عاجز کو نہیں مل سکا، البتہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے اپنے=

نوٹ: میت کے لیے ایصال ثواب کے کسی طریقے کو "فاتحہ" کا نام نہیں دینا چاہیے، اس کے بجائے "دعاء کرنے یا ایصال ثواب" کا لفظ استعمال کرنا چاہیے، اس لیے کہ اہل بدعت اس کو غیر شرعی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۷] عاشورہ کے دن حضرت حسینؓ کی یاد میں روزہ رکھنا

۲۵۱-سوال: زید کا کہنا ہے کہ محرم کی دسویں تاریخ کو حضرت حسینؓ کی یاد میں روزہ رکھنا، عاشورہ کی نماز پڑھنا، بچوں سے محبت کرنا، دل سے کسی کو کھانا کھلانا، غریب اور محتاج کی مدد کرنا: یہی ان کی سچی اقتدا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ حضرت حسین کی یاد میں روزہ رکھا جائے؟ کیا کسی کی یاد میں روزہ رکھ سکتے ہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

عاشورہ (دسویں محرم کا دن) پہلے ہی سے عظمت والا دن ہے۔(۲) حضرت حسینؓ کی خوش قسمتی تھی کہ اس مبارک دن میں انہیں شہادت نصیب ہوئی، اس دن میں روزہ رکھنے کا تو پہلے ہی سے حکم ہے اور کوئی بھی روزہ ہو، وہ اللہ کے نام کا اور اللہ ہی کے لیے ہوسکتا ہے۔ فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۴۸] محرم میں لوگوں کو شربت پلانا

۲۵۲-سوال: ہمارے یہاں پندرہ بیس دن پہلے جمعہ کی نماز میں ایک مولانا صاحب کتاب

= انتقال کے وقت اس کی وصیت فرمائی تھی، طویل حدیث ہے، جزو مقصود ملاحظہ فرمائیں: فإذا دفنتموني فشنوا علي التراب شنا، ثم أقيموا حول قبري قدر ما تنحر جزور ويقسم لحمها، حتى أستأنس بكم، وأنظر ماذا أراجع به رسل ربي. (صحيح المسلم: ۱/۷۶، رقم: ۱۹۲-(۱۲۱)، كتاب الإيمان، باب بيان حكم عمل الكافر إذا أسلم بعده، ط: البدر ديوبند)

(۱) اس لیے کہ "فاتحہ" کا استعمال اہل بدعت کے یہاں اس موقع پر ہوتا ہے، جب کہ سامنے کھانا یا مٹھائی رکھی جائے، اگربتی جلائی جائے اور اس کے سامنے بیٹھ کر قرآن کریم کی مخصوص سورت یا آیت پڑھی جائے، اور ان سب میں یہ عقیدہ کارفرما ہوتا ہے کہ مردے کی روح گھر میں ہر جمعرات کو آتی ہے، اور صاحب خانہ سے فریاد کرتی ہے، حالاں کہ یہ بات قطعاً غلط ہے، ضابطہ یہ ہے کہ ایک لفظ کے کئی مفہوم ہوں، ایک صحیح اور دوسرا غلط تو احوط یہ ہے کہ اس لفظ کو استعمال ہی نہ کیا جائے، كما يفهم من قوله تعالى: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا. (۲-البقرة: ۱۰۴)

(۲) عن ابن عباس رضي الله عنهما، أن النبي صلى الله عليه وسلم لما قدم المدينة، وجدهم يصومون يوما، يعني عاشوراء، فقالوا: هذا يوم عظيم، وهو يوم نجى الله فيه موسى، وأغرق آل فرعون، فصام موسى شكرا لله، فقال «أنا أولى بموسى منهم» فصامه وأمر بصيامه. (صحيح البخاري: ۱/۴۸۱، رقم الحديث: ۳۳۹۷، كتاب الأنبياء، باب قول الله تعالى: {وهل أتاك حديث موسى}، ط: البدر - ديوبند)

دیکھ کر تعلیم کر رہے تھے، ماہ محرم کا پہلا خطبہ تھا، تعلیم کے دوران مولانا صاحب نے محرم کی بدعات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ دسویں محرم کو شربت پلانا جائز نہیں، اس دن بہت سے لوگ کثرت کے ساتھ شربت تقسیم کرتے ہیں، اس کی اجازت نہیں ہے، یہ سن کر مجمع میں سے ایک پکا بدعتی کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ مولانا صاحب! کس کتاب میں ناجائز لکھا ہے؟ اس پر دوسرے لوگ بھی کھڑے ہوگئے اور ایک ہنگامہ اور فتنہ شروع ہوگیا، پھر چند دن کے بعد میری ملاقات ایک دوسرے بدعتی سے ہوئی، تو اس نے کہا کہ عاشورہ کے دن جو شربت پلایا جاتا ہے، وہ حضرت حسین ؓ کے ایصال ثواب کے لیے ہوتا ہے اور یہ شربت تو بہت سے لوگ پلاتے ہیں، اس میں کیا حرج ہے؟ تو میں نے کہا: میں اپنے بڑے علماء سے پوچھ کر اس کا تحقیقی جواب دوں گا، لہٰذا آپ اس کا مسکت اور تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

لوگوں کو شربت، کھچڑا، زردا، یا بریانی کھلانا، دن اور مہینے کی تعیین وتخصیص کیے بغیر ثواب کا کام ہے۔[1] میت کو ثواب پہنچانے کی نیت سے جو بھی صدقہ کیا جائے، میت کو اس کا ثواب ملتا ہے۔[2] حضرت

---

(۱) نہ دن اور تاریخ کی تخصیص کرے، نہ کسی خاص چیز کی، اور اغنیاء اور گھر والوں کو نہ دے، اور اعلان کر کے نہ دے، اور کھانا وغیرہ سامنے رکھ کر کچھ نہ پڑھے، اور یہ عقیدہ نہ کرے کہ حضرت ہماری مدد فرمائیں گے، اور نہ یہ نیت رکھے کہ اس عمل کی برکت سے ہمارے مال اور اولاد میں برکت وترقی ہوگی۔ (امداد الفتاویٰ: ۵/۳۰۱، کتاب البدعات، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند)

(۲) إن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوما أو صدقة أو غيرها عند أهل السنة والجماعة. (الهداية-علي بن أبي بكر ،الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۲۷۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: اتحاد- ديوبند)

فللإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره عند أهل السنة والجماعة صلاة، أو صوما، أو حجا، أو صدقة، أو قراءة قرآن أو الأذكار، أو غير ذلك من أنواع البر ويصل ذلك إلى الميت وينفعه. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح-حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹هـ): ۲۲۴، كتاب الصلاة باب أحكام الجنائز، فصل في زيارة القبور ط: دار الكتب العلمية-بيروت، الطبعة الثانية: ۱۴۲۴هـ-۲۰۰۴م)

منها (البدعة): وضع الحدود; كالناذر للصيام قائما لا يقعد، ضاحيا لا يستظل،... ومنها: التزام الكيفيات والهيئات المعينة، كالذكر بهيئة الاجتماع على صوت واحد، واتخاذ يوم ولادة النبي صلى الله عليه وسلم عيدا، وما أشبه ذلك. ومنها: التزام العبادات المعينة في أوقات معينة لم يوجد لها ذلك التعيين في الشريعة، كالتزام صيام يوم النصف من شعبان وقيام ليلته. (الاعتصام-إبراهيم بن موسى بن محمد اللخمي الغرناطي الشهير بالشاطبي (م: ۷۹۰هـ): ۱/۵۳، تعريف البدعة وبيان معناها، ت: سليم بن عيد الهلالي، ط: دار ابن عفان، السعودية، الطبعة: الأولى، ۱۴۱۲هـ-۱۹۹۲م)

حسینؓ کو ثواب پہنچانا بھی جائز ہے۔ البتہ سوال میں مذکور کام (شربت پلانے) کو صرف یوم عاشورہ کے ساتھ خاص کرلینا اور اس دن اس عمل کی انجام دہی کو ضروری سمجھنا جائز نہیں ہے۔ (۳) یہ سمجھنا کہ حضرت حسینؓ بھوکے پیاسے شہید کیے گئے تھے؛ اس لیے اس دن شربت پلا کر ان کو ثواب پہنچایا جائے، یہ غلط ہے۔ شربت پینے پلانے والے نماز روزے سے غافل ہو کر ثواب کا عنوان دے ایک قسم کا ڈھونگ کرتے ہیں؛ اس لیے حدیث کی روشنی میں ان کاموں سے لوگوں کو منع کیا جاتا ہے۔ مباح امر کو ضروری سمجھ کر اس میں اس قدر دلچسپی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ فرائض تک سے انسان غافل ہو جاتا ہے، اگر کوئی اس پر نکیر کرے، تو لوگ اس سے جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

سوال کی تحریر کے موافق کہ عالم صاحب کے نکیر کرنے پر ''مسجد میں شور شرابہ ہوا اور فتنہ شروع ہو گیا'' سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کام کو بہت ضروری سمجھا جاتا ہے؛ اس لیے اس کے بدعت ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور اس کا کرنا جائز نہیں۔ (۴)

ان دنوں میں رسول اللہ ﷺ سے جو عمل منقول ہے، وہ 'نو اور دس' یا دس اور گیارہ کا روزہ رکھنا ہے۔ (۵) شربت پینے پلانے والے لوگ اس سے غافل رہتے ہیں، اسی طرح حضرت حسینؓ کی شہادت کے

---

(۳) قال ابن المنير: إن المندبات تنقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها؛ لأن التيامن مستحب في كل شيء: أي من أمور العبادة، لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه أشار إلى كراهته. (فتح الباري-ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲ھ): ۲/ ۳۳۰، كتاب الآذان، باب الانفتال والانصراف على اليمين والشمال، ط: دار الكتب العلمية، بيروت ☆ وقال الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): قال الطيبي: وفيه أن من أصر على أمر مندوب وجعله عزما ولم يعمل بالرخصة نقد أصاب منه الشيطان من الإضلال فكيف من أصر على بدعة أو منكر. (مرقاة المفاتيح: ۳/ ۲۶، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، الفصل الأول، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۴) قال العلامة الحصكفي (م: ۱۰۸۸ھ): والمكروه تنزيهاً كعاشوراء وحده. قال ابن عابدين: ويستحب أن يصوم يوم عاشوراء بصوم يوم قبله أو يوم بعده ليكون مخالفاً لأهل الكتاب. (الدر المختار: ۲/ ۳۷۵، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر بيروت: الطبعة الثانية: ۱۴۱۲ھ- ۱۹۹۲ء)

(۵) ابن عباس يقول في يوم عاشوراء: "خالفوا اليهود وصوموا التاسع والعاشر". (مصنف عبد الرزاق- أبو بكر عبد الرزاق بن همام بن نافع الحميري اليماني الصنعاني (م: ۲۱۱ھ): ۴/ ۲۸۷، رقم الحديث: ۷۸۳۹، باب صيام يوم عاشوراء، ت: حبيب الرحمان الأعظمي، ط: المكتب الإسلامي، الطبعة: الثانية، ۱۴۰۳)

وقال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: صوموا يوم عاشوراء، وخالفوا فيه اليهود، صوموا قبله يوما، أو بعده يوما. (مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۴/ ۵۲، مسند عبد الله بن عباس، رقم الحديث: ۲۱۵۴، ت: شعيب الأرنؤوط=

واقعہ سے جو عبرت حاصل کرنی چاہیے تھی، اس سے بے خبر رہتے ہیں اور لغویات میں مشغول ہوجاتے ہیں، اس لیے ایسے کام جائز نہیں۔

بدعتی لوگوں کا کہنا کہ ''شربت تو بہت سے لوگ پلاتے ہیں'' یہ کوئی شرعی دلیل نہیں ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک حق کے حامی کم اور مخالف زیادہ رہے ہیں، لہٰذا شربت پلانے والوں کی اکثریت یہ کوئی حجت نہیں ہے۔ دلیل قرآن اور حدیث سے دکھائی جائے کہ دسویں محرم کو شربت پلانا ثواب کا کام ہے، ایک بھی دلیل وہ نہیں پیش کر سکتے؛ کیوں کہ اس پر کوئی دلیل موجود ہی نہیں ہے؛ اسی لیے وہ مارے غیض وغضب کے مسجد کا احترام تک ملحوظ نہیں رکھتے اور جھگڑا کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں (جیسا کہ سوال میں مذکور ہے)۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۹] یومِ عاشوراء کو مدارسِ عربیہ میں تعطیل کا حکم

۲۵۳-سوال: عامۃً دیکھا گیا ہے کہ مدارسِ عربیہ میں عاشوراء کے دن تعطیل ہوتی ہے، تو کیا اس دن مدارس عربیہ کی تعطیل درست ہے؟ سوال کی وجہ یہ ہے کہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ہمارے دیوبندی مسلک کے کسی بزرگ کی رائے یہ تھی کہ مدارس میں عاشوراء کی تعطیل نہیں ہونی چاہیے، آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا اس طرح شدّت اختیار کرنا غلو فی الدین نہیں ہے؟ جلد از جلد جواب عنایت فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

یوم عاشوراء میں دو پہلو ہیں، ایک شہادت حضرت حسین رضی اللہ عنہ۔[1] دوسرا عاشوراء کی اصل

=وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى: ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۱ء)

قال المحقق شعيب الأرنؤوط وآخرون: إسناده ضعيف، ابن أبي ليلى -واسمه محمد بن عبد الرحمن- سيء الحفظ، وداود بن علي -وهو ابن عبد الله بن عباس الهاشمي- روى عنه جمع، وذكره ابن حبان في "الثقات"، وقال: يخطىء، وقال الإمام الذهبي: وليس حديثه بحجة... (المصدر السابق)

وفي معناه حديث صحيح عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لئن بقيت إلى قابل لأصومن اليوم التاسع". (المصدر السابق: ۵/۲۸۰، رقم: ۳۲۱۳)

(۱) قال الجماعة: مات يوم عاشوراء، سنة إحدى وستين. (سير أعلام النبلاء: ۳/۳۱۷، الحسين الشهيد، ط: دار الحديث-القاهرة)

فضیلت، کہ بڑے بڑے واقعات اسی دن میں ہوئے۔ [۲] اور قیامت کبریٰ کے لیے نفخ صور کا واقعہ بھی اسی روز پیش آئے گا۔ [۳]

---

(۲) عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: قدم النبي -صلى الله عليه وسلم- المدينة، فرأى اليهود تصوم يوم عاشوراء، فقال: ما هذا؟، قالوا: هذا يوم صالح هذا يوم نجى الله بني إسرائيل من عدوهم، فصامه موسى، قال: فأنا أحق بموسى منكم، فصامه، وأمر بصيامه. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۶۸، رقم: ۲۰۰۴، كتاب الصوم، باب صيام يوم عاشوراء، ط: البدر- ديوبند ☆صحيح مسلم: ۱/ ۳۵۷، رقم الحديث: ۱۲۷-۱۲۸ (۱۱۳۰)، كتاب الصيام، باب صوم يوم عاشوراء، ط: فيصل- ديوبند ☆سنن ابن ماجة: ۱۲۴، رقم: ۱۷۳۴، كتاب الصيام، باب صيام يوم عاشوراء، ط: مكتبه الاتحاد- ديوبند)

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- قال: يوم عاشوراء اليوم الذي تاب الله فيه على آدم، واليوم الذي استوت فيه سفينة نوح على الجودي، واليوم الذي فرق الله فيه البحر لبني إسرائيل، واليوم الذي ولد فيه عيسى، صيامه يعدل سنة مبرورة. (الترغيب و الترهيب- قوام السنة (م: ۵۳۵ھ): ۲/ ۳۰۰، رقم: ۱۸۶۸، فصل في فضل صوم عاشوراء، ط: دار الحديث- القاهرة)

(۳) ابن الجوزیؒ نے اسے موضوع قرار دیا ہے، چناں چہ وہ لکھتے ہیں: باب في ذكر عاشوراء، وقد تمذهب قوم من الجهال بمذهب أهل السنة، فقصدوا غيظ الرافضة، فوضعوا أحاديث في فضل عاشوراء، ونحن براء من الفريقين.

ابن الجوزیؒ نے اس تمہید کے بعد ایک حدیث ذکر کی ہے، جو کافی طویل ہے، جن کی بعض باتیں یہ ہیں:

(۱) حضرت ادریس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اسی دن بلند مقام پر فائز کیا۔ (۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسی دن آتش نمرود سے نجات دی۔ (۳) اسی دن نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہری اور آپ علیہ السلام اس سے اترے۔ (۴) اسی دن موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی گئی۔ (۵) اسی دن اسماعیل علیہ السلام کو ذبح ہونے سے بچایا گیا۔ (۶) اسی دن یوسف علیہ السلام کو جیل سے نجات ملی۔ (۷) اسی دن یعقوب علیہ السلام کی بصارت و بینائی لوٹا دی گئی۔ (۸) حضرت ایوب علیہ السلام سے اسی دن بلاء کو دور کیا گیا۔ (۹) دنیا میں سب سے پہلے یوم عاشورہ کو پیدا کیا گیا۔ (۱۰) اسی دن یونس علیہ السلام کی توبہ قبول کی گئی۔ (۱۱) اس دن کا روزہ چالیس سال کے گناہوں کے کفارہ کا سبب ہے۔ (۱۲) آسمان سے پہلی بارش یوم عاشورہ کو برسائی گئی۔ (۱۳) پہلی رحمت یوم عاشورہ میں نازل کی گئی۔ (۱۴) یوم عاشورہ کا روزہ صوم الدہر ہے۔ (۱۵) عاشورہ کی رات کو عبادت کرنے والا ساتوں آسمان کے عبادت کرنے والوں کی طرح ہے۔ (۱۶) جس شخص نے اس دن اس طور پر نماز ادا کی کہ ہر رکعت میں ایک مرتبہ الحمد شریف اور اکاون مرتبہ سورہ اخلاص پڑھا، تو اس کے اگلے پچھلے پچاس سال کے گناہ معاف ہو جائیں گے، اور ملا اعلیٰ میں اس کے لیے نور کا منبر بنایا جائے گا۔ (۱۷) جس نے عاشورہ کے دن صدقہ کیا، وہ کبھی تنگ دست نہیں ہوگا۔ (۱۸) جس نے اس دن سرمہ لگایا، اس کی آنکھ خراب نہیں ہوگی۔ (۱۹) جس نے اس دن کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا، گویا اس نے دنیا کے تمام یتیموں کے ساتھ صلہ رحمی کی۔ جس نے عاشورہ کا روزہ رکھا، اس کو ایک ہزار فرشتوں کے برابر ثواب دیا جائے گا۔ (۲۰) جبریل علیہ السلام، لوح و قلم، عرش و کرسی، زمین و آسمان اور سمندر کو اسی دن پیدا کیا گیا۔ (۲۱) اس دن جو غسل کرے گا، وہ مرض الموت کے علاوہ کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوگا۔ (۲۲) جبریل نے یوم عاشورہ کو پیدا کیا ہے۔

اور بھی اس طرح کی بہت سی بے بنیاد باتوں کا اس روایت میں تذکرہ ہے، علامہ ابن الجوزی نے اس روایت کو بجا طور =

عاشوراء کے روزے کی فضیلت اس پر مستزاد ہے۔[۴] اُس کے روزے میں یہود کی مشابہت سے احتراز کے لیے ایک اور روزے کے اضافہ کا حکم ہے۔[۵] گویا عاشوراء کا دِن ایک طرح سے خوشی کا دن ہے؛ اس پہلو کے پیشِ نظر اُس دِن طلبہ واساتذہ کے روزہ رکھنے کی وجہ سے مدارس میں تعطیل رکھی جائے، تو ممنوع نہیں ہے، جس طرح رمضان المبارک میں چھٹی رکھی جاتی ہے۔

اگر اکابر میں سے کسی سے یہ صحیح طور پر ثابت ہوجائے کہ وہ اس تعطیل کو پسند نہیں فرماتے تھے، تو اُس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ فرقۂ روافض سے تشبہ ہوتا ہے، لیکن جیسا کہ معلوم ہوا کہ ہمارے مدارس میں یہ پہلو پیشِ نظر نہیں ہوتا، نہ اُس دِن کوئی مجلس ہوتی ہے، اس لیے عام اکابر سے اس بارے میں کوئی ممانعت منقول نہیں ہے۔

اگر اِس دِن مجلسِ شہادت کا انعقاد ہو، تو تشبہ کا شبہ ہوسکتا ہے، چناں چہ ان ہی خاص ایام میں اِسی مجلس کے انعقاد میں شہادت کا تذکرہ ہو، تو بعض نے شیعہ کے ساتھ مشابہت کی بناء پر ممنوع قرار دیا ہے۔[۶]

= پر موضوع قرار دیا ہے۔ (الموضوعات - جمال الدين عبد الرحمن بن علي بن محمد الجوزي (م:۵۹۷ھ) : ۲/ ۲۰۱-۲۰۲، كتاب الصيام، ت: عبد الرحمن محمد عثمان، ط: المكتبة السلفية بالمدينة المنورة)

نوٹ: الغرض یوم عاشوراء میں جن بڑے بڑے واقعات کے وقوع کا ذکر کیا جاتا ہے، تقریبا سب موضوع ہیں، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

الموضوعات لابن الجوزي: ۲/ ۲۰۰-۲۰۱ ☆اللآلي المصنوعة في الأحاديث الموضوعة -السيوطي (م:۹۱۱ھ): ۲/ ۹۲-۹۳، كتاب الصيام، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ تنزيه الشريعة المرفوعة عن الأخبار الشنيعة الموضوعة- نور الدين، ابن عراق الكناني (م:۹۶۳ھ): ۲/ ۱۴۹-۱۵۰، كتاب الصوم، الفصل الأول، ت: عبد الوهاب عبد اللطيف، عبد الله محمد الصديق الغماري، ط: دار الكتب العلمية☆ الآثار المرفوعة في الأخبار الموضوعة- محمد عبد الحي بن محمد عبد الحليم اللكنوي، أبو الحسنات (م:۱۳۰۴ھ): ۱/ ۹۴-۹۵، فضل يوم عاشوراء وصيامه، ت: محمد السعيد بسيوني زغلول، ط: مكتبة الشرق الجديد- بغداد)

(۴) ... وصيام يوم عاشوراء احتسب على الله أن يكفر السنة التي قبله. (صحيح مسلم: ۱/ ۳۶۷، رقم: ۱۹۶- (۱۱۶۲)، كتاب الصوم، باب: استحباب ثلاثة أيام من كل شهر... الخ، ط: البدر- ديوبند)

(۵) عن عبد الله بن عباس رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لئن بقيت إلى قابل لأصومن التاسع. (صحيح مسلم: ۱/ ۳۵۹، رقم: ۱۳۴-(۱۱۳۴)، كتاب الصوم، باب صوم عاشوراء، ط: البدر- ديوبند)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "صوموا يوم عاشوراء، وخالفوا اليهود، صوموا قبله يوما، أو بعده يوما". (صحيح ابن خزيمة: ۳/ ۲۹۰، رقم: ۲۰۹۵، باب الأمر بأن يصام قبل عاشوراء... الخ، ط: المكتب الإسلامي- بيروت)

(۶) عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من تشبه بقوم فهو منهم". (سنن أبي داؤد، ص: ۵۵۹، رقم: ۴۰۳۱، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة، ط: البدر- ديوبند)

اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ سادہ مجلس میں شہادت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ دیگر صحابۂ کرامؓ کی شہادت اور دین کی خاطر اُن کی دی ہوئی قربانیوں کا تذکرہ ہو، تو جائز ہے، اس لیے عاشوراء کی تعطیل مباح ہے، اُس میں کوئی حرج نہیں، مگر خاص احوال مثلاً کوئی شیعیت کے زور اور اُن کے ماحول میں رہتا ہو اور تشبہ کی بنا پر اُسے منع کر دے، تو یہ غلو فی الدین نہیں کہلائے گا، بل کہ اسے ''صلابت و استقامت فی الدین'' کا نام دیا جائے گا، جہاں شیعیت کا زور زیادہ ہو وہاں اسی منع والے قول پر عمل ہونا چاہیے۔ (علامۃ المتقویٰ، از: مولانا عبدالحی صاحب برحاشیہ محمود الفتاویٰ لکھنؤ: ۲/۲۳۰)[ے] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

[۵۰] عید الفطر کی نماز کے بعد مصافحہ اور معانقہ کرنا

۲۵۴-سوال: یہ درست ہے کہ عید الفطر کی نماز کے بعد مصافحہ اور معانقہ کرنا شرعی اعتبار سے بدعت ہے؛ لیکن کسی شخص کی یہ نیت ہو کہ سال کے دوران ساتھیوں اور دوست واحباب سے جو کبھی کبھار لڑائی، جھگڑے ہو گئے ہیں، جن کی وجہ سے دل میں ایک طرح کی کدورت پیدا ہو گئی ہے، اس موقع پر مصافحہ اور معانقہ کر کے دلی کدورت اور رنجش دور ہو جائے اور دشمنی ختم ہو جائے اور ایک دوسرے کے دل صاف ہو جائیں، تو کیا اس نیت سے مصافحہ اور معانقہ کرنے میں بھی کوئی حرج لاحق ہوگا یا نہیں؟ میرے خیال سے تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے؛ کیوں کہ اس صورت میں اجتماعی اور معاشرتی زندگی پرسکون اور خیر و برکت کا ذریعہ بنے گی اور لوگوں کے تعلقات مزید مستحکم اور مضبوط ہوں گے۔

قاسم یعقوب داہوری، بڑادرا، پچھا

الجواب حامداً ومصلیاً:

ہمارا خیال آپ سے جداگانہ ہے؛ کیوں کہ رسمی ملاقات سے دلوں کی صفائی نہیں ہوگی اور نہ ہی کدورتیں ختم ہوں گی اور خاص بات یہ ہے کہ جس کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے، وہ لوگ ایسے موقع پر بھی آپس میں نہیں ملتے ہیں؛ لہٰذا لوگوں کا ان دنوں یعنی عیدین کی نماز کے بعد ملاقات کو ضروری سمجھ لینا اور مصافحہ و معانقہ کرنا بدعت سے خالی نہیں ہے؛ یہ رسم ناجائز ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(ے) ما وجدت هذا الكتاب.

(۱) ونقل في تبيين المحارم عن الملتقط أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلاة بكل حال، لأن الصحابة - رضي الله تعالى عنهم - ما صافحوا بعد أداء الصلاة، ولأنها من سنن الروافض اهـ ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية أنها بدعة=

[۵۱] عیدین کی نماز کے بعد عیدگاہ یا راستے میں ملاقات کرنا؟

۲۵۵-سوال: عیدین کی نماز سے فراغت کے بعد عیدگاہ یا راستے میں ملاقات ومصافحہ اور معانقہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ کیا یہ بات کسی حدیث سے ثابت ہے؟ باحوالہ تحریر فرما کر بندہ پر احسان فرمائیں۔

(المستفتی: خاکسار یوسف احمد بیا، کھلود، ۱۹/۱۲/۱۴۰۳ھ مطابق ۲/۹/۱۹۸۳ء)

الجواب حامدا ومصليا:

عیدین کی نماز کے بعد عیدگاہ یا راستے میں ان لوگوں کا آپس میں مصافحہ وملاقات کرنا درست نہیں ہے، جو روزانہ آپس میں ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں، ایک ایک دن میں کئی کئی مرتبہ ملاقات ہوتی رہتی ہے، اور ساتھ اٹھنا بیٹھنا رہتا ہے۔

البتہ جن حضرات سے کبھی کبھار ملاقات ہوجاتی ہے، ان سے اس وقت ملاقات، مصافحہ اور معانقہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، وجہ یہ ہے کہ جو حضرات روزانہ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں، جن کا اٹھنا بیٹھنا اکثر وبیشتر ایک ساتھ ہوتا ہے، انہیں اس سے پہلے کی ملاقاتوں میں کبھی مصافحہ ومعانقہ، حتی کہ سلام مسنون کی بھی توفیق نہیں ہوتی ہے اور عیدین کے دن بس رسم ورواج کے طور پر ملاقات اور معانقہ کرنے میں پیش پیش نظر آتے ہیں؛ لہٰذا اگر اس عمل کو ضروری سمجھ کر کیا جائے اور ملاقات نہ کرنے والوں کو برا بھلا کہا جائے، انہیں لعنت وملامت کا نشانہ بنایا جائے، تو اس صورت میں حرام ہوجائے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=مكروهة لا أصل لها في الشرع، وأنه ينبه فاعلها أولا ويعزر ثانيا، ثم قال: وقال ابن الحاج من المالكية في المدخل: إنها من البدع، وموضع المصافحة في الشرع، إنما هو عند لقاء المسلم لأخيه لا في أدبار الصلوات فحيث وضعها الشرع يضعها فينهى عن ذلك ويزجر فاعله لما أتى به من خلاف السنة اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۸۱/۶، باب الاستبراء وغيره، ط: دار الفكر بيروت)

وانظر أيضا: فتاویٰ رحیمیہ: ۱۱۱/۲، کتاب السنۃ والبدعۃ، ط: دار الاشاعت کراچی۔

(۱) قال ابن المنير: فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها؛ لأن التيامن مستحب في كل شيء أي من أمور العبادة، لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه أشار إلى كراهته. والله أعلم. (فتح الباري - ابن حجر (م: ۸۵۲هـ): ۳۳۸/۲، كتاب الأذان، باب الانفتال والانصراف عن اليمين والشمال، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

دیکھیے فتاویٰ رحیمیہ: ۱۱۱/۲، کتاب السنۃ والبدعۃ، ط: دار الاشاعت، کراچی۔

فتاویٰ رشیدیہ ص: ۱۴۸، کتاب البدعات، ط: مکتبہ تھانوی، دیوبند۔

[۵۲] جمعہ اور فجر کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا

۲۵۶-سوال: مسجد کے جماعت خانے میں بعد نماز جمعہ اور بعد نماز فجر لوگوں کا مصافحہ کرنا کیسا ہے؟ مذہب احناف میں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصليا:

مصافحہ کرنا سنت ہے۔(۱) لیکن اس کے لیے اول ملاقات کے علاوہ دیگر اوقات کو مخصوص و متعین اور لازم کرنا جائز نہیں۔(۲) لہٰذا مذکورہ بالا دونوں اوقات میں مصافحہ کرنا جائز نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

۵/۱۰/۱۹۷۷ء

[۵۳] عید کے دن مسجد میں مصافحہ کرنا

۲۵۷-سوال: عید اور بقرعید کے دن مسجد یا عیدگاہ میں نماز کے بعد مصافحہ کرنا کیسا ہے؟

احقر سعید احمد محمد سیدات

---

(۱) قال لأبي ذر: هل كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصافحكم إذا لقيتموه؟ قال: " ما لقيني قط إلا صافحني ولقد جئت مرة فقبل لي: إن النبي صلى الله عليه وسلم طلبك فجئته فلقيني فاعتنقني فكان ذلك أجود وأجود ". (مسند أبي داود الطيالسي - أبو داود سليمان بن داود الطيالسي البصرى (م: ۲۰۴ھ): ۱/۳۸۰، رقم: ۴۷۵، أحاديث أبي ذر الغفاري، ت: د. محمد بن عبد المحسن التركي، ط: دار هجر - مصر ٭ المعجم الأوسط - الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۷/۲۸۶، رقم: ۷۵۰۹، بتغير يسير)

(۲) ونقل في تبيين المحارم عن الملتقط أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلاة بكل حال؛ لأن الصحابة - رضي الله تعالى عنهم - ما صافحوا بعد أداء الصلاة، ولأنها من سنن الروافض اهـ ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية: أنها بدعة مكروهة، لا أصل لها في الشرع، وأنه ينبه فاعلها أولا، ويعزر ثانيا، ثم قال: وقال ابن الحاج من المالكية في المدخل: إنها من البدع، وموضع المصافحة في الشرع إنما هو عند لقاء المسلم لأخيه، لا في أدبار الصلوات فحيث وضعها الشرع يضعها فينهى عن ذلك ويزجر فاعله لما أتى به من خلاف السنة اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/۳۸۱، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء، وغيره ☆ المدخل - ابن الحاج المالكي (م: ۷۳۷ھ): ۲/۲۱۹، فصل: المصافحة بعد صلاة الصبح وبعد صلاة العصر، ط: دار التراث العربي)

نیز ملاحظہ فرمائیں: امداد الفتاویٰ: ۵/۲۶۰، کتاب البدعات، مصافحہ بعد نماز، ط: ادارہ تالیفات اولیاء۔

الجواب حامداو مصلیا:

عید کی نماز کے بعد گاؤں والوں سے مصافحہ و معانقہ کرنا جائز ہے (۱) اور ضروری سمجھ کر ایسا کرنا بدعت ہے اور ہر بدعت حرام ہے، اس لیے ضروری سمجھ کر ایسا کرنے والا حرام کام کا ارتکاب کرنے والا ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۱۸/۱/۱۹۷۶ء

[۵۴] عیدین کے علاوہ دوسرے دنوں میں مسجد کے اندر مصافحہ کرنا

۲۵۸-سوال: عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے علاوہ دوسرے دنوں میں اگر کوئی شخص مسجد میں مصافحہ کرے، تو یہ کیسا ہے؟

احقر سعید احمد محمد سیدات

الجواب حامداو مصلیا:

عادت بنائے بغیر کبھی کبھی جماعت خانے میں ملاقات کر لینا جائز ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ
(۱۸/۱/۱۹۷۶ء)

---

(۱) لیکن فی زماننا ایسا ہوتا ہے کہ لوگ عیدین کی نماز کے لیے گھر سے ایک ساتھ جاتے ہیں، ایک دوسرے کے بغل میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں، ساتھ بیٹھ کر خطبہ بھی سنتے ہیں، اسی دوران آپس میں مختلف طرح کی گفتگو بھی ہوتی رہتی ہے؛ لیکن جیسے ہی خطبہ ختم ہوا، سب ایک دوسرے سے مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں، یہ یقیناً بدعت ہے؛ اس لیے کہ شریعت میں مصافحہ کا محل 'اول ملاقات' ہے، چنانچہ ملا علی قاری فرماتے ہیں:

فإن محل المصافحة المشروعة أول الملاقاة، وقد يكون جماعة يتلاقون من غير مصافحة ويتصاحبون بالكلام ومذاكرة العلم وغيره مدة مديدة، ثم إذا صلوا يتصافحون، فأين هذا من السنة المشروعة، ولهذا صرح بعض علمائنا بأنها مكروهة حينئذ، وأنها من البدع المذمومة. (مرقاة المفاتيح -الملا علي القاري: ۷/ ۲۹۶۳، باب المصافحة والمعانقة، ط: دار الفكر بيروت)

وقال ابن الحاج في المدخل: وأما المصافحة فإنها وضعت في الشرع عند لقاء المؤمن لأخيه، وأما في العيدين على ما اعتاده بعضهم عند الفراغ من الصلاة يتصافحون فلا أعرفه. (المدخل - ابن الحاج: ۲/ ۲۸۸، فصل في انصراف الناس من صلاة العيد، ط: دار التراث العربي)

مزید دیکھیے: (فتاویٰ رشیدیہ، ص: ۱۴۸، کتاب البدعت، ط: مکتبہ تھانوی دیوبند☆ امداد الفتاویٰ: ۵/ ۲۹۰، کتاب البدعات، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند☆ رد المحتار: ۶/ ۳۸۱، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیرہ، ط: دار الفکر بیروت)

(۲) إن المواظبة عليها بعد الصلوات خاصة قد يؤدي الجهلة إلى اعتقاد سنيتها في خصوص هذه المواضع، وأن=

[۵۵] عیدین کے بعد مصافحہ ومعانقہ کا حکم

۲۵۹-سوال: دعا کے بعد گھر جانے سے پہلے مسلمان عید کی خوشی میں ایک دوسرے سے مصافحہ و معانقہ کرتے ہیں۔ عموماً یہ جماعت خانہ میں ہی ہوتا ہے؟ کیا شریعت میں کوئی اس کی اہمیت ہے؟ جماعت خانہ کے باہر ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

عید کے دن خطبہ کے بعد مسجد میں ان مسلمانوں سے مصافحہ یا معانقہ کرنا، جن سے روزانہ ملاقات ہوتی ہو، اور اس کو ضروری سمجھنا، اور مصافحہ نہ کرنے والے پر لعن وطعن جائز نہیں؛ بدعت ہے، جس سے بچنا ضروری ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۶] عید کی نماز کے بعد یا مسجد میں جلسہ کے بعد مصافحہ کرنا

۲۶۰-سوال: عید کے خطبے کے بعد یا کسی جلسہ کے موقع پر- جب کہ جلسہ مسجد میں رکھا گیا ہو- مسجد کے اندر معانقہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس طریقے سے سال میں صرف دو تین دفعہ اس طرح کے موقعے آتے ہیں کہ جس میں مسجد کے اندر لوگ مصافحہ کرتے ہیں، تو کیا یہ بدعت کے دائرے میں داخل ہوگا؟

الجواب حامداومصلیا:

مصافحہ کرنا سنت ہے۔[۲] رسول اللہ ﷺ نے مصافحہ کرنے والوں کے لیے مغفرت کی خبر

=لها خصوصية زائدة على غيرها مع أن ظاهر كلامهم أنه لم يفعلها أحد من السلف في هذه المواضع. (رد المحتار على الدر المختار: ٦/٣٨١، الحظر والإباحة، باب الاستبراء، ط: دار الفكر - بيروت)

(١) ونقل في تبيين المحارم عن الملتقط أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلاة بكل حال؛ لأن الصحابة - رضي الله تعالى عنهم - ما صافحوا بعد أداء الصلاة، ولأنها من سنن الروافض اهـ ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية: أنها بدعة مكروهة لا أصل لها في الشرع، وأنه ينبه فاعلها أولا، ويعزر ثانيا. ثم قال: وقال ابن الحاج من المالكية في المدخل إنها من البدع، وموضع المصافحة في الشرع إنما هو عند لقاء المسلم لأخيه لا في أدبار الصلوات فحيث وضعها الشرع يضعها فينهى عن ذلك، ويزجر فاعله لما أتى به من خلاف السنة اهـ. (رد المحتار: ٦/٣٨١، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، ط: دار الفكر، بيروت)

(٢) عن قتادة، قال: قلت لأنس: أكانت المصافحة في أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم؟ قال: »نعم«. (صحيح=

وبشارت دی ہے۔[1] لیکن جب کوئی امر مستحب ومباح' بدعت کی شکل اختیار کرلے، اس کے مرتبے کو بڑھا دیا جائے اور لوگ اسے ضروری سمجھنے لگیں، جو لوگ مصافحہ نہ کریں، ان کو لعن طعن کیا جائے اور برا بھلا کہا جائے، تو ایسی صورت میں وہ امر مستحب' مستحب نہیں رہتا، بدعت کے حکم میں ہوجاتا ہے۔[2] عید کے دن اور دیگر جلسے جلوس کے موقع پر اگر مصافحہ کو ضروری سمجھ لیا جائے، اس کے لیے دوسروں کو تکلیف دی جائے، تو اس صورت میں مصافحہ کرنا جائز نہیں، بدعت کہلائے گا، اس لیے اس کو ترک کردینا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۱۹۷۵/۱۲/۸ء

[۵۷] رسم بسم اللہ

۲۶۱-سوال: میمن برادری میں یہ رواج ہے کہ جب لڑکا چند سال کا ہوجاتا ہے، تو اس کے رشتہ داروں کو دعوت دی جاتی ہے، اور ان کے سامنے بچے کو ایک مولانا صاحب "اعوذ باللہ، بسم اللہ، اور سورہ فاتحہ" پڑھاتے ہیں، اس کے بعد مٹھائی تقسیم ہوتی ہے اور بچہ کو بخشش دی جاتی ہے۔ تو مذکور کام کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

مذکورہ رسم قرآن مجید اور حدیث نبوی سے ثابت نہیں ہے، اس کا شمار بدعت کی باتوں میں ہوتا

=البخاري: ۲/۹۲۶، رقم الحديث: ۶۲۶۳، كتاب الاستئذان، باب المصافحة، ط: البدر - ديوبند)

عن رجل من عنزة، أنه قال لأبي ذر -في حديث طويل-: هل كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصافحكم إذا لقيتموه؟ قال: »ما لقيته قط إلا صافحني. (سنن أبي داؤد: ۲/۷۰۸، رقم الحديث: ۵۲۱۴، كتاب الأدب، باب في المعانقة، ط: البدر - ديوبند)

(۱) عن البراء، قال: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: »ما من مسلمين يلتقيان، فيتصافحان إلا غفر لهما قبل أن يفترقا«. (سنن أبي داؤد: ۲/۷۰۸، كتاب الأدب، باب في المعانقة، رقم الحديث: ۵۲۱۲، ط: البدر - ديوبند ☆سنن الترمذي: ۲/۱۰۲، رقم الحديث: ۲۷۲۷، باب ما جاء في المصافحة، أبواب الاستئذان و الآداب، ط: فيصل - ديوبند ☆سنن ابن ماجة، ص: ۲۶۳، رقم الحديث: ۳۷۰۳، باب المصافحة، كتاب الأدب، مكتبة الاتحاد - ديوبند)

(۲) قال ابن المنير: فيه أن المندوبات قد تنقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها؛ لأن التيامن مستحب في كل شيء، لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه، أشار إلى كراهته. (فتح الباري: ۲/ ۳۳۳، باب الانفتال و الانصراف عن اليمين، ط: دار المعرفة بيروت ☆نيل الأوطار - محمد بن علي بن محمد بن عبد الله الشوكاني اليمني (م: ۱۲۵۰هـ): ۲/ ۳۶۴، باب جواز الانحراف عن اليمين والشمال، أبواب صفة الصلاة، ت: عصام الدين الصبابطي، ط: دار الحديث، مصر، الطبعة الأولى، ۱۴۱۳هـ)

ہے۔اس لیے شریعت میں جائز نہیں ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۸] شب براءت میں کوئی مخصوص نماز ثابت نہیں ہے

۲۶۲-سوال: شب براءت میں نماز مغرب کے بعد دو رکعت درازیٔ عمر کے لیے، دو رکعت قبر کے عذاب سے نجات پانے کے لیے اور دو رکعت قرض وغیرہ سے محفوظ رہنے کی نیت سے پڑھتے ہیں اور ہر دو رکعت کے درمیان سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتے ہیں، تو یہ کیسا ہے؟ ہمارے یہاں بہت سے لوگ قرآن کریم پڑھنا نہیں جانتے ہیں؛ اس لیے ہر دو رکعت کے درمیان ایک صاحب بلند آواز سے سورۂ یٰسین پڑھتے ہیں اور دوسرے حضرات سنتے ہیں، اس کا حکم کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکور طریقہ سے نماز پڑھنا احادیث مبارکہ سے ثابت نہیں ہے، اس رات میں قبرستان جاکر مرحومین کے لیے دعائیں کریں۔[۲] اور رات عبادت میں گزاریں اور دن میں روزہ رکھیں۔[۳] حدیث

---

(۱) عن جابر بن عبد الله، قال: كان رسول الله -صلى الله عليه وسلم- إذا خطب احمرت عيناه، وعلا صوته، واشتد غضبه، حتى كأنه منذر جيش يقول: صبحكم ومساكم، ويقول: بعثت أنا والساعة كهاتين، ويقرن بين إصبعيه السبابة، والوسطى، ويقول: أما بعد، فإن خير الحديث كتاب الله، وخير الهدي هدي محمد، وشر الأمور محدثاتها، وكل بدعة ضلالة. ثم يقول: أنا أولى بكل مؤمن من نفسه، من ترك مالا فلأهله، ومن ترك دينا أو ضياعا فإلي وعلي. (صحيح المسلم: ۱/ ۲۸۴، رقم: ۴۳-(۸۶۷)، كتاب الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة)

''بہشتی زیور'' میں ہے: ان رسموں سے ایک ''بسم اللہ'' کی رسم ہے، جو بڑے اہتمام اور پابندی کے ساتھ لوگوں میں جاری ہے، اُس میں یہ خرابیاں ہیں: چار برس، چار مہینے، چار دن کا ہونا اپنی طرف سے مقرر کیا ہے، جو محض بے اصل اور لغو ہے، پھر اُس کی اتنی پابندی کہ چاہے جو کچھ ہو اُس کے خلاف نہ ہونے پائے، اور اَن پڑھ لوگ تو اُس کو شریعت ہی کی بات سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے عقیدے میں خرابی اور شریعت کے حکم میں ایک پیچڑ لگانا لازم آتا ہے۔ وغير ذلك من المفاسد المذكورة، فليرجع ثمة. (بہشتی زیور: ۶/ ۳۳۷، مکتب یعنی بسم اللہ کی رسموں کا بیان۔ ط: مقیم بک ڈپو، دیوبند)

(۲) عن عائشة أنها قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم (كلما كان ليلتها من رسول الله- صلى الله عليه وسلم) يخرج من آخر الليل إلى البقيع، فيقول: السلام عليكم دار قوم مؤمنين، وأتاكم ما توعدون غدا، مؤجلون، وإنا إن شاء الله بكم لاحقون، اللهم اغفر لأهل بقيع الغرقد. (مسلم: ۱/ ۳۱۳، رقم الحديث: ۱۰۲-(۹۷۴)، كتاب الجنائز، فصل في التسليم على أهل القبور والدعاء والاستغفار لهم، ط: البدر - ديوبند)

(۳) عن علي بن أبي طالب قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا كانت ليلة النصف من شعبان، فقوموا ليلها وصوموا نهارها، فإن الله ينزل فيها لغروب الشمس إلى سماء الدنيا. الخ. (ابن ماجة: ۱/ ۴۴۴، كتاب إقامة الصلاة=

سے بس اتنا ثابت ہے، اس کے علاوہ کوئی مخصوص نماز وغیرہ ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس طرح کی رسموں کو ترک کر کے ہر آدمی کو اپنی استطاعت کے موافق اللہ تعالیٰ کی صحیح عبادت کرنی چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۹] شب برأت میں چھ رکعات نماز کا حکم (أیضاً)

۲۶۳-سوال: بہت سے آدمی ۱۵ر شعبان کی رات میں ۶ر رکعات نماز پڑھتے ہیں۔ دو رکعات درازیٔ عمر کے لیے، دو رکعات محتاجی دور کرنے کے لیے اور دو رکعات مصائب سے حفاظت کے لیے، کیا اس طرح کی نماز صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

مذکورہ نماز کسی روایت سے ثابت نہیں ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں مبارک ماہ اور مبارک راتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اعمال کی تفصیل ہے، اس کتاب میں مذکورہ نماز کے متعلق لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں ہے۔ (۱) واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۰] شب برأت کا انکار کرنا

۲۶۴-سوال: عرب علماء کہتے ہیں کہ شب براءت اور اس کی فضیلت کا قرآن کریم اور حدیث پاک سے کوئی ثبوت نہیں ہے اور جن احادیث مبارکہ سے فضیلت کا پتہ چلتا ہے، وہ سب کی سب ضعیف ہیں؛ اس لیے وہ حضرات شب براءت کا بالکل انکار کرتے ہیں، آپ اس بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

عرب حضرات کا اس طرح کی بات کرنا بالکل صحیح نہیں ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= والسنة فيها، باب ما جاء في ليلة النصف من شعبان، رقم الحديث: ۱۳۸۸، ت: محمد فؤاد عبد الباقي، في الزوائد: إسناده ضعيف لضعف ابن بسرة، ط: دار إحياء الكتب العربية)

(۱) لم أجد هذا الكتاب. مسئلہ کی تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے ''شب برأت میں کوئی مخصوص نماز ثابت نہیں''۔

(۲) قال الإمام الرازي: اختلفوا في هذه الليلة المباركة، فقال الأكثرون: إنها ليلة القدر، فقال عكرمة وطائفة آخرون: إنها ليلة البراءة وهي الليلة النصف من شعبان. (التفسير الكبير: ۲۷/ ۶۵۲، ط: دار إحياء التراث العربي، الطبعة الثانية: ۱۴۲۰ھ)

عن علي بن أبي طالب، قال: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: "إذا كانت ليلة النصف من شعبان، =

= فقوموا ليلها وصوموا نهارها، فإن الله ينزل فيها لغروب الشمس إلى سماء الدنيا، فيقول: ألا من مستغفر لي فأغفر له ألا مسترزق فأرزقه ألا مبتلى فأعافيه ألا كذا ألا كذا، حتى يطلع الفجر". (ابن ماجة: ۱/ ۴۴۴، رقم: ۱۳۸۸، كتاب إقامة الصلاة، والسنة فيها، باب ماجاء في ليلة النصف من شعبان، ت: فؤاد عبد الباقي، قال تعليقا على هذا الحديث: إسناده ضعيف لضعف ابن يسرة - ص: ۹۹، اتحاد - ديوبند - ☆ وأخرجه أحمد في مسنده عن "عبد الله بن عمرو (۶۶۴۲) وعن عائشة (۲۶۰۱۸) وابن حبان في صحيحه عن معاذ بن جبل (۵۶۶۵) والبيهقي في شعب الإيمان (۳۵۵۰) و(۳۵۵۱) و(۳۵۵۲) و (۶۲۰۴) و (۳۵۵۴) و(۳۵۵۵) و(۳۵۵۹) والبزار في مسنده عن أبي بكر (۸۰) وعن أبي هريرة (۹۲۶۸) وعوف ابن مالك (۲۷۵۴) والترمذي في سننه عن عائشة (۷۳۹) والطبراني في المعجم الكبير عن أبي ثعلبة (۶۷۸) و(۵۹۳) و(۵۹۰) و(۲۱۵) وفي الأوسط عن معاذ بن جبل (۶۷۷۶) وإسحاق بن راهوية في مسنده (۱۷۰۲) و (۱۷۰۰) وابن أبي شيبة في مصنفه، عن كثير بن مرة الحضرمي (۲۹۸۵۹) وعن عائشة (۲۹۸۵۸) وغيرها (۷۹۲۳) و(۷۹۲۷) و(۷۹۲۸).

قال العلامة الألباني: رداً مؤلف "إصلاح المساجد من البدع والعوائد" الشيخ محمد جمال الدين القاسمي السلفي على ماذكر: "أنه ليس في فضل ليلة النصف حديث يصح" أخرجه (أي حديث مكحول) أخرجه ابن أبي عاصم في "السنة" "ق: ۱/ ۴۳" وابن حبان في "صحيحه" "۱۹۸۰" ورجاله ثقات، والحديث صحيح، وله طرق وشواهد خرجتها في "الصحيحة" "۱۱۴۴" فلا تلتفت إلى ما سينقله المصنف أنه ليس في فضل ليلة النصف حديث يصح، نعم لا يلزم من ثبوت هذا الحديث اتخاذ هذه الليلة موسماً يجتمع الناس فيها، ويفعلون فيها من البدع ما ذكره المؤلف يرحمه الله تعالى. (إصلاح المساجد من البدع والعوائد ص: ۹۹ الفصل الثاني، زيادة التنوير ليلة النصف من شعبان... الخ، ت: محمد ناصر الدين الألباني، ط: المكتب الإسلامي، الطبعة الخامسة، ۱۴۰۳هـ - ۱۹۸۳ء)

قال المباركفوري في تحفة الأحوذي: اعلم أنه قد ورد في فضيلة ليلة النصف من شعبان عدة أحاديث، مجموعها يدل على أن لها أصلاً، فمنها حديث الباب، وهو منقطع، ومنها حديث عائشة قالت: قام رسول الله - صلى الله عليه وسلم - من الليل، فصلى، فأطال السجود، حتى ظننت أنه قد قبض، فلما رأيت ذلك قمت حتى حركت إبهامه، فتحرك فرجع فلما رفع رأسه من السجود وفرغ من صلاته، قال: يا عائشة أو يا حميراء، أظننت أن النبي - صلى الله عليه وسلم - قد خاس بك، قلت: لا والله يا رسول الله، ولكني ظننت أنك قبضت طول سجودك، فقال أتدري أي ليلة هذه، قلت: الله ورسوله أعلم، قال: هذه ليلة النصف من شعبان، إن الله - عز وجل - يطلع على عباده في ليلة النصف من شعبان، فيغفر للمستغفرين، ويرحم المسترحمين، ويؤخر أهل الحقد كما هم رواه البيهقي، وقال: هذا مرسل جيد، ويحتمل أن يكون العلاء أخذه من مكحول. (ثم ذكر حديث معاذ و حديث علي و غير ذلك من الصحابة الوارد في فضيلة ليلة النصف من شعبان، وقال بعده:) فهذه الأحاديث مجموعها حجة على من زعم أنه لم يثبت في فضيلة النصف من شعبان شئ، والله تعالى أعلم. (تحفة الأحوذي: ۳/ ۳۶۵ ۷۴۶، أبواب الصوم، باب ماجاء في ليلة النصف من شعبان، ط: دار الكتب العلمية - بيروت.

مزید دیکھیے: نظام الفتاوی: ۱/ ۴۳-۴۷ تحت عنوان: شب برأت کیا ہے؟ ط: تاج پبلشنگ ہاؤس دیوبند، سن طباعت: ۲۰۰۱ء)

[۶۱] بڑی راتوں میں مساجد میں چراغاں کرنا

۲۶۵-سوال: بڑی راتوں[1] میں مساجد میں روشنی کا خاص اہتمام کر سکتے ہیں یا نہیں؟ پوری مسجد کو قمقموں سے بھر دینا اور روشنی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں ہونے والے خرچ کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟

اختر حبیب خان

الجواب حامدا ومصليا:

یہ اسراف اور فضول خرچی ہے اور یہ حرام ہے۔[2] مسجد میں ضرورت کے مطابق ہی روشنی کا انتظام کرنا چاہیے، ضرورت سے زائد روشنی کرنا حرام ہے اور اس میں جو حضرات ذمہ دار ہیں، وہ گنہ گار ہوں گے۔

بڑی راتوں میں بھی ضرورت سے زائد روشنی کرنا جائز نہیں؛ حرام ہے۔[3] اور اس طرح کی روشنی

---

(۱) بڑی راتیں: یعنی شب قدر، شب براءت، شب معراج وغیرہ۔

(۲) وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا۞ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ. [۱۷-الإسراء:۲۷]

إن الإسراف حرام. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۱۴۷، كتاب الحجر، ط: دار الفكر-بيروت)

(۳) من قبيل البدع التي أنكرها السلف الصالح - كزخرفة المساجد. (الاعتصام-إبراهيم بن موسى الغرناطي الشهير بالشاطبي (م: ۷۹۰ھ) ص: ۶۳۳، الباب الثامن في الفرق بين البدع والمصالح المرسلة والاستحسان، فصل الأمور المعتبرة في المصالح المرسلة، ت: سليم بن عيد الهلالي، ط: دار ابن عفان-السعودية)

وحاصله أن النار ليس إيقادها في المساجد من شأن السلف الصالح، ولا كانت مما تزين بها المساجد ألبتة، ثم أحدث التزيين بها حتى صارت من جملة ما يعظم به رمضان، واعتقد العامة هذا كما اعتقدوا طلب البوق في رمضان في المساجد، حتى لقد سأل بعض عنه: أهو سنة أم لا؟ ولا يشك أحد أن غالب العوام يعتقدون أن مثل هذه الأمور مشروعة على الجملة في المساجد، ... وكذلك أيضا لما لم يتخذ الناقوس للإعلام، حاول الشيطان فيه بمكيدة أخرى فعلق بالمساجد واعتد به في جملة الآلات التي توقد عليها النيران وتزخرف بها المساجد، زيادة إلى زخرفتها بغير ذلك، كما تزخرف الكنائس والبيع.

ومثله إيقاد الشمع بعرفة ليلة الثامن، ذكر النووي أنها من البدع القبيحة، وأنها ضلالة فاحشة جمع فيها أنواع من القبائح. منها إضاعة المال في غير وجهه، ومنها إظهار شعائر المجوس... الخ. (المصدر السابق: ص: ۶۰۰، الباب السابع في الابتداع هل يدخل في الأمور العادية أم يختص بالأمور العبادية ... الخ، فصل فشو المعاصي والمنكرات والمكروهات والعمل بها هل يعد بدعة)

وأما أمثلة البدع المكروهة، فعد منها: زخرفة المساجد. (المصدر السابق، ص: ۳۶۹، الباب الثالث: ذم البدع والمحدثات... الخ، فصل: الرد على ما قاله الشيخ عز الدين... الخ)

ہندوانہ تہوار دیوالی سے بھی مشابہت رکھتی ہے؛ اس لیے بھی حرام ہوگی۔ [1] بڑی راتیں خصوصیت سے عبادت کی ہیں، روشنی کی راتیں نہیں ہیں؛ لہٰذا ایسے لایعنی کاموں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ

۱۷/۱۱/ ۱۹۷۷ء

[۶۲] جمعہ کے روز ایک شخص کا سورۂ کہف پڑھنا اور باقی لوگوں کا سننا

۲۶۶-سوال: کتنے ہی گاؤں میں جمعہ کے دن مسجد میں بارہ (۱۲) آدمی باری باری سورۂ کہف بہ آواز بلند ایک ایک رکوع پڑھتے ہیں، اس طریقے سے بارہ رکوع پڑھتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس کے پڑھنے کے لیے باضابطہ وقت نکالتے ہیں، اگر ان کو اس طرح پڑھنے سے منع کیا جاتا ہے، تو کہتے ہیں کہ اس میں وقت ہی کتنا لگتا ہے؟ اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں، وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو لوگ قرآن مجید پڑھنا نہیں جانتے، وہ اسے سنیں؛ کیوں کہ پڑھنے والے کے مقابلے میں سننے والے کا ثواب زیادہ ہے، تو کیا یہ درست ہے؟

الجواب حامداو مصليا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سورۂ کہف کا اس انداز سے پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ [2] اور جو لوگ اس کے جواز میں دلیل پیش کرتے ہیں، آپ ان سے کہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں تمام لوگ حافظ قرآن نہیں تھے، صرف چار یا چھ صحابۂ کرام کے نام آتے ہیں، جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت پورا قرآن مجید یاد تھا۔ [3] نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض نومسلم صحابہ بھی

---

(۱) عن ابن عمر، قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: «من تشبه بقوم فهو منهم». (سنن أبي داؤد: ۵۵۹/۲، رقم الحديث: ۴۰۳۱، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة، ط: البدر - ديوبند)

(۲) فينبغي له أن ينهى الناس عما أحدثوه من قراءة سورة الكهف يوم الجمعة جماعة في المسجد أو غيره... فيقرأها سرا في نفسه في المسجد أو جهرا في غيره أو فيه إن كان المسجد مهجورا ما لم يكن فيه من يتشوش بقراءته والسر أفضل، وأما اجتماعهم لذلك فبدعة كما تقدم. والله تعالى أعلم. (المدخل-ابن الحاج المالكي (م: ۷۳۷هـ): ۲۸۱/۲، فصل في الصلاة على الميت في المسجد، ط: دار التراث العربي)

(۳) قتادة، قال: سألت أنس بن مالك رضي الله عنه: من جمع القرآن على عهد النبي صلى الله عليه وسلم؟ قال: "أربعة، كلهم من الأنصار: أبي بن كعب، ومعاذ بن جبل، وزيد بن ثابت، وأبو زيد". (صحيح البخاري: ۷۴۸/۲، رقم الحديث: ۴۸۱۲، كتاب فضائل القرآن، باب القراء من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، ط: البدر - ديوبند)

نوٹ: حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ اس حدیث کو نقل کر کے لکھتے ہیں: اس روایت سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ=

تھے؛ (گویا اکثر صحابہ کرام حافظ قرآن نہ تھے) اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکورہ طریقے پر سورۂ کہف پڑھنا ثابت نہیں ہے۔

مذکورہ طریقے سے بارہ آدمیوں کے باری باری بہ آواز بلند پڑھنے کی صورت میں تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھنے والوں کی نماز میں خلل واقع ہوگا؛ اس لیے اس طریقے سے سورۂ کہف پڑھنا جائز نہیں ہے۔ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ جب کوئی شخص مسجد میں نماز پڑھتا ہو، تو کسی دوسرے شخص کے لیے بلند آواز سے قرآن مجید کی تلاوت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔[۳] مساجد بنانے کے مقاصد میں سے یہ ہے کہ ان میں اللہ رب العزت کا ذکر کیا جائے۔[۴] تو جو حضرات تسبیح تحمید، استغفار اور درود شریف وغیرہ پڑھنے میں مشغول ہوں گے، اس طریقے سے سورہ کہف پڑھنے کی وجہ سے ان کے معمولات میں خلل واقع ہوگا، لہٰذا مذکورہ طریقے سے سورۂ کہف پڑھنا جائز نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کریم کے حافظ بس یہی چار حضرات تھے، حال آں کہ یہ خیال درست نہیں...... بل کہ مذکورہ بالا حدیث میں قرآن کریم کو جمع کرنے کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اس لفظ کا صحیح مفہوم قرآن کریم کو لکھنا ہے اور حضرت انس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چار حضرات وہ ہیں، جن کے پاس آں حضرت کے عہد مبارک ہی میں قرآن کریم پورا پورا لکھا ہوا موجود تھا...... اس ارشاد کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اوس اور خزرج میں قرآن کریم کو جمع کرنے والے یہی چار تھے، حضرت عثمانی مدظلہ ۳۳ حفاظ صحابہ کے اسماء گرامی نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: یہ تو صرف ان صحابہ کرام کے اسماء گرامی ہیں، جن کا نام حافظ قرآن کی حیثیت سے روایات میں محفوظ رہ گیا، ورنہ تو ایسے صحابہ تو بے شمار ہوں گے، جنھوں نے پورا قرآن کریم یاد کیا تھا؛ لیکن اس حیثیت سے ان کا نام روایات میں محفوظ نہیں رہ سکا۔ اس کی شہادت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات ایک قبیلے میں ستر ستر قاری تعلیم کے لیے بھیجے ہیں، چناں چہ صرف غزوۂ بیر معونہ کے موقع پر ستر (۷۰) قراء صحابہ شہید ہوئے، اور حفاظ کی تقریبا اتنی ہی تعداد آپ کے بعد جنگ یمامہ میں شہید ہوئی، بل کہ ایک روایت تو یہ ہے کہ جنگ یمامہ کے موقع پر سات سو قراء صحابہ شہید ہوئے تھے، اس کے علاوہ یہ تو صرف ان صحابہ کا ذکر ہے، جن کو پورا قرآن یاد تھا اور ایسے صحابہ کا تو کوئی شمار ہی نہیں، جنہوں نے قرآن کریم کے متفرق حصے یاد کر رکھے تھے۔ (علوم القرآن- مفتی محمد تقی عثمانی: ص۱۷۶، ۲۲۲، ط: مکتبہ دار العلوم دیوبند) ☆ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (فتح الباری: ۹/ ۶۲ - ۶۳، کتاب فضائل القرآن، باب القراء...... الخ، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

(۳) فالإسرار أفضل حيث خيف الرياء أو تأذي المصلين أو النيام. (رد المحتار على مع الدر: ۶/ ۳۹۸، فصل في البيع، الحظر والإباحة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) عن بريدة أن رجلا نشد في المسجد فقال: من دعا إلى الجمل الأحمر، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: «لا وجدت، إنما بنيت المساجد لما بنيت له.» (صحيح مسلم: ۱/ ۲۱۰، رقم الحديث: ۸۰-(۵۶۹)، كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب النهي عن نشد الضالة في المسجد وما يقوله من سمع الناشد)

قال الشيخ محمد فؤاد عبد الباقي: (إنما بنيت المساجد لما بنيت له) معناه لذكر الله تعالى والصلاة والعلم والمذاكرة في الخير ونحوها. (المصدر السابق في نسخة بيروت)

[۶۳] جمعہ کے روز بہ آواز بلند باری باری سورۂ کہف پڑھنا

۲۶۷-سوال: جمعہ کے روز بہت سے لوگ اذان کے بعد مسجد میں بآواز بلند باری باری سورۂ کہف کی تلاوت کرتے ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

جمعہ کے روز سورۂ کہف پڑھنے کا بڑا ثواب ہے، پڑھنے والے کے لیے اللہ کے رسول ﷺ نے بڑی بشارت سنائی ہے۔[1] لیکن واضح رہے کہ اس کے پڑھنے کے لیے کوئی خاص وقت متعین نہیں ہے، اگر کوئی غروب آفتاب تک بھی پڑھ لے، تو اس کو ثواب مل جائے گا، آپ نے لوگوں کے پڑھنے کا جو طریقہ لکھا ہے، وہ سراسر غلط ہے، اس میں خلاف شرع بہت سی باتیں ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

(۱) اذان کے بعد پڑھنے کو لوگ ضروری سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔

(۲) مسجد کو اللہ رب العزت کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے، اذان کے بعد متصلاً لوگ سنن قبلیہ پڑھنے میں مشغول ہوں گے، بعض لوگ ذکر واذکار اور تسبیحات پڑھنے میں مشغول ہوں گے اور ہر ایک کو اپنے اپنے اعمال کا ثواب مل جائے گا؛ لیکن جو لوگ قرآن مجید بہ آواز بلند پڑھ رہے ہوں گے، ان کی وجہ سے نماز اور ذکر واذکار میں مشغول لوگوں کی نمازوں اور ذکر میں خلل لازم آئے گا، گویا بلند آواز سے قرآن کی

---

(۱) عن أبي سعيد الخدري، قال: «من قرأ سورة الكهف ليلة الجمعة، أضاء له من النور فيما بينه وبين البيت العتيق». (مسند الدارمي المعروف بـ (سنن الدارمي) - أبو محمد عبد الله بن عبد الرحمن الدارمي، التميمي (م: ۲۵۵ھ): ۴/ ۲۱۴۳، رقم: ۳۴۵۰، ومن كتاب فضائل القرآن، باب في فضل سورة الكهف، ت: حسين سليم أسد الداراني، ط: دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية)

«إن من قرأ سورة الكهف يوم الجمعة أضاء له من النور ما بين الجمعتين». (المستدرك على الصحيحين - الحاكم النيسابوري (م: ۴۰۵ھ): ۲/ ۳۹۹، رقم: ۳۳۹۲، كتاب التفسير، تفسير سورة الكهف، ط: دار الكتب العلمية☆ الدعوات الكبير - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۲/ ۱۳۳، رقم الحديث: ۵۲۶، باب القول والدعاء يوم الجمعة☆ السنن الصغير: ۱/ ۲۳۳، رقم الحديث: ۶۰۶، ۶۰۷، باب فضل الجمعة☆ السنن الكبرى: ۳/ ۳۵۳، رقم: ۵۹۹۶، كتاب الجمعة، باب ما يؤمر به في ليلة الجمعة ويومها من كثرة الصلاة على رسول الله - صلى الله عليه وسلم - وقراءة سورة الكهف الخ ☆ روح المعاني: ۸/ ۱۹۰، دار الكتب العلمية)

تلاوت کرنے والے ان لوگوں کے حقوق باطل کر رہے ہیں۔ (۲)

(۳) قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔ (۳)

ترجمہ: اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگایا کرو اور خاموش رہا کرو، امید ہے کہ تم پر رحمت ہو۔

اس آیت شریفہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآن مجید کی جب تلاوت کی جائے، تو ضروری ہے کہ اسے غور سے سنا جائے اور خاموشی اختیار کی جائے؛ جب ایک آدمی جمعہ کے روز اذان کے بعد سورۂ کہف کی بہ آواز بلند تلاوت کرے گا، تو اس سے نماز پڑھنے والے حضرات کی نماز میں خلل لازم آئے گا اور نہ سننے کی صورت میں وہ لوگ گنہ گار ہوں گے، جس کا سبب تلاوت کرنے والا شخص بنے گا۔

(۴) مذکور طریقے سے پڑھنا اسلاف واخلاف کسی سے ثابت نہیں ہے؛ اس لیے اس طریق پر پڑھنا اور اس کو سنت سمجھنا جائز نہیں ہے۔ (۴)

(۵) اس کو ضروری سمجھنا بدعت میں داخل ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔ (۵)

---

(۲) وقد تقدم النهي عن القراءة جماعة والذكر جماعة. وإذا كان ذلك كذلك فينبغي له أن ينهى الناس عما أحدثوه من قراءة سورة الكهف يوم الجمعة جماعة في المسجد أو غيره... فيقرأها سرا في نفسه في المسجد أو جهرا في غيره أو فيه إن كان المسجد مهجورا ما لم يكن فيه من يتشوش بقراءته، والسر أفضل، وأما اجتماعهم لذلك فبدعة كما تقدم والله تعالى أعلم. (المدخل - ابن الحاج المالكي (م: ۷۳۷هـ): ۲/۲۸۱، فصل في الصلاة على الميت في المسجد، ط: دار التراث العربي)

(۳) ۷-الأعراف: ۲۰۴.

(۴) وفي حاشية الحموي عن الإمام الشعراني: أجمع العلماء سلفا وخلفا على استحباب ذكر الجماعة في المساجد وغيرها إلا أن يشوش جهرهم على نائم، أو مصل، أو قارئ إلخ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۶۶۰، كتاب الصلاة، باب الاستخلاف، فروع: أفضل المساجد، ط: دار الفكر بيروت)

(۵) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد». (صحيح البخاري: ۱/۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود. ط: البدر - ديوبند)

عليكم بسنتي وسنة الخلفاء المهديين الراشدين، تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ، وإياكم ومحدثات الأمور، فإن كل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة. (سنن أبي داؤد: ۲/۶۳۵، رقم: ۴۶۰۷، كتاب السنة، باب لزوم السنة، ط: البدر - ديوبند)

(۶) مذکور طریق کے مطابق پڑھنا خلاف سنت ہونے کی وجہ سے حضرات علماء نہیں پڑھیں گے، تو ناواقف لوگ ان پر لعن طعن کریں گے اور ان کے لعن طعن کا سبب یہی پڑھنے والے لوگ بنیں گے؛ لہٰذا یہ ناجائز اور حرام ہے۔ (۱)

لہٰذا ثواب حاصل کرنے کی نیت سے جمعہ کے روز غروب آفتاب سے پہلے پہلے جب کبھی اس کی تلاوت کرلے گا، تو اس کو اس کا ثواب مل جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۸/۸/۱۹۷۷ء

[۶۴] مکان، دوکان اور کاروبار کے افتتاح کے لیے کوئی اصلِ شرعی ہے؟

۲۶۸-سوال: نیا مکان، نئی دکان یا اور کوئی کاروبار شروع کرنے سے پہلے افتتاح کے موقع پر قرآن پاک کی تلاوت اور دعاء کے بعد کچھ کھانے پینے کا پروگرام منعقد کیا جا سکتا ہے؟ افتتاح کی شریعت میں کوئی اصل ہے یا نہیں؟ زید کا کہنا ہے کہ اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے، اس کے متعلق شرعی رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

فتاویٰ شامی اور عالمگیری میں لکھا ہے کہ گیارہ مواقع ایسے ہیں، جن میں دعوتِ طعام مستحب ہے، ان میں سے ایک "وکیرۃ" ہے۔ (۲) "وکیرۃ" اس کھانے کو کہا جاتا ہے، جسے نئے مکان کے افتتاح کے موقع پر

(۱) لأن الأصل أن سبب الحرام حرام. (فتح القدير-ابن الهمام: ۱۰/۴۷، كتاب الكراهة، فصل في الاستبراء وغيره، ط: دار الفكر)

(۲)

إن الولائم عشرة مع واحد	من عدها قد عز في أقرانه
فالخرس عند نفاسها وعقيقة	للطفل والإعذار عند ختانه
ولحفظ قرآن وآداب لقد	قالوا الحذاق لحذقه وبيانه
ثم الملاك لعقده ووليمة	في عرسه فاحرص على إعلانه
وكذاك مأدبة بلا سبب يرى	و وكيرة لبنائه لمكانه
ونقيعة لقدومه ووضيمة	لمصيبة وتكون من جيرانه
ولأول الشهر الأصم عتيرة	بذبيحة جاءت لرفعة شأنه

(رد المحتار: ۶/۱۶، كتاب الإجارة، شروط الإجارة، ط: دار الفكر-بيروت☆البحر الرائق: ۷/۳۰۲، كتاب الإجارة، طلب الأجر...الخ، ط: دار الكتاب الإسلامي)

کھلایا جائے۔ (۱) بخاری شریف کی دوسری جلد کے حاشیہ نمبر: ۵ میں ہے کہ دوکان یا مکان کے افتتاح کے موقع پر دوست واحباب وغیرہ کو دعوتِ طعام دینا جائز ہے۔ (۲) البتہ یہ دعوتِ طعام قرآن خوانی کے عوض میں نہ ہونی چاہیے۔ (۳) اس موقع پر قرآن خوانی کو ضروری سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۵] روضۂ اقدس کی جانب ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا

۲۶۹-سوال: مسجدِ نبوی میں روضۂ اقدس کی جانب ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا جائز ہے یا نہیں؟ حکومتِ سعودی کی جانب سے وہاں نگراں متعین ہوتے ہیں، جو ہاتھ اٹھانے سے منع کرتے ہیں، اگر اس دعاء کے دوران روضۂ اقدس کی جانب پشت ہوجائے، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

روضۂ اقدس کی زیارت کے وقت صلاۃ وسلام کے بعد دعاء مانگنا ہو، تو بہتر یہی ہے کہ ہاتھ نہ اٹھائے، قبلہ رُخ ہوکر دعاء کرے، یا روضۂ اقدس سے کچھ ہٹ کر، قبلہ رُخ ہوکر دعاء کرے، ہاتھ اٹھائے

---

(۱) والتوكير: أن يدعو الناس إلى طعام يتخذه إذا فرغ من بناء بيته أو داره، وكر توكيرا، واسم الطعام: الوكيرة. (جمهرة اللغة-ابن دريد الأزدي (م:۳۲۱ھ): ۲/ ۸۰۰، باب الراء والكاف، مع مابعدهما من الحروف، ت: رمزي منير بعلبكي، ط: دار العلم للملايين - بيروت☆ لسان العرب-محمد بن مكرم، ابن منظور الأنصاري، الإفريقي (م:۷۱۱ھ): ۵/ ۲۹۳، باب الراء، فصل الياء، ط: دار صادر - بيروت☆الزاهر في معاني كلمات الناس- أبو بكر الأنباري المعروف بابن الأنباري (م:۳۲۸ھ): ۱/ ۳۱۶، باب: وقولهم: دعي فلان إلى الوليمة، ت: د. حاتم صالح الضامن، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)

الضيافات ثمانية أنواع: الوليمة للعرس، والخرس بضم الخاء المعجمة، ويقال الخرص أيضا بالصاد المهملة للولادة، والاعذار بكسر الهمزة، وبالعين المهملة، والذال المعجمة للختان، والوكيرة للبناء، والنقيعة لقدوم المسافر، مأخوذة من النقع وهو الغبار. (شرح النووي على صحيح مسلم :۹/ ۲۱۷، باب الصداق وجواز كونه تعليم قرآن وخاتم حديد، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

(۲) صحيح البخاري: ۲/ ۷۷۶، كتاب النكاح، تحت باب: الوليمة حق، رقم الهامش: ۵، ط: البدر- ديوبند.

(۳) قال تاج الشريعة في شرح الهداية: إن القرآن بالأجرة لا يستحق الثواب لا للميت ولا للقارئ. وقال العيني في شرح الهداية: ويمنع القارئ للدنيا، والآخذ والمعطي آثمان ...فإذا لم يكن للقارئ ثواب لعدم النية الصحيحة، فأين يصل الثواب إلى المستأجر، ولولا الأجرة ما قرأ أحد لأحد في هذا الزمان؛ بل جعلوا القرآن العظيم مكسبا، ووسيلة إلى جمع الدنيا. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۵۶، كتاب الإجارة، مطلب في الاستيجار على المعاصي، ط: دار الفكر-بيروت)

بغیر روضۂ اقدس کی جانب رُخ کر کے دعاء کرنا بہتر ہے، اگر چہ اس صورت میں پشت قبلہ کی جانب ہو، ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن چوں کہ اِس شکل میں مبتدعین - جو قبروں سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں - سے مشابہت لازم آتی ہے، اس وجہ سے وہاں ہاتھ اٹھانے سے روکا جاتا ہے۔[۱]

(مراقی الفلاح: ۴۰۶)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۶] دسویں محرّم یا اور کسی دِن فاتحہ دینا

۲۷۰-سوال: دسویں محرم کو یا اور عام دنوں میں شربت یا کھانا کھلانے سے پہلے فاتحہ دینا (یعنی کھانا اور شربت پر فاتحہ پڑھنا) جائز ہے یا بدعت؟ اگر کوئی اِمام اِس طرح فاتحہ دے، تو اُس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً

مروجہ فاتحہ خوانی بدعت اور ناجائز ہے۔[۳]

اس کے متعلق مزید تفصیل کے لیے گجراتی کتاب: احکام میت کا مطالعہ کریں۔

[۶۷] ۱- دولہے کا ہار پہننا

[۶۸] ۲- دولہا کو شادی کی تقریب پر سونے کی انگوٹھی ہدیہ دینا

۲۷۱-سوال: اگر دولہن کے رشتہ داروں میں سے کوئی دولہا کو ہدیہ کے طور پر سونے کی انگوٹھی

(۱) اگر ہاتھ اُٹھانا ہی ہو، تو قبلہ رُخ ہو کر ہاتھ اُٹھا کے دعا مانگے، تا کہ صاحب قبر سے مانگنے کا شبہ نہ ہو:
عن عبد الله، قال: "والله لكأني أرى رسول الله - صلى الله عليه وسلم - في غزوة تبوك، وهو في قبر عبد الله ذي البجادين وأبو بكر وعمر رضي الله تعالى عنهم، يقول: أدليا مني أخاكما، وأخذه من قبل القبلة حتى أسنده في لحده، ثم خرج النبي - صلى الله عليه وسلم - وولاهما العمل، فلما فرغ من دفنه استقبل القبلة رافعا يديه يقول: اللهم إني أمسيت عنه راضيا فارض عنه، وكان ذلك ليلا. فوالله لقد رأيتني ولوددت أني مكانه، ولقد أسلمت قبله بخمسة عشر سنة". (حلية الأولياء وطبقات الأصفياء - أبو نعيم أحمد بن عبد الله، الأصبهاني (م: ۴۳۰ھ): ۱/ ۱۲۲، المهاجرون من الصحابة، ط: دار الفكر، بيروت)
(۲) ثم تدعو بما شئت، ثم انهض متوجها إلى القبر الشريف فتقف بمقدار أربعة أذرع بعيدا عن المقصورة الشريفة بغاية الأدب، مستدبرا القبلة. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - الشرنبلالي (م: ۱۰۶۹ھ)، ص: ۲۸۳، في زيارة النبي صلى الله عليه وسلم، ط: المكتبة العصرية)
(۳) فتاویٰ رحیمیہ میں فتاویٰ سمرقندی کے حوالے سے منقول ہے: قراءة الفاتحة والإخلاص والكافرون على الطعام بدعة.
(فتاویٰ رحیمیہ: ۲/ ۱۱۶، کتاب السنۃ والبدعۃ، ط: دار الاشاعت، کراچی)

دے، تو اس کا قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور وہ لے لے، تو اس کا کیا کرے؟ کیا وہ کسی کو بہ طور عطیہ دے سکتا ہے، یا اسے بیچ کر قیمت حاصل کر سکتا ہے؟

اسی طرح دولہا کو سہرا پہنانا یا پھولوں کا ہار پہنانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ہار پہنانا جائز ہو تو ہار کون سا ہونا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مرد کے لیے سونے کی انگوٹھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ (۱) لیکن اگر کوئی اُسے سونے کی انگوٹھی بطور ہدیہ دے، تو اُس کا لینا جائز ہے، البتہ اُسے چاہیے کہ وہ انگوٹھی اپنی کسی رشتہ دار عورت کو دے دے، یا فروخت کر کے اُس کی قیمت حاصل کر لے۔

حضور اکرم ﷺ کے پاس ایک مرتبہ ایک ریشمی قباء بہ طور ہدیہ آئی، آپ ﷺ نے اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ تو اس کو ناپسند فرماتے ہیں، تو پھر میرے پاس کیسے بھیج دیا؟ آپ ﷺ نے جواباً فرمایا کہ میں نے آپ کے پاس پہننے کے لیے نہیں بھیجا ہے؛ بل کہ اس لیے بھیجا ہے کہ آپ اُسے فروخت کریں اور اس کی قیمت استعمال کر لیں، چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُسے دو ہزار درہم میں بیچ دیا۔ (مختصر مفہوم از مسلم: ۲/ ۱۹۲)[۲]

شادی کی تقریب میں دولہے کو سہرا پہنانا' ہندوانہ رواج ہے، اس لیے اُس کا پہننا جائز نہیں ہے،

---

(۱) إن نبي الله صلى الله عليه وسلم: أخذ حريرا فجعله في يمينه، وأخذ ذهبا، فجعله في شماله ثم قال: إن هذين حرام على ذكور أمتي. (سنن أبي داود، ص: ۵۶۱، رقم: ۴۰۵۷، كتاب اللباس، باب في الحرير للنساء، عن علي رضي الله تعالى عنه، ط: البدر - ديوبند☆ المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۸/ ۱۶۰، رقم: ۵۱۴۴، ۵۱۴۵، ۵۱۴۶، كتاب الزينة، تحريم الذهب على الرجال، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

(۲) جابر بن عبد الله، يقول: لبس النبي - صلى الله عليه وسلم - يوما قباء من ديباج أهدي له، ثم أوشك أن نزعه، فأرسل به إلى عمر بن الخطاب، فقيل له: قد أوشك ما نزعته يا رسول الله، فقال: نهاني عنه جبريل، فجاءه عمر يبكي، فقال: يا رسول الله، كرهت أمرا، وأعطيتنيه فما لي؟ قال: إني لم أعطكه لتلبسه، إنما أعطيتكه تبيعه، فباعه بألفي درهم. (صحيح مسلم: ۲/ ۱۹۲، رقم: ۱۶ - (۲۰۷۰)، باب تحريم استعمال إناء الذهب والفضة على الرجال والنساء ... الخ، ط: البدر - ديوبند)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: **"من تشبه بقوم فهو منهم"**. (۳) کہ جو شخص کسی غیر مسلم قوم کی وضع اختیار کرے، اُس کا شمار اُن ہی میں ہوگا۔ نیز اُس میں فضول خرچی بھی ہے، اس لیے بھی جائز نہیں، پھولوں کا ہار خلافِ سنت ہے، اُس میں بھی فضول خرچی اور غیروں سے مشابہت ہے، مگر اُس کی قباحت سہرا کے مقابلہ میں کم ہے، تاہم مذکورہ وجوہات کی بنیاد پر اُس سے بچنا اولیٰ ہے۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۹] ایک مہینے میں تین نکاح کرنے سے کوئی مصیبت آسکتی ہے؟

۲۷۲-سوال: میرے ایک چھوٹے بھائی اور دو بہنوں کا رشتہ طے ہوا ہے، دونوں بہنوں کے سسرال کے رشتہ داروں کا اصرار یہ ہے کہ ربیع الآخر ہی میں نکاح ہو جائے، اور ہم بھی اپنے بھائی کا نکاح اُسی مہینے میں کرنے کی سوچ رہے ہیں؛ لیکن ہمارے گھر کی عورتیں اور بعض جاہل رشتہ داروں کا یہ کہنا ہے کہ ایک ہی دِن ایک شامیانے میں تین نکاح نہیں ہو سکتے، اگر ایسا کیا گیا، تو آفات آئیں گی، اِن بے بنیاد باتوں کی وجہ سے گھر کی عورتوں میں اختلاف بڑھتا جا رہا ہے، تو کیا ایک ہی مہینے میں اگر تین نکاح پڑھے گئے، تو اُس کی وجہ سے کوئی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے؟ اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ ربیع الآخر کے بعد جمادیٰ الاولیٰ میں تین نکاح ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں، تاکہ گھر کی عورتوں کی غلط فہمی دور ہو۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورتِ مسئولہ میں عورتوں کا عقیدہ بالکل غلط ہے، ایک مہینہ، ایک ہفتہ بل کہ ایک ہی دِن میں تین، تیرہ یا تئیس نکاح کرانا بھی جائز ہے، از روئے شریعت میرا مشورہ یہ ہے کہ بہنوں کے نکاح سے ایک دِن

---

(۳) سنن أبي داود، ص:۵۵۹، رقم: ۴۰۳۱، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة، ط: البدر - ديوبند.

سہرا ہندوانہ رسم ہے، اُن ہی سے لی گئی ہے، وہ تاروں کو باندھتے ہیں، مسلمانوں نے پھولوں کا بنانا شروع کر دیا ہے؛ مگر رسم اُن ہی کی ہے اور قابلِ ترک ہے۔ (کفایت المفتی، کتاب الحظر والاباحۃ، تیرا باب: رسوم مروّجہ، ۹/۸۸، ط: نعمانی پریس، دہلی)

(۴) وفي الفتاوى الصغرى: من تقلنس بقلنسوة المجوس أي لبسها، و تشبه بهم فيها، أو خاط خرقة صفراء على العاتق أي وهو من شعارهم، أو شد في الوسط خيطا كفر، إذا كان متشابها بخيطهم أو ربطهم أو سماه زنارا ... ولو شبه نفسه باليهود و النصارى أي صورة أو سيرة على طريق المزاح و الهزل أي ولو على هذا المنوال كفر. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۲۲۷، فصل: في الكفر صريحا و كناية، ط: ياسر نديم - ديوبند)

چوں کہ ہار پہننے میں غیروں کی مشابہت لازم آتی ہے، البتہ یہ ان کا مذہبی شعار نہیں ہے، اس لیے تکفیر نہیں کی جائے گی، البتہ مشابہت کی بناء پر اس سے احتراز لازم ہوگا۔

پہلے اپنے بھائی کا نکاح کروادیں، میاں بیوی کی خلوت بھی ہوجائے، پھر ولیمہ کردیں، جس میں بہنوں کی شادی میں آنے والے مہمانوں کی مہمان نوازی بھی ہوجائے گی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جس نکاح میں خرچ کم ہو، اُس میں برکت زیادہ ہوتی ہے۔ (حدیث شریف)[1]

سوال میں مذکور عقیدے کے علاوہ اور بھی بہت سے مہینے اور دِنوں کے متعلق عورتوں میں یہ غلط بات پھیلی ہوئی ہے کہ وہ منحوس ہیں، حالاں کہ یہ عقیدہ بالکل خلافِ شریعت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی بھی چیز میں نحوست نہیں ہوتی۔ (بخاری شریف)[2]

بعض عورتیں بعض مہینوں کو خالی مانتی ہیں، یعنی وہ یہ سمجھتی ہیں کہ اس میں کوئی بھی کارِ خیر یا بڑا اہم کام نہیں ہوسکتا، یہ عقیدہ رکھنا ناجائز ہے، اِس طرح کے عقائد غیر مسلمین سے اختلاط ومخالطت کی وجہ سے ہمارے معارے میں پھیل گئے ہیں۔

بعض عورتیں شوال کے مہینے کو نحوست والا مانتی ہیں، حالاں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرا نکاح شوال میں ہوا، رخصتی بھی شوال میں ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے جتنی محبت تھی، ازواجِ مطہرات میں سے کسی اور سے اتنی نہیں تھی۔ (حدیث شریف)[3]

آپ اگر تینوں نکاح ربیع الآخر ہی میں کریں، تو آپ کو ایک سو شہیدوں کا ثواب ملے گا، اُس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''جو شخص میری امت میں فتنہ وفساد کے موقع پر میری کسی ایک سنت کو زندہ کرے گا، تو اُسے سو شہیدوں کے برابر ثواب ملے گا۔'' (حدیث شریف)[4]

---

(۱) عن عائشة رضي الله عنها قالت: أعظم النكاح بركة أيسرها مؤنة. (مسند أبي داود الطيالسي (م: ۲۰۴ھ): ۳/ ۴۶، رقم: ۱۵۳۰، ط: دار هجر - مصر)

(وانظر مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۲۴/ ۳۴۶، رقم: ۲۴۵۲۹، ☆ شعب الإيمان - أبو بكر البيهقي: ۸/ ۵۰۱، رقم: ۶۱۴۶، ط: مكتبة الرشد - الرياض)

(۲) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا عدوى، ولا طيرة، ولا هامة، ولا صفر، وفر من المجذوم كما تفر من الأسد. صحيح البخاري: ۲/ ۸۵۰، رقم: ۵۷۰۷، كتاب الطب، باب الجذام، ط: البدر ديوبند)

(۳) عن عائشة رضي الله عنها قالت: تزوجني رسول الله - صلى الله عليه وسلم - في شوال، وبنى بي في شوال، فأي نساء رسول الله - صلى الله عليه وسلم - كان أحظى عنده مني. قال: وكانت عائشة تستحب أن تدخل نساءها في شوال. (صحيح مسلم: ۱/ ۴۵۶، رقم: ۷۳ - (۱۴۲۳)، كتاب النكاح، باب استحباب التزوج والتزويج في شوال... الخ، ط: البدر - ديوبند)

(۴) من تمسك بسنتي عند فساد أمتي فله أجر مائة شهيد. (أمالي ابن بشران - أبو القاسم عبد الملك بن محمد ابن =

لہٰذا دیگر اقوام کے رسوم و رواج اور اُن کے غلط عقائد پر کاری ضرب لگائیں، اپنے عقائد درست کریں اور اصلاح کی خاطر تینوں نکاح اسی مہینے میں پڑھا کر ایک سو شہیدوں کا ثواب حاصل کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۰] قبر پر چادر چڑھانا

۲۷۳-سوال: حضرت مفتی صاحب میرے پاس لندن سے ایک صاحب کا خط آیا ہے، اس میں لکھا ہے کہ کسی بزرگ کی درگاہ پر ہرے رنگ کی چادر چڑھا دینا؛ لیکن مجھے علم نہیں کہ شریعت کے احکام کی رو سے چادر چڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ لہٰذا اس کا جواب بالتفصیل اسی کاغذ کے پیچھے تحریر فرمادیں؛ تاکہ میں اسے لندن بھیج سکوں۔

الجواب حامداومصلیا:

مرنے کے بعد میت کو اگر وہ نیک ہے، تو اس کے اعمال نیک کی وجہ سے سکون واطمینان اور راحت حاصل ہوتی ہے؛ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔“ (۱) اگر میت کے اعمال اچھے نہ ہوں، تو قبر پر گنبد بنانے یا چادر چڑھانے سے میت کو رتی برابر بھی فائدہ نہیں ہوگا؛ بل کہ چادر چڑھانے والے کا مال برباد ہوگا اور مال کو برباد کرنا فضول خرچی اور حرام ہے۔ (۲) فضول خرچی کا بھی گناہ ہوگا اور چادر چڑھانے والے کے عقیدے میں بھی خرابی آئے گی، یہ دوسرا گناہ ہوگا؛ اس لیے چادر چڑھانا جائز نہیں ہے۔ (۳) مذکورہ شخص نے چادر

بشران بن مهران البغدادي (م: ۴۳۰ھ): ۱/ ۲۱۸، رقم: ۵۰۱، ضبط نصه: أبو عبد الرحمن عادل بن يوسف العزازي، ط: دار الوطن- الرياض)

المتمسك بسنتي عند فساد أمتي، له أجر مائة شهيد. (الإبانة الكبرى- ابن بطة العكبري (م: ۳۸۷ھ): ۱/ ۳۴۲، رقم: ۲۱۴، باب ما أمر به من التمسك بالسنة والجماعة ...الخ، ت: رضا معطي، وعثمان الأثيوبي، ويوسف الوابل، ط: دار الراية للنشر والتوزيع- الرياض☆المعجم الأوسط- أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۵/ ۳۱۵، رقم: ۵۴۱۴، ت: طارق بن عوض الله، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين- القاهرة)

(۱) قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم-: "إنما القبر روضة من رياض الجنة أو حفرة من حفر النار." (سنن الترمذي: ۲/ ۷۳، رقم الحديث: ۲۴۶۰، أبواب صفة القيامة، ط: ياسر نديم- ديوبند)

(۲) وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ [۶- الأنعام: ۱۴۱]

(۳) تكره الستور على القبور. (رد المحتار: ۲/ ۲۳۸، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر)

چڑھانے کی منت مانی ہو، تو وہ منت بھی صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ منت صرف عبادت وبندگی کی ہوتی ہے، گناہ کے کام کی منت جائز نہیں ہے۔[1] لہٰذا چادر چڑھانا جائز نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۱] قبر پر پھول چڑھانا، اگربتی جلانا اور روشنی کرنا

۲۷۴-سوال: قبر پر پھول چڑھانا کیسا ہے؟ اسی طرح اگربتی اور دیئے وغیرہ روشن کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصلیا:

قبر پر اگربتی جلانا اور روشنی کرنا اسراف اور فضول خرچی کی وجہ سے حرام ہے اور پھول چڑھانا بھی چوں کہ مال برباد کرنا ہے؛ اس لیے ناجائز ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۰۸/۱۲/۱۹۷۶ء

[۷۲] قبر پر اذان دینا، فاتحہ کرانا اور پھول چڑھانا

۲۷۵-سوال: ہمارے یہاں میت کے دفن کے وقت قبر میں اذان دی جاتی ہے، اسی طرح

---

(۱) (أن لا يكون معصية لذاته) قال ابن عابدين: "قال في الفتح: وأما كون المنذور معصية يمنع انعقاد النذر، فيجب أن يكون معناه إذا كان حراما لعينه أو ليس فيه جهة قربة. (رد المحتار: ۳/ ۷۳۶، كتاب الإيمان، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) عن ابن عباس، قال: «لعن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - زائرات القبور، والمتخذين عليها المساجد والسرج». (سنن أبي داؤد: ۲/ ۴۶۱، رقم الحديث: ۳۲۳۶، كتاب الجنائز، باب في زيارة النساء القبور، ط: المكتبة الأشرفية - ديوبند ☆سنن الترمذي: ۱/ ۷۳، رقم الحديث: ۳۲۰، أبواب الصلاة، باب ماجاء في كراهية أن يتخذ على القبر مسجداً، ط: البدر - ديوبند☆سنن النسائي: ۴/ ۹۴، رقم الحديث: ۲۰۴۳، كتاب الجنائز، التغليظ في اتخاذ السرج على القبور، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

قال علي القاري بذيل هذا الحديث: والنهي عن اتخاذ السرج لما فيه من تضييع المال؛ لأنه لا نفع لأحد من السراج، ولأنها من آثار جهنم، وإما للاحتراز عن تعظيم القبور. (مرقاة المفاتيح: ۲/ ۶۱۹، كتاب الصلاة، باب المساجد ومواضع الصلاة، رقم الحديث: ۷۴۰، ط: دار الفكر - بيروت)

وفي الدر المختار: وما يؤخذ من الدراهم، والشمع، والزيت ونحوها إلى ضرائح الأولياء الكرام تقربا إليهم، فهو بالإجماع باطل وحرام. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۳۹، كتاب الصوم، مطلب في صوم الست من الشوال، بيروت)

قبر پر پھول چڑھانے کے سلسلے میں تفصیلی فتویٰ ملاحظہ ہو: امداد الاحکام: ۱/ ۱۸۴، کتاب السنۃ والبدعۃ، ط: زکریا بک ڈپو، دیوبند۔

دفن کے بعد فاتحہ نیز چالیس قدمی فاتحہ اور قبر میں پھول، صندل ڈالنے اور اس طرح کی بہت سی چیزوں کے کرنے کا رواج ہے، آپ رہنمائی فرمائیں کہ ان کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

قبر میں یا قبر کے اوپر اذان دینا[۱] اور دفن کے بعد فاتحہ یا چالیس قدمی فاتحہ، اسی طرح قبر میں پھول اور صندل ڈالنا؛ ان میں سے کچھ بھی نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرام سے ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا یہ سب امور ناجائز و بدعت ہیں۔[۲] رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: جو شخص دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کرے، وہ مردود ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی خلاف سنت چیزیں لوگ سنت سمجھ کر کرتے ہیں، یہ سب امور ناجائز اور بدعت ہیں۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۳] قبر کے پاس اگربتی جلانا

۲۷۶-سوال: قبرستان میں کچی یا پکی قبر کے پاس لوبان یا اگربتی جلانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

قبروں پر چراغاں کرنا یا اگربتی جلانا جائز نہیں، حرام ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ایسے انسان پر، جو قبروں کو مسجد بنادے (کہ قبر کو سجدہ کرتا ہو) اور

---

(۱) لا يسن الأذان عند إدخال الميت في قبره، كما هو المعتاد الآن، وقد صرح ابن حجر في فتاويه بأنه بدعة. وقال: ومن ظن أنه سنة قياسا على ندبهما للمولود إلحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم يصب. (رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۱۳۹، باب في صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، كتاب الصلاة، ت: عادل أحمد الموجود، علي محمد معوض، ط: دار عالم الكتب، الرياض، طبع خاص: ۱۴۲۳ھ= ۲۰۰۳ء)

(۲) ويكره النوم عند القبر... وكل ما لم يعهد في السنة، والمعهود منها ليس إلا زيارتها والدعاء عندها قائما، كما كان يفعل صلى الله عليه وسلم في الخروج إلى البقيع. (فتح القدير: ۲/ ۱۴۲، فصل في الدفن قوله ويلحد السنة عندنا اللحد الخ، ط: دار الفكر، بيروت. والفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۳، كتاب الصلاة، باب في الجنائز و النقل من مكان إلى مكان آخر، الفصل السادس في القبر و الدفن، ط: دار الکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول: ۱۴۲۱ھ= ۲۰۰۰ء)

(۳) من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۷۱، رقم: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، ط: البدر-ديوبند ☆ صحيح مسلم: ۲/ ۷۷، رقم: ۱۷-(۱۷۱۸)، كتاب الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور، ط: فيصل-ديوبند)

دیے (چراغ) جلاتا ہو۔ (ابوداؤد شریف، ترمذی، نسائی شریف، مشکوۃ شریف: ۱/۷۱)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۴] حقانی صاحب اور قبروں پر پھول چڑھانا

۲۷۷-سوال: جناب محمد پالن حقانی صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے، لوگوں کا خیال ہے کہ اس کتاب سے قبروں پر پھول چڑھانے کا جواز معلوم ہوتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ اور کیا حقانی صاحب مستند عالم ہیں؟

الجواب حامداومصليا:

حقانی صاحب نے خود لکھا ہے کہ میں عالم نہیں ہوں، اس مسئلہ میں ان سے تسامح ہوا ہے، بعض علماء نے پھول کی چادر چڑھانے کو جائز کہا ہے، لیکن علماءِ محققین نے منع کیا ہے، درمختار میں ہے کہ پھول کی چادر چڑھانے کا مقصد یہ ہو کہ میت مجھ سے راضی ہو جائے، تو پھول چڑھانا حرام ہے، اگر مقصد قبر کی زینت ہو، تو مکروہ ہے؛ کیوں کہ قبر کو مزین کرنے کی ضرورت نہیں ہے، قبرستان میں جانے کا اصل مقصد آخرت کو یاد کرنا ہے۔ (ماۃ مسائل: ص ۷۵)[۲] واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن ابن عباس، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم زائرات القبور، والمتخذين عليها المساجد والسرج. (سنن الترمذي: ۱/ ۷۳، رقم الحديث: ۳۲۰، كتاب الصلاة، باب ما جاء في كراهية أن يتخذ على القبر مسجدا، ط: البدر - ديوبند ☆سنن أبي داؤد: ۲/ ۴۶۱، رقم الحديث: ۳۲۳۶، كتاب الجنائز، باب في زيارة النساء القبور، ط: البدر - ديوبند ☆سنن النسائي: ۴/ ۹۴، رقم الحديث: ۲۰۴۳، التغليظ في اتخاذ السرج على القبور، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

قال الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): (والسرج): جمع سراج، والنهي عن اتخاذ السرج لما فيه من تضييع المال، لأنه لا نفع لأحد من السراج، ولأنها من آثار جهنم، وإما للاحتراز عن تعظيم القبور، كالنهي عن اتخاذ القبور مساجد، كذا قاله بعض علمائنا. (مرقاة المفاتيح: ۲/ ۶۱۹، رقم الحديث: ۷۱۰، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے، فتاویٰ رحیمیہ جدید: ۲/ ۲۱۶، ط: دار الاشاعت کراچی، بہ حوالہ ماۃ مسائل، وامداد المسائل ترجمہ ماۃ مسائل۔

وكذلك ما يفعله أكثر الناس من وضع ما فيه رطوبة من الرياحين والبقول ونحوهما على القبور ليس بشيء. (عمدة القاري: ۳/ ۱۲۱، كتاب الوضوء، من الكبائر أن لا يستتر من بوله، ط: دار إحياء التراث العربي)

في الأحكام عن الحجة: تكره الستور على القبور. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۸، مطلب في دفن الميت، باب صلاة الجنازة، ط: بيروت)

[۷۵] پختہ قبر کو توڑ کر کچی قبر بنانا

۲۷۸-سوال: ''صوفی باغ'' مدرسہ میں حضرت شاہ صوفی صاحب لاجپوریؒ کا مزار ہے، اس مزار کو ان کے عقیدت مندوں نے برسوں پہلے پختہ بنایا تھا، قبر زمین سے تین فٹ لمبی، پانچ فٹ چوڑی ہے اور سنگ مرمر کے پتھروں سے پختہ بنائی گئی ہے، تو اگر شرعاً اس طرح کی قبر نا جائز ہو، تو پتھر اکھاڑ کر اس قبر کو مٹی کی بنادینا کیسا ہے؟ اگر ان کے مزار کو اسی طرح پختہ رہنے دیا جائے، تو اس کے جو ذمہ داران ومتولیان ہیں، وہ گنہ گار ہوں گے یا نہیں؟

نیز ان بزرگ کی تاریخ وفات پر مدرسہ کے بچوں سے تقریر کرانا، ایصال ثواب کرانا اور کوئی پروگرام رکھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قبر جس حالت میں ہے، اسی حالت میں رہنے دیجیے، ورنہ صاحب قبر کی بے حرمتی کی جائے گی، کوئی کہے گا کہ قبر کو مٹی کی بنادو، تو کوئی کہے گا کہ اس پر سنگ مرمر لگاؤ؛ لہٰذا ان اختلافات سے بچنے کے لیے'' قبر'' جس حالت میں ہے، اسی حالت پر برقرار رکھی جائے، اس کو توڑ پھوڑ کر کے بے حرمتی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) مسئلہ یہ ہے کہ پختہ قبر کو منہدم کر کے کچی قبر کا نشان باقی رکھا جائے، چناں چہ مروی ہے: عن أبي الهياج الأسدي، قال: قال لي علي بن أبي طالب: ألا أبعثك على ما بعثني عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ »أن لا تدع تمثالا إلا طمسته ولا قبرا مشرفا إلا سويته. (صحيح مسلم: ۱/ ۳۱۲، رقم الحديث: ۹۳-(۹۶۹)، كتاب الجنائز، باب: الأمر بتسوية القبر، ط: فیصل پبلیکیشنز، دیوبند)

قال علي القاري في شرحه: (ولا قبرا مشرفا) هو الذي بني عليه حتى ارتفع دون الذي أعلم عليه بالرمل والحصباء، أو محسومة بالحجارة ليعرف ولا يوطأ. (إلا سويته) في الأزهار قال العلماء: يستحب أن يرفع القبر قدر شبر، ويكره فوق ذلك، ويستحب الهدم، ففي قدره خلاف، قيل إلى الأرض تغليظا، وهذا أقرب إلى اللفظ، أي: لفظ الحديث من التسوية، وقال ابن الهمام: هذا الحديث محمول على ما كانوا يفعلونه من تعلية القبور بالبناء العالي، وليس مرادنا ذلك بتسنيم القبر بل بقدر ما يبدو من الأرض، ويتميز عنها، والله سبحانه أعلم. (مرقاة المفاتيح: ۴/ ۱۵۵، رقم الحديث: ۱۶۹۶، كتاب الجنائز، باب دفن الميت، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

لیکن اگر قبر کو منہدم کرنے میں فتنہ، فساد اور قبر کی بے حرمتی کا اندیشہ ہو، تو اس سے اجتناب لازم ہے۔ (خیال ہوتا ہے کہ=

[۷۶] شب براءت میں قبروں پر پانی ڈالنا

۲۷۹-سوال: بہت سے لوگ شب براءت (۱۵ ؍شعبان کی رات) میں قبرستان جا کر قبر پر پانی ڈالتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

شب براءت میں قبر پر پانی چھڑکنا ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا ایسا کام نہیں کرنا چاہیے۔[1] البتہ قبر کی مٹی اگر ہٹ گئی ہو، تو نئی مٹی ڈال کر پانی چھڑکنا جائز ہے۔[2] لیکن اسی رات میں یہ کام کرنا اور اس کو ضروری سمجھنا جائز نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۷] قبروں پر رسم ورواج کے طور پر روپیہ پیسہ ڈالے جانے کا مسئلہ

۲۸۰-سوال: ہمارے گاؤں میں ایک ہندو مزدور مر گیا، ہندوانہ رسم کے موافق اس کی آخری رسومات ادا کی گئیں، آخری رسومات میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے لوگوں نے اس کی سمادھی (قبر) پر

= حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس جواب کی بنیاد وحکمت یہی ہے) چناں چہ ملا علی قاری تحریر فرماتے ہیں: ثم اعلم أنه إذا كان المنكر حراما وجب الزجر عنه، وإذا كان مكروها ندب، والأمر بالمعروف أيضا تبع لما يؤمر به... وشرطهما أن لا يؤدي إلى الفتنة، كما علم من الحديث (من رأى منكم منكراً، الخ) وأن يظن قبوله، فإن ظن أنه لا يقبل فيستحسن إظهار شعار الإسلام. (مرقاة المفاتيح: ۳۲۶/۹، كتاب الآداب، باب الأمر بالمعروف، رقم الحديث: ۵۱۳۷)

وكره أبو حنيفة - رحمه الله - أن يوطأ على قبر، أو يجلس عليه، أو ينام عليه أو تقضى عليه حاجة من بول أو غائط لما روي عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه نهى عن الجلوس على القبور. (بدائع الصنائع: ۳۲۰/۱، كتاب الصلاة، فصل: في سنة الدفن، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) عن عائشة قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۳۷۱/۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، ط: البدر - ديوبند)

(۲) وإذا خربت القبور فلا بأس بتطيينها، كذا في التتارخانية، وهو الأصح وعليه الفتوى، كذا في جواهر الأخلاطي. (الفتاوى الهندية: ۱۸۲/۱، كتاب الصلاة، باب في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن والنقل، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

ولا بأس برش الماء على القبر؛ لأنه تسوية. (بدائع الصنائع: ۳۲۰/۱، كتاب الصلاة، الجنائز، فصل في سنة الدفن، ط: دار الكتب العلمية بيروت- لبنان الطبعة الثانية: ۱۴۰۶ھ، ۱۹۸۶م)

پانچ پیسے، دس پیسے، ۲۵/ پیسے، اسی طرح سکے ڈالنے لگے، سادھی پر چڑھائی گئی کل رقم پانچ روپے، پچاس پیسہ ہوئی، تین دن کے بعد میں اسے لے آیا اور خرچ کر دیا، جب گھر والوں کو پتہ چلا، تو کہنے لگے کہ وہ پیسے نہیں لینے چاہیے، اب کوئی نہ کوئی بلا ضرور آئے گی، کسی بھی طرح وہ پیسے تجھ کو نقصان پہنچائیں گے، سوال یہ ہے کہ اس پیسے کے لینے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

نفع ونقصان کا مالک اللہ ہے، شیاطین وجن نہیں ہیں؛ ''مذکورہ پیسے سے آپ کو شیطان کچھ نہ کچھ نقصان پہنچائے گا'' یہ من گھڑت باتیں ہیں، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، جن لوگوں کا اس طرح کا عقیدہ ہے، انہیں اپنے عقیدے کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے، اس سلسلے میں میری کتاب ''عقائد اسلام''[۱] ٹکٹ بھیج کر منگوالیں اور مطالعہ کریں۔

البتہ جو پیسے قبر پر ڈالے گئے تھے، ان کا استعمال کرنا آپ کے لیے جائز نہیں تھا؛ اس لیے کہ وہ ان ہی کی ملکیت میں تھے، جنہوں نے ڈالے تھے، قبر پر ڈالنے سے ان کی ملکیت سے خارج نہیں ہوگئے، ان کی اجازت کے بغیر آپ نے ان رقوم کو استعمال کیا، جو بلا شبہ ایک ناجائز کام ہوا۔[۲] لہٰذا جو پیسے آپ نے قبر سے اٹھائے ہیں، وہ ان کے مالک کے حوالے کردیں، تو آپ ذمہ داری سے سبک دوش ہوجائیں گے۔ اور اگر مالک لینے سے انکار کردے، اور آپ غریب ومحتاج ہیں، تو خود آپ کے لیے بھی استعمال کرنا صحیح ہے اور اگر غنی ہیں، تو پھر کسی غریب ومحتاج کو دینے سے آپ بری الذمہ ہوجائیں گے۔[۳] واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

---

(۱) الحمدللہ اب یہ کتاب بزبان اردو ''عقائد اسلام'' کے نام سے حافظ اسجد مفتی احمد بیمات صاحب کے زیر اہتمام شائع ہوچکی ہے۔

(۲) قال اللہ تعالی: وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ [۲-البقرة:۱۸۸]

لأنه لا حق له في مال الغير حتى يكون الإذن إسقاطا لحقه. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/۱۷۵، كتاب المأذون، فروع أقر الصبي و المعتوه الخ، ط: دار الفكر-بيروت)

لأن الإنفاق من مال الغير، لا يجوز إلا بإذنه نصا. (بدائع الصنائع-علاء الدين، الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۶/۷۲، كتاب الشركة، أنواع الشركة، فصل في حكم الشركة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

و التصرف في مال الغير حرام فيجب التحرز عنه. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ) :۶/۱۲۸، كتاب البيع، باب المرابحة و التولية، فصل في بيان التصرف في المبيع الخ، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۳) (الوصية المطلقة)... (لا تحل للغني) لأنها صدقة، وهي على الغني حرام. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/۶۹۸، كتاب الوصايا، فصل في وصايا الذمي وغيره، فروع: أوصى بثلث ماله، ط: دار الفكر-بيروت)

[۷۸] دعاءِ ثانی (فاتحہ) جہراً پڑھ کر دیگر نمازیوں کو خلل پہنچانا

۲۸۱–سوال: ہمارے گاؤں کی مسجد میں پنج وقتہ نماز کے بعد امام صاحب بالجہر دعاء کراتے ہیں، بعض لوگ اُس وقت اپنی سنن ونوافل وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں، اُن کو اس عمل کی وجہ سے نماز میں خلل ہوتا ہے، تو کیا اِن کی رعایت کرتے ہوئے اس کو موخر نہیں کیا جاسکتا ہے؟ یا ہر نمازی اپنی جانب سے انفرادی طور پر پڑھ لے، تو اس میں کوئی حرج ہے؟ دعاء کو ضروری سمجھ لیا جائے، تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

دعاء کے معنی ہیں: بندے کا اللہ تعالیٰ سے مانگنا۔[1] نماز چوں کہ ایک عبادت ہے، اور ہر عبادت اور نیک عمل کے بعد دعاء قبول ہوتی ہے۔[2] اس لیے نماز کے بعد بھی دعاء مانگی جاتی ہے، جو کہ ایک مسنون عمل ہے۔[3] نماز کی صحت اُس پر موقوف نہیں ہے، چوں کہ ہر ایک کی حاجت مختلف ہوتی ہے؛ اس لیے یہ (دعاء) ہر نمازی کا انفرادی عمل ہے، اجتماعی نہیں۔[4] لہٰذا مجمع کا ایک ساتھ پڑھنا، جس سے دوسرے

---

(۱) وقد قال الخطابي: حقيقة الدعاء استدعاء العبد من ربه العناية واستمداده إياه المعونة، وحقيقته إظهار الافتقار إليه، والبراءة من الحول والقوة التي له، وهو سمة العبودية وإظهار الذلة البشرية، وفيه معنى الثناء على الله، وإضافة الجود والكرم إليه. (إتحاف السادة المتقين بشرح إحياء علوم الدين: ۵/ ۲۷-۲۸، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) عن عثمان بن حنيف، أن رجلا ضرير البصر أتى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: ادع الله لي أن يعافيني فقال: إن شئت أخرت لك وهو خير، وإن شئت دعوت، فقال: ادعه، فأمره أن يتوضأ فيحسن وضوءه، ويصلي ركعتين، ويدعو بهذا الدعاء: اللهم إني أسألك، وأتوجه إليك بمحمد نبي الرحمة، يا محمد إني قد توجهت بك إلى ربي في حاجتي هذه لتقضى، اللهم فشفعه في. (سنن ابن ماجة، ص:۹۹، رقم: ۱۳۸۵، كتاب الصلوة، ما جاء في صلاة الحاجة، ط: فيصل-ديوبند)

(۳) عن أبي أمامة قال: قيل: يا رسول الله! أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف الليل الآخر ودبر الصلوات المكتوبات. (سنن الترمذي: ۲/ ۱۸۷، رقم: ۳۴۹۹، أبواب الدعوات، ط: ياسر نديم-ديوبند)

(۴) واعلم أن السنة الأكثرية بعد الصلوات: الانصراف إلى البيوت بدون مكث إلا بقدر خروج النساء. وكان في الأذكار والأدعية كلّ أمير نفسه، ولم تثبت شاكلة الجماعة فيها، كما هو المعروف الآن، إلا في نزر من المواضع. (فيض الباري: ۲/ ۳۱۷، كتاب الأذان، باب مكث الإمام في مصلاه بعد السلام، ط: تحت إشراف المجلس العلمي بدابيل، سورت-غجرات)

نمازیوں کو خلل ہو، جائز نہیں ہے، نیز اس عمل کو ضروری سمجھ لینا بھی جائز نہیں، اگر ضروری سمجھ کر پڑھا جارہا ہے، تو یہ بدعت میں شامل ہو کر گناہ کا باعث ہوگا، دعاء کے متعلق قرآن کریم میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ: "اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً" (۵) یعنی تم اپنے رب سے عاجزی اور آہستگی سے دعاء مانگو۔ اس ارشادِ ربانی کے پیش نظر دعاء بالجہر کو ضروری سمجھنا بدعت ہے، جو حرام ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۹] فرض نماز کے بعد سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھ کر بہ آواز بلند دعا کرنا

۲۸۲-سوال: فرض نماز اور سنن ونوافل سے فراغت کے بعد امام صاحب دعاء مانگتے ہیں اور مقتدی حضرات اس پر آہستہ سے آمین کہتے ہیں، دعا کے اختتام پر امام صاحب بہ آواز بلند "الفاتحة" کہتے ہیں، پھر امام اور مقتدی حضرات سورۂ فاتحہ اور تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھتے ہیں، اس کے بعد امام صاحب مختصر دعا کرتے ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا پانچوں نماز کے بعد ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

دعا کا مطلب ہے "اپنے آپ کو عاجز اور کمزور سمجھ کر اپنے رب سے اپنی ضروریات کو مانگنا"۔ (۱)

نماز سے فراغت کے بعد امام کو زور زور سے دعا کرنے کے لیے مجبور کرنا، (۲) دعا کیے بغیر مسجد سے

---

(۵) ۷-الأعراف: ۵۵۔

(۱) قال ابن حجر معزيا إلى الطيبي: الدعاء هو إظهار غاية التذلل والافتقار إلى الله والاستكانة له. (فتح الباري-ابن حجر العسقلاني: ۱۱/ ۹۵، كتاب الدعوات، ط: دار المعرفة-بيروت ☆ فيض القدير-المناوي: ۲/ ۴۴، حرف الهمزة، ط: المكتبة التجارية الكبرى، مصر)

(۲) گرچہ بعض وجوہات کی بناء پر بلند آواز سے دعا کرنا جائز ہے: وقيل الجهر أفضل لأحاديث كثيرة، منها ما رواه ابن الزبير كان رسول الله -صلى الله عليه وسلم- إذا سلم من صلاته قال بصوته الأعلى: لا إله إلا الله وحده لا شريك له... ولأنه أكثر عملا وأبلغ في التدبر ونفعه متعد لإيقاظ قلوب الغافلين. لیکن آہستہ دعا کرنا افضل ہے: اختلف هل الإسرار في الذكر أفضل؟ فقيل: نعم لأحاديث كثيرة تدل عليه، منها: خير الذكر الخفي، وخير الرزق ما يكفي، ولأن الإسرار أبلغ في الإخلاص وأقرب إلى الإجابة. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۳۱۸، فصل في صفة الأذكار، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

وفي المرقاة: وحمل الشافعي- رحمه الله تعالى- جهره هذا على أنه كان لأجل تعلم المأمومين لقوله تعالى: ولا تجهر بصلاتك. الآية، [۱۷-الإسراء: ۱۱۰] نزلت في الدعاء كما في الصحيحين، واستدل البيهقي وغيره لطلب الإسرار بخبر الصحيحين: أنه عليه السلام أمرهم بترك ما كانوا عليه من رفع الصوت بالتهليل والتكبير، =

نکلنے پر پابندی لگانا، یا اتنی بلند آواز سے دعا کرنا کہ سنن ونوافل پڑھنے والوں کی نمازوں میں خلل واقع ہو؛ یہ سب ناجائز ہیں؛ اس لیے اس طریقے سے دعا نہیں کرنی چاہیے۔ (۳)

نیز دعا میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، اس بناء پر اس طریقے سے دعا کرنا بدعت ہوگا اور ہر بدعت حرام ہے۔ اس صورت میں امام خود بھی گنہ گار ہوگا اور مقتدی حضرات بھی، نیز ایسے امام کو (جو بدعت کو رواج دے) منصب امامت سے الگ کرنا بھی متولی حضرات کی ذمہ داری ہے، ورنہ وہ بھی گنہ گار ہوں گے، ہاں! دعا کی جائز صورت یہ ہے کہ ہر شخص سنن اور نوافل سے فراغت کے بعد اپنی ضروریات اپنے رب کے حضور پیش کرے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ

= وقال: " «إنكم لا تدعون أصم ولا غائبا إنه معكم إنه سميع قريب» " اهـ.(مرقاة المفاتيح: ٢/ ٧٦٠، رقم الحديث: ٩٥٩، باب الذكر بعد الصلاة، ط: دار الفكر بيروت)

وقال الله تعالى: وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ. [٧- الأعراف: ٢٠٥] قال الآلوسي تفسيرا لهذه الآية الكريمة: فيه تجريد الخطاب إلى رسول الله -صلى الله عليه وسلم- وهو عام لكل ذكر، فإن الإخفاء أدخل في الإخلاص وأقرب من القبول... والمراد بالجهر رفع الصوت وبما دونه نوع آخر من الجهر، قال ابن عباس -رضي الله تعالى عنهما- هو أن يسمع نفسه. (روح المعاني: ٥/ ١٣٣، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

وفي الدر المختار: هل يكره رفع الصوت بالذكر والدعاء؟ قيل نعم. وفي شرحه لابن عابدين: وعن النبي -صلى الله عليه وسلم- أنه كره رفع الصوت عند قراءة القرآن والجنازة... وقد حرر المسألة في الخيرية وحمل ما في فتاوى القاضي على الجهر المضر، وقال: إن هناك أحاديث اقتضت طلب الجهر، وأحاديث طلب الإسرار، والجمع بينهما بأن ذلك يختلف باختلاف الأشخاص، والأحوال، فالإسرار أفضل حيث خيف الرياء أو تأذي المصلين أو النيام، والجهر أفضل حيث خلا مما ذكر. (رد المحتار: ٦/ ٣٩٨، الحظر والإباحة، ط: دار الفكر بيروت)

(٣) ورحم الله طائفة من المبتدعة في بعض أقطار الهند، حيث واظبوا على أن الإمام ومن معه يقومون بعد المكتوبة بعد قراءتهم: اللهم أنت السلام ومنك السلام... الخ، ثم إذا فرغوا من فعل السنن والنوافل، يدعوا الإمام عقب الفاتحة جهرا بدعاء مرة ثانية، والمقتدون يؤمنون على ذلك، وقد جرى العمل منهم بذلك على سبيل الالتزام والدوام؛ حتى أن بعض العوام اعتقدوا أن الدعاء بعد السنن والنوافل باجتماع الإمام والمأمومين ضروري واجب... ومن لم يرض بذلك يعزلونه عن الإمامة، ويطعنونه، ولا يصلون خلف من لا يصنع بمثل صنيعهم. وأيم الله إن هذا أمر محدث في الدين. (إعلاء السنن: ٣/ ١٦٧، كتاب الصلاة، باب الانحراف بعد السلام وكيفية سنية الدعاء والذكر بعد الصلاة، ط: إدارة القرآن- كراتشي)

[۸۰] قرآنِ پاک ہاتھ سے گر جانے پر سوا سیر گیہوں کے صدقے کا عقیدہ

۲۸۳-سوال: ہمارے گاؤں میں یہ رواج ہے کہ جب کسی کے ہاتھ سے قرآن پاک گر جائے تو اُس کو سوا سیر گیہوں دینا پڑتا ہے، ایسا عقیدہ رکھنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً

شریعت میں اِس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸۱] دولہا، دولہن کو ہلدی اور ابٹن لگانا کیسا ہے؟

۲۸۴-سوال: شادی سے چند دنوں قبل دولہا اور دلہن کے بدن اور چہرے پر ہلدی لگائی جاتی ہے، ہلدی لگانے کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی رسوم ادا کی جاتی ہیں، تو کیا ہلدی لگانے کی درج ذیل شکل پر عمل کیا جا سکتا ہے کہ لڑکا کو اس کے دوست واحباب ایک ایسے کمرے میں لے جا کر ہلدی لگائیں، جہاں ان دوستوں کے علاوہ کوئی نہ آسکے، اسی طرح لڑکی کی سہیلیاں اسے ایک کمرے میں لے جائیں، اور ہلدی لگادیں، اس صورت پر عمل کرنے کی وجہ سے ہلدی بھی لگ جائے گی اور دوسرے لوگ، جو مختلف رسم ورواج ادا کرتے ہیں، ان سے بھی حفاظت ہو جائے گی؟

الجواب حامداومصلیا:

''ہلدی'' دولہا ہو یا دولہن، دونوں کو لگانا حرام ہے؛ اس لیے کہ:

(۱) غیر قوم کی مشابہت لازم آتی ہے۔[۲]

(۲) اسراف (فضول خرچی) ہے۔[۳]

---

(۱) قال العلامة المناوي رحمه الله تعالى تحت حديث: من أحدث في أمرنا هذا ": أي أنشأ واخترع وأتى بأمر حديث من قبل نفسه ... (ما ليس منه) أي رأياً ليس له في الكتاب، أو السنة، عاضد ظاهر أو خفي، ملفوظ أو مستنبط (فهو رد) أي مردود على فاعله لبطلانه. (فيض القدير: ۱۱/ ۵۵۹۳، رقم الحديث: ۳۳۸۳، مكتبة نزار مصطفى الباز، رياض)

(۲) عن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «من تشبه بقوم فهو منهم». (سنن أبي داؤد، ص: ۵۵۹، رقم: ۴۰۳۱، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة، ط: البدر - ديوبند)

(۳) {وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا} الآية فذلك دليل على أن الإسراف والتقتير حرام. (الكسب - أبو عبد الله محمد بن الحسن الشيباني، ص: ۷۹، الناشر: عبد الهادي حرصوني - دمشق)

(۳) اس حالت میں نماز کا ترک لازم آتا ہے۔ [۱]

(۴) چہرے پر لگانے سے چہرے کی ساخت بدل جاتی ہے، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے۔ [۲]

(۵) غیر قوم کی رسم ورواج کو اپنانے کا گناہ لازم آئے گا۔ جو شخص کافروں کے مذہبی کام کرے گا، تو وہ ایمان سے نکل جائے گا۔ [۳] لہٰذا مذکور رسم ورواج میں ساتھ دینا اور ایسی مجلس ونکاح خوانی میں جانا حرام ہے۔ [۴] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے فساد کے زمانہ میں اگر کوئی میری ایک سنت کو زندہ کریگا، تو اس کو ۱۰۰ شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ (مشکوۃ) [۵] لہٰذا ان دونوں (دولہا اور دلہن) کو تاکیداً ایسی رسم ورواج سے بچانا چاہئے۔ [۶] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸۲] بسم اللہ کے عدد ۷۸۶ کے نیچے ۹۲ کا عدد لکھنا

۲۸۵-سوال: ہمارے یہاں غریب ومحتاج لوگوں کے علاج ومعالجہ میں تعاون کے لیے ایک

---

(۳) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «من ترك الصلاة متعمدا فقد كفر جهارا». (المعجم الأوسط، رقم: ۳۳۴۸، وأخرجه ابن نصر المروزي في تعظيم قدر الصلاة، برقم: ۹۱۹)

(۴) «كان نبي الله صلى الله عليه وسلم يحثنا على الصدقة، وينهانا عن المثلة». (سنن أبي داؤد، ص: ۳۶۲، كتاب الجهاد، باب النهي عن المثلة، رقم: ۲۶۶۷، ط: البدر - ديوبند☆ وأخرجه ابن أبي شيبه في مصنفه، برقم: ۲۷۹۳۰، ۲۷۹۳۴، ۲۷۹۳۵)

(۵) فيكفر ... بوضع قلنسوة المجوسي على رأسه على الصحيح. (البحر الرائق: ۵/ ۱۳۳، كتاب السير، باب أحكام المرتدين، ط: دار الكتاب الاسلامي)

و في الفتاوى الصغرى: من تقلنس بقلنسوة المجوس، أي لبسها و تشبه بهم فيها، أو خاط خرقة صفراء على العاتق، أي و هو من شعارهم، أو شد في الوسط خيطا كفر. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۲۲۷، فصل في الكفر صريحا و كناية، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۶) ﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾. (۵-المائدة: ۲)

(۷) عن ابن عباس، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «من تمسك بسنتي عند فساد أمتي فله أجر مائة شهيد». (أمالي ابن بشران: ۱/ ۲۱۸، ۳۰۶، ط: دار الوطن، الرياض، رقم: ۵۰۱، ۷۰۰)

(۸) حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں: یہ (شادی سے کچھ دن پہلے لڑکے کو ابٹن لگانا) بھی کوئی شرعی چیز نہیں ہے، قابل ترک رسم ہے، اس میں عورتوں کے ساتھ تشبہ بھی ہے، جس کی ممانعت آئی ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۱/ ۱۹۳، باب ما یتعلق بالرسوم عند الزفاف لڑکے کو ابٹن لگانا، ط: اشرفی بک ڈپو- دیوبند)

تنظیم قائم ہے، جو زکوۃ کی رقم جمع کرتی ہے اور محتاج و نادار کی دوا اور اُن کے علاج میں خرچ کرتی ہے، اس تنظیم کا چندہ بمبئی شہر سے بھی جمع کیا جاتا ہے، ہماری اس تنظیم کی رسید کے کاغذ پر بسم اللہ کا عدد ۷۸۶ چھپا ہوا ہے، اُسے دیکھ کر بہت سے چندہ دہندہ یہ سوال کرتے ہیں کہ تم لوگوں نے ۷۸۶ کے عدد کے نیچے ۹۲ کا عدد کیوں نہیں لکھا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ وہابڑے (وہابی و دیوبندی) ہو، ظاہری بات ہے کہ مذکور عدد اور چندہ میں کیا مناسبت ہے؟ یہ ایک قسم کی جہالت ہے۔ چندہ جمع کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے؛ اس لیے حکمت عملی اور موقع شناسی کے لحاظ سے کیا ہم ۷۸۶ کے عدد کے نیچے ۹۲ کا عدد- جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کا عدد ہے-[۱] چھپوا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

۷۸۶ کا عدد بسم اللہ کا ہے، اور ہر نیک کام بسم اللہ سے شروع کیا جاتا ہے؛ اس لیے بہت سے لوگ کچھ چیزوں پر یہ عدد لکھتے ہیں۔[۲] جس سے نیک فالی مقصود ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ساری کائنات کو وجود بخشنے والے ہیں، وہی ہمارے تمام نیک مقاصد پورا فرمائیں گے؛ لیکن ہر چیز کی تاثیر اُس کے صحیح موقع اور مقام پر ہی ہوتی ہے، مثلاً درود شریف پڑھنا بہت بڑے ثواب کا کام ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص اُسے نماز میں قعدہ کے بجائے قیام یا رکوع میں پڑھے، تو غلط ہوگا، اس لیے کہ اُس نے درود شریف کو اُس کے مقام سے ہٹا دیا، اسی طرح نیک کام کی ابتداء کے موقع پر مدد صرف اللہ تعالیٰ ہی سے چاہی جاتی ہے، اس لیے اُس موقع پر بسم اللہ کے عدد ۷۸۶ کے لکھنے میں کوئی حرج نہیں، اور حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے مدد نہیں چاہی جاتی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اللہ کی مدد کے محتاج ہیں۔[۳] اس لیے ایسے مواقع میں ۹۲ کا عدد لکھنا مناسب نہیں ہے۔

---

(۱) محمد کا عدد ۹۲ اس طرح بنتا ہے: "م" کے ۴۰، "ح" کے ۸، "م" کے ۴۰، اور دال کے ۴، مجموعی ۹۲ ہوئے۔

(۲) ۷۸۶، بسم اللہ شریف کے عدد ہیں، بزرگوں سے اس کے لکھنے کا معمول چلا آتا ہے، غالباً اس کو رواج اس لیے ہوا کہ خطوط عام طور پر پھاڑ کر پھینک دیے جاتے ہیں، جس سے بسم اللہ شریف کی بے ادبی ہوتی ہے، اس بے ادبی سے بچانے کے لیے غالباً بزرگوں نے بسم اللہ شریف کے اعداد لکھنے شروع کیے،...... البتہ اگر بے ادبی کا اندیشہ نہ ہو، تو بسم اللہ شریف ہی لکھنا بہتر ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۸/ ۳۴۸، ط: نعیمیہ، دیوبند☆ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، معارف القرآن: ۶/ ۵۷۸، ۵۷۹، سورۃ نمل، ط: اعتقاد پبلشنگ، دہلی)

(۳) وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ. (-۳ آل عمران: ۱۲۶)

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ. (-۸ الأنفال: ۱۰)

وقال اللہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ. (-۳۵ فاطر: ۱۵)

ابتداء کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خود قرآنِ پاک کی سب سے پہلی آیت میں حضورِ پاک ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ اپنے رب کے نام سے پڑھنا شروع کیجیے، جو کہ سب سے زیادہ مہربان ہے۔ (۴) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نیک کام کی ابتداء میں صرف اللہ ہی کا نام لیا جائے گا، وہی ایک ذات ہے جو ہر نیک کام کی ابتداء اور انتہاء میں مدد چاہے جانے کے قابل ہے، مخلوق -خواہ کتنے ہی بلند مقام پر کیوں نہ ہو- خالقِ کائنات کے مقام تک نہیں پہنچ سکتی؛ لہٰذا اللہ کے علاوہ کسی اور سے مدد مانگنا یا کوئی ایسا فال لینا، جس میں استعانت بغیر اللہ کا شبہ ہو، درست نہیں ہے، خود حضورِ پاک ﷺ نے اپنے تمام نیک کام اللہ کے نام سے شروع فرمائے ہیں، آپ ﷺ نے کبھی کسی کام کے آغاز میں اپنا نام نہیں لیا۔

اگر چہ یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اس عدد کو بہ طور تبرک لکھا گیا ہے؛ لیکن چوں کہ ابتداء جیسے مواقع میں معنیٔ متبادر کی جانب ذہن کی رسائی پہلے ہوتی ہے، اس لیے مناسب نہیں۔

اس عدد کے لکھنے میں دوسری قباحت یہ بھی ہے کہ اہلِ بدعت نے اس عدد کو اپنا لازمی شعار بنا لیا ہے، جو لوگ حضورِ پاک ﷺ سے محبت کا صرف زبانی دعویٰ کرتے ہیں، اور اُن کے اعمال طریقۂ سنت کے برخلاف ہیں، (اللہ تعالیٰ اُنہیں ہدایت دے) حدیثِ پاک میں اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ اُن ہی میں سے ہوگا۔ (۵) لہٰذا اہلِ بدعت کی مشابہت سے بچنے کے لیے بھی اس سے احتراز لازمی ہے۔

موقع شناسی کا لحاظ کرتے ہوئے اس عددِ مخصوص کے بجائے آپ درود شریف بھی لکھ سکتے ہیں، اس موقع پر درود شریف لکھنے میں کوئی حرج نہیں، اگر آپ نے اس عددِ مخصوص کو لکھ بھی دیا، تو ظاہری بات ہے کہ اہلِ بدعت میں سے جو لوگ بھی آپ کو چندہ دیں گے، وہ اس عدد سے آپ کو اپنے مکتبِ فکر کا فرد سمجھ کر

---

(۴) اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. [۹۶-العلق:۱-۳]

(۵) عن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «من تشبه بقوم فهو منهم». (سنن أبي داؤد: ۲/۵۵۹، رقم: ۴۰۳۱، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة، ط: البدر-ديوبند☆الجامع-معمر بن أبي عمرو راشد الأزدي، أبو عروة البصري (م: ۱۵۳ھ): ۱۱/۴۵۳، رقم الحديث: ۲۰۹۸۶، باب حلق القفا والزهد، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، ط: المجلس العلمي، باكستان، وتوزيع المكتب الإسلامي بيروت☆سنن سعيد بن منصور-أبو عثمان سعيد بن منصور الخراساني الجوزجاني (م: ۲۲۷ھ): ۲/۱۷۷، رقم: ۲۳۷۰، كتاب الجهاد، باب من قال الجهاد ماض، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، ط: الدار السلفية-الهند)

دیں گے، اور یہ صریح دھوکہ بازی ہے، بلکہ راز فاش ہوجانے کی صورت میں اُن اہلِ بدعت کو یہ کہنے کا بھی موقع ملے گا کہ دیکھو! یہ وہابڑے چندہ جمع کرنے کے لیے دھوکہ دینے سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں، اور بہت سے اہلِ حق اس عددِ مخصوص کو دیکھ کر آپ کو حق پرست ہونے کے باوجود بدعتی خیال کریں گے اور چندہ دینے سے رُک جائیں گے، تو بجائے فائدہ کے نقصان ہی نقصان ہوگا، لہٰذا صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے اُسی سے مدد مانگتے ہوئے چندہ جمع کرنا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸۳] خط وکتابت میں ۷۸۶ کے عدد کے نیچے ۹۲ کا عدد لکھنا

۲۸۶-سوال: خط وکتابت کی ابتداء میں ۷۸۶ کے نیچے ۹۲ کا عدد لکھنے میں شرعاً کوئی ممانعت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

۷۸۶ کے عدد کے نیچے ۹۲ کا عدد لکھنے میں اولاً تو اہلِ بدعت کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے، کہ یہ اُن کا لازمی شعار بن چکا ہے، کوئی بھی مباح عمل جب کسی فرقۂ باطلہ کا شعار اور علامت بن جائے اور وہ اُسی کے ذریعہ پہچانے جاتے ہوں، تو اُس کا اختیار کرنا ممنوع ہے۔ (مرقاۃ شرح مشکوۃ)[1]

دوسری قباحت یہ کہ اگر لکھنے والے کی نیت یہ ہو کہ محمد ﷺ کے نام سے ابتداء کر رہا ہوں، تو یہ شرکِ صریح ہے، اس وجہ سے بھی جائز نہیں ہے۔ فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۸۴] قوالی کا حکم

۲۸۷-سوال: قوالی سننا کیسا ہے؟ سماع کے بارے میں بعض حضرات صوفیاء سے جواز منقول ہے، گانا بھی تو قوالی ہی کی طرح ہے، تو کیا گانے کی بھی شرعاً اجازت ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قوالی جو ڈھول اور طبلے کے ساتھ ہوتی ہے وہ جائز نہیں ہے، یہی حکم گانا کا ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] ولا يخفى أن التشبه الممنوع إنما هو فيما يكون شعارا لهم مختصا بهم. (مرقاة الفاتيح-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۶/ ۲۶۴۸، كتاب الصيد والذبائح، ط: دار الفكر، بيروت-لبنان)

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں: بسم اللہ کے عدد ۷۸۶ کے نیچے ۹۲ کا عدد لکھنا۔

(۱) اگر بغیر ڈھول طبلے اور مزامیر کے اللہ تعالیٰ کی حمد اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت پڑھنا، جب کہ صحیح مضامین پر مشتمل ہو تو درست ہے، ورنہ نہیں: جاء في الحديث: ولكن نهيت عن صوتين أحمقين فاجرين: صوت عند مصيبة، خمش وجوه، =

[۸۵] جس بستر پر مردہ کو لٹایا گیا ہو، اسے مسجد میں دینا

۲۸۸-سوال: ہمارے گاؤں میں یہ رواج ہے کہ جب کسی شخص کا انتقال ہو جاتا ہے، تو اس کے گھر والے اس کو ایک بستر پر لٹاتے ہیں اور جب اس کو دفن کر دیا جاتا ہے، تو اس بستر کو گھر والے اپنے استعمال میں نہیں لاتے؛ بل کہ مسجد میں بھیج دیتے ہیں، تو کیا اس بستر کا مسجد میں دینا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

آدمی کے انتقال کے بعد اس کے مال سے (تجہیز وتکفین، -اگر دین ہو، تو- ادائے دیون اور -اگر میت نے وصیت کی ہو، تو- ثلث مال میں اجرائے وصیت کے بعد باقی ماندہ مال میں) اس کے ورثاء کا حق متعلق ہوتا ہے، اگر وہ بستر مردہ کی ملکیت میں تھا، تو اس کا مسجد میں دینا ورثاء کی اجازت پر موقوف ہوگا؛ کیوں

= وشق جيوب، ورنة شيطان. (سنن الترمذي: ۱۹۶/۱، أبواب الجنائز، باب ماجاء في الرخصة في البكاء على الميت، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی دیوبند)

وفي الفتاوى الهندية: قال رحمه الله تعالى: السماع والقول والرقص الذي يفعله المتصوفة في زماننا حرام لا يجوز القصد إليه والجلوس عليه وهو والغناء والمزامير سواء. (۳۳۱/۵، كتاب الكراهية، الباب السابع عشر في الغناء واللهو وسائر المعاصي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

وفي البناية شرح الهداية: التغني للهو ولجمع المال حرام بلاخلاف. (۱۲۳/۸، كتاب الشهادة، باب من يقبل شهادته ومن لا يقبل، ط: دار الفكر، الطبعة الثانية: ۱۴۱۱ھ-۱۹۹۰ء)

وفي حياة الحيوان للعلامة الدميري: نقل القرطبي عن أبي بكر الطرطوشي رحمهما الله تعالى -أنه سئل عن قوم- يجتمعون في مكان يقرؤون شيئا من القرآن ثم ينشد لهم منشد شيئا من الشعر، فيرقصون ويطربون ويضربون بالدف والشبابة هل الحضور معهم حلال ام لا؟ فأجاب: مذهب السادة الصوفية أن هذا بطالة وجهالة وضلالة إلى أخر كلامه، قلت: وقد رأيت أنه أجاب بلفظ غير هذا، وهو أنه قال: مذهب الصوفية بطالة وجهالة وضلالة، وما الإسلام إلا كتاب الله وسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأما الرقص، والتواجد فأول من أحدثه أصحاب السامري لما اتخذلهم عجلا جسداً، له خوار قاموا يرقصون حوله ويتواجدون، فهو دين الكفار وعباد العجل... وإنما كان مجلس النبي صلى الله عليه وسلم -مع أصحابه "كأنما على رؤوسهم الطير" من الوقار... ولا يحل لأحد يؤمن بالله واليوم الاخر أن يحضر معهم ولا يعينهم على باطلهم، هذا مذهب مالك والشافعي وأبي حنيفة وأحمد وغيرهم من أئمة المسلمين. (حياة الحيوان للدميري: ۱۵۴/۲، في ذيل: باب العين المهملة "العجل" ط: دار الكتب العلمية-بيروت، الطبعة الثانية، ۱۴۲۴ھ-۲۰۰۳ء)

کہ اس سے ورثاء کا حق متعلق ہوگیا ہے۔[1] اگر تمام ورثاء کی اجازت حاصل کر لی جائے، پھر بہ نیت ثواب دیا جائے، تو جائز ہے، اگر ایک بھی وارث منع کر دے، یا ورثاء میں کوئی نابالغ ہو، تو اس بستر کو مسجد میں نہیں دیا جاسکتا۔[2] جو دے گا، وہ گنہ گار ہوگا، عموماً اس بستر کو رواج سمجھ کر دیا جاتا ہے، اس صورت میں کوئی ثواب نہیں ملے گا۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸۶] مُردے کے سر کے نیچے ایسی مٹی رکھنا، جس پر ''چاروں قل'' پڑھا گیا ہو

۲۸۹-سوال: ہمارے یہاں لوگوں میں یہ رواج ہے کہ جب مردے کو دفن کرتے ہیں، تو پہلے کچھ لوگ ''چاروں قل'' پڑھ کر مٹی پر دم کرتے ہیں، پھر وہ مٹی مردے کے سر کے نیچے رکھتے ہیں، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامدا ومصليا:

تدفین سے قبل مذکور طریقے پر چاروں قل پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا چاروں قل پڑھی ہوئی مٹی مردے کے سرہانے میں رکھنا جائز نہیں ہوگا، اس سے میت کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ سنت کے خلاف کسی بھی چیز کا ایجاد کرنا حرام ہے۔[4]

---

(۱) التعلق بتركة الميت حقوق أربعة مرتبة: الأول يبدأ بتكفينه وتجهيزه من غير تبذير ولا تقتير، ثم تقضى ديونه من جميع ما بقي من ماله، ثم تنفذ وصاياه من ثلث ما بقي، ثم يقسم الباقي بين الورثة. (السراجي في الميراث، ص: ۳، ط: ديوبند ☆ الدر المختار مع رد المحتار - ابن عابدين، محمد أمين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲ھ): ۷۵۹/۶، كتاب الفرائض، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) " لا يحل لامرئ من مال أخيه إلا ما أعطاه من طيب نفس، ولا تظلموا ... الخ". (السنن الكبرى - البيهقي: ۱۶۰/۶، رقم الحديث: ۱۱۵۴۴، كتاب الغصب، باب لا يملك أحد بالجناية شيئا ... الخ، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

ولا تجوز بما زاد على الثلث إلا أن يجيزه الورثة بعد موته وهم كبار. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۹۰/۶، كتاب الوصايا، الباب الأول في تفسير الوصية، وشرط جوازها، وحكمها، ط: دار الفكر - بيروت، الطبعة الثانية: ۱۳۱۰ھ)

(۳) فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء المهديين الراشدين، تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ، وإياكم ومحدثات الأمور، فإن كل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة. (سنن أبي داؤد: ۶۳۵/۲، رقم الحديث: ۴۶۰۷، كتاب السنة، باب في لزوم السنة، ط: المكتبة الأشرفية - ديوبند)

(۴) عن عائشة - رضي الله عنها، قالت: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: "من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۳۷۱/۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب: إذا اصطلحوا على صلح جور ... الخ، ط: البدر - ديوبند)

مذکورہ رواج سے اجتناب ضروری ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۸۷] نیا مکان بنانے پر ختم قرآن کی مجلس اور اُس میں کھانا

۲۹۰-سوال: کوئی شخص نیا مکان بنانے کے بعد برکت کے طور پر ختم قرآن کرواتا ہے، اور ختم کے بعد کھانا یا کوئی میٹھی چیز کھلاتا ہے، تو اُس کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

صورتِ مسئولہ میں میٹھی چیز یا کوئی بھی دوسری چیز ہو، کھلانا جائز ہے، مسلم شریف کی شرح میں آٹھ قسم کی مہمانی کو مستحب بتایا گیا ہے، اُن میں سے ایک ''وکیرہ'' یعنی نیا گھر تعمیر ہو جانے کی خوشی میں کھانا کھلانا ہے۔ (جلد:۱/ ۴۵۸)۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۸۸] وفات پانے والے متعین شخص کے بارے میں جنتی یا جہنمی کہنا

۲۹۱-سوال: شہر بڑودہ میں ۱۳/ رمضان المبارک کو جماعت اسلامی کے رہنما وفات پاگئے، تو کیا وہ جنتی ہو گئے؟ ان کے لڑکوں کا کہنا ہے کہ ان کے ابا جنتی ہیں؟ ان کے جنازہ پر پھول چڑھائے گئے اور بلند آواز سے کلمے پڑھے گئے، ان کا تیجا بھی زور وشور سے کیا گیا کیا یہ جائز ہے؟ اور مولانا کی قبر پر ہفتہ میں دو تین بار عورتیں عربی مولود پڑھتی ہیں، کیا یہ درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

کسی بھی شخص معین کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ وہ جنتی ہے یا نہیں؟ یہ ہمارا کام نہیں ہے، اللہ تعالی کے اختیار کی بات ہے، ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالی سے امید ہے کہ وہ جنتی ہوگا، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک بچہ کی وفات ہوگئی، تو میں نے کہا کہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالی نے جنت اور دوزخ بنائی اور دونوں کے لیے

---

(۱) الضيافات ثمانية أنواع: الوليمة للعرس، والخرس بضم الخاء المعجمة، ويقال الخرص أيضا بالصاد المهملة للولادة، والاعذار بكسر الهمزة، وبالعين المهملة، والذال المعجمة للختان، والوكيرة للبناء، والنقيعة لقدوم المسافر، مأخوذة من النقع وهو الغبار. (شرح النووي على صحيح مسلم :۹/ ۲۱۷، باب الصداق وجواز كونه تعليم قرآن وخاتم حديد، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

مخلوق پیدا کی ہے۔ (مسلم شریف ج،۲ص:۳۳۷)۔[۱]

حضرت امام نوویؒ اس حدیث شریف کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ علمائے مسلمین کا اجماع ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے بچے جنتی ہیں، پھر حضرت عائشہؓ کو اس طرح کہنے سے کیوں روکا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بہت جلد پکا فیصلہ کر دیا کہ یہ جنتی ہے اور ایسا فیصلہ کرنے کا حق کسی کو نہیں۔[۲]

اور کسی شخص معین کے بارے میں جہنمی ہونے کا فیصلہ بھی نہیں کر سکتے، صرف میت کے اعمال کو سامنے رکھ کر کوئی خیال قائم کر سکتے ہیں، حقیقت حال تو اللہ پاک ہی جانتے ہیں، خاتمہ ایمان پر ہوا ہو تو مغفرت کی امید ہے، اگر خاتمہ ہی ایمان پر نہ ہوا ہو تو مغفرت کی کوئی شکل نہیں ہے۔

قبر پر پھول چڑھانا، تیجہ کرنا یہ سب بدعت اور ہندوانہ رسم ورواج ہیں؛ لہٰذا ناجائز ہیں، علمائے اہل حق اس سے منع کرتے ہیں، حدیث شریف سے ثابت نہیں ہے، اس کو کرنے والا گنہ گار ہے اور جس کو معلوم ہو کہ میرے مرنے پر میرے رشتے داران سب خرافات کا ارتکاب کریں گے اور اس نے ان کو وصیت نہ کی ہو کہ ایسا نہ کرنا یا وہ خود یہ سب کچھ کرتا تھا اور اس پر خوش تھا، تو وہ بھی گناہ میں برابر کا شریک ہے (فتاویٰ رشیدیہ جلد،۱ص:۹۱)۔[۳]

خود مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کے فتاویٰ جلد ۴ صفحہ ۲۱۰ پر لکھا ہے:

(سوال) تین برس کے بچہ کی فاتحہ دوجا کی ہونی چاہیے یا تیجا کی (سوم) ہونا چاہیے؟

---

(۱) عن عائشة أم المؤمنين، قالت: دعي رسول الله -صلى الله عليه وسلم إلى جنازة صبي من الأنصار، فقلت: يا رسول الله طوبى لهذا، عصفور من عصافير الجنة لم يعمل السوء ولم يدركه، قال: »أو غير ذلك، يا عائشة إن الله خلق للجنة أهلا، خلقهم لها وهم في أصلاب آبائهم، وخلق للنار أهلا، خلقهم لها وهم في أصلاب آبائهم. (صحيح المسلم : ۲/ ۳۳۷، رقم الحديث: ۳۱-(۲۶۶۲) كتاب القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة، ط: البدر-ديوبند)

(۲) أجمع من يعتد به من علماء المسلمين على أن من مات من أطفال المسلمين فهو من أهل الجنة لأنه ليس مكلفا وتوقف فيه بعض من لا يعتد به لحديث عائشة هذا وأجاب العلماء بأنه لعله نهاها عن المسارعة إلى القطع من غير أن يكون عندها دليل قاطع كما أنكر على سعد بن أبي وقاص في قوله أعطه إني لأراه مؤمنا قال أو مسلما الحديث (حاشية النووي على صحيح مسلم: ۲/ ۳۳۷، كتاب القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة، ط: البدر-ديوبند)
وللاستزادة راجع: مرقاة المفاتيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۷/ ۳۰۴۲، باب حفظ اللسان، ط: دار الفكر -بيروت.

(۳) فتاویٰ رشیدیہ مع تالیفات رشیدیہ، ص: ۱۴۵، کتاب البدعات، ط: مکتبہ الحق، جوگیشوری، ممبئی۔

(جواب) شریعت میں ثواب پہونچاتا ہے دوسرے دن ہو یا تیسرے دن باقی یہ تعیین عرفی ہماری آپس کی ہے جب چاہے کرے انہی دنوں کی گنتی ضروری جاننا جہالت اور بدعت ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالی اعلم۔

لکھا اس کو گنہ گار بندے احمد رضا بریلوی نے، اللہ اس کو محمد نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے معاف کرے۔ (فتاوی رضویہ)[1]

عورتوں کا قبر پر جانا اور بلند آواز سے پڑھنا جائز نہیں۔[2] اور عربی مولود کی کوئی اصل نہیں ہے نہ اس کے پڑھنے میں کچھ ثواب ہے۔ واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

[۸۹] کتابی تعلیم سے پہلے درود شریف پڑھنا اور ''ان اللہ و ملائکتہ'' کے ذریعہ درود شریف کی تلقین کرنا

۲۹۲-سوال: مسجد میں فرض نماز کی دعا کے بعد کتاب کی تعلیم ہوتی ہے اور دعا میں درود شریف کا ذکر آجاتا ہے، تو اب تعلیم شروع کرتے وقت درود شریف پڑھنا یا ''ان اللہ و ملائکتہ'' کے ذریعہ درود شریف کی تلقین کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصليا:

کسی بھی اہم کام کی ابتداء اللہ پاک کی حمد وثناء اور درود شریف کے ذریعہ کرنا برکت کا سبب ہے۔[3]

---

(۱) کتاب حقیر کے پاس موجود نہیں ہے۔

(۲) (قوله: ولو للنساء) وقيل: تحرم عليهن. والأصح أن الرخصة ثابتة لهن. وجزم في شرح المنية بالكراهة لما مر في اتباعهن الجنازة. وقال الخير الرملي: إن كان ذلك لتجديد الحزن والبكاء والندب على ما جرت به عادتهن فلا تجوز، وعليه حمل حديث «لعن الله زائرات القبور» وإن كان للاعتبار والترحم من غير بكاء والتبرك بزيارة قبور الصالحين فلا بأس إذا كن عجائز. ويكره إذا كن شواب كحضور الجماعة في المساجد. وهو توفيق حسن. (رد المحتار: ۲/ ۲۴۲، باب صلاة الجنازة، مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر) ★البحر الرائق - زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۲۱۰، كتاب الجنائز، ط: دار الكتاب الإسلامي★حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي - (م: ۱۲۳۱ هـ)، ص: ۶۲۰، فصل في زيارة القبور، ط: دار الكتب العلمية-بيروت.

(۳) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم: كل أمر ذي بال، لا يبدأ فيه بالحمد، أقطع. (سنن ابن ماجة، ص: ۱۳۶، رقم الحديث: ۱۸۹۴، كتاب النكاح، باب خطبة النكاح، ط: البدر-ديوبند)

لہٰذا درود شریف پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ البتہ لازم نہ سمجھے آیت پڑھنے میں بھی حرج نہیں ہے۔ (۱) لیکن یہ بدعتیوں کی علامت بن گئی ہے؛ لہٰذا اس کو پڑھنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹۰] بہ آواز بلند درود شریف پڑھنا

۲۹۳-سوال: امام صاحب عصر یا فجر کی نماز کے بعد آیت پاک-ان اللہ و ملائکتہ الآیۃ. پڑھتے ہیں، تو عوام حضرات بہ آواز بلند درود شریف پڑھتے ہیں، اسی طرح تقریری پروگراموں میں بھی ہوتا ہے، تو درود شریف بلند آواز سے پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ شریعت کی نظر میں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

دعا اور درود شریف عبادت ہے؛ لیکن اس عبادت کو ادا کرنے کا طریقہ سنت کے مطابق اصول وضوابط کی رعایت کے ساتھ ہونا چاہیے، اپنی مرضی سے یا غیر واجب کو واجب ولازم سمجھ کر، امام پر جبر کرکے دعا اور درود شریف پڑھانا ناجائز ہوگا، ثواب سے محروم ہوں گے، علاوہ ازیں بہ آواز بلند دعا اور درود شریف پڑھنے سے نماز پڑھنے والوں کی نماز میں خلل واقع ہوگا، اس لیے جہراً دعا اور درود شریف پڑھنے سے منع کیا جائے۔

اسی لیے علامہ شامیؒ نے جہری وسری دعا میں تطبیق دیتے ہوئے فرمایا کہ جہراً پڑھنے سے ریاء کا خوف ہے، یا نمازیوں کو تکلیف کا اندیشہ ہے یا نیند میں مشغول حضرات کو تکلیف ہوتی ہے، تو اس سے منع کیا جائے گا اور سراً افضل ہوگا اور جہاں ان امور کا خطرہ نہیں ہے، اور جہر کا مقتضا ہے، اس جگہ جہراً افضل ہے۔ (شامی ج:۲، ص:۲۸۴) (۲)

---

(۱) قال بن المنير فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها؛ لأن التيامن مستحب في كل شيء أي من أمور العبادة لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه أشار إلى كراهته. (فتح الباري- أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي: ۲/ ۳۳۸، باب الانفتال والانصراف عن اليمين والشمال، ط: دار المعرفة- بيروت)

(۲) وفي الفتاوى الخيرية من الكراهية والاستحسان: جاء في الحديث به اقتضى طلب الجهر به نحو " »وإن ذكرني في ملإ ذكرته في ملإ خير منهم« رواه الشيخان. وهناك أحاديث اقتضت طلب الإسرار، والجمع بينهما بأن ذلك يختلف باختلاف الأشخاص والأحوال كما جمع بذلك بين أحاديث الجهر والإخفاء بالقراءة ولا يعارض ذلك حديث »خير الذكر الخفي« لأنه حيث خيف الرياء أو تأذي المصلين أو النيام، فإن خلا مما ذكر؛ فقال بعض أهل العلم: إن الجهر أفضل لأنه أكثر عملا ولتعدي فائدته إلى السامعين، ويوقظ قلب الذاكر فيجمع همه إلى الفكر، ويصرف سمعه إليه، ويطرد النوم، ويزيد النشاط. وفي حاشية الحموي عن الإمام الشعراني: أجمع العلماء سلفا وخلفا على استحباب ذكر الجماعة في المساجد وغيرها إلا أن يشوش جهرهم على نائم أو مصل أو قارئ. (رد المحتار: ۱/ ۶۶۰، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة، مطلب في رفع الصوت بالذكر، ط: دار الفكر)

کیوں کہ بہ آواز بلند پڑھنے سے غافل قلوب بیدار ہوں گے، سونے والوں کی نیند اڑ جائے گی اور وعظ وتقریر کی محفل میں جہراً درود شریف پڑھا جائے، تو جائز ہے، نماز کے بعد جہراً پڑھنے سے نمازیوں کو تکلیف ہوگی اس لیے منع کیا جاوے؛ البتہ مصلی حضرات نماز سے فارغ ہوجائیں، تو جہراً بھی جائز ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹۱] مبارک راتوں میں اجتماعی طور پر قرآن خوانی کرنا

۲۹۴-سوال: اسلامی مہینوں کی مبارک راتوں میں بعد عشاء اجتماعی طور پر قرآن خوانی ہوتی ہے، دیگر عبادات، یعنی تسبیح، درود شریف، ذکر وغیرہ نہیں ہوتا اور یہ عمل ہر مبارک رات میں کیا جاتا ہے، کیا یہ طریقۂ ایصال ثواب درست ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

صرف قرآن خوانی ہو، ایصال ثواب ہو مگر دیگر خرافات نہ ہو تو جائز ہے۔[۱] البتہ فقط قرآن خوانی پر اکتفا نہ کیا جائے مختلف عبادات: تہجد، نفل نماز، تسبیح وتحمید، درود شریف میں بھی وقت صرف کیا جاوے، ایک عبادت سے جی اکتا جائے، تو دوسری عبادتوں میں مشغول ہوجائے۔[۲] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

[۹۲] بسملہ کی جگہ ۷۸۶ لکھنا اور کیا اس کی بے ادبی بسملہ کی بے ادبی کے مرادف ہوگی؟

۲۹۵-سوال: مسلم معاشرہ میں جو ۷۸۶ لکھنے کا رواج ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی اس طرح صحابہ لکھتے تھے؟ زید کا کہنا ہے کہ ۷۸۶ بسملہ کا عدد ہے، بسملہ لکھنے سے بے ادبی ہوتی ہے؛ اس لیے ۷۸۶ لکھتے ہیں، بکر کہتا ہے کہ کیا اگر کوئی ۷۸۶ کو پاؤں تلے روندے، تو بے ادبی نہیں ہوگی؟ بکر کا یہ بھی کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ سب نہیں تھا، جس طرح ہندو اپنے معبود کی عبادت میں خشوع خضوع کے لیے سامنے بت رکھتے ہیں، اسی طرح تم نے ۷۸۶ کو بسم اللہ کے لیے گھڑ لیا ہے؛ لہٰذا میں اس کو نہیں مانتا ہوں، یہ بدعت ہے، اگر ۷۸۶ بسم اللہ کا عدد ہے اور بسم اللہ کے بہ جائے

---

(۱) تفصیلی تخریج گذر چکی ہے۔

(۲) عن علي بن أبي طالب، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إذا كانت ليلة النصف من شعبان، فقوموا ليلها وصوموا نهارها، فإن الله ينزل فيها لغروب الشمس إلى سماء الدنيا، فيقول: ألا من مستغفر لي فأغفر له ألا مسترزق فأرزقه ألا مبتلى فأعافيه ألا كذا ألا كذا، حتى يطلع الفجر. (سنن ابن ماجة، ص: ۹۹، رقم الحديث: ۱۳۸۸، أبواب إقامة الصلاة، ما جاء في ليلة النصف من شعبان، ط: البدر - ديوبند)

۷۸۶ سے ہی برکت حاصل ہو جاتی ہے، تو پھر قرآن کی بھی کیا ضرورت ہے؟ پورے قرآن کے عدد بنالو! آج لوگ سورۂ یٰسین واخلاص کے عدد کے نقشے بنا کر فروخت کرتے ہیں، تو اس کے بارے میں بھی باتفصیل جواب مرحمت فرمائیں گے کہ اس طرح کے نقشے بنانا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

آیت یا سورۃ یا بسملہ کی عبارت کی جگہ اس کا عدد لکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا اس کا شریعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ ۷۸۶ کی بے ادبی کو بسملہ کی بے ادبی نہیں کہا جائے گا، یہ طریقہ بعد میں لوگوں نے اپنی سہولت کے لیے اور خاص کر تعویذ وغیرہ بنانے والوں نے ایجاد کیا ہے؛ لہٰذا اس کا شریعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے تاہم ۷۸۶ لکھنا جائز ہے، منع نہیں ہے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹۳] بدعتی رشتہ داروں کی خوشی وغم میں شریک ہونا

۲۹۶-سوال: یہاں لوگ ہمیں وہابی سمجھتے ہیں، ہمارے رشتے دار شادی یا انتقال وغیرہ کا موقع ہو، تو دعوت دیتے ہیں؛ لیکن جب ہم ان کو مدعو کرتے ہیں، تو وہ لوگ آتے نہیں ہیں۔ ہم سے بہت نفرت کرتے ہیں اور ہمارے یہاں جنازہ میں بھی شریک نہیں ہوتے، تو ہمیں ان کی دعوت یا جنازے میں حاضر ہونا چاہیے یا نہیں؟ نیز دوسرے اعتبار سے بھی ہم پر بہت ظلم کرتے ہیں اور ہماری ۵۰۰۰ کی بستی ہے، اس میں ہم ۵۰ ؍ ہیں، وہ حضرات ہم کو بعض مساجد سے بھی نکالتے ہیں اور ہماری بے عزتی کرتے ہیں، اسی طرح ہمارے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اپنی لڑکیاں ولڑکوں کا رشتہ بھی قبول نہیں کرتے، تو آپ ہمارے حق میں دعا فرما کر مذکور مسائل کا حل مرحمت فرمائیں گے۔

---

(۱) ۷۸۶، بسم اللہ شریف کے عدد ہیں، بزرگوں سے اس کے لکھنے کا معمول چلا آتا ہے، غالباً اس کو رواج اس لیے ہوا کہ خطوط عام طور پر پھاڑ کر پھینک دیے جاتے ہیں، جس سے بسم اللہ شریف کی بے ادبی ہوتی ہے اس بے ادبی سے بچانے کے لیے غالباً بزرگوں نے بسم اللہ شریف کے اعداد لکھنے شروع کیے؛ البتہ اگر بے ادبی کا اندیشہ نہ ہو تو بسم اللہ شریف ہی لکھنا بہتر ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۸ ؍ ۳۴۸، ط: نعیمیہ، دیوبند)

قرآن وسنت کے نصوص واشارات سے حضرات فقہاء نے یہ کلیہ قاعدہ لکھا ہے کہ جس جگہ بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھا جائے اگر اس جگہ اس کاغذ کے بے ادبی سے محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام نہیں؛ بل کہ وہ پڑھ کے ڈال دیا جاتا ہے، تو ایسے خطوط اور ایسی چیز میں بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھنا جائز نہیں کہ وہ اس طرح اس بے ادبی کے گناہ کا شریک ہو جائے گا۔ آج کل جو عموماً خط لکھے جاتے ہیں ان کا حال سب جانتے ہیں کہ نالیوں اور گندگیوں میں پڑے نظر آتے ہیں۔ (معارف القرآن: ۸ ؍ ۵۷۹، سورۃ النمل، ط: اشرفی - دیوبند)

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں ایک جماعت ایسی ہوگی، جو قیامت تک حق پر رہے گی، اس جماعت کو نہ تو کوئی برباد کر سکے گا اور نہ ہی ذلیل کر سکے گا۔ (حدیث)۔ [۱] یعنی ان کو کوئی بھی دلائل کے ذریعہ پسپا نہیں کر سکے گا، یاد رہے آپ حق پر ہیں اور اسی جماعت کے پیروکار انبیاء کے وارث ہیں، چھوٹی بڑی تکلیف برداشت کیجیے، انبیاء کے اوپر کتنی بڑی بڑی مصیبتیں آئیں؛ لیکن ان کے اخلاق، عفو درگزر کیسے تھے، لہٰذا آپ بھی عفو درگذر سے کام لیں اور ان کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنے سے بچتے رہیں۔

ان کی دعوتوں میں شرکت سے اگر ایمان واعتقاد کے عدم تحفظ کا اندیشہ ہو، تو بالکل ہی نہ جایئے، ہاں اگر جانے کے باوجود ایمان واعتقاد پر کسی قسم کا اندیشہ نہ ہو، تو جانا جائز ہے۔ [۲] لیکن اس نیت سے جانا چاہیے کہ وہاں جا کر اگر موقع ملا، تو حق بات کہوں گا۔ [۳] مذکور رشتے دار یہاں کام نہیں آتے ہیں، تو آپ کو فکر کی کوئی ضرورت نہیں، انہیں فکر کرنا چاہیے کہ آخرت کی منزل تو اس سے زیادہ سخت ہے، جہاں رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں بدعتی حوض کوثر سے مرحوم رہیں گے اور فرشتے دھکا دے کر ان کو ہٹا دیں گے۔ [۴] اخیر اً دعا

---

(۱) عن ثوبان، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: »لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق، لا يضرهم من خذلهم، حتى يأتي أمر الله وهم كذلك. (صحيح المسلم: ۲/ ۱۴۳، رقم الحديث: ۱۷۰- (۱۹۲۰) كتاب الامارة، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لا تزال طائفة. الخ، ط: البدر - ديوبند)

(۲) وعن الحسن: " لا تجالس صاحب هوى فيقذف في قلبك ما تتبعه عليه فتهلك، أو تخالفه فيمرض قلبك "....وعن أبي قلابة: " لا تجالسوا أهل الأهواء، ولا تجادلوهم؛ فإني لا آمن أن يغمسوكم في ضلالتهم، ويلبسوا عليكم ما كنتم تعرفون "...وعن بعض السلف: " من جالس صاحب بدعة، نزعت منه العصمة، ووكل إلى نفسه. (الاعتصام - إبراهيم بن موسى بن محمد الشاطبي (م: ۷۹۰ھ)، ص: ۱۱۳، ۱۱۴، فصل ما جاء عن السلف الصالح في ذم البدع وأهلها، ط: دار ابن عفان - السعودية)

(۳) اگر اس کے ساتھ میل جول رکھنے اور اس کے یہاں کھانا کھانے سے اس کی اصلاح کی توقع ہو تو میل جول رکھنا بہتر ہے اگر اس سے خود بدعات میں مبتلا ہونے یا بدعات کی تائید کا اندیشہ ہو، تو میل جول نہیں رکھنا چاہیے۔ (فتاوی محمودیہ - مفتی محمود الحسن گنگوہی (م: ۱۹۹۶ء): ۳/ ۵۶، باب البدعات والرسوم، ط: اشرفی بک ڈپو - دیوبند)

(۴) عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم، أنه أتى المقبرة فسلم على المقبرة، فقال: »السلام عليكم دار قوم مؤمنين، وإنا إن شاء الله تعالى بكم لاحقون... « ، قال: »أنا فرطكم على الحوض « ، ثم قال: " ليذادن رجال عن حوضي، كما يذاد البعير الضال، فأناديهم: ألا هلموا فيقال: إنهم قد بدلوا بعدك، ولم يزالوا يرجعون على أعقابهم، فأقول: ألا سحقا، سحقا ". (سنن ابن ماجة، ص: ۳۱۹، رقم الحديث: ۴۳۰۶، ابواب الزهد، باب الحوض، ط: البدر - ديوبند)

ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی پریشانیوں کو دور فرمائیں، آمین، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹۴] نماز کے بعد لوگوں کو صلاۃ وسلام کے لیے مجبور کرنا جائز نہیں ہے

۲۹۷-سوال: جمعہ وفجر کی نماز کے بعد صلاۃ وسلام کھڑے ہو کر پڑھنا اور نہ پڑھنے والے کو برا بھلا کہنا کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا

صلاۃ وسلام پڑھنا ثواب کا کام ہے۔ (۱) لیکن اس کا بھی موقع ومحل ہوتا ہے، بلا موقع پڑھنا مکروہ اور گناہ کا کام ہے۔

(۱) مثلاً درود پڑھنا ثواب کا کام ہے، لیکن قعدۂ اولیٰ میں تشہد کے بعد پڑھنے سے سجدۂ سہو واجب ہوگا۔ (۲)

(۲) اسی طرح دکان دار کا گاہک کو کپڑا دکھا کر دھوکہ دینے کے لیے درود شریف پڑھے، تو یہ بھی گناہ کا کام ہے۔

(۳) اسی طرح مسجد میں فرض نماز کے بعد اس طرح دعا زور سے پڑھنا کہ مسبوق کی نماز میں خلل واقع ہو ناجائز ہے۔ (۳)

(۴) فرض نماز کے بعد دعا ثابت ہے، صلاۃ وسلام ثابت نہیں ہے۔

(۵) لوگوں کو مجبور کرنا لڑائی جھگڑا کرنا جائز نہیں ہے، صلاۃ وسلام پڑھنا سنت یا مستحب ہے اور لڑائی

---

(۱) عن عبد الله بن مسعود، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: »أولى الناس بي يوم القيامة أكثرهم علي صلاة. (سنن الترمذي: ۱/۱۱۰، رقم الحديث: ۴۸۴، أبوب الوتر، باب ماجاء في فضل الصلاة على النبي - صلى الله عليه وسلم)

(۲) (ولا يصلي على النبي - صلى الله عليه وسلم - في القعدة الأولى في الأربع قبل الظهر والجمعة وبعدها) ولو صلى ناسيا فعليه السهو. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۱۶، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الفكر)

ولو كرر التشهد في القعدة الأولى فعليه السهو وكذا لو زاد على التشهد الصلاة على النبي - صلى الله عليه وسلم -، وعليه الفتوى. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۲۷، الباب الثاني عشر في سجود السهو، ط: دار الفكر)

(۳) إن هناك أحاديث اقتضت طلب الجهر، وأحاديث طلب الإسرار والجمع بينهما بأن ذلك يختلف باختلاف الأشخاص والأحوال، فالإسرار أفضل حيث خيف الرياء أو تأذي المصلين أو النيام والجهر أفضل حيث خلا مما ذكر، لأنه أكثر عملا ولتعدي فائدته إلى السامعين، ويوقظ قلب الذاكر فيجمع همه إلى الفكر، ويصرف سمعه إليه، ويطرد النوم ويزيد النشاط. (رد المحتار: ۶/۳۹۸، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر)

جھگڑا کرنا حرام ہے؛ لہٰذا جو لوگ اس طرح کا کام کرتے ہیں، وہ اس اسے اجتناب کریں کہ یہ جائز نہیں ہے۔[۱] آپ اور آپ کے ساتھی سنت طریقے کے مطابق عمل کریں اور تسبیح و دعا پڑھتے رہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹۵] زندوں کو بھی ایصال ثواب کر سکتے ہیں؟

۲۹۸-سوال: جس طرح مردہ کو ایصال ثواب کرتے ہیں، کیا اسی طرح زندوں کو بھی ایصال ثواب کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

زندہ کو بھی ایصال ثواب کر سکتے ہیں، وہ بھی زندہ کے نامۂ اعمال میں درج ہو جائے گا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹۶] مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کرنا

۲۹۹-سوال: (۱) مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کرنا کیسا ہے؟ قرآن خوانی کے بعد کسی چیز پر فاتحہ وغیرہ بدعت کا کام نہیں کرتے ہیں، صرف پڑھنے والوں کو کھانے کی کوئی چیز تقسیم کر دی جاتی ہے، اس طرح قرآن خوانی کرنے سے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

(۲) گیارہویں کرنا یا اس کا کھانا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کرنا کرانا جائز ہے؛ البتہ دن، وقت وغیرہ کسی چیز کی تعیین نہ ہو۔[۳]

---

(۱) قال ابن المنير فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها لأن التيامن مستحب في كل شيء أي من أمور العبادة لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه أشار إلى كراهته والله أعلم. (فتح الباري-ابن حجر: ۲/ ۳۳۸، باب الانفتال والانصراف عن اليمين، ط: دار المعرفة)

(۲) صرح علماؤنا في باب الحج عن الغير بأن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوما أو صدقة أو غيرها ... الأفضل لمن يتصدق نفلا أن ينوي لجميع المؤمنين والمؤمنات لأنها تصل إليهم ولا ينقص من أجره شيء هو مذهب أهل السنة والجماعة. (رد المحتار: ۲/ ۲۴۳، باب صلاة الجنازة، مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر)

(۳) وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الإخلاص. (رد المحتار: ۲/ ۲۴۰، باب صلاة الجنازة، مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر)

وفي دعاء الأحياء للأموات وصدقتهم أى صدقة الأحياء عنهم أى عن الأموات نفع لهم أي للأموات. (شرح العقائد النسفية، ص: ۱۷۱، ط: ياسر نديم-ديوبند)

من صام أو صلى أو تصدق وجعل ثوابه لغيره من الأموات أو الأحياء جاز ويصل ثوابها إليهم عند أهل السنة والجماعة وقد صح عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - «أنه ضحى بكبشين أملحين: أحدهما: عن نفسه، =

نیز یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن خوانی پر اجرت کی لین دین نہ ہو۔[1] آپ کا قرآن خوانی کرانا ان ناجائز شروط سے خالی ہے؛ اس لیے جائز ہے، اگر اپنی حلال کمائی سے کچھ بلا اجرت تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو صحیح ہے۔

(۲) گیارہویں کا کھانا اللہ تعالی کے ولی شیخ عبد القادر جیلانی کے ایصال ثواب کے لیے کھلایا جاتا ہے اور اللہ کے ولی اور بزرگ سے زیادہ ایصال ثواب کے مستحق اور محتاج گیارہویں کرنے والے کے آباء واجداد وغیرہ دیگر رشتہ دار ہیں، تو معلوم ہوا کہ یہ کھانا رسمی طور پر ہے، نیز اس میں مہینہ اور دن کی تعیین ہوتی ہے، جس سے یہ بدعت بن جاتا ہے؛ لہذا گیارہویں کا کھانا کھانا اور کھلانا دونوں ممنوع ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ۔

=والآخر: عن آمنه ممن آمن بوحدانية الله تعالى وبرسالته« - صلى الله عليه وسلم - وروي »أن سعد بن أبي وقاص - رضي الله عنه - سأل رسول الله - صلى الله عليه وسلم - فقال يا رسول الله: إن أمي كانت تحب الصدقة أفأتصدق عنها؟ فقال النبي: - صلى الله عليه وسلم - تصدق« وعليه عمل المسلمين من لدن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - إلى يومنا هذا من زيارة القبور وقراءة القرآن عليها والتكفين والصدقات والصوم والصلاة وجعل ثوابها للأموات، ولا امتناع في العقل أيضا لأن إعطاء الثواب من الله تعالى إفضال منه لا استحقاق عليه، فله أن يتفضل على من عمل لأجله بجعل الثواب له كما له أن يتفضل بإعطاء الثواب من غير عمل رأسا. (بدائع الصنائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۲/ ۲۱۲، كتاب الحج، فصل نبات الحرم، ط: دار الكتب العلمية ☆ البحر الرائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الاسلامي ☆ رد المحتار: ۲/ ۲۴۳، باب صلاة الجنازة، مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر. ☆ شرح الفقه الأكبر، ص: ۱۵۸، دعاء الأحياء للأموات. الخ، ط: ياسر نديم-ديوبند.

(۱) ثم قراءة القران واهداءها له تطوعا بغير أجرة يصل إليه وأما لو أوصى بأن يعطى شيئا من ماله لمن يقرأ القران على قبره فالوصية باطلة لأنه في معنى الأجرة. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۱۶۰، قراءة القران واهداؤها. الخ، ط: ياسر نديم-ديوبند)

قال تاج الشريعة في شرح الهداية: إن القرآن بالأجرة لا يستحق الثواب لا للميت ولا للقارئ. وقال العيني في شرح الهداية: ويمنع القارئ للدنيا، والآخذ والمعطي آثمان. فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز؛ لأن فيه الأمر بالقراءة وإعطاء الثواب للآمر والقراءة لأجل المال؛ فإذا لم يكن للقارئ ثواب لعدم النية الصحيحة فأين يصل الثواب إلى المستأجر ولولا الأجرة ما قرأ أحد لأحد في هذا الزمان بل جعلوا القرآن العظيم مكسبا ووسيلة إلى جمع الدنيا - إنا لله وإنا إليه راجعون. (رد المحتار: ۶/ ۵۶، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على المعاصي، ط: دار الفكر)

(۲) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: »من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، ط: البدر-ديوبند)

[۹۷] تیجہ، دسواں اور چالیسواں کا حکم

۳۰۰-سوال: انسان کے مرنے بعد اس کا تیجہ، دسواں، چالیسواں کرنا کیسا ہے؟ میں اس کے کلاف تحریک چلا رہا ہوں، لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں مل رہی ہے۔

الجواب حامداو مصلیا:

تیجہ، چالیسواں شرعی اعتبار سے جائز نہیں ہے۔ (۱)

مسلمان مکلف ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جو امور ثابت ہوں، ان پر عمل کرے، چناں چہ رسول اللہ ﷺ کے چچا غزوۂ احد میں شہید ہوگئے اور چچازاد بھائی غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے، رسول اللہ ﷺ کے صاحب زادے حضرت ابراہیم ۱۶-۱۷ مہینہ زندہ رہے، صاحب زادی ام کلثوم حضرت زینب کی وفات ہوئی، مگر رسول اللہ ﷺ سے نہ تو تیجہ ثابت ہے نہ چالیسواں؛ لہٰذا مذکورہ امور جائز نہیں، مزید دینی اہم نقصان یہ ہے کہ ان کو ضروری اور دین کا جزو سمجھ کر کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے بدعت ہو جاتا ہے۔ (۲) حالاں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے:

من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد. (بخاری) (۳) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے دین کے معاملے میں نئی چیز ایجاد کی، تو وہ مردود ہے۔

وہ انسان مردود یا ایجاد کردہ چیز، بہ ہر صورت مردود شئے اللہ کے نزدیک قابل قبول نہیں، مذکورہ فاتحہ خوانی رسماً کرائی جاتی ہے یا ریاء وشہرت کے لیے نیز اس میں ورثاء کے مال سے ان کی اجازت کے بغیر خصوصاً نابالغ ورثاء کے مال سے کھلانا پلانا ہوتا ہے؛ لہٰذا حرام ہے، البتہ کوئی رشتہ دار اپنی حلال کمائی سے دن مقرر کیے بغیر فقط غرباء یا یتیم یا بیوہ پر صدقہ خیرات کرے تو موجب ثواب ہے، آپ کا کام محنت کرنا ہے اور کامیابی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، ان شاء اللہ آپ کو ضرور اس کا اجر ملے گا۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قد تقدم تخريجه عن رد المحتار نقلا عن البزازية و حاشية الطحطاوي.

(۲) قال ابن المنير فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها لأن التيامن مستحب في كل شيء أي من أمور العبادة لكن لما خشي بن مسعود أن يعتقدوا وجوبه أشار إلى كراهته والله أعلم. (فتح الباري - ابن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي: ۲/ ۳۳۸، باب الانفتال والانصراف عن اليمين والشمال، ط: دار المعرفة - بيروت)

(۳) (صحيح البخاري: ۱/ ۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، ط: البدر - ديوبند)

(۴) انظر الحواشی تحت عنوان: مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کرنا۔

[۹۸] تہوار اور مبارک راتوں میں ختم قرآن کی رسم کا حکم

۳۰۱-سوال: ہمارے یہاں تہوار اور مبارک راتوں میں پہلے ختم قرآن کیا جاتا ہے پھر علماء اس دن کی فضیلت کو بیان کرتے ہیں۔ اب بعض لوگوں کا کہنا ہے پہلے ختم قرآن کیا جائے اور بعض کا کہنا ہے کہ ختم قرآن کا رواج ہے، اس کو جاری نہ رکھنا چاہیے، تو اس طرح ختم قرآن جائز ہے یا نہیں؟ اور اس طرح بیان کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اسلام میں صرف دو عیدیں ہیں۔ (۱) عید الفطر (۲) عید الاضحیٰ اس کے علاوہ اور کوئی عید نہیں؛ اس لیے رسول اللہ ﷺ کی ولادت کے موقع کی مناسبت سے مہینہ، دن اور تاریخ متعین کر کے عید منانا جائز نہیں ہے۔ [(۱)]

البتہ اللہ کے رسول اللہ ﷺ کی سیرت واخلاق اور پاک زندگی کے حالات کو بیان کرنا - جس سے مسلمان اور غیر مسلم ہدایت حاصل کریں - دن اور تاریخ کو آگے پیچھے کر کے یا کوئی دوسرا دن یا تاریخ طے کر کے، جائز ہے۔ [(۲)]

---

(۱) ومن جملة ما أحدثوه من البدع مع اعتقادهم أن ذلك من أكبر العبادات وإظهار الشعائر ما يفعلونه في شهر ربيع الأول من مولد وقد احتوى على بدع ومحرمات جمة. (المدخل - ابن الحاج (م: ۷۳۷ھ): ۲/۲، فصل في مولد النبي والبدع المحدثة فيه، ط: دار التراث)

(۲) الموالد والأذكار التي تفعل عندنا أكثرها مشتمل على خير، كصدقة، وذكر، وصلاة وسلام على رسول الله صلى الله عليه وسلم ومدحه، وعلى شر بل شرور لو لم يكن منها إلا رؤية النساء للرجال الأجانب، وبعضها ليس فيها شر لكنه قليل نادر، ولا شك أن القسم الأول ممنوع للقاعدة المشهورة المقررة أن درء المفاسد مقدم على جلب المصالح، فمن علم وقوع شيء من الشر فيما يفعله من ذلك فهو عاص آثم، وبفرض أنه عمل في ذلك خيرا، فربما خيره لا يساوي شره ألا ترى أن الشارع صلى الله عليه وسلم اكتفى من الخير بما تيسر وفطم عن جميع أنواع الشر حيث قال: (إذا أمرتكم بأمر فأتوا منه ما استطعتم، وإذا نهيتكم عن شيء فاجتنبوه) فتأمله تعلم ما قررته من أن الشر وإن قل لا يرخص في شيء منه، والخير يكتفى منه بما تيسر. (الفتاوى الحديثية - أحمد بن محمد بن علي بن حجر الهيتمي السعدي الأنصاري، شهاب الدين شيخ الإسلام، أبو العباس (م: ۹۷۳ھ): ۱/۱۰۹، ط: دار الفكر)

والاحتفال بذكر الولادة الشريفة ان كان خاليا من البدعات المروجة فهو جائز بل مندوب كسائر اذكاره صلى الله عليه وسلم. (امداد الفتاوى: ۶/ ۳۱۲، كتاب العقائد والكلام، ط: ادارہ تاليفات اولياء - ديوبند)

اسی طرح اس تاریخ کو قرآن پڑھنے کو ضروری سمجھنا جائز نہیں اور عید میلاد کے عدم جواز کی وجہ بھی یہی ہے۔ (یعنی التزام مالا یلزم)

قرآن کے ختم کے لیے کوئی دوسرا دن رکھا جائے، تاکہ اس میں شریک ہونے والے کو زیادہ موقع ملے، الغرض شب برأت وغیرہ میں قرآن کا ختم ضروری سمجھنا جائز نہیں، وعظ کے بعد مسجد یا گھر میں تلاوت کرنا یا ذکر کرنا زیادہ ثواب کا کام ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹۹] کیا ختم خواجگان پڑھنا بدعت ہے؟

۳۰۲-سوال: ہمارے یہاں مسجدوں میں تقریباً ایک سال پہلے عصر کی نماز کے بعد بہت سے مصلی مسجد کے جماعت خانے میں مل بیٹھ کر یاسین پڑھتے تھے، پھر حسب ذیل طریقہ سے تسبیحات پڑھتے اور یہ سلسلہ برابر جاری تھا۔ ان تسبیحات کو چشتیہ طریقہ کے مطابق ختم خواجگان کہا جاتا ہے۔ (۱) ہر ایک شخص درود شریف تین مرتبہ پڑھتا تھا۔ (۲) کانچ کی ۳۶۰ گوٹیاں رکھ کر ان میں سے کچھ لے لیتا اور ''لا ملجاو لا منجا من اللہ الا الیہ'' پڑھتا تھا۔ (۳) مذکور طریقہ کے مطابق سب مل کر کانچ کی ۳۶۰ گوٹیوں پر سورۂ الم نشرح پڑھتے۔ (۴) پھر واپس دوسرے نمبر کے مطابق ''لا ملجاو لا منجا من اللہ الا الیہ'' پڑھتے۔ (۵) اور اس کے بعد پھر تین مرتبہ درود شریف پڑھتے۔ اس طرح اجتماعی ذکر واذکار کے بعد ایک متقی آدمی بستی اور اہل بستی یعنی مسلمانوں کے لیے دعا کرتا تھا۔

سہارنپور کے مدرسے میں بھی روزانہ عصر کی نماز کے بعد اوپر ذکر کردہ طریقے کے مطابق ختم خواجگان پڑھا جاتا ہے۔ اس میں اکثر اوقات مرحوم حضرت مولانا زکریا صاحبؒ بھی شریک ہوتے تھے۔ (جامعہ حسینیہ راندیر کی طرف سے شائع شدہ ختم خواجگان کی کتاب کے حوالہ سے)

اس طرح پڑھنے اور دعا مانگنے کا سلسلہ جاری تھا کہ اچانک ایک صاحب کہنے لگے کہ یہ بدعت ہے۔ یہ سلسلہ یہاں نہیں تھا، اس کو بعد میں قائم کیا گیا ہے، یہ درست نہیں ہے۔ اس کے بعد ہفتہ میں ایک مرتبہ اسے چھوڑ دیتے تھے۔ یعنی جس دن گشت یا آداب گشت یا تقریر کا پروگرام ہوتا تھا، اس دن اسے (ختم خواجگان) موقوف رکھتے تھے۔ وہ حضرت تو اس سلسلہ کو بند کرنے کے لیے برابر اصرار کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بدعت ہے۔

اس کی بناء پر وہ تلاوت یٰسین شریف بھی بند کرانے پر تلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ تسبیح یعنی ختم خواجگان کو

اوپر ذکر کردہ طریقہ کے مطابق پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا جائے، تو کیسا ہے؟ جو حضرات اس تسبیح کو نہیں پڑھتے ہیں، ان پر دباؤ نہیں ڈالا جاتا، کیا اس طرح پڑھنا حقیقت میں بدعت ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

مذکورہ طریقہ پر پڑھے جانے والے ذکر اور دعا کو ختم خواجگان کہا جاتا ہے، اگر غیر ضروری سمجھ کر پڑھا جائے اور شرکت نہ کرنے والے کو برا نہ کہا جائے، تو کوئی بھی وقت متعین کر کے پڑھنا اور ساتھ مل کر دعا کرنا جائز ہے، اسے بدعت کہنا صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح اوپر ذکر کردہ شرائط کی رعایت کرتے ہوئے یٰسین شریف کی تلاوت کی جائے، تو جائز ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ بدعت وہ ہے، جو قرآن، حدیث، اثر اور اجماع امت کے خلاف ہو؛ لہٰذا اگر کوئی کام مذکورہ امور کے خلاف نہ ہو، تو جائز ہوگا، امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ بدعت ہر وہ چیز ہے جس کا وجود صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں نہ ہو۔ (مرقاۃ شرح مشکوۃ: ۱/۱۷۹)۔[1] لہٰذا مذکور ختم خواجگان اور ختم یاسین شریف بدعت نہیں ہے۔ جو بھائی ضد کرتے ہیں، ان کا بند کرانا اور بند کرانے کے لیے دباؤ ڈالنا جائز نہیں ہے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر، بدی اور فتنے کے غلبے کے زمانے میں لوگ جمع ہو کر ذکر الٰہی اور تلاوت یٰسین شریف کے بعد دعا مانگیں، تو بہتر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی معاملہ یا حادثہ پیش آجاتا، مثلاً آندھی چلتی، یا بادل چھا جاتے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے جلدی کرتے تھے۔[2]

رات دن امت مسلمہ پر پریشانی اور مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں؛ لہٰذا اہل اسلام مجتمع ہو کر ذکر واذکار اور ختم تلاوت یٰسین شریف کے بعد دعائیں مانگیں، یہ نہ صرف جائز بل کہ مطلوب ہے۔ اس لیے کسی کا اس سے روکنا، ضد کرنا، اور دباؤ ڈالنا جائز نہیں ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قال الشافعي رحمه الله: ما أحدث مما يخالف الكتاب أو السنة أو الأثر أو الإجماع فهو ضلالة، وما أحدث من الخير مما لا يخالف شيئا من ذلك فليس بمذموم... قال النووي: البدعة كل شيء عمل على غير مثال سبق، وفي الشرع إحداث ما لم يكن في عهد رسول الله - صلى الله عليه وسلم. (مرقاة المفاتيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۱/ ۲۲۳، تحت رقم الحديث: ۱۴۱، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) عن حذيفة قال: «كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا حزبه أمر، صلى. (سنن أبي داؤد، ص: ۱۸۷، رقم الحديث: ۱۳۱۹، كتاب الصلاة، باب وقت قيام النبي صلى الله عليه وسلم، ط: البدر-ديوبند)

(۳) اسی سے ملتا جلتا سوال حضرت مفتی عبدالرحیم لاج پوری صاحب نے حضرت مفتی یحییٰ صاحب سے کیا تھا، انہوں نے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی سے دریافت فرمایا تھا۔ سوال وجواب کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (فتاوی رحیمیہ: ۲/ ۲۲۸، کتاب السنۃ والبدعۃ، ط: کراچی)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ.
(۴-النساء:۵۹)

باب التقلید

(تقلید کا بیان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[تقلید کا بیان]

[۱] ائمۂ اسلام کی تقلید درحقیقت پیغمبر علیہ السلام کی پیروی ہے

۳۰۳-سوال: ائمہ کرام چار ہیں: امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ، جن کی بہت سے حضرات تقلید کرتے ہیں اور ہر انسان اپنے اپنے امام کی پیروی کرتا ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ ان اماموں کا امام کون ہے؟ اور ان کے (یعنی امام الائمہ کے) بتائے ہوئے راستہ کی اتباع کرنی چاہیے یا ان ائمہ کی اور دونوں میں فرق کیا ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

بہتر ہوتا کہ آپ اس سوال کا تسلی بخش جواب حاصل کرنے کے لیے روبرو تشریف لاتے؛ تاہم آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے:

ہر مومن کے لیے مشعل راہ، قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں، یہی دونوں چیزیں بنیاد ہیں، اور ان کی ہی روشنی میں قیاس واستحسان کے ذریعہ مسائل کو اخذ کیا جاتا ہے۔ (۱) پھر اگر اس پر تمام علماء امت کا اتفاق ہو، تو "اجماع امت" ورنہ اسے "قیاس" کہا جاتا ہے، اور جو مسائل ان چاروں دلائل سے

---

(۱) عن أناس من أهل حمص من أصحاب معاذ بن جبل أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- لما أراد أن يبعث معاذا إلى اليمن، قال: كيف تقضي إذا عرض لك قضاء؟ قال: أقضي بكتاب الله. قال: فإن لم تجد في كتاب الله. قال فبسنة رسول الله -صلى الله عليه وسلم-. قال: فإن لم تجد في سنة رسول الله -صلى الله عليه وسلم- ولا في كتاب الله. قال: أجتهد رأيي ولا آلو. فضرب رسول الله -صلى الله عليه وسلم- صدره وقال: الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله لما يرضي رسول الله. (سنن أبي داؤد: ۲/۵۰۵، رقم: ۳۵۹۲، كتاب الأقضية، باب اجتهاد الرأي في القضاء، ط: المكتبة الأشرفية- ديوبند ☆ سنن الترمذي: ۱/۲۴۷، رقم الحديث: ۱۳۲۷، باب ما جاء في القاضي كيف يقضي، أبواب الأحكام، ط: البدر- ديوبند)

مستنبط کیے گئے ہوں، ان ہی کے مجموعے کو ''فقہ'' کہا جاتا ہے۔ [۲]

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ چاروں ائمہ جو کچھ کہتے ہیں، وہ ان کی اپنی باتیں نہیں ہیں؛ بل کہ انھوں نے مذکورہ چاروں حجتوں کو بنیاد بنا کر مسائل کو اخذ کیا ہے اور لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ [۳] جس کی وجہ سے آج ان کی اتباع کرنے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ [۴] اور جو لوگ ان کی اتباع نہیں کرتے ہیں، ان میں ایک فرقہ ''اہل حدیث'' نامی ہے، جو صرف احادیث کو حجت مانتا ہے اور جہاں سہولت وآسانی ہوتی ہے، بہ تقاضائے نفس اسی پر عمل کرتا ہے، بیس رکعت تراویح کے بجائے آٹھ رکعت، تین طلاق میں ایک طلاق وغیرہ مسائل ان کے یہاں مشہور ہیں، حاصل یہ کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک بنیادی چیز قرآن وحدیث ہے اور دیگر مسائل ان ہی دونوں (قرآن وحدیث) سے اخذ کردہ ہیں۔

اس لیے ان ائمہ کی پیروی درحقیقت نبی کریم ﷺ کی پیروی ہے، جو حضرات ان ائمہ کی اتباع کرتے ہیں، وہ درحقیقت دین کی تشریح وتعبیر میں ان کو معتبر مانتے ہیں، ان کی پیروی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہی واجب الاتباع ہیں، قرآن وحدیث کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بعض لوگ اس طرح دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر بے شمار تحریریں لکھی گئی ہیں، جن میں تقلید کی شرعی حیثیت کی خوب وضاحت کی گئی ہے، آپ ان کی جانب بھی رجوع کرسکتے ہیں۔ [۵] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۲) كما هو ظاهر من تعريف الفقه: العلم بالأحكام الشرعية الفرعية المكتسب من أدلتها التفصيلية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۱۱۸، مقدمة، ت: عادل أحمد الموجود، علي محمد معوض، ط: دار عالم الكتب، الرياض، طبع خاص: ۱۴۲۳ھ=۲۰۰۳ء)

(۳) وهذا الأصل مروي عن ابن عباس، كما في سنن الدارمي عن عبد الله بن أبي يزيد قال: كان ابن عباس إذا سئل عن الأمر فكان في القرآن أخبر به، وإن لم يكن في القرآن وكان عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أخبر به، فإن لم يكن فعن أبي بكر وعمر، فإن لم يكن قال فيه برأيه. قال: إسناده صحيح. (سنن الدارمي: ۱/۲۶۵، رقم: ۱۶۶، باب الفتيا وما فيه من الشدة، المقدمة، ت: حسين سليم أسد الداراني، ط: دار المغني للنشر والتوزيع، طبع اول: ۱۴۲۱ھ=۲۰۰۰ء)

(۴) جس كا حكم قرآن و حديث ميں موجود هے، قرآن كريم ميں ارشاد هے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ. (سورۃ النساء: ۵۹) قال الرازي: فكان حمل لفظ "أولي الأمر" عليهم (العلماء) أولى. (مفاتيح الغيب لمحمد بن عمر المعروف بـ فخر الدين الرازي: ۱۰/۱۵۰، ط: دار الفكر، بيروت، طبع اول: ۱۴۰۱ھ=۱۹۸۱ء)

(۵) دیکھیے: الکلام المفید فی اثبات التقلید، ایضاح الادلۃ اور تقلید کی شرعی حیثیت

[۲] تقلید فرض ہے یا واجب؟

۳۰۴-سوال: کسی بھی امام کی تقلید کرنا فرض ہے یا واجب؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قرآن کریم اور حدیث پاک سے (براہ راست) جس شخص کو مسئلہ سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے، اس پر تقلیـد ضروری ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تقلید کا حکم خود قرآن کریم میں ہے: ارشاد ربانی ہے: وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ. [-۴ النساء: ۸۳] یہ آیت اگرچہ ایک خاص معاملے میں نازل ہوئی ہے، مگر آیت کے عموم سے تقلید کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے۔ دوسری آیت ہے: يأيها الذين آمنوا أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم. [-۴ النساء: ۵۹] اس میں بھی اولو الأمر کی اطاعت کا حکم ہے اور اسی اطاعت کا اسلامی نام تقلید ہے۔

وفي الحديث: من أفتى بغير علم كان إثمه على من أفتاه. (سنن أبي داؤد، ص: ۵۱۵، رقم الحديث: ۳۶۵۷، كتاب العلم، باب التوقي في الفتيا، ط: البدر-ديوبند) یہ حدیث بھی تقلید کے جواز پر بڑی واضح دلیل ہے۔

وفي البخاري تعليقا وفي المسلم متناً "ايتموا بي وليأتم بكم من بعد كم. (صحيح البخاري: ۱/۹۹، كتاب الأذان، باب الرجل يأتم بالإمام ويأتم الناس بالمأموم) قال ابن حجر في شرحه: وقيل معناه تعلموا مني أحكام الشريعة، وليتعلم منكم التابعون بعدكم وكذلك أتباعهم إلى انقراض الدنيا. (فتح الباري-ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲هـ): ۲/۲۰۵، ط: دار المعرفة-بيروت)

تقلید مطلق اور شخصی عہد صحابہ میں موجود تھی، تقلید مطلق کی ایک مثال: عن ابن عباس قال: خطب عمر بن الخطاب الناس بالجابية وقال: يأيها الناس! من أراد أن يسأل عن القران فليأت أبي بن كعب، ومن أراد أن يسأل عن الفرائض فليأت زيد بن ثابت، ومن أراد أن يسأل عن الفقه فليأت معاذ بن جبل، ومن أراد أن يسأل عن المال فليأتني فإن الله جعلني له واليا وقاسماً. (المعجم الأوسط-الطبراني: ۴/۱۲۷، رقم الحديث: ۳۷۸۳، ت: ابو معاذ طارق بن عوض الدين بن محمد، وغيره، ط: دار الحرمين، ۱۴۵۰هـ-۱۹۹۵ء)

عن معاذ بن جبل، أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- لما أراد أن يبعث معاذا إلى اليمن قال: » كيف تقضي إذا عرض لك قضاء؟« ، قال: أقضي بكتاب الله، قال: »فإن لم تجد في كتاب الله؟« ، قال: فبسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: »فإن لم تجد في سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولا في كتاب الله؟« قال: أجتهد رأيي، ولا آلو، فضرب رسول الله -صلى الله عليه وسلم- صدره، وقال: »الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله لما يرضي رسول الله«. (سنن أبي داؤد، ص: ۵۰۵، رقم الحديث: ۳۵۹۲، كتاب الأقضية، باب أجتهاد الرأي في القضاء، ط: البدر-ديوبند)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو تقلید شخصی کی نہ صرف اجازت دی؛ بلکہ اس کو ان کے لیے لازم فرمایا۔

جواب میں جن کی جانب سے اشارہ کیا گیا ہے، اصطلاح میں ان کو "عوام" کہا جاتا ہے: حضرت مفتی تقی عثمانی مدظلہ رقم فرماتے ہیں:

[۳] دین کے معاملے میں کسی بزرگ کے اصول کی حیثیت

۳۰۵-سوال: ایک حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم لوگ قرآن مجید اور میری احادیث مبارکہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھو''۔ (۱) اس حدیث پاک کی رو سے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی امر دینی میں کسی امام یا بڑے سے بڑے عالم کا قول و فعل قابل قبول اور لائق اعتناء نہ ہو؛ کیوں کہ شرعی اصول وضوابط تو آج سے چودہ سو سال قبل ہی آں حضور ﷺ کے زمانے میں متعین و مقرر ہو چکے تھے، آپ ﷺ کے بعد کسی بشر کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی امر شرعی میں اصول اور ضابطے بنائے۔

حضرت مفتی صاحب! گستاخی معاف فرمائیں، میں نے یہ سوال صرف اس لیے کیا ہے کہ میرے سامنے جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو معا میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں قرآن و حدیث سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے، میری ناقص فہم کے اعتبار سے قرآن وحدیث سے جو حکم ثابت ہو، اسی پر عمل کرنا چاہیے، اور اللہ اور رسول ﷺ کے علاوہ جن لوگوں نے خود ساختہ اصول وضوابط مقرر کیے ہیں، ان کی جانب التفات نہیں کرنا چاہیے۔

الجواب حامداً ومصلياً:

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں اگر کوئی قوانین وضوابط بنائے جائیں، تو یہ لائق تقلید

= عوام سے ہماری مراد مندرجہ ذیل اقسام کے حضرات ہیں: (۱) وہ حضرات ہیں، جو عربی زبان اور اسلامی علوم سے بالکل ناواقف ہوں، خواہ وہ دوسرے فنون میں کتنے ہی تعلیم یافتہ ماہر ومحقق ہوں۔ (۲) وہ حضرات جو عربی زبان جانتے اور عربی کتابیں سمجھ سکتے ہوں؛ لیکن انہوں نے تفسیر، حدیث، فقہ اور متعلقہ دینی علوم کو باقاعدہ اساتذہ سے نہ پڑھا ہو۔ (۳) وہ حضرات ہیں جو رسمی طور پر اسلامی علوم سے فارغ التحصیل ہوں؛ لیکن تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے اصولوں میں اچھی استعداد اور بصیرت پیدا نہ ہوئی ہو۔ یہ تینوں قسم کے حضرات تقلید کے معاملے میں ''عوام'' ہی کی صف میں شمار ہوں گے، اور تینوں کا حکم ایک ہے (في الهداية: لأن على العامي الاقتداء بالفقهاء لعدم الاهتداء في حقه إلى معرفة الأحاديث. (الهداية: ۱/ ۲۰۶، كتاب الصوم، باب ما يوجب القضاء والكفارة، ط: مكتبة الاتحاد ديو بند) [الماخوذ من موضع مختلفته من كتاب: ''تقليد كى شرعى حيثيت'' للشيخ محمد تقي العثماني - حفظه الله - ط: دار المؤلفين، ديو بند، الطبعة السابعة: ۲۰۰۹ء]

(۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إني قد خلفت فيكم اثنين، لن تضلوا بعدهما أبدا، كتاب الله، وسنتي، ولن يتفرقا حتى يردا على الحوض. (مسند البزار: ۱۵/ ۳۸۵، رقم: ۸۹۹۳، ط: مكتبة العلوم والحكم، المدينة المنورة)

ہوتے ہیں؛ہاں! قرآن کریم اور احادیث نبویہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) کے خلاف کوئی قانون ہو،تو وہ ماننے کے لائق نہیں ہے؛لہٰذا کوئی بھی مسلم تنظیم یا سوسائٹی اگر قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں کوئی اصول وضوابط مقرر کرتی ہے،تو ان کو تسلیم کر کے ان پر عمل پیرا ہونا چاہیے،ان کی خلاف ورزی کرنا مناسب نہیں ہے۔[1] فقط،واللہ اعلم بالصواب۔

[۴]ایک غیر مقلد کی جانب سے حنفی امام کو اِرسال کیے گئے تقلید کے متعلق چند سوالات

۳۰۶-سوال: محترم المقام حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم!

آپ کی خدمت میں چند سوالات پیش کر رہا ہوں، جو مجھ پر کسی غیر مقلد نے بذریعۂ خط روانہ کیے ہیں، میں ایک جگہ اِمامت کرتا ہوں، تراویح کے متعلق میں بیان کر رہا تھا، اُس کے چند روز بعد یہ خط مجھے ارسال کیا گیا ہے، برائے کرم آپ اُس کا ایسا مسکت جواب دیں کہ اس جیسے سوالات کا سلسلہ بند ہو جائے، اور آپ بھی مجھے کچھ سوالات کی رہنمائی فرمائیں، جو میں اُس کو پوچھ سکوں، خط میں مندرجۂ ذیل سوالات تھے:

(۱) کیا تقلید واجب ہے؟

(۲) اگر تقلید واجب ہے، تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اُمت پر یا اُس سے کچھ لوگوں کا استثناء ہے؟

(۳) ائمۂ اربعہ کس کے مقلد تھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

تقلید کے وجوب وعدمِ وجوب کا مسئلہ بہت تفصیل طلب اور دقیق ہے، یہاں عام فہم انداز میں مختصراً اُس کا خلاصہ نقل کرتا ہوں:

ایک عامی آدمی-جو مسائلِ شرعیہ سے واقف نہیں ہے-آخر کیا کرے گا؟ کسی واقف سے دریافت کرلے گا، خواہ اپنے مسائل کے لیے کسی خاص شخص کو متعین کرلے، جس پر اُسے یقین اور اعتماد ہو، کہ وہ جو کچھ بھی بتائے گا وہ صحیح اور قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک کے مطابق ہوگا، خواہ اِس قسم کے چند متعدد لوگوں سے بہ وقتِ ضرورت پوچھتا رہے، اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے:

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تقلید کی شرعی حیثیت، از: حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم ☆ ارمغان حق، از: مولانا ابو بکر غازی پوریؒ ☆ تجلیات صفدر، از: مولانا امین صفدر ☆ اختلاف امت اور صراط مستقیم، از: شہید اسلام مولانا یوسف لدھیانویؒ۔

فاسئلوا أهل الذکر إن کنتم لا تعلمون.(۱)

ترجمہ: اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھتے رہو۔

اس کا نام تقلید ہے، تقلید ایک معقول چیز ہے، معمولی عقل والا بھی بہ خوبی جانتا ہے کہ دنیوی امور میں بھی ہر شخص (اگر چہ وہ کچھ علم رکھتا ہو) کسی فن میں مہارت حاصل کیے بغیر اور اساتذہ سے پڑھے بغیر اپنے مطالعہ کی بنیاد پر عمل کرے گا، تو ٹھوکر کھائے گا، اگر ایک بیمار آدمی کتبِ طب سے اپنا علاج خود ڈھونڈنا چاہے، تو نقصان اٹھائے گا، اُس کو لامحالہ کسی طبیب سے مشورہ کرنا ہوگا اور اُس کی بات ماننی ہوگی، ڈاکٹر کے پاس علاج کے لیے جانا پڑے گا، خواہ اپنے تمام امراض کا علاج ایک ڈاکٹر سے کروائے جو اُس کا فیملی ڈاکٹر ہو، یا مختلف امراض میں مختلف ڈاکٹروں سے علاج کروائے، دونوں صورتیں صحیح ہیں؛ لیکن علاج ضروری ہے، اب اگر یہ شخص ایک ہی مرض میں مختلف ڈاکٹروں سے نسخے لکھوائے، پھر اُن نسخوں میں سے اپنی جانب سے کچھ دوائیاں منتخب کرتا ہے، کہ ایک ڈاکٹر کی تجویز کردہ ٹیبلیٹ لیتا ہے، دوسرے کا انجکشن، تیسرے کی کیپسول اور چوتھے کی پینے کی دوا پی لے، ظاہری بات ہے کہ کوئی بھی عقل مند نہیں کہے گا کہ اُس کا یہ فعل درست ہے، بل کہ یہ شخص صحت یاب ہونے کے بجائے مزید بیمار ہوگا، ہاں، مختلف مواقع میں مختلف ڈاکٹروں، اطباء یا ہومیو پیتھک ڈاکٹروں سے علاج کرواتا ہے، تو کوئی حرج نہیں، پھر بھی یہ بات مزاج کے موافق نہ ہوگی۔

اسی طرح مسائلِ شرعیہ میں اگر کسی ایک ہی امام کی تقلید کرتا ہے، تو محفوظ رہتا ہے، اگر ایک مسئلہ میں چند مجتہدین کے حکم پر عمل کرتا ہے، تو یہ ابطالِ شرع ہے اور اپنی خواہش کی اتباع ہے، ایسا آدمی نقصان اٹھائے گا، بجائے ہدایت کے ضلالت میں جا گرے گا، مثلاً وضوء کرنے کے بعد عورت کو ہاتھ لگایا، کہتا ہے کہ وضوء نہیں ٹوٹا، بدن سے خون یا پیپ نکلا اور کہتا ہے کہ وضو نہیں ٹوٹا، تو اس شخص کے نزدیک تو اُس کا وضوء باقی ہے، حالاں کہ کسی بھی امام کے نزدیک اُس کا وضو باقی نہیں رہا، تو کیا یہ شریعتِ مطہرہ کے ساتھ کھلواڑ نہیں ہے؟ یہ خواہش نفس کی اتباع اور آزادیٔ نفس ہے۔

اس لیے ایسے آدمی کے لیے واجب اور ضروری ہے کہ وہ چاروں ائمہ میں سے کسی ایک کی راہ کو اختیار کرے اور اُسی پر چلتا رہے، اُس میں اتنی بصیرت کہاں کہ مختلف مسائل میں مختلف ائمہ کے مسلک کو اختیار کرے۔

اور اگر وہ عالم ہے، تو وہ اپنے اجتہاد پر عمل کر سکتا ہے، بشرطیکہ اجتہاد کی شان اور قابلیت اُس میں

---

(۱) فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. [۱۶-النحل:۴۳]

موجود ہو۔ (جس کا تذکرہ ابھی آئے گا) مگر ایسا آدمی دوسرے لوگوں کو یہ دعوت نہیں دے سکتا کہ تم چاروں ائمہ کا مسلک چھوڑ دو اور میری راہ اختیار کرو، جب تک کہ وہ اجتہاد میں ائمۂ اربعہ سے زیادہ اپنی صلاحیت ثابت نہ کر دے اور اگر کوئی ایسا ہے، تو اُس کے اتباع کی دعوت دینا تو تقلیدِ عظیم ہے اور ''جس سے بھاگے ،اُسی میں گرے'' کا مصداق بھی ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دوسروں کو ائمۂ اربعہ کی تقلید سے روکتے ہیں، در حقیقت وہ بڑی اور بری تقلید میں خود مبتلا ہیں؛ کیوں کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید کرنے والوں میں تو ایسے لوگ بھی ہیں، جنھوں نے کہیں اپنے امام کے قول کو ترک کیا ہے؛ لیکن یہ غیر مقلدین تو سب کے سب یک زبان ہیں کہ ائمہ کی تقلید کو چھوڑ دو، ہم جو کہتے ہیں اُسی کو مانو، یہی درست ہے۔ ـــــــــ علامہ ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، نواب صدیق حسن خاںؒ اور دو تین دوسرے علماء کرام ہیں بس، اُنہوں نے جو راستہ اختیار کیا، تم بھی اُسی کو اختیار کرو، گویا ائمہ اربعہ کی تقلید کو ترک کرنے کے بارے میں بلا دلیل ہماری بات مان لو، اگر اُن میں کچھ اونچے نیچے لوگ ہیں، تو امام بخاریؒ یا امام مسلمؒ وغیرہ کی بات یا اُن کی روایت پیش کرتے ہیں، تو آخر یہ بھی تو امام بخاریؒ یا امام مسلمؒ کی تقلید ہوئی، یہ آزادیٔ نفس اور کبر ہے، اگر ایسے لوگوں کو خدشہ نہ ہوتا کہ لوگ ہمیں ٹھکرا دیں گے، تو شاید ضرور یہ کہتے کہ صحابۂ کرامؓ کی بات بھی مت مانو، مگر ایسا کہہ دینا بہت مشکل ہے؛ اس لیے کہتے ہیں کہ صحابہؓ کی اتباع کرو، چناں چہ اُن کی ایک جماعت 'مودودی مکتبِ فکر' کے متبعین در حقیقت غیر مقلدین ہی کی جماعت ہے، جو صحابۂ کرامؓ کو بھی ناقابلِ اعتبار اور قابلِ تنقید ٹھہراتے ہیں، یہاں تک کہ حدیثِ صحیح کے انکار تک باز نہیں آتے، اور یہ حقیقت ہے کہ جس نے اِس آزادیٔ نفس کو اختیار کیا ہے، وہ بسا اوقات انکارِ حدیث، دعویٰ نبوت اور دعوائے مہدویت تک کر بیٹھتا ہے، چناں چہ جو لوگ بھی ایسے ہیں، وہ اپنے ادھورے مطالعہ اور ناقص استعداد کی بنا پر اور کسی معلم واستاذ کی تربیت ورہنمائی کے بغیر آگے بڑھنے کی وجہ سے گمراہ ہو گئے۔

جب صحابۂ کرامؓ میں سے بعض نے دوسرے صحابہؓ کا اتباع کیا، حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی جن کے بارے میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''لو كان بعدي نبي، لكان عمر ابن الخطاب''.[1]

(۱) لو كان بعدي نبي، لكان عمر بن الخطاب. (فضائل الصحابة- أبو عبد الله أحمد ابن حنبل الشيباني (م: ۲۴۱هـ) :۱/ ۳۵۶، رقم: ۵۱۹، ت: د. وصي الله محمد عباس، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت ☆سنن الترمذي، رقم: ۳۶۸۶، أبواب المناقب، باب في مناقب أبي حفص عمر بن الخطاب رضي الله عنه☆ مسند الإمام أحمد: ۲۸/ ۶۲۴، رقم: ۱۷۴۰۵، ط: مؤسسة الرسالة ☆وانظر الشريعة -الآجري (م: ۳۶۰هـ): ۴/ ۱۷۱۴، رقم: ۱۲۰۳، باب ذكر خلافة أمير المؤمنين عمر بن الخطاب، ط: دار الوطن-الرياض)

کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا، اور فرمایا کہ ہر اُمت میں کچھ لوگوں کو الہام ہوتا ہے اور میری اُمت میں عمر کی یہی شان ہے، چناں چہ کچھ مسائل میں حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق وحی نازل ہوئی، مگر ایسا صحابی بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تقلید کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتا؛ بل کہ فخر کرتا ہے:

قال عمر بن الخطاب رضي الله عنه: إني لأستحي من الله أن أخالف أبا بكر، صح عنه أنه قال: رأينا لرأيك تبع. وصح عن ابن مسعود - رضي الله تعالى عنه - أنه كان يأخذ بقول عمر. [1]

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ میں حضرت ابوبکرؓ کی مخالفت کروں، اور صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا کہ ہماری رائے آپ کی رائے کے تابع ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت عمرؓ کے قول کو اختیار فرماتے تھے۔ (اعلام الموقعین لابن القیم: ۲/ ۲۰۲)[2]

حضرت شعبیؒ حضرت مسروقؒ سے نقل کرتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ میں سے چھ صحابہؓ فتویٰ دیتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم، اگر اختلاف ہوتا تو حضرت ابن مسعودؓ حضرت عمرؓ کے قول کو مانتے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت علیؓ کے قول کو اور حضرت زید بن ثابتؓ حضرت ابی بن کعبؓ کے قول کو اختیار فرماتے۔ (اعلام الموقعین: ۲/ ۲۰۲)[3]

---

(۱) تخريج الأحاديث والآثار الواقعة في تفسير الكشاف للزمخشري - جمال الدين، الزيلعي (م: ۷۶۲هـ): ۱/ ۲۹۱، سورة النساء، ت: عبدالله بن عبدالرحمن السعد، ط: دار ابن خزيمة - الرياض)

تفسير الثعلبي = الكشف والبيان عن تفسير القرآن - الثعلبي، أبو إسحاق (م: ۴۲۷هـ): ۳/ ۲۶۹، ت: الإمام أبي محمد بن عاشور، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(الدر المنثور - جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱هـ): ۲/ ۵۶۷، ط: دار الفكر - بيروت)

(أضواء البيان في إيضاح القرآن بالقرآن - الشنقيطي، محمد الأمين (م: ۱۳۹۳هـ): ۷/ ۳۱۶، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) إعلام الموقعين عن رب العالمين - ابن قيم الجوزية (م: ۷۵۱هـ): ۲/ ۱۴۰، التقليد والاتباع في الدين، ت: محمد عبدالسلام إبراهيم، ط: دار الكتب العلمية - بيروت.

(۳) وقال الشعبي عن مسروق: كان ستة من أصحاب النبي - صلى الله عليه وسلم - يفتون الناس: ابن مسعود، وعمر بن الخطاب، وعلي، وزيد بن ثابت، وأبي بن كعب، وأبو موسى، وكان ثلاثة منهم يدعون قولهم لقول ثلاثة: كان عبدالله يدع قوله لقول عمر، وكان أبو موسى يدع قوله لقول علي، وكان زيد يدع قوله لقول أبي بن كعب. (المصدر السابق)

رہی یہ بات کہ پھر ہم صحابۂ کرامؓ کی اتباع کیوں نہیں کرتے؟ ہم بھی حضرت عمرؓ یا اور کسی صحابیؓ کو اپنا پیشوا کیوں نہیں بناتے کہ اُن کی تقلید کریں، تو مختصر اور سادہ بات یہ ہے کہ یقیناً یہ حضرات قابل اتباع ہیں، لیکن دین وشریعت کے ہر مسئلہ میں کسی بھی ایک صحابیؓ سے ہمیں پورا ذخیرہ نہیں ملتا، کہ ہم ہر مسئلہ میں اُن ہی کی رائے کو اختیار کرسکیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ اپنے دور میں دین کی اشاعت اور دشمنوں سے جہاد میں اس قدر مشغول تھے کہ انہیں فرصت نہیں ملی کہ وہ ہر ہر مسئلہ کے بارے میں جس قدر احادیث اور صحابہؓ کی آراء ہیں جمع کر کے غور کرتے اور اجتہاد کے ذریعہ ہر ہر مسئلہ میں کسی ایک حکم کو طے کرتے، نیز صحابۂ کرامؓ کے دور میں خواہشات کا اتباع بھی نہ تھا، اس لیے جس کے پاس جو حدیث تھی، یا اجتہاد تھا، اُسی پر وہ عمل کر لیتا، پھر بھی حضرت عمرؓ نے ایسی جماعتیں قائم کر کے- جو بھی صحابہؓ موجود تھے- اُن سے پیش آمدہ مسائل میں مشورہ کر کے بہت سے علوم جمع کر دیے تھے؛ لیکن عوام کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ صحابہؓ کے علوم سے براہِ راست استفادہ کرسکیں۔ (۱)

اِسی لیے ائمہ مجتہدین کرامؒ کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا کہ جب نورِ اسلام دنیا کے بہت سے خطوں میں پھیل گیا اور اطمینان وسکون حاصل ہوا، جملہ احادیث اور اقوالِ صحابہؓ سامنے آگئے، تو اُن مجتہدین کرامؒ نے عام اُمت کے لیے ایک راہ تجویز کی، جس پر مداومت سے چل کر منزل تک پہنچا جا سکے، منزل ایک ہی ہے، اور راستے چار ہیں، یہ من جانب اللہ ہے کہ جلیل القدر پیغمبر چار ہیں، (۲) جلیل القدر کتبِ سماویہ چار ہیں، (۳) جلیل القدر فرشتے چار ہیں، (۴) اور جلیل القدر ائمہ مجتہدین اور اُن کے مذاہب بھی چار ہیں، (۵)

---

(۱) فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: ''صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یقیناً ائمہ اربعہ سے بدرجہا افضل ہیں، ائمہ اربعہ کی تقلید کی یہ وجہ نہیں کہ اُن کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل تصور کیا جاتا ہے؛ بل کہ اُس کی وجہ یہ ہے کہ تقلید کے لیے ان مسائل کا معلوم ہونا ضروری ہے، جن میں تقلید کی جاتی ہے، اور آج جس قدر تفصیل کے ساتھ ہر باب اور ہر فصل کے مسائل ائمہ اربعہ کے مذاہب میں مدوّن اور مجتمع ہیں، یہاں تک کہ کتاب الطہارۃ سے لے کر کتاب الفرائض تک عبادات، معاملات؛ غرض ہر شعبہ کے ایک ایک مسئلہ کو جمع کر دیا ہے، اس طرح تفصیل کے ساتھ نہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کا مذہب مدوّن ملتا ہے، نہ تابعین سے، نہ تبع تابعین وغیرہ سے، پھر ائمہ اربعہ کو چھوڑ کر کسی اور کی تقلید کی جائے، تو کس طرح کی جائے؟ اس لیے ائمہ اربعہ ہی کی تقلید کو اختیار کیا گیا ہے''۔ (فتاویٰ محمودیہ ۲/ ۴۰۵ باب التقلید، ط: مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند)

(۲) حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۳) زبور، توراۃ، انجیل، قرآن شریف۔

(۴) حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل، حضرت عزرائیل علیہم السلام۔

(۵) حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ۔

جلیل القدر سلسلۂ اولیاء بھی چار[۱] اور جسمانی بیماریوں کے علاج کے لیے طریقۂ علاج بھی چار ہیں۔[۲]

ان چاروں ائمہ میں سے کسی بھی ایک کی تقلید ضروری ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو جو صلاحیت واستعداد ملی، وہ دوسرے مجتہدین کو حاصل نہیں ہوئی، دوسرے بہت سے مجتہدین پیدا ہوئے؛ مگر اُن کو وہ مقبولیتِ عامہ حاصل نہیں ہوئی جو ائمہ اربعہ کو حاصل ہوئی؛ اس لیے جو بھی غیر مجتہد ہے، اُس کے لیے اِن مجتہدین میں سے کسی ایک کی بات ماننا اور اُن پر اعتماد رکھنا- کہ اُنہوں نے پوری دیانت داری کے ساتھ اپنی انتھک محنتوں اور جاں فشانی کے بعد کتاب اللہ، احادیثِ صحیحہ، اجماع اور قیاس کے ذریعہ ہمارے لیے مسائل مستنبط فرما کر ہمیں ضلالت سے بچایا ہے- نہایت ضروری ہے۔[۳]

چنانچہ علامہ ابن قیم جوزیؒ جو بہت بڑے عالم ہیں اور غیر مقلدین اُنہیں اپنا پیشوا قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں کہ اُن علماء کے لیے- جنہوں نے کتاب اللہ کے اتباع میں محنت صرف کی اور بعض مسائل کا حکم اُن پر پوشیدہ رہا- اپنے سے بڑے عالم کی تقلید کرنا قابلِ مذمت نہیں؛ بل کہ تعریف کا باعث ہے۔ (اعلام

---

(۱) نقشبندی، سہروردی، چشتی، قادری۔

(۲) اصلاحِ بلغم، اصلاحِ سوداء، اصلاحِ صفراء، اصلاحِ خون/ ہومیوپیتھک، آلوپیتھک، آیورویدک اور یونانی طریقۂ علاج۔

(۳) العامي و من ليس له أهلية الاجتهاد، وإن كان محصلا لبعض العلوم المعتبرة في الاجتهاد، يلزمه اتباع قول المجتهدين، والأخذ بفتواه عن المحققين من الأصوليين. (الإحكام في أصول الأحكام-أبو الحسن الآمدي (م:۶۳۱ھ): ۴/ ۲۲۸، القاعدة الثانية، الباب الثاني، المسئلة الثانية: من ليس له أهلية الاجتهاد، ت: عبد الرزاق عفيفي، ط: المكتب الإسلامي، بيروت- دمشق- لبنان)

(و) بنى (على هذا) الذي ذكر من إجماع المحققين (ما ذكر بعض المتأخرين) وهو ابن الصلاح (منع تقليد غير) الأئمة (الأربعة) أبي حنيفة ومالك والشافعي وأحمد رحمهم الله تعالى (لانضباط مذاهبهم وتقييد) مطلق (مسائلهم وتخصيص عمومها) أي مسائلهم (ولم يدر مثله) أي مثل هذا الصنيع (في غيرهم) من المجتهدين (الآن لانقراض أتباعهم) أي أتباع غيرهم من المجتهدين، وبانقراض الأتباع تعذر ثبوت نقل حقيقة مذاهبهم. (تيسير التحرير- محمد أمين بن محمود البخاري المعروف بأمير بادشاه الحنفي (م: ۹۷۲ھ) ۴/ ۲۵۶، المقالة الثالثة في الاجتهاد، تكملة، ط: دار الفكر)

وقال الشاه ولي الله الدهلوي: منها أن هذه المذاهب الأربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الأمة أو- من يعتد منها- على جواز تقليدها إلى يومنا هذا، وفي ذلك من المصالح ما لا يخفى، لا سيما في هذه الأيام التي قصرت فيه الهمم جدا، وأشربت النفوس الهوى، وأعجب كل ذي رأي برأيه. (حجة الله البالغة- الشاه ولي الله الدهلوي (م: ۱۱۷۶ھ): ۱/ ۲۷۶، باب حكاية حال الناس قبل المائة الرابعة وبعدها، ت: السيد سابق، ط: دار الجيل- بيروت)

الموقعین : ۳/ ۱۸۸)[1]

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ وفات پاجانے والے عالم کی - جو کہ مجتہد ہو- تقلید جائز ہے، اور اُسی پر اطرافِ عالم میں سب مقلدین کا عمل ہے، اور بہترین تقلید اُن کے سامنے وفات پاجانے والوں کی تقلید ہے، اور جن لوگوں نے ان کی تقلید سے منع کیا ہے، یہ اُن کی اپنے من کی بات ہے۔ (بلا دلیل ہے)(اعلام الموقعین: ۴/ ۲۱۵)(۲)

حضرت علامہ ابن قیم جوزیؒ نے حضرت امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ ”کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ دین کے بارے میں فتویٰ دے، ہاں! اگر ایسا عالم، جو کتاب اللہ کے ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ، تاویل، تنزیل، مکی ومدنی اور آیات کی مراد سے مکمل واقف ہو، نیز حدیث شریف کا پورا علم رکھتا ہو، جس طرح قرآنِ پاک کا علم ہو، لغتِ عرب کا پورا ماہر ہو، پھر یہ کہ وہ انصاف اور دیانت داری سے فیصلہ کرے، دنیا کے مختلف خطوں کے عرف ورواج سے واقف ہو، اور ان تمام کے ساتھ وہ فقیہ النفس ہو، کہ اُس کی طبیعت میں فقہ کی مناسبت راسخ ہو“۔ (اعلام الموقعین: ۱/ ۴۶)[۳]

اگر کوئی عالم ان اوصاف کا حامل نہ ہو، تو اس کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔

جب ایک مفتی کے لیے اِس قدر اوصاف کا حامل ہونا ضروری ہے، تو پھر ایک مجتہد کے لیے کتنی صلاحیت مطلوب ہوگی؟؟؟! اگر ایسی صلاحیت کا کوئی شخص حامل ہو، تو اُس پر تقلید واجب نہیں، بل کہ خود ائمہ مجتہدین نے

---

(۱) وأما تقليد من بذل جهده في اتباع ما أنزل الله وخفي عليه بعضه فقلد فيه من هو أعلم منه فهذا محمود غير مذموم، ومأجور غير مأزور. (إعلام الموقعين عن رب العالمين - ابن قيم الجوزية (م: ۷۵۱هـ): ۲/ ۱۳۰، القول في التقليد وانقسامه، أنواع ما يحرم القول به، ت: محمد عبد السلام إبراهيم، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) هل يجوز للحي تقليد الميت والعمل بفتواه من غير اعتبارها بالدليل الموجب لصحة العمل بها؟ فيه وجهان... والثاني: الجواز، وعليه عمل جميع المقلدين في أقطار الأرض، وخيار ما بأيديهم من التقليد تقليد الأموات، ومن منع منهم تقليد الميت فإنما هو شيء يقوله بلسانه. (إعلام الموقعين: ۴/ ۱۹۵، فصل: هل للحي أن يقلد الميت من غير نظر للدليل)

(۳) وقال الشافعي فيما رواه عنه الخطيب في كتاب الفقيه والمتفقه له: لا يحل لأحد أن يفتي في دين الله إلا رجلا عارفا بكتاب الله بناسخه ومنسوخه، ومحكمه ومتشابهه، وتأويله وتنزيله، ومكيه ومدنيه، وما أريد به، ويكون بعد ذلك بصيرا بحديث رسول الله - صلى الله عليه وسلم -، وبالناسخ والمنسوخ، ويعرف من الحديث مثل ما عرف من القرآن، ويكون بصيرا باللغة، بصيرا بالشعر وما يحتاج إليه للسنة والقرآن، ويستعمل هذا مع الإنصاف، ويكون بعد هذا مشرفا على اختلاف أهل الأمصار، وتكون له قريحة بعد هذا، فإذا كان هكذا فله أن يتكلم ويفتي في الحلال والحرام، وإذا لم يكن هكذا فليس له أن يفتي. (إعلام الموقعين: ۱/ ۳۷، فصل: الإفتاء في دين الله بالرأي)

ایسے لوگوں کو اپنی تقلید سے منع فرمایا ہے، کیا موجودہ دور میں کوئی ایسی صلاحیت کا حامل ہے؟ اگر ہے، تو اپنی صلاحیت ثابت کر دکھائے، کیا وہ لوگ جو احادیث کے ترجمے دیکھ کر باتیں بناتے ہیں اور ایک حدیث پاک بھی جن کو سند و متن کے ساتھ یاد نہ ہو، اُن کو تقلید سے عار اور مقلد پر غیظ آتا ہے، یہ تو سراسر نادانی اور کبر ہے۔

جیسا کہ شروع میں بتایا جاچکا ہے کہ یہ تحریر عام فہم انداز میں مختصراً لکھی گئی ہے، جس سے خلاصہ سمجھ لیا ہوگا، اب ایک مشہور مانے ہوئے غیر مقلد عالم حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی کا قول جو اُن کی کتاب ''اشاعت السنۃ'' میں ہے، دیکھ لیجیے، فرماتے ہیں:

''پچیس سالہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ عدمِ تقلید بے دینی کا دروازہ ہے۔'' (احسن الفتاویٰ: ۱/ ۴۰۶)(۱)

غور کیجئے کہ پچیس سالہ تجربہ کے بعد اِتنے بڑے عالم کو اقرار کرنا پڑا کہ عدمِ تقلید بے دینی کا دروازہ ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] والدین میں مسلک کا اختلاف ہو، تو بالغ لڑکا کس کی پیروی کرے؟

۳۰۷-سوال: ایک گھرانے میں شوہر حنفی المسلک ہے، اور بیوی شافعی المسلک، اُن کا ایک بالغ لڑکا ہے، جو کبھی مسلکِ حنفی پر اور کبھی مسلکِ شافعی پر عمل کرتا ہے، مثلاً کبھی رفع یدین کرتا ہے اور کبھی رفع یدین ترک کرتا ہے اور پوچھنے پر کہتا ہے کہ میں نے اپنی والدہ کو رفع یدین کرتے دیکھا ہے؛ اس لیے میں بھی کرتا ہوں، یا اپنے والد کو بغیر رفع کے نماز پڑھتے دیکھا ہے؛ اس لیے میں بھی اِسی طرح کرتا ہوں، سوال یہ ہے کہ اِس بالغ لڑکے کا یہ عمل شرعی اعتبار سے درست ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب اِرسال فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

عندالاحناف رفع یدین میں تو کوئی حرج نہیں؛ گرچہ احناف اس بات کے قائل ہیں کہ یہ غیر اولیٰ و غیر افضل ہے، تاہم اس کی اباحت میں کوئی شبہ نہیں۔(۲)

لیکن مذکورۂ بالا صورت کا تعلق صرف رفع یدین کے مسئلہ سے نہیں ہے؛ بل کہ اس کا تعلق تقلید و

(۱) احسن الفتاوی: ۱/ ۴۱۰، کتاب العلم والعلماء، بہ حوالہ: رسالہ اشاعت السنۃ نمبر: ۲، ج: ۱۱، طبع: ۱۸۸۸ء، ط: ایچ ایم سعید، کراچی۔

(۲) (قوله: إلا في سبع) أشار إلى أنه لا يرفع عند تكبيرات الانتقالات، خلافا للشافعي و أحمد، فيكره عندنا، ولا يفسد الصلوة، إلا في رواية مكحول عن الإمام. (ردالمحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۰۶، كتاب الصلوة، فصل في بيان تأليف الصلوة إلى انتهائها، ط: دار الفكر)

تلفیق سے ہے، جاننا چاہیے کہ حنفی یا شافعی ہونا کوئی ذاتی یا قومی وصف نہیں ہے کہ والدین کی اتباع اُس میں کافی ہو، اور دونوں کا مسلک علاحدہ ہونے کی صورت میں جب جی چاہے، دونوں میں سے کسی کی بھی اتباع کر لی جائے؛ بل کہ بالغ لڑکے کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی بھی ایک مسلک کا پابند رہے، حنفیت اور شافعیت دونوں پر بیک وقت ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا، کیوں کہ دونوں مسلکوں میں بعض مسائل میں حکم کے اعتبار سے حرمت وحلت، جواز وعدمِ جواز اور وجوب وعدمِ وجوب کا فرق ہے۔[1]

ائمۂ مجتہدین اور بالغ النظر علماء کے لیے تو گنجائش ہے کہ وہ بہ وقتِ ضرورت کسی امر میں ایک امام کے قول پر عمل کریں اور دوسرے امر میں دوسرے امام کے قول پر عمل کریں، مگر ایک ہی عمل میں بہ یک وقت دو مختلف مسلکوں پر عمل نہیں کر سکتے۔ (ردالمحتار: ۱/ ۵۶)[2]

اور عام آدمی؛ بل کہ عام علماء کو بھی اجازت نہیں ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف ائمہ کے اقوال پر عمل

= وللاستزادة انظر فتح القدير - ابن الهمام: ۱/ ۳۰۹، كتاب الصلوة، باب صفة الصلاة، ط: دار الفكر.

علامہ شامیؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ رفع یدین مکروہ ہے، اور مکروہ سے ذہن مکروہ تحریمی کی طرف جاتا ہے، جب کہ جصاص رازیؒ اور علامہ سرخسیؒ نے اسے افضل اور غیر افضل کا اختلاف قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو جصاص رازی کی تحریر: أما ما ليس بفرض فهم مخيرون في أن يفعلوا ما شاء وا منه، وإنما الخلاف بين الفقهاء فيه في الأفضل منه. (أحكام القرآن: ۱/ ۲۲۸، مطلب الدهن المتنجس يجوز الانتفاع به... الخ، تحت قوله تعالى: يٰأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

اس کی وضاحت کرتے ہوئے فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے لکھا ہے کہ اسے مکروہ تحریمی قرار دینا مشکل ہے، انہوں نے دلیل میں علامہ شامیؒ کی اس تحریر کی جانب اشارہ کیا ہے:

فحينئذ إذا ذكروا مكروها فلا بد من النظر في دليله، فإن كان نهيا ظنيا، يحكم بكراهة التحريم، إلا لصارف للنهي عن التحريم إلى الندب، فإن لم يكن الدليل نهيا؛ بل كان مفيدا للترك الغير الجازم فهي تنزيهية. اهـ. (رد المحتار: ۱/ ۱۳۲، كتاب الطهارة، مطلب في تعريف المكروه، وأنه قد يطلق على الحرام الخ، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں: ایسے نازک وقت میں تقلیدِ شخصی واجب ہے اور غیر شخصی ان فتن مشاہدہ کے سبب ممنوع ہے، البتہ اگر کہیں یہ فساد غیر شخصی میں نہ پایا جائے، تو وہ بھی مامور علی التخدیر ہے مثل شخصی کے، پس واضح ہو گیا کہ تقلیدِ شخصی واجب ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ مع تالیفاتِ رشیدیہ، ص: ۲۰۷، تقلید واجتہاد کے مسائل، تحت عنوانِ تقلیدِ شخصی، ط: مکتبۃ الحق ماڑدن ڈیری جوگیشوری بمبئی)

وللاستزادة انظر: فتاویٰ محمودیہ: ۴/ ۶۱۴، باب التقلید، ط: مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند۔

(۲) وأنه يجوز له العمل بما يخالف ما عمله على مذهبه مقلدا فيه غير إمامه مستجمعا شروطه ويعمل بأمرين متضادين في حادثتين لا تعلق لواحدة منهما بالأخرى، وليس له إبطال عين ما فعله بتقليد إمام آخر... وقبل سطرين: وأما لو صلى يوما على مذهب وأراد أن يصلي يوما آخر على غيره فلا يمنع منه. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۷، مقدمة الكتاب، ط: دار الفكر)

کریں، کیوں کہ اس میں اتباعِ ہویٰ کا خدشہ ہے، کہ جو بھی جی میں آیا، سہل معلوم ہوا اور اپنی غرض کے مطابق پایا اُس کو اپنا لیا، اور جو خلافِ خواہش اور مشکل معلوم ہوا، اُس کو چھوڑ دیا، تو یہ تلفیق عام آدمی کے لیے خواہشات کے اتباع کا سبب بنے گی، اِسی لیے علماء نے تقلیدِ شخصی کو واجب قرار دیا ہے۔

ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ ایک مرتبہ غور وخوض کے بعد کسی ایک مجتہد کے مسلک کو اختیار کرے، پھر اُسی پر قائم رہے، کیوں کہ ہر شخص میں ایسی صلاحیت واستعداد نہیں ہوتی کہ وہ دلائلِ شرع میں غور وخوض کر کے کسی حکم کو معلوم کر سکے۔

اِس لیے مذکور بالغ لڑکے کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک مسلک پر عمل پیرا ہو جائے، حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ نے بھی اِسی کے قریب قریب لکھا ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱/ ۳۸۵)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] تمام مسائل قرآن وحدیث سے ثابت ہیں

۳۰۸-سوال: بعض احکامات قرآن سے ثابت ہیں، بعض حدیث شریف سے ثابت ہیں، مگر کچھ مسائل ایسے بھی نظر آتے ہیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنے گئے، مثلاً: قربانی حج اور نماز کے مسائل، تو علماء نے یہ مسائل کہاں سے اخذ کیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مکمل دین اور دین کے چھوٹے بڑے تمام مسائل، قرآن کریم اور حدیث شریف ہی سے ثابت ہیں، البتہ فرق اتنا ہے کہ کچھ مسائل قرآن کریم اور حدیث شریف کی عبارت ہی سے سمجھ میں آجاتے ہیں، حتی کہ بعض مسائل تو ان کے ترجمہ ہی سے سمجھ میں آجاتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کا کلام جس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا اور اس کی ایک چھوٹی سی چھوٹی آیت بھی کوئی بنا نہیں سکا اور نہ بنا سکے گا، ایسا کلام جن مضامین اور مطالب کو شامل ہے، اسے بڑے درجہ کے عربی داں علماء ہی سمجھ سکتے ہیں، قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے پندرہ قسم کے علوم میں ماہر ہونا ضروری ہے۔ (۲) اور قرآن کریم کے بعد دوسرے نمبر پر حدیث شریف ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

(۱) دیکھیے: فتاویٰ محمودیہ: ۲/ ۶۱۳-۶۱۶، باب التقلید، ط: مکتبۂ شیخ الاسلام۔

(۲) ومنهم من قال: يجوز تفسيره لمن كان جامعا للعلوم التي يحتاج المفسر إليها، وهي خمسة عشر علما: أحدها: اللغة، الثاني: النحو، الثالث: التصريف، الرابع: الاشتقاق، الخامس والسادس والسابع: المعاني والبيان والبديع، الثامن: علم القراءات، التاسع: أصول الدين بما في القرآن من الآيات الدالة بظاهرها على ما لا يجوز على الله تعالى، العاشر: أصول الفقه، الحادي عشر: أسباب النزول والقصص، الثاني عشر: الناسخ والمنسوخ، الثالث عشر: الفقه، الرابع عشر: الأحاديث المبينة لتفسير المجمل والمبهم، الخامس عشر: علم الموهبة. قال ابن أبي الدنيا: =

ہے کہ اللہ تعالی میری زبان پر ایسا کلام جاری فرما دیتے ہیں، جو مختصر ہوتا ہے، مگر مختلف قسم کے مضامین اور مطالب سے بھرپور ہوتا ہے[1] غرضیکہ قرآن و حدیث کی زبان قانونی زبان ہے، جیسے گورمنٹ کے قوانین (لاء) کی کتاب میں ایسی زبان استعمال کی جاتی ہے کہ وکلاء اس میں سے کئی مطالب نکال لیتے ہیں اور جہاں تک وکلاء کی رسائی نہ ہو، اسے ماہر بیرسٹر ہی سمجھ سکتے ہیں، تو یہ احکم الحاکمین کا کلام ہے، اس میں سے کیا نہیں نکالا جاسکتا؟ مگر اس کے لیے بڑی استعداد چاہیے، سمجھنے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ دین کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں، جو بالواسطہ یا بلا واسطہ قرآن وحدیث سے ثابت نہ ہو۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] جو آدمی اہل حدیث ہوجائے، مگر کسی امام کو برا نہ کہتا ہو، اس کو گمراہ کہنا

۳۰۹-سوال: ایک آدمی کسی بھی امام کو برا بھلا کہے بغیر اپنی مرضی سے اہل حدیث ہوجائے تو کیا صرف اہل حدیث ہوجانے کی وجہ سے اس کو گمراہ کہہ سکتے ہیں؟

الجواب حامداومصليا:

ائمہ کی تقلید کرنے سے آدمی گمراہ ہونے سے بچ جاتا ہے؛ لیکن کوئی آدمی اہل حدیث ہوجائے اور ائمہ کو برا بھلا نہ کہتا ہو، تو جائز ہے، اس کا شمار گمراہ فرقوں میں تو نہیں ہوسکتا؛ لیکن اس کے گمراہ ہوجانے کا اندیشہ ہے؛ لہذا ایسا کرنا مناسب نہیں ہے۔[2]

= وعلوم القرآن وما يستنبط منه بحر لا ساحل له، قال: فهذه العلوم- التي هي كالآلة للمفسر لا يكون مفسرا إلا بتحصيلها فمن فسر بدونها كان مفسرا بالرأي المنهي عنه وإذا فسر مع حصولها لم يكن مفسرا بالرأي المنهي عنه. (الإتقان في علوم القرآن- عبد الرحمان بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م:۹۱۱ھ): ۲۱۶/۴، النوع الثامن والسبعون: في معرفة شروط المفسر وآدابه، ت: محمد أبو الفضل إبراهيم، ط: الهيئة المصرية العامة للكتاب، الطبعة: ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴م)

روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني- شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م: ۱۲۷۰ھ): ۶/۱، خطبة المفسر، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت، الطبعة: الأولى، ۱۴۱۵ھ)

(۱) أن أبا هريرة، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: «بعثت بجوامع الكلم، ونصرت بالرعب، وبينا أنا نائم أتيت بمفاتيح خزائن الأرض فوضعت في يدي» قال أبو عبد الله: "وبلغني أن جوامع الكلم: أن الله يجمع الأمور الكثيرة، التي كانت تكتب في الكتب قبله، في الأمر الواحد، والأمرين، أو نحو ذلك". (صحيح البخاري: ۱۰۳۸/۲، رقم الحديث: ۷۰۱۳، كتاب التعبير، باب المفاتيح في اليد، ط: البدر- ديوبند)

(۲) العامي ومن ليس له أهلية الاجتهاد، وإن كان محصلا لبعض العلوم المعتبرة في الاجتهاد يلزمه اتباع قول المجتهدين والأخذ بفتواه عند المحققين من الأصوليين. (الإحكام في أصول الأحكام- أبو الحسن سيد الدين علي بن أبي علي بن محمد بن سالم الثعلبي الآمدي (م:۶۳۱ھ): ۲۲۸/۴، الباب الثاني في التقليد والمفتي=

اور جاہل آدمی- جو خود حدیث اور عربی نہ سمجھتا ہو- تو وہ اہل حدیث نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ تو دوسرے کے کہنے اور سمجھانے کے مطابق ہی چلے گا؛ بل کہ چلنا ہی پڑے گا؛ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ کسی بھی امام پر اعتماد کرے، اور جو راستہ انہوں نے بتایا ہے، اس پر چلے، جس کے نتیجہ میں وہ گمراہ ہونے بچ سکتا ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] غیر مقلد کی تعریف اور ان کی کتابوں کا مطالعہ

۳۱۰-سوال: (۱) غیر مقلد کس کو کہتے ہیں؟

(۲) اہل حدیث کا اہل سنت والجماعت میں شمار ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

جو حضرات ائمہ اربعہ میں سے کسی کی اتباع نہیں کرتے وہ غیر مقلد ہیں، ان کا دعوی ہے کہ وہ صرف حدیث کی اتباع کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو چاروں امام اور علماء عظام پر سب وشتم سے بھی باز نہیں آتے، وہ اہل سنت والجماعت میں داخل نہیں ہیں۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=والمستفتي الخ، المسألة الثانية من ليس له أهلية الاجتهاد يلزمه اتباع قول المجتهدين، ت: عبد الرزاق عفيفي، ط: المكتب الإسلامي- بيروت)

(غير المجتهد المطلق يلزمه) عند الجمهور (التقليد وإن كان مجتهدا في بعض مسائل الفقه أو بعض العلوم).

(تيسير التحرير -محمد أمين بن محمود البخاري المعروف بـ أمير بادشاه الحنفي (م: ۹۷۲هـ): ۴/ ۲۴۶، المقالة الثالثة في الاجتهاد وما يتبعه من التقليد والإفتاء، ط: دار الفكر -بيروت)

قال التهانوي: الذي نعتقده في دين الله ويعتقده جميع مشائخنا رحمهم الله تعالى هو ان تقليد أحد من الأئمة الأربعة واجب على كل واحد من المسلمين في هذا الزمان وتاركه فاسق لاعب في الدين. (امداد الفتاوی: ۶/ ۳۱۲، كتاب العقائد والكلام، ط: ادارہ تالیفات اولیاء- دیوبند)

مذکورہ عبارات اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ تقلید واجب اور ضروری ہے، اگر کوئی شخص ائمہ اربعہ کو برا بھلا نہ کہے اور تقلید بھی نہ کرے، پھر بھی اس کو ترک واجب کا گناہ ہوگا۔

(۱) منها أن هذه المذاهب الأربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الأمة- أو من يعتد به منها- على جواز تقليدها إلى يومنا هذا، وفي ذلك من المصالح ما لا يخفى لا سيما في هذه الأيام التي قصرت فيها الهمم جدا، وأشربت النفوس الهوى وأعجب كل ذي رأي برأيه. (حجة الله البالغة- أحمد بن عبد الرحيم بن الشهيد وجيه الدين المعروف بـ «الشاه ولي الله الدهلوي» (م: ۱۱۷۶هـ): ۱/ ۲۶۳، المبحث السابع، باب حكاية حال الناس قبل المائة الرابعة وبعدها، ط: دار الجيل- بيروت)

(۲) اہل سنت والجماعت وہ مسلمان ہیں جو عقائد واحکام میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے مسلک پر ہوں اور قرآن کے ساتھ سنت نبویہ کو بھی حجت مانتے اور اس پر عمل کرتے ہوں۔۔۔ یہ تو اس لقب کے معنی ہیں اور اس کا مصداق وہ لوگ ہیں جو عقائد میں امام ابو=

[۹] کیا تلفیق بین المذاہب درست ہے؟

۳۱۱-سوال: ائمہ اربعہ میں سے کسی بھی امام کے کسی بھی مسئلہ پر عمل کر سکتے ہیں، اگر نہیں کر سکتے ہیں، تو اس کی وجہ کیا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

جو آدمی مقلد ہے اس کو اپنے مسلک کے امام کے مفتی بہ مسائل پر عمل کرنا ضروری ہے؛ لیکن کسی عذر کی بناء پر اس وقت کے علماء کرام دوسرے مسلک پر بھی فتوی دے سکتے ہیں، مثلاً حنفی مسلک میں کسی مسئلے کے بارے میں تنگی اور امت کے لیے باعث تکلیف سمجھے تو علماء کرام متفق ہو کر دوسرے امام کے مسلک کے مطابق فیصلہ کر سکتے ہیں؛ لہٰذا ان کے فتوی کی وجہ سے دوسرے امام کے مسئلہ پر عمل کرنا جائز ہوگا، جس طرح ''حیلۂ ناجزہ'' کتاب لکھی گئی ہے جس میں بعض مسائل میں حنفی مسلک میں دشواری ہونے کی وجہ سے مالکی مسلک پر عمل کرنے کے متعلق فتوی دیا گیا ہے؛ لیکن عوام کا اپنی طرف سے دوسرے امام کے کسی بھی مسئلہ پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، اس کی کچھ وجوہات ہیں، یہاں درج کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

سب سے بڑی وجہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس عمل سے انسان اہل ہوی یعنی خواہشات پر عمل کرنے والا بن جائے گا، جس سے حدیث پر عمل کرنا آسان ہوگا اس پر عمل کرے گا اور یہ جائز نہیں ہے۔[1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الحسن اشعری یا ابو منصور ماتریدی کے متبع ہوں ...اور فروع میں ائمہ اربعہ مشہور میں سے کسی ایک امام کے مقلد ہوں۔(امداد الاحکام-مولانا ظفر احمد عثانی: ۱/۱۶۹، کتاب الایمان والعقائد، فصل فی الفرق الاسلامیہ، ط: زکریا بک ڈپو، دیوبند)

اس سلسلے کے مزید مفصل جواب کے لیے ملاحظہ فرمائیں، ارمغان حق-مولانا ابوبکر غازی پوری: ۱/۳۲۵، زیر عنوان: (۱) صحابہ کرام کو برا کہنے والا اہل سنت نہیں قرار پائے گا، (۲) تارکین تقلید کا نام عقلاً وشرعاً غیر مقلد سے زیادہ کوئی اور مناسب نہیں، ط: مکتبہ اثریہ، قاسمی منزل، سیدواڑہ، غازی پور، یوپی۔

(۱) رہا تقلید مذہب غیر کا معاملہ سو عامی کو اس کی اجازت نہیں؛ کیوں کہ عوام کو اس کی اجازت دینے میں تلاعب بالدین ہے وہ دین کو کھیل بنا لیں گے کہ آج اس کے مذہب میں سہولت دیکھی اس پر عمل کر لیا کل دوسرے کے مذہب پر، اور وہ تقلید مذہب غیر جس کا منشاء تتبع رخص ہو اتفاقاً حرام ہے، بل کہ یہ منصب علماء کا ہے کہ وہ سائل کی حالت دیکھ کر اور تقلید مذہب غیر کی ضرورت دیکھیں تو اس کو اس کی اجازت دے دیں، جس کی صورت یہ نہیں کہ خود مذہب غیر پر فتوی دیں؛ بل کہ اس کو دوسرے مذہب کے علماء سے رجوع کرنے کا طریقہ بتلا دیں۔(امداد الاحکام ۱/۱۷۴، کتاب التقلید والاجتہاد، ط: زکریا-دیوبند)

قاموس الفقہ-مولانا خالد سیف اللہ مدظلہ: ۲/۵۳۲، ط: نعیمیہ-دیوبند۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ. (۳-آل عمران:۱۱۰)

باب ما يتعلق بالتبليغ

(تبلیغ دین)

٥

[تبلیغ دین]

[۱] ''فضائل اعمال'' کی طرح کسی اور کتاب کی تعلیم کا ثبوت صحابہؓ سے

۳۱۲-سوال: میں نے آپ سے ایک سوال کے تحت پوچھا تھا کہ فضائل اعمال جیسی کسی کتاب کا امت کے دینی فائدے کے لیے صحابۂ کرام، تابعین یا تبع تابعین وغیرہ سے پڑھنا ثابت ہے؟ توقع ہے کہ اس کے متعلق آپ جواب عنایت فرمائیں گے، میرے اُس سوال کے جواب میں اس جز وکا آپ نے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا اور اگر کسی نے اس طرح کی کوئی کتاب پڑھی ہو، تو اس کا نام بھی عنایت فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیا:

تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں کتب احادیث لکھی گئیں۔ (۱) اور انہیں کا سبق ان کے زمانے میں شائع اور رائج تھا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق: صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں خیر اور بھلائیاں غالب رہی ہیں۔ (۲) لوگوں کے قلوب بلا واسطہ یا ایک' دو واسطے سے نور نبوت سے منور تھے،

(۱) موطا امام مالک، موطا امام محمد اور مسند الامام الشافعی: یہ تینوں کتابیں دوسری صدی ہجری کی ہیں، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن أبي داؤد، سنن الترمذی، سنن النسائی، سنن ابن ماجہ، مسند الامام احمد اور مسند الدارمی: یہ ساری کتابیں تیسری صدی کی ہیں، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (أحسن الفتاوی: ۱/ ۵۱۱، کتاب التفسیر والحدیث، ط: دار الاشاعت دیوبند)

(۲) عمران بن حصين رضي الله عنهما، يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "خير أمتي قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم، ... ثم إن بعدكم قوما يشهدون ولا يستشهدون، ويخونون ولا يؤتمنون، وينذرون ولا يفون، ويظهر فيهم السمن". (صحيح البخاري: ۱/ ۵۱۵، رقم: ۳۶۵۰، كتاب فضائل أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، ط: البدر - ديوبند)

شر وفساد کے مادے مغلوب تھے اور ہر چہار سو خیر وبھلائی کا غلبہ تھا، اسلامی حکومتیں قائم تھیں، لوگوں کے دل علوم نبوی سے سرشار تھے، حتیٰ کہ ایک ایک محدث کی مجلس میں ایک ہی وقت میں ہزار ہا طالبان علوم نبوت موجود ہوتے تھے، جہاں کہیں انہیں کسی محدث کی موجودگی کا علم ہوتا، دور دراز کے اسفار، اور ہزاروں قسم کی مشقت برداشت کرکے، مال وزر کی پرواہ کیے بغیر پہنچ جاتے اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے، بہت سی کتابوں میں ان کے حالات، حصول علم کی جدوجہد اور محنت ومشقت کا مبارک ذکر موجود ہے۔

آج کل فتنہ وفساد کا دور دورہ ہے، خیر وبھلائی سے لوگ کوسوں دور ہیں، ٹیلی ویژن، ریڈیو، فلم بینی، اخبار بینی اور گانے بجانے میں منہمک ہوکر اپنے قیمتی اوقات کا خون کر رہے ہیں، ان کے پاس دینی مسائل اور شرعی احکام سیکھنے سکھانے کی فرصت نہیں ہے، ان احالات میں اگر روزانہ تھوڑے سے وقت میں کسی دینی کتاب کی آٹھ دس منٹ تعلیم کردی جائے، تو اس میں کیا حرج ہے؟؟؟ عموماً تعلیم کرنے والے اور ان دینی کتابوں کے پڑھنے والے مسجد کے ائمہ ہوتے ہیں، جو کچھ کتاب میں لکھا ہوتا ہے، پڑھ کر سنا دیتے ہیں، اگر کوئی ذی استعداد عالم اس بات کے لیے آمادہ ہوجائے کہ وہ روزانہ مختصر وقت میں قرآن کریم کی تفسیر بیان کردیں گے یا حدیث پاک کا درس دیں گے یا پھر زبانی کچھ مسائل بتادیں گے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور تبلیغی جماعت کا کوئی فرد اس کو غلط نہیں کہتا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] ’’فضائل اعمال‘‘ کی تعلیم کے بجائے ہفتے میں ایک، دو دن قرآن مجید کی تفسیر کرنا

۳۱۳-سوال: قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے احادیث مبارکہ کی ضرورت پڑتی ہے، یہ بات تو بالکل بجا اور صحیح ہے، لیکن مجھے اشکال اس بات پر ہے کہ جو لوگ تبلیغی جماعت سے منسلک ہیں، انہیں کبھی بھی تفسیر قرآن کے درس میں حاضری کی تشکیل کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا ہے، وہ حضرات صرف اور صرف فضائل اعمال کی ترغیب دیتے ہیں اور اسی کی تشکیل کرتے ہیں، تو اب میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حضرات کی قرآن مجید کی تفسیر سے آخر اتنی دوری اور ’’تبلیغی نصاب‘‘ نامی کتاب سے اتنی نزدیکی کیوں ہے؟ کیا - معاذ اللہ - فضائل اعمال کا درجہ قرآن کریم سے بڑھا ہوا ہے؟ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی، اس کے متعلق میری الجھن ختم فرمائیں اور تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

قرآن مجید کی تفسیر کرنا علمائے کرام کا منصب ہے، کوئی عالم دین اگر تفسیر کرتے ہیں، تو تبلیغی جماعت کے احباب انہیں ہرگز منع نہیں کرتے؛ بل کہ بہت سے تبلیغی جماعت کے مراکز میں قرآن کریم کی تفسیر اور حدیث پاک کے درس کا معمول ہے؛ ہاں! اگر یہ حضرات' علماء کو تفسیر کرنے سے منع کریں گے، تو گناہ گار ہوں گے، اور آپ کا اشکال بجا ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] "تبلیغی نصاب" نامی کتاب کی تعلیم کو بدعت کہنا جائز نہیں

۳۱۴-سوال: تبلیغی حضرات عصر اور عشاء کی نماز کے بعد بلا ناغہ "تبلیغی نصاب" نامی کتاب کی تعلیم کرتے ہیں، وہ اس کی تعلیم کو اپنے لیے لازم اور ضروری سمجھتے ہیں؛ لیکن امت کے لیے قیامت تک رہنمائی کرنے والی کتاب ہدایت "قرآن مجید" کو سمجھنے کے لیے یہ حضرات کوئی پروگرام نہیں بناتے، یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس طرح کا پروگرام بنانا ہی نہیں چاہتے ہیں، تو کیا اس کتاب کو اتنی اہمیت دینا اور قرآن مجید کو چھوڑ دینا جائز ہے؟ ہدایت کے لیے اگر کوئی کتاب بہتر ہوسکتی ہے، تو وہ قرآن مجید ہے، تو پھر ہمارے یہ تبلیغی بھائی ہدایت کے لیے اپنے روزانہ کے پروگرام میں تبلیغی نصاب کے بجائے قرآن مجید کی تفسیر کیوں نہیں کرتے ہیں؟ آخر ہدایت کے حصول کے لیے "تبلیغی نصاب" جیسی کسی کتاب کا صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین یا ائمۂ اربعہ میں سے کسی نے عصر اور عشاء کی نماز کے بعد پڑھنے کا حکم دیا ہے؟ اور اگر حکم دیا ہو، تو اس کتاب کا نام کیا ہے؟ بہ حوالہ تحریر فرمائیں۔

مذہب اسلام میں کسی جائز یا مستحب امر کو مبالغے کی حد تک پہنچا دینا بدعت ہے، جیسا کہ جمعہ کے روز خطبے سے پہلے سورۂ کہف کو بہ آواز بلند ایک آدمی کا پڑھنا اور دوسرے لوگوں کا سننا، جس سے دوسرے نمازیوں کی نمازوں میں خلل واقع ہوتا ہے، اس کو ہمارے علماء کرام نے مکروہ قرار دیا ہے۔ (۱) تو کیا "تبلیغی نصاب"

---

(۱) وإذا كان كذلك فينبغي له أن ينهى الناس عما أحدثوه من قراءة سورة الكهف يوم الجمعة جماعة في المسجد وغيره... فيقرأها سرا في نفسه في المسجد، أو جهرا في غيره... وأما اجتماعهم لذلك فبدعة كما تقدم، والله تعالى أعلم. (المدخل-أبو عبد الله محمد بن محمد العبدري الفاسي المالكي الشهير بـ "ابن الحاج" (م: ۷۳۷هـ): ۲۸۱/۲، فصل في الصلاة على الميت في المسجد، ط: دار التراث)

نامی کتاب، جس کو ہمارے تبلیغی بھائی روزانہ عصر اور عشاء کی نماز کے بعد اپنے پروگراموں میں لازماً پڑھتے ہیں، بدعت نہیں ہے؟

نوٹ: حالاں کہ جمعہ کے روز جب سورۂ کہف پڑھی جاتی ہے، اس کے بعد لوگوں کو سنتیں پڑھنے کے لیے دس پندرہ منٹ کا وقت بھی دیا جاتا ہے، سنتوں سے فراغت کے بعد خطبہ شروع ہوتا ہے؛ گویا اس سے نمازیوں کی نماز میں کوئی خلل نہیں ہوتا ہے، جب کہ تبلیغی احباب نماز ختم ہوتے ہی منبر کے پاس اس کتاب کی تعلیم شروع کر دیتے ہیں، جس سے بعض اوقات نمازیوں کو خلل بھی ہوتا ہے۔

قرآن مجید کو نصاب کے طور پر اپنانے اور اس کے مقابلے میں دوسری کسی کتاب کی اہمیت ظاہر نہ ہو، اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

یہ حقیقت ہر شبہ سے بالاتر ہے کہ قرآن مجید کتاب ہدایت ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے بہتر کوئی دوسری کتاب انسانوں کی ہدایت کے لیے نہ تو اس وقت موجود ہے اور نہ ہی آئندہ وجود میں آنے والی ہے، اس کو سمجھنے کے لیے احادیث مبارکہ کا سہارا لینا پڑتا ہے، کیوں کہ یہ قرآن مجید کی آیات کی تفسیر و تشریح ہیں۔

خواص اور بالخصوص علمائے ربانیین نے عام انسانوں کی ہدایت کے لیے محض اللہ رب العزت کی توفیق سے قرآنی ہدایات اور نبوی ارشادات کی روشنی میں جماعتیں بنائیں، ان جماعتوں کے لیے بھی اصول مقرر کیے، تاکہ ان کی روشنی میں کام کر کے جماعت کامیابی کی منزل سے ہم کنار ہو سکے؛ مثلاً اہل تصوف نے اپنے مریدین کے وظائف کے لیے ایک سہل اور آسان کتاب تصنیف فرمائی، تاکہ ان وظائف کو پڑھ کر لوگ راہ سلوک طے کر سکیں، پیر طریقت اپنے مریدین کو اس کتاب کے پڑھنے کی تاکید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو پڑھ کر اپنی زندگی میں سدھار پیدا کرو، تجربہ شاہد ہے کہ لوگوں کو اس کتاب کے پڑھنے سے اور اس پر عمل کرنے سے بڑا فائدہ ہوا۔

اسی طرح تبلیغی جماعت کے احباب نے بھی کام کرنے والوں کی آسانی کی خاطر آسان زبان میں چند کتابوں کا انتخاب کیا، یہ لوگ اس کی روشنی میں اپنی استطاعت کے مطابق گاؤں اور اپنے محلے کے لوگوں

کے مشورے سے ایک وقت متعین کر کے آٹھ دس منٹ ان کتابوں کو پڑھتے ہیں، انہیں میں ایک کتاب ''فضائل اعمال'' بھی ہے، اس کتاب میں فضائل قرآن، فضائل درود شریف، فضائل صدقات، فضائل ذکر، فضائل نماز اور فضائل روزہ وغیرہ؛ اہم مضامین ہیں، اس کتاب کو پہلے ''تبلیغی نصاب'' کا نام دیا گیا تھا؛ لیکن ابھی اس کا نام بدل کر ''فضائل اعمال'' رکھا ہے، تبلیغی احباب نہ تو اس کتاب کو اس طور پر پڑھنا لازم سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی تعلیم میں عدم شرکت پر طعن وتشنیع اور لڑائی جھگڑا کرتے ہیں، تبلیغی احباب اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ آپس میں مل بیٹھ کر اس کا ذکو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ لوگ دوسری کتابوں کے پڑھنے سے نہ روکتے ہیں اور نہ اس کو برا سمجھتے ہیں۔

اس کتاب کی تعلیم کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں مذکورہ بالا عناوین پر اہم مضامین موجود ہیں، جن کے پڑھنے سے حق بات سمجھنے اور حق بات کہنے کی طاقت نصیب ہوتی ہے، لوگوں کو ہدایت کی دعوت دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، قرآن مجید کی تلاوت کا شوق پیدا ہوتا ہے اور اس کی برکت سے تفسیر کی کتابوں کے دیکھنے کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کھلی حقیقت ہے کہ اس جماعت کے ذریعہ لاکھوں گم گشتۂ راہ اور گمراہ انسانوں کو ہدایت ملی ہے؛ اس لیے اس کتاب کو روزانہ پانچ دس منٹ پڑھنا بدعت نہیں ہے؛ البتہ جو لوگ اس کتاب کو پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں اور اس کی تعلیم میں نہ بیٹھنے والوں پر طعن وتشنیع اور تنقید کرتے ہیں، ان کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کا یہ عمل بدعت بن کر ناجائز ہوگا۔[1]

جس طرح جمعہ کے روز سورۂ کہف بہ آواز بلند پڑھنے کو ضروری سمجھنا اور نہ پڑھنے اور نہ سننے والوں کو برا بھلا کہنا اور ان کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنا ناجائز اور حرام ہے۔[2] اسی طرح اگر تبلیغی جماعت کے احباب بھی فضائل اعمال کی تعلیم میں عدم شرکت پر لعنت وملامت اور لڑائی جھگڑا کریں گے، تو ان کے لیے بھی

(۱) قال ابن المنير فيه أن المندوبات قد تنقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها؛ لأن التيامن مستحب في كل شيء أي من أمور العبادة لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه أشار إلى كراهته. (فتح الباری - ابن حجر العسقلاني: ۲/ ۳۳۸، كتاب الأذان، باب الانفتال والانصراف عن اليمين والشمال، ط: دار المعرفة - بيروت)

(۲) وإذا كان كذلك فينبغي له أن ينهى الناس عما أحدثوه من قراءة سورة الكهف يوم الجمعة جماعة في المسجد وغيره... فيقرأها سرا في نفسه في المسجد، أو جهرا في غيره... وأما اجتماعهم لذلك فبدعة كما تقدم، والله تعالى أعلم. (المدخل - أبو عبد الله محمد بن محمد العبدري الفاسي المالكي الشهير بـ "ابن الحاج" (م: ۷۳۷هـ): ۲/ ۲۸۱، فصل في الصلاة على الميت في المسجد، ط: دار التراث)

ناجائز اورحرام ہوگا؛لیکن یہ لوگ ایسا کرتے نہیں ہیں؛اس لیے یہ بدعت نہیں ہے ؛البتہ اگران کی تعلیم اورکتاب کے پڑھنے سے نمازیوں کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہو،توتعلیم کے لیے مسجد کے کسی کونے میں دائیں یا بائیں جانب کوئی جگہ متعین کرلیں اوروہیں بیٹھ کرتعلیم کریں، تاکہ نمازیوں کی نماز میں کوئی خلل واقع نہ ہو؛ کیوں کہ مسجد کے بنانے کا مقصد یہ ہے کہ اس میں نماز پڑھی جائے ،ذکرواذکاراورمراقبہ کیا جائے ،قرآن مجید کی تلاوت کی جائے ،دینی امور کے لیے مشورے کیے جائیں اورلوگوں کی ہدایت کے لیے کسی دینی کتاب کی تعلیم کی جائے ؛لیکن ہرشخص اور ہر جماعت والا اس طرح کام کرے کہ دوسروں کوکوئی تکلیف نہ ہو، اوران کے کام میں کسی قسم کا کوئی خلل واقع نہ ہو،اسی وجہ سے حضرات علماء نے لکھا ہے کہ قرآن مجید کی اس طرح بلند آواز سے تلاوت کرنا کہ کسی نمازی کی نماز میں خلل واقع ہو،مکروہ ہے۔ (۳) علماء کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ نماز کے بعد اس قدر بلند آواز سے دعاء کرنا کہ دوسرے نمازی کی نماز میں خلل واقع ہو،مکروہ ہے۔ (۴)

اگردینی کتاب کی تعلیم مسجد کے درمیانی حصہ میں منبر کے پاس کرنے سے نمازیوں کی نمازوں میں خلل واقع ہوتا ہو،تو یہ بھی مکروہ ہے، اگرتبلیغی احباب ایسا کرتے ہوں، توآپ ان کو سمجھائیں کہ وہ کسی ایک کونے میں تعلیم کریں؛لیکن اصل کتاب کی تعلیم ہی کوبدعت قراردینا جائز نہیں ہے۔

فتنہ وفساد کے اس زمانے میں' جماعتِ تبلیغ' بسا غنیمت ہے؛اس لیے ہر مسلمان کے لیے اپنی طاقت وبساط کے مطابق اس کا ساتھ دینا اوراس کی مدد کرنا ضروری ہے اوردین کے خلاف اگرکوئی کام

---

(۳) لا يقرأ جهرا عند المشتغلين بالأعمال. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۱۶، كتاب الكراهية، الباب الرابع في الصلوة، والتسبيح، ورفع الصوت عند قراءة القرآن. ط: دار الفكر - بيروت)

وانظر تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق: ۱/ ۵۸، مدة الحيض، ط: المطبعة الكبرى - القاهرة.

(۴) وفي الفتاوى الخيرية من الكراهية والاستحسان: جاء في الحديث به اقتضى طلب الجهر به نحو " »وإن ذكرني في ملإ ذكرته في ملإ خير منهم« رواه الشيخان. وهناك أحاديث اقتضت طلب الإسرار، والجمع بينهما بأن ذلك يختلف باختلاف الأشخاص والأحوال كما جمع بذلك بين أحاديث الجهر والإخفاء بالقراءة ولا يعارض ذلك حديث »خير الذكر الخفي« لأنه حيث خيف الرياء أو تأذي المصلين أو النيام، الخ. (رد المحتار على الدر: ۱/ ۶۶۰، فروع كتاب الصلوة، أفضل المساجد، ط: دار الفكر - بيروت)

فمن خاف الرياء أو تأذى به أحد كان الإسرار أفضل. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱ هـ) ص: ۳۱۸، فصل في صفة الذكر، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

ہوتا ہو، تو اس کی اصلاح کرنا اور اس خرابی کو دور کرنا حضرات علماء کرام کی ذمہ داری ہے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو دین کی صحیح عطا فرمائیں۔ (آمین) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] تبلیغی جماعت میں جانے سے ایمان کیسے بنتا ہے؟

۳۱۵-سوال: تبلیغی جماعت میں جانے سے دین سمجھ میں آتا ہے، نماز کے فرائض وواجبات یاد ہوتے ہیں، قرآن مجید کی سورتیں، دعائے قنوت اور التحیات وغیرہ یاد ہوجاتے ہیں، کتابی تعلیم سننے کی صورت میں اس میں مذکور وعدہ وعید کی باتوں سے بھی فائدہ ہوتا ہے؛ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تبلیغی حضرات یہ کہتے ہیں کہ ''جماعت میں جانے سے ایمان بنتا ہے''، تو سوال یہ ہے کہ تبلیغ میں جانے سے ایمان کس طرح بنتا ہے؟ ایمان کا کون سا شعبہ ایسا ہے، جو تبلیغ سے سمجھ میں آتا ہے؟

محمد یوسف

الجواب حامداً ومصلیاً:

''اسلامی تعلیمات'' انسان کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ ان پر عمل کرے، اپنی زندگی اسلامی سانچے میں ڈھالے، قرآن مجید کی تلاوت کرے، اللہ کا ذکر کرے، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرکے دونوں عالم میں سرخ روئی حاصل کرے، ان اعمال کی برکت سے اس کا ایمان وعقیدہ مضبوط ہوگا، یہ سارے کام تبلیغی جماعت سے حاصل ہوسکتے ہیں؛ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ''جماعت میں جانے سے ایمان بنتا ہے''۔

ایمان بننے کا ایک مطلب ہے کلمۂ توحید ''لا إله إلا الله'' کے مقتضا پر مکمل عمل کرنا، کہ سب مسلمان اس کلمے کو پڑھتے ہیں، تاہم اذان سن کر مسجد جاتے وقت دوکان دار یا کسان کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اُس سے میری دوکان یا کھیت کا نقصان ہوگا، لیکن اس خیال کو وہ جھٹک دیتا ہے اور مسجد میں اللہ کی عبادت کے لیے حاضر ہوتا ہے، گویا وہ کلمے کے تقاضے پر عامل ہے اور جان ومال اللہ تعالیٰ کی راہ میں لٹا دینے کا جذبہ رکھتا ہے، یہ ''جذبۂ قربانی'' آدمی میں تبلیغی جماعت سے پیدا ہوتا ہے، جو اسے اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔[1]

---

(۱) عرف الإيمان بقوله إقرار باللسان، وتصديق بالجنان... (وعمل القلب) من محبة الله - عز وجل - والتوكل عليه والخوف منه - جل جلاله - ورجاؤه، والإنابة إليه، وخشية الرب - جل جلاله - ونحو ذلك؛ من أعمال القلوب... ولهذا فإن التفاضل - الزيادة والنقصان - زيادة ونقصان باعتبار العمل الظاهر، وزيادة ونقصان باعتبار =

جماعت کی برکت سے آدمی کی ذات میں مجاہدے کی صفات پیدا ہوں گی اور مجاہدے ہی سے یقین پیدا ہوتا ہے، تیرہ سالہ مکی زندگی میں اسی ایمان اور یقین کو بنانے کی کوشش کی گئی تھی، مدنی زندگی میں احکام نازل ہوئے تھے۔[1]

تبلیغی جماعات میں ایمان بننے سے یہی یقین کا مضبوط ہونا مراد ہے، جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان ومال کے ذریعہ قربانی دینے پر آمادہ کرتا ہے۔فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] دین کو دعوت وتبلیغ میں ہی منحصر کرنا

۳۱۶-سوال: اگر کوئی تبلیغی امور واصول کا پابند شخص یہ کہتا ہے کہ ''صرف تبلیغی گشت ہی سے ایمان بنتا ہے، باقی نماز، روزہ اور قرآن کریم کی تلاوت وغیرہ سے ایمان نہیں بنتا ہے۔'' تو کیا اس جیسے الفاظ بولنا صحیح ہے؟ جب کہ دوسروں پر اس کا غلط اثر بھی پڑتا ہو۔

الجواب حامداو مصلیا:

ایمان کو پختہ اور مضبوط کرنے کے لیے صرف دعوت وتبلیغ ہی کی راہ نہیں ہے؛ بل کہ دین کے جتنے احکامات اور تقاضے ہیں، مثلاً: نماز، روزہ، زکوۃ، حج، غریبوں کی خدمت، جہاد، درود شریف، قرآن کی تلاوت،

=عمل القلب الباطن.فالناس يتفاوتون في الإيمان من جهة: ١ - زيادته ونقصانه في أعمالهم الظاهرة وهي أمور الإسلام: من الصلاة والزكاة والصيام والحج والاستسلام لله - عز وجل - في الأوامر، والانقياد، ونحو ذلك والانتهاء من المحرمات. ٢ - وكذلك أعمال القلوب. (شرح العقيدة الطحاوية المسمى بـ"إتحاف السائل بما في الطحاوية من مسائل"-صالح بن عبدالعزيز آل الشيخ:١/ ٢٠٨،المكتبة الشاملة)

(١) وذلك أن الله تعالى أمرهم في الابتداء بمجرد الإيمان، ثم فرض عليهم الصلاة، والزكاة، وسائر الشرائع، فشق على بعض فأنزل الله تعالى هذه الآية ثم عزاهم. (السراج المنير في الإعانة على معرفة بعض معاني كلام ربنا الحكيم الخبير- شمس الدين، الخطيب الشربيني الشافعي (م:٩٧٧هـ): ٣/ ١١٨،سورة العنكبوت،ط:دار النشر / دار الكتب العلمية-بيروت)

عن أبي عمران الجوني قال: سمعت جندبا البجلي قال: "كنا فتيانا حزاورة مع نبينا صلى الله عليه وسلم، فتعلمنا الإيمان قبل أن نتعلم القرآن، ثم تعلمنا القرآن فازددنا به إيمانا، وإنكم اليوم تعلمون القرآن قبل الإيمان. (شعب الإيمان:١/ ١٥٢،رقم الحديث:٥٠،باب القول في زيادة الإيمان ونقصانه،ط:مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون مع الدار السلفية ببومباي بالهند)

مظلوموں کی مدد، بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی کفالت، مدرسہ میں پڑھنا پڑھانا وغیرہ، اس طرح کے تمام امور سے ایمان میں پختگی اور مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں، ان میں سب سے افضل "کلمہ لا الہ الا اللہ" ہے اور سب سے ادنیٰ درجہ راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے (مسلم شریف: ۱/۴۷)[۱]

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ ایمان کی ساٹھ سے زیادہ شاخیں ہیں اور شرم وحیاء ایمان کی سب سے بڑی شاخ ہے۔ (۲)

مذکورہ دونوں حدیث پاک سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایمان کو مضبوط بنانے کے لیے صرف دعوت وتبلیغ ہی کی راہ نہیں ہے؛ بل کہ اس کے علاوہ اور بھی بے شمار راہیں اور طریقے ہیں، اگر کوئی شخص اخلاص کے ساتھ دین کی کسی بھی ایک راہ سے منسلک ہوجائے، تو اسے ضرور اللہ کی رضامندی حاصل ہوگی۔

اگر سب کے سب دعوت وتبلیغ میں ہی لگ جائیں گے، تو پھر امامت، مدارس ومکاتب کی تعلیم، تجارت، وکالت اور ڈاکٹری کا فریضہ کون انجام دے گا؟ اس لیے اسلام کے مزاج ومنشاء کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔

حدیث میں ایمان کی ساٹھ سے زیادہ شاخیں مذکور ہیں؛ لہٰذا ہر شاخ اور شعبہ کو تقویت پہونچانا اور اس کے پیچھے محنت کرنا ضروری ہے؛ اگر کسی ایک ہی شعبہ کے پیچھے ساری محنت صرف کردی گئی اور دین کے دیگر شعبوں کو نظر انداز کیا گیا، تو ایسی صورت میں دین کی بقیہ شاخیں یوں ہی رہ جائیں گی۔

---

(۱) عن أبي هريرة، عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: «الإيمان بضع وسبعون - أو بضع وستون - شعبة، فأفضلها قول لا إله إلا الله، وأدناها إماطة الأذى عن الطريق، والحياء شعبة من الإيمان». (صحيح مسلم: ۱/۴۷، رقم الحديث: ۵۸-(۳۵)، كتاب الايمان، باب بيان عدد شعب الإيمان وأفضلها وأدناها، الخ، ط: البدر - ديوبند)

(۲) عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: «الإيمان بضع وسبعون شعبة، والحياء شعبة من الإيمان». (صحيح البخاري: ۱/۶، رقم الحديث: ۹، كتاب الإيمان، باب أمور الإيمان، ط: البدر - ديوبند★صحيح مسلم: ۱/۴۸، رقم: ۵۷-(۳۵)، كتاب الإيمان، باب شعب الإيمان، ط: البدر - ديوبند☆المجتبى من السنن=السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳ھ): ۸/۱۱۰، رقم: ۵۰۰۴، كتاب الإيمان وشرائعه، ذكر شعب الإيمان، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص دین کے کسی ایک ہی شعبہ کو سب کچھ سمجھتا ہے اور باقی شعبوں کو نظر انداز کرتا ہے، تو یہ اس کی جہالت ہے، ایسے شخص سے دین اسلام کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے، فائدہ کی امید نہیں کی جاسکتی؛ لہٰذا اس مزاج کے لوگوں کو- جو مسلمانوں کی جماعت میں اس راہ سے خلفشار اور انتشار پیدا کرتے ہیں- اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیے اور اس قسم کی حرکات و عادات کی اصلاح کی جانب پوری توجہ دینی چاہیے۔

خود تبلیغ کے ذمہ دار حضرات اس طرح کی باتیں کرنے سے شدت کے ساتھ منع کرتے ہیں اور وہ مدارس اسلامیہ کو دین کا ستون اور مسلک حق کا پاسبان سمجھتے ہیں۔ اس لیے دین کے تمام شعبوں کی طرف توجہ دینے کے ساتھ ساتھ دعوت و تبلیغ میں بھی اپنا وقت لگاتے رہیں، اس میں خود اپنی ذات کا اور دوسروں کا بے حد فائدہ ہے، اس سے مسلمانوں میں دینی بیداری پیدا ہوتی ہے اور دینی فضا قائم ہوتی ہے۔

ایمان کی پختگی کے لیے صرف دعوت و تبلیغ ہی نہیں ہے؛ بل کہ دین کے اور بھی شعبے ہیں۔

جن کی تفصیل عمدۃ القاری شرح بخاری (ج:۱،ص:۱۲۹) میں ہے کہ دین کے ۳۰ رشعبوں کا تعلق عقائد (دل) سے ہے، سات کا معاملات (زبان) سے اور چالیس کا بدن کے ساتھ ہے، جس میں علم اور تبلیغ بھی شامل ہے۔ (۱)

تو اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ صرف دعوت و تبلیغ ہی مکمل دین نہیں ہے؛ بل کہ دین کے اور شعبے بھی ہیں، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہے، اس سے لوگوں کو بے حد فائدہ ہوتا ہے، دین سے کوسوں دور اور قسم قسم کی ضلالت و گمراہی میں پھنسے ہوئے انسان کی اس سے بہ آسانی اصلاح ہوجاتی ہے۔ اس طرح کی خصوصیت اور امتیاز بیان کرنا اور لوگوں کے سامنے ترغیباً ان کا ذکر

---

(۱) إن أصل الإیمان هو: التصديق بالقلب والإقرار باللسان، ولكن الإيمان الكامل التام هو التصديق والإقرار والعمل، فهذه ثلاثة أقسام. فالأول: يرجع إلى الاعتقاديات، وهي تتشعب إلى ثلاثين شعبة.... والقسم الثاني: يرجع إلى أعمال اللسان، وهي تتشعب إلى سبع شعب.... والقسم الثالث: يرجع إلى أعمال البدن، وهي تتشعب إلى أربعين شعبة، وهي على ثلاثة أنواع.... والقسم الثالث: يرجع إلى أعمال البدن، وهي تتشعب إلى أربعين شعبة، وهي على ثلاثة أنواع.... النوع الثالث: ما يتعلق بالعامة، وهو ثماني عشرة شعبة.... السادسة: الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر. (عمدة القاري-بدر الدين العيني (م:۸۵۵هـ): ۱/۱۲۸، ۱۲۹، كتاب الايمان، باب أمور الإيمان، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

کرنا درست ہے۔

جیسا کہ تقریر بخاری میں مولانا شاہد صاحب سہارنپوری دامت فیوضہم نے نقل کیا ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف کے سبق کے دوران فرمایا کہ دعوت وتبلیغ کے ساتھ خدا کی خصوصی رحمت ہے۔(جلد ۲، صفحہ ۱۲۲)

چوں کہ دعوت وتبلیغ کے ساتھ خدا کی خصوصی رحمت ہے؛ اس لیے دعوت وتبلیغ میں دل چسپی لینا، اس میں وقت لگانا اور اس کا بھرپور تعاون کرنا؛ دینی اعتبار سے حد درجہ مفید، بل کہ عظیم دینی خدمت اور صدقۂ جاریہ کا سبب ہے، جب کہ جماعتی احباب سے دشمنی کرنا اور بدظن ہونا حد درجہ مضر ہوگا۔

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ جماعت سے منسلک دو چار آدمی کے اخلاق وکردار، زبان وگفتگو کے خراب ہونے سے پوری جماعت کو خراب نہیں کہا جاسکتا؛ یہ خود ان افراد کی ذاتی خرابی ہے، جس سے دعوت وتبلیغ بے زار ہے، لہٰذا ہمیں نفس دعوت وتبلیغ کو پیش نظر رکھنا چاہیے، ان میں لگے ہوئے افراد کے ذاتی احوال کی جانب توجہ نہیں دینی چاہیے۔ اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ دعوت وتبلیغ کی باگ ڈور ان مخلص اور ماہر علماء کرام کے ہاتھوں میں ہے، جو اس طرح کی باتیں نہیں کرتے، بل کہ وہ ہر برحق جماعت اور ہر مفید دینی کام کو اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس میں دوسرے حضرات کو شرکت کی ترغیب دیتے ہیں۔

لہٰذا ہمیں صرف چند افراد کی ذاتی خرابی کی وجہ سے دعوت وتبلیغ (جماعت) سے بدگمانی اور نفرت نہیں کرنی چاہیے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۶] فضائل اعمال کی تعلیم کو لازم قرار دینا

۳۱۷-سوال: ہمارے یہاں روزانہ عشاء کی نماز کے بعد فضائلِ اعمال کی تعلیم ہوتی ہے، جس میں ہمارے مدرسہ کے ملازمین کبھی کبھی نہیں بیٹھتے ہیں، اس پر ہمارے متولی صاحب نے یہ اعلان جاری فرمایا ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد فضائلِ اعمال کی تعلیم میں مدرسہ کے ہر فرد کا بیٹھنا ضروری ہے، تو کیا شرعی اعتبار سے ایک امر مستحسن کو ضروری اور فرضیت کا درجہ دینا صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

فضائلِ اعمال کی تعلیم ایک کارِ ثواب ہے، اور اُس سے دینی فائدہ ہوتا ہے؛ لیکن یہ واجب یا مسنون

نہیں ہے، نیز کسی خاص وقت میں ہونا بھی ضروری نہیں؛ لہٰذا اگر کسی کو دوسرا کوئی اہم کام درپیش ہو، یا خاص وقت میں بیٹھنے کو جی نہ چاہے، تو اُس میں کوئی حرج نہیں، ذکر، تلاوتِ قرآن پاک اور نوافل کے متعلق بھی احادیث میں وارد ہے کہ خشوع وخضوع کے ساتھ جب تک طبیعت میں نشاط ہوادا کرتے رہو، اگر سستی اور اکتاہٹ محسوس ہورہی ہو، تو اُس وقت چھوڑ دو، پھر دوسرے وقت میں پڑھو۔ [(۱)] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے یہ درخواست کی کہ آپ ہمیں روزانہ احادیثِ مبارکہ سنا کر نصیحت فرمائیں۔ (آپؓ ہر جمعرات کو وعظ فرماتے تھے) تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے اِس بات کا خوف ہے کہ لوگ کہیں اکتانہ جائیں؛ اِس لیے روزانہ یہ کام نہیں کرتا، نبیٔ اکرم ﷺ بھی ہمارے نشاط کا خیال کرتے ہوئے کبھی کبھی نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ [(۲)] لہٰذا تعلیم میں اس بات کا خوب خیال رہنا چاہیے کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے اس میں شریک نہ ہوسکے، تو اس پر ناراضگی یا ملامت ہرگز نہ ہو، اور نہ ہی اُس کے بارے میں یہ گمان کرنا جائز ہے کہ وہ تعلیم کی مخالفت کررہا ہے، خصوصاً وہ علماء کرام کہ جن کا راتِ دن کا مشغلہ قرآن وحدیث کے پڑھنے اور پڑھانے کا ہے، فضائل کے متعلق بہت سی احادیث انہیں یاد بھی ہوتی ہیں، فضائل وغیرہ کا انہیں علم ہوتا ہے، ان کے تعلیم میں شریک نہ ہونے پر کوئی بدگمانی قائم کرلینا، یا ان پر اپنے عرفی رتبہ کا دباؤ ڈال کر تعلیم میں بیٹھنے پر مجبور کرنا غلط ہے، کسی بھی افضل اور مستحب کام کو واجب یا مسنون کا درجہ دینا بدعت ہے، جو جائز نہیں ہے۔ [(۳)]

علماء کرام کو بھی چاہیے کہ اِس جیسی مجلس میں شرکت کی ہرممکن کوشش کریں، علماء کی شرکت سے

---

(۱) عن أبي هريرة - رضي الله عنه - قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ادعوا الله وأنتم موقنون بالإجابة، واعلموا أن الله لا يستجيب دعاء من قلب غافل لاه. (سنن الترمذي: ۲/ ۱۸۶، رقم: ۳۴۷۹، باب جامع الدعوات عن النبي صلى الله عليه وسلم، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۲) عن أبي وائل قال كان عبد الله يذكر الناس في كل خميس، فقال له رجل: يا أبا عبد الرحمن، لوددت أنك ذكرتنا كل يوم، قال أما إنه يمنعني من ذلك أني أكره أن أملكم، وإني أتخولكم بالموعظة، كما كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولنا بها مخافة السآمة علينا. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۴، رقم: ۷۰، كتاب العلم، باب من جعل لأهل العلم أياما معلومة، ط: البدر - ديوبند)

(۳) قال ابن المنير: فيه أن المندوبات قد تنقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها؛ لأن التيامن مستحب في كل شيء أي من أمور العبادة، لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه أشار إلى كراهته، والله أعلم. (فتح الباري - ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲ھ): ۲/ ۴۳۰، كتاب الأذان، باب الانفتال والانصراف... الخ، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

دوسرے لوگوں کا شوق اور حوصلہ بڑھے گا، ایک حدیث پاک میں وارد ہے کہ خود آپ ﷺ صحابۂ کرامؓ کے ساتھ ذکر کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] تبلیغ اہم ہے یا تعلیم؟

۳۱۸-سوال: زیادہ اہم کیا ہے، تعلیم یا تبلیغ؟ ایک صاحب یہ کہتے ہیں کہ تبلیغ زیادہ ضروری ہے، آپ اس کا تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

تبلیغ اور تعلیم دونوں ضروری ہیں، آدمی کا جس میں بھی دل لگے، اخلاص کے ساتھ وہ کام کرتا رہے، ایک دوسرے کی تنقیص اور تنقید کر کے اپنا ایمان اور اپنی نیکی برباد نہ کرے، مقصد دونوں کا اللہ رب العزت کے نام کو بلند کرنا اور اس کا پیغام مخلوق تک پہنچانا ہے، مدرس بھی یہی کام کرتا ہے اور اپنے فاضل اوقات میں بھی لوگوں کو دین کی باتوں کی تاکید کرتا ہے، یہ بھی بہرحال بہت بڑی نیکی کا کام ہے، تمام لوگ اگر مبلغ بن جائیں گے اور تدریس کے لیے کوئی نہیں ہوگا، تو اللہ رب العزت کے احکام: نماز و روزہ وغیرہ کی تعلیم لوگوں تک کیسے پہنچیں گے؟ اس لیے جس کا جس میں دل لگے، خاموشی کے ساتھ اسے انجام دیتا رہے اور اس طرح کی بحث میں نہ الجھے۔ اللہ اعلم بالصواب۔[2]

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ (۲۳/۷/۱۹۷۶ء)

---

(۱) عن أبي سعيد الخدري، قال: جلست في عصابة من ضعفاء المهاجرين وإن بعضهم ليستتر ببعض من العري، وقارئ يقرأ علينا إذ جاء رسول الله صلى الله عليه وسلم فقام علينا، فلما قام رسول الله -صلى الله عليه وسلم- سكت القارئ، فسلم، ثم قال: ما كنتم تصنعون؟ قلنا: يا رسول الله، إنه كان قارئ لنا يقرأ علينا، فكنا نستمع إلى كتاب الله، قال: فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الحمد لله الذي جعل من أمتي من أمرت أن أصبر نفسي معهم. قال: فجلس رسول الله -صلى الله عليه وسلم- وسطنا ليعدل بنفسه فينا، ثم قال: بيده هكذا، فتحلقوا وبرزت وجوههم له قال: فما رأيت رسول الله -صلى الله عليه وسلم- عرف منهم أحدا غيري، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أبشروا يا معشر صعاليك المهاجرين بالنور التام يوم القيامة، تدخلون الجنة قبل أغنياء الناس بنصف يوم وذاك خمس مائة سنة. (سنن أبي داؤد، ص: ۵۱٦، رقم: ۳٦٦٦، كتاب العلم، باب في القصص، ط: البدر - ديوبند☆مسند أبي يعلى الموصلي (م: ۳۰۷هـ): ۲/ ۳۸۲، رقم: ۱۱۵۱، ت: حسين سليم أسد، ط: دار المأمون للتراث - دمشق☆شرح السنة -محيي السنة البغوي الشافعي (م: ۵۱٦هـ): ۱۴/ ۱۹۱، ت: شعيب الأرنؤوط-محمد زهير الشاويش، ط: المكتب الإسلامي - دمشق - بيروت)

(۲) دیکھیے: آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۸/ ۲۰۱، تبلیغ دین، ط: مکتبہ لدھیانوی، پاکستان۔

[۸] ملکیت بیچ کر یا گروی رکھ کر تبلیغی جماعت میں جانا

۳۱۹-سوال: تبلیغی جماعت میں جانے والے کو اپنی ملکیت زمین، زیورات، اور گھر کو بیچ کر یا ان چیزوں کو گروی رکھ کر پیسہ حاصل کر کے تبلیغ میں جانا کیا ضروری ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

تبلیغ میں جانا فرض کفایہ ہے؛ لہٰذا اگر مال نہ ہو اور قرض باقی چھوڑ کر جائے، یہ بہتر نہیں ہے، اور اگر زمین، مکان وغیرہ گروی رکھ کر جائے، تو جائز ہے، گنہ گار نہ ہوگا؛ کیوں کہ قرض کی ادائیگی کے لیے زمین وغیرہ موجود ہے۔ پس جن کے پاس زمین وغیرہ کوئی ملکیت نہیں ہے، ان کو قرض لے کر نہیں جانا چاہیے۔ [1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] قرض خواہوں کا قرض ادا کیے بغیر تبلیغ میں جانا

۳۲۰-سوال: پیسے قرض لے کر تبلیغی جماعت میں جانا اس حال میں کہ جن کا قرض باقی ہے ان کو بھی ادا نہ کرنا یہ کیسا ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

قرض کی ادائیگی سب سے پہلے ضروری ہے، اس کے بعد تبلیغ میں جائے۔

فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] نوکری چھوڑ کر تبلیغ میں جانا

۳۲۱-سوال: مالی حیثیت سے کمزور ہونے کی بنا پر گھر والے تنگی میں مبتلا ہوں اور اس حال میں اپنے ذریعہ معاش نوکری وغیرہ ترک کر کے تبلیغی جماعت میں چلا جانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

خود تبلیغی جماعت کے اکابرین نوکری چھوڑنے کو منع کرتے ہیں، چھٹی لے کر جانا چاہیے، جو نوکری

(۱) حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: اگر اپنے پاس پیسہ نہ ہو، تو ان کے کہنے کی وجہ سے قرض نہ لیں، اگر جلدی ادا کرنے کی صورت ہو تو پھر حسب حیثیت قرض لینے کی بھی گنجائش ہے۔ (فتاوی محمودیہ- مفتی محمود حسن گنگوہی (م:۱۹۹۶ء) : ۴/ ۲۶۳، باب التبلیغ، ط: اشرفی بک ڈپو، دیوبند)

چھوڑ کر جاتا ہے، اس کا طریقہ غلط ہے، فسادات کا زمانہ ہے، لوگوں کے ایمان اتنے مضبوط نہیں ہیں، اگر چلہ سے واپس آنے کے بعد حالات سخت ہوئے اور ان حالات کا مقابلہ نہیں کر سکا، تو پریشانی میں مبتلا ہوگا اور تھوڑا جو کچھ اس کو تبلیغ سے لگاؤ ہے، وہ بھی چھوڑ دے گا اور مبلغین اور اہل تبلیغ کو بدنام کرے گا، لہٰذا نوکری چھوڑ کر جانے کی ضرورت نہیں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] تبلیغ کا چلہ ضروری ہے یا بوڑھے ماں باپ کی خدمت؟

۳۲۲-سوال: بوڑھے ماں باپ ہیں اور وہ بیمار ہیں، ایسی حالت میں ان کی نافرمانی کر کے اور ان کو ناراض کر کے، ان کا خیال کیے بغیر تبلیغی جماعت میں جانا کیسا ہے؟ کیا شریعت میں اس کی اجازت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ماں باپ بوڑھے کمزور ہوں اور ان کو خدمت کی ضرورت ہو تو تبلیغ میں جانا جائز نہیں، کیوں کہ ضرورت کے وقت ماں باپ کی خدمت کرنا فرض عین ہے اور تبلیغ میں جانا فرض کفایہ ہے اور فرض عین کا درجہ مقدم ہے، امام بخاریؒ نے ایک مستقل باب باندھا ہے کہ "ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد میں نہیں جانا چاہیے" اس میں حضرت عبداللہ بن عمر بن عاصؓ سے روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے آکر کہا: "یارسول اللہ میں جہاد میں جانا چاہتا ہوں مجھے اجازت عطا فرمائیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تمہارے والدین حیات ہیں، اس نے کہا جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان میں جہاد کرو، یعنی پہلے ان کی خدمت کرو۔ (۲)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے اور ماں باپ کی خدمت فرض عین ہے، لہٰذا ماں باپ محتاج ہوں اور دوسرا کوئی بھائی خدمت نہ کرتا ہو یا کرتا ہو لیکن ماں باپ اس کو زیادہ چاہتے ہیں اور اسی سے خدمت لینا چاہتے ہوں تو ایسی صورت میں اس کو تبلیغ میں جانا جائز نہیں۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قال اللہ تعالی: ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ [۲-البقرة-۱۹۵]

(۲) عن عبد اللہ بن عمرو، قال: قال رجل للنبي صلى اللہ عليه وسلم أجاهد؟ قال: »لك أبوان؟« قال: نعم، قال: »ففيهما فجاهد. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۸۳، رقم الحديث: ۵۹۷۲، كتاب الأدب، باب لا يجاهد إلا بإذن الوالدين، ط: البدر-ديوبند)

(۳) أن العلماء اتفقوا على أن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر من فروض الكفايات ولم يخالف في ذلك إلا النزر. (روح المعاني-شهاب الدين محمود بن عبد اللہ الحسيني الآلوسي (م: ۱۲۷۰ھ): ۲/ ۲۳۸، ط: دار الكتب العلمية-بيروت) =

[۱۲] مصیبت زدہ پر پیسے خرچ کرنا اہم ہے یا تبلیغ میں جانے والے پر؟

۳۲۳-سوال: تبلیغی جماعت میں جانے کے لیے کسی کو پیسہ دے کر بھیجا جاتا ہے، اگر یہی پیسے کسی بیوہ، بیمار، مقروض یا کسی اور مصیبت میں پھنسے ہوئے شخص کو دیے جائیں تو ان دونوں کام میں کس کی اہمیت زیادہ ہے؟ یعنی کون سا کام مقدم ہے؟ پہلے کس میں پیسے خرچ کرنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

پیسے خرچ کرنے والا خود اجتہاد کرے کہ ثواب کے دونوں کاموں میں سے کون سا کام فی الحال زیادہ ضروری ہے اور کس میں زیادہ ثواب ملے گا، اس کے حساب سے پیسہ خرچ کرے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] تبلیغ میں جانے کے لیے مجبور کرنا

۳۲۴-سوال: تبلیغی جماعت میں جانے کا ارادہ نہ ہونے کے باوجود آدمی کو اس پر مجبور کیا جاتا ہے، اور پکڑ پکڑ کر بار بار تاکید کر کے کھڑا کر کے اس کا نام لکھا جاتا ہے، تو کیا اس طرح تاکید کر کے زبردستی تبلیغ میں بھیجنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

تبلیغی احباب یہ کام محبت میں کرتے ہیں، جس طرح مریض کو مجبور کر کے اس کو دوا کا ڈوز دیا جاتا ہے۔ آج لوگ روحانی بیماری میں کثرت سے مبتلاء ہیں، اس کا روحانی علاج تبلیغ ہے، مریضوں کو یہ دوا اچھی نہیں لگتی؛ اس لیے نفرت کرتے ہیں۔

اور تبلیغ والے مجبور نہیں کرتے ہیں، بل کہ نیک کام کے لیے لوگوں کو مہمیز کرتے ہیں، ان میں ایک

= وله الخروج لطلب العلم الشرعي بلا إذن والديه لو ملتحيا وتمامه في الدرر. (الدر المختار) (قوله وله الخروج إلخ) أي إن لم يخف على والديه الضيعة بأن كانا موسرين، ولم تكن نفقتهما عليه. وفي الخانية: ولو أراد الخروج إلى الحج وكره ذلك قالوا إن استغنى الأب عن خدمته فلا بأس، وإلا فلا يسعه الخروج، فإن احتاجا إلى النفقة ولا يقدر أن يخلف لهما نفقة كاملة أو أمكنه إلا أن الغالب على الطريق الخوف فلا يخرج، ولو الغالب السلامة يخرج. وفي بعض الروايات لا يخرج إلى الجهاد إلا بإذنهما ولو أذن أحدهما فقط لا ينبغي له الخروج، لأن مراعاة حقهما فرض عين والجهاد فرض كفاية. (رد المحتار: ٦/ ٤٠٨، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر)

جذبہ پیدا کرتے ہیں، جو بلاشبہ جائز بل کہ مطلوب ہے۔ تبلیغی جماعت کے ذمہ داران مجبور کرنے سے منع کرتے ہیں؛ لیکن بدقسمتی ہے کہ اصل اس کام کی ذمہ داری جن لوگوں پر تھی، یعنی علماء، وہ اس میں مالی یا دینی رکاوٹ کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے، اس لیے بعض مرتبہ جہالت کی بنا پر کچھ ایسی نامناسب باتیں سامنے آجاتی ہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] پیسے دے کر تبلیغ میں بھیجنا اور اس کے گھر والوں کو بھی خرچہ دینا

۳۲۵-سوال: جس کی معاشی حالت کمزور ہو اور محنت مزدوری کر کے اپنا گذر بسر کرتا ہو، اس کو تبلیغی جماعت میں بھیج کر اس کے گھر والوں کو خرچ کے لیے پیسے دیے جاتے ہیں، تو کیا صاحب استطاعت اور کاروباری شخص کا اس طرح کسی کی مدد کرنا صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جائز ہے، اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے، جس طرح علماء تنخواہ لے کر پڑھاتے ہیں، اسی طرح کسی کو تنخواہ دے کر تبلیغ میں بھیجنا یا اس کی کچھ مدد کرنا جائز ہے، بل کہ یہ ثواب کا کام ہے، پس اس طرح پیسہ لینا دینا جائز ہے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] تبلیغی اجتماع میں شادی کے بعد بادل ناخواستہ جماعت میں جانا

۳۲۶-سوال: تبلیغی اجتماع میں شادی کی جاتی ہے، شادی کے بعد اس کی مرضی کے خلاف اس کو جماعت میں بھیجا جاتا ہے، تو کیا اس کو جماعت میں جانا ضروری ہے؟ اور اگر گیا، تو اس کا دل کیسے لگے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جائز ہے، اس پر یہ بوجھ (گرانی) طبعی ہے، عقلی اور شرعی اعتبار سے اس کا دل بھی تبلیغ میں جانے کو ہی کہتا ہے؛ لہٰذا جائز ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب

---

(۱) قال اللہ تعالی: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى. (۔۵ المائدۃ: ۲)

[۱۶] ماں باپ کی خدمت کرنا اہم ہے یا تبلیغ میں جانا؟

۳۲۷-سوال: لمبی مدت کے سفر کے بعد-خواہ وہ سفر دینی ہو یا غیر دینی - پہلے بوڑھے ماں باپ کی خبر لینا چاہیے یا جماعت (تبلیغ) میں نکل جانا؟ دونوں میں سے کون سا فریضہ پہلے ادا کرنا چاہیے؟

الجواب حامداًومصلیاً:

چلہ میں جا کر واپسی سے پہلے مذکورہ سوال پوچھیے، جب آپ خود چلہ میں گئے نہیں، تو دوسروں کی فکر کی ضرورت نہیں، قبر میں آپ سے مذکورہ سوال نہیں ہوگا، جو سوال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں، پہلے ان کو حل کیجئے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

۸ مارچ ۱۹۸۰ء

[۱۷] تین چلوں اور گشت کا شرعی حکم

۳۲۸-سوال: تبلیغ میں تین دن یا چلے دینا اور گشت وغیرہ کی پابندی کرنا فرض ہے؟ اور اگر کوئی شخص ان کی پابندی نہ کرے، تو کیا وہ گنہ گار ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً

اپنی طاقت اور قوت کے مطابق دین کی خدمت کرنا؛ ہر مسلمان کا فریضہ اور ذمہ داری ہے، ایک جماعت اس کام کو کرے گی، تو اس سے فرض کفایہ ادا ہو جائے گا؛ لیکن آپ اخروی ثواب اور اپنی روحانی ترقی سے محروم رہیں گے؛ اس لیے عملی طور پر حصہ لے کر رضائے الٰہی حاصل کرنے کی ہر مسلمان محنت اور کوشش کرے اور جو باتیں آپ نے لکھی ہیں، ان کے علاوہ سے بھی دین کی خدمت کر سکتے ہیں؛ اس لیے ایک یا تین چلے یا گشت فرض عین نہیں ہے۔[1] البتہ جماعت کے ساتھ جڑ کر کام کرنا زیادہ نفع بخش ہوتا ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تاہم مزاج و احوال کے تغیر میں چلے کو بڑی اہمیت حاصل ہے: عن عبد الله، قال: حدثنا رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو الصادق المصدوق "إن أحدكم يجمع خلقه في بطن أمه أربعين يوما، ثم يكون في ذلك علقة مثل ذلك، ثم يكون في ذلك مضغة مثل ذلك، ثم يرسل الملك فينفخ فيه الروح، ويؤمر بأربع كلمات: بكتب رزقه، وأجله، وعمله، وشقي أو سعيد. الخ. (صحيح المسلم: ۲/ ۳۳۲، رقم: -۱ (۲۶۴۳) كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي. الخ، ط: البدر - ديوبند)

[۱۸] تبلیغی کاموں میں گشت اور بات چیت کے لیے جو دِن مقرر کیا گیا ہے، اُس دِن عشاء کے بعد اگر تعلیم چھوڑ دی جائے، تو اُس میں کوئی حرج ہے یا نہیں؟

۳۲۹-سوال: دعوت وتبلیغ کے کام کے لیے علماء ربانی نے جو اصول بتائے ہیں، اُن پر عمل پیرا رہتے ہوئے ہم نے اپنی بستی میں ہفتہ میں ایک دِن روزِ جمعہ گشت کے لیے اور اسی رات کو بات چیت کے لیے مقرر کیا ہے، روزانہ کتابی تعلیم عشاء کے بعد ہوتی ہے، اور بات چیت کے دِن یعنی جمعہ کی رات کو عشاء کی نماز کے بعد اولا کتابی تعلیم ہوتی ہے، پھر بات چیت ہوتی ہے، گاؤں کے کچھ لوگوں کا اسی پر اصرار ہے، اور کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ بات چیت کے دِن کتابی تعلیم نہیں ہونی چاہیے، جیسا کہ ہمارے امام صاحب بھی یہی فرماتے ہیں، تو آپ والا سے درخواست ہے کہ کتب کے حوالوں سے اس باب میں شرعی رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

تبلیغی جماعت کے کاموں کے لیے مختلف بستیوں میں اور شہروں میں جو اوقات طے کیے جاتے ہیں، وہ گاؤں اور محلہ والوں کی سہولت اور فرصت کے پیش نظر طے ہوتے ہیں، اور مقصد اس میں یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ گشت، تعلیم، مشورہ اور بات چیت وغیرہ میں شریک ہوسکیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بعض لوگوں نے اُن سے یہ درخواست کی کہ ہمیں آپ روزانہ نصیحت کرتے رہیں، تو آپؓ نے جواب میں فرمایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ہفتہ میں ایک دِن نصیحت فرماتے تھے، تاکہ ہمیں اکتاہٹ محسوس نہ ہو۔ (بخاری شریف: ۱/۱۶)[۱]

اِس حدیث پاک سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہفتہ میں ایک دِن عام خطاب کے لیے طے فرمایا تھا، اور اِس حدیث پر امام بخاریؒ نے بھی یہی عنوان قائم فرمایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نصیحت کے لیے ایک دِن مقرر فرماتے تھے، اسی طرح اور ایک عنوان قائم فرمایا ہے کہ: ''عورتوں کے لیے

---

(۱) عن أبي وائل، قال: كان عبد الله يذكر الناس في كل خميس فقال له رجل: يا أبا عبد الرحمن لوددت أنك ذكرتنا كل يوم؟ قال: أما إنه يمنعني من ذلك أني أكره أن أملكم، وإني أتخولكم بالموعظة، كما كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولنا بها، مخافة السآمة علينا". (صحيح البخاري: ۱/۱۶، رقم الحديث: ۷۰، كتاب العلم، باب من جعل لأهل العلم أياما معلومة، ط: البدر-ديوبند)

ہفتہ میں ایک دن علاحدہ طور پر مقرر کرنا''[۲] لہٰذا معلوم ہوا کہ دن طے کر کے کام کرنا جائز ہے، لیکن اُس کا مفہوم یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسے ایسا ضروری قرار دیا جائے کہ کوئی اور کام اُس سے اہم درپیش ہو، تب بھی اسی اصول سے چپٹے رہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ اصول اس لیے بنائے جاتے ہیں تاکہ کام زیادہ ہو اور اچھا ہو، اس لیے نہیں کہ اُصول کو ایسا لازمی بنالیا جائے کہ لوگ اس کام سے اکتا جائیں یا متنفر ہو جائیں، اور شرکت سے دور رہیں، عام لوگوں کی مصلحت اور شرکت کے پیش نظر کسی بھی اصول میں بوقتِ ضرورت ترمیم کی جاسکتی ہے، موقع محل اور ضرورت کو دیکھتے ہوئے بات چیت کے دن کتابی تعلیم چھوڑی جاسکتی ہے، اس میں اصول کی مخالفت نہیں ہے، بل کہ لوگ اگر زیادہ مقدار میں شریک ہوتے ہوں تو جائز اور بہتر ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

[۱۹] حضرت مسیح الامتؒ کی کتاب ''اصولِ تبلیغ'' پر اعتراض اور اس کا جواب

۳۳۰-سوال: ایک کتاب جس کا نام ''اصولِ تبلیغ'' ہے، ہمارے چند رفقاء کا خیال اس کتاب کے متعلق یہ ہے کہ اس میں تبلیغ کی مخالفت کی گئی ہے، لہٰذا اس کو پڑھنا گناہ ہے، آپ سے عرض ہے کہ اس کتاب کے متعلق حکمِ شرعی کی طرف رہنمائی فرمائیں، ساتھ میں مذکور کتاب کا نسخہ بھی بھیجا ہے، اسے واپس بھیجنے کی زحمت نہ فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اصولِ تبلیغ، مصنفہ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب دامت برکاتہم (مقام: جلال آباد، ضلع: مظفرنگر یوپی) کے متعلق تبلیغ کے روحِ رواں حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ کی تائید ہی کافی ہے، جس کے بعد کسی بھی مفتی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی، حضرت شیخ الحدیثؒ کی تائید کتاب کے صفحہ نمبر: ۵ پر ملاحظہ فرمالیں۔

کتاب مذکور کے متعلق آپ کے رفقاء کی غلط فہمی کی وجہ اُن کا ناقص علم ہے، اگر انھوں نے اچھی طرح علمِ دین حاصل کیا ہوتا تو مذکور سوال پیدا نہ ہوتا، حضرت مسیح الامتؒ نے مذکور کتاب میں جو مسائل و نصائح جمع فرمائے ہیں، تمام کا ثبوت اصول شرع کے عین مطابق ہے، کتاب کے صفحہ نمبر ۹۹ پر کسان کے متعلق آپؒ نے جو مسئلہ لکھا ہے، اُس کا ثبوت صحیح بخاری سے بھی ملتا ہے۔

---

(۲) باب هل يجعل للنساء يوم على حدة في العلم. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۰، كتاب العلم. ط: البدر-ديوبند)

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں کتاب العلم کے تحت ایک باب قائم فرمایا ہے: **"التناوب في العلم"** یعنی علم سیکھنے کے لیے باری مقرر کرنا، اس باب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی وہ روایت ذکر فرمائی ہے، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے؛ طویل روایت ہے، جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اور میرا ایک پڑوسی (جو قبیلۂ بنو امیہ بن زید سے تعلق رکھتے تھے) باری باری آپ ﷺ کے پاس علم سیکھنے کے لیے حاضر ہوتے تھے، جس دن میری باری ہوتی، تو میں آپ ﷺ سے سنی ہوئی علمی باتیں بعد میں ان کو بتادیتا، اور جس دن ان کی باری ہوتی، تو وہ بھی اسی طرح کرتے۔ [1]

اس روایت سے اوّل تو صحابۂ کرامؓ کی علم کی طلبِ صادق کا پتہ چلتا ہے کہ وہ علمِ دین کے کس درجہ طلب گار تھے، اور ضمناً یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اپنی دیگر ضروریات ومشاغل بھی متاثر نہ ہوں؛ اس لیے انہوں نے باہمی باری مقرر کر کے یہ بہترین نظام بھی قائم کیا کہ علمِ دین بھی حاصل کیا جاسکے، اور کسبِ حلال جیسے دیگر واجبات کی ادائیگی میں بھی کوئی خلل واقع نہ ہو۔

لہٰذا آپؒ نے جو مسئلہ کسان کے متعلق ذکر فرمایا، وہ بالکل حدیث شریف کے عین مطابق ہے، ظاہر سی بات ہے کہ جب کسی بھی قسم کے پیشگی انتظام کے بغیر اگر کوئی آدمی سفر میں چلا جائے، اور اتفاق سے یہ ہوا کہ کھیتی برباد ہوگئی، یا دوکان تھی جس میں ملازمین نے خیانت کر کے دھوکہ کیا، تو سفر سے واپسی پر سوائے حسرت کے اور کیا ہوگا، اور ایسے مواقع میں توکل میں ضعف پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے، جس سے ایمان خراب ہوگا۔

یادرکھنا چاہیے کہ دنیا دارالاسباب ہے، لہٰذا اسباب کو اختیار کرنے کا بندہ من جانب اللہ مکلف ہے، توکل اسباب اختیار کرنے کے منافی نہیں ہے، برائے کرم توکل کا صحیح معنی سمجھنے کی کوشش کریں، توکل یہ ہے کہ کسی بھی عمل کے لیے جو اسبابِ عادیہ درکار ہیں، انھیں اختیار کرنا، اور اُس کے بعد مسبب (نتیجہ) کے پیدا

---

(۱) عن عبد الله بن عباس عن عمر قال كنت أنا وجار لي من الأنصار في بني أمية بن زيد وهي من عوالي المدينة وكنا نتناوب النزول على رسول الله صلى الله عليه وسلم ينزل يوما وأنزل يوما فإذا نزلت جئته بخبر ذلك اليوم من الوحي وغيره وإذا نزل فعل مثل ذلك فنزل صاحبي الأنصاري يوم نوبته فضرب بابي ضربا شديدا فقال أثم هو ففزعت فخرجت إليه فقال قد حدث أمر عظيم قال فدخلت على حفصة فإذا هي تبكي فقلت طلقكن رسول الله صلى الله عليه وسلم قالت لا أدري ثم دخلت على النبي صلى الله عليه وسلم فقلت وأنا قائم أطلقت نساءك قال لا فقلت الله أكبر.
(صحیح البخاری ۱:۱۹، رقم:۸۹، کتاب العلم، باب التناوب فی العلم، ط: البدر - دیوبند)

ہونے کے لیے اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھنا کہ وہی ذات تمام امور میں مؤثرِ حقیقی ہے، جو اسباب اختیار کیے گئے ہیں، ان میں مستقل طور پر بالذات کوئی تاثیر نہیں ہے، ان میں تاثیر پیدا کرنا اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے، جیسا کہ ایک صحابیؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے اونٹ کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے چھوڑ رکھا ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلے آپ اونٹ کو باندھ دیجیے، پھر اس کی حفاظت کے متعلق اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں۔ (۲)

لہٰذا کسی کسان یا تاجر کا اپنے اہل وعیال کے لیے پیشگی انتظام کے بغیر کسی بھی سفر میں چلا جانا یہ توکل میں داخل نہیں؛ بل کہ اس کے برعکس ہے۔

حضرت مسیح الامتؒ نے کتابِ مذکور کے صفحہ نمبر : ۱۰۰ پر دوسری ایک اہم بات کی جانب رہنمائی فرمائی ہے، اور وہ ہے قرض لے کر اس سفر میں نکلنا۔

قرض کی شناعت کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے معمول سے انداز لگانا چاہیے، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں کتاب الحوالۃ میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل فرمائی ہے:

عن سلمة بن الأكوع رضي الله عنه، قال: كنا جلوسا عند النبي صلى الله عليه وسلم، إذ أتي بجنازة، فقالوا: صل عليها، فقال: »هل عليه دين؟« ، قالوا: لا، قال: »فهل ترك شيئا؟« ، قالوا: لا، فصلى عليه، ثم أتي بجنازة أخرى، فقالوا: يا رسول الله، صل عليها، قال: » هل عليه دين؟ « قيل: نعم، قال: »فهل ترك شيئا؟« ، قالوا: ثلاثة دنانير، فصلى عليها، ثم أتي بالثالثة، فقالوا: صل عليها، قال: »هل ترك شيئا؟« ، قالوا: لا، قال: »فهل عليه دين؟« ، قالوا: ثلاثة دنانير، قال: »صلوا على صاحبكم« ، قال أبو قتادة صل عليه يا رسول الله وعلي دينه، فصلى عليه. (بخاري) (۳)

اس روایت کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسولِ اکرم

(۲) أنس بن مالك، يقول: قال رجل: يا رسول الله أعقلها وأتوكل، أو أطلقها وأتوكل؟ قال: »اعقلها وتوكل. (سنن الترمذي: ۲/ ۸۷، برقم الحديث: ۲۵۱۷، قبيل أبواب صفة الجنة، ط: البدر- ديوبند)

(۳) صحيح البخارى: ۱/ ۳۰۵، برقم الحديث: ۲۲۸۹، كتاب الحوالة، باب إذا أحال دين الميت على رجل جاز، ط: البدر- ديوبند)

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اُسی دوران ایک جنازہ لایا گیا، صحابہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نمازِ جنازہ پڑھانے کی درخواست کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا اس مرنے والے کے ذمہ کوئی قرض باقی ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا نہیں، پھر آپؐ نے پوچھا کیا انہوں نے کچھ مال چھوڑا ہے؟ جواب دیا گیا کہ نہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ پڑھائی، پھر ایک ایسا جنازہ لایا گیا جس میت کے ذمہ کچھ قرض تھا، اور اُس نے میراث میں تین دینار چھوڑے تھے، تو اُس پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحقیق فرما کر نمازِ جنازہ پڑھائی، پھر تیسرا جنازہ ایسی میت کا لایا گیا جن پر قرض تو تھا؛ لیکن ادائیگی کے لیے کوئی مال نہیں چھوڑا تھا، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اُن کی نمازِ جنازہ تم پڑھ لو، پھر جب حضرت ابوقتادہؓ نے اُن کے قرض کی ادائیگی اپنے ذمہ لی، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

اس روایت سے جہاں قرض کی ادائیگی کی تاکید معلوم ہوتی ہے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرض چھوڑ کر مرنے سے آدمی کتنے بڑے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے، ایک اور حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ قرض دار شخص اگر شہید بھی ہو جائے تو اُسے اپنے جنتی رشتہ داروں کی لقاءِ روحانی سے روک دیا جاتا ہے۔

اب ان روایات میں غور کر کے آپ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کسی بھی کسان یا تاجر کا بغیر کسی پیشگی انتظام کے چلہ یا چار مہینے کے لیے قرض لے کر سفر کرنا کیسا ہے، اگر خدانخواستہ موت واقع ہو گئی تو اس قرض کی ادائیگی کا کوئی حتمی انتظام ہے؟

یہ بات بھی خوب یاد رہے کہ علماءِ کرام تبلیغ کے مخالف نہیں ہیں، اور کبھی ہو بھی نہیں سکتے، کیوں کہ یہ کام انبیاءِ کرام علیہم السلام کا فرضِ منصبی ہے، لہٰذا علماءِ کرام بھی انبیاء کے وارث ہونے کی وجہ سے ان پر بھی یہ فرضِ منصبی عائد ہے، لاکھوں راہ بھولے ایسے ہیں جن کو اس بابرکت کام کی بدولت ہدایت نصیب ہوئی ہے، اور سیکڑوں کو ایمان نصیب ہوا ہے، علماءِ کرام کی جانب سے بمقتضاءِ فرضِ منصبی اس کام کے اصول سکھائے جاتے ہیں، راہِ اعتدال بتائی جاتی ہے، اور اس قسم کی اصلاح کے لیے ملک وبیرونِ ملک کے ذمہ داران کو جمع کیا جاتا ہے، چوں کہ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے بہت سے دیہاتوں تک یہ اصلاحی پیغامات نہیں پہنچ پاتے جس کے نتیجے میں کچھ ناخواندہ لوگ اس قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ علماءِ کرام العیاذ باللہ تبلیغ کے مخالف ہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(سلوک وتصوف)

[۱]ایک اصلاحی خط

۳۳۱-سوال: میں نے اس سے پہلے حضرت مولانا الیاس نورگت صاحب کو اصلاح کی غرض سے خط لکھا تھا، آپ نے جس خوبی کے ساتھ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیا، وہ قابل تعریف ہے، اللہ تعالیٰ قیامت تک ایسے باصلاحیت دین دار لوگ پیدا فرماتے رہیں۔ آمین

میں ظاہری عمل سے زیادہ باطنی عمل کو اہمیت دیتا ہوں، حقوق اللہ کی طرف توجہ کم ہے، نماز روزے کی پابندی مجھ سے کم ہوتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ میں بلڈ پریشر اور ڈپریشن کا مریض ہوں۔ حقوق العباد، معاملات، معاشرت کی طرف توجہ زیادہ ہے (بتوفیق اللہ) معاشرت، اخلاق، معاملات کی پابندی کرنے میں نفس پر بوجھ پڑتا ہے، اسلام کے اخلاقی شعبہ کی پیروی کرنے میں وساوس اور خیالات کا زیادہ غلبہ رہتا ہے، جس کی وجہ سے دماغ پر بوجھ پڑتا ہے، دماغ ہلکا رکھنا چاہتا ہوں، تو کیا کروں؟ طریقہ بتلائیں۔ میں نے شیخ صاحب سے جن چار باطنی بیماریوں کا علاج کروایا ہے، اس سے فائدہ ضرور ہے، شیخ کی اتباع بہت کرتا ہوں؛ لیکن ایک مرتبہ توبہ کرنے کے بعد پھر سے ہر دو تین دن میں مجھ سے وہ گناہ ہو جاتا ہے، دل چاہتا ہے کہ گناہ مجھ سے سرزد نہ ہو، بار بار گناہ کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو سزا دینے کا وقت نہیں ملتا، جس سے کامل مؤمن بننے سے ناامید ہو جاتا ہوں۔

میں اپنے شیخ کی روبرو ملاقات نہیں کرسکتا ہوں، کیوں کہ سرکاری ملازمت ہے، جس کی وجہ سے چھٹی نہیں ملتی؛ لیکن خط وکتابت کے ذریعہ حالت بیان کر کے رہنمائی حاصل کرتا ہوں، کیا میں اصلاح کا یہ طریقہ بدل دوں؟

اتباع سنت کا بہت خیال کرتا ہوں، بے شک یہ اچھی بات ہے؛ لیکن اتباع کا خیال کرنے میں وساوس شامل ہو جاتے ہیں، اس سے بچنے کے لیے کیا کروں؟ گجراتی زبان میں اصلاح کرنے والی کچھ کتابوں کے نام عطا فرمائیں، حضرت تھانویؒ کا معتقد ہوں، نماز جیسی اہم عبادت میں سستی ہو جاتی ہے، گھر کی ذمہ داریوں کی خوب فکر رہتی ہے، رزق کی تنگی کی وجہ سے دنیوی کام کی طرف توجہ دیتا ہوں، پہلے مجھ پر جب دین غالب تھا، تو مکمل پابندی ہوتی تھی، آج دین پیچھے رہ گیا دنیا غالب آگئی، اللہ کی صفت رزاقیت کا یقین آجائے، ایسی اصلاح فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اخلاقیات اور اتباع سنت میں چاہے وساوس آتے رہیں، اس کی طرف توجہ کیے بغیر اپنا کام کرتے جایئے، وساوس کی طرف توجہ مت کیجیے، جتنی زیادہ توجہ دیں گے، اتنے وساوس آئیں گے۔

ممکن ہے جس کام کو آپ گناہ سمجھ رہے ہوں، وہ گناہ نہ ہو، اپنے شیخ صاحب کے سامنے اس گناہ کا اظہار کر کے علاج پوچھ لیجیے، وہ بتائیں گے اور فائدہ ہوگا، خط وکتابت کے ذریعہ بھی اصلاح کا طریقہ رائج ہے؛ لیکن کبھی کبھی شیخ کی خدمت میں بھی رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، آپ شیخ صاحب کے مشورے سے تھوڑے دن کی چھٹی لے کر ان کی خدمت میں جا سکتے ہیں۔

وساوس دور کرنے کے لیے روزانہ فجر کی نماز بعد دس مرتبہ اور مغرب کی نماز بعد دس مرتبہ چوتھا کلمہ جس میں "**یحی ویمیت**" کے بعد "**بیده الخیر**" بھی پڑھیے۔

اور درود شریف کی کثرت رکھیے، اپنے شیخ کی اجازت سے درود شریف کی مقدار متعین کر لیجیے یا ۳۰۰ مرتبہ درود شریف پڑھتے رہیے۔

کوئی بھی صورت ہو، نماز کے سلسلے میں سستی نہ کیجیے، ہر نماز کے بعد آیت الکرسی ضرور پڑھیے، تنگی رزق کی وجہ سے پریشانی اور فکر تو رہتی ہے، مگر گھبرانے کی ضرورت نہیں، اللہ پر پورا توکل کرنا چاہیے۔

اور دماغ میں یہ بات مستحضر رکھنی چاہیے کہ تقدیر میں جو رزق لکھا ہوا ہے، اس سے زیادہ ملنے والا نہیں ہے اور اس میں کمی کرنے کی کسی کے اندر طاقت نہیں ہے، رزق کے لیے کوشش ضرور کیجیے۔[1] پھر بھروسہ اللہ پر کیجیے اللہ جس حالت میں رکھے اس پر خوش رہیے، ہاں دعا ضرور کرتے رہنا چاہیے، آپ کے حسن ظن پر مجھے خوشی ہے یہ آپ کا حسن عقیدت ہے دعا فرمائیں اللہ تعالی آپ کے حسن ظن کے مطابق مجھے بنادے۔ آمین، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) أن السعي بالإجمال لا ينافي الاعتماد على الملك المتعال، كما قال تعالى جل جلاله: {وكأين من دابة لا تحمل رزقها الله يرزقها وإياكم} [العنكبوت: ۶۰] فالحديث للتنبيه على أن الكسب ليس برازق، بل الرازق هو الله تعالى، لا للمنع عن الكسب فإن التوكل محله القلب فلا ينافيه حركة الجوارح، مع أنه قد يرزق أيضا من غير حركة، بل بتحريك غيره إليه يصل رزق الله ببركته كما يستفاد العموم من قوله تعالى: {وما من دابة في الأرض إلا على الله رزقها} [هود: ۶]. (مرقاة المفاتيح-ملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۸/ ۳۳۲۰، باب التوكل والصبر، ط: دار الفكر- بيروت)

عن عوف بن مالك الأشجعي، قال: كنا نرقى في الجاهلية فقلنا يا رسول الله كيف ترى في ذلك فقال: »اعرضوا على رقاكم. لا بأس بالرقى ما لم يكن فيه شرك«. (صحیح مسلم: ۶۴-۲۲۰۰)

باب التعویذ

(تعویذ کا بیان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

[تعویذ کا بیان]

[۱] تعویذ کی کتابوں سے تعویذات بنانا اور اس میں اجازت کا ضروری ہونا

۳۳۲-سوال: اعمال قرآنی اور اس جیسی دوسری تعویذ کی کتابوں سے عامل خود اپنے لیے تعویذات بنا سکتا ہے؟ یا تعویذ بنا کر دوسروں کو دے سکتا ہے؟ کیا اس میں کسی کی اجازت لینا ضروری یا نہیں؟

حاجی محمد حسین

الجواب حامداومصلیا:

تعویذات آپ خود اپنے لیے بھی لکھ سکتے ہیں اور دوسروں کو لکھ کر دے بھی سکتے ہیں، جائز ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۷/۱۱/۱۹۷۶ء

[۲] مستند عامل کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق عمل کرنا

۳۳۳-سوال: ایک نوجوان تقریباً دو سال سے ایک بیماری میں مبتلا ہے، اس کی طبیعت میں سکون نہیں ہے، طبیعت دن بدن بگڑتی ہی جا رہی ہے، اطباء اور عاملین نے بہت علاج کیا؛ لیکن خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا، اس کے بعد ہم لوگ اس کو ڈابھیل میں مولانا خیر الرحمن پٹھان صاحب کے پاس لے گئے، انہوں نے اس کی جانچ کر کے یہ بتلایا کہ اس کو جسمانی بیماری بھی ہے اور جن کا بھی اثر ہے، پھر جسمانی بیماری کے ازالہ کے لیے انہوں نے دوائیاں دی اور جن کے اثرات دور کرنے کے لیے تعویذات دیئے، اس میں ایک عمل یہ بتایا کہ اس مسحور آدمی کے مکان میں ایک گوشہ میں ایک میٹر جگہ کے برابر چنا لگایا جائے، پھر ایک میٹر نیا سفید کپڑا اس

پر بچھا کر اس پر مسحور (سحر زدہ، جس پر اثر ہے) کو بٹھایا جائے، اس کے سامنے ایک کالا نیا مٹکا الٹا رکھا جائے، جس پر ایک نئے مٹی کے برتن میں سرسوں کا تیل ڈالا جائے، پھر ایک لمبا تعویذ اس چھوٹے برتن میں رکھ کر جلایا جائے اور مٹکے کے اردگرد پھول رکھے جائیں، اس کے بعد ایک آدمی اس مسحور کے داہنے کان میں آہستہ آہستہ اذان دے، دوسرا آدمی بائیں کان میں اقامت کہے، تیسرا آدمی سورۂ مزمل اور چوتھا آدمی سورۂ جن کی اس کے سامنے تلاوت کرے اور اس پر دم کرتا رہے، پانچواں آدمی ایک دوسرا تعویذ جلا کر اس کا دھواں اس شخص کی ناک میں پہنچائے، جب اس مٹی کے برتن میں رکھا تعویذ آدھا یا چوتھائی حصہ جل جائے، تو عمل بند کر دیا جائے اور جب تک چوتھائی حصہ نہ جل جائے، اس وقت تک وہ آدمی اس میں رکھے ہوئے تعویذ کو دیکھتا بھی رہے، اس طرح یہ عمل مسلسل تین دن تک کرتے رہنے سے ان شاء اللہ فائدہ گا، یہ پورا عمل مولانا پٹھان صاحب کا بتایا ہوا ہے، اس پر میرا سوال یہ ہے کہ اس طرح عمل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس طرح عمل کرنے سے قرآن کریم کی بے عزتی تو لازم نہیں آئے گی؟ امید ہے کہ تسلی بخش جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں خلاف شریعت کوئی بات نہیں، اس لیے عامل کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق عمل کرنا جائز ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ
۸/۵/۱۹۷۷ء

[۳] درود تاج کی حقیقت اور اس کے پڑھنے کا حکم

۳۳۴-سوال: درود تاج اور درود جیکل، جس کے سات ابواب ہیں، ان پر بہت سے گاؤں کی عورتیں بہت زیادہ یقین رکھتی ہیں، تو کیا ان کا پڑھنا جائز ہے؟ نیز حدیث شریف سے کون سا درود پڑھنا ثابت ہے؟ جس کا پڑھنا باعث ثواب اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بنتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صحیح احادیث کی روشنی میں مذکور درود شریف کا ثبوت نہیں ہے۔[1] اس لیے صرف ان درود شریف

---

(۱) مولانا رشید احمد گنگوہی تحریر فرماتے ہیں: آنچہ فضائل درود تاج کہ بعض جہلا بیان کنند غلط است وقدر آں بجز بیان شارع علیہ السلام معلوم شدن محال وتالیف آں درود بعد مرور صدہا سال واقع شد پس چگونہ درود ایں صیغہ را موجب ثواب قرار دادہ شود وآنچہ در احادیث صحاح صیغہائے درود وارد شدہ آں را ترک کردن وایں را موعود بہ ثواب جزیل پنداشتن ودرو ساختن بدعۃ ضلالۃ ہست =

کو پڑھنا چاہیے، جو صحیح احادیث اور صحیح سند سے ثابت ہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ (۲۸/۳/۱۹۷۷ء)

[۴] تعویذ پر اجرت لینا جائز ہے

۳۳۵-سوال: میں یہاں باپونگر، بلساڑ میں پڑھاتا ہوں، مجھے معمولی تنخواہ ملتی ہے اور مکان کا کرایہ اور گھر کا خرچ اتنا ہے کہ تنخواہ اس کے لیے ناکافی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے میں ہر وقت پریشان رہتا ہوں، گھر کے گذر بسر کے لیے میں کچھ تعویذات کا کام بھی کرتا ہوں، کیا یہ میرے لیے جائز ہے یا نہیں؟ اور میں اس پر اجرت لے سکتا ہوں یا نہیں؟ کیوں کہ میرے پاس اس کے علاوہ دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے، یہاں کچھ لوگ اپنی باتوں سے انتشار برپا کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ تعویذات لینا، کرنا، کرانا اور ان پر اجرت لینا سب حرام ہے۔ میں نے ان سے یہ کہا کہ اگر تعویذ دینا حرام ہوتا، تو ہمارے علمائے کرام اس موضوع پر کتابیں نہ لکھتے، اب آپ سے گزارش ہے کہ اس نزاع کا تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

تعویذ کا کام اگر ان کی شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے کسی کو دھوکہ دیئے بغیر کرے، تو اس پر اجرت اور معاوضہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (۱) البتہ عورتوں سے اختلاط اور بلا پردہ ان سے بات چیت کرنا حرام

= وچوں آں کہ در آں کلمات شرکیہ مذکور اند، اندیشۂ خرابی عقیدۂ عوام است؛ لہٰذا ورد آں ممنوع ہست پس تعلیم درود تاج ہمانا سم قاتل بعوام سپردن است کہ صدہا مردم بفساد عقیدہ وشرکیہ مبتلا شوند وموجب ہلاکت ایشاں گردد۔ (فتاویٰ رشیدیہ مع تالیفات رشیدیہ-مولانا رشید احمد گنگوہی، ص:۱۴۹، کتاب البدعات، درود تاج کا حکم، ط: مکتبۃ الحق ممبئی)

فتاویٰ رحیمیہ: ۲/ ۸۲، کتاب السنۃ والبدعۃ، درود تاج پڑھنا بدعت ہے، ط: دارالاشاعت، کراچی۔

(۱) عن أبي سعيد الخدري، أن ناسا من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كانوا في سفر، فمروا بحي من أحياء العرب، فاستضافوهم فلم يضيفوهم، فقالوا لهم: هل فيكم راق؟ فإن سيد الحي لديغ أو مصاب، فقال رجل منهم: نعم، فأتاه فرقاه بفاتحة الكتاب، فبرأ الرجل، فأعطي قطيعا من غنم، فأبى أن يقبلها، وقال: حتى أذكر ذلك للنبي صلى الله عليه وسلم، فأتى النبي صلى الله عليه وسلم فذكر ذلك له، فقال: يا رسول الله والله ما رقيت إلا بفاتحة الكتاب فتبسم وقال: »وما أدراك أنها رقية؟« ثم قال: » خذوا منهم، واضربوا لي بسهم معكم. (صحيح المسلم: ۲/ ۲۲۴، رقم الحديث: ۶۵- (۲۲۰۱) كتاب السلام، باب جواز أخذ الأجرة على الرقية، ط: البدر - ديوبند)

قال النووى في ذيل الحديث المذكور: (خذوا منهم واضربوا لي بسهم معكم) هذا تصريح بجواز أخذ الأجرة على الرقية بالفاتحة والذكر وأنها حلال لا كراهة فيها. (المصدر السابق)

ہے۔ [1] میں نے اپنی کتاب ''عقائد اسلام'' میں اس کے جواز کے متعلق لکھا ہے، اسے پڑھ لیا جائے اور لوگوں کو بھی بتلادیا جائے، آپ بھی احتیاط سے کام لیں، تاکہ امت میں فتنہ نہ پھیلے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۵] دم کیے ہوئے پانی سے کسی مریض کو غسل دینا

۳۳۶-سوال: بہت سی مرتبہ کچھ وظائف پڑھ کر پانی پر دم کر کے اس پانی کے ذریعہ جادو، جن اور بھوت کے مریض کو اور سحر زدہ کو غسل دیا جاتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ کیا اس کا کوئی فائدہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اس کا جواب تو کسی عامل ہی سے دریافت کرلیا جائے کہ اس کے استعمال میں نقصان ہوگا یا فائدہ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۱۹۸۶/۱۰/۲۶ء

[۶] کیس میں کامیابی اور نماز میں خشوع وخضوع کے لیے ایک خاص عمل

۳۳۷-سوال: میرے لڑکے سے مورخہ ۴/ ۵/ ۱۹۸۳ء کو ''کیوڑی'' میں موٹر سائکل سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا، اس حادثہ میں ایک خاتون کے پیر میں چوٹ لگ گئی تھی، جس کی وجہ سے پیر فیکچر ہوا تھا، اس کا مانگرول کورٹ میں کیس چل رہا ہے، جس کا فیصلہ ۱۲/ ۱۰/ ۱۹۸۳ء، کو ہے۔ کوئی دعا یا قرآن شریف کی کوئی ایسی آیت لکھ کر بھیجیے کہ میرا لڑکا بے گناہ ثابت ہوکر چھوٹ جائے، میں بہت ہی پریشانی میں ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بدلہ ضرور عطا کرے گا، اس غریب کا اتنا کام ضرور کر دیجیے، تو میں آپ کا احسان مند ہوں گا، ساتھ میں جوابی کاغذ بھیجا ہے، اس پر جواب لکھیے، اگر کوئی تعویذ بناتے ہوں، تو تعویذ بنا کر بھیجیں۔

---

(۱) والأصل فيه أنه لا يجوز أن ينظر إلى وجه امرأة أجنبية مع الشهوة لما روينا إلا للضرورة إذا تيقن بالشهوة أو شك فيها ... وفي نظر الطبيب إلى موضع المرض ضرورة فيرخص لهم إحياء لحقوق الناس ودفعا لحاجتهم فصار كنظر الختان والخافضة، وكذا ينظر إلى موضع الاحتقان للمرض؛ لأنه مداواة، وكذا للهزال الفاحش؛ لأنه أمارة المرض، ... وينبغي للطبيب أن يعلم امرأة إن أمكن؛ لأن نظر الجنس أخف، وإن لم يمكن ستر كل عضو منها سوى موضع المرض ثم ينظر، ويغض بصره عن غير ذلك الموضع ما استطاع؛ لأن ما ثبت للضرورة يتقدر بقدرها. (تبيين الحقائق-فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ٧٤٣هـ) :٦/ ١٧ كتاب الكراهية، فصل في النظر والمس، ط: المطبعة الكبرى-القاهرة)

(۲) مجھے نماز میں شیطان کی طرف سے وسوسے آتے ہیں، تو کوئی ایسی دعا بھیجیے کہ نماز صحیح ہو جائے، اور دین و دنیا دونوں صحیح ہو جائے، یہ ایک بہت بڑا نیکی کا کام ہے، دل پر قابو نہیں رہتا اور غلط غلط وسوسے پیدا ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے دل بہت ہی بے چین رہتا ہے، دعا یا قرآن شریف کی کوئی آیت لکھ کر مہربانی فرمائیں، اور یہ کب پڑھنا ہے، اس کی وضاحت فرمائیں تا کہ عمل کرنے میں غلطی واقع نہ ہو۔

الجواب حامداً ومصلياً:

مذکورہ پریشانی دور کرنے کے لیے صبح شام ایک سو ایک (۱۰۱) مرتبہ درود شریف پڑھتے رہیں، کیس میں کامیابی کے لیے فیصلہ ہونے تک صبح شام ایک سو ایک (۱۰۱) مرتبہ "رب إني مغلوب فانتصر" پڑھتے رہیں۔

برے خیالات اور وسوسوں کو دور کرنے کے لیے صبح شام اکہتر مرتبہ (۷۱) "لاحول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم" پڑھیں، لیکن یاد رہے کہ موٹر سائیکل چلانے میں آپ کے لڑکے کی غلطی سے اس بہن کا پیر فیکچر ہوا ہو، تو صلح کرنے کے بعد علاج ومعالجہ کا خرچہ دینا ضروری ہے۔[۱] واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیا غفرلہ

[۷] تعویذ وعملیات کی اجرت کا مسئلہ

۳۳۸-سوال: بیمار شخص یا ڈرے ہوئے شخص کو عمل کرنے والے کا عمل کرنے کے بدلہ میں معاوضہ لینا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

(۱) بیمار یا ڈرے ہوئے شخص پر عمل اور تعویذ کرنے والے کا معاوضہ لینا جائز ہے۔[۲] البتہ ایسے

---

(۱) (وضمن عاقلة كل فارس) أو راجل (دية الآخر إن اصطدما وماتا منه) فوقعا على القفا. (الدر المختار) قال الشامي: (قوله إن اصطدما) أي تضاربا بالجسد وهذا ليس على إطلاقه، بل محمول على ما إذا تقابلا لما في الاختيار سار رجل على دابة فجاء راكب من خلفه فصدمه فعطب المؤخر لا ضمان على المقدم، وإن عطب المقدم فالضمان على المؤخر وكذا في سفينتين. (رد المحتار: ۶/ ۶۰۵، كتاب الديات، باب جناية البهيمة والجناية عليها، ط: دار الفكر-بيروت)

رجل سار على دابة فجاء راكب من خلفه فصدمه فعطب المؤخر لا ضمان على المقدم، وإن عطب المقدم فالضمان على المؤخر، وكذا في السفينتين. ولو كانا دابتين وعليهما راكبان قد استقبلتا واصطدمتا فعطبت إحداهما فالضمان على الآخر. (الاختيار لتعليل المختار - عبد الله بن محمود، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳هـ) ۵/ ۴۹، كتاب الديات، فصل ضمان الإنسان فعله، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة)

(۲) والثانية: مسألة الأجرة على التعوذ، والرقية، وهي حلال لعدم كونها عبادة. (فيض الباري-الكشميري (م: ۱۳۵۳هـ)، كتاب الإجارة، باب ما يعطى في الرقية على أحياء العرب بفاتحة الكتاب، ط: دابهيل-سورت) =

شخص سے علاج کرانا چاہیے، جو کفریہ اور غیر اسلامی کلمات نہ بکتا ہو۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔
کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

[۸] بھوت، چڑیل، ڈائن اور آسیب وغیرہ کی حقیقت

۳۳۹-سوال: اللہ رب العزت نے جتنی مخلوق پیدا کی ہے، ان میں بھوت، چڑیل، ڈائن اور آسیب کا تعلق کس قوم سے ہے؟ جنات سے یا شیاطین سے؟ اور اگر یہ مخلوق نہیں ہیں تو کیا ان چار ناموں کو لوگوں نے گھڑ لیا ہے؟ یا یہ چار الگ الگ مخلوق ہیں، اگر یہ مخلوق ہیں، تو کیا ان کا ثبوت کسی کتاب سے ہے؟
عبد القادر حاجی نثیر محمد

الجواب حامدا ومصليا:

(۱) ڈائن انسانوں میں سے ہوتی ہے اور جنات وشیاطین کی مدد سے ناپاک علم حاصل کر کے لوگوں کو تکلیف پہنچاتی ہے، یہ ڈائن پس ماندہ قوم: بھنگی اور روبلوں (صوبہ گجرات کی ایک رذیل قوم ہے) میں سے زیادہ ہوتی ہے، ان میں بعض مرد بھی ناپاک علم سیکھ کر لوگوں کو تکلیف پہنچاتے رہتے ہیں۔(۱)

(۲) آسیب: جنات کے اثرات کو کہتے ہیں، جو کبھی کسی پر ظاہر ہو جاتا ہے؛ لہٰذا یہ جنات ہی کی ایک قسم ہے۔(۲)

=جوزوا الرقية بالأجرة ولو بالقرآن لأنها ليست عبادة محضة بل من التداوي. (رد المحتار: ۶/ ۵۷، كتاب الاجارة ،مطلب في الاستئجار على المعاصي، ط: دار الفكر)
تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تعویذ پر اجرت لینا جائز ہے۔

(۱) المراد بالسحر ما يستعان في تحصيله بالتقرب إلى الشيطان مما لا يستقل به الإنسان، وذلك لا يستتب إلا لمن يناسبه في الشرارة وخبث النفس. (تفسير البيضاوي (أنوار التنزيل وأسرار التأويل) - ناصر الدين أبو سعيد عبد الله بن عمر بن محمد الشيرازي البيضاوي (م: ۶۸۵هـ): ۱/ ۹۷، عند قوله تعالى: يعلمون الناس السحر، ت: محمد عبد الرحمن المرعشلي، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت، الطبعة: الأولى - ۱۴۱۸هـ)
ڈائن: (ڈا-ان) [ہ-ا-مث] جادوگرنی، جو خیال ہے کہ بچوں کا کلیجہ کھا جاتی ہے، بدصورت عورت۔ (فیروز اللغات: ۶۷۷)

(۲) آسیب: جن، پری، دیو، پریت، سایا۔ (فیروز اللغات - مولوی فیروز الدین، ص: ۲۱، ط: نعیمیہ، دیو بند)
قلت: الصرع صرعان: صرع من الأرواح الخبيثة الأرضية، وصرع من الأخلاط الرديئة. والثاني: هو الذي يتكلم فيه الأطباء في سببه وعلاجه. وأما صرع الأرواح، فأئمتهم وعقلاؤهم يعترفون به، ولا يدفعونه، ويعترفون بأن علاجه بمقابلة الأرواح الشريفة الخيرة العلوية لتلك الأرواح الشريرة الخبيثة، فتدافع آثارها، وتعارض أفعالها وتبطلها، وقد نص على ذلك بقراط في بعض كتبه، فذكر بعض علاج الصرع، وقال: هذا إنما ينفع من الصرع الذي سببه=

(۳-۴) بھوت اور چڑیل ناپاک شیاطین میں سے ہوتے ہیں، آسمانوں کی باتیں سننے کے لیے جانے کی وجہ سے فرشتے ان پر شہاب ثاقب پھینکتے ہیں، جس سے بعض تو جل جاتے ہیں اور بعضوں کو تکلیف پہنچتی ہے جو بعد جنگلوں میں بھٹکتے رہتے ہیں اور آنے جانے والوں کو ستاتے ہیں، لوگ انہی کو بھوت اور چڑیل کہتے ہیں۔[۳] واللہ اعلم بالصواب

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۲۳/۱۲/۱۹۷۶ء

[۹] بھوت، چڑیل اور ڈائن کی حقیقت کا انکار کرنا

گذشتہ سے پیوستہ

۳۴۰-سوال: بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بھوت، چڑیل اور ڈاکن نام کی مصیبت مستقل کوئی مخلوق نہیں ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

عبدالقادر حاجی فقیر محمد

الجواب حامدا ومصلیا:

پہلے سوال کے یہ بات ظاہر ہے کہ یہ کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۲۳/۱۲/۱۹۷۶ء

=الأخلاط والمادة. وأما الصرع الذي يكون من الأرواح، فلا ينفع فيه هذا العلاج. (زاد المعاد في هدي خير العباد -محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية (م:۷۵۱ھ): ۶۱/۴، فصل هديه صلى الله عليه وسلم في علاج الصرع، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت، الطبعة: السابعة والعشرون، ۱۴۱۵ھ ۱۹۹۴م)

فان حدوث المرض بمس الشيطان ثابت بالكتاب والسنة. (التفسير المظهري-المظهري، محمد ثناء الله (م:۱۲۲۵ھ): ۳۹۴/۱، ت: غلام نبي التونسي، ط: مكتبة الرشدية-الباكستان، الطبعة: ۱۴۱۲ھ)

(۳) قال الله تعالى: ﴿وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَن يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَّصَدًا﴾. [۷۲-الجن:۹]

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ.

(۳۹-الزمر:۹)

کتاب العلم

(علم اور متعلقات علم)

O

[علم اور متعلقات علم]

[۱] ایک عبارت میں ''سنت'' کا صحیح مفہوم

۳۴۱-سوال: ''فضائل حج، مصنفہ حضرت مولانا زکریاؒ'' کے اجمالی آداب میں ایک عبارت لکھی ہے، جس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، آپ سے درخواست ہے کہ اس کا مطلب سمجھادیں۔

حضرت اقدس شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہ نے تفسیر عزیزی میں تحریر فرمایا ہے: جو شخص آداب و مستحبات میں سُستی کرتا ہے، وہ سنت سے محرومی کی بلا میں گرفتار کیا جاتا ہے اور جو سنت کی ادائیگی میں سستی کرتا ہے، وہ فرائض سے محرومی کی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے۔

یہاں سنت کا معنیٰ سمجھ میں نہیں آیا، نیز مذکورہ عبارت کی تشریح کیا ہوگی؟

الجواب حامداو مصلیا:

جب کوئی شخص نیکی کرتا ہے، تو اس کو اللہ تعالیٰ مزید نیکی کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔[1] اس لیے سنن

---

(۱) قال اللہ تعالی:- إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ. [-۲۱ العنکبوت:۴۵]

قال: محمد ثناء اللہ، المظهري (م:۱۲۲۵ھ): هذه الجملة تعليل للأمر بإقامة الصلاة عن الفحشاء أى ما ظهر قبحه شرعا وعقلا وَالْمُنكَرِ للانتهاء عن المعاصي من حيث أنها تذكر الله وتورث للنفس خشية. قال البغوي: روي عن أنس رضي الله عنه قال كان فتى من الأنصار يصلي الصلوات الخمس مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، ثم لم يدع شيئا من الفواحش إلا ركبه، فوصف لرسول الله صلى الله عليه وسلم حاله، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن صلاته تنهاه يوما، فلم يلبث ان تاب وحسن حاله... قال البغوي: قال ابن عباس وابن مسعود في الصلوة منتهى، ومزدجر عن معاصى، فمن لم تأمره صلاته بالمعروف، ولم تنهه عن المنكر لم يزدد صلاته من الله إلا بعدا. (التفسير =

زوائد اور مستحبات کی پابندی کرنے والے خوش نصیب افراد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں ادا کرنے کی توفیق ملتی ہے۔ سنتیں ادا کرنے سے واجبات اور واجبات سے فرائض ادا کرنے کی توفیق ہوتی ہے۔ اس سے برخلاف برائی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس سے خیر کے کام کی توفیق سلب کر لی جاتی ہے، مستحب چھوڑنے سے سنتیں اور سنتیں چھوڑنے سے واجبات اور واجبات کے چھوڑنے سے فرائض اور فرائض چھوڑنے حرام کاموں میں آدمی مبتلا ہوتا ہے۔ اور حرام کاموں میں مبتلا ہونے سے ایمان سے خارج ہو جانے کا خطرہ ہے۔ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آدمی جان بوجھ کر چھوڑتا ہے کافر ہو جائے گا۔ (کافر ہو جانے کا خطرہ ہے)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] "وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العلمين" کا مطلب

۳۴۲-سوال: علماء حضرات وعظ وتقریر کے اخیر میں "وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين" کہتے ہیں،[۲] اس کا مطلب کیا ہے؟

الجواب حامداو مصليا:

اس کا ترجمہ ہے: "یہ ہماری آخری پکار ہے کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہیں، جو تمام جہاں کا پالنہار ہے"۔

[۳] مسلم ٹیم کی کس جیت میں قرآن خوانی کرنا

۳۴۳-سوال: کرکٹ کی مسلم ٹیم کی جیت کی خوشی میں قرآن خوانی کرانا جائز ہے یا نہیں؟ اور قرآن خوانی کے بعد شیرینی، پیڑا اور اس قسم کی دوسری مٹھائیاں تقسیم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

ایسے موقع سے قرآن خوانی کرانا اور اس میں شیرینی تقسیم کرنا؛ سب ناجائز ہے، حرام کام کے لیے

= المظهري: ۷/ ۲۰۵، ت: غلام نبي التونسي، ط: مكتبة الرشدية - الباكستان)
مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: تفسیر ابن کثیر: ۶/ ۲۸۰، ط: دار طیبہ۔

(۱) من ترك الصلاة متعمدا، فقد كفر جهارا. (المعجم الأوسط: ۳/ ۳۴۳، رقم: ۳۳۴۸، دار الحرمين - القاهرة)

(۲) قرآن کریم کے بیان کے مطابق اہل جنت کی آخری دعاء ہوگی: وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. [۱۰-یونس: ۱۰] اسی سے استیناس کر کے واعظین یہ دعاء پڑھتے ہیں۔

قرآن خوانی کرنے سے ایمان کا خطرہ ہے۔شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے حرام مال بسم اللہ پڑھ کر کھانے سے ایمان سے نکل جانے کا خطرہ ہے۔(۱)

[۴] کلونجی میں موت کے سوا ہر مرض سے شفاء ہے

۳۴۴-سوال: کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی دوا بتائی ہے، جس میں سوائے موت کے ہر بیماری کا علاج ہو؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

"الحبۃ السوداء" (یعنی کالا دانہ)، جس کا ترجمہ "کلونجی" سے کیا جاتا ہے، اس کے متعلق بخاری شریف: ۲/ ۸۴۹ میں ہے کہ اس میں موت کے علاوہ ہر (رطوبت والی)[۲] بیماری سے شفاء ہے۔(۳)

دوسرا ترجمہ اس کا "رائی" سے کیا گیا ہے۔(بخاری، حاشیہ نمبر: ۳)[۴] حکماء نے اس کے بائیس سے

---

(۱) من قال عند ابتداء شرب الخمر، أو الزنا، أو أكل الحرام "بسم الله" كفر. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۲۰۸، ط: یاسر ندیم - دیوبند)

(۲) لم اجد هذا القيد في البخاري، و أشار إليه ابن حجر في شرحه ناقلا عن بعض العلما ثم رد عليه ردا منيفا، حيث قال: و قال الخطابي: قوله من كل داء هو من العام الذي يراد به الخاص ... وإنما المراد أنها شفاء من كل داء يحدث من الرطوبة. و هكذا نقل اختيار أبي بكر ابن العربي هذا القول، ثم نقل كلام الشيخ أبي محمد بن أبي جمرة ما معناه: تكلم الناس في هذا الحديث و خصوا عمومه و ردوه إلى قول أهل الطب و التجربة، و لا خفاء بغلط قائل ذلك؛ لأنا إذا صدقنا أهل الطب - و مدار علمهم غالبا إنما هو على التجربة، التي بناؤها على ظن غالب - فتصديق من لا ينطق عن الهوى أولى بالقبول من كلامهم انتهى. و قد تقدم توجيه حمله على عمومه بأن يكون المراد بذلك ما هو أعم من الأفراد و التركيب، و لا محذور في ذلك، و لا خروج عن ظاهر الحديث، و الله أعلم. (فتح الباري شرح صحيح البخاري: ۱۰/ ۱۴۵، ط: دار المعرفة - بيروت، ۱۳۷۹ھ)

(۳) عن خالد بن سعد قال: خرجنا و معنا غالب بن أبجر، فمرض في الطريق، فقدمنا المدينة، و هو مريض فعاده ابن أبي عتيق، فقال لنا: عليكم بهذه الحبة السوداء! فخذوا منها خمسا أو سبعا فاسحقوها ثم اقطروها في أنفه بقطرات زيت في هذا الجانب و في هذا الجانب فإن عائشة حدثتني أنها سمعت النبي صلى الله عليه و سلم يقول: "إن هذه الحبة السوداء شفاء من كل داء إلا من السام". قلت: و ما السام؟ قال: الموت. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۴۸-۸۴۹، رقم: ۵۳۶۳ ☆ ۵۳۶۴، كتاب الطب، باب الحبة السوداء، ط: البدر - ديوبند)

(۴) و نقل إبراهيم الحربي في غريب الحديث عن الحسن البصري أنها الخردل. (فتح الباري شرح صحيح البخاري: ۱۰/ ۱۴۵، ط: دار المعرفة - بيروت، ۱۳۷۹ھ)

زائد فوائد بیان کیے ہیں: لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے فرمان پر یقین کر کے عمل کریں گے، تو ان شاء اللہ فائدہ ہوگا۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: طب نبوی ص ۵۰) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] چودہویں صدی ہجری کا اختتام کب ہوگا؟

۳۴۵-سوال: اسلامی تاریخ کے حساب سے ۱۳۹۹ھ کا سال چل رہا ہے، ذی الحجہ کا مہینہ ختم ہونے پر ۱۴۰۰ھ کا سال شروع ہوگا، بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ۱۳۹۹ھ کا ذی الحجہ کا مہینہ ختم ہوگا، تو چودہویں صدی ختم ہوجائے گی؛ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ ابھی ایک سال کے بعد جب ۱۴۰۰ھ کا سال ختم ہوگا، تب چودہویں صدی ختم ہوگی، تو ان دونوں میں صحیح کیا ہے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکور سوال کا تعلق حساب سے ہے، آپ غور کریں کہ ۱۳۹۹ھ پر بارہ مہینے جب گزر جائیں گے، تب ۱۴۰۰ھ کا سال پورا ہوگا، اور جب ۱۴۰۰ھ کے بعد بارہ مہینے گزر جائیں گے، تو ۱۴۰۱ھ ختم ہونا کہلائے گا، لہٰذا جو لوگ ذی الحجہ کا مہینہ ختم ہونے پر چودہویں صدی کے ختم ہونے کی بات کہتے ہیں، وہی صحیح ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] کیا کسی غیر مسلم کو کافر کہنا جائز ہے؟

۳۴۶-سوال: ایک آدمی غیر مسلم یا دوسری کسی قوم سے تعلق رکھتا ہے، اللہ کو نہیں مانتا ہے اور وہ مورتیوں کو پوجتا ہے، تو کیا اس کو کافر کہہ سکتے ہیں؟ مشتاق علی عبد اللہ میتی

الجواب حامداً ومصلیاً:

جائز ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۱/۹/۱۹۷۷ء

(۱) لفظ کفر کا اطلاق بعض گناہ کبیرہ پر ہوتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں ابن رجب حنبلیؒ نے تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ومنهم من فرق بين إطلاق لفظ الكفر فجوزه في جميع أنواع الكفر سواء كان ناقلا عن الملة أو لم يكن، وبين إطلاق اسم الكافر، فمنعه إلا في الكفر الناقل عن الملة. (فتح الباري شرح صحيح البخاري-ابن رجب الحنبلي (م: ۷۹۵هـ): ۱/۱۳۲، كتاب الإيمان، من الدين الفرار من الفتن، ط: مكتبة الغرباء الأثرية - المدينة النبوية☆روائع التفسير (الجامع لتفسير الإمام ابن رجب الحنبلي): ۱/۴۳۰، سورة المائدة، قوله تعالى: ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الكافرون، جمع وترتيب: أبي معاذ طارق بن عوض الله بن محمد، ط: دار العاصمة - المملكة العربية السعودية)

[۷] اجتماعی ذکر جہری سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا لوگوں کو منع کرنا

۳۴۷-سوال: مطالعے کے دوران ایک حدیث میری نظر سے گزری ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے زمانے میں کچھ لوگ مسجد میں جمع ہوکر بہ آواز بلند ذکر کر رہے تھے، جب اس کی اطلاع حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ہوئی، تو دوڑتے ہوئے مسجد تشریف لائے اور ذکر واشغال کرنے والوں کو سخت لب ولہجہ میں یوں کہا کہ تم لوگوں نے اس بدعت کو کیوں ایجاد کر رکھا ہے؟[1] اور آپ نے فوراً اس کو بند کروایا۔

اس سے یہ بات بہ خوبی معلوم ہوتی ہے کہ مسجد میں لوگوں کا جمع ہوکر اجتماعی طور پر ذکر کرنا صحیح نہیں ہے، آپ سے گزارش ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس پر کیوں نکیر فرمائی؟ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں گے۔

الجواب حامداًومصلیاً:

ہوسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ آواز بلند ذکر کرتے ہوئے نہ سنا ہو؛ اس لیے انہوں نے اس کا انکار کردیا ہو۔[2] اس سلسلے میں مزید تفصیل پر آگر آپ مطلع ہوں، تو لکھیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] دنیا کے دو روشن قبرستان میں ایک عسقلان کا قبرستان کیوں؟

''فضائل حج'' میں مذکور ایک حدیث کے متعلق ضروری وضاحت

۳۴۸-سوال: شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ نے اپنی کتاب

---

(۱) علامہ شامیؒ نے ایک بحث کے ضمن میں صاحب بزازیہ کے حوالے سے ذکر فرمایا ہے:
لما صح عن ابن مسعود رضي الله عنه أنه أخرج جماعة من المسجد يهللون ويصلون على النبي -صلى الله عليه و سلم- جهرا، وقال لهم: ما أراكم إلا مبتدعين. (رد المحتار على الدر المختار:۳۹۸/۶، فصل في البيع، ط: دار الفكر -بيروت)

(۲) صاحب فتح القدیر علامہ زین الدین مناویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے حوالے سے جو مذکورہ بات نقل کی جاتی ہے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے، ملاحظہ فرمائیں: وأما ما نقل عن ابن مسعود من أنه رأى قوما يهللون برفع الصوت في المسجد، فقال: ما أراكم إلا مبتدعين، وأمر بإخراجهم فغير ثابت، وبفرض ثبوته يعارضه ما في كتاب الزهد لأحمد عن شقيق بن أبي وائل قال: هؤلاء الذين يزعمون أن عبد الله كان ينهى عن الذكر، ما جالسته مجلسا قط إلا ذكر الله فيه. (فيض القدير - المناوي(م:۱۰۳۱ھ):۴۵۸/۱، حرف الهمزة، رقم: ۱۷۵، ط: المكتبة التجارية-مصر)

فضائل اعمال میں ایک جگہ لکھا ہے کہ زمین میں دو قبرستان آسمان والوں کے یہاں ایسے روشن اور چمک دار ہیں، جیسے دنیا والوں کے یہاں سورج اور چاند؛ ان میں ایک قبرستان جنت البقیع کا ہے اور دوسرا عسقلان کا۔ (۱)
تو سوال یہ ہے کہ عسقلان کا قبرستان کہاں واقع ہے اور اس کی اس قدر خصوصیت کس وجہ سے ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اولاً تو آپ نے فضائل اعمال کا صفحہ نمبر نہیں لکھا ہے، اگر یہ آں حضرت ﷺ کا فرمان ہو تو ہمارا کام تو صرف ان کو مان لینا ہے، ان جیسے سوالوں ہی کی وجہ سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا یا مفتی حضرات صرف قانون کے جاننے والے ہوتے ہیں، ان کو قانون کی حکمتوں کا علم نہیں ہوتا ہے، جس طرح ایک وکیل قانون بتلاتا ہے؛ لیکن اس کی حکمت کیا ہے؟ اس کی نشان دہی اس کا کام نہیں ہے، اس سلسلے کی مزید معلومات کے لیے کتاب "المصالح العقلية للمسائل النقلية" دیکھی جاسکتی ہے۔ (۲)

دوسری بات یہ ہے کہ شیطان انسان کو طرح طرح سے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، مختلف طرح سے بہکاتا ہے، لوگوں کو اس طرح کے کاموں میں لگا کر آپ ﷺ کی احادیث اور آپ کے فرامین سے ان کے اعتقاد کو کمزور کرتا ہے، شریعت کے ہر حکم کو عقل کی میزان پر پرکھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ (۳)

شریعت کے احکامات کو عقل کی میزان پر پرکھنے والے ماضی میں گمراہ ہوگئے، جن کو معتزلہ اور خوارج کہا جاتا ہے، فلسفہ پڑھ کر اس طرح کے گمراہ فرقے وجود میں آئے تھے؛ اس لیے آپ شریعت کے احکام کی حکمتیں جاننے سے دور رہیں، اور ہر حکم کو عقل سے سمجھنے یا اُس کی وجوہ واسباب کے جاننے کے درپے

---

(۱) یہ بات اس حقیر کو نہ تو فضائل اعمال میں مل سکی اور نہ ہی کسی دوسری حدیث کی کتاب میں۔

(۲) المصالح العقلية للأحكام النقلية - الشيخ التهانوي رحمه الله تعالى۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں) بہ حاشیہ: مولانا جمیل احمد تھانویؒ، ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)

(۳) قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ [۷- الاعراف: ۱۶-۱۷] وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۝ [۴- النساء: ۱۱۹]
وأوجبت أيضا: أنه لا يحل أن يتوقف في امتثال أحكام الشرع - إذا صحت به الرواية - على معرفة تلك المصالح، لعدم استقلال عقول كثير من الناس في معرفة كثير من المصالح، ولكون النبي صلى الله عليه وسلم أوثق عندنا من عقولنا؛ ولذلك لم يزل هذا العلم مضنونا به على غير أهله؛ ويشترط له ما يشترط في تفسير كتاب الله، ويحرم الخوض فيه بالرأي الخالص، غير المستند إلى السنن والآثار. (حجة الله البالغة: ۱/۵۰-۵۱، مكتبه حجاز ديوبند)

نہ رہیں، اسی میں ہم بندوں کی بھلائی ہے، حکمتوں اور وجوہ کو سمجھنے کے لیے کسی دارالعلوم میں داخل ہو کر سات-آٹھ سال لگانے کی ضرورت ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ عوام کو جن احکام ومسائل کے بارے میں اشکال ہوتے ہیں، اگر وہ سات-آٹھ سال دارالعلوم میں پڑھ لیں، تو وہ اپنے اشکالات کے بارے میں خود ہی شرمندہ ہوں گے، اور اُن کو حقیر سمجھیں گے، اس لیے مصالح وحکم سمجھنا عوام کی ذمہ داری نہیں ہے، اُن کا کام عمل کرنا اور ماننا ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] نمرود کی ولادت اور اُس کی پرورش کے قصہ کی حقیقت

۳۴۹-سوال: اکثر علماء سے سنا گیا ہے اور قصص القرآن میں بھی یہ قصہ منقول ہے کہ قارون- جس نے ایک جنت بنائی تھی- کی ولادت ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میں ہوئی تھی، جس کے ٹوٹنے کے بعد صرف ماں اور ایک بچہ باقی بچ گئے تھے، عین اُسی وقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملک الموت کو حکم ہوا کہ ماں کی روح قبض کر لی جائے، چناں چہ صرف بچہ باقی رہ گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اُس بچہ کی پرورش کا پورا انتظام فرمایا، بالآخر وہ بڑا ہو گیا، اور اُس نے اپنے زمانہ کے نبی سے مقابلہ کرتے ہوئے کہا کہ تیرے کہنے کے مطابق اگر ہم نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں تو تیرا اللہ ہمیں کیا دے گا؟ نبی نے جواب دیا کہ جنت دے گا، تو اُس پر اُس نے کہا کہ جنت تو میں بھی بنا سکتا ہوں، پھر اُس نے جنت نما محل تعمیر کیا، اور جیسے ہی اُس نے اپنا پہلا قدم اُس میں رکھا، اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملک الموت کو اُس کی قبضِ روح کا حکم ہوا، اور اُس کی روح اُسی حالت میں قبض ہو گئی۔

مذکورہ قصہ اختصاراً پیش کرنے کے بعد اب سوال یہ ہے کہ یہ قصہ قارون کا ہے یا شداد کا؟ اور یہ قصہ صحیح بھی ہے یا افسانہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

یہ قصہ قارون یا شداد کا نہیں؛ بل کہ نمرود کا ہے، جس نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو آگ میں ڈالا تھا، اور اُس کی عمر چار سو سال سے زائد ہوئی تھی، قصہ یہ ہے کہ نمرود اپنی ماں کے ساتھ ایک کشتی میں سوار تھا، کشتی ٹوٹ گئی، جس کی وجہ سے اُس کی ماں پانی میں تختہ ہی پر مر گئی، لیکن دریا کی موجوں نے نمرود کو کسی

جنگل میں پھینک دیا اور ایک بھیڑیا، جس کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، اُس کے دودھ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اُس کی پرورش کا انتظام فرمایا، جب کچھ بڑا ہوا، تو اُسے جنات کے سپرد کردیا گیا، جنات کے ساتھ رہ کر وہ پلا بڑھا، پھر انسانوں میں آکر بادشاہ بن گیا، حصول بادشاہت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اُسے ایمان کی دعوت دی، تو وہ اُن کے مقابلہ پر اُتر آیا اور بالآخر عاجز آکر اُس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اُس آگ سے بچالیا۔

یہی وہ نمرود ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ملک الموت سے سوال فرمایا کہ کیا تجھے کبھی کسی کی روح قبض کرتے وقت رحم وہمدردی پیدا ہوئی ہے؟ تو ملک الموت نے جواب میں عرض کیا کہ اے اللہ! ایک مرتبہ جب کہ ایک کشتی پانی میں ٹوٹ گئی اور کشتی کے تمام لوگ غرق آب ہوگئے، صرف ایک عورت لکڑی کے تختہ پر سہارا لیے ہوئے تھی، اُسی حالت میں اُس سے ایک بچہ کی ولادت ہوئی تھی، عین اُسی موقع پر مجھے اس خاتون کی روح کے قبض کرنے کا حکم ہوا، تو اُس وقت مجھے اُس تنہا معصوم بچہ پر ہمدردی پیدا ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے ملک الموت سے ارشاد فرمایا کہ وہ بچہ یہی نمرود ہے، جس نے میرے بھیجے ہوئے نبی حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کو آگ میں ڈالا۔ مذکورہ قصہ مثنوی شریف میں مولانا جلال الدین رومیؒ نے ذکر فرمایا ہے۔ فقط، واللہ اَعلم بالصواب۔ (مثنوی شریف: ۶/ ۴۶۴)[1]

[۱۰] کیا ابلیس فرشتوں کا سردار اور بہت بڑا عبادت گذار تھا؟

۳۵۰-سوال: کیا ابلیس فرشتوں کا سردار تھا؟ وہ خود فرشتہ تھا؟ ہم نے سنا ہے کہ وہ بہت بڑا عبادت گذار تھا، کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ابلیس چوں کہ فرشتوں میں کافی عرصہ تک رہا؛ اس لیے اُس کا شمار فرشتوں میں ہوتا تھا، لیکن وہ اپنی جماعت میں فرشتہ تھا یا جنات؟ اس بارے میں علماء کے دو اقوال ہیں، ایک قول کے مطابق وہ فرشتہ ہی تھا، فرشتوں ہی کی ایک قسم جسے جنات کہا جاتا ہے، اُن میں سے تھا، اور جنات کی یہ قسم دنیوی جنات کے علاوہ مخلوق ہے، ابلیس چوں کہ فرشتوں کے جنات کی قسم میں سے تھا، اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدے کا

(۱) دیکھیے: معارف مثنوی، شرح مثنوی اُردو، از: حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب، تحت عنوان: حکایت کفران نمرود، ص: ۱۹۱، ط: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند۔

حکم دیگر فرشتوں کی طرح اُس پر بھی نافذ تھا، اگر وہ از قسم فرشتہ نہ ہوتا، تو وہ سجدے کے حکم میں شامل ہی نہ ہوتا، اور سجدہ نہ کرنے کی بناء پر نافرمان بھی ثابت نہ ہوتا۔ (آکام المرجان: ۱۵۶)[1]

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ سجدے کا حکم تمام فرشتوں کو نہیں تھا؛ بل کہ اُن میں سے جو قسم جنات کی تھی، اُن ہی کو یہ حکم تھا؛ لہٰذا ابلیس سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے نافرمان ٹھہرا، اور اُس کی جماعت کے دیگر فرشتے فرماں بردار ثابت ہوئے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۶)[2]

اِس بارے میں علماء کا دوسرا قول یہ ہے کہ جنات کی وہ قسم جو زمین پر بستی ہے، اللہ تعالیٰ نے اُنہیں آگ سے پیدا فرمایا ہے، ابلیس اِن ہی میں سے تھا، اور وہ اِن جنات کا باپ تھا، جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام تمام انسانوں کے باپ ہیں، لیکن جب جنات کی سرکشی اور نافرمانی حد سے بڑھ گئیں، تو اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر فرشتوں کے ذریعہ عذاب نازل فرما کر اُنہیں ختم کر دیا اور جو بچ گئے، اُنہیں پہاڑوں اور سمندروں کے کنارے چھوڑ دیا گیا، ابلیس اُس وقت تک کچھ درمیانی حالت پر تھا، اس لیے عذاب سے بچا لیا گیا اور وہ فرشتوں کے ساتھ رہنے لگا، اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے تھے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو فرشتوں کے ساتھ رہنے دیا، اور ابلیس اپنے دِل میں یہ سمجھ رہا تھا کہ اب جب کبھی بھی دنیا دوبارہ آباد کی جائے گی، تو اُس کا

---

(۱) قال أبو الوفا علي بن عقيل في كتاب الإرشاد إن قيل لك إبليس كان من الملائكة أم لا فقل من الملائكة خلافا لبعض أصحابنا وبهذا قال أبو بكر عبد العزيز لأن الباري سبحانه وقال {وإذ قلنا للملائكة اسجدوا لآدم فسجدوا إلا إبليس} والاستثناء لا يكون من غير الجنس هذا هو المشهور في لغة العرب... والذي يدل على صحة هذا وانه من الملائكة أنه لو لم يكن منهم لما حسن لومه وسبه بامتناعه... فإن قالوا فقد خصه باسم فقال إلا إبليس كان من الجن قيل الجن نوع من الملائكة يقال لهم الجن. (آكام المرجان في أحكام الجان-محمد بن عبد الله الشبلي الدمشقي الحنفي، أبو عبد الله (م:۷۶۹هـ)، ۲۰۹-۲۱۰، فصل في نوحهم على الشهداء بالحرة، ت: إبراهيم محمد الجمل، ط: مكتبة القرآن-مصر)

(۲) عن ابن عباس قال: كان إبليس من حي من أحياء الملائكة، يقال لهم: الجن، خلقوا من نار السموم، من بين الملائكة... ثم قال الله تعالى للملائكة الذين كانوا مع إبليس خاصة دون الملائكة الذين في السماوات: اسجدوا لآدم. فسجدوا كلهم أجمعون إلا إبليس أبى واستكبر، لما كان حدث نفسه من الكبر والاغترار. فقال: لا أسجد له، وأنا خير منه وأكبر سنا وأقوى خلقا، خلقتني من نار وخلقته من طين. يقول: إن النار أقوى من الطين. قال: فلما أبى إبليس أن يسجد أبلسه الله، أي: آيسه من الخير كله، وجعله شيطانا رجيما عقوبة لمعصيته. (تفسير القرآن العظيم-أبو الفداء إسماعيل ابن كثير القرشي، الدمشقي (م۷۷۴هـ): ۱/ ۱۳۴-۱۳۵، سورة البقرة: ۳۴، ت: محمد حسين شمس الدين، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

سردار مجھے ہی بنایا جائے گا، فرشتوں کو اُس کے اس ناپاک ارادے کی خبر نہ تھی، لہٰذا ابلیس نے سرداری حاصل کرنے کی لالچ میں اللہ تعالیٰ کی خوب عبادت کی، کہ جس سے فرشتوں کو بھی رشک آنے لگا، ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا، لیکن وصفِ عبادت میں اُن سے آگے بڑھ جانے کی وجہ سے اُن میں شمار ہوتا تھا، لہٰذا جب فرشتوں کو سجدہ کا حکم ہوا تو وہ اُس میں شامل تھا، پھر سجدہ نہ کر کے وہ نافرمان ثابت ہوا۔ (تفسیر ابن کثیر : ۲/ ۷۸۸)[۳]

ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا، اور اُس کے فرشتہ ہونے کے متعلق جو روایات ہیں، وہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں، قرآنِ پاک میں فرشتوں کے متعلق اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ. [۴]

ترجمہ: فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہ ہر حکم کی فرماں برداری کرتے ہیں۔

حدیث شریف کی مشہور کتاب مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں اور جنات آگ سے، اور حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے متعلق تو تم جانتے ہی ہو۔ (مسلم شریف: ۲/ ۴۱۳)[۵]

---

(۳) وخلقت الجن الذين ذكروا في القرآن من مارج من نار... فأول من سكن الأرض الجن، فأفسدوا فيها، وسفكوا الدماء، وقتل بعضهم بعضا. قال: فبعث الله إليهم إبليس في جند من الملائكة -وهم هذا الحي الذي يقال لهم: الجن- فقتلهم إبليس ومن معه، حتى ألحقهم بجزائر البحور، وأطراف الجبال، فلما فعل إبليس ذلك اغتر في نفسه، فقال: قد صنعت شيئا لم يصنعه أحد. قال: فاطلع الله على ذلك من قلبه، ولم يطلع عليه الملائكة الذين كانوا معه. (تفسير القرآن العظيم (ابن كثير): ۱/ ۱۳۵، البقرة: ۳۴، ط: دار الكتب العلمية)

(۴) (-۶۶ التحريم: ۶)

(۵) عن عائشة، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خلقت الملائكة من نور، وخلق الجان من مارج من نار، وخلق آدم مما وصف لكم. (صحيح المسلم: ۲/ ۴۱۳، رقم: ۶۰-(۲۹۹۶)، باب في أحاديث متفرقة، كتاب الزهد والرقائق، ط: البدر- ديوبند☆الجامع - معمر بن أبي عمرو راشد الأزدي (م: ۱۵۳ھ): ۱۱/ ۴۲۵، رقم: ۲۰۹۰۴، باب قول: تعس الشيطان، وتحريق الكتب، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، ط: المجلس العلمي-باكستان، وتوزيع المكتب الإسلامي- بيروت☆الكتاب: مسند إسحاق بن راهويه-أبو يعقوب إسحاق بن إبراهيم، الحنظلي المروزي المعروف بـ" ابن راهويه" (م: ۲۳۸ھ): ۲/ ۲۷۷، رقم: ۷۸۶، ت: د. عبد الغفور بن عبد الحق البلوشي، ط: مكتبة الإيمان- المدينة المنورة)

اس حدیثِ صحیح سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتہ نور سے پیدا کی گئی مخلوق ہے، اور تمام جنات آگ سے پیدا کیے گئے ہیں، لہذا دونوں مخلوق علاحدہ ہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] یہود ونصاریٰ کی اسلام دشمنی کا ثبوت قرآن کریم اور احادیث مبارکہ سے؟

۳۵۱-سوال: امریکہ ایسا ملک ہے، جہاں غیر اسلامی قوانین نافذ ہیں، قرآن کریم اور حدیث پاک میں بہت سی جگہوں پر اُن کی اسلام دشمنی کا تذکرہ ہے، آپ سے درخواست ہے کہ اُن آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ کے متعلق ہماری رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب امریکہ کے قوانین میں اصولی طور پر یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کو کلی طور پر اپنے دین پر عمل پیرا ہونے دینا نہیں چاہتے، تو پھر اُسے غیر اسلامی ملک (دار الحرب) قرار دینے میں کیا شبہ ہے؟[۱] جب کہ شروع سے اس ملک کی اسلام دشمنی کا مشاہدہ بارہا ساری دنیا نے کیا ہے، پوری تاریخ اُن کی اسلام دشمنی سے بھری پڑی ہے، آج کے یہود ونصاریٰ اسلام دشمنی میں متحد و متفق ہیں، بعض ایسے مسلم ممالک جن سے امریکہ اپنے اچھے روابط کا دعویٰ کرتا ہے، وہ صرف اور صرف اُن کی خود غرضی اور اپنے برے مقاصد انجام دینے کے لیے ہے، قرآنِ کریم میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ.[۲]

ترجمہ: اے ایمان والو! تم یہود ونصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ یعنی اسلام دشمنی میں۔[۳]

---

(۱) أن الأمان إن كان للمسلمين فيها على الإطلاق، والخوف للكفرة على الإطلاق، فهي دار الإسلام، وإن كان الأمان فيها للكفرة على الإطلاق، والخوف للمسلمين على الإطلاق، فهي دار الكفر. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود الكاساني الحنفي (م:۵۸۷ھ):۱۳۱/۷، كتاب السير،فصل في بيان الأحكام التي تختلف باختلاف الدارين،ط:دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) ۵-المائدة:۵۱.

(۳) بعضهم أولياء بعض في معاداة المسلمين. (محاسن التأويل=تفسير القاسمي-محمد جمال الدين بن محمد الحلاق القاسمي (م:۱۳۳۲ھ):۱۶۶/۴،ت:محمد باسل عيون السود،ط:دار الكتب العلميه-بيروت)

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ دین اسلام اُن کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنے اور عدل وانصاف کا معاملہ کرنے سے نہیں روکتا ہے، نیز سورۂ ممتحنہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ایسے غیر مسلمین جو دین اسلام کے خلاف جنگ نہ کریں اور مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچائیں اُن کے ساتھ اچھے اخلاق برتنے اور انصاف سے اللہ نے تمہیں نہیں روکا۔ (۴)

لیکن ضروری ہے کہ اُن سے دل لگاؤ نہ رکھا جائے اور اُنہیں دینی دوست نہ بنایا جائے۔ قرآنِ پاک کی ایک اور آیت میں اُن کی اسلام دشمنی اِن الفاظ کے ساتھ بیان کی گئی ہے:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا. (۵)

ترجمہ: تم یہود اور مشرکین کو پاؤ گے کہ وہ ایمان والوں کے سب سے زیادہ سخت دشمن ہیں۔

اِس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود اور مشرکین کی اسلام دشمنی کو صراحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے، اُس کے بعد فوراً دوسری آیت نصاریٰ کے بارے میں ہے:

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ. (۶)

ترجمہ: اور تم مؤمنین سے محبت کرنے والا اُن لوگوں کو پاؤ گے، جنہوں نے کہا ہے کہ ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں۔

اِس آیتِ کریمہ میں جن نصاریٰ کی تعریف بیان کی گئی ہے، اُن سے مراد وہ نصاریٰ ہیں، جنہوں نے مہاجرین حبشہ سے قرآنِ کریم کی تلاوت سنی اور اُس پر رو پڑے، یعنی شاہِ حبشہ نجاشی اور اُس کے دربار کے راہبین، جنہوں نے اسلام قبول کرلیا، لیکن وہ نصاریٰ، جو دینِ حق پر ایمان نہیں لائے اور اسلامی دشمنی میں حد

---

(۴) قال الله تعالیٰ: لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (۶۰-الممتحنة: ۸)

ولا بأس بأن يصل الرجل المسلم المشرك، قريبا كان أو بعيدا، محاربا كان أو ذميا، و أراد بـ "المحارب" المستامن. (البحر الرائق: ۸/ ۲۳۲، كتاب الكراهية، فصل في البيع، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۸۸، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر - بيروت☆ الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۴۸، كتاب الكراهية، الباب الرابع عشر في أهل الذمة... الخ، ط: دار الفكر)

(۵-۶) -۵ المائدة: ۸۲.

سے تجاوز کر گئے، وہ بالکل یہود ہی کی طرح مسلمانوں کے دینی دشمن ہیں، جیسا کہ پہلی آیت میں واضح کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں مروی ہے کہ یہودی جب کسی مسلمان کو تنہا دیکھتا ہے، تو وہ اُس کے قتل کرنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۸۵)

یہود نے اپنی اسلام دشمنی کا بین ثبوت دیتے ہوئے متعدد مرتبہ حضور اکرم ﷺ کو مدینۂ طیبہ میں اور خیبر میں شہید کرنے کی کوششیں کیں، آپ ﷺ کو اُنہوں نے دھوکے سے زہر بھی دیا، جس کی تکلیف آپ ﷺ کو اخیری عمر تک رہی، اِن ہی ناپاک یہودیوں نے حضور اکرم ﷺ پر جادو بھی کیا تھا، جس کی تکلیف آپ ﷺ نے تین دِن تک برداشت کی، اُس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُس کے دفع کے لیے سورۂ فلق اور سورۂ ناس نازل فرمائی۔ (۷) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] ''زندگی صفتِ صلوٰۃ پر آجائے''

(تنقیح سوال)

۳۵۲-سوال: نماز کا مقصد ہے: زندگی صفتِ صلوٰۃ پر آجائے'' تو زندگی میں صلوٰۃ کی صفت کس طرح پیدا کی جائے؟ مثال دے کر سمجھائیں! بینوا توجروا۔

الجواب حامدًا ومصلّیًا:

صفتِ صلوٰۃ سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اُس کے کیا معنی اور مطلب ہیں؟ اسے لکھ کر بھیجیں، تو جواب دوں گا؛ کیوں کہ صفتِ صلوٰۃ سے آپ کیا سمجھے ہیں؟ آپ اُس سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟ واضح نہیں ہے۔ اس لیے اس وقت میرے لیے جواب دینا ممکن نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۷) عن ابن عباس: نزلت هذه الآيات في النجاشي وأصحابه، الذين حين تلا عليهم جعفر بن أبي طالب بالحبشة القرآن بكوا حتى أخضلوا لحاهم... لأن كفر اليهود عناد وجحود ومباهتة للحق، وغمط للناس وتنقص بحملة العلم. ولهذا قتلوا كثيرًا من الأنبياء حتى هموا بقتل رسول الله صلى الله عليه وسلم غير مرة وسحروه، وألبوا عليه أشباههم من المشركين... عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما خلا يهودي قط بمسلم إلا هم بقتله. (تفسير ابن كثير: ۳/ ۱۶۶، ط: دار طيبة)

[۱۳] ہفتہ کے مختلف ایام کے اعتبار سے داڑھی بنانے یا داڑھی میں کنگھی کرنے کے مخصوص فضائل کے متعلق تحقیق

۳۵۳-سوال: ''تنظیم'' نامی ماہنامہ کے ۱۹۶۴ء جون کے شمارہ میں ذیل کا مضمون شائع ہوا تھا، اُس کے بارے میں بہ حوالۂ کتب جواب دے کر مشکور فرمائیں:

(۱) اِتوار کے دِن داڑھی بنانے سے دِل اور من خوش رہتا ہے۔

(۲) پیر کے دِن جو شخص داڑھی میں کنگھی کرتا ہے، اُس کی حاجت پوری ہوتی ہے۔

(۳) منگل کے دِن کنگھی کرنے سے اللہ تعالیٰ زیادہ راحت وسکون عطا فرماتے ہیں۔

(۴) بدھ کے دِن جو کوئی کنگھی کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اُسے زیادہ نعمتوں سے نوازتے ہیں۔

(۵) جمعرات کے دِن جو شخص کنگھی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اُسے زیادہ نیکیاں عطا کرتا ہے۔

(۶) جمعہ کے دِن داڑھی میں کنگھی کرنے سے خوشی میں اِضافہ ہوتا ہے۔

(۷) سنیچر کے دِن داڑھی میں کنگھی کرنے سے آدمی بری باتوں سے محفوظ رہتا ہے۔

(۸) کھڑے کھڑے کنگی کرنے سے دین مضبوط ہوتا ہے، اور بیٹھے بیٹھے کرنے سے دین نکل جاتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ماہنامہ ''تنظیم'' سے نقل کردہ ان باتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے، حدیث یا فقہ میں اس طرح کی کوئی بات مذکور نہیں ہے کہ فلاں فلاں ایام میں کنگھی کرنے سے مذکورہ فوائد حاصل ہوتے ہیں، البتہ بزرگانِ دین نے اپنے مواعظ وتحریر میں جو باتیں ذکر کی ہیں، اُن کا تعلق حکمت اور طبی فوائد سے ہے، جیسے شیخ فرید الدین عطارؒ نے اپنی فارسی کتاب ''پندنامہ'' میں بہت سی دینی ودنیوی باتوں پر مشتمل نصیحتیں کی ہیں، جن کا حدیث وفقہ کی کتابوں میں کوئی ثبوت نہیں ہے، اس لیے بلا تحقیق ایسی باتوں کی طرف توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، البتہ اِن باتوں کے لکھنے والے سے حوالہ جات کا مطالبہ کر کے اُس سے مطلع فرمائیں، تو اُس کے مطابق جواب دیا جائے گا۔[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ... وَالَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوْا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا. [۲۵-الفرقان: ۷۳]

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوْا أَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ. [۴۹-الحجرات: ۶]

[۱۴] حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس حضرت اسماعیل کے ذبح کے وقت دنبہ لے کر کون آیا تھا؟

۳۵۴-سوال: ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر جب چھری پھیری، اُن کے تذکرہ میں دنبے کا ذکر کہیں دیکھنے میں نہیں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے چھری کے نیچے دنبہ ملائکہ مقربین کے ذریعہ بھیجا ہو اور دنبہ کی قربانی ہوئی ہو، اس بارے میں پوری بات بخاری شریف میں ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ چھری حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر پھیری گئی، اُس وقت اللہ تعالیٰ نے قربانی قبول کرلی تھی، دنبہ ذبح نہیں ہوا تھا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورتحریر کوئی ایسا سوال نہیں ہے جس کا تعلق کسی عقیدے سے یا حلال وحرام کے کسی حکم سے ہو، اور ہر بات کو ثابت کرنے کے لیے بخاری شریف کی ضرورت نہیں ہے، اس کے علاوہ دیگر کتبِ احادیث سے بھی علم حاصل ہوتا ہے، مسئلہ مذکورہ میں اگر آپ کی کوئی تحقیق ہے، تو مجھے بھی اُس سے مطلع فرمائیں!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ چھری چلائیں؛ لہٰذا اُن کا کام چھری چلانا تھا، اب کس پر چھری پھیری؟ اس بارے میں علماء مفسرین کے دو قول ہیں:

(۱) چھری حضرت اسماعیل علیہ السلام پر پھیری گئی۔

(۲) چھری پھیرنے کا اِرادہ کیا تو آواز آئی کہ : اے ابراہیمؑ! آپ نے جواب دیا: "لبیك، الله أكبر" تو فرشتہ نے بھی "الله أكبر" کہا، دنبہ نے بھی کہا، حضرت اسماعیلؑ نے بھی کہا۔

پہلے قول کے مطابق چھری پھیری گئی؛ لیکن رگیں اور کھال نہیں کٹی، تانبے کا ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا، کوشش جاری تھی اور وہاں دنبہ لایا گیا اور اُس کو ذبح کیا گیا۔ (روح المعانی: ۱۷۱/ پارہ: ۲۳)[1]

وفي "شرح الفصوص" للمولى الجامي أي : حققت الصورة المرئية وجعلتها صادقة مطابقة للصورة الحسية الخارجية بالإقدام على الذبح والتعرض لمقدماته، وقد قيل إنه أمر السكين بقوته على حلقه مراراً، فلم يقطع، ثم وضع السكين على قفاه فانقلب السكين. =

[۱۵] جس چھری سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کیا گیا، وہ کہاں گئی؟

۳۵۵-سوال: اور ایک بات چھری کی ہے کہ جس چھری سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کیا گیا، وہ کہاں گئی؟ بعض لوگ کہتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری پھینکی اور وہ دریا میں گری، جس نے مچھلی کو ذبح کیا، اس لیے مری ہوئی مچھلی کھانا جائز ہے، اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اُس جگہ پتھر تھا، اُس پر پھینکی، تو اُس پتھر کے ٹکڑے ہو گئے تھے، تو دونوں باتوں میں سے کون سی بات بخاری شریف سے ثابت ہے؟

الجواب حامداً ومصلّیاً:

مذکورہ باتیں لایعنی اور فضول ہیں، جن کا قربانی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، قربانی کا مقصد یہ ہے کہ دین و ایمان کے لیے اپنے جان و مال، اولاد اور بیوی کی قربانی پیش کرو، ذبح کر کے نہیں؛ بل کہ دین و ایمان کی نشر و اشاعت کے لیے ہمیشہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو پیش پیش رکھو، جذبات قربانی کے ہونے چاہئیں۔[۱]

چھری کیسی تھی؟ کتنے انچ کی تھی؟ تانبے کی تھی یا پیتل کی؟ یہ سب بے ہودہ اور لایعنی باتیں ہیں، جن کا اصل واقعہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، ایسی باتوں سے اپنے آپ کو بچائیں، یہ سب بے کار لوگوں کے کام ہیں، اللہ تعالیٰ ہم تمام کو بے کار کاموں میں وقت ضائع کرنے سے بچائے اور دین کی سمجھ عطا فرمائے، آمین۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= آن تـوکل تو خـلیـلانہ ترا
تـا نبـر د تیغت اسماعیل را

فعند ذلك وقع النداء ـــــــــــ... وروي أنه لما ذبحه قال جبريل: "الله أكبر، الله أكبر" فقال الذبيح: "لا إله إلا الله والله أكبر". فقال إبراهيم: "الله أكبر ولله الحمد" فبقي سنة. (تفسير روح المعاني: ۳۴۲/۷، سورة الصافات، ط: دار النشر / دار إحياء التراث العربي)

(۱) {لَن يَنَالَ اللهَ} لن يصيب، ويبلغ، ويدرك رضاه، ولا يكون مقبولاً عنده. {لُحُومُهَا} المأكولة والمتصدق بها {وَلَا دِمَاؤُهَا} المهراقة بالنحر، من حيث أنها لحوم ودماء، {وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ} وهو قصد الائتمار، وطلب الرضى والاحتراز عن الحرام والشبهة...واعلم أن كل مال لا يصلح لخزانة الرب ولا كل قلب يصلح لخدمة الرب، فعجل أيها العبد في تدارك حالك، وكن سخياً محسناً بمالك فإن لم يكن فبالنفس والبدن، وإن كان لك قدرة على بذلهما فيهما معاً ألا ترى أن إبراهيم عليه السلام كيف أعطى ماله الضيافة، وبدنه النيران، وولده للقربان، وقلبه للرحمن حتى تعجب الملائكة من سخاوته فأكرمه الله بالخلة. (تفسير روح المعاني: ۲۵/۶، سورة الحج، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۲) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حسن إسلام المرء تركه ما لا يعنيه. (سنن الترمذي، رقم الحديث: ۲۳۱۷، أبواب الزهد، باب فيمن تكلم بكلمة يضحك بها الناس)

[۱۶] میدان کربلا میں جنگ کتنے دن تک چلی؟

۳۵۶-سوال: زید کا کہنا ہے کہ ۹؍دن کی جنگ کے بعد دسویں دن حضرت امام حسینؓ نماز میں کھڑے تھے، اس حالت میں شہید ہوئے، تو کیا زید کی یہ بات صحیح ہے؟ کربلا میں کتنے دن تک جنگ چلی؟

الجواب حامداومصليا

کربلا میں حضرت امام حسینؓ کی جنگ دس دن تک نہیں چلی، جنگ درحقیقت ایک ہی دن رہی یا زیادہ سے زیادہ دیڑھ دن۔ [۱] فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۱۷] جھینگے وغیرہ کی حرمت میں بہشتی زیور کی ایک عبارت سے غلط فہمی

۳۵۷-سوال: بہشتی زیور (بزبان گجراتی، جلد: ۳، حلال اور حرام چیزوں کا بیان مسئلہ: ۲) میں مذکور ہے کہ دریا اور پانی کے جانوروں میں صرف مچھلی حلال ہے اس کے علاوہ باقی سب جانور حرام ہے۔ [۲] (بحوالہ: درمختار جلد ۵) تو سوال یہ ہے کہ جب اس مسئلہ کے موافق پانی کے جانوروں میں صرف مچھلی حلال ہے تو اپنے یہاں گجرات میں تو لوگ جھینگے، بوملے، لیوٹے وغیرہ بھی کھاتے ہیں، کیا ان کا کھانا جائز نہیں ہے؟ یہاں بہت سے لوگوں کو اس پر اشکال ہے، تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں۔

---

(۱) قالوا: فلما صلى عمر بن سعد الصبح بأصحابه يوم الجمعة وقيل يوم السبت - وكان يوم عاشوراء - انتصب للقتال، وصلى الحسين أيضا بأصحابه وهم اثنان وثلاثون فارسا وأربعون راجلا، ثم انصرف فصفهم ... ودخل عليهم وقت الظهر فقال الحسين: مروهم فليكفوا عن القتال حتى نصلي، .... ثم صلى الحسين بأصحابه الظهر صلاة الخوف، ثم اقتتلوا بعدها قتالا شديدا ... قالوا: ومكث الحسين نهارا طويلا وحده لا يأتي أحد إليه إلا رجع عنه، لا يحب أن يلي قتله، حتى جاءه رجل من بني بداء، يقال له مالك بن البشير، فضرب الحسين على رأسه بالسيف فأدمى رأسه، .... فحملت الرجال من كل جانب على الحسين وضربه زرعة بن شريك التميمي على كتفه اليسرى، وضرب على عاتقه، ثم انصرفوا عنه وهو ينوء ويكبو، ثم جاء إليه سنان بن أبي عمرو بن أنس النخعي فطعنه بالرمح فوقع، ثم نزل فذبحه وحز رأسه، ثم دفع رأسه إلى خولي بن يزيد. (البداية والنهاية-أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (م: ۷۷۴ھ): ۸/ ۱۶۹-۱۸۸، ثم دخلت سنة إحدى وستين، ط: دار الفكر)

پیش نظر عبارت اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ کربلا میں جنگ صرف ایک ہی دن ہوئی ہے۔

(۲) ولا يحل حيوان مائي إلا السمك. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۳۰۶، كتاب الذبائح، ط: دار الفكر، بيروت)

الجواب حامداً و مصلیاً:

آپ حضرات کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے، اس کتاب میں تفصیل مذکور نہیں ہے، دراصل چاروں ائمہ کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ دریائی (پانی) جانوروں میں کون سا جانور حلال ہے اور کون سا جانور حرام ہے؟[1] امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق صرف مچھلی حلال ہے، مچھلی کے علاوہ باقی دریائی جانور مثلاً دریائی مرغی، بکری، بیل، بھینس وغیرہ سب حرام ہیں۔[2] لیکن مچھلی میں بہت سی اقسام ہوتی ہیں لیوٹا، بوملا، وہل (جس کو عربی میں عنبر کہا جاتا ہے) راو، پاپلیٹ وغیرہ، پس ان میں نام کا فرق ہے، ذات کے اعتبار سے سب مچھلی ہی ہے؛ اس لیے ان سب کا کھانا حلال ہے۔

البتہ جھینگے کے متعلق علماء میں اختلاف ہے اور اس اختلاف کی بنیاد اس بات پر ہے کہ جھینگا مچھلی کی قبیل سے ہے یا نہیں؟ جو علماء اس کو مچھلی کی قبیل سے قرار دیتے ہیں، وہ اس کو حلال کہتے ہیں۔ چناں چہ مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے ہدایہ، منتہی العرب وغیرہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''جھینگا'' مچھلی کی ذات میں داخل ہے لہٰذا کھانا حلال ہے۔ (دیکھیے مجموعۃ الفتاویٰ: ۴۱۱)[3] اور کفایت المفتی میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ

---

(۱) قال النووي: أجمع المسلمون على إباحة السمك، و قال أصحابنا: يحرم الضفدع، للحديث في النهي عن قتلها، قالوا: و فيما سوى ذلك ثلاثة أوجه، أصحها: يحل جميعه، و الثاني: لا يحل، أي إلا السمك، و الثالث: يحل ما له نظير مأكول في البر.

و قال الشعراني: و من ذلك قول أبي حنيفة: لا يؤكل من حيوان البحر إلا السمك، و ما كان من جنسه، مع قول مالك: إنه يجوز أكل غير السمك من السرطان، و كلب الماء، و الضفدع، و خنزيره، و لكن الخنزير مكروه عنده، و روي أنه توقف فيه، و مع قول أحمد يؤكل جميع ما في البر، إلا التمساح، و الضفدع، و الكوسج، و ذكر الروايات الثلاثة للشافعية، ثم قال: و رجح بعض الشافعية أن كل ما في البحر حلال إلا التمساح، و الضفدع، و الحية، و السرطان، و السلحفاة. و سئل مالك عن الخنزير، فقال: حرام، فقيل له: إنه من البحر، فقال: إن الله حرم لحم الخنزير، و أنتم سميتموه خنزيرا. (أوجز المسالك إلى مؤطا الإمام مالك: ۱/۳۷۴، كتاب الطهارة، باب الطهور للوضوء، تحت رقم الحديث: ۴۲، ط: دار القلم، دمشق)

(۲) و لا يحل حيوان مائي إلا السمك. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/۳۰۶، كتاب الذبائح، ط: دار الفكر، بيروت)

(۳) ''جھینگہ'' کہ آں را ''اربیان'' بہ کسر ہمزہ می گویند، چناں چہ از صحاح وغیرہ مفہوم می شود، حلال است، چہ آں نوعیت است از انواع سمک، و السمك بجميع أنواعه حلال بالاتفاق، و آں کہ قائل بحرمتش شدہ اند، منشائے آں فہمیدن جھینگہ را خارج از اقسام سمک است، و لیس کذلک، در حماد یہ می آرد، الدودي الذي يقال له ''جهينگه'' حرام عند بعض العلماء، لأنه لا يشبه السمك، فإنما يباح عندنا من صيد البحر أنواع السمك، و هذا لا يكون كذلك، و قال بعضهم: حلال، لأنه يسمى باسم السمك. (مجموعة الفتاوى: ۲/۲۹۷، كتاب الأكل و الشرب، مكتبة سعيد، باكستان)

صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جھینگا بہت سے علماء کے نزدیک مچھلی کے حکم میں ہے، مچھلی کی ذات میں داخل کرکے کھانے والے کھاتے ہیں، جب کہ بعض علماء، جو اس کو مچھلی نہیں قرار دیتے ہیں، وہ اس کو ناجائز کہتے ہیں، پس جھینگا کے مچھلی ہونے کے متعلق علماء میں اختلاف ہے، احتیاط اس میں ہے کہ اس کو نہ کھایا جائے۔ (کفایت المفتی: ۹/ ۱۲۸)[۴] گجرات کے مایۂ ناز مفتی: ''حضرت مولانا مفتی اسماعیل بسم اللہ صاحبؒ'' اس کو مچھلی شمار کرتے تھے اور خود بھی کھاتے تھے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۴) کفایت المفتی: ۸/ ۱۲۴، کتاب الحظر والاباحۃ، چھٹا باب: ماکولات ومشروبات، ط: دارالاشاعت، کراچی، مزید دیکھیے: فتاوی رحیمیہ: ۱۰/ ۸۷، ۷۷، کتاب الحظر والاباحۃ، باب ما یجوز اکلہ من الحیوان وما لا یجوز، امداد الفتاویٰ: ۴/ ۱۰۳، کتاب الحظر والاباحۃ کھانے پینے کی حلال وحرام، مکروہ ومباح چیزوں کا بیان، ط: ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند۔

نوٹ: مسئلہ روبیان میں حضرت مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی کی ایک مفصل تحریر درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جو تقریباً تمام گذشتہ فتووں کا نچوڑ اور اس مسئلہ میں قول فیصل ہے:

و أما الروبيان أو الإربيان الذى يسمى في اللغة المصرية "جمبرى" و في اللغة الأردية "جهينگا" و في الإنكليزية "Prown" أو "Shrinp"، فلا شك في حلته عند الأئمة الثلاثة، لأن جميع حيوانات البحر حلال عندهم، و أما عند الحنفية، فيتوقف جوازه على أنه سمك أو لا، فذكر غير واحد من أهل اللغة أنه نوع من السمك، قال ابن دريد في جمهرة اللغة: ۳/ ۴۴، "وإربيان ضرب من السمك" و أقره في القاموس و تاج العروس: ۱/ ۱۴۶، و كذلك قال الدميري في حياة الحيوان: ۱/ ۴۷۳، الروبيان هو سمك صغير جداً أحمر، و أفتى غير واحد من الحنفية بجوازه بناءً على ذلك، مثل صاحب الفتاوى الحمادية، وقال شيخ مشائخنا التانوي رحمه الله في إمداد الفتاوى: ۴/ ۱۰۳، لم يثبت بدليل أن للسمك خواص لازمة تنقضى السمكية بانقضائها، فالمدار على قول العدول المبصرين، إن "حياة الحيوان" للدميرى الذي يبحث عن ماهيات الحيوان يصرح بأن الروبيان هو سمك صغير، فإني مطمئن إلى الآن بأنه سمك، ولعل الله يحدث بعد ذلك أمراً.

ولكن خبراء علم الحيوان اليوم لا يعتبرونه سمكا، و يذكرونه كنوع مستقل، ويقولون: إنه من أسرة السرطان، دون السمك، وتعريف السمك عند علماء الحيوان على ما ذكر في دائرة المعارف البريطانية: ۹/ ۳۰۵، (ط: ۱۹۵۰ء) "هو حيوان ذو عمود فقري، يعيش في الماء، ويسبح بعواماته ويتنفس بغلصحته، وإن الإربيان ليس له عمود فقري، و لا يتنفس بغلصحته، و إن علم الحيوان اليوم يقسم الحيوانات إلى نوعين كبيرين، الأول: الحيوانات الفقرية (Vertegrate) وهي التي لها عموم فقري في الظهر، و لها عظام عصبي مجمل بواسطته، والثاني: الحيوانات غير الفقرية (Invertegrate) التي ليس لها عموم فقري، وإن السمك يقع في النوع الأول، والإربيان في النوع الثاني، الذي ذكر في دائرة المعارف البريطانية: ۶/ ۳۶۳، (ط: ۱۹۸۸ء) أن التعين في المسئلة من الحيوانات الحية تتعلق بهذا النوع، و إنه يحتوي على الحيوانات القشرية الحشرات... إن هذه التعريفات لا تصدق على الإربيان، و إنه ينفصل عن السمك بأنه ليس من الحيوانات الفقرية، فلو أخذنا مقبول خبراء علم الحيوان، فإنه ليس سمكا، فلا يجوز على أصل الحنفية، ولكن السوال هنا: هل المعتبر في هذا الباب التدقيق =

[۱۸] امام ابوحنفیہ کا مختصر تعارف

۳۵۸-سوال: امام ابوحنیفہ کون ہے؟ اور ہم کن کی اتباع کرتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

امام ابوحنیفہ کا نام ''نعمان'' ہے، ابوحنیفہ ان کی کنیت ہے، اب یعنی باپ، ابوحنیفہ یعنی حنیفہ کے والد۔ یہ اس مذہب کے مقتداء ہیں، جس کی ہم مسائل میں اتباع کرتے ہیں۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دادی کی کا نام

۳۵۹-سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دادی کا نام کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

سیرت حلبیہ اردو جلد اول صفحہ ۳۰ میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دادی کا نام فاطمہ تھا۔[۲] فقط، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۲۰] قرض سے سبکدوشی کے لیے وظیفہ

۳۶۰-سوال: ہمارا ترکیسر ضلع میں ایک کارخانہ ہے، اس میں ساڑے پانچ لاکھ کا ہم نے سرمایہ لگایا ہے، حصہ دار کل پانچ افراد ہیں، ان میں ایک میں بھی ہوں۔ سرکار کی باقی رقم کل سوا تین لاکھ

= العلمي في كونه سمكا؟ أو يعتبر العرف المتفاهم بين الناس، و لا شك أن عند اختلاف العرف يعتبر عرف أهل العرب، لأن استثناء السمك من ميتات البحر إنما وقع باللغة العربية، وقد أوضحنا أن أهل اللغة أمثال ابن دريد، والفيروزآبادي، والزبيدي، والدميري كلهم ذكروا أنه سمك، فمن أخذ بحقيقة الإربيان حسب علم الحيوان، قال بمنع أكله عند الحنفية، و من أخذ بعرف أهل العرب، قال بجوازه، وربما يرجع على هذا القول بأن المعهود من الشريعة في أمثال هذه المسائل الرجوع إلى العرف المتفاهم بين الناس، دون التدقيق في الأبحاث النظرية، فلا ينبغي التشديد في مسئلة الإربيان عند الإفتاء، و لا سيما في حالة كون المسئلة مجتهدا فيها من أصلها، و لا شك أنه حلال عند الأئمة الثلاثة، وإن اختلاف الفقهاء يورث التخفيف... غير أن الاجتناب عن أكله أحوط وأولى و أحرى. (تكملة فتح الملهم: ۳/ ۵۱۳ - ۵۱۴، كتاب الصيد و الذبائح، تحت رقم الحديث: ۴۹۲۰، ط: أشرفيه ديوبند)

(۱) انظر للتوضيح سير أعلام النبلاء: ۶/ ۳۹۰، ط: مؤسسة الرسالة.

(۲) سیرت حلبیہ اردو: ۱/ ۱۴۳، حضرت عبداللہ کی والدہ فاطمہ، آپ کی نسب میں فاطما کیں۔

روپے ہیں، اس کا سود اوسطاً روزانہ ۷۵ ؍روپے چڑھتا رہتا ہے، تین سال سے اس کارخانہ کو بیچنے کی کوشش جاری ہے؛ لیکن بک نہیں رہا ہے، مہربانی فرما کر آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ قرض کی ادائیگی کی جلد سبیل پیدا فرمادے اور اس سلسلہ میں کوئی عمل اور وظیفہ ہو، تو اس کی بھی رہنمائی فرمائیں، ہم مشکور ہوں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کی پریشانی جان کر دکھ ہوا، آپ کے فرزند سے بھی یہ خبر ملی تھی، اللہ تعالیٰ آپ کی جملہ پریشانیوں کو جلد دور فرمادے، عملیات اور وظیفہ کی آپ نے درخواست کی ہے، تو ان امور کا لحاظ کریں: (۱) سب سے پہلے گناہ سے توبہ کریں۔ (۲) نماز وروزہ پر پابندی کریں۔ (۳) زکوٰۃ وقت پر ادا کردیں۔ (۴) سود سے دور رہیں۔ (۵) سورۂ واقعہ روزانہ عشاء کے بعد پڑھا کریں۔ (۶) یہ دعا روزانہ ۲۱؍ بار پڑھیں: **اللهم اكفنا بحلالك عن حرامك و اغننا بفضلك عمن سواك.** [۱] (۷) درود شریف صبح وشام ۲۱-۲۱ مرتبہ پڑھا کریں۔ دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کی سب پریشانیوں کو دور فرمادے۔ (آمین) وماذلک علی اللہ بعزیز۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

[۲۱] عمامہ کی مقدار

۳۶۱-سوال: عمامہ کتنے ہاتھ کا ہونا چاہیے؟ یعنی اس کی مقدار کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

شیخ شمس الدین جزریؒ لکھتے ہیں کہ عمامہ کی لمبائی کے سلسلہ میں شیخ محی الدین نوویؒ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا عمامہ تین طرح کا تھا، تین ہاتھ لمبا، سات ہاتھ لمبا اور بارہ ہاتھ لمبا، لہٰذا پنج وقتہ نمازوں کے لیے تین ہاتھ لمبے عمامہ سے سنت ادا ہوجائے گی، اور عیدین کے لیے آپ ﷺ بارہ ہاتھ لمبا عمامہ استعمال فرماتے تھے۔ (فیض الباری: ۴؍۳۷۵) [۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] عن علي، أن مكاتبا جاءه، فقال: إني قد عجزت عن مكاتبتي فأعني، قال: ألا أعلمك كلمات علمنيهن رسول الله صلى الله عليه وسلم، لو كان عليك مثل جبل صير دينا أداه الله عنك، قال: "قل: اللهم اكفني بحلالك عن حرامك، وأغنني بفضلك عمن سواك". (سنن الترمذي: ۲/۱۹۶، رقم: ۳۵۶۳، أبواب الدعوات، ط: ياسر نديم ديوبند)

(۲) قال الشيخ شمس الدين الجزري: تتبعت قدر عمامة النبي -صلى الله عليه وسلم- فتبين من كلام الشيخ محي الدين النووي أنها كانت على ثلاثة أنحاء: ثلاثة أذرع، و سبعة، و اثنى عشر من الذراع الشرعي، وهو النصف من ذراعنا، و تلك الأخيرة كانت للعيدين. (فيض الباري: ۴/۳۷۵، كتاب اللباس، باب العمائم، ط: تحت إشراف المجلس العلمي بدابيل، سورت، غجرات)

[۲۲]''ہدہد'' کون سا پرندہ ہے؟

۳۶۲-سوال: قران مجید میں سلیمان علیہ السلام کے قصے میں ایک ''ہدہد'' نامی پرندہ کا تذکرہ آیا ہے۔ (۱) اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو زمین کے اندر موجود پانی کے جگہ کی اطلاع دیتا تھا، تو آپ سے عرض ہے وہ پرندہ کون سا ہے اور اپنی زبان گجراتی میں اس کو کیا کہا جاتا ہے، یعنی فصیح گجراتی میں کس نام سے اس کو پہچانا جاتا ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

''ہدہد'' کو انگریزی میں :(۱) The Wood(۳)Hoopoo, (۲) Hoopoe, Pecker, اور(۴)Pewit، کہتے ہیں، اور اردو میں (۱) ہدہد (۲) ٹلکنٹھ، اور (۳) کھوٹ بڑھیا کہتے ہیں، اور انگریزی سے گجراتی لغت میں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ہدہد کو گجراتی میں ''لکڑ کھوڈ'' کہا جاتا ہے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] بال منڈوانا افضل ہے یا رکھنا؟ - ایک تحقیقی جائزہ

۳۶۳-سوال: آں جناب کی خدمت اقدس میں عرض ہے کہ: آپ کی مختصر شمائل ترمذی صفحہ ۳۴ پر لکھا ہوا ہے کہ ''مذکورہ وقت کے علاوہ بالوں کو منڈانا بعض جہلاء ثواب سمجھتے ہیں، یہ بدعت ہے اور جائز نہیں، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بال منڈانے پر ثواب صرف حج وعمرہ کے ارکان کے بعد ثابت ہے'' ۔اھ

جب کہ ہینڈ بل (چھوٹا اشتہار) میں لکھا ہے کہ ''سر کے بال منڈانا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی بار ثابت ہے اور یہ سنت ہے، حضرت امام اعظمؒ اور امام شافعیؒ بھی سر کے بال منڈواتے تھے، اور حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منڈانے والوں کے لیے تین بار یہ دعا فرمائی ہے کہ ''اے اللہ بال منڈوانے والوں پر رحم فرما، ایک صحابیؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! اور کتروانے والوں پر؟ تو اخیر میں (چوتھی مرتبہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے اللہ بال کتروانے والوں پر بھی رحم فرما''۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بال منڈوانا سنت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر تین بار دعاء ہے، اور کتروانے سے منڈاوانا افضل ہے۔

---

(۱) وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ (۲۷- النمل: ۲۰)

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کے سوال سے خوشی ہوئی، ہینڈ بل اور میری تحریر کے صفحہ ۴-۵-۶-۷ میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ پہلے کچھ اہم بنیادی باتیں جان لینی چاہیے، جس سے شمائل ترمذی کی عبارت سمجھ میں آجائے گی۔

(۱) علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف چار مرتبہ سر کے بال منڈوانا ثابت ہے، اور یہ حج وعمرہ کے ارکان کے بعد ہی ثابت ہے۔ [۱] (لامع الدراری: ۳/ ۲۶۴) اور مواہب لدنیہ میں ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سر کے بال منڈوانا صلح حدیبیہ (۶ھ میں)، عمرۃ القضاء (۷ھ میں) اور حجۃ الوداع (۱۰ھ) کے موقع پر کل تین بار ثابت ہے، اور ایک بار بال کتروانا بھی مناسک حج میں ثابت ہے۔ (مواہب الدنیہ: ۳۶، بہ حوالہ بخاری، مسلم) [۲]

مذکورہ حوالہ جات سے ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ شریف ہجرت فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین یا چار بار سر کے بال منڈوائے ہیں اور وہ بھی حج یا عمرہ کے ارکان ادا کرنے کے بعد، ہجرت کے بعد پورے دس سال میں ان مواقع کے علاوہ ایک بار بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سر کے بال منڈوانا ثابت نہیں۔

---

(۱) قال ابن القیم: لم یحلق علیه الصلاة والسلام رأسه إلا أربع مرات. (لامع الدراري: ۳/ ۲۶۴، ط: أشرفیه دیوبند)

(۲) إذ لم یرو تقصیر الشعر منه -صلی الله علیه وسلم- إلا مرة واحدة. (جمع الوسائل في شرح الشمائل -الملا علي القاري: ۱/ ۸۱، باب ما جاء في شعر رسول الله صلی الله علیه وسلم، ط: المطبع المشرفیة مصر)

عن معاویة قال: قصرت عن رسول الله صلی الله علیه وسلم بمشقص. (صحیح البخاري: ۱/ ۲۳۳، رقم: ۱۷۳۰، کتاب المناسك، باب الحلق والتقصیر عند الإحلال، ط: البدر دیوبند)

ولم یرو أنه -صلی الله علیه وسلم- حلق رأسه الشریف في غیر نسك حج أو عمرة فیما علمته. (المواهب اللدنیة بالمنح المحمدیة-أحمد بن محمد بن أبی بکر القسطلاني القتیبي المصري، أبو العباس، شهاب الدین (م: ۹۲۳هـ): ۲/ ۸۰، الفصل الأول في کمال خلقته وحال صورته. ط: المکتبة التوفیقیة، القاهرة-مصر)

انظر أیضا: منتهی السؤل علی وسائل الوصول إلی شمائل الرسول صلی الله علیه وآله وسلم-عبد الله بن سعید الحضرمي الشحاري، ثم المراوعي، ثم المکي (م: ۱۴۱۰هـ): ۱/ ۳۴۲، الفصل الثالث: في صفة شعره صلی الله علیه وسلم. ط: دار المنهاج-جدة)

و صحیح المسلم: ۱/ ۴۰۸، رقم: ۲۰-(۱۲۴۶) کتاب المناسك، باب جواز تقصیر المعتمر من شعره. ط: البدر دیوبند.

(۲) ہینڈ بِل میں بحوالہ بخاری: ۲۳۳ و مسلم: ۴۰۸ [۳] لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے بال منڈوانے والے کے لیے تین مرتبہ دعا فرمائی ہے، کہ اے اللہ بال منڈوانے والے پر رحم فرما۔ تو یہ حدیث شریف بالکل صحیح ہے، لیکن اس کا مطلب بہت مختصر لکھا ہوا ہے؛ اس لیے خلجان پیدا ہو رہا ہے۔

حدیث کا صحیح مطلب حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے، اسی طرح اصول حدیث کی بہت سی کتابوں میں بھی موجود ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کب کس موقع پر اور کس مقصد کے تحت ہے، اس کا جاننا یہاں ضروری ہے۔ (دیکھیے اصول حدیث کی کتاب نخبۃ الفکر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء بال منڈوانے والے کے لیے تین بار اور چوتھی بار بال کتروانے والے کے لیے یہ مطلقاً ہر انسان اور ہر حالت کے لیے ہے، جو بال منڈوائے، یا حج وعمرہ میں بال منڈوانے والے کے لیے ہے؟ محدثین وفقہاء تو فرماتے ہیں کہ یہ دعا صرف حج وعمرہ میں بال منڈوانے والے کے ساتھ خاص ہے، عام حالات میں بال منڈاوانے والے کے لیے نہیں ہے۔ [۴] اگر عام حالات میں بھی بال منڈوانے پر فضیلت ہوتی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے دس سال میں صرف چار مرتبہ منڈوانے اور ایک بار کتروانے پر اکتفاء نہ فرماتے، بل کہ کئی بار منڈوانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوتا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ کرامؓ سے بھی زیادہ تر بال رکھنا ہی ثابت ہے، لہٰذا بخاری ومسلم کی مذکورہ حدیث کا تعلق حج وعمرہ میں بال منڈوانے کے ساتھ ہے، اسی بنا پر محدثین نے ان احادیث کو حج وعمرہ کے عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ ایک جماعت نکلے گی، جو قرآن سے حجت

---

(۳) عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: »اللهم ارحم المحلقين« قالوا: والمقصرين يا رسول الله، قال: »اللهم ارحم المحلقين« قالوا: والمقصرين يا رسول الله، قال: »والمقصرين«، وقال الليث: حدثني نافع: »رحم الله المحلقين« مرة أو مرتين، قال، وقال عبيد الله: حدثني نافع، وقال في الرابعة: »والمقصرين«. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۳۳، رقم: ۱۷۲۷، كتاب المناسك، باب الحلق والتقصير، ط: البدر ديوبند☆صحيح المسلم: ۱/ ۴۲۰، رقم: ۱۷-۳۱۷ (۱۳۰۱)، كتاب المناسك، باب تفضيل الحلق على التقصير، ط: البدر ديوبند)

(۴) قوله: ثم يحلق أو يقصر، والحلق أفضل؛ لأن النبي -صلى الله عليه وسلم- دعا للمحلقين ثلاثا، وللمقصرين مرة. (الجوهرة النيرة-أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/ ۱۵۹، كتاب الحج، ط: المطبعة الخيرية)

وانظر للتوضيح: فتح الباري: ۳/ ۵۶۲-۵۶۴، كتاب المناسك، باب الحلق والتقصير، ط: دار المعرفة-بيروت.

پکڑے گی، دین میں حد سے آگے بڑھے گی، لیکن قرآن ان کے حلقوم سے آگے نہیں جائے گا، وہ لوگ لمبی لمبی نمازیں پڑھیں گے، لمبے لمبے سجدے کریں گے؛ لیکن ان کے دلوں میں ایمان نہ ہوگا، ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ سر کے بال منڈوائیں گے (بخاری: ۱۱۲۸/۲)[۵]

اس جماعت کو (جس کا ذکر اوپر آیا) خوارج کہا جاتا ہے، جو گمراہ ہے، اس حدیث کے تحت علماء نے بحث کی ہے کہ: ۱- سر کے بالوں کو منڈانا جائز ہے یا نہیں؟ ۲- جن بالوں کا رکھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یعنی جمہ، لمہ، وفرہ جس کی تفصیل شمائل ترمذی میں ہے، رکھنا جائز ہے یا نہیں؟[۶] ۳- سنتی بال رکھنے والے امام کو فیشن پرست کہنا کیسا ہے؟ اس طرح کے اور بھی بہت سے سوالات ہیں، جو عوام کی طرف سے میرے پاس آئے اور ہینڈ بیل چھپوانے کی درخواست بھی کی گئی، تو ان سوالوں کے پس منظر میں میں نے لکھا ہے:

علامہ کرمانیؒ تحریر فرماتے ہیں: کہ جماعت خوارج کی پہچان یہ ہے کہ وہ بالوں کو منڈواتے ہیں، انہوں نے اپنی جماعت کے ہر فرد کے لیے بہ طور شناخت بالوں کو منڈاوانا لازم قرار دیا تھا، پس بالوں کا منڈوانا ان کے یہاں ضروری اور واجب تھا۔ (لامع الدراری: ۴۶۴/۳)[۷] اسی بناپر امام احمدؒ کا ایک مذہب یہ ہے کہ سر کے بال منڈوانا حج اور عمرہ کے سوا مکروہ ہے، امام مالکؒ کا مذہب بھی یہی ہے کہ سر کے بال منڈانا مکروہ ہے۔ البتہ علامہ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ امت کا اتفاق ہے کہ بالوں کا منڈوانا جائز ہے، اور علامہ ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں کہ: سر کے بال منڈوانے کی چار وجوہات ہوسکتی ہیں: ۱- حج وعمرہ کے بعد ۲- ضرورت کے وقت جیسے آپریشن کروانا ہو، مرہم پٹی لگانی ہو، وغیرہ۔ ان دو صورتوں میں بال منڈوانا قرآن وحدیث یا اجماع امت سے

---

(۵) عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: »يخرج ناس من قبل المشرق، و يقرءون القرآن لا يجاوز تراقيهم، يمرقون من الدين كما يمرق السهم من الرمية، ثم لا يعودون فيه حتى يعود السهم إلى فوقه«، قيل ما سيماهم؟ قال: "سيماهم التحليق - أو قال: التسبيد -". (صحيح البخاري: ۱۱۲۸/۲، رقم: ۷۵۶۲، كتاب التوحيد، باب قراءة الفاجر والمنافق... الخ، ط: البدر - ديوبند)

(۶) عن أنس بن مالك قال: كان شعر رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى نصف أذنيه. عن عائشة رضي الله عنها قالت: ...وكان له شعر فوق الجمة ودون الوفرة. (شمائل ترمذي ص: ۳، ط: ياسر نديم ديوبند)

إذا جاوز شحمة الأذنين وألم بالمنكبين لمة وإذا جاوزت المنكبين فهي جمة وإذا قصرت عنهما فهي وفرة. (فتح الباري - العسقلاني: ۴۸۶/۶، ط: دار المعرفة ☆ مرقاة المفاتيح: ۲۸۳۲/۷، باب الترجل، ط: دار الفكر)

(۷) قال الكرماني: ... وأما هؤلاء فقد جعلوا الحلق شعارهم لجميع أعيانهم في جميع أزمانهم.
كتب في تقرير المكي: أي بأن التحليق كان واجبا عندهم. (لامع الدراري: ۴۶۴/۳، ط: الأشرفية - ديوبند)

ثابت ہے۔ ۳-عام حالات میں بال منڈوانے کو عبادت اور زہد (دنیا سے بے رغبتی) سمجھنا، تو یہ بدعت ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حج وعمرہ کے علاوہ کبھی اس کا حکم نہیں دیا ہے اور نہ اس کا ثواب بیان کیا ہے۔ صحابہؓ وتابعینؒ کا عمل بھی اس کو ثواب سمجھ کر کرنے کا نہیں تھا۔ ۴-عبادت یا زہد سمجھے بغیر عام حالات میں ویسے ہی بال منڈوانا، تو یہ امام احمدؒ اور امام مالکؒ کے مذہب کے مطابق مکروہ ہے، اور امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے مذہب کے موافق (بلاکراہت) جائز ہے۔ (لامع الدراری علی البخاری: ۳/ ۴۳۵) [۸]

مندرجہ بالا تفصیل کی بنیاد پر میں نے شمائل ترمذی میں لکھا ہے کہ صحابہؓ کا عام عمل یہی تھا کہ حج وعمرہ کے سوا بالوں کو منڈواتے نہیں تھے؛ لہٰذا جو لوگ سنت کے موافق بال رکھنے والوں پر طعن وتشنیع کرتے ہیں، ان کو فیشن پرست وغیرہ کہتے ہیں اور بال منڈوانے ہی کو ثواب سمجھتے ہیں وہ راہ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں، جہالت کی وجہ سے دین کو بدنام کر رہے ہیں، ان کے متعلق میں نے لکھا ہے کہ اگر بال رکھنے کو فیشن کہتے ہوں، تو اچھے کپڑے، موزے، خوبصورت گھڑی اور قلم وغیرہ استعمال کرنے والوں کے متعلق کیا کہیں گے؟؟؟ اور جہاں تک عام حالات میں بال منڈوانے کی بات ہے، تو وہ جائز ہے، اس کا انکار شمائل میں نہیں ہے، شرط یہ ہے کہ بال منڈوانے کو ثواب نہ سمجھا جائے، ورنہ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ یہ گناہ کا کام ہوجائے گا، کیوں کہ ثواب کا تعلق تو حج وعمرہ میں بال منڈوانے کے ساتھ خاص ہے اور آپ ﷺ کی دعا کا مصداق بھی یہی ہے۔

اور بال رکھنے والوں پر طعن وتشنیع تو بالکل جائز نہیں، یہ جہالت کی بات ہے، البتہ انگریزی بال رکھنا جائز نہیں، گناہ کا کام ہے، اس میں یہود ونصاریٰ کی مشابہت لازم آتی ہے؛ اس لیے اس کا ترک

---

(۸) ولكون التحليق شعارهم استدل الموفق على إحدى رواية أحمد أن التحليق مكروه، والأخرى عنه لا يكره، لكن تركه أفضل، وقال ابن عبدالبر: قد أجمع الناس على إباحته، وكفى به حجة... وقال ابن تيمية في فتاواه: حلق الرأس على أربعة أنواع: أحدها: حلقه في الحج والعمرة، والثاني: للحاجة، وهما جائزان بالكتاب والسنة والإجماع، والثالث: حلقه على وجه التعبد والتدين والتزهد من غير حج ولا عمرة، وهذا بدعة لم يأمر الله بها أحد من الصحابة والتابعين ولا شيوخ المسلمين المشهورين بالزهد.

والرابع: أن يحلق في غير النسك بغير حاجة، ولا على وجه التقرب والتدين، فهذا فيه قولان للعلماء، وهما روايتان عن أحمد، أحدهما: أنه مكروه، وهو مذهب مالك وغيره، والثاني أنه مباح، وهو المعروف عند أصحاب أبي حنيفة والشافعي. (لامع الدراري شرح جامع البخاري: ۳/ ۴۶۴-۴۶۵، ط: المكتبة الأشرفية ديوبند)

لازم ہے۔ ایسی مشابہت رکھنے والوں کی جگہ دینی اداروں میں نہیں ہے، اگر بالوں کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سمجھ کر رکھے گا، تو ثواب ملے گا اور فیشن سمجھ کر رکھے گا، تو ثواب سے محروم رہے گا۔

پس اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ''مختصر شمائل ترمذی''[۹] میں لکھی ہوئی بات صحیح ہے، اور ہینڈ بیل میں جو لکھا ہوا ہے، اس میں اختصار ہے، اس میں وضاحت ضروری تھی، اگر صاحب مضمون اس میں تفصیل سے لکھتا، تو آپ کو تعارض نہ ہوتا۔

فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۲۴] نماز میں رونے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

دو حدیث کی تحقیق اور راحت قلب کا حیلہ

۳۶۴-سوال: (۱) جب میں نماز میں ''ملك يوم الدين'' اور ''اهدنا الصراط'' (القران) پر پہنچتا ہوں، تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، نماز کی حالت میں اس طرح آنسوں بہنے سے نماز میں فساد آئے گا یا نہیں؟

(۲) جب میں درج ذیل حدیث کے استحضار کے ساتھ نماز ادا کرتا ہوں، تو اللہ کے فضل سے اس کی کیفیت کچھ اور ہی ہوتی ہے اور اتنا لطف آتا ہے کہ نماز پڑھتا ہی رہوں؛ لیکن دوسری طرف یہ خیال بھی آتا ہے کہ تو جس حدیث کے استحضار کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے، وہ تو تو نے ایک بدعتی کی کتاب میں پڑھی ہے یا ایسا خیال آتا ہے کہ تو جس حدیث کو مستحضر کر کے نماز پڑھ رہا ہے وہ تو صحیح نہیں ہے، حدیث یہ ہے:

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تک بندہ اپنی نگاہ ادھر ادھر نہیں پھیرتا اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس کی جانب متوجہ رہتے ہیں اور جیسے ہی بندہ اپنی توجہ دوسری طرف کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی توجہ اس سے ہٹا لیتے ہیں۔ (دوزخ کا کھٹکا)

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ بندہ جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے، تو یقیناً اللہ کے حضور میں ہوتا ہے اگر یہ شخص نماز میں کسی اور چیز کا خیال کرتا ہے، تو اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ اے میرے بندے! تو

(۹) حضرت مفتی بیمات صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تصنیف - جو در حقیقت شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی شمائل ترمذی (اردو) کا گجراتی ترجمہ اور مفید اضافہ ہے - حافظ احمد بیمات صاحب کی خصوصی دل چسپی سے اردو کے قالب میں منتقل ہو گئی ہے اور طباعت کے مرحلے میں ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی قارئین کے ہاتھوں میں ہوگی۔

میری طرف متوجہ رہ، اپنے خیال کو کس طرف لے جارہا ہے؟ کیا تجھے مجھ سے بہتر کوئی اور چیز مل گئی ہے کہ مجھے چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ اے میرے بندے! تو میری طرف متوجہ ہو، مجھ سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ (میری نماز)

آپ سے درخواست ہے کہ میری رہ نمائی فرمائیں اور اس بات کی وضاحت فرمادیں کہ مذکورہ بالا دونوں احادیث صحیح بھی ہیں یا نہیں؟ تاکہ میرے ذہن و دماغ سے وساوس اور غلط قسم کے خیالات دور ہو جائیں۔

(۳) نیز میں جب ذرج ذیل حدیث کا استحضار کر کے اللہ کا ذکر کرتا ہوں، اس وقت میری دلی کیفیت کچھ اور ہی ہوتی ہے اتنا لطف اور لذت محسوس ہوتی ہے کہ میں اسے الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتا؛ لیکن دوسری طرف وساوس کا ایسا ہجوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اس خوف سے رونے لگتا ہوں کہ کہیں موت اسی حالت میں آگئی، تو میرا ایمان اور زندگی بھر کے اعمال اکارت اور برباد ہو جائیں گے، اور کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ مارے خوف کے کلمہ کا ورد کرنے لگتا ہوں، حدیث شریف یہ ہے:

ایک حدیث قدسی میں آتا ہے- جو حضرت ابو ہریرہ سے منقول ہے- کہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا کہ بندہ جب مجھے یاد کرتا ہے اور میرے ذکر سے اس کے ہونٹ کو حرکت ہوتی ہے، تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔

حضرت مفتی صاحب! میں دل ہی دل میں ذکر کرنے کا عادی ہوں، لیکن مذکورہ حدیث پاک کے پیش نظر جب میں یہ سوچتا ہوں کہ ذکر قلبی کے بجائے ہونٹ کو حرکت دے کر ذکر کروں تاکہ مجھے بھی اللہ کی معیت و نصرت حاصل ہو جائے؛ لیکن وساوس وخیالات کا اس طرح ہجوم ہوتا ہے کہ میں اس فضیلت سے محروم ہی رہتا ہوں۔

خلاصہ یہ کہ ذکر و اذکار کے بعد بھی میں چین و سکون سے محروم ہوں، مجھے کسی بھی طرح قلبی راحت و اطمینان نصیب نہیں ہے، آپ میری رہ نمائی فرمائیں اور کسی ایسے وظیفے یا عمل کی نشان دہی کریں، جن سے میرے وساوس وخیالات رفع ہو جائیں اور ذکر و اذکار کی حلاوت نصیب ہو۔

الجواب حامداو مصلیا:

(۱) نماز میں اللہ کے خوف سے رونا آجائے اور رونے کی آواز بھی بلند ہو جائے، پھر بھی اس سے

نماز فاسد نہیں ہوگی۔ (ہدایہ:۱/ ۱۴۴☆درمختار مع شامی:۱/ ۵۷۹)[۱]

جو شخص خشوع خضوع کے ساتھ نماز پڑھے، اپنے کو گنہ گار سمجھ کر اللہ سے ہدایت کی بھیک مانگے، اسے اپنے گناہوں پر ندامت وشرمندگی ہو، اس طرح اسے اللہ کا ڈر اور خوف نصیب ہوتا ہے، پھر جب خوف الٰہی سے رونا آجائے، تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی کہ یہ تو امر مطلوب ہے۔

(۲) مذکورہ حدیث حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے امام احمدؒ، امام ابوداؤد، امام نسائی وغیرہ نے اسے روایت کیا ہے، حاکمؒ نے بھی روایت کرکے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ (الترغیب الترہیب:۱/ ۲۷۳)[۲]

دوسری حدیث بھی بزارؒ نے حضرت جابرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ (الترغیب:۱/ ۲۷۴)[۳]

لہٰذا آپ کا عمل مذکورہ حدیث کے اعتبار سے صحیح ہے، وساوس کی طرف توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) دل ہی دل میں ذکر کے پر بھی ثواب کا ثبوت حدیث پاک سے ثابت ہے، حضرت ابوہریرہ

---

(۱) فإن كان من ذكر الجنة أو النار لم يقطعها " لأنه يدل على زيادة الخشوع ". (الهداية:۱/ ۱۱۴، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة و مايكره فيها، ط: الاتحاد - ديوبند)

(لا لذكر جنة أو نار) فلو أعجبته قراءة الإمام فجعل يبكي ويقول بلى أو نعم أو آري لا تفسد... لدلالته على الخشوع. (در مختار) قال الشامي: لأن الأنين، ونحوه إذا كان يذكرهما صار كأنه قال: اللهم إني أسألك الجنة وأعوذ بك من النار، ولو صرح به لا تفسد صلاته. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۶۱۹-۶۲۰، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة، و مايكره فيها، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) عن أبي ذر - رضي الله عنه - قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يزال الله مقبلا على العبد في صلاته ما لم يلتفت، فإذا صرف وجهه انصرف عنه. (الترغيب والترهيب من الحديث الشريف - عبد العظيم بن عبد القوي، أبو محمد، زكي الدين المنذري (م: ۶۵۶هـ): ۱/ ۲۰۸، رقم الحديث: ۷۸۷، كتاب الصلاة، الترهيب من الالتفات في الصلاة وغيره مما يذكر، ت: إبراهيم شمس الدين، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ سنن أبي داؤد، رقم: ۹۰۹، كتاب الصلاة، باب الالتفات في الصلاة ☆ سنن الترمذي، رقم: ۲۸۶۳، أبواب الأمثال، باب ما جاء في مثل الصلاة والصيام والصدقة ☆ سنن النسائي، رقم: ۱۱۹۵، كتاب السهو، باب التشديد في الالتفات في الصلاة ☆ مسند الإمام أحمد: ۳۵/ ۴۰۰، رقم: ۲۱۵۰۸ ☆ مسند الدارمي المعروف بـ"سنن الدارمي" - أبو محمد، الدارمي (م: ۲۵۵هـ): ۲/ ۸۹۲، رقم: ۱۴۶۳، كتاب الصلاة، باب كراهية الالتفات في الصلاة، ت: حسين سليم أسد الداراني، ط: دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية)

(۳) عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن العبد إذا قام إلى الصلاة أحسبه قال فإنما هو بين يدي الرحمن تبارك وتعالى، فإذا التفت يقول الله تبارك وتعالى إلى من تلتفت إلى خير مني، أقبل يا ابن آدم إلي، فأنا خير ممن تلتفت إليه. (الترغيب والترهيب: ۱/ ۲۰۹، وأخرجه البزار في مسنده برقم: ۹۳۳۲ ☆ وبقية المصادر كما سبق)

رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر میرا بندہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے، تو میں اس کو اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں۔ (بخاری ومسلم)[۱] لہٰذا آپ دل سے اللہ کا ذکر کریں یا زبان سے، بہ ہر صورت ثواب ملے گا، لیکن میرا مشورہ ہے کہ آپ کسی متبع سنت بزرگ کے ہاتھ پر بیعت ہوجائیے، نظام الدین، دیوبند، سہارن پور جلال آباد وغیرہ کے بزرگوں کی صحبت میں کچھ وقت گذاریئے، آپ کا دل جس بزرگ سے مطمئن ہو، انہیں سے بیعت ہوجائیے اور ان کی نصیحت ومشورہ کے مطابق زندگی گزاریئے۔ ان شاء اللہ بہت فائدے محسوس ہوں گے، اور مزید ایمانی اور روحانی ترقیات میسر ہوں گی اور ایسے وقت میں مجھ جیسے گنہ گار اور میری اولاد کے لیے بھی دعا کیجیے۔ فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۲۵] وہ کون سی چیز ہے، جو فتح مکہ کا سبب بنی؟

۳۶۵-سوال: اس اسلامی غزوہ کا نام کیا ہے، جس سے مکہ فتح ہوا تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کے سوالات کرنے سے منع فرمایا ہے، جن سے جواب دینے والا پریشانی میں مبتلا ہوجائے، حدیث پاک میں ہے: "نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن الأغلوطات". [۲] پس اس حدیث کی بنا پر ایسے سوالات کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

سن ۸ ھ میں مکہ فتح ہوا۔[۳] اور اس میں جو غزوہ ہوا، وہی فتح مکہ کا غزوہ ہے، شاید آپ کے سوال کا مقصد یہ ہے کہ وہ کون سا غزوہ ہے، جو فتح مکہ کا ذریعہ وسبب بنا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ "صلح

---

(۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: "يقول الله تعالى: أنا عند ظن عبدي بي، وأنا معه إذا ذكرني، فإن ذكرني في نفسه، ذكرته في نفسي، وإن ذكرني في ملإ، ذكرته في ملإ خير منهم، وإن تقرب إلي بشبر تقربت إليه ذراعا، وإن تقرب إلي ذراعا، تقربت إليه باعا، وإن أتاني يمشي أتيته هرولة". (صحيح البخاري: ۱۱۰۱/۲، رقم: ۷۴۰۵، كتاب التوحيد، باب قول الله: ويحذركم الله نفسه، الخ، ط: البدر - ديوبند☆ صحيح مسلم: ۳۴۱/۲، رقم: ۲-(۲۶۷۵)، كتاب الذكر والدعاء، باب الحث على ذكر الله تعالى، ط: البدر - ديوبند)

(۲) المعجم الكبير: ۳۸۹/۱۹، رقم: ۹۱۳، ط: مكتبة ابن تيمية☆ مسند الشاميين - الطبراني: ۲۱۱/۳، رقم: ۲۱۰۸، ط: مؤسسة الرسالة☆ الإبانة الكبرى - ابن بطة العكبري (م: ۳۸۷ھ): ۴۰۰/۱، رقم: ۳۰۰، ط: دار الراية، رياض)

(۳) كان فتح مكة في عشر بقيت من شهر رمضان سنة ثمان. (البداية والنهاية: ۳۲۷/۴، غزوة الفتح الأعظم، ط: دار إحياء التراث العربي)

حدیبیہ" ہے۔ (۱) چناں چہ صلح حدیبیہ ہی کے موقع پر رسول اللہ ﷺ پر "إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا" الآیۃ (۲) والی سورت نازل ہوئی تھی۔ (۳) اگر آپ کے سوال کا یہ مقصد نہیں ہے، تو اپنا صحیح مقصد لکھ کر واضح کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] دف سے باجا کے جواز پر استدلال جائز نہیں

۳۶۶-سوال: آپ ﷺ کے زمانہ میں دف بجایا گیا تھا، تو موجودہ زمانہ میں باجا وغیرہ بجانے کا کیا حکم ہے؟ عرب علماء اس کی حرمت کے قائل نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

باجا وغیرہ بجانا جائز نہیں ہے، اور دف کے جواز سے باجا کے جواز پر استدلال درست نہیں ہے، کیوں کہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ (۴)

[۲۷] منبر رسول اللہ ﷺ کے زینے کی تعداد

۳۶۷-سوال: ہمارے یہاں ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے، اس میں منبر سے متعلق لوگوں میں کافی اختلاف ہو رہا ہے، بعض کہتے ہیں کہ منبر کے تین زینے ہوں، بعض کہتے ہیں چار سیڑھیاں، بعض کہتے ہیں پانچ، تو کوئی کہتا ہے کہ سات سیڑھیاں، حضرت والا سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی وضاحت فرمائیں کہ منبر رسول اللہ کی کتنی سیڑھیاں تھیں اور وہ منبر کیسا تھا؟۔ بینوا توجروا۔

---

(۱) انظر للبسط: البداية والنهاية: ۴/ ۲۷۸، غزوة الفتح الأعظم، ط: دار إحياء التراث العربي.

(۲) ۴۸-الفتح: ۱.

(۳) نزلت هذه السورة الكريمة لما رجع رسول الله -صلى الله عليه وسلم- من الحديبية في ذي القعدة، من سنة ست من الهجرة. (تفسير ابن كثير: ۷/ ۳۲۵، ط: دار طيبه)

(۴) وفي البزازية: استماع صوت الملاهي كضرب قصب ونحوه حرام؛ لقوله عليه الصلاة والسلام: استماع الملاهي معصية، والجلوس عليها فسق، والتلذذ بها كفر، أي بالنعمة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۳۴۹، كتاب الحظر والإباحة، ط: دار المعرفة)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: امداد الفتاویٰ ۴/ ۲۸۶-۲۸۷ باجوں پر تحقیق کی ایک زبردست چوٹ، ط: تالیفات اولیاء دیوبند۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر مدینہ منورہ کے ''غابۃ'' یعنی جنگل کی لکڑیوں سے بنایا گیا تھا۔ (بخاری شریف: ۱/ ۶۴-۱۲۵) [۱] اور اس منبر کی تین سیڑیاں تھیں۔ (زاد المعاد: ۱/ ۱۲۰-عمدۃ القاری: ۴/ ۱۰۴) [۲] لہٰذا اگر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک مسجد کے منبر کی نقل کرنا چاہتے ہیں، تو تین سیڑھیاں بنائیں اور اس میں اتباع سنت کا ثواب ملے گا۔

اگر آپ کی مسجد بڑی ہے، امام صاحب چھوٹے منبر پر بیٹھیں، تو تمام لوگوں کو نظر نہ آسکتے ہوں یا کوئی اور وجہ ہو تو چار پانچ سیڑیاں بنانا جائز ہے، پس لڑائی جھگڑے کی ضرورت نہیں ہے، لڑائی جھگڑا حرام ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تین سیڑھیاں بنوائی، وہ کوئی ضروری اور واجب نہیں، اس وقت اتنی سیڑھیوں کی ضرورت تھی۔ حاصل یہ کہ اگر کوئی عشق رسول اور محبت رسول میں تین سیڑھیاں بنواتا ہے، تو ثواب ملے گا؛ لیکن اس کو لازم نہیں سمجھنا چاہیے، اگر اس سے زیادہ کی ضرورت ہو، تو زیادہ سیڑھیاں بنوانا جائز ہے، اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۸] درود شریف میں لفظ ''مولانا'' پڑھنا

۳۶۸-سوال: درود شریف میں ایک درود ایسا ہے جس میں: **اللھم صل علی سیدنا مولانا محمد الخ** پڑھا جاتا ہے، تو اس میں لفظ ''مولانا'' جو آتا ہے، اس کا کیا معنی ہیں، بہت سے لوگ اس سلسلہ میں سوال کرتے ہیں، جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

''مولانا'' یہ مرکب ہے، مولیٰ اور نا (ضمیر) سے۔ ''مولا'' کے معنی ہیں: رب، سردار، مددگار، محبت

---

(۱) عن جابر بن عبد اللہ: أن امرأۃ قالت: یا رسول اللہ ألا أجعل لك شیئا تقعد علیه، فإن لي غلاما نجارا؟ قال: »إن شئت« فعملت المنبر. (صحیح البخاري: ۱/ ۶۴، رقم: ۴۴۹، کتاب الصلاۃ، باب الاستعانة بالنجار والصناع في أعواد المنبر والمسجد، ط: البدر دیوبند)

وانظر أیضا ص: ۱۲۵، رقم: ۹۱۷، کتاب الجمعة، باب الخطبة علی المنبر.

(۲) وکان منبرہ ثلاث درجات. (زاد المعاد: ۱/ ۱۸۲، فصل في هدیه صلی اللہ علیه وسلم في خطبته، ط: مؤسسة الرسالة☆ عمدۃ القاري: ۴/ ۱۰۴، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ في السطوح والمنبر والخشب، ط: دار إحیاء التراث العربي)

کرنے والا، احسان کرنے والا وغیرہ[1] اور "نا" جمع متکلم کی ضمیر ہے، اس کے معنی ہیں: ہمارا، ہمارے۔ تو اب یہ لفظ (مولانا) جیسے موقع پر استعمال ہوگا اس کے موافق اس کا مطلب ہوگا، اگر یہ لفظ اللہ کے لیے استعمال ہو اور کہا جائے: "اللہ مولانا" تو اس کا معنی ہوگا: اللہ ہمارے رب ہیں، حضور ﷺ کے لیے استعمال ہو، تو اس کا معنی ہوگا رسول اللہ ﷺ ہمارے سردار ہیں۔ پس سوال میں تحریر کردہ درود شریف کا معنی ہوگا: اے اللہ درود وسلام نازل فرما، ہمارے سردار محمد ﷺ پر۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] چھپکلی کو موذی جانور کیوں شمار کیا جاتا ہے؟

۳٦۹-سوال: چھپکلی کو علماء موذی جانوروں میں کیوں شمار کرتے ہیں؟ حالاں کہ یہ ایک چھوٹا مفید جانور ہے، اس کا بڑا اہم فائدہ یہ ہے کہ یہ دیوار پر موجود چھوٹے کیڑے مکوڑوں کو کھاجاتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

چھپکلی کو موذی (تکلیف دینے والا) اس لیے شمار کرتے ہیں کہ یہ بہت زہریلا جانور ہے اور چھپکلی اور گرگٹ دونوں ایک ہی نوع کے ہیں، مسلم شریف اور مشکوۃ شریف کی روایت کے مطابق اس کو "فویسق" یعنی چھوٹا بدمعاش جانور شمار کیا ہے اور اس کو مار دینے کا حکم بھی آیا ہے۔[2] اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ جس وقت نمرود نے آگ جلائی، تو دنیا کا ہر جان دار خاموش تھا، البتہ گرگٹ اور چھپکلی نے اپنی خباثت کو ظاہر کرتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام کی مخالفت میں ان کو جلانے کے لیے بھڑکائی گئی آگ میں پھونک مارا تھا۔ (مشکوۃ: ۳٦۲)[3] اور ایک روایت میں اس کے مارنے پر ثواب بھی بیان فرمایا ہے کہ جو اس کو ایک ہی وار میں مار ڈالے،

---

(۱) المولی: -۱المالك، -۲العبد، -۳المعتق، -۴المعتق، -۵الصاحب، -٦القريب كابن العم ونحوه، -۷الجار والحليف، -۸الابن والعم، -۹النزيل، -۱۰الشريك، -۱۱ابن الأخت، -۱۲الولي، -۱۳الرب، -۱۴الناصر، -۱۵المنعم، -۱٦المنعم عليه، -۱۷المحب، -۱۸التابع، -۱۹الصهر...وأكثرها قد جاءت في الحديث، فيضاف كل واحد إلى ما يقتضيه الحديث الوارد فيه. (تاج العروس من جواهر القاموس - محمد بن محمد بن عبد الرزاق الحسيني، أبو الفيض، الملقب بمرتضى، الزبيدي (م:۱۲۰۵ھ): ۴۰/۲۴۳، مادہ: ولي، ط: دار الهداية)

(۲) عن عامر بن سعد، عن أبيه، أن النبي صلى الله عليه وسلم «أمر بقتل الوزغ وسماه فويسقا». صحيح المسلم: ۲/۲۳٦، رقم: ۱۴۴-(۲۲۳۸)، كتاب قتل الحيات، باب استحباب قتل الوزغ، ط: البدر - ديوبند.

(۳) عن أم شريك رضي الله عنها أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أمر بقتل الوزغ، وقال: كان ينفخ على إبراهيم عليه السلام. (صحيح البخاري: ۱/۴۷۴، رقم: ۳۳۵۹، كتاب الأنبياء، باب قول الله تعالى: واتخذ الله إبراهيم خليلا، ط: البدر - ديوبند)

اس کے لیے سونیکیاں ہیں اور جو دو وار میں مارے، اس کو سو سے کم اور جو تین وار میں مارے، اس کے لیے اس سے کم نیکیاں لکھی جائیں گی۔ [1] حدیث میں دوسری بار میں مارنے پر کم ثواب اس لیے ہے کہ اس کے نشانہ میں کمی ہے، ملا علی قاریؒ شرح مشکوٰۃ میں تحریر فرماتے ہیں، اس بدمعاش جانور کا کام یہ ہے کہ وہ کھانے پینے کی چیزوں کو زہریلا بنادیتا ہے۔ [2] اور آج کل شادی بیاہ کے کھانوں میں قے وغیرہ کی جو شکایتیں سامنے آتی ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کھانے میں چھپکلی کی رال گری ہوتی ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] کیا دعائے گنج العرش قابل اعتبار ہے؟ اسے پڑھنا چاہیے؟

۳۷۰-سوال: دعائے گنج العرش پڑھنا اور اس کا معمول بنالینا کیسا ہے؟ اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کی گئی ہے، تو کیا اس کا پڑھنا بدعت اور گناہ ہے؟ جواب عنایت فرمائیں، کرم ہوگا۔

الجواب حامداًو مصلیاً:

دعائے گنج العرش کے شروع میں جو ''حدیث نمبر ایک'' بیان کی گئی ہے، وہ صحیح نہیں ہے، اس میں آپ ﷺ کی طرف جھوٹی نسبت کی گئی ہے، کیوں کہ اس میں جو فوائد بیان کئے گئے ہیں، وہ اللہ کے رسول ﷺ نے نہیں بتلائے ہیں، اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کی نسبت کرے، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ (بخاری شریف: ۲۱/۱) [1] اس لیے مذکورہ دعاء کا اس روایت کے پیش نظر پڑھنا جائز نہیں ہے، حدیث اعتماد کے لائق نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] عوام کے لیے حکم شرعی کی علت دریافت کرنا

(خنزیر کیوں حرام ہے)

۳۷۱-سوال: خنزیر کھانا حرام ہے، مگر ایک شخص نے ہم سے سوال کیا کہ کیوں حرام ہے؟ ہم

---

(۱) عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم ... من قتل وزغا في أول ضربة كتبت له مائة حسنة، وفي الثانية دون ذلك، وفي الثالثة دون ذلك «. (صحيح المسلم: ۲/۲۳۶، رقم: ۱۴۷- (۲۲۴۰)، كتاب قتل الحيات وغيرها، باب استحباب قتل الوزغ، ط: البدر - ديوبند)

(۲) قال ابن الملك: ومن شغفها إفساد الطعام، خصوصا الملح، فإنها إذا لم تجد طريقا إلى إفساده، ارتقت السقف وألقت خرأها في موضع يحاذيه. (مرقاة المفاتيح: ۲۶۷۱/۷، كتاب الصيد والذبائح، باب مايحل أكله ومايحرم، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار. (صحيح البخاري: ۲۱/۱، رقم: ۱۱۰، كتاب العلم، باب إثم من كذب على النبي صلى الله عليه وسلم، ط: البدر ديوبند)

نے اسے جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے؛ لیکن اس کی وہ حکمت معلوم کرتا ہے، اس لیے درخواست ہے کہ تفصیل سے جواب دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اس شخص کے لیے آپ کا جواب کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خنزیر کو "فإنه نجس. یعنی خنزیر نجس العین ہے" کہہ کر حرام قرار دیا ہے۔ اس کا ہر ہر جزء نجس وناپاک ہے، اس کا چمڑا دباغت کے بعد بھی ناپاک ہے، جب کہ دیگر حیوانات کے چمڑے دباغت کے بعد پاک ہوجاتے ہیں۔ (۱)

آپ سے اگر وہ حرمت کی وجہ (علت یا حکمت) دریافت کرتے ہیں، تو سوال ہوگا کہ دیگر حرام چیزوں کی وجہ حرمت ان کو معلوم ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے، تو خنزیر کی وجہ حرمت معلوم کرنے سے کیا فائدہ؟ آپ ان کو فقط یہ جواب دیں کہ: ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول وخاتم النبیین مانا ہے، ان کی رسالت پر ایمان لائے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا: اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر جو قرآن شریف اور اس میں جو حکم ہمیں دیا گیا اس پر ایمان لاتے ہیں۔ لہٰذا آپ کو ان کے جواب کی ضرورت نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حکیم الامت حضرت اقدس تھانویؒ فرمایا کرتے تھے: ہم لوگ قانون داں ہیں، قانون بنانے والے نہیں ہیں؛ وجہ حرمت قانون داں نہیں جانتے، قانون ساز (قانون بنانے والا) جانتا ہے؛ لہٰذا آپ کو اس کے تتبع وتلاش کی ضرورت نہیں۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں)

آپ آج اس کی وجہ علت تلاش کریں گے، تو کل یا دو چار دن بعد دیگر احکام کے لیے دوسری وجوہات کا مطالبہ ہوگا، لہٰذا شیطان ایسے لوگوں کو ایمان تک سے نکال دے گا؛ اس لیے عوام کو وجہ حرمت دریافت کرنے کی ضرورت نہیں، بس جواب اول کافی ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

---

(۱) قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ [-۱۰الأنعام: ۱۴۵]

و كل إهاب دبغ ... و هو يتحملها طهر ... خلا جلد خنزير ، فلا يطهر. قال الشامي: أي لأنه نجس العين، بمعنى أن ذاته بجميع أجزائه نجسة حيا و ميتا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۲۰۳، كتاب الطهارة، باب المياه، فرع: محدث انغمس في بئر ، ط: دار الفكر - بيروت)

[۳۲] جو اپنے علم پر عامل نہ ہو، کیا اسے تعلیمی سلسلہ منقطع کر دینا چاہیے

۳۷۲-سوال: ایک شخص حافظ قرآن ہے، مولوی بھی بن رہا ہے اور ہوشیار بھی ہے؛ لیکن اس سے اپنے علم کے مطابق عمل نہیں ہو پاتا، اس وجہ سے وہ اپنی پڑھائی چھوڑ نا چاہتا ہے، تو اس بنیاد پر اس کے لیے اپنی پڑھائی کا چھوڑ نا اچھا ہے یا برا؟

احمد سعید اسماعیل

الجواب حامدا ومصلیا:

مذکورہ وسوسہ ایک شیطانی دھوکہ ہے، طالب علم کو شیطان اس طرح گمراہ کرتا ہے، اس لیے یہ خیالات بالکل غلط اور گمراہ کن ہیں، وہ اپنی پڑھائی کو بالکل منقطع نہ کرے اور اللہ رب العزت سے رات دن دعائیں کرتا رہے کہ ”پروردگا عالم! تو مجھے عمل کی توفیق نصیب فرما، بزرگان دین اور اپنے اکابر کی سوانح حیات کا مطالعہ بھی کرتا رہے، کسی صاحب دل بزرگ کی خدمت میں بھی کچھ ایام گزارے اور وقت اور موقع ہو، تو تبلیغی جماعت میں بھی جایا کرے؛ ان شاء اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق نصیب ہو جائے گی، اعمال سے دوری گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے؛ اس لیے گناہوں کے کاموں کو چھوڑ کر توبہ واستغفار کرکے اعمال صالحہ کی طرف رغبت پیدا کرے؛ ایسے شیطانی وساوس کی وجہ اپنے طلب علم کے سلسلہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اپنانا غیر معقول بات ہے، کیوں کہ دین کی سمجھ اللہ تعالیٰ اسی کو عطا فرماتے ہیں، جس سے خیر کا ارادہ کرتے ہیں۔ [1] واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ

۷/۷/۱۹۷۷ء

[۳۳] کیا چند ماہ کے حمل کا اسقاط ”زندہ در گور کرنا“ ہے؟

۳۷۳-سوال: وہ حمل جو ابھی ناقص ہو اور اس کو دوا سے ساقط کر دیا جائے، تو کیا وہ ”موؤدۃ“

---

(۱) قال حميد بن عبد الرحمن، سمعت معاوية، خطيبا يقول سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: »من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين، وإنما أنا قاسم والله يعطي، ولن تزال هذه الأمة قائمة على أمر الله، لا يضرهم من خالفهم، حتى يأتي أمر الله«. (صحيح البخاري: ۱/۱۹، رقم الحديث: ۷۱، كتاب العلم، باب: من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين وانظر: رقم: ۳۱۱۶، ۳۶۴۱، ۷۳۱۲، ط: البدر- ديوبند☆صحيح المسلم: ۱/ ۳۳۳، رقم الحديث: ۱۰۰-(۱۰۳۷)، باب النهي عن المسألة، كتاب الزكاة، ط: البدر-ديوبند)

(زندہ درگور کرنا) میں داخل ہوگا؟ اور ایسا کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

''مفتی محمد شفیع صاحب'' نے ''معارف القرآن'' میں ''تفسیر مظہری'' سے نقل فرمایا ہے:

مسئلہ: بچوں کو زندہ دفن کر دینا یا قتل کر دینا سخت گناہ کبیرہ اور ظلم عظیم ہے اور چار ماہ کے بعد کسی حمل کو گرانا بھی اسی حکم میں ہے؛ کیوں کہ چوتھے مہینے میں حمل میں روح پڑ جاتی ہے اور وہ زندہ انسان کے حکم میں ہوتا ہے، اسی طرح جو شخص کسی حاملہ عورت کے پیٹ پر ضرب لگائے اور اس سے بچہ ساقط ہو جائے، تو باجماع امت مارنے والے پر اس کی دیت میں غرہ یعنی ایک غلام یا اس کی قیمت واجب ہوتی ہے، اور اگر بطن سے باہر آنے کے وقت وہ زندہ تھا، پھر مر گیا تو پوری دیت بڑے آدمی کے برابر واجب ہوتی ہے اور چار ماہ سے پہلے اسقاط حمل بھی بدون اضطراری حالات کے حرام ہے، مگر پہلی صورت کی نسبت کم ہے کیوں کہ اس میں کسی زندہ انسان کا قتل صریح نہیں ہے، انتہی۔ (معارف القرآن ج:۸ ص:۶۸۳، فی تفسیر سورۃ التکویر)[۱] اگر چہ یہ قتل صریح نہیں ہے، لیکن اگر اسقاط اس نقطۂ نظر سے ہو کہ بعد میں کیا کھلاؤں گا، کیا پلاؤں گا، تو اللہ تعالیٰ کا وعدۂ رزق "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا."[۲] کے خلاف ہے، دوسری جگہ پر فرمایا: ''وَلَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ''[۳] اس نقطۂ نظر سے قتل کرنا ایمان کے عدمِ کامل ہونے کی دلیل ہے، بل کہ ایسے لوگوں کے لیے ایمان کا خطرہ ہے، دوسری بات یہ ہے کہ ایک روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے عزل کے متعلق دریافت کیا گیا۔ تو آپ ﷺ نے اس کو ''وأدِ خفی'' فرمایا۔[۴] تو جو حمل قرار پاچکا ہے، اس کا اسقاط

---

(۱) معارف القرآن شفیعی ۸/ ۶۸۲، ۶۸۳، ط: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔

(۲) ۱۱-ھود:۶.

(۳) ۱۷-الإسراء:۳۱.

(۴) عن عائشة، عن جدامة بنت وهب، أخت عكاشة، قالت: حضرت رسول الله صلى الله عليه وسلم، في أناس وهو يقول: »لقد هممت أن أنهى عن الغيلة، فنظرت في الروم وفارس، فإذا هم يغيلون أولادهم، فلا يضر أولادهم ذلك شيئا« ، ثم سألوه عن العزل؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: »ذلك الوأد الخفي« ، زاد عبيد الله في حديثه: عن المقرئ، وهي: {وإذا الموءودة سئلت}. (صحيح المسلم: ۱/ ۴۶۶، رقم: ۱۴۱-(۱۴۴۲)، كتاب النكاح، باب جواز الغيلة وهي وطي المرضع وكراهة العزل، ط: البدر- ديوبند)

قال المحقق فواد عبد الباقي: (ذلك الوأد الخفي) الوأد دفن البنت وهي حية وكانت العرب تفعله خشية الإملاق وربما فعلوه خوف العار. (المصدر السابق، ط: دار إحياء التراث العربي)

بلاضرورت بدرجۂ اولیٰ واؤ خفی میں داخل ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۴] مکتب میں کس عمر تک کی بچی کو بھیجا جا سکتا ہے؟

۳۷۴-سوال: عموماً مدرسہ (مکتب) میں دو وقت تعلیم کا معمول ہے: دن میں (صبح کے وقت) اور مغرب سے عشاء تک، مکتب میں نوجوان حفاظ کرام تدریس کی خدمت انجام دیتے ہیں، وہاں کتنے سال تک کی لڑکیاں پڑھنے جا سکتی ہیں؟ کیوں کہ لڑکی کو مکتب بھیجنے میں بعض اندیشے ہیں، بہ طور خاص اس صورت میں اندیشے میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، جب کہ تدریس سے وابستہ نوجوان حضرات ہوں، الغرض کتنی عمر تک کی لڑکیوں کو مدرسے میں بھیجا جا سکتا ہے؟ اور کتنی عمر کے بعد مدرسہ کے لیے گھر سے باہر جانا منع ہے؟ بینوا توجروا۔

محمد یوسف، مقام: باگرول، ضلع: جوناگڈھ

الجواب حامداً ومصلیاً:

نابالغ لڑکی کو نوجوان استاد کے پاس پڑھانا جائز ہے، اسی طرح نابالغ لڑکے اور نابالغ لڑکیاں مخلوط تعلیم حاصل کریں، تو بھی جائز ہے، علماء نے لکھا ہے: کہ نابالغ لڑکی کو دیکھنا اور شہوت کے بغیر ہاتھ لگانا جائز ہے۔ (عالم گیری: ج/۵، ص ۱۲۵)[1] لیکن لڑکیاں اگر بالغ ہوں، تو ایسی حالت میں تعلیم کے لیے اتنی عمر کے شخص کو طے کیا جائے، جن سے فتنہ کا خوف اور ڈر نہ رہے: علماء نے لکھا ہے: کہ شہوت کا خوف نہ ہو، تو اجنبی مرد کا اجنبی عورت کو دیکھنا جائز ہے۔[2]

بہتر یہ ہے کہ معلمہ کے طور پر عورت کو طے کرے، بالغ لڑکیوں کے لیے بوڑھا شخص یا عورت بطور استاد کے مل سکے، تو بالغ لڑکیاں پردہ میں اپنا پورا بدن چھپا کر مدرسہ میں پڑھنے جا سکتی ہیں؛ علماء نے لکھا ہے: کہ لڑکی برقعہ سے بدن چھپا ہوا ہو کہ اجنبی مرد کی نظر صرف کپڑے پر پڑے، بدن نہ دیکھ سکے، تو جائز

(۱) فإن كانت صغيرة لا يشتهى مثلها فلا بأس بالنظر إليها ومن مسها؛ لأنه ليس لبدنها حكم العورة، ولا في النظر و المس معنى خوف الفتنة. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۲۹، كتاب الكراهية، الباب الثامن فيما يحل للرجل النظر إليه ...الخ، ط: دار الفكر -بيروت)

(۲) وأما النظر إلى الأجنبيات فنقول: يجوز النظر إلى مواضع الزينة الظاهرة منهن وذلك الوجه والكف في ظاهر الرواية، كذا في الذخيرة. وإن غلب على ظنه أنه يشتهي فهو حرام، كذا في الينابيع. النظر إلى وجه الأجنبية إذا لم يكن عن شهوة ليس بحرام لكنه مكروه، كذا في السراجية. (المصدر السابق)

ہے۔ (عالم گیری: ج/۵، ص:۱۲۵)[1] آزاد عورت کی طرف دیکھنا حرام نہیں ہے، بل کہ بغیر ضرورت کے مکروہ ہے۔ (شامی: ج/۵، ص:۳۲۵)[2] اور دینی تعلیم ضروری چیز ہے، دین وایمان پر باقی رہنے کے لیے تعلیم حاصل کرنا فرض عین یا فرض کفایہ ہے؛ اس لیے نوجوان استاد کے سامنے (الگ انتظام ہو اور) بالغ لڑکیاں پڑھنے آئیں اور ذمہ داروں نے ان کی تعلیم کا الگ انتظام کیا ہو، تو جائز ہے، پھر بھی ضرورت کی وجہ سے فتنہ کے تمام دروازے بند کر کے لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنا جائز ہے؛ البتہ فتنے دن بدن بڑھ رہے ہیں؛ لہٰذا بالغ لڑکیوں کے لیے دن کو تعلیم حاصل کرنے کا انتظام کیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] کیا دعائے جمیلہ کے بے انتہاء فضائل ہیں؟

۳۷۵-سوال: یہاں ایک چھوٹی سی کتاب اردو زبان میں شائع ہوئی ہے، جس کا نام "دعائے جمیلہ" ہے۔ اس میں ایک دعا ہے، جس کے متعلق ایک حدیث لکھی ہے؛ لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا ہے، اس کی سند بھی مذکور نہیں ہے، آپ جناب سے اس کی تحقیق مطلوب ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں؟ ہمارے یہاں بہت سی عورتیں اس کو پڑھتی ہیں؛ کیوں کہ وہ مختصر ہے اور اس کا ثواب بہت زیادہ بیان کیا گیا ہے۔

حدیث یہ ہے: حضرت رسالت مآب ﷺ مسجد نبوی میں بیٹھے تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور کہا: یا رسول اللہ! حق تعالیٰ نے سلام کہا ہے اور "دعائے جمیلہ" آپ کی امت کے لیے بہ طور تحفہ بھیجا ہے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ اس کا ثواب کتنا ہے؟ جبریل علیہ السلام نے کہا: جو اس کو پڑھے گا یا اس کو اپنے پاس رکھے گا، تو اگرچہ اس کے گناہ 'دریا کے قطرے یا جنگل کے ریت یا درختوں کے پتوں کے مانند ہوں' حق تعالیٰ اس دعا کی برکت سے بخش دیں گے اور جاں کنی کے وقت 'حق تعالیٰ اپنی قدرت سے بہ آسانی تمام' خاتمہ بالخیر فرمائیں گے، قبر میں ایک فرشتہ اس کی لاش پر قیامت تک کے لیے متعین کر دیا جائے گا۔ اور جو کوئی پندرہویں رمضان کو روزہ افطار کے وقت پڑھے گا اور جو پڑھنا نہ جانتا ہو،

---

(۱) فإن كان على المرأة ثياب، فلا بأس بأن يتأمل جسدها؛ لأن نظره إلى ثيابها، لا إلى جسدها، فهو كما لو كانت في بيت فنظر إلى جداره، هذا إذا لم تكن ثيابها ملتزقة بها بحيث تصف ما تحتها كالقباء التركية، ولم تكن رقيقة بحيث تصف ما تحتها. (المصدر السابق)

(۲) النظر إلى وجه الأجنبية الحرة ليس بحرام، ولكنه يكره لغير حاجة. رد المحتار: ۱/ ۴۰۷، كتاب الصلوٰة، مطلب في ستر العورة، ط: دار الفكر)

وہ اپنے ہاتھ میں رکھے گا اور گیارہ مرتبہ درود شریف باوضو پڑھے گا، تو بے شمار ثواب پائے گا اور اس کی جو بھی حاجت ہو، اللہ تعالیٰ پوری کرے گا، اگر ساری عمر میں اس دعاء کو کوئی شخص ایک مرتبہ بھی پڑھے گا یا اپنے پاس رکھے گا، تو قیامت کے دن پل صراط سے گزر کر جنت میں داخل ہو جائے ہوگا۔ پھر جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یا رسول اللہ! ڈرایئے اپنی امت کو دوزخ کے عذاب سے۔

مزید لکھا ہے: اور اس دعاء کا پڑھنے والا قیامت کے دن جب قبر سے اٹھے گا، تو مخلوق کہے گی: یہ کون ہے پیغمبر جیسا؟ حق تعالیٰ فرمائے گا: یہ پیغمبر تو نہیں ہے، البتہ یہ وہ شخص ہے، جس نے دنیا میں ''دعاء جمیلہ'' کو صدق دل سے پڑھا تھا۔

اور اس میں مزید لکھا ہے: جو کوئی اس کو فجر کے بعد پڑھے گا، وہ تین سو حج کا ثواب پائے گا اور ظہر بعد پڑھنے والا، پانچ سو حج کا ثواب پائے گا، عصر کے بعد پڑھنے والے کو سو حج اور عشا کے بعد پڑھنے والے کو ہزار حج کا ثواب ملے گا، جب کہ تہجد کے وقت پڑھنے والا تو ایک لاکھ حج کا ثواب پائے گا۔

کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ اگر اس دعاء کی فضیلت عوام کے سامنے بیان کر دی جائے، تو کیا وہ نماز و روزہ وغیرہ نہیں چھوڑ دیں گے؟ کیا اس کا پڑھنا اور شائع کرنا جائز ہے، جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

دشمنانِ اسلام، مسلمانوں کے دلوں سے دین اور احکامِ دین کی عظمت واحترام کو ختم کرنے کے لیے نت نئے طریقے آزمارہے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط باتوں کو منسوب کیا جائے اور کسی معمولی نیکی کا اتنا ثواب بیان کیا جائے، جتنا فرض کا بھی نہیں ہے، ایسی حدیثوں کو ''موضوع روایات'' کہا جاتا ہے، ایسی روایات کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کرنا حرام ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے: وہ جھوٹ جو مجھ پر لگایا جائے، اس طرح کا نہیں ہے، جو کسی کے اوپر لگایا جائے۔ مجھ پر جو شخص جھوٹ لگائے یا میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرے، تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔[1] اسی بنا پر علماء نے لکھا ہے کہ حدیث کا وضع کرنا خواہ احکام کے لیے ہو، یا اعمال کی ترغیب وترہیب کے لیے، بہر

(۱) عن المغيرة رضي الله عنه، قال: سمعت النبي - صلى الله عليه وسلم - يقول: »إن كذبا علي ليس ككذب على أحد، من كذب علي متعمدا، فليتبوأ مقعده من النار. (صحيح البخاري: ص: ۱/ ۱۷۲، رقم الحديث: ۱۲۹۱، كتاب الجنائز، باب: مايكره من النياحة على الميت، ط: البدر، ديوبند☆ صحيح مسلم: ۱/ ۷، رقم الحديث: ۴-(۴)، مقدمة مسلم، باب: باب في التحذير من الكذب على رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم، ط: ديوبند)

صورت حرام ہے۔[۲] اس تمہید کے بعد صورت مسئولہ کے متعلق چند باتیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) مذکور حدیث کی نہ تو سند بیان کی گئی ہے اور نہ ہی اس کا حوالہ لکھا گیا ہے۔ گویا کہ یہ بات حوالے اور سند کے بغیر ہے؛ اس لیے قابل قبول نہیں۔

(۲) مذکور ثواب کو تسلیم کر لینے میں نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ اہم ارکان دین کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے، گویا یہ قرآن کریم اور احادیث متواترہ کے مقتضیٰ کے خلاف ہے۔

(۳) موضوع حدیث کی شناخت و پہچان کے لیے محدثین نے کچھ اصول رقم فرمائے ہیں، حافظ حدیث علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (۷۷۳-۸۵۲ھ) اپنی مشہور کتاب نخبۃ الفکر (ص: ۵۷) میں تحریر فرماتے ہیں کہ موضوع حدیث کی پہچان یہ ہے کہ: ''وہ بات قرآن کریم یا حدیث متواتر یا اجماع امت کے خلاف ہو، یا صاف عقل میں نہ آتی ہو''۔[۳]

غور کیجیے! مذکور دعا کے متعلق جو لکھا ہے کہ ''جو ایک بار پڑھے گا یا اسے اپنے پاس رکھے گا، وہ پل صراط سے گزر کر جنت میں داخل ہو جائے گا'' یہ بات قرآن کریم اور احادیث نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام) کے صراحۃً خلاف ہے۔ قران کریم میں ہے: { فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ. وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ }[۴] ترجمہ: سو جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: گھوڑا تین قسم

---

(۲) الثالثة أنه لا فرق في تحريم الكذب عليه صلى الله عليه وسلم بين ما كان في الأحكام وما لا حكم فيه كالترغيب والترهيب والمواعظ وغير ذلك فكله حرام من أكبر الكبائر وأقبح القبائح بإجماع المسلمين الذين يعتد بهم في الإجماع خلافا للكرامية الطائفة المبتدعة في زعمهم الباطل أنه يجوز وضع الحديث في الترغيب والترهيب وتابعهم على هذا كثيرون من الجهلة الذين ينسبون أنفسهم إلى الزهد أو ينسبهم جهلة مثلهم. (حاشية النووي على مسلم: ۱/ ۸، باب في التحذير من الكذب على رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم، ط: البدر، ديوبند)

(۳) معرفته (الموضوع) بالقرائن الدالة على ذلك متمكنة، وقد يعرف الوضع بإقرار واضعه... ومن القرائن التي يدرك بها الوضع ما يوجد من حال الراوي... ومنها ما يوجد من حال المروي كأن يكون مناقضا لنص القرآن أو السنة المتواترة أو الإجماع القطعي أو صريح العقل؛ حيث لا يقبل شيء من ذلك التاويل. (شرح نخبة الفكر، ص: ۵۶-۵۸، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

(۴) ۹۹- الزلزال: ۷۔

کے لوگوں کے لیے ہے، ایک شخص کے لیے تو باعث اجر ہے، دوسرے کے لیے پردہ پوشی کا ذریعہ ہے اور تیسرے کے لیے عذاب کا باعث ہے۔ جس کے لیے ثواب کا باعث ہے، یہ وہ آدمی ہے، جس نے اللہ کی راہ میں گھوڑا باندھا اور اس کی رسی باغ یا چراگاہ میں ڈھیلی چھوڑ دی، تو وہ (گھوڑا) اس چراگاہ یا باغ کے جس حصہ تک پہنچے گا، اس کا اس آدمی کو ثواب ملے گا اور اگر اس نے رسی توڑ کر ایک یا دو دوڑ لگائی، تو اس کے قدموں اور لید کے عوض اس کو نیکیاں ملیں گی، گھوڑا ایسے آدمی کے لئے باعث اجر ہے۔ اور وہ جس نے گھوڑا بے نیازی ظاہر کرنے اور سوال سے بچنے کے لیے باندھا اور اس کی گردن اور اس کی پیٹھ میں اللہ کے حق کو نہ بھولا، تو وہ اس کے لیے پردہ پوشی کا ذریعہ ہے اور جو اس کو فخر اور غرور کے لیے باندھے، تو یہ اس کے لیے عذاب کا سبب ہے۔ جب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے کے سلسلے میں یہ تفصیل بیان فرمائی، تو بعض صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گدھوں کے متعلق پوچھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سلسلے میں مجھ پر اللہ تعالی نے جامع اور بے نظیر آیت: وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَه. نازل فرمائی ہے۔ (۵)

قرآن کریم کی مذکورہ آیت کریمہ اور حدیث نبوی (علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام) سے بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ انسان کو اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ عمل کا بھی بدلہ دیا جائے گا، اگر اس نے نیک عمل کیا ہے، تو بہترین بدلہ ملے گا اور اگر اس نے برا عمل کیا ہے، تو سزا ملے گی، اگر اس روایت (دعائے جمیلہ) کو صحیح مان لیا جائے، تو جزا و سزا کا جو اسلامی تصور ہے، وہ بے معنیٰ سا ہو جائے گا۔

اسی طرح اس میں ثواب کے متعلق لکھا ہے کہ ''تہجد کے وقت پڑھنے والا تو ایک لاکھ حج کا ثواب

---

(۵) عن أبي هريرة رضي الله عنه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: "الخيل لثلاثة: لرجل أجر، ولرجل ستر، وعلى رجل وزر، فأما الذي له أجر: فرجل ربطها في سبيل الله، فأطال لها في مرج أو روضة، فما أصابت في طيلها ذلك من المرج أو الروضة كان له حسنات، ولو أنها قطعت طيلها، فاستنت شرفا أو شرفين، كانت آثارها وأرواثها حسنات له، ولو أنها مرت بنهر فشربت منه ولم يرد أن يسقي به كان ذلك حسنات له، وهي لذلك الرجل أجر، ورجل ربطها تغنيا وتعففا، ولم ينس حق الله في رقابها ولا ظهورها، فهي له ستر، ورجل ربطها فخرا ورياء، فهي على ذلك وزر "وسئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الحمر، قال: »ما أنزل الله علي فيها إلا هذه الآية الفاذة الجامعة: ﴿فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره. ومن يعمل مثقال ذرة شرا يره﴾ [الزلزلة: ٨]](صحيح البخاري: ٢/ ١٠٩٣، رقم الحديث: ٧٣٥٦، كتاب الإعتصام بالكتاب والسنة، باب الأحكام التي تعرف بالدلائل، وكيف معنى الدلالة وتفسيرها، ورقم الحديث: ٤٩٦٢، كتاب تفسير القرآن، باب سورة إذا زلزلت الأرض زلزالها، ط: البدر، ديوبند ☆صحيح مسلم: ١/ ٣١٩، رقم الحديث: ٢٤- (٩٨٧)، كتاب الزكاة، باب إثم مانع الزكاة، ط: ديوبند)

پائے گا''۔ ذرا سوچیے کہ جب ایک بار دعائے جمیلہ پڑھ لینے سے ایک لاکھ حج کا ثواب مل جاتا ہو، تو پھر حج فرض کون ادا کرے گا؟

اس (دعاء جمیلہ) میں اور بھی متعدد خرابیاں ہیں، جس کی وجہ سے بلا شک وشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ موضوع روایت ہے۔

(۴) ایسا خیال ہوتا ہے کہ مذکورہ دعاء کا لکھنے والا کرامیہ فرقہ کا کوئی فرد ہے؛ کیوں کہ ان کے نزدیک ترغیب وترہیب کے لیے وضع حدیث جائز ہے۔ (۶)

دین کے دشمنوں نے مسلمانوں کو دین کے صحیح طریقے سے غافل کرنے کے لیے اس قسم کی سازش رچی ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ اس طرح کے فتنے کے وقت مکمل بیدار مغزی کا ثبوت دیں اور دین کے صحیح طریقے پر عمل کریں۔ الغرض مذکورہ دعاء صحیح اور ثابت نہیں ہے، اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ سے جو دعائیں منقول وماثور ہیں، انہی دعاؤں کو پڑھنا چاہیے۔

(۵) چوں کہ یہ (دعائے جمیلہ) موضوع ہے؛ اس لیے (موضوع جاننے کے باوجود) اس کا لکھنے والا، شائع کرنے والا اور پڑھنے والا؛ ہر ایک گنہ گار ہوگا؛ کیوں کہ حدیث موضوع کی روایت واشاعت (اُس کا حکم بیان کیے بغیر) جائز نہیں ہے۔ (۷) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۳۶] خرمن اٹھاتے وقت اس کو اس عقیدہ سے مارنا کہ اللہ کا ذکر بند کردے

۳۷۶-سوال: حدیث شریف میں ہے کہ ہر جان دار اور بے جان چیز اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی ہے، اسی لیے بعض لوگ خرمن (غلے کا وہ ڈھیر جس سے بھوسا الگ نہ کیا گیا ہو) اٹھاتے وقت اس کو دو چار بار بجاتے (مارتے) ہیں تاکہ تسبیح پڑھنا بند کردے، پھر خرمن استعمال میں لاتے ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟

(۶) دیکھیے اسی سوال کا حاشیہ نمبر: ۲۔

(۷) قال ابن حجر العسقلاني - رحمه الله تعالى -: واتَّفقوا على تحريم رواية الموضوع إلاَّ مقروناً ببيانه؛ لقوله صلى - الله عليه وسلَّم -: مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بحديثٍ يُرى أنَّه كذب فهو أحدُ الكاذِبِين، أخرجه مسلم. (نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر في مصطلح أهل الأثر: ۱/ ۲۲۵، الطعن في الراوي وأسبابه، حكم رواية الموضوع، ت: عبد الله بن ضيف الله الرحيلي، ط: مطبعة سفير بالرياض)

الجواب حامداً ومصلیاً:

ہر چیز اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی ہے یہ بات صحیح ہے۔[1] لیکن جب پانی بہنا بند ہو جائے، تو اس کا ذکر بند ہو جاتا ہے، اسی طرح جب پتھر کے ٹکڑے کر دیے جائیں، تو اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور اس کا ذکر بند ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی جب درخت کو کاٹ دیا جائے، یا پودے کو توڑ دیا جائے، تو اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور ذکر و تسبیح بند ہو جاتے ہیں لہٰذا مخرمن کے متعلق آپ نے جو لکھا ہے، وہ عمل صحیح نہیں ہے، اس کا ترک کرنا ضروری ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۷] انسان کی روح قبض ہونے سے پہلے اس کے نام کا پتہ درخت سے گرتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

۳۷۷-سوال: انسان کی روح قبض ہونے سے ۴۰ دن پہلے اس کے نام کا پتہ جس درخت سے گر جاتا ہے، اس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کسی بھی صحیح روایت میں اس کا تذکرہ نہیں ہے کہ ایسا درخت کہاں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۸] صفر والے عدد کے اخیر میں ایک لگایا جائے تا کہ اللہ کی وحدانیت کی طرف اشارہ ہو، یہ بات درست نہیں

۳۷۸-سوال: کیا ایسی کوئی حدیث ہے، جس میں یہ بات مذکور ہو کہ کسی عدد کے اخیر میں جب صفر آئے تو اس جگہ ایک لکھا جاوے جو اللہ کی وحدانیت کی طرف اشارہ کرے مثلاً ۱۰۱، ۲۰۱، ۳۰۱، ۱۰۰۱، ۲۰۰۱۔

---

(۱) (وإن من شيء) من الأشياء حيوانا كان أو نباتا أو جمادا (إلا يسبح... بحمده أي ينزهه تعالى بلسان الحال عما لا يليق بذاته الأقدس من لوازم الإمكان ولواحق الحدوث إذ ما من موجود إلا وهو بإمكانه وحدوثه يدل دلالة واضحة على أن له صانعا عليما قادرا حكيما واجبا لذاته قطعا للسلسلة. (تفسير أبي السعود = إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم-أبو السعود العمادي محمد بن محمد بن مصطفى (م: ۹۸۲ھ): ۳/ ۲۵۴، ت: عبد القادر أحمد عطا، ط: مكتبة الرياض الحديثة-الرياض)

الجواب حامداً ومصلیاً:

حدیث شریف میں آیا ہے حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے اہل قرآن! (حافظو یا مؤمنو) وتر پڑھا کرو؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ وتر ہے، وتر کو پسند کرتے ہیں (رواہ ابوداؤد)[1]

وتر کا مطلب طاق عدد ۱، ۳، ۵، وغیرہ ہے یعنی جب کوئی کام کرو، تو مقدار میں طاق عدد کا لحاظ رکھو، نماز میں تسبیح تین یا پانچ یا سات مرتبہ پڑھو وغیرہ۔ اسی طرح جو عمل بھی عدد اور مقدار سے تعلق رکھتا ہو، تو اس میں طاق کا لحاظ رکھنا مستحب ہے۔

اس لحاظ سے ۲۰۱ وغیرہ بھی اس فضیلت میں شامل ہے، وحدانیت پر اشارہ مقصود نہیں ہوتا اور یہ بھی درست نہیں کہ جہاں صفر آئے، تو خواہ مخواہ ایک لکھ دیا جائے، چالیس کا عدد بھی فضیلت والا ہے؛ لیکن یہ مطلب نہیں کہ چالیس کو اکتالیس لکھا جاوے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۹] اللہ کی رحمت کو جوش میں لانے کی تدبیر اختیار کرنا

ایک واقعہ کی تحقیق

۳۷۹-سوال: ایک بزرگ قرض لے لے کر غریبوں کی امداد کرتے رہے اور قرض خواہ جب قرض کا مطالبہ کرنے کے لیے آئے، تو بزرگ سر سے لے کر پاؤں تک چادر اوڑھ کر سو گئے، ایسے وقت میں ایک بچہ حلوا بیچنے کے لیے آیا، تو بزرگ نے حاضرین کو حلوا کھانے کے لیے کہا، اس کے بعد پیسے نہ ملنے کی جہ سے بچہ رونے لگا۔ اور رونے پر اللہ کی طرف سے فیصلہ ہوا، آپ سے دریافت امر یہ ہے کہ یہ کون سے بزرگ کا قصہ ہے؟

الجواب حامداً مصلیاً:

جب تک بچہ نہیں روتا ہے، ماں دودھ نہیں پلاتی اور ماں کی مامتا جوش میں نہیں آتی، ٹھیک اسی طرح اللہ کی رحمت اس کے دربار میں عاجزی اور گڑگڑانے کی وجہ سے زیادہ جوش مارتی ہے۔ تو اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لیے مذکورہ بزرگ نے یہ تدبیر ختیار کی؛ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم لوگوں کے حقوق ادا نہ کریں اور ان کو رلائیں تو اللہ ہم پر مہربان ہو جائے گا اور ہم پر روزی کے دروازے کھول دے گا۔

مذکورہ قصہ میں بزرگ کو اللہ پاک کے ساتھ گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے ان کو اللہ پر ناز تھا اور اپنی

(۱) عن علي رضي الله عنه، قال: قال رسول الله- صلى الله عليه وسلم: "يا أهل القرآن، أوتروا، فإن الله وتر، يحب الوتر". (سنن ابی داؤد، ص: ۲۰۰، رقم الحدیث: ۱۴۱۶، کتاب الصلاۃ، باب استحباب الوتر، ط: البدر-دیوبند)

حالت چھپانے کی ایک کوشش تھی، حقیقت میں وہ اس بزرگ کی عاجزی وگریہ وزاری کا اثر تھا اپنی عاجزی کے سہارے کے لیے ایک بچہ کو رلا کر التجا کر رہے تھے، رونا اللہ کو پسند ہے جیسا کہ بارش نہ ہو اور قحط سالی ہو جائے، تو ایسے قحط کے زمانہ میں صلوۃ استسقاء کے لیے بستی سے باہر پھٹے پرانے کپڑے پہن کر نکلنا اور ساتھ میں بچوں اور جانوروں کو لے جانا اور بچوں کو ان کی ماؤں سے علیحدہ رکھنے کا حکم ہے۔ [1] تا کہ دعاء کے ساتھ بچوں کا رونا اللہ کی رحمت کا ذریعہ بن جائے اور ایک عاجزی اور بندگی کا ماحول پیدا ہو جائے اور اللہ کی رحمت جوش میں آجائے؛ لہٰذا مذکورہ بزرگ نے بھی ماحول پیدا کرنے کی غرض سے اس طرح کیا تھا اور اپنی حالت چھپانے کے لیے چادر میں سو کر التجاء کی کہ یارب! خیال رکھ لینا جو لینا ہے تجھ ہی سے لینا ہے دوسرے سے مانگنے والا نہیں ہوں، جس کے نتیجے میں اللہ کی رحمت جوش میں آگئی، بزرگ کا مقصد ظلم کرنے کا نہیں تھا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۰] کیا اسلام میں فضیلت کی بنیاد قبیلہ وخاندان ہے؟

۳۸۰-سوال: کیا امت محمدیہ میں ذات پات، قبیلہ وخاندان، مرتبہ اور عزت کے اعتبار سے کوئی تفریق ہے؟ اسلام تو مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ سید قوم کا درجہ دوسری قوموں سے اونچا ہے، تو کیا شریعت کی رو سے سیدوں کا درجہ اونچا ہے؟ وہ آل رسول ہیں، خصوصاً وہ مسلمان، جو اپنے آپ کو سید کہتے ہیں یا ان کا لقب سید ہے، تو وہ مسلمان معاشرہ میں سید ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً

اسلام میں ذات پات، قبیلہ خاندان، مرتبہ عزت کے اعتبار سے کوئی تفریق نہیں ہے، اسلام میں بڑا مرتبہ تقوی اور پرہیزگاری کو ہے، اسی لئے ادنی خاندان والا اگر متقی اور پرہیزگار ہے تو وہ بڑے مرتبہ والا ہے اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں: یایہا الناس انما خلقنکم من ذکر وانثی و جعلنا کم شعوبا

---

(۱) (ویخرجون ثلاثة أيام متتابعات) ويستحب للإمام أن يأمرهم بصيام ثلاثة أيام قبل الخروج وبالتوبة ثم يخرج بهم في الرابع (مشاة في ثياب غسيلة أو مرقعة متذللين متواضعين خاشعين لله ناكسين رءوسهم ويقدمون الصدقة في كل يوم قبل خروجهم ويجددون التوبة ويستغفرون للمسلمين ويستسقون بالضعفة والشيوخ) والعجائز والصبيان ويبعدون الأطفال عن أمهاتهم. ويستحب إخراج الدواب. قال الشامي: (قوله ويبعدون الأطفال إلخ) أي ليكثر الضجيج والعويل فيكون أقرب إلى الرقة والخشوع. (الدر المختار مع رد المحتار:۲/۱۸۵،باب الاستسقاء،ط:دار الفكر)

وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم.[1]

اے لوگوں،ہم نے تم کوایک مرد(آدمؑ)اورایک عورت (حوا) سے پیدا کیا،ہم نے تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے؛تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو،یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو تم میں زیادہ متقی ہو۔

دوسری قوموں اور مذہب میں جو ذاتی اور خاندانی تفریق ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا کافروں کے ساتھ تھا اس نے حضرت نوحؑ کی بات نہیں مانی، تو ہلاک ہوگیا۔[2] سرکار دو عالم ﷺ کے چچا ابو طالب کافر تھے اور کفر کی حالت میں انتقال ہوا؛ اس لیے اسلام کی رو سے عزت اور مرتبہ،تقوی اور پرہیزگاری کی بنیاد پر ہے اس لیے نبی کریم ﷺ نے حضرت فاطمہ سے فرمایا کہ اے فاطمہ!تو فخر مت کر کہ میں محمد ﷺ کی لڑکی ہوں، اللہ کے یہاں نیکی ہی کام آئے گی۔[3]

لہٰذا فضیلت اور مرتبہ کی بنیاد تقوی پر ہے، دوسری قوموں اور مذہب کی طرح خاندان یا ذات پات پر نہیں ہے، آج بھی اگر پس ماندہ لوگوں میں سے کوئی مسلمان ہوجائے،توان کو وہی حقوق دیے جائیں گے جو ایک مسلمان کو دیے جاتے ہیں، نیز آل رسول اور سید وہ ہے جو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ کی اولاد ہے، جن کو اللہ کے رسول سے نسبت ہے، ان کو سید کہا جاتا ہے، ان کی عزت اور مرتبہ کی بناء پر زکوۃ دینا جائز نہیں۔[4] لیکن سید خاندان کے اعتبار سے اور ذات پات کی بنا پر کوئی خاص حق ان کو حاصل نہیں البتہ آل رسول ہونے

---

(۱) يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿١٣﴾.(۴۹-الحجرات:۱۳)

(۲) قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ إِنِّي أَعِظُكَ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٤٦﴾(۱۱-هود:۴۶)

(۳) عن أبي هريرة، قال: لما نزلت {وأنذر عشيرتك الأقربين} [الشعراء: ۲۱۴] جمع رسول الله صلى الله عليه وسلم قريشا فخص وعم فقال: «يا معشر قريش أنقذوا أنفسكم من النار فإني لا أملك لكم من الله ضرا ولا نفعا، يا معشر بني عبد مناف أنقذوا أنفسكم من النار فإني لا أملك لكم من الله ضرا ولا نفعا، يا معشر بني قصي أنقذوا أنفسكم من النار فإني لا أملك لكم ضرا ولا نفعا، يا معشر بني عبد المطلب أنقذوا أنفسكم من النار فإني لا أملك لكم ضرا ولا نفعا، يا فاطمة بنت محمد أنقذي نفسك من النار فإني لا أملك لك ضرا ولا نفعا، إن لك رحما سأبلها ببلالها. (سنن الترمذي: ۲/ ۱۵۳، رقم الحديث: ۳۱۸۵،أبواب تفسير القرآن عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ومن سورة الشعراء، ط: البدر - ديوبند)

(۴) (و) لا إلى (بني هاشم). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۵۰، كتاب الزكاة، مصرف الزكاة، ط: دار الفكر)

کی بنا پر جن کے نانا حضرت محمد ﷺ ہیں، جن کے طفیل ہم کو اسلام ملا، جنھوں نے ایمان اور اسلام کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں؛ لہٰذا ان کی اولاد اور خاندان سے محبت کرنا یہ ایمان کے مضبوط اور صحیح ہونے کی دلیل ہے، ان کے علاوہ اور کوئی حق ان کو نہیں دیا گیا، اور جو مسلمان اپنے آپ کو سید کہتے ہیں ان کی تحقیق تاریخ سے یا خاندان کے بڑے لوگوں کے کہنے سے معلوم ہوسکتی ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۱] تاریخ کی غرض وغایت

۳۸۱-سوال: کیا تاریخ کی غرض وغایت ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں کہ ماضی میں جو غلطیاں ہو چکیں وہ ہم سے مستقبل میں نہ ہونے پائے ایسا سبق لے کر روشن مستقبل بنانے کا موقع ہم کو تاریخ کے مطالعہ سے ملتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیا:

تاریخ کی تعریف یہ ہے کہ ان اہم قصے اور واقعات کا ذکر جو ماضی میں پیش آئے ہوں، لہٰذا اسلامی تاریخ کی غرض وغایت ان الفاظ میں بیان کی جاسکتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی، آپؐ کے صحابۂ کرامؓ، تابعینِ عظام اور اُن کے بعد کے اولیاءِ کرامؒ کی خوبیاں دیکھ کر مستقبل میں ان خوبیوں کو مدِ نظر رکھ کر روشن مستقبل بنانے کا موقع ہمیں اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے ملتا ہے۔[(۱)]

سوال میں جن الفاظ کے ذریعہ تاریخ کی غرض وغایت بیان کی گئی ہے وہ مطلق تاریخ پر منطبق ہے، لیکن صحابۂ کرامؓ اور تابعین عظام کے دور کے لیے مناسب نہیں ہے، کیوں کہ ان الفاظ کا حاصل یہ ہے کہ اگلے لوگوں نے صرف غلطیاں کی ہیں، اور ہم چوں کہ غلطی کرنا نہیں چاہتے؛ اس لیے ہمیں بطورِ عبرت کے تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے، حاصل کلام یہ کہ ان الفاظ میں اگلے لوگوں پر ایک گنا الزام وطعن کی بو آتی ہے، جو صحابۂ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کی شایانِ شان نہیں، اگر چہ ان سے بھی بتقاضۂ بشریت کچھ غلطیاں ضرور ہوئی ہوں گی؛ لیکن پھر بھی وہ خیر القرون میں ہونے کی وجہ سے ہم سے بڑھ کر تھے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۲] کتاب ''شادی بیاہ کی اصلاحی تحریک'' کے فارسی اشعار کا مطلب

۳۸۲-سوال: کتاب ''شادی بیاہ کی اصلاحی تحریک'' (مصنفہ جناب ڈاکٹر اسرار احمد، ط:

(۱) علم تاریخ اصطلاحاً اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بادشاہوں، نبیوں، فاتحوں اور مشہور شخصوں کے حالات اور گذرے ہوئے مختلف زمانوں کے عظیم الشان واقعات ومراسم وغیرہ معلوم ہوسکیں اور جو زمانہ گذشتہ کی معاشرت، اخلاق، تمدن وغیرہ سے واقف ہونے کا ذریعہ بن سکے۔ (تاریخ اسلام-مولانا اکبر شاہ خان، نجیب آبادی: ۱/۳۱، مقدمہ، ط: مکتبہ علمیہ، سہارن پور)

حبیب ٹرسٹ بمبئی) میں دو فارسی شعر لکھے ہوئے ہیں، برائے کرام ان کے معانی کی جانب رہنمائی فرمائیں۔

(۱)...... زمین جنبد، نہ جنبد گل محمد

(۲)...... یا سراپا نالہ بن جا، یا نوا پیدا نہ کر (اقبالؒ)

الجواب حامداً ومصلیاً

اس طرح کے اشعار یا محاورات کے معانی کا بیان کلام کے سیاق وسباق پر موقوف ہوتا ہے، سیاق و سباق میں جو مضمون ہوگا، اس کے مطابق اس کے معانی مراد ہوں گے، جب تک ماقبل و مابعد کا کلام پڑھا نہ جائے، معنیٔ مرادی کا بتانا مشکل ہے، تاہم پہلے شعر میں شاعر نے یہ بات بیان کی ہے کہ ضدی آدمی اپنی ضد سے کبھی باز نہیں آتا، وہ کسی کا کہنا نہیں مانتا، کہ زمین اپنی جگہ سے ہل جائے، یہ تو ممکن ہے؛ لیکن ضدی آدمی کا اپنی ضد چھوڑنا اس سے زیادہ محال بات ہے۔

دوسرے شعر کا حاصل یہ ہے کہ اے مخاطب! تجھے اپنے احوال کے پیش نظر خوشیوں کے نغمات زیب نہیں دیتے، تیرے لیے تو اپنی حالت پر رونا اور عاجزی کرنا ہی اچھا ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۳] لڑکی کا نام شبینہ رکھنا، حضرت خضر کون تھے؟ خضر کے کیا معنیٰ؟

۳۸۳-سوال: بعض لوگ اپنی لڑکی کا نام شبینہ رکھتے ہیں، تو اس کے کیا معنیٰ ہیں؟ حضرت خضر کون تھے؟ نبی یا فرشتہ؟ اور لفظِ خضر کے کیا معنیٰ ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

فارسی زبان میں رات کے عمل کو شبینہ کہا جاتا ہے۔[1] حضرت خضر علیہ السلام اللہ کے نبی تھے، مگر وہ تشریعی امور کے نہیں؛ بل کہ تکوینی امور کے نبی تھے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں کائنات کے نظام کا علم عطا فرمایا تھا، تفسیر کی کتابوں میں مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ جس جگہ بیٹھتے تھے وہاں ہرا گھاس اگتا تھا، اس لیے ان کا نام خضر مشہور ہوا، کہ خضر کے معنیٰ عربی زبان میں سبزی کے ہیں۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فیروز اللغات، ۸۳۷، ط: نعیمیہ، دیوبند۔

(۲) عن أبي هريرة رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: »إنما سمي الخضر أنه جلس على فروة بيضاء، فإذا هي تهتز من خلفه خضر. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۸۳، رقم الحديث: ۳۴۰۲، كتاب الأنبياء، باب حديث الخضر مع موسى عليهما السلام، ط: البدر - ديوبند)

لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ. (۵۶-الواقعہ:۷۹)

باب ما يتعلق بالقرآن والحديث

(قرآن کریم اور احادیث نبویہ)

O

قرآن کریم اور احادیث نبویہ

[۱] قرآن کریم اور حدیث پاک میں کیا فرق ہے؟

۳۸۴-سوال: کیا تمام احادیث قرآن کریم کی دلیل ہیں؟ قرآن کریم اور احادیث میں فرق کیا ہے؟ اور دونوں میں اہمیت کس کی زیادہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

قران شریف کی ہر آیت اور ہر کلمہ قطعی ہے، کسی بھی ایک آیت کا انکار کرنے والا ایمان سے نکل جاتا ہے، قران شریف کا چودہ سو سال سے یہ چیلنج قائم ہے کہ اگر اس کے اللہ تعالی کی طرف سے ہونے میں تمہیں کوئی شک ہے، تو ایک چھوٹی سورت بھی اس جیسی بنالاؤ:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ (۲-البقرة:۲۳)

ترجمہ: اور اگر تم کچھ خلجان میں ہو، اس کتاب کی بہ نسبت، جو ہم نے نازل فرمائی ہے، اپنے بندۂ (خاص) پر، تو (اچھا) پھر تم بنالاؤ، ایک محدود ٹکڑا، جو اس کا ہم پلہ ہو، اور بلالو اپنے حمایتیوں کو، جو خدا سے الگ ہیں، اگر تم سچے ہو۔

قرآن کریم کا تو ہر ہر لفظ قیامت تک اپنی جگہ باقی رہنے والا ہے، اس کے ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا یا پڑھنا حرام ہے۔

ہر حدیث کے متعلق اصول حدیث میں تفصیل بیان کی گئی ہے کہ وہ کس درجے کی ہے، صحابۂ کرام

رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جن الفاظ وارشادات کو سنا ہے، اکثر نے تو انہیں بعینہ بیان کیا ہے،، البتہ بعض احادیث معنیً بھی مروی ہیں، جن کی تعداد کم ہے۔[1] قرآن کریم اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین فرق لکھنے سے آپ کو سمجھ میں نہیں آئے گا، ایک بار روبرو مل کر سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ فقط، واللہ سبحانہ تعالی اعلم۔

۸/مارچ ۱۹۸۰ء

[۲] بوسیدہ قرآن اور دینی اوراق کو نذر آتش کرنا

۳۸۵-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیان شرع متین زیر نظر مسئلہ میں کہ:

بوسیدہ قرآن، یا کسی بھی دینی یا مذہبی تحریر کو بے ادبی کے خوف سے جلا دینا یا آگ کی نذر کرنا کیسا ہے؟ امید ہے کہ تسلی بخش جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں عطا فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلياً:

وہ رسائل یا کاغذات، جن میں اللہ کا نام، قرآن شریف کی آیات، یا احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں، ان کو پتھر سے باندھ کر دریا میں ڈالنا یا قبرستان میں دفن کرنا جائز ہے، اسی طریقہ سے اگر ان کو جلایا جائے، تو یہ بھی جائز ہے، تاکہ اللہ کے نام کی اور قرآن شریف کی بے حرمتی نہ ہو، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں قرآن کریم لغت قریش پر جمع فرما کر اطراف عالم میں چار پانچ نسخے روانہ فرمائے، اور اس سے قبل قرآن شریف جن چیزوں پر لکھا گیا تھا، ان تمام کو جلا دیا۔ **وأمر بما سواه من القرآن في كل صحيفة أو مصحف أن يحرق.** (بخاری شریف)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) دیکھیے، کفایت المفتی: ۱/۹۹، کتاب العقائد، ط: کراچی۔

(۲) صحيح البخاري: ۲/۷۴۶، رقم: ۴۹۸۷، كتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، ط: البدر - ديوبند.

لیکن فقہاء نے لکھا ہے کہ قرآن مجید اور دینی اوراق کو جلایا نہ جائے؛ کیوں کہ جلانے میں ایک قسم کی توہین ہے اور فی زمانہ تو اسے انتہائی برا سمجھا جاتا ہے اور امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غیر قریشی قرآن جلانے کا جو حکم دیا تھا، تو وہ بنا بر مصلحت تھا، وہ یہ کہ اگر پانی میں ڈالتے، تو لوگ نکال لیتے یا مٹی میں دفناتے تو بھی نکال لیا جاتا اور تا قیامت تورات وانجیل کی طرح اختلاف رہتا، اس مصلحت سے جلایا گیا تھا۔ پس قرآن مجید اور دینی اوراق کو یا تو اس طرح دفن کیا جائے، جس طرح بغلی قبر میں مردے کو رکھا جاتا ہے، تاکہ اس پر مٹی نہ پڑے، اور اوپر تختہ رکھ کر مٹی سے چھپا دیا جائے تو بھی مضائقہ نہیں۔ یا ان کے ساتھ کوئی وزنی شئے باندھ دی جائے اور کسی بہتے ہوئے گہرے پانی میں یا کنویں کی تہ میں احترام کے ساتھ پہنچا دیا جائے:

والمصحف اذا صار بحال لا يقرأ فيه يدفن. (الدر المختار) وفي الشامية: أي يجعل في خرقة طاهرة، ويدفن في=

[۳] قرآن کریم کا ترجمہ کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

۳۸۶-سوال: قرآن کریم کا ترجمہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فقہائے کرام کا اس سلسلہ میں کیا موقف رہا ہے؟ متقدمین ومتاخرین کا اس سلسلے میں اگر اختلاف ہو، تو ذکر فرمائیں، نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

قرآن کریم کا عربی زبان کے علاوہ دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز ہے، اس جواز کے خلاف احقر کو دوسرا مسلک عدم جواز کا معلوم نہیں ہوا، تو عدم کی دلیل کیا لکھی جائے، جواز کے دلائل یہ ہیں:

(۱) رسول اللہ نے ہرقل روم کے بادشاہ کو دعوت نامہ تحریر فرمایا تھا، اس خط مبارک میں یہ آیت کریمہ تحریر فرمائی تھی: قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ .الآیۃ (۳-آل عمران: ۶۴) اس سے استدلال کر کے امام بخاریؒ نے باب منعقد فرمایا ہے: ''باب مایجوز من تفسیر التوراۃ وغیرھا من کتب اللہ بالعربیۃ وغیرھا لقول اللہ تعالیٰ قل فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا إن کنتم صادقین''. (بخاری شریف: ۲/ ۱۱۲۵، فتح الباری: ۱۷/ ۲۹۹، عینی: ۲۵/ ۱۱۱، کرمانی: ۱۵/ ۲۳۱)(۱)

ہرقل عربی زبان نہیں جانتا تھا، اس کے باوجود عربی میں خط کو تحریر فرمانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ترجمان اس کا ترجمہ بادشاہ کو اور دیگر اراکین کو سناوے، کرمانی تحریر فرماتے ہیں: ''قلت کان غرض

= محل غیر ممتھن: لایوطأ، وفي الذخیرۃ: وینبغي أن یلحد له ولا یشق له؛ لأنه یحتاج إلی إھالة التراب علیه، وفي ذلك نوع تحقیر إلا إذا جعل فوقه سقفاً بحیث لا یصل التراب إلیه فھو حسن أیضا . . . ولا بأس بأن تلقی في ماء جار کماھي أو تدفن وھو أحسن.(۲)(رد المحتار مع الدر المختار: ۱/ ۱۷۷، کتاب الطھارۃ، سنن الغسل، ط: دار الفکر) وفي الھندیة: المصحف إذا صار خلقاً وتعذرت القراءۃ منه، لا یحرق بالنار، أشار الشیباني إلی ھذا في السیر الکبیر، وبه نأخذ، ھکذا في الذخیرۃ. (الفتاوی الھندیة: ۵/ ۳۲۳، کتاب الکراھیة، الباب الخامس: في آداب المسجد والقبلة والمصحف... الخ، ط: دار الفکر-بیروت. وھکذا في فتاوی دار لعلوم: ۱۴/ ۲۶۴-۲۶۵، آداب قرآن کریم، ط: مکتبہ دار العلوم-دیوبند☆امداد الفتاوی: ۴/ ۵۴ قرآن مجید ودیگر قابل تعظیم اشیاء کے احکام، ط: ادارہ تالیفات اولیاء-دیوبند☆ کفایة المفتی: ۱/ ۱۱۷☆امداد المفتیین: ۲۳۸)

(۱) صحیح البخاري: ۲/ ۱۱۲۵، کتاب التوحید، ط: البدر دیوبند.

عمدۃ القاري: ۲۵/ ۱۹۱، ط: دار إحیاء التراث العربي.

فتح الباري: ۱۳/ ۵۱۶، ط: دار المعرفة، بیروت.

صحیح أبي عبد اللہ البخاري بشرح الکرماني المعروف بـ الکواکب الدراري: ۲۵/ ۲۳۱، ط: دار إحیاء التراث العربي.

النبي صلى الله عليه وسلم في إرساله إليه أن يترجم عنده ليفهم مضمونه. الخ (۱۵/ ۲۳۱)[۲]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: ”کتب النبي صلى الله عليه وسلم إلى هرقل باللسان العربي ولسان هرقل رومي، ففيه اشعار بأنه اعتمد في إبلاغه مافي الكتاب على من يترجم بلسان المبعوث إليه ليفهمه والمترجم المذكور هو الترجمان... والحاصل أن الذي بالعربية يجوز التعبير عنه بالعبرانية وبالعكس. (۱۷/ ۳۸)[۳]

عمدۃ القاری میں علامہ عینیؒ تحریر فرماتے ہیں: وكان غرض النبي صلى الله عليه وسلم في إرساله إليه أن يترجم عنده ليفهم مضمونه، واحتج أبو حنيفة -رضي الله عنه- بحديث هرقل، وأنه دعا ترجمانه وترجم له كتاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بلسانه، حتى فهمه على أنه يجوز قراءة بالفارسية وقال: إن الصلوة تصح بذلك. (عمدۃ القاری: ۲۵/ ۱۱۱)[۴] ـــــــ ان علماء محدثین نے تحریر فرمایا ہے کہ تورات کی کوئی قید نہیں ہے، لفظ "وغیرها"(۵) سے تخصیص سے تعمیم کی طرف منتقل ہونا ہے، جس سے امام بخاریؒ اس بات کو بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی زبان کی قید نہیں ہے۔ اس وجہ سے بھی کہ آپ ﷺ کی بعثت ”کافۃ الناس“ کی طرف ہوئی ہے، الغرض قرآن مجید کا ترجمہ دیگر زبانوں میں کرنا جائز ہے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب اہل فارس نے سورۂ فاتحہ کے ترجمہ کو فارسی میں کرنے کی تجویز رکھی، تو آپ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی کو سورۂ فاتحہ کا ترجمہ فارسی میں کرنے کے متعلق تحریر فرمایا۔ إن الفرس كتبوا إلى سلمان الفارسي أن يكتب لهم الفاتحة بالفارسية، فكتب بسم الله الرحمن الرحيم، بنام يزدان بخشاونده، بعدما كتب، عرض النبي صلى الله عليه وسلم، ثم بعثه إليهم ولم ينكر عليه النبي صلى الله عليه وسلم. كذا في المبسوط. (حاشیہ ہدایہ: ۱/ ۸۶)[۶]

اس سے معلوم ہوا کہ فارسی ترجمہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، لہٰذا اہل سنت والجماعت کے

(۲) صحيح أبي عبدالله البخاري بشرح الكرماني المعروف بـ الكواكب الدراري: ۲۵/ ۲۳۱، كتاب التوحيد، باب مايجوز من تفسير التوراة، ط: دار إحياء التراث العربي.

(۳) فتح الباري: ۱۳/ ۵۱۶، كتاب التوحيد، باب مايجوز من تفسير التوراة، ط: دار المعرفة.

(۴) عمدة القاري: ۲۵/ ۱۹۱، كتاب التوحيد، باب مايجوز من تفسير التوراة، ط: دار الفكر بيروت.

(۵) المذكور في الباب.

(۶) هامش الهداية: ۱/ ۸۶، رقم الهامش: ۱، ط: اتحاد- ديوبند. =

نزدیک قرآن مجید کا ترجمہ دیگر زبانوں میں کرنا جائز ہے؛ بل کہ عین مطلوب ہے، البتہ متن کا ہونا ضروری ہے عربی متن کے بغیر مجرد ترجمہ کا شائع کرنا جائز نہیں ہے، ہاں! دو تین آیات کا ترجمہ (بغیر متن کے) کسی زبان میں لکھنے کی گنجائش ہے۔[۷] اس سلسلہ میں تفصیل کے لیے جواہر الفقہ جزء اول کا مطالعہ فرمائیں۔[۸]

پھر ترجمہ وتفسیر' کلام اللہ میں کس جگہ لکھی جائے، معمولی اختلاف ہے، طحطاوی میں ہے کہ تفسیر کا قرآن کے نیچے لکھنا مکروہ ہے، جب کہ فتح القدیر میں کافی سے منقول ہے کہ تفسیر کا قرآن کے نیچے لکھنا جائز ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس سے مراد کراہت تنزیہی ہے۔ (ترجمہ غایۃ الاوطار: ۱/۲۲۶)[۹] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] ختم قرآن کی مجلس میں شریک تمام حضرات کا بلند یا آہستہ آواز سے تلاوت کرنا

۳۸۷-سوال: دوکان یا گھر کے افتتاح کے لیے قرآن خوانی کی جو مجلس ہوتی ہیں، اس میں بیس تیس افراد مل کر قرآن ختم کرتے ہیں اور سب کو ایک ایک پارہ پڑھنے کے لیے دیا جاتا ہے، تو اس میں کوئی بلند آواز سے پڑھتا ہے اور کوئی آہستہ آواز سے، یہ صحیح ہے یا نہیں اور اس قسم کی مجلس کا کیا حکم ہے؟ مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

برکت حاصل کرنے کے لیے یا ایصال ثواب کے لیے قرآن مجید کا جو ختم کیا جاتا ہے- جس میں اکٹھا ہو کر قرآن شریف کے الگ الگ پاروں کی تلاوت کی جاتی ہے- جائز ہے، کیوں کہ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت خاموش رہنا اور غور سے سننا اس وقت لازم ہے، جب کہ ایک شخص تلاوت کر رہا ہو اور دوسرا سننے کے

=وفي المبسوط للسرخسي: وأبو حنيفة -رحمه الله- استدل بما روي أن الفرس كتبوا إلى سلمان -رضي الله عنه- أن يكتب لهم الفاتحة بالفارسية فكانوا يقرءون ذلك في الصلاة حتى لانت ألسنتهم للعربية. (۱/۳۷، كتاب الصلوة، باب افتتاح الصلوة، ط: دار المعرفة، بيروت)

(۷) وفيه إن اعتاد القراءة بالفارسية أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع وإن فعل في آية أو آيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز. (فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بـ 'ابن الهمام (م: ۸٦۱هـ): ۱/۲۸٦، كتاب الصلوة، باب صفة الصلوة، ط: دار الفكر - بيروت)

وتجوز كتابة آية أو آيتين بالفارسية، لا أكثر ... وقال الشامي: والظاهر أن الفارسية غير قيد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۴۸٦، كتاب الصلوة، باب صفة الصلوة، فروع: قرأ بالفارسية أو التوراة... الخ، ط: دار الفكر - بيروت)

(۸) تفصیل کے لیے دیکھیے: جواہر الفقہ - مفتی محمد شفیع عثمانیؒ (م: ۱۳۸۹ھ=۱۹۶۹ء): ۷-۹۷-۱۱۶، کیا قرآن مجید کا صرف ترجمہ شائع کیا جاسکتا ہے؟ ط: مکتبہ تفسیر القرآن، سید منزل، دیوبند۔

(۹) غایۃ الاوطار: ۱/۲۴۷-۲۴۸، ط: دکن ٹریڈرس، مغل پورہ- حیدرآباد۔

لیے بیٹھا ہو، جب کہ ختم قرآن کی مجلس میں سبھی تلاوت کے لیے بیٹھتے ہیں، پس اس میں کوئی حرج نہیں۔ [۱] البتہ اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ پڑھنا اور قرآن مجید کا ادب ملحوظ رکھنا ضروری ہے، نیز رسم ورواج سے اجتناب ضروری ہے، ورنہ ثواب کے بجائے الٹا گناہ لازم آئے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] ''وماعلینا الا البلاغ المبین'' اور ''قدس سرہ'' کا معنی!

(العلم)

۳۸۸-سوال: ''وماعلینا الا البلاغ المبین'' کا کیا معنی ہوتے ہیں؟ اسی طرح ''قدس سرہ'' کا کیا مطب ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

''وماعلینا الا البلاغ المبین'' کا معنی ہے: ہمارے ذمہ صرف کھلا ہوا پہنچانا ہے (یعنی توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے، ہمارا کام تبلیغ اور پیغام الٰہی کو پہنچا دینا ہے) اور ''قدس سرہ'' کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ انہیں پاک کرے، برکت عطا فرمائے۔ لغت میں قدس کا معنی ہیں: پاک کرنا، برکت عطا فرمانا۔ (المنجد: ۶۱۲) [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] قرآن کریم کے اس خاص انداز کی وجہ کیا ہے؟

۳۸۹-سوال: قرآن مجید میں ایک جگہ ''آمنا برب العالمین رب موسیٰ وھارون'' [۳] ہے اور ایک جگہ ''آمنا برب ھارون وموسیٰ'' [۴] تو ایسا تقدم وتاخر کیوں؟ اس کی کیا حکمت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قرآن کریم کسی قانون اور قاعدہ کے تابع نہیں ہے، جس طرح ایک کلام کو پیش کرے، کرسکتا ہے، یہ

---

(۱) ولا بأس باجتماعهم على قراءة الإخلاص جهرا عند ختم القرآن، ولو قرأ واحد واستمع الباقون فهو أولى، كذا في القنية. ويستحب له أن يجمع أهله وولده عند الختم ويدعو لهم، كذا في الينابيع. (الفتاوى الهندية: ۵/۳۱۷، كتاب الكراهية، الباب الرابع في الصلوة والتسبيح ورفع الصوت... الخ، ط: دار الفكر - بيروت)

وفي الدرة المنيفة عن القنية: يكره للقوم أن يقرؤوا القرآن جملة، لتضمنها ترك الاستماع والإنصات، وقيل لا بأس به. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۳۱۸، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) دیکھیے: القاموس الوحید، مادہ: قدس، ص: ۱۲۸۳، ط: کتب خانہ حسینیہ، دیوبند۔

(۱) قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝ [۷-الأعراف: ۱۲۱-۱۲۲] أیضا: [۲۶-الشعراء: ۴۷، ۴۸]

(۲) ۲۰-طٰہٰ: ۷۰۔

تقدم وتاخر بلاغت سے تعلق رکھتا ہے، یہ تفنن ہے کہ کبھی کسی کلام کو مقدم اور کبھی مؤخر لایا جاتا ہے، اور ایک ہی کلام کو مختلف انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مفسرین نے اس کی مختلف حکمتیں بیان کی ہیں:

فواصل کی رعایت کرتے ہوئے کبھی ''موسی ''کو مقدم کیا اور کبھی ''ھارون ''کو۔

جہاں ''موسی ''کو مقدم کیا، وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظمت، شرف اور اصل فی الرسالۃ والدعوۃ ہونے کی بنا پر ہے، ساتھ میں تقدیم میں حکایات حال کا بیان کیا ہے۔

اور جہاں ''ھارون'' کو مقدم کیا ہے، وہاں اولاً فواصل کی رعایت کی گئی ہے۔ ثانیاً ''ہارون علیہ السلام کی عمر کی رعایت کی گئی ہے کہ وہ اس اعتبار سے بڑے تھے۔

ثالثاً یہ بھی معلوم ہے کہ بچپن میں ''حضرت موسیٰ'' کی پرورش ''فرعون'' کے محل میں ہوئی تھی، گویا ''موسیٰ'' کے لیے وہ مجازاً رب تھا، نیز وہ اپنی ربوبیت کا دعویٰ بھی کرتا تھا، تو ''رب موسیٰ وھارون'' کہنے میں وہم ہوسکتا تھا، کہ "رب العالمین رب موسیٰ وھارون" سے فرعون مراد ہے؛ لہٰذا جہاں خالص خداوند قدوس کی ربوبیت کا اثبات مقصود تھا، وہاں پر ھارون کو مقدم کیا کہ یہاں رب سے فرعون مراد نہیں؛ بل کہ اللہ تعالیٰ مراد ہیں، اور جہاں پر حکایت حال مقصود تھا، وہاں موسیٰ کو مقدم کیا۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ''واؤ'' مطلق جمع کے لیے آتا ہے بغیر ترتیب کے؛ لہٰذا دونوں میں ترتیب مقصود نہیں؛ بل کہ فرعون کی عدم ربوبیت اور رب موسیٰ وھارون کی ربوبیت مقصود ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے کہ ایمان لانے والوں میں سے بعض نے "برب موسی وھارون" کہا ہو اور بعض نے "برب ھارون و موسی" کہا ہو، تو یہ مختلف مقامات میں مختلف گروہ کی حکایات کو نقل کیا گیا ہو۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) {آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَى} تأخير موسى -عليه السلام- عند حكاية كلامهم المذكورة في سورة الأعراف المقدم فيه موسى عليه السلام؛ لأنه أشرف من هارون، والدعوة والرسالة إنما هي له أولاً وبالذات وظهور المعجزة على يده -عليه السلام- لرعاية الفواصل، وجوز أن يكون كلامهم بهذا الترتيب، وقدموا هارون عليه السلام؛ لأنه أكبر سناً، وقول السيد في »شرح المفتاح« : إن موسى أكبر من هارون عليهما السلام سهو. وأما للمبالغة في الاحتراز عن التوهم الباطل من جهة فرعون وقومه حيث كان فرعون ربى موسى -عليه السلام- فلو قدموا موسى لربما توهم اللعين وقومه من أول الأمر أن مرادهم فرعون وتقديمه في سورة الأعراف تقديم في الحكاية لتلك النكتة. وجوز أبو حيان أن يكون ما هنا قول طائفة منهم وما هناك قول أخرى. (روح المعاني: ۵۴۱/۸، طه، ط:=

[۷] قرآن مجید میں جنات کو انسانوں پر مقدم کرنے کی وجہ

۳۹۰-سوال: اللہ رب العزت نے اپنے کلام پاک میں فرمایا: **وماخلقت الجن والانس إلا لیعبدون.**[1] ترجمہ: ہم نے جنات اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اپنی عبادت کے لیے، تو یہاں اللہ رب العزت نے جنات کے ذکر کو مقدم کیوں کیا؟ جب کہ انسانوں کا رتبہ جنات سے بڑھ کر ہے۔

نیز قرآن مجید کے متعلق اس طرح کے سوالات کرنا کیسا ہے؟

مولوی یوسف پانڈور، اٹالوہ

الجواب حامدا ومصلیا:

جناب والا کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عالم وفاضل ہیں؛ اس لیے مختصر المعانی، سفینۃ البلغاء اور البلاغۃ الواضحۃ میں پڑھ لیا ہوگا کہ اسلوب کلام میں کبھی تعمیم کے بعد تخصیص اور کبھی تخصیص کے بعد تعمیم ہوتی ہے، اور یہ کلام کا ایک طریقہ ہے کہ کبھی اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف تنزل اور کبھی ادنیٰ سے اعلی کی طرف ترقی ہوتی ہے، چناں چہ قرآن مجید کی مذکورہ آیت شریفہ میں بھی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہے۔ آیت شریفہ میں ''جن'' ادنیٰ ہے اور ''انسان'' اعلیٰ، دونوں کو اللہ رب العزت نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

سوال کبھی تو علت اور غرض معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی اللہ اور اس کے رسول کی طرف شکوک وشبہات کی وجہ سے؛ امر ثانی تو غلط اور موجب کفر ہے، امر اول نہیں، اسی لیے تو کہا گیا ہے:

فاسئلوا أهل الذکر إن کنتم لا تعلمون.(۲)

(ترجمہ: اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے پوچھو۔)

=دار الکتب العلمیة-بیروت)

{ رَبِّ موسی وهارون } بدل مما قبل وإنما أبدلوا لئلا یتوهم أنهم أرادوا فرعون ولم یقتصروا علی موسی علیه السلام إذ ربما یبقی للتوهم رائحة؛ لأنه کان ربي موسی -علیه السلام- في صغره، ولذا قدم هرون في محل آخر؛ لأنه أدخل في دفع التوهم أو لأجل الفاصلة أو لأنه أکبر سناً منه، وقدم موسی هنا لشرفه أو للفاصلة. روح المعاني: ۵/ ۲۷، سورة الأعراف، ط: دار الکتب العلمیة، بیروت)

(۱)-۵۱ الذاریات: ۵۶.

(۲)-۱۶ النحل: ۴۳.

ایک جگہ ارشاد فرمایا: وفوق كل ذي علم عليم.[۱]

(ترجمہ: اور ہر علم والے سے بڑھ کر دوسرا علم والا ہے)

اس طرح کے سوالات کرنے سے علم میں پختگی اور مضبوطی حاصل ہوتی ہے؛ قرآن مجید میں حج کی فرضیت سے متعلق جب آیت کریمہ: "ولله على الناس حج البيت" نازل ہوئی، تو ایک صحابی حضرت اقرع بن حابس ؓ نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! حج ہمارے صرف اسی سال کے لیے ہے یا ہمیشہ ہمیش کے لیے؟ تو آپ ﷺ نے اس پر ان کو جواب عنایت فرمایا۔[۲] اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کے علمی اور تحقیقی سوالات کرنا ایمان کو تازگی بخشتا ہے اور ان سے ایمان میں مضبوطی اور پختگی پیدا ہوتی ہے؛ لہٰذا اس طرح کے سوالات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ
۲۶/۱۰/۱۹۷۷ء

[۸] ۱- تلاوت کے وقت ایک شخص کا دوسرے کی جانب پشت کرنا

[۹] ۲- تلاوت قرآن کے آداب

۳۹۱- سوال: ہمارے گاؤں میں مسجد میں لوگ قرآن کریم کی تلاوت اس طرح بیٹھ کر کرتے ہیں کہ بعض مشرق کی جانب اپنا منھ کرتے ہیں، تو بعض اپنا رخ مغرب کی طرف کرتے ہیں، یعنی قرآن کی تلاوت کے وقت ایک دوسرے کی طرف پشت کرتے ہیں، یہ صحیح ہے یا غلط؟ اور قرآن کریم کی تلاوت کے آداب کیا ہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

آداب تلاوت میں سے ہے کہ حتی الامکان تلاوت کرنے والے کا رخ قبلہ کی طرف ہو؛ لیکن اگر

(۱) - ۱۲ یوسف: ۷۶

(۲) عن ابن عباس، قال: خطبنا - يعني رسول الله صلى الله عليه وسلم - فقال: "يا أيها الناس، كتب عليكم الحج" قال: فقام الأقرع بن حابس فقال: أفي كل عام يا رسول الله؟ قال: "لو قلتها لوجبت، ولو وجبت لم تعملوا بها، - أو: لم تستطيعوا أن تعملوا بها - الحج مرة، فمن زاد فهو تطوع". (مسند أحمد بن حنبل: ۱۵۱/۴، رقم: ۲۳۰۴، ط: مؤسسة الرسالة)

کسی کی پیٹھ قرآن کریم کی طرف ہورہی ہو، مثلاً پہلی صف میں بیٹھنے والوں کی پیٹھ دوسری صف میں قبلہ کی طرف رخ کرکے بیٹھنے والوں کے قرآن کی طرف ہورہی ہو، تو ایسی صورت میں پیٹھ ایک دوسرے کی طرف کرکے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ قرآن کریم کے آداب دو طرح کے ہیں: ایک ظاہری، ایک باطنی۔

ظاہری آداب یہ ہیں: جگہ پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، تلاوت کرنے والا باوضو ہو، قرآن کریم اونچی جگہ رکھ کر باادب اطمینان وسکون کے ساتھ بیٹھے، چہارزانو، ٹیک لگا کر اور تکبرانہ انداز میں نہ بیٹھے، بل کہ اس طرح بیٹھے جیسے کہ استاذ کے سامنے بیٹھا ہو، قرآن کریم کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھے، حروف والفاظ کو اچھی طرح ادا کرے، کوشش ہو کہ قرآن کریم کی تلاوت تجوید کے ساتھ کرے اور کم از کم سات دن میں قرآن کریم ختم کرے، وغیر ذلک۔ (۱)

اور باطنی آداب یہ ہیں: قرآن کریم پر عمل کرنے کی نیت ہو، قرآن کریم کے معانی کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش ہو (لیکن نہ سمجھ کر پڑھنے میں بھی اجر وثواب کا وعدہ ہے) کلام اور صاحب کلام کی عظمت واحترام قلب میں ہو، حضور قلب کے ساتھ ساتھ خشوع وخضوع بھی ہو، اگر آیت سجدہ آئے، تو سجدہ کرے، جہاں جہنم وعذاب کا ذکر ہو، وہاں روئے یا کم از کم رونے کی شکل بنائے اور پناہ مانگے اور جہاں جنت وبشارت کی آیات آئیں، وہاں خوش ہو اور دعا مانگے، وغیر ذلک۔ (اکثرھا من إحیاء علوم الدین: ۱/ ۲۷۴)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) الأول في حال القارىء: وهو أن يكون على الوضوء، واقفا على هيئة الأدب والسكون، إما قائما وإما جالسا، مستقبل القبلة، مطرقا رأسه، غير متربع، ولا متكىء، ولا جالس على هيئة التكبر، ويكون جلوسه وحده كجلوسه بين يدي أستاذه... أمر رسول الله -صلى الله عليه وسلم- عبدالله بن عمرو أن يختم القرآن في كل أسبوع. متفق عليه. وكذلك كان جماعة من الصحابة رضي الله عنهم يختمون القرآن في كل جمعة كـ "عثمان، وزيد بن ثابت، وابن مسعود، وأبي بن كعب رضي الله عنهم.

ففي الختم أربع درجات: الختم في يوم وليلة، وقد كرهه جماعة، والختم في كل شهر كل يوم جزء من ثلاثين جزءا، وكأنه مبالغة في الاقتصار كما أن الأول مبالغة في الاستكثار، وبينهما درجتان معتدلتان، إحداهما في الأسبوع مرة، والثانية في الأسبوع مرتين تقريبا من الثلاث...

واعلم أن الترتيل مستحب لا لمجرد التدبر، فإن العجمي الذي لا يفهم معنى القرآن يستحب له في القراءة أيضا الترتيل والتؤدة، لأن ذلك أقرب إلى التوقير والاحترام، وأشد تأثيرا في القلب من الهذرمة والاستعجال... البكاء مستحب مع القراءة. (إحياء علوم الدين: ۱/ ۲۷۵ - ۲۷۷، كتاب آداب تلاوة القرآن، الباب الثاني في ظاهر آداب التلاوة، ط: دار المعرفة- بيروت)

(۲) الثاني: التعظيم للمتكلم: فالقارئ عند البداية بتلاوة القرآن ينبغي أن يحضر في قلبه عظمة المتكلم، ويعلم أن مايقرؤه ليس من كلام البشر، وإن في تلاوة كلام الله عز وجل غاية الخطر... الثالث: حضور القلب وترك حديث =

[۱۰] حدیث شریف کا علم ہونے کے بعد اس کے خلاف عمل کرنا

۳۹۲-سوال: کسی حدیث کا علم ہوجانے کے بعد اس حدیث کے خلاف بولنا (انکار کرنا) کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

''حدیث متواتر'' کا منکر کافر ہے، حدیث متواتر یہ ہے کہ اس کی روایت کرنے والے ہر دور میں اتنی تعداد میں ہوں کہ ان کا جھوٹ پر اتفاق محال ہو۔ اور خبر واحد کا انکار کرنے والا فاسق ہے، خبر واحد یہ ہے کہ اس کو روایت کرنے والے دو تین افراد ہوں، البتہ اس میں تاویل کر کے عمل سے رک جاتا ہے، تو اس سے فاسق نہ ہوگا۔ [1]

نوٹ: کسی عالم سے مذکور تحریر سمجھنے کی کوشش کریں، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

=النفس،... الرابع: التدبر وهو وراء حضور القلب... الخامس: التفهم وهو أن يستوضح من كل آية ما يليق بها،... السادس التخلي عن موانع الفهم؛ فإن أكثر الناس منعوا عن فهم معاني القرآن لأسباب وحجب أسدلها الشيطان على قلوبهم فعميت عليهم عجائب أسرار القرآن،... السابع: التخصيص وهو أن يقدر أنه المقصود بكل خطاب في القرآن،.... الثامن: التأثر وهو أن يتأثر قلبه بآثار مختلفة بحسب اختلاف الآيات، فيكون له بحسب كل فهم حال ووجد يتصف به قلبه من الحزن والخوف والرجاء وغيره.

فتأثر العبد بالتلاوة أن يصير بصفة الآية المتلوة فعند الوعيد وتقييد المغفرة بالشروط يتضاءل من خيفته كأنه يكاد يموت، وعند التوسع ووعد المغفرة يستبشر، كأنه يطير من الفرح، وعند ذكر الله وصفاته وأسمائه يتطأطأ خضوعا لجلاله، واستشعارا لعظمته وعند ذكر الكفار ما يستحيل على الله عز وجل... وعند وصف الجنة ينبعث بباطنه شوقا إليها، وعند وصف النار ترتعد فرائصه خوفا منها. (إحياء علوم الدين: ۱/ ۲۸۰-۲۸۶، كتاب آداب تلاوة القرآن، الباب الثالث في أعمال الباطن في التلاوة، ط: دار المعرفة)

(۱) أما متواتر، وهو ما رواه جماعة عن جماعة لا يتصور تواطؤهم على الكذب، فمن أنكره كفر، ومشهور، وهو ما رواه واحد، عن واحد، ثم جمع، عن جمع، لا يتصور توافقهم على الكذب، فمن أنكره كفر عند الكل إلا عيسى بن أبان، فإن عنده يضلل، ولا يكفر، وهو الصحيح.

وخبر الواحد: وهو أن يرويه واحد عن واحد، فلا يكفر جاحده، غير أنه يأثم بترك القبول إذا كان صحيحا أو حسنا. (شرح الفقه الأكبر - الملا علي القاري، ص: ۲۰۳-۲۰۴، ط: ياسر نديم - ديوبند)

[۱۱] محفل گناہ میں قرآن کی تلاوت

۳۹۳-سوال: ایک اسٹیج پر چند مسلم نوجوانوں کی محفل جمی ہوئی تھی، اس محفل میں ایک حافظ صاحب بھی شریک تھے، اولاً اس محفل میں دین سے لاپرواہ نوجوانوں نے گانا گانا شروع کیا، پھر بھجن گانے لگے اور واہیات کلام میں مشغول ہوگئے، کچھ دیر کے بعد ان نوجوانوں نے اس محفل میں موجود حافظ صاحب سے کہا: آپ ہمیں قرآن کریم پڑھ کر سنائیں، تو ان حافظ صاحب نے قرآن سنانے کی بجائے ان کو گانا سنانا شروع کردیا، تو اب سوال یہ ہے کہ قرآن کی فرمائش پر گانا سنانا کیا اس میں قرآن کی توہین نہیں ہے؟ نیز ایسی محفل میں شریک ہونا اور اس میں قرآن سنانا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ تفصیل سے بیان فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

اگر مجلس فسق وفجور جمی ہوئی ہو کہ جس میں گانے اور دیگر اقوام کے مذہبی بھجن اور واہیات کلام وغیرہ ہوتا ہو، تو اس مجلس میں قرآن کریم کی تلاوت یا نعت شریف، یا حمد باری یا ایسا کلام، جس میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہو، پڑھنا جائز نہیں ہے، بل کہ اس سے گناہ لازم آئے گا۔ (مجمع الانہر: ۲/۵۵۱)[۱]

حافظ صاحب نے تلاوت کی فرمائش پر ایسی مجلس میں گانا گانا شروع کیا، تو قرآن کے ادب کا لحاظ کیا، لیکن ایک مسلمان کا گانا گانا یا سننا حرام ہے، مسلم نوجوانوں کی ذمہ داری ہے کہ اسلام اور اپنی جوانی کی قدر کریں اور گناہوں کی محفلوں سے توبہ کرکے نیکی کی مجلسیں قائم کریں اور نیک کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ سے قران سننے اور سجدۂ تلاوت کا حکم

۳۹۴-سوال: کیا ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ سے قرآن سنتے وقت انصات (خاموش رہنا) واجب ہے؟ اور ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ سے سجدہ کی آیت سنے، تو کیا حکم ہے؟

---

(۱) (وقد یأثم به) أي بالتسبیح ونحوہ (إذا فعله في مجلس الفسق وهو یعلمه) لما فیه من الاستهزاء والمخالفة لموجبه. (مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر - إبراهیم بن محمد بن إبراهیم الحلبي الحنفي (م: ۹۵۶ھ): ۲/۵۵۱، کتاب الکراهیة، فصل في المتفرقات، ط: دار إحیاء التراث العربي)

الجواب حامداً ومصلیاً:

ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر پر قرآن سننا جائز ہے اور آیت سجدہ سننے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوتا ہے۔(۱) البتہ ٹیپ ریکارڈ پر سجدہ کی آیت سننے سے سجدہ واجب نہیں؛ لیکن نیک نیتی سے احترام کے ساتھ قرآن سننا جائز ہے اور جب بھی سنے، قرآن مجید کا احترام واجب ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] تلاوت کے لیے مسجد کے قرآن کو نماز سے قبل اپنے قبضہ میں لے لینا

۳۹۵-سوال: عصر کی نماز کے بعد تلاوت کے لیے نماز سے قبل ہی مسجد کے وقف شدہ قرآن مجید کو اپنے قبضہ میں لے لینا اور سامنے رحل پر رکھ کر اس پر رومال رکھ لینا، تا کہ کوئی دوسرا اس کو نہ اٹھالے، کیسا ہے؟ شرعاً اس کی اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر نماز کا وقت ہو، تو قبضہ کرنا جائز ہے، کہ اس میں ممانعت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

[۱۴] دجال سے متعلق حدیث جساسہ

۳۹۶-سوال: دجال سے متعلق تمیم داری کی جو حدیث ہے، وہ کیا ہے؟ تفصیل سے بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

عامر بن شراحیل شعبی بیان کرتے ہیں کہ شعب حمدانی نے فاطمہ بنت قیس سے پوچھا (فاطمہ ضحاک بن قیس کی بہن ہیں، اور مہاجرین اولین میں سے ہیں) کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث شریف

---

(۱) ریڈیو کے تعلق سے یہ حکم اُس وقت ہے، جب کہ تلاوت کا ڈائریکٹ نشریہ ہو، اور اگر پہلے ریکارڈ کیا جاتا ہو اور بعد میں نشر کیا جاتا ہو، تو بہ ذریعہ ریڈیو تلاوت سننے سے سجدہ واجب نہ ہوگا، اس لیے کہ یہ اصل کی نقل ہے، بدائع میں ہے: بخلاف السماع من الببغاء والصدي، فإن ذلك ليست بتلاوة. (بدائع الصنائع: ۱/۱۸۶، كتاب الصلاة، فصل بيان من تجب عليه سجدة التلاوة، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

لا تجب بسماعه من الصدي والطير. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۱۰۸، كتاب الصلوة، باب سجود التلاوة، ط: دار الفكر - بيروت)

سنی ہے، وہ مجھے بیان کرو، کیوں کہ تم اکثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان کرتی ہو اور کسی اور کی طرف اس حدیث کی نسبت نہیں کرتی ہو، تو فاطمہ نے کہا: اگر تم چاہتے ہو، تو ضرور بیان کروں گی، شعب حمدانی نے کہا: ہاں! ضرور بیان کرو۔

فاطمہ نے کہا: میری شادی ابن المغیرۃ سے ہوئی تھی، وہ قریش کے اچھے نوجوانوں میں سے تھے، اسلام کی پہلی جنگ (غزوۂ بدر) میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے اور شہید ہو گئے، پھر جب میں بیوہ ہو گئی، تو عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے بعض صحابہ کی معرفت مجھے نکاح کا پیغام بھیجا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) اسامہ بن زید کے ساتھ نکاح کا پیغام بھیجا، اور مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان پہلے پہنچ چکا تھا کہ: "جو مجھ سے محبت کرنا چاہے، وہ اسامہ سے محبت کرے" تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے اس سلسلہ میں بات کی، تو میں نے کہا: یہ معاملہ آپ کے اختیار میں ہے، آپ میرا جس سے چاہیں نکاح کر دیجیے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ام شریک کے پاس چلی جاؤ- وہ انصار کی مال دار عورت ہے، اللہ تعالیٰ کے راستہ میں بہت خرچ کرتی ہے اور ان کے پاس مہمان بہت آتے ہیں- میں نے کہا: میں ضرور جاؤں گی، آپ نے پھر فرمایا: نہیں جانا، کیوں کہ ام شریک کے یہاں مہمان بہت آتے ہیں اور میں ناپسند کرتا ہوں کہ تم سے تمہاری اوڑھنی دور ہو یا کوئی کپڑا بدن سے سر کے اور بدن کا کوئی حصہ پنڈلی وغیرہ جسے ظاہر کرنا تم ناپسند کرتی ہو، کوئی دیکھ لے؛ لیکن تم ایسا کرو کہ اپنے چچا زاد بھائی عبداللہ بن عمر بن ام مکتوم کے پاس چلی جاؤ۔ (عبداللہ قبیلہ فرح کے ایک فرد ہیں، فرح قریش کا ایک خاندان ہے، حضرت فاطمہ بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں)

تو میں وہاں سے ان کے پاس چلی گئی، جب میری عدت پوری ہو گئی، تو میں نے ایک آواز دینے والے کی آواز سنی: "**الصلوٰۃ جامعۃ**" تو میں مسجد کی طرف نکلی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے کا شرف حاصل کیا، میں عورتوں کی اس صف میں تھی، جو مردوں سے بالکل متصل تھی، جب حضور نماز پڑھا کر فارغ ہوئے، تو ممبر پر تشریف لے گئے اور مسکرا کر فرمایا: سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں نے سب کو کیوں جمع کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تمہیں کوئی ترغیب (شوق دلانے) یا ترہیب (ڈرانے) کی غرض سے یہاں جمع نہیں کیا ہے، بل کہ اس لیے جمع کیا ہے کہ تمیم

داری ایک نصرانی شخص تھے، انہوں نے میرے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی اور مجھ سے ایک ایسی بات بیان کی، جو میں پہلے بھی تمہیں بیان کیا کرتا تھا، وہ بات مسیح دجال کے متعلق ہے۔

تمیم داری نے کہا کہ میں قبیلہ لخم اور جذام کے تیس (۳۰) افراد کے ساتھ ایک کشتی میں سوار ہوا اور ٹھاٹھے مارتے ایک سمندر میں ہماری کشتی داخل ہوگئی اور ایک مہینہ تک کشتی اِدھر اُدھر چکر لگاتی رہی، یعنی کشتی راستہ بھٹک گئی، یہاں تک کہ سمندر کے جزیروں میں سے ایک جزیرے کے پاس اس نے ہمیں پہنچادیا، پھر ہم ایک چھوٹی کشتی کے ذریعہ اس جزیرے میں داخل ہوئے۔

وہاں اچانک ہمیں ایک جانور ملا، جس کے بدن پر بہت زیادہ بال تھے، بال کی کثرت کی وجہ سے اس کے آگے اور پیچھے کا حصہ پہچاننا مشکل تھا، ہم نے اس سے کہا: تیری بربادی ہو! تو کون ہے؟ اس نے کہا میں ''جساسہ'' ہوں، تو ہم نے کہا: ''جساسہ'' کیا بلا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ تم اس ''گرجا'' میں ایک شخص کے پاس چلو، جو تمہاری خبر کا بہت منتظر ہے، روای (تمیم داری) کہتے ہیں کہ جب اس نے ہمارے سامنے اس شخص کا نام لیا، تو ہم ڈر گئے کہ کہیں وہ شیطان نہ ہو، پھر ہم سب اس کی طرف جلدی سے چلے، یہاں تک کہ اس گرجا میں پہنچے، تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ڈیل ڈول والا انسان ہے، اس جیسا انسان ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ بہت مضبوط تھا، اس کے دونوں ہاتھ گلے کی طرف دونوں پیروں کے ساتھ لوہے کی زنجیر سے بندھے ہوئے تھے، ہم نے کہا تیری ہلاکت ہو! تو کون ہے؟ اس نے کہا تم نے میری حالت جان لی ہے، اب تم بتاؤ کہ تم کون ہوں؟ ہم نے کہا کہ ہم عربستان کے باشندے ہیں، جب ایک کشتی میں ہم سوار ہوئے تو سمندر میں طغیانی آگئی اور ایک مہینے تک ہماری کشتی نے ادھر اُدھر چکر لگاتی رہی، یہاں تک کہ اخیر میں تیرے اس جزیرے کا ہم نے سہارا لیا، جب اس جزیرے میں ہم داخل ہوئے، تو ہماری ملاقات ایک بال والے جانور سے ہوئی، زیادہ بال ہونے سے اس کے آگے اور پیچھے کے حصہ کا امتیاز نہیں ہو رہا تھا۔ ہم نے اس سے پوچھا تیری بربادی ہو! تو کون ہے؟ اس نے کہا میں ''جساسہ'' ہوں، ہم نے کہا: جساسہ کیا چیز ہے؟ اس نے کہا تم اس گرجا میں چلو، وہاں ایک شخص ہے، جو تم سے ملاقات کا بڑا خواہش مند ہے، تو ہم جلدی سے تیرے پاس آئے اور ساتھ ہمیں یہ ڈر لگا کہ کہیں تو شیطان نہ ہو۔

اس نے کہا: تم مجھے ''نخل بیسان'' کے متعلق کچھ خبر دو، تو ہم نے کہا: تو اس کی کون سی حالت جاننا چاہتا ہے؟ تو اس نے کہا میں اس کے درخت کے متعلق پوچھتا ہوں کیا اس میں پھل آنے لگے؟ ہم نے کہا:

ہاں۔ اس نے کہا: کچھ مدت کے بعد وہ درخت پھل نہیں دیں گے،

پھر اس نے کہا مجھے ''بحیرہ طبریہ'' کے بارے میں بتاؤ، ہم نے کہا تو اس کی کون سی حالت کے متعلق پوچھتا ہے؟ تو اس نے کہا: میں اس کے پانی کے متعلق سوال کرتا ہوں، تو ہم نے کہا: وہ تو پانی سے لبریز ہے، اس نے کہا: کچھ عرصہ بعد اس کا پانی ختم ہو جائے گا۔

پھر اس نے کہا: مجھے ''شہر زغر'' کے چشمہ کے متعلق بتاؤ، ہم نے کہا: تو اس کی کون سی حالت جاننا چاہتا ہے، تو اس نے کہا: کیا اس چشمہ میں پانی ہے اور وہاں کے باشندے اس چشمے سے کھیتی کرتے ہیں؟ تو ہم نے کہا: اس میں خوب پانی ہے اور وہاں کے باشندے اس چشمے سے کھیتی بھی کرتے ہیں۔

پھر اس نے سوال کیا: مجھے نبی (امی) کے بارے میں بتاؤ، وہ کس حال میں ہیں؟ ہم نے کہا: وہ مکہ سے ہجرت کر کے یثرب میں مقیم ہو گئے ہیں، تو اس نے پوچھا: عرب کے لوگوں نے ان کے ساتھ جنگ کی ہے؟ تو ہم نے کہا: ہاں! تو اس نے کہا: اس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ ہم نے جواب دیا: بلاشبہ وہ اطراف کے لوگوں پر غالب ہیں اور عربوں نے ان کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ اس نے کہا: ان لوگوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس نبی کے تابع ہو جائیں اور ان کی اطاعت کریں۔

اب میں تمہیں اپنے متعلق خبر دیتا ہوں: میں ''مسیح دجال'' ہوں، کچھ عرصہ بعد مجھے نکلنے کی اجازت ملے گی، میں باہر نکلوں گا اور زمین کی سیر کروں گا اور چالیس رات میں کوئی بھی گاؤں ایسا نہیں چھوڑوں گا، جس میں داخل نہ ہو جاؤں، مگر مکہ اور مدینہ کہ یہ دو شہر ایسے ہیں، جن میں داخلہ مجھ پر حرام ہے، جب بھی میں اس میں داخل ہونا چاہوں گا، ایک فرشتہ تلوار لے کر میری طرف بڑھے گا اور مجھے روک دے گا اور اس کے ہر دروازے پر فرشتے ہیں، جو اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

حضرت فاطمہ فرماتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عصا ممبر پر مارا اور فرمایا: **هذه طيبة، هذه طيبة، هذه طيبة**. یہ (مدینہ) ''طیبة'' یعنی پاک ہے، پھر فرمایا: میں نے تم سے (اس دجال کے متعلق) پہلے بتلایا تھا یا نہیں؟ لوگوں نے جواب دیا: ہاں، آپ نے فرمایا مجھے تمیم داری کی یہ بات پسند آئی، کیوں کہ یہ اس کے موافق ہے، جو میں تمہیں بیان کرتا ہوں، یہ دجال بحر شام یا بحر یمن بل کہ وہ مشرق کی طرف ہے اور یہ آپ نے تین بار فرمایا اور اپنے دست مبارک سے مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ حضرت فاطمہ کہتی ہیں: میں نے یہ

حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر یاد رکھی ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) حدثني عامر بن شراحيل الشعبي، شعب همدان، أنه سأل فاطمة بنت قيس، أخت الضحاك بن قيس - وكانت من المهاجرات الأول - فقال: حدثيني حديثا سمعتيه من رسول الله صلى الله عليه وسلم، لا تسنديه إلى أحد غيره، فقالت: لئن شئت لأفعلن، فقال لها: أجل حدثيني فقالت: نكحت ابن المغيرة، وهو من خيار شباب قريش يومئذ، فأصيب في أول الجهاد مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، فلما تأيمت خطبني عبد الرحمن بن عوف في نفر من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، وخطبني رسول الله صلى الله عليه وسلم على مولاه أسامة بن زيد، وكنت قد حدثت، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: »من أحبني فليحب أسامة« فلما كلمني رسول الله صلى الله عليه وسلم قلت: أمري بيدك، فأنكحني من شئت، فقال: »انتقلي إلى أم شريك« وأم شريك امرأة غنية، من الأنصار، عظيمة النفقة في سبيل الله، ينزل عليها الضيفان، فقلت: سأفعل، فقال: »لا تفعلي، إن أم شريك امرأة كثيرة الضيفان، فإني أكره أن يسقط عنك خمارك أو ينكشف الثوب عن ساقيك، فيرى القوم منك بعض ما تكرهين ولكن انتقلي إلى ابن عمك عبد الله بن عمرو ابن أم مكتوم« - وهو رجل من بني فهر، فهر قريش وهو من البطن الذي هي منه - فانتقلت إليه. ____________ فلما انقضت عدتي سمعت نداء المنادي، منادي رسول الله صلى الله عليه وسلم، ينادي: الصلاة جامعة، فخرجت إلى المسجد، فصليت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، فكنت في صف النساء التي تلي ظهور القوم، فلما قضى رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاته جلس على المنبر، وهو يضحك، فقال: »ليلزم كل إنسان مصلاه«، ثم قال: »أتدرون لم جمعتكم؟« قالوا: الله ورسوله أعلم، قال: "إني والله ما جمعتكم لرغبة ولا لرهبة، ولكن جمعتكم، لأن تميما الداري كان رجلا نصرانيا، فجاء فبايع وأسلم، وحدثني حديثا وافق الذي كنت أحدثكم عن مسيح الدجال، حدثني أنه ركب في سفينة بحرية، مع ثلاثين رجلا من لخم وجذام، فلعب بهم الموج شهرا في البحر، ثم أرفئوا إلى جزيرة في البحر حتى مغرب الشمس، فجلسوا في أقرب السفينة، فدخلوا الجزيرة فلقيتهم دابة أهلب كثير الشعر، لا يدرون ما قبله من دبره، من كثرة الشعر، فقالوا: ويلك ما أنت؟ فقالت: أنا الجساسة، قالوا: وما الجساسة؟ قالت: أيها القوم انطلقوا إلى هذا الرجل في الدير، فإنه إلى خبركم بالأشواق، قال: لما سمت لنا رجلا فرقنا منها أن تكون شيطانة.

قال: فانطلقنا سراعا، حتى دخلنا الدير، فإذا فيه أعظم إنسان رأيناه قط خلقا، وأشده وثاقا، مجموعة يداه إلى عنقه، ما بين ركبتيه إلى كعبيه بالحديد، قلنا: ويلك ما أنت؟ قال: قد قدرتم على خبري، فأخبروني ما أنتم؟ قالوا: نحن أناس من العرب ركبنا في سفينة بحرية، فصادفنا البحر حين اغتلم فلعب بنا الموج شهرا، ثم أرفأنا إلى جزيرتك هذه، فجلسنا في أقربها، فدخلنا الجزيرة، فلقيتنا دابة أهلب كثير الشعر، لا يدرى ما قبله من دبره من كثرة الشعر، فقلنا: ويلك ما أنت؟ فقالت: أنا الجساسة، قلنا: وما الجساسة؟ قالت: اعمدوا إلى هذا الرجل في الدير، فإنه إلى خبركم بالأشواق، فأقبلنا إليك سراعا، وفزعنا منها، ولم نأمن أن تكون شيطانة، فقال: أخبروني عن نخل بيسان، قلنا: عن أي شأنها تستخبر؟ قال: أسألكم عن نخلها، هل يثمر؟ قلنا له: نعم، قال: أما إنه يوشك أن لا تثمر، قال: أخبروني عن بحيرة الطبرية، قلنا: عن أي شأنها تستخبر؟ قال: هل فيها ماء؟ قالوا: هي كثيرة الماء، قال: أما إن=

[۱۵] پاکی کو آدھا ایمان کہنے کی وجہ

۳۹۷-سوال: پاکی کو آدھا ایمان کیوں کہا گیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

حدیث شریف ہے: "الطهور شطر الإيمان" (مسلم: ۱/ ۱۱۸- ۲/ ۸۲)[1] اس میں شطر کا معنی "حصہ" کے ہیں، اس حدیث کے مختلف مطلب بیان کیے گئے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- پاکی ایمان کا ایک حصہ ہے (تو مراد نصف حصہ نہیں، بل کہ اس کے اجزاء میں سے ایک جزء ہے)

۲- ایمان کا تعلق ظاہر و باطن دونوں سے ہے، اور پاکی کا تعلق ظاہر سے ہے، اس اعتبار سے جو پاک رہتا ہے، وہ آدھا ایمان- جو ظاہر سے متعلق ہے- حاصل کر لیتا ہے، اس لیے پاکی کو آدھا ایمان کہا گیا۔

۳- حدیث شریف میں ایمان سے مراد نماز ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ (۲-البقرۃ: ۱۴۳)

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے نہیں ہیں کہ تمہاری نمازوں کو باطل کردیں۔

تو اب حدیث کا مطلب ہوگا: "پاکی نماز کا حصہ ہے" ظاہر ہے کہ نماز پاکی کے بغیر صحیح نہیں ہوتی؛

= ماءها أو شك أن يذهب، قال: أخبروني عن عين زغر، قالوا: عن أي شأنها تستخبر؟ قال: هل في العين ماء؟ وهل يزرع أهلها بماء العين؟ قلنا له: نعم، هي كثيرة الماء، وأهلها يزرعون من مائها.

قال: أخبروني عن نبي الأميين ما فعل؟ قالوا: قد خرج من مكة ونزل يثرب، قال: أقاتله العرب؟ قلنا: نعم، قال: كيف صنع بهم؟ فأخبرناه أنه قد ظهر على من يليه من العرب وأطاعوه، قال لهم: قد كان ذلك؟ قلنا: نعم، قال: أما إن ذاك خير لهم أن يطيعوه، وإني مخبركم عني، إني أنا المسيح، وإني أوشك أن يؤذن لي في الخروج، فأخرج فأسير في الأرض فلا أدع قرية إلا هبطتها في أربعين ليلة غير مكة وطيبة، فهما محرمتان علي كلتاهما، كلما أردت أن أدخل واحدة - أو واحدا - منهما استقبلني ملك بيده السيف صلتا، يصدني عنها، وإن على كل نقب منها ملائكة يحرسونها، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، وطعن بمخصرته في المنبر: »هذه طيبة، هذه طيبة، هذه طيبة« - يعني المدينة - »ألا هل كنت حدثتكم ذلك؟« فقال الناس: نعم، »فإنه أعجبني حديث تميم، أنه وافق الذي كنت أحدثكم عنه، وعن المدينة ومكة، ألا إنه في بحر الشأم، أو بحر اليمن، لا بل من قبل المشرق ما هو، من قبل المشرق ما هو من قبل المشرق، ما هو « وأومأ بيده إلى المشرق، قالت: فحفظت هذا من رسول الله صلى الله عليه وسلم. (صحيح المسلم: ۲/ ۴۰۴-۴۰۵، رقم: ۱۱۹- ۲۹۴۲، كتاب الفتن، باب قصة الجساسة، ط: البدر-ديوبند)

(۱) صحيح المسلم: ۱/ ۱۱۸، كتاب الطهارة، باب فضل الوضوء، رقم: ۱-(۲۲۳)، ط: البدر - ديوبند.

اس لیے اس کو نماز کا ایک حصہ کہا گیا ہے۔ (نووی شرح مسلم: ۱؍۱۵)[1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۱۶] ختم قرآن کی مجلس میں بلند آواز سے تلاوت کرنا

۳۹۸-سوال: ختم قرآن کی مجلس میں بلند آواز سے قرآن پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر تمام لوگ قرآن پڑھنے والے ہوں تو بلند آواز سے قرآن پڑھنا جائز ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] گجراتی میں چھپا ہوا قرآن مجید پڑھنا

۳۹۹-سوال: ایک صاحب سعودی عرب میں رہتے ہیں، وہ عربی زبان میں لکھا ہوا قرآن کریم بالکل پڑھنا نہیں جانتے ہیں؛ اس لیے انہوں نے ہم سے گجراتی زبان میں لکھی ہوئی ''پنج سورہ'' منگوائی ہے، جس میں سورۂ یٰسین، سورۂ رحمن، سورۂ واقعہ، سورۂ کہف اور تبارک الذی وغیرہ ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اسلامی رو سے گجراتی میں چھپے ہوئے قرآن مجید کا پڑھنا جائز ہے؟ میں خرید کر اس شخص کو بھیج سکتا ہوں یا نہیں؟ تفصیل سے جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

گجراتی زبان میں عربی کے بعض حروف نہیں پائے جاتے ہیں، مثلاً: ح-ق-غ-ظ-ش-ذ-ث وغیرہ۔ لہٰذا مکمل قرآن شریف یا اس کی سورتوں کو صرف گجراتی میں چھپوانا جائز نہیں ہے، اسی طرح ان کو خریدنا

---

(۱) (الطهور شطر الإيمان) فقيل: معناه: أن الأجر فيه ينتهي تضعيفه إلى نصف أجر الإيمان، وقيل: معناه: أن الإيمان يجب ما قبله من الخطايا، وكذلك الوضوء؛ لأن الوضوء لا يصح إلا مع الإيمان، فصار لتوقفه على الإيمان في معنى الشطر، وقيل: المراد بالإيمان هنا الصلاة، كما قال الله تعالى: "وما كان الله ليضيع إيمانكم"، والطهارة شرط في صحة الصلوة، فصارت كالشطر، وليس يلزم في الشطر أن يكون نصفا حقيقيا. وهذا القول أقرب الأقوال. (شرح النووي على صحيح المسلم: ۱/۱۱۸، كتاب الطهارة، باب فضل الوضوء، ط: البدر-ديوبند)

(۲) و لا بأس باجتماعهم على قراءة الإخلاص جهرا عند ختم القرآن. (الفتاوى الهندية: ۵/۳۱۷، كتاب الكراهية، الباب الرابع: في الصلاة، والتسبيح، ورفع الصوت... الخ، ط: دار الفكر-بيروت)
وانظر أيضا: حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۳۱۸، ط: دار الكتب العلمية-بيروت.

اور پڑھنا بھی جائز نہیں ہے۔ (۱)

البتہ گجراتی کے ساتھ عربی رسم الخط بھی رکھا جائے اور دونوں زبانیں ساتھ میں چھپائی جائیں، تو جائز ہے۔ (۲)

ضرورت اور مجبوری میں بھی اس کی اجازت ہے، مثلاً مذکورہ شخص کے لیے-جیسا کہ سوال میں تحریر ہے

---

(۱) وقال أشهب: سئل مالك: هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟ فقال: لا إلا على الكتبة الأولى. رواه الداني في المقنع، ثم قال: ولا مخالف له من علماء الأمة. وقال في موضع آخر: سئل مالك عن الحروف في القرآن مثل الواو، والألف، أترى أن يغير في المصحف إذا وجد فيه كذلك؟ قال: لا. قال أبو عمرو: يعني الواو والألف المزيدتين في الرسم، المعدومتين في اللفظ نحو أولوا.

وقال الإمام أحمد: يحرم مخالفة خط مصحف عثمان في واو، أو ياء، أو ألف، أو غير ذلك.

وقال البيهقي في شعب الإيمان: من يكتب مصحفاً فينبغي أن يحافظ على الهجاء الذي كتبوا به تلك المصاحف ولا يخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئاً، فإنهم كانوا أكثر علماً، وأصدق قلباً ولساناً، وأعظم أمانة منا، فلا ينبغي أن نظن بأنفسنا استدراكاً عليهم. (الإتقان في علوم القرآن -السيوطي: ۱۶۸/۴، النوع السادس والسبعون: في رسوم الخط وآداب كتابته، ط: الهيئة المصرية)

سئل هل يكتب المصحف على ما أحدثه الناس من الهجاء؟

فقال لا إلا على الكتبة الأولى أي كتبة الإمام، وهو المصحف العثماني قال بعض أئمة القراء ونسبته إلى مالك؛ لأنه المسئول وإلا فهو مذهب الأئمة الأربعة. قال أبو عمرو: ولا مخالف له في ذلك من علماء الأمة، وقال بعضهم: والذي ذهب إليه مالك هو الحق، إذ فيه بقاء الحالة الأولى إلى أن يتعلمها الآخرون، وفي خلافها تجهيل آخر الأمة أولهم، وإذا وقع الإجماع كما ترى على منع ما أحدث الناس اليوم من مثل كتابة الربا بالألف مع أنه موافق للفظ الهجاء، فمنع ما ليس من جنس الهجاء أولى، وأيضا ففي كتابته بالعجمية تصرف في اللفظ المعجز الذي حصل التحدي به بما لم يرد بل بما يوهم عدم الإعجاز، بل الركاكة؛ لأن الألفاظ العجمية فيها تقديم المضاف إليه على المضاف ونحو ذلك مما يخل بالنظم ويشوش الفهم. وقد صرحوا بأن الترتيب من مناط الإعجاز وهو ظاهر في حرمة تقديم آية على آية كتابة كما يحرم ذلك قراءة، فقد صرحوا بأن القراءة بعكس السور مكروهة وبعكس الآيات محرمة، وفرقوا بأن ترتيب السور على النظم المصحفي مظنون، وترتيب الآيات قطعي. وزعم أن كتابته بالعجمية فيها سهولة للتعليم كذب مخالف للواقع والمشاهدة فلا يلتفت لذلك على أنه لو سلم صدقه لم يكن مبيحا لإخراج ألفاظ القرآن عما كتبت عليه، وأجمع عليها السلف والخلف. (الفتاوى الفقهية الكبرى -ابن حجر الهيتمي (م: ۹۷۴هـ): ۳۸/۱، كتاب الطهارة، باب النجاسة، ط: المكتبة الإسلامية)

(۲) وفيه (أي الكافي) إن اعتاد القراءة بالفارسية، أو أراد أن يكتب مصحفا بها يمنع، وإن فعل في آية أو آيتين لا، فإن كتب القرآن وتفسير كل حرف وترجمته جاز. (فتح القدير -ابن الهمام: ۲۸۶/۱، ط: دار الفكر - بيروت)

کہ وہ بالکل ہی عربی پڑھنا نہیں جانتے۔ ''گجراتی پنج سورہ'' بھیج دیں اور یہ لکھ دیں کہ کسی عالم یا حافظ کے پاس بیٹھ کر عربی حروف ولہجہ کے موافق پڑھے اور ساتھ ساتھ اصل قرآن پڑھنا سیکھتا رہے، تو وہ جب اس طرح کوشش کرتا رہے گا، اس کے لیے گجراتی میں پڑھنا (مجبوری کی وجہ سے) جائز ہوگا، اگر عربی پڑھنے کی کوشش نہیں کرے گا اور اسی پر تکیہ کر کے بیٹھ جائے گا، تو پھر گجراتی میں پڑھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] جس کنویں میں اوراق قرآن ڈالے گئے ہوں، اس کو بیت الخلاء کے لیے استعمال کرنا

۴۰۰-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک کنواں بہت پرانا ہے، جو بے کار پڑا ہوا ہے، اس کا پانی بھی بہت گندا ہے، پینے وغیرہ کسی کام میں نہیں آسکتا، اب اس کنویں کو بیت الخلاء کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ ہے؛ لیکن سوال یہ ہے کہ آج سے دو ایک سال پہلے اس میں قرآن مجید کے پرانے اوراق ڈالے گئے تھے، جو یقیناً اب تک گل کر ختم ہو گئے ہوں گے، مگر پھر بھی اس کے اثرات کی وجہ سے قرآن کی بے ادبی کا ایک گونہ خدشہ ہے؛ اس لیے اس کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا کنویں کا سارا پانی پہلے نکالنا ہوگا، یا ویسے ہی (علی حالہ) اس کو بیت الخلاء کے لیے استعمال کر سکتے ہیں؟ ویسے بھی دیکھا جائے تو یہ کنواں ناپاک ہی ہے؛ کیوں کہ اس میں ایک مرغ گر گیا تھا اور کنواں اب تک پاک نہیں کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ مفصل ومدلل جواب دے کر ممنون فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

درمختار میں لکھا ہے کہ جو دینی کتابیں اس قدر پرانی ہو جائیں کہ پڑھنے کے لائق نہ ہوں، ان کے لیے تین طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار کیا جائے:

(۱) اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے ناموں کو دھو کر (یا نکال کر) باقی حصے کو جلا دیا جائے۔

(۲) دھوئے بغیر ان کو جلا دیا جائے۔ ـــــــــــ (۳) ان کو دفن کر دیں۔

تیسری صورت زیادہ بہتر ہے (شامی: ۵/۲۷۳)[1]

---

(۱) الكتب التي لا ينتفع بها يمحى عنها اسم الله وملائكته ورسله ويحرق الباقي، ولا بأس بأن تلقى في ماء جار كما هي، أو تدفن وهو أحسن. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/۴۲۲، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، فرع: يكره إعطاء سائل المسجد... الخ، ط: دار الفكر - بيروت)

یہاں غور کا مقام ہے کہ صورت مسئولہ میں کتابیں نہیں ہیں؛ بل کہ قرآن مقدس کے مبارک اوراق ہیں۔

میری رائے میں ایسا کیا جاسکتا ہے کہ کنویں کے پاس ایک قد آدم گڑھا کھود کر اس کنویں کا سارا پانی میں اس میں ڈالا جائے، پھر اگر کچھ اوراق نکلتے ہیں تو ان کو اسی گڑھے میں یا الگ کسی جگہ قبرستان وغیرہ میں دفن کر دیا جائے۔ اگر اوراق نہیں نکلتے ہیں، تو اس پانی میں مبارک اوراق کا جو اثر ہوگا وہ پاک جگہ میں مدفون ہوجائے گا، پھر اس کنویں کو استنجاء کے لیے آپ استعمال کر سکتے ہیں، اس طرح کرنے سے بے ادبی سے حفاظت ہوجائے گی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ سے قران کریم اور وعظ سننا

۴۰۱-سوال: کیا ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ سے قران کریم کی آیت سننا، اسی طرح اس میں ریکارڈ کرنا گناہ ہے؟ نیز ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ سے وعظ سن سکتے ہیں یا نہیں؟ کیوں کہ وعظ میں بھی قرآن کی آیت اور اس کی تفسیر ہوتی ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ سے قران کریم یا وعظ کا سننا جائز ہے، خواہ ریڈیو اور ٹیپ مستقل ہو، یا دونوں ایک ساتھ ہوں، البتہ موجودہ دور میں مذکورہ چیز کو وقت گزاری کا ذریعہ سمجھ کر قران کریم کی بے حرمتی کی جاتی ہے، اس لیے اس سے اجتناب کرنا چاہیے، ایک طرف قرآن کریم کی تلاوت جاری ہے، وعظ و بیان ہو رہا ہے اور سننے والا بات چیت یا ہنسی مذاق میں مشغول ہے، یہ بے حرمتی ہے، اس سے احتیاط لازم ہے۔ (۱)

[۲۰] عورت اپنے شوہر کے بغیر کتنی مدت صبر کر سکتی ہے

(ایک روایت کی تحقیق اور حضرت عمرؓ کے اپنی بیٹی سے سوال کرنے پر واقع ہونے والے اعتراض کا جواب)

۴۰۲-سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ذیل کی روایت کے بارے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ ''حضرت عمرؓ نے خود اپنی لڑکی حفصہ سے یہ پوچھا کہ ایک عورت شوہر کے بغیر کتنی مدت ٹھہر سکتی ہے''۔

ہمیں اس پر اشکال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ جیسا شخص -جس نے حضور ﷺ کی خدمت میں سالہا

(۱) ومن حرمة القرآن أن لا يقرأ في الأسواق، وفي موضع اللغو، كذا في القنية. (الهندية: ۵/۳۱۶، كتاب الكراهية، الباب الرابع: من آداب المسجد والتسبيح والقراءة، ط: دار الفكر - بيروت)

سال تربیت پائی ہو، اور حضور ﷺ نے ان کا کیرکٹر اس قدر مضبوط بنا دیا ہو کہ ان کے تقویٰ وطہارت اور حسنِ اخلاق کی قسم کھائی جائے- خود اپنی لڑکی سے ایسی فحش بات دریافت کرے، اس بات کے تسلیم کرنے پر ہماری عقل گوارا نہیں کرتی، کیا ایک باپ اپنی لڑکی سے ایسی فحش بات پوچھنے شرمندگی محسوس نہیں کرے گا؟ اور لڑکی ایسا کہنے سے شرمندگی محسوس نہیں کرے گی؟

ایک عامی سے عامی شخص- خواہ وہ دنیا کی کسی بھی قوم سے تعلق رکھتا ہو- ایسی بات اپنی لڑکی سے پوچھ نہیں سکتا، کیا ہم اور آپ اپنی لڑکی سے ایسی بات پوچھ سکتے ہیں؟

اگر واقعۃً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسی بات پوچھی ہو، تو ایسی فحش بات پوچھنے والے پر شریعت کا کیا حکم لگے گا؟

یہ روایت حدیث کی کس کتاب میں ہے؟ اور اس کتاب کا درجہ صحت کے لحاظ سے کیا ہے؟ ہمیں تو اس روایت کے پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں؛ کیوں کہ حضرت عمرؓ جیسی شخصیت سے ایسے امور کا صدور میں، ممکن ہی نہیں؛ بل کہ محال نظر آتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ شیعہ راویوں نے ایسی روایتیں خلفاء راشدین اور خصوصاً حضرت عمرؓ کو بدنام کرنے کے لیے وضع کر رکھی ہیں، اس لیے اس طرح کی روایات سے خلفاء راشدین کی توہین محسوس ہوتی ہے۔ کیا اس روایت میں بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ شیعہ راویوں نے حضرت عمرؓ کو بدنام کرنے کے لیے اپنی طرف سے روایات وضع کی اور اس کو ہمارے سیدھے سادھے محدثین نے غور وفکر کیے بغیر اپنی کتاب میں جمع فرما دیا۔

حضور ﷺ جب بھی عورتوں کے مسائل بیان فرماتے، تو ازواج مطہرات سے دریافت فرما کر بیان فرماتے تھے، نہ کہ اپنی لڑکی فاطمہؓ سے؛ تو جب کہ حضرت عمرؓ حضور ﷺ کے تربیت یافتہ تھے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی قانون کو بنانے کے لیے ایسی فحش بات اپنی زوجہ سے پوچھنے کے بجائے اپنی لڑکی سے پوچھیں؟

ماسٹر موسیٰ گورا صاحب، ۷؍ ۶؍ ستمبر ۱۹۸۳ء

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس روایت کے متعلق آپ نے سوال کیا ہے، وہ ''موطا امام مالک'' کی ہے، جیسا کہ ''تفسیر ابن

کثیر میں مذکور ہے، نیز یہ روایت ''درمنثور'' اور ''تفسیر فی ظلال القرآن'' میں بھی ہے۔[1] لیکن آخر الذکر دونوں میں کتب حدیث میں سے کسی بھی کتاب کی طرف نسبت نہیں کی گئی ہے۔

''درمنثور'' میں اس کے علاوہ اور بھی روایات مذکور ہیں، جن عورتوں کا حضرت عمرؓ سے اپنی ازواج کے متعلق تذکرہ کرنا ثابت ہے، نیز مسئول عنہا روایت کے متعلق ''ابن کثیر اور درمنثور'' میں لکھا ہے کہ کثرت طرق کی وجہ سے مشہورات میں سے ہے، مثلاً ابن کثیر کی روایت اس طرح ہے: ''وقد ذكر الفقهاء وغيرهم -في مناسبة تأجيل المولى بأربعة أشهر- الأثر الذي رواه الإمام مالك بن أنس رحمه الله في الموطا عن عبد الله بن دينار، قال خرج عمر بن الخطاب من الليل، فسمع إمرأة تقول... الخ''[2] پھر مفسر ابن کثیرؒ نے پوری روایت کو بیان فرمایا ہے۔

اس معنی کا مضمون ''درمنثور'' میں بھی ہے، ''درمنثور اور ابن کثیر'' میں ایک اثر اور بھی منقول ہے حضرت سائب بن جبیر مولی ابن عباسؓ سے، کہ میں ہمیشہ حضرت عمرؓ کی حدیث کے متعلق سنا کرتا تھا' جس میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ رات میں (عوام کی تحقیق حال کی خاطر گشت کے لیے) حضرت عمرؓ نکلے، (اور حضرت عمرؓ اس طرح نکلا کرتے تھے) کہ ایک عورت کو کہتے ہوئے سنا...... الخ، پھر پوری روایت کو بیان فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت اس وقت سے مشہور ہے، جیسا کہ ابن کثیرؒ نے اس کو مشہورات میں شامل فرمایا ہے: وقد روي هذا من طرق، وهو من المشهورات.[3]

---

(۱) وقد ذكر الفقهاء وغيرهم -في مناسبة تأجيل المولي بأربعة أشهر- الأثر الذي رواه الإمام مالك بن أنس -رحمه الله- في الموطأ، عن عمرو بن دينار، قال: خرج عمر بن الخطاب من الليل فسمع امرأة تقول:

تطاول هذا الليل واسود جانبه		وأرقني ألا خليل ألاعبه
فوالله لولا الله أني أراقبه		لحرك من هذا السرير جوانبه

فسأل عمر ابنته حفصة، رضي الله عنها: كم أكثر ما تصبر المرأة عن زوجها؟ فقالت: ستة أشهر أو أربعة أشهر. فقال عمر: لا أحبس أحدا من الجيوش أكثر من ذلك. (تفسير ابن كثير: ۱/۶۰۵، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

الدر المنثور في التفسير بالمأثور: ۱/۶۵۲، ط: دار الفكر - بيروت.

ظلال القرآن - سيد قطب إبراهيم حسين الشاربي (م: ۱۳۸۵هـ): ۱/۲۴۵، ط: دار الشرق - بيروت.

(۲) راجع رقم الهامش: ۱.

(۳) عن السائب بن جبير، مولى ابن عباس - وكان قد أدرك أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم - قال: ما زلت=

اب رہا یہ سوال کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی سے اس قسم کا سوال کس طرح فرمایا؟ تو اس روایت میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ نے بہ ذات خود سوال فرمایا؛ بل کہ (غالب گمان یہ ہے کہ) کسی کے واسطے سے سوال فرمایا ہوگا، اور آمر ہونے کے بنا پر سوال کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف کی گئی ہو، جیسا کہ علم المعانی کا قاعدہ ہے کہ کبھی فعل اور معنیٔ فعل کی ''نسبت حقیقی'' کو چھوڑ کر غیر کی طرف ادنیٰ مناسبت سے کی جاتی ہے، جیسا کہ ایک مسلمان کہتا ہے: "شفي الطبيب المريض" (۴) طبیب نے مریض کو شفا دی، اگر قائل اس کا اعتقاد رکھتا ہو، تو ایمان سے نکل جائے گا، مگر کوئی بھی مسلمان، مسلم قائل پر کفر کا حکم تو کیا، ادنیٰ شک وشبہ بھی نہیں کرتا، شافیٔ حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں، ڈاکٹر اور طبیب اسباب کے درجے میں ہیں، ایسا ہی یہاں سائل حقیقی کوئی اور ہے؛ البتہ سبب سوال حضرت عمرؓ کے ہونے کی بنا پر مجازاً سوال کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف کی گئی، جیسا

=أسمع حديث عمر أنه خرج ذات ليلة يطوف بالمدينة، وكان يفعل ذلك كثيرا، إذ مر بامرأة من نساء العرب مغلقة بابها [وهي] تقول:

تطاول هذا الليل واسود جانبه		وأرقني ألا خليل ألاعبه
تطاول هذا الليل وازوز جانبه		وأرقني ألا ضجيع ألاعبة
ألاعبه طورًا وطورًا كأنما		بدا قمرًا في ظلمة الليل حاجبه
يسرّ به من كان يلهو بقربه		لطيف الحشا لا يحتويه أقاربه
فوالله لولا الله لا شيء غيره		لنقض من هذا السرير جوانبه
ولكنني أخشى رقيبا موكلا		بأنفسنا لا يفتر الدهر كاتبه

ثم ذكر بقية ذلك كما تقدم، أو نحوه. وقد روي هذا من طرق، وهو من المشهورات. (المصدر السابق)

(۴) واعلم أن المجاز الحكمي كثير الوقوع في كلام رب العزة. قال عز من قائل " فما ربحت تجارتهم "، وقال: " وإذا تليت عليهم آياته زادتهم إيماناً "، وقال: " فمنهم من يقول أيكم زادته هذه إيماناً ". وقال: " تؤتي أكلها كل حين "، وقال: " حتى تضع الحرب أوزارها "، وقال: " وأخرجت الأرض أثقالها " بإسناد الأفعال في هذه كلها على غير ما هي لها عند العقل كما ترى زائلا الحكم العقلي فيها عن مكانه الأصلي، إذ مكانه الاصلي إسناد الربح على أصحاب التجارة، وإسناد زيادة الإيمان على العلم بالآيات، وإسناد إيتاء أكل الشجرة على خالقها، وإسناد وضع أوزار الحرب على أصحاب الحرب، وإسناد إخراج أثقال الأرض على خالق الأرض، ... وفي "شفى الطبيب المريض" أصل الحكم شفى الله المريض عند علاج الطبيب. (مفتاح العلوم - يوسف بن أبي بكر بن محمد بن علي السكاكي الخوارزمي الحنفي أبو يعقوب (م:۶۲۶ھ)، ص:۳۹۷-۳۹۸، الفصل الخامس: في المجاز العقلي، ت: نعيم زرزور، ط: دار الكتب العلمية- بيروت- لبنان)

کہ طحاوی شریف کی روایت میں ہے کہ اکسال کے متعلق جب صحابہؓ میں اختلاف ہوا کہ غسل واجب ہے یا نہیں؟ تو حضرت عمرؓ نے اولاً ایک شخص کو اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کے پاس بھیجا اور ان کو علم نہ ہونے کی وجہ سے حضرت عائشہؓ سے آدمی بھیج کر دریافت فرمایا۔ (۵)

اسی طرح مذکورہ روایت میں بھی آدمی بھیج کر دریافت فرمایا گیا ہو؛ البتہ آمر ہونے کی وجہ سے سوال کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف ہوگئی اور سائل حقیقی کو حذف کر دیا گیا؛ اس طرح کے نظائر کتب حدیث میں موجود ہیں، مثلاً: حضرت علیؓ کی روایت جس میں سوال کیا گیا کہ مذی موجب غسل ہے یا نہیں؟(۶) اس روایت میں سوال کی نسبت حضرت علیؓ طرف کی گئی ہے، حالاں کہ اس کے بعض طرق میں ہے کہ حقیقی سائل حضرت عمارؓ یا حضرت مقدادؓ تھے۔(۷) ''علامہ کرمانیؒ'' نے فرمایا: کہ اگر سائل حضرت علیؓ کے علاوہ ہوں، تو یہ مراسیل صحابہ میں سے ہے۔(۸)

(۵) عن معمر بن أبي حبيبة، قال: سمعت عبيد بن رفاعة الأنصاري، يقول: كنا في مجلس، فيه زيد بن ثابت، فتذاكرنا الغسل من الإنزال. فقال زيد: " ما على أحدكم إذا جامع فلم ينزل إلا أن يغسل فرجه، ويتوضأ وضوءه للصلاة. فقام رجل من أهل المجلس، فأتى عمر فأخبره بذلك. فقال عمر للرجل: اذهب أنت بنفسك فائتني به حتى يكون أنت الشاهد عليه. فذهب فجاء به، وعند عمر ناس من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، فيهم علي بن أبي طالب، ومعاذ بن جبل رضي الله عنهما، فقال عمر: أنت عدو نفسك، تفتي الناس بهذا؟ فقال زيد: أم والله ما ابتدعته ولكني سمعته من عماي رفاعة بن رافع ومن أبي أيوب الأنصاري. فقال عمر لمن عنده من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم: ما تقولون؟ فاختلفوا عليه. فقال عمر: يا عباد الله، فمن أسأل بعدكم وأنتم أهل بدر الأخيار؟ فقال له علي بن أبي طالب: فأرسل إلى أزواج النبي صلى الله عليه وسلم، فإنه إن كان شيء من ذلك، ظهرت عليه. فأرسل إلى حفصة، فسألها فقالت: لا علم لي بذلك، ثم أرسل إلى عائشة رضي الله عنها فقالت: إذا جاوز الختان الختان، فقد وجب الغسل. فقال عمر رضي الله عنه عند ذلك: لا أعلم أحدا فعله، ثم لم يغتسل إلا جعلته نكالا ".

(شرح معاني الآثار، رقم الحديث: ۳۳۵-۳۳۸، كتاب الطهارة، باب الذي يجامع ولا ينزل، ط: عالم الكتب)

(۶) عن علي - رضي الله عنه - قال: سألت النبي - صلى الله عليه وسلم - عن المذي، فقال: من المذي الوضوء، ومن المني الغسل. (سنن الترمذي: ۳۱/۱، رقم: ۱۱۴، كتاب الطهارة، باب ما جاء في المني والمذي، ط: البدر - ديوبند)

(۷) قلت: ظاهر هذا السياق أنه سمعه من الرسول صلى الله عليه وسلم حيث لم يقل قال المقدام قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولئن سلمنا عدم ظهوره فحكمه حكم مرسل الصحابي. (صحيح أبي عبد الله البخاري بشرح الكرماني: ۲/ ۱۴۳، كتاب العلم، باب من استحيا فأمر غيره بالسؤال، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۸) وجمع ابن حبان بين هذا الاختلاف، بأن عليا أمر عمارا أن يسأل، ثم أمر المقداد بذلك، ثم سأل بنفسه، وهو جمع جيد إلا بالنسبة إلى آخره لكونه مغاير القوله إنه استحيى عن السؤال بنفسه لأجل فاطمة، فيتعين حمله على =

اس قسم کے مجازات شائع ہیں: لہٰذا حضرت علی کی طرف نسبت آمر ہونے کی وجہ سے ہے، اور سائل حقیقی حضرت عمار بن یاسرؓ یا حضرت مقدادؓ ہیں۔

اس توجیہ پر یہ سوال کہ اپنی زوجہ سے کیوں سوال نہیں کیا؟ بیٹی (حضرت حفصہؓ) سے کیوں کیا؟ تو ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ نے سوچا ہو کہ حضرت حفصہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہ چکی ہیں، ہوسکتا ہے کہ اس باب میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہو؛ اس لیے بیوی کے بجائے صاحب زادی سے سوال کیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے سوال کی بنیاد حیاء پر ہے؟ کہ حضرت عمرؓ نے بیٹی سے سوال کے وقت حیاء نہیں کی، تو اس قسم کے امور کو حیاء شرعی میں شمار کرنا صحیح نہیں ہے۔

آپ کا یہ دعویٰ کہ دنیا کے کسی بھی قوم کا کوئی بھی شخص اس قسم کے سوال اپنی لڑکی سے نہیں کرتا ہے، یہ (دعویٰ) صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس کے خلاف موجود ہے؛ اس لیے کہ دنیا میں ایسی اقوام بھی موجود ہیں، جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ محارم تک سے نکاح کو جائز قرار دیتے ہیں، چہ جائے کہ اس قسم کے سوالات؟ اور فی زمانناتو یہ بالکل عیاں ہے، مثلاً مجوس۔ (عین الہدایہ ج: ۲/ص: ۱۱۰)۔[9]

حیاء کا معنی لغت کے اعتبار سے ہے: "تغير وانكسار يعتري الإنسان من خوف مايعاب به، ويذم وقد يعرف أيضاً بانه انحصار النفس خوف ارتكاب القبائح".[10] یعنی انسان پر کسی معیوب ومذموم چیز کے خوف سے تغیر وانکساری کا طاری ہونا۔

اور شرع میں اس کا معنی ہے: "خلق يبعث على اجتناب القبيح ويمنع من التقصير في حق ذي الحق".[11] یعنی وہ خُلقِ حسن، جو قبائح سے اجتناب کا باعث ہو اور صاحب حق کے حق میں تقصیر سے مانع ہو۔

"امام راغبؒ" نے فرمایا: "الحياء انقباض النفس عن القبيح".[12] یعنی نفس کا قبائح سے منقبض

=المجاز، بأن بعض الرواة أطلق أنه سأل لكونه الآمر بذلك وبهذا جزم الإسماعيلي ثم النووي. (فتح الباري-ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲هـ): ۱/ ۳۸۰، باب غسل المذي والوضوء منه، ط: دار المعرفة- بيروت)

(۹) عين الهداية: ۲/ ۱۲، فصل في بيان المحرمات، ط: زكريا ديوبند.

(۱۰) عمدة القاري: ۱/ ۱۲۶، باب أمور الإيمان، ط: دار إحياء التراث العربي.

(۱۱) وفي الشرع خلق يبعث على اجتناب القبيح، ويمنع من التقصير في حق ذي الحق. (فتح الباري-ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲هـ): ۱/ ۵۲، باب أمور الإيمان، ط: دار إحياء التراث العربي ★عمدة القاري: ۱/ ۲۹، باب أمور الإيمان)

(۱۲) قال الراغب: الحياء انقباض النفس عن القبيح. (فتح الباري-ابن حجر: ۱/ ۷۴)

معجم مفردات ألفاظ القرآن الكريم، ص: ۱۵۶، ط: دار الكتب العلمية- بيروت.

ہونا۔

بعض نے کہا ہے: "ھو انقباض النفس خشیۃ ارتکاب مایکرہ"۔ [۱۳] یعنی نفس کا منقبض ہونا مکروہ امر کے ارتکاب کی خشیت سے۔

"علامہ حلیمیؒ" فرماتے ہیں: "خوف الذم بنسبۃ الشر إلیہ" [۱۴] یعنی شر کے منسوب ہونے کی مذمت سے ڈرنا؛ یہ تو تھی حیاء کی لغوی وشرعی تحقیق۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حیاء شرعی وہ ہے: جو انسان کو امور خیر کے کرنے کا باعث ہو اور امور شر کے ارتکاب سے مانع ہو، اور یہ محمود ہے؛ لیکن اگر حیاء امور خیر کے اکتساب وتحصیل سے مانع ہو، تو یہ حیاء مذموم ہے؛ بل کہ حقیقت میں بزدلی اور ضعف وکمزوری ہے: "وأماما وقع سببا لترك أمر شرعي فهو مذموم، وليس بحياء شرعي؛ بل هو ضعف ومهانة، الحياء في العلم لاينبغي، ومثله لايسمى حياءًا شرعياً بل ضعف، فإن الحياء إذا كان عن تحصيل العلم؛ فهو مذموم"۔ [۱۵] مطلب یہ کہ جو حیاء امر شرعی کے ترک کا سبب ہو یا حصولِ علم سے مانع ہو، وہ حیاء نہیں ہے؛ بل کہ ضعف وعجز ہے۔

"علامہ کرمانیؒ" نے تحریر میں فرمایا ہے: یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ حیاء انسان کو حق بات کی مواجہت سے مانع ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حیاء نہیں؛ بل کہ بزدلی اور ضعف وکمزوری ہے۔

وقديستشكل من حيث أن صاحب الحياء قد يستحي أن يواجه الحق فيترك أمره بالمعروف ونهيه عن المنكر، والجواب أنه ليس حياءًا حقيقيا بل هو عجز ومهانة وضعف. [۱۶]

"بخاری شریف" "کتاب العلم میں امام بخاریؒ نے باب منعقد فرمایا ہے: "باب الحياء في العلم" اس باب کے تحت حضرت عائشہؓ کا اثر بیان فرمایا ہے، جس میں حضرت عائشہؓ نے انصار کی عورتوں کی تعریف

---

(۱۳) وقال غيره هو القباض النفس خشية ارتكاب مايكره أعم من أن يكون شرعيا أو عقليا أو عرفيا ومقابل الأول فاسق والثاني مجنون والثالث أبله. (فتح الباري: ۱/ ۷۴-۷۵)

(۱۴) المصدر السابق.

(۱۵) لامع الدراري شرح جامع البخاري: ۱/ ۶۵، ط: المكتبة الأشرفية- ديوبند.

(۱۶) صحيح أبي عبدالله البخاري بشرح الكرماني: ۱/ ۸۴، باب أمور الإيمان.

فرمائی ہے کہ ان کی حیاء تفقہ فی الدین سے مانع نہیں ہے۔(۱۷) اس کے بعد حضرت ام سلمہؓ کی اس روایت کو بھی بیان فرمایا ہے: جس میں ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے نبی کریم ﷺ سے احتلام سے غسل واجب ہونے کے متعلق سوال فرمایا، اور سوال سے قبل ایک تمہید قائم کی: کہ اللہ تعالیٰ حق سے حیاء نہیں فرماتے، بل کہ حق بیان فرمادیتے ہیں، اسی طرح میں بھی حق بات پوچھنے سے حیاء نہیں کروں گی، بل کہ پوچھ لوں گی ایسا سوال، جس سے عورتیں عادۃً حیاء کرتی ہیں۔

"إن الله لا يستحي من الحق أي لا يمتنع من بيان الحق، فكذا أنا لا امتنع من سؤال عما أنا محتاجة إليه مما تستحي النساء في العادة".(۱۸) معلوم ہوا کہ بعض امور حیاء میں شمار کیے جاتے ہیں؟ اگر حیاء ایسی ہے کہ امور خیر و تفقہ فی الدین سے مانع نہیں ہے، تو وہ محمود ہے؛ لیکن اگر مانع ہے، تو حقیقت میں وہ حیاء نہیں ہے، بل کہ عجز و ضعف ہے۔

اس حدیث سے "علامہ عینیؒ" نے چند احکام مستنبط فرمائے ہیں؛ ان میں سے سب سے پہلا حکم یہ بیان فرمایا: کہ حیاء کو ترک کرنا جب کوئی مسئلہ پیش آجائے: "ترك الحياء لمن عرفت عليه المسئلة".(۱۹) علامہ کرمانیؒ نے لکھا ہے کہ حیاء کا تقاضا ہے کہ حقائق سے نہ رُکا جائے: "وفيه أن الحياء يقتضي أن لا يمنع من طلب الحقائق".(۲۰)

اس قسم کی ایک روایت حضرت علیؓ کی بھی ہے، جس میں ہے کہ حضرت علیؓ نے حضور ﷺ سے "خروج

(۱۷) وقالت عائشة: »نعم النساء نساء الأنصار لم يمنعهن الحياء أن يتفقهن في الدين«. (رواه البخاري تعليقا في كتاب العلم، باب الحياء في العلم، ۱/ ۲۴، ط: البدر ديو بند)

(۱۸) عن أم سلمة، قالت: جاءت أم سليم إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت: يا رسول الله إن الله لا يستحيي من الحق، فهل على المرأة من غسل إذا احتلمت؟ قال النبي صلى الله عليه وسلم: »إذا رأت الماء« فغطت أم سلمة، تعني وجهها، وقالت: يا رسول الله أو تحتلم المرأة؟ قال: »نعم، تربت يمينك، فبم يشبهها ولدها«. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۴، رقم الحديث: ۱۳۰، كتاب العلم، باب الحياء في العلم، ط: البدر ديو بند)

قال العيني: قوله إن الله لا يستحي أي لا يمتنع من بيان الحق فكذا أنا لا أمتنع من سؤالي عما أنا محتاجة إليه مما تستحي النساء في العادة من السؤال عنه. (عمدة القاري: ۲/ ۲۱۲، باب الحياء في العلم)

(۱۹) ترك الاستحياء لمن عرضت له المسئلة. (عمدة القاري: ۲/ ۲۱۲، كتاب العلم، باب الحياء في العلم، ط: دار المعرفة بيروت)

(۲۰) صحيح أبي عبد الله البخاري بشرح الكرماني: ۲/ ۱۹۰، كتاب العلم، باب الحياء في العلم.

المذي'' سے غسل واجب ہونے کے متعلق سوال فرمایا۔[٢١] اور مذی کا خروج عامۃً ''ملاعبة المرأة'' سے ہوتا ہے،اس روایت پر اگرچہ بایں طور کلام ہے کہ اس کے بعض طرق میں سائل حضرت علیؓ ہیں، بعض میں حضرت مقدادؓ ہیں اور بعض میں حضرت عمارؓ ہیں۔[٢٢] لیکن علامہ عینیؒ نے ان میں تطبیق دی ہے: اولاً ان دونوں کو سوال کرنے کے لیے بھیجا، بعد میں خود گئے۔[٢٣] اور حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ اس کو تعدد واقعات پر محمول کیا جائے گا۔[٢٤] بہر حال اس سے حضرت علیؓ کا بہ ذات خود سوال کرنا ثابت ہوا،اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان امور کو حیاء شرعی میں شمار کرنا صحیح نہیں ہے،ورنہ اشکال ہوگا کہ داماد اپنے خسر سے اس قسم کے سوال کس طرح کرسکتا ہے،صرف اتنا ہی نہیں،بل کہ انصار کی عورتیں خود آ کر اس قسم کے سوالات حضور ﷺ سے کیا کرتیں تھیں،اور ماقبل میں ''درمنثور'' [٢٥] کے حوالہ سے گزرا کہ عورتیں حضرت عمرؓ سے اپنے ازواج کے متعلق تذکرہ کیا کرتیں تھیں؛اگر یہ حقیقت میں حیاء شرعی ہوتی،توان کو خود آ کر سوال کرنے کے بجائے اپنے ازواج کے واسطہ سے سوال کرنا چاہیے تھا، نیز ایک مرتبہ حضرت موسیٰ اشعریؓ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک مسئلہ دریافت کرنے گئے،اور حیاء محسوس کی،توحضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جو سوال تم اپنی ماں سے کرتے، وہ خود مجھ سے دریافت کرلو۔(موطا امام مالک،ص:١٧)

ان کے علاوہ اور بھی واقعات وروایات ہیں، کہ حیاء کے معنیٰ نہ سمجھنے کی وجہ سے ان سب واقعات وروایات پر اعتراض ہوگا؛لہٰذا حضرت عمرؓ نے واقعۂ مذکورہ بالا سے حقیقت مسئلہ جاننے کے لیے اپنی صاحبزادی سے سوال فرمایا ہو، یہ حیاء کے خلاف نہیں ہے،حیاء کا معنیٰ، مذکورہ تصریحات کے مطابق جو شخص بھی سمجھ لے گا، اشکال خود حل ہوجائے گا۔ أكثر مباحثها مأخوذة من فتح الباري:١/ ٥٨،وايضاً:١/ ٨١،وايضاً:١/ ٢٩١،و ايضاً:١/ ٣٩٤ ☆عمدة القاري، ١/ ١٢٩،و ايضاً:٢/ ١٧٥، و ايضاً: ٢/ ١١٠،☆ كرماني:١/ ٨٤، و ايضاً:١/ ١٢٠،وايضاً:١/ ١٥٩، لامع:١/ ٦٥ ،وغيرهامن الكتب المذكورة.فقط،والله أعلم بالصواب۔

٥/محرم ١٤٠٤ھ مطابق ١٣/اکتوبر ١٩٨٣ء بروز جمعرات

---

(٢١) عن علي بن أبي طالب، قال: كنت رجلا مذاء فأمرت المقداد بن الأسود أن يسأل النبي صلى الله عليه وسلم فسأله، فقال: »فيه الوضوء«. (صحيح البخاري:١/ ٢٤-٢٥،رقم:١٣٢،كتاب العلم،باب من استحيا فأمر غيره بالسؤال،ط:البدر-ديوبند)

(٢٢) انظر للبسط فتح الباري:١/ ٣٧٩-٣٨٠،باب غسل المذي والوضوء منه، ط: دار المعرفة.

(٢٣) وجمع ابن حبان بين هذا الاختلاف أن عليا سأل عمارا أن يسأل، ثم أمر المقداد بذلك، ثم سأل بنفسه. (عمدة القاري: ٣/ ٢١٩،باب غسل المذي والوضوء منه، ط: دار إحياء التراث العربي)

(٢٤) ابن حجرؒ کی یہ بات مجھے نہیں مل سکی،بل کہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی تقریباً وہی بات لکھی ہے، جو علامہ عینیؒ کے حوالے سے مذکور ہوئی۔ ملاحظہ ہو: فتح الباری١/ ٣٨٠،باب غسل المذي والوضوء منہ، ط: دار المعرفة۔

(٢٥) حاشیہ نمبر:(١) ملاحظہ فرمائیں۔

[۲۱] نماز میں قرآن کریم دیکھ کر پڑھنا

۴۰۳-سوال: نفل نماز میں قرآن شریف میں سے دیکھ کر قراءت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ہمارے یہاں ایک شخص نفل نماز میں قرآن شریف آگے رکھ کر پڑھتا ہے، اور رکوع، سجدہ کرتا ہے، پھر واپس دوسری رکعت میں قرآن شریف ہاتھ میں لے کر قراءت کرتا ہے، تو کیا چاروں اماموں میں سے کسی امام کے نزدیک نفل نماز میں قرآن شریف دیکھ کر پڑھنا جائز ہے؟

الجواب حامداو مصليا:

امام شافعیؒ کے قول کے مطابق اگر کوئی شخص نماز میں قرآن شریف سے دیکھ کر پڑھے تو، نماز صحیح ہو جائے گی۔ (شامی: ج۱/ص۵۸۵)[۱] امام یوسفؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق مکروہ ہے، امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق اگر قرآن شریف اٹھا کر پڑھے گا، تو نماز فاسد ہو جائے گی۔[۲] واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] کسی گھر جا کر قرآن پڑھنا

۴۰۴-سوال: غیر مسلم کے گھر یا دکان میں قرآن پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

دنیوی لالچ سے قرآن شریف پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے۔(۳) غیر مسلم سے رقم حاصل کرنے کے لیے

---

[۱] وجوّزه الشافعي بلا كراهة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۶۲۴، كتاب الصلوة، باب ما يفسد الصلوة وما يكره فيها، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲] (وقراءته من مصحف) أي ما فيه قرآن (مطلقا) لأنه تعلم إلا إذا كان حافظا لما قرأه وقرأ بلا حمل. (الدر المختار) ــــــــــــ و قال الشامي(م: ۱۲۵۲ھ): (قوله لأنه تعلم) ذكروا لأبي حنيفة في علة الفساد وجهين. أحدهما: أن حمل المصحف والنظر فيه وتقليب الأوراق عمل كثير. والثاني أنه تلقن من المصحف فصار كما إذا تلقن من غيره. وعلى الثاني لا فرق بين الموضوع والمحمول عنده، وعلى الأول يفترقان، وصحح الثاني في الكافي تبعا لتصحيح السرخسي. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۲۳ - ۶۲۴، كتاب الطهارة، باب ما يفسد الصلوة وما يكره فيها، دار الفكر - بيروت)

(و كذا في الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۱، كتاب الصلاة، الباب السابع: فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار الفكر)

(۳) وقراءة القرآن للدنيا مكروهة، والأفضل أن لا يعطى القارئ شيئا. (البناية شرح الهداية: ۱۲/ ۲۳۷، كتاب الكراهية، مسائل متفرقة، التعشير والنقط، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ رد المحتار: ۶/ ۵۶، مطلب في الاستيجار على المعاصي، ط: دار الفكر - بيروت)

ہی پڑھے گا؛ لہٰذا مکروہ تحریمی ہے، اس مقصد کے لیے مسلمان کے گھر ہی کیوں نہ پڑھے، مکروہ تحریمی ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] اسلام کے تعارف کے طور پر کسی غیر مسلم کے عمدہ جملے کو پیش کرنا

۴۰۵-سوال: ایک غیر مسلم نے اپنی کتاب کے اخیر میں پوری کتاب کا خلاصہ ایک سطر میں اس طرح بیان کیا ہے ''جو خود کو مناسب نہ لگے، ایسا برتاؤ دوسروں کے ساتھ نہ کرنا چاہیے'' تو کیا ہم اسلام کے تعارف میں، اس مختصر جملہ کو- جسے ایک غیر مسلم نے بتلایا ہے-لکھا ہے، کسی دوسرے غیر مسلم کے سامنے پیش کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

''جو خود کو مناسب نہ لگے، ایسا برتاؤ دوسروں کے ساتھ نہ کرنا چاہیے'' ویسے تو یہ خلاصہ جو مختصر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اس کا مفہوم اور مطلب تو ہر آدمی سمجھتا ہے، ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی سمجھ دار آدمی انتہائی غور و فکر کے بعد اس طرح کی بات کہہ سکے، تاہم اس جملہ میں جو نور و کشش کی کیفیت ہے، وہ کسی کافر کے ظلمت بھرے دل سے نہیں نکل سکتی، بات دراصل یہ ہے کہ آج کل بہت سے سادھوسنت اسلامی کتابوں کا مطالعہ کر کے ان میں سے اس طرح کی باتوں اور قصوں کو اسلامی کتاب کا حوالہ دیے بغیر بیان کر دیتے ہیں۔

چناں چہ مذکورہ خلاصہ بھی درحقیقت بلند ترین اخلاق کے سرتاج حضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگوں کے لیے وہی پسند کرو، جو اپنے لیے پسند کرو، جو چیز تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے، اسے دوسروں کے لیے بھی پسند مت کرو۔ (مسند احمد)[1]

پوری حدیث شریف اس طرح ہے:

حضرت معاذ؄ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ اسلام کی خصلتوں میں سے کون سی خصلت سب سے

(۱) عن معاذ أنه سأل النبي صلى الله عليه وسلم عن أفضل الايمان قال: "أن تحب لله، وتبغض لله، وتعمل لسانك في ذكر الله". قال: وماذا يا رسول الله؟ قال: "وأن تحب للناس ما تحب لنفسك وتكره لهم ما تكره لنفسك". (مسند الإمام أحمد بن حنبل - أبو عبدالله أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني (م: ۲۴۱ھ): ۳۶/ ۳۳۵، رقم الحديث: ۲۲۱۳۰، حديث معاذ بن جبل، ت: شعيب الأرنؤوط وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة، الطبعة: الأولى، ۱۴۲۱ھ-۲۰۰۱م)

زیادہ بلند ہے، تو ارشاد ہوا کہ تم اللہ ہی کے لیے محبت رکھو، اور اللہ ہی کے لیے دشمنی رکھو اور اپنی زبان کو اللہ کے ذکر میں تروتازہ رکھو۔ حضرت معاذؓ نے دریافت کیا اس کے بعد کون سی چیز افضل ہے یا رسول اللہ (ﷺ)؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگوں کے لیے وہی پسند کرو، جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، اور لوگوں کے لیے مت پسند کرو وہ چیز، جو اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔ ایک حدیث میں ہے جب تیرا کوئی بھائی غیر حاضر ہو، تو اس کا تذکرہ اس طرح کرو، جس طرح تم اپنا تذکرہ چاہتے ہو، اور لوگوں سے درگزر کرو جیسا کہ تم دوسروں سے درگزر کے خواہاں رہتے ہو۔ (الترغیب صفحہ ۵۹۰)(۲)

ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ مجھے زنا (بدکاری) کی اجازت عطا فرمایئے، میں مجبور ہوں، تو آپ ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر ارشاد فرمایا کہ کیا تو چاہتا ہے کہ کوئی تیری ماں کے ساتھ ایسا سلوک کرے، اس نے کہا: نہیں، آپ ﷺ نے خالہ، پھوپی وغیرہ رشتہ داروں کے متعلق دریافت فرمایا، اس شخص کا جواب ہر ایک کے متعلق نفی میں تھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: دوسرے لوگ بھی اپنی والدہ وغیرہ کے لیے اس کو پسند نہیں کرتے۔ (فضائل اعمال)(۳)

الغرض وہ جملہ درحقیت نبی کریم ﷺ کی تعلیمات واقوال سے ماخوذ ہے، اس لیے اسلام کے تعارف میں اس کو پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کہ یہ درحقیقت نبی کریم ﷺ کی حدیث کا ہی پیش کرنا ہے، اور اسی نیت سے غیر مسلموں کے سامنے اسے پیش کیا جانا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۴] حدیث پاک کے مفہوم کو ''اقوالِ زریں'' کے ماتحت لکھنا

۴۰۶–سوال: اگر ہمیں کسی حدیث کے بارے میں مکمل واقفیت نہیں ہے، تو اس حدیث کی

(۲) عن ابن عباس رضي الله عنهما قال سمعته يقول: خمس لهن أحسن من الدهم الموقفة، لا تكلم فيما لا يعنيك، فإنه فضل ولا آمن عليك الوزر، ولا تكلم فيما يعنيك حتى تجد له موضعا، فإنه رب متكلم في أمر يعنيه قد وضعه في غير موضعه فعيب، ولا تمار حليما ولا سفيها، فإن الحليم يقليك وإن السفيه يؤذيك، واذكر أخاك إذا تغيب عنك بما تحب أن يذكرك به، وأعفه مما تحب أن يعفيك منه، واعمل عمل رجل يرى أنه مجازى بالإحسان مأخوذ بالإجرام.
(الترغيب والترهيب– عبد العظيم بن عبد القوي بن عبد الله، أبو محمد، زكي الدين المنذري (م:۶۵۶هـ): ۳/ ۳۲۳، رقم الحديث: ۴۳۵۶، ت: إبراهيم شمس الدين، ط: دار الكتب العلمية– بيروت، الطبعة: الأولى، ۱۴۱۷ء)
(۳) فضائل اعمال، فضائل تبلیغ– حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ– ۲۲ فصل رابع، ط: ایم، ایس، پبلیشرز، دیوبند۔

عبارت کو "اقوالِ زریں" کے عنوان کے ماتحت لکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً یہ کہ طہارت آدھا ایمان ہے۔ عورت اور شراب لوگوں کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔ اس جیسے حدیث کے مفہوم کو اقوالِ زرین کے ماتحت ذکر کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

احادیثِ مبارکہ کے مفہوم کو حدیث شریف کے عنوان کے ماتحت اسی وقت لکھنا چاہیے، جب کہ اس حدیث کا حوالہ بھی معلوم ہو، اگر حوالہ معلوم نہ ہو تو اسے اقوالِ زریں وغیرہ کسی بھی اور عنوان کے ماتحت ذکر کرنا جائز ہے، لیکن اگر یہی عادت بنالی جائے تو پھر پوری تحقیق کے بعد حدیث شریف لکھنی چاہیے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] مکان، دکان اور گھر کی صفائی برکت کا سبب ہے (الف)

۴۰۷-سوال: مکان، دکان کی صفائی سے رزق میں برکت ہوتی ہے اور صفائی نہ کرنے سے رزق میں کمی ہوتی ہے، کیا یہ بات قران وحدیث سے ثابت ہے؟

اکثر لوگ صبح کے وقت دکان کے کونے کونے سے گرد وغبار کے ذرّے کو نکال کر اور اگربتی سلگا کر غیروں کے رسم ورواج کو اپناتے ہیں، تو کیا یہ شرعاً صحیح ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

حدیث شریف میں ہے کہ پاکی اور صفائی وستھرائی ایمان کا حصہ ہے۔ (۲) ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اپنے گھر کے آنگن کو صاف رکھو اور یہودیوں کی طرح گندہ نہ رکھو۔ (۳) مذکورہ احادیث مبارکہ سے معلوم

---

(۱) اس لیے کہ آپ ﷺ کی جانب جھوٹی حدیث منسوب کرنا گناہ کبیرہ ہے: عن المغيرة رضي الله عنه، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: »إن كذبا علي ليس ككذب على أحد، من كذب علي متعمدا، فليتبوأ مقعده من النار. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۷۲، رقم الحديث: ۱۲۹۱، كتاب الجنائز، باب مايكره النياحة على الميت، ط: البدر - ديوبند)

(۲) عن أبي مالك الأشعري، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول: »الطهور شطر من الإيمان، والحمد لله تملأ الميزان، وسبحان الله، والله أكبر، تملأ ما بين السماوات والأرض". (السنة- أبو بكر أحمد بن محمد بن هارون الخَلّال البغدادي الحنبلي (م: ۳۱۱ھ): ۵/ ۲۳، رقم الحديث: ۱۵۱۰، باب مناكحة المرجئة، ت: د. عطية الزهراني ط: دار الراية - الرياض، الطبعة: الأولى، ۱۴۱۰ھ - ۱۹۸۹م)

(۳) عن صالح بن أبي حسان، قال: سمعت سعيد بن المسيب يقول: »إن الله طيب يحب الطيب، نظيف يحب النظافة، كريم يحب الكرم، جواد يحب الجود، فنظفوا - أراه قال - أفنيتكم ولا تشبهوا باليهود« قال: فذكرت ذلك لمهاجر بن مسمار، فقال: حدثنيه عامر بن سعد بن أبي وقاص، عن أبيه، عن النبي صلى الله عليه وسلم مثله، إلا أنه قال: »نظفوا أفنيتكم. (سنن الترمذي: ۲/ ۱۰۷، رقم الحديث: ۲۷۹۹، أبواب الأداب، باب ماجاء في النظافة، ط: البدر - ديوبند)

ہوا کہ صفائی بہت اچھی چیز ہے، نیز اس سے بہت سی بیماریاں دور ہوتی ہے اور رزق میں برکت ہوتی ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جمعہ کے دن یعنی ہفتہ میں کم از کم ایک دن تو ضرور غسل کرنا چاہیے اور جمعہ وعید عبادت کا دن ہے؛ لہٰذا اس دن غسل کرنا بہتر ہے، روزانہ غسل کرے، تو بہت ہی اچھا ہے، ہر ہفتہ ناخن کاٹنا چاہیے، جس شخص کے ناخن بڑے رہتے ہیں اس کے رزق میں تنگی رہتی ہے، مسواک کرنے سے رزق میں اضافہ ہوتا ہے۔ (درمختار، جلد:۶، ص:۲۰۵)۔ (۱)

اس لیے یہ بات تو شرعاً ثابت ہے کہ گھر اور بدن کی صفائی سے برکت ہوتی ہے، ہاں غلط رسم ورواج کا اختیار کرنا ممنوع ہے، مگر گھر میں خوشبو رکھنا اچھی بات ہے، اگربتی یا لوبان کی خوشبو بھی اچھی ہے، اس سے بعض زہریلے جانور بھاگ جاتے ہیں؛ لیکن اگربتی کافروں کی خاص نشانی ہوگئی ہے؛ لہٰذا اس کے علاوہ کوئی اور خوشبو رکھنا زیادہ بہتر ہے۔ فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (ويستحب قلم أظافيره يوم الجمعة) وكونه بعد الصلاة أفضل إلا إذا أخره إليه تأخيرا فاحشا فيكره لأن من كان ظفره طويلا كان رزقه ضيقا وفي الحديث «من قلم أظافيره يوم الجمعة أعاذه الله من البلايا إلى الجمعة الأخرى ...(و) يستحب (حلق عانته وتنظيف بدنه بالاغتسال في كل أسبوع مرة) والأفضل يوم الجمعة وجاز في كل خمسة عشرة وكره تركه وراء الأربعين. (الدر المختار:۶/ ۴۰۵، ۴۰۶، كتاب الحظر والاباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر)

فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۴۳ [۱۶-النحل:۴۳]

علمی اصطلاحات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

[علمی اصطلاحات]

[۱] خبر متواتر اور خبر واحد کسے کہتے ہیں؟

۴۰۸-سوال: خبر متواتر اور خبر واحد کسے کہتے ہیں، کیا حدیثِ متواتر کا منکر کافر ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

متواتر کی تعریف: وہ حدیث: جسے ہر طبقے میں اتنے لوگ روایت کریں کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا یا ان سے اتفاقاً جھوٹ کا صدور عادتاً محال ہو۔ حدیث متواتر کا انکار کرنے والا کافر ہے۔

خبر واحد کی تعریف: جس کو روایت کرنے والے اتنے لوگ ہوں، جن کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا عادتاً محال نہ ہو، اس کا حکم یہ کہ اس کا انکار کرنا فسق ہے اور منکر گنہ گار ہوگا؛ اگر کچھ تاویل کر کے اس پر عمل نہ کرے تو فاسق بھی نہ ہوگا۔ (۱)

نوٹ: مذکور تحریر میں چوں کہ علمی اصطلاحات مذکور ہیں، اس لیے آپ کسی ذی استعداد عالم سے پڑھوا کر سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

[۲] واجب کسے کہتے ہیں؟

۴۰۹-سوال: فرض: وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بندوں پر ضروری قرار دیا ہو۔ ـــــ سنتِ

(۱) الحدیث إما متواتر، وهو ما رواه جماعة عن جماعة لا يتصور تواطؤهم على الكذب، فمن أنكره كفر... و خبر الواحد: وهو أن يرويه واحد عن واحد، فلا يكفر جاحده، غير أنه يأثم بترك القبول إذا كان صحيحا أو حسنا. (شرح الفقه الأكبر - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۲۰۳، قبيل: لا يصلى على غير الأنبياء والملائكة، ط: ياسر نديم - ديوبند)

مؤکدہ: اس کو کہتے ہیں جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہ چھوڑا ہو؛ لیکن ''واجب'' کسے کہتے ہے؟ اس کی رہبری فرما کر کرم فرمائیں۔

مستفتی: محمد یوسف

الجواب حامداً ومصلیاً:

فرض: دلیل قطعی (یعنی قرآن اور حدیث متواتر سے ثابت ہو) اور حدیث متواتر (ہر طبقے میں اتنے لوگ روایت کریں کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا یا ان سے اتفاقاً جھوٹ کا صدور عادتاً محال ہو) سے جو حکم ثابت ہوتا ہے، اسے فرض کہا جاتا ہے، اور فرض کا انکار کرنے والا کافر ہو جائے گا۔(۱) اسی طرح حدیث متواتر کا انکار کرنے والا بھی کافر ہو جائے گا۔(۲)

واجب: جو فرض کی طرح دلیل قطعی سے ثابت نہ ہو؛ بل کہ اس کا ثبوت دلیل ظنی سے ہو، یعنی اس میں کوئی دوسری تاویل کی بھی گنجائش ہو؛ اس کا انکار کرنے والا اور چھوڑنے والا دونوں ہی فاسق ہوں گے؛ اسی لیے اس کو فرض عملی بھی کہا جاتا ہے، واجب پر عمل کرنا لازم اور ضروری ہے؛ تاہم انکار کرنے والا کافر نہیں ہوگا۔(۳)

سنتِ مؤکدہ: جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مواظبت ثابت ہو، اور کبھی آپ نے اس وجہ سے ترک بھی کیا ہو کہ کہیں امت پر فرض نہ ہو جائے۔

---

(۱) فالفرض اسم لمقدر شرعا لا يحتمل الزيادة والنقصان، وهو مقطوع به لكونه ثابتا بدليل موجب للعلم قطعا من الكتاب أو السنة المتواترة أو الاجماع، وحكم هذا القسم شرعا أنه موجب للعلم اعتقادا باعتبار أنه ثابت بدليل مقطوع به ولهذا يكفر جاحده. (أصول السرخسي - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱/۱۱۱، فصل في بيان المشروعات من العبادات وأحكامها، ط: دار المعرفة - بيروت)

(۲) الحديث إما متواتر، وهو ما رواه جماعة عن جماعة لا يتصوّر تواطؤهم على الكذب، فمن أنكره كفر. (شرح الفقه الأكبر - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ) ص: ۲۰۳، قبيل: لا يصلي على غير الأنبياء والملائكة، ط: یاسر ندیم - دیوبند)

(۳) فأما الواجب فهو ما يكون لازم الاداء شرعا ... وما كان ثابتا بدليل موجب للعمل غير موجب للعلم يقينا باعتبار شبهة في طريقه يسمى واجبا. فيثبت حكم هذا القسم بحسب دليله وهو أنه لا يكفر جاحده؛ لأن دليله لا يوجب علم اليقين، ويجب العمل به؛ لان دليله موجب للعمل ويضلل جاحده إذا لم يكن متأولا؛ بل كان رادا لخبر الواحد، فإن كان متأولا في ذلك مع القول بوجوب العمل بخبر الواحد فحينئذ لا يضلل. (أصول السرخسي - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱/۱۱۲، فصل في بيان المشروعات من العبادات وأحكامها، ط: دار المعرفة - بيروت)

اعلم أن المشروعات أربعة أقسام، فرض وواجب وسنة ونفل، فما كان فعله أولى من تركه مع منع الترك إن ثبت بدليل قطعي ففرض، أو بظني فواجب، وبلا منع الترك إن كان مما واظب عليه الرسول - صلى الله عليه وسلم - أو الخلفاء الراشدون من بعده فسنة، وإلا فمندوب ونفل. (رد المحتار: ۱/۱۰۲، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، ط: دار الفكر)

سنتِ زوائد: یعنی مستحب، جس کا کرنا لازم نہ ہو؛ بل کہ کبھی کرے اور کبھی چھوڑے۔[(۱)] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] فرض عین کو چھوڑ کر سنت پر عمل کرنا

۴۱۰-سوال: کسی فرض عین کو چھوڑ کر سنت پر عمل کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً:

فرض کو ترک کرنا حرام ہے، چاہے سنت پر عمل کرے یا نہ کرے، ترک فرض کا گناہ لازم آئے گا۔[(۲)] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] واجب، فرض اور سنت کی تعریف وحکم

۴۱۱-سوال: ''فرض'' اسے کہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہو۔ ''سنت مؤکدہ'' وہ ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہ چھوڑا ہو؛ ''واجب'' کی تعریف اور اس کا حکم کیا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً:

''فرض'' وہ ہے، جو قطعی دلیل یعنی قرآن مجید یا احادیث متواترہ سے ثابت ہو۔[(۳)]

احادیث متواترہ وہ احادیث ہیں، جن کے روایت کرنے والے اتنی کثیر تعداد میں ہوں کہ ان کا

---

(۱) والسنة لغة الطريقة، ولو سيئة، واصطلاحا الطريقة المسلوكة في الدين من غير لزوم على المواظبة، وهي المؤكدة إن كان النبي - صلى الله عليه وسلم - تركها أحيانا، وأما التي لم يواظب عليها فهي المندوبة. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹هـ)، ص: ۳۱، فصل: في سنن الوضوء، ط: المكتبة العصرية)

في التلويح ترك السنة المؤكدة قريب من الحرام يستحق حرمان الشفاعة، لقوله - عليه الصلاة والسلام -: "من ترك سنتي لم ينل شفاعتي. وفي التحرير: إن تاركها يستوجب التضليل واللوم، والمراد الترك بلا عذر على سبيل الإصرار كما في شرح التحرير لابن أمير حاج. (رد المحتار: ۱/ ۱۰۴، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) لا يجوز ترك الفرض لإقامة ما ليس بفرض. (البناية شرح الهداية - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۲/ ۳۲۲، كتاب الصلاة، قراءة المؤتم خلف الإمام، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

ولا يجوز ترك الفرض بالسنة. (الحاوي الكبير شرح مختصر المزني - أبو الحسن علي بن محمد البصري البغدادي، الشهير بـ "الماوردي" (م: ۴۵۰هـ): ۲/ ۵۰۲، كتاب الجمعة (فصل) ت: الشيخ علي محمد معوض - الشيخ عادل أحمد عبد الموجود، ط: دار الكتب العلمية - بيروت، الطبعة الأولى، ۱۴۱۹هـ - ۱۹۹۹ء ☆ بدائع الصنائع - الكاساني (م: ۵۸۷هـ): ۱/ ۲۶۴، كتاب الصلاة، فصل صلاة الجمعة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۳) الفرض: لغة هو التقدير ... وفي الشرع: ما ثبت بدليل قطعي لا شبهة فيه. (أصول الشاشي - نظام الدين أبو علي أحمد بن محمد بن إسحاق الشاشي (م: ۳۴۴هـ): ۳۷۹، بحث بيان معنى الفرض لغة وشرعا، ط: دار الكتاب العربي - بيروت)

جھوٹ پر متفق ہونا عادۃً محال ہو۔[۱]

پس ان دونوں سے جو حکم ثابت ہوگا، اسے فرض کہیں گے اور فرض کا انکار باعث کفر ہے۔ (حدیث متواتر بھی قرآن کی طرح قطعی ہے، اس کا منکر بھی کافر ہو جاتا ہے)[۲]

واجب: وہ حکم ہے، جس کا ثبوت دلیل ظنی سے ہو، یعنی اس کا ایک ہی معنی قطعی اور یقینی نہ ہو، بل کہ اس کا دوسرا معنی بھی مراد لیا جا سکتا ہو، اس کا منکر فاسق ہے، اس سے ثابت ہونے والے حکم کو ترک کرنے والا بھی فاسق ہے، اسی بنا پر اس کو فرض عملی بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس پر عمل کرنا ضروری ہے؛ لیکن اس کا منکر کافر نہ ہوگا۔(۳)

سنت مؤکدہ: وہ عمل ہے: جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اکثر کیا ہو، لیکن بعض مرتبہ بلا عذر اس کو ترک بھی کیا ہو (تاکہ امت پر وہ عمل واجب نہ ہو جائے) اور اس کے تارک پر کوئی تنبیہ اور وعید بیان نہ فرمائی ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے ترک کی عادت بنالینا گناہ کا کام ہے، اس سے آدمی فاسق وفاجر ہو جاتا ہے۔(۴)

---

[۱] والخبر المتواتر ما بلغت رواته في الكثرة مبلغا أحالت العادة تواطؤهم على الكذب، ويدوم هذا فيكون أوله كآخره ووسطه كطرفيه كالقرآن والصلوات الخمس. (رسالة في أصول الحديث (مطبوع ضمن كتاب: رسالتان في المصطلح): علي بن محمد بن علي الزين الشريف الجرجاني (م:۸۱۶هـ) ص:۶۵، ت: علي زوين، ط: مكتبة الرشد- الرياض، الطبعة الأولى، ۱۴۰۷، مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: توجيه النظر إلى أصول الأثر-طاهر بن صالح (أو محمد صالح) الجزائري، ثم الدمشقي (م:۱۳۳۸هـ):۱/۱۰۸، الفصل الخامس، الخبر المتواتر، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتبة المطبوعات الإسلامية - حلب، الطبعة الأولى، ۱۴۱۶هـ☆تدريب الراوي في شرح تقريب النواوي-السيوطي (م:۹۱۱هـ):۲/۶۲۷، النوع الثلاثون المشهور، ت: أبو قتيبة نظر محمد الفاريابي، ط: دار طيبة)

[۲] لا يجوز للمسلم أن ينكر شيئا من دين الإسلام.

ولكن من أنكر شيئا من أمور الدين لا يحكم بكفره، إلا إن كان ما أنكره أمرا مجمعا عليه قد علم قطعا مجيء النبي صلى الله عليه وسلم به. كوجوب الصلاة والزكاة، ولم يكن ذلك المنكر جاهلا بالحكم ولا مكرها، وهذا قول جمهور الحنفية والمالكية والشافعية. (الموسوعة الفقهية الكويتية:۷/۶۱، مادة: إنكار، إنكار شيء من أمور الدين)

[۳] ثم المتواتر يوجب العلم القطعي ويكون رده كفرا. (أصول الشاشي:۲۷۲، بحث كون المتواتر موجبا للعلم القطعي، ط: دار الكتاب العربي - بيروت)

السنة المتواترة قطعية الثبوت أيضا كالقرآن، فهما متكافئان من هذه الناحية. (الضوء اللامع المبين عن مناهج المحدثين - أحمد محرم الشيخ ناجي، ص: ۶۳، دار الكتب العلمية، بيروت)

(۱) وفي الشرع وهو ما ثبت بدليل فيه شبهة كالآية المؤولة والصحيح من الآحاد. (أصول الشاشي: ۳۷۹)

الواجب هو في عرف الفقهاء عبارة عما ثبت وجوبه بدليل فيه شبهة لكونه ظني الدلالة أو ظني الثبوت. وحكمه أنه يثاب بفعله ويستحق بتركه عقوبة لولا العذر حتى يضلل جاحده ولا يكفر به. (قواعد الفقه-محمد عميم الإحسان المجددي البركتي:۵۳۹، القسم الثالث ما فيه خلاف بين الطرفين أبي حنيفة ومحمد وبين أبي يوسف رحمهم الله تعالى، ط: الصدف پبلشرز - كراتشي، الطبعة الأولى، ۱۴۰۷هـ☆نور الأنوار:۱۷۰، ط: ياسر نديم اينڈ سنس)

سنت زائدہ: وہ مستحب عمل ہے: جس پر مداومت (ہمیشگی) ثابت نہ ہو؛ بل کہ کبھی اس کو کیا ہو اور کبھی ترک کر دیا ہو۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] اصطلاح شرع میں مکروہ کا معنی

۴۱۲-سوال: اصطلاح شرع میں مکروہ کا کیا معنی ہے؟ کیا ''کمی کا ہونا''، یا ''عمل کا ادھورا ہونا'' بھی اس کے معنی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

مکروہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) مکروہ تنزیہی، (۲) مکروہ تحریمی۔

مکروہ تنزیہی: وہ عمل ہے جس کے نہ کرنے سے ثواب ملے، اور کر لینے سے گناہ نہیں ہو۔

نماز میں اس کا ارتکاب کر لینے سے نماز میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی؛ البتہ مکروہ تنزیہی کا نماز، وضو یا غسل وغیرہ میں ارتکاب کر لینے سے ثواب میں کمی واقع ہو جائے گی لیکن گناہ نہیں ہوگا؛ کیوں کہ عمل پورا ہو گیا ہے، ناقص نہیں رہا ہے۔

مکروہ تحریمی: وہ عمل ہے، جو حرام کے قریب قریب ہو، اور اس کی ممانعت دلیل ظنی سے ثابت ہو۔

اس کا ارتکاب کرنے والا حرام کا ارتکاب کرنے والا ہونے کی وجہ سے گنہ گار ہوگا اور عذاب کا مستحق ہوگا؛ اس لیے عمل میں اس کا ارتکاب کیا جائے گا وہ عمل بھی ناقص اور ادھورا رہے گا اور جب کام ناقص رہے گا تو گناہ بھی لازم آئے گا اور سزا کا بھی مستحق ہوگا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) والذي ظهر للعبد الضعيف أن السنة ما واظب النبي - صلى الله عليه وسلم - عليه لكن إن كانت لا مع الترك فهي دليل السنة المؤكدة، وإن كانت مع الترك أحيانا فهي دليل غير المؤكدة. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۱/ ۱۷-۱۸، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار: ۱/ ۱۰۵، سنن الوضوء، بيروت)

و في حاشية ابن عابدين: لأن السنة ما واظب عليه، والفعل مرة مع الترك أخرى يفيد الندب. (۲/ ۱۸۴، كتاب الصلاة، باب الاستسقاء)

سنة الهدى: هي التي واظب عليها النبي - صلى الله عليه وسلم - تعبدا أو ابتغاء مرضات الله تعالى مع الترك مرة أو مرتين بلا عذر أو لم يترك أصلا ولكنه لم ينكر على التارك. (قمر الأقمار حاشية نور الأنوار: ۱۷۱، یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

(۱) قسم الحنفية المكروه إلى قسمين: القسم الأول: المكروه كراهة تنزيه. ــــ وهو ما كان إلى الحل أقرب، بمعنى أنه لا يعاقب فاعله أصلا، لكن يثاب تاركه أدنى ثواب. ــــ القسم الثاني: المكروه كراهة تحريم. ــــ وهو إلى الحرمة أقرب بمعنى: أنه يتعلق به محذور دون استحقاق العقوبة بالنار: كحرمان الشفاعة، لقوله عليه السلام: من ترك سنتي لم ينل شفاعتي. ــــ وعند محمد المكروه كراهة تحريم حرام ثبت حرمته بدليل ظني؛ لأنه=

[۶] مجنون و پاگل کی تعریف

۴۱۳-سوال: شریعت کی اصطلاح میں پاگل ومجنون شخص کس کو کہا جاتا ہے؟ جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

پاگل پن جس کو عربی میں جنون کہا جاتا ہے، اس کی تعریف یہ ہے کہ: ''یہ ایک آفت ہے، جو دماغ میں اتر جاتی ہے اور عقل کے خلاف کام کرنے پر انسان کو ابھارتی ہے'' (نورالانوار:۲۸۸- حسامی:۱۴۲، حاشیہ:۱۴)[1] اور نورالانوار کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس سے اچھے برے کام میں تمیز کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔

جنون کا مادہ ''جن'' ہے جس کا معنی: ''چھپانا'' یا ''چھپ جانا'' ہے۔[2] اسی وجہ سے ''جن'' کو جن کہا جاتا ہے؛ کیوں کہ وہ انسان کی آنکھوں سے چھپ جاتا ہے۔ چوں کہ مجنون کی بھی عقل چھپ جاتی ہے- جس کی وجہ سے وہ عقل کے خلاف کام کرتا ہے- اس لیے اس کو مجنون کہا جاتا ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

[۷] غیر عالم شخص کو ''مولوی'' کہنا

۴۱۴-سوال: ایک شخص باقاعدہ سند یافتہ عالم نہیں ہے، یعنی اس نے کسی مدرسہ میں رہ کر درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کی ہے، البتہ دینی کتابوں کے مطالعہ اور علماء کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے اس کی دینی معلومات کافی وسیع ہیں، تو اسے مولوی کہنا درست ہوگا یا نہیں؟

=يرى أن ما لزم تركه إن ثبت ذلك بدليل قطعي يسمى حراما، وإلا يسمى مكروها كراهة التحريم. (الموسوعة الفقهية الكويتية:۸/ ۳۴۷، صادرة عن وزارة الأوقاف-الكويت)

المكروه ماهو راجح الترك، فإن كان للحرام أقرب تكون كراهة تحريمية، وإن كان للحل أقرب تكون تنزيهية، ومعنى القرب إلى الحرمة أنه يستحق فاعله العقابه. (قواعد الفقه -عميم الإحسان المجددى البركتي، ص: ۵۰۳، الراء، ط: الصدف پبلیشرز کراتشی)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۳۷، كتاب الحظر والإباحة، ط: دار الفكر-بيروت.

(۱) الجنون آفة تحل الدماغ، تبعث على الإقدام على ما يضاد مقتضى العقل من غير ضعف في أعضائه. (منتخب الحسامي، ص: ۱۴۲، رقم الحاشية: ۱۴، فصل في الأمور المعترضة على الأهلية، ط: ياسر نديم ديوبند ☆ نور الأنوار، ص: ۲۸۸، رقم الحاشية: ۱۸، ط: ياسر نديم-ديوبند)

(۱) جَنَّ يَجِنُّ جَنًّا: استتر، أَجَنَّ الشيء: ستره، (المعجم الوسيط، ص: ۱۴۰۰، مادة: جن، ط: حسينيه-ديوبند)

الجواب حامداً و مصلیاً:

جو شخص غیر عالم ہو، اور کچھ پڑھا لکھا ہو تو اسے مولوی کہنے میں کوئی حرج نہیں؛ البتہ مناسب بھی نہیں ہے، اس لیے کہ اسے مولوی کہنے میں بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہونے کا اندیشہ ہے کہ تھوڑا کچھ پڑھ لینے سے بھی عالم بن سکتے ہیں، اور اس طرح لفظ مولوی جس درجہ کے لیے مستعمل ہے اس درجہ کی شان میں کوتاہی ہوگی، جس طرح کوئی شخص ڈاکٹر نہ ہو، تو اسے ڈاکٹر نہیں کہا جاتا، اور اگر وہ خود اپنے آپ کو ڈاکٹر کہے تو حکومتی قانون اسے گنہگار قرار دیتا ہے، کیوں کہ اس کے پاس ڈاکٹر کہلانے کے لیے مطلوب ڈگری نہیں ہے، اور لوگوں میں اس کے بطور ڈاکٹر مشہور ہونے سے مغالطہ کا اندیشہ ہے، اسی طرح مولوی ہونا بھی ایک دینی درجہ ہے، لہٰذا اس کا اکرام ضروری ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] شریعتِ مطہرہ میں لفظ ''مکروہ'' کا مطلب کیا ہے؟

۴۱۵-سوال: شریعتِ مطہرہ کی اصطلاح میں لفظِ مکروہ تنزیہی کا مطلب کیا ہے؟ کیا اس سے کسی عمل میں ثواب کی کمی مراد ہے؟ کیا یہ مراد ہے کہ اس عمل کے سوفی صد اجر میں سے بندے کو کچھ کم یعنی اسی یا نوّے فی صد ثواب دیا جائے گا؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

کسی بھی عبادت میں مکروہِ تنزیہی کے ارتکاب سے کتنا ثواب کم ہوگا اس کی کوئی حد متعین نہیں ہے، کسی بھی عمل کے ثواب کی کمی بیشی منشاء خداوندی پر موقوف ہوتی ہے، کسی عمل میں کوئی غلطی بلا ارادہ ہو جائے، تو اس کا حکم الگ ہے اور قصداً غلطی کرنے کا حکم الگ ہے، نیز مکروہِ تنزیہی کو معمولی سمجھتے ہوئے بار بار اس کا ارتکاب کرنے سے وہ مکروہِ تحریمی بن جائے گا۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) أما الإصرار فيخرج الصغيرة عن [أن تكون] صغيرة. جزء من شرح تنقيح الفصول في علم الأصول- عبد الرحمن المالكي القرافي (م: ۶۸۴ھ): ۲/ ۴۳۲، حد الكبيرة، ط: رسالة علمية، مكة المكرمة

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ ﴿٦﴾

(۴۹-الحجرات:۶)

باب الكتب المعتمدة وغيرها

(معتبر اور غیر معتبر کتابیں)

O

[معتمد اور غیر معتمد کتابیں]

[۱] شری کرشن کی جو باتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے میل کھاتی ہوں، انہیں شائع کرنا

۴۱۶-سوال: حضرت مفتی صاحب ذیل کے سوالات کے جوابات اسلامی شریعت کے مطابق مرحمت فرمائیں:

میں نے سنسکرت اور گیتا کا مطالعہ کیا ہے، مطالعہ کے دوران مجھے یہ بات نظر آئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور پانچ ہزار سال قبل پیدا ہونے والے شری کرشن کی بہت سی باتیں اور بہت سے واقعات مثلاً نفس، نفس کی تین قسمیں، زندگی میں سادگی، اپنی باتیں لوگوں تک پہونچانے کا طریقہ، عقیدۂ توحید اور ہجرت وغیرہ میں کافی حد تک مماثلت ہے، دونوں حضرات کی باتیں آپس میں ملتی جلتی ہیں، تو کیا اگر یہ باتیں لوگوں میں صحیح سمجھ پیدا کرنے کے لیے عام کی جائیں، تو اس میں (شرعا) کوئی حرج ہے؟

اس سلسلے میں میں نے ایک مضمون لکھا ہے اور شری کرشن جی کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ ان کی زندگی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بڑی مماثلت تھی۔

اس مضمون کے اخیر میں میں نے لکھا ہے کہ پورے مضمون کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ دونوں مذاہب کے پیغام کو ہم صحیح معنی میں سمجھیں؛ تاکہ باہم مواخات اور انسانیت کی ہمدردی پیدا ہو، اس طرح مقابلہ کر کے نعوذ باللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو گھٹانا مقصود نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و بزرگی دونوں جہاں میں بہت اعلیٰ و برتر ہے اور اسی عقیدے کے ساتھ میں نے یہ مضمون لکھا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جن کی نبوت ثابت ہو، ان کی نبوت کا انکار جائز نہیں، اسی طرح جن کی نبوت ثابت نہ ہو، محض ظن و تخمین سے ان کو نبی قرار دینا جائز نہیں ہے، اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جن انبیاء کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نام کے ساتھ ذکر کیا ہے، ان پر تفصیلاً ایمان لانا واجب ہے، ساتھ ہی یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی انبیاء کرام ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا ہے، ان کے نام اور ان کی تفصیلات کو صرف اللہ تعالیٰ ہی کامل طور پر جانتے ہیں، ہم ان پر اجمالاً ایمان رکھتے ہیں۔

صرف کسی شخص کی تعلیمات سے ان کی نبوت پر استدلال نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح جن کے حالات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ہوں، یا جن کی باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتی جلتی ہوں، صرف اس طرح کی مماثلت کی وجہ سے قطعی طور پر ان کو نبی نہیں قرار دیا جاسکتا، تمام انبیاء کی تعلیم اور ان کے حالات بھی ملتے جلتے ہوتے ہیں اور بہت سے اولیاء کو بھی نبی کی طرح ہجرت بھی کرنی پڑی ہے؛ لہٰذا پیغمبر کون ہے؟ اور ان کا صحابی کون؟ اس کا (قطعی) فیصلہ محض ان کی تعلیم اور ان کے حالات سے مشکل ہے۔[1]

نفس اور اس کے تزکیہ کی باتیں تمام مذاہب میں برسوں سے منقول ہوتی چلی آرہی ہیں، آج کے سادھو سنت کے بیانات اور مضامین کو دیکھیے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، وہ حضرات اسلام کی اخلاقی تعلیم کا مطالعہ کرکے بہت سے صحابہ اور اولیاء کے ملفوظات کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ بیان کرتے ہیں؛ لہٰذا وید کی باتیں اللہ کی طرف سے کسی نبی پر اتری ہوئی باتیں ہیں یا کسی نبی کی باتیں ہیں؟ جو ان کے کسی سنت نے لکھی ہیں، اس کا حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ موجودہ انجیل اصل انجیل نہیں ہے؛ بل کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض متبعین نے لکھی ہے؛ لہٰذا آپ کی یہ بات کہ وید میں اچھی باتیں ہیں، یہ تو ٹھیک ہے؛ مگر اس سے یہ سمجھ لینا

---

(١) وأما الأنبياء والمرسلون، فعلينا الإيمان بمن سمى الله تعالى في كتابه من رسله، والإيمان بأن الله تعالى أرسل رسلا سواهم وأنبياء، لا يعلم أسماءهم وعددهم إلا الله تعالى الذي أرسلهم. فعلينا الإيمان بهم جملة؛ لأنه لم يأت في عددهم نص. وقد قال تعالى: {ورسلا قد قصصناهم عليك من قبل ورسلا لم نقصصهم عليك} (النساء: ١٦٤). وقال تعالى: {ولقد أرسلنا رسلا من قبلك منهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقصص عليك} (غافر: ٧٨). (شرح العقيدة الطحاوية-صدر الدين محمد بن علاء الدين، ابن أبي العز الحنفي، الأذرعي الصالحي الدمشقي (م: ٧٩٢هـ): ٢/ ٤٢٣، وجوب الإيمان بمن سمى الله في كتابه من رسله وأنبيائه، ت: شعيب الأرنؤوط - عبد الله بن المحسن التركي، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)

کہ وید آسمانی صحیفہ ہے، صحیح نہیں؛ اس لیے اس کو آسمانی صحیفہ ماننا جائز نہیں ہے، جب تک کہ اس پر کوئی واضح اور قطعی دلائل نہ ہوں۔[۲]

اگر شری کرشن جی کی چند باتیں لکھ کر ہندؤوں کو یہ بتلانا ہو کہ ہم تمہارے مذہبی پیشوا کو بڑا آدمی تصور کرتے ہیں، اس امید پر کہ اس سے ہندو خوش ہو جائیں گے اور (مذہب اسلام سے) قریب ہوں گے، تو یہ امید بارآور نہ ہوگی، حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کے کتنے فضائل آپ ﷺ نے بتلائے اور خود قرآن کریم میں کئی مقامات پر ان کے سچے واقعات ذکر کیے گئے اور تورات وانجیل میں نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے سے متعلق عہد بھی ہے، نیز قرآن کریم میں ہے: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ. [-۲البقرۃ:۱۴۶]

یعنی یہود (اور نصاریٰ) محمد ﷺ کو اس طرح پہچانتے ہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

جب یہ آیت نازل ہوئی، تو حضور ﷺ نے یہود کے ایک بڑے عالم کو- جو ایمان لا چکے تھے- بلایا اور دریافت فرمایا کہ کیا تم لوگ مجھے اس طرح پہچانتے ہو، جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہو، تو انہوں نے جواب دیا کہ بے شک! کسی کو اپنے بیٹے کے بارے میں تو شبہ ہو سکتا ہے؛ مگر اللہ رب العزت نے، جن کی پہچان تورات میں دی ہے، اس میں تو شک کی گنجائش ہی نہیں۔ (تفسیر البغوی: ۱/ ۱۶۴ ☆ الرازی: ۴/ ۱۴۲ ☆ القرطبی: ۲/ ۴۴۸ ☆ ابن کثیر ۲/ ۱۲۱)[۳]

اس کے بعد قرآن مجید میں ہے ''مگر وہ لوگ جان بوجھ کر حق کو چھپاتے ہیں'': وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ. (-۲البقرۃ:۱۴۶)

علم رکھنے والے یہود ونصاریٰ کیا کر رہے ہیں؟ کیا آپ نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے؟ انہوں نے

---

(۲) وأما الإيمان بالكتب المنزلة على المرسلين، فنؤمن بما سمى الله تعالى منها في كتابه، من التوراة، والإنجيل والزبور، ونؤمن بأن لله تعالى سوى ذلك كتبا أنزلها على أنبيائه، لا يعرف أسماءها وعددها إلا الله تعالى.... فعلينا الإيمان بأن الكتب المنزلة على رسل الله أتتهم من عند الله، وأنها حق، وهدى، ونور، وبيان، وشفاء. قال تعالى: ﴿قولوا آمنا بالله وما أنزل إلينا﴾ [-۲البقرة:۱۳۶]. ﴿الم الله لا إله إلا هو الحي القيوم﴾ [-۳آل عمران: ۱-۲]. ﴿آمن الرسول بما أنزل إليه من ربه﴾ [-۲البقرة:۲۸۵].... وقال تعالى: ﴿كان الناس أمة واحدة فبعث الله النبيين مبشرين ومنذرين وأنزل معهم الكتاب بالحق﴾ [-۲البقرة:۲۱۳]. (المصدر السابق: ۲/ ۴۲۴-۴۲۵، الإيمان بما سمى الله من الكتب المنزلة)

(۳) نوٹ: مذکورہ حوالہ جات میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے سوال کرنے والے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں۔

مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہادیں، ابھی بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ فلسطین، بوسینا اور صومالیہ میں کیا ہورہا ہے؟ اور پوری دنیا کے اسلامی ممالک کے بارے میں کیا کیا منصوبے بنائے جارہے ہیں؛ لہٰذا ایسی امید رکھنا لغو ہے۔ ہاں اگر اس مضمون کو انہیں دعوت دینے کی غرض سے تیار کیا ہے، تو جائز ہے؛ مگر چنداں مفید نہیں اور اگر مقصد یہ ہو کہ (دوسرے) مسلمان وید کو سیکھیں یا آپ خود وید سے متأثر ہوئے ہوں، اس لیے آپ نے لکھا ہو، تو یہ جائز نہیں۔ (۴)

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں تورات کے اوراق تھے، اس میں کچھ باتیں سچی تھیں۔ آپؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے پڑھنے لگے۔ یکایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر نظر پڑی، تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصہ میں ہیں، حضرت عمرؓ نے وہ اوراق رکھ دیئے اور پڑھنے لگے: ''میں اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہوں'' تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ فرو ہوا۔ (۵)

لہٰذا ہمیں کسی سے متأثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے لیے اللہ کی کتاب-قرآن مجید- کافی ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگلی کتابوں کی ساری باتیں قرآن مجید میں آگئیں اور مزید وہ باتیں بھی، جن کی خبر سابقہ امتوں کو نہ ہوسکی:

وليحكم اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ

---

(۴) والأولى في هذه المسألة التفرقة بين من لم يتمكن ويصر من الراسخين في الإيمان فلا يجوز له النظر في شيء من ذلك، بخلاف الراسخ فيجوز له، ولا سيما عند الاحتياج إلى الرد على المخالف، ويدل على ذلك نقل الأئمة قديما وحديثا من التوراة وإلزامهم اليهود بالتصديق بمحمد صلى الله عليه وسلم بما يستخرجونه من كتابهم ولولا اعتقادهم جواز النظر فيه لما فعلوه وتواردوا عليه. (فتح الباري-ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲ھ): ۱۳/ ۴۲۵- ۴۲۶، كتاب التوحيد، باب: قوله باب قول الله تعالى بل هو قرآن مجيد في لوح محفوظ، ط: دار المعرفة-بيروت)

(۵) عن عبد الله بن ثابت، قال: جاء عمر بن الخطاب إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: يا رسول الله إني مررت بأخ لي من قريظة، فكتب لي جوامع من التوراة ألا أعرضها عليك؟ قال: فتغير وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال عبد الله: فقلت له: ألا ترى ما بوجه رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فقال عمر: رضينا بالله ربا، وبالإسلام دينا، وبمحمد صلى الله عليه وسلم رسولا، قال: فسري عن النبي صلى الله عليه وسلم... إلى آخر الحديث. (مسند أحمد: ۲۵/ ۱۹۸، رقم الحديث: ۱۵۸۶۴، حديث عبد الله بن ثابتؓ، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)

اللهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ. (۵-المائدۃ:۴۸)

لہٰذا وید یا کرشن سے (لوگوں کو) متاثر کرنا یا متاثر ہونا جائز نہیں، سورج کی روشنی میں چاند ستارے اور ٹیوب لائٹ کی روشنی بے فائدہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آفتاب روشن ہے، قیامت تک غروب ہونے والا نہیں ہے۔ گرد وغبار یا بادل اس کی روشنی کو دھندلا نہیں کر سکتے؛ لہٰذا اگر مقصد یہ ہو کہ تم بھی حق پر ہو اور ہم بھی حق پر ہیں اور تمام ادیان موجودہ حالت پر برحق ہیں، تو یہ جائز نہیں۔ حق، حق ہے، باطل، باطل ہے۔[۱]

لہٰذا سوال میں لکھی گئی یہ بات کہ "دونوں مذاہب کے پیغام کو ہم صحیح معنیٰ میں سمجھیں؛ تاکہ باہم مواخات اور انسانیت کی ہمدردی پیدا ہو" کے متعلق عرض ہے کہ اس سلسلے میں مسلمانوں کو سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے اور اس مقصد سے (کہ ویدکی تعلیمات کو لوگ سمجھیں) مضمون لکھنا بھی درست نہیں۔

ہاں! اگر ہندوؤں کو سمجھا کر دین کی دعوت دینا ہو، تو جائز ہے؛ مگر تاجدار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ و برتر ماننے کے ساتھ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی یا سیرت کی برابری میں کرشن جی کو لانا بالکل مناسب نہیں؛ بل کہ بے ادبی ہے؛ کیوں کہ جن انبیاء کی نبوت ثابت ہے، ان کا بھی یہ درجہ نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کی برابری میں ان کی سیرت کا حوالہ دیا جائے، تمام انبیاء کی عظمت دلوں میں ہونی چاہیے؛ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت سب سے بڑھ کر ہونی چاہیے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روشن سورج قرار دیا ہے؛ لہٰذا سورج، سورج ہے اور ستارے، ستارے: يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. (۳۳-الأحزاب:۴۶) فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۲] مدینہ کے شیخ احمد کے خواب کی حقیقت

۴۱۷-سوال: آج کل مدینہ منورہ کے کسی شیخ احمد کی جانب منسوب کر کے ان کے ایک خواب کو پرچہ کی شکل میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک وصیت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے، اس وصیت نامے پر عمل کرنے والے اور اس کو چھپوانے والے کے لیے بڑی بڑی بشارتوں کا ذکر ہے اور عمل نہ کرنے والے اور اس کو نہ چھپوانے والے کے لیے سخت سے سخت ترین

(۱) وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا. [۱۷-الإسراء:۸۱]

وعیدوں کا بھی تذکرہ ہے، کیا یہ سب باتیں صحیح ہیں؟ اس پرچے کی کیا حقیقت ہے اور اس پر عمل کرنا کیسا ہے؟ امید ہے کہ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں گے۔

الجواب حامداو مصلیا:

فرمان نبوی کے نام سے آج کل جو اشتہارات چھپتے رہتے ہیں اور چھپوانے کے لیے بڑی بڑی بشارتوں کا ذکر ہے اور نہ چھپوانے والے کے لیے سخت عذاب اور فقر و فاقہ کی وعیدوں کی دھمکی بھی، یہ سب شریعت مطہرہ کے خلاف ہے، ان پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں:

(۱) صرف انبیاء کرام کے خواب ''حجت'' ہیں، ان کے علاوہ کسی اور کے خواب کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ وہ دلیل و حجت بن سکے۔ [۱] اسی وجہ سے حضرات علمائے کرام نے لکھا ہے کہ جو خواب خلاف شرع ہوگا، وہ رد اور باطل ہے؛ اس لیے مذکورہ خواب لوگوں کے لیے دلیل اور حجت نہیں بن سکتا۔ [۲]

(۲) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: جو شخص میری طرف جھوٹی باتوں کو منسوب کرے گا، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے گا۔ (مسلم شریف: ۱/ ۵) [۳] اسی وجہ سے احادیث کی قبولیت کے لیے یہ شرائط ہیں کہ راوی عاقل، عادل اور ثقہ (بھروسہ کے لائق) ہو۔ [۴] جب اس شخص (شیخ احمد) کو ان کے زمانے کے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے لوگ بھی نہیں پہچانتے ہیں، تو ان کی بات کا کس طرح اعتبار کیا جا سکتا ہے؟؟؟

---

(۱) وفي حديث طويل: قال عمرو سمعت عبيد بن عمير يقول: "رؤيا الأنبياء وحي، ثم قرأ {إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ} [الصافات: ۱۰۲]". (صحيح البخاري: ۱/ ۲۵، كتاب الوضوء، باب التخفيف في الوضوء، رقم: ۱۳۸، ط: البدر - ديوبند ☆ سنن الترمذي: ۲/ ۲۰۹، باب في مناقب... رقم: ۳۶۸۹)

(۲) والإلهام المفسر بالقاء معنى في القلب بطريق الفيض ليس من أسباب المعرفة بصحة الشيء عند أهل الحق. (شرح عقائد - النسفي، ص: ۲۲، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۳) «من كذب علي فليتبوأ مقعده من النار». (صحيح البخاري: ۱/ ۲۱، رقم: ۱۰۷، كتاب العلم، باب إثم من كذب على النبي صلى الله عليه وسلم، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۷، رقم: ۳-(۳)، مقدمة الإمام مسلم، باب في التحذير من الكذب على رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم، الخ، ط: البدر - ديوبند ☆ سنن أبي داؤد، رقم: ۳۶۵۱، كتاب العلم، باب في التشديد في الكذب على رسول الله صلى الله عليه وسلم)

(۴) قال الشافعي: "ويكون المحدث عالما بالسنة ثقة في دينه، معروفا بالصدق في حديثه، عدلا فيما يحدث... الخ. (المحدث الفاصل بين الراوي والواعي - المؤلف: أبو محمد الحسن بن عبد الرحمن بن خلاد الرامهرمزي الفارسي (م: ۳۶۰ھ)، ص: ۴۰۲، القول فيمن يستحق الأخذ عنه، ت: د. محمد عجاج الخطيب، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) شریعت کے بنیادی احکام (نماز، روزہ، حج اور زکوۃ) کو ادا کرنا نجات کا ذریعہ ہے۔[۵] جب کہ اس اشتہار میں یہ ہے کہ ان کو اتنی تعداد میں چھپوانے سے یہ فائدہ حاصل ہوگا، وہ فائدہ حاصل ہوگا، چھپوانے والا سیدھے جنت میں چلا جائے گا وغیرہ؛ اگر اس کو درست مان لیا جائے تو احکام شریعت سب عبث ہو جائیں گے، ان کا کوئی مقام باقی نہیں رہے گا؛ اس لیے بھی یہ خواب ماننے کے قابل نہیں ہے، اس سے عوام یہ سمجھے گی پانچ سو، ہزار اشتہار چھپوا لو اور سیدھے جنت میں داخل ہو جاؤ، نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ کی انجام دہی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس سے تو اعمال کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی اور لوگ فتنے میں واقع ہو جائیں گے۔

(۴) ''ایمان'' اللہ رب العزت کی ذات اور ان کی صفات پر یقین کرنے کا نام ہے۔[۶] اور سچے مسلمان کو اپنی وفات کے وقت اللہ رب العزت کی طرف سے مدد ہوتی ہے؛ چناں چہ اللہ رب العزت قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ.[۷]

ترجمہ: اللہ رب العزت مسلمان کو دنیا اور آخرت میں ایمان پر ثابت قدم رکھتے ہیں۔

اس آیت شریفہ کی روشنی میں غور کیجیے، خواب بیان کرنے والا لوگوں کو خوف دلا رہا ہے اور اس کے خواب پر عمل نہ کرنے کی صورت میں ڈرا رہا ہے کہ یہ کیسا مذہب ہے، جس میں ہزاروں لوگ کفر پر مر رہے ہیں؛ اس لیے اس کی بات ماننے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

(۵) کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا ولی مشہور ہو، اس کے اعمال' قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھے جائیں گے۔[۸] اگر اس کے اعمال قرآن وحدیث کے خلاف نہ ہوں، تو قبول کیے جائیں گے اور اگر خلاف ہوں، تو رد اور باطل مانے جائیں گے۔ اللہ کی ذات کے علاوہ اور کسی پر ایمان رکھنا جائز نہیں؛ اسی وجہ سے

---

(۵) عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم "بني الإسلام على خمس: شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، وإقام الصلاة، وإيتاء الزكاة، والحج، وصوم رمضان". (صحيح البخاري: ۱/ ۱۱، رقم: ۸، كتاب الايمان، باب قول النبي -صلى الله عليه وسلم-: بني الإسلام على خمس، ط: البدر- ديوبند)

(۶) فأخبرني عن الإيمان، قال: «أن تؤمن بالله، وملائكته، وكتبه، ورسله، واليوم الآخر، وتؤمن بالقدر خيره وشره». (صحيح مسلم: ۱/ ۲۷، رقم: ۱-(۸)، كتاب الايمان، باب معرفة الإيمان والإسلام، الخ، ط: البدر، ديوبند)

(۷) ۱۴-ابراهيم: ۲۷

(۸) "يا أيها الناس إني قد تركت فيكم ما إن اعتصمتم به فلن تضلوا أبدا: كتاب الله، وسنة نبيه". (السنن الكبرى- أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۱۰/ ۱۹۴، رقم: ۲۰۳۳۶، باب مايقضي به القاضي ويفتي به المفتي، الخ، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

عقائد کی کتابوں میں لکھا ہے کہ: کوئی شخص ہواؤں میں اڑ رہا ہو اور سمندروں میں کئی کئی روز تک رہتا ہو؛ لیکن اس کے کام سنت کے خلاف ہوں، تو وہ ہرگز ولی نہیں ہو سکتا۔ (۹) خواب بیان کرنے والا شخص یہ بتا رہا ہے کہ ''ہزاروں لوگ کفر کی حالت میں وفات پا چکے ہیں'' اس کے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟؟؟! اگر یہ خواب کی بات ہے، تو دلیل اور حجت نہیں بن سکتی اور ایمان تو ''اللہ کی ذات وصفات پر یقین'' کا نام ہے، جیسا کہ پہلے لکھا گیا، اللہ رب العزت کی یہ صفت ستاریت ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں کی باتیں اور اعمال چھپاتا ہے؛ اللہ کے رسول ﷺ کے پکے دشمن منافقین -جن کے متعلق قرآن مجید میں پوری سورۂ منافقون نازل کی گئی- اس کا علم اللہ رب العزت نے حضور ﷺ کو عطا فرمایا تھا کہ ان ان صفات کے حاملین لوگ بھروسے کے لائق نہیں ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے بھی بعض صحابہ کرام ؓ کو ان کے نام بتائے تھے، جن میں حضرت حذیفہ ؓ کو خاص طور پر ان کی تفصیل بتادی تھی، ان کو آں حضور ﷺ نے منافقین کی پوری فہرست دے رکھی تھی۔ (۱۰)؛ البتہ حضرت عمر ؓ، حضرت عثمان غنی ؓ، حضرت علی ؓ، حضرت حسن ؓ اور حضرت حسین ؓ وغیرہ کو ان کے

---

(۹) وقد قال يونس بن عبد الأعلى الصدفي: قلت للشافعي: كان الليث بن سعد يقول: إذا رأيتم الرجل يمشي على الماء ويطير في الهواء فلا تغتروا به، حتى تعرضوا أمره على الكتاب والسنة. فقال الشافعي: إذا رأيتم الرجل يمشي على الماء أو يطير في الهواء، فلا تغتروا به، حتى تعرضوا أمره على الكتاب والسنة، انتهى. (كشف ما ألقاه إبليس من البهرج والتليس على قلب داود بن جرجيس -عبد الرحمن التميمي (م: ۱۲۸۵هـ) ص: ۱۱۶، ط: دار العاصمة للنشر والتوزيع)

وانظر ايضاً: غاية الأماني في الرد على النبهاني -أبو المعالي محمود شكري بن عبد الله الألوسي (م: ۱۳۴۲هـ): ۱/ ۴۶۷، ذكر المجالس التي انعقدت لمناظرة شيخ الاسلام ابن تيمية في عقيدته الواسطية، ت: أبو عبد الله الداني بن منير آل زهوي، ط: مكتبة الرشد، الرياض)

الصواعق المرسلة الشهابية على الشبه الداحضة الشامية -سليمان بن سحمان بن مصلح الخثعمي النجدي (م: ۱۳۴۹هـ) ص: ۱۰۲، فصل: استدل الملحد على النبي -صلى الله عليه وسلم- بقوله: "من رآني في، الخ، ط: دار العاصمة، الرياض، المملكة العربية السعودية، ط: دار العاصمة، الرياض)

أعلام السنة المنشورة لاعتقاد الطائفة الناجية المنصورة - حافظ بن أحمد بن علي الحكمي (م: ۱۳۷۷هـ): ۱۳۸، ت: حازم القاضي، ط: وزارة الشؤون الإسلامية والأوقاف والدعوة والإرشاد - المملكة العربية السعودية، (الكتاب نشر -أيضا- بعنوان: ۲۰۰ سؤال وجواب في العقيدة الإسلامية)

(۱۰) كان حذيفة صاحب السر الذي لا يعلمه غيره حتى خص بمعرفة أسماء المنافقين وبكثير من الأمور الآتية. (فتح الباري شرح صحيح البخاري -أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي (م: ۸۵۲هـ): ۱۳/ ۴۷، كتاب الفتن، باب من كره أن يكثر بالتشديد سواد الفتن والظلم، تحت رقم الحديث: ۷۰۸۴، ط: دار المعرفة -بيروت)

وانظر ايضاً: (عمدة القاري -بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۲۲/ ۲۶۴، كتاب الاستئذان، باب من ألقي له=

نام نہیں بتائے تھے؛ اسی وجہ جب کسی کا انتقال ہوتا، تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دیکھتے تھے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس کی نمازِ جنازہ میں شریک ہیں یا نہیں، اگر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ شریک ہوتے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی جنازے کی نماز پڑھ لیتے تھے اور اگر وہ شریک نہ ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی جنازے کی نماز نہیں پڑھتے تھے۔[۱۱] سوچنے کا مقام ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کو منافقین کی فہرست نہیں بتائی، اور انہوں نے اس سلسلے میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے عمل کو اپنے پیش نظر رکھا، تو مذکور شخص صرف اپنے خواب کی بناء پر کیسے ہزاروں لوگوں کو کافر بتلا رہا ہے، یہ سراسر قرآن کریم اور حدیثِ پاک کی تعلیم کے خلاف ہے؛ اس لیے اس کی بات ماننے کے لائق نہیں۔

حوض کوثر پر بعض اہل بدعت کو فرشتے دھکے دے کر ہٹا رہے ہوں گے، تو رسول اللہ ﷺ فرمائیں گے: أصيحابي أصيحابي؛ یعنی یہ لوگ تو میری امت کے فرد ہیں، میری امتی ہیں، ان کو میرے پاس آنے دو، فرشتے جواب دیں گے کہ آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا گل کھلائے ہیں، تو اللہ کے رسول ﷺ فرمائیں گے ان کو مجھ سے دور کرو، ان کو مجھ سے دور کرو۔ (بخاری، مسلم)[۱۲]

=وسادة، تحت رقم الحديث: ٦٢٤٨، ط: دار احياء التراث العربي، بيروت☆ عون المعبود شرح أبي داؤد: ١١/ ٢١٢، كتاب الفتن والملاحم، باب ذكر الفتن ودلائلها، بذيل رقم الحديث: ٤٢٤٥، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(١١) وكان عمر في خلافته ينظر إليه عند موت من يموت فإن لم يشهد جنازته حذيفة لم يشهدها عمر. (المصباح المضي في كتاب النبي الأمي ورسله إلى ملوك الأرض من عربي وعجمي-محمد (أو عبد الله) بن علي الأنصاري، أبو عبدالله، جمال الدين ابن حديدة (م: ٧٨٣هـ): ١/ ٨٧، ت: محمد عظيم الدين، ط: عالم الكتب-بيروت)

وأيضاً: مستعذب الإخبار بأطيب الأخبار-أبو مدين بن أحمد، ص: ٣٢٦، ط: دار الكتب العلمية-بيروت، غزواته -صلى الله عليه وسلم- غزوة تبوك☆ وكذا راجع هامش: إمتاع الأسماع بما للنبي من الأحوال والأموال والحفدة والمتاع- أحمد بن علي، تقي الدين المقريزي (م: ٨٤٥هـ): ٩/ ١٢٩، رقم الهامش: ٢، ت: محمد عبد الحميد النميسي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(١٢) أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "ليردن علي الحوض رجال ممن صاحبني، حتى إذا رأيتهم ورفعوا إلي اختلجوا دوني، فلأقولن: أي رب أصيحابي، أصيحابي، فليقالن لي: إنك لا تدري ما أحدثوا بعدك". (صحيح مسلم: ٢/ ٢٥٢، رقم الحديث: ٤٠-(٢٣٠٤)، كتاب الفضائل، باب اثبات حوض نبينا صلى الله عليه وسلم، ط: البدر، ديوبند)

وانظر: صحيح البخاري: ٢/ ٦٦٥، كتاب التفسير، باب قوم وكنت عليهم شهيداً الخ، رقم: ٤٦٢٥، وكتاب الرقاق، باب في الحوض، رقم: ٦٥٨٢: ٢/ ٩٧٤، ط: البدر، ديوبند☆ سنن ابن ماجة، باب ذكر الحوض: ٤٣٠٦.

وفي رواية أبي هريرة، عند مسلم، فأقول: سحقا سحقا، رقم: ٣٩-(٢٤٩)، كتاب الطهارة، باب استحباب إطالة الغرة والتحجيل.

قیامت کے دن میدان حشر میں اللہ کے رسول ﷺ بعض مومنین کی سفارش کے بعد اللہ رب العزت سے فرمائیں گے کہ اے اللہ! جس نے زندگی میں ایک مرتبہ بھی کلمۂ شہادت پڑھا ہو، اس کی بھی مجھے سفارش کی اجازت دیجیے، تو اللہ رب العزت فرمائیں گے کہ اے محمد! آپ کو اس کا اختیار نہیں؛ البتہ میری عزت کی قسم، میری کبریائی کی قسم، میری عظمت اور میری صفت جبروت کی قسم، میں ضرور بالضرور ایسے لوگوں کو بھی جہنم کی آگ سے باہر نکالوں گا، جنہوں نے ایک مرتبہ بھی کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' پڑھا ہے۔ (مسلم شریف: ۱/ ۱۱۰)[۱۳]

سوچنے کا مقام ہے کہ جس آدمی نے ایک مرتبہ بھی سچے دل سے کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھ لیا، تو اللہ رب العزت اس کو بھی گناہوں کی سزا دینے کے بعد بخش دیں گے؛ اس لیے مذکور خواب کو اور اس کے متعلق چھپنے والے اشتہارات کو ماننے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

اس خواب کا دعویٰ کرنے والے کا عقیدہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، اگلے زمانے میں خوارج کے نام سے ایک جماعت پیدا ہو چکی ہے، وہ گنہ گار شخص کو کافر کہتی تھی۔[۱۴] چھپے ہوئے پرچے کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بھی اسی جماعت کے خیالات کا حامل ہے۔

عقائد کی کتابوں میں لکھا ہے کہ یزید جو بعض معاملات میں حضرت حسینؓ کی شہادت کا ذمہ دار بھی ہے، اس پر بھی کافر کا حکم لگانا جائز نہیں ہے۔[۱۵] تو خواب دیکھنے والے مذکورہ شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ

(۱۳) حديث طويل والجزء المقصود منه: فأقول: يا رب، ائذن لي فيمن قال: لا إله إلا الله، قال: ليس ذاك لك - أو قال: ليس ذاك إليك - ولكن وعزتي وكبريائي وعظمتي وجبريائي، لأخرجن من قال: لا إله إلا الله، "(صحيح مسلم: ۱/ ۱۱۰، رقم: ۳۲۶-(۱۹۳)، كتاب الإيمان، باب: إثبات الشفاعة وإخراج الموحدين من النار، ط: البدر، ديوبند☆ صحيح البخاري: ۲/ ۱۱۸-۱۱۹، رقم: ۷۵۱۰، كتاب التوحيد، باب كلام الرب، عزو جل يوم القيامة مع الأنبياء وغيرهم، ط: البدر - ديوبند)

(۱۴) خلافاً للخوارج فإنهم ذهبوا إلى أن مرتكب الكبيرة بل الصغيرة أيضاً كافر وأنه لا واسطة بين الإيمان والكفر. (شرح عقائد نسفي، ص: ۱۰۸، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۱۵) قال الشاه ولي الله المحدث الدهلوي في شرح تراجم أبواب البخاري الملحق بمقدمة البخاري: (قوله مغفور لهم) تمسك بعض الناس بهذا الحديث في نجات يزيد لأنه كان من جملة هذا الجيش الثاني؛ بل كان رأسهم ورئيسهم على ما يشهد به التواريخ، والصحيح أنه لا يثبت بهذا الحديث إلا كونه مغفوراً له ما تقدم من ذنبه على هذه الغزوة؛ لأن الجهاد من الكفارات وشان الكفارات إزالة آثار الذنوب السابقة عليها لا الواقعة بعدها نعم! لو كان مع=

ہزاروں لوگوں پر کفر کا فتویٰ لگائے، یہ شخص اپنے خواب کی باتوں کے پمفلیٹ چھپوانے والے کو جنت کی ضمانت کس بنیاد پر دے رہا ہے، اس کو اس کا کیا حق پہنچتا ہے، درحقیقت اس طرح کے پمفلیٹ چھپوا کر بھولی بھالی قوم کو گمراہ کر رہا ہے کہ محنت ومجاہدے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؛ نماز، روزے، حج وزکوۃ اور صدقات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے؛ صلہ رحمی، یتامیٰ، بیوگان اور مظلومین کی امداد کی جانب توجہ دینا بھی کارعبث ہے، بس اتنی تعداد میں میرے اس خواب کے پمفلیٹ چھپوالو، سیدھے جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اگر لوگ اس پر عمل کریں گے، تو گمراہی کی راہ پر چل کر ایمان سے نکل جائیں گے اور مسلمان فنا ہو جائیں گے؛ اس لیے مذکورہ تحریر کسی ہوش مند مسلمان کی نہیں؛ بل کہ فاسق، فاجر اور بدمعاش کی معلوم ہوتی ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ کسی یہودی اور نصرانی کا پروپیگنڈہ ہو، جسے مسلمانوں کو صحیح طریقے سے ہٹا کر گمراہی کی راہ پر لے جانے کے لیے چھپوایا گیا ہو؛ اس لیے اس کو چھپوانا، چھپوانے میں کسی طرح کی مدد کرنا، مساجد ومدارس کی دیواروں یا شاہ راہوں پر چسپاں کرنا گناہ کا کام ہے، اس سے بچنے کی سخت ضرورت ہے۔ (۱۶)

فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

۱۳/۱۱/۱۹۷۷ء

نوٹ: ماقبل کا سوال اور ذیل کا سوال تقریباً ایک ہی ہے؛ لیکن جواب کے انداز میں فرق ہے؛ اس لیے دونوں سوال وجواب شامل اشاعت ہیں۔ مرتب

[۳] وصیت نامہ کے عنوان سے ایک پرفتن ہینڈ بل کی اشاعت

۴۱۸- سوال: عرصہ سے وصیت نامہ کے عنوان سے ایک پرچہ چھپتا اور تقسیم ہوتا رہتا ہے، اس پرچہ میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ جو اس پرچہ کو دیکھ لے یا پڑھ لے، اس کے لیے اس کا چھپوانا لازم ہے، اس پرچہ کا

=هذا الكلام أنه مغفور إلى يوم القيامة، يدل على نجاته، وإذ ليس فليس، بل أمره مفوض إلى الله تعالى فيما ارتكبه من القبائح بعد هذه الغزوة من قتل الحسين- عليه السلام- وتخريب المدينة والاصرار على شرب الخمر إن شاء عفا عنه وإن شاء عذبه كما هو مطرد في حق سائر العصاة، على أن الأحاديث الواردة في شان من استخف بالعترة الطاهرة والملحد في الحرم والمبدل للسنة تبقى مخصصات لهذا العموم لو فرض شمولها لجميع الذنوب. (ص: ۱/۳۱-۳۲، ط: البدر، دیوبند)

ولا يخفى أن إيمان يزيد محقق ولا يثبت كفره بدليل ظني فضلا عن دليل قطعي فلا يجوز لعنه بخصوصه. (شرح الفقه الأكبر: ص ۸۸، واختلف في إكفار يزيد، ط: یاسر ندیم- دیوبند)

(۱۶) ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾. [۵-المائدة: ۲]

عکس بھیج رہا ہوں، اس میں اس طرح کا مضمون ہے:

مدینہ منورہ کے ایک شیخ احمد صاحب نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا، حضور اکرم ﷺ نے ان کو بعض نصیحتیں فرمائیں اور یہ فرمایا کہ اس وصیت نامہ کو شائع کرو، مزید یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی وصیت نامہ پڑھ کر اس کی نقل ایک جگہ سے دوسری جگہ ارسال کرے گا، اس کی قیامت کے دن میں شفاعت کروں گا اور اس کے خاندان کو جنت ملے گی اور جو ایسا نہیں کرے گا، تو وہ خدا کی رحمت سے محروم رہے گا اور اس کو دنیا میں سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔

نیز اس پرچہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ جو شخص اس پرچہ کی ۳۰ نقل چھپوا کر تقسیم کرے گا، اس کو چودہ دن میں خوشی حاصل ہوگی، ابھی ممبئی میں کسی نے تیس ۳۰ پرچے چھپوا کر تقسیم کیا، تو اس کو ۲۵۰۰ روپے کا فائدہ ہوا۔ اور ایک دوسرے آدمی کو ساٹھ ہزار کا فائدہ ہوا، جب کہ ایک شخص نے اس کو جھوٹ کہہ کر پھینک دیا، تو اس کو اپنے بیٹے سے ہاتھ دھونا پڑا۔

برسوں سے یہ دیوانگی اور دھوکہ دہی کا سلسلہ جاری ہے اس کو "مکتوب مسلسل" کا درجہ دیا جانے لگا ہے، یعنی جس کو ہم بذریعہ ڈاک یہ پرچہ بھیجیں، اس کو سات یا نو یا چودہ دوسرے اشخاص پر ایسے پرچہ روانہ کرنا ضروری ہوگا، جو ایسا کرے گا، اس کو فائدہ ہوگا اور جو ایسا نہیں کرے گا، اس کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔

اس طرح ایسے خطوط یا پرچوں کے حاصل کرنے والے لاکھوں سے متجاوز ہو جاتے ہیں، بھولے بھالے مسلمان امید و خوف کے اس پھندے میں آجاتے ہیں۔ ازیں قبل اس کے خلاف بہت سے فتوے شائع ہو چکے ہیں، مگر اب تک یہ خطرناک تحریک رکی نہیں ہے، اس لیے مسلسل توضیحات کی ضرورت ہے، مہربانی فرما کر اس کے جواز و عدم جواز کے سلسلے میں رہنمائی فرمائیں اور اس طرح کی حرکت کرنے والوں کا شریعت میں کیا درجہ ہے، اس کی بھی وضاحت فرمادیں۔

الجواب حامداومصلیا:

ایسا وصیت نامہ متعدد بار شائع ہو چکا ہے، اور تقریباً ہر سال یہ مضمون بہت معمولی فرق کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے، اور کمال یہ ہے کہ صرف ایک شخص کو ہی یہ خواب آتا ہے، اور دوسرے بزرگوں اور ولیوں کو یہ شرف زیارتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ہم کلامی نہیں ہوتی، اور جہاں یہ خواب دکھتا ہے یعنی مدینہ منورہ، وہاں

اس کی شہرت بھی نہیں ہوتی؛ بل کہ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ وہاں کوئی جانتا بھی نہیں ہے کہ کیسا وصیت نامہ ہے اور کیسا خواب؟ بس صرف ہندوستان میں اس کا خوب چرچا کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے جاہل مسلمان دھوکہ میں آ کر اس کو سچا سمجھنے لگتے ہیں اور اس پر عمل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے جس کا انسداد ہر مسلمان پر بقدر استطاعت واجب اور ضروری ہے۔

مذہب اسلام ایک مکمل مذہب ہے، اور حقائق پر مشتمل ہے، چند رسوم اور توہمات کا نام اسلام نہیں ہے، حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام دینا. [۱]" جیسی آیت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو چکی ہے، اس لیے اسلام میں کسی اضافے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ [۲]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں ارادہ فرمایا تھا کہ لاؤ تمہارے لیے ایک کتاب (وصیت نامہ) لکھ دوں، تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ، تو حاضرین مجلس نے اور حضرت عمرؓ نے فرمایا: "حسبنا کتاب اللہ" ہم کو خدا کی کتاب کافی ہے، آپ کو شدت مرض میں تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ بعض نے اس وقت اختلاف کیا؛ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، اور اس واقعہ کے بعد چند دن اس دنیا میں رہے، یہ جمعرات کا واقعہ ہے اور پیر کو آپ کی وفات ہوئی؛ لیکن کوئی کتاب و وصیت نہیں لکھائی گئی۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی (وصیت نہ لکھانے کی) رائے کو پسند فرمایا۔ [۳]

---

(۱) ۵-المائدة:۳.

(۲) عن عمر بن الخطاب، أن رجلا، من اليهود قال له: يا أمير المؤمنين، آية في كتابكم تقرءونها، لو علينا معشر اليهود نزلت، لاتخذنا ذلك اليوم عيدا. قال: أي آية؟ قال: [اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا] [المائدة:۳] قال عمر: قد عرفنا ذلك اليوم، والمكان الذي نزلت فيه على النبي صلى الله عليه وسلم، وهو قائم بعرفة يوم جمعة. (صحيح البخاري: ۱/۱۱، حديث: ۴۵، باب زيادة الإيمان، ط: البدر - ديوبند)

(۳) عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: لما حضر رسول الله صلى الله عليه وسلم وفي البيت رجال، فيهم عمر بن الخطاب، قال النبي صلى الله عليه وسلم: هلم أكتب لكم كتابا لا تضلوا بعده، فقال عمر: إن النبي صلى الله عليه وسلم قد غلب عليه الوجع، وعندكم القرآن، حسبنا كتاب الله. فاختلف أهل البيت فاختصموا، منهم من يقول: قربوا يكتب لكم النبي صلى الله عليه وسلم كتابا لن تضلوا بعده، ومنهم من يقول ما قال عمر، فلما أكثروا اللغو والاختلاف عند النبي صلى الله عليه وسلم، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: قوموا. (صحيح البخاري: ۲/۸۴۶، كتاب المرضى، حديث: ۵۶۶۹، باب قول المريض قوموا عني، ط: البدر - ديوبند)

عن ابن عباس رضي الله عنهما: أنه قال: يوم الخميس وما يوم الخميس؟ ثم بكى حتى خضب دمعه=

اللہ کے فضل سے مسلمانوں کے پاس حق اور باطل کے درمیان فرق و امتیاز کرنے والی عظیم الشان میزان ''قرآن پاک'' موجود ہے، کہ جس میں دستور اور نصب العین اور ایسا قانون جامع وحاوی تمام ضروریات ہے کہ اس میں قیامت تک ترمیم وتغیر کی ضرورت نہیں ہے، ہر زمانے کے مناسب احکام موجود ہیں، سائنس کی ترقی کے اس دور میں بھی قرآنی احکام اور اسلامی نظام پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا ہے، بل کہ سائنسی ترقی نے بہت سے الجھے ہوئے دماغوں کو قرآنی احکام کا سمجھنا آسان کر دیا ہے، کیوں کہ یہ احکم الحاکمین کا قانون ہے، جس کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کو اپنے بندوں کے لیے ایسا ہی ہونا چاہیے۔

نیز یہ قرآن کریم' نبی اکرم ﷺ سے ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچا ہے، ہزاروں اور لاکھوں ہر زمانے میں اس کے حافظ ہوتے چلے آئے ہیں اور آج تعداد کروڑوں سے بھی متجاوز ہوچکی ہے، قرآن کریم کا ہر حکم اور ہر حرف محفوظ ہے؛ کیوں کہ خداوند کریم نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے اور اس کا ایسا نظم کیا ہے کہ عقل انسانی اس کا تصور تک نہیں کرسکتی۔

اس امت کے پاس قرآن کریم کی تفصیل وتشریح کی شکل میں بڑا ذخیرہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا موجود ہے، اس کی حفاظت اور نشر واشاعت کا اللہ تعالیٰ نے ایسا غیبی نظام فرمایا کہ عقل انسانی حیران ہے، اولاً خود رسول اللہ ﷺ نے بار بار فرمایا: ''**من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار**'' کہ جس نے رسول اللہ کی طرف غلط نسبت کی، آپ ﷺ پر جھوٹ بولا۔ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہ روایت متواتر اور قطعی ہے۔ (۱)

= الحصباء، فقال: اشتد برسول الله صلى الله عليه وسلم وجعه يوم الخميس، فقال: ائتوني بكتاب أكتب لكم كتابا... الخ. (صحيح البخاري: ۴۲۹/۲، رقم الحديث: ۳۰۵۳، كتاب الجهاد، باب: هل يستشفع إلى أهل الذمة ومعاملتهم؟ ط: البدر - ديوبند)

ولهذا قال عمر حسبنا كتاب الله وظهر لطائفة أخرى أن الأولى أن يكتب لما فيه من امتثال أمره، وما يتضمنه من زيادة الإيضاح، ودل أمره لهم بالقيام على أن أمره الأول كان على الاختيار، ولهذا عاش صلى الله عليه وسلم بعد ذلك أياما، ولم يعاود أمرهم بذلك، ولو كان واجبا لم يتركه لاختلافهم؛ لأنه لم يترك التبليغ لمخالفة من خالف... الخ. (فتح الباري: ۲۰۹/۱، باب كتابة العلم، ط: دار المعرفة - بيروت)

(۱) صحيح البخاري: ۱۷۲/۱، رقم الحديث: ۱۲۹۱، باب مايكره من النياحة على الميت، ط: البدر - ديوبند)

قوله: (من كذب علي متعمدا)، الخ. فقد روي عن مائة من الصحابة على ما قال الحافظ: أنه ورد عن ثلاثين نفسا منهم بأسانيد صحاح وحسان، وعن نحو من خمسين غيرهم بأسانيد ضعيفة، وعن نحو من عشرين آخرين بأسانيد =

آپ نے جو بات نہ فرمائی ہو، اس کی نسبت آپ کی جانب کرنا قطعی طور پر حرام ہے، بل کہ بعض علماء اس کو کفر کہتے ہیں، الغرض اس اعلان کا صحابہ کرام نے ہمیشہ پاس ولحاظ رکھا؛ حتی الامکان کثرت روایت سے بچتے رہے، جب تک پورا بھروسہ اور یقین کامل نہ ہو جاتا، آپ ﷺ کی جانب کسی بات کی روایت نہیں کرتے تھے۔ (۱)

آپ ﷺ کی جانب غلط بیانی نہ ہو، اس کے لیے علماء نے رواۃ حدیث کے احوال محفوظ کیے اور اس سلسلے میں ''فن اسماء رجال'' کی مستقل طور پر تدوین فرمائی۔ جس میں راوی کے پورے حالات بیان کیے، ان کا حافظہ کیسا ہے؟ تقویٰ و امانت داری میں ان کا کیا مقام ہے؟ روایات کے قابل اعتبار ہونے کے لیے ایک کسوٹی بنائی گئی تا کہ غلط چیزیں دین میں داخل نہ ہو سکے، محدثین نے روایت حدیث میں اس قدر احتیاط کیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔ فن اسماء الرجال عظیم الشان فن ہے، اور مسلمانوں کے لیے باعث فخر ہے کہ یہ فن ان کا امتیاز ہے، جس سے دنیا کے تمام مذاہب خالی ہیں۔

الغرض جس دین میں اس قدر احتیاط برتی جاتی ہو اور غلط بات دین کا حصہ نہ بن جائے، اس کے لیے کئی فن وجود میں آئے ہوں، بھلا اس کے ماننے والوں کو کیوں کر روا ہے کہ وہ بلا سند بیان کی گئی باتوں کو تسلیم کر لیں؛ کیوں کہ اسلامی حکم یہ ہے کہ جب کوئی بات سامنے آئے، تو اس کی خوب تحقیق کر لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر اعتماد کر کے کوئی اقدام کر بیٹھو اور بعد میں ندامت اور شرمندگی اٹھانی پڑے، قرآن پاک میں ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ. (۲)

اسی طرح دوسری جگہ قرآن میں ہے:

=ساقطة، مع أن فيها ما هو مطلق في ذم الكذب عليه من غير تقييد بهذا الوعيد الخاص. ونقل النووي أنه جاء عن مائتين من الصحابة، ولأجل كثرة طرقه أطلق عليه أنه متواتر لفظاً ومعنى. (مرعاة المفاتيح شرح مشكوة المصابيح -أبو الحسن عبيد الله بن محمد عبد السلام، المباركفوري (م: ١٤١٤هـ): ١/ ٣٠٢، كتاب العلم، ط: إدارة البحوث العلمية والدعوة والإفتاء-الجامعة السلفية-بنارس الهند)

الأول: فيه دليل على تعظيم حرمة الكذب على النبي، عليه الصلاة والسلام، وانه كبيرة. والمشهور: أن فاعله لا يكفر إلا أن يستحله. وحكى إمام الحرمين عن أبيه أبي محمد الجويني من أصحاب الشافعي أنه كان يقول: من كذب على النبي، عليه الصلاة والسلام، متعمدا كفر وأريق دمه. وضعفه إمام الحرمين، وجعله من هفوات والده، وقال النووي: لو كذب في حديث واحد عمدا فسق وردت رواياته كلها...الخ. (عمدة القاري شرح البخاري: ٢/ ١٤٩، كتاب العلم، باب إثم من كذب على النبي صلى الله عليه وسلم، ط: دار إحياء التراث العربي)

(٢) ٤٩-الحجرات: ٦)

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ. (۱)

کوئی خوف یا امن کی بات لوگ سن کر خود اس کو نہ پھیلائیں؛ بل کہ رسول اللہ (ﷺ) کو سنائیں یا اہل علم اور اہل الرائے کو، وہ خود سمجھ کر موقع کے مناسب بات کریں گے۔

اس لیے کوئی بھی مضمون بلا سند کے قابل اعتبار نہیں ہے، ورنہ پھر تو جس کے جی میں آئے، مشہور کر دیا کرے، اب اس وصیت نامہ میں غور کیجیے! شیخ احمد کون ہیں؟ مجہول الحال والصفات۔ (۲)

لہٰذا ان کا ثقہ اور قابل اعتبار ہونا تو بعد کی بات ہے، خود مضمون میں ایسی باتیں ہیں، جو خلاف عقل اور خلاف شرع ہیں؛ کیوں کہ اس پرچہ میں لکھا ہوا ہے کہ اے احمد! ہماری امت سے یہ کہہ دو کہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک ساٹھ ہزار آدمی مرے ہیں، جن میں سے کسی کا ایمان محفوظ نہیں تھا، سب بے ایمان ہو کر مرے ہیں۔ یہ بات یقیناً خلاف شرع اور خلاف عقل ہے؛ اس لیے کہ اول تو خداوند تعالیٰ کی رحمت غضب پر غالب ہے۔ حدیث پاک میں ہے: "إن رحمتي سبقت غضبي"۔ (۳)

پس اللہ کی رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ اکثر مومن کا خاتمہ ایمان کی حالت میں ہو۔

دوسرے یہ کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اکثر مسلمان آخر وقت میں توبہ کرتے ہیں اور کلمہ پڑھتے ہوئے مرجاتے ہیں، یہ دونوں علامتیں ہیں خاتمہ بالخیر کی۔ (۴)

---

(۱) ۴-النساء: ۸۳۔

[۲] (ثانيها) مجهول الحال في العدالة ظاهرا، وباطنا، وهذا أيضا لا يقبل حديثه عند الأكثرين، وحكي عن أبي حنيفة قبوله: لكن قيل: أن الثابت عنده عدم قبوله مطلقا، وبه صرح الحماري من مقلديه، وإنما قبله في عصر التابعين خاصة كما تقدم. (الغاية في شرح الهداية في علم الرواية-شمس الدين، السخاوي (م: ۹۰۲ھ): ۱/۱۲۶، مراتب ألفاظ التعديل والتجريح، ت: أبو عائش عبد المنعم إبراهيم، ط: مكتبة أولاد الشيخ للتراث)

(۳) صحيح البخاري، رقم الحديث: ۶۹۸۶، باب: وكان عرشه على الماء)

(۴) عن أنس أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إن الرجل ليعمل البرهة من عمره بعمل أهل الجنة، فإذا كان قبل موته تحول بعمل بعمل أهل النار فمات فدخل النار، وإن الرجل ليعمل البرهة من عمره بعمل أهل النار، فإذا كان قبل موته عمل بعمل أهل الجنة فمات فدخل الجنة. (مسند أبي يعلى: ۶/ ۲۳۳، رقم الحديث: ۳۸۲۹، ط: دار المأمون للتراث-دمشق)
عن معاذ بن جبل قال قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم- من كان آخر كلامه لا إله إلا الله دخل الجنة. (سنن أبي داؤد، رقم الحديث: ۳۱۱۸، باب: باب في التلقين)

جب کہ پرچے میں لکھا جارہا ہے کہ کوئی بھی ایمان کی حالت میں نہیں مرا، ظاہر ہے کہ یہ سراسر جھوٹ اور خلاف واقعہ بات ہے۔

اور پھر غور کیجیے کہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک ساٹھ ہزار مسلمان کا مرجانا کس ملک اور کس قوم میں پیش آیا ہے، کیا اس سے ساری دنیا کے مسلمان مراد ہیں، جو ایک ہفتہ میں انتقال کر گئے ہیں یا کیا مراد ہے؟ یہ بالکل مبہم ہے، اور مسلمانوں کی موت وحیات کے ظاہری اعداد وشمار اس کی تائید نہیں کرتے۔

اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ ''بس چند دنوں میں ایک ستارہ آسمان پر طلوع ہوگا اور توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا''۔ کیوں کہ قیامت کی علامات - جو احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہیں - میں سے بہت سی علامتوں کا ظہور باقی ہے؛ اس لیے اس قدر قیامت قریب نہیں ہے، جس کا اس پرچے میں اظہار کیا گیا ہے۔ دوسرے توبہ کے دروازے کا بند ہونا آفتاب کے مغرب کی طرف سے طلوع ہونے پر ہوگا۔ (۱)

اور اس کے لیے ابھی بہت سے واقعات رونما نہیں ہوئے ہیں۔ جیسے حدیث میں یہ بھی ہے کہ قیامت آنے سے پہلے حروف قرآن مٹ جائیں گے۔ (۲)

بل کہ بخاری شریف میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت سے چند دن پہلے ایسے ہوں گے، کہ ان میں علم اٹھالیا جائے گا اور جہالت عام ہوجائے گی اور ہرج کی کثرت ہوگی اور ہرج سے مراد قتل ہے۔ (۳)

اسی طرح پرچے کا یہ مضمون کہ جو وصیت نامہ کو شائع کرے گا، اس کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کریں گے، اس کو اور اس کے خاندان کو جنت میں جگہ دلوائیں گے اور جو کوئی ایسا نہیں کرے گا، وہ خدا کی رحمت سے محروم رہے گا، یہ مضمون بھی سراسر غلط اور خلاف شریعت مطہرہ ہے۔

---

(۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا تقوم الساعة حتى تطلع الشمس من مغربها، فإذا طلعت فرآها الناس آمنوا أجمعون فذلك حين لا ينفع نفسا إيمانها لم تكن آمنت من قبل أو كسبت في إيمانها خيرا. (صحيح البخاری، رقم الحديث: ۶۱۴۱، باب: باب طلوع الشمس من مغربها)

(۲) لا تقوم الساعة حتى يرجع القرآن من حيث جاء، فيكون له دوي حول العرش كدوي النحل، فيقول الرب عز وجل: مالك؟ فيقول: منك خرجت وإليك أعود، أتلى فلا يعمل بي، فعند ذلك يرفع القرآن." الديلمي - عن ابن عمرو. (كنز العمال: ۱۴/ ۲۳۳، رقم الحديث: ۳۸۵۲۵، في اشراط الساعة الكبرى، ط: مؤسسة الرسالة)

(۳) قال أبو موسى: قال النبي صلى الله عليه وسلم: إن بين يدي الساعة لأياما، يرفع فيها العلم، وينزل فيها الجهل، ويكثر الهرج. والهرج القتل. (صحيح البخاري، رقم الحديث: ۶۶۵۴، باب ظهور الفتن)

کیوں کہ احادیث صحیحہ میں موجود ہے کہ ہر مسلمان کی آپ ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔ حدیث پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں راضی نہیں ہوگا، جب تک میری امت کا ایک آدمی بھی دوزخ میں رہے گا۔ [۱]

نیز آپ رحمۃ للعالمین ہیں، پھر خدا کی رحمت بہت وسیع ہے، محض اس فریبی اور جعلی وصیت نامہ پر جنت ودوزخ کیسے موقوف ہوسکتی ہے؟ اول تو خواب جھوٹا ہے اور اگر مان لیں کہ خواب سچا ہی ہے، تو بھی قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی تعلیمات کے سامنے یہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ہے؛ کیوں کہ غیر نبی کا خواب کوئی حجت اور دلیل شرعی نہیں ہے، نہ خواب دیکھنے والے کے لیے اور نہ ہی دوسروں کے لیے، خواب میں غلطی کے سیکڑوں امکانات ہیں۔ [۲]

معلوم نہیں مسلمانوں کو کیا ہوگیا ہے کہ صاف ستھری شریعت ہوتے ہوئے خواب پر کیوں بھروسہ کرتے ہیں، جس میں اضغاث احلام اور حدیث النفس اور شیطانی خیالات اکثر ہوتے ہیں، رویاء صالحہ کے لیے بہت سی شرطیں ہیں، ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ وہ یہ سمجھ بھی سکے کہ کیسا خواب ہے؟ اگر خواب میں نصوص شرعیہ کے خلاف کوئی بات ہو، تو اسے رد کردیا جائے گا۔ معلوم نہیں کہ خواب وخیال کی دنیا میں مسلمان کیوں مبتلا ہوگئے، آفتاب کی طرح روشن تعلیمات سے اعراض اور خواب وخیال کی طرف التفات کیا معنیٰ رکھتا ہے؟؟؟

الغرض وصیت نامہ من گھڑت ہے، محدثین نے تو جھوٹ کے ہلکے اور معمولی قرینہ پر حدیث کو موضوع کہہ دیا ہے اور موضوع کی اشاعت اور چھپائی نصوص کی رو سے حرام ہے؛ بل کہ بعض محدثین کے نزدیک کفر ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی بات کی نسبت کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔ [۳] اس لیے اس

---

(۱) عن أنس رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "يجمع الله الناس يوم القيامة... ثم يقال لي: ارفع رأسك: سل تعطه، وقل يسمع، واشفع تشفع، فأرفع رأسي، فأحمد ربي بتحميد يعلمني، ثم أشفع فيحد لي حدا، ثم أخرجهم من النار، وأدخلهم الجنة، ثم أعود فأقع ساجدا مثله في الثالثة، أو الرابعة، حتى ما بقي في النار إلا من حبسه القرآن" وكان قتادة، يقول عند هذا: أي وجب عليه الخلود. (صحيح البخاري، رقم الحديث: ۶۵۶۵، باب صفة الجنة والنار)

(۲) رؤيا غير الأنبياء عليهم الصلاة والسلام لا يبنى عليها حكم شرعي والجواب. (عمدة القاري شرح البخاري: ۸/ ۸۸، باب الأذان مثنى مثنى * وكذا في رد المحتار: ۱/ ۳۸۳، باب الأذان، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) تقدم تخريجه.

طرح اول شائع کرنے والا حرام کا مرتکب ہوگا؛ بل کہ اس پر کفر کا اندیشہ ہے، اسی طرح دوسرے لوگ جو اس کو شائع کریں گے، وہ بھی حرام کے مرتکب ہوں گے، ان کا شمار بھی واضع حدیث میں ہوگا، اس لیے خدائی عذاب سے بچنا ضروری ہے۔

اسے بالکل نہ سچ سمجھا جائے کہ اس کی تقسیم سے مالی منفعت ہوگی، اگر چہ اس خبر کو کوئی قابل اعتماد آدمی ہی کیوں نہ بیان کرے، کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ اسے کسی اور وجہ سے مالی فائدہ پہنچا ہو؛ لیکن وہ نادانی میں سمجھ بیٹھا کہ میرا فائدہ اسی کی تقسیم کی وجہ سے ہوا ہے، ویسے بھی شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے، وہ طرح طرح سے ایمان کو ضائع کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اس لیے اس طرح کی خبروں پر بالکل کان نہیں دھرنا چاہیے، اگر اسے صحیح سمجھا جائے، تو کفر کا اندیشہ ہے، بھلا کون مسلمان ہوگا، جو ایمان کو ضائع کر کے روپیہ کمانے کی سوچے۔

خوب یاد رکھیے! ''اس کی تقسیم سے مالی فائدہ حاصل ہوگا'' ایسا سوچنا غلط ہے، اگر یہ بات صحیح بھی ہو، تو بھی مسلمان اپنا ایمان داؤ پر لگا کر روپیہ نہیں حاصل کرتا، نیز غور کریں غیر مسلم لاکھوں روپیہ کماتے ہیں، انہوں نے کون سا وصیت نامہ شائع کرایا ہے، کیا قرآن وحدیث کی تبلیغ پر کوئی یہ وعدہ کرسکتا ہے کہ ۱۴ر دن میں اس کو اتنی دولت مل جائے گی، جب ایسا نہیں ہے، تو پھر اس پمفلیٹ کے شائع کرنے پر کیسے اس طرح کا وعدہ کیا جاسکتا ہے۔

خوب یاد رکھیں! رزق کا وعدہ اللہ نے سب جان داروں کے لیے قرآن میں فرمایا ہے۔ (۱)

رزق کے اسباب پیدا فرمائے ہیں، جو ان کو ختیار کرے گا، موافق جد و جہد کرے گا تو – مقدر میں جس قدر ہوگا – ملے گا، کس کو کتنا ملے گا، اس کی کسی کو خبر نہیں ہے، یہ دنیا دار الاسباب ہے، ان کو اختیار کیا جائے اور وصیت نامہ شائع نہ کرنے کہ وجہ ڈر اور خوف کھانا خلاف عقل و شرع ہے؛ کیوں کہ جس کی جس قدر عمر ہے، وہ پوری ہوگی، قضا نہ مقدم ہوتی ہے اور نہ مؤخر۔ (۲)

اس جھوٹے وصیت نامہ میں کہاں سے اثر ہوگیا کہ وہ وقت سے پہلے کسی کو مار دے، اگر کسی کا اس درمیان انتقال ہوجائے، تو یہ اتفاقی بات ہوگی، وصیت نامہ شائع نہ کرنے کا اثر نہیں ہوگا۔ ہر شخص کا وقت موعود

(۱) وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ. (۱۱-ھود: ۶)
(۲) وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ. (۷-الأعراف: ۳۴)

متعین ہے، جس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

افسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا عقیدہ کمزور ہو چکا ہے اور وہ ایسی فرضی چیزوں پر اعتماد رکھتا ہے؛ حالاں کہ نافع علی الاطلاق اور ضار علی الاطلاق صرف اللہ تعالیٰ ہیں، نہ کوئی شئے کسی کو نفع پہونچا سکتی ہے، اور نہ نقصان پہونچا سکتی ہے۔ (۱)

ایک مسلمان وہ تھے، جنہوں نے برسوں کی رسم دریائے نیل میں جوان لڑکی کا دان ختم کر دیا تھا، حالاں کہ یہ موقع ابتلا کا تھا، لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ اگر جوان لڑکی کو بھینٹ نہ چڑھا جائے، تو دریا اپنا پانی دینا بند کر دے گا۔ حالاں کہ یہ رسم اسلامی عقیدے کے خلاف تھی، اس رسم کو ختم کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کے گورنر نے قدم اٹھایا اور جوان لڑکی کو بھینٹ نہیں چڑھایا، اتفاق سے اس سال پانی کم ہوگیا، اس کی اطلاع حضرت عمر فاروقؓ کو دی گئی، تو انہوں نے دریائے نیل کے نام ختم لکھا: اے دریا! اگر خدا کے حکم سے تو بہتا تھا، تو جاری ہوجا، ورنہ ہمیں تیری ضرورت نہیں ہے، ایمان قوی تھا، توکل کے اعلیٰ اور انتہائی معیار پر فائز تھے، اللہ تعالیٰ نے لاج رکھی اور دریا دوبارہ اپنی شان کے ساتھ بہنے لگا۔ اور یہ رسم ختم ہوگئی۔ (۲)

یہ دنیا فانی ہے، آزمائش کی جگہ ہے، دیوی کے پجاری کی بھی مرادیں پوری ہوتی ہیں؛ لہٰذا ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ جس کو یہ وصیت نامہ ملا ہے، اس کو جلا کر ختم کر دے اور دوسرے کو جو گمراہ ہو چکا ہے، اصل حقیقت سمجھائے، یقین دلائے کہ اللہ ہی بھروسہ کرنے کے لائق ہے، ان پر بھروسہ کرنے سے کبھی کچھ

---

(۱) قُلْ لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللهُ. [۷-الأعراف:۱۸۸]

(۲) لما فتحت مصر أتى أهلها إلى عمرو بن العاص حين دخل بئونة من أشهر العجم، فقالوا: أيها الأمير إن لنيلنا هذا سنة لا يجري إلا بها، فقال: وما ذاك؟ قالوا: إذا كان ثنتا عشرة ليلة خلون من هذا الشهر عمدنا إلى جارية بكر من أبويها، فأرضينا أبويها، وجعلنا عليها من الحلي والثياب أفضل ما يكون، ثم ألقيناها في هذا النيل، فقال له عمرو: إن هذا مما لا يكون في الإسلام، إن الإسلام يهدم ما قبله، قال: فأقاموا بئونة وأبيب ومسرى والنيل لا يجري قليلا ولا كثيرا حتى هموا بالجلاء، فلما رأى ذلك عمرو كتب بذلك إلى عمر بن الخطاب، فكتب: إنك قد أصبت بالذي فعلت، وإن الإسلام يهدم ما قبله، وإني قد بعثت إليك ببطاقة داخل كتابي هذا فألقها في النيل، فلما قدم كتاب عمر إلى عمرو، أخذ البطاقة ففتحها فإذا فيها: "من عبد الله عمر أمير المؤمنين إلى نيل مصر، أما بعد: فإن كنت إنما تجري من قبلك فلا تجر، وإن كان الله الواحد القهار هو الذي يجريك فنسأل الله الواحد القهار أن يجريك". قال: فألقى البطاقة في النيل، فلما ألقى البطاقة أصبحوا يوم السبت وقد أجراه الله تعالى ستة عشر ذراعا في ليلة واحدة، وقطع الله تعالى تلك السنة عن أهل مصر إلى اليوم. (كرامات الأولياء-الرازي:۹/۱۲۶، رقم الحديث:۶۶، ط: دار طيبة-السعودية)

نقصان نہیں ہوگا؛ بل کہ آخرت میں رفع درجات کا سبب ہوگا، تجربہ کیجیے، اور اپنے تجربات لوگوں کے سامنے بیان کیجیے، تا کہ دوسروں کو جھوٹی باتوں کے بجائے سچی باتوں پر یقین ہو جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] گجراتی ماہنامہ ''ینگ وہورا ویلفیئر'' کے ایک مضمون پر اشکال

۴۱۹-سوال: ینگ وہورا ویلفیئر'' نامی ماہنامہ میں ۹ ستمبر ۱۹۹۱ء میں ''مسلم معاشرہ میں دنیوی تعلیم کی کوتاہی'' کے عنوان سے ایک مضمون چھپا تھا، جس کا ایک فقرہ قابل غور ہے، اُس میں یہ لکھا گیا ہے کہ ''ایسا مذہب جو قدیم روایات واقدار اور قدیم عقائد کا پابند ہو، وہ ہمیں غیر مفید احساسِ برتری میں مبتلا کرتا ہے، لیکن حقیقی راحت نہیں دے سکتا، سچا مذہب تو وہی ہے، جو زمانہ کے ساتھ تغیرات کو قبول کر سکتا ہو۔''

کیا یہ مضمون اسلامی نقطۂ نظر سے درست ہے؟ اور اس جیسے مضامین سے مسلمانوں کو دینی فائدہ ہوگا یا نقصان؟ کیا اس مضمون میں سراسر اسلام دشمنی نہیں ٹپکتی؟ اس مضمون کو شائع کرنے کے بعد مدیر ماہنامہ نے اس پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس کے پڑھنے اور اُس پر عمل کرنے کی درخواست بھی کی ہے، برائے کرم! آپ ہمیں اس مسئلہ میں شرعی نقطۂ نظر سے واقف فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکور مضمون لکھنے والا شخص غیر مسلم ہے، دین اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب چوں کہ صرف انسانی عقل کی پیداوار ہیں، کہ لوگوں عقل نے جس طرح چاہا، اُس طرح اپنا مذہب گڑھ لیا، مذاہب حقہ میں سے بعض مذاہب سماویہ بھی تھے، مگر اُن مذاہب کے متبعین نے اُن کی اصل روح اور اصل حقیقت پر باقی نہیں رہنے دیا؛ بل کہ اپنی جانب سے من چاہی ترمیمات کر کے ''من چاہا مذہب'' بنا دیا، جن میں نبوی تعلیمات اور روحانی تربیت کا کوئی اثر باقی نہیں رہا، اسلام کے علاوہ دیگر تمام مذاہب کا یہی حال ہوا، اِسی وجہ سے اُن مذاہب کے ماننے والوں کو جہاں کہیں اپنے ''خود ساختہ دین'' میں کوتاہی نظر آتی ہے کہ وہ موجودہ دور کے مسائل کے حل میں ناکافی اور کوتاہ ہیں، یا اُنہیں اپنے خود ساختہ مذہبی اصول اور دورِ حاضر کے تقاضوں کے مابین تعارض نظر آتا ہے، تو فوراً اُس پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے یا تو دین ہی کا انکار کر دیتے ہیں، یا اُسے معطل اور ناقابل عمل قرار دیتے ہیں، اور عقلِ انسانی کی کارستانی کا یہ سلسلہ صرف موجودہ دور ہی میں نہیں؛ بل کہ ہر زمانہ میں رہا، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھولی بھٹکی انسانیت پر رحم فرما کر نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث

فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کے تمام انسانوں کو دین اسلام جیسا عظیم تحفہ عنایت فرمایا، جو اپنی وسعت و ہمہ جہتی کی وجہ سے ہر زمانہ کی ہر قسم کی ضروریات کی تکمیل کرنے والا ہے؛ لیکن کچھ کوتاہ بین بندے دین اسلام کو بھی دیگر مذاہب ہی کی طرح سمجھتے ہیں اور جس عینک سے وہ دیگر مذاہب کو دیکھتے ہیں، اُسی عینک سے دین اسلام کو بھی دیکھتے ہیں اور جھوٹے من گھڑت مذاہب کے بارے میں جو فیصلہ کرتے ہیں، وہی فیصلہ دین اسلام جیسے سچے مذہب کے متعلق بھی کر بیٹھتے ہیں۔

یہ بات کوئی بہت زیادہ تعجب خیز نہیں ہے، تعجب اور افسوس کے قابل بات تو یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے دین دار مسلم گھرانہ میں آنکھیں کھولی، اُس کے کانوں میں سب سے پہلے گونجنے والی آواز اذان کی آواز تھی، اسلامی معاشرے ہی میں وہ پل بڑھ کر پروان چڑھا، جس کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا اسلامی ماحول میں گزرا، پھر یہ بھی نہیں کہ وہ دینی تعلیم سے دور رہ گیا ہو، بل کہ بفضلہٖ تعالیٰ اُسے بھی دین کا اچھا خاصہ علم اور سمجھ حاصل ہے، وہ کیسے ایک غیر مسلم کوتاہ بیں کے غلط مضمون کو بغیر کسی اصلاح وترمیم کے اپنے ماہنامہ میں من وعن شائع کر دیتا ہے، پھر صرف اس پر بس نہ کرتے ہوئے ان خیالات پر اپنی خوشی کا اظہار بھی کرتا ہے، کیا کوئی مسلمان قصداً کسی کو کفریہ اور شرکیہ عقائد کی دعوت دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، اور ایسی بدگمانی ہم کسی بھی مسلمان کے بارے میں نہیں کر سکتے، اور یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان ہونے کے ناطے آپ کو بھی اس پر اشکال ہوا اور ہونا ہی چاہیے۔

دین اسلام ہی ایک ہمہ گیر اور وسیع 'دین فطرت ہے، جو رہتی دنیا تک انسانوں کی صحیح رہبری اور ترقی کے ساتھ آخرت کی فلاح وبہبود کا ضامن ہے، نبوی تعلیمات کے بغیر کوئی بھی انسان 'انسان' کہلانے کے قابل نہیں، دنیا نے بارہا دیکھا ہے کہ جب کبھی دنیا نبوی تعلیمات سے دور ہوگئی، تو انسانوں میں وحشی حیوانوں کی سی صفات پیدا ہوگئیں، معاشرہ نام کی کوئی چیز اُن کے تصور میں باقی نہیں رہی، کون نہیں جانتا کہ عالمی جنگ کے دوران انسانی خون کی قیمت پانی سے بھی کم تھی، کیا اُن میں شریک ہونے والے فریقین مسلمان تھے؟ نہیں؛ بل کہ وہی عقل پرست اور کوتاہ بیں دنیوی تعلیم یافتہ سربراہوں کا گروہ تھا، جو خود کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب مقتدیٰ خیال کرتا تھا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ دین اسلام کبھی بھی دنیوی تعلیم اور جدید سائنسی انکشافات اور ترقیات کا مخالف

---

(۱) وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ﴿۲۰﴾ (۲۷-النمل: ۲۰)

نہیں رہا، جس دین کا حکمِ اولیں ہی "اقرأ"(۱) (پڑھو) ہو، وہ تعلیم و تعلم کی مخالفت کیسے کرسکتا ہے، دین اسلام نے احکامِ الٰہیہ کے ذریعہ انسانیت کی وہ بہترین تربیت کی کہ جس پر عمل کرنے کی وجہ سے پوری دنیا ایک کنبہ کے مانند ہوگئی، اسلام نے ہر قسم کی بے حیائی اور بے مروتی کے کاموں سے روکا ہے، دین اسلام نے کبھی دنیوی علوم کی مخالفت نہیں کی؛ بل کہ اعلیٰ دنیوی تعلیم یافتہ حضرات کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جس تعلیم کو وہ اپنا طرۂ امتیاز خیال کرتے ہیں، وہ بھی درحقیقت انبیاء ہی کے طفیل انہیں حاصل ہوئی ہے، لکھنے پڑھنے سے لے کر ہر قسم کی صنعت وحرفت کا علم اولاً اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو دیا، اور اُن ہی سے ساری انسانیت نے اُن علوم کو سیکھا ہے، اِس اعتبار سے تو کوئی بھی دین سماوی دنیوی تعلیم اور عصری ترقیات کا منکر و مخالف نہیں ہوسکتا، چہ جائے کہ دین اسلام جیسا عظیم الشان اور ہمہ گیر مذہب اُس کی مخالفت کرے۔

دین اسلام نے انسان کی دنیوی زندگی کے ہر مرحلہ میں ہر پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے صحیح تعلیمات اور صحیح تربیت کے ذریعہ رہنمائی کی ہے، لہٰذا اُس نے دنیوی تعلیم کے حصول اور اُس کے آداب بھی سکھائے ہیں اور ایسے امور سے روکا ہے، جن میں سراسر بے حیائی اور بے حجابی پائی جاتی ہو، چناں چہ موجودہ دور کی عصری تعلیم گاہوں میں جو عریانت اور فحاشی کی گندی ہوا چل پڑی ہے، اُس سے دور رہنے کی تعلیم دی ہے، عصری علوم کے حصول سے نہیں روکا؛ بل کہ اُن علوم کو ظاہری و باطنی پاکی اور صفائی کا خیال رکھتے ہوئے نبوی طور وطریق کے ساتھ حاصل کرنے کے لیے کہا ہے، جسے موجودہ دور کے عقل پرست اور کوتاہ بیں عصری علوم کی مخالفت سمجھ بیٹھے ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری فلاح بہبود کی ضمانت صرف اور صرف دین اسلام پر ثابت قدم رہنے میں اور قرونِ اولیٰ مشہود لہا بالخیر کی اتباع میں ہے، چنانچہ حدیث شریف میں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ اِس اُمت کے پچھلے لوگ بھی اُسی طور وطریق کے ذریعہ کامیاب ہوسکتے ہیں، جس پر چل کر پہلے لوگ کامیاب ہوئے ہیں۔(۲) لہٰذا حضرات صحابۂ کرامؓ اور تابعین عظام جس راہ پر چل کر کامیاب ہوئے، وہی ہمارے لیے مشعلِ راہ اور اُسوۂ حسنہ ہے۔

---

(۱) اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ [۹۶-العلق: ۱]

(۲) یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی نہیں؛ بل کہ حضرت امام مالکؒ نے وہب بن کیسانؒ کا مقولہ نقل کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:
قال مالك: كان وهب بن كيسان يقعد إلينا، ثم لا يقوم أبدا حتى يقول لنا: إنه لا يصلح آخر هذه الأمة إلا ما صلح أولها، قلت له: يريد ماذا؟ قال: يريد التقى. (مسند الموطأ للجوهري-أبو القاسم، الجوهري المالكي (م: ۳۸۱هـ) ص: ۵۸۴، ت: لطفي بن محمد الصغير، طه بن علي بو سريح، ط: دار الغرب الإسلامي، بيروت)

مذکورہ ماہنامہ ''ینگ وہورا ویل فیر'' کے تمام ذمہ داران سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ وہ اس مضمون میں اصلاح کریں اور آئندہ اس طرح کے مضامین کو بغیر اصلاح وتحقیق کے شائع نہ کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] پالن حقانی صاحب کی کتاب شریعت اور جہالت کیسی ہے؟

۴۲۰-سوال: جناب محمد پالن حقانی صاحب کی کتاب ''شریعت یا جہالت'' ارسال خدمت ہے، اس کے مطالعہ کے بعد حسب ذیل سوالوں جوابات مرحمت فرمائیں:

(۱) یہ کتاب سنی حنفی مذہب کے مطابق ہے یا اس کے خلاف؟ (۲) کیا اس کتاب میں پیغمبر، ان کے صحابہؓ یا اولیاء عظامؒ میں سے کسی کی بے عزتی کی گئی ہے؟ (۳) اس کتاب میں مذہبی، اخلاقی یا سماجی سوالوں کو اٹھا کر جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے، وہ سنی حنفی مسلک کے موافق صحیح ہے یا غلط؟ مسلمانوں کے لیے مفید ہے یا مضر؟ (۴) اس کتاب میں قرآن کریم، احادیث نبویہ اور فقہ کی کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں، وہ معتبر اور مستند ہیں یا نہیں؟ (۵) اس کتاب کو حنفی مسلک کا مخالف تو نہیں مانا جائے گا۔

حبیب الرحمان غزنوی- احمد آباد

الجواب حامداومصلیا:

(۱) کتاب ''شریعت یا جہالت'' مسلک حنفی سنی کے موافق ہے، البتہ بعض مسائل مفتی بہ نہیں ہیں۔ (مثلاً: مسئلہ صفحہ نمبر ۵۳۰، ۱۲۴ اور ۱۳۴ پر جو مسائل ہیں)

(۲) رسول اکرام صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ، اور اولیاء عظامؒ میں سے کسی کی شان میں گستاخی یا بے ادبی نہیں کی گئی ہے۔ ہر ایک کی شان میں صرف مراتب کا خیال رکھا گیا ہے؟ جو کچھ نقل کیا گیا ہے، صحیح اور قابل استناد کتابوں سے نقل کیا گیا ہے۔

(۳) امت مسلمہ کے لیے صرف اخلاقی اور سماجی ہی نہیں؛ بل کہ ہر اعتبار سے بہت اچھی ہدایات ہیں، الحمد اللہ۔

(۴) سارے حوالے جات صحیح ہیں۔

(۵) یہ کتاب سنی حنفی المسلک کے مطابق ہے، کسی طرح مخالف نہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

۲۸ رجمادی الآخر ۱۴۰۳ھ

اس فتویٰ پر حضرت مفتی احمد بیات صاحبؒ کے دستخط کے علاوہ اس کی تصحیح کرنے والے دیگر علماء کے نام حسب ذیل ہیں: ۱- مفتی محمد ابراہیم پالن پوری ۲- مفتی محمد شریف حسن

۳۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحب (منگرملت) ۴۔ حضرت مولانا عبدالغفور نقشبندی صاحب ۵۔ مولانا مفتی مصلح الدین صاحب ۶۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم ندوی غفرلہ۔

[۶] ''بہار شریعت'' نامی کتاب پڑھنا چاہیے یا نہیں؟

۴۲۱-سوال: مجھے فقہی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے، میں ایک کتاب ''بہار شریعت'' محمد امجد علی اعظمی کی لکھی ہوئی پڑھ رہا تھا، تو میرے ایک دوست نے کہا کہ یہ کتاب بریلویوں کی ہے ہمیں اہل دیوبند کی کتابیں پڑھنی چاہیے، تو اس سلسلہ میں آں جناب کا کیا مشورہ ہے کہ کتاب پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

''بہار شریعت'' بریلوی عالم کی ہے، اس کی جگہ پر بہشتی زیور حضرت اقدس تھانویؒ کی یا علم الفقہ ''مصنفہ: حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ'' پڑھیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

" الرؤيا ثلاث: حديث النفس، وتخويف الشيطان، و بشرى من الله. فمن رأى شيئا يكرهه فلا يقصه على أحد وليقم فليصل". (صحیح البخاری، رقم:۷۰۱۷)

باب تعبیر الرویاء
(خواب اور اس کی تعبیر)

۵

[خواب اور اس کی تعبیر]

[۱] خواب میں شیر کو دیکھنے اور اس کو مار ڈالنے کی تعبیر کیا ہے؟

۴۲۲-سوال: میری عمر اس وقت تیراسی سال ہے، میں نے ایک رات تقریباً تین ساڑھے تین بجے ایک خواب دیکھا کہ میں ایک گاؤں میں گیا، جہاں آج سے سال ڈیڑھ سال قبل جانا ہوا تھا، میں جیسے ہی گاؤں میں داخل ہوا، میری نظر ایک شیر پر پڑی، جو میرے سامنے آرہا تھا؛ لیکن میرے پاس لاٹھی وغیرہ کوئی چیز نہیں تھی، گاؤں والوں نے مجھے دور سے اشارہ کیا کہ تمہارے جیب میں کوئی قلم ہو، تو نکال کر اس کی طرف اشارہ کرو، وہ بھاگ جائے گا، میں نے ان کے کہنے کے مطابق اپنی جیب سے قلم نکالا اور شیر کی طرف اشارہ کیا، مگر شیر نہیں بھاگا، میں نظر بچا کر دوسری گلی سے دوڑتا ہوا مسجد کی طرف چلا گیا، جیسے ہی مسجد کے صحن میں پہنچا، تو دیکھتا ہوں کہ شیر دوڑتا ہوا میرے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا ہے، میں نے اس کو مار ڈالا، اس کے خون سے میرے ہاتھ اور کپڑے آلودہ ہو گئے، بس اسی پر میری آنکھ کھل گئی۔ اس خواب کی تعبیر کیا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلياً:

مجھے خواب کی جو تعبیر سمجھ میں آرہی ہے، وہ یہ ہے کہ شیر انسان کا دشمن ہوتا ہے، نیز بہت ہی بہادر اور طاقت ور جانور ہوتا ہے، شیر کا آپ کی جانب آنا اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ کوئی طاقت ور اور مضبوط آدمی

آپ کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے۔ [1] لیکن آپ کے دوستوں نے آپ کو دشمن سے بچنے میں سہارا دیا، کہ وہ آپ کو اپنے دشمن سے بچانے کے لیے ترکیبیں بتا رہے ہیں، آپ نے اپنی حفاظت کے لیے مسجد کا آسرا لیا، یہی ایک سچے مسلمان کی شان ہوتی ہے، نیز آپ کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسجد و مدرسے کی بھلائی چاہتے ہیں، اسی کی برکت سے آپ کو اپنے دشمن پر غلبہ حاصل ہوا اور آپ نے اسے ختم کر دیا۔

اس لیے کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کا دشمن آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا؛ کیوں کہ آپ نے اس کو زیر کرلیا ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] ''تین کچہری'' والی حدیث کا خواب میں دیکھنا اور اس کی تعبیر

۴۲۳-سوال: ایک رات میں نے یہ خواب دیکھا کہ ایک بڑا مجمع حلقہ لگا کر بیٹھا ہوا ہے، اس مجمع میں میں خود کھڑے ہو کر لوگوں میں حدیث بیان کر رہا ہوں، حدیث شریف وہ ہے جس میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ قیامت کے روز تین کچہریاں ہوں گی۔ [2] میں نے پہلی کچہری کے متعلق بیان کیا، تو ایک آدمی کھڑا ہوا، اس نے ایک آدمی کے ہاتھ میں کوئی چیز دی اور کہا کہ مٹھی بند کرلو اور اس کو ''نیتر نگ'' گاؤں میں پہنچا دو، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا تحفہ ہے؛ پھر میں نے دوسری کچہری کے متعلق بیان کیا، تو وہی نوجوان پھر کھڑا ہوا اور مذکورہ آدمی کو پھر ایک تحفہ دیا اور کہا کہ یہ تحفہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، اس کو ''نیتر نگ'' پہنچا دو، اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی اور تیسری کچہری کے متعلق میں کچھ بیان نہ کر سکا، تو اب حضرت والا سے گزارش ہے کہ اس خواب کی تعبیر بیان فرما کر ممنون فرمائیں۔　　صالح محمد غلام محمد ماسٹر منصوری، جیتالی

---

(۱) الأسد: عدو مسلط ذو سلطان و بأس شديد، فمن رأى أنه ينازع أسدا، أو يقاتله، فإنه ينازع عدوا مسلطا. (تعبیر نامہ خواب عربی اُردو- محمد بن سیرینؒ (م: ۱۱۰ھ) مترجم: سید حبیب احمد ہاشمی ص: ۱۶۹، ط: نصیر بک ڈپو- حضرت نظام الدین نئی دہلی)

الأسد في المنام عدو مسلط... (ومن رأى) أنه قاتل أسدا فإنه يقاتل عدوا مسلطا. (تعطير الأنام في تفسير الأحلام- عبد الغني النابلسي: ۱/ ۲۵-۲۸، در الكتاب- لبنان)

الأسد: سلطان قاهر جبار... والعدو الطالب... وقطع رأس الأسد نيل ملك وسلطان.... وقيل من رأى كأنه قتل أسداً، نجا من الأحزان كلها. (تفسير الأحلام- ابن سيرين: ۱/ ۱۰۲، ط: لجنة الدعوة)

(۲) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: »يعرض الناس يوم القيامة ثلاث عرضات، فأما عرضتان فجدال ومعاذير، وأما العرضة الثالثة، فعند ذلك تطير الصحف في الأيدي، فآخذ بيمينه وآخذ بشماله«. (سنن الترمذي: ۲/ ۶۸، أبواب الزهد، باب ما جاء في العرض، رقم: ۲۴۲۵، ط: ياسر نديم ديوبند)

الجواب حامداً و مصلیاً

تعبیر کے کئی اجزاء ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

(۱) خواب میں حدیث کا بیان کرنا خیر و برکت کا ذریعہ ہے۔

(۲) تین کچہری والی حدیث کا خواب میں بیان کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آپ کو امت کی فکر لاحق ہے، اللہ رب العزت آپ کو مزید ترقیات سے نوازے۔ (آمین)

(۳) خواب میں لوگ آپ سے حدیث سن رہے ہیں، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے لوگ آپ کے اس کام میں آپ کو سہارا دیں گے۔

(۴) غیب سے بھی آپ کو مدد ملتی رہے گی۔

(۵) آں حضرت ﷺ کی آپ کی طرف خاص توجہ ہے اور ''میتر نگ'' جیسے پس ماندہ اور دین سے دور علاقے میں آپ ﷺ کا تحفہ بھیجنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ اس علاقے میں دین کی محنت کریں اور چھوٹے بچوں کے عقائد کی طرف دھیان دیں، نبی کریم ﷺ کی توجہ خاص آپ کے ساتھ رہے گی۔

(۶) جس مجمع اور مجلس میں آپ حدیث بیان کر رہے تھے، اس میں آپ ﷺ کی تشریف آوری آپ کے لیے بشارت کی چیز ہے، کہ نبی کریم ﷺ کی توجہ آپ کے ساتھ ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] برے خواب کی وجہ

۴۲۴-سوال: اگر کوئی آدمی خواب میں یہ دیکھے کہ وہ اپنی بہن کے ساتھ زنا کر رہا ہے اور اسی حالت کو اس کو احتلام ہو جائے، تو اس طرح کے برے خواب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

عبد الرحیم حسن ماگروی (سوراشٹر)

الجواب حامداً و مصلیاً

خواب کی کئی قسمیں ہیں۔ [۱] برے خواب کے دیکھنے میں نفس اور شیطان کا بھی دخل ہوتا ہے؛ اس

(۱) قال محمد بن سيرين: وأنا أقول هذه - قال: وكان يقال: "الرؤيا ثلاث: حديث النفس، وتخويف الشيطان، وبشرى من الله، فمن رأى شيئا يكرهه فلا يقصه على أحد وليقم فليصل". (صحيح البخاري: ۲/۱۰۳۹، رقم: ۷۰۱۷، كتاب التعبير، باب القيد في المنام، ط: البدر ديوبند)

لیے آپ کا یہ خواب ''شیطانی خواب'' ہے، ایسے خوابوں سے اللہ رب العزت سے پناہ طلب کرتے رہنا چاہیے۔ رات کو سونے سے قبل قرآن واحادیث میں منقول اوراد و وظائف کے پڑھنے سے ایسے برے خوابوں سے بچا جاسکتا ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] خواب میں سانپ دیکھنا

۴۲۵-سوال: ایک عورت کو تقریباً تین سال سے خواب میں سانپ دکھائی دیتے ہیں، وہ روزانہ معمولات پڑھ کر سوتی ہے، مگر یہ سانپ کا خواب اکثر آتا ہے اور اچانک چیخ کر بیدار ہوجاتی ہے، ابھی چند دن پہلے اس نے یہ خواب دیکھا کہ ایک سانپ آیا اور اس کی چوٹی پر چڑھنے لگا، پس وہ چیخ مار کر ایک دم نیند سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس خواب کی کیا تعبیر ہوسکتی ہے؟ براہ کرم جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں: ۱-مبشرات: یعنی مستقبل میں ہونے والی اچھی چیزیں، جسے اللہ تعالیٰ خواب میں دکھادیتے ہیں ۲-اضغاث واحلام: یعنی انسان جو خیالات لے کر سوتا ہے، خواب میں اسے وہی دکھتا ہے ۳-شیطانی وسوسے (مخوفات)، یعنی چوں کہ شیطان انسان کا دشمن ہے، اس لیے وہ خواب میں بھی اس کو ڈراتا ہے اور ایسے وساوس ڈالتا ہے، جس سے انسان ڈرجاتا ہے۔ (۲)

پس مذکور خواب شیطانی ہے، اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس قسم کا خواب دیکھنے پر ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم'' تین بار پڑھ کر بائیں طرف تھتکاردیں اور کروٹ بدل کر سوجائیں، اور سونے سے پہلے چارقل اور آیت الکرسی پڑھ کر ہاتھ پر دم کرکے پورے بدن پر ہاتھ پھیردیں اور داہنی کروٹ پر سوئیں ان شاء اللہ براخواب ختم ہوجائے گا۔

(۱) عن أبي سلمة: أن أبا قتادة الأنصاري، وكان من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم وفرسانه، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: الرؤيا من الله، والحلم من الشيطان، فإذا حلم أحدكم الحلم يكرهه فليبصق عن يساره، وليستعذ بالله منه، فلن يضره. (صحيح البخاري، رقم الحديث: ۷۰۰۵، كتاب التعبير، باب: الحلم من الشيطان)

(۲) عن محمد بن سيرين، عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إذا اقترب الزمان لم تكد رؤيا المؤمن تكذب، وأصدقهم رؤيا أصدقهم حديثا، ورؤيا المسلم جزء من ستة وأربعين جزءا من النبوة، والرؤيا ثلاث: فالرؤيا الصالحة بشرى من الله، والرؤيا من تحزين الشيطان، والرؤيا مما يحدث بها الرجل نفسه، فإذا رأى أحدكم ما يكره، فليقم وليتفل ولا يحدث بها الناس" قال: «وأحب القيد في النوم وأكره الغل» القيد: ثبات في الدين. (سنن الترمذي: ۲/ ۵۳، رقم: ۲۲۷۰، أبواب الرؤيا، باب أن رؤيا المؤمن جزء من ستة وأربعين... الخ، ط: ياسر نديم-ديوبند)

خواب کی تعبیر کے بڑے امام علامہ محمد بن سیرینؒ لکھتے ہیں کہ خواب میں سانپ دیکھنے کی تعبیر یہ ہے کہ دشمن تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے، جو مال، عزت یا آبرو پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔[1] لیکن اگر تین سال سے خواب میں اس سانپ نے کاٹا نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دشمن نقصان نہیں پہنچا سکے گا، اور اس دنیا میں کون ہے، جس کا کوئی دشمن نہ ہو! صرف احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] خواب میں خود کو ناپاک حالت میں دیکھنا، یا سانپ کا نظر آنا

۴۲۶-سوال: میں یہ خواب دیکھتا ہوں کہ ناپاکی کی حالت میں ہوں اور پاک ہونے کے لیے غسل کا ارادہ کرتا ہوں، کہ یکا یک ایک سانپ میری طرف آتا ہے اور میرے بائیں ہاتھ میں بغل کے پاس کاٹتا ہے، ساتھ ہی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں ناپاکی کی حالت میں ہوں، اگر اس حالت میں موت آ گئی، تو ناپاکی کی حالت میں مروں گا، میں اس غم و رنج میں ہوتا ہوں کہ آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس سے پہلے بھی خواب میں کئی بار سانپ دیکھ چکا ہوں، تو اس کی تعبیر کیا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

انسان کو جو خواب نظر آتے ہیں اس کی تین قسمیں ہیں: [۱] مبشرات: یہ وہ خوش کن واقعات ہیں، جو مستقبل میں ہونے والے ہوتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ انسان کو وہ واقعات دکھاتے ہیں، تا کہ وہ نیک راہ پر مضبوطی سے قائم رہے۔ [۲] اضغاث واحلام: یہ وہ خیالات ہیں، جو انسان کے دل ودماغ پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں، وہ ان کو لے کر جب سوجاتا ہے، تو خواب میں وہی سب دیکھتا ہے، ایسے خواب کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ [۳] مخوفات: وہ ڈراؤنی چیزیں ہیں، جو شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں، شیطان انسان کا دشمن ہے، خواب میں بھی انسان کو حیران وپریشان کرتا ہے۔[2]

جو خواب آپ نے دیکھا ہے اور مسلسل دیکھتے رہتے ہیں، وہ اسی (تیسری) قسم سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔[3]

---

(۱) الحیة: فی تاویل عدو کاتم العداوة مبالغ فیها بقدر عظمها وهیئتها فی المنظر۔ تعبیر نامہ خواب عربی اردو، از: محمد بن سیرینؒ، ترجمہ: سید حبیب احمد حاشمی، ط: نصیر بک ڈپو، نئی دہلی۔

(۲) تفصیلی تخریج گذر چکی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: عنوان: خواب میں سانپ دیکھنا۔

(۳) سنن الترمذي: ۲/ ۵۳، رقم الحدیث: ۲۲۷۰، أبواب الرؤیا، باب أن رؤیا المؤمن جزء من ستة وأربعین جزءاً من النبوة، ط: یاسر ندیم - دیوبند.

خراب وڈراؤنے خواب آنے پر چاہیے کہ اپنی بائیں طرف تھتکار دے اور کروٹ بدل کر سوجائے اور سونے سے پہلے چار قل اور تین بار آیت الکرسی اول وآخر تین تین بار درود شریف کے ساتھ پڑھ کر پورے بدن پر دم کر لے، پھر سوجائے۔ (١) فقط، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

[٦] ایک خواب کی تعبیر

٤٢٧-سوال: رات میں بہ مقام کنتھاریہ، مولانا عبدالمجید صاحب ندوی کے بیان میں حاضری ہوئی، بہت لوگوں کی بھیڑ اور عجیب وغریب انوارات کے مناظر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، گھر لوٹ کر جب سویا، تو خواب میں والد مرحوم کی زیارت ہوئی، دیکھا کہ وہ ایک خوش نما مسجد کی طرف جارہے ہیں، میں بھی ان کے ساتھ ہولیا، مسجد جا کر دیکھا تو وہ دعا میں مصروف تھے، مجھے دیکھ کر بہت زیادہ خوش ہوئے والد صاحب کی ملاقات سے جہاں مجھے بے پناہ خوشی ہوئی، وہیں ان کی خوشی بھی قابل دید تھی، ہم دونوں خوشی کے عالم میں بات میں مصروف تھے کہ میرے چھوٹے بھائی کی دو چھوٹی لڑکیاں مسجد کے صحن میں آکر شور کرنے لگیں، میں نے جب یہ دیکھا، تو ان کو ڈانٹ دیا اور جھڑک کر کہا: گھر جاؤ! تو والد مرحوم نے میری طرف دیکھ کر کہا: بھائی! ابھی تک تمہارا غصہ ختم نہیں ہوا ہے۔

میں نے خواب میں عجیب نورانی منظر دیکھا تھا، ایسا نورانی منظر یا تو مکہ مکرمہ میں ہوتا ہے یا مدینہ شریف میں یا جیسا کہ میں نے کنتھاریہ میں دیکھا تھا۔ حضرت والا سے عرض ہے کہ بتائیں کہ اس خواب کی کیا تعبیر ہوسکتی ہے؟ اس خواب کے دیکھنے کے بعد مجھے کیا کرنا چاہئے؟ خواب خواہ برا ہو یا اچھا، اس کے بعد شریعت میں کوئی عمل مطلوب ہے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

والد صاحب کو اچھی اور خوشی کی حالت میں دیکھنا مرحوم کے لیے مغفرت اور جنت کی بشارت ہے۔ (ان شاء اللہ) [٢] اور مسجد میں ملاقات کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی مسجد والی زندگی

---

(١) عن أبي قتادة، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال: »الرؤيا من الله والحلم من الشيطان، فإذا رأى أحدكم شيئا يكرهه فلينفث عن يساره ثلاث مرات، وليستعذ بالله من شرها فإنها لا تضره« (سنن الترمذي: ٢/ ٥٣، رقم: ٢٢٧٧، أبواب الرؤيا، باب إذا رأى في المنام مايكره مايصنع، ط: ياسر نديم ديوبند)

(٢) إذا رأى الميت في هيئة حسنة... وهو ضاحك، أو مستبشر، دل ذلك على صلاح حاله أيضا في الآخرة. (تعبیر نامۂ خواب عربی اردو: ١١٢، از: علامہ ابن سیرین، ترجمہ: سید حبیب احمد حاشمی، ط: نصیر بک ڈپو، نئی دہلی)

سے حاصل ہوگی۔ اس کے بعد بھتیجیوں پر آپ کا غصہ اور والد صاحب کا نصیحت کرنا کہ ابھی تک غصہ ختم نہیں ہوا! اس میں ایک کمزوری کی اصلاح کی طرف متوجہ کرنا ہے، نفس غصہ کوئی بری چیز نہیں ہے؛ لیکن وہ اپنے موقع پر ہونا چاہیے اور انسان کو موقع ومحل دیکھ کر غصہ ہونا چاہیے، بچیاں نادان ہیں؛ لہٰذا ان پر غصہ کی کوئی مضبوط وجہ نہیں ہے، بل کہ آپ نے خود مسجد میں بلند آواز سے ڈانٹ کر مسجد کی بے ادبی کی، جب کہ لڑکیاں تو مسجد سے باہر تھیں، نیز وہ نادان اور غیر مکلف ہیں، پس یہاں غصہ کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے؛ اس لیے غصہ کے تعلق سے والد مرحوم کی نصیحت قبول کیجیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] خواب میں گھر میں بارش برستے دیکھنا

۴۲۸-سوال: مجھے خواب میں پاخانہ کا مقام نظر آیا، پھر میرے گھر میں بہت بارش ہوتی دکھائی دی اور گھر میں سب چیزیں سبز ہوگئیں۔ اس خواب کی تعبیر کیا ہے؟ اور بتلائیں کہ کیا وظائف مجھے پڑھنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

خواب کی طرف زیادہ دھیان دینے کی ضرورت نہیں، فی الجملہ یہ خواب اچھا ہے، آپ کو دنیا میں مال ملے گا۔ (۱)

اور پڑھنے کے متعلق مشورہ یہ ہے کہ: استغفار اور درود شریف کثرت سے پڑھیے، اور ممکن ہو تو روزانہ ایک پارہ یا نصف پارہ قرآن کی تلاوت کیجیے اور اولاد کے تئیں کوشش کیجیے کہ نہ صرف یہ کہ وہ دینی مزاج رکھیں، بل کہ وہ دین کے علم بردار ہوں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] خواب میں والد کو استنجاء خانہ سے نکالنے کی تعبیر

۴۲۹-سوال: میری لڑکی نے رات میں تین بجے یہ خواب دیکھا کہ اس نے مجھے دو دن سے دیکھا نہیں ہے، لڑکی کو یہ خیال ہوا کہ گھر کے پیچھے کنویں میں گر گئے ہوں گے، تو اس نے کنویں میں آ کر دیکھا، تو میں نظر نہیں آیا، پھر اس نے بیت الخلاء میں دیکھا، تو میں اس میں ٹب کے اندر بیٹھا ہوا تھا، اس نے میرا بال

(۱) المطر غيث و رحمة...سأل رجل الإمام جعفر بن صادق رحمه الله، فقال له: إني رأيت كأني أخوض في المطر يوما و ليلةً، فقال: ما أحسن ما رأيت، أنت تخوض في الرحمة، وترزق الأمن وسعة الرزق. (تعبیر نامۂ خواب، عربی اردو، از: محمد بن سیرینؒ، ترجمہ: سید حبیب احمد حاشمی، الباب الخامس فی تاویل الامطار......الخ، ط: نصیر بک ڈپو)

پکڑ کر باہر نکالا، میں اندر صحیح سالم تھا، کنویں میں گرا نہیں تھا، اگر ٹب نہ ہوتا، تو میں کنویں میں گر جاتا اور اس میں پاخانہ تھا، اس نے جب مجھے باہر نکالا، تو میرے پیر گل گئے تھے اور سوکھ گئے تھے، لڑکی یہ سب دیکھ کر رونے لگی، میں نے پھر اسے خاموش کرایا، تو اس خواب کی تعبیر کیا ہوگی؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

خواب کوئی شرعی حجت نہیں ہے، اس لیے خواب میں خواہ مخواہ دھیان لگانے سے دین کا کوئی فائدہ نہیں ہے، شیطان انسان کا دشمن ہے، وہ خواب میں آکر انسان کو اس طرح کی چیزیں دکھلا کر ڈراتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔

ہر انسان آج دنیا میں پھنس گیا ہے، یہ دنیا ایک کنویں کے مثل ہے، اور دنیا میں کمائی کے ذرائع حلال بھی ہیں اور حرام بھی ہیں، تو انسان کو حرام سے جو کہ ناپاک اور پاخانہ کے مثل ہے، بچنا چاہیے۔ (۱) اس لیے اگر کوئی حرام کام مثلاً سود وغیرہ میں ابتلاء ہو، تو اس سے توبہ واستغفار کر کے اپنی آخرت کو درست بنالینا چاہیے، بس اس خواب سے اس طرف اشارہ ہے۔

[۹] نیند میں ندائے غیبی سننے کی تعبیر

۴۳۰-سوال: تبلیغی جماعت میں چلہ کے دوران میں ایک رات سویا ہوا تھا کہ اچانک کان میں یہ آواز آئی: ''اٹھ ابھی مانگنے کا وقت ہے اور تو سو رہا ہے'' ! اس وقت تقریباً رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے، اٹھ کر جب میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، تو کوئی نظر نہیں آیا، پھر نیند نہیں آئی، حالاں کہ اٹھنے کے بعد مجھے نیند بہت آتی ہے، تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً:

اللہ تبارک وتعالیٰ بسا اوقات اپنے بندوں کو غفلت سے بیدار کرنے کے لیے اس طرح غیبی آواز سے متنبہ کرتے ہیں، اخیر رات کا وقت دعاء کی قبولیت کا ہے، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، آپ اخیر رات میں اٹھ کر تہجد پڑھنے اور اللہ سے مانگنے کی کوشش کرتے رہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا کہ آدمی کی سرگیں مال حرام ہے۔ (تعبیر رؤیا (اردو) از: محمد بن سیرینؒ، ص: ۳۳۷، ط: ادارہ مرکز ادب دیوبند)

[۱۰] خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور دیکھنے والے کی پیشانی پر مہر لگانا

۴۳۱-سوال: ایک شخص کو آقائے نامدار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی، اس وقت اسے پانی کا بھرا ہوا ایک حوض بھی دکھائی دیا، اس حوض میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے تھے اور ساتھ میں وہ بھی تھا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیشانی پر ایک مہر لگائی؛ لیکن وہ مہر پانی میں گر گئی، اس نے اس کو پانی میں تلاش کیا، مگر وہ نہیں ملی، اتنے میں اس کی آنکھ کھل گئی۔

یہ خواب جس شخص نے دیکھا ہے، وہ پنج وقتہ نمازوں کا پابند ہے؛ لیکن گھر میں ہر طرح کی گندگی رہتی ہے؛ یعنی کتا بھی گھر میں آتا جاتا رہتا ہے، گھر کے اڑوس پڑوس میں بھی ناپاکی اور گندگی پڑی رہتی ہے، ایسے میں اس شخص کا اس طرح کا خواب دیکھنا کیا حقیقت رکھتا ہے؟ امید ہے کہ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں گے۔

الجواب حامداو مصليا:

خواب کوئی شرعی حجت نہیں ہے، اس لیے خواہ مخواہ خواب کے پیچھے نہ پڑیں۔

احادیث میں خواب کی تین قسمیں بیان کی گئیں ہیں:

(۱) شیطانی وساوس: شیطان خواب میں آکر آدمی کو حیران و پریشان کرتا ہے، اس کو ڈراتا اور وحشت میں مبتلا کرتا ہے، اگر کسی کو ایسا خواب نظر آئے، جس سے اسے وحشت محسوس ہو، تو اپنی کروٹ بدل کر بائیں طرف تھوک کر تعوذ پڑھ لے، پھر سے سو جائے۔ (۱)

(۲) انسانی خیالات: یعنی رات دن جو وہ سوچتا رہا ہے، وہ تمام خیالات رات کے وقت خواب میں دیکھتا ہے۔

(۳) مبشرات: یعنی سچے دین دار، پرہیزگار آدمی کو اللہ تعالی کی طرف سے مستقبل میں پیش آنے باتوں کی بشارت دی جاتی ہے۔ (۲) اور دوسرے کسی اور طریقہ بھی بشارت دی جاتی ہے۔

مذکورہ خواب اچھا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت، بشارت کی علامت ہے۔ (۳) اور ایمان کی مہر لگانے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوشش کر رہے ہیں؛ البتہ افسوس اس بات کا کہ وہ شخص نجاست ناپاکی اور کتوں کے پالنے میں مشغول ہے، (یعنی صفائی ستھرائی کا خیال نہیں رکھتا، اپنے گھروں کو کتوں کی آمد و رفت سے محفوظ نہیں رکھتا) جس کی وجہ سے اس کی وہ مہر حوض میں گر گئی؛ اس لیے اس شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ ان

(۱-۲) تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں، عنوان: خواب میں سانپ، اور خواب میں خود کو ناپاک حالت میں دیکھنا، یا سانپ کا نظر آنا

(۳) ومن رأى النبي صلى الله في منامه، فإنه بشارة بالخير. (تعبیر نامہ خواب عربی اردو، الباب الثالث، ط: نصیر بک ڈپو نئی دہلی)

نافرمانی والے اعمال سے توبہ کرے اور اللہ رب العزت سے استغفار کرے، دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالی اس کو نیک ہدایت عطا فرمائیں۔ (آمین) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۱۱] خواب میں بیوی کو مردہ دیکھنے کی تعبیر

۴۳۲-سوال: احقر نے ایک خواب تقریباً تین مرتبہ دیکھا ہے، اس کی وجہ سے کافی پریشانی اور بے چینی ہے، اس لیے اس کی تعبیر دریافت کرنے کی غرض سے یہ خط ارسال خدمت کر رہا ہوں، امید ہے کہ اس کی تعبیر عنایت فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں گے، خواب حسب ذیل ہے:

میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری بیوی کا انتقال ہو چکا ہے، جس کی وجہ سے میری پریشانی اتنی بڑھ گئی کہ میں ادھر ادھر بھاگنے لگا اور میرے بچے بھی پریشان ہو گئے، پریشانی کے عالم میں نیچے سے سیڑھی چڑھتے ہوئے اوپر گیا، تو دیکھتا ہوں کہ بچے تو آرام کر رہے ہیں، تھوڑی دیر میں میری آنکھ کھل گئی، تو دیکھا کہ بیوی زندہ ہے، مگر یہ خواب چوں کہ تین مرتبہ نظر آیا ہے، اس لیے میری پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی ہے؛ لہذا آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اس خواب کی تعبیر عنایت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

عبدالقادر بھائی چھینی والا، احمدی ریلشور سینٹ، بڑودہ

الجواب حامداومصليا:

اگر آپ کا کسی صاحب نسبت بزرگ سے بیعت کا تعلق ہے، تو بہتر ہوتا کہ خواب کی تعبیر ان ہی سے دریافت کر لیتے؛ لیکن جناب نے چوں کہ احقر کو لکھا ہے، اس لیے تعبیر بتلا رہا ہوں، آپ کے اس خواب میں اہلیہ کے لیے ترقی درجات کی بشارت ہے اور اگر وہ پہلے سے کسی مرض، بیماری اور پریشانی میں مبتلا ہے، تو ان کے زوال کی طرف اشارہ ہے، اسی لیے بچوں کو آرام کرتے ہوئے سکون کی حالت میں دکھلایا گیا ہے، فکر کی کوئی بات نہیں ہے، اللہ ہم سب کا خاتمہ بالخیر فرمائے۔ (آمین)۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ

۸/۵/۱۹۷۷ء

[۱۲] خواب میں جنازہ کا حال اور اس کی تعبیر

۴۳۳-سوال: میں نے مولوی احمد رضا خان اور دیوبند کے وہ علماء جن پر حسام الحرمین میں کفر کا

فتوی لگایا گیا ہے، ان کا حال خواب میں دیکھنے کے لیے ''یا باطن'' کا پورا ہفتہ ورد کیا؛ لیکن مجھے کسی قسم کا خواب نہیں آیا، اس کے بعد میں نے ایک ہزار مرتبہ درود شریف کا ورد کیا، تو تقریباً آج سے ۲۲ ردن پہلے صبح سویرے ایک خواب دیکھا کہ میں جام نگر کے بردھن چوک میں ایک جنازے کے ساتھ ہوں اور یکا یک جنازہ نیچے گر گیا؛ لیکن میت کو میں نے دیکھا نہیں، میں بہت ڈر گیا اور چیختا چلاتا ہوا جنازہ پھینکنے والے کے پیچھے بھاگا؛ لیکن ان میں سے دو بائک پر، دو سائکل پر اور دو پیدل بھاگ گئے اور یہ چھ شخص ہندو تھے، اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی، آپ سے درخواست ہے کہ مذکور خواب کی تعبیر مرحمت فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

علماء محققین نے خواب کے بارے میں فرمایا کہ خواب حجت شرعی نہیں ہے، انبیاء و رسل کے خواب کے علاوہ امت کے کسی بھی فرد کے خواب سے استدلال جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ خواب حجت شرعی نہیں ہے۔ (۱)

نیز آپ نے وظائف پڑھ کر احمد رضا خان وعلماء دیو بند کی باطنی و برزخی حالت دیکھنے کی کوشش کی، وہ بھی وقت کو برباد کرنے کے برابر ہے، اتنے اوقات تسبیح وتحمید اور درود شریف واستغفار کرتے، تو ثواب ملتا۔

خواب کے بارے میں رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ چند قسم کے ہیں: (۱) حدیث نفس: انسان جن خیالات کے ساتھ ہوتا ہے، اسی کا نقشہ وہ دیکھتا ہے، یعنی انسان جن خیالات کے ساتھ سوتا ہے، وہی دیکھتا ہے۔ (۲) تخویف شیطان: شیطان چوں کہ انسان کا ازلی دشمن ہے؛ لہٰذا وہ انسان کو ڈراتا ہے، مارتا، خوف زدہ کرتا ہے، جس سے سوتا ہوا انسان چیخ کر، چلا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی شیطان کی طرف سے ہوتا ہے؛ لیکن اس میں انسان کھیل کود، ناچ گانا وغیرہ کی تصاویر دیکھتا ہے۔ (۳) مبشرات: مذکورہ خواب کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبوت کا اکتالیسواں حصہ ہے، کہیں اور فرمایا کہ خواب اللہ کی جانب سے مسلمانوں کے لیے بشارت وخوش خبری ہے۔ مستقبل میں ہونے والے بعض اچھے افعال کے متعلق اللہ کی جانب سے اچھے، نیک صالح متقی لوگوں کو خواب کے ذریعے خبر دی

(۱) والالهام المفسر بالقاء معنى في القلب بطريق الفيض ليس من أسباب المعرفة بصحة الشيء عند أهل الحق. (شرح العقائد النسفية- عمر بن محمد بن أحمد بن إسماعيل، أبو حفص، نجم الدين النسفي (م: ۵۳۷ھ)، ص: ۲۲، ط: یاسر ندیم- دیو بند)

فإن رؤيا الأنبياء وحي مطابق لما في نفس الأمر. (الروح- محمد بن أبي بكر بن أيوب ابن قيم الجوزية (م: ۷۵۱ھ)، ص: ۵۹، فصل ومما ينبغي أن يعلم أن عذاب القبر هو عذاب البرزخ، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

جاتی ہے۔ (۱) مذکورہ خواب احمد رضا کے لیے ہی ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ اس نے جو مسائل اور عقائد بتلائے ہیں، وہ احادیث وقرآن کے خلاف ہیں، اس کے بتائے ہوئے مسائل کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے اور جنازہ کو اٹھانے والے سب غیر مسلم (ہندو) تھے، حقیقت یہ ہے کہ اس نے جو باتیں بتلائی ہے، وہ انسان کو ایمان سے خارج کرنے والی ہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] خواب میں کسی بزرگ کو دیکھنا

۴۳۴-سوال: مجھے ایک خواب کی تعبیر درپیش ہے، خواب یہ ہے کہ مجھے تقریباً پانچ چھ مہینہ پہلے ایک خواب آیا کہ میں اپنی کولڈ ڈرنک کی دکان پر بیٹھا ہوا ہوں، اتنے میں میں دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ لمبی داڑھی والے میری دکان میں پانی بھر رہے ہیں، اور دکان کے سامنے فضل کریم بھائی بیٹھے ہیں- جو احمد آباد کالوپور میں رہتے ہیں تبلیغی اجتماعات میں بیان بھی کرتے ہیں- انہوں نے مجھے خواب میں کہا کہ جو شخص تیری دکان میں پانی بھر رہے ہیں وہ شیخ زکریاؒ ہیں، تجھے شرم نہیں آتی وہ تیری دکان میں پانی بھر رہے ہیں، تو میں خواب ہی میں شرمندہ ہوگیا...... برائے کرم آپ اس خواب کی تعبیر مرحمت فرمائیں گے؟ (خواب شیخ زکریاؒ کی زندگی میں آیا تھا)

الجواب حامداومصلیا:

بزرگوں کی زیارت، بزرگوں کا دکان میں آنا، گھر آنا، پانی بھرنا اس کا مطلب ان کی دعائیں وبرکتیں آپ کے ساتھ ہیں۔ (۲) فضل کریم صاحب آپ کو سمجھا رہے ہیں کہ آپ بزرگوں کی طرف متوجہ رہیے اور آپ کو ہمت کر کے جماعت میں وقت لگانا چاہیے، تبلیغی جماعت کی قدر کرنی چاہیے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ فرمایا کرتے تھے کہ موجودہ دور میں اللہ کی خاص رحمتیں تبلیغی جماعت کے ساتھ ہیں؛ لہٰذا اس کی قدر کرنی چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] خواب میں قرآن دیکھنا

۴۳۵-سوال: ایک دن میں دوپہر میں سویا ہوا تھا، کہ خواب میں یہ دیکھا کہ ایک غیر مسلم نے

(۱) قال محمد... وكان يقال: " الرؤيا ثلاث: حديث النفس، وتخويف الشيطان، وبشرى من الله. (صحيح البخاري: ۲/۱۰۳۹، كتاب التعبير، باب القيد، ط: البدر-دیوبند)

(۲) وكذلك رؤية العلماء و الصالحين خير عظيم. (تعبیر نامہ خواب: عربی، اردو- ترجمہ: سید حبیب احمد ہاشمی، ص: ۲۰، الباب الثالث، ط: نصیر بک ڈپو- نئی دہلی)

قرآن شریف کے اوپر بیٹھ کر غسل کیا، جب وہ آدمی غسل کر کے باہر آیا، تو میں نے اس سے پوچھا کہ کہاں سے آرہا ہے، تو اس آدمی نے جواب دیا کہ غسل کرنے کے لیے گیا تھا، پھر میں نے اس سے پوچھا کے تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ آپ لوگوں کا قرآن شریف ہے، اور اس کے اوپر بیٹھ کر میں نے غسل کیا ہے، یہ سن کر میں نے فوراً اس کے ہاتھ سے قرآن مجید لے لیا، قرآن میں سے کچھ آواز آئی، تو میں نے اس سے کہا کہ میرا دین سچا ہے، اس کے بعد میرے آنکھ کھل گئی۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

کافر اور غیر مسلموں کا کام دین کی بے حرمتی کرنا ہے؛ اس لیے آپ نے قرآن مجید پر بیٹھ کر غسل کرتے ہوئے دیکھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو سچ بات کہنے کی توفیق دی، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے دین کی خدمت لیں گے (ان شاء اللہ) اللہ آپ کو مبارک کرے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] کیا والدین کا انتقال کے بعد خواب میں آنا کسی شرعی سبب سے ہے؟

۴۳۶-سوال: والدین انتقال کے بعد خواب میں آتے ہیں، تو کیا وہ خواب دن کے وقت ہمارے دماغ میں گذرنے والے خیالات وافکار کی وجہ سے آتے ہیں، یا ان کا کوئی شرعی سبب ہوتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

والدین انتقال کے بعد خواب میں آتے ہیں؛ کیوں کہ ہر ایک کو اپنے ماں باپ کے ساتھ دلی اور قلبی محبت ہوتی ہے، اس کے لیے کوئی اور وجہ تلاش کرنا اپنا وقت برباد کرنے کے مرادف ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ.

(۹-التوبہ:۱۲۲)

ترکت فیکم أمرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما: کتاب الله وسنة نبيه. (موطأ إمام مالك)

فتاویٰ فلاحیہ جلد دوم

دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل اور دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی کے مسند افتاء سے دیے گئے فتاویٰ کا بیش قیمت مجموعہ

از: حضرت مفتی احمد ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ

سابق شیخ الحدیث وصدر مفتی: دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، گجرات،
صدر جمعیۃ علماء ہند، گجرات شاخ، و بانی دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی

مرتب: مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی

استاذ حدیث وفقہ: دارالعلوم اسلامیہ عربیہ، ماٹلی والا، بھروچ، گجرات

ناشر: حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات صاحب

خادم: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا۔ فون: 905 578 2547

رکن منتظمہ: دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی، بھروچ، گجرات، پن نمبر: 394115

تفصیلات

نام: **فتاویٰ فلاحیہ** جلد اوّل

صاحب فتاویٰ: حضرت مفتی احمد بن ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ

مرتب: مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی

بہ اہتمام: دار العلوم فلاح دارین، ترکیسر

ناشر: حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات

(خادم: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا)

سن طباعت: جمادی الاخریٰ، ۱۴۳۷ھ، مارچ، موافق: ۲۰۱۶ء

ملنے کے پتے:

(۱) دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی، انکلیشور، بھروچ، گجرات	02646 274243
(۲) حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات صاحب، خادم: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا	905 578 2547
(۳) مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی، دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ، گجرات	940 95 18452
(۴) مدنی ویلفیئر ٹرسٹ، کوسمبا، سورت، گجرات	9408 746664
(۵) ادارہ صدیق، ڈابھیل، ضلع: نوساری، گجرات	09904 886188
(۶) مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، یوپی	01336 22329
(۷) جے ایم سی انڈیا پبلشر پرائیویٹ لمیٹیڈ، جھاہاؤس، ویسٹ نظام الدین	011 24352220
(۸) مدرسہ اسلامیہ عربیہ، آزادویل، ساؤتھ افریقہ	114 132786
(۹) مدرسہ تعلیم الدین، اسپنکو بیچ، ڈربن، ساؤتھ افریقہ	273 19029916
(۱۰) اظہر اکیڈمی لمیٹیڈ، 60 لٹل ایلفورڈ لین، مانئر پارک، لندن، یو-کے	0208 9119797

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست فتاویٰ فلاحیہ جلد دوم

باب الوضوء (۵۲-۸۱)

[وضو کا بیان]

باب الغسل (۸۲-۱۰۱)

(غسل کا بیان)

باب المیاہ (۱۰۲-۱۳۳)

[پانی کے احکام]

باب التیمم (۱۳۴-۱۳۷)

تیمم کا بیان

باب المسح علی الخفین (۱۳۸-۱۴۱)

[موزے پر مسح کا بیان]

باب الحیض والنفاس والاستحاضة (۱۴۲-۱۵۳)

[حیض، نفاس اور استحاضہ کا بیان]

باب أحکام المعذورین (۱۵۴-۱۶۵)

[معذورین کے احکام]

باب الأنجاس (۱۶۶-۱۷۹)

[نجاست کا بیان]

باب الاستنجاء (۱۸۰-۱۸۵)

[استنجاء کا بیان]

کتاب الصلاۃ

باب المواقیت (۱۸۶-۲۲۷)

[اوقات نماز]

باب الأذان والإقامة (۲۲۸-۲۶۳)

[اذان واقامت کا بیان]

باب صفة الصلاة (۲۶۴-۳۰۵)

[شرائط وارکان اورآداب کا بیان]

باب الإمامة (۳۰۶-۳۵۱)

[امامت کا بیان]

باب إمامة الفاسق (۳۵۲-۴۴۱)

[فاسق کی امامت کا بیان]

باب الجمـــاعـــة (۴۴۲-۴۷۵)

[جماعت کا بیان]

باب الصفوف (۴۷۶-۴۹۹)

[جماعت کی صف بندی]

باب إدراك الفرائض وقضاء الفوائت (۵۰۰-۵۱۱)

[فرائض کو پانے اور فوت شدہ نماز کی قضا کا بیان]

باب مایفسد الصلاۃ ومایکرہ فیها (۵۱۲-۵۵۷)

[مفسدات ومکروہات کا بیان]

باب القراءة وزلة القاري (۵۵۸-۵۹۱)

[قراءت اور قاری کی لغزش کا بیان]

باب الوتر والنوافل والتہجد (۵۹۲-۶۳۱)

[وتر، نوافل اور تہجد کا بیان]

باب الاستسقاء (۶۲۹-۶۳۱)

[طلب باراں کا بیان]

باب التراویح (۶۳۲-۶۵۳)

[تراویح کا بیان]

باب سجود السھو (۶۵۴-۶۶۶)

[سجدۂ سہو کا بیان]

باب سجود التلاوۃ (۶۶۷-۶۷۷)

[سجدۂ تلاوت کا بیان]

باب صلاۃ المریض والمسافر (۶۷۸-۷۰۹)

[مریض اور مسافر کی نماز کا بیان]

باب الجمعة (۷۱۰-۷۴۹)

[جمعہ کا بیان]

باب الجمعة في القرىٰ (۷۵۰-۷۸۷)

[گاؤں میں جمعہ کا قیام]

باب العیدین (۷۸۸-۸۰۸)

[عیدین کا بیان]

☆☆☆

تقریظ وتائید

فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

ناظم: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد، جنرل سکریٹری: اسلامک فقہ اکیڈمی- انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فتویٰ کا مادہ "ف، ت، ی" ہے، فتویٰ اور فُتیا، افتاء سے ماخوذ ہے، افتاء کے معنی کسی امر کو واضح کرنے کے ہیں: أفتاه في الأمر، أبانه له. (القاموس المحیط،ص: ۲۰۷) فُتیا تو "ف" کے پیش کے ساتھ ہی استعمال ہوتا ہے؛ لیکن فتویٰ "ف" کے پیش اور زبر؛ دونوں طریقے پر استعمال کیا جاتا ہے۔(حوالہ سابق) البتہ "ف" پر زبر زیادہ مشہور اور مروج ہے، اور اہل مدینہ کی لغت بھی یہی ہے: الفتح في الفتوى لأهل المدينة. (لسان العرب: ۳۳۴۸) بل کہ علامہ زبیدی کا رجحان تو اس طرف ہے کہ فُتیا "ف" کے پیش کے ساتھ ہونا چاہیے اور فتویٰ "ف" کے زبر کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔(دیکھیے: تاج العروس: ۳۸/۲۰)ــــــــــ افتاء کے معنی فتویٰ دینے کے ہیں اور استفتاء کے معنی فتویٰ طلب کرنے کے ہیں۔

قرآن مجید میں اِفتاء اور استفتاء کے الفاظ مجموعی طور پر گیارہ (۱۱) جگہ استعمال ہوئے ہیں، اور حدیث کی نو (۹) مشہور کتب، جن کی فہرست سازی "المعجم المفهرس" میں کی گئی ہے، میں بارہ (۱۲) مواقع پر فُتیا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (دیکھیے "المعجم المفہرس لألفاظ الحدیث النبوی الشریف" کی متعلقہ بحث)

فتویٰ کی اصطلاحی تعریف کے سلسلے میں اہل علم نے مختلف تعبیرات اختیار کی ہیں، بعض لوگوں نے فتویٰ کی وہی تعریف کی ہے، جو "اجتہاد" کی ہے؛ کیوں کہ متقدمین کے نزدیک افتاء اور مفتی سے مراد مجتہد ہوا کرتا تھا؛ اس لیے بہت سے علمائے اصول نے اجتہاد وتقلید کی بحث میں اِفتاء اور استفتاء کے احکام ذکر کیے ہیں، بعد کے فقہاء نے اِفتاء کی ایسی تعریف کی ہے، جس میں بہ مقابلہ اجتہاد کے عموم پایا جاتا ہے، علامہ قرافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الفتوى إخبار عن الله تبارك وتعالى في إلزام أو إباحة. (کتاب الفروق: ۴/ ۵۳)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی امر کے لازم ہونے یا مباح ہونے کی خبر دینا فتویٰ ہے۔

علامہ بنانیؒ رقم طراز ہیں:

الإخبار بالحکم من غیر إلزام. (حاشیہ جمع الجوامع: ۲/ ۳۹۷)

لازم قرار دیے بغیر کسی حکم کی بابت خبر دینے کو فتویٰ کہتے ہیں۔

علامہ حصکفیؒ کی عبارت سے ظاہر ہے کہ حکم کے بارے میں خبر دینے کا نام "افتاء" ہے:

...إلا أن المفتي مخبر عن الحکم. (الدر المختار مع الرد: ۱/ ۱۷۶، مقدمہ)

فتویٰ کی اصطلاحی تعریف کے سلسلے میں چند باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں:

☆ مفتی کے فتویٰ کی حیثیت خبر و اطلاع کی ہوتی ہے، جیسے قاضی، فریقین پر احکام کو لازم قرار دیتا ہے، مفتی، مستفتی پر اپنے حکم کو لازم نہیں کرتا، اور نہ وہ اس کا مجاز ہے۔

☆ فتویٰ، حکم سے متعلق ایسی اطلاع کو کہتے ہیں، جو کسی سوال کے جواب میں ہو، سوال و استفسار کے بغیر اپنی طرف سے حکم شرعی کی رہنمائی کی جائے، وہ وعظ و ارشاد ہے نہ کہ فتویٰ۔

☆ فتویٰ ایسے سوال کا جواب ہوتا ہے، جو پیش آمدہ واقعات سے متعلق ہو، اگر کوئی واقعہ پیش نہیں آیا؛ بل کہ اس کو فرض کر کے جواب دیا گیا، تو یہ تعلیم ہے، نہ کہ افتاء، اس طرح فتویٰ کی جامع تعریف ڈاکٹر شیخ حسین محمد ملاّح کے الفاظ میں اس طرح ہوگی:

الإخبار بحکم اللہ تعالی عن الوقائع بدلیل شرعي لمن سأل عنه. (الفتوی: نشأتها وتطورها: ۱/ ۳۹۸)

پیش آمدہ واقعات کے بارے میں دریافت کرنے والے کو دلیل شرعی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بارے میں خبر دینے کو فتویٰ کہتے ہیں۔

منصب افتاء کی اہمیت اور کار افتاء کی نزاکت:

افتاء کی ذمے داری، بہت ہی نازک ذمے داری ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فتویٰ کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے: ﴿قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ﴾ [النساء: ۱۲۷] ایک اور موقع پر ارشاد ہے: ﴿قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ﴾ [النساء: ۱۷۶] گویا اللہ تعالیٰ کی ذات خود مفتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے منشا کی تشریح و توضیح، اپنے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حوالے کی: ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ [النحل: ۴۴] یہ بیان و وضاحت کی ذمے داری، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر عہد کے علماء و ارباب افتاء کے حصے میں آئی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "مفتی" گویا خود "شارع" کا نائب ہے، اور اس کی طرف سے احکام شرعیہ میں لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے، اسی لیے علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مفتی کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ فتویٰ دینے میں وہ کس کا قائم مقام ہے:

و لیعلم المفتی عمن ینوب في فتواه. (إعلام الموقعین: ۱/۱۱)

اور امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ ''مفتی'' اللہ کی جانب سے رائے کا اظہار کرتا ہے: **المفتي موقع عن الله تعالی.** (شرح مہذب: ۱/۴۰، مقدمہ)

اسی لیے فتویٰ دینے میں بہت احتیاط کرنی چاہیے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: تم میں جو شخص فتویٰ دینے میں جری ہو، وہ دراصل دوزخ پر جری ہے۔ (سنن دارمی: ۱/۵۷)

ابن ابی لیلیٰ سے منقول ہے: میں نے ایک سو بیس (۱۲۰) انصاری صحابہؓ کو دیکھا کہ ان میں ایک سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا، تو وہ دوسرے کا، دوسرا تیسرے کا حوالہ دیتا اور اسی طرح ایک دوسرے سے رجوع کرنے کی تلقین کرتا، یہاں تک کہ یہ سوال پھر پہلے شخص کی طرف لوٹ آتا۔ (شرح مہذب: ۱/۴۰، مقدمہ)

ان ہی سے منقول ہے کہ صحابہؓ کا حال یہ تھا کہ اگر انھیں کوئی حدیث یاد ہوتی، تو ان کی خواہش ہوتی کہ ان کے بجائے ان کا بھائی اس روایت کو نقل کردے اور کسی سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو وہ چاہتا کہ اس کے بجائے اس کا بھائی بتادے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جو شخص ہر سوال کا جواب دے، وہ مجنون ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کہا کرتے تھے کہ اگر علم کے ضائع ہوجانے کا خوف نہ ہوتا، تو فتویٰ نہ دیتا۔ امام مالکؒ کا حال یہ تھا کہ اڑتالیس (۴۸) مسائل پوچھے گئے، تو بتیس (۳۲) کے بارے میں کہہ دیا کہ مجھے اس کا علم نہیں۔ ایک مسئلے کے جواب کے بارے میں فرمایا: مجھے معلوم نہیں، عرض کیا گیا کہ یہ تو آسان اور معمولی مسئلہ ہے، تو آپؒ غصہ ہوگئے اور فرمایا کہ علم کی کوئی بات معمولی نہیں۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ فتویٰ کی جو صلاحیت اور مطلوبہ استعداد سفیان بن عیینہؒ میں تھی، میں نے کسی میں نہیں دیکھی؛ لیکن میں نے ان کو فتویٰ سے جتنا زیادہ بچتے ہوئے دیکھا، کسی اور کو نہیں دیکھا۔ اثرمؒ ناقل ہیں کہ میں نے امام احمدؒ کو بہت سے مسائل میں یہ کہتے ہوئے دیکھا ہے: ''مجھے معلوم نہیں''۔ سفیان بن عیینہؒ اور سحنونؒ کہتے ہیں کہ فتویٰ دینے میں جری وہی ہوسکتا ہے، جو کم علم ہو۔ عطا ابن سائبؒ تابعی ہیں، ان کا بیان ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ ان سے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا تو گفتگو کرتے ہوئے ان پر لرزہ طاری ہوجاتا۔ (ملخص از: شرح مہذب: ۱/۴۰-۴۱)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سلف صالحین افتاء کے سلسلے میں کس قدر احتیاط برتتے تھے۔

امت میں سب سے پہلے مفتی خود رسول اللہ ﷺ تھے، علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

و أول من قام بهذا المنصب الشريف سيد المرسلين. (اعلام الموقعین: ۱/۱۱)

آپ ﷺ کی شان یہ تھی کہ آپ ﷺ کی ہر بات وحی پر مبنی اور منشاء ربانی کی ترجمان ہوتی تھی:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى ۝﴾ [النجم: ۳-۴] نیز ارشاد ہے: ﴿إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحٰى إِلَيَّ﴾ [یونس: ۱۵]

اس لیے یہ بات تو ظاہر ہے کہ بنیادی طور پر آپ ﷺ کے فتاویٰ وحی کی بنیاد پر ہوا کرتے تھے، لیکن کیا آپ ﷺ اجتہاد سے بھی فتویٰ دیا کرتے تھے، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ابو یوسفؒ اور اکثر اصولیین اس کے قائل ہیں کہ آپ ﷺ احکام شرعیہ میں بھی اجتہاد پر مامور تھے۔ (دیکھیے: تیسیر التحریر: ۴/ ۱۸۵، کشف الاسرار للبخاري: ۳/ ۳۸۶) یہی رائے امام رازیؒ اور قاضی بیضاویؒ کی بھی ہے۔ (دیکھیے: المحصول للرازي: ج:۲، قسم: ۳، ص۹، نهاية السول شرح منهاج الوصول للأسنوي: ۳/ ۲۶۴، منهاج الوصول للبيضاوي، ص:۱۷۶) امام غزالیؒ کے نزدیک بھی یہی راجح ہے۔ (المستصفی: ۲/ ۳۵۵)

امام سرخسیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے نقطۂ نظر کی اس طرح صراحت کی ہے کہ حضور ﷺ اس بات پر مامور تھے کہ کسی بھی واقعہ میں وحی کا انتظار کریں، اگر انتظار کے باوجود وحی کا نزول نہیں ہوتا، تو یہ آپ ﷺ کے لیے رائے اور اجتہاد پر عمل کرنے کی من جانب اللہ اجازت ہوتی، البتہ اگر آپ ﷺ سے اجتہاد میں چوک ہوتی، تو من جانب اللہ متوجہ فرما دیا جاتا، لہٰذا اگر آپ ﷺ نے کسی امر کی بابت اجتہاد فرمایا ہو، اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر کوئی تنبیہ نازل نہ ہوئی ہو، تو یہ اس اجتہاد کے قطعی ہونے کی علامت ہے۔ (دیکھیے: اصول السرخسی: ۲/ ۱۹۶)، کشف الاسرار: ۳/ ۳۸۶)

عہد نبوی میں رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے صحابہ نے بھی فتویٰ دیا ہے، قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ وعلیؓ عہد نبوی میں بھی فتویٰ دیا کرتے تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۲/ ۳۳۵) سہل بن ابی حثمہ راوی ہیں کہ عہد نبوی میں تین مہاجر صحابہ: حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور تین انصاری صحابہ: حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ فتویٰ دیا کرتے تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱/ ۸۶)

علامہ ابن قیمؒ کی تفصیل وتحقیق کے مطابق ۱۳۰ رسے کچھ زیادہ صحابہؓ اور صحابیاتؓ نے فتاویٰ دیے ہیں، صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا دور، فقہ وفتاویٰ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے، ائمہ مجتہدین اور بعد کے فقہاء نے ان فتاویٰ سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔

دوسری صدی ہجری فقہ وفتاویٰ اور اجتہاد واستنباط کے لحاظ سے سب سے زرین دور کہلانے کا مستحق ہے، جس میں ایسے ائمہ مجتہدین پیدا ہوئے، جنھوں نے فقہ وفتاویٰ کا نہایت ہی نمایاں کارنامہ انجام دیا اور ایک بڑے گروہ نے ان کی اتباع وپیروی اور اقتدا وتقلید کا راستہ اختیار کیا، انھیں میں امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، اہل سنت کے چاروں ائمہ مجتہدین ہیں، جن کی فقہ کو امت کے سواد اعظم نے اپنی چشم محبت کا سرمہ بنایا۔

یہ حقیقت ہے کہ اس آخری دور میں ''برصغیر'' کو فتاویٰ کے نظام کے سلسلہ میں، ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے، جس کا آغاز شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوتا ہے اور جس کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ ہندوستان کے تقریباً تمام ہی خطوں میں وہاں کی ممتاز دینی درس گاہوں کے تحت دارالافتاء کا ایک مضبوط، منضبط

اور ذمہ دارانہ شعبہ قائم ہے، وہاں فقہ وفتاویٰ کی معتبر شخصیات اس ذمہ داری کو انجام دیتی ہیں۔

صوبۂ گجرات کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ یہاں قرن اول میں مسلمانوں کا قدم پہونچا، تابعین اور تبع تابعین نے یہاں رخت سفر کھولا، اسی لیے اس علاقہ میں ماشاء اللہ بہ مقابلہ ہندوستان کے دوسرے علاقہ کے، زیادہ دین داری پائی جاتی ہے اور ایک اہم بات یہ ہے کہ معاشی فارغ البالی اور مرفہ الحالی کے باوجود یہاں لوگوں میں تدین پایا جاتا ہے اور جب دین پر عمل کا جذبہ بڑھے گا، تو دین وشریعت سے متعلق سوالات بھی ذہن میں جنم لیں گے؛ اسی لیے گجراتی زبان میں فتاویٰ کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اب اسے اردو زبان کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی جارہی ہے، تاکہ اردو کی وسیع دنیا بھی اس سے مستفید ہو سکے۔

انہی علمی وفقہی ذخائر میں ممتاز عالم دین حضرت مولانا مفتی احمد بیمات کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، جسے بہ زبان اردو شائع کیا جارہا ہے۔ ——— راقم الحروف کو حضرت مفتی بیمات صاحبؒ سے نیاز حاصل ہے اور متعدد فقہی مجالس میں ان کی آراء کو سننے اور ان کے فقہی مباحث سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، ان کی فقیہانہ شان ان کے ان فتاویٰ سے بھی ظاہر ہے، ان کے فتاویٰ عام طور پر فقہ حنفی پر مبنی ہے، کیوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا سواد اعظم اسی فقہ کا متبع ہے؛ لیکن بعض مواقع پر لوگوں کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے توسع سے بھی کام لیا گیا ہے، فتویٰ دیتے ہوئے فقہ کی مستند کتابیں پیش نظر رکھی گئی ہیں اور راجح اقوال کی رہنمائی کی گئی ہے، نیز بحمد اللہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اہم مسائل فتاویٰ کے ذیل میں آگئے ہیں۔ ان شاء اللہ جب اس مجموعہ کی تمام جلدیں مرتب ہو کر آئیں گی، تو یہ علمائے ہند کے ذخیرۂ فتاویٰ میں ایک نمایاں اضافہ ہوگا۔

فتاویٰ کے اس مجموعہ کو بڑی محنت، خوش سلیقگی اور حسن ترتیب کے ساتھ عزیز گرامی **مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی سلمہٗ** (استاذ حدیث وفقہ: دار العلوم ماٹلی والا، بھروچ) نے مرتب کیا ہے۔ انہوں نے حسب ضرورت فتاویٰ کی زبان کو آسان بنایا ہے، آیات واحادیث کے حوالہ جات کا اضافہ کیا ہے اور فقہ کے مستند مراجع سے مسائل کی تفصیلی تخریج کی ہے، سوالات پر عناوین قائم کئے گئے ہیں۔ باب اور مسئلہ کی نمبر اندازی کی گئی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرتب کی محنت نے اس کی اہمیت اور خوبصورتی کو چار چاند لگا دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مولف، مرتب اور ناشر کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے اور اس کے نفع کو عام وتام کرے، آمین۔

خالد سیف اللہ رحمانی

ناظم: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد

یکم جمادی الثانی ۷ ۱۴۳ھ

۱۱ مارچ ۲۰۱۶ء بروز جمعہ (دربھنگہ ریلوے اسٹیشن)

تقریظ وتاثر:

حضرت مولانا اقبال محمد ٹنکاروی دامت برکاتہم

(مہتمم واستاذ تفسیر وحدیث: دار العلوم اسلامیہ عربیہ، ماٹلی والا، بھروچ)

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم، وعلی الہ وصحبہ أجمعین، أما بعد!

اسلام کی ابتدائی دو صدیوں میں مسلمانوں کی آمد ورفت کے نتیجہ میں گجرات کے کناروں پر واقع متعدد بندرگاہوں میں مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں، جن کی شہادت تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں گجرات آنے والے عرب سیاحوں نے دی ہے۔

قرب مکانی کے باعث حجاز، یمن، بصرہ وغیرہ سے سمندری راستوں کے ذریعہ گجرات تک آمد ورفت آسان ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد میں اہم جو تاجر پیشہ افراد اور خاندان یہاں مختلف جگہوں پر آباد ہوگئے، ان آباد ہونے والوں نے مسجدیں اور درس گاہیں قائم کیں، جن کے ذریعہ ابتدائی سطح پر دینی تعلیم کی بنیاد پڑی اور اس میں ہر دم ترقی ہوتی گئی۔

علمی ترقی کا دوسرا سبب گجرات کے سلاطین وامراء کی علم دوستی اور علم پروری تھا، گجرات میں مسلمانوں کے اقتدار کے قیام سے پیشتر جو راجپوت راجے مہاراجے حکومت کرتے تھے، وہ بھی وسیع المشرب اور روشن خیال حکمران تھے۔

ان اسباب وعوامل کے نتیجے میں گجرات کے تعلقات حجاز، یمن اور مصر کے ساتھ قریب سے قریب تر ہوتے گئے، گجرات کے چند بڑے شہر مثلاً احمد آباد، پٹن، بھروچ اور سورت تو ملک حجاز کا حصہ معلوم ہونے لگے تھے، ان تعلقات میں حکومت اور سیاست کو بہت زیادہ دخل نہیں تھا، ان کی بنیاد تجارت، ثقافت اور تعلیم وتعلم کے عمل پر رکھی گئی تھی، ان سے دونوں جانب کے عوام وخواص متاثر ہوئے تھے، اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ عرب مؤرخین نے اپنی تصانیف میں گجرات کو اہم مقام عطا کیا اور گجراتیوں کے علوم دینیہ کے میدان میں کارہائے نمایاں کا خاص ذکر کیا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ گجرات کی سرزمین، فقہاء ومحدثین سے کبھی خالی نہیں رہی، بلکہ بعض دور ایسے آئے کہ یہاں کے

علماء، فقہاء اور فضلاء کا شہرہ پورے عالم اسلام میں گونجنے لگا، البتہ ایسے وقفے بھی آئے، جس میں یہاں علم کی لو دھیمی ہوگئی؛ مگر پھر اس کی نشاۃ ثانیہ ہوتی رہی، خصوصا آٹھویں صدی کے بعد مسلسل فقہاء کی ایک بڑی تعداد گجرات میں موجود رہی ہے۔

ابوالفتح رکن الدین بن حسام الدین مفتی ناگوری، جو ناگپور کے مفتی تھے، انہوں نے بمقام نہروالہ اپنے قیام کے دوران، گجرات کے قاضی القضاۃ قاضی حماد الدین احمد بن قاضی اکرم کی فرمائش پر اپنے بیٹے داؤد کی مدد سے "الفتاوی الحمادیہ" لکھی، اس کتاب میں جن تصانیف کا حوالہ دیا گیا ہے یا جن تصانیف میں اس کتاب کا حوالہ ہے، ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب آٹھویں صدی کے اواخر میں یا نویں صدی کے اوائل میں لکھی گئی ہے، مصنف نے ان کتابوں کی طویل فہرست (۲۰۴) درج کی ہے، جن سے انہوں نے اپنی کتاب مرتب کرنے میں استفادہ کیا ہے، یہ ایک معتبر تصنیف ہے اور فتاوی عالم گیری میں بھی اس کے حوالے دیے گئے ہیں۔

یہ کتاب مخطوط شکل میں بانکی پور (۱۹-۱: ۱۷۲۳) فہرست عربی مخطوطات دہلی، انڈیا آفس لنڈن (۸۱۵) خدیوی کتب خانہ قاہرہ (۳/۸۸) رامپور (۲۲۲) بنگال (۱۴) کتب خانہ کلکتہ مدرسہ (۴۱) کتب خانہ انڈیا آفس (۱۶۸۹-۱۶۹۱) میں موجود ہے۔

اور گجرات ہی کے ایک ممتاز عالم قاضی جگن گجراتی کی ترتیب دی ہوئی کتاب خزانۃ الروایات ہے، جو فقہ حنفی کے احکام کی تفصیلات پر مشتمل ہے، یہ کتاب چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں لکھی جانے والی کتابوں سے اقتباسات کا مجموعہ ہے، شروع میں کتاب العلم کے عنوان سے ایک مقدمہ بھی تحریر کیا گیا ہے، اس میں انہوں نے علم اور علماء کی فضیلت بیان کی ہے، وہ خود حنفی تھے، اس لئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اوصاف وفضائل پر بھی ایک مقالہ قلم بند کیا ہے، انہوں نے فتاوی اور مفتی سے متعلق فنی نکات کی بھی تشریح کی ہے، یہ کتاب مخطوط شکل میں دہلی (۱۴۳۷) فہرست دینی کتب خانہ استنبول (۶۰۵) فہرست کتب خانہ نوری عثمانیہ استنبول (۱۵۲۰) فہرست کتب خانہ عشیر آفندی استنبول (۳۲۶) بوہار (۲/۱۵۶) بانکی پور (۱۹-۱: ۳۹) رامپور (۱۷۲) آصفیہ (۲/۱۰۸۴) میں موجود ہے۔

شہاب الدین احمد بن محمد جیلانی: ایک جید عالم تھے، گجرات میں پرورش پائی، اس میں اختلاف ہے کہ ان کا تعلق نویں صدی سے تھا یا دسویں صدی سے، اردو کے مشہور ماہنامہ "المعارف" اعظم گڑھ بابت مئی ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۴۷ پر شائع شدہ ایک مضمون کے مطابق، انہوں نے ایک کتاب فتاوی ابراہیم شاہ شرقی کے لیے لکھی تھی، محمد عبدالاول جونپوری نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ شہاب الدین دولت آبادی کے ہم عصر تھے اور ان کی قبر جونپور میں موجود ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ فتاوی ابراہیم عادل شاہ کے نام معنون کی گئی ہے۔

مذکورہ کتاب فتاوی ابراہیم شاہیہ بوہار عربی مخطوطات فہرست (۲/۱۵۹) بانکی پور (۵۲-۴۹-۱۷) آصفیہ

(۲:۱۰۵۲-۳:۴۴۲) رامپور (۲۲۱) انڈیا آفس (۴-۱۷) میں موجود ہے، نیز اس پر حافظ نذیر احمد جریدہ کا مختصر نوٹ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (۴۶) میں موجود ہے۔

شاہ وجیہ الدین گجراتی نے **حاشیة علی شرح الوقایه**، بوہار (۱۶۴) رامپور (۱۸۶) **حاشیة علی التلویح** ندوۃ العلماء، لکھنؤ (۱۷۲) **حاشیة علی أصول البزدوي** تذکرہ علماء ہند (۲۵۰) اور **حاشیة علی الشرح العضدی علی المختصر لابن حاجب** تحریر فرمائی۔

شیخ عبد اللطیف بن جمال بن حامد نہروالی نے ابراہیم بن موسیٰ طرابلسی کی کتاب **مواهب الرحمن** کی شرح لکھی، جو بشکل مخطوط بانکی پور (۱۷۴۳) میں موجود ہے۔

قاضی محمد عیسیٰ بن شیخ عبد الماجد صدیقی جونا گڑھی: جونا گڑھ کے قاضی تھے اور اسلامی علوم پر بہت عبور رکھتے تھے، انہوں نے فتح القادر شرح الہدایہ لکھی، اس کا صرف ایک حصہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے پاس تھا، جو ان کی اولاد میں سے ہے۔

شیخ نور الدین بن شیخ محمد احمد آبادی نے **حاشیة علی التلویح**، **حاشیة علی شرح الوقایه** اور **حاشیة علی شرح المطالع** تصنیف فرمائی، ان کتابوں کا تذکرہ رحمن علی لکھنوی نے تذکرۂ علماء ہند میں کیا ہے۔

نعمت اللہ بن طاہر نہروالی نے صلوۃ التراویح تالیف فرمائی، جو اسلامیہ کالج پیشاور کی لائبریری کے اورینٹل سیکشن کی فہرست (۶۵۴) میں درج ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی کچھ کتابیں اس فن میں لکھی گئیں، جیسے فیض الحسن بن نور الحسن سورتی گجراتی نے **فرح شاهی شرح خلاصة الکیدانی**، فتاوی نقشبندیہ، قاضی عیسیٰ بن عبد الرحیم گجراتی نے مسئلۂ سماع پر سب سے زیادہ مفصل اور نافع کتاب عربی زبان میں لکھی، اسی طرح بندوق کی گولی سے مرے ہوئے جانور کے حکم کے متعلق ایک کتاب شیخ محمد بن یوسف سورتی کی ہے، شیخ عبد القادر بن عبد الاحد باعلظ شافعی سورتی نے **تحفة المشتاق فی احکام النکاح والانفاق** اور شیخ ابراہیم بن عبد اللہ باعلظ شافعی سورتی نے **تحفة الاخوان** لکھی۔

اصول فقہ میں شیخ احمد بن سلیمان گجراتی نے حاشیہ برحاشیہ ملا عبد الحکیم، شیخ عبد النبی بن عبد اللہ شطاری گجراتی نے **المواهب الالهی شرح أصول ابراهیم شاهی**، علم الفرائض میں شیخ محمد ہاشم سامرودی سورتی نے **جوهر النظم** تحریر فرمائی اور ایک جامع کتاب اردو زبان میں بھی تحریر فرمائی۔

دور اخیر میں فقہ وفتاوی کے خدمات انجام دینے والوں میں مفتی احمد بزرگ سملکی، مفتی اسماعیل بسم اللہ، مفتی اسماعیل گوراراندیری، مولانا مفتی اکبر (مولانا نذیر صاحب پالن پوری کے برادر خورد) مفتی سید شمس الدین بڑودوی،

مفتی علی محمد تراجوی، مفتی محمد سعید احمد صاحب راندیری، مفتی محمد حسین صاحب راندیری، مفتی مرغوب احمد لاجپوری، مفتی احمد اشرف راندیری، مفتی عبدالغنی کاوی، مفتی احمد بیمات صاحب، مفتی گجرات حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری ،مفتی اسماعیل واڈی والا صاحب راندیری، مفتی اسماعیل بھڑکودروی رحمۃ اللہ علیہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت مفتی احمد بیمات صاحب رحمۃ اللہ علیہ :

استاذ محترم، شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی احمد بیمات صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حق تعالیٰ شانہ نے مختلف النوع صلاحیتوں سے نوازا تھا، درس کی پختگی و تحقیق کے اعتبار سے جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل سے ہی آپ کی شہرت تھی ،فلاح دارین-ترکیسر میں بخاری شریف کے اسباق انتہائی ضبط و اتقان اور پابندئ اوقات کے ساتھ ہوتے تھے، درس کے علاوہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی زیادہ تر مشغولیت فتاویٰ نویسی کی تھی ،آپ کے پاس آنے والے مختلف النوع مسائل سے آپ کو امت کی ہر قسم کی پریشانیوں، پیش آمدہ مسائل اور اخلاقی پستی کا بھی اندازہ ہوتا تھا؛ کیوں کہ سوالات (استفتاء) امت کی اعتقادی، عملی، اخلاقی، معاشرتی اور معاملاتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔

فتاویٰ کے علاوہ آپ نے گجراتی زبان میں مختلف موضوعات (اعتقادات، عبادات، اخلاقیات ،معاملات اور معاشرت) پر وقت کی ضرورت کے مطابق کتابیں تصنیف فرمائیں، یہ تصانیف درحقیقت آپ کے فتاویٰ ہی کی تکمیل وتشریح ہیں،کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مستفتی کو تفصیلی جواب لکھنا مشکل معلوم ہوتا ہے،اور مسئلے کی وضاحت کے لیے طویل تحریر کی ضرورت ہوتی ہے، آپ نے اسی کے پیش نظر ”مسائل حج ،مسائل قربانی اور سودی لین دین“ وغیرہ تصنیف فرمائیں۔

آپ کا درسی و روحانی تعلق اپنے استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، لہٰذا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ والا سوز دروں، اعتقادی پختگی، لایخاف فی اللہ لومۃ لائم جیسی عمدہ صفات آپ میں بھی علی وجہ الاتم موجود تھیں، جو آپ کے فتاویٰ میں بھی جھلکتی نظر آتی ہے، چناں چہ اعتقادی مسائل میں جہاں آپ نے کتاب وسنت کی روشنی میں رہنمائی کی ہے، وہیں معاشرہ میں پھیلی ہوئی بدعات وخرافات کا بھی خوب اچھے انداز میں تعاقب فرمایا ہے۔ مسائل کی جزئیات پر آپ کو کافی عبور تھا، فلاح دارین-ترکیسر کی مسجد میں کبھی طلبۂ عزیز سے نماز کے درمیان سہو ہو جاتا، تو حضرت مولانا سید ابرار احمد صاحب اور دیگر اساتذہ- جو مسئلہ سے واقف ہوتے تھے- حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس طالب علم کو بھیجتے تھے اور ان کی ہدایت کی مطابق ہی عمل کرتے تھے، حضرت مفتی صاحب دوسری مسجد میں ہوتے تھے،تو آپ کے آنے کا انتظار کیا جاتا تھا۔

چوں کہ جمعیت علمائے ہند، اصلاح المسلمین اور دینی تعلیم بورڈ سے آپ کی گہری وابستگی تھی ،اور معاملات ومعاشرت کے مسائل سے خوب سابقہ پڑتا تھا، اس لیے آپ نے معاملاتی نزاکتوں اور معاشرتی پریشانیوں کا حل

بہت عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب کے بیشتر فتاوی اور اکثر کتابیں گجراتی زبان میں تھیں، جن سے استفادہ محدود تھا، اللہ تبارک وتعالی جزائے خیر عطاء فرمائے صاحب زادۂ محترم جناب حافظ اسعد صاحب کو، کہ انہوں نے حضرت مفتی صاحب کے تمام فتاوی اور گجراتی میں لکھی ہوئی حضرت مفتی صاحب کی تمام قیمتی علمی تصنیفات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کے لیے جدوجہد فرمائی اور اللہ تعالی نے ان کی جدوجہد کو اتمام تک پہنچایا۔ **فللہ الحمد علی ذلك.**

کتابوں کے ترجمے کے مقابلہ میں حضرت مفتی صاحب کے فتاوی کو ترتیب دینا مشکل امر تھا؛ کیوں کہ فتاوی کی اردو زبان میں منتقلی، حوالے جات کی تلاش، عناوین سازی، زبان کی سلاست، مسائل کی تخریج اور ان پر نظر ثانی وثالث کے مختلف مراحل طے کرنے تھے۔

خوشی کی بات ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے فتاوی مختلف مراحل سے گزر ''فتاوی فلاحیہ'' کے نام سے ہمارے سامنے آرہے ہیں، پہلی جلد ایمان وعقائد کے مسائل پر مشتمل تھی، اب دوسری جلد کتاب الطہارت اور کتاب الصلاۃ پر مشتمل ہے، فتاوی کی زبان عام فہم اور سلیس رکھی گئی ہے، تخریج میں آیات، احادیث اور خاص کر کے فقہی عبارات (مسئلہ کے ہر ہر جزء کی تفصیلی تخریج) اور تخریج کے دیگر اصول وقواعد کی پابندی کی گئی ہے، جدید املاء اور رموز اوقاف کی بھی رعایت کی گئی ہے۔

مسائل میں معمولی سی تشنگی نظر آتی تھی، جو تخریج کے تحت دیگر عبارتوں اور فتاوی کے حوالہ سے مکمل کر لی گئی ہے، اسی طرح بعض جدید مسائل کی تنقیح نہیں ہوئی تھی، تخریج کے ذریعہ اس کی بھی تلافی کر لی گئی ہے، تخریج کا یہ عمل خاص کر کے کچھ مسائل کی تشنگی دور کرنا، حوالجات اور جدید مسائل کی تنقیح، اسی طرح کچھ مسائل میں استدراکات کا جو عمل کیا گیا ہے (جو بہت ضروری تھا) یہ مفتی صاحب کے فتاوی کو مدلل کر رہا ہے۔

ناچیز نے نمونے کی فائل دیکھنے کے بعد مشورہ دیا تھا کہ جدید مسائل کی تنقیح میں مختلف فقہ اکیڈمی کی تجاویز اور عصر حاضر کی تبدیلی، عرف وعادات کا بدلنا، نیز جدید میڈیکل اور جینٹک سائنس کی نئی تحقیقات بھی مد نظر رکھی جائیں، مرتب فتاوی نے اس کا بھر پور خیال کیا ہے؛ اور فقہ اکیڈمی کی تجاویز کے حوالے متعدد جگہ موجود ہیں؛ اس لیے توقع ہے کہ ان شاء اللہ حضرت مفتی صاحب کے یہ فتاوی، عصر حاضر کے دیگر فتاوی میں اپنی انفرادی شان برقرار رکھیں گے۔

نوٹ: کچھ فتاوی میں اجمال کی وجہ یہی ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، لہذا حضرت مفتی صاحب کے فتاوی پڑھنے والوں کو آپ کی تصانیف سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اس موقع پر میں کتاب کے مختلف مراحل میں علمی تعاون کرنے والے تمام علمائے کرام کو مبارک باد دیتا

ہوں، کتاب کا سب سے مشکل مرحلہ تخریج کے بعد تنقیح اور اس کو عصر حاضر کی تحقیقات جدیدہ سے منطبق کرنے کا عمل جس شخصیت نے انجام دیا ہے، میری مراد اس سے حضرت مولانا مفتی مجتبیٰ حسن صاحب قاسمی دامت برکاتہم ہیں، میں بہ طور خاص انھیں مبارک باد دیتا ہوں؛ کہ انہوں نے حضرت مفتی بیات صاحبؒ کے فتاوی کو اپنی جدوجہد اور علمی کاوش سے مفید سے مفید تر بنا دیا ہے۔ میں نے پورا مسودہ استفادہ کے ساتھ تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا ہے؛ تا کہ استاذ محترم کی بات منقح ہو کر لوگوں کے سامنے آئے، اور علمائے کرام بھی اس سے زیادہ مستفید ہوں، اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج بھی میں نے دیکھا ہے کہ کوئی شاگرد آپ سے کسی مسئلہ کی تحقیق میں اپنا اختلاف ظاہر کرتا، تو حضرت مفتی صاحب بہت سنجیدگی کے ساتھ اس کی بات سنتے تھے، مجھے خود دورۂ حدیث کے سال کئی مسائل کے دریافت کرنے میں اس کا احساس ہوا، نیز کچھ فتاوی میں نے بھی گجراتی رجسٹر میں نقل کیے ہیں، اس وقت بھی سوال کرنے پر حضرت نے بڑی فراخ دلی سے میری بات سن کر حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔

لہٰذا مسودہ کے مطالعہ کے دوران جہاں جواب میں معمولی سی تشنگی محسوس ہوئی، وہاں مولانا مفتی مجتبیٰ حسن صاحب نے حاشیہ میں اس کی تلافی کردی ہے، اسی طرح کچھ مسائل جدیدہ میں مزید تحقیق ہوئی ہے، وہاں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی عام متون کی عبارتوں اور قدیم فقہائے کرام کی طرز پر ہے، لیکن محشی صاحب نے وہاں دیگر فقہائے کرام کی عبارتیں نقل کر کے اس کی مکمل تنقیح فرمادی ہے، اور کچھ مواقع پر استدراکات بھی کیے ہیں۔

امید ہے کہ کتاب کے بقیہ حصوں میں بھی تخریج، تنقیح اور استدراکات کا یہ عمل اسی نہج کے ساتھ تسلسل سے جاری رہے گا اور کتاب کے حسن کو دوبالا کرے گا۔

اس موقع پر استاذ زادہ حافظ اسجد سلمہ ربہٗ کو دوبارہ مبارک بادی پیش کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ شانہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لیے اس کو ذخیرۂ آخرت بنائے اور تمام معاونین کو دنیا وآخرت میں بہترین بدلہ نصیب فرمائے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔

اقبال بن محمد ٹنکاروری

مہتمم دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا
عیدگاہ روڈ، بھروچ، گجرات، الہند

۲۰/ جمادی الاولی ۱۴۳۷ھ
موافق: ۲۹/ فروری ۲۰۱۶ء

رائے گرامی:

جناب مولانا اجود بن مفتی احمد بیمات صاحب دامت برکاتہم

مہتمم: دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی، بھروچ

رب ذوالجلال کا بے پناہ کرم واحسان ہے کہ اس نے ہمیں اسلام کے عظیم سرمایے کے ساتھ، علم دین سے وابستہ فرمایا، اور علمائے ربانیین سے استفادے کا موقع فراہم کیا، یقیناً رب کریم ہر قرن، ہر صدی، ہر دور، اور ہر زمانے میں ایسے مردمیدان اور رجال کار پیدا فرماتے ہیں، جن کے ذریعے نہ صرف ایک خطہ اور ایک علاقہ؛ بل کہ ایک دنیا سیراب ہوتی ہے، اور اپنی علمی، ادبی اور دینی پیاس بجھاتی ہے، انھیں افراد باتمکین میں والد گرامی حضرت مولانا ومفتی احمد ابراہیم بیمات نور اللہ مرقدہ کی ذات بابرکات ہے۔

والد صاحبؒ پوری زندگی، انتہائی مخلص ومربی اور کہنہ مشق استاذ کی حیثیت سے، درس وتدریس سے وابستہ رہے، اس درمیان آپؒ نے مختلف موضوعات پر گاہے بہ گاہے، حسب ضرورت کتابیں تصنیف فرمائیں، نیز جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، فلاح دارین ترکیسر، اور مدنی دارالتربیت، کرمالی میں قیام کے دوران مستفتی کے استفتاء کا جواب دیتے رہے، اور زندگی کی آخری سانس تک مرجع خلائق بنے رہے۔

والد گرامی کی رحلت کے بعد ہمیں ان کی کمی کا احساس ستاتا رہا اور یہ خواہش رہی کہ وہ تمام کتابیں، جو مقامی زبان (گجراتی) میں تصنیف کی گئی ہیں، کسی طرح اردو کے قالب میں ڈھل جائیں، اور اس گراں قدر علمی سرچشمے سے استفادے کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے برادر محترم حافظ اسجد بیمات صاحب کو، کہ انہوں نے یہ بار گراں اپنے مضبوط کاندھے پر اٹھایا، اور جہد مسلسل کے بعد، یکے بعد دیگرے، والد گرامیؒ کی تقریباً تیس سے زائد گجراتی کتابوں کا ترجمہ کرایا اور انھیں شان دار انداز میں طبع کرایا، خدا کا شکر ہے کہ ساری کتابیں ہاتھوں

ہاتھ لی گئیں، اور اہل علم نے خوب استفادہ کیا۔

کتابوں کے علاوہ والد گرامیؒ نے فتاویٰ کا عظیم ذخیرہ چھوڑا ہے، ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے موجودہ زمانے کے معیار کے مطابق، جمع وترتیب اور تخریج وتنقیح کرکے شائع کیا جائے، یہ کام جہاں بہت اہم تھا، وہیں بڑا نازک بھی۔

چناں چہ برادر محترم جناب حافظ اسجد بیمات صاحب دامت برکاتہم نے بڑی سعی وکوشش کے بعد اسے بھی شائع کیا ہے، پہلی جلد طبع ہوکر مقبول خاص وعام ہوگئی ہے، اب دوسری جلد طبع ہونے جارہی ہے، میں اس موقع سے مرتب فتاویٰ حضرت مولانا ومفتی مجتبیٰ حسن قاسمی (استاذ حدیث وفقہ: دارالعلوم ماٹلی والا، بھروچ) کا شکر گذار ہوں، کہ انہوں نے خاص محنت سے اسے مرتب فرمایا ہے، ساتھ ہی دارالعلوم کرمالی کے رکن منتظمہ اور فتاویٰ کی طباعت کے سلسلے میں حد درجہ فکر منداپنے بھائی حافظ اسجد بیمات صاحب کا ممنون ہوں کہ ان کی محنت اور لگن سے فتاویٰ کا یہ قیمتی ذخیرہ ہمارے ہاتھوں پہنچ رہا ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ ان تمام حضرات کو اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے اور والد گرامی کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے، آمین، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

مورخہ: ۲۱ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ

(مولانا) اجود بن مفتی احمد بیمات (صاحب)

مہتمم: دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

اللہ کا شکر و احسان ہے کہ اس ناچیز کو والد گرامی کے فتاویٰ بہ نام ''فتاویٰ فلاحیہ'' کی دوسری جلد قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

یہ جلد چھ سو سے زائد مسائل اور ۸۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، طہارت اور نماز کے مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس جلد کی طباعت میں کچھ تاخیر ہوئی، جس کے لیے میں شائقین سے معذرت خواہ ہوں، ان شاء اللہ فتاویٰ کی تیسری جلد، عنقریب ہی آپ کی خدمت میں ہوگی۔

پہلی جلد کی طباعت کے بعد بہت سے اکابر علماء اور شائقین نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا، حوصلہ افزا کلمات کہے، اور تمام جلدوں میں اسی معیار کو برقرار رکھنے کی تاکید کی، میں ان تمام کا شکر گذار ہوں، اور دعاء کرتا ہوں کہ انھوں نے اس ناچیز سے جس معیار کی طباعت کی توقع لگا رکھی ہے، اللہ تعالیٰ اسے پورا فرمادے، آمین۔ وماذٰلک علی اللہ بعزیز۔

میں شکر گذار ہوں مشہور فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کا، کہ انھوں نے اپنی قیمتی تحریر عنایت فرمائی، نیز احسان مند ہوں حضرت مولانا اقبال محمد فلاحی ٹنکاروی دامت برکاتہم (شیخ الحدیث و مہتمم: دارالعلوم اسلامیہ عربیہ، ماٹلی والا، بھروچ) کا، کہ انہوں نے فتاویٰ فلاحیہ کی اس دوسری جلد کے تعلق سے گراں قدر تاثر کا اظہار کیا، نیز مرتب فتاویٰ کو اپنے دارالعلوم میں علمی ماحول فراہم کیا، سہولتیں عطا فرمائی، جس کے نتیجے میں دوسری جلد منظر عام آسکی۔

اس موقع پر میں ممنون ہوں مرتب فتاویٰ حضرت مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی صاحب کا، کہ انھوں نے انتہائی جاں فشانی کے ساتھ فتاویٰ کی ترتیب و نظر ثانی کا کام انجام دیا، اور معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کے لیے ہر

طرح کی سعی وکوشش کو بروئے کار لائے، اللہ تعالیٰ انھیں اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے۔

قارئین کے علم میں یہ بات ہوگی کہ والد گرامی کے بیشتر فتاویٰ گجراتی زبان میں تھے، مختلف علماء کے ذریعے ترجمے کرائے گئے، میں ان تمام علماء کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں ان اہل خیر حضرات کا شکریہ ادا نہ ہوں، جنہوں نے اپنی جائز آمدنی اور حلال مال سے ہمارا تعاون فرمایا، اللہ ہر ایک کی جائز تمنائیں پوری فرمادے اور فتاویٰ فلاحیہ کو مفتی صاحب کی دیگر تصانیف کی طرح شرف قبولیت سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

۲/ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ (حافظ) اسجد بن مفتی احمد بیمات
موافق: ۱۲/ مارچ ۲۰۱۶ء رکن منتظمہ: دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی، بھروچ، گجرات
خادم: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا
e-mail:hafizasjed@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مرتب

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین، أما بعد!

فتاویٰ فلاحیہ کی دوسری جلد پیش خدمت ہے، شکر گذاری کے اس موقع پر احقر بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہے کہ اس نے اس کم سواد کو فتاویٰ فلاحیہ کے اس اہم علمی سلسلہ کو جاری رکھنے کی توفیق بخشی، ورنہ تو یہ کسی بھی لائق نہیں ہے، دعاء ہے کہ جس نے توفیق بخشی ہے، وہی اسے قبولیت بھی عطا فرمادے، اور بقیہ جلدوں کی تکمیل کی ہمت بھی، وما ذلك عليه بعزيز.

طہارت ونماز سے متعلق ۲۵ر سے زائد ابواب اور ۶۰۰ر سے زائد سوال وجواب پر مشتمل اس دوسری جلد کو احقر نے اپنی وسعت کے مطابق خوب سے خوب تر بنانے کی سعی کی ہے، کوشش کی ہے کہ کوئی مسئلہ حوالے کے بغیر نہ رہے، نصوص کے ذکر کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، اوران تمام امور کا لحاظ کیا گیا ہے، جن سے پہلی جلد مزین ہے۔

فتاویٰ فلاحیہ کی پہلی جلد کی اشاعت کے تقریبا ایک سال بعد دوسری جلد پریس کے حوالے کی جارہی ہے، اس درمیان احقر پر بڑے حالات آئے، اور اپنی زندگی کے سب سے عظیم حادثے سے دوچار ہوا، میری والدہ - جو اسی (۸۰) سے زائد بہاریں دیکھ چکی تھیں، اور انتہائی کمزور تھیں، اس کے باوجود احقر کی محبت میں احقر کے ساتھ ہی رہتی تھیں- ۴ر رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ کو اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی شایان شان مقام عطا فرمائے، آمین)

اس حادثے کا ذہن ودماغ پر ایسا اثر پڑا کہ کچھ دنوں تک کچھ بھی لکھنے پڑھنے سے لاتعلق رہا۔

اور بھی کچھ حالات ایسے آئے کہ ایک مرحلے میں تو ایسا لگ رہا تھا کہ شاید اب میں یہ کام آگے جاری نہیں رکھ سکوں گا، لیکن اسے حضرت مفتی بیمات صاحبؒ کی کرامت کہیے یا صاحب زادۂ محترم، میرے کرم فرما جناب

حافظ اسجد صاحب کا خلوص، کہ کام جاری رہا اور پہلی جلد سے کم عرصے میں کام مکمل ہوا، دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اگلی تمام جلد کو بھی جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچائے، آمین۔

میں اس موقع پر ممنون ہوں استاذ محترم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کا، کہ انہوں نے انتہائی مصروفیت کے باوجود قیمتی تحریر سے نوازا، اور حوصلہ افزائی فرمائی، احقر جو دو چار لفظ لکھ لیتا ہے، وہ در حقیقت استاذ محترم کی خاص توجہ و تربیت کا نتیجہ ہے، ورنہ تو حقیر خوب جانتا ہے کہ وہ کس لائق ہے۔

اسی طرح میں شکر گذار ہوں دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا کے عالی وقار مہتمم و شیخ الحدیث حضرت مولانا اقبال محمد ٹنکاروی فلاحی دامت برکاتہم کا، کہ انہوں نے اپنی قیمتی تحریر عنایت فرمائی، جو ان کی دیگر تحریر کی طرح انتہائی محقق ہے اور گجرات کے فقہ و فتاویٰ کی خدمات کا احاطہ کیے ہوئے ہے، فجزاہ اللہ أحسن الجزاء.

میں اپنے کرم فرما جناب حافظ اسجد بیات صاحب کا رسمی شکریہ ادا کر کے ان کے احسان کو کم نہیں کرنا چاہتا، کہ ان کے خلوص کی ہی برکت ہے کہ فتاویٰ کا کام جاری ہے، اللہ تعالیٰ انھیں بہترین بدلہ عطا فرمائے، ان کے اہل خانہ کو دینی و دنیوی ترقیات سے نوازے، آمین۔

دوسری جلد کے کام کے دوران دار العلوم ماٹلی والا کے شعبۂ تخصص فی الفقہ کے طلبہ (مولوی سعد عالم مذکر دہلوی، مولوی محمد نعیم امتیاز ٹنکاروی، مولوی عفان محمد ہارون مولیپور، مولوی شاہد یونس بھاؤنگر، مولوی اعجاز مولانا ایوب ہنسگلوٹ، مولوی محمد بن عثمان مجادر، مولوی محمد بن ہارون ڈینڈرول اور مولوی عرفان بن حنیف راڈھن پوری) شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے حوالہ جات کی تخریج اور پروف ریڈنگ میں تعاون کیا، اللہ تعالیٰ ان میں علمی ذوق پیدا فرمائے، اور مستقبل میں علمی مشغلہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اہل ذوق سے درخواست ہے کہ اس میں اگر کوئی غلطی در آئی ہو، تو اسے اس ناچیز کی جانب سے سمجھیں اور بلا تکلف مطلع فرمائیں، ناچیز ممنون ہوگا۔

مجتبیٰ حسن قاسمی

خادم حدیث: دار العلوم اسلامیہ عربیہ، ماٹلی والا، بھروچ

مورخہ: ۲ / جمادی الاخری ۱۴۳۷ھ

برائے رابطہ: 09409518452

۱۲ / مارچ ۲۰۱۶ء، بروز: ہفتہ

Email: qasmimujtaba@gmail.com

عن أبي هريرة. قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا وجد أحدكم في بطنه شيئا. فأشكل عليه أخرج منه شيء أم لا. فلا يخرجن من المسجد حتى يسمع صوتا. أو يجد ريحا.

(مسلم شریف: ۱/۱۵۸، حدیث نمبر: ۳۶۲)

باب الوضوء

[وضو کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب الوضوء

[وضو کا بیان]

[۱] ناگواری کی حالت میں وضو کرنے سے گناہوں کی معافی

۴۳۷-سوال: جامعہ اشرفیہ راندیر کے تبلیغی اشاعتی رسالہ نمبر: ۵۴، بہ نام: ''انوارِ محمدی'' میں ایک حدیث ہے، جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تکلیف اور ناگواری کے باوجود جو شخص اچھی طرح وضو کرے، اس کے گناہ مٹا دیے جاتے ہیں۔[1]

---

(۱) عن أبي هريرة، أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قال: ألا أدلكم على ما يمحو الله به الخطايا، ويرفع به الدرجات؟ قالوا بلى يا رسول الله قال: إسباغ الوضوء على المكاره، وكثرة الخطا إلى المساجد، وانتظار الصلاة بعد الصلاة، فذلكم الرباط. (الصحيح لمسلم: ١/ ١٢٧، رقم الحديث: ٤١-(٢٥١)، كتاب الطهارة، باب فضل إسباغ الوضوء على المكاره، ط: رشيدية- دهلي☆سنن الترمذي: ١/ ١٨، أبواب الطهارة، باب في إسباغ الوضوء، ط: فيصل- ديوبند ☆ المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي- أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ٣٠٣هـ): ١/ ٨٩، كتاب الطهارة، باب الفضل في ذلك، بعد باب الأمر بإسباغ الوضوء، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية- حلب☆سنن ابن ماجة: ١/ ٣٤، رقم الحديث: ٤٢٧، ٤٢٨، أبواب الطهارة و سننها، باب ما جاء في إسباغ الوضوء، و رقم الحديث: ٧٧٦، ص: ٥٦، باب المشي إلى الصلاة، أبواب المساجد والجماعات، ط: اشرفي بك ڈپو- ديوبند)

(على المكاره): جمع مكره بفتح الميم من الكره بمعنى المشقة والألم قيل: منها إعواز الماء والحاجة إلى طلبه أو ابتياعه بالثمن الغالي، كذا ذكره الطيبي رحمه الله تعالى. وقيل: المراد حال ما يكره استعمال الماء كالتوضؤ بالماء البارد في الشتاء أو ألم الجسم. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ١٠١٤هـ): ١/ ٣٤٤، رقم الحديث: ٢٨٢، كتاب الطهارة، الفصل الأول، ط: دار الفكر- بيروت) ———— مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج المعروف بـ شرح النووي- أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ٦٧٦هـ): ٣/ ١٤١، كتاب الطهارة، باب فضل إسباغ الوضوء على المكاره، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت☆قوت المغتذي على جامع الترمذي- عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م: ٩١١هـ): ١/ ٦٢، أبواب الطهارة، ط: رسالة الدكتوراة - جامعة أم القرى، مكة المكرمة- كلية الدعوة وأصول الدين، قسم الكتاب والسنة)

ناگواری اور مشقت کبھی سستی کی وجہ سے ہوتی ہے، مثلاً: پانی اتنا کم ہے کہ سنت کے مطابق وضو کرنے اور ہر عضو کو تین تین مرتبہ دھونے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا؛ بل کہ ایسا کرنے کے لیے پانی کچھ دور چل کر لانا پڑتا ہے، اور کبھی سخت ٹھنڈی کی وجہ سے بھی ناگواری ہوتی ہے، کہ پانی ٹھنڈا ہے اور موسم سردی کا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ فضیلت اور ثواب فقط وضو کرنے سے ہی مل جاتا ہے یا اس کے ساتھ دو رکعت نماز کی بھی شرط ہے؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب حامدا ومصليا:

ترمذی شریف (۲/۱) سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف اسباغ وضو (کامل طور پر وضو کرنے) سے ہی ثواب ملے گا۔[1]

اللہ تعالیٰ بہت فیاض ہیں، ان کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے؛ نیت کر کے وضو کر لیا جائے، تو ثواب ملے گا۔ (ان شاء اللہ)[2] اور یہ بات یاد رہے کہ نیک کام کرنے سے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں، جب کہ کبیرہ گناہوں کی معافی توبہ ہی سے ہوتی ہے۔[3] رہے حقوق العباد، تو ان میں توبہ بھی کافی نہیں ہے؛ بل کہ

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: سوال کا حاشیہ نمبر: ۱۔

(۲) وكيفيتها أن ينوي رفع الحدث أو إقامة الصلاة أو ينوي الوضوء أو امتثال الأمر ومحلها القلب . . . والنية سنة لتحصيل الثواب لأن المأمور به ليس إلا غسلا ومسحا في الآية ولم يعلمه النبي صلى الله عليه وسلم للأعرابي مع جهله. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح- حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ)، ص: ۳۳، باب في الوضوء، فصل في سنن الوضوء، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

علامہ شامی نے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: فعلم أنه لا تلازم بين الثواب والصحة فقد يوجد الثواب بدون الصحة كما ذكر، وبالعكس كما في الوضوء بلا نية فإنه صحيح، ولا ثواب فيه. (رد المحتار: ۶/۴۲۵، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، فرع يكره إعطاء سائل المسجد إلا إذا لم يتخط رقاب الناس، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

وقال الحنفية الذين لم يشترطوا النية في الوسائل: المراد كمال الأعمال ويكون تقديرهم كمال الأعمال بالنيات، فالنية شرط كمال فيها، لتحصيل الثواب فقط. (الفقه الإسلامي وأدلته- د. وهبة الزحيلي: ۱/۳۰، المطلب الثاني عشر- النية والباعث في العبادات والعقود والفسوخ والتروك، أولاً- حقيقة النية أو تعريفها، من الشاملة، وهو غير موافق للمطبوع)

(۳) وكون التوبة سببا لغفران الذنوب وعدم المؤاخذة بها، مما لا خلاف فيه بين الأمة. وليس شيء يكون سببا لغفران جميع الذنوب إلا التوبة، قال تعالى: ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ [الزمر: ۵۳]، وهذا لمن تاب. (شرح العقيدة الطحاوية- صدر الدين محمد بن علاء الدين، ابن أبي العز الحنفي، الأذرعي الصالحي الدمشقي (م: ۷۹۲ھ)، ص: ۳۲۷، أهل القبلة مسلمون مؤمنون، تخريج: ناصر الدين الألباني، ط: دار السلام للطباعة والنشر، الطبعة المصرية الأولى: ۱۴۲۶ھ- ۲۰۰۵م)

متعلقہ بندوں کے حقوق ادا کرنا ضروری ہے۔[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] ببول کی مسواک سے سنت ادا ہو جائے گی

۴۳۸-سوال: کیا صرف پیلو کا مسواک ہی استعمال کر سکتے ہیں یا کسی دوسرے درخت کی لکڑی سے بھی مسواک کا حق ادا ہو جائے گا؟ ببول کے مسواک میں کیا کوئی حرج ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

علماء کرام لکھتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ مسواک کڑوے درخت کی ہو اور اس کے ریشے نرم ہوں، ببول کی مسواک کرنے سے بھی سنت ادا ہو جائے گی۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] اعضائے وضو پر کلر لگ جائے، تو کیا حکم ہے؟

۴۳۹-سوال: اگر بدن کے کسی عضو پر کلر (پکا رنگ) لگ گیا ہو اور اس کو اچھی طرح صاف کرنے کے باوجود تھوڑا سا کلر رہ جائے، تو ایسی صورت میں وضوء یا غسل ہوگا یا نہیں؟

نوٹ:۔ بعض لوگوں کا پیشہ ہی کلر کا ہوتا ہے، ان کے لیے کلر سے بچنا دشوار ہوتا ہے، ایسی صورت میں پکے کلر لگ جانے سے محفوظ نہ رہنے کی وجہ سے وضو یا غسل ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

جن اعضاء کو وضوء میں دھونا فرض ہے، ان پر پکا رنگ اس طور پر لگ جائے، کہ اس کے رہتے ہوئے

(۱) وإن كانت عما فرط فيه من حقوق الله كصلاة وصيام وزكاة، فتوبته أن يندم على تفريطه أولاً، ثم يعزم على أن لا يعود أبدا . . .، وإن كانت عما يتعلق بالعباد، فإن كانت من مظالم الأموال، فتتوقف صحة التوبة منها مع ما قدمنا في حقوق الله تعالى على الخروج عن عهدة الأموال، وإرضاء الخصم في الحال والاستقبال؛ بأن يتحلل منهم، أو يردها إليهم أو إلى من يقوم مقامهم من وكيل، أو وارث هذا. (شرح كتاب الفقه الأكبر-ملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ)، ص: ۲۶۴، مسألة في التوبة وشرائطها وفيها أبحاث، ت: علي محمد دندل، ط: مكتبة دار الإيمان-سهارنفور)

(۲) والمستحب . . . أن يكون من شجر مر، ليكون أقطع للبلغم، وأنقى للصدر، وأهنأ للطعام، وأفضله الاراك، ثم الزيتون، ويصح بكل عود إلا الرمان والقصب لمضرتهما، وأن يكون طول شبر مستعمله، لأن الزائد يركب عليه الشيطان. اهـ (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح-أحمد بن محمد الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ)، ص: ۶۷، كتاب الطهارة، فصل في سنن الوضوء، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

پانی جسم تک نہ پہنچ سکے، تو اس کو دھو کر زائل کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر وضو درست نہیں ہوگا، خوب اچھی طرح صاف کرنے کے باوجود رنگ کا اثر باقی رہ گیا ہو اور وہ کیمیکل (چکنا اور گاڑھا رنگ) نہ ہو، تو رنگ کا کام کرنے والوں کے لیے اس کو زائل کرنا ضروری نہیں ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] درجۂ حفظ کے طلبہ کے لیے متعدد بار وضو اور سجدۂ تلاوت کا مسئلہ

۴۴۰-سوال: مجھے ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے، میں نے اس سوال کو کئی علماء سے پوچھا؛ لیکن اطمینان بخش جواب نہیں مل سکا، سوال یہ ہے کہ قرآن شریف حفظ کرنے والے طلبہ، جو صبح سے شام تک پڑھتے رہتے ہیں، ان کے لیے قرآن شریف بغیر وضو کے پڑھنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ یعنی اگر کسی سے دیر تک وضو باقی نہیں رکھا جا سکتا ہے اور اگر سبق کے وقت بار بار وضو کرے، تو اس کی پڑھائی میں کافی نقصان ہوتا ہے اور وقت بھی کافی ضائع ہوتا ہے اور جو تھوڑا بہت یاد کیا ہوا ہوتا ہے، تسلسل کے فوت ہونے کی وجہ سے وہ بھی ذہن سے نکل جاتا ہے اور اس کو پھر سے یاد کرنا پڑتا ہے، تو اس صورت میں طالب علم کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں؟ اور قرأت پڑھانے والوں کے لیے بھی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں؟

نیز استاذ اور طلبہ کو سجدۂ تلاوت کے متعلق کیا کرنا چاہیے؟ طالب علم متعدد جگہ اپنا سبق استاذ اور

---

(۱) وفي الجامع الصغير سئل أبو القاسم عن وافر الظفر الذي يبقى في أظفاره الدرن أو الذي يعمل عمل الطين أو المرأة التي صبغت أصبعها بالحناء، أو الصرام، أو الصباغ، قال: كل ذلك سواء يجزيهم وضوءهم إذ لا يستطاع الامتناع عنه إلا بحرج، والفتوى على الجواز. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۴، كتاب الطهارة، الباب الأول في الوضوء، ط: مكتبة رشيدية- پاكستان)

(ولا يمنع) الطهارة (ونيم) أي خرء ذباب وبرغوث لم يصل الماء تحته (وحناء) ولو جرمه به يفتى (ودرن ووسخ) عطف تفسير وكذا دهن ودسومة (وتراب) وطين ولو (في ظفر مطلقا) أي قرويا أو مدنيا في الأصح بخلاف نحو عجين. (و) لا يمنع (ما على ظفر صباغ و) لا (طعام بين أسنانه) أو في سنه المجوف به يفتى. وقيل إن صلبا منع، وهو الأصح. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: لم يصل الماء تحته) لأن الاحتراز عنه غير ممكن، حلية. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۵۴، مطلب أبحاث الغسل، ط: بيروت)

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر محض رنگ اور کسی قدر چکناہٹ باقی ہے، تو اس سے وضو میں خلل نہیں آتا، جیسے کہ اگر تیل لگا ہوا ہو اور اس پر پانی بہا دیا جائے، اگر صرف رنگ اور چکناہٹ ہی نہیں، بل کہ موم بھی باقی ہے، جس سے پانی نہیں پہنچ سکتا، تو وضو درست ہے نہ غسل"۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/ ۴۱، کتاب الطہارۃ، باب الوضوء، پالش ناخن پر لگی رہ جائے، تو وضو کا حکم، ط: اشرفی بک ڈپو- دیوبند)

ساتھیوں کو سناتے ہیں اور اپنی جگہ پر بھی پڑھتے ہیں، ان تمام کی گنتی یاد رکھنا بھی مشکل ہے اور یہ سجدے جمع ہوتے جاتے ہیں، تو ان سجدوں کا کیا حکم ہے؟ کیا سب مجموعی سجدوں کو ادا کرنا ضروری ہے؟ آپ اگر مہربانی کرکے ان مسائل کا حل بتلا دیں، تو میں آپ کا شکر گزار رہوں گا، میں درجہ حفظ کا طالب علم ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر ایک ہی آیت سجدہ طالب علم درس گاہ میں بار بار پڑھتا ہے اور استاذ یا دوسرے ہم سبق کو سناتا ہے، تو جب تک درس گاہ میں رہے گا، ایک ہی سجدہ واجب ہوگا، درس گاہ ''مکان واحد'' کے حکم میں ہے، کونے اور جگہ کے بدلنے سے مجلس نہیں بدلے گی اور جب تک پڑھتا رہے گا، کام (فعل) ایک ہی ہوگا؛ لہٰذا ایک سجدہ کافی ہوگا، اگر مجلس بدل جائے اس طور پر کہ درس گاہ سے باہر چلا جائے، یا پڑھتے پڑھتے دوسرا کام کرنے لگے، مثلاً اسی درس گاہ میں دسترخوان بچھائے اور کھانے لگے، پھر اسی آیت سجدہ کی تلاوت کرے، تو چوں کہ حکماً مجلس بدل گئی ہے؛ اس لیے اس پر دوسرا سجدہ واجب ہوگا۔ (درمختار مع الشامی: ۲/ ۵۹۰ ☆ مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر: ۱/ ۲۳۵، باب سجود التلاوۃ، کتاب الصلاۃ)[1]

اور نابالغ لڑکا لڑکی پر وضو واجب نہیں ہے، مگر سکھلانے کی غرض سے ابتداءً وضو کرکے اس کو قرآن شریف کی تلاوت کا حکم کیا جائے گا، اور بالغ کو بغیر وضو کے قرآن چھونا بالکل جائز نہیں ہے۔

استاذ کو بار بار وضو کی تکلیف ہو، تو وہ طالب علم سے قرآن کی خدمت (ورق کا پلٹنا وغیرہ) کا کام لے اور بالغ طالب علم رومال یا علاحدہ کپڑے سے اوراق کھولے، مجبوری کی صورت میں اس طرح کی تدبیر اختیار

---

[1] ولو تلاها في مسجد جماعة أو في المسجد الجامع في زاوية، ثم تلاها في زاوية أخرى ،لا يجب عليه إلا سجدة واحدة : لأن المسجد كله جعل بمنزلة مكان واحد في حق الصلاة ففي حق السجدة أولى ، وكذا حكم السماع ،وكذلك البيت والمحمل. (بدائع الصنائع: ۱/ ۴۳۳، كتاب الصلاة، فصل أما سبب وجوب السجدة، ط: زكريا-ديوبند)

الأصل أن السجدة لا يتكرر وجوبها إلا بأحد أمور ثلاثة: إما اختلاف المجلس ،أو التلاوة،أو السماع حتى أن من تلا آية واحدة مرارا في مجلس واحد تكفيه سجدة واحدة ، والأصل فيه ما روي أن جبريل عليه السلام كان ينزل بالوحي فيقرأ آية السجدة على رسول الله صلى الله عليه وسلم ورسول الله صلى الله عليه وسلم كان يسمع ويتلقن ثم يقرأ على أصحابه وكان لا يسجد إلا مرة واحدة. (حوالہ سابق: ۱/ ۴۳۱) ☆ مزید دیکھیے: البحر الرائق: ۲/ ۲۲۰-۲۱، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة، ط: زكريا-ديوبند)

کرنا گناہ کا باعث نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] مسجد میں یا وضو کے دوران باتیں کرنا

۴۴۱-سوال: دوران وضو یا مسجد میں دنیوی باتیں کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

وضو کے دوران دنیوی باتیں کرنا پسندیدہ نہیں ہے، اسی طرح مسجد میں بھی بلاضرورت دنیوی باتیں کرنا مکروہ ہے، اس سے نیکیاں اس طرح برباد ہوتی ہیں، جس طرح سوکھی گھاس کو آگ جلادیتی ہے؛ لہٰذا مسجد میں بلاضرورت دنیوی باتوں سے بچنا بہت ضروری ہے، مسجد میں نماز، تلاوت قرآن، ذکر وغیرہ عبادت الٰہی میں مشغول رہنا چاہیے، مسجد اللہ تبارک وتعالیٰ کا گھر ہے، اس کا احترام بہ ہر صورت ضروری ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- قال: رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتى يستيقظ، وعن المبتلى حتى يبرأ، وعن الصبي حتى يكبر. (سنن أبي داود: ۲/ ۶۰۴، رقم الحديث: ۴۳۹۸- ۴۴۰۳، كتاب الحدود، باب في المجنون يسرق أو يصيب حدا، ط: مختار اينڈ كمپني- ديوبند)

(و) يحرم (به) أي بالأكبر (وبالأصغر) مس مصحف أي ما فيه آية كدرهم وجدار ... (إلا بغلاف متجاف). [در مختار مع الشامي: ۱/ ۳۲۵، ط: زكريا- ديوبند☆ مزید دیکھیے: مجمع الانهر في شرح ملتقى الابحر: ۱/ ۴۲، كتاب الطهارة، ط: مكتبه فقيه الامت، ديوبند]

(ولا) يكره (مس صبي لمصحف ولوح) ولا بأس بدفعه إليه وطلبه منه للضرورة إذ الحفظ في الصغر كالنقش في الحجر. وقال الشامي: (قوله: ولا يكره مس صبي إلخ) فيه أن الصبي غير مكلف والظاهر أن المراد لا يكره لوليه أن يتركه يمس، بخلاف ما لو رآه يشرب خمرا مثلا فإنه لا يحل له تركه. (قوله: ولا بأس بدفعه إليه) أي لا بأس بأن يدفع البالغ المتطهر المصحف إلى الصبي، ولا يتوهم جوازه مع وجود حدث البالغ. (قوله: للضرورة) لأن في تكليف الصبيان وأمرهم بالوضوء حرجا بهم، وفي تأخيره إلى البلوغ تقليل حفظ القرآن، درر. (رد المحتار مع الدر المختار المعروف بالشامي: ۱/ ۳۱۶-۳۱۷، كتاب الطهارة، مطلب يطلق الدعاء على ما يشمل الثناء)

(۲) وأما الثالث وهو أنه لا يتكلم إلا بخير فلقوله تعالى: وقل لعبادي يقولوا التي هي أحسن. {الإسراء: ۵۳} وهو بعمومه يقتضي أن لا يتكلم خارج المسجد إلا بخير فالمسجد أولى كذا في غاية البيان. وفي التبيين وأما التكلم بغير خير؛ فإنه يكره لغير المعتكف فما ظنك للمعتكف اهـ... الكلام المباح في المسجد مكروه يأكل الحسنات كما تأكل النار الحطب. (البحر الرائق: ۲/ ۵۳۱، كتاب الصوم، باب الاعتكاف)

مزید دیکھیے: رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۴۴۱، كتاب الصوم، باب الاعتكاف☆ فتح القدير: ۱/ ۴۳۵، كتاب الصلاة قبيل باب الوتر، ط: زكريا، ديوبند)

[۶] مذی اور ودی کے خروج سے وضوٹوٹ جاتا ہے

۴۴۲-سوال: ایک شخص کو پیشاب کرنے کے بعد منی کے قطرات نکلتے ہیں، ایسا شخص پیشاب کے بعد جلد وضوء کر کے جماعت میں شامل ہوسکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

پیشاب کے بعد جو قطرات نکلتے ہیں، اس کو ودی کہتے ہیں، عضوتناسل بوجہ شہوت ایستادگی کی حالت میں ہواور قطرات ٹپکنے کے باوجود شہوت باقی رہے، تو اس (ٹپکنے والے قطرہ) کو مذی کہتے ہیں اور اگر قطرات نکلنے سے شہوت ختم ہوجائے، تو اس (ٹپکنے والے قطرہ) کو منی کہتے ہیں۔ مذی اور ودی سے وضوٹوٹ جاتا ہے، جب کہ منی کا خروج غسل کو واجب کرتا ہے۔ [۱]

اگر کسی کو پیشاب کے بعد قطرات آتے ہوں اور وہ جلدی سے وضوء کر کے جماعت میں شریک ہوجائے، پھر قطرہ نکل آئے، تو اس کا وضوء ٹوٹ جائے گا، اور بغیر وضو کے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے؛ اس لیے ایسا شخص استبراء کرے، یعنی مکمل طریقے سے اطمینان حاصل کرلے کہ اب پیشاب کا کوئی قطرہ مخرج میں باقی نہیں ہے، پھر وضوء کر کے جماعت میں شریک ہو۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] مذی کا حکم

۴۴۳-سوال: بیوی سے ملاعبت (مذاق ودل لگی) کے وقت شرم گاہ سے جو رطوبت (مذی) نکلتی ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ کیا اس سے وضوٹوٹ جائے گا؟ اگر وہ بدن یا کپڑے پر لگ جائے، تو کیا

---

(۱) قال (وفي المني الغسل) لقوله - صلى الله عليه وسلم - إنما الماء من الماء «يعني الاغتسال من المني، . . . قال (وفي المذي الوضوء) لحديث علي - رضي الله تعالى عنه - قال كنت فحلا مذاء فاستحييت أن أسأل رسول الله - صلى الله عليه وسلم - لمكان ابنته تحتي، فأمرت المقداد بن الأسود حتى سأله، فقال كل فحل يمذي، وفيه الوضوء. وكذلك الودي فإنه الغليظ من البول فهو كالرقيق منه، ثم فسر هذه المياه فقال (المني خاثر أبيض ينكسر منه الذكر . . . والمذي رقيق يضرب إلى البياض يخرج عند ملاعبة الرجل أهله، والودي رقيق يخرج منه بعد البول) وتفسير هذه المياه مروي عن عائشة - رضي الله تعالى عنها - بهذه الصفة. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۱/ ۶۷، كتاب الصلاة، باب الوضوء والغسل، ط: دار المعرفة - بيروت)

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے عنوان: استنجاء میں استبراء کی ایک تدبیر۔ (باب الاستنجاء)

اس کا دھونا ضروری ہے؟ کیا صرف کپڑے وغیرہ سے صاف کر لینا کافی نہیں ہوگا؟ بینوا تو جروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

بیوی کے ساتھ ملاعبت کے وقت جو رطوبت نکلتی ہے اور اس کے نکلنے سے شہوت ٹھنڈی (ختم) نہیں ہوتی ہے، اس کو "مذی" کہا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اور یہ خود نجس ہے؛ اس لیے جس جگہ لگ جائے، اس حصہ کا دھونا ضروری ہوگا: المذي ينقض الوضوء. (عالم گیری: ۱/ ۱۰، الفصل الخامس في نواقض الوضوء، كتاب الطهارة، ط: دار الفكر، الطبعة الثانية: ۱۳۱۰ھ ☆ شامی: ۱/ ۱۶۵، ط: دار الفکر- بیروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء) وقال الكاساني: كل ما يخرج من بدن الإنسان مما يجب بخروجه الوضوء أو الغسل فهو نجس، من البول والغائط والودي والمذي والمني... الخ. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۹۳، كتاب الطهارة، فصل في الطهارة الحقيقية، ط: زکریا، دیوبند)

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں ج: ۱، ص: ۵۴ پر ایک ترجمۃ الباب قائم کیا ہے، جس کا عنوان ہے: "باب غسل المذي والوضوء منه" (مذی کو دھونا اور اس کے نکلنے پر وضو کرنا) اس کے تحت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں: مجھے بہ کثرت مذی نکلتی تھی، چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا میری زوجیت میں تھی؛ اس لیے میں نے اس سلسلے میں خود مسئلہ معلوم کرنا مناسب نہیں سمجھا؛ حضرت مقداد بن اسودؓ سے درخواست کی کہ وہ مسئلہ معلوم کریں، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسئلے کو دریافت کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ذکر (آلۂ تناسل) کو دھولو، اور وضو کرلو"۔ (۱) اور امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب (۱/ ۱۶) میں عنوان قائم کیا ہے: "کپڑے پر مذی لگ جائے، تو کیا حکم ہے؟" اس کے تحت بیان کیا ہے کہ: امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک کپڑے کا دھونا ضروری ہے—— حنفی مذہب کے مطابق مذی ناپاک ہے، اگر وہ کپڑے یا بدن پر لگ جائے، تو اس کا دھونا ضروری ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) عن علي، قال: كنت رجلا مذاء فأمرت رجلا أن يسأل النبي صلى الله عليه وسلم، لمكان ابنته، فسأل فقال: توضأ واغسل ذكرك. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۱، رقم الحديث: ۲۶۹، كتاب الغسل، باب غسل المذي والوضوء منه ط: ديوبند)

(۲) عن سهل بن حنيف قال: كنت ألقى من المذي شدة وعناء، فكنت أكثر منه الغسل، فذكرت ذلك لرسول الله -صلى الله عليه وسلم- وسألته عنه، فقال: إنما يجزئك من ذلك الوضوء، فقلت: يا رسول الله! كيف بما يصيب ثوبي منه، قال: يكفيك أن تأخذ كفا من ماء فتنضح به ثوبك حيث ترى أنه أصاب منه. قال أبو عيسى: وقد اختلف أهل =

[٨] أيضــــــــا

٤٤٤-سوال: بندہ کئی دنوں سے خروج مذی کا شکار ہے، عضو مخصوص سے اس کا خروج ہوتا ہے، کبھی انتشار عضو کے ساتھ اور کبھی بغیر انتشار عضو کے، البتہ مذی کا خروج انتہائی قلیل مقدار میں ہوتا ہے، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ خروج مذی کے وقت جو کپڑا پہن رکھا تھا، اس کو دھویا جائے یا تبدیل کردیا جائے، اس میں احتیاطی پہلو کیا ہے؟ نیز اس سلسلے میں حضرت والا کے پاس کوئی علاج ہو، تو ضرور تحریر فرمائیں تاکہ اس پر عمل کیا جائے، عین کرم ہوگا۔

الجواب حامدا ومصليا:

اگر اگلی شرم گاہ سے سیال مادہ کے خروج کے بعد عضو مخصوص کا انتشار ختم ہوجائے اور عضو مخصوص ساکن ہوئے، تو غسل فرض ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں خارج ہونے والی شئے مذی نہیں ہوگی، بل کہ منی ہوگی۔ ہاں اگر نکلنے والے مادہ کے بعد بھی عضو ساکن نہ ہوتا ہو، تو اس صورت میں غسل فرض نہیں ہوگا، البتہ وضو واجب ہوگا۔[1]

کپڑا خواہ مذی سے آلودہ ہوا ہو یا منی سے، اگر قابل عفو مقدار سے زیادہ ہو، تو صرف اتنا ہی دھونا ضروری ہے، جتنا کپڑا آلودہ ہوا ہے، پورے کپڑے کا دھونا ضروری نہیں ہے اور مذی چوں کہ رقیق ہے؛ اس

العلم في المذي يصيب الثوب، فقال بعضهم: لا يجزئ إلا الغسل، وهو قول الشافعي، وإسحاق، وقال بعضهم: يجزئه النضح. وقال أحمد: أرجو أن يجزئه النضح بالماء. (سنن الترمذي: ١/٣١، رقم الحديث: ١١٥، أبواب الطهارات، باب في المذي يصيب الثوب، ط: مكتبه البدر - ديوبند)

(١) (وفرض) الغسل (عند) خروج (مني) من العضو وإلا فلا يفرض اتفاقا؛ لأنه في حكم الباطن (منفصل عن مقره) هو صلب الرجل وترائب المرأة، . . . (بشهوة) أي لذة ولو حكما كمحتلم. (الدر المختار مع رد المحتار: ١/١٥٩-١٦٠، باب الغسل، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

المذي ينقض الوضوء. (الفتاوى الهندية: ١/١٠، الفصل الخامس في نواقض الوضوء، كتاب الطهارة، ط: دار الفكر، الطبعة الثانية: ١٣١٠هـ☆شامي: ١/١٦٥، ط: دار الفكر - بيروت، طبع دوم: ١٤١٢هـ - ١٩٩٢ء)

وقال الكاساني: كل ما يخرج من بدن الإنسان مما يجب بخروجه الوضوء أو الغسل فهو نجس، من البول والغائط والودي والمذي والمني، الخ. (بدائع الصنائع: ١/١٩٣، كتاب الطهارة، فصل في الطهارة الحقيقية، ط: زكريا، ديوبند)

لیے ایک درہم کی مقدار تک معاف ہے، ایک درہم سے زیادہ معاف نہیں ہے، اگر ایک درہم سے زیادہ آلودہ ہوا ہو، تو کپڑے کو دھو دینا کافی ہے، تبدیل کرنا ضروری نہیں ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں حرجِ عظیم لازم آئے گا؛ لیکن ایسے شخص کے لیے، جسے خروجِ مذی کا عارضہ لاحق ہو، بہتر صورت یہ ہے کہ نماز کے لیے کوئی علاحدہ کپڑا رکھے، تاکہ نماز سے پہلے کپڑے تبدیل کر کے بہ سہولت نماز ادا کر سکے۔[1] علاج کے لیے کسی حکیم سے رجوع کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] خروجِ مذی کی وجہ سے وضو اور کپڑے کی طہارت کا حکم

۴۴۵-سوال: دل میں برے خیالات آتے ہیں، جن کی وجہ سے پیشاب کے راستے سے ''پانی جیسا رقیق چکنا مادہ'' نکلتا ہے، تو کیا کرنا چاہیے، اس کی صفائی ضروری ہے یا نہیں؟ اسی حالت میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج لاحق تو نہیں ہوگا؟ وضو باقی رہے گا یا نہیں؟ مذی اگر کپڑے پر لگ جائے تو کیا کپڑا ناپاک ہو جائے گا؟ کپڑا دھوئے بغیر نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ جوانی میں برے خیالات کی وجہ سے اگر مذی نکل جائے، تو اس سے کس طرح بچا جائے؟

عبدالرحیم حسن ماگرول (جوناگڈھ)

الجواب حامداً ومصلیاً:

خروجِ مذی سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، کیوں کہ مذی ناپاک ہے، اس کو دھونا ضروری ہے۔[2] اس کے

---

(۱) دیکھیے عنوان ''خروجِ مذی کی وجہ سے وضو اور کپڑے کی طہارت کا حکم'' کا حاشیہ نمبر ۲۔

(وعفي قدر الدرهم) وزنا في المتجسدة وهو عشرون قيراطا ومساحة في المائعة وهو قدر مقعر الكف داخل مفاصل الأصابع كما وفقه الهندواني وهو الصحيح فذلك عفو (من) النجاسة (المغلظة) فلا يعفى عنها إذا زادت على الدرهم مع القدرة على الإزالة (و) عفي قدر (ما دون ربع الثوب) الكامل (أو البدن) كله على الصحيح من الخفيفة لقيام الربع مقام الكل كمسح ربع الرأس. (مراقي الفلاح، ص:۳۷، كتاب الطهارة، باب الأنجاس والطهارة منه، ط: زكريا-ديوبند)

(۲) المذي ينقض الوضوء. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۰، الفصل الخامس في نواقض الوضوء، كتاب الطهارة، ط: دار الفكر، الطبعة الثانية: ۱۳۱۰ھ☆ شامي: ۱/۱۶۵، ط: دار الفكر-بيروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ - ۱۹۹۲ء) وقال الكاساني: كل ما يخرج من بدن الإنسان مما يجب بخروجه الوضوء أو الغسل فهو نجس، من البول والغائط والودي والمذي والمني، الخ. (بدائع الصنائع: ۱/۱۹۳، كتاب الطهارة، فصل في الطهارة الحقيقية، ط: زكريا، ديوبند)

روکنے کے لیے علاج یہ ہے کہ اگلی شرم گاہ (ذکر) پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کیا جائے، اس کی ٹھنڈک کی وجہ سے مذی کا سیلان رک جائے گا، پھر ناپاکی کو دھوکر وضوکر کے نماز پڑھے، کپڑے پر مذی کے لگ جانے سے کپڑا بھی ناپاک ہوجائے گا، ناپاکی ایک درہم کے برابر پھیل گئی ہو، تو کپڑا دھونا ضروری ہے، مذی کپڑے پر ایک درہم کی مقدار سے کم پھیلی ہوئی ہے، تو معاف ہے، اس کو دھوئے بغیر بھی نماز پڑھے، تو نماز ہوجائے گی۔ (۱)خروج مذی سے غسل واجب نہیں ہوتا ہے، صرف وضو واجب ہوگا۔ (۲) اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ شادی کرلو اور اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کر کے غسل کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔ واللہ اعلم بالصواب

[۱۰] عضوِ تناسل سے چکنے سیّال مادّے کا نکلنا

۴۴۶-سوال: ایک شخص کو اگلی شرم گاہ سے، دن میں چلتے وقت کئی مرتبہ بغیر کسی شہوت کے چکنی سیال چیز خارج ہوتی ہے، اُس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اس سے وضوء ٹوٹ جائے گا، غسل فرض نہیں ہے، غسل فرض ہونے کے لیے شہوت کے ساتھ کود کر منی کا نکلنا ضروری ہے۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) نجاست غلیظہ میں پتلی اور بہنے والی نجاست (خون، آدمی کا پیشاب وغیرہ) کپڑے یا بدن میں لگ جائے، تو پھیلاؤ میں مساحت کف یعنی ہتھیلی کے گڑھے (ایک روپے کے سکے) کے برابر یا اس سے کم معاف ہے، اگر اس کو دھوئے بغیر کوئی نماز پڑھ لے، تو اس کی نماز ہوجائے گی؛ لیکن نہ دھونا اور اس کے ساتھ نماز پڑھتے رہنا مکروہ اور برا ہے۔ اور اگر نجاست غلیظہ میں سے گاڑھی چیز (پاخانہ، مرغی کی بیٹ وغیرہ) لگ جائے، تو وزن میں ساڑھے چار ماشہ یا اس سے کم معاف ہے۔ اور اگر نجاست خفیفہ ہو، تو بدن یا کپڑے کے جس حصے میں لگی ہے، اگر اس کے چوتھائی سے کم ہو، تو معاف ہے اور اگر پورا چوتھائی یا اس سے زیادہ ہو تو معاف نہیں ہے:
(وعفي قدر الدرهم) وزنا في المتجسدة وهو عشرون قيراطا ومساحة في المائعة وهو قدر مقعر الكف داخل مفاصل الأصابع كما وفقه الهندواني وهو الصحيح فذلك عفو (من) النجاسة (المغلظة) فلا يعفى عنها إذا زادت على الدرهم مع القدرة على الإزالة (و) عفي قدر (ما دون ربع الثوب) الكامل (أو البدن) كله على الصحيح من الخفيفة لقيام الربع مقام الكل كمسح ربع الرأس. (مراقي الفلاح، ص:۳۷، كتاب الطهارة، باب الأنجاس والطهارة منه، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) عن علي، قال: كنت رجلا مذاء فأمرت رجلا أن يسأل النبي صلى الله عليه وسلم، لمكان ابنته، فسأل فقال: توضأ واغسل ذكرك. (صحيح البخاري: ۱/۴۱، رقم الحديث: ۲۶۹، كتاب الغسل، باب غسل المذي والوضوء منه، ط: ديوبند)

(۳) تفصیلی مسئلہ اور اس کی تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: خروج مذی کی وجہ سے وضو اور کپڑے کی طہارت کا حکم ☆ مذی کا حکم۔

[۱۱] انبیاء کرام علیہم السلام کی نیند ناقض وضو نہیں ہے

۴۴۷-سوال: ایک آدمی یہ معلوم کر رہے تھے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام کی نیند ناقض وضو نہیں ہے، تو کیا واقعی آپ ﷺ اور آپ کے علاوہ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام رات کی نیند کے بعد صبح اٹھ کر وضو کیے بغیر نماز پڑھ لیتے تھے؟ کیا یہ حضرات وضو نہیں کرتے تھے؟ ایک مولانا صاحب نے اس کا جواب یہ دیا کہ نوم سے انبیاء کرام کا وضو نہیں ٹوٹتا ہے، تو اس شخص نے پھر یہ کہا: کیا ہمارے نبی ﷺ وضو نہیں کرتے تھے، آپ بغیر وضو کے نماز پڑھ لیتے تھے؟

اے وائی پٹیل ملاڈ (ممبئی ۶۴)

الجواب حامداً ومصلیاً:

یہ صحیح ہے کہ انبیاء کرام کا سونا ناقض وضو نہیں ہے، احادیث کی معتبر کتابوں میں یہ ملتا ہے کہ آپ ﷺ سونے کے بعد جب بیدا ہوتے، تو وضو کیے بغیر نمازیں پڑھتے تھے؛ البتہ آپ ﷺ کا وضو بول و براز سے اسی طرح ٹوٹ جاتا تھا، جس طریقہ سے امتی کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب

---

(۱) وفي الدر المختار: والعته لا ينقض كنوم الأنبياء - عليهم الصلاة والسلام -، وهل ينقض إغماؤهم وغشيهم؟ ظاهر كلام المبسوط نعم. قال ابن عابدين: (قوله: كنوم الأنبياء) قال في البحر: صرح في القنية بأنه من خصوصياته - صلى الله عليه وسلم - ولذا ورد في الصحيحين «أن النبي - صلى الله عليه وسلم - نام حتى نفخ ثم قام إلى الصلاة ولم يتوضأ» لما ورد في حديث آخر «وإن عيني تنامان ولا ينام قلبي». وفي القهستاني: لا نقض من الأنبياء - عليهم الصلاة والسلام -، ومقتضاه التعميم في كل النواقض، لكن نقل ط عن شرح الشفاء لملا علي القاري الإجماع على أنه - صلى الله عليه وسلم - في نواقض الوضوء كالأمة إلا ما صح من استثناء النوم. اهـ (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۴۳، كتاب الطهارة، مطلب نوم الأنبياء غير ناقض، ط: دار الفكر - بيروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ - ۱۹۹۲، ☆عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: نمت عند ميمونة والنبي صلى الله عليه وسلم عندها تلك الليلة، فتوضأ، ثم قام يصلي، فقمت عن يساره، فأخذني، فجعلني عن يمينه، فصلى ثلاث عشرة ركعة، ثم نام حتى نفخ، وكان إذا نام نفخ، ثم أتاه المؤذن، فخرج، فصلى ولم يتوضأ. (صحيح البخاري: ۱/ ۹۷، رقم الحديث: ۶۹۸، كتاب الأذان، باب: إذا قام الرجل عن يسار الإمام، فحوله الإمام إلى يمينه، لم تفسد صلاتهما، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۶۰، رقم الحديث: ۱۸۷ - (۷۶۳)، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب صلاة النبي صلى الله عليه وسلم ودعائه بالليل، ط: ديوبند ☆المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳ھ): ۲/ ۲۱۸، رقم الحديث: ۱۱۲۱، كتاب التطبيق، باب الدعاء في السجود، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

[۱۲] آشوب چشم کے مرض کی وجہ سے نکلنے والے پانی کا حکم

۴۴۸-سوال: آشوب چشم کے مرض کی وجہ سے جو پانی آنکھوں سے نکلتا ہے، وہ پاک ہے یا ناپاک؟ اور کیا اس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جائے گا؟ بہشتی زیور [۱] اور فتاوی رحیمیہ [۲] میں لکھا ہے کہ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، جب کہ فتاوی رشیدیہ [۳] اور فتاوی دارالعلوم [۴] میں لکھا ہے کہ وہ پانی ناپاک نہیں ہے اور اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا، تو اب عمل کس پر کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً

آشوب چشم کے مرض کی وجہ سے جو پانی آنکھوں سے نکلتا ہے، وہ ناپاک ہے؛ کیوں کہ اس مرض کی وجہ سے آنکھوں میں چھوٹے چھوٹے دانے ہوجاتے ہیں، اور ان ہی دانوں سے وہ پانی نکلتا ہے؛ اس لیے وہ

---

(۱) ایسے ہی اگر آنکھیں دکھتی ہوں اور کھٹکتی ہوں، تو پانی بہنے اور آنسو نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اور اگر آنکھیں نہ دکھتی ہوں، اور نہ اس میں کچھ کھٹک ہوں، تو آنسو نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ (بہشتی زیور کامل، ص:۶۱)

(۲) فتاویٰ رحیمیہ (۴/۲۹، کتاب الطہارت، مرض آشوب چشم (آنکھ دکھنا) میں آنکھوں سے نکلنے والے پانی کا حکم، ط: دارالاشاعت، پاکستان) میں ہے:

مرض آشوب چشم (آنکھ دکھنا) لاحق ہونے کی حالت میں جو چکنا پانی یا پیپ نکلتا ہے، اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اور جو چیز ناقض وضو ہوتی ہے وہ ناپاک ہوتی ہے، آنکھوں میں تکلیف اور درد نہ ہو، اس وقت آنکھ سے پانی نکلے، اس سے وضو نہیں ٹوٹتا: (کما) لا ينقض (لو خرج من أذنه) ونحوها كعينه وثديه (قيح) ونحوه كصديد وماء سرة وعين (لا بوجع) وإن خرج (به) أي بوجع (نقض) لأنه دليل الجرح، فدمع من بعينه رمد أو عمش ناقض. (در مختار مع رد المحتار: ۱/۱۴۷، مطلب نواقض الوضوء)

(۳) آنکھ دکھنے میں جو پانی نکلتا ہے، پاک ہے، اگرچہ بعض نے ناپاک کہہ دیا ہے؛ لیکن تحقیق کے خلاف ہے۔ (ص:۲۹۵، طہارت، آنکھ دکھنے کی وجہ سے اگر پانی آنکھ سے بہے، ط: دارالاشاعت-کراچی)

(۴) آنکھ دکھنے میں جو پانی نکلتا ہے، اس میں تحقیقی قول وہی ہے، جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ نے ارقام فرمایا ہے، اس مسئلے کی بحث درمختار و شامی (۱/۱۴۷) میں اس طرح کی ہے کہ صاحب درمختار نے یہ لکھا ہے کہ وہ پانی نجس اور ناقض وضو ہے، عبارت اس کی یہ ہے: فدمع من بعينه رمد أو عمش ناقض الخ. اس پر شامی نے امام ابن ہمامؒ کی تحقیق یہ نقل کی ہے کہ ایسی صورت میں وضو کا حکم استحباباً ہے وجوباً نہیں، جیسا کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے، پس معلوم ہوا کہ وہ پانی ناقض وضو نہیں ہے، عبارت شامی کی یہ ہے: قال في المنية: وعن محمد إذا كان في عينيه رمد وتسيل الدموع منها آمره بالوضوء لوقت كل صلاة لأني أخاف أن يكون ما يسيل منها صديدا فيكون صاحب العذر. اهـ. اس عبارت سے معلوم ہوا کہ امام ابن ہمامؒ کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ناقض وضو نہیں ہے، اور یہ موافق قواعد شرعیہ کے ہے، یہی راجح ہے۔ (فتاوی دارالعلوم: ۱/۱۳۴، سوال نمبر: ۲۶، طہارت، آنکھ سے پانی گرنا ناقض وضو ہے یا نہیں؟ ط: زکریا-دیوبند)

ناپاک ہے، آشوب چشم کے مرض کے علاوہ کسی اور وجہ سے اگر پانی نکلے، تو وہ پاک ہے، ناپاک نہیں۔ [1]
فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] وضو کے دوران آنکھوں میں پانی کے چھینٹے مارنا

۴۴۹-سوال: وضو کرتے وقت بہت سے لوگ منہ دھونے کے بعد آنکھ پر دو تین مرتبہ پانی مار کر اسے دھوتے ہیں، کیا اس طرح دھونا ثواب کی زیادتی کا سبب ہے؟ آنکھوں میں پانی مارنا طبی اعتبار سے آنکھوں کی روشنی بڑھانے میں اور صفائی میں مفید بتلایا جاتا ہے، اس مقصد سے اگر یہ عمل وضو کے ساتھ کیا جائے، تو کیسا ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

وضو میں آنکھ کے اندرونی حصے کا دھونا ثواب کی زیادتی کا باعث نہیں ہے، اس سے منع کیا گیا ہے، کیوں کہ اس سے آنکھ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ چربی کی طرح ایک لطیف شئے ہے، جس کے لیے سرد و گرم پانی نقصان دہ ہے۔ [2] ہاں طبی اعتبار سے فائدہ ہو، تو ایسا کرنے کی اجازت ہوگی۔ تاہم فقہاء کی تصریح اس کے خلاف ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] ودی کا حکم

۴۵۰-سوال: زید جب پیشاب کرتا ہے، تو آخر میں دو تین گاڑھے قطرے منی جیسے نکلتے ہیں اور وہ کود کر شہوت کے ساتھ نہیں نکلتے تو کیا اس سے غسل واجب ہوگا؟ اور ان قطروں کو شریعت کی اصطلاح میں کیا کہتے ہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

شریعت کی اصطلاح میں ان قطروں کو ''ودی'' کہا جاتا ہے، یہ ناپاک ہیں، ان کے نکلنے سے وضو

---

(۱) (کما) لاینقض (لو خرج من أذنه) ونحوها كعينه وثديه (قيح) ونحوه كصديد وماء سرة وعين (لا بوجع) وإن خرج (به) أي بوجع (نقض) لأنه دليل الجرح، فدمع من بعينه رمد أو عمش ناقض. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۱۴۷-۱۴۸، مطلب نواقض الوضوء، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) لاغسل باطن العينين. (الدر المختار) وفي الشامية: لأنه شحم يضره الماء الحار والبارد. (رد المحتار: ۱/ ۹۷، كتاب الطهارة، في بيان فرائض الوضوء) ـــــ فمنها التعنيف في ضرب الماء على الوجه والمضمضة والاستنشاق باليسار والامتخاط باليمين من غير عذر. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۹، الوضوء، الفصل الرابع في المكروهات)

ٹوٹ جاتا ہے؛ لیکن غسل فرض نہیں ہوتا۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] ناپاکی سے متعلق وسوسہ کا حکم

۴۵۱-سوال: مجھے ناپاکی کے متعلق وسوسے آتے رہتے ہیں، یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں میرا وضو تو نہیں ٹوٹ گیا؟ اسی طرح یہ خیال آتا ہے کہ میں ناپاک تو نہیں ہوگیا؟ اس کے متعلق مجھے کیا کرنا چاہیے، کیا کسی انسان کو غلط وسوسے آسکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قاعدہ ہے کہ جو چیز یقینی طور پر ثابت ہو، وہ محض شک سے زائل نہیں ہوتی؛ لہٰذا اگر آپ کو کپڑے کی پاکی کا اور وضو کا یقین ہے، تو آپ کا وضو محض وسوسہ کی وجہ سے نہیں ٹوٹے گا اور کپڑا ابھی پاک رہے گا، اس طرح کے وسوسے انسان کے ذہن ودماغ میں پیدا ہوسکتے ہیں، ان کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے۔ ورنہ وسوسے ڈالنے والا شیطان آپ کو کبھی چین سے نہیں رہنے دے گا۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] جب تک وضو ٹوٹنے کا یقین نہ ہو، وضو باقی سمجھا جائے گا

۴۵۲-سوال: نماز کی حالت میں اکثر یہ وہم ہوتا ہے کہ گویا ریح خارج ہو رہی ہے۔ اب حقیقت میں ہوا خارج ہوتے وقت ہوا نکلنے کی جگہ بڑی ہوتی ہے اور پھولتی ہے؛ لیکن وہ جگہ بڑی ہوکر پھولتی نہ ہو اور ہم کو ریح خارج ہونے کا وہم پیدا ہو، تو مشکوۃ شریف کی جو حدیث ہے کہ شیطان وساوس ڈالنے کے لیے ہوا نکلنے کی جگہ کے بال کھینچتا ہے، تاکہ لوگوں کے دلوں میں وضو ٹوٹ جانے کا وسوسہ پیدا ہو، تو کیا مذکورہ صورت حال بال کھینچے سے پیدا ہوسکتی ہے؟ بینوا توجروا۔

---

(۱) "ودي" وهو ماء أبيض كدر ثخين، لا رائحة له، يعقب البول وقد يسبقه، أجمع العلماء على أنه لا يجب الغسل بخروج المذي والودي. (مراقي الفلاح، ص: ۴۳، كتاب الطهارة، فصل: عشرة أشياء لا يغتسل منها، ط: زكريا-ديوبند)

(۲) الأصل أن ما ثبت باليقين لا يزول بالشك. قال الإمام النسفي: من مسائله أن من شك في الحدث بعد ما تيقن بالوضوء فهو على وضوئه ما لم يتيقن بالحدث، ومن شك في وضوئه بعد ما تيقن بحدثه، فهو على حدثه ما لم يتيقن بوضوئه. (أصول الكرخي مع ذكر امثلتها من النسفي، مندرجہ: قواعد الفقه، ص: ۱۱، ط: دار الكتاب-ديوبند☆ مزید دیکھیے: بدائع الصنائع: ۱/ ۱۴۰، كتاب الطهارة، فصل في نواقض الوضوء)

الجواب حامداً ومصلیاً:

یہ بات تو صحیح ہے کہ جب تک وضوٹوٹنے کا یقین نہ ہو، وضوکو باقی سمجھنا چاہیے۔[۱] اور شیطان اس طرح کے وساوس ڈالتا ہے۔لیکن بال کھینچنے والی حدیث مشکوۃ شریف میں کون سی جگہ ہے؟ تحریر کیجیے۔فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] خروجِ ریح کے شک کی وجہ سے وضوٹوٹے گا یا نہیں؟

گذشتہ سے پیوستہ

۴۵۳-سوال: اگر کسی شخص کو یہ محسوس ہو کہ دبر سے بال کی طرح کوئی پتلی چیز نکلی، البتہ وہ ریح ہے یا نہیں، اس میں اسے شک ہے، جیسا کہ مشکوۃ شریف کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ شیطان بہت سی دفعہ اس طرح کے وساوس ڈالتا ہے، تو اس وہم کو شیطانی وسوسہ سمجھا جائے، یا وضوکا ٹوٹنا؟[۲]

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر یہ یقین ہو جائے کہ ریح خارج ہوئی ہے، تو وضو ٹوٹ جائے گا اور دوبارہ وضو کرنا پڑے گا اور اگر خروجِ ریح کا صرف شک ہوا ہے، تو اس کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔فقط، واللہ اعلم بالصواب۔(درمختار: ۱/ ۱۵۰)[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولو أيقن بالطهارة، وشك بالحدث أو بالعكس أخذ باليقين. (الدر مع الرد: ۱/ ۱۵۰، كتاب الطهارة، باب الوضوء، مطلب في ندب مراعاة الخلاف إذا لم يرتكب مكروه مذهبه، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) وعن أبي بن كعب عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: إن للوضوء شيطانا، يقال له الولهان، فاتقوا وسواس الماء. رواه الترمذي وابن ماجة. وقال الترمذي: هذا حديث غريب، وليس إسناده بالقوي عند أهل الحديث؛ لأنا لا نعلم أحدا أسنده غير خارجة، وهو ليس بالقوي عند أصحابنا. (مشكاة المصابيح- محمد بن عبد الله الخطيب العمري، أبو عبد الله، ولي الدين، التبريزي (م: ۷۴۱هـ): ۱/ ۱۳۱، رقم الحديث: ۴۱۹، باب سنن الوضوء، الفصل الثاني، ت: محمد ناصر الدين الألباني، ط: المكتب الإسلامي- بيروت)

[۳] ولو أيقن في الطهارة وشك بالحدث أو بالعكس أخذ باليقين. (الدر المختار) ـــــــ وقال ابن عابدين: (قوله: ولو أيقن بالطهارة إلخ) حاصله أنه إذا علم سبق الطهارة وشك في عروض الحدث بعدها أو بالعكس أخذ باليقين وهو السابق. قال في الفتح إلا إن تأيد اللاحق؛ فعن محمد علم المتوضي دخول الخلاء للحاجة وشك في قضائها قبل خروجه عليه الوضوء، أو علم جلوسه للوضوء بإناء وشك في إقامته قبل قيامه لا وضوء. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۵۰، باب الوضوء، ط: بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳، كتاب الطهارة، الفصل الخامس في نواقض الوضوء، ط: رشيديه-پاكستان☆المحيط البرهاني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مازة =

[۱۸] دوران نماز معمولی ریح خارج ہوئی تو؟

۴۵۴-سوال: نماز کے دوران پیچھے کی راہ سے ہلکی سی ہوا خارج ہوجائے، تو کیا حکم ہے؟ کیا نماز توڑ دینی چاہیے؟ اور کس مقدار میں ہوا خارج ہونے سے وضو لازم ہوتا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

نماز کے دوران پیچھے کی راہ سے ہوا خارج ہوئی اور اس کا یقین ہوگیا تو وضو ٹوٹ گیا، لہٰذا وضو کر کے دوبارہ نماز پڑھے، یا جس قدر نماز پڑھ چکا تھا، اس پر بناء کرے۔ البتہ پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہوئی، جس سے شک پیدا ہوا، تو محض شک سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اور وضو ٹوٹنے کے لیے ہوا کی کوئی مقدار معین نہیں، معمولی ہوا بھی وضو توڑنے کے لیے کافی ہے، جب کہ اس کے نکلنے کا یقین ہوجائے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ):۱/۶۷، كتاب الطهارات، الفصل الثاني: في بيان ما يوجب الوضوء وما لا يوجب، قبيل الفصل الثالث، ت: عبدالكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

قال: ومن شك في الحدث فهو على وضوئه، وإن كان محدثا فشك في الوضوء فهو على حدثه؛ لأن الشك لا يعارض اليقين، وما تيقن به لا يرتفع بالشك. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م:۴۸۳ھ):۱/۸۶، كتاب الصلاة، باب الوضوء والغسل، ط: دار المعرفة-بيروت)

(۱) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا وجد أحدكم في بطنه شيئا، فأشكل عليه أخرج منه شيء أم لا، فلا يخرجن من المسجد حتى يسمع صوتا، أو يجد ريحا. (الصحيح لمسلم:۱/۱۵۸، رقم الحديث: ۹۹-۳۶۲، كتاب الحيض، باب الدليل على أن من تيقن الطهارة، ثم شك في الحدث فله أن يصلي بطهارته تلك، ط: رشيدية-دهلي)

قال الملا علي القاري: (حتى يسمع صوتا): أي: صوت ريح يخرج منه (أو يجد ريحا): أي: يجد رائحة ريح خرجت منه، وهذا مجاز عن تيقن الحدث. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م:۱۰۱۴ھ):۱/۳۶۰، رقم الحديث: ۳۰۶، باب ما يوجب الوضوء، ط: دار الفكر - بيروت ☆ فيض القدير شرح الجامع الصغير - زين الدين محمد المدعو بعبد الرؤوف بن تاج العارفين، المناوي القاهري (م:۱۰۳۱ھ):۲/۳۵۲، حرف الهمزة، ط: المكتبة التجارية الكبرى-مصر)

قال: ومن شك في الحدث فهو على وضوئه، وإن كان محدثا فشك في الوضوء فهو على حدثه؛ لأن الشك لا يعارض اليقين، وما تيقن به لا يرتفع بالشك. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م:۴۸۳ھ):۱/۸۶، كتاب الصلاة، باب الوضوء والغسل، ط: دار المعرفة-بيروت)

[۱۹] گالیاں بکنا ناقض وضو نہیں ہے

۴۵۵-سوال: وضو کی حالت میں گالیاں بکنے اور لایعنی باتیں کرنے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ اور کیا نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

صورتِ مسئولہ میں وضو نہیں ٹوٹے گا، جب وضو نہیں ٹوٹے گا، تو نماز کے صحیح نہ ہونے کا کیا مطلب؟[۱]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] تعلیم الاسلام کے ایک سوال و جواب کے متعلق تفصیل

۴۵۶-سوال: "تعلیم الاسلام" کے تیسرے حصے میں ایک سوال اور اُس کا جواب حسبِ ذیل ہے:

س: اگر قرآن مجید پڑھنے، یا چھونے، یا مسجد میں جانے، یا اذان کہنے یا سلام کا جواب دینے کی نیت سے تیمم کیا، تو اُس سے نماز جائز ہے یا نہیں؟

ج: جائز نہیں۔[۲]

اب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہی حکم وضو کا بھی ہے؟ یا یہ حکم تیمم کے ساتھ ہی خاص ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

یہ حکم صرف تیمم ہی کے ساتھ خاص ہے، وضو کے لیے نہیں ہے، وجہ اُس کی یہ ہے کہ تیمم مجبوری کی

(۱) نوٹ: البتہ اعادۂ وضو مستحب ہے: والثالث مندوب للنوم على طهارة، وإذا استيقظ منه وللمداومة عليه، وللوضوء على الوضوء، وبعد غيبة، وكذب، ونميمة، وكل خطيئة. (نور الإيضاح، ص: ۳۷، كتاب الطهارة، فصل في الوضوء على ثلاثة أقسام، ط: تاج كمپنی چوك بازار، سهارن پور)

وقال في شرحه: "وبعد "كلام "غيبة" بذكرك أخاك بما يكره في غيبته. "وكذب" اختلاق ما لم يكن ولا يجوز إلا في نحو: الحرب وإصلاح ذات البين وإرضاء الأهل، "ونميمة" النمام: المضرب والنميم والنميمة: السعاية بنقل الحديث من قوم إلى قوم على جهة الإفساد "و" بعد "كل خطيئة وإنشاد شعر" قبيح لأن الوضوء يكفر الذنوب الصغائر. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح-حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي، الحنفي (م: ۱۰۶۹ھ)، ص: ۳۷، كتاب الطهارة، فصل في الوضوء على ثلاثة أقسام، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

(۲) تعلیم الاسلام: ۳/ ۴۵، تیمم کا بیان، ط: کتب خانہ عزیزیہ- جامع مسجد، دہلی۔

حالت میں پاکی کا سبب ہے، اور مذکورہ اعمال میں سے کوئی عمل عبادتِ مقصودہ نہیں ہے؛ اِس لیے اُس تیمم سے نماز جیسی عبادتِ مقصودہ ادا نہیں ہوگی۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] چہار زانو بیٹھ کر سونے سے وضو ٹوٹے گا یا نہیں؟

۴۵۷-سوال: ایک شخص مسجد میں باوضو ہونے کی حالت میں چہار زانو بیٹھ کر سو گیا، اُسی حالت میں اُسے نیند کا جھونکا آیا اور مقعد کا حصہ زمین سے اونچا ہو گیا، تو کیا اِس سے اُس کا وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

چہار زانو بیٹھ کر سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اور ایسی حالت میں ایک یا دو مرتبہ نیند کا جھونکا آ گیا اور مقعد کا حصہ زمین سے اٹھ گیا؛ لیکن وہ فوراً سنبھل کر سیدھا بیٹھ گیا، تو وضو نہیں ٹوٹے گا؛ لیکن اگر ایک مرتبہ اس طرح ہونے کے بعد بھی اُس کی نیند برقرار رہی اور متنبہ نہیں ہوا، تو اُس کا وضو ٹوٹ جائے گا، اور اسی میں احتیاط ہے۔ (شامی: ۱/ ۱۴۳)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] وقالوا: لو تيمم لدخول مسجد، أو لقراءة، ولو من مصحف، أو مسه، أو كتابته، أو تعليمه، أو لزيارة قبور، أو عيادة مريض، أو دفن ميت، أو أذان، أو إقامة، أو إسلام، أو سلام، أو رده، لم تجز الصلاة به عند العامة. (الدر مع الرد: ۱/ ۲۴۵، كتاب الطهارة، باب التيمم، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

قال ابن عابدين: (قوله لم تجز الصلاة به) أي لفقد الشرط، وهو أمران: كون المنوي عبادة مقصودة، وكونها لا تحل إلا بالطهارة. ــــــــــ أما في دخول المسجد ففي المحدث فقد الأمرين، وفي الجنب فقد الأول، وأما في القراءة للمحدث فلفقد الثاني، . . . وأما المس مطلقا فلفقد الأول . . . فإذا تيمم لذلك كانت العلة فقد الأمرين. (رد المحتار: ۱/ ۲۴۵، كتاب الطهارة، باب التيمم، ط: بيروت)

[۲] وإن نام جالسا وهو يتمايل وربما تزول مقعدته عن الأرض قال شمس الأئمة الحلواني: ظاهر المذهب أنه لا يكون حدثا. كذا في فتاوى قاضي خان. ــــــــــ ولو نام قاعدا فسقط على وجهه أو جنبه إن انتبه قبل سقوطه أو حالة سقوطه أو سقط نائما وانتبه من ساعته لا ينتقض وإن استقر نائما ثم انتبه ينتقض. كذا في التبيين. وإن نام متربعا لا ينتقض الوضوء وكذا لو نام متوركا بأن يبسط قدميه من جانب ويلصق أليتيه بالأرض كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲، كتاب الطهارة، الباب الأول في الوضوء، الفصل الخامس في نواقض الوضوء، ط: دار الفكر-بيروت)

(و) ينقضه حكما (نوم يزيل مسكته) أي قوته الماسكة بحيث تزول مقعدته من الأرض، وهو النوم على أحد جنبيه أو وركيه أو قفاه أو وجهه (وإلا) يزل مسكته (لا) ينقض . . . ولو نام قاعدا يتمايل فسقط، إن انتبه حين سقط فلا نقض، به يفتى كناعس يفهم أكثر ما قيل عنده. (الدر مع الرد: ۱/ ۱۴۱-۱۴۲، كتاب الطهارة، باب الوضوء) =

[۲۲] وضو یا اذان کے دوران سلام اور اُس کا جواب

۴۵۸-سوال: آپس میں سلام کا پھیلانا ایک اہم دینی حکم ہے، اس کو بنیاد بناکر بعض حضرات وضو یا اذان کے دوران بھی سلام کرتے ہیں اور جب اُنھیں کوئی جواب نہ دے، تو اُس پر نالاں ہوکر کہتے ہیں کہ لگتا ہے یہاں کوئی انسان نہیں بستا، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا وضو یا اذان کے دوران سلام کا جواب دینا ضروری ہے؟ نیز سلام کن جگہوں میں نہیں کرسکتے؟ تفصیلاً جواب عنایت فرمائیں؛ تاکہ آپسی غلط فہمی کا ازالہ ہوسکے۔

الجواب حامداً ومصلیا:

سلام کرنا سنت ہے اور اُس کا جواب دینا واجب ہے؛ لیکن ۲۰ رسے زیادہ احوال ایسے ہیں، جن میں فوراً سلام کا جواب دینا واجب نہیں اور بعض احوال میں تو خود سلام کرنے والا گنہ گار شمار ہوتا ہے، تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) نماز پڑھنے کے دوران۔ (۲) کھانے کے دوران۔ (۳) پانی پینے کے دوران۔ (۴) تلاوتِ قرآن کے دوران۔ (۵) ذکر واذکار اور دعا کے دوران۔ (۶) خطبہ کے دوران۔ (۷) تلبیہ کے دوران۔ (۸) استنجاء کے دوران۔ (۹) اقامت کے دوران۔ (۱۰) اذان کے دوران۔ (۱۱) بچے کے سلام پر۔ (۱۲) مدہوش کے سلام پر (۱۳) جوان عورت کے سلام پر۔ (۱۴) فاسق کے سلام پر۔ (۱۵) اونگھنے کی حالت میں۔ (۱۶) سونے کی حالت میں۔ (۱۷) جماع کی حالت میں۔ (۱۸) فیصلے کے دوران۔ (۱۹) غسل خانے میں۔ (۲۰) مجنون کے سلام پر۔ (۲۱) مسائلِ فقہیہ کی تعلیم کے دوران۔

ان صورتوں میں سلام نہیں کرنا چاہیے، اور اگر کسی نے سلام کیا، تو جواب دینا واجب نہیں ہے؛ لہٰذا اگر وضو کے دوران سلام کیا جائے، تو جو لوگ وضو سے فارغ ہو چکے ہیں، اُن میں سے کوئی ایک شخص جواب

=قال ابن عابدين: (قوله: به يفتى) كذا في الخلاصة. وقيل: إن ارتفعت مقعدته قبل انتباهه نقض وإن لم يسقط. وفي الخانية عن شمس الأئمة الحلواني أنه ظاهر المذهب، وعليه مشى في [نور الإيضاح] قال في شرح المنية: والأول أولى لأنه لا يتم الاسترخاء بعد مزايلة المقعدة حيث انتبه فورا. (رد المحتار: ۱/۱۴۳، كتاب الطهارة، باب الوضوء، ط: بيروت)

دے دے، تمام کی جانب سے کفایت کرجائے گا، اور اگر وضو کرنے والے نے جواب دیا، تب بھی صحیح ہے۔[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] وضو میں استعمال ہونے والا پانی گٹر میں گرانا کیسا ہے؟

۴۵۹-سوال: سورت میں ہمارا ایک چار منزلہ مکان ہے، جس میں بیت الخلاء اور حمام ایک ساتھ ہی ہے، بیت الخلا اور حمام میں ایک ہی پائپ لائن ہے، جس کے ذریعہ مستعمل پانی گٹر (GUTTER) میں جاتا ہے تو کیا وضو میں استعمال شدہ پانی کا گٹر میں جانا شریعت کے اعتبار سے ناجائز ہے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامدا و مصليا

وضو کا مستعمل پانی گٹر (GUTTER) میں جاتا ہو، تو شرعاً کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہاتھ، منہ، آنکھ، ناک سے سرزد ہونے والے گناہ وضو کے پانی کے ساتھ صاف ہوجاتے ہیں۔[2]

(۱) وفي شرح الشرعة: صرح الفقهاء بعدم وجوب الرد في بعض المواضع: القاضي إذا سلم عليه الخصمان، والأستاذ الفقيه إذا سلم عليه تلميذه أو غيره أوان الدرس، وسلام السائل، والمشتغل بقراءة القرآن، والدعاء حال شغله، .... اهـ. وفي البزازية: لا يجب الرد على الإمام والمؤذن والخطيب عند الثاني، وهو الصحيح اهـ....، وقد نظم الجلال السيوطي المواضع التي لا يجب فيها رد السلام ونقلها عنه الشارح في هامش الخزائن، فقال:

رد السلام واجب إلا على … من في الصلاة أو بأكل شغلا
أو شرب أو قراءة أو أدعيه … أو ذكر أو في خطبة أو تلبيه
أو في قضاء حاجة الإنسان … أو في إقامة أو الآذان
أو سلم الطفل أو السكران … أو شابة يخشى بها افتتان
أو فاسق أو ناعس أو نائم … أو حالة الجماع أو تحاكم
أو كان في الحمام أو مجنونا … فواحد من بعدها عشرونا

(ردالمحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۱۸، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة ومايكره فيها، مطلب المواضع التي لا يجب فيها رد السلام، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: »إذا توضأ العبد المسلم - أو المؤمن - فغسل وجهه خرج من وجهه كل خطيئة نظر إليها بعينيه مع الماء - أو مع آخر قطر الماء -، فإذا غسل يديه خرج من يديه كل خطيئة =

اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے مطابق مستعمل پانی ناپاک ہے۔[۱] تو جس گٹر (GUTTER) میں ناپاک پانی جاتا ہو، اس میں اگر وضو کا پانی بھی چلا جائے، تو کیا حرج ہے؟[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] بلی اگر کسی کی گود میں بیٹھ جائے، تو اس کا کپڑا ناپاک ہوگا یا نہیں؟

۴۶۰-سوال: جب میں گھر آتا ہوں، تو بلی کا بچہ میری گود میں آکر بیٹھ جاتا ہے، کیا اس سے کپڑا ناپاک ہوجائے گا؟

الجواب حامداومصليا:

بلی کے بدن پر کوئی ناپاکی لگی ہوئی نہ ہو، تو اس کے محض بیٹھنے سے نہ بدن ناپاک ہوگا اور نہ ہی کپڑا۔[۳]

= كان بطشتها يداه مع الماء أو مع آخر قطر الماء - ،فإذا غسل رجليه خرجت كل خطيئة مشتها رجلاه مع الماء - أو مع آخر قطر الماء - حتى يخرج نقيا من الذنوب ». (الصحيح لمسلم:١/ ١٢٥، رقم الحديث:٣٢-(٢٤٤)، كتاب الطهارة، باب خروج الخطايا مع ماء الوضوء. ط: رشيدية- دهلي☆سنن الترمذي:١/ ٣، رقم الحديث:٢، أبواب الطهارة، باب ما جاء في فضل الطهور، ط: فيصل - ديوبند☆الموطأ للإمام مالك بن أنس بن مالك بن عامر الأصبحي المدني (م:١٧٩هـ): ٢/ ٤٢، رقم الحديث:٣٢/ ٨٥، وقوت الصلاة، جامع الوضوء، ت: محمد مصطفى الأعظمي، ط: مؤسسة زايد بن سلطان آل نهيان للأعمال الخيرية والإنسانية- أبو ظبي- الإمارات)

(١) ثم مشايخ بلخ حققوا الخلاف فقالوا: الماء المستعمل نجس عند أبي حنيفة وأبي يوسف. وعند محمد طاهر غير طهور، ومشايخ العراق لم يحققوا الخلاف فقالوا: إنه طاهر غير طهور عند أصحابنا، حتى روي عن القاضي أبي حازم العراقي أنه كان يقول: إنا نرجو أن لا تثبت رواية نجاسة الماء المستعمل عن أبي حنيفة، وهو اختيار المحققين من مشايخنا بما وراء النهر. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع- علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م:٥٨٧هـ):١/ ٦٧، كتاب الطهارة، فصل في الطهارة الحقيقية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(٢) مزید دیکھیے: کتاب الفتاویٰ- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ: ٢/ ٤٢، ٤٣، طہارت کے احکام، وضوء کا پانی بیت الخلاء کی موری میں، ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند۔

(٣) عن حميدة بنت عبيد بن رفاعة، عن كبشة بنت كعب بن مالك- وكانت تحت ابن أبي قتادة- أن أبا قتادة، دخل فسكبت له وضوءا، فجاءت هرة فشربت منه، فأصغى لها الإناء حتى شربت، قالت كبشة: فرآني أنظر إليه، فقال: أتعجبين يا ابنة أخي؟ فقلت: نعم، فقال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إنها ليست بنجس، إنها من الطوافين عليكم والطوافات. (سنن أبي داؤد:١/ ١٠، رقم الحديث:٧٥، كتاب الطهارة، باب سؤر الهرة، ط: ديوبند☆سنن الترمذي:١/ ٢٧، رقم الحديث:٩٢، أبواب الطهارة، باب ما جاء في سؤر الهرة، ط: ديوبند☆المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي:١/ ٥٥، رقم الحديث:٦٨، سؤر الهرة، انظر ايضاً: ٣٤٠، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: حلب)=

لیکن بلی بدن چاٹے یا ہاتھ چاٹے، تو اس جگہ کو دھونا مستحب ہے۔ (عالمگیری: ۱/ ۱۸۰)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] پیشاب شرم گاہ میں آکر رک جائے، تو کیا وضو ٹوٹ جائے گا؟

۴۶۱-سوال: پیشاب شرم گاہ کے اندرونی حصے میں آکر رک جائے؛ لیکن باہر نہ نکلا ہو، تو کیا وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

پیشاب شرم گاہ کے اندرونی حصے میں اتر آئے؛ لیکن شرم گاہ سے باہر ظاہر نہ ہو، تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ (۲)

= "وسؤر الهرة طاهر مكروه" وعن أبي يوسف رحمه الله أنه غير مكروه ؛لأن النبي عليه الصلاة والسلام كان يصغي لها الإناء، فتشرب منه ثم يتوضأ به ولهما قوله عليه الصلاة والسلام "الهرة سبع". (الهداية في شرح بداية المبتدي: ۱/ ۲۶، باب: الماء الذي يجوز به الوضوء وما لا يجوز ،فصل في الأسآر وغيرها ،ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت ☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق: ۱/ ۳۳، أقسام الماء، ماء البئر إذا وقعت فيه نجاسة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

[۱] ويكره أن تلحس الهرة في كف إنسان ثم يصلي قبل غسلها. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۴، كتاب الطهارة، الباب الثالث في المياه، الفصل الثاني فيما لا يجوز به التوضؤ، ط: بيروت ☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ هـ): ۱/ ۳۳، كتاب الطهارة، ماء البئر إذا وقعت فيه نجاسة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة ☆ البناية شرح الهداية - بدر الدين العينى (م: ۸۵۵هـ): ۱/ ۴۸۱، سؤر الهرة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح، ص: ۱۸، فصل في بيان أحكام السؤر، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

(۲) وإذا وقع البول في قصبة الذكر لم ينتقض وضوءه. (الأصل المعروف بالمبسوط - أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني (م: ۱۸۹هـ): ۱/ ۶۵، كتاب الصلاة، باب الوضوء والغسل من الجنابة، ت: أبو الوفا الأفغاني، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية - كراتشي)

ثم المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور. (الدر المختار)———— قال ابن عابدين: (قوله: مجرد الظهور) من إضافة الصفة إلى الموصوف: أي الظهور المجرد عن السيلان، فلو نزل البول إلى قصبة الذكر لا ينقض لعدم ظهوره. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۳۵، سنن الوضوء، ط: بيروت ☆العناية شرح الهداية - محمد بن محمد بن محمود، أكمل الدين ، الرومي البابرتي (م: ۷۸۶هـ): ۱/ ۳۹، كتاب الطهارات، فصل في نواقض الوضوء، ط: دار الفكر ☆البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۱/ ۳۲، نواقض الوضوء، ط: دار الكتاب الإسلامي)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] کیا وضو کرتے وقت ''یا قادر'' کا ورد ثابت ہے؟

۴۶۲-سوال: ایک شخص نے بیان کیا کہ انہوں نے مولانا حقانی صاحب وانکانیری (گجرات) کے وعظ میں سنا ہے کہ جب کوئی آدمی وضو کے لیے بیٹھے اور وضو کے شروع میں ایک مرتبہ درود شریف پڑھنے کے بعد سے وضو کے ختم ہونے تک (یا قادر) پڑھتا رہے اور اخیر میں پھر ایک مرتبہ درود شریف پڑھے، تو انشاء اللہ اس کی جو بھی حاجت ہوگی، وہ پوری ہوگی۔

کیا یہ عمل صحیح و معتبر ہے؟ اور ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ سے تو ثابت نہیں ہے، البتہ بزرگان دین کے وظائف میں ہے؛ لہٰذا اس کے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] نماز جنازہ کے لیے کیے جانے والے وضو سے فرض نماز پڑھنا

۴۶۳-سوال: ایک شخص نے جنازہ کی نماز کے لیے وضو کیا، تو کیا اس وضو سے فرض یا سنت نماز پڑھ سکتا ہے؟ ہمارے امام صاحب کا کہنا ہے کہ ''اس وضو سے فرض اور سنت نماز جائز نہیں ہے''۔ کیا یہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

وضو کی صحت کے لیے نیت شرط نہیں ہے، نیت کے بغیر بھی وضو ادا ہو جائے گا۔ (کبیری، ص: ۵۲)[۱]

لہٰذا جنازہ کی نماز کے لیے جو وضو کیا گیا ہے، اس سے فرض نماز پڑھنا جائز ہے، آپ کے امام صاحب سے مسئلہ بتانے میں چوک ہوئی ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) والنیة سنة في الوضوء، ولیست بفرض. (غنیة المستملي في شرح منیة المصلي، ص: ۲۴، قبیل باب في آداب الوضوء، ط: دار الکتاب- دیوبند)

(وأما) النیة فلیست من الشرائط. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۷، کتاب الطهارة، فصل شرائط أرکان الوضوء، ط: بیروت)

[۲۸] نماز کے دوران شرم گاہ میں ایستادگی پیدا ہوجائے، تو وضوٹوٹ جائے گا؟

۴۶۴-سوال: نماز کی حالت میں خیالات فاسدہ کے آنے کی وجہ سے شرم گاہ (ذکر) میں تبدیلی پیدا ہوجائے اور عضو مخصوص ایستادہ ہوجائے، تو اس سے نماز یا وضو میں کوئی خرابی تو نہیں آئے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر منی یا مذی (چکنا مادّہ/ پانی) کا ایک قطرہ بھی خارج ہوگا، تو وضوٹوٹ جائے گا اور نماز بھی ٹوٹ جائے گی، ناپاکی دھوکر دوبارہ نماز ادا کرنی ہوگی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] تلاوتِ قرآن کے دوران تھوڑے تھوڑے وقفے سے ریح کا خارج ہونا

۴۶۵-سوال: کوئی آدمی قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا ہو اور اس درمیان تھوڑے تھوڑے وقفے پر ہوا خارج ہوتی ہو، تو کیا ہر مرتبہ وضو کرنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قرآن کریم کو ہاتھ لگائے بغیر، رومال وغیرہ کی مدد سے کھول کر تلاوت کرنا صحیح ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن أبي هريرة، أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- قال: لا وضوء إلا من صوت أو ريح. (سنن الترمذي: ۱/ ۲۳، رقم الحديث: ۷۴، أبواب الطهارة، باب ما جاء في الوضوء من الريح، ط: البدر - ديوبند☆سنن ابن ماجة، ص: ۳۹، رقم الحديث: ۵۱۳تا۵۱۶، أبواب الطهارة وسننها، باب لا وضوء إلا من حدث، ط: المكتبة الأشرفية - ديوبند)

"المعاني الناقضة للوضوء كل ما يخرج من السبيلين " لقوله تعالى: ﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ﴾ [النساء: ۴۳] وقيل لرسول الله صلى الله عليه وسلم: ما الحدث؟ قال: " ما يخرج من السبيلين ". وكلمة ما عامة فتتناول المعتاد وغيره ". (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر، الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۱۷، كتاب الطهارة، باب الوضوء، فصل في نواقض الوضوء، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت ☆درر الحكام شرح غرر الأحكام- محمد بن فرامرز بن علي الشهير بـ ملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۱/ ۱۲، كتاب الطهارة، نواقض الوضوء، ط: دار إحياء الكتب العربية)

(۲) أما المحدث فحكمه وحكم الطاهر سواء غير أنه لا يجوز له أداء الصلاة إلا بالوضوء، ولا يباح له مس المصحف إلا بغلافه... ويباح له دخول المسجد وقراءة القرآن وأداء الصوم... واختلف المشايخ في تفسير الغلاف، قال بعضهم: هو الجلد الذي عليه. وقال بعضهم هو الكم. وقال بعضهم: هو الخريطة، وهو الصحيح؛ لأن الجلد تبع للمصحف والكم تبع للحامل فأما الخريطة فليست بتبع. (تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي=

[۳۰] اگر چہرے یا ہاتھ پر گھی، ویسلین یا تیل وغیرہ لگا ہو، تو وضو ہوگا یا نہیں؟

۴۶۶-سوال: سردی کے موسم میں بعض لوگ چہرہ اور ہاتھ پر چکنی چیزیں لگاتے ہیں، اس صورت میں وضو کرنے سے چکنائی والی جگہ پر پانی ٹھہرتا نہیں ہے، تو کیا اس سے وضو میں کوئی خرابی آئے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

تیل، گھی یا ویسلین ہاتھ یا چہرے پر لگایا ہوا اور دوران وضو اس پر پانی بہادیا ہو، تو وضو ہو جائے گا، پانی کا بہانا ضروری ہے، ہاں اگر ان کے رہتے ہوئے پانی جسم اعضاء وضو تک سرایت نہ کرے، تو وضو نہیں ہوگا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] گالی گلوچ کرنے یا گانا بجانے کی وجہ سے وضو ٹوٹے گا یا نہیں؟

۴۶۷-سوال: وضو کی حالت میں کوئی آدمی گالی گلوچ کرے، گانا سنے، یا گندی اور نامناسب باتیں کرے، تو اس سے وضو باقی رہے گا یا نہیں؟ اس طرح کی حرکتوں کے بعد نماز پڑھنے یا قرآن مجید کی تلاوت کرنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟

= أحمد أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰ھ): ۱/ ۳۱، كتاب الطهارة، باب الحدث، ط: دار الكتب العلمية)

المحدث لا يمس المصحف ولا الدرهم الذي كتب عليه القرآن، لقوله تعالى: {لا يمسه إلا المطهرون} (الواقعة: ۷۹).
ولا بأس بأن يقرأ القرآن؛ لما روي عن بعض الصحابة أن رسول الله عليه السلام: كان لا يحجزه شيء عن قراءة القرآن إلا الجنابة. (المحيط البرهاني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۱/ ۷۷، كتاب الطهارة، الفصل الثاني: في بيان ما يوجب الوضوء وما لا يوجب، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۱) (ولا يمنع) الطهارة (ونيم) أي خرء ذباب وبرغوث لم يصل الماء تحته (وحناء) ولو جرمه به يفتى (ودرن ووسخ) عطف تفسير وكذا دهن ودسومة (وتراب) وطين. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: ودسومة) هي أثر الدهن. قال في الشرنبلالية قال المقدسي: وفي الفتاوى دهن رجليه ثم توضأ وأمر الماء على رجليه ولم يقبل الماء للدسومة جاز لوجود غسل الرجلين. اهـ (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۵۴، كتاب الطهارة، مطلب في أبحاث الغسل، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

الجواب حامداومصلیا:

مذکورہ اعمال گناہ کے ہیں۔[۱] لیکن ان سے وضوء نہیں ٹوٹے گا، اس سے نماز پڑھنا جائز ہے، البتہ ایسی بدکلامی کے بعد وضوء کرلینا مستحب ہے۔ (شامی: ۱/ ۱۱۲)[۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن عبد الله، قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم- : سباب المسلم فسوق، وقتاله كفر. (صحيح البخاري: ۹/۱، رقم الحديث: ۶۰۴۴، كتاب الأدب، باب ما ينهى من السباب واللعن، ط: رشيدية- دهلي ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۵۶، رقم الحديث: ۱۱۶- (۶۴)، كتاب الإيمان، باب بيان قول النبي صلى الله عليه وسلم: سباب المسلم فسوق وقتاله كفر، ط: رشيدية- دهلي)

عن ابن مسعود، قال: " الغناء ينبت النفاق في القلب كما ينبت الماء الزرع، والذكر ينبت الإيمان في القلب كما ينبت الماء الزرع ". (السنن الكبرى- أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۱۰/ ۳۷۷، رقم الحديث: ۲۱۰۰۷، كتاب الشهادات، باب: الرجل يغني فيتخذ الغناء صناعة يؤتى عليه ... الخ، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(وعن جابر - رضي الله تعالى عنه - قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الغناء) : بكسر الغين ممدودا أي: التغني (ينبت النفاق في القلب كما ينبت الماء الزرع) : يعني الغناء سبب النفاق ومؤد إليه، فأصله وشعبته كما قال: " البذاء والبيان شعبتان من النفاق ". وفي شرح السنة قيل: الغناء رقية الزنا. ... وقال النووي في الروضة: غناء الإنسان بمجرد صوته مكروه وسماعه مكروه، وإن كان سماعه من الأجنبية كان أشد كراهة. والغناء بآلات مطربة هو من شعار شاربي الخمر كالعود والطنبور والصنج والمعازف وسائر الأوتار حرام، وكذا سماعه حرام. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح- علي بن (سلطان) محمد، الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۷/ ۳۰۴۲، رقم الحديث: ۴۸۱۰، كتاب الآداب، باب البيان والشعر، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) قال (ولا ينقض الكلام الفاحش الوضوء) لحديث ابن عباس - رضي الله تعالى عنهما - الوضوء مما خرج يعني الخارج النجس، ولأنه لا كلام أفحش من الردة، والمتوضئ إذا ارتد - نعوذ بالله - ثم أسلم فهو على وضوئه، والذي روي عن عائشة - رضي الله تعالى عنها - أنها قالت للمتسابين: إن بعض ما أنتم فيه شر من الحدث فجددوا الوضوء إنما أمرت به استحسانا ليكون الوضوء على الوضوء مكفرا لذنوبهما. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱/ ۷۹، كتاب الصلاة، باب الوضوء والغسل، ط: دار المعرفة- بيروت ☆ المحيط البرهاني: ۱/ ۷۵، كتاب الطهارات، الفصل الثاني: في بيان ما يوجب الوضوء وما لا يوجب، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

والثالث مندوب للنوم على طهارة وإذا استيقظ منه وللمداومة عليه وللوضوء على الوضوء وبعد غيبة وكذب ونميمة وكل خطيئة وإنشاد شعر وقهقهة خارج الصلاة ... الخ. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح- حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹هـ) ص: ۳۷، كتاب الطهارة، باب في الوضوء، فصل في أوصاف الوضوء، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

[۳۲] وضو کے بعد بدن پر نجاست لگ جائے، تو صرف اس عضو کو دھولینا کافی ہے

۴۶۸-سوال: وضو کرنے کے بعد ہاتھ پاؤں یا بدن کے کسی حصے پر کوئی نجاست، مثلاً: کسی جانور کا بہنے والا خون، پیشاب پاخانہ وغیرہ لگ جائے، تو صرف اس عضو کو دھولینا کافی ہے یا از سر نو پورا وضو کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

وضو کرنے کے بعد نجاست بدن پر لگ جائے، تو صرف اس کو دور کر لینا کافی ہے، از سر نو وضو کی ضرورت نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] دوران صلاۃ، نیند اور بیداری کی حالت میں ہنسنے سے وضو کا حکم

۴۶۹-سوال: نماز کی حالت میں اگر کوئی شخص سو جائے اور اسی حالت میں ہنس پڑے، تو اس کا وضو کیوں نہیں ٹوٹتا ہے؟ اور بیداری کی حالت میں اگر ہنسے، تو اس کا وضو کیوں ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

بیدار شخص ہوش وحواس کے ساتھ اگر نماز میں قہقہہ لگا دے، تو اس کی نماز اور اس کا وضو دونوں ٹوٹ جائے گا اور عند اللہ اس کی سخت گرفت کا اندیشہ ہے، ایسے شخص کو سزا دینے کے لیے شریعت نے مذکورہ حکم لگایا ہے؛ ہاں! البتہ اگر یہ شخص نیند میں تھا اور اس نے قہقہہ لگایا، تو اس کی نماز تو فاسد ہو جائے گی؛ مگر وضو نہیں ٹوٹے گا۔ (الدر المختار: ۱/ ۱۳۴)[2]

---

(۱) فصل في نواقض الوضوء "المعاني الناقضة للوضوء كل ما يخرج من السبيلين "والدم والقيح إذا خرجا من البدن فتجاوزا إلى موضع يلحقه حكم التطهير والقيء ملء الفم". (الهداية: ۱/ ۲۳، كتاب الطهارة، فصل في نواقض الوضوء، ط: ياسر نديم اينڈ كمپني- ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۹-۱۰، كتاب الطهارة، الفصل الخامس في نواقض الوضوء، ط: زكريا-ديوبند)

(۲) عن معبد الجهني، قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي الغداة فجاء رجل أعمى وقريب من مصلى رسول الله صلى الله عليه وسلم بئر على رأسها جلة، فجاء الأعمى يمشي حتى وقع فيها، فضحك بعض القوم وهم في الصلاة، فقال النبي صلى الله عليه وسلم بعدما قضى الصلاة: من ضحك منكم فليعد الوضوء وليعد الصلاة. (سنن الدار قطني-أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد، البغدادي الدار قطني (م: ۳۸۵هـ): ۱/ ۳۰۷، رقم الحديث: ۶۲۳، باب أحاديث القهقهة في الصلاة وعللها، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت) =

سونے والا شخص اگر مکمل طور پر ہوش وحواس میں نہ ہو، تو اس کے قہقہہ لگانے کی وجہ سے اس کی اس درجہ سخت گرفت نہیں ہوتی؛ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر سونے والے کی نماز قضا ہوگئی تو بیدار ہونے کے بعد وہ پڑھ لے۔[1] مگر نماز قضا ہونے کا گناہ اس پر عائد نہیں ہوگا؛ کیوں کہ نیند میں ہونے کی وجہ سے اس نے قصدا جان بوجھ کر ترک نہیں کیا ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= (و) ينقضه ... (وقهقهة) (بالغ يقظان) فلا يبطل وضوء صبي ونائم بل صلاتهما به يفتى. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۱۳۵، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، ط: دار الفكر)

(قوله وليست القهقهة إلى آخره) وعلله في فتح القدير، بأنها إنما جعلت حدثا بشرط كونها جناية ولا جناية من النائم... ثم قال الكمال - رحمه الله - في كتابه زاد الفقير وينقضه القهقهة في الصلاة المطلقة إلا إذا كان نائما في صلاته وقهقه في نومه لا ينتقض، ولكن تفسد صلاته في المختار. (تبيين الحقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ھ): ۱/ ۱۱، كتاب الطهارة، نواقض الوضوء، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

(۱) عن أنس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من نام عن صلاة أو نسيها فليصلها إذا ذكرها. (مسند أبي يعلى - أبو يعلى أحمد بن علي بن المثنى بن يحيى بن عيسى بن هلال التميمي، الموصلي (م: ۳۰۷ھ): ۵/ ۴۰۹، قتادة، عن أنس، ط: دار المأمون للتراث - دمشق)

قال اللہ تعالی:

وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا. (۵-المائدۃ:۶)

وفرض الغسل: المضمضة والاستنشاق وغسل سائر البدن.

(الهداية: ۱/۲۹، كتاب الطهارة، فصل في الغسل)

باب الغسل

[غسل کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب الغسل

[غسل کا بیان]

[۱] غسل کے فرائض

۱-سوال: ایک شخص نے غسل جنابت میں صرف ایک مرتبہ غرارہ کیا اور ایک مرتبہ پورے بدن پر پانی بہایا، تو اس کا غسل ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

غسل جنابت میں تین فرض ہیں: (۱) کلی کرنا۔ (۲) ناک میں پانی ڈالنا (کلی کی حد یہ ہے کہ تمام منھ کے اندر پانی پہنچ جائے اور ناک میں پانی ڈالنے کی حد یہ ہے کہ نرمہ یعنی ناک کے نرم حصے تک پانی پہنچ جائے۔ ☆☆) اور (۳) پورے بدن پر ایک بار پانی بہانا۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی ترک کردے، تو غسل صحیح نہیں ہوگا۔ صورت مسئولہ میں اگر غسل کرنے والے نے ناک میں پانی نہیں ڈالا ہے، تو اس کا غسل صحیح نہیں ہوگا۔ (عالم گیری: ۱/ ۱۳، الباب الثاني في الغسل، كتاب الطهارة. ط: زکریا، دیوبند۔ الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۲۸۴، كتاب الطهارة، مطلب في أبحاث الغسل، ط: زکریا، دیوبند)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆ وحد المضمضة استيعاب الماء جميع الفم، وحد الاستنشاق: أن يصل الماء إلى مارن الأنف، كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۶، كتاب الطهارة، الفصل الثاني في سنن الوضوء، ط: زكريا - ديوبند)

[۱] قال الله تعالى: وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا. (۵- المائدة: ۶)

وفي الهداية: وفرض الغسل: المضمضة والاستنشاق وغسل سائر البدن. (۱/ ۲۹، كتاب الطهارة، فصل في الغسل)

قال الكاساني: (وأما) ركنه فهو إسالة الماء على جميع ما يمكن إسالته عليه من البدن من غير حرج مرة واحدة، حتى لو بقيت لمعة لم يصبها الماء لم يجز الغسل، وإن كانت يسيرة، لقوله تعالى {وإن كنتم جنبا فاطهروا}، أي: طهروا أبدانكم، واسم البدن يقع على الظاهر والباطن، فيجب تطهير ما يمكن تطهيره منه بلا حرج، ولهذا وجبت المضمضة والاستنشاق في الغسل. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۴۲، كتاب الطهارة، تفسير الغسل، ط: زكريا، ديوبند)

مزید دیکھیے: كنز الدقائق مع البحر: ۱/ ۸۶، كتاب الطهارة، ط: دار الكتاب - ديوبند ☆ غنية المستملي في شرح =

[۲] ہم بستری کے بعد عورت غسل کیسے کرے؟

سوال: ہم بستری کے بعد عام طور پر عورتیں غسل کے متعلق لا پرواہ ہوتی ہیں، دریافت یہ کرنا ہے کہ اس کا صحیح وقت اور بہتر طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ہم بستری کے بعد اگر میاں بیوی سونا چاہتے ہوں اور اسی وقت غسل کا ارادہ نہ ہو؛ بل کہ صبح میں غسل کرنا چاہیں، تو اس کی اجازت ہے، البتہ دونوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص اعضاء کو خوب اچھی طرح دھولیں، پھر وضوء کر کے سوئیں اور صبح جلد اٹھ کر غسل کریں۔ [۱]

غسل میں تین فرض ہیں: کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا اور پورے بدن پر اس طرح پانی بہانا، کہ کوئی حصہ خشک نہ رہ جائے۔ [۲]

کلی کرتے وقت گلے کے اندرون تک پانی لے جا کر پانی کو خوب پھیرے، پورا منہ اندرون سے اچھی طرح دھوئے، ناک میں تین مرتبہ پانی اس طرح ڈالے کہ ناک کے نرم حصے تک پانی پہنچ جائے، پھر

=منية المصلي: ۴۱، ط: دار الكتاب - ديوبند.

والدرن اليابس في الأنف يمنع تمام الغسل. كذا في الزاهدي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳، كتاب الطهارة، الباب الثاني في الغسل، الفصل الأول في فرائض الغسل، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) عن عائشة، قالت: كان النبي - صلى الله عليه وسلم - إذا أراد أن ينام، وهو جنب، غسل فرجه، وتوضأ للصلاة. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۳، رقم الحديث: ۲۸۸، كتاب الغسل، باب الجنب يتوضأ ثم ينام، ط: رشيديه - دهلي ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۴۴، رقم الحديث: ۲۱-(۳۰۵)، كتاب الحيض، باب جواز نوم الجنب واستحباب الوضوء له، وغسل الفرج إذا أراد أن يأكل الخ...، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند ☆ سنن أبي داؤد: ص: ۲۹، رقم الحديث: ۲۲۲، باب الجنب يأكل، ط: البدر - ديوبند)

عن عبد الله بن عمر، أنه قال: ذكر عمر بن الخطاب لرسول الله - صلى الله عليه وسلم - أنه تصيبه الجنابة من الليل، فقال له رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: توضأ واغسل ذكرك، ثم نم. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۳، رقم الحديث: ۲۹۰، كتاب الغسل، باب الجنب يتوضأ ثم ينام ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۴۴، رقم الحديث: ۲۵-(۳۰۶)، كتاب الحيض، باب جواز نوم الجنب واستحباب الوضوء له، وغسل الفرج إذا أراد أن يأكل... الخ ☆ سنن أبي داؤد: ص: ۲۹، رقم الحديث: ۲۲۱، باب الجنب يأكل، ط: البدر - ديوبند)

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: غسل کے فرائض۔

مسنون دعاء پڑھ کر وضوء کرے، پھر پورے سر کو ایک مرتبہ اس طرح دھوئے کہ تمام بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچ جائے، نیز پورے بدن میں جہاں تک ممکن ہو، پانی پہنچانا شرط ہے، ناف کے اندرون میں پانی پہنچائے، عورت کا اپنی شرم گاہ کے بالکل اندرون تک پانی پہنچانا ضروری نہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] غسل کا مسنون طریقہ

۲-سوال: غسل کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ تفصیل مطلوب ہے۔

الجواب حامداً ومصلياً:

غسل کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ غسل کرنے والا سب سے پہلے پاک جگہ پر بیٹھ کر تین دفعہ گٹوں تک ہاتھ دھوئے، پھر شرم گاہ دھوئے، اس کے بعد بدن کے جس حصے پر ناپاکی لگی ہو، اس کو صاف کرے، پھر نماز کے وضو کی طرح مکمل وضو کرے، پھر داہنے کندھے پر تین مرتبہ، پھر سر پر تین مرتبہ پھر بائیں کندھے پر تین مرتبہ پانی بہائے۔ (یہاں تک کہ پورے بدن پر پانی پہنچ جائے) پانی بہانے میں یہ ترتیب سنت ہے۔ اگر ناک میں رطوبت اس طور پر سوکھ کر چپک گئی ہو کہ کھال تک پانی کے پہنچنے میں مانع ہو تو اسے (رینٹ) صاف کیے بغیر غسل درست نہیں ہوگا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱)(ويجب) أي يفرض (غسل) كل ما يمكن من البدن بلا حرج مرة كأذن و (سرة وشارب وحاجب و) أثناء (لحية) وشعر رأس ولو متبلدا المافي - {فاطهروا} [المائدة:٦] - من المبالغة (وفرج خارج) لأنه كالفم لا داخل؛ لأنه باطن، ولا تدخل أصبعها في قبلها به يفتى. . . الخ. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۱۵۱-۱۵۲، كتاب الطهارة، في بيان الغسل، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) نوٹ: بدن پر پانی بہانے کے سلسلے میں تین طریقے فقہاء سے منقول ہیں: (۱) پہلے سر، پھر داہنے کندھے پھر بائیں کندھے پر پانی بہائے۔ ظاہر متن، ہدایہ، دوسری کتب فقہ اور حدیث کا مقتضیٰ یہی ہے۔ (۲) جو حضرت مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ پہلے داہنے کندھے پر پانی بہائے، پھر سر پر پھر بائیں کندھے پر، فقہاء سے یہ بھی منقول ہے۔ (۳) پہلے داہنے کندھے پر، پھر بائیں کندھے پر پھر سر پر پانی بہائے۔ موجودہ دور کے متداول کتب فتاویٰ میں اسی قول کو اختیار کیا گیا ہے۔ مکمل تفصیل کے لیے ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں: وسنة الغسل أن يقدم الوضوء عليه كوضوء الصلاة... وأن يزيل النجاسة الحقيقية كالمني ونحوه عن بدنه إن كانت... ثم يصب الماء على رأسه وسائر جسده ثلاثا كما في الصحيحين عن حديث ابن عباس قال: قالت ميمونة: وضعت للنبي - صلى الله عليه وسلم - غسلا، فسترته بثوب فصب على يديه فغسلهما، ثم أدخل يمينه في الإناء فأفرغ بها على فرجه ثم غسله بشماله، ثم ضرب بشماله الأرض، فدلكها دلكا شديدا، ثم غسلها، فمضمض، واستنشق، وغسل وجهه وذراعيه، ثم أفرغ على رأسه ثلاث حثيات ملء كفيه، ثم غسل سائر جسده، ثم تنحى =

[۴] غیر مسلم لڑکی یا جانور سے خواہش پوری کرنے کے بعد غسل صحیح ہوگا یا نہیں؟

سوال: کسی غیر مسلم لڑکی سے زنا کرکے جب آدمی غسل کرے، تو اُس کا غسل صحیح ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح جانوروں کے ساتھ خواہش پوری کرنے کے بعد غسل صحیح ہوگا یا نہیں؟ عوام میں مشہور ہے کہ ایسے شخص کا غسل صحیح نہیں ہوتا ہے، آدمی ناپاک ہی رہتا ہے اور نماز وروزہ کے قابل نہیں رہتا، کیا یہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیا:

زنا کا ارتکاب کرنا ایک مسلمان؛ بل کہ شریف انسان کی شان سے بعید ہے اور شریعت کی نگاہ میں سخت گناہ ہے، اگر کسی نے اس کا ارتکاب کرلیا ہے، تو اللہ کے حضور ندامت کے آنسو بہائے، اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔[1]

جب کسی شخص پر غسل فرض ہوجائے اور وہ شرائط کا لحاظ کرکے غسل کرے، تو فرض غسل ادا ہوجائے گا اور وہ پاک ہوجائے گا۔[2] لوگوں میں جو مشہور ہے کہ غیر مسلم سے زنا کرنے کے بعد یا جانور سے خواہش

=فغسل قدميه، فناولته ثوبا فلم يأخذه، فانطلق وهو ينفض يديه. ثم كيفية الصب قال شمس الأئمة الحلواني: يفيض على منكبه الأيمن ثلاثا ثم الايسر ثلاثا ثم على رأسه وسائر جسده. وقيل يبدء بالأيمن ثم بالرأس، ثم بالأيسر. وقيل يبدأ بالرأس ثم بالأيمن ثم بالأيسر، وهو ظاهر المتن والهداية وغيرها وظاهر الحديث. (غنية المستملي في شرح منية المصلي: ۴۴، ط: دار الكتاب - ديوبند. مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴، الفصل الثاني في سنن الغسل، ط: زكريا - ديوبند)

(۱) وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا. (۱۷- الإسراء: ۳۲)

عن ابن حجيرة، أنه سمع أبا هريرة رضي الله عنه، يقول: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: من زنى وشرب الخمر نزع الله منه الإيمان كما يخلع الإنسان القميص من رأسه. (المستدرك على الصحيحين - أبو عبد الله الحاكم النيسابوري (م: ۴۰۵ھ): ۱/ ۷۳، رقم الحديث: ۵۷، كتاب الإيمان، وأما حديث معمر، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن من أشراط الساعة: أن يرفع العلم ويثبت الجهل، ويشرب الخمر، ويظهر الزنا". (صحيح البخاري: ۱/ ۱۸، رقم الحديث: ۸۰، كتاب العلم، باب رفع العلم وظهور الجهل، ط: رشيدية - دهلي ☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۳۴۰، رقم الحديث: ۸-(۲۶۷۱)، كتاب العلم، باب رفع العلم وقبضه وظهور الجهل والفتن في آخر الزمان، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

(۲) وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا. (۵- المائدة: ۶)

غسل کے فرائض کی تفصیل اور تخریج کے لیے ملاحظہ کریں عنوان: غسل کے فرائض۔

پوری کرنے کے بعد فرض غسل چالیس دنوں تک ادا نہیں ہوتا، یہ غلط ہے، اُس کی شرعاً کوئی حقیقت نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] اعتکاف کی حالت میں غسلِ جمعہ کا حکم

۵-سوال: رمضان کے اخیر عشرہ کے اعتکاف یا پورے مہینے کے اعتکاف کے دوران، جمعہ کے غسل کے لیے مسجد سے باہر نکلنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

معتکف مستقلاً غسلِ جمعہ کی نیت سے مسجد سے باہر نکلے گا، تو اس کا اعتکاف فاسد ہوجائے گا، البتہ استنجاء کے ضمن میں غسل جمعہ کرلے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، یعنی استنجاء کے لیے جانے سے پہلے کسی خادم کے ذریعہ غسل کا انتظام کروالے اور استنجاء کے تقاضہ کے وقت استنجاء کی نیت سے نکلے، پھر استنجاء کے بعد جلدی سے بدن پر پانی بھی ڈال لے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (وحرم عليه) أي على المعتكف اعتكافا واجبا... (الخروج إلا لحاجة الإنسان) طبيعية كبول وغائط وغسل لو احتلم ولا يمكنه الاغتسال في المسجد، كذا في النهر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۴۳۵-۴۳۳، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: زكريا-ديوبند☆ مزید دیکھیے: الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۲، كتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: زكريا-ديوبند☆ البحر الرائق: ۲/ ۵۲۷، كتاب الصوم، باب الاعتكاف)

نوٹ: فقہ وفتاویٰ کی عام کتابوں میں یہی ذکر کیا گیا ہے کہ غیر واجب غسل کے لیے مسجد سے باہر نکلنا معتکف کے لیے جائز نہیں ہے، جمعہ کا غسل بھی غیر واجب غسل ہے؛ لہٰذا اس کے لیے بھی خروج کی اجازت نہیں ہوگی۔ خود حضرت مفتی بیات صاحبؒ نے یہی لکھا ہے؛ لیکن بعض اربابِ افتا نے مطلقاً غسل کے لیے معتکف کو اجازت دی ہے، اشعۃ اللمعات (۲/ ۱۲۸، کتاب الصوم، باب الاعتکاف) میں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے بھی یہی لکھا ہے۔ مفتی سلمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم نے بھی گنجائش کی بات لکھی ہے۔ (کتاب المسائل ۲/ ۱۱۰) انہوں نے استدلال میں یہ عبارت نقل کی ہے: وقال في التاتار خانية ويخرج للوضوء والاغتسال فرضا كان أو نفلا. تاتار خانية: ۳/ ۴۴۶"۔ مفتی رشید احمد صاحب نے لکھا ہے کہ کم از کم تیرہ کتابوں میں بلا تردد منقول ہے کہ غسل واجب ہو یا غیر واجب، معتکف کے لیے مسجد سے باہر نکلنے کی اجازت ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: احسن الفتاویٰ: ۴/ ۵۱۳، کتاب الصوم، باب الاعتکاف) لیکن ان سب کے باوجود مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے لکھا ہے: واضح رہے کہ آج کل بعض علماء نے غسل جمعہ کے لیے مسجد سے نکلنے کو جائز قرار دیا ہے، لیکن اس کی کوئی اطمینان بخش دلیل احقر کو اب تک نہیں ملی، اور جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں، ان سے اطمینان نہیں ہوتا۔ (دیکھیے: فتاویٰ عثمانی: ۲/ ۱۹۶، ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)

[۶] سر کے مریض کو غسل جنابت میں کب رخصت ملے گی؟

۶-سوال: جس عورت کو سر کا شدید درد رہتا ہو، اور پانی کا استعمال نقصان دہ ہو، تو کیا اس کے لیے غسل جنابت میں سر پر پانی ڈالنا لازم ہوگا؟ یا اس کے لیے کوئی رخصت ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ماہر مسلمان حکیم یا ڈاکٹر کی رائے ہو کہ سر پر پانی ڈالنے سے موت واقع ہو سکتی ہے یا بدن کا کوئی عضو معطل ہو سکتا ہے یا کوئی مہلک بیماری طاری ہو سکتی ہے، تو ایسی صورت میں سر پر پانی ڈالنے کی فرضیت ساقط ہو جائے گی، اس کے بغیر بھی غسل جنابت ادا ہو جائے گا۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] غسل خانے میں برہنہ ہو کر غسل کرنا

۱۲-سوال: ایک غسل خانہ ہے، جس میں سورج کی روشنی بالکل نہیں آتی ہے، اس میں کوئی شخص ننگا ہو کر غسل کرے، تو کیا اس کا غسل ہو جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مستحب تو یہی ہے کہ ناف سے گھٹنے تک کپڑا وغیرہ اس طرح باندھ کر غسل کیا جائے کہ اس سے ستر چھپ جائے۔ تاہم غسل خانہ بند کر کے مکمل پردے کا اہتمام کر کے غسل کرے، تو بلا کراہت جائز ہے، اور سورج کی روشنی کے آنے سے بھی کوئی حرج نہ ہوگا، اس میں گناہ کی کوئی بات نہیں۔ البتہ لوگوں کے سامنے ستر کھول کر غسل کرنا جائز نہیں، گناہ ہے؛ لیکن غسل بہر حال ہو جائے گا۔[۲] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) من به وجع رأس لا يستطيع معه مسحه محدثا و لا غسله جنبا، ففي الفيض عن غريب الرواية يتيمم، وأفتى قارئ الهداية أنه يسقط عنه فرض مسحه. (الدر المختار مع رد المحتار - ابن عابدين شامي (۱۱۹۸-۱۲۵۲ھ): ۱/ ۴۳۳، كتاب الطهارة، باب التيمم، ط: زكريا - ديوبند ☆ مزید دیکھیے: البحر الرائق: ۱/ ۲۸۶، كتاب الطهارة، باب التيمم)
ويعرف ذلك الخوف إما بغلبة الظن عن امارة أو بتجربة أو باخبار طبيب حاذق مسلم غير ظاهر الفسق. (غنية المستملي في شرح منية المصلي: ۵۷، ط: دار الكتاب - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۸، الباب الرابع في التيمم ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۷، كتاب الطهارة، باب التيمم)

(۲) أم هانئ بنت أبي طالب تقول: ذهبت إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم عام الفتح فوجدته يغتسل و فاطمة تستره فقال: من هذه؟ فقلت: أنا أم هانئ. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۲، رقم الحديث: ۲۸۰، ۳۵۷، ۳۱۷۱، ۶۱۵۸، باب التستر في الغسل عند الناس، كتاب الغسل ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۵۳، رقم الحديث: ۷۰-۳۳۶، كتاب الحيض، باب =

[۸] غسل کے بعد پتلی مذی نکلنے سے دوبارہ غسل کرنا ضروری ہے؟

25 سوال: (۲۵۲) ایک شخص پر غسل واجب تھا، اُس نے غسل کیا اور غسل کے بعد پتلی اور چکنی سیال شئے (مذی) نکلی، تو کیا اُس پر دوبارہ غسل کرنا فرض ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

غسل کرنے کے بعد ذکر میں ایستادگی تھی اور منی جوش وشہوت کے ساتھ نکلی، جس کے بعد انتشار جاتا رہا اور شہوت ختم ہوگئی، تو دوبارہ غسل فرض ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں نکلنے والا مادہ ''منی'' ہے اور اگر غسل کے بعد شرم گاہ میں جوش وشہوت باقی نہیں تھی، تو غسل فرض نہیں ہوگا، کہ اس صورت میں نکلنے والا سیال مادہ ودی یا مذی ہے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] شرم گاہ میں دوا لگانے سے غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں؟

۱۶- سوال: ایک شخص کو مسّا [1] کی بیماری لاحق ہوگئی ہے، ڈاکٹر نے ایک ٹیوب لگانے کے لیے دی ہے، اس میں سے دوا مقعد میں لگاتا ہے اور وہ دوا ایک دو انچ اندر تک لگائی ہوتی ہے، تو اس طرح دوا لگانے سے اس پر غسل واجب ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح ایک عورت کو فرج (آگے کی شرم گاہ) میں زخم ہے، اس کو خاتون ڈاکٹر نے روزانہ رات کو دوائی کی ایک گولی فرج کے اندر رکھنے کو کہا ہے، تو اس گولی کو فرج میں رکھنے کی وجہ سے اس عورت پر غسل واجب ہوگا یا نہیں؟ جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

= تستر المغتسل بثوب ونحوه، مختار اینڈ کمپنی - دیوبند)

وفي الدر المختار: (و) الرابع (ستر عورته) ووجوبه عام ولو في الخلوة على الصحيح إلا لغرض صحيح. وقال ابن عابدين: (قوله إلا لغرض صحيح) كتغوط واستنجاء. وحكى في القنية أقوالا إلا في تجرده للاغتسال منفردا: منها أنه يكره، ومنه أنه يعذر إن شاء الله، ومنها لا بأس به، ومنها يجوز في المدة اليسيرة، ومنها يجوز في بيت الحمام الصغير. (رد المحتار مع الدر: ۱/ ۴۰۴، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت، الطبعة الثانية: ۱۴۱۲ھ - ۱۹۹۲ء)

(۱) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے باب الوضوء، کا عنوان: مذی کا حکم۔

[۱] زائد گوشت، جو بواسیر کے سبب مقعد میں پیدا ہوجاتا ہے۔ (فیروز اللغات - الحاج مولوی فیروز الدینؒ: ۱۲۳۹، مادہ: م - س، ط: فیروز سنز، لاہور)

الجواب حامداً ومصلیاً:

غسل فرض ہونے کے لیے جن اسباب[1] کا وجود ضروری ہے، ان میں سے کوئی ایک بھی سبب یہاں موجود نہیں ہے، اس لیے مسّے یا فرج (☆☆) میں زخم ہونے کی وجہ سے ایک دو انچ اندر تک دوا رکھنے سے غسل واجب نہیں ہوگا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] دو جماع کے درمیان غسل ضروری نہیں

۲۶-سوال: بیوی کے ساتھ ایک مرتبہ ہم بستری کر کے دوسری مرتبہ ہم بستری کرنے کا ارادہ ہو، تو کیا غسل کرنا ضروری ہے؟ بغیر غسل کیے اگر دوسری مرتبہ ہم بستری کر لے، تو یہ عمل کیسا ہے؟ اور کیا اس سے پیدا ہونے والی اولاد پر کوئی اثر پڑے گا؟ اگر دوسری مرتبہ ہم بستری کے لیے غسل ضروری ہے، تو کیا دونوں (میاں اور بیوی) پر ضروری ہے یا صرف مرد پر؟ تسلی بخش جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً

ایک مرتبہ ہم بستری کے بعد دوسری مرتبہ ہم بستری کے لیے غسل کرنا ضروری نہیں ہے؛ البتہ افضل

---

[۱] وجوبِ غسل کے اسباب تین ہیں: (۱) جنابت (۲) انقطاعِ حیض (۳) انقطاعِ نفاس۔ أسباب الغسل ثلاثة: الجنابة، و الحيض، والنفاس. وفي مختار الفتاوى: المراد بقوله والحيض والنفاس انقطاعهما. (الفتاوى التاتارخانية: ۱/ ۱۵۲، زکریا-دیوبند)

(☆☆) نوٹ: مسّے کی وجہ سے مقعد میں ایک دو انچ اندر تک دوا رکھنے سے غسل فرض نہیں ہوگا۔ اور فرج میں ایک دو انچ اندر رکھنے سے غسل فرض ہونے نہ ہونے میں یہ تفصیل ہے، کہ اگر یہ عمل علاجا ہو، چاہے ڈاکٹر ہی کرے یا عورت خود کرے اور عورت کے اندر شہوت پیدا نہیں ہوتی، تو محض ہاتھ یا انگلی داخل کرنے سے غسل واجب نہ ہوگا؛ لیکن اگر عورت غلبۂ شہوت سے بہ قصدِ استمتاع (یعنی لذت اندوز ہونے کے ارادے سے) اپنی انگلی داخل کرے یا میاں بیوی بہ قصدِ استمتاع یہ عمل کریں (اور شوہر انگلی داخل کرے) تو بعض فقہاء کے قول کے مطابق غسل واجب ہو جاتا ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۴/ ۲۸، دار الاشاعت، کراچی، پاکستان)

(۲) (و) لا عند (إدخال إصبع ونحوه) كذكر غير آدمي وذكر خنثى وميت وصبي لا يشتهي وما يصنع من نحو خشب (في الدبر أو القبل) على المختار. قال ابن عابدين: (قوله: على المختار) قال في التجنيس: رجل أدخل إصبعه في دبره وهو صائم اختلف في وجوب الغسل والقضاء. والمختار أنه لا يجب الغسل ولا القضاء؛ لأن الأصبع ليس آلة للجماع فصار بمنزلة الخشبة ... وقيد بالدبر ؛لأن المختار وجوب الغسل في القبل إذا قصدت الاستمتاع؛ لأن الشهوة فيهن غالبة فيقام السبب مقام المسبب دون الدبر لعدمها، نوح أفندي. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۱۶۶، كتاب الطهارة، مطلب سنن الغسل، ط: دار الفكر-بيروت)

ہے کہ غسل کرلے، اگر کوئی غسل نہ کرسکتا ہو، تو وضو کرلے اور اگر وضو بھی نہیں کرسکتا ہے، تو کم از کم اپنے ذکر کو پانی سے اچھی طرح سے دھولے، کہ یہ مستحب ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] متعدد جماع کے بعد غسلِ واحد کافی ہے یا نہیں؟

سوال: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ایک ہی رات میں تین مرتبہ جماع کرے، پھر اخیر میں غسل کرے، تو کیا یہ تینوں جماع کے غسل کے لیے کافی ہوجائے گا؟ یا ہر جماع کے بعد غسل کرنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

کوئی شخص اپنی متعدد بیوی سے ایک رات میں کئی مرتبہ جماع کرے یا ایک ہی بیوی سے دو تین مرتبہ جماع کرے، تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ ہر جماع سے پہلے وضو کرلے، اخیر میں ایک مرتبہ غسل کافی ہے، ہر جماع کے بعد غسل کرنا فرض نہیں ہے۔ (۲)

امام بخاریؒ نے اس سلسلے میں ایک باب قائم فرمایا ہے: ''جماع کے بعد دوسری مرتبہ جماع کرنا اور چند عورتوں سے جماع کرنے کے بعد ایک ہی مرتبہ غسل کرنا''۔ (۳)

---

(۱) عن أبي سعيد الخدري قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا أتى أحدكم أهله، ثم أراد أن يعود، فليتوضأ. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۴۴، رقم الحديث: ۲۷- (۳۰۸)، باب من أتى أهله فأراد أن يعود (باب جواز نوم الجنب الخ)، كتاب الحيض، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

قال العيني: أجمع العلماء على أنه لا يجب بينهما، وإنما هو مستحب... وأما الوضوء بين الجماعين فقد اختلفوا فيه فعند الجمهور ليس بواجب،... قال أبو عمر: ما أعلم أحدا من أهل العلم أوجبه إلا طائفة من أهل الظاهر... كان ابن سيرين يقول: لا أعلم بذلك بأسا إنما قبل ذلك لأنه أجرى أن يعود. ونقل عن إسحاق بن راهويه أنه حمل الوضوء المذكور على الوضوء اللغوي، حيث نقل ابن المنذر عنه أنه قال: لا بد من غسل الفرج إذا أراد العود. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري-بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۳/ ۱۳-۲۱۲، باب إذا جامع ثم عاد ومن دار على نسائه في غسل واحد، كتاب الغسل، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(۲) قد تقدم تخريجه عن: (عمدة القاري شرح صحيح البخاري-بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۳/ ۱۳-۲۱۲، باب إذا جامع ثم عاد ومن دار على نسائه في غسل واحد، كتاب الغسل، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت) ضمن عنوان: دو جماع کے درمیان غسل ضروری نہیں۔

(۳) باب إذا جامع ثم عاد، ومن دار على نسائه في غسل واحد. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۱، كتاب الغسل، قبل باب غسل المذي والوضوء منه، ط: البدر - ديوبند)

اس باب کے تحت آپؒ نے دو حدیث ذکر فرمائی ہے، جن میں ایک یہ ہے:

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات رسول اللہ ﷺ رات یا دن کے کسی حصے میں اپنی تمام ازواج مطہرات کو صحبت سے نوازتے تھے، آپ ﷺ کی گیارہ ازواج (نو بیویاں اور دو باندیاں) تھیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ ﷺ کو اس قدر طاقت تھی؟ تو انہوں نے جواب دیا: آپ ﷺ کو تیس مردوں کی قوت و طاقت دی گئی تھی۔ (بخاری شریف: ۱/۴۱)[۱]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی تمام ازواج مطہرات سے جماع کے بعد ایک ہی غسل فرماتے تھے۔ (ترمذی شریف: ۱/۲۰)[۲]

''حلیہ'' نامی کتاب میں ہے کہ صحیح یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو چالیس جنتی مردوں کی طاقت دی گئی تھی۔[۳] اور ترمذی کی روایت ہے کہ جنت میں ایک شخص کو دنیا کے سو مردوں کی طاقت دی جائے گی۔[۴] تو

[۱] صحيح البخاري: ۱/۴۱، كتاب الغسل، باب إذا جامع ثم عاد، ومن دار على نسائه في غسل واحد، ط: البدر- ديوبند☆مسند الإمام أحمد بن حنبل (م: ۲۴۱هـ): ۲۱/۲۷۴، رقم الحديث: ۱۳۱۰۹، مسند أنس بن مالك، ت: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة☆السنن الكبرى- أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۸/۲۰۷، رقم الحديث: ۸۹۸۳، كتاب عشرة النساء، طواف الرجل على نسائه في الليلة الواحدة، ت: حسن عبد المنعم شلبي، ط: مؤسسة الرسالة- بيروت)

[۲] عن قتادة، عن أنس، أن النبي -صلى الله عليه وسلم- كان يطوف على نسائه في غسل واحد. (سنن الترمذي: ۱/۳۶، رقم الحديث: ۱۴۰، أبواب الطهارة، باب ما جاء في الرجل يطوف على نسائه بغسل واحد، ط: فيصل پبلی کیشنز - دیوبند)

(۳) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أتاني جبريل بقدر يقال لها الكفيت فأكلت منها أكلة فأعطيت قوة أربعين رجلا في الجماع. غريب من حديث صفوان تفرد به وكيع. (حلية الأولياء وطبقات الأصفياء- أبو نعيم أحمد بن عبد الله بن أحمد الأصبهاني (م: ۴۳۰هـ): ۸/۳۷۶، باب: وكيع بن الجراح ومنهم النصاح والمفهم المفصاح أبو سفيان وكيع بن الجراح، ط: السعادة - بجوار محافظة مصر☆الفتح الكبير في ضم الزيادة إلى الجامع الصغير -عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱هـ): ۱/۲۴، رقم الحديث: ۱۲۱، و ۱۲۲، حرف الهمزة، ت: يوسف النبهاني، ط: دار الفكر - بيروت☆كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال- علاء الدين علي بن حسام الدين الهندي البرهانفوري، الشهير بالمتقي الهندي (م: ۹۷۵هـ): ۱۲/۳۴۶، رقم الحديث: ۳۴۸۵۱، ت: بكري حياني - صفوة السقا، ط: مؤسسة الرسالة)

(۴) عن أنس، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: يعطى المؤمن في الجنة قوة كذا وكذا من الجماع، قيل: يا رسول الله أو يطيق ذلك؟ قال: يعطى قوة مائة. (سنن الترمذي: ۲/۸۰، رقم الحديث: ۲۵۳۶، أبواب صفة الجنة، باب ما جاء=

اس اعتبار سے آپ ﷺ کو چار ہزار مردوں کی طاقت عطا کی گئی تھی۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ بعض اوقات جماع کے بعد ایک ہی غسل فرماتے تھے، اس لیے ہر جماع کے بعد مستقل غسل فرض نہیں ہے، لیکن حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے جماع کرے اور دوسری بار جماع کا ارادہ ہو، تو اسے وضوء کرلینا چاہیے۔ (ترمذی: ۱/ ۲۰)[1]

اس لیے جماعین کے درمیان وضوء کرنا مستحب ہے، فرض اور واجب نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] کسی جنیہ (خاتون جن) کے ساتھ وطی کے بعد غسل کا حکم

۳۱- سوال: کسی مسلمان نے کسی جنیہ (خاتون جن) کے ساتھ وطی کی، یا کسی خاتون کے ساتھ کسی جن نے زنا کیا، تو اس کے اوپر کتنے دنوں تک غسل کرنا ضروری ہوگا؟ کب غسل ساقط ہوگا؟ اور جتنے دنوں تک غسل ساقط نہیں ہوگا، اتنے دنوں کی عبادتیں قبول ہوں گی یا نہیں؟۔

(مولوی یوسف پانڈور، اٹالوا)

الجواب حامداً ومصلياً

کوئی شخص بیداری کی حالت میں جنیہ (خاتون جن، جب کہ وہ انسانی شکل میں نمودار ہو) سے وطی کرے، یا جن مرد کی شکل میں آکر کسی عورت کے ساتھ بیداری کی حالت میں زنا کرے، تو غسل فرض ہوگا، خواہ انزال ہو یا نہ ہو، دخول محض سے غسل واجب ہوجائے گا؛ ہاں نیند کی حالت میں یہ امر پیش آیا ہو، تو انزال ہونے کی صورت میں غسل فرض ہوگا، انزال نہ ہو، تو غسل فرض نہیں ہوگا۔ البتہ بیداری کی حالت میں زنا

= في صفة جماع أهل الجنة، ط: فيصل - ديوبند☆ مسند أبي داود الطيالسي - أبو داود سليمان بن داود بن الجارود الطيالسي البصري (م: ۲۰۴هـ): ۳/ ۵۰۳، رقم الحديث: ۲۱۲۴، وما أسند أنس بن مالك الأنصاري، ماروى عنه قتادة، ت: د. محمد بن عبدالمحسن التركي، ط: دار هجر - مصر)

[۱] عن أبي سعيد الخدري، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا أتى أحدكم أهله، ثم أراد أن يعود، فليتوضأ بينهما وضوءا. (سنن الترمذي: ۱/ ۲۰، رقم الحديث: ۱۴۱، باب ما جاء إذا أراد أن يعود توضأ، ط: فيصل - ديوبند☆ وكذا في: الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۴۴، رقم الحديث: ۲۷ - (۳۰۸)، باب من أتى أهله فأراد أن يعود/ باب جواز نوم الجنب الخ)، كتاب الحيض، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

کرنے کی صورت میں زنا کا گناہ ہوگا؛ لیکن صرف ایک مرتبہ غسل فرض کر لینے سے ذمہ سے غسل ساقط ہوجائے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] جنبی شخص کا بغیر غسل کیے نماز پڑھ لینا

11 سوال: ایک آدمی کو غسل جنابت کی حاجت تھی، محض شرم کی وجہ سے اس کے نے غسل نہیں کیا اور بغیر غسل کے نماز پڑھ لی، دل میں نیت یہ تھی کہ بعد میں اس کو دہرالوں گا، تو اس شخص کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

عبدالرحیم حسن بانگروی (سوراشٹر)

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر اس نے نماز کی بے حرمتی اور بے عزتی کرنے کے لیے جنابت کی حالت میں نماز ادا کیا ہے، تو اس کے ایمان سے نکل جانے کا خطرہ ہے؛ لیکن دل میں نماز کا ادب واحترام باقی ہے اور اس گناہ پر دل ملامت بھی کرتا ہے، اس کے باوجود بھی اس نے جنابت کی حالت میں نماز پڑھ لی، تو گنہ گار ہوگا اور توبہ کرنا ضروری ہے، البتہ ایمان سے خارج نہ ہوگا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] بالوں کو انگریزی دواؤں سے رنگنا غسل سے مانع ہے یا نہیں؟

سوال برطانیہ میں سر کے بالوں کو مختلف قسم کی انگریزی دواؤں سے رنگنے کا رواج ہے، یہ رنگ چار سے پانچ ماہ تک بالوں پر رہتا ہے، اس طرح انگریزی دواؤں سے رنگے ہوئے بالوں کے ساتھ غسل صحیح

---

(۱) أما إذا ظهر في صورة آدمي وكذا إذا ظهر للرجل جنية في صورة آدمية فوطئها وجب الغسل لوجود المجانسة الصورية المفيدة لكمال السببية. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۱۶۱، كتاب الطهارة، مطلب في تحرير الصاع والمد والرطل، ط: ايچ، ايم سعيد-پاکستان)

(۲) وبه ظهر أن تعمد الصلاة بلا طهر غير مكفر كصلاته لغير القبلة أو مع ثوب نجس، وهو ظاهر المذهب كما في الخانية. (الدر المختار) وقال ابن عابدين (م: ۱۲۵۲ھ): (قوله: كما في الخانية) حيث قال بعد ذكره الخلاف في مسألة الصلاة بلا طهارة وأن الإكفار رواية النوادر. وفي ظاهر الرواية لا يكون كفرا، وإنما اختلفوا إذا صلى لا على وجه الاستخفاف بالدين، فإن كان وجه الاستخفاف ينبغي أن يكون كفرا عند الكل. (رد المحتار: ۱/۸۱، كتاب الطهارت، ط: دار الفكر-بيروت)

ہوگا یا نہیں؟ نماز درست ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورتِ مسئولہ میں جب کہ رنگ بالوں پر باقی رہتا ہو اور پانی بالوں تک پہنچنے سے روکتا ہو، تو غسلِ جنابت اور غسلِ حیض ونفاس کچھ بھی صحیح نہیں ہوگا، اس صورت میں مرد وعورت دونوں ناپاک ہی رہیں گے اور اس صورت میں پڑھی گئی نمازیں بھی صحیح نہیں ہوں گی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] مسنون طریقے پر غسل کرنے کے بعد وضو کے وقت کلی کرنا یا ناک میں پانی ڈالنا

سوال: (۱۵) اگر کسی نے سنت طریقے کے مطابق غسل کیا ہے، تو کیا بعد میں وضو کے وقت بھی کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

غسلِ مسنون کا جو طریقہ ہے، جس میں اولاً دونوں ہاتھ پہنچوں تک دھونا ہے، پھر کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا ہے، جس کی تفصیل معروف ومشہور ہے۔ (۲) اس طرح غسل کرنے کے بعد جب تک حدث پیش

---

(۱) ولو كان على بدنه قشر سمك أو خبز ممضوغ متلبد وجب إزالته، وكذا الخضاب المتجسد والحناء. (الجوهرة النيرة-أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰ھ): ۱/ ۱۰، كتاب الطهارة، سنن الطهارة، ط: المطبعة الخيرية☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳، الباب الثاني في الغسل، الفصل الأول في فرائض الغسل، ط: بيروت)

نعم ذكر الخلاف في شرح المنية في العجين واستظهر المنع؛ لأن فيه لزوجة وصلابة تمنع نفوذ الماء... ومفاده عدم الجواز إذا علم أنه لم يصل الماء تحته، قال في الحلية وهو أثبت. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۵۴، مطلب في أبحاث الغسل، ط: بيروت)

(۲) قال: "وسنته أن يبدأ المغتسل فيغسل يديه وفرجه ويزيل نجاسة إن كانت على بدنه ثم يتوضأ وضوءه للصلاة إلا رجليه ثم يفيض الماء على رأسه وسائر جسده ثلاثا ثم يتنحى عن ذلك المكان فيغسل رجليه" هكذا حكت ميمونة رضي الله عنها اغتسال رسول الله صلى الله عليه وسلم. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر، الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۱۹، كتاب الطهارات، فصل في الغسل، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت ☆ الدر مع الرد: ۱/ ۱۵۶-۱۵۸، كتاب الطهارة، في بيان سنن الغسل، ط: بيروت)

نہ آئے، وضوء لازم نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) لیکن اگر کوئی غسل کے بعد دوبارہ وضو کرے، تو کیا اس میں کراہت ہے؟

عن عائشة، أن النبي صلى الله عليه وسلم كان لا يتوضأ بعد الغسل. هذا حديث حسن صحيح، وهذا قول غير واحد من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، والتابعين: أن لا يتوضأ بعد الغسل. (سنن الترمذي: ۱/۳۰، رقم الحديث: ۱۰۷، أبواب الطهارة، باب في الوضوء بعد الغسل، ط: فيصل - ديوبند☆سنن أبي داؤد: ۱/۳۳، رقم الحديث: ۲۵۰، كتاب الطهارة، باب في الوضوء بعد الغسل، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند☆المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۱/۱۳۷، رقم الحديث: ۲۵۲، باب ترك الوضوء من بعد الغسل، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

علامہ شامیؒ نے اس سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

قال الحصكفي: أو لقصد الوضوء على الوضوء لا بأس به، وحديث " فقد تعدى " محمول على الاعتقاد، ولعل كراهة تكراره في مجلس تنزيهية. ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أو لقصد الوضوء على الوضوء) أي بعد الفراغ من الأول، بحر. وفي التتارخانية عن الناطفي: لو زاد على الثلاث فهو بدعة، وهذا إذا لم يفرغ من الوضوء، أما إذا فرغ ثم استأنف الوضوء فلا يكره بالاتفاق. اهـ ومثله في الخلاصة. ـــــــ وعارض في البحر دعوى الاتفاق بما في السراج من أنه مكروه في مجلس واحد: وأجاب في النهر بأن ما مر فيما إذا أعاده مرة واحدة، وما في السراج فيما إذا كرره مرارا، ولفظه في السراج: لو تكرر الوضوء في مجلس واحد مرارا لم يستحب؛ بل يكره لما فيه من الإسراف فتدبر اهـ. ـــــــ قلت: لكن يرد ما في شرح المنية الكبير حيث قال: وفيه إشكال لإطباقهم على أن الوضوء عبادة غير مقصودة لذاتها فإذا لم يؤد به عمل مما هو المقصود من شرعيته كالصلاة وسجدة التلاوة ومس المصحف ينبغي أن لا يشرع تكراره قربة، لكونه غير مقصود لذاته فيكون إسرافا محضا، وقد قالوا في السجدة لما لم تكن مقصودة: لم يشرع التقرب بها مستقلة وكانت مكروهة، وهذا أولى. اهـ. ـــــــ أقول: يؤيده ما قاله ابن العماد في هديته. قال في شرح المصابيح: وإنما يستحب الوضوء إذا صلى بالوضوء الأول صلاة، كذا في الشرعة والقنية. اهـ. وكذا ما قاله المناوي في شرح الجامع الصغير للسيوطي عند حديث «من توضأ على طهر كتب له عشر حسنات» من أن المراد بالطهر الوضوء الذي صلى به فرضا أو نفلا كما بينه فعل راوي الخبر وهو ابن عمر، فمن لم يصل به شيئا لا يسن له تجديده. اهـ. ومقتضى هذا كراهته، وإن تبدل المجلس ما لم يؤد به صلاة أو نحوها لكن ذكر سيدي عبد الغني النابلسي أن المفهوم من إطلاق الحديث مشروعيته ولو بلا فصل بصلاة أو مجلس آخر، ولا إسراف فيما هو مشروع، أما لو كرره ثالثا أو رابعا فيشترط لمشروعيته الفصل بما ذكر، وإلا كان إسرافا محضا اهـ فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۱۱۹، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، مطلب في الوضوء على الوضوء، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

وقالوا: لو توضأ أولا لا يأتي به ثانيا؛ لأنه لا يستحب وضوءان للغسل اتفاقا، أما لو توضأ بعد الغسل واختلف المجلس على مذهبنا أو فصل بينهما بصلاة كقول الشافعية فيستحب. (الدر المختار) =

[۱۶] وضو اور غسل میں صرف کلی کرنا کافی ہے یا غرارہ بھی ضروری ہے؟

سوال: (۱۶) وضوء اور غسل میں روزے کی حالت کے علاوہ میں صرف کلی کرنا کافی ہوگا، یا منہ اونچا کر کے حلق میں پانی گھمانا (غرارہ) ضروری ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیا:

وضوء اور غسل میں حلق تک پانی لے جانا ضروری نہیں، صرف پانی کے ذریعہ منہ بھر کے کلی کرنے سے ہی فرض ادا ہو جائے گا؛ البتہ غیر صائم کے لیے غرارہ مسنون ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] غسل میں فرائض ادا کرنا اور سنتوں کو ترک کر دینا

سوال: (۱۷) غسل میں صرف فرائض ادا کر لینے سے غسل ہو جائے گا؟ یا سنت کے چھوڑنے کا گناہ بھی ہوگا؟

=قال ابن عابدين: (قوله: لأنه لا يستحب إلخ) قال العلامة نوح أفندي: بل ورد ما يدل على كراهته. أخرج الطبراني في الأوسط عن ابن عباس - رضي الله عنهما - قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم - «من توضأ بعد الغسل فليس منا» اهـ تأمل. والظاهر أن عدم استحبابه لو بقي متوضئا إلى فراغ الغسل. (رد المحتار على الدر المختار: ١/ ١٥٨، كتاب الطهارة، سنن الغسل، ط: بيروت)

(١) قال الشرنبلالي: "و" يسن "المبالغة في المضمضة" وهي إيصال الماء لرأس الحلق "و" المبالغة في "الاستنشاق" وهي إيصاله إلى ما فوق المارن "لغير الصائم" والصائم لا يبالغ فيها خشية إفساد الصوم لقوله عليه الصلاة والسلام: "بالغ في المضمضة والاستنشاق إلا أن تكون صائما" (مراقي الفلاح) وقال الطحطاوي: قوله: "والمبالغة" فيهما هي سنة في الطهارتين على المعتمد وقيل سنة في الوضوء واجبة في الغسل إلا أن يكون صائما نقله القهستاني عن المنية وشارح الشرعة عن صلاة البقالي. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ١٢٣١هـ) ص: ٧٠، كتاب الطهارة، فصل في سنن الوضوء، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: الدر المختار مع رد المحتار: ١/ ١١٥-١١٦، كتاب الطهارة، في بيان سنن الوضوء ☆ الدر مع الرد: ١/ ١٥١- ١٥٢، كتاب الطهارة، في بيان فرض الغسل، مطلب في مهمات الغسل، ط: بيروت ☆ الجوهرة النيرة - أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ٨٠٠هـ): ١/ ٦، سنن الطهارة، ط: المطبعة الخيرية)

الجواب حامداً ومصلیا:

غسل کے فرائض ادا کرنے سے غسل تو صحیح ہوجائے گا، اس کے لیے غسل مسنون شرط نہیں ہے؛ لیکن سنتوں پر عمل کرنے کے ثواب سے محروم رہے گا۔ ہاں! کوئی شخص سنتوں پر عمل کرے اور کبھی کبھار چھوڑ دے، تو گنہ گار نہ ہوگا، سنتوں کو ترک کرنے کا معمول بنالینا حرمان نصیبی ہے۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] احتلام میں خروجِ منی کے وقت عضوِ تناسل پر انگلی رکھ دینا

سوال: (۱۹) زید نے نیند کی حالت میں جب کہ احتلام کی وجہ سے منی خارج ہونے کے بالکل قریب تھی، اپنی انگلی کے ذریعہ عضوِ تناسل کے سرے کو بند کردیا، جس کی وجہ سے منی باہر نہیں نکل سکی، تو کیا اس حالت میں زید پر غسل فرض ہوگا؟ اور کیا اس طرح عضوِ تناسل کا سرا بند کردینے سے صحت خراب ہوسکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اِس طرح کرنے سے منی اگر بالکل باہر نہ آئے، تو مہمان اور مسافر کے لیے غسل نہ کرنے کی گنجائش ہے، سخت سردی کے موسم میں مسافر کے لیے گنجائش ہے اور مہمان کو حیاء کی وجہ سے گنجائش ہے؛ لیکن حالتِ اِقامت میں اِس کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ [۲]

---

(۱) قال الحصكفي: وحكمها ما يؤجر على فعله ويلام على تركه. (الدر المختار)

(قوله: ويلام) أي يعاتب بالتاء لا يعاقب، كما أفاده في البحر والنهر، لكن في التلويح ترك السنة المؤكدة قريب من الحرام يستحق حرمان الشفاعة، لقوله - عليه الصلاة والسلام -: »من ترك سنتي لم ينل شفاعتي« . اهـ. وفي التحرير: إن تاركها يستوجب التضليل واللوم. اهـ. والمراد الترك بلا عذر على سبيل الإصرار كما في شرح التحرير لابن أمير حاج، ويؤيده ما سيأتي في سنن الوضوء من أنه لو اكتفى بالغسل مرة إن اعتاده أثم، وإلا لا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۰۳، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، مطلب في السنة وتعريفها، ط: بيروت)

(۲) (وفرض) الغسل (عند) خروج (مني) من العضو وإلا فلا يفرض اتفاقا؛ لأنه في حكم الباطن (منفصل عن مقره) هو صلب الرجل وترائب المرأة، ... (بشهوة) أي لذة ولو حكما كمحتلم، ولم يذكر الدفق ليشمل مني المرأة؛ لأن الدفق فيه غير ظاهر، ... ولأنه ليس بشرط عندهما خلافا للثاني، ولذا قال (وإن لم يخرج) من رأس الذكر (بها) وشرطه أبو يوسف، وبقوله يفتى في ضيف خاف ريبة أو استحيى كما في المستصفى. وفي القهستاني والتتارخانية معزيا للنوازل: وبقول أبي يوسف نأخذ؛ لأنه أيسر على المسلمين قلت: ولا سيما في الشتاء والسفر. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: وشرطه أبو يوسف) أي شرط الدفق، وأثر الخلاف يظهر فيما لو احتلم أو نظر بشهوة =

اس حرکت کی وجہ سے صحت کے خراب ہونے نہ ہونے کے بارے میں کسی طبیب سے معلوم کرلیا جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] شراب یا نشہ کی وجہ سے غسل کرنا ضروری ہے؟

سوال: ایک آدمی نے تاڑی (۱) یا شراب پی رکھی ہے، اس کے محلہ میں ایک شخص کا انتقال ہوا، تو یہ آدمی غسل کیے بغیر جنازے کی نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اس کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

شراب پینے کی وجہ سے غسل کرنا فرض نہیں ہوتا ہے، اس لیے غسل کی ضرورت نہیں ہے۔ (۲) ہوش و حواس درست ہے، تو نماز صحیح ہوجائے گی۔ (۳) ــــــ (البتہ شراب پینا گناہ کبیرہ ہے، اس سے احتراز ضروری ہے، شراب پینے والے کو توبہ کرنی چاہیے۔ [۴]) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] دانت پر سونے کا کَور چڑھانا اور اس کے ساتھ نماز پڑھنا

سوال: ۳۳: میرا ایک دانت گر گیا ہے، میرا ارادہ دانت فٹ کروانے اور اس پر سونے کا کور

= فأمسك ذكره حتى سكنت شهوته ثم أرسله فأنزل وجب عندهما لا عنده. ــــــ (قوله: وبقول أبي يوسف نأخذ) أي في الضيف وغيره. وفي الذخيرة أن الفقيه أبا الليث وخلف بن أيوب أخذا بقول أبي يوسف. وفي جامع الفتاوى أن الفتوى على قول إسماعيل. ــــــ (قوله: قلت إلخ) ظاهره الميل إلى اختيار ما في النوازل، ولكن أكثر الكتب على خلافه حتى البحر والنهر، ولا سيما قد ذكروا أن قوله قياس وقولهما استحسان وأنه الأحوط. فينبغي الإفتاء بقوله في مواضع الضرورة فقط تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۵۹-۱۶۰، كتاب الطهارة، أبحاث الغسل)

(۱) تاڑی: تاڑ کا نشہ آور رس۔ (فیروز اللغات، ص: ۳۳۶، ت ــ ا)

(۲) کیوں کہ وجوب غسل کے اسباب میں سے کوئی سبب یہاں موجود نہیں ہے، وجوب غسل کے اسباب تین ہیں: [۱] جنابت [۲] انقطاع حیض [۳] انقطاع نفاس۔ أسباب الغسل ثلاثة: الجنابة، والحيض، والنفاس. وفي مختار الفتاوى: المراد بقوله والحيض والنفاس انقطاعهما. (الفتاوى التاتارخانية: ۱/ ۱۵۴، زكريا- ديوبند)

(۳) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ [۴- النساء: ۴۳]

[۴] ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (۵- المائدة: ۹۰)

چڑھانے کا ہے، تو ایسا دانت لگانے سے غسل و وضوء میں کوئی حرج تو نہیں ہوگا اور نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

’’دانت‘‘ فٹ کرانا اور اس پر سونے کا کور چڑھانا جائز ہے، سونے کا دانت بھی جائز ہے۔ (رد المحتار: ۶/ ۳۶۳ ☆ عالمگیری جلد ۵، صفحہ ۳۵۴)[1] دانت کو فٹ کرا دے، تو اس پر سونے کا کور ہونے کے

---

[۱] (ولا يشد سنه) المتحرك (بذهب بل بفضة) وجوزهما محمد (ويتخذ أنفا منه) لأن الفضة تنتنه. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله المتحرك) قيد به لما قال الكرخي: إذا سقطت ثنية رجل، فإن أبا حنيفة يكره أن يعيدها، ويشدها بفضة أو ذهب ويقول هي كسن ميتة ولكن يأخذ سن شاة ذكية يشد مكانها وخالفه أبو يوسف فقال لا بأس به ولا يشبه سنه سن ميتة استحسن ذلك وبينهما فرق عندي وإن لم يحضرني اهـ إتقاني. زاد في التتارخانية قال بشر قال أبو يوسف: سألت أبا حنيفة عن ذلك في مجلس آخر فلم ير بإعادتها بأسا (قوله وجوزهما محمد) أي جوز الذهب والفضة أي جوز الشد بهما وأما أبو يوسف فقيل معه وقيل مع الإمام (قوله لأن الفضة تنتنه) الأولى تنتن بلا ضمير وأشار إلى الفرق للإمام بين شد السن، واتخاذ الأنف فجوز الأنف من الذهب لضرورة نتن الفضة لأن المحرم لا يباح إلا لضرورة، وقد اندفعت في السن بالفضة، فلا حاجة إلى الأعلى وهو الذهب. قال الأتقاني: ولقائل أن يقول مساعدة لمحمد لا نسلم أنها في السن ترتفع بالفضة؛ لأنها تنتن أيضا، وأصل ذلك ما روى الطحاوي بإسناده إلى »عرفجة بن أسعد أنه أصيب أنفه يوم الكلاب في الجاهلية فاتخذ أنفا من ورق فأنتن عليه، فأمره النبي - صلى الله عليه وسلم - أن يتخذ أنفا من ذهب، ففعل« ،والكلاب بالضم والتخفيف: اسم واد كانت فيه وقعة عظيمة للعرب هذا وظاهر كلامه جواز الأنف منهما اتفاقا، وبه صرح الإمام البزدوي وذكر الإمام الإسبيجابي أنه على الاختلاف أيضا. وفي التتارخانية وعلى هذا الاختلاف إذا جدع أنفه أو أذنه أو سقط سنه، فأراد أن يتخذ سنا آخر فعند الإمام يتخذ ذلك من الفضة فقط، وعند محمد من الذهب أيضا اهـ، وأنكر الأتقاني ثبوت الاختلاف في الأنف بأنه لم يذكر في كتب محمد والكرخي والطحاوي، وبأنه يلزم عليه مخالفة الإمام للنص ونازعه المقدسي بأن الإسبيجابي حجة في النقل، وبأن الحديث قابل للتأويل، واحتمال أن ذلك خصوصية لعرفجة كما خص - عليه الصلاة والسلام - الزبير وعبد الرحمن بلبس الحرير لحكة في جسدهما، كما في التبيين أقول: يمكن التوفيق بأن ما ذكره الإسبيجابي رواية شاذة عن الإمام فلذا لم تذكر في كتب محمد والكرخي والطحاوي والله تعالى أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۶۲، كتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس، ط: دار الفكر - بيروت)

قال محمد - رحمه الله تعالى - في الجامع الصغير: ولا يشد الأسنان بالذهب، ويشدها بالفضة يريد به إذا تحركت الأسنان وخيف سقوطها، فأراد صاحبها أن يشدها بالفضة، ولا يشدها بالذهب، وهذا قول أبي حنيفة - رحمه الله تعالى -. وقال محمد - رحمه الله تعالى -: يشدها بالذهب أيضا، ولم يذكر في الجامع الصغير قول أبي يوسف - رحمه الله تعالى - قيل: هو مع محمد - رحمه الله تعالى - ،وقيل: هو مع أبي حنيفة - رحمه الله تعالى -.

وذكر الحاكم في المنتقى لو تحركت سن رجل وخاف سقوطها فشدها بالذهب أو بالفضة لم يكن به =

باوجود غسل و وضو میں کوئی فرق نہیں پڑے گا اور نماز جائز ہوگی۔ (عالمگیری جلد ۱، صفحہ ۱۳)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=بأس عند أبي حنيفة و أبي يوسف - رحمهما الله تعالى - وروى الحسن عن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - أنه فرق بين السن و الأنف فقال في السن لا بأس بأن يشدها بالذهب، وفي الأنف كره ذلك، كذا في المحيط. وقال أبو يوسف - رحمه الله تعالى -: لا بأس بأن يعيد سن نفسه و أن يشدها، وإن كان سن غيره يكره ذلك، كذا في السراج الوهاج.
قال بشر: قال أبو يوسف - رحمه الله تعالى - في مجلس آخر: سألت أبا حنيفة - رحمه الله تعالى - عن ذلك، فلم ير بإعادتها بأسا، كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ٦/ ٣٣٦، كتاب الكراهية، الباب العاشر في استعمال الذهب و الفضة، ط: دار الفكر - بيروت)

(١) (ولا يمنع) الطهارة (ونيم) أي خرء ذباب وبرغوث لم يصل الماء تحته (وحناء) ولو جرمه به يفتى. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: ونيم إلخ) ظاهر الصحاح و القاموس أن الونيم مختص بالذباب نوح أفندي، وهذا بالنظر إلى اللغة، وإلا فالمراد هنا ما يشمل البرغوث؛ لأنه أولى بالحكم. ـــــ (قوله: لم يصل الماء تحته) لأن الاحتراز عنه غير ممكن حلية. ـــــــ (قوله: به يفتى) صرح به في المنية عن الذخيرة في مسألة الحناء والطين والدرن معللا بالضرورة. (رد المحتار على الدر المختار: ١/ ١٥٤، كتاب الطهارة، فرض الغسل، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ١/ ١٣، كتاب الطهارة، الباب الثاني في الغسل، الفصل الأول في فرائض الغسل، ط: دار الفكر - بيروت)

عن أبي هريرة-رضی الله تعالیٰ عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: طهور إناء أحدكم إذا ولغ فيه الكلب، أن يغسله سبع مرات أولاهن بالتراب.

(مسلم شریف: ۱/ ۱۳۷، حدیث نمبر: ۲۷۹)

باب المیاہ

[پانی کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب المیاہ

[پانی کے احکام]

[۱] شرعی حوض کی پیمائش

۴۹۰-سوال: مارچ کے ماہنامہ ''الاصلاح'' میں ایک مسئلہ حوض کی پیمائش کے متعلق مذکور ہے، اس میں لکھا ہے: حوض دہ دردہ ہونا چاہیے اور دہ دردہ کا مطلب ۶۰/ مربع فٹ ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ دہ دردہ کا مطلب دس بائی دس گز ہے اور ایک گز ڈیڑھ فٹ کا ہوتا ہے، تو اس حساب سے شرعی حوض ۱۵/ بائی ۱۵/ فٹ کا ہوگا، اور اس کا مربع جب ہم نکالتے ہیں، تو ۲۲۵ = ۱۵ × ۱۵ (دوسوپچیس) مربع فٹ نکلتا ہے۔ پس ۶۰/ مربع فٹ جو اس میں لکھا ہے، وہ کس حساب سے ہے؟ ممکن ہے ہمیں سمجھنے میں کوئی غلطی ہوئی ہو، درخواست ہے کہ صحیح صورت حال کی وضاحت فرمادیں۔

مستفتی: محمد اسماعیل وڈیا

الجواب حامداً ومصلیاً:

برادر عزیز مولانا محمد صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا کہنا بالکل صحیح ہے، مذکورہ پرچہ کی طباعت میں غلطی واقع ہوئی ہے۔ حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب قدس سرہ نے ایک مختصر رسالہ ''اوزان شرعیہ'' کے نام سے لکھا ہے، جس پر حکیم الامت حضرت تھانویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ، اور مظاہر علوم کے صدر مفتی حضرت مفتی سعید احمد صاحبؒ وغیرہ اکابرین امت کے تصدیقی دست خط بھی موجود ہیں، اس کے صفحہ: ۳۳ تا ۳۶/ پر اس سلسلہ میں کافی تفصیل موجود ہے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

عرب میں دو قسم کے ''ذراع'' مستعمل تھے، ایک ذراع کرباس (کپڑے ناپنے کا گز) دوسرا ذراع مساحت (زمین ناپنے کا گز) ذراع مساحت حسب تصریح قاضی خان وغیرہ سات مشت (مٹھی) ہیں، جن میں

ہرایک مٹھی کے ساتھ انگوٹھا بھی کھڑا ہو۔ (کذا فی البحر الرائق: ۱/۸۰، بحث المیاہ)

اور یہ مٹھی، جس پر انگوٹھا کھڑا ہو، آج کل کی پیائش کے حساب سے چھ انچ ہوتی ہے؛ کیوں کہ اس طرح کی دو مٹھی کا فٹ قرار دیا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ذراع مساحت، ساڑھے تین فٹ یا بیالیس انچ کا ہوتا ہے، جو انگریزی گز سے چھ انچ زیادہ ہے؛ لیکن فقہاء کے کلام میں عموماً جس جگہ ذراع کا لفظ بولا گیا ہے، ذراع مساحت مراد نہیں؛ بل کہ ذراع کرباس مراد ہوتا ہے، اور بعض مواضع میں فقہاء کا اختلاف بھی رہا ہے، کہ بعض نے اس میں ذراع کرباس مراد لیا، بعض نے ذراع مساحت، جیسا کہ ماء (پانی) کثیر کی بحث اور دہ در دہ کی تعیین میں قاضی خانؒ نے ذراع مساحت کو اختیار کیا ہے؛ لیکن جمہور فقہاء، صاحب ہدایہ اور عامہ متون وشروح نے اس جگہ بھی ذراع کرباس ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔

اور ذراع کرباس بھی دو قسم کا مشہور ہے، متقدمین میں ۳۲/انگشت کا ذراع معروف ہے، اور متاخرین میں ۲۴/انگشت کا، انگشت سے مراد یہ ہے کہ ۴/انگلیاں ملا کر رکھی جاویں اور انگوٹھا اس کے ساتھ شامل نہ کیا جائے، پھر چار ان کی برابر، اور پھر اسی طرح ۴، یہاں تک کہ ۳۲ یا ۲۴ ہو جاویں، اور چوں کہ ایک مشت (مٹھی) بھی ۴/انگشت ہوتی ہے؛ اس لیے متقدمین کا ذراع آٹھ مشت (مٹھی) اور متاخرین کا چھ مشت کا ہوگا۔ عامہ کتب مذہب، متون وشروح اور فتاویٰ میں متاخرین کا ذراع مستعمل ہے، اسی پر سب حسابات شرعیہ قائم کیے گئے ہیں، یعنی ۶/مشت یا ۲۴/انگشت کا ایک ذراع: و ذلك لما في تيمم الهندية بعد قوله أقرب الاقوال: كل ذراع أربع وعشرون أصبعا وعرض كل أصبع ست حبات شعير ملصقة ظهر البطن. هكذا في التبيين. (عالم گیری: ۱/۲۸، ط: دار الفکر، الطبعة الثانية: ۱۳۱۰ھ) و في مياه البحر الرائق: اختلف المشايخ في الذراع على ثلاثة أقوال ففي التجنيس المختار ذراع الكرباس، و اختلف فيه ففي كثير من الكتب أنه ست قبضات ليس فوق كل قبضة إصبع قائمة فهو أربعة وعشرون إصبعا بعدد حروف لا إله إلا الله محمد رسول الله و المراد بالإصبع القائمة ارتفاع الإبهام كما في غاية البيان. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۱/۸۰، ط: دار الكتاب الإسلامي) و مثله في تيمم البحر عن الينابيع و ذكر أنه ذراع العامة و في حاشية البحر (منحة الخالق) للشامي هناك أنه هو المعول وعزاه إلى الرملي صاحب الخيرية. (بحر: ۱/۱۴۷ ☆ مزید دیکھیے، شامی: ۱/۱۹۶، کتاب الطہارۃ، باب المیاہ، مطلب فی مقدار الذراع وتعیینہ، ط: ایچ، ایم سعید، پاکستان)

عبارات مرقومہ بالا سے واضح ہوگیا کہ قول معتمد فقہاء رحمہم اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ پانی کی مساحت کے متعلق دہ دردہ کے مسئلے میں ذراع کرباس معتبر ہے اور اس کی صحیح و راجح پیمائش ۲۴/انگلیاں یا ۶/مشت ہے، اور یہ بعینہ وہ مقدار ہے، جس کو ہمارے عرف میں ایک ہاتھ کہا جاتا ہے، چناں چہ مغرب میں (جس میں خاص فقہی کے لغت جمع کیے گئے ہیں) ہے: **(الذراع) من المرفق إلى أطراف الأصابع ثم سمي بها الخشبة التي يزرع بها ... والذراع المكسرة ست قبضات وهي ذراع العامة وإنما وصفت بذلك لأنها نقصت عن ذراع الملك بقبضة وهو بعض الأكاسرة لا الأخير وكانت ذراعه سبع قبضات.** (المغرب - أبو الفتح برهان الدين الخوارزمي المطرزي (م: ۶۱۰ھ): ۱/۳۰۶، الذال مع الراء المهملة، ط: دار الكتاب العربي)

مُغرب کی اس تحریر سے یہ معلوم ہوگیا کہ البحر الرائق، بحث المیاہ، میں جو قول ولوالجی سے نقل کیا ہے، کہ سات مشت کا ایک ذراع ہوتا ہے، یہ اس قدیم ذراع کی پیمائش ہے، جو آخری کسریٰ ملک فارس کا ذراع ہے، اور اسلام میں جو ذراع رائج ہوا وہ ایک مٹھی کم یعنی ۶/مٹھی یا ۲۴/انگلیوں کا ذراع ہے، اور یہی معتبر و مستند ہے اور عرب اور فقہاء کی سذاجت و سادگی کا بھی یہی مقتضی ہے، کہ ان کے کلام میں ذراع سے یہی ذراع مراد ہو؛ کیوں کہ وہ ذراع طبعی (یعنی ایک ہاتھ) کی صحیح مقدار ہے، اور یہ ذراع انگریزی گز سے نصف یعنی ڈیڑھ فٹ یا ۱۸/انچ ہوتا ہے، جیسا کہ عام طور پر چکرورتی (علم حساب) میں اس کی تصریحات الفاظ ذیل میں موجود ہیں:

۱۔[۹/انچ = ایک بالشت] ۲۔[۲/بالشت یا ۱۸/انچ = ایک ہاتھ]

۳۔[دو ہاتھ = ایک گز] ۴۔[ایک گز = ۳/فٹ یا ۳۶/انچ]

خلاصہ یہ ہے کہ رائج الوقت انگریزی گز اور فٹ کے اعتبار سے:

ذراع مساحت = ایک گز ۶/انچ یا ساڑھے تین فٹ یا بیالیس انچ ہے۔

ذراع کرباس = نصف گز یا ڈیڑھ فٹ یا اٹھارہ انچ ہے۔

پانی کے مسائل میں ذراع کرباس معتبر ہے، جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے۔

(اوزان شرعیہ: ۳۳-۳۶، ط: مکتبہ امدادیہ سہارن پور)

لہٰذا دہ دردہ حوض جب مربع (چوکور) ہو، تو 15×15=225 کا ہوگا، اور لمبائی چوڑائی میں کمی بیشی

کے ساتھ اس طرح بھی ہوسکتا ہے: 30×7.50 =225 ، یا 60 ×3.50=225۔ جیسی سہولت ہو، بنا سکتے ہیں، اور یہی حساب صحیح ہے، کفایت المفتی میں یہی لکھا گیا ہے۔[۱]

لہٰذا اصلاح میں جو دہ دردہ کا مطلب ۶۰/مربع فٹ بیان کیا گیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے، اور امکان ہے کہ طباعت کی غلطی ہو۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] حوض کی مختلف شکلوں میں ان کا حساب کیا ہونا چاہیے؟

۴۹۱-سوال: ہمارے یہاں مسجد کا ایک حوض ہے جس کی لمبائی ساڑھے ستائیس فٹ اور چوڑائی سوا چودہ فٹ ہے، اس کا کل رقبہ اس حساب سے ۳۹۱/تین سو اکانوے مربع فٹ ہے، اس حوض کا بعض حصہ چھت کے بالمقابل ہے اور بعض حصہ کھلا ہوا ہے، چھت کے بالمقابل حصے کو ہوا بالکل نہیں ملتی ہے، کیوں کہ چھت کا نیچے والا حصہ پانی کی اوپر کی سطح سے بالکل لگ چکا ہے، لوگ کھلی جگہ میں بیٹھ کر لوگ وضو کرلیا کرتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کفایت المفتی میں لکھا ہے کہ اس طرح کے حوض کا کل رقبہ ۲۲۵/مربع فٹ ہونا چاہیے۔[۲] اور فتاوی رحیمیہ میں لکھا ہے کہ گول حوض کا رقبہ ۳۶/چھتیس گز ہونا چاہیے۔[۳] اور تعلیم الاسلام میں لکھا ہے کہ ۵۴/فٹ ہونا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے اس حوض کو کون سا حوض شمار کریں؟ اگر ہمارا حوض گول شمار نہ ہو، تو لمبا گول شمار کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اس کا حساب کیا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیا:

مذہب حنفی کے مطابق ماء کثیر اس پانی کو کہا جاتا ہے جو 10×10=100 گز ہو، جو ہمارے حساب سے 15×15 یعنی 225 مربع فٹ ہونا ضروری ہے، لمبا چوکور ہو، تو: 30×7.50 =225، یا 60 ×3.50=225 ہوسکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حوض کیسا بھی ہو، اس کا کل رقبہ 225/دو سو پچیس مربع (اسکوائر) فٹ ہونا ضروری ہے۔ اگر گول حوض ۳۶/چھتیس گز ہوگا، تو بھی اس کا کل رقبہ 225 مربع (اسکوائر) فٹ ہی ہوگا، گولائی میں ۵۴/چون فٹ کا رقبہ ہوگا، تو بھی ۲۲۵/مربع فٹ کا ہی ہوگا؛ لہٰذا آپ کی

---

(۱) کفایت المفتی: ۲/۲۹۲، حوض اور کنویں کے احکام، ط: زکریا بک ڈپو- دیو بند۔

(۲) دیکھیے: کفایت المفتی: ۲/۲۹۲، حوض اور کنویں کے احکام، ط: زکریا بک ڈپو، دیو بند۔

(۳) اور اگر حوض مدور (گول) ہے، تو اس کا محیط (گھیراو) چھتیس گز ہو۔ (فتاوی رحیمیہ: ۴/۳۸، کتاب الطہارت، اگر پانچ ہاتھ چوڑا اور بیس ہاتھ لمبا حوض ہو، تو وہ دہ دردہ ہے۔ مسئلہ نمبر: ۳۲۔)

مسجد کے حوض کو حوض کبیر شمار کیا جائے گا۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ ۲۷/۱۱/۱۹۸۹ء

[۳] کولا واٹر کے صابن کا حکم

۴۹۲-سوال: کولا واٹر کو بدن پر لگانے کے بعد اس کا دھونا ضروری ہوتا ہے، تو کیا جو لوگ کولا واٹر کا صابن استعمال کرتے ہیں، ان کا غسل صحیح ہوجاتا ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ اس سے غسل صحیح نہیں ہوتا ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

کولا واٹر کا صابن اگر ناپاک چیزوں سے بنایا جاتا ہو، اس طور پر کہ اس ناپاک چیز کی ماہیت نہ بدلی ہو، تو وہ ناپاک ہے اور اس سے غسل کرنا درست نہیں ہے۔ [2] اور اگر وہ پاک چیزوں سے بنایا جاتا ہے،

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے سوال سابق کا تفصیلی جواب بہ عنوان: شرعی حوض کی پیمائش۔☆مزید دیکھیے: کفایت المفتی: ۲/ ۲۹۲، حوض اور کنویں کے احکام، ط: زکریا بک ڈپو، دیوبند☆ فتاویٰ رحیمیہ: ۴/ ۳۸، کتاب الطہارت، دارالاشاعت، پاکستان۔

في النهر: وأنت خبير بأن اعتبار العشر أضبط ولا سيما في حق من لا رأي له من العوام، فلذا أفتى به المتأخرون الأعلام: أي في المربع بأربعين، وفي المدور بستة وثلاثين، وفي المثلث من كل جانب خمسة عشر وربعا وخمسا بذراع الكرباس، ولو له طول لا عرض لكنه يبلغ عشرا في عشر جاز تيسيرا، ولو أعلاه عشرا وأسفله أقل جاز حتى يبلغ الأقل، ولو بعكسه فوقع فيه نجس لم يجز حتى يبلغ العشر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۱۹۳- ۱۹۴، فصل في المياه، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) لیکن اگر انقلاب ماہیت کا تحقق ہوجائے تو اس کی طہارت کا حکم لگایا جائے گا:

والأعيان النجسة تطهر بالاستحالة عندنا، وذلك مثل الميتة إذا وقعت في المملحة، فاستحلت حتى صارت ملحا، والعذرة إذا صارت ترابا أو أحرقت بالنار وصارت رمادا، فهي نظير الخمر إذا تخللت أو جلد الميتة إذا دبغت فإنه يحكم بطهارتها للاستحالة، وذكر في الفتاوى أن رأس الشاة لو أحرق حتى زال الدم يحكم بطهارته، وكذا البلة النجسة في التنور تزول بالإحراق. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق-عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۷۶، باب الاستنجاء، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق- القاهرة☆ البحر الرائق: ۱/ ۲۳۹، باب الأنجاس، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۲۶، باب الأنجاس، مطلب: العرقي الذي يستقطر من دردي الخمر نجس حرام، ط: دار الفكر-بيروت)

(وكذا يطهر حمار وقع في المملحة فصار ملحا) لانقلاب العين، وهو من المطهرات فإن كان من الخمر فلا خلاف في الطهارة، وإن كان من غيرها كالخنزير يطهر عند محمد خلافا لأبي يوسف. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر: ۱/ ۶۱، باب الأنجاس، ط: دار إحياء التراث العربي)

تو پاک ہے اور اس سے غسل درست ہے، یہی حکم کولا واٹر کا بھی ہے، اور جب تک کسی قسم کا کوئی ثبوت نہ ہو، محض شبہ کی بنیاد پر اسے ناپاک نہیں کہا جائے گا۔ [1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] بیت الخلاء کے کنویں اور پانی کے کنویں کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہیے؟

۴۹۳-سوال: ہمارے یہاں کرنج میں ایک شخص اپنی زمین میں پانی کا کنواں کھودنا چاہتا ہے اور ساتھ میں اسی زمین میں بیت الخلاء بھی بنانا چاہتا ہے، تو بیت الخلاء کے ٹینک اور پانی کے کنویں کے درمیان کتنا فاصلہ رکھنا شرعاً ضروری ہے؟ واضح رہے کہ اس زمین کی لمبائی جس میں یہ دو کنویں کھودے جانے ہیں، ۵۵/فٹ ہے، امید ہے کہ جواب دے کر ممنون فرمائیں گے۔ نیز درخواست ہے کہ ایسا کوئی عمل بتائیں، جس سے میٹھا پانی نکلے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

پانی کے کنویں اور نجاست کے کنویں کے درمیان مسافت کے متعلق علماء نے کوئی قطعی بات نہیں لکھی ہے، اس کا مدار زمین کی نرمی اور سختی پر ہے، نرم زمین میں اگر دس فٹ کا فاصلہ ہوگا، تب بھی نجاست کا اثر پہنچنے کا امکان رہے گا اور اگر پتھریلی اور سخت زمین ہوگی، تو چھ، سات فٹ کی دوری پر بھی اثر نہیں پہنچے گا؛ اس لیے وہ دور ہو یا قریب، اگر نجاست کے اثر سے پانی کے رنگ، بو یا مزہ میں تبدیلی آجائے، تو کنویں کا سارا پانی ناپاک ہوجائے گا، اور جب تک یہ اثر نہ آئے، پانی پاک رہے گا؛ لہٰذا کرنج کی زمین اگر نرم ہو، پتھریلی اور سخت نہ ہو، تو ۱۵/ سے ۲۰/فٹ کا فاصلہ رکھنا بہتر ہے۔ [2]

---

(۱) قال ابن عابدين (م: ۱۲۵۲ھ): في التتارخانية: من شك في إنائه أو في ثوبه أو بدن أصابته نجاسة أو لا فهو طاهر مالم يستيقن، وكذا الآبار والحياض والجباب الموضوعة في الطرقات ويستقي منها الصغار والكبار والمسلمون والكفار؛ وكذا مايتخذه أهل الشرك أو الجهلة من المسلمين كالسمن والخبز والأطعمة والثياب اهـ ملخصا. (رد المحتار: ۱/۱۵۱، مطلب نواقض الوضوء، كتاب الطهارة، ط: دار الفكر-بيروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء)
☆الأصل في الأشياء الإباحة. (قواعد الفقه:-محمد عميم الإحسان المجددي البركتي: ۵۹، قاعده نمبر: ۳۳، ط: الصدف پبلشرز-كراتشي، الطبعة الأولى: ۱۴۰۷-۱۹۸۶ء، ☆مزید دیکھیے: رد المحتار: ۱/۱۰۵، كتاب الطهارة، سنن الوضوء)

(۲) في الدر المختار: [فرع] البعد بين البئر والبالوعة بقدر ما لا يظهر للنجس أثر. وقال ابن عابدين: (قوله البعد إلخ) اختلف في مقدار البعد المانع من وصول نجاسة البالوعة إلى البئر، ففي رواية خمسة أذرع، وفي رواية سبعة. =

اور میٹھا پانی نکلے، اس کا عمل یہ ہے کہ طلب خیر کی نیت کرے کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں اور میرے لیے صدقۂ جاریہ ہو، ان شاء اللہ میٹھا پانی نکلے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] مسجد کا کنواں گندے نالے سے کتنے فاصلے پر کھودا جائے؟

۴۹۴-سوال: ہمارے یہاں مسجد کے استعمال کے لیے ایک پانی کا کنواں کھودنا ہے؛ مگر مشکل یہ ہے کہ اس کے ایک طرف بیت الخلاء کا کنواں ہے، تو اس صورت میں پانی کا کنواں اُس (بیت الخلاء کے کنواں) سے کتنا دور رکھیں؟ بیت الخلاء کے کنویں سے ۱۰ یا ۱۵ فٹ فاصلہ پر کنواں کھودا جائے، تو اس کا کیا حکم ہے؟ جواب لکھ کر رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

شامی میں لکھا ہے کہ پانی کا کنواں بیت الخلاء کے کنویں سے اتنے فاصلہ پر ہو کہ ناپاکی کا کوئی اثر پانی کے کنویں میں نہ پایا جائے، اثر سے مراد، رنگ، مزہ اور بو ہے، دوسری بات یہ ہے کہ ہر جگہ کی زمین یکساں نہیں ہوتی، بعض جگہ زمین نرم اور بعض جگہ سخت ہوتی ہے، اور زمین کی نرمی اور سختی، نجاست کے سرایت کرنے اور نہ کرنے میں اثر انداز ہوتی ہے، جہاں زمین نرم ہو، وہاں دور تک نجاست سرایت کرتی ہے اور جہاں زمین سخت ہو، وہاں نجاست دور تک سرایت نہیں کرتی ہے، الغرض نجاست کتنی دور تک سرایت کرتی ہے، اس کا دار و مدار زمین کی سختی اور نرمی پر ہے؛ اس لیے حتمی طور پر ہر جگہ کی ایک ہی مقدار متعین نہیں کی جاسکتی؛ اس لیے کسی اہل تجربہ واہل بصیرت سے دریافت کرنا چاہیے۔ ہمارے دیار میں کنویں کو بیت الخلاء کے کنویں سے ۱۵ رفٹ دور تو رکھنا ہی چاہیے، اگر اس سے زیادہ ہو، تو اور بہتر ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= وقال الحلواني: المعتبر الطعم أو اللون أو الريح، فإن لم يتغير جاز وإلا لا ولو كان عشرة أذرع. وفي الخلاصة والخانية: والتعويل عليه وصححه في المحيط بحر. والحاصل أنه يختلف بحسب رخاوة الأرض وصلابتها، ومن قدره اعتبر حال أرضه. (رد المحتار مع الدر: ۱/۲۲۱، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الفكر-بيروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء)

(۱) قد تقدم تخريجه عن رد المحتار مع الدر: ۱/۲۲۱، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الفكر-بيروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء، تحت عنوان سابق.

[۶] کتا کنویں میں داخل ہو کر زندہ نکل جائے، تو کیا حکم ہے؟

۴۹۵-سوال: ہمارے گھر کے احاطے کے پیچھے ایک کنواں ہے، اس کا پانی پینے، نہانے اور دھونے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس میں چند دنوں پہلے ایک کتا گر گیا تھا، مگر اس کو زندہ ہی باہر نکال دیا گیا، اس کے بعد اس میں سے تین سو ساٹھ ڈول پانی نکالا گیا؛ پھر اس کا پانی غیر مسلم حضرات کے پینے اور ان کے دوسرے کام؛ مثلاً: ان کے تعمیری کام کے لیے استعمال ہوا، اب کنویں کا پانی مسلمانوں کے پینے اور ان کے استعمال کے لیے جائز ہے یا نہیں؟ یعنی اس پانی کو نہانے، دھونے اور پینے میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

غلام محمد یوسف لمبادا

الجواب حامداومصلیا:

کتے کے بدن پر اگر کوئی ناپاکی لگی ہوئی ہو، یا اس کا منہ پانی کے اندر ایک مرتبہ بھی پہنچ گیا ہو، تو کنواں ناپاک ہو جائے گا۔[1]

کنواں ناپاک ہو جائے، تو اس کو پاک کرنے کے لیے پورا پانی نکالنا ضروری ہوتا ہے، مثلاً کنویں میں اگر پانچ ہزار ڈول پانی تھا، مسلم اور غیر مسلم سب نے مل کر اپنے تعمیری کام اور کھیت کی سینچائی وغیرہ کے لیے پانچ ہزار ڈول پانی نکال دیا ہے، تو کنواں پاک ہو جائے گا؛ تھوڑا تھوڑا کر کے اگر الگ الگ دنوں میں پانی نکالا ہے، تب بھی کنواں پاک ہو جائے گا؛ خلاصہ یہ ہے کہ پورا پانی نکالنا ضروری ہے؛ جب تک پورا پانی نہیں نکالا جائے گا، کنواں پاک نہیں ہوگا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۷] ''گرگٹ'' کنویں میں ملے، تو کیا حکم ہے؟

۴۹۶-سوال: ہمارے یہاں گاؤں کے کنویں میں جمعرات کو شام کے تقریباً ساڑھے چھ بجے

---

(۱) واعلم أنه (ليس الكلب بنجس العين) عند الإمام وعليه الفتوى... ولو أخرج حيا ولم يصب فمه الماء لا يفسد ماء البئر. (الدر مع الرد: ۱/ ۲۰۸، كتاب الطهارة، باب المياة، فرع مايخرج من دار الحرب كسنجاب إن علم دبغه بطاهر، ط: دار الفكر-بيروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ- ۱۹۹۲ء)

(۲) لو أخرج حيا وليس بنجس العين ولا به حدث أو خبث لم ينزح شيء إلا أن يدخل فمه الماء فيعتبر بسؤره، فإن نجسا نزح الكل وإلا لا هو الصحيح. (حوالہ سابق: ۱/ ۲۱۳، كتاب الطهارة، فصل في البئر)

ایک گرگٹ دیکھا گیا، دیکھنے والے شخص نے دو تین آدمیوں کو اطلاع دی؛ البتہ یہ لوگ دوسروں کو بتانا بھول گئے، اس کنویں کا پانی مسجد کی ٹنکی میں بھی آتا ہے، ٹنکی میں تھوڑا پانی پہلے سے ہوتا ہے؛ البتہ جیسے جیسے اس میں پانی کم ہوتا ہے، اس میں تھوڑا تھوڑا پانی کنواں سے آتا رہتا ہے اور ٹنکی بھرتی رہتی ہے، اس ٹنکی کے پانی سے لوگوں نے وضو کر کے مغرب، عشاء، فجر اور ظہر وغیرہ کی متعدد نمازیں پڑھی ہیں، اس کنویں کا پانی لوگوں کے گھروں میں بنی ہوئی ٹنکیوں میں بھی جاتا رہتا ہے، انہوں نے بھی اس پانی سے وضو اور غسل کیا ہے، اور دوسرے کاموں میں بھی استعمال کیا ہے، تو سوال یہ ہے کہ اس پانی سے وضو اور غسل کر کے جو نمازیں ادا کی گئی ہیں، اور جن کپڑوں کو دھویا گیا ہے، ان کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداومصليا:

حضرات صاحبین کے مسلک کے مطابق' کنویں میں مرا ہوا جانور جس وقت سے دیکھا گیا ہے، اس وقت سے کنویں کے ناپاک ہونے کا حکم لگایا جائے گا؛ اس لیے کنویں میں گرگٹ دیکھنے سے پہلے پڑھی گئی نمازوں کا اعادہ نہیں کیا جائے گا، اسی طرح اس پانی کے ذریعہ کیے گئے غسل' صحیح اور دھوئے گئے کپڑے پاک ہوں گے؛ البتہ گرگٹ کے گرنے کا جب علم ہوا، اس وقت سے پانی ناپاک سمجھا جائے گا، اس کے بعد بھی اگر لوگوں نے وضو یا غسل کیا ہے، یا کپڑے دھونے میں اس پانی کو استعمال کیا ہے، تو نہ وضو اور غسل صحیح ہوگا اور نہ ہی کپڑے پاک ہوں گے، اور اس وضو یا غسل سے جتنی نمازیں ادا کی گئی ہیں، ان سب کا اعادہ ضروری ہوگا۔

اگر مرے ہوئے گرگٹ کے دیکھنے کے بعد مسجد اور گاؤں کے لوگوں کی ٹنکیوں میں اس کنویں کا پانی نہ آیا ہو، تو ان کی ٹنکیاں پاک رہیں گی، ان کو اپنے غسل اور نمازوں کے لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے، گرگٹ دیکھنے کے بعد اگر پانی ٹنکیوں میں آیا ہو، تو وضو، غسل اور نمازوں کا اعادہ کرنا ضروری ہوگا۔ لوگوں کی آسانی کی خاطر حضرات صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول پر فتوی دیا گیا ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہٗ (۴/۲/۱۹۷۷ء)

---

(۱) (ويحكم بنجاستها) مغلظة (من وقت الوقوع إن علم، وإلا فمذ يوم وليلة إن لم ينتفخ ولم يتفسخ) وهذا (في حق الوضوء) والغسل؛... أما في حق غيره كغسل ثوب فيحكم بنجاسته في الحال. وقالا: من وقت العلم فلا يلزمهم شيء قبله، قيل وبه يفتى. قال ابن عابدين: (قوله قيل وبه يفتى) قائله صاحب الجوهرة. وقال العلامة قاسم في تصحيح القدوري: قال في فتاوى العتابي: قولهما هو المختار. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۲۱۹-۲۱۸، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الفكر - بيروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ - ۱۹۹۲ء)

نوٹ: فقہاء کے یہاں گرگٹ (سام ابرص) وہ ہے، جس کی دم دراز ہوتی ہے، اور جو مختلف طرح کے رنگ بدلتا رہتا ہے، یہ عموماً =

[۸] ناپاک کنویں کو پاک کرنے کی صورت

۴۹۷-سوال: ہمارے گاؤں میں ایک غیر آباد کنواں ہے، پہلے اس میں بقرعید کے موقع پر قربانی کے جانوروں کی ہڈیاں اور اوجھ وغیرہ ڈالی جاتی تھیں، مگر اب دو سال سے اس میں ہڈیاں اور اوجھ تو نہیں ڈالی جاتی ہیں، البتہ حیض ونفاس کے ناپاک کپڑے اور دوسری نجاستیں ابھی تک ڈالی جاتی ہیں، اس کنویں کو پاک کرنے کے لیے صرف اس میں سے پانی نکالا گیا ہے، کنویں کو صاف نہیں کیا گیا ہے، اور جو پانی نکالا گیا ہے، وہ بھی بدبودار ہے، پانی نکالنے کے بعد بھی کنویں میں ہڈی وغیرہ نظر آتی ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ کنواں محض پانی نکالنے سے پاک ہوجائے گا، یا اسے صاف بھی کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداومصلیا:

نجاست کنویں میں گر جائے، اور اس کو نکالنے کے بعد کنویں کا پانی نکال دیا جائے، تو کنواں پاک ہوجاتا ہے۔ ہاں اگر کنویں کو صاف کرنا اور اس میں گری ہوئی اشیاء مثلاً ناپاک کپڑوں کو نکالنا دشوار ہو، تو کنویں کو صاف کرنا ضروری نہیں ہوگا۔

صورت مسئولہ میں جب کنویں کا پورا پانی نکالا گیا، تو اس کنویں میں ڈالی گئی نجس اشیاء کو بھی نکالنا ضروری تھا، سوال میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس کنویں میں اوجھ بھی ڈالی جاتی رہی ہے، جس میں نجاست بھری ہوئی ہوتی ہے؛ لہٰذا جب تک کنویں میں نجاست، مردہ جانور یا اس کا گوشت موجود ہوگا، اس وقت تک وہ کنواں ناپاک رہے گا، ہاں اگر ان نجاستوں کے گرنے پر اتنی مدت گذر گئی، کہ اب وہ ساری نجاستیں کیچڑ سے بدل چکی ہیں، (جس کی مقدار چھ مہینے ہے) تو کنواں صاف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہڈیاں جو کنویں میں رہ گئی ہیں، وہ پاک ہیں، البتہ پھر بھی نکال لینا بہتر ہے اور اگر نہ نکالی گئیں، تب بھی پانی نکالنے کے بعد

= جنگلوں میں رہتا ہے، یہ دموی جانور ہے، اور اس کے کنویں میں گرنے سے کنواں ناپاک ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور جانور ہے، جسے "وزغۃ" یعنی چھپکلی کہتے ہیں، اور یہ دو طرح کی ہوتی ہے، ایک بڑی اور ایک چھوٹی، بڑی چھپکلی میں خون ہوتا ہے، بڑی چھپکلی کنویں میں گر جائے تو کنواں ناپاک ہوتا ہے، چھوٹی سے نہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: منتہی الارب: ۴/ ۳۰۴، باب الواو، فصل الزاء، ادارہ اسلامیات، لاہور☆ غیاث اللغات: ۵۴۲، فصل واز مع زاء معجمہ)

فتاویٰ محمودیہ (۱۵۱/۵، ناشر: ادارۂ صدیق، ڈابھیل، ۲۰۰۷ء) میں ہے: جو چھپکلی عامۃً ہمارے دیار میں چھت پر ہوتی ہے، وہ چھوٹی ہی ہے۔

کنواں پاک ہو جائے گا۔

پانی میں بدبو اگر نجاست کی وجہ سے ہو، تو نیا پانی بھی ناپاک ہوگا، تاہم کبھی کنویں کے ویران پڑے رہنے کی وجہ سے بھی بدبو پیدا ہو جاتی ہے، اگر پانی نکالنے کے بعد بھی اس قسم کی بدبو آ رہی ہو، تو پانی پاک ہے۔

البتہ احتیاط اسی میں ہے کہ ہڈیاں، کپڑے اور دوسری نجس اشیاء کنویں سے نکالنے کے بعد دوبارہ پانی نکال لیا جائے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] دوائی یا اس جیسی صاف کرنے والی دوسری چیز پانی میں ڈال کر کپڑے دھونا

۴۹۸-سوال: اگر پانی میں دوا، پٹرول، مٹی تیل یا اسپرٹ وغیرہ ڈال کر کپڑے دھوئے جائیں، تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

دوا، پٹرول، مٹی تیل، اسپرٹ یا اس جیسی کوئی دوسری چیز، جس سے مقصد صرف نظافت ہے، ان کو پانی میں ملا دیا جائے، پھر اس کے ذریعے کپڑے صاف کیے جائیں اور کپڑوں کا میل کچیل دور کیا جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ (۷/۹/۱۹۸۶ء)

---

(۱) إذا وقعت نجاسة... في بئر دون القدر الكثير... أو مات فيها... حيوان دموي غير مائي وانتفخ... أو تفسخ... ينزح كل مائها، الذي كان فيها وقت الوقوع، ذكره ابن الكمال، بعد إخراجه، لا إذا تعذر كخشبة أو خرقة متنجسة، فينزح الماء إلى حد لا يملأ نصف الدلو يطهر الكل تبعا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۲۱۱-۲۱۲) وفي الشامية: وأشار بقوله متنجسة إلى أنه لا بد من إخراج عين النجاسة كلحم ميتة وخنزير. اهـ ح. قلت: فلو تعذر أيضا ففي القهستاني عن الجواهر: لو وقع عصفور فيها فعجزوا عن إخراجه فما دام فيها فنجسة فتترك مدة يعلم أنه استحال وصار حمأة، وقيل: مدة ستة أشهر. اهـ (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۲۱۲، فصل في البئر، باب المياه، كتاب الطهارة، ط: دار الفکر- بیروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء)

(۲) (يطهر المتنجس) ثوبا كان أو غير (عن) نجاسة (مرئية بزوال عينها و) زوال (أثرها) كاللون، والرائحة (إن لم يشق) عليه (زواله) بأن لا يحتاج إلى الصابون ونحوه فإن الآلة المعدة لقلع النجاسات هي الماء فإذا احتيج إلى شيء آخر يشق عليه ذلك (بالماء) متعلق بقوله بزوال (وبمائع مزيل) أي من شأنه الإزالة بأن يكون إذا عصر انعصر (كالخل ونحوه) كماء الورد (بخلاف نحو اللبن) كالدهن فإن فيه دسومة لا تنعصر عن الثوب فيبقى بنفسه في الثوب فلا يزيل غيره. (درر الحكام شرح غرر الأحكام- محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو=

[۱۰] حوض سے وضو کرنے میں حقارت محسوس کرنا

۴۹۹-سوال: اکثر لوگ حوض میں وضو کرنے میں حقارت محسوس کرتے ہیں؛ کیوں کہ مسجد کے شرعی حوض میں وضو کرتے وقت اکثر لوگ بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں، ان کے پاؤں کا میل، ریت کے چھینٹے، کلی کا پانی وغیرہ حوض میں جاتا ہے، تو حوض سے وضو کرنے میں حقارت محسوس کرنا کیسا ہے؟ اور جب شریعت نے حوض کو ایک مقام دیا ہے، تو حوض میں وضو کرنے کے کچھ فضائل بھی ہونے چاہیے، نیز کیا حوض میں وضو کی کوئی خصوصیت ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

حوض، نہر یا نل سے وضو کرنا سب برابر ہے، ثواب کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہاں نہر سے وضو کرنا اس حیثیت سے افضل ہے کہ اس کا پانی جاری ہے اور جاری پانی نجاست گرنے کے بعد بھی پاک رہتا ہے؛ کیوں کہ نجاست آگے بہہ کر ختم ہوجاتی ہے، حوض میں بھی ناپاکی کا خطرہ نہیں؛ کیوں کہ حوض کو اتنا بڑا بنایا جاتا ہے کہ نہر کی طرح ماء جاری کے حکم میں آجاتا ہے؛ لہٰذا اس میں اگر کوئی ناپاکی گر جائے، تو جب تک نجاست کا رنگ یا بو یا مزہ کا اثر پانی میں ظاہر نہ ہو، اس وقت تک وہ پاک ہی شمار ہوگا۔ حوض کو گندگی سے بچانا بہتر ہے؛ لیکن لوگوں کی بے احتیاطی کی وجہ سے وہ ناپاک نہیں ہوتا، اس وجہ سے اس میں وضو کرنے کو حقیر سمجھنا ٹھیک نہیں۔ یہ معتزلہ کا عقیدہ ہے؛ اس لیے اہل سنت حوض سے وضو کرنے کو بہتر سمجھتے ہیں، اور اہل سنت جس کام کو بہتر سمجھیں، اس کا کرنا بہتر ہے؛ لہٰذا حوض میں وضو کرنے سے کترانا ٹھیک نہیں، پانی کی ٹنکی چھوٹی ہوتی ہے، جس میں نجاست گرنے کی وجہ سے پانی کے ناپاک ہونے کا بھی احتمال ہوتا ہے، اگر چہ اس احتمال کا کوئی

=المولی-خسرو (م: ۸۸۵ھ): ۱/ ۴۴، کتاب الطهارة، باب تطهير الأنجاس، ط: دار إحياء الكتب العربية)
فأما إذا كان شيئا يطبخ الماء به أو يخلط لزيادة التطهير فإنه لا يمنع التوضي به وإن تغير لون الماء وطعمه وذلك نحو ماء الصابون وماء الأشنان إلا إذا صار غليظا لا يمكن تسييله على العضو فإنه لا يجوز لأنه زال عنه اسم الماء ومعناه وهذا كله في غير حالة الضرورة، فأما عند الضرورة فيجوز التوضي به. (تحفة الفقهاء-محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو: ۵۴۰ھ): ۱/ ۶۷، كتاب الطهارة، باب النجاسات، ط: دار الكتب العلمية، بيروت-لبنان، طبع دوم: ۱۴۱۴ھ-۱۹۹۴ء)
نوٹ: جب اس طرح کے پانی سے وضو کرنا جائز ہے تو کپڑے دھونا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔

اعتبار نہیں، مگر حوض میں ایسا کوئی احتمال نہیں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] دہ دردہ حوض کا پانی ناپاک ہوگا؟

۵۰۰-سوال: مسجد کے کنویں سے نالی تقریبا ۲۵ رفٹ دور واقع ہے، اس کے باوجود اس کا پانی مسجد کے کنویں میں گرنے لگا ہے، گرچہ گرنے والے پانی کی مقدار زیادہ نہیں ہے، صرف بنڈل سے پانی ٹپکنے کی طرح معمولی مقدار میں ہے۔

تحقیق اس طرح ہوئی کہ وضو کے نل کے پانی میں بدبو کا بعض لوگوں نے احساس کیا، جس کے نتیجے میں تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ نالی کا پانی کنویں میں گر رہا ہے۔ اس کنویں کا پانی حوض میں آتا ہے، مگر حوض کی مقدار دہ دردہ سے زیادہ (۱۵×۱۵=۲۲۵، مربع فٹ) ہے، جس کی وجہ سے اس میں بدبو ظاہر نہیں ہوئی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ پانی کی ٹنکی کے ساتھ حوض کا پانی بھی ناپاک ہوگا یا نہیں؟

فی الحال نالی کو صاف کر کے پلاسٹر کر دیا گیا ہے اور کنویں کی دراڑیں بھی بند کر دی گئی ہیں، جس کی بنا پر نالی کا پانی بھی بند ہوگیا ہے، تو ایسی صورت میں کنویں سے کتنا پانی باہر نکالنا ہوگا؟ اور حوض کے پانی میں بدبو نہیں آتی ہے؛ لیکن درحقیقت پانی کنویں میں سے ہی آتا ہے؛ لہٰذا جب کنویں کا پانی ناپاک ہوگیا ہے۔ تو حوض کا پانی نکالنا ضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

جب تک حوض کے پانی کے اوصاف ثلاثہ (رنگ، بو، مزہ) میں سے کوئی ایک وصف نہ بدل جائے، اس وقت تک حوض کا پانی پاک شمار ہوگا؛ لیکن جب ان اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی ایک وصف بدل جائے، تو حوض کا پانی ناپاک شمار ہوگا۔ (۲)

---

(۱) وفي فوائد الرستغفني: التوضؤ بماء الحوض أفضل من النهر؛ لأن المعتزلة لا يجيزونه من الحياض فنرغمهم بالوضوء منها اهـ.ــــــــ وهذا إنما يفيد الأفضلية لهذا العارض ففي مكان لا يتحقق النهر أفضل كذا في فتح القدير. (البحر الرائق: ۱/۹۱، كتاب الطهارة، أحكام المياه، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ الدر المختار مع الرد: ۱/۱۸۶، باب المياه، مطلب في أن التوضؤ من الحوض أفضل رغما للمعتزلة، ط: بيروت)

(۲) (و) يجوز (بجار وقعت فيه نجاسة و) الجاري (هو ما يعد جاريا) عرفا، وقيل ما يذهب بتبنة، والأول أظهر، والثاني (وإن) وصلية (لم يكن جريانه بمدد) في الأصح، ... (إن لم ير) أي يعلم (أثره) فلو فيه جيفة أو بال فيه=

کنواں چھوٹا ہو، پانی کم ہو، موٹر لگا کر یا ڈول سے کھینچ کر کنویں کو صاف کیا جا سکتا ہو، تو پورا پانی نکال کر صاف کرنا ضروری ہوگا، اگر کنویں کے پانی کا سوت زور سے ابلتا ہو، اوپر سے پانی کھنچتے ہی سوت کا پانی بڑھ جاتا ہو اور پورا پانی نکالنا ممکن نہ ہو، تو اب پاک کرنے کی صورت یہ ہے کہ اولاً کنویں کے پانی کو ناپ لیا جائے، اگر کنویں میں دس فٹ پانی ہے اور ایک گھنٹہ موٹر کے ذریعہ کھینچنے سے دو فٹ پانی کم ہوا ہو، تو پانچ گھنٹہ موٹر چلا کر پانی کھینچ لیا جائے، اس صورت میں کنویں کا سارا پانی نکل جائے گا۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] بارش کا پانی نجاست سے گذر کر کنویں میں گرا ہو، تو کنواں ناپاک نہ ہوگا

۵۰۱-سوال: ہماری مسجد کا کنواں جو ۶۰ فٹ گہرا ہے اور ۴×۴ چوڑا ہے، جس میں ہمیشہ ۱۵ سے ۲۰ فٹ پانی رہتا ہے، اس کے پاس سے ایک گندے پانی کی نالی بہتی ہے، جس میں پیشاب خانہ کا پانی اور پیشاب بھی بہتا ہے، اب بارش ہونے کی وجہ سے کیچڑ پیدا ہو کر وہ نالی بند ہوگئی اور نالی کے گندے پانی کے ساتھ بارش کا پانی مل کر کنویں میں چلا گیا، فی الحال اس کنویں میں ۴۵ سے ۵۰ فٹ تک پانی ہے، جس میں نالی کا ناپاک پانی بھی شامل ہے، تو کنویں کا پانی پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

مذکورہ صورت میں بارش کا پانی نالی سے ہو کر کنویں میں گرا ہے، تو وہ ماء جاری ہے، لہٰذا پانی ناپاک نہیں ہوا، اگرچہ بارش کا پانی پیشاب پر سے گذرا ہو یا پیشاب کو لے کر بہا ہو، ایسے پانی کے کنویں میں گرنے کی وجہ سے کنواں ناپاک نہیں ہوا، اس کو خالی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہاں اگر بارش کے پانی میں نجاست یا پیشاب کی بو آرہی ہو، یا پانی کا مزہ بدلا ہوا ہو، ایسا پانی کنویں میں واقعی طور گرا ہو، تو وہ کنواں

=رجال فتوضأ آخر من أسفله جاز ما لم یر في الجریة أثره (وهو) إما (طعم أو لون أو ریح). (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۱۸۷-۱۸۸، کتاب الطهارة، باب المیاة، ط: بیروت)

(ویتغیر أحد أوصافه) من لون أو طعم أو ریح (ینجس) الکثیر ولو جاریا إجماعا، أما القلیل فینجس وإن لم یتغیر. (الدر مع الرد: ۱/ ۱۸۵، کتاب الطهارة، باب المیاه، ط: بیروت)

(۱) (إذا وقعت نجاسة)... (في بئر دون القدر الکثیر)... (ینزح کل مائها)... (بعد إخراجه)... (وإن تعذر) نزح کلها لکونها معینا (فبقدر ما فیها) وقت ابتداء النزح. (الدر مع الرد: ۱/ ۲۱۲-۲۱۱، کتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الکتب العلمیة-بیروت)

ناپاک ہے، اس کا پورا پانی نکالنا ضروری ہے، اگر ۴۵ فٹ پانی ہو، موٹر کے ذریعہ پانی نکالنا ہو، تو اگر ایک گھنٹے میں مثلاً ۱۰ فٹ پانی نکلتا ہو تو ساڑھے چار گھنٹے پانی نکالنا چاہیے، اس کے بعد اگر کنویں میں پانی جاری ہونے کی وجہ سے پانی باقی رہ جائے، تب بھی وہ پاک شمار ہوگا۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] کنویں میں کافر داخل ہو جائے یا غیر ماکول اللحم جانور مر جائے، تو کیا حکم ہے؟

۵۰۲-سوال: ایک کنویں میں ایک جنگلی بلی گر گئی، وہ زندہ تھی، اس کو باہر نکالنے کے لیے ایک کافر کنویں میں اترا اور اس نے بلی کو مار کر باہر نکالا، تو کنویں کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

صورت مسئولہ میں کنواں ناپاک ہوگیا، پہلی وجہ تو یہ کہ کافر کنویں میں اترا ہے، فتاویٰ شامی میں ہے کہ أن الكافر إذا وقع في البئر وهو حي نزح الماء.“ (جلد ا صفحہ ۱۹۷)[2]

دوسری وجہ یہ ہے کہ جنگلی بلی کو مارنے کی وجہ سے اس کا منہ پانی میں چلا گیا اور جنگلی بلی کا سؤر (جھوٹا) ناپاک ہے۔ (درمختار صفحہ ۲۰۶)[3] لہٰذا کنواں ناپاک ہو جائے گا، اور اس کا تمام پانی نکالنا پڑے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (و) يجوز (بجار وقعت فيه نجاسة)... (إن لم ير) أثره... (وهو) إما (طعم أو لون أو ريح). (الدر مع الرد: ١/ ١٨٧-١٨٨)

(وإن تعذر) نزح كلها لكونها معينا (فبقدر ما فيها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبي (يؤخذ ذلك بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتى، وقيل يفتى بمائة إلى ثلثمائة وهذا أيسر، وذاك أحوط. (الدر المختار مع رد المحتار: ١/ ٢١٤-٢١٥، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۲] [تتمة] نقل في الذخيرة عن كتاب الصلاة للحسن أن الكافر إذا وقع في البئر وهو حي نزح الماء. وفي البدائع: أنه رواية عن الإمام؛ لأنه لا يخلو من نجاسة حقيقية أو حكمية، حتى لو اغتسل فوقع فيها من ساعته لا ينزح منها شيء: أقول: ولعل نزحها للاحتياط، تأمل. (رد المحتار: ١/ ١١٤، فصل في البئر، باب المياه، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۳] (و) سؤر (خنزير وكلب وسباع بهائم) ومنه الهرة البرية ... (نجس) مغلظ. (الدر مع الرد: ١/ ٢٢٣، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۱۴] ناپاک پانی کنویں میں گرے، تو کنواں ناپاک ہوجائے گا

۵۰۳-سوال: ہمارے گاؤں کرنج میں ایک مسجد کے کنویں کا پانی وضو وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے، اس کے اندر سے کافی بدبو آنے لگی، لہٰذا اسے بند کردیا۔ مذکورہ کنویں میں دو کچھوے اور ایک اس کا بچہ تھا، فی الحال وہ دکھائی نہیں دیتے، اس میں ایک بلی بھی داخل ہوگئی تھی، جس کے بارے میں غالب گمان یہ ہے کہ وہ مرگئی ہو، یا کسی حصے میں پھنس گئی ہو، ایک ہفتہ موٹر چلا کر اندازاً ۱۰۰۰/ (ایک ہزار) ڈول کے بہ قدر پانی نکال دیا گیا ہے، اب پانی مکمل صاف ہے اور بو بھی نہیں آتی ہے، تو کیا اس سے وضو کرنا جائز ہے؟

مذکورہ کنویں کے قریب تقریباً ۲۰-۲۲ رفٹ کے فاصلہ پر بیت الخلاء اور پیشاب خانہ کا کنواں ہے، پانی کی موٹر فٹ کرنے کے لیے جب مسجد کے کنویں کے اندرونی حصہ کو تھوڑا کندہ کیا گیا، تو پیشاب کے کنویں کا پانی مسجد میں ٹپکنے لگا، اب سوال یہ ہے کہ مسجد کے کنویں کا پانی شرعی اعتبار سے پاکی کے لیے استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جو کچھوا پانی میں پیدا ہوا ہو اور اسی میں رہتا ہو، اس کے مرجانے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا؛ لیکن جو کچھوا بری وبحری دونوں میں رہتا ہے، اس کے مرنے سے پانی ناپاک ہوجائے گا۔[1]

حکم یہ ہے کہ جب کنواں ناپاک ہوجائے، تو اس کا پورا پانی نکالنا ضروری ہے اور آپ نے کنویں کا پورا پانی نکال دیا ہے؛ اس لیے اب وہ پاک ہوگیا۔[2]

---

(۱) (وإن مات فيه) أي الماء ولو قليلا (غير دموي كزنبور) وعقرب وبق: أي بعوض، . . . (ومائي مولد) ولو كلب الماء وخنزيره (كسمك وسرطان) وضفدع إلا بريا له دم سائل، وهو ما لا سترة له بين أصابعه، فيفسد في الأصح كحية برية، إن لها دم وإلا لا . . . (وينجس) الماء القليل (بموت مائي معاش بري مولد) في الأصح (كبط وإوز). [الدر المختار مع الرد: ۱/ ۱۸۳-۱۸۵، كتاب الطهارة، باب المياه، ط: بيروت]

ويتغير أحد أو صافه، من لون أو طعم أو ريح (ينجس) الكثير ولو جاريا اجماعا أما القليل فينجس وإن لم يتغير (الدر مع الرد: ۱/ ۱۸۵، كتاب الطهارة، باب المياة، ط: ايچ/ايم سعيد-پاكستان)

(۲) (إذا وقعت نجاسة) . . . (في بئر دون القدر الكثير) . . . (ينزح كل مائها) . . . (بعد إخراجه) . . . (وإن تعذر) نزح كلها لكونها معينا (فبقدر ما فيها) وقت ابتداء النزح. (الدر مع الرد: ۱/ ۲۱۲-۲۱۱، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

جو کچھوے کنویں کے اندر تھے اور مر کر ریزہ ریزہ ہوگئے، یا وہ بلی، جس کے بارے میں غالب گمان یہ ہے کہ وہ اسی میں مر کر ریزہ ریزہ ہوگئی، اور اس کی وجہ سے جو بو آرہی تھی، آپ نے اپنی استطاعت کے مطابق اسے تلاش کیا؛ لیکن ان میں سے کوئی چیز نہیں ملی اور نہ ہی دکھائی دیتی ہے؛ تو اس صورت میں کنویں کو پاک خیال کیا جائے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ پانی کے ساتھ اس کے سارے اجزاء نکل گئے۔ (۳)

اگر پیشاب کے کنویں کا پانی مسجد کے کنویں میں ٹپکتا ہو، تو مسجد کا کنواں ناپاک ہوجائے گا۔ (۴) اور جب تک ناپاک پانی کا کنویں میں گرنا بالیقین معلوم نہ ہو اور رنگ، مزہ اور بو میں سے کوئی ایک وصف بھی نہ بدلا ہو، اس وقت تک کنویں کے ناپاک ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔ (۵)

پیشاب کے کنویں کو پانی کے کنویں سے اتنا دور رکھنا چاہیے، جس سے اس کا اثر کنویں میں نہ آئے، بعد و دوری کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ زمین کی سختی و نرمی کے اعتبار سے بعد و دوری کی حد مختلف ہوسکتی ہے۔ (۶)

اگر واقعی پیشاب کے کنویں کا پانی مسجد کے کنویں میں ٹپکتا ہو، تو پہلے اس جگہ کو پتھر اور سمینٹ وغیرہ سے بند کردیا جائے، تاکہ پانی کا ٹپکنا بند ہوجائے، اس کے بعد کنویں کا پانی نکال لیا جائے، اس طرح کنواں پاک ہوجائے گا۔ (۷) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۳) إذا وقعت في البئر نجاسة نزحت، وكان نزح ما فيها من الماء طهارة لها بإجماع السلف - رحمهم الله -. كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹، كتاب الطهارة، الباب الثالث في المياه، الفصل الأول فيما يجوز به التوضؤ، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) دیکھیے حاشیہ نمبر ۲ و ۳۔

(۵) (وبتغير أحد أوصافه) من لون أو طعم أو ريح (ينجس) الكثير ولو جاريا إجماعا، أما القليل فينجس وإن لم يتغير. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۱۸۵، باب المياه، ط: بيروت)

(۶) في الدر المختار: [فرع] البعد بين البئر والبالوعة بقدر ما لا يظهر للنجس أثر. وقال ابن عابدين: (قوله البعد إلخ) اختلف في مقدار البعد المانع من وصول نجاسة البالوعة إلى البئر، ففي رواية خمسة أذرع، وفي رواية سبعة. وقال الحلواني: المعتبر الطعم أو اللون أو الريح، فإن لم يتغير جاز وإلا لا ولو كان عشرة أذرع. وفي الخلاصة والخانية: والتعويل عليه وصححه في المحيط بحر. والحاصل أنه يختلف بحسب رخاوة الأرض وصلابتها، ومن قدره اعتبر حال أرضه. (رد المحتار مع الدر: ۱/ ۲۲۱، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الفكر - بيروت)

(۷) دیکھیے حاشیہ نمبر ۲ و ۳۔

[۱۵] نجاست کے احتمال کی وجہ سے کنواں ناپاک شمار ہوگا یا پاک؟

۵۰۴-سوال: ایک کنویں کا پانی استعمال نہیں ہوتا ہے، اور اس وجہ سے اُس میں درخت کے پتے، کپڑے اور دیگر کچڑے پڑے رہتے ہیں، جو پانی کی اوپری سطح پر تیرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اس کنویں کا پانی روزانہ دو یا تین ٹینکر نکال کر مکانات کی تعمیر میں استعمال کیا جاتا ہے، اس طرح روزانہ تقریباً دو ہزار لیٹر پانی نکالا جاتا ہے، مفتیانِ کرام سے سنا گیا ہے کہ کنویں میں اگر چھوٹی ناپاکی گر جائے، تو دو سو سے تین سو ڈول پانی نکال دینے سے کنواں اور پانی پاک ہوجائیں گے، تو کیا اس قول کے مطابق ٹینکر کے ذریعہ پانی نکالے جانے کی وجہ سے یہ کنواں پاک شمار ہوگا یا ناپاک کہا جائے گا؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

شریعت مطہرہ میں شکوک وشبہات کا کوئی اعتبار نہیں، جب تک ناپاکی کنویں میں نظر نہ آئے، اس وقت تک پانی پاک شمار ہوگا۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] کنویں میں کوّا، گر کر مر جائے اور پھول جائے، تو کتنا پانی نکالا جائے گا؟

۵۰۵-سوال: مسجد کے احاطہ میں ایک کنواں ہے، جس کے پانی کا استعمال وضو اور استنجاء وغیرہ میں ہوتا ہے، اس کنویں میں ایک کوّا، گر کر مر گیا، بدبو آنے پر دیکھا گیا، تو وہ پھولا ہوا نکلا، اب تک پھٹا نہیں تھا، تو کیا اس کنویں کو پاک کرنے کے لیے اُس کا تمام پانی نکالنا ضروری ہے؟ یا کچھ مقدار میں پانی نکال دینے سے کنواں پاک ہوجائے گا؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

کوّا کنویں میں گرنے کے بعد مر کر پھول گیا ہو یا باہر مرنے کے بعد پھولا ہوا کوا کنویں میں گرا ہو،

(۱) ولو شك في نجاسة ماء أو ثوب أو طلاق أو عتق لم يعتبر، وتمامه في الأشباه. (الدر المختار) وفي الشامية: (قوله: ولو شك إلخ) في التتارخانية: من شك في إنائه أو في ثوبه أو بدن أصابته نجاسة أو لا فهو طاهر ما لم يستيقن، وكذا الآبار والحياض والجباب الموضوعة في الطرقات ويستقي منها الصغار والكبار والمسلمون والكفار؛ وكذا ما يتخذه أهل الشرك أو الجهلة من المسلمين كالسمن والخبز والأطعمة والثياب اهـ ملخصا. (رد المحتار: ۱/۱۵۱، كتاب الطهارة، قبيل: مطلب في أبحاث الغسل، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

دونوں صورتوں میں کنویں کا پورا پانی نکالنا واجب ہے؛ لیکن اگر کنواں ایسا ہے کہ اس کا پورا پانی نکالنا مشکل ہے، تو دو ایسے دین دار آدمی، جن کو پانی کے باب میں صحیح اندازہ لگانے کی مہارت ہو، انہیں بلاکر اتنا پانی نکال دیا جائے، جتنا کنویں میں کوے کے پائے جانے کے وقت تھا، مثلاً جس وقت کوے کا مرکر پھول جانا معلوم ہوا، اُس وقت پچاس فٹ تک پانی تھا، تو اولاً کوے کو نکالنے کے بعد پچاس فٹ تک کا پانی نکالا جائے، تاہم احتیاط اسی میں ہے کہ پہلی صورت کے مطابق پورا پانی خالی کردیا جائے۔ (درمختار مع شامی: ۱/۱۵۶)[۱]
فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] کنویں میں مرکر پھولا ہوا کوّا پایا جائے، تو کتنے دِن کی نماز کا اعادہ ضروری ہے؟

۵۰۶-سوال: ایک کنویں میں مرکر پھولا ہوا کوّا پایا گیا، تو اس کنویں کے پانی سے وضوء اور غسل کرکے جو نمازیں پڑھی گئی ہیں، اُن کے دہرانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جانور مرکر پھول گیا ہے؛ اس لیے اگر اُس کے گرنے کا وقت معلوم ہو، تو اُس وقت سے، اور اگر گرنے کا وقت معلوم نہ ہو، تو تین دِن سے کنواں ناپاک سمجھا جائے گا؛ لہٰذا ان تین دِنوں کے دوران اُس پانی سے وضوء اور غسل کرکے جو نمازیں پڑھی گئی ہیں، اُن کا اعادہ ضروری ہے، نیز اُس پانی سے برتن یا کپڑے وغیرہ دھوئے گئے ہوں، تو اُن کو بھی پاک کرنا ضروری ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (إذا وقعت نجاسة)... (في بئر دون القدر الكثير)... (أو مات فيها) أو خارجها وألقي فيها ولو فأرة يابسة على المعتمد... كسقط (حيوان دموي) غير مائي لما مر (وانتفخ) أو تمعط (أو تفسخ) ولو تفسخه خارجها ثم وقع فيها (ينزح كل مائها) الذي كان فيها وقت الوقوع ذكره ابن الكمال (بعد إخراجه)... (وإن تعذر) نزح كلها؛ لكونها معينا (فبقدر ما فيها) وقت ابتداء النزح، قاله الحلبي (يؤخذ ذلك بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتى، وقيل يفتى بمائة إلى ثلثمائة وهذا أيسر، وذاك أحوط. (الدر مع الرد: ۱/۲۱۱-۲۱۵، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) "وإن وجدوا في البئر فأرة أو غيرها، ولا يدري متى وقعت، ولم تنتفخ، ولم تتفسخ، أعادوا صلاة يوم وليلة، إذا كانوا توضئوا منها، وغسلوا كل شيء أصابه ماؤها، وإن كانت قد إنتفخت، أو تفسخت، أعادوا صلاة ثلاثة أيام ولياليها، وهذا عند أبي حنيفة رحمه الله. وقالا: ليس عليهم إعادة شيء، حتى يتحققوا متى وقعت". (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر، الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن، برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/۲۵، كتاب=

[۱۸] کنویں میں کوّا مر کر پھولا ہوا پایا جائے، تو کتنا پانی نکالا جائے گا؟

۵۰۷-سوال: ہمارے گاؤں کرنج کی مسجد کے کنویں میں ایک کوّا یا اُس کا بچہ مر کر پھولا ہوا پایا گیا، اُس کے کنویں میں گرنے کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے؛ اس لیے گاؤں کے لوگوں نے موٹر کے ذریعہ تقریباً پانچ یا چھ گھنٹے تک پانی نکالا، جس سے ۴۵ رمنٹ میں ایک فٹ کے حساب سے پانی نکلا، مزید ستر ڈول پانی نکالے گئے؛ چوں کہ کنویں کی تہہ سے پانی مسلسل نکلتا رہتا ہے، اس لیے اُس کا مکمل خالی کرنا ممکن نہیں ہے، نیز کنواں بہت پرانا ہے اور اُس کی دیواریں کمزور ہیں، اس لیے بڑی موٹر کے ساتھ بڑا پائپ فٹ کر کے پانی نکالنے میں کنویں کی دیواریں ٹوٹ کر گر جانے اور کنویں کے ناقابل استعمال ہو جانے کا اندیشہ ہے، تو کیا شرعی اعتبار سے جو پانی نکالا گیا، وہ کافی ہے؟ اور کیا اِتنا پانی نکال دینے سے کنواں پاک ہو جائے گا؟ یا کسی بھی شکل میں پورا پانی نکالنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورتِ مذکورہ کا اصل حکم شرعی تو یہی ہے کہ کوّا جب مر کر پھولا ہوا پایا گیا، تو پورا پانی نکال دیا جائے؛ چوں کہ پورا پانی نکالنا مشکل ہے، تو اب پانی نکالنے سے پہلے دو ایسے نیک اور صالح آدمیوں کو بلا کر اُن سے اندازہ کرنے کو کہا جائے جنھیں پانی کے باب میں تجربہ ہو، کہ کنویں میں پانی کتنا ہوگا؟ مثلاً جانور کے نکالنے کے بعد کنویں میں بیس فٹ پانی ہے؛ لیکن پورا پانی نکالنا مشکل ہے؛ اس لیے موٹر کے ذریعہ بیس فٹ پانی نکالا

=الطهارات، باب: الماء الذي يجوز به الوضوء وما لا يجوز، فصل في البير، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت - لبنان ☆الجوهرة النيرة- أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/ ۱۹، كتاب الطهارة، الأغسال المسنونة، ط: المطبعة الخيرية☆البناية شرح الهداية- أبو محمد محمود بن أحمد ، الحنفي، بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۱/ ۳۶۱، كتاب الطهارات، فصل في البئر، حكم وقوع النجاسة في البئر، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆البحر الرائق شرح كنز الدقائق-زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۱/ ۱۳۰، قبيل التيمم، [التداوي ببول ما يؤكل لحمه]، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار: ۱/ ۲۱۸- ۲۱۹، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: بيروت☆اللباب في شرح الكتاب-عبد الغني بن طالب، الغنيمي الدمشقي الميداني الحنفي (م: ۱۲۹۸هـ): ۱/ ۲۸، قبيل باب التيمم، ت: محمد محيي الدين عبد الحميد، ط: المكتبة العلمية- بيروت☆الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۲۰، كتاب الطهارة، الباب الثالث في المياه... إلخ، الفصل الأول فيما يجوز به التوضؤ، ط: دار الفكر)

جائے، سوال میں مذکورصورت کے اعتبار سے جب پونے گھنٹے میں ایک فٹ پانی نکلا، تو بیس فٹ کے برابر پانی نکالنے کے لیے پندرہ گھنٹے تک موٹر چلا کر پانی نکالنا ہوگا، اِس صورت میں بعض فقہاء نے تین سو ڈول پانی نکالنے کو کافی قرار دیا ہے، اگر اس طرح سے پانی نکال دیا جائے، تب بھی کافی ہوگا۔ واللہ اعلم۔ (شامی: ۱/ ۱۵۶)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] اگر پانی میں بال گر جائے، تو کیا حکم ہے؟

۵۰۸-سوال: بہشتی زیور میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ بال کی جڑ ناپاک ہے، تو اگر جڑ والا بال ماءِ قلیل میں گر جائے، تو اُس کی وجہ سے پانی ناپاک شمار ہوگا یا پاک؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جو بال بہ ذاتِ خود جھڑ جاتے ہیں، اُن کی جڑیں پاک ہیں۔[۲] البتہ ایسے بال، جنہیں اکھیڑا گیا ہو اور اُن کی جڑوں میں چربی کا حصہ لگا ہوا ہو، تو وہ ناپاک ہے، اگر اِس طرح کے بال کی تری خشک نہ ہوئی ہو اور وہ تھوڑے پانی میں گر گئے ہوں، تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔

بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر بال چمڑی کے خشک حصے کے ساتھ جھڑ گئے ہوں، جن میں بال کی جڑ بھی ہوتی ہے، اگر وہ ایک ناخن کی مقدار بھی پانی میں گر جائے، تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔ (شامی: ۱/ ۱۵۲)[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (إذا وقعت نجاسة)... (في بئر دون القدر الكثير)... (أو مات فيها) أو خارجها وألقي فيها ولو فأرة يابسة على المعتمد... كسقط (حيوان دموي) غير مائي لما مر (وانتفخ) أو تمعط (أو تفسخ) ولو تفسخه خارجها ثم وقع فيها (ينزح كل مائها) الذي كان فيها وقت الوقوع ذكره ابن الكمال (بعد إخراجه)... (وإن تعذر) نزح كلها؛ لكونها معينا (فبقدر ما فيها) وقت ابتداء النزح، قاله الحلبي (يؤخذ ذلك بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتى، وقيل يفتى بمائة إلى ثلثمائة وهذا أيسر، وذاك أحوط. (الدر مع الرد: ۱/ ۲۱۱ - ۲۱۵، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) (وشعر الإنسان) غير المنتوف..... (ودم سمك طاهر). [الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۲۰۷]

[۳] ويفسد الماء بوقوع قدر الظفر من جلده لا بالظفر. (المصدر السابق) ــــــ وقال ابن عابدين: (قوله غير المنتوف) أما المنتوف فنجس. بحر، والمراد رءوسه التي فيها الدسومة. أقول: وعليه فما يبقى بين أسنان المشط ينجس الماء القليل إذا بل فيه وقت التسريح؛ لكن يؤخذ من المسألة الآتية كما قال أن ما خرج من الجلد مع الشعر إن لم يبلغ مقدار الظفر لا يفسد الماء، تأمل. (رد المحتار: ۱/ ۲۰۷، كتاب الطهارة، باب المياه، ط: دار الفكر)

[۲۰] کنواں سے بلی دو رات اور ایک دِن کے بعد زندہ نکلے، تو کتنا پانی نکالا جائے؟

۵۰۹-سوال: کنویں میں بلی گر گئی اور اس میں دو رات اور ایک دِن تک پڑی رہی، نکالنے کی کوشش کی گئی، تو وہ زندہ نکل آئی، اب ظاہری بات ہے کہ دو رات اور ایک دِن تک جب اندر رہی، تو اُس نے اُس میں ضرور پیشاب و پاخانہ کیا ہوگا، تو اب کنویں سے کتنا پانی نکالنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب اس بات کا یقین ہے کہ بلی نے کنویں میں پیشاب و پاخانہ کیا ہے، تو کنویں کا پورا پانی نکالنا ضروری ہے، اگر صرف پیشاب کیا ہو، تو معاف ہے؛ لیکن پھر بھی پورا پانی نکالنا بہتر ہے۔[۱]

---

[۱] (إذا وقعت نجاسة)... (في بئر دون القدر الكثير)... (أو مات فيها) أو خارجها وألقي فيها ولو فأرة يابسة على المعتمد... كسقط (حيوان دموي) غير مائي لما مر (وانتفخ) أو تمعط (أو تفسخ) ولو تفسخه خارجها ثم وقع فيها (ينزح كل مائها) الذي كان فيها وقت الوقوع ذكره ابن الكمال (بعد إخراجه)... (وإن تعذر) نزح كلها؛ لكونها معينا (فبقدر ما فيها) وقت ابتداء النزح، قاله الحلبي (يؤخذ ذلك بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتى، وقيل يفتى بمائة إلى ثلثمائة وهذا أيسر، وذاك أحوط. (الدر مع الرد: ۱/۲۱۱-۲۱۵، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

بلی کے پیشاب کی نجاست کے سلسلے میں روایات مختلف ہیں، اکثر روایات سے اس کی نجاست کا پتہ چلتا ہے، البتہ بعض روایات میں ضرورت کی بناء پر اوانی مائعات (سیال اشیاء کے برتنوں) کے علاوہ (مثلاً: کپڑوں کے حق) میں اسے طاہر قرار دیا گیا ہے، علت بیان کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ عموماً برتنوں کے ڈھانکنے کا رواج ہے؛ اس لیے اس میں ضرورت متحقق نہیں ہے، جب کہ دوسری چیزوں میں ایسا نہیں ہے، لہٰذا ان میں ضرورت کی بناء پر اسے طاہر قرار دیا جائے گا۔ اس علت کی بناء پر کنویں کو کپڑوں کے ساتھ لاحق کیا جانا چاہیے، جیسا کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے کیا ہے، تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

واختلف التصحيح في بول الهرة، وقال الشيخ زين في قاعدة المشقة تجلب التيسير من الأشباه: الفتوى على أن بول الهرة عفو في غير أواني الماء، وهو قول الفقيه أبي جعفر، قال في الفتح: وهو حسن لعادة تخمير الأواني فلا ضرورة في ذلك بخلاف الثياب، وهو مروي عن محمد، فأنه قال في السنور يعتاد البول على الفراش بوله طاهر للضرورة وعموم البلوى، قال في الفتح: والحق صحة هذه الرواية اهـ. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ)، ص: ۱۵۴ - ۱۵۵، كتاب الطهارة، باب الأنجاس والطهارة عنها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

في الدر المختار: (ولا نزح) في بول فأرة في الأصح فيض. وقال ابن عابدين: (قوله في بول فأرة في الأصح) وسيذكر في الأنجاس أن عليه الفتوى، وأن خرأها لا يفسد ما لم يظهر أثره؛ وأن بول السنور عفو في غير أواني=

اور اگر یقین نہ ہو کہ اُس نے پیشاب کیا ہے؛ بل کہ صرف احتمال ہے، تو اُس شک کا اعتبار نہیں، اس صورت میں صرف ساٹھ ڈول پانی نکال لیا جائے۔ (۲)

=الماء وعليه الفتوى. اهـ ـــــــــــ أقول: وفي الخانية أن بول الهرة والفأرة وخرأهما نجس في أظهر الروايات يفسد الماء والثوب. اهـ ولعلهم رجحوا القول بالعفو للضرورة.(رد المحتار على الدر المختار:١/ ٢٢٠،فصل في البئر،فرع:وجد في ثوبه منيا أو بولا أو دما،ط:بيروت)

وقال ابن عابدين:اعلم أنه ذكر في الخانية أن بول الهرة والفأرة وخرأها نجس في أظهر الروايات يفسد الماء والثوب. ولو طحن بعر الفأرة مع الحنطة ولم يظهر أثره يعفى عنه للضرورة. وفي الخلاصة: إذا بالت الهرة في الإناء أو على الثوب تنجس، وكذا بول الفأرة، وقال الفقيه أبو جعفر: ينجس الإناء دون الثوب. اهـ. قال في الفتح: وهو حسن لعادة تخمير الأواني، وبول الفأرة في رواية لا بأس به، والمشايخ على أنه نجس لخفة الضرورة بخلاف خرئها، فإن فيه ضرورة في الحنطة. اهـ ـــــــــــ والحاصل أن ظاهر الرواية نجاسة الكل. لكن الضرورة متحققة في بول الهرة في غير المائعات كالثياب، وكذا في خرء الفأرة في نحو الحنطة دون الثياب والمائعات. وأما بول الفأرة فالضرورة فيه غير متحققة إلا على تلك الرواية المارة التي ذكر الشارح أن عليها الفتوى، لكن عبارة التتارخانية: بول الفأرة وخرؤها نجس، وقيل بولها معفو عنه، وعليه الفتوى. وفي الحجة الصحيح أنه نجس. اهـ. ولفظ الفتوى وإن كان آكد من لفظ الصحيح إلا أن القول الثاني هنا تأيد بكونه ظاهر الرواية فافهم، لكن تقدم في فصل البئر أن الأصح أنه لا ينجسه وقد يقال: إن الضرورة في البئر متحققة، بخلاف الأواني؛ لأنها تخمر كما مر فتدبر.(رد المحتار على الدر المختار:١/ ٣١٩،باب الأنجاس،ط:بيروت)

مزید دیکھیے:البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م:٩٧٠هـ):١/ ٢٣١ - ٢٣٢،باب الأنجاس، التطهير بالدهن، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد، المدعو بشيخي زاده،يعرف بـ'داماد أفندي'(م:١٠٧٨هـ):١/ ٦٢،باب الأنجاس،ط:دار إحياء التراث العربي)

(۲)ولو شك في نجاسة ماء أو ثوب أو طلاق أو عتق لم يعتبر، وتمامه في الأشباه.(الدر المختار)وفي الشامية: (قوله:ولو شك إلخ)في التتارخانية:من شك في إنائه أو في ثوبه أو بدن أصابته نجاسة أو لا فهو طاهر ما لم يستيقن، وكذا الآبار والحياض والجباب الموضوعة في الطرقات ويستقي منها الصغار والكبار والمسلمون والكفار؛ وكذا ما يتخذه أهل الشرك أو الجهلة من المسلمين كالسمن والخبز والأطعمة والثياب اهـ ملخصا. (رد المحتار: ١/ ١٥١، كتاب الطهارة،قبيل:مطلب في أبحاث الغسل،ط:دار الكتب العلمية-بيروت)

=بلی کے کنویں میں داخل ہو کر زندہ نکل جانے کی صورت میں استحبابا ساٹھ ڈول پانی نکالنے کی کوئی عبارت احقر کو نہیں ملی، ساٹھ ڈول تک نکالنے کا حکم اس صورت میں ہے، جب کہ وہ کنویں میں مرجائے اور فوراً سے نکال لیا جائے۔(قال: "فإن ماتت فيها حمامة أو نحوها كالدجاجة والسنور نزح منها ما بين أربعين دلوا إلى ستين وفي الجامع الصغير أربعون أو خمسون" وهو الأظهر. الهداية في شرح بداية المبتدي:١/ ٢٣،فصل في البئر،ت: طلال يوسف،ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)البتہ چالیس ڈول نکالنے کے سلسلے میں یہ عبارت صریح ہے: =

اگر پورا پانی نکالنے کی ضرورت ہو؛ لیکن کنویں کا چشمہ بڑا ہو اور پورا پانی نکالنا ممکن نہ ہو، تو اندازہ لگا کر بھی نکالا جاسکتا ہے، جس وقت بلی گری، اُس وقت جتنے فٹ پانی تھا، اُسی قدر پانی موٹر کے ذریعہ نکال لیا جائے، مثلاً بلی کے گرنے کے وقت دس فٹ پانی تھا، اور موٹر کے ذریعہ ایک گھنٹے میں ایک فٹ پانی نکلتا ہے، تو دس گھنٹے تک موٹر کے ذریعہ پانی نکال لیا جائے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] کنواں نجس اشیاء کے گرنے سے ہی ناپاک ہوگا

۵۱۰-سوال: ہماری بستی کی مسجد کا ایک چھوٹا سا کنواں ہے، جس کی گہرائی ایک فٹ اور چوڑائی تین فٹ ہے، کنویں کا تعمیری کام جاری ہے، جس کا ملبہ (سیمنٹ اور اینٹ کے ٹکڑے وغیرہ) کنویں کے پانی میں گرتا ہے، اور اسی پانی سے وضو اور غسل کیا جاتا ہے اور کھانا بھی پکایا جاتا ہے، کنویں میں چشمہ کا پانی ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ کنویں سے چشمہ کا پانی نکلتا ہے اور چشمہ کا پانی پاک ہے؛ لہٰذا کنویں کا پانی پاک ہوگا، جب کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ کنویں سے پانی نکلتا ہو یا نہ نکلتا ہو، کنواں صاف کرنے کے بعد ہی اس کا پانی غسل، وضو اور کھانا پکانے کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ کام کرنے والے مزدور احتیاط سے کام نہیں لیتے ہیں، تفصیلی جواب مطلوب ہے۔

الجواب حامداومصليا:

کنواں چھوٹا ہو یا بڑا، اس کا پانی پاک ہے، اینٹ، ریت اور سیمنٹ وغیرہ پاک ہے، لہٰذا ان کے

=إذا وقع في البئر فأرة أو عصفور أو دجاجة أو سنور أو شاة وأخرجت منها حية لا ينجس الماء. ولا يجب نزح شيء منه، وهذا استحسان . . . ولكن مع هذا إن كان الواقع فأرة يستحب لهم أن ينزحوا عشرين دلواً. وإن كان الواقع سنوراً أو دجاجة مخلاة يستحب لهم أن ينزحوا أربعين دلواً؛ لأن سؤر هذه الحيوانات مكروه على ما يأتي بعد هذا إن شاء الله تعالى. (المحيط البرهاني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:٦١٦هـ): ١/١٠١، كتاب الطهارات، الفصل الرابع في المياه التي يجوز التوضؤ بها، والتي لا يجوز التوضؤ بها، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(والثاني ما يستحب فيه نزح الماء) إذا وقع في البئر فأرة يستحب نزح عشرين دلوا، وفي السنور والدجاجة المخلاة نزح أربعين؛ لأن سؤر هذه الحيوانات مكروه، والغالب أن الماء يصيب فم الواقع حتى لو تيقنا أن الماء لم يصب فم هذه الحيوانات لا ينزح شيء من الماء. (الفتاوى الهندية: ١/٢١، كتاب الطهارة، الباب الثالث في المياه، الفصل الثاني فيما لا يجوز به التوضؤ، ط: دار الفكر)

(۳) ملاحظہ کیجیے، حاشیہ نمبر: ۱۔

کنویں میں گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا۔

لیکن اگر ناپاکی گرجائے،[۱] یا کافر اس میں غوطہ لگائے، تو پانی ناپاک شمار ہوگا۔[۲]

جب تک کنویں کے پانی کے ناپاک ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہوگی، وضوء اور غسل کرنا اور اس کا پانی دیگر ضروریات میں استعمال کرنا جائز ہوگا۔ (فتاوی عالمگیری: ۱/ ۱۴، طحطاوی: ۱/ ۲۲، خلاصۃ الفتاوی: ۱/ ۱۱)[۳] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] کتا اگر حوض سے پانی پی لے، تو کیا حکم ہے؟

۵۱۱-سوال: کتے نے حوض سے پانی پی لیا، تو وہ پانی پاک ہے یا ناپاک؟ اگر پانی ناپاک ہو، تو حوض میں سے کس قدر پانی نکالنے سے وہ پاک ہوجائے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

حوض اگر دہ دردہ ہو، یعنی لمبائی اور چوڑائی میں دوسوپچیس (۱۵×۱۵=۲۲۵) فٹ یا اس سے زائد ہو، جسے فقہاء کثیر لکھتے ہیں، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس میں ناپاکی گرجائے، تو اس سے پانی ناپاک نہیں ہوگا، جب تک کہ پانی میں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہوجائے، اگر پانی میں نجاست کا اثر ظاہر ہوگیا، تو پانی ناپاک

---

[۱] (إذا وقعت نجاسة)... (في بئر دون القدر الكثير)... (أو مات فيها)... (حيوان دموي) غير مائي لما مر (وانتفخ) أو تمعط (أو تفسخ) ولو تفسخه خارجها ثم وقع فيها (ينزح كل مائها). [الدر مع الرد: ۱/ ۲۱۱- ۲۱۳، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) اگر اس کو غسل کروادیا جائے، پھر اسے کنویں میں اتارا جائے، تو ظاہر ہے کہ اب اس کے بدن پر کوئی نجاست نہیں ہے، اس لیے کنواں پاک ہوگا:

وروي عن أبي حنيفة أنه قال في الكافر إذا وقع في البئر: ينزح ماء البئر كله؛ لأن بدنه لا يخلو من نجاسة حقيقية أو حكمية، حتى لو تيقنا بطهارته بأن اغتسل، ثم وقع في البئر من ساعته لا ينزح منها شيء. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۱/ ۷۴، فصل في بيان المقدار الذي يصير به المحل نجسا، ط: دار الكتب العلمية)

(۳) قال: ومن شك في الحدث فهو على وضوئه، وإن كان محدثا فشك في الوضوء فهو على حدثه؛ لأن الشك لا يعارض اليقين، وما تيقن به لا يرتفع بالشك. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۱/ ۸۶، كتاب الصلاة، باب الوضوء والغسل، ط: دار المعرفة-بيروت)

ہوجائے گا۔[1] اس لیے حوض کا پانی (جس سے کتے نے منہ ڈال کر پی لیا ہے) ناپاک نہیں ہوگا۔

ہاں اگر پانی کی وہ مقدار نہ ہو، جو اوپر تحریر کی گئی ہے، مثلاً ڈول، برتن یا لوٹا وغیرہ ہو اور اس میں کتا منہ ڈال دے، تو پانی اور برتن دونوں ناپاک ہوجائیں گے، پانی کو پھینک دیا جائے اور برتن تین بار دھویا جائے۔ (شامی، عالمگیری، وغیرہ)[2] اگر مٹی ہو تو مٹی سے مانجھنا اور پھر پانی سے دھونا سنت ہے۔ (حدیث)

---

[1] جس جگہ نجاست گری ہے (موضع نجاست) اس کا کیا حکم ہے؟ آیا وہ پاک ہے یا ناپاک؟ کیا نجاست کے مرئی وغیر مرئی ہونے کی وجہ سے بھی کوئی فرق پڑے گا؟ اس سلسلے کی نفیس اور عمدہ بحث کے لیے ملاحظہ فرمائیں درج ذیل عبارت:

(وكذا) -أي رفع الحدث- يجوز (براكد) كثير (كذلك) أي وقع فيه نجس لم ير أثره ولو في موضع وقوع المرئية، به يفتى بحر. ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله: لم ير أثره) أي من طعم أو لون أو ريح، وهذا القيد لا بد منه .... (قوله: به يفتى) أي بعدم الفرق بين المرئية وغيرها، وعزاه في البحر إلى شرح المنية عن النصاب، ... على أنه يشكل عليه ما في شرح المنية للحلبي عن الخلاصة أنه في المرئية ينجس موضع الوقوع بالإجماع. وأما في غيرها، فقيل كذلك: وقيل لا. اهـ. ومثله في الحلية، وكذا البدائع، لكن عبر بظاهر الرواية بدل الإجماع قال: ومعناه أن يترك من موضع النجاسة قدر الحوض الصغير ثم يتوضأ اهـ. وقيل يتحرى، ... قال في الحلية: قلت هو الأصح اهـ وكذا جزم في الخانية بتنجس موضع المرئية بلا نقل خلاف، ثم نقل القولين في غير المرئية، وصحح في المبسوط أولهما، وصحح في البدائع وغيرها ثانيهما نعم. قال في الخزائن: والفتوى على عدم التنجس مطلقا إلا بالتغير بلا فرق بين المرئية وغيرها لعموم البلوى. وقال في الفتح: وعن أبي يوسف أنه كالجاري لا يتنجس إلا بالتغير، وهو الذي ينبغي تصحيحه، فينبغي عدم الفرق بين المرئية وغيرها؛ لأن الدليل إنما يقتضي عند الكثرة عدم التنجس إلا بالتغير من غير فصل. اهـ. فقد ظهر أن ما ذكره الشارح مبني على ظاهر هذه الرواية عن أبي يوسف حيث جعله كالجاري، وقدمنا عنه أنه اعتبر في الجاري ظهور الأثر مطلقا، وأنه ظاهر المتون وكذا قال في الكنز هنا، وهو كالجاري، ومثله في الملتقى. وظاهره اختيار هذه الرواية؛ فلذا اختارها في الفتح واستحسنها في الحلية لموافقتها لما مر عنه في الجاري. قال: ويشهد له ما في سنن ابن ماجه عن «جابر - رضي الله عنه - قال: انتهيت إلى غدير فإذا فيه حمار ميت فكففنا عنه حتى انتهى إلينا رسول الله - صلى الله عليه وسلم - فقال: إن الماء لا ينجسه شيء فاستقينا وأروينا وحملنا» " اهـ وهذا وارد على نقل الإجماع السابق، والله أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۹۰- ۱۹۱، كتاب الطهارة، باب المياه، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

مزید دیکھیے: البحر الرائق شرح كنز الدقائق- زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۱/ ۱۳۴- ۱۳۵، سؤر الكلب والخنزير وسباع البهائم، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ البناية شرح الهداية- بدر الدين العينى (م: ۸۵۵هـ): ۱/ ۳۷۵، الوضوء بالماء الذي وقعت فيه نجاسة. و ۱/ ۴۷۰- ۴۷۴، فصل في الأسآر وغيرها، سؤر الكلب، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) عن عطاء، عن أبي هريرة «أنه كان إذا ولغ الكلب في الإناء أهراقه وغسله ثلاث مرات». (سنن الدارقطني- أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد، ابن دينار البغدادي الدارقطني (م: ۳۸۵هـ): ۱/ ۱۱۰، رقم الحديث: ۱۹۷، كتاب =

[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] نابالغ کافر بچہ یا بالغ کافر مرد غسل کے لیے کنویں میں اترے، تو کیا حکم ہے؟

۵۱۲-سوال: مدرسہ میں پانی کی قلت ہے، جس کی وجہ سے کچھ طلبہ غسل کے لیے کنویں پر جاتے ہیں، سنا گیا ہے کہ اُس میں چرواہے بھی نہانے کے لیے اُترتے ہیں۔ (نہانے والے چرواہے نابالغ بچے ہوتے ہیں) لیکن کسی نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے، تو اُن کے نہانے کی وجہ سے طلبہ کا غسل صحیح ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح اگر اُس میں بالغ غیر مسلم غسل کرے، تو کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً

کافر- نابالغ ہو یا بالغ- غسل کے لیے کنویں میں داخل ہو، تو کنواں ناپاک ہو جائے گا؛ کیوں کہ کافر کا بدن عموماً نجاست سے پاک نہیں ہوتا۔[۲]

=الطهارة، باب ولوغ الكلب في الإناء، ت: شعيب الارنؤوط، حسن عبد المنعم شلبي، عبد اللطيف حرز الله، أحمد برهوم، ط: مؤسسة الرسالة- بيروت)

(و) سؤر (خنزير وكلب وسباع بهائم... نجس) مغلظ. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۲۲۳، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: بيروت) ـــــ أما القليل فينجس وإن لم يتغير. (المصدر السابق: ۱/ ۱۸۵، كتاب الطهارة، باب المياه، ط: بيروت) ـــــ ويغسل الإناء من ولوغ الكلب ثلاثا، كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۴، كتاب الطهارة، الباب الثالث في المياه، الفصل الثاني فيما لا يجوز به التوضؤ، ط: بيروت* الهداية في شرح البداية: ۱/ ۲۶، كتاب الطهارات، باب: الماء الذي يجوز به الوضوء وما لا يجوز، فصل في الأسآر وغيرها، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

[۱] عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: طهور إناء أحدكم إذا ولغ فيه الكلب، أن يغسله سبع مرات أولاهن بالتراب. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۳۷، رقم الحديث: ۹۱- (۲۷۹)، كتاب الطهارة، باب حكم ولوغ الكلب، ط: مختار اينڈ كمپني- ديوبند)

(۲) حضرت مفتی محمود حسنؒ نے اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

اگر وہ (کافر) خوب غسل کر کے کنویں میں داخل ہوا ہے، تب تو پانی نکالنے کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر غسل کر کے اور پاک ہو کر داخل نہیں ہوا ہے، اور اس کے بدن پر کسی نجاست کا ہونا متعین نہیں، تو احتیاطاً کنویں کا تمام پانی نکالا جائے، اور اگر اس کے بدن پر نجاست تھی، تو تمام پانی کا نکالنا واجب ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/ ۱۳۶، سوال نمبر: ۱۹۰۰، کیا کنویں میں غیر مسلم کے اترنے سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے؟، ط: اشرفی بک ڈپو- دیوبند)

نقل في الذخيرة عن كتاب الصلاة للحسن أن الكافر إذا وقع في البئر وهو حي نزح الماء. وفي البدائع أنه رواية=

شریعتِ مطہرہ میں احکام کا دار و مدار یقین پر ہے، شکوک وشبہات پر نہیں؛ اس لیے جب تک دین دار لوگ اُن غیر مسلمین کو کنویں میں غسل کرتے ہوئے نہ دیکھیں، اُس کنویں کے ناپاک ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا اور اس سے طہارت حاصل کرنا جائز ہوگا۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] اگر کوئی غیر مسلم شراب پی کر کنویں میں گر جائے؟

۵۱۳-سوال: ایک غیر مسلم شراب پینے کے بعد کنویں میں گر گیا تو اس کنویں کا پانی ناپاک ہوا یا نہیں؟ اس کنویں سے غیر مسلم چار پانچ دن سے پانی بھر رہے ہیں، تقریباً ایک ہزار سے زیادہ ڈول پانی ان لوگوں نے بھرا ہوگا، تو اس سے کنواں پاک ہوا یا نہیں؟ المستفتی: اسماعیل پانچ بھایا لوہاروی

الجواب حامداً ومصلیاً:

کافر اگر کنویں میں گر جائے، تو اگرچہ اسے زندہ نکالا جائے، پھر بھی کنویں کا پورا پانی نکالا جائے گا؛ اس لیے کہ عموماً اس کا جسم ناپاک ہوتا ہے:

نقل في الذخيرة عن كتاب الصلاة للحسن أن الكافر إذا وقع في البئر وهو حي نزح الماء. وفي البدائع أنه رواية عن الإمام؛ لأنه لا يخلو من نجاسة حقيقية أو حكمية. [شامي: ۱/۱۴۷] (۲)

ایک ہی وقت میں پورا پانی نکالنا ضروری نہیں ہے، رفتہ رفتہ نکالا جائے، تب بھی کنواں پاک ہو جائے

=عن الإمام؛ لأنه لا يخلو من نجاسة حقيقية أو حكمية، حتى لو اغتسل فوقع فيها من ساعته لا ينزح منها شيء. أقول: ولعل نزحها للاحتياط تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۲۱۴، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۱/۷۴، كتاب الطهارة، فصل في بيان المقدار الذي يصير به المحل نجسا، ط: دار الكتب العلمية)

(۱) ولو شك في نجاسة ماء أو ثوب أو طلاق أو عتق لم يعتبر، وتمامه في الأشباه. (الدر المختار) وفي الشامية: (قوله: ولو شك إلخ) في التتارخانية: من شك في إنائه أو في ثوبه أو بدن أصابته نجاسة أو لا فهو طاهر ما لم يستيقن، وكذا الآبار والحياض والجباب الموضوعة في الطرقات ويستقي منها الصغار والكبار والمسلمون والكفار؛ وكذا ما يتخذه أهل الشرك أو الجهلة من المسلمين كالسمن والخبز والأطعمة والثياب اهـ ملخصا. (رد المحتار: ۱/۱۵۱، كتاب الطهارة، قبيل: مطلب في أبحاث الغسل، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) رد المحتار على الدر المختار: ۱/۲۱۴، فصل في البئر، ط: بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۱/۷۴، كتاب الطهارة، فصل في بيان المقدار الذي يصير به المحل نجسا، ط: دار الكتب العلمية-بيروت.

گا؛ اس لیے اندازہ لگایا جائے کہ غیر مسلم کے کنویں میں گرتے وقت جتنا پانی تھا، وہ نکل گیا یا نہیں؟ مثلاً اس میں چار ہزار ڈول پانی تھا، اور ابھی تک صرف ایک ہزار ڈول پانی نکالا جا سکا ہے، تو مزید تین ہزار ڈول نکالنا ضروری ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] کنویں میں جب کوئی مسلمان عورت گر کر مرجائے، تو کنواں کیسے پاک ہوگا؟

۵۱۴-سوال: تقریباً دو مہینہ پہلے ہمارے گاؤں کے کنویں میں ایک مسلمان عورت گرگئی تھی، گرنے کے ایک گھنٹے بعد اسے بہ حالت مردہ باہر نکالا گیا، پھر دو دن تک مشین کے ذریعہ پانی نکالا جاتا رہا، اندازاً آدھا پانی نکال دیا گیا، اب جو پانی کنویں میں باقی ہے، مشین اُس کو مکمل نہیں نکال سکتا؛ کیوں کہ پائپ کا وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔

اس واقعہ کے بعد سے اب تک جانوروں کو پلانے کے لیے اسی کنویں سے پانی نکالا جاتا رہا ہے، ادھر پندرہ بیس دنوں سے لوگ اُس پانی سے کپڑے بھی دھو رہے ہیں اور پینے میں بھی استعمال کررہے ہیں، تو کیا اس سے کپڑے دھونا اور پینا جائز ہے؟ اگر اُس پانی کے ذریعہ دھوئے ہوئے کپڑے پہن کر لوگوں نے نماز ادا کی، تو نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر کنواں دہ در دہ نہ ہو، تو عورت کے گر کر مرجانے کی وجہ سے پانی ناپاک ہوجائے گا، انتقال کے وقت جس قدر پانی کنویں میں موجود تھا، اُسے نکال دیا جائے تو کنواں پاک ہوجائے گا۔ (۲)

---

(۱) (إذا وقعت نجاسة)... (في بئر دون القدر الكثير)... (أو مات فيها) أو خارجها وألقي فيها ولو فأرة يابسة على المعتمد... كسقط (حيوان دموي) غير مائي لما مر (وانتفخ) أو تمعط (أو تفسخ) ولو تفسخه خارجها ثم وقع فيها (ينزح كل مائها) الذي كان فيها وقت الوقوع ذكره ابن الكمال (بعد إخراجه)... (وإن تعذر) نزح كلها؛ لكونها معينا (فبقدر ما فيها) وقت ابتداء النزح، قاله الحلبي (يؤخذ ذلك بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتى، وقيل يفتى بمائة إلى ثلثمائة وهذا أيسر، وذاك أحوط. (الدر مع الرد: ۱/ ۲۱۱-۲۱۵، كتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) (إذا وقعت نجاسة... في بئر دون القدر الكثير) على ما مر، ولا عبرة للعمق على المعتمد (أو مات فيها) أو خارجها وألقي فيها... إلا الشهيد النظيف والمسلم المغسول... الخ. (الدر المختار) قال ابن عابدين: (قوله والمسلم المغسول) أما قبل غسله فنصوا على أنه يفسد الماء القليل ولا تصح صلاة حامله، وبذلك استدل في=

لگاتار (مسلسل) پانی نکالنا ضروری نہیں ہے، دو دن تک مسلسل پانی نکالا، پھر بعد میں پندرہ دن تک جانوروں کو پلانے کے لیے پانی نکلتا رہا، اگر یقین ہے کہ جتنا پانی کنویں میں تھا، سب نکل گیا ہے، تو اُس پانی سے کپڑے دھونا اور وضوء وغسل کرنا سب جائز ہے: لا یشترط التوالي، وهو المختار، کما في البحر والقهستاني. (شامي: ۱/۱۹۶)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] غیر مسلم عورت کنویں میں گر کر زندہ نکل آئے، تو کیا حکم ہے؟

۵۱۵-سوال: میرے گاؤں کے کنویں میں ۲۱/۴/۱۹۷۳ء کو، گیارہ بجے بھیلنی (ایک غیر مسلم قوم کی عورت)[۲] گر گئی تھی، گرنے کے بعد اُس نے پانی میں دو غوطے کھائے اور تیسرے غوطہ میں اُس کے ہاتھ میں پائپ آ گیا، جسے پکڑ کر وہ زندہ حالت میں باہر نکل گئی، تو اُس بھیلنی کے گرنے سے پانی پاک رہا یا ناپاک؟ اگر پانی ناپاک ہوا ہے، تو اُسے کتنی مقدار میں نکالنا ضروری ہے؟ مذکور کنویں سے جانوروں کے پلانے کے لیے پانی نکالتے ہیں، تو اس طرح پانی نکالنے سے کنواں پاک ہو جائے گا یا نہیں؟ اس پانی سے کپڑے دھونا یا پینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیا

بھیلنی کے کنویں میں گرنے سے پانی ناپاک ہو گیا۔ (اس لیے کہ عموماً اس کا جسم ناپاک رہتا ہے۔) واتفقوا علی أن الکافر لا یطهر بالغسل. (شامی: ۱/۱۹۵)[۳] علماء نے لکھا ہے: وأما الکافر فینجسها مطلقا. (الدر المختار)[۴]

= المحیط علی أن نجاسة المیت نجاسة خبث؛ لأنه حیوان دموي فینجس بالموت کغیره من الحیوانات لا نجاسة حدث، وصححه في الکافي، ونسبه في البدائع إلی عامة المشایخ کما في جنائز البحر. (رد المحتار علی الدر المختار: ۱/۲۱۱، کتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الکتب العلمیة-بیروت)

(۱) رد المحتار: ۱/۲۱۳، کتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الکتب العلمیة-بیروت.

(۲) بھیلنی تانیث بھیل: (ہ-ا-مذ) ہندوستان کی ایک قدیم نسل کے لوگ، جو راجپوتانہ کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ (فیروز اللغات: ۲۴۳، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹیڈ-لاہور)

(۳) رد المحتار علی الدر المختار: ۱/۲۱۲، کتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الکتب العلمیة-بیروت.

(۴) الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۲۱۱، کتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الکتب العلمیة-بیروت.

اب حکم یہ ہے کہ جب تک پورا پانی نکل نہ جائے، اُسے کسی بھی کام میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ (۱)
فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) تقدم التخریج عن [الدر مع الرد: ۱/۲۱۱-۲۱۴، کتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: بيروت)

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ
اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا
بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

(۴-النساء:۴۳)

باب التیمم

[تیمم کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب التیمم

[تیمم کا بیان]

[۱] جو شخص پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو اس کا تیمم کرنا

۵۱۶-سوال: ایک شخص کے پورے پاؤں میں سیمنٹ کا پٹا بندھا ہوا تھا، چار پائی سے نیچے اترنے اور پانی استعمال کرنے سے ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا تھا، چناں چہ اس نے ڈاکٹر کے کہنے کی وجہ سے صرف تیمم کر کے ایک مہینہ تک نماز پڑھی، غسل کی جگہ بھی تیمم کیا، قبلہ رخ ہونے میں بھی تکلیف ہوتی تھی، اس لیے مجبوراً دوسری طرف رخ کر کے اشارے سے نماز پڑھی۔

اب وہ آدمی تندرست ہو گیا ہے، اور عذر کی حالت میں تیمم سے غیر قبلہ کی جانب پڑھی ہوئی ایک مہینے کی نمازوں کو لوٹانا چاہتا ہے، تو اس سلسلے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ تفصیلی جواب دیجیے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر چار پائی پر بیٹھ کر وضو کر سکتا تھا، یا پٹی پر مسح کی قدرت تھی اور دوسرے اعضاء وضو کو دھونا ممکن تھا، اس کے باوجود اس نے صرف تیمم کر کے نماز ادا کی ہے، تو یہ اس کے لیے جائز نہیں تھا، ایسی صورت میں نماز کا اعادہ ضروری ہے۔[1] اگر وضو کرنے پر بالکل قدرت نہ ہو، تو تیمم کر کے نماز پڑھنا جائز ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں، اسی طرح غسل کی حالت میں تیمم کر کے نماز پڑھ لی، تب بھی اعادہ کی ضرورت نہیں، اعادہ کر لے، تو کوئی

---

(۱) وإذا كان بدن الجنب جريحاً أو أعضاء المحدث، فإنه يتيمم ولا يستعمل الماء فيما كان صحيحا، وإن كان على العكس فإنه يغسل، والمسح على الجراحة إن أمكنه أو فوق الخرقة إن كان المسح يضره، ولا يتيمم، وهو قول علمائنا. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني -أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مازة البخاري الحنفي (م: ٦١٦ھ): ۱/ ۱۴۷-۱۴۸، كتاب الطهارة، الفصل الخامس في التيمم، ت: عبدالكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

حرج بھی نہیں ہے۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] کیا پتھر پر تیمم کر سکتے ہیں

۵۱۷-سوال: پتھر پر تیمم کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اس کی دلیل کیا ہے؟ تحریر فرمائیں۔

الجواب حامداومصلیا:

پتھر پر تیمم کرنا جائز ہے، قرآن کریم میں ہے: فتیمموا صعیدا طیبا۔ [۲] بنیاد، کلمہ ''صعید'' ہے، جس کا معنی ہے: وجه الأرض. یعنی زمین کا وہ حصہ، جس پر اگنے کی صلاحیت ہو، مٹی ہو یا پتھر: قلنا: الصعید وجه الأرض ترابا کان أو غیره. وقال الزجاج: لا اعلم اختلافا بین أهل اللغة فیه. (کبیری: ۴۷) [۳]

---

(۱) ثم اختلف مشایخنا في حد الکثرة: فمنهم من اعتبر الکثرة من حیث عدد الأعضاء في الکثرة في نفس العضو، بیانه: إذا کان برأسه ووجهه وبدنه جراحة والرجل صحیح، فإنه یتیمم، سواء کان الأکثر من الأعضاء الجرحة جریحاً أو أقله، ومنهم من اعتبر الکثرة في نفس العضو، فقال: إن کان الأکثر من کل عضو من أعضاء الوضوء جریحاً کان کثیر أبیح له التیمم. (المصدر السابق: ۱/ ۱۳۸)

(۲) ۴-النساء: ۴۳☆و ۵-المائدة: ۶.

[۳] والأصل فیه قوله تعالی: فتیمموا صعیدا طیبا. فقال من شرط التراب والرمل أو التراب خاصة المراد بالصعید التراب أو الرمل، وبالطیب المنبت نقلا عن ابن عباس. وقلنا: الصعید وجه الأرض ترابا کان أو غیره. وقال الزجاج: لا أعلم اختلافا بین أهل اللغة فیه. وأما الطیب فلفظ مشترك یستعمل بمعنی المنبت، وبمعنی الحلال، وبمعنی الطاهر، وقد أرید به الطاهر إجماعا، فلا یراد غیره، لأن المشترك لا عموم له. (غنیة المستملي في شرح منیة المصلي، المعروف بـالحلبي الکبیري-إبراهیم بن محمد بن إبراهیم الحَلَبي الحنفي (م: ۹۵۶ھ) ص: ۶۷، فصل في التیمم، ط: دار الکتاب-دیوبند)

والصعید في کلام العرب علی وجوه: فالتراب الذی علی وجه الأرض یسمی صعیدا، ووجه الأرض یسمی صعیدا، والطریق یسمی صعیدا، وقد قال بعض الفقهاء: إن الصعید وجه الأرض سواء کان علیه التراب أو لم یکن ویری التیمم بوجه الصفاة الملساء جائزا وان لم یکن علیها تراب إذ یمسح بها المتیمم. (الزاهر في غریب ألفاظ الشافعي - محمد بن أحمد بن الأزهري الهروي، أبو منصور (م: ۳۷۰ھ)، ص: ۳۴، باب التیمم، ت: مسعد عبد الحمید السعدني، ط: دار الطلائع)

(ص ع د): (الصعید) وجه الأرض ترابا کان أو غیره، قال الزجاج: ولا أعلم اختلافا بین أهل اللغة في ذلك، ومن قال هو فعیل بمعنی مفعول أو فاعل من الصعود ففیه نظر. (المغرب - ناصر بن عبد السید أبي المکارم ابن علي، أبو الفتح، برهان الدین الخوارزمي المطَرِّزِیّ (م: ۶۱۰ھ)، ص: ۲۶۷، الصاد مع العین المعجمة، ط: دار الکتاب العربي)

حیث جاز التیمم علی الصخرة وإن لم یعلق بالید شيء. (کبیری:۷۵)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] غنیة المستملي في شرح منیة المصلي، المعروف بـالحلبي الکبیري، ص ۶۷، فصل في التیمم.

عن المغيرة بن شعبة -رضى الله تعالىٰ عنه- قال: وضأت النبي صلى الله عليه وسلم فمسح على خفيه وصلى.

(صحیح البخاری: ۳۸۸)

باب المسح على الخفين

[موزوں پر مسح کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب المسح علی الخفین

[موزے پر مسح کا بیان]

[۱] بعض عرب کا نائلون اور سوتی موزوں پر مسح کو جائز کہنا

۵۱۸-سوال: کس طرح کے موزوں پر مسح درست ہے؟ کپڑے کے موزے پر مسح کرنے کو عرب علماء جائز کہتے ہیں، اور دلیل میں کہتے ہیں کہ: حدیث شریف میں صرف خفین کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی''موزے'' کے ہیں، لہٰذا جس پر بھی موزے کا اطلاق ہوگا، اس پر مسح کرنا درست ہوگا اور ثخین (دبیز ہونا) کی قید تو صرف فقہ میں مذکور ہے، حدیث سے ثابت نہیں، لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ ان کے اس استدلال کا کیا جواب ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

سوت یا اون کے موزے کو''جورب'' کہا جاتا ہے، پھر جورب کے دونوں جانب اگر چمڑا لگا ہوا ہو، تو اسے''مجلد'' کہتے ہیں، اور اگر صرف نچلے حصے میں چمڑا چڑھا ہوا ہو، تو اسے''منعل'' کہتے ہیں۔[1] اور اگر موزے پورے کے پورے چمڑے کے ہوں، یعنی سوت وغیرہ کا ان میں کوئی دخل نہ ہو، تو ایسے موزوں کو

---

(۱) الجورب: نوع من الخف يكون من الغزل والشعر والجلد الرقيق. ولا يجوز المسح عليه إلا إذا كان مجلدا وهو الذي وضع الجلد على أعلاه وأسفله أو منعلا وهو الذي وضع الجلد على أسفله كالنعل. (دستور العلماء = جامع العلوم في اصطلاحات الفنون - القاضي عبد النبي بن عبد الرسول الأحمد نكري: ۱/ ۲۸۷، باب الجيم مع الواو، عرب عباراته الفارسية: حسن هاني فحص، ط: دار الكتب العلمية - لبنان - بيروت، الطبعة: الأولى، ۱۴۲۱ھ = ۲۰۰۰ء ☆ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: تاج العروس من جواهر القاموس - الزَّبيدي (م: ۱۲۰۵ھ): ۲/ ۱۵۶، مادہ: ج ر ب، ط: دار الهداية)

’’خفین‘‘ کہتے ہیں۔ [۲] خفین، جوربین مجلدین، اور جوربین منعلین پر بالاتفاق مسح جائز ہے، اور اگر جوربین مجلد یا منعل نہ ہوں؛ لیکن ثخین ہوں، [۳] تو اس پر مسح کے سلسلے میں ائمہ ثلاثہ (امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) اور احناف میں سے صاحبین (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) فرماتے ہیں کہ اس پر بھی مسح جائز ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اولاً اس پر مسح کو ناجائز سمجھتے تھے، بعد میں انہوں نے اپنے قول سے رجوع کر لیا، گویا اب اس مسئلے پر اتفاق ہے کہ ایسے موزوں پر مسح جائز ہے۔ اگر جوربین مجلد یا منعل نہ ہوں اور رقیق ہوں یعنی اس میں ثخین کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں، تو ان پر مسح باتفاق ناجائز ہے؛ لہٰذا نائلون یا سوت کے باریک موزوں پر مسح بالکل درست نہیں ہے۔ [۴]

واضح رہے کہ مسح علی الجوربین کا جواز درحقیقت ’’تنقیح مناط‘‘ (علت) کے طریقے پر ہے، یعنی جن جوارب میں ثخین ہونے کی تین شرائط پائی جاتی ہوں، ان کو ’’خفین‘‘ ہی میں داخل کر کے ان پر جواز مسح کا حکم

---

(۲) (الخف) ...ما يلبس في الرجل من جلد رقيق. (المعجم الوسيط-مجمع اللغة العربية بالقاهرة (إبراهيم مصطفى / أحمد الزيات / حامد عبد القادر / محمد النجار): ۱/ ۲۴۷، باب الخاء، ط: دار الدعوة. ☆ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: القاموس الفقهي لغة واصطلاحا- الدكتور سعدي أبو حبيب، ص: ۱۱۸، حرف الخاء، ط: دار الفكر. دمشق-سورية، الطبعة الثانية ۱۴۰۸ھ = ۱۹۸۸ء)

[۳] ثخین کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں: (۱) شفاف نہ ہو، یعنی اگر ان پر پانی ڈالا جائے، تو پاؤں تک نہ پہنچے۔ (۲) مستمسك بغير الاستمساك ہو، یعنی کسی چیز سے باندھے بغیر خود بخود پاؤں پر ٹک جائے، لاسٹک وغیر کی ضرورت نہ پڑے۔ (۳) اس کو پہن کر تتابع مشی ممکن ہو، یعنی اسے پہن کر ایک فرسخ (تین میل) پیدل چلنا دشوار نہ ہو۔ قال الحصكفي: (الثخينين) بحيث يمشي فرسخا ويثبت على الساق ولا يرى ما تحته ولا يشف. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۲۶۹، كتاب الطهارة باب المسح على الخفين، ط: دار الفکر- بیروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ- ۱۹۹۲ء)

(۴) قال عامة العلماء بأن المسح على الخفين مشروع... وأما المسح على الجوربين فهو على أقسام ثلاثة إن كانا مجلدين أو منعلين جاز المسح بإجماع بين أصحابنا، وأما إذا كانا غير منعلين فإن كانا رقيقين بحيث يرى ما تحتهما لا يجوز المسح عليهما، وإن كانا ثخينين، قال أبو حنيفة: لا يجوز المسح عليهما، وقال أبو يوسف ومحمد: يجوز، وروي عن أبي حنيفة أنه رجع إلى قولهما في آخر عمره. (تحفة الفقهاء-محمد بن أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰ھ): ۱/ ۸۳-۸۶، كتاب الطهارة، باب المسح، ط: دار الكتب العلمية، بيروت-لبنان، الطبعة الثانية: ۱۴۱۴ھ-۱۹۹۴ء ☆ مزید دیکھیے: بدائع الصنائع: ۱/ ۷-۱۰، فصل المسح على الخفين، دار الكتب العلمية-بيروت ☆ المحيط البرهاني في الفقه النعماني- أبو المعالي برهان الدين الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۱/ ۱۶۹-۱۷۰، الفصل السادس في المسح على الخفين، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

لگایا گیا ہے، ورنہ جن روایات میں مسح علی الجوربین کا ذکر ہے، وہ سب ضعیف ہیں، یا کم از کم خبر واحد ہیں، جن سے کتاب اللہ پر زیادتی نہیں ہوسکتی؛ بل کہ اس کا جواز مسح علی الخفین کی احادیث متواترہ سے ہی تنقیح مناط کے طور پر ثابت ہوا ہے۔[۱]

بعض عرب دین سے آزاد ہوتے جارہے ہیں، ان کا یہ کہنا کہ خفین کا اطلاق ہر قسم کے موزے پر ہوتا ہے، صحیح نہیں ہے؛ اس لیے نائلون یا سوتی موزوں پر مسح کے سلسلے میں ان کی بات لائق تسلیم نہیں ہے۔ ان سے نائلون اور سوت کے موزے پر مسح کے جواز کے متعلق کسی روایت کا ثبوت طلب کیجیے، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] معذور شخص کا چمڑے کے موزے پہن کر اُس پر مسح کرنا

۵۱۹-سوال: معذور شخص چمڑے کا موزے پہن کر اُس پر مسح کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے جائز ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قال الحصكفي: أو جوربيه، ولو من غزل أو شعر. قال ابن عابدين: قوله ولو (من غزل أو شعر)... وخرج عنه ما كان من كرباس بالكسر: وهو الثوب من القطن الأبيض؛ ويلحق بالكرباس كل ما كان من نوع الخيط كالكتان والإبريسم ونحوهما. وأقول: الظاهر ... أنهم أخرجوه لعدم تأتي الشروط فيه غالبا. (رد المحتار مع الدر المختار: ۱/۲۶۹، كتاب الطهارة، باب المسح علي الخفين، مطلب: مطلب إعراب قولهم إلا أن يقال، ط: دار الفكر-بيروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء)

مستفاد از: درس ترمذی: ۱/۳۳۴-۳۳۵، باب المسح علی الجوربین والنعلین، ط: مکتبہ رشیدیہ-سہارن پور۔

(۲) تفصیلی شرائط اور تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: بعض عرب کا نائلون اور سوتی موزوں پر مسح کو جائز کہنا۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي
الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ
حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾
(۲-البقرۃ:۲۲۲)

باب الحیض والنفاس والاستحاضۃ

[حیض ونفاس اور استحاضہ کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب الحیض والنفاس والاستحاضۃ

[حیض، نفاس اور استحاضہ کا بیان]

[۱] کم عمری میں فیملی پلاننگ کی خاطر آپریشن کرانے والی خاتون کے ''ایام حیض'' کا حکم

۵۲۰-سوال: بہت سی عورتیں فیملی پلاننگ کے لیے کم عمری (بیس پچیس سال کی عمر) ہی میں اپنی بچہ دانی کا آپریشن کرا لیتی ہیں، جس کی وجہ سے ان کو حیض نہیں آتا ہے، حالاں کہ عورتوں کے لیے حیض کی مدت ہر ماہ ''تین سے دس روز تک'' رہتی ہے اور یہ عادت آپریشن کروا دینے سے ختم ہو جاتی ہے اور حیض بالکل نہیں آتا ہے، تو ''آپریشن کی وجہ سے منقطع ہونے والے حیض'' کو شرعی طور پر ایام حیض شمار کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ان ایام میں حیض کے ایام کے احکام جاری ہوں گے یا نہیں؟ یعنی ان ایام کی نمازیں، روزے وغیرہ کی ادائیگی اور اگر کسی نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہو، تو حیض کے ذریعے عدت کا گزارنا اور قرآن مجید کی تلاوت وغیرہ کے احکام حیض سے متعلق ہوں گے یا نہیں؟ کہ اگر معدوم حیض کو موجود مانا جائے، تو نماز کی ادائیگی درست نہ ہو، روزہ کی بعد میں قضا کرے، اس وقت روزہ رکھنا جائز نہ ہو، طلاق کی صورت میں تین حیض کی مدت کے ذریعے عدت پوری ہو، قرآن کریم کی تلاوت ان ایام میں جائز نہ ہو۔

واضح رہے کہ آپریشن کے بعد ان ایام میں خاتون کو دم حیض نہیں آتا ہے، مقام بالکل صاف رہتا ہے؛ تاہم اس کو حائضہ کے حکم میں شمار کیا جانا چاہیے؛ کیوں کہ اس نے اپنا یہ آپریشن جان بوجھ کر کروایا ہے اور اس کو آئسہ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں؛ کیوں کہ عورت کا یہ زمانہ تو بوڑھاپے میں آتا ہے اور یہ عورت تو بوڑھی نہیں ہے؛ بل کہ بالکل جوان ہے۔ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

بڑی عمر کے ہو جانے سے حیض کا خون بند ہو جائے یا کسی بیماری کی وجہ سے حیض نہ آئے یا حمل

ٹھہر جانے کی وجہ سے حیض نہ آئے یا بعض مانع حیض ادویات کا استعمال کرنے کی وجہ سے دم حیض نہ آئے، تو ان تمام صورتوں میں عورت پر حیض کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ (۱)

فی زماننا بعض ایسی دوائیاں ایجاد ہوگئیں ہیں کہ اگر ان کی ایک گولی عورت کو دی جائے، تو اس کو عادت کے مطابق خون نہیں آتا ہے، بعض عورتیں تو اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے حج کے زمانے میں ایسی دوائیاں استعمال بھی کرتی ہیں، تاکہ حیض کے ایام مؤخر ہوجائیں اور وہ ارکان حج پاکی کی حالت میں ادا کرلیں؛ چاند کی ۹ر تاریخ سے لے کر ۱۵ر تاریخ تک جن عورتوں کو خون کی عادت ہوتی ہے، وہ عورتیں اور بالخصوص یو-کے، افریقہ، امریکہ اور کینیڈا جیسے ملکوں سے حج کے لیے آنے والی عورتیں اس طرح کی گولیاں استعمال کرتی ہیں، جس کی وجہ سے حیض کی عادت میں تھوڑی سی تاخیر واقع ہوجاتی ہے اور بجائے ۹ر تاریخ کے ۱۹ر تاریخ کو آتا ہے۔ اس صورت میں عورتیں پاک گردانی جائیں گی اور ان کے ارکان حج صحیح ہوجائیں گے۔

ٹھیک اسی طرح اپنی رضامندی سے اپنا آپریشن کروانے والی خاتون کو ان کے ایام عادت میں جب دم حیض نہیں آئے گا، تو وہ بھی پاک گردانی جائے گی، اس کے لیے ہر وقت کی نماز اور روزے ادا کرنا فرض ہوگا اور اس کی عدت طلاق کی تکمیل، بجائے تین حیض کے، تین مہینے سے ہوگی، تین مہینے کے گزر جانے سے اس کی طلاق کی عدت پوری ہوجائے گی۔

الغرض حیض کے احکام حقیقی طور پر حیض کے آنے کی صورت میں نافذ ہوں گے، صرف تاریخ کے

---

(۱) اعلم بأن حكم الحيض والنفاس والاستحاضة لا يثبت إلا بظهور الدم وبروزه وقد روي عن محمد - رحمه الله تعالى - في غير الأصول أن حكم الحيض والنفاس يثبت إذا أحست بالبروز، وإن لم يظهر وحكم الاستحاضة لا يثبت إلا بالظهور، وفرق بينهما فقال للحيض والنفاس وقت معلوم فيمكن إثبات حكمهما باعتبار وقتهما إذا أحست بالبروز، والاستحاضة حدث كسائر الأحداث، ليس له وقت معلوم لإثبات حكمه، فلا يثبت حكمه إلا بالظهور، والفتوى على القول الأول؛ لما روي أن امرأة قالت لعائشة - رضي الله عنها - إن فلانة تدعو بالمصباح ليلا لتنظر إلى نفسها فقالت: ما كانت إحدانا تتكلف لذلك على عهد رسول الله - صلى الله عليه وسلم -، ولكنها تعرف ذلك، فهو بالمس، فهو إشارة منها إلى الظهور؛ ولأن ما لم يظهر، فهو في معدنه والشيء في معدنه لا يعطى له حكم الظهور ما لم يظهر. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل، شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۱۵۱/۳، كتاب الحيض و النفاس، فصل حكم الحيض والنفاس والاستحاضة لا يثبت إلا بظهور الدم وبروزه، ط: دار المعرفة - بيروت، سن طباعت: ۱۴۱۴ھ - ۱۹۹۳ء)

اعتبار سے حائضہ ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا، اسی وجہ سے حضرات علماء اور فقہائے عظام نے لکھا ہے کہ ”عورت کے حیض آنے کی عادت کبھی کبھی بدلتی بھی رہتی ہے۔“ (۲)

آپ نے جو عقلی باتیں لکھی ہیں، وہ ماننے کے قابل نہیں ہیں، ان پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، حیض آنے سے عورت حائضہ گردانی جائے گی، محض تاریخ اور دن کے آنے سے نہ وہ حائضہ گردانی جائے گی اور نہ اس پر حائضہ ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ (۱۹۸۶/۸/۳ء)

[۲] اسقاط حمل کے بعد نفاس کی مدت کا بیان

[۳] حالت نفاس میں عورت دعاء کرسکتی ہے؟

۵۲۱-سوال: عورت کا حمل اگر ساقط ہوگیا ہو اور پندرہ سولہ دن گزر جانے کے بعد وہ نہا دھوکر کپڑے بدل کر نماز پڑھنا چاہے اور قرآن مجید کی تلاوت کرنا چاہے، تو کیا اس کی اجازت ہے؟ یا چالیس روز پورے کرنا ضروری ہے، نیز ان دنوں میں وہ دعاء کس طرح کرے گی؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً:

حمل کا ساقط ہونا پانچ مہینوں پر ہوا ہو اور اس میں گوشت کے ٹکڑے جیسی کوئی چیز ظاہر ہوئی ہو، تو اس کے بعد جو خون خارج وظاہر ہوگا، وہ ”نفاس کا خون“ کہلائے گا۔ (۱)

اگر اس عورت کو پہلے کوئی بچہ پیدا ہوا ہو، اس وقت جتنی مدت اس کو خون آیا تھا، اتنی مدت اس وقت

---

(۲) (قال) وإذا كان حيضها خمسة أيام فزاد الدم عليها فالزيادة دم حيض معها إلى تمام العشرة لأن عادة المرأة في جميع عمرها لا تبقى على صفة واحدة بل تزداد تارة وتنقص أخرى بحسب اختلاف طبعها في كل وقت. (المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل، شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱۶/۲، باب صلاة المستحاضة، ط: دار المعرفة-بيروت، ۱۴۱۴هـ-۱۹۹۳ء)

(۱) (وسقط) مثلث السين: أي مسقوط (ظهر بعض خلقه كيد أو رجل) أو أصبع أو ظفر أو شعر، ولا يستبين خلقه إلا بعد مائة وعشرين يوما (ولد) حكما (فتصير) المرأة (به نفساء والأمة أم ولد ويحنث به) في تعليقه، وتنقضي به العدة، فإن لم يظهر له شيء فليس بشيء. (الدر المختار مع الرد: ۳۰۲/۱-۳۰۳، باب الحيض، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ فتح القدير: ۱۸۹/۱، كتاب الطهارات، فصل في النفاس، ط: زكريا-ديوبند)

بھی خون آجائے، پھر بند ہوجائے، تو وہ اسی وقت سے پاک سمجھی جائے گی، اس کے بعد وہ نہا دھو کر کپڑے بدل کر نماز پڑھے گی اور اس کے لیے تلاوت کرنا جائز ہوگا، اور اگر پہلی ہی مرتبہ خون آیا ہے، تو خون بند ہوجانے سے وہ پاک ہوجائے گی، اس کے بعد وہ نماز و روزے اور تلاوت شروع کردے، چالیس دن کا انتظار کرنا ضروری نہیں ہے۔[۲] لیکن وہ دعائیں تو ہر حال میں کرسکتی ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ (۱۹۸۶/۹/۱۷ء)

[۴] اسقاط حمل کے بعد کتنی مدت تک خون کا انتظار کرے؟

۵۲۲-سوال: ایک خاتون کو تین چار بچے ہونے کے بعد تین چار مرتبہ اسقاط حمل ہو چکا ہے، ان اسقاط حمل کے موقع پر شرعاً کتنی مدت تک، نماز و روزہ کے لیے انتظار کرنا چاہیے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اسقاط حمل کے بعد آنے والے خون کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اگر حمل میں بچے کے اعضاء بن چکے تھے، پھر اسقاط ہوا، اس صورت میں اسقاط کے بعد آنے والا خون ''نفاس کا خون'' کہلائے گا، جس کی مدت کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ دیکھا جائے گا کہ اگلے بچوں کی ولادت کے موقع پر اس کو کتنی مدت تک خون آیا تھا، اس کے مطابق اس پر نفاس کا حکم لگایا جائے گا، اگر سابقہ

---

(۲) "والسقط الذي استبان بعض خلقه ولد" حتى تصير المرأة به نفساء وتصير الأمة أم ولد به وكذا العدة تنقضي به "وأقل النفاس لا حد له ... وأكثره أربعون يوما والزائد عليه استحاضة" لحديث أم سلمة رضي الله عنها أن النبي عليه الصلاة والسلام وقت للنفساء أربعين يوما ... فإن جاوز الدم الأربعين وقد كانت ولدت قبل ذلك ولها عادة في النفاس ردت إلى أيام عادتها" لما بينا في الحيض "وإن لم تكن لها عادة فابتداء نفاسها أربعون يوما" لأنه أمكن جعله نفاسا ".(الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳ھ):۱/۳۵، كتاب الطهارات، فصل في النفاس، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)
مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: الاختيار لتعليل المختار - عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م:۶۸۳ھ):۱/۳۰، كتاب الطهارة، فصل في أحكام النفساء، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة ☆ الجوهرة النيرة-أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م:۸۰۰ھ):۱/۳۵، كتاب الطهارة، باب الحيض، دم النفاس، ط: المطبعة الخيرية)

(۳) ويجوز للجنب والحائض الدعوات وجواب الأذان ونحو ذلك في السراجية. (الفتاوى الهندية:۱/۳۸، كتاب الطهارة، الباب السادس، الفصل الرابع في أحكام الحيض والنفاس والاستحاضة، ط: دار الفكر -بيروت)

عادت کے موافق خون بند ہوگیا ہو، تو وہ نہا دھو کر نماز ادا کرے گی۔ اگر خون چالیس دن سے تجاوز کر جائے، تب بھی وہ پچھلی عادت کے مطابق مثلاً ۲۵ ر دن کے خون کو نفاس شمار کرے گی اور بقیہ خون استحاضہ کا شمار ہوگا، ہاں اگر خون سابقہ عادت سے تجاوز کر جائے، لیکن چالیس دن یا اس سے کم ہو، تو مکمل مدت، نفاس کی ہوگی اور یوں سمجھا جائے گا کہ اس کی نفاس کے تعلق سے عادت بدل گئی ہے۔ (۱)

(۲) اگر اسقاط حمل اس حال میں ہوا کہ بچے کا کوئی عضو نہیں بنا ہے، صرف خون ہی نظر آیا ہے، تو وہ خون حیض کا کہلائے گا، حیض کی جو عادت ہے، اتنے دن گزرنے کے بعد غسل کر کے نماز وغیرہ شروع کر دے گی، عادت سے بڑھ جائے اور دس دن سے بھی تجاوز کر جائے، تو عادت سے زائد جتنا بھی خون آیا ہے، سب استحاضہ کہلائے گا؛ لیکن دس دنوں کے اندر ہے، تو حیض کہلائے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ حیض کے متعلق اس کی عادت بدل گئی ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیات غفرلہ
۲/۱۰/۱۹۸۶ء

[۵] ایام حیض کے دوران ایک دن کے لیے خون بند ہو جائے، تو کیا حکم ہے؟

۵۲۳-سوال: حیض کے ایام میں اگر کسی عورت کو تھوڑی دیر کے لیے یا ایک دن کے لیے خون بند رہتا ہو، پھر جاری ہوتا ہو اور عادۃً ایسا ہوتا رہتا ہو، تو کیا وہ عورت اس وقت میں نماز ادا کرے گی؟

الجواب حامداومصلیا:

دو حیض کے درمیان کم از کم پندرہ دن کا فاصلہ ضروری ہے، اگر پندرہ دن کے فاصلہ کے بعد خون آنا شروع ہوا اور زیادہ سے زیادہ دس دن جاری رہا یا کم از کم تین دن رہا، تو اس کو حیض کہا جائے گا، ان ایام

(۱) تقدم تخریجہ تحت عنوان: اسقاط حمل کے بعد نفاس کی مدت کا بیان۔
وكذا النفاس فإن رأت لا على العادة ولم يجاوز الأربعين انتقلت. هكذا في المحيط وإذا جاوز الأربعين ولها عادة في النفاس ردت إلى أيام عادتها سواء كان ختم معروفها بالدم أو بالطهر عند أبي يوسف. هكذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۴۰، كتاب الطهارة، الباب السادس، الفصل الرابع في أحكام الحيض والنفاس والاستحاضة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) والمرئي حيض إن دام ثلاثا وتقدمه طهر تام وإلا استحاضة. (الدر المختار مع الرد: ۱/ ۳۰۳، باب الحيض، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

میں نماز جائز نہیں، معاف ہے، اور روزہ بھی ممنوع ہے، مگر اس کی قضا واجب ہوگی۔[۱] اگر ان تین دن یا دس دن کے درمیان ایک دو دن خون بند رہے، تب بھی ان ایام کو حیض ہی کے حکم میں شمار کیا جائے گا۔[۲]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] نفاس کے بند ہونے کے ایک ہفتہ بعد آنے والے خون کا حکم

۵۲۴-سوال: ایک عورت کو پہلی ولادت کے بعد چالیس دن تک خون آیا، پھر بند ہو گیا، ایک ہفتہ کے وقفے کے بعد دوبارہ خون جاری ہو گیا تو کیا اس حالت میں وہ نماز پڑھ سکتی ہے؟ اور اس خون کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ولادت کے بعد چالیس دن سے زیادہ جو خون آیا، وہ بیماری کا ہے، اس کو استحاضہ کہتے ہیں۔[۳] اس کے احکام پاکی کی حالت جیسے ہیں، نفاس کے چالیس دن کے بعد اس عورت پر نماز فرض ہے؛ لہٰذا ان دنوں میں حسب معمول نماز پڑھے۔[۴] صرف ایک ہفتہ کے وقفہ کے بعد آنے والا خون حیض کا نہیں ہے، اگر پندرہ دن کا وقفہ ہو، تو حیض ہوگا۔[۵]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (وأقل الطهر) بين الحيضتين أو النفاس والحيض (خمسة عشر يوما) ولياليها إجماعا... (وما تراه) من لون ككدرة وتربية (في مدته) المعتادة (سوى بياض خالص) ... (ولو) المرئي (طهرا متخللا) بين الدمين (فيها حيض) ؛ لأن العبرة لأوله وآخره وعليه المتون فليحفظ.... (يمنع صلاة) مطلقا ولو سجدة شكر (وصوما) وجماعا (وتقضيه) لزوما دونها للحرج. (الدر مع الرد: ۱/ ۲۸۵-۲۹۱، كتاب الطهارة، باب الحيض، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) الطهر المتخلل بين الدمين والدماء في مدة الحيض يكون حيضا. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۳۶، كتاب الطهارة، الباب السادس في الدماء المختصة بالنساء، ط: مكتبه رشيديه- پاكستان)

(۳) (والنفاس) لغة: ولادة المرأة. وشرعا (دم) ... (يخرج) من رحمها... (عقب ولد) أو أكثره... (لا حد لأقله)... (وأكثره أربعون يوما) كذا رواه الترمذي وغيره... (والزائد) على أكثره (استحاضة) لو مبتدأة. (الدر مع الرد: ۱/ ۲۹۹-۳۰۰، كتاب الطهارة، باب الحيض، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۴) (ودم استحاضة) حكمه (كرعاف دائم) (لا يمنع صوما وصلاة) ولو نفلا (وجماعا). (الدر مع الرد: ۱/ ۲۹۸، كتاب الطهارة، باب الحيض)

(۵) (وأقل الطهر) بين الحيضتين أو النفاس والحيض (خمسة عشر يوما) ولياليها إجماعا. (الدر مع الرد: ۱/ ۲۸۵، وفي الشامية: هذا إذا لم يكن في مدة النفاس. (رد المحتار: ۱/ ۲۸۵، كتاب الطهارة، باب الحيض)

[۷] عورت نفاس کا غسل کیسے کرے؟

۵۲۵-سوال: ولادت کے چالیس دن بعد عورت کے لیے نفاس کے غسل کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ولادت کے بعد چالیس دنوں کے درمیان جب تک خون آتا رہے، اُس وقت تک عورت پر نماز فرض نہیں ہے، اور غسل بھی فرض نہیں ہے۔[1] لیکن عورت کو چاہیے کہ نظافت کے پیش نظر غسل کرتی رہے۔[2]

جب نفاس کا خون بند ہوجائے، گرچہ چالیس دن مکمل نہ ہوئے ہوں؛ تو اُس وقت سے عورت پر غسل اور نماز دونوں فرض ہوجائیں گے؛ لہٰذا اُسے چاہیے کہ وہ غسل کرلے اور نماز پڑھنا شروع کر دے۔[3] اگر چالیس دن مکمل ہوجانے کے بعد بھی خون جاری رہے، تو وہ بیماری کا خون کہا جائے گا، جو غسل اور نماز سے مانع نہیں ہے، لہٰذا چالیس دن مکمل ہوجانے کے بعد اُسے چاہیے کہ غسل کرلے اور نماز شروع کر دے اور اس حالت میں اُس پر روزے بھی فرض ہوں گے۔[4] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (وأما) حكم الحيض والنفاس فمنع جواز الصلاة، والصوم، وقراءة القرآن. (بدائع الصنائع: ۱/ ۴۴، كتاب الصلاة، الاستحاضة وأحكامها، قبيل فصل التيمم، ط: دار الكتب العلمية- ديوبند)

(۲) (قوله ثم ذكر أحكامه)... منها: أن يمنع صحة الطهارة إلا التي يقصد بها التنظيف كأغسال الحج، ولا يحرمها لقولهم يستحب لها أن تتوضأ كل صلاة وتقعد على مصلاها تسبح وتهلل وتكبر بقدر أدائها كي لا تنسى عادتها. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۲۹۰، كتاب الطهارة، باب الحيض)

(۳) ومنها: (أي من الأحكام التي يشترك فيها الحيض والنفاس ثمانية) وجوب الاغتسال عند الانقطاع. هكذا في الكفاية. (الفتاوىٰ الهندية: ۱/ ۳۹، كتاب الطهارة، الباب السادس في الدماء المختصة بالنساء الخ، الفصل الرابع في أحكام الحيض والنفاس والاستحاضة، ط: دار الفكر- بيروت)

[۴] (والنفاس) لغة: ولادة المرأة. وشرعا (دم)... (يخرج) من رحمها... (عقب ولد) أو أكثره... (لا حد لأقله)... (وأكثره أربعون يوما) كذا رواه الترمذي وغيره... (والزائد) على أكثره (استحاضة) لو مبتدأة. (الدر مع الرد: ۱/ ۲۹۹-۳۰۰، كتاب الطهارة، باب الحيض، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

قال ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): (قوله: ولا حد لأقله) أي النفاس... وذكر شيخ الإسلام في مبسوطه اتفق أصحابنا على أن أقل النفاس ما يوجد فإنها كما ولدت إذا رأت الدم ساعة ثم انقطع الدم عنها فإنها تصوم وتصلي وكان ما رأت نفاسا لا خلاف في هذا بين أصحابنا. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق: ۱/ ۲۳۰، كتاب الطهارة، باب الحيض، أقل النفاس، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(ودم استحاضة) حكمه (كرعاف دائم) وقتا كاملا (لا يمنع صوما وصلاة) ولو نفلا (وجماعا) لحديث توضئي وصلي وإن قطر الدم على الحصير. (الدر مع الرد: ۱/ ۲۹۸، كتاب الطهارة، باب الحيض، ط: بيروت)

[۸] حیض کے بند ہونے کے بعد عورت غسل کیسے کرے؟

۵۲۶-سوال: حیض کے بند ہونے کے بعد غسل کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ جہالت کی وجہ سے بہت سی عورتیں اس غسل میں غیر دینی رسوم و روایات کی پابندی کرتی ہیں، مثلاً یہ کہ غسل کے وقت قبلہ رُخ ہونا ضروری سمجھتی ہیں، پانی دم کروا کے پیتی ہیں، تو ان رسوم کے ساتھ غسل کرنے سے غسل صحیح ہوگا؟ اور ایسے غسل کے ذریعہ جو نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور تلاوت کی جاتی ہے، اُن کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

حیض کے بند ہونے کے بعد کا غسل بھی نفاس کے غسل کی طرح ہے، جس میں مسنون دعاؤں کے علاوہ کچھ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ اس کے صرف تین فرائض ہیں: (۱) کلی کرنا، (۲) ناک میں پانی ڈالنا اور (۳) پورے بدن پر اس طرح پانی بہانا کی کوئی عضو خشک نہ رہ جائے۔ (۱)

حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے، اگر اُس سے زائد خون جاری رہے، تو اسے بیماری (استحاضہ) کا خون کہا جائے گا، لہٰذا عورت کو چاہیے کہ دس دن کے بعد غسل کر کے نماز شروع کر دے اور روزہ بھی رکھے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قال الله تعالى: وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا. (۵- المائدة:۶) و في الهداية: وفرض الغسل: المضمضة والاستنشاق وغسل سائر البدن. (۱/۲۹، كتاب الطهارة، فصل في الغسل)

قال الكاساني: (وأما) ركنه فهو إسالة الماء على جميع ما يمكن إسالته عليه من البدن من غير حرج مرة واحدة، حتى لو بقيت لمعة لم يصبها الماء لم يجز الغسل، وإن كانت يسيرة، لقوله تعالى {وإن كنتم جنبا فاطهروا}، أي: طهروا أبدانكم، واسم البدن يقع على الظاهر والباطن، فيجب تطهير ما يمكن تطهيره منه بلا حرج، ولهذا وجبت المضمضة، والاستنشاق في الغسل. (بدائع الصنائع: ۱/۱۳۲، كتاب الطهارة، تفسير الغسل، ط: زكريا، ديوبند)

مزید دیکھیے: كنز الدقائق مع البحر: ۱/۸۶، كتاب الطهارة، ط: دار الكتاب ديوبند☆غنية المستملي في شرح منية المصلي: ۴۱، ط: دار الكتاب، ديوبند۔

(۲) و (أقله ثلاثة بلياليها) الثلاث، ... (وأكثره عشرة) بعشر ليال، كذا رواه الدارقطني وغيره. (والناقص) عن أقله (والزائد) على أكثره أو أكثر النفاس أو على العادة وجاوز أكثرهما. (وما تراه) صغيرة دون تسع على المعتمد وآيسة على ظاهر المذهب (حامل) ولو قبل خروج أكثر الولد (استحاضة.) (وأقل الطهر) بين الحيضتين أو النفاس والحيض (خمسة عشر يوما) ولياليها إجماعا (ولا حد لأكثره). [الدر المختار مع الرد: ۱/۲۸۵-۲۸۴، كتاب الطهارة، باب الحيض، ط: دار الكتب العلمية- بيروت] =

[۹] خالص سفید پانی حیض نہیں ہے

۵۲۷-سوال: بعض عورتوں کو بیماری یا کسی عذر یا کمزوری کی بنا پر اکثر حیض آنے سے ایک دو دن قبل سفید پانی آنا شروع ہوجاتا ہے، تو ایسی حالت میں جماع کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

بالکل سفید پانی ہو، تو وہ حیض نہیں ہے، حیض کی مدت سے قبل یا حیض کی مدت کے بعد اس طرح پانی آتا ہے، تو ایسی حالت میں شرعی اعتبار سے وطی کرنا جائز ہے۔[۱] اس میں ذرا بھی کسی قسم کا رنگ ہو، تو وہ حیض شمار ہوگا۔[۲] حیض کے ایام میں وطی کرنا جائز نہیں ہے۔

حیض کی اقل مدت ۳/دن اور اکثر مدت ۱۰/دن ہے، اس سے کم یا زیادہ استحاضہ ہے، دو حیض کے درمیان کم از کم ۱۵/دن کا فاصلہ ہوتا ہے اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=ومنها: (أي من الأحكام التي يشترك فيها الحيض والنفاس ثمانية) وجوب الاغتسال عند الانقطاع. هكذا في الكفاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۳۹، كتاب الطهارة، الباب السادس في الدماء المختصة بالنساء الخ، الفصل الرابع في أحكام الحيض والنفاس والاستحاضة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۱) (وما تراه) من لون ككدرة وتربية (في مدته) المعتادة (سوى بياض خالص) قيل هو شيء يشبه الخيط الأبيض (ولو) المرئي (طهرا متخللا) بين الدمين (فيها حيض). [الدر المختار رد المحتار: ۱/ ۲۸۹-۲۹۰، كتاب الطهارة، باب الحيض، ط: دار الكتب العلمية-بيروت]

(۲) اعلم أن ألوان الدماء ستة: هذان والسواد والحمرة والصفرة والخضرة. ثم الكدرة ما هو كالماء الكدر، والتربية نوع من الكدرة على لون التراب بتشديد الياء وتخفيفها بغير همزة نسبة إلى الترب بمعنى التراب، والصفرة كصفرة القز والتبن أو السن على الاختلاف؛ ثم المعتبر حالة الرؤية لا حالة التغير؛ كما لو رأت بياضا فاصفر باليبس أو رأت حمرة أو صفرة فابيضت باليبس. (رد المحتار: ۱/ ۲۸۹، كتاب الطهارة، باب الحيض، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۳) و (أقله ثلاثة بلياليها) الثلاث، ... (وأكثره عشرة) بعشر ليال، كذا رواه الدارقطني وغيره. (والناقص) عن أقله (والزائد) على أكثره أو أكثر النفاس أو على العادة وجاوز أكثرهما. (وما تراه) صغيرة دون تسع على المعتمد وآيسة على ظاهر المذهب (حامل) ولو قبل خروج أكثر الولد (استحاضة.) (وأقل الطهر) بين الحيضتين أو النفاس والحيض (خمسة عشر يوما) ولياليها إجماعا (ولا حد لأكثره). [الدر المختار مع الرد: ۱/ ۲۸۵-۲۸۴، كتاب الطهارة، باب الحيض، ط: دار الكتب العلمية-بيروت]

[۱۰] حیض کی اکثر مدت ختم ہونے کے بعد غسل سے قبل وطی کرنا

۵۲۸-سوال: کیا حائضہ عورت سے حیض کی اکثر مدت دس دن مکمل ہوجانے کے بعد، غسل سے قبل وطی کرنا جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

صورت مسئولہ میں ایسی عورت سے ہم بستری کرنا جائز ہے، البتہ مستحب ہے کہ غسل کے بعد کرے۔ (درمختار: جلد:۱، صفحہ:۱۵۶)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] اگر ولادت کے بعد خون نہ دکھائی دے

۵۲۹-سوال: ایک مسلم خاتون کو آپریشن سے بچے کی ولادت ہوئی، جس کی وجہ سے دم نفاس اگلی شرم گاہ سے ظاہر نہیں ہوا، تو ایسی عورت کے لیے نماز اور روزے کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ عورت ''نفساء'' کہی جائے گی؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداومصلیا:

بچہ کی ولادت کی وجہ سے عورت ''نفساء'' کے حکم میں ہوگی؛ اس لیے غسل فرض ہوگا، اور اس دن کا روزہ صحیح نہ ہوگا: فلو لم تره هل تكون نفساء؟ المعتمد نعم. (درمختار مع شامی: ۱/۲۹۹) امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہی ہے۔[۲]

---

(۱) (ويحل وطؤها إذا انقطع حيضها لأكثره) بلا غسل وجوبا بل ندبا. (الدر المختار مع الرد المحتار: ۱/۲۹۴، كتاب الطهارة، باب الحيض، ط: بيروت)

إذا مضى أكثر مدة الحيض وهو العشرة يحل وطؤها قبل الغسل مبتدأة كانت أو معتادة ويستحب له أن لا يطأها حتى تغتسل. هكذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/۳۹، كتاب الطهارة، الباب السادس في الدماء المختصة الخ...، الفصل الرابع في أحكام الحيض والنفاس والاستحاضة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ مزید دیکھیے: مراقي الفلاح ص: ۳۵، كتاب الطهارة، باب الحيض والنفاس والاستحاضة، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) ولو ولدت، ولم تر دما، لا يجب الغسل عند أبي يوسف، وهو رواية عن محمد، قال في المفيد: هو الصحيح؛ لكن يجب عليها الوضوء بخروج النجاسة مع الولد. هكذا في التبيين، وعن أبي حنيفة - رحمه الله - يجب الغسل، وأكثر المشايخ أخذوا بقوله، وبه كان يفتي الصدر الشهيد. هكذا في المحيط، وقال أبو علي الدقاق وبه نأخذ. =

اس لیے بچہ پیدا ہونے کے بعد غسل کر کے نماز شروع کردے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= كذا في المضمرات، وفي الفتاوى: هو الصحيح. هكذا في الجوهرة النيرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۳۷، كتاب الطهارة، الباب السادس في الدماء المختصة بالنساء، الفصل الثاني في النفاس، ط: دار الفكر - بيروت)

قوله: "وقدمنا لزوم غسلها احتياطا" وإن لم تكن نفساء، ويبطل صومها، وقيل: بل هي نفساء عنده؛ لعدم خلو الولد عن قليل دم غالبا، أو لأن نفس خروج النفس نفاس، وأكثر المشايخ على قول الإمام، وصححه أيضا في الفتاوي. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ): ۱/ ۴۰، كتاب الطهارة، باب الحيض والنفاس والإستحاضة، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

والمعذور هو الذى لا يمضى عليه وقت صلاة إلا والحدث الذى ابتلى به موجود، حتى لو انقطع الدم وقتاً كاملاً خرج من أن يكون صاحب عذر من وقت الانقطاع. (الاختيار لتعليل المختار: ۱/۳۰)

باب أحكام المعذورين

[معذورین کے احکام]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب أحكام المعذورين

[معذورین کے احکام]

[۱] معذور کے لیے وضو کا حکم

۵۳۰-سوال: مجھے خروج ریح کا مرض ہے، وضو کرتا ہوں؛ لیکن زیادہ دیر وضو نہیں رہتا ہے، کافی علاج کراچکا ہوں، مگر ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ تمہارے معدے میں خرابی ہے؛ اس لیے تمہارا یہ حال ہے۔

اسی طرح مجھے شوگر (ذیابیطس) کا بھی مرض ہے، جس کی وجہ سے استنجاء کے بعد بھی قطرہ دو قطرہ نکل جایا کرتا ہے، حالاں کہ بہت ہی احتیاط کرتا ہوں، مگر بیماری سے مجبور ہوں، تو ایسی صورت میں میرے لیے نماز، تلاوت ذکر وغیرہ کے متعلق کیا حکم ہے؟ جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

آپ نے جو عذر' خروج ریح اور پیشاب کا ذکر کیا ہے، اگر اس کے لیے کوئی بھی تدبیر کارگر نہ ہو اور اس کا روکنا قابو سے باہر ہو، تو پھر اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر یہ ''عذر'' ایک نماز کے پورے وقت تک برابر قائم رہے، یعنی اتنا وقت نہ ملے کہ اس میں طہارت کے ساتھ آپ فرض نماز پڑھ سکیں، تو شرعاً آپ ''معذور'' ہیں۔ [۱] اور معذور کا حکم یہ ہے کہ ہر نماز کے وقت نیا وضو کرے، پھر اس وضو سے جس قدر نماز پڑھنا چاہے، پڑھ سکتا ہے، اب اس مرض کے پیش آنے کی وجہ سے اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا۔ ــــــ اگر کسی شخص کو زخم ہو اور مسلسل رطوبت بہتی رہتی ہو یا عورت کو استحاضہ کا مرض ہو اور خون جاری رہتا ہو، یا کسی کو ریح خارج

---

(۱) والمعذور هو الذي لا يمضي عليه وقت صلاة إلا والحدث الذي ابتلي به موجود، حتى لو انقطع الدم وقتا كاملا خرج من أن يكون صاحب عذر من وقت الانقطاع. (الاختيار لتعليل المختار - عبد الله بن محمود الموصلي (م: ۶۸۳ھ): ۱/۳۰، كتاب الطهارة، فصل أحكام أهل الأعذار، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة ☆ مزید دیکھیے: البحر الرائق: ۱/۳۷۶، كتاب الطهارة، باب الحيض: حيض المبتدأة ونفاسها. ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۳۰۵، كتاب الطهارة، باب الحيض، ط: دار الفكر - بيروت، الطبعة الثانية: ۱۴۱۲ھ - ۱۹۹۲ء)

ہونے کی بیماری ہو، تو ان سب کے لیے بھی یہی حکم ہے، یعنی ان کا یہ عذر ایک نماز کے وقت کو گھیر لے اور اتنی بھی فرصت نہ ملے کہ طہارت کے ساتھ کم از کم فرض نماز ادا کر سکے، تو یہ شرعاً معذور ہیں، اب ان کو صرف ہر نماز کے وقت نیا وضو کرنا ہوگا۔ نیز یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جس عذر سے وہ معذور ہوئے ہیں، اس کے پیش آنے سے ان کا وضو نہ ٹوٹے گا، البتہ اس عذر کے علاوہ وضو کو توڑنے والی دوسری چیزوں کے پیش آنے سے وضو ٹوٹ جائے گا، جیسے پیشاب کے مریض کو ریح خارج ہوئی، تو ریح سے اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ [۲]

معذور کے لیے ہر نماز کے وقت نیا وضو کرنا ضروری ہے، مثلاً غروب آفتاب کے بعد (مغرب کے لیے) اس نے وضو کیا، تو عشاء کا وقت داخل ہونے کے بعد عشاء کی نماز کے لیے دوسرا وضو ضروری ہوگا اور اگر غروب آفتاب سے پہلے مغرب کا وضو کیا، تو آفتاب غروب ہونے کے بعد وہ وضو ٹوٹ جائے گا، مغرب کا وقت داخل ہونے کے بعد دوسرا وضو کرنا لازم ہوگا۔

اور پھر ایک مرتبہ شرعی معذور بن جانے کے بعد اس عذر کے باقی رہنے کے لیے ہر نماز کے وقت میں کم از کم ایک مرتبہ اس مرض کا پایا جانا ضروری ہے، اگر نماز کا کوئی وقت اس سے خالی گیا، یعنی اس میں ایک بار بھی وہ مرض نہیں پایا گیا، تو پھر اس کا شرعی معذور ہونا ختم ہوجائے گا، اور اس پر دوبارہ صاحب عذر کے احکام جاری ہونے کے لیے مذکورہ بالا شرط کا پایا جانا ضروری ہوگا۔ [۳]

---

(۲) عن عدي بن ثابت عن أبيه عن جده عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال في المستحاضة: تدع الصلاة أيام أقرائها التي كانت تحيض فيها، ثم تغتسل وتتوضأ عند كل صلاة، وتصوم وتصلي. (سنن الترمذي: ۱/ ۳۳، رقم الحديث: ۱۲۶، باب ما جاء أن المستحاضة تتوضأ لكل صلاة، كتاب الطهارة، ط: مكتبة البدر - ديوبند)

المستحاضة ومن به سلسل بول أو استطلاق بطن أو انفلات ريح أو رعاف دائم أو جرح لا يرقأ يتوضؤن لوقت كل صلاة، ويصلون به في الوقت ما شاؤا من فرض ونفل، ويبطل بخروجه فقط. (ملتقى الأبحر - إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلَبي الحنفي (م: ۹۵۶ھ): ۱/ ۸۴، كتاب الطهارة، فصل: قبل باب الحيض، ط: دار الكتب العلمية - لبنان/ بيروت، الطبعة الأولى: ۱۴۱۹ھ - ۱۹۹۸ء)

وقال الكاساني: فخروج النجس من هؤلاء لا يكون حدثا في الحال ما دام وقت الصلاة قائما... وإنما تبقى طهارة صاحب العذر في الوقت إذا لم يحدث حدثا آخر أما إذا أحدث حدثا آخر، فلا تبقى. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۱/ ۲۷ - ۲۸، فصل بيان ما ينقض الوضوء، ط: دار الكتب العلمية، الطبعة الثانية: ۱۴۰۶ھ - ۱۹۸۶ء)

(۳) فالحاصل أن صاحب العذر ابتداء من استوعب عذره تمام وقت صلاة ولو حكما، لأن الانقطاع اليسير ملحق بالعدم وفي البقاء من وجد عذره في جزء من الوقت وفي الزوال يشترط استيعاب الانقطاع حقيقة. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۱/ ۳۷۷، كتاب الطهارة، باب الحيض، ط: دار الكتاب، ديوبند)

اور اگر کسی کا مرض اس قدر شدید نہ ہو کہ دو دو منٹ پر مثلاً خروج ریح یا پیشاب کا قطرہ ٹپکتا ہو؛ بل کہ وضو کر کے فرض نماز پڑھنے کا موقع مل جاتا ہو، تو ایسا شخص شرعاً معذور نہیں کہلائے گا، اس کے لیے لازم ہوگا کہ وہ پاکی کی حالت میں فرض نماز ادا کرے ـــــ اور پیشاب کا قطرہ ایک ہو یا دو، بہر حال اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] سلس البول کے مریض کے لیے طہارت کا حکم اور اس کا طریقہ

۵۳۱-سوال: ایک شخص کو پیشاب کی ایسی بیماری ہے کہ بار بار اس کا وضو ٹوٹتا رہتا ہے اور نماز میں اس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، تو اس کے لیے شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

پیشاب کے قطرات اس کثرت سے آتے ہوں کہ نماز کا مکمل وقت اسی حالت میں گذر جائے اور اتنا بھی وقت نہ ملے کہ طہارت حاصل کر کے فرض نماز ادا کی جا سکے، تو ایسی صورت میں یہ شخص معذور کہلائے گا، اور معذور کا حکم یہ ہے کہ ہر نماز کے وقت نیا وضو کرے، پھر اس وضو سے جس قدر نماز پڑھنا چاہے، پڑھ سکتا ہے، اب اس مرض کے پیش آنے کی وجہ سے اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا، دوسری نماز کا وقت ہونے پر دوبارہ کپڑے اور بدن کی ناپاک جگہوں کا دھونا ضروری ہوگا اور دوبارہ وضو کر کے وہ نماز پڑھے گا، جب تک نماز کا وقت باقی ہے اس کا وضو رہے گا، نماز کا وقت نکل جانے پر اس کا وضو ٹوٹ جائے گا، خواہ دوسرا کوئی ناقض وضو امر پیش آیا ہو یا نہ آیا ہو، ہر نماز کے لیے اسی طرح وہ کرتا رہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ (۱۹۸۶/۹/۱۷ء)

[۳] خروج ریح کے مریض کے لیے شرعی حکم

۵۳۲-سوال: ایک آدمی کو خروج ریح کی بیماری ہے، وہ چار رکعت نماز بھی نہیں پڑھ پاتا کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟

(۱) منها [من نواقض الوضوء] ما يخرج من السبيلين من البول والغائط والريح الخارجة من الدبر. (الفتاوى الهندية: ۹/۱، الباب الأول في الوضوء، الفصل الخامس في نواقض الوضوء، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) تقدم تخريجه تحت عنوان: معذور کے لیے وضو کا حکم۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ایسا شخص جو وضو کرنے کے بعد چار رکعت نماز بھی نہیں پڑھ پاتا کہ خروج ریح ہو جاتا ہے، اس کو چاہیے کہ حتی الامکان طہارت کے ساتھ نماز پڑھنے کی کوشش کرے، مثلاً اگر کھڑے ہو کر پڑھنے سے خروج ہوتا ہے، تو بیٹھ کر رکوع وسجدہ کر کے پڑھے، اگر اس سے بھی ریح خارج ہو جاتی ہے، تو بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھے، لیکن کوشش ہو کہ خروج ریح نہ ہو؛ اس لیے کہ طہارت کے ساتھ نماز پڑھنا افضل ہے، بغیر طہارت کے نماز پڑھنے سے: كما في مراقي الفلاح: "ومن به عذر كسلس بول أو استطلاق بطن" وانفلات ريح ورعاف دائم وجرح لا يرقأ ولا يمكن حبسه بحشو من غير مشقة ولا بجلوس ولا بالإيماء في الصلاة فبهذا يتوضؤون "لوقت كل فرض" ...الخ (مراقي الفلاح، ص: ۸۰)[۱] وفي الدّر: يجب رد عذره أو تقليله بقدر قدرته ولو بصلاته موميا، وبرده لا يبقى ذا عذر بخلاف الحائض. (ج:۱،ص: ۲۰۴)[۲] وفي البحر: ومتى قدر المعذور على رد السيلان برباط أو حشو أو كان لو جلس لا يسيل ولو قام سال وجب رده، وخرج برده عن أن يكون صاحب عذر. (ج:۱،ص: ۲۱۶)[۳]

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ حتی الامکان کوشش ہو عذر دفع کرنے کی، اور اگر عذر دفع ہو گیا، تو صاحب عذر نہ رہا؛ لیکن اگر کسی بھی صورت میں دفع نہ ہو تو یہ شخص صاحب عذر ہے؛ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرض نماز کے وقت وضو کرے، اور اس وقت میں جتنی فرض، سنت اور نفل نماز پڑھنی چاہے، پڑھے؛ لیکن جب اس فرض نماز کا وقت نکل جائے، تو اس کا وضو ٹوٹ جائے گا، یعنی صاحب عذر کا وضو اس وقت تک رہتا ہے، جب تک کہ اس نماز کا وقت نہ نکل جائے۔

فقہاء نے لکھا ہے: (وحكمه الوضوء ... لكل فرض) اللام للوقت ... (ثم يصلي) به (فيه فرضا ونفلا) فدخل الواجب بالأولى (فإذا خرج الوقت بطل) أي: ظهر حدثه السابق. (الدر المختار، ج:۱/ص:۲۸۱، ومثله في البحر الرائق: ج۱/ص: ۲۱۵، غنیة ا،ص: ۲۳۳، طحطاوی: ص ۸۰،

---

[۱] مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح -حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹ھ)، ص: ۶۳، كتاب الطهارة، باب الحيض والنفاس والاستحاضة، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

[۲] الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۰۷-۳۰۸، باب الحيض، مطلب في أحكام المعذور ، ط: بيروت.

[۳] البحر الرائق شرح كنز الدقائق -زين الدين بن إبراهيم، المعروف بابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۱/ ۲۲۷، باب الحيض، ط: دار الكتاب الإسلامي)

ملتقی مع شرحیہ: ج ١ ص: ٥٦، وغیرہ)

لیکن اگر اس عذر کے علاوہ نواقض وضو میں سے کوئی دوسرا حدث لاحق ہوگیا، تو پھر اس حدثِ آخر کی وجہ سے دوبارہ، وضو کرنا پڑے گا، کمافي أکثر الکتب الفقهیة.[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] جس کو بار بار ریح خارج ہوتی رہتی ہو، اس کے لیے کیا حکم ہے؟

٥٣٣-سوال: ایک شخص کو ہمیشہ ریح خارج ہوتی رہتی ہے، دوا، اور پرہیز سے بھی کام لیا؛ لیکن بیماری دور نہیں ہوئی، ایسا شخص کس طرح نماز ادا کرے؟ خروج ریح سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے اور بار بار وضوء کرنا پڑتا ہے، جس میں ناقابل برداشت پریشانی ہوتی ہے اور نماز میں کوشش بھی کی گئی کہ ریح کا خروج نہ ہو؛ لیکن ایسا ہو نہیں پاتا ہے، ایسے شخص کے لیے کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

مذکورہ شخص وضو کر کے نماز پوری کرے، اگر اسے اس قدر بھی وقت نہ ملتا ہو کہ وضو کر کے وقت میں نماز پڑھ سکے، تو شریعت کی اصطلاح میں اس کو "معذور" کہا جائے گا، ایسا شخص ہر وقت میں وضو کرے اور اُس سے جس قدر فرض ونفل اور واجب وغیرہ پڑھنا چاہے، اجازت ہے، اس کا یہ وضو ایک نماز کے وقت تک رہے گا، بشرطیکہ اُس میں اور کوئی دوسرا ناقض وضو امر نہ پیش آیا ہو۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] کیا معذور آدمی ہر نماز کے وقت نیا وضو کرے؟

٥٣٤-سوال: مجھے ریح خارج ہونے کی بیماری ہے اور یہ بیماری اس قدر پیش آتی ہے کہ جماعت کھڑی ہونے تک مجھے چار پانچ مرتبہ وضو کرنے کی نوبت آجاتی ہے، نیز سردی کے موسم میں گھر سے

(١) وقال الكاساني: فخروج النجس من هؤلاء لا يكون حدثا في الحال ما دام وقت الصلاة قائما... وإنما تبقى طهارة صاحب العذر في الوقت إذا لم يحدث حدثا آخر أما إذا أحدث حدثا آخر، فلا تبقى. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين الكاساني الحنفي (م: ٥٨٧هـ): ١/ ٢٧-٢٨، فصل بيان ما ينقض الوضوء، ط: دار الكتب العلمية، الطبعة الثانية: ١٤٠٦هـ-١٩٨٦ء)

(٢) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: خروج ریح کے مریض کے لیے شرعی حکم۔
تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: معذور کے لیے وضو کا حکم۔

گرم پانی سے وضو کر کے جاتا ہوں اور مسجد میں پہنچتا ہوں کہ یہ تکلیف پیش آجاتی ہے۔ مجھے نس کے جکڑ جانے کی بھی بیماری ہے، جس کی وجہ سے پاؤں میں بھی سخت درد رہتا ہے، میری عمر ۷۳ رسال ہے، بڑھاپے کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے، تو کیا میں خروج ریح کے وقت ہر مرتبہ نیا وضوء کر کے نماز پڑھوں یا پھر ایک مرتبہ وضو کرنا کافی ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

خروج ریح کا مرض ہو، یا پیشاب کے قطرے ٹپکنے کی بیماری، اگر یہ مرض ایک مکمل نماز کے وقت کو گھیر لے، اس طور پر کہ اس میں وضو کر کے نماز پڑھنے کا موقع نہ مل سکے، تو اس کو شریعت کی زبان میں ''عذر'' کہا جاتا ہے اور جس کو یہ مرض لاحق ہوا سے معذور کہتے ہیں۔ مثلاً: ظہر کا وقت ۱۲:۴۰ سے ۴:۴۰ تک ہے، اس پورے وقت میں آپ کو اتنا وقت نہیں ملتا ہے کہ آپ طہارت حاصل کر کے نماز پڑھ سکیں، اس طور پر کہ اگر آپ کو نماز پڑھنے میں ۱۰ رمنٹ کا وقت لگتا ہو اور یہ عذر ہر ۱۰ رمنٹ سے قبل ہی پیش آجائے، تو آپ معذور ہیں، اور معذور کے لیے حکم یہ ہے کہ نماز کے وقت میں وضو کر کے اس وقت کے اخیر تک جتنی فرض و نوافل پڑھنا چاہے، پڑھ سکتا ہے۔

جب کسی کو معذور کا حکم لاحق ہو جائے، اس کے بعد یہ عذر ہر نماز میں ایک-دو مرتبہ پیش آئے، تو اسے معذور ہی سمجھا جائے گا؛ لیکن اگر ایک نماز کے کامل وقت میں ایک مرتبہ بھی یہ عذر پیش نہیں آیا، تو پھر وہ شخص معذور ہونے سے نکل جائے گا، دوبارہ تحقق عذر کے لیے کامل ایک وقت تک عذر کا پیش آنا ضروری ہوگا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] جسے بار بار پیشاب کے قطرات ٹپکتے ہوں، وہ کس طرح نماز ادا کرے

۵۳۵-سوال: ایک شخص جب پیشاب کرتا ہے، تو پیشاب کے کچھ قطرات پیشاب کی نالی میں رکے رہتے ہیں اور وقفے وقفے سے نکلتے رہتے ہیں، اور وہ شک میں مبتلا رہتا ہے کہ پیشاب کے تمام قطرے خارج ہوئے یا نہیں؟ اسی شک کی بنیاد پر شرم گاہ کو بار بار دیکھنے کی عادت سی بن گئی ہے؛ اور بار بار استنجاء کے لیے بھی جانا پڑتا ہے، کئی مرتبہ تو اسے درمیان میں ہی نماز ترک کر دینی پڑتی ہے، اسی شک وشبہ کی وجہ سے

(۱) تفصیلی فتویٰ اور تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: معذور کے لیے وضو کا حکم۔

غسل کے لیے بھی کافی دیر لگ جاتی ہے، بہت سی مرتبہ پیشاب سے فراغت کے بعد بھی اٹھتے بیٹھتے وقت قطرات نکل جاتے ہیں، تو ایسی مجبوری کی حالت اس کے لیے شریعت کا کیا حکم ہے؟ اور اس بیماری کی وجہ سے وہ ''دماغی مرض'' کا بھی شکار ہو گیا ہے۔

(عبد الحفیظ عبد الرزاق، ہند)

الجواب حامداً ومصلیاً

اگر ایک مرتبہ نماز کا پورا وقت اس حالت میں گذر جائے کہ پیشاب کا قطرہ برابر آتا رہے، اتنا بھی وقت نہ ملے کہ طہارت حاصل کر کے وقتیہ نماز ادا کی جا سکے، تو ایسے شخص کو شرعاً معذور کہا جاتا ہے، جس کے احکام دوسرے ہیں۔ [1] آپ کی ایسی کیفیت نہیں ہے؛ اس لیے آپ نماز کے لیے مستقل الگ کپڑے رکھیں، نماز سے پہلے پانی سے استنجاء کر کے لنگی یا ازار کو تبدیل کریں، پھر نماز پڑھیں۔ [2]

اگر نماز سے پہلے پیشاب کی ضرورت ہو، تو پندرہ، بیس منٹ پہلے فارغ ہو جایا کریں، تاکہ پیشاب کے جو قطرے باقی ہیں، وہ پیشاب کے بعد، پانچ دس منٹ میں خارج ہو جائیں، اس کے بعد پانی کے ذریعہ استنجاء کر کے نئی لنگی یا نیا ازار پہن کر نماز پڑھ لیں۔

شریعت میں عذر کے متحقق ہونے کے لیے بڑی کڑی، شرط ہے، آپ کی کیفیت ان شرائط کے مطابق نہیں ہے؛ اس لیے خواہ مخواہ شکوک وشبہات میں مبتلا ہو کر جماعت ترک نہ کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۷] وضو میں کلی کرتے وقت خون کا نکلنا عذر ہے یا نہیں؟

۵۳۶-سوال: پچھلے تین مہینے سے زید کو دانت سے خون نکلنے کی بیماری ہے، کافی علاج کروایا؛ لیکن اب تک افاقہ نہیں ہو سکا، وہ جب بھی وضوء کرنے کے لیے بیٹھتا ہے، تو کلی کرتے وقت دانتوں پر انگلی پھیرتے ہی خون نکلنا شروع ہو جاتا ہے اور اس قدر نکلتا ہے کہ خون تھوک پر غالب ہو جاتا ہے، پانچوں نمازوں کے وقت وضوء میں یہی صورت حال رہتی ہے کہ وضوء کی ابتداء سے لے کر اخیری عضو کے دھونے

(۱) نوٹ: معذور اور اس کے احکام کی تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو عنوان: معذور کے لیے وضو کا حکم۔

(۲) (هي) ستة (طهارة بدنه) أي جسده لدخول الأطراف في الجسد دون البدن فليحفظ (من حدث) بنوعيه، وقدمه... (وخبث) مانع كذلك (وثوبه... {وثيابك فطهر} [المدثر:۴]- فبدنه ومكانه أولى .الخ...(الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۴۰۲-۴۰۳، باب شروط الصلاة، كتاب الصلاة، ط: دار الفكر-بيروت)

تک خون بہتا رہتا ہے، تو اس حالت میں زید معذور شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اگر دانتوں کی بیماری کی وجہ سے خون بہتا ہے، تو کچھ دیر منہ میں ٹھنڈا پانی بھر کر رکھے، پھر جب خون بند ہو جائے، تب وضوء کر کے نماز پڑھے، اگر اس کے باوجود کلی کرنے کے بعد کئی گھنٹوں تک خون بند نہ ہوتا ہو، تو وضوء میں صرف کلی کو چھوڑ دے، کلی کرنا فرض نہیں ہے، اُس کے بغیر بھی وضوء درست ہو جائے گا اور بغیر کلی کے وضوء کر کے نماز پڑھ لے۔[1]

یہ شخص شرعاً معذور شمار نہیں ہوگا، البتہ اگر کلی کرنا چھوڑ دے اور صرف چہرہ دھونے سے بھی خون اتنی مقدار میں بہتا ہے کہ اُسے وضو کر کے ایک فرض نماز پڑھنے کا موقع نہیں ملتا، تو پھر یہ معذور کے حکم میں داخل ہوگا، اُس کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ خون کے بہنے کی حالت میں ایک وضوء سے جس قدر نماز پڑھنا چاہے، پڑھے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] کیا معذور فجر کے وضوء سے بعد فجر تلاوتِ قرآن اور اشراق پڑھ سکتا ہے؟

۷۵۳-سوال: میری عمر ستر (۷۰) سال کی ہے، وضو تھوڑی دیر بھی نہیں رہتا، چار رکعات کے درمیان تین یا چار مرتبہ ریح خارج ہو جاتی ہے، اب مجھے فجر کی نماز کے بعد اسی وضوء سے تلاوتِ قرآن اور اشراق پڑھنی ہے، تو کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اگر آپ کا وضو اتنی دیر تک نہیں رہتا کہ وضو کر کے ایک نماز مکمل ادا کر سکیں، تو آپ شرعاً معذور ہیں اور معذور کا حکم یہ ہے کہ ایک نماز کے لیے اس نے جو وضو کیا ہے، اس سے نماز کا وقت ختم ہونے تک جتنی نمازیں پڑھنا چاہے، پڑھ سکتا ہے، اور تلاوت بھی کر سکتا ہے، البتہ جیسے ہی نماز کا وقت ختم ہوگا، اس کا وضو بھی

---

(۱) ترك السنة لا يوجب فسادا ولا سهوا بل إساءة لو عامدا غير مستخف. الخ. (الدر المختار)
وقال ابن عابدين: (قوله لا يوجب فسادا ولا سهوا) أي بخلاف ترك الفرض فإنه يوجب الفساد، وترك الواجب فإنه يوجب سجود السهو. (قوله لو عامدا غير مستخف) فلو غير عامد فلا إساءة أيضا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۷۴، واجبات الصلاة، قبيل: مطلب في قولهم: الإساءة دون الكراهة، ط: بيروت)

(۲) معذور اور اس کے احکام کی تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو عنوان: معذور کے لیے وضو کا حکم۔

ٹوٹ جائے گا۔[۱]

لہٰذا آپ فجر کی نماز کے بعد اُسی وضو سے تلاوتِ قرآن کر سکتے ہیں؛ لیکن سورج نکلتے ہی آپ کا وضو ٹوٹ جائے گا، پھر اشراق کے لیے مستقل وضو کرنا ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] جن کو ودی کے قطرات ٹپکنے کی دائمی بیماری ہو، وہ کیا کرے؟

۵۳۸-سوال: اگر کسی شخص کو بہ حالت نماز ہی ودی کا قطرہ نکلنے لگے، تو کیا کرے؟ یہ دائمی تکلیف ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

نماز شروع کرنے کے بعد اگر قطرات نکلے ہوں، تو وضو ٹوٹ جائے گا، نجاست کو دھو کر وضو کرے، پھر نماز پڑھے؛ لیکن اگر کسی آدمی کو ایسی بیماری ہے کہ ہر ۵، ۱۰ رمنٹ میں قطرات نکلتے رہتے ہیں، اور اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ آدمی طہارت کے ساتھ نماز پڑھ سکے، تو وہ شرعاً معذور ہوگا، ایسا شخص نماز کے وقت میں وضو کرلے اور ایک وقت میں جتنی چاہے، نمازیں پڑھے۔ کسی کے شرعاً معذور ہونے کے بعد بقاء عذر کے لیے نماز کے وقت میں کم از کم ایک مرتبہ اس مرض کا پایا جانا ضروری ہے، اگر نماز کا کوئی وقت اس سے خالی گیا، یعنی اس میں ایک بار بھی وہ مرض نہیں پایا گیا، تو وہ شرعاً معذور نہیں رہے گا، اس مسئلہ کو کسی مفتی اور عالم سے پڑھوا کر سمجھ لیں۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] سلس البول کے معذور کی طہارت کا حکم

۵۳۹-سوال: میرے بھائی کو پیشاب کے قطرات کی بیماری ہے، جس کی وجہ سے بار بار پیشاب کے لیے جانا پڑتا ہے اور طہارت بھی دیر تک باقی نہیں رہ پاتی، کپڑا بھی ناپاک ہوجاتا ہے، تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟

(محمد حسین دیار)

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر ایک مرتبہ نماز کا پورا وقت اس حالت میں گذر جائے کہ پیشاب کا قطرہ برابر آتا رہے، اتنا بھی

(۱-۲) معذور اور اس کے احکام کی تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو عنوان: معذور کے لیے وضو کا حکم۔

وقت نہ ملے کہ طہارت حاصل کر کے وقتیہ نماز ادا کی جاسکے، تو ایسی صورت میں آپ کے بھائی شرعا معذور ہوں گے، ہر نماز کے وقت تازہ وضو کر کے نماز پڑھ لینا کافی ہوگا، پیشاب کی وجہ سے دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، اور کپڑے بدلنا بھی لازم نہیں ہوگا۔ آپ کے بھائی اس وقت تک معذور رہیں گے جب تک کہ نماز کا ایک کامل وقت اس عذر سے خالی نہ گذر جائے، یعنی معذور رہنے کے لیے مسلسل عذر کا رہنا ضروری نہیں ہے۔(۱)

لیکن اگر یہ کیفیت نہیں ہے، جیسا کہ سوال سے ظاہر ہو رہا ہے، تو لازم ہے کہ نماز کے لیے الگ کپڑا رکھیں، اور اسی کپڑے میں نماز پڑھتے رہیں، اگر نماز کے دوران پیشاب کے قطرے ٹپک جائیں اور قدر درہم سے زیادہ کپڑے میں لگ جائیں، تو کپڑے کے اس حصے کا دھونا ضروری ہوگا، جہاں پیشاب کے قطرے لگ گئے ہیں، پورے کپڑے کا دھونا ضروری نہیں ہے۔(۲)

نماز کے علاوہ دوسرے کپڑوں میں بھی جہاں تک ہو سکے، طہارت کا اہتمام کریں، اس کے باوجود بھی اگر کپڑے ناپاک ہو جائیں، تو گناہ نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] پیشاب کی تھیلی اور اس میں استنجاء کا حکم

۵۴۰-سوال: میرے ایک ساتھی نے پیٹ کا آپریشن کروایا ہے، آپریشن کے بعد پیشاب کی تھیلی لگادی گئی ہے، صورت حال یہ ہے کہ مکمل پیشاب اسی تھیلی میں ہوتا ہے اور چوں کہ اس نے پینٹ پہن

---

(۱) لا یجب علی المعذور غسل الثوب ونحوه، إذا کان بحال لو غسله تنجس قبل الفراغ من الصلاة. (اللباب في شرح الکتاب - عبد الغني بن طالب بن حمادة بن إبراهيم الغنیمي الدمشقي المیداني الحنفي (م:۱۲۹۸ھ): ۱/ ۴۷، باب الحیض، ت: محمد محیي الدین عبد الحمید، ط: المکتبة العلمیة - بیروت)

نوٹ: معذور اور اس کے احکام کی تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ کریں: معذور کے لیے وضو کا حکم۔

(۲) (وعفا) الشارع (عن قدر درهم) وإن کره تحریما، فیجب غسله، وما دونه تنزیها فیسن، وفوقه مبطل. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۱۶، باب الأنجاس)

وفي الشامیة: وقدر الدرهم لا یمنع، ویکون مسیئا وإن قل، فالأفضل أن یغسلها ولا یکون مسیئا. (رد المحتار: ۱/ ۳۱۷، باب الأنجاس، ط: دار الفکر - بیروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ - ۱۹۹۲ء)

رکھا ہے؛ اس لیے وہ تھیلی باہر سے نظر نہیں آتی ہے، تو اس حالت میں وہ فرض نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اور قرآن مجید کی تلاوت کرسکتا ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ پیشاب کے خاص مقام سے پیشاب نہیں اترتا ہے؛ بل کہ استنجاء کے لیے ایک مقام دوسرا بنا ہے، وہاں سے استنجا ہوتا ہے۔

الجواب حامداومصلیا:

تھیلی میں بھی کوئی بھی نجاست اترے گی، خواہ وہ کہیں سے اترے، اس سے وضوٹوٹ جائے گا؛ کیوں کہ بدن کے کسی بھی حصے سے نجاست نکلے، وضوٹوٹ جاتا ہے، نماز پڑھنے سے پہلے اس تھیلی کو صاف کریں، مقام کی صفائی کریں، پھر وضو کر کے نماز پڑھیں۔ [۱] البتہ جس شخص کو، ہر پانچ دس منٹ پر قطرات ٹپکتے ہی رہتے ہوں اور اتنی بھی فرصت نہ ملے کہ طہارت حاصل کر کے فرض نماز ادا کرسکے، تو وہ معذور کہلائے گا، نجاست کو صاف کر کے وضو کر کے نماز پڑھتا رہے، نجاست نکلتی رہے گی، تب بھی وضو نہیں ٹوٹے گا، جب تک نماز کا وقت باقی ہے، اس کا وضو باقی رہے گا؛ لہٰذا وقت میں جتنی نمازیں خواہ فرض ہوں یا نوافل پڑھ سکتا ہے اور تلاوت بھی کرسکتا ہے، وقت گزر جانے کے بعد وضوٹوٹ جائے گا، گرچہ کوئی ناقض وضو امر پیش نہ آیا ہو۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) "المعاني الناقضة للوضوء كل ما يخرج من السبيلين" لقوله تعالى: {أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ} [النساء: ۴۳] وقيل لرسول الله صلى الله عليه وسلم ما الحدث؟ قال: "ما يخرج من السبيلين" وكلمة ما عامة، فتتناول المعتاد وغيره" والدم والقيح إذا خرجا من البدن فتجاوزا إلى موضع يلحقه حكم التطهير الخ. (الهداية في شرح بداية المبتدي- المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۱۷، فصل في نواقض الوضوء، كتاب الطهارات، باب الوضوء. ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

(۲) معذور اور اس کے احکام کی تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ کریں: معذور کے لیے وضو کا حکم۔

نوٹ: ایسا شخص مسجد میں نہ آئے؛ کیوں کہ یہ حامل نجاست ہے۔

عن أبي هريرة - رضى الله تعالى عنه - عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: "أكثر عذاب القبر فى البول".

(مسند احمد: ۱۴/ ۷۷، حدیث نمبر: ۸۳۳۱)

باب الأنجاس

[نجاست کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب الأنجاس

نجاست کا بیان

[۱] اگر کپڑے یا بدن پر نجاست لگ جائے، تو کس قدر معاف ہے؟

۵۴۱-سوال: بدن یا کپڑوں پر لگی ہوئی نجاست کی کتنی مقدار معاف ہے؟

(ناصر پٹھان)

الجواب حامداً ومصلیاً:

نجاست کی مختلف قسمیں ہیں: نجاست غلیظہ، نجاست خفیفہ، پھر نجاست غلیظہ وخفیفہ میں بعض سائلہ (بہنے والی) نجاست ہیں اور بعض متجسدہ (ذی جرم)؛ ان تمام کے احکام الگ الگ ہیں۔ تفصیلی بیان ''تعلیم الاسلام''[۱] اور ''بہشتی زیور''[۲] میں موجود ہے۔ وہاں دیکھ لیں۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۲) تعلیم الاسلام: ۳/۴۶، ط: کتب خانہ عزیزیہ، جامع مسجد۔ دہلی۔

(۳) بہشتی زیور (اختری): ۲/ ۳-۲، ط: کتب خانہ اختری، متصل مدرسہ مظاہر علوم، سہارن پور۔

(۴) نجاست کی دو قسمیں ہیں: غلیظ اور خفیف، نجاست غلیظ میں پتلی اور بہنے والی نجاست (خون، آدمی کا پیشاب وغیرہ) کپڑے یا بدن میں لگ جائے، تو پھیلاؤ میں مساحت کف یعنی ہتھیلی کے گڑھے (ایک روپے کے سکے) کے برابر یا اس کے کم معاف ہے، اگر اس کو دھوئے بغیر کوئی نماز پڑھ لے، تو اس کی نماز ہو جائے گی؛ لیکن نہ دھونا اور اس کے ساتھ نماز پڑھتے رہنا مکروہ اور برا ہے۔ اور اگر نجاست غلیظ میں سے گاڑھی چیز (پاخانہ، مرغی کی بیٹ وغیرہ) لگ جائے، تو وزن میں ساڑھے چار ماشہ یا اس سے کم معاف ہے۔ اور اگر نجاست خفیفہ ہو، تو بدن یا کپڑے کے جس حصے میں لگی ہے، اگر اس کے چوتھائی سے کم ہو، تو معاف ہے اور اگر پورا چوتھائی یا اس سے زیادہ ہو، تو معاف نہیں ہے: (وعفي قدر الدرهم) وزنا في المتجسدة وهو عشرون قيراطا ومساحة في المائعة وهو قدر مقعر الكف داخل مفاصل الأصابع كما وفقه الهندواني وهو الصحيح فذلك عفو (من) النجاسة (المغلظة) فلا يعفى عنها إذا زادت على الدرهم مع القدرة على الإزالة (و) عفي قدر (ما دون ربع الثوب) الكامل (أو البدن) كله على الصحيح من الخفيفة لقيام الربع مقام الكل كمسح ربع الرأس. (مراقي الفلاح، ص: ۳۷، كتاب الطهارة، باب الأنجاس والطهارة منه، ط: زکریا، دیوبند)

[۲] نجاست کی کتنی مقدار معاف ہے؟

۵۴۲-سوال: ایک شخص کو مسا کی بیماری ہے، جس کی وجہ سے کبھی کبھی اس کے کپڑے خون سے خراب ہو جاتے ہیں، غفلت میں یا عدم اطلاع کی وجہ سے کبھی خون سے آلودہ کپڑے میں ہی وہ نماز ادا کر لیتا ہے، تو کیا ایسے کپڑوں میں نماز ہو جائے گی؟

الجواب حامداو مصلیا:

جس وقت خون دکھائی دے گا، اس وقت سے کپڑے کی ناپاکی کا حکم لگایا جائے گا۔[1]

اگر ہتھیلی کی مقدار کے برابر یا اس سے کم حصہ خون سے آلودہ ہے، تو معاف ہے، اس حالت میں نماز ہو جائے گی، اس سے زائد معاف نہیں ہے۔[2] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] انسان کے پاخانہ سے گیس حاصل کرنا اور اس سے کھانا پکانا

۵۴۳-سوال: حضرت مفتی صاحب! سوال یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں ''گیس گوبر'' کا پلان دو تین جگہ جاری ہے، (جس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک کنواں کھود کر اس میں جانوروں کے فضلات ڈالتے ہیں اور اس سے گیس تیار کیے جاتے ہیں) اب بعض لوگ جانوروں کے گوبر کے ساتھ قریب میں بیت الخلاء بنا کر انسان کا پاخانہ بھی اس کنویں میں ڈالنے کا ارادہ کر رہے ہیں، تو ایسے گیس سے فائدہ اٹھانا اور اس سے کھانا پکانا' جو جانوروں اور انسان کے گوبر اور پاخانہ سے بنا ہو، شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ اس گیس سے پکایا ہوا کھانا حلال ہوگا یا حرام؟ جواب عنایت فرمائیں، مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداو مصلیا:

انسان اور جانور کے فضلہ سے گیس حاصل کرنا اور اس سے کھانا پکانا جائز ہے، اس میں کوئی حرج

---

(۱) (ویحکم بنجاستها) مغلظة (من وقت الوقوع إن علم، وإلا فمذ يوم وليلة إن لم ينتفخ ولم يتفسخ) وهذا (في حق الوضوء) والغسل؛ ... أما في حق غيره كغسل ثوب فيحكم بنجاسته في الحال. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۱۹-۲۱۸، کتاب الطهارة، فصل في البئر، ط: دار الفكر - بيروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء)

(۲) تفصیلی مسئلہ اور تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: اگر کپڑے یا بدن پر نجاست لگ جائے تو کس قدر معاف ہے؟

نہیں، اور اس سے پکایا ہوا کھانا بھی حلال ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] اگر سالن میں سڈاسیہ نامی کیڑا گر جائے، تو کیا حکم ہے؟

۵۴۴-سوال: پکے ہوئے سالن میں اگر سڈاسیہ (ایک قسم کا کیڑا، جو گندگی میں رہتا ہے، لال رنگ کا ہوتا ہے، رائی کی پیداوار کے موسم میں بہ کثرت نظر آتا ہے) گر کر مر جائے اور آدھے گھنٹے تک سالن میں رہے، اس کے بعد اسے نکالا جائے، تو وہ سالن پاک رہے گا یا ناپاک ہو جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جن کیڑے مکوڑے (حشرات الارض) میں دم مسفوح (بہنے والا خون) نہیں ہوتا ہے، وہ پاک ہے، اگر چہ وہ کیڑا ناپاکی سے پیدا ہوتا ہو، یعنی پانی وغیرہ سیال چیز میں اس کے گرنے سے وہ چیز ناپاک نہ ہوگی۔[۲] لہٰذا سڈاسیہ نامی کیڑے میں اگر دم مسفوح نہیں ہے، تو سالن میں گر کر مر جانے سے وہ سالن ناپاک نہیں ہوگا۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] الکحل آمیز سینٹ کا حکم

۵۴۵-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ: آج کل بیرونی ممالک کے تیار شدہ سینٹ بہ کثرت استعمال ہوتے ہیں، جن میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے، جسم پر چھڑکنے سے برودت بھی محسوس ہوتی ہے، جسم پر یا کپڑے پر داغ نہیں لگتا؛ بل کہ وہ بہت جلد اڑ جاتا ہے، البتہ خوشبو

---

(۱) الحمار أو الخنزير إذا وقع في المملحة فصار ملحا أو بئر البالوعة إذا صار طينا، يطهر عندهما خلافا لأبي يوسف - رحمه الله -. كذا في محيط السرخسي... جعل الدهن النجس في الصابون يفتى بطهارته؛ لأنه تغير. كذا في الزاهدي. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۴۵، كتاب الطهارة، الباب السابع في النجاسة وأحكامها، ط: دار الفكر ☆ مزید دیکھیے: رد المحتار: ۱/ ۳۱۶، باب الأنجاس، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) وفي الوهبانية: دود القز وماؤه وبزره وخرؤه طاهر كدودة متولدة من نجاسة. (الدر مع الرد: ۱/ ۱۸۴، كتاب الطهارة: باب المياه، ط: دار الفكر- بیروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ- ۱۹۹۲ء)

(۳) لیکن اگر اس کے بدن پر نجاست لگی ہوئی ہو اور اسی حالت میں وہ سالن میں گرا ہو، تو سالن ناپاک ہو جائے گا، چناں چہ علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں: (قوله: كدودة متولدة من نجاسة) فإنها طاهرة ولو خرجت من الدبر، والنقض إنما هو لما عليها لا لذاتها. (رد المحتار: ۱/ ۱۸۴، كتاب الطهارة: باب المياه، ط: دار الفكر- بیروت، طبع دوم: ۱۴۱۲ھ- ۱۹۹۲ء)

باقی رہتی ہے، یہ معلوم نہیں ہے کہ الکحل کس چیز سے تیار کی جاتی ہے، لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ اس کا استعمال حرام ہے، شرعاً اس کے استعمال کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یا مشتبہ جان کر چھوڑ دینا صرف اولیٰ ہے، جو بھی ہو، حتمی جواب عنایت فرمائیں؛ کیوں کہ اس کے استعمال اور کاروبار کے سلسلے میں لوگ شک میں مبتلا ہیں۔

المستفتیان: ممبئی کے عطر فروش

الجواب حامداومصليا:

الکحل کی پاکی اور ناپاکی کا مدار اس کے اجزائے ترکیبی پر ہے۔ اگر ''الکحل'' انگور سے بنا ہے، تب تو اس کے شراب (خمر) اور ناپاک ہونے پر علماء کا اتفاق ہے؛ کیوں کہ انگور سے تیار ہونے والی منشیات 'خمر' ہیں، جو حرام بھی ہیں اور ناپاک بھی۔ (۱)

انگور کے علاوہ دوسرے نباتات سے اگر تیار کیا گیا ہو، تو اس کے بارے میں اس بات پر تو اتفاق ہے کہ اگر نشہ آنے کے بہ قدر پیا جائے، تو حرام اور گناہ ہے؛ لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ خمر نہیں ہے؛ اس لیے نشہ کے بہ قدر اس کا پینا تو ناجائز ہے؛ لیکن وہ خمر کی طرح ناپاک نہیں، گویا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جو ''الکحل'' انگور کے علاوہ کسی اور شئے سے حاصل کیا گیا ہو، وہ ناپاک نہیں ہے، جمہور فقہاء کے نزدیک تمام نشہ آور کا حکم یکساں ہے اور سب خمر میں داخل ہیں اور ناپاک ہیں، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں اور حنفیہ کے یہاں فتویٰ بھی ان ہی کے قول پر ہے۔ (۲)

(۱) أما الخمر فيتعلق بها أحكام؛ (منها) أنه يحرم شرب قليلها و كثيرها إلا عند الضرورة لأنها محرمة العين فيستوي في الحرمة قليلها و كثيرها... (ومنها) أنها نجسة غليظة حتى لو أصاب ثوبا أكثر من قدر الدرهم يمنع جواز الصلاة. (: بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ۵/ ۱۱۲– ۱۱۳، بيان أحكام الأشربة، كتاب الأشربة، ط: دار الكتب العلمية، الطبعة الثانية: ۱۴۰۶ھ–۱۹۸۶ء)

(۲) قال الحصكفي: (وحرمها محمد) أي الأشربة المتخذة من العسل والتين ونحوهما قاله المصنف (مطلقا) قليلها و كثيرها. (وبه يفتى) ذكره الزيلعي وغيره، واختاره شارح الوهبانية، وذكر أنه مروي عن الكل... وفي طلاق البزازية: وقال محمد ما أسكر كثيره فقليله حرام، وهو نجس أيضا. قال ابن عابدين: (قوله وبه يفتى) أي بقول محمد، وهو قول الأئمة الثلاثة لقوله - عليه الصلاة والسلام - كل مسكر خمر و كل مسكر حرام، رواه مسلم، وقوله - عليه الصلاة والسلام - " «ما أسكر كثيره فقليله حرام» رواه أحمد وابن ماجة والدارقطني وصححه (قوله غيره) كصاحب الملتقى والمواهب والكفاية والنهاية والمعراج وشرح المجمع وشرح درر البحار والقهستاني والعيني، حيث قالوا الفتوى في زماننا بقول محمد لغلبة الفساد. (رد المحتار مع الدر المختار: ۶/ ۴۵۴، كتاب الأشربة، ط: دار الفكر - بيروت)

الغرض الکحل اگر انگور سے تیار شدہ ہے، تب تو وہ بالاتفاق حرام اور ناپاک ہے اور نجاست غلیظہ ہے، سینٹ کے طور پر اس کا استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں ہوگا؛ اگر جسم یا کپڑے پر درہم کے بہ قدر لگ جائے، تو اس کے ساتھ نماز درست نہیں ہوگی۔

لیکن اگر الکحل انگور کے علاوہ کسی اور چیز سے حاصل کیا گیا ہو، تو بھی وہ ناپاک ہی ہوگا، اور اس کا سینٹ کے طور پر استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا، تاہم اس کے پاک اور ناپاک ہونے میں اختلاف ہے، اس لیے یہ نجاست خفیفہ کے حکم میں ہوگا، اگر جسم یا کپڑے میں لگ جائے، تو جس عضو میں لگا ہو، اس عضو کی چوتھائی مقدار یا اس سے زائد ہو، تو اس کا دھونا ضروری ہوگا، یہ تو اصل مسئلہ ہے۔ (٣)

لیکن تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ الکحل اور اسپرٹ شراب کے ماسوا دوسری چیزوں سے بھی بنائی جاتی ہے، خصوصاً انگور کئی ممالک میں کافی مہنگا ہوتا ہے؛ اس لیے غالب گمان ہے کہ سینٹ میں اس کو استعمال نہیں کرتے ہوں گے۔ موجودہ دور میں کمپنی کے لیے اپنے پروڈکٹ کے اجزائے ترکیبی کی تفصیل حکومت کو پیش کرنا ضروری ہوتا ہے؛ اس لیے بمبئی کے تاجرانِ عطر سینٹ کے اجزاء ترکیبیہ کو معلوم کریں، تا کہ حتمی فیصلہ کیا جا سکے۔ (٤) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ
١٠ جنوری، ١٩٨٣ء

---

(٣) و بهذا يتبين حكم الكحول المسكرة (AL COHALS) التي عمت بها البلوى اليوم، فإنها تستعمل في كثير من الأدوية، و العطور، و المركبات الأخرى، فإنها إن اتخذت من العنب أو التمر، فلا سبيل إلى حلتها أو طهارتها، و إن اتخذت من غيرهما، فالأمر فيها سهل على مذهب أبي حنيفة رحمه الله، و لا يحرم استعمالها للتداوي أو لأغراض مباحة أخرى ما لم تبلغ حد الإسكار، لأنها إنما تستعمل مركبة مع المواد الأخرى، و لا يحكم بنجاستها أخذا بقول أبي حنيفة رحمه الله تعالى.

و إن ان معظم الكحول التي تستعمل اليوم في الأدوية و العطور و غيرهما لا تتخذ من العنب أو التمر، و إنما تتخذ من الحبوب أو القشور أو البترول و غيره كما ذكرنا في باب بيع الخمر من كتاب البيوع، و حينئذ هناك فسحة في الأخذ بقول أبي حنيفة عند عموم البلوى، والله سبحانه أعلم. (تكملة فتح الملهم: ٣/ ٦٠٨، كتاب الأشربة، باب تحريم الخمر . . . ، ط: مكتبة دار العلوم - كراتشي)

(٤) حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ نے الکحل سے سلسلے میں لکھا ہے: ابتدائی دور میں الکحل جوہر شراب یا روح شراب (شراب کی تلچھٹ) ہوتا تھا؛ اس لیے فقہاء نے اس کو شراب کا حکم دیا تھا، اور اس کا استعمال اور دوا میں بھی استعمال ناجائز قرار دیا تھا، مگر اب "الکحل" سائنٹفک طریقے سے بننے لگی ہے کہ وہ شراب نہیں رہتی؛ بل کہ سرکہ کے حکم میں ہو جاتی ہے؛ اس لیے جب تک دلائل شرعیہ سے یقین نہ ہو جائے کہ الکحل وہی شراب کا جوہر یا تلچھٹ ہے، اس وقت تک اس کے ناپاک و حرام ہونے کا اور اس کے دوا وغیرہ=

[۶] کپڑوں میں سینٹ کا اسپرے کرنا اور اُن کپڑوں میں نماز پڑھنا

۵۴۶-سوال: جب سینٹ کا کپڑوں پر اسپرے (چھڑکاؤ) کیا جاتا ہے، تو اُس کی اسپرٹ اور گیس کچھ ہی دیر میں ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے اور صرف خوشبو باقی رہ جاتی ہے، اس طرح کے اسپرے کیے ہوئے کپڑوں میں نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

اگر انگور، منقی اور کھجور سے بنی ہوئی سینٹ کا اسپرے کیا گیا ہو، تو کپڑے ناپاک ہو جائیں گے، اس لیے اُس کا استعمال جائز نہیں ہے، اگر ان اشیاء کے سوا دوسری اشیاء سے سینٹ تیار ہوا ہے، جو عطر میں لگایا جاتا ہے، تو اُس کا استعمال جائز ہے اور اُن کپڑوں میں نماز بھی صحیح ہو جائے گی، بشرطیکہ سینٹ میں اور کوئی ناپاک چیز نہ گر جائے۔ (امداد الفتاویٰ)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] ہم بستری کے بعد پہنے گئے پاک کپڑوں کا حکم

۵۴۷-سوال: ٹھنڈی کے موسم میں میاں بیوی نے مجامعت (ہم بستری) کے بعد اپنے مخصوص

= میں استعمال کی ممانعت کا عدم جواز کا حکم نہیں دے سکتے اور نہ استعمال کے بعد یا جسم پر لگنے کے بعد تطہیر کا حکم دینا ضروری کہہ سکتے ہیں؛ البتہ تقویٰ الگ بات ہوگی اور تقاضائے احتیاط کہا جائے گا، نہ کہ فتویٰ۔ (منتخبات نظام الفتاویٰ: ۳/۵ ۰ ۴، کتاب الحظر والاباحۃ، ایفا پبلی کیشنز، دہلی)

اسلامک فقہ اکیڈمی-انڈیا نے اس سلسلے میں سیمنار کا انعقاد کیا تھا، بحث و تمحیص اور غور و خوض کے بعد جو تجویز منظور ہوئی، وہ یہ ہے:

۳-عطریات میں جو الکحل استعمال ہوتا ہے، فنی ماہرین کی تحقیق کے مطابق وہ نشہ آور نہیں ہے، اس لیے یہ ناپاک نہیں ہے۔ (نئے مسائل اور علماء ہند کے فیصلے: ۱۵۳، طبی مسائل۔ الکحل، ط: ایفا پبلی کیشنز، دہلی)

[۱] امداد الفتاویٰ (۱/ ۷ ۱۳، کتاب الطہارت، تفصیل در حکم اسپرٹ، ط: مکتبہ دار العلوم، کراچی) میں ہے:

سوال: انگریزی دوا، جو پینے کی ہوتی ہے، اس میں عموماً اسپرٹ ملائی جاتی ہے۔ (یہ قسم ہے اعلیٰ درجے کے شراب کی، شراب کا ست ہے) تو جب اس امر کا یقین ہو چکا اور مسلم ہے، تو انگریزی (ہسپتال) کی دوا پینا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: اسپرٹ اگر عنب و زبیب و رطب و تمر سے حاصل نہ کی گئی ہو تو اس میں گنجائش ہے للاختلاف، ورنہ گنجائش نہیں للاتفاق۔

۲۱ رمحرم، ۱۳۳۴ھ (حوادث رابع، ص: ۹۲)

نوٹ: مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں عنوان: الکحل آمیز سینٹ کا حکم۔

مقام اور نجاست (منی) کو کپڑے وغیرہ سے صاف کر لیا، پھر دونوں نے پاک کپڑے پہن لیے، تو کیا یہ پاک کپڑے مخصوص مقام یا موضع منی (جس جگہ منی لگی ہوئی تھی) سے لگنے کی وجہ سے ناپاک ہو جائیں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

میاں بیوی کسی بھی موسم میں ہم بستری سے فراغت کے بعد نجاست (منی) صاف کر کے پاک کپڑے پہن لیں اور وہ پاک کپڑا اس ناپاک جگہ پر لگ جائے، ناپاکی خشک ہو اور اس کا اثر اس پاک کپڑے پر نہ آیا ہو، تو وہ کپڑا ناپاک نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اس صورت میں پاک کپڑے کے ناپاک ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے، البتہ عورت کو اس کی طرف خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے کہ مخصوص مقام کو صاف کر لینے کے بعد دوبارہ اس مقام سے کوئی رطوبت (نجاست) نکل کر پہنے ہوئے کپڑے پر نہ لگے، ورنہ کپڑا ناپاک ہو جائے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ عرینہ کے چند لوگوں کو پیشاب پینے کے حکم کیوں دیا؟

۵۴۸-سوال: بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چند افراد مدینہ منورہ آئے تھے، ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئی، اور مرض الجواء (مرض استقاء) لاحق ہو گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بہ طور علاج اونٹ کا پیشاب پینے کا حکم دیا تھا۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ حالاں کہ متعدد احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، اور پیشاب سے نہ بچنے والوں کے سلسلے میں فرمایا ہے کہ عموماً عذاب قبر، اسی سے ہوتا ہے۔ تو یہ بات کیسے ممکن ہے کہ اتنی سخت وعیدوں کے باوجود آپ نے ان لوگوں کو پیشاب پینے کا حکم دیا ہو؟۔

الجواب حامداً ومصلیاً

یہ صحیح ہے کہ قبیلۂ عرینہ اور عکل کے چند لوگ مدینہ منورہ آئے، مدینہ کی آب وہوا ان کو راس نہیں آئی

---

(۱) إذا نام الرجل على فراش فأصابه مني ويبس فعرق الرجل وابتل الفراش من عرقه إن لم يظهر أثر البلل في بدنه لا يتنجس وإن كان العرق كثيرا حتى ابتل الفراش ثم أصاب بلل الفراش جسده فظهر أثره في جسده يتنجس بدنه كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۴۷، كتاب الطهارت الباب السابع في النجاسة وأحكامها- ط: دار الفكر، بيروت، الطبعة الثانية)

مزید دیکھیے: المحيط البرهاني في الفقه النعماني: ۱/ ۱۹۰، كتاب الطهارات، الفصل السابع في النجاسات وأحكامها، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية، بيروت- لبنان)

اوران کے پیٹوں میں بیماری پیدا ہوگئی، انہوں نے اس کی شکایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اونٹوں کا پیشاب اور دودھ پینے کا حکم دیا، انہوں نے پیا تو اللہ کے حکم سے وہ لوگ اچھے ہوگئے۔ بخاری شریف کی روایت ہے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ عکل اور عرینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کا کلمہ پڑھا اور عرض کیا: اے اللہ کے نبی! ہم مویشیوں والے تھے، کاشت کاری کرنے والے نہیں تھے۔ اور مدینہ کی آب وہوا ان لوگوں کو راس نہ آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے لیے اونٹوں کا ایک گلہ اور چرواہا دیے جانے کا حکم دیا کہ ان جانوروں کے ساتھ رہیں اور ان کا دودھ اور پیشاب پییں، وہ لوگ روانہ ہوئے، یہاں تک کہ جب حرہ کے اطراف میں پہنچے، تو مرتد ہوگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہے کو قتل کرڈالا اور اونٹوں کو لے بھاگے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو ان کے پیچھے چند آدمی بھیجے (جب وہ لوگ پکڑ کر لائے گئے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق سزا کا حکم دیا، تو ان کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی اور ان کے ہاتھ کاٹ دیے گئے اور حرہ کے علاقہ میں چھوڑ دیے گئے، یہاں تک کہ سب کے سب اسی حال میں مرگئے اور جہنم رسید ہوگئے۔ (۱)

اس روایت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو اونٹ کا پیشاب پینے کا حکم دیا ہے، جب کہ ایک روایت میں ہے کہ پیشاب سے بچو؛ کیوں کہ عموماً عذاب قبر اسی سے ہوتا ہے۔ (۲)

بہ ظاہر ان دونوں روایتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے؛ حالاں کہ احناف کا مسلک یہ ہے کہ انسان

---

(۱) أن ناسا من عكل وعرينة قدموا المدينة على النبي -صلى الله عليه وسلم- وتكلموا بالإسلام، فقالوا يا نبي الله: إنا كنا أهل ضرع، ولم نكن أهل ريف، واستوخموا المدينة، فأمر لهم رسول الله -صلى الله عليه وسلم- بذود وراع، وأمرهم أن يخرجوا فيه فيشربوا من ألبانها وأبوالها. الخ (صحيح البخاري: ۲/ ۶۰۲، رقم: ۴۱۹۲ و ۵۷۲۷، باب قصة عكل وعرينة، كتاب المغازي، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۵۷، رقم الحديث: ۹- ۱۴(۱۶۷۱)، باب حكم المحاربين والمرتدين، كتاب القسامة والمحاربين والقصاص والديات، عن أنس رضي الله عنه)

(۲) ۱۔ عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلي الله عليه وسلم قال: استنزهوا من البول؛ فإن عامة عذاب القبر منه. قال الدار قطني: الصواب مرسل. (سنن الدار قطني: ۱/ ۲۳۳، رقم الحديث: ۴۶۴، باب نجاسة البول والأمر بالتنزه منه، ط: موسسۃ الرسالۃ، بیروت، لبنان، طبع اول: ۱۴۲۴ھ- ۲۰۰۴ء)

۲۔ عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أكثر عذاب القبر في البول. (مسند الإمام أحمد بن حنبل (م: ۲۴۱ھ): ۱۴/ ۷۷، رقم الحديث: ۸۳۳۱، ت: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة، طبع اول: ۱۴۲۱ھ- ۲۰۰۱ء)

(خواہ بالغ ہو یا نابالغ، لڑکا ہو یا لڑکی) اور جانور کا پیشاب ناپاک ہے۔(۳) گویا ''حدیث عرینہ'' جانور کے پیشاب کی نجاست کے سلسلے میں احناف کے خلاف ہے؛ اس لیے اس کا جواب حسب ذیل طریقوں سے دیا جاتا ہے:

(۱) یہ روایت [جس میں اونٹ (مراد: ماکول اللحم یعنی حلال جانور) کا پیشاب پینے کا حکم دیا گیا ہے] منسوخ ہے، پہلے ماکول اللحم کا پیشاب پاک تھا، بعد میں اس کو ناپاک قرار دے کر اس سے بچنے کا حکم دیا گیا، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ کی روایت ہے کہ: تم پیشاب سے بچو، کیوں کہ قبر کا اکثر عذاب پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مورخین کی تصریح کے مطابق عرنیین کا واقعہ سن چھ (۶) ہجری میں پیش آیا تھا، جب کہ حدیث "استنزھوا من البول" کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ نے سات ہجری میں اسلام قبول کیا ہے؛ اس لیے ان کی یہ روایت لازماً مذکورہ واقعہ کے بعد ہوگی، لہٰذا یہ روایت اُس واقعہ میں ثابت ہونے والے حکم کے لیے ناسخ ہوگی، نیز نسخ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اسی حدیث میں مذکور ہے کہ آپ نے عرنیین کے مثلہ کا حکم دیا، حالاں کہ مثلہ باتفاق منسوخ ہے؛ اس لیے یہ حکم بھی منسوخ ہوگا۔ تاہم یہ جواب بہتر نہیں ہے۔(۴)

(۲) پیشاب کا اصل حکم تو یہی ہے کہ وہ ناپاک ہے، البتہ کوئی حاذق اور ماہر طبیب یہ کہے کہ تمہاری بیماری کی شفا پیشاب کے پینے میں ہے، تو اس کے کہنے پر پیشاب کا پینا جائز ہوگا؛ کیوں کہ حرام چیز سے یقینی صحت و شفاء کے وقت علاج و معالجہ جائز ہے۔ اس واقعہ میں بھی نبی کریم ﷺ کو بہ ذریعہ وحی یہ بات بتلا دی گئی تھی کہ ابوال ابل کو پیے بغیر ان کی شفا اور زندگی ممکن نہیں ہے، گویا کہ وہ لوگ مضطر کے حکم میں آ گئے تھے اور مضطر کے لیے پیشاب کا پینا جائز ہے۔ اس جواب کو علامہ عینیؒ نے جواب شافی کہا ہے۔(۵)

---

(۳) قال العيني: وقال أبو حنيفة والشافعي وأبو يوسف وأبو ثور وآخرون كثيرون: الأبوال كلها نجسة. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵ھ): ۳/۱۵۴، باب أبوال الإبل والدواب والغنم ومرابضها، كتاب الوضوء، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت☆

تفصیل کے لیے دیکھیے: بدائع الصنائع: ۱/۶۰-۶۱، فصل في الطهارة الحقيقية، كتاب الطهارة، ط: دار الكتب العلمية، ۱۹۸۶ء۔

(۴) درس ترمذی: ۱/۲۹۱، باب ماجاء فی بول مایؤکل لحمہ، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند

(۵) والجواب المقنع في ذلك أنه - عليه الصلاة والسلام - عرف بطريق الوحي شفاهم، والاستشفاء بالحرام=

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پیشاب پینے کی اجازت نہیں دی تھی؛ بل کہ پیشاب کو صرف بدن پر لگانے اجازت دی تھی۔[۱]

(۴) اللہ کے علم کے مطابق وہ لوگ حقیقت میں مسلمان نہیں تھے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ ذریعہ وحی معلوم ہوگیا تھا کہ ان کی موت کفر کی حالت میں ہوگی، جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا تھا؛ اور اس بات کا امکان ہے کہ کافر کو حرام شئے سے شفا مل جاتی ہو؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پیشاب پینے کا حکم دیا تھا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ (۷/۱۰/۱۹۷۷ء)

[۹] شیر خوار بچے کا پیشاب ناپاک ہے

۵۴۹-سوال: شیر خوار بچے کا پیشاب پاک ہے یا ناپاک؟ امام شافعیؒ کا کیا مسلک ہے؟ کیا ایسے کپڑے میں نماز صحیح ہوجائے گی، جس پر شیر خوار بچے نے پیشاب کیا ہو؟

الجواب حامداومصلیا:

شیر خوار بچے کا پیشاب ناپاک ہے۔[۳] امام شافعی نے بھی اس کو ناپاک قرار دیا ہے۔[۴] رسول اللہ

= جائز عند التيقن بحصول الشفاء، كتناول الميتة في المخمصة، والخمر عند العطش، وإساغة اللقمة، وإنما لا يباح ما لا يستيقن حصول الشفاء به. وقال ابن حزم: صح يقينا أن رسول الله صلى الله عليه وسلم إنما أمرهم بذلك على سبيل التداوي من السقم الذي كان أصابه، وأنهم صحت أجسامهم بذلك، والتداوي منزلة ضرورة. وقد قال عز وجل: {إلا ما اضطررتم إليه} (الأنعام:۱۱۹) فما اضطر المرء إليه فهو غير محرم عليه من المآكل والمشارب. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م:۸۵۵هـ): ۳/ ۱۵۴-۱۵۵، باب أبوال الابل والدواب والغنم ومرابضها، كتاب الوضوء، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(۲) وقال شمس الائمة: حديث أنس، رضي الله تعالى عنه، قد رواه قتادة عنه أنه رخص لهم في شرب ألبان الإبل. ولم يذكر الأبوال، وإنما ذكره في رواية حميد الطويل عنه، والحديث حكاية حال، فإذا دار بين أن يكون حجة أو لا يكون حجة سقط الاحتجاج به. (حوالہ سابق: ۳/ ۱۵۵)

(۷) أو لأنهم كانوا كفارا في علم الله تعالى ورسوله- عليه السلام- علم من طريق الوحي أنهم يموتون على الردة، ولا يبعد أن يكون شفاء الكافر بالنجس. (حوالہ سابق: ۳/ ۱۵۵)

(۱) في الدر المختار: وبول غير مأكول ولو من صغير لم يطعم. وقال ابن عابدين: (قوله: لم يطعم) بفتح الياء أي: لم يأكل فلا بد من غسله. (رد المحتار: ۱/ ۳۱۸، باب الأنجاس، ط: بيروت)

فالغليظة كخمر... بول ما لا يؤكل لحمه كالآدمي ولو رضيعا. (مراقي الفلاح) وقال الطحطاوي (م: ۱۲۳۱هـ): =

ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ پیشاب سے نہ بچنا عذابِ قبر کا موجب ہے۔[۱]

لہٰذا بدن یا کپڑے کے جس حصہ میں پیشاب معفوعنہ (قابلِ معافی) مقدار سے زائد لگا ہو، تو اس کو دھونا ضروری ہے، ورنہ نماز درست نہیں ہوگی۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= (قوله: ولو رضيعا) لم يطعم، سواء كان ذكرا أو انثى. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح، ص: ۱۵۴، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت-لبنان)

(۴) بول الصبي والصبية اللذين لم يطعما الطعام نجس، كبول الذي يطعم الطعام، . . . إذا ثبت هذا: فلا خلاف على المذهب: أنه يجب الغسل منهما، ولكنهما مختلفان في كيفية الغسل: فيجزئ في بول الغلام الذي لم يطعم الطعام النضح، وهو: أن يبل موضعه بالماء، وإن لم ينزل عنه. وفي بول الصبية وجهان، ومنهم من يقول: هما قولان: أحدهما: يجزئ فيه النضح، كبول الغلام. والثاني: يجب غسله، كسائر الأبوال. وهو المشهور. (البيان في مذهب الإمام الشافعي-أبو الحسين يحيى بن أبي الخير بن سالم العمراني اليمني الشافعي (م: ۵۵۸ھ): ۱/ ۴۳۷، كتاب الطهارة، باب إزالة النجاسة، مسألة: بول الغلام الصغير، ت: قاسم محمد النوري، ط: دار المنهاج - جدة ☆ مزید دیکھیے: الحاوي الكبير في فقه مذهب الإمام الشافعي وهو شرح مختصر المزني-أبو الحسن علي بن محمد بن محمد بن حبيب البصري البغدادي، الشهير بالماوردي (م: ۴۵۰ھ): ۲/ ۲۴۸، كتاب الصلاة، باب الصلاة بالنجاسة ومواضع الصلاة من مسجد وغيره، ت: الشيخ علي محمد معوض - الشيخ عادل أحمد عبد الموجود، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ نهاية المطلب في دراية المذهب-عبد الملك بن عبد الله بن يوسف بن محمد الجويني، أبو المعالي، ركن الدين، الملقب بإمام الحرمين (م: ۴۷۸ھ): ۲/ ۳۱۲ و ۳۱۳، رقم المسئلة: ۱۰۸۸، كتاب الصلاة، باب الصلاة بالنجاسة، ت: أ. د/ عبد العظيم محمود الديب، ط: دار المنهاج ☆ أسنى المطالب في شرح روض الطالب - زكريا بن محمد بن زكريا الأنصاري، زين الدين أبو يحيى السنيكي (م: ۹۲۶ھ): ۱/ ۲۰، كتاب الطهارة، باب: بيان إزالة النجاسة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

اس صفحہ کا حاشیہ:

(۱) عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: "أكثر عذاب القبر في البول". (مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۱۴/ ۷۷، رقم الحديث: ۸۳۳۱، مسند أبي هريرة رضي الله عنه، ت: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة، قال المحقق: إسناده صحيح على شرط الشيخين)

مزید دیکھیے: مسند البزار المنشور باسم البحر الزخار - أبو بكر أحمد بن عمرو بن عبد الخالق بن خلاد بن عبيد الله العتكي المعروف بالبزار (م: ۲۹۲ھ): ۱۶/ ۱۱۹، رقم: ۹۲۰۱، ط: مكتبة العلوم والحكم - المدينة المنورة.

☆ الشريعة- أبو بكر محمد بن الحسين بن عبد الله الآجُرِّيُّ البغدادي (م: ۳۶۰ھ): ۳/ ۱۲۸۲، رقم: ۸۵۴، باب التصديق والإيمان بعذاب القبر، ت: د. عبد الله بن عمر بن سليمان الدميجي، ط: دار الوطن - الرياض / السعودية.

(۲) دیکھیے: حاشیہ نمبر: ۱۔

[۱۰] بیمار آدمی کا ایسے کپڑوں میں نماز پڑھنا، جس میں نجاست کا گمان ہو

۵۵۰-سوال: ایک بیمار آدمی ہے، جس کے کپڑے اور بستر وغیرہ کے ناپاک ہونے کا شک ہے، بدلنے میں تکلیف ہوتی ہے، تو کیا اسی ناپاک بستر میں نماز پڑھ سکتا ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

محض شک کی بنیاد پر نماز چھوڑنے کی ضرورت نہیں، غلبۂ ظن ناپاکی کا ہو، تو بستر اور کپڑے بدلنا ضروری ہے، ورنہ ضرورت نہیں، اگر بستر ناپاک ہو اور جگہ متعین ہو کہ بعض جگہ پر ناپاکی ہے، تو اگر بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھ رہا ہو، تو صرف بیٹھنے کی جگہ کا پاک ہونا ضروری ہے، سو کر نماز پڑھ رہا ہو تو بستر کا جو حصہ بدن کے ساتھ لگ رہا ہو، اس کا پاک ہونا ضروری ہے، اگر ایسا نہ ہو، بل کہ پورا بستر ناپاک ہو، تو بستر کا بدلنا یا نماز کی جگہ پر موٹا کور (مصلّی) بچھا دینا کافی ہے، ناپاک جگہ پر نماز جائز نہیں ہے، بیمار کو اٹھا کر نیچے سے بستر بدل دینا چاہیے۔

پہنے ہوئے کپڑے اگر ناپاک ہیں، تو اتار لینا ضروری ہے، کپڑے میں نجاست، پیشاب، خون یا پاخانہ ہو، تو ایک ہتھیلی کی گہرائی کی مقدار یعنی روپیہ کے بقدر ہو، تو نماز جائز نہیں اس سے کم ہو، تو جائز ہے، زیادہ ناپاک ہو اور اتارنے میں دقت ہو، تو محض تکلیف کی وجہ سے ناپاک کپڑے میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے، کسی بھی طریقے سے اس کو اتارے، اگر اتارنا مشکل ہو، اور تہبند یا ازار پر نجاست ہو، تو اس کو اتار دے، اور دوسرا کپڑا بدن پر ڈال کر نماز پڑھ لے۔

کرتے میں ناپاکی ہو، تو کرتا نکال لے، دونوں ناپاک ہوں اور نکال نہ سکے اور کپڑے کا چوتھائی حصہ پاک ہو، باقی کا حصہ ناپاک ہو، تو ایسے کپڑے میں نماز پڑھنا جائز ہے، اور اعادے کی کوئی ضرورت نہیں؛ لیکن احتیاط اس میں ہے کہ بیماری کے بعد موقع ملے، تو لوٹا لے۔ (عالم گیری: ۱/ ۵۸ ☆ رد المحتار: ۱/ ۴۱۲)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولو شك في نجاسة ماء أو ثوب أو طلاق أو عتق لم يعتبر، وتمامه في الأشباه. (الدر المختار) وفي الشامية: في التتارخانية: من شك في إنائه أو في ثوبه أو بدن أصابته نجاسة أو لا فهو طاهر ما لم يستيقن. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۵۱، كتاب الطهارة، قبيل فرض الغسل، ط: دار الفكر)

تطهير النجاسة من بدن المصلي وثوبه والمكان الذي يصلي عليه واجب. هكذا في الزاهدي في باب الأنجاس هذ=

[۱۱] کپڑے ناپاک رکھنا گناہ ہے یا نہیں؟

۵۵۱-سوال: کپڑے ناپاک رکھنا گناہ ہے یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصلیا:

نماز کے وقت کے علاوہ دوسرے وقت میں کپڑے ناپاک ہونا یا ناپاک کپڑے پہننا گناہ نہیں ہے۔[۱] البتہ پاک وصاف رہنا چاہیے؛ کیوں کہ پاکی نصف ایمان ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=إذا كانت النجاسة قدرا مانعا وأمكن إزالتها من غير ارتكاب ما هو أشد حتى لو لم يتمكن من إزالتها إلا بإبداء عورته للناس يصلي معها ولو أبداها للإزالة فسق. هكذا في البحر الرائق ويعتبر ظاهر البدن حتى لو اكتحل بكحل نجس لا يجب عليه غسل عينه. كذا في السراج الوهاج.____ النجاسة إن كانت غليظة وهي أكثر من قدر الدرهم فغسلها فريضة والصلاة بها باطلة وإن كانت مقدار درهم فغسلها واجب والصلاة معها جائزة وإن كانت أقل من الدرهم فغسلها سنة وإن كانت خفيفة فإنها لا تمنع جواز الصلاة حتى تفحش. كذا في المضمرات.____ ستر العورة شرط لصحة الصلاة إذا قدر عليه. كذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۸، الباب الثالث في شروط الصلاة، الفصل الأول في الطهارة وستر العورة، ط: دار الفكر☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۷۳، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، ط: زكريا ديوبند)

"وقدر الدرهم وما دونه من النجس المغلظ كالدم والبول والخمر وخرء الدجاجة وبول الحمار جازت الصلاة معه وإن زاد لم تجز"... "وإن كانت مخففة كبول ما يؤكل لحمه جازت الصلاة معه حتى يبلغ ربع الثوب"... "وإذا أصاب الثوب من الروث أو" من "أخثاء البقر أكثر من قدر الدرهم لم تجز الصلاة فيه عند أبي حنيفة رحمه الله". (الهداية: ۱/ ۷۳، كتاب الطهارات، باب الأنجاس وتطهيرها، ط: ياسر نديم اينڈ کمپنی - دیوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۴۵-۴۶، كتاب الطهارة، الفصل الثاني في الأعيان النجسة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) الأصل في الأشياء الإباحة. (قواعد الفقه - محمد عميم الإحسان المجددي البركتي، ط: الصدف ببلشرز - كراتشي ☆رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۰۵، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، مطلب المختار أن الأصل في الأشياء الإباحة، ط: بيروت)

قال الله تعالى: ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ [۷۴-المدثر: ۴] وقال الله تعالى: ﴿وَإِن كُنتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا﴾ [۵-المائدة: ۶]

تطهير النجاسة من بدن المصلي وثوبه والمكان الذي يصلي عليه واجب. هكذا في الزاهدي في باب الأنجاس. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۸، كتاب الصلاة، الباب الثالث في شروط الصلاة، الفصل الأول في الطهارة وستر العورة، ط: بيروت ☆الهداية: ۱/ ۴۵، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة التي تتقدمها، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆الجوهرة النيرة - أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/ ۴۶، كتاب الصلاة، باب شروط صحة الصلاة، ط: المطبعة الخيرية)

(۲) عن أبي مالك الأشعري قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الطهور شطر الإيمان.... الحديث (الصحيح لمسلم: ...، رقم الحديث: ۱-۲۲۳، كتاب الطهارة، باب فضل الوضوء، ط: البدر - ديوبند)

عن سلمان، قال: قيل له: قد علمكم نبيكم صلى الله عليه وسلم كل شيء حتى الخراءة قال: فقال: أجل، لقد نهانا أن نستقبل القبلة لغائط، أو بول، أو أن نستنجي باليمين، أو أن نستنجي بأقل من ثلاثة أحجار، أو أن نستنجي برجيع أو بعظم. (صحیح مسلم: ١/ ١٣٠، حدیث نمبر: ٢٦٢)

باب الاستنجاء

[استنجاء کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب الاستنجاء

[استنجاء کا بیان]

[۱] استنجاء میں کلوخ (ڈھیلے) کے بعد پانی استعمال نہ کرنے کا حکم

۵۵۲-سوال: ہمارے ایک دوست ہیں، جو تبلیغی جماعت سے منسلک ہیں، وہ ٹھنڈی کے زمانہ میں پیشاب کے بعد پانی کا استعمال نہیں کرتے ہیں، صرف ڈھیلے پر اکتفاء کرتے ہیں، تو کیا پانی کے ہوتے ہوئے محض ٹھنڈی کی وجہ سے اس کا استعمال نہ کرنا اور صرف ڈھیلے پر اکتفا کرنا درست ہے؟ ان کے وضو اور نماز کا کیا حکم ہوگا؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداومصليا:

اگر پیشاب، مخرج کے اردگرد ایک درہم (ہتھیلی کا گہرا حصہ) کے بہ قدر نہ پھیلا ہو، تو ڈھیلے کے بعد پانی کا استعمال کرنا محض مستحب ہے، واجب نہیں ہے؛ لہٰذا اس صورت میں ان کے لیے وضو کر کے نماز پڑھنا جائز ہوگا، اس میں کوئی نقصان نہیں آئے گا۔ اور اگر پیشاب، مخرج سے بہ قدر درہم تجاوز کر گیا ہو، تو پانی سے نجاست کو زائل کرنا واجب ہوگا، بہ شرطیکہ پانی کے استعمال میں کوئی عذر نہ ہو۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] استنجاء میں استبراء کی ایک تدبیر

۵۵۳-سوال: کیا استنجاء کے بعد پیشاب کے قطرات ٹپک سکتے ہیں؟ ایک شخص کو پیشاب کے

(۱) والغسل... بعده أي الحجر بلا كشف عورة... سنة مطلقا، به يفتي، سراج، ويجب أي يفرض غسله إن جاوز المخرج نجس مائع، ويعتبر القدر المانع لصلاة فيما وراء موضع الاستنجاء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۴۹-۵۵۱، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، فصل الاستنجاء ☆ مزید دیکھیے: مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي: ۴۴، كتاب الطهارة، فصل في الاستنجاء، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر: ۱/ ۹۹، كتاب الطهارة، باب الأنجاس ☆ البحر الرائق: ۱/ ۴۱۹، كتاب الطهارة، باب الأنجاس)

بعد قطرہ ٹپکنے کا مرض ہے، اگر وہ استنجاء کے وقت کھڑا ہو کر کچھ قدم چلے، پھر شرم گاہ کو کھینچے اور نچوڑے، تو دل کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ تمام نجاست نکل چکی ہے، اس کے بعد قطرات نہیں ٹپکتے ہیں؛ سوال یہ ہے کہ اس طرح شرم گاہ کو پکڑنے اور کھینچنے میں گناہ تو نہیں ہوگا؟ رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

پیشاب کے بعد قطرات کا ٹپکنا عام بات ہے، اس لیے ایسی تدبیر اختیار کرنا چاہیے کہ دل کو اطمینان ہو جائے کہ نجاست اپنے مخرج سے مکمل طور پر نکل جائے۔ اس طرح کا اطمینان مختلف لوگوں کو مختلف طریقے سے حاصل ہوتا ہے، کسی کو دیر تک بیٹھنے سے، کسی کو زمین پر پیر مارنے سے، کسی کو زور لگانے سے اور کسی کو چند قدم چلنے یا کھانسنے سے۔ اس طرح کے اطمینان کے بعد ہی استنجاء کرے۔[1]

صورت مسئولہ میں جو تدبیر بیان کی گئی ہے، وہ بھی صحیح اور شرعاً جائز ہے، البتہ شرم گاہ کو اس طرح نہیں کھینچنا چاہیے کہ کسی قسم کا مرض پیدا ہو جائے۔

استبراء کے بعد کوئی شخص طہارت حاصل کرے، پھر پیشاب کا کوئی قطرہ ٹپک جائے، تو وضو ٹوٹ جائے گا، البتہ بسا اوقات مرض ہو جانے سے ہر ۶-۷ منٹ میں قطرہ ٹپکتا رہتا ہے، اگر کسی کی یہ حالت ہو، اور کوئی ایک نماز، مثلاً ظہر سے عصر تک اتنا وقت نہ ملے کہ پاکی کی حالت میں چار رکعت فرض نماز پڑھ سکے، تو ایسے شخص کو شریعت کی اصطلاح میں ''معذور'' کہتے ہیں اور اس کے احکام شریعت میں جداگانہ ہیں، لیکن صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص کی یہ حالت نہیں ہے؛ اس لیے اس کے بیان کی کوئی حاجت نہیں ہے۔[2]

استنجاء کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ پہلے ڈھیلا وغیرہ کا استعمال کرے، اس کے بعد پانی سے طہارت حاصل کرے۔ (اس طریقہ سے استنجاء کرنا قطرات کے ٹپکنے کا ایک گونہ علاج بھی ہے، نیز قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے

---

(۱) (ویجب الاستبراء بالمشي أو التنحنح أو النوم) أي الاضطجاع على شقه الأيسر حتى يستقر قلبه على انقطاع العود كذا في الظهيرية (وقيل يكتفي بمسح الذكر واجتذابه ثلاث مرات)، والصحيح أن طباع الناس وعاداتهم مختلفة فمن في قلبه أنه صار طاهرا جاز له أن يستنجي لأن كل أحد أعلم بحاله كذا في التتار خانية. (درر الحكام شرح غرر الأحكام- محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا- أو منلا أو المولى - خسرو (م:۸۸۵ھ): ۱/۴۹-۵۰، كتاب الطهارة، فصل الاستنجاء، ط: دار إحياء الكتب العربية☆ مزید دیکھیے: مراقي الفلاح ص:۹، كتاب الطهارة، فصل في الاستنجاء)

(۲) معذور اور اس کے احکام کی تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ ہو باب المعذورین کا عنوان: معذور کے لیے وضو کا حکم۔

اس عمل [جمع بین الأحجار و الماء] پر اہل قبا کی تعریف فرمائی ہے)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] سردی اور گرمی کے زمانہ میں استنجاء کے متعلق تفصیل

۵۵۴-سوال: موسم سرما اور موسم گرما دونوں میں استنجا کس طرح کرنا چاہیے، مفصل بیان فرمائیں۔

الجواب حامداومصليا:

استنجاء سے مقصود انسان کا اعضاء مخصوصہ کو نجاست سے پاک کرنا ہے، جس طرح بھی پاکی حاصل ہو، درست ہے۔ ہاں پانی اور ڈھیلا دونوں سے استنجا کرنا سنت ہے۔ (عالمگیری: ۱/ ۳۰، ☆ شامی: ۱/ ۳۱۳)[۲]

---

[۱] عن محمد بن عبد الله بن سلام قال: لما قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم علينا يعني قباء، قال: "إن الله عز وجل قد أثنى عليكم في الطهور خيرا، أفلا تخبروني؟" قال: يعني قوله: {فيه رجال يحبون أن يتطهروا والله يحب المطهرين} [التوبة:١٠٨] قال: فقالوا: يا رسول الله! إنا نجده مكتوبا علينا في التوراة: الاستنجاء بالماء. (مسند الإمام أحمد بن حنبل: ٢٣٨٣٣، حديث محمد بن عبد الله بن سلام، ت: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى: ١٤٢١هـ-٢٠٠١م)

(والأفضل) في كل زمان (الجمع بين) استعمال (الماء والحجر) مرتبا (فيمسح) الخارج (ثم يغسل) المخرج؛ لأن الله تعالى أثنى على أهل قباء باتباعهم الأحجار الماء فكان الجمع سنة على الإطلاق في كل زمان، وهو الصحيح وعليه الفتوى. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح-حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي (م:١٠٦٩هـ):١٩، فصل في الاستنجاء، دار الكتب العلمية، بيروت، طبع دوم: ١٤٢٤هـ = ٢٠٠٤م)

(٢) الاستنجاء: إزالة نجس عن سبيل فلا يسن من ريح وحصاة ونوم وفصد (وهو سنة) مؤكدة مطلقا.... (بنحو حجر) مما هو عين طاهرة قالعة لا قيمة لها كمدر (منق)؛ لأنه المقصود، فيختار الأبلغ والأسلم عن التلويث. (الدر المختار مع رد المحتار: ١/ ٣٣٥-٣٣٧، كتاب الطهارة، فصل الاستنجاء، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ١/ ٣٨، كتاب الطهارة، الباب السابع، الفصل الثالث في الاستنجاء، ط: بيروت)

"الاستنجاء سنة" لأن النبي عليه الصلاة والسلام واظب عليه "ويجوز فيه الحجر وما قام مقامه يمسحه حتى ينقيه" لأن المقصود هو الإنقاء فيعتبر ما هو المقصود. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:٥٩٣هـ): ١/ ٣٨، باب الأنجاس و تطهيرها، فصل في الاستنجاء، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

(والأفضل) في كل زمان (الجمع بين) استعمال (الماء والحجر) مرتبا (فيمسح) الخارج (ثم يغسل) المخرج؛ لأن الله تعالى أثنى على أهل قباء باتباعهم الأحجار الماء فكان الجمع سنة على الإطلاق في كل زمان، وهو الصحيح، وعليه الفتوى. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح-حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي (م:١٠٦٩هـ):١٩، فصل في الاستنجاء، دار الكتب العلمية، بيروت، طبع دوم: ١٤٢٤هـ = ٢٠٠٤م)

قرآن مجید میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں: {فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ}[1]

جب یہ آیت نازل ہوئی، تو رسول اللہ ﷺ مسجد قبا کے گرد رہنے والے صحابہ کے پاس گئے اور پوچھا: تم کس طرح پاکی حاصل کرتے ہو؟ اللہ نے تمہاری تعریف کی ہے، تو انہوں نے بتایا کہ ہم ڈھیلے اور پانی دونوں کا استعمال کرتے ہیں۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ شریف)[2]

استنجاء بالاحجار میں تین ڈھیلے کا استعمال مستحب ہے۔ یہ تب ہے، جب کہ ناپاکی مقعد سے تجاوز نہ کرے، ورنہ پانی سے دھونا فرض ہوگا۔ (عالمگیری ص ۳۰)[3]

طریقہ: گرمی کے موسم میں یہ ہے کہ پہلے ڈھیلے کو پیچھے سے آگے، دوسرے کو آگے سے پیچھے اور تیسرے کو پیچھے سے آگے کی جانب استعمال کرے، تا کہ صفائی مکمل اور صحیح طور پر ہو جائے۔ چوں کہ مردوں کے خصیے گرمی میں لٹکتے رہتے ہیں؛ اس لیے آگے سے پیچھے لے جائے کہ نجاست خصیوں پر نہ لگ جائے۔

---

[۱] ۹-التوبة:۱۰۸.

[۲] عن أبي هريرة، عن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: " نزلت هذه الآية في أهل قباء: {فيه رجال يحبون أن يتطهروا} "قال: كانوا يستنجون بالماء، فنزلت فيهم هذه الآية. (سنن أبي داؤد:۱/۷، رقم الحديث: ۴۴، كتاب الطهارة، باب في الاستنجاء بالماء، ط: مختار ايند كمپني - ديوبند☆ سنن الترمذي:۲/۱۴۱، رقم الحديث: ۳۱۰۰، أبواب تفسير القرآن، باب: ومن سورة التوبة، ط: فيصل - ديوبند☆سنن ابن ماجه:۲۹، رقم الحديث: ۳۵۷، كتاب الطهارة وسننها، باب الاستنجاء بالماء، ط: اشرفي بكڈپو)

عن عويم بن ساعدة الأنصاري، أن النبي - صلى الله عليه وسلم - أتاهم في مسجد قباء فقال: إن الله عز وجل قد أحسن إليكم الثناء في الطهور في قصة مسجدكم فما هو الطهور الذي تطهرون به؟ قالوا: يا رسول الله ما نعلم شيئا إلا أنه كان لنا جيران من اليهود، فكانوا يغسلون أدبارهم من الغائط فغسلنا كما غسلوا. (المعجم الكبير - سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني (م:۳۶۰ھ):۱۷/۱۴۰، رقم الحديث:۳۴۹، باب العين، من اسمه عويم، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية - القاهرة)

(۳) (وليس العدد) ثلاثا (بمسنون فيه) بل مستحب. (الدر المختار) قال ابن عابدين: (قوله: بل مستحب) أشار إلى أن المراد نفي السنة المؤكدة لا أصلها، لما ورد من الأمر بالاستنجاء بثلاثة أحجار، ولم نقل إن الأمر للوجوب كما قال الإمام الشافعي؛ لأن قوله - عليه الصلاة والسلام - من استجمر فليوتر، فمن فعل فحسن، ومن لا فلا حرج، دليل على عدم الوجوب. ــــ فحمل الأمر على الاستحباب توفيقا، وتمام الكلام في الحلية وشرح الهداية للعيني. (رد المحتار على الدر المختار:۱/۳۳۷، فصل في الاستنجاء، ط: بيروت)

خواتین کے لیے ہر دو موسم میں آگے سے پیچھے لیجانا چاہیے، تا کہ نجاست شرم گاہ کو نہ لگ جائے۔ (عالم گیری: ۱/ ۳۰، ☆شامی: ۱/ ۳۱۲، شرح وقایہ: ۱/ ۱۴۳)[۱]

استنجا بائیں ہاتھ سے کرے، بلا عذر دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ (درمختار: ۱/ ۳۱۵)[۲]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ثم الاستنجاء بالأحجار إنما يجوز إذا اقتصرت النجاسة على موضع الحدث فأما إذا تعدت موضعها بأن جاوزت الشرج أجمعوا على أن ما جاوز موضع الشرج من النجاسة إذا كانت أكثر من قدر الدرهم يفترض غسلها بالماء ولا يكفيها الإزالة بالأحجار. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۴۸، كتاب الطهارة، الباب السابع، الفصل الثالث في الاستنجاء، ط: بيروت ☆الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۳۸، فصل في الاستنجاء، ط: بيروت)

(۲) وصفة الاستنجاء بالأحجار أن يجلس معتمدا على يساره منحرفا عن القبلة والريح والشمس والقمر ومعه ثلاثة أحجار يدبر بالأول ويقبل بالثاني ويدبر بالثالث، قال أبو جعفر: هذا في الصيف، أما في الشتاء فيقبل بالأول ويدبر بالثاني ويقبل بالثالث، والمرأة تفعل في جميع الأوقات مثل ما يفعل الرجل في الشتاء، ثم اتفق المتأخرون على سقوط اعتبار ما بقي من النجاسة بعد الاستنجاء بالحجر في حق العرق حتى إذا أصابه العرق من المقعدة لا يتنجس. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۴۸، كتاب الطهارة، الباب السابع، الفصل الثالث في الاستنجاء، ط: بيروت)

مزید دیکھیے: رد المحتار: ۱/ ۳۳۷، فصل في الاستنجاء، ط: بيروت ☆شرح الوقاية: ۱/ ۱۴۳، قبيل كتاب الصلاة)

[۲] عن سلمان، قال: قيل له: قد علمكم نبيكم صلى الله عليه وسلم كل شيء حتى الخراءة قال: فقال: أجل، لقد نهانا أن نستقبل القبلة لغائط، أو بول، أو أن نستنجي باليمين، أو أن نستنجي بأقل من ثلاثة أحجار، أو أن نستنجي برجيع أو بعظم. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۳۰، رقم الحديث: ۵۷-(۲۶۲)، باب الاستطابة، كتاب الطهارة، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند ☆ سنن أبي داؤد: ۱/ ۳، رقم الحديث: ۷، كتاب الطهارة، باب كراهية استقبال القبلة عند قضاء الحاجة، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند ☆سنن الترمذي: ۱/ ۱۰، رقم الحديث: ۱۶، كتاب الطهارة، باب الاستنجاء بالحجارة، ط: فيصل - ديوبند)

(وكره) تحريما (بعظم وطعام وروث) . . . ويمين) ولا عذر بيسراه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۳۹-۳۴۰، فصل في الاستنجاء، ط: بيروت)

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ (۴-النساء:۱۰۳)

باب المواقیت

[اوقاتِ نماز]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب المواقیت

[اوقات نماز]

[۱] فجر کی نماز کے لیے مستحب وقت

۵۵۵-سوال: فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے کون سا وقت بہتر ہے؟ آج کل لوگ فجر کی نماز اندھیرے ہی میں پڑھ لیتے ہیں، تو حنفی مسلک کے مطابق اس نماز میں کوئی حرج لاحق ہوگا یا نہیں؟ جب کہ حدیث پاک سے تو یہ ثابت ہے کہ فجر کی نماز کے لیے امام صاحب اندھیرے میں کھڑے ہوں اور اجالے میں ختم کریں، مذکورہ صورت میں اس پر عمل نہیں ہوتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

حنفی مسلک کے مطابق اجالا ہو جانے کے بعد فجر کی نماز ایسے وقت میں پڑھنا مستحب ہے، کہ اگر کسی وجہ سے نماز میں فساد در آئے، تو دوبارہ قراءت مستحبہ کے ساتھ لوٹانا ممکن ہو۔[۱] اگر وقت ہو جانے کے بعد

---

(۱) عن رافع بن خديج، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: أسفروا بالفجر، فإنه أعظم للأجر. (سنن الترمذي: ۱/۴۰، رقم الحديث: ۱۵۴، أبواب الصلاة، باب ما جاء في الإسفار بالفجر، ط: فيصل پبليكيشنز-ديوبند ☆المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي- أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب، الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۱/۲۷۲، رقم الحديث: ۵۴۸، كتاب المواقيت، الإسفار، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية-حلب)

يستحب تأخير الفجر ولا يؤخرها بحيث يقع الشك في طلوع الشمس بل يسفر بها، بحيث لو ظهر فساد صلاته يمكنه أن يعيدها في الوقت بقراءة مستحبة. كذا في التبيين، وهذا في الأزمنة كلها إلا صبيحة يوم النحر للحاج بالمزدلفة فإن هناك التغليس أفضل. هكذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/۵۱-۵۲، كتاب الصلاة، الباب الأول في المواقيت، الفصل الثاني في بيان فضيلة الأوقات، ط: دار الفكر)

اندھیرے ہی میں نماز پڑھ لی ہے، تب بھی نماز ہوجائے گی؛ البتہ اس وقت پڑھنا خلاف اولیٰ ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] ظہر سے پہلے مکروہ وقت کی تعیین

۵۵۶-سوال: ایک پاکستانی شخص سے مسجد میں ملاقات ہوئی، اس کا کہنا ہے کہ زوال سے آدھا گھنٹہ پہلے اور زوال کے پندرہ منٹ کے بعد نماز پڑھی جاسکتی ہے، تو اس سلسلہ میں جاننا ہے کہ زوال سے کتنی دیر پہلے نماز پڑھنا ممنوع ہے؟ اور بعدِ زوال کتنی دیر کے بعد نماز پڑھ سکتے ہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

نصف النہار کے وقت سورج کے ڈھلتے ہی فوراً ظہر کی نماز کا وقت شروع ہوجاتا ہے؛ لہٰذا زوال کے بعد ظہر کی نماز پڑھنا جائز ہے۔[2]

فقہاء کرام رحمہم اللہ کی صراحت کے مطابق اس وقت نماز پڑھنا ممنوع ہے، جب کہ ''آفتاب'' آسمان کے درمیان میں آجائے۔ (یعنی سر کے اوپر، بالکل برابر میں آجائے) شریعت کی اصطلاح میں اس کو ''استواءِ شمس'' کہتے ہیں، استواءِ شمس کا وقت مشکل سے ڈیڑھ دو منٹ کا ہوتا ہے؛ لیکن اس کا مشاہدہ دشوار ہے؛ اس لیے اس وقت میں (اس کے آگے پیچھے وقت ملا کر کل) پندرہ بیس منٹ تک نماز نہیں پڑھنی چاہیے،

---

(۱) وقت الفجر من الصبح الصادق وهو البياض المنتشر في الأفق إلى طلوع الشمس. (الفتاوى الهندية: ۱/۵۱، كتاب الصلاة، الباب الأول في المواقيت، الفصل الأول في أوقات الصلاة، ط: دار الفكر)

(۲) (وكره) تحريما... (صلاة) مطلقا... (مع شروق... واستواء). (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: واستواء) التعبير به أولى من التعبير بوقت الزوال؛ لأن وقت الزوال لا تكره فيه الصلاة إجماعا، بحر عن الحلية: أي لأنه يدخل به وقت الظهر كما مر. وفي شرح النقاية للبرجندي: وقد وقع في عبارات الفقهاء أن الوقت المكروه هو عند انتصاف النهار إلى أن تزول الشمس. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۳۷۰-۳۷۱، كتاب الصلاة، مطلب يشترط العلم بدخول الوقت، ط: بيروت)

أول وقت الظهر، فحين تزول الشمس بلا خلاف، لما روي عن أبي هريرة - رضي الله عنه - عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: «أول وقت الظهر حين تزول الشمس». (بدائع الصنائع: ۱/۱۲۲، كتاب الصلاة، فصل شرائط أركان الصلاة، بيان وقت الفجر والظهر، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

کہ اسی میں احتیاط ہے۔[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] فجر کی نماز تنہا پڑھنے کے بعد دوسری جماعت میں شرکت

۵۵۷-سوال: ایک مسجد میں مقتدیوں کی تعداد بہت کم رہتی ہے، ایک مرتبہ فجر کی نماز میں اتفاق یہ ہوا کہ صرف ایک ہی مقتدی وقت پر حاضر ہوا، تو اُس نے یہ سمجھ کر تنہا فرض نماز پڑھ لی کہ اب کوئی نہیں آئے گا، پھر دو مقتدی آئے، اب اِن کو دو مقتدی ہونے کی حالت میں جماعت قائم کرنے کی ترتیب معلوم

---

(۱) عقبة بن عامر الجهني، يقول: ثلاث ساعات كان رسول الله -صلى الله عليه وسلم- ينهانا أن تصلي فيهن، أو أن نقبر فيهن موتانا: »حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع، وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل الشمس، وحين تضيف الشمس للغروب حتى تغرب«. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۷۶، رقم الحديث: ۲۹۳-(۸۳۱)، كتاب فضائل القران و ما يتعلق به، باب الأوقات التي نهي عن الصلاة فيها، قبيل كتاب الجمعة، ط: مختار اينڈ كمپني- ديوبند ☆سنن أبي داود: ۱/ ۴۵۴- ۴۵۵، رقم الحديث: ۳۱۹۲، كتاب الجنائز، باب الدفن عند طلوع الشمس وعند غروبها، ط: مختار اينڈ كمپني- ديوبند☆سنن الترمذي: ۱/ ۲۰۰، رقم الحديث: ۱۰۳۰، أبواب الجنائز، باب ماجاء في كراهية الصلاة على الجنازة عند طلوع الشمس وعند غروبها، ط: فيصل- ديوبند) ـــــــــــ قال محمد فؤاد عبد الباقي: (حين يقوم قائم الظهيرة) الظهيرة حال استواء الشمس ومعناه حين لا يبقى للقائم في الظهيرة ظل في المشرق ولا في المغرب. (الصحيح لمسلم مع شرح محمد فؤاد عبد الباقي: ۱/ ۵۶۸، باب الأوقات التي نهي عن الصلاة فيها، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

وفي شرح النقاية للبرجندي: وقد وقع في عبارات الفقهاء أن الوقت المكروه هو عند انتصاف النهار إلى أن تزول الشمس، ولا يخفى أن زوال الشمس إنما هو عقيب انتصاف النهار بلا فصل، وفي هذا القدر من الزمان لا يمكن أداء صلاة فيه، فلعل أنه لا تجوز الصلاة بحيث يقع جزء منها في هذا الزمان، أو المراد بالنهار هو النهار الشرعي وهو من أول طلوع الصبح إلى غروب الشمس، وعلى هذا يكون نصف النهار قبل الزوال بزمان يعتد به. اهـ. إسماعيل ونوح وحموي. ـــــــــــ القنية: واختلف في وقت الكراهة عند الزوال، فقيل من نصف النهار إلى الزوال لرواية أبي سعيد عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه نهى عن الصلاة نصف النهار حتى تزول الشمس. قال ركن الدين الصباغي: وما أحسن هذا؛ لأن النهي عن الصلاة فيه يعتمد تصورها فيه اهـ وعزا في القهستاني القول بأن المراد انتصاف النهار العرفي إلى أئمة ماوراء النهر، وبأن المراد انتصاف النهار الشرعي وهو الضحوة الكبرى إلى الزوال إلى أئمة خوارزم. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۷۱، كتاب الصلاة، مطلب يشترط العلم بدخول الوقت، ط: بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۲، كتاب الصلاة، الفصل الثالث في بيان الأوقات التي لا تجوز فيها الصلاة وتكره فيها، ط: دار الفكر- بيروت)

نہیں تھی، اس لیے وہ شخص جو پہلے فرض نماز پڑھ چکا تھا، وہ بھی ان کے ساتھ جماعت میں شامل ہو گیا، تو یہ شخص جو اپنی فرض نماز تنہا پڑھ چکا ہے، اب جماعت میں شامل ہونے کی وجہ سے گنہ گار ہوگا یا اُسے نفل نماز کا ثواب ملے گا؟

الجواب حامداً و مصلیا:

فجر کی نماز کے بعد نفل نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے؛ لہٰذا صورتِ مذکورہ میں پہلے نماز سے فارغ ہونے والے شخص کا جماعت میں شامل ہونا درست نہیں، اُسے نفل کا ثواب نہیں ملے گا، البتہ اِن دو رکعت کی بعد میں قضا کر لے، تو نفل کا ثواب ملے گا۔ (رد المحتار: ۱/ ۳۷۳)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] وقت زوال کی تحدید اور اس میں نماز کا حکم

۵۵۸-سوال: زوال سے کتنا وقت پہلے اور بعد میں نماز پڑھنا درست ہے؟ یعنی کتنی دیر پہلے نماز نہ پڑھنی چاہیے اور کتنی دیر بعد نماز شروع کرنی چاہیے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

زوال کے بعد نفل، سنت، ادا، قضا جو بھی نماز پڑھے، جائز ہے: لأن وقت الزوال لا تكره فيه الصلاة إجماعا. (شامی: ۱/ ۳۴۴)[2]

اور زوال سے پہلے جو وقت ہوتا ہے، جسے علماء نے: 'استواء شمس'، 'نصف النہار شرعی' اور 'الضحوۃ

---

(۱) واعلم أن الأوقات المكروهة نوعان: الأول الشروق والاستواء والغروب. والثاني ما بين الفجر والشمس، ومابين صلاة العصر إلى الاصفرار.

فالنوع الأول لا ينعقد فيه شيء من الصلوات التي ذكرناها إذا شرع بها فيه، وتبطل إن طرأ عليها إلا صلاة جنازة حضرت فيها ... والنوع الثاني ينعقد فيه جميع الصلوات التي ذكرناها من غير كراهة، إلا النفل والواجب لغيره فإنه ينعقد مع الكراهة، فيجب القطع والقضاء في وقت غير مكروه اهـ ح مع بعض تغيير. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۷۳، كتاب الصلاة، مطلب يشترط العلم بدخول الوقت، ط: دار الفكر - بيروت☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۲۹، كتاب الصلاة، بيان وقت المكروه، ط: زكريا - ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۳، الباب الأول في مواقيت الصلاة ومايتصل بها، الفصل الثالث في الأوقات التي لا تجوز فيها الصلاة، ط: زكريا - ديوبند)

[۲] رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۷۱، كتاب الصلاة، مطلب يشترط العلم بدخول الوقت، ط: بيروت.

الکبریٰ' کے نام سے بیان کیا ہے، اس وقت کوئی بھی نماز پڑھنا جائز نہیں، یہ وقت زوال سے پہلے دو تین منٹ تک رہتا ہے، لیکن اس کا مشاہدہ دشوار ہے؛ اس لیے آگے پیچھے کل ملا کر ۱۰-۱۵ رمنٹ تک نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] زوال کے بعد وقتِ مکروہ کب تک ہے؟ اور کتنی دیر بعد اذان دے سکتے ہیں؟

۵۵۹-سوال: زوال کے بعد وقتِ مکروہ کتنے منٹ تک رہتا ہے؟ اور اذان کتنے منٹ بعد دے سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

وقتِ مکروہ 'استواء' کا وقت ہے، یعنی آفتاب بالکل سر پر آجائے، یہ وقت بہت قلیل ہوتا ہے، کیوں کہ آفتاب کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے؛ اس لیے اس کا مشاہدہ دشوار ہے؛ لہٰذا احتیاط اس میں ہے کہ استواء کے وقت کے بعد کم از کم دس پندرہ منٹ تک تاخیر کرے۔

زوال کے معنیٰ آفتاب ڈھلنے کے ہیں، جب مشرق کی جانب سے چڑھتا ہوا سورج بالکل سر پر آنے کے بعد ڈھلنے لگے، تو اُس وقت کو زوال کہتے ہیں، یعنی ظہر کے وقت کی ابتداء، اس لیے زوال سے متصلاً بھی نماز جائز ہوجاتی ہے، اِس وقت نمازِ ظہر کے لیے اذان کے انتظار کی ضرورت نہیں رہتی، اس لیے تقویم میں اگر زوال کا وقت لکھا ہے، تو یہ نماز کے جائز ہونے کا وقت ہے، پھر بھی چوں کہ زوال محسوس چیزوں میں سے نہیں ہے؛ اس لیے احتیاطاً پانچ دس منٹ تاخیر سے اذان دی جائے، تو بہتر ہے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] جمعہ کے دِن زوال کے وقت کا حکم

۵۶۰-سوال: بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ روزِ جمعہ کے علاوہ، ہر دن کے لیے ایک وقتِ زوال ہے، صرف جمعہ کے دِن کوئی وقت زوال کا نہیں ہوتا، تو کیا یہ صحیح ہے؟ نیز زوال کا وقت کب تک رہتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

جمعہ کے دِن استواءِ شمس کے وقت سنن ونوافل پڑھنے کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ [۳]

(۱-۲) مسئلے کی تفصیل وتخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: ظہر سے پہلے مکروہ وقت کی تعیین۔

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے: الموسوعة الفقهية الكويتية: ۱۸۰/۷، حرف الألف، أوقات الصلاة، أوقات الكراهة، صادر عن: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية-الكويت.

مسلکِ حنفی کے مطابق طلوعِ شمس، غروبِ شمس اور استواءِ شمس کے تینوں اوقات میں علی الاطلاق کوئی نماز جائز نہیں، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بھی یہی حکم ہے، اور جمعہ کے دن بھی یہی حکم ہے۔[1]

زوال کا مطلب یہ ہے کہ سورج سر کی جانب سے مغرب کی سمت میں ڈھلنا شروع ہو، اُس کے بعد ظہر اور جمعہ کی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے، اب کوئی بھی سنت ونفل نماز پڑھی جاسکتی ہے، ہمارے علاقے کی چھپی ہوئی تقویم (جنتری، اوقاتِ نماز کے کیلنڈر) کے اعتبار سے زوال (یعنی ظہر کے وقت) سے دس منٹ پہلے کوئی بھی نماز نہیں پڑھنی چاہیے، کہ اسی میں احتیاط ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] مکروہ اوقات میں نماز پڑھنا جائز نہیں

۵۶۱-سوال: کسی کتاب میں پڑھا ہے کہ جمعہ کے دن زوال کے وقت بھی نماز ممنوع نہیں ہے؛ اس لیے کہ اس دن جہنم بھڑکائی نہیں جاتی ہے، ایسا مسئلہ ایک اہل حدیث کی کتاب کے مطالعہ کے

(۱) أما الذي يكره التطوع فيها لمعنى يرجع إلى الوقت فثلاثة أوقات: أحدها ما بعد طلوع الشمس إلى أن ترتفع وتبيض، والثاني عند استواء الشمس إلى أن تزول، والثالث عند تغير الشمس وهو احمرارها، واصفرارها إلى أن تغرب. ففي هذه الأوقات الثلاثة يكره كل تطوع في جميع الأزمان يوم الجمعة وغيره، وفي جميع الأماكن بمكة وغيرها، وسواء كان تطوعا مبتدأ لا سبب له، أو تطوعا له سبب كركعتي الطواف وركعتي تحية المسجد ونحوهما. وروي عن أبي يوسف أنه لا بأس بالتطوع وقت الزوال يوم الجمعة، وقال: الشافعي لا بأس بالتطوع في هذه الأوقات بمكة. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۹۵-۲۹۶، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يكره من التطوع، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) أول وقت الظهر، فحين تزول الشمس بلا خلاف، لما روي عن أبي هريرة - رضي الله عنه - عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: «أول وقت الظهر حين تزول الشمس». (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۲۲، كتاب الصلاة، فصل شرائط أركان الصلاة، بيان وقت الفجر والظهر، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

والزوال ظهور زيادة الظل لكل شخص في جانب المشرق. كذا في الكافي، وطريق معرفة زوال الشمس وفيء الزوال، أن تغرز خشبة مستوية في أرض مستوية، فما دام الظل في الانتقاص، فالشمس في حد الارتفاع، وإذا أخذ الظل في الازدياد علم أن الشمس قد زالت، فاجعل على رأس الظل علامة، فمن موضع العلامة إلى الخشبة يكون فيء الزوال، فإذا ازداد على ذلك، وصارت الزيادة مثلي ظل أصل العود سوى فيء الزوال، يخرج وقت الظهر، عند أبي حنيفة - رحمه الله - كذا في فتاوى قاضي خان وهذا الطريق هو الصحيح، هكذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۱، كتاب الصلاة، الباب الأول في مواقيت الصلاة وما يتصل بها، الفصل الأول في أوقات الصلاة، ط: دار الفكر)

نوٹ: جمعہ کے دن بھی زوال کا وقت ہوتا ہے، البتہ بعض فقہاء، مثلاً امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ جمعہ کے دن زوال کے وقت نفل نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے: وروي عن أبي يوسف أنه لا بأس بالتطوع وقت الزوال يوم الجمعة. (بدائع: ۱/ ۲۹۶)

دوران نظر سے گزرا ہے، تو حنفی مسلک کا اس بارے میں کیا قول ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداو مصلیا:

حنفیہ کے نزدیک تین وقت میں کسی طرح کی نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، خواہ وہ فرض نماز ہو یا واجب یا نفل، وہ تین وقت یہ ہیں: (۱) طلوع آفتاب کے وقت (۲) غروب آفتاب کے وقت (۳) استواء شمس کے وقت۔ البتہ غروب آفتاب کے وقت اس دن کی عصر کی نماز پڑھ سکتے ہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] طلوع آفتاب کے بعد وقت مکروہ کی تحدید

۵۶۲-سوال: سورج طلوع ہونے کے بعد سے کب تک کا وقت مکروہ ہے؛ نیز سورج طلوع ہونے سے کتنے منٹ پہلے تک نماز پڑھنا مکروہ ہے اور سورج طلوع ہونے کے کتنے منٹ کے بعد نماز پڑھ سکتے ہیں؟ بعض جگہوں پر دس منٹ بتاتے ہیں اور بعض جگہوں پر بیس منٹ، آپ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں گے۔

الجواب حامداو مصلیا:

تقویم میں اندازے اور تخمین کے مطابق وقت لکھا جاتا ہے، پندرہ بیس منٹ کا وقفہ کر دیا جائے، یعنی پندرہ منٹ وقفہ رکھنا ضروری ہے اور بیس منٹ کا وقفہ احتیاطاً ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] وہ اوقات، جن میں قضاء نماز پڑھنا ممنوع ہے

۵۶۳-سوال: کن اوقات میں قضا نماز پڑھنا ممنوع ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

(۱) فرض، واجب، نفل، سنت خواہ ادا ہو کہ قضا، سجدۂ تلاوت اور سجدۂ شکر، کوئی بھی نماز ہو، تین اوقات میں پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، جائز نہیں: (۱) طلوع آفتاب کے وقت تقریباً پندرہ منٹ۔ (۲) زوال آفتاب کے

---

(۱) تقدم تفصیله و تخریجه تحت عنوان: "جمعہ کے دن زوال کے وقت کا حکم"۔

(۲) أما الذي يكره التطوع فيها لمعنى يرجع إلى الوقت، فثلاثة أوقات: أحدها ما بعد طلوع الشمس إلى أن ترتفع وتبيض. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۹۵، فصل بيان ما يكره من التطوع، ط: دار الكتب العلمية)

مذکورہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ جب تک سورج بلند اور سفید نہ ہو جائے، اس وقت تک نماز پڑھنا مکروہ ہے، اور عام طور پر مشاہدہ ہے کہ اس میں تقریباً ۲۰ / منٹ لگ جاتے ہیں۔

وقت تقریباً دس پندرہ منٹ، اسی طرح (۳) غروب آفتاب کے وقت۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] وہ اوقات جن میں نفل نماز پڑھنا ممنوع ہے

گذشتہ سے پیوستہ

۵۶۴-سوال: نفل نماز کون کون سے وقت میں پڑھنا منع ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۲) مذکورہ تینوں اوقات (سورج نکلنے کے وقت، استواء شمس کے وقت، سورج کے غروب ہونے کے وقت) میں کوئی بھی نفل نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، ان کے علاوہ صبح صادق کے بعد فجر کی دو رکعت سنت کے علاوہ دوسری کوئی بھی نفل نماز پڑھنا مکروہ ہے، نیز عصر کی فرض نماز کے بعد، مغرب کی اذان کے بعد تین رکعت فرض سے پہلے، خطیب کے خطبہ دینے کے لیے اپنی جگہ سے نکلنے کے وقت، خواہ جمعہ کا خطبہ ہو یا عیدین کا یا حج کا یا نکاح کا، عید کی نماز سے پہلے یا بعد میں عیدگاہ میں کوئی بھی نفل نماز پڑھنا مکروہ ہے، ہاں عید کی نماز کے بعد گھر آکر کوئی بھی نفل نماز پڑھنا جائز ہے، نفل پڑھنے کی مدت میں اگر فرض کا وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو، تو ایسی حالت میں بھی نفل پڑھنا مکروہ ہے، نیز جس وقت فرض نماز کے لیے اقامت کہی جارہی ہو، اس وقت بھی نفل پڑھنا مکروہ ہے، پیشاب پاخانے کی شدید حاجت کے باوجود ان کو دبا کر نفل بل کہ کوئی بھی نماز پڑھنا مکروہ ہے، کھانا حاضر ہو اور شدید بھوک کا تقاضہ ہو، اس وقت بھی کوئی نفل نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ (طحطاوی: ۱۰۳، شامی: ۱/ ۳۴۴) [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن عقبة بن عامر الجهني قال: "ثلاث ساعات كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهانا أن نصلي فيهن، أو نقبر فيهن موتانا: حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع، وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل، وحين تضيف الشمس للغروب حتى تغرب" (سنن الترمذي: ۱/ ۲۰۰، رقم الحديث: ۱۰۳۰، كتاب الجنائز، باب ماجاء في كراهية الصلاة على الجنازة، ط: البدر - ديوبند)

(وكره) تحريما... (صلاة) مطلقا (ولو) قضاء أو واجبة أو نفلا أو (على جنازة وسجدة تلاوة وسهو)... (مع شروق)... (واستواء)... (وغروب، إلا عصر يومه). (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۷۱-۳۷۲، كتاب الصلاة، ط: دار الفكر)

(۲) (وكره) تحريما... (صلاة) مطلقا (ولو) قضاء أو واجبة أو نفلا أو (على جنازة وسجدة تلاوة وسهو)... مع شروق... (واستواء)... (وغروب، إلا عصر يومه) فلا يكره فعله لأدائه كما وجب بخلاف الفجر... (وكذا) =

[۱۱] عصر کی نماز سے قبل نوافل کا حکم

۵۶۵-سوال: عصر کا وقت شروع ہوتے ہی اذان کے بعد نفل نماز، یا تحیۃ المسجد یا تحیۃ الوضوء پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

عصر کے وقت میں عصر کی فرض نماز سے قبل جتنی نوافل پڑھنا چاہیں، پڑھ سکتے ہیں، فرض عصر کے بعد نوافل پڑھنا مکروہ ہے، البتہ فرض نماز، جنازہ کی نماز، اسی طرح سجدہ تلاوت وغیرہ آفتاب کے زرد ہونے سے پہلے تک جائز ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الحكم من كراهة نفل وواجب لغيره لا فرض وواجب لعينه (بعد طلوع فجر سوى سنته) لشغل الوقت به تقديرا، حتى لو نوى تطوعا كان سنة الفجر بلا تعيين (وقبل) صلاة (مغرب) لكراهة تأخيره إلا يسيرا (وعند خروج إمام) من الحجرة أو قيامه للصعود إن لم يكن له حجرة (لخطبة) ما وسيجيء أنها عشر (إلى تمام صلاته)... لحديث الصحيحين وغيرهما «إذا قلت لصاحبك أنصت والإمام يخطب فقد لغوت». " فإذا نهي عن الأمر بالمعروف وهو فرض فما ظنك بالنفل؟ وهذا قول الجمهور من أهل العلم... (وكذا يكره تطوع عند إقامة صلاة مكتوبة)... أطلقها مع أنه قيدها في الخانية والخلاصة، وأقره في الفتح وغيره من الشراح بيوم الجمعة... وقال: وأما في غير الجمعة فلا يكره بمجرد الأخذ بالإقامة ما لم يشرع الإمام في الصلاة ويعلم أنه يدركه في الركعة الأولى... (إلا سنة فجر إن لم يخف فوت جماعتها)... وكذا يكره غير المكتوبة عند ضيق الوقت (وقبل صلاة العيدين مطلقا، وبعدها بمسجد لا بيت) في الأصح... (وعند مدافعة الأخبثين) أو أحدهما أو الريح (ووقت حضور طعام تاقت نفسه إليه، و) كذا كل (ما يشغل باله عن أفعالها ويخل بخشوعها) كائنا ما كان. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۷۵-۳۷۸، كتاب الصلاة، مطلب يشترط العلم بدخول الوقت، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۲/ ۱۵-۱۹، كتاب الصلاة، الأوقات التي يكره فيها التطوع، ط: مكتبہ زكريا - ديوبند)

[۱] (وكره نفل) قصدا ولو تحية مسجد (وكل ما كان واجبا) لا لعينه بل (لغيره) وهو ما يتوقف وجوبه على فعله (كمنذور، وركعتي طواف) وسجدتي سهو (والذي شرع فيه) في وقت مستحب أو مكروه (ثم أفسده و) لو سنة الفجر (بعد صلاة فجر و) صلاة (عصر). [الدر المختار: ۱/ ۳۷۴، ۳۷۵]

قال ابن عابدين: (قوله: بعد صلاة فجر وعصر) متعلق بقوله وكره أي وكره نفل إلخ بعد صلاة فجر وعصر: أي إلى ما قبيل الطلوع والتغير بقرينة قوله السابق لا ينعقد الفرض إلخ، ولذا قال الزيلعي هنا: المراد بما بعد العصر قبل تغير الشمس، وأما بعده فلا يجوز فيه القضاء أيضا وإن كان قبل أن يصلي العصر. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۷۵، كتاب الصلاة، مطلب يشترط العلم بدخول الوقت، ط: دار الفكر - بيروت)

[۱۲] عصر کی نماز کے وقت عصر کی ادائیگی سے پہلے ظہر کی قضا کرنا

۵۶۶-سوال: اگر عذر کی وجہ سے کسی شخص کی ظہر قضا ہوگئی، اور عصر کی اذان کے دوران وہ مسجد میں پہنچا، تو کیا وہ عصر کی ادائیگی سے قبل ظہر کی قضا نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

عصر کی اذان کے دوران عصر کی ادائیگی سے قبل ظہر کی قضا پڑھنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ شخص صاحب ترتیب نہ ہو۔[۱] اگر صاحب ترتیب ہے، تو عصر کی ادائیگی سے قبل ظہر کی قضا کرنا واجب ہے، بشرطیکہ عصر کا مکروہ وقت داخل نہ ہوجائے، اور وہ سورج کے پیلا ہونا اور اُس کی روشنی میں تغیر کا پیدا ہوجانا ہے۔

یعنی جب سورج پیلا ہوجائے، اور عصر کا وقت مکروہ داخل ہوجائے، تو اب ظہر کی قضا کرنا مکروہ تحریمی ہے، اب صرف عصر کی ادا نماز ہی پڑھ سکتا ہے، صاحب ترتیب سے اس صورت میں ترتیب ساقط ہوجائے گی۔ (شامی)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (وقضاء الفرض والواجب والسنة فرض وواجب وسنة) لف ونشر مرتب، وجميع أوقات العمر وقت للقضاء إلا الثلاثة المنهية كما مر. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله إلا الثلاثة المنهية) وهي الطلوع والاستواء والغروب ح وهي محل للنفل الذي شرع به فيها ثم أفسده ط. (رد المحتار على الدر المختار: ۶۶/۲، باب قضاء الفوائت، ط: دار الفكر - بيروت)

عقبة بن عامر الجهني، يقول: ثلاث ساعات كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهانا أن تصلي فيهن، أو أن تقبر فيهن موتانا: حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع، وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل الشمس، وحين تضيف الشمس للغروب حتى تغرب. (الصحيح لمسلم: ۲۷۶/۱، رقم الحديث: ۲۹۳-(۸۳۱)، كتاب فضائل القران وما يتعلق به، باب الأوقات التي نهي عن الصلاة فيها، قبيل كتاب الجمعة، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

[۲] (الترتيب بين الفروض الخمسة والوتر أداء وقضاء لازم) يفوت الجواز بفوته، للخبر المشهور «من نام عن صلاة» وبه يثبت الفرض العملي... (فلم يجز)... (فجر من تذكر أنه لم يوتر)... (إلا)... فلا يلزم الترتيب (إذا ضاق الوقت المستحب) (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله للخبر المشهور: من نام عن صلاة) تمام الحديث "أو نسيها فلم يذكرها إلا وهو يصلي مع الإمام فليصل التي هو فيها ثم ليقض التي تذكرها، ثم ليعد التي صلى مع الإمام"... (قوله المستحب) أي الذي لا كراهة فيه قهستاني. وقيل أصل الوقت، ونسبه الطحاوي إلى الشيخين، والأول إلى محمد. والظاهر أنه احترز عن وقت تغير الشمس في العصر،... ولذا قال في البحر: وتظهر ثمرته فيما لو تذكر الظهر وعلم أنه لو صلاه يقع قبل التغير ويقع العصر أو بعضه فيه، فعلى الأول يصلي العصر ثم=

[۱۳] فجر کی سنت سے پہلے یا بعد میں کوئی قضا نماز پڑھنا

۵۶۷-سوال: فجر کی سنت نماز سے پہلے یا سنت کے بعد قضا نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصليا:

صبح صادق کے بعد سورج نکلنے تک فرض، قضا اور نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے، اسی طرح عصر کی فرض نماز کے بعد- جب تک سورج پیلا نہ ہوجائے - قضا، فرض اور جنازے کی نماز پڑھ سکتے ہیں اور جنازہ ایسے وقت حاضر ہوا، جب کہ سورج پیلا ہو رہا تھا، تب بھی جنازے کی نماز جائز ہے۔ (شامی: ۱/۳۴۹)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] جہاں سورج غروب ہونے کے بعد ڈیڑھ گھنٹے میں ہی طلوع ہوجاتا ہو، وہاں تراویح کا حکم

۵۶۸-سوال: سویڈن میں سورج' غروب ہونے کے محض ڈیڑھ گھنٹے بعد طلوع ہوجاتا ہے،

= الظهر بعد الغروب، وعلى الثاني يصلي الظهر ثم العصر. واختار الثاني قاضي خان في شرح الجامع. وفي المبسوط أن أكثر مشايخنا على أنه قول علمائنا الثلاثة، وصحح في المحيط الأول.... (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۶، باب قضاء الفوائت، ط: دار الفكر- بيروت)

(وكره) تحريما... (صلاة) مطلقا (ولو) قضاء أو واجبة أو نفلا أو (على جنازة وسجدة تلاوة وسهو)... (مع شروق)... (واستواء)... (وغروب، إلا عصر يومه). (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۷۱- ۳۷۲، كتاب الصلاة، ط: دار الفكر)

مزید دیکھیے: الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۲، الباب الأول في مواقيت الصلاة، وما يتصل بها، الفصل الثالث في بيان الأوقات التي لا تجوز فيها الصلاة وتكره فيها، ط: دار الفكر- بيروت.

[۱] واعلم أن الأوقات المكروهة نوعان: الأول الشروق والاستواء والغروب. والثاني ما بين الفجر والشمس، وما بين صلاة العصر إلى الاصفرار.

فالنوع الأول لا ينعقد فيه شيء من الصلوات التي ذكرناها إذا شرع بها فيه، وتبطل إن طرأ عليها إلا صلاة جنازة حضرت فيها... والنوع الثاني ينعقد فيه جميع الصلوات التي ذكرناها من غير كراهة، إلا النفل والواجب لغيره فإنه ينعقد مع الكراهة، فيجب القطع والقضاء في وقت غير مكروه اهـ ح مع بعض تغيير. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۷۳، كتاب الصلاة، مطلب يشترط العلم بدخول الوقت، ط: دار الفكر- بيروت☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۲۹، كتاب الصلاة، بيان وقت المكروه، ط: زكريا- ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۳، الباب الأول في مواقيت الصلاة وما يتصل بها، الفصل الثالث في الأوقات التي لا تجوز فيها الصلاة، ط: زكريا- ديوبند)

اسی ڈیڑھ گھنٹے میں مغرب، عشاء اور فجر پڑھنی پڑتی ہے، تو اس حال میں تراویح کا کیا جائے؟

الجواب حامداومصليا:

فرض نماز: مغرب عشاء اور فجر کا پڑھنا تو ضروری ہے۔[1]

البتہ علماء کرام نے حدیث دجال میں -جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اس وقت ایک دن: ایک سال، ایک مہینہ اور ایک ہفتہ کے برابر ہوگا، تو نمازوں کے متعلق صحابۂ کرامؓ کے دریافت کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، حساب لگا کر پڑھو گے- یہ بحث کی ہے کہ اس میں عشاء اور فجر میں نیت قضا کی کرے یا ادا کی؟ شامی (۱/ ۲۴۲) میں اس کی تفصیل موجود ہے۔[2]

(۱) قلنا: يا رسول الله وما لبثه في الأرض؟ قال: أربعون يوما، يوم كسنة، ويوم كشهر، ويوم كجمعة، وسائر أيامه كأيامكم، قلنا: يا رسول الله فذلك اليوم الذي كسنة، أتكفينا فيه صلاة يوم؟ قال: لا، اقدروا له قدره. (الصحيح لمسلم: ۲/ ۴۰۱، رقم الحديث: ۱۱۰-(۲۹۳۷)، كتاب الفتن وأشراط الساعة، باب ذكر الدجال وصفته وما معه، ط: مختار اينڈ كمپني- ديوبند ☆ سنن أبي داؤد: ۲/ ۵۹۳، رقم الحديث: ۴۳۲۱، كتاب الملاحم، باب خروج الدجال، ط: ديوبند)

وفاقد وقتهما كبلغار، فإن فيها يطلع الفجر قبل غروب الشفق في أربعينية الشتاء، مكلف بهما فيقدر لهما. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۶۲، كتاب الصلاة، ط: دار الفكر- بيروت)

قال الأسنوي: ويقاس عليه اليومان التاليان واستظهر الكمال وجوب القضاء، استدلالا بحديث الدجال، وتبعه ابن الشحنة، فصححه في ألغازه، وذكر في المنح أنه المذهب. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: ۱/ ۱۷۸، كتاب الصلاة، مدخل، قبيل: فصل في الأوقات المكروهة، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) ولا ينوي القضاء لفقد وقت الأداء، به أفتى البرهان الكبير واختاره الكمال، وتبعه ابن الشحنة في ألغازه فصححه، فزعم المصنف أنه المذهب. (الدر المختار)

و قال ابن عابدين: هذه المسألة نقلوا فيها الاختلاف بين ثلاثة من مشايخنا وهم: البقالي والحلواني والبرهان الكبير، فأفتى البقالي بعدم الوجوب، وكان الحلواني يفتي بوجوب القضاء، ثم وافق البقالي؛ لما أرسل إليه الحلواني من يسأله عمن أسقط صلاة من الخمس أيكفر؟ فأجاب السائل بقوله: من قطعت يداه أو رجلاه كم فروض وضوئه؟ فقال له: ثلاث، لفوات المحل، قال فكذلك الصلاة، فبلغ الحلواني ذلك فاستحسنه ورجع إلى قول البقالي بعدم الوجوب. وأما البرهان الكبير، فقال بالوجوب، لكن قال في الظهيرية وغيرها: لا ينوي القضاء في الصحيح لفقد وقت الأداء. واعترضه الزيلعي بأن الوجوب بدون السبب لا يعقل، وبأنه إذا لم ينو القضاء يكون أداء ضرورة، وهو أي الأداء فرض الوقت ولم يقل به أحد، إذ لا يبقى وقت العشاء بعد طلوع الفجر إجماعا. اهـ. وأيضا فإن من جملة بلادهم ما يطلع فيها الفجر كما غربت الشمس كما في الزيلعي وغيره، فلم يوجد وقت قبل الفجر يمكن فيه الأداء. إذا علمت ذلك ظهر لك أن من قال بالوجوب يقول به على سبيل القضاء لا الأداء. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۶۲- ۳۶۳، كتاب الصلاة، مطلب في فاقد وقت العشاء كأهل بلغار، ط: دار الفكر- بيروت)

لہٰذا جو علماء قضا کی نیت سے پڑھنے کے قائل ہیں، ان کے نزدیک مذکورہ صورت میں تراویح نہیں پڑھی جائے گی؛ کیوں کہ تراویح سنت ہے۔[1] اور سنت کی قضا نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] جہاں سورج غروب ہونے کے فوراً بعد طلوع ہوجاتا ہو، وہاں نماز اور روزے کا حکم

گذشتہ سے پیوستہ

۵۶۹-سوال: ناروے میں ایک طرف سورج غروب ہوتا ہے اور دوسری طرف پندرہ منٹ میں نکل آتا ہے، تو وہاں نماز اور روزے وغیرہ کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نماز کے متعلق اوپر جو لکھا ہے، اس کے مطابق عمل ہوگا۔[3] ابھی آپ امریکہ میں ہیں، جب ناروے جائیں، تو حالات کی مزید تحقیق کر کے سوال کریں، اس سوال میں یہ تفصیل نہیں ہے کہ کیا ۱۲ر مہینے سورج کا یہ حال رہتا ہے یا مخصوص ایام میں؟ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (التراويح سنة) مؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين (للرجال والنساء) إجماعا.

(قوله سنة مؤكدة) صححه في الهداية وغيرها، وهو المروي عن أبي حنيفة. وذكر في الاختيار أن أبا يوسف سأل أبا حنيفة عنها وما فعله عمر، فقال: التراويح سنة مؤكدة، ولم يتخرجه عمر من تلقاء نفسه، ولم يكن فيه مبتدعا؛ ولم يأمر به إلا عن أصل لديه وعهد من رسول الله - صلى الله عليه وسلم -. ولا ينافيه قول القدوري إنها مستحبة كما فهمه في الهداية عنه؛ لأنه إنما قال يستحب أن يجتمع الناس، وهو يدل على أن الاجتماع مستحب، وليس فيه دلالة على أن التراويح مستحبة، كذا في العناية. وفي شرح منية المصلي: وحكى غير واحد الإجماع على سنيتها، وتمامه في البحر. ــــــــ (قوله لمواظبة الخلفاء الراشدين) أي أكثرهم لأن المواظبة عليها وقعت في أثناء خلافة عمر - رضي الله عنه -، ووافقه على ذلك عامة الصحابة ومن بعدهم إلى يومنا هذا بلا نكير، وكيف لا وقد ثبت عنه - صلى الله عليه وسلم - »عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ« كما رواه أبو داود بحر.

(رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۳-۴۴، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) لا خلاف بين أصحابنا في سائر السنن سوى ركعتي الفجر أنها إذا فاتت عن وقتها لا تقضى سواء فاتت وحدها، أو مع الفريضة. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۸۷، كتاب الصلاة، فصل: السنة إذا فاتت عن وقتها هل تقضى أم لا؟ ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۳) مسئلہ اور اس کی تفصیل وتخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: جہاں سورج غروب ہونے کے بعد ڈیڑھ گھنٹے میں ہی طلوع ہوجاتا ہو، وہاں تراویح کا حکم۔

[۱۶] سفر میں نکلتے وقت ظہر کی اذان اول وقت میں دینا اور نماز پڑھنا کیسا ہے؟

۵۷۰-سوال: زوال کے بعد ظہر کی نماز کا وقت ہوجاتا ہے، تو اگر سفر کی وجہ سے زوال کے فوراً بعد نماز پڑھنے کا اتفاق ہو، تو کیا اذان دینا ضروری ہوگا؟

کیا سفر سے پہلے سفر کی دو رکعت نماز ادا کرنا ضروری ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً:

۱-زوال کے فوراً بعد ظہر کی نماز جائز ہے؛ بل کہ اگر سفر میں جانے کا ارادہ ہو، تو وقت ہوجانے پر پہلے نماز پڑھ لے، پھر سفر کرے؛ کیوں کہ بسا اوقات گاڑی کے لیٹ ہوجانے سے نماز کے قضا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔[1]

۲-دو رکعت نماز پڑھنا پھر سفر کرنا، اسی طرح سفر سے واپسی پر دو رکعت پڑھنا مندوب ومستحب ہے۔[2]

---

(۱) أول وقت الظهر، فحين تزول الشمس بلا خلاف؛ لما روي عن أبي هريرة - رضي الله عنه - عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: «أول وقت الظهر حين تزول الشمس». (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۲۲، كتاب الصلاة، فصل شرائط أركان الصلاة، بيان وقت الفجر والظهر، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۷۰، كتاب الصلاة، مطلب يشترط العلم بدخول الوقت، ط: بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۲، كتاب الصلاة، الفصل الثالث في بيان الأوقات التي لا تجوز فيها الصلاة وتكره فيها، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) عن عبد الله بن مسعود قال: »جاء رجل إلى النبي - صلى الله عليه وسلم - فقال: يا رسول الله! إني أريد أن أخرج إلى البحرين في تجارة، فقال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: "صل ركعتين«. رواه الطبراني في الكبير، ورجاله موثقون. (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد- أبو الحسن نور الدين علي بن أبي بكر بن سليمان الهيثمي (م: ۸۰۷ھ): ۲/ ۲۸۳، رقم الحديث: ۳۶۸۳، كتاب الصلاة، أبواب العيدين، باب الصلاة إذا أراد سفرا، ت: حسام الدين القدسي، ط: مكتبة القدسي، القاهرة☆مزید دیکھیے: تنبيه القاري لتقوية ما ضعفه الألباني- عبد الله بن محمد بن أحمد الدويش (م: ۱۴۰۹ھ) ص: ۵۸، رقم الحديث: ۹۳، ط: دار العليان للنشر والنسخ والتصوير والتجليد، بريدة)

عن كعب بن مالك، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم »كان لا يقدم من سفر إلا نهارا في الضحى، فإذا قدم بدأ بالمسجد، فصلى فيه ركعتين، ثم جلس فيه«. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۴۸، رقم الحديث: ۷۴- (۷۱۶)، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب استحباب الركعتين في المسجد لمن قدم من سفر أول قدومه، ط: ديوبند)

ومن المندوبات ركعتا السفر والقدوم منه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۴، كتاب الصلاة، مطلب في ركعتي السفر، دار الفكر-بيروت)

۳-اور رہی اذان، تو وہ نماز کے لیے سنت ہے، اذان کے بغیر بھی نماز صحیح ہو جاتی ہے۔[۱] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] کیا صبح صادق کے بعد فجر کی اذان میں دس منٹ کی تاخیر ضروری ہے؟

۱۷۵-سوال: صبح صادق کے ۵ رمنٹ بعد فجر کی اذان دی جاتی ہے، پھر بھی بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے، کم از کم ۱۰ رمنٹ تاخیر سے اذان دینی چاہئے، تو اس سلسلے میں صحیح بات کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صبح صادق ہو جانے کے بعد فوراً فجر کی اذان دینا صحیح ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں ہے؛ بل کہ دوسرے ائمہ کے نزدیک تو تہائی یا چوتھائی رات کے گذر جانے کے بعد اگر کوئی فجر کی اذان دے دے، تب بھی درست ہے۔

البتہ حنفی مذہب میں صبح صادق کے بعد ہی وقت ہوتا ہے؛ لیکن اس میں تاخیر کرنا ضروری نہیں ہے، بلا تاخیر کے فوراً اذان دی جائے، تب بھی صحیح ہے، مگر گھڑی کا ٹائم صحیح ہونا ضروری ہے، تا کہ طلوع صبح کا یقینی علم ہو سکے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (وهو سنة) للرجال في مكان عال (مؤكدة) هي كالواجب في لحوق الإثم (للفرائض) الخمس (في وقتها ولو قضاء) لأنه سنة للصلاة. ــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله: للفرائض الخمس إلخ) دخلت الجمعة بحر، وشمل حالة السفر والحضر والانفراد والجماعة. قال في مواهب الرحمن ونور الإيضاح ولو منفردا أداء أو قضاء سفرا أو حضرا. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۸۴، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) وأما بيان وقت الأذان والإقامة فوقتهما ما هو وقت الصلوات المكتوبات، حتى لو أذن قبل دخول الوقت لا يجزئه ويعيده إذا دخل الوقت في الصلوات كلها في قول أبي حنيفة ومحمد. ــــــــ وقد قال أبو يوسف: أخيرا لا بأس بأن يؤذن للفجر في النصف الأخير من الليل، وهو قول الشافعي. ــــــــ (واحتجا) بما روى سالم بن عبد الله بن عمر عن أبيه - رضي الله عنه - أن بلالا كان يؤذن بليل، وفي رواية قال: لا يغرنكم أذان بلال عن السحور، فإنه يؤذن بليل؛ ولأن وقت الفجر مشتبه، وفي مراعاته بعض الحرج بخلاف سائر الصلوات. ولأبي حنيفة ومحمد ما روى شداد مولى عياض بن عامر أن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال لبلال: لا تؤذن حتى يستبين لك الفجر هكذا. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۵۴، كتاب الصلاة، فصل بيان وقت الأذان والإقامة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۱۸] تقویم میں درج شدہ وقت سے پہلے منوبر میں عشاء کی اذان

۵۷۲-سوال: رمضان شریف میں ہمارے یہاں ''وڈوا'' میں عشاء کی اذان کا وقت ۹/ بجے تھا، جب کہ قریب کے بڑے گاؤں منوبر میں عشاء کی اذان ۵۰-۸ کو ہوتی تھی۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ تقویم میں تو عشاء کا وقت ۵۷-۸ لکھا ہوا ہے، اس کے باوجود کیا منوبر کے موافق ہم اذان دے سکتے ہیں؟ اور شرعاً وقت سے پہلے اذان دینے کی گنجائش ہے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک شفق ابیض کے غروب ہونے کے بعد عشاء کا وقت ہوتا ہے، جب کہ امام شافعیؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک شفق احمر کے غروب کے بعد ہی سے عشاء کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔[۱]

غروب شمس کے بعد شفق احمر کے غروب تک کا فاصلہ ایک گھنٹہ ۲۲/منٹ سے ایک گھنٹہ ۳۵/منٹ رہتا ہے، اب آپ سوچیں کہ ڈیڑھ گھنٹے کا بھی فاصلہ ہو، تو عشاء کا وقت ۵۰-۸ کو ہوجاتا ہے اور اگر ایک

---

(۱) (وأما) أول وقت العشاء فحين يغيب الشفق بلا خلاف بين أصحابنا؛ لما روي في خبر أبي هريرة - رضي الله عنه- وأول وقت العشاء حين يغيب الشفق، واختلفوا في تفسير الشفق، فعند أبي حنيفة هو البياض، وهو مذهب أبي بكر وعمر ومعاذ وعائشة- رضي الله عنهم-، وعند أبي يوسف ومحمد والشافعي هو الحمرة، وهو قول عبد الله بن عباس وعبد الله بن عمر - رضي الله عنهم - وهو رواية أسد بن عمرو عن أبي حنيفة. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۲۴، كتاب الصلاة، بيان وقت المغرب والعشاء، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆مزید دیکھیے: الأصل المعروف بالمبسوط- أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني (م: ۱۸۹ھ): ۱/ ۱۴۵، كتاب الصلاة، باب مواقيت الصلاة، ت: أبو الوفا الأفغاني، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية - كراتشي ☆الحجة على أهل المدينة- أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني (م: ۱۸۹ھ): ۱/ ۸، اختلاف أهل الكوفة وأهل المدينة في الصلوات والمواقيت، ت: مهدي حسن الكيلاني القادري، ط: عالم الكتب - بيروت ☆المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۱/ ۱۴۴ - ۱۴۵، كتاب الصلاة، باب مواقيت الصلاة، ط: دار المعرفة - بيروت ☆كتاب الأم- الشافعي، أبو عبد الله محمد بن إدريس بن العباس، القرشي المكي (م: ۲۰۴ھ): ۱/ ۹۳، كتاب الصلاة، جماع مواقيت الصلاة، وقت العشاء، ط: دار المعرفة- بيروت)

گھنٹہ ۳۵ر کا فاصلہ ہو، تب بھی وقت ہوجانے کی امید ہے، بالفرض اگر وقت نہیں بھی ہوتا ہے، تو اذان نماز کی سنت ہے اور سنت چھوٹ جانے سے نماز میں کوئی فساد نہیں آتا۔ [۱] اس لیے منوبر والے جو کچھ کرتے ہیں، ان پر اعتراض نہ کیا جائے، البتہ آپ کا جو عمل ہے، اسی کو جاری رکھیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] دارالعلوم ترکیسر اور مفتی کفایت اللہ صاحب کی دائمی تقویم میں اختلاف کی حقیقت

گزشتہ سے پیوستہ

۵۷۳-سوال: ترکیسر سے طبع شدہ دائمی تقویم اور مفتی کفایت اللہ دہلوی صاحب کی دائمی تقویم میں تھوڑا سا فرق ہے، ۲۷ر جون سے ۲۲ر جولائی تک کے وقت میں دونوں تقویم میں اختلاف ہے، مفتی کفایت اللہ صاحب کی تقویم کے مطابق ۲۷ر جون میں عشاء کا وقت ۵-۹ (نو بج کر پانچ منٹ) پر ہوتا ہے، جب کہ ترکیسر کی تقویم کے موافق ۵۷-۸ (آٹھ بج کر ستاون منٹ) پر عشاء کا وقت ہوجاتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں میں صحیح کیا ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

آپ ترکیسر کی دائمی تقویم پر عمل کر سکتے ہیں، تیسری تقویم سورت پٹنی ایجوکیشن کمیٹی، سرکی واڑ، سورت نمبر:۱، میں بھی عشاء کا وقت وہی مذکور ہے، جو ترکیسر کی تقویم میں ہے؛ لہٰذا آپ نو بجے عشاء کی اذان دے سکتے ہیں، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کی جو تقویم ہے، وہ دہلی اور اس کے اطراف والوں کے لیے ہے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] منیار والوں کی شائع کردہ شمسی تقویم اور دائمی اوقات نامی تقویم میں سے کس پر عمل کیا جائے؟

۵۷۴-سوال: ہمارے گجرات میں منیار والوں نے شمسی تقویم شائع کی ہے، اور یوپی میں مولانا انس صاحب ادارۂ اشاعت دینیات پرائیوٹ لمیٹڈ حضرت نظام الدین نئی دہلی والے نے پورے ہندوستان کے لیے ''دائمی اوقات الصلاۃ'' نامی تقویم کتابی شکل میں شائع کی ہے، جو کمپیوٹر کی مدد سے تیار شدہ ہے۔

---

(۱) لأنه سنة للصلاة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۸۴، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الفكر - بيروت)
(۲) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے: تقویم میں درج شدہ وقت سے پہلے منوبر میں عشاء کی اذان۔

مذکورہ دونوں تقویم میں گجرات کے لیے صبح صادق کا جو وقت لکھا گیا ہے، وہ حضرت مفتی کفایت اللہ کے فتویٰ کے بالکل ہی خلاف ہے، اور دہلی، دیوبند، سہارن پور کے لیے صبح صادق کا جو وقت لکھا ہے، وہ فتویٰ کے مطابق کچھ ٹھیک ہے اور مذکورہ تقویموں میں گجرات کے لیے جو وقت عشاء لکھا گیا ہے، اس میں وقت عشاء حنفی نہیں ہوتا؛ بل کہ اس وقت میں عشاء شافعی کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

الغرض مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ والی تقویم اور کمپیوٹر کی مدد سے تیار کی گئی تقویم میں فرق ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کن کی تقویم پر عمل کیا جائے۔ بینوا توجروا۔

(۲) کمپیوٹر پر شرعاً اعتماد کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

شمسی تقویم اور دہلی والی دائمی تقویم کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ صبح اور طلوع آفتاب کے درمیان فاصلہ، اسی طرح غروب آفتاب اور عشاء کے وقت کے درمیان کا فاصلہ؛ دونوں میں برابر ہونا چاہیے۔

اب مفتی کفایت اللہؒ اور کمپیوٹر کی تحقیق پر مبنی تقویم کے درمیان اس قدر فرق رہتا ہے کہ حضرت مفتی کفایت اللہؒ نے گجرات کے لیے جو فاصلہ بتلایا ہے، وہ زیادہ ہے۔ ان کے فتویٰ کے مطابق کم از کم فاصلہ ایک گھنٹہ اور اکیس منٹ اور زیادہ سے زیادہ فاصلہ ماہ جون میں ایک گھنٹہ اور اڑتیس منٹ ہوتا ہے۔ جب کہ مذکورہ دونوں تقویموں کے حساب سے یہ فاصلہ کم از کم ایک گھنٹہ چودہ منٹ، اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ تیئس منٹ یا چوبیس منٹ ہوتا ہے؛ اس لیے مختلف مہینوں میں شمسی تقویم اور حضرت مفتی کفایت اللہؒ صاحب کے نظام الاوقات میں ۷ / سے ۱۳ / منٹ کا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً جنوری میں شمسی تقویم کے لحاظ سے ۷ / منٹ پہلے عشاء کا وقت ہوتا ہے اور مفتی صاحب کے فتویٰ کے مطابق ۷ / منٹ بعد ہوتا ہے اور شمسی تقویم کے لحاظ سے جنوری میں صبح صادق حضرت مفتی کفایت اللہ کے مطابق ۷ / منٹ پہلے ہوتی ہے اور شمسی تقویم کے مطابق ۷ / منٹ بعد ہوتی ہے، یہاں تک کہ جون میں یہ فاصلہ ۱۳ / منٹ پر جا پہونچتا ہے، تیرہ منٹ پہلے عشاء کا وقت شمسی تقویم میں ہو جاتا ہے اور شمسی تقویم کے وقت کے تیرہ منٹ بعد حضرت مفتی صاحب کے یہاں وقت ہوتا ہے۔ تقویم والوں نے کمپیوٹر اور دیگر سائنسی آلات کے ذریعہ وقت تجویز کیا ہے، حضرت مفتی صاحب نے بھی قدیم آلات اسطرلاب [1] وغیرہ سے مدد لی ہوگی۔ کوئی بھی آلہ ہو، اس سے غالب گمان اور تخمین کی حد تک

(۱) ایک آلہ جس سے ستاروں کی بلندی مقام اور رفتار دریافت کرتے ہیں۔ (فیروز اللغات، ص: ۱۰۶، ط: فیروز اینڈ سنز- کراچی)

ہی علم حاصل ہوتا ہے۔

مذکورہ صورت میں حضرت مفتی کفایت اللہ کے فتوی کے مطابق عمل کرنا ہی ضروری ہے؛ اس لیے کہ عبادات میں احتیاط کے پہلو کو اختیار کیا جاتا ہے۔ (۱)

مذکورہ صورت میں شمسی تقویم پر عمل کی صورت میں بعض مہینوں میں شفق ابیض کے غائب ہونے سے پہلے عشاء کی اذان ہونے کا احتمال ہے اور جون میں احتمال قوی ہے کہ شفق ابیض کے ابتدائی وقت ہی میں عشاء کی اذان ہو جائے گی؛ کیوں کہ شفق احمر کے غائب ہونے اور شفق ابیض کی غیبوبت کے درمیان بارہ منٹ کا فاصلہ ہوتا ہے؛ اس لیے عشاء کی اذان حضرت مفتی صاحب کے وقت کے مطابق دینا ضروری ہے۔

اور صبح صادق شمسی تقویم کے مطابق دیر سے ہوتی ہے، جس سے احتمال ہوتا ہے کہ روزہ ہی نہ ہو؛ کیوں کہ آخر وقت میں سحری کھانے یا پانی پینے سے، صبح صادق کے بعد، کھانا پینا واقع ہوگا اور حضرت مفتی صاحب کے فتویٰ کے مطابق صبح صادق کا وقت مقدم ہے؛ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ روزے کے بارے میں حضرت مفتی صاحب کے بیان کردہ وقت کے مطابق عمل کیا جائے۔ (۲)

(۲) نمازوں کے اوقات کا مدار ایسے نشانات و علامات ہیں کہ کوئی بھی شخص کسی بھی جگہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ نماز کا وقت ہوا ہے یا نہیں؛ لیکن اگر سہولت کی خاطر ایسے آلات سے مدد لی جائے، جن سے گمان غالب ہو جاتا ہو، تو اس پر عمل کرنا جائز ہوگا؛ اس لیے کمپیوٹر وغیرہ سے اگر ایسا وقت نکالا جائے، جس کے صحیح ہونے کا غالب گمان ہو، تو اس پر عمل کرنا جائز ہے، مگر ان آلات سے معلوم کردہ وقت

(۱) والثاني الاحتياط في باب الحرمات والعبادات. (أصول السرخسي- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۲/ ۳۲۰، فصل في تقسيم العلة، ط: دار المعرفة- بيروت)

والثالث: أن الصحابة عملوا على هذا الاحتياط في الدين لما فهموا هذا الأصل من الشريعة، وكانوا أئمة يقتدى بهم؛ فتركوا أشياء وأظهروا ذلك ليبينوا أن تركها غير قادح وإن كانت مطلوبة؛ فمن ذلك ترك عثمان القصر في السفر في خلافته. (الموافقات- إبراهيم بن موسى بن محمد اللخمي الغرناطي الشهير بالشاطبي (م: ۷۹۰ھ): ۴/ ۱۰۲، كتاب الأدلة الشرعية، الفصل الخامس: في البيان والإجمال، المسألة السادسة، ت: أبو عبيدة مشهور بن حسن آل سلمان، ط: دار ابن عفان)

(۲) البتہ فجر کی اذان و نماز کی ابتدا کے سلسلے میں دہلی کی تقویم کے مطابق عمل کیا جائے، تا کہ دونوں (تقویم اور فتویٰ) کے مطابق اذان و نماز درست ہو۔

میں اختلاف ہو،تو تردد اور شک والی صورت کو اختیار کرنا جائز نہیں ہے، جیسے مذکورہ صورت میں تردد ہوا ہے،تو احتیاط کی صورت پر عمل ضروری ہے۔ (شامی، جلد ۱ صفحہ ۳۷۰)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] غروبِ آفتاب کے بعد کب سے عشاء کی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے؟

۵۷۵-سوال: غروبِ آفتاب کے بعد شفق کب تک باقی رہتی ہے؟ اور شفق کے غائب ہونے کے بعد کتنے وقت میں عشاء کی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے؟ گرمی، سردی اور بارش کی تینوں فصلوں میں مغرب اور عشاء کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہیے؟ راندیر کے مفتی صاحب، نیز جامعہ حسینیہ، دار العلوم فلاح دارین ترکیسر، دار العلوم اشرفیہ راندیر اور جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل کے مفتیانِ کرام کی تصدیق سے شائع شدہ شمسی تقویم کا ہم لوگ نماز اور روزہ وغیرہ میں اعتبار کرتے ہیں، چناں چہ اُس تقویم کے مطابق مارچ مہینے کی ابتدا میں غروبِ آفتاب چھ بج کر اکاون منٹ کو بتایا گیا ہے، جس میں پانچ منٹ کے اضافہ کے ساتھ چھ بج کر چھپن منٹ کو مغرب کا وقت شروع ہوتا ہے، پھر عشاء کا وقت آٹھ بج کر پانچ منٹ کو بتایا گیا ہے، جس میں پانچ منٹ کے اضافہ کے ساتھ آٹھ بج کر دس منٹ کے بجائے ہم آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر اذان دیتے ہیں اور آٹھ بج کر تیس منٹ پر جماعت قائم ہوتی ہے، تو کیا ہمارا یہ عمل صحیح ہے یا نہیں؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ڈیڑھ گھنٹے کا فاصلہ ضروری ہے، تو ہم نے کہا کہ جب اتنے سارے مفتیانِ کرام نے تصدیق فرمائی ہے، تو وہ تقویم غلط تو نہ ہوگی، لہٰذا حضرت والا سے درخواست ہے کہ اِس باب میں شرعی فیصلہ کے ساتھ سال کی تمام فصلوں کے

---

(۱) [تتمة] يشترط لصحة الصلاة دخول الوقت، واعتماد دخوله كما في نور الإيضاح وغيره، فلو شك في دخول وقت العبادة، فأتى بها، فبان أنه فعلها في الوقت لم يجزه كما في الأشباه في بحث النية، ويكفي في ذلك أذان الواحد لو عدلا، وإلا تحرى وبنى على غالب ظنه، لما صرح به أئمتنا من أنه يقبل قول العدل في الديانات، كالإخبار بجهة القبلة والطهارة والنجاسة والحل والحرمة، حتى لو أخبره ثقة ولو عبدا أو أمة، أو محدودا في قذف بنجاسة الماء، أو حل الطعام وحرمته قبل ولو فاسقا، أو مستورا يحكم رأيه في صدقه أو كذبه ويعمل به؛ لأن غالب الرأي بمنزلة اليقين، بخلاف خبر الذمي حيث لا يقبل اهـ ومثله الصبي والمعتوه العاقلان في الأصح، ولا يخفى أن الإخبار عن دخول الوقت من العبادات، فيجري فيه هذا التفصيل، والله أعلم. ثم رأيت في كتاب القول لمن عن معين الحكام ما نصه: المؤذن يكفي إخباره بدخول الوقت إذا كان بالغا عاقلا عالما بالأوقات مسلما ذكرا ويعتمد على قوله. اهـ وفي صيام القهستاني: وأما الإفطار فلا يجوز بقول واحد بل بالمثنى. وظاهر الجواب أنه لا بأس به إذا كان عدلا صدقه إلخ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۳۷۰، كتاب الصلاة، قبل الأذان، أوقات الصلاة، ط: دار الفكر)

مطابق گھنٹے اور منٹ کے فاصلے بھی لکھ بھیجیں، ہمارا ضلع بلساڑ ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

غروبِ آفتاب اور شفق کے غائب ہونے کا فاصلہ پورے سال یکساں نہیں رہتا، بلکہ ہر موسم میں بدلتا رہتا ہے، کفایت المفتی، فتاویٰ دار العلوم، فتاویٰ رحیمیہ اور دیگر مفتیانِ کرام کے بیان کے مطابق یہ فاصلہ جون کے مہینے میں ایک گھنٹہ اڑتیس منٹ تک پہنچتا ہے، اس سے زیادہ پھر کسی موسم میں نہیں رہتا، اور کم سے کم فاصلہ ستمبر کے مہینے میں ایک گھنٹہ اکیس منٹ کا ہوتا ہے، لہٰذا مغرب اور عشاء کے مابین کم از کم ایک گھنٹہ اڑتیس منٹ اور ستمبر میں ایک گھنٹہ اکیس منٹ کا فاصلہ ہونا ضروری ہے۔

نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس دن غروبِ شمس اور شفق کے غائب ہونے کے درمیان جتنا فاصلہ ہوتا ہے، اتنا ہی فاصلہ اُس دن کے صبحِ صادق اور طلوعِ آفتاب کے درمیان ہوتا ہے۔

سوال میں جس شمسی تقویم کا ذکر کیا گیا ہے اُس کا اعتبار ظہر اور عصر کی نماز میں کرلیا جائے، تو کوئی حرج نہیں؛ البتہ عشاء اور صبحِ صادق میں کچھ احتیاط کر لینا ضروری ہے، کیوں کہ مذکورہ شمسی تقویم میں عشاء کا وقت مفتیانِ کرام کے بتائے ہوئے فاصلہ کے مقابلے میں دس سے تیرہ منٹ جلد بتایا گیا ہے، نیز دوسرے مہینوں میں سات منٹ کا فرق ہے، لہٰذا شمسی تقویم میں بتائے گئے وقت کے مطابق صاحبینؒ اور امام شافعیؒ کے مسلک کے موافق عشاء کی اذان درست شمار ہوگی؛ لیکن امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے موافق - جو کہ مفتیٰ بہ قول ہے- اذان وقت سے پہلے ہوگی، جو جائز نہیں ہے۔

نیز ماقبل میں بتائے گئے اصول کے مطابق ان دِنوں کے صبحِ صادق میں بھی فرق واقع ہوگا، لہٰذا شمسی تقویم میں ذکر کردہ صبحِ صادق کے وقت سے دس یا بارہ منٹ پہلے مفتیانِ کرام کے قول کے مطابق صبحِ صادق کا وقت ہوجاتا ہے، نیز دیگر مہینوں میں بھی تین سے لے کر سات منٹ قبل صبحِ صادق کا وقت ہوجاتا ہے، لہٰذا خصوصاً سحری کے وقت میں خوب احتیاط کی ضرورت ہے۔

بعض دیگر تقویمات اور مفتیانِ کرام کے اقوال کے مطابق ہر موسم میں صبحِ صادق اور طلوعِ آفتاب کے درمیان ہمیشہ ایک گھنٹے بیس منٹ ہی کا فاصلہ رہتا ہے، لیکن ماقبل میں جو قول بیان کیا گیا ہے، وہ علامہ ابن عابدین شامیؒ اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کا ذکر کردہ ہے کہ جس دِن غروب اور شفق کے غائب ہونے کے درمیان جو فاصلہ ہوگا، وہی فاصلہ صبحِ صادق اور طلوعِ آفتاب کے درمیان کا ہوگا۔ اس قاعدے کے مطابق صبح

صادق اور طلوعِ آفتاب کے درمیان کا فاصلہ ایک گھنٹہ اور اڑتیس منٹ تک پہنچتا ہے؛ لہٰذا روزہ اور نماز میں اس قول کے مطابق احتیاط بہتر ہے، شمسی تقویم کے اوقات میں بھی اگر احتیاط کے پیشِ نظر پانچ منٹ بڑھا دیے جائیں، تو بعض مہینوں میں دو منٹ اور بعض میں سات منٹ کا فرق رہتا ہے، اور مذکورہ بالا قول کے مطابق اگر احتیاطاً اس میں پانچ منٹ کا اضافہ کیا جائے، تو شمسی تقویم کے اوقات سے بارہ یا تیرہ منٹ کا فرق ہوگا، شمسی تقویم غلط نہیں ہے؛ لیکن عشاء کے وقت میں فرق ہوجاتا ہے، مفتیانِ کرام نے لکھا ہے کہ شفق احمر اور شفق ابیض کے مابین بارہ منٹ کا فرق ہوتا ہے، چناں چہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بارہ منٹ کے بعد عشاء کا وقت شروع ہوتا ہے، جب کہ دیگر ائمہؒ کے نزدیک بارہ منٹ پہلے شروع ہوتا ہے، لہٰذا شمسی تقویم میں جو وقت طلوع وغروب کا بتایا گیا ہے، اس میں احتیاط کے پیشِ نظر آخر میں مذکور قول کے مطابق جو اضافہ اس میں ہونا چاہیے، اُسے حنفی مسلک کے مطابق مندرجۂ ذیل نقشہ میں لکھ دیا گیا ہے:

حنفی مسلک کے مطابق پورے سال میں عشاء کی نماز کے اوقات

تاریخ کے مطابق اضافہ	انگریزی مہینہ	فاصلہ باعتبار کیلومیٹر
سات منٹ کا اضافہ	جنوری	۷-۳۵
آٹھ منٹ کا اضافہ	فروری	۷-۵۳
آٹھ منٹ کا اضافہ	مارچ	۸-۰۵
نو منٹ کا اضافہ	اپریل	۸-۱۶
نو منٹ کا اضافہ	مئی	۸-۳۱
دس منٹ کا اضافہ	جون کی ۲۳ تاریخ سے پہلے تک	۸-۵۱
تیرہ منٹ کا اضافہ	۲۳ جون سے مہینہ کے ختم تک	۹-۰۲
نو منٹ کا اضافہ	جولائی	۸-۵۰
نو منٹ کا اضافہ	اگست	۸-۴۸

دس منٹ کا اضافہ	ستمبر کی ۲۱ تاریخ تک	۸-۲۱
دس منٹ کا اضافہ	اکتوبر کی ۲۳ تاریخ تک	۷-۴۹
دس منٹ کا اضافہ	نومبر	۷-۲۶
دس منٹ کا اضافہ	دسمبر	۷-۳۵

حنفی مسلک کے مطابق ظہر وعصر کے اوقات
اور عصر سے مغرب کے درمیان کا فاصلہ باعتبار کیلومیٹر

تاریخ کے مطابق اضافہ	انگریزی مہینہ	فاصلہ باعتبار کیلومیٹر

شمسی تقویم کے مطابق ظہر وعصر کے اوقات برابر ہیں، پہلے نقشہ میں عشاء کی اذان کا وقت لکھ دیا گیا ہے، جس کا سمجھنا آسان ہے، پہلی تاریخ کا وقت شمسی تقویم کے مطابق ہے، پھر دوسری اور تیسری تاریخ سے اخیر تک کمی بیشی کر لی جائے، مثلاً جنوری میں شمسی تقویم کے مذکورہ وقت سات بج کر پچیس منٹ پر سات منٹ کا اضافہ کیا گیا ہے، تو اُتنا ہی اضافہ ہر تاریخ میں کر لیا جائے، نیز سات بج کر پینتیس منٹ میں پانچ منٹ کے اضافہ کے ساتھ سات بج کر چالیس منٹ کو عشاء کی اذان دی جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا عشاء اور مغرب کے درمیان کا فاصلے کا نقشہ صرف ہندوستان کے لیے ہے یا دوسرے ممالک میں بھی اُس پر عمل کی گنجائش ہے؟

۵۷۶-سوال: حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے مغرب اور عشاء کے وقت کے درمیان کون سے مہینے میں کتنا فاصلہ رہتا ہے اُس کا پورا نقشہ تیار فرمایا ہے، جس کو فتاویٰ رحیمیہ جلد: ۳ میں نقل کیا گیا ہے، اور اُس کے نیچے نوٹ لکھ کر یہ زیادتی کی ہے کہ یہی فاصلہ تقریباً ان مہینوں کے طلوعِ آفتاب اور صبحِ صادق کے درمیان رہتا ہے۔

(۱) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: منیار والوں کی شائع کردہ شمسی تقویم اور دائمی اوقات نامی تقویم میں سے کس پر عمل کیا جائے؟

سوال یہ ہے کہ اس نقشے میں جو وقت بتایا گیا ہے وہ صرف ہندوستان کے اوقات اور موسم کے لیے ہے یا سب ممالک میں اُس پر عمل کیا جا سکتا ہے؟ اگر کچھ فرق ہوتا ہو تو خاص جزیرۂ موریشش کے متعلق لکھنے کی درخواست ہے کہ کون سے مہینے میں کتنا فرق پڑتا ہے؟

فی الحال یہاں (مئی ۱۹۸۶ میں) مندرجۂ ذیل ٹائم ٹیبل بنایا گیا ہے:

سحری: ۱۵-۵ (پانچ بج کر پندرہ منٹ پر)	جو رمضان کے اخیر تک زیادہ ہو کر ۵:۲۵ تک ہوتا ہے۔
افطاری: ۴۶-۵ (پانچ بج کر چھیالیس منٹ پر)	جو رمضان کے اخیر تک کم ہو کر ۵:۳۹ تک ہوتا ہے۔
طلوعِ آفتاب: ۳۰-۶ (چھ بج کر تیس منٹ پر ہے)	

محتاج دعا (محمد علی)

الجواب حامداً و مصلیاً:

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتے ہیں: "رب المشارق و المغارب" مذکور آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ روزانہ سورج کے طلوع ہونے اور غروب ہونے کی جگہ الگ الگ ہے، اور سورج کی دوری اور اُس کی سمت ہر ملک کے اعتبار سے جداگانہ ہے، مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے جو ٹائم ٹیبل تحریر فرمایا ہے، وہ ہر ملک کے لیے لازم نہیں ہے، آپ لوگوں میں جو شخص رصدگاہ (Observetry) کے علم کا ماہر ہو، اُس کی مدد سے صبحِ صادق اور طلوعِ آفتاب کا وقت متعین کریں۔

اُن کو پوچھنے کے بعد بھی روزہ کے لیے احتیاطاً دس منٹ پہلے سحری بند کر دیں، جاپان نے اُس کے لیے گھڑیاں بنائی ہے، اُن سے بھی آپ حضرات مدد لے سکتے ہیں، اور اُس سے مدد لینے کی صورت میں بھی احتیاطاً دس منٹ پہلے سحری بند کر دیں۔[1] فقط، واللہ اُعلم بالصواب۔

[۲۳] عشاء کا وقت غروبِ آفتاب کے کتنے گھنٹے بعد شروع ہوتا ہے؟

۵۷۷-سوال: عشاء کا وقت غروبِ آفتاب کے کتنے گھنٹے بعد شروع ہوتا ہے؟

(۱) مزید دیکھیے عنوان: منیار والوں کی شائع کردہ شمسی تقویم اور دائمی اوقات نامی تقویم میں سے کس پر عمل کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عشاء کا وقت شروع ہونے کے لیے غروبِ آفتاب کے بعد کوئی ایک وقت طے نہیں ہے، ہر موسم میں یہ فاصلہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، اس بارے میں ایک قاعدۂ کلیہ، جو فقہاء کے ہاں معتبر ہے، اُسے یاد رکھنا چاہیے کہ جس روز طلوعِ صبح صادق اور اور طلوعِ آفتاب کے درمیان جتنا فاصلہ ہوتا ہے اُس روز کی شام کو غروبِ آفتاب اور غروبِ شفق ابیض (احناف کے نزدیک عشاء کا وقت) کے درمیان اسی قدر فاصلہ ہوتا ہے۔ (شامی: ۱/ ۳۵۹)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] جون کے مہینہ میں نماز کی دائمی تقویم پر عمل کرنا

۵۷۸-سوال: دائمی تقویم میں عشاء کی اذان کا وقت جون کے مہینے میں ۴۵-۸ کو ہوتا ہے، اور ہمارے یہاں ۰۰-۹ بجے اذان دی جاتی ہے، تو کچھ لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جون کے مہینے میں دائمی تقویم کے حساب سے اذان دینا صحیح نہیں ہے، اذان مزید تاخیر سے دینی چاہیے، تو اس سلسلہ میں شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

دائمی تقویم کے حساب سے جون مہینے میں تمام اذانیں اپنے وقت میں اسی طرح عشاء کی اذان ۰۰-۹ بجے دینا صحیح ہے اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، اس صورت میں غروب کے بعد ایک گھنٹہ ۳۵/ منٹ کا وقت رہتا ہے، جو ہمارے دیار میں مغرب اور عشاء کے درمیان کا زیادہ سے زیادہ وقت ہے، لہٰذا اس قدر ہو جانا کافی ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) [فائدة] ذكر العلامة المرحوم الشيخ خليل الكاملي في حاشيته على رسالة الأسطرلاب لشيخ مشايخنا العلامة المحقق علي أفندي الداغستاني أن التفاوت بين الفجرين وكذا بين الشفقين الأحمر والأبيض إنما هو بثلاث درج. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۵۹، كتاب الصلاة، مطلب في تعبده - عليه الصلاة والسلام - قبل البعثة، ط: دار الفكر - بيروت☆اللباب في شرح الكتاب - عبد الغني بن طالب بن حمادة بن إبراهيم الغنيمي الدمشقي الميداني الحنفي (م: ۱۲۹۸هـ): ۱/ ۵۶، كتاب الصلاة، تحقيق وتحشي: محمد محيي الدين عبد الحميد، ط: المكتبة العلمية، بيروت - لبنان)

تفصیل کے لیے دیکھیے: تقویم میں درج شدہ وقت سے پہلے منوبر میں عشاء کی اذان۔

(۲) قد تقدم تخريجه تحت عنوان: تقویم میں درج شدہ وقت سے پہلے منوبر میں عشاء کی اذان۔

[۲۵] جمعہ کی اذان کا وقت ۱۲:۳۰ (ساڑھے بجے) پورے سال کے لیے متعین کرنا

۵۷۹-سوال: ہماری بستی میں جمعہ کی اذان بارہ بج کر تیس منٹ پر ہوتی ہے، اور اذان کے فوراً بعد نمازی حضرات سنتیں ادا کر لیتے ہیں۔ ۱:۰۱ کو خطبہ ہوتا ہے اور ۱:۳۰ کو جماعت شروع ہوتی ہے۔ یہ مقررہ وقت پورے سال چلتا ہے، اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی ہے، تو کیا یہ درست ہے یا نہیں؟ نیز کہا جاتا ہے کہ ''جمعہ کے دن زوال نہیں ہوتا'' کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

۱۲:۳۰ کا وقت پورے سال کے لیے مقرر کرنا صحیح نہیں ہے؛ اس لیے کہ دسمبر، جنوری، فروری وغیرہ میں یہ وقت استوائے شمس کا ہوتا ہے، جس کو ''نصف نہار شرعی'' کہتے ہیں اور مذکورہ وقت میں اللہ کے رسول ﷺ نے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ حنفی مسلک میں مکہ مکرمہ ہو یا مدینہ منورہ، استوائے شمس کے وقت کسی قسم کی نماز پڑھنا درست نہیں ہے؛ لہٰذا اس وقت میں اذان بھی صحیح نہیں ہوگی؛ اس لیے کہ اذان وقت کی اطلاع کے لیے ہے، اگر قبل الوقت دی گئی، تو اعادہ واجب ہوگا۔[۱]

زوال روزانہ ہوتا ہے خواہ جمعہ ہو یا عید۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] حنفی حضرات کا عصر ایک مثل پر پڑھنا

۵۸۰-سوال: پورے امریکہ میں عصر ایک مثل پر پڑھی جاتی ہے؛ کیوں کہ عرب حضرات نے

---

(۱) وأما بيان وقت الأذان والإقامة فوقتهما ما هو وقت الصلوات المكتوبات، حتى لو أذن قبل دخول الوقت لا يجزئه، ويعيده إذا دخل الوقت في الصلوات كلها في قول أبي حنيفة ومحمد... ولأبي حنيفة ومحمد ما روى شداد مولى عياض بن عامر أن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال لبلال: لا تؤذن حتى يستبين لك الفجر هكذا، ومد يده عرضا، ولأن الأذان شرع للإعلام بدخول الوقت، والإعلام بالدخول قبل الدخول كذب، وكذا هو من باب الخيانة في الأمانة، والمؤذن مؤتمن على لسان رسول الله - صلى الله عليه وسلم -، ولهذا لم يجز في سائر الصلوات. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ۱/۱۵۵، كتاب الصلاة، فصل بيان وقت الأذان والإقامة، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) جمعہ کے دن بھی زوال کا وقت ہوتا ہے؛ البتہ بعض فقہاء، مثلاً امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ جمعہ کے دن زوال کے وقت نفل نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے: وروي عن أبي يوسف أنه لا بأس بالتطوع وقت الزوال يوم الجمعة. (بدائع: ۱/۲۹۶)

ٹائم ٹیبل بنایا ہے، ان کی تعداد زیادہ ہے، جب کہ حنفی حضرات تعداد میں کم ہیں؛ اس لیے وہ بھی عربوں کی اقتدا میں ایک مثل ہی پر عصر پڑھتے ہیں، شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ضرورت کی بناء پر عصر کی نماز ایک مثل پر پڑھنا جائز ہے، احناف حرمین شریفین میں عصر ایک مثل پر پڑھ لیتے ہیں؛ گرچہ امام ابوحنیفہؒ کی مفتیٰ بہ روایت یہی ہے کہ عصر کی نماز کا وقت مثل ثانی کے بعد شروع ہوتا ہے؛ لیکن صاحبین رحمہما اللہ کا قول یہ ہے کہ مثل اول تک ہی ظہر کا وقت رہتا ہے، اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہوجاتا ہے، خود امام صاحبؒ کی ایک روایت یہی ہے۔ اور امام طحاویؒ نے فرمایا ہے: "و بقولهما نأخذ".[1] پس ایسے وقت میں - جب کہ عصر کی جماعت مثل اول پر ہی ہوتی ہو - صاحبین کے قول پر عمل کی

---

(١) وفي حديث جبريل: عن ابن عباس، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "أمني جبريل عند البيت مرتين، فصلى الظهر في الأولى منهما حين كان الفيء مثل الشراك، ثم صلى العصر حين كان كل شيء مثل ظله. (سنن الترمذي- محمد بن عيسى بن سَوْرة، الترمذي، أبو عيسى (م: ٢٧٩هـ):١/ ٣٨، رقم الحديث: ١٤٩، كتاب الصلاة، باب ما جاء في مواقيت الصلاة عن النبي صلى الله عليه وسلم، ط: فيصل - ديوبند☆ سنن أبي داود:١/ ٥٦، رقم الحديث: ٣٩٣، كتاب الصلاة، باب في المواقيت، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

وأول وقت الظهر إذا زالت الشمس "لإمامة جبريل عليه السلام في اليوم الأول حين زالت الشمس"، وآخر وقتها عند أبي حنيفة رحمه الله إذا صار ظل كل شيء مثليه، سوى فيء الزوال، وقالا: إذا صار الظل مثله" وهو رواية عن أبي حنيفة رحمه الله... وأول وقت العصر إذ خرج وقت الظهر على القولين. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر، المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ٥٩٣هـ):١/ ٤٠، كتاب الصلاة، باب المواقيت، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت☆ ر: بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود، الكاساني الحنفي (م: ٥٨٧هـ):١/ ١٢٣، كتاب الصلاة، بيان وقت الفجر والظهر، شرائط أركان الصلاة ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد، المدعو بشيخي زاده، و يعرف بـ"داماد أفندي" (م: ١٠٧٨هـ):١/ ٦٩ - ٧٠، كتاب الصلاة، وقت الظهر، ط: دار إحياء التراث العربي☆ المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ٤٨٣هـ):١/ ١٤٢، كتاب الصلاة، باب مواقيت الصلاة، ط: دار المعرفة - بيروت)

قال الحصكفي: (ووقت الظهر من زواله) أي ميل ذكاء عن كبد السماء (إلى بلوغ الظل مثليه) وعنه مثله، وهو قولهما وزفر والأئمة الثلاثة. قال الإمام الطحاوي: وبه نأخذ. وفي غرر الأذكار: وهو المأخوذ به. وفي البرهان: وهو الأظهر. لبيان جبريل. وهو نص في الباب. وفي الفيض: وعليه عمل الناس اليوم وبه يفتى. (الدر المختار مع رد المحتار:١/ ٣٥٩، كتاب الصلاة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

گنجائش ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] سایہ ایک مثل ہونے پر عصر کی نماز پڑھنا

۵۸۱-سوال: شوافع کے نزدیک عصر کا وقت، حنفی مسلک کے وقت سے پہلے ہوتا ہے، تو کیا حنفی مسلک والے، شوافع کے وقت پر عصر کی نماز پڑھ سکتے ہیں؟ کہیں ایسا پڑھا ہوا یاد آتا ہے کہ اگر شافعی امام کے پیچھے حنفی مقتدی نماز پڑھے گا، تو اس کی نماز ہو جائے گی، تو کیا منفرد بھی اگر عصر کی نماز شافعی مذہب کے مطابق ایک مثل پر پڑھ لے، تو اس کی نماز ہو جائے گی؟ عصر حنفی اور شافعی میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کا فرق ہوتا ہے، اور ایک شخص کو نماز کے بعد پانچ کیلومیٹر تک جانا پڑتا ہے، روز کا مسئلہ ہے، تو کیا وہ اس طرح عصر کی نماز، عصرِ شافعی کے مطابق پڑھ سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداو مصلیا:

ضرورت کے وقت عصر کی نماز اس وقت پڑھنا جائز ہے، جب کہ ہر چیز کا سایہ اپنے سایۂ اصلی سے ایک گنا (مثل) بڑھ جائے، یہ امام شافعی، امام احمد بن حنبلؒ اور امام مالکؒ کا مذہب ہے، حضرات صاحبین کا بھی یہی مسلک ہے، امام حسن بن زیادؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے اسی کے موافق ایک روایت نقل فرمائی ہے، اور امام زفرؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ ضرورت کی بناء پر اس قول کو اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔ (مجمع الانھر جلد ۱ صفحہ ۶۹)[۲]

---

(۱) حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ (۱۹۳۲-۲۰۰۰ء) ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: حنفیہ کے یہاں بھی دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ مثل دوم میں عصر کی نماز صحیح ہے؛ لہٰذا اگر کسی جگہ عصر کی نماز دو مثل سے پہلے ہوتی ہو تو وہاں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا چاہیے، دوسری مثل ختم ہونے کے انتظار میں جماعت کا ترک جائز نہیں۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۳/۲۱۰، عنوان: سایہ ایک مثل ہونے پر عصر کی نماز پڑھنا، ط: نعیمیہ-دیوبند)

(۲) (ووقت الظهر من زوالها) أي زوال الشمس عن المحل الذي تم فيه ارتفاعها، وتوجه إلى الانحطاط . . . (إلى أن يصير ظل كل شيء مثليه سوى فيء الزوال) وهو رواية محمد عن الإمام وبه أخذ الإمام.——— (وقالا إلى أن يصير مثلا) وهو رواية الحسن عن الإمام وبه أخذ زفر والشافعي وروى أسد بن عمرو عن الإمام إذا صار ظل كل شيء مثله سوى فيء الزوال خرج وقت الظهر ولا يدخل وقت العصر حتى يصير ظل كل شيء مثليه فيكون بين وقت الظهر والعصر وقت مهمل قيل الأفضل أن يصلي صلاة الظهر إلى بلوغ الظل إلى المثل ولا يشرع في العصر إلا بعد بلوغ الظل إلى المثلين ولا يصلي قبله جمعا بين الروايات. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر -عبد الرحمن بن محمد، المدعو بشيخي زاده، ويعرف بـ"داماد أفندي" (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/۶۹-۷۰، كتاب الصلاة، وقت الظهر، ط: دار إحياء التراث العربي)

لہٰذا آپ ضرورت کی وجہ سے ایک مثل کے بعد عصر کی نماز ادا کر سکتے ہیں، اگر اس سے پہلے ادا کی، تو جائز نہیں ہے۔

حاجی حضرات بھی حرمین شریفین میں مذکورہ وقت پر نماز ادا کرتے ہیں، اسی طرح شوافع کی مسجد میں جماعت کا ثواب حاصل کرنے کی غرض سے اس وقت نماز ادا کر لی، تو جائز ہے۔

ہاں! اگر معقول وجہ نہیں ہے، تو پھر بہتر یہی ہے کہ ظہر کی نماز ایک مثل ہونے سے پہلے اور عصر کی نماز دو مثل کے بعد پڑھی جائے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۸] حرم شریف میں شافعی یا حنبلی المسلک امام کی اقتدا

۵۸۲-سوال: حرم شریف میں اگر امام شافعی یا حنبلی المسلک ہوں، تو ان کے پیچھے حنفی کی اقتدا صحیح ہوگی یا نہیں؟ نیز عصر کی نماز میں اگر امام شافعی المسلک ہیں، اور وہ اُن (حنفی) کے وقت کے موافق عصر کی نماز پڑھاتے ہیں، تو اُن کی اقتدا حنفی شخص کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

حنفی شخص کا، کہیں بھی، چاروں مسالک میں سے کسی بھی مسلک کے امام کی اقتدا کرنا صحیح ہے، لہٰذا حرم شریف میں بھی شافعی یا حنبلی المسلک امام کی اقتدا صحیح ہے۔ (۲) عصر کا وقت مسلکِ شافعی کے مطابق ہو،

---

(۱) مزید تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے عنوان: ''حنفی حضرات کا عصر ایک مثل پر پڑھنا'' نیز دیکھیے: فتاویٰ محمودیہ: ۵/۳۳۹۔

(۲) حضرت مفتی صاحبؒ نے اس سلسلے کے ایک جواب میں لکھا ہے کہ ''اگر شافعی یا مالکی یا حنبلی موضع اختلاف کی رعایت کرتے ہوں، تو ان کی اقتدا کرنا بلا کراہت جائز ہے'':

(قوله إن تيقن المراعاة لم يكره إلخ) أي المراعاة في الفرائض من شروط وأركان في تلك الصلاة وإن لم يراع الواجبات والسنن كما هو ظاهر سياق كلام البحر. مطلب في الاقتداء بشافعي ونحوه هل يكره أم لا؟

وظاهر كلام شرح المنية أيضا حيث قال: وأما الاقتداء بالمخالف في الفروع كالشافعي فيجوز ما لم يعلم منه ما يفسد الصلاة على اعتقاد المقتدي عليه الإجماع، إنما اختلف في الكراهة. اهـ فقيد بالمفسد دون غيره كما ترى.

وفي رسالة [الاهتداء في الاقتداء] لمنلا علي القاري: ذهب عامة مشايخنا إلى الجواز إذا كان يحتاط في موضع الخلاف وإلا فلا.ــــــــــــ والمعنى أنه يجوز في المراعي بلا كراهة وفي غيره معها. ثم المواضع المهملة للمراعاة أن يتوضأ من الفصد والحجامة والقيء والرعاف ونحو ذلك، لا فيما هو سنة عنده مكروه عندنا؛ كرفع اليدين في الانتقالات، وجهر البسملة وإخفائها، فهذا وأمثاله لا يمكن فيه الخروج عن عهدة الخلاف، فكلهم =

تب بھی اقتدا جائز ہے، علماءِ احناف میں سے حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا مذہب عصر کے وقت کے سلسلے میں وہی ہے، جو امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا ہے، خود امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت یہی ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] عذر کی وجہ سے عصر کی نماز اذان سے پہلے پڑھ لینا

۵۸۳-سوال: سورت سے احمد آباد کی طرف جانے والی ٹرین شام کو ۴:۵۵ کو روانہ ہوتی ہے، جس میں کوسمبا اور اُس کے اطراف کے لوگ سفر کرتے ہیں، شہر کے اکثر لوگ کوسمبا پہنچنے پر عصر کی نماز

=يتبع مذهبه ولا يمنع مشربه اهـ ـــــــــــ وفي حاشية الأشباه للخير الرملي: الذي يميل إليه خاطري القول بعدم الكراهة، إذا لم يتحقق منه مفسد. اهـ ـــــــــــ وبحث المحشي أنه إن علم أنه راعى في الفروض والواجبات والسنن فلا كراهة، وإن علم تركها في الثلاثة لم يصح، وإن لم يدر شيئا كره لأن بعض ما يجب تركه عندنا يسن فعله عنده فالظاهر أن يفعله، وإن علم تركها في الأخيرين فقط ينبغي أن يكره لأنه إذا كره عند احتمال ترك الواجب فعند تحققه بالأولى، وإن علم تركها في الثالث فقط ينبغي أن يقتدي به لأن الجماعة واجبة فتقدم على تركه كراهة التنزيه اهـ وسبقه إلى نحو ذلك العلامة البيري في رسالته، حيث ادعى أن الانفراد أفضل من الاقتداء به قال: إذ لا ريب أنه يأتي في صلاته بما تجب الإعادة به عندنا أو تستحب، لكن رد عليه ذلك غيره في رسالة أيضا، وقد أسمعناك ما يؤيد الرد، نعم نقل الشيخ خير الدين عن الرملي الشافعي أنه مشى على كراهة الاقتداء بالمخالف حيث أمكنه غيره، ومع ذلك هي أفضل من الانفراد، ويحصل له فضل الجماعة، وبه أفتى الرملي الكبير، واعتمده السبكي والإسنوي وغيرهما.

قال الشيخ خير الدين: والحاصل أن عندهم في ذلك اختلافا، وكل ما كان لهم علة في الاقتداء بنا صحة وفسادا وأفضلية كان لنا مثله عليهم، وقد سمعت ما اعتمده الرملي وأفتى به، والفقير أقول مثل قوله فيما يتعلق باقتداء الحنفي بالشافعي والفقيه المنصف يسلم ذلك:

وأنا رملي فقه الحنفي .... لا مرا بعد اتفاق العالمين

اهـ ملخصا، أي لا جدال بعد اتفاق عالمي المذهبين وهما رملي الحنفية يعني به نفسه ورملي الشافعية رحمهما الله تعالى، فتحصل أن الاقتداء بالمخالف المراعي في الفرائض أفضل من الانفراد إذ لم يجد غيره، وإلا فالاقتداء بالموافق أفضل. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۳، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب في الاقتداء بشافعي ونحوه هل يكره أم لا؟، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے باب الامامۃ کا عنوان: شافعی امام کے پیچھے نماز پڑھنا۔

(۱) تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے عنوان: ''حنفی حضرات کا عصر ایک مثل پر پڑھنا'' اور ''سایہ ایک مثل ہونے پر عصر کی نماز پڑھنا''۔

اذان سے پہلے پڑھ لیتے ہیں، کبھی یہ ٹرین دیر سے بھی آتی ہے، چوں کہ اس ٹرین میں ازدحام کے سبب نماز پڑھنے کی جگہ نہیں مل سکتی، تو کیا عصر کی نماز ۱۵-۴ بجے پڑھ لیں، تو صحیح ہے؟ یا پھر مؤخر کرکے غروبِ شمس سے کچھ پہلے پڑھی جائے؟

محمد ابراہیم خنجی والا

الجواب حامداً و مصلیاً:

بغیر کسی عذرِ شرعی کے نماز کو قضاء کرنا بہت بڑا گناہ ہے، جس کے بارے میں بہت سی وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ (۱) اور عصر کی نماز کے متعلق تو قرآن وحدیث میں خصوصی تاکید فرمائی گئی ہے، چناں چہ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے: {حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ} [۲]

یعنی تم تمام نمازوں کو پابندی کے ساتھ ادا کرتے رہو اور خصوصاً درمیانی نماز کو۔ اکثر مفسرین عظام نے "الصلوٰۃ الوسطیٰ" کی تفسیر عصر کی نماز سے فرمائی ہے۔ (۳)

---

(۱) قال اللہ تعالی: إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۴-النساء:۱۰۳) وقال تعالی: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ. (۱۰۷-الماعون:۵-۴) و قال تعالی: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ. (۲-البقرۃ:۲۳۸)

وفي حديث أبي قتادة :قال (رسول الله صلى الله عليه وسلم): أما إنه ليس في النوم تفريط، إنما التفريط على من لم يصل الصلاة حتى يجيء وقت الصلاة الأخرى. (الصحيح لمسلم:۱/۲۳۹، رقم الحديث:۳۱۱-(۶۸۱) كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب قضاء الصلاة الفائتة، واستحباب تعجيل قضائها، ط: ديوبند☆سنن أبي داؤد: ۱/۶۳، رقم الحديث:۴۴۱، كتاب الصلاة، باب في من نام عن الصلاة، أو نسيها، ط: مختار اينڈ كمپني-ديوبند☆ سنن الترمذي:۱/۴۳، رقم الحديث:۱۷۷، أبواب الصلاة، باب ماجاء في النوم عن الصلاة، ط: فيصل-ديوبند)

عن ابن عباس، عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: من جمع بين الصلاتين من غير عذر فقد أتى بابا من أبواب الكبائر. (سنن الترمذي:۱/۴۶، رقم الحديث:۱۸۸، أبواب الصلاة، باب ما جاء في الجمع بين الصلاتين، ط: ديوبند)

[۲] ۲-البقرة:۲۳۸.

(۳) عن علي، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الأحزاب: شغلونا عن الصلاة الوسطى، صلاة العصر، ملأ الله بيوتهم وقبورهم نارا، ثم صلاها بين العشاءين، بين المغرب والعشاء. (الصحيح لمسلم:۱/۲۲۷، رقم الحديث:۲۰۵-(۶۲۷)، كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب الدليل لمن قال الصلاة الوسطى هي صلاة العصر، ط: البدر-ديوبند)

الثاني- أنها العصر؛ لأن قبلها صلاتي نهار وبعدها صلاتي ليل. قال النحاس: وأجود من هذا الاحتجاج أن يكون إنما قيل لها وسطى؛ لأنها بين صلاتين إحداهما أول ما فرض، والأخرى الثانية مما فرض. وممن قال إنها وسطى علي بن أبي طالب، وابن عباس، وابن عمر، وأبو هريرة، وأبو سعيد الخدري، وهو اختيار أبي حنيفة وأصحابه، وقاله =

عصر کی نماز کا وقت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر چیز کا سایہ اُس کے سایۂ اصلی کو چھوڑ کر دو مثل ہونے کے بعد سے شروع ہوتا ہے، جب کہ امام محمدؒ، امام ابو یوسفؒ، امام احمدؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ہر چیز کا سایہ اُس کے سایۂ اصلی کو چھوڑ کر ایک مثل ہونے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔[1]

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ضرورت کے وقت اگر ۴:۱۵ بجے سایہ ایک مثل ہو جاتا ہے، تو اس کے بعد عصر کی نماز کے لیے گنجائش ہے، اس لیے کہ اس وقت نہ پڑھنے کی صورت میں یا تو نماز بالکلیہ قضاء ہوگی یا مکروہ ہوگی؛ لیکن گرمی کے موسم میں سایہ ایک مثل ہونے میں دیر لگتی ہے؛ لہٰذا اگر ۴:۱۵ بجے تک سایہ ایک مثل نہیں ہوا ہے، تو عصر کی نماز درست نہ ہوگی، اس صورت میں کوسما کے بعد پانولی یا کیم پہنچنے تک بھی عصر کا وقت مکروہ شروع نہیں ہوگا؛ لہٰذا وہاں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری: ۱/۵۱، مجمع الانہر: ۱/۷۰)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] حالتِ سفر میں جمع تقدیم اور جمع تاخیر کا حکم

۵۸۴-سوال: حالتِ سفر میں عرب حضرات جمع بین الصلاۃ کی بات کہتے ہیں اور جمع تقدیم یا جمع تاخیر پر اصرار کرتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

=الشافعي، وأكثر أهل الأثر، وإليه ذهب عبد الملك بن حبيب، واختاره ابن العربي في قبسه، وابن عطية في تفسيره، وقال: وعلى هذا القول الجمهور من الناس وبه أقول. واحتجوا بالأحاديث الواردة في هذا الباب، خرجها مسلم وغيره، وأنصها حديث ابن مسعود قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "الصلاة الوسطى صلاة العصر" خرجه الترمذي، وقال: حديث حسن صحيح. (الجامع لأحكام القرآن = تفسير القرطبي - أبو عبد الله محمد بن أحمد بن أبي بكر، شمس الدين القرطبي (م: ۶۷۱ھ): ۳/ ۲۱۰، البقرة: ۲۳۸، ت: أحمد البردوني وإبراهيم أطفيش، ط: دار الكتب المصرية - القاهرة)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: جامع البيان في تأويل القرآن - محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي، أبو جعفر الطبري (م: ۳۱۰ھ): ۵/ ۱۶۸، البقرة: ۲۳۸، ت: أحمد محمد شاكر، ط: مؤسسة الرسالة.

(۱) دیکھیے عنوان: "حنفی حضرات کا عصر ایک مثل پر پڑھنا" کا حاشیہ نمبر: ۱۔

[۲] مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد، المدعو بشيخي زاده، ويعرف بـ"داماد أفندي" (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/ ۶۹ - ۷۰، كتاب الصلاة، وقت الظهر، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۱، كتاب الصلاة، الباب الأول في مواقيت الصلاة وما يتصل بها، الفصل الأول في أوقات الصلاة، ط: دار الفكر.

الجواب حامداً ومصلیاً:

احناف کے نزدیک حج کے ایام میں، عرفات میں جمع تقدیم اور مزدلفہ میں جمع تاخیر بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے، اس کے علاوہ کہیں جائز نہیں، چناں چہ جمع تقدیم کی صورت میں نماز کی فرضیت ساقط نہیں ہوگی اور تاخیر کی صورت میں نماز کو اس کے وقت سے مؤخر (قضاء) کرنے کا گناہ لازم آئے گا۔(۱)

اور حدیث شریف میں جہاں ''جمع بین الصلاتین'' کا ذکر آیا ہے،(۲) امام ابوحنیفہؒ دوسری حدیثوں

---

(۱) قال الله تعالى: إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴿(۴-النساء:۱۰۳) وقال تعالى: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ﴿ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴿.(۱۰۷-الماعون:۴-۵) و قال تعالى: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴿.(۲-البقرة:۲۳۸)

وفي حديث أبي قتادة: قال (رسول الله صلى الله عليه وسلم): أما إنه ليس في النوم تفريط، إنما التفريط على من لم يصل الصلاة حتى يجيء وقت الصلاة الأخرى. (الصحيح لمسلم: ۱/۲۳۹، رقم الحديث: ۳۱۱-(۶۸۱) كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب قضاء الصلاة الفائتة، واستحباب تعجيل قضائها، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند ☆ سنن أبي داؤد، رقم الحديث: ۴۴۱، كتاب الصلاة، باب في من نام عن الصلاة، أو نسيها ☆ سنن الترمذي: ۱/۴۳، رقم الحديث: ۱۷۷، أبواب الصلاة، باب ما جاء في النوم عن الصلاة، ط: فيصل - ديوبند)

عن ابن عباس، عن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: من جمع بين الصلاتين من غير عذر فقد أتى بابا من أبواب الكبائر. (سنن الترمذي: ۱/۴۶، رقم الحديث: ۱۸۸، أبواب الصلاة، باب ما جاء في الجمع بين الصلاتين، ط: فيصل - ديوبند)

قال أصحابنا: إنه لا يجوز الجمع بين فرضين في وقت أحدهما إلا بعرفة والمزدلفة فيجمع بين الظهر والعصر في وقت الظهر بعرفة، وبين المغرب والعشاء في وقت العشاء بمزدلفة، اتفق عليه رواة نسك رسول الله - صلى الله عليه وسلم - أنه فعله، ولا يجوز الجمع بعذر السفر والمطر. (بدائع الصنائع - علاء الدين، الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱/۱۲۶، كتاب الصلاة، فصل شرائط أركان الصلاة، الجمع بين الصلاتين، ط: دار الكتب العلمية)

(فإن جمع فسد لو قدم) الفرض على وقته (وحرم لو عكس) أي أخره عنه (وإن صح) بطريق القضاء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۳۸۲، كتاب الصلاة، قبيل باب الأذان، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) عن ابن عباس، أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - جمع بين الصلاة في سفرة سافرها في غزوة تبوك، فجمع بين الظهر والعصر، والمغرب والعشاء. ——— عن معاذ، قال: خرجنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في غزوة تبوك، فكان يصلي الظهر والعصر جميعا، والمغرب والعشاء جميعا. (الصحيح لمسلم: ۱/۲۴۶، رقم الحديث: ۵۱-(۷۰۵) و ۵۲-(۷۰۶)، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب الجمع بين الصلاتين في الحضر، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

عن معاذ بن جبل، أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - كان في غزوة تبوك إذا زاغت الشمس قبل أن يرتحل، جمع=

کے پیش نظر اس کا یہ مطلب بیان فرماتے ہیں کہ: جمع تقدیم سے مراد ظہر کو اس کے آخر وقت میں پڑھنا اور عصر کو اس کے اول وقت میں پڑھنا ہے، اسی طرح جمع تاخیر کا مطلب ہے: مغرب کو اس کے آخری وقت میں پڑھنا اور عشا کو اس کے اول وقت میں پڑھنا، اس کو ''جمع صوری'' اور ''جمع فعلی'' بھی کہا جاتا ہے۔(۳)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ دو نماز کو ایک ہی وقت میں پڑھنا مراد نہیں ہے۔ البتہ تینوں ائمہ کے نزدیک جمع سے ''جمع حقیقی'' مراد ہے، یعنی ظہر کے وقت میں ظہر اور عصر کو اور عشاء کے وقت میں مغرب اور عشاء کو پڑھنا اور وہ اس کو سفر، بارش اور دیگر عوارض کی بنیاد پر جائز کہتے ہیں۔(۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=بين الظهر والعصر، وإن يرتحل قبل أن تزيغ الشمس، أخر الظهر، حتى ينزل للعصر، وفي المغرب مثل ذلك، إن غابت الشمس قبل أن يرتحل، جمع بين المغرب والعشاء، وإن يرتحل قبل أن تغيب الشمس، أخر المغرب حتى ينزل للعشاء ثم جمع بينهما ". (سنن أبي داود: ۱/ ۱۷۲، رقم الحديث: ۱۲۰۸، كتاب الصلاة، باب الجمع بين الصلاتين، ط: فيصل - ديوبند)

(۳) ثم هو مؤول وتأويله أنه جمع بينهما فعلا لا وقتا، بأن أخر الأولى منهما إلى آخر الوقت، ثم أدى الأخرى في أول الوقت، ولا واسطة بين الوقتين فوقعتا مجتمعتين فعلا، كذا فعل ابن عمر - رضي الله عنهما - في سفر وقال: هكذا كان يفعل بنا رسول الله - صلى الله عليه وسلم - دل عليه ما روي عن ابن عباس - رضي الله عنهما - أن النبي - صلى الله عليه وسلم - جمع من غير مطر ولا سفر، وذلك لا يجوز إلا فعلا، وعن علي - رضي الله عنه - أنه جمع بينهما فعلا ثم قال: هكذا فعل بنا رسول الله - صلى الله عليه وسلم - وهكذا روي عن أنس بن مالك أنه جمع بينهما فعلا ثم قال: هكذا فعل بنا رسول الله - صلى الله عليه وسلم -. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۲۷، كتاب الصلاة، فصل شرائط أركان الصلاة، الجمع بين الصلاتين، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۸۲، قبيل باب الأذان، ط: دار الفكر - بيروت)

[۴] (يجوز الجمع بين الظهر والعصر تقديما) في وقت الأولى (وتأخيرا) في وقت الثانية، والجمعة كالظهر في جمع التقديم كما نقله الزركشي واعتمده كجمعهما بالمطر بل أولى، ويمتنع تأخيرا لأن الجمعة لا يتأتى تأخيرها عن وقتها (و) بين (المغرب والعشاء كذلك) أي تقديما في وقت الأولى، وتأخيرا في وقت الثانية (في السفر الطويل) المباح للاتباع. (مغني المحتاج إلى معرفة معاني ألفاظ المنهاج - شمس الدين، محمد بن أحمد الخطيب الشربيني الشافعي (م: ۹۷۷هـ): ۱/ ۵۲۹، باب صلاة المسافر، فصل في الجمع بين الصلاتين، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ ر: شرح الزُرقاني على مختصر سيدي خليل - عبد الباقي بن يوسف بن أحمد الزرقاني المصري (م: ۱۰۹۹هـ): ۲/ ۴۸ - ۴۹، باب القصر والجمع، كتاب الصلاة، ط: دار الفكر ☆ التلقين في الفقة المالكي - أبو محمد عبد الوهاب بن علي، الثعلبي البغدادي المالكي (م: ۴۲۲هـ): ۱/ ۵۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة والجماعة وقضاء الفوائت والنوافل وأوقات النهي ومواضعه والجمع وما يتصل بذلك، ت: أبو أويس محمد بو خبزة الحسني التطواني، ط: دار الكتب العلمية ☆ التاج والإكليل لمختصر خليل - محمد بن يوسف بن أبي القاسم بن يوسف =

[۳۱] رمضان کے علاوہ مغرب کی جماعت میں تاخیر جائز نہیں

۵۸۵-سوال: موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام مسجدوں میں اذانیں لاؤڈ اسپیکر میں ہوتی ہیں اور لوگ اذان سن کر گھر سے نکلتے ہیں؛ اس لیے مغرب کی نماز کے متعلق بہت سے لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ اذان ہوجانے کے دو چار منٹ کے بعد جماعت کھڑی کرنی چاہیے، تاکہ جماعت میں زیادہ لوگ شریک ہوسکیں، تو کیا شرعاً اس کی اجازت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مغرب کی نماز میں رمضان کے علاوہ میں حکم یہ ہے کہ موذن اذان سے فارغ ہوکر مسجد میں ٹھہرے بغیر اقامت شروع کردے۔[1] البتہ رمضان شریف میں چوں کہ روزے دار افطار میں مشغول رہتے ہیں؛

= العبدري الغرناطي، أبو عبد الله المواق المالكي (م: ۸۹۷هـ): ۲/ ۵۱۰، كتاب الصلاة، باب في صلاة السفر، ط: دار الكتب العلمية ☆الشرح الكبير مع حاشية الدسوقي-أبو البركات أحمد بن محمد العدوي، الشهير بالدردير (۱۲۰۱هـ): ۱/ ۳۶۸-۳۶۹، فصل في أحكام صلاة المسافر، ط: دار الفكر ☆الكافي في فقه الإمام أحمد-أبو محمد موفق الدين عبد الله بن أحمد، ابن قدامة الجماعيلي المقدسي ثم الدمشقي الحنبلي، الشهير بابن قدامة المقدسي (م: ۶۲۰هـ): ۱/ ۳۱۱، كتاب الصلاة، باب الجمع بين الصلاتين، ط: دار الكتب العلمية)

(۱) عن مرثد بن عبد الله، قال: لما قدم علينا أبو أيوب غازيا وعقبة بن عامر يومئذ على مصر، فأخر المغرب، فقام إليه أبو أيوب، فقال: له ما هذه الصلاة يا عقبة، فقال: شغلنا، قال: أما سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: «لا تزال أمتي بخير» - أو قال: على الفطرة - ما لم يؤخروا المغرب إلى أن تشتبك النجوم". (سنن أبي داؤد: ۱/ ۶۰، رقم الحديث: ۴۱۸، كتاب الصلاة، باب وقت المغرب، ط: البدر-ديوبند)

مغرب کی اذان واقامت کے درمیان فصل لازم ہے۔ البتہ اس تحدید کا خیال رکھے، جو ہمارے اصحاب سے مروی ہے۔ امام صاحبؒ کے نزدیک یہ فصل اتنا ہوگا کہ اس میں ۳/ چھوٹی آیتیں یا ایک بڑی آیت پڑھ سکے، جب کہ صاحبین کے نزدیک یہ فصل اتنا ہوگا، جتنا دو خطبوں کے درمیان ہوتا ہے۔ (لیکن یہ اختلاف صرف افضلیت میں ہے) الغرض ہمارے ائمہ سے اسی قدر فصل ثابت ہے، اس سے زیادہ نہیں؛ اس لیے اس سے زیادہ فصل کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے:

وأما إذا كان في المغرب فالمستحب يفصل بينهما بسكتة يسكت قائما مقدار ما يتمكن من قراءة ثلاث آيات قصار. هكذا في النهاية فقد اتفقوا على أن الفصل لا بد منه فيه أيضا. كذا في العتابية. ــــــ واختلفوا في مقدار الفصل فعند أبي حنيفة - رحمه الله - المستحب أن يفصل بينهما بسكتة يسكت قائما ساعة ثم يقيم، ومقدار السكتة عنده قدر ما يمكن فيه من قراءة ثلاث آيات قصار أو آية طويلة، وعندهما يفصل بينهما بجلسة خفيفة مقدار الجلسة بين الخطبتين، وذكر الإمام الحلواني الخلاف في الأفضلية حتى إن عند أبي حنيفة - رحمه الله - إن جلس =

اس لیے ان کا خیال کر کے دو چار منٹ تک انتظا کرنا یا مصلیان اس سے زیادہ چھ سات منٹ ٹھہرنے کو کہیں، تو اس قدر ان کی رعایت کرنا بہتر ہے۔

کیوں کہ رسول اللہ کا فرمان ہے کہ: شام کا کھانا اور عشاء (مراد مغرب ہے) دونوں جمع ہو جائیں، تو عشاء کو بعد میں پڑھو اور پہلے کھانے سے فارغ ہو جاؤ۔ (بخاری شریف: ۱/ ۹۲)[۲] پس اگر ایسا اتفاق پیش آتا ہے، مثلاً آدمی سفر سے آیا اور نماز کا وقت ہو گیا اور بہت سخت بھوک لگی ہوئی ہے، تو پہلے کھانے سے فارغ ہو جائے، پھر نماز پڑھے؛ اسی طرح رمضان شریف میں روزے داروں کا بھوک کی وجہ سے کھانے پینے کی جانب دھیان و میلان رہتا ہے؛ لہٰذا جو لوگ کچھ تاخیر کا کہتے ہیں، ان کی بات تسلیم کر لی جائے گی اور پانچ دس منٹ تاخیر کرنے میں کوئی حرج نہ ہوگا، بل کہ یہ حدیث شریف کے موافق عمل ہے۔ (ہاں نماز قضاء ہونے کا خطرہ ہو، تو پہلے نماز پڑھ لے اس لیے کہ کراہت کے ساتھ نماز پڑھنا، قضاء کرنے سے بہتر ہے)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایسی حالت میں (یعنی نماز کے وقت کھانے کا بہت تقاضہ ہو) کھانے کے بعد نماز پڑھتے تھے۔[۳]

حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ: انسان کی عقل و سمجھ کا تقاضہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں کھانے سے فارغ ہو کر نماز پڑھے، اس صورت میں سکون واطمینان سے نماز پڑھ سکے گا۔[۴] اسی بنا پر حکماء امت

= جاز والأفضل أن لا يجلس وعندهما على العكس. كذا في النهاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۷، كتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، الفصل الثاني في كلمات الأذان والإقامة وكيفيتهما، ط: دار الفكر)

(ويجلس بينهما) بقدر ما يحضر الملازمون مراعيا لوقت الندب (إلا في المغرب) فيسكت قائما قدر ثلاث آيات قصار، ويكره الوصل إجماعا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۸۹-۳۹۰، كتاب الصلاة، باب الأذان)

(۲) عن أنس بن مالك: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «إذا قدم العشاء، فابدءوا به قبل أن تصلوا صلاة المغرب، ولا تعجلوا عن عشائكم». (صحيح البخاري: ۱/ ۹۲، رقم الحديث: ۶۷۲ كتاب الاذان، باب إذا حضر الطعام وأقيمت الصلاة، ط: البدر د-يوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۰۸، رقم الحديث: ۵۵۷، كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب كراهة الصلاة بحضرة الطعام الذي يريد أكله في الحال... الخ، ط: البدر- ديوبند)

(۳) عن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «إذا وضع عشاء أحدكم وأقيمت الصلاة، فابدءوا بالعشاء ولا يعجل حتى يفرغ منه» وكان ابن عمر: «يوضع له الطعام، وتقام الصلاة، فلا يأتيها حتى يفرغ، وإنه ليسمع قراءة الإمام». (صحيح البخاري: ۱/ ۹۲، رقم الحديث: ۶۷۳، كتاب الأذان، باب إذا حضر الطعام... الخ، ط: البدر- ديوبند)

(۴) قال أبو الدرداء: «من فقه المرء إقباله على حاجته حتى يقبل على صلاته وقلبه فارغ». (صحيح البخاري: ۱/ ۹۲، كتاب الاذان، باب إذا حضر الطعام... الخ، ط: البدر- ديوبند)

فرماتے ہیں کہ: ''نماز کو کھانا بنایا جائے، اس سے بہتر ہے کہ کھانے کو نماز بنایا جائے۔'' یعنی کھاتے وقت یہ خیال کرے گا کہ جلد فارغ ہو کر نماز پڑھوں اور یہ حقیقت ہے کہ نماز کا انتظار کرنے والا، نماز میں ہوتا ہے، تو اس طرح کھانا حکماً نماز ہو گیا اور بھوک کی حالت میں نماز پڑھے گا، تو نماز میں کھانے کی طرف دھیان ہوگا، تو یہ ایسا ہو گیا کہ اس نے نماز کو کھانا بنا لیا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] چاشت کی نماز کا وقت کب سے کب تک رہتا ہے؟

۵۸۶-سوال: چاشت کی نماز کا وقت کب سے شروع ہوتا ہے اور کب تک رہتا ہے؟ زوال سے پہلے کب تک وقت باقی رہتا ہے؟ مثلاً: اگر زوال ۱۲:۲۵ (بارہ بج کر پچیس منٹ) پر ہوتا ہے، تو کیا پچیس منٹ پہلے تک باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

صحیح یہ ہے کہ چاشت کی نماز کا وقت صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کے کل وقت کا چوتھائی حصہ گزرنے کے بعد شروع ہوتا ہے، اور زوال تک رہتا ہے، مثلاً: صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کا مکمل وقت اس وقت ۱۳ گھنٹہ ہے، تو صبح صادق سے سوا تین گھنٹے گزرنے کے بعد چاشت کا وقت شروع ہو جائے گا۔[۱]

اس سلسلے میں ایک دوسرا قول یہ ہے کہ طلوع آفتاب کے بعد مکروہ وقت نکل جانے پر چاشت کی نماز کا وقت شروع ہو جاتا ہے، اشراق کی نماز کے بعد چاشت کی نماز پڑھ لی جائے، تو چاشت کی نماز کا ثواب مل

(۱) (و) ندب (أربع فصاعدا في الضحى) على الصحيح من بعد الطلوع إلى الزوال، ووقتها المختار بعد ربع النهار. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله ووقتها المختار) أي الذي يختار ويرجح لفعلها وهذا عزاه في شرح المنية إلى الحاوي، وقال: لحديث زيد بن أرقم أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قال «صلاة الأوابين حين ترمض الفصال» رواه مسلم. وترمض بفتح التاء والميم: أي تبرك من شدة الحر في أخفافها. اهـ. (رد المحتار: ۲/ ۲۲، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب سنة الضحى، ط: دار الفكر)

(ومن المندوبات صلاة الضحى) وأقلها ركعتان وأكثرها اثنتا عشرة ركعة ووقتها من ارتفاع الشمس إلى زوالها. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۲، الباب التاسع في النوافل، من المندوبات صلاة الضحى، ط: دار الفكر)

جائے گا۔ (طحطاوی: ۲۱۶)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳۳] اشراق کی نماز کا آخری وقت کیا ہے اور چاشت کا وقت کب سے شروع ہوتا ہے؟

۵۸۷-سوال: اشراق کی نماز سورج کے ایک نیزہ بلند ہونے کے بعد سے کب تک پڑھ سکتے ہیں؟ اور چاشت کی نماز کا وقت کب سے شروع ہوتا ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

صبح کی نماز کے بعد اپنی جگہ ٹھہر کر سورج کے ایک نیزہ بلند ہونے کے بعد دو رکعت یا چار رکعت پڑھنا بڑی فضیلت رکھتا ہے، عام طور پر اشراق کی نماز کا مصداق یہی ہے۔[2]

---

(۱) "و" ندب صلاة الضحى على الراجع وهي "أربع" ركعات لما رويناه قريبا عن عائشة رضي الله عنها أنه عليه السلام كان يصلي الضحى أربع ركعات ويزيد ما شاء فلذا قلنا ندب أربع "فصاعدفي" وقت "الضحى" وابتداؤه من ارتفاع الشمس إلى قبل زوالها. (مراقي الفلاح)

قوله: "وندب صلاة الضحى" الضحوة إرتفاع النهار والضحى بالضم والقصر فوق ذلك وبالفتح والمد إذا علت الشمس إلى ربع السماء... قوله: "وابتداؤه من إرتفاع الشمس" ووقتها المختار إذا مضى ربع النهار لحديث زيد بن أرقم أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "صلاة الأوابين حين ترمض الفصال" رواه مسلم، وترمض بفتح التاء والميم أي تبرك من شدة الحر في أخفافها. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱ھ) ص:۳۹۵، كتاب الصلاة، فصل في تحية المسجد وصلاة الضحى وإحياء الليالي، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) عن أنس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: »من صلى الغداة في جماعة ثم قعد يذكر الله حتى تطلع الشمس، ثم صلى ركعتين كانت له كأجر حجة وعمرة«، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: »تامة تامة تامة«. (سنن الترمذي: ۱/ ۱۳۰، رقم الحديث: ۵۸۶، أبواب السفر، باب ذكر ما يستحب من الجلوس في المسجد بعد صلاة الصبح حتى تطلع الشمس، ط: البدر - ديوبند)

ولأن في الإسفار تكثير الجماعة وفي التغليس تقليلها وما يؤدي إلى التكثير أفضل وليسهل تحصيل ما ورد عن أنس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من صلى الفجر في جماعة ثم قعد يذكر الله تعالى حتى تطلع الشمس ثم صلى ركعتين كانت له كأجر حجة تامة وعمرة تامة" حديث حسن. (مراقي)

قال الطحطاوي: قوله: "ثم صلى ركعتين" ويقال لهما ركعتا الإشراق وهما غير سنة الضحى قوله: "تامة" أي كل منهما أي غير ناقص ثوابهما بارتكاب نحو محظور إحرام أو فساد والمراد الحج النفل والتأكيد يفيد أن له ذلك=

ابوداؤد شریف میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنی جگہ بیٹھا رہے، یہاں تک کہ چاشت کی دو رکعت پڑھ لے، خیر کے سوا کوئی کلمہ اپنی زبان سے نہ کہے، اور ذکر اللہ میں مشغول رہے، تو اُس کے گناہ بخش دیے جائیں گے، خواہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔ (ابوداؤد شریف: ۲/ ۲۷۲)[۱]

اِس لیے نمازِ اشراق یا چاشت کی یہ فضیلت تو اُس کو حاصل ہوگی، جو مذکورہ عمل پر قائم رہے، اگر کوئی شخص اس پر عمل نہیں کرتا؛ لیکن سورج چڑھنے کے بعد نماز پڑھ لیتا ہے، تو کہا جائے گا کہ اُس نے اشراق پڑھی، اور اُس کو دوسرے فضائل حاصل ہو جائیں گے، اشراق کا وقت کم رہتا ہے، اگر زیادہ دھوپ چڑھے سورج کے مائل بہ تیزی ہونے کے بعد پڑھی، تو یہ چاشت کا وقت مشترک ہے، درمختار میں مذکور ہے کہ اشراق کا وقت زوال تک باقی رہتا ہے، اگر اشراق میں تاخیر ہوگئی، تو اب یہ نماز اشراق ضحیٰ کہلائے گی، اور ضحیٰ کی فضیلت حاصل ہوجائے گی، ہاں، نمازِ فجر سے اشراق کے وقت تک بیٹھنے اور نماز پڑھنے کی فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔فقط، واللہ اعلم بالصواب۔ (درمختار: ۲/ ۲۴)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= الأجر حقيقة وليس من قبيل الترغيب. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح-أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱ھ)، ص:۱۸۱، كتاب الصلاة، مدخل، ت:محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت)

[۱] عن سهل بن معاذ بن أنس الجهني، عن أبيه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: من قعد في مصلاه حين ينصرف من صلاة الصبح، حتى يسبح ركعتي الضحى، لا يقول إلا خيرا، غفر له خطاياه، وإن كانت أكثر من زبد البحر. (سنن أبي داود: ۱/ ۱۸۲، رقم الحديث: ۱۲۸۷، كتاب الصلاة، باب صلاة الضحى، ط: البدر - ديوبند)

[۲] (و) ندب (أربع فصاعدا في الضحى) على الصحيح من بعد الطلوع إلى الزوال ووقتها المختار بعد ربع النهار. وفي المنية: أقلها ركعتان وأكثرها اثني عشر، وأوسطها ثمان وهو أفضلها كما في الذخائر الأشرفية. (الدر المختار) قال ابن عابدين: (قوله وفي المنية أقلها ركعتان) نقل الشيخ إسماعيل مثله عن الغزنوية والحاوي والشرعة والسمرقندية، وما ذكره المصنف مشى عليه في التبيين والمفتاح والدرر. ودليل الأول، أنه - صلى الله عليه وسلم - أوصى أبا هريرة بركعتين، كما في صحيح البخاري. ودليل الثاني: أنه - صلى الله عليه وسلم - كان يصلي الضحى أربعا ويزيد ما شاء الله، رواه مسلم وغيره. والتوفيق ما أشار إليه بعض المحققين أن الركعتين أقل المراتب والأربع أدنى الكمال (قوله وأكثرها اثنا عشر) لما رواه الترمذي والنسائي بسند فيه ضعف أنه - صلى الله عليه وسلم - قال: من صلى الضحى ثنتي عشرة ركعة بنى الله له قصرا من ذهب في الجنة، وقد تقرر أن الحديث الضعيف يجوز العمل به في الفضائل شرح المنية. وقيل أكثرها ثمانية، وعزاه في الحلية إلى الإمام أحمد، وعزاه بعض الشافعية إلى الأكثرين. (رد المحتار: ۲/ ۲۳، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب سنة الضحى، ط: دار الفكر)

[۳۴] رات اور دن کا اطلاق کب سے کب تک ہوتا ہے؟

۵۸۸-سوال: رات اور دن کا وقت کہاں سے کہاں تک شمار ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

روزہ اور دیگر احکام میں شرعی طور پر دن کا اطلاق ''صبح صادق سے غروب آفتاب تک'' پر ہوتا ہے۔[۱] اور غروب آفتاب سے صبح صادق تک رات کا وقت شمار کیا جاتا ہے؛ لہٰذا اگر کوئی شخص عشاء اور وتر کی نماز رات کے ابتدائی حصے میں نہ پڑھ سکا ہو، تو صبح صادق سے پہلے جب بھی ادا کرے گا، وہ ادا ہی شمار ہوگی۔[۲] اس کے بعد قضا شمار ہوگی۔

صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کا جو وقت ہے، اس کے نصف کو ''نصف نہار شرعی'' کہا جاتا ہے، اگر کسی نے نصف نہار شرعی سے پہلے روزہ کی نیت کر لی ہو، تو اس کا اعتبار ہوگا، اس کے بعد نیت کی ہو، تو اعتبار نہیں ہوگا۔

اور طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کا جو وقت ہے، اس کے نصف کو ''نصف نہار عرفی'' کہا جاتا ہے۔[۳] نماز کے سلسلے میں نصف نہار عرفی کا اعتبار ہے، چناں چہ اس وقت (استوائے شمس کے وقت) نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) أما الذي يرجع إلى أصل الوقت: فهو بياض النهار وذلك من حين يطلع الفجر الثاني إلى غروب الشمس. (بدائع الصنائع: ۲/ ۷۷، كتاب الصوم، شرائط الصوم، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ص:۶۲۳، كتاب الصوم، المكتبة الاشرفية- ديوبند)

اليوم الشرعي من طلوع الفجر إلى الغروب. (ردالمحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۷۱، كتاب الصوم، ط: دار الفكر)

(۲) وأول وقت العشاء إذا غاب الشفق على القولين، وآخره مالم يطلع الفجر أي الجزء الذي قبيل طلوع الفجر من الزمان، ووقت الوتر ما هو وقت العشاء، هذا عند أبي حنيفة، وعندهما وقتها بعد صلاة العشاء. (حلبي كبير ص: ۲۰۱، بحث فروع في شرح الطحاوي، ط: دار الكتاب- ديوبند)

[۳] (صح صوم رمضان والنذر المعين والنفل بنية من الليل إلى الضحوة الكبرى لا عندها) فإن النهار الشرعي من الصبح إلى الغروب، والضحوة الكبرى منتصفه فوجب أن توجد النية قبلها لتكون موجودة في أكثر النهار فتوجد في كله حكما، وهذا هو الأصح لا ما قيل إلى الزوال؛ لأنه منتصف نهار اعتبر من طلوع الشمس إلى غروبها. (درر الحكام شرح غرر الأحكام-محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م:۸۸۵ھ): ۱/ ۱۹۷، كتاب الصوم، ط: دار إحياء الكتب العربية☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۷۷، كتاب الصوم، ط: دار الفكر- بيروت)

قال معاوية: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: المؤذنون أطول الناس أعناقا يوم القيامة.
(مسلم شریف: ۱/ ۱۶۷، رقم الحدیث: ۳۸۷)

باب الأذان والإقامة

[اذان واقامت کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب الأذان والإقامة

اذان واقامت کا بیان

[۱] اذان کی ابتداء کس طرح ہوئی؟

۵۸۹-سوال: اذان کا حکم کب ہوا اور کس طرح ہوا؟ اذان کے متعلق کس صحابی نے خواب دیکھا تھا؟ اور سب سے پہلے اسلام میں کس نے اذان دی؟ جواب عنایت فرمائیں، کرم ہوگا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مکہ مکرمہ میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ نماز پڑھ لیتے تھے، جماعت کے ساتھ نماز نہیں ہوتی تھی؛ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ فروکش ہوئے اور مدینہ منورہ ''دارالاسلام'' بن گیا اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی منظم ہوئی، تو نماز بھی جماعت کے ساتھ ادا کی جانے لگی، ایسے میں ضرورت محسوس ہوئی کہ جماعت کا وقت قریب آنے کی عام اطلاع کے لیے اعلان کا کوئی خاص طریقہ تجویز کیا جائے، تاکہ تمام حضرات جماعت میں بہ یک وقت شریک ہو جائیں، یکے بعد دیگرے آنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو تکلیف نہ ہو، اور جماعت کے ثواب سے بھی کوئی محروم نہ رہ جائے۔

چناں چہ ہجرت کے پہلے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں مشورے کے لیے صحابہ کرامؓ کو جمع کیا، کسی نے کہا: اس کے لیے بہ طور علامت کوئی جھنڈا بلند کرنا چاہیے، لوگوں کی نگاہ جب اس پر پڑے گی، تو ایک دوسرے کو اطلاع کر دیں گے۔ کسی نے رائے دی کہ: کسی بلند جگہ پر آگ روشن کرنی چاہیے، کسی نے مشورہ دیا کہ: یہود کے عبادت خانوں میں نرسنگا بجایا جاتا ہے ہمیں بھی نرسنگا بجانا چاہیے۔ کسی نے

نصاریٰ کے ناقوس کی تجویز پیش کی؛ لیکن حضور اکرم ﷺ نے ان میں سے کسی بات پر اطمینان ظاہر نہیں فرمایا؛ بل کہ بعض تجاویز یہ فرما کر رد کر دیں کہ یہ غیر مسلموں کا طریقہ ہے۔

آخر میں حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ نماز کا وقت ہونے پر کوئی آدمی بھیجا جائے، جو محلہ محلہ گھوم کر "الصلاۃ جامعۃ" (نماز تیار ہے) کا اعلان کرے، چوں کہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی، اس لیے اس تجویز پر عمل کرنا کوئی دشوار کن نہیں تھا، چناں چہ آپ ﷺ نے یہ تجویز پسند فرمائی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس کام کے لیے منتخب فرمایا، مگر کسی وجہ سے اس تجویز پر فوری عمل شروع نہ ہوسکا، البتہ اس معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کی غیر معمولی فکر مندی نے بہت سے صحابہ کرام کو فکر مند کر دیا، چناں چہ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اذان سے متعلق خواب دیکھا، مگر کسی وجہ سے انہوں نے آں حضور ﷺ سے اپنے خواب کا تذکرہ نہ کیا، یہاں تک کہ ایک انصاری صحابی حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہؓ نے اذان کے متعلق خواب دیکھا۔

حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ خواب میں میرے سامنے ایک شخص آیا، جو اپنے ہاتھ میں ناقوس لیے ہوئے تھا، میں نے اس سے پوچھا: اے اللہ کے بندے! تم یہ ناقوس بیچو گے؟ اس نے کہا: تم اس کا کیا کروگے؟ میں نے کہا: ہم اس کے ذریعہ اعلان کر کے لوگوں کو نماز کے لیے اکٹھا کریں گے، اس نے کہا: کیا تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں، جو اس کام کے لیے نقارہ سے بہتر ہے؟ میں نے کہا: ہاں! ضرور بتاؤ، پھر اس نے اذان کہی الخ ــــــــ یہ خواب دیکھ کر میں خوش ہوگیا اور جلدی سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جا کر بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلاؤ، ان کی آواز تم سے بلند ہے، ان کے آنے پر آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: تم ان کے ساتھ کھڑے ہوجاؤ اور کلمات اذان ان کو بتلاؤ، وہ بلند آواز سے پکاریں گے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دینی شروع کی، اذان کے کلمات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوراً چادر گھسیٹتے ہوئے خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: قسم ہے اس ذات پاک کی، جس نے آپ کو دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا تھا، جیسا عبداللہ نے دیکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: الحمدللہ! مگر تم نے اس وقت جب عبداللہ نے خواب بیان کیا تھا، اپنے خواب کا تذکرہ کیوں نہیں کیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ عبداللہ نے یہ فضیلت آگے بڑھ کر حاصل کر لی، اس لیے مجھے تذکرہ کرتے ہوئے شرم محسوس ہوئی، اسی دن سے اذان کا یہ نظام قائم ہوگیا، جو آج تک اسلام

اور مسلمانوں کا خاص شعار ہے۔ (مستفاد: بخاری، ابوداؤد اور دیگر کتب حدیث)[1]

اور ترمذی: ۱/۲۶ کے حاشیہ نمبر: ۶ میں لکھا ہے کہ مذکورہ خواب دس سے زائد صحابۂ کرام ؓ نے دیکھا تھا۔[2] بعض کتابوں میں ہے کہ یہ واقعہ ۱۶/ سے زائد صحابۂ کرام ؓ کو خواب میں دکھایا گیا تھا۔[3] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) أن ابن عمر، كان يقول: كان المسلمون حين قدموا المدينة يجتمعون فيتحينون الصلاة ليس ينادى لها، فتكلموا يوما في ذلك، فقال بعضهم: اتخذوا ناقوسا مثل ناقوس النصارى، وقال بعضهم: بل بوقا مثل قرن اليهود، فقال عمر: أو لا تبعثون رجلا ينادي بالصلاة، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: »يا بلال قم فناد بالصلاة. (صحيح البخاري: ۱/ ۸۵، رقم الحديث: ۶۰۴، كتاب الأذان، باب بدء الأذان، ط: رشيدية- دهلي ☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۶۴، رقم الحديث: ۱-۳۷۷، كتاب الصلاة، باب بدء الأذان، ط: مختار اينڈ كمپني- ديوبند)

عن محمد بن عبد الله بن زيد بن عبد ربه، قال: حدثني أبي عبد الله بن زيد، قال: لما أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم بالناقوس يعمل ليضرب به للناس لجمع الصلاة طاف بي وأنا نائم رجل يحمل ناقوسا في يده، فقلت: يا عبد الله أتبيع الناقوس؟ قال: وما تصنع به؟ فقلت: ندعو به إلى الصلاة، قال: أفلا أدلك على ما هو خير من ذلك؟ فقلت له: بلى، قال: فقال: تقول: الله أكبر، الله أكبر، الله أكبر، الله أكبر، أشهد أن لا إله إلا الله، أشهد أن لا إله إلا الله، أشهد أن محمدا رسول الله، أشهد أن محمدا رسول الله، حي على الصلاة، حي على الصلاة، حي على الفلاح، حي على الفلاح، الله أكبر، الله أكبر، لا إله إلا الله، قال: ثم استأخر عني غير بعيد، ثم، قال: وتقول: إذا أقمت الصلاة، الله أكبر الله أكبر، أشهد أن لا إله إلا الله، أشهد أن محمدا رسول الله، حي على الصلاة، حي على الفلاح، قد قامت الصلاة، قد قامت الصلاة، الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله، فلما أصبحت، أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأخبرته بما رأيت فقال: إنها لرؤيا حق إن شاء الله، فقم مع بلال فألق عليه ما رأيت، فليؤذن به، فإنه أندى صوتا منك، فقمت مع بلال، فجعلت ألقيه عليه، ويؤذن به، قال: فسمع ذلك عمر بن الخطاب، وهو في بيته فخرج يجر رداءه، ويقول: والذي بعثك بالحق يا رسول الله، لقد رأيت مثل ما رأى، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: فلله الحمد. (سنن أبي داود: ۱/ ۷۱، رقم الحديث: ۴۹۹، كتاب الصلاة، باب كيف الأذان، ط: تهانوي- ديوبند☆ سنن الترمذي: ۱/ ۴۸، رقم الحديث: ۱۸۹، أبواب الصلاة، باب ما جاء في بدء الأذان، ط: فيصل- ديوبند)

(۲)... أنه رأى الأذان في المنام تلك الليلة أحد عشر رجلا من أصحاب رسول الله- صلى الله عليه وسلم-. (حاشية مشكاة المصابيح، ص: ۶۳، حاشیہ نمبر: ۸، باب الاذان كتاب الصلاة، ط: ياسر نديم اينڈ كمپنى، ديوبند)

(۳)... "أن عبد الله بن زيد هو أذن أولا وأنه رأى الأذان في المنام معه بضعة عشرة صحابيا". (خلاصة الأحكام في مهمات السنن وقواعد الإسلام- أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ۶۷۶هـ): ۱/ ۲۷۷- ۲۷۸، كتاب الأذان، باب ابتدائه وفضله، فصل في ضعيفه، ت: حسين إسماعيل الجمل، ط: مؤسسة الرسالة- بيروت)

[۲] خطبہ سے پہلے اذان کیوں؟

۵۹۰-سوال: جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے جو اذان دی جاتی ہے، اس کی کیا اہمیت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

خطبہ سننا واجب ہے، خطبہ سے قبل اذان اس لیے دی جاتی ہے کہ اس سے مسجد میں موجود حضرات کو متوجہ کرنا ہوتا ہے کہ امام صاحب جو خطبہ دیں گے، اس کو غور سے سننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ (۱) کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ کوئی خطبۂ جمعہ کے وقت بات کرے۔ (۲)

رسول پاک ﷺ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہی خطبہ کی اذان تھی، دوسری اذان -جو جمعہ کا وقت ہونے پر دی جاتی ہے اور موجودہ ترتیب کے اعتبار سے پہلی ہے- اس کا اضافہ خلیفۂ راشد

---

(۱) أي أذان لا يستحب رفع الصوت فيه؟ قل: هو الأذان الثاني يوم الجمعة الذي يكون بين يدي الخطيب؛ لأنه كالاقامة لإعلام الحاضرين، صرح به جماعة من الفقهاء. (السعاية: ۲/ ۳۸، باب الأذان، المقام الثاني في ذكر أحوال المؤذن، ط: سہیل اکیڈمی-لاہور)

(۲) عن أبي هريرة، أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- قال: "إذا قلت لصاحبك يوم الجمعة: أنصت، والإمام يخطب، فقد لغوت". (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲۷-۱۲۸، رقم الحديث: ۹۳۴، كتاب الجمعة، باب الإنصات يوم الجمعة والإمام يخطب، ط: مكتبة البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۸۱، رقم الحديث: ۱۱- ۸۵۱، كتاب صلاة الجمعة، باب في الإنصات يوم الجمعة في الخطبة، ط: ديوبند)

وفي المجتبى: الاستماع إلى خطبة النكاح والختم وسائر الخطب واجب، والأصح الاستماع إلى الخطبة من أولها إلى آخرها، وإن كان فيها ذكر الولاة اهـ. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق-زين الدين بن إبراهيم، المعروف بـ "ابن نجيم المصري" (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۱۶۸، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(قوله وإذا خرج الإمام فلا صلاة، ولا كلام) لما رواه ابن أبي شيبة في مصنفه عن علي وابن عباس وابن عمر - رضي الله عنهم - كانوا يكرهون الصلاة والكلام بعد خروج الإمام، وقول الصحابي حجة، ولأن الكلام يمتد طبعا فيخل بالاستماع والصلاة قد تستلزمه أيضا.... وأجمعوا أن الخروج قاطع للصلاة،...وفسر الشارح الخروج بالصعود على المنبر وهكذا في المضمرات وذكر في السراج الوهاج يعني خرج من المقصورة وظهر عليهم وقيل صعد المنبر، فإن لم يكن في المسجد مقصورة يخرج منها لم يتركوا القراءة والذكر إلا إذا قام الإمام إلى الخطبة اهـ. (البحر الرائق: ۲/ ۱۶۷، باب صلاة الجمعة، كتاب الصلاة)

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں کیا گیا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] جب نماز لوٹائی جائے، تو کیا دوبارہ اقامت کہی جائے گی؟

۵۹۱-سوال: اگر امام صاحب کی نماز فاسد ہوجائے، اور اس کا اعادہ کیا جائے، تو دوبارہ اقامت کہی جائے گی یا پہلی اقامت کافی ہے؟

الجواب حامداومصليا:

پہلی بار اقامت ہوگئی ہے، نماز فاسد ہونے کی وجہ سے دوبارہ اقامت کی ضرورت نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] کیا عیدین کی نماز کے لیے اذان دینا مشروع ہے؟

۵۹۲-سوال: عیدین کی نماز کے لیے متعدد گاؤں میں اذان دی جاتی ہے، کیا یہ درست ہے؟

الجواب حامداًومصلياً:

عیدین کی نماز کے لیے اذان مشروع نہیں ہے؛ اس لیے اذان نہ دی جائے، البتہ دو تین دن پہلے

---

(۱) عن الزهري، قال: سمعت السائب بن يزيد، يقول: إن الأذان يوم الجمعة كان أوله حين يجلس الإمام، يوم الجمعة على المنبر في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأبي بكر، وعمر رضي الله عنهما، فلما كان في خلافة عثمان بن عفان رضي الله عنه، وكثروا، أمر عثمان يوم الجمعة بالأذان الثالث، فأذن به على الزوراء، فثبت الأمر على ذلك. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲۵، رقم الحديث: ۹۱۶، كتاب الجمعة، باب التأذين عند الخطبة، وانظر رقم: ۹۱۲، باب الأذان يوم الجمعة، ط: ديوبند)

(۲) قال الحصكفي: [فروع] صلى السنة بعد الإقامة أو حضر الإمام بعدها لا يعيدها بزازية. وينبغي إن طال الفصل أو وجد ما يعد قاطعا كأكل أن تعاد. (الدر المختار) وقال ابن عابدين: (قوله: وينبغي إلخ) البحث لصاحب النهر.

أقول: قال في آخر شرح المنية: أقام المؤذن ولم يصل الإمام ركعتي الفجر يصليهما ولا تعاد الإقامة؛ لأن تكرارها غير مشروع إذا لم يقطعها قاطع من كلام كثير أو عمل كثير مما يقطع المجلس في سجدة التلاوة اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۰۰، كتاب الطهارة، باب الاذان، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

نوٹ: بلا تاخیر نماز شروع کرے، تو اقامت کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، پہلی اقامت کافی ہے، اور اگر تاخیر ہوگئی ہو تو دوبارہ اقامت کہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۴/ ۹۵، اعادۂ نماز کے لیے دوبارہ اقامت کہی جائے یا نہیں؟ سوال نمبر: ۷۔۱۲، ط: دار الاشاعت، پاکستان)

بورڈ پر لکھ کر اطلاع کردیں کہ نماز اتنے بجے ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] اذان واقامت میں ''أشھد أن محمداً رسول اللہ'' پر انگوٹھے چومنا

۵۹۳-سوال: بعض حضرات اذان واقامت میں ''اشھد ان محمداً رسول اللہ'' پر اپنے ہاتھ کے انگوٹھے چومتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب حامداًومصلیا:

اذان واقامت میں ''اشھد ان محمداً رسول اللہ'' پر انگوٹھے چومنا بدعت ہے۔[2] واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن جابر بن سمرة، قال: »صليت مع رسول الله -صلى الله عليه وسلم- العيدين، غير مرة ولا مرتين، بغير أذان ولا إقامة«. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۹۰، كتاب صلاة العيدين، فصل في الصلاة قبل الخطبة بغير أذان ولا إقامة، ط: البدر-ديوبند)

قلت أرأيت صلاة العيدين هل فيهما أذان وإقامة قال ليس فيهما أذان ولا إقامة. (الأصل المعروف بالمبسوط-أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني (م:۱۸۹ھ): ۱/ ۳۷۴، باب صلاة العيدين، ت: أبو الوفا الأفغاني، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية- كراتشي ☆بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م:۵۸۷ھ): ۱/ ۲۷۶، كتاب الصلاة، فصل شرائط وجوب وجواز صلاة العيدين، ط: دار الكتب العلمية ☆الجوهرة النيرة-أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي، الزَّبِيدِيّ، الحنفي (م:۸۰۰ھ): ۱/ ۹۳، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين، ط: المطبعة الخيرية)

(۲) انگوٹھے چومنا کسی صحیح مرفوع روایت سے ثابت نہیں ہے، اس سلسلے میں دیلمی کی مسند الفردوس کا حوالہ دیا جاتا ہے، اس میں اس سلسلے کی ایک روایت موجود ہے؛ لیکن وہ صحیح نہیں ہے، علامہ شامیؒ نے اس سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے، وہ رقم طراز ہیں:

يستحب أن يقال عند سماع الأولى من الشهادة: صلى الله عليك يا رسول الله، وعند الثانية منها: قرت عيني بك يا رسول الله، ثم يقول: اللهم متعني بالسمع والبصر بعد وضع ظفري الإبهامين على العينين؛ فإنه -عليه السلام- يكون قائدا له إلى الجنة، كذا في كنز العباد. اهـ. قهستاني، ونحوه في الفتاوى الصوفية. وفي كتاب الفردوس: من قبل ظفري إبهامه عند سماع أشهد أن محمدا رسول الله في الأذان، أنا قائده ومدخله في صفوف الجنة، وتمامه في حواشي البحر للرملي عن المقاصد الحسنة للسخاوي، وذكر ذلك الجراحي وأطال، ثم قال: ولم يصح في المرفوع من كل هذا شيء. ونقل بعضهم أن القهستاني كتب على هامش نسخته أن هذا مختص بالأذان، وأما في الإقامة فلم يوجد بعد الاستقصاء التام والتتبع. (رد المحتار على الدر المختار-ابن عابدين، الدمشقي الحنفي (م:۱۲۵۲ھ): ۱/ ۳۹۸، باب الأذان، ط: دار الفكر-بيروت)

اس سلسلے کی تمام احادیث کے لیے دیکھیے: المقاصد الحسنة في بيان كثير من الأحاديث المشتهرة على الألسنة-شمس الدين أبو الخير محمد بن عبد الرحمن بن محمد السخاوي (م:۹۰۲ھ): ۱/ ۶۰۴، رقم الحديث: ۱۰۲۱، ت: محمد=

[۶] تکبیر میں افراد اور اذان میں ترجیع احناف کے یہاں سنت نہیں

۵۹۴-سوال: اذان یا تکبیر میں مؤذن "اللہ أکبر" دوبار، "أشهد أن لا إله إلا الله" ایک بار، "أشهد أن محمداً رسول الله" ایک بار، "حي على الصلاة" ایک بار اسی طرح "حي على الفلاح" ایک بار کہے، تو جائز ہے یا نہیں؟ یا اولیٰ اور غیر اولیٰ کا اختلاف ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکور طریقہ اذان کا نہیں ہے؛ بل کہ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک کے مطابق صرف تکبیر کا ہے، کہ مکبر "اللہ أکبر" دوبار، "أشهد أن لا إله إلا الله" ایک بار، "أشهد أن محمداً رسول الله" ایک بار، "حي على الصلاة" ایک بار، "حي على الفلاح" ایک بار اور "قد قامت الصلاة" دوبار کہے گا۔[۱]

جب کہ اذان میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مؤذن شہادتین میں ترجیع کرے گا، ترجیع کا مطلب ہے: شہادتین (اشهد ان لا اله الا الله" اور "اشهد ان محمد أرسول الله) کو آہستہ آواز سے کہنے کے بعد دوبارہ بلند آواز سے کہنا، یعنی پہلے چار کلمات کو ہلکی آواز سے کہے گا، پھر بلند آواز سے کہے گا۔[۲]

=عثمان الخشت، ط: دار الكتاب العربي - بيروت ☆ مجموعة الفتاوى على هامش خلاصة الفتاوى: ۳۲۵/۴، أوائل كتاب الكراهية، زكريا - ديوبند.

الغرض جب مؤذن "أشهد أن محمداً رسول الله" کہے، اس وقت انگوٹھا چومنا بدعت ہے، جس سے احتراز لازم ہے۔

(۱) وأما الإقامة، فإنها إحدى عشرة كلمة: الله أكبر الله أكبر، أشهد أن لا إله إلا الله، أشهد أن محمداً رسول الله، حي على الصلاة، حي على الفلاح، قد قامت الصلاة، قد قامت الصلاة، الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله. (المهذب في فقه الإمام الشافعي - أبو اسحاق إبراهيم بن علي بن يوسف الشيرازي (م: ۴۷۶هـ): ۱۱۱/۱، كتاب الصلاة، باب الأذان والإقامة، ط: دار الكتب العلمية ☆ التنبيه في الفقه الشافعي - الشيرازي، ص: ۲۷، باب الأذان، ط: عالم الكتب ☆ منهاج الطالبين وعمدة المفتين في الفقه - أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ۶۷۶هـ)، ص: ۲۳، كتاب الصلاة، مدخل، ت: عوض قاسم أحمد عوض، ط: دار الفكر ☆ المغني لابن قدامة - أبو محمد موفق الدين عبد الله بن أحمد، ابن قدامة الجماعيلي المقدسي ثم الدمشقي الحنبلي، الشهير بابن قدامة المقدسي (م: ۶۲۰هـ): ۲۹۳/۱، رقم المسئلة: ۵۵۶، ط: مكتبة القاهرة ☆ كشاف القناع عن متن الإقناع - منصور بن يونس بن صلاح الدين ابن حسن بن إدريس البهوتي الحنبلي (م: ۱۰۵۱هـ): ۲۳۶/۱، باب الأذان والاقامة، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) والأذان تسع عشرة كلمة: الله أكبر الله أكبر، الله أكبر الله أكبر، أشهد أن لا إله إلا الله، أشهد أن لا إله إلا الله، أشهد أن محمداً رسول الله، أشهد أن محمداً رسول الله، ثم يرجع فيمد صوته فيقول أشهد أن لا إله إلا الله، أشهد أن لا إله إلا الله=

احناف کے نزدیک اذان واقامت؛ دونوں میں تمام کلمات کو دو، دو بار کہے، سوائے اللہ اکبر کے، کہ اس کو چار مرتبہ کہے گا، نیز فجر کی اذان میں "الصلاۃ خیر من النوم" کا اور اقامت میں "قد قامت الصلاۃ" کا اضافہ کرے۔[۳]

احناف کے نزدیک ترجیع نہ کرے؛ لیکن یہ صرف اولیٰ وغیر اولیٰ کا اختلاف ہے۔[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] اذان کے وقت تلاوت جاری رکھنا اور اذان کا جواب نہ دینا

۵۹۵-سوال: اذان کے دوران ایک شخص قرآن شریف یا کوئی دینی کتاب پڑھ رہا تھا، اس سے

= أشهد أن محمداً رسول الله، أشهد أن محمداً رسول الله، حي على الصلاة، حي على الصلاة، حي على الفلاح، حي على الفلاح، الله أكبر الله أكبر، لا إله إلا الله. (المهذب في فقه الإمام الشافعي: ١/ ١٠٩، كتاب الصلاة، باب الأذان والإقامة، ☆التاج والإكليل لمختصر خليل-محمد بن يوسف بن أبي القاسم، أبو عبد الله المواق المالكي (م: ٨٩٧هـ): ٢/ ٤٣، باب في الأذان والإقامة، فصل في حكم الأذان والإقامة، ط: دار الكتب العلمية)

(٣) عن الأسود، عن بلال، أنه كان يثني الأذان، ويثني الإقامة. (شرح معاني الآثار - أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة ، الأزدي ، المصري المعروف بـ "الطحاوي" (م: ٣٢١هـ): ١/ ١٠١، رقم الحديث: ٨٢٦ - ٨٢٨، كتاب الصلاة، باب الاقامة كيف هي، مكتبة ملت - ديوبند)

"وصفة الأذان معروفة" وهو كما أذن الملك النازل من السماء "ولا ترجيع فيه" . . . "ويزيد في أذان الفجر بعد الفلاح، الصلاة خير من النوم مرتين" . . . "والإقامة مثل الأذان إلا أنه يزيد فيها بعد الفلاح، قد قامت الصلاة، مرتين" هكذا فعل الملك النازل من السماء وهو المشهور. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر، المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ٥٩٣هـ): ١/ ٤٣، كتاب الصلاة، باب الأذان، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م: ٩٧٠هـ): ١/ ٤٥٠ - ٤٤٢، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الكتاب - ديوبند☆بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ١/ ١٤٧، كتاب الصلاة، فصل بيان كيفية الأذان، ط: دار الكتب العلمية☆رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، الدمشقي الحنفي (م: ١٢٥٢هـ): ١/ ٣٨٦، باب الأذان، ط: دار الفكر - بيروت)

[٤] (ولا ترجيع) فإنه مكروه ملتقى. الدر المختار . ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: فإنه مكروه ملتقى) ومثله في القهستاني، خلافا لما في البحر من أن ظاهر كلامهم أنه مباح لا سنة ولا مكروه. قال في النهر: ويظهر أنه خلاف الأولى. وأما الترجيع بمعنى التغني فلا يحل فيه اهـ وحينئذ فالكراهة المذكورة تنزيهية. (رد المحتار على الدر المختار: ١/ ٣٨٧، باب الأذان، ط: دار الفكر - بيروت)

کہا گیا کہ اذان ہو رہی ہے، پڑھنا موقوف کر دینا چاہیے اور اذان کا جواب دینا چاہیے؛ لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں کی اور پڑھنا جاری رکھا، تو شرعاً ایسا شخص گنہ گار ہوگا یا نہیں؟ جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

بہتر یہ ہے کہ اذان کے وقت قرآن کریم کی تلاوت بند کر دے اور اپنے محلے کی مسجد کی اذان کا جواب دے؛ چوں کہ اذان کا قولاً جواب دینا مستحب ہے اور عملاً یعنی اذان سن کر مسجد کے لیے جانا واجب ہے؛ اس لیے اگر کوئی شخص مسجد میں ہو، تو چوں کہ وہ واجب کو بجالایا ہے، اس کو قرآن شریف بند کر کے اذان کا جواب دینا ضروری نہیں، وہ قرآن کی تلاوت جاری رکھ سکتا ہے۔[1] اور اگر گھر میں تلاوت کر رہا ہو اور وقت پر نماز کے لیے چلا جاتا ہے اور اس کی جماعت ترک نہیں ہوتی، تب بھی کوئی حرج نہیں، اور اگر اس کی وجہ سے ترک جماعت کا اندیشہ ہو، تو تلاوت بند کر کے مسجد جانا واجب ہے، ورنہ ترک جماعت کا گناہ ہوگا، تاہم چوں کہ زبان سے جواب دینا صرف مستحب ہے، قرآن پڑھتا رہے گا اور اذان کا جواب نہیں دے گا، تو کوئی گناہ نہ ہوگا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) "وإذا سمع المسنون منه" أي الأذان وهو ما لا لحن فيه ولا تلحين "أمسك" حتى عن التلاوة ليجيب المؤذن ولو في المسجد وهو الأفضل، وفي الفوائد يمضي على قراءته إن كان في المسجد. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح-حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ) ص:۸۰، باب الأذان، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں ہو تب بھی تلاوت بند کر دینا افضل ہے۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

(۲) عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من سمع المنادي فلم يمنعه من اتباعه، عذر، قالوا: وما العذر؟، قال: خوف أو مرض، لم تقبل منه الصلاة التي صلى. (سنن أبي داود:۱/۸۱، رقم الحديث:۵۵۱، باب في التشديد في ترك الجماعة، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

ولا ينبغي أن يتكلم السامع في خلال الأذان والإقامة ولا يشتغل بقراءة القرآن ولا بشيء من الأعمال سوى الإجابة، ولو كان في القراءة ينبغي أن يقطع ويشتغل بالاستماع والإجابة. (الفتاوى الهندية:۱/۵۷، كتاب الصلاة، الفصل الثاني في كلمات الأذان والإقامة وكيفيتهما، مايتصل بذلك. ط: دار الفكر)

(ويجيب) وجوبا، وقال الحلواني ندبا، والواجب الإجابة بالقدم (من سمع الأذان) ولو جنبا لا حائضا ونفساء وسامع خطبة وفي صلاة جنازة وجماع، ومستراح وأكل وتعليم علم وتعلمه، بخلاف قرآن. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: وقال الحلواني ندبا إلخ) أي قال الحلواني: إن الإجابة باللسان مندوبة والواجبة هي الإجابة بالقدم.... (قوله: وتعليم علم) أي شرعي فيما يظهر، ولذا عبر في الجوهرة بقراءة الفقه. ـــــ (قوله: بخلاف قرآن) لأنه لا يفوت، جوهرة، ولعله لأن تكرار القراءة إنما هو للأجر فلا يفوت بالإجابة، بخلاف التعلم، فعلى هذا=

[۸] اذان کے دوران سراً یا جہراً تلاوت کرنا

۵۹۶-سوال: جس وقت اذان ہورہی ہو، اُس دوران جہراً یا سراً تلاوت کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

اذان کے دوران تلاوت نہ کرنی چاہیے، اگر تلاوت میں مشغول تھا اور پھر اذان شروع ہو جائے، تو اس شخص کو چاہیے کہ تلاوت موقوف کردے اور اذان کو سن کر اُس کا جواب دے، بعض فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اذان کا جواب دینا واجب ہے، اذان کا جواب یہ ہے کہ مؤذن جو کلماتِ اذان میں کہہ رہا ہے، اُن ہی کلمات کو دہرائے، **حي على الصلاة** اور **حي على الفلاح** کے جواب میں "**لا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم**" کہے، اور فجر کی اذان میں "**الصلاة خير من النوم**" کے جواب میں "**صدقت وبررت**" کہے۔ (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۵۵)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=لو يقرأ تعليما أو تعلما لا يقطع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۶، باب الأذان، مطلب في كراهة تكرار الجماعة في المسجد ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۱۵۵، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يجب على السامعين عند الأذان)

[۱] عن أبي سعيد الخدري: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا سمعتم النداء، فقولوا مثل ما يقول المؤذن. (صحيح البخاري: ۱/ ۸۶، رقم الحديث: ۶۱۱، كتاب الأذان، باب ما يقول إذا سمع المنادي، ط: البدر- ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۶۶، رقم الحديث: ۱۰-(۳۸۳)، كتاب الصلاة، باب القول مثل قول المؤذن لمن سمعه، ثم يصلي على النبي صلى الله عليه وسلم ثم يسأل له الوسيلة، ط: البدر- ديوبند)

وأما بيان ما يجب على السامعين عند الأذان، فالواجب عليهم الإجابة، لما روي عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: أربع من الجفاء: من بال قائما، ومن مسح جبهته قبل الفراغ من الصلاة، ومن سمع الأذان ولم يجب، ومن سمع ذكري ولم يصل علي.

والإجابة: أن يقول مثل ما قال المؤذن؛ لقول النبي - صلى الله عليه وسلم -: من قال مثل ما يقول المؤذن غفر الله ما تقدم من ذنبه وما تأخر، فيقول مثل ما قاله إلا في قوله: "حي على الصلاة، حي على الفلاح" فإنه يقول مكانه لا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم؛ لأن إعادة ذلك تشبه المحاكاة والاستهزاء، وكذا إذا قال المؤذن: "الصلاة خير من النوم" لا يعيده السامع لما قلنا، ولكنه يقول: صدقت وبررت، أو ما يؤجر عليه.

ولا ينبغي أن يتكلم السامع في حال الأذان والإقامة، ولا يشتغل بقراءة القرآن، ولا بشيء من الأعمال سوى الإجابة، ولو كان في القراءة ينبغي أن يقطع ويشتغل بالاستماع والإجابة. كذا قالوا في الفتاوى. والله أعلم. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ۱/ ۱۵۵، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يجب على السامعين عند الأذان، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۵-۶۹، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۷، كتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، الفصل الثاني في كلمات الأذان، ط: دار الفكر)

[۹] مؤذن کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا اقامت کہنا

۵۹۷-سوال: ہمارے یہاں مسجد کا مؤذن اذان کے بعد اکثر محلہ میں چلا جاتا ہے اور نماز کھڑی ہونے کے موقع پر آتا ہے، کبھی وقت پر نہیں پہنچتا ہے، جس کی وجہ سے دوسرا کوئی مقتدی تکبیر کہہ دیتا ہے، تو اس سلسلہ میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مؤذن کی اجازت سے دوسرا شخص اقامت کہہ سکتا ہے، جائز ہے، اس سے نماز میں کوئی خلل نہ آئے گا، البتہ مؤذن کی اجازت کے بغیر اقامت کہنے سے اس کا دل دکھتا ہو، تو دوسرے کو اقامت کہنا مکروہ ہے۔ (شامی)[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] مؤذن کے علاوہ کوئی شخص تکبیر کہے، تو کیا حکم ہے؟

۵۹۸-سوال: کیا یہ بات ضروری ہے کہ جو شخص اذان کہے، وہی تکبیر بھی کہے؟ اگر اس کے علاوہ کسی دوسرے نے تکبیر کہہ دی، تو کیا یہ صحیح نہیں ہے؟

---

(۱) عن زياد بن الحارث الصدائي، قال: أمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أؤذن في صلاة الفجر، فأذنت، فأراد بلال أن يقيم، فقال: رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن أخا صداء قد أذن، ومن أذن فهو يقيم. (سنن الترمذي: ۱/۵۰، رقم الحديث: ۱۹۹، باب ما جاء أن من أذن فهو يقيم، ط: فيصل - ديوبند☆ سنن ابن ماجة: ۱/۵۲، رقم الحديث: ۷۱۷، كتاب الأذان، والسنة فيه، باب السنة في الأذان، ط: ديوبند)

(أقام غير من أذن بغيبته) أي المؤذن (لا يكره مطلقا) وإن بحضوره كره إن لحقه وحشة. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: مطلقا) أي لحقه وحشة أو لا. (قوله: كره إن لحقه وحشة) أي بأن لم يرض به، وهذا اختيار خواهر زاده، ومشى عليه في الدرر والخانية لكن في الخلاصة: إن لم يرض به يكره، وجواب الرواية أنه لا بأس به مطلقا. اهـ. قلت: وبه صرح الإمام الطحاوي في مجمع الآثار معزيا إلى أئمتنا الثلاثة. وقال في البحر: ويدل عليه إطلاق قول المجمع: ولا نكرهها من غيره. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۳۹۵، باب الأذان، قبيل: مطلب في كراهة تكرار الجماعة في المسجد)

(ومنها) -أي من سنن الأذان- أن من أذن فهو الذي يقيم، وإن أقام غيره: فإن كان يتأذى بذلك يكره؛ لأن اكتساب أذى المسلم مكروه، وإن كان لا يتأذى به لا يكره. (بدائع الصنائع: ۱/۱۵۱، كتاب الصلاة، فصل بيان سنن الأذان، ط: دار الكتب العلمية☆ قاضي خان على هامش الهندية: ۱/۷۹، مسائل الأذان، كتاب الصلاة، ط: زكريا، ديوبند)

الجواب حامداً و مصلیا:

دوسرے آدمی کے تکبیر کہنے کی وجہ سے اگر مؤذن ناراض ہوتا ہو، تو مکروہ ہے اور مؤذن اگر خود خوشی سے اس کی اجازت دیتا ہو، تو کوئی حرج نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] جو اذان دے، وہی اقامت کہنے کا زیادہ حق دار ہے

۵۹۹-سوال: اقامت کون کہے گا؟ کیا اذان کہنے والے کا اقامت کہنا ضروری ہے؟ مؤذن کی اجازت کے بغیر دوسرے کا اقامت کہنا کیسا ہے؟ اگر کسی نے موذن کی اجازت کے بغیر اقامت کہی اور مؤذن اقامت کا ارادہ رکھتا ہو، تو کیا وہ اس کو درمیان میں روک سکتا ہے؟ اور روکنے کے باجود اگر وہ نہ رکے اور مؤذن دوسری اقامت شروع کردے، تو کیسا ہے؟ جماعت کا وقت ہوگیا اور یہ معلوم نہ ہو کہ کس نے اذان دی، تو ایسے وقت میں کیا کرنا چاہیے؟ کیا مؤذن کی اجازت کے بغیر اقامت کہہ دے، یا اعلان کرکے پتہ لگائے، اس کے بعد اقامت کہے؟

الجواب حامداً و مصلیا:

جس نے اذان دی ہے، اقامت بھی وہی شخص کہے گا؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو اذان دے وہی اقامت کہے۔[2] لہذا اقامت کا حق مؤذن کا ہے، اگر کوئی دوسرا مؤذن کی اجازت سے اقامت کہے، یا بغیر اجازت کے کہے؛ لیکن اس سے مؤذن کو تکلیف نہ ہو تو جائز ہے۔ اسی طرح اذان دینے والا موجود نہیں ہے، یا وقت ہونے کے بعد بھی ایک دو منٹ زائد ہو گئے اور مؤذن نے اقامت نہیں کہی، تو بھی دوسرے کا اقامت کہنا بغیر کسی کراہت کے جائز ہے۔ اگرچہ دوسرے کے اقامت کہنے سے اس کو تکلیف ہو، تو بھی جائز ہے؛ کیوں کہ وہ حاضر نہیں ہے اور اس کے انتظار میں دوسروں کو تکلیف ہوگی؛ اس لیے دیگر مصلیان کی رعایت کرکے دوسرے کا اقامت کہنا جائز ہے۔

---

(۱) قد تقدم تخریجه تحت عنوان: ''مؤذن کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا اقامت کہنا''۔

(۲) عن زیاد بن الحارث الصدائي، قال: أمرني رسول الله صلی الله علیه وسلم أن أؤذن في صلاة الفجر، فأذنت، فأراد بلال أن یقیم، فقال: رسول الله صلی الله علیه وسلم: إن أخا صداء قد أذن، ومن أذن فهو یقیم. (سنن الترمذي: ۱/۵۰، رقم الحدیث: ۱۹۹، باب ما جاء أن من أذن فهو یقیم، ط: فیصل-دیوبند☆سنن ابن ماجة: ۱/۵۲، رقم الحدیث: ۷۱۷، کتاب الأذان، والسنة فیه، باب السنة في الأذان، ط: أشرفي-دیوبند)

لیکن مؤذن کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے نے اقامت کہی اور مؤذن ناراض ہو، تو یہ جائز نہیں ہے۔ (شامی جلد ا صفحہ ۳۶۹ ☆ عالمگیری جلد ا صفحہ ۱۹)[۱]

علامہ شامیؒ نے یہاں ''افضل'' کا لفظ لکھا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مستحب ہے؛ لہٰذا جو شخص اذان دے، وہی اقامت کہے، یہ بہتر ہے، واجب اور ضروری نہیں ہے؛ لہٰذا کوئی شخص نادانی کی وجہ سے اقامت کہہ دے، تو اس کی بے عزتی نہ کی جائے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد اسے مسئلہ سمجھا دیا جائے، ایسا نہ ہو کہ ایک افضل کام کے لیے مسجد کو لڑائی جھگڑے کا گھر بنا دیا جائے؛ اس لیے مؤذن کو چاہیے کہ اقامت کہتے وقت اس کو نہ روکے یہی بہتر ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] اذان دینے والے شخص ہی کا اِقامت کہنا ضروری ہے؟

۷۰۰-سوال: کیا ایسی کوئی روایت ہے، جس میں یہ بات ہو کہ جو شخص اذان دے، وہی

[۱] (أقام غير من أذن بغيبته) أي المؤذن (لايكره مطلقا) وإن بحضوره كره إن لحقه وحشة. (الدر المختار)
قال ابن عابدين: (قوله: مطلقا) أي لحقه وحشة أو لا. (قوله: كره إن لحقه وحشة) أي بأن لم يرض به، وهذا اختيار خواهر زاده، ومشى عليه في الدرر والخانية لكن في الخلاصة: إن لم يرض به يكره، وجواب الرواية أنه لا بأس به مطلقا. اهـ. قلت: وبه صرح الإمام الطحاوي في مجمع الآثار معزيا إلى أئمتنا الثلاثة. وقال في البحر: ويدل عليه إطلاق قول المجمع: ولا نكرهها من غيره. (رد المحتار على الدر المختار: ١/ ٣٩٥، باب الاذان، قبيل: مطلب في كراهة تكرار الجماعة في المسجد)
وإن أذن رجل وأقام آخر إن غاب الأول جاز من غير كراهة وإن كان حاضرا ويلحقه الوحشة بإقامة غيره يكره وإن رضي به لا يكره عندنا. كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ١/ ٥٤، كتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، الفصل الأول في صفة الأذان وأحوال المؤذن، ط: دار الفكر)
(ومنها) - أي من سنن الاذان - أن من أذن فهو الذي يقيم، وإن أقام غيره: فإن كان يتأذى بذلك يكره؛ لأن اكتساب أذى المسلم مكروه، وإن كان لا يتأذى به لا يكره. (بدائع الصنائع: ١/ ١٥١، كتاب الصلاة، فصل بيان سنن الأذان، ط: دار الكتب العلمية ☆ قاضي خان على هامش الهندية: ١/ ٧٩، مسائل الاذان، كتاب الصلاة، ط: زكريا، ديوبند)
(٢) وقال في البحر: ويدل عليه إطلاق قول المجمع: ولا نكرهها من غيره، فما في شرحه لابن ملك من أنه لو حضر ولم يرض يكره اتفاقا فيه نظر. اهـ. وكذا يدل عليه إطلاق الكافي معللا بأن كل واحد ذكر، فلا بأس بأن يأتي بكل واحد رجل آخر، ولكن الأفضل أن يكون المؤذن هو المقيم اهـ أي لحديث "من أذن فهو يقيم"، وتمامه في حاشية نوح. (رد المحتار على الدر المختار: ١/ ٣٩٥، باب الاذان، قبيل: مطلب في كراهة تكرار الجماعة في المسجد)

اقامت بھی کہے؟ کیا یہ لزوم شوافع کے نزدیک ثابت ہے؟ کیوں کہ بعض عرب ممالک میں امام اذان بھی دیتا ہے، اقامت بھی کہتا ہے، پھر نماز بھی وہی پڑھاتا ہے، کیا اس طرح کرنا صحیح ہے؟

الجواب حامدا و مصلیا:

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق بھی مستحب یہ ہے کہ مؤذن اقامت کہے اور امامت بھی کرے، چناں چہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ مؤذن سمجھ دار، نیک، متقی اور عالم بالسنہ ہونا چاہیے، نیز صاحبِ شوکت ہونا چاہیے، جس کی لوگوں پر ہیبت ہو، جو لوگوں کے احوال سے باخبر رہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں یا نہیں؟ اور بے نمازی اور جماعت میں غیر حاضر رہنے والوں کو تنبیہ کرے، ہمیشہ اذان دے اور اپنی اذان پر آخرت کے ثواب کا طالب ہو، کوئی اُجرت نہ لے، اور بہتر یہ ہے کہ نماز میں امام بھی وہی ہو۔ (عالمگیری: ۱/ ۵۴)[۱]

اور حدیث شریف میں بھی ترمذی کی روایت سے ثابت ہے کہ: "**من أذن فهو يقيم**".[۲] یعنی جو شخص اذان دے، وہی اقامت کہے، یعنی اقامت کا حق مؤذن کا ہے، اگر مؤذن دوسرے کو اجازت دے یا مؤذن موجود نہ ہو، تو دوسرا شخص بھی اقامت کہہ سکتا ہے۔[۳]

اِس پوری تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ حکم اُس اذان و اقامت کا ہے، جس پر اُجرت نہ لی جائے، اور آدمی اپنی خوشی سے اذان کہے اور امامت بھی کرے۔

---

(۱) وينبغي أن يكون المؤذن رجلا عاقلا، صالحا، تقيا، عالما بالسنة. كذا في النهاية، وينبغي أن يكون مهيبا، ويتفقد أحوال الناس، ويزجر المتخلفين عن الجماعات. كذا في القنية، وأن يكون مواظبا على الأذان. هكذا في البدائع، والتتارخانية، وأن يكون محتسبا في أذانه. كذا في النهر الفائق، والأحسن أن يكون إماما في الصلاة. كذا في معراج الدراية والأفضل أن يكون المؤذن هو المقيم، كذا في الكافي. (الفتاوى الهندية-لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۵۳-۵۴، الباب الثاني في الأذان، الفصل الأول في صفة الأذان وأحوال المؤذن، ط: دار الفكر☆بدائع الصنائع: ۱/ ۱۴۹-۱۵۴، فصل بيان سنن الأذان، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆البناية شرح الهداية-أبو محمد محمود بن أحمد بن موسى، الغيتابي الحنفي، بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۲/ ۹۷، صفة الأذان، شروط المؤذن، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) عن زياد بن الحارث الصدائي، قال: أمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أؤذن في صلاة الفجر، فأذنت، فأراد بلال أن يقيم، فقال: رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن أخا صداء قد أذن، ومن أذن فهو يقيم.... والعمل على هذا عند أكثر أهل العلم: أن من أذن فهو يقيم". (سنن الترمذي: ۱/ ۵۰، رقم الحديث: ۱۹۹، أبواب الصلاة، باب ما جاء أن من أذن فهو يقيم، ط: البدر-ديوبند)

(۳) دیکھیے عنوان "جو اذان دے، وہی اقامت کہنے کا زیادہ حق دار ہے" کا حاشیہ نمبر: ۲۔

آج کل مؤذن تنخواہ لیتے ہیں، اور مسلم عوام بھی کم سے کم تنخواہ پر جاہل مؤذن کا تقرر کرتے ہیں، مزید برآں مسجد و محلہ کی اور بھی بہت سی ذمہ داریاں اُس کے سپرد ہوتی ہیں، جس کی بنا پر ہمارے معاشرہ میں مؤذن کی حیثیت نہایت پست ہوتی ہے، اس عظیم منصب کے لیے ایسے شخص کو مقرر کرتے ہیں، جو کسی کام کا نہ ہو، یہاں تک کہ کوئی شریف آدمی مؤذن بننے سے بھی شرماتا ہے، ایسے مؤذن کے لیے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ وہی امام بھی ہو، ورنہ منصب امامت کی قدر و منزلت بھی کم ہو جائے گی۔

حدیث پاک میں مؤذن کا درجہ بھی بہت بلند بتایا گیا ہے۔[1] اس لیے اُس درجہ کو بھی اس طرح گھٹانا ٹھیک نہیں ہے، اذان کے لیے مستقل آدمی ہونا چاہیے اور دیگر کاموں کے لیے علاحدہ خادم ہونا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] امام کے مصلیٰ پر پہنچتے ہی تکبیر کہنا لازم نہیں

۷۰۱-سوال: ایک صاحب کا کہنا ہے کہ امام صاحب جب مصلی پر نماز پڑھانے کے لیے آئیں، اسی وقت تکبیر (اقامت) کہنا چاہیے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر امام صاحب مسجد میں حاضر ہوں، مگر مصلی پر نہ آئے ہوں، تو تکبیر کہنا صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

بہتر یہ ہے کہ امام مصلی پر آجائیں، تب تکبیر کہی جائے، تاہم امام کے مصلی پر آنے سے پہلے بھی تکبیر کہنا جائز ہے، جب کہ امام مصلی کے قریب ہوں، تاکہ تکبیر سن کر مصلی پر آجائیں، اگر مسجد سے باہر ہوں، تو اس وقت تک تکبیر نہ کہی جائے، جب تک کہ وہ مسجد میں داخل نہ ہو جائیں۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن طلحة بن يحيى، عن عمه، قال: كنت عند معاوية بن أبي سفيان، فجاءه المؤذن يدعوه إلى الصلاة، فقال معاوية: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: المؤذنون أطول الناس أعناقا يوم القيامة. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۶۷، رقم الحديث: ۱۴- (۳۸۷)، كتاب الصلاة، باب فضل الأذان وهرب الشيطان عند سماعه، ط: البدر - ديوبند)

عن ابن عباس، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من أذن سبع سنين محتسبا كتبت له براءة من النار. (سنن الترمذي: ۱/ ۵۱، رقم الحديث: ۲۰۶، أبواب الصلاة، باب ماجاء في فضل الأذان، ط: البدر - ديوبند)

(۲) عن عبد الله بن أبي قتادة، عن أبيه، قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: إذا أقيمت الصلاة، فلا تقوموا حتى تروني. (صحيح البخاري: ۱/ ۸۸، رقم الحديث: ۶۳۷، كتاب الأذان، باب: متى يقوم الناس، إذا رأوا الإمام عند=

[۱۴] ڈاڑھی منڈے کی اذان واقامت

۲۰۲-سوال: ڈاڑھی منڈے شخص نے اقامت (تکبیر) کہی ہو،تو اس اقامت سے پڑھی گئی نماز درست ہوئی یا نہیں، یا پھر سے دوہرانی ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً:

"محلوق اللحية" (ڈاڑھی منڈے شخص) کی اذان واقامت مکرہ تحریمی ہے۔[۱] البتہ ایسے شخص کی اذان واقامت سے جو نماز پڑھی جائے گی، وہ ادا ہوجائے گی اور اس کا اعادہ نہیں ہے۔[۲] واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] ڈاڑھی منڈے کی اقامت کا حکم

۲۰۳-سوال: ڈاڑھی منڈا شخص اقامت کہے،تو نماز کا کیا حکم ہے؟ کیا پھر سے نماز پڑھنا ضروری ہوگا؟

=الإقامة، ط: رشيدية- دهلي، وانظر رقم: ٩٣٨، ☆الصحيح لمسلم: ١/ ٢٢٠، رقم الحديث: ١٥٦- (٦٠٣)، باب متى يقوم الناس للصلاة، ط: مختار- ديوبند)

قال ابن حجر العسقلاني (م: ٨٥٢هـ): وفيه جواز الإقامة والإمام في منزله إذا كان يسمعها وتقدم إذنه في ذلك. (فتح الباري شرح صحيح البخاري: ٢/ ١٢٠، باب لا يقوم إلى الصلاة مستعجلا وليقم إليها بالسكينة والوقار، ط: دار المعرفة- بيروت)

(والقيام) لإمام ومؤتم (حين قيل: حي على الفلاح)... (إن كان الإمام بقرب المحراب وإلا فيقوم كل صف ينتهي إليه الإمام على الأظهر.) [الدر المختار مع رد المحتار: ١/ ٤٧٩، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة]

(١) عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليؤذن لكم خياركم وليؤمكم قراؤكم. (سنن أبي داود: ١/ ٨٧، رقم الحديث: ٥٩٠، باب من أحق بالإمامة، ط: ديوبند☆سنن ابن ماجه: ١/ ٥٣، رقم الحديث: ٧٢٦، كتاب الأذان والسنة فيه، باب فضل الأذان وثواب المؤذنين، ط: أشرفي- ديوبند)

(ويكره أذان جنب وإقامته وإقامة محدث لا أذانه) على المذهب. (و) أذان (امرأة) وخنثى (وفاسق). (الدر المختار مع رد المحتار: ١/ ٣٩٢، باب الأذان، فائدة التسليم بعد الأذان، ط: دار الفكر- بيروت)

(٢) (قوله: ويعاد أذان جنب إلخ) زاد القهستاني: والفاجر والراكب والقاعد والماشي، والمنحرف عن القبلة. وعلل الوجوب في الكل بأنه غير معتد به والندب بأنه معتد به إلا أنه ناقص، قال وهو الأصح كما في التمرتاشي. (رد المحتار على الدر المختار: ١/ ٣٩٣، باب الأذان، فائدة التسليم بعد الأذان، ط: دار الفكر- بيروت)

ومنها- أي من سنن الأذان- أن يكون تقيا لقول النبي - صلى الله عليه وسلم -: الإمام ضامن، والمؤذن مؤتمن، والأمانة لا يؤديها إلا التقي. (بدائع الصنائع: ١/ ١٥٠، كتاب الصلاة، فصل بيان سنن الأذان، ط: دار الكتب العلمية)

الجواب حامداً ومصلیاً:

ڈاڑھی منڈا شخص فاسق ہے، اور فاسق کا اذان دینا اور اس کا اقامت کہنا مکروہ ہے۔ (درمختار مع الشامی: ۱/ ۲۶۳)[1]

البتہ اقامت صحیح ہوجائے گی، دوسرے شخص کا دوبارہ اقامت کہنا درست نہیں ہے، اور جب اقامت صحیح ہے، تو نماز بھی صحیح ہوجائے گی نماز کا اعادہ واجب نہیں۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] صحن مسجد میں اذان دینا

۶۰۴-سوال: بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ مسجد کے صحن میں اذان دینا جائز نہیں؛ بل کہ صحن سے بالکل باہر کے حصے میں اذان دینی چاہیے، یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اذان مسجد کے باہر کہنا سنت ہے، اس لیے اگر صحن، مسجد میں داخل ہے، تو ایسے صحن میں اذان دینا بہتر نہیں، اور بار بار ایسے صحن میں اذان دینے سے یعنی اس پر اصرار کرنے سے قباحت وکراہت پیدا ہوگی، البتہ وہ صحن، جو مسجد میں داخل نہیں، اس میں اذان دینا بلا کسی حرج کے جائز ہے۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۹۲، باب الأذان، فائدة التسليم بعد الأذان، ط: دار الفكر-بيروت.

(۲) تفصیلی تخریج گذر چکی ہے، ملاحظہ فرمائیں عنوان: "ڈاڑھی منڈے کی اذان واقامت" کا حاشیہ نمبر: ۲۔

(۳) وينبغي أن يؤذن على المئذنة أو خارج المسجد ولا يؤذن في المسجد. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۸، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: زکریا-دیوبند ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۶۹، فصل في بيان سنن الأذان، ط: زكريا- ديوبند ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۸، باب الأذان، ط: زكريا-ديوبند)

نوٹ: مفتی صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے، عموماً فقہی کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے، تاہم اصل مسئلہ یہ ہے کہ:

مسجد کے اندر اذان دینا جائز ہے، اس میں کچھ کراہت نہیں ہے، اگر اذان کی آواز لوگوں تک پہنچ جائے، تو جمعہ کی پہلی اذان نیز اور نمازوں کی اذانیں مسجد میں کہنا مکروہ نہیں ہے، کیوں کہ مسجد سے باہر اذان کہنے کا حکم تبلیغ صوت (آواز پہنچانے) کی غرض سے ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کا تو پورا اہتمام کیا جاتا تھا کہ اذان ایسی جگہ کہی جائے، کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اذان کی آواز پہنچ جائے، مگر مسجد یا خارج مسجد کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا تھا، طبقات ابن سعد میں ہے: أخبرنا محمد بن عمر، حدثني معاذ بن محمد عن يحيى بن عبد الله بن عبد الرحمن بن سعد بن زرارة قال: أخبرني من سمع النوار أم زيد بن ثابت تقول: كان بيتي أطول بيت حول المسجد فكان بلال يؤذن فوقه من أول ما أذن إلى أن بنى رسول الله مسجده. فكان يؤذن بعد على ظهر المسجد وقد رفع له شيء فوق ظهره. (الطبقات الكبرى-ابن سعد=

[۱۷] اذان کے لیے آلہ مکبر الصوت کا استعمال

۶۰۵-سوال: کیا آلہ مکبر الصوت یعنی لاؤڈ اسپیکر سے اذان دینا جائز ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

اذان کا مقصود اعلان ہے، جو لاؤڈ اسپیکر سے بہ درجہ اولی حاصل ہو جاتا ہے؛[۱] اس لیے اس سے اذان کے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے، ہاں اگر اس طرح اذان دینے میں فتنہ کا اندیشہ ہو کہ کوئی اللہ یا مسجد کے بارے میں زبان درازی کرتے ہوئے گالی گلوچ کرتا ہو تو لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان دینے سے بچنا

=(م: ۱۲۳۰ھ): ۸/ ۳۰۹، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد نبوی کی تعمیر سے پہلے اُم زید کے مکان پر اذان ہوتی تھی، پھر مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد مسجد کی چھت پر اذان ہونے لگی، اور ظاہر ہے کہ مسجد کی چھت تمام احکام میں مسجد کی طرح ہے، پس جس طرح مسجد کی چھت پر اذان کہنا مکروہ نہیں ہے، اسی طرح مسجد کے اندر بھی اذان کہنا مکروہ نہیں، بل کہ ابن ماجہ کی ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی اذان مسجد ہی میں کہی گئی تھی: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن صاحبكم قد رأى رؤيا، فاخرج مع بلال إلى المسجد فألقها عليه، ولينادِ بلال، فإنه أندى صوتا منك، قال: فخرجت مع بلال إلى المسجد، فجعلت ألقيها عليه وهو ينادي بها. (سنن ابن ماجه: ۱/ ۲۳۲، رقم الحديث: ۷۰۶، باب بدء الأذان، ت: محمد فؤاد عبد الباقي، ط: دار إحياء الكتب العربية)

اس روایت سے ثابت ہوا کہ اسلام میں سب سے پہلی اذان مسجد نبوی میں ہوئی تھی، پس مسجد میں اذان دینا بلا کراہت جائز ہے، فتاوی دار العلوم جدید میں ہے: کوئی اذان مسجد میں مکروہ نہیں ہے، خصوصا اذان خطبۂ جمعہ مسجد میں خطیب کے سامنے مسنون ہے۔

فتاوی دار العلوم (قدیم) میں ہے: اذان کی وجہ مشروعیت کتب احادیث سے اسی قدر ثابت ہے کہ نمازیوں کو اوقات نماز کی اطلاع ہو جائے، اور مسجد میں حاضر ہو کر با جماعت نماز ادا کریں، اذان کے کلمات پر غور کرو، تو صرف ذکر اللہ ہے، یا ذکر اللہ کی طرف بلایا جاتا ہے، ان کلمات کو نہ مسجد سے کسی قسم کی منافات اور نہ خارج مسجد سے خاص مناسبت، بل کہ بہ ظاہر تو معاملہ برعکس ہے، جیسا کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے، کہ مساجد کی بنا، نماز و ذکر کے لیے ہے؛ لیکن چوں کہ اذان سے مقصود اعلام و اطلاع ہے، اس لیے بلند جگہ پر اذان دینا اولی ہوا، چناں چہ حضور ﷺ کے زمانے میں بلند مقام پر اذان دینے کا اہتمام تھا، لیکن مسجد یا خارج مسجد کا کوئی التزام نہ تھا، حضور ﷺ کے زمانۂ مقدس میں مسجد اور خارج مسجد دونوں جگہ اذان دینا ثابت ہے۔ (آداب اذان و اقامت، ص: ۷۳-۷۵، از: مفتی محمد امین پالن پوری، الامین کتابستان - دیوبند) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

(۱) لأن الأصل في مشروعية الأذان الإعلام بدخول الوقت . . . وفي السراج: وينبغي للمؤذن أن يؤذن في موضع يكون أسمع للجيران، ويرفع صوته، ولا يجهد نفسه؛ لأنه يتضرر. اهـ بحر. (رد المحتار: ۱/ ۳۸۲ - ۳۸۳، باب الأذان، ط: دار الفكر - بيروت)

چاہیے،(۲) کہ دفع مضرت اولیٰ ہے جلب منفعت سے۔(۳) چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن شریف بلند آواز سے تلاوت فرماتے تھے، تو کفار، اللہ تعالیٰ، رسول صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن کریم اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو گالیاں دیتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا﴾(۴) یعنی اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ بہت آواز سے اور نہ ہی بالکل آہستہ؛ بل کہ معتدل آواز میں تلاوت فرمایا کیجیے۔(۵)

الغرض اگر مذکورہ صورت لازم نہ آتی ہو، تو مائیک سے اذان دینے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ بل کہ اولیٰ اور مطلوب ہے کہ اس سے مقصود اذان احسن طریقے سے حاصل ہوتا ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] نابالغ کی اذان کا حکم

۶۰۶-سوال: کیا بالغ اور نابالغ دونوں اذان دے سکتے ہیں؟ اگر نابالغ نے اذان دے دی، تو اس کی اذان سے پڑھی جانے والی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

---

(۲) ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾. (۶-الأنعام: ۱۰۸)

(۳) "درء المفاسد أولى من جلب المصالح. ـــــــــ فإذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالبا؛ لأن اعتناء الشرع بالمنهيات أشد من اعتنائه بالمأمورات، ولذا قال عليه السلام {إذا أمرتكم بشيء فأتوا منه ما استطعتم، وإذا نهيتكم عن شيء فاجتنبوه}، وروى في الكشف حديثا {لترك ذرة مما نهى الله عنه أفضل من عبادة الثقلين} ومن ثم جاز ترك الواجب دفعا للمشقة، ولم يسامح في الإقدام على المنهيات. خصوصا الكبائر. (الاشباه و النظائر: ۷۸، القاعدة الخامسة: "درء المفاسد أولى من جلب المصالح، ت: الشيخ زكريا عميرات، ط: دار الكتب العلمية، بيروت ☆التحبير شرح التحرير في أصول الفقه- علاء الدين أبو الحسن علي بن سليمان المرداوي الدمشقي الصالحي الحنبلي (م: ۸۸۵هـ): ۸/۳۸۵۱، باب الاستدلال، ت: د. عبد الرحمن الجبرين، د. عوض القرني، د. أحمد السراح، ط: مكتبة الرشد- السعودية/الرياض)

(۴) ۱۷-الإسراء: ۱۱۰.

(۵) وكان -صلى الله عليه وسلم- يجهر بالقرآن في الصلاة كلها ابتداءاً. . . وكان المشركون يؤذونه ويسبون من أنزل ومن أنزل عليه، فأنزل الله تعالى: ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا﴾ أي لا تجهر بها كلها ولا تخافت بها كلها وابتغ بين ذلك سبيلا بأن تجهر بصلاة الليل و تخافت بصلاة النهار. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ۱/ ۲۳۳، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فصل: يجهر الإمام، ط: دار المعرفة- بيروت)

الجواب حامداً ومصلیاً:

نابالغ سمجھدار، مراہق لڑکا اگر اذان دے، تو جائز ہے؛ لیکن کسی بالغ آدمی کا اذان دینا مستحب ہے۔ (عالمگیری: ۱/۴۱)[۱] ـــــــ نابالغ کی اذان سے پڑھی جانے والی نماز صحیح ہوگی؛ کیوں کہ اذان کے بغیر بھی نماز صحیح ہوجاتی ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] امرد اور نامرد کی اذان وتکبیر کا حکم

۶۰۷-سوال: امرد اور نامرد اگر نماز کے لیے اذان اور تکبیر کہیں، تو ان کی اذان وتکبیر کا کیا حکم

---

(۱) أذان الصبي العاقل صحيح من غير كراهة في ظاهر الرواية، ولكن أذان البالغ أفضل، وأذان الصبي الذي لا يعقل لا يجوز، ويعاد، وكذا المجنون. هكذا في النهاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۴، كتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، الفصل الأول في صفة الأذان وأحوال المؤذن، ط: دار الفكر ☆رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۱، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الفكر)

(۲) اس میں اختلاف ہے کہ اذان سنت ہے یا واجب، تاہم اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ شعائر میں سے ہے، جس کی بڑی تاکید آئی ہے، اس وجہ سے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اگر کسی شہر کے تمام افراد اذان کے ترک پر متفق ہوجائیں، تو ان سے قتال کیا جائے۔ تاہم یہ نماز کی صحت کے لیے شرط نہیں ہے، اس لیے بلا اذان پڑھی گئی نماز درست ہوگی:

(وأما) الأول فقد ذكر محمد ما يدل على الوجوب فإنه قال: إن أهل بلدة لو اجتمعوا على ترك الأذان لقاتلتهم عليه، ولو تركه واحد ضربته وحبسته، وإنما يقاتل ويضرب ويحبس على ترك الواجب، وعامة مشايخنا قالوا: إنهما سنتان مؤكدتان، لما روى أبو يوسف عن أبي حنيفة أنه قال في قوم صلوا الظهر أو العصر في المصر بجماعة بغير أذان ولا إقامة: فقد أخطئوا السنة وخالفوا وأثموا، والقولان لا يتنافيان لأن السنة المؤكدة والواجب سواء خصوصا السنة التي هي من شعائر الإسلام، فلا يسع تركها، ومن تركها فقد أساء؛ لأن ترك السنة المتواترة يوجب الإساءة، وإن لم تكن من شعائر الإسلام فهذا أولى، ألا ترى أن أبا حنيفة سماه سنة، ثم فسره بالواجب حيث قال: أخطئوا السنة وخالفوا وأثموا؟ والإثم إنما يلزم بترك الواجب. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۴۶- ۱۴۷، كتاب الصلاة، فصل واجبات الصلاة، دار الكتب العلمية- بيروت)

وقوله ولو لم يعد أجزأه: يعني الصلاة؛ لأنها جائزة بدون الأذان والإقامة. (العناية شرح الهداية- البابرتي (م: ۷۸۶هـ): ۱/ ۲۵۲، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الفكر)

البتہ بلا اذان واقامت باجماعت نماز پڑھنا مکروہ ہے:

ويكره أداء المكتوبة بالجماعة في المسجد بغير أذان وإقامة. كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۴، كتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، الفصل الأول في صفة الأذان وأحوال المؤذن، ط: دار الفكر)

ہے؟ اور یہ لوگ مسجد میں کس طرف کھڑے ہوں گے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

غلام حسین گنگات، کونڈھ

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) بالغ شخص کا اذان وتکبیر کہنا مستحب ہے؛ البتہ امرد اگر سمجھ دار ہو، تو اس کا اذان واقامت کہنا جائز ہے، اسی طرح سے نامرد کی اذان واقامت بھی صحیح ہے۔[۱]

(۲) اگر ایک لڑکا ہو، اور وہ مردوں کے ساتھ صف میں کھڑا رہے، تو کوئی حرج نہیں، ایک سے زائد ہوں، تو سنت یہ ہے کہ وہ مردوں کے پیچھے کھڑے رہیں۔ (شامی: ۱/ ۳۶۴، عالمگیری: ۱/ ۴۱)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] بارہ یا تیرہ سالہ لڑکے کا اذان دینا

۲۰۸- سوال: کیا بارہ یا تیرہ سال کا لڑکا اذان دے سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نیک، عقل مند، بالغ آدمی کے لیے اذان دینا مستحب ہے، لیکن اگر نابالغ بچہ جو عقل وشعور رکھتا ہو اذان دے تو جائز ہے۔ (عالمگیری: جلد اول، صفحہ: ۵۴)[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) أذان الصبي العاقل صحيح من غير كراهة في ظاهر الرواية، ولكن أذان البالغ أفضل، وأذان الصبي الذي لا يعقل لا يجوز، ويعاد، وكذا المجنون. هكذا في النهاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۴، كتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، الفصل الأول في صفة الأذان وأحوال المؤذن، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۱، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الفكر)

المؤذن يكفي إخباره بدخول الوقت إذا كان بالغا عاقلا عالما بالأوقات مسلما ذكرا ويعتمد على قوله. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۴، كتاب الصلاة، باب الأذان، فائدة التسليم بعد الأذان، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) ويصف أي يصفهم الامام بان يأمرهم بذلك... (الرجال) ظاهره يعم العبد (ثم الصبيان) ظاهره تعددهم، فلو واحدا دخل الصف. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: وكذا لو كان المقتدي رجلا وصبيا يصفهما خلفه لحديث أنس «فصففت أنا واليتيم وراءه والعجوز من ورائنا». (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۸-۵۷۱، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۱/ ۶۲۹-۶۱۷، كتاب الصلاة، باب الامامة، ط: دار الكتاب - ديوبند)

(۳) أذان الصبي العاقل صحيح من غير كراهة في ظاهر الرواية، ولكن أذان البالغ أفضل، وأذان الصبي الذي لا يعقل لا يجوز، ويعاد، وكذا المجنون. هكذا في النهاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۴، كتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، الفصل الأول في صفة الأذان وأحوال المؤذن، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۱، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الفكر) ـــــــــ مزید دیکھیے عنوان: ''امرد اور نامرد کی اذان وتکبیر کا حکم''۔

[۲۱] مائک بند ہونے کی وجہ سے مؤذن کو اذان سے روک دینا

۶۰۹-سوال: اذان کے لیے مائک کا نظم تھا، بجلی بھی موجود تھی، مؤذن نے مائک کا بٹن دبایا، مگر بٹن دبانے میں کوئی کمی رہ گئی، جس کی وجہ سے اذان کی آواز باہر صاف نہیں آرہی تھی۔ ایک دوسرے شخص نے یہ سمجھا کہ بجلی تو ہے، شاید صحیح طور پر بٹن نہیں دبایا گیا ہے؛ اس لیے مائک بند رہ گیا ہے، اس نے یہ سوچتے ہوئے مؤذن کو درمیان ہی میں روک دیا، کہ اذان کی آواز باہر نہیں پہنچے گی، تو لوگوں کو نماز کے وقت کی اطلاع نہ ہو سکے گی اور وہ نماز نہیں پڑھ سکیں گے، پھر مائک صحیح کر کے دوبارہ اذان دینے کو کہا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس طرح سے اذان موقوف کروانا جائز ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

اذان کا مقصد غائبین کو نماز کے وقت کی اطلاع دینا ہے، جب مؤذن سے بٹن دبانے میں چوک ہوگئی، تو بہتر تھا کہ اذان پوری ہونے کے بعد دوبارہ مائک پر اذان دی جاتی۔[۱]

مؤذن کو روک کر دوبارہ مائک پر اذان دینے کا مکلف بنانا بھی درست ہے؛ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، سنت ادا ہو جائے گی، روکنے والا گنہ گار نہیں ہوگا۔[۲] مسجد کی ایک جانب اذان دینے کی وجہ سے اگر دوسری جانب آواز نہ پہنچے، تو اس جانب کے لیے دوسرے مؤذن کا رکھنا بھی جائز ہے۔[۳] دو اذان ایک ہی وقت میں دینا بھی جائز ہے۔ چوں کہ روکنے سے مقصود بہتر طریقے سے اعلام واعلان کو یقینی بنانا ہے؛ اس لیے روکنے والا گنہ گار نہ ہوگا۔[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱)... لأن المقصود منه الإعلام، ولا يحصل بالإخفاء فصار كسائر كلماته. (البحر الرائق: ۱/ ۲۴۵، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الكتاب- ديوبند)

(۲) لأن تكرار الأذان مشروع دون الإقامة. (البحر الرائق: ۱/ ۲۴۸، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الكتاب- ديوبند ☆الهداية في شرح بداية المبتدي- المرغيناني، أبو الحسن (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۴۴، كتاب الصلاة، باب الأذان، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت ☆رد المحتار: ۱/ ۳۸۹، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الفكر- بيروت)

(۳)... والظاهر أن أهل كل محلة سمعوا الأذان ولو من محلة أخرى يسقط عنهم لا إن لم يسمعوا. (رد المحتار: ۱/ ۳۸۴، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الفكر- بيروت)

(۴)... الأصل في مشروعية الأذان الإعلام بدخول الوقت. (رد المحتار: ۱/ ۳۸۳، كتاب الصلاة، باب الأذان)

[۲۲] تکبیر میں قد قامت الصلاۃ کو وصل کے ساتھ پڑھنا

۶۱۰-سوال: ایک شخص کہتا ہے کہ: تکبیر میں قد قامت الصلاۃ (وصل کے ساتھ) نہ کہنا چاہیے؛ کیوں کہ اس سے معنی بدل جاتے ہیں، تو کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اس سے معنی میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا، "قد قامت الصلاۃ، قد قامت الصلاۃ" بغیر وقف کے بھی پڑھنا درست ہے، مگر افضل یہ ہے کہ قد قامت الصلاۃ (وقف کے ساتھ) پڑھے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] مؤذن نے "حی علی الفلاح" پہلے پڑھ لیا تو اذان کا دہرانا ضروری ہے یا نہیں؟

۶۱۱-سوال: مؤذن صاحب نے غلطی سے اذان میں حی علی الصلوٰۃ کی جگہ حی علی الفلاح پہلے

---

(۱) ويجزم الراء في التكبير ، ويسكن كلمات الأذان والإقامة في الأذان حقيقة، وينوي الوقف في الإقامة، لقوله صلى الله عليه وسلم: "الأذان جزم، والإقامة جزم، والتكبير جزم". (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح-حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ) ص:۷۸، باب الأذان، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

وفي الإمداد: ويجزم الراء أي يسكنها في التكبير ، قال الزيلعي: يعني على الوقف، لكن في الأذان حقيقة، وفي الإقامة ينوي الوقف اهـ أي للحدر ، وروي ذلك عن النخعي موقوفا عليه، ومرفوعا إلى النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال »الأذان جزم، والإقامة جزم، والتكبير جزم«). اهـ.

قلت: والحاصل أن التكبيرة الثانية في الأذان ساكنة الراء للوقف ورفعها خطأ، وأما التكبيرة الأولى من كل تكبيرتين منه وجميع تكبيرات الإقامة، فقيل محركة الراء بالفتحة على نية الوقف، وقيل بالضمة إعرابا، وقيل ساكنة بلا حركة على ما هو ظاهر كلام الإمداد والزيلعي والبدائع وجماعة من الشافعية. والذي يظهر الإعراب لما ذكره الشارح عن الطلبة، ولما قدمناه، ولما في الأحاديث المشتهرة للجراحي أنه سئل السيوطي عن هذا الحديث، فقال: هو غير ثابت كما قال الحافظ ابن حجر ، وإنما هو من قول إبراهيم النخعي، ومعناه كما قال جماعة منهم الرافعي وابن الأثير أنه لا يمد...

وحاصلها أن السنة أن يسكن الراء من "الله أكبر" الأول أو يصلها بـ "الله أكبر" الثانية، فإن سكنها كفى، وإن وصلها نوى السكون فحرك الراء بالفتحة، فإن ضمها خالف السنة؛ لأن طلب الوقف على "أكبر" الأول صيره كالساكن أصالة فحرك بالفتح. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۳۸۶، كتاب الصلاة، باب الأذان، مطلب في الكلام على حديث: الأذان جزم، ط: دار الفكر - بيروت)

پڑھ لیا، تو اذان کا دہرانا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کلماتِ اذان کے درمیان ترتیب ضروری ہے، اگر ترتیب کے خلاف ہو جائے اور اذان ہی میں یاد آ جائے تو اُسے اذان کے درمیان دہرا لینا چاہیے، اگر دورانِ اذان غلطی کا علم نہیں ہوا؛ بل کہ نماز کے بعد ہوا، تو نماز ادا ہو جائے گی، البتہ اگر نماز سے پہلے یاد آ جائے، تو اذان کا دہرانا افضل ہے، اگر اذان نہیں دہرائی گئی تب بھی نماز صحیح ہو جائے گی۔ (فتاویٰ عالم گیری: ۱/۵۶)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] مسجد میں ایک ہی مصلی ہو، تو وہ پست آواز سے اقامت کہے گا

۶۱۲-سوال: ایک مسجد میں اذان ہوگئی، جماعت کا مقررہ وقت بھی ہوگیا، اس کے باوجود کوئی دوسرا مقتدی نہیں آیا، اور فرض نماز تنہا ادا کرنے کی نوبت آگئی، ایسی صورت میں کیا تکبیر کہی جائے گی، اور کہی جائے گی، تو کس قدر آواز کے ساتھ؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اذان کے بعد مسجد میں کوئی مصلی تنہا نماز ادا کرے، تو اقامت زور سے نہ کہے؛ بل کہ پست آواز سے کہے کہ اقامت کا مقصود حاضرین کو اطلاع دینا ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] جماعت ثانیہ کے لیے تکبیر کہنا

۶۱۳-سوال: جماعت ثانیہ کے لیے تکبیر کہنا کیسا ہے؟

---

[۱] ویرتب بین کلمات الأذان والإقامة کما شرع. کذا في محیط السرخسي. وإذا قدم في أذانه أو في إقامته بعض الکلمات علی بعض، نحو أن یقول: أشهد أن محمدا رسول الله قبل قوله: أشهد أن لا إله إلا الله فالأفضل في هذا أن ما سبق علی أوانه لا یعتد به، حتی یعیده في أوانه وموضعه، وإن مضی علی ذلك جازت صلاته کذا في المحیط. (الفتاوی الهندیة: ۱/۵۶، کتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، الفصل الثاني في کلمات الأذان والإقامة وکیفیتهما، ط: دار الفکر)

(۲) والضابطة عندنا أن کل فرض أداء کان أو قضاء یؤذن له ویقام سواء أداه منفردا أو بجماعة. (الفتاوی الهندیة: ۱/۵۵، کتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، الفصل الأول في صفة الأذان وأحوال المؤذن، ط: دار الفکر ☆ البحر الرائق: ۱/۴۵۵، کتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الکتاب - دیوبند)

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر مسجد کے باہر صحن میں جماعت ہو رہی ہو، تو تکبیر کہنا چاہیے، اذان کی ضرورت نہیں ہے۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] اگر مؤذن خلاف فطرت کام کرواتا ہو؟

۶۱۴-سوال: میں ایک مسجد کا متولی ہوں، ہماری مسجد کے مؤذن صاحب خلاف فطرت کام کے گناہ میں مبتلا ہیں، ہم چار لوگوں نے مسجد کے کمرے میں ان کو خلاف فطرت عمل کرواتے دیکھا ہے، اس بنا پر ہم نے ان کو مؤذن کے عہدے سے معزول کر دیا ہے، مگر وہ مسجد کا مکان نہیں چھوڑ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے معاف کر دیجیے، میں معافی دیے جانے کے قابل ہوں، تو اب کیا کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

یہ فعل سخت عذاب کا موجب ہے، اگر کسی جگہ پر یہ کام ہو رہا ہو، اور وہاں کے لوگوں کو علم ہو، اس کے باوجود اس کو روکنے اور بند کرنے کی تدبیر نہ کریں، تو سب پر عذاب کا اندیشہ ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم میں یہ قبیح مرض عام ہو گیا تھا، تو اللہ نے اس بستی کو تہ وبالا کر دیا، جس کا پورا قصہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔[2]

(۱) (وكره تركهما) معا (لمسافر) ولو منفردا (وكذا تركها) لا تركه لحضور الرفقة (بخلاف مصل) ولو بجماعة (وفي بيته بمصر) أو قرية لها مسجد، فلا يكره تركهما إذ أذان الحي يكفيه (أو) مصل (في مسجد بعد صلاة جماعة فيه) بل يكره فعلهما وتكرار الجماعة إلا في مسجد على طريق فلا بأس بذلك جوهرة. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: في بيته) أي فيما يتعلق بالبلد من الدار والكرم وغيرهما قهستاني. وفي التفاريق: وإن كان في كرم أو ضيعة يكتفي بأذان القرية أو البلدة إن كان قريبا وإلا فلا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۴-۳۹۵، كتاب الصلاة، باب الأذان، فائدة التسليم بعد الأذان، ط: دار الفكر-بيروت)

أهل المسجد إذا صلوا بأذان وجماعة يكره تكرار الأذان والجماعة فيه. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۴، كتاب الصلاة، الباب الثاني في الأذان، الفصل الأول في صفة الأذان وأحوال المؤذن، ط: دار الفكر)

یہ حکم اس صورت میں ہے، جب کہ جماعت ہیئت اولیٰ کے موافق ہو، اگر جماعت ہیئت اولیٰ کے خلاف ہو، تو تکبیر کے ساتھ نماز پڑھی جائے گی، کیوں کہ اس صورت میں کراہت تکبیر کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے حاشیہ عنوان: ''مسجد میں ایک ہی مصلی ہو تو وہ پست آواز سے اقامت کہے گا''۔

(۲) وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هَٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۝ وَجَآءَهُۥ قَوْمُهُۥ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ ۔ وَمِن قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّـَٔاتِ ۔ قَالَ يَٰقَوْمِ هَٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِى هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ فِى ضَيْفِىٓ ۔ أَلَيْسَ مِنكُمْ رَجُلٌ رَّشِيدٌ ۝ قَالُوا لَقَدْ=

اس لیے فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ جو آدمی ایسے فعل بد کی عادت رکھتا ہو، اس کو اونچے پہاڑ سے اوندھے منھ گرا کر ہلاک کر دینا چاہیے۔ اسلامی حکومت ہو، تو ایسے آدمی کو بادشاہ تعزیراً قتل کر دے گا، یا کم از کم جیل میں تو ڈال ہی دے گا؛ یہاں تک کہ وہ سچی توبہ کر لے، ایسے بدکاروں کی سزا شہر بدر کرنا بھی مذکور ہے۔ (۱)

اس لیے مذکورہ مؤذن کو ہرگز مسجد کے وقف مکان میں نہ رہنے دیا جائے۔ دوسری سزائیں ہمارے اختیار میں نہیں ہیں؛ لیکن اتنی بات ہمارے اختیار میں ہے کہ مسجد کے مکان میں نہ رہنے دیں؛ بل کہ ممکن ہو، تو اپنے شہر میں نہ رہنے دیا جائے، ورنہ دوسرے لوگوں کو بھی خراب کرے گا۔ ایسے آدمی کی بات کا بھروسہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

–عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ﴿﴾ قَالَ لَوْ أَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً أَوْ اٰوِيْ إِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ﴿﴾ قَالُوْا يٰلُوْطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْا إِلَيْكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرَأَتَكَ ۚ إِنَّهُ مُصِيْبُهَا مَا أَصَابَهُمْ ۚ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۚ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ﴿﴾ فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ﴿﴾ (۱۱-ہود: ۷۷-۸۲)

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴿﴾ (۸-الانفال: ۲۵)

(۱) عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من وجدتموه يعمل عمل قوم لوط، فاقتلوا الفاعل، والمفعول به. (سنن أبي داود: ۲/ ۶۱۳، رقم الحديث: ۴۴۶۲، كتاب الحدود، باب فيمن عمل عمل قوم لوط، ط: البدر – ديوبند ☆ سنن الترمذي: ۱/ ۲۷۰، رقم الحديث: ۱۴۵۶، أبواب الحدود، باب ما جاء في حد اللوطي، ط: البدر – ديوبند ☆ سنن ابن ماجه: ۱/ ۱۸۴، رقم الحديث: ۲۵۶۱، كتاب الحدود، باب من عمل عمل قوم لوط، ط: البدر – ديوبند)

… أنه ليس بزنا لاختلاف الصحابة في موجبه من الإحراق بالنار، وهدم الجدار، والتنكيس من مكان مرتفع باتباع الأحجار، وغير ذلك. (الهداية: ۲/ ۳۴۶، كتاب الحدود، باب الوطء الذي يوجب الحد والذي لا يوجبه، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي – بيروت ☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق – ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۵/ ۱۸، كتاب الحدود، باب الوطء الذي يوجب الحد والذي لا يوجبه، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(قوله ومن أتى امرأة) أي أجنبية (في الموضع المكروه) أي دبرها (أو عمل عمل قوم لوط فلا حد عليه عند أبي حنيفة ولكنه يعزر) ويسجن حتى يموت أو يتوب، ولو اعتاد اللواطة قتله الإمام محصنا كان أو غير محصن سياسة، أما الحد المقدر شرعا فليس حكما له وقالا هو كالزنا، وهذه العبارة تفيد اعترافهما بأنه ليس من نفس الزنا بل حكمه حكم الزنا فيحد جلدا إن لم يكن أحصن ورجما إن أحصن. (فتح القدير – كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بـ 'ابن الهمام' (م: ۸۶۱ھ): ۵/ ۲۶۲، كتاب الحدود، باب الوطء الذي يوجب الحد والذي لا يوجبه، ط: دار الفكر)

وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۚ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا﴿﴾ (۴-النساء: ۱۶)

[۲۷] نفاس کی حالت میں ماں کا بچے کے کان میں اذان وتکبیر کہنا

۶۱۵-سوال: بچے کی پیدائش کے وقت ایک کان میں اذان اور دوسرے کان میں تکبیر کہی جاتی ہے، تو کیا یہ مرد کے بجائے عورت کہہ سکتی ہے؟ نیز خود بچے کی ماں بھی ناپاکی کی حالت میں کہہ سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

بچے کی پیدائش کے وقت جو اذان بچے کے کان میں کہی جاتی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ سب سے پہلے بچے کے کان میں اور اس کے دل ودماغ میں جو آواز پہونچے، وہ اللہ کی یاد اور شیطان کی نفرت پیدا کرنے والی ہو، گویا اس موقع کی ''اذان'' اور ''تکبیر'' ایک ذکر ہے؛ لہٰذا عورت بھی بچے کے کان میں اذان دے سکتی ہے اور خود ماں بھی دے سکتی ہے؛ لیکن بہتر یہ ہے کہ ماں نفاس کی حالت میں یہ الفاظ نہ کہے، ہاں دوسرا کوئی آدمی موجود نہ ہو، تو چوں کہ نفاس کی حالت میں ذکر جائز ہے؛ اس لیے اذان بھی بچے کے کان میں دے سکتی ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۸] وقت سے پہلے اذان دینا جائز نہیں ہے، اعادہ مسنون ہے

۶۱۶-سوال: اذان کو قصداً اس کے وقت سے ۲-۳ منٹ پہلے دینا جائز ہے یا نہیں؟ ایک

---

(۱) عن أبي رافع، قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم أذن في أذن الحسن بن علي حين ولدته فاطمة بالصلاة. (سنن أبي داود: ۶۹۶/۲، رقم الحديث: ۵۱۰۵، كتاب الأدب، باب في المولود يؤذن في أذنه، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند ☆ سنن الترمذي: ۲۷۸/۱، رقم الحديث: ۱۵۱۴، أبواب الأضاحي، باب الأذان في أذن المولود، ط: فيصل - ديوبند)

(ومنها) حرمة قراءة القرآن لا تقرأ الحائض والنفساء والجنب شيئا من القرآن والآية وما دونها سواء في التحريم على الأصح إلا أن لا يقصد بما دون الآية القراءة مثل أن يقول الحمد لله يريد الشكر أو بسم الله عند الأكل أو غيره فإنه لا بأس به. هكذا في الجوهرة النيرة، ولا تحرم قراءة آية قصيرة تجري على اللسان عند الكلام، كقوله تعالى {ثم نظر} [المدثر] أو {ولم يولد} [الإخلاص]. هكذا في الخلاصة.... ويجوز للجنب والحائض الدعوات، وجواب الأذان، ونحو ذلك في السراجية. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۳۸/۱، كتاب الطهارة، الباب السادس في الدماء المختصة بالنساء، الفصل الرابع في أحكام الحيض والنفاس والاستحاضة، ط: دار الفكر ☆ الجوهرة النيرة: ۲۸/۱، الحيض، ط: نعمانية ☆ البحر الرائق: ۳۴۶/۱، كتاب الطهارة، باب الحيض، ط: دار الكتاب - ديوبند)

بستی والے ایسا سمجھتے ہیں کہ اذان کے وقت روزہ افطار کرنا ادب کے خلاف ہے؛ اس لیے اس بستی میں اذان وقت سے پہلے ہوتی ہے اور اذان کے بعد افطار کرتے ہیں اور اگر اذان، وقت پر دی جائے تو پھر افطار کا وقت روزہ میں داخل ہو کر روزہ لمبا ہو جاتا ہے، تو کیا اذان کے وقت افطار کرنا ادب کے خلاف ہے؟ بالتفصیل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداو مصلیا:

اذان، نماز کے وقت کی اطلاع کے لیے ہے؛ لہٰذا دخول وقت سے پہلے اذان دینا جائز نہیں ہے، اگر وقت سے پہلے دے دی گئی، تو اعادہ مسنون ہے، ورنہ نماز سنت کے خلاف ہوگی۔ [1] رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں سحری کے وقت کی اطلاع دینے کے لیے بھی اذان دی جاتی تھی اور نماز فجر کے لیے از سر نو اذان دی جاتی تھی۔ (بخاری شریف) [2]

رمضان المبارک میں وقت سے قبل مغرب کی اذان دینے کا دوسرا نقصان یہ ہوگا کہ لوگ یوں سمجھیں گے کہ اذان غروب شمس کی وجہ سے دی جاتی ہے، گویا سورج غروب ہو گیا، اور اس کی وجہ سے وہ روزہ افطار کر لیں گے، نتیجۃً تمام کا روزہ خراب ہوگا؛ اس لیے وقت پر ہی اذان دی جائے، اس سے پہلے اذان نہ دی جائے۔

---

(۱) وأما بيان وقت الأذان والإقامة فوقتهما ما هو وقت الصلوات المكتوبات، حتى لو أذن قبل دخول الوقت لا يجزئه، ويعيده إذا دخل الوقت في الصلوات كلها في قول أبي حنيفة ومحمد... ولأبي حنيفة ومحمد ما روى شداد مولى عياض بن عامر أن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال لبلال: لا تؤذن حتى يستبين لك الفجر هكذا، ومد يده عرضا؛ ولأن الأذان شرع للإعلام بدخول الوقت، والإعلام بالدخول قبل الدخول كذب، وكذا هو من باب الخيانة في الأمانة، والمؤذن مؤتمن على لسان رسول الله - صلى الله عليه وسلم -، ولهذا لم يجز في سائر الصلوات. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ۱/ ۱۵۵، كتاب الصلاة، فصل بيان وقت الأذان والإقامة، ط: دار الكتب العلمية)

[۲] عن عبد الله بن عمر: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إن بلالا ينادي بليل، فكلوا واشربوا حتى ينادي ابن أم مكتوم. (صحيح البخاري: ۱/ ۸۷، رقم الحديث: ۶۲۰، كتاب الأذان، باب الأذان بعد الفجر، ط: البدر - ديوبند)

عن عبد الله بن مسعود، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا يمنعن أحدكم - أو أحدا منكم - أذان بلال من سحوره، فإنه يؤذن - أو ينادي بليل - ليرجع قائمكم، ولينبه نائمكم، وليس أن يقول الفجر - أو الصبح -، وقال بأصابعه ورفعها إلى فوق وطأطأ إلى أسفل حتى يقول هكذا، وقال زهير: بسبابتيه إحداهما فوق الأخرى، ثم مدها عن يمينه وشماله. (صحيح البخاري: ۱/ ۸۷، رقم الحديث: ۶۲۱، كتاب الأذان، باب الأذان قبل الفجر، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۴۹، رقم الحديث: ۳۹- (۱۰۹۳)، كتاب الصيام، باب بيان أن الدخول في الصوم يحصل بطلوع الفجر... الخ، ط: البدر - ديوبند)

رہ گئی یہ بات کہ اذان کے وقت روزہ افطار کرنا ادب کے خلاف ہے، تو یہ صحیح نہیں ہے؛ اسلامی شریعت آسان ہے، اس میں تنگی نہیں ہے، کچھ ناقص العقل لوگوں نے اس کو مشکل بنا دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عشاء کا کھانا اور نماز دونوں موجود ہوں، تو کھانے سے ابتدا کرو، جب کہ دل اس کی طرف مائل ہو خواہ جماعت ترک ہو جائے۔ (بخاری جلد ۱ صفحہ ۹۲) [۳] تو مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ بھوک کی شدت کی بناء پر جماعت – جو کہ واجب ہے – کو ترک کرنے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔

الغرض اذان وقت پر ہی دی جائے اور افطار کرنے والے کچھ کھا پی کر جماعت میں شریک ہوں، جماعت کچھ تاخیر سے شروع کی جائے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] فاسق وفاجر شخص کو اذان واقامت کے لیے رکھنا مکروہ تحریمی ہے

۶۱۷–سوال: انکلیشور کی ایک مسجد میں ایک صاحب مؤذن ہیں، جو اپنی نوعمری میں لوٹ مار کیا کرتے تھے، لوگوں کو دھوکہ دینا، ان کا پیشہ تھا۔ اب – جب کہ کمزور اور بڑی عمر کے ہو گئے ہیں، تو – اپنی روزی روٹی کے لیے اذان دیتے ہیں، اس کی یہ عادتیں تھیں: زنا کاری کرنا، رمضان کا روزہ نہ رکھنا، مسجد میں

---

[۳] عن أنس بن مالك: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا قدم العشاء، فابدءوا به قبل أن تصلوا صلاة المغرب، ولا تعجلوا عن عشائكم. (صحيح البخاري: ۱/ ۹۲، رقم الحديث: ۶۷۲، كتاب الأذان، باب: إذا حضر الطعام وأقيمت الصلاة، ط: البدر - ديوبند)

وكان ابن عمر: يبدأ بالعشاء. وقال أبو الدرداء: من فقه المرء إقباله على حاجته حتى يقبل على صلاته وقلبه فارغ. (صحيح البخاري: ۱/ ۹۲، رواه تعليقا)

عن أنس بن مالك: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا قدم العشاء، فابدءوا به قبل أن تصلوا صلاة المغرب، ولا تعجلوا عن عشائكم. (صحيح البخاري: ۱/ ۹۲، رقم الحديث: ۶۷۲، كتاب الأذان، باب: إذا حضر الطعام وأقيمت الصلاة، ط: البدر - ديوبند)

عن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا وضع عشاء أحدكم وأقيمت الصلاة، فابدءوا بالعشاء ولا يعجل حتى يفرغ منه. وكان ابن عمر: يوضع له الطعام، وتقام الصلاة، فلا يأتيها حتى يفرغ، وإنه ليسمع قراءة الإمام. (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۶۷۳)

عن ابن عمر، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: إذا كان أحدكم على الطعام، فلا يعجل حتى يقضي حاجته منه، وإن أقيمت الصلاة. (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۶۷۴)

(۴) مزید تفصیل کے لیے دیکھیں، عنوان: ''رمضان کے علاوہ مغرب کی جماعت میں تاخیر جائز نہیں'' (اوقات نماز)

بیڑی وغیرہ پینا۔

آج بھی یہ حالت ہے کہ مسجد میں صفائی کا خیال نہیں رکھتے ہیں، خود بھی صفائی کا اہتمام نہیں کرتے، تبلیغی جماعت کو بدعتی خیال کرتے ہیں، مسجد کے صحن میں- جہاں لوگ نماز پڑھتے ہیں- مٹی کے تیل والے چولہے سے چائے وغیرہ بناتے ہیں۔ ۹۵ رفی صد لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں؛ لیکن متولی حضرات کی اس جانب کوئی توجہ نہیں ہے، وہ (مؤذن صاحب) امام کی عدم موجودگی میں امامت بھی کراتے ہیں۔ صاحب نصاب ہونے کے باوجود لوگوں سے زکاۃ، فطرہ اور صدقہ لیتے ہیں اور حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں رکھتے ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے موذن کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

جو شخص مسجد میں بیڑی پیتا ہے، پاکی وناپاکی کا خیال نہیں رکھتا اور اس کے نزدیک حلال وحرام کی تمیز بھی نہیں ہے، اور پاک وصاف نہیں رہتا ہے، اس کو موذن بنانا مکروہ ہے؛ کیوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے منھ سے بدبو آتی ہو، وہ مسجد میں نہ آئے۔ (حدیث)[1]

جو شخص مسجد کا احترام نہ کرے، اس کو صاف صفائی کے لیے رکھنا جائز نہیں ہے؛ لہٰذا مذکورہ موذن کو

---

(۱) عن جابر، قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم، عن أكل البصل والكراث، فغلبتنا الحاجة، فأكلنا منها، فقال: من أكل من هذه الشجرة المنتنة، فلا يقربن مسجدنا، فإن الملائكة تأذى، مما يتأذى منه الإنس. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۰۹، رقم الحديث: ۷۲- (۵۶۳)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب نهي من أكل ثوما أو بصلا أو كراثا أو نحوها، ط: البدر- ديوبند)

عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليؤذن لكم خياركم وليؤمكم قراؤكم. (سنن أبي داود: ۱/ ۸۷، رقم الحديث: ۵۹۰، باب من أحق بالإمامة، ط: مختار اينڈ كمپني- ديوبند☆سنن ابن ماجه: ۱/ ۵۳، رقم الحديث: ۷۲۶، كتاب الأذان، والسنة فيه، باب فضل الأذان، وثواب المؤذنين، ط: أشرفي- ديوبند)

المؤذن يكفي إخباره بدخول الوقت إذا كان بالغا عاقلا عالما بالأوقات مسلما ذكرا ويعتمد على قوله. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۲، كتاب الصلاة، باب الأذان، فائدة التسليم بعد الأذان، ط: دار الفكر- بيروت)

(قوله: ويعاد أذان جنب إلخ) زاد القهستاني: والفاجر والراكب والقاعد والماشي، والمنحرف عن القبلة. وعلل الوجوب في الكل بأنه غير معتد به والندب بأنه معتد به إلا أنه ناقص، قال وهو الأصح كما في التمرتاشي. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۳، باب الأذان، فائدة التسليم بعد الأذان، ط: دار الفكر- بيروت)

ومنها- أي من سنن الأذان- أن يكون تقيا لقول النبي - صلى الله عليه وسلم -: «الإمام ضامن، والمؤذن مؤتمن»، والأمانة لا يؤديها إلا التقي. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۵۰، كتاب الصلاة، فصل بيان سنن الأذان، ط: دار الكتب العلمية)

ذمہ داری سے الگ کردینا ضروری ہے، اور ایسے شخص کو امامت کی ذمہ داری سونپنا بھی مکروہ تحریمی ہے۔ [۱] البتہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے کی وجہ سے جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ کی اذان معتبر نہیں ہے

۶۱۸-سوال: کیا اگر کوئی شخص ٹیپ ریکارڈ یا ریڈیو کی اذان پر اکتفاء کرے، تو جائز ہے؟ یا پھر انسان کو خود اذان دینی پڑے گی؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ کی اذان سے سنت ادا نہیں ہوگی، اس کے لیے انسان کو خود اذان دینی پڑے گی۔ [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (قوله وفاسق) من الفسق: وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر، والزاني وآكل الربا ونحو ذلك، كذا في البرجندي إسماعيل.... وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعا، ولا يخفى أنه إذا كان أعلم من غيره لا تزول العلة، فإنه لا يؤمن أن يصلي بهم بغير طهارة، فهو كالمبتدع تكره إمامته بكل حال، بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر-بيروت)

لو قدموا فاسقا يأثمون بناءً على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم؛ لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبی کبیر-إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ۹۵۶ هـ) ص: ۵۱۳، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی-لاہور)

(۲) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ... والصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم برا كان أو فاجرا، وإن عمل الكبائر. (سنن أبي داود: ۱/ ۳۴۳، رقم الحديث: ۲۵۳۳، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، ط: البدر- ديوبند☆ سنن الدار قطني (م: ۳۸۵هـ): ۲/ ۴۰۴، رقم الحديث: ۱۷۶۸، باب صفة من تجوز الصلاة معه، والصلاة عليه، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)

فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

(۳) ولا تجب إذا سمعها من طير هو المختار... وإن سمعها من الصدى لا تجب عليه كذا في الخلاصة. (الفتاوى=

[۳۱] لاؤڈ اسپیکر میں اذان کے بعد کی دعاء پڑھنا

۶۱۹-سوال: مؤذن اگر اذان دینے کے بعد لاؤڈ اسپیکر میں اذان کے بعد کی دعاء اس غرض سے پڑھے کہ لوگوں کو یاد ہوجائے، تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مؤذن کا اذان کے بعد لاؤڈ اسپیکر میں جہراً اذان کی دعاء پڑھنا بہتر نہیں ہے؛ اس لیے کہ ہر دعاء اور ذکرِ مسنون کے جہراً یا سراً پڑھے جانے میں ایک خاص طریقہ ہے، جسے سنت کہا جاتا ہے، اور اذان کے بعد کی دعاء میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرامؓ کا معمول اُسے سراً پڑھنے کا رہا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین کے زمانے میں، جب کہ لوگ دن بہ دن اسلام قبول کر رہے تھے، اُس وقت تعلیم کی اشد ضرورت تھی، تاہم اُنہوں نے اذان کے بعد کی دعاء کو جہراً نہیں پڑھا؛ لہٰذا ہمیں بھی کوئی حق نہیں ہوگا کہ ہم اس طریقے کو بدل دیں۔ اگر یہ دعاء جہراً پڑھی جائے گی، تو اس میں سراً پڑھنے کا سنت طریقہ فوت ہوجائے گا، اسی لیے ہمارے بزرگانِ دین نے فرمایا ہے کہ جب کوئی بدعت رائج ہوتی ہے، تو ایک سنت ختم ہوجاتی ہے۔[۱]

جلیل القدر تابعی حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے کہ آپؒ نے فرمایا کہ میں ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ایک مسجد میں گیا، جس میں اذان ہوچکی تھی، ہم نماز کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ مؤذن نے تثویب شروع کی، (اذان کے بعد جماعت قائم ہونے سے کچھ دیر پہلے یہ اعلان کرنا کہ نماز کے لیے آجاؤ، اُسے ''تثویب'' کہا جاتا ہے) اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مسجد سے باہر نکل گئے اور فرمانے لگے کہ مجھے اس بدعتی کی مسجد سے باہر نکالو، اور آپؓ نے اُس مسجد میں نماز ادا نہیں فرمائی۔ (ترمذی: ۱/ ۵۰)[۲]

=الهندية: ۱/ ۱۳۴، كتاب الصلاة، الباب الثالث عشر في سجود التلاوة، ط: دار الفكر)

ولو سمع اٰية السجدة من حيوان صرحوا بعدم وجوبها على المختار لعدم أهلية القارئ بخلاف ما إذا سمعها من جنب، أو حائض. (الأشباه و النظائر على مذهب أبي حنيفة النعمان- زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بـ'ابن نجيم المصري' (م: ۹۷۰هـ) ص: ۴۷، القاعدة الثانية: الأمور بمقاصدها، خاتمة، قبيل القاعدة الثالثة، ت: الشيخ زكريا عميرات، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) قوله تعالى: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۷- الأعراف: ۵۵) و قوله تعالى: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا (۱۹- مريم: ۳-۴)

(۲) وروي عن مجاهد، قال: دخلت مع عبد الله بن عمر مسجدا وقد أذن فيه، ونحن نريد أن نصلي فيه، فثوب=

اس واقعہ سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرات صحابۂ کرامؓ اتباعِ سنت کو کس درجہ اہمیت دیتے تھے، کہ اذان کے بعد نماز پڑھے بغیر مسجد سے نکلنا مکروہ ہونے کے باوجود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے تثویب کی بدعت کو اس قدر ناپسند کیا کہ اُس مسجد میں نماز پڑھے بغیر نکل گئے؛ لہٰذا تعلیم کی غرض سے بھی اذان کے بعد کی دعاء جہراً نہیں پڑھی جائے گی، اور رہا لوگوں کے دعاء یاد کرنے کا مسئلہ، تو جو لوگ اذان اور نماز کی اہمیت جانتے ہیں، وہ ضرور اذان کے بعد کی دعاء یاد کرلیں گے، اور جسے اذان سننے کی فرصت نہ ہو، اسے یاد کرنے کی ضرورت ہی کہاں ہوگی؟؟؟؟ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] اذان کے بعد کی دعاء میں چند کلمات کی زیادتی

۶۲۰-سوال: اذان کے بعد کی دعاء میں: آت محمد الوسیلة کی بجائے آت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم الوسیلة لکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز اس طرح اضافے سے ساتھ اسے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اذان کا ''زبان'' سے جواب دینا مستحب ہے۔ (شامی: ۱/ ۳۶۸)[۱] اور اذان پوری ہوجانے کے بعد درود شریف کا پڑھنا مستحب ہے۔ (شامی: ۱/ ۳۷۰)[۲]

= المؤذن، فخرج عبد الله بن عمر من المسجد، وقال: »اخرج بنا من عند هذا المبتدع« ولم يصل فيه. وإنما كره عبد الله التثويب الذي أحدثه الناس بعد. (سنن الترمذي: ۱/ ۵۰، تحت رقم الحديث: ۱۹۸، أبواب الصلاة، باب ما جاء في التثويب في الفجر، ط: البدر - ديوبند)

وهو نوعان قديم وحادث، فالأول: الصلاة خير من النوم، وكان بعد الأذان إلا أن علماء الكوفة ألحقوه بالأذان. والثاني أحدثه علماء الكوفة بين الأذان والإقامة "حي على الصلاة" مرتين "حي على الفلاح" مرتين وأطلق في التثويب، فأفاد أنه ليس له لفظ يخصه بل تثويب كل بلد على ما تعارفوه، إما بالتنحنح، أو بقوله: الصلاة الصلاة، أو قامت قامت؛ لأنه للمبالغة في الإعلام. (البحر الرائق: ۱/ ۲۷۵، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۱] (قوله: لا بلسانه) أي لأن الإجابة به مندوبة. (رد المحتار: ۱/ ۳۹۸، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الفكر)

[۲] عن عبد الله بن عمرو بن العاص، أنه سمع النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إذا سمعتم المؤذن، فقولوا مثل ما يقول ثم صلوا علي، فإنه من صلى علي صلاة صلى الله عليه بها عشرا، ثم سلوا الله لي الوسيلة، فإنها منزلة في الجنة، لا تنبغي إلا لعبد من عباد الله، وأرجو أن أكون أنا هو، فمن سأل لي الوسيلة حلت له الشفاعة. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۶۶، رقم الحديث: ۱۱-۳۸۴، كتاب الصلاة، باب استحباب القول مثل قول المؤذن لمن سمعه، ثم يصلي على النبي صلى الله =

جو شخص درود شریف کے بعد اذان کے بعد کی دعاء پڑھے گا، وہ آپ کی شفاعت کا مستحق ہوگا، بخاری شریف میں اذان کے بعد کی دعاء ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

عن جابر بن عبد الله: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "من قال حين يسمع النداء: اللّٰهم رب هذه الدعوة التامة، والصلاة القائمة، آت محمدا الوسيلة والفضيلة، وابعثه مقاما محمودا الذي وعدته، حلت له شفاعتي يوم القيامة".[۳]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اذان سنتے وقت یہ دعا پڑھے: "اللّٰهم رب هذه الدعوة التامة، والصلاة القائمة، آت محمدا الوسيلة والفضيلة، وابعثه مقاما محمودا الذي وعدته." تو اس کو قیامت کے دن میری شفاعت نصیب ہوگی۔ (شامی: ۱/ ۳۰۷، طحطاوی: ۱۱۱)[۴]

اس حدیث میں سیدنا اور صلی اللہ علیہ وسلم وارد نہیں ہوا ہے اور حدیث کے سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ جو الفاظ اس میں منقول ہیں، ان میں کمی بیشی جائز نہیں کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ایسی بات کو منسوب کرنا لازم آئے گا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے؛[۵] اس لیے لکھنا جائز نہیں ہے؛ البتہ دعاء پڑھتے وقت اگر زبان سے پڑھ لے، تو کوئی حرج نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= عليه وسلم، ثم يسأل له الوسيلة، ط: البدر - ديوبند)

ويدعو عند فراغه بالوسيلة لرسول الله صلى الله عليه وسلم. (الدر المختار) قال ابن عابدين: (قوله: ويدعو إلخ) أي بعد أن يصلي على النبي صلى الله عليه وسلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۸، باب الأذان)

(۳) صحيح البخاري: ۱/ ۸۶، رقم الحديث: ۶۱۴، كتاب الأذان، باب الدعاء عند النداء، ط: البدر - ديوبند)

(۴) عن سلمة، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: من يقل علي ما لم أقل فليتبوأ مقعده من النار. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۱، رقم الحديث: ۱۰۹، كتاب العلم، باب إثم من كذب على النبي صلى الله عليه وسلم)

قال الكشميري: وينبغي لمن أراد أن يستن بسنة النبي صلى الله عليه وسلم أن يكتفي بتلك الكلمات، ولا يزيد عليها، إلا ما ثبت في نسخة الكشميهني من زيادة: إنك لا تخلف الميعاد. في آخره، قاله ابن دقيق العيد، وعند البيهقي أيضا. ـــــــ وأما زيادة: والدرجة الرفيعة، بعد قوله: والوسيلة والفضيلة. فلم تثبت عندي في حديث، فلا يزاد بها، لأنها زيادة في خلال الكلمات، ومن كان لا بد له أن يزيد في تلك الكلمات، ففي الآخر كما ثبت عن ابن عمر رضي الله عنه: أنه كان يزيد في تلبيته في الآخر: لبيك وسعديك ... إلخ. (فيض الباري على صحيح البخاري- (أمالي) محمد أنور شاه بن معظم شاه الكشميري الهندي ثم الديوبندي (م: ۱۳۵۳هـ): ۲/ ۲۱۴، كتاب الأذان، باب الدعاء عند النداء، ت: محمد بدر عالم الميرتهي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۳۳] اذان کے بعد فوراً ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا

۶۲۱-سوال: کیا اذان کے فوراً بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا گناہ ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

دیگر دعاؤں کی طرح اذان کے بعد کی دعاء کے لیے ہاتھ اٹھانا مستحب نہیں ہے، اذان کے بعد کی دعاء از قبیل اذکار ہے، جس طرح کھانے، پینے، سونے، بیت الخلاء میں داخل ہونے اور نکلنے وغیرہ کی دعائیں از قبیل اذکار ہیں، اسی طرح اذان کے بعد کی دعاء بھی ایک قسم کا ذکر ہے؛ اس لیے اُس میں ہاتھ نہیں اٹھایا جائے گا۔[1] لیکن اگر کوئی شخص اذان کے بعد کی دعاء کے ساتھ دوسری دعائیں بھی مانگنا چاہتا ہو، تو اُس کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا مستحب ہے، حدیث پاک میں مروی ہے کہ اذان اور اقامت کے درمیان کا وقت دعاء کے قبول ہونے کا وقت ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) والمسنون في هذا الدعاء ألا ترفع الأيدي، لأنه لم يثبت عن النبي صلى الله عليه وسلم رفعها، والتشبث فيه بالعمومات بعدما ورد فيه خصوص فعله صلى الله عليه وسلم لغو؛ فإنه لو لم يرد فيه خصوص عادته صلى الله عليه وسلم لنفعنا التمسك بها، وأما إذا نقل إلينا خصوص الفعل، فهو الأسوة الحسنة لمن كان يرجو الله والدار الآخرة، وينبغي لمن أراد أن يستن بسنة النبي صلى الله عليه وسلم أن يكتفي بتلك الكلمات، ولا يزيد عليها، إلا ما ثبت في نسخة الكشميهني من زيادة: »إنك لا تخلف الميعاد« في آخره، قاله ابن دقيق العيد، وعند البيهقي أيضا. (فيض الباري على صحيح البخاري- محمد أنور شاه بن معظم شاه الكشميري الهندي ثم الديوبندي (م: ۱۳۵۳ھ): ۲/ ۲۱۴، كتاب الأذان، باب الدعاء عند النداء، ت: محمد بدر عالم الميرتهي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: »لا يرد الدعاء بين الأذان والإقامة«. (سنن أبي داود: ۱/ ۷۷، رقم الحديث: ۵۲۱، كتاب الصلاة، باب ما جاء في الدعاء بين الأذان والإقامة، ط: البدر- ديوبند)

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا. (۷۳-المزمل:۲۰)

باب صفة الصلاة

[شرائط وارکان اور آداب کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب صفة الصلاة

[شرائط وارکان اور آداب کا بیان]

[١] وضو کے بغیر نماز پڑھنا

٦٢٢-سوال: ہم چند ساتھی حج کے لیے گئے ہوئے تھے، نویں ذی الحجہ کو عرفات پہنچے اور مسجد میں داخل ہوگئے، جماعت میں اچھا خاصہ وقت تھا، اس لیے مسجد میں سو گئے، جب نیند سے بیدار ہوئے، تو ہجوم زیادہ تھا، جس کی وجہ سے باہر نہیں نکل سکے، اور بغیر وضو کے نماز ادا کرلی، اور بعد میں باہر نکل کر وضو کر کے نماز ادا نہیں کی، تو کیا بغیر وضو کے ادا کی گئی نماز ہوگئی؟ اور کیا ایسے موقع پر صف (جائے نماز) پر تیمم کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

تیمم کی اس وقت اجازت ہوتی ہے، جب کہ پانی موجود نہ ہو، یا پانی موجود ہو، لیکن اس کے استعمال پر قدرت نہ ہو، صورت مسئولہ میں شرائطِ تیمم مفقود ہیں؛ اس لیے تیمم کی اجازت نہیں ہوگی۔[1]

---

(١) وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا (٤-النساء: ٤٣)

"ومن لم يجد ماء وهو مسافر أو خارج المصر بينه وبين المصر نحو ميل أو أكثر يتيمم بالصعيد" لقوله تعالى: ﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ [النساء] وقوله عليه الصلاة والسلام "التراب طهور المسلم ولو إلى عشر حجج ما لم يجد الماء" والميل هو المختار في المقدار؛ لأنه يلحقه الحرج بدخول المصر، والماء معدوم حقيقة، والمعتبر المسافة دون خوف الفوت؛ لأن التفريط يأتي من قبله "ولو كان يجد الماء إلا أنه مريض يخاف إن استعمل الماء اشتد مرضه يتيمم". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ٥٩٣هـ): ١/٢٧، باب التيمم، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

عرفات کی مقدس سرزمین پر حکومت اور معلمین حضرات پانی کا انتظام کرتے ہیں؛ آپ کے ساتھیوں نے وضو کے لیے پانی تلاش کیے بغیر نماز ادا کرلیا، اس صورت میں نماز ادا نہیں ہوئی۔[1] اس نماز کی قضا واجب ہوگی، لیکن آپ کے حج کی ادائیگی میں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] مسبوق امام کے ساتھ قعدۂ اخیرہ میں درود شریف پڑھے گا یا نہیں؟

۶۲۳-سوال: مسبوق یعنی ایسا شخص جس کی جماعت کی نماز میں ایک یا چند رکعات چھوٹ گئی ہوں، وہ (امام کے) آخری قعدہ میں صرف تشہد پڑھے گا یا درود شریف بھی پڑھے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً:

امام کے لیے یہ آخری قعدہ ہے، مسبوق کی تو ابھی نماز باقی ہے، اس کا یہ آخری قعدہ نہیں ہے؛ لہٰذا وہ اس میں صرف التحیات پوری کرے، درود شریف اور دعا نہ پڑھے، بہتر یہ ہے کہ وہ اس قدر ٹھہر ٹھہر کر پڑھے کہ امام کی فراغت کے ساتھ اس کے تشہد کی تکمیل ہو، اس کے باوجود اگر امام کے فارغ ہونے سے پہلے التحیات مکمل ہوجائے، تو "أشهد أن لا إله إلا الله و أشهد أن محمدا عبده و رسوله" مکرر پڑھتا رہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن همام بن منبه، أنه سمع أبا هريرة، يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تقبل صلاة من أحدث حتى يتوضأ. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۵، رقم الحديث: ۱۳۵، كتاب الوضوء، باب: لا تقبل صلاة بغير طهور، ط: البدر-ديوبند ☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۱۹، رقم الحديث: ۲-(۲۲۵)، كتاب الطهارة، باب وجوب الطهارة للصلاة، ط: ديوبند)

(۲) کیوں کہ موانع حج میں سے کوئی مانع نہیں پایا گیا۔

[۳] (ومنها) أن المسبوق ببعض الركعات يتابع الإمام في التشهد الأخير، وإذا أتم التشهد لا يشتغل بما بعده من الدعوات، ثم ماذا يفعل؟ تكلموا فيه: وعن ابن شجاع أنه يكرر التشهد، أي قوله: أشهد أن لا إله إلا الله، وهو المختار. كذا في الغياثية، والصحيح أن المسبوق يترسل في التشهد حتى يفرغ عند سلام الإمام. كذا في الوجيز للكردري، وفتاوى قاضي خان، وهكذا في الخلاصة، وفتح القدير. (الفتاوى الهندية-لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۹۱، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، الفصل السابع في المسبوق واللاحق، ط: دار الفكر)

وهل يأتي بها المسبوق مع الإمام؟ قيل: نعم وبالدعاء، وصححه في المبسوط، وقيل: يكرر كلمة الشهادة، واختاره ابن شجاع، وقيل يسكت، واختاره أبو بكر الرازي، وقيل: يسترسل في التشهد، وصححه قاضيخان، وينبغي الإفتاء به كما في البحر: وهو الصحيح، خلاصة. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح-أحمد=

[۳] امام صاحب کا قعدۂ اولیٰ میں دیر لگانا

۶۲۴-سوال: ہمارے یہاں مسجد میں امام صاحب ماشاء اللہ خوب اطمینان سے نماز پڑھاتے ہیں، یہاں تک کہ قعدۂ اولیٰ میں بعض مرتبہ اتنی دیر لگاتے ہیں کہ مقتدی حضرات التحیات کے بعد درود شریف اور دعائے ماثورہ سے بھی فارغ ہو جاتے ہیں، تو کیا اس قدر اطمینان کے ساتھ قعدۂ اولیٰ کرنا درست ہے؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اطمینان سے نماز پڑھنا بہتر ہے، اسی طرح التحیات اطمینان سے پڑھی جائے اور اُس میں دیر لگے، تو کوئی حرج نہیں۔[1] البتہ التحیات اطمینان سے پڑھنے کے بعد تاخیر بالکل درست نہیں، اگر امام صاحب التحیات اطمینان سے پڑھتے ہیں، تو مقتدیوں کو چاہیے کہ وہ بھی اطمینان سے پڑھیں، پھر اگر کوئی مقتدی قعدۂ اولیٰ میں امام سے پہلے التحیات پڑھ کر فارغ ہو جائے، تو اُسے چاہیے کہ وہ خاموش بیٹھا رہے، اُس وقت درود شریف یا دعائے ماثورہ نہ پڑھے۔[2] اور امام صاحب کو چاہیے کہ وہ قعدۂ اولیٰ میں حد سے زیادہ تاخیر نہ

=بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ): ۱/ ۲۷۱، كتاب الصلاة، فصل في بيان سننها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۱۱، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه: أن رجلا دخل المسجد، ورسول الله صلى الله عليه وسلم جالس في ناحية المسجد، فصلى ثم جاء فسلم عليه، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: وعليك السلام، ارجع فصل فإنك لم تصل، فرجع فصلى ثم جاء فسلم، فقال: وعليك السلام، فارجع فصل، فإنك لم تصل، فصلى، ثم جاء فسلم، فقال وعليك السلام فارجع، فصل فإنك لم تصل، فقال في الثانية، أو في التي بعدها: علمني يا رسول الله، فقال: إذا قمت إلى الصلاة فأسبغ الوضوء، ثم استقبل القبلة فكبر، ثم اقرأ بما تيسر معك من القرآن، ثم اركع حتى تطمئن راكعا، ثم ارفع حتى تستوي قائما، ثم اسجد حتى تطمئن ساجدا، ثم ارفع حتى تطمئن جالسا، ثم اسجد حتى تطمئن ساجدا، ثم ارفع حتى تطمئن جالسا، ثم افعل ذلك في صلاتك كلها، وقال أبو أسامة، في الأخير: حتى تستوي قائما. (صحيح البخاري: ۲/ ۹۲۳، رقم الحديث: ۶۲۵۱، كتاب الاستئذان، باب من رد فقال: عليك السلام، ط: البدر- ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۷۰، رقم الحديث: ۴۵-(۳۹۷)، كتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، وإنه إذا لم يحسن الفاتحة، ولا أمكنه تعلمها قرأ ما تيسر له من غيرها، ط: البدر- ديوبند)

(۲) ولو فرغ المؤتم قبل إمامه سكت اتفاقا، وأما المسبوق فيترسل ليفرغ عند سلام إمامه، وقيل يتم، وقيل يكرر =

کریں؛ بل کہ جلد فارغ ہو جائیں، یہی بہتر ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] عورتوں کے لیے رکوع اور سجدے کا طریقہ

۶۲۵-سوال: کیا عورتوں کو نماز میں رکوع کی حالت میں سر، کمر اور سرین کو برابر رکھنا چاہیے، جیسا کہ مرد رکھتے ہیں؟ اسی طرح گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑنا چاہیے، جیسا کہ مرد پکڑتے ہیں؟ یا عورتوں کے لیے کوئی الگ حکم ہے؟

نیز سجدے میں عورتوں کو ہاتھ اندر رکھنا چاہیے یا باہر؟ اگر عورت ہاتھ اندر رکھتی ہے، تو پیٹ اور ران کا ملاپ نہ ہوگا، تو ان کے لیے اصل حکم کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

عورت کی نماز مرد کی نماز سے پچیس طریقوں سے مختلف ہے- کیوں کہ عورت چھپانے کی چیز ہے، اس کو اپنا بدن اور اعضاء نماز میں بھی اس طریقے سے رکھنا چاہیے کہ ظاہر نہ ہوں- ان مختلف طریقوں میں من جملہ یہ ہیں: (۱) وہ اپنے ہاتھ چادر اور دوپٹہ وغیرہ میں رکھے، باہر نہ رکھے۔[۱] ـــــ (۲) اپنے ہاتھ صرف کندھوں تک اٹھائے۔[۲] ـــــ (۳) تکبیر تحریمہ کے بعد سینہ پر پستان کے نیچے ہاتھ باندھے۔[۳]

=كلمة الشهادة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۵۱۱، باب صفة الصلاة، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل، ط: دار الفكر - بيروت☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: ۱/۱۸۱، كتاب الصلاة، فصل في بيان واجب الصلاة، ط: المطبعة الكبرى الاميرية، ببولاق، مصر)

[۱] فمنها [أي من آدابها] "إخراج الرجل كفيه من كميه عند التكبير" للإحرام لقربه من التواضع إلا لضرورة كبرد. والمرأة تستر كفيها حذرا من كشف ذراعيها. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح-حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹ھ)، ص: ۱۰۳، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، فصل: من آدابها، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

[۲] (وكيفيتها) إذا أراد الدخول في الصلاة كبر ورفع يديه حذاء أذنيه حتى يحاذي بإبهاميه شحمتي أذنيه وبرءوس الأصابع فروع أذنيه. كذا في التبيين... والمرأة ترفع حذاء منكبيها هو الصحيح. كذا في الهداية والتبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/۷۳)

[۳] (ووضع يده اليمنى على اليسرى تحت السرة) كما فرغ من التكبير. هكذا في المحيط ناقلا عن الإمام خواهر زاده وهكذا في النهاية والمرأة تضعهما على ثدييها. كذا في المنية. (الفتاوى الهندية: ۱/۷۳، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الثالث في سنن الصلاة وآدابها وكيفيتها، ط: دار الفكر)

ــــــ (۴) رکوع میں مرد کی طرح نہ جھکے، بل کہ صرف اس طرح جھکے، جس میں اس کے ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں۔ــــــ (۵) رکوع میں ہاتھوں سے گھٹنوں کو پکڑنا اس کے لیے سنت نہیں ہے۔ــــــ (۶) رکوع میں ہاتھوں کی انگلیاں کشادہ رکھنا بھی مسنون نہیں ہے۔ــــــ (۷) رکوع میں اپنے ہاتھوں پر زیادہ سہارا نہ دے۔ــــــ (۸) رکوع میں اپنے گھٹنوں کو بالکل سیدھا نہ رکھے، بل کہ کسی قدر جھکانا مستحب ہے۔[۴]

اور سجدے میں: (۹) ہاتھوں کو اندر رکھے اور بازؤں کو پہلوؤں سے ملائے رکھے۔ــــــ (۱۰) سجدے میں پیٹ کو رانوں سے ملا ہوا رکھے، یعنی پیٹ کو رانوں پر بچھادے۔ــــــ (۱۱) اور کہنیاں زمین پر بچھی ہوئی رکھے۔[۵]

پس ان طریقوں کے مطابق عورت کو رکوع وسجدہ کرنا چاہیے کہ ان میں اس کے لیے زیادہ ستر ہے، مردوں کی طرح اس کو رکوع وسجدہ نہیں کرنا چاہیے؛ لیکن عورت نے اپنے ہاتھوں کو اوڑھنی وغیرہ سے باہر رکھا، ان کو چھپایا نہیں، تو دیکھا جائے گا کہ پہنچوں تک آستین ہے، جس کی وجہ سے ہاتھ ڈھکے ہوئے ہیں، تو نماز ہوجائے گی، اور اگر آستین بالکل نہیں ہے یا نصف آستین ہے اور کہنیوں سے پہنچوں تک چوتھائی حصہ-تین مرتبہ سبحان اللہ کہنے کے بہ قدر-کھل گیا تو نماز فاسد ہوجائے گی، کیوں کہ چہرہ، دو ہتھیلیاں، اور دونوں قدم کے علاوہ عورت کا پورا بدن ستر ہے، اس کا چھپانا فرض ہے، ان پانچ اعضاء کے علاوہ اس کے بدن کا کوئی بھی حصہ (بہ قدر چوتھائی عضو) تین مرتبہ سبحان اللہ کہنے کی مقدار میں کھلا رہا، تو اس کی نماز فاسد ہوجائے گی، یہ اس صورت میں ہے جب کہ بلا ارادہ ستر کھل گیا ہو، اگر بالا رادہ جان بوجھ کر ستر کھولا ہے، تو کھلتے ہی فوراً نماز فاسد ہوجائے گی، اس میں تین مرتبہ سبحان اللہ کہنے یعنی رکن کے بہ قدر کی مہلت نہیں ہے۔[۶] (مستفاد: طحطاوی: ۱۴۱-۱۴۴، عمدۃ الفقہ: ۵۴-۱۱۵) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۴] والمرأة تنحني في الركوع يسيرا ولا تعتمد ولا تفرج أصابعها ولكن تضم يديها وتضع على ركبتيها وضعا وتحني ركبتيها ولا تجافي عضديها. كذا في الزاهدي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۴)

[۵] والمرأة تخفض "فتضم عضديها لجنبيها" وتلزق بطنها بفخذيها" لأنه أستر لها. (مراقی الفلاح: ۱۰۷)

فأما المرأة فينبغي أن تفترش ذراعيها وتنخفض ولا تنتصب كانتصاب الرجل وتلزق بطنها بفخذيها لأن ذلك أستر لها. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۱۰، كتاب الصلاة، سنن الصلاة، دار الكتب العلمية)

[۶] (ويمنع) حتى انعقادها (كشف ربع عضو) قدر أداء ركن بلا صنعه (من) عورة غليظة أو خفيفة على المعتمد. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله قدر أداء ركن) أي بسنته منية. قال شارحها: وذلك قدر ثلاث =

[۵] آنے والے کے لیے امام کا قراءت یا رکوع کو لمبا کرنا

۶۲۶-سوال: مسجد میں جماعت شروع ہوئی، اس موقع پر امام صاحب نے دیکھا کہ کچھ لوگ وضو کر رہے ہیں، ان وضو کرنے والوں کو جماعت مل جائے؛ اس لیے وہ لمبی سورت پڑھتے ہیں، تو کیا اس میں کوئی حرج ہے؟ اسی طرح امام رکوع میں ہوتے ہیں، اس درمیان انھیں آہٹ سے محسوس ہوتا ہے کہ کچھ لوگ جماعت میں شریک ہو رہے ہیں، تو وہ یہ سوچتے ہوئے کہ انھیں رکوع مل جائے؛ مزید تھوڑی دیر رکوع میں رہتے ہیں، اس کی وجہ سے نماز میں کوئی نقصان آئے گا یا نہیں؟ جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

آنے والا کون ہے؟ اگر امام کو اس کی اطلاع نہ ہو، تو قراءت و رکوع کو اس قدر دراز کرنا کہ مقتدیوں کو تکلیف نہ ہو، جائز ہے، البتہ کسی خاص شخص کے لیے مثلاً سیٹھ صاحب، مال دار شخص، یا متولی وغیرہ کے لیے قراءت یا رکوع کو لمبا کرے، تو ان کا یہ عمل مکروہ ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=تسبيحات اهـ وكأنه قيد بذلك حملا للركن على القصير منه للاحتياط، وإلا فالقعود الأخير والقيام المشتمل على القراءة المسنونة أكثر من ذلك، ثم ما ذكره الشارح قول أبي يوسف. واعتبر محمد أداء الركن حقيقة، والأول المختار للاحتياط كما في شرح المنية، واحترز عما إذا انكشف ربع عضو أقل من قدر أداء ركن فلا يفسد اتفاقا؛ لأن الانكشاف الكثير في الزمان القليل عفو، كالانكشاف القليل في الزمن الكثير، وعما إذا أدى مع الانكشاف ركنا فإنها تفسد اتفاقا. قال: واعلم أن هذا التفصيل في الانكشاف الحادث في أثناء الصلاة، أما المقارن لابتدائها فإنه يمنع انعقادها مطلقا اتفاقا بعد أن يكون المكشوف ربع العضو. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۰۸، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، مطلب في ستر العورة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) وكره تحريما إطالة ركوع أو قراءة لإدراك الجائي: أي إن عرفه وإلا فلا بأس به، ولو أراد التقرب إلى الله تعالى لم يكره اتفاقا لكنه نادر وتسمى مسألة الرياء، فينبغي التحرز عنها. (الدر المختار)

علامہ شامیؒ نے اس مسئلہ پر بڑی مفید اور تفصیلی بحث نقل کی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

(قوله أي إن عرفه) عزاه في شرح المنية إلى أكثر العلماء أي لأن انتظاره حينئذ يكون للتودد إليه، لا للتقرب والإعانة على الخير. (قوله وإلا فلا بأس) أي وإن لم يعرفه فلا بأس به؛ لأنه إعانة على الطاعة، لكن يطول مقدار ما لا يثقل على القوم، بأن يزيد تسبيحة أو تسبيحتين على المعتاد، ولفظة لا بأس تفيد في الغالب أن تركه أفضل. وينبغي أن يكون هنا كذلك، فإن فعل العبادة لأمر فيه شبهة عدم إخلاصها لله تعالى لا شك أن تركه أفضل؛ لقوله - عليه الصلاة والسلام - دع ما يريبك إلى ما لا يريبك، ولأنه وإن كان إعانة على إدراك الركعة ففيه إعانة على التكاسل وترك المبادرة والتهيؤ للصلاة قبل حضور وقتها، فالأولى تركه شرح المنية. (قوله ولو أراد التقرب إلى الله تعالى)=

[۶] امام سے پہلے یا ساتھ میں سلام پھیرنا

۶۲۷-سوال: عرب حضرات کہتے ہیں کہ: امام کے سلام پھیر لینے کے بعد ہی سلام پھیرنا چاہیے، اس سے پہلے جائز نہیں، تو اس سلسلہ میں صحیح مسئلہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

مقتدی کو امام کے ساتھ یا اس کے بعد رکن کو ادا کرنا چاہیے، جو حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ امام کے بعد ہی رکن ادا کرنا چاہیے، وہ دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ ''نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو مقتدی، امام سے سبقت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا سر گدھے جیسا بنا دیں گے''۔ (بخاری شریف)[1] پس امام کا بدن بھاری ہو، اور اٹھنے بیٹھنے میں تھوڑی بہت دیر ہو جاتی ہو، تو احتیاط یہ ہے کہ مقتدی اس کے بعد ہی ارکان ادا کریں، تاہم ساتھ ساتھ ادا کرنا بھی جائز ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= أي خاصة من غير أن يتخالج قلبه شيء سوى التقرب حتى ولا الإعانة على إدراك الركعة، فيكون حينئذ هو الأفضل، لكنه في غاية الندرة. ـــــــ ويمكن أن يراد بالتقرب الإعانة على إدراك الركعة لما فيه من إعانة عباد الله على طاعته فيكون الأفضل تركه لما فيه من الشبهة التي ذكرناها شرح المنية ملخصا.

أقول: قصد الإعانة على إدراك الركعة مطلوب، فقد شرعت إطالة الركعة الأولى في الفجر اتفاقا وكذا في غيره على الخلاف إعانة للناس على إدراكها؛ لأنه وقت نوم وغفلة، كما فهم الصحابة ذلك من فعله - عليه الصلاة والسلام -. وفي المنية: ويكره للإمام أن يعجلهم عن إكمال السنة. ونقل في الحلية عن عبد الله بن المبارك وإسحاق وإبراهيم والثوري أنه يستحب للإمام أن يسبح خمس تسبيحات ليدرك من خلفه الثلاث. اهـ. فعلى هذا إذا قصد إعانة الجائي فهو أفضل بعد أن لا يخطر بباله التودد إليه ولا الحياء منه ونحوه، ولهذا نقل في المعراج عن الجامع الأصغر أنه مأجور، - {وتعاونوا على البر والتقوى} [المائدة: ۲] - وفي أذان التتارخانية قال: وفي المنتقى أن تأخير المؤذن وتطويل القراءة لإدراك بعض الناس حرام، هذا إذا مال لأهل الدنيا تطويلا وتأخيرا يشق على الناس. ـــــــ فالحاصل أن التأخير القليل لإعانة أهل الخير غير مكروه. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۹۵، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) عن محمد بن زياد، سمعت أبا هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "أما يخشى أحدكم - أو: لا يخشى أحدكم - إذا رفع رأسه قبل الإمام، أن يجعل الله رأسه رأس حمار، أو يجعل الله صورته صورة حمار". (صحيح البخاري: ۱/ ۹۶، رقم الحديث: ۶۹۱، باب إثم من رفع رأسه قبل الإمام، كتاب الأذان، ط: البدر - ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۸۱، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶-(۴۲۷)، كتاب الصلاة، باب تحريم سبق الإمام بركوع أو سجود ونحوهما، ط: ديوبند)

(۲) ولو أتمه قبل إمامه فتكلم جاز وكره. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله لو أتمه إلخ) أي لو أتم =

[۷] نماز کے بعد کی تسبیحات سے قبل امام کا دعا کرانا

۶۲۸-سوال: عرب حضرات کہتے ہیں کہ امام کو سلام کے بعد دعا نہیں کرنی چاہیے؛ بل کہ نماز سے فراغت کے بعد ہی دعا کرنی چاہیے، تو کیا نماز کے بعد متصلاً دعا نہیں کی جاسکتی ہے؟

الجواب حامداومصليا:

کتب احادیث میں سلام کے فوراً بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کرنا ثابت ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=المؤتم التشهد، بأن أسرع فيه وفرغ منه قبل إتمام إمامه فأتى بما يخرجه من الصلاة كسلام أو كلام أو قيام جاز: أي صحت صلاته لحصوله بعد تمام الأركان . . . وإنما كره للمؤتم ذلك لتركه متابعة الإمام بلا عذر، فلو به كخوف حدث أو خروج وقت جمعة أو مرور مار بين يديه فلا كراهة. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۲۵، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: زكريا - ديوبند☆البحر الرائق: ۱/ ۵۱۲-۵۲۵، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الكتاب - ديوبند)

اختلفوا في تسليم المقتدي، قال الفقيه أبو جعفر المختار أن ينتظر إذا سلم الإمام عن يمينه يسلم المقتدي عن يمينه وإذا فرغ عن يساره يسلم المقتدي عن يساره. كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۷، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الثالث في سنن الصلاة وآدابها وكيفيتها، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) عن ثوبان، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم، إذا انصرف من صلاته استغفر ثلاثا وقال: اللهم أنت السلام ومنك السلام، تباركت ذا الجلال والإكرام، قال الوليد: فقلت للأوزاعي: "كيف الاستغفار؟ قال: تقول: أستغفر الله، أستغفر الله". (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۱۸، رقم الحديث: ۱۳۵-(۵۹۱)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، ط: البدر - ديوبند)

عن عائشة - رضي الله تعالى عنها -، قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا سلم لم يقعد إلا مقدار ما يقول: «اللهم أنت السلام ومنك السلام، تباركت ذا الجلال والإكرام، وفي رواية ابن نمير: يا ذا الجلال والإكرام. [حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۱۳۶-(۵۹۲)]

عن وراد، مولى المغيرة بن شعبة، قال: كتب المغيرة بن شعبة إلى معاوية، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان إذا فرغ من الصلاة وسلم، قال: لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير، اللهم لا مانع لما أعطيت، ولا معطي لما منعت، ولا ينفع ذا الجد منك الجد. [حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۱۳۷-(۵۹۳)]

تاہم جن نمازوں کے بعد سنن مؤکدہ ہیں، ان میں مختصر و ماثور دعا کرنی چاہیے، کہ سنت کو فرض سے زیادہ مؤخر کرنا مکروہ ہے:

إذا فرغ الإمام من الصلاة، فلا يخلو إما أن كانت صلاة لا تصلى بعدها سنة: أو كانت صلاة تصلى بعدها سنة: فإن كانت صلاة لا تصلى بعدها سنة كالفجر والعصر فإن شاء الإمام قام، وإن شاء قعد في مكانه يشتغل بالدعاء؛ لأنه لا =

[۸] نماز کے بعد دعاء کرنا

۶۲۹-سوال: نماز کے بعد دعاء کرنا کیسا ہے، سنت ہے یا بدعت؟

الجواب حامداومصليا:

فرض نماز کے بعد دعاء کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، بخاری شریف میں ایک روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض کے بعد "لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير، اللهم لا مانع لما أعطيت، ولا معطي لما منعت، ولا ينفع ذا الجد منك الجد." (بخاری شریف، کتاب الصلاۃ)[۱] پڑھا کرتے تھے۔

= تطوع بعد هاتين الصلاتين فلا بأس بالقعود، إلا أنه يكره المكث على هيئته مستقبل القبلة لما روي عن عائشة - رضي الله عنها - أن النبي - صلى الله عليه وسلم - كان إذا فرغ من الصلاة لا يمكث في مكانه إلا مقدار أن يقول: اللهم أنت السلام ومنك السلام تباركت يا ذا الجلال والإكرام....

(وإن) كانت صلاة بعدها سنة يكره له المكث قاعدا، وكراهة القعود مروية عن الصحابة - رضي الله عنهم - روي عن أبي بكر وعمر - رضي الله عنهما - أنهما كانا إذا فرغا من الصلاة قاما كأنهما على الرضف. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۵۹-۱۶۰، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يستحب للإمام أن يفعله عقيب الفراغ من الصلاة، ط: دار الكتب العلمية)

ويكره تأخير السنة إلا بقدر اللهم أنت السلام إلخ. قال الحلواني: لا بأس بالفصل بالأوراد واختاره الكمال. قال الحلبي: إن أريد بالكراهة التنزيهية ارتفع الخلاف قلت: وفي حفظي حمله على القليلة؛ ويستحب أن يستغفر ثلاثا، ويقرأ آية الكرسي والمعوذات، ويسبح ،ويحمد، ويكبر ثلاثا وثلاثين؛ ويهلل تمام المائة ويدعو ويختم بسبحان ربك. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: وأما ما ورد من الأحاديث في الأذكار عقيب الصلاة، فلا دلالة فيه على الإتيان بها قبل السنة، بل يحمل على الإتيان بها بعدها؛ لأن السنة من لواحق الفريضة وتوابعها ومكملاتها فلم تكن أجنبية عنها، فما يفعل بعدها يطلق عليه أنه عقيب الفريضة. ــــــ وقول عائشة بمقدار لا يفيد أنه كان يقول ذلك بعينه، بل كان يقعد بقدر ما يسعه ونحوه من القول تقريبا، فلا ينافي ما في الصحيحين من "أنه - صلى الله عليه وسلم - كان يقول في دبر كل صلاة مكتوبة: لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير، اللهم لا مانع لما أعطيت ولا معطي لما منعت ولا ينفع ذا الجد منك الجد". وتمامه في شرح المنية، وكذا في الفتح من باب الوتر والنوافل. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۳۰، باب صفة الصلاة، مطلب هل يفارقه الملكان، ط: دار الفكر - بيروت)

[۱] صحيح البخاري: ۱/ ۱۱۷، رقم الحديث: ۸۴۴، كتاب الأذان، باب الذكر بعد الصلاة، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۱۸، رقم الحديث: ۱۳۷-(۵۹۱)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، ط: البدر - ديوبند)

حضرت ابوسعید سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ کیا آپ نے وہ کلمات یاد کیے ہیں، جن کو رسول اللہ ﷺ ہر فرض نماز کے بعد پڑھا کرتے تھے، توانہوں نے جواب دیا کہ: جی ہاں! آں حضرت ﷺ ''سبحان ربك رب العزة عما يصفون وسلام على المرسلين والحمد لله رب العالمين'' پڑھا کرتے تھے۔ (مجمع الزوائد)[۲]

آں حضرت ﷺ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ کون سی دعاء قبول ہوتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: رات کے آخری حصے اور ہر فرض نماز کے بعد کی دعاء قبول ہوتی ہے۔[۳] ایک دوسری حدیث میں آں حضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے یہ فرمایا کہ تم کبھی بھی نماز کے بعد اس دعاء کو مت چھوڑو: "اللهم أعني على ذكرك، وشكرك، وحسن عبادتك".[۴] ان کے علاوہ اور بھی متعدد احادیث میں فرض نماز کے بعد دعاء کرنا ثابت ہے، مگر آہستہ دعاء کرنا مستحب ہے۔[۵] ہاں جہراً دعاء کرنے میں مسبوق کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہو، تو مکروہ ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] نماز کا وقت ہو جانے پر قبرستان میں وقتیہ نماز پڑھنا

۶۳۰-سوال: ہمارے یہاں قبرستان میں نماز پڑھنے کے لیے جگہ مختص ہے، بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ میت کی تدفین کے بعد عصر کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے، تو کیا عصر کی نماز قبرستان کی اس جگہ میں پڑھ سکتے ہیں؟

---

[۲] عن أبي هارون قال: قلنا لأبي سعيد: هل حفظت عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - شيئا كان يقوله بعد ما سلم؟ قال: نعم كان يقول: "سبحان ربك رب العزة عما يصفون وسلام على المرسلين والحمد لله رب العالمين".

رواه أبو يعلى ورجاله ثقات. (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد- أبو الحسن نور الدين علي بن أبي بكر بن سليمان الهيثمي (م:۸۰۷هـ): ۲/ ۱۴۷، رقم الحديث: ۲۸۹۱، كتاب الصلاة، باب ما يقول من الذكر والدعاء عقيب الصلاة، ت: حسام الدين القدسي، ط: مكتبة القدسي، القاهرة)

(۳) عن أبي أمامة، قال: قيل يا رسول الله: أي الدعاء أسمع؟ قال: جوف الليل الآخر، ودبر الصلوات المكتوبات. (سنن الترمذي: ۲/ ۱۸۷، رقم الحديث: ۳۴۹۹، أبواب الدعوات، باب بعد: باب ما جاء في عقد التسبيح باليد)

(۴) عن معاذ بن جبل، أن الرسول صلى الله عليه وسلم أخذ بيده، وقال: يا معاذ، والله إني لأحبك، والله إني لأحبك، فقال: "أوصيك يا معاذ لا تدعن في دبر كل صلاة تقول: اللهم أعني على ذكرك، وشكرك، وحسن عبادتك". (سنن أبي داود: ۱/ ۲۱۳، رقم الحديث: ۱۵۲۲، كتاب الصلاة، باب في الاستغفار، ط: البدر - ديوبند)

(۵) ﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ (۷-الأعراف: ۵۵)

﴿وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ﴾ (۷-الأعراف: ۲۰۵)

الجواب حامداً ومصلیاً

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: میرے لیے اور میری امت کے لیے زمین کے ہر حصہ کو مسجد بنایا گیا ہے۔ (بخاری: ۱/ ۴۸)[1] اس لیے اگر زمین پاک ہو اور سامنے قبر نہ ہو، تو قبرستان میں بھی فرض نماز پڑھنا جائز ہے۔[2] آپ کی تحریر کے مطابق جب نماز کے لیے جگہ متعین کردی گئی ہے اور پاک ہونے کا یقین ہے، تو وقت ہوجانے پر نماز پڑھنا جائز ہے۔ فقط۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] تکبیرات انتقالیہ کا ابتدائی اور انتہائی وقت

۶۳۱-سوال: امام تکبیرات انتقالیہ کب شروع کرے اور کب ختم کرے؟

الجواب حامداومصلیا:

ایک رکن ادا کر کے دوسرے رکن کی طرف جاتے ہی تکبیرات انتقالیہ (اللہ أکبر، سمع اللہ لمن حمدہ) شروع کردینی چاہیے اور دوسرا رکن شروع ہوتے ہی ختم کردینی چاہیے۔[3] فقط اللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن جابر بن عبد الله، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "أعطيت خمسا لم يعطهن أحد قبلي: نصرت بالرعب مسيرة شهر، وجعلت لي الأرض مسجدا وطهورا، فأيما رجل من أمتي أدركته الصلاة فليصل، وأحلت لي المغانم ولم تحل لأحد قبلي، وأعطيت الشفاعة، وكان النبي يبعث إلى قومه خاصة وبعثت إلى الناس عامة". (صحيح البخاري: ۱/ ۴۸، رقم الحديث: ۳۳۵، كتاب التيمم، قبل باب اذا لم يجد ماء أو لا ترابا، وانظر رقم: ۴۳۸، ط: البدر -ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۹۹، رقم الحديث: ۳-(۵۲۱)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب جعلت لي الأرض مسجدا وطهورا، قبل: باب تحويل القبلة من القدس إلى الكعبة، ط: البدر -ديوبند)

(۲) إلا إذا غسل موضعا منه ولا تمثال، أو صلى في موضع نزع الثياب، أو كان في المقبرة موضع أعد للصلاة ولا قبر ولا نجاسة فلا بأس كما في الخانية. اهـ... وفي القهستاني: لا تكره الصلاة في جهة قبر إلا إذا كان بين يديه؛ بحيث لو صلى صلاة الخاشعين وقع بصره عليه كما في جنائز المضمرات. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۵۴، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، مطلب في بيان السنة، والمكروه، ط: دار الفكر)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: ''عیدگاہ میں نماز جنازہ اور جنازہ گاہ میں عید کی نماز پڑھنا''۔

[۳] (ثم) كما فرغ (يكبر) مع الانحطاط (للركوع) [الدر المختار] ـــــــــ قال ابن عابدين: (قوله مع الانحطاط) أفاد أن السنة كون ابتداء التكبير عند الخرور وانتهائه عند استواء الظهر، وقيل إنه يكبر قائما، والأول هو الصحيح كما في المضمرات وتمامه في القهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۹۳، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۴-۷۵، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الثالث في سننها وآدابها... الخ، ط: زكريا -ديوبند)

[۱۱] سورۂ فاتحہ اور ضم سورت کی حیثیت

۶۳۲-سوال: نماز میں قراءت فرض ہے؛ لیکن واجبات صلوۃ میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا اور اس کے ساتھ کسی سورت کو ملانا ہے، تو پھر ان دونوں میں کون سی قراءت فرض ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نفس قراءت فرض ہے، پورے قرآن مجید میں سے جہاں سے بھی پڑھا جائے، فرضیت ادا ہو جائے گی۔ (۱)

احناف کے یہاں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا مستقل واجب ہے، اسی طرح اس کے ساتھ کسی سورت کا ملانا بھی مستقل واجب ہے۔ کسی سورت کو ملائے یا کسی بھی جگہ سے تین چھوٹی آیات پڑھے، واجب ادا ہو جائے گا، مقتدی کے لیے احناف کے مذہب کے مطابق امام کے پیچھے قراءت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ (۲)

خلاصہ یہ کہ پورے قرآن مجید میں سے جہاں کہیں سے بھی پڑھے گا، فرضیتِ قراءت ادا ہو جائے گی، البتہ سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، اس کے بعد کسی سورت کا ملانا یا کم از کم ایک بڑی آیت یا تین چھوٹی آیات کا اس طور پر پڑھنا لازم ہے کہ ان میں کم از کم تیس حروف ہوں، جیسے: ثُمَّ نَظَرَ ۝۲۱ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝۲۲ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝۲۳ اس طرح قراءت کی فرضیت بھی ادا ہو جائے گی اور وجوب بھی۔

الغرض نفس قراءت فرض ہے اور سورۂ فاتحہ اور ضم سورت واجب، سورۂ فاتحہ یا ضم سورت کے ضمن میں فرضیت خود بہ خود ادا ہو جاتی ہے۔

---

(۱) قوله تعالى: فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ . (۷۳-المزمل: ۲۰)
(من فرائضها) التي لا تصح بدونها (التحريمة) قائما ... (ومنها القراءة). [الدر المختار شرح تنوير الأبصار وجامع البحار-علاء الدين الحصكفي الحنفي (م: ۱۰۸۸ھ): ۱/ ۶۲، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ت: عبد المنعم خليل إبراهيم، ط: دار الكتب العلمية]

(۲) وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (۷-الأعراف: ۲۰۴)
وتكره القراءة خلف الإمام عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالى. هكذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۹، الباب السابع فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها، الفصل الثاني فيما يكره في الصلاة وما لا يكره، ط: دار الفكر)
قال في الخزائن: وفي الكافي: ومنع المؤتم من القراءة مأثور عن ثمانين نفرا من كبار الصحابة، منهم المرتضى والعبادلة وقد دون أهل الحديث أساميهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۴۵، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فروع يجب الاستماع للقراءة مطلقا، قبيل: مطلب الاستماع للقرآن فرض كفاية، ط: دار الفكر-بيروت)

اگر کوئی فرض چھوٹ جائے، تو نماز کا اعادہ ضروری ہے؛ لیکن اگر واجب چھوٹ جائے، تو اس کی سجدۂ سہو سے تلافی ہوجاتی ہے، الا یہ کہ واجب کو جان بوجھ کر ترک کر دیا ہو، تو اس صورت میں سجدۂ سہو سے تلافی نہیں ہوتی، گرچہ اصل فرضیت ساقط ہوجاتی ہے، تاہم نماز واجب الاعادہ ہوتی ہے۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] ظہر کی سنن قبلیہ کی چوتھی رکعت میں ضم سورت کا حکم

۶۳۳-سوال: ظہر کی سنن قبلیہ کی چوتھی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت ملائی یا نہیں؟ ایسا شک رکوع میں جانے کے بعد ہوا تو کیا کرے؟ یا واقعی سورت ملانا ہی بھول گیا، رکوع اور سجدہ کر لیا اور قعدہ میں یاد آیا، تو کیا کرے؟

الجواب حامداو مصلیا:

شک کی وجہ سے کوئی حکم نہیں لگے گا اور نماز صحیح ہوجائے گی۔ (۲) قعدہ میں یاد آیا کہ سورت ملانا بھول گیا، تو سجدہ سہو واجب ہوگا۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] (ولها واجبات) لا تفسد بتركها وتعاد وجوبا في العمد والسهو إن لم يسجد له، وإن لم يعدها يكون فاسقا آثما، وكذا كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب إعادتها.... (وهي)... (قراءة فاتحة الكتاب) فيسجد للسهو بترك أكثرها لا أقلها، لكن في المجتبى: يسجد بترك آية منها، وهو أولى.... (وضم) أقصر (سورة) كالكوثر أو ما قام مقامها، وهو ثلاثة آيات قصار، نحو: ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ وكذا لو كانت الآية أو الآيتان تعدل ثلاثا قصارا. ذكره الحلبي (في الاولين من الفرض)... (و) في (جميع) ركعات (النفل). [حوالہ سابق: ۱/ ۶۴ ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۶۹ و ۷۱، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الأول في فرائض الصلاة، والفصل الثاني في واجبات الصلاة، ط: زكريا - ديوبند]

(۲) اليقين لا يزول بالشك. (الاشباه والنظائر - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۴۷، القاعدة الثالثة، ت: الشيخ زكريا عميرات، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ شرح القواعد الفقهية - أحمد بن الشيخ محمد الزرقا (۱۲۸۵هـ - ۱۳۵۷هـ): ۷۹، ت: مصطفى أحمد الزرقا، ط: دار القلم - دمشق/سوريا ☆ قواعد الفقه - محمد عميم الإحسان المجددي البركتي (م: ۱۳۹۵هـ): ۱۴۳، رقم: ۴۲۱، ط: الصدف ببلشرز - كراتشي)

(۳) (ولها واجبات) لا تفسد بتركها وتعاد وجوبا في العمد والسهو إن لم يسجد له، وإن لم يعدها يكون فاسقا آثما.... (وهي)... (وضم) أقصر (سورة) كالكوثر أو ما قام مقامها، وهو ثلاثة آيات قصار، نحو: ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ وكذا لو كانت الآية أو الآيتان تعدل ثلاثا قصارا. ذكره الحلبي (في الاولين من الفرض)... (و) في (جميع) ركعات (النفل). [الدر المختار شرح تنوير الأبصار وجامع البحار - علاء الدين الحصكفي الحنفي (م: ۱۰۸۸هـ): ۱/ ۶۴، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ت: عبد المنعم خليل إبراهيم، ط: دار =

[۱۳] مقتدی کا سورۂ فاتحہ پڑھنا

۶۳۴-سوال: جو شخص امام کے ساتھ ظہر یا عصر کی نماز پڑھے، تو اس کے لیے آخری دو رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا کیسا ہے؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مسلک حنفی کے مطابق وہ تمام نمازیں جو امام کے پیچھے پڑھی جائیں، خواہ اُن میں قرأت سراً (آہستہ) ہو، یا جہراً (آواز سے) ہو، دونوں صورتوں میں مقتدی تکبیر تحریمہ کے بعد صرف ثناء پڑھے، اور اگر جہری قراءت شروع ہو چکی ہو، تو پھر ثناء بھی نہ پڑھے، لہٰذا مقتدی کا امام کے پیچھے قراءت کرنا جائز نہیں ہے:

وتكره القراءة خلف الإمام عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالى. هكذا في الهداية. (عالم گیری)[۱]

(والمؤتم لا يقرأ مطلقا) ولا الفاتحة في السرية اتفاقا، وما نسب لمحمد ضعيف كما بسطه الكمال. (فإن قرأ كره تحريما) وتصح في الأصح. (درمختار)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] واجبات، سنن اور نوافل کی ہر رکعت میں اور فرض کی پہلی دو رکعات میں قراءت کی حکمت

۶۳۵-سوال: واجبات، سنن اور نوافل کی تمام رکعات میں قراءت ہوتی ہے، جب کہ فرض نماز کی صرف پہلی دو رکعت میں قراءت کا حکم ہے، اس کی حکمت کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

شریعتِ مطہرہ کے تمام احکام کا مدار اطاعت پر ہے، قرآنِ کریم میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

=الكتب العلمية ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۶۹ و ۷۱، الفصل الأول في فرائض الصلاة و الفصل الثاني في واجبات الصلاة، ط: زكريا-ديوبند)

[۱] الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۹، الباب السابع فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها، الفصل الثاني فيما يكره في الصلاة وما لا يكره، ط: دار الفكر-بيروت.

[۲] الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۴۵، باب صفة الصلاة، باب في القراءة، ط: دار الفكر.

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ [۱]

ترجمہ: اور رسول ﷺ تمہیں جو کچھ دیں، وہ لے لو، اور جس چیز سے منع کریں، اس سے رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

بخاری اور مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں، تو تم سے جس قدر ہو سکے، اُس پر عمل پیرا رہو، اور جس چیز سے میں تمہیں منع کروں اُسے چھوڑ دو، اس لیے کہ تم سے پہلے بہت سی اُمتیں اُن کے نبی کے سامنے غیر ضروری سوالات کی وجہ سے ہلاک ہوگئیں۔ [۲]

قرآنِ پاک کی مذکورہ آیت اور حدیثِ رسول ﷺ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ احکامِ شریعت میں اطاعت ہی مطلوب ہے، بلا چوں و چرا احکامِ الٰہی کو تسلیم کرنا ہی بندے کی شان ہے، خواہ بندہ اُن احکام کی حکمت جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، دنیا میں ہم رات دن دیکھتے ہیں کہ حکومت کی جانب سے جب کوئی فرمان جاری کیا جاتا ہے تو رعایا فوراً اُس پر عمل شروع کر دیتی ہے، کوئی اُس قانون کی حکمت نہیں پوچھتا، اور حکمت نہ جاننے کے باوجود، خواہی نہ خواہی اُس پر عمل کرنا ہی پڑتا ہے، بصورتِ دیگر سزا ہوتی ہے، پھر بسا اوقات قانون کے ماہرین اور وکلاء اُس قانون کی حکمت معلوم کر لیتے ہیں، اور کبھی اُن کی رسائی حکمت تک نہیں بھی ہوتی، تاہم قانون پر تو ہر حال میں عمل ضروری ہوتا ہے، علاوہ ازیں ہر شخص کی عقل ہر بات کی حکمت کا ادراک کر لے یہ بھی ضروری نہیں۔

بالکل اسی طرح فرامینِ خداوندی کے بارے میں کسی بندے کو حکمت معلوم کرنے کا کوئی حق نہیں، اور نہ تو عمل کرنا حکمت کے معلوم ہونے پر موقوف ہے، ہاں یہ بات اور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے ایسے

---

[۱] ۵۹-الحشر:۷۔

(۲) عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: دعوني ما تركتكم، إنما هلك من كان قبلكم بسؤالهم واختلافهم على أنبيائهم، فإذا نهيتكم عن شيء فاجتنبوه، وإذا أمرتكم بأمر فأتوا منه ما استطعتم. (صحيح البخاري: ۲/ ۱۰۸۲، رقم الحديث: ۷۲۸۸، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله صلى الله عليه وسلم، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/ ۲۶۲، رقم الحديث: ۱۳۰-۱۳۳۷، كتاب الفضائل، باب توقيره صلى الله عليه وسلم، وترك إكثار سؤاله عما لا ضرورة إليه، أو لا يتعلق به تكليف وما لا يقع، ونحو ذلك، ط: البدر - ديوبند)

بندے، جن کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین سے نوازا ہوتا ہے، اُن پر احکام شریعت کی حکمتیں اور اسرار، بفضلہٖ تعالیٰ کھلتے ہیں، لیکن ایسے ماہر علماء وفقہاء کی تعداد بھی بہت کم ہے، لہٰذا حِکَم واَسرار اُن کی کتابوں سے جانے جاسکتے ہیں، آپ نے جن حکمتوں کے متعلق سوال کیا ہے، اُن کی کچھ تفصیل پیش خدمت ہے:

مسلکِ احناف کے مطابق فرض نماز کی پہلی دو رکعت میں قراءت کی جاتی ہے، وجہ اُس کی یہ ہے کہ قرآن کریم کا حکم اِس سلسلے میں مطلق ہے: "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ"۔ [۳] یعنی قرآنِ کریم میں سے جو تم بہ آسانی پڑھ سکتے ہو، اُسے پڑھو۔

اِس حکم کے پیشِ نظر تو صرف ایک رکعت میں بھی قراءت کرلی جاتی، تو کافی تھا؛ مگر احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض نماز کی پہلی دو رکعت حکم کے اعتبار سے بعد والی دو رکعت سے کچھ مختلف ہیں، جیسا کہ حالتِ سفر میں چار رکعات والی نماز میں قصر کیا جاتا ہے، تو پہلی دو رکعت پڑھی جاتی ہے اور بعد والی دونوں ساقط ہو جاتی ہیں، نیز ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نماز جب ابتدا میں فرض ہوئی، تو دو، دو رکعات تھیں، پھر حالتِ سفر میں اُن دو کو باقی رکھا گیا، اور حالتِ اقامت میں دو کا اضافہ کیا گیا۔ [۴]

اِس سے معلوم ہوا کہ بعد والی دو رکعات جن کا اضافہ ہوا ہے وہ پہلی دو رکعات سے کچھ مختلف ہیں، لہٰذا پہلی دونوں رکعات میں قراءت کی جائے گی، اور بعد والی دو رکعات میں صرف سورۂ فاتحہ پر اکتفاء کیا جائے گا۔ (بدائع الصنائع: ۱/۱۱۱، فصل ارکان الصلاۃ، ط: دار الکتب العلمیۃ - بیروت)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ: فرض نماز کی وہ رکعات، جو کسی بھی حال میں ساقط نہیں ہوتیں، وہ کل گیارہ رکعات ہیں، اسی طرح تہجد کے ساتھ وتر ملا کر کل گیارہ رکعات ہیں، یہ ایک بابرکت اور معتدل عدد ہے، ایسا کثیر بھی نہیں کہ لوگوں کے لیے اُس پر عمل کرنا دشوار ہو، اور اتنا قلیل بھی نہیں کہ نماز کا مقصد حاصل نہ ہو، چناں چہ ابتداءِ اسلام میں اسی پر عمل کروایا گیا، پھر جب ہجرت کے بعد دین اسلام کو تقویت حاصل ہوئی، اطاعت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، دین میں لوگوں کی رغبت بڑھ گئی، تو ظہر، عصر اور

---

(۳) ۷۳-المزمل: ۲۰.

(۴) عن عائشة أم المؤمنين، قالت: فرض الله الصلاة حين فرضها، ركعتين ركعتين، في الحضر والسفر، فأقرت صلاة السفر، وزيد في صلاة الحضر. (صحيح البخاري: ۱/۵۱، رقم الحديث: ۳۵۰، كتاب الصلاة، باب: كيف فرضت الصلاة في الإسراء؟ ط: البدر - ديوبند)

عشاء میں چھ رکعات کا اضافہ کیا گیا، اور سفر کی نماز کو حسبِ سابق برقرار رکھا گیا، ان ساری تفاصیل کا خلاصہ یہ نکلا کہ فرض نماز میں جن رکعات کا اضافہ کیا گیا ہے، اُن میں قراءت نہیں ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ: ۲/۶)[1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] فجر، مغرب اور عشاء میں جہری اور ظہر وعصر میں سری قراءت کی حکمت

۶۳۶-سوال: فجر، مغرب اور عشاء کی نمازوں میں قراءت جہری ہوتی ہے، جب کہ ظہر اور عصر میں قراءت سری ہوتی ہے، اُس کی کیا حکمت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ظہر اور عصر کی نماز کے اوقات ایسے ہیں کہ اُن میں تمام لوگ اپنی مشغولیات میں ہوتے ہیں، بازار وغیرہ میں شور و ہنگامے ہوتے ہیں، تو ان اوقات میں دل کو مزید خشوع وخضوع اور توجہ الی اللہ حاصل ہو سکے؛ اس لیے سری قراءت کا حکم دیا گیا ہے، اور اِن اوقات کے علاوہ دیگر اوقات میں عام طور فضا پرسکون ہوتی ہے، اور لوگ اطمینان سے آرام کرتے ہیں، اِس لیے جہری قراءت کا حکم ہوا، تاکہ لوگوں کو اللہ کی یاد دلائی جائے، کہ وہ ان اوقات میں ذکر اللہ سے غفلت نہ برتیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

---

[۱] أقول الأصل في عدد الركعات أن الواجب الذي لا يسقط بحال إنما هو أحدى عشر ركعة، وذلك لأنه اقتضت حكمة الله ألا يشرع في اليوم والليلة إلا عددا مباركا متوسطا لا يكون كثيرا جدا، فيعسر إقامته على المكلفين جميعا، ولا قليلا جدا، فلا يفيد لهم ما أريد من الصلاة، وقد علمت فيما سبق أن الأحد عشر من بين الأعداد أشبهها بالوتر الحقيقي، ثم لما هاجر النبي صلى الله عليه وسلم واستقر الإسلام، وكثر أهله، وتوفرت الرغبات في الطاعة زيدت ست ركعات، وأبقيت صلاة السفر على النمط الأول. (حجة الله البالغة-أحمد بن عبد الرحيم بن الشهيد وجيه الدين بن معظم بن منصور المعروف بـ 'الشاه ولي الله الدهلوي' (م:۱۱۷۶هـ): ۲/۱۱، الأمور التي لا بد منها في الصلاة، ت: السيد سابق، ط: دار الجيل-بيروت)

[۲] والسر في مخالفته الظهر والعصر أن النهار مظنة الصخب واللغط في الأسواق والدور، وأما غيرهما فوقت هدوء الأصوات والجهر أقرب إلى تذكر القوم واتعاظهم. (حجة الله البالغة-أحمد بن عبد الرحيم بن الشهيد وجيه الدين بن معظم بن منصور المعروف بـ 'الشاه ولي الله الدهلوي' (م:۱۱۷۶هـ): ۲/۱۵، أذكار الصلاة وهيأتها المندوب إليها، ت: السيد سابق، ط: دار الجيل-بيروت)

[۱۶] نماز میں زائد دعاؤں کے پڑھنے کا حکم

۷۳۶- سوال: نماز فرض، نفل اور سنت میں "ربنا لك الحمد" کے بعد "حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه" پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اور سجدے میں "سبحان ربي الأعلى" کے بعد "سبوح قدوس، ربنا ورب الملائكة والروح" پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اور دونوں سجدے کے درمیان جلسے میں "اللهم اغفر لي وارحمني وعافني واهدني وارزقني واجبرني وارفع عني" پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ مذکورہ دعائیں امام کے ساتھ اور علاحدہ؛ ہر دو صورت میں پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

رکوع، سجدے اور جلسے میں جو ذکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، انہی کو پڑھنا سنت ہے؛ اس لیے رکوع میں "سبحان ربي العظيم" اور سجدے میں "سبحان ربي الأعلى" پڑھنا چاہیے۔ (۱) دونوں سجدوں کے درمیان اگر امام پڑھے گا، تو مقتدیوں پر بوجھ بنے گا اور مقتدی پڑھے گا، تو اپنے امام کی اقتدا نہیں کر سکے گا؛ لہٰذا منفرد اگر سوال میں مذکور دعائیں دونوں سجدوں کے درمیان، رکوع اور سجدے میں اور رکوع

---

(۱) ويقول "سبحان ربي العظيم ثلاثا، وذلك أدناه" لقوله عليه الصلاة والسلام "إذا ركع أحدكم فليقل في ركوعه سبحان ربي العظيم ثلاثا، وذلك أدناه" أي أدنى كمال الجمع"، ثم يرفع رأسه، ويقول سمع الله لمن حمده، ويقول المؤتم ربنا لك الحمد ولا يقولها الإمام عند أبي حنيفة رحمه الله تعالى، وقالا: يقولها في نفسه "لما روى أبو هريرة رضي الله عنه أن النبي عليه الصلاة والسلام كان يجمع بين الذكرين..." ويقول في سجوده سبحان ربي الأعلى ثلاثا وذلك أدناه" لقوله عليه الصلاة والسلام" وإذا سجد أحدكم فليقل في سجوده سبحان ربي الأعلى ثلاثا وذلك أدناه" أي أدنى كمال الجمع.

ويستحب أن يزيد على الثلاث في الركوع والسجود بعد أن يختم بالوتر لأنه عليه الصلاة والسلام كان يختم بالوتر وإن كان إماما لا يزيد على وجه يمل القوم حتى لا يؤدي إلى التنفير ثم تسبيحات الركوع والسجود سنة لأن النص تناولهما دون تسبيحاتهما فلا يزاد على النص. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر، المرغيناني، أبو الحسن، برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۵۰- ۵۲، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

سے کھڑے ہونے کے بعد پڑھنا چاہے، تو پڑھ سکتا ہے۔ [۲] ان دعاؤں کا ثبوت بھی احادیث کی کتابوں سے ملتا ہے۔ [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۲) (وليس بينهما ذكر مسنون، وكذا) ليس (بعد رفعه من الركوع) دعاء، وكذا لا يأتي في ركوعه وسجوده بغير التسبيح (على المذهب) وما ورد محمول على النفل. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: قوله وليس بينهما ذكر مسنون) قال أبو يوسف: سألت الإمام أيقول الرجل إذا رفع رأسه من الركوع والسجود اللهم اغفر لي؟ قال: يقول ربنا لك الحمد وسكت، ولقد أحسن في الجواب إذ لم ينه عن الاستغفار نهر وغيره. ـــــ أقول: بل فيه إشارة إلى أنه غير مكروه إذ لو كان مكروها لنهى عنه كما ينهى عن القراءة في الركوع والسجود وعدم كونه مسنونا لا ينافي الجواز كالتسمية بين الفاتحة والسورة؛ بل ينبغي أن يندب الدعاء بالمغفرة بين السجدتين خروجا من خلاف الإمام أحمد؛ لإبطاله الصلاة بتركه عامدا ولم أر من صرح بذلك عندنا، لكن صرحوا باستحباب مراعاة الخلاف، والله أعلم. ـــــــــ (قوله وما ورد إلخ) فمن الوارد في الركوع والسجود ما في صحيح مسلم، أنه - صلى الله عليه وسلم - كان إذا ركع قال: اللهم لك ركعت وبك آمنت ولك أسلمت خشع لك سمعي وبصري ومخي وعظمي وعصبي، وإذا سجد قال: اللهم لك سجدت وبك آمنت ولك أسلمت، سجد وجهي للذي خلقه وصوره وشق سمعه وبصره تبارك الله أحسن الخالقين، والوارد في الرفع من الركوع أنه كان يزيد ،ملء السماوات والأرض وملء ما شئت من شيء بعد أهل الثناء والمجد أحق ما قال العبد وكلنا لك عبد لا مانع لما أعطيت ولا معطي لما منعت ،ولا ينفع ذا الجد منك الجد. رواه مسلم وأبو داود وغيرهما. ـــــ وبين السجدتين "اللهم اغفر لي وارحمني وعافني واهدني وارزقني". رواه أبو داود، وحسنه النووي وصححه الحاكم، كذا في الحلية. ـــــــ (قوله محمول على النفل) أي تهجدا أو غيره خزائن.

وكتب في هامشه: فيه رد على الزيلعي حيث خصه بالتهجد. اهـ. ثم الحمل المذكور صرح به المشايخ في الوارد في الركوع والسجود، وصرح به في الحلية في الوارد في القومة والجلسة وقال على أنه إن ثبت في المكتوبة فليكن في حالة الانفراد، أو الجماعة والمأمومون محصورون لا يتثقلون بذلك كما نص عليه الشافعية، ولا ضرر في التزامه وإن لم يصرح به مشايخنا فإن القواعد الشرعية لا تنبو عنه، كيف والصلاة والتسبيح والتكبير والقراءة كما ثبت في السنة. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۰۵-۵۰۶، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل، ط: دار الفكر)

(۳) عن رفاعة بن رافع الزرقي، قال: "كنا يوما نصلي وراء النبي صلى الله عليه وسلم، فلما رفع رأسه من الركعة قال: سمع الله لمن حمده"، قال رجل وراءه: ربنا ولك الحمد حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه، فلما انصرف، قال: من المتكلم؟ قال: أنا، قال: رأيت بضعة وثلاثين ملكا يبتدرونها أيهم يكتبها أول. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۱۰، رقم الحديث: ۷۹۹، كتاب الأذان، باب فضل اللهم ربنا لك الحمد، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۱۹، رقم الحديث: ۱۳۹-(۶۰۰)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، وباب ما يقال بين تكبيرة الإحرام والقراءة، ط: ديوبند)

عن عائشة رضي الله عنها، قالت: "كان النبي صلى الله عليه وسلم يقول في ركوعه وسجوده: سبحانك اللهم ربنا وبحمدك اللهم اغفر لي". (صحيح البخاري: ۱/ ۱۰۹، رقم الحديث: ۷۹۴، كتاب الأذان، باب الدعاء في الركوع)

[۱۷] نماز کے بعد طلب رزق کی دعا اخلاص کے منافی نہیں

۹۳۸-سوال: علماء کرام فرماتے ہیں کہ نماز کے ذریعہ رزق طلب نہ کرنا چاہیے؛ کیوں کہ نماز کا اخلاص یہی ہے کہ وہ صرف رضائے الٰہی کے لیے پڑھی جائے، اس کے ذریعہ کوئی حاجت طلب نہ کی جائے، تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت اور ضرورت کے مطالبہ کی دوسری شکل کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نماز فرض ہو یا نفل یا صلاۃ الحاجۃ، اس کو اللہ کی عبادت کے طور پر اور اللہ کے دربار میں عاجزی کے ساتھ ادا کرنی چاہیے، اس خیال اور توجہ سے پڑھنی چاہیے کہ وہ خالق اور مالک ہے اور میں اس کا بندہ ہوں، دنیا اور آخرت کی بھلائی کا میں محتاج ہوں اور خصوصاً حالت نماز میں یہی سوچنا چاہیے کہ میں اللہ کی بندگی کرتا ہوں؛ کیوں کہ وہ میرا رب ہے، وہ مجھے دیکھ رہا ہے اور میں اس کے سوا دوسرے کی عبادت نہیں کرتا ہوں، جب اپنی عاجزی کا اظہار کردیا، پھر نماز کے بعد کسی بھی حاجت کا مطالبہ کرے گا، تو یہ مناسب درخواست ہوگی اور ان شاء اللہ قبول ہوگی؛ بہر حال نماز میں اخلاص ایک الگ چیز ہے اور نماز کے بعد اپنی حاجت کا مطالبہ الگ چیز ہے، حدیث شریف میں بھی آتا ہے کہ جب کوئی مصیبت آجائے، تو نماز کی طرف متوجہ ہوجاؤ۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] اگر امام پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو، اور مقتدی اقتدا نہ کرے، تو کیا حکم ہے؟

۹۳۹-سوال: ظہر کی فرض نماز میں امام صاحب چوتھی رکعت پر نہیں بیٹھے، پانچویں رکعت کو

---

(۱) ﴿إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾ (۲۰-طٰہٰ: ۱۴)

عن أبي هريرة، قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم بارزا يوما للناس، فأتاه رجل فقال: ما الإيمان؟ قال: الإيمان أن تؤمن بالله وملائكته، وكتبه، وبلقائه، ورسله وتؤمن بالبعث. قال: ما الإسلام؟ قال: "الإسلام: أن تعبد الله، ولا تشرك به شيئا، وتقيم الصلاة، وتؤدي الزكاة المفروضة، وتصوم رمضان". قال: ما الإحسان؟ قال: «أن تعبد الله كأنك تراه، فإن لم تكن تراه فإنه يراك». (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲، رقم الحديث: ۵۰، كتاب الإيمان، باب سؤال جبريل النبي صلى الله عليه وسلم عن الإيمان، والإسلام، والإحسان، وعلم الساعة، و انظر: رقم: ۴۷۷۷، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۷، رقم الحديث: ۵-(۹)، كتاب الإيمان، باب: الإيمان ما هو وبيان خصاله، ط: البدر - ديوبند)

چوتھی رکعت سمجھ کر کھڑے ہو گئے، بعض مقتدی حضرات نے لقمہ دیا؛ لیکن امام مکمل کھڑے ہو گئے، یہاں تک کہ پانچویں رکعت بھی مکمل کرادی، اب ہوا یہ کہ بعض مقتدی نے امام کی پیروی کی اور بعض چوتھی رکعت کے قعدے میں بیٹھ گئے اور بالآخر سلام پھیر دیا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ چوتھی رکعت پر بیٹھے رہنے والوں کی نماز درست ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداو مصليا:

جو مقتدی حضرات بیٹھے رہے، ان کی بھی نماز درست نہیں ہوئی، اعادہ لازم ہے۔ (شامی: ۱/ ۴۵۷)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] سنت نماز میں اس طرح نیت کرنا کہ: ''میں رسول اللہ ﷺ کے نام کی نماز پڑھتی ہوں''

۶۴۰-سوال: ایک خاتون ہر نماز کی سنتوں میں اس طرح نیت کرتی ہے کہ: ''نیت کرتی ہوں میں نماز کی، نماز پڑھتی ہوں میں واسطے اللہ کے، چار رکعت نماز سنت، رسول اللہ کے نام کی۔'' خاتون کا عقیدہ ہے کہ سنت تو سرکار دو عالم ﷺ کی ہے، تو نیت میں بھی سنت کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی جانب کرنی چاہیے؟ کیا اس طرح نیت کرنا شرک ہوگا؟

الجواب حامداو مصليا:

اگر اس کی مراد یہ ہے کہ میں نماز رسول ﷺ کی سنت کی حیثیت سے پڑھتی ہوں، تو کوئی حرج نہیں؛ لیکن اگر اس کی ''چار رکعت نماز سنت، رسول اللہ کے نام کی'' سے مراد یہ ہے کہ یہ چار رکعت رسول اللہ

[۱] کیوں کہ امام کی نماز کا فساد، مقتدی کی نماز کے فساد کو مستلزم ہے، بصورت مسئولہ میں امام کی نماز فرض ادا نہیں ہوئی، تو مقتدی کی بھی نماز فرض ادا نہیں ہوگی:

(ولو سها عن القعود الأخير) كله أو بعضه (عاد) ويكفي كون كلا الجلستين قدر التشهد (ما لم يقيدها بسجدة) لأن مادون الركعة محل الرفض وسجد للسهو لتأخير القعود (وإن قيدها) بسجدة عامدا أو ناسيا أو ساهيا أو مخطئا (تحول فرضه نفلا برفعه) الجبهة عند محمد، وبه يفتى. (الدر المختار)

(قوله عامدا أو ناسيا) أشار إلى ما في البحر من أنه لا فرق في عدم البطلان عند العود قبل السجود والبطلان إن قيد بالسجود بين العمد والسهو، ولذا قال في الخلاصة: فإن قام إلى الخامسة عامدا أيضا لا تفسد ما لم يقيد الخامسة بالسجدة عندنا. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۸۵، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۱۷۹ تا ۱۸۱، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: دار الكتاب - ديوبند)

صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے لیے پڑھتی ہوں، تو شرک ہے، لیکن اس کے اس جملے سے کہ "واسطے اللہ کے" سے اس مراد کی نفی ہوتی ہے، الغرض جیسی مراد ہوگی، اس کے مطابق حکم ہوگا۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] نماز میں صرف دو آیتیں پڑھنا

۶۴۱-سوال: امام صاحب نے تراویح کے بعد وتر کی تیسری رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد سورۂ بلد کی آخری دو آیتیں پڑھی، رکوع کیا اور نماز مکمل کی، تو ایک صاحب نے کہا کہ نماز وتر ادا نہیں ہوئی؛ چناں چہ وتر کی نماز لوٹائی گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ پہلی مرتبہ پڑھی گئی وتر کی نماز ادا ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداو مصلیا:

سورۂ بلد کی آخری دو آیت "و الذين كفروا" سے پڑھی، تو نماز درست ہوگئی ہے، لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔ (درمختار)[۲]

---

(۱) الاعتبار للمعنى لا للألفاظ، صرحوا به في مواضع. (الأشباه و النظائر على مذهب أبي حنيفة - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ)، ص: ۱۷۳، الفن الثاني في الفوائد، كتاب البيوع، أحكام الحمل، حواشي و تخريج: الشيخ زكريا عميرات، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆إرشاد الفحول إلى تحقيق الحق من علم الأصول- محمد بن علي بن محمد، الشوكاني اليمني (م: ۱۲۵۰ھ): ۲/ ۹۶، الأدلة من القرآن الكريم، ت: أحمد عزو عناية، الناشر: دار الكتب العربي)

[۲] (من فرائضها) التي لا تصح بدونها... (ومنها القراءة) لقادر عليها. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله ومنها القراءة) أي قراءة آية من القرآن، وهي فرض عملي في جميع ركعات النفل و الوتر و في ركعتين من الفرض... وأما قراءة الفاتحة و السورة أو ثلاث آيات فهي واجبة أيضا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۴۶، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، مبحث القراءة، ط: دار الفكر- بيروت)

(وضم) أقصر (سورة) كالكوثر أو ما قام مقامها، هو ثلاث آيات قصار، نحو {ثُمَّ نَظَرَ} [المدثر: ۲۱] {ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ} [المدثر: ۲۲] {ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ} [المدثر: ۲۳] وكذا لو كانت الآية أو الآيتان تعدل ثلاثا قصارا ذكره الحلبي. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۴۵۸، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، واجبات الصلاة. ☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۶۹، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الأول في فرائض الصلاة، ط: زكريا- ديوبند)

و تجب قراءة الفاتحة و ضم السورة أو ما يقوم مقامها من ثلاث آيات قصار أو آية طويلة في الأوليين بعد الفاتحة كذا في النهر الفائق و في جميع ركعات النفل و الوتر. هكذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۱، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الثاني في واجبات الصلاة، ط: زكريا- ديوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: سورۂ فاتحہ اور ضم سورت کی حیثیت۔

یہ دوسری بات ہے کہ کسی بھی سورت کی صرف آخری دو تین آیتیں پڑھنا مناسب نہیں ہے۔[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] رکوع کے بارے میں فقہاء کی عبارت ''نصب ساق'' کا مطلب

۶۴۲-سوال: رکوع کے سلسلے میں فقہاء کی عبارتوں میں ''نصب ساق'' کا لفظ ملتا ہے۔[2] اور ''احنائهما تشبه القوس مکروه''[3] یہ عبارت بھی ملتی ہے تو ان دونوں جملوں کا مطلب کیا ہے؟ گھٹنوں کو سیدھا رکھ کر سخت کیا جائے گا، یا قبلہ کی جانب گھٹنوں کے آگے والے حصہ کو بڑھایا جائے گا؟ براہِ کرم وضاحت فرمائیں کہ گھٹنوں کو آگے قبلے کی جانب بڑھانے کی صورت میں ''احناء'' کا تحقق ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصليا:

گھٹنوں کو سخت کر کے پشت سیدھی رکھی جائے گی۔ (درمختار)[4] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولو قرأ في ركعة من وسط سورة أو من آخر سورة وقرأ في الركعة الأخرى من وسط سورة أخرى أو من آخر سورة أخرى لا ينبغي له أن يفعل ذلك على ما هو ظاهر الرواية ولكن لو فعل ذلك لا بأس به. كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۸، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الرابع في القراءة، ط: زكريا- ديوبند)

(۲-۳) "و" يسن "نصب ساقيه" لأنه المتوارث، وإحناؤهما شبه القوس مكروه. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح، ص: ۹۹، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة وأركانها، فصل في سننها، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۴۹۳، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الفكر)

[۴] اس طرح نصب بھی ہو جائے گا اور کمان کی شکل بھی نہیں بنے گی۔ گھٹنوں کو آگے کی جانب نکالنے کی صورت میں احناء کا تحقق ہوتا ہے، جو کہ مکروہ ہے:

(ويضع يديه) معتمدا بهما (على ركبتيه ويفرج أصابعه) للتمكن. ويسن أن يلصق كعبيه. وينصب ساقيه (ويبسط ظهره) ويسوي ظهره بعجزه (غير رافع ولا منكس رأسه)

وفي الشامية: وكان ينبغي أن يذكر لفظ يسن عند قوله ويضع يديه ليعلم أن الوضع والاعتماد والتفريج والإلصاق والنصب والبسط والتسوية كلها سنن كما في القهستاني.

قال: وينبغي أن يزاد مجافيا عضديه مستقبلا أصابعه فإنهما سنة كما في الزاهدي. اهـ. . . (قوله وينصب ساقيه) فجعلهما شبه القوس كما يفعله كثير من العوام مكروه بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۹۳، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل، ط: دار الفكر)

(قوله وركع ووضع يديه على ركبتيه وفرج أصابعه) . . . وفي فتح القدير ويعتمد بيديه على ركبتيه ناصبا ساقيه، وإحناؤهما شبه القوس كما يفعل عامة الناس مكروه، ذكره في روضة العلماء، وإنما يفرج بينهما؛ لأنه أمكن من=

[۲۲] تشہد میں انگلیوں کا حلقہ کب تک باقی رکھا جائے؟

۶۴۳-سوال: تشہد میں شہادت کی انگلی حلقہ بنا کر اٹھائی جاتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ حلقہ کو اسی حالت پر سلام پھیرنے تک باقی رکھنا سنت ہے، یا حلقہ بنانے کے فوراً بعد کھول دینا چاہیے؟ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ حلقہ فوراً کھول دینا چاہیے، اس سلسلے میں صحیح بات کیا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

انگلیوں کا حلقہ سلام تک باقی رکھنا سنت ہے۔[1] لہٰذا انگلی کے حلقے کو سلام تک باقی رکھنے کے سلسلے میں سنت کہنے والے کی بات درست اور حق ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حلقہ بنا کر اشارہ کرے، پھر فوراً حلقہ چھوڑ دے، یہ بھی ایک قول ہے، مگر فتویٰ اس پر نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= الأخذ بالركب، ولا يندب إلى التفريج إلا في هذه الحالة . . . (قوله وبسط ظهره وسوى رأسه بعجزه) فإنه سنة كما صح عنه - صلى الله عليه وسلم - فلهذا لا يرفع رأسه ولا يخفضه، وفي المجتبى والسنة في الركوع إلصاق الكعبين واستقبال الأصابع للقبلة. (البحر الرائق: ۱/ ۵۵۰، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الكتاب- ديوبند)

(۱) عن ابن عمر: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان إذا قعد في التشهد وضع يده اليسرى على ركبته اليسرى، ووضع يده اليمنى على ركبته اليمنى، وعقد ثلاثة وخمسين، وأشار بالسبابة. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۱۶، رقم الحديث: ۱۱۵-۵۸۰، كتاب الصلاة، باب صفة الجلوس في الصلاة، ط: البدر- ديوبند)

وصفتها: أن يحلق من يده اليمنى عند الشهادة الإبهام والوسطى، ويقبض البنصر والخنصر، ويشير بالمسبحة، أو يعقد ثلاثة وخمسين بأن يقبض الوسطى والبنصر والخنصر، ويضع رأس إبهامه على حرف مفصل الوسطى الأوسط. ويرفع الأصبع عند النفي ويضعها عند الإثبات اهـ. . . وفي القهستاني، وعن أصحابنا جميعا أنه سنة. (رد المحتار: ۱/ ۵۰۹، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الفكر)

والأصل بقاء الشيء على ما عليه واستصحابه . . . إلى آخر الأمر اهـ. (تقريرات الرافعي على رد المحتار: ۱/ ۶۳ كتاب الصلاة، فصل في بيان صفة الصلاة، ط: ايچ، ايم، سعيد، پاكستان)

(۲) والذي تحصل من كلام البرهان قول ملفق من القولين، وهو الإشارة مع بسط الأصابع بدون عقد، وقد علمت أنه خلاف المنقول في كتب المذهب، وأن ما نقله الشارح عن درر البحار وشرحه خلاف الواقع، ولعله قول غريب لم نر من قاله، فتبعه في البرهان ومشى عليه الناس في عامة البلدان. (رد المحتار: ۱/ ۵۰۳، باب صفة الصلاة، ط: دار الفكر- بيروت)

[۲۳] کثرتِ ازدحام کی وجہ سے اگلی صف کے مصلی کے پیر پر سجدہ کرنا

۶۴۴-سوال: مکہ مکرّمہ میں حرم شریف میں حج کے ایام کے دوران ازدحام زیادہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے بعض مرتبہ یہاں تک نوبت آجاتی ہے کہ ایک آدمی کھڑا ہو کر نماز پڑھ رہا ہوتا ہے، تو اُس کے سجدہ کی جگہ ہی میں دوسرا آدمی کھڑا ہو جاتا ہے، اب سجدہ کرتے وقت پیچھے والے مصلی کا سجدہ آگے کھڑا ہونے والے شخص کے پیروں پر یا دونوں پیر کے درمیان ہوتا ہے، تو اس صورت میں نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورتِ مذکورہ میں کثرتِ ازدحام اور جگہ کی تنگی کی وجہ سے اگر مصلی کے پیروں کے اوپر یا پیروں کے درمیان یا اُس کی پیٹھ پر سجدہ کرنا پڑے، تب بھی نماز صحیح ہو جائے گی۔ (درمختار)[1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) "إلا" أن يكون ذلك "لزحمة سجد فيها على ظهر مصل صلاته" للضرورة فإن لم يكن ذلك المسجود عليه مصلياً أو كان في صلاة أخرى لايصح السجود. (مراقي)

قال الطحطاوي: قوله: "على ظهر مصل صلاته الخ" وشرط في الكفاية كون ركبتي الساجد على الأرض، وشرط في المجتبى سجود المسجود عليه على الأرض، فجملة الشروط خمسة، بل ستة، بزيادة الزحام، لكن في القهستاني عن الأصل أنه يجوز ولو على ظهر غير المصلي، ونقل الزاهدي جوازه على ظهر كل مأكول، وفي القهستاني عن صدر القضاة أنه يجوز وإن كان سجود الثاني على ظهر الثالث، وفيه أنه في هذه الحالة يكون الساجد الثالث في صفة الراكع، أو أزيد، ونقل عن الجلابي أنه يستحب التأخير حتى يزول الزحام اهـ. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱هـ) ص:۲۳۲، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، ط: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ النهر الفائق شرح كنز الدقائق- سراج الدين عمر بن إبراهيم بن نجيم الحنفي (م:۱۰۰۵هـ): ۱/ ۲۱۷، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فرع، ت: أحمد عزو عناية، ط: دار الكتب العلمية ☆ رد المحتار على الدر المختار- ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۱/ ۵۰۲-۵۰۳، باب صفة الصلاة، قبل: مطلب مهم في عقد الأصابع عند التشهد، ط: دار الفكر- بيروت ☆ البحر الرائق: ۱/ ۳۳۸، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، قبيل باب الإمامة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام- محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا- أو منلا أو المولى- خسرو (م:۸۸۵هـ): ۱/ ۷۲، باب صفة الصلاة، ط: دار إحياء الكتب العربية)

[۲۴] سلام پھیرنے کا مسنون طریقہ

۶۴۵-سوال: سلام پھیرنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

سلام پھیرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہوئے اپنے چہرے کو داہنی طرف اتنا پھیرے کہ پیچھے والا مقتدی اس کے چہرہ کا داہنی طرف والا حصہ دیکھ لے، اور سلام پھیرنے میں جب کہ مقتدی امام کے برابر میں پیچھے ہو، تو وہ اپنے امام، دونوں طرف کے مقتدیوں، دونوں طرف کے فرشتوں اور دونوں طرف کے صالح جنات کی نیت کرے؛ اور اگر امام کے دائیں بائیں ہو، تو جس طرف امام ہو، اس طرف تو (مذکورہ تمام چیزوں کی نیت کے ساتھ) امام کی نیت کرے اور جس طرف امام نہ ہو، اس طرف (امام کے سلام) نیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ اور امام دونوں طرف کے سلام میں اپنے مقتدیوں، فرشتوں اور صالح جنات کی نیت کرے؛ اور مقتدی حضرات دونوں سلام میں صرف فرشتوں کی نیت کریں گے؛ اور منفرد صرف فرشتوں کی نیت کرے۔ (شامی: ۱/ ۴۹۳)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] حالت سجدہ میں اپنے دونوں ہاتھ زمین پر بچھا دینا

۶۴۶-سوال: سجدے میں دونوں ہاتھوں کو زمین پر بچھا دینا کیسا ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

سجدے کی حالت میں دونوں ہاتھ زمین پر بچھا دینا مکروہ ہے؛ سجدے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ کی انگلیاں قبلہ سمت رکھی جائیں، پیٹ کو رانوں سے الگ، دونوں بازؤں کو پہلو سے جدا،

[۱] (وسلم مع الإمام كالتحريمة عن يمينه ويساره، ناويا القوم، والحفظة، والإمام في الجانب الأيمن أو الأيسر أو فيهما لو محاذيا)... وقد ورد في حديث ابن مسعود "أنه - صلى الله عليه وسلم - كان يسلم عن يمينه حتى يرى بياض خده الأيمن وعن يساره حتى يرى بياض خده الأيسر". (البحر الرائق: ۱/ ۳۵۱، كتاب الصلاة، آداب الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۲۶، ۵۲۷، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت)

اور دونوں ہاتھوں کی کہنیوں کو زمین سے بلند رکھے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] جمعہ کی نماز میں اگر حدث لاحق ہوجائے، تو کیا کرے؟

۷۶۴-سوال: جمعہ کی نماز میں کسی مقتدی کا وضو ٹوٹ گیا، وضو کر کے آنے کے بعد امام کو دوسری رکعت میں پایا، یا قعدۂ اخیرہ میں پایا، اس کے بعد امام صاحب نے سلام پھیر دیا، تو اب وہ کیا کرے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

مذکورہ شخص نے امام کے پیچھے نماز پوری پڑھنے کی نیت سے اقتداء کی تھی، اس لیے صورت مسئولہ میں وضو کے بعد وہ امام کو دوسری رکعت میں پائے، یا قعدہ اخیرہ میں یا سجدۂ سہو کے بعد قعدہ اخیرہ میں پائے، شیخینؒ کے نزدیک بہر صورت وہ جمعہ کی نماز پوری کرے گا۔ (الجوهرة النيرة: ۱/ ۹۲)[2]

---

(۱) (قوله، ثم كبر ووضع ركبتيه، ثم يديه)... وأبدى ضبعيه وجافى بطنه عن فخذيه ووجه أصابع رجليه نحو القبلة... وعبارة الحاوي في سنن السجود: وتوجيه أصابع اليدين وأنامل الرجلين إلى القبلة، وفي القهستاني: انحراف أصابعهما عن القبلة مكروه... أن النبي - صلى الله عليه وسلم - «كان إذا سجد فرج بين يديه حتى يبدو بياض إبطيه» ولحديث مسلم «إذا سجدت فضع كفيك وارفع مرفقيك». (البحر الرائق: ۱/ ۳۳۵-۳۳۸، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆رد المحتار: ۱/ ۵۰۱، ۵۰۲، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) ومن أدرك الإمام يوم الجمعة صلى معه ما أدرك وبنى عليها الجمعة وإن أدركه في التشهد أو في سجود السهو بنى عليها الجمعة عند أبي حنيفة وأبي يوسف وقال محمد: إن أدرك معه أكثر الركعة الثانية بنى عليها الجمعة وإن أدرك أقلها بنى عليها الظهر. (مختصر القدوري - أحمد بن محمد بن أحمد بن جعفر بن حمدان أبو الحسين القدوري (م: ۴۲۸هـ) ص: ۴۰، باب صلاة الجمعة، ت: كامل محمد محمد عويضة، ط: دار الكتب العلمية)

وفي الجوهرة: (قوله: ومن أدرك الإمام يوم الجمعة صلى معه ما أدرك وبنى عليها الجمعة) فإذا قام هذا المسبوق إلى قضائه كان مخيرا في القراءة إن شاء جهر وإن شاء خافت. (قوله: وإن أدركه في التشهد أو في سجود السهو بنى عليها الجمعة) وهذا عند أبي حنيفة وأبي يوسف وظاهر هذا أنه يسجد للسهو في صلاة الجمعة والعيدين والمختار عند المتأخرين أنه لا يسجد في الجمعة والعيدين لتوهم الزيادة من الجهال. (قوله: وقال محمد إن أدرك معه أكثر الركعة الثانية بنى عليها الجمعة) يعني إذا أدركه قبل أن يركع أو في الركوع. (قوله: وإن أدرك أقلها) بأن أدركه وقد رفع رأسه من الركوع بنى عليها الظهر إلا أنه ينوي الجمعة إجماعا. (الجوهرة النيرة - أبو بكر بن علي، الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/ ۹۱، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: المطبعة الخيرية)

اگر امام نے سلام پھیر بھی دیا ہو، تب بھی وہ جمعہ کی نماز پڑھے گا؛ کیوں کہ وہ ابتداء میں امام کے ساتھ شریک تھا؛ اس لیے وہ وضو کے بعد باقی ماندہ رکعت پڑھے گا، اس کو فقہاء کی اصطلاح میں ''بناء صلاۃ'' کہا جاتا ہے؛ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس دوران اس نے بات چیت نہ کی ہو اور کوئی منافیٔ صلاۃ فعل نہ کیا ہو۔ اگر اس نے منافیٔ صلاۃ فعل کر لیا، تو اب بناء کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ (۱)

بناء کرنے کی صورت میں مابقیہ رکعت بغیر قراءت کے مکمل کرے گا؛ اس لیے کہ اس نے اپنی نماز امام کے ساتھ پورا کرنے کا عہد کیا تھا؛ لیکن وہ عارض کی وجہ سے مکمل نہ کر سکا؛ الغرض وہ جمعہ ہی پڑھے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] مقتدی کے بعض مسائل

۶۴۸-سوال: کیا مقتدی کے لیے نماز کی ابتدا سے انتہا تک کی تمام تکبیرات لازم ہیں؟

(۲) امام تکبیر کہہ کر رکوع یا سجدہ میں جائے، تو کیا مقتدیوں کو بھی تکبیر کہنا ضروری ہے؟

(۳) تکبیر تحریمہ کے بعد مقتدی کو صرف ثناء پڑھ کر خاموش ہو جانا چاہیے یا استعاذہ وبسملہ بھی پڑھنا چاہیے؟

(۴) دوسری، تیسری یا چوتھی رکعت میں امام صاحب سجدہ سے کھڑے ہوں، تو قیام میں مقتدیوں کو خاموش کھڑے رہنا چاہئے یا بسملہ پڑھنا چاہیے؟

(۵) جب امام رکوع سے کھڑے ہو کر تسمیع (سبحان ربي الأعلی) کہے، تو مقتدیوں کو صرف تحمید (ربنا ولك الحمد) کہنا چاہیے یا دونوں؟

---

(۱) من سبقه حدث توضأ وبنى. كذا في الكنز.... (ثم لجواز البناء شروط):
(منها) أن يكون الحدث موجبا للوضوء ولا يندر وجوده وأن يكون سماويا لا اختيار للعبد فيه ولا في سببه. هكذا في البحر الرائق.... (ومنها) أن لا يفعل بعد الحدث فعلا منافيا للصلاة لو لم يكن أحدث إلا ما لا بد منه أو كان من ضرورات ما لا بد منه أو من توابعه وتتماته حتى إذا سبقه الحدث ثم تكلم أو أحدث متعمدا أو قهقه أو أكل أو شرب أو نحو ذلك لا يجوز له البناء... الخ. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۹۳-۹۴، الباب السادس في الحدث في الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۱/ ۶۴۳-۶۴۴، كتاب الصلاة، الحدث في الصلاة، ط: دار الكتاب - ديوبند ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۲، باب الاستخلاف، ط: زكريا - ديوبند)

(۶) جب امام سلام پھیرے، تو کیا مقتدیوں کے لیے بھی السلام علیکم کہنا ضروری ہے؟

(۷) ہر رکعت میں تکبیر، تسمیع، تحمید وغیرہ میں امام اپنی زبان سے مذکورہ الفاظ کا تلفظ کرے، تو مقتدیوں کو ساتھ میں ہی کہنا چاہیے، یا امام کے کہنے کے بعد؟

(۸) فجر کی دو رکعت سنت پڑھنے سے فجر کی جماعت فوت ہو جاتی ہو، تو فجر کی سنت نماز کے بعد فوراً ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر فوراً ادا نہیں کر سکتے، تو کون سے وقت میں ادا کرنا چاہیے۔

عصر کی چار رکعت سنت نماز فوت ہوگئی ہو، تو اس کو کب ادا کرنا چاہیے؟

فجر اور عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد سنت ادا کرنے کے لیے کس طرح نیت کرنی چاہیے؟

(۹) جس گاؤں میں جمعہ کی نماز درست نہیں ہے، ایک شخص نے بہ اصرار کہا کہ جمعہ کی نماز شروع کی جائے۔ اس کی بات نہیں مانی گئی، تو اب وہ شخص پانچوں وقت کی نماز منفرداً پڑھتا ہے، جماعت سے نہیں پڑھتا، تو اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

جب اس کو سمجھایا جاتا ہے کہ جمعہ یہاں نہیں ہو سکتی اور جمعہ پڑھنے سے ظہر کے ثواب سے بھی محرومی ہوتی ہے، تو وہ جواب دیتا ہے کہ جمعہ نہیں ہوتی تو پھر عید کی نماز بھی صحیح نہیں ہونی چاہیے؟ آپ حضرات عید کی نماز کیوں پڑھتے ہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

(۱) تکبیر تحریمہ فرض ہے باقی تکبیریں سنت ہیں۔[۱]

(۲) رکوع اور سجدہ کی تکبیر نیز دیگر تکبیرات انتقالیہ سنت ہیں۔[۲]

---

(۱) (من فرائضها) التي لا تصح بدونها (التحريمة) قائما (وهي شرط) في غير جنازة على القادر به يفتى. (الدر المختار) ــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله من فرائضها) جمع فريضة أعم من الركن الداخل الماهية والشرط الخارج عنها.... (قوله التي لا تصح بدونها) صفة كاشفة إذ لا شيء من الفروض ما تصح الصلاة بدونه بلا عذر (قوله التحريمة) المراد بها جملة ذكر خالص. مثل: الله أكبر.... (قوله في غير جنازة) أما فيها فهي ركن اتفاقا كبقية تكبيراتها. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۴۲، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فرائض الصلاة، مطلب قد يطلق الفرض على ما يقابل الركن وعلى ما ليس بركن ولا شرط، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲] (سننها)... وتكبير الركوع وتسبيحه ثلاثا ... وتكبير السجود والرفع، وكذا الرفع نفسه. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۲، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الثالث في سنن الصلاة وآدابها وكيفيتها، ط: دار الفكر ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۷۰ - ۱۷۳، باب صفة الصلاة، ط: زكريا - ديوبند)

(۳) صرف ثنا پڑھ کر خاموش رہے، استعاذہ وبسملہ وہ شخص پڑھے گا، جس کو قراءت کرنی ہے۔ (یعنی امام ومنفرد)[۳]

(۴) خاموش کھڑے رہنا ہے، مقتدی کو کچھ بھی پڑھنا نہیں ہے۔[۴]

(۵) مقتدی کو صرف تحمید (ربنا لک الحمد) کہنا ہے، تسمیع نہیں۔[۵]

(۶) قعدۂ اخیرہ میں تشہد کی مقدار بیٹھنا فرض ہے۔[۶] اور السلام علیکم دومرتبہ کہنا واجب ہے، ''ورحمۃ اللہ'' کہنا واجب نہیں ہے۔ اسی وجہ سے امام نے جب السلام علیکم کہہ دیا، اس کے بعد مقتدی نے اقتداء کی،

---

[۳] ثم يقول: سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا إله غيرك، سواء كان إماما أو مقتديا أو منفردا هكذا ذكر في ظاهر الرواية... ثم يتعوذ بالله من الشيطان الرجيم، في نفسه، إذا كان منفردا أو إماما....

وأما من يسن في حقه التعوذ، فهو الإمام والمنفرد، دون المقتدي في قول أبي حنيفة ومحمد، وعند أبي يوسف هو سنة في حقه أيضا، ذكر الاختلاف في السير الكبير وحاصل الخلاف راجع إلى أن التعوذ تبع للثناء أو تبع للقراءة فعلى قولهما تبع للقراءة؛ لأنه شرع لافتتاح القراءة صيانة لها عن وساوس الشيطان فكان كالشرط لها، وشرط الشيء تبع له وعلى قوله تبع للثناء؛ لأنه شرع بعد الثناء وهو من جنسه وتبع الشيء كاسمه ما يتبعه.________

ويتفرع على هذا الأصل ثلاث مسائل، إحداها أنه لا تعوذ على المقتدي عندهما لأنه لا قراءة عليه، وعنده يتعوذ؛ لأنه يأتي بالثناء فيأتي بما هو تبع له... الخ. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ۱/ ۴۷۲-۴۷۳، كتاب الصلاة، الكلام في الاستعاذة، قبل: فصل بيان ما يستحب في الصلاة وما يكره، ط: زكريا - ديوبند☆ فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۱/ ۸۷-۸۸، باب افتتاح الصلاة، ط: زكريا - ديوبند)

[۴] (والمؤتم لا يقرأ مطلقا) ولا الفاتحة في السرية اتفاقا... (فإن قرأ كره تحريما) وتصح في الأصح.... (بل يستمع) إذا جهر (وينصت) إذا أسر، لقول أبي هريرة - رضي الله عنه - كنا نقرأ خلف الإمام فنزل - {وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا}. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۴۵، باب صفة الصلاة، فصل في القراءة، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ۱/ ۴۷۳، الكلام في الاستعاذة، قبل: فصل بيان ما يستحب في الصلاة وما يكره، ط: زكريا - ديوبند)

[۵] (و) يكتفي (بالتحميد المؤتم) وأفضله: اللهم ربنا ولك الحمد، ثم حذف الواو، ثم حذف اللهم فقط. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۴۵، باب صفة الصلاة، فصل في القراءة)

[۶] والقعدة الأخيرة فرض في الفرض والتطوع حتى لو صلى ركعتين ولم يقعد في آخرهما وقام وذهب تفسد صلاته. كذا في الخلاصة وأما الخروج بصنع المصلي فليس بفرض هو الصحيح. هكذا في التبيين والعيني شرح الكنز وأكثر الكتب. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۱، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الأول في فرائض الصلاة)

تو اقتداء صحیح نہیں ہوگی۔[۷]

(۷) امام سے پہلے کہنے سے گنہ گار رہوگا؛ لہٰذا امام کے بعد کہنا چاہیے۔[۸]

(۸) فرض نماز پڑھ لی، تو پھر سنت کی قضا نہیں ہے، (صرف فجر کی سنت میں اختلاف ہے کہ اس کی قضا بعد میں کی جائے گی یا نہیں، اگر قضا کی گئی، تو سنت فجر شمار ہوگی یا مستقل نفل۔)[۹]

(۹) اس شخص کا کہنا صحیح ہے کہ جہاں جمعہ صحیح نہیں، وہاں عید کی نماز بھی صحیح نہیں ہے؛ لیکن اس کی بات نہ مان کر جمعہ قائم نہ کرنے کی صورت میں اس پنج وقتہ نماز کی جماعت ترک نہیں کرنی چاہیے، صورت مسئولہ میں جماعت ترک کرنے کا گناہ ہوگا۔ جن لوگوں کے اوپر جمعہ واجب نہیں، ان کے ذمہ ظہر باقی رہے گی؛ لہٰذا اس شخص کو سمجھایا جائے؛ کیوں کہ وہ جماعت ترک کرے گا، تو گنہگار رہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۷] (ثم يسلم عن يمينه ويساره) حتى يرى بياض خده... وتنقطع به التحريمة بتسليمة واحدة، برهان وقد مر وفي التتارخانية ما شرع في الصلاة مثنى فللواحد حكم المثنى، فيحصل التحليل بسلام واحد كما يحصل بالمثنى وتتقيد الركعة بسجدة واحدة كما تتقيد بسجدتين (مع الإمام)... (كتحريمة) مع الإمام. وقالا: الأفضل فيهما بعده (قائلا السلام عليكم ورحمة الله) هو السنة. (الدر المختار: ۱/ ۵۲۴-۵۲۶، باب صفة الصلاة، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل)

(ولفظ السلام) مرتين فالثاني واجب على الأصح برهان، دون عليكم؛ وتنقضي قدوة بالأول قبل عليكم على المشهور عندنا وعليه الشافعية خلافا للتكملة. (الدر المختار)

(قوله دون عليكم) فليس بواجب عندنا ... (قوله وتنقضي قدوة بالأول) أي بالسلام الأول. قال في التجنيس: الإمام إذا فرغ من صلاته فلما قال السلام جاء رجل واقتدى به قبل أن يقول عليكم لا يصير داخلا في صلاته لأن هذا سلام، ألا ترى أنه لو أراد أن يسلم على أحد في صلاته ساهيا فقال السلام ثم علم فسكت تفسد صلاته. اهـ. رحمتي (قوله خلافا للتكملة) أي لشارح التكملة حيث صحح أن التحريمة إنما تنقطع بالسلام الثاني كما وجد قبله في بعض النسخ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۶۸، واجبات الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت * الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۲، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الثاني في واجبات الصلاة)

(۸)... (كتحريمة) مع الإمام. وقالا: الأفضل فيهما بعده. (الدر المختار: ۱/ ۵۲۴-۵۲۶، باب صفة الصلاة، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل)

(۹) لا خلاف بين أصحابنا في سائر السنن سوى ركعتي الفجر أنها إذا فاتت عن وقتها لا تقضى سواء فاتت وحدها، أو مع الفريضة. (بدائع الصنائع: ۱/ ۶۴۳، فصل السنة إذا فاتت عن وقتها هل تقضى أم لا، ط: زكريا - ديوبند)
سنت فجر کی قضاء کے سلسلے میں تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں عنوان: ''تنہا فجر کی سنت کی قضاء کرنا'' (نوافل و وتر کا بیان)

[۲۸] سجدہ میں جاتے وقت پہلے دونوں گھٹنے پھر ہاتھ ناک پیشانی رکھے اور اٹھتے وقت اس کے برعکس کرے

۶۴۹-سوال: سجدہ میں جاتے وقت پہلے داہنا گھٹنا، پھر بایاں پھر داہنا ہاتھ، پھر بایاں ہاتھ اور بہ حالت سجدہ دونوں پاؤں ملائے رکھنا اور اٹھنے کے وقت اس کے برعکس کرنا سنت ہے یا مستحب؟

الجواب حامداو مصلیا:

مذکور طریقہ سنت ہے، سجدہ میں جاتے وقت سب سے پہلے دونوں گھٹنے، پھر ناک پھر پیشانی کو زمین پر رکھے، یہ سنت ہے اور اٹھتے وقت سب سے پہلے پیشانی، ناک، ہاتھ پھر گھٹنوں کو اٹھانا سنت ہے، البتہ عذر کی وجہ سے پہلے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے، تو بھی جائز ہے۔ (شامی و عالم گیری)[1] دونوں پاؤں ملانا عورت کے لیے مسنون ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) (ثم يكبر) مع الخرور (ويسجد واضعا ركبتيه) أولا لقربهما من الأرض (ثم يديه) إلا لعذر (ثم وجهه) مقدما أنفه لما مر (بين كفيه) اعتبار الآخر الركعة بأولها ضاما أصابع يديه لتتوجه للقبلة (ويعكس نهوضه...) [الدر المختار]

قال ابن عابدين: (قوله مع الخرور) بأن يكون ابتداء التكبير عند ابتداء الخرور وانتهاؤه عند انتهائه شرح المنية، ويخر للسجود قائما مستويا، لا منحنيا لئلا يزيد ركوعا آخر ... (قوله واضعا ركبتيه ثم يديه) ... ويضع اليمنى منهما أولا ثم اليسرى كما في القهستاني، لكن الذي في الخزائن واضعا ركبتيه ثم يديه إلا أن يعسر عليه لأجل خف أو غيره فيبدأ باليدين ويقدم اليمنى. اهـ. ومثله في البدائع والتتارخانية والمعراج والبحر وغيرها، ومقتضاه أن تقديم اليمنى إنما هو عند العذر الداعي إلى وضع اليدين أولا، وإنه لا تيامن في وضع الركبتين، وهو الذي يظهر لعسر ذلك.... (قوله ويعكس نهوضه) أي يرفع في النهوض من السجدة وجهه أولا ثم يديه ثم ركبتيه وهل يرفع الأنف قبل الجبهة: أي على القول بأنه يضعه قبلها قال في الحلية: لم أقف على صريح فيه. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۹۷-۴۹۸، باب صفة الصلاة، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل، ط: دار الفكر)

(ثم إذا استوى قائما كبر وسجد). كذا في الهداية ويكبر في حالة الخرور... قالوا إذا أراد السجود يضع أولا ما كان أقرب إلى الأرض فيضع ركبتيه أولا ثم يديه ثم أنفه ثم جبهته. ——— وإذا أراد الرفع يرفع أولا جبهته ثم أنفه ثم يديه ثم ركبتيه قالوا هذا إذا كان حافيا أما إذا كان متخففا فلا يمكنه وضع الركبتين أولا فيضع اليدين قبل الركبتين ويقدم اليمنى على اليسرى كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۵، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الثالث في سنن الصلاة وآدابها وكيفيتها، ط: دار الفكر)

(۲) ولا تجافي ركبتيها، وتنضم في ركوعها وسجودها. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۰۴، باب صفة الصلاة، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل، مطلب في إطالة الركوع للجائي، ط: دار الفكر)

[۲۹] سجدے میں پہلے گھٹنے زمین پر رکھنا

۶۵۰-سوال: نماز کے دوران سجدے میں جاتے وقت سب سے پہلے گھٹنے زمین پر رکھے جائیں، کیا یہ کسی حدیث سے ثابت ہے؟ اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کیا تھا؟ جو لوگ سجدے میں جاتے وقت پہلے ہاتھ، پھر گھٹنے رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ حدیث میں اسی طرح مذکور ہے کہ اونٹ کی طرح بیٹھو، یعنی جس طرح اونٹ اپنے اگلے پیر زمین پر پہلے رکھتا ہے، پھر پچھلے پیر، اسی طرح نماز میں پہلے ہاتھ، پھر گھٹنے زمین پر رکھے جائیں۔ لہٰذا اگر سجدے میں جاتے وقت پہلے ہاتھ رکھے جائیں، تو اس میں کوئی حرج یا قباحت ہے؟ ایسا کرنا سنت کے خلاف ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

سجدے میں جاتے وقت سب سے پہلے گھٹنے زمین پر رکھے جائیں؛ کیوں کہ گھٹنے زمین کے زیادہ قریب ہیں۔ پھر ہاتھ پھر پیشانی دونوں ہاتھوں کے بیچ رکھنی چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اسی طرح تھا۔ چناں چہ حضرت وائل بن حجرؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا سجد يضع ركبتيه قبل يديه، وإذا نهض رفع يديه قبل ركبتيه. (ترمذي شريف)[۱]

اور کبیری میں ہے: ويضع ركبتيه أولا، ثم يديه، ثم وجهه بين كفيه على الأرض. (ص:۳۱۲)

مجمع الأنهر (۱/ ۹۸)[۲] پر لکھا ہے: (ويسجد) مجاز أي يميل إلى السجدة (فيضع) على الأرض (ركبتيه) ويقدم اليمنى على اليسرى والفاء لعطف المفصل على المجمل (ثم يديه) أي يضع يده اليمنى ثم اليسرى (ثم) يضع. (وجهه بين كفيه ضاما أصابع يديه).

لیکن اگر تکلیف ہو یا کمزوری وضعف ہو، تو مجبوری کے درجہ میں پہلے ہاتھ رکھنا جائز ہے۔ (۳) ۔فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] ص: ۱/ ۶۱، رقم الحديث: ۲۶۸، أبواب الصلاة، باب ما جاء في وضع الركبتين قبل اليدين في السجود، ط: البدر - ديوبند. قال أبو عيسى: والعمل عليه عند أكثر أهل العلم، يرون أن يضع الرجل ركبتيه قبل يديه، وإذا نهض رفع يديه قبل ركبتيه». (حوالہ سابق)

[۲] ۱/ ۹۸، كتاب الصلاة، فصل صفة الشروع في الصلاة، ط: دار إحياء التراث العربي.

(۳) تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں عنوان سابق: ''سجدہ میں جاتے وقت پہلے دونوں گھٹنے پھر ہاتھ تا ک پیشانی رکھے اور اٹھتے وقت اس کے برعکس کرے''۔

[۳۰] ڈیوٹی کے دوران نماز کس طرح ادا کرے؟

۶۵۱-سوال: میں ایک ریلوے اسٹیشن پر "اسٹیشن ماسٹر" کی حیثیت سے ملازمت کرتا ہوں، جب میری شام کی ڈیوٹی ہوتی ہے، تو عصر و مغرب قضا ہو جاتی ہے، دوسری نمازیں بھی باجماعت ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا، شام کے علاوہ دوسرے وقت کی ڈیوٹی میں بھی نماز قضا ہو جاتی ہے۔ اب اگر میں ڈیوٹی کے درمیان ۱۵-۲۰ منٹ نکال کر گھر نماز کے لیے جاتا ہوں، تو نماز پڑھتے ہوئے میرا دھیان اسٹیشن کی طرف چلا جاتا ہے، بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ نماز شروع کی اور دربان بلانے آ گیا کہ چلو! گاڑی آ رہی ہے، سگنل دینا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسی طرح بار بار وقت نکال کر گھر جانا، دیانت داری کے خلاف ہے، اگر میں آفس میں نماز پڑھتا ہوں، تو کبھی فون کی رنگ بجتی ہے، اور ذہن اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے، جس کی وجہ کر خشوع خضوع ختم ہو جاتا ہے۔ نیز مجھے یہ وہم بھی ہوتا ہے کہ میں لوگوں کو دکھلانے کے لیے نماز پڑھتا ہوں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ آفس کے کام کو چھوڑ کر دوسرے کام میں مشغول ہونا، دیانت داری کے خلاف ہے؛ اس لیے کہ نوکری کے وقت میں آفس میں حاضری ضروری ہے؛ لہٰذا آپ سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ وقت پر نماز پڑھنے کا کوئی طریقے مجھے بتلائیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کو آفس میں وضوء اور مصلی وغیرہ کے ساتھ تیار رہنا چاہیے اور وقت ملتے ہی فوراً نمازِ فرض، واجب، سنت مؤکدہ ادا کر لینی چاہیے۔[۱] ریاء کا جو خیال دل میں گذرتا ہے، وہ شیطان کا دھوکہ ہے، اس کو آپ نظر انداز کر دیں۔[۲]

---

(۱) إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۝ (۴-النساء: ۱۰۳)

عن أبي الدرداء، قال: أوصاني خليلي صلى الله عليه وسلم أن: لا تشرك بالله شيئا، وإن قطعت وحرقت، ولا تترك صلاة مكتوبة متعمدا، فمن تركها متعمدا، فقد برئت منه الذمة، ولا تشرب الخمر، فإنها مفتاح كل شر. (سنن ابن ماجه، ص: ۲۹۲، رقم الحديث: ۴۰۳۷، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، ط: البدر - ديوبند)

(۲) عن مالك أنه بلغه أن رجلا سأل القاسم بن محمد فقال: إني أهم في صلاتي. فيكثر ذلك علي. فقال القاسم بن محمد "امض في صلاتك. فإنه لن يذهب عنك، حتى تنصرف وأنت تقول: ما أتممت صلاتي". (موطأ الإمام مالك: ۱/ ۱۰۰، رقم: ۳، كتاب السهو، باب العمل في السهو، ت: محمد فؤاد عبد الباقي، ط: دار إحياء التراث=

نماز کے لیے کچھ وقت نکالنے کو آپ خیانت سمجھتے ہیں، اس سلسلے کی وضاحت یہ ہے کہ نوکری کے وقت آپ قضاء حاجت کے لیے جاتے ہیں، وقت نکال کر یا وقت آگے پیچھے کر کے آپ کھاتے پیتے ہیں، اسی طرح اگر آپ آفس میں نماز پڑھیں گے، تو دس بارہ منٹ میں آپ فارغ ہو جائیں گے، البتہ اس کا خاص خیال رکھیں کہ آپ کی جو ذمہ داری ہے، اس میں خلل نہ ہو، وقت ذرا آگے پیچھے کر لیا کریں۔(۳)

فرض، واجب یا سنت مؤکدہ پڑھنے کے دوران اگر فون بجتا ہو اور اس کا جواب دینا ضروری ہو، تو آپ نماز ترک کر کے جواب بھی دے سکتے ہیں؛ لہٰذا نماز میں تاخیر کرنا یا قضاء کر دینا، نماز کی روح اور خشوع وخضوع کو ختم کرنا ہے۔ اس طرح کرنا جائز نہیں ہے۔ چیکنگ کرنے والا اگر سمجھدار ہوگا، تو وہ آپ کو آفس میں نماز پڑھتے دیکھ کر خوش ہوگا اور کوئی قانونی کارروائی بھی نہیں کرے گا۔ اور اگر آفسر آپ کو نماز کے لیے وقت دینے سے انکار کرتا ہے، تو پھر اس طرح کی نوکری کرنا جائز نہیں ہے۔(۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات

=العربي-بيروت)

قال الملاعلي القاري(م: ١٠١٤هـ): (فقال له: امض في صلاتك): سواء كانت الوسوسة خارج الصلاة، أو داخلها، ولا تلتفت إلى موانعها (فإنه لن يذهب ذلك عنك) ... والمعنى لا يذهب عنك تلك الخطرات الشيطانية، (حتى تنصرف) أي: تفرغ من الصلاة (وأنت تقول): للشيطان صدقت (ما أتممت صلاتي): لكن ما أقبل قولك، ولا أتمها إرغاما لك، ونقضا لما أردته مني، وهذا أصل عظيم لدفع الوساوس، وقمع هواجس الشيطان في سائر الطاعات، والحاصل أن الخلاص من الشيطان إنما هو بعون الرحمن، والاعتصام بظواهر الشريعة، وعدم الالتفات إلى الخطرات، والوساوس الذميمة، ولاحول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم.(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ١/ ١٤٧، كتاب الإيمان، باب الوسوسة، ط: دار الفكر، بيروت-لبنان)

(٣) الضرورات تقدر بقدرها.(قواعد الفقه، ص: ٨٩، دار الكتاب-ديوبند)

(٤) عن علي، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث جيشا، وأمر عليهم رجلا، فأوقد نارا، وقال: ادخلوها، فأرادوا أن يدخلوها، وقال الآخرون: إنما فررنا منها، فذكروا ذلك للنبي صلى الله عليه وسلم، فقال للذين أرادوا أن يدخلوها: لو دخلوها لم يزالوا فيها إلى يوم القيامة، وقال للآخرين قولا حسنا، وقال: لا طاعة في معصية الله، إنما الطاعة في المعروف.(صحيح البخاري: ٢/ ١٠٧٧، رقم الحديث: ٧٢٥٧، كتاب أخبار الآحاد، باب ما جاء في إجازة خبر الواحد الصدوق في الأذان والصلاة والصوم والفرائض والأحكام، ط: البدر- ديوبند☆الصحيح لمسلم: ٢/ ١٢٥، رقم الحديث: ٣٩- (١٨٤٠)، كتاب الإمارة، باب وجوب طاعة الأمراء في غير معصية، وتحريمها في المعصية، ط: البدر-ديوبند، واللفظ لمسلم)

[۳۱] امام کا فرض نماز پڑھاتے وقت عمامہ باندھنا

۶۵۲-سوال: اگر امام صاحب صرف فرض نماز پڑھانے کے لیے عمامہ باندھتے ہیں، تو اسکا کیا حکم ہے؟ کیا اُس میں امام کی نیت کا کچھ دخل ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

اگر امام عمامہ کو ضروری سمجھے، یا لوگوں کے دباؤ کی وجہ سے باندھے، تو بدعت شمار ہوگا، اگر اس نیت سے عمامہ باندھا جائے کہ اللہ کے حضور کھڑا ہو رہا ہوں؛ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی سنت کی اتباع کرتے ہوئے عمامہ باندھ کر کھڑا ہوتا ہوں، تو یہ جائز ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] مصلیٰ کو کیسے بند کیا جائے؟

۶۵۳-سوال: میری اہلیہ کچھ پڑھی لکھی ہے، اُن کا کہنا ہے کہ مصلی سیدھا بند کرنا سنت ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ اِس باب میں شرعی رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

جناب نبیٔ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ وہ بغیر مصلی ہی کے نماز پڑھتے تھے۔[2] اور یہی افضل ہے۔[3] البتہ حضورِ اکرم ﷺ سے مصلی کا استعمال ثابت ہے، ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ

---

(۱) والمستحب أن يصلي الرجل في ثلاثة أثواب: قميص، وإزار، وعمامة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۹، الباب الثالث في شروط الصلاة، الفصل الأول في الطهارة وستر العورة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۱/ ۲۶۸، كتاب الصلاة، شروط الصلاة، ط: دار الكتاب - ديوبند)

(۲) عن جابر بن عبد الله قال: كنت أصلي الظهر مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، فآخذ قبضة من الحصى لتبرد في كفي أضعها لجبهتي أسجد عليها لشدة الحر. (سنن أبي داود: ۱/ ۵۸، رقم الحديث: ۳۹۹، كتاب الصلاة، باب في وقت صلاة الظهر، ط: البدر - ديوبند)

(۳) وكان ابن مسعود لا يصلي على شيء إلا على الأرض. وروي عن أبي بكر الصديق، أنه رأى قوما يصلون على بسط، فقال لهم: أفضوا إلى الأرض. وفي إسناده نظر. وروي عن ابن عمر، أنه كان يصلي على الخمرة ويسجد على الأرض. ونحوه عن علي بن الحسين. وقال النخعي في السجود على الحصير: الأرض أحب إلي. وعنه، أنه قال: لا بأس أن يصلي الحصير؛ لكن لا يسجد عليه. (فتح الباري شرح صحيح البخاري لابن رجب، الحنبلي (م: ۷۹۵هـ): ۳/ ۱۹، باب الصلاة على الحصير، ط: مكتبة الغرباء الأثرية - المدينة النبوية. =

عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ مسجد میں تھے، وہیں سے فرمایا کہ میرا مصلی (جو گھر میں تھا) دے دو، میں نے کہا کہ میں حائضہ ہوں، (مصلی دینے کے لیے مسجد میں ہاتھ کیسے بڑھاؤں؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے حیض کا اثر تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ (یعنی آپ ﷺ اُس وقت اعتکاف میں تھے؛ اس لیے ہاتھ حجرہ سے مسجد میں دراز کرنا پڑتا تھا؛ اس لیے فرمایا کہ اُس میں کوئی حرج نہیں) (مسلم شریف: ۱/ ۱۴۳)[1]

حدیث پاک میں مصلی کے لیے لفظ "خمرہ" استعمال ہوا ہے، جو چٹائی یا گھاس کا ہوتا ہے۔[2]

= الصلاة على الأرض أفضل ثم على ما أنبتته ذكره المرغيناني وغيره لأن الصلاة سرها التواضع والخشوع وذلك في مباشرة الأرض أظهر وأتم إلا لضرورة حر أو برد أو نحوهما ويلحق بها ما أنبتته لهذا المعنى ذكره ابن أمير حاج. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ١٢٣١ هـ): ٢٦٨، كتاب الصلاة، فصل في بيان سننها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(عن أبي سعيد الخدري قال: دخلت على النبي - صلى الله عليه وسلم -): وفي نسخة على رسول الله (- صلى الله عليه وسلم - فرأيته يصلي على حصير): في الفائق فيه دليل على جواز الصلاة على شيء يحول بينه وبين الأرض، سواء نبت من الأرض أم لا، قلت: لا دلالة فيه على العموم، وقال القاضي عياض: الصلاة على الأرض أفضل إلا لحاجة، كحر أو برد أو نجاسة. وفي شرح المنية: الصلاة على الأرض وما أنبتته الأرض كالحصير أفضل؛ لأنه أقرب إلى التواضع. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ٢/ ٦٣٨، رقم الحديث: ٧٦٨، كتاب الصلاة، باب الستر، الفصل الثالث، ط: دار الفكر - بيروت)

[١] عن عائشة قالت: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: ناوليني الخمرة من المسجد، قالت فقلت: إني حائض، فقال: إن حيضتك ليست في يدك. (الصحيح لمسلم: ١/ ١٤٣، رقم الحديث: ١١- (٢٩٨)، كتاب الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها...... الخ، ط: البدر - ديوبند)

(٢) قوله: (على الخمرة)، بضم الخاء المعجمة وسكون الميم: سجادة صغيرة تعمل من سعف النخل وترمل بالخيوط. قيل: سميت خمرة لأنها تستر وجه المصلي عن الأرض. ومنه سمي الخمار الذي يستر الرأس. وقال ابن بطال: الخمرة مصلى صغير ينسج من السعف، فإن كان كبيرا قدر طول الرجل أو أكثر فإنه يقال له حينئذ: حصير، ولا يقال له خمرة، وجمعها: خمر. وفي حديث ابن عباس: (جاءت فأرة فأخذت تجر الفتيلة فجاءت بها فألقتها بين يدي رسول الله - صلى الله عليه وسلم -، على الخمرة التي كان قاعدا عليها، فأحرقت منها مثل موضع درهم). وهذا ظاهر في إطلاق الخمرة على الكبيرة من نوعها. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العينى (المتوفى: ٨٥٥هـ): ٤/ ١٠٨، باب الصلاة على الحصير، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت☆المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج المعروف بـ 'شرح النووي'- أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ٦٧٦هـ): ٣/ ٢٠٩، كتاب الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها وترجيله وطهارة سؤرها... الخ، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

البتہ دوسری روایات سے کپڑے کا مصلی بھی ثابت ہے۔[۱]

بہر حال مصلی بند کرنا سنت ہے یا نہیں؟ اور کس طرح بند کرنا سنت ہے؟ تو یہ سب مباحث دائرۂ سنت سے خارج ہیں، ہاں، اُسے بند کرنے میں کون سی صورت بہتر رہے گی؟ تو اس کا جواب مصلی کی بناوٹ اور نماز کی جگہ پر موقوف ہے، لہٰذا مصلی اگر ایسی چیز کا بنا ہوا ہو، جسے سیدھا ہی بند کیا جائے، نیچے کی طرف سے بند کرنے میں نقصان ہونے کا اندیشہ ہو تو سیدھا بند کرنا چاہیے، اور اگر کسی موٹی چیز کا بنا ہوا ہے، جیسے چٹائی وغیرہ ہو، تو اُسے کھلا ہی چھوڑ دینا بہتر ہوگا، کیوں کہ بند کرنے میں نقصان کا اندیشہ ہے، اور اگر کپڑے وغیرہ کا ہے، تو نیچے سے بند کرنا چاہیے، تاکہ سیدھی جانب میل کچیل سے بچ جائے۔

جس جگہ مصلی بچھایا گیا ہے، وہ اگر گندی یا پانی وغیرہ سے نم ہے اور نیچے سے اوپر کی طرف بند کرنے میں نیچے کا کوڑا کرکٹ مصلی سے لگ جانے کا اندیشہ ہو، تو ایسی صورت میں اوپر سے نیچے کی طرف بند کیا جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] دوران نماز دو پیروں کے درمیان چار انگل کا فاصلہ رکھنا

۶۵۴-سوال: تعلیم الاسلام جلد ۳/ میں پڑھا ہے کہ نماز میں دو پیر کے درمیان چار انگلیوں جتنا فاصلہ رہنا چاہیے۔ نیز (اسی طرح) بہت سے حضرات بھی یہی کہتے ہیں۔ تو اب سوال یہ ہے کہ کیا نمازوں میں دو پیروں کے درمیان اس سے زیادہ فاصلہ رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

نماز میں مناسب یہ ہے کہ دو پیروں کے درمیان چار انگل جتنا فاصلہ ہو؛ کیوں کہ اس طرح کرنا خشوع اور عاجزی میں اضافہ کرتا ہے؛ لہٰذا چار انگل جتنا فاصلہ رہنا چاہیے۔ وينبغي أن يكون بينهما مقدار أربع أصابع اليد لأنه أقرب إلى الخشوع، هكذا روي عن أبي نصر الدبوسي إنه كان يفعله كذا في الكبرى. (شامی: ۱/ ۴۴۴)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب الصلاة على الحصير (۱/ ۵۵، رقم الحديث: ۳۸۰) باب الصلاة على الخمرة (۱/ ۵۵، رقم الحديث: ۳۸۱) باب الصلاة على الفراش (۱/ ۵۵- ۵۶، رقم الحديث: ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴) باب السجود على الثوب في شدة الحر (۱/ ۵۶، رقم الحديث: ۳۸۵)

[۲] باب صفة الصلاة، فرائض الصلاة، مطلب قد يطلق الفرض على ما يقابل الركن وعلى ما ليس بركن ولا شرط، ط: دار الفكر- بيروت.

[۳۴] اگر نماز کے دوران وضو ٹوٹ جائے؟

۶۵۵-سوال: میں امام کے ساتھ فرض نماز با جماعت پڑھ رہا تھا، دوران نماز کسی بنا پر میرا وضو ٹوٹ گیا۔ میں نے کسی کے ساتھ بات چیت کیے بغیر سیدھے جا کر وضو کیا اور پھر جماعت میں شامل ہو گیا، تو مجھے چھوٹی ہوئی رکعتیں پھر سے ادا کرنی پڑیں گی، یا امام کے ساتھ سلام پھیر دینی چاہیے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

اگر نماز میں حدث پیش آ جائے، تو بہتر یہ ہے کہ از سر نو نماز ادا کر لی جائے۔ لیکن اگر کوئی پڑھی ہوئی نماز کے بعد ہی اپنی نماز جاری رکھنا چاہے، تو اسے اصطلاح میں ''بنا'' کہتے ہیں۔ [1]

اس کے لیے فقہاء نے دو طریقے لکھے ہیں: پہلا طریقہ یہ ہے کہ جو رکعات امام کے ساتھ پڑھنے سے رہ گئی ہوں، اس کو پہلے بغیر قراءت کے ادا کر لے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد باقی رہ گئی رکعات بغیر قراءت کے ادا کر لے۔ مجمع الانہر (۱/۱۱۴) میں لکھا ہے: وفي شرح الطحاوي يشتغل أولا بقضاء ما سبقه الإمام بغير قراءة لأنه لاحق ثم يقضي آخر صلاته ولو تابع الإمام أولا جاز ويقضي ما فاته لأن ترتيب أفعال الصلاة ليس بشرط عندنا. [2]

ان دونوں طریقوں میں سے جس کے مطابق نماز ادا کی جائے، درست ہو جائے گی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن عائشة، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أصابه قيء أو رعاف أو قلس أو مذي، فلينصرف، فليتوضأ ثم ليبن على صلاته، وهو في ذلك لا يتكلم. (سنن ابن ماجه: ۸۵، رقم الحديث: ۱۲۲۱، كتاب إقامة الصلاة، والسنة فيها، باب ما جاء في البناء على الصلاة، ط: البدر - ديوبند)

من سبقه حدث توضأ وبنى. كذا في الكنز. والرجل والمرأة في حق حكم البناء سواء. كذا في المحيط... والاستئناف أفضل. كذا في المتون وهذا في حق الكل عند بعض المشايخ، وقيل هذا في حق المنفرد قطعا وأما الإمام والمأموم إن كانا يجدان جماعة فالاستئناف أفضل أيضا وإن كانا لا يجدان فالبناء أفضل صيانة لفضيلة الجماعة وصحح هذا في الفتاوى كذا في الجوهرة النيرة. (الفتاوى الهندية: ۱/۹۳، كتاب الصلاة، الباب السادس في الحدث في الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۵۵، كتاب الصلاة، باب الاستخلاف، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) كتاب الصلاة، باب الحدث في الصلاة، ط: دار إحياء التراث العربي.

[۳۵] امام کا سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد ذرا توقف کرنا

۶۵۶-سوال: ایک امام صاحب ہیں، وہ جب رکوع سے اٹھتے ہیں، تو سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد ذرا سا توقف کرتے ہیں، جس کی وجہ سے مقیم مقتدی کے علاوہ، نئے مقتدی امام سے آگے ہو جاتے ہیں، تو کیا امام صاحب کا توقف کرنا صحیح ہے؟ جواب جلد از جلد مرحمت فرمائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ امام داعی بھی ہیں اور دعوت وتبلیغ کی فکر ان کی رگ و پے میں رچی بسی ہے، اور وہ امامت چھوڑ دینے کا ارادہ کر رہے ہیں؛ لیکن مقتدی کسی بھی حالت میں ان کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مقتدی ان سے خوش ہیں، نیز ہماری بستی کے ذمہ دار اور کاٹھیاواڑ کے ذمہ دار کا مشورہ بھی یہی ہے کہ وہ امامت جاری رکھیں؛ کیوں کہ ان کی امامت سے دین کا بہت فائدہ ہوتا ہے، اور نئے نئے نوجوان دعوت کے کام سے جڑتے ہیں اور امام صاحب بھی امامت کے ترک کر دینے پر مکمل مطمئن نہیں ہیں، لہٰذا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

جب امام متقی اور پرہیزگار ہیں، دین کا کام بہ حسن وخوبی انجام دے رہے ہیں، اور لوگ ان سے خوش ہیں، تو ایسے امام کو امامت سے نہ تو برطرف کرنا چاہیے اور نہ ہی ان کو امامت سے دست بردار ہونے دینا چاہیے۔ اگر ان کی کوئی ضرورت ہو، تو اہل مسجد کو اسے پوری کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

امام صاحب کے سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد توقف کا سبب کیا ہے؟ لکنت ہے، تو مجبوری ہے۔ اور اگر زبان میں لکنت نہیں ہے، تو امام صاحب کو اپنی غلطی کی اصلاح کر لینی چاہیے۔[1] مقتدیوں کے امام سے پہلے

---

[1] ''سمع اللہ لمن حمدہ'' کہنے کے بعد اگر امام صاحب اس مقصد سے ایک رکن کے بہ قدر توقف کرتے ہیں کہ تعدیل ارکان کا تحقق ہو جائے، تو یہ عین مطلوب ہے، اس صورت میں اگر مقتدی عجلت کے ساتھ سجدہ میں چلے جاتے ہوں، تو قابل اصلاح مقتدی ہیں، انہیں امام صاحب کی تکبیر سن کر سجدہ میں جانا چاہیے۔ ایک سوال کے جواب میں فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ رقم طراز ہیں:

جب رکوع سے سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں، کہ تمام اعضاء معتدل ہو جائیں، تو قومہ ادا ہو جاتا ہے، اس سے فساد نماز کا حکم نہ ہوگا، کچھ قدر قلیل وقفہ کر لیا کریں۔ جس میں مقتدی ''ربنا ولك الحمد'' پڑھ لیں، تو بہتر ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۵۰۷، باب صفۃ الصلاۃ، الفصل الثالث فی واجبات الصلاۃ، تعدیل ارکان کی مقدار، سوال نمبر: ۲۳۴۷، ط: دار المعارف-دیوبند)

(وتعديل الأركان) أي تسكين الجوارح قدر تسبيحة في الركوع والسجود، وكذا في الرفع منهما على ما=

رکوع یا سجدے میں چلے جانے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعید بیان فرمائی ہے کہ ان کا سر گدھے کا سر بن جائے گا۔ (بخاری)[1] لہٰذا مقتدیوں کو چاہیے کہ کسی بھی رکن میں امام سے آگے بڑھنے سے اجتناب کریں۔
فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=اختاره الكمال. (الدر المختار) ـــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله وتعديل الأركان) هو سنة عندهما في تخريج الجرجاني، وفي تخريج الكرخي، واجب حتى تجب سجدتا السهو بتركه كذا في الهداية وجزم بالثاني في الكنز والوقاية والملتقى، وهو مقتضى الأدلة كما يأتي قال في البحر: وبهذا يضعف قول الجرجاني (قوله وكذا في الرفع منهما) أي يجب التعديل أيضا في القومة من الركوع والجلسة بين السجدتين، وتضمن كلامه وجوب نفس القومة والجلسة أيضا لأنه يلزم من وجوب التعديل فيهما وجوبهما. (رد المحتار على الدر المختار: ١/ ٤٦٤، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، مطلب قد يشار إلى المثنى باسم الإشارة الموضوع للمفرد، ط: دار الفكر-بيروت)

[١] عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "أما يخشى أحدكم -أو: لا يخشى أحدكم- إذا رفع رأسه قبل الإمام، أن يجعل الله رأسه رأس حمار، أو يجعل الله صورته صورة حمار". (صحيح البخاري، رقم الحديث: ٦٩١، كتاب الأذان، باب إثم من رفع رأسه قبل الإمام☆ الصحيح لمسلم، رقم الحديث: ٤٢٧، كتاب الصلاة، باب تحريم سبق الإمام بركوع أو سجود ونحوهما)

عن أبي مسعود الأنصاري، قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم - : يؤم القوم أقرؤهم لكتاب الله، فإن كانوا في القراءة سواء، فأعلمهم بالسنة، فإن كانوا في السنة سواء، فأقدمهم هجرة، فإن كانوا في الهجرة سواء، فأقدمهم سلما، ولا يؤمن الرجل الرجل في سلطانه، ولا يقعد في بيته على تكرمته إلا بإذنه. (مسلم شریف: ۱/ ۲۳۶، رقم الحدیث: ۶۷۳)

باب الإمامة

[امامت کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب الإمامة

[امامت کا بیان]

[۱] ایسے شخص کو امام بنانا، جسے نماز کے فرائض کا علم نہ ہو

۶۵۷-سوال: ہمارے امام صاحب کو یہ نہیں پتہ کہ نماز کی شرائط کیا ہیں اور اس کے فرائض کتنے ہیں؟ تو اُسے امام بنانے والے ذمہ دار حضرات گنہ گار رہوں گے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

ایسا شخص جسے مسائل نماز کا علم نہ ہو، اُس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے، دوسرے علماء کی موجودگی میں ایسے شخص کو امام بنانے والا گنہ گار ہوگا۔ (شامی: ۱/ ۵۵۹)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (والأحق بالإمامة) تقديما بل نصبا مجمع الأنهر (الأعلم بأحكام الصلاة) فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة، وحفظه قدر فرض، وقيل واجب، وقيل سنة (ثم الأحسن تلاوة) وتجويدا (للقراءة، ثم الأورع) أي الأكثر اتقاء للشبهات. (الدر المختار) ———— قال ابن عابدين: (قوله تقديما) أي على من حضر معه. (قوله بل نصبا) أي للإمام الراتب. (قوله بأحكام الصلاة فقط) أي وإن كان غير متبحر في بقية العلوم، وهو أولى من المتبحر، كذا في زاد الفقير عن شرح الإرشاد. (قوله بشرط اجتنابه إلخ) كذا في الدراية عن المجتبى. وعبارة الكافي وغيره: الأعلم بالسنة أولى، إلا أن يطعن عليه في دينه؛ لأن الناس لا يرغبون في الاقتداء به. (قوله قدر فرض) أخذه تبعا للبحر من قول الكافي قدر ما تجوز به الصلاة، بناء على أن تجوز بمعنى تصح لا بمعنى تحل.

(قوله وقيل واجب) ذكره في البحر بحثا لكن يمكن أخذه من كلام الكافي؛ لأن الجواز يطلق بمعنى الحل؛ بل قال الشيخ إسماعيل: ينبغي حمل الجواز المذكور على ما يشمل عدم الكراهة، وحينئذ فيرجع إلى القول الثالث. (قوله وقيل سنة) قاله الزيلعي، وهو ظاهر المبسوط كما في النهر؛ ومشى عليه في الفتح. قال: وهو الأظهر لأن هذا التقديم على سبيل الأولوية؛ فالأنسب له مراعاة السنة. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۷، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب في تكرار الجماعة في المسجد، ط: دار الفكر - بيروت) =

[۲] نماز میں اس شخص کی اقتدا کرنا، جس کی قراءت صحیح نہ ہو

۶۵۸-سوال: ایک صاحب ہیں، جو بہت امانت دار اور بزرگ ہیں، انہوں نے قرآن شریف صرف ناظرہ تک اور کچھ اردو، عربی پڑھ رکھی ہے؛ لیکن مکمل عالم نہیں ہیں، اور با قاعدہ قراءت بھی انہوں نے نہیں سیکھی ہے، جس کی وجہ سے قرآن شریف پڑھتے وقت حروف ان سے صحیح ادا نہیں ہوتے ہیں، تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ کوئی کراہت تو نہیں پیدا ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر وہ امام قرأت میں ایسی غلطیاں کرے، جس سے معانی ہی بدل جائیں، حالاں کہ مقتدی میں کوئی دوسرا آدمی صحیح قراءت کرنے والا موجود ہو، تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں، لیکن وہ ایسی غلطی کرتا ہے کہ معنیٰ میں تغیر پیدا نہیں ہوتا، تو ان کی اقتداء مکروہ ہے؛ کہ بہتر اور صحیح پڑھنے والا موجود ہے۔[1] تاہم جماعت

=لو قدموا فاسقا يأثمون بناءا على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم، لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير - إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ٩٥٦ھ) ص:٥١٥، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی-لاہور)

(١) إذا أم أمي أميا وقارئا فصلاة الجميع فاسدة عند أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - وقالا: صلاة القارئ وحده، وأما إذا صلوا وحدانا فقيل: إنه على الخلاف وقيل: يصح وهو الصحيح. هكذا في شرح مجمع البحرين للمصنف....

ولا يصح اقتداء القارئ بالأمي وبالأخرس وكذا لا يصح اقتداء الأمي بالأخرس والكاسي بالعاري والمسبوق في قضاء ما سبق بمثله. كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ١/ ٨٥-٨٦، الباب الخامس في الإمامة وفيه سبعة فصول، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماما لغيره، ط: دار الفكر)

(ومنها اللحن في الإعراب) إذا لحن في الإعراب لحنا لا يغير المعنى بأن قرأ لا ترفعوا أصواتكم برفع التاء لا تفسد صلاته بالإجماع وإن غير المعنى تغييرا فاحشا بأن قرأ وعصى آدم ربه بنصب الميم ورفع الرب وما أشبه ذلك مما لو تعمد به يكفر. إذا قرأ خطأ فسدت صلاته في قول المتقدمين واختلف المتأخرون: قال محمد بن مقاتل وأبو نصر محمد بن سلام وأبو بكر بن سعيد البلخي والفقيه أبو جعفر الهندواني وأبو بكر محمد بن الفضل والشيخ الإمام الزاهد وشمس الأئمة الحلواني لا تفسد صلاته. وما قاله المتقدمون أحوط؛ لأنه لو تعمد يكون كفرا وما يكون كفرا لا يكون من القرآن وما قاله المتأخرون أوسع؛ لأن الناس لا يميزون بين إعراب وإعراب. كذا في فتاوى قاضي خان وهو الأشبه. كذا في المحيط وبه يفتي. كذا في العتابية وهكذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية: ١/ ٨١، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، مكتبة زكريا - ديوبند)

ومنها الوقف والوصل والابتداء في غير موضعها... ومنها ترك التشديد والمد في موضعهما... ومنها ترك=

سے نماز پڑھنے کا ثواب مل جائے گا؛ بل کہ اگر ایسے امام کو معزول کرنے پر قدرت نہ ہو، تو پھر کراہت بھی نہیں آئے گی، کیوں کہ مقتدی اس سلسلہ میں معذور شمار ہوں گے۔ (۲)

ہاں اگر اسی جیسے دیگر مقتدی بھی ہوں، کوئی صحیح قراءت کرنے والا موجود نہ ہو، تو نماز بلا کراہت درست ہوگی۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] دائمی امام کی غیر حاضری میں عارضی امام نیت کس طرح کرے؟

۶۵۹-سوال: پنج وقتہ نماز کا دائمی امام اگر کسی وجہ سے حاضر نہ ہو اور نماز کا وقت ہو جائے اور اس نے کسی کو نماز پڑھانے کی خبر بھجوائی ہو، تو اب اس کے لیے نماز پڑھانے کا طریقہ کیا ہوگا؟ وہ نیت کس طرح کرے گا؟ نیت کے الفاظ کیا ہوں گے؟ بیان فرمائیں۔

الجواب حامداومصلیا:

نماز پڑھانے کا اصل حق ''امام راتب'' کا ہے، اگر وہ کسی کو نماز پڑھانے کو کہتا ہے، تو اس کی اجازت ہے۔ اس مقرر کردہ امام کے لیے نماز کی کوئی خاص نیت لازم نہیں ہے؛ بل کہ وہ صرف اس بات کی نیت

=الإدغام والإتيان به... ومنها الإمالة في غير موضعها. (المصدر السابق)

الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية. ويجتنب الفواحش الظاهرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، ط: زكريا-ديوبند☆ بدائع الصنائع- علاء الدين الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱/ ۱۵۷، كتاب الصلاة، فصل بيان من هو أحق بالإمامة وأولى بها، ط:: دار الكتب العلمية☆ تحفة الفقهاء- أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو: ۵۴۰هـ): ۱/ ۲۳۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد؛ لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

(۳) وإمامة الأمي قوما أميين جائزة. كذا في السراجية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۵، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماما لغيره، ط: دار الفكر - بيروت)

کرے کہ وہ کون سی نماز پڑھا رہا ہے؛ البتہ اگر اس کی اقتداء میں عورتیں بھی ہوں، تو یہ نیت کرے گا کہ میں مردوں اور عورتوں کو نماز پڑھاتا ہوں، اگر امام نے عورتوں کی امامت کی نیت نہیں کی، تو عورتوں کا اقتدا کرنا درست نہیں ہوگا۔ (۱)

نیت دل سے پختہ عہد کرنے کو کہتے ہیں، زبان سے بولنا ضروری نہیں، البتہ متاخرین حضرات نے عوام کی غفلت کے پیش نظر زبان سے نیت کے کلمات ادا کرنے کو مستحب قرار دیا ہے، نیز اس لیے بھی، تا کہ زبان کی دل سے موافقت ہوجائے۔ نیت کے الفاظ یہ ہیں، مثلاً: ''اللہ تعالیٰ کے لیے میں ظہر کی چار رکعت پڑھتا ہوں'' بس یہ کہہ کر تکبیر تحریمہ کہتے ہوئے ہاتھ باندھ لے۔ (۲) فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (ولا تدخل في صلاته بلا نيته إياها) أي لا تدخل المرأة في صلاة الرجل إلا أن ينويها الإمام. ـــــــ وقال زفر: تدخل بغير نية كالرجل، ولنا أنه يلحقه من جهتها ضرر على سبيل الاحتمال بأن تقف في جنبه فتفسد صلاته فكان له أن يحترز عن ذلك بترك السنة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ داماد أفندي (م:۱۰۷۸ھ):۱/۱۱۱، كتاب الصلاة، فصل الجماعة سنة مؤكدة، أولى الناس بالإمامة، ط:دار إحياء التراث العربي☆الاختيار لتعليل المختار-عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م:۶۸۳ھ):۱/۵۸، كتاب الصلاة، باب صلاة الجماعة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة)

ویسے یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ مطلقاً عورتوں کی صحت اقتدا کے لیے امام کی نیت ضروری ہے یا اس صورت میں نیت ضروری ہے، جب کہ وہ کسی مرد کے محاذات میں کھڑی ہوجائے، صاحب بدائع کی تصریح ملاحظہ فرمائیں:

ويجوز اقتداء المرأة بالرجل إذا نوى الرجل إمامتها، وعند زفر نية الإمامة ليست بشرط على ما مر، وروى الحسن عن أبي حنيفة أنها إذا وقفت خلف الإمام جاز اقتداؤها به وإن لم ينو إمامتها، ثم إذا وقفت إلى جنبه فسدت صلاتها خاصة لا صلاة الرجل، وإن كان نوى إمامتها فسدت صلاة الرجل وهذا قول أبي حنيفة الأول. (بدائع الصنائع: ۱/۱۴۰، كتاب الصلاة، فصل شرائط أركان الصلاة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(وإن أم نساء، فإن اقتدت به) المرأة (محاذية لرجل في غير صلاة جنازة، فلابد) لصحة صلاتها (من نية إمامتها) لئلا يلزم الفساد بالمحاذاة بلا التزام (وإن لم تقتد محاذية اختلف فيه) فقيل يشترط وقيل لا كجنازة إجماعا، وكجمعة وعيد على الأصح خلاصة وأشباه، وعليه إن لم تحاذ أحدا تمت صلاتها وإلا لا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۴۲۵، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، مطلب في ستر العورة، ط: دار الفكر - بيروت☆مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: الاشباه و النظائر - ابن نجيم المصري: ۱/۷۷-۷۸، رقم المسئلة: ۱۵، ت: محمد يوسف التاؤلوي، ط: مكتبة فقيه الأمة - ديوبند)

(۲) والنية هي الإرادة، والشرط أن يعلم بقلبه أي صلاة يصلي، أما الذكر باللسان فلا معتبر به ويحسن ذلك لاجتماع عزيمته، ثم إن كانت الصلاة نفلا يكفيه مطلق النية، وكذا إن كانت سنة في الصحيح، وإن كانت فرضا فلا=

[۴] سوال سے توبہ کرنے والے فقیر کا نماز میں امام بننا

۶۶۰-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ:

میں ایک فقیر کا لڑکا ہوں، میں تبلیغی جماعت کے ساتھ جڑ گیا ہوں، اور میں نے لوگوں سے بھیک مانگنا (پیشۂ گداگری) بند کر دیا ہے، اس بات کو بیس سال ہو گئے ہیں۔ میں میت کو غسل بھی دیتا ہوں، جس وقت میں سوال کرتا تھا، اس وقت تو لوگ میرے پیچھے فرض نماز نہیں پڑھتے تھے؛ لیکن اب میرے گاؤں کے ایک مولانا نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ جو شخص میت کو غسل دیتا ہے، اس کے پیچھے فرض نماز نہیں ہوتی ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں، فی الحال میں نے سوال کرنا چھوڑ دیا ہے، تو کیا میں نماز پڑھا سکتا ہوں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداو مصليا:

اللہ تعالیٰ رزق کا مالک ہے؛ اس لیے روزی اللہ ہی سے مانگنی چاہیے، لوگوں سے مانگنا چھوڑ کر آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر استقامت نصیب فرمائیں۔ (۱)

=بد من تعيين الفرض، كالظهر مثلا؛ لاختلاف الفروض ". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۹۶، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة التي تتقدمها، ط: اشرفی-دیوبند)

(النية) بالإجماع (وهي الإرادة) المرجحة... الخ، (والمعتبر فيها عمل القلب اللازم للإرادة)... (والتلفظ عند الإرادة (بها مستحب) هو المختار... وفي المحيط يقول: اللهم إني أريد أن أصلي صلاة كذا فيسرها لي و تقبلها مني. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۴۱۲-۴۱۵-۴۱۶، بحث النية، كتاب الصلاة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) عن قبيصة بن مخارق الهلالي، قال: تحملت حمالة، فأتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم أسأله فيها، فقال: أقم حتى تأتينا الصدقة، فنأمر لك بها، قال: ثم قال: " يا قبيصة إن المسألة لا تحل إلا لأحد ثلاثة رجل، تحمل حمالة، فحلت له المسألة حتى يصيبها، ثم يمسك، ورجل أصابته جائحة اجتاحت ماله، فحلت له المسألة حتى يصيب قواما من عيش - أو قال سدادا من عيش - ورجل أصابته فاقة حتى يقوم ثلاثة من ذوي الحجا من قومه: لقد أصابت فلانا فاقة، فحلت له المسألة حتى يصيب قواما من عيش - أو قال سدادا من عيش - فما سواهن من المسألة يا قبيصة سحتا يأكلها صاحبها سحتا ". (الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۳۴، رقم الحديث: ۱۰۹- ۱۰۴۴، باب من تحل له المسألة، ط: البدر-ديوبند)

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من سأل الناس أموالهم تكثرا، فإنما يسأل جمرا فليستقل أو ليستكثر. (حوالہ سابق: ۱/ ۳۳۳، حدیث نمبر: ۱۰۵-۱۰۴۱، باب كراهة المسألة للناس)

جس شخص نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ: میت کو غسل دینے والے کے پیچھے فرض نماز صحیح نہیں ہے، وہ ناواقف ہے، ان کو صحیح مسئلہ معلوم نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ اگر گاؤں میں بہت سارے لوگ ہوں، تو میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے اور اگر ایک ہی شخص ہو، تو اس کے لیے میت کو غسل دینا فرض عین ہے۔ (۲) اور فرض کفایہ اور فرض عین کو ادا کرنے سے ثواب ملتا ہے، گناہ نہیں ہوتا، کہ جس کی وجہ سے اس کے پیچھے نماز نہ ہو، البتہ فرض کفایہ کے وقت غسل کرانے کے پیسے لینا جائز ہے اور فرض عین کے وقت غسل کرانے کے پیسے لینا جائز نہیں۔ (۳) میت کو غسل دینا بڑے ثواب کا کام ہے۔ حضرت ابو شفیع فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص میت کو غسل دے اور اس کے عیب کو چھپائے، تو اللہ تعالیٰ اس کے چالیس بڑے گناہ معاف فرمادیں گے۔ (طبرانی کبیر) [۴]

دوسری رایت میں ہے کہ: اللہ تعالیٰ چالیس مرتبہ اس کو معاف فرمائیں گے۔ (حاکم) [۵]

---

(۲) اعلم بأن غسل الميت واجب، وهو من حق المسلم على المسلم قال - عليه الصلاة والسلام -: للمسلم على المسلم ستة حقوق، وفي جملته أن يغسله بعد موته ولكن إذا قام به بعض المسلمين سقط عن الباقين لحصول المقصود. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل، شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۲/ ۵۸، كتاب الصلاة، باب غسل الميت، ط: دار المعرفة - بيروت☆بدائع الصنائع: ۱/ ۳۰۰، كتاب الصلاة، فصل بيان كيفية وجوب غسل الميت، ط: دار الكتب العلمية☆البحر الرائق شرح كنز الدقائق: ۱/ ۶۸، كتاب الصلاة، أحكام الغسل، ط: دار الكتاب الإسلامي☆رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۷، كتاب الصلاة، سنن الغسل، ط: دار الفكر)

(۳) ينبغي أن يكون المغسل طاهرا ويكره أن يكون جنبا أو حائضا والأفضل أن يكون غسل الميت مجانا، وإن ابتغى الغاسل أجرا، فإن كان هناك غيره يجوز أخذ الأجرة وإلا لا. (حاشية الشرنبلالي مع درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۱/ ۱۶۱، باب الجنائز، مايفعل بالمحتضر، ط: دار إحياء الكتب العربية)

(۴) عن علي بن رباح، قال: سمعت أبا رافع، يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من غسل ميتا فكتم عليه غفر له أربعين كبيرة، ومن حفر لأخيه قبرا حتى يجنه فكأنما أسكنه مسكنا مرة حتى يبعث. (المعجم الكبير - أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۱/ ۳۱۵، رقم الحديث: ۹۲۹، باب الألف، علي بن رباح اللخمي، عن أبي رافع، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية - القاهرة)

(۵) عن أبي رافع، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من غسل ميتا فكتم عليه غفر له أربعين مرة، ومن كفن ميتا كساه الله من السندس، وإستبرق الجنة، ومن حفر لميت قبرا فأجنه فيه أجري له من الأجر كأجر مسكن أسكنه إلى يوم القيامة. (المستدرك على الصحيحين - أبو عبد الله الحاكم النيسابوري (م: ۴۰۵ھ): ۱/ ۵۰۵، رقم الحديث: ۱۳۰۷، كتاب الجنائز، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص میت کو غسل دے، وہ گناہوں سے اس طرح نکل جائے گا، گویا کہ وہ آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ (طبرانی اوسط)[۶]

حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص میت کو غسل دے اور اس کے عیب کو چھپائے، تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے گناہوں کو معاف فرمادیں گے۔ (طبرانی کبیر)[۷]

اسی طرح اس قسم کی دوسری روایات حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ (ترغیب ترہیب: ۶/ ۳۴-۳۵)[۸]

مذکورہ احادیث مبارکہ سے ثابت ہوگیا کہ میت کو غسل دینا ثواب کا کام ہے، کیوں کہ غسل دینے والے کو موت کی یاد آئے گی، دل نرم ہوگا، توبہ اور استغفار کی توفیق ہوگی؛ اس لیے جو میت کو غسل دے، وہ نماز میں امام بن سکتا ہے، جب کہ وضو، غسل اور نماز کے مسائل جانتا ہو اور قرآن کی سورتیں (حفظ) یاد ہوں، تو فرض، نفل اور عیدین کی نماز میں اس کو امام بنانا جائز ہے۔ جس شخص نے مذکور مسئلہ بیان کیا ہے، وہ بالکل غلط ہے اس پر بالکل عمل نہیں کیا جائے گا۔[۹] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۶) عن عائشة، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من غسل ميتا فأدى فيه الأمانة، يعني: ستر ما يكون عند ذلك، كان من ذنوبه كيوم ولدته أمه. (المعجم الأوسط: ۴/ ۴۸، رقم الحديث: ۳۵۷۵، باب الدال، من اسمه داؤد، ط: دار الحرمين، القاهرة)

(۷) عن أبي أمامة رضي الله عنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من غسل ميتا، فكتم عليه طهره الله من ذنوبه. (المعجم الكبير: ۸/ ۲۸۱، رقم الحديث: ۸۰۷۸، باب الصاد، أبو غالب صاحب المحجن، واسمه حزور، ط: مكتبة ابن تيمية القاهرة)

(۸) الترغيب والترهيب-قوام السنة (م: ۵۳۵هـ): ۳/ ۱۵۵- ۱۵۶، رقم الحديث: ۲۲۸۰- ۲۲۸۲، باب في الترغيب في غسل الجنابة وغسل الحيض وغسل الميت، ت: أيمن بن صالح بن شعبان، ط: دار الحديث - القاهرة. ـــــ نوٹ: اس باب میں احقر کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت نہیں مل سکی۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

(۹) الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق، هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين، ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية. ويجتنب الفواحش الظاهرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، ط: زكريا- ديوبند ☆بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱/ ۱۵۷، كتاب الصلاة، فصل بيان من هو أحق بالإمامة وأولى بها، ط:: دار الكتب العلمية☆تحفة الفقهاء-أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو: ۵۴۰هـ): ۱/ ۲۳۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۵] شافعی امام کے پیچھے نماز پڑھنا

۶۶۱-سوال: ہمارے یہاں مسجد میں حنفی امام ہے، گزشتہ کل ان کی عدم موجودگی میں مؤذن-جو کہ شافعی ہے- نے نماز پڑھائی اور پیچھے سب مقتدی حنفی تھے، تو ان حنفیوں کی شافعی امام کے پیچھے نماز بلا کراہت صحیح ہوئی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

اگر شافعی امام، مذہب حنفی کی رعایت کرتا ہو، اس طور پر کہ وہ ان چیزوں سے بچتا ہو، جو حنفی مسلک کے مطابق مفسدات صلاۃ میں سے ہیں، مثلاً: احناف کے یہاں منھ بھر کر قے سے وضوٹوٹ جاتا ہے، تو وہ اس کا خیال رکھتا ہو، کہ ایسا ہونے پر وہ وضو کر لیتا ہو، تو حنفیوں کی نماز اس کے پیچھے بلا کراہت ہو جائے گی، اس میں شک کی ضرورت نہیں۔[1] بمبئی جامع مسجد کے امام صاحب شافعی المسلک ہیں، اسی طرح مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے امام صاحبان بھی حنبلی و مالکی ہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] وتر کی نماز میں حنفی شخص کا شافعی کی اقتدا کرنا

۶۶۲-سوال: ہم یہاں دبئی میں رمضان شریف میں شافعی امام کے پیچھے تراویح پڑھتے ہیں، تراویح کے بعد جب وتر کا وقت ہوتا ہے، تو حنفی حضرات انفراداً یا مسجد کے صحن میں باجماعت وتر ادا کرتے ہیں

---

(۱) وظاهر كلام شرح المنية أيضا حيث قال: وأما الاقتداء بالمخالف في الفروع كالشافعي فيجوز ما لم يعلم منه ما يفسد الصلاة على اعتقاد المقتدي عليه الإجماع، إنما اختلف في الكراهة. اهـ فقيد بالمفسد دون غيره كما ترى. وفي رسالة [الاهتداء في الاقتداء] لمنلا علي القاري: ذهب عامة مشايخنا إلى الجواز إذا كان يحتاط في موضع الخلاف وإلا فلا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۳، كتاب الصلاة، مطلب في الاقتداء بشافعي ونحوه هل يكره أم لا؟)

والاقتداء بشافعي المذهب إنما يصح إذا كان الإمام يتحامى مواضع الخلاف بأن يتوضأ من الخارج النجس من غير السبيلين كالفصد وأن لا ينحرف عن القبلة انحرافا فاحشا. هكذا في النهاية والكفاية في باب الوتر. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۴، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مكتبة زكريا، ديوبند)

مزید تفصیل ملاحظہ کریں: البحر الرائق شرح كنز الدقائق: ۲/ ۵۰، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ منحة الخالق مع البحر الرائق: ۲/ ۵۰، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الكتاب الإسلامي.

،شافعی امام کے پیچھے وتر نہیں پڑھتے ہیں ،تو سوال یہ ہے کہ کیا حنفی حضرات کا شافعی امام کے پیچھے وتر کی نماز پڑھنا درست نہیں ہے؟ امید ہے کہ مفصل ومدلل جواب عطا فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک وتر کی تین رکعت ایک سلام سے پڑھنا واجب ہے۔[1] اور امام شافعیؒ کے نزدیک وتر کو دو سلام سے پڑھنا سنت ہے،اور شوافع میں بعض وتر ایک سلام سے بھی پڑھنے کے قائل ہیں۔[2]

---

(۱) أما الأول فعند أبي حنيفة فيه ثلاث روايات ،روى حماد بن زيد عنه أنه فرض ،وروى يوسف بن خالد السمتي أنه واجب ،وروى نوح بن أبي مريم المروزي في الجامع عنه أنه سنة وبه أخذ أبو يوسف ومحمد والشافعي - رحمهم الله - وقالوا: إنه سنة مؤكدة آكد من سائر السنن المؤقتة.(بدائع الصنائع:۱/ ۲۷۰، كتاب الصلاة، فصل في أنواع الصلاة الواجبة ومنها صلاة الوتر ،ط:دار الكتب العلمية)

(هو فرض عملا وواجب اعتقادا وسنة ثبوتا) بهذا وفقوا بين الروايات.(الدر المختار)ـــــ قال ابن عابدين: (قوله بين الروايات) أي الثلاث المروية عن أبي حنيفة، فإنه روي عنه أنه فرض وأنه واجب وأنه سنة، والتوفيق أولى من التفريق، فرجع الكل إلى الوجوب الذي مشى عليه في الكنز وغيره. قال في البحر: وهو آخر أقوال الإمام، وهو الصحيح محيط والأصح خانية، وهو الظاهر من مذهبه مبسوط. اهـ ثم قال: وأما عندهما فسنة عملا واعتقادا ودليلا ،لكنها آكد سائر السنن المؤقتة.(رد المحتار على الدر المختار:۲/ ۴،كتاب الصلاة،باب الوتر والنوافل، ط:دار الفكر-بيروت)

والكلام فيه في فصول: (أحدها) أن الوتر ثلاث ركعات لا يسلم إلا في آخرهن عندنا.(المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م:۴۸۳هـ):۱/ ۱۶۴، كتاب الصلاة،أحكام الوتر، الفصل الأول عدد ركعات الوتر ،ط:دار المعرفة-بيروت)

"الوتر واجب عند أبي حنيفة رحمه الله وقالا سنة"...قال: "الوتر ثلاث ركعات لا يفصل بينهن بسلام".(الهداية في شرح بداية المبتدي-المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳هـ):۱/ ۶۹، كتاب الصلاة، باب صلاة الوتر ،ت:طلال يوسف،ط:دار إحياء التراث العربي-بيروت)

(۲) الوتر سنة. ويحصل بركعة، وبثلاث، وبخمس، وبسبع، وبتسع، وبإحدى عشرة، فهذا أكثره على الأصح. وعلى الثاني: أكثره ثلاث عشرة. ولا يجوز الزيادة على أكثره على الأصح. فإن زاد، لم يصح وتره. وإذا زاد على ركعة، فأوتر بثلاث فأكثر موصولة،فالصحيح: أن له أن يتشهد تشهدا واحدا في الأخيرة، وله تشهد آخر في التي قبلها. وفي وجه: لا يجزئ الاقتصار على تشهد واحد. وفي وجه: لا يجوز لمن أوتر بثلاث، أن يتشهد تشهدين بتسليمة. فإن فعل، بطلت صلاته، بل يقتصر على تشهد أو يسلم في التشهدين. وهذان الوجهان منكران، والصواب جواز ذلك كله.(روضة الطالبين وعمدة المفتين-أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ۶۷۶هـ):۱/ ۳۲۸، كتاب الصلاة،فصل قبل :فصل في النوافل التي يسن فيها الجماعة،ت: زهير الشاويش،ط:=

اسی بنا پر درمختار میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شافعی المسلک امام، وتر کو ایک سلام سے پڑھاتا ہے، تو حنفی کا اس کی اقتدا کرنا درست ہے، ورنہ (یعنی دو سلام سے پڑھاتا ہو) تو حنفی شخص کی نماز درست نہ ہوگی: (وصح الاقتداء فيه) ففي غيره أولى إن لم يتحقق منه ما يفسدها في الأصح ... (بشافعي) مثلا (لم يفصله بسلام) لا إن فصله (على الأصح). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۴۴، مكتبہ زكريا ديوبند)[۱]

لہذا آپ کے امام صاحب اگر ایک سلام سے وتر پڑھاتے ہوں، تو الگ جماعت کرنے یا انفراداً وتر پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، ان ہی کی اتباع میں وتر پڑھ لینی چاہیے، اور اگر دو سلام سے پڑھاتے ہوں، تو علاحدہ پڑھ لیا کریں۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] امرد کی امامت کا حکم

۶۶۳-سوال: اگر لڑکے کی عمر ۱۶-۱۷ سال کی ہوگئی ہو؛ لیکن اس کی ڈاڑھی اور مونچھ نہ نکلی ہو، یعنی امرد ہو، تو کیا اس کی امامت جائز نہیں ہے؟ اگر وہ تراویح پڑھائے، تو تراویح درست ہوگی یا نہیں؟ یا امرد کے پیچھے نماز درست نہیں ہے؟ مفصل جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

صلوات مفروضہ (فرض نمازیں) اور تراویح وغیرہ میں امامت کے لیے امام کا بالغ ہونا شرط ہے۔[۳] اس لیے اگر لڑکے کی عمر جب ۱۶-۱۷ سال کی ہے، تو اس کے پیچھے نماز درست ہے، جب کہ امامت

= المكتب الإسلامي - بيروت ☆الحاوي الكبير في فقه مذهب الإمام الشافعي وهو شرح مختصر المزني - أبو الحسن علي بن محمد بن محمد بن حبيب البصري البغدادي، الشهير بالماوردي (م: ۴۵۰هـ): ۲/ ۲۹۳، باب صلاة التطوع وقيام رمضان، مسألة: القول في عدد الركعات، ت: الشيخ علي محمد معوض - الشيخ عادل أحمد عبد الموجود، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۱) الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۷-۸، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الفكر.

(۲) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: البحر الرائق: ۲/ ۶۸، کتاب الصلاة، باب الوتر والنفل، ط: دار الکتاب - دیوبند)

(۳) ولا يجوز للرجال أن يقتدوا بامرأة أو صبي "..... وأما الصبي فلأنه متنفل فلا يجوز اقتداء المفترض به، وفي التراويح والسنن المطلقة جوزه مشايخ بلخ رحمهم الله ولم يجوزه مشايخنا رحمهم الله... والمختار أنه لا يجوز في الصلوات كلها. (الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر، المرغيناني، برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۵۷، باب الإمامة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

کی دیگر شرائط اس میں موجود ہوں۔[۱] البتہ امامت میں اس ترتیب کی رعایت کرنی چاہیے، جو حدیث پاک سے ثابت ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] ایسے آدمی کے پیچھے فرض نماز پڑھنا جن کی داڑھی نہیں نکلی ہے

۶۶۴-سوال: ایک شخص عاقل وبالغ، مسائل کا جاننے والا اور قرآن مجید کو صحیح پڑھنے والا ہے؛ لیکن اس کی داڑھی نہیں نکلی ہے، تو کیا ایسے شخص کے پیچھے فرض نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

اگر عمر کے لحاظ سے بالغ ہے، اور ابھی ڈاڑھی نہیں نکلی ہے، تو اس کی امامت صحیح ہے، اسی طرح جس شخص کی قدرتی طور پر ڈاڑھی نہیں ہے، اس کی بھی امامت صحیح ہے، امامت کے جواز کے لیے ڈاڑھی کا نکلنا شرط نہیں ہے، بل کہ شرط یہ ہے کہ امام بالغ ہو، نابالغ کی امامت درست نہیں ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) سوال: لڑکا اگر چہ بالغ ہو گیا، مگر امرد ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟
جواب: جائز ہے، مگر غیر امرد اس سے مقدم ہے، خاص کر جب کہ وہ امرد صبیح وملیح ہو۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۶/ ۳۱۴-۳۱۵، باب الامامۃ)
(وكذا تكره خلف أمرد) الظاهر أنها تنزيهية أيضا . . . والظاهر أن المراد به الصبيح الوجه؛ لأنه محل الفتنة . . . وفي حاشية المدني عن الفتاوى العفيفية: سئل العلامة الشيخ عبد الرحمن بن عيسى المرشدي عن شخص بلغ من السن عشرين سنة وتجاوز حد الإنبات ولم ينبت عذاره، فهل يخرج بذلك عن حد الأمردية، وخصوصا وقد نبت له شعرات في ذقنه تؤذن بأنه ليس من مستديري اللحى، فهل حكمه في الإمامة كالرجال الكاملين أم لا أجاب: سئل العلامة الشيخ أحمد بن يونس المعروف بابن الشلبي من متأخري علماء الحنفية عن هذه المسألة.ــــــ فأجاب بالجواز من غير كراهة، وناهيك به قدوة، والله أعلم. وكذلك عنها المفتي محمد تاج الدين القلعي فأجاب كذلك. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب في إمامة الأمرد، ط: دار الفكر)
(۲) عن أبي مسعود الأنصاري، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يؤم القوم أقرؤهم لكتاب الله، فإن كانوا في القراءة سواء، فأعلمهم بالسنة، فإن كانوا في السنة سواء، فأقدمهم هجرة، فإن كانوا في الهجرة سواء، فأقدمهم سلما، ولا يؤمن الرجل الرجل في سلطانه، ولا يقعد في بيته على تكرمته إلا بإذنه. قال الأشج في روايته: مكان سلما سنا. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۳۶، رقم الحديث: ۲۹۰-(۶۷۳)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب من أحق بالإمامة، ط: البدر - ديوبند☆سنن أبي داود ۱/ ۸۶، رقم الحديث: ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، باب من أحق بالإمامة ☆سنن الترمذي: ۱/ ۵۵، رقم الحديث: ۲۳۵، باب من أحق بالإمامة، ط: البدر - ديوبند)
(۳) وفي حاشية المدني عن الفتاوى العفيفية: سئل العلامة الشيخ عبد الرحمن بن عيسى المرشدي عن شخص =

[۹] پندرہ سالہ بچے کی امامت

۶۶۵-سوال: ایک بچے کی عمر اسلامی تاریخ کے اعتبار سے ۲۶ رشعبان المعظم کو پندرہ سال ہوجائے گی، تو کیا یہ بچہ اس کے بعد ماہِ رمضان میں تراویح اور دیگر فرض نمازیں پڑھا سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اقتداء کے صحیح ہونے کے لیے عند الاحناف امام کا بالغ ہونا ضروری ہے، اگر علاماتِ بلوغ بچے میں معلوم نہ ہوں، تو پندرہ سال مکمل ہونے پر اس پر بلوغ بالسن کا حکم لگایا جائے گا، لہٰذا حسبِ تحریر، امامت کی گنجائش ہے۔[1]

لیکن امامت چوں کہ ایک اہم ذمہ داری ہے، اس لیے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کسی ایسے شخص کو امام

=بلغ من السن عشرين سنة وتجاوز حد الإنبات ولم ينبت عذاره، فهل يخرج بذلك عن حد الأمردية، وخصوصا وقد نبت له شعرات في ذقنه تؤذن بأنه ليس من مستديري اللحى، فهل حكمه في الإمامة كالرجال الكاملين أم لا أجاب: سئل العلامة الشيخ أحمد بن يونس المعروف بابن الشلبي من متأخري علماء الحنفية عن هذه المسألة. فأجاب بالجواز من غير كراهة، وناهيك به قدوة، والله أعلم. وكذلك عنها المفتي محمد تاج الدين القلعي فأجاب كذلك. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر-بيروت☆البحر الرائق: ۱/ ۶۲۸، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتاب ديوبند)

(۱) ربط صلاة المؤتم بالإمام بشروط عشرة: نية المؤتم الاقتداء، واتحاد مكانهما وصلاتهما... الخ. (الدر المختار)
قال ابن عابدين: (قوله بشروط عشرة) هذه الشروط في الحقيقة شروط الاقتداء، وأما شروط الإمامة، فقد عدها في نور الإيضاح على حدة، فقال: وشروط الإمامة للرجال الأصحاء ستة أشياء: الإسلام، والبلوغ، والعقل والذكورة، والقراءة، والسلامة من الأعذار كالرعاف، والفأفأة، والتمتمة، واللثغ، وفقد شرط كطهارة وستر عورة. اهـ. احترز بالرجال الأصحاء عن النساء الأصحاء فلا يشترط في إمامهن الذكورة؛ وعن الصبيان فلا يشترط في إمامهم البلوغ، وعن غير الأصحاء فلا يشترط في إمامهم الصحة، لكن يشترط أن يكون حال الإمام أقوى من حال المؤتم أو مساويا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

(بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال) والأصل هو الإنزال (والجارية بالاحتلام والحيض والحبل) ولم يذكر الإنزال صريحا لأنه قلما يعلم منها (فإن لم يوجد فيهما) شيء (فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتى) لقصر أعمار أهل زماننا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۱۵۳، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، ط: دار الفكر-بيروت)

بنانا بہتر ہے، جو عالم بالسنۃ ہو اور مسائل کا جاننے والا ہو؛ لہٰذا مذکورہ بچے کو سنن ونوافل وغیرہ میں امام بنایا جائے۔ اسی طرح تراویح کے لیے بھی کوئی عالم بالسنۃ امام مل جائے تو بہتر ہے، ورنہ مذکورہ بچہ بالغ بالسن ہونے کی وجہ سے پڑھائے، تو جائز ہے، شرعی اعتبار سے کوئی حرج نہیں ہے۔ (شامی ☆ عالمگیری)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] پندرہ سالہ بچہ تراویح پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟

۶۶۶-سوال: ایک بچے کی عمر پندرہ سال ہو چکی ہے، لیکن اب تک علاماتِ بلوغ اُس میں ظاہر نہیں ہوئیں، تو کیا ایسا لڑکا تراویح پڑھا سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

پندرہ سال پورے ہو چکے ہوں؛ لیکن علاماتِ بلوغ ظاہر نہ ہوئی ہوں، تو بھی ایسے لڑکے لیے تراویح پڑھانا جائز ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] تیرہ یا چودہ سالہ نابالغ بچے کی امامت

۶۶۷-سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ میں کہ کسی لڑکے کی عمر تیرہ چودہ سال کے درمیان ہے، ابھی تک وہ بالغ نہیں ہوا ہے، کیا وہ لوگوں کی فرض نماز میں امامت کرا سکتا ہے؟ اگر وہ حافظ ہو تو نمازِ تراویح میں امام بن سکتا ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

---

[۱] (والأحق بالإمامة) تقديما بل نصبا، مجمع الأنهر (الأعلم بأحكام الصلاة) فقط صحة وفسادا، بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة، وحفظه قدر فرض، وقيل واجب، وقيل سنة، (ثم الأحسن تلاوة) وتجويدا (للقراءة، ثم الأورع) أي الأكثر اتقاء للشبهات.... (ثم الأسن) أي الأقدم إسلاما، فيقدم شاب على شيخ أسلم، وقالوا: يقدم الأقدم ورعا. وفي النهر عن الزاد: وعليه يقاس سائر الخصال، فيقال: يقدم أقدمهم علما ونحوه، وحينئذ فقلما يحتاج للقرعة (ثم الأحسن خلقا) بالضم ألفة بالناس (ثم الأحسن وجها) أي أكثرهم تهجدا... الخ. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۵۷، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، الباب الخامس في الإمامة، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) قد تقدم تخريجه تحت عنوان: ''پندرہ سالہ بچے کی امامت''۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

تیرہ یا چودہ سالہ لڑکے پر اگر علاماتِ بلوغ ظاہر ہو گئے ہوں، مثلاً: بال ریش و مونچھ یا زیرِ ناف نکل آئے ہوں، تو وہ بالغ ہے، ورنہ نہیں۔ (۱) اگر کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی ہو اور احتلام بھی نہ ہوا ہو، تو وہ نابالغ ہے۔ ہاں، پندرہ سال پورے ہو جائیں تو بالغ شمار ہوگا، اگر چہ کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی ہو۔ (۲)

نابالغ بچہ اگر چہ قریب البلوغ (مراہق) ہو، تب بھی اُس کے لیے تراویح میں بالغین کی امامت جائز نہیں ہے، یہی صحیح ہے۔ (عالم گیری) [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) علاماتِ بلوغ میں موئے ریش ولحیہ اور زیرِ ناف کا ذکر، غیر روایۃ الاصول یا امام ابو یوسف کی روایت پر مبنی ہے، تاہم متون وشروح کی روایات میں ان علامتوں کا ذکر نہیں ہے؛ بل کہ ان (موئے ریش ولحیہ اور زیرِ ناف) کے علامتِ بلوغ نہ ہونے کی تصریح منقول ہے:

(بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال) والأصل هو الإنزال (والجارية بالاحتلام والحيض والحبل) ولم يذكر الإنزال صريحا لأنه قلما يعلم منها (فإن لم يوجد فيهما) شيء (فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتى) [الدر المختار] ـــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله: فإن لم يوجد فيهما) أي في الغلام والجارية شيء مما ذكر إلخ مفاده: أنه لا اعتبار لنبات العانة خلافا للشافعي، ورواية عن أبي يوسف، ولا اللحية، وأما نهود الثدي فذكر الحموي أنه لا يحكم به في ظاهر الرواية، وكذا ثقل الصوت كما في شرح النظم الهاملي أبو السعود وكذا شعر الساق والإبط والشارب. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۱۵۳، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، ط: دار الفكر- بيروت)

قوله: (وقال أبو يوسف ومحمد: إذا تم للغلام، والجارية خمس عشرة سنة فقد بلغا) ولا معتبر بنبات العانة، وعن أبي يوسف: أنه اعتبر نباتها الخشن بلوغا، وهو الذي يحتاج في إزالته إلى حلق، وأما نهود الثدي فلا يحكم به بلوغا في ظاهر الرواية، وقال بعضهم يحكم به كذا في الخجندي، وأما شعر الإبط والشارب فقد قيل على الخلاف في شعر العانة وقيل لا عبرة به، وأما الزغب وهو الشعر الضعيف وثقل الصوت فلا اعتبار به. (الجوهرة النيرة- أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/ ۲۴۵، كتاب الحجر، ط: المطبعة الخيرية ☆ حاشية الشلبي على تبيين الحقائق (شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِّلْبِيّ (م: ۱۰۲۱ هـ): ۵/ ۲۰۳، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة ☆ البناية شرح الهداية- بدر الدين العينى (م: ۸۵۵هـ): ۱۱/ ۱۰۹، كتاب الحجر، فصل في حد البلوغ، علامات بلوغ الغلام والجارية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ کیجیے عنوان: "پندرہ سالہ بچے کی امامت" کا حاشیہ نمبر: ۱۔

[۳] وإمامة الصبي المراهق لصبيان مثله يجوز. كذا في الخلاصة، وعلى قول أئمة بلخ يصح الاقتداء بالصبيان في التراويح والسنن المطلقة. كذا في فتاوى قاضي خان، المختار أنه لا يجوز في الصلوات كلها. كذا في الهداية وهو الأصح. هكذا في المحيط وهو قول العامة وهو ظاهر الرواية. هكذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۵، =

[۱۲] لڑکا اور لڑکی کے بالغ ہونے کی کم سے کم عمر

۶۶۸-سوال: میرا بھائی ریاض الدین اس سال رمضان میں ہمارے گاؤں اون میں تراویح، فرض اور وتر کی نمازیں، امام صاحب کی اجازت وخوشی سے پڑھاتا ہے، اس کی تاریخ ولادت ۱۰/ ۳/ ۱۹۶۸ء ہے، انگریزی تاریخ کے لحاظ سے پہلی رمضان کو اس کی عمر ۱۷ سال ۲ رمہینہ ۱۰ ردن تھی، بعض لوگ اس کو نابالغ سمجھتے ہیں اور، بہت سے لوگ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ مذکورہ شخص تراویح پڑھا سکتا ہے، فرض اور وتر کی نماز نہیں۔

سوال یہ ہے کہ ابن آدم بالغ کب ہوتا ہے؟ کیا اس وقت جب مونچھ کے بال آ چکے ہوں؟ اور میرا بھائی ریاض الدین اس سال تراویح پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ برائے کرم بالتفصیل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداو مصلیا:

لڑکا کے بالغ ہونے کی کم سے کم عمر بارہ (۱۲) سال ہے، صحت اچھی ہو اور غذا اچھی ہو، تو بارہ (۱۲) سال میں بالغ ہو سکتا ہے؛ اس لیے اس بات کا شرعاً امکان ہے کہ ۲۵ رسال کی عمر میں آدمی دادا اور ساڑھے بارہ سال کی عمر میں باپ بن جائے؛ کیوں کہ حمل کی اقل مدت ۶ رمہینہ ہے۔

اسی طرح اس بات کا امکان ہے کہ نو (۹) سال میں لڑکی بالغ ہو جائے، ساڑھے نو سال میں ماں بن جائے اور انیس سال کی عمر میں نانی۔[1]

= كتاب الصلاة، باب في الإمامة، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماما لغيره، ط: دار الفكر - بيروت)

(ولا يصح اقتداء رجل بامرأة) وخنثى (وصبي مطلقا) ولو في جنازة ونفل على الأصح. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۷۶-۵۷۸، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۱/ ۶۲۸، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتاب - ديوبند)

(۱) (وأقله ستة أشهر لقوله تعالى {وحمله وفصاله ثلاثون شهرا} [الأحقاف: ۱۵] ثم قال {وفصاله في عامين} [لقمان: ۱۴] فبقي للحمل ستة أشهر) وهذا تأويل أخرجه ابن عباس، ذكره في المبسوط، فقال: روي أن رجلا تزوج امرأة فولدت ولدا لستة أشهر، فهم عثمان برجمها، فقال ابن عباس: أما إنها لو خاصمتكم بكتاب الله لخصمتكم، قال الله تعالى {وحمله وفصاله ثلاثون شهرا} [الأحقاف: ۱۵] وقال تعالى {وفصاله في عامين} [لقمان: ۱۴] فإذا ذهب للفصال عامان لم يبق للحمل إلا ستة أشهر، فدرأ عثمان الحد عنها، وأثبت النسب من الزوج. (العناية شرح الهداية-محمد بن محمد بن محمود، أكمل الدين، الرومي البابرتي (م: ۷۸۶هـ): ۴/ ۳۶۳، كتاب الطلاق، باب ثبوت النسب، اكثر مدة الحمل، ط: دار الفكر ☆ فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۴/ ۳۶۳، باب ثبوت النسب، ط: دار الفكر)

اگر لڑکے کو احتلام نہ ہوا ہو، تو وہ پندرہ سال کی عمر میں بالغ مانا جائے گا؛ آپ کی تحریر کے مطابق آپ کے بھائی کی عمر سترہ (۱۷) سال ہے، لہٰذا وہ بالغ ہے، فرض نماز کے لیے دیگر صلاحیت ہو، تو اس کی امامت جائز ہے، لوگوں کا اعتراض صحیح نہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] عورت کا نماز میں امام بننا

۶۶۹-سوال: اگر کوئی عورت نماز میں امام ہو اور اس کے پیچھے اس کے گھر کی خواتین نماز ادا کرتی ہوں، تو ان کے ساتھ کوئی مرد جماعت میں شریک ہو سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً:

تنہا عورتوں کی جماعت مکروہ تحریمی ہے؛ اس لیے اگر کوئی مرد موجود ہو اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی کوئی ضرورت ہو، تو مرد امامت کرے۔[2] عورت کو امام نہ بنایا جائے، اگر کہیں عورت کی جماعت ہو رہی ہو، اور عورت ہی امامت کر رہی ہو، تو مرد کے لیے اس کی اقتدا کرنا جائز نہیں ہے۔[3] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) وأدنى مدة يصدق الغلام فيها على البلوغ اثنتا عشرة سنة، والجارية تسع سنين، وقيل غير ذلك، وهذا هو المختار. (الاختيار لتعليل المختار - ابن مودود الموصلي (م: ۶۸۳هـ): ۲/ ۹۵-۹۶، كتاب الحجر، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة)

تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ کیجیے، عنوان: ''پندرہ سالہ بچے کی امامت'' کا حاشیہ نمبر: ۱۔

(۲) عن عبد الرحمن بن أبي بكرة، عن أبيه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم «أقبل من نواحي المدينة يريد الصلاة، فوجد الناس قد صلوا، فمال إلى منزله، فجمع أهله، فصلى بهم». (المعجم الأوسط - أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰هـ): ۵/ ۳۵، رقم الحديث: ۴۶۰۱، باب العين، من اسمه عبدان، ت: طارق بن عوض الله بن محمد، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين - القاهرة)

" ويكره للنساء أن يصلين وحدهن الجماعة " لأنها لا تخلو عن ارتكاب محرم وهو قيام الإمام وسط الصف فيكره كالعراة " فإن فعلن قامت الإمام وسطهن " ... ولا يجوز للرجال أن يقتدوا بامرأة أو صبي ". (الهداية في شرح بداية المبتدي - المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۵۷، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(۳) لا يصح اقتداء الرجل بالمرأة. (خلاصة الفتاوى: ۱/ ۱۴۶، كتاب الصلاة، في صحة الاقتداء، ط: اشرفيه - ديوبند)

[۱۴] مرد کا صرف عورتوں کی امامت کرنا

۶۷۰-سوال: جماعت کی نماز میں صرف ایک مرد امام ہو اور کوئی مرد نہ ہو اور پیچھے عورتیں اقتدا کریں، تو جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

پیچھے محرم عورتیں: ماں، بہن وغیرہ ہوں، تو جائز ہے، تنہا غیر محرم عورتوں کی امامت کرنا مکروہ ہے۔[۱]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] دوسرے مقتدی کے آنے پر خود امام کا آگے بڑھ جانا

۶۷۱-سوال: امام کے ساتھ صرف ایک مقتدی اس کی داہنی جانب تھا، جب دوسرا مقتدی آیا، تو وہ پیچھے نہیں ہٹا، جس کی وجہ سے امام صاحب خود آگے چلے گئے، تو اس طرح امام صاحب کے آگے چلے جانے سے نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟

(۲) مقتدی کا کہنا ہے کہ امام صاحب جب سجدہ کی جگہ سے آگے چلے جائیں، تو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، تو امام نے پھر سے نماز پڑھائی، تو دونوں نمازوں میں سے کون سی نماز صحیح ہوئی؟

(۳) اگر امام کے ساتھ ایک ہی مقتدی ہو، پھر دوسرے مقتدی کے آنے کا علم ہو، تو امام کو آگے جانا چاہیے یا نہیں؟ اگر آگے جانے کی اجازت ہے، تو اس کی کیا شرط ہے؟

(۴) اگر پہلی نماز صحیح ہوگئی ہے، تو بعد والی نماز کی وجہ سے کوئی گناہ تو نہیں ہوگا؟ بینوا توجروا۔

---

(۱) تكره إمامة الرجل لهن في بيت ليس معهن رجل غيره ولا محرم منه) كأخته (أو زوجته أو أمته، أما إذا كان معهن واحد ممن ذكر ... لا) يكره، بحر. (الدر المختار) ـــــــــ قال ابن عابدين: (قوله ليس معهن رجل غيره) ظاهره أن الخلوة بالأجنبية لا تنتفي بوجود امرأة أجنبية أخرى وتنتفي بوجود رجل آخر تأمل (قوله كأخته) من كلام الشارح كما رأيته في عدة نسخ، وكذا بخطه في الخزائن كتبه بالأسود وأفاد أن المراد بالمحرم ما كان من الرحم، لما قالوا من كراهة الخلوة بالأخت رضاعا والصهرة الشابة تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۵۶۶/۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة، دار الفكر -بيروت)

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) بعد میں آنے والا مقتدی پہلے سے اقتدا کرنے والے کو آگے سے پیچھے کھینچ لے اور دونوں امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا کریں، یہ طریقہ سنت کے موافق ہے، البتہ مقتدی مسئلہ نہ جانتا ہو اور امام خود آگے بڑھ جائے، اور دونوں مقتدی پیچھے کھڑے رہیں، تو یہ صورت بھی جائز ہے، صف بندی مسنون طریقہ پر ہوگئی، لہٰذا امام کے آگے بڑھ جانے میں اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا، اس سے نماز فاسد نہیں ہوئی؛ بل کہ سنت کے موافق ہوئی۔ (شامی: ۱/۵۳۱)[۱]

(۲) سجدہ کی جگہ تک جانا چاہیے تھا، البتہ اگر اس سے آگے بھی بڑھ گیا، تب بھی نماز فاسد نہ ہوگی۔ (شامی: ۱/۵۳۱)[۲]

(۳) بہتر یہ ہے کہ بعد میں آنے والا پیچھے کھڑا ہو، اور پہلا مقتدی پیچھے ہٹ جائے، یا آنے والا اس کو پیچھے کھینچ لے، ورنہ امام خود آگے بڑھ جائے۔ (شامی: ۱/۵۳۱)[۳]

[۱-۲-۳] عن جابر في الحديث الطويل ... ثم جئت حتى قمت عن يسار رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأخذ بيدي فأدارني حتى أقامني عن يمينه، ثم جاء جبار بن صخر فتوضأ، ثم جاء فقام عن يسار رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم بيدينا جميعا، فدفعنا حتى أقامنا خلفه، فجعل رسول الله صلى الله عليه وسلم يرمقني وأنا لا أشعر، ثم فطنت به، فقال هكذا، بيده - يعني شد وسطك - فلما فرغ رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: يا جابر، قلت: لبيك، يا رسول الله قال: إذا كان واسعا فخالف بين طرفيه، وإذا كان ضيقا فاشدده على حقوك. (الصحيح لمسلم: ۲/۴۱۷، رقم الحديث: ۳۰۱۰، كتاب الزهد والرقائق، باب حديث جابر الطويل وقصة أبي اليسر، ط: ديوبند ☆ سنن أبي داود: ۱/۹۳، رقم الحديث: ۶۳۴، كتاب الصلاة، باب إذا كان الثوب ضيقا يتزر به، ط: ديوبند)

تتمه: إذا اقتدى بإمام، فجاء آخر يتقدم الإمام موضع سجوده، كذا في مختارات النوازل. ــــــ وفي القهستاني عن الجلابي أن المقتدي يتأخر عن اليمين إلى خلف إذا جاء آخر. اهـ ــــــ وفي الفتح: ولو اقتدى واحد بآخر فجاء ثالث، يجذب المقتدي بعد التكبير، ولو جذبه قبل التكبير لا يضره، وقيل يتقدم الإمام اهـ ومقتضاه أن الثالث يقتدي متأخرا، ومقتضى القول بتقدم الإمام أنه يقوم بجنب المقتدي الأول. والذي يظهر أنه ينبغي للمقتدي التأخر إذا جاء ثالث، فإن تأخر وإلا جذبه الثالث إن لم يخش إفساد صلاته، فإن اقتدى عن يسار الإمام يشير إليهما بالتأخر، وهو أولى من تقدمه؛ لأنه متبوع؛ ولأن الاصطفاف خلف الإمام من فعل المقتدين لا الإمام، فالأولى ثباته في مكانه وتأخر المقتدي، ويؤيده ما في الفتح عن صحيح مسلم: قال جابر: سرت مع النبي - صلى الله عليه وسلم - في غزوة فقام يصلي فجئت حتى قمت عن يساره فأخذ بيدي فأدارني عن يمينه، فجاء ابن صخر حتى قام عن يساره فأخذ بيديه جميعا فدفعنا حتى أقامنا خلفه. اهـ وهذا كله عند الإمكان وإلا تعين الممكن. (رد المحتار: ۱/۵۶۸، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) علم حاصل کرنے میں کوتاہی کا گناہ ہوگا، جو رکعتیں صحیح ہوگئیں، وہ فرض شمار ہوں گی۔ علماء کا اس سلسلہ میں مختلف وجوہات کی بناء پر اختلاف ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] مشق شدہ سورتیں ہی نماز میں پڑھنا

۶۷۲-سوال: بہت سے ائمہ چند سورتوں کی مشق کر لیتے ہیں اور اسی کو بار بار پڑھتے ہیں، کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلياً:

جائز ہے؛ لیکن دوسری سورتوں کو بھی پڑھنا چاہیے، البتہ اس کی وجہ سے نماز میں کوئی نقصان نہیں آئے گا، ہاں اگر مشق والی سورتوں کو بار بار پڑھنے کی وجہ سے عوام یہ سمجھنے لگیں کہ ان ہی سورتوں کو پڑھنا ضروری ہے، یا خود امام ان سورتوں کو پڑھنا ضروری سمجھتا ہو، تو مکروہ ہے، اگر آسانی اور سہولت کے لیے پڑھتا ہو، تو جائز ہے، حرج نہیں۔ (شامی: ۱/ ۵۰۸)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] عمامہ کے بغیر نماز پڑھانا

۶۷۳-سوال: کیا ائمہ حضرات کے لیے عمامہ باندھنا ضروری ہے؟ اور عمامہ (پگڑی) کے بغیر نماز پڑھانا مکروہ ہے؟ بینوا توجروا۔

---

[۱] (ولا يتعين شيء من القرآن لصلاة على طريق الفرضية) بل تعين الفاتحة على وجه الوجوب (ويكره التعيين) [الدر المختار] ______ قال ابن عابدين: (قوله ويكره التعين إلخ) ... لأن الشارع إذا لم يعين عليه شيئا تيسيرا عليه كره له أن يعين، وعلله في الهداية بقوله: لما فيه من هجر الباقي وإيهام التفضيل ... وفي فتح القدير: لأن مقتضى الدليل عدم المداومة، لا المداومة على العدم ... وأيضا فإن إيهام هجر الباقي يزول بقراءته في صلاة أخرى. وأيضا ذكر في وتر البحر عن النهاية أنه لا ينبغي أن يقرأ سورة متعينة على الدوام لئلا يظن بعض الناس أنه واجب اهـ فهذا يؤيد ما في الفتح أيضا ______ هذا، وقيد الطحاوي والإسبيجابي الكراهة بما إذا رأى ذلك حتما لا يجوز غيره، أما لو قرأه للتيسير عليه أو تبركا بقراءته -عليه الصلاة والسلام- فلا كراهة لكن بشرط أن يقرأ غيرها أحيانا لئلا يظن الجاهل أن غيرها لا يجوز. (رد المحتار: ۱/ ۵۴۴، كتاب الصلاة، قبيل باب الإمامة، ط: دار الفكر-بيروت) ______ مزید تفصیل دیکھیے: فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بـ'ابن الهمام' (م: ۸۶۱ھ): ۱/ ۳۳۷، باب صفة الصلاة، فصل في القراءة، ط: دار الفكر.

الجواب حامداً ومصلیاً:

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: يَـٰبَنِيٓ ءَادَمَ خُذُوا۟ زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ وَلَا تُسْرِفُوٓا۟.[۱] مسجد جاتے وقت زینت لازم پکڑو۔ یعنی اچھی حالت میں اچھے کپڑے پہن کر، ستر چھپا کر پاک صاف ستھرے ہونے کی حالت میں مسجد میں جاؤ، اور ممکن ہو تو خوشبو بھی لگاؤ۔

اسی لیے رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: لہسن پیاز کھا کر ہماری مسجد میں کوئی نہ آئے۔ (بخاری شریف)[۲] بیڑی اور سگریٹ کا بھی یہی حکم ہے، پس بیڑی سگریٹ پی کر منہ کی بدبو، دور کیے بغیر مسجد جانا مکروہ تحریمی ہے، اسی کے حکم میں تیلی، قصائی اور ایسا مزدور بھی ہے، جن کے کپڑوں سے بو آتی ہو، یعنی ان کو اسی حالت میں مسجد میں آنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ ان کی وجہ سے نمازیوں کو تکلیف ہوگی۔

اسی بنا پر فقہاء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ ’’ثیاب بذلہ‘‘ یعنی معمولی کپڑوں میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، اور ’’ثیاب بذلہ‘‘ وہ ہے، جن کو پہن کر بزرگوں یا دوستوں کی محفل میں جاتے ہوئے شرم محسوس ہو۔[۳]

---

(۱) ۷-الاعراف: ۳۱۔

(۲) عن ابن عمر رضي الله عنهما: أن النبي صلى الله عليه وسلم قال في غزوة خيبر: من أكل من هذه الشجرة - يعني الثوم - فلايقربن مسجدنا. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۱۸، رقم الحديث: ۸۵۳، كتاب الأذان، باب ما جاء في الثوم النيء والبصل والكراث، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۰۹، رقم الحديث: ۶۸-۵۶۱، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب نهي من أكل ثوما أو بصلا أو كراثا أو نحوها، ط: البدر - ديوبند)

(۳) "و" "تكره "الصلاة في ثياب بذلة" بكسر الباء وسكون الذال المعجمة ثوب لا يصان عن الدنس ممتهن وقيل ما لا يذهب به إلى الكبراء ورأى عمر رضي الله عنه رجلا فعل ذلك فقال: أرأيت لو كنت أرسلتك إلى بعض الناس أكنت تمر في ثيابك هذه؟ فقال: لا. فقال عمر رضي الله عنه: الله أحق أن تتزين له. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح - حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹هـ) ص: ۱۳۱، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة، فصل في المكروهات، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

قال الطحطاوي: قوله: "وتكره الصلاة في ثياب البذلة" الظاهر أن الكراهة للتنزيه كما في البحر وفي القهستاني إن الكراهة للفعل في هذه الأشياء أي إيقاع الصلاة فيها إلا الصلاة وفي الجلابي أنها تكره بسبب هذه الأفعال اهـ. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ): ۳۵۹، فصل في المكروهات، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۴۱-۶۴۰، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار الفكر - ديوبند.

ان تفصیلات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر کوئی شخص عمامہ باندھے بغیر دوستوں کی محفل میں نہ جاتا ہو، یا شیروانی پہنے بغیر نہ نکلتا ہو، تو اس کا بغیر شیروانی پہنے یا عمامہ باندھے مسجد جانا مکروہ ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص صرف ٹوپی پہنتا ہو، اور عمامۃ اسی حالت میں دوستوں کی محفل میں آتا جاتا ہو، تو صرف ٹوپی پہن کر مسجد جانا اس کے لیے بلا کراہت جائز ہوگا، عمامہ باندھنا لازم نہیں ہوگا، اور اس حالت میں اس کی پڑھائی ہوئی نماز بلا کراہت جائز ہوگی۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] امام صاحب یا مدرس کا بیل بوٹے والا لباس پہننا

۶۷۴-سوال: (۱) امام صاحب نماز پڑھاتے وقت بیل بوٹے والی پینٹ پہن کر نماز پڑھاتے ہیں، تو ان کے پیچھے نماز صحیح ہے یا نہیں؟

(۲) مکتب کے استاذ -جو عالم صاحب اور حافظ صاحب ہیں- کا بیل بوٹے والا لباس پہننا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

(۱-۲) نیک لوگ جو لباس پہنتے ہوں، ایسا لباس پہننا مستحب ہے، بیل بوٹے والا لباس جائز ہے، حرام نہیں ہے، نماز صحیح ہوجائے گی۔[۲] لیکن قوم کے رہبروں کو ایسا لباس نہیں پہننا چاہیے، اس سے اجتناب

(۱) والمستحب أن يصلي الرجل في ثلاثة أثواب: قميص، وإزار، وعمامة. أما لو صلى في ثوب واحد متوشحا به تجوز صلاته من غير كراهة. (الفتاوى الهندية:۱/ ۵۹، كتاب الصلاة، الباب الثالث في شروط الصلاة، الفصل الأول في الطهارة وستر العورة، ط: زكريا- ديوبند☆المحيط البرهاني-ابن مازة البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ):۱/ ۳۷۷، كتاب الصلاة، الفصل السادس عشر في التغني والألحان، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆الاختيار لتعليل المختار-ابن مودود الموصلي (م:۲۸۳ھ):۱/ ۴۵، كتاب الصلاة، باب ما يفعل قبل الصلاة، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي-القاهرة☆البحر الرائق:۱/ ۲۸۳، باب شروط الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

وقد ذكروا أن المستحب أن يصلي في قميص وإزار وعمامة، ولا يكره الاكتفاء بالقنسوة، ولا عبرة لما اشتهر بين العوام من كراهة ذلك، وكذا ما اشتهر أن المؤتم لو كان معتما بعمامة والإمام مكتفيا على القلنسوة يكره. (عمدة الرعاية على هامش شرح الوقاية:۱/ ۱۶۹، كتاب الصلاة، سعيديه-پاكستان)

(۲) فإن الإسلام... لم يقرر للإنسان نوعا خاصا أو هيئة خاصة من اللباس ولا اسلوبا خاصا للمعيشة، وإنما وضع مجموعة من المبادي والقواعد الأساسية يجب المسلم أن يحتفظ بها في أمر لباسه... الخ. (تكمله فتح الملهم-محمد تقي العثماني):۴/ ۸۷، كتاب اللباس والزينة، ط: مكتبه دار العلوم كراتشي) =

کرنا چاہیے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] حنفی امام کا شافعی مذہب کے موافق نماز پڑھانا

۶۷۵-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے متعلق کہ: کوئی حنفی امام، شافعی مسلک کے موافق نماز پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

حنفی مسلک کے مقلد کے لیے لازم اور ضروری ہے کہ وہ ہر معاملہ میں مذہب احناف کی اقتدا کرے، اس کا نام تقلید شخصی ہے، جو باتفاق علماء واجب ہے، اس کے برعکس بعض امور میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر، بعض میں امام مالکؒ کے مسلک پر اور بعض میں امام ابوحنیفہ کے مسلک پر عمل کرنا، جسے "تلفیق" کہا جاتا ہے، ناجائز ہے، کیوں کہ جب کسی ایک امام کی اقتدا کرلی، تو اب دوسرے ائمہ کے مذہب کو اختیار کرنا درحقیقت دین کو اپنی خواہش کے تابع بنانا ہے۔[۱]

=فأما هيئة اللباس فيختلف باختلاف عادة كل بلد. (فتح الباري: ۱۰/ ۳۳۲، كتاب اللباس، باب المتشبهين بالنساء والمتشبهات بالرجال، ط: دار المعرفة-بيروت)

(۲) (وعنه): أي عن ابن عمر (قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم - (من تشبه بقوم): أي من شبه نفسه بالكفار مثلا في اللباس وغيره، أو بالفساق أو الفجار أو بأهل التصوف والصلحاء الأبرار. (فهو منهم): أي في الإثم والخير. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح-علي بن (سلطان) محمد، الملا، القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۷/ ۲۷۸۳، رقم الحديث: ۴۳۴۷، كتاب اللباس، ط: دار الفكر-بيروت)

[۱] (الثالثة) هل يجوز للعامي أن يتخير ويقلد أي مذهب شاء، قال الشيخ: ينظر إن كان منتسبا إلى مذهب بيناه على وجهين حكاهما القاضي حسين في أن العامي هل له مذهب أم لا؟ أحدهما لا مذهب له، لأن المذهب لعارف الأدلة، فعلى هذا له أن يستفتي من شاء من حنفي وشافعي وغيرهما.

والثاني وهو الأصح عند القفال: له مذهب فلا يجوز له مخالفته، وقد ذكرنا في المفتي المنتسب ما يجوز له أن يخالف إمامه فيه، وإن لم يكن منتسبا، بني على وجهين حكاهما ابن برهان في أن العامي هل يلزمه أن يتمذهب بمذهب معين؟ يأخذ برخصه وعزائمه؟ أحدهما لا يلزمه، كما لم يلزمه في العصر الأول أن يخص بتقليده عالما بعينه، فعلى هذا هل له أن يستفتي من شاء أم يجب عليه البحث عن أشد المذاهب وأصحها أصلا ليقلد أهله، فيه وجهان مذكوران،... والثاني يلزمه وبه قطع أبو الحسن إلكيا، وهو جار في كل من لم يبلغ رتبة الاجتهاد من الفقهاء وأصحاب سائر العلوم: ووجهه أنه لو جاز اتباع أي مذهب شاء لأفضى إلى أن يلتقط رخص المذاهب متبعا هواه=

ہاں کسی مسئلہ میں ضرورت کے وقت مذہب کے مقتدا اور مجتہدین علماء کرام اپنے مسلک کے علاوہ کسی اور مسلک پر عمل کرنے کا فتویٰ دیں، تو اس کی اجازت ہے، اس کے متعلق تفصیل کے لیے دیکھیے حضرت اقدس تھانویؒ کی کتاب ''الحیلة الناجزة''۔ (۲)

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کسی حنفی امام کے لیے اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ امام شافعی کے مسلک کے مطابق نماز پڑھائے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] قراءت میں غلطی امام کے لیے موجب ملامت نہیں

۶۷۶-سوال: مؤرخہ ۲-۵-۱۹۸۳ء بروز پیر، نماز مغرب میں ہمارے یہاں امام صاحب نے سورۂ البینة (لم یکن) شروع کی، پہلی رکعت میں پانچ آیات پڑھ کر رکوع میں چلے گئے، اب دوسری رکعت میں چھٹی آیت سے شروع کرنا لازم تھا؛ لیکن امام صاحب نے چھٹی آیت کو ترک کر کے ساتویں آیت سے دوسری رکعت کو شروع کر کے نماز مکمل کی۔

=ويتخير بين التحليل والتحريم والوجوب والجواز وذلك يؤدي إلى انحلال ربقة التكليف، بخلاف العصر الأول فإنه لم تكن المذاهب الوافية بأحكام الحوادث مهذبة وعرفت: فعلى هذا يلزمه أن يجتهد في اختيار مذهب يقلده على التعيين. (المجموع شرح المهذب - أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م:٦٧٦هـ): ١/ ٥٤-٥٥، مقدمة، فصل في آداب المستفتي وصفته وأحكامه، ط: دار الفكر☆فتاوى ابن الصلاح- عثمان بن عبد الرحمن، أبو عمرو، تقي الدين المعروف بـ'ابن الصلاح' (م: ٦٤٣هـ): ١/ ٨٧، فرعان، ت: د. موفق عبد الله عبد القادر، ط: مكتبة العلوم والحكم، عالم الكتب - بيروت☆فتح المعين بشرح قرة العين بمهمات الدين (هو شرح للمؤلف (زين الدين أحمد بن عبد العزيز المعبري المليباري الهندي- [م:٩٨٧هـ] على كتابه هو المسمى قرة العين بمهمات الدين): ١/ ٦١٣، باب القضاء، ط: دار بن حزم)

وأن الحكم الملفق باطل بالإجماع. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وأن الحكم الملفق) المراد بالحكم الحكم الوضعي كالصحة ـــ مثاله: متوضئ سال من بدنه دم ولمس امرأة ثم صلى فإن صحة هذه الصلاة ملفقة من مذهب الشافعي والحنفي والتلفيق باطل، فصحته منتفية. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ١/ ٧٥، مقدمة، قبيل مطلب في حكم التقليد والرجوع عنه، ط: دار الفكر - بيروت)

تلفيق بين المذاهب اور تقلید شخصی کے تفصیلی مباحث ودلائل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: اسی کتاب کی جلد اول، ص: ۴۸۳-۵۰۰۔

(۲) دیکھیے: ص: ۲۴-۲۶، ضرورت شدیدہ میں دوسرے ائمہ کے مذہب پر فتویٰ دینا، دوسرے ائمہ کے مذہب پر فتویٰ دینے کی بعض شرائط، ط: مکتبہ رضی- دیوبند۔

سوال یہ ہے کہ اس میں امام صاحب سے جو غلطی ہوئی، اس سے کلام پاک کی توہین ہوئی یا نہیں؟ اور جو شخص اتنی چھوٹی سورت میں غلطی کرسکتا ہے، اس کا کیا اعتبار؟ اور کیا ایسا شخص امامت کا مستحق ہے یا نہیں؟ حوالہ کے ساتھ جواب دیں گے، شکریہ۔

الجواب حامداًومصلیاً:

صورتِ مسئولہ میں نماز ہوجائے گی؛ کیوں کہ نماز میں سورۂ فاتحہ اور کم از کم تین آیات کا پڑھنا واجب ہے اور امام صاحب نے تین آیات پڑھ لی ہے۔ (۱)

صورتِ مسئولہ میں کلام پاک کی توہین کچھ نہیں ہوئی؛ کیوں کہ امام صاحب سے ایک آیت بھول سے ترک ہوگئی تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''رفع عن أمتي الخطاء والنسیان'' میری امت سے خطاء اور غلطی کا گناہ اٹھالیا گیا ہے۔ (۲)

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تلاوت میں غلطی واقع ہوگئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے بعض لوگ طہارت اچھی طرح حاصل نہیں کرتے ہیں، اس کا اثر مجھ پر ہوتا ہے'' (حدیث) [۳]

---

[۱] (وفرض القراءة آية على المذهب) . . . أقلها ستة أحرف ولو تقديرا، كـ "لم يلد"، إلا إذا كان كلمة، فالأصح عدم الصحة، وإن كررها مرارا إلا إذا حكم حاكم فيجوز ذكره القهستاني. ولو قرأ آية طويلة في الركعتين فالأصح الصحة اتفاقا؛ لأنه يزيد على ثلاث آيات قصار قاله الحلبي. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۳۷، باب صفة الصلاة، فصل في القراءة، ط: دار الفكر - بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۱، كتاب الصلاة، الفصل الثاني في واجبات الصلاة، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) وقال النبي - صلى الله عليه وسلم - رفع عن أمتي الخطأ والنسيان. قال في الفتح: ولم يوجد بهذا اللفظ في شيء من كتب الحديث؛ بل الموجود فيها "إن الله وضع عن أمتي الخطأ والنسيان وما استكرهوا عليه. رواه ابن ماجه وابن حبان والحاكم، وقال: صحيح على شرطهما ح. (قوله على رفع الإثم) وهو الحكم الأخروي، فلا يراد الدنيوي وهو الفساد لئلا يلزم تعميم المقتضي. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۱۵، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) عن شبيب أبي روح، عن رجل من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه صلى صلاة الصبح، فقرأ الروم فالتبس عليه، فلما صلى قال: ما بال أقوام يصلون معنا لا يحسنون الطهور، فإنما يلبس علينا القرآن أولئك. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن، النسائي (م: ۳۰۳ھ): ۲/ ۱۵۶، رقم الحديث: ۹۴۷، كتاب الافتتاح، القراءة في الصبح بالروم، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

ذرا سوچیے! جب مقتدی سے اعلیٰ درجے کی طہارت میں کمی واقع ہوگئی، تو اس کا اثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت پر ہوا، تو موجودہ دور میں بھلا امام اس سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں، جب کہ مقتدیوں کی سنت کے مطابق شکل وصورت نہیں، سنت کے مطابق لباس نہیں، اور طہارت کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، صورت حال یہ ہے کہ سگریٹ پی کر لوگ مسجد میں آتے ہیں، جس سے فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے اور انتہائی کم عمر کے معصوم بچے ساتھ لاتے ہیں، جو مسجد میں آکر شور وغل کرتے ہیں اور ان کے اولیا اور ذمہ دار اس سے روکتے نہیں ہیں، بھلا ان غیر شرعی امور کی وجہ سے امام اور مقتدیوں پر کیا کچھ اثر نہ پڑے گا؟ پھر بھی حال یوں ہے کہ امام کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے، ان پر لعنت وملامت کی جاتی ہے، جو بالکل صحیح نہیں ہے۔

تیسری بات: قراءت میں بھول چوک کا پایا جانا امام کی امامت کی عدم اہلیت پر دلالت نہیں کرتا؛ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی قراءت میں اور دوسرے ارکان میں بھول ہوئی ہے، جس کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔[۴] اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نسیان اس لیے طاری کیے گئے ہیں، تاکہ نسیان کے مسائل کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل واضح طور پر موجود رہے۔

الغرض صورت مسئولہ میں نماز صحیح ہوئی ہے، نیز امام صاحب امامت کے اہل اور لائق ہیں، خواہ مخواہ ان سے تعرض نہ کیا جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] نائب امام کی تعداد کتنی ہونی چاہیے؟

۶۷۷-سوال: ایک مسجد میں کتنے نائب امام رکھے جاسکتے ہیں، چار پانچ نائب امام رکھے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

---

(۴) عن أبي هريرة رضي الله عنه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم انصرف من اثنتين، فقال له ذو اليدين: أقصرت الصلاة، أم نسيت يا رسول الله؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أصدق ذو اليدين؟ فقال الناس: نعم، فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم فصلى اثنتين أخريين، ثم سلم، ثم كبر، فسجد مثل سجوده أو أطول، ثم رفع". (صحيح البخاري: ۱/ ۱۶۴، رقم الحديث: ۱۲۲۸، كتاب التهجد، باب من لم يتشهد في سجدتي السهو، ط: ديوبند، و انظر أيضا رقم: ۴۸۲- ۷۱۴- ۱۲۲۷- ۱۲۲۹- ۲۰۵۱- ۷۲۵۰ ☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۱۳، رقم الحديث: ۹۷-۹۹-(۵۷۳)، كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب السهو في الصلاة و السجود له، ط: مختار اينڈ كمپني- ديوبند)

الجواب حامداً ومصلیاً:

شریعت میں نائب امام کی کوئی خاص تعداد متعین نہیں ہے، حسب ضرورت کم وبیش رکھ سکتے ہیں، متولی اور ٹرسٹیوں کی صواب دید پر مبنی ہے، اگر ایک نائب امام سے کام چل جاتا ہو، تو ایک ہی کافی ہے، ورنہ دو یا تین جیسی ضرورت ہو، رکھ لیں، تعداد کوئی طے نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] عیسائی عورت کے ساتھ نکاح کرنے والے کی امامت

۶۷۸-سوال: جس شخص نے عیسائی عورت کے ساتھ نکاح کر رکھا ہو، اس کی امامت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر عیسائی عورت کا آسمانی کتاب کے موافق عقیدہ ہو تو اس سے نکاح کرنا جائز ہے۔[2] اور جب نکاح جائز ہے، تو امامت بھی جائز ہوگی، بہ شرطیکہ اس میں دیگر شرائط امامت موجود ہوں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] امام کا تقرری کے وقت بدعات سے متعلق شرائط منظور کرنا اور صلح حدیبیہ سے استدلال کرنا

۶۷۹-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ:

ہماری بستی کا ماحول دین کے اعتبار سے ایسا ہے کہ جمعہ کے روز خطبہ اردو وعربی میں پڑھا جاتا ہے

---

(۱) الضرورات تقدر بقدرها (قواعد الفقه - محمد عميم الإحسان المجددي البركتي (م: ۱۳۹۵ھ) ص: ۸۹، قاعدہ نمبر: ۱۷۱، ط: الصدف ببلشرز - كراتشي ☆ شرح القواعد الفقهية - أحمد بن الشيخ محمد الزرقا (م: ۱۳۵۷ھ)، ص: ۱۸۷، القاعدة الحادية والعشرون، المادة: ۲۲، ت: مصطفى أحمد الزرقا، ط: دار القلم - دمشق/سوريا)

(۲) وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ (۵-المائدۃ: ۵)

و كل من يعتقد دينا سماويا وله كتاب منزل كصحف إبراهيم - عليه السلام - وشيث وزبور داود - عليه السلام - فهو من أهل الكتاب فتجوز مناكحتهم، وأكل ذبائحهم، كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۸۱، كتاب النكاح، الباب الثالث في بيان المحرمات، القسم السابع المحرمات بالشرك، ط: دار الفكر)

اہل کتاب عورت سے مسلمان مرد کی شادی کی گنجائش ہے، لیکن اس میں مفاسد ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے [اپنے عہد خلافت میں] اس سے منع فرمایا تھا، اس لیے جہاں تک ہو سکے ایسا قدم نہ اٹھایا جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۱/ ۴۵۳، باب المحرمات، عیسائی لڑکی سے نکاح، ط: اشرفی بک ڈپو- دیوبند)

اور میت کو دفن کرنے کے بعد چالیس قدم پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے، پھر میت کے گھر جا کر بھی فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور محرم الحرام میں پنچایت اور بستی والے بھی تعزیہ بناتے ہیں اور دس روز تک مرثیہ خوانی ہوتی ہے، علاوہ ازیں بستی میں میلادیں بھی پڑھی جاتی ہیں اور اس میں کھڑے ہو کر تعظیم کرتے ہیں اور سلام پڑھتے ہیں اور محرم میں تیسرے دن تیجہ بھی کرتے ہیں اور گیارہویں شریف میں نیاز وغیرہ بھی ہوتی ہے، اب اس ماحول کے خلاف کوئی حکم شرعی بتائے تو جھگڑا ہونے کا ڈر رہتا ہے اور کئی مرتبہ جھگڑا ہو گیا ہے۔ بستی والوں نے ایک عالم صاحب کو مدرسہ میں تعلیم دینے اور مسجد میں امامت کے لیے چند شرطوں کے ساتھ رکھا ہے۔ وہ شرائط یہ ہیں:

(۱) اردو و عربی میں خطبہ پڑھانا ہوگا۔ (۲) میلادیں پڑھنی ہوں گی اور تعظیم بھی کرنی ہوگی۔ (۳) محرم الحرام میں دس روز مرثیہ خوانی میں جانا ہوگا۔ مجلس میں روایت پڑھنا ہوگا۔ (۴) دفن کے بعد چالیس قدم پر فاتحہ اور پھر گھر جا کر فاتحہ اور محرم الحرام کے تیسرے دن کا تیجہ؛ یہ سب کرنا ہوگا۔ (۵) بستی کے ماحول میں مولوی صاحب کو ڈھلنا ہوگا، بستی کا جو ماحول ہے، اس کے خلاف کچھ بھی بولنے کی ممانعت ہوگی۔

ان تمام شرائط کو مولوی صاحب نے منظور کرتے ہوئے امامت کر لی، اب مولوی صاحب وہ ہر کام کر رہے ہیں، جن کا اوپر ذکر ہوا اور اس کے خلاف بولتے بھی نہیں ہیں، جب کہ وہ اہل حق میں سے ہیں، ان کی اس ملازمت کو قریب پانچ ماہ ہو گئے ہیں، ہم نے ان سے بات کی تو انہوں نے چند دلائل دیے، مثلاً: صلح حدیبیہ میں بھی رسول اللہ ﷺ نے چند شرائط منظور کی تھی، بعد میں اللہ تعالیٰ نے فتح عطا کیا، پھر ہم نے پوچھا کہ کیا ائمہ اربعہ کے نزدیک اور بہ طور خاص امام اعظمؒ کے نزدیک ان شرائط پر امامت کرنا – اس امید کے ساتھ کہ کام سے آہستہ آہستہ اصلاح ہوگی – صحیح ہے؟ تو مولوی صاحب نے جواب نہیں دیا۔ اب آپ فرمائیں کہ کیا ایسا کرنا صحیح ہے، جب کہ شرط نمبر ۵ / بہت سخت ہے، اللہ اور رسول ﷺ کا کیا حکم ہے؟ کیا ہم ایسا طریقہ اصلاح کے لیے اختیار کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً

(۱) جمعہ خطبہ عربی میں ہوگا، عربی کے ساتھ اردو خطبہ ملانا جائز نہیں، بلکہ مکروہ تحریمی ہے۔ [1]

(۱) چوں خطب آں حضرت ﷺ و خلفاء و حلم جزا ملاحظہ کردیم، تنقیح آن وجود چند چیز است: حمد و شہادتین، و صلاۃ بر آں حضرت ﷺ، و امر بتقوی، و تلاوت قرآن پاک، و دعائے مسلمین و مسلمات، و عربی بودن خطبہ، و عربی بودن نیز بجہت عمل مستمرہ مسلمین، در مشارق و مغارب، باوجود آں کہ در بسیارے از اقالیم مخاطبان عجمی بودند۔ (مصفی شرح موطا، ص: ۱۵۴، باب التشدید علی من ترک الجمعۃ بغیر عذر، ط: کتب خانہ رحیمیہ، سنہری مسجد، دھلی، بہ حوالہ: فتاوی محمودیہ: ۸/ ۲۳۷-۲۳۸، باب صلاۃ الجمعۃ) =

(۲) میلاد، فاتحہ خوانی، قیام، تیجہ، محرم کا مرثیہ وغیرہ؛ تمام چیزیں بدعت ہیں۔ بدعت کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات نکالی، جو دین میں سے نہیں ہے، تو وہ مردود ہے۔ (متفق علیہ، مشکوۃ: ۲۷)[۲]

نیز حدیث پاک میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مضبوطی سے تھامے رہنے کی ہدایت دی اور فرمایا کہ اگر ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہوگے، تو گمراہی سے محفوظ رہوگے۔ (رواہ فی موطا، مشکوۃ: ۳۱)[۳]

ایک اور روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کہ: میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے، سب کے سب جہنمی ہوں گے، صرف ایک فرقہ جہنم سے نجات پائے گا اور یہ وہ فرقہ ہوگا، جو میرے اور میرے اصحاب کے طریق کو اختیار کرے گا۔ (ترمذی، مشکوۃ: ۳۰)[۴]

= ... فانه لاشك في أن الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوارثة من النبي -صلى الله عليه وسلم- والصحابة، فيكون مكروها تحريما. (عمدة الرعاية على هامش شرح الوقاية: ۱/ ۲۰۰، كتاب الجمعة، باب الجمعة، ط: ياسر نديم-ديوبند)

(۲) عن عائشة- رضي الله عنها- قالت: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود ☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۷۷، رقم الحديث: ۱۷-(۱۷۱۸)، كتاب الحدود، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور، ط: فيصل - ديوبند ☆ مشكاة المصابيح: ۲۷، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، الفصل الأول، ياسر نديم-ديوبند)

(۳) مالك، أنه بلغه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما: كتاب الله وسنة نبيه. (الموطأ-مالك بن أنس بن مالك بن عامر الأصبحي المدني (م: ۱۷۹هـ): ۵/ ۱۳۲۳، رقم الحديث: ۳۳۳۸/ ۶۷۸، كتاب القدر، النهي عن القول بالقدر، ت: محمد مصطفى الأعظمي، ط: مؤسسة زايد بن سلطان آل نهيان للأعمال الخيرية والإنسانية - أبو ظبي - الإمارات ☆ مشكاة المصابيح: ۳۱، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، ط: ياسر نديم- ديوبند)

(۴) عن عبد الله بن عمرو، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليأتين على أمتي ما أتى على بني إسرائيل، حذو النعل بالنعل، حتى إن كان منهم من أتى أمه علانية، لكان في أمتي من يصنع ذلك، وإن بني إسرائيل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة، وتفترق أمتي على ثلاث وسبعين ملة، كلهم في النار إلا ملة واحدة، قالوا: ومن هي يا رسول الله؟ قال: ما أنا عليه وأصحابي. (سنن الترمذي: ۲/ ۹۲، رقم الحديث: ۲۶۴۱، أبواب الإيمان، ما جاء في افتراق هذه الأمة، ط: البدر-ديوبند ☆ مشكاة المصابيح: ۳۰، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، الفصل الأول)

مذکورہ احادیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ بدعت جہنم تک پہنچانے والی شئے ہے اور بدعت کا مرتکب گمراہی کی راہ پر گامزن ہے۔ اُن خلاف شرع باتوں پر کسی شخص کا دنیوی مال ومتاع کے لیے تیار ہونا، اس کی گمراہی کی علامت ہے۔

وہ ان ناجائز شرائط کے منظور کرنے پر واقعۂ صلح حدیبیہ سے استدلال کرتا ہے اور اس سے دلیل پکڑتا ہے، یہ مزید گمراہ کن ہے؛ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود صاحب شریعت ہیں اور ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح نامہ حدیبیہ میں کون سی بات ایسی ہے، جو قرآن کریم کی آیات کے خلاف ہے؛ بل کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صلح تو عین موافق قرآن ہے، جس کی واضح اور صاف دلیل یہ ہے کہ کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود اس کو ''فتح مبین''[۵] سے تعبیر فرمایا ہے؛ اس لیے صلح حدیبیہ کے واقعہ پر قیاس کرنا کم عقلی کی بات ہے، مولوی صاحب کا جواب بالکل گمراہ کن ہے، اگر ان کی غرض ان شرائط کو منظور کر کے لوگوں میں انفرادی طور پر دینی ذہن ومزاج بنا کر شدہ شدہ اصلاح کرنے کی ہوتی، تو کسی درجہ میں گنجائش تھی، مگر وہ تو شرائط غیر شرعیہ کی منظوری اور تصدیق میں صلح حدیبیہ کو پیش کر رہے ہیں، جو حیلہ باز اور گمراہ کن کا شیوہ ہے۔

امت محمدیہ کے لیے روشنی اور ہدایت کے منار: کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ؛ دو ہی چیزیں ہیں اور سوال میں مذکورہ چیزیں (میلاد، فاتحہ خوانی اور تیجہ وغیرہ) کتاب اللہ اور سنت رسول کے خلاف ہیں اور اب وہ مولوی صاحب اہل حق میں سے تو کیا ہوتے، باطل کے اہل کار ہیں، ان گمراہ کن افکار وخیالات اور فاسد نظریات کو پھیلانے کا ایک موثر ذریعہ ہیں۔[۶] واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] ولد الزنا کے پیچھے نماز کا حکم

۶۸۰-سوال: ایک شخص کو ہندو سماج کی ایک لڑکی کے ساتھ محبت ہوگئی، وہ دونوں اپنے گھر سے بھاگ گئے، اور ایک ساتھ رہنے لگے، نکاح وغیرہ کی کوئی صورت اختیار نہیں کی، حتیٰ کہ لڑکی کو حمل ٹھہر گیا اور اس حمل سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جب وہ لڑکا بڑا ہوا، تو اس کو ایک مدرسہ میں داخل کر کے حافظ بنایا گیا، اس وقت وہ

---

(۵) إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ (۴۸- الفتح: ۱، ۲)

(۶) سوال میں مذکور تیجہ، فاتحہ خوانی اور اس طرح کی خرافات وبدعات کی تفصیل کے لیے فتاویٰ فلاحیہ کی پہلی جلد: (۳۶۱-۴۸۲) کے متعلقہ ابواب دیکھیے۔

مکمل حافظ قرآن ہے، اور ظاہراً پرہیزگار بھی ہے، تو کیا اس کے پیچھے نماز پڑھی جا سکتی ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

زنا کے نتیجے میں پیدا ہونے والا [بچہ] اگر حافظ قرآن ہو، متقی اور پرہیزگار ہو، تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ (عالمگیری: ۱/ ۶۷، شامی: ۱/ ۵۲۵)[۱]

مذہب اسلام میں عزت و ذلت کا مدار نسب اور خاندان نہیں؛ بل کہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے؛ اس لیے جب یہ لڑکا حافظ قرآن ہے اور عاقل و بالغ ہے، نیک اور پرہیزگار بھی ہے، تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہونا چاہیے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] امام کی تقرری کے لیے متولی کن چیزوں کا خیال رکھے؟

۶۸۱-سوال: امام متعین کرنے کے لیے متولی صاحب کی کیا ذمہ داری ہے؟

---

(۱) وتجوز إمامة الأعرابي والأعمى والعبد، وولد الزنا والفاسق. كذا في الخلاصة إلا أنها تكره. هكذا في المتون. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۵، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماما لغيره، ط: دار الفكر - بيروت)

"ولد الزنا کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے، جب کہ اس سے افضل امام موجود ہو"۔ عام متون میں یہی ہے۔ کراہت کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ ولد الزنا چوں کہ شفقت پدری سے محروم رہتا ہے، اس لیے عموماً جاہل اور ناخواندہ رہتا ہے، دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ عموماً اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر ولد الزنا متقی و پرہیزگار ہو اور حفظ قرآن اور علم دین کی دولت سے مالا مال ہو تو کراہت کی دونوں وجہ اس کے حق میں ختم ہو جائے گی؛ لہٰذا اس کی امامت بلا کراہت جائز ہونی چاہیے:

(وولد الزنا) هذا إن وجد غيرهم وإلا فلا كراهة بحر بحثا. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله وولد الزنا) إذ ليس له أب يربيه ويؤدبه ويعلمه فيغلب عليه الجهل بحر، أو لنفرة الناس عنه. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿۱۳﴾ (۴۹-الحجرات: ۱۳)

عن أبي نضرة، حدثني من سمع خطبة رسول الله صلى الله عليه وسلم في وسط أيام التشريق، فقال: "يا أيها الناس، ألا إن ربكم واحد، وإن أباكم واحد، ألا لا فضل لعربي على عجمي، ولا لعجمي على عربي، ولا أحمر على أسود، ولا أسود على أحمر، إلا بالتقوى. (مسند أحمد بن حنبل: ۳۸/ ۴۷۴، رقم الحديث: ۲۳۴۸۹، حديث رجل من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، ط: مؤسسة الرسالة)

الجواب حامدا ومصلیا:

متولی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ امامت کے عظیم منصب کے لیے کسی عالم، متبع سنت، نیک، متقی اور پرہیزگار شخص کو متعین کرے، کسی فاسق وفاجر اور بدعتی کو یہ ذمہ داری حوالہ کرے گا، تو گنہ گار ہوگا۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] میت کو غسل دینے والے امام کے پیچھے نماز پڑھنا

۶۸۲-سوال: ''میت کو غسل دینے والے امام کے پیچھے نماز مکروہ ہوتی ہے''، پھر بھی بعض گاؤں میں امام کو گاؤں کے کام کرنے کی شرط کے ساتھ امامت پر رکھتے ہیں، گاؤں کے کام سے مراد میت کو غسل دینا وغیرہ ہے، تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز مکروہ ہوگی؟

الجواب حامدا ومصلیا:

میت کو غسل دینا ثواب اور فضیلت کا کام ہے۔ [2] ''میت کو غسل دینے والے کے پیچھے نماز مکروہ ہوتی ہے'' یہ بات غلط ہے۔

---

(۱) الأولی بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية. ويجتنب الفواحش الظاهرة. (الفتاوی الهندية: ۱/ ۸۳، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، مكتبة زكريا-ديوبند☆ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۱/ ۱۵۷، كتاب الصلاة، فصل بيان من هو أحق بالإمامة وأولی بها، ط: دار الكتب العلمية☆ تحفة الفقهاء- أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو: ۵۴۰ھ): ۱/ ۲۳۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت) لو قدموا فاسقا يأثمون بناء علی أن كراهة تقديمه كراهة تحريم، لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير- إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ۹۵۶ھ) ص: ۳۱۵، كتاب الصلاة، الأولی بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی-لاہور)

(۲) عن علي بن رباح، قال: سمعت أبا رافع، يقول: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: من غسل ميتا فكتم عليه غفر له أربعين كبيرة، ومن حفر لأخيه قبرا حتی يجنه فكأنما أسكنه مسكنا مرة حتی يبعث. (المعجم الكبير - أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۱/ ۳۱۵، رقم الحديث: ۹۲۹، باب الألف، علي بن رباح اللخمي، عن أبي رافع، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية - القاهرة)

قال الهيثمي (م: ۸۰۷ھ): ورجاله رجال الصحيح. (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۳/۲۱، رقم الحديث: ۴۰۹۷، كتاب الجنائز، باب تجهيز الميت وغسله والإسراع بذلك، ت: حسام الدين القدسي، ط: مكتبة القدسي- القاهرة)

تاہم یہ حقیقت ہے کہ آج کل مؤذن کے ذمے اذان کے علاوہ ایسے کام سپرد کردیے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے سماج میں ان کی کوئی عزت ووقعت باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح میت کوغسل دینے والے کے ذمہ ایسے کام ہوتے ہیں، جن کی بناء پر ان کی کوئی قدر نہیں ہوتی، سماج میں لوگ اس کو گھٹیا اور کم درجہ کا تصور کرتے ہیں، حالاں کہ میت کوغسل دینے والے [۲] اور اذان دینے والے [۳] کا شریعت میں بہت اونچا مقام ہے؛ لیکن دوسرے کاموں کی وجہ سے وہ گھٹیا شمار ہوتا ہے اور اس کا رہن سہن بھی سماج میں معمولی درجے کا ہوتا ہے، طہارت ونظافت کی طرف توجہ بھی کم ہوتی ہے؛ حالاں کہ امامت کے لیے متقی، پرہیزگار، نماز کے مسائل سے واقف، صحت کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے والے، باعزت آدمی کی ضرورت ہے؛ لہٰذا اگر میت کوغسل دینے والا شخص ایسا بے پرواہ، جاہل ہو کہ پاکی ناپاکی کا خیال نہ رکھتا ہو اور ایسے امور انجام دیتا ہو، جن کی وجہ سے سماج میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہو، تو ایسے آدمی کی امامت مکروہ ہوگی۔ جیسا کہ کسی ان پڑھ گنوار آدمی کو دوسرے اچھے لوگوں کی موجودگی میں امام بنانا مکروہ ہے۔ (درمختار مع شامی: ۱/ ۵۵۰) [۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۲) عن عائشة، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من غسل ميتا، فأدى فيه الأمانة، ولم يفش عليه مايكون منه عند ذلك، خرج من ذنوبه كيوم ولدته أمه"، قال: "ليله أقربكم منه إن كان يعلم، فإن كان لا يعلم فمن ترون أن عنده حظا من ورع وأمانة". (مسند الإمام أحمد بن حنبل (م: ۲۴۱هـ): ۴۱/ ۳۷۳، رقم الحديث: ۲۴۸۸۱، مسند الصديقة عائشة بنت الصديق رضي الله عنها، ت: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة☆ المعجم الأوسط - أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰هـ): ۴/ ۳۷، رقم الحديث: ۳۵۷۵، باب الدال، من اسمه داود، ت: طارق بن عوض الله بن محمد، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين - القاهرة)

(۳) عن طلحة بن يحيى، عن عمه، قال: كنت عند معاوية بن أبي سفيان، فجاءه المؤذن يدعوه إلى الصلاة فقال معاوية: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: المؤذنون أطول الناس أعناقا يوم القيامة. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۶۷، رقم الحديث: ۱۴-(۳۸۷)، كتاب الصلاة، باب فضل الأذان وهرب الشيطان عند سماعه، ط: ديوبند)

(۴) ربط صلاة المؤتم بالإمام بشروط عشرة: نية المؤتم الاقتداء، واتحاد مكانهما وصلاتهما... الخ. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله بشروط عشرة) هذه الشروط في الحقيقة شروط الاقتداء، وأما شروط الإمامة، فقد عدها في نور الإيضاح على حدة، فقال: وشروط الإمامة للرجال الأصحاء ستة أشياء: الإسلام، والبلوغ، والعقل والذكورة، والقراءة، والسلامة من الأعذار كالرعاف، والفأفأة، والتمتمة، واللثغ، وفقد شرط كطهارة وستر عورة. اهـ. احترز بالرجال الأصحاء عن النساء الأصحاء فلا يشترط في إمامهن الذكورة، وعن الصبيان فلا يشترط في إمامهم البلوغ، وعن غير الأصحاء فلا يشترط في إمامهم الصحة، لكن يشترط أن يكون حال الإمام أقوى من حال المؤتم أو مساويا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲۷] دوران صلاۃ اگر کسی امام کا وضو ٹوٹ جائے تو وہ کیا کرے؟

۶۸۳-سوال: نماز پڑھاتے ہوئے اگر کسی امام صاحب کی ریح خارج ہو جائے تو اب وہ کیا کرے؟ کیا وہ کسی کو اپنا نائب بنائے یا پھر تمام مقتدیوں کی نماز فاسد ہو جائے گی؟

الجواب حامداومصليا:

اگر نماز کی حالت میں کسی امام کا وضو ٹوٹ جائے تو اسے چاہیے کہ اپنا خلیفہ بنائے اور خلیفہ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ رکوع کی کیفیت میں جھکا ہوا پیچھے ہٹ کر مقتدی میں سے کسی کو آگے کر کے امام بنا دے، امام بناتے وقت امام اول کو بولنے کی بھی ضرورت نہیں، اگر وہ بولے گا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، بات چیت کیے بغیر خاموشی کے ساتھ پیچھے والے کا کپڑا کھینچ کر اس کو آگے کر دے، وہ خود بخود امام بن جائے گا۔[۱] واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۸] امام صاحب کی اجازت کے بغیر امامت کرانا جائز نہیں

۶۸۴-سوال: نان پورا، گولنداز محلہ کی ملا عابد نامی مسجد میں، امام ومتولی کے ساتھ درج ذیل واقعہ پیش آیا ہے:

ہمارے امام صاحب ۴۰؍سال سے نماز پڑھاتے ہیں اور اخیری ۶/۵ سال سے رمضان میں تراویح کی نماز بھی وہی پڑھاتے ہیں اور زیادہ تر تراویح کے وقت عشاء کی نماز کی امامت بھی وہی کرتے ہیں، کبھی کبھی تراویح پڑھانے والے حفاظ کرام عشاء کی نماز امام صاحب کی اجازت لے کر پڑھاتے تھے۔ اس سال امام صاحب عشاء کی چار رکعت فرض پڑھانے کے لیے جا رہے تھے، تو ایک متولی نے ان کو روکا اور کہا کہ آپ عشاء کی نماز نہیں پڑھائیں گے، اب سے تراویح پڑھانے والے حفاظ کرام ہی عشاء کی نماز پڑھائیں گے، تب پیش امام

(۱) (سبق الإمام حدث) سماوي، لا اختيار للعبد فيه ولا في سببه ... (غير مانع للبناء) (استخلف) أي جاز له ذلك ولو في جنازة بإشارة أو جر لمحراب، ولو لمسبوق، ويشير بأصبع لبقاء ركعة، وبأصبعين لركعتين ويضع يده على ركبته لترك ركوع، وعلى جبهته لسجود، وعلى فمه لقراءة، وعلى جبهته ولسانه لسجود تلاوة أو صدره لسهو. (الدر المختار) ــــــ قال الشامي: (قوله بإشارة) متعلق بقوله استخلف. قال في الفتح: والسنة أن يفعله محدودب الظهر آخذا بأنفه يوهم أنه رعف. (رد المحتار: ۱/۶۰۱، كتاب الصلاة، باب الاستخلاف، دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۵۲۲-۵۲۳، کتاب الصلاۃ، فصل فی الاستخلاف، ط: مکتبہ زکریا-دیوبند)

نے کہا کہ فرض پڑھانے کے لیے میری اجازت ضروری ہے، تو متولی صاحب نے کہا کہ میں اجازت دیتا ہوں، میری اجازت سے حفاظ کرام فرض نماز پڑھائیں گے، بالآخر پیش امام ناراض ہو گئے۔

اس واقعے میں آپ سے چند سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) کیا عشاء کی چار رکعت پڑھانے کے لیے پیش امام کی اجازت ضروری ہے؟

(۲) متولی دینی بات میں (نماز کے لیے) اپنی من مانی کرتا ہے، تو کیا اس کا یہ رویہ درست ہے؟

(۳) ناراض ہونے والے امام کے پیچھے مقتدیوں کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

(۱) شریعت نے ایک نظام قائم کیا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ آپس میں میل محبت پیدا ہو، حق دار کو اس کا حق ملے اور ذمہ داری کا احساس کر کے ہر شخص اپنی ذمے داری کو نبھاتا رہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ: جس کو امامت کی ذمے داری سپرد کی گئی ہے، وہی شخص امامت کا حق دار ہوگا، حتی کہ اگر کوئی اس سے علم و فضل اور تقویٰ وطہارت میں بڑھا ہوا شخص آجائے تو بھی اسی اصل امام کا حق ہے۔ (شامی جلد ۱، ص: ۵۲۲)[1]

اب سوچیے! کہ یہاں تو امام صاحب چالیس سال سے متعین ہیں؛ لہٰذا امام صاحب کی بات صحیح ہے، متولی نے جہالت اور اپنے مقام ومرتبہ کا ناجائز فائدہ اٹھا کر، جو برتاؤ امام صاحب کے ساتھ کیا ہے، بہت ہی برا اور ناپسندیدہ ہے، اسے چاہیے کہ امام صاحب سے معافی مانگے؛ البتہ وہ نمازیں جو امام صاحب کی اجازت کے بغیر حافظ صاحب نے پڑھائی ہیں، وہ بلا شبہ صحیح ہو جائیں گی، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، متولی نے حافظ کو امامت کے لیے کہا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فقط حافظ ہی ہیں عالم نہیں، جب کہ امام صاحب عالم بھی ہیں، یہ چیز بھی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ امامت کے حق دار امام صاحب ہی ہیں نہ کہ وہ، جن کو متولی صاحب نے اجازت دی ہے۔

(۱) فإن اختلفوا اعتبر أكثرهم، ولو قدموا غير الأولى أساءوا بلا إثم.... (و) اعلم أن (صاحب البيت) ومثله إمام المسجد الراتب (أولى بالإمامة من غيره) مطلقا. قال في التتارخانية: ولو أن رجلين في الفقه والصلاح سواء إلا أن أحدهما أقرأ فقدم القوم الآخر فقد أساءوا وتركوا السنة، ولكن لا يأثمون؛ لأنهم قدموا رجلا صالحا. (قوله مطلقًا) أي وإن كان غيره من الحاضرين من هو أعلم وأقرأ منه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الامامة، ط: دار الفكر☆ مجمع الأنهر - عبد الرحمان بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/ ۱۶۲، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ہاں! اگر امام صاحب اپنی مرضی سے دوسرے کسی لائق حافظ، قاری، عالم کو امامت کے لیے کہیں، تو دوسرا شخص امامت کرا سکتا ہے، متولی حضرات کا اس میں کسی قسم کی دخل اندازی کرنا صحیح نہیں ہے۔

(۲) من مانی کرنے کے لیے اب صرف مسجد اور مدرسے ہی باقی رہ گئے ہیں، ان کے علاوہ کہیں پر اب کسی بھی طبقے کی من مانی نہیں چلتی ہے، اگر چل سکتی ہے، تو صرف مساجد و مدارس اور ان کے بھولے بھالے ائمہ اور مدرسین پر، یہ انتہائی افسوس ناک بات ہے۔

متولیان کرام کا خود شریعت سے دور ہو کر، قرآن وحدیث سے دور ہو کر، من مانی کرنا شرعی اعتبار سے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے؛ اچھی طرح یاد رکھیں، ان ائمہ اور مدرسین کی بے عزتی کرنا، ان کو نگاہ حقارت سے دیکھنا، خود اپنی عاقبت تباہ کرنا اور اپنے اعمال کو اکارت کرنے کے مترادف ہے۔

(۳) آپ کا تیسرا سوال یہ تھا کہ: ناراض ہونے والے امام کے پیچھے مقتدیوں کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ جواب یہ کہ نماز تو صحیح ہو جائے گی؛ البتہ مقتدی حضرات کو چاہیے کہ اپنے امام صاحب کو راضی رکھیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] پیش امام کی اجازت کے بغیر نائب امام کا امامت کرانا

۶۸۵-سوال: ہمارے گاؤں کی مسجد کے دو امام ہیں، ایک پیش امام، اور ایک نائب امام۔ ظہر کی نماز ۱:۳۰ بجے کھڑی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جب مؤذن صاحب اقامت کے لیے کھڑے ہوئے، اور امام صاحب موجود نہیں تھے، تو مؤذن صاحب نے نائب امام کو نماز پڑھانے کا اشارہ کیا، چناں چہ ہمارے نائب امام صاحب نے پیش امام کا انتظار کیے بغیر امامت کرائی، جب نماز مکمل ہوئی، تو پیش امام نے کہا کہ میری اجازت کے بغیر نائب امام نے نماز پڑھائی ہے؛ لہٰذا تم میں سے کسی کی نماز درست نہیں ہوئی اور مقتدیوں میں سے بعض نے کہا کہ نماز صحیح ہوگئی۔ امام صاحب بھی چوں کہ کوئی عالم نہیں ہیں، امام صاحب نے عوام کو نماز کے بارے میں شک میں ڈال دیا ہے، اس لیے آپ سے سوال یہ ہے کہ کیا امام صاحب کی بات صحیح ہے یا نہیں؟ نیز نائب امام نے پیش امام کی غیر حاضری (یعنی: پیش امام صاحب وضو کر رہے تھے) میں ان کی اجازت کے بغیر نماز پڑھائی، تو کیا ان کا نماز پڑھانا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

امامت ایک دینی منصب ہے، اس کا ادب واحترام ہر مسلمان پر فرض ہے۔[1] (۲) نائب امام کی ذمے داری یہ ہے کہ امام کی غیر حاضری میں امامت کرائے۔[2] (۳) اور اگر امام ہو، تو کچھ شرائط کے ساتھ ذمے داری رہے گی۔[3]

آپ کی تحریر کے مطابق امام صاحب موجود نہیں تھے، نائب امام کو مؤذن نے اشارہ کیا اور نائب امام نے امامت کرائی؛ لہٰذا اس صورت میں نماز بغیر کسی کراہت کے درست ہوگئی۔ اگر پیش امام موجود ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر نائب امام کے لیے امامت کرانا مکروہ ہوگا؛ کیوں کہ یہ ان کا حق ہے، اس کے باجود نائب امام کی پڑھائی ہوئی نماز ہوجائے گی، اعادے کی کوئی حاجت نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] قوله تعالى: إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا. (۲- البقرة: ۱۲۴) فإن الإمام من يؤتم به في أمور الدين من طريق النبوة وكذلك سائر الأنبياء أئمة عليهم السلام لما ألزم الله تعالى الناس من اتباعهم والائتمام بهم في أمور دينهم فالخلفاء أئمة لأنهم رتبوا في المحل الذي يلزم الناس اتباعهم وقبول قولهم وأحكامهم والقضاة والفقهاء أئمة أيضا ولهذا المعنى الذي يصلي بالناس يسمى إماما لأن من دخل في صلاته لزمه الاتباع له والائتمام به وقال النبي صلى الله عليه وسلم (إنما جعل الإمام إماما ليؤتم به فإذا ركع فاركعوا وإذا سجد فاسجدوا) وقال (لا تختلفوا على إمامكم)... وإذا ثبت أن اسم الإمامة يتناول ما ذكرناه فالأنبياء عليهم السلام في أعلى رتبة الإمامة ثم الخلفاء الراشدون بعد ذلك ثم العلماء والقضاة العدول ومن ألزم الله تعالى الاقتداء بهم ثم الإمامة في الصلاة ونحوها. (أحكام القرآن- أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م: ۳۷۰هـ): ۱/ ۸۴، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

[۲] (و) اعلم أن (صاحب البيت) ومثله إمام المسجد الراتب (أولى بالإمامة من غيره) مطلقًا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الامامة، ط: دار الفكر ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۱۰۷، باب الإمامة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۳] (والأحق بالإمامة)... (الأعلم بأحكام الصلاة)... صحة وفسادًا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة، (ثم الأحسن تلاوةً) وتجويدًا (للقراءة، ثم الأورع) (ثم الأسن) (ثم الأحسن خلقًا) (ثم الأحسن وجهًا) (ثم الأشرف نسبًا) (فإن استووا يقرع) بين المستويين (أو الخيار إلى القوم) فإن اختلفوا اعتبر أكثرهم؛ ولو قدموا غير الأولى أساءوا بلا إثم. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۵۷، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، كتاب الصلاة، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، ط: مكتبه زكريا- ديوبند)

[۳۰] مہینے میں چار یا پانچ مرتبہ امام صاحب کی جماعت فجر کا فوت ہوجانا
[۳۱] اگر امام صاحب کی صبح میں آنکھ نہ کھلے، تو انہیں جگانا کیسا ہے؟

۶۸۶-سوال: ہمارے امام صاحب سے ایک مہینے میں چار یا پانچ مرتبہ فجر کی جماعت فوت ہوجاتی ہے، جب اُن سے اس بارے میں دریافت کیا جاتا ہے، تو کبھی وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ غسل کی حاجت تھی، اور کبھی عذر بیان کرتے ہیں کہ آنکھ لگ گئی تھی، تو کیا اُن کا یہ عذر معتبر ہوگا؟

ہماری مسجد میں تین یا چار مقتدی ہوتے ہیں، پھر امام صاحب فرماتے ہیں کہ آپ حضرات مجھے جگادیا کریں، تو کیا مقتدیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اُنھیں جگائیں؟

بعض مرتبہ امام صاحب کو بیدار ہوکر آنے میں دیر ہوجاتی ہے، تو امام صاحب کے از خود آنے تک انتظار کرنا بہتر ہے یا اُن کو جگانے کے لیے کسی ایک مقتدی کو بھیجنا بہتر ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ نماز باجماعت کا پابند ہو، خصوصاً جب کہ امامت کے ذمہ داری سنبھالی ہو، تو اُس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، لہٰذا امام صاحب کو چاہیے کہ نماز کے وقت سے پہلے جاگنے کا مکمل انتظام کریں، مثلاً گھڑی میں الارم رکھیں، یا کسی سے جگانے کے لیے کہہ دیں، یا مقتدی حضرات اُنھیں جگانے کی ذمہ داری اٹھالیں، اگر امام صاحب مہینے میں چار یا پانچ مرتبہ جماعت کے فوت ہوجانے پر کوئی عذرِ معقول پیش کرتے ہیں، علاوہ ازیں وہ نوجوان ہیں، تو اُن کا عذر معقول ہے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ مہینے کے دوسرے دِنوں میں جماعت کی پابندی کرتے ہوں، تو یہ اُن کی دین داری کی علامت ہے۔[1] اگر مقتدی

---

(۱) (والجماعة سنة مؤكدة للرجال)... (وقيل واجبة وعليه العامة) أي عامة مشايخنا وبه جزم في التحفة وغيرها. قال في البحر: وهو الراجح عند أهل المذهب (فتسن أو تجب) ثمرته تظهر في الإثم بتركها مرة (على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلاة بالجماعة من غير حرج)... إلا إذا واظب تكاسلا فلا يعذر، ويعزر ولو بأخذ المال يعني بحبسه عنه مدة ولا تقبل شهادته إلا بتأويل بدعة الإمام أو عدم مراعاته. (الدر المختار: ۱/ ۵۵۲-۵۵۶) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله قال في البحر إلخ) وقال في النهر: هو أعدل الأقوال وأقواها ولذا قال في الأجناس: لا تقبل شهادته إذا تركها استخفافا ومجانة، إما سهوا، أو بتأويل، ككون الإمام من أهل الأهواء أو لا يراعي مذهب المقتدي فتقبل. اهـ... (قوله بتركها مرة) أي بلا عذر، وهذا عند العراقيين، وعند=

حضرات اُن کے جگانے کا کام خود کرلیں، تو یہ بھی تبلیغ دین میں شامل ہے، جس پر اُن کو ثواب ملے گا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی جب فجر کی نماز پڑھانے کے لیے تشریف لے جاتے، تو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے تھے، تاکہ انھیں بیدا کردیں۔[۲] نیز دوسری ایک حدیث میں مروی ہے کہ جو شخص نماز کے وقت سویا رہا، (اور اس کے جاگنے کا پختہ ارادہ تھا) یا نماز کا وقت بھول گیا، تو اُسے چاہیے کہ جاگنے کے بعد جب اُسے یاد آئے قضا کرلے۔[۳]

علماء نے لکھا ہے کہ نماز باجماعت پڑھنے کا پختہ ارادہ تھا، پھر کوشش کے باوجود نہیں جاگ سکا، تو وہ

=الخراسانيين إنما يأثم إذا اعتاده كما في القنية. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۴، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت ☆بدائع الصنائع: ۱/ ۳۸۴، صلاة الجماعة، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) عن أنس بن مالك، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يمر بباب فاطمة ستة أشهر إذا خرج إلى صلاة الفجر يقول: الصلاة يا أهل البيت {إنما يريد الله ليذهب عنكم الرجس أهل البيت ويطهركم تطهيرا}. (سنن الترمذي: ۲/ ۱۵۶، رقم الحديث: ۳۲۰۶، أبواب تفسير القرآن عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب: ومن سورة الأحزاب، ط: البدر - ديوبند ☆مسند أبي داود الطيالسي - أبو داود سليمان بن داود بن الجارود الطيالسي البصرى (م: ۲۰۴هـ): ۳/ ۵۳۹، رقم الحديث: ۲۱۷۱، وما أسند أنس بن مالك الأنصاري، ت: د. محمد بن عبد المحسن التركي، ط: دار هجر - مصر)

عن أبي الحمراء، قال: شهدت النبي صلى الله عليه وسلم ثمانية أشهر، كلما خرج إلى الصلاة - أو قال: إلى صلاة الفجر -، مر بباب فاطمة فيقول: " السلام عليكم أهل البيت: {إنما يريد الله ليذهب عنكم الرجس أهل البيت ويطهركم تطهيرا} [الأحزاب] (مسند ابن أبي شيبة - أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵هـ): ۲/ ۳۳۲، رقم الحديث: ۲۰۷ و ۲۲۷، حديث أبي الحمراء، ت: عادل بن يوسف العزازي وأحمد بن فريد المزيدي، ط: دار الوطن - الرياض)

(۳) عن عبد الله بن رباح الأنصاري، حدثنا أبو قتادة، أن النبي صلى الله عليه وسلم كان في سفر له فمال رسول الله صلى الله عليه وسلم وملت معه، قال: انظر، فقلت: هذا راكب، هذان راكبان، هؤلاء ثلاثة، حتى صرنا سبعة، فقال: احفظوا علينا صلاتنا - يعني صلاة الفجر - فضرب على آذانهم فما أيقظهم إلا حر الشمس فقاموا فساروا هنية ثم نزلوا فتوضئوا وأذن بلال فصلوا ركعتي الفجر، ثم صلوا الفجر وركبوا، فقال بعضهم لبعض: قد فرطنا في صلاتنا، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: إنه لا تفريط في النوم، إنما التفريط في اليقظة فإذا سها أحدكم عن صلاة، فليصلها حين يذكرها، ومن الغد للوقت. (سنن أبي داود: ۱/ ۶۳، رقم الحديث: ۴۳۷، كتاب الصلاة، باب في من نام عن الصلاة، أو نسيها، ط: البدر - ديوبند)

گنہگار نہیں ہوگا، لہٰذا مذکورہ امام صاحب کا عذر صحیح ہے، ماننے کے قابل ہے۔ [۱]

اگر دو چار مقتدی ہیں، تو کسی ایک کو چاہیے کہ وہ نماز کے وقتِ مستحب کا خیال کرتے ہوئے امام صاحب کو جگادے، تاکہ وقتِ مقررہ پر نماز ادا ہو سکے، لیکن ایک ہی وقتِ متعین پر جماعت قائم کریں، ورنہ فتنہ کا اندیشہ ہے، سوائے یہ کہ کسی بڑے عالم کی تشریف آوری ہو، تو اُن کے لیے کچھ دیر انتظار جائز ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] دار العلوم میں پڑھنے والے طلبہ کے پیچھے نماز پڑھنا

۶۸۷-سوال: ہمارے گاؤں کے بہت سے بچے دار العلوم میں داخلہ لے کر دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اُن کے پیچھے گاؤں کے بہت سے علماء اور مفتیان کرام نماز پڑھتے ہیں، تو ان کی نماز ادا ہوگی یا اُس میں کوئی کمی رہ جائے گی؟ بینوا تو جروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اِمامت کا ترجیحی بنیاد پر زیادہ مستحق وہ شخص ہے، جو مسائل نماز سے بہ خوبی واقف ہو، اگرچہ نماز کے علاوہ دوسرے مسائل کی واقفیت میں کمزور ہو، علاوہ ازیں اُس کا دین دار ہونا ضروری ہے، کہ اس معاملے میں متہم نہ ہو، گناہ کے کاموں سے دور رہتا ہو، اور صحیح تلاوتِ قرآن کرسکتا ہو۔ (عالمگیری: ۱/ ۸۳) [۲]

اگر مدارسِ عربیہ میں پڑھنے والے طلبہ میں ذکر کردہ اوصاف پائے جاتے ہوں، تو اُن کے پیچھے نماز

---

(۱) "وإذا انقطع عن الجماعة لعذر من أعذارها المبيحة للتخلف" وكانت نيته حضورها لولا العذر الحاصل "يحصل له ثوابها" لقوله صلى الله عليه وسلم: "إنما الأعمال بالنيات وإنما لكل امرئ مانوى" (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح- حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹ھ) ص: ۱۱۳، باب الإمامة، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

[۲] الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية.

ويجتنب الفواحش الظاهرة وإن كان غيره أورع منه. كذا في المحيط وهكذا في الزاهدي وإن كان متبحرا في علم الصلاة لكن لم يكن له حظ في غيره من العلوم فهو أولى. كذا في الخلاصة. . . .

دخل المسجد من هو أولى بالإمامة من إمام المحلة فإمام المحلة أولى. كذا في القنية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، ط: دار الفكر)

درست ہے، مذکورہ بالا اوصاف کا اعتبار امام کے منتخب کرنے کے لیے ہوگا، اگر کسی مسجد میں امامِ مؤظف (تنخواہ دار امام) مقرر ہے، اور اُس سے زیادہ علم وتقویٰ والا کوئی دوسرا شخص آئے، تب بھی مقرر امام نماز پڑھانے کا زیادہ حق دار ہے، لیکن اگر مقرر کردہ امام فاسق وفاجر ہو، تو اُسے معزول کر کے دوسرا عالم اور متقی امام منتخب کرنا مسجد کے ذمہ داروں پر لازم ہے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] امام صاحب کی سخت کلامی کی وجہ سے اُن کو معزول کرنا

۶۸۸-سوال: ہمارے شہر ولساڑ میں ایس۔ ٹی۔ ڈپو سے قریب ایک مسجد ہے، جس کے امام صاحب کی سخت کلامی کی وجہ سے ایک بڑے فتنہ کا اندیشہ ہے، مختصراً اُس کی تفصیل یہ ہے کہ امام صاحب کو چند وجوہات کی بنیاد پر معزول کیا گیا ہے، جن میں سے ایک یہ کہ وہ مدرسہ میں بچوں کو صحیح ڈھنگ سے تعلیم نہیں دیتے تھے، اس پر اگر ٹرسٹی حضرات کچھ باز پرس کرتے، تو امام صاحب اُنہیں یہ جواب دیتے کہ: ''آپ لوگ ٹرسٹی بننے کے قابل ہی نہیں ہیں''۔ یہ بھی کہتے تھے کہ: ''جمعہ کے دن جو کچھ چندہ تمہارے ڈبے میں آتا ہے، وہ صرف میری وجہ سے آتا ہے''۔

امام صاحب کی بیوی بھی وقتاً فوقتاً ٹرسٹی حضرات کے ساتھ جھگڑتی رہتی تھی، پھر یہ کہ امام صاحب کو متعدد مرتبہ منع کیا گیا کہ تم مرغیاں اور بکریاں پالنا چھوڑ دو، اس لیے کہ مسجد قریب ہے، مرغی اور بکری کی وجہ سے مسجد کے اندر گندگی ہونے کا اندیشہ ہے۔ (ایک مرتبہ ایسا ہوا بھی کہ اُن کی بکری جماعت خانہ میں آ گئی) لیکن امام صاحب بالکل اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، آخری تین سال سے اس طرح منازعت جاری تھی، بالآخر اُنھیں ٹرسٹی حضرات نے معزول کر دیا، تو کیا یہ اقدام شرعی اعتبار سے درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

سوال میں ذکر کردہ شکایتیں اگر درست ہوں، تو امام صاحب کو معزول کرنے کا حق ٹرسٹی حضرات کو حاصل ہے، لیکن ایک عالم دین کی توہین نہ ہو، اس کا خیال رکھنا ضروری ہے، امام صاحب سے میں مؤدبانہ درخواست کروں گا کہ اگر ٹرسٹی حضرات کے ساتھ نباہ نہ ہو رہا ہو، تو اپنی جانب سے استعفیٰ پیش کر دینا چاہیے،

---

[1] لو قدموا فاسقاً یأثمون بناءً علی أن کراھۃ تقدیمہ کراھۃ تحریم، لعدم اعتنائہ بأمور دینہ. (حلبی کبیر - إبراھیم بن محمد بن إبراھیم الحلبي (م: ۹۵۶ھ) ص: ۵۱۳، کتاب الصلاۃ، الأولی بالإمامۃ، ط: سہیل اکیڈمی - لاہور)

اور کوئی ایسی حرکت ہرگز نہیں کرنی چاہیے، جو علماء کی شان کے خلاف ہو۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۴] حرم شریف میں تعمیر شدہ اونچے مکانات میں رہ کر امام کی اقتدا کرنا

۶۸۹-سوال: حرم شریف کے اِرد گرد چھ، سات یا دس منزلہ اونچے مکانات بنے ہوئے ہیں، جن میں حجاجِ کرام حج کے دوران رہتے ہیں، اگر کوئی شخص اِن مکانات میں کھڑا ہو کر اِمام کی اقتدا کی نیت کرے، تو اُس کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ اگر کوئی شخص ایسا معذور ہو کہ اُس کو نیچے اترنے اور اوپر آنے میں دشواری ہو، تو اُس کے لیے اِن مکانات میں سے اقتدا کا حکمِ شرعی کیا ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

اگر مسجد کی جماعت کی صفیں تعمیر سے متصل ہوں، اور بیچ میں کوئی راستہ وغیرہ حائل نہ ہو، تو اُس تعمیر کے ہر منزلہ میں اقتدا صحیح ہوگی، لیکن اوپری منزلہ میں اقتدا کے صحیح ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ نیچے والے منزلہ میں بھی کچھ لوگ اِمام کی اقتدا کر رہے ہوں، اگر جماعت کی صفوں کا سلسلہ تعمیر کے ساتھ متصل نہ ہو؛ بلکہ بیچ میں کوئی راستہ وغیرہ حائل ہے، جس میں لوگوں کا اور سواریوں کا گزر ہوتا ہو، تو اقتدا صحیح نہیں ہے، اور اقتدا کے باب میں بیمار اور تندرست شخص ایک ہی حکم میں ہیں۔ (فتاویٰ عالمگیری: ۱/ ۸۷)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فالأنبياء عليهم السلام في أعلى رتبة الإمامة، ثم الخلفاء الراشدون بعد ذلك، ثم العلماء والقضاة العدول ومن ألزم الله تعالى الاقتداء بهم، ثم الإمامة في الصلاة ونحوها. (أحكام القرآن - أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م: ۳۷۰ھ): ۱/ ۸۳، الحث على نظافة البدن والثياب، سورة البقرة، ت: عبد السلام محمد علي شاهين، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: " إنما جعل الإمام ليؤتم به، فلا تختلفوا عليه. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۰۰، رقم الحديث: ۷۲۲، كتاب الأذان، باب: إقامة الصف من تمام الصلاة، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۷۷، رقم الحديث: ۸۶-(۴۱۴)، كتاب الصلاة، باب ائتمام المأموم بالإمام، ط: البدر - ديوبند)

(۲) المانع من الاقتداء ثلاثة أشياء.

(منها) طريق عام يمر فيه العجلة والأوقار هكذا في شرح الطحاوي إذا كان بين الإمام وبين المقتدي طريق إن كان ضيقا لا يمر فيه العجلة والأوقار لا يمنع وإن كان واسعا يمر فيه العجلة والأوقار يمنع. كذا في فتاوى قاضي خان والخلاصة هذا إذا لم تكن الصفوف متصلة على الطريق أما إذا اتصلت الصفوف لا يمنع الاقتداء. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۷، كتاب الصلاة، الفصل الرابع في بيان ما يمنع صحة الاقتداء وما لا يمنع، ط: زكريا - ديوبند ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۳۰ تا ۳۳۵، باب الإمامة، كتاب الصلاة، ط: زكريا - ديوبند)

[۳۵] ایسے شخص کا اِمامت کرنا، جسے ریح کے خارج ہونے کا عذر ہو

۶۹۰- سوال: مجھے ریح کے خارج ہونے کی تکلیف ہے، تو ایسی صورت میں میں امامت کرسکتا ہوں یا نہیں؟ اگر نہیں کرسکتا تو رمضان میں تراویح پڑھا سکتا ہوں یا نہیں؟ اگر اس تکلیف کے ہوتے ہوئے نماز پڑھادی، تو مقتدیوں کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر آپ کو اتنا وقت مل جاتا ہے کہ آپ وضوء کرکے فرض نماز پڑھا سکیں اور دورانِ نماز کوئی ایسی شکایت پیدا نہیں ہوتی کہ جس سے نماز فاسد ہوجائے، تو نماز پڑھانا جائز ہے، اگر یہ اندیشہ رہتا ہے کہ دوران صلاۃ عذر پیش آجائے گا اور اس کی وجہ سے نماز فاسد ہوجائے گی، تو بہتر یہ ہے کہ آپ امامت نہ کریں، اگر امامت کی اور نماز کے دوران ریح خارج نہیں ہوئی، تو نماز درست ہوجائے گی، تراویح کا بھی یہی حکم ہے۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۶] سفید داغ والے شخص کی امامت

۶۹۱- سوال: ہماری مسجد کے پیش امام پچھلے بیس سالوں سے نماز پڑھاتے ہیں؛ لیکن اب

---

(۱) (وكذا لا يصح الاقتداء... (ولا طاهر بمعذور) هذا (إن قارن الوضوء الحدث أو طرأ عليه) بعده (وصح لو توضأ على الانقطاع وصلى كذلك). [الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۷۸، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت]

(قوله وطاهر بمعذور) أي وفسد اقتداء طاهر بصاحب العذر المفوت للطهارة؛ لأن الصحيح أقوى حالا من المعذور والشيء لا يتضمن ما هو فوقه والإمام ضامن بمعنى تضمن صلاته صلاة المقتدي، وقيد المعذور في المجتبى بأن يقارن الوضوء الحدث أو يطرأ عليه للاحتراز عما إذا توضأ على الانقطاع وصلى كذلك فإنه يصح الاقتداء به؛ لأنه في حكم الطاهر. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق: ۱/ ۳۸۱، باب الإمامة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

مزید دیکھیے: النهر الفائق شرح كنز الدقائق: ۱/ ۲۵۱، كتاب الصلاة، فرع قبل: باب الحدث في الصلاة، ت: أحمد عزو عناية، ط: دار الكتب العلمية ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ 'داماد آفندي' (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/ ۱۱۱، أولى الناس بالإمامة، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵ھ): ۱/ ۸۸، فصل في الإمامة، جماعة النساء وحدهن، ط: دار إحياء الكتب العربية.

اُن کی چمڑی پر کسی بیماری کی وجہ سے سفید داغ نکل آئے ہیں، تو اب ان کے لیے نماز پڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

چمڑی پر سفید داغ والے شخص کی امامت درست ہے، اُس میں کوئی حرج کی بات نہیں، اگر اس سے مقتدی کو گھن محسوس نہ ہو۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۷] حافظِ قرآن شخص کا جمعہ کے دن تقریر، خطبہ اور نماز پڑھانا

۶۹۲- سوال: ایک شخص حافظِ قرآن ہے، اور اُس نے کچھ سال درسِ نظامی کی تعلیم بھی حاصل کی ہے، اور وہ ایک مسجد میں امامت کرتا ہے، تو کیا یہ شخص جمعہ کی تقریر کر سکتا ہے؟ نیز خطبہ اور نمازِ جمعہ بھی پڑھا سکتا ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

یہ شخص اگر مسائلِ نماز سے واقف ہو، تو اُس کے لیے جمعہ میں وعظ، خطبہ اور نماز پڑھانا جائز ہے، کوئی حرج نہیں ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۸] ناظرہ پڑھے ہوئے شخص کی امامت

۶۹۳- سوال: ہمارے محلہ میں مستقل امام نہیں ہیں، جس کی بناء پر ایک آدمی جس نے صرف

---

(۱) وكذا تكره خلف أمرد وسفيه ومفلوج، وأبرص شاع برصه. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله ومفلوج وأبرص شاع برصه) وكذلك أعرج يقوم ببعض قدمه، فالاقتداء بغيره أولى تتارخانية، وكذا أجذم برجندي، ومجبوب وحاقن، ومن له يد واحدة فتاوى الصوفية عن التحفة. والظاهر أن العلة النفرة، ولذا قيد الأبرص بالشيوع ليكون ظاهرا ولعدم إمكان إكمال الطهارة أيضا في المفلوج والأقطع والمجبوب. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ حاشية على مراقي الفلاح: ۱/ ۳۰۲، فصل في بيان الأحق، ط: المطبعة الكبرى الاميرية، بولاق، مصر)

(۲) الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية. ويجتنب الفواحش الظاهرة، وإن كان غيره أورع منه. كذا في المحيط وهكذا في الزاهدي وإن كان متبحرا في علم الصلاة لكن لم يكن له حظ في غيره من العلوم فهو أولى. كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، ط: دار الفكر)

ناظرہ کیا ہوا ہے، بلا تنخواہ، فی سبیل اللہ اپنے محلہ کے جماعت خانہ میں امامت کرتے ہیں؛ چوں کہ امام صاحب صرف ناظرہ پڑھے ہوئے ہیں، اس وجہ سے سورۃ الضحیٰ سے سورۃ الناس تک کی سورتیں نماز میں تلاوت کرتے ہیں، اگر اس جماعت خانے میں نماز پڑھنے کے لیے کوئی حافظ قرآن یا عالم دین آجاتے ہیں، تو مذکورہ شخص، آئے ہوئے حافظ و عالم سے نماز پڑھانے کی درخواست کرتے ہیں؛ لیکن گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ آئے ہوئے حافظ صاحب یا عالم صاحب نماز پڑھانے سے انکار کردیتے ہیں، تب وہ خود امامت کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس صورت میں ان کے لیے امامت کرنا جائز ہے یا ناجائز، مسئلہ کو تفصیل سے سمجھا کر مہربانی فرمائیں۔

نیز یہ بھی بتائیں کہ مذکورہ شخص (جس نے صرف ناظرہ کیا ہوا ہے) امامت کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

امامت کی ذمہ داری کے لیے متولی یا ذمہ دار کو چاہیے کہ وہ مسائل سے باخبر متقی عالم کو منتخب کریں، عالم نہ مل سکے، تو حافظ قرآن کا انتخاب کریں۔ اہل محلہ میں وسعت نہ ہو، تو ایسا ناظرہ پڑھا ہوا شخص، جو دین کے ضروری عقائد و مسائل سے باخبر ہو، اس کو بھی امام بنالیں جماعت کا ثواب مل جائے گا، نماز صحیح ہوجائے گی۔ (۱)

آپ کے جماعت خانے میں جو شخص نماز پڑھاتے ہیں، ان کی امامت جائز ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۹] ایسے حافظ کی امامت، جو مسائل نماز سے واقف نہ ہو

۷۹۴- سوال: متعدد افراد ایسے دیکھے گئے ہیں، جو حافظ قرآن ہیں؛ لیکن طہارت و نجاست اور امامت وغیرہ کے مسائل سے ناواقف ہیں، تو ایسوں کو امام بنانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

طہارت و نجاست اور نماز کے ضروری مسائل کا جاننا ضروری ہے، اس لیے جو شخص ان مسائل سے

(۱) (والأحق بالإمامة) تقديما بل نصبا مجمع الأنهر (الأعلم بأحكام الصلاة) فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة، وحفظه قدر فرض، وقيل واجب، وقيل سنة (ثم الأحسن تلاوة) وتجويدا (للقراءة، ثم الأورع) أي الأكثر اتقاء للشبهات. والتقوى: اتقاء المحرمات (ثم الأسن)... [الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۵۷، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت]

باخبر ہو، اس کو امام بنانا چاہیے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۰] امامت کا زیادہ مستحق کون ہے؟ مسائل جاننے والا غیر حافظ یا بے خبر حافظ قرآن

۶۹۵-سوال: ایک شخص ناظرہ پڑھا ہوا ہے اور دوسرا شخص حافظ قرآن ہے، جو ناظرہ پڑھا ہوا ہے، وہ نماز، امامت، طہارت اور نجاست وغیرہ مسائل سے باخبر ہے اور جو شخص حافظ قرآن ہے، وہ ان مسائل سے بے خبر ہے، تو کس کو امام بنانا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جو امام طہارت ونجاست اور نماز کے مسائل سے باخبر ہے، اس کو امام بنانا چاہیے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۱] ایسے شخص کی امامت، جس کے ہاتھ اور پیر میں نقص ہو

۶۹۶-سوال: اگر کسی شخص میں کسی حادثہ کی وجہ سے یا پیدائشی طور پر دست وپا میں کمی ہو، تو اس کو امام بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

بہ آسانی رکوع، سجدہ اور قعدہ کرسکتا ہو، تو اس کی امامت جائز ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے عنوان: ''ناظرہ پڑھے ہوئے شخص کی امامت''۔

(۲) (والأحق بالإمامة) تقديما بل نصبا مجمع الأنهر (الأعلم بأحكام الصلاة) فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة، وحفظه قدر فرض، وقيل واجب، وقيل سنة (ثم الأحسن تلاوة) وتجويدا (للقراءة، ثم الأورع) أي الأكثر اتقاء للشبهات. والتقوى: اتقاء المحرمات (ثم الأسن)... [الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۵۷، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت]

[۳] (قوله ومفلوج وأبرص شاع برصه) وكذلك أعرج يقوم ببعض قدمه، فالاقتداء بغيره أولى تتارخانية، وكذا أجذم، برجندي،... ومن له يد واحدة فتاوى الصوفية عن التحفة. والظاهر أن العلة النفرة، ولذا قيد الأبرص بالشيوع ليكون ظاهرا ولعدم إمكان إكمال الطهارة أيضا في المفلوج والأقطع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، باب الإمامة، مطلب في إمامة الأمرد، ط: دار الفكر - بيروت)

عن أبي هريرة قال: قال رسول الله-صلى الله عليه وسلم-: الصلاة المكتوبة واجبة خلف كل مسلم برا كان أو فاجرا وإن عمل الكبائر. (ابوداود: ۱/ ۳۴۳، حدیث نمبر: ۲۵۳۳ ☆ سنن الدارقطنی: ۲/ ۴۰۴، بیروت)

باب أمامة الفاسق

[فاسق کی امامت کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب إمامة الفاسق

[فاسق کی امامت کا بیان]

[۱] ڈاڑھی منڈوانے والے کی امامت

۶۹۷-سوال: ڈاڑھی منڈوانے والے شخص کی امامت کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ڈاڑھی منڈوانے والے شخص کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، البتہ نماز ہوجاتی ہے، فریضہ ذمہ سے ساقط جاتا ہے، اگر ایسے امام کے ہٹانے پر قدرت نہ ہو اور مجبوری میں اس کی اقتدا کرنی پڑتی ہو، تو ثواب میں بھی ان شاء اللہ کمی نہ ہوگی، جماعت کا ثواب ملے گا، البتہ مقتدی اس قدر ثواب کا حق دار نہ ہوگا، جتنا وہ کسی متقی وپرہیزگار کے پیچھے نماز پڑھنے سے مستحق ہوتا۔[1] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ويكره تنزيها إمامة... فاسق. (الدر المختار) ــــــ فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد؛ لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: حاشية الشِّلْبِيِّ مع تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِّلْبِيّ (م: ۱۰۲۱ھ): ۱/ ۱۳۴ - ۱۳۵، كتاب الصلاة، الأحق بالإمامة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة☆البناية شرح الهداية - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵): ۲/ ۳۳۳، باب في الإمامة، إمامة العبد والفاسق والأعمى وولد الزنا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت

[۲] چار چھ مہینے بیوی سے دور رہنے والے کی امامت

۶۹۸-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین اس بابت کہ:

زید سند یافتہ عالم ہیں، چوڑی باؤلی، نورانی مسجد میں امام ہیں، ''پارولہ'' شہر میں عربی مدرسہ میں چار سال سے معلم ہیں؛ ڈاڑھی چھوٹی ہے، ایک کان کا بیرونی حصہ پیدائشی طور پر مڑا ہوا ہے (چھوٹا ہے) مگر سماعت میں کوئی کمی نہیں، گوشت کا کام بھی انجام دیتے ہیں، بہار کے رہنے والے ہیں؛ اس لیے چار یا چھ مہینے میں گھر جاتے ہیں، اخلاق وکردار میں بہت ہی بہتر ہیں، شہر میں دینی معاملات میں ان سے بہتر کوئی نہیں؛ لیکن ہمارے شہر کے چند اشخاص کا کہنا ہے کہ بیوی سے اتنا عرصہ علاحدہ رہنے والے کی اقتداء میں نماز درست نہیں، تو کیا زید کی امامت درست ہے یا نہیں؟ جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

ایک شخص بیوی کی رضامندی سے اپنے علاقے سے چار یا چھ ماہ دور رہتا ہے، معاش کا کوئی بہتر ذریعہ اور وسیلہ خود اس کے گاؤں یا قصبہ یا شہر میں نہیں ہے؛ اس لیے دور دراز بیوی بچوں کے نان نفقہ کی ذمہ داری ادا کرنے کی خاطر رہتا ہے، تو وہ گنہ گار اور فاسق نہیں ہوگا؛ لہٰذا امامت کا عہدہ ایسے شخص کے حوالے کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔[۱]

اور جب کہ آپ کی بستی ''پارولہ'' میں اس جیسا دوسرا کوئی عالم موجود نہیں ہے، تو اس عالم کو امامت کا حق ہے، ایسے شخص کے پیچھے پڑھی گئی نماز ہو جائے گی۔[۲] البتہ اگر اس کی ڈاڑھی چھوٹی ہے، تو لازم ہے کہ

---

(۱) ويسقط حقها بمرة ويجب ديانة أحيانا ولا يبلغ الإيلاء إلا برضاها، ويؤمر المتعبد بصحبتها أحيانا. (الدر المختار)
قال ابن عابدين: (قوله ويسقط حقها بمرة) قال في الفتح: واعلم أن ترك جماعها مطلقا لا يحل له، صرح أصحابنا بأن جماعها أحيانا واجب ديانة، لكن لا يدخل تحت القضاء والإلزام إلا الوطأة الأولى ولم يقدروا فيه مدة. ويجب أن لا يبلغ به مدة الإيلاء إلا برضاها وطيب نفسها به. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۲۰۲، كتاب النكاح، باب القسم بين الزوجات، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) ويكره تنزيها إمامة... فاسق. (الدر المختار) ـــــــ فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وہ اپنی ڈاڑھی کو ایک مشت سنت کے موافق بڑھائیں۔ (١) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٣] امام کا ایک مشت سے کم داڑھی رکھنا

٦٩٩-سوال: ہمارے گاؤں کے امام صاحب حافظ اور قاری ہیں، قرآن پاک اچھا پڑھتے ہیں؛ لیکن داڑھی ایک مشت سے کم رکھتے ہیں، ایسے امام کے پیچھے نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ اگر مکروہ ہو تو کراہت کس قسم کی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

ایک مشت داڑھی رکھنا سنتِ مؤکدہ ہے، بعض ائمہ نے اُس کو واجب فرمایا ہے، ایک مشت سے زیادہ ہو، تو اُسے کتر کر ایک مشت تک کرنے کی اجازت ہے، ایک مشت سے کم کرنا اور بالکل نہ رکھنا؛ دونوں گناہ کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ (٢) ایسے شخص کو فاسق کہا جاتا ہے، اور فاسق کی امامت مکروہِ تحریمی ہے، اگر

---

(١) عن ابن عمر، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "خالفوا المشركين: وفروا اللحى، وأحفوا الشوارب" وكان ابن عمر: إذا حج أو اعتمر قبض على لحيته، فما فضل أخذه. (صحيح البخاري: ٨٧٥/٢، رقم الحديث: ٥٨٩٢، كتاب اللباس، باب تقليم الأظفار، ط: ديوبند، ☆الصحيح لمسلم: ١٢٩/١، رقم الحديث: ٥٢-(٢٥٩)، و ٥٥-(٢٦٠)، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، ط: مختار اينڈ كمپني-ديوبند)

حدثنا مروان يعني ابن سالم المقفع، قال: رأيت ابن عمر يقبض على لحيته، فيقطع ما زاد على الكف. (سنن أبي داود: ٣٢١/١، رقم الحديث: ٢٣٥٧، كتاب الصوم، باب القول عند الإفطار، ط: ديوبند)

عن أبي زرعة، قال: كان أبو هريرة يقبض على لحيته، ثم يأخذ ما فضل عن القبضة. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار-أبو بكر بن أبي شيبة، العبسي (م: ٢٣٥هـ): ٢٢٥/٥، رقم الحديث: ٢٥٤٨١، كتاب الأدب، ما قالوا في الأخذ من اللحية، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد-الرياض)

عن الحسن، قال: كانوا ايرخصون فيما زاد على القبضة من اللحية أن يؤخذ منها. (حوالہ سابق: حدیث نمبر: ٢٥٤٨٤)

ولا بأس بنتف الشيب، وأخذ أطراف اللحية والسنة فيها القبضة... ولذا يحرم على الرجل قطع لحيته، والمعنى المؤثر التشبه بالرجال اهـ. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله والسنة فيها القبضة) وهو أن يقبض الرجل لحيته فما زاد منها على قبضة قطعه، كذا ذكره محمد في كتاب الآثار عن الإمام، قال وبه أخذ. محيط اهـ ط. (رد المحتار على الدر المختار: ٤٠٧/٦، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر-بيروت)

(٢) ولا بأس بنتف الشيب، وأخذ أطراف اللحية والسنة فيها القبضة... ولذا يحرم على الرجل قطع لحيته، والمعنى المؤثر التشبه بالرجال اهـ. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله والسنة فيها القبضة) وهو أن يقبض الرجل لحيته فما زاد منها على قبضة قطعه، كذا ذكره محمد في كتاب الآثار عن الإمام، قال وبه أخذ. =

ایسا فاسق امام منتخب کیا گیا ہے اور مقتدی حضرات ان کی اقتدا کرنی پڑے، تو نماز درست ہوگی؛ البتہ اُسے امام بنانے والے گنہگار رہوں گے، یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ تنہا نماز پڑھنے کے مقابلے میں ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا افضل ہے، اگر قرب وجوار میں کوئی مسجد ہو، تو مقتدیوں کو چاہیے کہ وہاں نماز پڑھیں، بہ صورت دیگر اسی امام کے پیچھے نماز پڑھ لیں، لیکن جماعت چھوڑ کر تنہا نماز نہ پڑھیں۔ (شامی: ۴۰۷/۶)[۲] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

[۴] فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام

۷۰۰-سوال: (۱) زید تھوڑا سا علم رکھتا ہے، قرآن شریف بالکل غلط پڑھتا ہے، نیز زکاۃ، صدقۂ فطر وغیرہ لیتا ہے، خرید وفروخت کی دلالی کرتا ہے اور حلال وحرام میں کوئی تمیز نہیں کرتا ہے، چغلی وغیبت اس کی عادت ہے، مسائل کے علم سے کوسوں دور ہے، وہ شہر پارولہ کے بڑے محلہ کا امام ہے، تو کیا اس کی امامت درست ہے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

(۲) اسی طرح خالد شہر کا پہلا قاضی تھا، دینی علم بالکل نہیں رکھتا ہے، نماز نہیں پڑھتا ہے، صرف عیدین کی نماز پڑھتا ہے، اپنے کاروبار کے لیے سودی پیسے لیتا ہے، موٹر کا بزنس ہے، اس کا فائنانس ساہوکار سے کرواتا ہے اور بینک سے بھی کرواتا ہے، مزید برآں سینما دیکھتا ہے، تاش کھیلتا ہے، تو ایسے شخص کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟ جلد جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

امامت کا عہدہ ترجیحی بنیاد پر ایسے شخص کے حوالے کرنا چاہیے، جو قران شریف صحیح پڑھتا ہو، صالح

=محیط اھ ط. (رد المحتار علی الدر المختار: ۴۰۷/۶، کتاب الحظر و الإباحة، فصل في البیع، ط: دار الفکر- بیروت)

عن ابن عمر، عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال: "خالفوا المشرکین: وفروا اللحی، وأحفوا الشوارب" وکان ابن عمر: إذا حج أو اعتمر قبض علی لحیته، فما فضل أخذه. (صحیح البخاري: ۸۷۵/۲، رقم الحدیث: ۵۸۹۲، کتاب اللباس، باب تقلیم الأظفار، ط: دیوبند ☆الصحیح لمسلم: ۱۲۹/۱، رقم الحدیث: ۵۴-(۲۵۹)، و ۵۵-(۲۶۰)، کتاب الطھارة، باب خصال الفطرة، ط: دیوبند)

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: "فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ داڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نا اہل امام اور متولی کی ذمہ داری، اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت" کے حواشی۔

اور نیک ہو، گناہوں سے اجتناب کرتا ہو، نیز نماز کی صحت وفساد کے مسائل سے واقف ہو۔[۱]

جو شخص جب قرآن شریف صحیح نہیں پڑھتا ہے، حرام کاموں میں ملوث ہے، احکام ومسائل سے نابلد ہے، تو وہ فاسق کے زمرے میں آتا ہے، اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے، جب کہ اس سے زیادہ متبع شریعت شخص موجود ہو۔[۲] اس لیے متولیان مسجد کی ذمہ داری ہے کہ ایسے شخص کو امامت سے برطرف کردیں، اگر ذمہ دار حضرات اس کو برطرف نہیں کریں گے، تو وہ گنہ گار ہوں گے۔[۳]

لیکن محلہ والوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ امام جیسا بھی ہو، اس کے پیچھے نماز پڑھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "**صلوا خلف كل بر وفاجر**" ہر نیک وبد کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو۔ (دار قطنی)[۴]

اسلام اجتماعیت کی تعلیم دیتا ہے اور نزاع وفساد سے بچنے اور دور رہنے کی تلقین کرتا ہے، پس عوام کو

---

(۱) الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية. ويجتنب الفواحش الظاهرة. (الفتاوى الهندية: ١/ ٨٣، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، مكتبة زكريا-ديوبند☆ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ٥٨٧هـ): ١/ ١٥٧، كتاب الصلاة، فصل بيان من هو أحق بالإمامة وأولى بها، ط:: دار الكتب العلمية☆تحفة الفقهاء-أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو: ٥٤٠هـ): ١/ ٢٣٠، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(٢) (قوله وفاسق) من الفسق: وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر، والزاني وآكل الربا ونحو ذلك، كذا في البرجندي إسماعيل.... وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعا، ولا يخفى أنه إذا كان أعلم من غيره لا تزول العلة، فإنه لا يؤمن أن يصلي بهم بغير طهارة، فهو كالمبتدع تكره إمامته بكل حال، بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا. (رد المحتار على الدر المختار: ١/ ٥٦٠، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر-بيروت)

(٣) لو قدموا فاسقا يأثمون بناء على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم، لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير-إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ٩٥٦هـ) ص: ٣١٥، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی-لاہور)

(٤) سنن الدارقطني- أبو الحسن علي بن عمر، البغدادي الدارقطني (م: ٣٨٥هـ): ٢/ ٤٠٤، رقم الحديث: ١٧٦٨، كتاب العيدين، باب صفة من تجوز الصلاة معه والصلاة عليه، ت: شعيب الارنؤوط وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت.

چاہیے کہ امام جیسا بھی فاسق وفاجر ہو، اس کے پیچھے نماز پڑھ لیا کریں، ان کو جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ (۵)

اور امام کے لیے ضروری ہے کہ جب دینی امور کی وجہ سے لوگ ان سے ناراض ہیں، تو وہ خود امامت سے کنارہ کشی اختیار کرلیں، ورنہ وہ اس سلسلہ میں گنہگار ہوں گے۔ (۶) اور اگر امام مستعفی نہ ہوں، تو متولیان مسجد اسے امامت کے عہدے سے الگ کردیں، ورنہ وہ بھی گنہگار ہوں گے۔

صورت مسئولہ میں امام کی جو صفات ذمیمہ بیان کی گئی ہیں، اگر واقعتاً ایسا ہی ہے، تو اسے فوراً امامت سے علاحدگی اختیار کرلینی چاہیے، ورنہ متولیان کے لیے ایسے فاسق وفاجر کو امامت سے علاحدہ کردینا ضروری ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت

[۶] نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری

۷۰۱-سوال: (۱) امام کی بیوی بے پردہ گھومتی ہے اور دوکان چلاتی ہے، تو ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اسی طرح امام سودی لین دین کرتا ہو، تو کیا حکم ہے؟

(۲) ہمارے یہی امام تقریباً ۱۲؍سال سے ہیں، لوگ ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے کراہیت محسوس کرتے ہیں، تو کیا کیا جائے؟

(۳) ان امام صاحب نے تاریخ ۳۱-۱۰-۸۱ء کو تنخواہ لے کر کہا: میں کل سے مستعفی ہوں، ایک دن امامت اور مدرسہ سے الگ رہے، اور دوسرے دن ۲؍تاریخ سے کام شروع کردیا، اس وقت لوگوں نے

(۵) فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

(۶) عن ابن عباس، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "ثلاثة لا ترفع صلاتهم فوق رءوسهم شبرا: رجل أم قوما وهم له كارهون، وامرأة باتت وزوجها عليها ساخط، وأخوان متصارمان". (سنن ابن ماجه: ص ۶۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: البدر - ديوبند)

کہا: آپ نماز نہ پڑھائیں، صرف مدرسہ میں پڑھائیں، کمیٹی نے بھی یہی فیصلہ کیا اور کہا: مدرسہ کی ۲۰۰/ روپے تنخواہ آپ کو دی جائے گی؛ لیکن یہ امام صاحب صرف مدرسہ کی تنخواہ لینے سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے امامت اور مدرسہ دونوں کی تنخواہ ملنی چاہیے، اور وہ عدالت (کورٹ) میں جانا چاہتے ہیں، اس سلسلہ میں آپ شریعت کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

(۱) متولی اور ٹرسٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ منصب امامت نیک اور متقی انسان کے حوالہ کریں۔[۱] فاسق وفاجر کو امام بنانا مکروہ ہے۔[۲] البتہ لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں، تو جماعت کا ثواب مل جائے گا۔[۳] وبال متولی اور ٹرسٹیوں پر ہوگا، جنہوں نے ایسے شخص کو امام بنایا ہے۔[۴]

جس امام کی بیوی بے پردہ گھومتی ہو، دوکان چلاتی ہو اور غیر محرم سے بے پردہ باتیں کرتی ہو، اور امام ان تمام حرکتوں کو جاننے کے باوجود منع نہ کرتا ہو، تو وہ فاسق ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔[۵] البتہ

---

(۱) الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين، ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية. ويجتنب الفواحش الظاهرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، ط: زكريا- ديوبند ☆بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱/ ۱۵۷، كتاب الصلاة، فصل بيان من هو أحق بالإمامة وأولى بها، ط:: دار الكتب العلمية☆تحفة الفقهاء-أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو: ۵۴۰هـ): ۱/ ۲۳۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) لو قدموا فاسقا يأثمون بناء على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم؛ لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير-إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ۹۵۶ هـ) ص: ۳۱۵، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی- لاہور)

(۳) فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد؛ لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

(۴) حاشیہ نمبر: ۲ ملاحظہ کریں۔

(۵) قال ابن عابدين: (قوله وفاسق) من الفسق: وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر، والزاني وآكل الربا ونحو ذلك، كذا في البرجندي إسماعيل.... وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعا، ولا يخفى أنه إذا كان =

اگر امام اپنی بیوی کو ان سب کاموں سے منع کرتا ہو، مگر عورت مانتی ہی نہ ہو اور طلاق دینے کی صورت میں بیوی کے بغیر صبر مشکل ہو، یا کوئی اور مجبوری ہو، تو ایسی صورت میں وہ امام فاسق شمار نہ ہوگا، اور اس کے پیچھے نماز بلا کراہت جائز ہوگی۔ (۶)

(۲) متولی کی ذمہ داری یہ ہے کہ ایسے امام کو اپنا فرض منصبی یاد دلائیں، اگر نہ مانیں تو معزول کردیں اور کسی دین دار امام کا تقرر کریں۔ (۷)

(۳) آپ سب لوگوں کا فیصلہ اور کمیٹی کا فیصلہ شریعت کے موافق ہے اور بالکل صحیح فیصلہ ہے، جب لوگ اس امام کی بد دینی کی وجہ سے ناراض ہیں، تو اس کو الگ کردینا جائز ہے۔ (۸) امام صاحب کو چاہیے کہ

=أعلم من غيره لا تزول العلة، فإنه لا يؤمن أن يصلي بهم بغير طهارة فهو كالمبتدع تكره إمامته بكل حال، بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۶) قال الله تعالى: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ. (۳۵-فاطر: ۱۸)

له امرأة فاسقة لا تنزجر بالزجر لا يجب تطليقها كذا في القنية. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۷۲، كتاب الكراهية، الباب الثلاثون في المتفرقات، ط: دار الفكر - بيروت)

وفي المجتبى من آخر الحظر والإباحة: لا يجب على الزوج تطليق الفاجرة ولا عليها تسريح الفاجر إلا إذا خافا أن لا يقيما حدود الله فلا بأس أن يتفرقا. اهـ (البحر الرائق شرح كنز الدقائق: ۳/ ۱۱۵، كتاب النكاح، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۵۰، كتاب النكاح، قبيل باب الولي☆النهر الفائق شرح كنز الدقائق - سراج الدين عمر بن إبراهيم بن نجيم الحنفي (م: ۱۰۰۵هـ): ۲/ ۱۹۹، كتاب النكاح، فصل في المحرمات، ت: أحمد عزو عناية، ط: دار الكتب العلمية)

(۷) عن عبد الله، قال النبي صلى الله عليه وسلم: كلكم راع وكلكم مسئول، فالإمام راع وهو مسئول، والرجل راع على أهله وهو مسئول، والمرأة راعية على بيت زوجها وهي مسئولة، والعبد راع على مال سيده وهو مسئول، ألا فكلكم راع وكلكم مسئول. (صحيح البخاري: ۲/ ۷۷۹، رقم الحديث: ۵۱۸۸، كتاب النكاح، باب: قوا أنفسكم وأهليكم نارا، ط: البدر - ديوبند)

(۸) أبو أمامة، يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "ثلاثة لا تجاوز صلاتهم آذانهم: العبد الآبق حتى يرجع، وامرأة باتت وزوجها عليها ساخط، وإمام قوم وهم له كارهون". (سنن الترمذي: ۱/ ۸۳، رقم الحديث: ۳۶۰، أبواب الصلاة، باب ما جاء فيمن أم قوما وهم له كارهون، ط: البدر - ديوبند☆سنن أبي داود: ۱/ ۸۸، رقم الحديث: ۵۹۳، باب الرجل يؤم القوم وهم له كارهون، ط: البدر - ديوبند☆سنن ابن ماجه: ۱/ ۶۹، رقم الحديث: ۹۷۰، ۹۷۱، باب من أم قوما وهم له كارهون، ط: أشرفي - ديوبند)

مسجد سے علاحدہ ہوکر صرف مدرسہ پڑھائیں اور اسی کی تنخواہ لیں، یہی صلح کا راستہ ہے۔ (۹) اور علماء کی شان کے خلاف ہے کہ وہ غیر شرعی کام کر کے عدالت کا سہارا لیں۔ (۱۰) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا، جن کی بیوی الیکشن کی امیدوار ہو

۷۰۲-سوال: ایک شخص برسوں سے امام ہے، اس کی بیوی پردہ کا اہتمام نہیں کرتی ہے، نیز وہ الیکشن میں امیدوار بھی ہے، اور ظاہراً دو، چار عام خاص مجلسوں میں حاضری بھی دے چکی ہے،، جن میں اس نے پردے کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا، تو کیا ایسی عورت کا شوہر نماز پڑھا سکتا ہے؟ کیا ایسا شخص امامت کے لائق ہے؟ اس کے پیچھے پڑھی گئی نماز قبول ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

ہر آزاد عورت کے لیے منہ، دونوں ہاتھ کی ہتھیلی اور دونوں پاؤں کے علاوہ پورا بدن چھپانا ضروری ہے، چہرہ کھلا رکھنے میں فتنہ کا اندیشہ ہے؛ اس لیے فقہاء نے اس کو چھپانا بھی ضروری قرار دیا ہے۔ (۱)

---

(۹) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الصلح جائز بين المسلمين، زاد أحمد، إلا صلحا أحل حراما، أو حرم حلالا، وزاد سليمان بن داود، وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المسلمون على شروطهم. (سنن أبي داود: ۲/۵۰۶، رقم الحديث: ۳۵۹۴، كتاب الأقضية، باب في الصلح، ط: ديوبند)

(۱۰) يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا. (۴-النساء: ۵۹)

(۱) قال: (وجميع بدن الحرة عورة) قال - عليه الصلاة والسلام -: الحرة عورة مستورة.

قال: (إلا وجهها وكفيها) لقوله تعالى: {ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها} [النور: ۳۱] قال ابن عباس: الكحل والخاتم. ومن ضرورة إبداء الزينة إبداء موضعها، فالكحل زينة الوجه، والخاتم زينة الكف، ولأنها تحتاج إلى كشف ذلك في المعاملات فكان فيه ضرورة.

(وفي القدم روايتان) الصحيح أنها ليست بعورة في الصلاة، وعورة خارج الصلاة. (الاختيار لتعليل المختار - عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳هـ): ۱/۴۶، كتاب الصلاة، باب ما يفعل قبل الصلاة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة)

بدن الحرة عورة إلا وجهها وكفيها وقدميها. كذا في المتون وشعر المرأة ما على رأسها عورة وأما المسترسل ففيه روايتان الأصح أنه عورة. كذا في الخلاصة وهو الصحيح وبه أخذ الفقيه أبو الليث وعليه الفتوى. كذا في معراج الدراية. (الفتاوى الهندية: ۱/۵۸، الباب الثالث في شروط الصلاة، الفصل الأول في الطهارة وستر العورة، ط: دار الفكر)=

الغرض عورت کے لیے پردہ لازمی حکم ہے، الیکشن میں امیدوار بننے کی وجہ سے شریعت کے اس حکم کی پاسداری نہیں ہو سکے گی؛ کیوں کہ جب بھی مجلسیں منعقد ہوں گی، بے پردہ بیٹھنا پڑے گا، اجنبی مردوں کے سامنے بے پردہ بیٹھ کر باتیں کرنی ہوگی؛ یہ تمام گناہ کے کام ہیں، اور کوئی شخص گناہ کا کام ہوتا دیکھے اور روکنے کی استطاعت ہو، تو اس کے لیے روکنا ضروری ہے۔ (۲)

صورت مسئولہ میں شوہر- جو کہ امام ہیں- دین کے اونچے مقام پر فائز ہیں، ان پر اپنی بیوی کو بے پردہ نکلنے سے روکنا ضروری ہے، اگر یہ ذمہ داری امام صاحب ادا نہیں کریں گے، تو مرتکب کبیرہ ہو کر گنہ گار ہوں گے، جس کو شریعت میں ''فاسق'' کہا جاتا ہے۔ (۳) اور فاسق کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے؛ تاہم قوم کی ذمہ داری ہے کہ مذکورہ امام کے پیچھے ہی نماز ادا کریں، ان کو باجماعت نماز پڑھنے کا ثواب مل جائے گا۔ (۴)

البتہ امام اور متولی حضرات گنہ گار ہوں گے؛ کیوں کہ متولیوں کی ذمہ داری تھی کہ کسی نیک، متقی شخص کو

=وكشف العورة من غير ضرورة لمعنى الشهوة لا يجوز. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۱۰/۱۵۶، كتاب الاستحسان، النظر إلى الأجنبيات، ط: دار المعرفة- بيروت)

(۲) قال أبو سعيد (الخدري): سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان. (الصحيح لمسلم: ۱/۵۱، رقم الحديث: ۷۸- (۴۹)، كتاب الإيمان، باب بيان كون النهي عن المنكر من الإيمان، الخ، ط: البدر- ديوبند)

(۳) قال ابن عابدين: (قوله وفاسق) من الفسق: وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر، والزاني وآكل الربا ونحو ذلك، كذا في البرجندي إسماعيل.... وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعا، ولا يخفى أنه إذا كان أعلم من غيره لا تزول العلة، فإنه لا يؤمن أن يصلي بهم بغير طهارة فهو كالمبتدع تكره إمامته بكل حال، بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۵۶۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۴) فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة) =

امامت کی ذمہ داری سپرد کرتے، نااہل کو ذمہ، سپرد کرنے کی وجہ سے وہ گنہ گار ہوں گے۔ (۵)

البتہ اگر امام عورت کو نصیحت کرتا ہے؛ لیکن وہ نہیں مانتی، پردہ میں نہیں رہتی ہے اور طلاق دینے سے امام صاحب کے پریشانی میں مبتلا ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، یا طلاق دینے کی وجہ سے دنیوی قانون کے موافق عدالت کے چکر کاٹنے پڑیں گے، جس کی وہ اپنے اندر ہمت نہیں پاتا، تو وہ فاسق نہیں ہوگا اور اس کی امامت کسی کراہت کے بغیر جائز ہے۔ (۶) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] اِمام و مدرّس کی بیوی بے پردہ رہے، تو اُن کی اِمامت مکروہ ہوگی یا نہیں؟

۷۰۳-سوال: ہمارے یہاں ایک عالم قرآنِ پاک پڑھاتے ہیں اور ایک مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں، اُن کے یہاں بعض نوجوان لڑکوں کی آمد و رفت رہتی ہے، جو اُن کے گھر میں اندر تک بلا جھجک چلے جاتے ہیں، اُن کی بیوی کے ساتھ بیٹھ کر بے محابا باتیں کرتے ہیں، حالاں کہ یہ نوجوان لڑکے اُن کی بیوی کے محرم بھی نہیں ہیں، اُن نوجوانوں میں سے ایک کی اِمام صاحب کے ساتھ دور کی رشتہ داری ہے؛ لیکن محرم وہ بھی نہیں ہے، اپنی بیوی کی اس بے حجابی کا مذکورہ مدرّس کو علم بھی ہے، پھر بھی اُنہیں اس بات کا گویا کوئی احساس ہی نہیں ہے، ہاں! یہ بات ہے کہ اُن کی بیوی گھر سے باہر آمد و رفت میں برقع پہنتی ہے، تو ایسے امام کی امامت کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ اُن کی اِمامت مکروہِ تحریمی شمار ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیا:

عورت پر واجب ہے کہ وہ ہر غیر محرم سے پردہ میں رہے، جو بھی عورت اس پر عمل پیرا نہیں ہوگی تو وہ

(۵) لو قدموا فاسقا یأثمون بناء أعلی أن کراهة تقدیمه کراهة تحریم، لعدم اعتنائه بأمور دینه. (حلبی کبیر - إبراهیم بن محمد بن إبراهیم الحلبي (م: ۹۵۶ھ) ص: ۳۱۵، کتاب الصلاة، الأولی بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی - لاہور)

(۶) قال الله تعالی: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰى. (۳۵-فاطر: ۱۸)

له امرأة فاسقة لا تنزجر بالزجر لا یجب تطلیقها کذا في القنیة. (الفتاوی الهندیة: ۵/ ۳۴۷، کتاب الکراهیة، الباب الثلاثون في المتفرقات، ط: دار الفکر - بیروت)

وفي المجتبی من آخر الحظر والإباحة: لا یجب علی الزوج تطلیق الفاجرة ولا علیها تسریح الفاجر إلا إذا خافا أن لا یقیما حدود الله فلا بأس أن یتفرقا. اهـ. (البحر الرائق شرح کنز الدقائق: ۳/ ۱۱۵، کتاب النکاح، ط: دار الکتاب الإسلامي ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۵۰، کتاب النکاح، قبیل باب الولي ☆ النهر الفائق شرح کنز الدقائق - سراج الدین عمر بن إبراهیم بن نجیم الحنفي (م: ۱۰۰۵ھ): ۲/ ۱۹۹، کتاب النکاح، فصل في المحرمات، ت: أحمد عزو عنایة، ط: دار الکتب العلمیة)

سخت گنہ گار ہوگی۔ [۱] مسئلۂ مذکورہ میں نوجوان لڑکوں کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اس طرح کی آمد و رفت رکھیں۔ [۲] اگر امام صاحب اُن کی اس آمد و رفت سے باخبر ہونے کے باوجود کوئی باز پرس نہیں کرتے، تو وہ بھی گنہ گار رہوں گے، اگر وہ اس سے توبہ نہ کریں، تو اُن کی امامت مکروہِ تحریمی ہوگی۔ [۳]

لیکن جب کہ امام صاحب اپنی بیوی کو گھر سے باہر آمد و رفت کے لیے پردہ کرنے کو کہتے ہیں، جس کی علامت یہ ہے کہ ان کی بیوی برقعہ پہن کر باہر نکلتی ہے، تو اُن کے بارے میں اس طرح کا حسن ظن رکھا جاسکتا ہے کہ وہ قصداً گھر میں بے پردگی سے راضی نہیں ہوں گے، ہوسکتا ہے کہ بے احتیاطی کی بنیاد پر مذکورہ بے حجابی ہو رہی ہو، تو اس صورت میں اُن کی امامت میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر وہ مذکورہ مسئلہ جانتے ہیں، اور اُنہیں اس منکر کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، پھر بھی وہ اس پر کوئی اقدام نہیں کر رہے ہیں، تو اُن کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی ہوگی۔ (رد المحتار: ۱/ ۵۶۰، ۵۶۲) [۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قوله تعالى: وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ ۚ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ۚ. (۳۳-الاحزاب: ۵۳)

(۲) قوله تعالى: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۲۷﴾. (۲۴-النور: ۲۷)

عن عقبة بن عامر: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إياكم والدخول على النساء، فقال رجل من الأنصار: يا رسول الله، أفرأيت الحمو؟ قال: الحمو الموت. (صحيح البخاري: ۲/ ۷۸۷، رقم الحديث: ۵۲۳۲، كتاب النكاح، باب لا يخلون رجل بامرأة إلا ذو محرم، والدخول على المغيبة، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/ ۲۱۵، رقم الحديث: ۲۰-(۲۱۷۲)، كتاب السلام، باب تحريم الخلوة بالأجنبية والدخول عليها، ط: البدر - ديوبند)

عن أم سلمة، قالت: كنت عند رسول الله صلى الله عليه وسلم وعنده ميمونة، فأقبل ابن أم مكتوم وذلك بعد أن أمرنا بالحجاب، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: احتجبا منه، فقلنا: يا رسول الله، أليس أعمى لا يبصرنا، ولا يعرفنا؟ فقال النبي صلى الله عليه وسلم: أفعمياوان أنتما، ألستما تبصرانه. (سنن أبي داؤد: ۲/ ۵۶۷، رقم الحديث: ۴۱۱۲، كتاب اللباس، باب في قوله عز وجل: {وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن}، ط: البدر - ديوبند☆سنن الترمذي: ۲/ ۱۰۶، رقم الحديث: ۲۷۷۸، أبواب الأدب، باب ما جاء في احتجاب النساء من الرجال، ط: البدر - ديوبند)

(۳) عن عبد الله، قال النبي صلى الله عليه وسلم: كلكم راع وكلكم مسئول، فالإمام راع وهو مسئول، والرجل راع على أهله وهو مسئول، والمرأة راعية على بيت زوجها وهي مسئولة، والعبد راع على مال سيده وهو مسئول، ألا فكلكم راع وكلكم مسئول. (صحيح البخاري: ۲/ ۷۷۹، رقم الحديث: ۵۱۸۸، كتاب النكاح، باب: قوا أنفسكم وأهليكم نارا، ط: البدر - ديوبند)

(۴) دیکھیے عنوان: ''ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا، جن کی بیوی الیکشن کی امیدوار ہو'' کا حاشیہ نمبر: ۳۔

[۹] عید میلاد اور مشاعرہ وغیرہ میں پیش پیش رہنے والے حافظ کے پیچھے نماز

۷۰۴-سوال: ہماری بستی لاج پور میں ہر سال عید میلاد النبی کا جلسہ ہوتا ہے، جس میں حسب ذیل پروگرام ہوتے ہیں: پہلے دن عالم صاحبان کی تقریر، دوسرے روز مشاعرہ اور تیسرے روز اسی اسٹیج پر قوالوں کی قوالی۔ قوالی میں ایک مرد اور ایک عورت گاتی ہے، اس پروگرام کی کمیٹی میں ایک حافظ صاحب بھی ہیں، جو لوگوں کو ترغیب وتحریص دلا کر اس کے پروگرام کی جانب مائل کرتے ہیں، اس کام کے لیے چندہ بھی مانگا جاتا ہے، ہمیں اس کا چندہ دینا چاہیے یا نہیں؟ اور ایسے حافظ صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ جواب سے نوازیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

سیرت مبارکہ کا جلسہ، جو افراط وتفریط، فضول خرچی واسراف اور رسوم ورواجات سے پاک ہو، بلا شبہ جائز ہے۔ (۱) میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسہ کے نام پر مشاعرہ اور قوالی کرانا اور اس کے لیے لوگوں سے جبرا

---

(۱) عن أنس، قال: قال النبي -صلى الله عليه وسلم-: لا يؤمن أحدكم، حتى أكون أحب إليه من والده، وولده، والناس أجمعين. (صحيح البخاري ۱/۶-۷، باب: حب الرسول صلى الله عليه وسلم من الإيمان، كتاب الإيمان، رقم: ۱۵، ط: البدر - ديوبند☆صحيح مسلم: ۱/۴۹، كتاب الإيمان، باب وجوب محبة رسول الله- صلى الله عليه وسلم- أكثر من الأهل والولد والوالد، ط: البدر - ديوبند)

امداد الفتاویٰ میں ہے: ذکر ولادت شریف نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مثل دیگر اذکار خیر کے ثواب اور افضل ہے، اگر بدعات اور قبائح سے خالی ہو۔ (۵/۲۴۹، کتاب البدعات، ط: ادارہ تالیفات اولیاء، دیوبند)

تاہم یہ اسی وقت درست ہے، جب کہ دن، تاریخ اور مہینہ کی تعیین نہ ہو، لیکن فی زماننا احتراز اولی اور احوط ہے؛ کیوں کہ اس کو واجب اور فرض کا درجہ دے دیا گیا ہے، اور اس قسم کی محفل منعقد نہ کرنے والوں اور اس میں شریک نہ ہونے والوں پر لعن و طعن کی بوچھاڑ کی جاتی ہے؛ بل کہ ان کو کافر تک کہنے سے گریز نہیں کیا جاتا ہے، جب کہ کسی امر مباح کو اس کے درجے سے بڑھا دینا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے، شارح بخاری علامہ ابن حجر عسقلانی (م: ۸۵۲ھ) رقم طراز ہیں: قال ابن المنير: فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها لأن التيامن مستحب في كل شيء أي من أمور العبادة، لكن لما خشي بن مسعود أن يعتقدوا وجوبه أشار إلى كراهته. والله أعلم. (فتح الباري شرح صحيح البخاري: ۲/۳۳۸، كتاب الصلاة، باب الانفتال والانصراف عن اليمين، ط: دار المعرفة - بيروت)

نوٹ: اس سلسلے کے تمام فتاویٰ اور ان کی تخریج کے لیے دیکھیے، فتاویٰ فلاحیہ کی جلد اول، ص: ۳۶۵-۳۷۵۔

چندہ جمع کرنا اور گانا سننا اور باجہ وغیرہ بجانا حرام ہے۔ (۲) جو کمیٹی ان امور کو انجام دیتی ہے، اس کا تعاون کرنا جائز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتے ہیں: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى، وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (۳) نیکی اور تقویٰ کے کام میں مدد کرو اور ظلم اور گناہ کے کام میں مدد نہ کرو۔

لہٰذا ان گناہ کے کاموں پر مدد کرنا حرام ہے۔

جو حافظ ان گناہوں کے کام میں مددگار ہے، وہ فاسق ہے، اس کو امام بنانا مکروہ ہے۔ (۴) متولیان کی ذمہ داری ہے ایسے امام کو معزول کردیں، اگر متولی حضرات معزول نہ کریں، تو فاسق کے پیچھے نماز ہوجائے گی، نماز پڑھنے والے کو جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] امام کا ڈاڑھی کٹانا اور اپنی بیوی کو میلے میں بے پردہ گھمانا

۷۰۵-سوال: (۱) ایک امام صاحب عالم ہیں، ایک مشت سے کم ڈاڑھی رکھتے ہیں، تو اتنی

---

(۲) عن ابن مسعود، قال: " الغناء ينبت النفاق في القلب كما ينبت الماء الزرع، والذكر ينبت الإيمان في القلب كما ينبت الماء الزرع ". (السنن الكبرى - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۱۰/ ۳۷۷، رقم الحديث: ۲۱۰۰۷، باب: الرجل يغني فيتخذ الغناء صناعة، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ وروى أبو داود شطره الأول برقم: ۴۹۲۷، في باب كراهية الغناء والزمر)

قال إبراهيم: الغناء ينبت النفاق في القلب. قال: وقال مجاهد: {ومن الناس من يشتري لهو الحديث} [لقمان: ۶]: الغناء. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار - أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵هـ): ۴/ ۳۶۸، رقم الحديث: ۲۱۱۳۸، في هذه الآية: ومن الناس من يشتري لهو الحديث، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد - الرياض)

قال الله تعالى: ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم. الآية (النساء: ۲۹) وقال النبي صلى الله عليه وسلم: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (مسند الإمام أحمد: ۳۴/ ۲۹۹، رقم: ۲۰۶۹۵، ت: شعيب أرناؤط، ط: مؤسسة الرسالة عام ۱۴۲۱هـ ☆ ومسند أبو يعلى: ۳/ ۱۴۰، رقم: ۱۵۰۷، ت: حسين سليم، ط: دار المأمون للتراث - دمشق عام ۱۴۰۴هـ)

قال المظهري في تفسير "الباطل" أي بوجه ممنوع شرعاً، كالغصب، والسرقة، والخيانة، والقمار، والرباء، والعقود الفاسدة. (التفسير المظهري: ۲/ ۲۹۸، ت: أحمد عزو عناية، ط: زکریا - دیوبند)

(۳) ۵- المائدہ: ۲۔

(۴) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے: فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری کے حواشی۔

ڈاڑھی رکھنا شرعاً کیسا ہے؟ جب کہ ان کے پیچھے مقتدیوں میں سے بہت سوں کی مکمل ڈاڑھی ہوتی ہے۔ اور ایسے امام کو مقرر کرنے میں متولی اور کمیٹی والوں کی کوئی ذمہ داری ہے یا نہیں؟ نیز یہ عالم بہت پرزور بیان بھی کرتے ہیں۔

(۲) چند دنوں پہلے مذکورہ امام صاحب ایک میلے میں اپنی بیوی کو بے پردہ لے کر گئے تھے، اس سلسلہ میں لوگوں میں کافی چہ میگوئیاں ہوئیں، ان کو جب اس بات کی اطلاع ہوئی کہ میرے میلے میں جانے اور ڈاڑھی سے متعلق لوگ تبصرہ کر رہے ہیں، تو انتہائی غصہ کے عالم میں خطاب کیا اور دوران خطاب کہا کہ ''ایسی بات کہنے والے یزید کی ذریت اور ابولہب کی اولاد ہیں''۔ انہوں نے مزید کہا کہ لوگوں کو اپنے امام کے متعلق کچھ بولنے کا حق نہیں ہے، اور استدلال میں واقعہ بیان کیا کہ حضرت بایزید بسطامیؒ ایک مرتبہ ایک رنڈی کے کوٹھے پر گئے تھے، تو لوگوں میں اس کا چرچہ ہوا، تو ان کے بعض مریدوں نے لوگوں کو سمجھایا اور کہا کہ شیخ کے متعلق ہمیں اس طرح کا گمان نہیں رکھنا چاہیے؛ بل کہ کہو ''الحمد اللہ''، ہمارا شیخ مرد ہے! اس بات پر انہوں نے واقعہ ختم کر دیا، جب کہ لوگ الجھن میں مبتلا ہو گئے کہ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ اس رنڈی کے پاس کیوں گئے تھے؟ ان امام کی بات سے تو کچھ اور ہی ثابت ہوتا ہے، جو حضرتؒ کی شان کے خلاف ہے، بہر حال انہوں نے اپنے آپ کو پاک صاف بتلایا اور قصوروار، مقتدی حضرات کو ٹھہرایا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایک امام کی مذکورہ حرکت اور لوگوں کے ساتھ ان کا ایسا رویہ کہ ان کو یزید کی ذریت، ابولہب کی اولاد تک کہنا - جب کہ مجمع میں نوجوان اور بہت سے سفید ریش بزرگ بھی تھے - شرعاً کیسا ہے؟ تفصیل سے تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

متولی اور ٹرسٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ امامت کا منصب نیک، صالح و متقی شخص کے حوالہ کریں، اگر فاسق وفاجر کو یہ منصب دیں گے، تو وہ گنہگار ہوں گے۔ [1] اور اس طور پر ڈاڑھی کٹانا کہ ایک مشت بھی باقی نہ رہے، گناہ

(۱) لو قدموا فاسقا یأثمون بناء أعلی أن کراهة تقدیمه کراهة تحریم؛ لعدم اعتنائه بأمور دینه. (حلبی کبیر - إبراهیم بن محمد بن إبراهیم الحلبي (م: ۹۵۶ھ) ص: ۳۱۵، کتاب الصلاة، الأولی بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی - لاہور ☆ فتح القدیر: ۱/ ۳۰۴، کتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: رشیدیة - کراتشي)

کبیرہ ہے، اوراس طرح ڈاڑھی تراشنے والا فاسق وفاجر ہے۔ [۲] ایسے شخص کوامام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔

مقتدی کی داڑھی ہو یا نہ ہو، امام کے لیے ایک مشت ڈاڑھی رکھنا سنت ہے۔ [۳] نیز لازم ہے کہ وہ شریعت کے تمام احکام کا پابند ہو، اگر وہ ایسا نہیں کرے گا، تو سخت گنہگار ہوگا، خواہ وہ امام بیان کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، اگر بیان بھی کرتا ہواور خود سنن کی اور شعائر دین کی پابندی نہ کرتا ہو، تو وہ سخت غلطی میں ہے۔ [۴] ایسے شخص کوامامت سے الگ کر دینا ضروری ہے، ورنہ متولی وٹرسٹیان گنہگار ہوں گے۔

(۲) صورت مسئولہ میں امام کے تعلق سے درج ذیل قباحتیں ہیں:

۱- ہندؤوں کے میلے میں جانا، جو حرام ہے۔ [۵]

(۲-۳) عن ابن عمر، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "خالفوا المشركين: وفروا اللحى، وأحفوا الشوارب" وكان ابن عمر: إذا حج أو اعتمر قبض على لحيته، فما فضل أخذه. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۷۵، رقم الحديث: ۵۸۹۲، كتاب اللباس، باب تقليم الأظفار، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۲۹، رقم الحديث: ۵۴-(۲۵۹)، و ۵۵-(۲۶۰)، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، ط: ديوبند)

حدثنا مروان يعني ابن سالم المقفع، قال: رأيت ابن عمر يقبض على لحيته، فيقطع ما زاد على الكف. (سنن أبي داود: ۱/ ۳۲۱، رقم الحديث: ۲۳۵۷، كتاب الصوم، باب القول عند الإفطار، ط: ديوبند)

عن أبي زرعة، قال: كان أبو هريرة يقبض على لحيته، ثم يأخذ ما فضل عن القبضة. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار-أبو بكر بن أبي شيبة العبسي (م: ۲۳۵ھ): ۵/ ۲۲۵، رقم الحديث: ۲۵۴۸۱، كتاب الأدب، ما قالوا في الأخذ من اللحية، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد-الرياض)

عن الحسن، قال: كانوا ير خصون فيما زاد على القبضة من اللحية أن يؤخذ منها. (حوالہ سابق: حدیث نمبر: ۲۵۴۸۴)

ولا بأس بنتف الشيب، وأخذ أطراف اللحية والسنة فيها القبضة... ولذا يحرم على الرجل قطع لحيته، والمعنى المؤثر التشبه بالرجال اهـ. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله والسنة فيها القبضة) وهو أن يقبض الرجل لحيته فما زاد منها على قبضة قطعه، كذا ذكره محمد في كتاب الآثار عن الإمام، قال وبه أخذ. محيط اهـ ط. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۴۰۷، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر-بيروت)

(۴) عن صفوان بن محرز، عن جندب، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مثل الذي يعلم الناس الخير وينسى نفسه مثل مصباح يضيء للناس ويحرق نفسه. (كتاب الأمثال في الحديث النبوي-أبو محمد عبد الله بن محمد بن جعفر بن حيان الأنصاري المعروف بـ"أبي الشيخ الأصبهاني" (م: ۳۶۹ھ): ۱/ ۳۲۲، رقم الحديث: ۲۷۶، ذكر قوله صلى الله عليه وسلم: مثل الذي يعلم الناس الخير وينسى نفسه، ت: الدكتور عبد العلي عبد الحميد حامد، ط: الدار السلفية-بومباي)

(۵) عن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم. (سنن أبي داود: ۲/ ۵۵۹، رقم الحديث: ۴۰۳۱، كتاب اللباس، فصل في لبس الشهرة، ط: مكتبة الاتحاد-ديوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے فتاویٰ فلاحیہ: ۱/ ۳۰۷، عنوان: غیر مسلموں کے مذہبی میلوں میں شرکت اور خرید وفروخت۔

۲-عورت کو بے پردہ گھر سے باہر جانے دینا، جو حرام ہے۔ (۶)

۳-شوہر کا اپنے ساتھ عورت کو میلے میں گھمانا، جو گناہ کا کام ہے۔ (۷)

۴-امام کو احساس ذمہ داری دلانے والوں کو یزید کی ذریت، ابولہب کی اولاد وغیرہ الفاظ سے خطاب کرنا، جو حرام ہے۔ (۸)

۵-گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنے آپ کو بزرگوں کے ساتھ غلط تشبیہ دینا، جو حرام ہے۔

کہاں بایزید بسطامی اور کہاں یہ امام!

۶-شیخ اور مریدوں کے احکام الگ ہوتے ہیں اور امام اور مقتدیوں کے احکام جداگانہ۔ مرید تو اپنے ارادہ کو ختم کر کے شیخ کے تابع ہو جاتا ہے، جب کہ امام شیخ نہیں ہے کہ اس پر روک ٹوک کی بالکل گنجائش نہ ہو۔

۷-ضعیفوں، عالموں اور نیک نوجوانوں کو برے ناموں سے خطاب کرنا حرام ہے، جب مذکورہ امام گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے اور روکنے والوں پر دشنام طرازیاں کرتا ہے، تو اس کو تاکیداً امامت سے الگ

---

(۶) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳-الأحزاب-۵۹)

(۷) وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝ (۳۳-الأحزاب: ۳۳-۳۴)

(۸) وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (۴۹-الحجرات: ۱۱)

عن أبي ذر رضي الله عنه أنه سمع النبي صلى الله عليه وسلم يقول: لا يرمي رجل رجلا بالفسوق، ولا يرميه بالكفر، إلا ارتدت عليه، إن لم يكن صاحبه كذلك. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۹۳، رقم الحديث: ۶۰۴۵، كتاب الأدب، باب ما ينهى من السباب واللعن، ط: ديوبند)

أبو جبيرة بن الضحاك، قال: فينا نزلت هذه الآية في بني سلمة ﴿ولا تنابزوا بالألقاب بئس الاسم الفسوق بعد الإيمان﴾ قال: قدم علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم وليس منا رجل إلا وله اسمان أو ثلاثة، فجعل النبي صلى الله عليه وسلم يقول: يا فلان، فيقولون: مه يا رسول الله، إنه يغضب من هذا الاسم، فأنزلت هذه الآية ﴿ولا تنابزوا بالألقاب﴾. (سنن أبي داود: ۲/ ۶۷۸، رقم الحديث: ۴۹۶۲، كتاب الأدب، باب في الألقاب، ط: ديوبند)

کردینا چاہیے، ورنہ متولی گنہگار ہوں گے۔

نوٹ: امام کو الگ کرنے کی ذمہ داری متولی اور ٹرسٹیوں کی ہے، اگر وہ الگ نہیں کرتے ہیں، تو گنہ گار ہوں گے، مگر مقتدیوں کو چاہیے کہ اس امام کے پیچھے نماز ادا کرلیں، جماعت کا ثواب مل جائے گا، الگ سے نماز پڑھنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ جماعت چھوڑنے کا گناہ ہوگا۔[۹] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا

۷۰۶-سوال: ایک شخص ہے، اس میں ایسا بھرم ہے کہ گویا اس کے علاوہ کوئی دوسرا دین کا مسئلہ جانتا ہی نہیں، وہ امامت کراتا ہے؛ لیکن بعض مرتبہ شراب بھی پیتا ہے اور غیر قوموں کے مذہبی امور میں بھی شرکت کرتا ہے، جیسے ''نوراتری'' کے موقع پر ان کی محفل میں شریک ہونا وغیرہ، تو ایسے شخص کے پیچھے نماز میں اقتدا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ یعنی اس کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں ہے، تو جو نماز پڑھی جاچکی ہے، کیا اس کا لوٹانا ضروری ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر اس شخص کے عقائد درست ہوں، تو کراہت کے ساتھ اس کی اقتدا میں نماز ہوجائے گی اور مقتدیوں کو جماعت کا ثواب بھی مل جائے گا، البتہ متولی کی ذمہ داری ہے کہ نماز پڑھانے کے لیے کسی دین دار شخص کا تقرر کرے، شرابی، اور دوسری قوم کے تہواروں میں شرکت کرنے والے کو امامت سے دور رکھے، ورنہ ذمہ دار حضرات گنہ گار ہوں گے۔

اگر اس امام کے عقائد درست نہ ہوں، تو اس کے پیچھے نماز صحیح نہیں ہوگی۔[۱] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۹) وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۵۶۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)
تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نا اہل امام اور متولی کی ذمہ داری'' کے حواشی۔

(۱) (ويكره) تنزيها (إمامة عبد)... (وفاسق)... (ومبتدع) اى صاحب بدعة وهي اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول لا بمعاندة بل بنوع شبهة وكل من كان من قبلتنا... (وإن) أنكر بعض ما علم من الدين ضرورة (كفر بها) كقوله إن الله تعالى جسم كالأجسام وإنكاره صحبة الصديق (فلا يصح الاقتداء به أصلا) فليحفظ (وولد الزنا) هذا إن وجد غيرهم وإلا فلا كراهة بحر بحثا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۵۵۹-۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

[۱۲] أیضاً

۷۰۷-سوال: ہمارے گاؤں میں ایک شخص ہے، اس کی ڈاڑھی تو ہے، لیکن پانچ وقت کی نماز پابندی سے نہیں پڑھتا ہے، غیبت میں بھی مبتلاء ہے، سینما (فلم) دیکھنے بھی جاتا ہے، وہ بعض مرتبہ- جب امام صاحب نہیں ہوتے- جمعہ کی نماز پڑھاتا ہے، تو ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ ہماری نماز صحیح ہوجائے گی یا نہیں؟ گاؤں کے لوگ جاہل ہیں، ان کو مسئلہ معلوم نہیں ہے، جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

امامت کا منصب بہت اہم ہے، ٹرسٹیوں کی ذمہ داری ہے ایسے شخص کو امام مقرر کریں، جو نیک اور دین دار ہو، فاسق شخص- جو ڈاڑھی منڈواتا ہو یا کترواتا ہو، سینما دیکھتا ہو، اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، البتہ مقتدیوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ امام فاسق ہو، تب بھی اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں، ان کو جماعت کا ثواب مل جائے گا، کیوں کہ اسلام اتفاق واتحاد کی تعلیم دیتا ہے، پس مقتدیوں کو چاہیے کہ کوئی ایسا کام نہ کریں، جس سے اختلاف وانتشار ہو۔ مگر ٹرسٹیوں اور کمیٹی والوں پر لازم ہے کہ ایسا شخص جس سے دینی بنیاد پر لوگ ناراض ہوں، اس کو امامت کا منصب سپرد نہ کریں۔ (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] ڈاڑھی منڈے کے پیچھے نماز پڑھنا

۷۰۸-سوال: ڈاڑھی منڈوانے والے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً:

متولی اور ٹرسٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ امامت کا عہدہ متقی اور متشرع شخص کے حوالہ کریں، اگر وہ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے یا ایک مشت سے کم رکھنے والے شخص کو امامت کا عہدہ دیتے ہیں، تو گنہگار رہوں گے، البتہ محلہ والوں کا فریضہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے- جب تک اس کا عقیدہ کفر تک نہ پہنچا ہو- نماز پڑھ لیں، مجبوراً ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے سے ان کو جماعت کا ثواب مل جائے گا؛ لیکن متولی اور ٹرسٹیوں سے مشورہ

---

(۱) مسئلہ اور اس کی تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: "فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری" کے حواشی۔

کر کے ایسے امام کو معزول کرنے کی کوشش کریں، البتہ اس میں لڑائی جھگڑا نہ کریں، مصلیوں کی صرف اس قدر ذمہ داری ہے کہ بغیر کوئی فتنہ کیے اس امام کو معزول کرنے کی کوشش کرتے رہیں اور جماعت سے نماز پڑھتے رہیں جماعت کا ثواب مل جائے گا۔[۱] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] شرابی -جس نے فی الحال توبہ کی ہے- کا امام بننا

۷۰۹-سوال: ایک شخص حافظ ہے؛ لیکن اس کی بداعمالیاں بہت ہیں؛ حتی کہ شراب بھی پیتا تھا ؛لیکن فی الحال اس نے شراب ترک کردی ہے، تو ایسے شخص کے پیچھے تراویح یا فرض نماز پڑھنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً

گناہ کبیرہ کے ارتکاب یا گناہ صغیرہ پر مداومت سے انسان فاسق ہوجاتا ہے، اور فاسق کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔[۲] شراب، تاڑی وغیرہ پینا گناہ کبیرہ ہے۔[۳] جو شخص شراب پیتا ہو، اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہوگا، البتہ شراب پینے والے اور دیگر فسق کے کاموں کا ارتکاب کرنے والے نے اگر سچی توبہ کرلی ہو

---

(۱) مسئلہ اور اس کی تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری'' کے حواشی۔

(۲) قال ابن عابدين: (قوله وفاسق) من الفسق: وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر، والزاني وآكل الربا ونحو ذلك، كذا في البرجندي إسماعيل. . . . وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعا. . . . مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۳) يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۝ (۵-المائدة: ۹۰)

قال أبو هريرة رضي الله عنه: إن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا يزني الزاني حين يزني وهو مؤمن، ولا يشرب الخمر حين يشربها وهو مؤمن، ولا يسرق السارق حين يسرق وهو مؤمن. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۳۶، رقم الحديث: ۵۵۷۸، كتاب الأشربة، باب قول الله تعالى: {إنما الخمر والميسر والأنصاب . . . الآية* الصحيح لمسلم: ۱/ ۵۵، رقم الحديث: ۱۰۰ (۵۷)، كتاب الإيمان، باب بيان أن الدين النصيحة، ط: البدر - ديوبند)

اور گناہوں سے اجتناب کرنے لگا ہو، تو اب اس کو امام بنانا کسی کراہت کے بغیر جائز ہے، خواہ نماز فرض ہو یا تراویح؛ اس کی امامت جائز ہوگی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] بیان میں ایک بات کہنے کے بعد مکر جانے والے امام کے پیچھے نماز کا حکم

۱۷۰- سوال: امام صاحب نے چار سو پانچ سو آدمی کے سامنے یہ بیان دیا تھا کہ محرم کا شربت پینا اور پلانا جائز نہیں ہے، اب امام صاحب اور ان کے بعض ساتھیوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا ہے۔ حالاں کہ امام صاحب نے حقیقتاً ایسا کہا تھا، اگرچہ وہ اب اس سے منع کرتے ہوں، بہت سے لوگ اس پر گواہ ہیں، تو ایسے جھوٹے امام کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ مقتدیوں کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً

رسم و رواج کے طور پر محرم میں شربت پلایا جاتا ہے، لوگوں نے اس کو ضروری سمجھ لیا ہے، پس یہ جائز نہیں ہے اور امام صاحب کا یہ بیان کرنا بھی صحیح ہے۔ (۲)

---

(۱) وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ ﴿۸۲﴾ (۲۰-طٰہٰ:۸۲)

عن ابن عباس، عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال: کل مخمر خمر، و کل مسکر حرام، ومن شرب مسکرا بخست صلاته أربعين صباحا، فإن تاب تاب الله عليه..... الحدیث. (سنن أبي داود: ۲/ ۵۱۸، رقم الحدیث: ۳۶۸۰، کتاب الأشربة، باب باب ما جاء في المسکر، ط: البدر - دیوبند)

... فإن العبد إذا اعترف بذنبه، ثم تاب تاب الله عليه. (صحیح البخاري: ۱/ ۳۶۵، رقم الحدیث: ۲۶۶۱، کتاب الشهادات، باب تعدیل النساء بعضهن بعضا، عن عائشة رضي الله عنها، ط: البدر ☆ الصحیح لمسلم: ۲/ ۳۶۶، رقم الحدیث: ۵۶-۲۷۷۰، کتاب التوبة، باب في حدیث الإفك وقبول توبة القاذف، ط: البدر - دیوبند)

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: التائب من الذنب، کمن لا ذنب له. (سنن ابن ماجه، ص: ۳۱۳، رقم الحدیث: ۴۲۵۰، أبواب الزهد، باب ذکر التوبة، عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه، ط: البدر دیوبند)

عن أنس، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: کل بني آدم خطاء، وخیر الخطائین التوابون. (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۴۲۵۱)

مزید تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری'' کے حواشی۔

(۲) حضرت مفتی بیات صاحبؒ نے اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں رقم فرمایا ہے: لوگوں کو شربت، کھچڑا، زردا، یا بریانی کھلانا، دن اور مہینے کی تعیین و تخصیص کے بغیر ثواب کا کام ہے۔ میت کو ثواب پہنچانے کی نیت سے جو بھی صدقہ کیا جائے، میت کو اس کا ثواب ملتا ہے۔ حضرت حسینؓ کو ثواب پہنچانا بھی جائز ہے۔ البتہ..... شربت پلانے کو صرف یوم عاشورہ کے ساتھ خاص کر لینا اور اس =

امام صاحب نے شربت پینے کو ناجائز کہا تھا، اب وہ انکار کر رہے ہیں کہ میں نے ایسا نہیں کہا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کو یاد نہ ہو کہ کیا کہا تھا، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یاد ہونے کے باوجود جان بوجھ کر منع کر رہے ہوں، تاکہ لوگوں میں فتنہ اور کسی قسم کا اختلاف نہ ہو، (چوں کہ ان کا جھوٹ بولنا واضح نہیں ہے، صرف امکان کے درجے میں ہے) اس لیے ان کو فی الحال ان کے منصب پر رہنے دیں، اگر دوسری بار جھوٹ بولیں، تو معزول کردیں، نیز ان کی کسی بھی طرح کی بے عزتی نہ کریں، ان کا مکمل ادب واحترام ملحوظ رکھیں۔

جہاں تک نماز کا تعلق ہے، تو ان کے پیچھے بلا کسی کراہت کے نماز جائز ہے، ان کی امامت میں کوئی قباحت نہیں ہے، ہاں اگر ان کا فسق (جھوٹ بولنا) دو دو، چار کی طرح واضح ہوجائے، تو اس صورت میں ان کو امام بنانا مکروہ ہوگا، تاہم ان کے پیچھے پڑھی گئی نماز ہوجائے گی۔[1]

لوگوں نے امام صاحب کی- باوجود صحیح مسئلہ بتانے کے- جو بے عزتی کی ہے، تو اس کے لیے وجہ جواز کیا ہے؟ آپ نے اس سلسلہ میں اپنے سوال میں اس کا تذکرہ تک نہیں کیا ہے، واضح رہے کہ جن لوگوں نے امام صاحب کی محرم کے موقع پر شربت پلانے کے مسئلہ میں بے عزتی کی ہے، ان کے لیے امام صاحب سے معافی مانگنا ضروری ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= دن اس عمل کی انجام دہی کو ضروری سمجھنا جائز نہیں ہے۔ یہ سمجھنا کہ حضرت حسینؓ بھوکے پیاسے شہید کیے گئے تھے: اس لیے اس دن شربت پلا کر ان کو ثواب پہنچایا جائے، یہ غلط ہے۔ شربت پینے پلانے والے' نماز روزے سے غافل ہوکر ثواب کا عنوان دے کر ایک قسم کا ڈھونگ کرتے ہیں: اس لیے حدیث کی روشنی میں ان کاموں سے لوگوں کو منع کیا جاتا ہے۔ مباح امر کو ضروری سمجھ کر اس میں اس قدر دل چسپی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ فرائض تک سے انسان غافل ہوجاتا ہے، اگر کوئی اس پر نکیر کرے، تو لوگ اس سے جھگڑنا شروع کردیتے ہیں۔ (فتاوی فلاحیہ: ۱/ ۴۲۶-۴۲۷)

مسئلے کی مزید تفصیل اور تخریج کے لیے مطالعہ کریں عنوان: محرم میں لوگوں کو شربت پلانا۔ (۱/ ۴۲۶-۴۲۷)

(۱) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری'' کے حواشی۔

(۲) عن أبي بكرة، ذكر النبي صلى الله عليه وسلم قال: فإن دماءكم وأموالكم... وأعراضكم، عليكم حرام، كحرمة يومكم هذا، في شهركم هذا... الخ. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۱، رقم الحديث: ۱۰۵، كتاب العلم، باب: ليبلغ العلم الشاهد الغائب، ط: البدر- ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/ ۶۰، رقم الحديث: ۲۹- ۱۶۷۹، كتاب القسامة والمحاربين والقصاص والديات، باب تغليظ تحريم الدماء والأعراض والأموال، ط: البدر- ديوبند)

عبد الله بن عمر، قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يطوف بالكعبة، ويقول: ما أطيبك وأطيب ريحك، ما أعظمك وأعظم حرمتك، والذي نفس محمد بيده، لحرمة المؤمن أعظم عند الله حرمة منك، ماله، ودمه، وأن نظن=

[۱۶] امام کا ظہر کی چار سنت پڑھے بغیر امامت کرانا

۱۱۷-سوال: ظہر سے قبل چار رکعت سنت مؤکدہ ہے؛ لیکن اگر کوئی امام تاخیر سے پہنچنے کی بنا پر ان چار رکعت کو پڑھے بغیر فرض نماز پڑھانا شروع کر دے، تو اس کی امامت میں کوئی کراہیت آئے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

بلاشبہ ظہر سے قبل چار رکعت سنت مؤکدہ ہے؛ اس لیے امام جماعت سے قبل سنتوں سے فراغت کا اہتمام کرے۔[۱] لیکن اگر کسی وجہ سے عین جماعت کے وقت پہنچے، اور سنت مؤکدہ پڑھنے میں مشغول ہو جائے، تو جماعت میں تاخیر ہوگی، جس کی وجہ سے فتنہ کا اندیشہ ہے، اور فتنہ سے بچنا اور بچانا ضروری ہے۔

=به إلا خيرا. (سنن ابن ماجه: ۲۸۲، رقم الحديث: ۳۹۳۲، كتاب الفتن، باب حرمة دم المؤمن وماله، ط: ديوبند)

عن أبي هريرة رضي الله عنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من كانت له مظلمة لأخيه من عرضه أو شيء، فليتحلله منه اليوم، قبل أن لا يكون دينار ولا درهم، إن كان له عمل صالح أخذ منه بقدر مظلمته، وإن لم تكن له حسنات أخذ من سيئات صاحبه فحمل عليه. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۳۱، رقم الحديث: ۲۴۴۹، أبواب المظالم والقصاص، باب من كانت له مظلمة عند الرجل فحللها له، هل يبين مظلمته، ط: البدر - ديوبند)

قوله: (له مظلمة) أي قد ظلم أحدا بقول أو فعل.... (فليتحلله) يطلب منه العفو والمسامحة أو يؤدي إليه مظلمته. (فحمل عليه) ألقي على الظالم عقوبات سيئات المظلوم. (صحيح البخاري مع شرح مصطفى ديب البغا: ۳/ ۱۳۹، رقم: ۲۴۴۹، ط: دار طوق النجاة)

[۱] (والأربع قبل الظهر يقضيها بعدها) قالت عائشة: كان رسول الله - عليه الصلاة والسلام - إذا فاتته الأربع قبل الظهر قضاها بعد الظهر، ولأن الوقت وقت الظهر وهي سنة الظهر، ثم عند أبي يوسف يقضيها قبل الركعتين؛ لأنها شرعت قبلها، وعند محمد بعدها؛ لأنها فاتت عن محلها، فلا يفوت الثانية عن محلها أيضا، وهذا بخلاف سنة العصر؛ لأنها ليست مثلها في التأكيد، ولنهيه - عليه الصلاة والسلام - عن الصلاة بعد العصر. (الاختيار لتعليل المختار -: ابن مودود الموصلي (م: ۶۸۳هـ): ۱/ ۶۵، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۱۲ - ۵۱۳، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، ط: زكريا - ديوبند)

(والأحق بالإمامة) تقديما؛ بل نصبا، مجمع الأنهر (الأعلم بأحكام الصلاة) فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة وحفظه قدر فرض، وقيل واجب، وقيل سنة (ثم الأحسن تلاوة) وتجويدا (للقراءة، ثم الأورع) أي الأكثر اتقاء للشبهات. والتقوى: اتقاء المحرمات. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۵۴، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: زكريا - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، ط: زكريا - ديوبند)

نیز اس سنت کی، فرض نماز کے بعد ادائیگی درست ہے، لہٰذا اگر گاہے سنت پڑھے بغیر امام نماز پڑھا دے، تو نماز بلا کراہت جائز ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] کسی امام سے سنتِ مؤکدہ چھوٹ جائے تو اُس کو امامت پر برقرار رکھا جائے گا یا نہیں؟

۱۲ ۷ - سوال: ہمارے گاؤں کے امام صاحب حافظ، قاری اور مولوی ہیں، قرآن صحیح اور صاف پڑھتے ہیں، اُن کے اخلاق بھی بہت اچھے ہیں؛ لیکن اُن سے اکثر ظہر سے پہلے کی چار رکعات سنتِ مؤکدہ چھوٹ جاتی ہے، بعض مرتبہ بہ غرضِ تجارت سفر کی وجہ سے اور کبھی نیند کے غلبہ کی وجہ سے اِس طرح ہوتا ہے؛ لیکن فرض نماز کے بعد اِن چار رکعات کو وہ پڑھ لیتے ہیں، تو ایسے امام کو امامت پر برقرار رکھا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

ظہر کی فرض نماز سے پہلے چار رکعات سنتِ مؤکدہ ہے۔ اگر امام صاحب سے سفر یا نیند کے غلبہ کی وجہ سے یہ سنتیں کبھی کبھی چھوٹ جاتی ہیں، تو اس میں حرج نہیں، اور اس کی وجہ سے وہ تارکِ سنت نہیں کہے جائیں گے؛ کیوں کہ وہ فرض کے بعد اِن سنن کو پڑھ لیتے ہیں؛ لیکن سنت کو اکثر اوقات میں اُس کے صحیح وقت پر نہ پڑھنا کسی امام کو زیب نہیں دیتا، سنتِ مؤکدہ کو چھوڑنا واجب کو چھوڑنے کے برابر ہے، اور ظہر کی سنتِ مؤکدہ جان بوجھ کر چھوڑنے کی عادت بنا لینے والا قابلِ ملامت ہے۔ (البحر الرائق: ۱/ ۷۶☆ رد المحتار: ۴۹۶)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ترك السنة لا يوجب الفسق إلا إذا تركه رغبة عن السنة. (الاختيار لتعليل المختار: ۲/ ۱۹۰، كتاب الشهادات، ط: دار الكتب العلمية- بيروت، الطبعة الثالثة: ۱۴۲۶ هـ)

[۲] وفي القنية واختلف في آكد السنن بعد سنة الفجر فقيل الأربع قبل الظهر والركعتان بعده والركعتان بعد المغرب كلها سواء، والأصح أن الأربع قبل الظهر آكد اهـ. ــــــــ وهكذا صححه في العناية والنهاية؛ لأن فيها وعيدا معروفا قال - عليه الصلاة والسلام -: من ترك أربعا قبل الظهر لم تنله شفاعتي، وفي التجنيس والنوازل والمحيط: رجل ترك سنن الصلوات الخمس، إن لم ير السنن حقا، فقد كفر؛ لأنه ترك استخفافا، وإن رأى حقا، منهم من قال: لا يأثم، والصحيح: أنه يأثم؛ لأنه جاء الوعيد بالترك اهـ.

وتعقبه في فتح القدير بأن الإثم منوط بترك الواجب وقد قال - صلى الله عليه وسلم - للذي قال والذي بعثك بالحق لا أزيد على ذلك شيئا أفلح إن صدق اهـ. ــــــــ ويجاب عنه بأن السنة المؤكدة بمنزلة الواجب في الإثم بالترك كما صرحوا به كثيرا (البحر الرائق: ۲/ ۸۶، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الكتاب- ديوبند) =

[۱۸] بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت

۷۱۳-سوال: ہمارے گاؤں کے امام صاحب غریب اور مزدوری کرنے والی بھولی قوم سے، ان کا راشن کارڈ ایک سال کے لیے پانچ دس روپے میں خرید لیتے ہیں، اس کے بعد ہر مہینے ''سستے اناج کی دوکان'' سے ان راشن کارڈز کے ذریعہ سستا اور مناسب قیمت کا اناج (شکر، تیل وغیرہ) خرید کر جمع کرتے رہتے ہیں، اور مناسب موقع پر اس کو بلیک مارکٹ کرتے ہیں، یعنی دو تین گنا زیادہ قیمت لے کر بیچتے ہیں، امام صاحب کی اس حرکت کا علم مسجد کے متولی وٹرسٹی سمیت گاؤں کے تمام لوگوں کو ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ ایسے امام کے پیچھے جو نمازیں ادا کی گئیں ہیں، کیا ان کے جواز وعدم جواز میں کوئی شک وشبہ ہوسکتا ہے؟ اگر نمازیں قبول نہ ہوئیں، تو ذمہ دار کون ہوگا؟ امام، متولی، ٹرسٹیان یا راشن کارڈ فروخت کرنے والے یا گاؤں کے رہنما حضرات؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

غریب ومزدور طبقہ سے راشن کارڈ خریدنا اور ان سے مال خرید کر بلیک مارکیٹ کرنا جائز نہیں ہے۔ (۱)

=(وسن) مؤكدا (أربع قبل الظهر و) أربع قبل (الجمعة و) أربع (بعدها بتسليمة)... (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله وسن مؤكدا) أي استنانا مؤكدا؛ بمعنى أنه طلب طلبا مؤكدا زيادة على بقية النوافل، ولهذا كانت السنة المؤكدة قريبة من الواجب في لحوق الإثم كما في البحر، ويستوجب تاركها التضليل واللوم كما في التحرير: أي على سبيل الإصرار بلا عذر كما في شرحه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۲، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في السنن والنوافل، ط: دار الفكر - ديوبند)

(والأربع قبل الظهر يقضيها بعدها) قالت عائشة: كان رسول الله - عليه الصلاة والسلام - إذا فاتته الأربع قبل الظهر قضاها بعد الظهر، ولأن الوقت وقت الظهر وهي سنة الظهر، ثم عند أبي يوسف يقضيها قبل الركعتين؛ لأنها شرعت قبلها، وعند محمد بعدها؛ لأنها فاتت عن محلها، فلا يفوت الثانية عن محلها أيضا، وهذا بخلاف سنة العصر؛ لأنها ليست مثلها في التأكيد، ولنهيه - عليه الصلاة والسلام - عن الصلاة بعد العصر. (الاختيار لتعليل المختار -: ابن مودود الموصلي (م: ۶۸۳ھ): ۱/ ۶۵، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۱۲- ۵۱۳، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، ط: زكريا - ديوبند)

(۱) راشن کارڈ، حکومت کی جانب سے غریب کو ملنے والا رعایتی ''حق'' ہے، جس کے ذریعے کارڈ ہولڈر کو راشن (شکر اور تیل وغیرہ) خریدنے کا اختیار رہتا ہے، حکومتی قانون کے مطابق اس کا کسی دوسرے کو منتقل کرنا درست نہیں ہے؛ درحقیقت یہ حقوق مجردہ کی قبیل سے ہے؛ اس لیے اس کی خرید وفروخت جائز نہیں ہونی چاہیے: =

ناجائز امر کا ارتکاب کرنے والے کو شریعت کی اصطلاح میں ''فاسق'' کہا جاتا ہے، جس کو امام بنانا مکروہ ہے۔ (۲)

متولی کی ذمہ داری ہے کہ امامت کے لیے متقی اور پرہیزگار شخص کا انتخاب کرے، اگر یہ ذمہ داری فاسق کو دیں گے، تو گنہ گار ہوں گے۔ (۳) تاہم فاسق امام کے پیچھے نماز ہو جائے گی؛ کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو۔ (۴)

ایسے امام کو خود الگ ہو جانا چاہیے، جس کی امامت سے مقتدی (کسی دینی بنیاد پر) خوش نہ ہوں۔ (۵) اگر امام صاحب خود علاحدہ نہ ہوتے ہوں، تو خوش اسلوبی سے انہیں علاحدہ کر دیا جائے، فتنہ و فساد کو ہوا نہ دی جائے، اور جب تک امام کو ان کے منصب سے علاحدہ نہ کیا جاتا ہو، اسی کے پیچھے نماز پڑھی جائے، ان شاء اللہ مقتدی حضرات کو باجماعت نماز پڑھنے کا ثواب مل جائے گا۔ (۶) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=وفي الأشباه لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة كحق الشفعة وعلى هذا لا يجوز الاعتياض عن الوظائف بالأوقاف. (الدر المختار مع رد المحتار: ۴/ ۵۱۸، كتاب البيوع، مطلب في بيع الجامكية، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲] (قوله وفاسق) من الفسق: وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر، والزاني وآكل الربا ونحو ذلك، كذا في البرجندي إسماعيل.... وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعا، ولا يخفى أنه إذا كان أعلم من غيره لا تزول العلة، فإنه لا يؤمن أن يصلي بهم بغير طهارة فهو كالمبتدع تكره إمامته بكل حال، بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا. (رد المحتار: ۱/ ۵۶۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

(۳) لو قدموا فاسقا يأثمون بناء على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم؛ لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير - إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ۹۵۶ھ) ص: ۵۱۳، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی - لاہور)

(۴) سنن الدارقطني - أبو الحسن علي بن عمر البغدادي الدارقطني (م: ۳۸۵ھ): ۲/ ۴۰۴، رقم الحديث: ۱۷۶۸، كتاب العيدين، باب صفة من تجوز الصلاة معه والصلاة عليه، ت: شعيب الارنؤوط وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت.

(۵) عن ابن عباس، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "ثلاثة لا ترفع صلاتهم فوق رءوسهم شبرا: رجل أم قوما وهم له كارهون، وامرأة باتت وزوجها عليها ساخط، وأخوان متصارمان". (سنن ابن ماجة: ص ۶۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: البدر - ديوبند)

(۶) فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد؛ لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

[۱۹] پردے کے متعلق تاویل کرنے والے کی امامت

۱۴۱۷-سوال: زید سند یافتہ عالم ہے، عوام کو احکام شرعیہ، فضائل اور وعیدیں بڑے زور وشور سے سناتا ہے اور اپنی ولولہ انگیز تقریروں میں عوام کو خوب لتاڑتا ہے؛ لیکن ان کے گھر کی عورتوں میں پردہ- جو کہ لازم وضروری ہے- کو اہم نہیں سمجھا جاتا، یوں کہا جاتا ہے کہ: بے پردگی میں کوئی مضائقہ نہیں، وہ لوگ پردے کی فرضیت کی نفی کرتے ہیں، جس کا اظہار خود ان کی اہلیہ محترمہ بازاروں اور پورے گاؤں میں بے پردہ گھوم کر کرتی ہے اور اللہ رب العزت کے حکم کی کھلے طور پر خلاف ورزی کرتی ہے، یہ عالم صاحب تماشائی بن کر دیکھتے رہتے ہیں، اگر کوئی پردے کے فوائد اور بے پردگی کے نقصانات بیان کر کے ان کو اس جانب متوجہ کرتا ہے، تو وہ عالم صاحب تاویلات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور ایسے عالم کو شرعاً امامت کا حق ہے یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔

الجواب حامداومصلیا:

اگر کسی امام صاحب کی اہلیہ بے پردہ گلی کوچوں میں گھومتی ہے اور امام صاحب اپنی بیوی کو نصیحت نہیں کرتے اور نہ ہی پردے میں رہنے کی تلقین کرتے ہیں، تو دینی اعتبار سے ان کو ''فاسق'' سمجھا جائے گا، اور فاسق کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے۔

امام صاحب اپنی بیوی کو نصیحت کرتے ہوں، مگر وہ نہ مانتی ہو اور پردہ نہ کرتی ہو، تو امام صاحب اگر اس پوزیشن میں ہوں کہ ایسی نافرمان بیوی کو طلاق دے کر دوسری جگہ شادی کر لیں، اور اس عورت کے بغیر زندگی گذاریں، تو ان کو اس طرح کر لینا چاہیے؛ لیکن اگر کسی مجبوری کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ ہو، تو (مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ)[1] کے پیش نظر ان کی امامت مکروہ نہیں ہے؛ اس لیے کہ امام صاحب نے فرمان رسول اللہ ﷺ: من رأى منكم منكرا

(۱) ۱۷-الاسراء: ۱۵۔ ـــــــ ترجمہ: جو شخص (دنیا میں) راہ پر چلتا ہے، وہ اپنے نفع کے لیے راہ پر چلتا ہے اور جو شخص بے راہی کرتا ہے، سو وہ بھی اپنے ہی نقصان کے لیے بے راہ ہوتا ہے، اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ (ترجمہ تھانویؒ)

فلیغیرہ بیدہ، فإن لم یستطع فبلسانہ، فإن لم یستطع فبقلبہ، و ذلك أضعف الإیمان۔ [1] کے موافق اپنی ذمہ داری ادا کر دی ہے۔

ہاں! کوئی امام - معاذ اللہ - حالات سے متاثر ہو کر صراحۃً پردے کا انکار کر دے، تو اب وہ امامت کا بالکل اہل نہیں ہے، بلا تاخیر اس کو منصب امامت سے علاحدہ کرنا ضروری ہے۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۲۰] میراث نہ ادا کرنے والے امام کے پیچھے نماز کا حکم

۷۱۵- سوال: ہمارے ایک امام صاحب ہیں، جن کے پاس دوسرے ورثاء کا مال ہے، جب ورثاء مال طلب کرتے ہیں، تو امام صاحب جواب دیتے ہیں کہ میراث چاہیے، تو کورٹ سے وصول کر لو، یعنی میراث کا مال دینے سے انکار کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ میرا اس مال پر پرانا قبضہ ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ملک غیر پر قبضہ سے کوئی - امام ہو یا کوئی اور - مالک نہیں ہو جاتا، کہ اس کے لیے اس مال میں تصرف جائز ہو۔ [3]

---

(۱) عن طارق بن شہاب، قال: أول من بدأ بالخطبة یوم العید قبل الصلاة مروان. فقام إلیه رجل، فقال: الصلاة قبل الخطبة، فقال: قد ترك ما هنالك، فقال أبو سعید: أما هذا فقد قضی ما علیه سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: من رأی منكم منكرا فلیغیره بیده، فإن لم یستطع فبلسانه، فإن لم یستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإیمان. (الصحیح لمسلم: ۱/ ۵۰، رقم الحدیث: ۷۸- ۴۹، کتاب الإیمان، باب بیان کون النهي عن المنکر من الإیمان، و... أن الأمر بالمعروف والنهي عن المنکر واجبان، ط: البدر - دیوبند)

(۲) پردہ کا صراحۃً انکار، درحقیقت قرآنی آیات کا انکار ہے، جس کی وجہ سے آدمی کے کفر کا اندیشہ ہے: ولا نكفر أحدا من أهل القبلة بذنب ما لم یستحله. (عقیدة الطحاوي - أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة، الأزدي، المصري المعروف بـ'الطحاوي' (م: ۳۲۱ھ) ص: ۶۰، شرح وتعلیق: محمد ناصر الدین الألباني، ط: المکتب الإسلامي - بیروت)
تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: "فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ داڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت" کے حواشی۔

(۳) لا یجوز التصرف في مال غیره بلا إذنه ولا ولایته. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۲۰۰، کتاب الغصب، مطلب فیما یجوز من التصرف... الخ، ط: دار الفکر - بیروت) =

اس لیے امام صاحب کے لیے لازم ہے کہ صاحب حق ورثاء کو ان کا حق دے دیں۔ (۲)

کسی کے مال پر ناحق قبضہ جمالینا اور دینے سے انکار کرنا گناہ کبیرہ ہے، اور مرتکب کبیرہ فاسق ہے، اگر واقعی امام ورثاء کو ان کا حق نہ دیتا ہو، تو وہ مرتکب کبیرہ ہو کر فاسق قرار پائے گا، جس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے، البتہ ان کے پیچھے نماز پڑھ لی، تو ہو جائے گی، اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ (۳)

ایک مسلمان کی ہدایت کے لیے قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کا ذخیرہ موجود ہے، دنیوی عدالت اور غیر شرعی کورٹ میں اپنی مرضی سے جانا یا جانے پر کسی کو مجبور کرنا ناجائز اور حرام ہے، ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے، اس لیے عدالت اور کورٹ میں جانے سے بچنا ضروری ہے۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= قال رسول الله صلى الله عليه وسلم... ألا لا تظلموا، ألا لا تظلموا، ألا لا تظلموا، إنه لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه. (مسند الإمام أحمد: ۲۹۹/۳۴، رقم الحديث: ۲۰۶۹۵، مسند البصريين، حديث عم أبي حرة الرقاشي ☆ مسند أبي يعلى - أبو يعلى أحمد بن علي بن المثنى، الموصلي (م: ۳۰۷هـ): ۱۴۰/۳، رقم الحديث: ۱۵۷۰، مسند عم أبي حرة الرقاشي، ت: حسين سليم أسد، ط: دار المأمون للتراث - دمشق ☆ السنن الكبرى - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۱۶۶/۶، رقم الحديث: ۱۱۵۴۵، كتاب الغصب، باب من غصب لوحا فأدخله في سفينة أو بنى عليه جدارا، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

عبد الله بن السائب بن يزيد، عن أبيه، عن جده قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يأخذ أحدكم عصا أخيه لاعبا أو جادا، فمن أخذ عصا أخيه فليردها إليه. (سنن الترمذي: ۳۹/۲، رقم الحديث: ۲۱۶۰، أبواب الفتن، باب ما جاء لا يحل لمسلم أن يروع مسلما، ط: البدر - ديوبند ☆ سنن أبي داود: ۶۸۳/۲، رقم الحديث: ۵۰۰۳، كتاب الأدب، باب من يأخذ الشيء من مزاح، ط: البدر - ديوبند ☆ شرح السنة - محيي السنة، أبو محمد الحسين بن مسعود، البغوي الشافعي (م: ۵۱۶هـ): ۲۶۳/۱۰، رقم الحديث: ۲۵۷۲، كتاب قتال أهل البغي، باب لا يحل لمسلم أن يروع مسلما، ت: شعيب الأرنؤوط - محمد زهير الشاويش، ط: المكتب الإسلامي - دمشق ☆ مشكاة المصابيح، ص: ۲۵۵، رقم الحديث: ۲۹۴۸، كتاب البيوع، باب الغصب والعارية، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۲) إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا ۔ (۴-النساء: ۵۸)

(۳) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ داڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت'' کے حواشی۔

(۴) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ (۳۳-الأحزاب: ۳۶)

يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۔ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا ۝ (۴-النساء: ۵۹)

[۲۱] میراث ہڑپ کر لینے والے کو امامت سے علاحدہ کرنا

گذشتہ سے پیوستہ

۷۱۶-سوال: میراث ہڑپ کر لینے والے امام کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہ ہو، تو متولی کو ایسے امام کو علاحدہ کردینا چاہیے یا نہیں؟ چوں کہ میراث ادا نہ کرنا، درحقیقت قرآن وحدیث کے فرمان کو ٹھکرانا ہے۔ بینوا تو جروا۔

الجواب حامداومصلیا:

متولی اور ٹرسٹیان کی ذمہ داری ہے کہ وہ امامت کے لیے نیک اور صالح آدمی مقرر کریں، فاسق و فاجر کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، البتہ جماعت کا ثواب مل جائے گا، تنہا نماز پڑھنے کے مقابلے میں فاسق کے پیچھے ہی نماز پڑھ لینا بہتر ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] امام متہم کے پیچھے نماز کا حکم

۷۱۷-سوال: گاؤں کے پیش امام پر ایک آدمی محض شک کی بنیاد تہمت لگا کر اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا ہے، نماز کے مکمل ہوجانے کے بعد وہ اپنی نماز ادا کرتا ہے، تو ایسی صورت میں اس شخص کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ بینوا، تو جروا۔

---

(۱) وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعا، ولا يخفى أنه إذا كان أعلم من غيره لا تزول العلة، فإنه لا يؤمن أن يصلي بهم بغير طهارة فهو كالمبتدع تكره إمامته بكل حال، بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

لو قدموا فاسقا يأثمون بناء على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم؛ لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير - إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ۹۵۶ھ) ص: ۳۱۵، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی - لاہور)

فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

الجواب حامداً ومصلیاً:

کسی بھی مسلمان پر محض شک کی بنیاد پر تہمت لگانا جائز نہیں، حرام ہے؛ جس کے متعلق قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں بڑی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں؛ اس لیے شک کر کے اپنے امام صاحب کی عزت و آبرو کو نیلام کرنا سخت گناہ کی بات ہے۔ (۱)

جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر نیک اور فاجر کے پیچھے نماز ادا کرلو۔ (۲) اس لیے مقتدی کو چاہیے کہ ہر حال میں امام کے پیچھے نماز پڑھے، ان شاء اللہ اس کو

---

(۱) يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَٱتَّقُوا ٱللَّهَ إِنَّ ٱللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿۴۹-الحجرات:۱۲﴾

قال ابن كثير: يقول تعالى ناهيا عباده المؤمنين عن كثير من الظن، وهو التهمة والتخون للأهل والأقارب والناس في غير محله؛ لأن بعض ذلك يكون إثما محضا، فليجتنب كثير منه احتياطا. (تفسير القرآن العظيم-أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي (م: ۷۷۴هـ): ۷/ ۳۷۷، الحجرات: ۱۲، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

عن أبي بكرة، ذكر النبي صلى الله عليه وسلم قال: «فإن دماءكم وأموالكم... وأعراضكم، عليكم حرام، كحرمة يومكم هذا، في شهركم هذا... الخ. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۱، رقم الحديث: ۱۰۵، كتاب العلم، باب: ليبلغ العلم الشاهد الغائب، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/ ۶۰، رقم الحديث: ۲۹ - ۱۶۷۹، كتاب القسامة، باب تغليظ تحريم الدماء والأعراض والأموال، ط: البدر - ديوبند)

عبد الله بن عمر، قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يطوف بالكعبة، ويقول: ما أطيبك وأطيب ريحك، ما أعظمك وأعظم حرمتك، والذي نفس محمد بيده، لحرمة المؤمن أعظم عند الله حرمة منك، ماله، ودمه، وأن نظن به إلا خيرا. (سنن ابن ماجه: ۲۸۲، رقم الحديث: ۳۹۳۲، كتاب الفتن، باب حرمة دم المؤمن وماله، ط: ديوبند)

عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إياكم والظن، فإن الظن أكذب الحديث، ولا تحسسوا، ولا تجسسوا، ولا تحاسدوا، ولا تدابروا، ولا تباغضوا، وكونوا عباد الله إخوانا. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۹۶، رقم الحديث: ۶۰۶۳، كتاب الأدب، باب ما ينهى عن التحاسد والتدابر، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/ ۳۱۶، رقم الحديث: ۲۸ - (۲۵۶۳)، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم الظن... الخ، ط: البدر - ديوبند)

(۲) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الصلاة المكتوبة واجبة خلف كل مسلم برا كان أو فاجرا وإن عمل الكبائر. (سنن أبي داود: ۱/ ۳۴۳، رقم الحديث: ۲۵۳۳، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، ط: البدر - ديوبند☆ سنن الدار قطني (م: ۳۸۵هـ): ۲/ ۴۰۴، باب صفة من تجوز الصلاة معه، والصلاة عليه، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت)

جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ (۳)

البتہ متولی کی ذمہ داری ہے کہ نیک، متقی اور پرہیزگار شخص کو امامت کے منصب پر فائز کرے، اگر اس نے کسی ایسے شخص کو امام بنایا، جو فاسق وفاجر ہے اور دینی امور کے سلسلے میں لاپرواہی سے کام لیتا ہے، تو متولی گنہ گار ہوگا۔ (۴)

مذکورہ شخص کا جماعت کی نماز کو چھوڑ کر تنہا نماز ادا کرنا گناہ کا کام ہے، جس سے بچنا سخت ضروری ہے۔ (۵) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] أيضـــــاً

۷۱۸-سوال: اگر واقعۃً پیش امام نے غلط کام کیا ہے اور گواہوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مقتدی حضرات ان کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں، تو ان کی نماز ہوگی یا نہیں؟

---

(۳) فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد؛ لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

(۴) لو قدموا فاسقا يأثمون بناء على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم؛ لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير-إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ۹۵۶ھ) ص: ۵۱۳، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی-لاہور)

[۵] (والجماعة سنة مؤكدة للرجال) قال الزاهدي: أرادوا بالتأكيد الوجوب إلا في جمعة وعيد فشرط. وفي التراويح سنة كفاية، وفي وتر رمضان مستحبة على قول. (الدر المختار)

(قوله قال الزاهدي إلخ) توفيق بين القول بالسنية والقول بالوجوب الآتي، وبيان أن المراد بهما واحد أخذا من استدلالهم بالأخبار الواردة بالوعيد الشديد بترك الجماعة. وفي النهر عن المفيد: الجماعة واجبة، وسنة لوجوبها بالسنة اهـ وهذا كجوابهم عن رواية سنية الوتر بأن وجوبها ثبت بالسنة، قال في النهر: إلا أن هذا يقتضي الاتفاق على أن تركها مرة بلا عذر يوجب إثما مع أنه قول العراقيين. والخراسانيون على أنه يأثم إذا اعتاد الترك كما في القنية. اهـ ــــــــ وقال في شرح المنية: والأحكام تدل على الوجوب، من أن تاركها بلا عذر يعزر وترد شهادته، ويأثم الجيران بالسكوت عنه، وقد يوفق بأن ذلك مقيد بالمداومة على الترك. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب في تكرار الجماعة في المسجد، ط: دار الفكر-بيروت)

الجواب حامداو مصلیا:

امام اگر چہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے، تب بھی ان کے پیچھے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے سے مصلین کو نماز با جماعت کا ثواب مل جائے گا؛ اس لیے ہر حال میں -خواہ امام صاحب گناہوں سے اجتناب کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں- جماعت سے نماز پڑھنی چاہیے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] شک کی بنیاد پر امام کے پیچھے نماز نہ پڑھنے والے کا حکم

۷۱۹-سوال: شک کی بنیاد پر جو شخص اپنے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا؛ بل کہ وہ تنہا نماز پڑھ لیتا ہے، تو اس کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ اور اس پر گناہ عائد ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

نماز تو ادا ہو جائے گی؛ البتہ جماعت چھوڑنے کا اس پر گناہ عائد ہوگا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الصلاة المكتوبة واجبة خلف كل مسلم برا كان أو فاجرا وإن عمل الكبائر. (سنن أبي داود: ۱/ ۳۴۳، رقم الحديث: ۲۵۳۳، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، ط: البدر- ديوبند☆ سنن الدار قطني (م: ۳۸۵هـ): ۲/ ۴۰۴، باب صفة من تجوز الصلاة معه، والصلاة عليه، ط: مؤسسة الرسالة- بيروت)

(۲) عن عثمان قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أدركه الأذان في المسجد، ثم خرج، لم يخرج لحاجة، وهو لا يريد الرجعة، فهو منافق. (سنن ابن ماجه: ۵۳، رقم الحديث: ۷۳۴، كتاب الأذان والسنة فيه، باب إذا أذن وأنت في المسجد فلا تخرج، ط: البدر- ديوبند)

(والجماعة سنة مؤكدة للرجال) قال الزاهدي: أرادوا بالتأكيد الوجوب إلا في جمعة وعيد فشرط. وفي التراويح سنة كفاية، وفي وتر رمضان مستحبة على قول. (الدر المختار)

(قوله قال الزاهدي إلخ) توفيق بين القول بالسنية والقول بالوجوب الآتي، وبيان أن المراد بهما واحد أخذا من استدلالهم بالأخبار الواردة بالوعيد الشديد بترك الجماعة. وفي النهر عن المفيد: الجماعة واجبة، وسنة لوجوبها بالسنة اهـ وهذا كجوابهم عن رواية سنية الوتر بأن وجوبها ثبت بالسنة. قال في النهر: إلا أن هذا يقتضي الاتفاق على أن تركها مرة بلا عذر يوجب إثما مع أنه قول العراقيين. والخراسانيون على أنه يأثم إذا اعتاد الترك كما في القنية. اهـ. (رد المختار على الدر المحتار: ۱/ ۵۵۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب في تكرار الجماعة في المسجد، ط: دار الفكر- بيروت)

[۲۵] خلاف شرع بال رکھنے اور داڑھی کتروانے والے کی امامت

۷۴۲۰-سوال: ایک شخص مسجد میں امامت کے منصب پر فائز ہے، اس کے بال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کی طرح نہیں ہیں، وہ خلاف شرع انگلش اسٹائل کے بال رکھے ہوئے ہے، ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اس کو انتہائی نرمی سے اس جانب متوجہ کیا گیا، اس کے باوجود وہ اپنے طرز کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہے، متولی کو اس امام کی بار بار شکایت کی گئی، اس کے باوجود وہ اس امام کو اس کے منصب سے علاحدہ نہیں کرتے ہیں، ایسے متولی کا کیا حکم ہے؟ کیا متولی پر لازم نہیں ہے کہ ایسے امام کو علاحدہ کردیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداو مصليا:

جو امام انگریزی بال رکھتا ہو اور ایک مشت سے کم ہونے کے باوجود اپنی داڑھی بھی کترواتا ہو، تو چوں کہ یہ دونوں امر خلاف سنت ہیں، اگر امام اس پر مداومت اختیار کیے ہوئے ہو، اور اپنی اس غلط روش کو تبدیل کرنے کے لیے تیار نہ ہو، تو اس کے ''فاسق'' ہونے میں شبہ نہیں ہے۔ (۱)

---

(۱) عن ابن عمر، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: " خالفوا المشركين: وفروا اللحى، وأحفوا الشوارب " وكان ابن عمر: إذا حج أو اعتمر قبض على لحيته، فما فضل أخذه. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۷۵، رقم الحديث: ۵۸۹۲، كتاب اللباس، باب تقليم الأظفار، ط: ديوبند ☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۲۹، رقم الحديث: ۵۴-(۲۵۹)، و ۵۵-(۲۶۰)، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، ط: ديوبند)

حدثنا مروان يعني ابن سالم المقفع، قال: رأيت ابن عمر يقبض على لحيته، فيقطع ما زاد على الكف. (سنن أبي داود: ۱/ ۳۲۱، رقم الحديث: ۲۳۵۷، كتاب الصوم، باب القول عند الإفطار، ط: ديوبند)

عن أبي زرعة، قال: كان أبو هريرة يقبض على لحيته، ثم يأخذ ما فضل عن القبضة. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار-أبو بكر بن أبي شيبة، العبسي (م: ۲۳۵هـ): ۵/ ۲۲۵، رقم الحديث: ۲۵۴۸۱، كتاب الأدب، ما قالوا في الأخذ من اللحية، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد-الرياض)

عن الحسن، قال: كانوا يرخصون فيما زاد على القبضة من اللحية أن يؤخذ منها. (حوالہ سابق: حدیث نمبر: ۲۵۴۸۳)

ولا بأس بنتف الشيب، وأخذ أطراف اللحية والسنة فيها القبضة... ولذا يحرم على الرجل قطع لحيته، والمعنى المؤثر التشبه بالرجال اهـ. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله والسنة فيها القبضة) وهو أن يقبض الرجل لحيته فما زاد منها على قبضة قطعه، كذا ذكره محمد في كتاب الآثار عن الإمام، قال وبه أخذ. محيط اهـ ط. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۴۰۷، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر-بيروت)

عن ابن عمر: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن القزع، قال: قلت لنافع وما القزع قال: يحلق بعض رأس =

اس لیے اگر اس امام کے مقابلہ میں زیادہ نیک اور متقی دوسرا کوئی شخص موجود ہو، تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے؛ البتہ مقتدیوں کو اپنی جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ (۲)

متولی اور ٹرسٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ کسی متقی اور پرہیزگار آدمی کو امامت کی ذمہ داری حوالہ کریں، ورنہ وہ گنہ گار ہوں گے؛ بعض لوگ اپنی ذاتی لڑائی جھگڑوں کی بنیاد پر بھی امام کو غلط طریقہ سے بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس سے بھی بچنے کی سخت ضرورت ہے، آپ نے متولیوں اور امام کو سمجھا دیا، آپ نے اپنی ذمہ داری ادا کردی ہے، آپ ان کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں، آپ کو جماعت کا ثواب مل جائے گا اور جو لوگ اس کے حقیقی سبب ہیں، ان سے سوال ہوگا، اور وہی گنہ گار ہوں گے۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] فاسق امام کے پیچھے نماز اور تراویح کا حکم

۷۲۱-سوال: میں مہووتج گاؤں کے مدرسہ کی کمیٹی کا ممبر ہوں، درج ذیل صورت میں میرے لیے کیا حکم ہے؟

ابھی حال ہی میں ہمارے مدرسہ میں ایک مدرس کا تقرر کیا گیا ہے، جو حافظ قرآن ہیں، تاہم پنج وقتہ نماز نہیں پڑھتے ہیں، ریڈیو پر گانا بھی سنتے ہیں، سنیما بھی دیکھتے ہیں اور بدکاری میں بھی ملوث ہیں، کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ نماز بھی پڑھاتے ہیں، اس وقت میں ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا ہوں، نماز سے فراغت کے بعد لوگ مجھے اکیلا نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ تم اکیلے نماز کیوں پڑھتے ہو؟ اس وقت میں لوگوں کو اس نو منتخب مدرس کی ساری حقیقت بتاتا ہوں، اس کے باوجود بھی گاؤں کے لوگ اس کو امام بناتے ہیں۔

اس سال ان کے پیچھے گاؤں کے لوگ تراویح بھی پڑھنے والے ہیں؛ تو اس امام کے پیچھے ہماری

=الصبي ويترك بعض. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۷۷، رقم الحديث: ۵۹۲۰، ۵۹۲۱، كتاب اللباس، باب القزع، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۲۰۳، رقم الحديث: ۱۱۳ - (۲۱۲۰)، كتاب اللباس و الزينة، باب كراهة القزع، ط: البدر - ديوبند)

(۲) ويكره تنزيها إمامة. . . فاسق. (الدر المختار) ـــــــ فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

(۳) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: "فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ داڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت" کے حواشی۔

تراویح کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

متولیان اور ٹرسٹیان کی ذمہ داری ہے کہ منصب امامت کے لیے کسی لائق اور عالم آدمی کا تقرر کریں جو دین دار بھی ہو؛ اگر عالم نہ ہو، تو کم از کم حافظ قرآن تو ضرور ہو۔ (عالمگیری)[۱]

آپ کی تحریر کے مطابق وہ حافظ دین دار نہیں ہیں، تو ایسے شخص کو امامت کی ذمہ داری سپرد کرنا مکروہ تحریمی ہے، اگر ٹرسٹیان اور متولیان ان کو منصب امامت پر فائز کریں گے، تو گنہ گار ہوں گے۔[۲]

البتہ ٹرسٹیان جس کسی آدمی کو بھی امامت کی ذمہ داری سپرد کردیں، محلے اور گاؤں والوں کے لیے اسی امام کے پیچھے نماز پڑھنا ضروری ہے، ان کو اپنی نماز باجماعت کا ثواب مل جائے گا؛ اور امام اور ٹرسٹیان گنہ گار ہوں گے؛ اس لیے آپ کی ذمہ داری تو بس یہی ہے کہ آپ اسی امام کے پیچھے اپنی نماز پڑھتے رہیں، جماعت کی نماز کو چھوڑ کر انفراداً اپنی نماز پڑھنا گناہ کا باعث ہوگا۔[۳] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

(۱) الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية. ويجتنب الفواحش الظاهرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، ط: زكريا-ديوبند☆ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱/ ۱۵۷، كتاب الصلاة، فصل بيان من هو أحق بالإمامة وأولى بها، ط: دار الكتب العلمية☆تحفة الفقهاء- أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو: ۵۴۰هـ): ۱/ ۲۳۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(قوله وفاسق) من الفسق: وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر، والزاني وآكل الربا ونحو ذلك، كذا في البرجندي إسماعيل.... وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعا، ولا يخفى أنه إذا كان أعلم من غيره لا تزول العلة، فإنه لا يؤمن أن يصلي بهم بغير طهارة، فهو كالمبتدع تكره إمامته بكل حال، بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) لو قدموا فاسقا يأثمون بناء على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم؛ لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير-إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ۹۵۶هـ) ص: ۳۱۵، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی-لاہور)

(۳) عن عثمان قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أدركه الأذان في المسجد، ثم خرج، لم يخرج لحاجة، وهو لا يريد الرجعة، فهو منافق. (سنن ابن ماجه: ۵۳، رقم الحديث: ۷۳۴، أبواب الأذان والسنة فيها، باب إذا أذن وأنت في المسجد فلا تخرج، ط: البدر-ديوبند)

[۲۷] امام کا کسی اجنبیہ سے ناجائز تعلقات رکھنا

۷۲۲-سوال: ہمارے امام صاحب نوجوان ہیں، پچیس سال کی عمر ہے، اب تک شادی نہیں کی ہے، ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ عشق بازی میں مبتلا ہیں، ایسے شخص کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں؟ اُس کے پیچھے نماز درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

اجنبیہ کے ساتھ غلط تعلقات رکھنے والا، یا بدنظری کرنے والا، گنہ گار ہے، اگر غلط تعلقات رکھتا ہے، تو زانی اور فاسق ہے، ایسے شخص کو کسی بھی حال میں امام نہ بنایا جائے، اُس کو امام بنانے والے گنہگار ہوں گے؛ لیکن اگر بہ درجۂ مجبوری ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھ لی گئی، تو نماز درست ہوگی۔ (رد المحتار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= (والجماعة سنة مؤكدة للرجال) قال الزاهدي: أرادوا بالتأكيد الوجوب إلا في جمعة وعيد فشرط. وفي التراويح سنة كفاية، وفي وتر رمضان مستحبة على قول. (الدر المختار)

(قوله قال الزاهدي إلخ) توفيق بين القول بالسنية والقول بالوجوب الآتي، وبيان أن المراد بهما واحد أخذا من استدلالهم بالأخبار الواردة بالوعيد الشديد بترك الجماعة. وفي النهر عن المفيد: الجماعة واجبة، وسنة لوجوبها بالسنة اهـ وهذا كجوابهم عن رواية سنية الوتر بأن وجوبها ثبت بالسنة، قال في النهر: إلا أن هذا يقتضي الاتفاق على أن تركها مرة بلا عذر يوجب إثما مع أنه قول العراقيين. والخراسانيون على أنه يأثم إذا اعتاد الترك كما في القنية. اهـ. (رد المحتار على الدر المحتار: ۱/ ۵۵۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب في تكرار الجماعة في المسجد، ط: دار الفكر - بيروت)

[۱] قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝

عن سهل بن سعد، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من يضمن لي ما بين لحييه وما بين رجليه أضمن له الجنة. (صحيح البخاري: ۲/ ۹۵۸، رقم الحديث: ۶۴۷۴، كتاب الرقاق، باب حفظ اللسان، ط: البدر - ديوبند)

(قوله وفاسق) من الفسق: وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر، والزاني وآكل الربا ونحو ذلك، كذا في البرجندي إسماعيل.... وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعا، ولا يخفى أنه إذا كان أعلم من غيره لا تزول العلة، فإنه لا يؤمن أن يصلي بهم بغير طهارة، فهو كالمبتدع تكره إمامته بكل حال، بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲۸] سود کھانے والے کے پیچھے نماز پڑھنے کا شرعی حکم

۷۲۳-سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اور علمائے دین متین حسب ذیل مسئلہ میں:

زید نامی طالب علم، اپنے والد اور دادا کے ساتھ ایک گھر میں رہتا ہے، گھر کا مکمل نظم و نسق اس کے دادا کے ہاتھ میں ہے، اس کے والد کا گھر میں کسی قسم کا کوئی رول و دخل نہیں ہے، دادا کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کو سود پر پیسے دیتا ہے، اب یہ طالب علم یا اس کے والد لوگوں کو نماز پڑھائیں، تو ان کی اقتدا کرنے والوں کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں ہوگی؟ اگر نماز صحیح نہ ہو، تو اب تک جو نمازیں ان کے پیچھے پڑھی گئیں ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ کیا ان کا اعادہ لازم ہوگا؟ نیز اس طالب علم کا ان پیسوں سے پڑھنا اور تعلیم حاصل کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

سود کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، جس سے بچنا لازم و ضروری ہے؛[1] اس لیے لازم ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں مل کر اپنے دادا کو سودی کاروبار سے منع کریں۔

---

(۱) اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۝ (۲-البقرۃ:۲۷۵)

اور جو لوگ سود کھاتے ہیں، نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص، جس کو شیطان خبطی بنادے لپٹ کر (یعنی حیران و مدہوش) یہ سزا اس لیے ہوگی کہ ان لوگوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے۔ پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا، تو جو کچھ پہلے (لینا) ہو چکا ہے، وہ اسی کا رہا اور (باطنی) معاملہ اس کا خدا کے حوالے رہا، اور جو شخص پھر عود کرے، تو یہ لوگ دوزخ میں جاویں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (ترجمہ تھانوی)

عن أبي هريرة رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: اجتنبوا السبع الموبقات، قالوا: يا رسول الله وما هن؟ قال: الشرك بالله، والسحر، وقتل النفس التي حرم الله إلا بالحق، وأكل الربا، وأكل مال اليتيم، والتولي يوم الزحف، وقذف المحصنات المؤمنات الغافلات. (صحيح البخاري: ۱/۳۸۸، رقم الحديث: ۲۷۶۶، كتاب الوصايا، باب قول الله تعالى: ﴿إن الذين يأكلون أموال اليتامى ظلما...﴾، ط: البدر - ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/۶۴، رقم الحديث: ۱۴۵ - (۸۹)، كتاب الإيمان، باب بيان الكبائر وأكبرها، ط: البدر - ديوبند)

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الربا سبعون حوبا، أيسرها أن ينكح الرجل أمه. (سنن ابن ماجه: ۱۶۴، رقم الحديث: ۲۲۷۴، كتاب التجارات، باب التغليظ في الربا، ط: البدر - ديوبند)

اگر باپ اور بیٹا کے منع کرنے کے باوجود دادا نے اس کاروبار کو بند نہ کیا ہو، تو باپ اور بیٹے؛ دونوں ان شاء اللہ گنہ گار نہ ہوں گے، اور ضرورت کی وجہ سے اگر بہ قدر کفاف سودی مال کو استعمال بھی کر لیا ہو، تب بھی ان کی امامت بلا کراہت جائز ہوگی۔ (۱)

لیکن اگر وہ دونوں دادا کے فعل پر راضی ہیں، تو فسق کی وجہ سے ان کی امامت مکروہ ہوگی، لیکن بہ ہر دو صورت مقتدی کی نماز ہو جائے گی، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ (۲)

طالب علم کا سود کے پیسوں سے علم حاصل کرنا جائز نہ ہوگا، کیوں کہ علم دین کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، جب کہ سود سے بچنا فرض عین۔ (۳)

اگر آمدنی کا صحیح اور حلال ذریعہ موجود ہو، تو اس طالب علم اور اس کے باپ کے لیے لازم ہے کہ دادا کی کمائی سے بالکل کوئی چیز استعمال نہ کریں۔

ہاں! اگر ان کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ موجود نہ ہو تو بہ قدر کفاف استعمال کی گنجائش ہے۔ بہ طور خاص اس صورت میں، جب کہ سود کے علاوہ دادا کے پاس دوسرے ذرائع بھی موجود ہوں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] سودی کاروبار کرنے والے امام اور مؤذن کی امامت واذان کا حکم

۴۲۴۷- سوال: ایک مسجد کے امام اور مؤذن اگر سودی کاروبار کرتے ہوں اور [مثلاً] ایک روپیہ دے کر ایک مہینہ کے بعد اس کے عوض سوا روپیہ وصول کرتے ہوں، تو ایسے امام اور مؤذن کی امامت واذان کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

سودی لین دین کا معاملہ کرنا بہت بڑے گناہ کا کام ہے۔ (۴) ایسا شخص فاسق ہے، جو سودی کاروبار میں

(۱) مسئلے کی تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے عنوان: بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت۔

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت'' کے حواشی۔

(۳) درء المفاسد أولی من جلب المنافع. (قواعد الفقہ، ص: ۸۱، قاعدہ نمبر: ۱۳۳، ط: دار الکتاب - دیوبند)

(۴) اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ. (۲- البقرۃ: ۲۷۵)

ملوث ہو، اور فاسق کی اذان اور اس کی امامت مکروہ ہے؛ اس لیے اس سے زیادہ اچھا اور بہتر کوئی دوسرا آدمی اذان اور امامت کی ذمہ داری قبول کرسکتا ہو، تو اس کو اس منصب پر فائز کرنا چاہیے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] غیر شرعی وضع قطع والے امام کی امامت حکم

۷۲۵-سوال: مسجد کے امام صاحب انگلش طرز کے بال کٹواتے ہیں اور چست کپڑے پہنتے ہیں، اگر ان کو کوئی اس جانب توجہ دلاتا ہے، تو کہتے ہیں کہ میں تو اسی طریقہ سے رہوں گا، گویا وہ اس سلسلے میں کسی کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

غلام حسین گنگات کونڈھ

الجواب حامداً ومصلیاً:

انگلش طرز کے بال رکھنا، درحقیقت یہود و نصاریٰ کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا ہے؛ اس لیے سنت

= عن أبي هريرة رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: اجتنبوا السبع الموبقات، قالوا: يا رسول الله وما هن؟ قال: الشرك بالله، والسحر، وقتل النفس التي حرم الله إلا بالحق، وأكل الربا، وأكل مال اليتيم، والتولي يوم الزحف، وقذف المحصنات المؤمنات الغافلات. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۸۸، رقم الحديث: ۲۷۶۶، كتاب الوصايا، باب قول الله تعالى: ﴿إن الذين يأكلون أموال اليتامى ظلما...﴾، ط: البدر - ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۶۴، رقم الحديث: ۱۴۵ - (۸۹)، كتاب الإيمان، باب بيان الكبائر وأكبرها، ط: البدر - ديوبند)

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الربا سبعون حوبا، أيسرها أن ينكح الرجل أمه. (سنن ابن ماجه ۱۶۴، رقم الحديث: ۲۲۷۴، كتاب التجارات، باب التغليظ في الربا، ط: البدر - ديوبند)

(۲) قال الحصكفي: ويكره... إمامة عبد... وأعرابي... وفاسق. (الدر المختار)

(قوله وفاسق) من الفسق: وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر، والزاني وآكل الربا ونحو ذلك، كذا في البرجندي إسماعيل.... وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعا، ولا يخفى أنه إذا كان أعلم من غيره لا تزول العلة، فإنه لا يؤمن أن يصلي بهم بغير طهارة، فهو كالمبتدع تكره إمامته بكل حال، بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت'' کے حواشی۔

کے موافق بال کٹوانا چاہیے، انگلش طرز کے بال کٹوانا جائز نہیں۔[1] اگر کوئی اس طرز کے موافق بال کٹوائے، تو تشبہ بالفساق کی وجہ سے وہ فاسق قرار پائے گا، جس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے؛ تاہم اس کے پیچھے نماز ہوجائے گی، اور جماعت کا ثواب بھی ملے گا، ان شاء اللہ۔

متولی حضرات کی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی نیک اور دین دار عالم کو امامت کی ذمہ داری سپرد کریں، فاسق و فاجر کو امامت کا منصب حوالے کریں گے، تو گنہ گار ہوں گے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] داڑھی کٹوانے والے امام کے پیچھے نماز کا حکم

۷۲۶-سوال: ہمارے گاؤں کے امام صاحب اپنی داڑھی کٹواتے ہیں، ڈاڑھی کو ایک مشت کی مقدار تک نہیں بڑھاتے ہیں، اور ازار بھی ٹخنوں سے نیچے پہنتے ہیں، تو ایسے امام کے پیچھے نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ اس حوالے سے مصلیوں میں تشویش، بل کہ ناراضگی ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

ایسے شخص کو امامت کا منصب سپرد کرنا مکروہ تحریمی ہے؛ جو اپنی داڑھی کترواتا ہو، اور ازار یا تہہ بند کو ٹخنوں سے نیچے بلا عذر لٹکا کر پہنتا ہو۔

وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں کام: ڈاڑھی کٹوانا، اور بلا عذر ٹخنوں سے نیچے ازار کو لٹکا کر پہننا گناہ کبیرہ ہے، اور مرتکب کبیرہ ''فاسق'' کہلاتا ہے، جس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

---

(۱) حدثنا الحجاج بن حسان، قال: دخلنا على أنس بن مالك، فحدثتني أختي المغيرة، قالت: وأنت يومئذ غلام ولك قرنان، أو قصتان، فمسح رأسك، وبرك عليك، وقال: احلقوا هذين - أو قصوهما - فإن هذا زي اليهود. (سنن أبي داود: ۲/۵۷۷، رقم الحديث: ۴۱۹۷، كتاب الترجل، باب ما جاء في الرخصة، قبل: باب في أخذ الشارب)

عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ليس منا من تشبه بغيرنا، لا تشبهوا باليهود ولا بالنصارى... الحديث. (سنن الترمذي: ۲/۹۹، رقم الحديث: ۲۶۹۵، أبواب الاستئذان والآداب عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في كراهية إشارة اليد في السلام، ط: البدر - ديوبند)

مسلم را تشبہ بہ کفار وفساق حرام است۔ (مالا بد منہ: ۱۳۱)

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت'' کے حواشی۔

حدیث شریف میں "إعفاء اللحية" یعنی ڈاڑھی بڑھانے کو خصال فطرت میں شمار کیا گیا ہے۔ (۱)
اس لیے ڈاڑھی رکھنا واجب ہے اور ایک مشت تک پہنچنے سے پہلے پہلے کٹوانا ناجائز ہے۔ (۲)

بلا عذر ٹخنوں سے نیچے اپنا ازار یا تہبند لٹکانا مکروہ ہے، آں حضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ: تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ رب العزت ان سے کلام نہیں فرمائیں گے اور ان کی طرف رحمت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے اور نہ ان کو پاک کریں گے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے [وہ تین یہ ہیں]: (۱) اپنے ازار اور تہبند کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا۔ (۲) احسان جتلانے والا۔ اور (۳) جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے مال کو فروخت کرنے والا۔ (مسلم شریف: ۱/۷۱) [۳]

---

(۱) عن عائشة، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "عشر من الفطرة: قص الشارب، وإعفاء اللحية، و السواك، واستنشاق الماء، وقص الأظفار، وغسل البراجم، ونتف الإبط، وحلق العانة، وانتقاص الماء". (الصحيح لمسلم: ۱/۱۲۹، رقم الحديث: ۵٦-(۲٦۱)، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، ط: البدر-ديوبند)

(۲) عن ابن عمر، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "خالفوا المشركين: وفروا اللحى، وأحفوا الشوارب" وكان ابن عمر: إذا حج أو اعتمر قبض على لحيته، فما فضل أخذه. (صحيح البخاري: ۲/۸۷۵، رقم الحديث: ۵۸۹۲، كتاب اللباس، باب تقليم الأظفار، ط: البدر-ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/۱۲۹، رقم الحديث: ۵۲-۲۵۹، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، ط: البدر-ديوبند)

عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: انهكوا الشوارب، وأعفوا اللحى. (صحيح البخاري: ۲/۸۷۵، رقم الحديث: ۵۸۹۳، كتاب اللباس، باب إعفاء اللحى)

ولا بأس بنتف الشيب، وأخذ أطراف اللحية والسنة فيها القبضة... ولذا يحرم على الرجل قطع لحيته، والمعنى المؤثر التشبه بالرجال اهـ. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله والسنة فيها القبضة) وهو أن يقبض الرجل لحيته فما زاد منها على قبضة قطعه، كذا ذكره محمد في كتاب الآثار عن الإمام، قال وبه أخذ. محيط اهـ ط. (رد المحتار على الدر المختار: ٦/٤۰۷، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر-بيروت)

وقص اللحية من صنع الأعاجم وهو اليوم شعار كثير من المشركين كالإفرنج والهنود، ومن لا خلاق له في الدين من الطائفة القلندرية. (مرقاة المصابيح: ۱/۳۹٦، رقم الحديث: ۳۷۹، كتاب الطهارة، باب السواك، الفصل الأول، ط: دار الفكر-بيروت)

وأما الأخذ منها وهي دون ذلك كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه أحد. (فتح القدير-ابن الهمام (م: ۸٦۱هـ): ۲/۳٤۸، كتاب الصوم، باب ما يوجب القضاء والكفارة، ط: دار الفكر)

[۳] عن أبي ذر، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة، ولا ينظر إليهم ولا يزكيهم ولهم عذاب أليم، قال: فقرأها رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلاث مرار، قال أبو ذر: خابوا وخسروا، من هم يا رسول الله؟=

الغرض وہ امام جوڈاڑھی کاٹتا ہو، اور ٹخنے سے نیچے ازار لٹکا تا ہو، اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔امام کے لیے لازم ہے کہ اپنی بری عادتوں سے باز آجائے؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: تین آدمی ایسے ہیں کہ ان کی نماز ان کے کانوں سے اوپر نہیں جاتی (یعنی اللہ رب العزت ان کی نماز قبول نہیں فرماتے، وہ تین آدمی یہ ہیں): [۱] وہ غلام، جو اپنے آقا سے بھاگ گیا ہو۔ [۲] وہ عورت جس نے رات اس حال میں گزاری ہو کہ اس کا شوہر اس سے ناراض ہو۔ [۳] وہ امام، جس نے لوگوں کی امامت کی اور لوگ اس کی امامت سے ناخوش ہوں۔ (ترمذی شریف) [۴]

صورت مسئولہ میں امام صاحب سے ان کے مقتدی حضرات اس لیے ناراض ہیں کہ امام صاحب اپنی داڑھی کٹواتے ہیں، اور لباس کی سنت کی پابندی نہیں کرتے، گویا اسلامی تعلیم کے خلاف کام کرتے ہیں؛ اس لیے امام کے لیے لازم ہے کہ اپنے منصب امامت سے دست بردار ہوجائیں، امام صاحب اگر خود سے علاحدگی اختیار نہ کریں، تو متولی صاحبان ان کو علاحدہ کردیں، لیکن جب تک علاحدگی کا عمل مکمل نہ ہو، مقتدی کے لیے لازم ہے کہ وہ اسی امام کی اقتدا میں نماز پڑھتے رہیں، ان شاء اللہ ان کو جماعت کا ثواب مل جائے گا؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: تم لوگ ہر نیک اور فاسق کے پیچھے نماز پڑھ لو۔ (ابوداود شریف، مشکوۃ شریف:۱/ ۱۰۰) [۵] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=قال: المسبل، والمنان، والمنفق سلعته بالحلف الكاذب. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۷۱، رقم الحديث: ۱۷۱-(۱۰۶)، كتاب الإيمان، باب بيان تحريم إسبال الإزار ... الخ، ط: البدر- ديوبند)

الحديث الصحيح أن الإسبال يكون في الإزار والقميص والعمامة وأنه لايجوز إسباله تحت الكعبين إن كان للخيلاء، فإن كان لغيرها فهو مكروه. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج المعروف بـ "شرح النووي" - أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م:۶۷۶هـ): ۱۴/ ۶۲، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم جر الثوب خلاء، وبيان حد ما يجوز إرخاؤه إليه وما يستحب، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

(۴) عن أبي أمامة، يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " ثلاثة لا تجاوز صلاتهم آذانهم: العبد الآبق حتى يرجع، وامرأة باتت وزوجها عليها ساخط، وإمام قوم وهم له كارهون ". (سنن الترمذي: ۱/ ۸۳، رقم الحديث: ۳۶۰، أبواب الصلاة، باب ما جاء فيمن أم قوما وهم له كارهون، ط: البدر- ديوبند☆ سنن أبي داود: ۱/ ۸۸، رقم الحديث: ۵۹۳، كتاب الصلاة، باب الرجل يؤم القوم وهم له كارهون، ط: البدر- ديوبند)

(۵) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الصلاة المكتوبة واجبة خلف كل مسلم برا كان أو فاجرا وإن عمل الكبائر. (سنن أبي داود: ۱/ ۳۴۳، رقم الحديث: ۲۵۳۳، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، ط: البدر- ديوبند☆ سنن الدار قطني (م: ۳۸۵هـ): ۲/ ۴۰۴، باب صفة من تجوز الصلاة معه، والصلاة عليه، ط: مؤسسة الرسالة- بيروت)

[۳۲] جھگڑالو، بدزبان اور جھوٹے امام کے پیچھے نماز کا حکم

۲۷۷-سوال: ہماری مسجد کے امام صاحب کا حال یہ ہے کہ وہ فرائض کے تعلق سے لاپرواہی برتتے ہیں، مصلیوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، متولی صاحب کے ساتھ لڑائی جھگڑا اور گالی گلوچ تک کرتے ہیں، ان امور کی بنیاد پر جب ان کو منصب امامت سے الگ کیا گیا، تو انہوں نے تنخواہ کے نام پر ملنے والی مسجد کی ایک رقم کو اپنے اثر و رسوخ سے بند کروادیا، اور متولی کے خلاف ایک آدمی کا سہارا لے کر کورٹ میں مقدمہ دائر کیا، دوران سماعت کورٹ کے اندر جج کے سامنے بھی متولی کے خلاف سراسر جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لیا۔

بعد میں اس شرط پر صلح ہوگئی اور امام صاحب کو ان کے منصب پر بحال کرلیا گیا کہ وہ زبان درازی نہیں کریں گے اور جس جگہ سے تنخواہ رکوائی ہے، اسے دوبارہ فہمائش کے بعد شروع کرادیں گے اور مقدمہ واپس لے لیں گے، ایسا ہی ہوا؛ لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ ان کے پیچھے مصلی حضرات نماز پڑھنے کے لیے راضی نہیں ہیں، فی الحال محلہ کا کوئی بھی آدمی ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا ہے؛ بل کہ ہر آدمی قریب کی ایک دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جاتا ہے، نتیجتاً مسجد بالکل ویران ہورہی ہے، تو ایسے امام صاحب کے متعلق شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟ کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں؟ ایسے امام کو امامت کرنا جائز ہے؟ مسجد کی مدد کرنے والے لوگ اس طرح کا دباؤ کرکے اس کی مدد بند کردیں، تو اس کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

امامت بہت ہی اہم اور عظیم منصب ہے، اس لیے متولی اور ٹرسٹیان حضرات کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے لیے ایسے آدمی کا تقرر کریں، جو عالم، متبع سنت، متقی، پرہیزگار اور گناہوں سے دور رہنے والا ہو، تاکہ اس کی برکتوں سے مقتدیوں میں جوڑ، لگاؤ اور تعلق پیدا ہوسکے۔ وہ (امام) اسلامی تعلیمات پر عمل کرکے قوم کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہو؛ اس لیے جو باتیں سوال میں لکھی گئی ہیں، اگر وہ درست ہیں، اور آپ کے امام کے اندر واقعتاً وہ ساری باتیں پائی جاتی ہیں، تو اس کے فسق میں کلام نہیں، اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، لازم تھا کہ وہ خود امامت کے منصب سے دست بردار ہوجاتے، اگر اس نے ایسا نہیں کیا، تو متولی کی ذمہ

داری ہے کہ اسے امامت کے منصب سے علاحدہ کردے۔[۱]

البتہ متولی اگر ٹرسٹ کے مال میں خیانت کرتا ہو، دھوکہ بازی سے کام لیتا ہو، بار بار سمجھانے کے باوجود بھی وہ سمجھنے کے لیے تیار نہ ہو؛ اس وجہ سے امام صاحب نے مجبور ہو کر کورٹ کچہری کا سہارا لیا ہو، تو اس نے اپنی ذمہ داری ادا کی ہے، اس بنا پر اگر متولی امام صاحب سے ناراض ہے، تو وہ (متولی) گنہ گار ہوگا۔

اگر امام صاحب کے اندر کوئی خلاف شرع بات ہے، اس وجہ سے ناراض ہو کر لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھنا نہیں چاہتے ہیں، تو اس کو امامت سے اجتناب کرنا ضروری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ایسے امام کی نماز اس کے کانوں سے اوپر نہیں چڑھتی۔ (مشکوۃ شریف)[۲] لیکن اگر محلے والے اس کے باوجود اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں گے، تو نماز صحیح ہوجائے گی اور ان کو جماعت کا ثواب مل جائے گا؛ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: تم ہر نیک اور فاجر کے پیچھے اپنی نماز پڑھ لیا کرو۔[۳]

کسی دینی وجہ سے اگر مقتدی حضرات اس امام کے پیچھے نماز پڑھنا نہیں چاہتے ہیں، تو امام کے لیے بھی مناسب نہیں کہ وہ ان کی امامت کرے؛ امداد کرنے والوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اچھی طرح سے اس بات کی تحقیق کرلیں کہ اس معاملہ میں کس کا قصور ہے، اگر متولی اور ٹرسٹیان کا قصور ثابت ہوجائے، تو امام کے لیے اپنی امداد بند نہ کریں۔ ہاں! اگر قصور امام کا ثابت ہوجائے، تو پھر اس کی طرف داری کرتے ہوئے

---

(۱) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: "فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ داڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت" کے حواشی۔

[۲] (ولو أم قوما وهم له كارهون، إن) الكراهة (لفساد فيه أو لأنهم أحق بالإمامة منه كره) له ذلك تحريما؛ لحديث أبي داود: لا يقبل الله صلاة من تقدم قوما وهم له كارهون. (وإن هو أحق لا) والكراهة عليهم. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

عن أبي أمامة، يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "ثلاثة لا تجاوز صلاتهم آذانهم: العبد الآبق حتى يرجع، وامرأة باتت وزوجها عليها ساخط، وإمام قوم وهم له كارهون". (سنن الترمذي: ۱/ ۸۳، رقم الحديث: ۳۶۰، أبواب الصلاة، باب ما جاء فيمن أم قوما وهم له كارهون، ط: البدر - ديوبند ☆ سنن أبي داود: ۱/ ۸۸، رقم الحديث: ۵۹۳، كتاب الصلاة، باب الرجل يؤم القوم وهم له كارهون، ط: البدر - ديوبند)

(۳) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الصلاة المكتوبة واجبة خلف كل مسلم برا كان أو فاجرا وإن عمل الكبائر. (سنن أبي داود: ۱/ ۳۴۳، رقم الحديث: ۲۵۳۳، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، ط: البدر - ديوبند ☆ سنن الدار قطني (م: ۳۸۵هـ): ۲/ ۴۰۴، باب صفة من تجوز الصلاة معه، والصلاة عليه، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت)

متولیان پر دباؤ ڈالنا اور نہ ماننے کی صورت میں اپنی امداد بند کرنے کی دھمکی دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] گالی دے کر معافی مانگنے والے شخص کی امامت

۷۲۸-سوال: ہمارے گاؤں کی مسجد میں ایک امام صاحب ہیں جو تقریباً پینتیس سال سے امامت کا فریضہ بہ حسن وخوبی انجام دے رہے ہیں، ابھی کچھ دنوں قبل وہ بیمار ہوئے، مرض ایسا تھا کہ رات کو انھیں نیند نہیں آتی تھی، کافی علاج ومعالجہ کرایا؛ تب جا کر ٹھیک ہوئے، دوران مرض ذہنی اعتبار سے وہ کافی ٹینشن میں تھے، کہ متولی صاحب کے ساتھ ان کا جھگڑا ہو گیا، گالم گلوچ تک کی نوبت آ گئی، امام صاحب سے بھی نہ رہا گیا اور انہوں نے بھی غصہ میں آ کر متولی صاحب کو گالیاں دے دی۔

جھگڑا مسجد سے باہر محلے میں ہو رہا تھا، محلے کے بیشتر لوگوں نے اس مکروہ منظر کو دیکھا، بعد میں امام

---

(۴) خلاصہ یہ کہ اصحاب خیر کسی بھی حال میں اپنی امداد بند نہ کریں، خواہ غلطی ٹرسٹیان کی ہو، یا امام صاحب کی؛ کیوں کہ وہ درحقیقت مسجد کا تعاون کرتے ہیں، نہ کہ کسی مخصوص آدمی کا:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَى وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۲۲﴾ (۲۴-النور: ۲۲)

قال ابن كثير القرشي: وهذه الآية نزلت في الصديق، حين حلف ألا ينفع مسطح بن أثاثة بنافعة بعدما قال في عائشة ما قال، كما تقدم في الحديث. فلما أنزل الله براءة أم المؤمنين عائشة، وطابت النفوس المؤمنة واستقرت، وتاب الله على من كان تكلم من المؤمنين في ذلك، وأقيم الحد على من أقيم عليه، شرع تبارك وتعالى، وله الفضل والمنة، يعطف الصديق على قريبه ونسيبه، وهو مسطح بن أثاثة، فإنه كان ابن خالة الصديق، وكان مسكينا لا مال له إلا ما ينفق عليه أبو بكر، رضي الله عنه، وكان من المهاجرين في سبيل الله، وقد ولق ولقة تاب الله عليه منها، وضرب الحد عليها. وكان الصديق- رضي الله عنه- معروفا بالمعروف، له الفضل والأيادي على الأقارب والأجانب. فلما نزلت هذه الآية إلى قوله: ﴿ألا تحبون أن يغفر الله لكم والله غفور رحيم﴾ أي: فإن الجزاء من جنس العمل، فكما تغفر عن المذنب إليك نغفر لك، وكما تصفح نصفح عنك. فعند ذلك قال الصديق: بلى، والله إنا نحب -يا ربنا- أن تغفر لنا. ثم رجع إلى مسطح ما كان يصله من النفقة، وقال: والله لا أنزعها منه أبدا، في مقابلة ما كان قال: والله لا أنفعه بنافعة أبدا، فلهذا كان الصديق هو الصديق [رضي الله عنه وعن بنته]. (تفسير القرآن العظيم المعروف بتفسير ابن كثير- أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي (م: ۷۷۴هـ): ۶/۳۱، النور: ۲۲، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، تو انہوں نے متولی صاحب کے پاس جا کر معافی بھی مانگ لی، گاؤں کے بڑے سرکردہ حضرات کے سامنے بھی انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور یہ کہا کہ غصہ کی حالت میں زبان کی گالی نکل گئی تھی، اسلامی نقطۂ نظر سے میرے اس کرتوت کی جو بھی سزا ہو سکتی ہو، میں اس کو بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔

امام صاحب ویسے اپنے رہن سہن، رفتار و گفتار اور کردار وغیرہ ہر اعتبار سے قابل اعتماد ہیں؛ لیکن چوں کہ انہوں نے سب کے سامنے گالی دی تھی؛ اس لیے متولی صاحب اور دیگر مصلیان کا یہ کہنا ہے کہ ایسے گالی دینے والے امام کے پیچھے نماز صحیح نہیں ہوتی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "ایسے امام کے پیچھے نماز صحیح نہیں ہوتی"۔ شرعاً ایسے امام صاحب کا اور ان کے پیچھے نماز کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

گالی گلوچ اور جھگڑا کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔[1] جو شخص گالی گلوچ کرتا ہو اور جھگڑنے کا عادی ہو، وہ شرعاً فاسق ہے اور فاسق کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔

صورت مسئولہ میں اگر امام نے خود گالی دینے میں پہل کی ہو، تو ان کی امامت مکروہ ہوگی؛ اگر متولی کی طرف سے گالی کی ابتدا ہوئی اور اس کے جواب میں امام صاحب نے بھی ان کو گالی دی ہے، تو اس صورت میں ان کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں؛ البتہ گالی دینا ہر حال میں امام کی شان کے خلاف ہے۔

جب امام صاحب اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگتے ہیں، تو اسلامی تعلیم یہ ہے کہ متولی صاحب ان کو معاف کر دیں؛ کیوں کہ احادیث میں معاف کرنے والوں کے بڑے بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں اور بالخصوص اس وقت، جب کہ ان کے اندر بہت ساری خوبیاں ہیں اور دوسرے نقائص نہیں ہیں۔[2]

---

(۱) اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ (۲-البقرة:۱۹۷)

عن عبد الله أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: سباب المسلم فسوق، وقتاله كفر. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲، رقم الحديث: ۴۸، كتاب الإيمان، باب خوف المؤمن من أن يحبط عمله وهو لا يشعر، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۵۸، رقم الحديث: ۱۱۶-(۶۴)، كتاب الإيمان، باب بيان قول النبي صلى الله عليه وسلم: سباب المسلم فسوق وقتاله كفر، ط: البدر - ديوبند)

(۲) اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۳-آل عمران: ۱۳۴) =

جب فاسق امام کے پیچھے بھی نماز صحیح ہو جاتی ہے؛ تو ان مذکورہ امام کا فسق چوں کہ ظاہر نہیں ہے؛ اس لیے ان کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہوگا، ہاں! ان کے اندر اس کے علاوہ دوسرے بھی نقائص موجود ہوں؛ مثلاً: ان کے فسق کی وجہ سے اہل محلہ ان سے ناراض رہتے ہوں، محلہ میں وقتاً فوقتاً لڑائی کرواتے رہتے ہوں، ان کی امامت کی وجہ سے محلہ میں فتنہ وفساد بھڑکنے کا اندیشہ ہو اور وہ اپنی ذمہ داری بھی ٹھیک سے ادا نہ کرتے ہوں، تو ان وجوہات کی بنا پر متولی ان کو منصب امامت سے الگ کرنا چاہے، تو کر سکتا ہے، جائز ہے، لیکن محض ایک وجہ سے الگ کرنا بہتر نہیں ہے۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۴] بیوی کے حقوق ادا نہ کرنے والے کی امامت

۷۲۹-سوال: ہمارے امام صاحب عالم دین ہیں؛ لیکن ان میں بعض خرابیاں بھی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ: ان کی دو بیویاں ہیں: نئی بیوی کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں، جب کہ پرانی کو اپنے وطن میں، اور پرانی بیوی کے ساتھ بین طور پر ناانصافی کرتے ہیں، شب باشی میں انصاف سے کام نہیں لیتے، ان کا کوئی حق اس سلسلے میں ادا نہیں کرتے، امام صاحب بہت دور کے رہنے والے ہیں، ان کی نئی بیوی شادی سے قبل خود ان ہی کے پاس پڑھنے کے لیے آیا کرتی تھی، دو سال تک تو اس کے ساتھ محبت و پیار کا معاملہ رہا، اس کے بعد انہوں نے پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ نکاح سے پہلے انہوں نے جو اس کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھے ہیں اور گناہوں میں ملوث ہوئے ہیں، نیز اپنی پرانی بیوی کے ساتھ انصاف نہیں کرتے ہیں، تو کیا ان کی پیچھے نماز

عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إذا كان يوم القيامة ينادي مناد فيقول: أين العافون عن الناس؟ هلموا إلى ربكم خذوا أجوركم، وحق على كل مسلم إذا عفا أن يدخله الله الجنة". (الترغيب في فضائل الأعمال وثواب ذلك-ابن شاهين (م: ۳۸۵هـ): ۱/۱۴۹، رقم الحديث: ۵۱۹، باب ما ذكر في فضل من عفا عن أخيه المؤمن، ت: محمد حسن محمد حسن إسماعيل، ط: دار الكتب العلمية، بيروت - لبنان☆مكارم الأخلاق للطبراني (مطبوع مع مكارم الأخلاق لابن أبي الدنيا): ۱/۳۳۱، رقم الحديث: ۵۵، باب فضل العفو عن الناس، ط: دار الكتب العلمية☆حلية الأولياء وطبقات الأصفياء-أبو نعيم الأصبهاني (م: ۴۳۰هـ): ۶/۱۸۷، ذكر طوائف من جماهير النساك والعباد، غالب القطان ومنهم المتعبد اليقظان... الخ، ط: السعادة-بجوار محافظة مصر)

(۳) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: "فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام☆ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت" کے حواشی۔

پڑھنا جائز ہے؟ کیا ہماری نمازیں صحیح ہوں گی؟

امام صاحب نے گاؤں میں کچھ ناخواندہ لوگوں کو اپنے گروپ میں شامل کرلیا ہے، یہ لوگ وقتاً فوقتاً امام صاحب کی طرف داری کرتے ہوئے مسجد میں آکر متولی صاحب کے ساتھ جھگڑا کرتے رہتے ہیں، اکثر ٹرسٹیان بے نمازی ہیں، تو ایسے مولوی کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے، میں نے خود تو اس مسجد میں نماز پڑھنا چھوڑ دیا ہے، میں دوسری مسجد میں نماز پڑھتا ہوں، تو میرا یہ عمل کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت حاصل کرنا لازم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نکاح کا معاملہ مردوں کے سپرد فرمایا ہے اور متعدد (بہ یک وقت چار تک) نکاح کی اجازت دی ہے۔[1]

بغیر گواہوں کے کسی آدمی پر غلط کاری اور زنا کی تہمت لگانا جائز نہیں۔[2]

---

(۱) قوله تعالى: وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذٰلِكَ أَدْنٰٓى أَلَّا تَعُولُوا ﴿۳﴾ (۴-النساء: ۳)

(۲) وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمٰنِينَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۚ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿۴﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوا ۚ فَإِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۵﴾ (۲۴-النور: ۵-۴)

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ ۖ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَّلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللهَ ۚ إِنَّ اللهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲﴾ (۴۹-الحجرات: ۱۲)

قال ابن كثير: يقول تعالى ناهيا عباده المؤمنين عن كثير من الظن، وهو التهمة والتخون للأهل والأقارب والناس في غير محله؛ لأن بعض ذلك يكون إثما محضا، فليجتنب كثير منه احتياطا. (تفسير القرآن العظيم-أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي (م: ۷۷۴هـ): ۷/۳۷۷، الحجرات: ۱۲، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

عن أبي بكرة، ذكر النبي صلى الله عليه وسلم قال: فإن دماءكم وأموالكم ... وأعراضكم، عليكم حرام، كحرمة يومكم هذا، في شهركم هذا ... الخ. (صحيح البخاري: ۱/۲۱، رقم الحديث: ۱۰۵، كتاب العلم، باب: ليبلغ العلم الشاهد الغائب، ط: البدر- ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/۶۰، رقم الحديث: ۲۹- ۱۶۷۹، كتاب القسامة والمحاربين والقصاص والديات، باب تغليظ تحريم الدماء والأعراض والأموال، ط: البدر- ديوبند)

عبد الله بن عمر، قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يطوف بالكعبة، ويقول: ما أطيبك وأطيب ريحك، ما أعظمك وأعظم حرمتك، والذي نفس محمد بيده، لحرمة المؤمن أعظم عند الله حرمة منك، ماله، ودمه، وأن نظن به إلا خيرا. (سنن ابن ماجه: ۲۸۲، رقم الحديث: ۳۹۳۲، كتاب الفتن، باب حرمة دم المؤمن وماله، ط: ديوبند)

عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إياكم والظن، فإن الظن أكذب الحديث، ولا تحسسوا، ولا =

''پرانی بیوی اپنے باپ کے مکان پر کیوں چلی گئی'' اس کی تفصیل آپ نے نہیں لکھی ہے، اگر وہ عورت بغیر کسی شرعی وجہ کے اپنے شوہر کی نافرمانی کرتے ہوئے چلی گئی ہے، تو شب باشی میں انصاف اور عدم انصاف کی بات بے معنیٰ ہے؛ اس لیے میاں بیوی کے معاملے میں پرانی بیوی سے کوئی بات پوچھے بغیر کچھ بھی نہیں لکھا جاسکتا، آپ کا اس مسئلے کو چھیڑنا، مناسب نہیں، گناہ کا کام ہے۔

البتہ امام صاحب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اچھے اخلاق کا برتاؤ کریں، سب کے ساتھ اتحاد اور اتفاق قائم رکھیں، اختلاف پیدا کرنا اور کرانا جائز نہیں، حرام ہے۔(۳)

اگر امام کا مشغلہ ہی جھگڑا لڑائی اور پارٹی بندی ہو، جو حرام اور کار فسق ہے، تو اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہوگا، لڑائی جھگڑے کے بغیر اگر امام کو بدلا جاسکتا ہو، تو بدلنا ضروری ہے، ورنہ آپ کو اس امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے جماعت کا ثواب مل جائے گا، آپ کو اپنے محلے کی مسجد چھوڑ کر دوسری مسجد میں جانے کی بجائے اپنی ہی مسجد میں نماز پڑھنی چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: تم ہر نیک اور فاجر کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو۔ (الحدیث)(۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] أیضـــــــاً

گذشتہ سے پیوستہ

۷۳۰- سوال: ۲۸/۱۰/۷۷ء کے جواب میں جو ۹/۱۰/۷۷ء کے روز پوچھا گیا تھا، اس سلسلے میں مزید عرض ہے کہ پہلی بیوی کے بھائی کا بیان ہے کہ: ''پیش امام صاحب نئی بیوی کو وہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور پرانی کو اپنے وطن میں، شب باشی میں اس کو کوئی حق نہیں دیتے اور اس کے ساتھ انصاف بھی

=تجسسوا، ولا تحاسدوا، ولا تدابروا، ولا تباغضوا، وكونوا عباد الله إخوانا. (صحيح البخاري: ۵۹۶/۲، رقم الحديث: ۶۰۶۴، كتاب الأدب، باب ما ينهى عن التحاسد والتدابر، ط: البدر- ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۳۱۶/۲، رقم الحديث: ۲۸-(۲۵۶۳)، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم الظن... الخ، ط: البدر-ديوبند)

(۳) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۲۹- الحجرات: ۱۲)

(۴) مسئلہ اور حدیث کی تخریج کے لیے دیکھیے عنوان: ''داڑھی کٹوانے والے امام کے پیچھے نماز کا حکم'' اور ''جھگڑالو، بدزبان اور جھوٹے امام کے پیچھے نماز کا حکم''۔

نہیں کرتے۔"

الغرض گواہوں کے ذریعے ان کا اپنی بیوی کے ساتھ ناانصافی کرنا ثابت ہے، اس لیے ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ کیا ہماری نمازیں صحیح ہوں گی؟ اور کتنے سالوں سے تو یہ مولانا صاحب اپنے وطن میں بھی نہیں جاتے ہیں، آپ سے اس سلسلے میں جواب درکار ہے۔

الجواب حامداومصلیا:

امام صاحب کی دوسری بیوی اپنے وطن میں رہتی ہے، تو اس سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی کہ وہ بیوی کے ساتھ ناانصافی کا معاملہ کرتے ہیں؛ بل کہ ممکن ہے کہ بیوی نے اپنی باری اور اپنے حق کو معاف کر دیا ہو، ایسی صورت میں امام گنہ گار نہیں ہوگا؛ جیسا کہ حضرت سودہ بنت زمعہؓ - جو آں حضرت ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہیں - نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے دی تھی،؛ اس لیے حضرت عائشہؓ کے یہاں آپ ﷺ دو دن گزارتے تھے اور دوسری ازواج کے یہاں ایک دن۔ (۱)

الغرض امام صاحب کی دوسری شادی کر لینے اور نئی بیوی کو اپنے ساتھ رکھنے کی وجہ سے ان پر صراحۃً ناانصافی کرنے کا حکم لگانا درست نہیں ہے۔ (۲)

البتہ امام صاحب اگر فاسق ہوں اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہوں، تو ان کو امامت کے منصب

---

(۱) وفي شوال من هذه السنة- سنة: ۱۰/ من النبوة- تزوج رسول الله صلى الله عليه وسلم سودة بنت زمعة، كانت ممن أسلم قديما، وهاجرت الهجرة الثانية إلى الحبشة، وكان زوجها السكران بن عمرو، وكان قد أسلم وهاجر معها، فمات بأرض الحبشة، أو بعد الرجوع إلى مكة، فلما حلت خطبها رسول الله صلى الله عليه وسلم وتزوجها، وكانت أول امرأة تزوجها بعد وفاة خديجة، وبعد عدة أعوام وهبت نوبتها لعائشة. (الرحيق المختوم- صفي الرحمن المباركفوري (م: ۱۴۲۷هـ) ص: ۱۰۵، الدور المكي، المرحلة الثانية، عام الحزن، الزواج بسودة رضي الله عنها، ط: دار الهلال - بيروت)

(۲) يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَٱتَّقُوا ٱللَّهَ إِنَّ ٱللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲﴾ (۴۹- الحجرات: ۱۲)

قال ابن كثير: يقول تعالى ناهيا عباده المؤمنين عن كثير من الظن، وهو التهمة والتخون للأهل والأقارب والناس في غير محله؛ لأن بعض ذلك يكون إثما محضا، فليجتنب كثير منه احتياطا. (تفسير القرآن العظيم- أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي (م: ۷۷۴هـ): ۷/ ۳۷۷، الحجرات: ۱۲، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

سے متولی علاحدہ کردے، اگر بلا عذر علاحدہ نہ کرے، تو گنہ گار ہوگا۔ [۱]

لڑائی جھگڑا کرنا بڑا گناہ ہے، اس لیے مصلحت سے کام لیا جائے، کسی کا فاسق ہونا ظاہر ہو جائے، اس صورت میں بھی اس کے پیچھے پڑھی گئی نماز ہو جاتی ہے، تو جن کا فسق ظاہر اور یقینی نہ ہو، ان کے پیچھے تو بلا کراہت نماز درست ہوگی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۶] تصویر کھینچوانے والے امام کے پیچھے نماز کا حکم

۷۳۱-سوال: مدرسہ صدر مدرس صاحب نے عید میلاد النبی کے جلسے میں علی الاعلان تصویر کھینچوائیں، حالاں کہ بلا ضرورت تصویر کھینچوانا حرام ہے، اس کے باوجود انہوں نے ایسا کیا، وہ نماز بھی پڑھاتے ہیں، تو کیا ان کے پیچھے نماز صحیح ہو جائے گی؟ بینوا تو جروا۔

الجواب حامداو مصلیا:

بلا ضرورت تصویر کھینچوانا حرام اور گناہ کا کام ہے۔ [۲] البتہ حرام کا ارتکاب کرنے کے باوجود اگر کوئی نماز پڑھاتا ہو تو اس کی اقتداء میں پڑھی گئی نماز کراہت کے ساتھ ہو جائے گی۔ [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۷] سید نہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو سید کہلانے والے کی امامت

گذشتہ سے پیوستہ

۷۳۲-سوال: ہمارے مدرسہ کے صدر مدرس صاحب - جو امام مسجد بھی ہیں - اپنے آپ کو سید ظاہر کرتے ہیں، حالاں کہ وہ سید خاندان سے تعلق نہیں رکھتے، ان کے گاؤں کے قریب کی بستی کے رہنے والے

---

(۱) تقدم تخریجه غیر مرة.

(۲) عن مسلم، قال: كنا مع مسروق، في دار يسار بن نمير، فرأى في صفته تماثيل، فقال: سمعت عبد الله، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابا عند الله يوم القيامة المصورون. (صحيح البخاري: ۸۸۰/۲، رقم الحديث: ۵۹۵۰، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة، ط: البدر - ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۲۰۱/۲، رقم الحديث: ۲۱۰۹، كتاب اللباس والزينة، باب لا تدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا صورة، ط: البدر - ديوبند)

(۳) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: "فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نا اہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت" کے حواشی۔

ایک شخص کا یہ کہنا ہے کہ وہ سید نہیں ہیں، تو کیا حقیقی نسب کو چھپانے اور دوسرے اعلیٰ خاندان کی جانب اپنے آپ کو منسوب کرنے والے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟ اور اگر نماز پڑھ لی، تو ان نمازوں کا کیا حکم ہوگا؟

صدر مدرس صاحب بہ کثرت جھوٹ بھی بولتے ہیں، تو ایسے امام صاحب کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ ان کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا چاہیے؟ ان کی مخالفت ہو رہی ہے، اس کے باوجود وہ ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اپنے حقیقی خاندان اور نسب کی جانب نسبت نہ کر کے دوسرے خاندان کی جانب اپنے آپ کو منسوب کرنا ہونے حرام ہے؛ اس لیے اگر امام صاحب سید نہیں ہیں، تو ان کے لیے اپنے آپ کو سید کہنا حرام ہے۔ (مسلم شریف: ۱/ ۵۷)[1]

جھوٹ بولنا بھی گناہ کبیرہ ہے۔[2] اور مرتکب کبیرہ کو "فاسق" کہا جاتا ہے۔

الغرض کسی شخص کا اپنے خاندان کے علاوہ کسی دوسرے خاندان کی جانب منسوب کرنا اور جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ اور عمل فسق ہے، ایسے شخص کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے؛ لیکن اس کے باوجود اس امام کے پیچھے نماز کراہت کے ساتھ صحیح ہو جائے گی، تاہم متولیان مسجد کی ذمہ داری ہے کہ ایسے فاسق امام کو بدل دے، ورنہ گنہ گار ہوں گے۔ ہاں! اگر گاؤں کے بعض جاہلوں کی لڑائی، جھگڑے اور فتنہ وفساد برپا کرنے کے اندیشے

---

(۱) عن أبي ذر رضي الله عنه، أنه سمع النبي صلى الله عليه وسلم، يقول: ليس من رجل ادعى لغير أبيه - وهو يعلمه - إلا كفر، ومن ادعى قوما ليس له فيهم، فليتبوأ مقعده من النار. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۹۸، رقم الحديث: ۳۵۰۸، كتاب المناقب، باب، بعد: باب نسبة اليمن إلى إسماعيل، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۵۷، رقم الحديث: ۱۱۲-(۶۱)، كتاب الإيمان، باب بيان حال إيمان من رغب عن أبيه وهو يعلم، ط: البدر - ديوبند)

(۲) وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ ﴿۳۰﴾. (۲۲-الحج: ۳۰)

عن عبد الرحمن بن أبي بكرة، عن أبيه رضي الله عنه، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: "أكبر الكبائر: الإشراك بالله، وعقوق الوالدين، وشهادة الزور، وشهادة الزور - ثلاثا - أو: قول الزور" فما زال يكررها حتى قلنا: ليته سكت. (صحيح البخاري: ۲/ ۱۰۲۲، رقم الحديث: ۶۹۱۹، كتاب استتابة المرتدين والمعاندين وقتالهم، باب إثم من أشرك بالله، وعقوبته في الدنيا والآخرة، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۶۴، رقم الحديث: ۱۴۳-(۸۷)، كتاب الإيمان، باب بيان الكبائر وأكبرها، ط: البدر - ديوبند)

سے امام کے بدلنے پر متولیان قادر نہ ہوں، تو وہ گنہ گار نہیں ہوں گے، پورا گناہ امام کی ناحق، طرف داری کرنے والوں کے سر ہوگا؛ کہ وہ غلط امر کی حمایت کر رہے ہیں۔ [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۸] ڈھول باجا بجوانے والے امام کے پیچھے نماز کا حکم

گذشتہ سے پیوستہ

۷۳۳-سوال: مسجد کے قریب ہی اس امام صاحب نے اپنے حکم سے کسی کی شادی بیاہ کے موقع پر ڈھول اور باجہ بجوایا تھا اور کھیل تماشہ کروایا تھا اور ڈھول بجانے اور تماشہ کرنے والوں کو انہوں نے نقد رقم انعام بھی دیا تھا، تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے والے کی نماز ہو جائے گی؟

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ ایسے امام صاحب کو رکھنے والے ٹرسٹیان ہی گنہ گار ہوں گے، ہماری نمازیں تو صحیح ہو جائیں گی، تو کیا یہ نظریہ صحیح ہے؟ کیوں کہ ٹرسٹیوں کو معلوم ہے، اس کے باوجود بھی انہوں نے ایسے امام کو منصب امامت پر برقرار رکھا ہے۔

دراصل اس مسجد کے زیادہ ٹرسٹیان بے نمازی ہیں، ان کو نماز کی قدر و قیمت کیا معلوم؟ میں ان کو مختلف طریقے سے سمجھاتا ہوں؛ لیکن وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان کو تو صرف مسجد کے ٹرسٹیان کی فہرست میں اپنا نام چاہیے، بڑا اور ذمہ دار بننے کا شوق ہے اور بس۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ڈھول باجا بجانا یا اس کا سننا سنانا سب حرام ہے۔ [۱] امام صاحب نے بجانے کا حکم دیا، مزید برآں

---

(۳) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت'' کے حواشی۔

(۱) ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ [۳۱-لقمان: ۶]

قال ابن جرير: ... عن أبي الصهباء البكري، أنه سمع عبد الله بن مسعود - وهو يسأل عن هذه الآية: {ومن الناس من يشتري لهو الحديث ليضل عن سبيل الله} - فقال عبد الله: الغناء، والله الذي لا إله إلا هو، يرددها ثلاث مرات. ـــــــ وكذا قال ابن عباس، وجابر، وعكرمة، وسعيد بن جبير، ومجاهد، ومكحول، وعمرو بن شعيب، وعلي بن بذيمة.

وقال الحسن البصري: أنزلت هذه الآية: {ومن الناس من يشتري لهو الحديث ليضل عن سبيل الله بغير علم} في الغناء والمزامير. (تفسير القرآن العظيم - ابن كثير القرشي (م: ۷۷۴هـ): ۶/ ۳۳۰-۳۳۱، لقمان: ۶، ت: سامي=

اس پر انعام بھی تقسیم کیے؛ یہ سب افعال گناہ اور معصیت کے ہیں اور حرام ہیں؛ اور ان کا مرتکب فاسق ہے، جن کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے، لہٰذا متولی حضرت کی ذمہ داری ہے کہ اس امام کو نصیحت و خیر خواہی کے جذبے سے سمجھائے، اگر امام صاحب توبہ کرلے، تو ٹھیک، ورنہ ان کو منصب امامت سے علاحدہ کردیا جائے۔ اگر متولی و ٹرسٹیان امام کے فسق کو جاننے کے باوجود انہیں منصب امامت پر برقرار رکھیں گے، تو گنہ گار ہوں گے۔[۲]

البتہ اتنی بات ضرور یاد رکھیں کہ آپ کا کام صرف تبلیغ کرنا، دین کی بات دوسروں تک پہنچانا اور نصیحت و خیر خواہی ہے، تبلیغ کے کام میں مخاطب کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنا روا نہیں، اخلاص کے ساتھ کام کرتے رہیں، اللہ رب العزت آپ کو اپنے کام میں کامیابی عطا فرمائے گا۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۳۹] امام صاحب کا ریڈیو کے ذریعہ گانے سننا اور اُن گانوں کے طرز پر نعت پڑھنا

۷۳۴-سوال: ہمارے امام صاحب ریڈیو پر گانے سنتے ہیں، پھر اُن گانوں کے نغمہ کے

= بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

عن ابن عباس، قال: هو الغناء والاستماع له، يعني قوله: (ومن الناس من يشتري لهو الحديث)....

جابر في قوله: (ومن الناس من يشتري لهو الحديث) قال: هو الغناء والاستماع له. (جامع البيان في تأويل القرآن- أبو جعفر الطبري (م: ۳۱۰ھ): ۲۰/ ۱۲۸، لقمان: ۶، ت: أحمد محمد شاكر، ط: مؤسسة الرسالة)

(۲) لو قدموا فاسقا يأثمون بناء على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم، لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير- إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ۹۵۶ھ) ص: ۵۱۳، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی- لاہور)

فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

(۳) قوله تعالى: ﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾. (۱۶- النحل: ۱۲۵)

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (۵- المائدة: ۲)

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾. (۵- المائدة: ۶۷)

مطابق نعتِ رسول ﷺ پڑھتے اور لکھتے ہیں، کیا ایسے امام صاحب کے پیچھے نماز صحیح ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیا:

(۱) ''گانا'' سننا جائز نہیں؛ حرام ہے۔[۱] اور اس گناہ میں مبتلا شخص فاسق ہے، اور فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ منصبِ امامت فاسق کے حوالہ کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ اگر متولیانِ مسجد ایسے امام کو سبک دوش نہیں کرتے، تو وہ گنہگار ہوں گے، لیکن ایسے امام کے پیچھے نماز ادا کرنے سے نماز ادا ہو جائے گی، اگر قریب میں دوسری مسجد ہے، تو وہیں نماز ادا کرنی چاہیے، بہر صورت امام کے فاسق و فاجر ہونے کی وجہ سے جماعت چھوڑنے کا معمول بنانا درست نہیں ہے۔ (شامی)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ [۳۱-لقمان: ۶]

قال ابن جرير: . . . عن أبي الصهباء البكري، أنه سمع عبد الله بن مسعود - وهو يسأل عن هذه الآية: {ومن الناس من يشترى لهو الحديث ليضل عن سبيل الله} - فقال عبد الله: الغناء، والله الذي لا إله إلا هو، يرددها ثلاث مرات.

وكذا قال ابن عباس، وجابر، وعكرمة، وسعيد بن جبير، ومجاهد، ومكحول، وعمرو بن شعيب، وعلي بن بذيمة. وقال الحسن البصري: أنزلت هذه الآية: {ومن الناس من يشتري لهو الحديث ليضل عن سبيل الله بغير علم} في الغناء والمزامير. (تفسير القرآن العظيم - ابن كثير القرشي (م: ۷۷۴هـ): ۶/ ۳۳۰-۳۳۱، لقمان: ۶، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

عن ابن عباس، قال: هو الغناء والاستماع له، يعني قوله: (ومن الناس من يشترى لهو الحديث). . . .

جابر في قوله: (ومن الناس من يشترى لهو الحديث) قال: هو الغناء والاستماع له. (جامع البيان في تأويل القرآن - أبو جعفر الطبري (م: ۳۱۰هـ): ۲۰/ ۱۲۸، لقمان: ۶، ت: أحمد محمد شاكر، ط: مؤسسة الرسالة)

(۲) لو قدموا فاسقا يأثمون بناء على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم؛ لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبی کبیر - إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ۹۵۶هـ) ص: ۵۱۳، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی - لاہور)

فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل، وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ـــــــــ قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

[۴۰] ڈھول تاشے کی نذر کو حضرت خدیجہؓ کی جانب منسوب کرنے والے کی امامت

۷۳۵-سوال: امام صاحب نے اپنی ایک تقریر اور بیان میں یہ کہا تھا کہ: حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے یہ نذر مانی تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ اگر جہاد سے فتح حاصل کر کے صحیح سلامت واپس تشریف لائیں گے تو میں آپ کے سامنے ڈھول تاشے بجاؤں گی، چناں چہ اللہ کے رسول ﷺ صحیح سلامت واپس تشریف لائے، تو انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے ڈھول تاشے بجا کر خوشی منائی تھی، کیا یہ بات صحیح ہے؟

امام صاحب کی تقریر کے بعد، دوسرے دن سے لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، بعضوں نے کہا کہ: یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی ہے، مولانا صاحب سے چوک ہوئی ہے؛ کیوں کہ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا جیسی پاک باز خاتون اس طرح کی نذر مان ہی نہیں سکتیں، اب جب امام صاحب کا گاؤں کے لوگوں نے پیچھا کیا اور اس سلسلے میں وضاحت چاہی، تو امام صاحب کہتے ہیں کہ میں نے ایسا نہیں کہا؛ بل کہ یوں کہا تھا کہ: خادمہ نے ایسی منت مانی تھی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس پوری روایت کی کیا حقیقت ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ڈھول باجے کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔[۱] البتہ خوشی کے موقعہ پر دف بجانے کی اجازت ہے۔[۲]

---

(۱) من الناس من يشتري إلخ، ولهو الحديث على ما روي عن الحسن كل ما شغلك عن عبادة الله تعالى وذكره من السمر والأضاحيك والخرافات والغناء ونحوها. (روح المعاني - شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م: ۱۲۷۰هـ): ۱۱/ ۶۶، لقمان: ۱-۱۱، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(قوله وكره كل لهو) أي كل لعب وعبث فالثلاثة بمعنى واحد، كما في شرح التأويلات، والإطلاق شامل لنفس الفعل، واستماعه كالرقص، والسخرية، والتصفيق، وضرب الأوتار: من الطنبور، والبربط، والرباب، والقانون، والمزمار، والصنج، والبوق: فإنها كلها مكروهة؛ لأنها زي الكفار، واستماع ضرب الدف، والمزمار، وغير ذلك حرام، وإن سمع بغتة، يكون معذورا، ويجب أن يجتهد أن لا يسمع، قهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۹۵، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر)

(۲) عن الربيع بنت معوذ رضي الله عنها، قالت: دخل علي النبي صلى الله عليه وسلم غداة بني علي، فجلس على فراشي كمجلسك مني، وجويريات يضربن بالدف، يندبن من قتل من آبائهن يوم بدر، حتى قالت جارية: وفينا نبي يعلم ما في غد. فقال النبي صلى الله عليه وسلم: لا تقولي هكذا وقولي ما كنت تقولين. (صحيح البخاري: ۲/ ۵۷۰، رقم الحديث: ۴۰۰۱، كتاب المغازي، باب بعد: باب شهود الملائكة بدرا، ط: البدر - ديوبند)

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا اظہار خوشی کے لیے ڈھول بجانا غیر معقول امر ہے؛ اس لیے امام صاحب نے جو بات ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی جانب منسوب کی ہے کہ ''انہوں نے ڈھول تاشے بجا کر خوشی منانے کی منت مانگی، اور نبی کریم ﷺ کی واپسی پر ڈھول تاشے بجا کر خوشی منائی''، یہ غلط نسبت ہے اور ان پر بہتان ہے، اور کسی کی جانب جان بوجھ کر ایسی چیز کی نسبت کرنا، جو اس نے نہ کہی ہو اور نہ کی ہو، ناجائز اور حرام ہے، جس کا مرتکب شرعاً فاسق ہوتا ہے، اور فاسق کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے؛ لہٰذا جان بوجھ کر اگر اس امام نے حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی جانب مذکورہ بات منسوب کی ہو، تو اسے منصب امامت سے بہ عجلت ممکنہ علاحدہ کر دیا جائے۔ (۳)

حضرت خدیجہؓ کی وفات مکۃ المکرمہ میں ہجرت سے تین سال قبل ہو چکی تھی؛ یعنی نبوت کے دسویں سال آپ کی وفات ہو چکی تھی اور جہاد کی اجازت آیت شریفہ: ''أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا'' کے ذریعہ نبوت کے چودہویں سال مدینہ منورہ ہجرت کر جانے کے بعد دی گئی، گویا کہ اللہ کے رسول ﷺ کو جب جہاد کی اجازت دی گئی، اس وقت حضرت خدیجہؓ زندہ ہی نہیں تھیں؛ اس لیے ان کے اس طرح منت ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (۴)

ان کی جانب ایسی بات منسوب کرنے والا شخص کوئی عالم معلوم نہیں ہوتا؛ بل کہ جاہل اور فاسق وفاجر

(۳) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت'' کے حواشی۔

(۴) عن أبي حبيبة مولى الزبير قال: سمعت حكيم بن حزام يقول: توفيت خديجة بنت خويلد في شهر رمضان سنة عشر من النبوة وهي يومئذ بنت خمس وستين سنة. (الطبقات الكبرى-ابن سعد (م: ۲۳۰ھ): ۱۵/۸، ذكر خديجة بنت خويلد، رقم: ۴۰۹۶، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

وقال محمد بن إسحاق: ماتت خديجة وأبو طالب في عام واحد. ـــــ وقال البيهقي: بلغني أن خديجة توفيت بعد موت أبي طالب بثلاثة أيام. ـــــ ذكره عبد الله بن منده في كتاب المعرفة، وشيخنا أبو عبد الله الحافظ. ـــــ قال البيهقي: وزعم الواقدي أن خديجة وأبا طالب ماتا قبل الهجرة بثلاث سنين عام خرجوا من الشعب، وأن خديجة توفيت قبل أبي طالب بخمس وثلاثين ليلة. ـــــ قلت: مرادهم قبل أن تفرض الصلوات الخمس ليلة الإسراء. (السيرة النبوية - ابن كثير القرشي (م: ۷۷۴ھ): ۱۳۲/۲، ذكر عزم الصديق على الهجرة إلى أرض الحبشة، ط: دار المعرفة - بيروت)

معلوم ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی پاک دامن ازواج اور امت کی ماؤں کی جانب غلط باتیں منسوب کرنے والا معلوم ہوتا ہے؛ اس لیے اس کو جلد از جلد منصب امامت سے علاحدہ کر دیا جائے، تاکہ کوئی فتنہ رونما نہ ہو۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۱] ڈھول تاشے کی نذر کو حضرت فاطمہؓ کی جانب منسوب کرنے والے کی امامت

گذشتہ سے پیوستہ

۷۳۶-سوال: اس امام صاحب نے اپنی ایک تقریر اور بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ: حضرت فاطمہؓ نے یہ نذر مانی تھی کہ میرے والد اور اللہ کے رسول ﷺ اگر جہاد سے فتح حاصل کر کے صحیح سلامت واپس تشریف لائیں گے، تو میں آپ کے سامنے ڈھول تاشا بجاؤں گی، چناں چہ اللہ کے رسول ﷺ صحیح سلامت واپس تشریف لائے، تو انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے ڈھول تاشا بجا کر خوشی منائی تھی۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ اس مولوی صاحب کی تقریر کے دوسرے دن سے لوگوں میں چہ میگویاں شروع ہو گئیں اور لوگوں نے یہ کہا کہ یہ بات بالکل صحیح نہیں ہو سکتی ہے، مولانا صاحب سے چوک ہوئی ہے؛ کیوں ایسی پاک دامن خاتون حرام اور ناجائز امر کی نذر مان ہی نہیں سکتی۔ جب مولانا صاحب کا گاؤں کے لوگوں نے پیچھا کیا، تو مولانا صاحب نے کہا کہ: میں نے ایسا کہا ہی نہیں، میں نے تو یہ کہا تھا کہ: خادمہ نے ایسی منت مانی تھی، اس پوری روایت کی کیا حقیقت ہے؟ تفصیل سے جواب مطلوب ہے، اور ایسے پیش امام کے پیچھے کیا نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

مذکورہ نذر حضرت فاطمہؓ یا ان کی باندی دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں مانی ہے، ایسا کہنا گناہ کا کام ہے، ڈھول تاشا بجانا باعثِ گناہ اور حرام ہے۔ (۱) امام صاحب کو اپنے اس بیان سے توبہ کرنی چاہیے، جان بوجھ کر جھوٹ بولنا اور لوگوں میں غلط روایت بیان کرنا حرام ہے؛ اس لیے اس طرح کی بات بیان کرنے والے شخص کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔ تاہم ان کے پیچھے نماز صحیح ہو جائے گی اور مقتدی کو جماعت کا ثواب بھی

(۱) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے عنوان: ڈھول تاشے کی نذر کو حضرت خدیجہؓ کی جانب منسوب کرنے والے کی امامت'' کا حاشیہ نمبر: ۱۔

مل جائے گا؛ لڑائی جھگڑے کے بغیر اگر ان کو علاحدہ کرنا ممکن ہو، تو متولیان مسجد ان کو منصب امامت سے علاحدہ کردیں، ورنہ گنہ گار ہوں گے۔ (۲) فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

[۴۲] اخلاق خراب ہونے کے باوجود امام کو منصب امامت پر برقرار رکھنا

۷۳۷-سوال: ہمارے گاؤں میں ایک صاحب نائب امام ہیں، جنہوں نے ایک عورت کے ساتھ زنا کیا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اس عورت کو ایک مرتبہ پانچ روپیہ اور دوسری مرتبہ دو روپیہ

---

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: "فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت" کے حواشی۔

ضروری وضاحت: مذکورہ دونوں سوال میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جواب اصل سوال سے مربوط ہے، سوال میں اس بات کا ذکر ہے کہ امام صاحب نے حضرت خدیجہؓ یا حضرت فاطمہؓ کے بارے میں یہ ذکر کیا ہے کہ انہوں نے یہ نذر مانی تھی کہ:

"حضور ﷺ رسول ﷺ اگر جہاد سے فتح حاصل کر کے صحیح سلامت واپس تشریف لائیں گے، تو میں آپ ﷺ کے سامنے ڈھول تاشا بجاؤں گی، چناں چہ اللہ کے رسول ﷺ صحیح سلامت واپس تشریف لائے، تو انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے ڈھول تاشا بجا کر خوشی منائی تھی۔"

اصل میں امام ابوداودؒ نے بہ طریق: عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ایک روایت ذکر کی ہے کہ ایک خاتون نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ اے اللہ کے رسول! میں نے نذر مانی ہے کہ آپ جہاد سے صحیح سالم فتح یاب ہو کر واپس آجائیں گے، تو میں (مارے خوشی کے) دف بجاؤں گی (کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو فتح سے ہم کنار کیا اور صحیح سالم ہمارے درمیان تشریف لے آئے، آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: کہ آپ اپنی نذر پوری کریں۔ روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده، أن امرأة، أتت النبي صلى الله عليه وسلم فقالت: يا رسول الله، إني نذرت أن أضرب على رأسك بالدف، قال: أوفي بنذرك. (سنن أبي داود: ۲/ ۴۶۹، رقم الحديث: ۳۳۱۲، كتاب الأيمان والنذور، باب مايؤمر به من الوفاء بالنذر، ط: البدر- ديوبند)

لازمی طور پر اس خاتون نے دف بجا کر خوشی کا اظہار کیا ہوگا، وہ خاتون (امرأة) کون ہیں؟ حضرت خدیجہؓ تو ہو نہیں سکتیں؛ کیوں کہ ان کا انتقال سن ۱۰ نبوی میں ہو چکا تھا، حدیث کا انداز بتا رہا ہے کہ حضرت فاطمہؓ بھی مراد نہیں ہیں، پھر کون ہیں؟ بذل المجهود میں ہے: "لم أقف على تسميتها" (۱۴/ ۲۶۳، ط: دار الكتب العلمية) اور ابوداود کے بین السطور میں بھی یہی مذکور ہے۔

الغرض جو واقعہ سوال میں مذکور ہے، وہ بے اصل نہیں ہے، البتہ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اصل حدیث میں دف بجا کر خوشی کا اظہار کرنا مذکور ہے، جو کہ امر مباح ہے، جب کہ واقعہ بیان کرتے ہوئے امام صاحب سے یا سمجھنے میں مقتدی سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے دف کو "ڈھول تاشہ" سمجھ لیا، جو کہ ناجائز ہے، اور سوال کے مطابق ہی مفتی صاحبؒ نے جواب ذکر کیا ہے، اسی وجہ سے اس کی حضرت خدیجہؓ یا حضرت فاطمہؓ کی جانب نسبت کو حضرت مفتی صاحب نے بہتان سے تعبیر فرمایا ہے اور اسی کے موافق حکم بھی ذکر کیا ہے۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

دیا ہے۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ ابھی مدرسے میں نہیں سوتے ہیں؛ بل کہ کسی اور جگہ سوتے ہیں۔

مسجد کے پیش امام صاحب کو اصل واقعہ معلوم ہے، اس کے باوجود جب بھی وہ غیر حاضر ہوتے ہیں، تو امامت کی ذمہ داری ان ہی کو حوالے کر کے جاتے ہیں، جب گاؤں میں ان کے متعلق زیادہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں، تو پیش امام صاحب نے کہا کہ ان کے پیچھے نماز صحیح نہیں ہے۔

گاؤں کے سرکردہ حضرات نے ان کو سمجھایا کہ تم اپنی رضامندی سے اپنا استعفیٰ نامہ پیش کردو، اس میں تمہاری عزت باقی رہے گی؛ لیکن وہ استعفیٰ دینے کے لیے تیا نہیں ہیں اور مدرسہ اور مسجد کی کمیٹی بھی ان کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے، اس صورت میں کمیٹی کے ممبران گنہ گار ہوں گے یا نہیں؟ تفصیلی جواب درکار ہے۔

الجواب حامداو مصلیا:

ثبوت زنا کے لیے شریعت نے کچھ اصول مقرر کیے ہیں، جن کے بغیر کسی کو ''زنا کار'' کہنا حرام ہے؛ اگر اسلامی حکومت ہے، تو زنا کا الزام لگانے والے سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اس (زنا) کو چار گواہوں کے ذریعہ ثابت کرو، اگر چار گواہوں میں سے ایک گواہ بھی ٹوٹ جائے، اور وہ صراحۃً گواہی نہ دے سکے، تو الزام لگانے والے پر حد قذف (افتراء اور بہتان تراشی کی حد) لگائی جائے گی، جو ۸۰ اسی کوڑے ہیں؛ اس لیے اگر امام صاحب نے اس عورت کو پانچ روپے یا دس روپے دیے ہیں، تو اس سے ان کا زانی ہونا ثابت نہیں ہوگا۔ (۱)

مسجد و مدرسے کے مکان میں نہ سونا اور کسی دوسرے کے مکان پر سونے کے لیے جانے سے بھی ان کا زانی ہونا ثابت نہیں ہوگا، نیز پیش امام کے یہ کہنے سے کہ ''ان کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے۔'' اس (نائب امام) کا زانی ہونا ثابت نہیں ہوگا۔

ہاں! نائب امام صاحب غیر محرم عورتوں سے بے پردہ باتیں کرتے ہوں، ان سے ہنسی مذاق کرتے ہوں اور اس بات پر گواہ موجود ہوں، تو ان کا فسق ثابت ہوگا، اور ان کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہوگی۔ (۲)

لہٰذا مذکورہ وجوہات کی بنیاد پر اگر آپ لوگ ان کا پیچھا کرنا چاہیں، تو کر سکتے ہیں؛ کمیٹی کے افراد اگر

---

(۱) قولہ تعالیٰ: ﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾. (النور: ۴-۴۲)

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت'' کے حواشی۔

آپ کے مخالف ہوں اور ان کو منصب امامت پر برقرار رکھنے کے لیے مصر ہیں، تو اولاً آپ یا دوسرا کوئی شخص جا کر امام صاحب کو سمجھائے اور اپنی غلط حرکتوں سے باز رہنے کی تاکید کرے؛ اگر نائب امام توبہ واستغفار کر لے اور غیر محرم عورتوں سے دور رہنے اور ان سے بات چیت نہ کرنے کا پختہ ارادہ اور اللہ رب العزت سے پکا عہد کر لے، تو اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کرنے والے ہیں۔

اگر انہوں نے اس طرح توبہ کر لی ہے، تو بلا کسی کراہت کے ان کے پیچھے نماز صحیح ہو جائے گی، اور اس صورت میں ان کو علاحدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۳] مرض کی وجہ سے نس بندی کرانے والے شخص کی امامت

۷۳۸-سوال: ایک امام صاحب نے مرض کی وجہ سے دو آپریشن کروائے ہیں، ان میں ایک آپریشن نس بندی کا بھی ہے، امام صاحب کی عمر اس وقت پچاس سال کی ہے، ان کی دو لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے، تو سوال یہ ہے کہ اتنی عمر میں کوئی امام صاحب اپنے کسی مرض کی وجہ سے نس بندی کروائے، تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: دین آسان ہے۔[۱] اس لیے صحت اور بیماری دونوں

(۳) إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٥﴾ (۲۴-النور:۵)

وقال الإمام النووي: التوبة ما استجمعت ثلاثة أمور: أن يقلع عن المعصية، وأن يندم على فعلها، وأن يعزم عزما جازما على أن لا يعود إلى مثلها أبدا، فإن كانت تتعلق بآدمي، لزم رد الظلامة إلى صاحبها، أو وارثه، أو تحصيل البراءة منه، وركنها الأعظم الندم. ———— وفي شرح المقاصد قالوا: إن كانت المعصية في خالص حق الله تعالى فقد يكفي الندم كما في ارتكاب الفرار من الزحف وترك الأمر بالمعروف، وقد تفتقر إلى أمر زائد كتسليم النفس للحد في الشرب، وتسليم ما وجب في ترك الزكاة، ومثله في ترك الصلاة، وإن تعلقت بحقوق العباد لزم مع الندم، والعزم، إيصال حق العبد أو بدله إليه، إن كان الذنب ظلما كما في الغصب والقتل العمد... الخ. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني- الألوسي (م: ۱۲۷۰ھ): ۱۴/ ۳۵۳، سورة التحريم (۶۶)، آیت نمبر: ۷-۱۲، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن الدين يسر، ولن يشاد الدين أحد إلا غلبه، فسددوا وقاربوا، وأبشروا، واستعينوا بالغدوة والروحة وشيء من الدلجة. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۰، رقم الحديث: ۳۹، كتاب الإيمان، باب: الدين يسر، ط: البدر- ديوبند)

کے احکام شریعت میں الگ الگ ہیں۔

تندرست مرد و عورت اس خوف اور اندیشے کی وجہ سے نس بندی کرواتے ہوں کہ بچوں کو کہاں سے کھانا کھلائیں گے، کہاں سے کپڑے پہنائیں گے، تب تو باعث گناہ اور حرام ہے،[۲] جس کا مرتکب فاسق ہے، اور فاسق کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔(۳)

کسی مرض کی وجہ سے اگر آپریشن کرایا جائے، تو اس کی گنجائش ہے، خواہ وہ امام ہو یا مقتدی، مثلاً: کسی رگ میں خرابی واقع ہوگئی ہو، اس میں کیڑے پڑ گئے ہوں، یا عورت کی بچہ دانی میں خرابی پیدا ہوگئی ہو؛ اور کسی ماہر ڈاکٹر یا حکیم نے آپریشن تجویز کیا ہو۔

اس لیے صورت مسئولہ میں امام صاحب کے پیچھے نماز بلا کسی کراہت کے جائز ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۴] خاندانی منصوبہ بندی کروانے والے کے پیچھے نماز پڑھنا

۷۳۹-سوال: ایک صاحب نے خاندانی منصوبہ بندی (فیملی پلاننگ) کروائی ہے، تو کیا یہ گناہ

---

(۲) وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۚ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا۝ (۱۷-الإسراء: ۳۱)
عن عبد الله، قال: قلت يا رسول الله، أي الذنب أعظم؟ قال: أن تجعل لله ندا وهو خلقك، قلت: ثم أي؟ قال: أن تقتل ولدك خشية أن يأكل معك، قال: ثم أي؟ قال: أن تزاني حليلة جارك . . . (صحيح البخاري: ۲/ ۸۸۷، رقم الحديث: ۶۰۰۱، كتاب الأدب، باب قتل الولد خشية أن يأكل معه، ط: البدر - ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۶۳، رقم الحديث: ۱۴۱، ۱۴۲-(۸۶)، كتاب الإيمان، باب كون الشرك أقبح الذنوب، وبيان أعظمها بعده، ط: البدر - ديوبند)
وَلَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ يعني البنات كما كانوا يفعلون خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ مخافة الفقر نهاهم عن القتل وضمن لهم أرزاقهم فقال نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً . قرا ابن عامر برواية ابن ذكوان وابو جعفر بفتح الخاء والطاء مقصورا - وابن كثير بكسر الخاء وفتح الطاء ممدودا - والباقون بكسر الخاء وسكون الطاء - قال البغوي معنى الكل واحداى اثما كبيرا. (التفسير المظهري - المظهري، محمد ثناء الله (م: ۱۲۲۵هـ): ۵/ ۴۳۶، سورة الإسراء (۱۷): ۳۱، ت: غلام نبي التونسي، ط: مكتبة الرشدية - الباكستان)
إذا أراد الرجل أن يقطع إصبعا زائدة أو شيئا آخر، قال نصير - رحمه الله تعالى - إن كان الغالب على من قطع مثل ذلك الهلاك، فإنه لا يفعل وإن كان الغالب هو النجاة فهو في سعة من ذلك. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۶۰، كتاب الكراهية، الباب الحادي والعشرون فيما يسع من جراحات بني آدم والحيوانات، ط: دار الفكر)
(۳) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: "فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت" کے حواشی۔

نہیں ہے؟ اور اب وہ صاحب مکتب میں استاذ بن کر دینی تعلیم دے رہے ہیں، کیا ایسا آدمی اس کے لائق ہے؟ اور امامت بھی کرتے ہیں، تو کیا ایسے امام کے پیچھے نماز جائز ہے؟

الجواب حامداو مصليا:

مرد کا نس بندی کرانا یا عورت کا ایسا آپریشن کروانا، جس سے مستقبل میں عورت کو کبھی بھی اولاد نہ ہو، ناجائز اور گناہ ہے، اس کے علاوہ اگر عارضی طور پر خاندانی منصوبہ بندی کروائی، تو اس کا مقصد کیا ہے؟ اس پر حکم کا دارومدار ہے، اگر تنگی اور مفلسی کے ڈر سے ایسا کیا ہے، تو جائز نہیں؛ لیکن اگر عورت کی طبیعت کی خرابی اور کمزوری کے پیش نظر ایسا کیا ہے، تو جائز ہے۔ (شامی جلد ۳ صفحہ ۱۷۶)[۱]

مدرسہ میں ان کو باقی رکھنے کی گنجائش ہے، اسی طرح اگر کسی عذر کی وجہ سے خاندانی منصوبہ بندی کروائی ہے، تو جائز ہے اور امامت بھی جائز ہے، اگر بلا عذر نس بندی کروالی ہے، تو گنہ گار ہوگا، توبہ کرلے تو نماز میں کوئی حرج نہیں۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۵] اپنی بیوی کی بچہ دانی نکلوا دینے والے امام کے پیچھے نماز پڑھنا

۴۰۷-سوال: امام نے اپنی زوجہ کا آپریشن کروالیا ہے کہ بچے پیدا نہ ہوں، تو ایسے امام کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداو مصليا:

روزی روٹی کا مالک اللہ ہے، خود اللہ نے مخلوق کی ذمہ داری لی ہے: ﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾[۳]

(۱)... [تنبيه] أخذ في النهر من هذا و مما قدمه الشارح عن الخانية و الكمال أنه يجوز لها سد فم رحمها كما تفعله النساء مخالفا لما بحثه في البحر من أنه ينبغي أن يكون حراما بغير إذن الزوج قياسا على عزله بغير إذنها.
قلت: لكن في البزازية أن له منع امرأته عن العزل. اهـ نعم النظر إلى فساد الزمان يفيد الجواز من الجانبين. فما في البحر مبني على ما هو أصل المذهب، وما في النهر على ما قاله المشايخ، والله الموفق. (رد المحتار على الدر المختار: ۳/۱۷۶، كتاب النكاح، باب نكاح الرقيق، مطلب في حكم العزل، ط: دار الفكر - بيروت)
(۲) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے عنوان: ''کسی مرض کی وجہ سے نس بندی کرانے والے شخص کی امامت'' کا حاشیہ نمبر: ۲۔
(۳) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت'' کے حواشی۔
(۳) ۱۱-هود: ۶.

زمین پر چلنے والی جنتی بھی مخلوق ہے، اللہ تعالیٰ ان کی روزی کا ضامن ہے؛ لہٰذا امام صاحب ہوں یا اور کوئی، یہ سوچ کر کہ بچے کیا کھائیں گے؟ کہاں رہیں گے؟ مکان کہاں سے خریدیں گے؟ ان چیزوں کی وجہ سے نس بندی یا آپریشن کرواتا ہے، تو حرام ہے؛ بل کہ ایمان سے نکل جانے کا خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت پر ایمان نہیں ہے، ایسے لوگ درحقیقت نسل انسانی کو برباد کرنے والے ہیں، گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے لوگ ہیں، اور جو کوئی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے، وہ فاسق ہے اور فاسق کو امام بنانا مکروہ ہے۔[1] البتہ مقتدی حضرات کے لیے لازم ہوگا کہ جب تک کسی متبادل کا نظم نہ ہو، ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھتے رہیں، ان کو جماعت کا ثواب مل جائے گا، متولیان کی ذمہ داری ہے کہ ایسے فاسق شخص کو امامت سے جلد علاحدہ کردیں۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٤٦] مجبوری میں بچہ دانی نکلوادینے والے امام کے پیچھے نماز پڑھنا

١٤١٧-سوال: عورت کی بچہ دانی میں خرابی پیدا ہوگئی ہے، اور ڈاکٹروں نے کہا کہ اگر بچہ دانی نہیں نکالی گئی، تو کینسر کی بیماری لاحق ہوجائے گی، جس کی وجہ سے عورت کی جان جاسکتی ہے؛ اس لیے شوہر (جو ایک مسجد کے امام ہیں) نے عورت کی بچہ دانی نکلوادی، اب بچے نہیں ہوسکتے، تو ایسی صورت میں ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

صورت مسئولہ میں اگر عورت واقعۃً بیمار ہے، اور حاذق ماہر طبیب کہتا ہے کہ مستقبل میں بچے کی پیدائش سے جان کے ضائع اور ہلاک ہونے کا شدید خطرہ ہے، اس وجہ سے آپریشن کروایا ہے، تو امام صاحب گنہ گار نہیں ہوں گے اور ان کے پیچھے بلا کراہت نماز درست ہوگی۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(١) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے عنوان: ''کسی مرض کی وجہ سے نس بندی کرانے والے شخص کی امامت'' کا حاشیہ نمبر: ٢۔

(٢) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ داڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت'' کے حواشی۔

(٣) إذا أراد الرجل أن يقطع إصبعا زائدة أو شيئا آخر، قال نصير - رحمه الله تعالى - إن كان الغالب على من قطع مثل ذلك الهلاك؛ فإنه لا يفعل وإن كان الغالب هو النجاة فهو في سعة من ذلك. (الفتاوى الهندية: ٥/ ٣٦٠، كتاب الكراهية، الباب الحادي والعشرون فيما يسع من جراحات بني آدم والحيوانات، ط: دار الفكر)

مزید تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے عنوان: ''کسی مرض کی وجہ سے نس بندی کرانے والے شخص کی امامت''۔

[۴۷] وضع حمل کی تکلیف کی وجہ سے آپریشن کرانا

۷۴۲-سوال: وضع حمل میں بہت تکلیف ہو، تو آپریشن کرانا جائز ہے یا نہیں؟
ایسا امام، جس نے اپنی بیوی کا آپریشن کروایا ہو، وہ امامت کر سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

دنیا کے ہر کام میں تکلیف ہوتی ہے اور قرآن میں بھی وضع حمل کی تکلیف کا بیان ہے۔[۱] اسی وجہ سے فرماں بردار کے لیے ماں کی قدموں میں جنت کا وعدہ ہے۔[۲]

لہٰذا اس وجہ سے آپریشن کی اجازت نہیں دی جاسکتی، البتہ ماہر مسلمان ڈاکٹر مشورہ دے کہ آئندہ حمل رہے گا تو عورت کا انتقال ہوجائے گا یا عورت کا کوئی ہاتھ یا پاؤں معطل ہوجائے گا، تو مذکورہ شرعی عذر کی بنا پر آپریشن کرانا جائز ہے اور شوہر گنہ گار نہیں ہوگا۔

بغیر شرعی عذر کے آپریشن کرانے سے امام فاسق وفاجر شمار ہوگا اور ایسے آدمی کو امامت کی ذمہ داری دینا مکروہ ہے، البتہ شرعی عذر کی وجہ سے آپریشن کرانا جائز ہے اور ایسے آدمی کو امام بنانا بھی جائز ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قوله تعالى: ﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ﴾ (۳۱-لقمان: ۱۴)

(۲) عن ابن عباس، في قوله: {ولنبلونكم بشيء من الخوف والجوع} [البقرة:۱۵۵] ونحو هذا، قال: "أخبر الله سبحانه المؤمنين أن الدنيا دار بلاء وأنه مبتليهم فيها، وأمرهم بالصبر وبشرهم"، فقال: {وبشر الصابرين} [البقرة:۱۵۵]، "ثم أخبرهم أنه هكذا فعل بأنبيائه وصفوته يطيب نفوسهم"، فقال: {مستهم البأساء والضراء وزلزلوا} [البقرة:۲۱۴]، "وأما البأساء: فالفقر، والضراء: فالسقم، وزلزلوا: بالفتن وأذى الناس إياهم". (شعب الإيمان- أبو بكر البيهقي (م:۴۵۸هـ): ۱۲/ ۱۷۷، رقم الحديث: ۹۲۳۸، باب في الصبر على المصائب وعما ينتزع النفس من لذة وشهوة، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون مع الدار السلفية ببومباي بالهند)

عن معاوية بن جاهمة السلمي، أن جاهمة جاء إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: يا رسول الله، أردت أن أغزو وقد جئت أستشيرك، فقال: هل لك من أم؟ قال: نعم، قال: فالزمها، فإن الجنة تحت رجليها. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳هـ): ۶/ ۱۱، رقم الحديث: ۳۱۰۴، كتاب الجهاد، الرخصة في التخلف لمن له والدة، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

(۳) تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے عنوان: "کسی مرض کی وجہ سے نس بندی کرانے والے شخص کی امامت" ☆ مجبوری میں بچہ دانی نکلوا دینے والے امام کے پیچھے نماز پڑھنا۔

[۴۸] نس بندی کرنے والے کی امامت

۷۴۳-سوال: کیا نس بندی کرانے والا شخص امامت کراسکتا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

متولیان وٹرسٹیانِ مسجد کی ذمہ داری ہے کہ ایسے شخص کو امامت کے منصب پر فائز کرے، جو متبع سنت ہو، قرآن مجید تجوید سے پڑھتا ہو، متقی ہو، گناہ کبیرہ سے اجتناب کرنے والا ہو؛ لہٰذا جس شخص نے نس بندی کرائی ہے، وہ دوحال سے خالی نہیں: (۱) عورت مریضہ ہے اور ماہر مسلم ڈاکٹر وحکیم نے کہا ہے کہ حملکی صورت میں عورت کی جان کا خطرہ ہے یا اس کے کسی عضو کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہے، تو شریعت مطہرہ اجازت دیتی ہے؛ لہٰذا ایسے شخص کا امامت کے لیے تقرر کرنا جائز ہے۔ (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ دنیا آواز لگاتی ہے، لوگ رات دن پکارتے ہیں کہ بچے زیادہ ہوجائیں گے، تو ان کو کیسے کھلاؤ گے، ان کا نان ونفقہ اور ضروریات زندگی وغیرہ کا نظم کیسے کروگے، تو اس طرح سوچنا بھی دوحال سے خالی نہیں: (۱) اگر نقصان کا تصور ہو کہ ہم ہی طعام، شراب، لباس، سکونت کے ذمہ دار ہیں اور ہم ہی یہ انتظام کرنے والے ہیں، تو وہ انسان ایمان واسلام سے خارج ہوجائے گا، مرتد ہوجائے گا، لہٰذا وہ امامت کے لائق نہیں (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ خالق اور رازق اللہ ہی ہے، مگر وہ آدمی سوچتا ہے، یعنی وہ اس عقیدہ میں مکمل مضبوط نہیں ہوتا ہے اور دینی نقطہ سے کمزور ہوتا ہے؛ لہٰذا اہل دنیا کے دیکھادیکھی وہ بھی نس بندی کروالیتا ہے، تو وہ فاسق ہے اور فاسق کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے، لہٰذا ایسے شخص کو بھی امام بنانا درست نہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۹] شراب کا گڑ بیچنے والے امام صاحب کے پیچھے نماز

۷۴۴-سوال: ایک مسجد کے امام صاحب شراب بنانے کا گڑ اور نوسار (شراب بنانے کی ایک شئے) غیر مسلم بستیوں میں فروخت کرتے ہیں، تو ان کے پیچھے نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ ان کے اس کام سے

(۱) تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے عنوان: ''کسی مرض کی وجہ سے نس بندی کرانے والے شخص کی امامت'' ☆ مجبوری میں بچہ دانی نکلوادینے والے امام کے پیچھے نماز پڑھنا۔

ان کے پیچھے نماز پڑھنے والے مقتدی حضرات ناراض ہیں اور نماز پڑھنے میں شش و پنج میں مبتلا ہیں کہ پتہ نہیں ان کی نماز ہوگی یا نہیں؟ تسلی بخش جواب مطلوب ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جو گڑ شراب کے علاوہ دوسرے کاموں کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے، مثلاً: جانوروں کے کھلانے کے لیے یا اس کے علاوہ دوسرے کسی کام کے لیے، تو اس کی تجارت جائز ہے، کوئی حرج نہیں ہے۔ (۱)

لہٰذا ایسے امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا بلا کسی کراہت کے جائز ہے، کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۰] فاسق امام کے پیچھے نماز کا حکم

۷۴۵-سوال: آپ کی کتاب ''مسلمان عورت'' میں لکھا ہے کہ جو امام صاحب اپنی عورت کو پردے کا حکم نہ کرے، تو ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، تو ہم لوگ برسوں سے ایسے امام کے پیچھے نمازیں پڑھتے چلے آئے ہیں تو ہماری نمازوں کا کیا ہوگا؟ اگر ہماری نمازیں صحیح ہوگئی ہیں، تو مکروہ تحریمی ہونے کا کیا مطلب؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کتبِ فقہ میں لکھا ہے کہ فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ (۲)

فاسق اس آدمی کو کہتے ہیں، جو گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہو؛ مثلاً: شراب پینا، جوا کھیلنا، زنا کرنا وغیرہ؛

---

(۱) (و) جاز (بیع عصیر) عنب (ممن) یعلم أنه (یتخذه خمرا) لأن المعصیة لا تقوم بعینه بل بعد تغیره وقیل یکره لإعانته علی المعصیة ونقل المصنف عن السراج والمشکلات أن قوله ممن أي من کافر أما بیعه من المسلم فیکره ومثله في الجوهرة والباقاني وغیرهما زاد القهستاني معزیا للخانیة أنه یکره بالاتفاق. (الدر المختار)

قال ابن عابدین: (قوله وجاز) أي عنده لا عندهما بیع عصیر عنب أي معصوره المستخرج منه فلا یکره بیع العنب والکرم منه بلا خلاف، کما في المحیط لکن في بیع الخزانة أن بیع العنب علی الخلاف قهستاني. (قوله ممن یعلم) فیه إشارة إلی أنه لو لم یعلم لم یکره بلا خلاف قهستاني. (رد المحتار علی الدر المختار: ۶/۳۹۱، کتاب الحظر والإباحة، فصل في البیع، ط: دار الفکر-بیروت)

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: ''فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوائے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت'' کے حواشی۔

عورت کے لیے پردہ کرنا فرض ہے۔[1] باپ کے لیے اپنی لڑکی اور شوہر کے لیے اپنی بیوی کو پردے کا حکم دینا فرض ہے۔[2] اور عصر حاضر میں عورتوں کا پردہ کرنا تو شعائرِ اسلام میں داخل ہے؛ کیوں کہ اس زمانے میں پردے کے خلاف منظم سازشیں چل رہی ہیں، بے پردگی کو عام کرنے کے لیے فحش لٹریچر چھپوا کر لوگوں میں عام کیے جاتے ہیں، اسی گندے ماحول کے زہریلے جراثیم کی وجہ سے آج ہماری مسلم لڑکیاں یہ کہنے لگیں ہیں کہ مجھے مولوی، ملا، حافظ جی اور کسی تبلیغی کے ساتھ شادی نہیں کرنی ہے، اس لیے اس زمانے میں عورتوں کا خود بھی پردے کا اہتمام کرنا ضروری ہے اور سرپرستوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی ماتحت عورتوں کو پردے کا تاکیداً حکم کریں؛ لہٰذا ایک حافظ، مولوی اور امام، اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا، تو وہ فاسق کہلائے گا اور اپنے اس عمل کی وجہ سے وہ گنہ گار ہوگا، ذمہ دار حضرات کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے امام کو منصب امامت سے علاحدہ کردیں، تاکہ لوگوں کی نمازیں صحیح ہوں؛ لیکن ایسا شخص ٹرسٹیوں سے تعلق قائم کرکے اگر امام بن گیا ہے اور اس کو ہٹانے کی صورت میں فتنے کا اندیشہ ہے، تو آپ اسی امام کے پیچھے اپنی نمازیں پڑھ لیں، نماز ہوجائے گی اور جماعت کا ثواب بھی ملے گا؛ اس لیے کہ بعض صحابۂ کرام نے بھی ظالم اور فاسق کے پیچھے نماز ادا کی ہیں، جیسے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حجاج کے پیچھے نماز ادا کی ہیں، اس لیے اس امام کے پیچھے آپ کی نمازیں صحیح ہوجائیں گی؛ لیکن اس امام کو برقرار رکھنے والے ذمہ دار حضرات یا اس کی طرف داری کرنے والے لوگ گنہ گار ہوں گے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۱] ڈیوٹی میں کوتاہی کرنے والے اور جھوٹ بولنے والے شخص کی امامت

۴۷۶- سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ کرام اس مسئلہ میں کہ:

ایک شخص امامت کرتا ہے اور نذرانہ دو الگ الگ عنوانات کے تحت پاتا ہے، خدمت امامت کا الگ اور مکتب کا الگ، امامت کا حال یہ ہے کہ سال بھر وہ صرف چار وقت کی نمازوں کی امامت کرتا ہے، ماہ رمضان المبارک کو چھوڑ کر گیارہ ماہ وہ فجر کی نماز نہیں پڑھاتا ہے۔ رہا سوال مکتب کا، تو وہ جب سے اس خدمت

---

(۱) وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴿۳۳-الأحزاب: ۳۳﴾

(۲) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿۳۳-الأحزاب: ۵۹﴾

پر مامور ہوا ہے، آج تک بچوں کو پڑھایا ہی نہیں، یہ شخص کھلے عام جھوٹ بولتا ہے، اگر اس شخص کی مرضی کے خلاف کوئی کام ہو، تو وہ برداشت نہیں کرتا، اپنی بات خواہ وہ غلط کیوں نہ ہو، منوانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتا ہے، اگر کوئی اس کا ساتھ نہ دے، تو اس کے خلاف لوگوں کو ورغلا کر آپس میں ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کر کے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا ہے، دینی کام صحیح طور پر انجام دینے والی جماعت کے کام میں رخنہ پیدا کرتا ہے، رخنہ ڈالنے کے لیے جہلاء کو اپنا ہم خیال بناتا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسے شخص کی امامت درست ہے؟ براہِ کرم اس کا شرعی حل جلد از جلد روانہ فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداومصلیا:

اگر مدرسہ میں ملازمت کے باوجود نہیں پڑھاتا ہے اور تنخواہ لیتا ہے، تو یہ جائز نہیں، وقف کا مال ناحق کھا رہا ہے۔[۱] جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے، اس پر احادیث میں سخت وعید آئی ہے۔[۲]

اگر وہ شخص اپنے مذکورہ غلط روش پر برقرار رہنے اور معصیت کے افعال کو انجام دینے کے لیے مسلمین میں پھوٹ ڈالنا اور دینی کام انجام دینے والی جماعت میں رخنہ پیدا کرنا تو منافقین کا کام ہے۔

جو شخص ان امورِ قبیحہ کا ارتکاب کرے، وہ فاسق ہے، اور فاسق کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہیے، ایسے

---

(۱) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۝ (۴-النساء:۲۹-۳۰)

(۲) عن عبد الله رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن الصدق يهدي إلى البر، وإن البر يهدي إلى الجنة، وإن الرجل ليصدق حتى يكون صديقا. وإن الكذب يهدي إلى الفجور، وإن الفجور يهدي إلى النار، وإن الرجل ليكذب حتى يكتب عند الله كذابا. (صحيح البخاري: ۲/ ۹۰۰، رقم الحديث: ۶۰۹۴، كتاب الأدب، باب قول الله تعالى: {يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وكونوا مع الصادقين} [التوبة:۱۱۹] وما ينهى عن الكذب، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۳۲۵، رقم الحديث: ۱۰۳- ۲۶۰۷، كتاب البر والصلة والآداب، باب قبح الكذب وحسن الصدق وفضله، ط: البدر - ديوبند)

عن سمرة بن جندب رضي الله عنه، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: "رأيت الليلة رجلين أتياني، قالا: الذي رأيته يشق شدقه فكذاب، يكذب بالكذبة تحمل عنه حتى تبلغ الآفاق، فيصنع به إلى يوم القيامة". (صحيح البخاري: ۲/ ۹۰۰، رقم الحديث: ۶۰۹۶، كتاب الأدب، باب قول الله تعالى: {يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وكونوا مع الصادقين} [التوبة] وما ينهى عن الكذب، ط: البدر - ديوبند)

شخص کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے، جو لوگ اس کو امام بنائیں گے، وہ گنہگار ہوں گے، مقتدی مجبور ہوں تو دوسری مسجد میں نماز پڑھیں، اگر دوسری مسجد قریب میں نہ ہو، تو گھر میں نماز پڑھنے کی بہ نسبت ایسے شخص کے پیچھے جماعت سے نماز پڑھنا افضل ہے، جماعت کو ترک نہ کریں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۲] ایسے فاسق کی اِمامت، جو قرآن کریم صحیح نہ پڑھ پاتا ہو

۷۴۷-سوال: ہمارے یہاں کے اِمام صاحب ٹی وی پر کرکٹ میچ اور سینما بینی میں مبتلا ہیں، اُن کی بیوی بے پردہ ہو کر بازاروں میں گھومتی پھرتی ہے، علاوہ ازیں امام صاحب مسائل نماز سے بھی ناواقف ہیں، چناں چہ ایک مرتبہ مغرب کی نماز میں ثناء کے بعد خاموش کھڑے رہ گئے، میرے کھنکھارنے پر اُنہوں نے سورۂ فاتحہ شروع کی، اور سجدۂ سہو بھی نہیں کیا، دوسری طرف گاؤں کے اکثر لوگ جاہل ہیں؛ تاہم اُن میں دینی ذوق اچھا ہے، اکثر مسلمانوں کی عورتیں پردے کی پابندی کرتی ہیں، اطراف میں نواپور سے آنے والے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اِمام صاحب قرآن بھی صحیح نہیں پڑھتے؛ لہٰذا اُن کے پیچھے نماز نہیں ہوگی، تو ایسے امام کے پیچھے نماز کی صحت کے متعلق حکم شرعی کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جو امام قرآنِ پاک صحیح نہ پڑھے اور نماز کے دوران قراءت میں کوئی ایسی غلطی کرے، جس سے معنی میں کوئی خرابی پیدا ہو رہی ہو، تو نماز فاسد ہو جائے گی؛ اور اس کا اعادہ ضروری ہوگا۔[2] اسی طرح سجدۂ سہو

(۱) لو قدموا فاسقا یأثمون بناء علی أن کراهة تقدیمه کراهة تحریم؛ لعدم اعتنائه بأمور دینه. (حلبی کبیر-إبراهیم بن محمد بن إبراهیم الحلبي (م: ۹۵۶ھ) ص: ۵۱۳، کتاب الصلاۃ، الأولی بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی-لاہور)

فإن أمکن الصلاة خلف غیرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولی من الانفراد. (رد المحتار علی الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، کتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفکر)

وفي النهر عن المحیط: صلی خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدین: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولی من الانفراد، لکن لا ینال کما ینال خلف تقي ورع. (رد المحتار علی الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، کتاب الصلاة، باب الإمامة)

(۲) فإن کان لا یغیر المعنی، لا تفسد صلاته، نحو أن یقرأ: ولقد جاءهم رسلنا بالبینات، بترك التاء من جاءت، وإن غیر المعنی تفسد صلاته عند عامة المشایخ، نحو أن یقرأ: فما لهم یؤمنون، في لا یؤمنون بترك لا، هکذا في المحیط، وفي العتابیة: هو الأصح. کذا في التتارخانیة. (الفتاوی الهندیة: ۱/ ۷۹، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الخامس في زلة القاری، ط: دار الفکر)

واجب ہوگیا ہو اور امام نے سجدۂ سہو نہیں کیا، تب بھی نماز کا اعادہ ضروری ہے۔[1]

نماز کے دوران امام کسی رُکن کی ادائیگی میں غلطی کر رہا ہو، تو مقتدی کو چاہیے کہ وہ جہراً سبحان اللہ یا اللہ اکبر پڑھے؛ جس سے وہ متنبہ ہو سکے۔[2] لہٰذا آپ کا کھنکھار کر متنبہ کرنے کی کوشش کرنا غلط ہے؛ بل کہ بلا ضرورت آواز کرنے سے اگر دو یا تین حروف پیدا ہو گئے، تو اُس سے نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے۔[3]

امام اگر ٹی وی دیکھتا ہو، اجنبی عورتوں کے ساتھ اختلاط سے پرہیز نہ کرتا ہو اور اپنی بیوی کو پردے کی تاکید نہ کرے، تو وہ فاسق ہے، اور فاسق کے پیچھے نماز مکروہ ہوتی ہے؛ لہٰذا ایسا شخص امامت کے لائق نہیں ہے، متولیانِ مسجد کی ذمہ داری ہے کہ اُسے فوری طور پر امامت سے سبک دوش کر کے متقی، متبع سنت، مسائل سے واقف اور صحیح قرآن پڑھنے والے امام کو تلاش کریں، اگر متولیانِ مسجد اس امر میں غفلت برتیں گے، تو وہ گنہ گار ہوں گے۔[4] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۳] امام کے ساتھ جھگڑا ہو جانے کی وجہ سے مقتدی کا علاحدہ نماز پڑھنا

۷۴۸-سوال: ہمارے گاؤں ورکونڈ کے امام مولانا یعقوب بن یوسف درویش، بھروچ ضلع کے

(۱) (ولها واجبات) لا تفسد بتركها وتعاد وجوبا في العمد والسهو إن لم يسجد له، وإن لم يعدها يكون فاسقا آثما. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۴۵۶، واجبات الصلاة، ط: دار الفكر)

(۲) وكذا إذا عرض للإمام شيء فسبح المأموم ولا بأس به؛ لأن القصد به إصلاح الصلاة، فسقط حكم الكلام عنه للحاجة إلى الإصلاح. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ۱/ ۲۳۵، فصل بيان حكم الاستخلاف، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۷۷، كتاب الصلاة، ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: زكريا - ديوبند ☆ البحر الرائق: ۲/ ۸، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۳) فإن كان التنحنح لعذر فإنه لا يبطل الصلاة بلا خلاف وإن حصل به حروف؛ لأنه جاء من قبل من له الحق، فجعل عفوا، وإن كان من غير عذر، ولا غرض صحيح، فهو مفسد عندهما خلافا لأبي يوسف في الحرفين، وإن كان بغير عذر لكن لغرض صحيح كتحسين صوته للقراءة أو للإعلام أنه في الصلاة أو ليهتدي إمامه عند خطئه ففيه اختلاف فظاهر الكتاب والظهيرية اختيار الفساد لكن الصحيح عدمه؛ لأن ما للقراءة ملحق بها كما في فتح القدير وغيره. (البحر الرائق: ۲/ ۵، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۷۷، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: زكريا - ديوبند)

(۴) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: "فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام ☆ ڈاڑھی منڈوانے ہوئے شخص کی امامت ☆ بے پردہ گھومنے والی عورت کے شوہر کی امامت ☆ نااہل امام اور متولی کی ذمہ داری اور ☆ بلیک مارکیٹ کرنے والے کی امامت" کے حواشی۔

پالیج تحصیل کے وِلن گاؤں کے وطنی ہیں، ایک سال سے ہمارے گاؤں میں امامت کرتے ہیں، اُن کے اور ہمارے والد صاحب کے مابین بہت اچھے تعلقات تھے، امام صاحب نے مجھ سے بہ تاریخ: ۱۰/نومبر ۱۹۸۹ء، بہ روز جمعرات، بعد نمازِ مغرب دو ہزار روپے بہ طورِ قرض مانگے، میں نے اُن کو جواب دیا کہ میں اپنے والد صاحب سے اجازت لے کر آپ کو جواب دوں گا۔ میرے والد صاحب نے بھی یہی کہا کہ بعد میں جواب دیں گے۔

اُس کے بعد ہمارے گھر میں مشورے کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ امام صاحب کو قرض نہیں دیں گے، دوسرے دن جمعہ کی رات کو مسجد میں امام صاحب کا بیان تھا، تو پیسے نہ ملنے کی وجہ سے اُنھوں نے بیان میں ہی والد صاحب کی شان میں بہت سے گستاخانہ کلمات کہے، یہاں تک کہ اُن کو جانور تک کہہ دیا، ہم سب خاموش تھے، کوئی کچھ نہیں بولا، اُس کے دو دن بعد جب وہ اپنے وطن سے واپس آئے، تو والد صاحب کے ساتھ جھگڑا کیا، لعنت کی اور بد دعائیہ کلمات بھی کہے، اُن کی اہلیہ نے بھی ہمارے والد صاحب کے ساتھ خوب جھگڑا کیا اور گالیاں تک دیں، اُس کے بعد میرے والد صاب نے اُن کو ماضی میں جو کچھ ہدیہ وغیرہ دیا تھا، وہ واپس طلب کیا، تو اُنھوں نے وہ ہدایا بھی واپس کر دیے، اور ایک خط لکھ کر لائے، جس میں اُنھوں نے والد صاحب کے بارے میں لکھا کہ ”شیطان! تیرے لیے جنت حرام ہے“، پھر جھگڑا کر کے والد صاحب پر حملہ کرنے کی بھی کوشش کی۔

جب نوبت یہاں تک آ گئی، تو والد صاحب نے گاؤں کے ذمہ داروں کے سامنے اِس امام کو علاحدہ کرنے کی بات کی، سارے لوگوں نے انکار کر دیا اور امام صاحب کا ساتھ دیتے ہوئے اُنھوں نے والد صاحب ہی کا قصور نکالا، مذکور امام اور اُن کی اہلیہ مرغی کی تجارت کرتے ہیں، اور اُس میں وہ جھوٹ بھی بولتے ہیں، ہم تو اِس واقعہ کے بعد اُن کے پیچھے نماز بھی نہیں پڑھتے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسے امام کے پیچھے نماز ہوگی یا نہیں؟ اور گاؤں کے سارے لوگ اُن کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں، تو گنہ گار کون ہوگا؟ ایسا امام امامت کے لائق ہے یا نہیں؟ گاؤں کے ذمہ دار اگر اُسے علاحدہ نہ کریں، تو شرعاً کیا حکم ہے؟ والد صاحب نے اُن کے پیچھے جمعہ پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے، تو اس کا گناہ کس کے سر ہوگا؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

اگر سوال میں تحریر کردہ باتیں صحیح ہیں، تو امام صاحب اور اُن کی اہلیہ گنہ گار ہوں گے، گاؤں کے

لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ حق پرست کی مدد کریں، خواہ وہ اجنبی ہو یا گاؤں کا باشندہ ہو۔[۱] اولاً تو یہ کہ اگر کسی بھی مؤمن میں ہم کوئی عیب دیکھیں، تو ہمیں چاہیے کہ اُسے خلوت میں نصیحت کریں۔ کیوں کہ دین نام ہے خیر خواہی کا، اور خیر خواہی اسی میں ہے کہ اس کو خلوت میں متنبہ کیا جائے۔[۲] بیانات میں یا عام مجمع میں کسی کے عیوب بیان کرنا جائز نہیں ہے۔[۳]

اگر کسی شخص میں کوئی عیب ہو، تو اُسے خلوت میں کہنا چاہیے، کہ یہ اُس کے لیے نصیحت ہے، اور اگر جلوت میں سب کے سامنے نشان دہی کی جائے، تو یہ اُس کی فضیحت ہے۔"[۴]

لہٰذا امام کا کسی کی اصلاح کے لیے عام مجمع کے سامنے کچھ کہنا جائز نہیں ہے۔

امام کا جھوٹ بولنا گناہ کا کام ہے، ارباب حل وعقد کی ذمہ داری ہے کہ ایسے امام کو امامت سے سبک دوش کردیں، اگر نہیں کریں گے، تو وہ گنہگار رہوں گے، لیکن ایک مسئلہ یاد رہے کہ بایں ہمہ گاؤں کے لوگوں کا فرض یہی ہے کہ وہ ایسے امام کے پیچھے بھی باجماعت نماز پڑھیں، اگر وہ امام کے فسق کی وجہ سے علاحدہ نماز

---

(۱) وَإِن طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۞ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۞ (۴۹-الحجرات:۹-۱۰)

(۲) عن تميم الداري أن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: الدين النصيحة، قلنا: لمن؟ قال: لله ولكتابه ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامتهم. (الصحيح لمسلم:۱/ ۵۴، رقم الحديث: ۹۵ - (۵۵)، كتاب الإيمان، باب بيان أن الدين النصيحة، ط: البدر - ديوبند☆ر: صحيح البخاري:۱/ ۱۳، رقم الحديث: ۵۷-۵۸، كتاب الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: "الدين النصيحة: لله ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامتهم"، ط: البدر - ديوبند)

(۳) عن ابن شهاب أن سالما أخبره أن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما، أخبره: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: المسلم أخو المسلم لا يظلمه ولا يسلمه، ومن كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته، ومن فرج عن مسلم كربة، فرج الله عنه كربة من كربات يوم القيامة، ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة. (صحيح البخاري:۱/ ۳۳۰، رقم الحديث:۲۴۴۲، كتاب المظالم و القصاص، باب: لا يظلم المسلم المسلم ولا يسلمه، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم:۱/ ۳۲۰، رقم الحديث: ۵۸-۲۵۸۰، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم الظلم، ط: البدر - ديوبند)

(۴) (وعن أبي هريرة - رضي الله عنه - قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن أحدكم مرآة أخيه.) بكسر ميم ومد همز أي: آلة لإراءة محاسن أخيه ومعايبه، لكن بينه وبينه، فإن النصيحة في الملأ فضيحة. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۸/ ۳۱۲۲، رقم الحديث: ۴۹۸۵، كتاب الآداب، باب الشفقة والرحمة على الخلق، ط: دار الفكر، بيروت)

پڑھنا شروع کریں گے، تو گنہ گار ہوں گے، اس باب میں آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ: "صلوا خلف کل بر او فاجر". [۱] کہ ہر نیک یا برے کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو، لہٰذا جب تک امام کے عقائد میں کوئی خرابی نہ ہو وہاں تک امام کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو، خواہ اُس کے اعمال برے ہوں، علاحدہ نماز پڑھنا یا جمعہ چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۴] اس شخص کی امامت، جو ٹی وی دیکھتا ہو اور اس کی بیوی بے پردہ رہتی ہو؟

۷۴۹-سوال: ایک مسجد کے امام صاحب کی اہلیہ محترمہ پردے کا اہتمام نہیں کرتی ہیں، میں نے اس سلسلے میں فتاوی رحیمیہ جلد ۴ میں پڑھا، اس کے بعد امام صاحب کو اس جانب متوجہ کیا: (اس وقت ان کے استاذ ان کے ساتھ تھے) تو انہوں نے یوں جواب دیا کہ "اگر سب امام صحیح اصولوں پر چلیں گے، تو مصلے ہوا میں اڑیں گے"۔ حالاں کہ وہ اس مسئلہ سے خوب واقف ہیں، جمعہ کے دن متعدد مرتبہ وہ اور ان کے استاذ لمبی لمبی تقریریں کرتے ہیں اور مقتدیوں کو کہتے ہیں کہ ٹی وی دیکھنا گناہ ہے۔

ایک مرتبہ میں نے ٹی وی پر حج کا پروگرام دیکھنے کے بارے میں پوچھا: تو انہوں نے کہا کہ اس کا دیکھنا بھی سخت گناہ ہے؛ حالاں کہ وہ خود ٹی وی دیکھ کر نکلے تھے، تو ہم نے کہا کہ آپ بھی تو گناہ کا کام کر کے آئے ہیں۔ تو امام صاحب اور ان کے استاذ نے کہا کہ "ہم تو گناہ کا کام کرتے آئے ہیں"۔

امام صاحب لوگوں کی غیبت بھی بہت کرتے ہیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ ایسے امام کے پیچھے نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصلیا:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: الرجال قوٰمون علی النساء... الآیۃ [۳] شوہر کی ذمہ داری ہے کہ عورت کو پردہ میں رہنے کے بابت حکم کرے، اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ عورت کو بے پردہ رہنے، بے پردہ گھومنے پھرنے اور بے پردہ باہر نکلنے سے روکے، کیوں کہ رسول اللہ نے فرمایا: من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ...

(۱) قدتقدم تخریجہ مرارا عن الدار قطني.

(۲) قدتقدم تخریجہ وتفصیلہ مرارا.

(۳) ۴-النساء: ۳۴۔

الحدیث۔[۱]

اب اگر شوہر اپنی ذمہ داری کو ادا نہیں کرتا ہے، بیوی کو بے پردگی سے نہیں روکتا نہیں ہے، تو وہ فاسق گناہ گار ہے، اور فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔[۲]

اور آپ نے امام صاحب جو "جواب"، سوال میں تحریر کیا ہے کہ "سب امام صحیح اصولوں پر چلیں گے تو مصلے میں ہوا اڑنے لگیں گے" یہ دین کا مذاق ہے، (جان بوجھ کر ایسا کیا ہو، تو ایمان کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے) اسی طرح ٹی وی دیکھنا، گناہ کا کام کرنا اور گناہ کا اقرار کرنا اور گناہ کرتے رہنا، فاسق ہونے کی علامت ہے؛ امام کو چاہیے کہ بلا تاخیر توبہ کرے، ورنہ متولیان مسجد کی ذمہ داری ہے کہ ایسے امام کو امامت سے علاحدہ کردے، اگر متولیان قدرت کے باوجود، ایسے فاسق امام کو علاحدہ نہیں کریں گے، تو گنہ گار ہوں گے؛ لیکن مقتدی جماعت سے نماز پڑھتے رہیں، ان کو جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ (ان شاء اللہ)[۳]

واضح رہے کہ لمبی لمبی تقریریں کرنا مقصد نہیں ہے، مقصد تو عمل ہے، جب واعظ عالم میں عمل نہیں ہوگا، تو علم سے فائدہ نہ اٹھانے اور اس کے مقتضاء پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے گنہ گار ہوگا۔[۴] اس لیے اگر توبہ نہ کرے، تو امامت سے الگ کرنا ضروری ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قال أبو سعيد (الخدري): سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان. (الصحيح لمسلم: ۱/۵۰، رقم الحديث: ۷۸-(۴۹)، كتاب الإيمان، باب بيان كون النهي عن المنكر من الإيمان، الخ، ط: البدر - ديوبند)

عن عبد الله، قال النبي صلى الله عليه وسلم: كلكم راع وكلكم مسئول، فالإمام راع وهو مسئول، والرجل راع على أهله وهو مسئول، والمرأة راعية على بيت زوجها وهي مسئولة، والعبد راع على مال سيده وهو مسئول، ألا فكلكم راع وكلكم مسئول. (صحيح البخاري: ۲/۷۷۹، رقم الحديث: ۵۱۸۸، كتاب النكاح، باب: قوا أنفسكم وأهليكم نارا، ط: البدر - ديوبند)

(۲) قد تقدم تخريجه وتفصيله مرارا.

[۳] لو قدموا فاسقا يأثمون بناءا على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم؛ لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير - إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ۹۵۶ھ) ص: ۳۱۵، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی - لاہور)

(۴) عن جندب، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مثل الذي يعلم الناس الخير وينسى نفسه مثل مصباح يضيء للناس ويحرق نفسه. (كتاب الأمثال في الحديث النبوي - أبو محمد عبد الله بن محمد، الأنصاري المعروف بـ'أبي الشيخ الأصبهاني' (م: ۳۶۹ھ): ۱/۳۲۴، رقم الحديث: ۲۷۶، ذكر قوله صلى الله عليه وسلم: مثل الذي يعلم الناس الخير وينسى نفسه، ت: الدكتور عبد العلي عبد الحميد حامد، ط: الدار السلفية - بومباي)

[۵۵] مرتکب کبائر کی امامت

گذشتہ سے پیوستہ

۷۵۰-سوال: (۱) پیش امام صاحب لنگی ٹخنوں سے نیچے لٹکا کر امامت کرواتے ہیں، تو کیا اس سے نماز میں کوئی خرابی نہیں آئے گی؟ (۲) امام صاحب اذان کے بعد مسجد میں آ کر دنیوی باتیں کرتے ہیں۔ (۳) اور عصر و عشاء کی سنت غیر مؤکدہ نہیں پڑھتے۔ (۴) اور جماعت کا وقت ہو جاتا ہے، اس کے باوجود وقت پر جماعت کھڑی نہیں کرتے، فجر کے وقت ۵ / سے سات منٹ دیر کرتے ہیں، لائٹ بند کر کے جماعت خانہ کے باہر بیٹھے رہتے ہیں اور مصلی حضرات کو ان کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ (۵) وہ اپنی مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں، اگر کوئی ان کو کچھ کہتا ہے، تو اس کو نامناسب الفاظ سے جواب دیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ ایسے امام امامت کے عہدہ پر برقرار رکھنا چاہیے یا امامت سے معزول کر دینا چاہیے؟

(۶) مسجد میں پرانا حوض تھا، اس کو شہید کر کے نیا حوض بنایا گیا، پرانے حوض کی جگہ پر پودے اور پپیتے وغیرہ کا درخت لگایا گیا ہے، امام صاحب پپیتہ وغیرہ لے جا کر اپنی ضرورت میں استعمال کرتے ہیں، کیا وہ اسے کھا سکتے ہیں؟

(۷) گھر میں بجلی کا میٹر نہیں ہے، بجلی کے تار کے ساتھ تار لگا کر اپنے گھر میں بجلی کا استعمال کرتے ہیں اور بجلی کا خرچہ پنچایت کو دینا پڑتا ہے، وہ نہیں دیتے، تو کیا کرنا چاہیے؟

(۸) مؤذن کو اپنے اعتماد میں لے رکھا ہے، ان کی ملی بھگت سے پپیتہ اور سینگ دانہ کا استعمال کرتے ہیں، اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

(۱) ازار بلا عذر گھٹنوں سے نیچے ہو، تو نماز مکروہ تحریمی ہوگی؛ لہٰذا جس امام کی ازار بلا عذر گھٹنوں کے نیچے ہوئی، اس کو امام بنانا مکروہ ہے، کہ یہ فسق کا کام ہے۔[1]

(۲) مسجد میں بیٹھ کر دنیوی باتیں کرنا جائز نہیں، کبھی کوئی ضروری بات کر لی ہو، تو جائز ہے، رسول

(۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ما أسفل من الكعبين من الإزار ففي النار. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۶۱، رقم الحديث: ۵۷۸۷، كتاب اللباس، باب ما أسفل من الكعبين فهو في النار، ط: ديوبند)

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آگ جس طرح سوکھی گھاس اور لکڑی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، اسی طرح مسجد میں دنیوی باتیں کرنے سے نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ (۲)

(۳) سنت غیر مؤکدہ نہ پڑھنے سے آدمی گنہ گار نہیں ہوتا؛ لیکن امام کو سنت مؤکدہ کے ساتھ سنت غیر مؤکدہ اور نوافل کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔

(۴) نماز کے اوقات اس لیے مقرر کیے جاتے ہیں، تا کہ نمازیوں کے لیے سہولت ہو، اس لیے امام کا جان بوجھ کر وقت کی پابندی نہ کرنا، مروت و اخلاق کے خلاف ہے، ساتھ ہی نمازیوں کو تکلیف پہونچانا ہے، یہ جائز نہیں۔

(۵) نصیحت کرنے والوں کو نامناسب الفاظ کہنا، بدگوئی کرنا، تہمت لگانا: یہ سب حرام کام ہیں؛ اس لیے امام کو ان کاموں سے بچنا چاہیے۔ (۳)

---

(۲) ذكر سفيان، عن بعض أصحابه، عن الحسن، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "يأتي على الناس زمان يكون حديثهم في مساجدهم في أمر دنياهم، فلا تجالسوهم، فليس لله فيهم حاجة". (شعب الإيمان-أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۳۸۷/۴، رقم الحديث: ۲۷۰۱، كتاب الصلاة، باب المشي إلى المساجد، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع-الرياض)

قال الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): (في مساجدهم في أمر دنياهم): وهي: موضوعة لأمر دينهم، قال ابن الهمام في شرح الهداية: الكلام المباح في المسجد مكروه يأكل الحسنات. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۶۲۲/۲، رقم: ۷۴۳، باب المساجد ومواضع الصلاة، ط: دار الفكر-بيروت)

وصرح في الظهيرية بكراهة الحديث أي كلام الناس في المسجد لكن قيده بأن يجلس لأجله ـــــ وفي فتح القدير الكلام المباح فيه مكروه يأكل الحسنات. وينبغي تقييده بما في الظهيرية أما إن جلس للعبادة ثم بعدها تكلم فلا. (البحر الرائق: ۳۹/۲، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، الوطء فوق المسجد والبول والتغوط، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ حاشية الشرنبلالي مع درر الحكام شرح غرر الأحكام-حسن بن عمار الشرنبلالي (م: ۱۰۶۹ھ): ۱۱۱/۱، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة، مكروهات الصلاة، ط: دار إحياء الكتب العربية)

(۳) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝ (۳۳-الأحزاب: ۷۰-۷۱)

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره، ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه، ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليقل خيرا أو ليصمت. (صحيح البخاري: ۸۸۹/۲، رقم الحديث: ۶۰۱۸ و ۶۰۱۹، كتاب الأدب، باب: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۵۰/۱، رقم الحديث: ۷۴-۷۵ (۴۷)، كتاب الإيمان، باب الحث على إكرام الجار والضيف، ولزوم الصمت إلا عن الخير وكون ذلك كله من الإيمان، ط: ديوبند)

(۶) مذکورہ زمین میں جس نے درخت لگایا ہے، جس نے محنت کی ہے، مذکورہ مسئلہ کے حکم کا دارو مدار اس کی نیت پر ہے، اس نے کیا نیت کی ہے: (۱) اپنے کھانے کے لیے۔ (۲) نمازیوں کے لیے۔ (۳) مسجد کے لیے، امام نے اگر اپنے لیے درخت لگائے ہوں، تو اس کے پھل کھانا جائز ہے، اگر مسجد کے لیے ہو، تو جائز نہیں۔ (۴) اگر ۵۰ رفیصد مسجد کے لیے اور اور ۵۰ رفی صد اپنے لیے ہو، تو امام کو کھانا جائز ہے؛ لیکن نمبر ار کے مطابق نیت ہو، تو متولیان مسجد کو اختیار ہے کہ وہ درخت اکھڑوا دیں، اس لیے شرکت کی نیت کرنا بہتر ہے؛ لہٰذا امام کا بھی ۵۰ رفیصد حق ہے، اس اعتبار سے کھانا جائز ہوگا۔

(۷) گاؤں والوں پر فرض ہے کہ امام کے لیے ان کی ضرورت کے مطابق گھر کی چیزوں کا انتظام کردے، لائٹ فٹنگ کروا کر، میٹر رکھوادے، امام کی ضرورتیں گاؤں والوں کو سمجھنا چاہیے، گرام پنچایت کارکنان سے اجازت لیے بغیر بجلی کا استعمال کرتے ہیں، تو جائز نہیں ہے، امام کو مذکورہ کام سے توبہ کرنی چاہیے اور جتنی بجلی کا استعمال کیا ہے، اس کا تاوان ادا کرنا چاہیے۔

(۸) جواب نمبر ۳ رمیں تفصیل لکھی ہے، امام ومؤذن نے وقف کی زمین میں درخت لگا کر محنت کی ہے، اور اپنے لیے استعمال کی نیت کی ہے، تو کھانا جائز ہے، معاملہ کی تحقیق کرلیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ غلط بیانی کر کے گنہگار ہو جائیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۶] أيضــــا

گزشتہ سے پیوستہ

۱۵۷-سوال: (۱) مؤذن کا وضوء صحیح نہیں ہوتا، کہنے کے باوجود وہ اپنی اصلاح نہیں کرتے؟ (۲) ان کو رہنے کے لیے مکان دیا ہے، اس کے باوجود رات کو جماعت خانہ میں سوجاتے ہیں، امام صاحب جب ان سے کہتے ہیں، تو مؤذن ان کو جواب میں یہ کہتے ہیں کہ: ''جن تابع کرنے کا عمل کرتا ہوں'' اور امام صاحب نے ۸ ردن میں یہ ظاہر بھی کر دیا کہ مؤذن صاحب نے جن تابع کرلیا ہے۔ ہم نے کہا کہ جماعت خانہ میں سونے سے مسجد کی بے ادبی ہوتی ہے، تو جواب دیتے ہیں کہ آپ نہیں سمجھیں گے، سو سکتے ہیں۔ (۳) جماعت خانہ میں ناپاک پاؤں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں۔ (۴) سنت ونوافل بھی نہیں پڑھتے۔ (۵) ان کے تکبیر پڑھنے کی وجہ سے نماز میں کوئی حرج ونقص تو نہیں ہوگا؟ (۶) مسجد میں پرانا حوض تھا، اس کو

شہید کر کے نیا حوض بنایا گیا ہے، پرانے حوض کی جگہ پپیتے کا درخت لگایا گیا ہے، وہاں سے پپیتے توڑ کر اپنے کمرہ میں لے جا کر کھاتے ہیں، گذشتہ کل اس سلسلے میں امام و مؤذن کے درمیان جھگڑا بھی ہوا اور مزید جھگڑے کا اندیشہ ہے، تو ان کو رکھنا چاہیے یا مستعفی کر دینا چاہیے؟ (۷) امام صاحب نماز میں بار بار داہنا پاؤں اٹھاتے رہتے ہیں؟ (۸) نماز میں قراءت ایسی پڑھتے ہیں، گویا شاعری پڑھتے ہوں اور سلام کھینچ کر کہتے ہیں، لوگ اس سے اکتا گئے ہیں، صرف پانچ سات مصلی باقی ہو گئے ہیں۔ (۹) نماز کے اوقات دائمی تقویم کے مطابق نہیں لکھتے، اس میں اپنی من مانی کرتے ہیں اور جب کوئی اس کو غلطی سے متنبہ کرتا ہے، تو اس کے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں۔ (۱۰) اگر وہ نماز پڑھائے، تو اس میں کوئی حرج ہے؟

الجواب حامداو مصليا:

(۱) آپ کو صحیح بات کہنے کا ثواب مل گیا، آپ دعا کیجیے، اللہ ان کو ہدایت عطا فرمائے۔

(۲) مسجد نماز، تلاوت، ذکر کے لیے ہے، مسجد میں سونے کی عادت بنالینا جائز نہیں، مسجد جن کو تابع کرنے کی جگہ نہیں، جو کمرہ دیا ہے، اس کا استعمال کرنا چاہیے، جھوٹے بہانے بنا کر مسجد میں سونے کی عادت بنالینا مسجد کی بے عزتی ہے، جو جائز نہیں ہے۔[1]

---

(۱) ﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ (۲۴- النور: ۳۶)

{في بيوت أذن الله أن ترفع} أي: أمر الله تعالى برفعها، أي: بتطهيرها من الدنس واللغو، والأفعال والأقوال التي لا تليق فيها، كما قال علي بن أبي طلحة، عن ابن عباس في هذه الآية الكريمة: {في بيوت أذن الله أن ترفع} قال: نهى الله سبحانه عن اللغو فيها. وكذا قال عكرمة، وأبو صالح، والضحاك، ونافع بن جبير، وأبو بكر بن سليمان بن أبي حثمة، وسفيان بن حسين، وغيرهم من علماء المفسرين. (تفسير القرآن العظيم- أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۶/ ۶۲، سورة النور: ۳۶، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

(وكره) أي تحريما لأنها محل إطلاقهم بحر (إحضار مبيع فيه) كما كره فيه مبايعة غير المعتكف مطلقا للنهي وكذا أكله ونومه إلا لغريب أشباه وقد قدمناه قبيل الوتر، لكن قال ابن كمال لا يكره الأكل والشرب والنوم فيه مطلقا ونحوه في المجتبى. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله مطلقا) أي سواء احتاج إليه لنفسه أو عياله أو كان للتجارة أحضره أو لا كما يعلم مما قبله ومن الزيلعي والبحر (قوله للنهي) هو ما رواه أصحاب السنن الأربعة وحسنه الترمذي، أن رسول الله نهى عن الشراء والبيع في المسجد وأن ينشد فيه ضالة أو ينشد فيه شعر ونهى عن التحلق قبل الصلاة يوم الجمعة، فتح (قوله وكذا أكله) أي غير المعتكف (قوله لكن إلخ) استدراك على ما في الأشباه، وعبارة ابن الكمال عن جامع الإسبيجابي لغير المعتكف أن ينام في المسجد مقيما كان أو غريبا أو مضطجعا أو متكئا رجلاه إلى القبلة أو إلى غيرها فالمعتكف أولى اهـ ونقله أيضا في المعراج وبه يعلم تفسير =

(۳) ناپاک پاؤں کے ساتھ جماعت خانہ میں داخل ہونا جائز نہیں، ناپاکی لگ جانے کی وجہ سے نمازیوں کی نماز نہیں ہوگی، اس کا بھی گناہ ہوگا۔[۲]

(۴) سنت مؤکدہ چھوڑنے کی عادت بنا لینے کی وجہ سے آدمی فاسق بن جاتا ہے؛ کہ یہ سنت سے عدم دل چسپی اور بے رغبتی کی علامت ہے۔[۳]

(۵) مذکورہ کام کرنے والا فاسق ہے اور فاسق کی اذان مکروہ ہے۔ (مجمع الانہر جلد ۱ صفحہ ۷۸)[۴]

(۶) سجدہ صحیح ہونے کے لیے پاؤں کی انگلیوں کا تھوڑی دیر کے لیے زمین پر رکھنا ضروری ہے؛

= الإطلاق قال ط: لكن قوله رجلاه إلى القبلة غير مسلم لما نصوا عليه من الكراهة اهـ ومفاد كلام الشارح ترجيح هذا الاستدراك والظاهر أن مثل النوم الأكل والشرب إذا لم يشغل المسجد ولم يلوثه لأن تنظيفه واجب كما مر لكن قال في متن الوقاية: ويأكل أي المعتكف ويشرب وينام ويبيع ويشتري فيه لا غيره، قال منلا علي في شرحه: أي لا يفعل غير المعتكف شيئا من هذه الأمور في المسجد اهـ ومثله في القهستاني ثم نقل ما مر عن المجتبى. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۴۹/۲، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) إسحاق بن أبي طلحة، حدثني أنس بن مالك - وهو عم إسحاق -، قال: بينما نحن في المسجد مع رسول الله صلى الله عليه وسلم. إذ جاء أعرابي فقام يبول في المسجد، فقال أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم: مه مه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تزرموه دعوه، فتركوه حتى بال، ثم إن رسول الله صلى الله عليه وسلم دعاه، فقال له: إن هذه المساجد لا تصلح لشيء من هذا البول، ولا القذر إنما هي لذكر الله عز وجل، والصلاة وقراءة القرآن، أو كما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: فأمر رجلا من القوم فجاء بدلو من ماء فشنه عليه. (الصحيح لمسلم: ۱۳۸/۱، رقم الحديث: ۱۰۰-(۲۸۵)، كتاب الطهارة، باب وجوب غسل البول وغيره من النجاسات إذا حصلت في المسجد، وأن الأرض تطهر بالماء، من غير حاجة إلى حفرها، ط: ديوبند)

تطهير النجاسة من بدن المصلي وثوبه والمكان الذي يصلي عليه واجب. هكذا في الزاهدي في باب الأنجاس. (الفتاوى الهندية: ۵۸/۱، الباب الثالث في شروط الصلاة، الفصل الأول في الطهارة وستر العورة، ط: دار الفكر)

(۳) والسنة نوعان: سنة الهدي، وتركها يوجب إساءة وكراهية كالجماعة والأذان والإقامة ونحوها ـــــ وسنة الزوائد، وتركها لا يوجب ذلك كسير النبي - عليه الصلاة والسلام - في لباسه وقيامه وقعوده. . . . السنة هي الطريقة المسلوكة في الدين، فهي في نفسها عبادة . . . ولما لم تكن من مكملات الدين وشعائره سميت سنة الزوائد، بخلاف سنة الهدي، وهي السنن المؤكدة القريبة من الواجب التي يضلل تاركها؛ لأن تركها استخفاف بالدين. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۰۳/۱، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، مطلب في السنة وتعريفها، ط: بيروت)

[۴] (وكره أذان الفاسق) لعدم الاعتماد ولكن لا يعاد. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - داماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۷۸/۱، باب الأذان، صفة الأذان، ط: دار إحياء التراث العربي)

صورت مسئولہ میں یہ بات متحقق ہوتی ہے؛ اس لیے نماز تو ہو جائے گی؛ لیکن پاؤں اونچا نیچا کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔(۵)

(۷) گاؤں والے اپنے حالات سے بہ خوبی واقف ہیں، وہ اپنی مالی حالت کو سمجھ سکتے ہیں، اگر ان کے پاس زیادہ تنخواہ دینے کی طاقت وگنجائش ہو، تو نیک وصالح امام ومؤذن کا انتخاب کریں، تا کہ گاؤں کے بچوں کی تعلیم وتربیت اچھی ہو اور اگر تنخواہ دینے کی گنجائش نہ ہو، صالح آدمی کو رکھنے کی وسعت نہ ہو، تو کہیں ایسا نہ ہو موجودہ امام ومؤذن کو علاحدہ کرنے کی وجہ سے مسجد ومدرسہ ویران وبرباد ہو جائے اور تعلیم دینے والا کوئی آدمی نہ ہو؛ اس لیے سوچ سمجھ کر کام کریں۔

(۸) امام اگر سوال میں تحریر کردہ کیفیت کے ساتھ کرتا ہے، تو اس طرح قرآن شریف پڑھنا صحیح نہیں ہے، امام اگر شرعی مسائل کی خلاف ورزی کرتا ہے، تو متولیان کی ذمہ داری ہے کہ وہ امامت کی ذمہ داری کسی نیک، متقی، مسائل سے واقف عالم باعمل شخص کے حوالہ کرے؛ لیکن اگر مقتدیوں نے ایسے امام کے پیچھے بھی نماز پڑھ لی، تو نماز ہو جائے گی، متولی اور امام گنہگار رہوں گے، مقتدی کو جماعت کا ثواب مل جائے گا۔(۶)

(۹) آپ کی شکایتوں کا حل متولی امام اور گاؤں کے دو سمجھدار آدمی بیٹھ کر نکالیں، تو ممکن ہے۔

(۱۰) ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے، متولی کی ذمہ داری ہے، نیک آدمی کو امامت کی ذمہ داری سپرد کریں، بہر حال جماعت کا ثواب مل جائے گا۔(۷) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۷] سیاہ خضاب لگانے والے امام کے پیچھے نماز پڑھنا

۷۵۲-سوال: داڑھی میں سیاہ خضاب لگانا کیسا ہے؟ اور سیاہ خضاب لگانے والے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

سیاہ خضاب مجاہد کے لیے لگانا جائز ہے، تا کہ دشمن یہ نہ سمجھے کہ میرا مقابل بوڑھا ہے؛ بل کہ یہ سمجھے

---

(۵) ویکفیه وضع أصبع واحدة، فلو لم یضع الأصابع أصلا، ووضع ظهر القدم فإنه لا یجوز. (البحر الرائق: ۱/۵۵۶، کتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الکتاب دیوبند)

(۶-۷) قد تقدم مرارا.

کہ مقابل میں مضبوط نوجوان ہے، اسی طرح اگر جوان عورت ہو اور وہ اپنے شوہر کو جوان دیکھنا چاہتی ہو تو جوان عورت کے شوہر کے لیے جوان عورت کی وجہ سے خضاب لگانا جائز ہے، ورنہ جائز نہیں ہے۔

جو امام بلاوجہ صرف فیشن کی خاطر خضاب لگائے، اس کو امام نہیں بنانا چاہیے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۸] اجنبیہ کی شرم گاہ سے شرم گاہ ملانے والے کی امامت

۷۵۳-سوال: غیر شادی شدہ عاقل و بالغ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کی شرم گاہ کو ایک ساتھ مس کریں، دخول نہ ہو، تو وہ زانی ہوں گے یا نہیں؟ اور مذکورہ آدمی کے پیچھے کوئی شخص جماعت کے ساتھ نماز پڑھے، تو اس کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

شوہر و بیوی کے علاوہ کسی اور کا اس طرح کرنا حرام ہے، زنا کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آنکھ بھی زنا کرتی ہے، ہاتھ اور پاؤں بھی زنا کرتے ہیں۔[2] شرم گاہ کا شرم گاہ میں داخل کرنا یہ بھی زنا ہے؛ اس لیے مذکورہ فعل حرام ہے، اس کا مرتکب فاسق ہے، توبہ نہ کرے، تو اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) يستحب للرجل خضاب شعره ولحيته ولو في غير حرب في الأصح، والأصح أنه - عليه الصلاة والسلام - لم يفعله، ويكره بالسواد، وقيل: لا، مجمع الفتاوى. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويكره بالسواد) أي لغير الحرب. قال في الذخيرة: أما الخضاب بالسواد للغزو؛ ليكون أهيب في عين العدو فهو محمود بالاتفاق، وإن ليزين نفسه للنساء فمكروه، وعليه عامة المشايخ، وبعضهم جوزه بلا كراهة روي عن أبي يوسف أنه قال: كما يعجبني أن تتزين لي يعجبها أن أتزين لها. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۴۲۲، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، فرع يكره إعطاء سائل المسجد إلا إذا لم يتخط رقاب الناس، و انظر: ۶/ ۷۵۶ و ۷/ ۳۴۷، ط: دار الفكر- بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۵۹، الباب العشرون في الزينة واتخاذ الخادم للخدمة، ط: دار الفكر ☆المحيط البرهاني -ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۵/ ۳۷۷، كتاب الاستحسان و الكراهية، الفصل الحادي و العشرون في الزينة، واتخاذ الخادم للخدمة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۱) عن ابن مسعود، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: " العينان تزنيان، واليدان تزنيان، والرجلان تزنيان، والفرج يزني ". (مسند الإمام أحمد بن حنبل (م: ۲۴۱ھ): ۷/ ۲۸، رقم الحديث: ۳۹۱۲، ت: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة☆سنن أبي داود: ...، رقم الحديث: ۲۱۵۲، ۲۱۵۳، ۲۱۵۴، كتاب النكاح، باب ما يؤمر به من غض البصر، عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه، ط: ...)

(۲) قد تقدم مرارا.

[۵۹] گورنمنٹ سے اپنی تنخواہ چھپانے والے کی امامت

۷۵۴-سوال: زید لندن میں رہتا ہے، یہاں کی حکومت بیمار اور بیکار شخص کو طے شدہ رقم دیتی ہے، لیکن اس رقم سے اس کا بہ مشکل گذارہ ہوتا ہے، وہ مسجد میں امامت کی خدمت بھی انجام دیتا ہے اور مدرسے میں تعلیم بھی، مدرسہ کی جو کچھ تنخواہ دوسرے اساتذہ کو ملتی ہے، وہ بھی لیتا ہے؛ البتہ امامت کے فرائض فی سبیل اللہ انجام دیتا ہے، وہ صرف ناظرہ کیے ہوا ہے، البتہ کچھ وجوہات کی بنا پر حکومت کو اس کی اطلاع نہیں دیتا کہ وہ مدرسے سے بھی رقم لیتا ہے، بعض وجہ یہ ہے: محلے کا چھوٹا ہونا، آمدنی کم ہونا۔

اگر وہ شخص مدرسے کی تنخواہ سے حکومت کو مطلع کردے، تو دوسرے اساتذہ کی بھی پکڑ ہوگی اور محلہ کو حکومتی ٹیکس ادا کرنا پڑے گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید امامت کی خدمت انجام دے سکتا ہے یا نہیں اور جو نماز اس نے پڑھائی ہے، کیا ان کا اعادہ تو ضروری نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

زید امامت کی تنخواہ مذکورہ مصلحت کی بنا پر نہیں لیتا ہے اور مدرسے کی تنخواہ کی خبر مذکورہ مصلحت کی بنا پر گورنمنٹ میں نہیں کرتا ہے، تو اگر گورنمنٹ کے ساتھ دغابازی نہ ہو، تو حرج نہیں اور ان کی امامت بلا کراہت جائز ہوگی؛ لیکن اگر حکومت کے ساتھ دغابازی ہو رہی ہو، تو جائز نہیں ہے۔ ایسے شخص کو امام نہ بنایا جائے، البتہ اس کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) يَآيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا، إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿﴾ (۲۳-المؤمنون:۵۱)

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿﴾ (۲-البقرة:۱۸۸)

وقال سعيد بن جبير، والضحاك: {كلوا من الطيبات} يعني: الحلال. (تفسير القرآن العظيم-ابن كثير القرشي، الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۵/۴۷۷، سورة المؤمنون: ۵۱، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "أيها الناس، إن الله طيب لا يقبل إلا طيبا، وإن الله أمر المؤمنين بما أمر به المرسلين، فقال: {يا أيها الرسل كلوا من الطيبات واعملوا صالحا، إني بما تعملون عليم} [المؤمنون: ۵۱] وقال: {يا أيها الذين آمنوا كلوا من طيبات ما رزقناكم} [البقرة: ۱۷۲] ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر، يمد يديه إلى السماء، يا رب، يا رب، ومطعمه حرام، ومشربه حرام، وملبسه حرام، وغذي بالحرام، فأنى يستجاب لذلك؟". (الصحيح لمسلم: ۱/۳۲۶، رقم الحديث: ۶۵-(۱۰۱۵)، كتاب الزكاة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب وتربيتها، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

مزید دیکھیے عنوان: فاسق کی امامت سے متعلق کچھ احکام۔

[۱۰] مقتدی کا ایسے امام کی اقتدا کرنا، جس کی عیب جوئی میں وہ لگا رہے

۷۵۵-سوال: اگر امام سے مقتدی ناراض ہے اور وہ ہر وقت امام کی عیب جوئی میں لگا ہوا ہے تو اس امام کی اقتدا میں ایسے مقتدی کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

اگر کسی دنیوی وجہ کی بنا پر مقتدی امام سے ناراض ہو اور امام کی عیب جوئی میں لگا رہے، تو یہ فعل حرام ہے کسی کے درپے رہنے والے کے لیے بہت سی وعیدیں وارد ہوئی ہیں، کسی مسلمان کا اپنے مسلمان بھائی کی عیب جوئی میں لگ جانا اور اسی میں شب و روز گزارنا حرام ہے، اگر کوئی عیب نظر بھی آجائے تو اس کو پوشیدہ رکھنے کی آپ ﷺ نے نصیحت فرمائی ہے۔[۱]

اگر واقعتاً امام میں کوئی عیب شرعی ہو، کسی حکم شریعت پر عمل نہ کرتا ہو، تو ایسی حالت میں ذمہ داروں کو مطلع کر کے امام کو متوجہ کیا جائے، ذمہ داروں کے توجہ دلانے کے باوجود وہ (امام) گناہ سے باز نہ آئیں، تو انہیں امامت سے معزول کر دیا جائے، کیوں کہ فاسق کو امام بنانا مکروہ ہے۔[۲]

جو شخص امام کی عیب جوئی میں لگا رہے، اگر وہ اسی امام کی اقتدا میں نماز پڑھتا ہے، تو نماز ہو جائے گی۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن ابن عمر قال: صعد رسول الله صلى الله عليه وسلم المنبر فنادى بصوت رفيع، فقال: يامعشر من أسلم بلسانه ولم يفض الإيمان إلى قلبه، لاتؤذوا المسلمين ولا تعيروهم ولا تتبعوا عوراتهم، فإنه من تتبع عورة أخيه المسلم تتبع الله عورته، ومن تتبع الله عورته يفضحه ولو في جوف رحله، قال: ونظر ابن عمر يوما إلى البيت أو إلى الكعبة فقال: ما أعظمك وأعظم حرمتك، والمؤمن أعظم حرمة عند الله منك. (سنن الترمذي: ۲/ ۲۳، رقم الحديث: ۲۰۳۲، أبواب البر والصلة، باب ماجاء في تعظيم المؤمن، ط: مختار اينڈ كمپني- ديوبند)

(۲) قدتقدم مرارا.

(۳) کہ اس کے گمان کے مطابق زیادہ سے زیادہ وہ شخص فاسق ہوگا، جب کہ نبی کریم ﷺ نے ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اور جماعت سے علاحدگی کو ناپسند فرمایا ہے:

صلوا خلف كل بر و فاسق. (سنن الدارقطني- أبو الحسن علي بن عمر، البغدادي الدارقطني (م: ۳۸۵هـ): ۲/ ۴۰۲، رقم الحديث: ۱۷۶۸، كتاب العيدين، باب صفة من تجوز الصلاة معه والصلاة عليه، ت: شعيب الارنؤوط وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

[۶۱] اسے شخص کی امامت، جو کرکٹ ٹیم کا کپتان ہو

۷۵۶-سوال: ہمارے گاؤں میں امام صاحب کرکٹ ٹیم کے کپتان ہیں اور ہر اعتبار سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، ابھی کچھ دنوں قبل اطراف کے دیہاتوں کا کرکٹ راؤنڈ (Cricket Raund) کھیلا گیا تھا، جس میں ٹیم (Team) کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک جلسہ منعقد ہوا تھا، اس جلسہ کی تصاویر خود امام صاحب نے لی تھی، اسی طرح اس جلسہ کی ابتدا قرآن پاک کی تلاوت سے کی گئی تھی۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکور کرکٹر (Cricketer) اور تصویر کھنچوانے والے کی اقتداء میں نماز جائز ہے، مذکورہ امام امامت کے لائق ہے؟ کیا مذکورہ جلسے میں تلاوت کرنا اور کرانا جائز ہے؟ مذکورہ امام صاحب کو معزول کرنے کے لیے گاؤں کے اہم ذمہ داران کو توجہ دلائی گئی؛ لیکن ذمہ داروں کی اکثریت امام کے عزیز واقارب کی ہے؛ اس لیے کوئی کچھ نہیں بولتا ہے، ایسے حالات میں ذمہ دار حضرات کی کیا ذمہ داری ہے؟ باخبر مصلیان کرام کیا کریں؟ نماز پڑھیں یا نہیں؟ کیا پڑھی ہوئی نماز پھر سے دہرائیں؟ یا ذمہ داروں پر بوجھ رہے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

مسجد کے متولیان کی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ امامت کے لیے دین دار، پابندِ صوم وصلاۃ عالم کا انتخاب کرے، اگر ذمہ داران، مذکور ذمہ داری ادا نہیں کریں گے، تو گنہ گار ہوں گے۔[۱]

قیامت کے دن ایسے خائن ذمہ داروں کا حشر خیانت کے عَلَم کے ساتھ ہوگا، اس علم (جھنڈا) کی وجہ سے لوگ جان لیں گے کہ ان لوگوں نے اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی تھی، ذمہ داری بڑی ہوگی، تو پرچم بھی بڑا ہوگا۔ (الحدیث)[۲]

دوسری حدیث میں ہے کہ تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے متعلق

(۱) لو قدموا فاسقا يأثمون بناء أعلى أن كراهة تقديمه كراهة تحريم، لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبی کبیر-إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ۹۵۶ھ) ص: ۳۱۵، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی-لاہور)

[۲] عن أبي سعيد، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لكل غادر لواء يوم القيامة، يرفع له بقدر غدره، ألا ولا غادر أعظم غدرا من أمير عامة. (الصحيح لمسلم: ۲/ ۸۳، رقم الحديث: ۱۶-(۱۷۳۸)، كتاب الجهاد و السير، باب تحريم الغدر، ط: ديوبند)

پوچھا جائے گا۔[۳]

آج ذمہ دار کو جاہ و مال یا شہرت یا طاقت کے خوف سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، قیامت کے دن ایسے متکبروں کا تکبر اتر جائے گا اور اللہ کے یہاں ان کو جواب دینا پڑے گا۔

سوال میں امام کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں، اگر وہ واقعی صحیح ہیں، تو ایسے شخص کو امام بنانا مکروہ ہے، اس مسئلے کی خبر ذمے داروں کو کی جائے۔ اگر ذمہ دار ایسے فاسق امام کو نہیں بدلتے، تو مجبوراً ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے سے مقتدیوں کو جماعت کا ثواب حاصل ہو جائے گا اور امام اور ذمہ دار حضرات گنہ گار ہوں گے۔

گناہ کے جلسوں میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا گناہ اور قرآن شریف کی بے عزتی ہے، ایسی صورت میں ایمان سے خارج ہو جانے کا خطرہ ہے؛ لہٰذا توبہ و استغفار کر کے آئندہ ایسا نہ کرنے کے متعلق اللہ سے عہد کرنا چاہیے۔[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۲] فلم دیکھنے والے شخص کی امامت

۷۵۷-سوال: جو حافظ فلم دیکھتا ہو، اس کے پیچھے تراویح جائز ہے یا نہیں، اگر مکروہ ہے، تو مکروہ تنزیہی یا تحریمی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

امامت، فرائض کی ہو یا تراویح کی؛ اہم ذمہ داری ہے، امام مقتدیوں کا نمائندہ ہوتا ہے؛ لہٰذا عادل متبع السنت، متقی، پرہیزگار کو امام بنایا جائے۔[۱]

---

(۳) عن عبد الله، قال النبي صلى الله عليه وسلم: كلكم راع وكلكم مسئول، فالإمام راع وهو مسئول، والرجل راع على أهله وهو مسئول، والمرأة راعية على بيت زوجها وهي مسئولة، والعبد راع على مال سيده وهو مسئول، ألا فكلكم راع وكلكم مسئول. (صحيح البخاري: ۲/۷۷۹، رقم الحديث: ۵۱۸۸، كتاب النكاح، باب: قوا أنفسكم وأهليكم نارا، ط: البدر - ديوبند)

(۴) مزید تفصیل و تخریج کے لیے دیکھیے فتاوی فلاحیہ کی پہلی جلد کا عنوان: "سودی بینک کا افتتاح قرآن خوانی سے کرنا"، باب المکفرات، مسئلہ نمبر: ۱۶۱، ص: ۲۹۷۔

(۱) الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية. =

گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والوں کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے؛ لہٰذا متولیان کے لیے لازم ہے کہ فاسق وفاجر اور گناہ کبیرہ کے مرتکب کو امامت کا منصب حوالے نہ کرے۔

اگر متولی حضرات ایسے شخص کو امام بنائیں گے، تو گنہ گار ہوں گے۔(۲)

فلم دیکھنے والا فاسق وفاجر ہے۔(۳) اس کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔(۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=ویجتنب الفواحش الظاهرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، مكتبة زكريا-ديوبند ☆ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱/ ۱۵۷، كتاب الصلاة، فصل بيان من هو أحق بالإمامة وأولى بها، ط:: دار الكتب العلمية ☆ تحفة الفقهاء-أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو: ۵۴۰هـ): ۱/ ۲۳۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) لو قدموا فاسقا يأثمون بناء على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم؛ لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير-إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلَبي (م: ۹۵۶هـ) ص: ۵۱۳، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی-لاہور)

[۳] (وكل لهو) لقوله-عليه الصلاة والسلام-: كل لعب ابن آدم حرام.... الحديث. وفي البزازية: استماع صوت الملاهي معصية والجلوس عليها فسق والتلذذ بها كفر أي بالنعمة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-داماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۲/ ۵۵۳، كتاب الكراهية، فصل في المتفرقات، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ الاختيار لتعليل المختار-ابن مودود الموصلي (م: ۶۸۳هـ): ۴/ ۱۶۵، كتاب الكراهية، فصل في مسائل مختلفة، ت: الشيخ محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي-القاهرة)

(۴) تقدم تخريجه مرارا.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عن أبي هريرة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: والذى نفسى بيده لقد هممت أن آمر بحطب، فيحطب، ثم آمر بالصلاة، فيؤذن لها، ثم آمر رجلا فيؤم الناس، ثم أخالف إلى رجال، فأحرق عليهم بيوتهم، والذى نفسى بيده لو يعلم أحدهم، أنه يجد عرقا سمينا، أو مرماتين حسنتين، لشهد العشاء.

(بخاری شریف: ۱/۸۹، حدیث نمبر: ۶۴۴، دیوبند)

باب الجماعة

[جماعت کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب الجماعة

[جماعت کا بیان]

[۱] ترک جماعت کی عادت بنالینا

۷۵۸-سوال: ایک شخص کی بازار میں سائیکل کی دکان ہے، وہ دن کی دو یا تین نمازیں تنہا پڑھ لیتا ہے؛ کیوں کہ جماعت کے وقت گاہک زیادہ ہوتے ہیں اور یہ کہتا ہے کہ تنہا نماز پڑھنا بھی صحیح ہے۔ یہ سلسلہ کافی دنوں سے جاری ہے، تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

(۲) ایک شخص ایسی جگہ پر ملازمت کرتا ہے، جہاں اس کی روزانہ تین یا چار نمازیں قضا ہوجاتی ہیں، تو کیا اس طرح ملازمت کو عذر بنا کر نماز قضا کرنا صحیح ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

(۱) حنفی مسلک کے مطابق جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے، بعض حضرات کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ وجوب کے قائلین کا کہنا ہے کہ جو لوگ جماعت کو سنت قرار دیتے ہیں، اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ واجب، سنت سے ثابت ہے، کبیری میں لکھا ہے کہ واجب ہے۔ (صفحہ ۴۷۴)[1]

---

(۱) وقال محمد في الأصل: اعلم أن الجماعة سنة مؤكدة لا يرخص الترك فيها إلا بعذر مرض أو غيره.

و أول هذا الكلام يفيد السنية و آخره يفيد الوجوب، و هو الظاهر، ففي الغاية: قال عامة مشائخنا أنها واجبة، و في المفيد: أنها واجبة، و تسميتها سنة لوجوبها بالسنة، و في البدائع: تجب على العقلاء البالغين الاحرار القادرين على الجماعة من غير حرج، انتهى.——— و الأدلة تدل على الوجوب، منها ما في الصحيحين و اللفظ لمسلم عن أبي هريرة أنه عليه السلام قال: و لقد هممت أن آمر بالصلاة، فتقام، ثم آمر رجلا فيصلي بالناس، ثم أنطلق معي برجال معهم حزم من حطب إلى قوم لا يشهدون الصلاة، فأحرق عليهم بيوتهم بالنار.... فهذه الأدلة=

عالمگیری میں بدائع اور بعض کتابوں کے حوالے سے منقول ہے کہ آزاد، عاقل بالغ تندرست شخص پر جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے۔ (۲)

شمس الائمہ حلوائی نے لکھا ہے کہ قدم سے اذان کا جواب دینا (یعنی جماعت سے نماز پڑھنے کے لیے مسجد جانا) واجب ہے، اگر صرف زبان سے جواب دے گا تو جواب دینا شمار نہ ہوگا۔ (خلاصۃ الفتاویٰ: ۱/ ۵۰) [۳]

علامہ زاہدی تحریر فرماتے ہیں کہ ترک جماعت کے متعلق رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سخت وعیدیں اور سزا بیان فرمائی ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے۔ (۴)

=أدنى ما يثبت بها الوجوب، و تسمية محمد لها سنة لا ينافيه؛ لأنه يطلق السنة كثيرا على ما يجب بالسنة، كما اطلق على صلاة العيد أنها سنة ... مع أنها واجبة على الأصح ؛لان وجوبها بالسنة ... و كذلك الأحكام تدل على الوجوب، من أن تاركها من غير عذر يعزر ،و ترد شهادته، و يأثم الجيران بالسكوت عنه، و هذه كلها أحكام الواجب ... وهذه الأحكام المذكورة مما استدل به على الوجوب مقيدا بالمداومة على الترك، كما هو ظاهر قوله عليه السلام: لا يشهدون الصلاة. (حلبي كبير-إبراهيم بن محمد الحلبي (م:۹۵۶ھ)، ص:۴۳۸-۴۳۹، كتاب الصلاة، فصل في الإمامة، ط: دار الكتاب-ديوبند)

(۲) الجماعة سنة مؤكدة. كذا في المتون والخلاصة والمحيط ومحيط السرخسي، وفي الغاية قال عامة مشايخنا: إنها واجبة، وفي المفيد: وتسميتها سنة لوجوبها بالسنة، وفي البدائع: تجب على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلاة بالجماعة من غير حرج. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۲، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الأول في الجماعة، ط: دار الفكر-بيروت)

قال ابن نجيم المصري: (الجماعة سنة مؤكدة) أي قوية تشبه الواجب في القوة، والراجح عند أهل المذهب الوجوب، ونقله في البدائع عن عامة مشايخنا، وذكر هو وغيره أن القائل منهم أنها سنة مؤكدة ليس مخالفا في الحقيقة بل في العبارة؛ لأن السنة المؤكدة والواجب سواء خصوصا ما كان من شعائر الإسلام، ودليله من السنة المواظبة من غير ترك مع النكير على تاركها بغير عذر في أحاديث كثيرة. (البحر الرائق: ۱/ ۳۶۵، باب الإمامة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۳] و من سمع الأذان، فعليه أن يجيب ... قال شمس الأئمة الحلواني: الإجابة بالقدم لا باللسان، حتى لو أجاب باللسان و لم يمش إلى المسجد لا يكون مجيبا. (خلاصة الفتاوى- طاهر بن أحمد بن عبد الرشيد البخاري (م:۵۴۲ھ): ۱/ ۵۰، كتاب الصلاة، الفصل الأول في الأذان، ط: المكتبة الأشرفية-ديوبند)

(۴) (والجماعة سنة مؤكدة للرجال) قال الزاهدي: أرادوا بالتأكيد الوجوب إلا في جمعة وعيد فشرط. وفي التراويح سنة كفاية. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله قال الزاهدي إلخ) توفيق بين القول بالسنية والقول بالوجوب الآتي، وبيان أن المراد بهما واحد أخذا من استدلالهم بالأخبار الواردة بالوعيد الشديد بترك الجماعة. وفي النهر عن المفيد: الجماعة واجبة، وسنة لوجوبها بالسنة اهـ وهذا كجوابهم عن رواية سنية الوتر بأن وجوبها ثبت بالسنة. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۲، باب الإمامة، مطلب شروط الإمامة الكبرى، ط: دار الفكر)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ خدا میرا جی چاہتا ہے کہ میں نماز کا باجماعت انتظام کر کے بعض لوگوں کو لے جا کر ایندھن جمع کروں اور جو لوگ نماز میں حاضر نہیں ہوئے ہیں، ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ (مفہوم حدیث، بخاری شریف)[۵]

اس کے علاوہ بہت سی روایات میں جماعت سے نماز پڑھنے کے متعلق تاکید وارد ہوئی ہے، جس کی وجہ سے علما کرام نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کو واجب قرار دیا ہے؛ اس لیے جو شخص بغیر عذر کے جماعت ترک کردے، وہ گنہ گار ہے، اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی، پڑوسی اگر ایسے شخص کو نصیحت نہیں کریں گے تو وہ بھی گنہگار ہوں گے۔ (البحر الرائق: ۱/ ۳۴۵ ☆ کبیری، ص: ۴۷۵)[۶]

اس لیے دکان دار نے تجارت کی حرص میں جماعت ترک کرنے کی جو عادت بنالی ہے اور ۲-۳ نماز جماعت سے نہیں پڑھتا، تو وہ فسق کا کام کرتا ہے، اس کی شہادت قبول کیے جانے کے لائق نہیں، آپ جیسے لوگ مبارک بادی کے قابل ہیں کہ ان کو نصیحت کرنے لیے جواب طلب کر رہے ہیں، تاکہ انھیں سمجھا سکیں، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔ اور آپ کی محنت کو قبول فرمائے، آمین۔

(۲) جس نوکری یا کام دھندے کی وجہ سے دو، تین نمازیں قضاء ہوتی ہوں، تو ایسا کام کرنا جائز نہیں ہے، حرام ہے؛ اس لیے دوسری نوکری تلاش کر کے اس کو ترک کر دینا ضروری ہے۔[۷] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

[۵] عن أبي هريرة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: والذي نفسي بيده لقد هممت أن آمر بحطب، فيحطب، ثم آمر بالصلاة، فيؤذن لها، ثم آمر رجلا فيؤم الناس، ثم أخالف إلى رجال، فأحرق عليهم بيوتهم، والذي نفسي بيده لو يعلم أحدهم، أنه يجد عرقا سمينا، أو مرماتين حسنتين، لشهد العشاء. (صحيح البخاري: ۱/ ۸۹، رقم الحديث: ۶۴۴، كتاب الأذان، باب وجوب صلاة الجماعة، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

[۶] وذكر في غاية البيان معزيا إلى الأجناس أن تارك الجماعة يستوجب إساءة ولا تقبل شهادته إذا تركها استخفافا بذلك ومجانة. (البحر الرائق: ۱/ ۳۶۵ ☆ حلبي كبير، ص: ۴۳۹)

(۷) ایسی ملازمت کرنا، جس میں بھی ترک جماعت بغیر کام نہ چلے منع ہے، اس کو چاہیے کہ کوئی دوسری ملازمت یا گذران کی دوری صورت اختیار کرے، جو ادائے فرض وسنن میں حارج نہ ہو، اور جب ملازمت مل جائے تو موجودہ ملازمت کو ترک کرے۔ (فتاوی محمودیہ: ۶/ ۴۱۴، سوال نمبر: ۲۸۳۸، باب الجماعت، ملازمت کی وجہ سے ترک جماعت، ط: زکریا - دیوبند)

[۲] جماعت کے وقت مسجد کے صحن میں سنت فجر پڑھنا

۷۵۹-سوال: مسجد کا صحن اگر مسجد شرعی میں داخل ہو، تو جماعت کھڑی ہونے کے بعد اس کے صحن میں سنت فجر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

بہشتی زیور میں لکھا ہے کہ جماعت کھڑی ہونے کی حالت میں مسجد کے اندر سنتیں پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، یہ مسئلہ صحن مسجد پر صادق آئے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

فجر کی فرض نماز ہو رہی ہو، ایسے وقت میں اگر کوئی شخص فجر کی سنت گھر سے پڑھے بغیر پہنچے، تو وہ دیکھے کہ اگر سنت فجر پڑھنے سے جماعت فوت ہوجانے کا خطرہ ہو، تو جماعت میں شریک ہوجائے اور طلوع شمس کے کچھ دیر بعد سنت پڑھ لے اور اگر جماعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو، تو مسجد کے قریب کسی حجرہ میں یا صحن مسجد میں سنت ادا کرلے، پھر جماعت میں شریک ہوجائے۔ (۱)

---

(۱) (وإذا خاف فوت) ركعتي (الفجر لاشتغاله بسنتها تركها) لكون الجماعة أكمل (وإلا) بأن رجا إدراك ركعة في ظاهر المذهب. وقيل التشهد واعتمده المصنف والشرنبلالي تبعا للبحر، لكن ضعفه في النهر (لا) يتركها بل يصليها عند باب المسجد إن وجد مكانا وإلا تركها لأن ترك المكروه مقدم على فعل السنة. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله عند باب المسجد) أي خارج المسجد كما صرح به القهستاني. وقال في العناية لأنه لو صلاها في المسجد كان متنفلا فيه عند اشتغال الإمام بالفريضة وهو مكروه، فإن لم يكن على باب المسجد موضع للصلاة يصليها في المسجد خلف سارية من سواري المسجد، وأشدها كراهة أن يصليها مخالطا للصف مخالفا للجماعة والذي يلي ذلك خلف الصف من غير حائل اهـ ومثله في النهاية والمعراج.

(قوله وإلا تركها) قال في الفتح: وعلى هذا أي على كراهة صلاتها في المسجد ينبغي أن لا يصلي فيه إذا لم يكن عند بابه مكان لأن ترك المكروه مقدم على فعل السنة. غير أن الكراهة تتفاوت، فإن كان الإمام في الصيفي فصلاته إياها في الشتوي أخف من صلاتها في الصيفي وعكسه، وأشد ما يكون كراهة أن يصليها مخالطا للصف كما يفعله كثير من الجهلة. اهـ.

والحاصل أن السنة في سنة الفجر أن يأتي بها في بيته، وإلا فإن كان عند باب المسجد مكان صلاها فيه، وإلا صلاها في الشتوي أو الصيفي إن كان للمسجد موضعان، وإلا فخلف الصفوف عند سارية. لكن فيما إذا كان للمسجد موضعان والإمام في أحدهما، ذكر في المحيط أنه قيل لا يكره لعدم مخالفة القوم، وقيل يكره لأنهما كمكان واحد. قال: فإذا اختلف المشايخ فيه فالأفضل أن لا يفعل. قال في النهر: وفيه إفادة أنها تنزيهية اهـ. لكن في الحلية قلت: =

بہشتی زیور میں لکھا ہوا مسئلہ غور سے پڑھ لیں۔ اس میں یہ ہے کہ ”فرض ہونے کی حالت میں جو سنتیں پڑھی جائیں، خواہ فجر کی ہوں یا کسی اور وقت کی، وہ ویسے مقام پر پڑھی جائیں، جو مسجد سے علاحدہ ہو، اس لیے کہ جہاں فرض نماز ہوتی ہو، پھر کوئی دوسری نماز وہاں پڑھنا مکروہ تحریمی ہے“۔[۱] اور صحن مسجد، مسجد میں داخل نہیں ہوتا، اس لیے اس میں نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] داعی کا نماز نہ پڑھنے والوں کو مارنا

۷۶۰-سوال: ہمارے یہاں ایک شخص ہے، جو دعوت کا کام کرتا ہے، اس کا کام اچھی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، وہ لوگوں کو نماز کی دعوت دیتا ہے، تو بہت سے نماز کے لیے آجاتے ہیں، مگر کچھ لوگ نہیں آتے ہیں تو کیا نہ آنے والوں کو تنبیہاً مار سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

شریعت نے جو حدود بیان کی ہے، اس پر عمل ضروری ہے، اس سے تجاوز جائز نہیں، باپ اپنی اولاد کو یا استاذ و مہتمم اپنے شاگردوں اور ماتحتوں کو اور (ایک قول کے مطابق) شوہر اپنی بیوی کو نماز نہ پڑھنے پر تادیباً مار سکتا ہے، اس کے علاوہ مبلغ و داعی کسی عامی شخص کو مارے گا، تو بہ جائے فائدہ کے نقصان ہوگا؛ لہٰذا جائز نہیں، یہ حق تو بادشاہ اور حکومت کے کارندوں کا ہے ہر کسی کو یہ حق نہیں دیا گیا، ورنہ فساد پھیل جائے گا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= وعدم الكراهة أوجه للآثار التي ذكرناها اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۶-۵۷، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، مطلب هل الإساءة دون كراهة أو أفحش، ط: دار الفكر - بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۳، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، ط: دار الفكر - بيروت☆فتح القدير - ابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۱/ ۴۷۷، باب إدراك الفريضة، ط: دار الفكر)

(۱) بہشتی زیور: ۶۷۰، حصہ نمبر: ۱۱، مسئلہ نمبر: ۸، جماعت میں شامل ہونے نہ ہونے کے مسائل، ط: اسلامک بک سروس۔

(۲) تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ. (۲- البقرة: ۲۲۹)

(ويعزر المولى عبده والزوج زوجته... على تركها الزينة... و) تركها غسل الجنابة، و... (لا على ترك الصلاة) لأن المنفعة لا تعود عليه بل إليها، كذا اعتمده المصنف تبعا للدرر على خلاف ما في الكنز والملتقى واستظهره في حظر المجتبى. (والأب يعزر الابن عليه) وقدمنا أن للولي ضرب ابن سبع على الصلاة، ويلحق به الزوج نهر. (الدر المختار) ـــــــــ قال ابن عابدين: (قوله واستظهره) أي ما في الكنز والملتقى من أن له ضربها على ترك الصلاة، وبه قال كثير كما في البحر... (قوله والأب يعزر الابن عليه) أي على ترك الصلاة. ومثلها الصوم كما =

[۴] مسواک کرنے پر رکعت فوت ہوجانے کا اندیشہ ہو، تو کیا کرے؟

۷۶۱-سوال: مغرب کی جماعت کھڑی ہوگئی ہو اور وضو کے وقت مسواک کرنے میں رکعت فوت ہوجانے کا اندیشہ ہو، تو ایسی صورت میں مسواک ترک کر کے صرف انگلی پھیرنے پر اکتفاء کرنا درست ہوگا یا نہیں؟ مسواک کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ کیا اس صورت میں مسواک کرنا ضروری ہوگا؟ وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

رکعت فوت ہونے پر بھی جماعت کا ثواب ملے گا، دوسری رکعت میں شرکت کرسکتا ہے، لہٰذا مسواک کر کے نماز میں شریک ہونا بہتر ہے، وضوء کرتے وقت مسواک کرنا سنت ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=صرحوا به، وتعليل القنية الآتي يفيد أن الأم كالأب. والظاهر أن الوصي كذلك، وأن المراد بالابن الصغير بقرينة ما بعده، أما الكبير فكالأجنبي، . . . (قوله ابن سبع) تبع فيه النهر، والذي قدمه في كتاب الصلاة أمر ابن سبع وضرب ابن عشر. اهـ. وهكذا ذكره القهستاني عن الملتقط، والمراد ضربه بيد لا بخشبة كما تقدم هناك (قوله ويلحق به الزوج) فله ضرب زوجته الصغيرة على الصلاة كالأب، (قوله وفي القنية إلخ) وفيها عن الروضة: ولو أمر غيره بضرب عبده حل للمأمور ضربه، بخلاف الحر. ———— قال: فهذا تنصيص على عدم جواز ضرب ولد الآمر بأمره، بخلاف المعلم؛ لأن المأمور يضربه نيابة عن الأب لمصلحة والمعلم يضربه بحكم الملك بتمليك أبيه لمصلحة الولد اهـ وهذا إذا لم يكن الضرب فاحشا كما يأتي في المتن قريبا. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۷۷-۷۸، كتاب الحدود، باب التعزير، ط: دار الفكر-بيروت☆درر الحكام شرح غرر الأحكام-ملاخسرو (م: ۸۸۵هـ): ۲/ ۷۷، كتاب الحدود، فصل: التعزير، قبيل كتاب السرقة، ط: دار إحياء الكتب العربية☆مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ داماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۶۱۲، كتاب الحدود، فصل في التعزير، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لولا أن أشق على أمتي أو على الناس لأمرتهم بالسواك مع كل صلاة. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲۲، رقم الحديث: ۸۸۷، كتاب الجمعة، باب السواك يوم الجمعة، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۲۸، رقم الحديث: ۴۲- (۲۵۲)، كتاب الطهارة، باب السواك، ط: البدر - ديوبند) ———— وعن عائشة -رضي الله تعالى عنها- قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: تفضل الصلاة التي يستاك لها على الصلاة التي لا يستاك لها سبعين ضعفا. (مشكاة المصابيح، ص: ۴۵، الفصل الثالث، باب السواك، ط: ياسر نديم- ديوبند)

. . . أن من أدرك ركعة من الظهر مثلا فقد أدرك فضل الجماعة وأحرز ثوابها كما نص عليه محمد وفاقا لصاحبيه، وكذا لو أدرك التشهد يكون مدركا لفضيلتها على قولهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۶، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، ط: زكريا- ديوبند)

[۵] عورتوں کا پردے کے ساتھ مسجد میں تراویح پڑھنا

۷۶۴-سوال: کیاعورتوں کا رمضان المبارک میں ایسی مسجد میں تراویح پڑھنادرست ہے، جہاں مکمل پردہ کانظم کیا گیاہو،اس طور پر کہ مردعورت کونہ دیکھ سکیں اورنہ ہی عورتیں مردوں کودیکھ سکیں۔بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

موجودہ دورفتنہ وفساد کا دور ہے،حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ موجودہ زمانے کی عورتوں کودیکھ لیتے،توان کومسجد میں آنے سے منع فرمادیتے۔[۱]

حضرت عمرؓ کی دلی تمناتھی کہ ان کی عورتیں مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے نہ جائیں؛اس لیے علماء کرام نے موجودہ دورفتن میں عورتوں کومسجد میں جاکرنمازاداکرنے کی -خواہ پردے کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو- اجازت نہیں دی ہے،اوران کی مسجد میں حاضری اورنمازکومکروہ تحریمی قراردیاہے۔[۲] عورتیں

---

(۱)عن عمرة بنت عبد الرحمن، أنها سمعت عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم تقول: لو أن رسول الله صلى الله عليه وسلم رأى ما أحدث النساء، لمنعهن المسجد كما منعت نساء بني إسرائيل. قال: فقلت لعمرة: أنساء بني إسرائيل منعن المسجد؟ قالت: نعم. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲۰، رقم الحديث: ۸۶۹، كتاب الأذان، باب خروج النساء إلى المساجد بالليل والغلس، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۸۳، رقم الحديث: ۱۴۴-۴۴۵، كتاب الصلاة، باب خروج النساء الى المساجد... الخ، ط: البدر - ديوبند، واللفظ لمسلم)

[۲](ويكره حضورهن الجماعة) ولو لجمعة وعيد ووعظ (مطلقا) ولو عجوزا ليلا (على المذهب) المفتى به لفساد الزمان، واستثنى الكمال بحثا العجائز والمتفانية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۶۶، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - ديوبند)

ويكره لهن حضور الجماعات يعني الشواب منهن؛ لما فيه من خوف الفتنة، ولا بأس للعجوز أن تخرج في الفجر والمغرب والعشاء. (الهداية)———قال العيني: (قال: ويكره لهن حضور الجماعات) ش: أي يكره للنساء (يعني الشواب منهن)... وهذه اللفظة بإطلاقها تتناول الجمع والأعياد والكسوف والاستسقاء. وعن الشافعي: يباح لهن الخروج، (لما فيه) أي في حضورهن الجماعة (من خوف الفتنة) عليهن من الفساق، وخروجهن سبب للحرام وما يفضي إلى الحرام فحرام. وذكر في كتاب الصلوات مكان الكراهة الإساءة والكراهة فحش. قلت: المراد من الكراهة التحريم ولا سيما في هذا الزمان لفساد أهله. (البناية شرح الهداية - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵ھ): ۲/ ۳۵۴، كتاب الصلاة، باب في الإمامة، حضور النساء للجماعات، ط: دار الكتب العلمية)

(قوله ولا يحضرن الجماعات) لقوله تعالى {وقرن في بيوتكن} [الأحزاب: ۳۳] وقال - صلى الله عليه وسلم -: =

اپنے گھروں میں نماز ادا کریں، یہی ان کے لیے زیادہ اجر وثواب کا باعث ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] عورتوں کی تنہا جماعت کا حکم

۷۶۳-سوال: ایک شخص نے اپنی ذاتی زمین میں ایک مسجد بنوائی ہے، جس کے پڑوس میں ایک اسکول ہے، نماز کے اوقات میں لڑکے تو مسجد میں آکر امام کے پیچھے باجماعت نماز ادا کر لیتے ہیں؛ لیکن لڑکیاں کیا کریں؟ وہ مسجد میں ایک طرف کونے میں مردوں سے علاحدہ ہو کر امام کی اقتدا میں نماز پڑھ سکتی ہیں یا نہیں؟

واضح رہے کہ اگر وہ اسکول کے کمروں میں رہ کر امام کی اقتدا کرنا چاہیں، تو کر سکتی ہیں؛ کیوں کہ وہاں لاؤڈ اسپیکر کا بھی نظم ہے؛ تاہم ایک صاحب کا کہنا ہے کہ لڑکیوں ہی میں ایک کو امام بنا دیا جائے اور دوسری لڑکیاں اس کی اقتدا میں نماز ادا کرلیں، تو کیا ان کا ایسا کہنا صحیح ہے یا غلط؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

فتنہ وفساد کی وجہ سے عورتوں کے لیے مسجد میں آنا جائز نہیں ہے۔[۲] اسکول، مسجد سے الگ ہے؛ اس لیے وہاں اقتدا ہو ہی نہیں سکتی۔[۳]

=صلاتها في قعر بيتها أفضل من صلاتها في صحن دارها وصلاتها في صحن دارها أفضل من صلاتها في مسجدها وبيوتهن خير لهن. ولأنه لا يؤمن الفتنة من خروجهن أطلقه فشمل الشابة والعجوز والصلاة النهارية والليلية، قال المصنف في الكافي: والفتوى اليوم على الكراهة في الصلاة كلها لظهور الفساد. (البحر الرائق: ١/ ٣٨٠، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(١) عن عبد الله، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: صلاة المرأة في بيتها أفضل من صلاتها في حجرتها، وصلاتها في مخدعها أفضل من صلاتها في بيتها. (سنن أبي داود: ١/ ٨٤، رقم الحديث: ٥٧٠، كتاب الصلاة، باب التشديد في ذلك، بعد: باب ماجاء في خروج النساء إلى المسجد، ط: البدر - ديوبند)

(٢) عن عمرة بنت عبد الرحمن، أنها سمعت عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم تقول: لو أن رسول الله صلى الله عليه وسلم رأى ما أحدث النساء، لمنعهن المسجد كما منعت نساء بني إسرائيل. قال: فقلت لعمرة: أنساء بني إسرائيل منعن المسجد؟ قالت: نعم. (صحيح البخاري: ١/ ١٢٠، رقم الحديث: ٨٦٩، كتاب الأذان، باب خروج النساء إلى المساجد بالليل والغلس، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ١/ ١٨٣، رقم الحديث: ١٤٤-٤٤٥، كتاب الصلاة، باب خروج النساء الى المساجد... الخ، ط: البدر - ديوبند، واللفظ لمسلم)

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں عنوان "عورتوں کا پردے کے ساتھ مسجد میں تراویح پڑھنا" کا حاشیہ نمبر: ۳۔

(٣) (ويمنع من الاقتداء)... (طريق تجري فيه عجلة) الةيجرها الثور (أو نهر تجري فيه السفن) ولو زورقا ولو في=

نیز عورتوں کا علاحدہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا - کہ جس میں امام بھی خود عورت ہو - مکروہ ہے۔[1] لہٰذا بہتر یہ ہے کہ لڑکیاں فرداً فرداً نماز ادا کریں۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] عورتوں کا رمضان میں ایک امام کی اقتدا میں تراویح ادا کرنا

۷۶۴-سوال: عام دنوں میں تو عورتیں نماز باجماعت نہیں پڑھتی ہیں؛ لیکن رمضان میں اگر کسی نامحرم امام کے پیچھے پردے کا مکمل خیال کر کے صرف نماز تراویح پڑھیں، تو کیا کوئی حرج لازم آئے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

امام کے پیچھے عوتوں کا اقتدا کر کے نماز پڑھنا جائز ہے؛ لیکن پھر بھی عورتوں کا رمضان میں اور رمضان کے علاوہ دیگر ایام میں علاحدہ نماز پڑھنا ہی افضل ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] کیا رکوع میں شامل ہونے والے مقتدی کو تکبیر تحریمہ کا ثواب ملے گا؟

۷۶۵-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مقتدی پہلی رکعت کے رکوع میں شامل ہوا، تو اس کو تکبیر تحریمہ کا ثواب ملے گا؟ یا قیام میں شامل ہو تو ہی تکبیر تحریمہ کا ثواب ملے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر مقتدی پہلی رکعت کے رکوع میں شامل ہو جائے، تو صاحبینؒ کی روایت کے مطابق اس کو تکبیر

= المسجد (أو خلاء) أي فضاء (في الصحراء) أو في مسجد كبير جدا كمسجد القدس (يسع صفين) فأكثر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۸۴- ۵۸۵، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۷، كتاب الصلاة، الفصل الرابع في بيان ما يمنع ... الخ، ط: زكريا- ديوبند)

[۱] (ويكره حضورهن الجماعة) ولو لجمعة وعيد ووعظ (مطلقا) ولو عجوزا ليلا (على المذهب) المفتى به لفساد الزمان، واستثنى الكمال بحثا العجائز والمتفانية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۶۶، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر- ديوبند)

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں عنوان "عورتوں کا پردے کے ساتھ مسجد میں تراویح پڑھنا" کا حاشیہ نمبر: ۳۔

(۲) عن عبد الله، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: صلاة المرأة في بيتها أفضل من صلاتها في حجرتها، وصلاتها في مخدعها أفضل من صلاتها في بيتها. (سنن أبي داود: ۱/ ۸۴، رقم الحديث: ۵۷۰، كتاب الصلاة، باب التشديد في ذلك، بعد: باب ما جاء في خروج النساء إلى المسجد، ط: البدر- ديوبند)

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: عورتوں کا پردے کے ساتھ مسجد میں تراویح پڑھنا☆عورتوں کی تنہا جماعت کا حکم۔

تحریمہ پانے کی فضیلت حاصل ہوجائے گی، جب کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس فضیلت کو پانے کے لیے ضروری ہے کہ مقتدی کی تکبیر تحریمہ امام کی تکبیر تحریمہ سے ملی ہوئی ہو۔ (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] تکبیر اولیٰ کا وقت کب تک رہتا ہے؟

۷۶۶-سوال: تکبیر اولیٰ کا وقت کب تک رہتا ہے؟ اگر کوئی شخص پہلی رکعت کے قیام کو پالے، بالکل ابتدا میں شریک نہ ہوسکا ہو، تو اس کو تکبیر اولیٰ کی فضیلت اور اس کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

تکبیر اولیٰ کا ثواب پہلی رکعت پالینے میں ہے، لہٰذا جسے پہلی رکعت کا رکوع مل جائے، اسے صحیح قول کے مطابق تکبیر اولیٰ کا ثواب مل جائے گا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ثم اختلفوا في وقت إدراك فضيلة تكبيرة الافتتاح، ذكر شيخ الإسلام اختلافاً بين أبي حنيفة وصاحبيه، فقال على قول أبي حنيفة: إذا كبر مقارناً لتكبير الإمام، فيصير مدركاً فضيلة تكبيرة الافتتاح، وما لا فلا، وعندهما إذا أدرك الإمام في الثناء وكبر يصير مدركاً فضيلة تكبيرة الافتتاح وما لا فلا.

وذكر الشيخ الإمام الزاهد أبو نصر الصفار رحمه الله أن شداد بن الحكيم كان يقول: إن كان الرجل حاضراً وأراد أن يدرك فضيلة تكبيرة الافتتاح ينبغي أن يشرع قبل قراءة سبع آيات، وقال بعضهم: إذا أدرك الإمام في الركعة الأولى يصير مدركاً فضيلة تكبيرة الافتتاح، وهذا أوسع بالناس والله أعلم. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۱/ ۳۵۵، كتاب الصلاة، الفصل السادس عشر في التغني والألحان، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

قال ابن عابدين: وتظهر فائدة الخلاف في وقت إدراك فضيلة تكبيرة الافتتاح، فعنده بالمقارنة، وعندهما إذا كبر في وقت الثناء، وقيل بالشروع قبل قراءة ثلاث آيات لو كان المقتدي حاضرا، وقيل سبع لو غائبا، وقيل بإدراك الركعة الأولى، وهذا أوسع وهو الصحيح. اهـ وقيل بإدراك الفاتحة وهو المختار خلاصة. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۲۶، باب صفة الصلاة، مطلب في وقت إدراك فضيلة الافتتاح، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) وتظهر فائدة الخلاف في وقت إدراك فضيلة تكبيرة الافتتاح، فعنده: بالمقارنة، وعندهما: إذا كبر في وقت الثناء، وقيل: بالشروع قبل قراءة ثلاث آيات لو كان المقتدي حاضرا، وقيل: سبع لو غائبا، وقيل: بإدراك الركعة الأولى، وهذا أوسع، وهو الصحيح. اهـ وقيل بإدراك الفاتحة وهو المختار، خلاصة. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۲۶، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، مطلب في وقت إدراك فضيلة الافتتاح، ط: دار الفكر- بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۶۹، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الأول في فرائض الصلاة، ط: زكريا- ديوبند ☆ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: ''کیا رکوع میں شامل ہونے والے مقتدی کو تکبیر تحریمہ کا ثواب ملے گا؟''۔

[۱۰] رمضان میں افطاری کے عذر کی وجہ سے مغرب کی جماعت ترک کرنا

۷۶۷-سوال: ایک شخص رمضان میں افطار کر کے مسجد میں مغرب کی نماز کے لیے جاتا ہے؛ لیکن مسجد تک پہنچتے پہنچتے نماز ختم ہوجاتی ہے اور جماعت نکل جاتی ہے، تو کیا اس کے لیے اس بات کی گنجائش ہے کہ اپنے گھر میں نماز پڑھ لیا کرے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا سنت مؤکدہ ہے، سنت مؤکدہ کے ترک کی عادت بنالینا (خصوصاً رمضان المبارک میں) جائز نہیں؛ البتہ کبھی کبھار جماعت نکل جائے، تو اپنے گھر والوں اور بال بچوں کو جمع کر کے ان کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرلے؛ لیکن اس کی عادت بنالینا جائز نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] منفرد حنفی کے پیچھے کسی شافعی کا اقتداء کی نیت سے کھڑا ہوجانا

۷۶۸-سوال: ہمارے یہاں شوافع حضرات بڑی تعداد میں رہتے ہیں، میں حنفی ہوں، شوافع کی مسجد میں ایک بات یہ ہوتی ہے کہ ان میں سے کوئی آدمی جماعت کے بعد مسجد میں پہنچتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کوئی تنہا نماز پڑھ رہا ہے، تو وہ (آنے والا) پیچھے سے اس نمازی کے بدن کو آہستہ سے چھوتا ہے۔ (جو اس

---

(۱) عن أبي هريرة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: والذي نفسي بيده لقد هممت أن آمر بحطب، فيحطب، ثم آمر بالصلاة، فيؤذن لها، ثم آمر رجلا فيؤم الناس، ثم أخالف إلى رجال، فأحرق عليهم بيوتهم، والذي نفسي بيده لو يعلم أحدهم، أنه يجد عرقا سمينا، أو مرماتين حسنتين، لشهد العشاء. (صحيح البخاري: ۱/۸۹، رقم الحديث: ۶۴۴، كتاب الأذان، باب وجوب صلاة الجماعة، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/۲۳۲، رقم الحديث: ۲۵۱-(۶۵۱)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب فضل صلاة الجماعة وبيان التشديد في التخلف عنها... الخ، ط: ديوبند)

(والجماعة سنة مؤكدة للرجال)... ولو فاتته ندب طلبها في مسجد آخر إلا المسجد الحرام ونحوه... إلا إذا واظب تكاسلا فلا يعذر ويعزر ولو بأخذ المال يعني بحبسه عنه مدة ولا تقبل شهادته إلا بتأويل بدعة الإمام أو عدم مراعاته. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله ولو فاتته ندب طلبها) فلا يجب عليه الطلب في المساجد بلا خلاف بين أصحابنا، بل إن أتى مسجدا للجماعة آخر فحسن، وإن صلى في مسجد حيه منفردا فحسن. وذكر القدوري: يجمع بأهله ويصلي بهم، يعني وينال ثواب الجماعة كذا في الفتح. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۵۵۲-۵۵۶، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ شخص اس کی اقتدا کرے گا) اور اس کے بعد اس کی اقتدا کرنے لگتا ہے؛ چناں چہ وہ نمازی سمجھ جاتا ہے اور تکبیر وغیرہ جہراً شروع کر دیتا ہے، اس طرح نماز مکمل کرتا ہے۔

بعض دفعہ میرے ساتھ بھی ایسا واقعہ پیش آیا ہے کہ میں اکیلا نماز پڑھ رہا ہوتا ہوں اور کوئی شافعی آجاتا ہے اور میری اقتدا میں کھڑا ہو جاتا ہے، اس صورت میں میں کیا کروں؟ جہراً قراءت کروں یا نہیں؟ امامت کی نیت ضروری ہے یا نہیں؟ اگر امامت کی نیت کی، تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟ اور بعض اوقات میں سنت پڑھ رہا ہوتا ہوں، تب بھی ایسا ہوتا ہے، اس وقت میں کیا کروں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کوئی شخص تنہا نماز پڑھ رہا ہو، تو اس کی اقتداء کرنا جائز ہے۔ اگر جہری نماز ہو اور کچھ قراءت کے بعد کسی نے آکر اس کی اقتدا کر لی، تو بقیہ قراءت جہراً کرے گا، اگر سورۂ فاتحہ کی دو، تین آیتیں پڑھی اور دوسرے نے اقتدا کر لی، تو از سرِنو سورۂ فاتحہ پڑھے، اگر اکثر سورۂ فاتحہ پڑھ چکا ہے، تو بقیہ کو جہراً پڑھ لے، پوری سورت نہ دہرائے۔ اگر سری نماز ہے، تو جہراً قراءت کی ضرورت نہیں۔ (۱)

---

(۱) ولو ائتم به بعد الفاتحة أو بعضها سرا أعادها جهرا، بحر. لكن في آخر شرح المنية: ائتم به بعد الفاتحة، يجهر بالسورة إن قصد الإمامة، وإلا فلا يلزمه الجهر. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله أعادها جهرا) لأن الجهر فيما بقي صار واجبا بالاقتداء والجمع بين الجهر والمخافتة في ركعة واحدة شنيع، بحر. ومفاده أنه لو ائتم بعد قراءة بعض السورة أنه يعيد الفاتحة والسورة، فليراجع ح (قوله لكن إلخ) استدراك على قوله ولو ائتم به، وهذا قول آخر. وقد حكى القولين القهستاني حيث قال: إن الإمام لو خافت بعض الفاتحة أو كلها أو المنفرد ثم اقتدى به رجل أعادها جهرا كما في الخلاصة، وقيل لم يعد وجهر فيما بقي من بعض الفاتحة أو السورة كلها أو بعضها كما في المنية اهـ وعزا في القنية القول الثاني إلى القاضي عبد الجبار وفتاوى السعدي، ولعل وجهه أن فيه التحرز عن تكرار الفاتحة في ركعة وتأخير الواجب عن محله، وهو موجب لسجود السهو فكان مكروها، وهو أسهل من لزوم الجمع بين الجهر والإسرار في ركعة. على أن كون ذلك الجمع شنيعا غير مطرد لما ذكره في آخر شرح المنية أن الإمام لو سها فخافت في الجهرية ثم تذكر يجهر بالسورة ولا يعيد، ولو خافت بآية أو أكثر يتمها جهرا ولا يعيد. وفي القهستاني: ولا خلاف أنه إذا جهر بأكثر الفاتحة يتمها مخافتة كما في الزاهدي اهـ أي في الصلاة السرية، وكون القول الأول نقله في الخلاصة عن الأصل كما في البحر... (قوله إن قصد الإمامة إلخ) عزاه في القنية إلى فتاوى الكرماني. ووجهه أن الإمام منفرد في حق نفسه، ولذا لا يحنث في لا يؤم أحدا ما لم ينو الإمامة، ولا يحصل ثواب الجماعة إلا بالنية. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۳۲-۵۳۳، كتاب الصلاة، فصل في القراءة، ط: دار الفكر - بيروت)

اگر کوئی سنت یا نفل پڑھ رہا ہو، اور کسی نے فرض نماز اس کے پیچھے شروع کردی، تو حنفی مقتدی کی نماز درست نہ ہوگی؛ کیوں کہ حنفیہ کے یہاں فرض نماز متنفل (نفل پڑھنے والے) کے پیچھے درست نہیں ہوتی۔[۲] اگر شافعی مقتدی ہے، تو اس کی نماز درست ہوجائے گی؛ لیکن اگر مقتدی نے جہری نماز میں اقتدا کی ہو، تو امام کو جہراً قراءت کرنا ہوگی، تاکہ مقتدی کی نماز درست ہوجائے، اب اگر رات کی نوافل ہیں، تو حنفی منفرد کے لیے جہراً قراءت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر دن کی نوافل ہیں، تو حنفی کے لیے جہراً قراءت کرنا مکروہ ہے؛ لیکن مقتدی کی رعایت میں جہراً قراءت کرلے گا، تو نماز درست ہوجائے گی۔ (رد المحتار: ۱/ ۵۴۲)[۳]

اسی طرح حنفی مقتدی ہو تو (فرض میں) نماز کا متحد ہونا بھی ضروری ہے، مقتدی ظہر کی نیت سے امام عصر کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتا، اگر مقتدی شافعی ہو، تو نماز درست ہوجائے گی، اگرچہ فرض جدا ہوں۔ (رد المحتار)[۴]

---

(۲) (قوله و مفترض بمتنفل و بمفترض آخر) أي و فسد اقتداء المفترض بإمام متنفل أو بإمام يصلي فرضا غير فرض المقتدي؛ لأن الاقتداء بناء، و وصف الفرضية معدوم في حق الإمام في الأولى وهو مشاركة و موافقة فلا بد من الاتحاد و هو معدوم في الثانية . . . و الحاصل أن اتحاد الصلاتين شرط لصحة الاقتداء و ذلك بأن يمكنه الدخول في صلاته بنية صلاة الإمام فتكون صلاة الإمام متضمنة لصلاة المقتدي وهو المراد بقوله - عليه الصلاة و السلام -: الإمام ضامن، أي تتضمن صلاته صلاة المقتدي. (البحر الرائق: ۱/ ۶۳۱، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتاب - ديوبند ☆ الهداية: ۱/ ۱۲۴-۱۲۷، باب الإمامة، كتاب الصلاة، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۳) فالحاصل أن الإخفاء في صلاة المخافتة واجب على المصلي إماما كان أو منفردا وهي صلاة الظهر و العصر و الركعة الثالثة من المغرب و الأخريان من صلاة العشاء و صلاة الكسوف و الاستسقاء، وهو واجب على الإمام اتفاقا و على منفرد على الأصح، و أما الجهر في الصلاة الجهرية فواجب على الإمام فقط، وهو أفضل في حق المنفرد وهي صلاة الصبح و الركعتان الأوليان من المغرب و العشاء و صلاة العيدين و التراويح و الوتر في رمضان. (البحر الرائق: ۱/ ۳۱۹، كتاب الصلاة، سنن الصلاة، الجهر و الإسرار في الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(و يخير المنفرد في الجهر) وهو أفضل و يكتفي بأدناه (إن أدى) و في السرية يخافت حتما على المذهب كمتنفل بالليل منفردا، فلو أم جهر لتبعية النفل للفرض زيلعي. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله فلو أم) أي فلو صلى المتنفل بالليل إماما جهر، و مقتضاه أن الوتر في غير رمضان كذلك، لأن كلا منهما تكره فيه الجماعة على سبيل التداعي، و بدونه لا. و إذا وجب الجهر في النفل يجب في الوتر كما أفهمته عبارة الزيلعي أفاده الرحمتي. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۳۳، فصل في القراءة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) (و) لا (مفترض بمتنفل و بمفترض فرضا آخر) لأن اتحاد الصلاتين شرط عندنا. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله و بمفترض فرضا آخر) سواء تغاير الفرضان اسما أو صفة كمصلي ظهر أمس بمصلي ظهر اليوم؛ بخلاف ما إذا فاتتهم صلاة واحدة من يوم واحد فإنه يجوز؛ و كذا لو صلى ركعتين من العصر فغربت الشمس =

اگر مقتدی شافعی ہو، تو مقتدی کی نماز صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ امام نے امامت کی نیت کی ہو، خواہ پہلے سے، خواہ مقتدی کے شریک ہوتے وقت، اگر امام نے نیت نہیں کی تو شافعی مقتدی کی نماز درست نہ ہوگی۔[۵]

حنفی مقتدی کی نماز درست ہو جاتی ہے، حنفیہ کے یہاں امام کے لیے نیتِ امامت شرط نہیں ہے۔ (رد المحتار: ۱/ ۵۷۴)[۶] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

= فاقتدى به آخر في الأخريين لأن الصلاة واحدة وإن كان هذا قضاء للمقتدي، جوهرة. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۷۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب الواجب كفاية هل يسقط بفعل الصبي وحده؟ ط: دار الفكر)

(۵) فقہ شافعی میں بھی یہی مسئلہ ہے کہ امامت کی صحت کے لیے نیت ضروری نہیں ہے، مسنون ہے، نیت کی وجہ سے جماعت کا ثواب ملے گا، اگر نیت نہ کرے، تو مقتدی کی نماز ہو جائے گی۔ ذیل کی عبارت دیکھیں:

إذا كان إماما. . . فيسن له: أن ينوي الإمامة، فإن لم ينو ذلك. . لم تحصل له فضيلة الجماعة، هكذا ذكره الجويني. وتجوز نية الإمامة بعد التكبيرة. وإن كان مأموما. . قال الجويني، والمسعودي [في "الإبانة" ق\61\ب]: فعليه أن ينوي الاقتداء، فإن لم ينو ذلك، وتابع الإمام. . بطلت صلاته. (البيان في مذهب الإمام الشافعي - أبو الحسين يحيى بن أبي الخير بن سالم العمراني اليمني الشافعي (م: ۵۵۸ھ): ۲/ ۱۲۳، باب صفة الصلاة، مسألة النية في الصلاة، فرع نية الإمام والمأموم، ت: قاسم محمد النوري، ط: دار المنهاج - جدة)

ينبغي للإمام أن ينوي الإمامة فإن لم ينوها صحت صلاته وصلاة المأمومين وفي وجه غريب حكاه الرافعي عن حكاية أبي الحسن العبادي عن أبي حفص البابشامي والقفال أنهما قالا يجب على الإمام نية الإمامة وأشعر كلام العبادي بأنهما يشترطانها في صحة الاقتداء، والصواب أن نية الإمامة لا تجب، ولا تشترط لصحة الاقتداء، وبه قطع جماهير أصحابنا، وسواء اقتدى به رجال أم نساء لكن يحصل فضيلة الجماعة للمأمومين، وفي حصولها للإمام ثلاثة أوجه. . . الخ. (المجموع شرح المهذب - أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ۶۷۶ھ): ۴/ ۲۰۲ - ۲۰۳، باب صلاة الجماعة، ط: دار الفكر)

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک احناف ہی کی طرح امامت کے لیے نیت شرط نہیں ہے، البتہ ایک ضعیف روایت - جو ابو حفص بابشامی اور قفال سے منقول ہے - سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نیت شرط ہے۔

خیال ہوتا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اسی کے پیش نظر یہ لکھا ہے کہ شافعی حضرات کے یہاں نیت امامت شرط ہے، اس لیے اگر امام نے نیت نہ کی ہو اور مقتدی نے اقتدا کر لی تو نماز صحیح نہیں ہوگی۔ (مجتبیٰ حسن قاسمی)

(۶) وهل يحتاج إلى نية الإمامة؟ أما نية إمامة الرجال فلا يحتاج إليها ويصح اقتداؤهم به بدون نية إمامتهم. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - الكاساني (م: ۵۸۷ھ): ۱/ ۱۲۸، كتاب الصلاة، فصل شرائط أركان الصلاة، ط: دار الكتب العلمية)

[۱۴] کیمرے میں امام کی تصویر دیکھ کر اقتداء کرنا

۷۶۹-سوال: ہمارے یہاں امریکہ میں ایک مسجد دومنزلہ ہے، جس کی پہلی منزل میں عورتیں اور دوسری منزل میں مرد نماز پڑھتے ہیں۔ اس مسجد میں کیمرا (Closed-Circuit Television=CCTV) نصب کیا گیا ہے، جو دوران صلاۃ امام صاحب کی تصویر پہلے منزلہ کی دیوار پر بتلاتا ہے، ضرورت کے مطابق عورتیں اس میں نماز پڑھتی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس صورت میں کیمرے کی اقتداء کہی جائے گی یا امام کی؟ ایسی صورت میں نماز درست ہوگی یا نہیں؟

اس مسئلے کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں اردو یا عربی زبان میں عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداو مصلیا:

☆☆☆ في الصورة المسئولة، الاقتداء يجوز إن كانت انقلابات الإمام يعلم بصوت الإمام أو المكبر، ولا يبقى اشتباه، و إن كانت انقلابات الإمام غير معلومة إلا من هذه المصورة (كاميرا = تلفزيون الدائرة المقفلة) فالاقتداء لا يجوز؛ لأن هذا عكس و صورة، و اقتداء العكس و الصورة لا يجوز؛ لأنها ليست بإمام عاقل، كما لا تجب سجدة التلاوة على السامع مع صوت الصدى و الطير؛ لأنها ليست بتال، فكذلك في الاقتداء، وإذا كان صوت الإمام يسمع أو انقلاباته ترى، ولا يبقى اشتباه، فيجوز الاقتداء، وإلا لا يجوز، كما لا يجوز الاقتداء بصوت و صورة تنعكس في الفيديو، وليس هذا إمام؛ لأنه اقتداء بغير مصل؛ بل هو اقتداء الغير العاقل، فكذلك في هذه الحالة المسئولة يكره الاقتداء للعكس والصورة وهي غير عاقلة۔

☆☆☆ ترجمہ: اگر امام کے انتقالات کا علم ہوجائے، خواہ امام کی آواز کے ذریعے ہو، یا آلۂ مکبر الصوت یا مکبر کے ذریعے، اور کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہے، تو اقتدا کرنا جائز ہے، اور اگر امام کے انتقالات کا علم صرف مصورہ (کیمرا=کلوز ڈ ٹی وی سرکٹ (CCTV) کے ذریعے ہو، تو اقتدا جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ یہ (اسکرین پر ابھرنے والی شکل) عکس اور صورت ہے، جس کی اقتدا کرنا جائز نہیں ہے، اس وجہ سے کہ امام عاقل نہیں ہے، جیسا کہ سجدہ تلاوت، صدائے بازگشت اور پرندہ کی آواز سننے سے واجب نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ (صدائے بازگشت اور پرندے کی آواز) تلاوت کرنے والا نہیں ہے، (حالاں کہ سجدہ تلاوت اس وقت واجب ہوتا ہے، جب کہ تلاوت کرنے والے سے سننا متحقق ہو) اسی طرح اقتدا میں ہے، کہ جب امام کی آواز سنائی دے یا اس کے انتقالات کا علم ہوجائے، اور کوئی اشتباہ باقی نہ رہے، تو اقتدا کرنا جائز ہوجائے گا، ورنہ جائز نہیں ہوگا، جیسا کہ ایسی آواز اور صورت، جس کا عکس ویڈیو میں منعکس ہو، اس کی اقتدا جائز نہیں ہے، کہ یہ امام نہیں ہے، اس لیے کہ یہ غیر مصلی کی اقتدا ہے؛ بل کہ غیر عاقل کی اقتدا ہے۔

وفي الصورة الأولى وإن كان الاقتداء يجوز؛ لأنه اقتداء لصوت الإمام، ولكن الصورة أمام المصلي تفسد صلوته، وهذه صورة؛ لأن المصورة (الكاميرا) تصور، ثم تنعكس على زجاج تي وى (على شاشة التلفزيون) فهي مفسدة للصلاة؛ لأن الصورة في مكان الصلاة سوى تحت قدم المصلي توجب الكراهة التحريمية، وأشد الكراهة تكون في كون الصورة أمام المصلي.[1] وفي هذه الحالة وإن لم توجه مواجهة الصورة للمصلي؛ بل تكون جدار ولكنه لا يكون الخالي عن الكراهة؛ لان صلاة المسبوقين لا تكون محفوظة من المواجهة، فلذا لا يجوز عمل نصب تي وى (التلفزيون) أمام المصلين مطلقا؛ لان فيه إيقاع الصلاة على خطر الفساد. (رد المحتار)[2] والله أعلم بالصواب.

= لہٰذا (دوسری) صورت مسئولہ میں اقتدا مکروہ (ناجائز) ہے، صورت اور عکس کے اقتدا کے مستلزم ہونے کی وجہ سے (حالاں کہ صورت وعکس کی اقتدا جائز نہیں ہے)

اور پہلی صورت میں اگرچہ اقتدا جائز ہے؛ اس لیے کہ امام کے آواز کی اقتدا کرنا ہے؛ لیکن نمازی کے سامنے تصویر ہے۔ اور تصویر، نماز کو فاسد کرنے والی ہے، اس لیے کہ کیمرہ پہلے فوٹو کھینچتا ہے، پھر اس کا عکس ٹی وی کی اسکرین پر منعکس ہوتا ہے، اور یہ صورت مفسد صلاۃ ہے، اس لیے کہ اس صورت میں نمازی کے سامنے تصویر ہے، نہ کہ اس کے پاؤں کے نیچے، جو کراہت تحریمی کو ثابت کرتی ہے، اور حد درجہ مکروہ تحریمی وہ شکل ہے، جب کہ تصویر نمازی کے سامنے ہو۔ صورت مسئولہ میں تصویر گرچہ مصلی کی مواجہت میں نہیں ہوتی، بل کہ دیوار پر ہوتی ہے، لیکن یہ بھی کراہت سے خالی نہیں ہے؛ اس لیے کی مسبوقین کی نماز مواجہت سے محفوظ نہیں رہتی۔

لہٰذا امام کے انتقالات سے واقف ہونے کے لیے ٹی وی (CCTV) نصب کرنا مطلقاً حرام اور ناجائز ہے، اس لیے کہ اس سے نماز فاسد ہونے کا اندیشہ ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) ويكره أن يصلي وبين يديه أو فوق رأسه أو على يمينه أو على يساره أو في ثوبه تصاوير . . . وأشدها كراهة أن تكون أمام المصلي، ثم فوق رأسه، ثم يمينه، ثم يساره، ثم خلفه. هكذا في الكافي. وفي التهذيب ولو كانت على وسادة منصوبة بين يديه يكره ولو كانت ملقاة على الأرض لا يكره. كذا في التتارخانية ولا يكره تمثال غير ذي الروح كذا في النهاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۷، كتاب الصلاة، الباب السابع فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها، الفصل الثاني فيما يكره في الصلاة وما لا يكره، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۴۸، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة وما يكره فيها، فرع لا بأس بتكليم المصلي وإجابته برأسه، ط: دار الفكر)

(۲) ولو قام على سطح المسجد واقتدى بإمام في المسجد إن كان للسطح باب في المسجد ولا يشتبه عليه حال الإمام يصح الاقتداء وإن اشتبه عليه حال الإمام لا يصح. كذا في فتاوى قاضي خان وإن لم يكن له باب في المسجد لكن لا يشتبه عليه حال الإمام صح الاقتداء أيضا وكذا لو قام في المئذنة مقتديا بإمام المسجد. كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۸، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الرابع في بيان ما يمنع صحة الاقتداء وما لا يمنع، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۳۴، كتاب الصلاة، باب الإمامة، زكريا - ديوبند)

[۱۳] قریب میں مسجد ہونے کے باوجود چند افراد کا اپنی قیام گاہ پر باجماعت نماز پڑھنا

۷۷۰-سوال: (۱) ایک شخص کے گھر کے قریب مسجد ہے، تو کیا اس کے لیے اس بات کی گنجائش ہے کہ چند افراد کے ساتھ بغیر کسی عذر کے، محض اپنی سہولت کے لیے، اپنی قیام گاہ پر، ایک امام کو متعین کر کے، مستقل پنج گانہ باجماعت نماز ادا کر لے، کیا اس صورت میں ان کی نماز صحیح ہو جاتی ہے؟

(۲) اگر مذکورہ صورت میں نماز درست نہیں ہوتی؟ تو کیا ان کو اس عمل سے روکنا مناسب ہوگا؟

(۳) اگر کوئی شخص اس جماعت میں اس وجہ سے شریک ہوتا ہے کہ اس کے بچے بھی اس کی نگرانی میں نماز پڑھتے ہیں، تو اس نیت سے شریک ہونا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصليا:

صورت مسئولہ میں جماعت کی فضیلت حاصل تو ہو جائے گی، اور ترک جماعت کی وعید سے بھی بری ہو جائے گا؛ لیکن مسجد میں نماز ادا کرنے کی فضیلت سے محروم رہے گا، اور بلا وجہ مسجد کو ترک کرنے کی قباحت لازم آئے گی، مسجد کا حق ہے خصوصا محلے کی مسجد کا کہ اس کو آباد کیا جائے؛ اس لیے اس طرح اگر جماعت کرنے کی عادت ہو اور اس پر دوام ہو، تو کراہت سے خالی نہیں ہے، مسجد کی جماعت کے کثیر منافع سے محرومی ہوتی ہے، مثلاً باہمی مشورہ، مسلمین کے احوال سے واقفیت، عبادت اور اجتماعی امور کو انجام دینے میں نظم باہمی، ہم دردی واتحاد کا مظاہرہ -جس سے اسلام اور مسلمانوں کی شوکت ظاہر ہوتی ہے- ان سب منافع سے محرومی ہے، نیز اپنی قیام گاہ پر جماعت کرنے سے باہمی تفریق کا مظاہرہ ہے، جو موجودہ احوال میں شدید مضر ہے۔ ہاں اگر کوئی فتنہ اور عقائد کے جھگڑوں سے بچنے کے لیے یا مسجد میں عقائد حق اور اصلاحی کام میں رکاوٹ دور کرنے کی خاطر ایسا کیا جائے، تو جائز ہے (شامی)[1]

---

(۱) وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ. (۸-الأنفال:۴۶)
أفضل المساجد مكة، ثم المدينة، ثم القدس، ثم قبا، ثم الأقدم، ثم الأعظم، ثم الأقرب، ومسجد أستاذه لدرسه أو لسماع الأخبار أفضل اتفاقا، ومسجد حيه أفضل من الجامع. والصحيح أن ما ألحق بمسجد المدينة ملحق به في الفضيلة. (الدر المختار: ۱/ ۶۵۸) ـــــــــ قال ابن عابدين: (قوله ومسجد حيه أفضل من الجامع) أي الذي جماعته أكثر من مسجد الحي، وهذا أحد قولين حكاهما في القنية، والثاني العكس، وما هنا جزم به في شرح المنية كما مر، وكذا في المصفى والخانية؛ بل في الخانية: لو لم يكن لمسجد منزله مؤذن فإنه يذهب إليه ويؤذن فيه ويصلي ولو كان وحده لأن له حقا عليه فيؤديه. (رد المحتار: ۱/ ۶۵۹، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فروع أفضل المساجد، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) اگر کسی شرعی وجہ کے بغیر ایسا کرتے ہوں، تو ضرور روکنا چاہیے؛ لیکن حکمت سے روکے، لڑائی جھگڑا نہ کرے۔[۲]

(۳) بچوں کو بھی تاکید کرنی چاہیے کہ وہ مسجد جاکر نماز ادا کریں، اور عورتیں اپنے گھر پر بلا جماعت نماز ادا کریں؛ بچوں کی نگرانی کی مصلحت' قابل اعتبار نہیں ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] مسجد دور ہونے کی وجہ سے اپنے مکان پر باجماعت فرض نماز ادا کرنا

۱۷۷-سوال: ایک شخص اپنے گھر جماعت سے نماز پڑھتا ہے، گاؤں میں دو مسجدیں ہیں، مگر دونوں مسجدیں گھر سے دور ہیں، یعنی اتنی دور ہیں کہ اذان ہونے کے ساتھ وہ آدمی اپنے مکان سے نکلے، تو جماعت کھڑی ہوتے وقت مسجد میں پہونچ جائے، اس کے باوجود یہ لوگ گھر پر نماز پڑھتے ہیں اور مجھ سے امامت کی درخواست کرتے ہیں، تو کیا صورت مسئولہ میں نماز ادا ہوجائے گی؟ اور ان کی امامت کرنا کیسا ہے؟ واضح رہے کہ بارش اور ٹھنڈی کے دنوں میں گاؤں کی مسجد جانے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔

الجواب حامداو مصليا:

مسجد میں جاکر جماعت سے نماز ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے؛ بل کہ بعض فقہاء کے قول کے مطابق واجب ہے؛ لہٰذا مسجد میں جاکر نماز ادا کرنا چاہیے، چاہے مسجد دور ہو، گھر میں باجماعت نماز ادا کرلینے سے نماز تو درست ہوجائے گی، مگر ایسی عادت بنالینا مکروہ ہے، مسجد دور ہونے کی صورت میں بارش کے دنوں میں گھر پر نماز ادا کرلی، تو جائز ہے، بارش نہ ہورہی ہو، تو مسجد جانا چاہیے، سردی اتنی زیادہ ہو کہ باہر نکلنے میں تکلیف ہو رہی ہو، دوسرے کام کاج کے لیے بھی باہر نہ نکلتا ہو، تو ایسی سردی کے وقت گھر میں ادا کرلینے کی اجازت ہے، ایسا بوڑھا یا بیمار آدمی، جو پیدل مسجد نہ جاسکتا ہو، یا جانے میں زیادہ تکلیف ہوتی ہو، تو وہ بھی گھر میں ادا کرسکتا ہے، البتہ تندرست آدمی کا مسجد سے اتنا دور ہونا کہ اذان کے بعد پیدل چل کر جماعت کے وقت پر پہنچ

---

(۲) ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١٢٥﴾ (۱۶-النحل: ۱۲۵)

(۳) عن عبد الملك بن الربيع بن سبرة، عن أبيه، عن جده، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: مروا الصبي بالصلاة إذا بلغ سبع سنين، وإذا بلغ عشر سنين فاضربوه عليها. (سنن أبي داود: ۱/۷۰، رقم الحديث: ۴۹۴، كتاب الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، ط: البدر - ديوبند)

جائے، عذر نہیں ہے؛ لہٰذا ان کی امامت کرنے کے لیے مسجد کی جماعت چھوڑنا مکروہ ہے۔ (درمختار: ۱/ ۵۵۵)[۱]
فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] جس امام سے نمازی ناراض ہوں، ان کے پیچھے نماز پڑھنا

۲۷۷-سوال: مصلیان مسجد اگر کسی امام سے ناراض ہوں، تو ان کے پیچھے نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

اگر امام کے فاسد العقیدہ ہونے کی وجہ سے یا معاصی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یا نماز کے بارے میں مصلیوں کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے مصلیان مسجد ناراض ہوں، تو ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ امامت نہ کرائے، ورنہ گنہ گار ہوگا؛ کیوں کہ حدیث شریف میں ممانعت آئی ہے۔

لیکن ان کے پیچھے نماز ہو جائے گی، اگر ناراضگی کسی دینی تقاضے سے نہیں ہے؛ بل کہ صرف ذاتی کشیدگی یا عداوت وعصبیت کی بناء پر ہے، یا خود نمازی فاسد العقیدہ ہے، اور امام حق پر ہے، تو ایسی صورت میں مصلیان کی ناراضگی خود ان کے لیے گناہ کا باعث ہے، ایسی صورت میں امام کو اپنی امامت نہ چھوڑنا چاہیے۔ (ترمذی شریف)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱)(والجماعة سنة مؤكدة للرجال)... (وقيل واجبة وعليه العامة) أي عامة مشايخنا وبه جزم في التحفة وغيرها. قال في البحر: وهو الراجح عند أهل المذهب (فتسن أو تجب) ثمرته تظهر في الإثم بتركها مرة (على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلاة بالجماعة من غير حرج)... (فلا تجب على مريض ومقعد وزمن ومقطوع يد ورجل من خلاف) أو رجل فقط، ذكره الحدادي (ومفلوج وشيخ كبير عاجز وأعمى) وإن وجد قائدا (ولا على من حال بينه وبينها مطر وطين وبرد شديد وظلمة كذلك) وريح ليلا لا نهارا، وخوف على ماله، أو من غريم أو ظالم، أو مدافعة أحد الأخبثين، وإرادة سفر، وقيامه بمريض، وحضور طعام (تتوقه) نفسه ذكره الحدادي، وكذا اشتغاله بالفقه لا بغيره، كذا جزم به الباقاني تبعا للبهنسي: أي إلا إذا واظب تكاسلا فلا يعذر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۵۲-۵۵۶، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۲- ۸۳، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، ط: دار الفكر☆الهداية: ۱/ ۱۲۱، باب الإمامة، ط: ياسر نديم-ديوبند)

(۲) عن أبي أمامة، يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "ثلاثة لا تجاوز صلاتهم آذانهم: العبد الآبق حتى يرجع، وامرأة باتت وزوجها عليها ساخط، وإمام قوم وهم له كارهون". (سنن الترمذي: ۱/ ۸۳، رقم الحديث: ۳۶۰، أبواب الصلاة، باب ما جاء فيمن أم قوما وهم له كارهون، ط: البدر - ديوبند☆سنن أبي داؤد: ۱/ ۸۸، رقم الحديث: ۵۹۳، كتاب الصلاة، باب الرجل يؤم القوم وهم له كارهون، ط: البدر - ديوبند) =

[۱۶] نجی عداوت کی وجہ سے امام صاحب کے پیچھے نماز نہ پڑھنا

۴۷۷۳-سوال: مسجد کے امام صاحب کے ساتھ نجی عداوت کو بنیاد بنا کر اُن کے پیچھے نماز نہ پڑھنا اور جماعت ترک کردینا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

امام صاحب سے نجی عداوت کی بناء اُن کے پیچھے نماز نہ پڑھنا درست نہیں ہے، ہاں اگر امام کی کوئی دینی کمزوری ہو، جس کی وجہ سے دوسری مسجد میں باجماعت نماز پڑھ لے، تو گنجائش ہے، کسی بھی سبب سے ترکِ جماعت کی عادت بنالینا مکروہ ہے، نماز باجماعت ادا کرنا سنتِ مؤکدہ قریب بہ واجب ہے، بہت سے محققین فقہاء نے اُس کو واجب کہا ہے، لہٰذا دنیوی عداوت کی وجہ سے امام کے پیچھے نماز چھوڑ دینا گناہ کا کام ہے، اگر امام فاسق بھی ہو، تو اس بات کی گنجائش ہے کہ دوسری کسی مسجد میں باجماعت نماز پڑھ لے لیکن ترک جماعت کی عادت بنا کر تنہا نماز پڑھنا گناہ ہے۔ (شامی)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

=(ولو أم قوما وهم له كارهون، إن) الكراهة (لفساد فيه أو لأنهم أحق بالإمامة منه كره) له ذلك تحريما، لحديث أبي داود: لا يقبل الله صلاة من تقدم قوما وهم له كارهون، (وإن هو أحق لا) والكراهة عليهم. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

(۱) (والجماعة سنة مؤكدة للرجال)... (وقيل واجبة وعليه العامة) أي عامة مشايخنا وبه جزم في التحفة وغيرها. قال في البحر: وهو الراجح عند أهل المذهب (فتسن أو تجب) ثمرته تظهر في الإثم بتركها مرة (على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلاة بالجماعة من غير حرج)... إلا إذا واظب تكاسلا فلا يعذر، ويعزر ولو بأخذ المال يعني بحبسه عنه مدة ولا تقبل شهادته إلا بتأويل بدعة الإمام أو عدم مراعاته. (الدر المختار: ۱/ ۵۵۲-۵۵۶)

قال ابن عابدين: (قوله قال في البحر إلخ) وقال في النهر: هو أعدل الأقوال وأقواها ولذا قال في الأجناس: لا تقبل شهادته إذا تركها استخفافا ومجانة، إما سهوا، أو بتأويل، ككون الإمام من أهل الأهواء أو لا يراعي مذهب المقتدي فتقبل. اهـ... (قوله بتركها مرة) أي بلا عذر، وهذا عند العراقيين، وعند الخراسانيين إنما يأثم إذا اعتاده كما في القنية. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۴، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۸۴، صلاة الجماعة، ط: زكريا - ديوبند)

[۱۷] جس امام سے مقتدی ناراض ہوں، ان کی امامت کا حکم
[۱۸] امام سے ناراض ہوکر اگر کوئی جماعت ترک کردے؟

۴۷۷-سوال: مصلی کے ناراض ہونے کی صورت میں امامت کرنا کیسا ہے؟ مصلی کے ساتھ کچھ اختلاف ہوا، جس کے نتیجے میں وہ امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا؛ بل کہ اپنے گھر نماز پڑھ لیتا ہے، تو اس حالت میں امام امامت کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

سوال میں امام کے ساتھ اختلاف کی وجہ مذکور نہیں ہے۔ اگر امام صاحب حق پر ہوں اور سنت کے مطابق رہن سہن اختیار کیے ہوئے ہوں، مسجد اور مدرسے کی ذمہ داری پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہوں، تو اس صورت میں مذکورہ آدمی غلطی پر ہے اور امام کی امامت جائز ہے۔

مذکورہ آدمی کے لیے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ضروری ہے اور جماعت کی نماز سنت مؤکدہ قریب بہ واجب ہے، اور سنت مؤکدہ کو ہمیشہ چھوڑنے کی عادت بنالینا جائز نہیں؛ اس لیے جماعت کے چھوڑنے کی بناء پر مقتدی گنہ گار ہوگا۔ (عالمگیری، شامی)[۱]

اور اگر امام کی غلطی ہو، تو ان کو اصلاح کی فکر کرنی چاہیے؛ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ اگر کسی امام سے اس کی قوم (دینی کام کی بناء پر) ناراض ہو، تو ایسے امام کی نماز اس کے سر سے ایک بالشت بھی اوپر نہیں جائے گی۔ (حدیث)[۲] یعنی ایسے امام کی پڑھائی ہوئی نماز اللہ کے دربار میں قبولیت کا درجہ

---

[۱] رجل أم قوما وهم له كارهون إن كانت الكراهة لفساد فيه أو لأنهم أحق بالإمامة يكره له ذلك وإن كان هو أحق بالإمامة لا يكره. هكذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۶-۸۷، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماما لغيره، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، عنوان: ''نجی عداوت کی وجہ سے امام صاحب کے پیچھے نماز نہ پڑھنا'' کا حاشیہ نمبر ا۔

[۲] سنن الترمذي: ۱/ ۸۳، رقم الحديث: ۳۶۰، أبواب الصلاة، باب ما جاء فيمن أم قوما وهم له كارهون، ط: البدر - ديوبند ☆ سنن أبي داؤد: ۱/ ۸۸، رقم الحديث: ۵۹۳، كتاب الصلاة، باب الرجل يؤم القوم وهم له كارهون، ط: البدر - ديوبند.

حاصل نہیں کر پاتی ہے؛لیکن مصلیوں کے لیے ایسی حالت میں بھی جماعت ترک کرنا جائز نہیں ۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ہر نیک وبد کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو۔ (حدیث) [۱]

اس لیے اگر امام میں کوئی دینی نقص ہو، تب بھی مصلی کے لیے امام کے پیچھے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ضروری ہے، مصلی کو جماعت کا ثواب مل جائے گا، امام اور ذمہ دار حضرات گنہ گار ہوں گے ۔ الغرض مذکورہ آدمی کا جماعت چھوڑنا درست نہیں ، جماعت سے نماز پڑھنا ضروری ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] نماز باجماعت ہوجانے کے گمان سے گھر پر نماز پڑھ لینا

۷۷۵-سوال: فجر،ظہر،عصر،مغرب یا عشاء کی نماز کے لیے مسجد جانے میں تاخیر ہوگئی اور یہ گمان ہوا کہ مسجد میں نماز باجماعت ادا ہو چکی ہوگی ،تو ایسی صورت میں مسجد میں جانے کے بجائے گھر پر ہی نماز پڑھ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

اگر مسجد میں نماز باجماعت ہوچکی ہو،تو چھوٹی ہوئی نماز گھر پر پڑھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [۲] واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱)سنن الدارقطني- أبو الحسن علي بن عمر، البغدادي الدارقطني (م:۳۸۵هـ):۲/ ۴۰۴، رقم الحديث: ۱۷۶۸، كتاب العيدين، باب صفة من تجوز الصلاة معه والصلاة عليه، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت.

(۲)عن عبد الله بن عمر: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: صلاة الجماعة تفضل صلاة الفذ بسبع وعشرين درجة. (صحيح البخاري:۱/ ۸۹، رقم الحديث: ۶۴۵، كتاب الأذان، باب فضل صلاة الجماعة، ط: ديوبند)

عن أبي سعيد الخدري، أنه سمع النبي صلى الله عليه وسلم يقول: صلاة الجماعة تفضل صلاة الفذ بخمس وعشرين درجة. (حوالہ سابق، رقم الحديث: ۶۴۶☆الصحيح لمسلم:۱/ ۲۳۱، رقم الحديث: ۲۴۹-(۶۵۰)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب فضل صلاة الجماعة، وبيان التشديد في التخلف عنها، ط: البدر-ديوبند)

البتہ بہتر یہ ہے کہ اہل خانہ کے ساتھ گھر میں نماز باجماعت پڑھے:

عن عبد الرحمن بن أبي بكرة، عن أبيه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أقبل من بعض نواحي المدينة يريد الصلاة، فوجد الناس قد صلوا، فذهب إلى منزله، فجمع أهله، ثم صلى بهم. (المعجم الأوسط-أبو القاسم الطبراني (م:۳۶۰هـ):۷/ ۵۰، رقم الحديث: ۶۸۲۰، باب الميم، من اسمه أحمد، ت: طارق بن عوض الله بن محمد، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين-القاهرة) =

[۲۰] غلطی کی وجہ سے امام نماز کا اعادہ کرے، تو مسبوق اور نو وارد کیا کرے؟

۷۷۶-سوال: امام صاحب نے ظہر کی تیسری رکعات میں بیٹھ کر سلام پھیر دیا، نماز پوری ہونے کے بعد مقتدی حضرات بولے کہ تین رکعت ہوئی ہے، تو امام صاحب نے دوبارہ نماز پڑھائی، تو اب مسبوق کیا کرے گا؟ کیا وہ دوسری جماعت میں شامل ہو سکتا ہے؟ نیز نو وارد اس جماعت میں شامل ہو سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں مسبوق، امام صاحب کے ساتھ نماز کا اعادہ کرے؛ کیوں کہ امام کی نماز کا فساد خود اس (مسبوق) کی نماز کے فساد کو مستلزم ہے۔[1] ان کے علاوہ وہ تمام حضرات بھی نماز میں شریک ہو سکتے ہیں، جو پہلے سے نماز میں شامل نہیں تھے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= وروي عن أنس "أن أصحاب رسول الله - صلى الله عليه وسلم - كانوا إذا فاتتهم الجماعة في المسجد صلوا في المسجد فرادى" ولأن التكرار يؤدي إلى تقليل الجماعة؛ لأن الناس إذا علموا أنهم تفوتهم الجماعة يتعجلون فتكثر وإلا تأخروا. اهـ بدائع. وحينئذ فلو دخل جماعة المسجد بعد ما صلى أهله فيه فإنهم يصلون وحدانا، وهو ظاهر الرواية، ظهيرية. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۵، كتاب الصلاة، باب الأذان، فائدة التسليم بعد الأذان، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الإمام ضامن، والمؤذن مؤتمن، اللهم أرشد الأئمة، واغفر للمؤذنين. (سنن الترمذي: ۱/ ۵۱، رقم الحديث: ۲۰۷، أبواب الصلاة، باب ما جاء أن الإمام ضامن، والمؤذن مؤتمن، ط: البدر - ديوبند ☆ سنن أبي داود: ۱/ ۷۷، رقم الحديث: ۵۱۷، كتاب الصلاة، باب ما يجب على المؤذن من تعاهد الوقت، ط: البدر - ديوبند)

قال العيني: (الإمام ضامن)، بمعنى: يضمنها صحة وفسادا. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۵/ ۲۳۹، كتاب مواقيت الصلاة، باب إذا طول الإمام وكان للرجل حاجة فخرج فصلى، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(۲) حضرت مفتی عزیز الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر پہلی دفعہ میں نماز بالکل نہیں ہوئی تھی، مثلاً باطل ہوئی تھی، تو نئے نمازیوں کی نماز بہ وقت اعادہ کرنے نماز کے ادا ہو گئی اور اگر کسی واجب کے ترک ہو جانے سے اعادہ نماز کا واجب تھا، تو نئے نمازیوں کی نماز نہ ہوگی۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۳/ ۴۸، باب الامامۃ والجماعۃ، ط: دار الاشاعت، کراچی)

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ ناکارہ احتیاطاً حضرت مفتی عزیز الرحمان صاحب قدس سرہ کے فتوے کا اتباع کرتا ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۶/ ۴۵۰، باب الجماعۃ، ترک واجب کی بنا پر اعادہ والی نماز میں نو وارد شخص کی شرکت کا مفصل حکم، ط: پاکستان)

[۲۱] بغیر وضوادا کی ہوئی نماز کا اعادہ کرتے وقت نئے مقتدی کا شرکت کرنا

۷۷۷-سوال: امام صاحب نے ظہر کی نماز پڑھادی، پھر یاد آیا کہ ان کا وضوء نہیں تھا، نئے سرے سے وضوء کر کے نماز کا اعادہ کیا، زید نامی شخص دوسری مرتبہ کی نماز میں شرکت کرتا ہے، بکر کا کہنا ہے کہ یہ نماز امام کے فرض نماز کی تکمیل ہے اور زید نے فرض نماز امام کے پیچھے ادا نہیں کی ہے؛ لہٰذا وہ امام کے ساتھ شرکت نہیں کرسکتا، تو کیا بکر کا قول صحیح ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

وضو کے بغیر نماز درست نہیں ہوتی ہے؛ مذکورہ صورت میں جو حضرات نماز میں شریک نہ تھے، ان کا بھی اقتداء کرنا صحیح ہے، جس صورت میں نیا مقتدی [نو وارد] اقتدا نہیں کرسکتا، وہ مسئلہ دوسرا ہے اور وہ یہ ہے کہ وضو کرنے کے بعد کسی ترک واجب کی وجہ سے نماز میں فساد پیدا ہو جائے اور امام سجدہ سہو نہ کرے، تو ایسی صورت میں نماز واجب الاعادہ ہوتی ہے اور اس کی ادائیگی کے وقت نئے مقتدی [نو وارد] کے لیے حکم ہے کہ وہ اقتدا نہ کرے؛ کیوں کہ اس صورت میں فرض کی تکمیل کے لیے نماز پڑھی جارہی ہے، نہ کہ اصل فرض کی ادائیگی کے لیے؛ لہٰذا جو اصل فرض پڑھنا چاہتا ہے، وہ کیوں کر اس صورت میں اقتدا کرسکتا ہے؟[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] واجب الاعادہ نماز میں امام کے ساتھ نو وارد شخص کی شرکت

۷۷۸-سوال: امام کی نماز ترک واجب کی وجہ سے فاسد ہوگئی، اب وہ اس کا اعادہ کررہے ہیں، تو ایسی صورت میں بعد میں آنے والا شخص (نو وارد) امام کی اقتداء کرسکتا ہے یا نہیں؟ واضح ہو کہ وہ پہلی مرتبہ شریک نہیں تھا۔ بینوا تو جروا۔

الجواب حامداومصلیا:

صورت مسئولہ میں جماعت کی نماز کے اعادہ کیے جانے کی صورت میں وہ حضرات امام کی اقتداء نہیں کرسکتے، جو پہلی مرتبہ امام کے ساتھ شریک نہیں تھے؛ اس لیے کہ فرض نماز دوبارہ نہیں پڑھی جاتی؛ ترک

(۱) تقدم تفصیلہ و تخریجہ تحت عنوان: غلطی کی وجہ سے امام نماز کا اعادہ کرے، تو مسبوق اور نو وارد کیا کرے؟۔

واجب کی بناء پر نماز درست نہیں ہوئی؛ اس لیے لوٹائی جا رہی ہے، تو وہ اصل فرض کو مکمل کرنے والی ہے، لہٰذا یہ نماز، مثل نفل کے ہوگی، اور فرض نماز پڑھنے والے کی اقتداء نفل نماز پڑھانے والے کے پیچھے درست نہیں ہے؛ اس لیے ترک واجب کی وجہ سے اعادہ کی صورت میں وہی حضرات اقتداء کریں گے، جو پہلی مرتبہ امام کے ساتھ شریک تھے۔[۱] (کفایت المفتی: جلد ۳/ ۹۶ ☆ فتاوی دار العلوم: ۲/ ۷۱ ۳)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] صحن مسجد میں جماعت ثانیہ

۷۷۹-سوال: مسجد شرعی کی حد کے بعد صحن مسجد ہے، وہ صحن، مسجد میں داخل نہیں ہے؛ لیکن اس کو چھت سے مسقف کر دیا گیا ہے، تو اس جگہ بہ وقت ضرورت جماعت ثانیہ کی جا سکتی ہے؟ واضح رہے کہ یہ جماعت ثانیہ کبھی کبھار چار پانچ مہینے میں کر لی جاتی ہے، وہ بھی باہر سے آنے والے لوگ ایسا کر لیتے ہیں، تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صحن مسجد میں جماعت ثانیہ کبھی کبھار کر سکتے ہیں، صورت مسئولہ میں جیسا کہ لکھا ہے کہ چار پانچ مہینے میں کبھی پڑھ لی جاتی ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، بلا کراہت جائز ہے؛ البتہ روزمرہ کی عادت بنالینا مکروہ ہے کہ اس کی وجہ سے جماعت اولیٰ متاثر ہوگی۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (ولها واجبات) لا تفسد بتركها، وتعاد وجوبا في العمد والسهو، إن لم يسجد له، وإن لم يعدها يكون فاسقا آثما، وكذا كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب إعادتها. والمختار أنه جابر للاول؛ لان الفرض لا يتكرر. (الدر المختار) ـــــــــــــ (قوله والمختار أنه) أي الفعل الثاني جابر للأول بمنزلة الجبر بسجود السهو وبالأول يخرج عن العهدة وإن كان على وجه الكراهة على الأصح، كذا في شرح الأكمل على أصول البزدوي. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۵۷، باب صفة الصلاة، واجبات الصلاة، مطلب كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب إعادتها، ط: دار الفكر)

(۲) دیکھیے: کفایت المفتی: ۳/ ۱۳۵، فصل دوم: جماعت، جماعت اعادہ میں نئے آنے والے کی شرکت درست نہیں، جواب نمبر: ۱۸۸، ط: زکریا-دیوبند ☆ فتاوی دار العلوم دیوبند: ۳/ ۴۸، باب الامامۃ والجماعۃ، ط: دار الاشاعت، کراچی۔

[۳] وروي عن أبي يوسف أنه إنما يكره إذا كانت الجماعة الثانية كثيرة، فأما إذا كانوا ثلاثة، أو أربعة، فقاموا في زاوية من زوايا المسجد وصلوا بجماعة لا يكره. ـــــــــ وروي عن محمد أنه إنما يكره إذا كانت الثانية على سبيل التداعي والاجتماع، فأما إذا لم يكن فلا يكره. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۵۳، كتاب الصلاة، فصل بيان محل وجوب الأذان، ط: دار الكتب العلمية-بيروت) =

[۲۴] جماعت فوت ہونے پر مسجد میں الگ سے جماعت کرنا

۷۸۰-سوال: امام صاحب نماز کے وقت پر حاضر نہیں تھے، جس کی وجہ سے ایک دوسرے شخص نے امامت کی، نماز ختم ہونے کے بعد امام صاحب آئے، تو انہوں نے کچھ دوسرے لوگوں کو لے کر- جن کی جماعت فوت ہوگئی تھی- الگ سے جماعت کی، تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ امام صاحب کا یہ طریقہ صحیح ہے یا غلط؟ واضح رہے کہ وہ نماز کے وقت پر بازار جانے کی وجہ سے وقت پر حاضر نہیں ہو سکے تھے؛ اس لیے دوسرے شخص نے نماز پڑھائی تھی، امید ہے مفصل جواب عنایت فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

دوسری جماعت مسجد میں یا صحن میں مکروہ ہے، البتہ اگر کوئی معقول وجہ ہو، تو کبھی کبھار مسجد کے باہر والے حصے میں جماعت کر لینے کی گنجائش ہے، مگر عادت بنالینا جائز نہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] جماعت ثانیہ کا حکم

۷۸۱-سوال: مسجد میں باجماعت نماز ہو چکی تھی، بعد میں کچھ حضرات آئے، جو دوسری جماعت کر کے نماز ادا کرنا چاہتے ہیں، میری معلومات کے مطابق غالباً شامی وغیرہ میں لکھا ہے کہ جماعت ثانیہ مکروہ ہے؛ لیکن فتاوی رضویہ میں لکھا ہے کہ مصلی کے داہنی یا بائیں طرف ہٹ کر جماعت ثانیہ کی جا سکتی

=وعن أبي يوسف إذا لم تكن على الهيئة الأولى لا تكره وإلا تكره وهو الصحيح، وبالعدول عن المحراب تختلف الهيئة كذا في البزازية. اهـ. وفي التتارخانية عن الولوالجية: وبه نأخذ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۵، باب الأذان، ط: دار الفكر-بيروت)

مزید دیکھیے: المحيط البرهاني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۱/ ۳۵۱، الفصل السادس عشر في التغني والألحان، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆البحر الرائق-ابن نجيم المصري: ۱/ ۶۰۵، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: در الكتب العلمية☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، ط: زكريا- ديوبند☆الفقه الإسلامي وأدلته- د. وهبة الزحيلي (م: ۲۰۱۵ء=۱۴۳۶هـ): ۲/ ۱۶۳-۱۶۴، الفصل العاشر: أنواع الصلاة، تاسعاً. تكرار الجماعة في المسجد، ط: ديوبند.

(۱) تقدم تخريجه عن البدائع، ورد المحتار، والمحيط البرهاني، والبحر الرائق، تحت: صحن مسجد میں جماعت ثانیہ۔

ہے، تو دونوں باتوں میں صحیح کیا ہے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامدا و مصلیا:

شامی میں لکھا ہے کہ اگر کسی کی نماز جماعت کے ساتھ چھوٹ جائے، تو بہتر یہ ہے کہ وہ تنہا نماز پڑھ لے۔ (شامی: ۱/ ۵۱۷)[۱]

البتہ امام ابو یوسفؒ کے مسلک کے مطابق لکھا ہے کہ اگر جماعت ثانیہ، جماعت اولیٰ کی طرح نہ ہو، تو جائز ہے، مکروہ نہیں، محراب سے ہٹ جائے گا، تو ہیئت بدل جائے گی اور ان کے مسلک کے مطابق مکروہ نہیں ہوگی۔ (فتاوی تاتارخانیہ: ۲/ ۵۱۷)[۲]

لیکن یہ بات کبھی کبھار کی ہے، ہمیشہ کے لیے اگر محلے والوں کو ان کی مساجد میں تکرار جماعت کی اجازت دے دی جائے، تو ان کے دلوں سے جماعت اولیٰ کی اہمیت ختم ہو جائے گی، اور جماعت اولیٰ لازماً متاثر ہوگی؛ اس لیے عام حالات میں جماعت ثانیہ کی اجازت نہیں ہے، ہاں کوئی خاص مجبوری ہو، اور ہیئت اولیٰ کے خلاف ہو، کبھی کبھار ہو، یا اسٹیشن کی مسجد ہو، تو اجازت ہے۔[۳] فتاویٰ رضویہ کی بات کو اسی صورت پر محمول کیا جائے اور شامیؒ کی بات کو عام حالت پر، تو اشکال کی کوئی وجہ نہیں ہوگی، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] وروي عن أنس "أن أصحاب رسول الله - صلى الله عليه وسلم - كانوا إذا فاتتهم الجماعة في المسجد صلوا في المسجد فرادى" ولأن التكرار يؤدي إلى تقليل الجماعة؛ لأن الناس إذا علموا أنهم تفوتهم الجماعة يتعجلون فتكثر وإلا تأخروا. اهـ بدائع. وحينئذ فلو دخل جماعة المسجد بعد ما صلى أهله فيه فإنهم يصلون وحدانا، وهو ظاهر الرواية، ظهيرية. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۵، كتاب الصلاة، باب الأذان، فائدة التسليم بعد الأذان، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) وروي في الفصل الأول أنه قال: إنما يكره تكرار الجماعة إذا كان القوم كثيرا، أما إذا صلى واحد بواحد أو باثنين بعد ما صلى فيه أهله، فلا بأس به. (التاتار خانيه: ۲/ ۱۵۵، كتاب الصلاة، رقم المسئلة: ۲۰۱۲، الفصل الثاني، ت: المفتي شبير أحمد القاسمي، ط: زكريا - ديوبند)

وعن أبي يوسف إذا لم تكن على الهيئة الأولى لا تكره وإلا تكره وهو الصحيح، وبالعدول عن المحراب تختلف الهيئة كذا في البزازية. اهـ. وفي التتارخانية عن الولوالجية: وبه نأخذ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۵، كتاب الصلاة، باب الأذان، فائدة التسليم بعد الأذان، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) تقدمه تخريجه عن البدائع، ورد المحتار، والمحيط البرهاني، والبحر الرائق، تحت: صحن مسجد میں جماعت ثانیہ۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: المحيط البرهاني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۱/ ۳۵۱، الفصل السادس عشر في التغني والألحان، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب =

[۲۶] ایک مسجد میں دوسری مرتبہ جماعت

۷۸۲-سوال: جس مسجد میں جماعت ہوگئی ہو، وہاں بعد میں چند لوگ دیر سے آئے اور جماعت خانہ کے باہر کے حصہ میں با جماعت نماز پڑھنا چاہتے ہیں، تو کیا دوسری مرتبہ جماعت کرنا درست ہے؟ بعض کا کہنا ہے کہ مکروہ ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداو مصليا:

جو لوگ مکروہ کہتے ہیں، ان کی بات صحیح ہے، اگر اس کی اجازت دے دی جائے، تو محلے کا ہر مصلی اس طرح الگ سے نماز با جماعت پڑھتا رہے گا اور جماعت کی اہمیت ختم ہوجائے گی۔

ہاں اگر کوئی معقول عذر ہو، تو پہلی جماعت جس جگہ ہوئی ہے، اس سے الگ دوسری جگہ گنجائش ہے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= العلمية- بيروت ☆ البحر الرائق-ابن نجيم المصري:١/ ٦٠٥، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط:در الكتب العلمية ☆ الفتاوى الهندية:١/ ٨٣، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفقه الإسلامي و أدلته-د. وهبة الزحيلي(م:٢٠١٥م=١٤٣٦هـ):٢/ ١٩٣ - ١٩٤، الفصل العاشر:أنواع الصلاة، تاسعاً - تكرار الجماعة في المسجد، ط: ديوبند.

(١) وكره... وتكرار الجماعة إلا في مسجد على طريق فلا بأس بذلك جوهرة. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: وتكرار الجماعة) لما روى عبد الرحمن بن أبي بكر عن أبيه أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - خرج من بيته ليصلح بين الأنصار فرجع وقد صلى في المسجد بجماعة، فدخل رسول الله - صلى الله عليه وسلم - في منزل بعض أهله فجمع أهله فصلى بهم جماعة، ولو لم يكره تكرار الجماعة في المسجد لصلى فيه. وروي عن أنس "أن أصحاب رسول الله - صلى الله عليه وسلم - كانوا إذا فاتتهم الجماعة في المسجد صلوا في المسجد فرادى"؛ ولأن التكرار يؤدي إلى تقليل الجماعة؛ لأن الناس إذا علموا أنهم تفوتهم الجماعة يتعجلون فتكثر وإلا تأخروا. اهـ. بدائع. وحينئذ فلو دخل جماعة المسجد بعد ما صلى أهله فيه فإنهم يصلون وحدانا، وهو ظاهر الرواية ظهيرية. وفي آخر شرح المنية: وعن أبي حنيفة لو كانت الجماعة أكثر من ثلاثة يكره التكرار وإلا فلا. وعن أبي يوسف إذا لم تكن على الهيئة الأولى لا تكره وإلا تكره وهو الصحيح، وبالعدول عن المحراب تختلف الهيئة كذا في البزازية. اهـ. وفي التتارخانية عن الولوالجية: وبه نأخذ وسيأتي في باب الإمامة إن شاء الله تعالى لهذه المسألة زيادة كلام. (قوله: إلا في مسجد على طريق) هو ما ليس له إمام ومؤذن راتب فلا يكره التكرار فيه بأذان وإقامة، بل هو الأفضل خانية. (رد المحتار على الدر المختار:١/ ٣٩٥، كتاب الصلاة، باب الأذان، قبل: مطلب في كراهة تكرار الجماعة في المسجد، ط: دار الفكر - ديوبند)

[۲۷] افطار کے بعد تاخیر سے آنے پر مغرب کی جماعت ثانیہ کا حکم

۷۸۳-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ: مغرب کی نماز کے وقت پانچ سات آدمی کھانے (افطار) کی دعوت میں مصروف تھے، کھانے سے فراغت کے بعد مسجد میں آئے، اور صحن میں جماعت ثانیہ کی، تو جماعت اولیٰ کی فضیلت میں کوئی کمی آئے گی یا نہیں؟ رمضان المبارک میں اس طرح کی جماعت ثانیہ لوگ کرتے رہتے ہیں، اپنے اپنے گھروں پر اطمینان سے افطار کرتے ہیں اور مسجد میں چند لوگوں کے ساتھ جماعت ثانیہ کرتے ہیں، تو کیا اذان سنائی دینے کے بعد یہ لوگ اس طرح تاخیر کریں اور اپنی من مانی کے مطابق مسجد میں آ کر جماعت ثانیہ کریں، کیا شریعت میں ان کے لیے ایسا کرنا جائز ہے؟ نیز یہ بھی واضح فرمائیں کہ جماعت ثانیہ کب کر سکتے ہیں؟

امام صاحب واگرا ضلع بھروچ

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس مسجد کے اندر امام ومؤذن متعین ہوں، وہاں جماعت ثانیہ کرنا مکروہ تحریمی ہے؛ ہاں ہیئت بدل کر بلا تداعی کے کبھی کبھار جماعت ثانیہ کر لی جائے، تو جائز ہے۔ [1]

صورت مسئولہ میں جماعت ثانیہ کرنے والے لوگ ''امر مکروہ'' کا ارتکاب کرنے والے ہیں؛ لیکن اس کا جماعت اولیٰ تک اثر نہیں پہنچے گا، اور ان کے ثواب میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

امام صاحب کی ذمہ داری ہے کہ وہ رمضان المبارک میں سات آٹھ منٹ تک جماعت کو مؤخر کریں، تاکہ افطار کر کے لوگ اطمینان سے جماعت میں شریک ہو سکیں۔ [2] اگر نمازیوں کو جماعت نہیں مل سکی، تو تنہا تنہا اپنی اپنی نماز پڑھ لیں، جماعت ثانیہ نہ کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۸] جماعت ثانیہ جائز ہے یا نہیں؟

۷۸۴-سوال: بہت سی مساجد میں دیکھا گیا ہے کہ ایک مرتبہ با جماعت نماز ادا کر لی گئی، اُس

(۱) تقدم تخریجہ عن البدائع، ورد المحتار، والمحیط البرهاني، والبحر الرائق، تحت: صحن مسجد میں جماعت ثانیہ۔
(۲) متعلقہ مسئلہ کے لیے دیکھیے عنوان: ''رمضان کے علاوہ مغرب کی جماعت میں تاخیر جائز نہیں''۔

کے بعد پھر دوسری اور تیسری مرتبہ بھی جماعت قائم ہوتی ہے، اور اُس کے لیے مستقل اقامت بھی کہی جاتی ہے، تو کیا یہ عمل شرعاً صحیح ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

جو مساجد ایسی ہیں، جن کا کوئی مؤذن اور امام مقرر نہیں ہے؛ بل کہ وہ اس مقصد سے بنائی گئی ہیں کہ مسافرین وغیرہ وہاں آ کر نماز پڑھ سکیں، جیسا کہ بہت سے اسٹیشنوں پر ایسی مساجد کا انتظام ہوتا ہے، تو اُن میں متعدد مرتبہ جماعت قائم کی جاسکتی ہے، البتہ ایسی مساجد، جن میں امام اور مؤذن مقرر ہوتے ہیں، مثلاً محلہ کی مسجد، تو اُن میں مستقل اذان کے ساتھ دوسری یا تیسری مرتبہ جماعت قائم کرنا جائز نہیں ہے، ہاں! بغیر اذان کے کبھی کسی ضرورت کی وجہ سے صرف اقامت کہہ کر چند لوگوں نے جماعت قائم کی ہو، تو جائز ہے، بشرطیکہ مسجد بڑی ہو اور دوسری جماعت مسجد کے جماعت خانہ میں نہیں؛ بلکہ اُس کے صحن یا کسی اور کونے میں قائم کی گئی ہو، لیکن اس کو بھی ہمیشہ کی عادت بنانا درست نہیں اور مستقل اذان کہنا بھی درست نہیں۔ (عالمگیری :۱/ ۸۳)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] أيضـــــا

۷۸۵-سوال: ہمارے ملک میں مقامی افریقی مسلمان، شافعی المسلک ہیں، ایسا اکثر ہوتا ہے کہ وہ لوگ ایک مرتبہ مسجد میں نماز کے ختم ہونے کے بعد دیر سے آئے ہوئے مصلیوں کی دوسری جماعت مسجد کے باہر صحن میں قائم کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم حنفی المسلک ہندوستانی لوگ بھی کئی مرتبہ اس طرح کرتے ہیں، اور کبھی اُن کے ساتھ جماعت میں شریک بھی ہوتے ہیں، تو شرعی اعتبار سے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

ایسی مسجد، جس میں اذان اور اِقامت کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی جاچکی ہو اور اُس مسجد کے مؤذن اور اِمام مقرر ہوں، تو دوسری مرتبہ وہاں جماعت قائم کرنا مکروہ ہے، جماعت خانہ سے باہر یا مسجد اگر

---

[۱] المسجد إذا كان له إمام معلوم و جماعة معلومة في محلة فصلى أهله فيه بالجماعة لا يباح تكرارها فيه بأذان ثان أما إذا صلوا بغير أذان يباح إجماعا و كذا في مسجد قارعة الطريق. كذا في شرح المجمع للمصنف إذا زاد على الواحد في غير الجمعة فهو جماعة وإن كان معه صبي عاقل. كذا في السراجية. (الفتاوى الهندية:۱/ ۸۳، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الأول في الجماعة، ط: دار الفكر - بيروت)

بڑی ہے، تو کسی ایک کونے میں بغیر جماعت کے نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اگر جماعت قائم کی جارہی ہے، تو اُس میں شرکت کرلینا جائز ہے۔ (عالمگیری: ۱/ ۸۳)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] جماعت ثانیہ کا شرعی حکم

۷۸۶-سوال: "باب ادراک الفریضۃ" میں جہاں جہاں نماز توڑی جاسکتی ہے؛ مثلاً: کسی میں ایک رکعت تک گنجائش ہے، کسی میں دو رکعت تک گنجائش ہے۔[۲] تو کیا نماز توڑنے کی ایسی ہی گنجائش اس صورت میں بھی رہے گی، جب کہ جماعت ثانیہ ہورہی ہو؛ مثلاً: ایک مسجد میں ظہر کی جماعت ختم ہوگئی، اس کے بعد ایک آدمی آیا اور منفرداً اس نے نماز شروع کی، ابھی ایک یا دو رکعت ہی پڑھ سکا تھا، کہ چند آدمی آئے اور انہوں نے مل کر جماعت ثانیہ شروع کی، تو اب وہ منفرد اپنی نماز توڑ کر اس جماعت میں شامل ہوگا یا نہیں ؟ اسی طریقہ سے مسجد کی جماعت تو نہیں ہوئی ہے؛ لیکن جماعت سے پہلے چند آدمیوں نے مل کر اپنی جماعت علاحدہ کرلی، جیسا کہ عام طور پر اسٹیشنوں کی مساجد میں ہوتا ہے، اس میں بھی اگر مذکورہ صورت پائی گئی، تو منفرد اپنی نماز توڑ کر جماعت میں شامل ہوسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر کسی کی جماعت فوت ہوگئی ہو، تو اصل حکم یہ ہے کہ منفرداً نماز پڑھ لے۔[۳] جماعت ثانیہ سے

---

[۱] دیکھیے عنوان: جماعت ثانیہ جائز ہے یا نہیں؟ کا حاشیہ، تقدم تخريجه عن البدائع، و رد المحتار، و المحيط البرهاني، و البحر الرائق، تحت: صحن مسجد میں جماعت ثانیہ۔

(۲) إن صلى ركعة من الفجر أو المغرب فأقيم يقطع ويقتدي وكذا يقطع الثانية مالم يقيدها بالسجدة وإذا قيدها بها لم يقطعها... ومن صلى ركعة من الظهر ثم أقيمت يصلي ركعة ثم يدخل مع الإمام وإن لم يقيد الأولى بالسجدة يقطع ويشرع مع الإمام هو الصحيح، كذا في الهداية، أراد بالإقامة شروع الإمام في الصلاة لا إقامة المؤذن... الخ. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۹، كتاب الصلاة، الباب العاشر في إدراك الفريضة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) وروي عن أنس "أن أصحاب رسول الله - صلى الله عليه وسلم - كانوا إذا فاتتهم الجماعة في المسجد صلوا في المسجد فرادى" ولأن التكرار يؤدي إلى تقليل الجماعة؛ لأن الناس إذا علموا أنهم تفوتهم الجماعة يتعجلون فتكثر وإلا تأخروا. اهـ. بدائع. وحينئذ فلو دخل جماعة المسجد بعد ما صلى أهله فيه فإنهم يصلون وحدانا، وهو ظاهر الرواية، ظهيرية. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۹۵، كتاب الصلاة، باب الأذان، فائدة التسليم بعد الأذان، ط: دار الفكر - بيروت)

سلسلے میں کلام ہے کہ وہ بلا کراہت جائز ہے یا مکروہ ہے؛ اس لیے مسجد میں جماعت اولی کے ختم ہونے کے بعد تنہا نماز پڑھنے والا شخص اصل حکم کے مطابق فریضہ کو ادا کر رہا ہے؛ لہٰذا اس کے لیے اس کی اجازت نہ ہوگی کہ نماز کو ترک کر کے جماعت ثانیہ میں شریک ہو۔

الغرض ''ادراک فریضہ'' کی صورت میں منفرداً نماز پڑھنے والا نماز توڑ کر جماعت میں شامل ہو جائے، یہ حکم اس صورت میں ہے، جب کہ جماعت اولیٰ شروع ہو رہی ہو۔ البتہ فقہائے کرام جس کو ''اسٹیشن کی مسجد'' سے تعبیر کرتے ہیں، وہاں جماعت ثانیہ، جماعت اولی کی مانند ہے، اور تنہا نماز پڑھنے والے لیے گنجائش ہے کہ وہ اپنی نماز کو ترک کر کے جماعت میں شریک ہو جائے، خواہ وہ پہلی جماعت ہو، یا دوسری۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] صحن مسجد میں دوسری جماعت قائم کرنا

۷۸۷-سوال: ایک مسجد میں نماز باجماعت ہو چکی ہو، اس کے بعد دو یا دو سے زائد مصلی آئے اور انہوں نے جماعت خانے کے احاطے سے باہر تخت پر یا برآمدے میں فرض نماز کی دوسری جماعت قائم کرنا چاہا، تو کیا یہ دوسری جماعت مکروہ ہے؟ اور کیا اس سے جماعت کی اہمیت ختم ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس مسجد میں امام اور مؤذن مقرر ہوں اور مسنون طریقے پر نماز باجماعت پڑھی جا چکی ہو، تو ایسی مسجد کے صحن یا برآمدے اور تخت پر کبھی کبھار عادت بنائے بغیر باجماعت نماز پڑھ لینا جائز ہے۔[2] لیکن حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی تحقیق کے مطابق جماعت کے جائز ہونے سے جماعت کا ثواب نہیں ملے گا۔ (امداد الفتاوی: ۱/ ۳۶۹)[3]

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: صحن مسجد میں جماعت ثانیہ اور ☆ جماعت ثانیہ کا حکم۔

(۲) تقدم تخریجہ عن البدائع، ورد المحتار، والمحیط البرهاني، والبحر الرائق، تحت عنوان: صحن مسجد میں جماعت ثانیہ۔

[۳] حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلے کی تحقیق کے بعد حاصل تحقیق ان الفاظ میں رقم فرماتے ہیں:

''پس غایت مافی الباب ایک فعل مباح ہوا، جس میں نہ ثواب نہ عقاب، اور امام صاحب کراہت کے قائل، تب بھی اسلم اور احوط اس کا ترک ہی ہوا، کیوں کہ فعل میں احتمال کراہت کا ہے، اور ترک میں کوئی ضرر محتمل نہیں، کہ حرمان ثواب بھی نہیں، پس ترک ہی راجح ہوا، یہ سب تحقیق ہے باعتبار حکم فی نفسہ کے۔...... لیکن چوں کہ مسئلہ مختلف فیہا ہے، اور علماء کے فتوے بھی مختلف ہیں، اس لیے کسی کو کسی پر نکیر شدید وطعن زیبا نہیں۔ (امداد الفتاوی: ۱/ ۳۶۹-۳۷۰، تحقیق کراہت وعدم کراہت جماعت ثانیہ، سوال نمبر ۲۸۷، باب الامامۃ، ط: زکریا- دیوبند)

لہٰذا بہتر یہ ہے کہ برآمدے میں بھی دوسری مرتبہ جماعت سے نماز نہ پڑھیں؛ کیوں کہ جو لوگ جماعت کے پابند ہیں، اگر عذر کی بنا پر ان کی جماعت چھوٹ بھی جائے، پھر بھی ان شاء اللہ جماعت کا ثواب مل جائے گا؛ اس لیے دوسری جماعت نہ کرنا بہتر ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

عن سماك بن حرب، قال: سمعت النعمان بن بشير، يقول: كان رسول الله - صلى الله عليه وسلم - يسوي صفوفنا حتى كأنما يسوي بها القداح حتى رأى أنا قد عقلنا عنه، ثم خرج يوما فقام، حتى كاد يكبر فرأى رجلا باديا صدره من الصف، فقال: عباد الله لتسون صفوفكم، أو ليخالفن الله بين وجوهكم. (مسلم شریف: ۱/ ۱۸۲، حدیث نمبر: ۴۳۶)

باب الصفوف

[جماعت کی صف بندی]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الصفوف

[جماعت کی صف بندی]

[۱] نماز میں صفیں کیسے سیدھی کی جائیں؟

۷۸۸-سوال: عرب حضرات نماز میں پیر چوڑے کرکے ایک دوسرے کے پیر کے ساتھ ملا کر کھڑے رہتے ہیں، تو اس سلسلہ میں صحیح طریقہ کیا ہے؟ کس طرح صفیں سیدھی کی جائیں؟ بینوا، توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً:

شریعت میں مطلوب یہ ہے کہ صفیں سیدھی ہوں، عرب حضرات اور خاص کر غیر مقلدین اس کے لیے ایڑی کو ایڑی کے ساتھ ملانے کو ضروری سمجھتے ہیں، جب کہ دیگر ائمہ صفوں کو سیدھی کرنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ کندھے کو کندھے سے ملایا جائے، کیوں کہ اس سے بہتر طور پر صفیں سیدھی ہوں گی۔[1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) دراصل حدیث پاک میں کندھوں کو کندھوں سے، گھٹنوں کو گھٹنوں سے اور ٹخنوں کو ٹخنوں سے، اسی طرح ایک دوسری حدیث میں گردن کو گردن سے ملانے کا حکم معلوم ہوتا ہے، درحقیقت اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرنا دشوار کن امر ہے، تصور کیجیے! ایک شخص پستہ قد ہے اور دوسرا خوش قامت، اتفاق سے دونوں ایک صف میں جمع ہو گئے، تو اس حدیث کے ظاہر پر کیسے عمل ہوگا؟ اس لیے شراح حدیث کے نزدیک اس سے "تعدیل صفوف میں مبالغہ" مراد ہے، چناں چہ ابن حجر عسقلانیؒ رقم طراز ہیں: (قوله باب إلزاق المنكب بالمنكب والقدم بالقدم في الصف) المراد بذلك المبالغة في تعديل الصف وسد خلله، وقد ورد الأمر بسد خلل الصف والترغيب فيه في أحاديث كثيرة أجمعها حديث بن عمر عند أبي داود وصححه بن خزيمة والحاكم. (فتح الباری: ۲/۲۱۱، ط: دار المعرفۃ-بیروت)

الغرض ہر حال میں صف درست کی جائی، نیز تجربہ ہے کہ کوئی کندھے سے کندھا ملانے کا اہتمام کرے گا، تو تمام اعضاء -جن کا حدیث میں ذکر ہے- خود بہ خود برابر ہو جائیں گے: =

[۲] صف اول کی تعریف اور امام کا صف میں کھڑا ہونا

۷۸۹-سوال: (۱): صف اول کسے کہتے ہیں؟ مسجد میں پہلے منبر نہیں تھا، بعد میں صف کے درمیان منبر بنایا گیا، تو کیا دوسری صف میں منبر کے سامنے جو حضرات نماز پڑھتے ہیں، ان کو صف اول کا ثواب ملے گا؟

(۲): محراب چھوٹا ہے، جس کی وجہ سے امام صاحب پہلی صف کے مقتدیوں سے صرف ایک دو قدم آگے کھڑے ہوتے ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) علامہ ابن عابدین شامیؒ نے پہلی صف کے متعلق تفصیل بیان فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ امام سے متصل جو صف ہوتی ہے، وہ پہلی صف کہلاتی ہے، پس پہلی صف کے بیچ میں یا ایک جانب منبر رکھنے سے پہلی صف کا حکم باطل نہ ہوگا۔[1] امام کے متصل ہونے سے اسی صف کو پہلی صف کہا جائے گا۔ علامہ شامیؒ مزید

=عن عبد الله بن عمر، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: أقيموا الصفوف وحاذوا بين المناكب وسدوا الخلل ولينوا بأيدي إخوانكم، ولا تذروا فرجات للشيطان ومن وصل صفا وصله الله، ومن قطع صفا قطعه الله. (سنن أبي داود: ۱/ ۹۷، رقم الحديث: ۶۶۶، كتاب الصلاة، باب تسوية الصفوف، ط: البدر - ديوبند)

عن أبي القاسم الجدلي، قال: سمعت النعمان بن بشير، يقول: أقبل رسول الله صلى الله عليه وسلم على الناس بوجهه، فقال: أقيموا صفوفكم، ثلاثا، والله لتقيمن صفوفكم أو ليخالفن الله بين قلوبكم، قال: فرأيت الرجل يلزق منكبه بمنكب صاحبه، وركبته بركبة صاحبه، وكعبه بكعبه. (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۶۶۲)

مزید دیکھیے: اعلاء السنن: ۴/ ۳۱۳-۳۱۴، كتاب الصلاة، أبواب الإمامة، باب سنة تسوية الصفوف، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية، پاکستان)

(۱) قال في البحر في آخر باب الجمعة: تكلموا في الصف الأول، قيل هو خلف الإمام في المقصورة، وقيل ما يلي المقصورة، وبه أخذ الفقيه أبو الليث؛ لأنه يمنع العامة عن الدخول في المقصورة، فلا تتوصل العامة إلى نيل فضيلة الصف الأول. اهـ. ــــــ أقول: والظاهر أن المقصورة في زمانهم اسم لبيت في داخل الجدار القبلي من المسجد كان يصلي فيها الأمراء الجمعة ويمنعون الناس من دخولها خوفا من العدو، فعلى هذا اختلف في الصف الأول، هل هو ما يلي الإمام من داخلها أم ما يلي المقصورة من خارجها؟ فأخذ الفقيه بالثاني توسعة على العامة كي لا تفوتهم الفضيلة، ويعلم منه بالأولى أن مثل مقصورة دمشق التي هي في وسط المسجد خارج الحائط القبلي يكون الصف الأول ما يلي الإمام في داخلها وما اتصل به من طرفيها خارجا عنها من أول الجدار إلى آخره، فلا ينقطع الصف ببنائها، كما لا ينقطع بالمنبر الذي هو داخلها فيما يظهر. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۹، كتاب الصلاة، مطلب في الكلام على الصف الأول، ط: دار الفكر) =

فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بات ماخوذ ہوئی کہ: دوسری صف میں منبر کے محاذات میں جو مقتدی ہوں گے، ان کو پہلی صف کا ثواب ملے گا؛ کیوں کہ وہ، دوسرے مقتدیوں کے پیچھے نہیں ہیں، پس وہ حکماً پہلی صف میں شمار ہوں گے: ویؤخذ من تعریف الصف الأول بما هو خلف الإمام أي لا خلف مقتد آخر: أن من قام في الصف الثاني بحذاء باب المنبر یکون من الصف الأول، لأنه لیس خلف مقتد آخر، واللہ تعالیٰ أعلم. (شامی: ۱/ ۳۸۳)[۲]

البتہ پہلی صف-منبر والی-اس طرح کی ہو کہ اس میں امام مقتدیوں کے ساتھ ہی صف میں کھڑا رہتا ہو، تو مکروہ ہے، کیوں کہ دو یا زائد مقتدیوں کے ہونے پر امام کا ان سے آگے کھڑا رہنا واجب ہے، اس کے خلاف کرنا مکروہ تحریمی ہے۔[۳] لیکن اگر محراب بڑا ہو اور تنگی کی وجہ سے امام باہر کھڑا رہ کر رکوع وسجدہ محراب میں کرتا ہو، تو اس میں حرج نہیں، اسی طرح سردی یا بارش کے موقع پر باہر لوگوں کا کھڑا رہنا مشکل ہو یا لوگ زیادہ ہوں اور مسجد تنگ ہو، جس کی وجہ سے امام مقتدیوں کے ساتھ صف میں تھوڑا آگے بڑھ کر کھڑا رہے، تو درست ہے، ضرورتاً اس کی اجازت ہے، بلا ضرورت مکروہ ہے۔[۴]

(۲) مذکورہ تفصیل کی روشنی میں اس صف کے مقتدیوں کو پہلی صف کا ثواب ملے گا؛ لیکن بلا ضرورت اس طرح امام کا مقتدیوں کے ساتھ کھڑا رہنا مکروہ تحریمی ہے، صرف ضرورت کی صورت میں گنجائش ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= صف اول وہ ہے، جو امام سے متصل ہو، مؤذن اقامت کے لیے پیچھے کھڑا ہوتا ہے، تو اس کے ساتھ مصلیوں کی جو صف ہے، وہ صف اول ہے۔ اگر یہ صف آگے بڑھ کر امام کے قریب ہو جائے، اس وقت بھی وہ صف اول شمار ہوگی۔ (دیکھیے: فتاویٰ رحیمیہ: ۵/ ۳۰، باب صفۃ الصلاۃ، ط: دار الاشاعت-کراچی)

(۲) رد المحتار علی الدر المختار: ۱/ ۵۷۰، کتاب الصلاۃ، مطلب في الکلام علی الصف الأول، ط: دار الفکر.

[۳] (والزائد) یقف (خلفه) فلو توسط اثنین کره تنزیها وتحریما لو أکثر. (الدالمختار) ــــ قال ابن عابدین: (قوله وتحریما لو أکثر) أفاد أن تقدم الإمام أمام الصف واجب کما أفاده في الهدایة والفتح. (رد المحتار علی الدر المختار: ۱/ ۵۶۸، باب الإمامة، مطلب في جواز الإیثار بالقرب، ط: دار الفکر☆المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۱/ ۴۲، کتاب الصلاۃ، باب افتتاح الصلاۃ، ط: دار المعرفة- بیروت)

(۴) والذي یظهر أنه ینبغي للمقتدي التأخر إذا جاء ثالث فإن تأخر وإلا جذبه الثالث إن لم یخش إفساد صلاته، فإن اقتدی عن یسار الإمام یشیر إلیهما بالتأخر . . . وهذا کله عند الإمکان وإلا تعین الممکن. (رد المحتار: ۱/ ۵۶۸، باب الإمامة، مطلب هل الإساءة دون الکراهة أو أفحش منها؟)

[۳] جمعہ کے دن امام کا مصلیٰ محراب کی جانب کھینچ کر آگے صف بنانا

۷۹۰-سوال: ہماری مسجد میں جمعہ کے دن نمازی زیادہ ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے ممبر کے ساتھ والی صف- جہاں صرف امام ہی کھڑے رہتے ہیں- کے مصلیٰ کو محراب کی جانب کھینچ کر آگے ایک صف بڑھائی جاتی ہے، بعض تبلیغی حضرات کا کہنا ہے کہ اس میں پہلی صف کا ثواب حاصل نہیں ہوگا، اور بعض کا کہنا ہے کہ پہلی صف کا ثواب حاصل ہوگا؟ تو صحیح کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ صف پہلی صف نہیں ہے، اس کو ایمرجنسی صف شمار کیا جائے گا، لوگوں کے ازدحام اور جگہ کی تنگی کی وجہ سے اس کا اضافہ کرنا بغیر کسی حرج کے جائز ہے اور بلا ضرورت مکروہ ہے۔ (۱)

امام کے دائیں اور بائیں کی صف گرچہ پہلی صف نہیں ہے، اس کے باوجود پہلی صف کے مقتدی پیچھے کے مقتدیوں کی آسانی کی غرض سے جگہ خالی کردیں اور اس صف میں اس نیت سے شامل ہو جائیں کہ پچھلی صفوں کے مقتدیوں کو سہولت ہوگی، تو اس قربانی کا ثواب پہلی صف کے ثواب سے بھی زیادہ ہوگا، علمائے کرام نے لکھا ہے کہ کوئی شخص پہلی صف میں تھا، اس غرض سے کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف نہ ہو، پیچھے کی صف میں آ گیا اور وہیں نماز ادا کی، مقصد یہ تھا کہ اس کی ذات سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے، تو مذکورہ شخص کو پہلی صف میں نماز ادا کرنے والے سے زیادہ ثواب ہوگا۔ بس اسی طرح محراب والی صف پہلی صف نہیں ہے؛ لیکن پیچھے کی صف کے نمازیوں کی تکلیف کو مد نظر رکھتے ہوئے قربانی دیتے ہوئے محراب والی صف میں نماز ادا کرے، تو پہلی صف سے بھی زیادہ ثواب کا مستحق ہوگا۔ (ان شاء اللہ) [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) والذي يظهر أنه ينبغي للمقتدي التأخر إذا جاء ثالث فإن تأخر وإلا جذبه الثالث إن لم يخش إفساد صلاته، فإن اقتدى عن يسار الإمام يشير إليهما بالتأخر، ... وهذا كله عند الإمكان وإلا تعين الممكن. (رد المحتار: ۱/۵۶۸، باب الإمامة، مطلب هل الإساءة دون الكراهة أو أفحش منها؟، ط: دار الفكر-بيروت)

[۲] قال في البحر في آخر باب الجمعة: تكلموا في الصف الأول، قيل هو خلف الإمام في المقصورة، وقيل ما يلي المقصورة، وبه أخذ الفقيه أبو الليث لأنه يمنع العامة عن الدخول في المقصورة فلا تتوصل العامة إلى نيل فضيلة الصف الأول. اهـ ـــــــــــ أقول: والظاهر أن المقصورة في زمانهم اسم لبيت في داخل الجدار القبلي من المسجد كان يصلي فيها الأمراء الجمعة ويمنعون الناس من دخولها خوفا من العدو، فعلى هذا اختلف في الصف=

[۴] امام کا پہلی صف میں مقتدیوں سے کچھ آگے کھڑا رہنا

۷۹۱-سوال: جناب مفتی صاحب، بعد سلام مسنون عرض ایں کہ ہم اپنی مسجد میں صفیں فٹ (سیٹ) کرا رہے ہیں، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی صف میں امام کی جگہ اس طرح بنائی جارہی ہے کہ مقتدی ان سے دو فٹ دور رہیں گے، سجدہ کے وقت مقتدی کا سر امام کے پیٹ کے برابر تک پہنچ جائے گا۔ یعنی امام کے لیے مستقل صف نہیں ہوگی، مقتدی کی پہلی صف میں ہی امام صاحب کھڑے ہوں گے، البتہ اس قدر آگے کھڑے ہوں گے کہ سجدہ کرتے وقت مقتدی کا سر ان کے پیٹ یا گھٹنے تک ہی پہنچ سکے گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس طرح امام کا کھڑا ہونا جائز ہے، اس صورت میں ہماری نماز مکروہ تو نہیں ہوگی؟ اس طرح صف فٹ کرنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟

ضروری نوٹ: پہلی صف کا ہم صرف جمعہ اور عید کے دن اور رمضان المبارک میں عشاء اور تراویح میں ہی استعمال کریں گے، ان دنوں کے علاوہ باقی نمازوں میں پہلی صف کا استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔

واضح رہے کہ اگر مذکورہ طریقے سے صفوں کو فٹ نہ کرائیں اور امام صاحب کے لیے مستقل صف قائم کریں، تو نقصان یہ ہوتا ہے کہ پیچھے پوری ایک صف کٹ جاتی ہے، جس سے پچاس (۵۰) ساٹھ (۶۰) مقتدیوں کی جگہ کم ہوجاتی ہے؛ جس کی وجہ سے جمعہ وعیدین میں وقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تفصیل سے جواب

= الأول، هل هو ما يلي الإمام من داخلها أم ما يلي المقصورة من خارجها؟ فأخذ الفقيه بالثاني توسعة على العامة كي لا تفوتهم الفضيلة، ويعلم منه بالأولى أن مثل مقصورة دمشق التي هي في وسط المسجد خارج الحائط القبلي يكون الصف بنائها. كما لا ينقطع بالمنبر الذي هو داخلها فيما يظهر، وصرح به الشافعية. وعليه فلو وقف في الصف الثاني داخلها قبل استكمال الصف الأول من خارجها يكون مكروها. ويؤخذ من تعريف الصف الأول بما هو خلف الإمام أي لا خلف مقتد آخر أن من قام في الصف الثاني بحذاء باب المنبر يكون من الصف الأول لأنه ليس خلف مقتد آخر، والله تعالى أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۹-۵۷۰، كتاب الصلاة، مطلب في الكلام على الصف الأول، ط: دار الفكر)

قال في المعراج: الأفضل أن يقف في الصف الآخر إذا خاف إيذاء أحد. قال -عليه الصلاة والسلام- من ترك الصف الأول مخافة أن يؤذي مسلما أضعف له أجر الصف الأول، وبه أخذ أبو حنيفة ومحمد، وفي كراهة ترك الصف الأول مع إمكانه خلاف اهـ أي لو تركه مع عدم خوف الإيذاء. (المصدر السابق: ۱/ ۵۶۹)

عنایت فرمائیں۔

الجواب حامدا ومصليا:

مذکورہ صورت میں امام صاحب پہلی ہی صف میں شمار ہوں گے، چاہے وہ مقتدیوں سے ایک بالشت آگے کھڑے رہیں یا چار بالشت، اور امام کا پہلی صف میں کھڑے رہنا مکروہ تحریمی ہے؛ لہٰذا امام صاحب کا پہلی صف سے آگے رہنا واجب ہے، بغیر مجبوری کے ایسا کرنا جائز نہیں ہے؛ لہٰذا مجبوری کے بغیر مذکورہ مسجد کی پہلی صف میں مقتدیوں کا کھڑا رہنا مکروہ تحریمی ہوگا۔ (فتح القدیر)[1]

ہاں، اگر عید یا جمعہ کی نماز میں مقتدی زیادہ ہو جائیں اور پیچھے کھڑے رہنے کی جگہ نہ ہو اور عید اور جمعہ کی نماز کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو، تو پہلی صف کا استعمال کر سکتے ہیں۔ (شامی)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] پہلی صف کے درمیان منبر حائل ہو جائے، تو کیا وہ پہلی صف کہلائے گی؟

۷۹۲-سوال: آج سے چار، پانچ مہینہ پہلے جب آپ کا نوساری شہر کا سفر ہوا تھا، تو آپ نے

---

(۱) وفي الكافي: وإن كثر القوم كره قيام الإمام وسطهم لأن تقدم الإمام سنة لمواظبته - صلى الله عليه وسلم - والإعراض عن سنته مكروه انتهى. والحق أن يعلل بترك الواجب لأن مقتضى فعله التقدم على الكثير من غير ترك الوجوب، فيكون التوسط مكروها كراهة تحريم، وهو صريح الهداية فيما قدمنا في صدر إقامة المرأة النساء حيث قال: لأنها لا تخلو عن ارتكاب محرم وهو قيام الإمام وسط الصف، ولو قام في يمنة الصف أو يسرته أساءوا، ولو قام واحد بجنب الإمام، وخلفه صف يكره بالإجماع، كذا في الدراية. (فتح القدير: ۱/۳۵۶، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر-بيروت)

[۲] السنة أن يقوم الإمام إزاء وسط الصف، ألا ترى أن المحاريب ما نصبت إلا وسط المساجد وهي قد عينت لمقام الإمام. اهـ. وفي التتارخانية: ويكره أن يقوم في غير المحراب إلا لضرورة اهـ ومقتضاه أن الإمام لو ترك المحراب وقام في غيره يكره ولو كان قيامه وسط الصف لأنه خلاف عمل الأمة، وهو ظاهر في الإمام الراتب دون غيره والمنفرد، فاغتنم هذه الفائدة... (قوله كجمعة وعيد) مثال للعذر، وهو على تقدير مضاف: أي كزحمة جمعة وعيد (قوله فلو قاموا إلخ) تفريع على عدم الكراهة عند العذر في جمعة وعيد. قال في المعراج: وذكر شيخ الإسلام إنما يكره هذا إذا لم يكن من عذر، أما إذا كان فلا يكره كما في الجمعة إذا كان القوم على الرف، وبعضهم على الأرض لضيق المكان. وحكى الحلواني عن أبي الليث: لا يكره قيام الإمام في الطاق عند الضرورة بأن ضاق المسجد على القوم. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۶۴۶، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فرع لا بأس بتكليم المصلي وإجابته برأسه، ط: دار الفكر-بيروت)

یہاں کی جامع مسجد میں جمعہ کے روز خطبہ سے پہلے بیان فرمایا تھا، جب آپ کا بیان ختم ہوا، تو میں نے آپ کو منبر والی پہلی صف میں بٹھانے کی کوشش کی، تو آپ نے انکار کر دیا اور آپ یہ کہتے ہوئے میرے پاس بیٹھ گئے کہ آٹھ دس روز ہوئے ہیں کہ میں منبر والی ناقص صف کے رد میں فتویٰ دے چکا ہوں، اب ہم لوگ ہی اس کے خلاف عمل کریں گے، تو ہم میں اور عوام میں کیا فرق رہے گا؟ تو اب ہمیں آپ کے اس فتوے کی ضرورت ہے؛ تاکہ یہ فتویٰ لوگوں کو پڑھ کر سنا دیا جائے؛ سوال کے اجزاء حسب ذیل ہیں:

(۱) منبر والی صف میں نماز کیوں نہیں پڑھنی چاہیے، ممانعت کی کیا وجہ ہے؟

(۲) منبر والی صف کو اگر ختم کرنا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟ ہمارے ایک دعوت وتبلیغ سے جڑے بزرگ نے یہ ارشاد فرمایا کہ: منبر والی پہلی صف میں مصلی کھینچ لیا جائے، جس سے وہ صف خود بخود ختم ہو جائے گی؛ تو کیا ہم اس پر عمل کریں؟ ان شاء اللہ حتی عمل تو اسی پر ہوگا، جیسا آپ فتویٰ دیں گے۔

ابراہیم اون والا

الجواب حامدا ومصليا:

منبر کے درمیان میں، حائل ہونے کی وجہ سے جو صف ٹوٹ جاتی ہو، وہ پہلی صف نہیں ہے، پہلی صف کے متعلق علمائے کرام نے لکھا ہے کہ جس کے دونوں کنارے برابر ہوں، درمیان میں ٹوٹتی نہ ہو۔ (شامی: ۱/ ۵۳۲)[1]

اس تبلیغی بزرگ صاحب نے بالکل صحیح بات کہی ہے، مصلی منبر والی صف میں کھینچ لیا جائے اور امام وہیں پر کھڑے ہوں؛ البتہ جب ضرورت ہو اور نمازیوں کی تعداد بڑھ جائے اور مسجد کا صحن بھر جائے، تو اس وقت منبر والی صف کو پہلی صف بنانا ضرورت کے تحت جائز ہوگا اور اس صف میں نماز پڑھنے والے کو پہلی صف کا ثواب مل جائے گا۔ (شامی: ۱/ ۶۰۵)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وما اتصل به من طرفيها خارجا عنها من أول الجدار إلى آخره، فلا ينقطع الصف ببنائها. (رد المحتار: ۲/ ۳۱۱، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب في الكلام على الصف الأول، ط: مكتبه زكريا - ديوبند)

(۲) قال الولوالجي في فتاواه، وصاحب التجنيس: إذا ضاق المسجد بمن خلف الإمام على القوم لا بأس بأن يقوم الإمام في الطاق؛ لأنه تعذر الأمر عليه، وإن لم يضق المسجد بمن خلف الإمام لا ينبغي للإمام أن يقوم في الطاق؛ لأنه يشبه تباين المكانين اهـ. يعني: وحقيقة اختلاف المكان تمنع الجواز فشبهة الاختلاف توجب الكراهة. (البحر الرائق: ۲/ ۲۸، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۶] امام کے دائیں بائیں کچھ پیچھے ہٹ کر صف بنانا

۷۹۳-سوال: مسجد کے اندرونی حصہ میں نیز صحن میں جگہ ہونے کے باوجود امام کے پڑوس میں کچھ پیچھے ہٹ کر (محراب کی لائن میں) صف بنانا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

بہت سی مساجد میں محراب بڑا ہونے کی بنا پر امام اگر اس طرح کھڑا ہو، کہ پاؤں کا پچھلا کچھ حصہ محراب کے باہر اور کچھ محراب میں ہو، تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ امام محراب والی صف میں کھڑا ہے؛ بل کہ یہ صف بندی تو مسنون طریقے پر ہوئی ہے اور مذکورہ طریقہ پر صف بندی جائز ہے؛ لیکن بہت سی مساجد میں محراب تنگ ہونے کی وجہ سے امام صف کے درمیان کھڑا رہتا ہے، تو یہ سنت طریقے کے خلاف ہے؛ اس لیے فقہاء نے اس طریقے کو مکروہ لکھا ہے۔

لیکن اگر مسجد میں جگہ تنگ ہو اور مصلی حضرات زیادہ ہوں؛ اس لیے امام مقتدیوں کے ساتھ، تھوڑا آگے کی طرف بڑھ کر، درمیان میں کھڑا ہو جائے، تو یہ جائز ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ صحن میں اور مسجد کے اندرونی حصے میں جگہ ہے، تو ایسی صورت امام کا صف کے درمیان کھڑا رہنا مکروہ ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) وكره... قيام الامام في المحراب لا سجوده فيه. وقدماه خارجة؛ لأن العبرة للقدم (مطلقا) وإن لم يتشبه حال الإمام... إذا لم يضق المسجد بمن خلف الإمام لا ينبغي له ذلك... إنما بني علامة لمحل قيام الإمام ليكون قيامه وسط الصف كما هو السنة، لا لأن يقوم في داخله .... وفي التتارخانية: ويكره أن يقوم في غير المحراب إلا لضرورة اهـ ومقتضاه أن الإمام لو ترك المحراب وقام في غيره يكره ولو كان قيامه وسط الصف لأنه خلاف عمل الأمة، وهذا كله (عند عدم العذر) كجمعة وعيد، وذكر شيخ الإسلام إنما يكره هذا إذا لم يكن من عذر، أما إذا كان فلا يكره كما في الجمعة إذا كان القوم على الرف، وبعضهم على الأرض لضيق المكان. وحكى الحلواني عن أبي الليث: لا يكره وقيام الإمام في الطاق عند الضرورة بأن ضاق المسجد على القوم. (رد المحتار: ۲/ ۴۱۵-۴۱۵، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلوة، ومايكره فيها، ط: مكتبه زكريا-ديوبند ☆مراقی الفلاح، ص: ۱۳۱، كتاب الصلاة، فصل يكره للمصلي سبعة وسبعون شيئا، ط: فيصل-ديوبند)

[۷] مصلی پر کھڑا ہونے کے بعد امام کا اِدھر اُدھر دیکھنا

۷۹۴-سوال: پیش امام صاحب جب مصلی پر کھڑے ہوتے ہیں، تو موذن کی تکبیر کے وقت وہ دائیں بائیں اور گھڑی وغیرہ کی طرف دیکھتے رہتے ہیں، تو ان کی اس طرح کی حرکت کہاں تک درست ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

امام صاحب کی ذمہ داری ہے کہ مقتدیوں کی صفیں برابر اور درست کرنے کا مکمل خیال رکھیں، اگر مقتدی آگے پیچھے ہوں، یا صف کے درمیان جگہ خالی ہو، تو حکم دیں کہ صفیں درست کی جائیں؛ اس مقصد کی خاطر امام صاحب دائیں بائیں دیکھتے ہوں- جس کو مقتدی سمجھتے ہوں کہ گھڑی کی طرف دیکھتے ہیں- تو اس میں کوئی حرج نہیں؛ بل کہ ضرورت کے وقت گھڑی کی طرف دیکھنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (۱)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] بڑوں کا صف بنانے کے لیے بچوں کی صف کے سامنے سے گزرنا

۷۹۵-سوال: بڑوں کی صف کے پیچھے ایک صف چھوڑ کر تیسری صف بچوں کے لیے رکھی گئی ہو

---

(۱) عن سماك بن حرب، قال: سمعت النعمان بن بشير، يقول: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يسوي صفوفنا حتى كأنما يسوي بها القداح حتى رأى أنا قد عقلنا عنه، ثم خرج يوما فقام، حتى كاد يكبر فرأى رجلا باديا صدره من الصف، فقال: عباد الله لتسون صفوفكم، أو ليخالفن الله بين وجوهكم. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۸۲، رقم الحديث: ۱۲۸-(۴۳۶)، كتاب الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها... الخ، ط: ديوبند)

عن النعمان بن بشير، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يسوي صفوفنا، فخرج يوما فرأى رجلا خارجا صدره عن القوم، فقال: لتسون صفوفكم أو ليخالفن الله بين وجوهكم. ـــــــ وقد روي عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: من تمام الصلاة إقامة الصف. وروي عن عمر: "أنه كان يوكل رجالا بإقامة الصفوف، ولا يكبر حتى يخبر أن الصفوف قد استوت. وروي عن علي، وعثمان، أنهما كانا يتعاهدان ذلك، ويقولان: استووا، وكان علي يقول: "تقدم يا فلان، تأخر يا فلان. (سنن الترمذي: ۱/ ۵۳، رقم الحديث: ۲۲۷، أبواب الصلاة، باب ماجاء في إقامة الصفوف، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(ويصف) أي يصفهم الإمام بأن يأمرهم بذلك. قال الشمني: وينبغي أن يأمرهم بأن يتراصوا ويسدوا الخلل، ويسووا مناكبهم ويقف وسطا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۶۸، كتاب الصلاة، باب الامامة، ط: دار الفكر)

اور دوسری صف بنانے کے لیے بچوں کے آگے گزرنا پڑتا ہو، ایسی صورت میں بچوں کی صف امام کے پیچھے، درمیان سے بنانے کی بجائے کسی ایک جانب سے بنائی جائے، تو کیا اس میں کوئی حرج ہوگا؟

الجواب حامداومصلیا:

امام کو بیچ میں کھڑا رہنا چاہیے اور صف دونوں جانب میں برابر ہونی چاہیے، ایک طرف صف بنانا مکروہ ہے؛ مگر مذکورہ صورت میں جب کہ اگلی صفیں برابر ہوں، بچوں کی صف اگر ایک جانب میں بنادی جائے، تو اس کی گنجائش ہے؛ لیکن جب بچے زیادہ ہوں گے، تو مردوں کو دوسری صف بنانے میں وہی حرج لاحق ہوگا، جو آپ نے ذکر کیا ہے؛ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ بچوں کی صف بھی درمیان ہی سے بنائی جائے۔

اور رہ گیا معاملہ دوسری صف بنانے کے لیے بڑوں کا بچوں کے سامنے سے گذرنے کا، تو کوشش کی جائے کہ اس کی نوبت نہ آئے؛ لیکن اگر اس کی نوبت آجائے، تو ان کے سامنے سے گذرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (درمختار جلد ۲ صفحہ ۳۹۹، باب مایفسد الصلاۃ)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] نابالغ بچے کا بڑوں کی صف میں کھڑا ہونا

۷۹۶-سوال: (۱) بچہ نابالغ ہو، گیارہ سے بارہ سال کی عمر ہو، ہوش وحواس رکھتا ہو اور سمجھ بوجھ والا ہو، کیا ایسا نابالغ بچہ بڑوں کی صف میں کھڑا ہوسکتا ہے؟

---

[۱] قال الشمني: وينبغي أن يأمرهم بأن يتراصوا ويسدوا الخلل ويسووا مناكبهم ويقف وسطا... وخير صفوف الرجال أولها. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۶۸، باب مايفسد الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت)

ولو كان فرجة فللداخل أن يمر على رقبة من لم يسدها لأنه أسقط حرمة نفسه فتنبه (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله ولو كان فرجة إلخ) كان تامة وفرجة فاعلها. قال في القنية: قام في آخر الصف في المسجد بينه وبين الصفوف مواضع خالية فللداخل أن يمر بين يديه ليصل الصفوف؛ لأنه أسقط حرمة نفسه فلا يأثم المار بين يديه، دل عليه ما ذكر في الفردوس برواية ابن عباس - رضي الله تعالى عنهما - عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: من نظر إلى فرجة في صف فليسدها بنفسه، فإن لم يفعل فمر مار فليتخط على رقبته فإنه لا حرمة له. أي فليتخط المار على رقبة من لم يسد الفرجة. اهـ.

قلت: وليس المراد بالتخطي الوطء على رقبته لأنه قد يؤدي إلى قتله ولا يجوز، بل المراد أن يخطو من فوق رقبته، وإذا كان له ذلك فله أن يمر من بين يديه بالأولى، فافهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۳۶، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة، فروع مشى المصلي مستقبل القبلة هل تفسد صلاته، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) کیا نابالغ بچہ بڑوں کی صف میں کھڑا رہے گا، تو شرعی اعتبار سے وہ جگہ خالی جگہ کے حکم میں شمار ہوگی؟

الجواب حامدا ومصلیا:

ایک امام اور دو مقتدی ہوں، ایک بالغ اور دوسرا نابالغ، تو دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑے رہنے کا حکم ہے۔ [۱] لیکن بالغ دو یا دو سے زیادہ ہوں، تو نابالغ کی صف ان کے پیچھے بنائی جائے گی، سمجھ بوجھ رکھنے والا، ہوشیار بچہ بھی نابالغ ہو، تو مردوں کی صف میں کھڑا نہیں رہے گا؛ بل کہ پیچھے کھڑا کیا جائے گا، اگر کوئی بچہ مردوں کی صف میں کھڑا ہو جائے، حالاں کہ بچوں کی صف قائم ہو، تو یہ ترتیب کے خلاف ہے، لیکن وہ مقام "خالی جگہ" کے حکم میں شمار نہیں ہوگا۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] امام کی ہر دو جانب مقتدی برابر ہوں

۷۹۷-سوال: ایک صاحب نے مثال بیان کی: "جماعت کے وقت امام اور مقتدی حضرات کی مثال ترازو کی ڈنڈی اور اس کے پلے کی سی ہے، امام کی دونوں جانب مقتدی برابر برابر ہوں، ایسا نہ ہو کہ

---

(۱) عن أنس بن مالك، أن جدته مليكة دعت رسول الله صلى الله عليه وسلم لطعام صنعته له، فأكل منه، ثم قال: قوموا فلأصل لكم. قال أنس: فقمت إلى حصير لنا، قد اسود من طول ما لبس، فنضحته بماء، فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم، وصففت واليتيم وراءه، والعجوز من ورائنا، فصلى لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم ركعتين، ثم انصرف. (صحيح البخاري: ۱/ ۵۵، رقم الحديث: ۳۸۰، كتاب الصلاة، باب الصلاة على الحصير، ط: البدر - ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۳۴، رقم الحديث: ۲۶۶ - (۶۵۸)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب جواز الجماعة في النافلة، والصلاة على حصير... الخ، ط: البدر - ديوبند)

(الرجال)... (ثم الصبيان) ظاهره تعددهم، فلو واحدا دخل الصف (ثم الخناثي ثم النساء). [الدر المختار]

وفي الشامية: (قوله فلو واحدا دخل الصف) ذكره في البحر بحثا، قال: وكذا لو كان المقتدي رجلا وصبيا يصفهما خلفه لحديث أنس: فصففت أنا واليتيم وراءه والعجوز من ورائنا. وهذا بخلاف المرأة الواحدة فإنها تتأخر مطلقا كالمتعددات للحديث المذكور. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۷۱، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

وإذا كان معه اثنان قاما خلفه وكذلك إذا كان أحدهما صبيا. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۸، كتاب الصلاة، الفصل الرابع في بيان ما يمنع صحة الاقتداء... الخ، ط: زكريا ديوبند)

(۲) ولو اجتمع الرجال والنساء والصبيان والخناثي والصبيات المراهقات فأرادوا أن يصطفوا للجماعة - يقوم الرجال صفا مما يلي الإمام، ثم الصبيان بعدهم، ثم الخناثي، ثم الإناث، ثم الصبيات المراهقات. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۵۹، كتاب الصلاة، فصل في بيان مقام الإمام والمأموم، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

ایک جانب کم ہو اور دوسری جانب زیادہ۔ اور جس طرح تاجر برابر کرنے کے لیے، ترازو کے اس پلڑے سے مال کو نکال دیتا ہے، جس پلے میں زیادہ ہو، اسی طرح اللہ بھی اس جانب سے مقتدی کو نکال دیتے ہیں، جس جانب زیادہ ہوں۔"

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس طور پر مثال بیان کرنا صحیح ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

حدیث شریف سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امام صاحب بالکل بیچ میں کھڑے ہوں اور صف کے درمیان کی خالی جگہوں کو پُر کیا جائے، اور جب تک ایک صف مکمل نہ ہو، دوسری صف نہ بنائی جائے؛ امام کے دونوں جانب مقتدی برابر، برابر کھڑے رہیں، اگر اس کے خلاف ہو، تو مکروہ ہوگا۔ (شامی جلد ۱ صفحہ ۵٦۸)[1]

[۱] النعمان بن بشير، يقول: قال النبي صلى الله عليه وسلم: لتسون صفوفكم، أو ليخالفن الله بين وجوهكم. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۰۰، رقم الحديث: ۷۱۷، كتاب الأذان، باب تسوية الصفوف عند الإقامة وبعدها، ط: البدر - ديوبند)

عن جابر بن سمرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ألا تصفون كما تصف الملائكة عند ربهم جل وعز، قلنا وكيف تصف الملائكة عند ربهم؟، قال: يتمون الصفوف المقدمة ويتراصون في الصف. (سنن أبي داود: ۱/ ۹۷، رقم الحديث: ٦٦۱، كتاب الصلاة، باب تسوية الصفوف، ط: البدر - ديوبند)

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "توسطوا الإمام، وسدوا الخلل". (السنن الكبرى - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۳/ ۱۴۷، رقم الحديث: ۵۲۰۳، جماع أبواب موقف الإمام والمأموم، باب مقام الإمام من الصف، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

قال الشمني: وينبغي أن يأمرهم بأن يتراصوا ويسدوا الخلل ويسووا مناكبهم ويقف وسطا. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله ويقف وسطا) قال في المعراج: وفي مبسوط بكر: السنة أن يقوم في المحراب ليعتدل الطرفان، ولو قام في أحد جانبي الصف يكره.... ومتى استوى جانباه يقوم عن يمين الإمام إن أمكنه وإن وجد في الصف فرجة سدها وإلا انتظر حتى يجيء آخر فيقفان خلفه، وإن لم يجئ حتى ركع الإمام يختار أعلم الناس بهذه المسألة فيجذبه ويقفان خلفه، ولو لم يجد عالما يقف خلف الصف بحذاء الإمام للضرورة، ولو وقف منفردا بغير عذر تصح صلاته عندنا اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵٦۸، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

[تنبيه] يفهم من قوله أو إلى سارية كراهة قيام الإمام في غير المحراب، ويؤيده قوله قبله السنة أن يقوم في المحراب، وكذا قوله في موضع آخر: السنة أن يقوم الإمام إزاء وسط الصف، ألا ترى أن المحاريب ما نصبت إلا وسط المساجد وهي قد عينت لمقام الإمام اهـ. والظاهر أن هذا في الإمام الراتب لجماعة كثيرة لئلا يلزم عدم قيامه في الوسط، فلو لم يلزم ذلك لا يكره تأمل. (حوالہ سابق، مطلب في الكراهة قيام الإمام في غير المحراب☆البحر الرائق: ۱/ ٦۱۸، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتاب - ديوبند)

لیکن ترازو کی مثال دے کر ایک جانب کے مقتدیوں کو نکالنے کی بات درست نہیں، نماز ادا ہو جائے گی، البتہ ثواب کم ملے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] اگلی صف پُر کیے بغیر پچھلی صف میں کھڑے ہونے والوں کا حکم

۷۹۸-سوال: اگر اگلی صفوں میں جگہ خالی ہو، تو پچھلی صف میں کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مکروہ [کراہت] کا گناہ پچھلی صف میں کھڑے ہونے والے تمام حضرات کو ہوگا؟

الجواب حامداو مصلیا:

ہر ایک کو گناہ ہوگا، البتہ جن لوگوں کو اگلی صف پُر کرنے کے لیے پچھلی صف کے مقتدیوں کے آگے سے ہو کر گزرنا پڑتا ہو، وہ لوگ مصلی کے آگے سے گزرنے کی وعید سے بچنے کے لیے پچھلی صف میں کھڑے ہو گئے ہوں، تو گنہ گار نہیں ہوں گے، اگر چہ حکم یہی ہے کہ اس صورت میں مصلی کے آگے سے گزرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے؛ لہٰذا مصلی کے آگے سے گذر کر بھی اگلی صف پر کرنی چاہیے۔ (شامی: جلد ۱ صفحہ ۵۷۰)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) النعمان بن بشير، يقول: قال النبي صلى الله عليه وسلم: لتسون صفوفكم، أو ليخالفن الله بين وجوهكم. (صحيح البخاري: ۱/۱۰۰، رقم الحديث: ۷۱۷، كتاب الأذان، باب تسوية الصفوف عند الإقامة وبعدها، ط: ديوبند)

عن جابر بن سمرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ألا تصفون كما تصف الملائكة عند ربهم جل وعز، قلنا وكيف تصف الملائكة عند ربهم؟، قال: يتمون الصفوف المقدمة ويتراصون في الصف. (سنن أبي داود: ۱/۹۷، رقم الحديث: ۶۶۱، كتاب الصلاة، باب تسوية الصفوف، ط: البدر - ديوبند)

ولو وجد فرجة في الأول لا الثاني له خرق الثاني لتقصيرهم، وفي الحديث: من سد فرجة غفر له. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله لتقصيرهم) يفيد أن الكلام فيما إذا شرعوا. وفي القنية قام في آخر صف وبينه وبين الصفوف مواضع خالية فللداخل أن يمر بين يديه ليصل الصفوف لأنه أسقط حرمة نفسه فلا يأثم المار بين يديه، دل عليه ما في الفردوس عن ابن عباس عنه - صلى الله عليه وسلم -: من نظر إلى فرجة في صف فليسدها بنفسه، فإن لم يفعل فمر مار فليتخط على رقبته فإنه لا حرمة له. أي فليتخط المار على رقبة من لم يسد الفرجة. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۵۷۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

[۱۲] ضرورت کے وقت چھوٹے بچوں کو بڑوں کی صف میں کھڑا کرنے کا حکم

۷۹۹-سوال: آٹھ دس سال کے بچے، نماز میں بڑے آدمیوں کی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ ایک آدمی کا یہ کہنا ہے کہ: چھوٹے بچے نماز کے لیے اگلی صفوں میں پہلے سے آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور بڑے لوگ نماز کی جماعت کھڑی ہونے کے عین وقت پر حاضر ہوتے ہیں، اب اگر وہ اگلی صفوں میں موجود بچوں کو پیچھے کر دیتے ہیں، تو ان بچوں کے دلوں میں نماز کے متعلق نفرت پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم لوگ نماز میں پہلے حاضر ہوئے تھے اور ہمیں انہوں نے پیچھے کر دیا، یہ سوچ کر کسی دن وہ بچے مسجد میں آنے کو تیار بھی نہیں ہوتے، بسا اوقات ان کو اتنا پیچھے کر دیا جاتا ہے کہ باہر دھوپ اور بارش سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے، بچوں کی جگہوں پر بعد میں آنے والے بڑے حضرات اپنا قبضہ جما دیتے ہیں، اس سے غلط اثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ بچے مسجد سے نکل کر سینما ہال وغیرہ کا رخ کرتے ہیں؛ لہٰذا ان حالات کے پیش نظر ان بچوں کے بارے میں اب کیا کیا جائے؟

بہت سی مرتبہ شہروں میں عیدین کے موقع پر لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے، ایسے موقع پر چھوٹے بچے بھی اپنے اپنے اولیاء کے ساتھ نماز عید میں شرکت کی غرض سے آتے ہیں، اب ان کے اولیاء پہلی صف میں ہوتے ہیں اور بچے آخری صف میں، نماز کے بعد ہر ایک کو ایک دوسرے سے ملنے کی فکر لاحق ہوتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نماز میں کسی کا بھی دل نہیں لگتا ہے، اور نماز کے بعد اتنے بڑے مجمع میں سے ایک دوسرے کو تلاش کرنے میں کافی وقت ضائع ہوتا ہے اور پریشانی بھی لاحق ہوتی ہے؛ خدانخواستہ بچہ اگر گم ہو گیا پھر تو مصیبت اور تکلیف کی انتہا نہیں رہتی؛ یہ بات بھی ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بچوں کو پیچھے کر دینے سے ان کی بے راہ روی کا قوی اندیشہ ہے، جیسا کہ اوپر اس کی جانب ہلکا سا اشارہ کیا گیا، یا پھر ان کے دلوں سے نماز کی اہمیت ختم ہو کر اس کی جگہ نفرت پیدا ہو جائے گی اور نماز میں آنا ہی بالکل چھوڑ دیں گے۔ اور بڑے مجمع میں اگر چھوٹے بچے اپنے والدین سے بچھڑ جائیں، تو پھر ہر ایک کو بڑی پریشانی لاحق ہوگی۔

ان ساری وجوہات کے پیش نظر ایک آدمی کا یہ کہنا ہے کہ بچوں کو اپنے والدین کے ساتھ ایک ہی صف میں نماز پڑھنے کی اجازت ہونی چاہیے اور ان کو پیچھے نہ کیا جائے؛ اس سلسلے میں کیا بات صحیح ہے، شریعت کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصليا:

صف بندی کا مسنون طریقہ آں حضرت ﷺ کے فرمان کے بہ موجب یہ ہے کہ پہلے مردوں کی صفیں، پھر بچوں کی، پھر عورتوں کی۔ (۱) البتہ ضرورت کے وقت ایک دو بچے اگر مردوں کی صف میں کھڑے رہیں تو یہ جائز ہے، ممنوع نہیں ہے۔ (۲) چھوٹے، نابالغ بچوں کو نماز کے لیے مسجد ہی میں آنا ضروری نہیں ہے؛ بل کہ ان کو نماز کی مشق اور عادت اپنے گھروں پر رکھ کر بھی کروائی جا سکتی ہے، نیز عیدین کے موقع پر بچوں کو عیدگاہ لے جانے سے وہ خود بھی پریشانی میں مبتلا ہوں گے اور ان کے اولیاء بھی؛ اس لیے ان مواقع میں چھوٹے بچوں کو محلے ہی کی مسجد میں نماز پڑھنے کی تاکید کی جائے، اگر عیدگاہ میں بچے اپنے والدین کے ساتھ آگے کی صفوں میں ہوں گے، تو ان کی وجہ سے بڑوں کی نماز میں خلل واقع ہوگا؛ اس لیے عیدگاہ کی بہ جائے ان بچوں کو محلے کی مسجد ہی میں نماز پڑھنے کی تاکید کرنی چاہیے، یا اس کی ایک آسان شکل یہ ہے کہ عیدگاہ ہی میں ایک الگ جگہ ان بچوں کے لیے متعین کی جائے، جہاں جمع ہو کر یہ سارے بچے اپنی اپنی نماز امام کی اقتدا میں ادا کریں، نماز سے فراغت کے بعد اولیاء حضرات اپنے بچوں کو وہاں جا کر تلاش کر لیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] آپ ﷺ کا اپنے نواسوں کو صف میں اپنے ساتھ رکھ کر نماز ادا کرنا

۸۰۰-سوال: آں حضرت ﷺ اپنے نواسوں کو صف میں اپنے ساتھ رکھ کر نماز ادا کرتے تھے، کیا یہ بات صحیح ہے۔؟

الجواب حامداومصليا:

کبھی کبھی پڑھتے تھے، مستقل آپ کی عادت نہیں تھی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب

---

(۱) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خير صفوف الرجال أولها، وشرها آخرها، وخير صفوف النساء آخرها، وشرها أولها. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۸۲، رقم الحديث: ۱۳۲-(۴۴۰)، كتاب الصلاة، باب تسوية الصفوف وإقامتها وفضل الأول فالأول... الخ، ط: البدر - ديوبند)

[۲] (ويصف) أي يصفهم الإمام بأن يأمرهم بذلك الرجال، (ثم الصبيان) ظاهره تعددهم، فلو واحدا، دخل الصف (ثم الخناثي ثم النساء)... وكذا لو كان المقتدي رجلا وصبيا يصفهما خلفه لحديث أنس: فصففت أنا واليتيم وراءه والعجوز من ورائنا. أخرجه البخاري. (رد المحتار: ۱/ ۵۶۸ - ۵۷۱، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۱/ ۶۱۶ - ۶۱۷، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتاب - ديوبند)

(۲) اس سلسلے میں صریح حدیث تو احقر کو تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکی، تاہم ذیل کی روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نماز =

[۱۴] کسی نمازی کا مسجد سے قریب مدرسہ میں رہ کر امام کی اقتدا کرنا

۸۰۱-سوال: ہمارے محلہ کی مسجد چھوٹی ہے، جو رمضان میں تراویح کے لیے ناکافی ہوتی ہے، مسجد سے بالکل متصل مدرسہ ہے، تو کیا یہ جائز ہے کہ کچھ مقتدی وہاں مدرسہ میں، مسجد کے امام کی اقتدا میں نماز پڑھیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں جب مسجد کا صحن نمازیوں سے پُر ہو جائے اور کوئی جگہ خالی نہ رہے، اور مسجد سے متصل مدرسہ میں نماز پڑھنے والے مقتدیوں کو امام کی نقل وحرکت کی اطلاع کے لیے پورا انتظام ہو، تو ان کا امام کی اقتداء کے ساتھ اس جگہ میں نماز پڑھنا درست ہے؛ البتہ صفوں کا اتصال ضروری ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= سے پہلے منبر سے صحابہ کو خطاب فرما رہے ہیں، اور حضرت حسن بن علی خطبے کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بازو میں بیٹھے ہیں۔ غالب گمان یہی ہے کہ نماز کے دوران بھی رہے ہوں گے، فقط، واللہ اعلم:

.....فقال الحسن: ولقد سمعت أبا بكرة يقول: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم على المنبر والحسن بن علي إلى جنبه، وهو يقبل على الناس مرة، وعليه أخرى ويقول: إن ابني هذا سيد، ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين. (صحيح البخاري: ۲/ ۳۷۳، رقم الحديث: ۲۷۰۴، كتاب الصلح، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم للحسن بن علي رضي الله عنهما الخ، ط: البدر - ديوبند)

(۱) (ويمنع من الاقتداء)... (طريق تجري فيه عجلة) آلة يجرها الثور (أو نهر تجري فيه السفن) ولو زورقا ولو في المسجد (أو خلاء) أي فضاء (في الصحراء) أو في مسجد كبير جدا كمسجد القدس (يسع صفين) فأكثر إلا إذا اتصلت الصفوف فيصح مطلقا، كأن قام في الطريق ثلاثة، وكذا اثنان عند الثاني لا واحد اتفاقا لأنه لكراهة صلاته صار وجوده. كعدمه في حق من خلفه. (والحائل لا يمنع) الاقتداء (إن لم يشتبه حال إمامه) بسماع أو رؤية ولو من باب مشبك يمنع الوصول في الأصح (ولم يختلف المكان) حقيقة كمسجد وبيت في الأصح قنية، ولا حكما عند اتصال الصفوف؛ ولو اقتدى من سطح داره المتصلة بالمسجد لم يجز لاختلاف المكان درر وبحر وغيرهما وأقره المصنف لكن تعقبه في الشرنبلالية ونقل عن البرهان وغيره أن الصحيح اعتبار الاشتباه فقط. قلت: وفي الأشباه وزواهر الجواهر ومفتاح السعادة أنه الأصح. وفي النهر عن الزاد أنه اختيار جماعة من المتأخرين. (الدر المختار: ۱/ ۵۸۴-۵۸۸)

(قوله عند اتصال الصفوف) أي في الطريق أو على جسر النهر، فإنه مع وجود النهر أو الطريق يختلف المكان، وعند اتصال الصفوف يصير المكان واحدا حكما فلا يمنع كما مر، وكأنه أراد بالحائل في كلام المصنف ما يشمل الحائط وغيره كالطريق والنهر.

[۱۵] مقتدی حضرات 'حی علی الفلاح' کہنے سے قبل ہی کیوں کھڑے ہوجاتے ہیں؟

ایک تحقیقی جواب

۸۰۲-سوال: میرے پیش نظر ایک دارالافتاء سے جاری کیا گیا فتویٰ ہے، جس میں یہ تحریر ہے کہ نماز کے لیے اقامت میں "حی علی الفلاح" سے قبل صف بنا کر کھڑا ہونا مکروہ تحریمی ہے۔ اور یہ بات بخاری شریف، عالم گیری وغیرہ کے حوالہ سے لکھی ہے۔

توسوال یہ ہے کہ بعض بریلویوں کی مساجد کے علاوہ تمام مساجد میں دیکھا جاتا ہے کہ تمام مقتدی -جن میں علماء بھی ہوتے ہیں- اقامت شروع ہوتے ہی کھڑے ہوجاتے ہیں اور "حی علی الفلاح" تک انتظار نہیں کرتے، تو مسلسل کراہت تحریمی کا ارتکاب کیسے برداشت کیا جاتا ہے؟ یا حی علی الفلاح تک انتظار صرف مستحب ہے، جس پر عمل نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں؟ مستند حوالوں کے ساتھ تشفی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ نماز باجماعت کے لیے کچھ فرائض، سنن اور آداب ہیں، ادب کو

=(قوله درر) عبارتها: الحائل بينهما لو بحيث يشتبه به حال الإمام يمنع وإلا فلا، إلا أن يختلف المكان. قال قاضي خان: إذا قام على الجدار الذي يكون بين داره وبين المسجد ولا يشتبه حال الإمام يصح الاقتداء، وإن قام على سطح داره، وداره متصلة بالمسجد لا يصح اقتداؤه، وإن كان لا يشتبه عليه حال الإمام؛ لأن بين المسجد وبين سطح داره كثير التخلل فصار المكان مختلفا.

أما في البيت مع المسجد لم يتخلل إلا الحائط ولم يختلف المكان، وعند اتحاد المكان يصح الاقتداء إلا إذا اشتبه عليه حال الإمام. اهـ. أقول: حاصل كلام الدرر أن اختلاف المكان مانع مطلقا. وأما إذا اتحد، فإن حصل اشتباه منع وإلا فلا، وما نقله عن قاضي خان صريح في ذلك.

(قوله لكن تعقبه في الشرنبلالية إلخ) حيث ذكر أن ما نقله عن الخانية من أنه لو قام على سطح داره المتصلة بالمسجد لا يصح إلخ خلاف الصحيح، لما في الظهيرية من أن الصحيح أنه يصح؛ ولما في البرهان من أنه لو كان بينهما حائط كبير لا يمكن الوصول إلى الإمام ولكن لا يشتبه حاله عليه بسماع أو رؤية لانتقالاته لا يمنع صحة الاقتداء في الصحيح، وهو اختيار شمس الأئمة الحلواني. اهـ. وحاصل كلام الشرنبلالي أن المعتبر الاشتباه وعدمه فقط دون اختلاف المكان، فإن حصل الاشتباه منع سواء اتحد المكان أو لا، وإلا فلا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۸۶- ۵۸۷، باب الإمامة، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۸، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الرابع في بيان ما يمنع الاقتداء وما لا يمنع، ط: زكريا- ديوبند)

''مستحب'' بھی کہا جاتا ہے، درمختار میں ادب کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: "ترکه لايوجب اساءة ولا عتاباً، كترك سنة الزوائد، لكن فعله أفضل". [۱] یعنی تارک ادب کسی گناہ یا ملامت کا مستحق نہیں ہوتا ہے، جیسے سنن زوائد کا چھوڑنے والا، البتہ ادب پر عمل کرنا افضل ہے۔

اور مذکورہ مسئلہ کہ: ''حی علی الفلاح'' پر امام اور مقتدیوں کو کھڑا ہونا چاہیے، تو وہ آداب میں سے ہے، جیسا کہ بدائع الصنائع، طحطاوی، نور الایضاح اور مراقی الفلاح میں ہے۔ [۲] پس یہ فعل ادب ومستحب ہے، جس کے نہ کرنے پر کوئی گناہ وملامت نہیں۔

اور نماز کے آداب میں سے تو یہ بھی ہے کہ امام ''قد قامت الصلوٰۃ'' پر نماز شروع کریں۔ [۳] لیکن بتائیں آج اس مسئلہ پر کس جگہ عمل ہو رہا ہے؟ ظاہر ہے اس پر عمل اس لیے چھوڑ دیا گیا ہے کہ مکبر (تکبیر کہنے والے) کی رعایت ہو جائے کہ وہ بھی امام کے ساتھ نماز شروع کر سکے۔ [۴]

جب صرف تنہا مکبر کی رعایت میں یہ ادب ترک کر دیا گیا ہے، تو صفوں کی درستگی - جو کہ بعض علماء کے نزدیک واجب ہے اور یہ تمام مقتدیوں کا حق ہے - کی رعایت میں حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کا ادب ترک کر دیا جائے، تو اس میں کیا حرج ہے؟ بل کہ ہمارے اس غفلت والے دور میں تو لوگ پہلے کھڑے

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۴۷۷، كتاب الصلاة، آداب الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت.

(۲) بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۱/ ۲۰۰، فصل في سنن حكم التكبير أيام التشريق، ط: دار الكتب العلمية ☆ حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ۱/ ۲۱۵، باب صفة الصلاة، ط: دار الكتب العلمية ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱ھ): ۲۷۷، فصل في آدابها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ نور الإيضاح ونجاة الأرواح في الفقه الحنفي - حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹ھ) ص: ۵۹، كتاب الصلاة، فصل: في آداب الصلاة، ت: محمد أنيس مهرات، ط: المكتبة العصرية ☆ مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح - الشرنبلالي الحنفي ص: ۱۰۳، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية.

(۳) أن المؤذن إذا قال قد قامت الصلاة كبر الإمام في قول أبي حنيفة ومحمد. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۰۰)

[۴] (وشروع الإمام) في الصلاة (مذ قيل قد قامت الصلاة) ولو أخر حتى أتمها لا بأس به إجماعا، وهو قول الثاني والثلاثة، وهو أعدل المذاهب كما في شرح المجمع لمصنفه. ـــــ وفي القهستاني معزيا للخلاصة أنه الأصح. (الدر المختار) ـــــــ وقال ابن عابدين: (قوله وهو) أي التأخير المفهوم من قوله أخر. (قوله إنه الأصح) لأن فيه محافظة على فضيلة متابعة المؤذن وإعانة له على الشروع مع الإمام. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۷۹، آداب الصلاة)

ہونے کے باوجود صحیح صف بندی نہیں کر پاتے ہیں، امام کو انتظار کرپڑتا ہے، تو اگر حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو کہا جائے گا، تو ذرا سوچیے کہ ایک رکعت پوری ہونے تک بھی صفیں درست نہیں ہوسکیں گی۔

اور مسئلہ میں یہ جو کہا گیا ہے کہ ''مکبر جب ''حی علی الفلاح'' پر پہنچے، تو امام اور مقتدیان کھڑے ہوجائیں'' تو اس میں تحدید بتلائی گئی ہے نہ کہ حکم، یعنی کھڑے ہونے کا آخری وقت ''حی علی الفلاح'' تک ہے، اس سے تاخیر نہیں کرنی چاہیے، یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا جائز نہیں، چناں چہ طحطاوی میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''الظاهر أنه احتراز عن التاخير لا التقديم حتى لو قام أول الاقامة لابأس به''۔ (طحطاوی: ۱۵۱)[۵] یعنی ظاہر یہ ہے کہ حی علی الفلاح سے آگے تاخیر کرنا ممنوع ہے نہ کہ پہلے کھڑا ہونا، یہاں تک کہ اول اقامت میں کھڑا ہوگیا تو کوئی حرج نہیں؛ لیکن اس بات کو غلط رخ دے کر فتویٰ دیا جاتا ہے اور لوگوں کو بہکایا جاتا ہے، حالاں کہ اصل حقیقت وہی ہے، جو اوپر بیان کی گئی۔

اس مسئلہ میں جب یہ ثابت ہوگیا کہ حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کا درجہ، مستحب کا ہے اور اس کے ترک پر کوئی گناہ نہیں؛ بل کہ اس زمانہ میں تو اول اقامت میں ہی کھڑا ہونا افضل ہے۔[۶] (تاکہ تسویہ صفوف میں حرج نہ ہو، جس کی بڑی تاکید احادیث میں وارد ہوئی ہے۔) تو اب جب کسی کتاب میں مکروہ لکھا ہے، تو مکروہ کا لفظ یہاں مستحب کے مقابل میں ہے اور مستحب کی مخالفت میں- جیسا کہ اوپر بیان ہوا- گناہ نہیں ہے۔ اور مکروہ کے لفظ سے مکروہ تحریمی مراد لینا قطعاً غلط ہے اور یہ گمراہی ہے، بلکہ درحقیقت یہاں مکروہ سے مکروہ تنزیہی بھی ثابت نہیں ہوتا۔

ہاں اگر کسی جگہ لوگ پہلے سے صف بندی کے پابند ہوں اور سیدھی دیوار کی طرح برابر بیٹھنے کے عادی

---

[۵] حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ۲۱۵/۱، باب صفة الصلاة۔

(۶) أخبرني ابن شهاب: " أن الناس كانوا ساعة يقول المؤذن: الله أكبر، الله أكبر، يقيم الصلاة، يقوم الناس إلى الصلاة، فلا يأتي النبي صلى الله عليه وسلم مقامه حتى يعدل الصفوف ". (المصنف-أبو بكر عبد الرزاق بن همام بن نافع الحميري اليماني الصنعاني (م:۲۱۱هـ): ۵۰۷/۱، رقم الحديث: ۱۹۴۲، كتاب الصلاة، باب قيام الناس عند الإقامة، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، ط: المجلس العلمي-ڈابهيل، الهند)

عن نافع، أن عمر بن الخطاب كان يأمر بتسوية الصفوف، فإذا جاءوا فأخبروه أن قد استوت كبر.

عن ابن عمر قال: كان عمر لا يكبر حتى تعتدل الصفوف، يوكل بذلك رجالا. (المصدر السابق: ۴۷/۲، رقم الحديث: ۲۴۳۸ و ۲۴۳۹)

ہوں، تو ان کے لیے مستحب و افضل یہ ہے کہ شروع اقامت میں نہیں؛ بل کہ حی علی الفلاح پر کھڑے ہوں۔[1]

نوٹ: مکروہ سے مکروہ تحریمی اس جگہ مراد لیا جاتا ہے، جہاں دوسری جگہ اس کے خلاف کی صراحت نہ ہو، جب دوسری کتابوں میں؛ بل کہ اسی کتاب میں دوسری جگہ خود مصنف اس کے مقابل مستحب لفظ بیان کر رہے ہوں، تو مکروہ سے مراد وہاں مکروہ تحریمی بالکل نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] مقتدی حی علی الصلاۃ کے وقت کھڑے ہوں یا اس سے پہلے؟

۸۰۳-سوال: فرض نماز کے لیے امام اور مقتدی، موذن کے حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح کہتے وقت کھڑے ہوں گے یا شروع ہی سے کھڑے ہو جائیں؟ یعنی جب اللہ اکبر (تکبیر) کہی جائے، اسی وقت کھڑے ہو جائیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

نماز پڑھنا فرض، جماعت واجب اور صفوں کو درست کرنا ضروری ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: صفیں درست کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہرے مسخ کر دے گا۔ (بخاری شریف)[2] نیز صفیں درست نہ

---

[۱] مسئلے کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: شامی: ۱/ ۴۷۹، باب صفۃ الصلاۃ ☆ فتاویٰ محمودیہ: ۵/ ۴۰۷-۴۹۸، ط: اشرفی بک ڈپو-دیوبند۔

[۲] النعمان بن بشير يقول قال النبي صلى الله عليه وسلم لتسون صفوفكم أو ليخالفن الله بين وجوهكم. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۰۰، رقم الحديث: ۷۱۷، كتاب الأذان، باب تسوية الصفوف عند الإقامة وبعدها، ط: البدر-ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۸۲، رقم الحديث: ۱۲۷-(۴۳۶)، كتاب الصلاة، باب تسوية الصفوف، وإقامتها، وفضل الأول... الخ، ط: البدر-ديوبند)

قال المحقق مصطفى البغا: (ليخالفن الله بين وجوهكم) يوقع بينها المخالفة بتحويلها عن مواضعها أو المراد اختلاف القلوب ووقوع العداوة والبغضاء بينها]

قال العيني: والمعنى: ليخالفن الله إن لم تقيموا الصفوف؛ لأنه قابل بين الإقامة وبينه، فيكون الواقع أحد الأمرين، وهذا وعيد لمن لم يقم الصفوف بعذاب من جنس ذنبهم لاختلافهم في مقامهم، وقيل: يوقع بينكم العداوة والبغضاء واختلاف القلوب، يقال: تغير وجه فلان علي، أي: ظهر لي من وجهه كراهية في وتغير؛ لأن مخالفتهم في الصفوف مخالفة في الظاهر، واختلاف الظاهر سبب لاختلاف الباطن. وقيل: هو على حقيقته، والمراد تشويه الوجه بتحويل خلقه عن وضعه بجعله موضع القفا، وهذا نظير الوعيد فيمن رفع رأسه قبل الإمام أن يجعل الله رأسه رأس حمار، ويؤيد حمله على ظاهره ما رواه أحمد من حديث أبي أمامة بلفظ: (لتسون الصفوف أو لتطمسن الوجوه).=

کرنے کی وجہ سے تم میں لڑائی جھگڑے کھڑے ہوں گے۔

نمازوں کی صفیں درست نہ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہاری شکل وصورت کو مسخ کردیں گے۔ اب آپ ہی سوچیں کہ برابر صف بندی پہلے سے کھڑے ہونے کی صورت میں ہوگی یا حی علی الصلوۃ کے وقت؟ ظاہر ہے کہ مسجد میں نماز پڑھنے ہی آئے ہیں اور استوائے صفوف واجب ہے؛ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اقامت شروع ہوتے ہی لوگ کھڑے ہو جائیں؛ لیکن اگر کوئی شخص بیٹھا رہے گا اور حی علی الصلاۃ پر کھڑا ہوگا، تو وہ نماز میں سستی کرنے والوں کی فہرست میں داخل نہیں ہوگا؛ اسلیے علامہ طحطاویؒ نے درمختار کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ حی علی الصلاۃ کے وقت کھڑے ہو جائیں اور اس سے زیادہ تاخیر سے احتراز کریں: وقال العلامة الطحطاوي:

"الظاهر أنه احتراز عن التاخير لا التقديم حتى لو قام أول الاقامة لا بأس به".[۲]

اب آپ سوچئے! جو لوگ حی علی الصلاۃ پر کھڑے ہونے کے لیے کہتے ہیں تو ان سے سوال ہے کہ کیا حی علی الصلاۃ پر کھڑا ہونا واجب ہے یا سنت یا مستحب؟ کسی نے بھی واجب نہیں کہا ہے۔ درمختار میں لکھا ہے کہ نماز کے چند آداب ہیں، جن کے ترک پر برا بھلا کہنا یا غصہ کرنا جائز نہیں ہے، جس طرح کہ سنن زوائد کے تارک پر برہمی کا اظہار کرنا درست نہیں ہے۔

تاہم ان (آداب) کی رعایت کرنا بہتر ہے، اگر ان کے نزدیک امام اور مقتدی کا حی علی الصلاۃ کے وقت کھڑا ہونا مستحب ہے، (واجب نہیں ہے) تو ایک مستحب عمل کے بارے میں لڑائی جھگڑا کرنا حرام ہے، نمازی سہولت کے مطابق کھڑے ہوں، تو جائز ہے؛ لیکن اگر کھڑے ہونے میں حی علی الصلاۃ سے زیادہ تاخیر نہ کریں۔

اگر اقامت شروع ہوتے ہی کھڑے ہو جائیں کہ جس سے صف بندی - جو واجب ہے- درست ہو سکے، تو بہتر ہوگا؛ لہٰذا جو لوگ استوائے صفوف کا لحاظ کرتے ہوئے شروع ہی سے کھڑے ہو جائیں، ان پر لعن طعن کرنا اور برا بھلا کہنا حرام ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= قال القرطبي: معناه تفترقون فيأخذ كل واحد وجها غير الذي أخذ صاحبه، لأن تقدم الشخص على غيره مظنة الكبر المفسد للقلب الداعي إلى القطيعة، ويقال: المراد من الوجه إما الذات فالمخالفة بحسب المقاصد، وإما العضو المخصوص، فالمخالفة إما بحسب الصورة الإنسانية وغيرها، وإما بحسب الصفة، وإما بحسب القدام والوراء. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العينى (م:۸۵۵هـ):۵/ ۲۵۳، رقم الحديث: ۷۱۷، باب تسوية الصفوف عند الإقامة وبعدها، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

(۲) حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ۱/ ۲۱۵، باب صفة الصلاة.

(۳) تقدم تفصيله وتخريجه.

[۱۷] امام کی دائیں جانب کھڑے ہونے کی فضیلت

۸۰۴-سوال: بہت سے لوگ نماز میں امام کے پیچھے داہنی جانب کھڑے ہونے کا اہتمام کرتے ہیں، اس بارے میں کوئی فضیلت وارد ہوئی ہو، تو تحریر فرمائیں۔

الجواب حامداومصلیا:

روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنی رحمت نازل فرماتے ہیں، تو اولاً امام پر، پھر اس صف پر، جو امام سے نزدیک ہوتی ہے، اس میں بھی پہلے دائیں جانب، پھر بائیں جانب۔ اسی تفصیل کے مطابق دوسری اور تیسری صف والوں پر اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرماتے ہیں۔

دوسری حدیث میں ہے کہ امام کے پیچھے نماز پڑھنے والے کو ۱۰۰/نماز کا ثواب، اس کی دائیں جانب ۷۵/نماز، بائیں جانب ۵۰/نماز، اس کے بعد ہر ایک کو ۲۵/نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔ (مراقی الفلاح)[1] الغرض مختلف افراد امام کے پیچھے داہنی جانب زیادہ ثواب حاصل کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وأفضل الصفوف أولها ثم الأقرب فالأقرب لما روى أن الله تعالى ينزل الرحمة أولا على الإمام ثم تتجاوز عنه إلى من يحاذيه في الصف الأول ثم إلى الميامن ثم إلى المياسر ثم إلى الصف الثاني، وروى عنه صلى الله عليه وسلم أنه قال: "تكتب للذي خلف الإمام بحذائه مائة صلاة وللذي في الجانب الأيمن خمسة وسبعون صلاة وللذي في الأيسر خمسون صلاة وللذي في سائر الصفوف خمسة وعشرون صلاة". (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ)، ص:۱۱۶، باب الإمامة، "فصل: في "بيان "الأحق بالإمامة و "في بيان "ترتيب الصفوف"، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية ☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م:۹۷۰ھ): ۱/ ۳۷۵، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م:۱۲۵۲ھ): ۱/ ۵۶۹، باب الإمامة، مطلب في الكراهة قيام الإمام في غير المحراب، ط: دار الفكر - بيروت)

عن أنس بن مالك، عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: " من نسي صلاة فليصل إذا ذكرها، لا كفارة لها إلا ذلك {وأقم الصلاة لذكري} [طه:١٤] ". (متفق علیہ، بخاری شریف، حدیث نمبر: ۵۹۷، مسلم شریف: ٦٨٠)

باب إدراك الفرائض وقضاء الفوائت

[فرائض کو پانے اور فوت شدہ نماز کی قضا کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب إدراك الفرائض وقضاء الفوائت

[فرائض کو پانے اور فوت شدہ نماز کی قضا کا بیان]

[۱] امام صاحب کو رکوع میں پانے والا، رکعت کو پانے والا ہوگا

۸۰۵-سوال: ایک شخص جماعت میں ایسے وقت شریک ہوا، جب کہ امام صاحب رکوع میں تھے، شریک ہونے والا آدھے رکوع کے بہ قدر جھک سکا کہ امام صاحب رکوع سے اٹھنے لگے، تو کیا ایسی صورت میں وہ رکعت پانے والا شمار ہوگا؟ بینوا تو جروا۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

مذکورہ صورت میں اگر پشت ٹیڑھی ہو چکی ہو، چاہے پوری ٹیڑھی نہ ہوئی ہو اور ہاتھ بھی گھٹنوں تک نہ پہنچے ہوں اور امام کے رکوع میں ہونے کی حالت میں ہی اس قدر جھک گیا ہو، تو وہ اس رکعت کا پانے والا شمار ہوگا، مگر پوری طرح رکوع میں جانے کے بعد ایک تسبیح کے بہ قدر ٹھہرنا واجب ہے؛ لہٰذا اگر امام کے کھڑے ہونے کے بعد رکوع میں اتنی مقدار ٹھہرا ہو، تو نماز درست ہوگی اور اگر تھوڑا ٹیڑھا ہونے (جھکنے) کے بعد مکمل رکوع کیے بغیر امام کے ساتھ کھڑا ہو گیا، تو واجب چھوڑنے کی وجہ سے نماز کا اعادہ کرنا ہوگا۔ (شامی جلد ۱، صفحہ: ۴۴۷)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) ذكر الجلابي في صلاته أدرك الإمام في الركوع، فكبر قائما ثم شرع في الانحطاط، وشرع الإمام في الرفع، الأصح أن يعتد بها إذا وجدت المشاركة قبل أن يستقيم قائما وإن قل، هكذا في معراج الدراية. (الفتاوى الهندية: ١/ ١٢٠، كتاب الصلاة، الباب العاشر في إدراك الفريضة، ط: زكريا- ديوبند☆رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ٥١٦-٥١٧، كتاب الصلاة، باب ادراك الفريضة، ط: زكريا-ديوبند)

[۲] مقتدی تکبیر تحریمہ کہہ کر قعدہ میں جا رہا ہو کہ امام سلام پھیر دے

۸۰۶-سوال: جماعت ہو رہی تھی، امام صاحب قعدۂ اخیرہ میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ بعد میں آنے والے شخص نے جماعت میں شامل ہونے کے ارادے سے تکبیر تحریمہ کہی، قیام کیا اور قعدہ میں بیٹھنے ہی جا رہا تھا کہ امام صاحب نے سلام پھیر دیا، تو کیا اس صورت میں بعد میں آنے والے شخص کو جماعت میں شامل سمجھا جائے گا؟ جماعت میں شمولیت کی آخری حد کیا ہے؟ مقتدی کا التحیات شروع کر دینا یا پھر قعدہ میں اطمینان سے بیٹھ جانا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آنے والے شخص کی اقتداء کے صحیح ہونے کے لیے امام کا نماز میں ہونا ضروری ہے؛ لہٰذا اگر آنے والا شخص نیت کر کے تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز میں داخل ہو گیا، تو اقتدا صحیح ہو گئی، قعدہ میں بیٹھنا ضروری نہیں ہے؛ لیکن اگر امام نے سلام شروع کیا اور مقتدی نے تکبیر پڑھی، تو اقتداء صحیح نہیں ہوگی اور مذکورہ تکبیر رد و باطل ہو جائے گی؛ کیوں کہ اقتدا کی نیت سے تکبیر کہی تھی اور اقتداء صحیح ہوئی نہیں؛ لہٰذا از سر نو تکبیر کہہ کر نماز کا آغاز کرے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] رکوع میں مقتدی کے ہاتھ گھٹنوں تک نہیں پہونچے تھے کہ امام کھڑا ہو گیا

۸۰۷-سوال: امام صاحب رکوع میں تھے، بعد میں آنے والے شخص نے تکبیر کہی اور امام کے ساتھ شامل ہونے کے لیے جھکے، ابھی ہاتھ گھٹنوں تک پہونچے تھے کہ امام رکوع سے کھڑے ہو گئے، تو کیا بعد میں آنے والا شخص رکعت پانے والا ہوگا؟ رکعت پانے کا معیار کیا ہے؟ ایک مرتبہ سبحان ربي العظیم کہنا یا جھک کر گھٹنوں تک ہاتھ پہنچانا؟

---

(۱) وتنقضي قدوة بالأول قبل عليكم على المشهور عندنا وعليه الشافعية. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله وتنقضي قدوة بالأول) أي بالسلام الأول. قال في التجنيس: الإمام إذا فرغ من صلاته، فلما قال السلام، جاء رجل، واقتدى به قبل أن يقول عليكم، لا يصير داخلا في صلاته؛ لأن هذا سلام؛ ألا ترى أنه لو أراد أن يسلم على أحد في صلاته ساهيا، فقال السلام ثم علم فسكت تفسد صلاته. اهـ. رحمتي. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۶۸، كتاب الصلاة، واجبات الصلاة، مطلب لا ينبغي أن يعدل عن الدراية إذا وافقتها رواية، ط: دار الفكر)

الجواب حامداو مصليا:

رکوع اور رکعت مل جانے کا معیار مقتدی کا رکوع میں شامل ہو جانا ہے، سبحان اللہ پڑھنا معیار نہیں ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] دوران صلاۃ وضوٹوٹ جائے اور مجمع کی زیادتی کی وجہ سے نکلنا دشوار ہو تو کیا کرے؟

۸۰۸-سوال: ایک شخص با جماعت نماز پڑھ رہا ہو، کسی وجہ سے وضوٹوٹ گیا، اب اگر وہ آدمی وضو کرنے کے لیے جائے گا، تو پیچھے بہت سی صفیں ہیں، جن کی وجہ سے اسے کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، مثلاً اجتماع کا موقع ہے، تو ایسے وقت بوڑھے اور جوان آدمی کو کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟

الجواب حامداو مصليا:

فرض نماز کی جماعت میں وضوٹوٹ جائے، تو وضو کر کے جتنی نماز پڑھ چکا ہے، اس پر بناء کرنے کی اجازت ہے اور جماعت چھوٹنے کا اندیشہ ہو، تو بناء کرنا افضل ہے، تنہا نماز پڑھ رہا ہو، تو ایسی صورت میں استیناف (یعنی وضو کر کے از سر نو نماز پڑھنا) افضل ہے۔[۲]

---

(۱) "ومن انتهى إلى الإمام في ركوعه فكبر ووقف حتى رفع الإمام رأسه لا يصير مدركا لتلك الركعة خلافا لزفر رحمه الله" هو يقول أدرك الإمام فيما له حكم القيام فصار كما لو أدركه في حقيقة القيام ولنا أن الشرط هو المشاركة في أفعال الصلاة ولم يوجد لا في القيام ولا في الركوع ". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۷۲، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

قوله: "أو لم يقف بل انحط بمجرد إحرامه فرفع الإمام رأسه" بحيث لم تتحقق مشاركته له فيه فإنه يصح اقتداؤه ولكنه لم يدرك الركعة حيث لم يدركه في جزء من الركوع قبل رفع رأسه منه . . . وقيل في مقدار تسبيحة، قال ابن أمير حاج: والأول أوجه، وقال الحلبي: هو الأصح؛ لأن الشرط المشاركة في جزء من الركوع، وإن قل، والحاصل أنه إذا وصل إلى حد الركوع قبل أن يخرج الإمام من حد الركوع فقد أدرك معه الركعة وإلا فلا. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱ھ)، ص: ۴۵۵، باب إدراك الفريضة، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۶۰، باب إدراك الفريضة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) من سبقه حدث توضأ وبنى. كذا في الكنز. . . . والاستئناف أفضل. كذا في المتون وهذا في حق الكل عند بعض المشايخ، وقيل: هذا في حق المنفرد قطعا، وأما الإمام والمأموم إن كانا يجدان جماعة فالاستئناف أفضل =

صورت مسئولہ میں وضو کرنا فرض ہے، اگر سہولت کے ساتھ صف سے نکلنے کی کوئی صورت ہو، تو جا کر وضو کر لے اور جماعت میں شامل ہو کر بقیہ رکعتیں مکمل کرے، اگر یہ ممکن نہ ہو، تو بہتر ہے کہ وہاں تیمم کر کے نماز کی صورت قائم رکھے، پھر جیسے ہی جگہ ملے، وضو کر کے فرض نماز کو لوٹا لے۔ (شامی جلد ا، صفحہ ۲۴۲)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] فدیہ صلاۃ اپنی بہن یا بھانجی کو دینا

۸۰۹-سوال: زید اپنی والدہ کا فدیہ صلاۃ ادا کر رہا ہے، تو کیا یہ فدیہ وہ اپنی بہن یا بھانجی کو دے سکتا ہے؟ بیّنوا توجروا۔

=أيضا، وإن كانا لا يجدان فالبناء أفضل صيانة لفضيلة الجماعة، وصحح هذا في الفتاوى كذا في الجوهرة النيرة.
(الفتاوى الهندية: ١/ ٩٣، كتاب الصلاة، الباب السادس في الحدث في الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت)
(وإذا ساغ له البناء توضأ) فورا بكل سنة (وبنى على ما مضى) بلا كراهة (ويتم صلاته ثمة) وهو أولى تقليلا للمشي (أو يعود إلى مكانه) ليتحد مكانها (كمنفرد) فإنه مخير، وهذا كله (إن فرغ خليفته وإلا عاد إلى مكانه) حتما لو بينهما ما يمنع الاقتداء (كالمقتدي إذا سبقه الحدث). [الدر المختار]
قال ابن عابدين: (قوله توضأ) أي إن وجد ماء وإلا تيمم، كما يعلم من قولهم في التيمم أعيد ولو بناء رملي. قلت: بل صرح به في البدائع هنا، وقال لأن ابتداء الصلاة بالتيمم جائز فالبناء أولى، فإن تيمم ثم وجد الماء، فإن وجده بعدما عاد إلى مقامه استقبل، وإن قبله في الطريق فالقياس كذلك. وفي الاستحسان يتوضأ ويبني. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ١/ ٦٠٥-٦٠٦، كتاب الصلاة، باب الاستخلاف، ط: دار الفكر)
(١) وحاصله ما ذكره القهستاني بقوله: إن سبق الحدث في المصلي قبل الصلاة، فإن رجا إدراك شيء منها بعد الوضوء لا يتيمم؛ وإن شرع، فإن خاف زوال الشمس تيمم بالإجماع، وإلا فإن رجا إدراكه لا يتيمم، وإلا فإن شرع به تيمم إجماعا، وإن شرع بالوضوء فكذلك عنده خلافا لهما. اهـ وهو محمول على ما إذا خاف خروج الوقت إذا ذهب يتوضأ وإلا فلا بد من الوضوء لأمن الفوات؛ لأنه يمكنه إكمال صلاته بعد سلام إمامه تأمل، وقد اقتصروا في تصوير مسألة البناء على صلاة العيد، وذكر في الإمداد أنه ليس للاحتراز عن الجنازة؛ لأن العلة فيهما واحدة. (رد المحتار على الدر المختار: ١/ ٢٤٢، كتاب الطهارة، باب التيمم، سنن التيمم، ط: دار الفكر)
نوٹ: مذکورہ فقہی جزئیہ ان نمازوں کے لیے ہے، جن کے فوت پر کوئی بدل موجود نہ ہو، جیسا کہ خط کشیدہ عبارت سے واضح ہے، صورت مسئولہ میں جماعت کی فضیلت فوت ہو رہی ہے، خیال ہوتا ہے کہ مذکورہ جزئیہ پر قیاس کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ایسا شخص تیمم کر کے نماز پڑھ لے یا نماز پڑھنے کی صورت بنا لے، بعد میں اس کا اعادہ کر لے۔

الجواب حامداً ومصلیا:

اگر والدہ کے حکم سے یا وصیت کی بنا پر والدہ کے مال میں سے فدیہ ادا کر رہا ہے، تو وہ اپنی بہن کو نہیں دے سکتا، اگر ورثا تبرعاً اپنی جانب سے فدیہ ادا کریں، تو بہن یا بھانجی کو دینا صحیح ہے۔ (رد المحتار ۳/ ۳۴۵)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] کیا مغرب کی نماز میں مسبوق کے لیے تین قعدے ہو سکتے ہیں؟

۸۱۰-سوال: زید کا کہنا ہے کہ اگر کسی کو امام کے ساتھ کسی بھی نماز میں ایک رکعت ملی ہو، تو وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی نماز پوری کرنے کے لیے کھڑا ہو، تو ایک رکعت کے بعد قعدہ کرنا ضروری ہے چاہے مغرب میں تین قعدہ ہوتے ہوں، تو کیا زید کا ایسا کہنا صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

زید کا کہنا صحیح ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک بھی یہی ہے، نیز علماء کا عمل بھی اسی پر ہے، البتہ اگر مسبوق پہلی رکعت میں نہیں بیٹھا، دوسری رکعت پر بیٹھا، تو سجدہ سہو واجب نہ ہوگا۔ اور مسبوق کے لیے پہلی دو باقی ماندہ (چھوٹی ہوئی) رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورہ ملانا واجب ہے۔ (شامی)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] مصرف الكفارة مصرف الفطرة وهو أي مصرف الفطرة مصرف الزكاة. (منحة الخالق على البحر الرائق: ۱۱۶/۴، كتاب الطلاق، باب الظهار، فصل في كفارة الظهار، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(قوله وأصله، وإن علا وفرعه، وإن سفل) بالجر أي لا يجوز الدفع إلى أبيه وجده، وإن علا، ولا إلى ولده وولد ولده، وإن سفل؛... وفيه إشارة إلى أن هذا الحكم لا يخص الزكاة بل كل صدقة واجبة لا يجوز دفعها لهم كأحد الزوجين كالكفارات وصدقة الفطر والنذور، وقيد بأصله وفرعه؛ لأن من سواهم من القرابة يجوز الدفع لهم، وهو أولى لما فيه من الصلة مع الصدقة كالإخوة والأخوات والأعمام والعمات والأخوال والخالات الفقراء. (البحر الرائق: ۲۶۲/۲، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) (والمسبوق -من سبقه الإمام بها أو ببعضها- وهو منفرد) حتى يثني ويتعوذ ويقرأ... (فيما يقضيه) أي بعد متابعته لإمامه، ... ويقضي أول صلاته في حق قراءة، وآخرها في حق تشهد؛ فمدرك ركعة من غير فجر يأتي بركعتين بفاتحة وسورة وتشهد بينهما، وبرابعة الرباعي بفاتحة فقط. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله ويقضي أول صلاته في حق قراءة إلخ) هذا قول محمد كما في مبسوط السرخسي، وعليه اقتصر في الخلاصة وشرح الطحاوي والإسبيجابي والفتح والدرر والبحر وغيرهم وذكر الخلاف كذلك في السراج لكن في صلاة الجلابي أن هذا قولهما وتمامه في شرح إسماعيل. وفي الفيض عن المستصفى: لو أدركه=

[۷] نماز میں شریک ہونے والا نو وارد کب رکعت کا پانے والا شمار کیا جائے گا؟

۸۱۱-سوال: مقتدی تکبیر کہہ کر رکوع میں گیا، اور امام نے سر اٹھا لیا یعنی امام صاحب رکوع سے اٹھ گئے؛ البتہ صف اول کے مقتدی ابھی رکوع میں ہیں، تو رکعت پانا (ملنا) شمار ہوگا یا نہیں؟

یعنی امام کو تو اس شخص نے رکوع میں نہیں پایا، البتہ بعض مقتدی ابھی رکوع میں تھے، تو ایسی صورت میں اس کی وہ رکعت شمار کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر مقتدی کے آگے کوئی صف ہو اور اس صف کے مقتدی ابھی رکوع ہی میں ہوں، خواہ امام نے رکوع سے سر اٹھا لیا ہو، شریک ہونے والے شخص کو رکعت مل گئی۔ (عینی شرح بخاری: ۵/ ۵۰)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= في ركعة الرباعي يقضي ركعتين بفاتحة وسورة ثم يتشهد ثم يأتي بالثالثة بفاتحة خاصة عند أبي حنيفة. وقالا: ركعة بفاتحة وسورة وتشهد ثم ركعتين أولاهما بفاتحة وسورة وثانيتهما بفاتحة خاصة اهـ.

وظاهر كلامهم اعتماد قول محمد (قوله وتشهد بينهما) قال في شرح المنية: ولو لم يقعد جاز استحسانا لا قياسا، ولم يلزمه سجود السهو لكون الركعة أولى من وجه. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۹۶ - ۵۹۷، باب الإمامة، فروع اقتداء متنفل بمتنفل ومن يرى الوتر واجبا بمن يراه سنة، مطلب في أحكام المسبوق والمدرك اللاحق، ط: دار الفكر - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۵۶۵، كتاب الصلاة، حكم المسبوق، ط: زكريا - ديوبند)

(۱) وإذا انتهى إلى الصف الآخر ولم يرفعوا رؤوسهم، أو بقي منهم واحد لم يرفع رأسه، وقد رفع الإمام رأسه، فإنه يركع وقد أدرك الصلاة؛ لأن الصف الذي هو فيه إمامه. وقال ابن أبي ليلى وزفر والثوري: إذا كبر قبل أن يرفع الإمام رأسه فقد أدرك، وإن رفع الإمام قبل أن يضع يديه على ركبتيه، فإنه لا يعتد بها. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۵/ ۵۰، كتاب مواقيت الصلاة، باب من أدرك ركعة من العصر قبل الغروب، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ، ایک غیر مفتیٰ بہ قول پر مبنی ہے؛ جمہور احناف کے نزدیک نماز میں شریک ہونے والے شخص کی رکعت، اسی وقت شمار کی جائے گی، جب کہ کم از کم رکوع میں امام کے ساتھ اس کی مشارکت پائی جائے، خواہ وہ ادنیٰ درجے کی ہی کیوں نہ ہو، اس کے بغیر اس رکعت کا وہ پانے والا شمار نہیں کیا جائے گا، جس میں وہ شریک ہوا ہے:

(ولو اقتدى بإمام راكع فوقف حتى رفع الإمام رأسه لم يدرك) المؤتم (الركعة) لأن المشاركة في جزء من الركن شرط ولم توجد فيكون مسبوقا فيأتي بها بعد فراغ الإمام. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله فوقف) وكذا لو لم يقف بل انحط فرفع الإمام قبل ركوعه لا يصير مدركا لهذه الركعة مع الإمام فتح. ويوجد في =

باب قضاء الفوائت

[۸] فدیہ صوم کی طرح زندہ آدمی کا فدیہ صلاۃ ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

۸۱۲-سوال: زید اپنی والدہ- جو کہ عجوزۂ فانیہ (بہت زیادہ بوڑھی) ہیں- کی طرف سے صوم وصلاۃ کا فدیہ ادا کرنا چاہتا ہے، تو یہ صحیح ہے یا نہیں؟ درمختار کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فدیہ صلاۃ نہیں دے سکتے: **ولو فدى عن صلاته في مرضه لا يصح بخلاف الصوم.** (درمختار)[۱]

اور اُس کو علامہ شامیؒ نے عقلی ونقلی دلائل سے مؤید بھی فرمایا ہے۔[۲] اس لیے اُمید ہے کہ جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

= بعض النسخ: فوقف بلا عذر أي بأن أمكنه الركوع فوقف ولم يركع، وذلك لأن المسألة فيها خلاف زفر، فعنده إذا أمكنه الركوع فلم يركع أدرك الركعة لأنه أدرك الإمام فيما له حكم القيام. ــــــــ (قوله لأن المشاركة) أي أن الاقتداء متابعة على وجه المشاركة ولم يتحقق من هذا مشاركة لا في حقيقة القيام ولا في الركوع فلم يدرك معه الركعة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۰، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، مطلب هل الإساءة دون كراهة أو أفحش، ط: دار الفكر-بيروت)

[۱] الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۷۳، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، مطلب في بطلان الوصية بالختمات والتهاليل، ط: دار الفكر.

(۲) (قوله ولو فدى عن صلاته في مرضه لا يصح) في التتارخانية عن التتمة: سئل الحسن بن علي عن الفدية عن الصلاة في مرض الموت هل تجوز؟ فقال لا. وسئل أبو يوسف عن الشيخ الفاني هل تجب عليه الفدية عن الصلوات كما تجب عليه عن الصوم وهو حي؟ فقال لا. اهـ. وفي القنية: ولا فدية في الصلاة حالة الحياة بخلاف الصوم. اهـ.
أقول: ووجه ذلك أن النص إنما ورد في الشيخ الفاني أنه يفطر ويفدي في حياته، حتى إن المريض أو المسافر إذا أفطر يلزمه القضاء إذا أدرك أياما أخر وإلا فلا شيء عليه، فإن أدرك ولم يصم يلزمه الوصية بالفدية عما قدر، هذا ما قالوه، ومقتضاه أن غير الشيخ الفاني ليس له أن يفدي عن صومه في حياته لعدم النص ومثله الصلاة؛ ولعل وجهه أنه مطالب بالقضاء إذا قدر، ولا فدية عليه إلا بتحقيق العجز عنه بالموت فيوصي بها، بخلاف الشيخ الفاني فإنه تحقق عجزه قبل الموت عن أداء الصوم وقضائه فيفدي في حياته، ولا يتحقق عجزه عن الصلاة لأنه يصلي بما قدر ولو موميا برأسه، فإن عجز عن ذلك سقطت عنه إذا كثرت، ولا يلزمه قضاؤها إذا قدر كما سيأتي في باب صلاة المريض، وبما قررنا ظهر أن قول الشارح بخلاف الصوم أي فإن له أن يفدي عنه في حياته خاص بالشيخ الفاني تأمل. (رد المحتار: ۲/ ۷۳، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، مطلب في بطلان الوصية بالختمات والتهاليل)

الجواب حامداً ومصلیا:

یہ صحیح ہے کہ نمازوں کا فدیہ آدمی کی زندگی میں دینا جائز نہیں ہے، فتاویٰ عالم گیری میں ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے مرض الموت میں نمازوں کے فدیہ کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ کیا یہ جائز ہے؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ جائز نہیں ہے۔

نیز امام ابو یوسف اور امام محمدؒ سے شیخ فانی کے بارے میں سوال کیا گیا کہ اُس پر نماز کا فدیہ واجب ہے یا نہیں؟ جس طرح کہ روزوں کا فدیہ اُس کی زندگی میں واجب ہوتا ہے، تو فرمایا کہ نہیں۔ کذا فی التاتارخانیۃ۔ (عالم گیری)[۱]

علامہ شامیؒ اور علامہ حصکفیؒ نے بھی یہی فرمایا ہے؛ کیوں کہ نماز اشارہ سے بھی پڑھنا فرض ہے، اگر اشارہ سے بھی پڑھنے کی قدرت نہ ہو، تو ساقط ہوجاتی ہے، شیخ فانی اشارہ سے نماز پڑھ سکتا ہے، اور جب تک زندہ ہے، احتمال ہے کہ اشارہ سے نماز پڑھنے پر قادر ہوجائے، اس لیے نمازوں کا فدیہ زندگی میں واجب نہیں ہوگا، اور دینا جائز بھی نہیں ہے۔[۲] ہاں، اُس کے مرنے کی وجہ سے جب عجز متحقق ہوچکا اور اس نے وصیت کی ہو، تو ایک تہائی میں سے ادا کرنا واجب ہے، اور اگر وصیت نہیں کی ہے اور ورثاء اپنی جانب سے تبرعاً ادا کر دیں، تو جائز ہوگا۔ (فتاویٰ ہندیہ: ۱/ ۱۲۵)[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ۔

---

[۱] وفي اليتيمة سئل الحسن بن علي - رضي الله تعالى عنه - عن الفدية عن الصلوات في مرض الموت هل يجوز فقال: لا، وسئل حمير الوبري وأبو يوسف بن محمد عن الشيخ الفاني هل تجب عليه الفدية عن الصلوات كما تجب عليه عن الصوم وهو حي فقال: لا، كذا في التتارخانية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۵، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) دیکھیے: اسی سوال کا حاشیہ نمبر ۲۔

[۳] إذا مات الرجل وعليه صلوات فائتة فأوصى بأن تعطى كفارة صلواته يعطى لكل صلاة نصف صاع من بر وللوتر نصف صاع ولصوم يوم نصف صاع من ثلث ماله ... وفي فتاوى الحجة وإن لم يوص لورثته وتبرع بعض الورثة يجوز. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۵، كتاب الصلاة، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/ ۱۶۰، باب قضاء الفوائت، ط: دار الكتاب - ديوبند ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۳۲، باب قضاء الفوائت، ط: زكريا - ديوبند ☆ قاضي خان على هامش الهندية: ۱/ ۱۱۴، فصل في الترتيب و قضاء المتروكات، ط: زكريا - ديوبند)

[۹] خروج وقت کے بعد اذان کہہ کر با جماعت نماز پڑھنا

۸۱۳-سوال: اگر کسی مسجد میں گھڑی بگڑ گئی ہو، وقت کا کچھ پتہ نہ چل سکے اور ظہر کی نماز کا وقت نکل جائے، اس (خروج وقت) کے بعد اذان دے کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

اذان اور اقامت کہہ کر نماز با جماعت پڑھنا جائز ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کا طریقہ

۸۱۴-سوال: میرے ذمے دو سال کی نمازیں باقی ہیں، میں اب ان کی قضا کرنا چاہتا ہوں، کس طرح قضا کروں؟ تفصیلی بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ قضا کرتے وقت یہ نیت کر لیجیے کہ میں پہلے سال کے پہلے مہینے یعنی: جنوری کی پہلی تاریخ کی چھوٹی ہوئی فجر کی نماز کی قضا کرتا ہوں، پھر ظہر کی، پھر عصر کی، پھر مغرب کی اور پھر عشاء کی، اس طرح روزانہ نمازوں کی قضا کرتے جائیں اور ایک ڈائری میں یادداشت کے لیے لکھتے بھی جائیں؛ اگر یہ طریقہ مشکل معلوم ہو، تو یہ نیت کرلیں کہ میرے ذمہ سب سے پہلی فجر کی جو نماز چھوٹی ہوئی ہے، میں اس کی قضا کرتا ہوں، اس کے بعد ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں بھی اسی طرح قضا کرتے جائیں؛

---

(۱) قال عبد الله: إن المشركين شغلوا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن أربع صلوات يوم الخندق، حتى ذهب من الليل ما شاء الله، فأمر بلالا فأذن، ثم أقام فصلى الظهر، ثم أقام فصلى العصر، ثم أقام فصلى المغرب، ثم أقام فصلى العشاء. (سنن الترمذي: ۱/ ۴۳، رقم الحديث: ۱۷۹، أبواب الصلاة، باب ما جاء في الرجل تفوته الصلوات بأيتهن يبدأ، ط: ديوبند)

(قوله: وكذا الأولى الفوائت وخير فيه للباقي) أي في الأذان إن شاء أذن وإن شاء تركه لما روى أبو يوسف بسنده: أنه -صلى الله عليه وسلم- حين شغلهم الكفار يوم الأحزاب عن أربع صلوات عن الظهر والعصر والمغرب والعشاء قضاهن على الولاء وأمر بلالا أن يؤذن ويقيم لكل واحدة منهن، ولأن القضاء على حسب الأداء. (البحر الرائق: ۱/ ۲۷۶، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: دار الكتاب الإسلامي)

اور روزانہ اسی نیت سے قضاء کرتے جائیں؛ کیوں کہ جب سب سے پہلے چھوٹی ہوئی نماز قضا ہو جائے گی، تو لامحالہ اس کے بعد والی نماز سب سے پہلی ہی رہے گی؛ اس لیے نیت یہی کریں کہ میرے ذمے چھوٹی ہوئی نمازوں میں سے جو سب سے پہلی نماز ہے میں اس کی قضا کرتا ہوں، اس طرح ہر نماز کے وقت میں اگر دو دو نمازوں کی قضا کی جائے گی، تو پانچ سال میں دس سال کی نمازوں کی قضا مکمل ہو جائے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) كثرت الفوائت نوى أول ظهر عليه أو آخره . . . فإن أراد تسهيل الأمر، يقول أول فجر مثلا، فإنه إذا صلاه يصير ما يليه أولا أو يقول آخر فجر، فإن ما قبله يصير آخرا، ولا يضره عكس الترتيب لسقوطه بكثرة الفوائت. وقيل لا يلزمه التعيين أيضا (رد المحتار: ۲/۷۶، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، ط: دار الفكر)

ولو نوى أول ظهر عليه أو آخر ظهر عليه جاز وهذا هو المخلص لمن لم يعرف الأوقات الفائتة أو اشتبهت عليه أو أراد التسهيل على نفسه. (الاشباه و النظائر - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۳۶، القاعدة الثانية: الأمور بمقاصدها، الثالث في بيان تعيين المنوي وعدمه، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

قال اللہ تعالی: {وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ} [۷۴-المدثر: ۴]

وقال اللہ تعالی: {وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُوا} [۵-المائدة: ۶]

تطهير النجاسة من بدن المصلى وثوبه والمكان الذى يصلى عليه واجب. هكذا فى الزاهدى فى باب الأنجاس. (عالمگیری: ۱/ ۵۸)

باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها

[مفسدات ومکروہات کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب مایفسد الصلاۃ ومایکرہ فیھا

[مفسدات ومکروہات کا بیان]

[۱] ناپاک کپڑا مصلّٰی پر رکھ کر نماز پڑھنا

۸۱۵-سوال: ناپاک کپڑا رومال میں لپیٹ کر مصلی پر رکھ دیا جائے اور اُس پر نماز پڑھی جائے، تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر کپڑا نمازی کے بدن سے مس نہ ہو رہا ہو اور نہ ہی نمازی سجدہ میں جاتے ہوئے اس پر ہاتھ یا سر رکھے، تو نماز صحیح ہو جائے گی؛ لیکن احتیاط بہتر ہے۔[1] فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۲] لاؤڈ اسپیکر میں نماز پڑھانا

۸۱۶-سوال: سلام مسنون کے بعد عرض یہ ہے کہ ہمارے یہاں ایک مسجد میں جمعہ کی نماز لاؤڈ اسپیکر میں پڑھائی جاتی ہے، جب کہ جماعت خانہ نمازیوں سے مکمل پُر نہیں ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں شریعت

(۱) قال اللہ تعالی: {وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ} [۷۴-المدثر:۴] وقال اللہ تعالی: {وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُوا} [۵-المائدة:۶]
تطهير النجاسة من بدن المصلي وثوبه والمكان الذي يصلي عليه واجب. هكذا في الزاهدي في باب الأنجاس. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۸، كتاب الصلاة، الباب الثالث في شروط الصلاة، الفصل الأول في الطهارة وستر العورة، ط: بيروت ☆ الهداية: ۱/ ۴۵، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة التي تتقدمها، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ الجوهرة النيرة - أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰ھ): ۱/ ۴۶، كتاب الصلاة، باب شروط صحة الصلاة، ط: المطبعة الخيرية)

کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب نماز میں بھیڑ زیادہ ہو اور امام کی آواز آخری صف تک نہ پہنچ پاتی ہو، تو مسئلہ یہ ہے کہ ایک یا زیادہ مکبر متعین کر کے نماز ادا کی جائے، موجودہ زمانہ میں اس ضرورت کو لاؤڈ اسپیکر سے حاصل کیا جا سکتا ہے، کہ اس کے استعمال کی گنجائش ہے؛ لیکن صورت مسئولہ میں جب کہ مصلی جماعت خانہ میں زیادہ نہیں ہیں، بلا ضرورت لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنا مکروہ ہوگا۔[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا حکم

۸۱۷-سوال: کیا امام کے لیے فرض نماز اور تراویح کی نماز مائک کے ذریعے پڑھانا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً

علماء نے لکھا ہے کہ قرآن شریف ضرورت کے بہ قدر آواز سے زیادہ بلند آواز سے پڑھنا مکروہ ہے۔ (شامی جلد ا: صفحہ ۴۹۷)[۲] اس لیے اگر مقتدی اس قدر زیادہ ہوں کہ امام کی آواز، ان تمام تک نہ پہنچتی ہو، تو گنجائش ہے، ورنہ مکروہ ہے؛ البتہ احتیاط استعمال نہ کرنے میں ہے۔

اس لیے کہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر سے جو آواز بلند ہوتی ہے، وہ قائل کی اصل آواز

(۱) کیوں کہ اس میں مال وقف کا اسراف ہے، حالاں کہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے مسجد میں روشنی کے لیے چراغ دیا ہو تو اس کا بہ قدر ضرورت استعمال جائز ہے، پوری رات جلانا جائز نہیں ہے:

ولو وقف على دهن السراج للمسجد لا يجوز وضعه جميع الليل بل بقدر حاجة المصلين ويجوز إلى ثلث الليل أو نصفه إذا احتيج إليه للصلاة فيه، كذا في السراج الوهاج ولا يجوز أن يترك فيه كل الليل إلا في موضع جرت العادة فيه بذلك كمسجد بيت المقدس ومسجد النبي - صلى الله عليه وسلم - والمسجد الحرام، أو شرط الواقف تركه فيه كل الليل كما جرت العادة به في زماننا، كذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۴۵۹، كتاب الوقف، الباب الحادي عشر في المسجد وما يتعلق به، ط: دار الفكر - بيروت ☆البحر الرائق: ۵/ ۴۲۰، كتاب الوقف، فصل في أحكام المسجد، ط: دار الكتاب - ديوبند)

[۲] (ويجهر الإمام) وجوبا بحسب الجماعة، فإن زاد عليه أساء. (الدر المختار) قال ابن عابدين: (قوله فإن زاد عليه أساء) وفي الزاهدي عن أبي جعفر: لو زاد على الحاجة فهو أفضل، إلا إذا أجهد نفسه أو آذى غيره قهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۳۲، كتاب الصلاة، فصل في القراءة، ط: دار الفكر - ديوبند)

نہیں ہوتی ہے، بل کہ اصل آواز ختم ہوجاتی ہے، اور جو آواز سنائی دیتی ہے، وہ صدائے بازگشت ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہو، تو اس سے نماز فاسد ہوجائے گی؛ چوں کہ اس کے استعمال کے جواز و عدم جواز میں اختلاف ہے۔ (البتہ تحقیق یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر سے سنائی دینے والی آواز صدائے بازگشت نہیں؛ بل کہ متکلم کی اصل آواز ہے، آلہ مکبر الصوت اس آواز کو صرف بلند کردیتا ہے) اس لیے استعمال نہ کرنا بہتر ہے، تاہم ضرورت کے موقع پر استعمال کرے، تو جائز ہے، بلا ضرورت استعمال کرے، تو مکروہ ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] بلا ضرورت نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال

۸۱۸-سوال: ایک گاؤں میں نمازیوں کی تین چار صفیں ہوتی ہیں، امام کی آواز نمازی حضرات کو واضح طریقے سے سنائی دیتی ہے، اس کے باوجود محض شوقیہ بلا کسی ضرورت کے وہاں لاؤڈ اسپیکر (مائیک) کا استعمال کیا جاتا ہے، مائیک پر تراویح اور نماز وغیرہ پڑھائی جاتی ہے، تو کیا یہ جائز ہے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداو مصليا:

نماز میں مائیک کے استعمال کے سلسلہ میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، اس پر بہت سی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ جن کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت کے وقت مائیک استعمال کرنے کی اجازت ہے؛ بلا ضرورت مکروہ ہے۔[۱]

---

(۱) اختلف في الصوت الذي يخرج من مكبر الصوت هل هو صوت المتكلم وتلك الآلة ترفعه وتجهره أم هو صدى، وأصل صوت المتكلم يختتم وينعدم في الآلة؟ وأكثر مشتهرة هذا الفن على الأول، فتجوز الصلاة بتلك الآلة على قولهم، وهو الراجع عند أكثر أهل العلم، فصوت الخطيب بتلك الآلة يصل إلى السامعين ويتأدى الفرض. وأما الأذان بتلك الآلة، فلا اشكال فيه، ومع هذا لاينبغي استعمال هذه الآلة في الصلاة من غير حاجة، بأن يصل صوت الإمام إلى الحاضرين بلاتكلف، فإن الصلاة على هيئة القديمة أحسن وأقرب. (فتاویٰ محمودیہ: ۷/ ۴۸، نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال، ط: اشرفی - دیوبند)

حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جدید تحقیقات کے نتیجے میں یہ ظاہر ہوا ہے کہ آلہ مکبر الصوت سے سنی ہوئی آواز متکلم کی اصلی آواز ہوتی ہے، جس کی وجہ سے فساد نماز کی اصل بنیاد ہی منہدم ہوگئی۔ (آلات جدیدہ، ص: ۳۲، مقدمہ طبع ثالث، ادارۃ المعارف - کراچی ☆ امداد الفتاویٰ: ۱/ ۶۰۷ ضمیمہ، بابت مسئلہ مکبر الصوت، ط: دار العلوم - کراچی)

[۲] (وجهر الإمام بالتكبير) بقدر حاجته للإعلام بالدخول والانتقال. وكذا بالتسميع والسلام. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: . . . والزائد على قدر الحاجة كما هو مكروه للإمام يكره للمبلغ. ـــــــ وفي حاشية أبي السعود: واعلم أن التبليغ عند عدم الحاجة إليه بأن بلغهم صوت الإمام مكروه. وفي السيرة الحلبية: اتفق الأئمة الأربعة على أن التبليغ حينئذ بدعة منكرة أي مكروهة وأما عند الاحتياج إليه فمستحب. (رد المحتار على الدر المختار: =

جب آپ کے گاؤں کی مسجد میں صرف تین یا چار صف ہوتی ہیں، تو محض دکھلاوے کے لیے مائیک کا استعمال کرنا جائز نہیں مکروہ تحریمی ہے، کہ اس میں وقف کے مال کا اسراف لازم آتا ہے، جو ناجائز ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] نماز اور لاؤڈ اسپیکر

۸۱۹-سوال: نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ ہمارے یہاں بڑی مسجد میں جمعہ کے دن نمازیوں کی خاصی تعداد رہتی ہے، جس کی وجہ سے بغیر لاؤڈ اسپکر کے امام صاحب کی آواز باہر تمام مقتدیوں تک نہیں پہونچتی ہے، تو کیا اس صورت میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

شروع میں جب لاؤڈ اسپیکر وجود میں آیا، تو مفتیان کرام کے دو گروہ تھے، سہارن پور کے علماء کا فتویٰ تھا کہ جائز نہیں ہے۔[2] اور دیوبند کے علماء کا فتویٰ تھا کہ جائز ہے۔[3] حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (مفتی اعظم: پاکستان) اس زمانہ میں دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی تھے، اس وقت انہوں نے بڑی تحقیق کے ساتھ نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔[4] اسی وقت سے عام مسلمان اس پر عمل کرتے آرہے ہیں۔

اسی طرح حرم شریف میں بھی نماز لاؤڈ اسپیکر میں ہوتی ہے؛ لیکن بعض علماء، احتیاط کی وجہ سے پرہیز کرتے چلے آئے ہیں، چناں چہ مجمع زیادہ ہو، تو لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن اگر امام کی آواز تمام مقتدیوں کو پہنچ جاتی ہو، تو بلا ضرورت لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ مسئلہ ہے

=۱/ ۴۷۵، کتاب الصلاۃ، واجبات الصلاۃ، مطلب في التبليغ خلف الإمام، ط: دار الفکر - بیروت)

قد تقدم شرح المسئلة وتخريجها تحت عنوان: لاؤڈ اسپیکر میں نماز پڑھانا اور ☆ نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا حکم۔

(۱) إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا إِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝ (۱۷-الإسراء: ۲۷)

(۲) آلات جدیدہ کے شرعی احکام: ص ۱۱، ط: کتب خانہ قاسمی، دیوبند۔

(۳) حوالہ سابق: ص ۱۰۔

(۴) حوالہ سابق: ص ۵۷۔

کہ امام کے لیے بھی خود اپنی آواز ضرورت سے زیادہ بلند کرنا مکروہ ہے۔[۴]

خلاصہ یہ ہے کہ فرض نماز کی جماعت میں اگر لاؤڈ اسپیکر کی ضرورت ہو، تو جائز ہے، البتہ لاؤڈ اسپیکر کو پہلے ٹھیک کر لینا ضروری ہے، نماز میں یا نماز کے شروع ہوتے وقت شور وغل کا ہونا اچھی بات نہیں ہے (آلات جدیدہ-حضرت مفتی محمد شفیع صاحب)[۵] فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۶] سجدہ میں پیر کا انگوٹھا اٹھ جانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی ہے

۸۲۰-سوال: ہمارے یہاں ایک مسئلہ پیش آیا ہے، اس کا جواب عنایت فرما کر مہربانی فرمائیں، مسئلہ یہ ہے کہ: نماز میں سجدہ کی حالت میں یا کسی اور حالت میں پیر کا انگوٹھا اٹھ جائے، تو کیا اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے؟ ہمارے گاؤں کے ایک مولانا صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، ان کی یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

نماز کی صحت کے لیے سجدہ شرط ہے اور سجدہ کی شرائط میں سے یہ ہے کہ دونوں پیروں کی انگلیوں میں سے کوئی ایک انگلی تھوڑی دیر کے لیے زمین پر لگ جائے۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں ان مولانا صاحب کا کہنا صحیح نہیں ہے؛ لہٰذا دائیں یا بائیں پیر میں سے کوئی

---

[۴] (وجهر الإمام بالتكبير) بقدر حاجته للإعلام بالدخول والانتقال. وكذا بالتسميع والسلام. (الدر المختار) قال ابن عابدين: ... والزائد على قدر الحاجة كما هو مكروه للإمام يكره للمبلغ. ـــــــ وفي حاشية أبي السعود: واعلم أن التبليغ عند عدم الحاجة إليه بأن بلغهم صوت الإمام مكروه. وفي السيرة الحلبية: اتفق الأئمة الأربعة على أن التبليغ حينئذ بدعة منكرة أي مكروهة وأما عند الاحتياج إليه فمستحب. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۷۵، كتاب الصلاة، واجبات الصلاة، مطلب في التبليغ خلف الإمام، ط: دار الفكر-بيروت)

(۵) نوٹ: لاؤڈ اسپیکر (Loud speaker) سے نماز کے جواز وعدم جواز کا اختلاف درحقیقت ایک دوسرے اختلاف پر مبنی ہے کہ کہ لاؤڈ اسپیکر (Loud speaker) کی آواز بعینہٖ متکلم کی آواز ہے یا آواز متکلم کا غیر ہے، علماء سہارن پور کی تحقیق یہ تھی کہ آلہ مکبر الصوت کی آواز متکلم کی آواز کا غیر ہے اور علماء دیوبند اور مفتی اعظم پاکستان کی تحقیق یہ تھی کہ آلہ مکبر الصوت (Loud speaker) کی آواز بعینہٖ متکلم کی آواز ہے؛ مگر یہ اختلاف عہد قدیم کا ہے اب یہ مسئلہ متفق علیہ ہو گیا ہے اور ہر ایک کے یہاں لاؤڈ اسپیکر سے نماز درست ہے، مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: آلات جدیدہ کے شرعی احکام، از: حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی صاحبؒ)

ایک پیر کا انگوٹھا زمین پر ٹک جائے، تو نماز صحیح ہو جائے گی۔[۱] (درمختار وشامی: ۱/۴۱۶)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] بہ حالت سجدہ پاؤں کی انگلیوں کا زمین سے اٹھالینا

۸۲۱-سوال: نماز میں بہ حالت سجدہ، دونوں پیر زمین سے اونچا کرنے کے متعلق درج ذیل دو مسئلوں کے جواب مطلوب ہیں:

(۱) اگر کوئی انسان بہ حالت سجدہ دونوں پاؤں کی انگلیوں کو ایک سیکنڈ کے لیے زمین سے اٹھالے تو کیا اس کی نماز درست ہو جائے گی؟

(۲) کوئی انسان دونوں سجدوں میں دونوں پاؤں کی انگلیاں زمین پر تھوڑی دیر کے لیے بھی نہ رکھے، تو کیا اس کا سجدہ ادا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

دونوں پاؤں کی انگلیاں زمین پر رکھنا ضروری ہے، اگر بالکل ہی نہ رکھے، تو نماز ادا نہ ہوگی اور اگر صرف ایک پاؤں کی انگلیاں رکھے، تو نماز مکروہ ہوگی۔

اگر دونوں پاؤں کی انگلیاں زمین پر رکھنے کے بعد اٹھالی، تو اگر ایک مرتبہ سبحان اللہ پڑھنے کی مقدار رکھنے کے بعد اٹھائی ہے، تو نماز جائز ہوگی اور اگر اتنی مقدار سے کم ہو، تو نماز کا اعادہ ضروری ہوگا۔ (عالم گیری جلد ۱ صفحہ ۴۱)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وخرج أيضا بقولنا: "مما لا سخرية فيه" ما إذا رفع قدميه في السجود، فإنه لا يصح؛ لأن السجود مع رفعهما بالتلاعب أشبه منه بالتعظيم والإجلال، ويكفيه وضع أصبع واحدة فلو لم يضع الأصابع أصلا، ووضع ظهر القدم فإنه لا يجوز؛ لأن وضع القدم بوضع الأصبع، وإذا وضع قدما ورفع آخر، جاز مع الكراهة من غير عذر، كما أفاده قاضي خان، وذهب شيخ الإسلام إلى أن وضعهما سنة، فتكون الكراهة تنزيهية، والأوجه على منوال ما سبق هو الوجوب، فتكون الكراهة تحريمية لما سبق من الحديث، وذكر القدوري أن وضعهما فرض، وهو ضعيف. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۱/۳۳۶، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۲] رد المحتار على الدر المختار: ۱/۴۴۷، كتاب الصلاة، بحث الركوع والسجود، ط: دار الفكر-ديوبند.

(۱) ولو سجد ولم يضع قدميه على الأرض لا يجوز، ولو وضع إحداهما جاز مع الكراهة إن كان بغير عذر. كذا في شرح منية المصلي لابن أمير الحاج، ووضع القدم بوضع أصابعه، وإن وضع أصبعا واحدة، فلو وضع ظهر القدم=

[۸] سجدہ کی حالت میں پاؤں اٹھالینا

۸۲۲-سوال: ''اگر کوئی شخص نماز میں تین مرتبہ سبحان اللہ پڑھنے کے بہ قدر سجدہ میں دونوں پاؤں زمین سے اٹھالے، تو نماز فاسد ہو جائے گی، اور دو مرتبہ سبحان اللہ پڑھنے کی مقدار ہو، تو درست جائے گی''۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

نماز کے سجدہ میں دونوں پاؤں زمین پر رکھنا فرض ہے، اگر پاؤں بالکل نہ رکھے، تو نماز نہیں ہوگی اور اگر ایک مرتبہ سبحان اللہ پڑھنے کی بہ قدر رکھ کر اٹھالے، تو نماز ہو جائے گی، خواہ تین مرتبہ سبحان اللہ پڑھنے کی بہ قدر یا اس سے زیادہ دیر تک اٹھائے ہوئے ہو، البتہ پورے سجدہ میں پاؤں زمین پر رکھنا بہتر ہے۔ (درمختار، البحرالرائق)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] نماز میں گرم ٹوپی وغیرہ سے پیشانی ڈھانک کر سجدہ کرنا

۸۲۳-سوال: ایک شخص نماز میں سردی کے موسم میں گرم ٹوپی یا مفلر (گلوبند) باندھے ہوئے ہو، جس کی وجہ سے اس کی پیشانی ڈھک [چھپ] جاتی ہو، تو اس حال میں اس کا سجدہ ادا ہوگا یا نہیں؟

=دون الأصابع بأن كان المكان ضيقا، إن وضع إحداهما دون الأخرى تجوز صلاته، كما لو قام على قدم واحدة. كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۰، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الأول في فرائض الصلاة، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار: ۱/ ۴۹۹، باب صفة الصلاة، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل، ط: دار الفكر)

[۱] (ومنها السجود) بجبهته وقدميه، ووضع إصبع واحدة منهما شرط. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله وقدميه) يجب إسقاطه لأن وضع إصبع واحدة منهما يكفي كما ذكره بعد ح. وأفاد أنه لو لم يضع شيئا من القدمين لم يصح السجود. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۴۷، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، بحث الركوع والسجود، ط: دار الفكر)

ويكفيه وضع أصبع واحدة، فلو لم يضع الأصابع أصلا، ووضع ظهر القدم فإنه لا يجوز. (البحر الرائق: ۱/ ۵۵۶، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الكتاب ديوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: سجدہ میں پیر کا انگوٹھا اٹھ جانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی ہے ☆ بہ حالت سجدہ پاؤں کی انگلیوں کا زمین سے اٹھالینا۔

الجواب حامداًومصلیاً:

سجدہ کا معنیٰ زمین پر پیشانی کو جمانا ہے۔[۱] جب سجدے میں پیشانی اور ناک کو رکھ لیا، اگر چہ ٹوپی پہننے کی حالت میں ہو اور پیشانی اچھی طرح زمین پر جم گئی تو سجدہ ادا ہو گیا۔

اُس لیے اگر ٹوپی یا مفلر باندھنے کی حالت میں پیشانی جم جاتی ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں، نماز ہوجائے گی، تاہم بہتر ہے کہ وہ گرم ٹوپی یا مفلر پیشانی سے اوپر ہی رکھے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱)سجد: (أبو عبيد عن أبي عمرو) : أسجد الرجل إذا طأطأ رأسه وانحنى، وسجد إذا وضع جبهته بالأرض. (تهذيب اللغة- محمد بن أحمد بن الأزهري الهروي، أبو منصور (م:۳۷۰هـ):۱۰/ ۳۰۰، أبواب الجيم والسين، ت: محمد عوض مرعب، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت☆لسان العرب- ابن منظور الأنصاري، الإفريقي (م:۷۱۱هـ): ۳/ ۲۰۴، فصل السين المهملة، ط: دار صادر - بيروت)

(۲)عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: أمرت أن أسجد على سبعة أعظم على الجبهة، وأشار بيده على أنفه واليدين والركبتين، وأطراف القدمين ولا نكفت الثياب والشعر. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۱۲، رقم الحديث: ۸۱۲، كتاب الأذان، باب السجود على الأنف، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۹۳، رقم الحديث: ۲۲۸-(۴۹۰)، كتاب الصلاة، باب أعضاء السجود، والنهي عن كف الشعر والثوب وعقص الرأس في الصلاة، ط: ديوبند)

ومنها (من السنن) أن يسجد على الجبهة والأنف من غير حائل من العمامة والقلنسوة... ولو سجد على كور العمامة ووجد صلابة الأرض جاز عندنا كذا ذكر محمد في الآثار. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۱۰، فصل في سنن حكم التكبير أيام التشريق، ط: دار الكتب العلمية)

ويسجد على أنفه وجبهته.... ولو سجد على كور عمامته أو فاضل ثوبه جاز. (المختار)

قال في شرحه: (ولو سجد على كور عمامته أو فاضل ثوبه جاز) قال ابن عباس: رأيت النبي - صلى الله عليه وسلم - يسجد على كور عمامته. وقال أيضا: إنه - عليه الصلاة والسلام - صلى في ثوب واحد يتقي بفضوله حر الأرض وبردها، ولو سجد على السرير والعرزال، جاز ولو سجد على الحشيش والقطن إن وجد حجمه بجبهته كالطنفسة واللبد والحصير جاز. (الاختيار لتعليل المختار - عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م:۶۸۳هـ): ۱/ ۵۱- ۵۲، كتاب الصلاة، باب الأفعال في الصلاة، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة☆الفتاوى التاتارخانية: ۲/ ۱۴۵، كتاب الصلاة، فصل في السجود، ط: زكريا - ديوبند)

(فائدة) قال البيهقي: أحاديث كان يسجد على كور عمامته لا يثبت منها شيء، يعني مرفوعا. وحكي عن الأوزاعي أنه قال: كانت عمائم القوم صغارا لينة، وكان السجود على كورها لا يمنع من وصول الجبهة إلى الأرض. وقال الحسن: كان أصحاب رسول الله - صلى الله عليه وسلم - يسجدون وأيديهم في ثيابهم. ويسجد الرجل منهم على عمامته. علقه البخاري، ووصله البيهقي، وقال: هذا أصح ما في السجود على العمامة موقوفا على الصحابة. (التلخيص الحبير في تخريج أحاديث الرافعي الكبير - ابن حجر العسقلاني (م:۸۵۲هـ): ۱/ ۶۱۵، باب صفة الصلاة، ط: دار الكتب العلمية)

[۱۰] امام کا لنگی پہن کر نماز پڑھانا

۸۲۴-سوال: اگر کسی نے لنگی پہن کر نماز پڑھائی، تو نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ ہم نے یہ سن رکھا ہے کہ لنگی پہننا جائز نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لنگی نہیں پہنی ہے۔

الجواب حامداومصلیا:

یہ بات صحیح نہیں ہے کہ لنگی پہننا جائز نہیں، یہ بھی درست نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لنگی نہیں پہنی ہے، صحیح بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری عمر لنگی ہی پہنی ہے، اور اُسی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز بھی پڑھائی ہے، ازار کا خریدنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؛ البتہ پہننا ثابت نہیں ہے۔[۱]

لیکن چوں کہ قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: {يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ}.[۲]

ترجمہ: اے اولادِ آدم علیہ السلام کی تم مسجد کی ہر حاضری (یعنی عبادت) کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔

اس آیتِ کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے فقہاء کرام نے فرمایا کہ ایسے معمولی کپڑے پہن کر نماز پڑھنا مکروہ ہے؛ جن میں بندہ لوگوں کے سامنے آنے سے شرم محسوس کرتا ہے، اگر آپ عام معمول کے مطابق

---

(۱) عن سويد بن قيس قال: جلبت أنا ومخرفة العبدي بزا من هجر، فأتانا رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحن بمنى، ووزان يزن بالأجر، فاشترى منا سراويل، فقال للوزان: زن وأرجح. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي- أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳ھ): ۷/ ۲۸۴، رقم الحديث: ۴۵۹۲، كتاب البيوع، الرجحان في الوزن، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية- حلب)

قال السيوطي ذكر بعضهم أن النبي صلى الله عليه وسلم اشترى السراويل ولم يلبسها.

وفي الهدي لابن القيم الجوزي أنه لبسها فقيل إنه سبق قلم لكن في مسند أبي يعلى والمعجم الأوسط للطبراني بسند ضعيف، عن أبي هريرة قال دخلت يوما السوق مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فجلس إلى البزازين فاشترى سراويل بأربعة دراهم، قلت يا رسول الله وإنك لتلبس السراويل، فقال أجل في السفر والحضر والليل والنهار، فإني أمرت بالستر فلم أجد شيئا أستر منه، كذا في فتح الودود. (تحفة الأحوذي بشرح جامع الترمذي- أبو العلا محمد عبد الرحمن بن عبد الرحيم المباركفوری (م: ۱۳۵۳ھ): ۴/ ۴۴۳، تحت: رقم الحديث: ۱۳۰۵، باب ما جاء في الرجحان في الوزن، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۲] ۷- الأعراف: ۳۱.

لنگی پہن کر بازار، آفس اور دعوت وغیرہ کی تقریبات میں جاتے ہیں، تو لنگی پہن کر مسجد میں آ کر نماز پڑھنا اور پڑھانا بھی صحیح ہے، مگر وہ اُس وقت ہے جب کہ لوگوں کے سامنے آفس، بازار نیز شادی وغیرہ کی تقریبات میں آپ لنگی پہننا باعثِ عار سمجھتے ہوں اور نماز کے لیے اُس کو پہن لیں۔ [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] نماز میں آگے پیچھے ہٹنا

۸۲۵-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ: ہمارے گاؤں

---

(۳) عن ابن جريج قال: أخبرني نافع، أن ابن عمر كساه ثوبين وهو غلام قال: فدخل المسجد فوجده يصلي متوشحا به في ثوب فقال: أليس لك ثوبان تلبسهما؟ فقلت: بلى. فقال: أرأيت لو أني أرسلتك إلى وراء الدار لكنت لابسهما؟ قال: نعم قال: فالله أحق أن تتزين له أم الناس؟ قال نافع: فقلت: بل الله. (مصنف عبد الرزاق-أبو بكر عبد الرزاق بن همام بن نافع الحميري اليماني الصنعاني (م:۲۱۱هـ): ۱/ ۳۵۷، رقم الحديث: ۱۳۹۰، كتاب الصلاة، باب ما يكفي الرجل من الثياب، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، ط: المجلس العلمي- الهند☆ شرح صحيح البخاري لابن بطال- ابن بطال أبو الحسن علي بن خلف بن عبد الملك (م: ۴۴۹هـ): ۲/ ۱۸، كتاب الصلاة، باب عقد الإزار على القفا في الصلاة، ت: أبو تميم ياسر بن إبراهيم، ط: مكتبة الرشد- السعودية، الرياض)

وسأل رجل ابن عمر - رضي الله عنهما - عن الصلاة في ثوب واحد، فقال: أرأيت لو أرسلتك في حاجة كنت منطلقا في ثوب واحد؟ فقال: لا. فقال: الله أحق أن تتزين له. وروى الحسن عن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - أن الصلاة في إزار واحد فعل أهل الجفاء، وفي ثوب واحد متوشحا به أبعد عن الجفاء، وفي إزار ورداء من أخلاق الكرام. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱/ ۳۴، مكروهات الصلاة، ط: دار المعرفة - بيروت☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۲۱۹، فصل بيان ما يستحب في الصلاة وما يكره، ط: دار الكتب العلمية ☆المحيط البرهاني -ابن مازة البخاري الحنفي (م:۶۱۶هـ): ۱/ ۳۷۷، كتاب الصلاة، الفصل السادس عشر في التغني والألحان، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ): ص: ۳۴۴، ۳۵۹، مكروهات الصلاة، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت)

(و) كره ... (وصلاته في ثياب بذلة) يلبسها في بيته (ومهنة) أي خدمة، إن له غيرها وإلا لا. (الدر المختار)ـــــ قال ابن عابدين: (قوله وصلاته في ثياب بذلة) بكسر الباء الموحدة وسكون الذال المعجمة: الخدمة والابتذال، وعطف المهنة عليها عطف تفسير؛ وهي بفتح الميم وكسرها مع سكون الهاء، وأنكر الأصمعي الكسر حلية. قال في البحر، وفسرها في شرح الوقاية بما يلبسه في بيته ولا يذهب به إلى الأكابر والظاهر أن الكراهة تنزيهية. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۴۰، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، مطلب في الكراهة التحريمية والتنزيهية، ط: دار الفكر - بيروت)

میں ایک پیش امام ہیں، وہ جہری اور سری؛ دونوں نماز میں مصلّی (جائے نماز) پر جس جگہ کھڑے رہتے ہیں ،وہاں سے دوارانِ نماز (رکوع اور سجدہ میں جاتے ہوئے) کھسکتے کھسکتے بالکل اس کے کنارے پر آجاتے ہیں ،پھر واپس اپنی جگہ چلے جاتے ہیں ،اس طرح کرتے رہتے ہیں، ان کو کسی طرح کا عذر بھی نہیں ہے ،بسا اوقات ان کے پیر بھی حالت سجدہ میں زمین سے اٹھ جاتے ہیں ،بعض مقتدیوں نے اس جانب توجہ دلائی، مگر عادت سے باز نہیں آتے ،تو کیا ایسے امام کے پیچھے ہماری نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

بہت سے مقتدی بھی نماز میں اپنے پیروں کو آگے پیچھے کرکے اپنی جگہ سے ہٹتے رہتے ہیں ،تو اس حالت میں ان کی بھی نماز صحیح ہوتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کا مفصل ومدلل جواب عطا فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

صورتِ مسئولہ میں امام کی نماز بغیر کسی شک وشبہ کے صحیح ہے۔ ان کی نماز کے صحیح نہ ہونے کے متعلق شک کرنا درست نہیں۔

سجدہ کی حقیقت چہرے کا زمین پر بہ طریق تعظیم رکھنا ہے۔[۱] اس کی صحت کے لیے پیروں کی انگلیوں کا زمین پر خواہ تھوڑی دیر کے لیے رکھنا شرط ہے۔ اس میں پیروں کا ایک ہی جگہ رکھے رکھنا شرط نہیں؛ اس لیے امام صاحب کی نماز صحیح ہے۔ (شامی ۱/۴۶۶-طحطاوی: ۱۲۶) **وفیہ یفترض وضع أصابع القدم ولو واحدۃ.** (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۰۴، زکریا دیوبند- ہندیہ: ۱/ ۷۰)[۲]

مقتدیوں کی نماز کا بھی یہی حکم ہے کہ جب ان کی انگلیاں سجدہ میں تھوڑی دیر کے لیے لگ گئی ہوں، تو پھر ہٹنے سے نقصان نہ ہوگا، ان کی نماز صحیح ہے، البتہ صف کے آگے پیچھے ہونے سے صف سیدھی نہ رہے گی، تو سنت کے خلاف ہوگا؛ لیکن نماز ہوجائے گی۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: أمرت أن أسجد على سبعة أعظم على الجبهة، وأشار بيده على أنفه واليدين والركبتين، وأطراف القدمين ولا نكفت الثياب والشعر. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۱۲، رقم الحديث: ۸۱۲، كتاب الأذان، باب السجود على الأنف، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۹۳، ۲۲۸-(۴۹۰)، كتاب الصلاة، باب أعضاء السجود، والنهي عن كف الشعر والثوب وعقص الرأس في الصلاة، ط: ديوبند)

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان ''نماز میں گرم ٹوپی وغیرہ سے پیشانی ڈھانک کر سجدہ کرنا'' کا حاشیہ نمبر: ۱۔

(۲-۳) تفصیل تخریج کے لیے دیکھیے: ''نماز میں گرم ٹوپی وغیرہ سے پیشانی ڈھانک کر سجدہ کرنا'' اور ''سجدہ میں پیر کا انگوٹھا اٹھ جانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی ہے'' کے حواشی۔

[۱۲] نماز میں پیر آگے پیچھے ہوجانا یا ایڑی زمین سے اٹھ جانا

۸۲۶-سوال: امام صاحب جب مصلی (جائے نماز) پر کھڑے ہوتے ہیں، تو ان کے پیر پیچھے سے اٹھ جاتے ہیں، یا ان کے پیر اپنی جگہ سے ہٹ جاتے ہیں، تو ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

قیام کی حالت میں ایڑی اوپر اٹھ جانے سے، یا پیر کچھ آگے پیچھے ہوجانے سے نماز ہوجائے گی، اس سے نماز میں کوئی نقصان نہ آئے گا۔ (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] رکوع یا سجدہ میں امام سے سبقت کرنا

۸۲۷-سوال: جماعت کی نماز میں مقتدی امام سے پہلے رکوع یا سجدہ کرے تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

رکوع وسجدہ میں مقتدی کا امام سے سبقت کرنا جائز نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: کیا تم میں سے کوئی، جو اپنا سر امام سے پہلے اٹھالیتا ہے، اس بات کا خوف نہیں کرتا کہ اللہ اس کے سر کو گدھے کا سا سر بنادے یا اللہ اس کی صورت کو گدھے کی سی صورت بنادے۔ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا سر گدھے کے سر

---

(۱) وإن حرك رجلا واحدة لا على الدوام لا تفسد صلاته وإن حرك رجليه تفسد واعتبر هذا القائل العمل بالرجلين بالعمل باليدين والعمل برجل واحدة، وقال بعضهم: إن حرك رجليه قليلا لا تفسد صلاته. كذا في المحيط وهو الأوجه. هكذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۳، كتاب الصلاة، الباب السابع فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها، الفصل الأول فيما يفسدها، ط: دار الفكر ☆ البناية شرح الهداية - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۲/ ۴۴۹، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فصل في العوارض التي تكره في الصلاة، الأكل والشرب في الصلاة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتاوى التاتار خانية: ۲/ ۲۳۵، كتاب الصلاة، فصل ما يفسد الصلاة وما لا يفسد، ط: زكريا - ديوبند ☆ النهر الفائق شرح كنز الدقائق - سراج الدين عمر بن إبراهيم بن نجيم الحنفي (م: ۱۰۰۵هـ): ۱/ ۲۷۴، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ت أحمد عزو عناية، ط: دار الكتب العلمية)

جیسا بنا دیں گے۔ (بخاری شریف)[۱]

البتہ اگر بے خیالی میں امام سے سبقت کر گیا، تو اگر امام بھی اس کے ساتھ اس رکوع یا سجدے میں شریک ہو گیا تو نماز ہو گئی اور اگر امام کے رکوع یا سجدہ میں آنے سے پہلے ہی اس نے اپنا سر اٹھا لیا، اس کے بعد امام نے رکوع یا سجدہ کیا، تو مقتدی اگر امام کے ساتھ دوبارہ وہ رکوع یا سجدہ کر لیتا ہے، تو نماز ہو جائے گی، ورنہ اس کی نماز نہ ہوگی۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] نماز میں محبوبہ کا خیال آنے سے نماز ترک کرنا

۸۲۸-سوال: زید کو ایک لڑکی سے بہت محبت ہے، ہر وقت اس کا خیال آتا رہتا ہے؛ یہاں تک کہ نماز میں بھی اس کے متعلق وساوس آتے رہتے ہیں، وہ پانچوں وقت کی نماز کا پابند ہے؛ لیکن لڑکی سے بے انتہاء محبت ہے، جس کی وجہ سے نماز میں آنے والے خیالات سے وہ پریشان ہے، زید کہتا ہے کہ کیا ایسی صورت میں مجھے نماز چھوڑ دینی چاہئے؟ ان خیالات کے ساتھ نماز پڑھنا گناہ تو نہ ہوگا؟ رہنمائی فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

نماز پڑھنا ہر حال میں فرض ہے، نماز چھوڑنا جائز نہیں۔[۳] نماز میں خیالات کا لانا برا ہے، خیالات

---

(۱) عن محمد بن زياد، سمعت أبا هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "أما يخشى أحدكم - أو: لا يخشى أحدكم - إذا رفع رأسه قبل الإمام، أن يجعل الله رأسه رأس حمار، أو يجعل الله صورته صورة حمار". (صحيح البخاري: ۱/۹۶، رقم الحديث: ۶۹۱، باب إثم من رفع رأسه قبل الإمام، كتاب الأذان، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/۱۸۱، رقم الحديث: ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶-(۴۲۷)، كتاب الصلاة، باب تحريم عن سبق الإمام بركوع أو سجود ونحوهما، ط: ديوبند)

[۲] (ولو ركع) قبل الإمام (فلحقه إمامه فيه صح) ركوعه، وكره تحريما... (وإلا لا) يجزيه. (الدر المختار) (قوله وإلا لا) أي وإن لم يلحقه إمامه فيه بأن رفع رأسه قبل أن يركع الإمام... لا يجزيه. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۶۱، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۴- النساء: ۱۰۳)

عن أبي الدرداء، قال: أوصاني خليلي صلى الله عليه وسلم أن: لا تشرك بالله شيئا، وإن قطعت وحرقت، ولا تترك صلاة مكتوبة متعمدا، فمن تركها متعمدا، فقد برئت منه الذمة، ولا تشرب الخمر، فإنها مفتاح كل شر. (سنن ابن ماجه، رقم الحديث: ۴۰۳۴، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، ط: أشرفيه - ديوبند)

وساوس کا از خود آجانا برا نہیں ہے، بل کہ اگر خیالات و وساوس کے ہجوم کے باوجود کوئی نماز کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کرتا رہے، تو اسے مجاہدے کا ثواب ملے گا۔

اس لیے خیالات و وساوس کی وجہ سے زید کے لیے نماز کا ترک کرنا جائز نہ ہوگا، البتہ چاہیے کہ وہ روزانہ صبح وشام کثرت سے استغفار کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف دل سے متوجہ ہو کر نماز پڑھنے کی کوشش کرے، ان شاء اللہ وساوس ختم ہو جائیں گے۔[1] ان وساوس کے ساتھ بھی نماز ہو جائے گی۔[2] (اسے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ غیر اللہ کی ایسی محبت جو خالق سے توجہ کو ہٹا دے، بھلا کیوں کر درست ہو سکتی ہے؟؟؟) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] نماز میں شیطانی وسواس کا علاج

۸۲۹-سوال: سلام مسنون کے بعد عرض ہے کہ میں جب نماز پڑھنے لگتا ہوں، تو مسلسل شیطانی وساوس شروع ہو جاتے ہیں، جس سے دل بہت بے چین اور پریشان ہوتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؛ اس لیے آپ سے عرض ہے کہ اس کا کوئی علاج بیان فرمائیں، یعنی دعا یا کوئی قرآنی آیت پڑھنے کی ہو، تو رہنمائی

---

(۱) عن عبد الله بن عباس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من لزم الاستغفار جعل الله له من كل هم فرجا، ومن كل ضيق مخرجا، ورزقه من حيث لا يحتسب. (سنن ابن ماجه: ۱/ ۲۷۱، باب الاستغفار، أبواب الأدب، ط: البدر-ديوبند)

[۲] عن مالك أنه بلغه أن رجلا سأل القاسم بن محمد فقال: إني أهم في صلاتي. فيكثر ذلك علي. فقال القاسم بن محمد "امض في صلاتك. فإنه لن يذهب عنك، حتى تنصرف وأنت تقول: ما أتممت صلاتي". (موطأ الإمام مالك: ۱/ ۱۰۰، رقم: ۳، كتاب السهو، باب العمل في السهو، ت: محمد فؤاد عبد الباقي، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

قال الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): (فقال له: امض في صلاتك): سواء كانت الوسوسة خارج الصلاة أو داخلها، ولا تلتفت إلى موانعها (فإنه لن يذهب ذلك عنك)... والمعنى لا يذهب عنك تلك الخطرات الشيطانية، (حتى تنصرف) أي: تفرغ من الصلاة (وأنت تقول): للشيطان صدقت (ما أتممت صلاتي): لكن ما أقبل قولك، ولا أتمها إرغاما لك، ونقضا لما أردته مني، وهذا أصل عظيم لدفع الوساوس، وقمع هواجس الشيطان في سائر الطاعات، والحاصل أن الخلاص من الشيطان إنما هو بعون الرحمن، والاعتصام بظواهر الشريعة، وعدم الالتفات إلى الخطرات، والوساوس الذميمة، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۱/ ۱۴۷، كتاب الإيمان، باب الوسوسة، ط: دار الفكر، بيروت-لبنان)

فرمائیں، تاکہ میری نماز صحیح ہوجائے اور دین ودنیا کی کامیابی میسر ہو، اس دعا کو پڑھنے کا طریقہ اور وقت وغیرہ بھی تفصیل سے بیان فرمائیں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اور مجھ پر بڑا احسان ہوگا، باقی دعائے خیر میں یاد فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

شیطانی وساوس اور برے خیالات کو رفع کرنے کے لیے صبح شام ۱۷-۱۷ دفعہ ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم'' کا ورد رکھیے، ان شاء اللہ اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] ٹخنوں سے نیچے پاجامہ لٹکانا ہر حال میں ممنوع ہے

[۱۷] نماز کے وقت پائینچے چڑھانا پھر اتار دینا

۸۳۰-سوال: شریعت نے مردوں کو پاجامہ، لنگی، پینٹ وغیرہ کو ٹخنوں سے اوپر باندھنے کا حکم دیا ہے، تو یہ حکم صرف نماز کی حالت میں ہے یا عام حالت میں بھی؟ بہت سے لوگ صرف نماز کے وقت پاجامہ یا پینٹ ٹخنوں سے اوپر کرتے ہیں اور بعض تو اس طرح کرتے ہیں کہ صرف نیچے کے پائینچے موڑ دیتے ہیں، تو نماز کے وقت یہ پائینچے موڑنا (چڑھانا) کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ازار، لنگی، پینٹ، کرتہ، جبّہ، چغا وغیرہ ٹخنوں سے نیچے لٹکانا، تمام حالتوں میں مکروہ تحریمی ہے، یعنی خواہ نماز میں ہو یا نماز سے باہر، ہر حال میں یہ حکم ہے۔ (۱)

---

(۱) دیکھیے: فتاویٰ رحیمیہ: ۵/۱۲۰، دار الاشاعت کراچی پاکستان ☆ طب نبوی: ص ۱۴۵/ دار الکتاب دیوبند۔
مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں ''نماز میں محبوب کا خیال آنے سے نماز ترک کرنا'' کے حواشی۔

(۲) وأما القدر المستحب فيما ينزل إليه طرف القميص والإزار فنصف الساقين، كما في حديث ابن عمر المذكور وفي حديث أبي سعيد إزارة المؤمن إلى أنصاف ساقيه لاجناح عليه فيما بينه وبين الكعبين، ما أسفل من ذلك فهو في النار، فالمستحب نصف الساقين، والجائز بلا كراهة ماتحته إلى الكعبين، فما نزل عن الكعبين فهو ممنوع، فإن كان للخيلاء فهو ممنوع منع تحريم وإلا فمنع تنزيه وأما الأحاديث المطلقة بأن ماتحت الكعبين في النار، فالمراد بها ما كان للخيلاء، لأنه مطلق فوجب حمله على المقيد، والله أعلم. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج-أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ٦٧٦هـ): ١٤/ ٩٣، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم جر الثوب خيلاء وبيان حد ما يجوز إرخاؤه إليه وما يستحب، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت☆ مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح-ملاعلي القاري (م: ١٠١٤هـ): ٧/ ٢٧٦٦، رقم الحديث: ٤٣١٤، ط: دار الفكر - بيروت) =

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: تین قسم کے آدمی سے اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن بات نہیں کریں گے اوران کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔ وہ تین یہ ہیں: ۱- جو شخص ازار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے لٹکا تا ہے۔ ۲- جو احسان کر کے جتلا تا ہے۔ ۳- جو جھوٹی قسم کھا کر مال بیچتا ہے۔ (مسلم شریف: ۱/۱۰۲)[۱]

اگر نماز کی حالت میں ٹخنوں سے نیچے کپڑا ہوگا، تو نماز مکروہ تحریمی ہوگی، تاہم فریضہ ادا ہو جائے گا۔[۲] اور جو لوگ نماز کے وقت پائینچے چڑھاتے ہیں، ان کی نماز بلا کراہت ادا ہو جائے گی، مسلمانوں کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پائجامہ ہمیشہ ٹخنوں سے اوپر رکھنا چاہیے، لہٰذا جو لوگ نماز کے علاوہ عام حالت میں ٹخنوں سے نیچے پائجامہ لٹکاتے ہیں، وہ مرتکب کبیرہ ہونے کی وجہ سے گنہ گار ہوں گے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] امام کا قعدۂ اخیرہ چھوڑ کر پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جانا

۸۳۱-سوال: ہمارے یہاں امام صاحب ظہر کی نماز میں، چوتھی رکعت میں قعدہ کرنے کے

= تقصير الثياب سنة وإسبال الإزار والقميص بدعة ينبغي أن يكون الإزار فوق الكعبين إلى نصف الساق وهذا في حق الرجال، وأما النساء فيرخين إزارهن أسفل من إزار الرجال ليستر ظهر قدمهن. إسبال الرجل إزاره أسفل من الكعبين إن لم يكن للخيلاء ففيه كراهة تنزيه، كذا في الغرائب. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۳۳، كتاب الكراهية، الباب التاسع في اللبس مايكره من ذلك وما لايكره، ط: دار الفكر - بيروت)

[۱] عن أبي ذر، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة، ولا ينظر إليهم، ولا يزكيهم ولهم عذاب أليم، قال: فقرأها رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلاث مرارا، قال أبو ذر: خابوا وخسروا، من هم يا رسول الله؟ قال: المسبل، والمنان، والمنفق سلعته بالحلف الكاذب. (الصحيح لمسلم: ۱/۷۱، رقم الحديث: ۱۷۱- (۱۰۶)، كتاب الإيمان، باب بيان غلظ تحريم إسبال الإزار... الخ، ط: البدر - ديوبند☆سنن ابوداؤد: ۲/ ۵۶۵، رقم الحديث: ۴۰۸۷، كتاب اللباس، باب ماجاء في اسبال ازار، ط: مكتبة البدر - ديوبند)

(۲) ويكره للمصلي ما هو من أخلاق الجبابرة. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱/ ۳۴، مكروهات الصلاة، ط: دار المعرفة - بيروت☆المحيط البرهاني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۱/ ۳۷۷، الفصل السادس عشر في التغني والألحان، ت: عبدالكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۳) عن أبي هريرة رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ما أسفل من الكعبين من الإزار ففي النار. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۶۱، رقم الحديث: ۵۷۸۷، كتاب اللباس، باب ما أسفل من الكعبين فهو في النار، ط: ديوبند)

بجائے سیدھے کھڑے ہوگئے، مقتدیوں نے لقمہ بھی دیا، مگر اس کی طرف انہوں نے توجہ نہیں دی اور پانچویں رکعت کے دو سجدے کرنے بعد قعدۂ اخیرہ کیا، پھر اخیر میں سجدۂ سہو کیا، تو نماز ظہر صحیح ہوئی یا نہیں؟ یا پانچویں رکعت کے ساتھ چھٹی رکعت ملانا بھی ضروری تھا؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

نماز، خواہ فرض ہو یا نفل، اس کا آخری قعدہ فرض ہے، پس ظہر یا عصر میں چار رکعت کے بعد ''التحیات'' پڑھنے کے بہ قدر بیٹھنا فرض ہے۔[1] جب آپ کے امام صاحب چوتھی رکعت کے بعد آخری قعدہ میں بیٹھے ہی نہیں، تو (پانچویں رکعت کا سجدہ کرتے ہی) فرض نماز فاسد ہوگئی، سجدۂ سہو سے بھی اب تلافی نہ ہوگی، نماز کا اعادہ لازم ہوگا۔

اگر امام صاحب چوتھی رکعت میں التحیات کے بہ قدر بیٹھ جاتے، پھر کھڑے ہوتے، تو سجدۂ سہو سے تلافی ہوجاتی، مگر یہاں ایسا نہیں ہوا ہے؛ بل کہ سیدھے پانچویں رکعت کے لیے کھڑے ہوگئے ہیں۔ ایسی صورت میں حکم یہ تھا کہ پانچویں رکعت کا سجدہ کرنے سے پہلے اگر لوٹ آئے، تو سجدۂ سہو سے نماز صحیح ہوجاتی ہے اور اگر پانچویں رکعت کا سجدہ کرلیا، تو فرض نماز فاسد ہوکر نفل بن جائے گی، اور سجدۂ سہو کرنے سے بھی فرضیت عود کر نہیں آئے گی۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) "فرائض الصلاة ستة: التحريمة" . . . " والقعدة في آخر الصلاة مقدار التشهد " لقوله عليه الصلاة و السلام لابن مسعود رضي الله عنه حين علمه التشهد " إذا قلت هذا أو فعلت هذا فقد تمت صلاتك " علق التمام بالفعل قرأ أو لم يقرأ. (الهداية في شرح بداية المبتدي - المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۹۸، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: ياسر نديم - ديوبند☆ تحفة الفقهاء - أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ): ۱/۱۳۶، كتاب الصلاة، باب افتتاح الصلاة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۶۶، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) وإن سها عن القعدة الأخيرة حتى قام إلى الخامسة رجع إلى القعدة ما لم يسجد " لأن فيه إصلاح صلاته وأمكنه ذلك؛ لأن ما دون الركعة بمحل الرفض. ———— قال: " وألغى الخامسة " لأنه رجع إلى شيء محله قبلها فترتفض " وسجد للسهو " لأنه أخر واجبا " وإن قيد الخامسة بسجدة بطل فرضه " عندنا . . . وتحولت صلاته نفلا عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله " خلافا لمحمد رحمه الله. (الهداية في شرح بداية المبتدي: ۱/۱۵۹، باب سجود السهو، كتاب الصلاة، ياسر نديم - ديوبند)

ولو ترك القعدة الأخيرة من ذوات الأربع، وقام إلى الخامسة - فإن لم يقيدها بالسجدة يعود إلى القعدة، لأنه لما لم يقيد الخامسة بالسجدة لم يكن ركعة فلم يكن فعل صلاة كاملا، وما لم يكمل بعد فهو غير ثابت على الاستقرار =

[۱۹] قعدہ اخیرہ ترک کر کے سیدھا کھڑا ہو جانا

۸۳۲-سوال: امام ظہر کی نماز پڑھا رہا تھا اور چوتھی رکعت میں قعدہ اخیرہ کرنے کے بجائے کھڑا ہو گیا اور اتنا کھڑا ہو گیا کہ گویا قیام کے قریب تھا، اس حال میں مقتدی نے پیچھے سے لقمہ دیا اور امام نے اس لقمہ کی تابع داری کی اور بیٹھ گیا یعنی لقمہ کی وجہ سے امام- جو کھڑے ہونے کے قریب تھا- لوٹ آیا اور بیٹھ گیا، تو نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

قعدۂ اخیرہ میں بیٹھنے کے بجائے کھڑے ہونے کے قریب تھا اور لقمہ کی وجہ سے بیٹھ گیا، تو نماز ہو جائے گی اور سجدہ سہو لازم آئے گا۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] تصویر والے کپڑے پہن کر نماز پڑھنا

۸۳۳-سوال: جان دار کی تصویر والے کپڑے پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ نیز بہ طور فیشن ایسے کپڑے عام حالات میں پہننا کیسا ہے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

=فكان قابلا للرفع، ويكون رفعه في الحقيقة دفعا ومنعا عن الثبوت، فيدفع ليتمكن من الخروج عن الفرض وهو القعدة الأخيرة، وقد روي أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قام إلى الخامسة فسبح به فعاد، وإن قيد الخامسة بالسجدة لا يعود وفسد فرضه. (بدائع الصنائع:۱/۱۷۱، كتاب الصلاة، فصل بيان المتروك ساهيا هل يقضي أم لا، ط: دار الكتب العلمية ☆المحيط البرهاني :۱/۵۰۷، كتاب الصلاة، الفصل السابع عشر في سجود السهو، ت: عبدالكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۱) وإن سها عن القعدة الأخيرة حتى قام إلى الخامسة رجع إلى القعدة ما لم يسجد "لأن فيه إصلاح صلاته وأمكنه ذلك؛ لأن ما دون الركعة بمحل الرفض.ـــــــ قال: "وألغى الخامسة" لأنه رجع إلى شيء محله قبلها فترتفض " وسجد للسهو "لأنه أخر واجبا" وإن قيد الخامسة بسجدة بطل فرضه" عندنا . . . وتحولت صلاته نفلا عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله" خلافا لمحمد رحمه الله. (الهداية في شرح بداية المبتدي:۱/۱۵۹، باب سجود السهو، كتاب الصلاة، ياسر نديم-ديوبند☆البحر الرائق: ۲/۱۱۰-۱۱۱، كتاب الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي) مزید دیکھیے: بدائع الصنائع:۱/۱۷۱، كتاب الصلاة، فصل بيان المتروك ساهيا هل يقضي أم لا، ط: دار الكتب العلمية ☆المحيط البرهاني :۱/۵۰۷، كتاب الصلاة، الفصل السابع عشر في سجود السهو، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت.

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول اللہ ﷺ نے تعلیم دی ہے کہ ہم گناہ کے کاموں سے دور رہیں، خصوصاً کفر اور شرک کی چیزوں سے۔ آپ نے ﷺ نے اس مضمون کو اس طرح سے واضح فرمایا ہے کہ مسلمان اگر اس پر غور کرے، تو اس کے دل میں کفر وشرک سے نفرت ضرور پیدا ہوگی۔ یاد رہے کہ ایمان جس قدر مضبوط ہوگا، کفر وشرک کی چیزوں سے مسلمان اتنا ہی دور رہے گا۔

تصویر اور فوٹو کی راہ سے شیطان نے انسان کو گمراہ کیا ہے، چناں چہ اس نے بزرگوں اور نیک لوگوں کی یاد میں تصویر بنانے کا خیال دل میں ڈالا، جب وہ اس میں کام یاب ہوگیا، تو ان تصویروں کے ادب، احترام اور عزت کی تعلیم دی، معاملہ یہاں تک پہنچا کہ لوگ، اکابر کی ان تصویروں کو ہی پوجنے لگے اور شرک و بت پرستی نے ان میں جڑ پکڑ لیا۔ [1] اس لیے شریعت اسلامیہ میں تصویر کی سخت وعید آئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جان دار کی تصویر جس گھر میں ہوگی، رحمت کے فرشتے اس میں داخل نہیں ہوں گے۔ [2]

اگر روپے کی نوٹ پر تصویر ہو اور وہ مصلی کے پاس اس طور پر ہو کہ تھیلی یا پیکٹ وغیرہ میں بند ہو (ڈھکی ہوئی ہو) تو نماز مکروہ نہ ہوگی، اور اگر کھلی ہو، اوپر سے نظر آتی ہو تو نماز اس حال میں مکروہ ہے؛ لیکن اگر بہت چھوٹی تصویر ہو، جو (نیچے رکھی ہوئی ہو تو کھڑے ہو کر دیکھنے سے صاف) نظر نہ آتی ہو، تو اس کو پہن کر

---

(۱) عن عائشة أم المؤمنين، أن أم حبيبة، وأم سلمة ذكرتا كنيسة رأينها بالحبشة فيها تصاوير، فذكرتا للنبي صلى الله عليه وسلم فقال: إن أولئك إذا كان فيهم الرجل الصالح فمات، بنوا على قبره مسجدا، وصوروا فيه تلك الصور، فأولئك شرار الخلق عند الله يوم القيامة. (صحيح البخاري: ۱/ ۶۱، رقم الحديث: ۴۲۷، كتاب الصلاة، باب: هل تنبش قبور مشركي الجاهلية، ويتخذ مكانها مساجد، ط: ديوبند، وانظر: ۴۳۴، ۱۳۴۱، ۳۸۷۳، ☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۰۱، رقم الحديث: ۱۶- (۵۲۸)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب النهي عن بناء المساجد على القبور واتخاذ الصور فيها والنهي عن اتخاذ القبور مساجد، ط: ديوبند)

(۲) عن أبي طلحة، رضي الله عنه قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: لا تدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا تصاوير. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۸۰، رقم الحديث: ۵۹۴۹، كتاب اللباس، باب التصاوير، ط: ...، وانظر: ۳۲۲۵، ۳۲۲۶، ۳۳۲۲، ۴۰۰۲ ☆الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۹۹، رقم الحديث: ۸۳- (۲۱۰۶)، كتاب اللباس والزينة، باب لا تدخل الملائكة بيتا فيه كلب ولا صورة، ط: ديوبند)

نماز پڑھنے میں حرج نہیں۔ [۳] جان دار کی تصویر والا کپڑا پہننا مکروہ ہے، عام حالات میں بھی اس کا پہننا مکروہ ہے، ظاہر ہے کہ جب عام حالات میں مکروہ ہے، تو اس کپڑے میں نماز پڑھنا بدرجہ اولیٰ مکروہ ہوگا۔ (۴)

جب تصویر کی وجہ سے رحمت کے فرشتے گھر نہیں آتے، تو نماز پڑھنے والا جو کہ اللہ کی رحمت و مغفرت کا طلب گار ہے، اس کو تو اس سے بچنا بہت ضروری ہے؛ اس لیے نمازی کو اپنی شکل و صورت ایسی بنانی چاہیے، جو شریعت میں مطلوب ہے، عام حالات میں جن کپڑوں کا پہننا مکروہ ہے، مسلمان کو نماز میں ایسے کپڑے پہننے سے حد درجہ اجتناب کرنا چاہیے، البتہ اگر تصویر جان دار کی نہ ہو، تو ایسے کپڑے پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے، کیوں کہ ممانعت کا حکم جان دار کی تصویر کے ساتھ مخصوص ہے۔ (۵)

اور جان دار کی تصویر والے کپڑے فیشن کے طور پر پہننے کی بھی بالکل اجازت نہیں ہے۔ (۶) کیوں کہ اس طرح کے کپڑے پہننے کی وجہ سے دل سے تصویر کی نفرت ختم ہو جائے گی، اور جب تصویر کی نفرت دل سے نکل جائے گی، تو شریعت کی حدیں ٹوٹنے لگیں گی، اور گناہ کے کاموں سے نفرت آہستہ آہستہ ختم ہو جائے

---

[۳] (واختلف فيما إذا كان) التمثال (خلفه والأظهر الكراهة و) لا يكره (لو كانت تحت قدميه) أو محل جلوسه لأنها مهانة (أو في يده) عبارة الشمني بدنه لأنها مستورة بثيابه (أو على خاتمه) بنقش غير مستبين. قال في البحر: ومفاده كراهة المستبين لا المستتر بكيس أو صرة أو ثوب آخر. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله لا المستتر بكيس أو صرة) بأن صلى ومعه صرة أو كيس فيه دنانير أو دراهم فيها صور صغار فلا تكره لاستتارها بحر، ومقتضاه أنها لو كانت مكشوفة تكره الصلاة مع أن الصغيرة لا تكره الصلاة معها كما يأتي، لكن يكره كراهة تنزيه جعل الصورة في البيت، نهر. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۴۸، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، مطلب إذا تردد الحكم بين سنة وبدعة كان ترك السنة أولى، ط: دار الفكر)

ويكره أن يصلي وبين يديه أو فوق رأسه أو على يمينه أو على يساره أو في ثوبه تصاوير وفي البساط روايتان و الصحيح أنه لا يكره على البساط إذا لم يسجد على التصاوير وهذا إذا كانت الصورة كبيرة تبدو للناظر من غير تكلف. كذا في فتاوى قاضي خان، ولو كانت صغيرة بحيث لا تبدو للناظر إلا بتأمل لا يكره وإن قطع الرأس فلا بأس به. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۷، كتاب الصلاة، الفصل الثاني فيما يكره في الصلاة وما لا يكره، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) قال في البحر: وفي الخلاصة وتكره التصاوير على الثوب، صلى فيه أو لا انتهى، وهذه الكراهة تحريمية. (رد المحتار على الدر: ۱/ ۶۴۷)

(۵) ولا يكره تمثال غير ذي الروح كذا في النهاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۷)

(۶) دیکھیے حاشیہ نمبر: ۴۔

گی، ایمان کمزور ہو جائے گا، لہٰذا ایسے کپڑوں سے حد درجہ احتراز ضروری ہے، اور کپڑا بدن کو چھپانے کے لیے ہے، دکھانے اور تکبر کے لیے نہیں ہے، فیشن والا عموماً اسی نیت سے پہنا جاتا ہے، لہٰذا حرام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر و گھمنڈ ہوگا، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (مسلم شریف: ۱/ ۶۵)[۱] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] نماز میں بار بار چھینک آنے پر ہاتھ، منہ پر رکھنا

۸۳۴-سوال: زید نماز میں قیام کی حالت میں چھینک آنے پر ہاتھ منھ پر رکھتا ہے، تاکہ قریب والے اس سے متاثر نہ ہوں، تو اگر تین بار چھینک آجائے، اور ہر بار ہاتھ منہ پر رکھے، تو اس سے اس کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں شرعاً کیا حکم ہے؟ ہاتھ منہ پر رکھنا چاہیے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

''نماز'' عمل کثیر سے فاسد ہوتی ہے، عمل قلیل سے فاسد نہیں ہوتی، اور عمل قلیل وکثیر کی تحدید میں علماء کی عبارتیں مختلف ہیں: ایک قول یہ ہے کہ جو کام دو ہاتھ سے کیا جاتا ہو، وہ ''عمل کثیر'' ہے اور جو ایک ہاتھ سے ہو جاتا ہو، وہ ''عمل قلیل'' ہے۔ بعض علماء کے نزدیک ایسی حرکت کرنا کہ جس سے دیکھنے والا یوں سمجھے کہ یہ شخص نماز میں نہیں ہے، عمل کثیر ہے۔ پس چھینک آنے پر ایک ہاتھ منھ پر رکھنے سے نماز فاسد نہ ہوگی؛ کیوں کہ یہ ''عمل کثیر'' کے تحت نہیں آتا ہے۔[۱]

---

(۱) وعن ابن مسعود قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا يدخل النار أحد في قلبه مثقال حبة خردل من إيمان، ولا يدخل الجنة أحد في قلبه مثقال حبة من خردل من كبر. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۶۵، كتاب الايمان، تحريم الكبر وبيانه، ط: البدر - ديوبند)

(۲) العمل الكثير يفسد الصلاة والقليل لا. كذا في محيط السرخسي واختلفوا في الفاصل بينهما على ثلاثة أقوال:
(الأول) أن ما يقام باليدين عادة كثير وإن فعله بيد واحدة كالتعمم ولبس القميص وشد السراويل والرمي عن القوس وما يقام بيد واحدة قليل وإن فعل بيدين كنزع القميص وحل السراويل ولبس القلنسوة ونزعها ونزع اللجام. هكذا في التبيين وكل مايقام بيد واحدة فهو يسير مالم يتكرر. كذا في فتاوى قاضي خان.
(والثاني) أن يفوض إلى رأي المبتلى به وهو المصلي فإن استكثره كان كثيرا وإن استقله كان قليلا وهذا أقرب الأقوال إلى رأي أبي حنيفة رحمه الله تعالى.
(والثالث) أنه لو نظر إليه ناظر من بعيد إن كان لا يشك أنه في غير الصلاة فهو كثير مفسد وإن شك فليس بمفسد=

چھینک آنے پر مصلی منہ پر ہاتھ ڈال سکتا ہے، تاکہ اس سے دوسرے مقتدی کو کسی قسم کی کراہیت محسوس نہ ہو اور مسجد بھی تلویث سے محفوظ رہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] نماز میں چھینک آنے پر الحمدللہ کہنا

۸۳۵-سوال: فرض یا نفل نماز میں نمازی کو چھینک آئے اور وہ اس پر الحمدللہ کہے، تو اس سے نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نماز میں چھینک آنے پر الحمدللہ کہنے سے نماز فاسد نہ ہوگی۔ (عالم گیری: ۱/ ۹۸)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] ایک رکن میں تین مرتبہ کھجلانا

۸۳۶-سوال: نماز کے ایک رکن میں تین مرتبہ ہاتھ اٹھائے، تو نماز فاسد ہو جاتی ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ حقیقۃً مجبوری ہو اور بار بار کھجلانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہو تو تین مرتبہ سے زیادہ کھجلانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً ومسلماً

صورت مسئولہ میں نماز صحیح ہو جائے گی۔ حضرات فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ عمل کثیر سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، عمل قلیل وکثیر کی تحدید میں علماء کی عبارتیں مختلف ہیں: ایک قول یہ ہے کہ جو کام دو ہاتھ سے

= وهذا هو الأصح. هكذا في التبيين وهو أحسن. كذا في محيط السرخسي وهو اختيار العامة كذا في فتاوى قاضي خان والخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۱- ۱۰۲، كتاب الصلاة، الباب السابع فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها، النوع الثاني في الأفعال المفسدة للصلاة، ط: دار الفكر - بيروت☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۸۴- ۳۸۵، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة وما يكره، ط: زكريا- ديوبند)

[۱] تاہم بہتر یہ ہے کہ اس وقت کچھ نہ پڑھے، خاموش رہے: ولو عطس، فقال له المصلي الحمد لله لا تفسد؛ لأنه ليس بجواب، وإن أراد به جوابه، أو استفهامه، فالصحيح أنها تفسد، هكذا في التمرتاشي. ولو قال العاطس لا تفسد صلاته، وينبغي أن يقول في نفسه، والأحسن هو السكوت. كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۹۸، كتاب الصلاة، الباب السابع فيما يفسد الصلاة ومايكره فيها، ط: دار الفكر - ديوبند☆ البحر الرائق: ۲/ ۸، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة ومايكره فيها، ط: دار الكتاب- ديوبند)

کیا جاتا ہو، وہ ''عمل کثیر'' ہے اور جو ایک ہاتھ سے ہو جاتا ہو، وہ ''عمل قلیل'' ہے۔ بعض علماء کے نزدیک ایسی حرکت کرنا کہ جس سے دیکھنے والا یوں سمجھے کہ یہ شخص نماز میں نہیں ہے، عمل کثیر ہے۔

آپ کی تحریر کے مطابق صاحب واقعہ کو حقیقۃً عذر ہے؛ اس لیے اس طور پر کھجلائے کہ دیکھنے والا اسے نماز سے باہر نہ سمجھے، تو نماز فاسد نہیں ہوگی، خواہ تین مرتبہ ہی اس نے کیوں نہ کھجلایا ہو۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] نماز میں مقتدی کا ایک رکن میں تین مرتبہ ہاتھ اٹھانا

۸۳۷-سوال: اگر کوئی مقتدی ایک رکن میں تین مرتبہ ہاتھ اٹھائے، تو کیا اس کی نماز ہو جائے گی؟ یا نماز کا اعادہ لازم ہوگا؟

الجواب حامداومصلیا:

چوں کہ عمل کثیر کی تحدید میں کئی اقوال ہیں؛ اس لیے اگر اس مصلی کو دور سے دیکھنے والا نماز میں ہی خیال کرتا ہو، تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] نماز میں اللہ کے خوف سے رونے سے کوئی فساد نہیں آتا ہے

۸۳۸-سوال: میں جب نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتا ہوں تو ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' یا ''اِهْدِنَا

(۱) العمل الكثير يفسد الصلاة والقليل لا. كذا في محيط السرخسي واختلفوا في الفاصل بينهما على ثلاثة أقوال:

(الأول) أن ما يقام باليدين عادة كثير وإن فعله بيد واحدة كالتعمم ولبس القميص وشد السراويل والرمي عن القوس وما يقام بيد واحدة قليل وإن فعل بيدين كنزع القميص وحل السراويل ولبس القلنسوة ونزعها ونزع اللجام. هكذا في التبيين وكل ما يقام بيد واحدة فهو يسير ما لم يتكرر. كذا في فتاوى قاضي خان.

(والثاني) أن يفوض إلى رأي المبتلى به وهو المصلي فإن استكثره كان كثيرا وإن استقله كان قليلا وهذا أقرب الأقوال إلى رأي أبي حنيفة رحمه الله تعالى.

(والثالث) أنه لو نظر إليه ناظر من بعيد إن كان لا يشك أنه في غير الصلاة فهو كثير مفسد وإن شك فليس بمفسد وهذا هو الأصح. هكذا في التبيين وهو أحسن. كذا في محيط السرخسي وهو اختيار العامة كذا في فتاوى قاضي خان والخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۰۱-۱۰۲، كتاب الصلاة، الباب السابع فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها، النوع الثاني في الأفعال المفسدة للصلاة، ط: دار الفكر - بيروت☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۸۴-۳۸۵، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) قد تقدم تخريجه تحت عنوان: ''نماز میں بار بار چھینک آنے پر ہاتھ منہ پر رکھنا''۔

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ''جیسی آیات پر آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوجاتے ہیں، تو اس طرح نماز میں آنسو بہنے سے نماز میں کوئی خلل تو نہیں آتا ہے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

نماز میں اللہ تعالیٰ کے خوف اور ڈر سے رونا آجائے، اور اس میں آواز بھی نکل جائے، تو نماز میں کوئی نقصان نہ آئے گا۔ (ہدایہ: ۱/ ۱۴۴، درمختار و شامی: ۱/ ۵۷۹)[1] کیوں کہ جو نماز خشوع وخضوع سے پڑھی جائے گی، انسان خود کو گنہ گار سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے ہدایت مانگے گا، راہ راست طلب کرے گا اور اپنے گناہوں پر ندامت کا اظہار کرے گا، تو اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خوف وڈر محسوس ہوگا اور رونا آئے گا، گویا نماز میں رونا کمال خشوع وخضوع کی علامت ہے، پس اس سے نماز میں کوئی خلل نہ آئے گا، نماز بلا کراہت صحیح رہے گی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] مسجد کی چھت پر تراویح اور فرض نماز پڑھنا

۸۳۹- سوال: ہمارے گاؤں میں مسجد سے متصل ہی مدرسہ ہے اور مسجد اور مدرسہ کی چھت ملی ہوئی ہے، فی الحال شدت کی گرمی پڑ رہی ہے، تو ایسے میں مسجد کی چھت کے اوپر تراویح پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ نیز مدرسہ کی چھت پر پڑھنے کا کیا حکم ہوگا؟ اور تراویح کے علاوہ دیگر فرض نمازیں وغیرہ چھت پر پڑھی جائیں، تو کیسا ہے؟ تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مسجد کا ادب واحترام کرنا ضروری ہے؛ اسی وجہ سے علماء نے بلاضرورت مسجد کی چھت پر چڑھنے کو

(۱) " فإن أن فيها أو تأوه أو بكى فارتفع بكاؤه فإن كان من ذكر الجنة أو النار لم يقطعها " لأنه يدل على زيادة الخشوع. (الهداية في شرح بداية المبتدي: ۱/ ۱۳۵، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة، ومايكره فيها، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(لا لذكر جنة أو نار) فلو أعجبته قراءة الإمام فجعل يبكي ويقول بلى أو نعم أو آري لا تفسد... لدلالته على الخشوع. (در مختار) قال الشامي: لأن الأنين، ونحوه إذا كان بذكرهما صار كأنه قال: اللهم إني أسألك الجنة وأعوذ بك من النار، ولو صرح به لا تفسد صلاته. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۶۱۹-۶۲۰، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة، ومايكره فيها، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید دیکھیے: سكب الأنهر مع المجمع: ۱/ ۱۷۸-۱۷۹، كتاب الصلاة، ط: مكتبة فقيه الأمة - ديوبند.

مکروہ لکھا ہے، چناں چہ آج تک امت کا عمل اس پر ہے کہ گرمی کے زمانہ میں صحن مسجد میں نماز تو پڑھتے ہیں، چھت پر کوئی نہیں پڑھتا ہے، لہٰذا بلا ضرورت مسجد کی چھت پر خواہ فرض، نفل یا تراویح ہو؛ پڑھنا مکروہ ہوگا، اگر ضرورت ہو کہ مسجد، مصلیوں کے لیے تنگ پڑتی ہو، تو اس کی چھت پر نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہوگا۔ —— مدرسہ کی چھت پر نماز پڑھی جاسکتی ہے؛ لیکن اس میں مسجد کا ثواب نہ ملے گا، اسی طرح تراویح میں مسجد کا حق ادا نہ ہوگا۔ (شامی، عالم گیری)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] گرمی کی شدت کی وجہ سے مسجد کی چھت پر نماز اور تراویح ادا کرنا

۸۴۰-سوال: پچھلے کئی سالوں سے رمضان المبارک کا مہینہ، بارش کے موسم میں آتا ہے، جس میں گرمی حد درجہ شدید ہوتی ہے، رات کو تراویح اور عشاء کی نماز میں وقت گزارنا بہت دشوار ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ بجلی کے نہ ہونے کی وجہ سے پنکھوں کا بھی انتظام نہیں ہے، اس کیفیت ناگفتہ بہ کو مانع خشوع قرار دیں، تو مبالغہ نہ ہوگا۔

کتب فقہ کے مطالعہ، نیز علمی صحبت کے نتیجہ میں خیال ہوتا ہے کہ "**إبراد بالظهر**" کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ گرمی کی شدت مانع خشوع ہوتی ہے، جب کہ نماز میں خشوع مطلوب ہے۔

مذکورہ بالا صورت میں- کہ گرمی شدید ہوتی ہے، جو نماز میں مانع خشوع ہے- نماز عشاء اور تراویح

---

[۱] الصعود على سطح كل مسجد مكروه، ولهذا إذا اشتد الحر يكره أن يصلوا بالجماعة فوقه إلا إذا ضاق المسجد فحينئذ لا يكره الصعود على سطحه للضرورة، كذا في الغرائب. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۲۲، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد والقبلة والمصحف... الخ، ط: دار الفكر)

(و) كره تحريما (الوطء فوقه، والبول والتغوط) لأنه مسجد إلى عنان السماء. (الدر المختار) —— وفي الشامية: (قوله الوطء فوقه) أي الجماع خزائن؛ أما الوطء فوقه بالقدم فغير مكروه إلا في الكعبة لغير عذر، لقولهم بكراهة الصلاة فوقها. ثم رأيت القهستاني نقل عن المفيد كراهة الصعود على سطح المسجد اهـ ويلزمه كراهة الصلاة أيضا فوقه فليتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۵۶، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، مطلب في أحكام المسجد، ط: دار الفكر - بيروت)

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، عام کتابوں میں ایسا ہی ہے، تاہم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ "مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا کیسا ہے؟" کے جواب میں رقم طراز ہیں: مسجد کی چھت بھی مسجد ہی کا حکم رکھتی ہے، چھت پر نماز پڑھنا خصوصاً گرمی کی وجہ سے بلا کراہت جائز ہے۔ (کفایت المفتی: ۳/ ۱۵۹، جواب نمبر: ۲۲۱، کتاب الصلاۃ، گرمی کی وجہ سے چھت پر نماز، ط: دار الاشاعت، کراچی)

مسجد کی کھلی چھت (جماعت خانے کی چھت) پر ادا کی جائے، تو مکروہ نہ ہوگا۔

مسجد کا صحن اتنا کشادہ نہیں کہ تمام نمازی ایک ساتھ بہ آسانی نماز ادا کر سکیں؛ علاوہ ازیں مسجد کا صحن ہر چہار طرف سے بند بھی ہے، بعض حضرات مسجد کے بالائی حصہ میں نماز ادا کرنے کو مسجد کے آداب کے خلاف سمجھتے ہیں، اور ایسی ناگفتہ بہ حالت میں بھی اوپر والے حصہ میں نماز ادا کرنے میں کراہت کے قائل ہیں، کیا اصول فقہ کے قاعدہ: ''الضرورات تبيح المحظورات'' کے پیش نظر ہمارے لیے بلا کراہت مسجد کی کھلی چھت پر نماز ادا کرنے کی گنجائش ہے؟ محمد عابد عبدالرحیم گڈھا (سابر کانٹھا)

الجواب حامداً و مصلياً:

صورت مسئولہ میں مسجد کی چھت پر نماز عشاء اور نماز تراویح کی اجازت نہیں ہوگی۔ مسجد کی چھت پر چڑھنا بلا ضرورت شدیدہ مکروہ تحریمی ہے۔ فقہاء کرامؒ نے صرف اس صورت میں مسجد کی چھت پر نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے، جب کہ مسجد تنگ پڑ رہی ہو یا کوئی ایسی مجبوری در پیش ہو کہ مسجد میں نماز پڑھنا ممکن نہ ہو۔ گرمی کی صورت میں مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا، کیوں کہ اس صورت میں عذر متحقق نہیں ہے۔ اس مسئلے کو ''إبراد بالظهر'' پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، ابراد بالظہر کی صورت میں کسی امر مکروہ کا ارتکاب لازم نہیں آتا، جب کہ چھت پر نماز پڑھنے کی صورت میں امر مکروہ کا ارتکاب لازم آتا ہے، اس لیے مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا کراہت سے خالی نہ ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۸] نفل نماز میں قرآن کریم دیکھ کر قراءت کرنا

۸۴۱-سوال: کیا نفل نماز میں قرآن میں دیکھ کر قراءت کرنا جائز ہے؟ ہمارے یہاں ایک شخص ہیں، جو نفل نماز میں قرآن شریف سامنے رکھ کر پڑھتے ہیں اور رکوع وسجدہ میں نیچے رکھ لیتے ہیں، پھر جب کھڑے ہوتے ہیں، تو ہاتھ میں قرآن لے کر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، تو کیا ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک نفل نماز میں قرآن شریف دیکھ کر تلاوت کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداً و مصلياً

امام شافعیؒ کے نزدیک قرآن دیکھ کر پڑھنا جائز ہے، اس سے نماز ہو جاتی ہے۔ (رد المحتار علی الدر

(۱) قد تقدم تخريجه تحت عنوان: ''مسجد کی چھت پر تراویح اور فرض نماز پڑھنا''۔

المختار: ج:۱،ص:۵۸۵)[۱]

امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے نزدیک مکروہ ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر قرآن شریف ہاتھ میں اٹھا کر پڑھتا ہے، تو اس سے نماز فاسد ہوجائے گی۔ (عالم گیری:۱/۸۱، وردشامی:۱/۵۸۵)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] قعدۂ اخیرہ چھوڑ کر مزید دو رکعت ملانے کی صورت میں فرض کا متغیر ہوجانا

۸۴۲-سوال: امام صاحب نے عصر کی نماز پڑھائی، قعدۂ اخیرہ نہیں کیا، ان کو متنبہ کیا گیا، مگر انہوں نے پانچویں اور چھٹی رکعت پڑھ کر سجدۂ سہو کرلیا، ان کا کہنا ہے کہ چار رکعت فرض اور دو رکعت نفل ہوگئی، کیا ان کی یہ بات درست ہے؟ کیا اس صورت میں فرض نماز ہوجائے گی؟ بینوا تو جروا۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

پانچویں رکعت کو سجدہ سے مقید کرنے سے قبل تک امام کے لیے ضروری تھا کہ قعدہ اخیرہ کی جانب

(۱) يفسدها (انتقاله من صلاة إلى مغايرتها) ... (وقراءته من مصحف) أي ما فيه قرآن (مطلقا) ... وجوزه الشافعي بلا كراهة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۶۲۴، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فروع: سمع المصلي اسم الله تعالى فقال جل جلاله ... الخ، ط: دار الفكر)

فلو قرأ في صلاته من مصحف جاز. (الحاوي الكبير في فقه مذهب الإمام الشافعي - الماوردي (م: ۴۵۰هـ): ۲/ ۱۸۴، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة وعدد سجود القرآن، ت: علي محمد معوض - عادل أحمد عبد الموجود، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

ويجوز أن يقرأ في الصلاة من مصحف. (الإقناع في الفقه الشافعي، ص: ۴۵، باب ما يبطل الصلاة وما لا يبطلها)

[۲] ويفسدها قراءته من مصحف عند أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - وقال: لا يفسد له إن حمل المصحف وتقليب الأوراق والنظر فيه عمل كثير وللصلاة عنه بد، وعلى هذا لو كان موضوعا بين يديه على رحل وهو لا يحمل ولا يقلب أو قرأ المكتوب في المحراب لا تفسد، ولأن التلقن من المصحف تعلم ليس من أعمال الصلاة وهذا يوجب التسوية بين المحمول وغيره فتفسد بكل حال وهو الصحيح. هكذا في الكافي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۱، كتاب الصلاة، الباب السابع فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها، الفصل الأول فيما يفسدها، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۶۲۴، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فروع: سمع المصلي اسم الله تعالى فقال جل جلاله ... الخ، ط: دار الفكر)

لوٹ جائے اور سجدہ سہو کے ساتھ نماز کی تکمیل کرے۔[1]

صورت مسئولہ میں قعدۂ اخیرہ کے چھوٹ جانے، اور پانچویں رکعت کا سجدہ کر لینے کی صورت میں فرض نماز صحیح نہیں ہوگی؛ کیوں کہ قعدۂ اخیرہ میں تشہد کی مقدار بیٹھنا فرض ہے اور فرض چھوٹ جانے کی وجہ سے نماز ادا نہیں ہوتی ہے؛ مذکورہ صورت میں چھ کی چھ رکعات نفل بن جائے گی، امام اور مقتدیوں سب کو اپنی اپنی نمازیں دوبارہ پڑھنی ہوگی۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] چار رکعت فرض کی جگہ پانچ رکعت پڑھنا

۸۴۳-سوال: ایک شخص نے غلطی سے چار رکعت فرض کے بجائے پانچ رکعت پڑھ لی، پانچویں رکعت کے سجدہ کے بعد یاد آیا تو پھر مزید ایک رکعت ملالی، اس طرح کل چھ رکعات ہوئیں، تو سجدۂ سہو کرنے سے نماز درست ہوگی یا پوری نماز دہرانا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اگر چوتھی رکعت کے قعدہ کے بعد پانچویں اور چھٹی رکعات پڑھی ہے اور سجدۂ سہو کیا ہے، تو نماز درست

[۱] (ولو سها عن القعود الأخير) كله أو بعضه (عاد) ويكفي كون كلا الجلستين قدر التشهد (ما لم يقيدها بسجدة) لأن ما دون الركعة محل الرفض وسجد للسهو لتأخير القعود (وإن قيدها) بسجدة عامدا أو ناسيا أو ساهيا أو مخطئا (تحول فرضه نفلا). [رد المحتار على رد المحتار: ۲/ ۸۵، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: دار الفكر -بيروت]

(۲) فرائض الصلاة ستة ... " والقعدة في آخر الصلاة مقدار التشهد " لقوله عليه الصلاة والسلام لابن مسعود رضي الله عنه حين علمه التشهد " إذا قلت هذا أو فعلت هذا فقد تمت صلاتك " علق التمام بالفعل قرأ أو لم يقرأ. (الهداية في شرح بداية المبتدي: ۱/ ۹۸، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة☆ تحفة الفقهاء: ۱/ ۱۳۶، كتاب الصلاة، باب افتتاح الصلاة☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۶۶، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۱۷۱، كتاب الصلاة، فصل بيان المتروك ساهيا هل يقضى أم لا☆ المحيط البرهاني: ۱/ ۵۰۷، كتاب الصلاة، الفصل السابع عشر في سجود السهو)

وفي الولو الجية الأصل في هذا أن المتروك ثلاثة أنواع فرض وسنة وواجب، ففي الأول أمكنه التدارك بالقضاء يقضي وإلا فسدت صلاته وفي الثاني لا تفسد؛ لأن قيامها بأركانها وقد وجدت ولا يجبر بسجدتي السهو وفي الثالث إن ترك ساهيا يجبر بسجدتي السهو وإن ترك عامدا لا، كذا التتارخانية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۶، كتاب الصلاة، الباب الثاني عشر في سجود السهو، ط: زكريا - ديوبند)

ہوجائے گی، اس صورت میں چار رکعات فرض اور دو رکعات نفل شمار ہوں گی، لیکن یہ دو رکعات فرض کے بعد کی سنت کے قائم مقام نہیں ہوں گی۔ [۱] اور اگر چوتھی رکعت کے بعد قعدہ نہیں کیا، تو سجدۂ سہو کے باوجود فرض نماز درست نہیں ہوگی، بل کہ یہ چاروں رکعت نفل بن جائیں گی۔ (شامی: ۱/ ۵۵۳) [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] کسی وجہ سے امام صاحب کے ساتھ رکوع چھوٹ جائے، تو کیا کرے؟

۸۴۴-سوال: ہمارے یہاں جمعہ کی نماز مائیک میں ہوتی ہے، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ امام صاحب جمعہ کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے، انہوں نے اللہ اکبر کہا، سب مصلیوں نے ان کے ساتھ تکبیر تحریمہ کہی، اس کے بعد امام صاحب نے سورۂ فاتحہ پڑھی اور سورت ملاتے ہوئے ایک آیت پڑھی کہ مائیک بند ہوگیا، اس کے بعد امام صاحب نے رکوع کی تکبیر کہی، وہ رکوع میں گئے، پھر قومہ میں آئے؛ لیکن مائیک بند ہی تھا، جب سجدے میں جانا شروع کیا، تو ایک دم سے مائیک چالو ہوا، امام صاحب تو سجدے میں چلے گئے؛ لیکن مقتدیوں کا ابھی رکوع باقی تھا، انہوں نے رکوع کے بغیر ہی امام صاحب کے ساتھ سجدے میں شرکت کرلی، ان میں سے بعض نے اس رکعت کا اعادہ کیا، اور بعض نے نہیں کیا۔

سوال یہ ہے کہ جنہوں نے پہلی رکعت کا اعادہ کیا، ان کی نماز کا کیا ہوگا اور جنہوں نے اعادہ نہیں کیا ہے، ان کی نماز کا کیا حکم ہے؟ بعضوں کا یہ کہنا ہے کہ ہم لوگ امام صاحب کے تابع ہیں؛ اس لیے ہماری نماز صحیح ہوجائے گی، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

صورتِ مسئولہ میں جن لوگوں نے رکوع نہیں کیا ہے اور سیدھے سجدے میں چلے گئے ہیں، اور بعد میں اس رکعت کی تکمیل نہیں کی، ان کی نماز نہیں ہوگی؛ کیوں رکوع نماز میں فرض ہے اور فرض کے چھوٹ جانے

---

(۱) (و) الركعتان (لا ينوبان عن السنة الراتبة) بعد الفرض في الأصح لأن المواظبة عليهما إنما كانت بتحريمة مبتدأة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۸۸، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: دار الفكر- بيروت)

[۲] (ولو سها عن القعود الأخير) كله أو بعضه (عاد) ويكفي كون كلا الجلستين قدر التشهد (ما لم يقيدها بسجدة) لأن ما دون الركعة محل الرفض وسجد للسهو لتأخير القعود (وإن قيدها) بسجدة عامدا أو ناسيا أو ساهيا أو مخطئا (تحول فرضه نفلا). [الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۸۵، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: دار الفكر- بيروت]

کی وجہ سے نماز فاسد ہوجاتی ہے؛ البتہ جنہوں نے رکوع کرکے سجدہ کیا ہے، -کہ اصل یہی ہے- یا رکوع تونہیں کیا ہے؛ لیکن بعد میں کھڑے ہوکر ایک رکعت پڑھ لی ہے، ان کی نماز صحیح ہوجائے گی۔ جن لوگوں نے یہ کہا کہ ''ہم لوگ امام صاحب کے تابع ہیں؛ لہٰذا ان کی تبعیت میں ہماری نماز صحیح ہوجائے گی'' ان کا ایسا کہنا غلط ہے؛ کیوں کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے میں گرچہ امام کی اتباع واجب ہے؛ لیکن کسی مقتدی کا اگر کوئی فرض چھوٹ جائے، تو اس سے نماز فاسد ہوجائے گی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] امام کے ساتھ کسی مقتدی کا سجدۂ ثانیہ چھوٹ جائے تو کیا کرے؟

۸۴۵-سوال: فرض نماز میں کسی مقتدی نے امام کے ساتھ پہلا سجدہ کیا، پھر جلسہ کیا، اور کسی وجہ سے دوسرا سجدہ امام کے ساتھ نہیں کرسکا، بل کہ سیدھا سر اٹھا کر دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہوگیا، تو مقتدی کی نماز واجب الاعادہ ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

امام کے ساتھ اگر کوئی مقتدی سجدہ نہیں کرسکا، تو اُسے چاہیے کہ وہ سجدہ کرکے امام کے ساتھ شریک ہوجائے، اِس صورت میں اُس کا سجدہ درست ہوگا، اگرچہ امام کے سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد سجدہ کیا ہو، تب بھی درست ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری) [اگر نہ تو اس وقت سجدہ کیا اور نہ بعد میں؛ بل کہ اسی طرح نماز مکمل

---

(۱) اللاحق وهو الذي أدرك أولها وفاته الباقي لنوم أو حدث أو بقي قائما للزحام... اللاحق... ينبغي له أن يشتغل أولا بقضاء ما سبقه الإمام بغير قراءة يقوم مقدار قيام الإمام وركوعه وسجوده ولو زاد أو نقص فلا يضره هكذا في شرح الطحاوي وإذا كبر مع الإمام ثم نام حتى صلى الإمام ركعة ثم انتبه فإنه يصلي الركعة الأولى وإن كان الإمام يصلي الركعة الثانية. هكذا في الذخيرة، ولو لم يشتغل بقضاء ما سبقه الإمام ولكن يتابع الإمام أولا ثم قضى ما سبقه الإمام بعد تسليم الإمام جازت صلاته عندنا. هكذا في شرح الطحاوي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۹۲، الباب الخامس في الإمامة، الفصل السابع في المسبوق واللاحق، ط: دار الفكر - بيروت)

إن المتروك الذي يتعلق به سجود السهو من الفرائض والواجبات لا يخلو إما أن كان من الأفعال أو من الأذكار، ومن أي القسمين كان وجب أن يقضي إن أمكن التدارك بالقضاء، وإن لم يمكن فإن كان المتروك فرضا تفسد الصلاة، وإن كان واجبا لا تفسد، ولكن تنتقص وتدخل في حد الكراهة. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۶۷، كتاب الصلاة، فصل بيان المتروك ساهيا هل يقضى أم لا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

کرلی، تو فرض [رکن] کے رہ جانے کی وجہ سے نماز نہیں ہوگی اور اعادہ ضروری ہوگا۔][۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] قراءاتِ سبعہ کی تمام روایتوں کو ایک نماز میں پڑھنا

۸۴۶-سوال: قرآت سبعہ کی تمام روایتوں کو نماز میں جمع کرکے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قراءات سبعہ متواتر ہیں، اس اعتبار سے ان کا نماز میں پڑھنا جائز ہے؛ لیکن کوئی ایک روایت پڑھنی چاہیے۔[۲]

ایک ساتھ تمام روایات کو جمع کرکے یا بعض روایات کو جمع کرکے نماز میں پڑھنا مکروہ ہے۔ اس طرح پڑھنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے، یہ تو نمائش اور فن کا اظہار ہے اور نماز اس کے لیے نہیں ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۴] پلاسٹک کی سخت ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا

۸۴۷-سوال: ہمارے یہاں مسجدوں میں پلاسٹک کی ٹوپیاں رکھی گئی ہیں، ٹوپیاں اتنی سخت ہیں کہ نماز پڑھتے وقت سر سے گر جاتی ہیں، تو ایسی ٹوپی میں نماز درست ہوگی یا نہیں؟

(۱) تكون المتابعة فرضا، بمعنى أن يأتي بالفرض مع إمامه أو بعده، كما لو ركع إمامه فركع معه مقارنا أو معاقبا وشاركه فيه أو بعدما رفع منه، فلو لم يركع أصلا، أو ركع ورفع قبل أن يركع إمامه ولم يعده معه أو بعده بطلت صلاته. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۴۷۰، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، واجبات الصلاة، مطلب مهم في تحقيق متابعة الإمام، ط: دار الفكر - بيروت)

(ومنها السجود) السجود الثاني فرض كالأول بإجماع الأمة. كذا في الزاهدي. (الفتاوى الهندية: ۱/۷۰، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الأول في فرائض الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان سابق: "کسی وجہ سے امام صاحب کے ساتھ رکوع چھوٹ جائے تو کیا کرے؟"۔

(۲) في الحجة قراءة القرآن بالقراءات السبعة والروايات كلها جائزة. (الفتاوى الهندية: ۱/۷۹، كتاب الصلاة، الفصل الرابع في القراءة، ط: زكريا - ديوبند)

(۳) قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ (۲۳-المؤمنون: ۱-۳)

الجواب حامداو مصلیا:

پلاسٹک کی ٹوپی پہن کر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، جائز ہے؛ لیکن اگر بار بار سر سے گر جاتی ہو، تو بہتر نہیں ہے؛ کیوں کہ کھلے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے اور بار بار ٹوپی کو اٹھا کر پہنے سے نماز فاسد ہو جائے گی؛ لہٰذا ایسی ٹوپی نہیں پہننی چاہیے۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] امام صاحب کو لقمہ دینا مفسد صلاۃ نہیں ہے

۸۴۸-سوال: اگر امام صاحب سے تین آیتیں پڑھ لینے کے بعد غلطی ہوئی اور کسی مقتدی نے لقمہ دیا، تو کیا لقمہ دینے والے کی نماز فاسد ہو جائے گی؟

الجواب حامداو مصلیا:

امام صاحب نے تین آیت سے کم تلاوت کی ہو یا زیادہ، لقمہ دینے والے مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔ (درمختار جلد ا صفحہ ۶۲۲)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۶] مصلی کے سامنے کا پردہ سترہ کے قائم مقام ہے

۸۴۹-سوال: کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو، اس کے آگے پردہ لگا ہوا ہو، جو اوپر سے ڈوری سے بندھا ہوا ہو اور نیچے سے تقریباً ایک بالشت پردہ اونچا ہو، تو کیا وہ سترہ مانا جائے گا؟ جب کہ سترہ کا حکم نیچے سے

[۱] وکره... (وصلاته حاسرا) أي كاشفا (رأسه للتكاسل) ولا بأس به للتذلل، وأما للإهانة بها فكفر ولو سقطت قلنسوته فإعادتها أفضل إلا إذا احتاجت لتكوير أو عمل كثير. (الدر المختار)

وفي الدرر عن التتارخانية: والظاهر أن أفضلية إعادتها حيث لم يقصد بتركها التذلل. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۴۱، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة، ومايكره فيها، فروع مشي المصلي مستقبل القبلة هل تفسد صلاته، ط: دار الفكر - ديوبند☆البحر الرائق: ۲/ ۴۴، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة، ومايكره فيها، ط: دار الكتاب - ديوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۶، فيمايكره الصلاة ومالايكره، ط: زكريا - ديوبند)

[۲] (بخلاف فتحه على إمامه) فإنه لايفسد (مطلقا) لفاتح وآخذ بكل حال، ... وينوي الفتح لا القراءة. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله بكل حال) أي سواء قرأ الإمام قدر ما تجوز به الصلاة أم لا، انتقل إلى آية أخرى أم لا، تكرر الفتح أم لا، هو الأصح نهر. (رد المحتار: ۱/ ۶۲۲، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فروع سمع المصلي اسم الله تعالى فقال جل جلاله أو النبي صلى الله عليه وسلم فصلى عليه، ط: دار الفكر - بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۹۹، كتاب الصلاة، الباب السابع فيما يفسد الصلاة، الفصل الأول فيما يفسدها، ط: زكريا - ديوبند)

دو بالشت کا ہے اور پردہ نیچے سے کھلا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداو مصلیا:

سترہ کا مقصد یہ ہے کہ مصلی کے سامنے سے گذرنے کی بنا پر اس کی توجہ اور دھیان میں خلل نہ ہو، سترہ کی وجہ سے ایک حد قائم ہو جاتی ہے، جس حد تک اس کی توجہ مرکوز رہتی ہے، سترہ کے باہر سے گذرنے میں توجہ محدّد میں خلل نہیں آتا۔[1] اسی لیے سترہ نہ ہونے کی صورت میں حضرات شوافع کے یہاں طویل کپڑا بچھا دینا بھی کافی ہوتا ہے۔ جب مقصد خیال کو انتشار سے بچانا ہے اور ایک حد قائم کر دینا ہے، تو مذکورہ پردہ سے بھی حد قائم ہو جاتی ہے اور مصلی کا دھیان بھی ہٹتا نہیں ہے، جس طرح دیوار سامنے ہو، اس لیے مذکورہ پردہ سترہ کے لیے کافی ہے؛ کیوں کہ گزرنے والا مصلی کی نظروں سے غائب ہے، تو سترہ سے بھی زیادہ مفید ہے۔ اگر پردہ نیچے سے کچھ اونچا ہے؛ اور باہر چلنے پھرنے سے مصلی کی توجہ میں خلل نہیں پڑتا اور چلنے والے کے پیر مصلی کو نظر نہیں آتے، تو مقصد حاصل ہو جاتا ہے؛ اس لیے وہ سترہ کے لیے کافی ہے۔ (تحفۃ المحتاج: ۲/۱۱۰ ☆ المجموع: ۳/۲۴۸)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فأما إن كان بينهما حائل فلا بأس بالمرور فيما وراء الحائل والمستحب لمن يصلي في الصحراء أن ينصب بين يديه عودا أو يضع شيئا أدناه طول ذراع كي لا يحتاج إلى الدرء، لقول النبي - صلى الله عليه وسلم - إذا صلى أحدكم في الصحراء فليتخذ بين يديه سترة. (بدائع الصنائع: ۱/۲۱۷، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يستحب في الصلاة وما يكره، ط: دار الكتب العلمية ☆ رد المحتار: ۲/۴۰۱-۴۰۲، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: زكريا - ديوبند ☆ الهداية: ۱/۱۳۸-۱۳۹، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: ياسر نديم، ديوبند)

[۲] (ويسن للمصلي) أن يتوجه (إلى جدار أو سارية) أي عمود (أو عصا مغروزة) أو هنا وفيما يعد للترتيب وفيما قبل للتخيير . . . وكذا يقال في المصلي مع العصا وفي الخط مع المصلي (أو بسط مصلى) بعد عجزه عما ذكر (أو خط) خطا (قبالته). (تحفة المحتاج في شرح المنهاج - أحمد بن محمد بن علي بن حجر الهيتمي (م: ۹۷۴هـ): ۲/۱۵۶-۱۵۷، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، (فصل) في ذكر مبطلات الصلاة وسننها ومكروهاتها، ط: المكتبة التجارية الكبرى بمصر لصاحبها مصطفى محمد)

قال الإمام عبد الحميد الشرواني: . . . أقول ما ذكره من التردد ظاهر فيما لو بسط نحو بساط طويل للصلاة عليه، أما ما جرت به العادة من الحصر المفروشة في المساجد فينبغي القطع بأنه لا يعد شيء منها سترة، حتى لو وقف في وسط حصير وكان الذي أمامه منها ثلاثة أذرع لم يكف؛ لأن المقصود من السترة تنبيه المار على احترام المحل بوضعها وهذه لجريان العادة بدوام فرشها في المحل لم يحصل بها التنبيه المذكور، ع ش. (حاشية الشرواني مع تحفة المحتاج: ۲/۱۵۷ ☆ المجموع شرح المهذب - أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ۶۷۶هـ): ۳/۲۴۸-۲۴۹، كتاب الصلاة، باب استقبال القبلة، ط: دار الفكر.

[۳۷] امام کا سترہ مقتدیوں کے لیے کافی ہے

۸۵۰-سوال: امام کے آگے سترہ ہو، تو کیا صرف امام کے لیے کافی ہوگا یا مقتدی حضرات کے لیے بھی کفایت کر جائے گا، یعنی اس صورت میں مقتدی کے آگے سے گذرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامدا و مصلیا:

امام کے آگے سترہ ہو، تو یہ مقتدی کو بھی کافی ہوگا، ایسی صورت میں امام کے پیچھے جو مقتدی حضرات ہیں، ان کے آگے سے نکلنا جائز ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۸] سجدے میں جاتے ہوئے ازار اور پتلون کو سمیٹنا

۸۵۱-سوال: سجدے میں جاتے ہوئے دونوں ہاتھ سے اپنی ازار یا پتلون کو اوپر چڑھانا کیسا ہے؟

الجواب حامدا و مصلیا:

سجدے میں جاتے ہوئے اپنی ازار اور پتلون کو اوپر نہیں چڑھانا چاہیے؛ کیوں کہ اس میں عمل کثیر ہوگا۔ عمل کثیر کسے کہتے ہیں، اس سلسلے میں ایک قول یہ ہے کہ کوئی کام نماز کی حالت میں دونوں ہاتھ سے کیا جائے؛ لہٰذا اس قول کے مطابق نماز فاسد ہو جائے گی؛ عمل کثیر کے بارے میں دوسرے دو قول اور بھی

(۱) عن عون بن أبي جحيفة، قال: سمعت أبي: أن النبي صلى الله عليه وسلم صلى بهم بالبطحاء وبين يديه عنزة، الظهر ركعتين، والعصر ركعتين، تمر بين يديه المرأة والحمار. (صحيح البخاري: ۱/۷۱، رقم الحديث: ۴۹۵، كتاب الصلاة، باب سترة الإمام سترة من خلفه، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۹۵-۱۹۶، رقم الحديث: ۲۵۲-(۵۰۳)، كتاب الصلاة، باب سترة المصلي، ط: البدر - ديوبند)

"وسترة الإمام سترة للقوم" "لأنه عليه الصلاة والسلام صلى ببطحاء مكة إلى عنزة ولم يكن للقوم سترة". (الهداية في شرح بداية المبتدي - المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۱۳۹، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: ياسر نديم - ديوبند☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۰۳-۴۰۴، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: زكريا - ديوبند)

(وسترة الإمام مجزئة) أي كافية (عن القوم) وإن كان مسبوقا كما هو ظاهر الأحاديث الثابتة في الصحيحين من الاقتصار على سترته - عليه الصلاة والسلام - وهي سترة للقوم. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۱۲۲، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار إحياء التراث العربي)

ہیں: ان کے مطابق نماز فاسد نہیں ہوگی؛ لہٰذا اگر ضرورت کی وجہ سے ازار اور پتلون کو اوپر چڑھانا ہی پڑ جائے، تو دونوں ہاتھ سے جلدی سے چڑھا لے، اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی، اور اگر دونوں ہاتھ سے چڑھانے میں دونوں ہاتھ کو دو تین مرتبہ استعمال کیا ہے، تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۹] نماز کی حالت میں جمائی آنا اور روکنے کی صورت میں آنکھوں سے پانی بہنا

۸۵۲-سوال: ایک شخص کو نماز میں بہت جمائی آتی ہے اور اگر تکلف کے ساتھ اس کو روکنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کو پورے بدن میں تکلیف ہونے لگتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ناقص جمائیاں آتی ہیں، جن کی وجہ سے نماز میں بھی پریشانی لاحق ہوتی ہے، ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھی پانی اتر آتا ہے اور اتنی مقدار میں پانی اترتا ہے کہ وہ چہرے اور کپڑوں پر بھی گرنے لگتا ہے، تو ان کی وجہ سے نماز میں کوئی حرج لازم آئے گا یا نہیں؟ زیادہ تر ایسا نماز ہی کی حالت میں ہوتا ہے۔

الجواب حامداومصلیا:

جو چیزیں طبعی اور فطری ہوتی ہیں، جن میں آدمی کے قصد وارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے، ایسے کام اگر نماز میں طبعی تقاضوں کی وجہ سے پیش آجائیں، تو ان سے نماز میں کوئی خرابی لازم نہیں آئے گی، مثلاً: جمائی، کھانسی اور چھینک آجائے، تو ان چیزوں میں آدمی مجبور ہوتا ہے؛ اس لیے ان کی وجہ سے نماز میں کوئی نقصان لازم نہیں آئے گا؛ اسی طرح اگر کسی شخص سے قصد وارادے اور درد وتکلیف کے بغیر "ہاہ ہاہ" کی

---

(۱) العمل الكثير يفسد الصلاة والقليل لا. كذا في محيط السرخسي، واختلفوا في الفاصل بينهما على ثلاثة أقوال: (الأول) أن ما يقام باليدين عادة كثير، وإن فعله بيد واحدة كالتعمم، ولبس القميص، وشد السراويل، والرمي عن القوس، وما يقام بيد واحدة قليل، وإن فعل بيدين كنزع القميص، وحل السراويل، ولبس القلنسوة، ونزعها ونزع اللجام. هكذا في التبيين.

(والثاني) أن يفوض إلى رأي المبتلى به، وهو المصلي فإن استكثره كان كثيرا وإن استقله كان قليلا، وهذا أقرب الأقوال إلى رأي أبي حنيفة - رحمه الله تعالى -.

(والثالث) أنه لو نظر إليه ناظر من بعيد إن كان لا يشك أنه في غير الصلاة فهو كثير مفسد، وإن شك فليس بمفسد وهذا هو الأصح. هكذا في التبيين وهو أحسن. كذا في محيط السرخسي وهو اختيار العامة. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۰۱، ۱۰۲، كتاب الصلاة، النوع الثاني في الأفعال المفسدة للصلاة، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار: ۱/ ۶۲۴، ۶۲۵، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة، وما يكره فيها، ط: دار الفكر)

آواز نکلے اور آنکھوں سے آنسو بہے، تو بھی نماز میں کوئی فساد نہیں آئے گا؛ ہاں! اگر یہ تمام چیزیں اپنے قصد و ارادے سے کر رہا ہے، تو اس سے بعض صورتوں میں نماز فاسد ہو جائے گی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۰] نماز کا وقت ختم ہو جانے کے خوف سے استنجاء کے شدید تقاضہ کے ساتھ نماز پڑھنا

۸۵۳-سوال: کسی شخص کو استنجاء کا سخت تقاضہ ہے، اور فجر کی نماز کا وقت بہت ہی کم باقی رہ گیا ہے، کہ اگر استنجاء سے فراغت حاصل کرے گا، تو وقت ختم ہو جائے گا اور نماز قضاء ہو جائے گی، تو اس صورت میں اگر وہ شخص استنجاء کے تقاضہ کو روک کر نماز ادا کرے، تو اُس کی نماز درست ہوگی یا مکروہ؟

الجواب حامداً ومصلیاً ومسلماً

استنجاء کے تقاضہ کے ساتھ نماز ادا کرنا مکروہ ہے، اگر نماز کا وقت کم ہو اور استنجاء کا تقاضہ اتنا شدید نہ ہو، کہ اُسے روکنے میں کوئی تکلیف ہو اور اُسے روک کر نماز پڑھنے سے نماز کے خشوع وخضوع میں کوئی فرق نہیں آتا، تو پہلے نماز پڑھ لینی چاہیے؛ لیکن اگر تقاضہ کو روکنے میں تکلیف ہو کہ نماز کا خشوع وخضوع حاصل نہ ہو، اور پورا دھیان استنجاء میں ہی رہنے کا اندیشہ ہو، تو پہلے استنجاء سے فارغ ہو جائے، اور بعد میں نماز کی قضا کر لے۔ (فتاوی قاضی خان) [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) يفسدها . . . (والتنحنح) بحرفين (بلا عذر) أما به بأن نشأ من طبعه فلا (أو) بلا (غرض صحيح) فلو لتحسين صوته أو ليهتدي إمامه أو للإعلام أنه في الصلاة فلا فساد على الصحيح . . . (والأنين) هو قوله "آه" بالقصر (والتأوه) هو قوله آه بالمد (والتأفيف) أف أو تف (والبكاء بصوت) يحصل به حروف (لوجع أو مصيبة) قيد للأربعة إلا لمريض لا يملك نفسه عن أنين وتأوه لأنه حينئذ كعطاس وسعال وجشاء وتثاوب وإن حصل حروف للضرورة. (الدر المختار مع رد المحتار :۱/ ۶۱۸، ۶۱۹، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار الفكر ☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۱، كتاب الصلاة، الباب السابع فيما يفسد الصلاة الخ، الفصل الاول فيما يفسدها، ط: مكتبه زكريا- ديوبند)

(۲) عن ابن أبي عتيق، قال: تحدثت أنا والقاسم، عند عائشة رضي الله عنها، حديثا وكان القاسم رجلا لحانة وكان لأم ولد، فقالت له عائشة: ما لك لا تحدث كما يتحدث ابن أخي هذا، أما إني قد علمت من أين أتيت هذا أدبته أمه، وأنت أدبتك أمك، قال: فغضب القاسم وأضب عليها، فلما رأى مائدة عائشة، قد أتي بها قام، قالت: أين؟ قال: أصلي، قالت: اجلس، قال: إني أصلي، قالت: اجلس غدر، إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا صلاة بحضرة الطعام، ولا هو يدافعه الأخبثان. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۰۸، رقم الحديث: ۶۷-(۵۶۰)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب لا صلاة بحضرة طعام ولا وهو يدافعه الأخبثان، ط: البدر- ديوبند)

ويكره الدخول في الصلاة وهو مطالب ببول أو غائط، فإن افتتحها وذلك يشغله عن الصلاة، قطعها، وإن مض =

[۴۱] امام سری نماز میں جہراً قراءت شروع کردے تو مقتدی اُسے کیسے آگاہ کرے؟

۸۵۴-سوال: امام صاحب اگر غلطی سے سری نماز میں جہراً قراءت شروع کردیں، تو مقتدی اُنہیں کیسے آگاہ کرے؟

الجواب حامدا ومصليا:

سری نماز میں امام صاحب جہراً قراءت شروع کردیں یا اور کوئی غلطی ہوجائے، تو مقتدی کو چاہیے کہ وہ ''سبحان اللہ'' کہہ کر آگاہ کرے۔ (درمختار)[1] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

= عليها أجزأه و قد أساء، و كذا لو أصابه بعد الافتتاح. (فتاوى قاضي خان مع الهندية: ۱/ ۱۱۹، باب الحدث في الصلاة، و مايكره و مالايكره، ط: زكريا- ديوبند)

و في "المحيط" ويكره أن يدخل في الصلاة وهو يدافع الأخبثين أو الريح فإن ثقله الاهتمام بها قطعها، وإن مضى عليها أجزأه وقد أساء، وشدد أبو زيد المروزي والقاضي حسين من الشافعية وقالا: إذا انتهى به مدافعة الأخبثين إلى ذهاب خشوعه لم تصح صلاته، ومذهب الظاهرية بطلان الصلاة مع مدافعة الأخبثين، والصحيح عند العلماء: صحة ذلك مع الكراهة. (البناية شرح الهداية-أبو محمد محمود بن أحمد بن موسى، الغيتابي الحنفي بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۲/ ۴۳۶، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فصل في العوارض التي تكره في الصلاة، كف الثوب في الصلاة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

ويكره الصلاة وقت مدافعة البول أو الغائط، ووقت حضور الطعام إذا كانت النفس تائقة إليه، والوقت الذي يوجد فيه ما يشغل البال من أفعال الصلاة، ويخل بالخشوع كائنا ما كان الشاغل، ويكره أداء العشاء ما بعد نصف الليل. هكذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۳، الباب الأول في مواقيت الصلاة وما يتصل بها، الفصل الأول في أوقات الصلاة، ط: دار الفكر☆الجوهرة النيرة- أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/ ۵۹، باب صفة الصلاة، ط: المطبعة الخيرية)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۴۱، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، مطلب في الخشوع، ط: دار الفكر- بيروت☆حاشية الشرنبلالي على درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۱/ ۱۰۹، مكروهات الصلاة، ط: دار إحياء الكتب العربية.

[۱] ولو استأذن على المصلي إنسان، فسبح، وأراد به إعلامه أنه في الصلاة، لم يقطع صلاته؛ لما روي عن علي- رضي الله عنه- أنه قال: كان لي من رسول الله- صلى الله عليه وسلم- مدخلان في كل يوم، بأيهما شئت دخلت، فكنت إذا أتيت الباب، فإن لم يكن في الصلاة فتح الباب فدخلت، وإن كان في الصلاة، رفع صوته بالقراءة فانصرفت؛ ولأن المصلي يحتاج إليه لصيانة صلاته؛ لأنه لو لم يفعل ربما يلح المستأذن حتى يبتلى هو بالغلط في القراءة، فكان القصد به صيانة صلاته فلم تفسد، وكذا إذا عرض للإمام شيء فسبح المأموم ولا بأس به؛ لأن القصد به إصلاح=

[۴۲] دوران صلاۃ امام صاحب کی لنگی کی گرہ کھل جائے، تو وہ بقیہ نماز کیسے پوری کریں؟

۸۵۵-سوال: امام صاحب کی لنگی کی گرہ دوسری رکعت کے سجدے کے دوران کھل گئی؛ جس کی وجہ سے وہ بیٹھ گئے، اور اسی حالت میں نماز مکمل کی، جب کہ مقتدی کھڑے ہوگئے، امام صاحب نے اس لیے بیٹھ کر نماز مکمل کی کہ اگر کھڑے ہوتے تو ستر کھل جاتا، اور لنگی باندھ لیتے تو عملِ کثیر ہو جاتا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح امام بیٹھ کر نماز پوری کرے اور مقتدی کھڑے ہوں، تو نماز صحیح ہوگی؟ اور اس صورت میں امام کے لیے صحیح طریقہ کون سا ہے؟ کیا انھیں عملِ کثیر کے باوجود لنگی باندھ لینی چاہیے تھی؟ یا بیٹھ کر نماز پوری کرنا ہی صحیح ہے، جیسا کہ انہوں نے کیا۔

الجواب حامدا ومصليا:

مسئلۂ مذکورہ میں جب امام صاحب نے بیٹھ کر نماز مکمل کی، تو قیام - جو کہ فرض ہے - [1] کے ترک کرنے کی وجہ سے نماز فاسد ہوگئی، امام صاحب کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ اس صورت میں اولاً عملِ قلیل کے ذریعے لنگی باندھ لیتے، اگر احتیاط کے باوجود عملِ کثیر کا تحقق ہو جاتا، تو نماز کا اعادہ کر لیتے، یہ ایسا ہی ہے، جیسے نماز کے درمیان اگر سانپ یا بچھو نکل آئے اور اس کے کاٹنے کا خوف ہو، تو نماز کے دوران اولاً اُسے مارنے کا حکم ہے۔ پھر نماز دہرائی جائے۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= الصلاة، فسقط حكم الكلام عنه للحاجة إلى الإصلاح. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ۱/ ۲۳۵، فصل بيان حكم الاستخلاف، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۷۷، كتاب الصلاة، ما يفسد الصلاة و ما يكره فيها، ط: زكريا- ديوبند☆ البحر الرائق: ۲/ ۸، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۱) ولا يجوز ترك القيام في المكتوبة إلا من عذر. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱/ ۲۰۸، كتاب الصلاة، صلت المرأة وربع ساقها مكشوف، ط: دار المعرفة- بيروت☆ المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۱۴۳، كتاب الصلاة، الفصل الحادي والثلاثون في صلاة المريض، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) (لا) يكره (قتل حية أو عقرب) إن خاف الأذى، إذ الأمر للإباحة لأنه منفعة لنا، فالأولى ترك الحية البيضاء لخوف الأذى (مطلقا) ولو بعمل كثير على الأظهر؛ لكن صحح الحلبي الفساد. (الدر المختار: ۱/ ۶۵۰)

قال ابن عابدين: (قوله على الأظهر) كذا قال الإمام السرخسي، وقال لأنه عمل رخص فيه للمصلي، فهو كالمشي=

[۴۳] نماز میں کسی نابالغ کا لقمہ دینا

۸۵۶-سوال: اگر جہری نماز میں کسی نابالغ بچے نے لقمہ دے دیا، تو اُس کا لقمہ قبول کرنے سے نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً:

نابالغ کی نماز اور اقتداء درست ہے؛ لہٰذا اُس سے لقمہ لینا بھی جائز ہے۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۴] کھجور کے درخت کی پتیوں سے بنی ہوئی ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا

۸۵۷-سوال: ہماری مسجد میں کھجور کے درخت کی پتیوں کی ٹوپیاں رکھی ہوئی ہیں، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان ٹوپیوں کو پہن کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

کھجور کے درخت کی پتیوں کی ٹوپی، جو عام طور پر مساجد میں رکھی جاتی ہیں، انھیں پہن کر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، نماز جائز ہے، جس طرح کھجور کی چٹائی پر نماز پڑھی جاتی ہے، اسی طرح یہ بھی جائز ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= بعد الحدث بحر (قوله لكن صحح الحلبي الفساد) حيث قال تبعا لابن الهمام: فالحق فيما يظهر هو الفساد، والأمر بالقتل لا يستلزم صحة الصلاة مع وجوده كما في صلاة الخوف؛ بل الأمر في مثله لإباحة مباشرته وإن كان مفسدا للصلاة. اهـ. ونقل كلام ابن الهمام في الحلية والبحر والنهر وأقروه عليه، وقالوا: إن ما ذكره السرخسي رده في النهاية بأنه مخالف لما عليه عامة رواة شروح الجامع الصغير ومبسوط شيخ الإسلام من أن الكثير لا يباح. اهـ. (رد المحتار: ۱/۶۵۱، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فرع لا بأس باتخاذ المسبحة لغير رياء، ط: دار الفكر-بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/ ۵۳-۵۴، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة، ط: دار الكتاب-ديوبند)

(۱) وفتح المراهق كالبالغ. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق- زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۱۱، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار الكتاب- ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۹۹، الباب السابع فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها، الفصل الأول فيما يفسدها، ط: دار الفكر)

(۲) کہ عدم جواز کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے: والأصل في الأشياء الإباحة (رد). [قواعد الفقه- محمد عميم الإحسان المجددي البركتي: ۵۹، القواعد الفقهية، ط: الصدف ببلشرز - كراتشي]

[۴۵] عورتوں کا ایسی چوڑیاں پہن کر نماز پڑھنا، جن میں باریک تصویریں ہوں

۸۵۸-سوال: چوڑیوں میں اگر ایسی باریک تصاویر ہوں، جو بہت غور سے دیکھے بغیر دکھائی نہ دیتی ہوں، تو ایسی چوڑیاں پہن کر نماز پڑھنے سے نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

ایسی چوڑیاں پہن کر نماز پڑھنا جن میں غور سے دیکھے بغیر تصاویر کا پتہ نہ چل سکتا ہو جائز ہے۔ (فتاویٰ عالم گیری)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۶] جان بوجھ کر بغیر ٹوپی پہنے نماز پڑھنا

۸۵۹-سوال: ہمارے یہاں بہت سے مسلمان بغیر ٹوپی پہنے نماز پڑھ لیتے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ اُن کی نماز تو ہو جاتی ہے؛ لیکن جان بوجھ کر بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنے کے سلسلہ میں حکمِ شرعی کیا ہے؟ اس کے متعلق مکمل تفصیل سے رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

بغیر ٹوپی پہنے نماز پڑھنا مکروہ ہے، ٹوپی پہننے کو ضروری نہ سمجھتے ہوئے یا اس وجہ سے کہ ٹوپی اپنے ساتھ رکھنا بوجھ معلوم ہو رہا ہو، تو مکروہِ تنزیہی ہے، کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے بغیر ٹوپی کے نماز پڑھ لے، تو گنجائش ہے، لیکن اس کی عادت بنانے والا گنہ گار ہوگا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] ويكره أن يصلي وبين يديه أو فوق رأسه أو على يمينه . . . وهذا إذا كانت الصورة كبيرة تبدو للناظر من غير تكلف. كذا في فتاوى قاضي خان، ولو كانت صغيرة بحيث لا تبدو للناظر إلا بتأمل، لا يكره. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۷، الباب السابع فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها، الفصل الثاني فيما يكره في الصلاة وما لا يكره، ط: دار الفكر)

(۲) وكره . . . (وصلاته حاسرا) أي كاشفا (رأسه للتكاسل) ولا بأس به للتذلل، وأما للإهانة بها فكفر ولو سقطت قلنسوته فإعادتها أفضل إلا إذا احتاجت لتكوير أو عمل كثير. (الدر المختار) ———— قال ابن عابدين: (قوله للتكاسل) أي لأجل الكسل، بأن استثقل تغطيته ولم يرها أمرا مهما في الصلاة فتركها لذلك، وهذا معنى قولهم تهاونا بالصلاة وليس معناه الاستخفاف بها والاحتقار لأنه كفر شرح المنية. قال في الحلية: وأصل الكسل ترك العمل لعدم الإرادة، فلو لعدم القدرة فهو العجز. (قوله ولا بأس به للتذلل) قال في شرح المنية: فيه إشارة إلى أن الأولى أن لا يفعله وأن يتذلل ويخشع بقلبه فإنهما من أفعال القلب. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۴۱، =

[۷۴] قلیل کلام مفسد صلاۃ ہے

۸۶۰-سوال: ایک مرتبہ یہاں (کویت میں) امام صاحب نے بھول کر عصر کی تین رکعت فرض نماز پڑھائی، کچھ گفتگو کی، پھر ان کو یاد آیا، تو انہوں نے باقی ایک رکعت پڑھائی اور سجدۂ سہو کر کے سلام پھیرا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسی صورت میں نماز ہوئی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک اصلاح صلاۃ کے لیے قلیل گفتگو سے نماز فاسد نہ ہوگی۔ (۱)

= باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فروع مشي المصلي مستقبل القبلة هل تفسد صلاته، مطلب في الخشوع، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۰۲، الباب السابع فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها، الفصل الثاني فيما يكره في الصلاة وما لا يكره، ط: دار الفكر)

(۱) عن معاوية بن الحكم السلمي، قال: بينا أنا أصلي مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، إذ عطس رجل من القوم، فقلت: يرحمك الله فرماني القوم بأبصارهم، فقلت: واثكل أمياه، ما شأنكم؟ تنظرون إلي، فجعلوا يضربون بأيديهم على أفخاذهم، فلما رأيتهم يصمتونني لكني سكت، فلما صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فبأبي هو وأمي، ما رأيت معلما قبله ولا بعده أحسن تعليما منه، فوالله، ما كهرني ولا ضربني ولا شتمني، قال: إن هذه الصلاة لا يصلح فيها شيء من كلام الناس، إنما هو التسبيح والتكبير وقراءة القرآن. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۰۳، رقم الحديث: ۳۳-(۵۳۷)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب تحريم الكلام في الصلاة، ونسخ ما كان من إباحته، ط: ديوبند)

امام نووی شافعیؒ (م: ۶۷۶ھ) نے اس حدیث کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے:

فيه تحريم الكلام في الصلاة سواء كان لحاجة أو غيرها وسواء كان لمصلحة الصلاة أو غيرها، فإن احتاج إلى تنبيه، أو إذن لداخل ونحوه سبح إن كان رجلا وصفقت إن كانت امرأة، هذا مذهبنا ومذهب مالك وأبي حنيفة رضي الله عنهم والجمهور من السلف والخلف، وقال طائفة منهم الأوزاعي يجوز الكلام لمصلحة الصلاة لحديث ذي اليدين... وهذا في كلام العامد العالم أما الناسي فلا تبطل صلاته بالكلام القليل عندنا، وبه قال مالك وأحمد والجمهور، وقال أبو حنيفة رضي الله عنه والكوفيون: تبطل،... فإن كثر كلام الناسي، ففيه وجهان مشهوران لأصحابنا، أصحهما تبطل صلاته، لأنه نادر وأما كلام الجاهل إذا كان قريب عهد بالإسلام فهو ككلام الناسي فلا تبطل الصلاة بقليله. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج المعروف بـ 'حاشية النووي على المسلم: ۵/ ۲۰، باب تحريم الكلام في الصلاة ونسخ ما كان من إباحته، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

احناف کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی؛ اس لیے صورت مسئولہ میں حنفی مسلک والوں کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۸] نماز میں بلاضرورت عادتاً کھنکھارنا

۸۶۱-سوال: ایک شخص ہر وقت رکوع اور سجدہ میں کھنکھارتا رہتا ہے اور بلغم پی جاتا ہے، خواہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہو یا اکیلا، کیا اس طرح ہر نماز میں زور سے کھنکھارنے سے نماز فاسد نہیں ہوگی؟

الجواب حامداو مصلیا:

مصلی کے دوران صلاۃ بلاضرورت کھنکھارنے کی وجہ سے اگر کوئی لفظ بن جائے، جیسے کہ آہ آہ کرنا، تو نماز فاسد ہو جائے گی؛ لیکن اگر عذر ہے، گلے میں بلغم پھنسا ہوا ہے، یا آواز کی صفائی کے لیے ایسا کرتا ہے، یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے کھنکھارتا ہے، تو جائز ہے، نماز فاسد نہ ہوگی۔ درمختار میں ہے: (والتنحنح بحرفين (بلاعذر) أما به بأن نشأ من طبعه فلا (أو) بلا (غرض صحيح) فلو لتحسين صوته أو ليهتدي إمامه أو للإعلام أنه في الصلاة فلا فساد على الصحيح. (درمختار مع شامی، ج:۱، ص:۵۷۸) [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (يفسدها التكلم) هو النطق بحرفين أو حرف مفهم. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۶۱۳، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار الفكر - بيروت)

ومنها أي من مفسدات الصلاة الكلام عمدا أو سهوا، وقال الشافعي: كلام الناسي لا يفسد الصلاة إذا كان قليلا. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۳۳، فصل بيان حكم الاستخلاف، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) قال ابن عابدين: (قوله والتنحنح) هو أن يقول أح بالفتح والضم بحر (قوله بحرفين) يعلم حكم الزائد عليهما بالأولى،... (قوله بأن نشأ من طبعه) أي بأن كان مدفوعا إليه (قوله على الصحيح) لأنه يفعله لإصلاح القراءة فيكون من القراءة معنى كالمشي للبناء، فإنه وإن لم يكن من الصلاة لكنه لإصلاحها فصار منها معنى شرح المنية عن الكفاية، لكنه لا يشمل ما لو كان لإعلام أنه في الصلاة أو ليهتدي إمامه إلى الصواب. والقياس الفساد في الكل إلا في المدفوع إليه كما هو قول أبي حنيفة ومحمد؛ لأنه كلام، والكلام مفسد على كل حال كما مر، وكأنهم عدلوا بذلك عن القياس وصححوا عدم الفساد به إذا كان لغرض صحيح لوجود نص، ولعله ما في الحلية عن سنن ابن ماجه عن علي - رضي الله عنه - قال: كان لي من رسول الله - صلى الله عليه وسلم - مدخلان: مدخل بالليل ومدخل بالنهار، فكنت إذا أتيته وهو يصلي تنحنح لي. وفي رواية: سبح. وحملهما في الحلية على اختلاف الحالات، والله تعالى أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۱۷ - ۶۱۸، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، مطلب المواضع التي لا يجب فيها رد السلام، ط: دار الفكر - بيروت)

[۴۹] کیا نمازی کے آگے سے گزرنا اور ہٹنا دونوں برابر ہیں؟

۸۶۲-سوال: نمازی کے آگے بیٹھے ہوئے شخص کا اٹھ کر چلا جانا گناہ کا باعث ہے یا نہیں؟ ہم نے سنا ہے کہ "نمازی کے آگے جو شخص ہوتا ہے، وہ بہ منزلہ سترہ کے ہے، اگر وہ وہاں سے ہٹ جائے گا، تو گنہ گار ہوگا"۔ میں بھی ایسا ہی خیال کرتا ہوں کہ جس طرح سامنے سے گزرنے پر گناہ ہوتا ہے، اسی طرح سامنے بیٹھے ہوئے شخص کا ہٹنا بھی گناہ کا باعث ہوگا، تو کیا میرا ایسا سمجھنا درست ہے؟ جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مصلی کے سامنے والے آدمی کا ہٹنا جائز ہے، البتہ گزرنا جائز نہیں ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو اس کا پتا چل جائے کہ اس کی وجہ سے اس کو کس قدر گناہ ہوگا، تو وہ چالیس دن یا چالیس مہینہ یا چالیس سال انتظار کرنا پسند کرے گا۔ (اور اس کے سامنے سے نہیں گذرے گا)[1]

---

(۱) عن بسر بن سعيد، أن زيد بن خالد، أرسله إلى أبي جهيم يسأله: ماذا سمع من رسول الله صلى الله عليه وسلم في المار بين يدي المصلي؟ فقال أبو جهيم: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لو يعلم المار بين يدي المصلي ماذا عليه، لكان أن يقف أربعين خيرا له من أن يمر بين يديه. قال أبو النضر: لا أدري، أقال أربعين يوما، أو شهرا، أو سنة. (صحيح البخاري: ۱/ ۷۳، رقم الحديث: ۵۱۰، كتاب الصلاة، باب إثم المار بين يدي المصلي، ط: البدر - ديوبند ☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۹۷، رقم الحديث: ۲۶۱-۵۰۷، كتاب الصلاة، باب سترة المصلي، ط: ديوبند)

قال الطحاوي في مشكل الآثار: إن المراد: أربعين سنة، واستدل بحديث أبي هريرة مرفوعا: "لو يعلم الذي يمر بين يدي أخيه معترضا وهو يناجي ربه وحينئذ لكان أن يقف مكانه مائة عام خيرا من الخطوة التي خطاها"، ثم قال: هذا الحديث متأخر عن حديث أبي جهيم؛ لأن فيه زيادة الوعيد، وذلك لا يكون إلا بعدما أو عدهم بالتخفيف كذا نقله ابن الملك. ـــــــ وفي شرح المنية: إنما يكره المرور بين يدي المصلي إذا لم يكن عنده حائل نحو السترة؛ فإنه لا يكره المرور من وراء الحائل، وأيضا إنما يكره المرور عند عدم الحائل إذا مر في موضع سجوده، وهو الأصح، وهو مختار السرخسي، وفي النهاية: الأصح أنه لو صلى صلاة الخاشعين بأن يكون بصره حال قيامه إلى موضع سجوده لا يقع بصره على المار لا يكره، وهو مختار فخر الإسلام، وقيل: هذا في الصحراء، أما في المسجد الصغير فيكره مطلقا، وأما الكبير فقيل: هو كالصغير، وقيل كالصحراء، ورجح ابن الهمام ما ذكره في النهاية من غير تفصيل بين المسجد وغيره، والله أعلم. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح-الملا علي الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۲/ ۶۴۳، رقم الحديث: ۷۷۶، باب السترة، الفصل الأول، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید دیکھیے: رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۳۶، باب ما يفسد الصلاة و ما يكره فيها، فروع مشى المصلي مستقبل القبلة هل تفسد صلاته، مطلب إذا قرأ قوله تعالى جدك "بدون ألف لا تفسد، ط: دار الفكر - بيروت.

اس حدیث میں وعید "گزرنے والے" کے بارے میں ہے اور جو مصلی کے آگے ہو اور اٹھ کر چلا جائے، تو اس کو گزرنا نہیں کہتے؛ بل کہ "سامنے سے ہٹنا" کہا جاتا ہے، الغرض مصلی کے سامنے سے ہٹنے والا گنہ گار نہیں ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۰] مصلی کے آگے سے اٹھ جانا

۸۶۳-سوال: نمازی کے سامنے سے گذرنا تو گناہ ہے لیکن اگر ایک آدمی پیچھے کی صف میں نماز پڑھ رہا ہو اور آگے کی صف والا فارغ ہو گیا ہے تو وہ اٹھ کر جا سکتا ہے یا نہیں؟ زید کا کہنا ہے کہ اٹھ کے جا سکتا ہے گناہ نہیں ہوگا؟

الجواب حامداو مصلیا:

سامنے نماز پڑھنے والا آدمی ہٹ سکتا ہے، نمازی کے سامنے سے گذرنا ممنوع ہے، ہٹنا ممنوع نہیں۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۱] امام کا محراب میں کھڑا ہونا

۸۶۴-سوال: مسجد میں جماعت کھڑی ہونے پر امام مسجد میں بالکل محراب کے اندر کھڑا رہے -جس کو امام کا کٹ جانا کہتے ہیں- تو اس طرح کرنے سے نماز فاسد ہوگی یا صحیح ہوگی؟ بہت سوں کا کہنا ہے کہ امام محراب سے تھوڑا باہر کھڑا رہے، اس سلسلہ میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

امام کا اس طرح کھڑا رہنا کہ دونوں پیر محراب کے اندر ہوں، مکروہ ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے نماز فاسد نہیں ہوگی؛ لہٰذا امام اپنے دونوں پیر مسجد میں رکھیں اور محراب سے باہر کھڑے ہوں۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تقدم تخريجه تحت عنوان متقدم.

(۲) (و) كره ... (قيام الإمام في المحراب لا سجوده فيه) وقدماه خارجة لأن العبرة للقدم (مطلقا) وإن لم يتشبه حال الإمام إن علل بالتشبه وإن بالاشتباه ولا اشتباه فلا اشتباه في نفي الكراهة. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله إن علل بالتشبه إلخ) قيد للكراهة. وحاصله أنه صرح محمد في الجامع الصغير بالكراهة ولم يفصل، فاختلف المشايخ في سببها، فقيل كونه يصير ممتازا عنهم في المكان؛ لأن المحراب في معنى بيت آخر وذلك صنيع أهل الكتاب، واقتصر عليه في الهداية واختاره الإمام السرخسي وقال إنه الأوجه، وقيل اشتباه حاله=

[۵۲] امام کا محراب کے اندر کھڑے رہ کر نماز پڑھانا

۸۶۵-سوال: اگر کوئی امام جماعت والی نماز میں بالکل محراب کے اندر کھڑے ہو کر نماز پڑھائے، تو اس سے نماز مکروہ ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

امام کے لیے بالکل محراب کے اندر کھڑے ہو جانا مکروہ ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=علی من في یمینه ویساره، فعلی الأول یکره مطلقا، وعلی الثاني لا یکره عند عدم الاشتباه، وأید الثاني في الفتح بأن امتیاز الإمام في المکان مطلوب، وتقدمه واجب وغایته اتفاق الملتین في ذلك، وارتضاه في الحلیة وأیده، لکن نازعه في البحر بأن مقتضی ظاهر الروایة الکراهة مطلقا، وبأن امتیاز الإمام المطلوب حاصل بتقدمه بلا وقوف في مکان آخر، ولهذا قال في الولوالجیة وغیرها إذا لم یضق المسجد بمن خلف الإمام لا ینبغي له ذلك لأنه یشبه تباین المکانین انتهی. . . . وفي حاشیة البحر للرملي: الذي یظهر من کلامهم أنها کراهة تنزیه تأمل اهـ. (رد المحتار علی الدر المختار: ۱/ ۶۴۵-۶۴۶، کتاب الصلاة، باب مایفسد الصلاة ومایکره فیها، ط: دار الفکر)

قال أبو جعفر: (ویکره للإمام أن یکون مقامه في الصلاة في الطاق، ولا نری بأسا أن یکون مقامه في المسجد، وسجوده في الطاق). ـــــــ قال أحمد: یعني بالطاق: المحراب إذا کان طاعنا في الحائط یمکن أن یغیب فیه الإمام ببدنه، حتی لا یبصره من علی جنبتیه، وکذا کانت محاریب الکوفة قدیما. ـــــــ وقد روی کراهة ذلك عن بعض السلف. ـــــــ ووجه ذلك: أنه إذا کان مقامه في الطاق: لم یبصره من عن جانبیه فیقتدوا به. (شرح مختصر الطحاوي-أبو بکر الرازي الجصاص الحنفي (م: ۳۷۰ھ): ۸/ ۵۱۷، کتاب الکراهیة، مسألة: کراهیة صلاة الإمام في المحراب الذي لا یری منه، ط: دار البشائر الإسلامیة-ودار السراج)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: درر الحکام شرح غرر الأحکام-ملاخسرو (م: ۸۸۵ھ): ۱/ ۱۰۸، باب ما یفسد الصلاة وما یکره فیها، ط: دار إحیاء الکتب العربیة☆مراقي الفلاح شرح متن نور الإیضاح، ص: ۳۲، فصل في المکروهات، ط: المکتبة العصریة.

(۲) قد تقدم تخریجه تحت عنوان ''امام کا محراب میں کھڑا ہونا''

لو قرأ القرآن فی الصلاۃ بالألحان إن غیر الکلمۃ تفسد وإن کان ذلك فی حروف المد واللین لا تفسد إلا إذا فحش وإن قرأ فی غیر الصلاۃ اختلف المشایخ وعامتھم کرھوا ذلك. کذا فی الخلاصۃ وھو الصحیح. کذا فی الوجیز للکردری وکرھوا الاستماع أیضا. کذا فی الخلاصۃ ونقل عن أبی القاسم الصفار البخاری أن الصلاۃ إذا جازت من وجوہ فسدت من وجہ یحکم بالفساد احتیاطا إلا فی باب القراءۃ لأن للناس عموم البلوی. کذا فی الظھیریۃ.

(فتاویٰ عالم گیری: ۱/ ۸۲، الباب الرابع فی صفۃ الصلاۃ، الفصل الخامس فی زلۃ القاری، ط: دار الفکر)

باب القراءۃ وزلۃ القاري

[قراءت اور قاری کی لغزش کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب القراءة وزلة القاري

[قراءت اور قاری کی لغزش کا بیان]

[۱] فجر کی نماز میں ۴۰؍ سے ۵۰؍ آیتیں پڑھنا استحباب کے لیے کافی ہے

۸۶۶-سوال: ایک امام صاحب اپنی مسجد میں مقتدیوں کا خیال کرتے ہوئے مفصلات سے قراءت کرتے ہیں، مثلاً صبح کی نماز میں سورۂ نازعات کا پہلا رکوع پہلی رکعت میں اور دوسرا رکوع دوسری رکعت میں، مغرب کی پہلی رکعت میں سورۂ قریش اور دوسری میں اخلاص، اور عشاء کی پہلی رکعت میں سورۂ ضحیٰ اور دوسری میں بینہ [سورۂ لم یکن] کی آخری تین آیتیں پڑھتے ہیں، تو کیا امام صاحب نے اس طرح تلاوت کرنے میں کسی ایسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے، جو نماز کو متاثر (فاسد یا مکروہ) کردے؟

کیا امام صاحب کو مصلی ہی پر مصلین کے سامنے کہا جاسکتا ہے کہ آپ اتنی مختصر نماز کیوں پڑھاتے ہیں کہ فجر میں صرف سات منٹ میں نماز مکمل ہوجاتی ہے؟

کیا ثواب کا مدار وقت کے زیادہ ہونے پر ہے یا طول قراءت پر؟ ایک شخص کا کہنا ہے کہ نماز میں وقت زیادہ لگنا چاہیے، سوال یہ ہے کہ شریعت میں صحیح و مسنون طریقہ کیا ہے؟ واضح رہے کہ یہ مسئلہ گاؤں کی مسجد کا ہے، جن میں کمزور افراد بھی ہیں، جن کی عمر ۴۰، ۵۰، ۶۰، ۷۰ تک ہوتی ہے، اور مختصر نماز سے مقتدی راضی ہیں، تو امام کیا کرے؟ امام صرف اس ایک ہی شخص کی رعایت کرے یا اکثر مقتدی حضرات کی۔ تفصیلاً جواب مطلوب ہے۔

الجواب حامداو مصلیا:

(۱) امام اور منفرد کے لیے فجر اور ظہر کی نماز میں طوال مفصل یعنی سورۂ حجرات سے سورۂ بروج تک،

عصر اور عشاء میں اوساط مفصل یعنی سورۂ بروج سے سورۂ لم یکن تک اور مغرب میں قصار مفصل یعنی لم یکن سے اخیر قرآن تک پڑھنا مستحب ہے۔ (عالم گیری، شامی، البحر الرائق) [۱]

(۲) نیز یہ بھی مستحب ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی ایک مکمل سورت پڑھی جائے۔ (عالمگیری) [۲]

(۳) اسی طرح ایک سورت کا نصف حصہ یعنی ایک رکوع ایک رکعت میں اور دوسرا نصف دوسری رکعت میں پڑھنا جائز ہے، اس سے نماز میں کوئی کراہت پیدا نہیں ہوگی۔ (عالمگیری) [۳]

(۴) فجر کی نماز کے متعلق علماء کرام نے لکھا ہے کہ دونوں رکعت میں کل ملا کر ۴۰/آیتیں پڑھنا مستحب ہے دو رکعت میں ۴۰ آیات سے کم قرآن کی تلاوت کی گئی تو مستحب ادا نہ ہوگا۔ (البحر الرائق) [۴]

لیکن آیتیں چھوٹی ہوں تو ٦۰ سے ۱۰۰، بڑی ہوں تو ۴۰/اور متوسط ہوں تو ۵۰ آیات پڑھنے سے مستحب ادا ہو جائے گا۔ (۵)

[۱] وسنتها في الحضر أن يقرأ في الفجر في الركعتين بأربعين أو خمسين آية سوى فاتحة الكتاب وفي الظهر ذكر في الجامع الصغير مثل الفجر وذكر في الأصل أو دونه وفي العصر والعشاء في الركعتين عشرين آية سوى فاتحة الكتاب وفي المغرب يقرأ في كل ركعة سورة قصيرة. هكذا في المحيط واستحسنوا في الحضر طوال المفصل في الفجر والظهر وأوساطه في العصر والعشاء وقصاره في المغرب. كذا في الوقاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۷، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الرابع في القراءة، ط: دار الفكر ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي الحنفي (م: ۹۵٦هـ): ۱/ ۱۵۷-۱۵۸، باب صفة الصلاة، فصل: يجهر الإمام بالقراءة، ت: خليل عمران المنصور، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ البحر الرائق: ۱/ ۳٦۰، باب صفة الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - داماد آفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۱۰۵، باب صفة الصلاة، فصل في أحكام القراءة في الصلاة، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۹۲، باب صفة الصلاة، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل، مطلب قراءة البسملة بين الفاتحة والسورة حسن، ط: دار الفكر - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۴۸۰، كتاب الصلاة، بيان القدر المستحب من القراءة، ط: زكريا - ديوبند)

[۲] الأفضل أن يقرأ في كل ركعة الفاتحة وسورة كاملة في المكتوبة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۸ ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۴۸۲)

[۳] ولو قرأ بعض السورة في ركعة والبعض في ركعة قيل يكره وقيل لا يكره وهو الصحيح. كذا في الظهيرية ولكن لا ينبغي أن يفعل ولو فعل لا بأس به. كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۸ ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۴۸۲)

[۴ - ۵] ولم يذكر المصنف عدد الآيات التي تقرأ في كل صلاة لاختلاف الآثار والمشايخ، والمنقول في الجامع الصغير أنه يقرأ في الفجر في الركعتين سوى الفاتحة أربعين أو خمسين أو ستين آية، واقتصر في الأصل على الأربعين، وروى الحسن في المجرد ما بين ستين إلى مائة، ووردت الأخبار بذلك عنه - صلى الله عليه وسلم - ثم قالوا يعمل بالروايات كلها بقدر الإمكان، واختلفوا في كيفية العمل به، فقيل: ما في المجرد من المائة محمل =

فجر میں سورۂ نازعات (جس کی ۴۶/آیتیں ہیں) اور مغرب میں قصارِ مفصل پڑھنے سے سنت پر عمل ہوجائے گا؛ لیکن عشاء کی پہلی رکعت میں "والضحی" تومقدارِ مستحب ہے؛ لیکن دوسری رکعت میں سورۂ بینہ کی آخری تین آیتوں کی تلاوت کرنے سے سنت پر عمل نہ ہوگا؛ کیوں کہ وہ مقدارِ مسنون سے کم ہے۔ البتہ کسی رکعت میں کسی سورت کی آخری آیات تلاوت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (۲)

البتہ اگر دوسری رکعت میں کم آیات پڑھنے کا کوئی عذر یا کوئی معقول وجہ ہو، تو یہ سنت کے خلاف نہ ہوگا۔ مذکورہ صورت میں امام صاحب نے کوئی ایسی غلطی نہیں کی ہے، جو نماز میں خلل ونقصان کا باعث بنے؛ اس لیے مسجد میں مصلین کے سامنے یہ کہنا کہ ''امام صاحب نے فجر کی نماز میں بہت جلدی کی ہے'' جائز نہیں ہے۔ جب امام صاحب نے مستحب کے ادنیٰ درجہ کی قرات کی ہے، تو ان پر نکیر کرنا جائز نہیں ہے، امام صاحب کی بے حرمتی کرنے کے مرادف ہے۔

اگر امام صاحب ۱۰۰/آیات پڑھنے کی استطاعت رکھتے ہوں اور رغبت بھی ہو اور مقتدی بھی طویل قراءت کے خواہش مند اور متمنی ہوں، تو فجر کی دونوں رکعت میں کل ملاکر ۶۰ سے ۱۰۰ آیات تک - جو یہ قول امام حسن مستحب ہے - پڑھنا اور استحباب کے اعلیٰ درجے پر عمل کرنا مطلوب ہے۔ (البحرالرائق: ۱/۳۶۰)[۷]

لیکن دو، چار مقتدی طویل قراءت کو چاہتے ہوں اور دوسرے مقتدی کم قراءت کی آرزو رکھتے ہوں،

=الراغبين، وما في الأصل محمل الكسالى أو الضعفاء، وما في الجامع الصغير من الستين محمل الأوساط، وقيل: ينظر إلى طول الليالي وقصرها وإلى كثرة الأشغال، وقلتها. قال في فتح القدير: الأولى أن يجعل هذا محمل اختلاف فعله - عليه الصلاة والسلام - بخلاف القول الأول؛ فإنه لا يجوز فعله عليه؛ لأنهم لم يكونوا كسالى، فيجعل قاعدة لفعل الأئمة في زماننا ويعلم منه أنه لا ينقص في الحضر عن الأربعين، وإن كانوا كسالى؛ لأن الكسالى محملها اهـ.
فالحاصل أنه لا ينقص عن الأربعين في الركعتين في الفجر على كل حال على جميع الأقوال، وقال فخر الإسلام قال مشايخنا إذا كانت الآيات قصارا فمن الستين إلى مائة وإذا كانت أوساطا فخمسين وإذا كانت طوالا فأربعين. (البحر الرائق: ۱/ ۳۶۰-۳۶۱، باب صفة الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي☆بدائع الصنائع: ۱/ ۴۷۸-۴۷۹، كتاب الصلاة، بيان القدر المستحب من القراءة، ط: زكريا - ديوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۷)

(۲) ولو قرأ في ركعة من وسط سورة أو من آخر سورة وقرأ في الركعة الأخرى من وسط سورة أخرى أو من آخر سورة أخرى لا ينبغي له أن يفعل ذلك على ما هو ظاهر الرواية ولكن لو فعل ذلك لا بأس به. كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۸)

[۷] وروى الحسن في المجرد ما بين ستين إلى مائة. (البحر الرائق: ۱/ ۳۶۰)

تو اختلاف سے بچنے کے لیے امام صاحب کا جو عمل ہے، وہ استحباب کی مقدار کے موافق ہے۔ رسول ﷺ نے فرمایا کہ بعض ائمہ لوگوں کو جماعت سے متنفر کرنے والے ہیں، اگر تم میں سے کوئی امام بنے تو سنت اور مستحب کا خیال کرتے ہوئے امامت میں تخفیف سے کام لے؛ کیوں کہ تم میں عمر رسیدہ ضعیف اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں؛ لہٰذا ان کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ (بخاری شریف جلد ۱ صفحہ ۹۸)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] قراءت کے دوران آیات کے ترک یا ردوبدل سے نماز کا حکم

۸٦۷-سوال: ہمارے یہاں ایک دن امام صاحب نے فجر کی نماز میں سورۂ رحمٰن پڑھتے وقت کبھی کچھ آیات کو چھوڑ دیا، کبھی اوپر چلے گئے، کبھی نیچے کی آیتوں کو شروع کر دیا، اس طرح سورۂ رحمٰن کی قراءت مکمل کی، پھر نماز کے اخیر میں سجدۂ سہو بھی نہیں کیا، تو نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

امام اگر فرض نماز میں سہو یا شبہ کی بناء پر آیتوں کو مکرر پڑھے، تو مکروہ نہ ہوگا، اگر قصداً بلا عذر آیت کا تکرار کرتا ہے، تو مکروہ تنزیہی ہے۔ (۲)

صورت مسئولہ میں امام صاحب سے شبہ کی بنیاد پر ایسا ہوا ہے؛ اس لیے نماز میں کوئی نقصان نہیں آیا، نماز ادا ہوگئی، سجدۂ سہو بھی واجب نہیں ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

---

[۱] عن أبي مسعود، قال: قال رجل: يا رسول الله إني لأتأخر عن الصلاة في الفجر مما يطيل بنا فلان فيها، فغضب رسول الله صلى الله عليه وسلم، ما رأيته غضب في موضع كان أشد غضبا منه يومئذ، ثم قال: يا أيها الناس، إن منكم منفرين، فمن أم الناس فليتجوز، فإن خلفه الضعيف والكبير وذا الحاجة. (صحيح البخاري: ۱/ ۹۸، رقم الحديث: ۷۰۲، كتاب الأذان، باب من شكا إمامه إذا طول، وانظر: رقم: ۷۰۴، ۶۱۱۰، ۷۱۵۹، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۸۸، رقم الحديث: ۱۸۲-(۴۶۶)، كتاب الصلاة، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام، ط: البدر - ديوبند)

(۲) وإذا كرر آية واحدة مرارا، فإن كان في التطوع الذي يصلي وحده، فذلك غير مكروه، وإن كان في الصلاة المفروضة، فهو مكروه في حالة الاختيار، وأما في حالة العذر والنسيان فلا بأس. هكذا في المحيط. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۱۰۷، كتاب الصلاة، الباب السابع فيما يفسد الصلاة وما يكره فيها، الفصل الثاني فيما يكره في الصلاة وما لا يكره، ط: دار الفكر ☆ ر: فتاوىٰ محموديہ: ۷/ ۹۷، اشرفی - دیوبند)

[۳] آیت کی تبدیلی میں تغیر فاحش ہوگیا، تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟
[۴] کیا اسی رکعت میں اصلاح ضروری ہے، بعد میں اصلاح کافی نہیں؟

۸۶۸-سوال: تراویح کی نماز میں امام صاحب نے "اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" پڑھا، جب کہ اصل آیت ہے: "اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ" تو اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل سوالات ہیں:

۱-کیا اس صورت میں نماز فاسد ہوجائے گی، ایک مولانا صاحب کا کہنا ہے کہ معنیٰ کفر تک پہنچ گیا ہے؛ اس لیے نماز فاسد ہوگئی، نماز پھر سے ادا کرنی ہوگی، کیا یہ بات صحیح ہے؟

۲-اگر دو رکعت کی نیت ہو اور اس میں پہلی رکعت میں اس طرح کی غلطی ہوجائے اور دوسری رکعت میں اس غلطی کی اصلاح کرلی جائے، تو کیسا ہے؟ نماز صحیح ہوجائے گی یا اعادہ لازم ہوگا؟

۳-اگر ان دو رکعتوں میں غلطی کی اصلاح نہ کی گئی؛ بل کہ بعد والی دو رکعتوں میں اصلاح کی گئی، تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ تلافی کے لیے یہ کافی ہوگا یا نہیں؟

۴-اگر معنیٰ میں فحش تغیر نہیں ہوا ہے، تو بعد والی نماز میں اصلاح کرنا کافی ہوگا یا نہیں؟ یا اسی نماز میں اصلاح ضروری ہے؟

۵-اگر تراویح کے بجائے فجر کی نماز میں مذکورہ غلطی پیش آئے، تو کیا حکم ہے؟ اس سلسلہ میں کیا فجر اور تراویح دونوں نمازوں کا حکم ایک ہی ہے یا دونوں میں فرق ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً:

(۱) صورت مسئولہ میں مولانا صاحب کا کہنا صحیح ہے کہ: ''نماز فاسد ہوگئی''؛ لہٰذا تراویح کی ان دو رکعتوں کو پھر سے دوہرانا ضروری ہے: منها ذكر آية مكان آية... أما إذا غير المعنى بأن قرأ "إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات أولئك هم شر البرية إن الذين كفروا من أهل الكتاب" إلى قوله "خالدين فيها أولئك هم خير البرية" تفسد عند عامة علمائنا وهو الصحيح. هكذا في الخلاصة. (عالمگیری)[1]

(۱) الفتاوى الهندية: ۱/۸۰-۸۱، كتاب الصلاة، الفصل الخامس في زلة القاري، ط: زكريا-ديوبند.

نوٹ: لیکن اگر امام صاحب نے "اَلْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ" پر سانس توڑ دیا ہو اور وقف تام کیا ہو، پھر پڑھا "يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ لو ذکر آیة مکان آیة إن وقف وقفا تاما، ثم ابتدأ بآیة أخری أو ببعض آیة لا تفسد... أو قرأ {إن الذین آمنوا وعملوا الصالحات} ووقف ثم قال {أولئك هم شر البریة}... لا تفسد. (عالمگیری)[۲]

(۲) اسی رکعت میں اگر امام بہ ذات خود یا مقتدی کے لقمہ دینے سے غلطی کی اصلاح کر لیتا ہے، تو نماز صحیح ہوجائے گی؛ لیکن دوسری رکعت میں اصلاح کرنے سے نماز صحیح نہیں ہوگی، ان دونوں رکعتوں کو دوہرانا لازم ہوگا۔

(۳) دوسری دو رکعتوں میں اصلاح کرنے سے بہ درجہ اولیٰ نماز [تراویح] صحیح نہیں ہوگی، فاسد ہی رہے گی، دوبارہ ادائیگی لازم ہوگی۔

(۴) جب تغیر فاحش نہیں ہوا، تو نماز صحیح رہی، اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ (عالم گیری)[۳]

(۵) علماء متاخرین کے نزدیک دونوں نمازوں کا حکم ایک ہی ہے، اس میں کوئی فرق نہیں۔[۴] اور

---

(۲) المصدر السابق.

(۳) (ومنها ذکر آیة مکان آیة) لو ذکر آیة مکان آیة... أما إذا لم یقف ووصل - إن لم یغیر المعنی - نحو أن یقرأ {إن الذین آمنوا وعملوا الصالحات} فلهم جزاء الحسنی مکان قوله {کانت لهم جنات الفردوس نزلا} لا تفسد. (الفتاوی الهندیة: ۱/ ۸۱-۸۰)

فإن کان لا یغیر المعنی لا تفسد صلاته نحو أن یقرأ ولقد جاءهم رسلنا بالبینات بترك التاء من جاءت. (الفتاوی الهندیة: ۱/ ۷۹، الفصل الخامس في زلة القاري، ط: زکریا - دیوبند)

(۴) فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے ایک سوال کے جواب میں ذکر فرمایا ہے:

"جو غلطی منافی صلوۃ ہو، اس سے نماز فاسد ہوجاتی ہے، اگر معنی بگڑنے سے نماز فاسد ہوگئی تھی، تو اس لفظ کا صحیح طور پر اعادہ کرنے سے نماز صحیح نہیں ہوئی؛ بل کہ نماز کا اعادہ ضروری ہوگا، البتہ عالم گیری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز صحیح ہوجائے گی، ہمارے اکابر اس کو نفل وتراویح پر حمل کرتے ہیں"۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۷/ ۱۲۰، باب فی مسائل زلۃ القاری، سوال نمبر: ۳۲۲۶)

حضرت مفتی صاحبؒ کے فتویٰ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں فرض اور تراویح ونفل کے درمیان فرق ہے، فرض میں اگر قرامت کے اندر فاحش غلطی ہوئی، تو ہر حال میں نماز کا اعادہ ضروری ہے، خواہ اسی وقت اس غلطی کی اصلاح کر لے، البتہ تراویح میں توسع ہے کہ اس طرح کی غلطی کی اصلاح کر لی جائے، تو نماز ہوجائے گی۔

تاہم صاحب فتاویٰ "مفتی بینات صاحب" اور دیگر علماء کی رائے یہ ہے کہ فرض نماز اور نفل وتراویح کا حکم ایک ہی ہے، اگر غلطی کی اصلاح کر لی گئی، تو نماز درست ہوجائے گی۔

=

ائمہ سے لغزشیں ہوتی رہتی ہیں؛ اس لیے اگر معنی میں تغیر فاحش ہو بھی گیا ہے، تو ساتھ ہی یہ گنجائش بھی ہے کہ اسی رکعت میں اصلاح کر لینے سے نماز صحیح ہو جاتی ہے؛ لیکن بعد کی رکعتوں میں اصلاح سے نماز صحیح نہ ہوگی۔[۵] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] قراءت کی غلطی کی دوسری رکعت میں اصلاح معتبر ہے یا نہیں؟

۸۶۹-سوال: ایک امام صاحب نے عشاء کی نماز میں سورۂ اعراف کا پہلا رکوع پڑھا، اس میں "فمن ثقلت موازینه فأولئك هم المفلحون" کی جگہ "هم الكافرون" پڑھا؛ لیکن دوسری رکعت میں خود ہی "والوزن يومئذ الحق" سے اعادہ کر کے درست کر لیا، تو نماز درست ہوگی یا نہیں؟ کیا اعادہ لازم ہے یا نہیں؟

پہلی رکعت میں کوئی غلطی ہو جائے اور دوسری رکعت میں درست کر لے تو نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ مع حوالہ جواب عطا فرمانے کی گزارش ہے، عین نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلياً:

اگر امام صاحب نے "ثقلت موازينه" پر وقف کیا ہے اور وقف کے بعد "هم الكافرون" پڑھا ہے، تو نماز صحیح ہو جائے گی: أو قرأ {إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات} [البينة:۷] ووقف ثم قال {أولئك هم شر البرية} [البينة:۲] لا تفسد. (عالم گیری: جلد ۱، صفحہ ۶۳)[۲]

= حضرت مفتی عبد الرحیم لاج پوری رقم طراز ہیں: ''جب قرأت کی غلطی بذات خود درست کر لے یا مقتدی کے لقمہ دینے سے درست کر لے، تو حرج اور عموم بلویٰ کے پیش نظر نماز صحیح ہونے کا فتویٰ دیا جائے گا''۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۵/ ۱۰۳-۱۰۴، سوال نمبر: ۸۵)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: امداد الفتاویٰ: ۱/ ۱۶۸، باب شروط الصلاۃ وصفتها، ط: دار العلوم، کراچی ☆ احسن الفتاویٰ: ۳/ ۵۴۴، مسائل زلۃ القاری ☆ فتاویٰ دار العلوم ۴/ ۸۱، مسائل زلۃ القاری، دار الاشاعت - پاکستان ☆ فتاویٰ حقانیہ: ۳/ ۱۷۷، باب القراءۃ، لاہور)

(۱) ذكر في الفوائد لو قرأ في الصلاة بخطأ فاحش ثم رجع وقرأ صحيحا قال عندي صلاته جائزة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۲، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الخامس في زلة القارى، ط: زكريا - ديوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۳۰ - ۶۳۲، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما لا يكره فيها، مطلب مسائل زلة القاري ☆ المحيط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۱/ ۳۲۶، كتاب الصلاة، قبيل: الفصل الخامس: في حذف حرف من كلمة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت.

[۲] الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۰، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الخامس في زلة القارى، ط: دار الفكر - بيروت.

وفي الكبيري: و لو قرأ "إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات" ووقف، وقرأ بعد الوقف التام "أولئك أصحاب الجحيم"، و"أولئك هم شر البرية"... وما أشبه ذلك مما فيه تغيير حكم الله على أحد الفريقين بضده، لا تفسد لصيرورة الكلام الثاني مبتدأ به غير متصل بالأول فلم يتعين الحكم بضده. (صفحہ:۴۵۶)[1]

البتہ بغیر وقف کے، ساتھ ہی پڑھ لیا، تو معنی فاسد ہوجانے کی بناء پر نماز فاسد ہوجائے گی: ولو لم يقف ووصل، قال عامة المشائخ: تفسد صلوته، لأنه أخبر بخلاف ما أخبر الله تعالى به ولو اعتقده يكون كفرا كبيرا. (صفحہ ۴۵۶)[2]

وفي العالمگيرى: تفسد عند عامة علمائنا وهو الصحيح. هكذا في الخلاصة. (ص: ۶۳)[3]

مگر غلط بلا وقف پڑھنے کے بعد اصلاح کر لی، تو نوافل اور تراویح میں نماز صحیح ہوجائے گی۔ اعادہ کی ضرورت نہیں، البتہ فرائض میں غلط پڑھنے کے بعد اسی رکعت میں یا دوسری رکعت میں اصلاح کر لی، تو احتیاطا نماز کو لوٹالے، حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحبؒ استاذ محترم نے اعادہ کا حکم فرمایا تھا اور فرماتے تھے کہ بناء الفاسد علی الفاسد فاسد۔

فتاوی کاملیہ، فتاوی قاضی خان وغیرہ میں اصلاح کے بعد بھی عدم صحت صلاۃ کو لکھا ہے؛ لیکن ائمہ سے ایسی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں؛ لہٰذا عموم بلوی کی وجہ سے، جب کہ ایام گزر جائیں، نماز کی صحت کا حکم لگایا جائے گا۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے نماز کی صحت کا حکم لگایا ہے، جب کہ اسی رکعت میں اصلاح کر لی جائے؛ لہٰذا تحریر کردہ صورت میں اعادہ نماز کی ضرورت نہیں۔ (امداد الفتاوی، جلد ۱، صفحہ ۲۵۴)[4]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] حلبي كبير، ص: ۴۴۰، فصل في بيان أحكام زلة القاري الواقعة في الصلاة، ط: دار الكتاب - ديوبند.

[۲] المصدر السابق.

[۳] الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۱، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الخامس في زلة القاري.

[۴] مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: امداد الفتاویٰ: ۱/ ۱۶۸، باب شروط الصلاۃ وصفتھا، ط: دار العلوم، کراچی ☆ احسن الفتاویٰ: ۳/ ۴۴۵، مسائل زلۃ القاری ☆ فتاویٰ دار العلوم ۴/ ۸۱، مسائل زلۃ القاری، دار الاشاعت - پاکستان ☆ فتاویٰ حقانیہ: ۳/ ۱۷۷، باب القراءۃ، لاہور۔ ☆ نیز تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے "آیت کی تبدیلی میں تغیر فاحش ہوگیا تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟" اور "کیا اسی رکعت میں اصلاح ضروری ہے، بعد میں اصلاح کافی نہیں؟" کا حاشیہ نمبر ۱۳ور ۵۔

[۶] قراءت میں غلطی کے بعد اصلاح کر لینے سے نماز کا حکم

۸۷۰-سوال: امام نے نماز میں آیت: {وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ} [1] کی بجائے ''وَيُعَذِّبَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ'' پڑھا تو نماز باقی رہی یا فاسد ہوگئی؟ اور اگر کوئی مقتدی امام کو لقمہ دے، پھر امام صحیح آیت پڑھ لے، تو کیا حکم ہے؟ نماز صحیح رہے گی یا فاسد ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلياً:

قرأت میں امام سے ایسی غلطی ہو جائے، جس سے معنی میں تغیر فاحش ہو جائے، تو نماز فاسد ہو جاتی ہے، دوبارہ نماز پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اگر امام نے غلطی کر کے خود ہی اس کو اسی رکعت میں صحیح کر لیا، یا مقتدی نے لقمہ دیا اور امام نے غلطی کی اصلاح کر لی، تو نماز صحیح ہو جائے گی؛ کیوں کہ عامۃً اماموں سے ایسی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں، اگر اس وقت بھی نماز کا اعادہ ضروری ہو، تو لوگ حرج میں مبتلا ہوں گے۔ [2]

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر امام نے غلط پڑھنے کے بعد اسی رکعت میں اس کی اصلاح کر لی ہو، تو نماز ہو جائے گی اور اگر اصلاح نہ کی ہو، تو نماز فاسد ہوگی، اعادہ ضروری ہوگا۔ (امداد الفتاویٰ: ۱/۲۵۶) [3]

فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] امام کا ''إن الأبرار لفي نعيم'' کے بجائے ''إن الأبرار لفي جحيم'' پڑھ کر اصلاح کر لینا

۸۷۱-سوال: امام صاحب نے فجر کی نماز میں ''إن الأبرار لفي نعيم'' کے بجائے ''إن

(۱) ۴۸-الفتح: ۶۔

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے ''آیت کی تبدیلی میں تغیر فاحش ہو گیا، تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟'' اور ''کیا اسی رکعت میں اصلاح ضروری ہے، بعد میں اصلاح کافی نہیں؟'' کا حاشیہ نمبر ۳ اور ۵۔

[۳] سوال: اگر کسے فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿۶﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴿۹﴾ خوانده فی الفور تصحیح نموده نماز ادا کرد، نمازش صحیح باشد یا نہ؟

الجواب: في العالمگيرية: ذكر في الفوائد لو قرأ في الصلاة بخطأ فاحش ثم رجع وقرأ صحيحا قال عندي صلاته جائزة. وكذلك الأعراب، ۱ھ ج: ۱، ص: ۵۱. قلت: وكذلك سمعت شيخي مولانا محمد يعقوب رحمه الله تعالى. پس بناءً علیہ نماز این کس صحیح باشد۔ (امداد الفتاویٰ: ۱/۲۵۱-۲۵۵، صحت صلاۃ بعد تدارک زلۃ القاری، سوال نمبر: ۲۲۵، ط: زکریا-دیوبند)

الأبرار لفي جحیم" پڑھ لیا، لیکن فوراً متنبہ ہوئے، اور اُسے دہرا کر "**إن الأبرار لفي نعیم**" پڑھ لیا، تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً:

مذکورہ صورت میں اگر امام صاحب فوراً دہرا کر اصلاح نہ کر لیتے، تو نماز فاسد ہو جاتی؛ لیکن جب اُنہوں نے دہرا کر اصلاح کر لی، تو نماز صحیح ہوگئی، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری: ۱/ ۸۲)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] امام نے یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کے بجائے یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ پڑھا تو؟

۸۷۲-سوال: امام صاحب نے نماز میں "یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ" کی بجائے "یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ" پڑھا لقمہ دینے کے باوجود پھر سے یہی غلطی کی تو نماز میں کوئی نقصان آیا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً:

نماز صحیح ہوگئی؛ کیوں کہ معنی میں ایسا تغیر فاحش نہیں ہوا کہ جس سے نماز کے فساد کا حکم لگے، البتہ امام صاحب کو احتیاط کرنا ضروری ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] تجوید کے لحاظ سے امام صاحب کی قراءت صحیح نہ ہونے پر کیا حکم ہے؟

۸۷۳-سوال: بولٹن، انگلینڈ کی ایک مقامی مسجد کے امام جامعہ حسینیہ راندیر کے فارغ التحصیل ہیں، نام مولوی عبدالرشید ہے، قرات صحیح نہ ہونے کی وجہ سے ان پر بار بار سوالات اٹھتے رہتے ہیں، ایک

---

(۱) ذکر في الفوائد لو قرأ في الصلاۃ بخطأ فاحش ثم رجع وقرأ صحیحا قال عندي صلاتہ جائزۃ. (الفتاوی الهندیة: ۱/ ۸۲، کتاب الصلاۃ، الباب الرابع في صفة الصلاۃ، الفصل الخامس في زلة القاری، ط: زکریا- دیوبند)
مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: رد المحتار علی الدر المختار: ۱/ ۶۳۰-۶۳۲، کتاب الصلاۃ، باب مایفسد الصلاۃ و مالا یکرہ فیها، مطلب مسائل زلة القاري.

(۲) إن کانت الکلمة التي قرأها مکان کلمة یقرب معناها وهي في القرآن لا تفسد صلاته نحو إن قرأ مکان العلیم الحکیم وإن لم تکن تلك الکلمة في القرآن لکن یقرب معناها عن أبي حنیفة ومحمد - رحمهما الله تعالی - لا تفسد. (الفتاوی الهندیة: ۱/ ۸۰، کتاب الصلاۃ، الفصل الخامس في زلة القاری، ط: دار الفکر- بیروت)

مرتبہ مسجد کی کمیٹی نے ان کو نوٹس بھی دی، نماز میں بھی غلطیاں ہوتی ہیں اور رمضان المبارک میں تو تراویح میں بے شمار غلطیاں ہوتی ہیں، بسا اوقات نماز کے فساد کا بھی اندیشہ ہو جاتا ہے۔

لوگ سمجھ رہے تھے کہ ان کی قراءت اس حد تک غلط ہے کہ نماز فاسد ہو جاتی ہے، حالاں کہ فساد نماز کا الزام ان پر بے بنیاد تھا۔ اس کے باوجود ہم کمیٹی کے ممبران نے نمازوں کے فساد کو ثابت کرنے کا چیلنج کیا، کمیٹی کے ممبران دس پندرہ آدمیوں کی بات سن کر ان کو اپنے منصب امامت سے برطرف کرنا چاہتے تھے؛ لیکن بعد میں کمیٹی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور نمازوں کے عدم فساد اور غلط الزام لگانے کو انہوں نے قبول کیا اور امام صاحب کو ان کے منصب پر برقرار رکھا۔ تاہم امامت کی ذمہ داری ان پر سے اٹھالی؛ صرف یہ طے ہوا کہ اصل امام صاحب کی غیر حاضری میں امامت کر سکتے ہیں۔

اب پھر کمیٹی کے افراد کا یہ کہنا ہے کہ اصل امام صاحب کی غیر حاضری میں جب بھی وہ امامت کرتے ہیں، تو اس وقت لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں؛ اس لیے کمیٹی کے لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں کسی مفتی صاحب سے مشورہ کیا جائے، اور مولوی عبدالرشید کی نماز اور ان کی قرات مفتی صاحب کو سنائی جائے، ان سے فتویٰ دریافت کیا جائے، مفتی صاحب کا جو فتویٰ ہوگا، اس پر عمل کیا جائے گا، چناں چہ ایک مفتی صاحب کے فتویٰ پر مولوی عبدالرشید صاحب کو ان کے منصب امامت سے علاحدہ کر دیا گیا اور مدرسے میں صرف صدر مدرس کی حیثیت سے ان کو برقرار رکھا گیا۔

اس کے بعد اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے لندن کے مفتی عبدالباقی صاحب یہاں تشریف لے آئے، انہوں نے مولوی عبدالرشید صاحب کی قرات وغیرہ سنی اور اپنا حسب ذیل فتویٰ جاری کیا:

''۳؍ جولائی ۱۹۷۷ء کو بولٹن میں حاضری ہوئی، حاضری کا مقصد ایک تنازعے کو حل کرنا تھا، جو وہاں کے امام صاحب جناب مولوی عبدالرشید، مسجد کے متولی صاحبان اور وہاں کے مصلیان کے درمیان تھا، امام صاحب پر دو اعتراض تھے: (۱) امام صاحب تراویح میں قرآن مجید سناتے وقت بھول جاتے ہیں اور حروف کاٹ دیتے ہیں۔ (۲) دوسرا یہ کہ ان کی قراءت اچھی نہیں ہے، اور حروف کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ میں نے امام صاحب سے کمیٹی کے چند افراد کی موجودگی میں یعنی مولانا یوسف متالا صاحب اور ان کے علاوہ دوسرے چند حضرات کی موجودگی میں ان کی تلاوت سنی، امام صاحب نے تجوید کے لحاظ سے کچھ غلطیاں کی ہیں؛ لیکن فقہی لحاظ سے کوئی غلطی نہیں ہے، حضرات فقہائے کرام کے نزدیک ایسے امام کے پیچھے نماز درست ہو جاتی

ہے، نفس قراءت کی حد تک امام کے اندر کوئی خرابی نہیں ہے، یہ فقہ کا مسئلہ ہے، اور حضرات فقہائے کرام نے ایسے امام صاحب کے پیچھے بلا کسی شک وشبہ کے نماز کی اجازت دی ہے؛ رہا قاری صاحبان کا مسلک، تو وہ حضرات اخفاء، اظہار، قلقلہ وغیرہ کو بھی ضروری سمجھتے ہیں؛ اس لیے وہ حضرات اخفاء کی جگہ اظہار، اظہار کی جگہ اخفاء اور قلقلہ کی جگہ عدم قلقلہ وغیرہ کو قابل اعتراض سمجھتے ہیں۔

امام صاحب پر دوسرا اعتراض تراویح میں قرآن مجید کے بھول جانے کا ہے، تو اس کا حل یہ ہے کہ امام صاحب سے تراویح نہ پڑھوائی جائے، یعنی وہ تراویح میں قرآن مجید کو نہ سنائیں؛ یہ فیصلہ دیانت وامانت کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے، کسی جانب کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔''

کتبہ عبدالباقی عفی عنہ مفتی لندن

ان کے فتویٰ کی وجہ سے مولوی عبدالرشید صاحب کو امامت کی ذمہ داری دوبارہ حوالے کر دینی چاہیے تھی؛ لیکن کمیٹی کے ممبران نے ایسا نہیں کیا، اس کے بعد میں نے کمیٹی کے لوگوں کو ایک خط لکھا، جس میں میں نے یہ لکھا کہ: '' آپ لوگوں نے مولوی عبدالرشید صاحب کو امامت کی ذمہ داری مفتی عبدالباری کے فتویٰ کے باوجود کیوں حوالے نہیں کی، ان کو کس وجہ سے آپ حضرات نے امامت کی ذمہ داری سے علاحدہ کیا تھا؟''

لیکن کمیٹی کے لوگوں نے آج تک مجھے اس کا جواب نہیں دیا، جب کہ خط لکھے ہوئے آج تقریباً تین ہفتے ہو چکے ہیں؛ البتہ کمیٹی کے لوگوں نے مولوی عبدالرشید صاحب کو اپنے یہاں بلا کر یہ کہا کہ: لوگوں کی شکایات بہت آتی رہتی ہیں؛ اس لیے ہمارا آپ کے متعلق فیصلہ یہ ہے کہ آپ از خود اپنا استعفیٰ نامہ پیش کر دیں، تا کہ آپ کی بھی عزت برقرار رہے۔ اس پر مولوی عبدالرشید صاحب نے یہ کہا کہ: میں بے قصور ہوں، میں از خود اپنا استعفیٰ نامہ پیش نہیں کروں گا، آپ کو جیسا مناسب لگے، ویسا کیجیے۔

اس کے بعد کمیٹی نے مولوی عبدالرشید صاحب کو علاحدہ ہونے کی نوٹس دے دی ہے کہ تاریخ ۶/۱۱/۱۹۷۷ء سے آپ کو علاحدہ کیا جارہا ہے؛ کیوں کہ آپ کی وجہ سے ہم کمیٹی ممبران کو عوام کے ساتھ بار بار تکرار اور بحث ومباحثے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس پر حسب ذیل چند سوالات ہیں، جن کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) مولوی عبدالرشید صاحب کا پڑھنا دل کش نہیں ہے۔

(۲) کمیٹی کے ممبران کا یہ کہنا کہ مولوی عبدالرشید رمضان المبارک میں جب تراویح پڑھاتے ہیں

توان سے بہت غلطیاں ہوتی ہیں، اس کا حل مفتی صاحب نے یہ بتایا کہ مولوی عبدالرشید تراویح نہ پڑھائیں۔

(۳) مفتی صاحب نے اپنے فتویٰ میں فقہ اور قرات کے مابین جو فرق کیا ہے، وہ نہ تو عوام کی سمجھ میں آتا ہے اور نہ تو کمیٹی کے ممبران کی سمجھ میں؛ اس لیے کمیٹی کے ممبران امام صاحب کو ان کے منصب سے یہ بہانہ بنا کر علاحدہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی نماز نہیں ہوتی۔

(۴) مفتی صاحب کے فتویٰ کے مطابق مولوی عبدالرشید صاحب کے پیچھے بلا کسی شک وشبہ کے نماز ہوجائے گی۔

(۵) کمیٹی، جن عوام کے اعتراض کی بات کرتی ہے، ان کی تعداد پندرہ سے زیادہ نہیں ہے۔

اب شریعت مطہرہ اور فقہ کی روشنی میں حضرت والا سے گزارش ہے کہ بتائیں کہ کمیٹی کے ممبران مولوی عبدالرشید کو اپنی امامت کی ذمہ داری سے سبک دوش کرنے میں حق بہ جانب ہیں یا پھر وہ ان پر ظلم کررہے ہیں؟

نوٹ: یہ ایک حقیقت ہے کہ مولوی عبدالرشید صاحب کا تقرر آج سے تقریباً چار سال پہلے ہوا تھا، اس کے بعد سے ان کے پیچھے مسلسل اعتراضات کی بارش ہوتی رہتی ہے اور لوگ برابر ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ایک شخص نے میرے نام سے یہاں کی ہیڈ آفس (جہاں دوسرے ممالک سے آنے والے حضرات کے لیے انگلینڈ میں رہنے کے حقوق وغیرہ سے متعلق کارروائیاں کی جاتی ہیں) سے یہ عرضی لکھی کہ مولوی عبدالرشید صاحب کو انگلینڈ سے واپس اپنے ملک میں بھیج دیا جائے۔

مولوی عبدالرشید کو ابھی تک انگلینڈ میں رہنے کا باقاعدہ کوئی حق نہیں ملا ہے، ہر سال کمیٹی کے ممبران ان کا پاسپورٹ یہاں کی ہیڈ آفس میں بھیجتے ہیں اور وہاں سے ایک ایک سال کے ویزے لگواتے ہیں، اس طرح سے پانچ سال گزرنے پر ہی ان کو دائمی حق رہائش ملے گا اور بڑے مزے کی بات تو یہ ہے کہ کمیٹی جب بھی مولوی عبدالرشید کو الگ ہونے کی نوٹس دیتی ہے اس وقت بڑا نازک حال ہوتا ہے، یعنی مولوی عبدالرشید کا پاسپورٹ اس وقت ہیڈ آفس میں بھیجنے کا وقت بالکل قریب آچکا ہوتا ہے، بس یہ ان کی پوری حقیقت ہے؛ اس لیے حضرت والا سے گزارش ہے کہ بتائیں اس میں کون حق پر ہے اور کون حق پر نہیں ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

آپ کا مذکورہ استفتاء اور مفتی عبدالباقی صاحب کا فتویٰ میں نے پڑھا۔

فتوے کے بعد بھی کمیٹی کے ممبران نے مولوی عبدالرشید صاحب کو منصب امامت سے علاحدہ کردیا، آخر کیوں؟

مولوی عبدالرشید صاحب جو پڑھتے ہیں، اگر اس میں سننے والے کو اشتباہ ہوتا ہے، تو محض اشتباہ کی وجہ سے کوئی حکم نہیں لگے گا۔ اور اگر امام صاحب کی غلطی کا تعلق مد، غنہ، اور حروف کو باریک اور پُر پڑھنے سے ہے، تو نماز صحیح ہوجائے گی، نماز پر کسی طرح کے فساد کا حکم نہیں لگے گا۔ (فتاوی دارالعلوم)[۱]

اگر پڑھنے میں حروف بدل جاتے ہیں (ز) کی جگہ (ج)، (ص) کی جگہ (س) اور (ش) کی جگہ (ث) وغیرہ پڑھتے ہیں اور ترجمہ بالکل بدل جاتا ہے، تو نماز فاسد ہوجائے گی۔ (شامی: ۱/ ۵۹۲)[۲]

---

[۱] سوال: لفظ "علیہم"...... کے نے پر نو، دس الف کے برابر مد کھینچ کر پڑھنے سے نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟
سوال: (۲) جس جگہ میم اور نون کو غنہ کرکے پڑھا جاتا ہے، اس جگہ میم اور نون کو ظاہر کرکے پڑھے تو نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟
الجواب: یہ ظاہر ہے کہ حسب قاعدۂ تجوید اس جگہ مد نہیں ہے؛ لہٰذا یہ لحن ہے، اور خطاء ہے؛ مگر نماز ہوجاتی ہے۔
(۲) اس صورت میں نماز صحیح ہے۔
(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۴/ ۸۰-۸۱، باب زلۃ القاری، علیہم کا لام زیادہ کھینچا تو نماز ہوئی یا نہیں، سوال نمبر: ۱۴۳۶-۱۴۳۷)

[۲] ولو زاد كلمة أو نقص كلمة أو نقص حرفا، أو قدمه أو بدله بآخر نحو من ثمره إذا أثمر واستحصد - تعالى جد ربنا - انفرجت بدل - انفجرت - إياب بدل - أواب - لم تفسد ما لم يتغير المعنى إلا ما يشق تمييزه كالضاد والظاء فأكثرهم لم يفسدها. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله إلا ما يشق إلخ) قال في الخانية والخلاصة: الأصل فيما إذا ذكر حرفا مكان حرف وغير المعنى إن أمكن الفصل بينهما بلا مشقة تفسد، وإلا يمكن إلا بمشقة كالظاء مع الضاد المعجمتين والصاد مع السين المهملتين والطاء مع التاء قال أكثرهم لا تفسد. اهـ. وفي خزانة الأكمل قال القاضي أبو عاصم: إن تعمد ذلك تفسد، وإن جرى على لسانه أو لا يعرف التمييز لا تفسد، وهو المختار حلية وفي البزازية: وهو أعدل الأقاويل، وهو المختار اهـ وفي التتارخانية عن الحاوي: حكى عن الصفار أنه كان يقول: الخطأ إذا دخل في الحروف لا يفسد لأن فيه بلوى عامة الناس لأنهم لا يقيمون الحروف إلا بمشقة. اهـ. وفيها: إذا لم يكن بين الحرفين اتحاد المخرج ولا قربه إلا أن فيه بلوى العامة كالذال مكان الصاد أو الزاي المحض مكان الذال والظاء مكان الضاد لا تفسد عند بعض المشايخ. اهـ.

قلت: فينبغي على هذا عدم الفساد في إبدال الثاء سينا والقاف همزة كما هو لغة عوام زماننا، فإنهم لا يميزون بينهما ويصعب عليهم جدا كالذال مع الزاي ولا سيما على قول القاضي أبي عاصم وقول الصفار، وهذا كله قول=

البتہ مشورتاً چند باتیں عرض کرتا ہوں:

(۱) کمیٹی کے تمام ممبران کی اہم ذمہ داری ہے کہ امامت کا منصب ایسے عالم کے حوالے کرے، جو متقی اور پرہیزگار ہو، اور نماز کے مسائل سے واقف ہو، اگر مذکورہ شخص عالم نہیں ہے، تو امامت کی ذمہ داری ایسے آدمی کے حوالے کرے، جو قرآن مجید اچھے طریقے سے پڑھ سکتا ہو اور اس کی امامت سے لوگ خوش ہوں، یعنی دینی اعتبار سے وہ ایسا آدمی ہو کہ لوگ اس کو پسند کرتے ہوں۔ (۳)

اس لیے مولوی عبدالرشید صاحب سے بہتر کوئی امام ملتا ہو، جو قرآن مجید بھی اچھا پڑھتا ہو اور علم قراءت سے بھی اچھی طرح واقف ہو، تو امامت کی ذمہ داری اس کے حوالے کردی جائے، اگر مذکورہ شرائط کے مطابق فی الحال کوئی امام نہ ملتا ہو، تو عارضی طور پر یہ ذمہ داری مولوی عبدالرشید کے حوالے کی جاسکتی ہے، جب اچھا آدمی مل جائے، تو یہ ذمہ داری ان سے واپس لے لی جائے۔

(۲) کتنے لوگ ان کے مخالف ہیں اور کتنے موافق؟ یہ تنازعہ اخلاص کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کریں، اپنے کسی ذاتی مقصد کو پیش نظر نہ رکھیں اور نہ ہی اپنے دل کی بھڑاس نکالنا مقصود ہو، کہ یہ خواہش نفس کی پیروی ہے۔ (۴)

= المتأخرين، وقد علمت أنه أوسع وأن قول المتقدمين أحوط قال في شرح المنية: وهو الذي صححه المحققون وفرعوا عليه، فاعمل بما تختار، والاحتياط أولى سيما في أمر الصلاة التي هي أول ما يحاسب العبد عليها. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۳۲ - ۶۳۳، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة و مايكره فيها، مطلب إذا قرأ قوله تعالى جدك "بدون ألف لا تفسد، ط: دار الفكر - بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۹، كتاب الصلاة، الفصل الخامس في زلة القاري، ط: زكريا - ديوبند)

(۳) الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية. ويجتنب الفواحش الظاهرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، مكتبة زكريا - ديوبند ☆ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱/ ۱۵۷، كتاب الصلاة، فصل بيان من هو أحق بالإمامة وأولى بها، ط: دار الكتب العلمية ☆ تحفة الفقهاء - أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو: ۵۴۰هـ): ۱/ ۲۳۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۴) يَٰدَاوُۥدُ إِنَّا جَعَلْنَٰكَ خَلِيفَةً فِى ٱلْأَرْضِ فَٱحْكُم بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِٱلْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ ٱلْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ ۚ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌۢ بِمَا نَسُوا۟ يَوْمَ ٱلْحِسَابِ ﴿۳۸- ص: ۲۶﴾

(۳) مولوی عبدالرشید صاحب کو مدرسے سے علاحدہ نہ کریں، بل کہ جہاں تک ہو سکے ان کی دل داری کریں، اور ان کو صدر مدرس کے عہدہ پر بحال رکھیں۔

(۴) اگر تراویح میں ان سے بہ کثرت غلطیاں ہوتی ہوں، تو تراویح کے لیے کسی دوسرے شخص کا انتخاب کیا جائے اور ان کو تراویح کی ذمہ داری سے سبک دوش کیا جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] سورۂ عادیات کی آیتوں میں وصل کرتے ہوئے تنوین کو ظاہر نہ کرنا

۸۷۴-سوال: امام صاحب نے سورۂ عادیات کی تلاوت کی اور ضبحا. قدحا. صبحا. نقعا اور جمعا کو ایک ساتھ پڑھا کسی آیت پر انہوں نے وقف نہیں کیا، وصل کی صورت میں چوں کہ تنوین کو ظاہر کرنا چاہیے تھا اور ضبحاً. قدحاً. صبحاً. نقعاً اور جمعاً تنوین کے ساتھ پڑھنا چاہیے تھا، مگر انہوں نے وصل کرنے کے باوجود تنوین کو ظاہر نہیں کیا اور الف کے ساتھ پڑھتے ہوئے گزر گئے، تو کیا تنوین کو ظاہر نہ کرنے کی صورت میں نماز میں کوئی حرج لاحق نہیں ہوگا؟ چوں کہ نماز میں پہلی تین آیات کا صحیح ہونا ضروری ہے؛ لیکن امام صاحب نے تو پہلی تین آیات ہی کو تجوید کے لحاظ سے غلط پڑھا ہے، تو اس طرح پڑھنے سے نماز کو لوٹانا پڑے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً

صورتِ مسئولہ میں سانس توڑے بغیر تمام کلمات کو ایک ساتھ پڑھنا اور ان پر تنوین کو ظاہر نہ کرنا تجوید کے قواعد کے لحاظ سے لحن خفی ہے، اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] امام کو متنبہ کرنے کی غرض سے ”جزاک اللہ“ کہنا

۸۷۵-سوال: امام صاحب کو نماز کے دوران کسی غلطی پر متنبہ کرنے کے لیے جزاک اللہ کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ جزاک اللہ کہنے والے کی نماز فاسد ہو جائے گی، یہ تو یقینی ہے؛ لیکن کیا امام اس جزاک اللہ

---

(۱) ومنها القراءة بالألحان إن غير المعنى وإلا لا إلا في حرف مد ولين إذا فحش وإلا لا بزازية، ومنها زلة القارئ، فلو في إعراب أو تخفيف مشدد وعكسه، أو بزيادة حرف، فأكثر نحو الصراط الذين، أو بوصل حرف بكلمة نحو إياك نعبد، أو بوقف وابتداء لم تفسد وإن غير المعنى به يفتى بزازية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۶۳۰ - ۶۳۲، باب مايفسد الصلاة وما يكره فيها، فروع مشى المصلي مستقبل القبلة هل تفسد صلاته، ط: دار الفكر)

کے مطابق عمل کرلے، یعنی رکوع وغیرہ میں چلا جائے، تو اس کی بھی نماز فاسد ہوجائے گی یا نہیں؟

واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ رمضان المبارک میں ''شبینہ تراویح'' کے پروگرام میں ایک رکعت میں ڈیڑھ ڈیڑھ پارہ پڑھنے کی وجہ سے مقتدی حضرات تھک گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بیٹھ کر نماز پڑھنے لگا، کوئی نماز توڑ کر بیٹھ گیا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ حالت دیکھ کر ایک ذمہ دار صاحب نے- جو دوسری مسجد سے تراویح پڑھ کر آئے تھے- نماز میں شامل ہوئے اور امام صاحب کو جزاک اللہ کہا، جس کی وجہ سے امام صاحب نے فوراً رکوع اور سجدہ وغیرہ ادا کر کے نماز پوری کردی، تو کیا اس طرح جزاک اللہ کے ذریعہ امام کو متنبہ کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

امام صاحب کو نماز کی اصلاح کی غرض سے تنبیہ کرنا جائز ہے؛[1] اس کے لیے ''سبحان اللہ'' لفظ استعمال کیا جاتا ہے؛ لیکن دوسرا لفظ کہہ دے، تو اس سے بھی نماز فاسد نہیں ہوتی۔

مذکورہ صورت میں ''جزاک اللہ'' نماز کو مختصر کرنے کی غرض سے کہا گیا ہے، تو یہ تعلیم ہوئی، لہٰذا خود مصلی کی نماز فاسد ہوگئی اور امام نے فوراً اس کی تنبیہ پر عمل کیا، لہٰذا امام کی نماز بھی فاسد ہوگئی، اگر امام صاحب تھوڑی دیر کے بعد اپنی مرضی کے مطابق نماز کو مختصر کرتے، تو کوئی حرج نہیں تھا۔ (رد المحتار: ۱/ ۶۲۲)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وفتحه على إمامه جائز، ولو قرأ المفروض أو انتقل لآية أخرى على الصحيح لإصلاح صلاتهما. (مراقي الفلاح)

قال الطحطاوي: قوله: "وفتحه على إمامه جائز" لما روي أنه صلى الله عليه وسلم قرأ في الصلاة سورة المؤمنين، فترك كلمة، فلما فرغ، قال: ألم يكن فيكم أبي؟ قال: بلى، قال: هلا فتحت علي؟ قال: ظننت أنها نسخت، فقال صلى الله عليه وسلم: "لو نسخت لأعلمتكم"، وقال: "إذا استطعمك الإمام فأطعمه" أي إذا استفتحك الإمام فافتح عليه والصحيح أنه ينوي الفتح دون التلاوة؛ لأن الفتح مرخص فيه وقراءة المقتدي محظورة ... قوله: "لإصلاح صلاتهما" لأنه لو لم يفتح ربما يجري على لسانه ما يكون مفسدا، فيكون فيه إصلاح صلاة الإمام، وبإصلاحها تصلح صلاة المقتدي. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح-الطحطاوي (م: ۱۲۳۱ھ) ص: ۳۳۴، باب مايفسد الصلاة، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۲] (وفتحه على غير إمامه) إلا إذا أراد التلاوة وكذا الأخذ، إلا إذا تذكر فتلا قبل تمام الفتح (بخلاف فتحه على إمامه) فإنه لا يفسد (مطلقا) لفاتح وآخذ بكل حال، إلا إذا سمعه المؤتم من غير مصل ففتح به تفسد صلاة الكل، وينوي الفتح لا القراءة. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله وفتحه على غير إمامه) لأنه تعلم وتعليم من غير حاجة بحر. وهو شامل لفتح المقتدي على مثله وعلى المنفرد وعلى غير المصلي وعلى إمام آخر، لفتح الإمام والمنفرد على أي شخص كان إن أراد به=

[۱۲] "يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ" الآیۃ کے بجائے يَاأَيُّهَا النَّاسُ پڑھنا

۸۷۶-سوال: کسی امام نے اٹھائیسویں پارہ کے آخری صفحہ کی آیت يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ [۱] کے بجائے نماز میں يَاأَيُّهَا النَّاسُ جَاهِدِ الْكُفَّارَ پڑھا، تو نماز درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ کی جگہ يَاأَيُّهَا النَّاسُ پڑھنے سے معنی اور مطلب میں زیادہ فرق نہیں پڑتا ہے؛ اس لیے بھول کر ایسا پڑھنے کی وجہ سے نماز فاسد نہ ہوگی، البتہ عمداً اس طرح پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائے گی، اور گنہ گار ہوگا۔ (ردالمحتار: ۱/ ۶۳۰) [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= التعليم لا التلاوة نهر. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۲۲، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فروع سمع المصلي اسم الله تعالى فقال جل جلاله أو النبي صلى الله عليه وسلم فصلى عليه، ط: دار الفكر - بيروت)

"و"يفسدها"فتحه"أي المصلي"على غير إمامه"لتعليمه بلا ضرورة. (مراقی)

قوله: "على غير إمامه" سواء كان الغير في الصلاة أم لا هذا إذا قصد تعليمه لأنه يقع جوابا من غير ضرورة فكان من كلام الناس وإن أراد القراءة دون التعليم لا تفسد كما في مسكين وغيره. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: ۳۳۷)

مزید دیکھیے: البحر الرائق: ۲/ ۳، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة، وما يكره فيها، ط: دار الكتاب ديوبند.

(۱) يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ. (۶۶- التحریم: ۹☆۹- التوبۃ: ۷۳)

(۲) ولو زاد كلمة أو نقص كلمة أو نقص حرفا، أو قدمه أو بدله بآخر نحو من ثمره إذا أثمر واستحصد - تعالى جد ربنا - انفرجت بدل - انفجرت - إياب بدل - أواب - لم تفسد ما لم يتغير المعنى إلا ما يشق تمييزه كالضاد والظاء فأكثرهم لم يفسدها. (الدر المختار: ۱/ ۶۳۲ - ۶۳۳)

قال ابن عابدين: (قوله أو بدل بآخر) هذا إما أن يكون عجزا كالألثغ وقدمنا حكمه في باب الإمامة، وإما أن يكون خطأ، وحينئذ فإذا لم يغير المعنى، فإن كان مثله في القرآن نحو (إن المسلمون) لا يفسد، وإلا نحو (قيامين بالقسط)، وكمثال الشارح لا تفسد عندهما، وتفسد عند أبي يوسف، وإن غير فسدت عندهما؛ وعند أبي يوسف إن لم يكن مثله في القرآن، فلو قرأ (أصحاب الشعير) بالشين المعجمة فسدت اتفاقا وتمامه في الفتح. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۳۳، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فروع مشى المصلي مستقبل القبلة هل تفسد صلاته، ط: دار الفكر - بيروت)

(ومنها) ذكر كلمة مكان كلمة على وجه البدل إن كانت الكلمة التي قرأها مكان كلمة يقرب معناها وهي في القرآن لا تفسد صلاته. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۰، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الخامس في زلة القارئ، ط: دار الفكر - بيروت☆خلاصة الفتاوى: ۱/ ۱۱۵، كتاب الصلاة، تقديم الحروف و الكلمة مكان الكلمة، ط: اشرفيه - ديوبند)

[۱۳] امام کا قراءت میں وقف وغیرہ میں غلطی کرنا اور آیتوں کا بھول جانا

۸۷۷-سوال: امام صاحب نے فجر کی نماز اس طرح پڑھائی کہ پہلی رکعت میں سورۂ انبیاء کے آخری رکوع کی تلاوت کی، تین آیت درست پڑھی، اس کے بعد آگے کی آیت بھول گئے اور "ولقد کتبنا" والی آیت پڑھنے لگے، پیچھے سے ایک مقتدی نے لقمہ دیا "انکم وما تعبدون من" والی آیت کا؛ لیکن امام صاحب نے لقمہ نہیں لیا اور "ولقد کتبنا" والی آیت دو سے تین مرتبہ پڑھی، پھر خیال آیا، تو "لهم فيها زفير" والی آیت پڑھی اور "اولئك عنها مبعدون" کی جگہ "هم الفسقون یا هم الغفلون" پڑھ دیا، یہاں تک کہ سورۂ انبیا ختم کر ڈالی اور اس کسمپرسی کے عالم میں پہلی رکعت پوری ہوئی۔

دوسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ حشر کے آخری رکوع کی تلاوت کی اور دوسری رکعت ختم ہوئی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ فجر کی نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟ کیا اس کا دوبارہ اعادہ لازم ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصليا:

تحریر کردہ صورت میں امام کے لیے افضل اور مستحب تھا کہ رکوع کر لیتے اور دوسری رکعت میں دوسری سورت کی قراءت کرتے، مگر جب غلط سلط قرآت کر لی، تو عموم بلوی کی وجہ سے نیز بقیہ آیت پر وقف کر دینے اور "هم الغفلون" یا "لهم فيها زفير" پر وقف کرنے کے بعد پڑھ لینے کی وجہ سے نماز صحیح ہوگئی۔ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کسی نے الذين آمنوا وعملوا الصلحت پر وقف کر دیا، اس کے بعد "اولئك اصحب الجحيم" یا اولئك هم شر البرية" پڑھا، تو نماز صحیح ہوجائے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] (ومنها الوقف والوصل والابتداء في غير موضعها) إذا وقف في غير موضع الوقف أو ابتدأ في غير موضع الابتداء إن لم يتغير به المعنى تغيرا فاحشا نحو أن يقرأ {إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات} [البينة:۷] ووقف ثم ابتدأ بقوله {أولئك هم خير البرية} [البينة:۷] لا تفسد بالإجماع بين علمائنا. هكذا في المحيط وكذا إن وصل في غير موضع الوصل كما لو لم يقف عند قوله أصحاب النار بل وصل بقوله {الذين يحملون العرش} [غافر:۷] لا تفسد لكنه قبيح. هكذا في الخلاصة وإن تغير به المعنى تغيرا فاحشا نحو أن يقرأ {شهد الله أنه لا إله} [آل عمران: ۱۸] ووقف ثم قال: {إلا هو} [آل عمران:۱۸] لا تفسد صلاته عند عامة علمائنا، وعند البعض تفسد صلاته والفتوى على عدم الفساد بكل حال. هكذا في المحيط. (الفتاوى الهندية:۸۱/۱، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الخامس في زلة القاري، ط: دار الفكر - بيروت☆ رد المحتار على الدر المختار: ۳۹۳/۲-۳۹۵، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة ومايفسد فيها، ط: زكريا - ديوبند)

[۱۴] نماز میں غلطی سے ''رب العرش العظیم'' کے بجائے ''رب العرش الکریم'' پڑھ لیا

۸۷۸-سوال: فرض نماز میں بھول سے لقد جاء کم رسول والی آیت[۱] کے آخر میں رب العرش العظیم کی بجائے العرش الکریم پڑھ لیا، تو کیا نماز میں کوئی نقصان آئے گا؟

الجواب حامداو مصليا:

"رب العرش العظیم" کی جگہ پر "رب العرش الکریم" پڑھ لیا، تو نماز میں کوئی نقصان نہیں آئے گا؛ کیوں کہ عظیم کا معنی عظمت و بڑائی والا اور کریم کا معنی عزت والا ہوتا ہے، یعنی دونوں کے معنی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] امام کا الٓر میں لام کو کھینچے بغیر اور "إن نسينا" میں دوسرے نون کو کھینچ کر پڑھنا

۸۷۹-سوال: ہمارے یہاں امام صاحب نماز میں قرآن کریم کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ جہاں کھینچنا چاہیے، وہاں نہیں کھینچتے ہیں، اور جہاں نہیں کھینچنا چاہیے، وہاں کھینچتے ہیں، مثلاً: سورۂ یوسف کے شروع میں الٓر لام کے اوپر بڑا مد (مد لازم) ہے، اسے بالکل نہیں پڑھتے اور سورۂ کہف کے آخر میں "قل إنما أنا بشر" کے "أنا" کی الف کو چھوٹے مد کی مقدار میں کبھی کھینچتے ہیں۔ اور ایک جگہ "ربنا لا تؤاخذنا إن نسينا" کو "إن نانسينا" پڑھتے ہیں؛ اس لیے ہمیں نماز میں کراہت ہوتی ہے، ہم نے امام صاحب کی اس جانب توجہ

---

(۱) لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٨﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿١٢٩﴾ (۹-التوبة: ۱۲۸، ۱۲۹)

(۲) (ومنها) ذكر كلمة مكان كلمة على وجه البدل إن كانت الكلمة التي قرأها مكان كلمة يقرب معناها وهي في القرآن لا تفسد صلاته، نحو إن قرأ مكان العليم الحكيم. وإن لم تكن تلك الكلمة في القرآن، لكن يقرب معناها، عن أبي حنيفة ومحمد - رحمهما الله تعالى - لا تفسد، وعن أبي يوسف - رحمه الله تعالى - تفسد، نحو: إن قرأ التيابين مكان التوابين، وإن لم تكن تلك الكلمة في القرآن، ولا تتقاربان في المعنى، تفسد صلاته بلا خلاف، إذا لم تكن تلك الكلمة تسبيحا ولا تحميدا ولا ذكرا، وإن كان في القرآن ولكن لا تتقاربان في المعنى، نحو: إن قرأ وعدا علينا إنا كنا غافلين، مكان فاعلين، ونحوه مما لو اعتقده يكفر تفسد عند عامة مشايخنا، وهو الصحيح من مذهب أبي يوسف رحمه الله تعالى، هكذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۰، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الخامس في زلة القارئ، ط: دار الفكر - بيروت ☆ خلاصة الفتاوى: ۱/ ۱۱۵، كتاب الصلاة، تقديم الحروف و الكلمة مكان الكلمة، ط: اشرفيه - ديوبند)

دلائی، تو وہ کہتے ہیں کہ میں آیت کا ترجمہ جانتا ہوں، "أنا" کا الف پڑھا جائے گا اور "ان ناسینا" پڑھتا ہوں، اس سے معنی میں تبدیلی نہیں ہوتی، سوال یہ ہے کہ اس لفظ کو کس طرح پڑھنا چاہیے؟ اگر امام صحیح نہ پڑھے، تو ہماری نماز ہو جائے گی؟ یا لوٹانی پڑے گی؟ دوسری چھوٹی غلطیاں بھی بہت ہوتی ہیں، اگر ہمیں نماز لوٹانی پڑے، تو ہم نماز علاحدہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ مثالوں میں نماز تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔ [1] لیکن اگر امام بار بار ایسی غلطیاں کرے، اور توجہ دلانے پر اصلاح کی کوشش کے بجائے ضد سے کام لے، اصلاح کی فکر نہ کرے، تو ایسے امام کو حسن تدبیر کے ساتھ بدل دینا چاہیے؛ کیوں کہ امامت کا ترجیحی بنیاد پر مستحق وہ شخص ہے، جو قرآن کریم کی عمدہ تلاوت اچھے انداز میں کرتا ہو۔ [2]

---

(۱) وأما ترك المد، إن كان لا يغير المعنى، بأن قرأ أولئك بلا مد، وإنا أعطيناك بدون المد، لا تفسد، وإن كان يغير، بأن قرأ سواء عليهم بترك المد، وكذا في قوله دعاء ونداء، المختار أنها لا تفسد كما في ترك التشديد. هكذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية:۱/۸۱، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الخامس في زلة القاري، ط: دار الفكر-بيروت)

لو قرأ القرآن في الصلاة بالألحان إن غير الكلمة تفسد وإن كان ذلك في حروف المد واللين لا تفسد إلا إذا فحش وإن قرأ في غير الصلاة اختلف المشايخ وعامتهم كرهوا ذلك. كذا في الخلاصة وهو الصحيح. كذا في الوجيز للكردري وكرهوا الاستماع أيضا. كذا في الخلاصة ونقل عن أبي القاسم الصفار البخاري أن الصلاة إذا جازت من وجوه فسدت من وجه يحكم بالفساد احتياطا إلا في باب القراءة؛ لأن للناس عموم البلوى. كذا في الظهيرية. (حوالہ سابق:۱/۸۲☆الدر المختار مع رد المحتار:۱/۶۳۰-۶۳۲، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فروع مشى المصلي مستقبل القبلة هل تفسد صلاته، ط: دار الفكر)

(۲) الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية.

ويجتنب الفواحش الظاهرة وإن كان غيره أورع منه. كذا في المحيط وهكذا في الزاهدي وإن كان متبحرا في علم الصلاة لكن لم يكن له حظ في غيره من العلوم فهو أولى. كذا في الخلاصة فإن تساووا فأقرؤهم أي أعلمهم بعلم القراءة يقف في موضع الوقف ويصل في موضع الوصل ونحو ذلك من التشديد والتخفيف وغيرهما. كذا في الكفاية. (الفتاوى الهندية:۱/۸۳، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، ط: زكريا-ديوبند☆بدائع الصنائع - علاء الدين الكاساني الحنفي (م:۵۸۷ھ):۱/۱۵۷، كتاب الصلاة، فصل بيان من هو أحق بالإمامة وأولى بها، ط: دار الكتب العلمية☆تحفة الفقهاء - أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو:۵۴۰ھ):۱/۲۳۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

مذکورہ غلطیاں گرچہ لحن جلی (بڑی غلطی، جس سے نماز فاسد ہوجائے) میں داخل نہیں ہے، لیکن شریعت میں یہ بھی مطلوب ہے کہ قرآن کریم کو عمدہ انداز میں، صحیح مخرج اور اصول تجوید کی رعایت کرکے پڑھا جائے؛ اس لیے مذکورہ غلطیوں سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] لحنِ جلی کے ساتھ تلاوت کرنے والے کے پیچھے نماز پڑھنا

۸۸۰-سوال: ہمارے یہاں ایک افریقی امام صاحب ہیں، جو قرآنِ پاک تجوید کے ساتھ صحیح نہیں پڑھتے ہیں؛ قرآن کریم پڑھنے میں غلطی کرتے ہیں اور لحنِ جلی کے ساتھ پڑھتے ہیں، تو ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

نماز ایک اہم عبادت ہے، اُس میں جہاں تک ہوسکے احتیاط کا پہلو اختیار کرنا چاہیے، امام ایسا ہونا چاہیے، جو تجوید کے ساتھ قرآنِ پاک صحیح پڑھتا ہو۔[۱] اگر لحنِ جلی اس قدر ہو کہ جس سے معنیٰ میں خرابی واقع ہورہی ہو، تو بعض صورتوں میں نماز فاسد ہوجائے گی۔[۲] اگر امام سے اس طرح کی غلطی ہورہی ہو، تو اُسے

---

(۱) الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية.
ويجتنب الفواحش الظاهرة وإن كان غيره أورع منه. كذا في المحيط وهكذا في الزاهدي وإن كان متبحرا في علم الصلاة لكن لم يكن له حظ في غيره من العلوم فهو أولى. كذا في الخلاصة فإن تساووا فأقرؤهم أي أعلمهم بعلم القراءة يقف في موضع الوقف ويصل في موضع الوصل ونحو ذلك من التشديد والتخفيف وغيرهما. كذا في الكفاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، ط: زكريا-ديوبند ☆ بدائع الصنائع- علاء الدين الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱/ ۱۵۷، كتاب الصلاة، فصل بيان من هو أحق بالإمامة وأولى بها، ط:: دار الكتب العلمية ☆ تحفة الفقهاء- أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو: ۵۴۰هـ): ۱/ ۲۳۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) ومنها القراءة بالألحان إن غير المعنى وإلا لا إلا في حرف مد ولين إذا فحش وإلا لا بزازية. (الدر المختار) قال ابن عابدين: (قوله بالألحان) أي بالنغمات، وحاصلها كما في الفتح إشباع الحركات لمراعاة النغم. (قوله إن غير المعنى) كما لو قرأ- {الحمد لله رب العالمين}- وأشبع الحركات حتى أتى بواو بعد الدال وبياء بعد اللام والهاء وبألف بعد الراء، ومثله قول المبلغ رابنا لك الحامد بألف بعد الراء لأن الراب هو زوج الأم كما في الصحاح والقاموس وابن الزوجة يسمى ربيبا.————— (قوله وإلا لا إلخ) أي وإن لم يغير المعنى فلا فساد إلا=

امام بنانا جائز نہیں ہے۔ نیز ایسے امام کے پیچھے اُن لوگوں کی نماز صحیح نہیں ہوگی، جو خود صحیح قرآنِ پاک پڑھنے پر قادر ہوں۔

اگر کوشش کے باوجود کوئی شخص صحیح نہ پڑھ پاتا ہو، تو اُس کی خود کی نماز تو درست ہو جائے گی؛ لیکن اُس کے پیچھے صحیح پڑھنے پر قادر شخص کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔ (۳)

=في حرف مد ولين إن فحش فإنه يفسد، وإن لم يغير المعنى، وحروف المد واللين وهي حروف العلة الثلاثة الألف والواو والياء إذا كانت ساكنة وقبلها حركة تجانسها، فلو لم تجانسها فهي حروف علة ولين لا مد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۳۰، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فروع مشي المصلي مستقبل القبلة هل تفسد صلاته، ط: دار الفكر)

لو قرأ القرآن في الصلاة بالألحان إن غير الكلمة تفسد وإن كان ذلك في حروف المد واللين لا تفسد إلا إذا فحش وإن قرأ في غير الصلاة اختلف المشايخ وعامتهم كرهوا ذلك. كذا في الخلاصة وهو الصحيح. كذا في الوجيز للكردري وكرهوا الاستماع أيضا. كذا في الخلاصة ونقل عن أبي القاسم الصفار البخاري أن الصلاة إذا جازت من وجوه فسدت من وجه يحكم بالفساد احتياطا إلا في باب القراءة؛ لأن للناس عموم البلوى. كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۲، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الخامس في زلة القارئ، ط: دار الفكر)

(ومنها اللحن في الإعراب) إذا لحن في الإعراب لحنا لا يغير المعنى بأن قرأ لا ترفعوا أصواتكم برفع التاء لا تفسد صلاته بالإجماع وإن غير المعنى تغييرا فاحشا بأن قرأ وعصى آدم ربه بنصب الميم ورفع الرب وما أشبه ذلك مما لو تعمد به يكفر. إذا قرأ خطأ فسدت صلاته في قول المتقدمين واختلف المتأخرون: قال محمد بن مقاتل وأبو نصر محمد بن سلام وأبو بكر بن سعيد البلخي والفقيه أبو جعفر الهندواني وأبو بكر محمد بن الفضل والشيخ الإمام الزاهد وشمس الأئمة الحلواني لا تفسد صلاته. وما قاله المتقدمون أحوط؛ لأنه لو تعمد يكون كفرا وما يكون كفرا لا يكون من القرآن وما قاله المتأخرون أوسع؛ لأن الناس لا يميزون بين إعراب وإعراب. كذا في فتاوى قاضي خان وهو الأشبه. كذا في المحيط وبه يفتى. كذا في العتابية وهكذا في الظهيرية. (المصدر السابق: ۱/ ۸۱، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الخامس في زلة القارئ، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) (و) لا (غير الألثغ به) أي بالألثغ (على الأصح) كما في البحر عن المجتبى، وحرر الحلبي وابن الشحنة أنه بعد بذل جهده دائما حتما كالأمي، فلا يؤم إلا مثله، ولا تصح صلاته إذا أمكنه الاقتداء بمن يحسنه أو ترك جهده أو وجد قدر الفرض مما لا لثغ فيه، هذا هو الصحيح المختار في حكم الألثغ، وكذا من لا يقدر على التلفظ بحرف من الحروف أو لا يقدر على إخراج الفاء إلا بتكرار. (الدر المختار: ۱/ ۵۸۱-۵۸۲)

قال ابن عابدين: وفي الظهيرية وإمامة الألثغ لغيره تجوز، وقيل لا، ونحوه في الخانية عن الفضلي. وظاهره اعتمادهم الصحة، وكذا اعتمدها صاحب الحلية، قال لما أطلقه غير واحد من المشايخ من أنه ينبغي له أن لا يؤم غيره، ولما في خزانة الأكمل: وتكره إمامة الفأفاء اهـ ولكن الأحوط عدم الصحة كما مشى عليه المصنف ونظمه في منظومته تحفة الأقران، وأفتى به الخير الرملي وقال في فتاواه: الراجح المفتى به عدم صحة إمامة الألثغ لغيره=

تجوید کی ایسی باریک غلطی- جو ہر شخص کوشش کے باوجود صحیح نہیں پڑھ سکتا، مثلاً: 'ص' کی جگہ 'س' پڑھنا، 'ظ' کی جگہ 'ذ' پڑھنا یا 'ض' کی جگہ 'ظ' یا 'ذ' پڑھنا وغیرہ- معاف ہے، لیکن ایسے شخص کو امام بنانا مناسب نہیں ہے۔ (۴) لہٰذا مذکورہ امام صاحب کی غلطی کی تفصیل درکار ہے، اور اُسی پر حکم موقوف ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] اِمام کا قراءت میں کسی حرف کو بڑھا دینا

۸۸۱-سوال: ہمارے اِمام صاحب قرآنِ پاک صحیح نہیں پڑھ پاتے ہیں، اور لحنِ جلی اُن سے اتنی مقدار میں ہوتی ہے کہ اولاً تو اُن کے پیچھے نماز پڑھنے والے علماء وحفاظ کو یہی پتہ نہیں چلتا کہ وہ قرآنِ پاک کی کون سی سورت یا کون سی آیت پڑھ رہے ہیں؟ اور اگر کسی آیت کا پتہ چل بھی گیا، تو اُس میں حذف و زوائد بہت ہوتے ہیں، مثلاً سورۂ فجر میں "دکا دکا" کی جگہ وہ "دکا دکان' اور "صفا صفا" کی جگہ "صفا صفان" اور "وأنا لہ الذکران" پڑھتے ہیں، یعنی ہر آیت میں الف اور نون کو اخیر میں بڑھا دیتے ہیں، تو ایسے امام کے پیچھے نماز کا حکم کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قراءت کے دوران ایک حرف کی زیادتی سے بھی نماز فاسد ہوجاتی ہے، لہٰذا امام صاحب کی مذکورہ قراءت کی وجہ سے بھی نماز فاسد ہوجائے گی، ایسے شخص کو امام بنانا جائز نہیں ہے، نیز ایسے شخص کی بھی امامت

= ممن لیس به لثغة. (رد المحتار علی الدر المختار: ۱/ ۵۸۲، کتاب الصلاۃ، باب الإمامة، مطلب في الألثغ، ط: دار الفکر- بیروت)

(۴) وإن کان الخطأ بإبدال حرف بحرف، فإن أمکن الفصل بینهما بلا کلفة کالصاد مع الطاء بأن قرأ الطالحات مکان الصالحات فاتفقوا علی أنه مفسد، وإن لم یمکن إلا بمشقة کالظاء مع الضاد والصاد مع السین فأکثرهم علی عدم الفساد لعموم البلوی.

وبعضهم یعتبر عسر الفصل بین الحرفین وعدمه. وبعضهم قرب المخرج وعدمه، ولکن الفروع غیر منضبطة علی شيء من ذلك فالأولی الأخذ فیه بقول المتقدمین لانضباط قواعدهم وکون قولهم أحوط وأکثر الفروع المذکورة في الفتاوی منزلة علیه اهـ ونحوه في الفتح. (رد المحتار علی الدر المختار: ۱/ ۶۳۱، کتاب الصلاۃ، باب ما یفسد الصلاۃ، وما یکره فیها، فروع مشی المصلي مستقبل القبلة هل تفسد صلاته، مطلب مسائل زلة القاري)

درست نہیں ہے، جس کی تلاوت بالکل سمجھ میں نہ آئے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا جو ترتیبِ قراءت سے واقف نہ ہوں

۸۸۲–سوال: ہمارے امام صاحب نماز میں قراءت کی ترتیب سے واقف نہیں ہیں، بہت سی نمازوں میں وہ پہلی رکعت میں مختصر قراءت اور دوسری رکعت میں لمبی قراءت کرتے ہیں، تو ان کے پیچھے پڑھی گئی نماز درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

پہلی رکعت میں طویل قراءت کرنا اور دوسری میں مختصر کرنا مکروہ ہے؛ لیکن نماز درست ہو جائے گی۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قال في البزازية: ولو زاد حرفا لا يغير المعنى لا تفسد عندهما. وعن الثاني روايتان، كما لو قرأ: وانهى عن المنكر - بزيادة الياء، ويتعد حدوده يدخلهم نارا. وإن غير أفسد مثل: وزرابيب مكان - زرابي مبثوثة - ومثانين مكان مثاني، وكذا - {والقرآن الحكيم} [يس]-و - {إنك لمن المرسلين} [يس] - بزيادة الواو تفسد اهـ أي لأنه جعل جواب القسم قسما كما في الخانية، لكن في المنية: وينبغي أن لا تفسد. قال في شرحها لأنه ليس بتغيير فاحش ولا يخرج عن كونه من القرآن، ويصح جعله قسما. والجواب محذوف كما في - {والنازعات غرقا} [النازعات] - إلخ فإن جوابه محذوف. اهـ. أقول: والظاهر أن مثل زرابيب ومثانين يفسد عند المتأخرين أيضا إذا لم يذكروا فيه خلافا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۶۳۱ - ۶۳۲، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة، وما يكره فيها، فروع مشى المصلي مستقبل القبلة هل تفسد صلاته، مطلب مسائل زلة القاری، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید دیکھیے: ''لحن جلی کے ساتھ تلاوت کرنے والے کے پیچھے نماز پڑھنا'' کا حاشیہ نمبر ا و ۲۔

(۲) (وإطالة الثانية على الأولى يكره) تنزيها (إجماعا إن بثلاث آيات) إن تقاربت طولا وقصرا، وإلا اعتبر الحروف والكلمات، واعتبر الحلبي فحش الطول لا عدد الآيات، واستثنى في البحر ما وردت به السنة واستظهر في النفل عدم الكراهة مطلقا (وإن بأقل لا) يكره. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: ... والحاصل أن سنية إطالة الأولى على الثانية وكراهية العكس إنما تعتبر من حيث عدد الآيات إن تقاربت الآيات طولا وقصرا فإن تفاوتت تعتبر من حيث الكلمات، فإذا قرأ في الأولى من الفجر عشرين آية طويلة وفي الثانية منها عشرين آية قصيرة تبلغ كلماتها قدر نصف كلمات الأولى فقد حصل السنة، ولو عكس يكره، وإنما ذكر الحروف للإشارة إلى أن المعتبر مقابلة كل كلمة بمثلها في عدد الحروف، فالمعتبر عدد الحروف لا الكلمات فلو اقتصر الشارح على الحروف أو عطفها على الكلمات كما فعل في الكافي لكان أولى (قوله واعتبر الحلبي فحش الطول إلخ) كما لو قرأ في الأولى والعصر وفي الثانية الهمزة فرمز في القنية أولا أنه لا يكره ثم رمز =

[۱۹] ایسا اِمام متعین کرنا، جس کے پیچھے نماز فاسد ہوتی ہو

۸۸۳-سوال: اگر امام کے پیچھے نماز فاسد ہوتی ہو، تو اُسے امام بنانے میں گنہ گار کون شمار ہوگا؟ مسجد کے متولی اور ذمہ داران یا مقتدی حضرات؟ کسی اچھے امام کا انتخاب متولی کی ذمہ داری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

ایسا امام جس کے پیچھے نماز فاسد ہوتی ہو، اُسے امام بنانا جائز نہیں ہے۔[1] ایسے شخص کو امام بنانے والا گنہگار ہوگا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] غلط قراءت کرنے والے کے پیچھے علماء وحفاظ کی نماز صحیح ہوگی؟

گذشتہ سے پیوستہ

۸۸۴-سوال: غلط قراءت کرنے والے امام کے پیچھے علماء وحفاظ کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

ثانيا أنه يكره وقال لأن الأولى ثلاث آيات و الثانية تسع، وتكره الزيادة الكثيرة. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۴۳، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فصل في القراءة، ط: دار الفكر ☆ فتاوى قاضي خان مع الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۹، كتاب الصلاة، باب الحدث في الصلاة، ومايكره فيها، ط: زكريا - ديوبند)

(۱) (و) لا (غير الألثغ به) أي بالألثغ (على الأصح) كما في البحر عن المجتبى، وحرر الحلبي وابن الشحنة أنه بعد بذل جهده دائما حتما كالأمي، فلا يؤم إلا مثله، ولا تصح صلاته إذا أمكنه الاقتداء بمن يحسنه أو ترك جهده أو وجد قدر الفرض مما لا لثغ فيه، هذا هو الصحيح المختار في حكم الألثغ، وكذا من لا يقدر على التلفظ بحرف من الحروف أو لا يقدر على إخراج الفاء إلا بتكرار. (الدر المختار: ۱/ ۵۸۱-۵۸۲)

قال ابن عابدين: وفي الظهيرية وإمامة الألثغ لغيره تجوز، وقيل لا، ونحوه في الخانية عن الفضلي. وظاهره اعتمادهم الصحة، وكذا اعتمدها صاحب الحلية، قال لما أطلقه غير واحد من المشايخ من أنه ينبغي له أن لا يؤم غيره، ولما في خزانة الأكمل: وتكره إمامة الفأفاء اهـ ولكن الأحوط عدم الصحة كما مشى عليه المصنف ونظمه في منظومته تحفة الأقران، وأفتى به الخير الرملي وقال في فتاواه: الراجح المفتى به عدم صحة إمامة الألثغ لغيره ممن ليس به لثغة. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۸۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب في الألثغ، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) لو قدموا فاسقا يأثمون بناءاً على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم، لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير - إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م: ۹۵۶ هـ) ص: ۳۱۵، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی - لاہور)

الجواب حامداً و مصلیا:

غلط قراءت کرنے والے امام کے پیچھے کسی عالم یا حافظ کی نماز درست نہیں ہے۔ (درمختار)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] فرض نماز کی قراءت میں اعتدال ہونا چاہیے

۸۸۵-سوال: رمضان میں ایک قاری صاحب تراویح پڑھانے آتے ہیں اور وہی صبح کی نماز بھی پڑھاتے ہیں ایک مقتدی نے اخلاص کے ساتھ قاری صاحب کو جمعہ کی فجر میں سورۂ سجدہ پڑھانے کا کہا اور الحمدللہ انہوں نے پڑھائی، یہ بات ہمارے امام صاحب کو برداشت نہیں ہوئی اور بہت غصہ ہوئے اور غصہ یہ کہہ کر اتارا کہ آخری صف میں دو مقتدی نیند کی وجہ سے گرتے گرتے بچ گئے۔ گویا ۱۴۰۰ رسال بعد بھی ہمارے امام صاحب ایک سنت کو زندہ کرنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے مولوی قوم کو کہاں تک گمراہ کریں گے۔

ہمارے امام صاحب ظہر کی نماز اقامت سے سلام تک ساڑھے تین منٹ میں ختم کردیتے ہیں مسجد کے بہت سے ٹرسٹی امام صاحب کو کچھ بھی کہتے ڈرتے ہیں کہ کچھ کہیں گے اور امام صاحب امامت چھوڑ کر چلے جائیں گے، تو مسجد کے انتظامات کون کرے گا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون، دل گواہی نہ دے، تب بھی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنی چاہیے؟

الجواب حامداو مصلیا:

جمعہ کے دن فجر کی نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سورہ سجدہ اور سورہ دہر پڑھنا ثابت ہے۔[۲] لہٰذا جمعہ کی فجر میں اس کا پڑھنا سنت ہے۔

---

(۱) تقدم تخریجہ تحت عنوان: ''ایسا امام متعین کرنا جس کے پیچھے نماز فاسد ہوتی ہو''۔ حاشیہ نمبر: (۱) دیکھیے۔

(۲) عن أبي هريرة رضي الله عنه، قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يقرأ في الجمعة في صلاة الفجر الم تنزيل السجدة، وهل أتى على الإنسان حين من الدهر. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲۲، رقم الحديث: ۸۹۱، كتاب الجمعة، باب ما يقرأ في صلاة الفجر يوم الجمعة، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۸۸، رقم الحديث: ۶۴-۸۷۹، كتاب الجمعة، باب ما يقرأ في يوم الجمعة، عن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما، ط: ديوبند)

البتہ طویل قراءت کے متعلق فقہاء لکھتے ہیں کہ مقتدیوں میں شوق اور رغبت ہو، تو طویل قراءت کرنی چاہیے، جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فجر کی دونوں رکعت میں مکمل سورہ بقرہ پڑھی ہے۔ (۲) اور نبی کریم ﷺ نے مغرب کی نماز میں سورہ اعراف پڑھی ہے۔ (۳) لیکن اس میں مقتدیوں کی رعایت کرنا ضروری ہے، سکت نہ ہو، تو طویل قراءت نہیں کرنی چاہیے۔ (۴)

حضرت معاذؓ نے ایک مرتبہ عشاء کی نماز میں سورہ بقرہ پڑھی، تو ایک مقتدی نے آپ ﷺ کو شکایت کی، چناں چہ آپ ﷺ نے فرمایا اے معاذ! ایسا لگتا ہے کہ تم، لوگوں کو فتنہ، بلا اور گناہ میں مبتلا کر دو گے۔ [۵] ظہر کی نماز میں سورہ حجرات سے سورہ بروج تک کی سورتوں میں سے پڑھنا سنت ہے،

---

(۲) عن أبيه، أن أبا بكر الصديق صلى الصبح فقرأ فيها بسورة البقرة، في الركعتين كلتيهما. (الموطأ- إمام دار الهجرة مالك بن أنس المدني (م:۱۷۹ھ): ۲/۱۱۱، رقم الحديث: ۲۷۰، كتاب الصلاة، القراءة في الصبح، ت: محمد مصطفى الأعظمي، ط: مؤسسة زايد بن سلطان آل نهيان للأعمال الخيرية والإنسانية- أبو ظبي- الإمارات)

(۳) عن عائشة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قرأ في صلاة المغرب بسورة الأعراف فرقها في ركعتين. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳ھ): ۲/۱۷۰، رقم الحديث: ۹۹۱، كتاب الافتتاح، القراءة في المغرب بـ 'المص'، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية- حلب)

(۴) عن إسماعيل، قال: سمعت قيسا، قال: أخبرني أبو مسعود، أن رجلا، قال: والله يا رسول الله إني لأتأخر عن صلاة الغداة من أجل فلان مما يطيل بنا، فما رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم في موعظة أشد غضبا منه يومئذ، ثم قال: إن منكم منفرين، فأيكم ما صلى بالناس فليتجوز، فإن فيهم الضعيف والكبير وذا الحاجة. (صحيح البخاري: ۱/۹۷، رقم الحديث: ۷۰۲، كتاب الأذان، باب تخفيف الإمام في القيام، وإتمام الركوع والسجود، ط: البدر- ديوبند)

عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا صلى أحدكم للناس، فليخفف، فإن منهم الضعيف والسقيم والكبير، وإذا صلى أحدكم لنفسه فليطول ما شاء. (صحيح البخاري: ۱/۹۷، رقم الحديث: ۷۰۳، كتاب الأذان، باب: إذا صلى لنفسه فليطول ما شاء ☆ الصحيح لمسلم: ۱/۱۸۸، رقم الحديث: ۱۸۵-(۴۶۷) كتاب الصلاة، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام، ط: البدر- ديوبند)

يكره تحريما (تطويل الصلاة) على القوم زائدا على قدر السنة في قراءة وأذكار رضي القوم أو لا لإطلاق الأمر بالتخفيف نهر وفي الشرنبلالية ظاهر حديث معاذ أنه لا يزيد على صلاة أضعفهم مطلقا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۵۶۴، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر- بيروت)

[۵] عن عمرو، قال: سمعت جابر بن عبد الله، قال: كان معاذ بن جبل يصلي مع النبي صلى الله عليه وسلم، ثم يرجع، فيؤم قومه، فصلى العشاء، فقرأ بالبقرة، فانصرف الرجل، فكأن معاذا تناول منه، فبلغ النبي صلى الله عليه وسلم فقال: فتان، فتان، فتان، ثلاث مرار - أو قال: فاتنا، فاتنا، فاتنا - وأمره بسورتين من أوسط المفصل، قال عمرو: لا أحفظهما. (صحيح البخاري: ۱/۹۷، رقم الحديث: ۷۰۱، كتاب الأذان، باب إذا طول الإمام، وكان للرجل حاجة، فخرج فصلى، ط: البدر- ديوبند)

مقتدیوں کی رعایت کے ساتھ ساتھ سنت قراءت کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔[۶]

نماز میں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے کہ سنتوں کی رعایت بھی نہ ہو اور ارکان کی ادائیگی میں اطمینان بھی حاصل نہ ہو، آپ ﷺ نے جلدی کرنے اور اطمینان سے ارکان ادا نہ کرنے کی وجہ سے ایک مصلی کو نماز لوٹانے کا حکم دیا تھا۔[۷] اس بنا پر بعض ائمہ کے نزدیک تعدیل ارکان (اطمینان سے نماز ادا کرنا) فرض ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے۔[۸] جلدی جلدی پرندے کے چونچ مارنے کے مانند رکوع، سجدہ کرنے والے کو حدیث شریف میں منافق کہا گیا ہے؛ اس لیے اس طرح کی وعید بھی امام کی نظر میں رہنی چاہیے۔[۹] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۶] (طوال المفصل) من الحجرات إلى آخر البروج (في الفجر والظهر، و) منها إلى آخر - لم يكن - (أوساطه في العصر والعشاء، و) باقية (قصاره في المغرب) أي في كل ركعة سورة مما ذكره الحلبي. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۴۰، باب صفة الصلاة، فصل في القراءة، ط: دار الفكر)

(۷) عن أبي هريرة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم دخل المسجد فدخل رجل، فصلى، فسلم على النبي صلى الله عليه وسلم، فرد وقال: ارجع فصل، فإنك لم تصل، فرجع يصلي كما صلى، ثم جاء، فسلم على النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: ارجع فصل، فإنك لم تصل، ثلاثا، فقال: والذي بعثك بالحق ما أحسن غيره، فعلمني، فقال: إذا قمت إلى الصلاة فكبر، ثم اقرأ ما تيسر معك من القرآن، ثم اركع حتى تطمئن راكعا، ثم ارفع حتى تعدل قائما، ثم اسجد حتى تطمئن ساجدا، ثم ارفع حتى تطمئن جالسا، وافعل ذلك في صلاتك كلها. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۰۴، رقم الحديث: ۷۵۷، كتاب الأذان، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم في الصلوات كلها، في الحضر والسفر... الخ، وانظر رقم: ۷۹۳ و ۶۲۵۱ و ۶۶۶۷، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۷۰، رقم الحديث: ۴۵ - ۳۹۷، كتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، وإنه إذا لم يحسن الفاتحة، ولا أمكنه تعلمها قرأ ما تيسر له من غيرها، ط: البدر - ديوبند)

(۸) (قوله وتعديل الأركان)، وهو تسكين الجوارح في الركوع والسجود حتى تطمئن مفاصله وأدناه مقدار تسبيحة، وهو واجب على تخريج الكرخي، وهو الصحيح كما في شرح المنية، وسنة على تخريج الجرجاني وفرض على ما نقله الطحاوي عن الثلاثة، والذي نقله الجم الغفير أنه واجب عند أبي حنيفة ومحمد، فرض عند أبي يوسف. (البحر الرائق: ۱/ ۳۱۶، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۶۴، باب صفة الصلاة، واجبات الصلاة، مطلب لا ينبغي أن يعدل عن الدراية إذا وافقتها رواية، ط: دار الفكر - بيروت ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - داماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۸۸، باب صفة الصلاة، واجبات الصلاة، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام - ملا خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۱/ ۷۱، باب صفة الصلاة، ط: دار إحياء الكتب العربية)

(۹) ... رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: تلك صلاة المنافق، يجلس يرقب الشمس حتى إذا كانت بين قرني =

[۲۲] سورتوں کی ترتیب الٹنے سے نماز ہوگی یا نہیں؟

۸۸۶-سوال: اگر امام صاحب نے مغرب کی پہلی رکعت میں سورۂ لہب پڑھی اور دوسری رکعت میں سورۂ نصر، تو نماز ہوئی یا نہیں؟ اور اس طرح پڑھنا کیسا ہے؟ اور اگر کسی امام نے ظہر کی پہلی چار رکعت سنت مؤکدہ نہ پڑھی ہو، تو وہ ظہر کی نماز پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

پہلی رکعت میں سورۂ لہب کے بعد دوسری رکعت میں سورۂ نصر پڑھی، تو یہ مکروہ ہے، مگر نماز ادا ہوجائے گی۔ (عالم گیری: ۱/۶۱)[۱]

رہی ظہر کی چار رکعات سنت مؤکدہ، تو امام صاحب کی اس کی جانب توجہ مبذول کرائیں، البتہ امام صاحب کسی عذر کی وجہ سے نہیں پڑھ سکے، تو ان کی امامت میں کچھ حرج نہیں۔ نماز ہر حال میں ہوجائے گی۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] امام صاحب کا لھب میں ھ کی جگہ ح اور الحمد کی ح جگہ ھ پڑھنا

۸۸۷-سوال: امام صاحب "لهب" میں "ھ" کی جگہ "ح" اور "الحمد" میں "ح" کی جگہ

=الشيطان، قام فنقرها أربعا، لا يذكر الله فيها إلا قليلا. (الصحيح لمسلم: ۱/۲۲۵، رقم الحديث: ۱۹۵-(۶۲۲)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب التبكير بالعصر، عن أنس بن مالك، ط: البدر-ديوبند)

[۱] وإذا قرأ في ركعة سورة وفي الركعة الأخرى أو في تلك الركعة سورة فوق تلك السورة يكره. (الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الرابع في القراءة، ط: دار الفكر-بيروت)

ويكره الفصل بسورة قصيرة وأن يقرأ منكوسا إلا إذا ختم فيقرأ من البقرة. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله وأن يقرأ منكوسا) بأن يقرأ الثانية سورة أعلى مما قرأ في الأولى لأن ترتيب السور في القراءة من واجبات التلاوة، وإنما جوز للصغار تسهيلا لضرورة التعليم، (قوله إلا إذا ختم إلخ) قال في شرح المنية: وفي الولوالجية: من يختم القرآن في الصلاة إذا فرغ من المعوذتين في الركعة الأولى يركع ثم يقرأ في الثانية بالفاتحة وشيء من سورة البقرة، لأن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: خير الناس الحال المرتحل. أي الخاتم المفتتح اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۵۴۷، فصل في القراءة، قبيل باب الإمامة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) مسئلہ کی تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے: باب الإمامة کا عنوان امام کا ظہر کی چار سنت پڑھے بغیر امامت کرانا۔

''ھ'' اور ''لن نجمع'' میں ''ع'' کی جگہ پر ''ء'' پڑھتے ہیں، اور ''ش'' کی جگہ پر ''س'' اور ''ک'' کی جگہ ''ق'' وغیرہ پڑھتے ہیں، تو نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کوئی ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف پڑھ لے، اور اس کی وجہ سے معنیٰ میں تغیر پیدا ہوجائے، تو ایسی صورت میں اس کی نماز فاسد ہوجائے گی، بہ شرطیکہ وہ بغیر مشقت کے ان حروف کے درمیان فرق کرنے پر قادر ہو، مثلاً ''صالحات'' کی جگہ ''طالحات'' پڑھ لے، تو نماز فاسد ہوجائے گی۔ اور اگر ایسے حروف ہوں کہ بغیر مشقت کے فصل کرنے پر قدرت نہ ہو، جیسے۔ ''ظاء'' کی جگہ ''ضاد'' پڑھ لیا، اور ''صاد'' کی جگہ ''سین'' یا ''طاء'' کی جگہ ''تاء''، تو اکثر حضرات کے نزدیک نماز فاسد نہ ہوگی، اور خزانۃ الاکمل میں ہے کہ اگر وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے، تو نماز فاسد ہوجائے گی، ورنہ زبان پر بلا اختیار جاری ہوجائے یا تمیز کرنے پر قادر نہیں ہے، تو نماز فاسد نہیں ہوگی، یہ پسندیدہ قول ہے اور اس سلسلے کے تمام اقوال میں معتدل ہے۔

اسی طرح اگر ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف پڑھنے سے معنیٰ میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو، تو مطلقاً نماز صحیح ہوجائے گی۔ (عالم گیری ☆ خلاصۃ الفتاوی)[1]

[۱] (ومنها) ذكر حرف مكان حرف إن ذكر حرفا مكان حرف ولم يغير المعنى بأن قرأ إن المسلمون، إن الظالمون، وما أشبه ذلك لم تفسد صلاته، وإن غير المعنى، فإن أمكن الفصل بين الحرفين من غير مشقة، كالطاء مع الصاد، فقرأ الطالحات مكان الصالحات تفسد صلاته عند الكل، وإن كان لا يمكن الفصل بين الحرفين إلا بمشقة، كالظاء مع الضاد، والصاد مع السين، والطاء مع التاء، اختلف المشايخ، قال أكثرهم: لا تفسد صلاته. هكذا في فتاوى قاضي خان. وكثير من المشايخ أفتوا به، قال القاضي الإمام أبو الحسن والقاضي الإمام أبو عاصم: إن تعمد فسدت، وإن جرى على لسانه أو كان لا يعرف التميز لا تفسد، وهو أعدل الأقاويل والمختار هكذا في الوجيز للكردري. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۹، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الخامس في زلة القارئ، ط: دار الفكر)

قال في الخانية والخلاصة: الأصل فيما إذا ذكر حرفا مكان حرف وغير المعنى إن أمكن الفصل بينهما بلا مشقة تفسد، وإلا يمكن إلا بمشقة كالظاء مع الضاد المعجمتين والصاد مع السين المهملتين والطاء مع التاء قال أكثرهم لا تفسد. اهـ. وفي خزانة الأكمل قال القاضي أبو عاصم: إن تعمد ذلك تفسد، وإن جرى على لسانه أو لا يعرف التمييز لا تفسد، وهو المختار حلية وفي البزازية: وهو أعدل الأقاويل، وهو المختار اهـ وفي التتارخانية عن الحاوي: حكى عن الصفار أنه كان يقول: الخطأ إذا دخل في الحروف لا يفسد لأن فيه بلوى عامة الناس لأنهم لا يقيمون الحروف إلا بمشقة. اهـ. وفيها: إذا لم يكن بين الحرفين اتحاد المخرج ولا قربه إلا أن فيه بلوى العامة كالذال مكان الصاد أو الزاي المحض مكان الذال والظاء مكان الضاد لا تفسد عند بعض المشايخ. اهـ. =

اس لیے کمیٹی کے ذمے داران ایسے شخص کو امام بنائیں، جو تجوید سے واقف ہو، تاکہ اس طرح کی خرابیوں سے بچا جا سکے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= قلت: فينبغي على هذا عدم الفساد في إبدال الثاء سينا والقاف همزة كما هو لغة عوام زماننا، فإنهم لا يميزون بينهما ويصعب عليهم جدا كالذال مع الزاي ولا سيما على قول القاضي أبي عاصم وقول الصفار، وهذا كله قول المتأخرين، وقد علمت أنه أوسع وأن قول المتقدمين أحوط قال في شرح المنية: وهو الذي صححه المحققون وفرعوا عليه، فاعمل بما تختار، والاحتياط أولى سيما في أمر الصلاة التي هي أول ما يحاسب العبد عليها. (رد المحتار على الدر المختار: ١/ ٦٣٣، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، مطلب إذا قرأ قوله تعالى جدك "بدون ألف لا تفسد، ط: دار الفكر-بيروت)

ولو قرأ الغيظ بالضاد أو بالزاء أو قرأ المغضوب بالظاء أو بالذال يفسد، ولو قرأ الضالين بالظاء أو الذال لا يفسد. (خلاصة الفتاوى: ١/ ١٠٦، كتاب الصلاة، في زلة القارىء، ط: المكتبة الأشرفية- ديوبند)

(۲) الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة... هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة،... فإن تساووا فأقرؤهم أي أعلمهم بعلم القراءة يقف في موضع الوقف، ويصل في موضع الوصل، ونحو ذلك من التشديد والتخفيف وغيرهما. كذا في الكفاية. (الفتاوى الهندية: ١/ ٨٣، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، ط: دار الفكر)

عن ابن عباس - رضی اللہ تعالیٰ عنہما - قال: کانت صلاۃ النبی -صلی اللہ علیہ وسلم- ثلاث عشرۃ رکعۃ یعنی باللیل. (بخاری شریف: ۱/ ۱۵۳، حدیث نمبر: ۱۱۳۸)

عن أم حبیبۃ -رضی اللہ تعالیٰ عنہا- قالت: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: من صلی فی یوم ثنتی عشرۃ رکعۃ تطوعا، بنی لہ بھن بیت فی الجنۃ. (مسلم شریف: ۱/ ۲۵۱، حدیث نمبر: ۷۲۸)

باب الوتر والنوافل والتہجد

[وتر، نوافل اور تہجد کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب الوتر والنوافل والتهجد

[وتر، نوافل اور تہجد کا بیان]

[۱] تہجد کی رکعتوں کی تعداد

[۲] صلاۃ التسبیح افضل ہے یا تہجد؟

۸۸۸-سوال: تہجد کی نماز چار، چھ، آٹھ، دس یا بارہ (۴-۶-۸-۱۰-۱۲) کل کتنی رکعتیں پڑھنی چاہیے؟ چار رکعت پڑھنا افضل ہے یا بارہ رکعت؟ نیز تہجد کے وقت صلاۃ التسبیح پڑھنا افضل ہے یا تہجد کی نماز؟ جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی دن لمبی قراءت فرماتے، تو رکعتوں کی تعداد کم رہتی تھی اور قراءت مختصر فرماتے، تو تعداد بڑھ جاتی تھی، روایت میں تہجد کی کم از کم دو رکعت ہیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعت ثابت ہیں۔[1]

---

(۱) عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: كانت صلاة النبي صلى الله عليه وسلم ثلاث عشرة ركعة، يعني بالليل. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۵۳، رقم الحديث: ۱۱۳۸، كتاب الجمعة، باب: كيف كان صلاة النبي صلى الله عليه وسلم؟ وكم كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي من الليل؟)

عن مسروق، قال: سألت عائشة رضي الله عنها، عن صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم بالليل؟ فقالت: سبع، وتسع، وإحدى عشرة، سوى ركعتي الفجر. (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۱۱۳۹)

عن عائشة رضي الله عنها، قالت: «كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي من الليل ثلاث عشرة ركعة منها الوتر، وركعتا الفجر». (حوالہ سابق، حدیث: نمبر: ۱۱۴۰)

مزید روایتوں کی تفصیل کے ملاحظہ فرمائیں: فتح الباری- ابن حجر عسقلانی (م: ۸۵۲ھ): ۳/ ۲۰-۲۱، (قولہ باب کیف صلاۃ اللیل وکم کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی باللیل، ط: دار المعرفۃ- بیروت)

پس تہجد پڑھنے والا دو رکعت سے بارہ رکعت تک حسب سہولت پڑھ سکتا ہے۔ تاہم بیشتر روایات آٹھ رکعات کی ہیں، اس لیے احناف نے آٹھ رکعت کے معمول بنانے کو بہتر قرار دیا ہے۔ (۲)

= ان تمام روایتوں کے درمیان صاحب فتح الملہم نے بڑی عمدہ تطبیق دی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

قلت: والذي يظهر للعبد الضعيف من مجموع الروايات -والله أعلم- أن النبي -صلى الله عليه وسلم- كان يفتتح صلاته بالليل بركعتين خفيفتين، وهما من مبادىء التهجد، ثم يصلي ثمان ركعات، وهي أصل التهجد، ثم يوتر بثلاث ركعات، ثم يصلي ركعتين جالسا، وهما من توابع الوتر، كالركعتين بعد المغرب، ثم يركع ركعتين في مبدأ الفجر حين يسمع الأذان، ثم يضطجع، فمن قال سبع عشر ركعة، جمع كلها، ومن قال خمس عشرة، لعله أسقط ركعتي الفجر لوقوعها بعد انقضاء الليل، ومن قال: بثلاث عشرة ركعة، فأكبر ظني أنه اسقط الركعتين اللتين كان يفتتح بهما، والركعتين بعد الوتر جالسا، وعد ركعتي الفجر منها، وفي بعض الروايات ما يشعر بإسقاط ركعتي الفجر وعد ركعتي الافتتاح، ومن قال: بأحدى عشرة ركعة، فبإسقاطه كل من المبدأ والمنتهى، والركعتين بعد الوتر أيضا، والاقتصار على أصل التهجد والوتر، وأما روايات التسع والسبع فمحمولة على تقليل ركعات التهجد الثمانية حين أسن وضعف، والله اعلم. (فتح الملهم-شبير أحمد العثماني (م:١٣٦٩هـ): ٦/٥، باب صلاة الليل وعدد ركعات النبي صلى الله عليه وسلم في الليل وأن الوتر ركعة ... الخ، ت: المفتي رفيع العثماني، مع تكملة محمود شاكر، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

(٢) وصلاة الليل وأقلها على ما في الجوهرة ثمان. (الدالمختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله وأقلها على ما في الجوهرة ثمان) قيد بقوله على ما في الجوهرة؛ لأنه في الحاوي القدسي قال: يصلي ما سهل عليه ولو ركعتين والسنة فيها ثماني ركعات بأربع تسليمات اهـ والتقييد بأربع تسليمات مبني على قول الصاحبين، وأما على قول الإمام فلا كما ذكره في الحلية، وقال فيها أيضا، وهذا بناء على أن أقل تهجده - صلى الله عليه وسلم - كان ركعتين، وأن منتهاه كان ثماني ركعات، أخذا مما في مبسوط السرخسي. ثم ساق تبعا لشيخه المحقق ابن الهمام الأحاديث الدالة على ما عينه في المبسوط من منتهاه، وحديث أبي داود الدال على أن أقل تهجده - صلى الله عليه وسلم - أربع سوى ثلاث الوتر، وتمام ذلك فيها فراجعها، لكن ذكر آخرا عنه - صلى الله عليه وسلم -: من استيقظ من الليل وأيقظ أهله فصليا ركعتين كتبا من الذاكرين الله كثيرا والذاكرات. رواه النسائي وابن ماجه وابن حبان في صحيحه والحاكم، وقال المنذري صحيح على شرط الشيخين. اهـ.

أقول: فينبغي القول بأن أقل التهجد ركعتان وأوسطه أربع وأكثره ثمان، والله أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ٢٥/٢، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في صلاة الليل، دار الفكر - بيروت)

فأما ما أجابت به مسروقا فمرادها أن ذلك وقع منه في أوقات مختلفة فتارة كان يصلي سبعا وتارة تسعا وتارة إحدى عشرة وأما حديث القاسم عنها فمحمول على أن ذلك كان غالب حاله. (فتح الباري شرح صحيح البخاري-أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي (م:٨٥٢هـ): ٢٠/٣، قوله باب كيف صلاة الليل وكم كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي بالليل، ط: دار المعرفة - بيروت)

تہجد کے وقت تہجد کی نماز پڑھنا افضل ہے، اور بڑے ثواب کا باعث ہے۔[1] واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] نماز تہجد پڑھنا افضل ہے یا صلاۃ التسبیح؟

گزشتہ سے پیوستہ

۸۸۹-سوال: تہجد کی نماز میں ۴، ۶، ۱۰ رکعت پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز تہجد پڑھنا افضل ہے یا صلاۃ التسبیح؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

تہجد کی کم سے کم دو اور زیادہ بارہ رکعت ہے۔

جو روزانہ تہجد کا پابند ہو، اس کے لیے بھی بہتر یہ ہے کہ تہجد پڑھے اور کبھی کبھی ۲ رکعت تہجد پڑھ کر چار رکعت صلوۃ التسبیح پڑھے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] کیا نوافل کا اہتمام سنت کے خلاف ہے؟

۸۹۰-سوال: ہمارے علاقے میں مسجد کے ایک امام ہیں، جو صرف فرض، وتر اور سنت مؤکدہ پڑھتے ہیں، مثلاً: عشاء کی ۴ رکعت فرض، ۲ رکعت سنت مؤکدہ اور ۳ رکعت وتر، کل ۹ رکعت پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں اور مصلی حضرات کو بھی اس کی ترغیب دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نفل نماز کا اہتمام کرنا سنت کے خلاف ہے۔

---

[۱] (قوله وصلاة الليل) أقول: هي أفضل من صلاة النهار كما في الجوهرة ونور الإيضاح, وقد صرحت الآيات والأحاديث بفضلها والحث عليها. قال في البحر: فمنها ما في صحيح مسلم مرفوعا: أفضل الصلاة بعد الفريضة صلاة الليل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في صلاة الليل)

(۲) وصلاة الليل وأقلها على ما في الجوهرة ثمان، قال: يصلي ما سهل عليه ولو ركعتين، والسنة فيها ثماني ركعات بأربع تسليمات، والتقييد بأربع تسليمات مبني على قول الصاحبين، وأما على قول الإمام فلا كما ذكره في الحلية، وقال فيها أيضا، وهذا بناء على أن أقل تهجده - صلى الله عليه وسلم - كان ركعتين، وأن منتهاه كان ثماني ركعات، أخذا مما في مبسوط السرخسي. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۵، ۲۶، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۱۳، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الكتاب - ديوبند)

الجواب حامداو مصلیا:

امام صاحب کا عمل صحیح نہیں ہے، فرض نماز کے بعد کے نوافل اور مستحب روزے کا اہتمام آپ ﷺ سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا صحیح اور بہترین عمل وہ ہے، جس پر اس کا کرنے والا مداومت کرے۔ (بخاری شریف)[1] یہ فرمان نبوی نوافل کے متعلق ہے؛ اس لیے ان کی بات ماننے کے لائق نہیں ہے، ان کو اپنی اس فکر کی اصلاح کرنی چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] وتر کی نماز مسلسل ترک کرنا

۸۹۱-سوال: عرب حضرات گاہے وتر پڑھتے ہیں اور گاہے نہیں۔ ان سے جب پوچھا گیا، تو کہنے لگے: وتر فرض نہیں ہے، سنت ہے، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

دوسرے ائمہ کے نزدیک وتر سنت ہے۔[2] اس لیے وہ کبھی پڑھتے ہیں اور کبھی نہیں پڑھتے ہیں۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن عائشة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: سددوا وقاربوا، واعلموا أن لن يدخل أحدكم عمله الجنة، وأن أحب الأعمال إلى الله أدومها وإن قل. (صحيح البخاري: ۲/ ۹۵۷، رقم الحديث: ۶۴۶۴، كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/ ۳۷۷، رقم الحديث: ۷۸- ۲۸۱۸، كتاب صفة القيامة والجنة والنار، باب لن يدخل أحد الجنة بعمله بل برحمة الله تعالى، ط: البدر - ديوبند)

عن عائشة رضي الله عنها، قالت: صلى النبي صلى الله عليه وسلم العشاء، ثم صلى ثماني ركعات، وركعتين جالسا، وركعتين بين النداءين ولم يكن يدعهما أبدا. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۵۵، رقم الحديث: ۱۱۵۹، كتاب التهجد، باب المداومة على ركعتي الفجر، ط: البدر - ديوبند)

رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵۲- ۴۵۳، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) قال الشافعي رضي الله عنه: "الفرض خمس في اليوم والليلة لقوله - صلى الله عليه وسلم - للأعرابي حين قال هل علي غيرها؟ قال: لا إلا أن تطوع" ــــــــ قال الماوردي: وهذا كما قال يتضمن هذا الفصل الخلاف في صلاة الوتر فعند الشافعي أنها سنة، وبه قال الفقهاء كافة. ــــــــ وقال أبو حنيفة: الوتر واجب. (الحاوي الكبير في فقه مذهب الإمام الشافعي - أبو الحسن، الماوردي (م: ۴۵۰هـ): ۲/ ۲۷۸، كتاب الصلاة، باب صلاة التطوع وقيام شهر رمضان، ت: علي محمد معوض - عادل أحمد عبد الموجود، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۳) تاہم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے، جس کی ادائیگی لازم ہے: =

[۶] ضرورت کے پیش نظر فرض نماز پر اکتفاء کرنا

۸۹۲-سوال: اگر کوئی نوکری اور کام کے موقع پر وقت نہ ہونے کی وجہ سے صرف فرض نماز پڑھ لے، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

گنجائش ہے۔[۱]

[۷] سنن مؤکدہ اور غیر مؤکدہ کی تعریف اور ان کا حکم

۸۹۳-سوال: محترم حضرت مفتی صاحب! ظہر کی کل رکعتیں (سنن ونوافل کے ساتھ) کتنی

= (هو فرض عملا وواجب اعتقادا وسنة ثبوتا) [الدر المختار] ـــــ قال ابن عابدين: أي ثبوته علم من جهة السنة لا القرآن وهي قوله - صلى الله عليه وسلم -: الوتر حق، فمن لم يوتر فليس مني، قاله ثلاثا. رواه أبو داود والحاكم وصححه وقوله - صلى الله عليه وسلم -: أوتروا قبل أن تصبحوا. رواه مسلم، والأمر للوجوب، وتمامه في شرح المنية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، زكريا- ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۰-۱۱۱، كتاب الصلاة، الباب الثامن في صلاة الوتر، ط: زكريا- ديوبند★ بدائع الصنائع: ۱/ ۶۰۵-۶۰۷، فصل في أنواع الصلاة الواجبة، ومنها صلاة الوتر، ط: زكريا- ديوبند)

[۱] تاہم سنتوں کے ترک کی عادت نہ بنائی جائے، کہ اس سے فرائض میں کوتاہی ہونے لگتی ہے، نیز نبی کریم ﷺ نے سنن مؤکدہ کی ادائیگی کا بڑا اہتمام فرمایا ہے اور ان کی بڑی فضیلت بیان کی ہے: عن عائشة، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " من ثابر على ثنتي عشرة ركعة من السنة، بنى الله له بيتا في الجنة: أربع ركعات قبل الظهر، وركعتين بعدها، وركعتين بعد المغرب، وركعتين بعد العشاء، وركعتين قبل الفجر ". (سنن الترمذي: ۱/ ۹۴، رقم الحديث: ۴۱۴، أبواب الصلاة، باب ما جاء فيمن صلى في يوم وليلة ثنتي عشرة ركعة من السنة، ما له فيه من الفضل، ط: البدر- ديوبند☆ المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳هـ): ۳/ ۲۶۰-۲۶۱، رقم الحديث: ۱۷۹۴، ۱۷۹۵، كتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب ثواب من صلى في اليوم والليلة ثنتي عشرة ركعة سوى المكتوبة ... الخ، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية- حلب)

(ويأتي) المسافر (بالسنن) إن كان (في حال أمن وقرار وإلا) بأن كان في خوف وفرار (لا) يأتي بها، هو المختار؛ لأنه ترك لعذر تجنيس، قيل: إلا سنة الفجر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۱۳، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: زكريا- ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۹، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: زكريا، ديوبند)

ہیں؟ اسی طرح مغرب اور عشاء کی کل رکعتیں کتنی ہیں؟ ظہر، مغرب اور عشاء میں جو نفل نمازیں ہیں، میں جان بوجھ کر محض سستی کی بناء پر ان کو ترک کر دیتا ہوں؛ حالاں کہ کوئی کام کاج نہیں ہوتا ہے، پھر بھی نہیں پڑھتا ہوں، جب کہ پانچوں وقت کی نماز کے لیے میں اذان کے ساتھ ہی مسجد میں حاضر ہو جاتا ہوں، تو آپ حدیث شریف کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً

لغت میں نفل کے معنی ہیں: ''زیادتی''۔[1] اور شریعت کی اصطلاح میں: وہ عبادت وبندگی، جس کے کرنے میں ثواب حاصل ہو اور نہ کرنے میں کوئی عذاب نہ ہو۔[2]

سنت کی دو قسمیں ہیں: (۱) سنت مؤکدہ اور (۲) سنت غیر مؤکدہ۔

(۱) سنت مؤکدہ: جو کام رسول اللہ ﷺ نیز خلفائے راشدینؓ نے ہمیشہ کیا ہو اور وہ فرض اور واجب کے علاوہ ہو اور کبھی کبھار اسے ترک بھی کیا ہو۔ اس کو سنن ہدیٰ اور سنت رواتب بھی کہا جاتا ہے، یہ حکم میں واجب کے قریب قریب ہے، یہ فرض اور واجب میں نقصان کی تلافی کرنے والا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ: بلا عذر چھوڑ دے گا، تو لعنت کا مستحق ہوگا اور ترک میں مواظبت کرے گا، تو فاسق ہو جائے گا اور اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔[3]

---

(۱) والنفل في اللغة: الزيادة. وفي الشريعة زيادة عبادة شرعت لنا لا علينا. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الفكر)

(۲) النفل... يثاب فاعله ولا يسيء تاركه. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۰۳، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، مطلب في السنة وتعريفها، ط: دار الفكر)

(۳-۴) فما كان فعله أولى من تركه مع منع الترك إن ثبت بدليل قطعي ففرض، أو بظني فواجب، وبلا منع الترك إن كان مما واظب عليه الرسول - صلى الله عليه وسلم - أو الخلفاء الراشدون من بعده فسنة، وإلا فمندوب و نفل. (حوالہ سابق: ۱/ ۱۰۲)

والسنة نوعان: سنة الهدي، وتركها يوجب إساءة وكراهية كالجماعة والأذان والإقامة ونحوها.

وسنة الزوائد، وتركها لا يوجب ذلك كسير النبي - عليه الصلاة والسلام - في لباسه وقيامه وقعوده.... السنة هي الطريقة المسلوكة في الدين، فهي في نفسها عبادة .... ولما لم تكن من مكملات الدين وشعائره سميت سنة الزوائد، بخلاف سنة الهدي، وهي السنن المؤكدة القريبة من الواجب التي يضلل تاركها؛ لأن تركها استخفاف بالدين. (حوالہ سابق: ۱/ ۱۰۳)

(۲) سنت غیر مؤکدہ: وہ کام جو رسول اللہ ﷺ نے کبھی کیا ہو اور کبھی نہ کیا ہو، وہ کام آپ کو پسند ہو، مگر اس کے چھوڑنے والے پر وعید اور عذاب نہ ہو۔ اس کو "سنن زوائد" اور "مستحب" بھی کہا جاتا ہے۔ (۴)

نفل کا اطلاق بعض مرتبہ دونوں قسم کی سنتوں پر ہوتا ہے، جیسا کہ آپ نے فرض کے علاوہ ہر نماز کے متعلق نفل ہونا لکھا ہے۔ (۵)

سنت مؤکدہ: ۱۲/ رکعتیں ہیں، دو رکعت فجر کی فرض نماز سے پہلے، چار رکعت ظہر کی فرض نماز سے پہلے، دو رکعت ظہر کی فرض نماز کے بعد، دو رکعت مغرب کی فرض نماز کے بعد، اور دو رکعت عشاء کی فرض نماز کے بعد۔ پس یہ کل بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں۔ (۶)

البتہ جمعہ کے دن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ۱۶/ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں، جمعہ سے پہلے چار رکعت، اور جمعہ کے بعد چار اور دو، کل چھ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں، پس جمعہ کے وقت ان کے نزدیک مجموعی دس رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں۔ (۷) البتہ جمعہ کے بعد کی دو رکعت سنت کو کبھی کبھار چھوڑنے سے گناہ نہ ہوگا؛ لیکن

---

(۵) رد المحتار علی الدر المختار: ۱/ ۱۰۳، کتاب الطهارة، سنن الوضوء، مطلب في السنة وتعريفها، ط: دار الفكر.

(۶) عن عبد الله بن شقيق، قال: سألت عائشة عن صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم، عن تطوعه؟ فقالت: كان يصلي في بيتي قبل الظهر أربعا، ثم يخرج فيصلي بالناس، ثم يدخل فيصلي ركعتين، وكان يصلي بالناس المغرب، ثم يدخل فيصلي ركعتين، ويصلي بالناس العشاء، ويدخل بيتي فيصلي ركعتين، ... وكان إذا طلع الفجر صلى ركعتين. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۵۲، رقم الحديث: ۱۰۵- (۷۳۰)، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب جواز النافلة قائما وقاعدا، وفعل بعض الركعة قائما وبعضها قاعدا، ط: البدر- ديوبند☆سنن أبي داود: ۱/ ۱۷۸، رقم الحديث: ۱۲۵۱، كتاب الصلاة، باب تفريع أبواب التطوع وركعات السنة، ط: البدر- ديوبند)

عن أم حبيبة، قالت: قال النبي صلى الله عليه وسلم: من صلى في يوم ثنتي عشرة ركعة تطوعا، بني له بهن بيت في الجنة. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۵۱، رقم الحديث: ۱۰۱- ۷۲۸، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب فضل السنن الراتبة قبل الفرائض وبعدهن، وبيان عددهن، ط: البدر- ديوبند☆سنن أبي داود: ۱/ ۱۷۸، رقم الحديث: ۱۲۵۰، باب تفريع أبواب التطوع وركعات السنة، ط: البدر- ديوبند)

عن عائشة رضي الله عنها، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من ثابر على ثنتي عشرة ركعة من السنة بنى الله له بيتا في الجنة: أربع ركعات قبل الظهر، وركعتين بعدها، وركعتين بعد المغرب، وركعتين بعد العشاء، وركعتين قبل الفجر". (سنن الترمذي: ۱/ ۹۳، كتاب الصلاة، باب ما جاء في من صلى في يوم وليلة... الخ، ط: ياسر نديم- ديوبند)

(۷) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من كان منكم مصليا بعد الجمعة فليصل أربعا. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۸۸، رقم الحديث: ۶۹- (۸۸۱)، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب الصلاة بعد=

پڑھنے سے ثواب کا مستحق ہوگا۔

ظہر کی فرض اور سنت مؤکدہ کے بعد دو رکعت، عصر کی فرض سے پہلے چار رکعت یا دو رکعت جو بھی پڑھنا میسر ہو اور عشاء کی فرض و سنت مؤکدہ کے بعد دو رکعت اور وتر کے بعد دو رکعت، اور مغرب میں سنت مؤکدہ کے بعد چھ رکعت یا دو رکعت جو بھی میسر ہو، اسی طرح تحیۃ المسجد کی دو رکعت، اشراق کی دو یا چھ رکعت اور چاشت کی دو یا بارہ رکعت، اور تہجد کی دو یا آٹھ رکعت اور ایک روایت کے مطابق بارہ رکعت؛ یہ سب نمازیں نوافل یعنی سنن غیر مؤکدہ ہیں، ان کے فضائل اور ثواب احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ (۸)

= الجمعة،فصل في استحباب أربع ركعات أو الركعتين بعد ا؛جمعة،ط: البدر - ديوبند ☆سنن الترمذي:١/ ١١٧، رقم الحديث: ٥٢٣،أبواب الجمعة،باب ماجاء في الصلاة قبل الجمعة و بعدها،ط: البدر - ديوبند)

وروي عن عبد الله بن مسعود: أنه كان يصلي قبل الجمعة أربعا، وبعدها أربعا ـــــــ وروي عن علي بن أبي طالب أنه: أمر أن يصلى بعد الجمعة ركعتين، ثم أربعا.(سنن الترمذي:١/ ١١٧، أبواب الجمعة، باب ما جاء في الصلاة قبل الجمعة وبعدها،ط:البدر - ديوبند)

ويصلي قبلها أربعا وفي رواية ستا الأربع سنة والركعتان تحية المسجد وبعدها أربعا أو ستا على حسب الاختلاف في سنة الجمعة وسننها توابع لها.(الهداية في شرح بداية المبتدي- المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ٥٩٣هـ):١/ ١٣٠، كتاب الصوم،باب الاعتكاف،ت: طلال يوسف،ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

(وسن) مؤكدا (أربع قبل الظهر و) أربع قبل (الجمعة و) أربع (بعدها بتسليمة)...الخ.(الدر المختار مع رد المحتار:٢/ ١٣، كتاب الصلاة، باب الوتر والنفل، ط: دار الفكر☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ٣٨٩،فصل في بيان النوافل،ت: محمد عبد العزيز الخالدي،ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

قال العلامة العثماني: عن أبي عبد الرحمان السلمي...فإن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه يعلمنا أن نصلي أربع ركعات بعد الجمعة، حتى سمعنا قول علي صلوا ستا...الخ. ذهب إليه أبو يوسف من أئمتنا أن السنة بعد الجمعة ست ركعات.(إعلاء السنن:٧/ ١٢، كتاب الصلاة،باب النوافل،إدارة القرآن - كراتشي، بحوالہ فتاویٰ محمودیہ:٨/ ٣٢٣)

[٨](ويستحب أربع قبل العصر، وقبل العشاء وبعدها بتسليمة) وإن شاء ركعتين، وكذا بعد الظهر لحديث الترمذي "من حافظ على أربع قبل الظهر وأربع بعدها حرمه الله على النار" (وست بعد المغرب) ليكتب من الأوابين (بتسليمة) أو ثنتين أو ثلاث والأول أدوم وأشق وهل تحسب المؤكدة من المستحب، ويؤدى الكل بتسليمة واحدة؟ اختار الكمال: نعم. وحرر إباحة ركعتين خفيفتين قبل المغرب؛ وأقره في البحر والمصنف. (الدر المختار) ـــــــ وقال ابن عابدين:(قوله ويستحب أربع قبل العصر) لم يجعل للعصر سنة راتبة لأنه لم يذكر في حديث عائشة المار بحر قال في الإمداد وخير محمد بن الحسن والقدوري المصلي بين أن يصلي أربعا أو ركعتين قبل العصر لاختلاف الآثار (قوله وإن شاء ركعتين) كذا عبر في منية المصلي. وفي الإمداد عن الاختيار: يستحب أن يصلي قبل العشاء أربعا وقيل ركعتين، وبعدها أربعا وقيل ركعتين اهـ. والظاهر أن الركعتين =

آپ سنن مؤکدہ نہیں پڑھتے ہیں، یہ غلط ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

آگاہ رہو! بے شک مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کے مثل بھی دی گئی ہے، خبردار! قریب ہے کہ ایک پیٹ بھرا آدمی اپنے تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھا کہے گا کہ تمہارے ذمہ قرآن کو پکڑنا لازم ہے۔ (صرف قرآن کافی ہے، حدیث کی ضرورت نہیں) پس تم اس میں جو حلال پاؤ تو اسے حلال سمجھو اور جو اس میں تم حرام پاؤ، تو اسے حرام سمجھو۔ خبردار! (اس کی بات میں مت آنا)......الحدیث۔ (ابوداود)[۹]

اس حدیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف قرآن کریم پر تکیہ کرنے سے منع فرمایا ہے اور حدیث پاک سے ثابت ہونے والے احکام کو نہ ماننے والے کو سخت لہجہ میں متنبہ کیا ہے۔ جس کا حاصل یہ نکلا کہ سنت (مؤکدہ وغیر مؤکدہ) کا اگر قرآن کریم میں ذکر نہ ہو، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شریعت میں مطلوب نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت کی ادائیگی کا بڑا اہتمام فرمایا ہے، نیز ان کے پڑھنے پر بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے، حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ اگر فرائض میں کمی ہوگی، تو ان سنتوں کے ذریعہ قیامت میں تلافی کی جائے گی۔[۱۰]

=المذكورتين غير المؤكدتين. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۳، كتاب الصلاة، باب الوتر والنفل، ط: دار الفكر-بيروت)

(۹) عن المقدام بن معدي كرب عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال: "ألا إني أوتيت الكتاب، ومثله معه ألا يوشك رجل شبعان على أريكته يقول عليكم بهذا القرآن فما وجدتم فيه من حلال فأحلوه، وما وجدتم فيه من حرام فحرموه، ألا لا يحل لكم لحم الحمار الأهلي، ولا كل ذي ناب من السبع، ولا لقطة معاهد، إلا أن يستغني عنها صاحبها، ومن نزل بقوم فعليهم أن يقروه فإن لم يقروه فله أن يعقبهم بمثل قراه". (سنن أبي داود: ۲/ ۶۳۳، رقم الحديث: ۴۶۰۴، كتاب السنة، باب في لزوم السنة، ط: البدر-ديوبند)

(۱۰) (عن أبي هريرة) قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "إن أول ما يحاسب به العبد يوم القيامة من عمله صلاته، فإن صلحت فقد أفلح وأنجح، وإن فسدت فقد خاب وخسر، فإن انتقص من فريضته شيء، قال الرب عز وجل: انظروا هل لعبدي من تطوع فيكمل بها ما انتقص من الفريضة، ثم يكون سائر عمله على ذلك". (سنن الترمذي: ۱/ ۹۴، كتاب الصلاة، باب ما جاء أن أول ما يحاسب به العبد الصلاة، ط: ياسر نديم-ديوبند)

... شرعت البعدية لجبر النقصان، والقبلية لقطع طمع الشيطان. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۳، كتاب الصلاة، باب الوتر والنفل، ط: دار الفكر)

السنة المؤكدة بمنزلة الواجب في الإثم بالترك كما صرحوا به كثيرا وصرح به في المحيط هنا وأنه لا يجوز ترك السنن المؤكدة. (البحر الرائق: ۲/ ۸۶، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الكتاب ديوبند)

سنن زوائد انسان مسجد میں جا کر ادا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تو فرائض کو استحضار قلب کے ساتھ پڑھنے کی توفیق ملتی ہے۔ آپ مسجد میں اذان ہوتے ہی چلے جاتے ہیں، تو اس کا اہتمام کریں، ورنہ مسجد میں پہنچ کر لغو باتوں میں مشغول ہو جانے کا خطرہ رہے گا۔

بنیادی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض کے علاوہ بہت سی نمازیں سنت مؤکدہ اور غیر مؤکدہ کے طور پر ادا فرمائی ہیں؛ اس لیے آپ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے فرائض میں نقصان کی تلافی کے لیے کمربستہ ہو جائیں اور سنن ونوافل کا اہتمام کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] نفل اور سنت نماز کا حکم اور ان کی تعداد

۸۹۴-سوال: نفل نماز کا کیا حکم ہے؟ اور نفل رکعتیں کتنی ہیں؟ مغرب اور عشاء کی جو نفل رکعتیں ہیں، انہیں پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً

فرض نماز سے پہلے اور بعد میں کل بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں، بلا عذر ان کا چھوڑنا جائز نہیں ہے، ان کو چھوڑنے والا لعنت کا مستحق ہے، اور سنت کو خفیف اور بے عزت سمجھ کر چھوڑنے والے پر کفر کا اندیشہ ہے۔

مذکورہ بارہ رکعتوں کے علاوہ پڑھی جانے والی نفل نماز کو سنت غیر مؤکدہ یا مستحب کہتے ہیں۔ ان کے پڑھنے والے بہت ثواب کے مستحق ہوں گے اور چھوڑنے والے گنہگار نہ ہوں گے۔ کتابوں میں مذکور نفل اور مستحب نماز کے پڑھنے پر بھی بہت سے وعدے اور فضائل بیان کیے گئے ہیں؛ اس لیے انہیں پڑھنا بہتر ہے، ترک کی عادت نہیں بنانی چاہیے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] کم وقت میں زیادہ رکعت پڑھنے والا بہتر ہے یا زیادہ وقت میں کم رکعت پڑھنے والا؟

۸۹۵-سوال: ایک شخص چار منٹ میں چھ رکعت پڑھتا ہے، دوسرا شخص چار منٹ میں چار رکعت پڑھتا ہے اور تیسرا شخص چار منٹ میں دو رکعت پڑھتا ہے، تو ان تینوں میں سے بہتر کون ہے اور کس کو زیادہ ثواب ملے گا؟ بہت سوں کو دیکھا ہے وہ جلدی جلدی نماز پڑھتے ہیں تو کیا جلدی نماز پڑھنا خشوع اور خضوع

(۱) مسئلے کی تفصیل اور تخریج کے لیے دیکھیے ''سنن مؤکدہ اور غیر مؤکدہ کی تعریف اور ان کا حکم'' کے تمام حواشی۔

کے خلاف نہیں ہے؟ کیا نماز جیسی عظیم الشان عبادت میں تعدیل ارکان ضروری نہیں ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً

جو شخص نفل نماز میں زیادہ لمبی قراءت کرے اور رکعت کم پڑھے، وہ اس شخص سے بہتر ہے، جو قراءت کم کرے اور رکعت زیادہ پڑھے، بصورت مسئولہ میں چار منٹ میں دو رکعت پڑھنے والا شخص بہتر ہوگا؛ اس لیے کہ کم رکعت پڑھنے والا قرآن کی تلاوت زیادہ کرے گا اور قرآن کی تلاوت، تمام اذکار میں سب سے بہتر یعنی افضل الذکر ہے؛ اس لیے زیادہ وقت میں کم رکعت پڑھنے والا، کم وقت میں زیادہ رکعت پڑھنے والے سے بہتر ہوگا۔ (۱)

نماز میں تعدیل ارکان واجب ہے، اگر کوئی شخص تعدیل ارکان کا خیال کرتے ہوئے جلدی نماز پڑھتا ہے، تو اس کی نماز ہو جائے گی اور جو شخص جلدی نماز پڑھتا ہے اور تعدیل ارکان کا لحاظ نہیں کرتا، تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ واجب ترک کرنے کی وجہ سے دوبارہ نماز پڑھنا ضروری ہوگا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] بہن کی ہم نام خاتون کے ساتھ نکاح کے لیے صلاۃ استخارہ

۸۹۶-سوال: صلوۃ استخارہ کا طریقہ کیا ہے؟ نیز کسی ایسی عورت کے ساتھ نکاح کرنے کے لیے، جو میری بہن کے ہم نام ہے، استخارہ کی نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

(۱) والحاصل أن المذهب المعتمد أن طول القيام أحب، ومعناه كما في شرح المنية أنه إذا أراد شغل حصة معينة من الزمان بصلاة فإطالة القيام مع تقليل عدد الركعات أفضل من عكسه، فصلاة ركعتين مثلاً في تلك الحصة أفضل من صلاة أربع فيها، وهكذا القياس. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۸/۲، كتاب الصلاة، باب الوتر و النوافل، ط: دار الفكر - بيروت)

وَلَذِكْرُ اللهِ أَكْبَرُ. (۲۹-العنكبوت: ۴۵)

(۲) وأما الاعتدال في الركوع والسجود وكل ركن، هو أصل بنفسه، ذكر الكرخي: أنه واجب على قولهما. هكذا في الظهيرية، وهو الصحيح. كذا في شرح المنية لابن أمير الحاج، وتعديل الأركان: هو تسكين الجوارح؛ حتى تطمئن مفاصله، وأدناه قدر تسبيحة. كذا في العيني شرح الكنز، والنهر الفائق. (الفتاوى الهندية: ۷۱/۱، كتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الثاني في واجبات الصلاة، ط: زكريا - ديوبند☆النهر الفائق شرح كنز الدقائق - سراج الدين عمر بن إبراهيم بن نجيم الحنفي (م: ۱۰۰۵ھ): ۱۹۹/۱، باب صفة الصلاة، ت: أحمد عزو عناية، ط: دار الكتب العلمية☆رد المحتار على الدر المختار: ۴۶۴/۱، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الفكر - بيروت)

الجواب حامداً ومصلیا:

آپ سونے سے قبل وضوء کرکے دو رکعت نماز نفل کی نیت سے پڑھیں، پھر استخارہ کی مسنون دعاء پڑھ کر سو جائیں۔ دعاء میں "ھذا الأمر" کے بجائے اس لڑکی کا نام لیں اور یہ کہیں کہ اس لڑکی کے ساتھ نکاح کا ارادہ رکھتا ہوں، اس کے بعد آپ سو جائیں، اگر پندرہ، بیس دنوں میں آپ کے دل کو سکون واطمینان نصیب ہو جائے اور ان سے شادی کرنے پر دل مطمئن ہو جائے تو نکاح کرلیں۔ [۱]

صورت مسئولہ میں استخارہ کرنا چاہیے۔ [۲]

نوٹ: اس مسئلے کی مزید معلومات کے لیے میری کتاب ''مسلمان عورت حصہ اول دوم'' کا مطالعہ کیجیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] استخارہ کا طریقہ

۸۹۷-سوال: استخارہ کا طریقہ اور اس کی ترتیب کیا ہے؟

(۱ - ۲) عن جابر رضي الله عنه، قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يعلمنا الاستخارة في الأمور كلها، كالسورة من القرآن: " إذا هم بالأمر فليركع ركعتين ثم يقول: اللهم إني أستخيرك بعلمك، وأستقدرك بقدرتك، وأسألك من فضلك العظيم، فإنك تقدر ولا أقدر، وتعلم ولا أعلم، وأنت علام الغيوب، اللهم إن كنت تعلم أن هذا الأمر خير لي في ديني ومعاشي وعاقبة أمري - أو قال: في عاجل أمري وآجله - فاقدره لي، وإن كنت تعلم أن هذا الأمر شر لي في ديني ومعاشي وعاقبة أمري - أو قال: في عاجل أمري وآجله - فاصرفه عني واصرفني عنه، واقدر لي الخير حيث كان، ثم رضني به، ويسمي حاجته ". (صحيح البخاري: ۲/ ۹۴۴، رقم الحديث: ۶۳۸۲، كتاب الدعوات، باب الدعاء عند الاستخارة، ط: البدر - ديوبند)

وفي الحلية: ويستحب افتتاح هذا الدعاء وختمه بالحمدلة والصلاة. وفي الأذكار أنه يقرأ في الركعة الأولى الكافرون، وفي الثانية الإخلاص. اهـ. وعن بعض السلف أنه يزيد في الأولى - {وربك يخلق ما يشاء ويختار} [القصص:۶۸] إلى قوله - {يعلنون} [القصص:۶۹] - وفي الثانية {وما كان لمؤمن ولا مؤمنة} [الأحزاب:۳۶] الآية. وينبغي أن يكررها سبعا، لما روى ابن السني "يا أنس إذا هممت بأمر فاستخر ربك فيه سبع مرات، ثم انظر إلى الذي سبق إلى قلبك فإن الخير فيه" ولو تعذرت عليه الصلاة استخار بالدعاء اهـ ملخصا. وفي شرح الشرعة: المسموع من المشايخ أنه ينبغي أن ينام على طهارة مستقبل القبلة بعد قراءة الدعاء المذكور، فإن رأى منامه بياضا أو خضرة فذلك الأمر خير، وإن رأى فيه سوادا أو حمرة فهو شر ينبغي أن يجتنب اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶-۲۷، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في ركعتي الاستخارة، ط: دار الفكر - بيروت

الجواب حامداً و مصلیاً:

جب کوئی اہم کام درپیش ہو، تو پہلے دو رکعت نماز پڑھے، پہلی رکعت میں "قُلْ يَاأَيُّهَا الْكٰفِرُوْن" اور دوسری رکعت میں "قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ" پڑھے، سلام پھیرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور نبی کریم ﷺ پر درود بھیج کر یہ دعا پڑھے: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ، وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلاَ أَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلاَ أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ، اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الأَمْرَ خَيْرٌ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي أَوْ فِي عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ، فَاقْدُرْهُ لِي، وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الأَمْرَ شَرٌّ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي أَوْ فِي عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ فَاصْرِفْهُ عَنِّي وَاصْرِفْنِي عَنْهُ، وَاقْدُرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ رَضِّنِي بِهِ.(۱)

ترجمہ: اے اللہ میں آپ سے آپ کے علم کے ذریعہ خیر طلب کرتا ہوں اور آپ کی قدرت کے ذریعہ آپ سے (بھلے کام پر) قدرت طلب کرتا ہوں اور آپ سے آپ کے بڑے فضل (مہربانی وانعام) کا سوال کرتا ہوں؛ کیوں کہ آپ کو قدرت ہے اور مجھے قدرت نہیں اور آپ جانتے ہیں اور میں نہیں جانتا اور آپ تمام غیبوں کو خوب جاننے والے ہیں۔ اے اللہ! اگر آپ کے علم میں یہ کام (یہاں کام کا نام لے) میرے لیے دین و دنیا، حال و مستقبل اور آخرت کے لحاظ سے بہتر ہے، تو آپ اسے میرے لیے مقدر فرما دیجیے اور اسے میرے لیے اس میں آسانی پیدا فرما دیجیے، پھر میرے لیے اس میں برکت عطا فرمائیے۔ اور اگر یہ کام (یہاں کام کا نام لے) میرے لیے دین و دنیا، حال و مستقبل، معاش اور انجام کار کے لحاظ سے برا ہے، تو اس کام کو مجھ سے دور رکھیے اور میرے دل کو اس کام کی طرف سے پھیر دیجیے، اور جہاں بھی میرے لیے خیر مقدر ہو، اس کا میرے لیے فیصلہ فرما دیجیے اور جو فیصلہ آپ فرمائیں، اس پر مجھے خوش رکھیے۔

اگر یہ دعا عربی میں نہیں پڑھ سکتا، تو گجراتی میں یا کسی بھی زبان میں پڑھ لے، دعا پڑھنے کے بعد قبلہ رخ ہو کر سو جائے، اگر نیند میں سفید یا ہرے رنگ کی کوئی چیز دیکھے، تو یہ اس کام کے خیر ہونے کی علامت ہے، اور اگر کالے یا سرخ رنگ کی چیز دیکھے، تو اس کام کے شر ہونے کی علامت ہے؛ لہٰذا اس سے بچنا چاہیے، خواب کسی چیز کا دیکھنا یا نہ دیکھنا اصل نہیں ہے؛ اس لیے اگر کوئی خواب نہ دیکھے، تو دل جس پر جم جائے، اسی کو

(۱) صحیح البخاري: ۲/ ۹۴۴، رقم الحدیث: ۶۳۸۲، کتاب الدعوات، باب الدعاء عند الاستخارۃ، ط: دیوبند.

کرلے، اگر ایک دن میں تسلی وتشفی نہ ہو،تو سات دن تک ایسا ہی کرے، پھر جو کام کرے گا، اسی میں بھلائی ہوگی۔ (شامی، کتاب الصلاۃ، باب الوتر والنوافل، مطلب فی رکعتی الاستخارۃ، ج ۲: ص: ۴۰۷، زکریا- دیوبند)[1]

[۱۲] سنن ونوافل کوگھر میں ادا کرنا اور عشاء کی اخیری دورکعت بیٹھ کر ادا کرنا

۸۹۸-سوال: فجر کی دو رکعت سنت مؤکدہ گھر سے پڑھ کر جانے اور عشاء کی آخری دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ بعض لوگ عشاء کی آخری دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے کو سنت بتلاتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

الجواب حامداومصلیا

فجر کی دو رکعت گھر میں پڑھنا سنت ہے۔[2] اس کے علاوہ دوسرے نوافل بھی گھر پر، پڑھنا افضل ہے؛ لیکن اگر یہ خوف ہو کہ سستی اور مشغولی کی وجہ سے نماز کے بعد نوافل گھر جاکر نہیں پڑھ سکے گا،تو پھر مسجد میں پڑھ لینا افضل ہے۔ نیز فجر کی دو رکعت مسجد میں نہ پڑھنے کی وجہ سے جاہل لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو کہ فجر کی سنت، سنت مؤکدہ نہیں ہے یا ایسی بدگمانی کا اندیشہ ہو کہ لوگ یہ کہیں گے کہ فلاں صاحب سنت نہیں

(۱) وفي الحلية: ويستحب افتتاح هذا الدعاء وختمه بالحمدلة والصلاة. وفي الأذكار أنه يقرأ في الركعة الأولى الكافرون، وفي الثانية الإخلاص. اهـ. وعن بعض السلف أنه يزيد في الأولى - {وربك يخلق ما يشاء ويختار} [القصص:۶۸] إلى قوله - {يعلنون} [القصص: ۶۹] - وفي الثانية {وما كان لمؤمن ولا مؤمنة} [الأحزاب: ۳۶] الآية. وينبغي أن يكررها سبعا، لما روى ابن السني "يا أنس إذا هممت بأمر فاستخر ربك فيه سبع مرات، ثم انظر إلى الذي سبق إلى قلبك فإن الخير فيه"، ولو تعذرت عليه الصلاة استخار بالدعاء اهـ ملخصا.

وفي شرح الشرعة: المسموع من المشايخ أنه ينبغي أن ينام على طهارة مستقبل القبلة بعد قراءة الدعاء المذكور، فإن رأى منامه بياضا أو خضرة فذلك الأمر خير، وإن رأى فيه سوادا أو حمرة فهو شر ينبغي أن يجتنب اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶-۲۷، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في ركعتي الاستخارة، ط: دار الفكر - بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۲، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، ط: زكريا- ديوبند)

(۲) وفي الخلاصة: والسنة في ركعتي الفجر ثلاث: أحدها أن يقرأ في الركعة الأولى {قل يا أيها الكافرون}، وفي الثانية الإخلاص، والثانية أن يأتي بهما أول الوقت، والثالثة أن يأتي بهما في بيته . . . اهـ. (البحر الرائق: ۲/ ۸۵، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الكتاب ديوبند☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۰، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، قبيل: مبحث مهم في الكلام على الضجعة بعد سنة الفجر، ط: دار الفكر - بيروت)

پڑھتے ہیں، تو ایسی صورت میں مسجد میں پڑھنا بہتر ہے۔ (۱)

وتر کے بعد کی دو رکعت نفل کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے، آپ ﷺ تہجد کے بعد وتر پڑھتے تھے لمبی تہجد پڑھنے کی وجہ سے تھک جاتے تھے؛ اس لیے بعض مرتبہ بیٹھ کر پڑھتے تھے، ہمارے لیے کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے، ہاں اگر کوئی آدمی تہجد کے بعد وتر کی نماز پڑھتا ہے۔ (۲) اور آپ ﷺ کی اتباع کی نیت سے بیٹھ کر دو رکعت پڑھتا ہے، تو زیادتی ثواب کا مستحق ہوگا۔ (درمختار) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) والأفضل في النفل غير التراويح المنزل إلا لخوف شغل عنها والأصح أفضلية ما كان أخشع وأخلص. (الدر المختار)
قال ابن عابدين: (قوله والأفضل في النفل إلخ) شمل ما بعد الفريضة وما قبلها لحديث الصحيحين: عليكم الصلاة في بيوتكم فإن خير صلاة المرء في بيته إلا المكتوبة. وأخرج أبو داود "صلاة المرء في بيته أفضل من صلاته في مسجدي هذا إلا المكتوبة" وتمامه في شرح المنية، وحيث كان هذا أفضل يراعى ما لم يلزم منه خوف شغل عنها لو ذهب لبيته، أو كان في بيته ما يشغل باله ويقلل خشوعه، فيصليها حينئذ في المسجد لأن اعتبار الخشوع أرجح. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۲، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في الكلام على حديث النهي عن النذر، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) عن عبد الله بن عمرو، قال: حدثت أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: صلاة الرجل قاعدا نصف الصلاة، قال: فأتيته، فوجدته يصلي جالسا، فوضعت يدي على رأسه، فقال: ما لك يا عبد الله بن عمرو، قلت: حدثت يا رسول الله أنك قلت: صلاة الرجل قاعدا على نصف الصلاة، وأنت تصلي قاعدا، قال: أجل، ولكني لست كأحد منكم. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۵۳، رقم الحديث: ۱۲۰-(۷۳۵)، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب جواز النافلة قائما وقاعدا، وفعل بعض الركعة قائما وبعضها قاعدا، ط: البدر- ديوبند☆ سنن أبي داود: ۱/ ۱۳۷، رقم الحديث: ۹۵۰، كتاب الصلاة، باب في صلاة القاعد، ط: البدر- ديوبند☆ المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳هـ): ۳/ ۲۲۳، رقم الحديث: ۱۶۵۹، كتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب فضل صلاة القائم على صلاة القاعد، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية- حلب)
لأنه صلى الله عليه وسلم كان يصلي بعد الوتر قاعدا... و "لكن له" أي للمتنفل جالسا "نصف أجر القائم" لقوله صلى الله عليه وسلم: "من صلى قائما فهو أفضل ومن صلى قاعدا فله نصف أجر القائم ومن صلى نائما فله نصف أجر القاعد" "إلا" أنهم قالوا هذا في حق القادر. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح، ص: ۱۵۲، باب في النوافل، فصل في صلاة النفل جالسا وفي الصلاة على الدابة وصلاة الماشي، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)
(قوله ولكن له نصف أجر القائم) يستثنى منه صاحب الشرع صلى الله عليه وسلم كما ورد عنه صلى الله عليه وسلم. فإن أجر صلوته قاعداً كأجر صلوته قائما، فهو من خصوصياته. (حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح: ۱/ ۲۶۵، فصل في صلاة النفل جالسا، ط: المطبعة الكبرى الأميرية ببولاق، مصر)
قلت الصواب أن هاتين الركعتين فعلهما صلى الله عليه وسلم بعد الوتر جالسا لبيان جواز الصلاة بعد الوتر وبيان=

[۳۱] رمضان میں تہجد کی نماز باجماعت پڑھنے کا حکم

۸۹۹-سوال: چہ فرمائید علمائے دین ومفتیان شرع متین در بارۂ ایں مسئلہ کہ گزاردن نماز تہجد باجماعت در رمضان المبارک شرعاً جائز است یا نہ؟ بعضے دریں ادائے کردن تہجد باجماعت مکروہ دانند وبعضے جائز گویند، وبعضے بلا تداعی آں را ور رمضان مبارک حرج نمی دانند، ایں قول مفتی بہ عند الاحناف در فقہ نمی آید، و شمارا مؤدبانہ التماس کردہ شود تا ایں مسئلہ یعنی گزادن نماز تہجد باجماعت در رمضان مبارک قدرے تفصیل بیان کردہ شود، وقول مفتی بہ عند الاحناف ذکر کردہ آید، تا عمل برائے عوام الناس در تشویش افتادہ اند سہل آید، بینوا بسند الکتاب وتوجروا فی اللہ الملک الوہاب، فقط۔ (۱)

الجواب حامداً ومصلیاً

بعض اکابر رمضان المبارک میں ''نماز تہجد'' جماعت سے ادا کرتے تھے؛ بغیر تداعی کے اس کی اجازت ہے، تاہم افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ تہجد کی نماز تنہا پڑھی جائے، بلا تداعی کبھی کبھار دو تین شخص کسی کی اقتداء میں تہجد ادا کرلیں، تو جائز ہے۔

البتہ تین سے زائد نے غیر رمضان میں اقتداء کی ہو تو مکروہ ہے، تاہم اقتداء صحیح ہوجائے گی۔

درحقیقت اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ باجماعت تہجد کی نماز ادا کرنا کیسا ہے؟ واضح رہے کہ یہ اختلاف جواز وعدم جواز کا نہیں ہے؛ بل کہ کراہت وعدم کراہت کا ہے۔

تداعی کے بغیر ہو، تو رمضان وغیر رمضان: ہر دو میں اس کا باجماعت ادا کرنا بلا کراہت جائز ہے۔

=جواز النفل جالسا ولم يواظب على ذلك بل فعله مرة أو مرتين أو مرات قليلة. (شرح النووي: ۳/۵۷، صلاة الليل وعدد الركعات، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

والمحققون من أكابرنا على أن اتيانهما قياما أفضل اهـ. (إعلاء السنن: ۶/۱۰۹، كتاب الصلاة، حكم الركعتين بعد الوتر، ط: ادارة الكراچي)

(۱) ترجمہ: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ: رمضان المبارک میں تہجد کی نماز باجماعت پڑھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بعض حضرات باجماعت تہجد کی نماز ادا کرنے کو مکروہ سمجھتے ہیں، جب کہ بعض حضرات اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ بعض بغیر تداعی کے رمضان میں کوئی حرج نہیں سمجھتے ہیں، اور یہی قول فقہ حنفی میں مفتیٰ بہ ہے۔ آپ سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اس مسئلے کو واضح فرمائیں اور مفتی بہ قول کی بھی نشان دہی کردیں، تا کہ عوام کے لیے اس اختلافی مسئلے میں عمل کرنا آسان ہوجائے۔ بینوا توجروا۔

تداعی کے ساتھ غیر رمضان میں مکروہ ہے۔ البتہ رمضان المبارک میں کیا حکم ہے؟ فقہ حنفی کی بیشتر روایت تو یہی ہے کہ رمضان میں بھی تداعی کے ساتھ مکروہ ہے؛ بعض فقہاء کی صراحت کے مطابق مکروہ تنزیہی ہے، بعض کی صراحت کے مطابق مکروہ تحریمی۔[1]

خود بعض اکابر کا یہی معمول رہا ہے کہ تہجد میں جماعت کے ساتھ قرآن کریم ختم کرتے تھے۔

بعض نے تداعی کا مطلب ''اذان واقامت'' بیان کیا ہے، الہٰذا نفل نماز جماعت سے ادا کرنے کے لیے اذان واقامت کہنا مکروہ ہوگا اوراس پر مواظبت مکروہ تحریمی؛ بل کہ بدعت کی حد میں داخل ہوکر حرام ہوگا۔

جو حضرات تہجد کی نماز رمضان المبارک میں جماعت سے ادا کرتے ہیں، وہ فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم: **من قام رمضان إيمانا واحتساباً**۔ الحدیث (بخاری، مسلم)[2] سے استدلال کرتے ہیں کہ اس روایت میں تراویح

---

[۱] (ولا يصلي الوتر و) لا (التطوع بجماعة خارج رمضان) أي يكره ذلك على سبيل التداعي، بأن يقتدي أربعة بواحد كما في الدرر، ولا خلاف في صحة الاقتداء إذ لا مانع نهر. [الدر المختار] ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله أي يكره ذلك) أشار إلى ما قالوا من أن المراد من قول القدوري في مختصره لا يجوز الكراهة لا عدم أصل الجواز، لكن في الخلاصة عن القدوري أنه لا يكره، وأيده في الحلية بما أخرجه الطحاوي عن المسور بن مخرمة، قال: دفنا أبا بكر - رضي الله تعالى عنه - ليلا، فقال عمر - رضي الله عنه -: إني لم أوتر، فقام وصففنا وراءه فصلى بنا ثلاث ركعات لم يسلم إلا في آخرهن. ثم قال: ويمكن أن يقال: الظاهر أن الجماعة فيه غير مستحبة، ثم إن كان ذلك أحيانا كما فعل عمر كان مباحا غير مكروه، وإن كان على سبيل المواظبة كان بدعة مكروهة؛ لأنه خلاف المتوارث، وعليه يحمل ما ذكره القدوري في مختصره، وما ذكره في غير مختصره يحمل على الأول، والله أعلم اهـ ــــ قلت: ويؤيده أيضا ما في البدائع من قوله: إن الجماعة في التطوع ليست بسنة إلا في قيام رمضان اهـ فإن نفي السنية لا يستلزم الكراهة، نعم إن كان مع المواظبة كان بدعة فيكره. وفي حاشية البحر للخير الرملي: علل الكراهة في الضياء والنهاية بأن الوتر نفل من وجه حتى وجبت القراءة في جميعها، وتؤدى بغير أذان وإقامة، والنفل بالجماعة غير مستحب؛ لأنه لم تفعله الصحابة في غير رمضان اهـ وهو كالصريح في أنها كراهة تنزيه تأمل. اهـ ــــ (قوله على سبيل التداعي) هو أن يدعو بعضهم بعضا كما في المغرب، وفسره الواني بالكثرة وهو لازم معناه ــــ (قوله أربعة بواحد) أما اقتداء واحد بواحد أو اثنين بواحد فلا يكره، وثلاثة بواحد فيه خلاف بحر عن الكافي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۸-۴۹، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في كراهة الاقتداء في النفل على سبيل التداعي وفي صلاة الرغائب، ط: دار الفكر-بيروت)

[۲] عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من قام رمضان إيمانا واحتسابا، غفر له ما تقدم من ذنبه. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۰، رقم الحديث: ۳۷ و ۳۸، كتاب الإيمان، باب: تطوع قيام رمضان من الإيمان، ط: البدر-ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۵۹، رقم الحديث: ۱۷۳- (۵۵۹)، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب الترغيب في قيام رمضان، وهو التراويح)

کی کوئی قید نہیں ہے؛ لہٰذا تراویح وغیر تراویح ہر دو کا جماعت سے ادا کرنا جائز ہوگا۔

اسی طرح سے فقہاء نے لکھا ہے کہ نفل مطلقاً جماعت سے تداعی کے بغیر جائز ہے: وفي عمدة الفقهاء وتحفة الفقهاء: والتفسير فيه أن التطوع بالجماعة إذا لم يكن على وجه التداعي، وهو بالأذان والإقامة على سبيل الجهر - كما هو المعتاد في المساجد - لا يكره... (الخزانة: ۱/ ۲۰۴)[۳]

الغرض رمضان المبارک میں با جماعت تہجد پڑھنا مختلف فیہ ہے؛ اس لیے جو حضرات کسی حافظ، قاری وعالم کے پیچھے تہجد ادا کرتے ہیں، ان پر شدت سے نکیر نہ کی جائے؛ اس لیے کہ اگر شدت سے روکا گیا، تو منفرداً تہجد کو چھوڑ دیں گے، یہ ایسا ہی ہے، جیسے کہ وقت مکروہ میں نماز ادا کرنا، کہ باتفاق علماء احناف مکروہ تحریمی ہے، اس کے باوجود اگر عوام کو اس وقت نماز پڑھنے سے نہیں روکا جائے گا، جیسا کہ علامہ حصکفیؒ نے صراحت کی ہے کہ: وقت مکروہ میں جو نماز ادا کرے، اس کو نہ روکا جائے، اگر اس وقت نماز سے روک دیا گیا، تو احتمال ہے کہ نماز قضا کر دے گا یا نماز کو ترک کر دے گا۔[۴]

الغرض تہجد جماعت سے ادا کرنے پر رمضان المبارک میں سختی سے نکیر نہ کی جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] تہجد کی نماز با جماعت پڑھنا اور طلوعِ صبح صادق کے بعد اور اذانِ فجر سے قبل پڑھنا
[۱۵] نماز کی حالت میں کھجلانا، مچھر کو بھگانا اور سجدے کی حالت میں زمین سے پیر اٹھانا

۹۰۰- سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسائل ذیل کے بارے میں:

(۱) تہجد کی نماز با جماعت ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ زید کا کہنا ہے کہ اعلان کر کے یا لوگوں کو بلا کر جماعت کرنا جائز نہیں ہے، ہاں جب کسی آدمی کو تہجد کی جماعت میں شرکت کی دعوت نہ دی جائے اور نہ ہی کسی کو بلانے کے لیے بھیجا جائے، بل کہ کچھ لوگ تہجد کے لیے خود اپنے شوق و رغبت سے آ جائیں، تو کوئی حرج

---

[۳] لم أجد هذا الكتاب.

(۴) (وكره) تحريما، وكل ما لا يجوز مكروه (صلاة) مطلقا (ولو) قضاء أو واجبة أو نفلا أو (على جنازة وسجدة تلاوة وسهو) لا شكر قنية (مع شروق) إلا العوام، فلا يمنعون من فعلها؛ لأنهم يتركونها، والأداء الجائز عند البعض أولى من الترك كما في القنية وغيرها. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۷۰-۳۷۱، كتاب الصلاة، ط: دار الفكر)

نہیں ہے۔ ہمارے یہاں یہی صورت حال رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ان لوگوں کی طرف سے پیش آتی ہے، جو شب بیداری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ تہجد میں مکمل کلام پاک سن کر زیادہ اجر وثواب کے مستحق ہوں، نیز یہ حضرات اپنے طور پر اپنے خویش واقارب کو ترغیب دے کر تہجد کی جماعت میں شریک ہونے کے لیے لاتے ہیں، تو اس طرح جماعت بڑی ہوجاتی ہے؛ لہٰذا اب دریافت یہ کرنا ہے کہ مذکورہ بالا صورت کے ساتھ تہجد کی نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

(۲) اکثر جگہ رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں فجر کی اذان صبح صادق کے آدھا گھنٹہ یا مزید کچھ دیر بعد ہوتی ہے، تو اس صورت میں اذان سے قبل اور صبح صادق کے بعد تہجد پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) نماز کی حالت میں کھجلانا، مچھروں کو بھگانا، داڑھی کا بار بار خلال کرنا، پکڑنا یا دونوں ہاتھوں سے دامن کو بار بار صحیح کرنے کا کیا حکم ہے؟

(۴) سجدے کی حالت میں ایک پاؤں کا زمین سے اٹھانا کیسا ہے؟ اور اگر دونوں پاؤں اٹھ جائے، تو شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

تہجد کی نماز کے لیے جماعت غیر مسنون (مکروہ) ہے؛ غیر رمضان میں کسی صاحب نے تہجد کی نماز پڑھنا کے لیے نیت باندھی، دو تین مقتدیوں نے اس کی اقتدا کرلی، تو جائز ہے، حضرت عتبان بن مالکؓ کے مکان پر رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے، آپ ﷺ نے نماز شروع فرمائی، دیگر صحابہ نے اقتدا کرلی، تو آپ ﷺ نے منع نہیں فرمایا؛ لہٰذا اگر کبھی بلا تداعی غیر رمضان میں اتفاقی طور سے جماعت بن گئی، تو جائز ہے۔ (حدیث بخاری)[1]

البتہ رمضان المبارک میں تہجد کی نماز جماعت سے ادا کرنے کے متعلق اختلاف ہے: بعض علماء نے جائز کہا ہے اور شامی اور بدائع کی اس عبارت سے استدلال کیا ہے، جس میں ہے: ''جماعت نفل نماز کے لیے مسنون نہیں ہے، سوائے نوافل رمضان میں۔''

[۱] عن عتبان بن مالك، أن النبي صلى الله عليه وسلم أتاه في منزله، فقال: أين تحب أن أصلي لك من بيتك؟ قال: فأشرت له إلى مكان، فكبر النبي صلى الله عليه وسلم، وصففنا خلفه، فصلى ركعتين. (صحيح البخاري: ۱/ ۹۰، رقم الحديث: ۴۲۴، كتاب الصلاة، باب إذا دخل بيتا يصلي حيث شاء أو حيث أمر ولا يتجسس، ط: البدر - ديو بند)

رمضان کے نوافل میں تراویح اور تہجد دونوں داخل ہوں گے؛ لہٰذا رمضان المبارک میں تہجد کی نماز جماعت سے پڑھنا جائز ہوگا اور غیر رمضان میں مکروہ۔[۲]

(۲) طلوع صبح صادق کے بعد فجر کی دو رکعت سنت کے علاوہ دوسری کوئی نفل نماز جائز نہیں ہے۔ (عالمگیری ج:۱ ص:۱۹۔۲۰)[۳]

تہجد کا وقت صبح صادق تک ہے؛ لہٰذا صبح صادق کے بعد تہجد کی نیت سے نفل نماز جائز نہیں۔

(۳) فقہاءؒ نے لکھا ہے کہ عمل کثیر سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، عمل کثیر میں کئی اقوال ہیں، مگر علامہ شامیؒ نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ دور سے دیکھنے والا نمازی کو خارج صلاۃ سمجھے، تو یہ عمل کثیر ہے ورنہ عمل قلیل۔ داڑھی میں ہاتھ پھیرنا، کپڑے درست کرنا یہ عبث بے کار کام ہیں؛ اس لیے مکروہ ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے؛ مگر عمل کثیر کا تحقق نہ ہو، تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔[۴]

[۲] (ولا يصلي الوتر و) لا (التطوع بجماعة خارج رمضان). (الدر المختار) ـــــ قال الشامي: أي يكره ذلك على سبيل التداعي، بأن يقتدي أربعة بواحد كما في الدرر، ولا خلاف في صحة الاقتداء إذ لا مانع ،نهر... قلت: ويؤيده أيضا ما في البدائع من قوله: إن الجماعة في التطوع ليست بسنة إلا في قيام رمضان اهـ فإن نفيالسنية لا يستلزم الكراهة، نعم إن كان مع المواظبة كان بدعة فيكره. والنفل بالجماعة غير مستحب؛ لأنه لم تفعله الصحابة في غير رمضان وهو كالصريح في أنها كراهة تنزيه. (رد المحتار: ۲/ ۵۰۰، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: مكتبه زكريا-ديوبند)

[۳] تسعة أوقات يكره فيها النوافل وما في معناها لا الفرائض. منها ما بعد طلوع الفجر قبل صلاة الفجر. يكره فيه التطوع بأكثر من سنة الفجر. (الفتاوى الهندية:۱/ ۵۲، كتاب الصلاة، الباب الأول في مواقيت الصلاة، الفصل الثالث في بيان الأوقات التي لا تجوز فيها الصلاة وتكره فيها، ط: دار الفكر)

(قوله: وبعد طلوع الفجر بأكثر من سنة الفجر) أي ومنع عن التنفل بعد طلوع الفجر قبل صلاة الفجر بأكثر من سنته قصدا لما رواه أحمد وأبو داود: لا صلاة بعد الصبح إلا ركعتين. وفي رواية الطبراني: إذا طلع الفجر فلا تصلوا إلا ركعتين. قيدنا بكونه قصدا لما في الظهيرية. (البحر الرائق:۱/ ۲۶۵، كتاب الصلاة، التنفل بعد صلاة الفجر، ط: دار الكتب العلمية ☆ رد المحتار: ۲/ ۱۷۱، كتاب الصلاة، باب الوتر النوافل، ط: دار الفكر)

[۴] (و) يفسدها (كل عمل كثير) ليس من أعمالها ولا لإصلاحها، وفيه أقوال خمسة: أصحها (ما لا يشك) بسببه (الناظر) من بعيد (في فاعله أنه ليس فيها) وإن شك أنه فيها أم لا فقليل. (الدر المختار) ـــــ قال الشامي: (قوله وفيه أقوال خمسة أصحها ما لا يشك إلخ) صححه في البدائع، وتابعه الزيلعي والولوالجي. وفي المحيط أنه الأحسن. وقال الصدر الشهيد: إنه الصواب. وفي الخانية والخلاصة: إنه اختيار العامة. وقال في المحيط وغيره: رواه الثلجي عن أصحابنا حلية. (رد المحتار:۱/ ۶۲۴، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار الفكر)=

(۴) اگر سجدہ میں دونوں پاؤں بالکل اٹھ گئے ہوں، تھوڑی دیر کے لیے بھی زمین پر نہیں رکھے گئے ہوں، تو نماز فاسد ہو جائے گی، البتہ تھوڑی دیر بھی پاؤں زمین پر رہے، پھر اٹھ گئے یا شروع سے اٹھے ہوئے تھے، بعد میں زمین پر تھوڑی کے لیے ٹک گئے، تو سجدہ صحیح ہو جائے گا اور نماز بھی صحیح ہو جائے گی؛ البتہ پاؤں کو اٹھانا یا حرکت دینا مکروہ ہے۔[۵] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] نماز وتر میں دعاء قنوت کے وجوب پر ایک اشکال کا جواب

۹۰۱-سوال: دو مسئلے بہشتی ثمر، حصہ اول، باب سجود السہو سے نقل کر رہا ہوں:

مسئلہ: ''دعاء قنوت کی جگہ سبحانک اللہم پڑھ لیا، پھر جب اس کو یاد آیا، تو دعاء قنوت پڑھ لی، تو سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا؛ کیوں کہ کوئی خاص دعاء اس میں واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: وتر میں دعاء قنوت پڑھنا بھول گیا، سورت پڑھ کر رکوع میں چلا گیا، تو سجدۂ سہو واجب ہے؛ کیوں کہ دعاء قنوت پڑھنا واجب ہے۔

اب اس پر سوال یہ ہے کہ پہلے مسئلے میں تو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ نماز وتر میں کسی دعاء کی تخصیص نہیں

= (و) كره (كفه) أي رفعه ولو لتراب كمشمر كم أو ذيل (وعبثه به) أي بثوبه (وبجسده) للنهي إلا لحاجة ولا بأس به خارج صلاة. ((قوله ولو لتراب) وقيل لا بأس بصونه عن التراب، أي كما لو دخل في الصلاة، وهو مشمر كمه أو ذيله، وأشار بذلك إلى أن الكراهة لا تختص بالكف وهو في الصلاة، وحاصله أن كل عمل هو مفيد للمصلي فلا بأس بأن يأتي به، أصله ما روي: أن النبي - صلى الله عليه وسلم - عرق في صلاة فسلت العرق عن جبينه، أي مسحه؛ لأنه كان يؤذيه فكان مفيدا، وفي زمن الصيف كان إذا قام من السجود نفض ثوبه يمنة أو يسرة؛ لأنه كان مفيدا كي لا يبقى صورة، فأما ما ليس بمفيد فهو العبث وقوله كي لا تبقى صورة يعني حكاية صورة الألية، فليس نفضه للتراب. فلا يرد ما في البحر عن الحلية من أنه إذا كان يكره رفع الثوب كي لا يترب، لا يكون نفضه من التراب عملا مفيدا (قوله للنهي) وهو ما أخرجه القضاعي عنه - صلى الله عليه وسلم - «إن الله كره لكم ثلاثا: العبث في الصلاة. والرفث في الصيام، والضحك في المقابر» "وهي كراهة تحريم كما في البحر" (قوله إلا لحاجة) كحك بدنه لشيء أكله وأضره وسلت عرق يؤلمه ويشغل قلبه. وهذا لو بدون عمل كثير. (رد المحتار: ۲/۴۰۶-۴۰۷، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: مكتبه زكريا - ديوبند)

[۵] (ومنها السجود) بجبهته وقدميه، ووضع إصبع واحدة منهما شرط؛ لأن وضع إصبع واحدة منهما يكفي كما ذكره بعد. وأفاد أنه لو لم يضع شيئا من القدمين لم يصح السجود. (رد المحتار: ۲/۱۳۵، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: مكتبه زكريا - ديوبند)

ہے، جب کہ دوسرے مسئلے میں وتر کی نماز میں دعاء قنوت کی تخصیص کی گئی ہے، اور یہ کہا گیا ہے کہ: دعاء قنوت کا پڑھنا واجب ہے۔ نیز دعاء قنوت کے نہ پڑھنے کی صورت میں سجدہ سہو کا بھی حکم دیا گیا ہے، اسی طرح اس کتاب میں ص: ٦٦ پر واجبات صلاۃ کی تعداد میں وتر کے لیے دعاء قنوت کو بھی شمار کیا گیا ہے۔ بہ ظاہر دونوں مسئلوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے، دونوں کے مابین تطبیق دے کر ممنون فرمائیں گے۔

مولوی ولی اسماعیل فلاحی خان پوری

الجواب حامداومصلیا:

جناب والا نے بہشتی ثمر کے حوالے سے جن دو مسائل کا ذکر کیا ہے، ان دونوں مسئلوں میں کوئی تعارض نہیں ہے؛ اس لیے کہ وتر کی نماز میں نفس دعاء واجب ہے؛ البتہ مشہور دعاء پڑھنا سنت ہے؛ لہٰذا ''سبحانک اللّٰھم ...... الخ'' یا اس کے علاوہ کوئی دوسری دعاء پڑھے گا، تو نفس وجوب ادا ہو جائے گا؛ شامی میں لکھا ہے: (وقنت فيه) ويسن الدعاء المشهور ... وبه يفتي. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۶)[۱]

اور صرف قراءت پر اکتفا کرنا اور بالکلیہ دعاء نہ پڑھنا، دعاء واجب کو ترک کرنا ہے؛ لہٰذا سجدۂ سہو واجب ہوگا، واجبات میں قنوت کو واجب کہنا مخصوص دعاء کے وجوب کے معنی میں نہیں ہے۔ وذكر في البحر عن الكرخي أن القنوت ليس فيه دعاء مؤقت لأنه روي عن الصحابة أدعية مختلفة و لأن المؤقت من الدعاء يذهب برقة القلب. (شامی: ۲/ ۶۳۳)[۲]

اس جواب سے آپ کا اشکال حل ہو جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] رمضان میں عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھنے والے کے لیے وتر کا حکم

۹۰۲- سوال: رمضان المبارک میں جس نمازی کو عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ نہ ملے اور وہ تراویح میں شرکت کر لے، تو اس کے لیے وتر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

عشاء کی فرض نماز پڑھنے کے بعد ہی اس کی سنن اور تراویح پڑھی جائے، فرض نماز ادا کیے بغیر وتر اور

(۱) رد المحتار: ۲/ ۶، کتاب الصلاة، باب الوتر و النوافل، ط: دار الفكر.

(۲) رد المحتار: ۲/ ۶، کتاب الصلاة، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۶۱۴، کتاب الصلاة، القنوت، ط: مكتبه زكريا- ديوبند.

تراویح کی نماز ادا نہیں ہوگی، فرض نماز اگر امام کے ساتھ باجماعت نہیں ملی ہے، تو تنہا ادا کرلے، اس کے بعد ہی تراویح میں شامل ہو، فرض نماز ادا کیے بغیر تراویح میں شامل ہونا صحیح نہیں ہے اور وتر کو رمضان میں جماعت کے ساتھ ادا کرنا چاہیے، اس سے ثواب زیادہ ملے گا اور جولوگ وتر کو تنہا پڑھنے کے قائل ہیں، وہ صریح غلطی پر ہیں۔ (شامی: ۱/ ۴۷۳)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] سنن قبلیہ کو فرض نماز کے بعد پڑھنا

۹۰۳- سوال: فرض نماز سے پہلے کی سنت، فرض نماز کے بعد پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) اسی طرح فرض کی قضاء کے ساتھ اسے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) بعض لوگ کہتے ہیں کہ سنت مؤکدہ کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورت ملانی چاہیے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱-۲) ظہر کی سنت مؤکدہ اگر چھوٹ جائے، تو فرض نماز کے بعد پڑھ لینا بہتر ہے۔[2] اور اگر فجر کی

---

(۱) وقوله ثم يوتر بهم يشير إلى أن وقتها بعد العشاء قبل الوتر وبه قال عامة المشايخ رحمهم الله والأصح أن وقتها بعد العشاء إلى آخر الليل قبل الوتر وبعده لأنها نوافل سنت بعد العشاء . . . "ولا يصلي الوتر بجماعة في غير "شهر "رمضان" وعليه إجماع المسلمين والله أعلم. (هداية-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ) ص: ۱۵۱، كتاب الصلاة، فصل في قيام رمضان، ط: مكتبه ياسر نديم-ديوبند)

(ولو تركوا الجماعة في الفرض لم يصلوا التراويح جماعة) لأنها تبع فمصليه وحده يصليها معه. (ولا يصلي الوتر و) لا (التطوع بجماعة خارج رمضان). (رد المحتار: ۲/ ۴۹۹-۵۰۰، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: مكتبه زكريا-ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۷، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، ط: مكتبة زكريا-ديوبند ☆ البحر الرائق: ۲/ ۱۱۵-۱۱۹ كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الكتاب-ديوبند)

(۲) عن عائشة، أن النبي صلى الله عليه وسلم كان إذا لم يصل أربعا قبل الظهر صلاهن بعدها. (سنن الترمذي: ۱/ ۹۷، رقم الحديث: ۴۲۶، أبواب الصلاة، باب آخر قبل: باب ما جاء في الأربع قبل العصر، ط: البدر-ديوبند)

(بخلاف سنة الظهر) وكذا الجمعة (فإنه) إن خاف فوت ركعة (يتركها) ويقتدي (ثم يأتي بها) على أنها سنة (في وقته) أي الظهر. (الدر المختار) ـــــــــ قال ابن عابدين: . . . وقد استدل قاضي خان لقضاء سنة الظهر بما عن عائشة-رضي الله تعالى عنها-"أن النبي-صلى الله عليه وسلم-كان إذا فاتته الأربع قبل الظهر قضاهن بعده" فيكون قضاؤها ثابت بالحديث على خلاف القياس. (رد المحتار: ۲/ ۵۸، باب إدراك الفريضة، ط: دار الفكر-بيروت)

سنت چھوٹ گئی ہو، تو چوں کہ فجر کی فرض نماز کے بعد نفل نماز مکروہ ہے؛ لہٰذا فرض کے بعد اسے نہ پڑھنا چاہیے اور طلوع آفتاب کے بعد پڑھا، تو یہ سنت کی قضا نہیں ہوئی، ہاں اگر فجر کی سنت فرض کے ساتھ چھوٹ گئی ہو اور اسی دن طلوع آفتاب کے بعد اس کی قضا کر رہا ہو، تو فرض کے ساتھ ساتھ سنت کی بھی قضا کر لے، تنہا سنتوں کی قضا نہیں ہے، اسی طرح اس دن کی فجر کے علاوہ کسی اور قضا نماز کے ساتھ سنتوں کی قضا نہیں ہے۔[1]

(۳) سنت مؤکدہ ہو یا غیر مؤکدہ، اس کی چاروں رکعت میں قرأت فرض ہے، صرف فرض کی پہلی دو رکعتوں کے علاوہ میں قرأت فرض نہیں ہے۔ (درمختار)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] تنہا فجر کی سنت کی قضاء کرنا

۹۰۴- سوال: فجر کی سنت مؤکدہ فوت ہوجائے اور فرض نماز ادا کردی جائے، تو کیا سورج طلوع ہونے کے بعد سنت مؤکدہ کی قضاء کرسکتے ہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

تنہا سنت کی قضاء مشروع نہیں ہے، ہاں اگر فجر کی سنت کے ساتھ فرض نماز بھی قضاء ہوجائے، تو اس

---

(۱) (وإذا خاف فوت) ركعتي (الفجر لاشتغاله بسنتها تركها) لكون الجماعة أكمل (وإلا) بأن رجا إدراك ركعة في ظاهر المذهب. وقيل التشهد واعتمده المصنف والشرنبلالي تبعا للبحر، لكن ضعفه في النهر (لا) يتركها . . . (ولا يقضيها إلا بطريق التبعية لـ) قضاء (فرضها قبل الزوال لا بعده في الأصح). [الدر المختار: ۲/۵۶-۵۸]

قال ابن عابدين: (قوله ولا يقضيها إلا بطريق التبعية إلخ) أي لا يقضي سنة الفجر إلا إذا فاتت مع الفجر فيقضيها تبعا لقضائه لو قبل الزوال؛ وما إذا فاتت وحدها فلا تقضى قبل طلوع الشمس بالإجماع؛ لكراهة النفل بعد الصبح. وأما بعد طلوع الشمس فكذلك عندهما. وقال محمد: أحب إلي أن يقضيها إلى الزوال كما في الدرر. قيل هذا قريب من الاتفاق؛ لأن قوله "أحب إلي" دليل على أنه لو لم يفعل لا لوم عليه. وقالا: لا يقضي، وإن قضى فلا بأس به، كذا في الخبازية؛ ومنهم من حقق الخلاف، وقال الخلاف في أنه لو قضى كان نفلا مبتدأ أو سنة، كذا في العناية يعني نفلا عندهما، سنة عنده كما ذكره في الكافي إسماعيل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۷، كتاب الصلاة، باب إدراك الفريضة ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۲۳۳، فصل في بيان أن السنة . . .، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) (قوله ومنها القراءة) أي قراءة آية من القرآن، وهي فرض عملي في جميع ركعات النفل والوتر وفي ركعتين من الفرض كما سيأتي متنا في باب الوتر والنوافل. وأما تعيين القراءة في الأوليين من الفرض فهو واجب. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۴۴۶، باب صفة الصلاة، فرائض الصلاة، مبحث القراءة، ط: دار الفكر - بيروت)

دن زوال سے قبل فرض کے ساتھ سنت کی بھی قضا کر سکتے ہیں؛ لیکن زوال کے بعد فجر کی قضا کی جائے، تو صرف فرض کی قضاء کی جائے گی، سنت کی قضا نہیں ہوگی۔ (شامی جلد ١، صفحہ ٢٣٢)[١] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٢٠] وتر کی نماز میں دعاء قنوت کے بعد درود شریف پڑھنا

٩٠٥- سوال: وتر کی نماز میں دعاء قنوت پڑھنے کے بعد درود شریف پڑھنا کیسا ہے؟ مطلب یہ کہ رکوع میں جانے سے پہلے قیام کی حالت میں دعاء قنوت پڑھنے کے بعد درود شریف پڑھنا سنت ہے، یا بدعت؟

الجواب حامداو مصليا:

وتر کی تیسری رکعت میں دعاء قنوت کے بعد درود شریف پڑھنا چاہئے۔ (درمختار مع الشامی، جلد ٢، صفحہ ٦)[٢] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[١] (وإذا خاف فوت) ركعتي (الفجر لاشتغاله بسنتها تركها) لكون الجماعة أكمل (وإلا) بأن رجا إدراك ركعة في ظاهر المذهب. وقيل التشهد واعتمده المصنف والشرنبلالي تبعا للبحر، لكن ضعفه في النهر (لا) يتركها . . . (ولا يقضيها إلا بطريق التبعية لـ) قضاء (فرضها قبل الزوال لا بعده في الأصح). [الدر المختار: ٢/٥٦-٥٨]

قال ابن عابدين: (قوله ولا يقضيها إلا بطريق التبعية إلخ) أي لا يقضي سنة الفجر إلا إذا فاتت مع الفجر فيقضيها تبعا لقضائه لو قبل الزوال؛ وما إذا فاتت وحدها فلا تقضى قبل طلوع الشمس بالإجماع؛ لكراهة النفل بعد الصبح. وأما بعد طلوع الشمس فكذلك عندهما. وقال محمد: أحب إلي أن يقضيها إلى الزوال كما في الدرر. قيل هذا قريب من الاتفاق؛ لأن قوله "أحب إلي" دليل على أنه لو لم يفعل لا لوم عليه. وقالا: لا يقضي، وإن قضى فلا بأس به، كذا في الخبازية؛ ومنهم من حقق الخلاف، وقال الخلاف في أنه لو قضى كان نفلا مبتدأ أو سنة، كذا في العناية يعني نفلا عندهما، سنة عنده كما ذكره في الكافي إسماعيل. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/٥٧، باب إدراك الفريضة* بدائع الصنائع: ١/ ٦٢٣، فصل في بيان أن السنة. . .، ط: زكريا- ديوبند)

[٢] قنوت وتر کے بعد درود شریف پڑھنے کے سلسلے میں دو مختلف تصریح منقول ہے، صاحب درمختار نے ذکر کیا ہے کہ درود شریف پڑھنا چاہیے، اور یہی مفتیٰ بہ قول ہے، علامہ ابن عابدینؒ نے خلاف عادت اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے: (وقنت فيه) ويسن الدعاء المشهور، ويصلي على النبي - صلى الله عليه وسلم - به يفتى. (الدر المختار مع رد المحتار: ٢/٦، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الفكر- بيروت)

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے؛ لیکن عالمگیری کی صراحت ہے کہ درود شریف نہ پڑھے، یہی ہمارے مشائخ کا پسندیدہ عمل ہے۔ (عام معمول بھی یہی ہے): ولا يصلي على النبي - صلى الله عليه وسلم - في القنوت وهو اختيار مشايخنا. كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية: ١/١١١، كتاب الصلاة، الباب الثامن في صلاة الوتر، ط: دار الفكر)

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے: سوال: ایک شخص کہتا ہے کہ وتر میں دعائے قنوت کے بعد درود شریف پڑھنا مستحب ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ =

[۲۱] وتر کی نماز تہجد کے بعد پڑھنا

۹۰۶- سوال: تہجد پڑھنے والے اور اس کے عادی شخص کے لیے وتر کی نماز تہجد کی نماز کے بعد پڑھنا سنت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

تہجد کی نماز کے لیے اٹھنے پر پورا اعتماد ہو، اور تہجد کا عادی ہو، تو اس کے لیے تہجد کے بعد وتر کی نماز پڑھنا مسنون ہے۔ اور اگر اعتماد نہ ہو تو عشاء کے بعد پڑھ لینا بہتر ہے۔ جسے رات کے آخری پہر میں جاگنے کا یقین نہ ہو، اسے عشاء کے بعد سونے سے پہلے وتر پڑھنے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی ہے۔ (درمختار)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= الجواب: جی ہاں! نماز وتر میں دعائے قنوت پوری کر کے اللهم صل على محمد و على آل محمد پڑھنا مستحب ہے۔ (بہ طور استدلال مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ نے درمختار کی وہی عبارت ذکر فرمائی ہے، جو ماقبل میں گذر چکی۔) [فتاویٰ رحیمیہ: ۲۳۶/۵، باب الوتر، دعائے قنوت کے ساتھ درود پڑھنا، سوال نمبر: ۳۳۶، ط: دارالاشاعت، کراچی]

(۱) عن جابر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من خاف أن لا يقوم من آخر الليل فليوتر أوله، ومن طمع أن يقوم آخره فليوتر آخر الليل، فإن صلاة آخر الليل مشهودة، وذلك أفضل. (الصحيح لمسلم: ۲۵۸/۱، رقم الحديث: ۱۶۲- (۷۵۵)، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب من خاف أن لا يقوم من آخر الليل فليوتر أوله، ط: البدر- ديوبند)

(و) تأخير (الوتر إلى آخر الليل لواثق بالانتباه) وإلا فقبل النوم. (الدر المختار)

(قوله: فإن فاق إلخ) أي إذا أوتر قبل النوم ثم استيقظ يصلي ما كتب له، ولا كراهة فيه بل هو مندوب، ولا يعيد الوتر، لكن فاته الأفضل المفاد بحديث الصحيحين إمداد.

وفي الشامية: ولا يقال: إن من لا يثق بالانتباه فالتعجيل في حقه أفضل كما في الخانية، فإذا انتبه بعدما عجل يتنفل ولا تفوته الأفضلية؛ لأنا نقول: المراد بالأفضلية في الحديث السابق هي المترتبة على ختم الصلاة بالوتر وقد فاتت، والتي حصلها هي أفضلية التعجيل عند خوف الفوات على التأخير فافهم وتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۶۹/۱، كتاب الصلاة، مطلب في طلوع الشمس من مغربها، ط: دار الفكر- بيروت ☆ متن بداية المبتدي في فقه الإمام أبي حنيفة- علي بن أبي بكر، المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ) ص: ۱۲، كتاب الصلاة، باب المواقيت، فصل ويستحب الأسفار بالفجر والإبراد... الخ، ط: مكتبة ومطبعة محمد علي صبح- القاهرة)

قال- رحمه الله- (والوتر إلى آخر الليل لمن يثق بالانتباه) أي ندب تأخير الوتر إلى آخر الليل إذا كان يثق من نفسه أنه ينتبه ليصلي ليكون الوتر ختما لقيام الليل كله لقوله- عليه الصلاة والسلام-: اجعلوا آخر صلاتكم من الليل وترا. رواه البخاري ومسلم وغيرهما، فإن لم يثق بالانتباه أوتر قبل النوم لحديث جابر أنه- عليه الصلاة والسلام- قال: أيكم خاف أن لا يقوم من آخر الليل فليوتر، ثم ليرقد ومن وثق بقيام من آخر الليل فليوتر من آخره فإن قراءة آخر =

[۲۲] فرض نماز کے بعد سنن ونوافل کے لیے جگہ تبدیل کرنا

۹۰۷-سوال: ایک جگہ فرض نماز با جماعت ادا کرنے کے بعد نفل یا سنت نماز جگہ بدل کر پڑھنا مستحب ہے؛ کیوں کہ کل قیامت کے دن وہ جگہ گواہی دے گی؛ لیکن کوئی دوسرے مقتدی کو ہٹا کر جگہ بدلنا اور مستحب ادا کرنا کیسا ہے؟ یہ کسی مسلمان کو تکلیف دینا شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

امام کے لیے جگہ بدلنے کی تاکید زیادہ ہے، مقتدیوں کے لیے بھی فضیلت کی چیز ہے؛ لیکن اس کے لیے مستقل کسی کو اس کی جگہ سے ہٹانا- جس کی وجہ سے اس کو تکلیف پہونچتی ہو- درست نہیں ہے، استحباب پر عمل کرنے کے لیے ممنوع کا ارتکاب جائز نہیں ہے، ایسی صورت میں یہ عمل، مستحب نہیں رہے گا۔ (درمختار جلد ا، صفحہ ۵۳۱)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الليل محضورة وذلك أفضل، رواه مسلم وغيره، وقال - عليه الصلاة والسلام - لأبي بكر: متى توتر؟ قال: أول الليل بعد العتمة، فقال أخذت بالوثقى، ثم قال لعمر: متى توتر؟ قال: آخر الليل، قال أخذت بالقوة، رواه الطحاوي وروى أبو سليمان الخطابي أنه - عليه الصلاة والسلام - قال لأبي بكر حذر هذا ولعمر قوي هذا. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ھ): ۱/ ۸۴، كتاب الصلاة، مواقيت الصلاة، الأوقات التي يستحب فيها الصلاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة ☆ مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح - حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹ھ) ص: ۷۵، كتاب الصلاة، أحكام الصلاة، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية ☆ مختصر القدوري في الفقه الحنفي - أحمد بن محمد بن أحمد بن جعفر بن حمدان أبو الحسين القدوري (م: ۴۲۸ھ) ص: ۲۴، كتاب الصلاة، ت: كامل محمد محمد عويضة، ط: دار الكتب العلمية ☆ النهر الفائق شرح كنز الدقائق - سراج الدين عمر بن إبراهيم بن نجيم الحنفي (م: ۱۰۰۵ھ): ۱/ ۱۶۳، كتاب الصلاة، ت: أحمد عزو عناية، ط: دار الكتب العلمية)

[1] وفي الجوهرة: ويكره للإمام التنفل في مكانه لا للمؤتم، وقيل يستحب كسر الصفوف. وفي الخانية يستحب للإمام التحول ليمين القبلة يعني يسار المصلي لتنفل أو ورد. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله يكره للإمام التنفل في مكانه) بل يتحول مخيرا كما يأتي عن المنية، وكذا يكره مكثه قاعدا في مكانه مستقبل القبلة في صلاة لا تطوع بعدها كما في شرح المنية عن الخلاصة، والكراهة تنزيهية كما دلت عليه عبارة الخانية (قوله لا للمؤتم) ومثله المنفرد، لما في المنية وشرحها: أما المقتدي والمنفرد فإنهما إن لبثا أو قاما إلى التطوع في مكانهما الذي صليا فيه المكتوبة جاز، والأحسن أن يتطوعا في مكان آخر. اهـ. (قوله وقيل يستحب كسر الصفوف) ليزول الاشتباه عن الداخل المعاين للكل في الصلاة البعيد عن الإمام، وذكره في البدائع والذخيرة عن محمد، ونص في =

[۲۳] نماز کا وقت ہو جانے پر اذان سے پہلے سنن قبلیہ پڑھی جاسکتی ہیں یا نہیں؟

۹۰۸- سوال: نماز کا وقت ہو جانے کے بعد اذان سے پہلے سنن قبلیہ پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

سنن قبلیہ جو فرض نماز سے پہلے پڑھی جاتی ہیں، اُن کا اصل وقت اذان اور اقامت کے درمیان کا ہے، لہٰذا اذان ہونے کے بعد اقامت سے پہلے پڑھنا مسنون ہے، نبی اکرم ﷺ اور حضرات صحابہ کرامؓ کا بھی یہی عمل رہا ہے، مثلاً فجر کی سنت کے متعلق حدیث پاک میں آپ ﷺ کا عمل یہ بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ تہجد اور وتر سے فراغت کے بعد کچھ دیر آرام فرماتے، اُس کے بعد جب مؤذن آپ ﷺ کو فجر کی نماز کے لیے جگاتے، تو آپ ﷺ دو رکعت مختصراً پڑھنے کے بعد مسجد میں تشریف لاتے۔ (ابوداؤد شریف)[1]

=المحيط على أنه السنة كما في الحلية، وهذا معنى قوله في المنية: والأحسن أن يتطوعا في مكان آخر. قال في الحلية. وأحسن من ذلك كله أن يتطوع في منزله إن لم يخف مانعا. (رد المحتار على الدر المختار-ابن عابدين، الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۱/ ۵۳۱، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، قبيل: فصل في القراءة، ط: دار الفكر☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۶۳۹، كتاب الصلاة، الصلاة المسنونة، وبيان مايكره، ط: زكريا-ديوبند)

[۱] ... ثم أوتر، ثم اضطجع حتى جاءه المؤذن، فقام فصلى ركعتين خفيفتين، ثم خرج، فصلى الصبح". (سنن أبي داود: ۱/ ۱۹۳، رقم الحديث: ۱۳۶۷، كتاب الصلاة، باب في صلاة الليل، ط: البدر-ديوبند)

عن عبد الله بن عباس رضي الله عنهما: أنه بات عند ميمونة أم المؤمنين رضي الله عنها - وهي خالته - قال: فاضطجعت على عرض الوسادة، واضطجع رسول الله صلى الله عليه وسلم وأهله في طولها، فنام رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى انتصف الليل - أو قبله بقليل، أو بعده بقليل - ثم استيقظ رسول الله صلى الله عليه وسلم، فجلس، فمسح النوم عن وجهه بيده، ثم قرأ العشر آيات خواتيم سورة آل عمران، ثم قام إلى شن معلقة، فتوضأ منها، فأحسن وضوءه، ثم قام يصلي، قال عبد الله بن عباس رضي الله عنهما: فقمت فصنعت مثل ما صنع، ثم ذهبت، فقمت إلى جنبه، فوضع رسول الله صلى الله عليه وسلم يده اليمنى على رأسي، وأخذ بأذني اليمنى يفتلها بيده، فصلى ركعتين، ثم ركعتين، ثم ركعتين، ثم ركعتين، ثم ركعتين، ثم ركعتين، ثم أوتر، ثم اضطجع حتى جاءه المؤذن، فقام، فصلى ركعتين خفيفتين، ثم خرج، فصلى الصبح. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۵۹، رقم الحديث: ۱۱۹۸، كتاب التهجد، باب استعانة اليد في الصلاة، إذا كان من أمر الصلاة، ط: البدر-ديوبند)

عائشة، قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا سكت المؤذن بالأولى من صلاة الفجر قام، فركع ركعتين خفيفتين قبل صلاة الفجر، بعد أن يستبين الفجر، ثم اضطجع على شقه الأيمن، حتى يأتيه المؤذن للإقامة. (صحيح البخاري: ۱/ ۸۷، رقم الحديث: ۶۲۶، كتاب الأذان، باب من انتظر الإقامة، ط: البدر-ديوبند) =

مذکورۂ بالا روایت میں آپ ﷺ کے عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سنن قبلیہ کا وقت فرض نماز سے پہلے، اذان کے بعد ہے، دیگر روایات میں بھی یہی تعلیم دی گئی ہے، مثلاً ایک حدیث پاک میں آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ ہر اذان اور اقامت کے درمیان نفل نماز ہے۔ (ترمذی شریف: ۴۵)[۲]

لیکن اگر کوئی شخص اپنے محلہ کی مسجد جس میں وہ عام طور پر نماز پڑھتا ہے، اُس میں اذان نہ ہوئی ہو، اور نماز کا وقت ہو جانے سے دوسری قرب وجوار کی مساجد میں اذان ہو چکی ہو، تو اُس کے لیے محلہ کی مسجد کی اذان سے پہلے سنن قبلیہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ فرض نماز اور سنن قبلیہ کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ کرنا بہتر ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] اذان کے بعد تحیۃ الوضوء یا تحیۃ المسجد پڑھنا

۹۰۹- سوال:　اذان کے بعد تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

= 　عن عائشة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، كان يصلي بالليل إحدى عشرة ركعة، يوتر منها بواحدة، فإذا فرغ منها اضطجع على شقه الأيمن، حتى يأتيه المؤذن فيصلي ركعتين خفيفتين. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۵۳، رقم الحديث: ۱۲۱- (۷۳۶)، كتاب صلاة المسافرين و قصرها، باب صلاة الليل، وعدد ركعات النبي صلى الله عليه وسلم في الليل، الخ، ط: البدر - ديوبند)

تفصیل کے لیے دیکھیے: رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۱- ۲۶۲، كتاب الصلاة، باب الوتر و النوافل، بحث مهم في الكلام على الضعجة بعد سنن الفجر، ط: زكريا - ديوبند.

[۲] عن عبد الله بن مغفل، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: بين كل أذانين صلاة لمن شاء. (سنن الترمذي: ۱/ ۴۵، رقم الحديث: ۱۸۵، أبواب الصلاة، باب ما جاء في الصلاة قبل المغرب، ط: البدر - ديوبند)

عن عبد الله بن مغفل، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: بين كل أذانين صلاة، بين كل أذانين صلاة، ثم قال في الثالثة: لمن شاء. (صحيح البخاري: ۱/ ۸۷، رقم الحديث: ۶۲۷، كتاب الأذان، باب: بين كل أذانين صلاة لمن شاء، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۳۰۴- (۸۳۸)، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب بين كل أذانين صلاة، ط: البدر - ديوبند)

(۳) (وفي بيته بمصر) أو قرية لها مسجد، فلا يكره تركهما إذ أذان الحي يكفيه. (الدر المختار) ــــ قال ابن عابدين: (قوله: إذ أذان الحي يكفيه) لأن أذان المحلة وإقامتها كأذانه وإقامته، لأن المؤذن نائب أهل المصر كلهم كما يشير إليه ابن مسعود حين صلى بعلقمة والأسود بغير أذان ولا إقامة، حيث قال: أذان الحي يكفينا، وممن رواه سبط ابن الجوزي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۳، كتاب الصلاة، باب الأذان، ط: زكريا - ديوبند)

الجواب حامداً ومصلیاً:

اذان کے بعد تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھنا جائز ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] فجر کی نماز کے علاوہ کسی اور نماز میں قنوتِ نازلہ پڑھنا

۹۱۰- سوال: آج کل بابری مسجد کی شہادت کے پیش نظر پورے ملک میں حالات انتہائی کشیدہ ہیں، ان حالات کی وجہ سے فجر کی نماز کے علاوہ مغرب یا جمعہ وغیرہ میں قنوتِ نازلہ پڑھنے کے متعلق کیا حکم ہے؟ نیز ان حالات کے مناسب کوئی اور دعاء وورد ہو، تو رہنمائی فرمائیں؛ تاکہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اُسے حفاظت کے لیے پڑھنے کا معمول بنایا جا سکے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

امام سفیان ثوری اور امام احمدؒ کا قول ہے کہ جہری نماز میں قنوتِ نازلہ پڑھی جائے، اس سلسلے میں امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مصیبت سخت ہو، تو سرّی وجہری تمام نمازوں میں بھی قنوتِ نازلہ پڑھنا جائز ہے، علماءِ احناف فرماتے ہیں کہ قنوتِ نازلہ صرف فجر کی نماز ہی میں پڑھی جائے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (ويسن تحية) رب (المسجد، وهي ركعتان) [الدر المختار] ــــ قال ابن عابدين: (قوله ويسن تحية) كتب الشارح في هامش الخزائن أن هذا رد على صاحب الخلاصة حيث ذكر أنها مستحبة.

(قوله رب المسجد) أفاد أنه على حذف مضاف؛ لأن المقصود منها التقرب إلى الله تعالى لا إلى المسجد؛ لأن الإنسان إذا دخل بيت الملك يحيي الملك لا بيته، بحر عن الحلية. ثم قال: وقد حكي الإجماع على سنيتها، غير أن أصحابنا يكرهونها في الأوقات المكروهة تقديما لعموم الحاظر على عموم المبيح اهـ.

(قوله وهي ركعتان) في القهستاني وركعتان أو أربع، وهي أفضل لتحية المسجد إلا إذا دخل فيه بعد الفجر أو العصر، فإنه يسبح ويهلل ويصلي على النبي - صلى الله عليه وسلم - فإنه حينئذ يؤدي حق المسجد كما إذا دخل للمكتوبة؛ فإنه غير مأمور بها حينئذ كما في التمرتاشي. اهـ. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۱۸، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في تحية المسجد، ط: دار الفكر - بيروت)

مذکورہ عبارت سے واضح ہے کہ تحیۃ المسجد دخول مسجد کے وقت ادا کی جائے گی، بشرطیکہ وقت مکروہ نہ ہو۔

(۲) (ولا يقنت لغيره) إلا النازلة فيقنت الإمام في الجهرية، وقيل في الكل. (الدر المختار) ــــ قال ابن عابدين: (قوله إلا لنازلة) قال في الصحاح: النازلة الشديدة من شدائد الدهر، ولا شك أن الطاعون من أشد النوازل أشباه.

(قوله فيقنت الإمام في الجهرية) يوافقه ما في البحر والشرنبلالية عن شرح النقاية عن الغاية: وإن نزل بالمسلمين نازلة قنت الإمام في صلاة الجهر، وهو قول الثوري وأحمد اهـ وكذا ما في شرح الشيخ إسماعيل عن البنانية: إذا=

[۲۶] قنوتِ نازلہ کب تک پڑھی جائے؟

گذشتہ سے پیوستہ

۹۱۱- سوال: ہندوستان کے حالات چند مہینوں پہلے ناسازگار تھے؛ اس وجہ سے نمازِ فجر میں

= وقعت نازلة قنت الإمام في الصلاة الجهرية، لكن في الأشباه عن الغاية: قنت في صلاة الفجر، ويؤيده ما في شرح المنية حيث قال بعد كلام: فتكون شرعيته: أي شرعية القنوت في النوازل مستمرة، وهو محمل قنوت من قنت من الصحابة بعد وفاته - عليه الصلاة والسلام -، وهو مذهبنا وعليه الجمهور. وقال الحافظ أبو جعفر الطحاوي: إنما لا يقنت عندنا في صلاة الفجر من غير بلية، فإن وقعت فتنة أو بلية فلا بأس به، فعله رسول الله - صلى الله عليه وسلم - وأما القنوت في الصلوات كلها للنوازل فلم يقل به إلا الشافعي، وكأنهم حملوا ما روي عنه - عليه الصلاة والسلام - :أنه قنت في الظهر والعشاء. كما في مسلم، وأنه قنت في المغرب أيضا، كما في البخاري على النسخ لعدم ورود المواظبة والتكرار الواردين في الفجر عنه - عليه الصلاة والسلام - اهـ وهو صريح في أن قنوت النازلة عندنا مختص بصلاة الفجر دون غيرها من الصلوات الجهرية أو السرية. ومفاده أن قولهم بأن القنوت في الفجر منسوخ معناه نسخ عموم الحكم لا نسخ أصله كما نبه عليه نوح أفندي، وظاهر تقييدهم بالإمام أنه لا يقنت المنفرد، وهل المقتدي مثله أم لا؟ وهل القنوت هنا قبل الركوع أم بعده؟ لم أره. والذي يظهر لي أن المقتدي يتابع إمامه إلا إذا جهر فيؤمن وأنه يقنت بعد الركوع لا قبله، بدليل أن ما استدل به الشافعي على قنوت الفجر وفيه التصريح بالقنوت بعد الركوع حمله علماؤنا على القنوت للنازلة، ثم رأيت الشرنبلالي في مراقي الفلاح صرح بأنه بعده؛ واستظهر الحموي أنه قبله والأظهر ما قلناه، والله أعلم.

(قوله وقيل في الكل) قد علمت أن هذا لم يقل به إلا الشافعي، وعزاه في البحر إلى جمهور أهل الحديث، فكان ينبغي عزوه إليهم؛ لئلا يوهم أنه قول في المذهب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۱۱، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في القنوت للنازلة، ط: دار الفكر - بيروت)

قال الحافظ أبو جعفر الطحاوي: إنما لا يقنت عندنا في صلاة الفجر من غير بلية، فإذا وقعت فتنة أو بلية، فلا بأس به، فعله رسول الله - صلى الله تعالى عليه وسلم -، وأما القنوت في الصلوات كلها عند النوازل، فلم يقل به إلا الشافعي، وكأنهم حملوا ما روي عنه - عليه السلام - أنه قنت في الظهر والعشاء على ما في مسلم وأنه قنت في المغرب أيضا على ما في البخاري، على النسخ لعدم ورود المواظبة، والتكرار الواردين في الفجر عنه - عليه الصلاة والسلام - اهـ. ومقتضى هذا أن القنوت لنازلة خاص بالفجر، ويخالفه ما ذكره المؤلف معزيا إلى الغاية، من قوله في صلاة الجهر، ولعله محرف عن الفجر، وقد وجدته بهذا اللفظ في حواشي مسكين، وكذا في الأشباه، وكذا في شرح الشيخ إسماعيل، لكنه عزاه إلى غاية البيان، ولم أجد المسألة فيها، فلعله اشتبه عليه غاية السروجي بغاية البيان، لكن نقل عن البناية ما نصه: إذا وقعت نازلة قنت الإمام في الصلاة الجهرية، وقال الطحاوي: لا يقنت عندنا في صلاة الفجر في غير بلية أما إذا وقعت فلا بأس به اهـ. (منحة الخالق على البحر الرائق: ۲/۴۷-۴۸، باب الوتر، القنوت في غير الوتر، ط: دار الكتاب الإسلامي)

قنوتِ نازلہ پڑھنا شروع کیا گیا تھا، جو اب تک جاری ہے، حدیث پاک میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مہینے تک قنوتِ نازلہ پڑھی تھی۔[1] تو اب فی الحال قنوتِ نازلہ بند کیا جائے؟ یا اُسے پڑھنا چاہیے؟ اور کب تک پڑھا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

فی الحال ہندوستان کے حالات سازگار نہیں ہیں، حالات جیسے نظر آ رہے ہیں، حقیقت اُس سے کچھ الٹی ہی ہے۔ یو۔ پی۔ میں انامت (ریز رویشن) کے خلاف شدت سے مظاہرے ہو رہے ہیں، اور اب گجرات میں بھی اس طرح کے مظاہرے اور احتجاج کے بارے میں سوچا جا رہا ہے، اس لیے قنوتِ نازلہ جاری رکھا جائے، رسول اللہ ﷺ نے ایک مہینے تک قنوتِ نازلہ پڑھی، قبولیت دعاء (یعنی جن کے حق میں بددعاء کر رہے تھے، ان کے انجام کار تک پہنچ جانے) کے بعد آپ ﷺ نے قنوتِ نازلہ پڑھنا بند فرمایا۔[2]

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ جب تک حالات درست نہ ہوں، اس وقت تک قنوتِ نازلہ پڑھتے رہیں، ملک

---

(۱) عن أنس بن مالك رضي الله عنه، أن رعلا، وذكوان، وعصية، وبني لحيان، استمدوا رسول الله صلى الله عليه وسلم على عدو، فأمدهم بسبعين من الأنصار، كنا نسميهم القراء في زمانهم، كانوا يحتطبون بالنهار، ويصلون بالليل، حتى كانوا ببئر معونة قتلوهم وغدروا بهم، فبلغ النبي صلى الله عليه وسلم، فقنت شهرا يدعو في الصبح على أحياء من أحياء العرب، على رعل، وذكوان، وعصية، وبني لحيان. (صحيح البخاري: ۲/ ۵۸۵، رقم الحديث: ۴۰۹۰، كتاب المغازي، باب غزوة الرجيع، ورعل، وذكوان، وبئر معونة، وحديث عضل، والقارة، وعاصم بن ثابت، وخبيب وأصحابه، ط: البدر-ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۳۷، رقم الحديث: ۲۹۹-(۶۷۷)، كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب استحباب القنوت في جميع الصلاة إذا نزلت بالمسلمين نازلة، ط: البدر-ديوبند)

(۲) عن أبي سلمة، أن أبا هريرة، حدثهم أن النبي صلى الله عليه وسلم قنت بعد الركعة في صلاة شهرا، إذا قال: سمع الله لمن حمده، يقول في قنوته: اللهم أنج الوليد بن الوليد، اللهم نج سلمة بن هشام، اللهم نج عياش بن أبي ربيعة، اللهم نج المستضعفين من المؤمنين، اللهم اشدد وطأتك على مضر، اللهم اجعلها عليهم سنين كسني يوسف. قال أبو هريرة: "ثم رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم ترك الدعاء بعد، فقلت: أرى رسول الله صلى الله عليه وسلم قد ترك الدعاء لهم، قال: فقيل: وما تراهم قد قدموا ". [ش (وما تراهم قد قدموا) معناه ماتوا]. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۳۹، رقم الحديث: ۲۹۵-(۶۷۵)، كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب استحباب القنوت في جميع الصلاة إذا نزلت بالمسلمين نازلة، ط: البدر-ديوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: ''فجر کی نماز کے علاوہ کسی اور نماز میں قنوتِ نازلہ پڑھنا'' کا حاشیہ۔

میں مسلمان شہید ہو گئے، اُن کے گھر بار لوٹے گئے، اُس کے بعد بھی مظلومین کو ظلم بالائے ظلم عدالتوں میں جھوٹے مقدمات درج کر کے ستایا جا رہا ہے، کتنے بے قصور نوجوانوں کو دہشت گردی کے جھوٹے الزام میں پکڑ کر قید خانہ میں ڈھکیل دیا گیا ہے، لہٰذا قنوتِ نازلہ جاری رکھیں، مسجدیں آباد کرنے کی کوشش میں رہیں، یٰسین شریف پڑھ کر دعا کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] وتر کے علاوہ کسی اور نماز میں دعائے قنوت پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

۹۱۲- سوال: وتر کے علاوہ کسی اور نماز میں دعائے قنوت پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

دعاءِ قنوت صرف وتر ہی کی نماز میں پڑھی جائے گی، اُس کے علاوہ کسی اور فرض نماز میں پڑھنا صحیح نہیں، جس وقت دین اسلام اور مسلمانوں پر دشمنوں کی جانب سے کوئی خطرہ ہو یا ظلم و زیادتی کی گئی ہو، تو ایسے حالات میں فجر کی نماز میں دوسری رکعت کے رکوع کے بعد قنوتِ نازلہ پڑھنی چاہیے۔ (درمختار، شامی: ۲/ ۴)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۸] زوال کے بعد پڑھی جانے والی سنت کا ثواب

۹۱۳- سوال: دوپہر میں زوال آفتاب کے بعد وقت مکروہ ختم ہونے کے بعد جب ظہر کا وقت شروع ہوتا ہے، اس وقت چار رکعت سنت زوال پڑھتے ہیں، کیا یہ چار رکعت سنت ہے؟ اور اس کا ثواب کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

سنت زوال مسنون ہے، آپ ﷺ زوال کے بعد چار رکعت پڑھتے تھے اور فضیلت بیان فرماتے تھے کہ زوال کے بعد آسمان کے دروازے کھلتے ہیں؛ اس لیے میں پسند کرتا ہوں کہ اس وقت میرے نیک اعمال اوپر چڑھیں۔ (ترمذی)[۲]

[۱] تقدم تخریجہ تحت عنوان: فجر کی نماز کے علاوہ کسی اور نماز میں قنوت نازلہ پڑھنا''۔

[۲] عن عبد الله بن السائب، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي أربعا بعد أن تزول الشمس قبل الظهر، وقال: إنها ساعة تفتح فيها أبواب السماء، وأحب أن يصعد لي فيها عمل صالح.

وروي عن النبي صلى الله عليه وسلم: أنه كان يصلي أربع ركعات بعد الزوال، لا يسلم إلا في آخرهن. (سنن الترمذي: ۱/ ۱۰۸، رقم الحديث: ۴۷۸، أبواب الوتر، باب ما جاء في الصلاة عند الزوال، ط: البدر - ديوبند) =

اور ایک روایت میں ارشاد فرمایا کہ تہجد کی نماز کے برابر ثواب ملتا ہے اور ہر چیز اس وقت اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ (ترمذی، بیہقی، مشکوۃ)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] فرض پڑھے بغیر وتر کی اقتدا کرنا

۹۱۳- سوال: ایک آدمی عشاء کی نماز امام کے پیچھے نہ پڑھ سکا ہو تو کیا وہ وتر میں امام کی اقتداء کر سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ایک شخص اس وقت مسجد میں داخل ہوا، جب کہ عشاء کی جماعت ہو چکی تھی، تو اسے چاہیے کہ اولاً فرض نماز ادا کرے، پھر تراویح میں شریک ہو، اور باجماعت تراویح پڑھے، اور وتر بھی جماعت کے ساتھ ادا کرے، خلاصہ یہ کہ جس مقتدی نے باجماعت تراویح پڑھی ہو، وہ وتر میں اقتدا کر سکتا ہے، چاہے عشاء کی فرض نماز میں امام کی اقتدا نہ کی ہو۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= عن أبي أيوب الأنصاري: أنه كان يصلي أربع ركعات قبل الظهر، فقيل له: إنك تديم هذه الصلاة فقال: إني رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يفعله فسألته، فقال: " إنها ساعة تفتح فيها أبواب السماء، فأحببت أن يرتفع لي فيها عمل صالح ". (مسند الإمام أحمد بن حنبل- (م:۲۴۱هـ):۳۸/ ۵۳۳،رقم الحديث:۲۳۵۵۱،ت: شعيب الأرنؤوط-عادل مرشد،وآخرون،ط:مؤسسة الرسالة،وانظر:۲۳۵۳۲)

(۱) عن عمر رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "أربع ركعات قبل الظهر بعد الزوال تحسب بمثلهن في صلاة السحر. وما من شيء إلا وهو يسبح الله تلك الساعة ثم قرأ: (يتفيأ ظلاله عن اليمين والشمائل سجدا لله وهم داخرون) رواه الترمذي والبيهقي في شعب الإيمان. (مشكاة المصابيح-محمد بن عبد الله الخطيب العمري، أبو عبد الله، ولي الدين، التبريزي (م:۷۴۱هـ):۱/ ۳۶۹،رقم الحديث:۱۱۷۷، كتاب الصلاة، باب السنن وفضائلها، الفصل الثالث،ت: محمد ناصر الدين الألباني،ط: المكتب الإسلامي - بيروت☆ ص:۱۰۵،مکتبہ تھانوی-دیوبند)

(۲) فمصليه وحده يصليها معه. (ولو لم يصلها) أي التراويح (بالإمام) أو صلاها مع غيره (له أن يصلي الوتر معه) بقي لو تركها الكل هل يصلون الوتر بجماعة؟ فليراجع. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله ولو لم يصلها إلخ) ذكر هذا الفرع والذي قبله في البحر عن القنية، وكذا في متن الدرر، لكن في التتارخانية عن التتمة أنه سأل علي بن أحمد عمن صلى الفرض والتراويح وحده أو التراويح فقط هل يصلي الوتر مع الإمام؟ فقال لا اهـ. ثم رأيت القهستاني ذكر تصحيح ما ذكره المصنف، ثم قال: لكنه إذا لم يصل الفرض معه لا يتبعه في الوتر اهـ. فقوله: ولو لم يصلها أي وقد صلى الفرض معه، لكن ينبغي أن يكون قول القهستاني معه احترازا عن صلاتها منفردا، أما لو صلاها جماعة مع غيره ثم صلى الوتر معه لا كراهة تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: =

[٣٠] جمعہ کی پہلی چار سنت مؤکدہ چھوٹ جائے تو کب پڑھے؟

٩١٥- سوال: یہاں کناڈا میں اکثر لوگ کام کاج سے سیدھے نماز جمعہ کے لیے آتے ہیں، بعض لوگ خطبہ کے وقت مسجد میں پہنچتے ہیں، جس کی بناء پر پہلی چار رکعت سنت مؤکدہ نہیں پڑھ پاتے، اب اگر وہ چھوٹی ہوئی سنت مؤکدہ فرض نماز کے بعد پڑھنا چاہیں، تو کیا وہ چھوٹی ہوئی سنت پہلے پڑھیں یا فرض کے بعد والی سنتیں پہلے پڑھیں؟ بندے نے عالم گیری اور شامی کے حوالے بعض اردو کتابوں میں دیکھے، لیکن جواب مختلف فیہ ملا۔ امید ہے کہ آپ راجح قول بیان فرمائیں گے، نیز اگر جمعہ کے بعد والی سنتیں پہلے پڑھیں؟ تو کیا چار رکعت پڑھیں یا چھ رکعت؟

الجواب حامداومصليا:

آپ کے لکھنے کے مطابق شامی، عالم گیری، کبیری وغیرہ کتابیں دیکھیں؛ لیکن اس (جمعہ) کے بارے میں کوئی مستقل جزئیہ نہیں مل سکا۔

البتہ کفایت المفتی اور فتاوی دار العلوم میں لکھا ہے کہ متروکہ سنتیں پہلے اور بعد میں دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔[1]

لیکن بہتر وہ ہے، جو فتاوی دار العلوم کے حاشیہ میں لکھا ہے اور جس میں سنتوں کے بارے میں بحث ہے؛ لیکن اس میں بھی جمعہ کی متروکہ سنتوں کا مستقلاً بیان نہیں ہے؛ بل کہ ظہر کی چھوٹی ہوئی سنتوں کا بیان ہے کہ ظہر کی چار سنتیں اگر فرض کی اقامت کی وجہ سے چھوٹ گئیں، تو اسے مصلی فرض کے بعد والی دو رکعت سنتوں کے بعد پڑھے؛ کیوں کہ پہلی چار رکعات سنت مؤکدہ تو اپنی جگہ سے ہٹ ہی گئی ہیں، اب ان کو ادا کرنے کے لیے بعد والی دو رکعت سنت مؤکدہ کو اپنی جگہ سے نہ ہٹایا جائے؛ لہٰذا اس پر قیاس کرتے ہوئے

= ١/ ٢٨، كتاب الصلاة، باب الوتر و النوافل، قبيل: مطلب في كراهة الاقتداء في النفل على سبيل التداعي وفي صلاة الرغائب، ط: دار الفكر- بيروت)

(١) جمعہ سے پہلے کی چار رکعتیں نماز کے بعد پڑھ لے اور چاہے انہیں پہلے پڑھ لے یا بعد والی پہلے پڑھے، دونوں جائز ہے۔ (کفایت المفتی: ٣/ ٣١٧، کتاب الصلاۃ، جمعہ کی پہلی سنتیں رہ جائیں تو کب پڑھے، جواب: ٥١٥، ط: دار الاشاعت، کراچی)

بعد فرض کے چار سنت پڑھے، دو سنت سے پہلے یا پیچھے، اور نیت سنت ظہر کی کرے۔ (فتاوی دار العلوم: ٤/ ٢٠٢، ظہر کی جماعت کے وقت آنے والا پہلی سنت کب پڑھے گا، سوال: ١٩٨٥، ط: زکریا دیوبند)

جمعہ کی چار سنن قبلیہ، فرض نماز کے بعد والی چار سنتوں کو ایک سلام سے یا چھ رکعت سنتوں کو دو سلام سے ادا کرنے کے بعد پڑھی جائے۔ امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی قول ہے۔ فتاوی دار العلوم کے حاشیہ میں لکھا ہے:

وفی مبسوط شیخ الاسلام انه الأصح لحديث عائشة ﷺ انه عليه الصلوة والسلام كان اذا فاتته الأربع قبل الظهر يصليهن بعد الركعتين وهو قول ابی حنيفة. (فتاوی دار العلوم ۴/ ۲۰۴، فی الحاشیہ)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۲] عن عائشة، قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا فاتته الأربع قبل الظهر، صلاها بعد الركعتين بعد الظهر. (سنن ابن ماجه: ۸۰، رقم الحديث: ۱۱۵۸، كتاب إقامة الصلاة، والسنة فيها، باب من فاتته الأربع قبل الظهر، ط: البدر - ديوبند)

(بخلاف سنة الظهر) وكذا الجمعة (فإنه) إن خاف فوت ركعة (يتركها) ويقتدي (ثم يأتي بها) على أنها سنة (في وقته) أي الظهر (قبل شفعه) عند محمد، وبه يفتي جوهرة. (الدر المختار) ــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله عند محمد) وعند أبي يوسف بعده، كذا في الجامع الصغير الحسامي وفي المنظومة وشرحها: الخلاف على العكس. وفي غاية البيان: يحتمل أن يكون عن كل من الإمامين روايتان ح عن البحر.

(قوله وبه يفتي) أقول: وعليه المتون، لكن رجح في الفتح تقديم الركعتين. قال في الإمداد: وفي فتاوى العتابي أنه المختار، وفي مبسوط شيخ الإسلام أنه الأصح لحديث عائشة: أنه - عليه الصلاة والسلام - كان إذا فاتته الأربع قبل الظهر يصليهن بعد الركعتين، وهو قول أبي حنيفة، وكذا في جامع قاضي خان اهـ والحديث قال الترمذي حسن غريب فتح. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۸-۵۹، باب إدارك الفريضة، مطلب هل الإساءة دون كراهة أو أفحش، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید دیکھیے: فتاوی دار العلوم: ۴/ ۲۰۲ - ۲۰۳، باب مسائل سنن مؤکدہ، ظہر کی جماعت کے وقت آنے والا پہلی سنت کب پڑھے گا، سوال: ۱۶۸۵، مرتب ومحشی: مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ، ط: زکریا دیوبند۔

باب الاستسقاء

[طلب باراں کا بیان]

[۱] قحط سالی میں قنوت نازلہ اور نماز استسقاء پڑھنا

۹۱۶- سوال: فی الحال یہاں باران رحمت بالکل نہیں ہے؛ لہٰذا درخواست ہے کہ آپ خاص طور پر دار العلوم میں زیر تعلیم طلبہ سے دعا کرائیں، کیا ایسی حالات میں قنوت نازلہ پڑھ سکتے ہیں؟ اسی طرح نماز استسقاء؟ بالتفصیل جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب حامداو مصلیا:

بارش کے لیے دعاء مانگنی چاہیے، گناہوں سے استغفار کرنا چاہیے،[۱] اور ایک خاص نماز پڑھنی چاہیے، جسے نماز استسقاء (صلاۃ الاستسقاء) کہتے ہیں۔ (عالم گیری)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۔ إِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ أَنْهٰرًا ۝ (۷۱- نوح: ۱۰-۱۲)

[۲] قال أبو حنيفة - رحمه الله تعالى - ليس في الاستسقاء صلاة مسنونة في جماعة، كذا في الهداية، ولا خطبة فيه ولكنه دعاء واستغفار وإن صلوا وحدانا فلا بأس به، كذا في الذخيرة وليس فيه قلب رداء عند أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - هكذا في التبيين.

وقالا: يخرج الإمام ويصلي بهم ركعتين يجهر فيهما بالقراءة، كذا في العيني شرح الهداية، ويخطب خطبتين بعد الصلاة ويستقبل الناس بوجهه قائما على الأرض لا على المنبر ويفصل بين الخطبتين بجلسة وإن شاء خطب خطبة واحدة ويدعو الله ويسبحه ويستغفر للمؤمنين والمؤمنات وهو متكئ قوسا فإذا مضى صدر من خطبته قلب رداءه، كذا في المضمرات. ــــــــ وصفة تقليب الرداء إن كان مربعا جعل أسفله أعلاه وأعلاه أسفله وإن كان مدورا جعل الجانب الأيمن على الأيسر والأيسر على الأيمن ولكن القوم لا يقلبون أرديتهم، هكذا في الكافي والمحيط والسراج الوهاج وفي التحفة وإذا فرغ الإمام من الخطبة يجعل ظهره إلى الناس ووجهه إلى القبلة ويقلب رداءه ثم يشتغل بدعاء الاستسقاء قائما والناس قعود مستقبلون ووجوههم إلى القبلة في الخطبة والدعاء فيدعوا الله تعالى

ويستغفر للمؤمنين ويجددون التوبة ويستغفرون ثم عند الدعاء إن رفع يديه نحو السماء فحسن وإن ترك ذلك وأشار بأصبعه السبابة فحسن وكذا الناس يرفعون أيديهم أيضا؛ لأن السنة في الدعاء بسط اليدين، كذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۳، ۱۵۴، كتاب الصلاة، الباب التاسع عشر في الاستسقاء، ط: دار الفكر)

کسی حادثہ اور طاعون وغیرہ کی وجہ سے دعاء قنوت کا پڑھنا مشروع ہے، قحط سالی میں دعاء قنوت کا اہتمام منقول نہیں، اس کے لیے صلاۃ الاستسقاء منقول ومتوارث ہے:

(ولا يقنت لغيره) إلا النازلة فيقنت الإمام في الجهرية، وقيل في الكل. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله إلا النازلة) قال في الصحاح: النازلة الشديدة من شدائد الدهر، ولا شك أن الطاعون من أشد النوازل، أشباه.

(قوله فيقنت الإمام في الجهرية) يوافقه ما في البحر والشرنبلالية عن شرح النقاية عن الغاية: وإن نزل بالمسلمين نازلة قنت الإمام في صلاة الجهر. وهو قول الثوري وأحمد اهـ وكذا ما في شرح الشيخ إسماعيل عن البنانية: إذا وقعت نازلة قنت الإمام في الصلاة الجهرية، لكن في الأشباه عن الغاية: قنت في صلاة الفجر، ويؤيده ما في شرح المنية حيث قال بعد كلام: فتكون شرعيته: أي شرعية القنوت في النوازل مستمرة، وهو محمل قنوت من قنت من الصحابة بعد وفاته - عليه الصلاة والسلام -، وهو مذهبنا وعليه الجمهور. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۱، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في القنوت للنازلة، ط: دار الفكر - بيروت)

عن ابن عباس -رضی اللہ تعالیٰ عنہما- أن النبی -صلی اللہ علیہ وسلم- کان یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ سوی الوتر.

(معجم اوسط-ابوالقاسم طبرانی (م:۳۶۰ھ) ۱/ ۲۴۳، رقم الحدیث:۷۹۸)

باب التراویح

[تراویح کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب التراویح

[تراویح کا بیان]

[۱] بیس رکعات تراویح کا ثبوت اور اس کی حقیقت

۹۱۷- سوال: آں حضرت ﷺ سے تراویح کی کتنی رکعات ثابت ہے، آٹھ، بارہ یا بیس؟ احادیث کے حوالے سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامدا ومصلیا:

علمی بحث ومباحثہ آپ کا کام نہیں، آپ کے لیے اتنا جان لینا کافی ہے کہ آں حضرت ﷺ رمضان المبارک میں وتر کے علاوہ بیس رکعات تراویح پڑھتے تھے۔ (طبرانی، بیہقی- عن ابن عباسؓ) [1] مصنف

---

[۱]عن ابن عباس، أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يصلي في رمضان عشرين ركعة سوى الوتر. (المعجم الأوسط-أبو القاسم الطبراني (م:۳۶۰ھ): ۱/ ۲۴۳، رقم الحديث: ۷۹۸، باب الألف، من اسمه أحمد، ت: طارق بن عوض الله بن محمد، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين-القاهرة، ورواه أيضا برقم: ۵۵۴۴، باب الميم، من اسمه محمد☆المعجم الكبير: ۱۱/ ۳۹۳، رقم الحديث: ۱۲۱۰۲، باب العين، مقسم عن ابن عباس، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية-القاهرة)

عن الحكم، عن مقسم، عن ابن عباس قال: "كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي في شهر رمضان في غير جماعة بعشرين ركعة، والوتر". (السنن الكبرى-أبو بكر البيهقي (م:۴۵۸ھ): ۲/ ۶۹۸، رقم الحديث: ۴۲۸۶، جماع أبواب صلاة التطوع، وقيام شهر رمضان، باب ما روي في عدد ركعات القيام في شهر رمضان، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ابن ابی شیبہ میں بھی اس روایت کونقل کیا گیا ہے۔ (۲)

جب حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں بیس رکعات تراویح پڑھی ہے، توان کے پاس لامحالہ کوئی مضبوط دلیل ہوگی، تبھی انہوں نے بیس رکعات پڑھی ہے، بغیر دلیل کے ان سے اس فعل کا صدور ممکن نہیں ہے، اس جانب بھی توجہ دیں کہ آں حضرت ﷺ نے خلفائے راشدین کی اتباع کا حکم دیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: **علیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين** (۳) کہ تم پر میری اور راہ یاب خلفائے راشدین کی سنت کی اتباع لازم ہے، حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کو تمام صحابہ کرامؓ نے تسلیم کیا تھا، معلوم یہ ہوا کہ بیس رکعات تراویح پر اجماع صحابہ ہے۔ نیز ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی بیس رکعت سے کم کے قائل نہیں ہیں۔ (۴)

شامی میں لکھا ہے کہ بیس رکعات تراویح جمہور علمائے کرام کا مذہب ہے، نیز اہل مشرق ومغرب کا اسی پر عمل ہے۔ (شامی: ۱/ ۶۶۰) [۵]

(۲) عن ابن عباس، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار - أبو بكر بن أبي شيبة (م: ۲۳۵هـ): ۲/ ۱۶۴، رقم الحديث: ۷۶۹۲، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد - الرياض)

(۳) ... أوصيكم بتقوى الله والسمع والطاعة، وإن عبدا حبشيا، فإنه من يعش منكم بعدي فسيرى اختلافا كثيرا، فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء المهديين الراشدين، تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ، وإياكم ومحدثات الأمور، فإن كل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة. (سنن أبي داود: ۲/ ۶۳۵، رقم الحديث: ۴۶۰۷، كتاب السنة، باب في لزوم السنة، ط: البدر - ديوبند ☆ سنن الترمذي: ۲/ ۹۶، رقم الحديث: ۲۶۷۶، أبواب العلم، باب ما جاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع، ط: البدر - ديوبند ☆ سنن ابن ماجة: ۱/ ۵، رقم الحديث: ۴۲، افتتاح الكتاب في الإيمان وفضائل الصحابة والعلم، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين، ط: البدر - ديوبند)

(۴) لم يقل أحد من الأئمة الأربعة بأقل من عشرين ركعة في التراويح، وعليه جمهور الصحابة رضوان الله عليهم أجمعين. (العرف الشذي على هامش سنن الترمذي: ۱/ ۱۶۶، أبواب الصوم، باب الترغيب في قيام شهر رمضان وما جاء فيه من الفضل، ط: فيصل - ديوبند)

[۵] (التراويح سنة) مؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين (للرجال والنساء) إجماعا (ووقتها بعد صلاة العشاء) إلى الفجر (قبل الوتر وبعده) في الأصح... (والجماعة فيها سنة على الكفاية) في الأصح، فلو تركها أهل مسجد أثموا إلا لو ترك بعضهم، وكل ما شرع بجماعة فالمسجد فيه أفضل قاله الحلبي. (وهي عشرون ركعة) [الدر المختار]

قال ابن عابدين: (قوله سنة مؤكدة) صححه في الهداية وغيرها، وهو المروي عن أبي حنيفة. وذكر في الاختيار أن أبا يوسف سأل أبا حنيفة عنها وما فعله عمر، فقال: التراويح سنة مؤكدة، ولم يتخرجه عمر من تلقاء نفسه، ولم=

الغرض بیس رکعات تراویح پر تمام حضرات صحابۂ کرام کا اجماع اور اتفاق ہے؛ یعنی ان کو بیس رکعات تراویح کا علم ضرور تھا، اسی لیے انہوں نے اس کو بلا کسی اختلاف کے تسلیم کرلیا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] حضرت عمرؓ کا بیس رکعات تراویح پر لوگوں کو جمع کرنے کی حکمت

۹۱۸-سوال: آں حضرت ﷺ نے تراویح کو پابندی کے ساتھ باجماعت اس لیے نہیں ادا فرمایا تھا؛ تاکہ امت پر وہ فرض نہ ہوجائے، تو پھر حضرت عمرؓ نے کن وجوہات کی بنیاد پر اس کو فرض قرار دیا اور باجماعت ادا کیا؟

الجواب حامداو مصلیا:

آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، حضرت عمرؓ نے اس کی حیثیت کو تبدیل نہیں کیا ہے کہ سنت کو فرض قرار دیا ہو؛ بل کہ تراویح، الگ الگ جگہوں پر الگ الگ ائمہ کے پیچھے ہوا کرتی تھی، ہر ایک امام کے پیچھے پانچ چھ مقتدی ہوتے تھے، تو حضرت عمرؓ نے ان تمام مقتدیوں کو ایک ہی امام کے پیچھے تراویح پڑھنے کی ترغیب دی، نفس تراویح میں آپ کی جانب سے کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوا ہے؛ کیوں کہ اسلام اجتماعیت اور اتحاد کا داعی ہے، حضرت عمرؓ نے صرف اسی اجتماعیت اور اتحاد کی بناء پر لوگوں کو توجہ دلائی ہے۔(۱)

= یکن فیه مبتدعا، ولم یأمر به إلا عن أصل لدیه وعهد من رسول الله صلی الله علیه وسلم.... وفي شرح منیة المصلي: وحکی غیر واحد الإجماع علی سنیتها، وتمامه في البحر.———— (قوله لمواظبة الخلفاء الراشدین) أي أکثرهم؛ لأن المواظبة علیها وقعت في أثناء خلافة عمر - رضي الله عنه -، ووافقه علی ذلك عامة الصحابة ومن بعدهم إلی یومنا هذا بلا نکیر، وکیف لا وقد ثبت عنه - صلی الله علیه وسلم - علیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین عضوا علیها بالنواجذ، کما رواه أبو داود، بحر.... (قوله وهي عشرون رکعة) هو قول الجمهور وعلیه عمل الناس شرقا وغربا. (رد المحتار: ۲/ ۴۳-۴۵، کتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراویح، ط: دار الفکر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۱۱۶-۱۱۷، کتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الکتاب دیوبند)

(۱) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۝ (۳-آل عمران ۱۰۳)

عن عبد الرحمن بن عبد القاري، أنه قال: خرجت مع عمر بن الخطاب رضي الله عنه، لیلة في رمضان إلی المسجد، فإذا الناس أوزاع متفرقون، یصلي الرجل لنفسه، ویصلي الرجل فیصلي بصلاته الرهط، فقال عمر: إني أری لو جمعت هؤلاء علی قارئ واحد، لکان أمثل، ثم عزم، فجمعهم علی أبي بن کعب، ثم خرجت معه لیلة أخری، والناس یصلون بصلاة قارئهم، قال عمر: نعم البدعة هذه، والتي ینامون عنها أفضل من التي یقومون، یرید آخر اللیل وکان الناس یقومون أوله. (صحیح البخاري: ۱/ ۲۶۹، رقم: ۲۰۱۰، کتاب الصوم، باب فضل من قام رمضان، ط: دیوبند)

الغرض حضرت عمرؓ نے اصل حکم میں کوئی تبدیلی نہیں فرمائی ہے، صرف تمام کو جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے کی ترغیب دی ہے۔

آج بھی یہ حکم ہے کہ مسجد میں فرض نماز پڑھ لیجیے اور گھر آکر- اگر کوئی تراویح پڑھانے والا موجود ہو، تو اس کے پیچھے- باجماعت تراویح پڑھ لیجیے، مسجد کے امام کے پیچھے تراویح پڑھنا ضروری نہیں ہے، اصل سنت ادا ہو جائے گی، یہ دوسری بات ہے کہ مسجد کی فضیلت حاصل نہ ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] بیس رکعات تراویح کا ثبوت حضرت عمرؓ کے عمل سے

۹۱۹- سوال: تراویح کی بیس رکعات احادیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہے، تو اس کا حوالہ عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اصول فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ: مسائل کا ثبوت قرآن مجید سے بھی ہوتا ہے، اسی طرح احادیث رسول ﷺ، اجماع امت اور قیاس کے ذریعہ بھی ہوتا ہے؛ اس لیے آپ کا حوالے میں صرف حدیث طلب کرنا صحیح نہیں ہے۔[۲]

[۱] (والجماعة فيها سنة على الكفاية) في الأصح، فلو تركها أهل مسجد أثموا إلا لو ترك بعضهم، وكل ما شرع بجماعة فالمسجد فيه أفضل قاله الحلبي. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله والجماعة فيها سنة على الكفاية إلخ) أفاد أن أصل التراويح سنة عين، فلو تركها واحد كره، بخلاف صلاتها بالجماعة فإنها سنة كفاية، فلو تركها الكل أساءوا، أما لو تخلف عنها رجل من أفراد الناس وصلى في بيته فقد ترك الفضيلة، وإن صلى أحد في البيت بالجماعة لم ينالوا فضل جماعة المسجد وهكذا في المكتوبات كما في المنية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۳-۴۵، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مبحث صلاة التراويح، ط: دار الفكر)

(۲) الأدلة المثبتة للأحكام نوعان: متفق عليه ومختلف فيه. فالمتفق عليه أربعة وهي: الكتاب والسنة والإجماع والقياس، التي ترجع إليها أدلة الفقه الإجمالية، والمختلف فيه كثير جمعها القرافي في مقدمة الذخيرة، منها: الاستحسان، والمصالح المرسلة، وسد الذريعة، والعرف، وقول الصحابي، وشرع من قبلنا، والاستصحاب، وإجماع أهل المدينة، وغيرها. ويقصد بالأحكام: الأحكام التكليفية الخمسة: الوجوب، والندب، والإباحة، والكراهة، والحرمة. والأحكام الوضعية: كالشرط، والمانع، والسبب ونحوها. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۱/ ۲۲، حرف الدال، مادة: دليل، صادر عن: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية - الكويت☆أصول الشاشي- نظام الدين أبو علي أحمد بن محمد بن إسحاق الشاشي (م: ۳۴۴هـ) ص: ۱۳، بحث كون أصول الفقه أربعة، ط: دار الكتاب العربي- بيروت)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تم میری اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھام لو۔[۱] خلفائے راشدین میں سے حضرت عمرؓ نے امام کو بیس رکعات تراویح پڑھانے کا حکم دیا تھا، حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں بھی بیس رکعات تراویح پڑھائی جاتی تھی۔ (بیہقی : ،موطا امام محمد: حاشیہ :۱۰، صفحہ: ۱۴۳)[۲]

جب تینوں خلفاء کے زمانے میں تراویح بیس رکعات پڑھی جاتی رہی ہے، تو آپ ان کی اقتدا کریں گے یا نام نہاد دین کے ٹھیکیداروں (سامرودی جیسے اہل حدیث ہونے کے دعوے داروں) کی۔

اس سلسلے میں غیر مقلدین کے مشہور پیشوا نواب صدیق حسن بھوپالیؒ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ

(۱)... أوصيكم بتقوى الله والسمع والطاعة، وإن عبدا حبشيا، فإنه من يعش منكم بعدي فسيرى اختلافا كثيرا، فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء المهديين الراشدين، تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ، وإياكم ومحدثات الأمور، فإن كل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة. (سنن أبي داود: ۲/ ۶۳۵، رقم الحديث: ۴۶۰۷، كتاب السنة، باب في لزوم السنة، ط: البدر -ديوبند☆سنن الترمذي: ۲/ ۹۶، رقم الحديث: ۲۶۷۶، أبواب العلم، باب ما جاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع، ط: البدر - ديوبند ☆سنن ابن ماجه: ۱/ ۵، رقم الحديث: ۴۲، افتتاح الكتاب في الإيمان وفضائل الصحابة والعلم، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين، ط: البدر - ديوبند)

[۲] عن السائب بن يزيد قال: "كانوا يقومون على عهد عمر بن الخطاب رضي الله عنه في شهر رمضان بعشرين ركعة" قال: "وكانوا يقرءون بالمئين، وكانوا يتوكئون على عصيهم في عهد عثمان بن عفان رضي الله عنه من شدة القيام". (السنن الكبرى-أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۲/ ۶۹۸، رقم الحديث: ۴۲۸۸، جماع أبواب صلاة التطوع، وقيام شهر رمضان، باب ما روي في عدد ركعات القيام في شهر رمضان، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

... أبو الخصيب قال: "كان يؤمنا سويد بن غفلة في رمضان فيصلي خمس ترويحات عشرين ركعة" وروينا عن شتير بن شكل، وكان من أصحاب علي رضي الله عنه "أنه كان يؤمهم في شهر رمضان بعشرين ركعة، ويوتر بثلاث". (حوالہ سابق: حدیث نمبر: ۴۲۹۰)

عن أبي عبد الرحمن السلمي، عن علي رضي الله عنه قال: "دعا القراء في رمضان فأمر منهم رجلا يصلي بالناس عشرين ركعة" قال: وكان علي رضي الله عنه يوتر بهم" (حوالہ سابق: حدیث نمبر: ۴۲۹۱)

... انهم كانوا يقومون على عهد عمر بعشرين ركعة وعلى عهد عثمان وعلى مثله. (مؤطا مالك- رواية محمد بن الحسن في حاشية: ۱/ ۳۵۵، باب قيام شهر... الخ، ط: دار القلم دمشق)

... ان عمر جمع الناس على ثلث وعشرين ركعة مع الوتر. (مؤطا مالك، رواية محمد بن الحسن في حاشية: ۱/ ۳۵۵، باب قيام شهر... الخ، ط: دار القلم دمشق)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو بیس رکعات پڑھی گئیں، اس کو علماء نے اجماع کے مثل شمار کیا ہے۔ (۱)

خلاصہ یہ کہ ہر مسئلے کے لیے حدیث کا ہونا ضروری نہیں ہے اور حدیث شریف سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفاء راشدین کی اقتدا اور اتباع کا حکم دیا ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو بیس رکعات تراویح با جماعت پڑھنے کا حکم دیا ہے؛ لہٰذا تراویح کی بیس رکعات ہوں گی نہ کہ آٹھ رکعات۔ (۲) واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ [۳۰/۹/۱۹۷۷ء]

[۴] مستقل امام کو حق تراویح ہے یا دوسرے مقررہ حافظ کو؟

۹۲۰- سوال: میں مسجد کا دائمی امام اور مدرسہ کا مدرس بہ مشورۂ کمیٹی طے ہوا ہوں اور بحمد اللہ حافظ ہوں، تراویح ہر سال پڑھاتا رہتا ہوں، بندہ کے تقرر سے پہلے ایک غیر حافظ امام تھے، جن کی موجودگی میں قرآن کریم سنانے کے لیے ایک بزرگ صاحب یوپی سے آیا کرتے تھے جو وقتاً فوقتاً تقریر بھی کرتے تھے اور چندہ بھی؛ لہٰذا اس سال بھی بندہ کی بغیر اجازت ورضامندی کے ان صاحب کو دعوت دی گئی اور بندہ کو یک لخت مصلّی سے دور کر دیا گیا، حتیٰ کہ چار رکعت کا بھی موقع نہیں دیا گیا، سوال یہ ہے کہ یہ کہاں تک صحیح ہے؟ نیز آنے والے بزرگ کو دائمی امام کی حق تلفی کہاں تک زیب دیتی ہے، جو محض دھونس سے ایک غریب و بے بس امام کے حق میں کی جاتی ہے؟ قبل رمضان جلد از جلد جواب مرحمت فرمائیں، تا کہ فتنہ سے پہلے صلح ہو جائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کا تقرر پنج وقتہ نمازوں کی امامت اور تعلیم الصبیان (بچوں کی تعلیم) کے لیے ہوا ہے، آپ کی

---

(۱) و المعروف و هو الذي عليه الجمهور، أنه عشرون ركعة بعشر تسليمات، و ذلك خمس ترويحات، كل ترويحة أربع ركعات بتسليمتين غير الوتر، و هو ثلاث ركعات، و في سنن البيهقي بإسناد صحيح كما قال ابن العراقي في شرح التقريب، عن السائب بن يزيد قال: كانوا يقومون على عهد عمر الخطاب في شهر رمضان بعشرين ركعة، و في الموطا عن يزيد بن رومان قال: كان الناس يقومون في زمن عمر بثلاث و عشرين. و في رواية بإحدى عشرة، و جمع البيهقي بينهما بأنهم كانوا يقومون بإحدى عشرة ثم قاموا بعشرين و أوتروا بثلاث و قد عدوا ما وقع في زمن عمر رضي الله عنه كالإجماع. (عون الباري- نواب صديق حسن خان (م: ۱۳۰۷ھ): ۲/۸۶۱، كتاب صلاة التراويح، ط: دار الرشيد- حلب)

(۲) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: بیس رکعات تراویح کا ثبوت اور اس کی حقیقت۔

ذمہ داری تراویح کی نہیں تھی؛ اس وجہ سے اگر اہل قریہ آپ کو تراویح کی ذمہ داری حوالہ نہ کریں، تو آپ کا کوئی حق تلف نہیں ہوا، (۱) ان کا یہ فعل جائز ہے؛ البتہ آپ کی ذمہ داری پنج وقتہ نمازوں کی تھی، اس کے متعلق حق تلفی ہوئی ہو، تو آپ ان سے رجوع کر سکتے ہیں، مگر احقر کا مشورہ ہے کہ ایک ماہ کا مسئلہ ہے، مہمان چلے جائیں، اس کے بعد اپنی ذمہ داری ادا کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] نابالغ کا تراویح پڑھانا

۹۲۱- سوال: یک لڑکے کی برتھ سرٹیفکیٹ (ولادت نامہ) ہم بھیج رہے ہیں، وہ لڑکا تراویح

(۱) مستقل امام کو حق تراویح ہے یا دوسرے مقررہ حافظ کو؟ اس سلسلے میں حضرت مفتی بیات صاحبؒ نے جو کچھ رقم فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقل امام کے ذمہ تراویح نہیں ہے، حالاں کہ فتاویٰ دار العلوم میں ہے کہ تراویح کی امامت کا حق بھی امام راتب ہی کو حاصل ہے، ملاحظہ فرمائیں اصل سوال اور جواب:

سوال: بکر ایک مسجد میں امام مقرر ہوا، اور حافظ قرآن ہے، اور زید بھی حافظ قرآن ہے، وہ زمانہ بعید سے اس مسجد میں تراویح پڑھاتا ہے، اب بکر کہتا ہے کہ میں اب امام مقرر ہوا ہوں، تو تراویح پڑھانے کا حق مجھ کو ہی ہے، اور وہ حافظ کہتا ہے کہ میرا قدیمی حق ہے، تو کس کو حق حاصل ہے؟

الجواب: صورت مسئولہ میں جب کہ بکر امام مقرر ہو گیا، تو تراویح کی امامت کا حق بھی اسی کو حاصل ہے۔ فقط۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۴/ ۲۸۲، مسائل تراویح، سوال نمبر: ۱۸۴۳، مرتب: مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ، ط: زکریا- دیوبند)

حضرت مفتی عبد الرحیم لاج پوریؒ ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں:

تراویح پڑھانے کا حق امام کا ہے، اگر امام نہ پڑھا سکے، یا امام اجازت دے دے، تو دوسرے حافظ کو سپرد کرنا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۶/ ۲۵۷، مسائل تراویح، مقرر امام تراویح پڑھانے کا حق دار ہے، ط: دار الاشاعت، پاکستان)

امامت کا ترجیحی بنیاد پر کون زیادہ مستحق ہے؟ اس مسئلہ کو علامہ حصکفیؒ نے یوں لکھا ہے:

(و) اعلم أن (صاحب البيت) ومثله إمام المسجد الراتب (أولى بالإمامة من غيره) مطلقا.

علامہ شامی نے وضاحت کی ہے: (قوله مطلقا) أي وإن كان غيره من الحاضرين من هو أعلم وأقرأ منه. (رد المحتار مع الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، کتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

الغرض امام راتب ترجیحی بنیاد پر تراویح پڑھانے کا حق دار ہے، فتاویٰ دار العلوم اور فتاویٰ رحیمیہ میں یہی ہے، علامہ شامیؒ کی مندرجہ بالا عبارت کے عموم سے بھی یہی بات مترشح ہوتی ہے؛ اس لیے خیال ہوتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی رائے اس صورت پر محمول ہے، جب کہ یہ شرط امام اور متولی کے درمیان طے ہوئی ہو کہ صرف پنج وقتہ نماز اور تعلیم الصبیان کے لیے امام کی تقرری عمل میں لائی جا رہی ہے، جیسا کہ مفتی صاحبؒ کے جواب کے ابتدائی جملوں سے معلوم ہو رہا ہے، نیز ہمارے عرف میں بھی ایسا ہی ہے؛ اس لیے اگر یہ شرط ہو تو "المسلمون علی شروطهم" [ابو داود، باب فی الصلح، حدیث نمبر: ۳۵۹۴، عن ابی ہریرۃؓ] کے پیش نظر متولی کو حق ہوگا کہ تراویح کے لیے کسی اور کو موقع دے اور یہ امام راتب کی حق تلفی نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

پڑھانا چاہتا ہے، تو کیا وہ تراویح پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ جلد جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مسلک احناف میں نابالغ لڑکے کو فرائض، تراویح اور دیگر نوافل میں امام بنانا جائز نہیں۔[۱] اگر لڑکے کو احتلام ہوتا ہو، خواہ اس کی عمر بارہ سال ہو، وہ بالغ شمار ہوگا، اس کو امام بنانا جائز ہے، اور اگر احتلام نہ ہوتا ہو، تو پندرہ سال کی عمر ہونے کے بعد اسے بالغ قرار دیا جائے گا، اس سے پہلے اس کو امام بنانا جائز نہیں ہے۔[۲]

---

(۱) ولا يجوز للرجال أن يقتدوا بامرأة أو صبي "...... وأما الصبي فلأنه متنفل فلا يجوز اقتداء المفترض به، وفي التراويح والسنن المطلقة جوزه مشايخ بلخ رحمهم الله ولم يجوزه مشايخنا رحمهم الله... والمختار أنه لا يجوز في الصلوات كلها. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر، المرغيناني، برهان الدين (م:۵۹۳ھ): ۱/۵۷، باب الإمامة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

[۲] (بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال) والأصل هو الإنزال (والجارية بالاحتلام والحيض والحبل) ولم يذكر الإنزال صريحا لأنه قلما يعلم منها (فإن لم يوجد فيهما) شيء (فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتى) لقصر أعمار أهل زماننا (وأدنى مدته له اثنا عشرة سنة ولها تسع سنين) هو المختار كما في أحكام الصغار. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۱۵۳-۱۵۴، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، ط: دار الفكر - بيروت)

ثم بلوغه إما أن يكون بالعلامة أو بالسن والعلامة في ذلك الإنزال بالاحتلام والإحبال، وفي حق الجارية بالاحتلام والحبل والحيض قالوا وأدنى المدة في حق الغلام اثنا عشر سنة، وفي حق الجارية تسع سنين... وأما بلوغهما بالسن فقدر أبو حنيفة - رحمه الله تعالى - في الجارية بسبع عشرة سنة، وفي الغلام بتسع عشرة سنة.

وفي كتاب الوكالة ذكر في الغلام ثمان عشرة سنة في موضع، وفي موضع تسع عشرة سنة من أصحابنا من وفق فقال المراد أن يتم له ثمان عشرة سنة ويطعن في التاسع عشرة ولكن ذكر في نسخ أبي سليمان في كتاب الوكالة حتى يستكمل تسع عشرة سنة ففيه روايتان إذن.

وعلى قول أبي يوسف ومحمد والشافعي رحمهم الله تعالى في الغلام والجارية يتقدر بخمس عشرة سنة لحديث ابن عمر - رضي الله تعالى عنه - قال: عرضت على رسول الله - صلى الله عليه وسلم - يوم أحد وأنا ابن أربع عشرة سنة فردني، ثم عرضت عليه يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة سنة فأجازني. ولما سمع عمر بن عبد العزيز - رضي الله تعالى عنه - هذا الحديث، قال: هذا هو الفصل بين البالغ وغير البالغ وكتب به إلى أمراء الأجناد والمعنى فيه أن العادة الظاهرة أن البلوغ لا يتأخر عن هذه المدة. (المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۶/ ۵۴، كتاب الطلاق، باب العدة وخروج المرأة من بيتها، ط: دار المعرفة - بيروت☆ بدائع الصنائع: ۷/ ۱۷۲، كتاب الحجر، فصل في بيان ما يرفع الحجر، ط: دار الكتب العلمية☆ الهداية في شرح بداية المبتدي-المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳ھ): ۳/۲۸۱، كتاب الحجر، فصل: في حد البلوغ، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

لڑکا جب بالغ ہوجاتا ہے، تو مرد کے حکم میں ہوتا ہے، اس پر نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا فرض ہوجاتا ہے، اسی طرح اس کی امامت بھی درست ہوجاتی ہے۔ (شامی (۱)، عالمگیری (۲)) [۳] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] مسجد کے فنڈ سے تراویح پڑھانے والے کا ہدیہ اور خطیب کا خرچ ادا کرنا

۹۲۲- سوال: تراویح پڑھانے والے امام صاحب کو ہدیہ دینا، اسی طرح کسی عالم کو بیان وتقریر کے لیے بلانے پر ان کے ٹکٹ وغیرہ کا انتظام کرنا مسجد کے فنڈ سے جائز ہے یا نہیں؟ یعنی مسجد کی رقم ان امور میں صرف کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

چندہ دینے والوں نے کس مقصد سے چندہ دیا ہے، اس کا اعتبار ہوگا، اگر چندہ میں صراحتاً یا عرفاً اس کی اجازت ہو، تو گنجائش ہے۔ [۴]

البتہ تراویح کا معاوضہ لینا اور دینا جائز نہیں ہے، حنفی مسلک میں امامت (اور دیگر طاعات) پر

---

(۱) رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۷۶-۵۷۷، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۵، الباب الخامس في الإمامة، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماما لغيره، ط: دار الفكر.

(۳) عن عائشة رضي الله عنها، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتى يستيقظ، وعن المبتلى حتى يبرأ، وعن الصبي حتى يكبر". (سنن أبي داود: ۲/ ۲۰۲، رقم الحديث: ۴۳۹۸، كتاب الحدود، باب في المجنون يسرق أو يصيب حدا، ط: البدر - ديوبند، وانظر رقم: ۴۴۰۱، عن ابن عباس، ۴۴۰۳، عن علي ☆ سنن الترمذي، رقم الحديث: ۱۴۲۳، أبواب الحدود، باب ما جاء فيمن لا يجب عليه الحد ☆ المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي، رقم الحديث: ۳۴۳۲، كتاب الطلاق، باب: من لا يقع طلاقه من الأزواج)

[۴] (ويبدأ من غلته بعمارته) ثم ما هو أقرب لعمارته كإمام مسجد ومدرس مدرسة يعطون بقدر كفايتهم ثم السراج والبساط كذلك إلى آخر المصالح وتمامه في البحر.

في الشامية: قال في الحاوي القدسي: والذي يبدأ به من ارتفاع الوقف أي من غلته عمارته شرط الواقف أو لا ثم ما هو أقرب إلى العمارة، وأعم للمصلحة كالإمام للمسجد، والمدرس للمدرسة يصرف إليهم إلى قدر كفايتهم، ثم السراج والبساط كذلك إلى آخر المصالح، هذا إذا لم يكن معينا، فإن كان الوقف معينا على شيء يصرف إليه بعد عمارة البناء اهـ... وقوله إلى آخر المصالح: أي مصالح المسجد يدخل فيه المؤذن والناظر ويدخل تحت الإمام الخطيب لأنه إمام الجامع اهـ ملخصا. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۳۶۷، كتاب الوقف، مطلب في وقف المنقول قصدا، ط: دار الفكر - بيروت)

اجرت ضرورتاً جائز ہے [۱] تراویح میں ختم قرآن ضروری نہیں؛ لہٰذا یہاں ضرورت متحقق نہیں ہے۔ ہاں تراویح پڑھانے والے امام صاحب کے ذمہ ایک دو فرض نماز پڑھانا بھی مقرر کیا جائے، تو ان فرض نمازوں کی اجرت لینا جائز ہوگا۔ [۲] تراویح کے نام پر کچھ بھی معاوضہ لینا اور دینا جائز نہیں۔ پس مسجد کے فنڈ سے تراویح کے نام پر رقم دینا جائز نہ ہوگا۔ [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] تراویح کے بعد وتر سے پہلے اجتماعی دعاء کا حکم

۹۲۳-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین، اس مسئلہ میں کہ: رمضان کے مہینے میں تراویح کے بعد وتر نماز سے پہلے جو اجتماعی دعا کی جاتی ہے، کیا وہ خلاف شریعت ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد امام اور مقتدیوں کو اختیار ہے کہ تسبیح پڑھیں، قرآن شریف پڑھیں یا انفرادی طور پر چار رکعت نفل پڑھیں یا خاموش بیٹھے رہیں، یا مسجد الحرام میں ہوں تو طواف کریں اور مدینہ

---

(۱) ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والإمامة والأذان. (الدر المختار)

(قوله ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن إلخ) قال في الهداية: وبعض مشايخنا - رحمهم الله تعالى - استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم لظهور التواني في الأمور الدينية، ففي الامتناع تضييع حفظ القرآن، وعليه الفتوى اهـ، وقد اقتصر على استثناء تعليم القرآن أيضا في متن الكنز ومتن مواهب الرحمن وكثير من الكتب، وزاد في مختصر الوقاية ومتن الإصلاح تعليم الفقه، وزاد في متن المجمع الإمامة، ومثله في متن الملتقى ودرر البحار.

وزاد بعضهم الأذان والإقامة والوعظ، وذكر المصنف معظمها، ولكن الذي في أكثر الكتب الاقتصار على ما في الهداية، فهذا مجموع ما أفتى به المتأخرون من مشايخنا... وقد اتفقت كلمتهم جميعا في الشروح والفتاوى على التعليل بالضرورة وهي خشية ضياع القرآن كما في الهداية. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/۵۵-۵۶، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، ط: دار الفكر)

(۲) فالحاصل: أن ما يتخلص به الرجل من الحرام أو يتوصل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن، وإنما يكره ذلك أن يحتال في حق لرجل حتى يبطله، أو في باطل حتى يموهه، أو في حق حتى يدخل فيه شبهة، فما كان على هذا السبيل فهو مكروه، وما كان على السبيل الذي قلنا أولا فلا بأس به. (المبسوط للسرخسي - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۳۰/۲۱۰، كتاب الحيل، ط: دار المعرفة - بيروت)

(۳) ويكره للرجال أن يستأجروا رجلا يؤمهم في بيتهم؛ لأن استئجار الإمام فاسد. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۱۶، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، ط: دار الفكر - بيروت)

(مسجد نبوی) میں ہوں، تو چار رکعت انفراداً پڑھیں۔ (البحر الرائق شرح کنز: ۲/ ۶۹ - عالم گیری: ۱/ ۲)[1]

اسی طرح بیس رکعت کے بعد اور وتر سے قبل تسبیح، تحمید، درود شریف، استغفار وغیرہ پڑھیں یا انفرادی واجتماعی دعا مانگیں؛ سب جائز ہے، فتاویٰ دار العلوم میں ہے کہ تراویح کے بعد دعا مانگنا درست؛ بل کہ مستحب ہے اور متاخرین کا اس پر عمل ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۴/ ۲۵۳) لہٰذا اس موقع پر دعا مانگنا شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] تراویح پڑھانے والے کو ہدیہ پیش کرنا

۹۲۴- سوال: تراویح پڑھانے والے کو ہدیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

تراویح پڑھانے والے کو بہ طور اجرت کچھ بھی دینا جائز نہیں ہے۔[2] البتہ ہدیہ دینے کی گنجائش ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] تراویح پر اجرت لینا

۹۲۵- سوال: اگر کوئی حافظ قرآن رمضان المبارک میں تراویح پڑھائے، اور وہاں کے لوگ اس کو یہ کہیں کہ ہم آپ کو تین سو روپے دے رہے ہیں، اس میں سے آپ اپنے کھانے پینے کا انتظام بھی

---

[۱] وقد قالوا أنهم مخيرون في حالة الجلوس إن شاءوا سبحوا، وإن شاءوا قرءوا القرآن، وإن شاءوا صلوا أربع ركعات فرادى، وإن شاءوا قعدوا ساكتين، وأهل مكة يطوفون أسبوعا ويصلون ركعتين، وأهل المدينة يصلون أربع ركعات فرادى. (البحر الرائق: ۲/ ۱۲۲، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الكتاب-ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۵، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، زكريا- ديوبند)

ويستحب الجلوس بين الترويحتين قدر ترويحة، وكذا بين الخامسة والوتر. كذا في الكافي وهكذا في الهداية، ولو علم أن الجلوس بين الخامسة والوتر يثقل على القوم لا يجلس. هكذا في السراجية، ثم هم مخيرون في حالة الجلوس إن شاءوا سبحوا، وإن شاءوا قعدوا ساكتين، وأهل مكة يطوفون أسبوعا ويصلون ركعتين، وأهل المدينة يصلون أربع ركعات فرادى. كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۵، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح)

(۲) وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ۝ (۲-البقرة: ۴۱)

(۳) مسئلہ کی تفصیل اور تخریج کے لیے دیکھیے عنوان: "مسجد کے فنڈ سے تراویح پڑھانے والے کا ہدیہ اور خطیب کا خرچ ادا کرنا" کے حواشی۔

کرلینا، اور اسی میں سے آپ کی تراویح کا ہدیہ بھی ہوجائے گا، تو کیا ایسی رقم لے کر تراویح پڑھانا جائز ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

تراویح پر اجرت لینا جائز نہیں۔ (۱)

اس کی جائز صورت یہ ہے کہ حافظ صاحب معاملہ اس طرح طے کریں کہ رمضان میں ایک نماز مثلاً مغرب کی نماز پڑھاؤں گا، اور اجرت تین سو روپے لوں گا، کھلانے کی ذمہ داری گاؤں والوں کی نہیں رہے گی، تو ایسی صورت میں خشک تنخواہ تین سو روپے دے دینا جائز ہے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] تراویح پڑھانے کی اُجرت لینا

۹۲۶- سوال: رمضان المبارک میں تراویح پڑھانے کے بعد بہ طور ہدیہ جو رقم دی جاتی ہے، اُس کا لینا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

تراویح پڑھانے کے لیے اُجرت لینا جائز نہیں ہے۔ (۳)

---

(۱) وَلَا تَشْتَرُوا بِاٰيٰتِي ثَمَنًا قَلِيْلًا ۚ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝ (۲-البقرة: ۴۱)

عن بريدة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من قرأ القرآن يتأكل به الناس، جاء يوم القيامة ووجهه عظم ليس عليه لحم. (شعب الإيمان-أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۳/ ۱۹۵، رقم الحديث: ۲۳۸۴، تعظيم القرآن، فصل في ترك قراءة القرآن في المساجد والأسواق ليعطى وليستأكل به، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون)

عن زاذان، قال: سمعته يقول: من قرأ القرآن يأكل به الناس، جاء يوم القيامة ووجهه عظم ليس عليه لحم. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار-أبو بكر بن أبي شيبة (م: ۲۳۵هـ): ۲/ ۱۹۸، رقم الحديث: ۷۷۴۱، في الرجل يقوم بالناس في رمضان فيعطى، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد-الرياض)

[۲] (و) لا لأجل الطاعات مثل (الأذان والحج والإمامة وتعليم القرآن والفقه) ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والإمامة والأذان. (الدر المختار) ———— قال العلامة بن عابدين: قال في الهداية: وبعض مشايخنا - رحمهم الله تعالى - استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم لظهور التواني في الأمور الدينية، ففي الامتناع تضييع حفظ القرآن وعليه الفتوى اهـ. (رد المحتار: ۶/ ۵۵، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، ط: دار الفكر-بيروت)

(۳) دیکھیے عنوان "تراویح پر اجرت لینا" کا حاشیہ نمبر: ۱

بہتر یہ ہے کہ تراویح پڑھانے والا ٹرسٹی کے ساتھ بات کر کے ایک دو نماز پڑھانے کی ذمہ داری قبول کر کے اُجرت طے کرے، اور تراویح فی سبیل اللہ پڑھائے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] تراویح اور ہدیہ

۹۲۷- سوال: ختم تراویح کے موقع سے مصلیان بہ خوشی کچھ رقم دیتے ہیں، سواُن کا لینا کیسا ہے؟ اور تراویح سے پہلے طے کرنا کہ میں اتنی رقم لوں گا، درست ہے یا نہیں؟ یہاں ایک عالم باعمل کہتے ہیں کہ تراویح پر پیسے لینا قرآن شریف بیچنے کے برابر ہے، اور اُس پر اُجرت لینا بالکل جائز نہیں ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

خوشی خوشی دیتے ہوں، تو لینے کی گنجائش ہے، لیکن پہلے سے شرط لگانا کہ اتنی رقم دیں گے، تو تراویح پڑھاؤں گا، حرام ہے، اس صورت میں دی گئی رقم لینا جائز نہیں ہے۔[۲]

حیلہ یہ ہے کہ حافظ صاحب یوں طے کریں کہ میں صبح، بچوں کو روزانہ دو گھنٹے پڑھاؤں گا، اور دو سو روپیہ لوں گا، تو یہ جائز ہے؛ [اس رقم کو اپنے خرچ میں استعمال کریں اور تراویح للہ پڑھائیں] کیوں کہ بچوں کو پڑھانے پر تنخواہ لینا جائز ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فالحاصل: أن مايتخلص به الرجل من الحرام أو يتوصل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن، وإنما يكره ذلك أن يحتال في حق لرجل حتى يبطله أو في باطل حتى يموهه أو في حق حتى يدخل فيه شبهة فما كان على هذا السبيل فهو مكروه، وما كان على السبيل الذي قلنا أولا فلا بأس به. (المبسوط للسرخسي- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۲۱۰/۳۰، كتاب الحيل، ط: دار المعرفة- بيروت)

(۱) وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ۝ (۲-البقرة: ۴۱)

عن بريدة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من قرأ القرآن يتأكل به الناس، جاء يوم القيامة ووجهه عظم ليس عليه لحم. (شعب الإيمان-أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۱۹۵/۴، رقم الحديث: ۲۳۸۴، تعظيم القرآن، فصل في ترك قراءة القرآن في المساجد والأسواق ليعطى وليستأكل به، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون)

عن زاذان، قال: سمعته يقول: من قرأ القرآن يأكل به الناس، جاء يوم القيامة ووجهه عظم ليس عليه لحم. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار-أبو بكر بن أبي شيبة (م: ۲۳۵ھ): ۱۶۸/۲، رقم الحديث: ۷۷۴۱، في الرجل يقوم بالناس في رمضان فيعطى، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد- الرياض)

[۳] (و) لا لأجل الطاعات مثل (الأذان والحج والإمامة وتعليم القرآن والفقه) ويفتى اليوم بصحتها لتعليم=

[۱۲] رمضان میں عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھنے والے کے لیے وتر کا حکم

۹۲۸-سوال: رمضان المبارک میں کسی شخص کو عشاء کی نماز نہ ملے اور وہ تراویح میں شرکت کرلے تو اس کے لیے وتر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

عشاء کی فرض نماز پڑھنے کے بعد ہی سنن اور تراویح پڑھے، فرض نماز ادا کیے بغیر وتر اور تراویح کی نماز ادا نہیں ہوگی۔ [۱] فرض اگر امام کے ساتھ نہ پڑھ سکا ہو تو تنہا ادا کرلے، اس کے بعد ہی تراویح میں شامل ہو اور جس قدر رکعات تراویح امام صاحب کے ساتھ ملے، اسے پڑھ لے، پھر وتر جماعت کے ساتھ ادا کرلے، تراویح کی جتنی رکعات باقی رہ گئی ہیں، انھیں بعد میں پڑھ لے۔ [۲] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] تراویح کے کسی ترویحہ میں آیت سجدہ چھوٹ جانے پر دوسرے ترویحہ میں قضا کرنا

۹۲۹-سوال: ایک حافظ صاحب تراویح پڑھا رہے تھے، وہ آیت سجدہ پڑھے بغیر ہی سجدے میں چلے گئے، دوسری رکعت میں بھی انہوں نے آیت سجدہ نہیں پڑھی، اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے اور نماز

=القرآن والفقه والإمامة والأذان. (الدر المختار) ـــ قال العلامة بن عابدين: قال في الهداية: وبعض مشايخنا - رحمهم الله تعالى - استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم لظهور التواني في الأمور الدينية، ففي الامتناع تضييع حفظ القرآن وعليه الفتوى اهـ. (رد المحتار: ۶/ ۵۵، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) والصحيح أن وقتها ما بعد العشاء إلى طلوع الفجر قبل الوتر وبعده، حتى لو تبين أن العشاء صلاها بلا طهارة، دون التراويح والوتر، أعاد التراويح مع العشاء دون الوتر؛ لأنها تبع للعشاء هذا عند أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - . . . وعندهما الوتر سنة العشاء كالتراويح فابتداء وقته بعد أداء العشاء فتجب الإعادة إذا أدي قبل العشاء وإن كان بالنسيان عندهما كالتراويح وبالجملة إعادة الوتر مختلف فيها، وأما إعادة التراويح وسائر سنن العشاء، فمتفق عليها إذا كان الوقت باقيا هكذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۵، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، ط: دار الفكر)

(۲) صلى العشاء وحده فله أن يصلي التراويح مع الإمام ولو تركوا الجماعة في الفرض ليس لهم أن يصلوا التراويح بجماعة وإذا صلى معه شيئا من التراويح أو لم يدرك شيئا منها أو صلاها مع غيره له أن يصلي الوتر معه هو الصحيح، كذا في القنية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۷، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، ط: دار الفكر)

پوری کرلی، اب دوسرے حافظ صاحب نے چھوٹی ہوئی اسی آیت کو پڑھ کر لوگوں کو دوبارہ سجدہ کروایا، تو وہ دو رکعت جس میں پہلے حافظ صاحب نے آیت سجدہ پڑھے بغیر ہی لوگوں کی نماز پوری کرادی تھی، آیا یہ دو رکعت صحیح ہوگی یا نہیں؟ اور اگر صحیح نہ ہو تو نماز لوٹانی پڑے گی یا کچھ اور کرنا پڑے گا؟ اگر نماز لوٹانی پڑے گی تو کیا ان لوگوں کو، جو اگلے روز نماز میں حاضر تھے، ان کو آج سجدے کے وقت اطلاع کرنی پڑے گی؟

الجواب حامداومصلیا:

آیت سجدہ پڑھے بغیر اگر امام صاحب نے تراویح سجدہ کرلیا، تو اس پر سجدۂ سہو کرنا لازم تھا۔[1] سجدۂ سہو نہیں کیا، تو اس پر اسی وقت دو رکعت دوبارہ پڑھنا لازم ہوا؛ کیوں کہ سجدۂ سہو چھوٹ جانے سے اس پر نماز کا لوٹانا واجب تھا، اب وقت گذر گیا؛ اس لیے نماز لوٹانا ضروری نہیں۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] تراویح کی تمام رکعت کی ایک ساتھ نیت کرنا کافی ہے

• ۹۳۰- سوال: کیا تراویح کی بیس رکعت کی نیت ایک ساتھ کرلینا کافی ہے یا دو دو رکعات کی الگ الگ نیت کرنا ضروری ہوگا؟

الجواب حامداومصلیا:

ہر دو رکعت پر نیت کرنا افضل ہے، اور ایک ساتھ بیس رکعات کی نیت کرنا بھی جائز ہے (فتاوی قاضی خان، فتاوی ہندیہ)[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولا يجب السجود إلا بترك واجب، أو تأخيره، أو تأخير ركن، أو تقديمه، أو تكراره، أو تغيير واجب، بأن يجهر فيما يخافت، وفي الحقيقة وجوبه بشيء واحد، وهو ترك الواجب. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۶، كتاب الصلاة، الباب الثاني عشر في سجود السهو، ط: دار الفكر)

(۲) والوجوب مقيد بما إذا كان الوقت صالحا؛ حتى إن من عليه السهو في صلاة الصبح، إذا لم يسجد حتى طلعت الشمس بعد السلام الأول سقط عنه السجود... وكل ما يمنع البناء إذا وجد بعد السلام يسقط السهو. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۵، كتاب الصلاة، الباب الثاني عشر في سجود السهو، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۱۶۳، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: دار الكتاب ديوبند ☆ رد المحتار: ۲/ ۵۴۲، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: مكتبه زكريا- ديوبند)

[۳] وهل يحتاج لكل شفع من التراويح أن ينوي التراويح الأصح أنه لا يحتاج ؛ لأن الكل بمنزلة صلاة واحدة، هكذا في فتاوى قاضي خان فإذا صلى التراويح مع الإمام ولم يجدد لكل شفع نية جاز ، كذا في السراجية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۷، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، ط: دار الفكر- بيروت) =

[۱۵] رمضان کی ستائیسویں شب میں ہی قرآن مکمل کرنا ضروری نہیں ہے

۹۳۱- سوال: پوری دنیا میں رمضان کی ستائیسویں شب میں قرآن کریم پورا کیا جاتا ہے؛ لیکن یہاں (انگلینڈ) میں چھبیسویں تراویح میں مولانا صاحب نے قرآن کریم مکمل کیا، جب ان سے پوچھا گیا، تو کہنے لگے کہ: ستائیسویں تراویح میں قرآن ختم کرنا اور شیرینی تقسیم کرنا بدعت ہے"، تو کیا ستائیسویں تراویح میں قرآن پورا کرنا یا کوئی میٹھی چیز تقسیم کرنا بدعت ہے؟ کیا اس پر ہمیشہ عمل کرنے میں کوئی حرج ہے؟ اس بارے میں پیسے جمع کر کے اس سے کوئی مٹھائی خرید کر تقسیم کرنا جائز ہے؟ اگر یہ سمجھ کر کہ ستائیسویں تراویح میں قرآن مکمل کرنا بدعت ہے، کسی اور رات میں مکمل کرے، تو کیا اس میں بھی کوئی حرج ہے؟ بالتفصیل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداو مصليا:

تراویح میں ایک مرتبہ قرآن کریم پورا کرنا سنت ہے، دو مرتبہ مستحب اور تین مرتبہ افضل ہے؛ لیکن در مختار میں لکھا ہے اس طرح پڑھے کہ لوگ تکلیف محسوس نہ کریں؛ اس لیے قرآن کریم مکمل کرنے کے لیے کوئی تاریخ مقرر کرنا ضروری نہیں ہے۔ ۲۱/تا ۲۹/رجب چاہے مکمل کر سکتے ہیں؛ لیکن ۲۷/کی رات میں پورا کرنے کو علامہ شامیؒ نے زیلعیؒ کے حوالے سے مستحب لکھا ہے۔[۱]

=وهل يحتاج لكل شفع من التراويح أن ينوي ويعين قال بعضهم يحتاج؛ لأن كل شفع صلاة والأصح أنه لا يحتاج؛ لأن الكل بمنزلة صلاة واحدة. اهـ. (البحر الرائق: ۱/ ۲۹۳، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الجوهرة النيرة-أبو بكر بن علي الحدادي، الزَّبِيدِيّ، الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/ ۹۹، كتاب الصلاة، باب قيام شهر رمضان، ط: المطبعة الخيرية)

[۱] (والختم) مرة سنة ومرتين فضيلة وثلاثا أفضل. (ولا يترك) الختم (لكسل القوم) لكن في الاختيار: الأفضل في زماننا قدر ما لا يثقل عليهم. (الدر المختار) ــــــــ وفي الشامية: قال الزيلعي: ومنهم من استحب الختم في ليلة السابع والعشرين، رجاء أن ينالوا ليلة القدر؛ لأن الأخبار تظاهرت عليها. (رد المحتار: ۲/ ۴۹۷، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: مكتبه زكريا-ديوبند)

وقوله والختم مرة... على أن السنة الختم مرة فلا يترك لكسل القوم، ويختم في الليلة السابع والعشرين، لكثرة الإخبار أنها ليلة القدر، ومرتين فضيلة، وثلاث مرات، في كل عشر مرة أفضل كذا في الكافي، وذكر في المحيط والاختيار: أن الأفضل أن يقرأ فيها مقدار ما لا يؤدي إلى تنفير القوم في زماننا؛ لأن تكثير الجمع أفضل من تطويل القراءة. (البحر الرائق: ۲/ ۱۲۰، ۱۲۱، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: مكتبه دار الكتاب-ديوبند)

لیکن جب امر مستحب، رسم بن جائے، لوگ اس کو ضروری سمجھ کر کرنے لگیں، اس طور پر کہ، جو لوگ ۲۷/ کی رات میں قرآن کریم مکمل نہ کریں، ان کو برا بھلا کہا جائے، تو اس طرح ضروری سمجھنا، بدعت ہے؛ اس طرح جب کوئی امر مستحب، بدعت بن جائے، تو اس کو چھوڑ دینا چاہیے؛ لہٰذا مذکورہ خرابی کی وجہ سے اور بدعت سے بچنے کے لیے آپ کے امام صاحب نے ۲۷/ کی بجائے ۲۶ کی شب میں قرآن کریم مکمل کیا، تو یہ شریعت کے عین مطابق ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] ۲۷/ ویں شب میں ختم قرآن کو ضروری سمجھنا

۹۳۲- سوال: آج کل تقریباً ہر جگہ، تراویح میں ۲۷/ ویں شب ہی کو قرآن کریم ختم کیا جاتا ہے اور بہت سے لوگ اسی رات میں ختم کرنا ضروری سمجھتے ہیں؛ حتی کہ اگر کوئی کسی اور رات میں ختم کرنے کی بات کرتا ہے، تو اس کی سخت مخالفت کی جاتی ہے اور دلیل کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ستائیسویں رات میں ہی شب قدر ہوتی ہے، تو کیا تعیین کے ساتھ ستائیسویں رات میں ہی شب قدر کا ہونا حدیث شریف سے ثابت ہے؟ بینوا و توجروا۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

تراویح میں ختم قرآن کے لیے کسی تاریخ کو متعین کرنا اور اسی میں ختم کو ضروری سمجھنا بدعت ہے۔[۲]

رمضان المبارک کی کسی بھی رات میں تراویح مکمل کی جاسکتی ہے، اور رہی شب قدر کی بات، تو یہ مبارک رات اخیری عشرے کی طاق راتوں میں زیادہ تر ہوتی ہے، اور رمضان المبارک کے پہلے دو عشرے میں بھی اس کا امکان ہے اور جفت راتوں میں بھی؛ مگر زیادہ تر ستائیسویں رات میں ہوتی ہے۔[۳]

---

(۱) قال ابن حجر في شرحه: قال ابن المنير: فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها؛ لأن التيامن مستحب في كل شيء، أي من أمور العبادة؛ لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه، أشار إلى كراهته، والله أعلم. (فتح الباري- ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲هـ): ۳۳۸/۲، قوله باب الانفتال والانصراف عن اليمين و الشمال، رقم الحديث: ۸۵۲، ط: دار المعرفة- بيروت، ۱۳۷۹)

(۲) تقدم تفصيله و تخريجه تحت عنوان: ''رمضان کی ستائیسویں شب میں ہی قرآن مکمل کرنا ضروری نہیں ہے''۔

(۳) عن عائشة رضي الله عنها: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: تحروا ليلة القدر في الوتر، من العشر الأواخر من رمضان. (صحيح البخاري: ۲۷۰/۱، رقم الحديث: ۲۰۱۷، كتاب الصوم، باب تحري ليلة القدر في الوتر من العشر الأواخر، ط: البدر- ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۳۷۰/۱، رقم الحديث: ۲۱۹-(۱۱۶۹)، كتاب الصيام، باب استحباب صوم ستة أيام من شوال إتباعا لرمضان، ط: البدر- ديوبند) =

ترمذی شریف میں ہے کہ حضرت ابی بن کعب قسم کھا کر کہتے تھے کہ وہ (لیلۃ القدر) ستائیسویں ہی رات ہے، اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس رات کی نشانی بھی بتلائی ہے اور ہمیں وہ علامت یاد ہے۔ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابیؓ سے دریافت کیا اے ابوالمنذر! تم نے کیسے جانا کہ شب قدر ستائیسویں رات ہی کو ہوتی ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں خبر دی کہ اس رات کی صبح میں یہ آفتاب اس حال میں طلوع ہوتا ہے کہ اس کی کوئی شعاع نہیں ہوتی، ہم لوگوں نے ان علامتوں کو شمار کیا اور اچھی طرح یاد کر لیا، اور قسم بہ خدا! حضرت ابن مسعودؓ بھی جانتے ہیں کہ وہ رمضان المبارک کی ستائیسویں رات ہے؛ لیکن ابن مسعود تمہیں اس لیے بتلانے پر راضی نہیں ہوئے کہ تم لوگ (ستائیسویں شب پر) اعتماد کر کے بیٹھ جاؤ گے (اور دوسری راتوں میں عبادت کرنا ترک کر دو گے) [ترمذی شریف جلد۱صفحہ ۱۶۴] (۱)

=عن أبي ذر قال: قلت: يا رسول الله أخبرني عن ليلة القدر أفي كل رمضان هي؟ قال: نعم، قلت: أفتكون مع الأنبياء، و إذا رفعوا رفعت أو إلى يوم القيامة؟ قال: لا بل إلى يوم القيامة، ثم حدث رسول الله صلى الله عليه وسلم وحدث فاهتبلت غفلة رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت: بأبي وأمي في أي رمضان هي؟ قال: في العشر الأول والعشر الأواخر، ثم حدث رسول الله صلى الله عليه وسلم وحدث، فاهتبلت غفلة رسول الله صلى الله عليه وسلم قلت: بأبي وأمي يا رسول الله، في أي العشرين هي؟ قال: في العشر الأواخر، ثم حدث رسول الله صلى الله عليه وسلم وحدث فاهتبلت غفلة رسول الله صلى الله عليه وسلم قلت: بأبي وأمي يا رسول الله، أقسم عليك بحقي لما أخبرتني في أي العشر هي فغضب علي غضبا لم يغضب علي قبله مثله ثم قال: في السبع الأواخر، لا تسألني عن شيء بعدها. (السنن الكبرى-أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۳/ ۴۰۷، رقم الحديث: ۳۴۱۳، كتاب الاعتكاف، ليلة القدر في كل رمضان، قبيل: كتاب المحاربة، ت: حسن عبد المنعم شلبي، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت ☆مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۳۵/ ۳۹۳، رقم الحديث: ۲۱۴۹۹، مسند الأنصار، حديث أبي ذر الغفاري رضي الله عنه، ط: مؤسسة الرسالة☆المستدرك على الصحيحين-أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله بن محمد بن حمدويه، النيسابوري المعروف بابن البيع (م: ۴۰۵هـ): ۱/ ۶۰۳، رقم الحديث: ۱۵۹۶، كتاب الصوم، وأما حديث شعبة، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۱) وقد روي عن أبي بن كعب أنه: "كان يحلف أنها ليلة سبع وعشرين، ويقول: أخبرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم بعلامتها فعددنا وحفظنا". (سنن الترمذي: ۱/ ۱۶۴، تحت رقم الحديث: ۷۹۲، أبواب الصوم، باب ما جاء في ليلة القدر، ط: البدر - ديوبند)

عن زر قال: قلت لأبي بن كعب: أنى علمت أبا المنذر أنها ليلة سبع وعشرين، قال: بلى أخبرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم أنها ليلة صبيحتها تطلع الشمس ليس لها شعاع، فعددنا، وحفظنا والله لقد علم ابن مسعود أنها في رمضان، وأنها ليلة سبع وعشرين، ولكن كره أن يخبركم فتتكلوا. (سنن الترمذي: ۱/ ۱۶۴، رقم الحديث: ۷۹۳، أبواب الصوم، باب ما جاء في ليلة القدر)

مذکورہ روایتوں کے پیش نظر بزرگان دین نے ستائیسویں شب میں ختم قرآن کو مستحب قرار دیا ہے، اور اسی شب میں ختم قرآن کا معمول رہا ہے، اگر چہ اسی کو ضروری سمجھ لینا ٹھیک نہیں، مگر اس کی بنیا درست اور صحیح ہے؛ لہٰذا ستائیسویں شب کو قرآن ختم کرنے میں حرج نہیں؛ بل کہ ضروری سمجھے بغیر اس رات میں قرآن کریم ختم کیا جائے تو اچھی بات ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] بلا عذر تنہا نماز تراویح ادا کرنا

۹۳۳- سوال: ہمارے محلہ میں ایک نوجوان وصحت مند شخص نماز کا پابند ہے، اس کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں ہے، مسجد میں با جماعت نماز اور تراویح ہوتی ہے، بہ ظاہر اسے کوئی عذر نہیں ہے، اس کے باجود مسجد میں نماز ادا کرنے کے بجائے اپنے گھر میں نماز ادا کرتا ہے، تو کیا اس کی نماز ادا ہو جائے گی؟ مذکورہ شخص کا یہ معمول طویل عرصہ سے ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

پنج وقتہ نماز کا با جماعت ادا کرنا ضروری ہے، کوئی آدمی بلا عذر بغیر جماعت کے تنہا نماز پڑھنے کی عادت بنالے، تو وہ سخت گنہ گار ہے، ایسے شخص کی گواہی مردود ہے۔ (درمختار جلد ا صفحہ ۵۵۲)[۲]

---

(۱) دیکھیے عنوان: ''رمضان کی ستائیسویں شب میں ہی قرآن مکمل کرنا ضروری نہیں ہے۔'' کا حاشیہ نمبر ۱-۲۔

[۲] عن أبي هريرة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: والذي نفسي بيده لقد هممت أن آمر بحطب، فيحطب، ثم آمر بالصلاة، فيؤذن لها، ثم آمر رجلا فيؤم الناس، ثم أخالف إلى رجال، فأحرق عليهم بيوتهم، والذي نفسي بيده لو يعلم أحدهم، أنه يجد عرقا سمينا، أو مرماتين حسنتين، لشهد العشاء. (صحيح البخاري: ۱/ ۸۹، رقم الحديث: ۶۴۴، كتاب الأذان، باب وجوب صلاة الجماعة، ط: البدر - ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۳۲، رقم الحديث: ۲۵۱-(۶۵۱)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب فضل صلاة الجماعة وبيان التشديد في التخلف عنها...، ط: البدر - ديوبند)

(والجماعة سنة مؤكدة للرجال)... (وقيل واجبة وعليه العامة) أي عامة مشايخنا وبه جزم في التحفة وغيرها. قال في البحر: وهو الراجح عند أهل المذهب (فتسن أو تجب) ثمرته تظهر في الإثم بتركها مرة (على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلاة بالجماعة من غير حرج)... (فلا تجب على مريض ومقعد وزمن ومقطوع يد ورجل من خلاف) أو رجل فقط، ذكره الحدادي... وكذا اشتغاله بالفقه لا بغيره، كذا جزم به الباقاني تبعا للبهنسي: أي إلا إذا واظب تكاسلا فلا يعذر ويعزر ولو بأخذ المال يعني بحبسه عنه مدة ولا تقبل شهادته إلا بتأويل بدعة الإمام أو عدم مراعاته. (الدر المختار: ۱/ ۵۵۲-۵۵۶) =

البتہ تراویح کی نماز بلا جماعت پڑھنا جائز ہے، تاہم باجماعت بہتر ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] محلہ کی مسجد چھوڑ کر دوسری مسجد میں نماز اور تراویح ادا کرنا

گذشتہ سے پیوستہ

۹۳۴- سوال: مذکورہ شخص اور ایک دوسرے آدمی نے اپنے محلہ کی مسجد میں (محلہ میں صرف پانچ قبیلے آباد ہیں) تراویح کی نماز نہیں پڑھی اور آدھے کلومیٹر دور، دوسری مسجد میں تراویح پڑھی، تو اس کے متعلق شرعا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

محلہ کی مسجد کا حق زیادہ ہے؛ لہٰذا مستحب یہ ہے کہ پنج وقتہ نماز محلہ کی مسجد میں ادا کرے، تراویح دوسری مسجد میں پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (درمختار)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= قال ابن عابدين: (قوله بتركها مرة) أي بلا عذر، وهذا عند العراقيين، وعند الخراسانيين إنما يأثم إذا اعتاده كما في القنية... (قوله من غير حرج) قيد لكونها سنة مؤكدة أو واجبة، فبالحرج يرتفع الإثم ويرخص في تركها، ولكنه يفوته الأفضل... لكن في نور الإيضاح: وإذا انقطع عن الجماعة لعذر من أعذارها وكانت نيته حضورها لولا العذر يحصل له ثوابها اهـ والظاهر أن المراد به العذر المانع كالمرض والشيخوخة والفلج، بخلاف نحو المطر والطين والبرد والعمى تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۴- ۵۵۵، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر- بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۲- ۸۳، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، ط: دار الفكر ☆ الهداية: ۱/ ۱۲۱، باب الإمامة، ط: ياسر نديم- ديوبند)

(۱) ونفس التراويح سنة على الأعيان عندنا، كما روى الحسن عن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - وقيل: تستحب والأول أصح. والجماعة فيها سنة على الكفاية، كذا في التبيين وهو الصحيح، كذا في محيط السرخسي. لو أدى التراويح بغير جماعة أو النساء وحدهن في بيوتهن يكون تراويح، كذا في معراج الدراية. ولو ترك أهل المسجد كلهم الجماعة فقد أساءوا وأثموا، كذا في محيط السرخسي. وإن تخلف واحد من الناس وصلاها في بيته فقد ترك الفضيلة ولا يكون مسيئا ولا تاركا للسنة وأما إذا كان الرجل ممن يقتدى به وتكثر الجماعة بحضوره وتقل عند غيبته فإنه لا ينبغي له ترك الجماعة، كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۶، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، ط: دار الفكر- بيروت)

[۲] ومسجد حيه أفضل من الجامع. (الدر المختار) ـــــــــ قال ابن عابدين: (قوله ومسجد حيه أفضل من الجامع) أي الذي جماعته أكثر من مسجد الحي، وهذا أحد قولين حكاهما في القنية، والثاني العكس، وما هنا جزم به في شرح المنية كما مر، وكذا في المصفى والخانية، بل في الخانية: لو لم يكن لمسجد منزله مؤذن، فإنه يذهب =

[۱۹] پیشگی اعلان کرنا کہ پہلی یا دوسری رکعت میں سجدہ تلاوت ہے

۹۳۵- سوال: تراویح میں سجدۂ تلاوت کی جو آیت آنے والی ہو، اس کا پہلے سے ہی مقتدیوں میں اعلان کرنا کہ دوسری رکعت میں سجدۂ تلاوت ہے، کیا اس طرح کہنا صحیح ہے؟

الجواب حامداومصليا:

اس طرح اعلان کرنا مناسب نہیں ہے، بزرگوں کے طریقے کے خلاف ہے، اور کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= إليه ويؤذن فيه ويصلي، ولو كان وحده؛ لأن له حقا عليه فيؤديه. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۵۹، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، مطلب في أفضل المساجد، ط: دار الفكر)

ولا يجب السجود إلا بترك واجب، أو تأخيره، أو تأخير ركن أو تقديمه، أو تكراره أو تغيير واجب، بأن يجهر فيما يخافت، وفي الحقيقة وجوبه بشيء واحد، وهو ترك الواجب، كذا في الكافي.

(عالم گیری: ١/ ١٢٦، سجود السہو، بیروت)

باب سجود السهو والتلاوة

[سجدۂ سہو اور سجدۂ تلاوت کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب سجود السھو

[سجدۂ سہو کا بیان]

[۱] ارکان کی ادائیگی کے دوران ایک رکن کی مقدار میں یا اس سے زیادہ تفکر کرنا

۹۳۶-سوال: نماز جسمانی وزبانی عبادت کا مجموعہ ہے اور جو عبادات بدنی ہیں، ان میں چار چیزیں گویا ظروف ہیں: قیامؔ، رکوعؔ، سجودؔ اور قعودؔ اور ان چاروں میں جو عبادت زبانی ہیں، وہ گویا مظروف ہیں، اب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ظرف اور مظروف دونوں لازم ہوتے ہیں؛ مثلاً: جہاں فرض اور واجب دونوں ایک ساتھ پائے جائیں؛ جیسا کہ قعدۂ اخیرہ ظرف اور اس میں تشہد کا پڑھنا مظروف ہیں؛ لیکن قعدہ بہ ذات خود تو فرض ہے اور اس میں تشہد کا پڑھنا واجب ہے؛ ہاں قعدۂ اولیٰ میں دونوں واجب ہیں، الغرض ایک شکل تو یہ ہوئی۔

دوسری شکل یہ ہے کہ ظرف ضروری اور مظروف غیر ضروری ہو؛ مثلاً: رکوع اور سجود ظرف ہیں، جو کہ فرض ہیں؛ لیکن ان کا مظروف، یعنی ان میں تین مرتبہ تسبیحات کا پڑھنا، مسنون، تین سے زیادہ مرتبہ مستحب اور تین سے کم مکروہ۔

تیسری شکل یہ ہے کہ ظرف تو ضروری ہو؛ مگر ان کا مظروف مخلوط، یعنی بعض صورتوں میں ضروری اور بعض صورتوں میں غیر ضروری؛ مثلاً: قیام بہ ذات خود ضروری، مگر اس میں ثناء کا پڑھنا غیر ضروری اور سورۂ فاتحہ کا پڑھنا اور سورت کا ملانا ضروری، اس میں غیر ضروری مقدم اور ضروری مؤخر اور اس کے برعکس قعدۂ اخیرہ میں تشہد ضروری جو کہ مقدم ہے اور درود و دعاء غیر ضروری جو کہ مؤخر ہیں۔

اب ایک بات تو بالکل یقینی ہے کہ شکل اول میں اگر تفکر بہ قدر ایک رکن تاخیر کا سبب بنے، تو وہ

موجب سجدۂ سہو ہے؛ لیکن دوسری اور تیسری شکل میں ایسا تفکر موجب سجدۂ سہو ہوگا یا نہیں؟ مثلاً رکوع میں جانے کے بعد تین تسبیحات پڑھنے سے پہلے یا پڑھنے کے بعد یا پڑھنے کے دوران تفکر میں لگ گیا اور زبان پڑھنے سے بالکل بند ہے اور یہ تفکر ایک رکن کی مقدار میں یا اس سے زیادہ رہا، تو سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟ نیز تحریمہ کے بعد سوچنا شروع کیا اور ایک رکن کی تاخیر کی مقدار میں تفکر کرتا رہا، اس کے بعد ثناء شروع کیا یا ثناء کے بعد یا ثناء کے درمیان میں تفکر پایا گیا؛ نیز قعدۂ اخیرہ میں تشہد کے بعد یہ تفکر پایا گیا، تو ان تمام صورتوں میں سجدۂ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداومصليا:

سجدۂ سہو کا وجوب، رکن کی تقدیم وتاخیر سے بھی ہوتا ہے، جیسا کہ فقہائے کرام نے اس کی صراحت کی ہے؛ لہٰذا رکوع وسجود کی تسبیحات گرچہ فرض نہیں ہیں، مگر ایک رکن کی مقدار میں تفکر، [غور وفکر میں لگے رہنا] رکن کی تاخیر کو مستلزم ہے؛ اس لیے سجدۂ سہو لازم ہوگا، شامی میں ہے:

وإن كان تفكره ليس إلا إطالة القيام أو الركوع أو السجود، وهذه الأذكار سنة لكنه أخر واجبا أو ركنا لا بسبب إقامة السنة بل بسبب التفكر، وليس التفكر من أعمال الصلاة. اهـ. (شامی: ۱/ ۷۶)[۱]

عدم وجوب سجدۂ سہو کی روایت غریب اور نادر ہے۔ (سعایہ شرح وقایہ: ۱/ ۲۰۸)

خلاصہ کلام یہ کہ سجدۂ سہو کے وجوب کا مدار رکن کی تقدیم وتاخیر ہے یا ترتیب واجب کا سقوط یا سہواً کسی واجب کا چھوڑ دینا ہے، کسی سنت یا نفل کو طویل کر دینے سے سجدۂ سہو لازم نہیں ہوگا۔ شامی میں لکھا ہے:

"... أنّ الملزم للسجود ما كان فيه تأخير الواجب أو الركن عن محله، إذ ليس في مجرد التفكر مع الأداء ترك واجب". (شامی: ۱/ ۷۰۷)[۲] واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] ایک رکعت کا مسبوق فوت شدہ رکعت میں سورت ملانا بھول گیا تو؟

۷۹۳- سوال: ایک شخص کی مغرب کی ایک رکعت فوت ہوگئی، امام کے سلام کے بعد جب وہ

[۱] رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۹۴، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، دار الفكر - بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۶، كتاب الصلاة، الباب الثاني عشر في سجود السهو، ط: زكريا - ديوبند.

[۲] رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۹۴، كتاب الصلاة، باب سجود السهو.

رکعت پوری کرنے کے لیے کھڑا ہوا، تو وہ سورۂ فاتحہ کے بعد سورت ملانا بھول گیا، سجدہ میں یہ بات یاد آئی اور اس نے اخیر میں سجدۂ سہو کرلیا، تو نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟ اور نماز میں قراءت فرض ہے یا واجب؟ جواب عنایت فرمائیں، مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے موافق نماز کی صحت کے لیے فرض کی دو رکعت اور نفل کی تمام رکعات میں مطلق قراءت فرض ہے اور سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ تین چھوٹی آیتوں کے بقدر قراءت کرنا واجب ہے۔[1]

مسبوق اپنی فوت شدہ رکعت کو پوری کرنے کے لیے کھڑا ہوا، سورۂ فاتحہ پڑھ لی؛ لیکن سورت ملانا بھول گیا، تو واجب ترک ہوا، چوں کہ اس نے سجدۂ سہو کرلیا ہے، اس لیے اس کی نماز ہوگئی۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] تیسری رکعت میں سہواً کس قدر بیٹھنے سے سجدۂ سہو لازم ہوگا؟

۹۳۸- سوال: امام صاحب تیسری رکعت میں بھول کر بیٹھ گئے اور مقتدی کے لقمہ کے بعد چوتھی رکعت کے لیے کھڑے ہوئے، تو اس صورت میں سجدۂ سہو واجب ہوا یا نہیں؟ اگر بنا سجدۂ سہو کیے نماز پوری کرلی ہو، تو کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

---

[۱] (قوله ومنها القراءة) أي قراءة آية من القرآن، وهي فرض عملي في جميع ركعات النفل والوتر وفي ركعتين من الفرض ... وأما قراءة الفاتحة والسورة أو ثلاث آيات فهي واجبة أيضا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۴۴۶، كتاب الصلاة، مبحث القراءة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) ولا يجب السجود إلا بترك واجب، أو تأخيره، أو تأخير ركن أو تقديمه، أو تكراره أو تغيير واجب، بأن يجهر فيما يخافت، وفي الحقيقة وجوبه بشيء واحد، وهو ترك الواجب، كذا في الكافي. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/۱۲۶، كتاب الصلاة، الباب الثاني عشر في سجود السهو، ط: دار الفكر☆بدائع الصنائع: ۱/ ۱۶۴، فصل بيان سبب وجوب سجود السهو، ط: دا الكتب العلمية - بيروت)

ولو سها عن الفاتحة فيهما أو في إحداهما، أو عن السورة فيهما أو في إحداهما - فعليه السهو؛ لأن قراءة الفاتحة على التعيين في الأوليين واجبة عندنا، ... وكذا قراءة السورة على التعيين، أو قراءة مقدار سورة قصيرة وهي ثلاث آيات واجبة، فيتعلق السجود بالسهو عنهما. (بدائع الصنائع: ۱/۱۶۶، فصل بيان سبب وجوب سجود السهو)

الجواب حامداومصليا:

پہلی اور تیسری رکعت کے بعد تھوڑی دیر بیٹھنا (جلسۂ استراحت) امام شافعیؒ کے نزدیک مستحب ہے۔[۱]
جب کہ احناف کے یہاں افضل یہ ہے کہ جلسۂ استراحت نہ کرے۔[۲] اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے علامہ شامیؒ نے صفحہ ۴۳۸ پر لکھا ہے کہ اگر زیادہ دیر تک بیٹھ جائے - اور وہ التحیات پڑھ لینے کی مقدار ہے - تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔ اور اگر تھوڑی دیر بیٹھ جائے - اور وہ التحیات سے کم مقدار ہے - تو سجدۂ سہو واجب نہ ہوگا۔[۳]
شامی کی اسی بحث کی بنیاد پر فتاویٰ دارالعلوم جدید (۲۷۷/۴)[۴] میں اس کے موافق فتویٰ دیا گیا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں سجدۂ سہو واجب نہیں ہوا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قال الماوردي: إذا رفع من السجدتين على ما وصفنا فقد أكمل الركعة الأولى فيستحب له بعدها أن يجلس قبل قيامه إلى الثانية جلسة الاستراحة، وهي سنة، وليست واجبة. (الحاوي الكبير في فقه مذهب الإمام الشافعي -أبو الحسن الماوردي (م:۴۵۰ھ) ۱۳۱/۲، باب صفة الصلاة وما يجزئ منها وما يفسدها وعدد سجود القرآن، ت: علي محمد معوض -عادل أحمد عبد الموجود، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)
فإن كانت الركعة تستعقب تشهداً، جلس للتشهد ... وإن كانت تستعقب قياماً، فينبغي أن يجلس على إثر السجدة الثانية جلسةً خفيفةً، ثم ينتهض منها قائماً، وهذه الجلسة تسمى جلسة الاستراحة، وهي مسنونة عندنا. (نهاية المطلب في دراية المذهب- عبد الملك بن عبد الله، الجويني، أبو المعالي، الملقب بـ'إمام الحرمين' (م:۴۷۸ھ): ۱۷۰/۲، رقم المسئلة: ۸۶۲، باب صفة الصلاة، ط: دار المنهاج)
[۲] (ويقوم مستويا بلا اعتماد) على الأرض... (ولا قعود) قبل القيام يسمى جلسة الاستراحة كما ذهب إليه الشافعي. (درر الحكام شرح غرر الأحكام-ملا - أو منلا أو المولى-خسرو (م:۸۸۵ھ): ۷۳/۱، باب صفة الصلاة، ط: دار إحياء الكتب العربية☆البناية شرح الهداية-بدر الدين العينى (م:۸۵۵ھ): ۲۵۰/۲، باب في صفة الصلاة، سنن الصلاة، قول سبحان ربي الأعلى في السجود، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆ مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح- حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ) ص:۱۰۷، باب شروط الصلاة و أركانها، فصل: في كيفية تركيب أفعال الصلاة من الابتداء إلى الانتهاء، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)
(۳) وكذا القعدة في آخر الركعة الأولى أو الثالثة فيجب تركها، ويلزم من فعلها أيضا تأخير القيام إلى الثانية أو الرابعة عن محله، وهذا إذا كانت القعدة طويلة، أما الجلسة الخفيفة التي استحبها الشافعي فتركها غير واجب عندنا، بل هو الأفضل كما سيأتي وهكذا كل زيادة بين فرضين يكون فيها ترك واجب بسبب تلك الزيادة، ويلزم منها ترك واجب آخر وهو تأخير الفرض الثاني عن محله. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۵۹/۱، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الفكر -بيروت)
[۴] سوال: اگر پہلی اور تیسری رکعت میں سہواً بیٹھ کر کھڑا ہو جائے، تو کتنے وقفہ میں ''سجدۂ سہو'' لازم ہوگا؟ =

[۴] قعدۂ اولیٰ میں التحیات کے بعد درود شریف پڑھنا

۹۳۹- سوال: ''سنت نماز'' میں سہو ہوگیا اور سجدۂ سہو نہیں کیا، تو کیا حکم ہے؟ سہو یہ ہوا تھا کہ چار رکعت والی نماز کے قعدۂ اولیٰ میں التحیات کے بعد بھول سے ''درود ابراہیم'' پڑھ لی تھی اور آخر میں سجدۂ سہو کرنا بھی بھول گیا، تو نماز ہوگئی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر کوئی شخص فرض، واجب، ظہر اور جمعہ سے پہلے کی چار رکعت اور جمعہ کے بعد کی چار رکعت والی سنت مؤکدہ کے قعدۂ اولیٰ میں التحیات کے بعد درود شریف ''اللہم صلی علی محمد'' تک بھول سے پڑھ لے، تو اس کے لیے سجدۂ سہو کرنا واجب ہوگا، ان کے علاوہ باقی سنن ونوافل کے قعدۂ اولیٰ میں التحیات کے بعد درود شریف پڑھنے سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا ہے۔ (شامی: ۱/ ۴۳۳، عالم گیری) [1]

اگر نماز میں واقع ہونے والی کسی غلطی کی وجہ سے سجدۂ سہو واجب ہو، اور اسے ادا کرنا بھول جائے، تو

= الجواب: طویل قعدہ سے سجدۂ سہو لازم آتا ہے، جیسے بہ قدر التحیات پڑھنے کے مثلاً، یا اس سے قریب ہو، باقی جلسہ خفیفہ سے سجدۂ سہو لازم نہیں آتا۔ (فتاویٰ دار العلوم مکمل ومدلل: ۴/ ۲۷۷، مسائل تراویح، سوال نمبر: ۱۸۳۱، پہلی اور تیسری رکعت میں کتنی دیر بیٹھنے سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے)

[۱] (ولا يصلي على النبي - صلى الله عليه وسلم - في القعدة الأولى في الأربع قبل الظهر والجمعة وبعدها) ولو صلى ناسيا فعليه السهو. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله ولا يصلي إلخ) أقول: قال في البحر في باب صفة الصلاة: إن ما ذكر مسلم فيما قبل الظهر، لما صرحوا به من أنه لا تبطل شفعة الشفيع بالانتقال إلى الشفع الثاني منها، ولو أفسدها قضى أربعا، والأربع قبل الجمعة بمنزلتها. وأما الأربع بعد الجمعة فغير مسلم فإنها كغيرها من السنن، فإنهم لم يثبتوا لها تلك الأحكام المذكورة اهـ ومثله في الحلية، وهذا مؤيد لما بحثه الشرنبلالي من جوازها بتسليمتين لعذر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵۶، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الفكر)

وكذا لو زاد على التشهد الصلاة على النبي - صلى الله عليه وسلم -، كذا في التبيين وعليه الفتوى، كذا في المضمرات، واختلفوا في قدر الزيادة، فقال بعضهم: يجب عليه سجود السهو بقوله: اللهم صل على محمد، وقال بعضهم: لا يجب عليه حتى يقول: وعلى آل محمد والأول أصح. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۷، كتاب الصلاة، الباب الثاني عشر في سجود السهو، ط: دار الفكر - بيروت)

نوٹ: جمعہ کے بعد کی چار رکعت سنت مؤکدہ کے قعدۂ اولیٰ میں اگر کوئی شخص درود شریف پڑھ لے، تو سجدۂ سہو واجب ہوگا (جیسا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے فتویٰ سے ظاہر ہے) یہ بات محل نظر ہے، جیسا کہ عبارتِ شامی سے واضح ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جب تک نماز کا وقت باقی ہے، اس نماز کا اعادہ واجب ہے، اور وقت ختم ہونے پر اعادہ مستحب ہے۔ (شامی :۱/ ۱۲۵-طحطاوی:۱۸۹)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] قیام میں امام صاحب کا تین مرتبہ سبحان اللہ کہنے کے بہ قدر خاموش کھڑا رہنا اور قراءت شروع نہ کرنا

۹۴۰-سوال: نمازِ فجر کی دوسری رکعت میں امام صاحب نے قراءت شروع نہیں کی اور اتنی دیر تک خاموش کھڑے رہے کہ تین مرتبہ سبحان اللہ پڑھی جا سکے، پیچھے سے مقتدی حضرات امام صاحب کو متوجہ کرنے کے لیے اللہ اکبر، اللہ اکبر کہا، تو انہوں نے سورۂ فاتحہ پڑھنا شروع کیا، اور اخیر میں سجدۂ سہو کیے بغیر امام صاحب نے نماز مکمل کرا دیا، تو نماز صحیح ہوگی یا نہیں، کیا اس صورت میں سجدۂ سہو واجب نہیں تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

تین چھوٹی آیات پڑھی جا سکے اس سے زیادہ اگر وقت امام صاحب خاموش کھڑے رہے ہوں، تبھی سجدۂ سہو لازم ہوگا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] فرض کی تیسری رکعت میں سورت ملا لینے سے سجدۂ سہو واجب نہ ہوگا

۹۴۱-سوال: اگر امام صاحب یا منفرد چار رکعت والی فرض نماز کی تیسری رکعت میں سورۂ فاتحہ

---

(۱) ثم اعلم أن الوجوب مقيد بما إذا كان الوقت صالحا حتى أن من عليه السهو في صلاة الصبح، إذا لم يسجد حتى طلعت الشمس بعد السلام الأول، سقط عنه السجود وكذا إذا سها في قضاء الفائتة فلم يسجد حتى احمرت، وكذا في الجمعة إذا خرج وقتها، وكل ما يمنع البناء إذا وجد بعد السلام يسقط السهو. (البحر الرائق: ۲/ ۱۹۳، باب سجود السهو، كتاب الصلاة، ط: دار الكتاب ديوبند☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۴۰-۵۴۲، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ز كريا- ديوبند)

كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تعاد أي وجوبا في الوقت، وأما بعده فندبا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۶۴، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) ولا يجب السجود إلا بترك واجب أو تأخيره أو تأخير ركن أو تقديمه أو تكراره أو تغيير واجب بأن يجهر فيما يخافت وفي الحقيقة وجوبه بشيء واحد وهو ترك الواجب، كذا في الكافي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۶، كتاب الصلاة، الباب الثاني عشر في سجود السهو، ط: دار الفكر)

کے بعد سورت ملا لے، تو کیا سجدۂ سہو واجب ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

خواہ امام ہو یا منفرد، انہیں فرض نماز کی تیسری رکعت میں سورت نہیں ملانی چاہیے؛ لیکن اگر کسی نے ملالی، تو سجدۂ سہو واجب نہ ہوگا۔ (عالمگیری: جلد ۱، صفحہ ۱۲۶)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] قعدۂ اولیٰ میں تشہد کے بعد درود شریف پڑھنے سے سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں

۹۴۲- سوال: چار رکعت والی نماز، خواہ فرض ہو یا نفل، سنت مؤکدہ ہو یا غیر مؤکدہ، کوئی شخص اس کے قعدۂ اولیٰ میں التحیات کے بعد درود شریف کو "**اللھم صل علی محمد**" تک پڑھے، تو فرض، سنت اور نفل؛ تمام نمازوں میں سجدۂ سہو واجب ہوگا، یا صرف فرض نمازوں ہی میں سجدۂ سہو واجب ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

نفل نماز کے قعدۂ اولیٰ میں درود شریف پڑھنے سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا۔[۲] البتہ فرض اور واجب نماز، نیز ظہر کی چار رکعت سنت مؤکدہ کے پہلے قعدہ میں تشہد کے بعد درود شریف "**اللھم صل علی**

---

[۱] ولو قرأ في الأخريين الفاتحة والسورة لا يلزمه السهو وهو الأصح. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۶، الباب الثاني عشر في سجود السهو، ط: دار الفكر)

(قوله وهل يكره) أي ضم السورة (قوله المختار لا) أي لا يكره تحريما بل تنزيها لأنه خلاف السنة. قال في المنية وشرحها: فإن ضم السورة إلى الفاتحة ساهيا يجب عليه سجدتا السهو في قول أبي يوسف لتأخير الركوع عن محله وفي أظهر الروايات لا يجب لأن القراءة فيهما مشروعة من غير تقدير، والاقتصار على الفاتحة مسنون لا واجب. اهـ. وفي البحر عن فخر الإسلام أن السورة مشروعة في الأخريين نفلا. وفي الذخيرة أنه المختار. وفي المحيط: وهو الأصح. اهـ. والظاهر أن المراد بقوله نفلا الجواز، والمشروعية بمعنى عدم الحرمة فلا ينافي كونه خلاف الأولى كما أفاده في الحلية. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۴۵۹، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، واجبات الصلاة، مطلب كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب إعادتها، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۱۰۲، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) وفي الأربع قبل الظهر والجمعة وبعدها لا يصلي على النبي - صلى الله عليه وسلم - في القعدة الأولى ولا يستفتح إذا قام إلى الثالثة بخلاف سائر ذوات الأربع من النوافل. كذا في الزاهدي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۳، الباب التاسع في النوافل، ط: دار الفكر)

محمد" تک پڑھ لے گا، تو سجدۂ سہو واجب ہوجائے گا، جمعہ کی دورکعت فرض سے پہلے کی چار رکعت کا بھی یہی حکم ہے۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] امام صاحب کا قعدۂ اولیٰ میں درود شریف پڑھنا موجب سہو ہے

۹۴۳-سوال: چار رکعت والی نماز مثلاً ظہر پڑھاتے ہوئے امام صاحب نے قعدہ اولیٰ میں تشہد کے بعد درود شریف "اللهم صل علی محمد" سے بھی زیادہ پڑھ لیا، تو سجدہ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

---

[۱] (ولا يصلي على النبي - صلى الله عليه وسلم - في القعدة الأولى في الأربع قبل الظهر والجمعة وبعدها) ولو صلى ناسيا فعليه السهو، وقيل لا شمني. (الدر المختار) ———— قال ابن عابدين: (قوله ولا يصلي إلخ) أقول: قال في البحر في باب صفة الصلاة: إن ما ذكر مسلم فيما قبل الظهر، لما صرحوا به من أنه لا تبطل شفعة الشفيع بالانتقال إلى الشفع الثاني منها، ولو أفسدها قضى أربعا، والأربع قبل الجمعة بمنزلتها. وأما الأربع بعد الجمعة فغير مسلم فإنها كغيرها من السنن، فإنهم لم يثبتوا لها تلك الأحكام المذكورة اهـ ومثله في الحلية... (قوله وقيل لا إلخ) قال في البحر: ولا يخفى ما فيه والظاهر الأول. زاد في المنح ومن ثم عولنا عليه وحكينا ما في القنية بقيل. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۶/۲، باب الوتر والنوافل، قبيل: مطلب قولهم كل شفع من النفل صلاة ليس مفردا)

ولو كرر التشهد في القعدة الأولى فعليه السهو وكذا لو زاد على التشهد الصلاة على النبي - صلى الله عليه وسلم -، كذا في التبيين وعليه الفتوى، كذا في المضمرات واختلفوا في قدر الزيادة فقال بعضهم: يجب عليه سجود السهو بقوله: اللهم صل على محمد وقال بعضهم: لا يجب عليه حتى يقول: وعلى آل محمد والأول أصح. (الفتاوى الهندية: ۱۲۷/۱، الباب الثاني عشر في سجود السهو، ط: دار الفكر)

نوٹ: اگر نوافل کے علاوہ مذکورہ نماز کے قعدۂ اولیٰ میں غلطی سے درود شریف "اللهم صل علی محمد" تک پڑھے، تو سجدۂ سہو سے تلافی ہوجائے گی؛ لیکن جان بوجھ کر پڑھے، تو عام ضابطہ کے موافق اعادہ واجب ہوگا، اسی کی صراحت متعدد عبارتوں میں ملتی ہے؛ لیکن درمختار کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ واجب کو جان بوجھ کر ترک کرنے کی وجہ سے اعادہ لازم ہوگا، إلا في أربع مسائل، انہی میں درود شریف کا قعدہ اولیٰ میں پڑھنا ہے۔ جس کا حاصل یہ نکلا کہ عمداً پڑھنے کی صورت میں بھی سجدۂ سہو سے اس کی تلافی ہوجائے گی، تاہم اس قول کو "قیل" کے ذریعے نقل کیا گیا ہے، متعلقہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

فلا سجود في العمد، قيل إلا في أربع: ترك القعدة الأولى، وصلاته فيه على النبي - صلى الله عليه وسلم -، وتفكره عمدا حتى شغله عن ركن، وتأخير سجدة الركعة الأولى إلى آخر الصلاة، نهر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۸۰/۲، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: دار الفكر)

(ولا يزيد) في الفرض (على التشهد في القعدة الأولى) إجماعا (فإن زاد عامدا كره) فتجب الإعادة (أو ساهيا وجب عليه سجود السهو إذا قال: اللهم صل على محمد) فقط (على المذهب) المفتى به لا لخصوص الصلاة بل لتأخير القيام. (الدر المختار مع رد المحتار: ۵۱۰/۱-۵۱۱، باب صفة الصلاة، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل)

(۲) امام صاحب نے تین مرتبہ سبحان اللہ کہنے کے بہ قدر، قراءت کرنے میں تاخیر کی، تو سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

اگر امام صاحب نے چار رکعت والی فرض نماز میں التحیات کے بعد درود شریف "اللھم صل علی محمد" تک پڑھ لیا ہو، تو سجدۂ سہو واجب ہوگا، چار رکعت نفل نماز میں التحیات کے بعد درود شریف پڑھنے کی وجہ سے سجدہ سہو واجب نہ ہوگا؛ بل کہ چار رکعت والی نفل نماز میں دو رکعت پر بیٹھ کر التحیات کے بعد درود شریف پڑھنا افضل ہے۔ (در مختار)[۱]

دوسری رکعت کے قراءت میں یا کسی بھی رکعت کی قراءت میں کسی سوچ میں پڑ جانے کی وجہ سے تاخیر ہوئی اور سوچنا تین تسبیح کے بہ قدر ہوگیا، تو سجدۂ سہو واجب ہوگا، اگر کسی نے سجدۂ سہو نہ کیا، تو نماز کا اعادہ واجب ہوگا۔[۲]

قراءت کے دوران یا قراءت کے شروع میں کسی دعاء یا تسبیح پڑھنے کی بنا پر قراءت میں تاخیر ہوجائے، تو سجدۂ سہو واجب نہ ہوگا۔ (فتاوی قاضی خان علی ہامش العالمگیری: ۱/ ۱۲۲)[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] سجدۂ سہو میں دو کے بجائے ایک ہی سجدہ کیا، تو کیا حکم ہے؟

۹۴۴- سوال: نماز میں ترک واجب کی بنا پر سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے، اگر سجدۂ سہو کرتے ہوئے کسی نے دو سجدوں کے بجائے ایک ہی سجدہ کیا، تو کافی ہوگا یا نہیں؟ سہواً ایک کیا، تو کیا حکم ہے؟ اور عمداً کیا، تو کیا حکم ہے؟

---

(۱) قد تقدم تخريجه و تفصيله تحت عنوان: "قعدۂ اولی میں تشہد کے بعد درود شریف پڑھنے سے سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں"۔

(۲) قال في المنية وشرحها الصغير: ثم الأصل في التفكر أنه إن منعه عن أداء ركن كقراءة آية أو ثلاث أو ركوع أو سجود أو عن أداء واجب كالقعود يلزمه السهو لاستلزام ذلك ترك الواجب وهو الإتيان بالركن أو الواجب في محله، وإن لم يمنعه عن شيء من ذلك بأن كان يؤدي الأركان ويتفكر لا يلزمه السهو. (رد المحتار على المختار: ۲/ ۹۳، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: دار الفكر)

(۳) وإن افتتح الصلاة، فقرأ التشهد في قيامه قبل أن يشرع في قراءة الفاتحة عامدا أو ساهيا لا سهو عليه. (فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۱/ ۱۲۲، فصل فيما يوجب السهو وما لا يوجب السهو، ط: زكريا- ديوبند)

الجواب حامداً و مصلیاً:

سہو کے لیے دو سجدے واجب ہیں، اگر عمداً ایک سجدہ چھوڑ دے، تو گنہ گار ہوگا، اگر سہواً چھوٹ گیا، تو واجب ادا نہیں ہوا، لیکن سجدۂ سہو لازم نہ ہوگا، کیوں کہ سہو میں سہو سے سجدہ لازم نہیں ہوتا۔ (طحطاوی علی المراقی صفحہ ۲۵۰)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] تیسری رکعت میں قعدہ کر کے چوتھی رکعت کے بعد سجدۂ سہو کر لے تو نماز درست ہو جائے گی

۹۴۵- سوال: میں ایک مرتبہ ظہر کی نماز پڑھا رہا تھا، تیسری رکعت میں کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ گیا، پیچھے سے مقتدی حضرات لقمہ دے رہے تھے، تا کہ میں کھڑا ہو جاؤں؛ لیکن میں اپنے اس گمان کے مطابق کہ ایک مرتبہ مکمل طور پر بیٹھ جانے کے بعد کھڑے ہونے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، بیٹھا رہا، اور تیسری رکعت پر سلام پھیر کر مقتدیوں سے کہا کہ نماز فاسد ہو گئی ہے، دوبارہ پڑھنی پڑے گی، چناں چہ پھر سے چار رکعت پڑھا دی۔

اب کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر آپ تیسری رکعت سے کھڑے ہو کر چوتھی رکعت پڑھ لیتے اور سجدۂ سہو کر لیتے، تو کافی ہو جاتا، تو ان دونوں صورتوں میں کون سی صورت افضل ہوگی؟ کیا تیسری رکعت میں غلطی سے بیٹھ جانے کی وجہ سے نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

تیسری رکعت میں بھول سے بیٹھ جانے کی وجہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی، خواہ پوری التحیات ہی کیوں نہ پڑھ لی ہو؛ لہٰذا ایسی صورت میں جب بھی یاد آ جائے، کھڑے ہو کر چوتھی رکعت پڑھ لینے اور التحیات کے بعد سجدۂ سہو کر لینے سے نماز ہو جائے گی، جماعت والی نماز کو لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔[۲]

---

[۱] ويجب "سجدتان" لأنه صلى الله عليه وسلم سجد سجدتين للسهو، وهو جالس بعد التسليم وعمل به الأكابر من الصحابة والتابعين "بتشهد وتسليم". (مراقي) ــــــــــ قال الطحطاوي (م: ۱۲۳۱ھ): فلو اقتصر على سجدة واحدة، لا يكون آتيا بالواجب، ولا شيء عليه إن كان ساهيا، وإن تعمده يأثم. وفي البحر: لو سها في سجود السهو، لا يسجد لهذا السهو. وفي المضمرات: لو سها في سجود السهو، عمل بالتحري ولا يجب عليه سجود السهو، لئلا يلزم التسلسل، ولأنه يغتفر في التابع ما لا يغتفر في المتبوع. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح، ص: ۴۶۰، باب سجود السهو، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) قال: "ويلزمه السهو إذا زاد في صلاته فعلا من جنسها ليس منها" وهذا يدل على أن سجدة السهو واجبة هو =

البتہ اگر تنہا نماز پڑھ رہا ہو اور پہلی مرتبہ ایسی بھول ہو جائے، بار بار ایسی بھول نہ ہوتی ہو، تو نماز کو لوٹانا افضل ہے، نہ لوٹائے اور سجدۂ سہو کر لے، تو بھی جائز ہے۔ بار بار ایسی بھول ہوتی ہو، تو سجدۂ سہو کر لینا چاہیے، لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] سجدۂ تلاوت کی آیت پڑھنے سے قبل سجدۂ تلاوت کرنا

۹۴۶- سوال: امام صاحب نے سجدۂ تلاوت کی آیت پڑھنے سے پہلے ہی غلطی سے سجدۂ تلاوت کی آیت سمجھ کر سجدہ کر لیا، پھر سجدہ کی آیت پڑھی، رکوع کیا اور رکوع میں سجدہ کی نیت کر لی تو کیا سجدۂ سہو واجب ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

سجدۂ سہو واجب ہوگا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] امام کا قعدۂ اخیرہ چھوڑ کر پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جانا

۹۴۷- سوال: میں ایک مسجد میں امام ہوں، ایک مرتبہ چار رکعت والی نماز میں مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ چوتھی رکعت کے سجدہ سے فراغت کے بعد قعدۂ اخیرہ میں بیٹھنے کے بجائے کھڑا ہو گیا، مقتدی حضرات

=الصحيح لأنها تجب لجبر نقص تمكن في العبادة فتكون واجبة كالدماء في الحج وإذا كان واجبا لا يجب إلا بترك واجب أو تأخيره أو تأخير ركن ساهيا هذا هو الأصل وإنما وجب بالزيادة لأنها لا تعرى عن تأخير ركن أو ترك واجب. (الهداية: ۱/ ۷۴، باب سجود السهو، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

[۱] "ومن شك في صلاته فلم يدر أثلاثا صلى أم أربعا وذلك أول ما عرض له استأنف" لقوله عليه الصلاة والسلام "إذا شك أحدكم في صلاته أنه كم صلى فليستقبل الصلاة" "وإن كان يعرض له كثيرا بنى على أكبر رأيه" لقوله عليه الصلاة والسلام "من شك في صلاته فليتحر الصواب" "وإن لم يكن له رأي بنى على اليقين" لقوله عليه الصلاة والسلام "من شك في صلاته فلم يدر أثلاثا صلى أم أربعا بنى على الأقل". (الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۷۶، باب سجود السهو، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

(۲) ولا يجب السجود إلا بترك واجب، أو تأخيره، أو تأخير ركن، أو تقديمه، أو تكراره، أو تغيير واجب؛ بأن يجهر فيما يخافت ... الخ. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۶، كتاب الصلاة، الباب الثاني عشر في سجود السهو، ط: زكريا - ديوبند ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۴۳، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: زكريا - ديوبند)

کے لقمہ دینے کی وجہ سے متنبہ ہوکر بیٹھ گیا اور سجدۂ سہو کر کے نماز مکمل کی۔

نماز کے بعد ایک مقتدی عالم کھڑے ہوکر کہنے لگے کہ سجدۂ سہو کے باوجود نماز صحیح نہیں ہوئی، لہٰذا میں نے دوسری مرتبہ نماز پڑھائی، اب سوال یہ ہے کہ کیا پہلی مرتبہ جو نماز سجدۂ سہو کے ساتھ پڑھی گئی تھی، وہ صحیح تھی یا نہیں؟ اور کیا اس صورت میں اعادہ واجب تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ نے پہلی مرتبہ جو نماز سجدۂ سہو کے ساتھ پڑھائی، وہ بالکل صحیح تھی، جس مقتدی عالم نے اعادہ کے لیے کہا، وہ مسئلہ سے ناواقف ہیں، اگر مصلی (یعنی نماز پڑھنے والا، خواہ امام بن کر نماز پڑھائے یا منفرداً نماز ادا کر رہا ہو) قعدۂ اخیرہ میں بیٹھنے کے بعد یا بغیر بیٹھے کھڑا ہو جائے؛ تو جب تک رکعت زائدہ کا سجدہ نہ کر لے، اس وقت تک اُس کا حکم یہی ہے کہ وہ بیٹھ جائے اور سجدۂ سہو کر کے نماز مکمل کرے۔ (شامی: ۲/ ۸۵)[1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱](ولو سها عن القعود الأخير) كله أو بعضه (عاد) ويكفي كون كلا الجلستين قدر التشهد (ما لم يقيدها بسجدة) لأن ما دون الركعة محل الرفض وسجد للسهو لتأخير القعود (وإن قيدها) بسجدة عامدا أو ناسيا أو ساهيا أو مخطئا (تحول فرضه نفلا). [رد المحتار على رد المحتار: ۲/ ۸۵، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: دار الفكر - بيروت]

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے "باب ما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیہا" کا عنوان: "امام کا قعدۂ اخیرہ چھوڑ کر پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو جانا"

باب سجود التلاوۃ

[سجدۂ تلاوت کا بیان]

[۱] خارج صلاۃ شخص نے امام صاحب سے سجدہ کی آیت سنی، تو کیا کرے؟

۹۴۸- سوال: ہمارے یہاں امام صاحب جمعہ کے روز فجر کی نماز میں سورۂ سجدہ پڑھتے ہیں، تو اس میں سجدہ کی آیت وہ لوگ سن لیں، جو ابھی نماز میں شامل نہیں ہوئے ہیں؛ بل کہ وضو کر رہے ہیں، تو ان پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر کوئی شخص امام صاحب سے سجدہ کی آیت سننے کے بعد اسی رکعت میں شامل ہوگیا، تو اس پر سجدۂ تلاوت کا الگ سے ادا کرنا واجب نہیں، کیوں کہ اس کا سجدۂ تلاوت حکماً ادا ہوگیا، اور اگر دوسری رکعت میں شریک ہوا یا بالکل شریک نہیں ہوا، تو اس کے ذمہ سجدۂ تلاوت ادا کرنا واجب ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] نماز کے باہر کوئی شخص، امام سے آیت سجدہ سنے

۹۴۹- سوال: اگر کوئی شخص سجدۂ تلاوت امام صاحب سے نماز کے باہر سنے، تو اس کا کیا حکم ہے؟

---

(۱) ولو سمعها من الإمام أجنبي ليس معهم في الصلاة ولم يدخل معهم في الصلاة لزمه السجود، كذا في الجوهرة النيرة، وهو الصحيح، كذا في الهداية. ـــــــ سمع من إمام فدخل معه قبل أن يسجد سجد معه وإن دخل في صلاة الإمام بعدما سجدها الإمام لا يسجدها وهذا إذا أدركه في اخر تلك الركعة أما لو أدركه في الركعة الأخرى يسجدها بعد الفراغ، كذا في الكافي، وهكذا في النهاية. (الفتاوى الهندية-لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۱۳۳، كتاب الصلاة، الباب الثالث عشر في سجود التلاوة، ط: دار الفكر ☆ الجوهرة النيرة-أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/ ۸۲، باب سجود التلاوة، ط: المطبعة الخيرية ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۲/ ۴۷۶، كتاب الصلاة، سجدة التلاوة، ط: مكتبة زكريا-ديوبند)

الجواب حامداو مصلیا:

مذکورہ صورت میں وہ شخص اگر اسی رکعت میں امام کی اقتدا کرلے، تو وہ سجدہ تلاوت پانے والا ہوگا؛ لیکن اگر اس نے اس رکعت میں اقتدا نہیں کی؛ بل کہ دوسری رکعت میں اقتدا کی، تو اب یہ نماز کے باہر الگ سے سجدہ کرے گا۔ (عالمگیری، قدوری، ہدایہ، شامی)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] ایک ہی جگہ متعدد آیات سجدہ تلاوت کرنے کا حکم

۹۵۰- سوال: قرآن شریف کی تلاوت کے دوران دو یا زائد سجدے کی آیتیں ایک ہی جگہ تلاوت کرتے ہوئے پڑھنے میں گذریں، تو ہمیں کتنے سجدے کرنے ہوں گے؟

الجواب حامداًو مصلیا:

جو شخص ایک ہی جگہ تین یا چار، سجدے کی مختلف آیتوں کی تلاوت کرے، تو اس پر اسی کے بہ قدر سجدے واجب ہوں گے؛ البتہ ایک آیت کو ایک ہی جگہ، متعدد بار تلاوت کرے، تو ایک ہی سجدہ واجب ہوگا؛ اس لیے صورت مسئولہ میں سجدے کی جتنی آیتیں پڑھی گئیں ہیں، اتنے سجدے کیے جائیں۔ (شامی (۱)، عالم گیری (۲))[۳] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] " فإن قرأها الإمام، وسمعها رجل ليس معه في الصلاة، فدخل معه بعدما سجدها الإمام لم يكن عليه أن يسجدها؛ " لأنه صار مدركا لها بادراك الركعة " وإن دخل معه قبل أن يسجدها سجدها معه " ؛لأنه لو لم يسمعها سجدها معه، فههنا أولى " وإن لم يدخل معه سجدها وحده " لتحقق السبب ". (الهداية:۱/ ۱۶۴، باب في سجود التلاوة، ط:ياسر نديم- ديوبند☆ الفتاوى الهندية:۱/ ۱۳۳، الباب الثالث عشر في سجود التلاوة، ط: زكريا، ديوبند☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۲، باب الاستخلاف، ط: زكريا- ديوبند☆الجوهرة النيرة-أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي، الزَّبِيدِيّ الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/ ۸۲، باب سجود التلاوة، ط: المطبعة الخيرية)

(۱) رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۱۴، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة، ط: دار الفكر-بيروت.

(۲) الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۴، كتاب الصلاة، الباب الثالث عشر في سجود التلاوة، ط: دار الفكر.

(۳) اجتمع سببا الوجوب وهما: التلاوة، والسماع بأن تلا السجدة ثم سمعها، أو سمعها ثم تلاها، أو تكرر أحدهما فنقول: الأصل أن السجدة لا يتكرر وجوبها إلا بأحد أمور ثلاثة: إما اختلاف المجلس، أو التلاوة، أو السماع؛ حتى أن من تلا آية واحدة مرارا في مجلس واحد تكفيه سجدة واحدة، والأصل فيه ما روي أن جبريل - عليه السلام - كان ينزل بالوحي فيقرأ آية السجدة على رسول الله - صلى الله عليه وسلم - ورسول الله - صلى الله عليه وسلم - كان يسمع ويتلقن ثم يقرأ على أصحابه وكان لا يسجد إلا مرة واحدة، وروي عن أبي عبد الرحمن السلمي معلم الحسن =

[۴] مسجد کی مختلف جگہوں میں آیت سجدہ متعدد بار تلاوت کرنے کا حکم

۹۵۱- سوال: بہشتی زیور (۲/ ۴۴) میں ''سجدۂ تلاوت کے بیان میں'' کے عنوان سے مسئلہ نمبر ۲۲ میں ہے کہ: مسجد کا بھی یہی حکم ہے جو کمرے کا ہے، یعنی سجدہ کی ایک آیت اگر متعدد دفعہ پڑھے گا، تب بھی ایک ہی سجدہ واجب ہوگا، خواہ ایک ہی جگہ بیٹھ کر پڑھے یا مسجد میں ادھر ادھر چلتا پھرتا پڑھے۔[(۱)] تو اس میں سوال یہ ہے کہ چھوٹی اور بڑی مسجد دونوں کا ایک ہی حکم ہے؟ یا دونوں کے حکم میں فرق ہے؟ ہمارے گاؤں ''کوسمڑی'' کی تو بڑی مسجد ہے جو تقریباً ۶۰×۵۵ ہے، تو کیا اس کا بھی یہی حکم ہوگا؟ اگر چھوٹی بڑی مسجد میں فرق ہے، تو مندرجہ بالا حوالہ میں اس کی قید کیوں نہیں لگائی گئی، وہاں مسئلہ کو مطلق رکھنے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی یا بڑی مسجد ہونے سے حکم میں کوئی فرق نہیں ہوتا، تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

مذکور مسئلہ کے متعلق عالم گیری: ۱/ ۴۸،[(۲)] شامی: ۱/ ۷۲۷،[(۳)] الجوہرۃ النیرۃ: ۱/ ۸۴،[(۴)] اور مجمع الانہر:

=والحسين - رضي الله عنهم - أنه كان يعلم الآية مرارا، وكان لا يزيد على سجدة واحدة، والظاهر أن عليا - رضي الله عنه - كان عالما بذلك ولم ينكر عليه. ـــــــــ وروي عن أبي موسى الأشعري - رضي الله عنه - أنه كان يكرر آية السجدة حين كان يعلم الصبيان وكان لا يسجد إلا مرة واحدة، ولأن المجلس الواحد جامع للكلمات المتفرقة. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۸۱، فصل سجدة التلاوة، فصل في سبب وجوب السجدة، ط: دار الكتب العلمية)

(۱) مسجد کا بھی یہی حکم ہے، جو ایک کوٹھری کا حکم ہے، کہ اگر سجدہ کی ایک آیت کئی دفعہ پڑھے، تو ایک ہی سجدہ واجب ہے، چاہے ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے دہرایا کرے، یا مسجد میں ادھر ادھر ٹہل ٹہل کر پڑھے۔ (بہشتی زیور: ۲/ ۴۰، باب نواز دہم، سجدۂ تلاوت کا بیان، ط: امدادیہ لائبریری، چوک بازار، ڈھاکہ)

(۲) والمجلس واحد وإن طال، أو أكل لقمة، أو شرب شربة، أو قام، أو مشى خطوة أو خطوتين، أو انتقل من زاوية البيت أو المسجد إلى زاوية، إلا إذا كانت الدار كبيرة كدار السلطان، وإن انتقل في المسجد الجامع من زاوية إلى زاوية لا يتكرر الوجوب وإن انتقل فيه من دار إلى دار ففي كل موضع يصح الاقتداء يجعل كمكان واحد. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۱۳۴، كتاب الصلاة، الباب الثالث عشر في سجود التلاوة، ط: دار الفكر)

(۳) رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲ھ) ۲/ ۱۱۹، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة، ط: دار الفكر - بيروت.

(۴) ولو قرأها في المسجد الجامع في زاوية ثم تلاها في زاوية أخرى منه كفته سجدة واحدة؛ لأن المسجد مع تباعد أطرافه يجعل كبقعة واحدة في حق الصلاة فأولى أن يكون كذلك في حق السجدة؛ لأنها دونها. (الجوهرة النيرة -=

۱/ ۱۵۸ [۵] میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بڑی مسجد اور چھوٹی مسجد؛ دونوں کا ایک ہی حکم ہے، ایک آیت سجدہ اس میں متعدد بار پڑھنے سے-خواہ کونہ بدل جائے یا چلتا پھرتا پڑھے-ایک ہی سجدہ واجب ہوگا۔ البتہ مسجد بہت زیادہ بڑی ہو اور مجمع الانہر میں اس کی مثال ''مسجد حرام'' سے دی گئی ہے، [۶] تو سمت بدل جانے سے حکم بدل جائے گا، پس مسجد حرام کے شمالی حصے میں آیت سجدہ تلاوت کی، پھر مغرب یا جنوب کے حصے میں آکر اسی آیت کی دوبارہ تلاوت کی، تو تبدیلئ مجلس کا حکم لگایا جائے گا اور متعدد سجدے واجب ہوں گے۔

اسی طرح مکان بھی مجلس واحد کے حکم میں ہوتا ہے، مگر فقہاء لکھتے ہیں کہ بادشاہ کا مکان (محل ،قلعہ) مجلس واحد کے حکم میں نہیں ہے، اس میں سمت: شمال، جنوب وغیرہ کے بدلنے سے مجلس بدل جائے گی اور متعدد سجدے واجب ہوں گے۔ [۷]

آپ کے گاؤں کی مسجد ''مسجد حرام'' جتنی وسیع نہیں ہے؛ بل کہ اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے؛ لہٰذا وہ پوری مسجد مجلس واحد کے حکم میں ہوگی اور ایک ہی سجدہ واجب ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] نماز میں دو مرتبہ ایک ہی آیت سجدہ کی تلاوت سے، ایک سجدہ واجب ہوگا

۹۵۲-سوال: امسال میرے ساتھ ایک طالب علم نے تراویح پڑھائی، اس نے سجدہ کی آیت آنے کی وجہ سے سجدہ ادا کیا، اس کے بعد قیام ہی کی حالت میں پھر سے اس کو پڑھا، تو کیا دوسری مرتبہ سجدہ واجب ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح رکن کے بدلنے سے کیا دوسری مرتبہ سجدہ واجب ہوگا؟ جیسا کہ تبدیل مجلس سے واجب ہوتا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

صورت مسئولہ میں دوسری مرتبہ سجدہ واجب نہیں ہوگا۔ عالمگیری میں لکھا ہے کہ اگر ایک شخص نے پہلی رکعت میں سجدہ تلاوت ادا کر دیا، پھر دوسری رکعت میں اسی سجدہ کی آیت کا اعادہ کیا، تو سجدۂ اولی کافی

=أبو بكر بن علي ،الحدادي (م: ۸۰۰ھ): ۱/ ۸۳، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة، ط: المطبعة الخيرية)

(۵ - ۶) ثم المجلس لا يختلف بمجرد القيام ولا بخطوة أو خطوتين ولا بالانتقال من زاوية إلى زاوية إلا أن يكون كبيرا كالمسجد الحرام (مجمع الأنهر - داماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/ ۲۳۵، كتاب الصلاة، سجود التلاوة، ط: فقيه الأمة - ديوبند)

(۷) دیکھیے: حاشیہ نمبر: ۱۔

ہو جائے گا دوسرا سجدہ واجب نہیں ہوگا۔ (۱/ ۱۰۷)[۱]

جب رکعت کے بدلنے سے دوسرا سجدہ واجب نہیں ہوتا ہے، تو اسی رکعت میں پڑھنا تو ایک جگہ کے درجہ میں ہے؛ اس لیے اس صورت میں بھی سجدہ واجب نہیں ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] نماز میں آیت سجدہ پر سجدۂ تلاوت نہ کرنا

۹۵۳- سوال: ہمارے یہاں تراویح میں یہ واقعہ پیش آیا کہ امام صاحب نے سجدے کی آیت میں کچھ غلطی کی، جس کی وجہ سے دو تین دن کے بعد اس کو دوسرے حافظ صاحب نے پھر سے پڑھا؛ لیکن انہوں نے سجدۂ تلاوت نہیں کیا؛ حالاں کہ آیت سجدہ کے بعد فوراً رکوع بھی نہیں کیا تھا، بل کہ اس کے بعد آٹھ دس آیتوں کی تلاوت کی تھی، پوچھنے پر بتلایا کہ میں نے پہلے سے سجدہ نہ کرنے کی نیت کی تھی اور انہوں اپنے ساتھی حافظ صاحب کو بھی کہا تھا کہ آج میں سجدہ کی آیت پڑھوں گا؛ لیکن سجدۂ تلاوت نہیں کروں گا۔

تو سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح پہلے سے سجدہ نہ کرنے کی نیت سے سجدۂ تلاوت ساقط ہو جاتا ہے؟ اگر نہیں ہوتا ہے، تو واجب ترک ہونے سے اس کے تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ اور نماز کے متعلق اب کیا حکم ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

سجدہ کی آیت جب دوسرے تیسرے دن تلاوت کی گئی، تو سجدہ کرنا واجب تھا، لیکن امام صاحب نے پہلے سے سجدہ نہ کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا، اسی وجہ سے سجدہ نہیں کیا اور رکوع بھی سجدہ کی آیت کے آٹھ دس آیتوں کے بعد کیا؛ اس لیے سجدۂ تلاوت اس کے ضمن میں ادا نہ ہوگا۔ اور نماز کے سجدہ کی قضا نماز کے باہر نہیں ہو سکتی ہے؛ اس لیے واجب ترک ہونے سے گناہ لازم ہوا، جس پر توبہ ضروری ہے، البتہ تراویح کی دو رکعت ادا ہو جائے گی اور سجدۂ تلاوت نہ کرنے کا گناہ ہوگا۔ (شامی: ۱/ ۱۵۸)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] ولو قرأها فسجد ثم قرأ القرآن بعد ذلك طويلا ثم أعاد تلك السجدة لا تجب عليه أخرى. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۴، كتاب الصلاة، الباب الثالث عشر في سجود التلاوة، ط: دار الفكر)

(۲) ويأثم بتأخيرها ويقضيها ما دام في حرمة الصلاة ولو بعد السلام فتح... (ولو تلاها في الصلاة سجدها فيها لا خارجها) لما مر. وفي البدائع: وإذا لم يسجد أثم فتلزمه التوبة. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله ولو بعد=

[۷] سجدہ کی آیت سننے والوں پر سجدہ کا واجب ہونا

۹۵۴-سوال: قرآن کریم کی آیت سجدہ اگر باجماعت نماز میں پڑھی جائے، تو تمام نمازیوں پر سجدہ واجب ہوتا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اگر نماز سے باہر محفل میں لوگ بیٹھے ہوں اور کوئی آیت سجدہ تلاوت کرے، تو اس صورت میں بھی تمام سامعین پر سجدہ واجب ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

قران مجید میں چودہ سجدے ہیں، جو پڑھنے اور سننے والے؛ دونوں پر واجب ہوتے ہیں، مجلس میں قرآن مجید کی آیت سجدہ جو بھی سنے گا، اس پر سجدہ واجب ہوگا۔ (شامی، عالم گیری)[۱] ہاں ٹیپ ریکارڈ اور ریڈیو سے آیت سجدہ سننے سے سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] امام کا وقتاً فوقتاً نماز میں آیت سجدہ پڑھنا

۹۵۵-سوال: اگر کوئی امام نماز میں آیت سجدہ کی تلاوت بار بار کرتا ہے اور مقتدیوں کو اس سے

=السلام) أي ناسيا ما دام في المسجد وروي أنه لا يسجد بعد السلام ناسيا تتارخانية. . . . (قوله وإذا لم يسجد أثم إلخ) أفاد أنه لا يقضيها. قال في شرح المنية: وكل سجدة وجبت في الصلاة، ولم تؤد فيها، سقطت أي لم يبق السجود لها مشروعا لفوات محله. اهـ ـــــــــ أقول: وهذا إذا لم يركع بعدها على الفور وإلا دخلت في السجود وإن لم ينوها كما سيأتي وهو مقيد أيضا بما إذا تركها عمدا حتى سلم وخرج من حرمة الصلاة. أما لو سهوا وتذكرها ولو بعد السلام قبل أن يفعل منافيا يأتي بها ويسجد للسهو كما قدمناه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۱۰، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة، دار الفكر - ديوبند☆بدائع الصنائع: ۱/ ۱۹۱، كتاب الصلاة، فصل وأما بيان وقت أدائها. . . الخ، ط: دار الكتب العلمية)

[۱] (يجب) بسبب (تلاوة آية) أي أكثرها مع حرف السجدة (من أربع عشرة آية). . . (بشرط سماعها) فالسبب التلاوة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۰۳- ۱۰۴، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة، ط: دار الفكر -بيروت ☆البحر الرائق: ۲/ ۲۱۰- ۲۱۳، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة، ط: دار الكتاب-ديوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۴، كتاب الصلاة، الباب الثالث عشر في سجود التلاوة، زكريا-ديوبند)

[۲] (لا) تجب (بسماعه من الصدى والطير) [الدر المختار] ــــــ قال ابن عابدين: (قوله من الصدى) هو ما يجيبك مثل صوتك في الجبال والصحاري ونحوهما كما في الصحاح. ــــــ (قوله والطير) هو الأصح زيلعي وغيره، وقيل تجب. وفي الحجة هو الصحيح تتارخانية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۰۸- ۱۰۹، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة، ط: دار الفكر - ديوبند)

پریشانی ہوتی ہے، تو یہ شریعت میں درست ہے یا نہیں؟

عبداللہ میاں، بھارت ڈیری والا

الجواب حامداً ومصلیاً

امامت ایک اہم ذمہ داری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی امامت کرائے تو قراءت مختصر کرے اس لیے کہ مقتدیوں میں بعض ضعیف بیمار اور عمر دراز بھی ہوتے ہیں۔ (بخاری شریف: ۱/ ۵۹۴)[1]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے امام کی لمبی قراءت کی شکایت کی گئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بہت ناراضگی کا اظہار کیا۔ (بخاری: ۱/ ۹۸)[2]

اس لیے مقتدیوں میں اگر کمزور، بیمار اور بوڑھے لوگ ہوں، تو ایسی سورت کی تلاوت نہ کرے، جس میں سجدۂ تلاوت ہو، خلاصہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ سجدہ کی آیت تلاوت کرنے والے کو یہ معلوم ہو کہ سننے والوں کا وضو نہیں ہے، یا وضو تو ہے؛ لیکن سجدۂ تلاوت نہیں کریں گے، یا سجدۂ تلاوت کرنے میں ان کو مشقت ہوگی، تو نماز میں ہو یا نماز سے باہر، سجدہ کی آیت کو آہستہ تلاوت کرنا مستحب ہے۔ (عالم گیری: ۱/ ۱۰۹)[3]
لہذا مستحب یہ ہے کہ امام مقتدیوں کا خیال رکھتے ہوئے آیت سجدہ کے علاوہ کی سورتوں کو پڑھے، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «إذا صلى أحدكم للناس، فليخفف، فإن منهم الضعيف والسقيم والكبير، وإذا صلى أحدكم لنفسه فليطول ما شاء». (صحيح البخاري: ۱/ ۹۷، رقم الحديث: ۷۰۳، كتاب الاذان، باب إذا صلى أحدكم لنفسه فليطول ما شاء، ط: البدر ديوبند)

[۲] عن أبي مسعود، قال: قال رجل: يا رسول الله إني لأتأخر عن الصلاة في الفجر مما يطيل بنا فلان فيها، فغضب رسول الله صلى الله عليه وسلم، ما رأيته غضب في موضع كان أشد غضبا منه يومئذ، ثم قال: يا أيها الناس، إن منكم منفرين، فمن أم الناس فليتجوز، فإن خلفه الضعيف والكبير وذا الحاجة. (صحيح البخاري: ۱/ ۹۸، رقم الحديث: ۷۰۴، كتاب الاذان، باب من شكا إمامه إذا طول، ط: البدر - ديوبند)

(۳) القارئ إذا كان عنده قوم إن كانوا متأهبين للسجود ويقع في قلبه أنه لا يشق عليهم أداء السجدة ينبغي أن يقرأ جهرا وإن كانوا محدثين أو يظن أنهم يسمعون ولا يسجدون أو يشق عليهم أداء السجدة ينبغي أن يقرأ في نفسه سواء كان في الصلاة أو خارج الصلاة، كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۵، كتاب الصلاة، الباب الثالث عشر في سجود التلاوة، ط: زكريا - ديوبند)

[۹] آیت سجدہ پڑھ کرفوراًرکوع کرکے، اس میں سجدے کی نیت کرلینا

۹۵۶- سوال: اگر امام نے نماز میں سورۂ نجم پڑھی اور اس کی آخری آیت- جو کہ آیت سجدہ ہے -کو پڑھ کر فوراً ہی رکوع کرلیا اور رکوع میں سجدۂ تلاوت کی نیت کرلی، تو مقتدیوں کے لیے نیت کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر مقتدیوں نے نیت نہیں کی، تو ان کا سجدۂ تلاوت ادا ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

مستحب یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت کو مستقل ادا کیا جائے۔[۱]

اگر رکوع میں امام نے تو سجدۂ تلاوت کی نیت کی؛ لیکن مقتدیوں نے نیت نہیں کی، تو مقتدیوں کا سجدۂ تلاوت ادا نہیں ہوگا، وہ امام صاحب کے سلام کے بعد سجدۂ تلاوت اور قعدۂ اخیرہ کا اعادہ کریں گے۔ (در مختار مع شامی: ۱؍ ۷۲۴)[۲]

ہاں! اگر مقتدیوں نے بھی رکوع میں نیت کر لی ہے، تو ان کی جانب سے بھی سجدۂ تلاوت ادا ہوجائے گا، اسی طرح سے اگر آیت سجدہ ختم کر کے فوراً سجدہ کرلیا اور آگے کچھ بھی نہیں پڑھا، تو نماز کے سجدے میں سجدۂ تلاوت بلا کسی نیت کے بھی ادا ہوجائے گا۔ (درمختار)[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (وتؤدى بركوع وسجود) غير ركوع الصلاة وسجودها (في الصلاة) [الدر المختار] ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله وتؤدى بركوع وسجود) الواو بمعنى أو. قال في الحلية والأصل في أدائها السجود وهو أفضل ولو ركع لها على الفور جاز وإلا لا اهـ أي وإن فات الفور لا يصح أن يركع لها . . . الخ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۱۱، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة، ط: دار الفكر-بيروت)

والمستحب أنه إذا أراد أن يسجد وإذا رفع رأسه من السجود يقوم ثم يقعد، كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۵، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة، ط: دار الفكر)

[۲] (و) تؤدى (بركوع صلاة) إذا كان الركوع (على الفور من قراءة آية) أو آيتين وكذا الثلاث على الظاهر كما في البحر (إن نواه) أي كون الركوع (لسجود) التلاوة على الراجح (و) تؤدى (بسجودها كذلك) أي على الفور (وإن لم ينو) بالإجماع، ولو نواها في ركوعه ولم ينوها المؤتم لم تجزه ويسجد إذا سلم الإمام ويعيد القعدة، ولو تركها فسدت صلاته كذا في القنية وينبغي حمله على الجهرية. نعم لو ركع وسجد لها فورا ناب بلا نية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۱۱-۱۱۲، باب سجود التلاوة، ط: دار الفكر)

[۳] (و) تؤدى (بسجودها كذلك) أي على الفور (وإن لم ينو) بالإجماع. (حوالہ سابق)

[۱۰] سجدۂ تلاوت ادا کرنے کا طریقہ

۹۵۷- سوال: قرآن مجید کی تلاوت کے ختم پر جو سجدۂ تلاوت کیے جاتے ہیں، وہ تمام سجدے ایک ساتھ بیٹھ کر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ یا ہر سجدہ ادا کرتے وقت کھڑا ہونا ضروری ہے؟

الجواب حامداومصليا:

صورت مسئولہ میں تمام سجدۂ تلاوت ایک ساتھ ادا کیے جائیں، تو ادا ہو جائیں گے، ہر ہر سجدے کے لیے قیام کرنا اور قیام کی حالت میں تکبیر کہتے ہوئے سجدے کے لیے جانا ضروری نہیں ہے۔ (درمختار و عالم گیری)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] تفسیر قرآن کے دوران لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے آیتِ سجدہ آہستہ پڑھنا

۹۵۸- سوال: ایک عالمِ دین نمازِ فجر کے بعد قرآنِ پاک کی تفسیر کرتے ہیں، مگر آیتِ سجدہ آتی ہے، تو اُسے آہستہ پڑھتے ہیں، تاکہ بڑے مجمع کو سجدہ نہ کرنا پڑے اور تفسیر میں بیٹھنے کے بجائے کوئی نکل نہ جائے، اس طرح عوام کی رعایت کرتے ہوئے وہ آیتِ سجدہ کو آہستہ پڑھتے ہیں، اور خود اکیلے جا کر سجدہ کرتے ہیں، کیا اُن یہ عمل درست ہے؟

---

[۱] وسنتها التكبير ابتداء وانتهاء، كذا في محيط السرخسي هو الظاهر، كذا في التبيين فإذا أراد السجود كبر و لا يرفع يديه و سجد ثم كبر ورفع رأسه ولا تشهد عليه ولا سلام، كذا في الهداية، ويقول في سجوده: سبحان ربي الأعلى ثلاثا و لا ينقص عن الثلاث كما في المكتوبة، كذا في الخلاصة، وهو الصحيح، هكذا في فتاوى قاضي خان ولو لم يذكر فيها شيئا يجزيه كما في المكتوبة، كذا في الخلاصة، ويرفع صوته بالتكبير والمستحب أنه إذا أراد أن يسجد وإذا رفع رأسه من السجود يقوم ثم يقعد، كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۵، كتاب الصلاة، الباب الثالث عشر في سجود التلاوة، ط: دار الفكر - بيروت)

(وهي سجدة بين تكبيرتين) مسنونتين جهرا وبين قيامين مستحبين (بلا رفع يد وتشهد وسلام وفيها تسبيح السجود) في الأصح (على من كان) متعلق بيجب (أهلا لوجوب الصلاة) لأنها من أجزائها. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۰۷، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة، ط: دار الفكر)

اگرچہ مستحب یہ ہے کہ ہر ایک کو مستقل کھڑا ہو کر ادا کرے اور ہر سجدے کے بعد کھڑا ہو جائے، جیسا کہ مذکورہ بالا عبارات سے واضح ہے، لیکن اگر سجدۂ تلاوت کرنے کے بعد کھڑا نہ ہو؛ بل کہ بیٹھے بیٹھے ہی دوسرا سجدۂ تلاوت کرلے تو بھی ادا ہو جائے گا، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، مفتی صاحبؒ نے اسی دوسری شق کو ذکر کیا ہے۔

الجواب حامداً و مصلیا:

افضل تو یہی ہے کہ تفسیرِ قرآن کے دوران آیتِ سجدہ آ جائے، تو اُسے بھی دیگر آیات کی طرح بالجہر پڑھے اور اُسی وقت سجدہ بھی کرے، کہ فوری سجدہ کر لینا ہی مسنون ہے، اور لوگوں سے بھی کہہ دے کہ سجدہ کر لیجیے، اِس میں لوگوں کو سجدۂ تلاوت کا حکم اور طریقہ بھی معلوم ہوگا، اور عظمت بھی ظاہر ہوگی، اور اس بنا پر مجمع میں کسی قسم کی کمی کا اندیشہ نہیں ہے، اس لیے کہ مسجد میں اکثر لوگ باوضو ہوتے ہیں، اور اگر بے وضو بیٹھتے ہوں، تو اُن کو تاکید کرنی چاہیے کہ وہ اِس جیسی مجالس میں باوضو ہونے کی حالت میں شریک ہوں۔ (ردالمحتار: ۱۲۰/۲)[۱]

البتہ اگر ایسا مجمع ہو کہ اُن میں بے وضو لوگ بھی ہوں، تو سجدہ کی آیت آہستہ پڑھ لینا بھی جائز ہے، اُس میں کوئی حرج نہیں، تا کہ بے وضو شخص کا بے وضو ہونا مجمع کے سامنے ظاہر نہ ہو۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] عن أبي سعيد الخدري، أنه قال: قرأ رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو على المنبر ص، فلما بلغ السجدة نزل فسجد وسجد الناس معه. . . الحديث. (سنن أبي داود: ۲۰۰/۱، رقم الحديث: ۱۴۱۰، كتاب الصلاة، باب السجود في ص، ط: البدر - ديوبند)

ولو تلا على المنبر سجد وسجد السامعون. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله وسجد السامعون) أي لا غيرهم بخلاف الصلاة، تتارخانية. وفي البدائع: ولو تلاها الإمام على المنبر يوم الجمعة سجدها وسجدها معه من سمعها؛ لما روي أنه - عليه الصلاة والسلام - تلا سجدة على المنبر، فنزل وسجد وسجد الناس معه، اهـ والله تعالى أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۲۰/۲، باب سجود التلاوة، قبيل باب صلاة المسافر، ط: دار الفكر)

(۲) واستحسن إخفاؤها عن سامع غير متهيئ للسجود. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله واستحسن إخفاؤها إلخ) لأنه لو جهر بها لصار موجبا عليهم شيئا ربما يتكاسلون عن أدائه فيقعون في المعصية، فإن كانوا متهيئين جهر بها، بحر عن البدائع، قال في المحيط بشرط أن يقع في قلبه أن لا يشق عليه أداء السجدة، فإن وقع أخفاها اهـ وينبغي أنه إذا لم يعلم بحالهم أن يخفيها، نهر. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۱۸/۲، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة، ط: دار الفكر)

ولو قرأ آية السجدة وعنده ناس فإن كانوا متوضئين متهيئين للسجدة قرأها فإن كانوا غير متهيئين ينبغي أن يخفض قراءتها؛ لأنه لو جهر بها لصار موجبا عليهم شيئا بما يتكاسلون عن أدائه فيقعون في المعصية. (بدائع الصنائع: ۱۹۲/۱، سجدة التلاوة، فصل في سنن السجود، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

عن أنس بن مالك - رضی الله عنه - قال: صليت الظهر مع النبی- صلی الله عليه وسلم- بالمدينة أربعاً، والعصر بذی الحليفة ركعتين. (بخاری شریف: ۱/ ۱۴۸)

وخرج علی بن أبی طالب -رضی الله عنه- فقصر وهو يری البيوت، فلما رجع قيل له هذه الكوفة قال: لا حتی ندخلها.
(بخاری شریف: ۱/ ۱۴۸)

باب صلاة المريض والمسافر

[مریض اور مسافر کی نماز کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب صلاۃ المریض والمسافر

[مریض اور مسافر کی نماز کا بیان]

[۱] پہلی صف میں کرسی پر نماز پڑھنا

۹۵۹- سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ: ایک شخص پیر سے معذور ہے، اس کے لیے مسجد میں پہلی صف میں کرسی لگائی جاتی ہے، وہ اس پر بیٹھ کر لنگڑا پیر لٹکا کر فرائض اور سنن ادا کرتا ہے۔ کیا اس طرح پہلی صف میں کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا، جب کہ پیچھے بھی دو تین صفیں ہوتی ہوں، درست ہے؟ اس کو آخری صف میں نماز پڑھنا چاہیے یا پہلی صف میں، درست کیا ہے؟ فرائض وسنن کے بعد وہ شخص فرش پر بیٹھ جاتا ہے، زمین پر بیٹھنے میں اس کے لیے کوئی دقت نہیں، صرف سجدہ میں سر، زمین پر نہیں رکھ سکتا ہے، تو ایسے شخص کے متعلق مذکورہ صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

فرض نماز میں قیام: یعنی کھڑے ہو کر نماز پڑھنا فرض ہے اور رکوع، سجدہ بھی فرض ہے، اگر کوئی شخص کھڑے رہنے کی استطاعت [1] نہیں رکھتا، تو جس قدر بھی کھڑا رہ سکتا ہو- خواہ صرف تکبیر تحریمہ کھڑا ہو کر کہہ سکتا ہو- تو اس قدر کھڑا رہنا فرض ہے، ورنہ نماز صحیح نہ ہوگی، لیکن اگر بالکل بھی کھڑا نہ رہ سکتا ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور بیٹھنے میں جو بھی طریقہ اختیار کرے، درست ہے نماز ادا ہو جائے گی، البتہ جہاں

(۱) استطاعت نہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں مثلاً سر چکراتا ہو، گر جانے کا اندیشہ ہو، بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو، گھٹنے یا اور کسی جگہ شدید درد ہو، جس کی وجہ سے کھڑے ہونے میں دقت ہوتی ہو، معمولی درد یا معمولی تکان کی وجہ سے بیٹھ کر فرض وواجب نماز ادا کرنا درست نہیں ہے۔ (درمختار مع شامی: ۲/ ۹۵-۹۸، باب صلاۃ المریض، ط: دار الفکر- بیروت)

تک ممکن ہو، قبلہ کی طرف پیر لمبا نہ کرے؛ کیوں کہ بلا عذر قبلہ کی طرف پیر کرنا مکروہ ہے، بیٹھنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ قعدہ میں بیٹھنے کی طرح بیٹھے، اگر اس طرح ممکن نہ ہو، تو چار زانو (پالتی مار کر) بیٹھے، یہ بھی ممکن نہ ہو تو تَوَرُّک کر کے بیٹھے، یعنی سرین پر بیٹھ کر پیروں کو موڑ کر شمال یا جنوب میں کر دے۔ (شامی: ۱/۷۰۹- طحطاوی: ۳۳۶)[۲]

الغرض صحیح وسالم اور تندرست شخص کے لیے قیام، رکوع اور سجدہ کرنا فرض ہے، اگر قیام پر قدرت نہ ہو، تو زمین پر بیٹھ کر نماز پڑھے، اگر زمین پر بیٹھ کر بھی نماز نہ پڑھ سکتا ہو، تو کرسی پر پڑھے۔

اس تفصیل کے بعد جاننا چاہیے کہ مسجد میں اگلی صف میں نماز پڑھنے کے لیے کرسی رکھنا مکروہ ہے، کیوں کہ اگر وہ معذور موجود نہیں ہوگا، تو صفیں ٹوٹیں گی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوں کو توڑنے والے کے لیے بددعا اور جوڑنے والے کے لیے دعا فرمائی ہے۔ (۳)

صورتِ مسئولہ میں معذور شخص جب زمین پر بیٹھ سکتا ہے، جس کی علامت یہ ہے کہ وہ نوافل بیٹھ کر ہی

---

[۲] (من تعذر عليه القيام) أي كله (لمرض) حقيقي وحده أن يلحقه بالقيام ضرر به يفتي... (أو) حكمي بأن (خاف زيادته أو بطء برئه بقيامه أو دوران رأسه أو وجد لقيامه ألما شديدا) أو كان لو صلى قائما سلس بوله... (صلى قاعدا) ولو مستندا إلى وسادة، أو إنسان؛ فإنه يلزمه ذلك على المختار (كيف شاء) على المذهب؛ لأن المرض أسقط عنه الأركان فالهيئات أولى. وقال زفر: كالمتشهد، قيل وبه يفتي (بركوع وسجود وإن قدر على بعض القيام) ولو متكئا على عصا أو حائط (قام) لزوما بقدر ما يقدر ولو قدر آية أو تكبيرة على المذهب... (وإن تعذرا) ليس تعذرهما شرطا بل تعذر السجود كاف (لا القيام أومأ)... (قاعدا) وهو أفضل من الإيماء قائما؛ لقربه من الأرض (ويجعل سجوده أخفض من ركوعه)... (ولا يرفع إلى وجهه شيئا يسجد عليه) فإنه يكره تحريما. (الدر المختار مع رد المختار: ۲/ ۹۵-۹۸، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۶-۱۳۷، كتاب الصلاة، الباب الرابع عشر في صلاة المريض، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الهداية: ۱/ ۱۶۱، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، ط: ياسر نديم - ديوبند)

(۳) عن عبد الله بن عمر... أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: أقيموا الصفوف وحاذوا بين المناكب وسدوا الخلل ولينوا بأيدي إخوانكم... ولا تذروا فرجات للشيطان ومن وصل صفا وصله الله، ومن قطع صفا قطعه الله. (سنن أبي داود: ۱/ ۹۷، رقم الحديث: ۶۶۶، كتاب الصلاة، باب تسوية الصفوف، ط: البدر - ديوبند ☆ المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۲/ ۹۳، رقم الحديث: ۸۱۹، كتاب الإمامة، من وصل صفا، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

پڑھتا ہے، تو اس کے لیے کرسی وغیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، متولی اور ٹرسٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو ایسے کام سے منع کریں، اور خود معذروں کی بھی ذمہ داری ہے کہ صفوں میں خلل پیدا نہ کریں، پہلی صف میں کرسی وغیرہ رکھنے سے مندرجہ ذیل قباحت لازم آتی ہے:

۱- مسجد میں جو شخص پہلے آتا ہے، وہ جہاں چاہے بیٹھ سکتا ہے، اگر کرسی رکھی ہوگی، تو مسجد میں پہلے آنے والا شخص اس جگہ نہیں بیٹھ سکے گا، اور اس طرح جگہ روکنا لازم آئے گا، جو درست نہیں ہے۔

۲- اگر وہ معذور کسی وجہ سے مسجد نہیں آسکا، تو پہلی صف ناقص رہ جائے گی۔

۳- اس میں ضرورت سے زیادہ جگہ روکنا ہے۔

۴- صف توڑنے کی نبی کریم ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے۔

لہٰذا کرسی، ٹیبل وغیرہ مسجد میں رکھنے سے بچنا چاہیے اور مسجد کے فرش پر نیچے بیٹھ کر نماز پڑھنی چاہیے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] مسافر کا چار رکعت پڑھنا یا پڑھانا

۹۶۰- سوال: اگر کوئی مسافر چار رکعت پڑھ لے، یا پڑھا لے، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر کوئی مسافر چار رکعت پڑھ لے؛ لیکن قعدہ اولیٰ میں بیٹھا ہو اور اخیر میں سجدۂ سہو کیا ہو، تو نماز ہو جائے گی؛[۱] لیکن اس کے پیچھے مقیم کی نماز نہ ہوگی۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (فلو أتم مسافر إن قعد في) القعدة (الأولی تم فرضه و) لكنه (أساء) لو عامدا؛ لتأخير السلام، وترك واجب القصر، وواجب تكبيرة افتتاح النفل، وخلط النفل بالفرض، وهذا لا يحل... (وما زاد نفل) كمصلي الفجر أربعا، (وإن لم يقعد بطل فرضه) وصار الكل نفلا لترك القعدة. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/۱۲۸، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: زكريا - ديوبند☆ الفتاوی الهندية: ۱/۱۳۹، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: زكريا - ديوبند☆ البحر الرائق: ۲/۲۳۰، كتاب الصلاة، باب المسافر، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) ولو نوی الإقامة لا لتحقيقها بل ليتم صلاة المقيمين لم يصر مقيما. (الدر المختار) ــــ قال ابن عابدين: (قوله لم يصر مقيما) فلو أتم المقيمون صلاتهم معه فسدت؛ لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل، ظهيرية. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/۱۳۰، باب صلاة المسافر، قبل: مطلب في الوطن الأصلي ووطن الإقامة، ط: دار الفكر)

[۳] ایامِ حج میں مسافر کا اِمامت کرنا

۹۶۱- سوال: ایامِ حج میں اگر کوئی شخص اِمامت کروائے تو قصر و اِتمام کے متعلق کیا حکم ہوگا؟ اُس میں ائمہ کے اختلاف سے کیا فرق پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

منفرداً نماز پڑھے یا اِمام بن کر، ہر حال میں قصر لازم ہے۔ اُس میں ائمہ کے اختلاف سے کوئی فرق نہیں ہوگا، اگر اِتمام کرے گا، تو مکروہِ تحریمی کا مرتکب ہوگا، اور وقت کے رہتے ہوئے نماز کا اعادہ لازم ہوگا۔[1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] ایس ٹی کا کنڈیکٹر روزانہ اٹھتر کلومیٹر کا سفر کرے، تو کون سی نماز پڑھے گا؟

۹۶۲- سوال: میں ایس ٹی محکمے میں کنڈکٹر ہوں، میرا گاؤں پریج ہے، جو بھروچ ضلع میں ہے، میری ملازمت انکلیشور ڈپو میں ہے، روزانہ ۷۸ / اٹھتر کیلومیٹر سے زیادہ مجھے سفر کرنا ہوتا ہے، تو کیا میں شرعاً مسافر کہلاؤں گا یا نہیں؟ نیز میں اپنے گاؤں پریج سے نکل کر بھروچ پہنچوں، تب بھی مجھے سفر کی نماز پڑھنی پڑے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً

جب آپ اپنے گاؤں سے اس ارادے سے نکلیں، کہ مجھے اٹھتر کلومیٹر دور یا اس سے زیادہ بہ طور کنڈیکٹر جانا ہے، تو آپ گاؤں کی آبادی سے نکلتے ہی شرعاً مسافر ہوں گے اور آپ پر مسافر کے احکام جاری ہوں گے۔ خواہ اتنی دور روزانہ ہی کیوں نہ جانا پڑتا ہو، اس لیے جب آپ بھروچ پہنچیں، اور نماز ادا کرنی

---

(۱) وفرض المسافر في الرباعية ركعتان، كذا في الهداية، والقصر واجب عندنا، كذا في الخلاصة فإن صلى أربعا وقعد في الثانية قدر التشهد أجزأته والأخريان نافلة ويصير مسيئا لتأخير السلام وإن لم يقعد في الثانية قدرها بطلت، كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۹، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: دار الفكر)

وكذا كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب إعادتها. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۴۵۷، باب واجبات الصلاة، ط: دار الفكر- بيروت)

پڑے، تو چار رکعات والی نماز بہ طور قصر دو رکعت پڑھیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] مسافر سفر سے واپس ہوتے ہوئے کہاں پہنچے گا، تو مقیم ہوگا؟

گذشتہ سے پیوستہ

۹۶۳- سوال: میں اپنی ملازمت سے واپس اپنے گھر کے لیے جاؤں، تو میں کس جگہ سے شرعاً مقیم شمار کیا جاؤں گا، یعنی میں ملازمت سے فارغ ہو کر جب گھر جاؤں، اور بھروچ میں مجھے نماز پڑھنی پڑے، تو میں کون سی نماز پڑھوں مسافر کی یا مقیم کی؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

سفر ختم کر کے اپنے گاؤں کی حدود (قبرستان، عیدگاہ، گاؤں کی آبادی) میں داخل ہونے سے آپ مقیم بنیں گے؛ لہٰذا بھروچ میں آپ مسافر ہی رہیں گے اور نماز قصر ادا کریں گے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] بس کی سیٹ پر نماز پڑھنا

۹۶۴- سوال: بس کی سیٹ پر نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

---

(۱) قال محمد - رحمه الله تعالى - يقصر حين يخرج من مصره ويخلف دور المصر، كذا في المحيط وفي الغيائية هو المختار وعليه الفتوى، كذا في التتارخانية الصحيح ما ذكر أنه يعتبر مجاوزة عمران المصر لا غير إلا إذا كان ثمة قرية أو قرى متصلة بربض المصر فحينئذ تعتبر مجاوزة القرى بخلاف القرية التي تكون متصلة بفناء المصر فإنه يقصر الصلاة وإن لم يجاوز تلك القرية، كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۳۹، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: دار الفكر☆البحر الرائق: ۲/۲۲۵- ۲۳۳، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: دار الكتاب- ديوبند☆الهداية في شرح بداية المبتدي: ۱/۸۰، باب صلاة المسافر، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي☆الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۱۲۱- ۱۲۳، باب صلاة المسافر، ط: دار الفكر)

(۲) وكذا إذا عاد من سفره إلى مصره لم يتم حتى يدخل العمران ولا يصير مسافرا بالنية حتى يخرج ويصير مقيما بمجرد النية، كذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۳۹، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: دار الفكر)

(قوله حتى يدخل موضع مقامه) أي الذي فارق بيوته سواء دخله بنية الاجتياز أو دخله لقضاء حاجة لأن مصره متعين للإقامة فلا يحتاج إلى نية جوهرة، ودخل في موضع المقام ما ألحق به كالربض كما أفاده القهستاني. (رد المحتار على الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۱۲۴، باب صلاة المسافر، ط: دار الفكر)

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر کسی مقام پر نماز پڑھنے کا موقع نہ ملے، اور نماز کا وقت ختم ہونے کے قریب ہو، تو جس قدر فرائض واجبات کی رعایت کے ساتھ ممکن ہو، نماز پڑھ لے، نماز بالکل ترک نہ کرے۔[1] ہاں منزل پر پہنچ کر اعادہ کر لے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] بس کے انجن کی سیٹ پر نماز پڑھنا

۹۶۵- سوال: بس کے انجن کی سیٹ پر نماز پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے نماز پڑھ سکتے ہیں، اور سجدے میں سر اور پیشانی ٹک جاتی ہے، تو سجدہ ادا ہو جائے گا، اور اگر سیٹ نہیں ہے اور سجدے میں پیشانی ٹکتی نہ ہو، تو سجدہ ادا نہ ہونے کی وجہ سے نماز ادا نہ ہوگی۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ... في تيمم الحلية عن المبتغى مسافر لا يقدر أن يصلي على الأرض لنجاستها وقد ابتلت الأرض بالمطر يصلي بالإيماء إذا خاف فوت الوقت اهـ.(رد المحتار على الدر المختار: ۴۱/۲، كتاب الصلاة، باب الوتر و النوافل، مطلب في القادر بقدرة غيره، ط: دار الفكر)

(۲) وفي الخلاصة وفتاوى قاضي خان وغيرهما الأسير في يد العدو إذا منعه الكافر عن الوضوء والصلاة يتيمم ويصلي بالإيماء ثم يعيد إذا خرج... لأن هذا عذر جاء من قبل العباد فلا يسقط فرض الوضوء عنه اهـ.ـــــ فعلم منه أن العذر إن كان من قبل الله تعالى لا تجب الإعادة، وإن كان من قبل العبد وجبت الإعادة.(البحر الرائق شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري(م: ۹۷۰هـ): ۱۴۹/۱، كتاب الطهارة، باب التيمم، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۳) (أما إذا كان) الكور (على رأسه فقط وسجد عليه مقتصرا) أي ولم تصب الأرض جبهته ولا أنفه على القول به (لا) يصح لعدم السجود على محله وبشرط طهارة المكان وأن يجد حجم الأرض والناس عنه غافلون.(الدر المختار)
قال ابن عابدين: (قوله على محله) أي محل السجود الذي هو الجبهة والأنف،... (قوله وأن يجد حجم الأرض) تفسيره أن الساجد لو بالغ لا يتسفل رأسه أبلغ من ذلك، فصح على طنفسة وحصير وحنطة وشعير وسرير وعجلة وإن كانت على الأرض لا على ظهر حيوان كبساط مشدود بين أشجار، ولا على أرز أو ذرة إلا في جوالق أو ثلج إن لم يلبده وكان يغيب فيه وجهه ولا يجد حجمه، أو حشيش إلا إن وجد حجمه، ومن هنا يعلم الجواز على الطراحة القطن، فإن وجد الحجم جاز وإلا فلا بحر (قوله والناس عنه غافلون) أي عن اشتراط وجود الحجم في السجود على نحو الكور والطراحة، كما يغفلون عن اشتراط السجود على الجبهة في كور العمامة.(رد المحتار على الدر المختار: ۵۰۰/۱، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فروع قرأ بالفارسية أو التوراة أو الإنجيل، مطلب في إطالة الركوع للجائي، ط: دار الفكر) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سابق سوال: ''بس کی سیٹ پر نماز پڑھنا''۔

[۸] منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں نمازوں کا حکم

۹۶۶- سوال: میں تاریخ شمسی کے لحاظ سے تین کو مکہ پہنچا تھا، تیرہ تاریخ کو منیٰ میں پہنچا، چودہ تاریخ کو عرفات میں جا کر حج کیا، میں نے حج کے ایام میں نمازیں پوری (چار رکعت) پڑھی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا مجھے دوبارہ نمازوں کو قصر کے طور پر دہرانا پڑے گا؟ میرا ارادہ مکہ مکرمہ میں اٹھائیس دن ٹھہرنے کا تھا؛ اس لیے میں نے حج کے ایام میں نمازیں پوری پڑھی تھیں، میرے پیچھے مزید ایک دو آدمیوں نے نماز پڑھی ہے، جو مجھ سے تقریباً پچیس دن پہلے آچکے تھے، تو کیا ان کو بھی اپنی نمازیں دہرانی پڑیں گی؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کو چوں کہ ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷ تاریخوں میں منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں قیام کرنا ہے اور ان مقامات میں اقامت کی نیت کرنا صحیح نہیں ہے؛ اس لیے ان مقامات میں آپ مسافر کہلائیں گے، لہٰذا مذہب حنفی کے مطابق آپ کے لیے قصر کرنا واجب تھا، اور چار رکعت والی نماز میں صرف دو رکعت پڑھنا لازم تھا، آپ نے دو کے بجائے چار پڑھی ہے؛ اس لیے (وقت رہتے ہوئے) اعادہ ضروری ہے۔[۱] اور وہ حضرات، جو آپ سے پچیس دن سے پہلے مکہ مکرمہ پہنچ چکے ہیں، انہوں نے اگر وہاں اقامت کی نیت کر لی ہے، تو ان کا آپ کے پیچھے پوری نماز پڑھنا صحیح نہیں ہوا، اس لیے ان پر بھی نماز کا اعادہ لازم ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (فيقصر إن نوى) الإقامة (في أقل منه) أي في نصف شهر (أو) نوى (فيه لكن في غير صالح) أو كنحو جزيرة، أو نوى فيه لكن (بموضعين مستقلين كمكة ومنى) فلو دخل الحاج مكة أيام العشر لم تصح نيته؛ لأنه يخرج إلى منى وعرفة، فصار كنية الإقامة في غير موضعها، وبعد عوده من منى تصح... (فلو أتم مسافر إن قعد في) القعدة (الأولى تم فرضه، و) لكنه (أساء) لو عامدا لتأخير السلام، وترك واجب القصر، وواجب تكبيرة افتتاح النفل، وخلط النفل بالفرض،... (وإن لم يقعد بطل فرضه) وصار الكل نفلا لترك القعدة المفروضة... (وصح اقتداء المقيم بالمسافر في الوقت وبعده فإذا قام) المقيم (إلى الإتمام لا يقرأ) ولا يسجد للسهو (في الأصح) لأنه كاللاحق. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۲۵-۱۲۸، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: دار الفكر- بيروت)

وكذا كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب إعادتها. (المصدر السابق: ۱/ ۴۵۷، باب واجبات الصلاة)

(۲) فلو أتم المقيمون صلاتهم معه فسدت لأنه اقتداء المفترض بالمتنفل ظهيرية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۳۰، باب صلاة المسافر)

[۹] سفر کے دوران فرض نمازوں کا حکم

۹۶۷-سوال: ایک شخص سفر کی نیت کر کے اپنے وطن سے روانہ ہوا اور تین منزل سفر طے کر کے اسے کسی ایک جگہ پندرہ دن سے زیادہ ٹھہرنا ہے، تو اب اپنے وطن سے اس جگہ تک جاتے ہوئے اور وہاں سے وطن واپس آتے ہوئے سفر کے درمیان کی نمازوں میں قصر کرے گا یا پوری پڑھے گا؟

الجواب حامدا ومصليا:

اڑتالیس میل کے ارادے سے جب اپنے شہر کے حدود سے نکل جائے گا، تو اسے قصر کرنا ہوگا، شہر کی آبادی سے باہر منزل پر پہنچ کر جب پندرہ دن کے قیام کا ارادہ کرے، تو پوری نماز پڑھے اور راستہ میں ان نمازوں میں قصر کرے گا۔ (شامی، عالم گیری)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] مختلف مقامات میں ٹھہرنے کی نیت سے نمازوں کا حکم

۹۶۸-سوال: عمر نے جوہانس برگ سے ویرلم جاتے ہوئے - جو تقریباً چار سو میل ہے - کا سفر طے کیا ہے، وہ ویرلم میں بارہ دن تک رہے گا، وہاں قیام کے دوران ویرلم کے اطراف میں بھی اس کی آمد ورفت رہے گی، جو ویرلم سے تین منزل کے اندر اندر ہے، کبھی اسے رات کا قیام بھی وہیں کرنا پڑے گا، پھر وہ چار دن ڈربن میں رہے گا، ان چار دنوں میں بھی اسے ادھر ادھر تین منزل کے اندر اندر آنا جانا رہے گا، یہ سب مل کر کل سولہ دن ہوں گے، ان سولہ دنوں میں وہ اپنی نمازیں قصر پڑھے یا پوری؟

الجواب حامدا ومصليا:

مسافر شرعی پر احکام اقامت کے لزوم کے لیے فقط ایک جگہ پندرہ دن کا قیام شرط ہے؛ لہٰذا صورت مسئولہ میں قصر ہی کے احکامات جاری ہوں گے؛ اس لیے کہ ویرلم میں بارہ دن کے قیام کا ارادہ ہے، اطراف

[۱] (من خرج من عمارة موضع إقامته) ...(قاصدا مسيرة ثلاثة أيام ولياليها) ...(بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة صلى الفرض الرباعي ركعتين) ...(حتى يدخل موضع مقامه) ...(أو ينوي إقامة نصف شهر بموضع واحد (صالح لها) من مصر أو قرية (فيقصر إن نوى) الإقامة (في أقل منه) أي في نصف شهر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۱۲۱-۱۲۵، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۳۸، ۱۳۹، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: مكتبة زكريا - ديوبند)

وجوانب میں چار پانچ دن سیر وتفریح کا ارادہ ہے؛ لہٰذا ایک جگہ پندرہ دن کے قیام کا ارادہ نہیں ہوا؛ اس لیے وہ مسافر ہی رہے گا۔ (شامی)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] ٹھہر ٹھہر کر سفر کرنے کی صورت میں نمازوں کا حکم

۹۶۹- سوال: بکر اپنے مکان سے چھ سو میل دور ویرلم میں پندرہ دن سے زائد ٹھہرنے کی نیت سے چلا ہے، دوران سفر اسے بعض جگہ ایک دن اور بعض جگہ دو دن ٹھہرتے ہوئے ویرلم جانا ہے، ویرلم جا کر وہاں وہ پندرہ دن سے زائد ٹھہرے گا، لیکن وہاں سے ویرلم کے اطراف وجوانب میں اس کی آمد و رفت محض تفریحاً رہے گی، اب سوال یہ ہے کہ وہ شرعی مسافر ہوگا یا نہیں، نیز وہ اپنی نمازوں میں قصر کرے گا یا اتمام؟

الجواب حامداومصلیا:

تین، چار یا پانچ، چھ سو میل کے سفر کا ارادہ ہے؛ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اول مرحلہ میں اس کا ارادہ کتنے میل سفر کرنے کا ہے، اگر اول مرحلہ میں اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ کے سفر کا ارادہ ہے، تو وہ شرعی مسافر ہوگیا؛ لہٰذا اب اگر پندرہ بیس میل پر ایک دو دن کے قیام کا ارادہ ہے، تب بھی اس پر مسافر کے احکام ہی جاری ہوں گے؛ لیکن جب وہ ویرلم یا ڈربن پہنچے گا اور پندرہ دن کے قیام کا ارادہ کرلے گا، تو وہ مقیم ہوجائے گا، اس پر اقامت کے احکام جاری ہوں گے، ویرلم یا ڈربن میں جب اس نے پندرہ دن یا ایک مہینہ کے قیام کا ارادہ کرلیا؛ اور اطراف وجوانب میں اڑتالیس میل سے کم کے سفر پر جائے گا، تو وطن اقامت باطل نہیں ہوگا، اڑتالیس میل سے زائد کے ارادے سے جائے گا، تو وہ مسافر ہوجائے گا اور وطن اقامت باطل ہوجائے گا، ویرلم آکر دوبارہ پندرہ دن کے قیام کا ارادہ کرے گا، تو مقیم بنے گا، ورنہ مسافر ہی رہے گا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱-۲) من خرج من عمارة موضع إقامته... قاصداً... مسيرة ثلاثة أيام ولياليها (باليسر الواسط مع الاستراحات المعتادة)... صلى الفرض الرباعي ركعتين... (حتى يدخل موضع مقامه)... (أو ينوي) (إقامة نصف شهر) (بموضع) واحد (صالح لها) من مصر أو قرية... (فيقصر إن نوى) الإقامة (في أقل منه) أي في نصف شهر. (أو نوى (فيه لكن في غير صالح) الخ... الإقامة أصل إلا إذا قصدوا موضعا بينهما مدة السفر فيقصرون إن نووا سفرا وإلا لا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۲۱-۱۲۸، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۸، ۱۳۹، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: مكتبه زكريا- ديوبند)

[۱۲] ملازمت کرنے والا جب اپنے وطن اصلی آئے تو اس کی نمازوں کا حکم

۹۷۰- سوال: احمد اپنے آبائی وطن سے تقریباً سو میل کی مسافت پر تدریسی خدمت انجام دے رہا ہے، چھٹیوں میں وہ اپنے والدین کے گھر پر آتا رہتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا جب وہ اپنے والدین کے گھر پر آئے گا تو اس وقت وہ اپنی نمازوں میں قصر کرے گا یا اتمام؟ نیز شادی کے بعد اگر وہ عارضی طور پر یا مستقل طور پر اپنی اس ملازمت والی جگہ پر جائے، اور مکان کرائے پر لے کر یا خرید کر وہاں رہنے لگے، تو کیا اس صورت میں جب وہ اپنے والدین کے گھر ملاقات کے لیے آیا کرے گا، تو وہ مسافر شمار ہوگا یا مقیم؟ اور راستہ میں آتے جاتے ہوئے وہ اپنی نمازوں میں قصر کرے گا یا اتمام؟

الجواب حامداومصلیا:

احمد کا تولد جس جگہ ہوا ہے، وہ اس کا وطن اصلی ہے، ملازمت والا مکان وطن اقامت ہے؛ لہٰذا والدین کے پاس آنے جانے سے بلا کسی نیت کے اس پر اقامت کے احکام جاری ہوں گے۔[1] ملازمت والی جگہ پر جب بھی جائے گا، وہاں پر پندرہ دن سے زیادہ اگر ٹھہرنے کا ارادہ کرے گا، تو اس پر اقامت کے احکام جاری ہوں گے، ورنہ اس پر سفر کے احکام ہی جاری ہوں گے۔[2] ملازمت والے شہر میں اگر مکان خرید لیا یا کرایہ پر لے لیا اور وہاں ہمیشہ کے لیے رہنے کا ارادہ کرلیا ہے، تو یہ اب اس کا وطن اصلی ہوجائے گا اور اپنے والدین کے مکان پر جانے سے وہ مسافر ہوگا۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] مسافر کسی ایک جگہ پندرہ دن اقامت کی نیت کرنے سے مقیم ہوجاتا ہے

۹۷۱- سوال: میں جتالی سے بمبئی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں؛ لیکن مجھے بمبئی میں

(۱) ویبطل (وطن الإقامة بمثله و) بالوطن (الأصلي). (الدر المختار) قال الشامي: (قوله ویبطل وطن الإقامة) ...وهو ما خرج إليه بنية إقامة نصف شهر. (رد المحتار: ۲/ ۱۳۲، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي ووطن الإقامة، ط: دار الفكر)

(۲) ولا یزال علی حكم السفر حتی ینوي الإقامة في بلدة أو قریة خمسة عشر یوما أو أكثر. (الفتاوی الهندیة: ۱/ ۱۳۹، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: دار الفكر)

(۳) أن یتوطن في بلدة أخری وینقل الأهل إلیها فیخرج الأول من أن یكون وطنا أصلیا حتی لو دخله مسافرا لا یتم. (البحر الرائق: ۲/ ۱۴۷، باب صلاة المسافر، ط: دار الكتب العلمیة)

کتنے دن رہنا ہے، میں نے یہ متعین نہیں کیا، تو مجھے قصر نماز کب تک پڑھنی پڑے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مسافر جب تک ایک جگہ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ کرے، اس وقت تک اس کے لیے قصر کرنا ضروری ہے۔ آپ ٹریننگ کے لیے آئے ہیں۔ اب اگر آپ نے پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کی ہے، تو آپ مقیم ہو جائیں گے، پوری نماز پڑھنی پڑے گی۔ اور اگر کوئی نیت نہیں ہے، تو بغیر نیت کے آٹھ، دس، بیس، پچیس مہینے بھی رہیں گے، تب بھی آپ مقیم نہ ہوں گے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] مقیم کا مسافر امام کی اقتداء میں نماز ادا کرنا

۹۷۲- سوال: ہمارے یہاں مسافر خانہ میں کوئی بھی شخص نماز پڑھا دیتا ہے، خواہ وہ مسافر ہو یا مقیم، اب بہت سی مرتبہ میں جماعت میں تاخیر سے شامل ہوتا ہوں، تو مجھے کس طرح نیت کر کے نماز پڑھنی چاہیے، مثلاً امام مسافر ہے، قعدۂ اخیرہ میں ہے، میں نے اس کی قعدہ اخیرہ میں اقتداء کی، جب کہ میں مقیم ہوں، مجھ پر قصر نہیں ہے، اب مجھے امام کے سلام پھیرنے کے بعد پتہ نہیں چلا کہ چار رکعت پڑھائی یا دو رکعت؛ تو ایسی صورت میں میری نماز مکمل شمار ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اولاً تو آپ نماز باجماعت پڑھنے کے لیے امام کا انتظام کیجیے؛ تاکہ مذکورہ مسائل پیدا ہی نہ ہوں۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ امام مسافر ہو، تو وہ دو رکعت پر سلام پھیر کر فوراً اعلان کرے کہ ''میں مسافر ہوں، مقیم حضرات اپنی نماز مکمل کر لیں''۔ اس اعلان سے آپ کو بھی امام کے مسافر ہونے کی اطلاع ہو جائے گی، اور آپ چوں کہ مقیم ہیں؛ اس لیے اب آپ کو چار رکعت ہی پڑھنی ہوگی اور اگر امام مسافر ہے اور مقتدی بھی مسافر ہے، تو اس صورت میں بھی کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے، سب کو دو ہی رکعت پڑھنی ہے؛ لیکن مقتدی

---

(۱) ولا يزال على حكم السفر؛ حتى ينوي الإقامة في بلدة أو قرية خمسة عشر يوما أو أكثر . . . الخ" ولو دخل مصرا على عزم أن يخرج غدا أو بعد غد ولم ينو مدة الإقامة حتى بقي على ذلك سنين قصر". (الهداية-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ) :۱/ ۱۶۶، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی- دیوبند ☆ رد المحتار: ۲/ ۶۰۶-۶۰۷، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: مکتبہ زکریا- دیوبند)

حضرات مقیم ہوں اور امام مسافر ہوں، تو اس صورت میں پریشانی ہوگی کہ وہ چار رکعت پڑھے، یا دو رکعت پڑھے؛ اس لیے اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے مسافر خانہ میں ایک نوٹ لکھ کر لگا دیں کہ جو بھی شخص امامت کرائے، وہ اعلان کر دے کہ وہ مسافر ہے یا مقیم، ورنہ تو حنفی مذہب کے مطابق بہت سی پریشانیاں کھڑی ہوں گی، اس لیے کہ حنفی مذہب میں قصر کرنا واجب ہے، اب اس صورت میں، جب کہ امام مسافر ہے اور مقتدی حضرات مقیم ہیں، امام کے لیے تو دو رکعت پر بیٹھنا فرض ہے؛ کیوں کہ اس کے حق میں دوسری رکعت کا قعدہ قعدۂ اخیرہ ہے اور یہ قعدہ فرض ہے، اب قعدہ کرنے کے بعد سلام سے قبل تیسری یا چوتھی رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا، تو سلام میں تاخیر کی وجہ سے سجدہ سہو واجب ہوگا، اگر اس نے سجدۂ سہو نہ کیا، تو نماز واجب الاعادہ ہوگی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] سفر شرعی کی مقدار

۹۷۳- سوال: شرعی اعتبار سے سفر کے احکام کتنی مسافت پر جاری ہوں گے؟

الجواب حامدا ومصليا:

شرعی سفر جس سے نماز میں قصر واجب ہوتا ہے ۴۸ ر میل ہے جس کے ۷۶ کیلومیٹر ۸۰۰ سینٹی میٹر ہوتے ہیں؛ اس لیے ۷۷ رکیلومیٹر کے سفر کے ارادہ سے اپنے گاؤں سے نکلا ہے، تو شہر یا فناء شہر کو چھوڑتے ہی سفر کے احکام جاری ہوں گے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[1] (وصح اقتداء المقيم بالمسافر في الوقت وبعده، فإذا قام) المقيم (إلى الإتمام لا يقرأ) ولا يسجد للسهو (في الأصح) لأنه كاللاحق، والقعدتان فرض عليه، وقيل لا (وندب للإمام) هذا يخالف الخانية وغيرها أن العلم بحال الإمام شرط، لكن في حاشية الهداية للهندي الشرط العلم بحاله في الجملة لا في حال الابتداء. وفي شرح الإرشاد ينبغي أن يخبرهم قبل شروعه وإلا فبعد سلامه (أن يقول) بعد التسليمتين في الأصح «أتموا صلاتكم فإني مسافر» لدفع توهم أنه سها، ولو نوى الإقامة لا لتحقيقها بل ليتم صلاة المقيمين لم يصر مقيما، وأما اقتداء المسافر بالمقيم فيصح في الوقت ويتم لا بعده فيما يتغير. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۳۰، ۱۳۱، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: دار الفكر ☆ الهداية: ۱/ ۱۶۶ - ۱۶۷، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: مكتبه ياسر نديم اينڈ كمپني - ديوبند)

[1] (قاصدا مسيرة ثلاثة أيام ولياليها) من أقصر أيام السنة ... (بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة) أي سير الإبل ومشي الأقدام ويعتبر في الجبل بما يناسبه من السير وكذا ما في الفتح من أنه قيل يقدر بواحد وعشرين =

[۱۶] مسافتِ سفر میں طویل وقریب دوراستوں میں سے کس کا اعتبار ہوگا؟

۹۷۴- سوال: میں اپنے گاؤں سے اطراف کے دیہاتوں میں تجارت کے لیے سفر کرتا ہوں، گاؤں سے نکل کر واپس لوٹنے تک کی مسافت ۴۸ر میل سے زیادہ ہوتی ہے؛ لیکن ان میں کوئی ایسا گاؤں نہیں کہ اگر میں اپنے گاؤں سے سیدھا اس گاؤں پہنچوں تو ۴۸ر میل ہو جائے، تو کیا مجھ پر سفر کے احکام جاری ہوں گے یعنی: قصر واجب ہوگی یا مکمل نماز پڑھنی ہوگی؟

الجواب حامداومصليا:

آپ جس راستے سے سفر کرتے ہیں اسی راستے کے اعتبار سے حکم لگے گا، یعنی اگر آپ نے ۷۷ر کلو میٹر والا راستہ اختیار کیا ہے، تو اس سے آپ مسافر شمار ہوں گے اور اگر ۷۷ر سے کم مسافت کا راستہ اختیار کیا ہے، تو مسافر نہ ہوں گے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] مسافر کب قصر کرے اور کب اتمام؟

۹۷۵- سوال: ہمارے یہاں والور میں ایک شخص بہ تاریخ ۱۵/ ۲/ ۱۹۸۲ پیر کے دن نوکری کی تلاش میں شرعی سفر طے کر کے آیا، ملازمت ملنے کی وجہ سے اس نے وہیں اقامت اختیار کر لی، پھر اس نے ارادہ کیا کہ ۲۹/ ۲/ ۱۹۸۲ اتوار کے دن واپس گھر جا کر اہل وعیال کو ساتھ لے آئے تو کیا وہ اس دوران مکمل نماز پڑھے گا یا قصر کرے گا؟ اگر قصر کا حکم ہے، تو مکمل پڑھی ہوئی نمازوں کا کیا ہوگا یا اس درمیان

=فرسخا وقيل بثمانية عشر وقيل بخمسة عشر ثم اختلفوا فقيل: واحد وعشرون، وقيل: ثمانية عشر، وقيل: خمسة عشر والفتوى على الثاني لأنه الأوسط. وفي المجتبى فتوى أئمة خوارزم على الثالث. وجه الصحيح أن الفراسخ تختلف باختلاف الطريق في السهل والجبل والبر والبحر. (رد المحتار: ۲/ ۶۰۰ - ۶۰۳، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: مكتبه زكريا - ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۸، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: مكتبه زكريا - ديوبند)

(۱) فإذا قصد بلدة وإلى مقصده طريقان، أحدهما مسيرة ثلاثة أيام ولياليها، والآخر دونها، فسلك الطريق الأبعد كان مسافرا عندنا، هكذا في فتاوى قاضي خان، وإن سلك الأقصر يتم، كذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۸، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: دار الفكر☆ رد المحتار: ۲/ ۶۰۳، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: مكتبه زكريا - ديوبند)

اگر امامت کرائی ہو، تو ان نمازوں کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداو مصلیا:

مسافر ہونے کے بعد جب تک مستقل ۱۵ ردن ٹھہرنے کا ارادہ نہ کرے، اس وقت تک وہ مسافر ہی شمار ہوگا، قصر کرنا واجب ہوگا۔ اس دوران اگر امامت کرائے گا، تو دو رکعت پر سلام پھیرنے کے بعد اعلان کر دے کہ میں مسافر ہوں، مقیم حضرات اپنی اپنی نماز مکمل کرلیں۔ (ہاں اگر مسافر نے مقیم امام کے پیچھے مکمل نماز پڑھنے کی نیت کی، تو اس کی نماز ادا ہو جائے گی) اگر مسافر امام نے مکمل نماز (چار رکعت) پڑھائی، تو اس صورت میں مقتدیوں کی نماز صحیح نہ ہوگی؛ البتہ امام کی نماز صحیح ہو جائے گی؛ اس لیے کہ امام کی پہلی دو رکعت فرض تھی اور تیسری اور چوتھی رکعت نفل تھی اور اقتداء المفترض خلف المتنفل جائز نہیں ہے۔[1]

اور اگر مسافر نے مستقل پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرلی، تو اب چار رکعت والی نماز میں اس کا امامت کرنا صحیح ہو جائے گا، اس لیے کہ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرنے کی وجہ سے وہ مقیم ہو گیا۔ پندرہ دن ٹھہرنے کا ارادہ کیا؛ لیکن کسی ضروری کام کی وجہ سے کہیں جانا پڑا، تو وہ پھر دوبارہ مسافر ہو جائے گا، اب اگر دوبارہ اقامت کی نیت کرے گا، تو ہی مقیم کے احکام اس پر جاری ہوں گے، ورنہ نہیں۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

(۱) واقتداء المفترض بالمتنفل لا يجوز عندنا. (المحيط البرهاني: ۱/ ۴۰۶، كتاب الصلاة، الفصل السادس عشر في التغني والألحان، ط: دار الكتب العلمية ☆ الهداية: ۱/ ۱۲۷، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: مكتبه ياسر نديم اينڈ كمپنى - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۶، كتاب الصلاة، باب الإمامة، الفصل الثالث في بيان من يصلح إماما لغيره، ط: دار الفكر)

(۲) لا يزال على حكم السفر حتى ينوي الإقامة في بلدة أو قرية خمسة عشر يوما أو أكثر وإن نوى أقل من ذلك قصر " وإن صلى المسافر بالمقيمين ركعتين سلم وأتم المقيمون صلاتهم " لأن المقتدي التزم الموافقة في الركعتين فينفرد في الباقي كالمسبوق إلا أنه لا يقرأ في الأصح " ويستحب للإمام إذا سلم أن يقول أتموا صلاتكم فإنا قوم سفر " لأنه عليه الصلاة والسلام قاله حين صلى بأهل مكة وهو مسافر " وإن صلى أربعا وقعد في الثانية قدر التشهد أجزأته الأوليان عن الفرض والأخريان له نافلة " وإن لم يقعد في الثانية قدرها بطلت " لاختلاط النافلة بها قبل إكمال أركانها ". (الهداية: ۱/ ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: مكتبه ياسر نديم اينڈ كمپنى - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۲، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: مكتبه زكريا - ديوبند)

[۱۸] مسافر پر نماز جمعہ واجب نہیں ہے

۹۷۶-سوال: مسافر پر نماز جمعہ فرض ہے یا نہیں نیز مسافر نماز جمعہ کی امامت کرا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مسافر پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے؛ مگر جب جمعہ میں حاضر ہوگا، تو اس کی نماز جمعہ ادا ہو جائے گی؛ لہٰذا امامت کرے گا، تو مقیم مقتدیوں کی نماز درست ہو جائے گی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

[۱۹] وطن اصلی میں اتمام ضروری ہے، خواہ ایک دن ہی ٹھہرنے کا ارادہ کیوں نہ ہو

۹۷۷-سوال: میں کبھی کبھی کرمالی اپنے وطن اصلی آتا ہوں، تو کیا مجھ پر قصر واجب ہوگی یا مکمل نماز پڑھنی پڑے گی؟ حالاں کہ میں کرمالی میں صرف دو دن کا مہمان رہتا ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

وطن اصلی: وہ ہے جہاں انسان کی ولادت ہوئی ہو اور وہاں اس نے ہمیشہ کے لیے رہنے کا ارادہ کر لیا ہو۔

وطن واقامت: انسان جس جگہ کسی کام یا پیشہ وغیرہ کے لیے رہتا ہو، اگر چہ وہ ۴۰/۵۰ سال تک رہے؛ لیکن اس نے اس کو وطن اصلی نہیں بنایا ہے، اس کو ہمیشہ کے لیے قیام گاہ کے طور پر منتخب نہیں کیا ہے، مگر وہاں ۱۵/دن ٹھہرنے کی نیت کرتا ہے، تو اب وہ مقیم ہو جائے گا، اسے پوری نماز پڑھنی پڑے گی۔

آپ کا وطن کرمالی ہے اور آپ نے اس کو ترک نہیں کیا ہے؛ بل کہ وقتاً فوقتاً آپ آتے رہتے ہیں، معلوم ہوا کہ کرمالی کو آپ نے اپنا وطن اصلی باقی رکھا ہے؛ اس لیے کرمالی آکر آپ پوری نماز پڑھیں گے۔ اور اگر آپ نے کرمالی کو چھوڑ دیا اور یہ نیت کی کہ احمد آباد میں ہی اب ہمیشہ رہوں گا، خواہ ملازمت باقی رہے یا نہ رہے، تو اب کرمالی وطن اصلی باقی نہیں رہے گا، اب جب تک آپ کرمالی میں پندرہ دن اقامت کی نیت

(۱) " ويجوز للمسافر والعبد المريض أن يؤم في الجمعة ". (الهداية: ۱/ ۱۶۷، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: مكتبه ياسر نديم اينڈ كمپنى - ديوبند ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۶۶، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: دار الكتاب - ديوبند)

نہیں کریں گے، اس وقت تک آپ یہاں آنے کے بعد مسافر ہی شمار ہوں گے اور آپ کو قصر ہی کرنی پڑے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] مسافر نے بھول سے ظہر کی چار رکعت پڑھ لی تو کیا حکم ہے؟

۹۷۸- سوال: ۱۵۰: ایک آدمی نے ترکیسر سے بمبئی کا سفر کیا، تو کیا وہ مسافر ہو گیا؟ اس کی دو ہی دن ٹھہرنے کی نیت تھی، دوسرے تین آدمی بھی اس کے ساتھ تھے؛ اس شخص نے ظہر کی نماز امام بن کر پڑھائی؛ لیکن قصر کرنا بھول گیا اور تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا اور اس کو تیسری رکعت میں یاد آ گیا کہ وہ مسافر ہے، اس کے باوجود وہ نہیں بیٹھا اور چار رکعت پوری کر لی، تو کیا ظہر کی فرض نماز ادا ہوئی یا نفل؟ اور اگر کوئی جان بوجھ کر سفر کی حالت میں قصر نہ کرے، تو اس کا کیا حکم ہے؟ اور پیچھے تین مقتدیوں میں سے کسی ایک مقتدی نے دو رکعت پر بیٹھ کر سلام پھیر دیا، تو اس کا کیا حکم ہے، اس کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں اور سفر کی حالت میں سنت کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

جان بوجھ کر اگر کوئی مسافر قصر نہ کرے اور چار رکعت پڑھ لے تو نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے، ہاں اگر بھول سے ایسا ہو گیا ہو، تو سجدہ سہو واجب ہے، اگر سجدہ سہو بھی نہیں کیا، تو اعادۂ صلاۃ واجب ہے۔ (شامی: ۱۲۸/۲)[۲]

(۱) والوطن الأصلي هو وطن الإنسان في بلدته أو بلدة أخرى اتخذها دارا وتوطن بها مع أهله وولده، وليس من قصده الارتحال عنها بل التعيش بها وهذا الوطن يبطل بمثله لا غير، وأما وطن الإقامة فهو الوطن الذي يقصد المسافر الإقامة فيه، وهو صالح لها نصف شهر. (البحر الرائق: ۲۳۹/۲، كتاب الصلاة، باب المسافر، ط: زكريا- ديوبند ☆ رد المحتار: ۶۱۴/۲، كتاب الصلاة، مطلب في الوطن الأصلي ووطن الإقامة، ط: مكتبه زكريا- ديوبند)

[۱] (فلو أتم مسافر إن قعد في) القعدة (الأولى تم فرضه و) لكنه (أساء) لو عامدا لتأخير السلام وترك واجب القصر وواجب تكبيرة افتتاح النفل وخلط النفل بالفرض، وهذا لا يحل كما حرره القهستاني بعد أن فسر أساء بأثم واستحق النار (وما زاد نفل) كمصلي الفجر أربعا (وإن لم يقعد بطل فرضه) وصار الكل نفلا لترك القعدة المفروضة. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله وصار الكل نفلا) أي بتقييده الثالثة بسجدة لتمكنه من العود قبلها وهذا عندهما بناء على أنه إذا بطل الوصف لا يبطل الأصل خلافا لمحمد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۲۸/۲، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: دار الفكر - بيروت)

وفرض المسافر في الرباعية ركعتان، كذا في الهداية، والقصر واجب عندنا، كذا في الخلاصة فإن صلى أربعا وقعد في الثانية قدر التشهد أجزأته والأخريان نافلة ويصير مسيئا لتأخير السلام وإن لم يقعد في الثانية قدرها بطلت، كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱۳۹/۱، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: دار الفكر)

دو رکعت پر قعدہ کرنے کے بعد جو دو رکعت پڑھی ہے وہ نفل ہے اور جس مقتدی نے دو رکعت کے بعد سلام پھیر دیا، اس کی نماز صحیح ہے، اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ (شامی صفحہ ۵۹۲)[۱]

سفر میں سنتیں پڑھنی چاہیے، جب کہ وقت ہو اور کوئی جلدی نہ ہو، دوران سفر سوائے فجر کے دوسری نماز کی سنتوں کو چھوڑنا جائز ہے، اپنی منزل پر پہونچنے کے بعد سنتیں پڑھنا افضل ہے۔ (درمختار)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] ایک ہی شہر کی مختلف جگہوں پر پندرہ دن سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت ہو تو؟

۹۷۹- سوال: ہماری تبلیغی جماعت چار مہینہ کے لیے بنگلور شہر میں آئی ہے، پورے چار مہینہ شہر ہی میں رہنے کا ارادہ ہے اور بنگلور میں کل ۲۶ر حلقے ہیں، جو تقریباً ۳۰ سے ۴۰ کلومیٹر کے علاقہ میں پھیلے ہوئے ہیں، اور ہر حلقہ میں زیادہ سے زیادہ ۲ر ہفتہ ۱۴ دن کا قیام ہے، تو اب دریافت یہ کرنا ہے کہ ہمیں نماز قصر کرنی ہوگی یا پوری ادا کرنی ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلياً:

صورت مسئولہ میں - کہ بنگلور شہر میں ہی چھبیس حلقے ہیں اور چار مہینہ چھبیس حلقے میں چودہ دن یا اس

---

[۱] (وأربعة أشياء إذا تعمد الإمام لا يتابعه المقتدي) زاد في صلاته سجدة عمدا، . . . أو قام إلى الخامسة ساهيا. كذا في الوجيز للكردري، فإن لم يقيد الخامسة بالسجدة وعاد وسلم سلم المقتدي معه وإن قيد الخامسة بالسجدة سلم المقتدي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۹۰، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، الفصل السادس فيما يتابع الإمام وفيما لا يتابعه، ط: دار الفكر)

[۲] (ويأتي) المسافر (بالسنن) إن كان (في حال أمن وقرار وإلا) بأن كان في خوف وفرار (لا) يأتي بها هو المختار لأنه ترك لعذر تجنيس، قيل إلا سنة الفجر. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله هو المختار) وقيل الأفضل الترك ترخيصا، وقيل الفعل تقربا. وقال الهندواني: الفعل حال النزول والترك حال السير، وقيل يصلي سنة الفجر خاصة، وقيل سنة المغرب أيضا بحر قال في شرح المنية والأعدل ما قاله الهندواني. اهـ.

قلت: والظاهر أن ما في المتن هو هذا وأن المراد بالأمن والقرار النزول وبالخوف والفرار السير لكن قدمنا في فصل القراءة أنه عبر عن الفرار بالعجلة لأنها في السفر تكون غالبا من الخوف تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۳۱، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، قبيل: مطلب في الوطن الأصلي ووطن الإقامة، ط: دار الفكر ☆ (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۹، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: دار الفكر)

سے کم دن کے اعتبار سے گزارنے ہیں- پوری نماز پڑھنی پڑے گی؛ کیوں کہ بنگلور شہر میں چار مہینے ٹھہرنے کی نیت ہے اور یہ ایک جگہ اقامت کرنے کے حکم میں ہے۔ (شامی)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] مسافت سفر پر جانے والا بس ڈرائیور قصر کرے گا

۹۸۰- سوال: ایک بس ڈرائیور ہے، جو مانڈوی کا باشندہ ہے، وہ بس لے کر ۸۰ سے ۱۰۰ کلومیٹر تک جاتا ہے، وہاں زیادہ سے زیادہ تیس (۳۰) منٹ ٹھہرتا ہے۔ اب وہاں نماز کا وقت ہو جائے۔ تو وہ نماز میں قصر کرے گا یا پوری پڑھے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

۷۷ رکلومیٹر سے زیادہ یا ۷۷ رکلومیٹر تک جانے والے ڈرائیور کو جہاں بس لے کر جانا ہے، وہاں پندرہ دن سے کم ٹھہرنا ہو، تو قصر کرے گا۔ مذکورہ ڈرائیور ۸۰ رکلومیٹر جاتا ہے اور صرف تیس منٹ ٹھہرتا ہے، تو وہ قصر کرے گا اور چار رکعت والی فرض نماز دو ہی رکعت پڑھے گا۔ (عالم گیری)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] كما لو نوى مبيته بأحدهما أو كان أحدهما تبعا للآخر بحيث تجب الجمعة على ساكنه للاتحاد حكما. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله أو كان أحدهما تبعا للآخر) كالقرية التي قربت من المصر بحيث يسمع النداء على ما يأتي في الجمعة وفي البحر لو كان الموضعان من مصر واحد أو قرية واحدة فإنها صحيحة لأنهما متحدان حكما ألا ترى أنه لو خرج إليه مسافرا لم يقصر. اهـ. ط. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۱۲۶، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: دار الفكر-بيروت)

ولو نوى الإقامة خمسة عشر يوما في موضعين فإن كان كل منهما أصلا بنفسه نحو مكة ومنى والكوفة والحيرة لا يصير مقيما وإن كان أحدهما تبعا للآخر حتى تجب الجمعة على سكانه يصير مقيما. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۴۰، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: دار الفكر)

قيد بالمصرين ومراده موضعان صالحان للإقامة، لا فرق بين المصرين أو القريتين أو المصر والقرية، للاحتراز عن نية الإقامة في موضعين من مصر واحد أو قرية واحدة فإنها صحيحة؛ لأنهما متحدان حكما، ألا ترى أنه لو خرج إليه مسافر لم يقصر. (البحر الرائق: ۲/۱۴۳، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۲] أقل مسافة تتغير فيها الأحكام مسيرة ثلاثة أيام، كذا في التبيين، هو الصحيح، كذا في جواهر الأخلاطي الأحكام التي تتغير بالسفر هي قصر الصلاة وإباحة الفطر... الخ... والمعتبر السير الوسط، كذا في السراجية وهو سير الإبل ومشي الأقدام في أقصر أيام السنة، كذا في التبيين،... ولا معتبر بالفراسخ هو الصحيح، كذا في الهداية.... وتعتبر المدة من أي طريق أخذ فيه، كذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۳۸، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: دار الفكر) =

[۲۳] مسافتِ سفر میں فناءِ مصر کا اعتبار

۹۸۱- سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ مذہب مسئلۂ ذیل کے متعلق کہ:

زید شہر ڈھاکہ کے محلہ خواجہ دیوان میں مقیم بہ وطنِ اقامت ہے، اگر یہ پندرہ دن سے کم کے لیے اتنی دور کا سفر کرے کہ منزل مطلوب تک محلہ خواجہ دیوان سے ۵۰ ر میل کی مسافت ہوجاتی ہے، جو کہ مسافتِ سفرِ شرعی ہے؛ لیکن اگر محلہ کے بجائے شہر کی اُن حدود سے مسافت شمار کی جائے، جن کو وہ عبور کر کے نکلا ہے، تو مسافتِ سفر شرعی پوری نہیں ہوتی، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ صورتِ مذکورہ میں زید حدودِ شہر سے باہر رہنے کی مدت میں، آیا ابتداءِ سفر کا اعتبار محلے ہی سے کرتے ہوئے وہ مسافر شمار ہوگا، یا احاطۂ حدودِ شہر کا اعتبار کرتے ہوئے وہ مقیم شمار ہوگا؟ جواب مدلل ومفصل باحوالہ تحریر کر کے ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

فقہاء کرام نے تحریر فرمایا ہے کہ فناءِ مصر داخلِ مصر ہے۔[1] لہٰذا فناءِ مصر کے عبور کے بعد ہی مسافت

= ولا یزال علی حکم السفر حتی ینوي الإقامة في بلدة أو قریة خمسة عشر یوما أو أکثر، کذا في الهدایة.
(حوالہ سابق: ۱/ ۱۳۹ ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۳۰، کتاب الصلاة، باب المسافر، ط: دار الکتاب- دیوبند)

فالذي یصیر المقیم به مسافرا، نیة مدة السفر، والخروج من عمران المصر، فلا بد من اعتبار ثلاثة أشیاء: أحدها: مدة السفر، وأقلها غیر مقدر عند أصحاب الظواهر، وعند عامة العلماء مقدر، واختلفوا في التقدیر قال أصحابنا: مسیر ثلاثة أیام سیر الإبل ومشي الأقدام وهو المذکور في ظاهر الروایات. وروي عن أبي یوسف یومان وأکثر الثالث، وکذا روی الحسن عن أبي حنیفة وابن سماعة عن محمد، ومن مشایخنا من قدره بخمسة عشر فرسخا وجعل لکل یوم خمس فراسخ، ومنهم من قدره بثلاث مراحل. (بدائع الصنائع: ۱/ ۹۳، کتاب الصلاة، فصل بیان ما یصیر به المقیم مسافرا، ط: دار الکتب العلمیة- بیروت)

نوٹ: ۴۸ ر میل کی مسافت سفر شرعی کے لیے لازم ہے، میل دو طرح کا ہوتا ہے، میل انگریزی اور میل شرعی، میل انگریزی کے حساب سے ۴۸ ر میل کے ۷۷ ر کلومیٹر ہوتے ہیں۔ (حضرت مفتی صاحبؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے، ہندوستانی علماء کی بڑی تعداد اسی کی قائل ہے۔) جب کہ میل شرعی کے حساب سے ۴۸ میل کے ۸۷ کلومیٹر ہوتے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: الاوزان المحمودۃ)

(۱) (قوله من خرج من عمارة موضع إقامته) ... وأشار إلی أنه یشترط مفارقة ما کان من توابع موضع الإقامة کربض المصر، وهو ما حول المدینة من بیوت ومساکن، فإنه في حکم المصر، وکذا القری المتصلة بالربض في الصحیح ... وأما الفناء وهو المکان المعد لمصالح البلد کرکض الدواب ودفن الموتی وإلقاء التراب، فإن اتصل بالمصر اعتبر مجاوزته وإن انفصل بغلوة أو مزرعة فلا. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۱۲۱، باب صلاة المسافر)

سفر کا اعتبار کیا جائے گا، چناں چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وہ عمل جسے امام بخاریؒ نے نقل فرمایا ہے؛ اُس سے یہ واضح ہوتا ہے:

وخرج علي بن أبي طالب -رضي الله عنه- فقصر وهو يرى البيوت، فلما رجع قيل له هذه الكوفة قال: لا حتى ندخلها. (بخاری: ۱/۱۴۸) [۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ فناءِ مصر شہر میں داخل ہے:

عن أنس بن مالك رضي الله عنه، قال: صليت الظهر مع النبي صلى الله عليه وسلم بالمدينة أربعا، والعصر بذي الحليفة ركعتين. (بخاری: ۱/۱۴۸) [۳]

الغرض صورتِ مسئولہ میں زید مقیم شمار ہوگا؛ کیوں کہ وہ جہاں گیا ہے، وہ جگہ سفرِ شرعی کی مسافت کے بہ قدر نہیں ہے۔ [۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] صحيح البخاري: ۱/۱۴۸، رواه تعليقا، كتاب الصلاة، أبواب تقصير الصلاة، باب يقصر إذا خرج من موضعه، ط: البدر - ديوبند.

عن علي بن ربيعة قال: "خرجنا مع علي بن أبي طالب رضي الله عنه متوجهين ههنا، وأشار بيده إلى الشام فصلى ركعتين ركعتين، حتى إذا رجعنا ونظرنا إلى الكوفة حضرت الصلاة، فقالوا: يا أمير المؤمنين، هذه الكوفة نتم الصلاة؟ قال: "لا، حتى ندخلها". (السنن الكبرى- أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۳/۲۰۹، رقم الحديث: ۵۴۴۸، جماع أبواب صلاة المسافر والجمع في السفر، باب: لا يقصر الذي يريد السفر حتى يخرج من بيوت القرية، ثم يقصر حتى يدخل أدنى بيوتها، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۳] صحيح البخاري: ۱/۱۴۸، رقم الحديث: ۱۰۸۹، كتاب الصلاة، أبواب تقصير الصلاة، باب يقصر إذا خرج من موضعه، ط: البدر - ديوبند.

(۴) إذا جاوز المقيم عمران مصره قاصدا مسيرة ثلاثة أيام ولياليها . . . يلزمه قصر الصلاة. (قاضي خان مع الهندية: ۱/۱۶۴، باب صلاة المسافر، ط: زكريا - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۳۹، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: زكريا - ديوبند ☆ البحر الرائق: ۱/۲۲۶، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: زكريا - ديوبند)

واضح رہے کہ مسافتِ سفر کا آغاز کہاں سے ہوگا؟ اس موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی - انڈیا کا باضابطہ سیمینار منعقد ہو چکا ہے۔ اس سیمینار کا ایک سوال یہی تھا کہ "ایسا شخص جو ایسے مقام کا سفر کر رہا ہو، جو شہر کی انتہائی حدود سے تو ۴۸ میل کے فاصلے پر نہ ہو، لیکن اس کے گھر کے پاس سے ۴۸ میل کا فاصلہ ہو تو وہ قصر کرے گا یا اتمام؟

عارضِ مسئلہ نے لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں مقالہ نگاروں کی دو طرح کی آراء ہیں، ۲۳ مقالہ نگار حضرات تو اس حق میں ہیں کہ ایسا شخص اتمام کرے گا، جب کہ ۲۱ حضرات اس صورت میں قصر کے قائل ہیں۔ (مسافتِ سفر کا آغاز - ایک اہم شرعی مسئلہ، ص: ۴۱-۴۲، مسافتِ سفر کا شمار کہاں سے ہوگا؟ عارض: مفتی حبیب اللہ قاسمی، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی - انڈیا) =

[۲۴] سمندری جہاز کے ملازم کے لیے قصر کا حکم

۹۸۲- سوال: میں سمندری جہاز میں ملازم ہوں، سمندری جہاز میں گھر سے زیادہ سہولیات مہیا ہوتی ہیں، جہاز اکثر اوقات سفر کی حالت میں رہتا ہے، اس صورت میں مجھے نماز مکمل پڑھنی ہوگی یا قصر لازم ہوگا؟ ایک حافظ صاحب سے مسئلہ پوچھنے کے بعد پچھلے دو سال سے قصر کر رہا ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر آپ کا جہاز سفر کے ارادے سے سفرِ شرعی کی مسافت (تقریباً ۷۸ رکلومیٹر) طے کرلے، تو آپ مسافر شمار ہوں گے، اور حالتِ سفر میں آپ کو قصر کرنا ہوگا، اور اگر جہاز سفرِ شرعی کی مسافت سے کم رقبے میں گھومتا رہتا ہے، تو آپ مسافر شمار نہ ہوں گے، اس صورت میں مکمل نماز پڑھنی ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= اس سلسلے میں اکیڈمی کا فیصلہ یہ ہے:

۳- چھوٹے شہروں میں مسافت شرعی کا حساب اس جگہ سے ہوگا، جہاں شہر ختم ہوا ہے، یعنی شہر ختم ہونے کے بعد ۴۸ر میل کا سفر کیا جائے، تبھی وہ مسافر ہوگا۔

۴- بڑے شہروں میں، جن کی آبادی میلوں تک پھیل گئی ہے، مسافت شرعی کا شمار کس مقام سے ہوگا، اس میں دو نقاط نظر ہیں: زیادہ حضرات کی رائے ہے کہ جہاں شہر ختم ہوتا ہے، وہیں سے ۴۸ر میل کی مسافت شمار کی جائے گی، دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ جس محلہ سے سفر شروع ہوا ہے، وہیں سے مسافت کا شمار ہوگا، البتہ اس پر سبھوں کا اتفاق ہے کہ نماز میں قصر کا حکم شہر سے باہر نکلنے کے بعد ہی شروع ہوگا۔ (مسافت سفر کا آغاز- ایک اہم شرعی مسئلہ ص: ۲۴، مسافت سفر کا آغاز، اکیڈمی کا فیصلہ، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی- انڈیا)

تقریباً یہی بات حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے فتویٰ میں ذکر فرمائی ہے۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

(۱) (من خرج من عمارة موضع إقامته) من جانب خروجه وإن لم يجاوز من الجانب الآخر.... (قاصدا)... (مسيرة ثلاثة أيام ولياليها)... (بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة) حتى لو أسرع فوصل في يومين قصر، ... (صلى الفرض الرباعي ركعتين)... (ولو) كان (عاصيا بسفره)... (حتى يدخل موضع مقامه) إن سار مدة السفر، وإلا فيتم بمجرد نية العود... (أو ينوي)... (إقامة نصف شهر) حقيقة أو حكما... (فيقصر إن نوى الاقامة (في أقل منه) أي في نصف شهر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱۲۱/۲-۱۲۵، كتاب الصلاة، باب المسافر، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲۲۵/۲ تا ۲۳۱، باب المسافر، ط: دار الكتاب- ديوبند)

والمعتبر في البحر ثلاثة أيام في ريح مستوية غير غالبة ولا ساكنة كما في الجبل يعتبر فيه أيضا ثلاثة أيام وإن كان في السهل تقطع في أقل منها. (الفتاوى الهندية: ۱۳۸/۱-۱۳۹، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر ط: دار الفكر)

[۲۵] بیرونِ ملک سے فرض نماز ادا کر کے ہندوستان آنے والے کی دوبارہ اُسی نماز میں شرکت

۹۸۳- سوال: ایک شخص عصر کی نماز بیرونِ ملک میں ادا کر کے ہندوستان آیا، اُس وقت ہندوستان میں عصر کی نماز کا وقت تھا، تو کیا اس شخص کے لیے عصر کی نماز میں دوبارہ شرکت جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اس شخص نے جب بیرونِ ملک میں عصر کی نماز ادا کر لی، تو چوں کہ عصر کی نماز کے بعد نوافل نہیں ہے؛ لہٰذا ہندوستان آ کر وہ عصر میں بہ نیتِ نفل شامل نہیں ہوسکتا۔[1] البتہ اگر ظہر یا عشاء کی نماز ہو رہی ہو تو بہ نیتِ نفل شرکت جائز ہے، بہ طورِ فرض نہیں؛ اس لیے کہ فرض ادا کر چکا ہے، البتہ رمضان المبارک میں ہندوستان آیا، اور یہاں ۲۹واں یا ۳۰واں روزہ ہے، تو افطار نہ کرے؛ بل کہ روزہ رکھے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] وطن سے کتنی مسافت پر قصر کا حکم ہے؟ کن کن نمازوں میں قصر کا حکم ہے؟ اگر لمبا سفر ہو تو کب تک قصر کرے؟

۹۸۴- سوال: مسافر آدمی وطن سے کتنی مسافت کی دوری پر پہنچے تو اُس کے لیے قصر کا حکم ہوگا؟ اگر سفر طویل ہو، تو کب تک قصر کرتا رہے گا؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیا:

جب گاؤں کی حد، آبادی اور گاؤں کی ضروریات کے لیے قائم کردہ تعمیرات وغیرہ سے آگے نکل

---

(۱) واعلم أن الأوقات المكروهة نوعان: الأول الشروق والاستواء والغروب. والثاني ما بين الفجر والشمس، وما بين صلاة العصر إلى الاصفرار. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۷۳، كتاب الصلاة، مطلب يشترط العلم بدخول الوقت، ط: دار الفكر-بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۲۹، كتاب الصلاة، بيان وقت المكروه، ط: زكريا-ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۳، الباب الأول في مواقيت الصلاة وما يتصل بها، الفصل الثالث في الأوقات التي لا تجوز فيها الصلاة، ط زكريا-ديوبند ☆ الهداية شرح بداية المبتدي: ۱/ ۸۴، كتاب الصلاة، باب المواقيت، ط: ياسر نديم-ديوبند)

(۲) قوله تعالى: فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ. (۲-البقرة: ۱۸۵)

جائے تو قصر کا حکم ہے، سفر سے واپسی کے وقت بھی اسی حد پر قصر کا حکم ختم ہوگا۔ [۱]

ظہر، عصر اور عشاء کی نماز میں قصر کرے یعنی دو رکعت پڑھے، اُن کے علاوہ دیگر تمام نمازیں پوری پڑھے، اپنے وطن سے ۷۸ رکیلومیٹر دور کا سفر ہو، تو آدمی مسافر کہلائے گا، لہٰذا اپنی بستی ختم ہوتے ہی وہ قصر شروع کردے گا، پھر جب تک سفر میں رہے، قصر کرتا رہے، البتہ اگر دورانِ سفر کسی جگہ پندرہ دِن تک ٹھہرنے کی نیت کرلی، تو یہ وطنِ اقامت کہلائے گا، لہٰذا جب تک اُس جگہ مقیم رہے، پوری نماز پڑھے، ہر نماز کی سنن قبلیہ اور بعدیہ کو بھی پڑھتا رہے، خصوصاً فجر کی سنت کو ہرگز نہ چھوڑے۔ [۲]

جس جگہ سفر میں گیا ہے، وہاں پہنچنے کے بعد اگر پندرہ دِن یا اُس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت نہ کی ہو، تو قصر کرتا رہے، اگر چہ بغیر نیت کے پندرہ دِن سے زیادہ اقامت ہوجائے، پوری مدت قصر کرتا رہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] شہر کے ریلوے اسٹیشن سے قصر شروع کرنا

۹۸۵-سوال: ایک شخص نے اپنا سفر شروع کیا، ابھی گھر سے نکل کر اسٹیشن پر پہنچا ہے اور وہاں وہ نماز میں قصر کرتا ہے، تو کیا ازروئے شریعت اُس کا یہ عمل صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

جو شخص ۴۸ میل تقریباً ۷۸ رکیلومیٹر کے سفر کے ارادے سے اپنے شہر سے چلا، تو اُس کے لیے قصر

---

[۱] (من خرج من عمارة موضع إقامته) من جانب خروجه وإن لم يجاوز من الجانب الآخر.... (قاصدا)... (مسيرة ثلاثة أيام ولياليها)... (بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة) حتى لو أسرع فوصل في يومين قصر، ... (صلى الفرض الرباعي ركعتين)... (ولو) كان (عاصيا بسفره)... (حتى يدخل موضع مقامه) إن سار مدة السفر، وإلا فيتم بمجرد نية العود... (أو ينوي)... (إقامة نصف شهر) حقيقة أو حكما... (فيقصر إن نوى) الاقامة (في أقل منه) أي في نصف شهر (أو) نوى (فيه لكن في غير صالح) ... (أو لم يكن مستقلا برأيه) كعبد وامرأة (أو دخل بلدة ولم ينوها) أي مدة الإقامة (بل ترقب السفر) غدا أو بعده (ولو بقي) على ذلك (سنين) إلا أن يعلم تأخر القافلة نصف شهر كما مر.. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱۲۱/۲-۱۲۵، كتاب الصلاة، باب المسافر، ط: دار الفكر ☆البحر الرائق: ۲۲۵/۲ تا ۲۳۱، باب المسافر، ط: دار الكتاب- ديوبند)

[۲] (ويأتي) المسافر (بالسنن) إن كان (في حال أمن وقرار وإلا) بأن كان في خوف وفرار (لا) يأتي بها هو المختار لأنه ترك لعذر تجنيس، قيل إلا سنة الفجر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱۳۱/۲، باب صلاة المسافر، ط: دار الفكر- بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۱۳۹/۱، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: زكريا- ديوبند)

کا حکم اُس وقت ہوگا جب کہ وہ اپنے شہر یا بستی کی فنا (ضروریاتِ شہر و بستی کے لیے تعمیر شدہ تعمیرات) سے تجاوز کر جائے، جب تک وہ فناءِ قریہ کی حدود میں ہے، قصر کی اجازت نہیں، اتمام ضروری ہے۔

مذکورۂ بالا صورت میں ریلوے اسٹیشن فناء میں داخل ہو، تو اتمام ضروری ہوگا، جیسا کہ عام طور پر اسٹیشن فناء میں داخل ہوتا ہے، کہ وہ بھی شہر کی عمارت میں سے ہے، لیکن اگر قریہ کا اسٹیشن بستی سے اِس قدر دور ہے کہ بستی کی فناء ختم ہونے کے بعد تین سو یا چار سو گز کے فاصلہ پر ہو اور دیگر عمارت اور اسٹیشن کے بیچ میں اتصالِ تعمیر نہ ہو، خلا ہی خلا ہو، تو ایسی صورت میں ریلوے اسٹیشن فناءِ شہر میں داخل نہیں ہوگا، اور اسٹیشن پہنچتے سے قصر کا حکم ہوگا۔ (درمختار مع الشامی)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۸] ایامِ حج میں منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کے قیام کے دوران کن نمازوں میں قصر کیا جائے؟

۹۸۶- سوال: ایامِ حج میں منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کے قیام کے دوران کون کون سی نمازوں میں قصر ہوگا؟ نیز مدینہ منورہ کے قیام کے دوران اور وہاں سے مکہ واپسی کی صورت میں چار رکعات والی نماز جو بغیر جماعت کے ادا کی جا رہی ہو، تو اُس میں قصر ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر مکہ میں کوئی شخص حج کے لیے ایسے وقت میں پہنچا کہ آٹھویں ذی الحجہ اور منیٰ کے لیے راونگی تک پندرہ دِن سے کم مدت ہے، تو وہ مسافر کہلائے گا، اُس کے لیے لازم ہے کہ وہ چار رکعات والی نماز میں قصر

---

[۱] (قوله من خرج من عمارة موضع إقامته)... وأشار إلى أنه يشترط مفارقة ما كان من توابع موضع الإقامة كربض المصر، وهو ما حول المدينة من بيوت ومساكن، فإنه في حكم المصر، وكذا القرى المتصلة بالربض في الصحيح... وأما الفناء وهو المكان المعد لمصالح البلد كركض الدواب ودفن الموتى وإلقاء التراب، فإن اتصل بالمصر اعتبر مجاوزته وإن انفصل بغلوة أو مزرعة فلا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۲۱/۲، باب صلاة المسافر، ط: دار الفكر-بيروت)

عن علي بن ربيعة قال: " خرجنا مع علي بن أبي طالب رضي الله عنه متوجهين ههنا، وأشار بيده إلى الشام فصلى ركعتين ركعتين، حتى إذا رجعنا ونظرنا إلى الكوفة حضرت الصلاة، فقالوا: يا أمير المؤمنين، هذه الكوفة نتم الصلاة؟ قال: " لا، حتى ندخلها ". (السنن الكبرى- أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۲۰۹/۳، رقم الحديث: ۵۴۴۸، جماع أبواب صلاة المسافر والجمع في السفر، باب: لا يقصر الذي يريد السفر حتى يخرج من بيوت القرية، ثم يقصر حتى يدخل أدنى بيوتها، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

کرے اور دو رکعات پڑھے۔ اگر حج سے پہلے مکہ میں پندرہ دِن رہنا اُس کے لیے ممکن ہے؛ لیکن اُس کا ارادہ مکہ میں پندرہ دِن رہنے کا نہیں ہے؛ بلکہ مدینہ منورہ، طائف یا جدہ یا کسی اور جگہ جانے ارادہ ہے، تب بھی مسافر کہلائے گا، اور قصر لازم ہوگا، مکہ، مدینہ یا کسی اور جگہ جب تک پندرہ دِن قیام کا ارادہ نہ ہو، اس وقت تک قصر کرتا رہے۔ (رد المحتار: ۱۲۶/۲) [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] وطن اصلی کے علاوہ کسی اور جگہ دس بارہ دِن رہنے والا شخص مقیم ہوگا یا نہیں؟

۹۸۷- سوال: ایک آدمی کا مکان، کھیت اور مستقبل میں ہونے والی بیوی وطنِ اصلی میں ہے، اور اُس کے والدین وطنِ عارضی میں ہیں، تو کیا یہ شخص وطنِ عارضی میں اگر دس بارہ دِن رہنے کی نیت سے جائے، تو مقیم کہلائے گا یا مسافر؟ وضاحت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

اگر وطنِ اصلی میں رہنے کا ارادہ ہے، اُس کو ترک نہیں کرتا ہے، اور خود بالغ ہے، تو اس صورت میں

[۱] (من خرج من عمارة موضع إقامته) من جانب خروجه وإن لم يجاوز من الجانب الآخر.... (قاصدا)... (مسيرة ثلاثة أيام ولياليها)... (بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة) حتى لو أسرع فوصل في يومين قصر، ... (صلى الفرض الرباعي ركعتين)... (ولو) كان (عاصيا بسفره)... (حتى يدخل موضع مقامه) إن سار مدة السفر، وإلا فيتم بمجرد نية العود... (أو ينوي)... (إقامة نصف شهر) حقيقة أو حكما... (فيقصر إن نوى الاقامة (في أقل منه) أي في نصف شهر (أو) نوى (فيه لكن في غير صالح) أو كنحو جزيرة أو نوى فيه لكن (بموضعين مستقلين كمكة ومنى) فلو دخل الحاج مكة أيام العشر لم تصح نيته لأنه يخرج إلى منى وعرفة فصار كنية الإقامة في غير موضعها وبعد عوده من منى تصح، كما لو نوى مبيته بأحدهما أو كان أحدهما تبعا للآخر بحيث تجب الجمعة على ساكنه للاتحاد حكما. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱۲۱/۲-۱۲۶)

قال ابن عابدين: (قوله فلو دخل إلخ) هو ضد مسألة دخول الحاج الشام؛ فإنه يصير مقيما حكما، وإن لم ينو الإقامة، وهذا مسافر حكما، وإن نوى الإقامة لعدم انقضاء سفره ما دام عازما على الخروج قبل خمسة عشر يوما أفاده الرحمتي. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۲۶/۲، كتاب الصلاة، باب المسافر، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲۲۵/۲تا۲۳۱، باب المسافر، ط: دار الكتاب - ديوبند)

وذكر في كتاب المناسك أن الحاج إذا دخل مكة في أيام العشر ونوى الإقامة خمسة عشر يوما أو دخل قبل أيام العشر لكن بقي إلى يوم التروية أقل من خمسة عشر يوما ونوى الإقامة لا يصح؛ لأنه لا بد له من الخروج إلى عرفات فلا تتحقق نية إقامته خمسة عشر يوما فلا يصح. (بدائع الصنائع: ۹۸/۱، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يصير المسافر به مقيما، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

مسافر رہے گا؛ لہٰذا قصر کرے گا:

فلو كان له أبوان ببلد غير مولده وهو بالغ ولم يتأهل به فليس ذلك وطنا له. (رد المحتار: ۱۳۱/۲-۱۳۲)[1] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] ۴۸ میل کی مسافت کا ارادہ کرنے والا دوران سفر پندرہ دِن سے کم ٹھہرنے کی نیت کرے، تو قصر کرے گا یا اِتمام؟

۹۸۸- سوال: ایک شخص گھر سے ۴۸ میل کے سفر کی نیت سے نکلا، اور ۴۰ میل طے کرنے کے بعد کسی جگہ اُس نے پندرہ دِن سے کم ٹھہرنے کی نیت کی، تو یہ شخص قصر کرے گا یا اِتمام؟ مدتِ سفر مسلسل طے کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو اُس مدت کو قطع کرنے سے قبل کسی مقام پر پندرہ دِن سے کم ٹھہرنے کی نیت کی بنا پر قصر جائز نہیں ہونا چاہیے، علم الفقہ کے جزئیہ (جلد: ۱۳۱/۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ ضروری ہے:

''اگر کوئی شخص، قبل طے کرنے، مدتِ مسافت کے، جس کا اعتبار میں سفر میں کیا گیا ہے، کسی مقام میں ٹھہرنے کی یا اپنے وطن لوٹ جانے کی نیت کرے، تو وہ مقیم ہو جائے گا، کہ اُس نے اپنے اِرادۂ سفر کو ختم کر دیا۔''

اور البحر الرائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس مدتِ اِقامت میں وہ قصر کرے گا، لہٰذا آں جناب سے گذارش ہے کہ اِس کا جواب مع حوالۂ کتب دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر ۴۸ میل کے سفر کی نیت سے نکلا تو اپنے مقام کی فناء سے نکلنے پر احکامِ قصر نافذ ہو جائیں گے، بقاءِ احکامِ قصر کے لیے اِس سفر میں ۴۸ میل تک جاری رہنا اِس معنی کر شرط ہے کہ ''قطعِ سفر'' یا عود الی الوطن کی نیت نہ ہو۔[2]

(۱) كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، مطلب في الوطن الأصلي ووطن الإقامة، ط: دار الفكر- بيروت☆ الفتاوى الهندية: ۱۴۲/۱، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: زكريا- ديوبند.

(۲)... والحاصل أن شروط الإتمام ستة: النية، والمدة، واستقلال الرأي، وترك السير، واتحاد الموضع، وصلاحيته، قهستاني. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله ستة) زاد في الحلية شرطا آخر وهو أن لا تكون حالته منافية لعزيمته قال كما صرحوا به في مسائل اهـ أي كمسألة من دخل بلدة لحاجة ومسألة العسكر فافهم. ثم هذه شروط الإتمام بعد تحقق مدة السفر وإلا فلا. فلو عزم على الرجوع إلى بلده قبل سيره ثلاثة أيام على قصد قطع السفر فإنه يتم كما مر وكذا لو رجع إلى بلدته لأخذ حاجة نسيها كما سنذكره. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۲۸/۲، كتاب الصلاة، باب المسافر)

چناں چہ ۴۰ میل کے بعد کہیں پندرہ دن سے کم کے لیے ٹھہر گیا؛ لیکن ابھی آگے بڑھنے کی نیت برقرار ہے، تب تو احکامِ قصر باقی رہیں گے، اگر ۴۰ میل پر ٹھہرنے کے ساتھ یہ بھی نیت کر لے کہ اب آگے نہیں جانا ہے اور یہاں سے وطن واپس چلا جاؤں گا، تب احکامِ سفر باقی نہیں رہیں گے، ایسی نیت کرتے ہی قصر کا حکم ساقط ہو جائے گا۔ (شامی: ۲/ ۱۲۳)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] تحقق سفر کے لیے وطن ہی سے نیتِ سفر شرط ہے یا نہیں؟

۹۸۹- سوال: ایک آدمی اپنے وطن سے اتنے دور جانے کے لیے روانہ ہوا کہ وہاں جا کر وہ مسافر نہیں بنتا، یعنی ۴۸ میل کی مسافت سے کم ہے، پھر اُسی دن اُس جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوا؛ لیکن وہ جگہ بھی جہاں سے روانہ ہوا ہے، وہاں سے ۴۸ میل سے کم دوری پر ہے، البتہ اُس کے وطن سے ۴۸ میل کی مسافت پر ہے، تو اب یہ آدمی اس تیسری جگہ مسافر شمار ہوگا یا نہیں؟

مثلاً ایک شخص دیولہ سے کنتھاریہ جو کہ ۶۰ کلومیٹر کی مسافت پر ہے روانہ ہوا، پھر اُسی دن کنتھاریہ سے پانولی جانے کے لیے روانہ ہوا، جو کہ کنتھاریہ سے ۳۰ کیلومیٹر کی مسافت پر ہے، تو یہ شخص کس جگہ سے مسافر شمار ہوگا؟ اپنے وطن سے یا کنتھاریہ سے روانہ ہونے کے بعد؟ اس لیے کہ یہ شخص جب گھر سے نکلا تو

---

[۱] (من خرج من عمارة موضع إقامته) من جانب خروجه وإن لم يجاوز من الجانب الآخر.... (قاصدا)... ومن طاف الدنيا بلا قصد لم يقصر (مسيرة ثلاثة أيام ولياليها)... (بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة) حتى لو أسرع فوصل في يومين قصر،... (صلى الفرض الرباعي ركعتين)... (ولو) كان (عاصيا بسفره)... (حتى يدخل موضع مقامه). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۱۲۱-۱۲۵)

قال ابن عابدين: (قوله بلا قصد) بأن قصد بلدة بينه وبينها يومان للإقامة بها، فلما بلغها بدا له أن يذهب إلى بلدة بينه وبينها يومان وهلم جرا. ح. قال في البحر: وعلى هذا قالوا: أمير خرج مع جيشه في طلب العدو، ولم يعلم أين يدركهم فإنه يتم وإن طالت المدة أو المكث، أما في الرجوع فإن كانت مدة سفر قصر. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۲۲، كتاب الصلاة، باب المسافر، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۲۵ تا ۲۳۱، باب المسافر، ط: دار الكتاب - ديوبند)

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: وطن اصلی یا وطن اقامت (یعنی جہاں پندرہ یوم کے قیام کا قصد ہو) سے جب سفر شروع ہو تو دیکھنا چاہیے کہ کتنی دور چلنے کا مصمم ارادہ ہے، اگر کم از کم تین منزل چلنے کا قصد ہے، خواہ یک دم، خواہ بیچ میں ٹھہرتے ہوئے (بشرطیکہ پندرہ یوم سے کم ٹھہرنے کا قصد ہو) تو قصر کرنا یعنی چار رکعت والے فرض کو دو پڑھنا ضروری ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۷/ ۵۰۴، سفر میں قصر و اتمام کی صورتیں، سوال نمبر: ۳۶۰۱، باب صلاۃ المسافر، ط: دار المعارف - دیوبند)

اُس کی نیت مسافتِ سفر طے کرنے کی نہیں تھی، جب وہ اپنے اخیری مقام یعنی تیسری جگہ پہنچا تو دوسری اور تیسری جگہ کے درمیان کی مسافت پورے ۴۸ میل کی نہیں ہے، اگر چہ اُس کے وطن سے تیسری جگہ تک ۴۸ میل ہو جاتے ہیں، اگر ہم اُس کو مسافر مانتے ہیں تو فتاویٰ دار العلوم جلد چہارم صفحہ: ۴۵۴ کی عبارت سوال نمبر: ۲۲۲۱ کے جواب کے خلاف ہوتا ہے، تو جواب طلب امر یہ ہے کہ تحقق سفر کے لیے وطن ہی سے نیتِ سفر شرط ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

جوازِ قصر کے لیے مدتِ سفر کی نیت شرط ہے، چناں چہ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص نے ایسے مقام کا قصد کیا ہے جہاں تک مسافتِ سفر پوری نہیں ہوتی، تو وہ مقیم ہے، پھر اُس مقام سے روانہ ہو کر دوسری جگہ گیا، جہاں پہلے مقام سے مسافتِ سفر پوری نہیں ہوتی، اگر چہ اُس کے وطن سے مسافتِ سفر مکمل ہو جائے تب بھی یہ شخص مقیم ہی کے حکم میں رہے گا۔ (شامی: ۲/ ۱۲۱)[1]

چناں چہ اس مسئلہ میں بدائع الصنائع کی عبارت واضح ہے کہ مدتِ سفر کی نیت جوازِ قصر کے لیے شرط ہے، مذکور تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ جہاں سے مدتِ سفر کی نیت ہوگی وہاں سے مسافر شمار ہوگا۔

اِس لیے دیولہ سے کنتھاریہ تک نیتِ سفر نہ ہونے کی بنا پر مسافر نہیں ہوا، پھر جب کنتھاریہ سے پانولی کے لیے چلا، تو چوں کہ صرف ۳۰ کیلومیٹر کی مسافت ہے، اِس لیے اتمام کرے گا، لیکن اگر یہ نیت کی ہے کہ کنتھاریہ سے پانولی اور پانولی سے کسی دوسرے راستہ سے دیولہ پہنچیں گے تو اب کنتھاریہ سے وہ مسافر ہوگا۔ (بدائع الصنائع: ۱/ ۹۴)[2]

---

[۱] قال ابن عابدين: (قوله بلا قصد) بأن قصد بلدة بينه وبينها يومان للإقامة بها، فلما بلغها بدا له أن يذهب إلى بلدة بينه وبينها يومان وهلم جرا. ح. قال في البحر: وعلى هذا قالوا: أمير خرج مع جيشه في طلب العدو، ولم يعلم أين يدركهم فإنه يتم وإن طالت المدة أو المكث؛ أما في الرجوع فإن كانت مدة سفر قصر. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۲۲، كتاب الصلاة، باب المسافر، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۲۵ تا ۲۳۱، باب المسافر، ط: دار الكتاب - ديوبند)

[۲] والثاني: نية مدة السفر لأن السير قد يكون سفرا وقد لا يكون؛ لأن الإنسان قد يخرج من مصره إلى موضع لإصلاح الضيعة، ثم تبدو له حاجة أخرى إلى المجاوزة عنه إلى موضع آخر ليس بينهما مدة سفر، ثم، وثم، إلى أن يقطع مسافة بعيدة أكثر من مدة السفر لا لقصد السفر فلا بد من النية للتمييز. (بدائع الصنائع: ۱/ ۹۴، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يصير به المقيم مسافرا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت) =

یہ تو اصل مسئلہ ہوا؛ لیکن نیت وقصدِ سفر سے کیا مراد ہے؟ تو تقریراتِ رافعی تکملۂ شامی صفحہ نمبر ۱۰۷[۳] پر درج ہے کہ اس قصد سے مراد غلبۂ ظن ہے، یعنی غالب گمان مراد ہے، قطعی اور یقینی طور پر مدتِ سفر کی نیت ضروری نہیں ہے، اس لیے ایسا شخص جو جانتا ہے یا اُس کا غالب گمان ہے کہ مجھے ''کنتھاریہ'' ہوکر ''پانولی'' تک جانا ہے، پھر وہ ''دیولہ'' سے سفر کی نیت نہ کرے، تب بھی مسافر کہلائے گا، یعنی نیت کے اصل معنیٰ ''قلبی ارادہ'' کا اعتبار ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] مسافر کے لیے مقیم امام کی اقتدا میں پوری نماز پڑھنا

۹۹۰- سوال: حالتِ سفر میں کچھ دور جانے کے بعد نماز میں قصر ضروری ہے، اب مسافر قصر کی شروعات کے بعد نماز کے وقت مسجد میں پہنچا، تو دیکھا کہ دو رکعت ہو چکی ہے، پھر وہ امام کے ساتھ جماعت میں شریک ہوا۔ امام نے دو رکعت کے بعد سلام پھیر دیا، تو کیا مسافر اپنی چھوٹی ہوئی دو رکعت کھڑا ہوکر پوری کرے یا دو رکعت پر ہی امام کے ساتھ سلام پھیر دے؟

الجواب حامداومصلیا:

مسافر اگر مقیم (چار رکعت پڑھنے والے) کی اقتدا کرے، تو اس کے لیے بھی چار رکعت پڑھنا

= اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے رقم فرمایا ہے: اگر میرٹھ زید کا وطن اصلی یا وطن اقامت ہے، اور وہاں سے صرف مظفر نگر کی نیت سے چلا، جو کہ ۳۵/ میل ہے، تو وہ قصر نہیں کرے گا، پھر مظفر نگر سے دیو بند کا ارادہ ہوگیا، تو بھی قصر نہیں کرے گا، پھر دیو بند سے سہارن پور کا ارادہ ہوگیا، تب بھی قصر نہیں کرے گا، اگر چہ میرٹھ سے سہارن پور تک مسافت قصر ہے، مگر چوں کہ ابتدائے سفر کے وقت مسافت قصر کی نیت نہیں تھی، اور درمیان میں بھی کسی جگہ سے مسافت قصر کی نیت نہیں کی، جہاں سے بھی نیت کی مسافت قصر سے کم کی نیت کی۔

ضابطہ یہ ہے کہ جب سے پوری مسافت قصر کی نیت سے سفر شروع ہوگا، تب قصر لازم ہوگا، ورنہ تھوڑی تھوڑی مسافت کی نیت سے اگر تمام دنیا میں گھوم جائے، تب بھی قصر نہیں کرے گا۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۷/ ۴۸۸، باب صلاۃ المسافر، سوال نمبر: ۳۵۸۳)

[۳] (قول المصنف قاصدا إلخ) ويكفي في ذلك القصد غلبة الظن يعني إذا غلب على ظنه أنه يسافر قصر ولا يشترط فيه التيقن. اهـ، تبيين. (تقريرات الرافعي على حاشية ابن عابدين: ۲/ ۱۳۵، باب صلاة المسافر، ط: زكريا- ديوبند)

ولا بد للمسافر من قصد مسافة مقدرة بثلاثة أيام حتى يترخص برخصة المسافرين وإلا لا يترخص أبدا ولو طاف الدنيا جميعها بأن كان طالب آبق أو غريم أو نحو ذلك ويكفي في ذلك القصد غلبة الظن يعني إذا غلب على ظنه أنه يسافر قصر ولا يشترط فيه التيقن، كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۳۹، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: دار الفكر- بيروت)

ضروری ہے، مسافر پر رباعی (چار رکعت والی نماز) میں دو رکعت فرض ہے، مگر یہ حکم اس وقت ہے، جب کہ وہ تنہا نماز پڑھے؛ مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی صورت میں چار رکعت پڑھنا ضروری ہے؛ لہٰذا مسافر کو چھوٹی ہوئی دو رکعت پڑھنی پڑے گی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) وأما اقتداء المسافر بالمقيم فيصح في الوقت ويتم. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۳۰، باب صلاة المسافر، ط: دار الفكر-بيروت ☆ الهداية: ۱/ ۱۶۶، باب صلاة المسافر، ط: ياسر نديم-ديوبند)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ
فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ. (۶۲-الجمعۃ:۹)

باب الجمعة والعيدين

[جمعہ اور عیدین کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب الجمعة

[جمعہ کا بیان]

[۱] جمعہ کی اذان اول پر سعی واجب ہے یا اذان ثانی پر؟

۹۹۱- سوال: جمعہ کے متعلق آیت کریمہ: "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ"[1] کا مصداق جمعہ کی اذان اول ہے یا اذان ثانی؟ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ اذان اول کے بعد بھی مسجد نہیں پہنچتے ہیں اور اپنے کاروبار میں مشغول رہتے ہیں، تو ان کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں خطبہ کی اذان تھی، دوسری اذان- جو جمعہ کا وقت ہونے پر دی جاتی ہے- اس کا اضافہ صحابۂ کرام کے مشورے سے خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں کیا گیا۔[2]

فقہ کی اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ تمام فقہاء کے نزدیک جمعہ میں پہلی اذان، جو منارہ پر ہوتی ہے،

---

(۱) ۶۲-الجمعۃ:۹۔

(۲) عن الزهري، قال: سمعت السائب بن يزيد، يقول: إن الأذان يوم الجمعة كان أوله حين يجلس الإمام، يوم الجمعة على المنبر في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأبي بكر، وعمر رضي الله عنهما، فلما كان في خلافة عثمان بن عفان رضي الله عنه، وكثروا، أمر عثمان يوم الجمعة بالأذان الثالث، فأذن به على الزوراء، فثبت الأمر على ذلك. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲۵، رقم الحديث: ۹۱۶، كتاب الجمعة، باب التأذين عند الخطبة، و انظر: رقم: ۹۱۲، باب الأذان يوم الجمعة، ط: البدر - ديوبند)

اسی وقت سے سعی کرنا واجب ہے اور آیت کریمہ کا مصداق یہی ''اذان اول'' ہے، پس اس اذان کے بعد ایسے کام کرنا، جس سے جمعہ کی سعی میں خلل ہو، جیسے کاروبار میں مشغول رہنا، ہوٹلوں اور چوراہوں پر بیٹھنا، یا مسجد کے باہر بیٹھے رہنا وغیرہ؛ سب مکروہ تحریمی ہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] نماز جمعہ کی جماعت کی صحت کے لیے کتنے مقتدی کا ہونا ضروری ہے؟

۹۹۲- سوال: جمعہ کی نماز کے لیے کتنے افراد کا موجود ہونا ضروری ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

شہر، قصبہ اور بڑا گاؤں- جہاں جمعہ کی نماز جائز ہے- میں جمعہ کی صحت کے لیے امام کے علاوہ کم از کم تین مقتدیوں کا ہونا ضروری ہے۔ (عالم گیری)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) ويجب السعي وترك البيع بالأذان الأول، . . . وقال الحسن بن زياد: المعتبر هو الأذان على المنارة، والأصح أن كل أذان يكون قبل الزوال فهو غير معتبر والمعتبر أول الأذان بعد الزوال سواء كان على المنبر أو على الزوراء، كذا في الكافي. (الفتاوى الهندية-لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/۱۴۹، صلاة الجمعة، ط: دار الفكر)

(ووجب سعي إليها وترك البيع) ولو مع السعي، في المسجد أعظم وزرا (بالأذان الأول) في الأصح وإن لم يكن في زمن الرسول بل في زمن عثمان. (الدر المختار)

وقال ابن عابدين: (قوله ووجب سعي) لم يقل افترض مع أنه فرض للاختلاف في وقته هل هو الأذان الأول أو الثاني أو العبرة لدخول الوقت؟ بحر. ———— وحاصله أن السعي نفسه فرض والواجب كونه في وقت الأذان الأول، وبه اندفع ما في النهر من أن الاختلاف في وقته لا يمنع القول بفرضيته كصلاة العصر فرض إجماعا مع الاختلاف في وقتها (قوله وترك البيع) أراد به كل عمل ينافي السعي وخصه اتباعا للآية، نهر. (قوله: ولو مع السعي) صرح في السراج بعدم الكراهة إذا لم يشغله بحر وينبغي التعويل على الأول نهر. ———— . . . (قوله في الأصح) قال في شرح المنية. واختلفوا في المراد بالأذان الأول فقيل الأول باعتبار المشروعية وهو الذي بين يدي المنبر لأنه الذي كان أولا في زمنه -عليه الصلاة والسلام- وزمن أبي بكر وعمر حتى أحدث عثمان الأذان الثاني على الزوراء حين كثر الناس. والأصح أنه الأول باعتبار الوقت، وهو الذي يكون على المنارة بعد الزوال. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۱۶۱، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر-بيروت)

[۲] (ومنها الجماعة) وأقلها ثلاثة سوى الإمام، كذا في التبيين. ولا يشترط كونهم ممن حضر الخطبة، كذا في فتح القدير، ولو خطب الإمام يوم الجمعة ونفر الناس وجاء آخرون وصلى بهم الجمعة أجزأهم، كذا في محيط السرخسي، والشرط فيهم أن يكونوا صالحين للإمامة، أما إذا كانوا لا يصلحون لها كالنساء والصبيان لا تصح الجمعة، كذا في الجوهرة النيرة. =

[۳] خطبہ میں ان اللہ وملئکتہ... سن کر بلند آواز سے درود پڑھنا

۹۹۳- سوال: جمعہ کے خطبہ میں خطیب آیت کریمہ: اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ پڑھے، جس میں درود وسلام پڑھنے کی ہدایت دی گئی ہے، تو اس موقع پر سامعین بلند آواز سے درود شریف پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

خطبہ کے دوران بات چیت اور نماز کی ممانعت ہے، حتیٰ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر- جو واجب ہے- کی بھی اس دوران اجازت نہیں ہے۔ (۱) اس لیے خطیب جب آیت کریمہ: اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ

= اگر چہ خطبہ کے وقت تین افراد حاضر نہ ہوں، صرف ایک ہی شخص ہو، تب بھی اصح قول کے مطابق درست ہے:

خطب وحده أو بحضرة النساء الصحيح أنه لا يجوز، هكذا في معراج الدراية، ولو حضر واحد أو اثنان وخطب وصلى بالثلاثة جاز، كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية-لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۱۴۶، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۵۱، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۱) عن أبي هريرة، أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- قال: "إذا قلت لصاحبك يوم الجمعة: أنصت، والإمام يخطب، فقد لغوت". (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲۷-۱۲۸، رقم الحديث: ۹۳۴، كتاب الجمعة، باب الإنصات يوم الجمعة والإمام يخطب، ط: مكتبة البدر- ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۸۱، رقم الحديث: ۱۱- ۸۵۱، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، فصل في عدم ثواب من تكلم والإمام يخطب...، ط: البدر- ديوبند)

وفي المجتبى: الاستماع إلى خطبة النكاح والختم وسائر الخطب واجب، والأصح الاستماع إلى الخطبة من أولها إلى آخرها، وإن كان فيها ذكر الولاة اهـ. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق- زين الدين بن إبراهيم، المعروف بـ"ابن نجيم المصري" (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۱۶۸، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(قوله وإذا خرج الإمام فلا صلاة، ولا كلام) لما رواه ابن أبي شيبة في مصنفه عن علي وابن عباس وابن عمر - رضي الله عنهم - كانوا يكرهون الصلاة والكلام بعد خروج الإمام، وقول الصحابي حجة، ولأن الكلام يمتد طبعا فيخل بالاستماع والصلاة قد تستلزمه أيضا.... وأجمعوا أن الخروج قاطع للصلاة،... وفسر الشارح الخروج بالصعود على المنبر وهكذا في المضمرات وذكر في السراج الوهاج يعني خرج من المقصورة وظهر عليهم وقيل صعد المنبر، فإن لم يكن في المسجد مقصورة يخرج منها لم يترك القراءة والذكر إلا إذا قام الإمام إلى الخطبة اهـ. (البحر الرائق: ۲/ ۱۶۷، باب صلاة الجمعة، كتاب الصلاة)

عَلَى النَّبِيِّ ، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا پڑھے، تو سامعین اس آیت کو سن کر بلند آواز سے درود شریف نہ پڑھیں، بل کہ دل ہی دل میں آہستہ سے پڑھ لیں۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] جمعہ کے بعد امام سے مصافحہ کرنا

۹۹۴- سوال: جمعہ کی نماز کے بعد امام صاحب سے مصافحہ کے لیے لوگ بھیڑ لگاتے ہیں، تو یہ مصافحہ سنت ہے یا کیا ہے؟ اور اس طرح مصافحہ کا رواج بنالینا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

مصافحہ کرنا عبادت ہے، اور ہر عبادت کے کچھ شرائط وآداب ہوتے ہیں، جن کی رعایت ضروری ہے۔

جب آدمی سفر سے آئے، تو مصافحہ کرنا سنت ہے؛ لیکن اگر کوئی آپ کے محلہ میں رہتا ہو، دن میں کئی بار اس سے ملاقات ہوتی ہو، صرف جمعہ کے دن ہی اس سے مصافحہ کیا جائے اور نہ کرنے والے پر لعن و طعن کیا جائے، یہ جائز نہیں ہے، ایسا مصافحہ بدعت ہے۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (وكل ما حرم في الصلاة حرم فيها) أي في الخطبة خلاصة وغيرها... (بلا فرق بين قريب وبعيد) في الأصح محيط... والصواب أنه يصلي على النبي - صلى الله عليه وسلم - عند سماع اسمه في نفسه. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله في نفسه) أي بأن يسمع نفسه أو يصحح الحروف فإنهم فسروه به، وعن أبي يوسف قلبا امتثالا لأمري الإنصات والصلاة عليه - صلى الله عليه وسلم - كما في الكرماني قهستاني قبيل باب الإمامة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۵۹، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت)

قال الكاساني: قال أبو حنيفة: إن سماع الخطبة أفضل من الصلاة على النبي - صلى الله عليه وسلم - فينبغي أن يستمع ولا يصلي عليه عند سماع اسمه في الخطبة لما أن إحراز فضيلة الصلاة على النبي - صلى الله عليه وسلم - مما يمكن في كل وقت وإحراز ثواب سماع الخطبة يختص بهذه الحالة فكان السماع أفضل. ــــــ وروي عن أبي يوسف أنه ينبغي أن يصلي على النبي - صلى الله عليه وسلم - في نفسه عند سماع اسمه لأن ذلك مما لا يشغله عن سماع الخطبة فكان إحراز الفضيلتين أحق. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۶۴، كتاب الصلاة، فصل صلاة الجمعة، حكم الخطبة، ط: دار الكتب العلمية ☆البحر الرائق شرح كنز الدقائق لابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۱۶۸، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

قال ابن عابدين: وكذلك إذا ذكر النبي - صلى الله عليه وسلم - لا يجوز أن يصلوا عليه بالجهر، بل بالقلب، وعليه الفتوى، رملي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۵۸، باب الجمعة، مطلب في شروط وجوب الجمعة)

(۲) ونقل في تبيين المحارم عن الملتقط أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلاة بكل حال؛ لأن الصحابة - رضي الله =

[۵] جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے وعظ کہنا اور مقررہ وقت سے زائد لینا

۹۹۵- سوال: (۱) ہمارے یہاں جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے ہر کوئی مولوی بیان کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں، شریعت میں اس کا کیا حکم ہے؟

(۲) اگر جمعہ کا خطبہ ۱:۳۰ (ڈیڑھ بجے) ہو، تو کبھی وہ مولوی صاحب ۱۵ منٹ، کبھی ۲۰ منٹ زیادہ بیان کرتے ہیں اور نماز دیر سے کھڑی ہوتی ہے، تو یہ نماز قضا شمار ہوگی یا ادا؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

ہمارے علم میں جمعہ میں ہر کوئی مولوی صاحب بیان کے لیے کھڑے نہیں ہوتے؛ بل کہ امام صاحب کو کمیٹی کی طرف ذمہ داری دی جاتی ہے، یا تو وہ خود بیان کرتے ہیں یا کسی معتبر و مستند عالم دین کا بیان رکھتے ہیں، الغرض کمیٹی کی منشا کے مطابق امام صاحب کی اجازت کے بعد ہی کسی عالم کا بیان ہوتا ہے۔

(۱) جب امام صاحب کی رضامندی سے وعظ کہا جاتا ہے، تو واعظ کو لوگوں کی طلب اور وقت کا خیال کر کے وعظ کہنا جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

(۲) بیان کا کوئی وقت ۱۵/ یا ۲۰/ منٹ مقرر کر لینا چاہیے اور واعظ کو چاہیے کہ وقت پر بیان ختم کر دے، تاکہ نمازیوں کے کام میں حرج نہ ہو؛ لیکن اگر ۱:۳۰ کی بجائے ۱:۴۵ یا ۱:۵۵ تک بیان کیا گیا، تو اس سے نماز میں فساد نہ آئے گا؛ کیوں کہ جمعہ کا وقت وہی ہے، جو ظہر کا وقت ہے، پس نماز ادا شمار ہوگی نہ کہ قضا۔[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

= تعالی عنهم - ما صافحوا بعد أداء الصلاة، ولأنها من سنن الروافض اهـ ثم نقل عن ابن حجر عن الشافعية: أنها بدعة مكروهة، لا أصل لها في الشرع، وأنه ينبه فاعلها أولا، ويعزر ثانيا، ثم قال: وقال ابن الحاج من المالكية في المدخل: إنها من البدع، وموضع المصافحة في الشرع، إنما هو عند لقاء المسلم لأخيه، لا في أدبار الصلوات فحيث وضعها الشرع يضعها فينهى عن ذلك ويزجر فاعله لما أتى به من خلاف السنة اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ٣٨١/٦، الحظر والإباحة، باب الاستبراء، ط: دار الفكر - بيروت☆ مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ٤٧/٩، باب المصافحة والمعانقة، ط: مكتبة امدادية-ملتان)

(١) عن أبي وائل، قال: كان عبد الله يذكر الناس في كل خميس فقال له رجل: يا أبا عبد الرحمن لوددت أنك ذكرتنا كل يوم؟ قال: أما إنه يمنعني من ذلك أني أكره أن أملكم، وإني أتخولكم بالموعظة، كما كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولنا بها، مخافة السآمة علينا ". (صحيح البخاري: ١٦/١، كتاب العلم، باب من جعل لاهل العلم اياما معلومة، ط: البدر - ديوبند)

[۲] جمعہ سے قبل بیان ثابت ہے، بدعت نہیں ہے

۹۹۶- سوال: جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے بیان کے متعلق بہت سے علماء کو جب کہا گیا، تو ان کا کہنا یہ ہے کہ نماز کے بعد لوگ وعظ سننے کے لیے بیٹھتے نہیں ہیں، تو ان کا اگر یہ تاثر ہو، تو اس کا مطلب یہ نکلا کہ لوگوں میں وعظ سننے کا شوق نہیں ہے، اس سے اکتا گئے ہیں، گویا نماز سے پہلے وعظ کر کے علماء ان کو مجبور کرتے ہیں، زبردستی ان کو وعظ سناتے ہیں، ان کے سر تھوپتے ہیں، مولانا ابوالاعلی مودودیؒ کا ایک مقولہ ہے ''ہر کسی عالم کی ذہنی غلامی کا شکار نہ ہونا چاہیے'' مگر یہاں علماء لوگوں کو ذہنی غلامی کا شکار بناتے ہیں۔ یہ واعظ لوگ، کام کاج والوں کو، بوڑھوں کو، معذوروں اور بیماروں کو بیٹھا کر گھنٹہ دو گھنٹہ بیان کرتے رہتے ہیں، اور ان پر ایک قسم کا ظلم کرتے ہیں، کسی کو دکان کا، تو کسی کو کھیتی کا، تو کسی کو آفس کا، تو کسی کو کچھ اور کام ہوتا ہے، ان سننے والوں پر کیا گذرتی ہے، وہ تو جو سہن (براداشت) کرتا ہے، وہی جانتا ہے، ان وعظ کہنے والوں کو اس کا کیا اندازہ؟ میرے اس سوال کا جواب تفصیل سے عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

آپ کی اس تحریر کا مطلب یہ ہے کہ: علماء لوگوں کو ذہنی غلامی کا شکار بناتے ہیں؛ حالاں کہ بات ایسی نہیں ہے، قرآن وحدیث اور اکابر علماء کی نظر میں جمعہ کے دن کی کیا اہمیت ہے؟ اور لوگ کس راہ پر جا رہے ہیں؟ کیا آپ نے ان باتوں کا کبھی اندازہ لگایا؟ — پنج وقتہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا اکثر علماء کے نزدیک واجب ہے اور بعض کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔[۱]

[۱] (قوله الجماعة سنة) لا يطابق دليله الذي ذكره الدعوى، إذ مقتضاه الوجوب إلا لعذر، إلا أن يريد ثبوتها بالسنة. وحاصل الخلاف في المسألة أنها فرض عين إلا من عذر، وهو قول أحمد وداود وعطاء وأبي ثور، وعن ابن مسعود وأبي موسى الأشعري وغيرهما: من سمع النداء ثم لم يجب فلا صلاة له، وقيل على الكفاية، وفي الغاية قال عامة مشايخنا: إنها واجبة، وفي المفيد أنها واجبة، وتسميتها سنة لوجوبها بالسنة. وفي البدائع: يجب على العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الجماعة من غير حرج. (فتح القدير: ۱/ ۳۴۵-۳۴۶، باب الإمامة، ط: دار الفكر- بيروت ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي- المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۵۶، باب الإمامة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

ولو تركها أهل مصر يؤمرون بها، فإن قبلوا وإلا يقاتلون عليها لأنها من شعائر الإسلام. (الاختيار لتعليل المختار- عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي (م: ۶۸۳ھ): ۱/ ۵۷، باب صلاة الجماعة، ط: مطبعة الحلبي)

جمعہ کی اذان کے بعد تجارت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔[۲] قرآن کریم میں ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝[۳]

کہ اے ایمان والو! جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لیے اذان کہی جایا کرے، تو تم اللہ کی یاد (یعنی نماز وخطبہ) کی طرف (فوراً) چل پڑا کرو اور خرید وفروخت (اور اسی طرح دیگر مشاغل، جو چلنے سے مانع ہوں) چھوڑ دیا کرو، یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم کو کچھ سمجھ ہو (کیوں کہ اس کا نفع باقی ہے اور بیع وغیرہ کا فانی)

جمعہ کے دن ایک ایسی گھڑی (ساعت) آتی ہے، جس میں انسان جو بھی دعا کرے، قبول ہوتی ہے۔ (بخاری، حدیث: ۸۸۳، الساعة التی فی یوم الجمعة)[۴]

جمعہ کی نماز کو سنن وآداب کی رعایت کے ساتھ ادا کی جائے، تو پچھلے دس دن کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ (بخاری، حدیث: ۸۳۴، باب الدهن للجمعة)[۵]

علامہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ جمعہ کا دن ہفتہ کے دنوں کا سردار ہے اور رمضان کا مہینہ

(۲) وقوله تعالى وذروا البيع، قال أبو بكر: اختلف السلف في وقت النهي عن البيع، فروي عن مسروق والضحاك ومسلم بن يسار أن البيع يحرم بزوال الشمس، وقال مجاهد والزهري: يحرم بالنداء، وقد قيل: إن اعتبار الوقت في ذلك أولى، إذ كان عليهم الحضور عند دخول الوقت، فلا يسقط ذلك عنهم تأخير النداء، ولما لم يكن للنداء قبل الزوال معنى، دل ذلك على أن النداء الذي بعد الزوال، إنما هو بعد ما قد وجب إتيان الصلاة، واختلفوا في جواز البيع عند نداء الصلاة، فقال أبو حنيفة وأبو يوسف وزفر ومحمد والشافعي: البيع يقع مع النهي، وقال مالك: البيع باطل. (أحكام القرآن-أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م: ۳۷۰هـ): ۳۴۱/۵، الجمعة: ۹، ت: محمد صادق القمحاوي، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(۳) ۶۲ - الجمعة: ۹.

(۴) عن أبي هريرة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ذكر يوم الجمعة، فقال: فيه ساعة، لا يوافقها عبد مسلم، وهو قائم يصلي، يسأل الله تعالى شيئا، إلا أعطاه إياه، وأشار بيده يقللها. (صحيح البخاري: ۱۲۸/۱، كتاب الجمعة، باب الساعة التي في يوم الجمعة، ط: البدر - ديوبند)

(۵) عن سلمان الفارسي، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: «لا يغتسل رجل يوم الجمعة، ويتطهر ما استطاع من طهر، ويدهن من دهنه، أو يمس من طيب بيته، ثم يخرج فلا يفرق بين اثنين، ثم يصلي ما كتب له، ثم ينصت إذا تكلم الإمام، إلا غفر له ما بينه وبين الجمعة الأخرى». (صحيح البخاري: ۱۲۱/۱، باب الدهن للجمعة، كتاب الجمعة)

تمام مہینوں کا سردار ہے۔[۶] پس جمعہ کا دن جیسا گذرے گا، باقی دن بھی ویسے گذریں گے اور رمضان کا مہینہ جیسا گذرے گا، باقی گیارہ مہینے بھی ویسے گذریں گے۔

اس لیے علماء نے سوچا کہ ہفتہ میں ایک دن یا کم ازکم مہینہ میں دو جمعے ایسے گذریں کہ ان میں لوگ دین کی باتیں سنیں اور آخرت کی طرف توجہ کریں، اس فانی دنیا سے دل ہٹا کر تھوڑے وقت کے لیے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی باتوں کو سننے میں مشغول رہیں۔

خطبہ سے پہلے وعظ کہنا حضرات صحابہؓ سے ثابت ہے، حضرت ابو ہریرہؓ جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے احادیث بیان کرتے تھے، اس کے بعد حضرت عمرؓ خطبہ دیتے تھے۔ (مستدرک حاکم: ۱/ ۱۰۸)[۷]

اسی طرح حضرت عمرؓ وحضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حضرت تمیم داریؓ خطبہ سے پہلے بیان کیا کرتے تھے۔ (مسند امام احمد بن حنبل: ۱/ ۴۴۹)[۸]

علامہ زبیدی (احیاء العلوم کے شارح) تحریر فرماتے ہیں کہ ابن ابی شیبہ نے لکھا ہے کہ حضرت سائبؓ، حضرت عبداللہ بن بسر، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ جمعہ سے پہلے دینی مجلس کو جائز کہتے تھے۔ (شرح احیاء علوم الدین: ۳/ ۲۷۷)[۹]

---

(۶) زاد المعاد في هدي خير العباد-ابن قيم الجوزية (م:۷۵۱هـ): ۱/ ۳۶۴، فصل في خواص يوم الجمعة وهي ثلاث وثلاثون، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت-مكتبة المنار الإسلامية، الكويت.

[۷] عن عاصم بن محمد بن زيد، عن أبيه، قال: كان أبو هريرة يقوم يوم الجمعة إلى جانب المنبر فيطرح أعقاب نعليه في ذراعيه ثم يقبض على رمانة المنبر، يقول: قال أبو القاسم صلى الله عليه وسلم، قال محمد صلى الله عليه وسلم: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: قال الصادق المصدوق صلى الله عليه وسلم، ثم يقول في بعض ذلك: ويل للعرب من شر قد اقترب، فإذا سمع حركة باب المقصورة بخروج الإمام جلس. هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه، هكذا وليس الغرض في تصحيح حديث "ويل للعرب من شر قد اقترب" فقد أخرجاه، إنما الغرض فيه استحباب رواية الحديث على المنبر قبل خروج الإمام. (المستدرك على الصحيحين- أبو عبد الله الحاكم، النيسابوري المعروف بـ'ابن البيع' (م:۴۰۵هـ): ۱/ ۱۹۰، رقم الحديث: ۳۶۷، كتاب العلم، ومنهم يحيى بن أبي المطاع القرشي، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

عن محمد بن هلال، عن أبيه، قال: كان أبو هريرة، يحدثنا يوم الجمعة حتى يخرج الإمام. (مصنف ابن أبي شيبة: ۱/ ۴۶۸، رقم الحديث: ۵۴۱۱، الحديث يوم الجمعة قبل الصلاة، ت: كمال يوسف الحوت)

(۸) ر: مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۲۴/ ۳۸۹، وما بعدها، رقم الحديث: ۱۵۷۱۵، ۱۵۷۱۶، ط: الرسالة، بيروت.

[۹] قد روى ابن أبي شيبة جواز ذلك عن السائب وعبد الله بن بسر وابن عمر وأبي هريرة. (إتحاف السادة=

لہٰذا جمعہ سے پہلے علماء کا جو بیان ہوتا ہے اور دینی باتیں و مسائل بیان کیے جاتے ہیں، وہ بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک دینی بات اور مسئلہ کا جاننا ہزار رکعت نفل نماز پڑھنے سے زیادہ ثواب رکھتا ہے۔ (ابن ماجہ صفحہ ۱۰)[۱۰]

فتاویٰ عالم گیری میں لکھا ہے کہ کسی علمی بات میں غور و فکر کرنا، پانچ ہزار مرتبہ قل ہو اللہ (سورۂ اخلاص) پڑھنے سے زیادہ ثواب رکھتا ہے۔[۱۱] اور ایک حدیث میں ہے کہ دینی مسائل سیکھنے کا ایک دن، دس ہزار سال کی عبادت و بندگی سے بہتر ہے۔[۱۲] (فتاویٰ ہندیہ: ۱/ ۱۵۰)

پس ان فضائل کے پیش نظر خطبہ سے پہلے بیان کرنا مستحب اور ثواب کا کام ہے، ہر مسلمان کا دینی تقاضہ ہونا چاہیے کہ جمعہ سے پہلے بیان کے لیے امام صاحب سے درخواست کرے کہ یا تو وہ خود بیان کریں یا کسی مستند و معتبر عالم دین کا انتخاب فرمائیں، تاکہ مخلوق خدا ان کے بیان کو سن کر اپنے ایمان کو مضبوط بنائیں۔

افسوس کی بات ہے کہ مغربی تہذیب کے غلبہ کی وجہ سے دینی مزاج بگڑ گیا ہے، جس کی وجہ سے بعض لوگ بیان و وعظ سے نفرت کرتے ہیں اور اس کو ذہنی غلامی سمجھتے ہیں، ایسا گمان نہایت نقصان دہ ہے، یورپ کے رہنماؤں نے لوگوں میں جو آزادی پیدا کی ہے، وہ دین سے آزاد ہو جانا ہے اور سنت نبوی سے نفرت کرنا ہے، جب کہ قرآن کریم ہمیں حکم دیتا ہے: وَمَآ اٰتٰـكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ، وَمَا نَهٰـكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا.(۱۳) ـــــــ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن چیزوں کے کرنے کا حکم فرمائیں، ان کو بجالاؤ اور جن چیزوں سے منع کریں، ان سے رک جاؤ۔

= المتقين بشرح إحياء علوم الدين - محمد بن محمد الحسيني الزبيدي الشهير بـ 'مرتضى الزبيدي' (م: ۱۲۰۵ھ = ۱۷۹۰م): ۳/ ۲۷۷، ط: مؤسسة التاريخ العربي - بيروت ☆ مصنف ابن أبي شيبة: ۱/ ۴۶۸، رقم الحديث: ۵۴۰۹ تا ۵۴۱۲، الحديث يوم الجمعة قبل الصلاة، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد - الرياض)

[۱۰] عن أبي ذر، قال: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا أبا ذر، لأن تغدو فتعلم آية من كتاب الله، خير لك من أن تصلي مائة ركعة، ولأن تغدو فتعلم بابا من العلم، عمل به أو لم يعمل، خير من أن تصلي ألف ركعة. (سنن ابن ماجه، ص: ۱۰، رقم الحديث: ۲۱۹، افتتاح الكتاب في الإيمان وفضائل الصحابة والعلم، باب فضل من تعلم القرآن وعلمه، ط: البدر - ديوبند)

[۱۱] وعن ابن مقاتل النظر في العلم أفضل من قراءة {قل هو الله أحد} خمسة آلاف مرة كذا في التتارخانية. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۷۹، كتاب الكراهية، الباب الثلاثون في المتفرقات، ط: دار الفكر - بيروت)

[۱۲] لم أجد هذا الشطر في الفتاوى الهندية.

(۱۳) ۵۹ - الحشر: ۷۔

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے :"عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين ". (ابوداود، حدیث:۳۹۹۱، السنۃ)[۱۴] تم میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑلو۔

اسلام کا معنیٰ ہی ہے ماننا اور فرماں برداری کرنا، رسول اللہ ﷺ کی سنتوں پر عمل کیے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوسکتا، ایمان لانے کے بعد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیم کو ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے، اسی پر کامیابی کا مدار ہے۔ اور علماء اسی ذہنی غلامی (جسے صحیح معنوں میں دینی غلامی کہا جائے، جو درحقیقت اطاعت وبندگی کی واضح علامت ہے) کی طرف بلاتے ہیں، اپنی غلامی کی طرف کوئی نہیں بلاتا، لہٰذا خطبہ سے پہلے بیان یا وعظ بلاشبہ جائز ہے۔

البتہ اتنا لمبا بیان کرنا کہ لوگوں کو پریشانی ہو اور ان کے کاموں میں حرج ہو، درست نہیں، اس سے اجتناب ضروری ہے، اسی طرح کبھی کبھار جمعہ کا بیان ترک بھی کردیا جائے، تاکہ لوگ اس کو ضروری نہ سمجھ بیٹھیں۔ پس بہتر یہ ہے کہ امام صاحب یا کمیٹی والے یا ذمہ داران کوئی وقت بیان کا مقرر کردیں، تاکہ خطیب اپنا بیان لمبا کرکے لوگوں کو تکلیف میں نہ ڈالے، اور وقت پر بیان ختم ہوکر خطبہ اور نماز شروع ہوجائے۔[۱۵] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] جمعہ میں خطبہ سے پہلے تقریر کرنا ثابت ہے یا نہیں؟

۷۹۷- سوال: خطبہ سے پہلے تقریر کرنا کیسا ہے؟ بعض عرب حضرات کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جائز ہے، اور صحابۂ کرام کے عمل سے ثابت ہے، فتاویٰ رحیمیہ، جو انگریزی میں بھی چھپی ہوئی ہے،

(۱۴) سنن أبي داود: ۲/۶۳۵، رقم الحديث: ۴۶۰۷، كتاب السنة، باب في لزوم السنة، ط: البدر - ديوبند ☆ سنن الترمذي: ۲/۹۱، رقم الحديث: ۲۶۷۶، أبواب العلم، باب ما جاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدع ☆ سنن ابن ماجه، ص: ۵، رقم الحديث: ۴۲، ۴۳، افتتاح الكتاب، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين.

(۱۵) عن أبي وائل، قال: كان عبد الله يذكر الناس في كل خميس فقال له رجل: يا أبا عبد الرحمن لوددت أنك ذكرتنا كل يوم؟ قال: أما إنه يمنعني من ذلك أني أكره أن أملكم، وإني أتخولكم بالموعظة، كما كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولنا بها، مخافة السآمة علينا ". (صحيح البخاري: ۱/۱۶، كتاب العلم، باب من جعل لاهل العلم اياما معلومة، ط: البدر - ديوبند)

اس میں ملاحظہ فرمائیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٨] جمعہ کے خطبہ سے پہلے کس موضوع پر بیان کرنا چاہیے؟

٩٩٨- سوال: ہمارے یہاں جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے خطبہ کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اس ترجمہ میں نصیحت کے طور پر کچھ خارجی باتیں- جو خطبہ میں نہ ہوں- بیان کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً آج کل مسلمان ہندؤں کے تہوار میں شریک ہوتے ہیں، ان کی ہولی، دیوالی، اور نوراتری وغیرہ میں جاتے ہیں؛ بل کہ نوراتری میں تو مسلمان لڑکیاں ان کے ناچ میں بھی شریک ہوتی ہیں، تو اس طرح کی معاشرتی برائیوں سے لوگوں کو متنبہ کرنا اس ترجمہ میں جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً:

خطبہ سے پہلے خطیب کا وعظ ونصیحت کرنا جائز؛ بل کہ مستحسن ہے، اور جو خطبہ عربی میں ہے، اسی کا ترجمہ ضروری نہیں، خطیب کو جو موضوع مناسب لگے، اس پر وہ تقریر کر سکتے ہیں۔

آپ نے جن موضوعات کا سوال میں ذکر کیا ہے، ان پر وعظ کہنا بہت ہی ضروری ہے، بعض جگہوں پر تو مسلمانوں کا ایمان خطرے میں ہے، ان کے ایسے کرتوت ہیں کہ ایمان سے نکل جانے کا اندیشہ ہے، پس ان چیزوں سے انہیں متنبہ کرنا ضروری ہے، تا کہ ان کا ایمان محفوظ ہو جائے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(١) مسئلہ کی تفصیل وتخریج کے ملاحظہ فرمائیں عنوان: ''جمعہ سے قبل بیان ثابت ہے، بدعت نہیں ہے''۔

(٢) عن تميم الداري أن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: الدين النصيحة، قلنا: لمن؟ قال: لله ولكتابه ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامتهم. (الصحيح لمسلم: ١/ ٥٤، رقم الحديث: ٩٥- (٥٥)، كتاب الإيمان، باب بيان أن الدين النصيحة، ط: مختار اينڈ كمپني- ديوبند) ــــــــــ قال النووي: وأما نصيحة عامة المسلمين وهم من عدا ولاة الأمر فإرشادهم لمصالحهم في آخرتهم ودنياهم وكف الأذى عنهم فيعلمهم ما يجهلونه من دينهم ويعينهم عليه بالقول والفعل وستر عوراتهم وسد خلاتهم ودفع المضار عنهم وجلب المنافع لهم وأمرهم بالمعروف ونهيهم عن المنكر برفق وإخلاص والشفقة عليهم وتوقير كبيرهم ورحمة صغيرهم... قال ابن بطال رحمه الله في هذا الحديث: ... النصيحة فرض يجزي فيه من قام به ويسقط عن الباقين، قال: والنصيحة لازمة على قدر الطاقة، إذا علم الناصح أنه يقبل نصحه، ويطاع أمره، وأمن على نفسه المكروه، فإن خشي على نفسه أذى، فهو في سعة، والله أعلم. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج- أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ٦٧٦هـ): ٢/ ٣٩، باب بيان أن الدين النصيحة، ط: دار إحياء التراث العربي) =

[۹] جمعہ کے دن اذان اور خطبہ کے درمیان وعظ کا حکم

۹۹۹- سوال: جمعہ کے دن جمعہ کی اذان اور خطبہ کے درمیان امام صاحب وعظ کہتے ہیں، تو کیا یہ جائز ہے؟ حالاں کہ اذان اور خطبہ کے درمیان لوگ سنتیں پڑھتے ہیں، تو کیا اس میں خلل واقع نہ ہوگا؟ اور کیا اذان اور خطبہ کے درمیان وعظ کیا جائے، یہ بہتر ہے یا جمعہ کی نماز اور دعا کے بعد کیا جائے، وہ بہتر ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً

جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے وعظ اور تقریر کرنا جائز ہے، لوگوں کے جمع ہونے پر خطبہ سے پہلے وعظ کرنے میں زیادہ فائدہ ہے۔ نماز سے فراغت کے بعد وعظ کہنے پر لوگ اپنے کام کی وجہ سے روانہ ہو جائیں گے؛ اس لیے خطبہ سے پہلے بیان بہتر ہے۔

وعظ شروع ہونے کے بعد آنے والوں کی نماز میں خلل ہو، تو وہ بھی وعظ میں شریک ہو جائیں

= عن أبي وائل، قال: كان عبد الله يذكر الناس في كل خميس، فقال له رجل: يا أبا عبد الرحمن، لوددت أنك ذكرتنا كل يوم؟ قال: أما إنه يمنعني من ذلك أني أكره أن أملكم، وإني أتخولكم بالموعظة، كما كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولنا بها، مخافة السآمة علينا". (صحيح البخاري: ۱/۱۶، رقم الحديث: ۷۰، كتاب العلم، باب من جعل لأهل العلم أياما معلومة، ط: البدر - ديوبند)

الثالثة والثلاثون: إنه يوم اجتماع الناس وتذكيرهم بالمبدأ والمعاد، وقد شرع الله سبحانه وتعالى لكل أمة في الأسبوع يوما يتفرغون فيه للعبادة ويجتمعون فيه لتذكر المبدأ والمعاد، والثواب والعقاب، ويتذكرون به اجتماعهم يوم الجمع الأكبر قياما بين يدي رب العالمين، وكان أحق الأيام بهذا الغرض المطلوب اليوم الذي يجمع الله فيه الخلائق، وذلك يوم الجمعة. (زاد المعاد في هدي خير العباد-شمس الدين ابن قيم الجوزية (م: ۷۵۱هـ): ۱/۴۰۷، فصل في خواص يوم الجمعة وهي ثلاث وثلاثون، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت - مكتبة المنار الإسلامية، الكويت)

فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ رقم طراز ہیں: بہ خصوصیت کے ساتھ نماز جمعہ اور خطبہ سے قبل یا بعد نماز جمعہ، سو اس سے متعلق انکار کسی جگہ وارد نہیں، بل کہ اصل یہ ہے کہ جس وقت سہولت سے آدمی جمع ہو جائیں، یا جس وقت ضرورت پیش آئے، اسی وقت اس فریضہ تبلیغ کو ادا کرنی چاہیے، جمعہ کا دن اجتماع مسلمین کا دن ہوتا ہے، اس لیے اس دن کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۸/۲۶۵، خطبہ سے پہلے اردو میں وعظ، ط: دار المعارف - دیوبند)

اور وعظ کے بعد پانچ منٹ کا وقت سنتوں کے لیے دیا جائے، تاکہ بعد میں آنے والے سنتیں پڑھ لیں، اس طرح نماز میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] جمعہ کی نماز کے لیے عمامہ باندھنا

۱۰۰۰- سوال: میں ہر جمعہ کو جب گھر سے مسجد نماز پڑھنے کے لیے جاتا ہوں، تو عمامہ باندھ کر جاتا ہوں اور نماز پڑھ کر جب گھر آتا ہوں، تو عمامہ کھول دیتا ہوں، گھر سے مسجد سات آٹھ منٹ کا راستہ ہے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ خاص جمعہ کو عمامہ باندھنا بدعت ہے، تو اس سلسلہ میں شریعت کی روشنی میں صحیح رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

عمامہ باندھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے، تو مبارک سر پر، کالا عمامہ تھا۔[2]

ایک حدیث میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے جمعہ کے دن غسل کیا اور اچھے کپڑے پہنے، خوشبو لگائی، اگر خوشبو موجود ہو اور جمعہ کے لیے نکلا، اس حال میں کہ لوگوں کی گردنوں کو اس نے نہیں پھلانگا، اس کے بعد اس نے نماز پڑھی اور خاموش رہا، جب امام خطبہ کے لیے نکلا، تو اس کا یہ عمل گزشتہ جمعہ سے اس جمعہ تک کے جتنے (صغیرہ) گناہ ہوں گے، سب کے لیے کفارہ بن جائے گا۔ (ابوداؤد شریف)[3]

---

(۱) مسئلہ کی تفصیل وتخریج کے ملاحظہ فرمائیں عنوان: ''جمعہ سے قبل بیان ثابت ہے، بدعت نہیں ہے'' اور ''جمعہ کے خطبہ سے پہلے کس موضوع پر بیان کرنا چاہیے؟''

(۲) عن جابر بن عبد الله، أن النبي صلى الله عليه وسلم دخل يوم فتح مكة، وعليه عمامة سوداء. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۴۳۹، رقم الحديث: ۱۳۵۸، كتاب الحج، باب جواز دخول مكة بغير إحرام، ط: البدر - ديوبند)

(۳) عن أبي سعيد الخدري، وأبي هريرة، قالا: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «من اغتسل يوم الجمعة ولبس من أحسن ثيابه، ومس من طيب إن كان عنده، ثم أتى الجمعة فلم يتخط أعناق الناس، ثم صلى ما كتب الله له، ثم أنصت إذا خرج إمامه ؛حتى يفرغ من صلاته، كانت كفارة لما بينها وبين جمعته التي قبلها ». (سنن ابو داؤد: ۱/ ۱۵۴، رقم الحديث: ۳۴۳، باب الغسل يوم الجمعة، ط: البدر - ديوبند)

ایک روایت میں حضرت عبد اللہ بن سلام سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر کسی میں استطاعت ہو تو روزانہ کے کپڑوں کے علاوہ جمعہ کے لیے ایک مخصوص کپڑے کا جوڑا بنائے رکھے، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ (ابن ماجہ)[1]

ان تمام روایات سے درج ذیل امور ثابت ہوتے ہیں: (۱) عمامہ باندھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ (۲) ممکن ہو تو ایک عمدہ جوڑا کپڑے کا استطاعت کے موافق بنا کر رکھے اور ہر جمعہ کو نیز ایک روایت کے بموجب عیدین میں اس کو پہنے، کہ یہ بہتر ہے۔ (۳) جمعہ کے دن اچھے وعمدہ کپڑے پہنے۔

لہٰذا اگر آپ جمعہ یا عیدین میں اچھے کپڑے پہنتے ہیں، اور عمامہ باندھتے ہیں، تو یہ عین سنت ہے، اس کو بدعت کہنا جائز نہیں، البتہ اگر سنت کو ضروری سمجھ لیا جائے گا اور دوسرے لوگ - جو عمامہ نہیں باندھتے ہیں - ان پر تنقید کی جائے، تو یہ عمل بدعت بن جائے گا۔[2] پس آپ جب تک مذکورہ احادیث کے پیش نظر اس کو سنت زائدہ (مستحب) سمجھ کر کریں گے، جائز ہوگا اور بدعت کہنے والے غلطی پر ہیں، اور غلط مسئلہ بتانا گناہ کا کام ہے اور ایسے جاہل مفتی - جو سنت کو بدعت بتلا رہے ہیں - کا پیدا ہونا، قیامت کی علامتوں میں سے ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] خطیب کا ہاتھ میں عصا لینا

۱۰۰۱- سوال: ہمارے یہاں امام صاحب جمعہ کے خطبہ میں کبھی ہاتھ میں عصا لیتے ہیں اور کبھی نہیں لیتے ہیں، تو شرعاً خطبہ کے وقت عصا لینے کے متعلق کیا حکم ہے؟ تفصیل سے بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جمعہ اور عیدین کے خطبہ میں عصا لینے کے متعلق درمختار میں خلاصۃ الفتاویٰ کے حوالہ سے مکروہ

(۱) عن عبد اللہ بن سلام، أنہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یقول علی المنبر في یوم الجمعۃ: ما علی أحد کم لو اشتری ثوبین لیوم الجمعۃ، سوی ثوب مہنتہ. (ابن ماجہ، ص: ۷۷، رقم الحدیث: ۱۰۹۵، باب ماجاء في الزینۃ یوم الجمعۃ، ط: أشرفي - دیوبند، و رواہ أیضا عن عائشۃ - رضي اللہ عنہا، برقم: ۱۰۹۶، ☆ سنن أبي داود: ۱/ ۱۵۴، رقم الحدیث: ۱۰۷۸، باب اللبس للجمعۃ، ط: البدر - دیوبند)

(۲) قال ابن المنیر: فیہ أن المندوبات قد تنقلب مکروہات إذا رفعت عن رتبتہا؛ لأن التیامن مستحب في کل شيء أي من أمور العبادۃ لکن لما خشي ابن مسعود أن یعتقدوا وجوبہ أشار إلی کراہتہ. (فتح الباري - ابن حجر العسقلاني: ۲/ ۳۲۸، کتاب الأذان، باب الانفتال والانصراف عن الیمین والشمال، ط: دار المعرفۃ - بیروت)

لکھا ہوا ہے۔[۱] اسی طرح عالم گیری میں بھی اس کو مکروہ لکھا ہے۔[۲] لیکن طحطاوی میں سنت لکھا ہے۔[۳] شامی میں بھی اس کا سنت ہونا مذکور ہے۔[۴] اور یہی (سنت ہونے کی بات) صحیح ہے؛ کیوں کہ ابوداؤد شریف کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ میں عصا یا کمان کا سہارا لیتے تھے۔[۵] مذکورہ اختلاف میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ عصا ہاتھ میں لینا سنن زوائد میں سے ہے؛ لیکن اگر اس کو ضروری سمجھا جائے اور نہ لینے پر لعن طعن ہو، تو عصا لینا مکروہ ہوگا؛ کیوں کہ سنت کو ضروری سمجھنے سے شریعت کی حدیں ٹوٹتی ہیں۔

اسی بناء پر علماء نے لکھا ہے کہ امر مستحب پر اصرار بدعت ہے، جس کو ترک کرنا لازم ہے۔[۶] لہٰذا سوال میں آپ نے جو صورت بیان کی ہے کہ امام صاحب گاہے عصا لیتے ہیں اور گاہے نہیں لیتے ہیں، تو وہ صحیح

(۱، ۴) وفي الخلاصة: ويكره أن يتكئ على قوس أو عصا. (الدر المختار) ـــــــ وقال ابن عابدين: (قوله وفي الخلاصة إلخ) استشكله في الحلية بأنه في رواية أبي داود: أنه - صلى الله عليه وسلم - قام: أي في الخطبة متوكئا على عصا أو قوس. اهـ. ونقل القهستاني عن المحيط أن أخذ العصا سنة كالقيام (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۶۳، باب الجمعة، ط: دار الفكر)

(۲) ويكره أن يخطب متكئا على قوس أو عصا، كذا في الخلاصة، وهكذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۸، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: دار الفكر)

(۳) وفيه إشارة إلى أنه يكره الإتكاء على غيره كعصا وقوس خلاصة؛ لأنه خلاف السنة محيط وناقش فيه ابن أمير حاج بأنه ثبت أنه صلى الله عليه وسلم قام خطيبا بالمدينة متكئا على عصا أو قوس كما في أبي داود وكذا رواه البراء بن عازب عنه صلى الله عليه وسلم وصححه ابن السكن. (حاشية الطحطاوي على المراقي - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱ھ)، ص: ۵۱۵، باب الجمعة، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۵) عن شعيب بن رزيق الطائفي، قال: جلست إلى رجل له صحبة من رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقال له: الحكم بن حزن الكلفي، فأنشأ يحدثنا، قال: وفدت إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم سابع سبعة - أو تاسع تسعة - فدخلنا عليه، فقلنا: يا رسول الله، زرناك فادع الله لنا بخير، فأمر بنا، أو أمر لنا بشيء من التمر، والشأن إذ ذاك دون، فأقمنا بها أياما شهدنا فيها الجمعة مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقام متوكئا على عصا، أو قوس، فحمد الله وأثنى عليه... الحديث. (سنن أبي داود: ۱/ ۱۵۶، رقم الحديث: ۱۰۹۶، كتاب الصلاة، باب الرجل يخطب على قوس، ط: البدر - ديوبند)

(۶) قال ابن حجر في شرحه: قال ابن المنير: فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها؛ لأن التيامن مستحب في كل شيء، أي من أمور العبادة، لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه، أشار إلى كراهته، والله أعلم. (فتح الباري - ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲ھ): ۲/ ۳۳۸، قوله باب الانفتال والانصراف عن اليمين والشمال، رقم الحديث: ۸۵۲، ط: دار المعرفة - بيروت)

کرتے ہیں؛ کیوں کہ ہر جمعہ میں عصا لینے سے عوام اس کو ضروری سمجھنے لگے گی، پس کبھی نہ لے، تو اس کی گنجائش ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] جمعہ کے دن خطبہ دیتے وقت خطیب کا عصا کو ہاتھ میں لینا

۱۰۰۲- سوال: جمعہ کی نماز میں خطبہ کے وقت امام صاحب کے لیے عصا ہاتھ میں پکڑنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جمعہ کے خطبہ میں امام صاحب کا ہاتھ میں عصا پکڑنا مستحب ہے؛ لیکن اس کو ضروی سمجھ لینا غلط ہے، اگر لوگ ضروری سمجھتے ہوں، تو نہ پکڑے اور اگر ضروری نہ سمجھتے ہوں، تو پکڑنا مستحب ہے۔ (شامی جلد ۲ صفحہ ۱۶۳)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] خطبہ جمعہ میں امام کا عصا لے کر کھڑا ہونا

۱۰۰۳- سوال: کیا جمعہ کے خطبے میں امام کے لیے ہاتھ میں عصا لے کر کھڑا ہونا ضروری ہے؟ عصا کا کیا درجہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

خطبہ کے وقت عصا یا تلوار ہاتھ میں لینا واجب اور ضروری نہیں ہے، خطبہ کی صحت کا مدار اُس پر نہیں ہے، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ خطبے کے وقت عصا پکڑنا مستحب ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وفي الخلاصة: ويكره أن يتكئ على قوس أو عصا. (الدر المختار) ـــــــــ وقال ابن عابدين: (قوله وفي الخلاصة إلخ) استشكله في الحلية بأنه في رواية أبي داود: أنه -صلى الله عليه وسلم- قام: أي في الخطبة متوكئا على عصا أو قوس. اهـ. ونقل القهستاني عن المحيط أن أخذ العصا سنة كالقيام (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۶۳، باب الجمعة، ط: دار الفكر)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: ''خطیب کا ہاتھ میں عصا لینا''

(۲) قد تقدم تخريجه عن سنن أبي داؤد (۱/ ۱۵۶، رقم الحديث: ۱۰۹۶، كتاب الصلاة، باب الرجل يخطب على قوس، ط: ديوبند) وحاشية الطحطاوي على المراقي (ص: ۵۱۵، باب الجمعة، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية) و الفتاوى الهندية (۱/ ۱۴۸، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: دار الفكر) و رد المحتار على الدر المختار (۲/ ۱۶۳، باب الجمعة، ط: دار الفكر) تحت عنوان: ''خطیب کا ہاتھ میں عصا لینا''

[۱۴] خطبۂ جمعہ کے دوران امام کا عصا پکڑنا

[۱۵] سنتِ مؤکدہ، غیر مؤکدہ اور مباح کے معنیٰ

۱۰۰۴-سوال: (الف) ایک مسجد کے امام صاحب بعض مرتبہ خطبۂ جمعہ میں عصا ہاتھ میں لیتے ہیں، اور بعض جمعہ میں عصا نہیں پکڑتے، تو عصا ہاتھ میں لے کر خطبہ پڑھنا مسنون ہے یا مستحب؟ عصا چھوڑ دینے کی وجہ سے امام گنہ گار ہوگا یا نہیں؟ تفصیلاً رہنمائی فرمائیں۔

(ب): ایک مرتبہ جب امام صاحب جمعہ کے دو خطبوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے، اُس دوران ایک شخص نے کھڑے ہوکر بہ آوازِ بلند امام صاحب سے کہا کہ عصا ہاتھ میں لیجیے، عصا لے کر خطبہ پڑھنا سنت ہے، تو کیا اس طرح خطبے کے دوران بات کرنا جائز ہے؟ جمعہ کا خطبہ شروع ہونے کے بعد سنتیں پڑھی جا سکتی ہیں یا نہیں؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

(ج): جب عصا پکڑنے کے متعلق بحث ہوئی کہ عصا پکڑنا مسنون ہے، تو امام صاحب نے فرمایا کہ سنت غیر مؤکدہ ہے، اور سنتِ غیر مؤکدہ اور مستحب دونوں ایک ہی ہیں، تو کیا یہ صحیح ہے؟ یا دونوں میں کچھ فرق ہے؟ سنتِ مؤکدہ، غیر مؤکدہ اور مستحب وغیرہ کے درجات کیا ہیں؟ بالتفصیل سمجھائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

(الف) جو علاقے جہاد کے ذریعہ فتح ہوئے ہیں اُن میں تلوار ہاتھ میں لے کر خطبہ دینا مستحب ہے۔(۱)

لہٰذا عصا پکڑنا مستحب ہے، ضروری نہیں ہے۔(۲)

(ب): جب امام خطبہ کے لیے نکلے، تو کوئی بھی نماز یا بات جائز نہیں ہے۔(۳)

---

(۱) ويتقلد الخطيب السيف في كل بلدة فتحت بالسيف، كذا في شرح الطحاوي. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۴۸، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: دار الفكر)

(۲) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: ''خطیب کا ہاتھ میں عصا لینا''۔

(۳) وإذا خرج الإمام فلا صلاة ولا كلام. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۴۷، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۱۶۰، باب الجمعة، ط: دار الفكر)

"وإذا خرج الإمام يوم الجمعة ترك الناس الصلاة والكلام حتى يفرغ من خطبته". (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر المرغيناني (م: ۵۹۳هـ): ۱/۸۳، باب صلاة الجمعة، ط: دار احياء التراث العربي)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جمعہ کے دن امام کے خطبہ دینے کے دوران بات کی، وہ اُس گدھے جیسا ہے، جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں، اور وہ شخص جو اُس سے کہے کہ خاموش رہ، اُس کو جمعہ کی فضیلت کا کوئی حصہ نصیب نہ ہوگا۔ (۴)

نیز ایک روایت میں ہے کہ جس نے کسی بات کرنے والے سے کہا کہ: خاموش رہ، اُس نے بھی لغو بات کی۔ (۵)

اِن روایاتِ حدیث وفقہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص دو خطبوں کے درمیان کھڑا ہو کر امام سے عصا پکڑنے کے لیے کہے، تو وہ بہت بڑا گنہگار ہے؛ اس لیے کہ متعدد احادیث میں یہ مروی ہے کہ کسی بات کرنے والے کو خاموش کرنا بھی لغو کام ہے، حالاں کہ عام احوال میں تبلیغ ہر شخص کا فریضہ ہے، اُس سے بھی خطبہ کے دوران منع فرمایا گیا، جس سے انصات یعنی خاموش رہ کر خطبہ سننے کا وجوب مستفاد ہوتا ہے۔ (۶)

دوسرا گناہ یہ ہے کہ امام کی برسرِ عام توہین کی ہے، جو فسادِ عام کا سبب اور ایذاءِ مسلم ہے، اور ایذاءِ مسلم حرام ہے۔ (۷) لہٰذا ایسے شخص کو امام صاحب کے پاس معافی مانگنی چاہیے۔

---

(۴) عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " من تكلم يوم الجمعة والإمام يخطب، فهو كمثل الحمار يحمل أسفارا، والذي يقول له: أنصت، ليس له جمعة ". (مسند الإمام أحمد بن حنبل (م: ۲۴۱هـ): ۳/ ۴۷۵، رقم الحديث: ۲۰۳۳، مسند عبد الله بن العباس بن عبد المطلب، عن النبي صلى الله عليه وسلم، ت: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة)

(۵) . . . سعيد بن المسيب، أن أبا هريرة، أخبره: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: " إذا قلت لصاحبك يوم الجمعة: أنصت، والإمام يخطب، فقد لغوت ". (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲۷ - ۱۲۸، رقم الحديث: ۹۳۴، كتاب الجمعة، باب الإنصات يوم الجمعة والإمام يخطب، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۸۱، رقم الحديث: ۱۱ - (۸۵۱)، باب في الإنصات يوم الجمعة في الخطبة، ط: البدر - ديوبند)

(۶) (واستقبلوه مستمعين) منصتين سواء كانوا قريبين أو بعيدين في الأصح فلا يشمتون عاطسا ولا يردون سلاما ولا يقرءون قرآنا. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد، المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۱۷۱، باب صلاة الجمعة، شرط وجوب الجمعة، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۷) (ما يحل لمؤمن أن يشتد إلى أخيه) في الإسلام (بنظرة تؤذيه) فإن إيذاء المؤمن حرام ونبه بحرمة النظر على حرمة ما فوقه من نحو سب أو شتم أو ضرب بالأولى. (فيض القدير شرح الجامع الصغير - زين الدين محمد المدعو بعبد الرؤوف بن تاج العارفين بن علي الحدادي ثم المناوي القاهري (م: ۱۰۳۱هـ): ۵/ ۵۰۲، رقم الحديث: ۸۱۴۳، حرف الميم، ط: المكتبة التجارية الكبرى - مصر)

تیسرا یہ کہ باعتبارِ حکمِ شرعی عصا پکڑنا مستحب ہے، لہٰذا اُس کو ضروری سمجھ کر ردِ عمل کے طور پر کسی ناجائز فعل کا ارتکاب کرنا گناہ ہے، لہٰذا حرام ہے۔

(ج): سنتِ غیر مؤکدہ کو مستحب بھی کہا جاتا ہے، لہٰذا امام صاحب کا فرمان بجا ہے، سنتِ مؤکدہ آپ ﷺ کے اُس عمل کو کہا جاتا ہے، جسے آپ ﷺ نے اکثر کیا ہو اور کبھی کبھی چھوڑ دیا ہو، لہٰذا سنتِ مؤکدہ کو چھوڑنے کی عادت بنانا گناہ ہے، البتہ کبھی کبھار چھوڑ دینے سے گناہ نہ ہوگا۔ (شامی)[۸]

سننِ زوائد جسے مستحب یا نفل بھی کہا جاتا ہے؛ وہ آپ ﷺ کا ایسا عمل ہے، جو آپ نے ہمیشہ نہ کیا ہو، کبھی کیا ہو اور کبھی چھوڑ دیا ہو، یا اکثر چھوڑ دیا ہو، اس پر عمل کرنے سے ثواب ملے گا؛ البتہ چھوڑنے والا گنہگار نہیں ہوگا۔[۹]

مثلاً فجر سے قبل دو رکعت سنتِ مؤکدہ ہے، اگر کوئی شخص اُسے ہمیشہ چھوڑنے کی عادت بنالے، تو گنہگار ہوگا، فاسق شمار ہوگا، اُس کے برخلاف عصر سے قبل کی چار رکعت، یا تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد وغیرہ سنن

(۸) فما كان فعله أولى من تركه مع منع الترك إن ثبت بدليل قطعي ففرض، أو بظني فواجب، وبلا منع الترك إن كان مما واظب عليه الرسول - صلى الله عليه وسلم - أو الخلفاء الراشدون من بعده فسنة، وإلا فمندوب و نفل. ((رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۰۲، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، مطلب في السنة وتعريفها، ط: دار الفكر)

والسنة نوعان: سنة الهدي، وتركها يوجب إساءة وكراهية كالجماعة والأذان والإقامة ونحوها.

وسنة الزوائد، وتركها لا يوجب ذلك كسير النبي - عليه الصلاة والسلام - في لباسه وقيامه وقعوده.... السنة هي الطريقة المسلوكة في الدين، فهي في نفسها عبادة .... ولما لم تكن من مكملات الدين وشعائره سميت سنة الزوائد، بخلاف سنة الهدي، وهي السنن المؤكدة القريبة من الواجب التي يضلل تاركها؛ لأن تركها استخفاف بالدين. (حوالہ سابق: ۱/ ۱۰۳)

فالأولى ما في التحرير أن ما واظب عليه مع ترك ما بلا عذر سنة، وما لم يواظب عليه مندوب ومستحب وإن لم يفعله بعد ما رغب فيه اهـ بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۲۴، سنن الوضوء، ط: دار الفكر)

(۹) النفل... يثاب فاعله ولا يسيء تاركه. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۰۳، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، مطلب في السنة وتعريفها، ط: دار الفكر)

اعلم أن الذي عليه الأصوليون عدم الفرق بين المستحب والمندوب وأن ما واظب عليه - صلى الله تعالى عليه وسلم - مع ترك ما بلا عذر سنة وما لم يواظب عليه مندوب ومستحب وإن لم يفعله بعد ما رغب فيه كذا في التحرير وعند الفقهاء المستحب ما فعله النبي - صلى الله تعالى عليه وسلم - مرة وتركه أخرى، والمندوب ما فعله مرة أو مرتين تعليما للجواز كذا في شرح النقاية. (منحة الخالق على البحر الرائق: ۲/ ۲۷۸، كتاب الصوم، اقسام الصوم، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق: ۱/ ۲۹، سنن الوضوء، ط: دار الكتاب الإسلامي)

زوائد ہیں، اگر کوئی شخص اُن پر عمل کرے گا تو ثواب ملے گا، لیکن چھوڑ دینے سے گنہگار نہیں ہوگا۔

مباح یعنی وہ عمل جو جائز ہو، یعنی جس کے کرنے پر ثواب نہیں اور نہ کرنے پر کوئی گناہ بھی نہیں، البتہ اگر نیک نیتی کے ساتھ کوئی عملِ مباح کیا جائے، تو اُس پر ثواب ملے گا۔[1] مثلاً مقوی دوا کھانا جائز ہے، اب کسی نے یہ دوا استعمال کرتے وقت یہ نیت کی کہ اس کے ذریعہ قوت حاصل ہوگی اور میں تین دن کی جماعت میں نکل سکوں گا، یا میرا فلاں مریض رشتہ دار- جو ۱۰۰ رکلو میٹر دور رہتا ہے- اُس کی عیادت کے لیے جاسکوں گا، تو مذکورہ نیت کا ثواب ملے گا، مزید تفصیل کے لیے رسالہ ''عقائدِ اسلام'' صفحہ: ۱۸-۲۱۷ کا مطالعہ کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] بڑی مسجد میں خطبہ اردو میں ہو تو چھوٹی مسجد میں قیام جمعہ

۱۰۰۵- سوال ہمارے گاؤں میں تین مسجد ہے، جن میں سے ایک ''جمعہ مسجد'' بھی ہے اور دوسری دو چھوٹی مسجدیں ہیں، گاؤں کا ماحول بدعت زدہ ہے۔ ''جمعہ مسجد'' میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور اس میں بھی خطبہ اردو میں ہوتا ہے، ایک چھوٹی مسجد کے امام صاحب پابند شریعت ہیں، گاؤں کے ماحول کی وجہ سے وہ جمعہ مسجد میں عربی میں خطبہ نہیں دے سکتے؛ لیکن وہ اپنی چھوٹی مسجد میں عربی میں خطبہ دینا چاہتے ہیں اور بعض لوگ بھی امام صاحب کی بات کو پسند کرتے ہیں، تو کیا شرعی طور پر اس مسجد میں جمعہ قائم کی جاسکتی ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

مذہب اسلام آپس میں محبت، مودت اور اتفاق پیدا کرنے کے لیے آیا ہے؛ لہٰذا جب تک ہو سکے، ''جمعہ مسجد'' ہی میں جمعہ کی نماز ادا کرتے رہنا چاہیے۔[2]

---

(۱) والمباح ما أجيز للمكلفين فعله وتركه بلا استحقاق ثواب وعقاب، نعم يحاسب عليه حسابا يسيرا اختيار. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۳۳۶، كتاب الحظر والإباحة، دار الفكر- بيروت)

(۲) عن أبي هريرة، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "المؤمن مألف، ولا خير فيمن لا يألف، ولا يؤلف". (مسند الإمام أحمد: ۱۵/ ۱۰۷، رقم الحديث: ۹۱۹۸، مسند أبي هريرة، ط: الرسالة، ورواه أيضا عن سهل بن سعد الساعدي برقم: ۲۲۸۴۰)

عن حذيفة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لا تكونوا إمعة، تقولون: إن أحسن الناس أحسنا، وإن ظلموا ظلمنا، ولكن وطنوا أنفسكم، إن أحسن الناس أن تحسنوا، وإن أساءوا فلا تظلموا". (سنن الترمذي: ۲/ ۲۱، رقم الحديث: ۲۰۰۷، أبواب البر والصلة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب الإحسان والعفو، ط: البدر- ديوبند)

''جمعہ مسجد'' کو چھوڑ کر دوسری مسجد میں نماز ادا کرنا بہتر نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] خطبۂ جمعہ کا اُردو ترجمہ منبر پر پڑھنا

۱۰۰۶- سوال: ہماری مسجد کے امام صاحب جمعہ کے دن جمعہ کا خطبۂ اولیٰ اولاً عربی زبان میں پڑھتے ہیں، پھر اُس کا اُردو ترجمہ پڑھتے ہیں، تو کیا اس طرح خطبہ کا اُردو ترجمہ منبر پر پڑھنے سے جمعہ کی نماز صحیح ہوجائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عربی زبان میں خطبۂ جمعہ پڑھنے کے بعد اُس کا اُردو ترجمہ پڑھنا مکروہ ہے، البتہ خطبہ صحیح ہوجائے گا اور نمازِ جمعہ بھی صحیح ہوجائے گی۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] ایک گاؤں میں دو جگہ جمعہ کی نماز قائم کرنا

۱۰۰۷- سوال: ہمارے گاؤں میں دو مسجدیں ہیں اور مسلمانوں کی دو سو گھر کی آبادی ہے، زیادہ

---

(۱) اس لیے کہ جمعہ کا ایک اہم مقصد اظہارِ شوکت ہے، جو بڑی جمعیت کے ساتھ ایک جگہ ادا کرنے سے حاصل ہوتا ہے، بلا ضرورت جگہ جگہ جمعہ قائم کرنے سے یہ مقصد زیادہ حاصل نہیں ہوتا؛ اس لیے یہ طریقہ ناپسندیدہ ہے:

الخاصة الثالثة: صلاة الجمعة التي هي من آكد فروض الإسلام، ومن أعظم مجامع المسلمين، وهي أعظم من كل مجمع يجتمعون فيه وأفرضه سوى مجمع عرفة، ومن تركها تهاونا بها طبع الله على قلبه، وقرب أهل الجنة يوم القيامة وسبقهم إلى الزيارة يوم المزيد بحسب قربهم من الإمام يوم الجمعة وتبكيرهم. (زاد المعاد في هدي خير العباد-ابن قيم الجوزية (م:۷۵۱هـ):۱/ ۳۶۵، فصل في خواص يوم الجمعة وهي ثلاث وثلاثون، ط:مؤسسة الرسالة، بيروت-مكتبة المنار الإسلامية، الكويت)

البتہ اردو میں خطبہ مکروہ تحریمی ہے، لیکن اس کے باوجود نماز جمعہ ادا ہوجائے گی:

لا شك في أن الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوارثة من النبي صلى الله عليه وسلم، والصحابة رضي الله تعالى عنهم، فيكون مكروها تحريما. (عمدة الرعاية على هامش شرح الوقاية:۱/ ۲۰۰، كتاب الصلاة، باب الجمعة، رقم الحاشية: ۲، ط: سعيديه-پاكستان)

(۲) لا شك في أن الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوارثة من النبي صلى الله عليه وسلم، والصحابة رضي الله تعالى عنهم، فيكون مكروها تحريما. (عمدة الرعاية على هامش شرح الوقاية:۱/ ۲۰۰، كتاب الصلاة، باب الجمعة، رقم الحاشية: ۲، ط: سعيديه-پاكستان)

تر آبادی بڑی مسجد کے اطراف میں ہے، چھوٹی مسجد کے اطراف میں صرف آٹھ دس گھر کی آبادی ہے۔

گاؤں کی دونوں مسجد میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے، بڑی مسجد میں نماز کے لیے لوگ زیادہ جاتے ہیں اور چھوٹی مسجد میں کم؛ کیوں کہ بڑی مسجد گاؤں کے اندر ہے اور چھوٹی مسجد اسٹیشن پر ہے، تو سوال یہ ہے کہ دونوں مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اسٹیشن والی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے والوں کی نماز ہوگی یا نہیں؟ یا ان کے ذمہ ظہر کی نماز باقی رہے گی؟ اور اگر گاؤں والے اس مسجد میں جمعہ کی نماز بند کر کے ایک ہی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھیں، تو یہ کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

بہتر یہی ہے کہ ایک ہی جگہ ایک ہی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی جائے، تاکہ نمازیوں سے مسجد بھر جائے اور عید کا سا سماں محسوس ہو، اور مسلمانوں کی خاص شان کا اظہار ہو، اس کے علاوہ اور بھی کئی فائدے ہیں؛ مثلاً مسلم قوم میں اتحاد واجتماعیت کا اظہار ہو، جس کی آج خاص ضرورت ہے۔[1] البتہ دونوں جگہ جمعہ کی نماز پڑھنا جائز ہے، نماز جمعہ بلا کراہت صحیح ہوگی۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) جمعہ کا ایک اہم مقصد اظہار شوکت ہے، جو بڑی جمعیت کے ساتھ ایک جگہ ادا کرنے سے حاصل ہوتا ہے، بلا ضرورت جگہ جگہ جمعہ قائم کرنے سے یہ مقصد زیادہ حاصل نہیں ہوتا؛ اس لیے یہ طریقہ ناپسندیدہ ہے:

الخاصة الثالثة: صلاة الجمعة التي هي من آكد فروض الإسلام، ومن أعظم مجامع المسلمين، وهي أعظم من كل مجمع يجتمعون فيه وأفرضه سوى مجمع عرفة، ومن تركها تهاونا بها طبع الله على قلبه، وقرب أهل الجنة يوم القيامة وسبقهم إلى الزيارة يوم المزيد بحسب قربهم من الإمام يوم الجمعة وتبكيرهم. (زاد المعاد في هدي خير العباد-ابن قيم الجوزية (م:۷۵۱ھ):۱/ ۳۶۵، فصل في خواص يوم الجمعة وهي ثلاث وثلاثون، ط:مؤسسة الرسالة، بيروت-مكتبة المنار الإسلامية، الكويت)

(۲) (وتؤدى في مصر واحد بمواضع كثيرة) مطلقا على المذهب وعليه الفتوى شرح المجمع للعيني وإمامة فتح القدير. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله مطلقا) أي سواء كان المصر كبيرا أو لا وسواء فصل بين جانبيه نهر كبير كبغداد أو لا وسواء قطع الجسر أو بقي متصلا وسواء كان التعدد في مسجدين أو أكثر هكذا يفاد من الفتح، ومقتضاه أنه لا يلزم أن يكون التعدد بقدر الحاجة كما يدل عليه كلام السرخسي الآتي (قوله على المذهب) فقد ذكر الإمام السرخسي أن الصحيح من مذهب أبي حنيفة جواز إقامتها في مصر واحد في مسجدين وأكثر به نأخذ لإطلاق "لا جمعة إلا في مصر" شرط المصر فقط، وبما ذكرنا اندفع ما في البدائع من أن ظاهر الرواية جوازها في موضعين لا في أكثر وعليه الاعتماد اهـ فإن المذهب الجواز مطلقا بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۴۴-۱۴۵، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر-بيروت)

[۱۹] ایک سے زیادہ جگہ پر جمعہ ادا کرنا

۱۰۰۸- سوال: ہمارے یہاں ''نگینہ'' نامی ایک مسجد ہے، جس میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے، دوسری مسجد ''زینۃ الاسلام'' ہے، جس میں جمعہ نہیں ہوتی، آج سے سات سال پہلے نگینہ مسجد کے امام صاحب سے جھگڑا ہوا تھا، جس کی بنا پر راندیر کے مفتی صاحب سے پوچھنے کے بعد مسجد زینۃ الاسلام میں جمعہ ادا کی گئی تھی، پھر ان امام صاحب کو برطرف کردیا گیا، جس کی بنا پر زینۃ الاسلام میں جمعہ بند ہوگئی۔

اب کثرت آبادی کی بنا پر ہم زینۃ الاسلام میں جمعہ شروع کرنا چاہتے ہیں، جس کی وجوہات درج ذیل ہیں:

بوڑھے اور کمزور لوگوں کو نگینہ مسجد تک جانے میں دشواری ہوتی ہے، نگینہ مسجد میں جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے، نگینہ مسجد کے امام صاحب کی آواز پیچھے تک سنائی نہیں دیتی اور اگر زینۃ الاسلام میں جمعہ شروع کی جائے، تو لوگوں کو گاڑی سے جانے کی سہولت حاصل ہوجائے گی۔

کیا ان وجوہات کی بناء پر دوبارہ مسجد زینۃ الاسلام میں جمعہ شروع کرنا درست ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

مذکورہ صورت میں آپ حضرات، اپنے گاؤں کے جناب مفتی نور محمد صاحب سے مشورہ لیتے اور اس پر عمل کرتے، تو بہتر تھا۔

حنفی مسلک میں جس شہر اور بڑے گاؤں میں جمعہ فرض ہے، وہاں چند مسجدوں میں جمعہ ادا کرنا جائز ہے؛ لہٰذا مذکورہ وجوہات کی بنا پر زینۃ الاسلام میں جمعہ ادا کرنا جائز ہے اور اسی وجہ سے سات آٹھ سال قبل فتویٰ دیا گیا تھا اور جمعہ کی نماز ادا کی گئی تھی؛ البتہ فقہاء اور علماء کا عمل یہ بتاتا ہے کہ بڑے گاؤں میں ایک ہی مسجد (جمعہ مسجد) میں جمعہ ادا کی جائے، تاکہ اتحاد و اتفاق باقی رہے اور ایک جگہ جمع ہونے سے مسلمانوں کے جذبات میں ترقی آئے، اس کے علاوہ کئی مصلحتوں کی بنا پر ایک جگہ جمعہ ادا کرنا بہتر ہوتا ہے، البتہ سوال میں مذکور تحریر کے مطابق لوگوں کو نگینہ مسجد جانے میں تکلیف ہوتی ہے اور بھی دیگر وجوہات ہیں، اس لیے زینۃ الاسلام میں جمعہ ادا کرنا جائز ہے۔ (شامی)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۱۴۴-۱۴۵، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ، ط: دار الفکر - بیروت.
قد تقدم تفصیلہ و تخریجہ تحت عنوان متقدم.

[۲۰] ایک گاؤں میں دو جگہ جمعہ ادا کرنا

۱۰۰۹- سوال: ہمارے بودھان گاؤں میں دو مسجد ہے، ۱۹۶۲ء سے مرحوم مولانا احمد اشرف صاحب کے ساتھ ایک جمعہ اس مسجد میں اور دوسری جمعہ دوسری مسجد میں گاؤں والے ادا کرتے تھے؛ لیکن ابھی گاؤں کے دو چار آدمی یہ کوشش کرر ہے ہیں کہ دونوں مسجد میں الگ الگ نماز ہو، اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ نماز کے وقت بہت شور ہوتا ہے، گاؤں کی آبادی بڑھ گئی ہے؛ اس لیے جگہ بھی تنگ ہوجاتی ہے؛ لیکن جگہ کی تنگی کی وجہ بے بنیاد ہے، البتہ شور کا زیادہ ہونا حقیقت ہے۔

۱۹۶۲ء سے پہلے دونوں مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی جاتی تھی، تو ایک ہی مسجد میں نماز ادا کی جائے یا (امام کے تعلق سے) بے بنیاد وجہ بیان کرکے دو جگہ نماز جمعہ ادا کی جائے؟

الجواب حامداومصلیا:

دین اسلام کی بنیاد عبادت، بندگی اور اللہ کے احکام کو بلا چوں وچرا مان لینے پر ہے، جس میں اہم تعلیم اتفاق واتحاد اور اجتماعیت ہے۔

غور کیجیے! نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا، حج میں احرام کی یکسانیت، امیر وغریب بادشاہ اور رعایا تمام کے لیے حج کا مقام اور اس کا وقت ایک ہی رکھا گیا ہے، کسی کو آگے پیچھے کرنے کی اجازت نہیں ہے، روزے کا ٹائم بھی ایک ہی رکھا گیا ہے، توحید ورسالت کا اقرار بھی تمام کے لیے ایک ہی طور پر رکھا گیا ہے، اور نماز جس کو دن میں پانچ بار ادا کرنا فرض ہے، اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امام نیک ہو یا بد اس کے پیچھے نماز پڑھ لو۔ (حدیث)[1]

متولی اور ٹرسٹی کا فرض تھا کہ متقی، پرہیزگار کو امامت کے لئے متعین کرے، لیکن انہوں نے بے توجہی کرتے ہوئے متقی کو امام نہیں بنایا، تب بھی قوم کی ذمہ داری ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھے۔

[۱] سنن الدارقطني- أبو الحسن علي بن عمر، البغدادي الدارقطني (م:۳۸۵ھ):۲/ ۴۰۳، رقم الحديث: ۱۷۶۸، كتاب العيدين، باب صفة من تجوز الصلاة معه والصلاة عليه، ت: شعيب الارنؤوط وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت.

لو قدموا فاسقا يأثمون بناء على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم؛ لعدم اعتنائه بأمور دينه. (حلبي كبير- إبراهيم بن محمد بن إبراهيم الحلبي (م:۹۵۶ھ) ص:۳۱۵، كتاب الصلاة، الأولى بالإمامة، ط: سہیل اکیڈمی-لاہور)

لہذا آپ کے بودھان گاؤں کی دونوں مسجد کے متولیان کی بات سن کر حضرت مولانا اشرف صاحبؒ نے جو صلاح دی تھی اور ذمہ داران نے آج تک اس پر عمل کیا اور دونوں مسجدوں میں باری باری نماز ادا کی جاتی رہی، اسی پر عمل کرنے میں بہتری ہے اور مسلمانوں کا اتحاد بھی اسی میں قائم رہے گا۔ اگرچہ مسئلہ کی رو سے شہر یا قصبہ میں چند جگہ پر جمعہ کی نماز پڑھنا جائز ہے؛ لیکن آپ کے گاؤں میں الگ الگ دو مسجدوں میں جمعہ کی نماز ادا کرنا بہتر نہیں ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] شہر یا قصبہ کی ایک سے زائد مسجدوں میں جمعہ جائز ہے

۱۰۱۰- سوال: محترم ومکرم جناب مفتی صاحب! سورت ضلع میں ویارا نامی ایک گاؤں ہے، جہاں مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی ہے، اس میں دو مسجد اور دو عبادت گاہ ہیں، ایک عبادت گاہ ریلوے اسٹیشن پر ہے اور ایک عبادت گاہ گاؤں کے کنارے ہائی وے پر ہے، یہاں ایک تعلیم الاسلام نامی مدرسہ چلتا ہے اور پنج وقتہ نماز بھی ہوتی ہے۔ یہ جگہ ''اسلام پورا'' کے نام سے پہچانی جاتی ہے، یہاں مسلم گھروں کی تعداد کم از کم ۸۰ رہے اور سارے لوگ معماری کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور بالکل ان پڑھ ہیں۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ ہم نے حالات کے پیش نظر یہاں جمعہ کی نماز شروع کی ہے۔ (پنج وقتہ نماز تو ہوتی ہی ہے) اور الحمدللہ جمعہ کی نماز میں تقریباً ۷۰ ریا ۸۰ رنمازی حضرات اور ۲۵ ریا ۳۰ رلڑکے آتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلام پورا سے گاؤں کی مسجد اندازاً آدھے کلومیٹر کی دوری پر ہے اور یہ معمار پیشہ لوگ اپنے کام سے ۱۲ ربجے آتے ہیں، اور دوری کی وجہ سے ۹۹ رفیصد مسلمان، جمعہ کی نماز میں حاضر نہیں ہوتے، زیادہ سے زیادہ آٹھ دس افراد، نماز جمعہ کے لیے گاؤں کی مسجد میں جاتے ہیں۔

ان صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہم نے وہاں پر جمعہ کی نماز شروع کی ہے اور اس کے نتیجہ میں

---

(۱) الخاصة الثالثة: صلاة الجمعة التي هي من آكد فروض الإسلام، ومن أعظم مجامع المسلمين، وهي أعظم من كل مجمع يجتمعون فيه وأفرضه سوى مجمع عرفة، ومن تركها تهاونا بها طبع الله على قلبه، وقرب أهل الجنة يوم القيامة وسبقهم إلى الزيارة يوم المزيد بحسب قربهم من الإمام يوم الجمعة وتبكيرهم. (زاد المعاد في هدي خير العباد-ابن قيم الجوزية (م:۷۵۱ھ): ۱/ ۳۶۵، فصل في خواص يوم الجمعة وهي ثلاث وثلاثون، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت-مكتبة المنار الإسلامية، الكويت)

تفصیل وتخریج سابقہ جوابات میں ملاحظہ فرمائیں۔

سارے مسلمان نماز جمعہ کے لیے آتے ہیں۔

گاؤں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہاں جمعہ کی نماز بند کی جائے اور اپنے اس قول کی تائید میں وہ کوئی ایسی حدیث پیش کرتے ہیں کہ ۸ رمحلے ہو، پھر بھی ایک ہی جگہ نماز جمعہ ادا کی جائے۔

جمعہ بند کرنے کی صورت میں جیسا کہ میں نے بتایا کہ صرف آٹھ دس آدمی ہی وہاں سے جمعہ کے لیے آتے ہیں۔ تو کیا ہم وہاں جمعہ بند کردیں یا جاری رکھیں؟ اگر بند کردیں، تو لوگوں کی نماز جمعہ فوت ہوجاتی ہے۔ جب کہ جاری رکھنے کی صورت میں جمعہ کی برکت سے دوسرے نمازی بھی آتے ہیں، اور دینی ماحول بننے کی امید ہے؛ لہٰذا جمعہ جاری رکھنے سے کوئی نقصان ہوتا ہو، تو بتائیں، نیز جمعہ بند کرنی چاہیے یا جاری رکھنی چاہیے، واضح انداز میں بتائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

وہ شہر، قصبہ یا بڑا گاؤں، جس میں نماز جمعہ پڑھنا جائز ہے، وہاں ضرورت کی بناء پر ایک سے زیادہ جگہوں پر بھی نماز جمعہ پڑھنا جائز ہے۔[1] لہٰذا آپ نے ضرورت کی بنیاد پر اسلام پورا میں جو جمعہ کی نماز شروع کی ہے، اور جن ضرورتوں کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، وہ ضرورت واقعی ہے؛ اس لیے جمعہ جاری رکھیں، بند نہ کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] بلا ضرورت گاؤں کی متعدد مساجد میں جمعہ شروع کرنا

۱۰۱۱- سوال: فی الحال ہمارے گاؤں میں چار مساجد ہیں، ان میں سے دو میں کچھ عرصہ سے

---

(۱) (وتؤدی في مصر واحد بمواضع كثيرة) مطلقا على المذهب وعليه الفتوى شرح المجمع للعيني وإمامة فتح القدير. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله مطلقا) أي سواء كان المصر كبيرا أو لا وسواء فصل بين جانبيه نهر كبير كبغداد أو لا وسواء قطع الجسر أو بقي متصلا وسواء كان التعدد في مسجدين أو أكثر هكذا يفاد من الفتح، ومقتضاه أنه لا يلزم أن يكون التعدد بقدر الحاجة كما يدل عليه كلام السرخسي الآتي (قوله على المذهب) فقد ذكر الإمام السرخسي أن الصحيح من مذهب أبي حنيفة جواز إقامتها في مصر واحد في مسجدين وأكثر به نأخذ لإطلاق "لا جمعة إلا في مصر" شرط المصر فقط، وبما ذكرنا اندفع ما في البدائع من أن ظاهر الرواية جوازها في موضعين لا في أكثر وعليه الاعتماد اهـ فإن المذهب الجواز مطلقا بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۴۴-۱۴۵، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت)

جمعہ کی نماز ہوتی ہے، ان دونوں میں گاؤں کے تمام مصلی حضرات آرام سے نماز پڑھ سکتے ہیں، کسی قسم کی تکلیف ودشواری نہیں ہے، اب ہمارا تیسری مسجد میں بھی جمعہ وعیدین کو قائم کرنے کا ارادہ ہے، تو کیا تیسری مسجد میں جمعہ وعیدین کی نماز قائم کر سکتے ہیں، اس بارے میں شرعی فیصلہ کیا ہے؟

واضح رہے کہ اس مسجد کی تعمیر کے وقت یہ نیت کی تھی کہ ہم اس مسجد میں پانچ نمازیں ہی پڑھیں گے، عیدین وجمعہ ''جامع مسجد'' میں پڑھیں گے، تو کیا اس طرح کی نیت کے بعد ہم اس مسجد میں جمعہ و عیدین قائم کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصليا:

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ ''اجتماعی عبادت کے لیے تمام حضرات کا روزانہ جمع ہونا مشکل امر تھا، اس لیے اس کے لیے کسی مدت کی تعیین ضروری تھی، یہ مدت نہ اتنی مختصر ہو کہ لوگوں کا جمع ہونا دشوار ہو جائے اور نہ ہی اتنی طویل کہ مقصد فوت ہو جائے، بین بین مدت ہونی چاہیے، اور وہ ہفتہ کی مدت ہے، عرب وعجم اور اکثر مذاہب میں یہ مدت مستعمل ہے، اور اس مقصد کے لیے کار آمد بھی ہے، اس لیے ہفتہ واری اجتماعی طے کیا گیا۔''(۱)

یہ ہفتہ واری اجتماع اس لیے بھی طے ہوا ہے کہ لوگ جمع ہو کر نفع ونقصان کے متعلق سوچ سکیں اور کوئی لائحہ عمل تیار کر سکیں؛ اس وجہ سے بعض علماء کرام نے تو ایک شہر یا قصبہ میں دو تین جگہ پر جمعہ قائم کرنے کو ناجائز کہا ہے؛ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ضرورت کی بناء پر (جیسے آبادی کا دور دور ہونا، مسجد کا لوگوں سے بھر جانا، گرمی وسردی میں مصلیوں کا ایک ہی جگہ جمع ہونے میں تکلیف کا سامنا کرنا) ایک شہر یا قصبہ کی مختلف مساجد میں جمعہ پڑھنا جائز ہے۔

مسجد کی تعمیر کے وقت خواہ نیت کی ہو یا نہ کی ہو، دونوں مساجد میں نماز پڑھنے میں جب کوئی عذر و حرج نہیں ہے، تو تیسری مسجد میں جمعہ شروع کرنا بہتر نہیں ہے۔ نیز اگر مسجد بنانے والے یا متولی کی خاندانی

(۱) الأصل فيها أنه لما كانت إشاعة الصلاة في البلد - بأن يجتمع لها أهلها - متعذره كل يوم وجب أن يعين لها حد لا يسرع دورانه جدا، فيتعسر عليهم، ولا يبطؤ جدا، فيفوتهم المقصود وكان الأسبوع مستعملا في العرب والعجم، وأكثر الملل، وكان صالحا لهذا الحد، فوجب أن يجعل ميقاتها ذلك. (حجة الله البالغة - أحمد بن عبد الرحيم، المعروف بـ'الشاه ولي الله الدهلوي' (م:۱۱۷۶ھ): ۲/ ۴۴، الجمعة، ت: السيد سابق، ط: دار الجيل، بيروت)

شرافت کو اجاگر کرنے کی وجہ سے اس تیسری مسجد میں قیام جمعہ کی سعی ہوگی، تو جمعہ قائم کرنا درست نہیں ہوگا، لیکن دلوں کو حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں؛ اس لیے بہتر ہے کہ وہاں جمعہ کی نماز شروع نہ کی جائے۔[1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] بارش کے عذر کی وجہ سے صرف برسات کے موسم کے لیے عبادت خانہ میں جمعہ پڑھنا

۱۰۱۲- سوال: ہمارے یہاں عبادت خانہ میں صرف پنج وقتہ نماز ہوتی ہے، جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں جانا پڑتا ہے، اور بارش کے موسم میں مسجد جانے کے لیے ضعیف اور کمزور لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے، تو کیا صرف بارش کے موسم میں عبادت خانہ میں جمعہ کی نماز ہوسکتی ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے ''مسجد کا ہونا'' شرط نہیں ہے، عبادت خانہ میں بھی جمعہ کی نماز ادا کرنا جائز ہے۔[2]

البتہ بہتر یہ ہے کہ ایک ہی جگہ پر جمعہ کی نماز ادا ہو؛ لیکن بارش وغیرہ اعذار کی بناء پر دو جگہ نماز پڑھنا بھی جائز ہے۔ (درمختار)[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] جمعہ کی صرف دو رکعتیں فرض پڑھنا اور سنتوں کو چھوڑ دینا

۱۰۱۳- سوال: جمعہ کے روز ہمارے بہت سے بھائی جمعہ کی صرف دو رکعت فرض پڑھ کر گھر چلے جاتے ہیں، یا مسجد سے باہر بیٹھ کر یا کھڑے کھڑے گپ شپ کرتے رہتے ہیں، تو کیا ان کی نماز جمعہ درست ہوگی؟

(۱) تقدم تفصیله و تخریجه ضمن عنوان: ایک گاؤں میں دو جگہ جمعہ کی نماز قائم کرنا۔

(۲) السلطان إذا أراد أن يجمع بحشمه في داره فإن فتح باب الدار و أذن إذنا عاما جازت صلاته شهدها العامة أو لم يشهدوها، كذا في المحيط ويكره، كذا في التتارخانية وإن لم يفتح باب الدار و أجلس البوابين عليها لم تجز لهم الجمعة، كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۸، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۴۷، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: زكريا- ديوبند)

(۳) وتؤدى الجمعة في مصر واحد في مواضع كثيرة وهو قول أبي حنيفة ومحمد - رحمهما الله تعالى - وهو الأصح و ذكر الإمام السرخسي أنه الصحيح من مذهب أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - وبه نأخذ، هكذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵)

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: ''ایک گاؤں میں دو جگہ جمعہ کی نماز قائم کرنا'' کا حاشیہ نمبر: ۲۔

الجواب حامداً ومصلیا:

صورت مسئولہ میں ان کی فرض نماز تو ادا ہو جائے گی۔

سنن مؤکدہ کو چھوڑنے کی عادت بنالینا جائز نہیں، اس سے آدمی فاسق ہو جاتا ہے، جس کی دینی معاملات میں گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ (۱)

اسی طرح مسجد میں دنیوی باتیں کرنا حرام ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے نمازیوں کو نماز میں خلل واقع ہوگا، نیز مسجد میں دنیوی باتیں کرنے سے مسجد کی بے حرمتی ہوگی۔

ایک حدیث پاک میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "مسجد کے اندر دنیوی باتیں کرنے سے نیکیاں اس طرح جل جاتی ہیں، جس طرح خشک گھاس کو آگ جلا دیتی ہے۔" (۲) لہٰذا جو لوگ صرف جمعہ کی دو رکعت پڑھتے ہیں اور سنت بالکل ہی نہیں پڑھتے، مسجد میں دنیوی گفتگو کرتے ہیں، وہ فاسق ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) فما كان فعله أولى من تركه مع منع الترك إن ثبت بدليل قطعي ففرض، أو بظني فواجب، وبلا منع الترك إن كان مما واظب عليه الرسول - صلى الله عليه وسلم - أو الخلفاء الراشدون من بعده فسنة، وإلا فمندوب و نفل. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۰۲، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، مطلب في السنة وتعريفها، ط: دار الفكر)

والسنة نوعان: سنة الهدي، وتركها يوجب إساءة وكراهية كالجماعة والأذان والإقامة ونحوها.

وسنة الزوائد، وتركها لا يوجب ذلك كسير النبي - عليه الصلاة والسلام - في لباسه وقيامه وقعوده. . . . السنة هي الطريقة المسلوكة في الدين، فهي في نفسها عبادة . . . . ولما لم تكن من مكملات الدين وشعائره سميت سنة الزوائد، بخلاف سنة الهدي، وهي السنن المؤكدة القريبة من الواجب التي يضلل تاركها؛ لأن تركها استخفاف بالدين. (حوالہ سابق: ۱/ ۱۰۳)

(۲) وعن الحسن مرسلا قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: »يأتي على الناس زمان يكون حديثهم في مساجدهم في أمر دنياهم. فلا تجالسوهم فليس لله فيهم حاجة« . رواه البيهقي في شعب الإيمان. (مشكاة المصابيح: ۱/ ۷۱، باب المساجد ومواضع الصلاة، الفصل الثالث، ط: ياسر نديم - ديوبند☆شعب الإيمان - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۴/ ۳۸۷، رقم الحديث: ۲۷۰۱، الصلاة، فصل في المشي إلى المساجد، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض)

(و) فيها يكره (الكلام في المسجد وخلف الجنازة وفي الخلاء وفي حالة الجماع) [الدر المختار]

قال ابن عابدين: (قوله وفيها) أي في السراجية (وقوله يكره الكلام في المسجد) ورد »أنه يأكل الحسنات كما تأكل النار الحطب« وحمله في الظهيرية وغيرها على ما إذا جلس لأجله وقد سبق في باب الاعتكاف وهذا كله في المباح لا في غيره فإنه أعظم وزرا. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۴۱۸، كتاب الحظر والإباحة، فرع يكره إعطاء سائل المسجد إلا إذا لم يتخط رقاب الناس، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲۵] جمعہ کی نماز کے لیے جامع مسجد جانا ضروری نہیں

۱۰۱۴- سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

کیا جمعہ کی نماز کے لیے جامع مسجد جانا واجب ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

نماز جمعہ کے لیے جامع مسجد جانا واجب نہیں ہے، مستحب ہے، ایک شہر میں متعدد جگہ جمعہ کی نماز جائز ہے، اگر جامع مسجد بڑی ہے اور شہر کی آبادی تھوڑی ہے، تو بہتر یہی ہے کہ ایک جگہ جمعہ ہو۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] جمعہ کی پہلی اذان کے بعد غسل کرنے کا حکم

۱۰۱۵- سوال: کیا جمعہ کی پہلی اذان کے بعد وضو اور غسل نا جائز ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

جمعہ کی پہلی اذان ہوتے ہی مسجد کے لیے نکلنا واجب ہے، کوئی ایسا کام، جو اذان کے بعد مسجد جانے سے مانع ہو، جائز نہیں ہے، اذان کے بعد غسل کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ (۲)

---

(۱) والمسجد الجامع ليس بشرط لصحة الجمعة، حتى أجمعوا على صحة الجمعة في المصلى. (حلبی کبیر: ۱/۵۵۱، سہیل اکیڈمی-لاہور)

(وتؤدى في مصر واحد بمواضع كثيرة) مطلقا على المذهب وعليه الفتوى شرح المجمع للعيني وإمامة فتح القدير. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله مطلقا) أي سواء كان المصر كبيرا أو لا وسواء فصل بين جانبيه نهر كبير كبغداد أو لا وسواء قطع الجسر أو بقي متصلا وسواء كان التعدد في مسجدين أو أكثر هكذا يفاد من الفتح، ومقتضاه أنه لا يلزم أن يكون التعدد بقدر الحاجة كما يدل عليه كلام السرخسي الآتي (قوله على المذهب) فقد ذكر الإمام السرخسي أن الصحيح من مذهب أبي حنيفة جواز إقامتها في مصر واحد في مسجدين وأكثر به نأخذ لإطلاق "لا جمعة إلا في مصر" شرط المصر فقط، وبما ذكرنا اندفع ما في البدائع من أن ظاهر الرواية جوازها في موضعين لا في أكثر وعليه الاعتماد اهـ فإن المذهب الجواز مطلقا بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۱۴۴-۱۴۵، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ. (۶۲-الجمعة:۹)

وقال ابن عباس رضي الله عنهما: يحرم البيع حينئذ، وقال عطاء: تحرم الصناعات كلها. (صحيح البخاري: ۱/۱۲۴، كتاب الجمعة، باب المشي إلى الجمعة، تعليقا، ط: ديوبند) =

ہاں غسل واجب ہو، تو کرنا ضروری ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] منبر کے چوتھے زینے سے خطبہ دینا کیسا ہے؟

۱۰۱۶- سوال: امام کا منبر کے چوتھے زینے سے خطبہ دینے کے متعلق فقہاء کیا فرماتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے تین زینے تھے، اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ چوتھے زینہ پر بیٹھنا جائز نہیں ہے، اگر چوتھے زینے پر چڑھ کر خطبہ دینے سے سامعین تک آواز اچھی طرح پہنچتی ہو، تو جائز ہے، ممانعت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= ويجب السعي وترك البيع بالأذان الأول، ... وقال الحسن بن زياد: المعتبر هو الأذان على المنارة، والأصح أن كل أذان يكون قبل الزوال فهو غير معتبر والمعتبر أول الأذان بعد الزوال سواء كان على المنبر أو على الزوراء، كذا في الكافي. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ١/ ١٤٩، صلاة الجمعة، ط: دار الفكر)

(ووجب سعي إليها وترك البيع) ولو مع السعي، في المسجد أعظم وزرا (بالأذان الأول) في الأصح وإن لم يكن في زمن الرسول بل في زمن عثمان. (الدر المختار)

وقال ابن عابدين: (قوله ووجب سعي) لم يقل افترض مع أنه فرض للاختلاف في وقته هل هو الأذان الأول أو الثاني أو العبرة لدخول الوقت؟ بحر. ـــــ وحاصله أن السعي نفسه فرض والواجب كونه في وقت الأذان الأول، وبه اندفع ما في النهر من أن الاختلاف في وقته لا يمنع القول بفرضيته كصلاة العصر فرض إجماعا مع الاختلاف في وقتها (قوله وترك البيع) أراد به كل عمل ينافي السعي وخصه اتباعا للآية، نهر. (قوله: ولو مع السعي) صرح في السراج بعدم الكراهة إذا لم يشغله بحر وينبغي التعويل على الأول نهر. ـــــ ... (قوله في الأصح) قال في شرح المنية. واختلفوا في المراد بالأذان الأول فقيل الأول باعتبار المشروعية وهو الذي بين يدي المنبر لأنه الذي كان أولا في زمنه- عليه الصلاة والسلام- وزمن أبي بكر وعمر حتى أحدث عثمان الأذان الثاني على الزوراء حين كثر الناس. والأصح أنه الأول باعتبار الوقت، وهو الذي يكون على المنارة بعد الزوال. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ١٦١، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر- بيروت☆البحر الرائق: ٢/ ٢٧٣، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: دار الكتاب- ديوبند☆الهداية: ١/ ١٧١، كتاب الصلاة باب الجمعة، ط: ديوبند)

(١) الباب الثالث في شروط الصلاة، وهي عندنا سبعة: الطهارة من الأحداث، والطهارة من الأنجاس... الخ. (الفتاوى الهندية: ١/ ٥٨، الباب الثالث في شروط الصلاة، الفصل الأول في الطهارة وستر العورة، ط: دار الفكر)

(٢) ومن السنة أن يخطب عليه اقتداء به- صلى الله عليه وسلم- ... ومنبره- صلى الله عليه وسلم- كان ثلاث درج غير المسماة بالمستراح. قال ابن حجر في التحفة. (رد المحتار: ٢/ ١٦١، كتاب الصلاة، مطلب في حكم المرقى، الخ، ط: دار الفكر)

[۲۸] جمعہ کا بیان مقررہ وقت پر ختم نہ کرنا

۱۰۱۷- سوال: ۸۰-۹۰ ہزار کی آبادی والا ایک شہر ہے، اس میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، اس شہر کے اطراف میں بھی مسلم بڑی تعداد میں آباد ہیں، صنعتی شہر ہے، جس کی وجہ سے ملازمین بھی کثیر تعداد میں رہتے ہیں، ان وجوہ سے شہر کی مسجدوں میں اچھے خاصے لوگ نماز جمعہ کے لیے جمع ہوتے ہیں، ریلوے اسٹیشن اور بس ڈپو بھی شہر کے بالکل قریب ہے، اس کے علاوہ سرکاری آفس اور تجارت کی ایک بڑی منڈی بھی ہے۔ جمعہ کی نماز بھی شہر کی بہت سی مسجدوں میں ہوتی ہے؛ لیکن ریلوے اسٹیشن اور بس ڈپو کی مساجد میں بہت بھیڑ ہوتی ہے، حتیٰ کہ مسجد کے باہر کمپاؤنڈ میں بھی نماز ادا کرنی پڑتی ہے، جمعہ کی نماز کا وقت ایک بج کر تیس منٹ مقرر ہے، مسجد میں اوقات کے بورڈ لگے ہوئے ہیں اور یہ وقت برسوں سے متعین ہے۔ اس وقت کے مطابق آس پاس کے مصلیان، جیسے کہ ملازمین، تجار اور مسافرین نماز ادا کرتے ہیں۔

ایک عالم صاحب- جن کا بڑا اونچا مقام ہے- جمعہ کے دن باہر گاؤں سے آکر تقریر کرتے ہیں، یوں تو وہ پہلے سے ہی بیان کرتے ہیں؛ لیکن آٹھ دس جمعہ سے وقت کا خیال نہیں کرتے اور دو بجے تک اپنی تقریر جاری رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو دقت ہوتی ہے، ٹرین میں سفر کرنے والوں کی ٹرین چھوٹ جاتی ہے، ملازمین سے آفس کے وقت کی پابندی نہیں ہوتی، یہ بات مسجد کے ٹرسٹی حضرات کے سامنے رکھی گئی، تو انہوں نے بھی اس بات پر توجہ دی اور مذکورہ عالم صاحب سے انہوں نے وقت کی رعایت کے متعلق بات کی؛ لیکن عالم صاحب اپنی ضد پر اڑے رہے، ایک مرتبہ جمعہ کی نماز میں ایک بج کر پینتیس منٹ پر ایک ٹرسٹی نے کھڑے ہو کر عالم صاحب کو بیٹھنے کے لیے کہا، تو وہ یہی کہتے رہے: جس کو تقریر نہ سننی ہو، وہ دوسری مساجد میں نماز پڑھ لے، خیر بعد میں خطبہ ہوا، نماز ہوئی، اس واقعہ سے متعلق- جو مفصل بیان کیا گیا ہے- دریافت طلب امور درج ذیل ہیں، امید ہے کہ جلد جواب عنایت فرمائیں گے:

(۱) وقت کی پابندی کرنی چاہیے یا نہیں؟

(۲) کیا مولانا (عالم) کا ضد کرنا مناسب ہے؟

(۳) عالم دین کا یہ کہنا کہ ''دوسری مساجد میں چلے جاؤ'' کیا مناسب ہے؟

(۴) اس زمانہ کے ماحول کو دیکھتے ہوئے لمبی لمبی تقریر کرنا مناسب ہے؟

(۵) مولانا اخیری جمعہ میں روکنے کے باجود نہ رکے، اور تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور بیان میں یہ بھی کہا کہ میں نے بھی اس جگہ کے لیے قربانی دی ہے، تو کیا یہ لفظ کہنا مناسب ہے، کیا آئندہ چل کر کوئی آدمی مسجد بنوا کر اس طرح بول سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) آج کل دنیا کا پورا نظام، اوقات کے مطابق انجام پاتا ہے، اس بات کو سامنے رکھ کر نماز کے اوقات مقرر کرنے میں حرج نہیں، اور جو وقت مقرر ہو، اس پر نماز ہونی چاہیے، اور وقت کی پابندی بھی ہونی چاہیے، خاص طور پر بس اسٹینڈ اور ریلوے اسٹیشنوں کی مساجد میں لوگ اس لیے نماز پڑھنے آتے ہیں کہ نماز پڑھ کر گاڑی پکڑنے میں انھیں آسانی رہے، ان کے علاوہ دیگر حضرات بھی نماز کے وقت کے مطابق اپنا نظام بناتے ہیں؛ اس لیے طے شدہ وقت سے لاپرواہی کرنے میں بہت سے لوگوں کے نقصان کا اندیشہ ہے؛ لہٰذا وقت کی پابندی ایک ضروری امر ہے۔

لیکن کوئی ایک مرتبہ، کسی عذر کی بناء پر دیر ہو جائے، تو اس پر انگلی نہیں اٹھانی چاہیے، البتہ ایک وقت مقرر ہو جانے کے بعد جان بوجھ کر ہر مرتبہ دیر کرنا مناسب نہیں۔

جب نماز کی حالت میں کوئی ایسا عذر پیش آجائے، جس سے نمازیوں کا اطمینان ختم ہو رہا ہو، تو ایسے وقت میں امام کو چاہیے کہ نماز کو مختصر کر دے، تا کہ نمازی کی نماز میں حرج نہ ہو؛ اس لیے جو لوگ نماز کے لیے حاضر ہو گئے ہیں، نماز کو اپنے وقت سے مؤخر کر کے انھیں مشقت میں ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ (مراقی)[1]

(۱) عن أبي قتادة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إني لأقوم في الصلاة أريد أن أطول فيها، فأسمع بكاء الصبي، فأتجوز في صلاتي كراهية أن أشق على أمه. (صحيح البخاري: ۱/ ۹۸، رقم الحديث: ۷۰۷، باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبي، ط: البدر - ديوبند)

قال أنس: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يسمع بكاء الصبي مع أمه وهو في الصلاة، فيقرأ بالسورة الخفيفة، أو بالسورة القصيرة. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۸۸، رقم الحديث: ۱۹۱ - (۴۷۰)، كتاب الصلاة، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام، ط: البدر - ديوبند)

دیکھیے: مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹ھ)، ص: ۱۳۳، أحكام الصلاة، باب ما يفسد الصلاة، فصل في المكروهات، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

وكان رءوفا رحيما بالأطفال حتى إذا سمع بكاء الصبي خفف في صلاته كي لا يشق على أمه خلفه. (حاشية الشِّلْبِيِّ مع تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - شهاب الدين أحمد بن محمد، الشِّلْبِيُّ (م: ۱۰۲۱ھ): ۱/ ۱۹۰، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

(۲) ہمیشہ تاخیر کرنے کی عادت بنالینا مناسب نہیں ہے اور نامعقول بات پر ضد کرنا، زیادہ نامناسب ہے۔(۲)

(۳) پہلے ہی سے نماز کا وقت تاخیر سے پڑھنا مقرر کیا ہو، تاکہ کسی کی نماز نہ چھوٹے اور جماعت میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں؛ ایسی صورت میں کوئی کہے کہ جلدی وقت کیوں مقرر نہیں کیا؟ تو اس کو کہہ سکتے ہیں کہ دوسری مسجد میں نماز پڑھ لو؛ لیکن ایک وقت مقرر ہے، اس کے مطابق مصلیوں کے حاضر ہوجانے کے بعد تاخیر کرنے کی عادت بنالینا اور کوئی توجہ دلائے، تو اس پر یہ کہنا کہ ''دوسری مسجد میں چلے جاؤ'' قطعاً غیر مناسب ہے، اس سے اجتناب لازم ہے۔(۳)

(۴) لمبی تقریر کرنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے؛ لیکن جلدی شروع کر کے مقررہ وقت پر ختم کردے۔

(۵) مسجد کے لیے قربانی تو آخرت میں ثواب حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے، دنیا کے لیے نہیں ہوتی، اس کے باوجود شریعت میں گنجائش ہے کہ جس آدمی نے قربانی دی ہو، وہ مسجد کا متولی اور ٹرسٹی بن سکتا ہے اور اس کی قربانی کا خیال کرتے ہوئے اسے متولی بنانا بھی چاہیے؛ لیکن اس کی وجہ سے مقررہ وقت میں تاخیر کر کے دوسرے لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کرنے کا اختیار نہیں ملتا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] جمعہ کے روز تقریر کو ضروری سمجھنا اور اس کی وجہ سے جمعہ کو مؤخر کرنا

۱۰۱۸- سوال: جمعہ سے قبل ضروری سمجھ کر تقریر کرنا اور نماز کا وقت متعین ہونے کے باوجود وقت سے تاخیر کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

مسلمانوں میں دین سے دوری عام ہے؛ اس لیے ترغیب و ترہیب اور حالات حاضرہ پر مشتمل خطاب، وقت کی اہم ضرورت ہے، اس کے بڑے فائدے ہیں، اسی کے پیش نظر ہندوستان کی مساجد میں

(۲) عن أبي أمامة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنا زعيم ببيت في ربض الجنة، لمن ترك المراء، وإن كان محقا، وببيت في وسط الجنة، لمن ترك الكذب، وإن كان مازحا، وببيت في أعلى الجنة، لمن حسن خلقه. (سنن أبي داود: ۲/۶۶۱، رقم الحديث: ۴۸۰۰، كتاب الأدب، باب في حسن الخلق، ط: البدر - ديوبند)

(۳) وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ أُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَّدْخُلُوْهَآ إِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞ (۲- البقرۃ: ۱۱۴)

خطبہ سے قبل اردو یا مقامی زبان میں تقریر کا رواج ہے، یہ لازم اور ضروری نہیں ہے کہ اس کے بغیر جمعہ کی نماز ہی درست نہیں ہوگی، متولی یا امام تقریر کرنے کو فرض سمجھتے ہوں، تو یہ گناہ ہے؛ کیوں کہ یہ امر مباح ہے اور امر مباح کو لازم وضروری سمجھنا، درحقیقت اس کو اس کے درجے سے بڑھانا ہے، جو جائز نہیں ہے۔[1]

نماز کے وقت کی تعیین اس لیے ہوتی ہے کہ مختلف شعبہ سے وابستہ افراد اپنی اپنی ضرورتوں کو آگے پیچھے کر کے مقررہ وقت پر نماز باجماعت ادا کر سکیں۔ اگر جمعہ کے دن تقریر کو طول دینے کی وجہ سے یہ مقصد متاثر ہو، اور مقتدی حضرات کی تکلیف کا باعث بنے، تو ناجائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انسان کی عقل مندی یہ ہے کہ نماز کو طویل کرے اور خطبہ کو مختصر کرے۔ (الحدیث)[2]

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ نماز میں لمبی قرأت کی، تو ایک صحابی، جو کاشتکار تھے، انھیں اس سے تکلیف ہوئی اور نماز توڑ کر چلے گئے۔ دوسرے دن آپ ﷺ سے طویل قرأت کے متعلق شکایت کی، تو آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا کہ: اے معاذؓ! کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالنا چاہتے ہو؟ نماز میں ضعیف، مریض اور حاجت مند؛ ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمائی۔ (بخاری جلد ا صفحہ ۹۷)[3] اس سے ثابت ہوا کہ امام کو تمام مقتدیوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

---

(۱) قال ابن حجر في شرحه: قال ابن المنير: فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها؛ لأن التيامن مستحب في كل شيء، أي من أمور العبادة، لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه، أشار إلى كراهته، والله أعلم. (فتح الباري- ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲ھ): ۳۳۸/۲، قوله باب الانفتال والانصراف عن اليمين و الشمال، رقم الحديث: ۸۵۲، ط: دار المعرفة- بيروت، ۱۳۷۹ء)

(۲) قال أبو وائل: خطبنا عمار، فأوجز وأبلغ، فلما نزل قلنا: يا أبا اليقظان لقد أبلغت وأوجزت، فلو كنت تنفست فقال: إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: إن طول صلاة الرجل، وقصر خطبته، مئنة من فقهه، فأطيلوا الصلاة، واقصروا الخطبة، وإن من البيان سحرا. (الصحيح لمسلم: ۲۸۶/۱، رقم الحديث: ۴۷-(۸۶۹)، كتاب الجمعة، فصل في إيجاز الخطبة وإطالة الصلاة، ط: ديوبند)

(۳) عن عمرو، قال: سمعت جابر بن عبد الله، قال: كان معاذ بن جبل يصلي مع النبي صلى الله عليه وسلم، ثم يرجع، فيؤم قومه، فصلى العشاء، فقرأ بالبقرة، فانصرف الرجل، فكأن معاذا تناول منه، فبلغ النبي صلى الله عليه وسلم فقال: "فتان، فتان، فتان" ثلاث مرار - أو قال: فاتنا، فاتنا، فاتنا - وأمره بسورتين من أوسط المفصل. قال عمرو: لا أحفظهما. (صحيح البخاري: ۹۷/۱، رقم الحديث: ۷۰۱، كتاب الأذان، باب إذا طول الإمام، وكان للرجل حاجة، فخرج فصلى، ط: البدر- ديوبند)

اس روایت کو مکمل تفصیل کے ساتھ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح نقل کیا ہے: =

الغرض جس خطیب امام کی یہ حالت ہو- جو سوال میں مذکور ہے- تو ذیلی مجلس (کمیٹی) سے شکایت کرنی چاہیے۔

بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرا جی چاہتا ہے کہ میں قرأت کو طویل کروں؛ لیکن جب بچے کے رونے کی آواز آتی ہے، تو میں قراءت کو مختصر کر دیتا ہوں؛ کیوں کہ بچے کے رونے کی وجہ سے بچے کی ماں کو تکلیف ہوتی ہے، اور وہ حیران و پریشان ہو جاتی ہے۔ (جلد: ۱/ ۹۸)[۲]

اس لیے امام کو چاہیے کہ لمبی تقریر کر کے اپنے مقتدیوں کو پریشان نہ کرے، خطیب و مقرر کو چاہیے کہ جو وقت ۸ یا ۱۰ یا ۱۵ منٹ کا متعین ہو، مصلحت کے پیش نظر اسی پر اپنی تقریر کو ختم کر لے اور لوگوں کو فتنہ میں مبتلا ہونے سے بچائے، ایسے لوگوں کو بیان و تقریر سے کیا فائدہ ہوگا، جب کہ اس کو سننے کے لیے لوگوں کے دل ہی آمادہ نہ ہوں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] جمعہ کی اذانِ ثانی امام کے سامنے ہونی چاہیے یا صحنِ مسجد میں؟

۱۰۱۹- سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلۂ ذیل میں کہ جامع مسجد میں

= عن جابر قال: كان معاذ، يصلي مع النبي صلى الله عليه وسلم، ثم يأتي فيؤم قومه، فصلى ليلة مع النبي صلى الله عليه وسلم العشاء، ثم أتى قومه، فأمهم، فافتتح بسورة البقرة، فانحرف رجل، فسلم ثم صلى وحده، وانصرف، فقالوا له: أنافقت؟ يا فلان، قال: لا. والله ولآتين رسول الله صلى الله عليه وسلم فلأخبرنه. فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسول الله، إنا أصحاب نواضح نعمل بالنهار، وإن معاذا صلى معك العشاء، ثم أتى فافتتح بسورة البقرة، فأقبل رسول الله صلى الله عليه وسلم على معاذ، فقال: يا معاذ أفتان أنت؟ اقرأ بكذا واقرأ بكذا، قال سفيان: فقلت لعمرو، إن أبا الزبير، حدثنا عن جابر، أنه قال: اقرأ والشمس وضحاها والضحى، والليل إذا يغشى، وسبح اسم ربك الأعلى، فقال عمرو نحو هذا. (الصحيح لمسلم: ١/ ١٨٧، رقم الحديث: ١٧٨- (٤٦٥)، كتاب الصلاة، باب القراءة في العشاء، ط: البدر- ديوبند☆صحيح البخاري: ١/ ١٨، رقم الحديث: ٧٠٥، كتاب الأذان، باب من شكا إمامه إذا طول، ط: البدر- ديوبند)

(٢) عن أبي قتادة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إني لأقوم في الصلاة أريد أن أطول فيها، فأسمع بكاء الصبي، فأتجوز في صلاتي كراهية أن أشق على أمه. (صحيح البخاري: ١/ ١٨، رقم الحديث: ٧٠٧، باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبي، ط: البدر- ديوبند)

قال أنس: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يسمع بكاء الصبي مع أمه وهو في الصلاة، فيقرأ بالسورة الخفيفة، أو بالسورة القصيرة. (الصحيح لمسلم: ١/ ١٨٨، رقم الحديث: ١٩١- (٤٧٠)، كتاب الصلاة، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام، ط: البدر- ديوبند)

جمعہ کی اذانِ ثانی ہمیشہ سے امام کے سامنے منبر کے پاس ہوتی ہے؛ لیکن کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ یہ اذان مسجد کے صحن میں ہونی چاہیے، منبر کے پاس اذان کہنا مکروہ تحریمی ہے، اب حضرت والا سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ مسئلہ، فقہ حنفی کے مطابق مؤید بالدلائل واضح فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

مذکورہ سوال کے متعلق مختلف فتاویٰ میں تفصیل سے لکھا گیا ہے، مختصر یہ کہ خطیب جب منبر پر بیٹھ جائیں، تو ان کے سامنے دوسری اذان دی جائے، تسلسل کے ساتھ اسی پر عمل ہے:

وإذا جلس على المنبر أذن بين يديه وأقيم بعد تمام الخطبة بذلك جرى التوارث، كذا في البحر الرائق. (عالمگیری: ۱/۱۴۹)[۱]

(ويؤذن) ثانيا (بين يديه) أي الخطيب. (درمع الشامی: ۲/۱۶۱، مطبع: ایچ ایم سعید کمپنی)[۲]

وإذا صعد الإمام المنبر جلس وأذن المؤذنون بين يدي المنبر بذلك جرى التوارث. (ہدایہ، باب صلاۃ الجمعۃ)[۳] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] قید خانہ میں نمازِ جمعہ ادا کرنا

۱۰۲۰- سوال: قید خانہ میں جمعہ کی نماز اور خطبہ وغیرہ درست ہے یا نہیں؟

---

[۱] كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت.

(قوله فإذا جلس على المنبر أذن بين يديه وأقيم بعد تمام الخطبة) بذلك جرى التوارث، والضمير في قوله بين يديه عائد إلى الخطيب الجالس، وفي القدوري بين يدي المنبر، وهو مجاز إطلاقا لاسم المحل على الحال كما في السراج الوهاج، فأطلق اسم المنبر على الخطيب. (البحر الرائق: ۲/۱۶۹، باب صلاة الجمعة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۲] قال ابن عابدين: (قوله: ويؤذن ثانيا بين يديه) أي على سبيل السنية كما يظهر من كلامهم رملي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۱۶۱، باب الجمعة، مطلب في حكم المرقي بين يدي الخطيب، ط: دار الفكر)

[۳] الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر المرغيناني (م: ۵۹۳هـ): ۱/۸۴، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي☆الاختيار لتعليل المختار - عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳هـ): ۱/۸۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ت: الشيخ محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة☆بدائع الصنائع: ۱/۲۷۰، فصل صلاة الجمعة، ط: دار الكتب العلمية)

الجواب حامداً ومصلیاً:

قید خانہ اگر شہر یا اُس کی فناء میں داخل ہے اور قید خانہ کی مسجد میں نماز جمعہ کے لیے ہر شخص کو آنے کی اجازت ہے، جسے اذنِ عام کہا جاتا ہے، تو وہاں نماز جمعہ درست ہے۔

اگر اذنِ عام ہے؛ مگر قید خانہ شہر یا فناء شہر میں واقع نہیں ہے، یا قید خانہ تو شہر یا فناء شہر میں ہے؛ لیکن اذنِ عام نہیں ہے، کہ قید خانہ کے احاطہ میں رہنے والے لوگوں کے علاوہ دیگر کسی شخص کو اُس میں آنے کی اجازت نہیں ہے، تو ایسی جگہ جمعہ ادا کرنا جائز نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] جمعہ کی نماز کے وقت تجارت کے لیے دکان کھلی رکھنا

۱۰۲۱- سوال: جمعہ کے دن اگر دکان دار اپنی دکان کھلی رکھ کر کسی غیر مسلم یا نابالغ لڑکے کو سپرد کر کے خود نماز کے لیے جائے، تو یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ نیز اگر ایک مسلمان نوکر بے نمازی ہے، اُسے ہم نماز کی دعوت دیتے ہیں؛ لیکن وہ نماز کے لیے نہیں آتا، تو نماز کے وقت دکان اُس نوکر کے حوالے کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

غیر مسلم، نابالغ بچے، بیمار یا مسافر اور وہ لوگ جن پر جمعہ فرض نہیں ہے، انہیں جمعہ کی نماز کے وقت دوکان پر بٹھانا جائز ہے، اور اُن کی تجارت بھی جائز ہے۔[2]

[۱] (ومنها الإذن العام) وهو أن تفتح أبواب الجامع فيؤذن للناس كافة حتى أن جماعة لو اجتمعوا في الجامع وأغلقوا أبواب المسجد على أنفسهم وجمعوا لم يجز وكذلك السلطان إذا أراد أن يجمع بحشمه في داره فإن فتح باب الدار وأذن إذناً عاماً جازت صلاته شهدها العامة أو لم يشهدوها، كذا في المحيط ويكره، كذا في التتارخانية وإن لم يفتح باب الدار وأجلس البوابين عليها لم تجز لهم الجمعة، كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ١/ ١٤٨، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت☆ رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ١٥٢، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر)

(ويشترط لصحتها) سبعة أشياء، الأول المصر... وعليه فتوى أكثر الفقهاء. (رد المحتار على الدر المختار: ٣/ ٥، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: زكريا - ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ١/ ١٤٥، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: زكريا - ديوبند☆ الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ٥٩٣هـ): ١/ ٨٢، باب صلاة الجمعة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

(۲) اس لیے کہ ان کے حق میں یوم جمعہ نماز کے اعتبار سے دوسرے ایام کی طرح ہے:... لأن ساكن المصر مأمور بشيئين في هذا الوقت بترك الجماعات وشهود الجمعة، والمعذور قدر على أحدهما وهو ترك الجماعات فيؤمر بالترك. وأما=

جس پر جمعہ کی نماز فرض ہے اور وہ بے نمازی ہے، تو جمعہ کے وقت اُس کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے، خرید وفروخت سے وہ اتنا ہی گنہگار ہوگا جس قدر ترک جمعہ سے ہوتا ہے، لیکن اُس نے جمعہ کے وقت جو سودا کیا ہے، وہ گناہ کے ساتھ درست ہوگا، لہٰذا کسی ایسے شخص کو جس پر جمعہ فرض ہے، جمعہ کے وقت دکان پر بٹھانا جائز نہیں ہے۔ (بدائع الصنائع)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] جمعہ کے خطبہ کے دوران مسجد کا چندہ کرنا

۱۰۲۲- سوال: جمعہ کے دن جب خطبہ شروع ہوتا ہے اور لوگ فارغ بیٹھے ہوتے ہیں، اس وقت دو شخص ہر مصلی کے سامنے سے مسجد کے خرچ کے لیے جھولی لے کر گزرتے ہیں، جس کو دینا ہوتا ہے، اپنی خوشی سے دیتا ہے اور جو نہیں دیتا ہے، اس پر کوئی زبردستی نہیں ہوتی، تو شرعاً یہ فعل جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

ضرورت کی بنا پر مانگنے والے کو چندہ دینا جائز ہے، بشرطیکہ لوگوں کی گردنیں پھلانگنا، نمازی کے سامنے سے گذرنا اور چمٹ کر مانگنا لازم نہ آتا ہو، اور یہ اس وقت ہے جب کہ مانگنا خطبہ شروع ہونے سے پہلے ہو، اگر دوران خطبہ ہے، تو اس کی اجازت نہیں ہے؛ کیوں کہ خطبہ سننا ہر شخص پر واجب ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= أهل القرى فإنهم يصلون الظهر بجماعة بأذان وإقامة؛ لأنه ليس عليهم شهود الجمعة ولأن في إقامة الجماعة فيها تقليل جمع الجمعة فكان هذا اليوم في حقهم كسائر الأيام. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۷۰، فصل بيان ما يستحب في يوم الجمعة وما يكره فيه، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۱) وكذا يكره البيع والشراء يوم الجمعة ... لقوله تعالى ﴿يا أيها الذين آمنوا إذا نودي للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا إلى ذكر الله وذروا البيع﴾ [الجمعة: ۹] والأمر بترك البيع يكون نهيا عن مباشرته وأدنى درجات النهي الكراهة. ولو باع يجوز؛ لأن الأمر بترك البيع ليس لعين البيع بل لترك استماع الخطبة. (حوالہ سابق)

(۲) قال في النهر: والمختار أن السائل إن كان لا يمر بين يدي المصلي، ولا يتخطى الرقاب، ولا يسأل إلحافا، بل لأمر لا بد منه، فلا بأس بالسؤال والإعطاء اهـ ومثله في البزازية. وفيها ولا يجوز الإعطاء إذا لم يكونوا على تلك الصفة المذكورة. قال الإمام أبو نصر العياضي: أرجو أن يغفر الله - تعالى - لمن يخرجهم من المسجد. وعن الإمام خلف بن أيوب: لو كنت قاضيا لم أقبل شهادة من يتصدق عليهم. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۶۴، باب الجمعة، مطلب في الصدقة على سؤال المسجد، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید دیکھیے: فتاویٰ محمودیہ: ۸/ ۴۶۶ ☆ کتاب المسائل: ۱/ ۴۶۴۔

عن ابن عباس - رضی الله تعالیٰ عنهما -: أنه قال: إن أول جمعة جمعت بعد جمعة فی مسجد رسول الله صلى الله علیه وسلم، فی مسجد عبد القیس بجوائی من البحرین. (بخاری شریف: ۱/ ۱۲۲، حدیث نمبر: ۸۹۲)

عن عبد الرحمن بن كعب بن مالك، وكان قائد أبیه بعد ما ذهب بصره، عن أبیه كعب بن مالك، أنه كان إذا سمع النداء یوم الجمعة ترحم لأسعد بن زرارة، فقلت له: إذا سمعت النداء ترحمت لأسعد بن زرارة، قال: "لأنه أول من جمع بنا فی هزم النبیت من حرة بنی بیاضة فی نقیع، یقال له: نقیع الخضمات"، قلت: كم أنتم یومئذ، قال: أربعون. (ابوداود شریف: ۱/ ۱۵۳، حدیث نمبر: ۱۰۶۹)

باب الجمعة في القرىٰ

[گاؤں میں جمعہ کا قیام]

ضروری نوٹ: حضرت مفتی بیمات صاحبؒ کے ''جمعہ فی القریٰ'' کے تمام فتاویٰ کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جمہور علماء احناف کی طرح ان کے نزدیک بھی قیام جمعہ کے لیے بنیادی طور پر مصر شرط ہے، چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں، تاہم کسی چھوٹے گاؤں میں جمعہ کی نماز عرصۂ دراز سے ہو رہی ہو، اور اسے بند کرنے میں فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو، تو حضرت مفتی صاحبؒ کا نظریہ ہے کہ اسے بند نہ کیا جائے، نماز پڑھ لی جائے، امام ہو، تو وہ بھی جمعہ کی نیت سے نماز پڑھاوے، نماز ہوجائے گی، اور ظہر کی نماز بہ طور احتیاط (**احتیاط الظہر**) پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں، ہاں کوئی گاؤں بالکل ہی چھوٹا ہے، کہ جہاں ضروریات زندگی کی اکثر چیزیں دست یاب نہیں ہیں، وہاں احتیاط الظہر کا حکم دیتے ہیں؛ اگر یہ وضاحت پیش نظر رہے، تو آئندہ صفحات کے بعض فتاویٰ سے پیدا ہونے والا خلجان ان شاء اللہ رفع ہوجائے گا۔

یہ بھی واضح رہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ جمعہ فی القریٰ کے قیام کے سلسلے میں توسع والے قول کو اختیار کرتے نظر آتے ہیں، اکابر علماء میں مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں، جگہ جگہ اپنے فتاویٰ میں ان کی رائے کو نقل بھی فرماتے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض علاقوں میں بہت سے افراد- جو حقیقت میں بدعملی کا شکار ہیں- قیام جمعہ کی وجہ سے ہی دین سے اپنی وابستگی محسوس کرتے ہیں، اس دن غسل کرتے ہیں، ذکر واذکار کا اہتمام کرتے ہیں اور اپنے مسلمان ہونے کو محسوس کرتے ہیں اور دھیرے دھیرے پابند شرع ہوجاتے ہیں؛ اس لیے جن گاؤں میں جمعہ قائم وجاری ہے، اسے بند نہ کیا جائے۔ (دیکھیے عنوان: رویدرا میں جمعہ)

یہی بات اکابر علماء میں حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور موجودہ دور کے ممتاز فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کے فتاویٰ میں بھی ملتی ہے۔

مجتبیٰ حسن قاسمی

خادم شعبۂ افتاء: دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الجمعة في القریٰ

[گاؤں میں جمعہ کا قیام]

[۱] چھوٹے گاؤں میں قدیم زمانے سے جمعہ پڑھا جارہا ہو تو؟

۱۰۲۳- سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ:

ایک گاؤں میں جمعہ شرعی اعتبار سے صحیح نہیں ہوتا ہے؛ لیکن لوگ پرانے زمانہ سے جمعہ ادا کرتے چلے آرہے ہیں، اور امام صاحب نفل نماز کی نیت کرتے ہیں، تو مقتدیوں کی نماز ہوگی یا نہیں؟ بعض لوگ جمعہ کے بجائے ظہر پڑھتے ہیں، تو ان میں سے اگر کسی کو نماز کی ذمے داری سونپی جائے اور وہ نماز جمعہ پڑھائے، تو نماز ہوگی یا نہیں؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

مذہب حنفی میں چھوٹے گاؤں میں جمعہ پڑھنا جائز نہیں، جمعہ پڑھنے سے ظہر کا ذمہ ادا نہ ہوگا، جو لوگ ظہر پڑھتے ہیں، وہ صحیح راہ پر ہیں۔[۱]

امام صاحب کی ذمہ داری یہ ہے کہ صحیح مسائل لوگوں کو حکمت کے ساتھ سمجھا کر انہیں جمعہ نہ پڑھنے کی تاکید

---

(۱) (ويشترط لصحتها) سبعة أشياء:

الأول: (المصر، وهو ما لا يسع أكبر مساجده أهله المكلفين بها) وعليه فتوى أكثر الفقهاء، مجتبى؛ لظهور التواني في الأحكام.ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله وعليه فتوى أكثر الفقهاء إلخ) وقال أبو شجاع: هذا أحسن ما قيل فيه. وفي الولوالجية وهو صحيح بحر، وعليه مشى في الوقاية ومتن المختار وشرحه وقدمه في متن الدرر على القول الآخر وظاهره ترجيحه وأيده صدر الشريعة بقوله لظهور التواني في أحكام الشرع سيما في إقامة الحدود في الأمصار. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۳۷، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت)

کریں، قرآن مجید میں ہے: ﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾[۲] اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے نصیحت کر کے دعوت دیجیے، اور (اگر بحث کی نوبت آئے تو) ان سے بحث بھی ایسے طریقے سے کریں، جو بہترین ہو؛ لیکن اگر لوگ ماننے کے لیے تیار نہ ہوں، تو جمعہ ہی کی نیت سے جمعہ پڑھائیں، امام کی ذمہ داری ادا ہو جائے گی۔[۳] لیکن جمعہ بند

---

[۲] ۱۶-النحل:۱۲۵.

(۳) گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھنا احناف کے نزدیک درست نہیں ہے، جواز جمعہ کے لیے 'مصر' شرط ہے، ان کا استدلال "لا جمعة ولا تشريق الا في مصر" (مصنف عبد الرزاق (م:۲۱۱ھ): ۳/ ۱۶۷، حدیث نمبر: ۵۱۷۵، و۵۱۷۷، باب القرى الصغار، محقق: حبیب الرحمن اعظمی، ط: مجلس علمی-ڈابھیل) سے ہے، کہ جمعہ اور تشریق صرف شہر والوں پر ہے۔ پھر "مصر" کی مختلف تعریف کی گئی ہے، اور تصحیح میں خاصہ اختلاف ہے، جیسا کہ حاشیہ نمبر (۱) اور اگلے سوال میں مذکور ہے، نیز اس روایت میں "لا" صحت کی نفی کے لیے بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ احناف کا مسلک ہے، اور نفی وجوب کا بھی احتمال رکھتا ہے، اس دوسرے احتمال کو یوں بھی تقویت حاصل ہے کہ متعدد روایت سے "جمعہ فی القریٰ" کی اجازت معلوم ہوتی ہے، مثلاً:

① عن عبد الرحمن بن كعب بن مالك، وكان قائد أبيه بعد ما ذهب بصره، عن أبيه كعب بن مالك، أنه كان إذا سمع النداء يوم الجمعة ترحم لأسعد بن زرارة، فقلت له: إذا سمعت النداء ترحمت لأسعد بن زرارة، قال: "لأنه أول من جمع بنا في هزم النبيت من حرة بني بياضة في نقيع، يقال له: نقيع الخضمات"، قلت: كم أنتم يومئذ، قال: أربعون. (سنن أبي داود: ۱/ ۱۵۳، رقم الحديث: ۱۰۶۹، كتاب الصلاة، باب الجمعة في القرى، ط: البدر-ديوبند)

② عن ابن عباس: أنه قال: إن أول جمعة جمعت بعد جمعة في مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم، في مسجد عبد القيس بجواثى من البحرين. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲۲، رقم الحديث: ۸۹۲، كتاب الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن، ط: رشيدية-ديوبند)

③ وروى البيهقي في "المعرفة" عن مغازي ابن إسحاق وموسى بن عقبة: أن النبي -صلى الله عليه وسلم- حين ركب من بني عمرو بن عوف في هجرته إلى المدينة، مر على بني سالم وهي قرية بين قباء والمدينة، فأدركته الجمعة فصلى فيهم الجمعة، وكانت أول جمعة صلاها حين قدم۔ــــــ ووصله ابن سعد من طريق الواقدي بأسانيد له، وفيه: أنهم كانوا حينئذ مائة رجل. (التمييز في تلخيص تخريج أحاديث شرح الوجيز المشهور بـ "التلخيص الحبير"-ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲ھ): ۳/ ۹۹۳، رقم: ۱۹۰۳، كتاب الجمعة، ت: د. محمد الثاني بن عمر بن موسى، ط: دار أضواء السلف)

نیز جن روایات سے احناف نے استدلال کیا ہے، سند کے اعتبار سے بھی اس پر کلام کیا گیا ہے، مثلاً: "لا جمعة ولا تشريق الا في مصر جامع" کو زیلعیؒ نے "موقوف على علي" قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: قلت: غريب مرفوعا، وإنما وجدناه موقوفا على علي. (نصب الراية لأحاديث الهداية-جمال الدين الزيلعي (م: ۷۶۲ھ): ۲/ ۱۹۵، باب صلاة الجمعة، ت: محمد عوامة، ط: مؤسسة الريان للطباعة والنشر-بيروت/ دار القبلة للثقافة الإسلامية-جدة)

احناف کا استدلال اس روایت سے بھی ہے: "الجمعة على من آواه الليل إلى أهله". (ترمذی، باب ما جاء من کم تؤتی=

کرانے کے سلسلہ میں جھگڑا کرنے کی اجازت نہیں ہے، لڑائی جھگڑا کرنا حرام ہے، نفل کی نیت سے جمعہ کی نماز پڑھانا اور بعد میں اپنے طور پر ظہر پڑھنا کسی طرح جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس طرح مقتدی کو دھوکہ دینا اور ان کی نماز کو فاسد کرنا لازم آئے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الجمعہ، حدیث نمبر: ۵۰۲) لیکن محدثین نے اسے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ [قال الحافظ (في التلخيص الحبير: ۳/ ۹۹۲، رقم الحديث: ۱۹۰۲): ضعفه أحمد و الترمذي. و له شاهد من حديث أبي قلابة مرسل. رواه البيهقي]

(ضروری نوٹ: ان تفصیلات کے ذکر کرنے کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ اس سلسلے میں احناف کے دلائل کمزور ہیں، احناف کے دلیل کی قوت دیکھنا ہو تو اوثق العری فی تحقیق الجمعہ فی القریٰ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کے فتاویٰ دیکھیں، نیز علامہ نیمویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کی بھی اس سلسلے میں مفصل تحریر موجود ہے۔ ضعف دلیل کی وجہ سے یہاں مذہب غیر پر فتویٰ نہیں ہے؛ بل کہ ایک خاص مصلحت متقتضی ہے کہ جہاں جمعہ قائم ہے، اسے نہ روکا جائے، اکابر میں مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کی تحریر میں اس کی جانب اشارہ موجود ہے۔)

اس لیے اگر کسی گاؤں میں جمعہ کی نماز ہوتی چلی آرہی ہو، اور اس کے روکنے سے فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو، تو جمعہ کی نماز ادا کرلینی چاہیے، حضرت مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

''حنفیہ کے اصول کے بہ موجب دیہات میں اقامت جمعہ درست نہیں، مصر ہونا جواز جمعہ کے لیے شرط ہے، لیکن مصر کی تعریفیں مختلف اور متعدد منقول ہیں، اس مسئلے میں زیادہ تحقیق کا موقع نہیں ہے، اور اس زمانے کے مصالح عامہ مبہمہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ اقامت جمعہ کو نہ روکا جائے، تو بہتر ہے، بالخصوص ایسی حالت میں کہ مدت دراز سے جمعہ قائم ہو، اس کو روکنا بہت سے مفاسد عظیمہ کا موجب ہوتا ہے۔ (کفایت المفتی: ۳/ ۲۴۲، دار الاشاعت، کراچی)

ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب رقم طراز ہیں: ''لا جمعة ولا تشريق...... الخ'' حنفیہ نے اس میں 'لا' سے نفی صحت مراد لی ہے، مگر محتمل ہے کہ نفی وجوب مراد ہو۔ (حوالہ سابق)

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں: فقہاء احناف کے نزدیک جمعہ و عیدین نہیں پڑھی جائے گی، بل کہ جمعہ کے بجائے ظہر کی نماز ادا کی جائے گی، اس لیے کہ حضرت علی سے مروی ہے کہ: ''لا جمعة ولا تشريق الا في مصر جامع'' جمعہ وعیدین شہر ہی میں پڑھی جائیں، لیکن شہر (مصر) سے کیا مراد ہے؟ یہ حدیث میں متعین نہیں ہے، فقہاء نے اپنے ذوق ومزاج اور اپنے عہد کے عرف کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصر کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں خاصا اختلاف ہے، فقہاء کے نزدیک شہر کا جو مفہوم راجح ہے، وہ یہ ہے کہ اگر اس جگہ کے تمام لوگ وہاں کی بڑی مسجد میں جمع ہو جائیں تو مسجد نا کافی ہو جائے، یہ شہر کا ایسا مفہوم ہے، کہ اس کے اعتبار سے شہر کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، اور ضرورت اس وقت یہی ہے کہ شہر کا ایسا مفہوم متعین ہو کہ زیادہ سے زیادہ مقامات پر نماز جمعہ کی گنجائش نکل آئے، کیوں کہ جمعہ نہ صرف ایک عبادت ہے؛ بل کہ تذکیر و موعظت کا بھی بہترین موقع ہے اور بعض علاقوں میں جمعہ ہی کی وجہ سے اسلام سے اپنی وابستگی محسوس کرتے ہیں۔ (کتاب الفتاویٰ: ۳/ ۳۶-۳۷، نماز کے متعلق سوالات، دیہات میں جمعہ، ط: نعیمیہ- دیوبند)

[۲] دیہات میں جمعہ جائز نہ ہونے کے دلائل

۱۰۲۴- سوال: اقامت جمعہ میں جہاں اور شرطیں ہیں، وہاں دو خاص شرطیں: ''وجود سلطان'' اور ''مصر جامع'' کی ہے، شرط سلطان تو ہمارے ملک میں نہیں ہے، اسی بناء پر تمام مفتیان کرام نے اس کو فتویٰ میں ملحوظ نہیں رکھا ہے، رہی ''مصر جامع'' کی شرط، تو اس میں بہت اجمال ہے اور اس کی تفصیل میں متعدد اقوال ہیں، من جملہ یہ ہیں:

۱- مصر سے مراد وہ جگہ ہے، جہاں حدود و احکام کا نفاذ ہو۔ —— ۲- اتنا بڑا گاؤں ہو کہ پورا قریہ اس کی مسجد میں نہ سما سکے۔ —— ۳- جہاں دس ہزار آدمی رہتے ہوں۔ —— ۴- جہاں ہر حرفت (پیشہ) والا رہتا ہو۔ —— ۵- جہاں امیر موجود ہو۔ —— ۶- جہاں ۵۰۰۰ / آزاد آدمی رہتے ہوں۔ —— ۷- جس میں موت سے کمی اور ولادت سے زیادتی نہ معلوم ہوتی ہو۔ —— ۸- جہاں کے باشندے مشکل سے شمار کیے جا سکیں۔ —— ۹- جہاں دشمن سے مقابلہ کے وقت کسی سے مدد نہ لینی پڑے۔ —— ۱۰- جس بستی میں ۱۰۰ / آدمی مقیم ہوں، (۱) وغیرہ وغیرہ.....

---

(۱) أما المصر الجامع فقد اختلفت الأقاويل في تحديده، ذكر الكرخي أن المصر الجامع ما أقيمت فيه الحدود ونفذت فيه الأحكام، وعن أبي يوسف روايات ذكر في الإملاء كل مصر فيه منبر وقاض ينفذ الأحكام ويقيم الحدود فهو مصر جامع تجب على أهله الجمعة، وفي رواية قال: إذا اجتمع في قرية من لا يسعهم مسجد واحد بنى لهم الإمام جامعا ونصب لهم من يصلي بهم الجمعة، وفي رواية: لو كان في القرية عشرة آلاف أو أكثر أمرتهم بإقامة الجمعة فيها، وقال بعض أصحابنا: المصر الجامع ما يعيش فيه كل محترف بحرفته من سنة إلى سنة من غير أن يحتاج إلى الانتقال إلى حرفة أخرى، وعن أبي عبد الله البلخي أنه قال: أحسن ما قيل فيه إذا كانوا بحال لو اجتمعوا في أكبر مساجدهم لم يسعهم ذلك حتى احتاجوا إلى بناء مسجد الجمعة فهذا مصر تقام فيه الجمعة، وقال سفيان الثوري: المصر الجامع ما يعده الناس مصرا عند ذكر الأمصار المطلقة، وسئل أبو القاسم الصفار عن حد المصر الذي تجوز فيه الجمعة، فقال: أن تكون لهم منعة لو جاءهم عدو قدروا على دفعه فحينئذ جاز أن يمصر وتمصره أن ينصب فيه حاكم عدل يجري فيه حكما من الأحكام، وهو أن يتقدم إليه خصمان فيحكم بينهما.

وروي عن أبي حنيفة أنه بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على إنصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه أو علم غيره والناس يرجعون إليه في الحوادث، وهو الأصح. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۵۹-۲۶۰، كتاب الصلاة، فصل بيان شرائط الجمعة، ط: دار الكتب العلمية)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: النتف في الفتاوى - أبو الحسن علي بن الحسين بن محمد السُّغدي، حنفي (م: ۴۶۱ھ): =

اب آپ ہی بتائیں کہ ہم مصر کی صحیح تعریف کیا کریں۔

آیات قرآنی جمعہ کے بارے میں غیر مقید ہیں، وہاں شرط کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اور وہ احادیث جو آیت کریمہ کی تفسیر ہیں، ان میں بعض افراد (مسافر، عورت اور بچے) کا استثناء کیا گیا ہے؛ لیکن دیہات کا استثناء نہیں کیا گیا ہے، چناں چہ احادیث میں ہے: ۱-الجمعة حق واجب... الحدیث (أبو دائود) ۲-من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فعلیه الجمعة... الحدیث (مشکوۃ) ۳-الجمعة واجبة علی کل قریة... الحدیث (دارقطنی)۔ ۴-إن اول جمعة جمعت بعد جمعة في مسجد رسول اللہ -صلی اللہ علیه وسلم- في مسجد عبدالقیس. (بخاری، ابوداؤد)

اور بہت سے آثار صحابہ میں بھی ''مصر جامع'' کی شرط نہیں ہے، مثلاً: ۱-اثر حضرت عمرؓ (فتح الباری :۱/ ۴۸۶) ۲-اثر ابوذرؓ (کبیری شرح منیۃ: ۵۱۲) ۳-اثر حضرت عبداللہ بن عمرؓ (فتح الباری: ۱/ ۴۸۶) ان کے علاوہ بھی اثار صحابہ اس باب میں ہیں، جن میں مصر جامع کی شرط نہیں ہے، سوائے حضرت علیؓ کے، کہ وہ فرماتے ہیں: ''لا جمعة ولا تشریق الا في مصر جامع''؛ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اثر علیؓ میں لا نفی کمال ہونے کا بھی تو احتمال ہے اور نفی کمال سے مطلق نفی لازم نہیں آتی۔

پھر کیا وجہ ہے کہ آیت کریمہ کے مطلق ہونے کے باوجود، احادیث میں عدم صراحت مصر کے باوجود اور آثار صحابہ کے معارض ہونے کے باوجود اس اثر علیؓ کو ضروری سمجھا جاتا ہے اور چھوٹے دیہات میں جمعہ کو ہمارے مفتیان کرام منع کرتے ہیں۔ اگر ''مصر جامع'' کی شرط اتنی ہی ضروری تھی، تو شارع علیہ السلام نے بعض افراد کے استثناء کے ساتھ اس کو بھی کیوں واضح نہیں فرمایا اور اس کو مستثنیٰ میں شامل کیوں نہیں کرلیا؟ اس کی عدم شمولیت اور بہت سے آثار صحابہؓ کے معارض ہونے سے تو یہ گمان ہوتا ہے کہ اثر حضرت علی رضی اللہ عنہ میں ''لا'' نفی کمال سمجھ کر دیگر احادیث وآثار میں تطبیق دی جائے، اور اقامت جمعہ شہر و دیہات ہر جگہ عام ہو، واللہ اعلم بالصواب، اس سوال کا جواب مفصل عنایت فرمائیں۔

=۱/ ۹۱، مطلب صلاة الجمعة، تعریف المصر، ت: صلاح الدین الناهي، ط: دار الفرقان / مؤسسة الرسالة - عمان الأردن / بیروت ☆المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۲/ ۲۳، باب صلاة الجمعة، ط: دار المعرفة - بیروت☆الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر المرغيناني (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۸۲، باب صلاة الجمعة، ت: طلال یوسف، ط: دار إحیاء التراث العربي - بیروت)

الجواب حامداً ومصلیاً:

فقہ یعنی مسائل شرعیہ فرعیہ کے اثبات کا مبنی قرآن، احادیث، اجماع امت اور قیاس شرعی ہے۔

جمعہ کی فرضیت کے متعلق قرآن میں ہے: {يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ.}[1] فقہاء نے غور کیا کہ اس فریضہ جمعہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے کہاں ادا فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہاں ادا کرنے کا حکم فرمایا، اور کیا قریہ صغیرہ اور جنگل میں جمعہ جائز ہے؟ تو اس سلسلہ میں بنیادی احادیث ان کے سامنے یہ تھی: ۱- ما روی عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع.[2]

۲- وعن علي رضي الله عنه: لا جمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا في مصر جامع. (بدائع)[3]

۳- عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: "أول جمعة جمعت، بعد جمعة جمعت في مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم، في مسجد عبد القيس بجواثى، يعني قرية من البحرين.[4]

اور بدائع الصنائع میں ہے: وكذا الصحابة رضي الله عنهم فتحوا البلاد وما نصبوا المنابر إلا في الأمصار فكان ذلك إجماعاً منهم على أن المصر شرط. (بدائع)[5]

اگر جمعہ کا حکم مطلق ہوتا، تو دیہات وجنگل میں بھی جمعہ ادا کرنے کا حکم ہوتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم وہاں جمعہ ادا کرنے کا حکم فرماتے؛ لیکن ایسا نہیں ہے، معلوم ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مقید فرمایا ہے، نیز صحابہ کے اقوال غیر مدرک بالقیاس کو حدیث کا حکم دیا گیا ہے اور صحابہ کی روایات (آثار)

---

(۱) ۶۲- الجمعۃ: ۹۔

(۲-۳) بدائع الصنائع: ۱/ ۲۵۹، کتاب الصلاة، شرائط الجمعة، ط: دار الكتب العلمية.

"لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع" کو زیلعیؒ نے "موقوف علی علی" قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: قلت: غريب مرفوعاً، وإنما وجدناه موقوفاً على علي. (نصب الراية لأحاديث الهداية- جمال الدين الزيلعي (م: ۷۶۲ھ): ۲/ ۱۹۵، باب صلاة الجمعة، ت: محمد عوامة، ط: مؤسسة الريان للطباعة والنشر - بيروت/ دار القبلة للثقافة الإسلامية- جدة ــــــ نیز بیہقیؒ نے سنن کبری (۳/ ۱۷۹) میں لکھا ہے: "إنما يروى عن علي موقوفاً، فأما النبي صلى الله عليه وسلم فإنه لا يروى عنه في ذلك شيء". حاشیہ بدائع: ۱/ ۵۸۴، زکریا- دیوبند)

(۴) صحيح البخاري: ۲/ ۶۲۷، رقم الحديث: ۴۳۷۱، كتاب المغازي، باب وفد عبد القيس، وانظر: رقم: ۸۹۲، باب الجمعة في القرى والمدن، ط: البدر- ديوبند.

[۵] بدائع الصنائع: ۱/ ۲۵۹، کتاب الصلاة، فصل بيان شرائط الجمعة، ط: دار الكتب العلمية)

سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ شہر ہی میں صحیح ہوتا ہے۔

اور جن روایات میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواثی (یا جوثاء) قریہ بحرین میں مدینہ کے بعد جمعہ ادا فرمایا تھا، تو قریہ کا اطلاق قرآن شریف میں شہر پر بھی آیا ہے: ﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾[۶] پس قریتین کا اطلاق یہاں مکہ اور طائف پر ہوا ہے، جو شہر اور قلعہ بھی تھا (لہٰذا قریہ کا لفظ لے کر دیہات میں جمعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا)۔

''صحابہ کرامؓ منبروں کو صرف شہروں ہی میں قائم فرماتے تھے'' یہ بھی اس پر دال ہے کہ قریہ صغیرہ میں جمعہ صحیح نہیں، جمعہ کے لیے شہر یا قصبہ کا ہونا ضروری ہے، اسی بنا پر مسلک احناف میں اس کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

نیز اس لیے بھی کہ ظہر کی فرضیت نص قطعی سے ثابت ہے، اس کو ترک نہیں کیا جائے گا مگر نص قطعی ہی سے اور شہر میں ظہر ترک کرکے جمعہ کی ادائیگی کے متعلق نص وارد ہوئی ہے، دیہات کے متعلق نہیں ہے؛ لہٰذا قریہ و دیہات میں ظہر ترک کرکے جمعہ ادا نہیں کیا جائے گا۔ اور آپ نے یہ تحریر کیا ہے کہ بعض صحابہ سے مصر کی قید ثابت نہیں ہے، مگر غور فرمائیں کہ عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عمل صحابہؓ کیا ہے؟ صاحب بدائع کے الفاظ پر غور فرمائیں کہ: فكان ذلك إجماعاً منهم على أن المصر شرط. (بدائع)[۷]

اور آپ کی بیان کردہ روایات: ۱-الجمعة حق واجب... اور ۲-من كان يومن بالله واليوم الآخر فعليه الجمعة... یہ روایات مطلق ہیں، ان کو مقید پر محمول کریں گے، اور ۳-الجمعة واجبة على كل قرية... الحدیث اور ۴-فی مسجد عبد القيس... والی روایات میں قریہ سے مراد شہر ہے اور قریہ ''بحرین'' شہر ہی تھا (جیسا کہ محقق ہے) لہٰذا امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمعہ شہر میں ادا کرنا ہوگا، دیہات میں جائز نہیں۔ پس مذکورہ تفصیل کی بنا پر حضرت علیؓ کے اثر میں ''لا'' نفی کمال کا نہیں ہے، بلکہ نفی صحت کا ہے۔

علاوہ ازیں شعار کو ہر مکان میں ادا کرنے سے شعار کی عظمت باقی نہیں رہتی، کیوں کہ کچھ شعار ایسے ہیں، جو مکان مخصوص، وقت مخصوص اور عمر مخصوص ہی میں ادا کیے جاتے ہیں؛ لہٰذا جمعہ کو- جو شعار اسلام ہے- مصر ہی میں ادا کرنے سے اس کی عظمت باقی رہے گی۔ جس کا اندازہ بالفعل آپ لگا سکتے ہیں؛ بل کہ اس شعار کا تقاضہ یہ

[۶] ۴۳-الزخرف: ۳۱۔

[۷] بدائع الصنائع: ۱/ ۲۵۹، کتاب الصلاة، فصل بیان شرائط الجمعة، ط: دار الكتب العلمية.

ہے کہ دیہات کے لوگ شہر ہی جا کر اجتماعیت کا ثبوت دیں: ولأن الجمعة من أعظم الشعائر فتختص بمكان اظهار الشعائر وهو المصر. (بدائع: ۱/۲۵۹)[۸]

اور مصر کی تعریف میں کئی اقوال ہیں؛ لیکن راجح قول عرف ومحاورے کا ہے۔ (یعنی عرف میں جو شہر شمار ہوتا ہو، وہ شہر ہے) جیسا کہ صاحب بدائع نے تمام اقوال ذکر کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے۔ (بدائع)[۹]

اور صحت جمعہ کے لیے قیود صرف امام اعظم ابوحنیفہؒ کے یہاں نہیں ہیں؛ بل کہ دیگر ائمہ نے بھی صحت جمعہ کے لیے قیود مقرر کی ہیں، چنانچہ عمدۃ القاری میں ہے: واختلف العلماء في الموضع الذي تقام فيه الجمعة، فقال مالك: كل قرية فيها مسجد أو سوق فالجمعة واجبة على أهلها، ولا يجب على أهل العمود وإن كثروا؛ لأنهم في حكم المسافرين. وقال الشافعي وأحمد: كل قرية فيها أربعون رجلا أحرارا بالغين عقلاء مقيمين بها لا يظعنون عنها صيفا ولا شتاء إلا ظعن حاجة، فالجمعة واجبة عليهم، وسواء كان البناء من حجر أو خشب أو طين أو قصب أو غيرها، بشرط أن تكون الأبنية مجتمعة، فإن كانت متفرقة لم تصح، ... ومذهب أبي حنيفة، رضي الله تعالى عنه: لا تصح الجمعة إلا في مصر جامع أو في مصلى المصر، ولا تجوز في القرى، وتجوز في منى إذا كان الأمير أمير الحاج، أو كان الخليفة مسافرا. وقال محمد: لا جمعة بمنى ولا تصح بعرفات في قولهم جميعا. وقال أبو بكر الرازي في كتابه (الأحكام): اتفق فقهاء الأمصار على أن الجمعة مخصوصة بموضع لا يجوز فعلها في غيره؛ لأنهم مجتمعون على أنها لا تجوز في البوادي، ومناهل الأعراب، وذكر ابن المنذر عن ابن عمر أنه كان يرى على أهل المناهل والمياه أنهم يجمعون.(۱۰)

اور ماشاء اللہ آپ تو عالم ہیں، امید ہے سب امور حل ہو گئے ہوں گے؛ لیکن جہالت کا ماحول ہے، ہر ہر قریہ میں گروہ بندی کا دور دورہ ہے؛ اس لیے عوام کو مسئلہ سمجھا دیں، اس کے باوجود جمعہ پر اصرار کریں، تو جمعہ پڑھا دیں اور اعادۂ ظہر کی تلقین کریں، تاکہ ظہر ذمہ میں واجب نہ رہے، اور فتنہ وفساد پھیلے ایسی کوئی سبیل اختیار نہ کریں، اس کا خاص خیال رکھیں۔(۱۱) فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

[۸] حوالہ سابق: ۱/۲۵۹۔ [۹] حوالہ سابق: ۱/۲۶۰۔

(۱۰) عمدة القاري شرح صحيح البخاري-بدر الدين العيني (م: ۸۵۵ھ): ۶/۱۸۷، كتاب الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت.

(۱۱) تفصیل کے لیے ''چھوٹے گاؤں میں قدیم زمانے سے جمعہ پڑھا جا رہا ہو تو؟'' کا حاشیہ نمبر ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

[۳] قصبہ میں نماز جمعہ اور دیہات کے باشندے کی اس میں شرکت

۱۰۲۵- سوال: ساتیجا گاؤں میں نئی مسجد بناتے وقت اس میں جمعہ وعیدین پڑھنے کی نیت کی، تو اس میں جمعہ وعیدین کی ادائیگی صحیح ہوگی یا نہیں؟ واضح رہے کہ مذکور گاؤں ''ساتیجا'' ایک قصبہ ہے، ضروریات زندگی کی ساری چیزیں وہاں دست یاب ہوجاتی ہیں، نیز اس گاؤں کے اطراف میں دوسرے تین گاؤں بھی ہیں، جو بالکل قریب قریب ہیں، امید ہے کہ ان دیہاتوں کے باشندے بھی جمعہ پڑھنے آویں گے؟

الجواب حامدا ومصليا:

''ساتیجا'' اگر قصبہ ہے، جیسا کہ سوال میں مذکور ہے، تو وہاں جمعہ اور عیدین جائز ہے اور اس نیت سے مسجد بنانے میں ثواب ہے، اطراف کے چھوٹے دیہات والوں پر جمعہ کی نماز فرض نہیں؛ لیکن اگر وہ لوگ ''ساتیجا'' آکر جمعہ کی نماز ادا کرلیں، تو نماز درست ہوجائے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] چار ہزار کی آبادی میں نماز جمعہ کا حکم

۱۰۲۶- سوال: ہمارے یہاں تقریباً تین سے چار ہزار تک کی آبادی ہے، تو ہمارے یہاں

(۱) تقع فرضا في القصبات والقرى الكبيرة التي فيها أسواق. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۳۸/۲، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت)

القروي إذا دخل المصر يوم الجمعة إن نوى أن يمكث ثمة يوم الجمعة يلزمه الجمعة، وإن نوى أن يخرج في ذلك اليوم قبل الوقت أو بعده لا جمعة عليه؛ لأنه في الأول صار كواحد من أهل المصر في ذلك اليوم وفي الثاني لم يصر. (درر الحكام شرح غرر الأحكام - ملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۱۴۱/۱، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار إحياء الكتب العربية☆المحيط البرهاني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۸۷/۲، كتاب الصلاة، الفصل الخامس والعشرون في صلاة الجمعة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۱۵۱/۲، باب الجمعة، ط: دار الكتاب الإسلامي☆الدر المختار مع رد المحتار: ۱۶۲/۲، باب الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت)

القروي إذا دخل المصر ونوى أن يمكث يوم الجمعة لزمته الجمعة؛ لأنه صار كواحد من أهل المصر في حق هذا اليوم وإن نوى أن يخرج في يومه ذلك قبل دخول الوقت أو بعد الدخول لا جمعة عليه ولو صلى مع ذلك كان مأجورا، كذا في فتاوى قاضي خان والتجنيس والمحيط. (الفتاوى الهندية: ۱۴۵/۱، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: دار الفكر☆البحر الرائق: ۲۴۷/۲، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: زكريا - ديوبند)

جمعہ کی نماز جائز ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور جواز جمعہ کے لیے کتنی آبادی کا ہونا ضروری ہے؟ اور اس کے لیے کیا کیا شرائط ہیں؟ تفصیلی جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً

شہر، قصبہ یا بڑا گاؤں، جہاں ضرورت کی اشیاء مل جاتی ہوں، وہاں جمعہ پڑھنا واجب ہے۔ جمعہ کے جواز کے لیے مصر شرط ہے، آبادی کی کوئی خاص تعداد متعین نہیں ہے، اس سلسلے میں متعدد باتیں کہی گئی ہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] چھوٹے دیہات والوں کا جمعہ کے دن ظہر پڑھنا

۱۰۲۷- سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین ذیل کے مسئلہ میں کہ:

ایک چھوٹا سا دیہات ہے، جہاں جمعہ کی نماز جائز نہیں؛ لیکن وہاں کے باشندے جمعہ پڑھتے ہیں، وہاں دار العلوم بھی ہے، سوال یہ ہے کہ اگر دار العلوم کے اساتذہ وطلبا اپنی تمام نمازیں ادارے میں ادا کرتے ہوں، جمعہ کے دن ظہر کی نماز ادا کرتے ہوں، اور مسلسل کئی جمعہ تک وہ لوگ قریب کے شہر یا قصبہ میں نہ جائیں، تو یہ حضرات درج ذیل احادیث کے مصداق ہوں گے یا نہیں؟

عن أبي الجعد الضمري، وكانت له صحبة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من ترك ثلاث جمع تهاونا بها، طبع الله على قلبه. (رواه أبو داؤد)[2]

ترجمہ: حضرت ابو الجعد ضمری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

---

(۱) قد تقدم التخريج عن: رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۵، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، كتاب الصلاة، مكتبه زكريا- ديوبند)
مسئلے کی مزید تفصیل وتخریج کے لیے "چھوٹے گاؤں میں قدیم زمانے سے جمعہ پڑھا جارہا ہو تو؟" کا حاشیہ نمبر ۳ اور "دیہات میں جمعہ جائز نہ ہونے کے دلائل" کے تمام حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

[۲] سنن أبي داود: ۱/ ۱۵۱، رقم الحديث: ۱۰۵۲، كتاب الصلاة، باب التشديد في ترك الجمعة، ط: البدر- ديوبند ☆ سنن الترمذي: ۱/ ۱۱۲، رقم الحديث: ۵۰۰، أبواب الجمعة، باب ما جاء في ترك الجمعة من غير عذر، ط: البدر- ديوبند ☆ المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳هـ): ۳/ ۸۸، رقم الحديث: ۱۳۶۹، كتاب الجمعة، باب التشديد في التخلف عن الجمعة، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية- حلب.

جو شخص محض سستی اور کاہلی کی بنا پر تین جمعہ چھوڑ دے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے دِل پر مہر لگا دیں گے۔

عن ابن عباس رضي الله عنهما، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من ترك الجمعة من غير ضرورة كتب منافقا في كتاب لا يمحى ولا يبدل، وفي بعض الحديث: ثلاثا. (رواه الشافعي)[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بغیر کسی عذر کے نمازِ جمعہ چھوڑ دیتا ہے، وہ اُس کتاب میں منافق لکھ دیا جاتا ہے جو نہ کبھی مٹائی جاتی ہے اور نہ کبھی تبدیل ہوتی ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جو شخص تین جمعہ چھوڑ دے۔

الجواب حامداً ومصلیا:

چھوٹے دیہات جہاں جمعہ واجب نہ ہو؛ لیکن پہلے سے پڑھا جا رہا ہو، تو جائز ہے، جو لوگ جمعہ پڑھ لیں گے، اُن کا جمعہ درست ہے، اور جو لوگ اُسے ناجائز سمجھ کر ظہر پڑھتے ہیں، وہ بھی گنہگار نہیں ہیں۔ (کفایت المفتی: ۳/۱۸۹)[۲]

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ فرض ہوتے ہوئے اگر کوئی اُسے ترک کر دیتا ہے، تو وہ مستحق وعید ہے، اگر سستی کی بنا پر چھوڑ دیتا ہے تو نفاق کی مہر لگے گی، نمازِ جمعہ کے استخفاف یا اُس کی فرضیت کے انکار کی بنا پر ترک کرتا ہے، تو مہرِ کفر لگے گی، یعنی قلب مسخ ہو جائے گا۔ (کوکب)[۳]

---

[۱] مسند الشافعي - الإمام أبو عبد الله محمد بن إدريس بن العباس بن عثمان بن شافع بن عبد المطلب بن عبد مناف المطلبي القرشي المكي الشافعي (م: ۲۰۴هـ): ۱/۷۰، ومن كتاب ايجاب الجمعة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت (رقم الحديث: ۹۳۸، على ترتيب السندي) ☆ معرفة السنن والآثار - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۴/۳۱۷، رقم الحديث: ۶۶۶۵، كتاب الجمعة، التشديد في ترك الجمعة، ت: عبد المعطي أمين قلعجي، ط: جامعة الدراسات الإسلامية (كراتشي - باكستان)، دار قتيبة (دمشق - بيروت)، وغيرهما.

[۲] کفایت المفتی: ۳/۲۰۲، ۲۰۷، ۲۰۸، کتاب الصلاۃ، فصل دوم، شرائط جمعہ، ط: کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، سنٹرل بک ڈپو، دہلی۔ ☆ مسئلے کی مزید تفصیل وتخریج کے لیے ''چھوٹے گاؤں میں قدیم زمانے سے جمعہ پڑھا جا رہا ہو تو؟'' کا حاشیہ نمبر ۳ اور ''دیہات میں جمعہ جائز نہ ہونے کے دلائل'' کے تمام حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

[۳] اعلم أن ترك الجمعة إما أن يكون لتسهيل أمرها وعدم اهتمام بشانها فالطبع طبع نفاق، أعاذنا الله منها، وإما أن يكون لا لتسهيل أمر، بل لاهانة نفسه في ترك ما يجب عليه أداؤه، فالطبع طبع رين وغين، والحديث يشمل كليهما. (الكوكب الدري على جامع الترمذي: ۱/۱۹۸، كتاب الصلاة، أبواب الجمعة، قوله: باب ما جاء في ترك الجمعة من غير عذر، ط: المكتبة الأشرفية - ديوبند)

جو لوگ مدرسہ میں ظہر کی نماز پڑھیں اور مسلسل کئی جمعہ تک کہیں جمعہ پڑھنے کے لیے نہ جائیں تب بھی وہ لوگ مذکورہ وعید کے مستحق نہیں ہیں، اس لیے کہ جمعہ اُن پر واجب ہی نہیں ہے، البتہ گاؤں اگر کسی شہر کی فناء میں داخل ہو، یا فناءِ شہر سے اس قدر متصل ہو کہ فناءِ شہر سے اذان کی آواز وہاں تک پہنچ جاتی ہے، یا زوال کے بعد پیدل جا کر جمعہ میں شرکت کر کے شام ہونے سے پہلے واپس گھر آ سکتے ہوں، تو ایسے گاؤں والوں پر بعض فقہاء کے نزدیک شہر میں جا کر جمعہ ادا کرنا ضروری ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ فناء اگر شہر سے باہر ہو، تو جمعہ کے لیے شہر میں جانا ضروری نہیں ہے، اگر جائے تو بہتر ہے۔ (شامی: ۲/ ۱۵۳)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] چار ہزار کی آبادی والے گاؤں میں جمعہ پڑھنا

۱۰۲۸- سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ھذا میں کہ ہماری بستی میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے، جس کی آبادی جملہ چار ہزار ہے، اس میں مسلمانوں کے دس مکان ہیں، جن کی آبادی کی تعداد ۶۰/ تک ہے، بستی میں بازار بھی لگتا ہے، دکانیں وغیرہ بھی ہیں، پنچایت بھی ہے، پوسٹ آفس ہے، دواخانہ ہے، مسجد بنی ہوئی نہیں ہے، صرف ایک جھونپڑا ہے، وہیں پانچ وقت کی نماز ہوتی ہے، وہیں جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے؛ لیکن بستی سے پانچ کلومیٹر ایک شہر یعنی قصبہ ہے، جہاں دو مسجدیں ہیں، ایسی حالت میں ہم بستی میں جمعہ ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

[۱] (وشرط لافتراضها) تسعة تختص بها (إقامة بمصر) وأما المنفصل عنه فإن كان يسمع النداء تجب عليه عند محمد وبه يفتى كذا في الملتقى، وقدمنا عن الولوالجية تقديره بفرسخ، ورجح في البحر اعتبار عوده لبيته بلا كلفة. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله يسمع النداء) أي من المنابر بأعلى صوت كما في القهستاني (قوله وقدمنا إلخ) فيه أن ما مر عن الولوالجية في حد الفناء الذي تصح إقامة الجمعة فيه، والكلام هنا في حد المكان الذي من كان فيه يلزمه الحضور إلى المصر ليصليها فيه، نعم في التتارخانية عن الذخيرة: أن من بينه وبين المصر فرسخ يلزمه حضور الجمعة، وهو المختار للفتوى (قوله ورجح في البحر إلخ) هو ما استحسنه في البدائع وصحح في مواهب الرحمن قول أبي يوسف بوجوبها على من كان داخل حد الإقامة أي الذي من فارقه يصير مسافرا وإذا وصل إليه يصير مقيما، وعلله في شرحه المسمى بالبرهان بأن وجوبها مختص بأهل المصر والخارج عن هذا الحد ليس أهله. اهـ. ــــــــ قلت: وهو ظاهر المتون. وفي المعراج أنه أصح ما قيل. وفي الخانية المقيم في موضع من أطراف المصر إن كان بينه وبين عمران المصر فرجة من مزارع لا جمعة عليه وإن بلغه النداء، وتقدير البعد بغلوة أو ميل ليس بشيء، هكذا رواه أبو جعفر عن الإمامين، وهو اختيار الحلواني، وفي التتارخانية ثم ظاهر رواية أصحابنا لا تجب إلا على من يسكن المصر أو ما يتصل به فلا تجب على أهل السواد ولو قريبا وهذا أصح ما قيل فيه اهـ وبه جزم في التجنيس. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۵۳، باب الجمعة، مطلب في شروط وجوب الجمعة، ط: دار الفكر)

اورعیدین کی نماز ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ (پچیس سال پہلے پولیس چوکی بھی تھی، اب نہیں ہے) بینوا،توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً

صورت مسئولہ میں- کہ آپ کے بستی کی آبادی چار ہزار ہے، ضروریات کی اکثر وبیشتر چیزیں مل جاتی ہیں، دواخانہ اور پوسٹ آفس ہے اور بازار بھی لگتا ہے- جمعہ کی نماز پڑھنا جائز ہے۔[۱] کوشش فرما کر جھونپڑے کی جگہ اینٹوں سے پختہ مسجد بنالیں۔[۲] آپ نے جھونپڑا پنج وقتہ نماز کے لیے بنایا ہے، اسی میں نماز ادا کر سکتے ہیں، نماز کے لیے پختہ مسجد کا ہونا ضروری نہیں ہے۔[۳] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (قوله شرط أدائها المصر) أي شرط صحتها أن تؤدى في مصر حتى لا تصح في قرية، ولا مفازة؛ لقول علي - رضي الله عنه - لا جمعة، ولا تشريق، ولا صلاة فطر، ولا أضحى إلا في مصر جامع أو في مدينة عظيمة. (البحر الرائق: ۲/ ۲۴۵، أبواب الصلاة، صلاة الجمعة، ط: دار الكتاب- ديوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: زكريا ديوبند)

مسئلے کی مزید تفصیل وتخریج کے لیے ''چھوٹے گاؤں میں قدیم زمانے سے جمعہ پڑھا جارہا ہو تو؟'' کا حاشیہ نمبر ۳، اور ''دیہات میں جمعہ جائز نہ ہونے کے دلائل'' کے تمام حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) عثمان بن عفان، يقول عند قول الناس فيه حين بنى مسجد الرسول صلى الله عليه وسلم: إنكم أكثرتم، وإني سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: " من بنى مسجدا - قال بكير: حسبت أنه قال: يبتغي به وجه الله - بنى الله له مثله في الجنة ". (صحيح البخاري: ۱/ ۶۴، رقم الحديث: ۴۵۰، كتاب الصلاة، باب من بنى مسجدا، ط: البدر- ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۰۱، رقم الحديث: ۲۴ - ۵۳۳، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب فضل بناء المساجد والحث عليها، ط: البدر - ديوبند)

فيه: أن التعاون في بنيان المسجد من أفضل الأعمال لأنه مما يجري للإنسان أجره بعد موته. (عمدة القاري - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۴/ ۲۰۹، باب التعاون في بناء المسجد، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(۳) المسجد: كل موضع يتعبد فيه.... عرفا: الموضع المبني للصلاة. (القاموس الفقهي لغة واصطلاحا- الدكتور سعدي أبو حبيب، ص: ۱۶۷، حرف السين، ط: دار الفكر. دمشق- سورية)

التسليم في المسجد أن تصلي فيه جماعة بإذنه وعن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - فيه روايتان في رواية الحسن عنه يشترط أداء الصلاة فيه بالجماعة بإذنه اثنان فصاعدا، كما قال محمد - رحمه الله تعالى - رواية الحسن، كذا في فتاوى قاضي خان ويشترط مع ذلك أن تكون الصلاة بأذان وإقامة جهرا لا سرا، حتى لو صلى جماعة بغير أذان وإقامة سرا لا جهرا لا يصير مسجدا عندهما، كذا في المحيط والكفاية._____ ولو جعل رجلا واحدا مؤذنا وإماما وأقام وصلى وحده صار مسجدا بالاتفاق، كذا في الكفاية وفتح القدير. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۴۵۵، كتاب الوقف، الباب الحادي عشر في المسجد وما يتعلق به، الفصل الأول فيما يصير به مسجدا وفي أحكامه وأحكام ما فيه، ط: دار الفكر☆رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۳۵۶، كتاب الوقف، مطلب في أحكام المسجد)

[۷] رویدرا میں جمعہ

۱۰۲۹-سوال: ہمارے گاؤں رویدرا میں پہلے جمعہ کی نماز پڑھی جاتی تھی، تقریباً ۱۹۸۵ء سے جمعہ کے بجائے ظہر کی نماز پڑھی جاتی ہے؛ لیکن یاد رہے کہ اسی گاؤں کی اسی مسجد میں عید کی نماز اب بھی پڑھی جاتی ہے، ادھر دونوں گاؤں (رویدرا اور کرمالی) کے متعدد افراد کو اپنے اپنے گاؤں میں رہ کر جمعہ پڑھنے کا شوق ہوا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ گذشتہ سالوں کے مقابلے میں فی الحال حالات میں بہت تبدیلی آئی ہے۔

رویدرا اور کرمالی کو جوڑنے والا ۲۰ر فٹ کا راستہ، دونوں کے درمیان حد فاصل ہے، ورنہ دونوں ایک ہی گاؤں جیسے ہیں، ناواقف شخص دونوں کو ایک ہی گاؤں سمجھے گا، دونوں کے ایک ہی گاؤں ہونے کی دوسری بہت سی مثالیں ہیں، مثلاً: دونوں گاؤں کے مدارس اور خاص طور پر بڑا دارالعلوم، کرمالی کا ہونے کے باوجود رویدرا گاؤں کی حد میں ہے، اور رویدرا و کرمالی کی پانچویں کلاس کے بعد کی اسکولی تعلیم صرف رویدرا گاؤں میں ہے، اسی طرح پوسٹ آفس، پی۔سی۔او (PCO) اور دو ہسپتال رویدرا میں ہیں۔

گاؤں میں کتنے لوگ بستے ہیں؟ اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

رویدرا گاؤں میں کل ۱۶۲۳ر (سولہ سو تیئس) افراد ہیں، جن میں ۸۰۱ (آٹھ سو ایک) مرد اور ۸۲۲ (آٹھ سو بائیس) عورتیں ہیں۔ اور کرمالی گاؤں میں کل ۱۰۸۲ (ایک ہزار بیاسی) افراد ہیں، جن میں ۵۴۲ر مرد اور ۵۴۰ر عورتیں ہیں اور ساتھ ہی رویدرا گاؤں میں "مدنی دار التربیت" نام کا ایک "دارالعلوم" ہے اور ساتھ ساتھ گاؤں میں دو مکتب بھی ہے، جن میں صرف "رویدرا" کے مکتب میں بچوں کی تعداد ۳۰۰ر تک ہے، جن کو ۱۳ر اساتذہ تعلیم دے رہے ہیں، "رویدرا" کے اسکول میں بچوں کی تعداد ۳۳۵ر ہیں اور ۸ر اساتذہ (ٹیچرس) ہیں اور کرمالی کے اسکول میں بچوں کی تعداد ...... ہے اور ۴ر اساتذہ ہے، نیز لڑکیوں کا مدرسہ بھی گاؤں میں ہے، دو واٹر ورکس ہیں، چکیاں بھی ہیں، "رویدرا" مدرسے کے کرایہ کے تقریباً ۲۴ر مکانات ہیں، کرمالی گاؤں میں تقریباً ۱۲ر مکانات کرایہ کے ہیں، رویدرا گاؤں میں ضرورت کی تمام چیزیں ملتی ہیں، شہر کے بھاؤ پر یا اس سے کچھ کم و زیادہ قیمت پر ضرورت کی اشیاء دست یاب ہو جاتی ہیں، رویدرا گاؤں کے اسکول میں ۷ر کلاس تک کی تعلیم ہے، جس میں دوسرے گاؤں کے بچے بھی ہیں، گاؤں میں دو ڈاکٹر ہیں، جن میں سے ایک ۲۴ر گھنٹے گاؤں میں رہتا ہے، سرکاری ہسپتال اور جانوروں کا دواخانہ بھی ہے، رویدرا اور کرمالی کی تمام دوکانیں

مل کر تقریباً ۵۱ر ہیں۔ (ناچیز کو ۵۱ر دکانوں اور مذکورہ بالا اشیاء میں سے بعض کے موجود ہونے میں تردد ہے، ہوسکتا ہے کہ ناقل فتاویٰ سے چوک ہوئی ہو۔ مجتبیٰ حسن قاسمی)

گاؤں میں لائبریری بھی ہے اور مفتیان کرام بھی ہیں اور زمانہ کے تقاضے کے مطابق کمپیوٹرائز فون کا بھی انتظام ہے، جس کے ذریعہ دنیا کے کونے کونے تک بات پہونچائی جاسکتی ہے۔

کھیتی کے لیے (گاؤں کے زیادہ تر لوگ کاشتکار ہونے کی وجہ سے) کاشتکاروں کی اشیاء ضرورت بھی گاؤں میں دستیاب ہیں، پولٹری فارم، قصاب، گاؤں سے شہر جانے کے لیے ہر طرح کی بسیں اور آٹو رکشہ بھی ہیں اور بجلی کا بھی انتظام ہے۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شریعت کی رو سے ہم لوگ دونوں گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھنا چاہتے ہیں، جس سے گاؤں کے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں جمعہ کے دن اور جمعہ کی نماز کی اہمیت پیدا ہو، تو ہمارے لیے جمعہ کی نماز پڑھنا صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

حنفی مسلک کے مطابق چھوٹی بستی میں جمعہ کی نماز جائز نہیں ہے۔[1] بڑے گاؤں اور قصبے میں جائز ہے۔[2] حنفی مسلک کے مطابق گاؤں کی آبادی اور بستی کی کوئی حد متعین نہیں ہے، زمانہ کے حالات کے مطابق گاؤں اور قصبے کا معیار بدلتا رہتا ہے، پہلے زمانہ کا قصبہ آج کے اعتبار سے بڑے گاؤں جتنا ہوتا تھا، اس لیے جمعہ کی نماز کے جو قواعد ہیں، ان کی رعایت کرتے ہوئے جمعہ کے بارے میں تھوڑی نرمی اختیار کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے، حنفی مسلک کے شرائط بہت سی جگہوں پر متحقق نہیں ہوتے؛ اس لیے جمعہ کے بارے میں اس ناچیز کی رائے نرمی کی ہے اور مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحبؒ کے بہت سے فتاویٰ سے بھی یہی خلاصہ نکلتا ہے۔[3]

ناچیز کے تجربے کے مطابق مسلمان جمعہ کے دن غسل کرتے ہیں اور طہارت حاصل کرنے کا خاص اہتمام کرتے ہیں، عورتیں اور بچے بھی حصول طہارت کا خاص اہتمام کرتے ہیں، اور جمعہ کی عظمت کے سبب

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: ''دیہات میں جمعہ جائز نہ ہونے کے دلائل''۔
(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: ''قصبہ میں نماز جمعہ اور دیہات کے باشندے کی اس میں شرکت''۔
(۳) دیکھیے عنوان: ''چھوٹے گاؤں میں قدیم زمانے سے جمعہ پڑھا جارہا ہو تو؟'' کا حاشیہ نمبر ۳۔

ذکر و تلاوت کرتے ہیں اور جو لوگ مسجد سے دور رہتے ہیں، بدن اور کپڑے کی پاکی کا جن کو کچھ خیال بھی نہیں ہوتا، وہ بھی جمعہ کے دن مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے آتے ہیں اور اس بہانے کچھ وعظ و نصیحت بھی سنتے ہیں اور جن لوگوں کو نماز ایک بوجھ لگتا ہے اور جو لوگ نماز کی پابندی نہیں کرتے، وہ بھی جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے آتے ہیں اور جمعہ کی نماز کی وجہ سے ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس دن ایک بار تو ہمیں نماز پڑھنی ہی چاہیے، ایک ہفتے میں اتنا احساس بھی پیدا ہو جانا، بڑی بات ہے؛ کیوں کہ اس کی وجہ سے بالکل احساس ختم ہو جانے اور مسجد سے دور ہو جانے کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، اس احساس کے ساتھ مسجد میں آ کر وعظ و نصیحت سن کر اور نیک لوگوں کی زیارت کر کے لوگ پانچوں وقت کے نمازی بن جاتے ہیں۔ اگر جمعہ بھی نہ ہو، تو پھر دوسرا کوئی موقع ایسا نہیں، جس میں لوگ ایک ساتھ جمع ہو سکیں، اگر یہ احساس بھی ختم ہو جائے، تو دین سے بالکل دور ہو جائیں گے، نیز بچوں کی تعلیم اور مدارس و علماء سے ربط کا خیال بھی نہیں رہے گا، یہ صرف رویدرا کی بات نہیں، رویدرا تو تعلیم یافتہ گاؤں سمجھا جاتا ہے۔ اس سے چھوٹے گاؤں میں جمعہ ہوتی ہے؛ لہٰذا جمعہ کی نماز کو بڑے گاؤں میں ناجائز کہنے میں بڑا نقصان ہے، جہاں جمعہ ہو رہی ہے، وہاں بند نہ کرنی چاہیے؛ بڑے گاؤں میں شروع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"[۴]

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے تو صرف ۲۰۰ر آدمیوں کی آبادی والے گاؤں میں بھی ایک مرتبہ جمعہ شروع ہو جانے کے بعد جمعہ کو جائز کہا ہے۔ جہاں ۲۵ر سال سے نماز جمعہ بند کر دی گئی تھی، دو بارہ جاری کی گئی، تو مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ جائز ہے اور لکھا ہے کہ اسلام کے دشمنوں کی چالیں ایسے گاؤں پر

---

(۴) حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں: فقہاء احناف کے نزدیک جمعہ و عیدین نہیں پڑھی جائے گی، بل کہ جمعہ کے بجائے ظہر کی نماز ادا کی جائے گی، اس لیے کہ حضرت علی سے مروی ہے کہ: "لا جمعۃ ولا تشریق الا فی مصر جامع" جمعہ و عیدین شہر ہی میں پڑھی جائیں؛ لیکن شہر (مصر) سے کیا مراد ہے؟ یہ حدیث میں متعین نہیں ہے، فقہاء نے اپنے ذوق و مزاج اور اپنے عہد کے عرف کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصر کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں خاصا اختلاف ہے، فقہاء کے نزدیک شہر کا جو مفہوم راجح ہے، وہ یہ ہے کہ اگر اس جگہ کے تمام لوگ وہاں کی بڑی مسجد میں جمع ہو جائیں تو مسجد ناکافی ہو جائے، یہ شہر کا ایسا مفہوم ہے، کہ اس کے اعتبار سے شہر کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، اور ضرورت اس وقت یہی ہے کہ شہر کا ایسا مفہوم متعین ہو کہ زیادہ سے زیادہ مقامات پر نماز جمعہ کی گنجائش نکل آئے، کیوں کہ جمعہ نہ صرف ایک عبادت ہے؛ بل کہ تذکیر و موعظت کا بھی بہترین موقع ہے اور بعض علاقوں میں جمعہ ہی کی وجہ سے اسلام سے اپنی وابستگی محسوس کرتے ہیں۔ (کتاب الفتاویٰ: ۳/ ۳۶-۳۷، نماز کے متعلق سوالات، دیہات میں جمعہ، ط: نعیمیہ- دیوبند)

اثر انداز نہیں ہوتیں، جہاں جمعہ ہوتی ہے۔ (کفایت المفتی)[۵]

یہ حقیقت ہے کہ ایسے گاؤں میں، جہاں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی، وہاں دھیرے دھیرے مسجدیں ویران ہونے لگتی ہیں اور ارتداد کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے؛ لہٰذا بہت چھوٹے گاؤں کے علاوہ بڑے گاؤں میں جمعہ جائز ہونی چاہیے، رویدرا میں عید کی نماز ہوتی ہے، تو اب جمعہ پڑھنے میں بھی کوئی حرج نہیں، اگر فرض کر لیا جائے کہ دونوں گاؤں (رویدرا اور کرمالی) جدا جدا ہیں، تب بھی رویدرا میں تمام ضروریات کا انتظام ہے، جس کی وجہ سے رویدرا میں جمعہ کی نماز پڑھنا جائز ہوگا، کرمالی میں نہ پڑھی جائے، ایک ہی جگہ نماز پڑھی جائے؛ لیکن جمعہ کی نماز پڑھی جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۵) دوسو آبادی والے گاؤں میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

سوال: ایک موضع کرینڈا، ریاست الور، جس کی آبادی قریب دوسو آدمیوں کی ہے، ان میں سے دوسری قوموں کے صرف پچیس، تیس آدمی ہیں، بقیہ سب مسلمان ہیں، پنجگانہ نمازی قریب پچاس آدمی ہیں، اس گاؤں میں سنا گیا ہے کہ بیس پچیس سال قبل جمعہ ہوتا تھا، یہاں کے باشندگان کو نماز جمعہ کی سخت تکلیف ہوتی ہے، جس مقام پر قدیمی جمعہ ہوتا چلا آتا ہے، وہ اس گاؤں سے تین چار کوس کے فاصلے پر ہے، وہاں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے جانا اور واپس آنا، اس میں بہت تکلیف ہوتی تھی، تمام دن بے کار ہو جاتا تھا، اس گاؤں میں صرف ایک مسجد ہے، اس میں جو مقررہ امام ہیں، سال بھر سے جمعہ پڑھانا شروع کر دیا ہے، دس بارہ آدمی کسی جمعہ میں باہر کے بھی آ جاتے ہیں، جمعہ کی نماز میں بلاشبہ ہر جمعہ کو اندازاً چالیس پچاس آدمی ہو جاتے ہیں، لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس گاؤں میں جمعہ قائم کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور آیا یہ ایک سال سے جو جمعہ ہو رہا ہے، اس کو بند کر دیا جائے یا جاری رکھا جائے؟

جواب: جمعہ بند نہ کیا جائے، جاری رکھا جائے، اور سب لوگوں کو لازم ہے کہ اتفاق سے رہیں، آپس میں اختلاف کرنا بہت برا ہے۔

قلت: هذا و إن كان غير موافق لما عليه الحنفية، ولكنه أشد موافقة لمصالح الإسلامية الاجتماعية، خصوصا في هذا القطر، و في هذا الزمان، فإن أعداء الإسلام يظفرون بمقاصدهم المشومة في قرى لا تقام فيها الجمعة و يخيبون في مواضع إقامة الجمعة، والتوفيق من الله عز و جل، و حفاظة الإسلام خير من الإصرار على تركها، والمسألة مجتهد فيها. محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ، دہلی

(کفایت المفتی: ۳/ ۲۵۰-۲۵۱، پانچواں باب، نماز جمعہ، دوسو آبادی والے گاؤں میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ ط: زکریا-دیوبند)

نوٹ: گاؤں میں فتنے کے خوف کی وجہ سے جمعہ جاری رکھنے کا حضرت مفتی صاحب کا یہ قول توسع پر مبنی ہے، یہی رائے اکابر علماء میں مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کی رائے بھی اس سلسلے میں نرمی اختیار کرنے کی ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۸] رویدرا اور کرمالی میں جمعہ جائز ہے؟

گذشتہ سے پیوستہ

۱۰۳۰-سوال: ہمارے رویدرا، کرمالی گاؤں میں درج ذیل صورت حال ہے، کیا یہاں جمعہ کی نماز جائز ہوگی؟

(۱) رویدرا گاؤں میں پہلے جمعہ کی نماز ادا کی جاتی تھی؛ لیکن غالباً ۱۹۸۵ء سے جمعہ کی جگہ نماز ظہر ادا کی جانے لگی، البتہ گاؤں کی اسی مسجد میں عید کی نماز اب بھی ادا کی جارہی ہے، اب چوں کہ گاؤں کے حالات تبدیل ہوگئے ہیں؛ اس لیے دونوں گاؤں والے یہاں جمعہ قائم کرنا چاہ رہے ہیں، ان حالات سے آپ بھی واقف ہیں۔

(۲) رویدرا اور کرمالی دونوں گاؤں کے درمیان صرف ۲۰ رفٹ کا راستہ ہی حائل ہے، دونوں گاؤں ایک گاؤں کے مانند ہی ہے۔ دیکھنے والے کو پہلے سے معلوم نہ ہو، تو ایک ہی گاؤں سمجھے اور بہت سی علامات ہیں، جو دونوں کے ایک ہونے پر دال ہیں، مثلاً کرمالی کا بڑا دارالعلوم رویدرا کی حد میں ہی ہے، رویدرا اور کرمالی کی پانچویں کلاس کے بعد کا اسکول بھی صرف رویدرا گاؤں میں ہی ہے، اسی طرح رویدرا اور کرمالی کی سرکاری آفس، راشن ڈپو، ڈاک خانہ، پی سی او (PCO) اور دوا خانے بھی صرف رویدرا میں ہی ہیں۔

(۳) رویدرا کی کل پبلک ۱۶۲۳ رہے، جس میں ۸۰۱ رمرد اور ۸۲۲ رعورتیں ہیں اور کرمالی کی کل پبلک ۱۰۸۲ رہے، جس میں ۵۴۲ رمرد اور ۵۴۰ رعورتیں ہیں، ان کے علاوہ ایک ''مدنی دارالتربیت'' نامی دارالعلوم ہے، جس میں کئی طلبہ مقیم ہیں، کرمالی مدرسہ میں تقریباً ۱۲۶ رطلبہ ہیں، دو مکتب ہیں، تقریباً ۳۰۰ رطلبہ ہیں، رویدرا کے اسکول میں ۳۳۵ راسٹوڈنٹ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

(۴) رویدرا گاؤں میں ضروریات زندگی کی ساری چیزیں مہیا ہیں؛ لہٰذا ہم جمعہ ادا کرنا چاہتے ہیں، تو کیا ہمارا جمعہ ادا کرنا صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب: حامداومصلیا:

آپ کا جواب لکھنے سے پہلے میں بعض باتیں پیش خدمت ہیں:

۱۹۴۹ء میں ہم: مولانا محمد لولات بھگت رویدروی، مولانا محمد موسی جلاد ہاسوڑ اور احقر (مفتی احمد بیمات رحمۃ اللہ علیہ، صاحب فتاویٰ) دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کررہے تھے۔

کرمالی میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی تھی اور رویدرا میں ہوتی تھی، چھوٹے گاؤں میں حنفی مسلک کے مطابق جمعہ جائز نہیں ہے؛ لیکن فتنہ کے خوف سے مذکورہ مسلک والے بھی خاموش رہے، ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء میں حضرت عبدالرحمن صاحبؒ (خلیفہ شیخ الاسلام سید مولانا حسین احمد مدنیؒ) نے حضرت مدنیؒ کو خط لکھ کر اپنے لیے مشورہ طلب کیا۔

جواب میں حضرت مدنیؒ نے کہا کہ گاؤں چھوٹا ہے، جمعہ جائز نہیں، البتہ فتنہ کے ماحول میں بہت سے گاؤں میں یہ حالت ہے؛ لہٰذا مسئلہ بتادو، لوگ مان لیں تو ٹھیک ہے، نہ مانیں، تو فتنہ برپا مت کرنا، مسئلہ بتادینے سے آپ کی ذمہ داری ادا ہوجائے گی؛ لیکن آپ جمعہ پڑھا کر ظہر پڑھ لینا۔ چناں چہ رویدرا میں جمعہ جاری رہی۔

اس کے بعد حضرت مفتی عبداللہ پٹیل صاحب نے عوام کو سمجھایا کہ چھوٹے گاؤں میں جمعہ جائز نہیں ہے اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، سمجھ دار عوام نے مفتی صاحب کے سمجھانے سے جمعہ پڑھنا بند کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنت کو قبول فرمائے (آمین) اور سمجھ دار کارکنان کو بہترین بدلہ عطا فرمائے (آمین) اس معاملہ کو تقریباً ۸-۹ سال ہوگئے ہیں۔

۱۹۸۳ء اور ۸۴، ۸۵ کے بعد جی، آئی، ڈی، سی (گجرات انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن) انکلیشور آئی، جس کی وجہ سے انکلیشور کے دیہات کے احوال تبدیل ہوگئے، حکومتی اور سیاسی اسکیموں کی وجہ سے مالی حالات ٹھیک ہوئے، غریبوں کے جھونپڑے مکانات میں تبدیل ہوئے، موٹر، رکشا، ڈاکٹر، ماسٹر اور اساتذہ میں اضافہ ہوا، دارالعلوم کی طلبہ کی ضروریات کی وجہ سے دکانوں اور دکانوں کی اشیاء میں زیادتی ہوئی، رویدرا اور کرمالی کے مدرسہ کے آمدنی کے اسباب اور مکانات مہیا کیے گئے، شہروں سے تعلقات بڑھنے کی وجہ سے ٹیلی فون اور جی، آئی، ڈی، سی کے لیے ایس ٹی ڈی کا انتظام وجود میں آیا، جس کا انتظام بعض بڑے شہروں میں بھی نہیں ہے اور آبادی تین ہزار سے زیادہ ہے؛ لہٰذا رویدرا اور کرمالی ''گاؤں'' [قریہ کبیرہ] کے درجہ میں ہے، جہاں جمعہ پڑھنا لازم ہے، علامہ ''شامیؒ'' نے لکھا ہے: تقع فرضا في القصبات والقرى الكبيرة التي فيها أسواق. (شامی ۱/ ۳۴۸)[۱]

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے سوال نمبر ۲۳۸۳ (حصہ ۵) کا خلاصہ ہے کہ سوجر ضلع مظفر نگر کا گاؤں

[۱] رد المحتار على الدر المختار: ۱۳۸/۲، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت.

ہے، جس میں اندازاً تین ہزار کی آبادی ہے، لیکن گاؤں میں بازار نہیں ہے، کپڑے اور اناج کی دکان نہیں ہے تو جمعہ جائز ہوگی؟

جواب: شامی میں ہے جمعہ شہر، قصبہ اور بڑے گاؤں میں صحیح ہو جاتی ہے اور مذکورہ گاؤں بڑا گاؤں ہے؛ اس لیے کہ اس کی آبادی تین ہزار کے قریب ہے؛ لہٰذا جمعہ پڑھنا واجب ہے اور صحیح۔ فقط (فتاویٰ دار العلوم ۶۶/۵)[۲]

لہٰذا دونوں گاؤں ایک گاؤں کے حکم میں ہونے کی بنا پر دونوں گاؤں والے جمعہ ادا کر سکتے ہیں؛ اس لیے کہ سوال کی تحریر کے مطابق دکان، ڈاکٹر، ماسٹر، کرایے پر ملنے والے مکان اور ٹیلی فون وغیرہ کا انتظام برسوں سے ہے، لہٰذا جمعہ ادا کرنا جائز ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] چھوٹے گاؤں میں عرصہ سے جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھی جارہی ہو تو اس کو بند کرنا کیسا ہے؟

۱۰۳۱- سوال: ہمارا گاؤں بہت چھوٹا ہے، مسلمانوں کے تقریباً چالیس مکانات ہیں، غیر قوم کے بھی کچھ مکانات ہیں۔ فقہی کتابوں میں ذکر کردہ صحت جمعہ کی شرائط میں سے ایک بھی شرط اس گاؤں میں نہیں پائی جاتی ہے؛ لیکن گاؤں والے برسوں سے اس میں جمعہ اور عیدین ادا کرتے چلے آرہے ہیں، جمعہ میں بیس پچیس افراد نماز میں آتے ہیں، جب کہ عام دنوں میں صرف چھ سات افراد ہوتے ہیں، کچھ دن پہلے دو تین حضرات نے جمعہ بند کرنے کے متعلق کچھ بات بھی چلائی تھی، مگر گاؤں کے ان لوگوں کا کہنا تھا، جو صرف جمعہ میں آتے ہیں، کہ ہفتہ بھر میں ہم نہا دھو کر صرف ایک نماز کے لیے آتے ہیں، اس کو بھی آج کل کے مولوی بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ اگر جمعہ کسی طرح بند ہو جائے، تو بھی نماز عیدین کا بند کرنا بہت مشکل ہے، اس میں سخت فتنے کا اندیشہ ہے، گاؤں کے لوگ اس پر کسی حال میں راضی نہیں ہو سکتے ہیں، تو ایسی صورت میں اس گاؤں میں جمعہ اور عیدین کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟ جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ گاؤں میں جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے، علماء کا کام مسئلہ بتانا ہے، ہدایت دینا اللہ

---

[۲] فتاویٰ دار العلوم: ۶۶/۵، مسائل نماز جمعہ، جب آبادی تین ہزار ہو تو جمعہ درست ہے، سوال نمبر: ۲۳۸۲، ط: زکریا- دیوبند۔
(۳) تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں، سابق سوال۔

تعالیٰ کا کام ہے، جو بھی عالم گاؤں میں ہوگا، اور واقعی حقیقت اور صحیح صورت حال سے آگاہ کردے گا، تو اس کا ذمہ بری ہوجائے گا۔

اگر جمعہ وعیدین کے بند کرنے میں فتنہ کا اندیشہ ہو، تو امام مسئلہ بتلا کر نماز پڑھا لے، ان شاء اللہ گنہ گار نہ ہوگا، اور گاؤں والوں کی یہ دلیل قابل اعتبار نہیں کہ صرف ایک دن ہمیں نہا دھو کر مسجد میں آنے کی توفیق ہوتی ہے، اور مولوی حضرات اس کو بھی بند کردینا چاہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ غسل کرکے عمدہ کپڑا پہن کر قریب کے شہر یا قصبہ میں جمعہ وعیدین کے لیے جاسکتے ہیں، کیا دنیوی حاجت کی تکمیل کے لیے قریب کے شہر وقصبہ میں انسان نہیں جاتا ہے؟ تو جمعہ ادا کرنے کے لیے بھی جانے میں حرج نہیں ہونا چاہیے۔ بخاری شریف (۱/ ۱۲۴)[۱] میں رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے جانے والے کو اللہ کی راہ میں نکلنے سے تعبیر فرمایا ہے۔ لہٰذا اگر کسی میں دین داری ہو، اور وعظ وتقریر سننا چاہتا ہو، تو گاؤں میں جمعہ پڑھنے کی بجائے شہر وقصبہ میں جاسکتا ہے۔

بہ ہر صورت فتنہ اور لڑائی نہیں ہونی چاہیے، جو لوگ کسی وجہ سے گاؤں میں قیام جمعہ پر مجبور ہیں، کہ اگر وہ جمعہ قائم نہ کریں، تو فتنہ وفساد برپا ہوگا، تو وہ گاؤں میں جمعہ کی نماز ادا کرلینے کی وجہ سے گنہگار نہ ہوں گے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] چھوٹے گاؤں میں جمعہ اور عید کی نماز پڑھنا

۱۰۳۲- سوال: ہمارے گاؤں میں آج سے چھ سال قبل ایک مسجد بنائی گئی تھی، جس کے افتتاح میں حضرت مفتی احمد بیمات صاحب، حضرت مولانا اجمیری صاحب، حضرت مفتی سعید صاحب وغیرہ بزرگان دین تشریف لائے تھے، اس موقع پر یہ بات لوگوں کے سامنے آئی تھی کہ اس گاؤں میں جمعہ اور عیدین پڑھنا

---

(۱) عن عباية بن رفاعة، قال: أدركني أبو عبس وأنا أذهب إلى الجمعة، فقال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: من اغبرت قدماه في سبيل الله حرمه الله على النار. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۲۷، كتاب الجمعة، باب المشي إلى الجمعة، ط: البدر - ديوبند)

وفي الحاشية: من حيث أن الجمعة تدخل فيه [أي في سبيل الله] لأن السبيل اسم جنس مضاف فيفيد العموم، ولأن أبا عبس جعل حكم السعي إلى الجمعة حكم الجهاد. (حوالہ سابق)

(۲) تفصیل کے لیے ''چھوٹے گاؤں میں قدیم زمانے سے جمعہ پڑھا جارہا ہو تو؟'' کا حاشیہ نمبر ۳ اور ''دیہات میں جمعہ جائز نہ ہونے کے دلائل'' کے تمام حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

صحیح نہیں ہے، جس پر سب لوگوں نے اتفاق کیا تھا؛ لیکن آج جب کہ آبادی اور دکانیں وغیرہ اس وقت کے مقابلہ میں کم ہیں، گذشتہ سال بقرعید کا خطبہ ونماز پڑھی گئی تھی، جس عالم صاحب نے نماز پڑھائی، ہم نے ان سے جب صحیح صورت حال کی وضاحت کی، تو انہوں نے اپنے دونوں کان پکڑ کر غلطی کا اعتراف کیا اور کہا آئندہ ایسا نہیں ہوگا؛ لیکن امسال پھر انہوں نے نقض عہد کرتے ہوئے عیدالفطر کی نماز پڑھائی، تو اس سلسلہ میں اسلامی شریعت کیا کہتی ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

حنفی مذہب میں جمعہ کی نماز کی صحت کے لیے شہر یا قصبہ -جس میں ضروریات زندگی کی اشیاء ملتی ہوں- ہونا ضروری ہے، آپ کی تحریر کے مطابق پانچ سال میں آبادی اور تجارت کم ہوئی ہے، تو وہاں جمعہ جائز نہیں۔ اسی طرح ایسے گاؤں میں عید کی نماز بھی پڑھنا مکروہ ہے، اگر امام صاحب اپنی رضا واختیار سے عید کی نماز پڑھائیں گے، تو گنہ گار ہوں گے، اگر متولی یا ٹرسٹیان یا لوگوں کے مجبور کرنے کی وجہ سے- جب کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو- پڑھاتے ہیں، تو گنہ گار نہ ہوں گے، الغرض امام کا کام لوگوں کو صحیح مسئلہ بتلا دینا ہے، لوگ مجبور کرتے ہوں اور نماز نہ پڑھانے میں فتنہ کا اندیشہ ہو، تو پڑھانے سے ان پر ان شاء اللہ کوئی گناہ نہ ہوگا۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] جمعہ کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے اپنے گاؤں میں جمعہ کی نماز قائم کرنا

۱۰۳۳- سوال: ہمارے گاؤں کی کل آبادی ۲۳۰۰ سے ۲۴۰۰ افراد پر مشتمل ہے، گاؤں میں ضرورت کی تمام اشیاء مہیا ہو جاتی ہیں اور مصلیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی رہتی ہے؛ ہم لوگ جمعہ کی نماز کے لیے انکلیشور اور اس کے پڑوس کے گاؤں جیتالی اور کونڈھ وغیرہ جاتے ہیں، یہ گاؤں ہماری بستی سے تین میل کے فاصلے پر ہے، جمعہ کی نماز کے لیے گاؤں کے تمام لوگ انکلیشور یا جیتالی نہیں جاتے ہیں، صرف چار پانچ آدمی چلے جاتے ہیں اور بقیہ تمام لوگ جمعہ کی نماز کی فضیلت سے محروم رہ جاتے ہیں، اس وجہ سے گاؤں کے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اگر ہمارے گاؤں میں جمعہ کی نماز شروع ہو جائے، تو دوسرے لوگ جو نماز سے محروم رہ

(۱) شرائط صحت کے لحاظ سے جمعہ اور عیدین میں کوئی فرق نہیں ہے۔
تفصیل کے لیے ''چھوٹے گاؤں میں قدیم زمانے سے جمعہ پڑھا جا رہا ہو تو؟'' کا حاشیہ نمبر: ۳، اور ''دیہات میں جمعہ جائز نہ ہونے کے دلائل'' کے تمام حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

جاتے ہیں، وہ بھی جمعہ کی نماز کے لیے آنے لگیں گے اور آہستہ آہستہ لوگوں میں دین داری کا ماحول بھی بن جائے گا اور دلوں میں خوف خدا بھی پیدا ہوگا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مذکورہ وجوہات کی بنیاد پر ہم لوگ اپنے گاؤں میں جمعہ کی نماز قائم کر سکتے ہیں؟ (احقر احمد محمد جلیل جیتالی والا)

الجواب حامداومصلیا:

آپ کی تحریر کے مطابق ۲۳۰۰ / یا ۲۴۰۰ / افراد کی آبادی آپ کے گاؤں میں ہے اور روزمرہ کی ضروریات بھی مہیا ہو جاتی ہیں؛ اگر یہ بات درست ہے، تو پھر آپ کے گاؤں میں جمعہ کی نماز ادا کرنا درست ہے۔[1] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] چھوٹے دیہات میں جمعہ اور عیدین کی نماز کا شرعی حکم

۱۰۳۴- سوال: ہمارے گاؤں کی آبادی اس وقت تقریباً آٹھ سو کے آس پاس ہے، ضروریات کی تمام چیزیں تقریباً مہیا ہو جاتی ہیں، گاؤں میں ڈاک خانہ بھی ہے، واٹر ورکس (پانی کی بڑی ٹنکی) بھی ہے، ایک چکی بھی ہے، بڑھئی بھی ہے، معمار بھی، پکا راستہ بھی ہے اور بسوں کا انتظام بھی ہے، اس کے علاوہ دواخانہ بھی ہے، جس میں سند یافتہ ڈاکٹر اور حکیم صاحبان خدمت انجام دے رہے ہیں، گاؤں میں ایک کتب خانہ بھی ہے اور اسکول بھی، جس میں گجراتی میڈیم میں سات کلاس تک کی تعلیم کا نظم ہے، گاؤں میں تقریباً ایک سو ساٹھ مکانات ہیں، اس صورت حال میں شرعی طور پر ہم یہاں جمعہ اور عید کی نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

جمعہ اور عیدین کی نماز کے صحیح ہونے کے لیے شہر، قصبہ یا بڑا گاؤں ہونا ضروری ہے، جس میں ضروریات زندگی کی تمام چیزیں بآسانی مہیا ہو جاتی ہوں، آپ کا گاؤں چھوٹا کہلائے گا؛ اس لیے آپ کے لیے جمعہ اور عیدین کی نماز اپنے گاؤں میں پڑھنا جائز نہیں ہے، البتہ پہلے سے اگر جمعہ اور عیدین کی نماز جاری

---

[۱] (قوله شرط أدائها المصر) أي شرط صحتها أن تؤدى في مصر حتى لا تصح في قرية، ولا مفازة؛ لقول علي - رضي الله عنه - لا جمعة، ولا تشريق، ولا صلاة فطر، ولا أضحى إلا في مصر جامع أو في مدينة عظيمة. (البحر الرائق: ۲/ ۲۴۵، أبواب الصلاة، صلاة الجمعة دار الكتاب ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: زكريا ديوبند)

مسئلے کی مزید تفصیل وتخریج کے لیے "چھوٹے گاؤں میں قدیم زمانے سے جمعہ پڑھا جا رہا ہو تو؟" کا حاشیہ نمبر ۳، اور "دیہات میں جمعہ جائز نہ ہونے کے دلائل" کے تمام حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

ہو، تو بند کروانے کے لیے لڑائی جھگڑا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ (۱) کیوں کہ مولوی، مفتی اور سمجھ دار آدمی کی ذمہ داری تو بس اتنی ہی ہے کہ صحیح مسئلہ بتلادے، عمل کروانا تو اسلامی حکومت کا کام ہے، آپ کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے، اس لیے اس مسئلہ میں لوگوں سے لڑائی جھگڑا کرنا درست نہیں۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] بڑے دیہات اور قصبہ میں نماز جمعہ کا شرعی حکم

۱۰۳۵- سوال: ہمارے گاؤں میں اس وقت ایک ہزار سات سو دس (۱۷۱۰) افراد کی آبادی ہے، ضروریات زندگی کی اکثر چیزیں مل جاتی ہیں؛ علاوہ ازیں دو دینی مکاتب، اور ۳/عدد مسجدیں ہیں، ڈاک خانہ، ٹیلی فون آفس اور ایک اسکول ہے، جس میں گجراتی میڈیم میں سات کلاس تک کی تعلیم کا نظم ہے، اس کے علاوہ ''سستے داموں کی اناج کی دو سرکاری دوکانیں بھی ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ہمیں اپنی اس بستی میں از روئے فقہ حنفی ، نماز جمعہ پڑھنا جائز ہے؟ جمعہ کی نماز ادا کر لینے کے بعد احتیاطاً ظہر کی نماز تو ادا نہیں کرنی پڑے گی؟

محمد عابد عبد الرحیم گڈھا (سابر کانٹھا)

الجواب حامداو مصليا:

سوال میں مندرج تفصیل کے مطابق آپ کے گاؤں میں جواز جمعہ کی گنجائش ہے، اس لیے احتیاط الظہر کے کوئی معنیٰ نہیں۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] فناء شہر کے باشندگان پر جمعہ لازم ہے

۱۰۳۶- سوال: پیرامن گاؤں انکلیشور شہر سے تقریباً ایک کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے اور پیدل

---

(۱) مسئلے کی مزید تفصیل وتخریج کے لیے ''چھوٹے گاؤں میں قدیم زمانے سے جمعہ پڑھا جارہا ہو تو؟'' کا حاشیہ نمبر ۳، اور ''دیہات میں جمعہ جائز نہ ہونے کے دلائل'' کے تمام حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۲۸-القصص: ۵۶﴾
ترجمہ: آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے؛ بل کہ اللہ جس کو چاہے، ہدیت کر دیتا ہے اور ہدایت پانے والوں کا علم (بھی) اسی کو ہے۔
وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ. (۲-البقرة: ۱۹۱) ـــــ ترجمہ: اور فتنہ قتل سے زیادہ سنگین برائی ہے۔

(۳) قد تقدم تخريجه عن: رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۵، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: زكريا-ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، كتاب الصلاة، مكتبه زكريا-ديوبند)
مسئلے کی مزید تفصیل وتخریج کے لیے ''چھوٹے گاؤں میں قدیم زمانے سے جمعہ پڑھا جارہا ہو تو؟'' کا حاشیہ نمبر ۱۳، اور ''دیہات میں جمعہ جائز نہ ہونے کے دلائل'' کے تمام حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

جانے والا راستہ تو اس سے بھی کم مسافت کا ہے، تو کیا اس گاؤں کے باشندوں کو جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے انکلیشور جانا لازم ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

چھوٹے گاؤں کے باشندوں کے لیے جمعہ کی نماز پڑھنا فرض نہیں ہے؛ البتہ کوئی گاؤں اگر شہر سے اتنا نزدیک ہو کہ شہر کی اذان اس گاؤں میں سنائی دیتی ہو، تو پھر اس کے گاؤں کے باشندوں پر جمعہ کی نماز پڑھنا فرض ہوگا؛ اس اعتبار سے آپ کا گاؤں انکلیشور شہر سے نزدیک شمار کیا جائے گا؛ اس لیے گاؤں والوں پر لازم ہے کہ جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے انکلیشور شہر جائیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] گاؤں سے چار کیلومیٹر کی دوری پر واقع باڑی میں کام کرنے والوں کے لیے نماز جمعہ کا حکم

۱۰۳۷- سوال: ایک گاؤں ہے، جس سے تقریباً چار کیلومیٹر کی دوری پر ایک باڑی[2] ہے، اس میں تین چار آدمی کام کرتے ہیں، جہاں روزانہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں؛ ان کے لیے جمعہ کی نماز کا کیا حکم ہے؟ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ گاؤں میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے وہاں (باڑی) سے نکلتے ہیں، کبھی تو ان کو سواری مل جاتی ہے اور کبھی نہیں ملتی، چار کیلومیٹر پیدل آنا دشوار ہے، پھر ان میں سے

---

(۱) أما المصر الجامع فشرط وجوب الجمعة وشرط صحة أدائها عند أصحابنا حتى لا تجب الجمعة إلا على أهل المصر ومن كان ساكنا في توابعه وكذا لا يصح أداء الجمعة إلا في المصر وتوابعه فلا تجب على أهل القرى التي ليست من توابع المصر ولا يصح أداء الجمعة فيها. ــــــــــ وأما تفسير توابع المصر فقد اختلفوا فيها روي عن أبي يوسف أن المعتبر فيه سماع النداء إن كان موضعا يسمع فيه النداء من المصر فهو من توابع المصر وإلا فلا... وروى ابن سماعة عن أبي يوسف كل قرية متصلة بربض المصر فهي من توابعه وإن لم تكن متصلة بالربض فليست من توابع المصر، وقال بعضهم: ما كان خارجا عن عمران المصر فليس من توابعه، وقال بعضهم: المعتبر فيه قدر ميل وهو ثلاثة فراسخ، وقال بعضهم: إن كان قدر ميل أو ميلين فهو من توابع المصر وإلا فلا، وبعضهم قدره بستة أميال،... وعن أبي يوسف أنها تجب في ثلاثة فراسخ، وعن الحسن البصري أنها تجب في أربعة فراسخ، وقال بعضهم: إن أمكنه أن يحضر الجمعة ويبيت بأهله من غير تكلف تجب عليه الجمعة وإلا فلا وهذا حسن. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۵۹- ۲۶۰، كتاب الصلاة، فصل في بيان شرائط الجمعة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۳۸- ۱۳۹، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر-بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: زكريا- ديوبند)

(۲) باڑی = باغیچہ، چھوٹا سا چمن، کپاس کا کھیت۔ (فیروز اللغات ص: ۱۶۷، ب- ۱، ط: فیروز سنز، کراچی)

بعضوں کی عمر ستر، پچھتر سال ہے؛ اس لیے بعض لوگ اتنی لمبی مسافت پیدل چلنے پر قدرت نہیں رکھتے، تو ان حضرات کے لیے جمعہ کی نماز کا کیا حکم ہوگا؟ حاجی آدم بھائی، ویرمگام

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کی تحریر کے مطابق، آپ اور آپ کے دوسرے ساتھی گاؤں سے تقریباً تین چار کلومیٹر دور رہتے ہیں، ایسی صورت میں آپ حضرات کے لیے جمعہ کی نماز پڑھنے گاؤں میں آنا ضروری نہیں، آپ پر جمعہ کی نماز فرض نہیں ہے، ظہر پڑھ لیں گے، تو فریضہ ادا ہوجائے گا۔

چھوٹے گاؤں کے باشندوں پر جمعہ کی نماز فرض نہیں، آپ نے جس گاؤں کا تذکرہ کیا ہے، اگر وہ بڑا گاؤں یا قصبہ ہے، تو وہاں جمعہ کی نماز صحیح ہوگی، چھوٹا گاؤں ہے، تو جمعہ کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔ (شامی، عالمگیری)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] سروس والے گاؤں میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی تو کیا کیا جائے؟

۱۰۳۸- سوال: میں ''دیتوا'' گاؤں میں سروس کرتا ہوں، جو ''آچھود'' گاؤں سے تقریباً دس کیلومیٹر کی دوری پر ہے، وہاں پوری آبادی غیر مسلموں کی ہے، وہاں سے قریب ''مانگرول'' گاؤں پڑتا ہے، جہاں ایک مسجد ہے؛ لیکن گاؤں چھوٹا ہے، سات سو چھپن (۷۵۶) آدمی کی آبادی ہے، تو سوال یہ ہے کہ مجھے مانگرول میں جمعہ کی نماز ادا کرنی چاہیے یا ''دیتوا'' گاؤں میں ظہر کی نماز ادا کرنا کافی ہوجائے گا، نیز مانگرول کے لوگوں کی جمعہ کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟

---

(۱) (ویشترط لصحتها) سبعة أشياء:

الأول: (المصر، وهو ما لا يسع أكبر مساجده أهله المكلفين بها) وعليه فتوى أكثر الفقهاء، مجتبى؛ لظهور التواني في الأحكام.ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله وعليه فتوى أكثر الفقهاء إلخ) وقال أبو شجاع: هذا أحسن ما قيل فيه. وفي الولوالجية وهو صحيح بحر، وعليه مشى في الوقاية ومتن المختار وشرحه وقدمه في متن الدرر على القول الآخر وظاهره ترجيحه وأيده صدر الشريعة بقوله لظهور التواني في أحكام الشرع سيما في إقامة الحدود في الأمصار. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۳۷، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، كتاب الصلاة، مكتبه زكريا - ديوبند)

مسئلے کی مزید تفصیل وتخریج کے لیے ''چھوٹے گاؤں میں قدیم زمانے سے جمعہ پڑھا جارہا ہو تو؟'' کا حاشیہ نمبر ۳، ''دیہات میں جمعہ جائز نہ ہونے کے دلائل'' اور ''شہر سے متصل ایک کیلومیٹر کے فاصلے کی آبادی میں جمعہ کی نماز پڑھنا'' کے تمام حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاًومسلماً

آپ ''دینوا'' میں رہ کر ظہر ہی کی نماز ادا کریں، مانگرول جاکر جمعہ کی نماز ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ کیوں کہ مانگرول چھوٹا گاؤں ہے، وہاں جمعہ کی نماز صحیح نہیں ہے۔ (۱) واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] چھوٹی بستی میں جمعہ کی نماز کا حکم

۱۰۳۹- سوال: ہمارے گاؤں سنجالی کی آبادی تقریباً ۱۲۰۰/بارہ سو افراد کی ہے، اس میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً چالیس فیصد ہے، گاؤں سے تقریباً آدھے کیلومیٹر کے فاصلے پر جی آئی ڈی سی کے کارخانے چلتے ہیں، اب آبادی بڑھی ہے اور جی آئی ڈی سی سے بھی تقریباً دس پندرہ افراد جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے ہمارے گاؤں میں آتے ہیں، ضروریات زندگی کی تمام اشیاء یہاں مل جاتی ہیں، چوبیس گھنٹے میں چار مرتبہ بس آتی ہے، یہاں پرکھوں کے زمانے سے جمعہ کی نماز ہوتی چلی آئی ہے، تمام لوگ جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں، اس کے باوجود بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یہاں جمعہ کی نماز صحیح نہیں ہے، اب رمضان المبارک بھی سامنے آرہا ہے، تو اگر جمعہ کی نماز یہاں صحیح نہ ہوتی ہو تو اعتکاف کرنے والے کیا کریں گے، وہ لوگ جمعہ کی نماز پڑھیں گے یا ظہر کی نماز؟ جی آئی ڈی سی کی بستی اور گاؤں کی آبادی کو سامنے رکھ کر جواب دینے کی درخواست ہے۔

الجواب حامداًومصلیاً:

چھوٹی بستی میں جمعہ کی نماز صحیح نہیں ہوتی ہے۔ (۲) البتہ اعتکاف صحیح ہوجائے گا۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱-۲) تفصیلی مسئلہ اور تخریج کے لیے عنوان: ''دیہات میں جمعہ جائز نہ ہونے کے دلائل'' کے تمام حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) وأطلق في المسجد فأفاد أن الاعتكاف يصح في كل مسجد وصححه في غاية البيان لإطلاق قوله تعالى {وأنتم عاكفون في المساجد} ـــــ وصحح قاضي خان في فتاواه أنه يصح في كل مسجد له أذان وإقامة واختار في الهداية أنه لا يصح إلا في مسجد الجماعة، وعن أبي يوسف تخصيصه بالواجب أما في النفل فيجوز في غير مسجد الجماعة ذكره في النهاية وصحح في فتح القدير عن بعض المشايخ ما روي عن أبي حنيفة أن كل مسجد له إمام و مؤذن معلوم ويصلي فيه الخمس بالجماعة يصح الاعتكاف فيه وفي الكافي أراد به أبو حنيفة غير الجامع فإن الجامع يجوز الاعتكاف فيه وإن لم يصلوا فيه الصلوات كلها ويوافقه ما في غاية البيان عن الفتاوى يجوز الاعتكاف في الجامع وإن لم يصلوا فيه بالجماعة. (البحر الرائق: ۲/ ۳۲۲، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الكتاب الإسلامي)

ومنها [من شرائطه] مسجد الجماعة فيصح في كل مسجد له أذان، وإقامة هو الصحيح كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۲۱، كتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: دار الفكر)

[۱۸] چھوٹے گاؤں میں جمعہ وعیدین صحیح نہیں ہے

۱۰۴۰- سوال: تمہید

ہمارے گاؤں اٹالوا کی بستی ۶۰-۷۰ر مکانوں پر مشتمل ہے، دو محلہ اور دو مسجدیں ہیں، پہلے بڑی مسجد میں جمعہ اور چھوٹی مسجد میں ظہر کی نماز ہوتی تھی؛ بعض ظہر کی نماز پڑھتے تھے اور بعض جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے بلیستر ڈابھیل، ویسما، نوساری یا سورت چلے آتے تھے اور بعض لوگ گاؤں میں ہی جمعہ پڑھتے تھے، گاؤں کی بڑی مسجد میں اس سے متعلق ڈابھیل سے فتویٰ پوچھا گیا، تو جواب ملا کہ چھوٹے گاؤں میں جمعہ پڑھنا صحیح نہیں ہے؛ لہٰذا جمعہ کی نماز نہیں ہوگی، ظہر کی فرض پڑھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد گاؤں والے جمع ہوئے اور مشورہ کیا کہ جب جمعہ ادا کرنے سے ادا نہیں ہوتی تو پھر کیوں جمعہ پڑھیں؟ تو بعض نے کہا کہ باپ دادا کے زمانہ سے پڑھتے چلے آرہے ہیں، تو اس کو کیسے بند کر سکتے ہیں؟ لیکن اکثر لوگوں نے فتویٰ کے مطابق عمل کیا اور کہا کہ غلط مسئلہ پر چلنا نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے یہ اعلان کیا گیا کہ آئندہ جمعہ سے ظہر کی نماز ہوگی اور ظہر کی نماز بغیر لڑائی جھگڑے کے شروع ہوگئی۔

چار پانچ مہینے کے بعد جب عید کی نماز کا مسئلہ پیش آیا، تو وہ لوگ، جو جمعہ پڑھنا چاہتے تھے، انہوں نے موقع دیکھ کر عید کا اعلان کروادیا، پھر وہ لوگ دوسرے دن عید کی نماز پڑھنے کے لیے اٹل رہے، حالاں کہ وہی لوگ جمعہ کی ادائیگی میں حاضر نہیں ہوتے تھے اور دوسری بڑی مسجد میں چلے جاتے تھے۔ عید کا اعلان صرف ایک غلط کام کرنے کے لیے کیا، ان کی یہ سوچی سمجھی سازش تھی کہ جمعہ پھر سے اسی طرح شروع کروادیں گے۔ اس صورت حال میں درج ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔

{۱} جب جمعہ جائز نہیں ہے، تو کیا عید کی نماز جائز ہوگی؟

{۲} شرعی قاعدہ کے مطابق جب جمعہ کی ادائیگی بند کردی گئی تو اب اس کو پھر سے شروع کرنا کیسا ہے؟

{۳} کیا گاؤں کے ذمہ داروں پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ کوشش کریں کہ جمعہ شروع نہ ہوسکے۔

امید ہے کہ آپ دلائل سے مسائل کا حل فرما کر لوگوں کو صحیح حکم پر عمل کرنے کی ترغیب دیں گے، تاکہ فتنہ ختم ہوجائے۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

{۱} ڈابھیل کے مفتی صاحب کا فتویٰ صحیح ہے کہ جمعہ چھوٹے گاؤں میں جائز نہیں ہے، قیام جمعہ کی جو شرطیں ہیں، وہی عیدین کی نماز کے لیے بھی ہیں؛ اس لیے عید کی نماز بھی جائز نہیں ہے۔ اور بعضوں کا یہ کہنا کہ: ''آباء و اجداد پڑھتے آئے ہیں، تو پھر ہم کو بھی پڑھنا چاہیے'' درست نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر آباء و اجداد نے کوئی ناجائز کام کیا ہو، تو ہمارے لیے اس کو بجالانا جائز نہیں، حرام ہے۔ [۱] حنفی فقہ کی تمام کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ چھوٹے گاؤں میں جمعہ اور عیدین کی نماز جائز نہیں ہے۔ (بحر، شامی، عالمگیری، ہدایہ) [۲]

{۲} جمعہ کے بہ حسن و خوبی بند ہو جانے کے بعد جو لوگ جمعہ شروع کریں گے یا کسی بھی طرح شروع کرنے میں مدد کریں گے، وہ سب گنہ گار ہوں گے۔ اور جمعہ کی ادائیگی درست نہ ہونے کی وجہ سے ظہر، ذمہ

---

(۱) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۰۴﴾ (۵-المائدة: ۱۰۴)

ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کلام نازل کیا ہے، اس کی طرف اور رسول کی طرف آؤ، تو وہ کہتے ہیں کہ: ہم نے جس (دین پر) اپنے باپ دادوں کو پایا ہے، ہمارے لیے وہی کافی ہے۔ بھلا اگر ان کے باپ دادے ایسے ہوں کہ نہ ان کے پاس کوئی علم ہو، اور نہ کوئی ہدایت تو کیا پھر بھی (یہ انہی کے پیچھے چلتے رہیں گے؟) [ترجمہ مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم]

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿۲۱﴾ (۳۱-لقمان: ۲۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کا اتباع کرو، جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں، تو کہتے ہیں کہ نہیں! ہم اس کا اتباع کریں گے، جس پر اپنے بڑوں کو پایا ہے، کیا اگر شیطان ان کے بڑوں کو عذاب دوزخ کی طرف بلاتا رہا ہو تب بھی۔ (ترجمہ حضرت تھانوی)

(۲) (قوله شرط أدائها المصر) أي شرط صحتها أن تؤدى في مصر حتى لا تصح في قرية، ولا مفازة؛ لقول علي - رضي الله عنه - لا جمعة، ولا تشريق، ولا صلاة فطر، ولا أضحى إلا في مصر جامع أو في مدينة عظيمة. (البحر الرائق: ۲/ ۲۴۵، أبواب الصلاة، صلاة الجمعة دار الكتاب ديوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: زكريا ديوبند)

(ويشترط لصحتها) سبعة أشياء، الأول المصر... وعليه فتوى أكثر الفقهاء. (رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: زكريا- ديوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: زكريا- ديوبند☆ الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۸۲، باب صلاة الجمعة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

وفي القنية: صلاة العيد في القرى تكره تحريمًا. (الدر المختار) ———— قال ابن عابدين: (قوله: صلاة العيد) ومثله الجمعة. (رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۴۶، كتاب الصلاة، باب صلاة العيد، ط: زكريا-ديوبند ☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۲، الباب السابع عشر في صلاة العيد، ط: زكريا- ديوبند)

میں باقی رہے گی، اور ظہر چھوڑ دینے کا گناہ لاحق ہوگا، جولوگ ظہر کو چھوڑ دیں گے، وہ تو گنہ گار ہوں گے ہی، ساتھ ہی جولوگ مدد کریں گے، ان کو بھی جمعہ پڑھنے والوں کی ظہر ترک کرنے کا سبب بننے کی وجہ سے گناہ ہوگا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) الدال علی الخیر کفاعله، و الدال علی الشر کفاعله. (حدیث)[۳]

(۲) من سن في الإسلام سنة حسنة، فله أجرها، و أجر من عمل بها بعده، من غير أن ينقص من أجورهم شيء، و من سن في الإسلام سنة سيئة، كان عليه وزرها و وزر من عمل بها من بعده، من غير أن ينقص من أوزارهم شيء.[۴]

جو شخص اچھا کام کرے گا اس کو اس کا ثواب ملے گا، اور جو اس پر چلے گا، اس کا بھی ثواب اس کو ملے گا، اسی طرح جو شخص برا طریقہ رائج کرے گا، تو اس کا گناہ ہوگا اور جو اس کے رائج کیے ہوئے طریقے پر چلے گا، اس کا بھی گناہ اس کو ہوگا۔

{۳} گاؤں کے بڑے اور ذمہ دار حضرات اپنی طاقت کے مطابق لوگوں کو سمجھائیں کہ یہاں جمعہ شروع نہیں کر سکتے، یہ ہر ایک عقل مند مؤمن کی ذمہ داری ہے: ألا كلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته.[۵] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خبردار! تم میں سے ہر یک ذمہ دار و نگراں ہے، تم سب سے اس کی ذمہ داری کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

گاؤں کے بڑے، سمجھ دار، ذمہ دار حضرات، لوگوں کو سمجھائیں، اگر وہ لوگ سمجھ جائیں، تو یہی ہمارا

---

(۳) المعجم في أسامي شيوخ أبي بكر الإسماعيلي - أبو بكر أحمد بن إبراهيم بن إسماعيل بن العباس بن مرداس الإسماعيلي الجرجاني (م: ۳۷۱ھ): ۱/ ۴۶۶، عن أنس رضي الله عنه، حرف الألف، ت: د. زياد محمد منصور، ط: مكتبة العلوم و الحكم - المدينة المنورة.

[۴] الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۲۷، رقم الحديث: ۶۹ - (۱۰۱۷)، كتاب الزكاة، باب الحث على الصدقة الخ، ط: البدر - ديوبند.

(۵) عن عبد الله، قال النبي صلى الله عليه وسلم: كلكم راع و كلكم مسئول، فالإمام راع و هو مسئول، و الرجل راع على أهله و هو مسئول، و المرأة راعية على بيت زوجها و هي مسئولة، و العبد راع على مال سيده و هو مسئول، ألا فكلكم راع و كلكم مسئول. (صحيح البخاري: ۲/ ۷۷۹، رقم الحديث: ۵۱۸۸، كتاب النكاح، باب: قوا أنفسكم و أهليكم نارا، ط: البدر - ديوبند)

مقصود ہے، ورنہ ان کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہ کریں، کہ یہ فتنہ وفساد کا سبب بنے گا جو کہ حرام ہے۔[1]

بل کہ ایسی صورت جو لوگ جمعہ پڑھنا چاہتے ہیں، وہ شہر یا بڑے قصبہ میں جا کر جمعہ ادا کر لیں اور لوگوں کی نماز کی ذمہ داری اپنے سر پر لینے سے بچیں۔ اور گاؤں میں اختلاف کی چنگاری کو ہوا دینے کی کوشش نہ کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] بستی سے باہر ایک کلومیٹر کی دوری پر کالونی میں جمعہ ادا کرنا

۱۰۴۱- سوال: ہمارے گاؤں سے باہر ایک کلومیٹر کی دوری پر ایک کالونی بنائی گئی ہے، کالونی حکومتی قانون کے اعتبار سے نگر پنچایت کی حدود میں درج ہے، جہاں مسلمانوں کے پچاس گھر آباد ہیں، اُس سے متصل بھی کچھ مسلمانوں کے گھر ہیں، پھر اُس کالونی سے آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر دوسرا گاؤں ہے، فی الحال اس کالونی میں پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کی جارہی ہے، اور کالونی کے مسلمانوں کی اب یہ تمنا ہے کہ نمازِ جمعہ بھی قائم کریں، تو اس کالونی میں جمعہ کے قیام کے متعلق حکمِ شرعی کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

سوال میں مذکور کالونی چوں کہ بستی کی حد سے باہر ہے، اس لیے اُس میں جمعہ قائم کرنا جائز نہیں ہے، جمعہ کے قیام کے لیے بستی کی حد میں ہونا، تمام ضروریاتِ زندگی کا دستیاب ہونا اور بستی کا بڑا ہونا شرط ہے، جو اس کالونی میں نہیں پائی جارہی ہیں، لہٰذا اُس میں جمعہ قائم کرنا صحیح نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] چھوٹے دیہات میں رہنے والے کا جمعہ ترک کرنا

۱۰۴۲- سوال: میں گڑکاچھ نامی ایک چھوٹے دیہات میں امامت کرتا ہوں، ساتھ میں مکتب کے

(۱) إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۲۸-القصص:۵۶)
ترجمہ: آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے؛ بل کہ اللہ جس کو چاہے، ہدیت کر دیتا ہے اور ہدایت پانے والوں کا علم (بھی) اسی کو ہے۔
وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (۲-البقرة:۱۹۱) ——— ترجمہ: اور فتنہ قتل سے زیادہ سنگین برائی ہے۔
(۲) (ويشترط لصحتها) سبعة أشياء، الأول المصر ... وعليه فتوى أكثر الفقهاء. (رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: زكريا- ديوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: زكريا-ديوبند ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۸۲، باب صلاة الجمعة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

بچوں کو دینی تعلیم بھی دیتا ہوں، چھوٹا دیہات ہونے کے سبب وہاں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی؛ لہٰذا میں جمعہ کے دِن ظہر کی نماز پڑھاتا ہوں، سوال یہ ہے کہ جس آدمی کی مسلسل تین جمعہ یا ظہر چھوٹ جائے اُس کا کیا حکم ہے؟ اسی طرح اگر کوئی آدمی گاؤں کا باشندہ ہے اور مسلسل تین جمعہ تک کسی کام سے جمعہ میں شامل نہ ہوسکا، تو اُس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

گڑ کا چھ جب چھوٹا دیہات ہے، جس میں صحتِ جمعہ کے شرائط نہیں پائے جارہے ہیں؛ تو وہاں جمعہ پڑھنا صحیح نہیں ہے، آپ ظہر پڑھارہے ہیں، وہی صحیح ہے، لیکن اگر آپ کے گاؤں گڑ کا چھ کا کوئی باشندہ اپنی کسی بھی ضرورت سے موسالی، مانگرول یا سورت جیسے بڑے قصبے یا شہر میں آیا ہے اور جمعہ کا وقت ہوچکا ہے، تو اس پر جمعہ کی نماز فرض ہوگی، اگر یہ آدمی جمعہ چھوڑ دے گا، تو گنہ گار ہوگا، مسلسل تین جمعہ کے چھوڑنے کی وعید اس شخص کے لیے ہے، جس پر جمعہ فرض ہو اور وہ ایسی جگہ رہتا ہو، جہاں جمعہ فرض ہو، آپ کے دیہات میں جمعہ فرض نہیں ہے، لہٰذا جو لوگ جمعہ کے وقت گاؤں ہی میں ہیں، اُن پر جمعہ فرض نہیں ہے؛ انھیں ظہر کی نماز پڑھنا ضروری ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] چھوٹی بستی میں قیام جمعہ

۱۰۴۳- سوال: ہماری بستی کھیتوں میں آباد ہے، جس میں مسلمانوں کے کل بائیس مکانات ہیں، اور تمام مکانات ایک دوسرے سے کافی دوری پر واقع ہیں، تمام ضروریاتِ زندگی دستیاب نہیں ہیں، اور اُس کے علاوہ جمعہ کے دیگر شرائط بھی مفقود ہیں، تو ہمیں جمعہ کے دِن جمعہ ادا کرنی چاہیے یا ظہر پڑھنی چاہیے؟

---

(۱) (ویشترط لصحتها) سبعة أشياء، الأول المصر . . . وعليه فتوى أكثر الفقهاء. (رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: زكريا- ديوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: زكريا- ديوبند☆ الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۸۲، باب صلاة الجمعة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

وفي الخلاصة القروي إذا دخل المصر يوم الجمعة إن نوى أن يمكث فيه يوم الجمعة لزمته الجمعة، وإن نوى الخروج من ذلك المصر من يومه قبل دخول وقت الصلاة لا تلزمه وبعد دخول وقت الجمعة تلزمه قال الفقيه إن نوى الخروج من يومه ذلك، وإن كان بعد دخول وقت الجمعة لا تلزمه. (البحر الرائق: ۲/ ۱۵۱، باب صلاة الجمعة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

الجواب حامداً ومصلیا:

جمعہ کے صحیح ہونے کے لیے شہر، قصبہ یا ایسا بڑا گاؤں ہونا ضروری ہے، جہاں تمام ضروریاتِ زندگی دست یاب ہوں، نیز لوگوں کی سہولت کے خاطر پولس چوکی اور پوسٹ آفس وغیرہ کا انتظام ہو، اور یہ تمام چیزیں نہ ہونے کی وجہ سے آپ کی بستی چھوٹی ہے، جس میں جمعہ صحیح نہیں، آپ لوگوں کو چاہیے کہ جمعہ کے دن ظہر کی نماز ادا کریں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] کارخانے والے علاقے میں جمعہ کا حکم

۱۰۴۴- سوال: ایک چوراہے پر ایک مسجد واقع ہے، اس چوراہے کی چاروں جانب میں مسلسل چار کلومیٹر تک کارخانے اور رہائشی تعمیرات ہیں، چوراہے کے اس علاقہ میں مخلوط آبادی ہے، سرکاری اسکول بھی قائم ہے، نیز تمام ضروریاتِ زندگی دستیاب ہیں، ان احوال کے پیش نظر کیا اس مسجد میں جمعہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اگر مسجد کا جائے وقوع ایسے علاقہ میں ہے کہ وہاں کارخانوں کے علاوہ رہائشی مکانات بھی ہیں، جن کی وجہ سے کارخانوں کے بند رہنے کے اوقات میں بھی بڑے گاؤں جیسی آبادی رہتی ہو، ضروریاتِ زندگی دست یاب ہوں اور کم از کم دو یا تین ہزار کی آبادی ہو، تو یہ جگہ بھی مستقل قریۂ کبیرہ کے حکم میں ہے، اس جگہ جمعہ صحیح؛ بل کہ واجب ہے۔ (۲)

اگر اس جگہ کارخانوں کے بند ہونے کے اوقات میں آبادی نہ رہتی ہو، تو جمعہ جائز نہیں۔ (۳)

---

(۱) تقدم تخريجه غير مرة.

(۲) تقع فرضا في القصبات والقرى الكبيرة التي فيها أسواق. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۳۸/۲، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) (ويشترط لصحتها) سبعة أشياء:

الأول: (المصر، وهو ما لا يسع أكبر مساجده أهله المكلفين بها) وعليه فتوى أكثر الفقهاء، مجتبى؛ لظهور التواني في الأحكام. ــــــ قال ابن عابدين: (قوله وعليه فتوى أكثر الفقهاء إلخ) وقال أبو شجاع: هذا أحسن ما قيل فيه. وفي الولوالجية وهو صحيح بحر، وعليه مشى في الوقاية ومتن المختار وشرحه وقدمه في متن الدرر على القول الآخر وظاهره ترجيحه وأيده صدر الشريعة بقوله لظهور التواني في أحكام الشرع سيما في إقامة الحدود في الأمصار. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱۳۷/۲، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت)

اگر یہ جگہ کسی شہر یا بڑی بستی کے فناء میں واقع ہو تو آبادی کے کم ہونے کے باوجود جمعہ صحیح ہے۔

فناء کا مطلب یہ ہے کہ شہر یا بستی کی وہ تعمیرات اور جگہیں جو اُس شہر یا بستی کے مصالح اور سہولیات کے لیے قائم ہوں، مثلاً عیدگاہ، قبرستان، اسکول، ہسپتال اور پولس تھانہ وغیرہ۔[1]

سوال میں مذکور کارخانوں کی تعمیرات اگر کسی قصبہ سے متعلق نہ ہوں، تو وہ اُس کے فناء میں داخل نہیں ہیں، اور اِس شکل میں وہاں جمعہ جائز نہیں، الا یہ کہ اِن کارخانوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اُس جگہ کی مستقل آبادی اتنی ہو کہ وہ قریہ کبیرہ کے حکم میں ہو۔ (درمختار علی الشامی: ۲/ ۱۳۸)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] دیہات میں فتنہ وفساد سے بچنے کے لیے امام کا نماز جمعہ پڑھانا

۱۰۴۵- سوال: آج سے دس سال پہلے میں نے جمعہ کی نماز کے بارے میں مسئلہ پوچھا تھا اور اپنے گاؤں کی پوری تفصیل ذکر کی تھی۔ جامعہ کی مہر کے ساتھ لکھا تھا کہ مذکورہ تفصیل کے مطابق آپ کے گاؤں میں نماز نہیں ہوتی۔ ظہر پڑھنی بہتر ہے؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں لوگ کئی سالوں سے

---

(۱) أما المصر الجامع فشرط وجوب الجمعة وشرط صحة أدائها عند أصحابنا حتى لا تجب الجمعة إلا على أهل المصر ومن كان ساكنا في توابعه وكذا لا يصح أداء الجمعة إلا في المصر وتوابعه فلا تجب على أهل القرى التي ليست من توابع المصر ولا يصح أداء الجمعة فيها. ــــــــــ وأما تفسير توابع المصر فقد اختلفوا فيها روي عن أبي يوسف أن المعتبر فيه سماع النداء إن كان موضعا يسمع فيه النداء من المصر فهو من توابع المصر وإلا فلا. . . وروى ابن سماعة عن أبي يوسف كل قرية متصلة بربض المصر فهي من توابعه وإن لم تكن متصلة بالربض فليست من توابع المصر، وقال بعضهم: ما كان خارجا عن عمران المصر فليس من توابعه. وقال بعضهم: المعتبر فيه قدر ميل وهو ثلاثة فراسخ، وقال بعضهم: إن كان قدر ميل أو ميلين فهو من توابع المصر وإلا فلا، وبعضهم قدره بستة أميال، . . . وعن أبي يوسف أنها تجب في ثلاثة فراسخ، وعن الحسن البصري أنها تجب في أربعة فراسخ، وقال بعضهم: إن أمكنه أن يحضر الجمعة ويبيت بأهله من غير تكلف تجب عليه الجمعة وإلا فلا وهذا حسن. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۵۹- ۲۶۰، كتاب الصلاة، فصل في بيان شرائط الجمعة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۳۸- ۱۳۹، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر- بيروت☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: زكريا- ديوبند)

وأما الفناء وهو المكان المعد لمصالح البلد كركض الدواب ودفن الموتى وإلقاء التراب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۲۱، باب صلاة المسافر)

[۲] حاشیہ نمبر ا دیکھیے۔

جمعہ کی نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں؛ اس لیے جمعہ بند نہیں کر سکتے، ایک مرتبہ کوشش بھی کی تھی لیکن ناکام رہا۔

بہت سی مرتبہ مجھے بھی جمعہ پڑھانی پڑتی ہے، تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ظہر پڑھنی چاہیے یا جمعہ پڑھنی چاہیے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

آپ کی تحریر کے مطابق آپ کے پاس فتویٰ موجود ہے کہ آپ کے گاؤں میں از روئے شرع جمعہ کی نماز نہیں ہوسکتی؛ اس لیے اصل حکم تو یہی ہے کہ جمعہ نہ پڑھی جائے اور ظہر کی نماز باجماعت ادا کی جائے۔[1]

لیکن چوں کہ لوگ پہلے سے پڑھتے چلے آئے ہیں؛ اس لیے اسے بند کرنے میں اگر فتنہ کا اندیشہ ہو، تو ان کو جمعہ کی نماز پڑھنے دیں اور بہتر یہی ہے کہ آپ پڑھا دیں؛ کیوں کہ قرآن میں ہے: وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ.[2] یعنی فتنہ برپا کرنا خون خرابے سے زیادہ خطرناک ہے؛ لہٰذا آپ ایسے حالات میں جمعہ پڑھا سکتے ہیں؛ لیکن جمعہ کے بعد آپ کے لیے ظہر کی چار رکعت پڑھ لینا ضروری ہے: ثم في كل موضع وقع الشك في جواز الجمعة لوقوع الشك في المصر أو غيره وأقام أهله الجمعة ينبغي أن يصلوا بعد الجمعة أربع ركعات وينووا بها الظهر حتى لو لم تقع الجمعة موقعها يخرج عن عهدة فرض الوقت بيقين، كذا في الكافي، وهكذا في المحيط ثم اختلفوا في نيتها قيل: ينوي آخر ظهر عليه وهو الأحسن والأحوط أن يقول: نويت آخر ظهر أدركت وقته ولم أصله بعد، كذا في القنية. (عالم گیری: ۱/۱۴۵)[3] واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] قصبہ سے قریب ہوٹل والوں پر جمعہ

۱۰۴۶- سوال: ''ممبئی- دہیسر'' سے ہماری ہوٹل دو کلومیٹر دور ہے، جو ایک چھوٹا سا دیہات ہے، وہاں کئی شافعی مسلمانوں کی آبادیاں ہیں، اس جگہ جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور ممبئی کی حد ''دہیسر'' چیک ناکہ پر ختم ہوجاتی ہے اور یہاں پر مسلمانوں کی آبادی نہیں ہے، ہمارے قریب میں دائیں جانب ''دلی دربار ہوٹل'' ہے۔ اور بائیں طرف بھینس کا طبیلہ (بھینس کا باڑا) ہے، جہاں تھوڑے سے مسلمان ہیں۔ ممبئی بی ایس ٹی

---

(۱) ومن لا تجب عليهم الجمعة من أهل القرى والبوادي لهم أن يصلوا الظهر بجماعة يوم الجمعة بأذان وإقامة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۵، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) ۲-البقرة: ۲۱۷۔

[۳] الباب السادس عشر في صلاة الجمعة، ط: دار الفكر- بيروت.

(ممبئی کی سرکاری بسیں) رکشہ اور ٹیکسی یہاں تک نہیں آتی، دوکلومیٹر پہلے چیک ناکہ ہے، وہاں تک یہ سب سہولت ہے۔

یہاں سے گجرات کی طرف بس گھنٹہ دو گھنٹہ بعد ملتی ہے، ضروریات زندگی کی تمام چیزیں یہاں دست یاب نہیں ہیں، زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی آبادی ۲۰۰۰ سے ۳۰۰۰ کے قریب ہوگی، ''دلی دربار ہوٹل'' سے تھوڑے فاصلے پر میرا گاؤں (کاشی) ہے، وہاں پولس چوکی ہے اور مسلمانوں کی آبادی ہے، بڑی مسجد بھی ہے اور پانچوں وقت نماز بھی ہوتی ہے اور جمعہ کی نماز بھی ادا کی جاتی ہے؛ لیکن ہم لوگ اپنی ہوٹل، دہلی دربار میں اور طبیلہ (تینوں جگہ) ظہر ادا کرتے ہیں، جمعہ پڑھنے کے لیے گاؤں نہیں جاتے، یہاں نہ کورٹ ہے، نہ گجراتی اسکول ہے اور نہ اردو اسکول ہے اور شہر میں جو سہولتیں رہتی ہے، وہ یہاں نہیں ہے اور سامنے نیشنل ہائی وے ہے، جس پر کم از کم ایک منٹ پر ایک گاڑی کا گذر ہوتا ہے۔ ان تمام تفصیلات کی روشنی میں بتائیں کہ کیا ہم پر جمعہ واجب ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

شہر یا قصبہ کی اذان آپ سنتے ہوں، تو جمعہ کے لیے قصبہ یا شہر جانا ضروری ہے، اگر آپ اذان کی آواز نہیں سنتے اور آپ جس بستی میں رہتے ہیں، وہاں ضروریات زندگی نہیں ملتیں، تو آپ کو ظہر پڑھنی چاہیے، جمعہ کے لیے قصبہ یا شہر جانا ضروری نہیں۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) وأما تفسير توابع المصر فقد اختلفوا فيها، روي عن أبي يوسف أن المعتبر فيه سماع النداء إن كان موضعا يسمع فيه النداء من المصر فهو من توابع المصر وإلا فلا، وقال الشافعي: إذا كان في القرية أقل من أربعين فعليهم دخول المصر إذا سمعوا النداء، وروى ابن سماعة عن أبي يوسف: كل قرية متصلة بربض المصر فهي من توابعه، وإن لم تكن متصلة بالربض فليست من توابع المصر، وقال بعضهم: ما كان خارجا عن عمران المصر فليس من توابعه. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۶۰، كتاب الصلاة، فصل في شرائط الجمعة، ط: دار الكتب العلمية☆الاختيار لتعليل المختار: ۱/ ۸۷، باب صلاة الجمعة، ط: دار الكتب العلمية☆البناية شرح الهداية-بدر الدين العينى (المتوفى: ۸۵۵ھ): ۳/ ۴۳، باب صلاة الجمعة، صلاة الجمعة في القرى، ط: دار الكتب العلمية-بيروت، لبنان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب العیدین

[عیدین کا بیان]

[۱] ۱۳؍ذی الحجہ کی عصر کی نماز اور عید کی نماز کے بعد تکبیر تشریق پڑھنے کا حکم

۷۰۴۱- سوال: تکبیر تشریق ذی الحجہ کی ۹؍تاریخ سے ۱۳؍ذی الحجہ کی عصر تک پڑھی جاتی ہے، تو کیا ۱۳؍ذی الحجہ کی عصر کی نماز کے بعد بھی تکبیر پڑھی جائے گی؟ نیز عید کی واجب نماز کے بعد تکبیر کہنے کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

تکبیر تشریق ۱۳؍ذی الحجہ کی عصر کی نماز کے بعد بھی پڑھنا واجب ہے۔ ۹؍ذی الحجہ کی صبح کی نماز سے لے کر ۱۳؍ذی الحجہ کی عصر کی نماز تک کل ۲۳؍نمازوں کے بعد تکبیر کہنا- کچھ شرائط کے ساتھ- واجب ہے۔ (عالم گیری: ۱؍۵۵- البحر الرائق: ۲؍۱۶۵)[۱]

اور عید کے نماز کے بعد تکبیر کے متعلق علماء احناف کے درمیان اختلاف ہے، علمائے بلخ عید کی نماز

---

[۱] وعندهما ينتهي بالتكبير عقب العصر من آخر أيام التشريق وهي ثلاث وعشرون صلاة، وهو قول عمر وعلي ورجحاه؛ لأنه الأكثر، وهو الأحوط في العبادات ورجح أبو حنيفة قول ابن مسعود؛ لأن الجهر بالتكبير بدعة فكان الأخذ بالأقل أولى احتياطا.ـــــــــ وقد ذكروا في مسائل السجدات أن ما تردد بين بدعة وواجب فإنه يؤتى به احتياطا وما تردد بين بدعة وسنة يترك احتياطا كما في المحيط وغيره، وهو يقتضي ترجيح قولهما؛ ولهذا ذكر الإسبيجابي وغيره أن الفتوى على قولهما، وفي الخلاصة، وعليه عمل الناس اليوم، وفي المجتبى والعمل والفتوى في عامة الأمصار وكافة الأعصار على قولهما. (البحر الرائق: ۲؍۱۷۸، باب صلاة العيدين، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ۱؍۱۵۲، كتاب الصلاة، الباب السابع عشر في صلاة العيدين، ط: زكريا- ديوبند)

کے بعد بھی تکبیر پڑھا کرتے تھے۔ (شامی: ۱/ ۷۸۶- البحر الرائق: ۲/ ۱۶۵)[۱] اسی پر مسلمانوں کا تسلسل کے ساتھ عمل ہے، گویا یہ عمل متوارث ہے۔

نوٹ: ۲۳/ نمازوں میں عید کی نماز داخل نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] تکبیر تشریق پڑھنے کی مقدار

۱۰۴۸- سوال: عید الاضحیٰ کے موقع پر ہر نماز کے بعد بلند آواز کے ساتھ تکبیر تشریق پڑھی جاتی ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ بلند آواز سے کتنی مرتبہ یہ تکبیر پڑھنا واجب ہے؟ بعض جگہوں پر تین مرتبہ پڑھتے ہیں، تو یہ تین مرتبہ پڑھنا واجب ہے یا مستحب؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

الجواب حامداً ومصلياً:

تکبیر تشریق ایک مرتبہ بلند آواز سے پڑھنا واجب ہے۔ (عالم گیری ☆ شامی: ۱/ ۷۸۵)[۲] اور ایک سے زائد دفعہ پڑھنا سنت کے خلاف ہے۔ (مجمع الانہر: ۱/ ۱۷۶- شامی: ۱/ ۷۸۵)[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] ولا بأس به عقب العيد لأن المسلمين توارثوه فوجب اتباعهم، وعليه البلخيون. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله ولا بأس إلخ) كلمة لا بأس قد تستعمل في المندوب كما في البحر من الجنائز والجهاد ومنه هذا الموضع لقوله فوجب اتباعهم (قوله فوجب) الظاهر أن المراد بالوجوب الثبوت لا الوجوب المصطلح عليه، وفي البحر عن المجتبى: والبلخيون يكبرون عقب صلاة العيد لأنها تؤدى بجماعة فأشبهت الجمعة اهـ وهو يفيد الوجوب المصطلح عليه ط. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۸۰، باب العيدين)

وفي المجتبى والبلخيون يكبرون عقب صلاة العيد؛ لأنها تؤدى بجماعة فأشبه الجمعة اهـ.

وفي مبسوط أبي الليث، ولو كبر على إثر صلاة العيد لا بأس به؛ لأن المسلمين توارثوا هكذا فوجب أن يتبع توارث المسلمين اهـ. (البحر الرائق: ۲/ ۱۷۹، كتاب الصلاة، باب العيدين)

(۲) وأما عدده وماهيته فهو أن يقول مرة واحدة: الله أكبر الله أكبر لا إله إلا الله والله أكبر الله أكبر ولله الحمد. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۲، كتاب الصلاة، الباب السابع عشر في صلاة العيدين، تكبيرات أيام التشريق، ط: دار الفكر)

(ويجب تكبير التشريق) في الأصح للأمر به (مرة) وإن زاد عليها يكون فضلا قاله العيني. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله وإن زاد إلخ) أفاد أن قوله مرة بيان للواجب، لكن ذكر أبو السعود أن الحموي نقل عن القراحصاري أن الإتيان به مرتين خلاف السنة. اهـ ـــــ قلت: وفي الأحكام عن البرجندي ثم المشهور من قول علمائنا أنه يكبر مرة وقيل: ثلاث مرات. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۷۷-۱۷۸، باب العيدين، مطلب يطلق اسم السنة على الواجب، ط: دار الفكر - بيروت)

[۳] (وصفته) أي صفة التكبير (أن يقول مرة) حتى لو زاد لقد خالف السنة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - داماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۱۷۶، باب صلاة العيدين، صفة التكبير في صلاة العيد، ط: دار إحياء التراث العربي)

[۳] عید کی نماز میں ایک زائد تکبیر چھوٹ جائے، تو کیا حکم ہے؟

۱۰۴۹- سوال: ہمارے گاؤں میں عید الاضحیٰ کی نماز میں امام صاحب نے پہلی رکعت میں تین زائد تکبیروں کے بجائے صرف دو تکبیر کہی، تو نماز ہوئی یا نہیں؟ پھر مصلیوں کے کہنے پر دوبارہ نماز پڑھائی گئی، تو یہ کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں مجتمع ہوکر دو رکعت کی صورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت وبندگی کی جاتی ہے، اس میں ۶/ زائد تکبیریں واجب ہیں، واجب اگر بھول سے چھوٹ جائے، تو سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے؛[1] اور امام سجدۂ سہو کر لے، تو نماز ہو جاتی ہے؛ یہاں بھی واجب کا ترک ہوا ہے؛ اس لیے اصولاً سجدۂ سہو کرنا چاہیے؛ لیکن عید کی نماز میں امام نے سجدۂ سہو اس لیے نہیں کیا کہ لوگ زیادہ ہیں، سجدۂ سہو کرنے سے غلط فہمی پیدا ہوگی، کوئی کرے گا اور کوئی نہیں کرے گا، گویا ایک طرح کا انتشار پیدا ہوگا، اس وجہ سے امام نے بغیر

---

(۱) امام اگر قراءت سے پہلے تکبیرات زوائد کو بھول جائے، تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگر رکوع میں جانے سے قبل یاد آجائے، تو اسی وقت اسے ادا کرلے، اور اگر رکوع میں چلا گیا، تو اب کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلے میں دو رائیں ہیں: ایک یہ کہ رکوع ہی میں ان زائد تکبیرات کو کہہ لے، اور دوسری یہ کہ ان تکبیرات کو کہنے کی ضرورت نہیں رہی، یوں ہی نماز پوری کرلی جائے۔ (وإذا نسي الإمام تكبيرات العيد حتى قرأ فإنه يكبر بعد القراءة، أو في الركوع ما لم يرفع رأسه، كذا في التتارخانية. (عالم گیری: ۱/ ۱۵۱، کتاب الصلاۃ، الباب السابع عشر في صلاۃ العیدین، ط: دار الفکر- بیروت ☆ در مختار مع شامی: ۲/ ۱۷۴، باب العیدین، ط: بیروت ☆ مستفاد از: کتاب الفتاویٰ- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی: ۸/ ۲۰۹-۲۱۰)

پہلا قول راجح ہے، کیوں کہ تکبیرات زوائد واجب ہیں اور تسبیحات مسنون ہیں، اور مسنون کے مقابلے میں واجب کی ادائیگی مقدم ہے۔ ثم إذا ركع يكبر تكبيرات العيد في الركوع عند أبي حنيفة ومحمد، وقال أبو يوسف: لا يكبر؛ لأنه فات عن محلها وهو القيام فيسقط كالقنوت، ولهما أن للركوع حكم القيام ألا ترى أن مدركه يكون مدركا للركعة فكان محلها قائما فيأتي بها ولا يرفع يديه، بخلاف القنوت؛ لأنه بمعنى القراءة فكان محله القيام المحض، وقد فات ثم إن أمكنه الجمع بين التكبيرات والتسبيحات جمع بينهما، وإن لم يمكنه الجمع بينهما بالتكبيرات دون التسبيحات؛ لأن التكبيرات واجبة والتسبيحات سنة، والاشتغال بالواجب أولى. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۷۸، فصل صلاة العيدين، فصل بيان قدر صلاة العيدين وكيفية أدائها، ط: دار الكتب العلمية ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۵۵-۵۷، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ العیدین، ط: زکریا دیوبند)

سجدۂ سہو کے نماز پوری کرلی، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، نماز ہوگئی، اسے دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ (عالم گیری، شامی)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] امام صاحب اگر عیدین کی زائد تکبیر کہنا بھول جائے

۱۰۵۰- سوال: عید کی نماز میں چھ تکبیرات زائدہ واجب ہیں، اور ان کی ادائیگی کا محل بھی مقرر و متعین ہے، اگر اس کے خلاف ہوجائے، تو کیا نماز ہوگی یا نہیں؟ مثلاً اگر امام پہلی رکعت میں تکبیر بھول جائے، تو اب وہ اس کو کب ادا کرے؟ اگر ایک ہی وقت میں چھ تکبیریں ایک ساتھ ادا کردے، تو صحیح ہے یا نہیں؟ اور اگر دونوں ہی رکعتوں میں تکبیر بھول جائے، تو کیا سجدۂ سہو سے اس کی تلافی ہوجائے گی؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداو مصليا:

عید کی ۶ رتکبیریں واجب ہیں، بھول سے کمی بیشی ہوجائے، یا بالکل بھول جائے، یا غیر محل میں ہوجائے، تو سجدۂ سہو سے نماز ادا ہوجائے گی۔ یہ بات بدائع الصنائع اور البحر الرائق میں لکھی ہے۔[۲] اسی

---

[۱] (ومنها تكبيرات العيدين) قال في البدائع: إذا تركها أو نقص منها أو زاد عليها أو أتى بها في غير موضعها فإنه يجب عليه السجود، كذا في البحر الرائق. ـــــــ ويستوي في الزيادة والنقصان القليل والكثير فقد روي عن الحسن عن أبي حنيفة -رحمه الله- إذا سها الإمام عن تكبيرة واحدة في صلاة العيد يسجد للسهو، كذا في الذخيرة. السهو في الجمعة والعيدين والمكتوبة والتطوع واحد إلا أن مشايخنا قالوا لا يسجد للسهو في العيدين والجمعة؛ لئلا يقع الناس في فتنة، كذا في المضمرات ناقلا عن المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۸، الباب الثاني عشر في سجود السهو، فصل سهو الإمام يوجب عليه وعلى من خلفه السجود، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۹۲، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) وكذلك تكبيرات العيدين إذا تركها أو نقص منها؛ لأنها واجبة، وكذا إذا زاد عليها أو أتى بها في غير موضعها؛ لأنه يحصل تغيير فرض أو واجب. ـــــــ وكذلك قراءة التشهد إذا سها عنها في القعدة الأخيرة ثم تذكرها قبل السلام أو بعد ما سلم ساهيا - قرأها وسلم وسجد للسهو، لأنها واجبة. (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۶۷، كتاب الصلاة، فصل بيان سبب وجوب سجود السهو، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

العاشر: تكبيرات العيدين قال في البدائع إذا تركها أو نقص منها أو زاد عليها أو أتى بها في غير موضعها فإنه يجب عليه السجود. (البحر الرائق: ۲/ ۱۰۳، باب سجود السهو، الإمام إذا سها عن التكبيرات حتى ركع، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۹۲، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، ط: دار الفكر-بيروت)

طرح عالمگیری جلد ا صفحہ ۱۰۲ میں بھی موجود ہے۔[۱]

لیکن آگے محیط کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جمعہ وعیدین میں غلطی ہوجائے، تو سجدۂ سہو نہ کرے۔ (عالمگیری جلد ا، صفحہ ۱۰۳)[۲]

کیوں کہ بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہوں گے کہ جو سال میں ایک نماز ادا کرنے والے ہوں گے، وہ سجدۂ سہو کا سلام پھیرنے کی وجہ سے یہ سمجھ لیں گے کہ نماز ختم ہوگئی، جس کی وجہ سے ایک فتنہ کھڑا ہوجائے گا۔ اسی طرح عید کی طریقۂ نماز سے ناآشنا لوگ یہ گمان کرلیں گے کہ عید کی نماز کا طریقہ یہی ہے کہ آخری رکعت میں چار سجدے ہوتے ہیں؛ اس لیے فقہاء کرامؒ نے لکھا ہے کہ عیدین کی نماز میں سہو ہوجائے، تو سجدۂ سہو نہ کرے۔[۳]

جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۂ الم سجدہ پڑھنا مسنون ہے۔[۴] اس سورت میں سجدہ کی آیت ہے، جس کی وجہ سے پہلی رکعت میں سجدہ تلاوت کیا جاتا ہے۔ بعض ممالک کے حجاج، حج کے لیے گئے، وہاں سے لوٹ کر عرض کیا کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں جمعہ کے دن فجر کی نماز ''تین رکعت'' ہوتی ہے۔

---

[۱] (ومنها تكبيرات العيدين) قال في البدائع: إذا تركها أو نقص منها أو زاد عليها أو أتى بها في غير موضعها فإنه يجب عليه السجود، كذا في البحر الرائق. ـــــــــــ ويستوي في الزيادة والنقصان القليل والكثير فقد روي عن الحسن عن أبي حنيفة - رحمه الله - إذا سها الإمام عن تكبيرة واحدة في صلاة العيد يسجد للسهو، كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۸، الباب الثاني عشر في سجود السهو، فصل سهو الإمام يوجب عليه وعلى من خلفه السجود، ط: دار الفكر)

(۲-۳) السهو في الجمعة والعيدين والمكتوبة والتطوع واحد إلا أن مشايخنا قالوا لا يسجد للسهو في العيدين والجمعة، لئلا يقع الناس في فتنة، كذا في المضمرات، ناقلا عن المحيط. (حوالہ سابق)

(۴) عن ابن أبي رافع، قال: استخلف مروان أبا هريرة على المدينة، وخرج إلى مكة، فصلى لنا أبو هريرة الجمعة، فقرأ بعد سورة الجمعة، في الركعة الآخرة: إذا جاءك المنافقون، قال: فأدركت أبا هريرة حين انصرف، فقلت له: إنك قرأت بسورتين كان علي بن أبي طالب يقرأ بهما بالكوفة، فقال أبو هريرة: إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقرأ بهما يوم الجمعة. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۸۷، رقم الحديث: ۶۱ - (۸۷۷)، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب ما يقرأ في صلاة الجمعة، ط: البدر - ديوبند)

ولو قرأ في الركعة الأولى بفاتحة الكتاب وسورة الجمعة وفي الثانية بفاتحة الكتاب وسورة المنافقون فحسن تبركا بفعل النبي عليه السلام. (تحفة الفقهاء - محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰ھ): ۱/ ۱۶۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

درمختار میں لکھا ہے کہ واجبات سہواً ترک ہوجائیں، تو سجدۂ سہو لازم ہوگا، خواہ جمعہ ہو یا عیدین، فرض یا نفل سب اس سلسلے میں برابر ہیں۔ متاخرین فقہاء نے لکھا ہے کہ عیدین میں سجدۂ سہو نہ کرنا بہتر ہے۔ (شامی جلد ا صفحہ ۷۰۵)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] عید کے دن مصافحہ کرنا

۱۰۵۱- سوال: عید کے دن مصافحہ کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مصافحہ کرنا سنت ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ ملاقات کرے، تو سلام کرے اور مصافحہ کرے یا صرف سلام پر اکتفاء کرے؛ جائز ہے، سنت ادا ہوجائے گی۔[2] لیکن عید کے دن مصافحہ کرنا، معانقہ کرنا، اور جولوگ ایسا نہ کریں، ان کو برا بھلا کہنا اوران کی غیبت کرنا ناجائز اور حرام ہے، اس سے اجتناب لازم وضروری ہے۔

آج کل صورت حال یہ ہے کہ لوگ رات دن میں کئی مرتبہ ملتے ہیں، مصافحہ کی بات تو دور، آپس میں سلام بھی نہیں کرتے اور عید کے دن مصافحہ کو واجب سمجھتے ہیں اور مصافحہ نہ کرنے والے کو برا بھلا کہتے ہیں۔ خوشی کے دن کولڑائی جھگڑوں میں تبدیل کرنا اور دین میں اپنی مرضی کے مطابق غیر ضروری چیز کوضروری

---

[۱] (والسهو في صلاة العيد والجمعة والمكتوبة والتطوع سواء) والمختار عند المتأخرين عدمه في الأوليين لدفع الفتنة كما في جمعة البحر، وأقره المصنف، وبه جزم في الدرر. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله عدمه في الأوليين) الظاهر أن الجمع الكثير فيما سواهما كذلك كما بحثه بعضهم ط وكذا بحثه الرحمتي، وقال خصوصا في زماننا. وفي جمعة حاشية أبي السعود عن العزمية أنه ليس المراد عدم جوازه، بل الأولى تركه لئلا يقع الناس في فتنة. اهـ ـــ (قوله وبه جزم في الدرر) لكنه قيده محشيها الواني بما إذا حضر جمع كثير، وإلا فلا داعي إلى الترك ط. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۹۲، كتاب الصلاة، باب سجود السهو، مطلب إذا أسلم المرتد هل تعود حسناته أم لا؟ ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تدخلون الجنة حتى تؤمنوا، ولا تؤمنوا حتى تحابوا، أولا أدلكم على شيء إذا فعلتموه تحاببتم؟ أفشوا السلام بينكم. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۵۴، رقم الحديث: ۹۳-(۵۴)، كتاب الإيمان، باب بيان أنه لا يدخل الجنة إلا المؤمنون، وأن محبة المؤمنين من الإيمان، وأن إفشاء السلام سببا لحصولها، ط: البدر - ديوبند)

سمجھنا بدعت اور گمراہی کی بات ہے؛ اس لیے عید کے دن ملاقات کو ضروری گمان کرنا حرام ہے۔ البتہ کوئی دوسرے گاؤں، یا شہر سے آیا ہو، تو رواج کے بغیر اس سے مصافحہ کرنا جائز ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] نمازِ عید میں تقدیم خطبہ مکروہ ہے

۱۰۵۲- سوال: امام صاحب نے عید کی نماز پڑھاتے ہوئے پہلے خطبہ پڑھا، جس میں انہوں نے خطبۂ جمعہ پڑھا، پھر بعد میں نماز پڑھائی، تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر امام صاحب عید کی نماز کا خطبہ نماز سے قبل پڑھے، تو نماز ہو جائے گی، دوسری بار پڑھنے کی ضرورت نہیں، البتہ ان کا یہ فعل خلافِ سنت ہے اور مکروہ ہے، سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلے نماز پڑھی جائے، پھر خطبہ پڑھا جائے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] خطبہ سننے کے لیے لوگوں کو پھلانگ کر آگے جانا

۱۰۵۳- سوال: عید کی نماز کے بعد خطبہ سننے کے لیے صفیں پھلانگ کر لوگ آگے بڑھتے ہیں، حالاں کہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بھی خطبہ سنائی دیتا ہے، تو اس طرح لوگوں کو پھلانگ کر آگے بڑھنا شرعاً کیسا ہے؟ اپنی جگہ بیٹھ کر ہی خطبہ سننا چاہیے یا آگے بڑھنا چاہیے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

---

(۱) تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے عنوان: "جمعہ کے بعد امام سے مصافحہ کرنا"۔

[۲] (قوله: ثم يخطب بعد الصلاة خطبتين) بذلك ورد النقل المستفيض، والخطبة ليست بواجبة؛ لأن الصلاة تقدم عليها، ولو كانت شرطا لتقدمت على الصلاة كالجمعة، وهي سنة، فإن تركها كان مسيئا، وإن خطب قبل الصلاة أجزأه مع الإساءة، ولا تعاد بعد الصلاة كذا في النهاية. (الجوهرة النيرة-أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/ ۹۴، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين، ط: المطبعة الخيرية ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۰، كتاب الصلاة، الباب السابع عشر في صلاة العيدين، ط: دار الفكر ☆ فتح القدير: ۲/ ۷۹، باب صلاة العيدين، ط: دار الفكر ☆ الاختيار لتعليل المختار-عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳هـ): ۱/ ۸۵، باب صلاة العيدين، فصل ما يستحب في يوم الفطر وفي يوم الأضحى، ت: الشيخ محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي)

الجواب حامداً ومصلیاً:

بلاضرورت آگے بیٹھے ہوئے لوگوں کو پھلانگ کر جانا بہتر نہیں ہے۔ البتہ خطبہ سننے کے لیے (لوگوں کو تکلیف دیے بغیر) آگے جانا جائز ہے، جب کہ پیچھے سے نہ سنائی دیتا ہو۔ (شامی [۱]) [۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] عید میں نماز، دعا، خطبہ اور بیان میں ترتیب

۱۰۵۴- سوال: ہمارے یہاں عید کے موقع پر مندرجہ ذیل ترتیب سے نماز، خطبہ اور بیان ہوتا ہے:

''سب سے پہلے عید کی نماز ہوتی ہے، پھر خطبہ ہوتا ہے، پھر کسی عالم کا بیان ہوتا ہے اور بیان کے بعد

---

(۱) رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۱۶۳، کتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفکر - بیروت.

[۲] عن أبي الزاهرية، قال: كنا مع عبد الله بن بسر صاحب النبي صلى الله عليه وسلم يوم الجمعة، فجاء رجل يتخطى رقاب الناس، فقال عبد الله بن بسر: جاء رجل يتخطى رقاب الناس يوم الجمعة، والنبي صلى الله عليه وسلم يخطب، فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: اجلس فقد آذيت. (سنن أبي داؤد: ۱/ ۱۵۹، رقم الحديث: ۱۱۱۸، كتاب الصلاة، باب تخطي رقاب الناس يوم الجمعة، كتاب الصلاة، ط: البدر - ديوبند ☆ المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۳/ ۱۰۳، رقم الحديث: ۱۳۹۹، كتاب الجمعة، النهي عن تخطي رقاب الناس والإمام على المنبر يوم الجمعة، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

وذكر الفقيه أبو جعفر رحمه الله عن أصحابنا رحمهم الله: أنه لا بأس بالتخطي ما لم يأخذ الإمام في الخطبة، ويكره إذا أخذ؛ لأن للمسلم أن يتقدم ويدنو من المحراب إذا لم يكن الإمام في الخطبة، ليتسع المكان على من يجيء بعده، وينال فضل القرب من الإمام، فإذا لم يفعل الأول فقد ضيع ذلك المكان من غير عذر، فكان للذي جاء بعده أن يأخذ ذلك المكان.______ أما من جاء والإمام يخطب فعليه أن يستقر في موضعه من المسجد؛ لأن مشيه وتقدمه عمل في حالة الخطبة، وروى هشام عن أبي يوسف أنه للناس بالتخطي ما لم يخرج الإمام، أو يؤذ أحداً. (المحيط البرهاني - ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۹۱، كتاب الصلاة، الفصل الخامس والعشرون في صلاة الجمعة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ البناية شرح الهداية - بدر الدين العينى (م: ۸۵۵هـ): ۳/ ۹۲، باب صلاة الجمعة، البيع والشراء بعد أذان الجمعة الأول، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۱۷۰، باب صلاة الجمعة، قبيل باب العيدين، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ)، ص: ۵۲۳، باب الجمعة، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت - لبنان)

اجتماعی دعا کی جاتی ہے۔''

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح کی ترتیب شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اس کی تصدیق مطلوب ہے، امید ہے کہ جواب دے کر ممنون ومشکور فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلياً:

سوال میں بیان کردہ ترتیب میں ''دعا'' آخر میں ہے، یہ ترتیب بہتر نہیں ہے، بہتر ترتیب یہ ہے کہ پہلے عید کی نماز ہو، نماز کے بعد ہی متصلاً دعا ہو، پھر خطبہ اور خطبہ کے بعد بیان۔

مجموعۂ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ عید کی نماز کے موقع سے دعاء مانگتے تھے۔[1] لیکن اس کی وضاحت احادیث میں نہیں ہے کہ نماز کے بعد دعا ہوتی تھی یا خطبہ کے بعد۔ تاہم عید کے علاوہ دوسری پنج وقتہ نمازوں کے متعلق احادیث میں نماز کے بعد (دبر صلاۃ) دعا کی صراحت ملتی ہے۔[2]

اس لیے علما نے دوسری نمازوں پر قیاس کرتے ہوئے عید میں بھی، نماز کے بعد دعا کو بہتر کہا ہے؛

(۱) عن أم عطية، قالت: أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم، أن نخرجهن في الفطر والأضحى، العواتق، والحيض، وذوات الخدور، فأما الحيض فيعتزلن الصلاة، ويشهدن الخير، ودعوة المسلمين، قلت: يا رسول الله إحدانا لا يكون لها جلباب، قال: «لتلبسها أختها من جلبابها». (الصحيح لمسلم:۱/۲۹۱، رقم الحديث:۱۲-(۸۹۰)، كتاب صلاة العيدين، باب ذكر إباحة خروج النساء في العيدين إلى المصلى وشهود الخطبة، مفارقات للرجال، ط: البدر-ديوبند)

(۲) عن ثوبان، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم، إذا انصرف من صلاته استغفر ثلاثا وقال: اللهم أنت السلام ومنك السلام، تباركت ذا الجلال والإكرام، قال الوليد: فقلت للأوزاعي: "كيف الاستغفار؟ قال: تقول: أستغفر الله، أستغفر الله". (الصحيح لمسلم:۱/۲۱۸، رقم الحديث:۱۳۵-(۵۹۱)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، ط: البدر-ديوبند)

عن عائشة -رضي الله تعالى عنها-، قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا سلم لم يقعد إلا مقدار ما يقول: اللهم أنت السلام ومنك السلام، تباركت ذا الجلال والإكرام، وفي رواية ابن نمير: يا ذا الجلال والإكرام. [حوالہ سابق، حدیث نمبر:۱۳۶-(۵۹۲)]

عن وراد، مولى المغيرة بن شعبة، قال: كتب المغيرة بن شعبة إلى معاوية، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان إذا فرغ من الصلاة وسلم، قال: لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير، اللهم لا مانع لما أعطيت، ولا معطي لما منعت، ولا ينفع ذا الجد منك الجد. [حوالہ سابق، حدیث نمبر:۱۳۷-(۵۹۳)]

لہٰذا نماز کے بعد دعا ہونی چاہیے، تا کہ اس میں تمام مسلمان شرکت کرلیں، خطبہ یا بیان کے بعد دعا بہتر نہیں ہے۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] نمازِ عید کے بعد کب دعاء مانگی جائے؟

۱۰۵۵-سوال: عید کی نماز کے بعد دعا کب مانگی جائے؟ نماز کے بعد یا خطبہ کے بعد؟

الجواب حامداو مصلیا:

مسلمانوں پر رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرنا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ عیدین میں دعا مانگتے تھے اور اس کے بعد بھی یہ عمل باقی رہا۔ امام بخاریؒ نے اپنی عظیم الشان کتاب میں اس طرح عنوان قائم کیا: ''باب شهود الحائض العيدين ودعوة المسلمين، ويعتزلن المصلى''. [۲] کہ حائضہ عورت کا عیدین اور مسلمان کی دعاؤں میں حاضر ہونا اور نماز کی جگہ سے دور رہنا۔

اس باب میں حضرت حفصہؓ سے ایک روایت منقول ہے، جس کا ایک ٹکڑا اس طرح ہے: عورتیں پردے کا اہتمام کر کے خیر کی جگہ اور مسلمانوں کی دعاؤں کی جگہ حاضر ہوں۔ (ج۔۱ صفحہ ۴۷) [۳]

(۱) حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم رقم طراز ہیں: احادیث میں نمازوں کے بعد دعا کا ذکر آیا ہے، گاہے گاہے آپ ﷺ نے نماز کے بعد اجتماعی دعاء بھی فرمائی ہے؛ لیکن خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد الگ سے دعاء کا ذکر نہیں ملتا، اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ خود خطبہ میں دعاء شامل ہوتی ہے، اس لیے نماز کے بعد دعاء پر اکتفا کرنا چاہیے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۸/ ۲۱۷، نماز عیدین کا بیان، دعاء نماز کے بعد یا خطبہ کے بعد☆ مزید دیکھیے: فتاویٰ دار العلوم: ۵/ ۲۱۳، مسائل نماز عیدین، عید میں بعد خطبہ دعا نہیں ہے، مسئلہ نمبر: ۲۶۶۱)

(۲) صحيح البخاري: ۱/ ۴۷، كتاب الحيض، بعد: باب من اتخذ ثياب الحيض سوى ثياب الطهر، ط: البدر، ديوبند.

[۳] پوری روایت اس طرح ہے: عن حفصة، قالت: كنا نمنع عواتقنا أن يخرجن في العيدين، فقدمت امرأة، فنزلت قصر بني خلف، فحدثت عن أختها، وكان زوج أختها غزا مع النبي صلى الله عليه وسلم ثنتي عشرة غزوة، وكانت أختي معه في ست، قالت: كنا نداوي الكلمى، ونقوم على المرضى، فسألت أختي النبي صلى الله عليه وسلم: أعلى إحدانا بأس إذا لم يكن لها جلباب أن لا تخرج؟ قال: لتلبسها صاحبتها من جلبابها ولتشهد الخير ودعوة المسلمين، فلما قدمت أم عطية، سألتها أسمعت النبي صلى الله عليه وسلم؟ قالت: بأبي، نعم، وكانت لا تذكره إلا قالت: بأبي، سمعته يقول: يخرج العواتق وذوات الخدور، أو العواتق ذوات الخدور، والحيض، وليشهدن الخير، ودعوة المؤمنين، ويعتزل الحيض المصلى، قالت حفصة: فقلت الحيض، فقالت: أليس تشهد عرفة، وكذا وكذا. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۶- ۴۷، رقم الحديث: ۳۲۴، كتاب الحيض، باب شهود الحائض العيدين ودعوة المسلمين، ويعتزلن المصلى، ط: البدر- ديوبند)

مذکورہ روایت سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ نے عورتوں کو دعاؤں میں شریک ہونے کا حکم دیا تھا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس موقع سے دعا ہوتی تھی، البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع سے دعاء کب مانگی ہے؟ یہ ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا امام کو اختیار ہے، نماز یا خطبہ کے بعد جب چاہے، دعا مانگ لے اور اس کے علاوہ بقیہ نمازوں میں دعا نماز کے بعد ہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نماز یا خطبہ دونوں میں سے کسی ایک کے بعد دعا مانگ لے، کسی ایک کو ضروری سمجھنا یا دونوں میں ضروری سمجھنا اور دونوں وقت دعا نہ مانگنے والے کے ساتھ لڑائی، جھگڑا کرنا اور گالی گلوچ کرنا حرام ہے؛ لہٰذا سنت کو سنت کے مطابق ادا کیا جائے، دو صورت جائز ہے، کسی ایک کو لازم سمجھنا غلط ہے؛ اس لیے امام صاحب کو ان میں سے کسی ایک امر پر مجبور نہ کیا جائے، اگر ان کا دل چاہے، تو نماز کے بعد مانگے، اگر چاہے تو خطبہ کے بعد مانگے، دونوں ہی طریقہ درست ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] نمازِ عید کے بعد دعا کا مناسب محل

۱۰۵۶- سوال: عید کے دن دو رکعت نماز پڑھانے کے بعد امام صاحب ممبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے ہیں، پھر اس کے بعد دعا کراتے ہیں؛ حالاں کہ اسی امام صاحب کا کہنا ہے کہ عید کی نماز کے فوراً بعد دعا کر لینی چاہیے، پھر ممبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا چاہیے، تو اس میں صحیح طریقہ کیا ہے؟ پہلے دعا پھر خطبہ، یا خطبہ کے بعد دعا کرنی چاہیے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

نماز کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، اور فرض نماز کے بعد بھی فوراً دعا مانگی جاتی ہے؛ اس لیے عید کی نماز کے بعد فوراً دعا دعا مانگ لینی چاہیے، تاہم عید کی نماز کے بعد دعا مانگنا صاف صاف منقول نہیں ہے؛ لہٰذا خطبہ کے بعد دعا مانگنے کو بدعت نہیں کہا جائے گا۔ (امداد الفتاوی ج۔ا ص: ۳/ ۶۰۲)[۲] البتہ قاعدے کے مطابق دعا نماز کے بعد مانگ لینا بہتر ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تاہم بہتر یہ ہے کہ نماز کے بعد دعا ہونی چاہیے، تا کہ اس میں تمام مسلمان شرکت کر لیں، خطبہ یا بیان کے بعد دعا بہتر نہیں ہے۔ جیسا کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ماقبل کے فتویٰ میں تحریر فرمایا ہے۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۲] اگر چہ دعاء ہر وقت جائز ہے، مگر یہ تخصیص بلا دلیل شرعی ہے، البتہ بعد نماز کے آثار کثیرہ میں مشروع ہے اور دبر صلاۃ اوقات اجابت دعاء بھی ہے، بہر حال بعد نماز دعاء نہ کرنا اور بجائے اس کے بعد خطبہ مقرر کرنا تغیر سنت ہے، اور قابل احتراز، وھذا کلہ ظاھر۔ (امداد الفتاوی: ۱/ ۶۰۲ – ۶۰۳، باب صلاۃ الجمعۃ والعیدین، نماز عید کے بعد دعا کا ثبوت عمومات نصوص سے ہے، خطبہ کے بعد ثبوت نہیں ہے، ط: زکریا – دیوبند)

(۳) التقدم تفصیلہ وتخریجہ تحت عنوان: ''عید میں نماز، دعا، خطبہ اور بیان میں ترتیب ☆ نماز عید کے بعد کب دعا مانگی جائے؟''

[۱۱] عیدگاہ میں نماز جنازہ اور جنازہ گاہ میں عید کی نماز پڑھنا

۱۰۵۷- سوال: ہمارے گاؤں میں عیدگاہ بنائی گئی ہے، کیا اس میں جنازہ کی نماز پڑھنا جائز ہے؟ نیز جنازہ کی نماز پڑھنے کے لیے جنازہ گاہ بنائی گئی ہے، تو اس حصے میں عید کی نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جنازہ گاہ، یعنی جنازہ کی نماز کے لیے جو جگہ مختص کی گئی ہے، اس میں عید کی نماز پڑھنا جائز ہے، البتہ جگہ کا پاک ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ سامنے قبریں نہ ہوں۔ اسی طرح عیدگاہ میں بھی جنازہ کی نماز پڑھنا جائز ہے۔ [۱] نیز جنازہ کی نماز کسی عمارت میں پڑھنا جائز ہے، جب کہ مالک کی اجازت ہو، البتہ عام راستے پر مکروہ ہے۔ [۲]

---

(۱) عن جابر بن عبد الله، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "أعطيت خمسا لم يعطهن أحد قبلي: نصرت بالرعب مسيرة شهر، وجعلت لي الأرض مسجدا وطهورا، فأيما رجل من أمتي أدركته الصلاة فليصل، وأحلت لي المغانم ولم تحل لأحد قبلي، وأعطيت الشفاعة، وكان النبي يبعث إلى قومه خاصة وبعثت إلى الناس عامة". (صحيح البخاري: ۱/ ۴۸، رقم الحديث: ۳۳۵، كتاب التيمم، قبل باب اذا لم يجد ماء أو لا ترابا، وانظر رقم: ۴۳۸، ط: البدر -ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۹۹، رقم الحديث: ۳-(۵۲۱)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب جعلت لي الأرض مسجدا وطهورا، ط: البدر-ديوبند)

إلا إذا غسل موضعا منه ولا تمثال؛ أو صلى في موضع نزع الثياب، أو كان في المقبرة موضع أعد للصلاة ولا قبر ولا نجاسة فلا بأس كما في الخانية. اهـ... وفي القهستاني: لا تكره الصلاة في جهة قبر إلا إذا كان بين يديه؛ بحيث لو صلى صلاة الخاشعين وقع بصره عليه كما في جنائز المضمرات. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۵۴، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة وما يكره فيها، مطلب في بيان السنة، والمكروه، ط: دار الفكر)

"وتكره الصلاة عليه في مسجد الجماعة. (مراقي) ______ قال الطحطاوي: وقيد بمسجد الجماعة لأنها لا تكره في مسجد أعد لها وكذا في مدرسة ومصلى عيد لأنه ليس لها حكم المسجد في الأصح إلا في جواز الاقتداء وإن لم تتصل الصفوف كذا في ابن أمير حاج والحلبي وفي شرح موطأ الإمام محمد للمنلا علي. (حاشية الطحطاوي على المراقي- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۱۳هـ) ص: ۵۹۳، باب أحكام الجنائز، المحقق: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) "تكره صلاة الجنائز في الشارع وأراضي الناس" (مراقي) وقال الطحطاوي: قوله: "تكره الجنائز الخ" لشغل حق العامة في الأول وحق المالك في الثاني. (حوالہ سابق ص: ۵۹۶)

عید کی نماز عیدگاہ میں پڑھنا مستحب ہے، لیکن اگر کوئی عذر ہو، مثلاً بارش وغیرہ ہو، تو پھر جامع مسجد میں پڑھنا مستحب ہے۔ (طحطاوی: ۲۹۰)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] عیدین کی نماز کہاں ادا کرنا افضل ہے؟

۱۰۵۸- سوال: ہمارے یہاں عیدین کی نماز ادا کرنے کے لیے بستی سے باہر کوئی خاص جگہ عیدگاہ کے طور پر بنی ہوئی نہیں ہے؛ بل کہ ایک کھلا میدان ہے، جہاں کرکٹ میچ اور دوسرے کھیل وغیرہ کھیلے جاتے ہیں، گاؤں کے لوگ اسی میدان میں عید کی نماز ادا کر لیتے تھے اور دوسری جانب ہمارے گاؤں کی مسجد نمازیوں کے اعتبار سے بہت ہی چھوٹی تھی؛ لیکن ابھی اللہ رب العزت کے فضل وکرم سے گاؤں کے لوگوں نے ایک بڑی شان دار مسجد بنوائی ہے، جس میں گاؤں کے تمام مصلی بہ آسانی سما سکتے ہیں اور اس میں ہر طرح کی راحت اور آرام کا بھی انتظام ہے اور پہلے جس میدان میں عیدین کی نماز پڑھتے تھے، گاؤں کی اس مسجد سے بالکل قریب ہے، اب سوال یہ ہے کہ ہمارے لیے سنت اور بہتر طریقہ کون سا ہے، آیا عیدین کی نماز مسجد میں پڑھنا یا اسی میدان میں جس میں پہلے پڑھا کرتے تھے؟ اسماعیل ڈیبائی

الجواب حامداومصليا:

بستی سے باہر جا کر عید کی نماز پڑھنا مسنون ہے؛ گرچہ گاؤں کی مسجد بڑی ہو۔

شامی میں لکھا ہے: **(والخروج إليها) أي الجبانة لصلاة العيد (سنة وإن وسعهم المسجد الجامع) هو الصحيح.** (شامی: ۱/ ۱۷۶)[۲]

لہٰذا اگر بارش نہ ہو تو عیدین کی نماز بستی سے باہر جا کر ادا کرنا مسنون ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (والخروج إليها) أي الجبانة لصلاة العيد (سنة وإن وسعهم المسجد الجامع) هو الصحيح. (الدر المختار)
قال ابن عابدين: (قوله: هو الصحيح) قال في الظهيرية. وقال بعضهم: ليس بسنة وتعارف الناس ذلك لضيق المسجد وكثرة الزحام والصحيح هو الأول. اهـ ـــــــ وفي الخلاصة والخانية السنة أن يخرج الإمام إلى الجبانة، ويستخلف غيره ليصلي في المصر بالضعفاء بناء على أن صلاة العيدين في موضعين جائزة بالاتفاق، وإن لم يستخلف فله ذلك. اهـ. نوح. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۶۹، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين)

[۲] الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۶۹، كتاب الصلاة، باب صلاة العيدين، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۶۲۵، كتاب الصلاة، فصل في بيان ما يستحب يوم العيد، ط: مكتبة زكريا - ديوبند.

[۱۳] عیدالفطر میں عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے تکبیر آہستہ آواز سے پڑھی جائے

۱۰۵۹- سوال: عیدالفطر کے دن عید کی نماز ادا کرنے کے لیے عیدگاہ کی جانب جاتے وقت راستہ میں تکبیر تشریق کا آہستہ آواز سے پڑھنا ثابت ہے، کیا یہی عمل عیدالاضحی کی نماز کے لیے جاتے وقت بھی کیا جائے گا یا اس موقع سے بلند آواز سے تکبیر کہی جائے گی؟

الجواب حامداومصلیا:

عیدالاضحیٰ میں تکبیر تشریق زور سے پڑھنا عیدالاضحیٰ کا خصوصی عمل ہے، عیدالاضحیٰ کے بعد ۱۳ رذی الحجہ تک تکبیر کے ایام ہیں، اس میں اللہ کی بڑائی اور کبریائی کا ظہور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق کو انسان اپنی جان کے بدلہ میں اللہ کے سامنے پیش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ انسان کی جان کی قربانی بھی طلب کر سکتے ہیں، اس کو پوری کائنات اور تمام مخلوقات پر قدرت ہے، اللہ کے حکم کے بغیر کسی کو کسی پر کوئی اختیار نہیں؛ لہٰذا یہ خاص طور پر بڑائی ظاہر کرنے کا وقت ہے، حالت حج میں بہ آواز بلند، لبیک (تلبیہ) پڑھا جاتا ہے، دوسرے لوگوں کے لیے تکبیر ہے۔

عیدالفطر بھی خدا کی جانب سے بندوں کی ضیافت کا دن ہے، اس سے پہلے کا پورا مہینہ روزہ کا ہے، رمضان المبارک میں روزہ رکھنے اور عبادت کرنے کی توفیق نصیب ہوئی، اللہ نے ہدایت دی اور پورے سال کے گناہوں اور خطاؤں سے توبہ کرکے نفس کی پاکیزگی حاصل کی، تو حکم ہوا کہ اللہ کا شکر ادا کرو، عید کے دن سب سے پہلے نماز ادا کرو اور زائد تکبیروں کے ساتھ نماز ادا کرو، اللہ کی بڑائی کا اقرار کرکے شکریہ کا اظہار کرو؛ لیکن روزے کی عبادت جس طرح چھپ کر سکون کے ساتھ ادا ہوتی ہے، اسی طرح اللہ کا شکر بھی آہستہ سے ادا کرو، اس لیے نماز کے علاوہ تکبیر آہستہ پڑھنے کا حکم ہے، یعنی اگر تکبیر پڑھنی ہو، تو آہستہ پڑھے، اگر نہ پڑھے تو بھی حرج نہیں۔

عیدالاضحیٰ کی تکبیر کی اصل یہ ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے اسماعیل کے فدیہ (بدلہ) میں دنبہ لے کر آئے، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اندیشہ ہوا کہ کہیں جلدی میں ابراہیم علیہ السلام اسماعیل پر چھری نہ پھیر دیں؛ اس لیے جبرئیل علیہ السلام نے زور سے کہا: اللہ اکبر، اللہ اکبر (اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو چھری پھیر چکے تھے) جب حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جبرئیل

امین علیہ السلام کو دیکھا، تو فرمایا: ''لا الٰہ الا اللہ، واللہ اکبر'' اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ فدیہ میں دنبہ آ چکا ہے، تو وہ بھی پکار اٹھے: اللہ اکبر وللہ الحمد۔

الغرض عید الاضحیٰ کی نماز کے لیے جاتے وقت بلند آواز سے اور عید الفطر کی نماز کے لیے جاتے وقت آہستہ سے تکبیر کہی جائے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] صرف عید الفطر کی رات کو لیلۃ الجائزہ کہا جاتا ہے

۱۰۶۰- سوال: عید الفطر اور عید الاضحیٰ دونوں کی راتوں کو لیلۃ الجائزہ کہا جاتا ہے، یا صرف عید الفطر کی رات کو؟ اسی طرح یوم الجائزہ دونوں عید کے دنوں کو کہا جاتا ہے یا صرف عید الفطر کے دن کو؟

الجواب حامداو مصلیا:

دونوں عید کی راتوں میں عبادت کرنا اور انہیں زندہ رکھنا (یعنی عبادت سے آباد رکھنا) فضیلت اور ثواب کا کام ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص دونوں عید کی راتوں کو زندہ رکھے گا، (یعنی عبادت سے آباد رکھے گا) اس کا دل پورے سال زندہ (نیک کاموں کے لیے قوی) رہے گا۔ (مراقی)[2]

---

(۱) ومنها أن يغدو إلى المصلى جاهرا بالتكبير في عيد الأضحى، فإذا انتهى إلى المصلى ترك؛ لما روي عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه كان يكبر في الطريق.

وأما في عيد الفطر فلا يجهر بالتكبير عند أبي حنيفة. . . لأن الأصل في الأذكار هو الإخفاء إلا فيما ورد التخصيص فيه، وقد ورد في عيد الأضحى فبقي الأمر في عيد الفطر على الأصل. (بدائع الصنائع: ۲۷۹/۱-۲۸۰، فصل صلاة العيدين، فصل بيان ما يستحب في يوم العيد، ط: دار الكتب العلمية)

ويكبر في الطريق في الأضحى جهرا يقطعه إذا انتهى إلى المصلى وهو المأخوذ به، وفي الفطر المختار من مذهبه أنه لا يجهر وهو المأخوذ به، كذا في الغياثية أما سرا فمستحب، كذا في الجوهرة النيرة. (الفتاوى الهندية: ۱۵۰/۱، كتاب الصلاة، الباب السابع عشر في صلاة العيدين، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۱۷۰/۲، ۱۷۱، كتاب الصلاة، باب العيدين، ط: دار الفكر - بيروت)

وروي أنه لما ذبحه قال جبريل: الله أكبر الله أكبر. فقال الذبيح: لا إله إلا الله والله أكبر. فقال إبراهيم: الله أكبر والحمد لله، فبقي سنة. (الجامع لأحكام القرآن = تفسير القرطبي - أبو عبد الله محمد بن أحمد، شمس الدين القرطبي (م: ۶۷۱هـ): ۱۰۲/۱۵، الصافات: ۱۰۲-۱۱۳، ت: أحمد البردوني وإبراهيم أطفيش، ط: دار الكتب المصرية - القاهرة)

[۲] عن أبي أمامة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من قام ليلتي العيدين محتسبا لله لم يمت قلبه يوم تموت القلوب. (سنن ابن ماجه: ۱۲۷/۱، رقم الحديث: ۱۷۸۲، كتاب الصيام، باب فيمن قام في ليلتي العيدين، ط: ديوبند، =

مگر عید الفطر کی رات ہی کو "**ليلة الجائزة**" کہا جاتا ہے، جائزہ کا معنی ہے انعام، اس کو انعام کی رات اس لیے کہا جاتا ہے کہ رمضان المبارک میں روزہ دار نے جو مشقت برداشت کی ہے، اس کے انعامات اس رات میں تقسیم کیے جاتے ہیں؛ عید الاضحیٰ کی رات کو "لیلۃ الجائزہ" نہیں کہا جاتا، اسی طرح عید کے دنوں کو بھی "یوم الجائزہ" نہیں کہا جاتا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] عید کی نماز سے پہلے نفل نماز پڑھنا

۱۰۶۱- سوال: عید کے دن فجر کی نماز کے بعد سے عید کی نماز ختم ہو جانے تک نفل نماز پڑھنا منع ہے یا مکروہ؟ نیز منع اور مکروہ میں کیا فرق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عید کی نماز سے پہلے نفل پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے، خواہ گھر پڑھے یا مسجد میں، ہاں! عید کے بعد اگر عیدگاہ یا مسجد میں پڑھے، تو ممنوع ہے، گھر پڑھنے کی اجازت ہے۔ (عالم گیری ☆ درمختار)[1]

منع: اس کا اطلاق عموماً شرعی اور عرفی پابندیوں پر ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز ممنوع ہے، یعنی

= في الزوائد إسناده ضعيف لتدليس بقية ☆شعب الإيمان-أبو بكر البيهقي (م:۴۵۸ھ):۵/۲۸۷، الصيام، التماس ليلة القدر في... الخ، ط:مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون مع الدار السلفية بومباي بالهند)

"و" ندب "إحياء ليلة العيدين" الفطر والأضحى لحديث: "من أحيا ليلة العيد أحيا قلبه يوم تموت القلوب" ويستحب الإكثار من الاستغفار بالأسحار وسيد الاستغفار: "اللهم أنت ربي لا إله إلا أنت خلقتني وأنا عبدك وأنا على عهدك ووعدك ما استطعت أعوذ بك من شر ما صنعت أبوء لك بنعمتك علي وأبوء بذنبي فاغفر لي فإنه لا يغفر الذنوب إلا أنت" والدعاء فيها مستجاب. (مراقي الفلاح شرح نور الايضاح، ص:۱۵۰، فصل في بيان النوافل، فصل في تحية المسجد وصلاة الضحى وإحياء الليالي وغيرها، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

[۱] (وكذا يكره تطوع عند إقامة صلاة مكتوبة)... (وقبل صلاة العيدين مطلقا، وبعدها بمسجد لا بيت) في الأصح. (الدر المختار)ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: مطلقا) أي سواء كان في المسجد أو في البيت بقرينة التفصيل في مقابله ح. (قوله: في الأصح) رد على من يقول لا يكره في البيت مطلقا سواء كان قبلها أو بعدها، وعلى من يقول لا يكره بعدها مطلقا سواء كان في المسجد أو في البيت ح. (رد المحتار على الدر المختار:۱/۳۷۸، كتاب الصلاة، قبل باب الأذان، ط: دار الفكر بيروت ☆ بدائع الصنائع:۲/۱۸-۱۹، كتاب الصلاة، الأوقات التي يكره فيها التطوع، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفتاوى الهندية:۱/۵۳، الباب الأول في مواقيت الصلاة وما يتصل بها، الفصل الثالث في بيان الأوقات التي لا تجوز فيها الصلاة وتكره فيها، ط: دار الفكر-بيروت)

اس کا استعمال جائز نہیں، خواہ شرعاً ممانعت ہو، یا عرفاً۔

جب کہ مکروہ اصطلاحی لفظ ہے، جس کی دو قسم ہے، مکروہ تنزیہی اور مکروہ تحریمی، [۱] منع کے لفظ میں یہ دونوں شامل ہو سکتے ہیں، اسی طرح کسی اور وجہ سے کسی شئے کی ممانعت ہو، تو وہ بھی اس میں داخل ہو سکتی ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] عیدگاہ نہ ہونے کی وجہ سے کھیل کود کے میدان میں عیدین کی نماز ادا کرنا

۱۰۶۲- سوال: ہمارے یہاں ری یونین کے سینٹ ڈینس شہر میں عیدگاہ نہیں ہے، اس وجہ سے فی الحال ہم فناء شہر جو کہ تقریباً آدھے میل کے فاصلہ پر ہے، عید کی نماز ادا کرتے ہیں، اور میونسپلٹی والوں کے پاس کوئی ایسی فارغ زمین بھی نہیں ہے جو ہم خرید سکیں، اور نہ ہی ہم میں سے کسی کے پاس کوئی ایسی زمین ہے، ہر سال ہم شہر کے لوگوں کو مذکورہ جگہ میں عید کی نماز کے لیے بلاتے ہیں، پندرہ سو مصلیوں میں سے صرف تین سو آتے ہیں، اور نہ آنے والے مذکورۂ ذیل وجوہات پیش کرتے ہیں:

(۱)...... عیدگاہ کا کوئی نظم نہیں ہے، پہلے آپ عیدگاہ بنائیے، پھر ہم آئیں گے۔

(۲)...... یہ تو کھیل کود کا میدان ہے، ہم اُس پر نماز نہیں پڑھیں گے۔

(۳)...... وہاں نماز پڑھنے سے عیدگاہ میں نماز کا ثواب نہیں ملے گا۔

ہماری جماعت کے پاس ایک بہت بڑا میدان ہے؛ لیکن وہ سینٹ ڈینس شہر کے مشرقی کنارے پر شہر سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، اور شہر کے بعض باشندے اگر وہاں آنا چاہیں تو انہیں دس کیلومیٹر طے کر کے آنا پڑے گا، دوسری بات یہ کہ وہ میدان میونسپلٹی کی حدود میں ہے، سینٹ ڈینس شہر میں نہیں ہے۔ تو اب ہم عیدین کی نماز کے لیے کیا کریں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عیدگاہ میں نماز ادا کرنا مسنون ہے، عام طور پر فقہاء کرام اُسے سنت لکھتے ہیں، جہاں مندوب و مستحب کے الفاظ منقول ہیں، تو اُن سے سنت ہی مراد ہے، چناں چہ فتاویٰ قاضی خان میں ہے: والسنة أن

(۱) المكروه تحريما عند الحنفية: هو ما كان إلى الحرام أقرب... المكروه تنزيها عند الحنفية: هو ما كان تركه أولى من فعله. (القاموس الفقهي لغة واصطلاحا، لسعدي أبو جيب، ص: ۳۱۸، ط: دار الفكر - بيروت)

یخرج الإمام إلی الجبانة. (قاضی خان)[۱]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے بجائے عید کی نماز عیدگاہ میں ادا فرمائی ہے۔[۲]

صرف ایک مرتبہ بارش کی وجہ سے مسجد نبوی میں ادا کی ہے۔ چناں چہ حضرت علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے عمدۃ القاری شرح بخاری میں تحریر فرمایا ہے: ولا یصلي في المسجد إلا عن ضرورة، وروی ابن زیاد عن مالك، قال: السنة الخروج إلی الجبانة إلا لأهل مكة، ففي المسجد، وقال الشافعي في (الأم): بلغنا أن رسول الله صلی الله علیه وسلم كان یخرج في العیدین إلی المصلی بالمدینة وكذا من بعده إلا من عذر مطر ونحوه، وكذا عامة أهل البلدان إلا مكة، شرفها الله تعالی. (عینی)[۳]

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عید کی نماز بلاضرورت و بلا عذر مسجد میں نہ پڑھی جائے، ابن زیاد نے مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ سنت یہی ہے کہ عید کی نماز کے لیے آبادی کو چھوڑ کر کھلے میدان یا صحراء کی جانب نکلے، صرف مکہ والوں کے لیے مسجد میں پڑھنے کا حکم ہے، کتاب الام میں امام شافعیؒ کی روایت ہے کہ

[۱] قاضي خان علی هامش الهندیة: ۱/ ۱۸۳، باب صلاة العیدین وتكبیرات أیام التشریق، ط: زكریا-دیوبند.

والخروج إلی الجبانة لصلاة العید سنة، وإن كان یسعهم المسجد الجامع علی هذا عامة المشایخ. وبعضهم قالوا: الخروج إلی الجبانة لیس سنة، وإنما تعارف الناس ذلك لضیق المسجد، والصحیح ما علیه عامة المشایخ: أنهم لا یخرجون عن المصر؛ بل یقیمونها في فناء المصر؛ لأن المصر شرط جواز هذه الصلاة وفناء المصر من المصر. ألا تری أن أفنیة البیوت كأجوافها فكذا فناء المصر كجوفه. أما ما زاد علی فناء المصر لیس من المصر، فلهذا قال یقیمونها في فناء المصر. (المحیط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدین محمود بن أحمد، ابن مازة البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ): ۲/ ۱۰۰، الفصل السادس والعشرون في صلاة العیدین، ت: عبد الكریم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمیة-بیروت)

(۲) عن أبي سعید الخدري، قال: كان رسول الله صلی الله علیه وسلم یخرج یوم الفطر والأضحی إلی المصلی... الحدیث. (صحیح البخاري: ۱/ ۱۳۱، رقم الحدیث: ۹۵۶، كتاب العیدین، باب الخروج إلی المصلی بغیر منبر، ط: البدر-دیوبند)

[۳] عمدة القاري شرح صحیح البخاري-بدر الدین العینی (م:۸۵۵ھ): ۶/ ۲۸۱، كتاب العیدین، باب الخروج إلی المصلی بغیر منبر، ط: دار إحیاء التراث العربي - بیروت☆شرح صحیح البخاری لابن بطال (م:۴۴۹ھ): ۲/ ۵۵۴، باب الخروج إلی المصلی بغیر منبر، ت: أبو تمیم یاسر بن إبراهیم، ط: مكتبة الرشد - السعودیة، الریاض ☆ إحكام الإحكام شرح عمدة الأحكام - ابن دقیق العید (م:۷۰۲ھ): ۱/ ۳۴۷، باب العیدین، ط: مطبعة السنة المحمدیة☆فتح الباري شرح صحیح البخاري-أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني (م:۸۵۲ھ): ۲/ ۴۵۰، باب الخروج إلی المصلی بغیر منبر، ط: دار المعرفة-بیروت.

وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں روایت پہنچی ہے کہ جناب رسولِ اکرم ﷺ اپنے مدینہ کے قیام کے دوران نمازِ عید کے لیے عیدگاہ میں تشریف لے جاتے تھے، اور آپ ﷺ کے خلفاءِ راشدین اور دیگر صحابہ کرامؓ کا بھی یہی معمول رہا ہے، مکہ کے سوا دوسرے تمام بلادِ اسلامیہ کا بھی یہی معمول رہا۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عیدگاہ میں نماز، مؤکد ہے، البتہ فقہاءِ کرام نے کمزوروں اور معذورین کو قریب کی مسجدِ جامع میں نمازِ عید کی اجازت دی ہے، اور فرمایا ہے کہ وہاں نمازِ عید جائز ہے، چناں چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب کوفہ تشریف لائے، تو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو شہر میں عید کی نماز کے لیے نائب بنایا، تاکہ وہ ضعفاء کو نماز پڑھائیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ خود بزرگانِ امت کی معیت میں شہر سے باہر پیدل تشریف لے گئے۔ (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۸۰)[۴]

لہٰذا جو لوگ منع کرتے ہیں، اور فناءِ مصر میں نمازِ عید کے لیے نہیں جاتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں، انہیں بہانہ بنانے کے بجائے نماز کے لیے وہاں جانا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] بارش کی وجہ سے عیدگاہ میں چھت قائم کرنا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۰۶۳- سوال: ہمارے یہاں ری یونین میں اکثر چاند نظر آنے سے پہلے یا بعد میں ایک دو دن تک ہلکی ہلکی بارش ہوتی ہے، کبھی زور کی بارش بھی ہوجاتی ہے، تو بارش سے بچنے کے لیے عیدگاہ میں چھت بنانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر چھت بنانا جائز نہ ہو، تو وقتی طور پر بارش سے بچنے کے لیے شامیانہ لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہم بارش سے بچنے کے لیے کوئی انتظام نہیں کریں گے، تو اکثر مصلی بارش کے خوف سے مسجد میں عید کی نماز پڑھ لیں گے، تو ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

[۴] (ومنها) أنه يستحب للإمام إذا خرج إلى الجبانة لصلاة العيد أن يخلف رجلا يصلي بأصحاب العلل في المصر صلاة العيد؛ لما روي عن علي - رضي الله عنه - أنه لما قدم الكوفة استخلف أبا موسى الأشعري ليصلي بالضعفة صلاة العيد في المسجد، وخرج إلى الجبانة مع خمسين شيخا يمشي ويمشون؛ ولأن في هذا إعانة للضعفة على إحراز الثواب فكان حسنا، وإن لم يفعل لا بأس بذلك؛ لأنه لم ينقل ذلك عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - ولا عن الخلفاء الراشدين سوى علي - رضي الله عنه -؛ ولأنه لا صلاة على الضعفة، ولكن لو خلف كان أفضل؛ لما بينا. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود، الكاساني (م: ۵۸۷ھ): ۱/ ۲۸۰، فصل صلاة العيدين، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

الجواب حامداً و مصلیاً:

بارش میں عید کی نماز مسجد میں پڑھی جائے گی، اُس وقت عیدگاہ میں جانا ضروری نہیں ہے۔ [۱]

چھت یا شامیانہ لگانے سے دھوپ کی حرارت اور معمولی بارش سے بچا جاسکتا ہے؛ اِس لیے دیوار قائم کیے بغیر صرف چھت یا عارضی طور پر شامیانہ لگا دیا جائے تو جائز ہے۔ فقط، واللہ اُعلم بالصواب۔

[۱۸] کھیل کود کے میدان میں عید کی نماز پڑھنا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۰۶۴- سوال: کھیل کود کے میدان میں عید کی نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ کیا اس صورت میں عید کی نماز کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

عیدگاہ بنانا ضروری نہیں ہے، کھیل کے میدان میں یا صحراء میں نیز شہر سے باہر کسی بھی جگہ عید کی نماز پڑھنے سے عیدگاہ کی فضیلت حاصل ہوجائے گی۔ [۲] البتہ کسی ایک جگہ کو متعین کر لینا بہتر ہے، اگر عیدگاہ کی زمین وقف ہے، یا باقاعدہ عیدگاہ کے لیے کمپاؤنڈ اور منبر و محراب بناتے ہیں، تو پھر اُس جگہ کو کھیل کود کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے، ایسے اِحاطہ والی جگہ کا حکم کلی طور پر مسجد کا سا تو نہیں ہے؛ کہ اُس میں حائضہ عورتیں اور اہلِ جنابت داخل نہ ہوسکیں، تاہم نجاست اور گندگیوں سے اُسے پاک و صاف رکھنا ضروری ہے۔ (شامی: ۶۵۷/۱) [۳] فقط، واللہ اُعلم بالصواب۔

---

(۱) ولا يصلي في المسجد إلا عن ضرورة. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م:۸۵۵هـ): ۲۸۱/۶، كتاب العيدين، باب الخروج إلى المصلى بغير منبر، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت☆شرح صحيح البخارى لابن بطال (م:۴۴۹هـ): ۵۵۴/۲، باب الخروج إلى المصلى بغير منبر، ت: أبو تميم ياسر بن إبراهيم، ط: مكتبة الرشد - السعودية، الرياض☆فتح الباري شرح صحيح البخاري: ۴۵۰/۲، باب الخروج إلى المصلى بغير منبر، ط: دار المعرفة - بيروت.

(۲) عن أبي سعيد الخدري، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج يوم الفطر والأضحى إلى المصلى... الحديث (صحيح البخاري: ۱۳۱/۱، رقم الحديث: ۹۵۶، كتاب العيدين، باب الخروج إلى المصلى بغير منبر، ط: البدر - ديوبند)

[۳] (و) أما (المتخذ لصلاة جنازة أو عيد) فهو (مسجد في حق جواز الاقتداء) وإن انفصل الصفوف رفقا بالناس (لا في حق غيره) به يفتى نهاية (فحل دخوله لجنب وحائض) كفناء مسجد ورباط ومدرسة ومساجد حياض وأسواق لا قوارع. (الدر المختار) =

[۱۹] عید کی نماز میں شافعی امام کی اقتدا کرے، تو کتنی تکبیر کہے؟

۱۰۶۵- سوال: یہاں (کویت میں) عید کی نماز میں زائد ۱۳ تکبیریں کہی جاتی ہیں، جب کہ ہمارے نزدیک زائد ۶ رتکبیریں ہیں، تو شافعی امام کے پیچھے عید کی نماز پڑھتے وقت حنفی کو ہر تکبیر پر ہاتھ اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

غیر حنفی امام کے پیچھے اگر حنفی مقتدی عید کی نماز پڑھے، تو دونوں رکعتوں میں امام کی اتباع میں ۱۶/ تکبیرات تک اتباع کرنا ضروری ہے۔ حنفی مقتدی امام کے مطابق تکبیریں بھی کہے اور ہاتھ بھی اٹھائے۔[1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= قال ابن عابدين: (قوله: به يفتى. نهاية) عبارة النهاية: والمختار للفتوى أنه مسجد في حق جواز الاقتداء إلخ، لكن قال في البحر: ظاهره أنه يجوز الوطء والبول والتخلي فيه، ولا يخفى ما فيه فإن الباني لم يعده لذلك فينبغي أن لا يجوز وإن حكمنا بكونه غير مسجد، وإنما تظهر فائدته في حق بقية الأحكام، وحل دخوله للجنب والحائض. اهـ. ومقابل هذا المختار ما صححه في المحيط في مصلى الجنازة أنه ليس له حكم المسجد أصلا، وما صححه تاج الشريعة أن مصلى العيد له حكم المساجد، وتمامه في الشرنبلالية. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۵۷، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فروع اشتمال الصلاة على الصماء... الخ مطلب في أحكام المسجد، ط: دار الفكر)

(۱) (ويصلي الإمام بهم ركعتين مثنيا قبل الزوائد، وهي ثلاث تكبيرات في كل ركعة) ولو زاد تابعه إلى ستة عشر لأنه مأثور. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله: ولو زاد تابعه إلخ) لأنه تبع لإمامه فتجب عليه متابعته وترك رأيه برأي الإمام لقوله - عليه الصلاة والسلام - إنما جعل الإمام ليؤتم به فلا تختلفوا عليه، فما لم يظهر خطؤه بيقين كان اتباعه واجبا ولا يظهر الخطأ في المجتهدات فأما إذا خرج عن أقوال الصحابة فقد ظهر خطؤه بيقين فلا يلزمه اتباعه.... (قوله إلى ستة عشر) كذا في البحر عن المحيط. وفي الفتح قيل: يتابعه إلى ثلاث عشرة، وقيل إلى ست عشرة. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۷۲- ۱۷۳، باب العيدين، مطلب أمر الخليفة لا يبقى بعد موته، ط: دار الفكر- بيروت)

قال محمد - رحمه الله تعالى - في الجامع إذا دخل الرجل مع الإمام في صلاة العيد وهذا الرجل يرى تكبيرات ابن مسعود - رضي الله تعالى عنهما - فكبر الإمام غير ذلك، اتبع الإمام إلا إذا كبر الإمام تكبيرا لم يكبره أحد من الفقهاء فحينئذ لا يتابعه، كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۱، الباب السابع عشر في صلاة العيدين، ط: دار الفكر)

کچھ ''فتاویٰ فلاحیہ'' کے بارے میں

نمونے کی فائل سے:

مفتی اعظم گجرات، حضرت مفتی احمد بیمات ؒ کے فتاویٰ نہایت ہی قیمتی ہیں، جن کو شائع کرنے کی ذمہ داری جناب حافظ اسجد صاحب نے اپنے سر اٹھائی، ایک بہت ہی اہم کام ہے، امت کو اس کی خوب ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ اس بڑی ذمہ داری کو پایۂ تکمیل تک بہ سہولت پہنچائے اور تمام مرحومین خصوصاً حضرت مفتی اعظم مرحوم کے حق میں ثواب جاریہ اور حافظ اسجد صاحب کے حق میں اپنی رضامندی کا ذریعہ بنائے، آمین۔

مرحوم مفتی احمد بیمات صاحب نور اللہ مرقدہ کے فتاویٰ نہایت پختہ، مضبوط، مستحکم اور مدلل ہیں، مگر مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی صاحب دامت برکاتہم کی ترتیب وتصحیح کی خوبی نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا ہے، سب ہی فتاویٰ کو مدلل بنادیا، اور وہ بھی سہل وسلیس اردو زبان میں۔ میں نے پہلی جلد کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، بہت بہتر کام ہوا، سب ہی معتبر فقہ وفتاویٰ کے حوالجات سے مزین ومستحکم ہے۔

حضرت مولانا ومفتی عبداللہ کاوی والا رحمہ اللہ

(صدر مفتی: دار الافتاء، دار العلوم عربیہ اسلامیہ، کنتھاریہ، بھروچ)

محترم ومکرم جناب **مولانا مفتی مجتبیٰ صاحب قاسمی** زید مجدکم وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

احقر نے فتاویٰ حضرت مفتی احمد بیمات صاحب ؒ کا تیار کردہ محقق مسودہ دیکھا، ماشاء اللہ اچھی محنت کی گئی ہے، اور یہ انداز بہتر، مفید اور قابل تعریف ہے۔ ------------ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد اس منصوبہ کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائیں، امت کے لیے نافع بنائیں اور سبھی معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائیں، آمین۔

(حضرت مولانا ومفتی) محمد سلمان منصور پوری (دامت برکاتہم)

فتاویٰ فلاحیہ

جلد سوم

از: حضرت مفتی احمد ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ

سابق شیخ الحدیث وصدر مفتی: دار العلوم فلاح دارین، ترکیسر، گجرات،

صدر جمعیۃ علماء ہند، گجرات شاخ، وبانی دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی

ناشر:

حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات صاحب

خادم: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا۔ فون: 1905 966 4141

فتاویٰ فلاحیہ

٣

کتاب الجنائز

کتاب الزکاۃ

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ.

(۹-التوبہ:۱۲۲)

ترکت فیکم أمرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما: کتاب الله وسنة نبيه. (موطأ إمام مالك)

فتاویٰ فلاحیہ جلد سوم

دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل اور دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی کے مسند افتاء سے دیے گئے فتاویٰ کا بیش قیمت مجموعہ

از: حضرت مفتی احمد ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ

سابق شیخ الحدیث وصدر مفتی: دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، گجرات،
صدر جمعیۃ علماء ہند، گجرات شاخ، و بانی دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی

مرتب: مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی

استاذ حدیث وفقہ: دارالعلوم اسلامیہ عربیہ، ماٹلی والا، بھروچ، گجرات

ناشر: حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات صاحب

خادم: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا۔ فون: 905 578 2547
رکن منتظمہ: دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی، بھروچ، گجرات، پن نمبر: 394115

تفصیلات

نام: **فتاویٰ فلاحیہ** جلد سوم

صاحب فتاویٰ: حضرت مفتی احمد بن ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ

مرتب: مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی

بہ اہتمام: دار العلوم فلاح دارین، ترکیسر

ناشر: حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات
(خادم: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا)

سن طباعت: محرم الحرام، ۱۴۳۸ھ، اکتوبر، موافق: ۲۰۱۶ء

ملنے کے پتے:

(۱) دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی، انکلیشور، بھروچ، گجرات	02646 274243
(۲) حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات صاحب، خادم: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا	905 578 2547
(۳) مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی، دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ، گجرات	940 951 8452
(۴) مدنی ویلفیر ٹرسٹ، کوسمبا، سورت، گجرات	9408 746664
(۵) ادارہ صدیق، ڈابھیل، ضلع: نوساری، گجرات	09904 886188
(۶) مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، یوپی	01336 22329
(۷) جے ایم سی انڈیا پبلشر پرائیویٹ لمیٹیڈ، جھاہاؤس، ویسٹ نظام الدین	011 24352220
(۸) مدرسہ اسلامیہ عربیہ، آزادویل، ساؤتھ افریقہ	114 132786
(۹) مدرسہ تعلیم الدین، اسپنگو بیچ، ڈربن، ساؤتھ افریقہ	273 19029916
(۱۰) مولانا اُسامہ ساچا، 19، انگھم روڈ تھورن ہل لیس، ویسٹ یارک شائر، یو-کے	+447712124569
(۱۱) مفتی اسعد بن عبدالرزاق پالن پوری، دار العلوم مرکز اسلامی، انکلیشور	9427 640 250

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست فتاویٰ فلاحیہ جلد سوم

[فہرست: ....۳-۲۷]

کتاب الجنائز (۳۹-۲۷۶)

متفرقات الجنائز (۴۰-۵۶)

[جنائز کے متفرق مسائل]

مایتعلق بالمحتضر (۵۷-۶۶)

[جاں کنی کے عالم کا بیان]

باب ما یتعلق بغسل المیت (۶۷-۸۲)

[غسلِ میت کا بیان]

باب ما یتعلق بکفن المیت (۸۳-۹۲)

[کفن کا بیان]

باب ما یتعلق بحمل الجنازة (۹۳-۹۹)

[جنازہ کو اٹھانے کا بیان]

باب صلاة الجنائز (۱۰۱-۱۳۳)

[نماز جنازہ کا بیان]

باب ما یتعلق بدفن المیت (۱۳۵-۱۶۹)

[تدفین کا بیان]

باب إهداء الثواب للميت (۱۷۱-۲۲۵)

[ایصال ثواب کا بیان]

(اس سلسلے کے اکثر مسائل پہلی جلد (ص: ۵۰۷، ۳۴۳ تا ۳۹۸) میں سنت و بدعت کے مرکزی عنوان کے تحت آچکے ہیں، یہ باب درحقیقت اس کا تتمہ ہے)

باب التعزیة (۲۲۷-۲۳۲)

[تعزیت کا بیان]

باب ما یتعلق بالزیارة والقبر والمقابر (۲۳۳-۲۶۹)

[زیارت، قبر اور مقابر کا بیان]

باب الشہید (۲۷۱-۲۷۵)

[شہداء کا بیان]

کتاب الزکاۃ (۲۷۷-۵۹۹)

باب وجوب الزکاۃ (۲۷۸-۳۶۴)

[وجوبِ زکاۃ کا بیان]

باب الزكاة في الذهب والفضة والفلوس (۳۶۵-۳۷۳)

[سونا، چاندی، اور نوٹ پر زکاۃ]

باب في العشر والخراج (۳۷۵-۳۹۰)

[عشر وخراج کا بیان]

باب اداء الزکاۃ (۳۹۱-۴۷۰)

[زکاۃ کی ادائیگی کا بیان]

باب مصارف الزکاۃ (۴۷۱-۵۶۲)

[زکاۃ کے مصارف کا بیان]

باب صدقة الفطر (۵۶۳-۵۷۲)

[صدقۃ الفطر کا بیان]

باب الصدقات النافلة (۵۷۳-۵۸۶)

[صدقات نافلہ کا بیان]

متفرقات الزکاۃ (۵۸۷-۵۹۹)

[زکاۃ کے متفرق مسائل]

تقریظ وتائید

حضرت مولانا ومفتی سید مصلح الدین احمد بڑودوی القاسمی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مفتی: جامعہ اسلامیہ تعلیم الاسلام، ڈیوزبری مرکز، یو- کے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی.

دین اسلام ان تمام خصوصیات وخوبیوں کا حامل ہے، جو سابقہ ادیان میں موجود تھیں، اسی طرح ان تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں سے پاک وصاف ہے، جو دوسرے مذاہب اور خود ساختہ ادیان میں تھیں اور ہیں، اس لیے ہر مذہب وملت اور دین نے بجا طور پر دین اسلام کو اپنا مقابل وحریف سمجھ کر اس کی راہ روکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اہل اسلام اور بالخصوص علماء دین نے منشاء خداوندی کی تکمیل میں، دین کی حفاظت، دفاع اور نشر واشاعت کے لیے ہر محاذ پر، ہر طرح کی قربانیاں دے کر اسلام کی حفاظت اور تبلیغ کا اہم فریضہ انجام دیا۔

اس وقت سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ موجودہ دور کی نوجوان نسل کو اسلام سے آشنا کیا جائے، اور جس طرح بھی ممکن ہو، انہیں اصلی وسچا اور پکا مسلمان بنایا جاوے، نسل جدید کو اسلام کی اساس سے روشناس کرائے، علمی فتنوں سے نجات دلائے، فقہ اسلامی کو فرسودہ اور ناقابل عمل کہہ کر مسترد کردینے کی روش تبدیل کرائے اور فقہ اسلامی کی تطبیق جدید کے ذریعہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور علم کلام سے اس کا رشتہ جوڑے۔

اہم فقہی مسائل بالخصوص جدید فقہی مسائل کا حل: امت مسلمہ کی ہر وقت اور ہر لحہ بنیادی ضرورت رہی ہے؛ کیوں کہ فقہ عملی زندگی کے آداب واحکام کا نام ہے، اور ہر لحہ مسلمانوں کے ساتھ یہ ضرورت لاحق ہے، لہٰذا اکابر ومشائخ واساطین علم وفضل نے ہر دور میں اس دینی فریضے پر پوری توجہ دی ہے، اور امت مسلمہ کی رہنمائی کے لیے، اور اس کو شرعی احکام سے آگاہ کرنے کے لیے درپیش مسائل ومعاملات میں حضرات مفتیان کرام فتویٰ دیتے رہے ہیں، اللہ جل شانہ کے فضل وکرم سے یہ مبارک سلسلہ جاری ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

اسی مبارک سلسلے کی ایک کڑی، حضرت مولانا مفتی احمد بیمات صاحب رحمہ اللہ کے قلم سے صادر شدہ فتاویٰ ہیں، مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی زید مجدہ استاذ حدیث وفقہ: مدنی دار التربیت کرمالی، وایا پانولی، ضلع بھروچ، گجرات [موجودہ استاذ حدیث وفقہ: دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ] کی تحقیق وتخریج وتعلیقات کے ساتھ ''فتاویٰ فلاحیہ'' کے نام سے

ان فتاویٰ کا مطبوعہ شکل میں منظر عام پر آنا حضرت مفتی احمد بیمات صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند حافظ امجد بیمات حفظہ اللہ تعالیٰ کی انتھک جدوجہد، پرخلوص مساعی جمیلہ کا رہین منت ہے، دس جلدوں میں ان فتاویٰ کی تکمیل متوقع ہے۔

حضرت مفتی احمد بیمات صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک کامیاب مدرس، کہنہ مشق مفتی تھے، ازہر ہند دار العلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی، حضرت العلامہ محمد ابراہیم بلیاوی وغیرہ رحمہم اللہ سے علوم دینیہ کی تحصیل وتکمیل کی، اس کے بعد فقہ وحدیث کا عمیق علم رکھنے والے ماہر فن حضرت مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوری رحمۃ اللہ علیہ سے دار الافتاء میں داخل ہو کر فتاویٰ نویسی کی مشق وتمرین کی، بناء بریں آپ کو فقہ وفتاویٰ میں ایک نمایاں مقام نصیب ہوا، اور گجرات کے معتمد ومستند مفتیان کرام میں شامل ہوئے۔

فراغت کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے تدریسی خدمات کا آغاز کیا اور سترہ سال تک مختلف علوم وفنون کی کتابیں زیر تدریس رہیں، اس کے بعد دار العلوم فلاح دارین، ترکیسر منتقل ہو کر بیس سال تک بخاری شریف ودیگر علوم وفنون کی تدریس کی خدمت کے ساتھ، بڑی عرق ریزی وجاں فشانی کے ساتھ افتاء کا کام بھی انجام دیا، اور اس طویل مدت میں بڑی تعداد میں فتاویٰ تحریر کیے۔ میرے والد صاحب حضرت مفتی سید شمس الدین بڑودوی رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں پڑھا ہے، کئی مرتبہ خود انہوں نے اس کا تذکرہ فرمایا، درس وتدریس کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند، گجرات، دینی تعلیمی بورڈ اور محکمۂ شرعیہ ہند کے اہم عہدوں پر فائز رہ کر عظیم دینی، ملی واصلاحی خدمات بھی انجام دی ہیں۔

۱۹۶۲ - ۱۹۶۳ء میں مفکر ملت حضرت مولانا عبد اللہ کاپودروی زیدت معالیہ، حضرت مفتی احمد بیمات صاحب وغیرہ کے ساتھ احقر بھی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریسی خدمات کے دوران وہاں قیام پذیر تھا، گاہے گاہے وہاں بعد نماز عصر کی مجلس میں ہم جمع ہو جاتے اور مختلف دینی وعلمی موضوعات کے علاوہ حالات حاضرہ پر گفتگو رہتی، بہر حال حضرت مفتی احمد بیمات صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت گوناگوں دینی، علمی وعملی کمالات وخوبیوں کی حامل تھی۔

اللہ تعالیٰ فتاویٰ کے اس مجموعے کو قبولیت سے نواز کر مرحوم کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، اور امت مسلمہ کو اس سے فیض یاب فرمائے، اور ان فتاویٰ کی تخریج، تعلیق، تبویب وترتیب میں علمی وتحقیقی تعاون کرنے والے اساتذہ کرام کو، نیز طباعت کے مراحل سے گذر کر منظر عام پر آنے تک میں جن حضرات نے کسی قسم کا بھی تعاون کیا ہو، ان تمام معاونین کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ ''ایں دعاء از من واز جملہ جہاں آمین باد''

فقط والسلام

سید مصلح الدین احمد بڑودوی القاسمی

خادم حدیث: جامعہ تعلیم الاسلام، ڈیوزبری مرکز، یوکے

۲۱ر محرم الحرام ۱۴۳۸ھ

۲۲ر اکتوبر، ۲۰۱۶ء، سنیچر

تقریظ وتأثر:

گرامی قدر حضرت مولانا اقبال محمد ٹنکاروی دامت برکاتہم

(مہتمم وشیخ الحدیث: دارالعلوم اسلامیہ عربیہ، ماٹلی والا، بھروچ)

الحمد لله و كفى، و الصلاة و السلام على رسوله الحبيب المصطفى، و على اله و صحبه و من أتبعه الاتباع الأوفى، أمابعد!

فتویٰ کا سلسلہ عہد رسالت سے ہی شروع ہوتا ہے؛ اس لیے فتویٰ کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے، جتنی خود دین اسلام کی، البتہ فتویٰ دریافت کرنے اور فتویٰ دینے کے طریقے، ہر عہد کے تقاضے کے مطابق بدلتے رہے اور فتاویٰ جمع کرنے کے طریقے بھی مختلف ہوتے رہے۔

عہد رسالت اور دور صحابہ میں فتاویٰ کا سلسلہ اکثر و بیشتر زبانی طور پر ہی چلتا رہا، جس طرح دیگر علوم و معارف عموماً زبانی روایت پر موقوف تھے، طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ پیش آتا، تو صحابہ کرام آں حضرت ﷺ کی جانب رجوع فرماتے؛ کیوں کہ آپ ﷺ ہی مہبط وحی، شارع اسلام اور دینی رہنمائی [فتاویٰ] کے سلسلے میں مرجع خلائق تھے، صحابہ کرام نے جو دینی مسائل آپ ﷺ سے دریافت کیے، ان کا جواب کبھی تو آیات قرآنی کی صورت میں ملتا تھا اور کبھی آپ ﷺ اپنے اجتہاد سے فتاویٰ صادر فرماتے، چناں چہ عبدالوہاب خلافؒ رقم طراز ہیں:

... بل كانوا إذا عرضت الحادثة أو شجر الخلاف أو خطر السؤال أو الاستفتاء رجعوا إلى الرسول هو يفتيهم ويفصل في خصوماتهم، ويجيب عن أسئلتهم تارة بآية أو آيات قرانية يوحي إليه بها ربه، وتارة باجتهاده الذي يعتمد فيه على إلهام الله له، أو على ما يهديه إليه عقلة وبحثه وتقديره. (خلاصة تاريخ التشريع الإسلامي، باب عهد الرسول، ص: ۱۱)

''فتاوی الرسول'' کے نام سے متعدد حضرات نے اس ذخیرہ کو جمع فرمادیا ہے۔

دور نبوت کے بعد دور صحابہ میں بھی استفتاء اور افتاء کا سلسلہ جاری رہا، اس دور میں بھی زیادہ تر زبانی طور

پر فتاویٰ پوچھے جاتے اور زبانی ہی جواب دے دیا جاتا، البتہ بعض فتاویٰ قید تحریر میں بھی آئے، جن میں بعض تو وہ تھے، جو خلفاء راشدین کے سرکاری احکام کی شکل میں قلم بند ہو کر مختلف دیار و امصار میں ارسال ہوتے رہے اور بعض فتاویٰ انفرادی کوششوں سے بھی قلم بند ہوتے رہے، کیوں کہ پہلی صدی کے خاتمہ سے قبل ہی تدوین فقہ کا دور شروع ہو گیا تھا، اور بعض جلیل القدر صحابہ اس وقت زندہ تھے، یوں گویا عہد صحابہ میں فتاویٰ کا سلسلہ زبانی اور تحریری؛ دونوں طریقوں سے جاری رہا۔

بعد کے ادوار میں بھی افتاء و استفتاء کا کام جاری رہا، البتہ ہر دور میں طریقے مختلف رہے۔ ہندوستان اور صوبۂ گجرات میں بھی مفتیان کرام اس عظیم خدمت سے وابستگی کو سعادت سمجھتے رہے، ان مفتیان کرام کا تذکرہ ''نزہۃ الخواطر'' میں متعدد حضرات کے تذکروں کے ضمن میں موجود ہے، ان فقہاء و مفتیان کرام کی خدمات کو مفتی عبد القیوم راجکوٹی صاحب نے ''فقہاء گجرات اور ان کی فقہی خدمات'' میں یکجا کر دیا ہے، جس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہر عہد اور ہر صدی میں گجرات میں یہ خدمت جاری رہی۔ آٹھویں صدی سے موجودہ صدی تک کے جن علماء کرام نے میں گجرات میں یہ خدمات انجام دی ہیں، مفتی عبد القیوم صاحب نے نزہۃ الخواطر کے حوالے سے ان کے نام ذکر کیے ہیں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی استاذ محترم حضرت مفتی احمد ابراہیم بیمات صاحب ہیں، جن کے فتاویٰ کے بارے میں فتاویٰ فلاحیہ کی جلد نمبر ۲ میں تفصیلی تحریر لکھ چکا ہوں۔

ماضی قریب تک، فتاویٰ میں فقہی عبارتیں درج کرنے کا رواج بہت کم تھا، حضرت مفتی صاحبؒ بھی اکثر و بیشتر فتاویٰ میں عبارتیں ذکر کرنے کے بجائے قدیم طرز کے مطابق کتاب، صفحہ اور جلد نمبر کا تذکرہ فرما دیا کرتے تھے، اب اس دور میں اکابر کی کتابوں اور فتاویٰ پر تحقیق کا سلسلہ چل پڑا ہے، جو انتہائی مفید ہے۔

فتاویٰ کو فقہی عبارات و مستدلات سے مزین کرنا ایک اہم اور نازک کام ہے، الحمد للہ جناب مولانا مجتبیٰ حسن قاسمی صاحب نے اس کام کو بڑی سلیقہ مندی سے انجام دیا ہے، کم سے کم الفاظ و کلمات پر مشتمل عناوین سازی، ضرورت کے مطابق حضرت مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ کی تائید میں قدیم فتاویٰ اور اکابر مفتیان کرام کی کتابوں کے اقتباسات، کہیں کہیں فتویٰ میں اختلاف کی بناء پر غور و فکر کا خلاصہ و ماحصل، تفصیلی حوالہ جات، جدید املا کے قواعد کی مکمل رعایت؛ اس مجموعہ کی اہم خوبیاں ہیں۔

حوالہ جات میں دلائل کی ترتیب بھی بہت خوب ہے، گجراتی زبان سے اردو میں منتقلی کے دوران عبارت

کے تمام اجزاء میں ربط کو ملحوظ رکھا گیا تھا، اگر کہیں بے ربطی معلوم ہوئی، تو اس کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فتاویٰ دراصل مسلم معاشرہ کے اقتصادی، معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل کے عکاس ہوتے ہیں، ان سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ایک مخصوص معاشرہ کے افراد، ایک مخصوص وقت اور حالات میں کن مسائل کا شکار تھے، معاشرتی تغیرات اور علمی وفکری اختلافات کی نوعیت کیا تھی؟ اور بعد میں تغیرات کے سبب فتویٰ میں کیا تبدیلیاں ہوئیں، اور اب فقہ اکیڈمیوں کے اجتماعی فیصلے کیا ہیں؟ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر کوئی فتویٰ حضرت مفتی صاحبؒ نے لکھا، اور حالات ووقت کے تغیرات کی بناء پر اب صورت حال تبدیل ہو چکی ہے، ایسے فتاویٰ میں فاضل مرتب نے فقہ اکیڈمی کے فیصلے بھی درج کر دیے ہیں، جس کی وجہ سے اصل اجتماعی حکم، دوران مطالعہ ہی حاصل ہو جائے گا اور اکیڈمیوں کے فیصلے کی جانب مراجعت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

مرتب فتاویٰ، اپنا طریقۂ تحقیق وتخریج اور خطِ عمل پہلی جلد میں پیش کر چکے ہیں، قارئین سے گذارش ہے کہ دوران مطالعہ اس خطِ عمل کو ملحوظ رکھیں۔

دعاء گو ہوں کہ اللہ پاک اس مجموعہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے، عوام وخواص کے لیے مفید ہو اور حضرت الاستاذ اور ان کے صاحب زادے جناب حافظ اسجد صاحب کے لیے ذخیرۂ آخرت بنے، آمین۔

اقبال بن محمد ٹنکاروری

مہتمم: دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا
عیدگاہ روڈ، بھروچ، گجرات، الہند

۲۴ رمحرم الحرام ۱۴۳۸ھ
موافق: ۲۶ را کتوبر ۲۰۱۶ء

رائے گرامی وتاثر:

حضرت مولانا ومفتی محمد نعمان قاسمی دامت برکاتہم

استاذ حدیث وفقہ: دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی، بھروچ، گجرات

الحمد للہ رب العلمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین، وعلی اٰلہ وصحبہ أجمعین، وعلی جمیع من تبعھم باحسان إلی یوم الدین، أما بعد:

اللہ رب العزت نے حضرت انسان کو ہزاروں مخلوقات میں جو عزت وشرافت سے نوازا ہے، اس کی بنیادی اور اصلی وجہ تعلیم ہے، انسان خود بھی سیکھتا ہے اور دوسروں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرتا ہے۔

تاریخ انسانیت کے سنہری اوراق میں آج بھی وہ لوگ زندۂ جاوید ہیں، جنہوں نے تعلیم کے ذریعے افرادسازی کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، یہ روشن ضمیر نفوس انسانوں کے قلوب کو علم نبوی کی ضیا پاش کرنوں سے منور کر کے اپنے لیے صدقۂ جاریہ بنا گئے۔

امم سابقہ کے مقابلہ میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ دربار رسالت سے انہوں نے جو فیضان حاصل کیا اسے پوری امانت ودیانت کے ساتھ اپنے بعد والوں کی طرف منتقل کر دیا۔

کس قدر خوش نصیب تھے حضرات صحابہ، کہ جنھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا رؤف ورحیم معلم نصیب ہوا، جن کے فیض صحبت سے انہوں نے وہ گوہر مراد حاصل کیا، جسے آج کی ترقی یافتہ کہی جانے والی دنیا حاصل کرنے کے لیے سرگرداں ہے۔

آج کی دنیا جن فنون کو علم کا درجہ دے رہی ہے، اس کا محور صرف دنیا اور دنیا کی زندگی ہے، زندگی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے گل ہو جانے اور سانسوں کے بندھن کے ٹوٹ جانے کے بعد قبر وحشر اور جنت ودوزخ؛ ایسی چیزیں ہیں، جن تک انسانی عقل کی رسائی ناممکن ہے، بڑے سے بڑے ڈاکٹر اور حاذق حکیم کی معلومات اسی وقت تک ساتھ دیتی ہیں، جب تک جسم وروح کا رشتہ باقی ہے، روح کے جسد عنصری سے پرواز کرتے ہی میڈیکل سائنس تمام تر جدید سہولیات اور نت نئی معلومات سے مسلح ہونے کے باوجود اپنی شکست کے اعلان پر مجبور ہو جاتا ہے، مرنے

کے بعد کی زندگی کا تو پوچھنا ہی کیا:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم وپیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع وضرر کر نہ سکا

زندگی کیا ہے؟ زندگی کے مقاصد کیا ہیں؟ زندگی کیسے گذارنی چاہیے؟ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اعمال صالحہ کا برزخی زندگی میں کیا اثر مرتب ہوتا ہے اور اعمال سیئہ دنیا وآخرت میں کس طرح پریشان کرتے ہیں؟ جنت کیا ہے؟ اس کی نعمتیں کیا ہیں؟ اس کے حصول کا کیا طریقۂ کار ہونا چاہیے؟ جہنم کیا ہے؟ اس میں موجود طرح طرح کے عذاب کیسے ہیں؟ اس سے چھٹکارے کا لائحۂ عمل کیا ہونا چاہیے؟ اس طرح کے ان گنت سوالات ہیں، جن کے تشفی بخش جواب سے دنیا بھر کے عقلاء، مفکر ودانش ور اپنی عقل سے صبح قیامت تک نہیں دے سکتے۔

ان بنیادی مسائل کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کا مبارک ومسعود سلسلہ جاری فرمایا، جنھوں نے اپنے اپنے دور میں گم گشتہ راہ انسانیت کو وحدانیت کا درس دیا اور انھیں حقیقی انسان بنا دیا۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ علوم دینیہ ہی علم کہے جانے کے لائق ہیں؛ اس لیے کہ ان کا دائرہ کار صرف دنیوی زندگی تک محدود نہیں؛ بل کہ مرنے کے بعد بھی یہ علوم پوری راہ نمائی کر رہے ہیں۔

حق جل مجدہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں دین اسلام سے نواز کر جینے کا شعور اور سلیقہ عطا فرمایا، مذہب اسلام نے ہر ہر قدم پر احکام وآداب بتائے، زندگی کے ہر موڑ پر خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، گھریلو ہو یا دفتری، ہر شخص کے لیے اس کے مناسب حال راہ نمائی کی ہے، صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ شرعی احکام وآداب کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے اور غور کیا جائے کہ شریعت نے ہماری کس طرح دست گیری کی ہے؟ اسلام کے پورے مطالعے کے بعد آپ ضرور اس نتیجے پر پہونچیں گے کہ مذہب اسلام شروع سے آخر تک شفقت ہی شفقت ہے۔

زیر نظر مجموعہ ''فتاوی فلاحیہ'' زندگی کے ہر شعبے میں راہ نمائی کرنے والا مستند مجموعہ ہے، جو سرزمین گجرات کی بافیض شخصیت، ام المدارس دار العلوم دیوبند کے مایۂ ناز سپوت، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور حضرت مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوری نور اللہ مرقدہما جیسے جبال علم کے لائق شاگرد حضرت مفتی احمد بیمات صاحب مرحوم کے گہر بار قلم سے نکلے ہوئے فتاوی ہیں، جن کے مطالعہ سے ہر شخص بآسانی دینی راہ نمائی حاصل کرسکتا ہے۔

حضرت مفتی احمد بیمات مرحوم اپنے دور کے جید ترین ارباب افتا میں رہے ہیں، گجرات سے نکل کر ہندوستان ہی نہیں؛ بل کہ بیرون ہند بھی ان کے فتاوی کو شہرت حاصل ہوئی ہے، آپ بیک وقت فقیہ ہونے کے ساتھ

محدث کبیر بھی تھے، گجرات کے مختلف اور ممتاز اداروں میں طویل عرصے تک بخاری شریف پڑھا کر آپ نے "مسند مشیخت حدیث" کو زینت بخشی، قدرت نے آپ کو حسن تدبیر کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا، مرحوم متعدد علمی، سماجی اور فلاحی تنظیموں کے سرگرم رکن اور کہیں سربراہ اعلیٰ بھی رہے۔

فقہ اور حدیث پر آپ کی نظر گہری تھی، فقہی جزئیات پر مبصرانہ نگاہ رکھتے تھے، اسی اوجِ فقاہت کا اثر تھا کہ اہم اہم مسائل پر بھی آپ کا اشہب قلم سرپٹ دوڑتا، فتویٰ نویسی میں آپ کی کثرت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک تین ضخیم جلدیں منصہ شہود پر آچکی ہیں اور امید ہے کہ چھ سات جلدیں مزید آئیں۔

اس مبارک مجموعہ کی دو جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں عقائد، طہارت، صلوۃ وغیرہ کے مسائل بہت عمدہ انداز سے ترتیب دیے گئے ہیں، فاضل مرتب مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی صاحب لائق تحسین ومبارک باد ہیں کہ انھوں نے فتاویٰ کو خوب سے خوب تر بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے، اللہ تعالیٰ نے موصوف کو کام کرنے کے ساتھ، کام لینے کا سلیقہ بھی عطا فرمایا ہے، تفصیلی تخریج نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ دارالعلوم مدنی دارالتربیت اور اس کے علاوہ مختلف اہل علم نے اسے مستند بنانے کی جی توڑ کوشش کی ہے، فجزاہم اللہ۔

اہل علم کی اس کامیاب جدوجہد پر صاحب زادہ محترم حافظ محمد اسجد مفتی احمد بیمات صاحب (جو فتاوی فلاحیہ کے اس مرحلے تک پہنچانے کے سب سے بڑے محرک ہیں، انھوں نے جو تن دہی اور مستعدی دکھائی ہے، وہ ان ہی کا حصہ ہے؛ کیوں کہ جب تک وہ کسی کام کو انجام تک نہیں پہنچالیتے، اس وقت تک ان کی سیمابی طبیعت بے قرار رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزاء خیر دے کہ انھوں نے والد مرحوم کے کام کو کارآمد بنا کر قوم وملت کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی) کی جانب سے انعامات سے حوصلہ افزائی بھی کی گئی؛ تاہم کسی مصلحت کے پیش نظر ان کے اسماء گرامی کو صیغۂ راز میں رکھا گیا، تاکہ ان کا آبگینۂ اخلاص ریاکاری کے مسموم جراثیم سے گدلا اور بے رونق نہ ہوجائے۔

مرتب کتاب نے بھی اپنے اخلاص کو ریاکاری سے بچاتے ہوئے صرف مرتب کے عنوان پر اکتفا کیا ہے، البتہ اپنے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرنے سے دریغ نہیں کیا ہے۔

امید ہی نہیں، یقین کامل ہے کہ فتاویٰ کی یہ جلد بھی دوسری جلدوں کی طرح ارباب علم وفضل سے خراج تحسین حاصل کرے گی اور خلقِ خدا مفتی صاحب مرحوم کے ان بیش قیمت قیمت جواہر پاروں سے مستفید ہوتی رہے گی۔

(مولانا و مفتی) محمد نعمان قاسمی حنفی (صاحب)

خادم حدیث وفقہ: دارالعلوم مدنی دارالتربیت،
کرمالی، رویدرا، وایا: پانولی، ضلع: بھروچ، گجرات

۲۲ محرم الحرام ۱۴۳۸ھ
موافق: ۲۴ ر اکتوبر ۲۰۱۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین، أما بعد.

ہر زمانے میں علماء امت نے اسلام کی مختلف اعتبار سے خدمت کی، بہ طور خاص اکابر دیوبند کو اللہ تعالیٰ نے اس اعتبار سے خاص ذہن و دماغ عطا فرمایا، جنہوں کے دنیا کے ہر خطے اور اسلام کے ہر گوشے کو اپنی خدمت کا میدان بنایا، اور ہر طرح کی جدوجہد اور محنت سے اسلام اور اسلامی تعلیمات کو عام کیا۔

انہیں اکابر میں والد گرامی حضرت مولانا ومفتی احمد ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی تھی، جنہوں نے ایک لمبے عرصے تک فتاویٰ نویسی کی خدمت انجام دی۔

قدیم زمانے سے یہ بات چلی آرہی ہے کہ اکابر کے انتقال کے بعد ان کی چھوڑی ہوئی علمی میراث کو ان کے اصاغر، امت تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ امت ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے علم سے فیض حاصل کرتی رہے۔ اللہ کا شکر و احسان ہے کہ اسی جذبے کے تحت اس ناچیز کو والد گرامی کے فتاویٰ بہ نام ”فتاویٰ فلاحیہ“ کی تیسری جلد قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔

یہ جلد چھ سو سے زائد صفحات اور ۴۰۰ رسے زائد مسائل پر مشتمل ہے، جنائز اور نماز کے مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

پہلی جلد کی طباعت کے بعد بہت سے اکابر علماء اور شائقین نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا، حوصلہ افزا کلمات کہے، اور تمام جلدوں میں اسی معیار کو برقرار رکھنے کی تاکید کی، دوسری جلد میں بھی اس معیار کو برقرار رکھا گیا، اور اس تیسری جلد میں بھی اس کے معیار سے سمجھوتا نہیں کیا گیا ہے؛ اس لیے توقع ہے کہ ان شاء اللہ اس سے امت کو بڑا فائدہ ہوگا۔

اس موقع پر میں شکر گذار ہوں مشہور عالم دین، والد گرامی کے ہم درس، حضرت مولانا سید مصلح الدین بزدوی دامت برکاتہم کا، کہ انھوں نے اپنی قیمتی تحریر عنایت فرمائی۔

نیز احسان مند ہوں حضرت مولانا اقبال محمد فلاحی ٹنکاروی دامت برکاتہم (شیخ الحدیث و مہتمم: دار العلوم اسلامیہ عربیہ، ماٹلی والا، بھروچ) کا، کہ انہوں نے فتاویٰ فلاحیہ کی اس جلد کے تعلق سے گراں قدر تاثر کا اظہار کیا۔

میں شکریہ ادا کرتا ہوں، دار العلوم مدنی دار التربیت کرمالی کے استاذ حدیث حضرت مولانا و مفتی محمد نعمان صاحب کہ، کہ انہوں نے میری خواہش پر بہت جلد فتاویٰ فلاحیہ کے تعلق سے ایک جامع تاثر لکھ دیا، اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے، آمین۔

نیز میں ممنون ہوں مرتب فتاویٰ حضرت مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی صاحب کا، کہ انھوں نے انتہائی جاں فشانی کے ساتھ فتاویٰ کی ترتیب ونظر ثانی کا کام انجام دیا، اور معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کے لیے ہر طرح کی سعی وکوشش کو بروئے کار لائے، اللہ تعالیٰ انھیں اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے۔

قارئین کے علم میں یہ بات ہوگی کہ والد گرامی کے بیشتر فتاویٰ گجراتی زبان میں تھے، مختلف علماء کے ذریعے ترجمے کرائے گئے، میں ان تمام علماء کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں ان اہل خیر حضرات کا شکریہ ادا نہ ہوں، جنہوں نے اپنی جائز آمدنی اور حلال مال سے ہمارا تعاون فرمایا، اللہ ہر ایک کی جائز تمنا پوری فرمادے اور فتاویٰ فلاحیہ کو مفتی صاحب کی دیگر تصانیف کی طرح شرف قبولیت سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

میرے بڑے بھائی جناب مولانا امجد بن مفتی احمد بیمات فلاحی دامت برکاتہم ان دنوں سخت بیمار ہیں، اس لیے میں تمام مخلصین ومعاونین سے ان کی صحت یابی کی دعاء کی درخواست کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ان کو جلد شفا عطا فرمائے، آمین۔

(حافظ) اسجد بن مفتی احمد بیمات
رکن منتظمہ: دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی، بھروچ، گجرات
خادم: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا
e-mail:hafizasjed@hotmail.com

۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۸ھ
موافق: ۲۵ / اکتوبر ۲۰۱۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مرتب

الحمد للہ رب العالمین، و الصلاۃ و السلام علی سید الأنبیاء و المرسلین، و علی آلہ و صحبہ أجمعین، أما بعد!

فتاویٰ فلاحیہ کی تیسری جلد پیش خدمت ہے، شکر گذاری کے اس موقع پر احقر بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہے کہ اس نے اس کم سواد کو فتاویٰ فلاحیہ کے اس اہم علمی سلسلہ کو جاری رکھنے کی توفیق بخشی، ورنہ تو یہ کسی بھی لائق نہیں ہے، دعاء ہے کہ جس نے توفیق بخشی ہے، وہی اسے قبولیت بھی عطا فرمادے، اور بقیہ جلدوں کی تکمیل کی ہمت بھی، و ما ذلك علیہ بعزیز.

جنائز و زکاۃ سے متعلق ۱۹؍ سے ابواب اور ۴۰۰؍ سے زائد سوال و جواب پر مشتمل اس تیسری جلد کو احقر نے اپنی وسعت کے مطابق خوب سے خوب تر بنانے کی سعی کی ہے، کوشش کی ہے کہ کوئی مسئلہ حوالے کے بغیر نہ رہے، نصوص کے ذکر کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، اور ان تمام امور کا لحاظ کیا گیا ہے، جن سے پہلی اور دوسری جلد مزین ہے۔

عام طور پر اکابر علماء کی تحریر و فتاویٰ میں حوالے کا اہتمام نہیں ہوتا تھا یا برائے نام حوالے درج کیے جاتے تھے، کہیں صرف کتاب کے نام پر اکتفا کیا جاتا، تو کہیں عبارت کا مفید مطلب ٹکڑا لکھ دیا جاتا، اور یہ طریقہ ان کے عہد میں رائج تھا اور باعث اطمینان بھی، عوام کے لیے عبارت اور حوالے کی ضرورت نہیں تھی، اور اہل علم کا اشتغال علم، اس درجے کا تھا کہ اشارے سے اصل مسئلے تک پہنچ جاتے تھے، ادھر علمی انحطاط آیا اور اشتغال علم کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی، جو اکابر کا حصہ تھی؛ اس لیے حوالے کے طور پر طویل عبارت لکھنے کا رواج چل پڑا ہے، اور آج کی ذرائع مواصلات کی ترقی یافتہ دنیا میں عوام بھی بغیر حوالے کے کسی بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

ناچیز نے اسی کے پیش نظر تفصیلی عبارت، اور اس پر کی گئی علمی بحث کو ذکر کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے، سیاق و سباق کے ساتھ عبارت اس انداز میں نقل کی گئی ہے کہ اصل کتاب کی جانب رجوع کی ضرورت باقی نہ

رہے۔ بعض ذہین اور نازک طبیعتوں کے لیے یہ طرز گرچہ باعث کلفت ہے، لیکن احقر کی ذکر کردہ وجہ سے وہ مطمئن ہوجائیں گے، ان سب کے باوجود اگر علم وتحقیق کے راہ رو کو یہ انداز ہضم نہ ہو، تو وہ یہ سوچ کر اس حقیر کو معذور سمجھیں کہ:

و للناس فیما یعشقون مذاھب.

تخریج وتعلیق کا ایک اہم مقصد تسہیل ہے، اس لیے کسی مسئلہ کی متعلقہ عبارت اگر ماقبل میں آ گئی ہے، تو صرف حوالہ دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بل کہ اسے دوبارہ درج کر دیا گیا ہے، اس کی وجہ سے تکرار ضرور پیدا ہوتا ہے، لیکن فی نفسہ اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا سکتا۔

تیسری جلد پریس کے حوالے کی جارہی ہے، اس موقع پر میں ممنون ہوں مفکر ملت، حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی دامت برکاتہم کا، کہ جب مولانا اجود بیات صاحب (مہتمم دار العلوم، کرمالی) کی معیت میں، ان کی خدمت میں دوسری جلد پیش کی گئی، تو حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے بڑے وقیع کلمات استعمال فرمائے اور ساتھ ہی فرمایا، کہ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ ان شاء اللہ ''فتاویٰ فلاحیہ'' کا کام ضرور پایۂ تکمیل کو پہنچے گا، اس [تیسری] جلد کی ترتیب وتخریج اور دیگر امور کے دوران جہاں کام کی رفتار دھیمی ہوتی، حضرت والا کا یہ جملہ یاد آنے لگتا، اور خیال ستانے لگتا کہ جب حضرت والا دریافت فرمائیں گے کہ کام کہاں تک ہوا، تو کیا جواب دوں گا؟ ــــــ اس کی برکت سے کام اپنے فطری رفتار پر جاری ہوجاتا۔ دعاء ہے کہ رب کریم حضرت والا کا سایہ، صحت وعافیت کے ساتھ، ہم پر تادیر قائم رکھے، آمین۔

میں شکر گذار ہوں دار العلوم اسلامیہ عربیہ، ماٹلی والا کے عالی وقار مہتمم وشیخ الحدیث، حضرت مولانا اقبال محمد ٹنکاروی فلاحی دامت برکاتہم کا، حضرت والا فتاویٰ کے بارے میں معلوم کرتے رہتے ہیں کہ کام کس مرحلے میں ہے، لکھنے پڑھنے والوں پر یہ مخفی نہیں کہ آج کل کے ماحول میں- جب کہ علمی ذوق ختم ہوتا جارہا ہے- کسی علمی کاز کے بارے میں یہ دریافت کرنا کہ کس مرحلے میں ہے، کام کرنے والے کے لیے کسی اکسیر سے کم نہیں، اس سے ہمت جوان ہوتی ہے اور کام کرنے والوں میں نیا جوش وجذبہ پیدا ہوتا ہے۔

میں اپنے کرم فرما جناب حافظ اسجد مفتی احمد بیمات صاحب کا دل کی اتھاہ گہرائی سے شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ انہوں نے وقفے وقفے سے کام کا تقاضہ کیا، اس ناچیز کو امید نہیں تھی کی تیسری جلد ششماہی امتحان [ماہ ربیع الاول] سے پہلے پریس میں جانے کے قابل ہوسکے گی، مگر ان کے خلوص اور پیہم تقاضے نے اسپرٹ پیدا کی اور الحمد للہ ایک

خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اللہ تعالیٰ انھیں بہترین بدلہ عطا فرمائے، ان کے اہل خانہ کو دینی و دنیوی ترقیات سے نوازے، آمین۔

دارالاحسان بارڈولی کے استاذ حدیث وفقہ، وسیع النظر مفتی، مشفق ومحترم حضرت مولانا محمد فاروق صاحب دربھنگوی دامت برکاتہم کا تہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر کتاب الزکاۃ کے بیشتر ابواب پر نظر ثانی فرمائی اور متعدد اہم امور کی جانب توجہ دلائی، اللہ تعالیٰ ان اس کا اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے۔

رفیق محترم حضرت مولانا ومفتی محمد نعمان صاحب قاسمی مدظلہ (استاذ حدیث وفقہ، دارلعلوم کرمالی، انکلیشور، بھروچ) کو میں کیوں کر فراموش کرسکتا ہوں کہ انہوں نے بڑے اچھوتے انداز میں فتاویٰ فلاحیہ پر اپنے تاثر کا اظہار فرمایا، اور ہر طرح سے حوصلہ بڑھایا، اللہ تعالیٰ انہیں زندگی کے ہر موڑ پر بامراد کرے، آمین۔

تیسری جلد کی تحقیق وتخریج اور تصحیح کے دوران دار العلوم ماٹلی والا کے شعبۂ تخصص فی الفقہ کے طلبہ (مولوی محمد بن اشرف پالن پوری، مولوی احمد رحمت اللہ مجادری، مولوی محمد بن معمور قاسمی بروڈوانی، مولوی حفیظ الرحمٰن بن حفظ الرحمٰن پالن پوری، مولوی رفیق بن سلیم ویرم گام، مولوی محسن بن عبد الغفار دھولکا، مولوی عمیر بن اسماعیل گڈھا، مولوی عبدالمتین بن منور اسلام پوری، جعفر بن محمد غوث جمکھنڈی، راحل بن ذاکر دیودر، اور مولوی حذیفہ بن عبدالمجید کوکنی) شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے حوالہ جات کی تخریج اور پروف ریڈنگ میں تعاون کیا، اللہ تعالیٰ ان میں علمی ذوق پیدا فرمائے، اور مستقبل میں علمی مشغلہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اہل ذوق سے درخواست ہے کہ اس میں اگر کوئی غلطی در آئی ہو، تو اسے اس حقیر کی جانب سے سمجھیں اور بلا تکلف مطلع فرمائیں، حقیر ممنون ہوگا۔

مجتبیٰ حسن قاسمی
خادم حدیث: دارالعلوم اسلامیہ عربیہ، ماٹلی والا، بھروچ
برائے رابطہ: 09409518452
Email: qasmimujtaba@gmail.com

مورخہ: ۲۳ر محرم الحرام ۱۴۳۸ھ
۲۵ر اکتوبر ۲۰۱۶ء، بروز: منگل

کتاب الجنائز

عن أم سلمة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: كسر عظم الميت ككسر عظم الحي في الإثم.

(سنن ابن ماجہ، ۱۱۷، دیوبند)

متفرقات الجنائز

(متفرقات)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

متفرقات الجنائز

[متفرقات]

[۱] غیر مسلم یا شیعہ کے انتقال پر "إنا للہ و إنا إلیہ راجعون" پڑھنا

۱۰۶۶-سوال: کسی غیر مسلم یا شیعہ کے انتقال کی خبر سن کر "اناللہ وانا الیہ راجعون" پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

غیر مسلم کے انتقال پر، نیز شیعہ کے انتقال پر- جب کہ اس کے عقائد کفریہ ہوں- "انا للہ الخ" پڑھنا درست نہیں ہے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] غیر مسلم کے جنازے کو دیکھ کر کھڑا ہونا اور استرجاع پڑھنا

۱۰۶۷-سوال: سوال: کسی غیر مسلم کے جنازے کو دیکھ کر کھڑے ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز "إنا للہ وإنا إلیہ راجعون" پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

مشتاق علی عبد اللہ تمبی

---

(۱) کافر و شیعہ کی موت کی خبر سننے پر الحمد للہ پڑھنا چاہیے؛ کہ اس کے شرک و کفر کی اور عقائد باطلہ سے اللہ تعالیٰ نے زمین کو پاک کر دیا:

قال اللہ تعالی: ﴿فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي نَجَّانَا مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ (۲۳-المؤمنون: ۲۸)

قال الألوسي: فإن الحمد على الإنجاء منهم متضمن للحمد على إهلاكهم، وإنما قيل ما ذكر ولم يقل فقل الحمد لله الذي أهلك القوم الظالمين لأن نعمة الإنجاء أتم، وقال الخفاجي: إن في ذلك إشارة إلى أنه لا ينبغي المسرة بمصيبة أحد ولو عدوا من حيث كونها مصيبة له بل لما تضمنته من السلامة من ضرره أو تطهير الأرض من وسخ شركه وإضلاله. ـــــــ وأنت تعلم أن الحمد هنا رديف الشكر فإذا خص بالنعمة الواصلة إلى الشاكر لا يصح أن يتعلق بالمصيبة من حيث إنها مصيبة وهو ظاهر، وفي أمره عليه السلام بالحمد على نجاة أتباعه إلى أنه نعمة عليه أيضا. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني - شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م: ۱۲۷۰ھ): ۹/ ۲۳۰، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

الجواب حامداً ومصلیاً:

کافر اور یہودی کے جنازے کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم (پہلے) کھڑے ہوجاتے تھے۔[1] لیکن بعد میں آپ نے اس معمول کو ترک فرمادیا تھا۔ (مرقات شرح مشکوۃ)[2] اس لیے کھڑا ہونا اور مذکورہ دعاء

---

(۱) عن جابر بن عبد الله رضي الله عنهما، قال: مر بنا جنازة، فقام لها النبي صلى الله عليه وسلم وقمنا به، فقلنا: يا رسول الله إنها جنازة يهودي، قال: إذا رأيتم الجنازة، فقوموا. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۷۵، رقم الحديث: ۱۳۱۱، كتاب الجنائز، باب من قام لجنازة يهودي، ط: ديوبند)

... عبد الرحمن بن أبي ليلى، قال: كان سهل بن حنيف، وقيس بن سعد قاعدين بالقادسية، فمروا عليهما بجنازة، فقاما، فقيل لهما إنها من أهل الأرض أي من أهل الذمة، فقالا: إن النبي صلى الله عليه وسلم مرت به جنازة فقام، فقيل له: إنها جنازة يهودي، فقال: أليست نفسا. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۱۳۱۲)

عن جابر بن عبد الله، قال: مرت جنازة، فقام لها رسول الله صلى الله عليه وسلم، وقمنا معه فقلنا: يا رسول الله، إنها يهودية، فقال: إن الموت فزع، فإذا رأيتم الجنازة فقوموا. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۱۰، رقم الحديث: ۷۸-۹۶۰، كتاب الجنائز، باب القيام للجنازة، ط: ديوبند)

[۲] عن جعفر بن محمد، عن أبيه، أن الحسن بن علي كان جالسا فمر عليه بجنازة، فقام الناس حتى جاوزت الجنازة، فقال الحسن: إنما مر بجنازة يهودي وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم على طريقها جالسا، فكره أن تعلو رأسه جنازة يهودي، فقام». (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳ھ): ۴/ ۴۷، رقم الحديث: ۱۹۲۷، كتاب الجنائز، الرخصة في ترك القيام، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

قال الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): (فقام الناس) أي: بعضهم الذين لم يبلغهم النسخ، أو كانوا قائلين بالاستحباب أو الجواز. (حتى جاوزت) أي: تعدت. (الجنازة) من مقابلتهم. (فقال الحسن: إنما مر بجنازة يهودي وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم على طريقها جالسا وكره أن تعلو رأسه جنازة اليهودي) إيماء إلى أن الإسلام يعلو ولا يعلى عليه. (فقام) أي: عن الطريق لهذا، وهذا إنكار منه رضي الله عنه على قيام الناس للجنازة، عكس ما سبق منه من الإنكار على ابن عباس على عدم القيام، ولعل هذا متأخر فيكون بعد تفحصه المسألة وتقررها عنده أن قيامه صلى الله عليه وسلم إنما كان لهذه العلة؛ لأنه اختلفت علل القيام فجعلت تارة للفزع، وأخرى كرامة للملائكة، وأخرى كراهية رفعة جنازة اليهودي على رأسه صلى الله عليه وسلم، والأخرى لم تعتبر شيئا من ذلك لاختلاف المقامات، ويمكن جمع العلل بمعلول واحد، إذ العمل بالنيات، أو كان إنكاره على ابن عباس لأنه كان على الطريق، وإنكاره على الناس لأنهم لم يكونوا على الطريق، والله أعلم. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۳/ ۱۲۱۴، رقم الحديث: ۱۶۸۴، كتاب الجنائز، المشي بالجنازة والصلاة عليها، ط: دار الفكر)

پڑھنا درست نہیں۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] میت کی ہڈی توڑنا

۱۰۶۸-سوال: بہت پہلے ایک عبارت مطالعہ میں آئی تھی کہ مردے کے جسم کی ہڈی توڑنے میں زندہ کی ہڈی توڑنے کے برابر گناہ ہے، تو کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

میت کی ہڈی توڑنا ناجائز اور گناہ کا کام ہے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) کافر کی موت کی خبر سننے پر یا جنازہ دیکھ کر "الحمد للہ" پڑھنا چاہیے، تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں: "غیر مسلم یا شیعہ کے انتقال پر "إنا للہ وإنا إلیہ راجعون" پڑھنا"۔

(۲) عن أم سلمة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: كسر عظم الميت ككسر عظم الحي في الإثم. (سنن ابن ماجه، ص: ۱۱۷، رقم الحديث: ۱۶۱۷، كتاب لجنائز، باب في النهي عن كسر عظام الميت، ط: ديوبند)

عن عائشة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: كسر عظم الميت ككسره حيا. (سنن أبي داود: ۴۵۸، رقم الحديث: ۳۲۰۷، كتاب الجنائز، باب في الحفار يجد العظم هل يتنكب ذلك المكان؟، ط: دديوبند☆مسند إسحاق بن راهويه- أبو يعقوب إسحاق بن إبراهيم بن مخلد بن إبراهيم الحنظلي المروزي المعروف بـ ابن راهويه (م: ۲۳۸هـ): ۲/ ۴۳۸، رقم الحديث: ۱۰۰۶، ما يروى عن عائشة بنت أبي بكر الصديق رضي الله عنهما زوجة النبي صلى الله عليه وسلم، ت: د. عبد الغفور بن عبد الحق البلوشي، ط: مكتبة الإيمان - المدينة المنورة☆الجامع لابن وهب- أبو محمد عبد الله بن وهب بن مسلم المصري القرشي (م: ۱۹۷هـ)، ص: ۲۸۳، رقم الحديث: ۴۹۱، كتاب القسامة والعقول والديات، ت: د. رفعت فوزي عبد المطلب - د. علي عبد الباسط مزيد، ط: دار الوفاء☆مسند الإمام أحمد بن حنبل (م: ۲۴۱هـ): ۴۰/ ۳۵۴، رقم الحديث: ۲۴۳۰۸، مسند النساء، مسند الصديقة عائشة بنت الصديق رضي الله عنها، ت: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة☆شرح مشكل الآثار- أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة بن عبد الملك بن سلمة الأزدي الحجري المصري المعروف بـ 'الطحاوي' (م: ۳۲۱هـ): ۳/ ۳۰۹، رقم الحديث: ۱۲۷۶، باب بيان مشكل ما روي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في كسر عظم الميت، ت: شعيب الأرنؤوط، ط: مؤسسة الرسالة)

لأن الميت يتأذى بما يتأذى به الحي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۹۲، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة عند الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

نوٹ: مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مردے کے جسم کی ہڈی کو توڑنے میں ویسا ہی گناہ ہے، جیسا کہ زندہ شخص کے جسم کی ہڈی کو توڑنے میں ہے، البتہ زندہ شخص کی ہڈی توڑنے میں جو قصاص، ارش یا دیت لازم ہوتی ہے، اس حکم سے مردے کی ہڈی کا توڑنا مستثنیٰ ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: شرح مشکل الآثار: ۳/ ۳۰۹، حدیث نمبر: ۱۲۷۸)

[۴] جس کمرے میں میت کی روح قبض ہوئی ہو، اس کو تین دن تک دھونی دینا

۱۰۶۹-سوال: جس کمرے میں میت کی روح قبض ہوئی ہو، اس کمرے میں مسلسل تین دن تک لوبان کی دھونی دینا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

اس کی کوئی اصل نہیں ہے، اور جس کی کوئی اصل نہ ہو، دین سمجھ کر اس کو انجام دینا بدعت ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے دین میں کوئی ایسی نئی چیز ایجاد کی، جس کا تعلق اس [دین] سے نہیں ہے، تو وہ قابل رد ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] زائد جنازہ دوسری بستی بھیج دینا

۱۰۷۰-سوال: ہمارے گاؤں میں دو جنازے[2] ہیں، جس میں سے ایک جنازہ کسی کام کا نہیں، تو وہ جنازہ کسی دوسری بستی میں دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

اگر جنازے کی بالکل ضرورت نہ ہو، نہ ابھی اور نہ آئندہ، تو قریب کی بستی میں جہاں ضرورت ہو، بھیج سکتے ہیں۔ (درمختار مع شامی: ۴/ ۳۵۹)[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن عائشة قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أحدث في أمرنا هذا ماليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا علي صلح جور فالصلح مردود، ط: ديوبند)

(۲) میت کو گھر سے قبرستان تک لے جانے والی چارپائی، جسے بعض علاقوں میں "تابوت" بھی کہا جاتا ہے۔

[۳] وعن الثاني ينقل إلى مسجد آخر بإذن القاضي (ومثله) في الخلاف المذكور (حشيش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما و) كذا (الرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر) والحوض (إلى أقرب مسجد أو رباط أو بئر) أو حوض (إليه). (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: وعن الثاني إلخ) جزم به في الإسعاف حيث قال: ولو خرب المسجد وما حوله وتفرق الناس عنه لا يعود إلى ملك الواقف عند أبي يوسف فيباع نقضه بإذن القاضي ويصرف ثمنه إلى بعض المساجد اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۳۵۹، كتاب الوقف، فرع بناء بيتا للإمام فوق المسجد، مطلب فيما لو خرب المسجد أو غيره، ط: دار الفكر - بيروت)

بعض عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے، جب کہ متعدد محققینؒ نے اپنے تجربے کی بنیاد پر اسی قول کو قابل عمل اور راجح قرار دیا ہے، اس سلسلے میں علامہ شامیؒ نے تفصیلی بحث کی ہے، دیکھیے: شامی: ۴/ ۳۵۹ تا ۳۶۰۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۶] غیر محرم عورت مرد (میت) کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی

۱۰۷۱-سوال: غیر محرم عورت غیر محرم میت (مرد) کا چہرہ دیکھ سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

غیر محرم عورت غیر محرم میت (مرد) کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی، جائز نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] غیر محرم مرد (میت) عورت کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا

۱۰۷۲-سوال: غیر محرم مرد غیر محرم عورت (میت) کا چہرہ دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

غیر محرم مرد بھی غیر محرم عورت کی میت کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ (شامی)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن أبي هريرة -رضي الله تعالى عنه- عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: كتب على ابن آدم نصيبه من الزنا، مدرك ذلك لا محالة، فالعينان زناهما النظر، والأذنان زناهما الاستماع، واللسان زناه الكلام، واليد زناها البطش، والرجل زناها الخطا، والقلب يهوى ويتمنى، ويصدق ذلك الفرج ويكذبه. (الصحيح لمسلم: ۲/۳۳۶، رقم الحديث: ۲۱-۲۶۵۷، كتاب القدر، باب قدر على ابن آدم حظه من الزنا وغيره، ط: ديوبند)

عن أم سلمة، قالت: كنت عند رسول الله صلى الله عليه وسلم وعنده ميمونة، فأقبل ابن أم مكتوم، وذلك بعد أن أمرنا بالحجاب، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: احتجبا منه، فقلنا: يا رسول الله، أليس أعمى لا يبصرنا، ولا يعرفنا؟ فقال النبي صلى الله عليه وسلم: أفعمياوان أنتما، ألستما تبصرانه. (سنن أبي داود: ۲/۵۸۷، رقم الحديث: ۴۱۱۲، كتاب اللباس، باب في قوله عز وجل: {وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن}، ط: ديوبند☆ سنن الترمذي: ۲/۱۰۶، رقم الحديث: ۲۷۷۸، أبواب الأدب، باب ما جاء في احتجاب النساء من الرجال، ط: ديوبند)

لأن ما كان عورة لا يسقط بالموت، ولذا لا يجوز مسه، حتى لو ماتت بين رجال أجانب يممها رجل بخرقة ولا يمسها إلخ، وفي الشرنبلالية: وهذا شامل للمرأة والرجل؛ لأن عورة المرأة للمرأة كالرجل للرجل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۱۹۵، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة عند الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲] لأن ما كان عورة لا يسقط بالموت، ولذا لا يجوز مسه، حتى لو ماتت بين رجال أجانب يممها رجل بخرقة ولا يمسها إلخ، وفي الشرنبلالية: وهذا شامل للمرأة والرجل؛ لأن عورة المرأة للمرأة كالرجل للرجل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۱۹۵، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة عند الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان ''غیر محرم عورت مرد (میت) کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی'' کا حاشیہ۔

[۸] غیر محرم عورت کے لیے میت مرد کا چہرہ دیکھنا یا غیر محرم مرد کے لیے میت عورت کا چہرہ دیکھنا

۱۰۷۳-سوال: میت مرد کا چہرہ غیر محرم عورتیں دیکھ سکتی ہیں یا نہیں؟ عورت کا انتقال ہو جائے تو غیر محرم مرد اُس کا چہرہ دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

مرد، اجنبی میت عورت کا اور عورت اجنبی میت مرد کا چہرہ دیکھ سکتی ہیں، البتہ ایک دوسرے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) اس فتویٰ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے مرد کے لیے غیر محرم خاتون میت کا چہرہ دیکھنے کو، اور عورتوں کے لیے غیر محرم میت مرد کا چہرہ دیکھنے کو جائز لکھا ہے، حالاں کہ ماقبل کے فتویٰ میں اس کے عدم جواز کی تصریح منقول ہے، اس لیے کہا جاسکتا ہے، کہ کہیں یہ ناقل فتاویٰ کی ''کارستانی'' تو نہیں، اصل حکم وہی ہے، جو ماقبل کے فتویٰ میں مذکور ہے، فقہ و فتاویٰ کی عام کتابوں میں بھی اسے ناجائز کہا گیا ہے، اکابر علماء کے چند فتاویٰ ملاحظہ فرمائیں:

سوال: مستورات کے لیے اجنبی مرد کی میت پر مہر (آخری دیدار) کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: مستورات کو اجنبی میت کو دیکھنا ناجائز ہے، اپنے محرم کو دیکھ سکتی ہیں؛ کیوں کہ حدیث شریف میں اجنبی شخص کو دیکھنے سے منع فرمایا ہے:

عن أم سلمة، قالت: كنت عند رسول الله صلى الله عليه وسلم وعنده ميمونة، فأقبل ابن أم مكتوم، وذلك بعد أن أمرنا بالحجاب، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: احتجبا منه، فقلنا: يا رسول الله، أليس أعمى لا يبصرنا، ولا يعرفنا؟ فقال النبي صلى الله عليه وسلم: أفعمياوان أنتما، ألستما تبصرانه. (سنن أبي داود: ۲/ ۵۸۷، رقم الحديث: ۴۱۱۲، كتاب اللباس، باب في قوله عز وجل: {وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن}، ط: ديوبند☆ سنن الترمذي: ۲/ ۱۰۶، رقم الحديث: ۲۷۷۸، أبواب الأدب، باب ما جاء في احتجاب النساء من الرجال، ط: ديوبند)

[کفایت المفتی: ۴/ ۶۴، کتاب الجنائز، ط: زکریا بک ڈپو، دیوبند]

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

عورت چھپانے کی چیز ہے، نہ کہ دکھانے کی چیز، آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''المرأة عورة'' یعنی عورت چھپانے کی چیز ہے، نیز آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''لعن الله الناظر والمنظور إليه'' یعنی خدا کی لعنت اس پر، جو نامحرم عورت کو دیکھے اور اس بے پردہ عورت پر، جس کو دیکھا جائے۔ (مشكاة المصابيح: ۲/ ۹۳۶، كتاب النكاح، باب النظر إلى المخطوبة، وبيان العورات، ط: المكتب الإسلامي-بيروت)

لہٰذا جس کو بہ حالت حیات دیکھنا منع ہے، مرنے کے بعد بھی اس کو دیکھنا منع ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۷/ ۱۴۱، کتاب الجنائز، ط: دار الاشاعت، کراچی)

[۹] میت کا چہرہ دیکھنے کے لیے جانا، جب کہ میت کے اردگرد بے پردہ عورتیں بیٹھی ہوں

۱۰۷۴-سوال: ہمارے گاؤں میں یہ رواج ہے کہ میت مرد کی ہو یا عورت کی، اس کے اردگرد عورتیں بیٹھ جاتی ہیں اور مرد حضرات دوسرے کاموں میں مشغول رہتے ہیں، اگر کسی مرد کو میت کا چہرہ دیکھنا ہو، تو عورتوں میں گھس کر بے پردگی کی حالت میں دیکھنا پڑتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ طریقہ شریعت کی رو سے درست ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اس طریقے کو ختم کرنے کے لیے پابندی لگانے کی کوشش کرے، تو کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

بے پردگی جائز نہیں ہے۔[1] لہٰذا میت کا چہرہ دیکھنے کے لیے غیر محرم مرد، عورتوں کی موجودگی میں مجلس میں نہ جائے، ہاں عورتیں باپردہ ہوں اور چہرہ کھلا ہوا نہ ہو، تو میت کو اندر جا کر دیکھ سکتا ہے۔

میت کے چہرہ پر کپڑے ڈال دیے گئے ہوں، تو عورتیں وہاں بیٹھ سکتی ہیں؛ لیکن حیض ونفاس والی عورتوں کے لیے میت کے پاس بیٹھنا جائز نہیں ہے، ایسی عورتوں کو وہاں سے ہٹادینا چاہیے۔[2]

میت کے اردگرد بیٹھنا جائز ہے، لیکن غیر محرم عورتوں کو مرد کی نعش کے پاس سے -بے پردگی ہونے کی وجہ سے- ہٹادینا چاہیے، اسی طرح غیر محرم مرد کو بھی عورت کی میت کے پاس سے ہٹادینا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰي جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَاۗءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَاۗىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰي عَوْرٰتِ النِّسَاۗءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۲۴-النور:۲۹،۳۰)

لقوله - عليه الصلاة والسلام - لعلي لا تنظر إلى فخذ حي ولا ميت. لأن ما كان عورة لا يسقط بالموت؛ ولذا لا يجوز مسه، حتى لو ماتت بين رجال أجانب يممها رجل بخرقة ولا يمسها إلخ. وفي الشرنبلالية: وهذا شامل للمرأة والرجل؛ لأن عورة المرأة للمرأة كالرجل للرجل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۹۵، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة عند الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) ويحضر عنده الطيب ويخرج من عنده الحائض والنفساء والجنب. (الدر المختار على رد المحتار: ۲/ ۱۹۳، باب صلاة الجنائز، ط: دار الفكر - بيروت)

[۱۰] کسی بزرگ کی قبر پر نسبت پیدا کرنے کے لیے جانا

۱۰۷۵-سوال: کسی بزرگ، ولی اور شہید کی قبر پر روزانہ جانے کا معمول بنا لینے اور ان کے ساتھ نسبت قائم کرنے سے دین و دنیا کا کوئی فائدہ ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نسبت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا، اور یہ بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے، اسی طرح وفات کے بعد ان کو ثواب پہونچانے سے نسبت حاصل ہوتی ہے، ان کی قبر پر جا کر ایصال ثواب کرنے سے اللہ پاک خوش ہوتے ہیں اور بزرگ کی برکت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا ہو جاتا ہے، تعلق کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کا خاص جذبہ اس میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کسی بزرگ کی قبر سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔

لیکن اس طرح فائدہ اٹھانا اور نسبت قائم کرنا کسی زندہ ولی و مرشد کی ہدایت اور رہنمائی میں ہونا چاہیے۔ جس میں شریعت کے خلاف کوئی کام نہ کرنا پڑے اور عقیدے میں بھی کوئی خرابی پیدا نہ ہونی چاہیے، اگر فسادِ عقیدہ یا خلافِ شرع امر کے ارتکاب کا اندیشہ ہو، تو نہ کرنا چاہیے؛ لہٰذا ہر کسی کے لیے یہ طریقہ مناسب نہیں ہے، دنیا کے اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] رمضان میں وفات پانے والے کی فضیلت

۱۰۷۶-سوال: کیا رمضان المبارک میں انتقال ہونے والے سعادت مند ہوتے ہیں؟ جمعہ کی رات اور جمعہ کے دن میں انتقال ہونے والے کے لیے جو فضائل ہیں، کیا وہ رمضان المبارک میں انتقال ہونے والے کے لیے بھی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جمعہ کے دن مرنے والا عذاب قبر سے محفوظ رہتا ہے، اس بات کی تو صراحت ہے؛ لیکن رمضان المبارک میں مرنے والا قبر کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے، اس کی صراحت حدیث پاک میں نہیں ہے، البتہ

بعض روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح جمعہ کی شب میں قبر کا عذاب موقوف رکھا جاتا ہے، اسی طرح رمضان المبارک میں کافروں سے بھی عذاب موقوف رکھا جاتا ہے۔ (شامی جلد ۱ صفحہ ۱۶۵)[1]

اور رمضان المبارک کی فضیلت کے بارے میں جو روایت ہے کہ اس ماہ میں جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔[2] اس کا مطلب یہ ہے کہ غلط کاموں سے بندوں کی حفاظت ہوتی ہے

چوں کہ یہ [رمضان المبارک] رحمت کا مہینہ ہے، اس میں اللہ کی مغفرت اور بخشش عام ہوتی ہے، اس لیے ایسے اوقات میں کوئی ایسا بندہ، جو صوم وصلاۃ کا پابند ہو، گرچہ دوسرے گناہ میں بھی ملوث ہو، اس کی مغفرت کی بہت امید کی جاسکتی ہے۔ (عمدۃ القاری جلد ۱ صفحہ ۲۷۰)

لیکن جو آدمی رمضان المبارک میں بھی روزہ نہ رکھتا ہو اور گناہوں میں مبتلا رہتا ہو، تو اس کی مغفرت

---

[۱] ویأمن المیت من عذاب القبر ومن مات فیه أو في لیلته أمن من عذاب القبر. (الدر المختار، قبیل باب العیدین)

(قوله ویأمن المیت من عذاب القبر إلخ) قال أهل السنة والجماعة: عذاب القبر حق وسؤال منكر ونكیر وضغطة القبر حق لكن إن كان كافرا فعذابه یدوم إلی یوم القیامة ویرفع عنه یوم الجمعة وشهر رمضان فیعذب اللحم متصلا بالروح والروح متصلا بالجسم فیتألم الروح مع الجسد، وإن كان خارجا عنه، والمؤمن المطیع لا یعذب بل له ضغطة یجد هول ذلك وخوفه والعاصي یعذب ویضغط لكن ینقطع عنه العذاب یوم الجمعة ولیلتها ثم لا یعود وإن مات یومها أو لیلتها یكون العذاب ساعة واحدة وضغطة القبر ثم یقطع، كذا في المعتقدات للشیخ أبي المعین النسفي الحنفي من حاشیة الحنفي ملخصا. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۱۶۵، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر - بیروت)

(۲) أبا هریرة رضي الله عنه، یقول: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: إذا دخل شهر رمضان فتحت أبواب السماء، وغلقت أبواب جهنم، وسلسلت الشیاطین. (صحیح البخاري: ۱/ ۲۵۵، رقم الحدیث: ۱۸۹۹، كتاب الصوم، باب: هل یقال رمضان أو شهر رمضان، ومن رأی كله واسعا، ط: دیوبند ☆ الصحیح لمسلم: ۱/ ۳۴۶، رقم الحدیث: ۱۰۷۹، كتاب الصیام، باب فضل شهر رمضان، ط: دیوبند)

قوله: (وغلقت أبواب جهنم) لأن الصوم جنة فتغلق أبوابها بما قطع عنهم من المعاصي وترك الأعمال السیئة المستوجبة للنار، ولقلة ما یؤاخذ الله العباد بأعمالهم السیئة لیستنقذ منها ببركة الشهر، ویهب المسيء للمحسن، ویجاوز عن السیئات، وهذا معنی الإغلاق. (عمدة القاري شرح صحیح البخاري - بدر الدین العیني (م: ۸۵۵هـ): ۱۰/ ۲۷۰، كتاب الصوم، باب: هل یقال رمضان أو شهر رمضان، ومن رأی كله واسعا، ط: دار إحیاء التراث العربي - بیروت)

کی امید کم ہے؛ کیوں کہ زیادہ ثواب کے اوقات اور مقام میں کوئی گناہ کرتا ہے، تو زیادہ سزا وعذاب کا مستحق ہوتا ہے۔

ہاں اتنی امید کی جاسکتی ہے کہ رمضان کے مہینہ تک وہ عذاب قبر سے محفوظ رہ سکے گا۔ اس کے بعد اللہ کا فضل ہو، تو نجات بھی ہوسکتی ہے، ورنہ عام قاعدے کے مطابق عذاب دیا جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] رمضان میں مرنے والے کا بغیر حساب جنت میں داخل ہونا ثابت نہیں

۱۰۷۷-سوال: اگر کوئی مسلمان رمضان المبارک میں انتقال کر جائے، تو کیا اس پر عذاب قبر ہوگا؟ کیا وہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا؟

الجواب حامداومصليا

قبر میں سوالات نہ ہونے سے دوسرے سوالات، اور حساب کا معاف ہونا ثابت نہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) البتہ رمضان المبارک کی فضیلت میں وارد ہونے والی متعدد احادیث مبارکہ کی وجہ سے اللہ پاک کی ذات سے امید ہے کہ اس ماہ میں وفات پانے والوں کو عذاب قبر نہ دے:

. . . أن عذاب القبر حق، سواء كان مؤمنا، أو كافرا، أو مطيعا، أو فاسقا، . . . يرفع عنه العذاب يوم الجمعة، و كل رمضان بحرمته. (شرح كتاب الفقه الأكبر، ص: ۱۷۳-۱۷۲، بحث في أن عذاب القبر حق، و بيان أن الروح تعاد للميت، ط: دار الإيمان-سهارن فور)

ويأمن الميت من عذاب القبر، ومن مات فيه [أي في يوم الجمعة] أو في ليلته، أمن من عذاب القبر، ولا تسجر فيه جهنم، وفيه يزور أهل الجنة ربهم تعالى. (الدر المختار) ———— وقال ابن عابدين: (قوله ويأمن الميت من عذاب القبر إلخ) قال أهل السنة والجماعة: عذاب القبر حق، وسؤال منكر ونكير، وضغطة القبر حق، لكن إن كان كافرا فعذابه يدوم إلى يوم القيامة، ويرفع عنه يوم الجمعة وشهر رمضان فيعذب اللحم متصلا بالروح والروح متصلا بالجسم فيتألم الروح مع الجسد، وإن كان خارجا عنه، والمؤمن المطيع لا يعذب بل له ضغطة يجد هول ذلك وخوفه والعاصي يعذب ويضغط، لكن ينقطع عنه العذاب يوم الجمعة وليلتها، ثم لا يعود وإن مات يومها أو ليلتها يكون العذاب ساعة واحدة وضغطة القبر ثم يقطع، كذا في المعتقدات للشيخ أبي المعين النسفي الحنفي من حاشية الحنفي ملخصا. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۱۶۵، كتاب الصلاة، باب الجمعة، قبيل باب العيدين، ط: دار الفكر-بيروت)

[۱۳] جنازہ، اور غسل دینے کے تختے وغیرہ خریدنے میں غیر مسلم کی امداد قبول کرنا

۱۰۷۸-سوال: ایک نئی "سنی مسلم جماعت" کی تنظیم عمل میں آئی ہے، ہمارے پاس کوئی چیز موجود نہیں ہے، مثلاً: جنازہ، (۱) نہانے کا تختہ، پکانے کے لیے برتن اور جماعتی احباب کو جمع کرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ہمارے غیر مسلم بھائی مدد کرنا چاہتے ہیں، تو ان کے پاس سے امداد لے سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر لیں تو مذکورہ کاموں میں خرچ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ رقم کام میں نہ آئے، تو کس کام میں خرچ کر سکتے ہیں؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ غیر مسلم کا پیسہ ہے، دینی کام میں اس کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ آپ سے درخواست ہے کہ تفصیلی جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداو مصليا:

غیر مسلم حضرات، جنازے یا تپائیاں یا برتن وغیرہ خریدنے کے لیے رقم دیں، یا زمین کی خریداری اور مکان بنانے کے لیے مالی مدد کریں۔ تو اس شرط کے ساتھ ان کی مالی مدد کو قبول کرنا جائز ہے کہ اس کی وجہ سے حال یا مستقبل میں کسی قسم کے نقصان کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ [1]

لیکن نوساری والوں کے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ سات (۷۰۰) آٹھ سو روپے کا جنازہ (تابوت) اور دو (۲۰۰) یا تین (۳۰۰) سو روپے کی تپائیاں وہ خود نہیں خرید سکتے؟ کیا غیرت ایمانی ختم ہوگئی کہ جنازہ اور میت کے غسل کی تپائی میں غیر مسلم سے مدد قبول کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

---

(۱) میت کو گھر سے قبرستان تک لے جانے والی چارپائی، جسے بعض علاقوں میں "تابوت" بھی کہا جاتا ہے۔

[۱] (وكفن من لا مال له على من تجب نفقته) فإن تعددوا فعلى قدر ميراثهم. (وإن لم يكن ثمة من تجب عليه نفقته ففي بيت المال فإن لم يكن) بيت المال معمورا أو منتظما (فعلى المسلمين تكفينه) فإن لم يقدروا سألوا الناس له ثوبا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۰۵-۲۰۶، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر-بيروت)

فإن لم يكن له من تجب النفقة عليه فكفنه في بيت المال، فإن لم يكن فعلى المسلمين تكفينه، فإن لم يقدروا سألوا الناس ليكفنوه. (البحر الرائق: ۲/ ۱۹۲، كتاب الجنائز، حكم صلاة الجنازة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۱، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثالث في التكفين، ط: دار الفكر-بيروت)

[۱۴] کیا مقروض جنت میں نہیں جائے گا؟

۱۰۷۹-سوال: ''سکرات سے فاتحہ تک کی سنن اور بدعات'' نامی آپ کی کتاب کے صفحہ نمبر ۸۵ پر لکھا ہے کہ: ''اگر کسی مسلمان کا اس حال میں انتقال ہوا کہ اس کے ذمے قرض ہے، تو جب تک اس کی ادائیگی نہ ہو جائے، اس وقت تک وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ نیز آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی روح قید کر لی جائے گی''۔ (۱)

لیکن ہم نے سنا ہے کہ اگر فوت شدہ مسلمان کے پاس قرض کی ادائیگی کے لیے ایک پیسہ بھی نہ ہو، لیکن اس کی نیت ادا کرنے کی ہو، تو ایسے لوگوں کا قرض اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی طرف سے ادا کر دیں گے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کون سی بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر مقروض کی نیت، قرض ادا کرنے کی تھی؛ لیکن اس سے پہلے اس کا انتقال ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائیں گے۔ (اوکما قال علیہ الصلوۃ والسلام) (بخاری شریف ۱/ ۳۲۳☆نسائی شریف ۲/ ۲۲۳) [۱]

---

(۱) عن محمد بن جحش قال: كنا جلوسا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم فرفع رأسه إلى السماء، ثم وضع راحته على جبهته، ثم قال: سبحان الله، ماذا نزل من التشديد، فسكتنا وفزعنا، فلما كان من الغد، سألته: يا رسول الله، ما هذا التشديد الذي نزل؟ فقال: والذي نفسي بيده، لو أن رجلا قتل في سبيل الله ثم أحيي، ثم قتل ثم أحيي، ثم قتل وعليه دين، ما دخل الجنة حتى يقضى عنه دينه.

عن سمرة قال: كنا مع النبي صلى الله عليه وسلم في جنازة فقال: أها هنا من بني فلان أحد؟ ثلاثا، فقام رجل، فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: ما منعك في المرتين الأوليين أن لا تكون أجبتني؟ أما إني لم أنوه بك إلا بخير، إن فلانا لرجل منهم مات مأسورا بدينه. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳ھ): ۷/ ۱۵- ۳۱۴، رقم الحديث: ۴۶۸۴- ۴۶۸۵، كتاب البيوع، الاستقراض، التغليظ في الدين، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

[۱] عن أبي هريرة رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من أخذ أموال الناس يريد أداءها أدى الله عنه، ومن أخذ يريد إتلافها أتلفه الله. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۲۱، رقم الحديث: ۲۳۸۷، كتاب في الاستقراض وأداء الديون والحجر والتفليس، باب من أخذ أموال الناس يريد أداءها أو إتلافها، ط: ديوبند)

عن عمران بن حذيفة قال: كانت ميمونة تدان، وتكثر، فقال لها أهلها في ذلك ولاموها، ووجدوا عليها، فقالت: لا أترك الدين وقد سمعت خليلي وصفيي صلى الله عليه وسلم يقول: ما من أحد يدان دينا فعلم الله أنه يريد=

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں ادائے قرض کے اسباب پیدا فرمائیں گے، اور نیت کے صحیح ہونے کی وجہ سے قیامت کے دن اپنے فضل وکرم سے معاف کردیں گے۔ (۲)

اسلامی تعلیمات میں اعتدال ہے، لہٰذا میری کتاب ''سکرات سے فاتحہ تک کی سنن اور بدعات'' میں ذکر کردہ آپ ﷺ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ انسان بلاضرورت قرض نہ لے۔ مجبوراً اگر لینا پڑے، تو جلد از جلد اس کو ادا کردے یا ادا کرنے کا پختہ ارادہ رکھے؛ اسی لیے امام نسائی نے نسائی شریف میں عنوان لگایا ہے ''قرض کے سلسلہ میں سختی'' کہ مسلمان ضرورت کے بغیر قرض لینے سے پرہیز کرے۔

آپ نے جو سنا ہے، وہ اللہ کا فضل اور رحمت ہے، جو بخاری شریف کی روایت میں ہے۔ (۳) اور اس بارے میں قاعدہ اور اصول وہ ہے، جو نسائی شریف کی روایت سے ثابت ہوتا ہے (۴)؛ لہٰذا دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] قرض خواہ نہ تو قرض لے اور نہ ہی معاف کرے، تو خلاصی کی کیا صورت ہے؟

گذشتہ سے پیوستہ

۱۰۸۰-سوال: گزارش خدمت ہے آپ کی جانب سے میرے دونوں سوالوں کے جواب ملے،

= قضاءه إلا أداه الله عنه في الدنيا.

عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة، أن ميمونة، زوج النبي صلى الله عليه وسلم استدانت فقيل لها: يا أم المؤمنين، تستدينين وليس عندك وفاء، قالت: إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من أخذ دينا وهو يريد أن يؤديه، أعانه الله عز وجل. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي-أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م:۳۰۳ھ):۷/۳۱۵، رقم الحديث: ۴۶۸۶- ۴۶۸۷، كتاب البيوع، الاستقراض، التسهيل فيه، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية-حلب)

(۲) من أخذ أموال الناس يريد أداءها أدى الله عنه، يعني: يسر له ما يؤديه من فضله لحسن نيته، ومن أخذ أموال الناس يريد إتلافها على صاحبها أتلفه الله، يعني: يذهبه من يده فلا ينتفع به لسوء نيته، ويبقى عليه الدين، ويعاقب به يوم القيامة. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م:۸۵۵ھ):۱۲/۲۲۶، كتاب في الاستقراض وأداء الديون والحجر والتفليس، باب من أخذ أموال الناس يريد أداءها أو إتلافها، ط: دار إحياء التراث العربي -بيروت)

(۳) حاشیہ نمبر (۱) دیکھیں۔

(۴) سوال کا حاشیہ نمبر (۱) دیکھیں۔

بہت بہت ممنون ہوں، ضروری عرض یہ ہے کہ سوال ۲ کے جواب میں سائل کو کچھ تشنگی معلوم ہوتی ہے، میں سوال اور جواب دونوں نمبر وار لکھتا ہوں اور ساتھ ساتھ سائل کی تشنگی کو بھی سوال کی شکل میں پیش خدمت کرنے کی جرأت کر رہا ہوں، امید ہے کہ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں گے، تکلیف یا بے ادبی معاف فرمائیں۔

سوال: (سوال کا اہم حصہ نقل کرتا ہوں) زید [قرض خواہ] نہ اپنے قرض کی رقم لیتا ہے، اور نہ ہی معاف کرتا ہے، اس صورت میں مقروض کیا کرے؟

جواب: (جو حضرت والا کی جانب سے آیا ہے) مذکورہ قرض [کی رقم] علاحدہ نکال کر وصیت لکھ دیجیے کہ میری وفات کے بعد زید کو یہ رقم دے دی جائے، اس کا قرض ہے، یا زید مر جائے، تو اس کے ورثاء کو بہ قدر میراث تقسیم کریں، آپ کی ذمہ داری ادا [ختم] ہو جائے گی۔

اگر ان کے ورثاء بھی نہ لیں، تو زید کی طرف سے فی سبیل اللہ کسی کار خیر میں صرف کر دینے سے بھی آپ کی ذمہ داری ادا ہو جائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تنقیح: جواب پڑھ کر سائل کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام صورتیں تو مقروض کے مرجانے کے بعد کی ہیں، جب کہ وہ چاہتا ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اس قرض کی ادائیگی سے کسی طرح سبک دوش ہو جائے، اس صورت میں مقروض کیا کرے؟ مقروض قرض کی رقم قرض خواہ کے نہ لینے پر اور معاف نہ کرنے پر جیتے جی کسی کار خیر میں، فی سبیل اللہ، قرض خواہ کی طرف سے صرف کر دے؟ کیا اس صورت میں بھی مقروض کی ذمہ داری ادا ہو جائے گی۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مقروض حالت حیات ہی میں قرض کی ذمہ داری سے سبک دوش ہونا چاہتا ہے، تو درمختار مع الشامی کا ایک جزئیہ ملا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی شخص نے کسی کے روپیہ وغیرہ ظلماً وصول کیے، اب معلوم نہیں کہ مالک کون ہے؟ کس جگہ کا رہنے والا ہے، جیسا کہ چور و ڈاکو چوری اور ڈکیتی کرتے ہیں، تو اس صورت میں حکم یہ ہے کہ مالک کو لوٹایا جائے، مگر مالک معلوم نہیں، تو جیب کاٹنے والے (جن کو اللہ تعالیٰ نے جیب کترنے سے بچنے کی ہدایت دی) نے مال کو اصل مالک کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے صدقہ وخیرات کر دیا، تو وہ ذمہ داری

سے سبک دوش ہوجائیں گے (شامی جلد ۴ صفحہ ۲۴۲)[۱]

صورت مسئولہ میں گرچہ مالک معلوم ہے، مگر کوئی بات دائن ومدیون میں نزاع کی ہے، جس کی وجہ سے [مقروض کی ہر ممکن کوشش کے باوجود] وہ قرض لینے سے یا معاف کرنے سے انکار کرتا ہے، تو وہ مال بمنزلہ لقطہ ہے اور اس جزئیہ کے تقاضے کے مطابق اگر وہ اپنی زندگی ہی میں کار خیر میں صرف کر کے ذمہ داری سے سبک دوش ہونا چاہتا ہے، تو ہو سکتا ہے، اس کی گنجائش ہوگی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (عليه ديون ومظالم جهل أربابها وأيس) من عليه ذلك (من معرفتهم فعليه التصدق بقدرها من ماله وإن استغرقت جميع ماله) هذا مذهب أصحابنا لا تعلم بينهم خلافا كمن في يده عروض لا يعلم مستحقيها اعتبارا للديون بالأعيان (و) متى فعل ذلك (سقط عنه المطالبة) من أصحاب الديون (في العقبى) مجتبى. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: جهل أربابها) يشمل ورثتهم، فلو علمهم لزمه الدفع إليهم؛ لأن الدين صار حقهم. وفي الفصول العلامية: من له على آخر دين فطلبه ولم يعطه فمات رب الدين لم تبق له خصومة في الآخرة عند أكثر المشايخ؛ لأنها بسبب الدين وقد انتقل إلى الورثة. والمختار أن الخصومة في الظلم بالمنع للميت، وفي الدين للوارث. قال محمد بن الفضل: من تناول مال غيره بغير إذنه ثم رد البدل على وارثه بعد موته برئ عن الدين وبقي حق الميت لظلمه إياه، ولا يبرأ عنه إلا بالتوبة والاستغفار والدعاء له. اهـ. (قوله: فعليه التصدق بقدرها من ماله) أي الخاص به أو المتحصل من المظالم. اهـ. ط وهذا إن كان له مال. وفي الفصول العلامية: لو لم يقدر على الأداء لفقره أو لنسيانه أو لعدم قدرته قال شداد والناطفي رحمهما الله تعالى: لا يؤاخذ به في الآخرة إذا كان الدين ثمن متاع أو قرضا، وإن كان غصبا يؤاخذ به في الآخرة، وإن نسي غصبه، وإن علم الوارث دين مورثه والدين غصب أو غيره فعليه أن يقضيه من التركة، وإن لم يقض فهو مؤاخذ به في الآخرة، وإن لم يجد المديون ولا وارثه صاحب الدين ولا وارثه فتصدق المديون أو وارثه عن صاحب الدين برئ في الآخرة.

(قوله: كمن في يده عروض لا يعلم مستحقيها) يشمل ما إذا كانت لقطة علم حكمها، وإن كانت غيرها فالظاهر وجوب التصدق بأعيانها أيضا (قوله: سقط عنه المطالبة إلخ) كأنه والله تعالى أعلم؛ لأنه بمنزلة المال الضائع والفقراء مصرفه عند جهل أربابه، وبالتوبة يسقط إثم الإقدام على الظلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۲۸۳، كتاب اللقطة، مطلب فيمن عليه ديون ومظالم جهل أربابها، ط: دار الفكر - بيروت)

عن ابن عمر -رضی الله عنهما- عن عائشة -رضی الله عنها- قالت: ما أغبط أحدا بهون موت بعد الذی رأیت من شدة موت رسول الله صلى الله عليه وسلم.

(سنن الترمذی: ۱/ ۱۹۲، رقم: ۹۷۹، دیوبند)

باب ما يتعلق بالمحتضر

[جاں کنی کے عالم کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ما یتعلق بالمحتضر

[جاں کنی کے عالم کا بیان]

[۱] میت کو کلمہ کی تلقین کرنا

۱۰۸۱-سوال: جناب مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام عرض ہے کہ میت کے پیچھے، یا دفن کے بعد قبر پر کلمہ طیبہ: ''لا إلٰہ إلا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھنا جائز ہے یا حرام؟ شریعت کے موافق جواب لکھ کر فوراً بھیج کر مہربانی فرمائیں، ۳۰؍تاریخ کو جمعہ کے دن ہماری میٹنگ ہونے والی ہے، یہ جواب ۲۹-۳-۱۹۷۹ء کو ملنا چاہیے۔

الجواب حامداًومصلیاً:

برادر عزیز! خط ملتا ہے ۲۸؍کو اور جواب مانگتے ہو ۲۹؍کو، اتنے دنوں تک آپ نے قوم کی جانب سے سپرد کی گئی ذمہ داری کیسے نبھائی؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مفتی حضرات بے کار بیٹھے ہیں، پھر آپ کا سوال بھی ناقص ہے، سوال جیسا ہوتا ہے، جواب اسی کے مطابق ہوتا ہے، گول مول سوال کی بجائے، صاف سوال لکھنا چاہیے، آئندہ اسے ملحوظ رکھیں۔

تلقین کرنا مستحب ہے، یعنی کسی پر موت کے آثار ظاہر ہوں، تو اس کے رشتہ دار، جو قریب میں ہوتے ہیں، وہ بلند آواز سے کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ پڑھتے ہیں اور مریض اس کو سن کر پڑھتا ہے، یہ مستحب ہے،

ایک بار جب وہ پڑھ لے، تو تلقین اس وقت تک بند کر لی جائے، جب تک کہ وہ دنیاوی بات نہ کرے۔[۱]

دفن کے بعد قبر پر تلقین کرنا، یعنی قبر پر کھڑے ہو کر زور سے کلمہ پڑھنا، تاکہ میت کو منکر نکیر کے سوالوں کے جوابات میں آسانی ہو، اس کی گنجائش ہے، البتہ بہتر نہیں۔ (طحطاوی: ۳۰۶، شامی: ۱/۷۸۶)[۲]

"پیچھے"[۳] کا اگر یہ مطلب ہے کہ انتقال کے بعد یہ کلمہ گھر میں ایصال ثواب کے لیے پڑھا جائے، تو اگر اس میں کوئی دن مقرر نہ ہو اور نہ کھانے پینے وغیرہ کا انتظام کیا جائے، تو گنجائش ہے، البتہ دن مقرر کر کے زیارت، ضیافت کے نام سے لوگوں کو جمع کرنا اور قرآن کریم یا دعا وغیرہ رسم کے مطابق پڑھنا جائز نہیں۔[۴] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) ولقن الشهادتين، وصورة التلقين أن يقال عنده في حالة النزع قبل الغرغرة جهرا، وهو يسمع، أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا رسول الله، ولا يقال له: قل. ولا يلح عليه في قولها مخافة أن يضجر، فإذا قالها مرة، لا يعيدها عليه الملقن إلا أن يتكلم بكلام غيرها، كذا في الجوهرة النيرة.

وهذا التلقين مستحب بالإجماع، وأما التلقين بعد الموت فلا يلقن عندنا في ظاهر الرواية، كذا في العيني شرح الهداية ومعراج الدراية. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۵۷، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الأول في المحتضر، ط: دار الفكر - بيروت☆ الجوهرة النيرة: ۱/۱۰۱-۱۰۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز، ط: المطبعة الخيرية)

[۲] قوله: "وتلقينه بعدما وضع في القبر مشروع" قال في المفتاح التلقين على ثلاثة أوجه ففي المحتضر لا خلاف في حسنه وما بعد انقضاء الدفن لا خلاف في عدم حسنه والثالث اختلفوا فيه وهو ما إذا لم يتم دفنه اهـ حموي. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ) ص: ۵۶۰، باب أحكام الجنائز، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۳] شاید سائل کی مراد لفظ "پیچھے" سے: جنازہ قبرستان لے جاتے وقت اس کے پیچھے کلمہ پڑھنا ہے، جیسا کہ بہت سی جگہ اس کا رواج ہے کہ میت کے پیچھے بلند آواز سے کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ یہ صورت بھی جائز نہیں؛ کیوں کہ شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں، یہ بدعات میں سے ہے، درج ذیل فقہی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

(كره) كما كره فيها رفع صوت بذكر أو قراءة فتح. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: كما كره إلخ) قيل تحريما، وقيل تنزيها كما في البحر عن الغاية. وفيه عنها: وينبغي لمن تبع الجنازة أن يطيل الصمت. وفيه عن الظهيرية: فإن أراد أن يذكر الله - تعالى - يذكره في نفسه {إنه لا يحب المعتدين} [الأعراف: ۵۵] أي الجاهرين بالدعاء. وعن إبراهيم أنه كان يكره أن يقول الرجل وهو يمشي معها استغفروا له غفر الله لكم. اهـ. قلت: وإذا كان هذا في الدعاء والذكر فما ظنك بالغناء الحادث في هذا الزمان. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۳۳، كتاب الصلاة، باب في صلاة الجنازة، قبيل: مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر)

(۴) تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں: "باب إهداء الثواب إلى الميت" کے تحت: ایصال ثواب کے لیے میت کے گھر جمع ہونا۔

[۲] جاں کنی کے وقت قبلہ کی طرف منہ کیا جائے یا پیر؟

۱۰۸۲-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ آدمی جب سکرات کی حالت میں ہو، اور اس وقت اس کا سر جنوب کی طرف اور پاؤں شمال کی جانب ہو اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا ہو اور پاؤں قبلہ کی طرف نہ کر سکا ہو، تو کیا اس میں کوئی حرج ہے؟ اور آیا وہ کسی فضیلت سے محروم رہتا ہے؟

مختلف کتابوں: مثلاً ہدایہ اور بہشتی ثمر وغیرہ میں ہے کہ پاؤں کو قبلہ کی طرف کرنا چاہیے اور سر اونچا ہونا چاہیے، تو اس میں فرضیت مراد ہے کہ کرنا ہی ضروری ہے یا استحباب مراد ہے؟ اگر پاؤں قبلہ کی طرف نہ کیے گئے ہوں، تو اس میں کوئی گناہ تو نہیں ہے؟ نیز حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ایک صحابی نے وصیت کی کہ میرے انتقال کے وقت منہ قبلہ کی طرف کیا جائے، تو اب سوال یہ ہے کہ منہ قبلہ کی طرف کرنا اصل ہے یا پاؤں؟ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

سکرات کے وقت مریض کو داہنی کروٹ پر لٹا کر منہ قبلہ رخ کیا جائے، جیسا کہ قبر میں لٹایا جاتا ہے اور جس طرح بستر پر ہوتا ہے، یعنی سوتے وقت جس طرح سونے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے، اس طریقے سے لٹانا مسنون ہے، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا مذہب بھی یہی ہے (ہدایہ: ۱/۱۰۸)[۱]

اسی کو درمختار وغیرہ میں مسنون لکھا ہے (درمختار: ۱/۹۰۷، عالمگیری: ۱/۵۶)[۲]

مجمع الانہر میں ہے: يوجه المحتضر... إلى القبلة مضطجعا على شقه الأيمن؛ لأنه السنة

[۱] "إذا احتضر الرجل وجه إلى القبلة على شقه الأيمن" اعتبارا بحال الوضع في القبر لأنه أشرف عليه والمختار في بلادنا الاستلقاء لأنه أيسر لخروج الروح والأول هو السنة". (الهداية في شرح بداية المبتدي: ۱/۸۸، كتاب الصلاة، باب الجنائز، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

[۲] (يوجه المحتضر) وعلامته استرخاء قدميه، واعوجاج منخره وانخساف صدغيه (القبلة) على يمينه هو السنة (وجاز الاستلقاء) على ظهره (وقدماه إليها) وهو المعتاد في زماننا (و) لكن (يرفع رأسه قليلا) ليتوجه للقبلة (وقيل يوضع كما تيسر على الأصح) صححه في المبتغى (وإن شق عليه ترك على حاله). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۱۸۹، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۵۷، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الأول في المحتضر، ط: دار الفكر - بيروت)

المنقول هذا إذا لم يشق عليه وإلا ترك على حاله وجعل رجلاه إلى القبلة.[١]

لیکن چت لٹا کر قدموں کو قبلہ کی طرف کر دیا جائے، تو بھی جائز ہے، اس میں روح نکلنے میں سہولت ہوتی ہے، صاحب ہدایہ نے لکھا ہے: "والمختار في بلادنا الاستلقاء لأنه أيسر لخروج الروح".[٢]

خیال رہے کہ ہدایہ ودیگر کتب کا مذکورہ بالا حکم (کروٹ پر لٹانا) اس وقت ہے کہ رخ بدلنے میں میت کو تکلیف نہ ہو، یعنی کمرہ اس طرح ہو کہ آسانی سے چارپائی پھیری جاسکتی ہو۔[٣] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٣] میت کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کرنا

١٠٨٣-سوال: سکرات کی حالت میں کیا پڑھنا چاہیے؟ میت کو سامنے رکھ کر تبارک الذی (سورۂ ملک) پڑھنا شرعی اصول سے کیسا ہے؟ کیا غسل سے پہلے قرآن کریم کی تلاوت کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

میت جب سکرات کی حالت ہو، تو سورۂ یٰسین اور سورۂ رعد پڑھنے کو علماء نے مستحب لکھا ہے۔ (درمختار وشامی: ١/ ٧٩٧)[٤]

---

(١) ١/ ١٧٨، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنائز، ط: دار إحياء التراث العربي.

[٢] دیکھیے حاشیہ نمبر: ١۔ (٣) دیکھیے حاشیہ نمبر: ٢۔

[٤] عن معقل بن يسار، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "اقرءوا على موتاكم {يس}. (السنن الكبرى - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ٣٠٣هـ): ٩/ ٣٩٤، رقم الحديث: ١٠٨٤٦، كتاب عمل اليوم والليلة عونك يا رب على ما بقي، ما يقرأ على الميت، وذكر الاختلاف على سليمان التيمي في حديث معقل بن يسار فيه، ت: حسن عبد المنعم شلبي، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت☆صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان - محمد بن حبان بن أحمد بن حبان بن معاذ بن مَعْبدَ، التميمي، أبو حاتم، الدارمي، البستي (م: ٣٥٤هـ): ٧/ ٢٦٩، رقم الحديث: ٣٠٠٢، كتاب الجنائز وما يتعلق بها مقدما أو مؤخرا، فصل في المحتضر، ت: شعيب الأرنؤوط، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت)

ويندب قراءة يس والرعد. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويندب قراءة يس) لقوله - صلى الله عليه وسلم - "اقرءوا على موتاكم يس"، صححه ابن حبان، وقال المراد به من حضره الموت. وروى أبو داود عن مجالد عن الشعبي قال: كانت الأنصار إذا حضروا اقرءوا عند الميت سورة البقرة إلا أن مجالدا مضعف، حلية (قوله: والرعد) هو استحسان بعض المتأخرين لقول جابر إنها تهون عليه خروج روحه إمداد. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ١٩١، باب صلاة الجنائز، مطلب في قبول توبة اليأس، ط: دار الفكر - بيروت)

روح نکل جانے کے بعد جب تک غسل نہ دیا جائے، قریب بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرنا مکروہ ہے۔[۱] البتہ غسل دینے کے بعد یا غسل سے پہلے میت سے دور رہ کر تلاوت قرآن جائز ہے۔ (شامی: ۱/ ۷۹۹)[۲]

سورۂ تبارک غسل کے بعد پڑھے، تو کوئی حرج نہیں، مگر اس کی کوئی خاص فضیلت وارد نہیں ہوئی ہے، غسل کے بعد کسی مخصوص سورت کی تلاوت کا حکم ثابت نہیں ہے، لہٰذا لاعلی التعیین کوئی بھی سورت پڑھنی چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] میت کے پیر قبلہ کی طرف کیوں کیے جاتے ہیں، جب کہ زندگی میں اس کی ممانعت ہے

۱۰۸۴-سوال: شریعت کا حکم ہے کہ قبلہ کی طرف پیر کر کے نہیں بیٹھنا چاہیے، جب کہ زید کا کہنا ہے کہ میت کے پیر قبلہ کی طرف کر دینا چاہیے، تاکہ اس کا منہ قبلہ کی طرف ہو جائے، تو زندگی میں جس چیز کی ممانعت تھی، کیا موت کے بعد وہ چیز جائز ہو جاتی ہے؟ زید کی مذکورہ بات صحیح ہے یا غلط؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

زید کا کہنا صحیح ہے، موت کی حالت میں پیروں کا قبلہ کی طرف ہونا نہیں دیکھا جائے گا؛ بل کہ اس کا خیال کیا جائے گا کہ منہ قبلہ کی طرف ہو جائے، جو کہ سنت ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (وکرہ قراءۃ القرآن عندہ إلی تمام غسلہ) عبارۃ الزیلعي حتی یغسل وعبارۃ النہر قبل غسلہ. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۹۳، باب صلاۃ الجنازۃ)

[۲] وذکر أن محل الکراہۃ إذا کان قریبا منہ، أما إذا بعد عنہ بالقراءۃ فلا کراہۃ. اھـ. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۱۹۳، باب الجنائز، مطلب في القراءۃ عند المیت)

تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے: ''ایصال ثواب کے لیے میت کے گھر جمع ہونا'' کا حاشیہ نمبر ا۔

(۳) (واختیر الاستلقاء) قال في التبیین والمختار في زماننا أن یلقی علی قفاہ وقدماہ إلی القبلۃ قالوا: ہو أیسر لخروج الروح ویرفع رأسہ قلیلا لیصیر وجہہ إلی القبلۃ دون السماء لکن لم یذکر وجہ ذلک ولا یمکن معرفتہ إلا نقلا مع أن الأول ہو السنۃ تفکر. (مجمع الأنہر في شرح ملتقی الأبحر -شیخي زادہ المعروف بـ داماد آفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/ ۱۷۹، باب صلاۃ الجنازۃ، ط: دار إحیاء التراث العربي☆ الہدایۃ في شرح بدایۃ المبتدي: ۱/ ۸۸، کتاب الصلاۃ، باب الجنائز، ت: طلال یوسف، ط: دار إحیاء التراث العربي☆ الفتاوی الہندیۃ: ۱/ ۱۵۷، کتاب الصلاۃ، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الأول في المحتضر، ط: دار الفکر -بیروت)

[۵] مردے کا منہ قبلہ کی جانب کرنا

۱۰۸۵-سوال: مردے کا منہ قبلہ سمت کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً:

مردے کا منہ قبلہ سمت کرنا سنت ہے (عالمگیری:۱/۱۲۶)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] میت کوکفن میں لپیٹنے کے بعد اس کے پاؤں قبلہ سمت کرنا

۱۰۸۶-سوال: میت کو غسل دینے اور کفن میں لپیٹنے کے بعد اس کے پاؤں قبلہ سمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

مصطفیٰ بھائی پان والا، ساندوی

الجواب حامداًومصلیاً:

میت کو غسل دینے کے بعد اس کو داہنی کروٹ پر لٹا کر اس کا چہرہ قبلہ سمت کر لینا بہتر ہے؛ البتہ سکرات کے وقت اس کو چت لٹا کر اس کا سر تھوڑا اونچا کر دیا جائے، چہرے اور پاؤں دونوں قبلہ کی جانب کر دیے جائیں، یہ صورت میت کی روح کے نکلنے کے لیے زیادہ آسان ہے۔ (طحطاوی:۳۰۵)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) إذا احتضر الرجل وجه إلى القبلة على شقه الأيمن وهو السنة، كذا في الهداية، وهذا إذا لم يشق ترك على حاله، كذا في الزاهدي. (الفتاوى الهندية:۱/۱۵۷، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الأول في المحتضر، ط: دار الفكر)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: ''میت کے پیر قبلہ کی طرف کیوں کیے جاتے ہیں، جب کہ زندگی میں اس کی ممانعت ہے''۔

[۱] "ويوضع" الميت "كيف اتفق على الأصح" قاله شمس الأئمة السرخسي وقيل عرضا وقيل إلى القبلة. (مراقي الفلاح) ———— قال الطحطاوي: قوله: "وقيل عرضا" أي كما يوضع في القبر قوله: "وقيل إلى القبلة" فتكون رجلاه إليها كالمريض إذا أراد الصلاة بإيماء وفي القهستاني عن المحيط وغيره أنه السنة. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱هـ) ص:۵۶۷، باب أحكام الجنائز، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت - لبنان)

ويوضع على التخت . . . ثم لم يذكر في ظاهر الرواية كيفية وضع التخت أنه يوضع إلى القبلة طولا أو عرضا؟ فمن أصحابنا من اختار الوضع طولا كما يفعل في مرضه إذا أراد الصلاة بالإيماء، ومنهم من اختار الوضع عرضا كما يوضع في قبره، والأصح أنه يوضع كما تيسر؛ لأن ذلك يختلف باختلاف المواضع. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م:۵۸۷هـ):۱/۳۰۰، فصل بيان كيفية =

[۷] موت کی سختی کی وجہ سے آس پاس کے لوگوں پر تلوار چلانا

۱۰۸۷-سوال: ایک کتاب میں لکھا ہے کہ انسان پر موت کی سختی اتنی ہوتی ہے کہ اگر اس کو چھوڑ دیا جائے، تو وہاں بیٹھنے والوں پر تلوار چلانے لگ جائے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ وہاں بیٹھنے والوں پر تلوار چلانے کے پیچھے اس کا مقصد کیا ہے؟ کیا مقصد یہ ہے کہ جس اہل وعیال کے لیے اس نے دین سے ہٹ کر زندگی گذاری ہے اور ان کی پرورش میں اپنا دین خراب کیا ہے، ان ہی کی وجہ سے اسے یہ تکلیف برداشت کرنی پڑ رہی ہے، اس لیے وہ اب انتقام میں تلوار سے وار کرنا چاہتا ہے؟ یا کوئی اور مقصد ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

مصنف کتاب کا مقصد، انسان کے بدن سے روح نکلنے کی سختی کو بیان کرنا ہوگا، یعنی روح کے نکلتے وقت تکلیف ایسی ہوتی ہے کہ اگر آدمی ہوش وحواس میں ہو اور ایسی تکلیف ہونے لگے، تو باؤلا بن کر اس طرح حرکتیں کرنے لگے، جیسا کہ پریشان حال آدمی، کہ غصہ میں آ کر مار پیٹ کرنے لگتا ہے۔ [۱]

=الغسل للميت، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆البحر الرائق:۲/۱۸۵، كتاب الجنائز، تلقين الشهادة للمحتضر ،ط: دار الكتاب الإسلامي☆رد المحتار على الدر المختار:۲/۱۹۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر)

"إذا احتضر الرجل وجه إلى القبلة على شقه الأيمن" اعتبارا بحال الوضع في القبر لأنه أشرف عليه والمختار في بلادنا الاستلقاء لأنه أيسر لخروج الروح والأول هو السنة. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ):۱/۸۸، باب الجنائز، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)ـــــــــ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سوال سابق کی تخریج۔

(۱) عن ابن عمر، عن عائشة -رضي الله عنها- قالت: ما أغبط أحدا بهون موت بعد الذي رأيت من شدة موت رسول الله صلى الله عليه وسلم. (سنن الترمذي:۱/۱۹۲، رقم الحديث:۹۷۹، أبواب الجنائز، باب ما جاء في التشديد عند الموت، ط:ديوبند)

عن عائشة -رضي الله عنها- أنها قالت: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو بالموت، وعنده قدح فيه ماء، وهو يدخل يده في القدح، ثم يمسح وجهه بالماء، ثم يقول: اللهم أعني على غمرات الموت أو سكرات الموت. (سنن الترمذي:۱/۱۹۲، رقم الحديث:۹۷۸، أبواب الجنائز، باب ما جاء في التشديد عند الموت، ط:ديوبند☆سنن ابن ماجه،ص:۱۱۷، رقم الحديث: ۱۶۲۳، كتاب الجنائز، باب ما جاء في ذكر مرض رسول الله صلى الله عليه وسلم، ط: المكتبة الأشرفية-ديوبند)

قال الملا علي القاري(م:۱۰۱۴هـ): (أو سكرات الموت) أي: شدائده، جمع سكرة بسكون الكاف، وهي=

گویا حقیقتاً تلوار سے وار کرنے کو ثابت کرنا مقصود نہیں ہے، بل کہ صرف روح کے نکلنے کے وقت کی شدت کو بیان کرنا ہے۔

ویسے آپ نے کتاب کا نام اور اس میں ذکر کردہ عبارت کو نہیں لکھا ہے، کہ ہم بتا سکیں کہ مصنف کا مقصد کیا ہے؟ اور اس نے یہ بات کہاں سے لکھی ہے؟ اس پوری تفصیل کو جانے بغیر مصنف کا مقصد سمجھانا مشکل ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=شدة الموت، وقيل: السكر حالة تعرض بين المرء، وعقله، وأكثر ما يستعمل ذلك في الشراب، وقد يعتري من الغضب والعشق، ولو من حب الدنيا، وقد يحصل من الخوف. قال تعالى: {وترى الناس سكارى وما هم بسكارى} [الحج: ۲] ، ...... [ويراد] ومن سكرات الموت شدائده التي لا يطيقها المحتضر فيموت فزعا جزعا. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۳/ ۲۲-۱۱۳۱، رقم الحديث: ۱۵۶۴، كتاب الجنائز، باب عيادة المريض وثواب المرض، ط: دار الفكر - بيروت)

(إن للموت سكرات): بفتحات جمع سكرة أي: شدائد ومشقات عظيمات من حرارات ومررات طبيعيات، حتى للأنبياء، وأرباب الكمالات، فاستعدوا لتلك الحالات، واطلبوا من الله تهوينه للأموات. (حوالہ سابق: ۹/ ۳۸۴۶، تحت رقم الحديث: ۵۹۵۹، كتاب الفضائل، باب هجرة الرسول صلى الله عليه وسلم إلى المدينة ووفاته)

عن أم عطية الأنصارية رضى الله عنها، قالت: دخل علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم حين توفيت ابنته، فقال: اغسلنها ثلاثا، أو خمسا، أو أكثر من ذلك إن رأيتن ذلك، بماء وسدر، واجعلن فى الآخرة كافورا - أو شيئا من كافور - فإذا فرغتن فآذننى، فلما فرغنا آذناه فأعطانا حقوه، فقال: أشعرنها إياه، تعنى إزاره. (بخاری شریف: ۱/ ۱۶۷، حدیث نمبر: ۱۲۵۳، ط: دیوبند)

باب ما يتعلق بغسل الميت

[غسلِ میت کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ما يتعلق بغسل الميت

[غسلِ میت کا بیان]

[۱] غسل میت کے بعد نجاست نکلے، تو کیا حکم ہے؟

۱۰۸۸-سوال: ایک عورت کا انتقال ہوا، اس کو غسل دیا گیا اور کفن بھی پہنا دیا گیا، اس کے بعد اس کے بدن سے ناپاکی نکلی اور کفن کا کپڑا ناپاک ہوگیا، تو کفن کا جو کپڑا ناپاک ہوا تھا اس کو تو بدل دیا؛ لیکن دوبارہ اس میت کو غسل نہیں دیا گیا اور ایسے ہی اس پر نماز جنازہ پڑھ لی گئی، تو وہ نماز ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً:

غسل کے بعد کفن پہنانے سے پہلے جو ناپاکی نکلے، اس کو دھووے؛ لیکن کفن پہنانے کے بعد جو ناپاکی نکلے، اس کا دھونا ضروری نہیں ہے، نہ بدن کا دھونا ضروری ہے اور نہ ہی کفن کا دھونا اور تبدیل کرنا ضروری ہے،[1] اسی حالت میں نماز پڑھنا جائز ہے:

(۱) تاہم موضع نجاست کو دھووے، ذیل کی عبارت دیکھیے:

(ولا يعاد غسله ولا وضوءه بالخارج منه) لأن غسله ما وجب لرفع الحدث لبقائه بالموت بل لتنجسه بالموت كسائر الحيوانات الدموية إلا أن المسلم يطهر بالغسل كرامة له وقد حصل بحر وشرح مجمع. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: وقد حصل) أي الغسل وبطرو النجاسة بعده لا يعاد بل يغسل موضعها. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ١٩٧، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة عند الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

(قوله وما خرج منه يغسله) أي تنظيفا له بحر. قال الرملي: أي لا شرطا حتى لو صلي عليه من غير غسله جاز، وهذا مما لا يتوقف فيه اهـ وفي الأحكام عن المحيط يمسح ما سال ويكفن. وفي كتاب الصلاة للحسن إذا سال قبل أن يكفن غسل وبعده لا. اهـ. (شامی: ١/ ٥٧٥)[١] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[٢] مردے کو غسل دینے والے کے لیے غسل کا حکم

١٠٨٩- سوال: مردے کو غسل دینے کے بعد غسل دینے والوں کے لئے غسل کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

غسل دینے والوں کے لیے غسل کرنا مستحب ہے۔ (شامی)[٢] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٣] میت کو غسل دینا کار ثواب ہے

١٠٩٠- سوال: ایک شخص کا یہ کہنا ہے کہ میت کو غسل دینے والے شخص کا دل مردہ ہوجاتا ہے اور ایسے شخص کے پیچھے نماز صحیح نہیں ہوتی، ایسا شخص نماز پڑھانے کا بالکل حق دار نہیں، تو کیا یہ بات صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے، تو میت کو باقاعدہ غسل دینے کا پیشہ اختیار کرنے والے ہی کے حق میں یہ بات ہوگی یا کسی طرح کی اجرت یا ہدیہ لیے بغیر فقط ثواب کی نیت سے غسل دینے والے پیش امام پر بھی یہ حکم عائد ہوگا؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

مذکورہ شخص کی یہ بات صحیح نہیں ہے؛ بل کہ قرآن پاک اور واحادیث نبویہ کی تعلیمات کے خلاف

---

[١] رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ١٩٧، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة عند الميت.

"ثم يجلسه ويسنده إليه ويمسح بطنه مسحا رفيقا" تحرزا عن تلويث الكفن "فإن خرج منه شيء غسله ولا يعيد غسله ولا وضوءه" "لأن الغسل عرفناه بالنص وقد حصل مرة". (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل، المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ٥٩٣هـ): ١/ ٨٩، باب الجنائز، فصل في الغسل، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت☆مجمع الأنهر: ١/ ١٨٠، باب صلاة الجنائز، ط: دار إحياء التراث الإسلامي ☆بدائع الصنائع: ١/ ٣٠١، فصل بيان كيفية الغسل للميت، ط: دار الكتب العلمية☆ المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ٤٨٣هـ): ٢/ ٥٩، باب غسل الميت، ط: دار المعرفة- بيروت)

[٢] يندب الغسل من غسل الميت. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ٢٠٢، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر)

ہے، میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے۔[۱] اور فرض کفایہ کی ادائیگی سے دل مردہ نہیں ہوتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ایک شخص کے دوسرے شخص پر چھ حقوق ہیں؛ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی مسلمان کے اس کے انتقال کے بعد غسل دیا جائے۔ (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۹۹)[۲]

بل کہ میت کو غسل دینے سے اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا ہوگا، اور موت کا تصور مستحضر ہوگا کہ گزشتہ کل یہ شخص گھومتا پھرتا تھا، آج روح کے نکل جانے کی وجہ سے بے بس ہوگیا ہے، کل میرا بھی ایسا وقت آنے والا ہے، اس طرح موت کو یاد کرے گا، تو اس کے دل میں نرمی پیدا ہوگی، اس کے دل کی دنیا آباد ہوگی، اس کا چراغ روشن ہوگا؛ اس لیے ان لوگوں کا یہ کہنا کہ: ''مردے کو غسل دینے سے دل مردہ ہوجاتا ہے'' سراسر غلط ہے۔

مذکورہ امام صاحب کی امامت میں کوئی خرابی نہیں آئے گی؛ مزدوری لے کر غسل دے یا ثواب کی نیت سے غسل دے، دونوں صورت جائز ہے، جب کوئی کام فرض کفایہ ہو، تو اس پر مزدوری لینا جائز ہے؛ لیکن جب کوئی مرد غسل دینے والا نہ ہو یا ہو، مگر ایک دو کی تعداد میں ہوں، تو اب ان پر غسل دینا فرض عین ہوجائے

(۱) (والصلاة عليه) صفتها (فرض كفاية) بالإجماع ... (كدفنه) وغسله وتجهيزه فإنها فرض كفاية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۰۷، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۸، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۰۰، فصل بيان كيفية وجوب غسل الميت، ط: دار الكتب العلمية)

وكذا غسل الميت والصلاة عليه والدفن كل ذلك فرض كفاية، إذا قام به البعض، سقط عن الباقين، وإن امتنعوا من ذلك حتى ضاع ميت بين قوم، مع علمهم بحاله كانوا مشتركين في المأثم. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۳۰/ ۲۶۳، كتاب الكسب، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۱۱، كتاب الصلاة، فصل بيان فريضة صلاة الجنازة وكيفية فرضها، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) أما النص فما روي عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: للمسلم على المسلم ست حقوق'' وذكر من جملتها أن يغسله بعد موته'' وعلى: كلمة إيجاب ـــــــ وروي أنه لما توفي آدم - صلوات الله عليه - غسلته الملائكة ثم قالت لولده هذه سنة موتاكم، والسنة المطلقة في معنى الواجب، وكذا الناس توارثوا ذلك من لدن آدم - صلى الله عليه وسلم - إلى يومنا هذا فكان تاركه مسيئا لتركه السنة المتوارثة، والإجماع منعقد على وجوبه. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۹۹، كتاب الصلاة، فصل: الغسل، ط: دار الكتب العلمية ☆ فتح القدير: ۲/ ۱۰۶، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل في الغسل، ط: دار الفكر - بيروت)

گا اور مزدوری لینا جائز نہیں ہوگا۔ (طحطاوی: ۳۱۲)[۱]

اس لیے آپ کے امام صاحب اگر میت کو غسل دیں گے، تو یہ بہت بڑے ثواب کا کام ہوگا، ان کی امامت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] فتاویٰ حسینیہ کے ایک فتویٰ کی مزید تحقیق

۱۰۹۱-سوال: فتاویٰ حسینیہ (ص:۳۷) پر سوال نمبر ۱۸ر کے جواب میں لکھا ہے کہ "جس شخص کو لوگ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں، اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، میت کو غسل دینے کے پیشہ کو لوگ حقیر سمجھتے ہیں اور غسل دینے کا پیشہ اختیار کرنے والے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؛ اس لیے ایسے شخص کے پیچھے نماز بہتر نہیں"۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص محض ثواب کی نیت سے کسی طرح کی اجرت اور ہدیہ لیے بغیر میت کو غسل دینے کا معمول بنالے، تو یہ پیشہ کہلائے گا یا نہیں؟ اور ایسے شخص کے پیچھے نماز درست ہوگی یا نہیں؟ نیز میت کو غسل دینے کا کیا ثواب ہے؟ بینوا توجروا۔ احمد اسماعیل کھتری

الجواب حامداً ومصلیاً:

فتاویٰ حسینیہ کے اس فتویٰ کا مصداق وہ لوگ ہیں، جو اجرت لے کر غسل دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ثواب سمجھ کر میت کو غسل دیتا ہو، تو اس کے لیے مذکورہ حکم نہیں ہے؛ اس لیے اجرت نہ لینا بہتر ہے۔[۲]

---

[۱] والأفضل أن يغسله مجانا وإن ابتغى الغاسل أجرا جاز إن كان ثمة غيره وإلا لا لتعينه عليه. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱ هـ) ص:۵۷۰، باب أحكام الجنائز، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت-لبنان)

والأفضل أن يغسل الميت مجانا وإن ابتغى الغاسل الأجر فإن كان هناك غيره يجوز أخذ الأجر وإلا لم يجز، هكذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/۱۶۰-۱۵۹، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر ☆الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۱۹۹، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) حضرت مفتی صاحب کی اس تطبیق سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے، جو اجرت لے کر میت کو غسل دینے کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہو، حالاں کہ سابقہ فتویٰ میں صراحت ہے کہ اجرت لے کر اگر کوئی غسل میت کا کام کرتا ہو، تو کوئی حرج نہیں، اور ایسے شخص کے پیچھے بلا کراہت نماز جائز ہے۔ [جب کہ دیگر شرائط امامت ان میں موجود ہوں]

واضح رہے کہ حضرت مفتی صاحب کا فتویٰ یہی ہے [جیسا کہ اسی میں آگے آرہا ہے] اور اصل حکم بھی یہی ہے۔ ہاں کہیں اس امر کو=

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو یہ حکم دیا تھا کہ ''اے علی! میت کو غسل دیتے رہو؛ کیوں کہ جو شخص میت کو غسل دیتا ہے، اس کو ستر مغفرت ملتی ہیں، ان میں سے اگر ایک مغفرت کو تقسیم کر دیا جائے، تو تمام زمین والوں کے لیے کافی ہو جائے''۔[۱]

ایک دوسری روایت میں وارد ہے کہ ''جس نے کسی میت کو غسل دیا اور اس نے میت کے اندر کسی عیب کو دیکھا اور اسے چھپا دیا، تو اس کے بڑے بڑے چالیس گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، جو شخص میت کو کفن پہنائے گا، تو اس کو جنت کا ریشمی کپڑا پہنایا جائے گا، اور جس نے میت کے لیے قبر کھودی، اور اس میں دفن کیا، تو اس کو قیامت کے دن تک میت کے لیے مکان میں پناہ دینے کا ثواب دیا جائے گا''۔

مستدرک حاکم نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور امام مسلمؒ کی شرط کے موافق ہے۔ (طحطاوی: ۳۱۲)[۲]

= حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو، تو اس (سوچ وفکر) کی اصلاح ضروری ہے، اور فطری بات ہے کہ جب تک لوگوں کا ذہن اس سلسلے میں صاف نہ ہو جائے، ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے سے وہ طبعاً کراہت محسوس کریں گے؛ اس لیے بہتر ہے کہ اصلاح حال کی کوشش کے ساتھ ایسے شخص کو وقتی طور پر امامت کے منصب سے دور رکھا جائے، امکان ہے کہ فتاویٰ حسینیہ کے فتویٰ کی یہی مراد ہو۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

(۱) عن علي بن أبي طالب، قال: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: "يا علي غسل الموتى، فإنه من غسل ميتا غفر له سبعون مغفرة، لو قسمت مغفرة منها على جميع الخلائق لوسعتهم"، قلت: يا رسول الله، ما يقول من يغسل ميتا؟ قال: يقول: "غفرانك يا رحمن، حتى يفرغ من الغسل". (نصب الراية لأحاديث الهداية - جمال الدين أبو محمد عبد الله بن يوسف بن محمد الزيلعي (م: ۷۶۲ھ): ۲/۲۵۶، باب الجنائز، فصل في الغسل، ت: محمد عوامة، ط: مؤسسة الريان للطباعة والنشر - بيروت / دار القبلة للثقافة الإسلامية - جدة)

مزید دیکھیے: حاشية الطحطاوي، ص: ۵۷۰، باب أحكام الجنائز، ط: دار الكتب العلمية - بيروت.

[۲] عن أبي رافع، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من غسل ميتا فكتم عليه غفر له أربعين مرة، ومن كفن ميتا كساه الله من السندس، وإستبرق الجنة، ومن حفر لميت قبرا فأجنه فيه أجري له من الأجر كأجر مسكن أسكنه إلى يوم القيامة. "هذا حديث صحيح على شرط مسلم، ولم يخرجاه". (المستدرك على الصحيحين - أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله بن محمد بن حمدويه بن نعيم بن الحكم، النيسابوري المعروف بابن البيع (م: ۴۰۵ھ): ۱/۵۱۶، رقم الحديث: ۱۳۴۰، كتاب الجنائز، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الآداب للبيهقي - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ) ص: ۱۱۴، رقم الحديث: ۲۷۶، باب اتباع الجنائز، ت: أبو عبد الله السعيد المندوه، ط: مؤسسة الكتب الثقافية - بيروت ☆ شعب الإيمان - أبو بكر البيهقي: ۱۱/۴۵۶، رقم الحديث: ۸۸۲۷، الصلاة على من مات من أهل القبلة، ت: الدكتور عبد العلي عبد الحميد حامد، ط: مكتبة الرشد للنشر =

اس لیے مزدوری لیے بغیر محض ثواب کی نیت سے میت کو غسل دینے والے کے لیے یہ حکم نافذ نہیں ہوگا، ایسے شخص کی عزت کرنی چاہیے، حقارت کی نگاہوں سے دیکھنے والے صریح غلطی پر ہیں۔ [1] لہٰذا فتاویٰ حسینیہ کے فتویٰ کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ شریعت نے جن لوگوں کو حقیر سمجھا ہے اور جن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کا حکم بھی دیا ہے، تو ایسا شخص حقارت کا مستحق ہے اور اس کو امامت کا منصب نہیں دینا چاہیے؛ مثلاً: جو کام شریعت اسلامی میں گناہ کے ہیں، ان کا وہ ارتکاب کرتا ہو؛ نیز ایسا کام اور پیشہ اختیار کیے ہوا ہو، جس کو لوگ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؛ مثلاً: کتوں یا بلیوں کا کاروبار کرتا ہو، تو ایسے آدمی کے لیے حضرات فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کی امامت مکروہ ہے۔

اس زمانے میں لوگ جانوروں کی طرح مال کے پیچھے دوڑ رہے ہیں ،قدریں بدل گئی ہیں، اور اب تو امامت ہی کو حقیر پیشہ سمجھتے ہیں؛ اسی وجہ سے مال دار حضرات اپنی اولاد کو دین کی تعلیم نہیں دیتے، تو کیا ان کی وجہ سے علمائے کرام کو پڑھانا چھوڑ دینا چاہیے؟؟؟

اسی طرح علماء کرام کو غسل میت کا پیشہ اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، بل کہ وہ اس کے آداب و سنن سے زیادہ واقف ہوتے ہیں، اس لیے یا تو وہ خود سے غسل دیں، یا کم از کم ان کی نگرانی میں غسل دینے کا اہتمام کیا جائے، جو لوگ اس کو حقیر سمجھیں، ان کو اس کی فضیلت بتائی جائے۔

=والتوزيع بالرياض، بالتعاون مع الدار السلفية ببومباي بالهند)

و روى البيهقي في المعرفة و الحاكم في المستدرك و قال على شرط مسلم. (حاشية الطحطاوى، ص:۵۷۰، باب أحكام الجنائز، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۱) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ... بحسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المسلم، كل المسلم على المسلم حرام، دمه، وماله، وعرضه. (الصحيح لمسلم: ۲/۳۱۷، رقم الحديث: ۳۲- ۲۵۶۴، باب تحريم ظلم المسلم، وخذله، واحتقاره ودمه، وعرضه، وماله، ط: ديوبند)

قوله: "بحسب امرئ من الشر أن يحقر أخاه المسلم" فيه تحذير عظيم من ذلك لأن الله تعالى لم يحقره إذ خلقه ورزقه ثم أحسن تقويم خلقه وسخر ما في السموات وما في الأرض جميعاً لأجله وإن كان له ولغيره فله من ذلك حصة ثم إن الله سبحانه سماه مسلماً ومؤمناً وعبداً وبلغ من أمره إلى أن جعل الرسول منه إليه محمداً صلى الله عليه وسلم فمن حقر مسلماً من المسلمين فقد حقر ما عظم الله عز وجل وكافيه ذلك... الخ. (شرح الأربعين النووية في الأحاديث الصحيحة النبوية- تقي الدين أبو الفتح محمد بن علي، القشيري، المعروف بابن دقيق العيد (م: ۷۰۲هـ)، ص:۱۱۸، باب أخوة الإسلام، ط: مؤسسة الريان)

الغرض غسل میت دینے والوں کے پیچھے بلا کراہت نماز درست ہے، جو ان کو حقیر سمجھتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں، اپنی اصلاح کی فکر کریں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] میت کو غسل دینا منصب امامت کے منافی نہیں

۱۰۹۲- سوال: جو آدمی ہمیشہ میت کو غسل دیتا ہو، اس کی اقتدا میں نماز جائز ہے یا نہیں؟ کیا یہ منصب امامت کے خلاف ہے۔

الجواب حامداو مصلیا:

کفن، دفن، غسل، وغیرہ میت کے حقوق ہیں۔ (۲) نبی کریم ﷺ نے میت کو غسل دینے والے کے بارے میں بہت سے فضائل بیان فرمائے ہیں، جو آدمی میت کو غسل دے اور اس کے عیوب کی چشم پوشی کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کو گناہوں سے پاک فرمادیتے ہیں۔ (۳)

دوسری روایت میں ہے کہ اس کے چالیس گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں۔ (۴)

---

(۱) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سابقہ فتویٰ بہ عنوان: ''میت کو غسل دینا کار ثواب ہے''۔

(۲) تقدم تخريجه عن: الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۰۷، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر- بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۵۸، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۱/۳۰۰، فصل بيان كيفية وجوب غسل الميت، ط: دار الكتب العلمية.

(۳) تقدم تخريجه عن: نصب الراية لأحاديث الهداية- جمال الدين أبو محمد عبد الله بن يوسف بن محمد الزيلعي (م: ۷۶۲هـ): ۲/۲۵۶، باب الجنائز، فصل في الغسل، ت: محمد عوامة، ط: مؤسسة الريان للطباعة والنشر- بيروت/دار القبلة للثقافة الإسلامية- جدة.

(۴) قد تقدم تخريجه عن: المستدرك على الصحيحين- أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله بن محمد بن حمدويه بن نعيم بن الحكم، النيسابوري المعروف بابن البيع (م: ۴۰۵هـ): ۱/۵۱۶، رقم الحديث: ۱۳۴۰، كتاب الجنائز، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الآداب للبيهقي- أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ)، ص: ۱۱۴، رقم الحديث: ۲۷۶، باب اتباع الجنائز، ت: أبو عبد الله السعيد المندوه، ط: مؤسسة الكتب الثقافية- بيروت ☆ شعب الإيمان- أبو بكر البيهقي: ۱۱/۴۵۶، رقم الحديث: ۸۸۴۷، الصلاة على من مات من أهل القبلة، ت: الدكتور عبد العلي عبد الحميد حامد، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض، بالتعاون مع الدار السلفية بيومباي بالهند.

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ نومولود بچے کی طرح وہ گناہوں سے پاک ہوجاتا ہے۔[1]

آج اس نیک عمل سے بعد ہوگیا ہے، عالم یا امام صاحب مذکورہ کام کرتے ہیں، تو سنت کا خاص اہتمام کرتے ہیں؛ لیکن عام آدمی جب غسل دیتا ہے، تو سنت کا اہتمام نہیں کرتا، اس سلسلے میں لوگوں کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

میت کو غسل دینے والا اگر علم سے عاری ہو تو اس کی جہالت کی بنا پر امامت مکروہ ہوگی، میت کو غسل دینے کی وجہ سے نہیں، اگر غسل دینے والا عالم باعمل ہے، تو اس کی امامت میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] مردے کو غسل میں کلی کرانا اور ناک میں پانی ڈالنا فرض نہیں

۱۰۹۳- سوال: جس طرح زندہ آدمی کے حق میں غسل کے تین فرائض (کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا اور پورے بدن پر پانی بہانا ضروری ہے، کہ ان میں سے کوئی ایک فرض چھوٹ جائے، تو غسل نہیں ہوتا، تو کیا مردے کے لیے بھی یہی حکم ہے؟ حالاں کہ مردے کو کلی کرانا ممکن نہیں ہوتا۔

الجواب حامداومصلیا:

میت کے غسل میں کلی کرانا اور ناک میں پانی ڈالنا فرض نہیں ہے، صرف اس قدر فرض ہے کہ پورے بدن کو ایک مرتبہ دھو دیا جائے، بہتر یہ ہے کہ کوئی باریک کپڑا یا روئی پانی میں بھگو کر دانت، ہونٹ، تالو اور منھ میں پھیر کر صاف

---

(۱) عن علي -رضي الله عنه- أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من غسل ميتا، وكفنه، وحنطه، وحمله، وصلى عليه، ولم يفش عليه ما رأى منه؛ خرج من خطيئته كيوم ولدته أمه. (الترغيب في فضائل الأعمال وثواب ذلك- أبو حفص عمر بن أحمد بن عثمان بن أحمد بن محمد بن أيوب بن أزداذ البغدادي المعروف بـ ابن شاهين (م: ۳۸۵هـ)، ص: ۱۲۳، رقم الحديث: ۴۱۴، باب فضل من غسل ميتا، ت: محمد حسن محمد حسن إسماعيل، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

عن عائشة -رضي الله عنها- قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من غسل ميتاً فأدى فيه الأمانة خرج من ذنوبه كيوم ولدته أمه. (الترغيب والترهيب- إسماعيل بن محمد بن الفضل بن علي القرشي الطليحي التيمي الأصبهاني، أبو القاسم، الملقب بـ"قوام السنة" (م: ۵۳۵هـ): ۱۵۶/۳، باب في الترغيب في غسل الجنابة وغسل الحيض وغسل الميت، ت: أيمن بن صالح بن شعبان، ط: دار الحديث- القاهرة)

(۲) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سابقہ فتاویٰ بہ عنوان: "میت کو غسل دینا کار ثواب ہے" اور "فتاویٰ حسینیہ کے ایک فتویٰ کی مزید تحقیق"۔

کردے، اسی طرح ناک کے اندرونی حصہ میں بھی پھیر دے۔ (عالمگیری صفحہ ۱۵۸)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] شرابی کا میت کو غسل دینا

۱۰۹۴- سوال: جو شخص نشہ میں دھت ہو، کیا وہ میت کو غسل دے سکتا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

نشہ آور اشیاء کا اپنے اختیار سے استعمال کرنے والا اور نشہ میں مست رہنے والا آدمی (شرابی) فاسق ہے؛ اس لیے ایسی خدمت پر اس کو مامور کرنے والے گنہ گار ہوں گے، کیوں کہ فاسق قابل اعتبار اور محترم منصب کے لائق نہیں، البتہ اس نے غسل دیا ہے، تو کفایت کرجائے گا۔[2]

اگر وہ نشہ میں چور ہے، منہ سے بدبو آرہی ہے، پوری طرح ہوش میں نہیں ہے تو اب غسل کا اعادہ بہتر

---

[۱] ولا يمضمض ولا يستنشق، كذا في فتاوى قاضي خان، ومن العلماء من قال: يجعل الغاسل على أصبعه خرقة رقيقة، ويدخل الأصبع في فمه، ويمسح بها أسنانه، وشفتيه، ولهاته، ولثته، وينقيها ويدخل في منخريه أيضا، كذا في الظهيرية، قال شمس الأئمة الحلواني: وعليه عمل الناس اليوم، كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۸، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل، ط: دار الفكر - بيروت)

(ويوضأ) من يؤمر بالصلاة (بلا مضمضة واستنشاق) للحرج، وقيل يفعلان بخرقة، وعليه العمل اليوم، ولو كان جنبا، أو حائضا، أو نفساء فعلا اتفاقا تتميما للطهارة، كما في إمداد الفتاح مستمدا من شرح المقدسي. (الدر المختار: ۲/ ۹۵-۱۹۶) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله للحرج) إذ لا يمكن إخراج الماء، أو يعسر فيتركان، زيلعي. (قوله: بخرقة) أي يجعلها الغاسل في أصبعه يمسح بها أسنانه ولهاته ولثته ويدخلها منخره أيضا، بحر. (قوله وعليه العمل اليوم) قائله شمس الأئمة الحلواني كما في الإمداد عن التتارخانية. (قوله: ولو كان جنبا إلخ) نقل أبو السعود عن شرح الكنز للشلبي أن ما ذكره الخلخالي أي في شرح القدوري من أن الجنب يمضمض ويستنشق غريب مخالف لعامة الكتب. اهـ ــــــــ قلت: وقال الرملي أيضا في حاشية البحر: إطلاق المتون والشروح والفتاوى يشمل من مات جنبا ولم أر من صرح به لكن الإطلاق يدخله، والعلة تقتضيه اهـ وما نقله أبو السعود عن الزيلعي من قوله: بلا مضمضة واستنشاق ولو جنبا صريح في ذلك، لكني لم أره في الزيلعي. (قوله اتفاقا) لم أجده في الإمداد ولا في شرح المقدسي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۹۶، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة عند الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) ولو كان الغاسل جنبا أو حائضا أو كافرا اجاز ويكره، كذا في معراج الدراية. ــــــ ولو كان محدثا لا يكره اتفاقا هكذا في القنية. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۱۵۹، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر)

ہے؛ کیوں کہ مکمل غسل دیا ہے یا نہیں، یہ محتمل ہے، اگر ظاہراً اس نے پورا غسل دیا ہے، تو درست ہوگا؛ لیکن ایسے شخص کو غسل دینے سے روکا جائے، کسی دیانت دار کو یہ خدمت سپرد کی جائے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] چھوٹے بچے اور بچی کو کون غسل دے گا؟

۱۰۹۵- سوال: معصوم لڑکا یا لڑکی کا انتقال ہو جائے، تو باپ یا دادا غسل دے سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز ان کو بڑے آدمیوں کی طرح وضو کرانا، تختہ کو دھونی دینا اور مسنون طریقہ کے مطابق کفن دینا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

معصوم لڑکا یا لڑکی (**غیر مراهقه**) کا انتقال ہو جائے، تو باپ یا دادا میں سے کوئی بھی غسل دے سکتے ہیں، باپ، دادا کے علاوہ غیر محرم عورت و مرد بھی غسل دے سکتے ہیں؛ لیکن بہتر یہ کہ چھوٹی لڑکی کو عورتیں اور چھوٹے لڑکے کو مرد حضرات غسل دیں:

ويغسل الرجال الرجال والنساء النساء ولا يغسل أحدهما الآخر فإن كان الميت صغيرا لا يشتهي جاز أن يغسله النساء وكذا إذا كانت صغيرة لا تشتهي جاز للرجال غسلها. (عالمگیری جلد ۱ صفحہ ۱۲۸)[2]

اور جس طرح عاقل و بالغ مرد و عورت کو غسل دینے اور کفنانے کا مسنون طریقہ ہے، وہی طریقہ معصوم بچے اور بچی کا ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری)[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ويستحب للغاسل أن يكون أقرب الناس إلى الميت فإن لم يعلم الغسل فأهل الأمانة والورع، كذا في الزاهدي.
يستحب أن يكون الغاسل ثقة يستوفي الغسل. (المصدر السابق ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۰۲، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر - بيروت ★ البحر الرائق: ۲/ ۱۸۸، كتاب الصلاة، كتاب الجنائز، غسل الميت، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۲] الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۰، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الجوهرة النيرة: ۱/ ۱۰۳، كتاب الصلاة، باب الجنائز، ط: المطبعة الخيرية ☆ البناية شرح الهداية: ۳/ ۱۹۰، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل في غسل الميت، تسريح شعر الميت ولحيته، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۳] والصبي المراهق في التكفين كالبالغ والمراهقة كالبالغة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۰، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثالث في التكفين، ط: دار الفكر - بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۱/ ۲۳۸، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاة الجنازة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق - القاهرة)

[۹] میت کو غسل دیتے وقت اُس کے پیر قبلہ رُخ رہ جائیں، تو کیا حکم ہے؟

۱۰۹۶- سوال: میت کو غسل دیتے وقت اُس کے پیر قبلہ رُخ کر کے غسل دینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر غلطی سے پیر قبلہ رُخ کر کے غسل دیا ہو، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

بہتر یہ ہے کہ جس صورت میں میت اور غاسل کے لیے سہولت اور آسانی ہو، وہی صورت اختیار کی جائے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ پیر قبلہ رُخ ہونے چاہئیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جنوباً یا شمالاً لٹا کر قبلہ رُخ کیا جائے۔ (شامی: ۱/ ۸۰۰، عالمگیری: ۱/ ۱۳۶)[1]

ہدایہ کے حاشیہ نمبر ۶/ میں بہ حوالہ فتح القدیر لکھا ہے کہ قبلہ کی سمت میں پیر کرنا یا رُخ کرنا جائز ہے۔[2] سرخسی کے حوالے سے لکھا ہے کہ جو صورت آسان ہو، اس کو اختیار کرے، لہٰذا سمت قبلہ پیر کرنا جائز ہے، گناہ نہیں ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] وكيفية الوضع عند بعض أصحابنا الوضع طولا كما في حالة المرض إذا أراد الصلاة بإيماء، ومنهم من اختار الوضع كما يوضع في القبر، والأصح أنه يوضع كما تيسر، كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۸، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر- بيروت)

(ويوضع) كمامات (كما تيسر) في الأصح (على سرير مجمر وترا) إلى سبع فقط فتح. (الدر المختار: ۲/ ۱۹۴)ـــــ قال ابن عابدين: (قوله كمامات)... أي أنه يوضع على السرير عقب تيقن موته، وقيده القدوري بما إذا أرادوا غسله، والأول أشبه كما في الزيلعي، (قوله في الأصح) وقيل: يوضع إلى القبلة طولا، وقيل: عرضا كما في القبر أفاده في البحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۹۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة عند الميت، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۰۰، كتاب الصلاة، فصل بيان كيفية الغسل للميت، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) (وإذا ما أرادوا غسله وضعوه على سرير) لينصب الماء عنه. (الهداية)ـــــ قال ابن الهمام: (قوله: وضعوه على سرير) قيل طولا إلى القبلة، وقيل عرضا. قال السرخسي: الأصح كيفما تيسر. (فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بـ 'ابن الهمام' (م: ۸۶۱هـ): ۲/ ۱۰۶، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل في الغسل، ط: دار الفكر)

(۳) (قال): ويوضع على تخت، ولم يبين كيفية وضع التخت إلى القبلة طولا أو عرضا، ومن أصحابنا من اختار الوضع طولا، كما كان يفعله في مرضه إذا أراد الصلاة بالإيماء، ومنهم من اختار الوضع عرضا، كما يوضع في قبره، والأصح أنه يوضع كما تيسر فذلك يختلف باختلاف المواضع. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۲/ ۵۹-۶۰، كتاب الصلاة، باب غسل الميت، ط: دار المعرفة - بيروت)

[۱۰] جس میت کی کھال نکل جانے کا اندیشہ ہو، اس کو غسل دینا ضروری نہیں

۱۰۹۷- سوال: ایک آدمی کنویں میں گر کر مر گیا، اور اس کی نعش ۲/دن اور ۳/راتیں اس میں رہی، اس کے بعد پوسٹ مارٹم میں ایک دن ہو گیا، اور ان سب وجوہات سے اس کا بدن بہت پھول گیا، اب صورت حال یہ ہے کہ صرف ہاتھ لگانے سے بھی چمڑی نکل جاتی ہے، جس کی وجہ سے غسل دینا مشکل ہے، اور اس کا بدل تیمم بھی مشکل ہے، اس لیے کہ ہاتھ لگانا ہی مشکل ہے، ایسی حالت میں غسل اور تیمم کو چھوڑ دیا جائے تو کوئی حرج ہے؟ یا اس کے منہ اور ہاتھ پر [تیمم کے طور پر] دھول یا راکھ ڈال دی جائے، دینی اعتبار سے اس کا جو بھی حل ہو، لکھ کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں غسل دینا ضروری ہے، کہ صرف پانی بہا دیا جائے، ہاتھ نہ لگایا جائے، کہ جس کی وجہ چمڑی سے نکل آئے۔

ولو كان الميت متفسخا يتعذر مسحه كفى صب الماء عليه، كذا في التتارخانية ناقلا عن العتابية. (عالمگیری۔ ۱/ ۱۲۷)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۱۱] غسل کے پانی کو بیری کے پتّوں سے ابالنا

۱۰۹۸- سوال: میّت کے غسل کے پانی کو بیری کے پتّوں سے اُبالا جاتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر بیری کے پتے نہ ہوں، تو کیا کیا جائے؟

---

[۱] الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۸، كتاب الصلاة، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر - بيروت.

اگر کوئی کنواں میں ڈوب کر مر جائے، اور اس کی لاش دو دن تک اسی میں پڑی رہے، تو نکالتے وقت ہی اس کو بہ نیت غسل حرکت دے دینا چاہیے، تاکہ بعد میں غسل کی ضرورت نہ پڑے:

الميت إذا وجد في الماء، لابد من غسله؛ لأن الخطاب بالغسل توجه على بني آدم، ولم يوجد من بني آدم فعل إلا أن يحركه في الماء بنية الغسل عند الإخراج، كذا في التجنيس، وهكذا في البدائع، ومحيط السرخسي. (حوالہ سابق)

الجواب حامدا و مصلیا:

اس کی وجہ سے جلد نرم ہو جاتی ہے اور میل نکل جاتا ہے، بیری کے پتے نہ ہوں، تو خالص پانی سے صابون لگا کر غسل دے دے، بیری کے پتے سے اُبالنا مستحب ہے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] میّت کو غسل دینے والے آدمی کا باوضو ہونا ضروری ہے؟

۱۰۹۹- سوال: میّت کو غسل دینے والے کا باوضو ہونا ضروری ہے؟ اگر ایسا شخص غسل دے

---

(۱) عن أم عطية الأنصارية رضي الله عنها، قالت: دخل علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم حين توفيت ابنته، فقال: اغسلنها ثلاثا، أو خمسا، أو أكثر من ذلك إن رأيتن ذلك، بماء وسدر، واجعلن في الآخرة كافورا - أو شيئا من كافور - فإذا فرغتن فآذنني، فلما فرغنا آذناه فأعطانا حقوه، فقال: أشعرنها إياه، تعني إزاره. (صحيح البخاري: ١/ ١٦٧، رقم الحديث: ١٢٥٣، كتاب الجنائز، باب غسل الميت و وضوئه بالماء و السدر، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ١/ ٣٠٥، رقم الحديث: ٦ ٣-٩٣٩، كتاب الجنائز، باب في غسل الميت، ط: ديوبند)

(ويصب عليه ماء مغلي بسدر) ورق النبق (أو حرض) بضم فسكون الأشنان (إن تيسر، وإلا فماء خالص مغلي. (الدر المختار) ــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله ورق النبق) بفتح النون و كسرها وبسكون الباء الموحدة و ككتف كما يعلم من القاموس. وفي التذكرة السدر شجر معروف وثمره هو النبق وسحيق ورقه يلحم الجراح ويقلع الأوساخ وينقي البشرة وينعمها ويشد الشعر. ومن خواصه أنه يطرد الهوام ويشد العصب ويمنع الميت من البلاء. اهـ. وفي القاموس أيضا النبق: حمل السدر، وبه علم أن السدر هو الشجر و النبق الثمر فإضافة الورق إلى النبق لأدنى ملابسة وتفسير السدر بالورق بيان للمراد منه فالأحسن في التعبير قول المعراج: السدر شجرة النبق، و المراد ورقه. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ١٩٦، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة عند الميت، ط: دار الفكر - بيروت☆ تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ٧٤٣هـ): ١/ ٢٣٦، باب الجنائز، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ٨٨٥هـ): ١/ ١٦١، باب الجنائز، ما يفعل بالمحتضر، ط: دار إحياء الكتب العربية☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م: ٩٧٠هـ): ٢/ ١٨٥، كتاب الجنائز، ما يصنع بالمحتضر، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ المحيط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ٦١٦هـ): ٢/ ١٥٧، كتاب الصلاة، الفصل الثاني و الثلاثون في الجنائز، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

دے، جو وضوء سے نہ ہو، تو غسل صحیح ہوگا یا نہیں؟ اور بے وضو آدمی اس طرح غسل دینے کی وجہ سے گنہ گار تو نہ ہوگا؟

الجواب حامداومصلیا:

بہتر ہے کہ غسل دینے والے شخص باوضو ہو، تاہم ایسا آدمی بھی غسل دے سکتا ہے، جس کا وضوء نہ ہو، غسل بہ ہر صورت ہوجائے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وينبغي أن يكون غاسل الميت على الطهارة، كذا في فتاوى قاضي خان، ولو كان الغاسل جنبا، أو حائضا، أو كافرا، جاز ويكره، كذا في معراج الدراية. ــــــــــ ولو كان محدثا لا يكره اتفاقا، هكذا في القنية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۹، كتاب الصلاة، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۰۴، كتاب الصلاة، فصل الكلام فيمن يغسل، ط: دار الكتب العلمية)

ویوضع الکافور علی مساجده. وأرادوا بالمساجد: الجبهة، والیدین، والرکبتین، تشریفا للمیت؛ لأن المغتسل فی حالة الحیاة قد یتطیب، ولا بأس بسائر الطیب فی الحنوط، غیر الزعفران، والورس فی حق الرجل، ولا بأس به فی حق المرأة.

(تحفۃ الفقہاء: ۱/ ۲۴۳، جنائز، ط: بیروت)

باب ما یتعلق بکفن المیت

[کفن میت کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ما یتعلق بکفن المیت

[کفن کا بیان]

[۱] چھوٹے بچوں کی تجہیز و تکفین کا طریقہ

۱۱۰۰- سوال: بالغ مرد و عورت کی قبر پر مشت خاک ڈالتے ہوئے سورۂ طٰہٰ کی آیت ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى﴾ پڑھی جاتی ہے، نیز ان کی قبر پر تین مرتبہ پانی بھی ڈالا جاتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ، کیا اسی طرح معصوم بچوں کی قبر پر مٹی ڈالتے وقت مذکورہ آیت قرآنی پڑھی جائے گی؟ اور کیا نابالغ کی قبر پر پانی ڈالنا چاہیے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

بالغ مرد و عورت کو قبر میں اتارنے کے بعد مٹی ڈالتے وقت جس طرح مذکورہ قرآنی آیت کا پڑھنا مستحب ہے، اسی طرح نابالغ کی قبر پر مٹی ڈالتے وقت بھی پڑھنا مستحب ہے، اور اس کی قبر پر پانی ڈالنا بھی مستحب ہے؛ لیکن واضح رہے کہ مذکورہ چیزیں مستحب ہیں، لازم و ضروری نہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ويستحب لمن شهد دفن الميت أن يحثو في قبره ثلاث حثيات من التراب بيديه جميعا ويكون من قبل رأس الميت ويقول في الحثية الأولى: منها خلقناكم وفي الثانية: وفيها نعيدكم وفي الثالثة: ومنها نخرجكم تارة أخرى، كذا في الجوهرة النيرة... ولا بأس برش الماء عليه. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/۱۶۶، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن والنقل من مكان إلى آخر، ط: دار =

[۲] چھوٹی بچی کا کفن

۱۱۰۱- سوال: ایک مہینے کی چھوٹی بچی کے کفن میں کتنے کپڑے ضروری ہیں؟ اُس کے لیے بڑی عورت جتنے ہی کپڑے ضروری ہیں، یا دو کپڑے کا کفن کافی ہوجائے گا؟ اور عطر و کافور وغیرہ لگانا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا

چھوٹی بچی کے لیے پانچ کپڑوں کی ضرورت نہیں ہے، دو کپڑوں میں کفن کافی ہے، اگر زیادہ کپڑے استعمال کیے گئے ہوں، تب بھی جائز ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری: ۱/ ۱۶۰)[۱]

= الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۷، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر - ديوبند ☆ الجوهرة النيرة: ۱/ ۱۰۹، كتاب الصلاة، باب الجنائز، ط: المطبعة الخيرية ☆ حاشية الطحطاوي، ص: ۶۱۱، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية)

(ومن ولد فمات يغسل ويصلى عليه) ويرث ويورث ويسمى (إن استهل) . . . أي وجد منه ما يدل على حياته بعد خروج أكثره. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله يغسل ويصلى عليه) أي ويكفن، ولم يصرح به لعلمه مما ذكره لأن ستر العورة شرط لصحة الصلاة تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۲۷، باب صلاة الجنازة، مطلب مهم: إذا قال: إن شتمت فلانا في المسجد، ط: دار الفكر - بيروت ☆ حاشية الطحطاوي، ص: ۵۹۶، باب أحكام الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۱] والصبي المراهق في التكفين كالبالغ والمراهقة كالبالغة وأدنى ما يكفن به الصبي الصغير ثوب واحد والصبية ثوبان كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۱۶۰، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثالث في التكفين، ط: دار الفكر)

ويكره أن تكفن المرأة في ثوبين، وأما الصغيرة فلا بأس بأن تكفن في ثوبين. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۱/ ۳۰۷، كتاب الصلاة، صلاة الجنازة، فصل كيفية وجوب التكفين، ط: دار الكتب العلمية)

قال الزيلعي وأدنى ما يكفن به الصبي الصغير ثوب واحد والصبية ثوبان. اهـ. وقال في البدائع: وإن كان صبيا لم يراهق فإن كفن في خرقتين إزار ورداء فحسن، وإن كفن في إزار واحد جاز، وأما الصغيرة فلا بأس أن تكفن في ثوبين. اهـ. ــــــ أقول: في قوله "فحسن" إشارة إلى أنه لو كفن بكفن البالغ يكون أحسن لما في الحلية عن الخانية والخلاصة: الطفل الذي لم يبلغ حد الشهوة الأحسن أن يكفن فيما يكفن فيه البالغ، وإن كفن في ثوب واحد جاز اهـ. وفيه إشارة إلى أن المراد بمن لم يراهق من لم يبلغ حد الشهوة. (رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲ھ): ۲/ ۲۰۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في الكفن، ط: دار الفكر - بيروت)

کافور وغیرہ چوں کہ میت کے بدن کو کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لیے لگایا جاتا ہے اس لیے چھوٹی بچی کے کفن میں بھی لگایا جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] میت کے سینے پر آیت کریمہ یا کلمہ طیبہ لکھنا

۱۱۰۲- سوال: یہاں سورت میں ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص کا انتقال ہوا، تو اس کی تدفین کے وقت سینے پر ایک لکھا ہوا خط رکھا گیا اور دفن کیا گیا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح میت کے سینے پر قرآن پاک کی آیت کریمہ، کلمہ طیبہ یا کوئی اور تحریر لکھ کر رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

میت کے سینہ پر آیت کریمہ، یا کلمہ طیبہ، یا کلمہ شہادت لکھا ہوا پرچہ رکھنا، اور اس کو کار ثواب سمجھنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے زمانہ میں یہ طریقہ رائج نہیں تھا، نیز اس میں آیت کریمہ، یا کلمہ طیبہ کی بے ادبی ہے کہ نعش جب پھٹے گی، تو اس کی بے حرمتی ہوگی؛ اس لیے یہ ناجائز ہے۔

البتہ اگر انگلی سے بغیر روشنائی کے، یعنی محض خالی انگلی پھیری جائے اور کلمہ طیبہ لکھا جائے، تو اس کی گنجائش ہے۔ (شامی: ۳/ ۱۵۸، مکتبہ زکریا)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] كتب على جبهة الميت أو عمامته أو كفنه عهد نامه يرجى أن يغفر الله للميت. أوصى بعضهم أن يكتب في جبهته وصدره - بسم الله الرحمن الرحيم - ففعل ثم رئي في المنام فسئل فقال: لما وضعت في القبر جاءتني ملائكة العذاب، فلما رأوا مكتوبا على جبهتي بسم الله الرحمن الرحيم، قالوا: أمنت من عذاب الله. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله عهد نامه) بفتح الميم وسكون الهاء، ومعناه بالفارسية الرسالة، والمعنى رسالة العهد. والمعنى أن يكتب شيء مما يدل أنه على العهد الأزلي الذي بينه وبين ربه يوم أخذ الميثاق من الإيمان، والتوحيد، والتبرك بأسمائه - تعالى، ونحو ذلك ح (قوله: يرجى إلخ) مفاده الإباحة أو الندب. وفي البزازية قبيل كتاب الجنايات: وذكر الإمام الصفار لو كتب على جبهة الميت أو على عمامته أو كفنه عهد نامه يرجى أن يغفر الله - تعالى - للميت ويجعله آمنا من عذاب القبر. قال نصير: هذه رواية في تجويز ذلك، وقد روي أنه كان مكتوبا على أفخاذ أفراس في إصطبل الفاروق: حبيس في سبيل الله - تعالى اهـ. ———— وفي فتاوى المحقق ابن حجر المكي الشافعي: سئل عن كتابة العهد على الكفن وهو لا إله إلا الله والله أكبر لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد، لا إله إلا الله ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم" وقيل: إنه "اللهم فاطر السماوات والأرض عالم الغيب والشهادة الرحمن الرحيم، إني أعهد إليك في هذه الحياة الدنيا أني أشهد أنك أنت الله لا إله إلا أنت وحدك لا شريك لك وأن محمدا عبدك ورسولك - صلى الله عليه وسلم - فلا تكلني إلى نفسي، تقربني من الشر وتبعدني من الخير، =

[۴] میت کی پیشانی پر کلمہ طیبہ لکھنا

۱۱۰۳- سوال: میت کو کفن پہناتے وقت اس کی پیشانی پر کلمہ طیبہ لکھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

روشنائی سے لکھنا جائز نہیں، البتہ غسل کے بعد کفن پہناتے وقت، پیشانی پر انگلی کے اشارے سے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اور سینہ پر "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" لکھا جائے، تو گنجائش ہے (شامی: ۱/ ۴۸۰)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= وأنا لا أثق إلا برحمتك، فاجعل لي عهدا عندك توفينيه يوم القيامة إنك لا تخلف الميعاد" هل يجوز ؟ ولذلك أصل ؟ . فأجاب بقوله: نقل بعضهم عن نوادر الأصول للترمذي ما يقتضي أن هذا الدعاء له أصل ، وأن الفقيه ابن عجيل كان يأمر به ثم أفتي بجواز كتابته قياسا على كتابة لله في إبل الزكاة، وأقره بعضهم ، وفيه نظر . وقد أفتى ابن الصلاح بأنه لا يجوز أن يكتب على الكفن يس والكهف ونحوهما خوفا من صديد الميت، والقياس المذكور ممنوع ؛ لأن القصد ثم التمييز ، وهنا التبرك، فالأسماء المعظمة باقية على حالها، فلا يجوز تعريضها للنجاسة، والقول بأنه يطلب فعله مردود؛ لأن مثل ذلك لا يحتج به إلا إذا صح عن النبي - صلى الله عليه وسلم - طلب ذلك وليس كذلك اهـ وقدمنا قبيل باب المياه عن الفتح أنه تكره كتابة القرآن وأسماء الله - تعالى - على الدراهم والمحاريب والجدران وما يفرش ، وما ذاك إلا لاحترامه ، وخشية وطئه ونحوه مما فيه إهانة فالمنع هنا بالأولى ما لم يثبت عن المجتهد أو ينقل فيه حديث ثابت فتأمل ، نعم نقل بعض المحشين عن فوائد الشرجي أن مما يكتب على جبهة الميت بغير مداد بالأصبع المسبحة - بسم الله الرحمن الرحيم - وعلى الصدر لا إله إلا الله محمد رسول الله، وذلك بعد الغسل قبل التكفين اهـ والله أعلم.(رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۷-۲۴۶، باب صلاة الجنازة، مطلب فيما يكتب على كفن الميت، ط: دار الفكر-بيروت)

فتاویٰ محمودیہ میں ہے: میت کے کفن پر کچھ لکھنا قرآن کریم، حدیث شریف، اجماع امت، قیاس مجتہد سے ثابت نہیں، غیر مجتہد کا عمل قابل حجت نہیں۔ درمختار میں جو کچھ اس سلسلہ میں لکھا ہے، علامہ شامیؒ نے اس کی تردید کی ہے..... ابن الصلاح سے بھی عدم جواز کا فتویٰ نقل کیا ہے؛ کیوں کہ اس کے لکھنے میں قرآن کریم اور اسمائے الٰہیہ کی بے ادبی ہے، اگر لکھنا ہو تو محض انگلی سے بغیر روشنائی کے میت کی پیشانی پر کچھ لکھ دیا جائے، یہ لکھنا بھی دلیل سے ثابت نہیں، تاہم اس طرح بے ادبی نہیں ہوگی۔ غور کا مقام ہے، اگر لکھنا دلیل سے ثابت ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ سے ضرور منقول ہوتا۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۸/ ۳۹-۵۳۸، سوال نمبر: ۴۰۲۲، ط: ادارہ صدیق-ڈابھیل)

[۱] نقل بعض المحشين عن فوائد الشرجي أن مما يكتب على جبهة الميت بغير مداد بالأصبع المسبحة - بسم الله الرحمن الرحيم - وعلى الصدر لا إله إلا الله محمد رسول الله، وذلك بعد الغسل قبل التكفين اهـ والله أعلم. (رد=

[۵] زم زم کے پانی سے تر کیے ہوئے کپڑے میں کفن دینا جائز ہے؟

۱۱۰۴- سوال: بعد سلام مسنون! عرض یہ کہ ابھی بربودھن میں ایک بوڑھی اماں کا انتقال ہوگیا، تو ان کو مکہ مکرمہ کا کفن -جس کو زم زم کے پانی میں بھگویا گیا تھا- دیا گیا، اس پر کسی نے کہا کہ زم زم کے پانی سے بھگویا ہوا کفن نہیں دے سکتے؛ کیوں کہ میت قبر میں سڑ گل جاتی ہے، تو اس سے زم زم سے تر کیے ہوئے کپڑے کی بڑی بے ادبی ہوتی ہے اور گناہ ہوتا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا زم زم سے بھگوئے ہوئے کپڑے میں میت کو کفن دے سکتے ہیں یا نہیں؟ مفصل جواب مطلوب ہے۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

مذکورہ آدمی کی بات درست نہیں ہے، پاک آدمی کا زم زم کے پانی سے غسل کرنا اور وضوء کرنا جائز ہے، کپڑا خشک ہونے سے پانی ختم ہو جاتا ہے، اس لیے زم زم کی بے ادبی کا کوئی معنیٰ نہیں؛ لہٰذا تبرکاً زم زم کے پانی میں بھگو کر خشک کیے گئے کپڑے میں کفن دینا جائز ہے۔[1]

امداد الفتاوی، جلد ۱ صفحہ ۷۱۵[2] میں لکھا ہے کہ عرب وعجم کے حاجیوں کا کئی سالوں سے یہ رواج چلا آرہا ہے کہ زم زم کے پانی میں بھگویا ہوا کفن دیتے ہیں اور علماء نے اس پر انکار نہیں کیا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۷، باب صلاة الجنازة، مطلب فيما يكتب على كفن الميت، ط: دار الفكر)
تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: میت کے سینے پر آیت کریمہ یا کلمہ طیبہ لکھنا۔

(۱) يجوز الوضوء والغسل بماء زمزم عندنا من غير كراهة، بل ثوابه أكبر، وفصل صاحب "لباب المناسك" آخر الكتاب، فقال: يجوز الاغتسال والتوضؤ بماء زمزم إن كان على طهارة للتبرك، فلا ينبغي أن يغتسل به جنب، ولا محدث، ولا في مكان نجس، ولا يستنجي به، ولا يزال به نجاسة حقيقية، وعن بعض العلماء تحريم ذلك، وقيل: إن بعض الناس استنجى به فحصل له باسور اهـ. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ)، ص: ۲۱- ۲۲، كتاب الطهارة، مدخل، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۲] از قدیم در تمام حجاج عرب وعجم ایں عمل جاری ست بلا نکیر کافہ انام ایں کار می کنند حتی الامکان فعل اوشاں بر محل صحیح آوردن بہتر ست بخیالے حقیر از دلائل قیاسیہ مجیب الرحمٰن قدس سرہ ایں جزئی تفسیر روح البیان اولیٰ است: قالوا لو وضع شعر رسول الله صلى الله عليه وسلم أو عصاه أو سوطه على قبر عاص لنجا ذلك العاصي ببركات تلك الذخيرة من العذاب وان كانت في دار انسان او بلدة لا يصيب سكانها بلاء ببركاتها وان لم يشعروا بها ومن هذا القبيل ماء زمزم والكفن المبلول به وبطانة أستار الكعبة والتكفن بها. [روح البيان في تفسير القرآن- إسماعيل حقي بن مصطفى الإستانبولي الحنفي (م: ۱۱۲۷هـ): ۲۵۹/۳، ۷- سورة الأعراف: ۱۵۹، ط: دار الفكر- بيروت] (امداد الفتاویٰ: ۱/ ۷۱۵- ۷۱۶، ط: ادارۂ تالیفات اولیاء- دیوبند)

[۶] کفن پر زم زم کا پانی چھڑکنا

۱۱۰۵- سوال: کفن پر زم زم کا پانی چھڑکنا، یا زم زم کے پانی سے تر کر کے خشک کیے ہوئے کپڑے میں کفن دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

جائز ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] کیا میت کے کفن، داڑھی اور بالوں پر عطر لگانا جہالت پر مبنی ہے؟

۱۱۰۶- سوال: بہت سے علماء کرام میت کے کفن پر عطر لگانے کو جہالت کہتے ہیں، تو کیا میت کے لیے عطر استعمال کرنا جائز ہے؟ اسی طرح داڑھی اور سر کے بالوں پر عطر لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصلیا:

میت کے بدن کے وہ حصے جو سجدے سے متعلق ہیں، (یعنی جن اعضاء پر سجدہ کیا جاتا ہے) جیسے کہ پیشانی، گھٹنے وغیرہ، ان پر کافور یا خوشبو لگانا سنت ہے، البتہ کفن پر خوشبو نہ لگائے، خیال رکھے کہ خوشبو رنگین نہ ہو: ويوضع الحنوط في رأسه ولحيته وسائر جسده، كذا في المحيط، ولا بأس بسائر الطيب غير الزعفران والورس في حق الرجل، كذا في الإيضاح. ويوضع الكافور على جبهته وأنفه ويديه وركبتيه وقدميه. (عالمگیری ۱/ ۱۲۹)[۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) مسئلے کی تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیں سابقہ فتویٰ بہ عنوان: ''زمزم کے پانی سے تر کیے ہوئے کپڑے میں کفن دینا جائز ہے؟''۔

[۲] الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۱۶۱، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثالث في التكفين، ط: دار الفكر.

(قوله وجعل الحنوط على رأسه ولحيته)؛ لأن التطيب سنة، وذكر الرازي أن هذا الجعل مستحب، والحنوط عطر مركب من أشياء طيبة، ولا بأس بسائر الطيب غير الزعفران، والورس، اعتبارا بالحياة، وقد ورد النهي عن المزعفر للرجال، وبهذا يعلم جهل من يجعل الزعفران في الكفن عند رأس الميت في زماننا. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق - زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بـ'ابن نجيم المصري' (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۱۸۶، كتاب الجنائز، غسل الميت، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۹۷، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر - بيروت☆ الهداية: ۱/ ۸۹، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل في الغسل، ط: دار إحياء التراث العربي) =

[۸] کفن پہنانے کے بعد لوبان یا اگربتی کی دُھونی دینا

۱۱۰۷- سوال: میت کو کفن پہنانے کے بعد اس کے سامنے لوبان یا اگربتی کی دُھونی دینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر کوئی دُھونی دیتا ہے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

کفن کو لوبان اور اگربتی کی دھونی دے کر پہنانا مستحب ہے، کفن پہنانے کے بعد دھونی نہ دی جائے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= ويوضع الكافور على مساجده، وأرادوا بالمساجد: الجبهة، واليدين، والركبتين، تشريفا للميت؛ لأن المغتسل في حالة الحياة قد يتطيب، ولا بأس بسائر الطيب في الحنوط، غير الزعفران، والورس في حق الرجل، ولا بأس به في حق المرأة. (تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ):۱/ ۲۴۳، كتاب الجنائز، باب الصلاة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع- علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م:۵۸۷هـ):۱/ ۳۰۸، كتاب الصلاة، بيان وجوب التكفين، فصل كيفية التكفين، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) وجميع ما يجمر فيه الميت ثلاث: عند خروج روحه لإزالة الرائحة الكريهة وعند غسله وعند تكفينه، ولا يجمر خلفه ولا في القبر؛ لما روي: لا تتبعوا الجنازة بصوت ولا نار. (فتح القدير- كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بـ'ابن الهمام' (م:۸۶۱هـ):۲/ ۱۰۸، باب الجنائز، فصل في الغسل، ط: دار الفكر ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱هـ)، ص:۵۷۹، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

م: (وتجمر الأكفان قبل أن يدرج فيها الميت وترا) ش: أي قبل أن يدرج الميت في الأكفان، ... يعني مرة أو ثلاثا أو خمسا، ولا يزاد على ذلك، ... والتجمير هو إحراق عود في المجمرة لتبخر به الأكفان، وفي "المجتبى" قيل: يحتمل بالتجمير جمع الأكفان وترا هاهنا قبل الغسل، يقال أجمر كذا إذا جمعه، والأول هو الأظهر.

وفي "الذخيرة" للمالكية: وللتجمير أربع أحوال عند خروج روحه كرهه مالك، واستحسنه ابن حبيب، وعند غسله يستحب بقطع الروائح كتجمير ثيابه، وهو متفق عليه، وخلف الجنازة متفق على كراهته، وقال- عَلَيْهِ السَّلَامُ-: لا تتبع الجنازة بصوت ولا نار، رواه أبو داود، ولما فيه من التشاؤم بالنار. وفي "المبسوط" يكره الإجمار في القبر واتباع الميت بها. قال النخعي: أكره أن يكون آخر زاده من الدنيا نارا. (البناية شرح الهداية - بدر الدين العيني (م:۸۵۵هـ): ۳/ ۲۰۴، باب الجنائز، فصل في التكفين، ما يجزئ في الكفن بالنسبة للمرأة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

وتجمر الأكفان قبل أن يدرج الميت فيها وترا واحدة أو ثلاثا أو خمسا، ولا يزاد على ذلك، كذا في العيني=

[۹] جن ٹکڑوں سے کفن میں گرہ لگائی گئی ہو، ان کا بعد میں کیا کیا جائے؟

۱۱۰۸- سوال: میت کو قبر میں لٹا کر اس کے کفن کے بند کو کھول دیا جاتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ بند کے اس ٹکڑے کو کفن کے ساتھ رکھنا چاہیے یا نکال دیا جائے؟ اس بند کے ٹکڑوں کو قبر کے علاوہ کسی جگہ ڈال دینے میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

دونوں طریقے درست ہیں، اگر بند کے ٹکڑے بڑے اور کشادہ ہوں، [جنھیں بعد میں کام میں لایا جاسکتا ہو] تو ان کو نکال دینا ضروری ہے، ورنہ اسراف اور فضول خرچی کی وجہ سے گناہ ہوگا، ہاں اگر چھوٹے ہوں، تو نکالنا لازم نہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= شرح الكنز، وجميع ما يجمر فيه الميت ثلاثة مواضع عند خروج روحه لإزالة الرائحة الكريهة وعند غسله وعند تكفينه ولا يجمر خلفه، كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۶۱، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثالث في التكفين، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) وقال: ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝﴾ [۱۷-الإسراء: ۲۷] وقال في صفة الذين سماهم عباد الرحمن ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝﴾ [۲۵-الفرقان: ۶۷] فاشتملت هذه الآيات كلها على الأمر بالاقتصاد، والنهي عن الإسراف وذلك موافق للنهي عن الإسراف في الأكل والشرب، لأن الله عز وجل يقول: ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝﴾ [۷-الأعراف: ۳۱] فإذا كان الإسراف في الأكل والشرب ممنوعا، وجب أن يكون الإسراف في الإنفاق ممنوعا. (شعب الإيمان - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۸/۳۸۸، الثاني والأربعون من شعب الإيمان وهو باب الاقتصاد في النفقة وتحريم أكل المال الباطل، ت: د. عبد العلي عبد الحميد حامد، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون مع الدار السلفية ببومباي بالهند)

عن قيس بن عباد قال: كان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم "يكرهون رفع الصوت عند ثلاث: عند القتال، وعند الجنائز وعند الذكر". (مصنف ابن ابی شیبہ:۹/ ۵۱۳، حدیث نمبر: ۳۳۴۲۰، ط: ریاض)

باب ما يتعلق بحمل الجنازة

[جنازہ کو اٹھانے کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ما یتعلق بحمل الجنازۃ

[جنازہ کو اٹھانے کا بیان]

[۱] جنازہ اٹھاتے وقت بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھنا

۱۱۰۹-سوال: میت کو کندھا دیتے وقت آواز کے ساتھ کلام پاک اور کلمۂ شہادت "أشهد أن لا إله إلا الله" پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

جنازہ کے پیچھے خاموشی کے ساتھ چلنا سنت ہے، کچھ پڑھنا ہو، تو دل میں پڑھے، بلند آواز سے پڑھنا مکروہ ہے۔[1] جنازہ کے پیچھے چلتے ہوئے، پڑھنے کے لیے کوئی خاص ذکر متعین نہیں ہے، ایسا اندیشہ ہو

---

(۱) عن قيس بن عباد قال: كان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم "يكرهون رفع الصوت عند ثلاث: عند القتال، وعند الجنائز وعند الذكر". (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار-أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵ھ): ۶/ ۵۱۳، رقم الحديث: ۳۳۴۲۰، كتاب الجهاد، رفع الصوت في الحرب، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد- الرياض ☆ السنن الكبرى-أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۴/ ۱۲۴، رقم الحديث: ۷۱۸۴، كتاب الجنائز، باب كراهية رفع الصوت في الجنائز والقدر الذي لا يكره منه، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية)

ويطيل الصمت إذا اتبع الجنازة ويكره رفع الصوت بالذكر لما روي عن قيس بن عبادة أنه قال: كان أصحاب رسول الله - صلى الله عليه وسلم - يكرهون رفع الصوت عند ثلاثة: عند القتال، وعند الجنازة، والذكر؛ ولأنه تشبه بأهل الكتاب فكان مكروها. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد =

کہ لوگ خاموشی کے ساتھ چلنے کے بجائے دنیوی باتوں میں مشغول ہو جائیں گے، تو ہلکی آواز سے کوئی بھی ذکر، درود شریف، یا قرآن شریف کی تلاوت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (عالم گیری)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] جنازے کو کندھا دیتے وقت بہ آواز بلند کلمۂ شہادت پڑھنا

۱۱۱۰- سوال: جنازہ کو کندھا پر لیتے وقت کلمۂ شہادت بہ آواز بلند پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

علمائے کرام نے فرمایا ہے کہ جنازہ کو لے کر چلتے وقت خاموش رہنا چاہیے، بلند آواز سے ذکر کرنا اور بلند آواز سے قرآن کریم پڑھنا مکروہ ہے۔ (البحر الرائق، عالمگیری صفحہ ۱۳۰ - مجمع الانہر جلد ۱ صفحہ ۱۸۲، شامی جلد ا صفحہ ۸۳۵)[۲] لہٰذا کلمۂ شہادت یا دوسرا کوئی ذکر آہستہ کرنا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

=الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۱/ ۳۱۰، كتاب الصلاة، صلاة الجنازة، فصل بيان عدد من يحمل الجنازة و كيفية حملها، ط: دار الكتب العلمية ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۰۷، كتاب الجنائز، فصل الأحق بالصلاة على الميت، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر)

[۱] وعلى متبعي الجنازة الصمت ويكره لهم رفع الصوت بالذكر وقراءة القرآن، كذا في شرح الطحاوي، فإن أراد أن يذكر الله يذكره في نفسه، كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۲، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، الفصل الرابع في حمل الجنازة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر)

[۲] قد تقدم تخريجه عن: الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۲، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، الفصل الرابع في حمل الجنازة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر.

راجع للتفصيل: مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۲/ ۵۵۱، كتاب الكراهية، فصل في المتفرقات، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۰۷، كتاب الجنائز، الصلاة على الميت في المسجد، ط: دار الكتاب الإسلامي.

''جنازہ اٹھاتے وقت بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھنا'' کے حواشی دیکھیں۔

[۳] شیعہ کو جنازہ میں کندھا دینے سے منع کرنا

۱۱۱۱- سوال: ہمارے یہاں رضاخانی مولویوں نے شیعہ اور ووہرا جماعت کے تعلق سے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی مسلمان کے جنازہ میں کندھا دینے کے لیے آئے، تو اسے برسرِ عام منع کر دیا جائے، تو اس طرح کندھا دینے سے شیعہ یا ووہرا کو، سب کے سامنے روکنا اور جھڑکنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

شیعہ ہو یا کوئی دوسرا، جب وہ جنازہ میں شریک ہو کر کندھا دیتا ہو، تو اس کو روکنا اخلاق کے خلاف ہے، اگر شیعہ مرتد وکافر بھی ہو، تو اس کی نجاست وناپاکی حکمی ہے، ظاہراً اس پر کوئی نجاست نہیں ہے۔ (۱) پھر عام لوگوں کے سامنے روکنے میں اس کی ذلت بھی ہے؛ لہٰذا ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا. (۹- التوبة: ۲۸)
قال الألوسي: "يا أيها الذين آمنوا إنما المشركون نجس" أخبر عنهم بالمصدر للمبالغة كأنهم عين النجاسة، أو المراد ذوو نجس لخبث بواطنهم وفساد عقائدهم أو لأن معهم الشرك الذي هو بمنزلة النجس أو لأنهم لا يتطهرون ولا يغتسلون ولا يجتنبون النجاسات فهي ملابسة لهم، ... وتخريج الآية على أحد الأوجه المذكورة هو الذي يقتضيه كلام أكثر الفقهاء حيث ذهبوا إلى أن أعيان المشركين طاهرة ولا فرق بين عبدة الأصنام وغيرهم، من أصناف الكفار في ذلك. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني - شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م: ۱۲۷۰ھ): ۵/ ۲۶۹، التوبة، الآية: ۱۸ تا ۳۳، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) عن أبي هريرة، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: المسلم من سلم الناس من لسانه ويده، والمؤمن من أمنه الناس على دمائهم وأموالهم. (سنن النسائي: ۲/ ۲۶۶، رقم الحديث: ۴۹۹۵، كتاب الإيمان و شرائعه، باب صفة المؤمن، ط: ديوبند)

نوٹ: اگر غیر مسلم کندھا دے، تو سرِ عام نہیں روکنا چاہیے، تاہم ایسی تدبیر اختیار کرنی چاہیے کہ وہ جنازہ کے قریب آ کر کندھا نہ دے سکے؛ کیوں کہ گرچہ وہ نجس نہیں ہے، لیکن بعض مومن کے جنازے میں ملائکہ شرکت کرتے ہیں، اس لیے اس ایسے وقت میں غیر مسلموں کی موجودگی نامناسب ہے۔ چناں چہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ - جو جسیم تھے - کے جنازے میں ملائکہ کی حاضری اور ان کا آپ کے جنازے کو اٹھانا ثابت ہے، تفصیل ملاحظہ کریں:
وهب بن جرير قال: أخبرنا أبي قال: سمعت الحسن قال: لما مات سعد بن معاذ. وكان رجلا جسيما جزلا. جعل=

[۴] کندھا دینے کے لیے جنازہ کے آگے چلنا اور صف بنانا

۱۱۱۲- سوال: میت کو کندھا دینے کیلئے لمبی لمبی قطاریں بن گئی ہوں، تو ایسی حالت میں کندھا دینے کے لیے جنازہ کے آگے چل سکتے ہیں؟ اور کیا جنازہ کے آگے کندھا دینے کے لیے صف بندی کی جا سکتی ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

احناف کے نزدیک جنازہ کے پیچھے چلنا مستحب ہے؛ لیکن آپ کی تحریر کے مطابق لوگ کندھا دینے کے طالب ہیں اور سب کے پیچھے چلنے سے تکلیف ہو سکتی ہے، تو اس صورت میں آگے صف بندی کی جا سکتی ہے، کوئی حرج نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

= المنافقون وهم يمشون خلف سريره يقولون: لم نر كاليوم رجلا أخف. وقالوا: أتدرون لم ذلك؟ ذاك لحكمه في بني قريظة. فذكر ذلك للنبي - صلى الله عليه وسلم - فقال: [والذي نفسي بيده لقد كانت الملائكة تحمل سريره].

... عن نافع قال: بلغني أنه شهد سعد بن معاذ سبعون ألف ملك لم ينزلوا إلى الأرض. [وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لقد ضم صاحبكم ضمة ثم فرج عنه] ... عن نافع عن ابن عمر قال: [قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لهذا العبد الصالح الذي تحرك له العرش وفتحت له أبواب السماوات وشهده سبعون ألفا من الملائكة لم ينزلوا الأرض قبل ذلك ولقد ضم ضمة ثم أفرج عنه]. يعني سعد بن معاذ. (الطبقات الكبرى- أبو عبد الله محمد بن سعد بن منيع الهاشمي بالولاء، البصري، البغدادي المعروف بـ'ابن سعد' (م:۲۳۰ھ): ۳/ ۳۲۸، طبقات البدريين من الأنصار، الطبقة الأولى من الأنصار، ۸۷- سعد بن معاذ، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۱) (والمشي خلفها) أي الجنازة (أفضل) من المشي قدامها، إلا أنه لا بأس أن يتقدمها نفيا للزحام... وقال أبو يوسف: رأيت أبا حنيفة - رحمه الله - يتقدم الجنازة - وهو راكب - ثم يقف حتى يؤتى بها، وهذا دليل على أنه لا بأس بالركوب؛ لكن كره عند أبي يوسف أن يتقدمها منقطعا عن القوم، وقال ابن مسعود - رضي الله تعالى عنه -: فضل المشي خلف الجنازة على أمامها كفضل المكتوبة على النافلة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م:۱۰۷۸ھ): ۱/ ۱۸۶، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنائز، سنن حمل الجنازة، ط: دار إحياء التراث العربي☆ حاشية الطحطاوي، ص: ۶۰۵، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۱۰، كتاب الصلاة، فصل بيان عدد من يحمل الجنازة وكيفية حملها، ط: دار الكتاب العلمية)

[۵] میّت کو کندھا دینے والے لوگوں کو کس طرح چلنا چاہیے؟

۱۱۱۳- سوال: میت کو کندھا دینے والے لوگوں کو کس طرح چلنا چاہیے؟ اور کم سے کم کتنے قدم تک چلے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

جنازہ اٹھانے والا اولاً میت کی دائیں جانب آگے کا حصہ اٹھا کر ۱۰/قدم چلے، پھر دائیں جانب پیچھے کے حصے میں، پھر بائیں جانب آگے کے حصے میں، پھر بائیں جانب پیچھے کے حصے میں کندھا دیتے ہوئے ۱۰/ قدم چلے، بھیڑ زیادہ ہو، تو جس قدر بھی میسر ہو، ۵-۶ قدم چلنا، جائز ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] میّت کو گاڑی سے قبرستان لے جانا

۱۱۱۴- سوال: قبرستان دور ہو، تو میّت کو بس، ٹیکسی، یا ٹرک میں لے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ اور لے جائیں تو کس طریقے سے لے جانا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

قبرستان دور ہو، اور اٹھانے والے آدمی موجود نہ ہوں، یا ہوں؛ لیکن اٹھانے میں تکلیف ہوتی ہو، تو

---

(۱) (وسن في حمل الجنازة أربعة) من الرجال... (وأن يبدأ) الحامل (فيضع مقدمها) أي مقدم الجنازة (على يمينه ثم) يضع (مؤخرها) على يمينه (ثم) يضع (مقدمها على يساره ثم مؤخرها) على يساره فيتم الحمل من الجوانب الأربع وينبغي أن يحملها من كل جانب عشر خطوات لقوله - عليه الصلاة والسلام - من حمل جنازة أربعين خطوة كفرت عنه أربعين كبيرة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر -عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ 'داماد آفندي' (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/۱۸۶-۱۸۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنائز، سنن حمل الجنازة، ط: دار إحياء التراث العربي☆بدائع الصنائع: ۱/۳۰۹، كتاب الصلاة، فصل بيان عدد من يحمل الجنازة، وكيفية حملها، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆تبيين الحقائق: ۱/۲۴۵، كتاب الصلاة، باب الجنائز، كيفية صلاة الجنازة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق -القاهرة)

(۲) ويكره حمله على ظهر دابة بلا عذر. (مراقي) ـــــــ قال الطحطاوي (م: ۱۲۳۱ھ): قوله: "بلا عذر" أما إذا كان عذر بأن كان المحل بعيدا يشق حمل الرجال له أو لم يكن الحامل إلا واحدا فحمله على ظهره فلا كراهة إذن. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۶۰۳، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية -بيروت)

گاڑی وغیرہ میں میت کو لے جانا جائز ہے۔[۲۱]

البتہ گاڑی کو زیادہ تیز چلا کر نہ لے جائیں۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) (ویسرعوا به) أي بالميت (بلا خبب) بفتحتين وهو أول عدو الفرس وحد التعجيل المسنون أن لا يضطرب الميت على الجنازة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م:١٠٧٨ھ):١/١٨٦، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنائز، سنن حمل الجنازة، ط: دار إحياء التراث العربي☆رد المحتار على الدر المختار: ٢/٢٣٢، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في حمل الميت، ط: دار الفكر-بيروت)

عن علی ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: للمسلم على المسلم ست بالمعروف. يسلم عليه إذا لقيه، ويجيبه إذا دعاه، ويشمته إذا عطس، ويعوده إذا مرض، ويتبع جنازته إذا مات، ويحب له ما يحب لنفسه.

(ترمذی شریف: ۲/ ۱۰۲، حدیث نمبر: ۲۷۳۶، ط: دیوبند)

باب صلاة الجنائز

[نماز جنازہ کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب صلاة الجنازة

[نماز جنازہ کا بیان]

[۱] فرض نماز کے وقت جنازہ تیار ہو، تو پہلے کون سی نماز پڑھی جائے؟

۱۱۱۵- سوال: اذان کے آدھے گھنٹے کے بعد جماعت کھڑی ہوتی ہے، اس عرصہ میں اگر کوئی جنازہ آجائے اور لوگ بھی حاضر ہوں، تو پہلے جنازہ کی نماز پڑھنی چاہیے، یا جماعت جلدی کھڑی کر دینی چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

سب سے پہلے فرض نماز ادا کی جائے گی، اس کے بعد جنازہ کی نماز پڑھی جائے گی۔ [1] اور اگر عید کی

(۱) ولو حضرت الجنازة بعد غروب الشمس، يبدؤون بالمغرب، ثم بالجنازة؛ لما روي عن أبي برزة الأسلمي أنه أتي بجنازة بعدما غربت الشمس ووضعت على مقبرة بالبصرة، فأمر المؤذن فأذن، وصلى المغرب ثم صلى على الجنازة، ولأن صلاة المغرب فرض عين، وصلاة الجنازة فرض كفاية، فتكون المغرب آكد، والبداية بآكد الفرضين أولى؛ ولأن تأخير المغرب مكروه، وتأخير صلاة الجنازة لا بأس به.

وروى الحسن بن زياد رحمه الله في "المجرد": أنه يبدأ بأيهما شاء؛ لأن مبنى صلاة الجنازة على المسارعة، قال عليه السلام: "ثلاث لا يؤخرن" وذكر من جملتها الصلاة على الجنازة، ومبنى المغرب أيضاً على المسارعة فاستويا فيبدأ بأيهما شاء. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ): ۲/ ۲۰۲، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

نماز کا وقت ہو، تو پہلے عید کی واجب نماز، پھر جنازے کی نماز ادا کی جائے گی۔ (شامی: ۱/ ۸۳۳)[1]

البتہ اگر سب نمازی حاضری ہوں، یا پہلے سے اطلاع کردی جائے، تو جماعت کچھ پہلے بھی کھڑی کی جاسکتی ہے، مقررہ وقت پر پڑھنا ضروری نہیں، وقت کی تعیین تو مقتدی حضرات کی سہولت کے لیے ہوتی ہے؛ اور اس صورت میں سہولت اسی میں ہے کہ جب سارے لوگ جمع ہو جائیں، تو نماز شروع کردی جائے؛ لیکن اس کی اطلاع نمازیوں کو پہلے کردینی چاہیے، تاکہ دوسرے دنوں میں جو وقت مقرر تھا، اس سے پہلے جماعت کھڑی کرنے میں ان کی جماعت ترک نہ ہو۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] صبحِ صادق، طلوعِ آفتاب اور نمازِ عصر کے بعد جنازہ کی نماز پڑھنا کیسا ہے؟

۱۱۱۶- سوال: صبحِ صادق کے وقت نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح بعد نمازِ فجر، طلوعِ آفتاب کے وقت اور نمازِ عصر کے بعد جنازہ کی نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلّیاً:

تین وقتوں میں کوئی بھی نماز ہو- فرض، نفل یا جنازہ کی- پڑھنا جائز نہیں ہے: (۱) طلوعِ آفتاب کے وقت۔ (۲) زوال کے وقت، جب کہ آفتاب سر پر ہو۔ (۳) غروبِ آفتاب کے وقت۔[2]

---

[۱] (وتقدم) صلاتها (على صلاة الجنازة إذا اجتمعا) لأنه واجب عينا والجنازة كفاية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۶۷، كتاب الصلاة، باب العيدين، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۰۶، كتاب الجنائز، الصلاة على الميت في المسجد، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) عقبة بن عامر الجهني، يقول: ثلاث ساعات كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينهانا أن نصلي فيهن، أو أن نقبر فيهن موتانا: حين تطلع الشمس بازغة حتى ترتفع، وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل الشمس، وحين تضيف الشمس للغروب حتى تغرب. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۷۶، رقم الحديث: ۲۹۳- (۸۳۱)، كتاب فضائل القران وما يتعلق به، باب الأوقات التي نهي عن الصلاة فيها، قبيل كتاب الجمعة، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

"لا تجوز الصلاة عند طلوع الشمس، ولا عند قيامها في الظهيرة، ولا عند غروبها" لحديث عقبة بن عامر رضي الله عنه قال: ثلاثة أوقات نهانا رسول الله عليه الصلاة والسلام أن نصلي فيها وأن نقبر فيها موتانا عند طلوع الشمس حتى ترتفع وعند زوالها حتى تزول وحين تضيف للغروب حتى تغرب، والمراد بقوله وأن نقبر صلاة الجنازة؛ لأن الدفن غير مكروه، . . . قال رضي الله عنه: والمراد بالنفي المذكور في صلاة الجنازة وسجدة التلاوة الكراهة؛ حتى لو صلاها فيه، أو تلا فيه آية السجدة، فسجدها جاز؛ لأنها أديت ناقصة كما وجبت، إذ الوجوب بحضور الجنازة والتلاوة.________ "ويكره أن يتنفل بعد الفجر حتى تطلع الشمس، وبعد العصر =

صبحِ صادق کے بعد سے، طلوعِ آفتاب سے پہلے تک، اور عصر کے بعد جب تک سورج کی روشنی میں تغیر اور فرق نہ ہوا ہو، ان (اوقات) میں قضا نماز، نمازِ جنازہ اور سجدۂ تلاوت ادا کرنا جائز ہے، اسی طرح کبھی آفتاب کی روشنی میں فرق آ گیا ہو اور اُسی وقت میت اور کفن و دفن کی تیاری ہو، تو ایسی حالت میں بھی نمازِ جنازہ ادا کرنا صحیح ہے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] نمازِ جنازہ کے بعد، جنازہ اٹھانے سے قبل، دعا مانگنا

۱۱۱۷- سوال: نماز جنازہ کے بعد میت کے حق میں، اسی جگہ جنازہ اٹھانے سے قبل دعا مانگنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ احادیث مبارکہ سے ثابت نہیں ہے، اور نماز جنازہ خود دعاء ہے، اب دعا کی کیا حاجت ہے؟ ہاں تدفین کے بعد دعاء کی گنجائش ہے۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= حتى تغرب " لما روي أنه عليه الصلاة والسلام نهى عن ذلك، " ولا بأس بأن يصلي في هذين الوقتين الفوائت ويسجد للتلاوة ويصلي على الجنازة". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳هـ): ۱/ ۴۲، كتاب الصلاة، فصل في الأوقات التي تكره فيها الصلاة، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي -بيروت ☆مراقي الفلاح: ۷۵-۷۶، كتاب الصلاة، فصل في الأوقات المكروهة، ط: المكتبة العصرية)

(۱) ثلاث ساعات لا تجوز فيها المكتوبة، ولا صلاة الجنازة، ولا سجدة التلاوة، إذا طلعت الشمس حتى ترتفع، وعند الانتصاف إلى أن تزول، وعند احمرارها إلى أن يغيب، إلا عصر يومه ذلك، فإنه يجوز أداؤه عند الغروب. هكذا في فتاوى قاضي خان، قال الشيخ الإمام أبو بكر محمد بن الفضل ما دام الإنسان يقدر على النظر إلى قرص الشمس فهي في الطلوع. كذا في الخلاصة. هذا إذا وجبت صلاة الجنازة وسجدة التلاوة في وقت مباح وأخرتا إلى هذا الوقت، فإنه لا يجوز قطعا أما لو وجبتا في هذا الوقت وأديتا فيه جاز؛ لأنها أديت ناقصة كما وجبت. كذا في السراج الوهاج وهكذا في الكافي والتبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۲، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثالث: في بيان الأوقات التي لا تجوز فيها الصلاة وتكره فيها، ط: دار الفكر ☆بدائع الصنائع: ۱/ ۳۱۶، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يكره فيها وصلاة الجنازة، ط: دار الكتب العلمية ☆ تبيين الحقائق: ۱/ ۸۵، كتاب الصلاة، مواقيت الصلاة، الأوقات التي يكره فيها الصلاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق)

(۲) ولا يدعو للميت بعد صلاة الجنازة لأنه يشبه الزيادة في صلاة الجنازة. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة=

[۴] خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنا

۱۱۱۸- سوال: خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے، یا صحابہ کرام ؓ نے ایسی کوئی جنازہ کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ اسی طرح رئیس المنافقین کی نماز جنازہ پڑھی تھی یا نہیں یا صرف دعا کروائی تھی؟

الجواب حامداً ومصلياً:

خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ (۱) رئیس المنافقین کی نماز جنازہ رسول اللہ

= المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۳/ ۱۲۱۳، كتاب الجنائز، المشي بالجنازة والصلاة عليها، ط: دار الفكر - بيروت)

ولا يقوم الرجل بالدعاء بعد صلاة الجنازة، لأنه قد دعا مرة، لأن أكثر صلاة الجنازة الدعاء. (المحيط البرهاني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۲/ ۲۰۵، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

وجلوس ساعة بعد دفنه لدعاء وقراءة بقدر ما ينحر الجزور ويفرق لحمه. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: وجلوس إلخ) لما في سنن أبي داود "كان النبي - صلى الله عليه وسلم - إذا فرغ من دفن الميت وقف على قبره، وقال: استغفروا لأخيكم، واسألوا الله له التثبيت، فإنه الآن يسأل" وكان ابن عمر يستحب أن يقرأ على القبر بعد الدفن أول سورة البقرة وخاتمتها. وروي أن عمرو بن العاص قال وهو في سياق الموت: إذا أنا مت فلا تصحبني نائحة ولا نار، فإذا دفنتموني فشنوا علي التراب شنا، ثم أقيموا حول قبري قدر ما ينحر جزور، ويقسم لحمها حتى أستأنس بكم وأنظر ماذا أراجع رسل ربي، جوهرة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۷، باب صلاة الجنائز، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر)

(۱) (من قتل نفسه) ولو (عمدا يغسل ويصلى عليه) به يفتى، وإن كان أعظم وزرا من قاتل غيره. ورجح الكمال قول الثاني بما في مسلم: أنه - عليه الصلاة والسلام - أتي برجل قتل نفسه فلم يصل عليه. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله به يفتى) لأنه فاسق غير ساع في الأرض بالفساد، وإن كان باغيا على نفسه كسائر فساق المسلمين، زيلعي (قوله: ورجح الكمال قول الثاني إلخ) أي قول أبي يوسف: إنه يغسل، ولا يصلى عليه، إسماعيل عن خزانة الفتاوى. وفي القهستاني والكفاية وغيرهما عن الإمام السعدي: الأصح عندي أنه لا يصلى عليه؛ لأنه لا توبة له. قال في البحر: فقد اختلف التصحيح، لكن تأيد الثاني بالحديث. اهـ.

أقول: قد يقال: لا دلالة في الحديث على ذلك لأنه ليس فيه سوى "أنه - عليه الصلاة والسلام - لم يصل عليه" فالظاهر أنه امتنع زجرا لغيره عن مثل هذا الفعل، كما امتنع عن الصلاة على المديون، ولا يلزم من ذلك عدم صلاة أحد عليه من الصحابة؛ إذ لا مساواة بين صلاته وصلاة غيره. قال تعالى {إن صلاتك سكن لهم} [التوبة: ۱۰۳] =

صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی تھی، بعد میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی نماز جنازہ پڑھانے سے منع فرمادیا۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

[۵] راستہ سے جنازہ گزرنے پر کندھا دیا تو قبرستان تک جانا اور نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہے؟

۱۱۱۹- سوال: (۱) جنازہ اگر ہماری دوکان کے پاس سے گزرے، تو جنازہ کو کندھا دینے کے لیے جانا کیسا ہے؟ بہت سے دوکان داروں کو دیکھا کہ دوکان کھلی رکھ کر کاندھا دینے کے لیے جاتے ہیں، تو کیا یہ فعل صحیح ہے؟

(۲) لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب جنازہ کو کندھا دیا، تو قبرستان تک جانا اور جنازہ کی نماز پڑھنا، ضروری ہے، اس بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

(۱-۲) ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چند حقوق ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے جنازہ میں شامل ہو؛[۲] لیکن یہ فرض کفایہ ہے، اگر مسلمانوں میں سے کسی نے اس کو ادا کرلیا، تو سب کی طرف

=ثم رأيت في شرح المنية بحثا كذلك. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۱۲-۲۱۱، باب صلاة الجنازة، مطلب هل يسقط فرض الكفاية بفعل الصبي؟ط: دار الفكر)

(۱) عن ابن عباس، عن عمر بن الخطاب رضي الله عنهم، أنه قال: لما مات عبد الله بن أبي ابن سلول، دعي له رسول الله صلى الله عليه وسلم ليصلي عليه، فلما قام رسول الله صلى الله عليه وسلم وثبت إليه، فقلت: يا رسول الله، أتصلي على ابن أبي وقد قال يوم كذا وكذا: كذا وكذا؟ أعدد عليه قوله، فتبسم رسول الله صلى الله عليه وسلم، وقال: أخر عني يا عمر، فلما أكثرت عليه، قال: إني خيرت فاخترت، لو أعلم أني إن زدت على السبعين يغفر له لزدت عليها، قال: فصلى عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم انصرف، فلم يمكث إلا يسيرا، حتى نزلت الآيتان من براءة: {ولا تصل على أحد منهم مات أبدا} [التوبة: ۸۴] إلى قوله {وهم فاسقون} [التوبة: ۸۴] قال: فعجبت بعد من جرأتي على رسول الله صلى الله عليه وسلم يومئذ، والله ورسوله أعلم. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۸۲، رقم الحديث: ۱۳۶۶، كتاب الجنائز، باب ما يكره من الصلاة على المنافقين، ط: ديوبند)

(۲) عن علي، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: للمسلم على المسلم ست بالمعروف، يسلم عليه إذا لقيه، ويجيبه إذا دعاه، ويشمته إذا عطس، ويعوده إذا مرض، ويتبع جنازته إذا مات، ويحب له ما يحب لنفسه. (سنن الترمذي: ۲/ ۱۰۲، رقم الحديث: ۲۷۳۶، أبواب الأدب، باب ما جاء في تشميت العاطس، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

سے کافی ہوجائے گا، اگر کسی نے بھی اس حق کو ادا نہیں کیا، تو سب گنہ گار ہوں گے؛[۱] اس لیے دوکان کے پاس سے جب جنازہ گزرے، تو دوکان میں رہنے والوں کے لیے مناسب یہ ہے کہ جنازہ کے ساتھ جائے اور نماز پڑھے، اگر ممکن ہو، تو تدفین میں بھی شریک ہوجائے؛[۲] لیکن اگر کوئی شخص صرف کاندھا دے کر واپس ہوجائے، تو اس کو کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] بے نمازی کی نماز جنازہ

۱۱۲۰- سوال: ہماری برادری میں ایک رشتہ دار ہیں، جن کو میں بہت قریب سے جانتا ہوں، تقریبا ۱۵-۲۰ سال سے سلام ودعا ہے، اس دوران میں نے ان کو کبھی بھی نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا، جب بھی ان کو نماز کی دعوت دیتا ہوں، تو کہتے ہیں: مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو، میری فکر نہ کرو، وغیرہ۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر ایسے آدمی کا انتقال ہوجائے، تو اس کی نماز جنازہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

ایسا آدمی سخت گنہ گار ہوگا۔[۳]

---

(۱) وكذا غسل الميت والصلاة عليه والدفن كل ذلك فرض كفاية إذا قام به البعض سقط عن الباقين، وإن امتنعوا من ذلك حتى ضاع ميت بين قوم مع علمهم بحاله كانوا مشتركين في المأثم. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۳/ ۲۶۳، كتاب الكسب، ط: دار المعرفة-بيروت☆بدائع الصنائع: ۱/ ۳۱۱، كتاب الصلاة، فصل بيان فريضة صلاة الجنازة وكيفية فرضها، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) الاتباع أفضل من النوافل لو لقرابة أو جوار أو فيه صلاح معروف. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: الاتباع أفضل) أي اتباع الجنازة لأنه بر الحي والميت، فالثواب المترتب عليه أكثر ط (قوله أو جوار) سيأتي في باب الوصية للأقارب وغيرهم أن الجار من لصق به. وقالا: من يسكن في محلته ويجمعهم مسجد المحلة، وهو استحسان. وقال الشافعي: الجار إلى أربعين دارا من كل جانب. اهـ.

قلت: والصحيح قول الإمام كما سيأتي هناك إن شاء الله - تعالى، وهو يقيد هنا بالملاصق أيضا؟ الظاهر نعم ما لم يوجد دليل الإطلاق. وقد يقال: كلام الموصي يحمل على العرف. والجار عرفا الملاصق أو من يسكن في المحلة فتصرف إليه الوصية بخلافه هنا فيكون حده إلى الأربعين كما في الحديث، والله أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۹، باب صلاة الجنازة، فروع في الجنائز، ط: دار الفكر-بيروت)

(۳) عن أبي سفيان، قال: سمعت جابرا، يقول: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إن بين الرجل وبين الشرك والكفر ترك الصلاة. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۶۱، رقم الحديث: ۱۳۴-(۸۲)، كتاب الإيمان، باب بيان إطلاق اسم الكفر على من ترك الصلاة، ط: البدر- ديوبند)

لیکن اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ (درمختار مع شامی، جلد:۲ صفحہ:۲۱۱)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] جوتے چپل پر کھڑے رہ کر جنازے کی نماز پڑھنا

۱۱۲۱- سوال: جوتے چپل وغیرہ کو اتار کر، اسی پر کھڑے رہ کر، جنازے کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جوتے وغیرہ پاک ہوں، تو ان پر کھڑے رہ کر نماز پڑھنے کی اجازت وگنجائش ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] غسل ونماز جنازہ کے بغیر دفن کیے گئے بچے کے سلسلے میں شریعت کا حکم

۱۱۲۲- سوال: ایک بچے کی ولادت ہوئی، ۲۴ر گھنٹے زندہ رہا، پھر وفات ہوئی، بغیر غسل دیے اور بغیر جنازہ کی نماز کے اسے دفن کر دیا گیا، اس معاملہ میں شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟ (احمد میاں فقیر)

---

[۱] عن واثلة بن الأسقع، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تكفروا أهل قبلتكم وإن عملوا الكبائر، وصلوا مع كل إمام، وجاهدوا مع كل أمير، وصلوا على كل ميت. (سنن الدارقطني-أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي بن مسعود بن النعمان بن دينار البغدادي الدارقطني (م:۳۸۵ھ): ۲/ ۴۰۳-۴۰۴، رقم الحديث: ۱۷٦٦-۱۷٦۹، كتاب العيدين، باب صفة من تجوز الصلاة معه والصلاة عليه، ت: شعيب الارنؤوط، حسن عبد المنعم شلبي، عبد اللطيف حرز الله، أحمد برهوم، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت☆السنن الكبرى- أبو بكر البيهقي (م:۴۵۸ھ): ۴/ ۲۹، رقم الحديث: ٦۸۳۲، جماع أبواب الشهيد ومن يصلى عليه ويغسل، باب الصلاة على من قتل نفسه غير مستحل لقتلها، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

دیکھیے: رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۰۷، باب صلاة الجنازة، مطلب في صلاة الجنازة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) وفي القنية الطهارة من النجاسة في الثوب والبدن والمكان وستر العورة شرط في حق الإمام والميت جميعا، وقد قدمنا في باب شروط الصلاة أنه لو قام على النجاسة، وفي رجليه نعلان لم يجز، ولو افترش نعليه وقام عليهما جازت، وبهذا يعلم ما يفعل في زماننا من القيام على النعلين في صلاة الجنازة لكن لا بد من طهارة النعلين كما لا يخفى. (البحر الرائق: ۲/ ۱۹۳، كتاب الجنائز، شروط صلاة الجنازة، ط: دار الكتاب الإسلامي☆حاشية الطحطاوي، ص: ۵۸۲، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل الصلاة عليه، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ٦۲، كتاب الصلاة، الباب الثالث في شروط الصلاة، الفصل الثاني في طهارة ما يستر به العورة وغيره، ط: دار الفكر- بيروت)

الجواب حامداومصليا:

مسلمان کے گھر زندہ پیدا ہونے والے ہر بچے کی وفات پر غسل دینا، کفن پہنانا اور جنازہ کی نماز پڑھنا فرض کفایہ ہے۔ ہر مسلمان کی نماز جنازہ فرض کفایہ ہے، چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۰۴ ☆ شامی ج ۱ ص ۸۱۱)[1]

فرض کفایہ کا مطلب ہے کہ بستی کے کچھ لوگ جنازہ کی نماز پڑھ لیں گے، تو سب کی جانب سے فرضیت ساقط ہو جائے گی، اگر کوئی نہ پڑھے، تو سب گنہ گار ہوں گے۔[2]

صورت مسئولہ میں اگر اندازہ یہ ہو کہ نعش پھول پھٹ کر گلی، سڑی نہیں ہے، تو جنازہ کی نماز قبر پر پڑھ سکتے ہیں، لاش کے پھولنے اور پھٹنے کی مقدار، موسم، آب وہوا اور زمین کی نرمی وسختی کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے، علماء نے ۳/دن سے لے کر ایک مہینہ تک کی مدت لکھی ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] ومن استهل بعد الولادة سمي وغسل وصلي عليه . . . والاستهلال ما يعرف به حياة الولد من صوت أو حركة، ولو شهدت القابلة أو الأم على استهلال الولد، فإن قولهما مقبول في جواز الصلاة عليه، هكذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ١/ ١٥٩، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر)

ويصلى على كل مسلم مات بعد الولادة صغيرا كان أو كبيرا ذكرا كان أو أنثى حرا كان أو عبدا. (المصدر السابق: ١/ ١٦٣، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلاة على الميت)

(٢) (والصلاة عليه) . . . (فرض كفاية) بالإجماع، فيكفر منكرها لأنه أنكر الإجماع، قنية (كدفنه) وغسله وتجهيزه؛ فإنها فرض كفاية. (الدر المختار مع رد المحتار: ٢/ ٢٠٧، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر - بيروت)

(الصلاة عليه فرض كفاية) بالإجماع، حيث يسقط عن الآخرين بأداء البعض، وإلا يأثم الكل. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ١٠٧٨هـ): ١/ ١٨٢، كتاب الصلاة، فصل في الصلاة على الميت، ط: دار إحياء التراث العربي)

الصلاة على الجنازة فرض كفاية، إذا قام به البعض واحدا كان أو جماعة، ذكرا كان أو أنثى، سقط عن الباقين، وإذا ترك الكل أثموا، هكذا في التتارخانية. (الفتاوى الهندية: ١/ ١٦٢، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلاة على الميت)

(٣) (وإن دفن) وأهيل عليه التراب (بغير صلاة) أو بها بلا غسل أو ممن لا ولاية له (صلي على قبره) استحسانا، (ما لم يغلب على الظن تفسخه) من غير تقدير، هو الأصح. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله هو الأصح)؛ لأنه يختلف باختلاف الأوقات حرا وبردا، والميت سمنا وهزالا، والأمكنة بحر، وقيل: يقدر بثلاثة أيام =

[۹] عیدگاہ میں جنازہ کی نماز، اور جنازہ گاہ میں عید کی نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

۱۱۲۳- سوال: ہمارے گاؤں میں عیدگاہ موجود ہے، کیا وہاں [یعنی عیدگاہ میں] جنازہ کی نماز پڑھ سکتے ہیں؟ تحریر فرمائیں، اور جنازہ کی نماز پڑھنے کے لیے جنازہ گاہ موجود ہے، تو کیا جنازہ گاہ میں عید کی نماز پڑھ سکتے ہیں؟ بالتفصیل جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداومصليا:

جو جگہ جنازہ کی نماز پڑھنے کے لیے بنائی گئی ہے، اس میں عید کی نماز پڑھنی جائز ہے، البتہ جگہ کا پاک ہونا ضروری ہے، نیز قریب میں قبریں نہ ہوں۔[1]

=وقيل عشرة، وقيل شهر، عن الحموي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۲۴، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، قبيل: مطلب في كراهة صلاة الجنازة في المسجد، ط: دار الفكر-بيروت)

(قال) وإن دفن قبل الصلاة عليها، صلي في القبر عليها، إنما لا يخرج من القبر؛ لأنه قد سلم إلى الله تعالى، وخرج من أيديهم. جاء عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قال: القبر أول منزل من منازل الآخرة. ولكنهم لم يؤدوا حقه بالصلاة عليه، والصلاة على القبر تتأتى، فقد فعله رسول الله - صلى الله عليه وسلم - فلهذا يصلى على القبر ما لم يعلم أنه تفرق، لأن المشروع الصلاة على الميت، لا على أعضائه.

وفي الأمالي عن أبي يوسف - رحمه الله تعالى - قال: يصلى عليه إلى ثلاثة أيام، وهكذا ذكره ابن رستم عن محمد رحمهما الله تعالى؛ لأن الصحابة - رضي الله عنهم - كانوا يصلون على رسول الله - صلى الله عليه وسلم - إلى ثلاثة أيام، والصحيح أن هذا ليس بتقدير لازم؛ لأنه يختلف باختلاف الأوقات، في الحر، والبرد، وباختلاف الأمكنة، وباختلاف حال الميت، في السمن، والهزال، والمعتبر فيه أكبر الرأي. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۲/ ۶۹، كتاب الصلاة، باب غسل الميت، دفن الميت قبل الصلاة عليه، ط: دار المعرفة-بيروت)

(۱) عن أبي مرثد الغنوي، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تجلسوا على القبور، ولا تصلوا إليها. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۱۲، رقم الحديث: ۹۷-۹۷۲، كتاب الجنائز، باب النهي عن تجصيص القبر والبناء عليه، ط: البدر-ديوبند)

وفي القهستاني: لا تكره الصلاة في جهة قبر إلا إذا كان بين يديه، بحيث لو صلى صلاة الخاشعين، وقع بصره عليه، كما في جنائز المضمرات. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۵۴، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، فروع اشتمال الصلاة على الصماء والاعتجار والتلثم والتنخم وكل عمل قليل بلا عذر، ط: دار الفكر-بيروت)

اسی طرح عیدگاہ میں بھی جنازہ کی نماز پڑھنی جائز ہے۔ (۱)

اسی طرح جنازہ کی نماز، کسی کے مکان میں یا عام راہ گذر پر بھی پڑھنی جائز ہے۔ (۲)

البتہ عید کی نماز عیدگاہ میں پڑھنا مستحب ہے۔ (۳)

---

(۱) "وتكره الصلاة عليه في مسجد الجماعة وهو" أي الميت فيه. (مراقي) ـــــــ قال الطحطاوي (م: ۱۲۳۱هـ): وقيد بمسجد الجماعة؛ لأنها لا تكره في مسجد، أعد لها، وكذا في مدرسة ومصلى عيد؛ لأنه ليس لها حكم المسجد في الأصح إلا في جواز الاقتداء، وإن لم تتصل الصفوف، كذا في ابن أمير حاج والحلبي. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح -أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي ص: ۵۹۵، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) کسی خاص آدمی کے مکان میں اس کی اجازت کے بغیر جنازہ کی نماز پڑھنا، یا شاہراہ عام پر جنازہ کی نماز پڑھنا عام کتب فقہ و فتاویٰ کی صراحت کے مطابق مکروہ ہے، یعنی اگر ایسا کیا جائے تو نماز جنازہ کا وجوب ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، تاہم یہ عمل (کسی کے مکان میں یا شاہراہ عام پر جنازہ کی نماز پڑھنا) مکروہ ہوگا، ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

وتكره أيضا في الشارع وأرض الناس، كما في الفتاوى الهندية عن المضمرات. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۲۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة صلاة الجنازة في المسجد، ط: دار الفكر)

"تنبيه" تكره صلاة الجنائز في الشارع وأراضي الناس" (مراقي) ـــــــ قال الطحطاوي: قوله: "تكره الجنائز الخ" لشغل حق العامة في الأول، وحق المالك في الثاني. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ص: ۵۹۶، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت، لبنان)

تكره في الشارع وأراضي الناس، كذا في المضمرات، أما المسجد الذي بني لأجل صلاة الجنازة، فلا تكره فيه، كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۱۶۵، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلاة على الميت، ط: دار الفكر)

(۳) (والخروج إليها) أي الجبانة لصلاة العيد (سنة وإن وسعهم المسجد الجامع) هو الصحيح. (الدر المختار) قال ابن عابدين: (قوله: هو الصحيح) قال في الظهيرية. وقال بعضهم: ليس بسنة وتعارف الناس ذلك لضيق المسجد وكثرة الزحام والصحيح هو الأول. اهـ. ـــــــ وفي الخلاصة والخانية: السنة أن يخرج الإمام إلى الجبانة، ويستخلف غيره ليصلي في المصر بالضعفاء بناء على أن صلاة العيدين في موضعين جائزة بالاتفاق، وإن لم يستخلف فله ذلك. اهـ. نوح. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۶۹، كتاب الصلاة، باب العيدين، مطلب يطلق المستحب على السنة وبالعكس، ط: دار الفكر)

کوئی عذر مثلاً بارش وغیرہ ہو، تو جامع مسجد میں پڑھنا مستحب ہے۔ (طحطاوی: ۲۹۰)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

[۱۰] نماز جنازہ میں بجائے چار کے تین تکبیر کہنا

۱۱۲۴- سوال: جنازہ کی نماز میں جو چار تکبیریں کہنا فرض ہے، اس کے بجائے اگر کوئی تین تکبیریں کہہ کر سلام پھیر دے، تو نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نماز نہیں ہوگی؛ اس لیے کہ جنازہ کی نماز میں چاروں تکبیریں کہنا فرض ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] اگر دو نعش میں سے مسلم اور غیر مسلم کی شناخت نہ ہو سکے تو؟

۱۱۲۵- سوال: دو شخص ایک ساتھ سفر کر رہے تھے، جن میں سے ایک مسلمان اور دوسرا غیر مسلم تھا، دورانِ سفر آگ لگنے کی وجہ سے ناگہانی حادثہ پیش آیا اور دونوں مکمل جل گئے، حتیٰ کہ اُن میں مسلم اور غیر مسلم کی شناخت بھی اب ناممکن ہوگئی، تو اب سوال یہ ہے کہ غسل کسے دیا جائے؟ تکفین کس کی ہونی چاہیے؟ اور نمازِ جنازہ کس کی پڑھی جائے؟ دفن کسے کریں؟ غیر مسلم کے لیے یہ سب چیزیں درست نہیں، اور مسلمان کو جلانا صحیح نہیں، اس صورتِ حال میں حکمِ شرعی کیا ہے؟

---

[۱] وفيه الخروج إلى المصلى في العيد، وأن صلاتها في المسجد لا تكون إلا عن ضرورة. (فتح الباري شرح صحيح البخاري-أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي (م: ۸۵۲هـ): ۲/ ۴۵۰، قوله باب الخروج إلى المصلى بغير منبر، ط: دار المعرفة-بيروت)

الخروج إلى الجبانة في صلاة العيد سنة، وإن كان يسعهم المسجد الجامع، على هذا عامة المشايخ، وهو الصحيح، هكذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۰، الباب السابع عشر في صلاة العيدين)

(۲) وصلاة الجنازة أربع تكبيرات ولو ترك واحدة منها لم تجز صلاته، هكذا في الكافي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۴، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلاة على الميت، ط: دار الفكر)

(وركنها) شيئان (التكبيرات) الأربع، فالأولى ركن أيضا لا شرط، فلذا لم يجز بناء أخرى عليها (والقيام) فلم تجز قاعدا بلا عذر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۰۹، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر- بيروت)

الجواب حامداً ومصلياً:

اگر شناخت کی کوئی بھی علامت باقی نہ رہے، تو دونوں میت کو غسل دے کر کفن پہنا کر نماز جنازہ ادا کی جائے، اور نیت یہ کی جائے کہ اِن دونوں میں سے جو مسلمان ہے، ہم اُس کی نماز جنازہ پڑھ رہے ہیں، اور اس مجبوری کی صورت میں دونوں میت کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا بھی صحیح ہے۔ (درمختار شامی: ۲/۲۰۱)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) اختلط موتانا بكفار، ولا علامة، اعتبر الأكثر، فإن استووا غسلوا، واختلف في الصلاة عليهم، ومحل دفنهم. (الدر المختار) ـــــــــ قال ابن عابدين: (قوله اعتبر الأكثر) أي في الصلاة، بقرينة قوله في الاستواء، واختلف في الصلاة عليهم. قال في الحلية: فإن كان بالمسلمين علامة، فلا إشكال في إجراء أحكام المسلمين عليهم، وإلا فلو المسلمون أكثر صلى عليهم، وينوي بالدعاء المسلمين، ولو الكفار أكثر. ففي شرح مختصر الطحاوي للإسبيجابي: لا يصلى عليهم، لكن يغسلون، ويكفنون، ويدفنون في مقابر المشركين اهـ قال ط: وكيفية العلم بالأكثر أن يحصي عدد المسلمين ويعلم ما ذهب منهم، ويعد الموتى فيظهر الحال (قوله: واختلف في الصلاة عليهم) فقيل لا يصلي لأن ترك الصلاة على المسلم مشروع في الجملة كالبغاة وقطاع الطريق فكان أولى من الصلاة على الكافر لأنها غير مشروعة ﴿ولا تصل على أحد منهم مات أبدا﴾ [التوبة: ۸۴] وقيل يصلي ويقصد المسلمين؛ لأنه إن عجز عن التعين لا يعجز عن القصد كما في البدائع.

قال في الحلية: فعلى هذا ينبغي أن يصلي عليهم في الحالة الثانية أيضا أي حالة ما إذا كان الكفار أكثر: لأنه حيث قصد المسلمين فقط لم يكن مصليا على الكفار، وإلا لم تجز الصلاة عليهم في الحالة الأولى أيضا، مع أن الاتفاق على الجواز، فينبغي الصلاة عليهم في الأحوال الثلاث كما قالت به الأئمة الثلاث، وهو أوجه قضاء لحق المسلمين بلا ارتكاب منهي عنه اهـ ملخصا. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۰۰-۲۰۱، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في حديث: كل سبب ونسب منقطع إلا سببي ونسبي، ط: دار الفكر - بيروت)

موتى المسلمين إذا اختلطوا بموتى الكفار أو قتلى المسلمين بقتلى الكفار، إن كان للمسلمين علامة يعرفون بها يميز بينهم - وعلامة المسلمين الختان والخضاب ولبس السود - فيصلى عليهم وإن لم تكن علامة، إن كانت الغلبة للمسلمين، يصلى على الكل، وينوى بالصلاة والدعاء للمسلمين، ويدفنون في مقابر المسلمين، وإن كانت الغلبة للمشركين؛ فإنه لا يصلى على الكل، ولكن يغسلون ويكفنون ولكن على وجه غسل موتى المسلمين وتكفينهم، ويدفنون في مقابر المشركين، وإن كانا سواء فلا يصلى عليهم أيضا، واختلف المشايخ في دفنهم، قال بعضهم: في مقابر المشركين، وقال بعضهم: في مقابر المسلمين، وقال بعضهم: يتخذ لهم مقبرة على حدة. كذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۵۹، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱/۳۰۳، كتاب الصلاة، فصل شرائط وجوب الغسل، ط: دار الكتب العلمية)

[۱۲] غیر معروف نعش پر نمازِ جنازہ پڑھنا

۱۱۲۶- سوال: جنگل سے ایک عورت کی نعش برآمد ہوئی، جس کے مسلم یا غیر مسلم ہونے کا کوئی علم نہیں ہے، تو اُس پر ہمیں اسلامی طریقے کے مطابق نماز پڑھنا اور دفن کرنا ضروری ہے، یا غیر مسلم سمجھ کر تدفین اور نمازِ جنازہ نہ پڑھنا اولیٰ ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جنگل میں جو اجنبی نعش ملی ہے، اُس کے بدن یا کپڑے وغیرہ پر کوئی علامت اُس کے مسلمان ہونے کی معلوم ہو، تو اُس کو اسلامی طریقے کے مطابق دفن کرنا اور اُس پر نمازِ جنازہ پڑھنا ضروری ہے، اگر علامات سے اُس کا مسلم یا غیر مسلم ہونا معلوم نہ ہو، تو پھر قرب وجوار کی بستی میں غور کیا جائے کہ آبادی کس قوم کی ہے، اگر مسلمانوں کی آبادی قرب وجوار میں ہے، تو مسلمان سمجھ کر اس پر صلاۃِ جنازہ پڑھی جائے اور تدفین کی جائے، اور اگر قرب وجوار کی بستی مسلمان کی نہ ہو، تو اُسے غیر مسلم سمجھتے ہوئے صرف دفن کر دیا جائے، نمازِ جنازہ اِس صورت میں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، حاصل یہ کہ نمازِ جنازہ اُسی وقت پڑھی جائے جب کہ نعش کے مسلمان ہونے کا یقین (ظنِ غالب) ہو، کسی مسلمان کو نمازِ جنازہ پڑھے بغیر دفن کرنے کے مقابلے میں کسی کافر کی نمازِ جنازہ پڑھنا زیادہ قبیح ہے، لہٰذا خوب احتیاط کیا جائے۔ (درمختار مع شامی: ۲/۲۰۰)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] [فروع] لو لم يدر أمسلم أم كافر، ولا علامة فإن في دارنا غسل وصلي عليه وإلا لا. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله فإن في دارنا إلخ) أفاد بذكر التفصيل في المكان بعد انتفاء العلامة أن العلامة مقدمة وعند فقدها يعتبر المكان في الصحيح لأنه يحصل به غلبة الظن كما في النهر عن البدائع. وفيها أن علامة المسلمين أربعة الختان والخضاب ولبس السواد وحلق العانة اهـ قلت: في زماننا لبس السواد لم يبق علامة للمسلمين. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۰۰-۲۰۱، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في حديث: كل سبب ونسب منقطع إلا سببي ونسبي، ط: دار الفكر-بيروت)

ولو وجد ميت أو قتيل في دار الإسلام، فإن كان عليه سيما المسلمين يغسل ويصلى عليه ويدفن في مقابر المسلمين، وهذا ظاهر، وإن لم يكن معه سيما المسلمين ففيه روايتان، والصحيح أنه يغسل ويصلى عليه ويدفن في مقابر المسلمين؛ لحصول غلبة الظن بكونه مسلما بدلالة المكان، وهي دار الإسلام، ولو وجد في دار الحرب، فإن كان معه سيما المسلمين، يغسل ويصلى عليه، ويدفن في مقابر المسلمين بالإجماع، وإن لم يكن معه سيما =

[۱۳] نمازِ جنازہ بالجہر پڑھنا

۱۱۲۷- سوال: جنازہ کی نماز جہری نماز کی طرح بلند آواز سے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اس بارے میں حضور اکرم ﷺ، صحابۂ کرام یا تابعینِ عظام سے کوئی ثبوت ملتا ہے یا نہیں؟ کیا ائمۂ اربعہ میں سے کسی نے اس کو ثابت فرمایا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

جنازہ کی نماز بالاتفاق آہستہ پڑھی جائے گی، دعاء کے بارے میں کوئی اختلاف ائمہ کے درمیان نہیں ہے، ہاں! جن ائمہ کے یہاں نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ کی قراءت ہوتی ہے، اُن کے نزدیک سورۂ فاتحہ بالجہر پڑھنے کی ایک روایت ہے؛ لیکن اُن کے نزدیک بھی جمہور ہی کا قول صحیح ہے کہ نمازِ جنازہ خواہ دن میں پڑھی جائے، یا رات میں، قراءت آہستہ ہی ہوگی، دوسرے قول میں صرف رات کی نمازِ جنازہ میں جہراً قراءت ہوگی، بہر حال دن میں سراً پڑھے جانے پر تمام کا اتفاق ہے اور رات میں جمہور کے نزدیک آہستہ پڑھنے کا حکم ہے، بعض کے نزدیک قراءت، جہراً ہے۔ (۱) البتہ دعاء کے بارے میں اتفاق ہے کہ آہستہ پڑھی جائے گی، چناں چہ حضرت امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے، حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عوف بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کے جنازہ کی نماز پڑھائی، تو میں نے آپ ﷺ کی

= المسلمين ففيه روايتان، والصحيح أنه لا يغسل ولا يصلى عليه ولا يدفن في مقابر المسلمين، والحاصل أنه لا يشترط الجمع بين السيما ودليل المكان؛ بل يعمل بالسيما وحده بالإجماع، وهل يعمل بدليل المكان وحده؟ فيه روايتان، والصحيح أنه يعمل به لحصول غلبة الظن عنده. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۱/ ۳۰۳، كتاب الصلاة، فصل شرائط وجوب الغسل، ط: دار الكتب العلمية)

(۱) وقد اتفق أصحابنا على أنه إن صلى عليها بالنهار أسر بالقراءة وإن صلى بالليل ففيه وجهان الصحيح الذي عليه الجمهور يسر والثاني يجهر. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، المعروف بـ"شرح النووي"- أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ۶۷۶ھ): ۷/ ۳۰، كتاب الجنائز، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت ☆ مرعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - أبو الحسن عبيد الله بن محمد عبد السلام، الرحماني المباركفوري (م: ۱۴۱۴ھ): ۵/ ۳۸۳، كتاب الجنائز، الفصل الأول، ط: إدارة البحوث العلمية والدعوة والإفتاء - الجامعة السلفية - بنارس الهند)

دعاء یاد کر لی، حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں:

وأما الدعاء فيسر به بلا خلاف، وحينئذ يتأول هذا الحديث على أن قوله حفظت من دعائه أي علمنيه بعد الصلاة فحفظته.[1]

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعاء بلا اختلاف تمام ائمہ کے نزدیک آہستہ پڑھی جائے گی، اِس لیے حدیثِ مذکور کا مطلب یہ ہوگا کہ نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دعاء سکھائی اور میں نے یاد کر لی۔ (مسلم شریف: ۱/۳۱۱)[2]

حضرت امام نوویؒ نے اِس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اِس روایت سے دعاء کا جہراً پڑھنا سمجھ میں آتا ہے، پھر یہ تاویل کی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ نماز کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا سکھلا دی ہو۔[3]

دراصل بات یہ ہے کہ جن روایات میں راوی کا یہ قول ہے کہ '**سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم**' کہ میں نے نمازِ جنازہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ صلاۃِ جنازہ میں صفوف کے درمیان فاصلہ نہیں ہوتا؛ اِس لیے امام آہستہ پڑھتے ہیں، تب بھی قریب میں کھڑا شخص اُس کو سن سکتا ہے، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی قصداً تعلیم کی غرض سے اِس طرح پڑھتے تھے کہ قریب والا شخص سن لے۔[4]

---

(۱) المصدر السابق.

[۲] عوف بن مالك، يقول: صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم على جنازة، فحفظت من دعائه وهو يقول: اللهم، اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه، وأكرم نزله، ووسع مدخله، واغسله بالماء والثلج والبرد، ونقه من الخطايا كما نقيت الثوب الأبيض من الدنس، وأبدله دارا خيرا من داره، وأهلا خيرا من أهله وزوجا خيرا من زوجه، وأدخله الجنة وأعذه من عذاب القبر أو من عذاب النار. قال: حتى تمنيت أن أكون أنا ذلك الميت. (الصحيح لمسلم: ۱/۳۱۱، رقم الحديث: ۸۵-۹۶۳، كتاب الجنائز، باب الدعاء للميت في الصلاة، ط: ديوبند)

(۳) فيه إثبات الدعاء في صلاة الجنازة وهو مقصودها ومعظمها وفيه استحباب هذا الدعاء وفيه إشارة إلى الجهر بالدعاء في صلاة الجنازة. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، المعروف بـ'شرح النووي': ۷/۳۰، كتاب الجنائز، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(۴) عن طلحة بن عبد الله بن عوف، قال: صليت خلف ابن عباس رضي الله عنهما على جنازة فقرأ بفاتحة الكتاب قال: ليعلموا أنها سنة. (صحيح البخاري: ۱/۱۷۸، رقم الحديث: ۱۳۳۵، باب قراءة فاتحة الكتاب على الجنازة، ط: ديوبند)

قال ابن حجر: قوله: "لتعلموا أنها سنة" قال الإسماعيلي: جمع البخاري بين روايتي شعبة وسفيان وسياقهما =

چناں چہ شامی میں مذکور ہے: 'فکان مما ظہر من صلاتہ'، یعنی راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی نماز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ آپ ﷺ یہ دعاء پڑھ رہے ہیں۔

اِس قسم کا فرق قراءتِ ظہر وعصر میں بھی ہوا ہے، چنانچہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ ظہر وعصر کی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور سورۃ پڑھتے تھے، اور کبھی کوئی آیت ہمیں سنا دیتے تھے، یعنی جہراً پڑھتے تھے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں، مطلب یہ ہے کہ ظہر وعصر کی نماز میں جہری قراءت جائز ہے۔ (نسائی شریف: ۱/ ۱۵۳)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] نمازِ جنازہ، پہلی صف میں افضل ہے یا آخری صف میں؟

۱۱۲۸- سوال: عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ نمازِ جنازہ پہلی صف کے بجائے آخری صف میں پڑھنا افضل ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

= مختلف اه فأما رواية شعبة فقد أخرجها ابن خزيمة في صحيحه والنسائي جميعا عن محمد بن بشار شيخ البخاري فيه بلفظ فأخذت بيده فسألته عن ذلك فقال نعم يا ابن أخي إنه حق وسنة. ـــــــــ وللحاكم من طريق آدم عن شعبة فسألته فقلت يقرأ قال نعم إنه حق وسنة. ـــــــــ وأما رواية سفيان فأخرجها الترمذي من طريق عبد الرحمن بن مهدي عنه بلفظ فقال إنه من السنة أو من تمام السنة. ـــــــــ وأخرجه النسائي أيضا من طريق إبراهيم بن سعد عن أبيه بهذا الإسناد بلفظ فقرأ بفاتحة الكتاب وسورة وجهر حتى أسمعنا، فلما فرغ أخذت بيده، فسألته، فقال: سنة وحق، ـــــــــ وللحاكم من طريق بن عجلان أنه سمع سعيد بن أبي سعيد يقول صلى بن عباس على جنازة فجهر بالحمد، ثم قال: إنما جهرت لتعلموا أنها سنة، وقد أجمعوا على أن قول الصحابي سنة حديث مسند، كذا نقل الإجماع. (فتح الباري شرح صحيح البخاري-أحمد بن علي بن حجر، أبو الفضل العسقلاني الشافعي (م: ۸۵۲هـ): ۳/ ۲۰۴، تحت رقم الحديث: ۱۳۳۵، قوله باب قراءة فاتحة الكتاب على الجنازة، ط: دار المعرفة-بيروت)

(۱) عبد الله بن أبي قتادة قال: حدثنا أبي، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقرأ بأم القرآن وسورتين في الركعتين الأوليين من صلاة الظهر وصلاة العصر، ويسمعنا الآية أحيانا، وكان يطيل في الركعة الأولى. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي-أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۲/ ۱۶۳، رقم الحديث: ۹۷۵، كتاب الافتتاح، باب إسماع الإمام الآية في الظهر، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية-حلب)

الجواب حامداً ومصلیاً

نمازِ جنازہ آخری صف میں پڑھنا افضل ہے، اس لیے کہ اس نماز کا مقصد یہ ہے کہ میت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعاءِ مغفرت اور سفارش کی جائے، تو اُس میں عاجزی وانکساری بہتر ہے، اسی لیے نمازِ جنازہ میں کوشش یہ کرنی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ صفیں بن سکیں، کم از کم تین صف ضرور بنائیں۔[۱] اگر دیگر نمازوں کی طرح اس نماز میں بھی پہلی صف کو افضل قرار دیا جائے، تو سبھی لوگ یہ کوشش کریں گے کہ پہلی صف میں نماز پڑھیں، اور اِس شکل میں صفیں کم بنیں گی؛ لہٰذا نمازِ جنازہ آخری صف میں پڑھنا افضل ہے۔ (شامی: ۴۲۱/۱)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] نمازِ جنازہ آخری صف میں پڑھنا اولیٰ کیوں ہے؟

۱۱۲۹- سوال: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جنازہ کی نماز صفِ اولیٰ کے بجائے آخری صفوں میں

---

(۱) وأفضل صفوفها آخرها إظهارا للتواضع. (الدر المختار) ــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله وأفضل صفوفها آخرها إلخ) كذا في القنية، وبحث فيه في الحلية بإطلاق ما في صحيح مسلم عنه - صلى الله عليه وسلم - "خير صفوف الرجال أولها، وشرها آخرها" وبأن إظهار التواضع لا يتوقف على التأخر. اهـ.

أقول: قد يقال: إن الحديث مخصوص بالصلاة المطلقة لأنها المتبادرة، ولقوله - صلى الله عليه وسلم -: "من صلى عليه ثلاثة صفوف غفر له" رواه أبو داود، وقال حديث حسن، والحاكم، وقال: صحيح على شرط مسلم، ولهذا قال في المحيط: ويستحب أن يصف ثلاثة صفوف، حتى لو كانوا سبعة يتقدم أحدهم للإمامة، ويقف وراءه ثلاثة ثم اثنان ثم واحد. اهـ. فلو كان الصف الأول أفضل في الجنازة أيضا لكان الأفضل جعلهم صفا واحدا ولكره قيام الواحد وحده كما كره في غيرها، هذا ما ظهر لي. (رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲/ ۲۱۴، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب هل يسقط فرض الكفاية بفعل الصبي؟ ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) وخير صفوف الرجال أولها في غير جنازة ثم وثم. (الدر المختار) ــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله في غير جنازة) أما فيها فآخرها إظهارا للتواضع لأنهم شفعاء فهو أحرى بقبول شفاعتهم لأن المطلوب فيها تعدد الصفوف، فلو فضل الأول امتنعوا عن التأخر عند قلتهم، رحمتي (قوله ثم وثم) أي ثم الصف الثاني أفضل من الثالث، وفي الجنازة ما يلي الأخير أفضل مما تقدمه، رحمتي. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۷۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب في جواز الإيثار بالقرب، ط: دار الفكر - بيروت☆ حاشية الشلبي على تبيين الحقائق: ۱/ ۱۳۶، كتاب الصلاة، الأحق بالإمامة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة☆ حاشية الطحطاوي ص: ۵۸۱، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل الصلاة عليه، ط: دار الكتب العلمية)

پڑھنا بہتر اس لیے ہے کہ مصلی، میت سے دور رہے، کیوں کہ پہلی صف میں میت کو قبلہ بنا کر اُس کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھنے شرک کی بو آتی ہے، جب کہ آخری صف میں اس کا گمان نہیں ہوتا، یہ توجیہ مجھے کسی کتاب کے حوالہ سے معلوم نہیں ہے، اگر یہ توجیہ درست ہو تو اُس کے حوالہ کی رہنمائی فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

نمازِ جنازہ آخری صف میں پڑھنا افضل ہے، کیوں کہ یہ موقعِ تذلل و انکسار ہے، اور پیچھے کھڑے رہنے میں انکساری کا اظہار زیادہ ہے، دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ نمازِ جنازہ میں صفوں کی زیادتی افضل ہے، تین، پانچ یا سات صفوں پر مغفرت کی بشارت ہے، چناں چہ اگر سات آدمی نمازِ جنازہ میں شریک ہوں، تو ایک امامت کرے گا، تین پہلی صف میں، دو دوسری صف میں اور ایک آدمی آخری صف میں کھڑا رہے گا، اگر پہلی صف کو افضل قرار دیا جائے، تو ہر شخص پہلی صف میں کھڑا ہونا چاہے گا، نتیجتاً صفوں کی زیادتی حاصل نہیں ہو سکے گی۔[1]

سوال میں ذکر کردہ توجیہ کہ میت کے قریب کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں شرک کی بو آتی ہے، یہ درست معلوم نہیں ہوتی، اور نہ کہیں میری نظر سے گزری ہے، نیز نمازِ جنازہ میں شرط ہے کہ میت مصلیوں کے سامنے خصوصاً امام کے سامنے ہو، نیز نمازِ جنازہ میں میت امام کے قائم مقام ہوتا ہے، تو پھر اُس کے قریب رہنے میں شرک کا شبہ کیسے ہو سکتا ہے؟ (شامی: ۲/ ۲۱۴)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وأفضل صفوفها آخرها إظهارا للتواضع. (الدر المختار) ——————— و في الشامية: ويستحب أن يصف ثلاثة صفوف، حتى لو كانوا سبعة يتقدم أحدهم للإمامة، ويقف وراءه ثلاثة ثم اثنان ثم واحد. اهـ. فلو كان الصف الأول أفضل في الجنازة أيضا لكان الأفضل جعلهم صفا واحدا ولكره قيام الواحد وحده كما كره في غيرها، هذا ما ظهر لي. (رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲/ ۲۱۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب هل يسقط فرض الكفاية بفعل الصبي؟ ط: دار الفكر - بيروت)

[۲] (ويقوم الإمام) ندبا (بحذاء الصدر مطلقا) للرجل والمرأة لأنه محل الإيمان والشفاعة لأجله. (الدر المختار) ——————— قال ابن عابدين: (قوله ندبا) أي كونه بالقرب من الصدر مندوب، وإلا فمحاذاة جزء من الميت لا بد منها قهستاني عن التحفة. ويظهر أن هذا في الإمام وفيما إذا لم تتعدد الموتى وإلا وقف عند صدر أحدهم فقط، ولا يبعد عن الميت كما في النهر ط (قوله للرجل والمرأة) أراد الذكر والأنثى الشامل للصغير والصغيرة ط عن أبي السعود: وعند الشافعي - رحمه الله - يقف عند رأس الرجل وعجز المرأة (قوله: والشفاعة لأجله) أي أن المصلي شافع للميت لأجل إيمانه فناسب أن يقوم بحذاء محله. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۱۶، كتاب الصلاة، باب الجنازة، مطلب هل يسقط فرض الكفاية بفعل الصبي؟ ط: دار الفكر - بيروت)

[۱۶] جنازہ کی نماز پڑھانے کا معاوضہ لینا

۱۱۳۰- سوال: جنازے کی نماز پڑھانے کے لیے امام صاحب کو، متولی صاحبان کی طرف سے ہر مہینے یا جب نماز پڑھاتے ہیں، تب کچھ رقم دی جاتی ہے، تو کیا اس طرح رقم لینا امام صاحب کے لیے جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جنازہ کی نماز فرض کفایہ ہے؛ لیکن جب کوئی پڑھانے والا نہ ہو، وہ تنہا ہو، تو اس صورت میں اس کے ذمے نماز پڑھانا واجب ہوگا، فرض کفایہ کی صورت میں رقم لینا جائز ہے اور واجب کی صورت میں لینا ناجائز ہے۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] تارکِ صلاۃ ودیگر فرائض دین کی نماز جنازہ

۱۱۳۱- سوال: میری نانی جان کی عمر تقریباً ستر یا اسّی کے درمیان ہے، ان کا نام مریم ہے، نماز روزہ وغیرہ دینی فرائض کی بالکل پابند نہیں ہے، ان کی لڑکی (میری ماں) کہتی ہے کہ میں اپنی والدہ کو تقریباً پچھلے چالیس سال سے نہ تو جمعہ کی نماز ادا کرتے دیکھا ہے نہ عید کی، اور میں اپنی بات کروں تو میں نے اپنی چونتیس سالہ زندگی میں نہ تو انہیں نماز پڑھتے دیکھا ہے نہ روزہ رکھتے ہوئے دیکھا ہے، یہ بات بالکل صحیح ہے اور میں حتی المقدور سمجھانے کی کوشش بھی کرتا ہوں، میں اپنی نانی کو ''بعث بعد الموت'' کی باتیں بتا

---

(۱) ويغسله أقرب الناس إليه وإلا فأهل الأمانة والورع. (مراقي الفلاح) ———— قال الطحطاوي: قوله: "وإلا فأهل الأمانة والورع" والأفضل أن يغسله مجانا وإن ابتغى الغاسل أجرا جاز إن كان ثمة غيره وإلا لا لتعينه عليه واختلفوا في أجرة خياطة كفن وحمال وحفار وتكون من رأس المال كما في البحر والشرنبلالية وينبغي أن يكون مثل الأول لأن ذلك من فروض الكفاية كما في السراج والضياء. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱ھ) ص:۷۰، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۱۹۹، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر- بيروت)

نوٹ: مذکورہ عبارت سے بالعوض جنازے کی نماز پڑھانے کا حکم ضمناً معلوم ہوتا ہے کہ اجرت لینا اس صورت میں جائز ہوگا، جب کہ اس کے علاوہ کوئی اور پڑھانے کی اہلیت رکھتا ہو، کہ اس صورت میں اس پر جنازہ کی نماز کا پڑھنا فرض کفایہ ہوگا، اور اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا اہلیت نہ رکھتا ہو تو اجرت لینا جائز نہیں؛ کیوں کہ اس صورت میں اس کے لیے جنازہ کی نماز پڑھانا از روئے شرع متعین ہے، فقط۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

تا ہوں، تو وہ کہتی ہیں کہ بعد موت کون زندہ ہوگا؟ اور جنت اور وہاں کی نعمت کا بھی انکار کرتی ہیں۔

میرا سوال یہ ہے کہ اگر میں زندہ رہوں اور وہ انتقال کر جائے، تو کیا میں اس کی نماز جنازہ پڑھ سکتا ہوں؟ وہ عاقلہ بھی ہے اور صحت بھی بہت اچھی ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

گناہوں کی وجہ سے انسان اسلام سے خارج نہیں ہوجاتا۔[۱]

آپ کی نانی نماز ادا نہیں کرتی اور نہ روزہ رکھتی ہے؛ لیکن ایمان مجمل اور ایمان مفصل پر ان کا عقیدہ ہے، تو وہ مسلمان ہے، اگر عقیدہ میں نقص ہوگا، تو ایمان میں خرابی آئے گی، ورنہ اگر عقیدہ صحیح اور درست ہے، تو آپ نماز جنازہ ادا کر سکتے ہیں۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) ولا نكفر أحدا من أهل القبلة بذنب ما لم يستحله، ولا نقول لا يضر مع الإيمان ذنب لمن عمله. (العقيدة الطحاوية- أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة بن عبد الملك بن سلمة الأزدي الحجري المصري المعروف بـ'الطحاوي' (م:۳۲۱هـ) ص:۶۰، شرح وتعليق: محمد ناصر الدين الألباني، ط: المكتب الإسلامي- بيروت)

ولا نجزم لأحد من أهل القبلة بجنة ولا نار إلا من جزم له الرسول صلى الله عليه وسلم، لكنا نرجو للمحسن ونخاف على المسيء. ولا نكفر أحدا من أهل القبلة بذنب، ولا نخرجه عن الإسلام بعمل. (لمعة الاعتقاد- أبو محمد موفق الدين عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة الجماعيلي المقدسي ثم الدمشقي الحنبلي، الشهير بابن قدامة المقدسي (م:۶۲۰هـ) ص:۳۸، محمد خاتم النبيين، ط: وزارة الشؤون الإسلامية والأوقاف والدعوة والإرشاد- المملكة العربية السعودية)

(۲) عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الجهاد واجب عليكم مع كل أمير، برا كان أو فاجرا، والصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم برا كان أو فاجرا، وإن عمل الكبائر، والصلاة واجبة على كل مسلم برا كان أو فاجرا، وإن عمل الكبائر. (سنن أبي داود: ۱/ ۳۴۳، رقم الحديث: ۲۵۳۳، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، ط: ديوبند)

وأما بيان من يصلى عليه، فكل مسلم مات بعد الولادة يصلى عليه صغيرا كان، أو كبيرا، ذكرا كان، أو أنثى، حرا كان، أو عبدا إلا البغاة وقطاع الطريق، ومن بمثل حالهم لقول النبي: - صلى الله عليه وسلم - "صلوا على كل بر وفاجر" وقوله: للمسلم على المسلم ست حقوق، وذكر من جملتها أن يصلي على جنازته من غير فصل إلا ما خص بدليل، والبغاة ومن بمثل حالهم مخصوصون لما ذكرنا. (بدائع الصنائع: ۱/۳۱۱، كتاب الصلاة، فصل صلاة الجنازة، بيان فريضة صلاة الجنازة، وكيفية فرضيتها، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۱۸] دو جنازوں کی نماز ایک ساتھ پڑھنا

۱۱۳۲- سوال: دو جنازے ایک ساتھ ہوں، تو کیا دونوں جنازوں کی نماز ایک ساتھ ہوگی یا الگ الگ؟ اور جنازے رکھنے کی ترتیب کیا ہوگی؟

الجواب حامداو مصلیا:

دو جنازے ایک ساتھ ہوں، تو دونوں کی نماز جنازہ ایک ساتھ ہوسکتی ہے؛ جنازہ رکھنے کی ترتیب درج ذیل ہے:

(۱) جنازوں میں جو افضل ہو، اس کو سب سے پہلے رکھا جائے، پھر دوسرے میت کا سر پہلے میت کے کاندھے کے برابر، پھر تیسرے میت (جنازہ) کو بھی اسی طرح سیڑھیوں کی مانند رکھا جائے اور امام پہلے جنازے کے سامنے کھڑے ہوکر نماز پڑھائے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ جنازوں کو یکے بعد دیگرے قطار بنا کر-ایک کے بعد آگے پیچھے کر کے-رکھا جائے، پہلے مردوں میں سب سے افضل کو رکھے، پھر اس کی جانب قبلہ میں اس سے کم درجہ کی میت کو، پھر اس کی جانب قبلہ میں اس سے کم درجے کی میت کو، اسی ترتیب سے رکھا جائے، اس صورت میں امام سے وہ جنازہ قریب ہوگا، جو سب سے افضل ہو، اور وہ جنازہ دور ہوگا، جو سب سے درجے میں کم تر ہو:

(وإذا اجتمعت الجنائز فإفراد الصلاة) على كل واحدة (أولى) من الجمع وتقديم الأفضل أفضل (وإن جمع) جاز، ثم إن شاء جعل الجنائز صفا واحدا وقام عند أفضلهم, وإن شاء (جعلها صفا مما يلي القبلة) واحدا خلف واحد (بحيث يكون صدر كل) جنازة (مما يلي الإمام) ليقوم بحذاء صدر الكل وإن جعلها درجا فحسن لحصول المقصود. (در مختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۱۹-۲۱۸، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر-بيروت.

خلاصہ یہ ہے کہ اگر جنازے جمع ہو جائیں، تو افضل یہ ہے کہ سب کی الگ الگ نماز پڑھی جائے، اگر ایک ساتھ نماز پڑھنا ہو، تو تین طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر جنازے کو رکھا جائے:

(۱) امام سے متصل سب سے افضل جنازہ کو رکھا جائے، اور اس میت سے متصل (جانب قبلہ میں) دوسرے کو، پھر تیسرے کو۔

(۲) سب سے پہلے افضل جنازہ کو رکھا جائے، اور اس کے بعد اس کے کاندھے کے برابر دوسرے جنازے کے سر کو رکھا جائے، پھر دوسرے کے کاندھے کے برابر میں تیسرے کے سر کو (سیڑھی کی مانند)۔ =

[۱۹] نماز جنازہ صحن مسجد میں ہوسکتی ہے یا نہیں؟

۱۱۳۳- سوال: نماز جنازہ صحن مسجد میں ہوسکتی ہے یا نہیں، جب کہ صحن بند اور حدود مسجد میں ہے اور اگر خارج مسجد ہو، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصليا:

صحن اگر حدود مسجد میں داخل ہو، تو نماز جنازہ اس میں مکروہ ہے۔

= (۳) ایک ہی صف میں عرضا رکھا جائے اور امام ان میں کے افضل کے سامنے کھڑے ہو کر نماز پڑھائیں۔

یہ تینوں طریقے جائز ہیں، پہلا طریقہ احسن، دوسرا احسن اور صحیح ہے، عبارت ملاحظہ فرمائیں:

(وإن جمع) جاز، ثم إن شاء جعل الجنائز صفا واحدا، وقام عند أفضلهم، وإن شاء (جعلها صفا مما يلي القبلة) واحدا خلف واحد (بحيث يكون صدر كل) جنازة (مما يلي الإمام) ليقوم بحذاء صدر الكل وإن جعلها درجا فحسن لحصول المقصود. (الدر المختار) ــــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله صفا واحدا) أي كما يصطفون في حال حياتهم عند الصلاة، بدائع: أي بأن يكون رأس كل عند رجل الآخر فيكون الصف على عرض القبلة. (قوله: وإن شاء جعلها صفا إلخ) ذكر في البدائع: التخيير بين هذا، والذي قبله، ثم قال: هذا جواب ظاهر الرواية. وروي عن أبي حنيفة في غير رواية الأصول: أن الثاني أولى؛ لأن السنة هي قيام الإمام بحذاء الميت، وهو يحصل في الثاني دون الأول. اهـ. (قوله درجا) أي شبه الدرج بأن يكون رأس الثاني عند منكب الأول، بدائع. (قوله لحصول المقصود) وهو الصلاة عليهم، درر، والأحسن ما في المبسوط؛ لأن الشرط أن تكون الجنائز أمام الإمام، وقد وجد، إسماعيل (قوله: فيقرب منه الأفضل فالأفضل) أي في صورة ما إذا جعلهم صفا واحدا مما يلي القبلة بوجهيها، أما في صورة جعلهم صفا عرضا، فإنه يقوم عند أفضلهم كما قدمه؛ إذ ليس أحدهم أقرب، وهذا حيث اختلفوا في الفضل، وإن تساووا اقدم أسنهم كما في الحلية. وفي البحر عن الفتح: وفي الرجلين يقدم أكبرهما سنا وقرآنا وعلما، كما "فعله- عليه الصلاة والسلام- في قتلى أحد من المسلمين". (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۱۹، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، قبيل: مطلب في بيان من هو أحق بالصلاة على الميت، ط: دار الفكر- بيروت)

(قال): وإذا اجتمعت الجنائز فإن شاءوا جعلوها صفا وإن شاءوا وضعوا واحدا خلف واحد وكان ابن أبي ليلى - رحمه الله تعالى- يقول: توضع شبه الدرج وهو أن يكون رأس الثاني عند صدر الأول، وعند أبي حنيفة- رضي الله عنه- أنه إن وضع هكذا فحسن أيضا؛ لأن الشرط أن تكون الجنائز أمام الإمام، وقد وجد ذلك كيف وضعوا فكان الاختيار إليهم. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۲/ ۶۵، كتاب الصلاة، باب غسل الميت، ط: دار المعرفة- بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۱۶، فصل بيان ما تصح به صلاة الجنازة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ مراقي الفلاح ص: ۲۲۰، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل الصلاة عليه، ط: المكتبة العصرية) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

البتہ اگر صحنِ مسجد، خارجِ مسجد ہے، تو اس میں بلا کراہت نمازِ جنازہ جائز ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۱] (وكرهت تحريما) وقيل (تنزيها في مسجد جماعة هو) أي الميت (فيه) وحده أو مع القوم. (واختلف في الخارجة) عن المسجد وحده أو مع بعض القوم، (والمختار الكراهة) مطلقا خلاصة، بناء على أن المسجد إنما بني للمكتوبة، وتوابعها كنافلة وذكر وتدريس علم، وهو الموافق لإطلاق حديث أبي داود "من صلى على ميت في المسجد فلا صلاة له". (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: وفي مختارات النوازل: سواء كان الميت فيه أو خارجه هو ظاهر الرواية. وفي رواية لا يكره إذا كان الميت خارج المسجد، (قوله بناء على أن المسجد إلخ) أما إذا عللنا بخوف تلويث المسجد فلا يكره إذا كان الميت خارج المسجد وحده أو مع بعض القوم اهـ ح. قال في شرح المنية: وإليه مال في المبسوط والمحيط، وعليه العمل، وهو المختار. اهـ ـــــــ قلت: بل ذكر في غاية البيان والعناية: أنه لا كراهة فيها بالاتفاق، لكن رده في البحر. وأجاب في النهر: بحمل الاتفاق على عدم الكراهة في حق من كان خارج المسجد وما مر في حق من كان داخله. ـــــــ ثم اعلم أن التعليل الأول فيه خفاء، إذ لا شك أن الصلاة على الميت دعاء وذكر وهما مما بني له المسجد وإلا لزم المنع عن الدعاء فيه لنحو الاستسقاء والكسوف مع أن الوارد في ذلك ما رواه مسلم "أن رجلا نشد في المسجد ضالة فقال - صلى الله عليه وسلم -: لا وجدت، إنما بنيت المساجد لما بنيت له" فليتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۲۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة صلاة الجنازة في المسجد، ط: دار الفكر ☆ تبيين الحقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۲۴۳، كتاب الصلاة، باب الجنائز، كيفية صلاة الجنازة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

وصلاة الجنازة في المسجد الذي تقام فيه الجماعة مكروهة، سواء كان الميت والقوم في المسجد، أو كان الميت خارج المسجد والقوم في المسجد، أو كان الإمام مع بعض القوم خارج المسجد والقوم الباقي في المسجد، أو الميت في المسجد والإمام والقوم خارج المسجد، هو المختار، كذا في الخلاصة. ولا تكره بعذر المطر ونحوه، هكذا في الكافي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۵، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلاة على الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

راجع للتفصيل: المحيط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۵/ ۳۰۷، كتاب الاستحسان والكراهية، الفصل الرابع في الصلاة، والتسبيح، وقراءة القرآن، والذكر، والدعاء ورفع الصوت عند قراءة القرآن والذكر والدعاء، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بـ "ملا - أو منلا أو المولى - خسرو" (م: ۸۸۵هـ): ۱/ ۱۶۵، باب الجنائز، دفن من غير أن يصلى عليه، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆ حاشية الطحطاوي، ص: ۵۹۶، باب أحكام الجنائز، فصل الصلاة عليه، ط: بيروت)

[۲۰] صحنِ مسجد میں جنازے کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

۱۱۳۴- سوال: مسجد کے باہر صحن ہے، جو مسجد کے حکم میں داخل نہیں ہے، لیکن اس صحن میں دوسری جماعت ہوتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس صحن میں جنازے کی نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اس صحن سے مسجد میں داخل ہونے کے لیے تین بڑے دروازے ہیں۔

الجواب حامداو مصليا:

جب صحن، مسجد میں داخل نہیں ہے، تو جنازہ کی نماز مذکورہ صحن میں ادا کرنا جائز ہے، مسجد میں جنازہ کی نماز ادا کرنا مکروہ ہے، لیکن جب مذکور صحن مسجد کے حکم میں نہیں اور اس میں مسجد ہونے کی نیت نہیں کی ہے، تو اس میں نمازِ جنازہ کے عدمِ جواز یا کراہت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] نمازِ جنازہ میں قبروں کا سامنے ہونا، امام کے سامنے سترہ یا دیوار کی آڑ کرنا

۱۱۳۵- سوال: ایک قبرستان میں ایک بچے کی قبر- جو مردہ پیدا ہوا تھا- جنازہ کی نماز کے وقت سامنے پڑتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی قبر سامنے کی جہت میں نہیں ہے، تو اس طرح بچے کی قبر کے سامنے ہوتے ہوئے جنازہ کی نماز پڑھ سکتے ہیں؟

(۲) قبرستان میں قبریں نمازِ جنازہ کے وقت سامنے ہوتی ہیں، اور نماز کے وقت درمیان میں دیوار وغیرہ کی کوئی آڑ نہیں ہوتی، تو اس وقت سامنے سترہ قائم کر سکتے ہیں یا نہیں؟ وہ سترہ امام کے سامنے ہو، تو جنازہ کے آگے قائم کیا جائے یا کسی اور جگہ؟ جو بھی طریقہ ہو، تحریر فرمائیں، امام کا ایک سترہ کافی ہے، یا ہر مقتدی کے لیے سترہ قائم کیا جائے؟

الجواب حامداو مصليا:

(۱) سترہ اور دیوار کی ضرورت نہیں ہے، اور امرِ مستحب بھی نہیں ہے، حضرت عائشہؓ اور حضرت امِ

---

(۱) تقدم تخريجه تحت عنوان: "نماز جنازہ صحن مسجد میں ہو سکتی ہے یا نہیں؟" عن: رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۲۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة صلاة الجنازة في المسجد، ط: دار الفكر☆ تبيين الحقائق- عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ هـ): ۱/ ۲۴۳، كتاب الصلاة، باب الجنائز، كيفية صلاة الجنازة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۵، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلاة على الميت، ط: دار الفكر.

سلمہؓ کے جنازہ کی نماز حضرت ابوہریرہؓ نے بقیع نامی قبرستان میں پڑھی تھی، اور نماز پڑھنے والوں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی تھے، اور سامنے سترہ قائم نہیں کیا تھا۔ (طحطاوی علی مراقی الفلاح: ۳۲۷)[1]

(۲) میت خود امام کے سامنے ہے، تو قبر کے امام کے سامنے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بعض اوقات قبر پر بھی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے، جب کہ میت کو اس پر نماز جنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا گیا ہو۔[2]

---

[۱] ... لا ينبغي أن يصلي على ميت بين القبور وكان علي وابن عباس يكرهان ذلك وإن صلوا أجزأهم لما روي أنهم صلوا على عائشة وأم سلمة بين مقابر البقيع والإمام أبو هريرة وفيهم ابن عمر رضي الله عنهم ثم محل الكراهة إذا لم يكن عذر فإن كان فلا كراهة اتفاقا. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح-أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ١٢٣١هـ) ص: ٥٩٥، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ويكره أن يصلى على القبر لما روي عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه نهى أن يصلى على القبر، قال: أبو حنيفة: ولا ينبغي أن يصلى على ميت بين القبور، وكان علي وابن عباس يكرهان ذلك، وإن صلوا أجزأهم لما روي أنهم صلوا على عائشة، وأم سلمة بين مقابر البقيع، والإمام أبو هريرة وفيهم ابن عمر - رضي الله عنهم -. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ٥٨٧هـ): ١/ ٣٢٠، كتاب الصلاة، فصل بيان وجوب الدفن، قبيل: فصل أحكام الشهيد، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆المحيط البرهاني في الفقه النعماني-ابن مازة البخاري الحنفي (م: ٦١٦هـ): ٢/ ١٩٣، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆البحر الرائق شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري (م: ٩٧٠هـ): ٢/ ٢٠٩، كتاب الجنائز، الصلاة على الميت في المسجد، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) (قوله: فإن دفن بلا صلاة صلي على قبره ما لم يتفسخ)؛ لأن النبي - صلى الله عليه وسلم - صلى على قبر امرأة من الأنصار، أطلقه فشمل ما إذا كان مدفونا بعد الغسل أو قبله كما قدمناه، وهو رواية ابن سماعة عن محمد؛ لكن صحح في غاية البيان معزيا إلى القدوري وصاحب التحفة أنه لا يصلى على قبره؛ لأن الصلاة بدون الغسل ليست بمشروعة، ولا يؤمر بالغسل لتضمنه أمرا حراما، وهو نبش القبر فسقطت الصلاة اهـ.

وقيد بالدفن؛ لأنه لو وضع في قبره، ولم يهل عليه التراب فإنه يخرج ويصلى عليه كما قدمناه، وقيد بعدم التفسخ؛ لأنه لا يصلى عليه بعد التفسخ؛ لأن الصلاة شرعت على بدن الميت فإذا تفسخ لم يبق بدنه قائما، ولم يقيد المصنف بمدة؛ لأن الصحيح أن ذلك جائز إلى أن يغلب على الظن تفسخه والمعتبر فيه أكبر الرأي على الصحيح من غير تقدير بمدة كذا في شرح المجمع وغيره، وظاهره أنه لو شك في تفسخه يصلى عليه والمذكور في غاية البيان أنه لو شك لا يصلى عليه رواه ابن رستم عن محمد اهـ. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق: ٢/ ١٩٦، كتاب الجنائز، دفن الميت بلا صلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي☆مراقي الفلاح ص: ٢٢٠، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل الصلاة عليه، ط: المكتبة العصرية☆الدر مع الرد: ٢/ ٢٢٣، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة)

اس لیے قبروں کے سامنے ہونے میں کوئی حرج نہیں، اور سترہ اور دیوار قائم کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] غیر مسلموں کی عیادت اور ان کی آخری رسوم میں شرکت

۱۱۳۶- سوال: ہمارے یہاں نصاریٰ اور ہندو وغیرہ رہتے ہیں، بہت سے مسلمان ان نصاریٰ اور ہندوؤں کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان غیر مسلموں میں جب کوئی بیمار ہوجائے، تو تعلق کی بنا پر کوئی مسلمان اس کی عیادت میں یا مرجائے تو کفن دفن میں اور میت کے متعلق ہونے والی متعدد مذہبی کاروائی میں شریک ہوسکتا ہے یا نہیں؟ نیز اس کے گھر والوں کی تعزیت کرسکتا ہے یا نہیں؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

کافر، یہودی یا نصرانی کے محلے یا گاؤں میں مسلمان رہتے ہوں اور وہ لوگ مسلمانوں سے حسن اخلاق کا معاملہ کرتے ہوں، تو مسلمانوں کے لیے بھی جائز ہے کہ ان کی بیمار پرسی کے لیے جائیں؛ بل کہ عیادت کرنا -خواہ کافر کی ہو- ثواب کا کام ہے، اور اس میں اگر نیت تبلیغ اسلام کی کرلے، تو بہت ثواب کا مستحق ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک غیر مسلم یہودی لڑکے کی خبر گیری اور عیادت کے لیے تشریف لے گئے تھے اور اس کو اسلام کی دعوت دی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے نتیجے میں وہ لڑکا مسلمان ہوگیا تھا۔ (بخاری شریف: ۱/۱۸۱)[۱] اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابو طالب کی بیمار پرسی اور دعوت ایمان کے لیے بھی تشریف لے گئے تھے۔ (بخاری شریف: ۱/۱۸۱)[۲]

---

[۱] عن أنس رضي الله عنه، قال: كان غلام يهودي يخدم النبي صلى الله عليه وسلم، فمرض، فأتاه النبي صلى الله عليه وسلم يعوده، فقعد عند رأسه، فقال له: أسلم، فنظر إلى أبيه وهو عنده فقال له: أطع أبا القاسم صلى الله عليه وسلم، فأسلم، فخرج النبي صلى الله عليه وسلم وهو يقول: الحمد لله الذي أنقذه من النار. (صحيح البخاري: ۱/۱۸۱، رقم الحديث: ۱۳۵٦، كتاب الجنائز، باب إذا أسلم الصبي فمات، هل يصلى عليه، وهل يعرض على الصبي الإسلام، ط: البدر-ديوبند)

[۲] عن ابن شهاب، قال: أخبرني سعيد بن المسيب، عن أبيه أنه أخبره: أنه لما حضرت أبا طالب الوفاة جاءه رسول الله صلى الله عليه وسلم، فوجد عنده أبا جهل بن هشام، وعبد الله بن أبي أمية بن المغيرة، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لأبي طالب: "يا عم، قل: لا إله إلا الله، كلمة أشهد لك بها عند الله" فقال أبو جهل، وعبد الله بن أبي أمية: يا أبا =

غیرمسلموں کے جنازے میں حاضری (جب کہ کسی تعلق یا مصلحت کی بنا پر ہو، تو) گنجائش ہے، مگر شرط یہ ہے کہ ان کے مذہبی کاموں سے دور رہے، ان کے مذہبی امور میں شریک رہنا جائز نہیں۔[1] بل کہ ان کے مذہبی امور اور ریت و رواج کو کوئی اچھا سمجھے گا، تو اس کے ایمان سے نکل جانے کا اندیشہ ہے۔[2]

البتہ غیرمسلم سے رشتہ کا تعلق ہو اور اس کے کفن و دفن کے لیے کوئی غیرمسلم نہ ہو، تو مسلمان اپنے اس

=طالب أترغب عن ملة عبد المطلب؟ فلم يزل رسول الله صلى الله عليه وسلم يعرضها عليه، ويعودان بتلك المقالة حتى قال أبو طالب آخر ما كلمهم: هو على ملة عبد المطلب، وأبى أن يقول: لا إله إلا الله، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أما والله لأستغفرن لك ما لم أنه عنك، فأنزل الله تعالى فيه: {ما كان للنبي} [التوبة: ۱۱۳] الآية. (صحيح البخاري: ۱/۱۸۱، رقم الحديث: ۱۳۶۰، كتاب الجنائز، باب إذا قال المشرك عند الموت: لا إله إلا الله، ط: ديوبند)

(۱) قال الله تعالى: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ﴾. (۹-التوبة: ۸۴)

والمراد من الصلاة المنهي عنها صلاة الميت المعروفة وهي متضمنة للدعاء والاستغفار والاستشفاع له... [وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ] أي لا تقف عليه ولا تتول دفنه... والمراد لا تقف عند قبره للدفن أو للزيارة، والقبر في المشهور مدفن الميت، ويكون بمعنى الدفن، وجوزوا إرادته هنا أيضا. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني-شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م: ۱۲۷۰ھ): ۵/۳۳۲، سورة التوبة، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

عن ابن عباس، عن عمر بن الخطاب رضي الله عنهم، أنه قال: لما مات عبد الله بن أبي ابن سلول، دعي له رسول الله صلى الله عليه وسلم ليصلي عليه، فلما قام رسول الله صلى الله عليه وسلم وثبت إليه، فقلت: يا رسول الله، أتصلي على ابن أبي وقد قال يوم كذا وكذا: كذا وكذا؟ أعدد عليه قوله، فتبسم رسول الله صلى الله عليه وسلم وقال: أخر عني يا عمر، فلما أكثرت عليه، قال: إني خيرت فاخترت، لو أعلم أني إن زدت على السبعين يغفر له لزدت عليها، قال: فصلى عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم انصرف، فلم يمكث إلا يسيرا، حتى نزلت الآيتان من براءة: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ قال: فعجبت بعد من جرأتي على رسول الله صلى الله عليه وسلم يومئذ، والله ورسوله أعلم. (صحيح البخاري: ۱/۱۸۲، رقم الحديث: ۱۳۶۶، كتاب الجنائز، باب ما يكره من الصلاة على المنافقين، والاستغفار للمشركين، ط: البدر-ديوبند)

(۲) نماز جنازہ اصل میں دعا و استغفار ہی ہے، اور مسلمانوں کا کفار کی عبادت گاہوں میں جا کر ان کے مذہبی اعمال میں شریک ہونا سخت خطرناک ہے؛ کیوں کہ اس سے ان کے اعمال دینیہ کی تعظیم اور ان کے مذہبی امور کی پسندیدگی و رضا معلوم ہوتی ہے، اور یہ باتیں شریعت مطہرہ اور غیرت اسلامی کے خلاف ہیں۔ (کفایت المفتی: ۴/ ۲۰۲، کتاب الجنائز، نواں باب: شرکت جنازۂ کفار، ط: زکریا-دیوبند)

غیر مسلم رشتہ دار کو دفن کر سکتا ہے۔ (۱) جس کی شکل یہ ہوگی کہ اس کو ایک کپڑے میں لپیٹ دے، اور گڑھا کھود کر اس میں ڈال کر دبا دے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] ’’کھوجہ‘‘ کے جنازہ میں شرکت اور مسلم قبرستان میں تدفین

۱۱۳۷- سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہمارے یہاں ایک فرقہ ’’کھوجہ‘‘ نامی [یہ فرقہ عقائد میں مثل شیعہ کے ہے] کئی سال سے رہتا ہے، ان کا کوئی مستقل قبرستان نہیں ہے، اب واقعہ یہ ہوا کہ اس فرقہ کے ایک شخص کا انتقال ہوگیا، تو انہوں نے مسلمانوں کے قبرستان میں تدفین کی اجازت چاہی، اجازت دے دی گئی اور مسلمانوں کے قبرستان میں اسے دفنایا گیا، صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا؛ بل کہ ہماری مسجد کے ایک موذن صاحب نے اس مردے کو غسل دیا اور دوسری مسجد کے امام صاحب نے نماز جنازہ بھی پڑھائی، اس سلسلے میں مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) ’’کھوجہ قوم‘‘ کے مردے کو ہمارے قبرستان میں دفنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) سنی حنفی مسلمانوں کے علاوہ کسی بھی قوم کے مردے کو ہمارے اپنے قبرستان میں دفنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(۳) اگر اس (کھوجہ کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن) کی اجازت نہیں ہے، تو مندرجہ بالا واقعہ کے متعلق اب کیا حکم ہے؟

(۴) کھوجہ قوم کے مردے کو اپنوں میں سے کوئی غسل دے سکتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) (ويغسل المسلم ويكفن ويدفن قريبه) كخاله (الكافر الأصلي)... (عند الاحتياج) فلو له قريب فالأولى تركه لهم (من غير مراعاة السنة) فيغسله غسل الثوب النجس ويلفه في خرقة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۳۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب مهم إذا قال: إن شتمت فلانا في المسجد، ط: دار الفكر☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۰۵، كتاب الجنائز، الصلاة على الميت في المسجد، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۱۸۵، باب صلاة الجنازة، سنن حمل الجنازة، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۲) "وإذا مات الكافر وله ولي مسلم، فإنه يغسله، ويكفنه، ويدفنه" بذلك أمر علي رضي الله عنه في حق أبيه أبي طالب؛ لكن يغسل غسل الثوب النجس، ويلف في خرقة، وتحفر حفيرة من غير مراعاة سنة التكفين واللحد، ولا يوضع فيها، بل يلقى. (الهداية في شرح بداية المبتدي: ۱/ ۱۸۱-۱۸۲، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، فصل في الصلاة على الميت، ط: ديوبند☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۳۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب مهم إذا قال: إن شتمت فلانا في المسجد، ط: دار الفكر)

(۵) اور ایسے مردے کی نماز جنازہ سنی مسلک کے پیش امام پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟ سنیوں کا اس کی نماز جنازہ میں شامل ہونا درست ہے یا نہیں؟

(۶) اگر غسل، نماز وغیرہ کی ممانعت ہو تو جہالت ونادانی کی وجہ سے جو کچھ ہو چکا، اس کے متعلق کیا احکام ہیں؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے بہ موجب دل سے یقین رکھ کر زبان سے کلمہ طیبہ اور کلمۂ شہادت کا اقرار کرتا ہو، یا اس کلمہ کے معنی پر یقین کر کے زبان سے اقرار کرتا ہو، وہ مسلمان ہے۔[1] اور ہر وہ شخص جو مسلمان ہو، اس کو غسل دینا، کفن پہنانا اور جنازہ کی نماز پڑھنا وپڑھانا؛ لازم وضروری اور حقوق مسلمین میں سے ہے۔[2]

البتہ جس کا عقیدہ صحیح نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر

---

(۱) الإيمان هو الإقرار باللسان والاعتقاد بالجنان وذلك أن يقروا بوحدانية الله تعالى وصفاته الأزلية وبجميع ما جاء من عنده من كتب ويعتقد بقلبه ذلك، والإقرار باللسان شرط في حق القادر على الناطق. (البحر الرائق: ۸/ ۲۰۵، كتاب الكراهية، ط: دار المعرفة-بيروت)

(۲) عن علي، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: للمسلم على المسلم ست بالمعروف، يسلم عليه إذا لقيه، ويجيبه إذا دعاه، ويشمته إذا عطس، ويعوده إذا مرض، ويتبع جنازته إذا مات، ويحب له ما يحب لنفسه. (سنن الترمذي: ۲/ ۱۰۲، رقم الحديث: ۲۷۳۶، أبواب الأدب، باب ما جاء في تشميت العاطس، ط: ديوبند)

(الصلاة عليه[الميت] فرض كفاية) بالإجماع حيث يسقط عن الآخرين بأداء البعض وإلا يأثم الكل، وقد صرح البعض بكفر من أنكر فرضيتها لأنه أنكر الإجماع وقيل: سنة.ـــــ (وشرطها) أي شرط جواز الصلاة عليه (إسلام الميت) فلا تصح على الكافر لقوله تعالى {ولا تصل على أحد منهم مات أبدا} [التوبة: ۸۴]. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-داماد آفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۱۸۲، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، فصل الصلاة على الميت، ط: دار إحياء التراث العربي☆فتح القدير: ۲/ ۱۱۷، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل في الصلاة على الميت، ط: دار الفكر-بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۱۹۳، كتاب الجنائز، شروط صلاة الجنازة، ط: دار الكتاب الإسلامي☆المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۳/ ۲۶۳، كتاب الكسب، ط: دار المعرفة-بيروت☆بدائع الصنائع: ۱/ ۳۱۱، كتاب الصلاة، فصل بيان فريضة صلاة الجنازة وكيفية فرضها، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

یقین نہ رکھتا ہو، وہ مسلمان نہیں، اس کے ساتھ کفن دفن وغیرہ میں مسلمانوں کا سا برتاؤ جائز نہیں۔ پس مذکور کھوجہ قوم کے عقائد اگر اسلام کے موافق ہیں، تو وہ مسلمان ہیں اور ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ جائز ہے، اور اگر ان کے عقائد اسلام مخالف ہیں، تو وہ مسلمان نہیں اور ان کے ساتھ اسلامی برتاؤ جائز نہیں۔"[1] مذکور قوم کے عقائد کیا ہیں؟ صحیح تحقیق کر کے تفصیل سے بیان کیجئے، تو قطعی جواب لکھا جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۴] غیر مسلم کی نماز جنازہ اور مسلمانوں کے قبرستان میں تدفین جائز نہیں

۱۱۳۸- سوال: ایک مسلمان عورت بھیلواڑا گاؤں میں رہتی ہے، جس کے یہاں ایک غیر مسلم بیوہ بھی رہتی ہے، اس کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے، پہلی شادی سے اس کی ایک لڑکی تھی، جس کا انتقال ہو گیا ہے، ایسا ارادہ ہو رہا ہے کہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفنایا جائے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفنایا جا سکتا ہے؟ اور اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟ احمد محمد پٹیل سیگپور (بھروچ)

الجواب حامداً ومصلياً:

جنازے کی نماز کی صحت کے لیے شرط یہ ہے کہ میت مسلمان ہو۔"[2]

---

(۱) لا يصلى على الكافر لقوله تعالى: {وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ فَٰسِقُونَ} (التوبة: ۸۴)، وروي أنه لما مات أبو طالب جاء علي رضي الله عنه إلى رسول الله عليه السلام، وقال: إن عمك الضال قد مات فقال عليه السلام: اغسله وكفنه وادفنه وما تحدث به حدثاً حتى تلقاني، أي: لا تصل عليه، ولأن الصلاة على الميت دعاء واستغفار له، والاستغفار للكافر حرام، قال الله تعالى: {ٱسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَن يَغْفِرَ ٱللَّهُ لَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْفَٰسِقِينَ} (التوبة: ۸۰) [المحيط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۱۸۴، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، القسم الثالث في بيان من يصلى عليه، ومن لا يصلى عليه، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت]

(۲) قال - رحمه الله -: (وشرطها) أي شرط الصلاة عليه (إسلام الميت وطهارته) أما الإسلام فلقوله تعالى {ولا تصل على أحد منهم مات أبدا} [التوبة: ۸۴] يعني المنافقين، وهم الكفرة، ولأنها شفاعة للميت إكراما له وطلبا للمغفرة، والكافر لا تنفعه الشفاعة، ولا يستحق الإكرام. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق مع حاشية الشِّلْبِيِّ - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۲۳۹، كتاب الصلاة، باب الجنائز، شرط الصلاة على الميت، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۱۸۲، باب الجنائز، فصل في الصلاة على الميت، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ فتح القدير: ۲/ ۱۱۷، باب الجنائز، فصل في الصلاة على الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: "کھوجہ" کے جنازہ میں شرکت اور مسلم قبرستان میں تدفین" کا حاشیہ نمبر: ۳۔

جب اس عورت کے ایمان لانے کی خبر گاؤں والوں میں سے بھی کسی کو نہیں ہے اور نہ خود اس عورت نے بھی آج تک اپنے ایمان کا اظہار کیا ہے، تو جب (اسی حالت میں) انتقال کرے گی، تو اس کو نہ تو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز ہوگا اور نہ ہی اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

جو لوگ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کریں گے اور اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے، وہ گنہ گار ہوں گے۔

یہی حکم اس کی لڑکی کا بھی ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] سمندر کے کنارے ملنے والی نامعلوم لاش کی تدفین کا حکم

۱۱۳۹- سوال: ایک عورت کی لاش سمندر میں بہتی ہوئی کنارے پر پہنچی، لاش بالکل ننگی تھی، اس کے پاس پہلے دو غیر مسلم شخص آئے، بعد میں دو مسلمان آدمی آئے، غیر مسلم یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم اس لاش کو جلائیں گے اور مسلمان کہہ رہے ہیں کہ ہم اس کو اپنے قبرستان میں دفنائیں گے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس لاش کی کس طرح تحقیق کی جائے کہ یہ مسلمان عورت کی لاش ہے یا کسی کافر کی، واضح رہے کہ میت کے بدن پر کوئی علامت ونشان بھی نہیں کہ جس کے ذریعہ پہچانا جائے، تو اب اس عورت کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ احمد اسحاق یعقوب پٹیل

الجواب حامداومصلیا:

مسلمانوں کی لاش کو پہچاننے کے لیے علامات: ختنہ، خضاب اور زیر ناف بالوں کی صفائی ہے، عورت میں ختنہ نہیں ہے؛ لہٰذا سہولت اور آسانی سے اس کی لاش مل جائے، تو اس کو غسل وکفن دے دیا جائے

(۱) وأصل الاختلاف في كتابية تحت مسلم حبلت ثم ماتت وفي بطنها ولد مسلم لا يصلى عليها بالإجماع؛ لأن الصلاة على الكافرة غير مشروعة، وما في بطنها لا يستحق الصلاة عليه ولكنها تغسل وتكفن، واختلف الصحابة في الدفن، قال بعضهم: تدفن في مقابر المسلمين ترجيحا لجانب الولد، وقال بعضهم: في مقابر المشركين؛ لأن الولد في حكم جزء منها ما دام في البطن، وقال واثلة بن الأسقع: يتخذ لها مقبرة على حدة، وهذا أحوط. (بدائع الصنائع: ۱/ ۳۰۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، فصل شرائط وجوب الغسل، ط: دار الكتب العلمية☆ رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۲۲، باب صلاة الجنازة، مطلب في حديث: كل سبب ونسب منقطع إلا سببي ونسبي، ط: دار الفكر - بيروت)

اور نماز جنازہ پڑھ کر قبرستان کے کسی کونے میں دفن کر دیا جائے، لڑائی جھگڑے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ (شامی: ۱/ ۸۰۵)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] لو لم يدر أمسلم أم كافر، ولا علامة فإن في دارنا غسل وصلي عليه وإلا لا. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله فإن في دارنا إلخ) أفاد بذكر التفصيل في المكان بعد انتفاء العلامة أن العلامة مقدمة وعند فقدها يعتبر المكان في الصحيح لأنه يحصل به غلبة الظن كما في النهر عن البدائع. وفيها أن علامة المسلمين أربعة الختان والخضاب ولبس السواد وحلق العانة اهـ قلت: في زماننا لبس السواد لم يبق علامة للمسلمين. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۰۰، باب صلاة الجنازة، مطلب في حديث "كل سبب ونسب منقطع إلا سببي ونسبي"، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۰۳، فصل شرائط وجوب الغسل، ط: دار الكتب العلمية ☆ حاشية الطحطاوي، ص: ۲۳۰، باب أحكام الشهيد، ط: دار الكتب العلمية)

ومن لا يدرى أنه مسلم أو كافر فإن كان عليه سيما المسلمين أو في بقاع دار الإسلام يغسل وإلا فلا، كذا في معراج الدراية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۹، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في الغسل، ط: دار الفكر - بيروت)

عن علی بن أبي طالب، أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال له: " یا علی، ثلاث لا تؤخرها: الصلاة إذا آنت، والجنازة إذا حضرت، والأیم إذا وجدت لها کفوا ".

(ترمذی شریف: ۱/ ۴۳، حدیث نمبر: ۱۷۱، ط: دیوبند)

باب ما یتعلق بدفن المیت

[تدفین کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب ما یتعلق بتدفین المیت

[تدفین کا بیان]

[۱] تدفین کے بعد فاتحہ اور تلقین کا حکم

۱۱۴۰- سوال: میت کو دفنانے کے بعد چالیس قدم لوٹنے کے بعد فاتحہ پڑھنا، اور قبر کے سامنے بیٹھ کر تلقین وغیرہ کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جنازہ کی نماز کے بعد یا کفن کے بعد یا مکان سے نکل کر یعنی گھر سے باہر فاتحہ پڑھنا، اور بلند آواز سے کلمہ وغیرہ پڑھنا، احادیث اور خلفائے راشدین کے عمل سے ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا جائز نہیں ہے۔[1] بل کہ غیر شرعی اور غیر مسنون عمل کو سنت یا ثواب سمجھ کر جو شخص انجام دے گا، تو ارتکاب بدعت کی وجہ سے گنہ گار ہوگا۔[2]

---

(۱) وعلى متبعي الجنازة الصمت، ويكره لهم رفع الصوت بالذكر وقراءة القرآن، كذا في شرح الطحاوي، فإن أراد أن يذكر الله يذكره في نفسه، كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۱۶۲، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الرابع في حمل الجنازة، ط: دار الفكر)

(۲) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/ ۷۷، رقم الحديث: ۱۷- ۱۷۱۸، كتاب الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة، ورد محدثات الأمور، ط: ديوبند)

قال الملا علي القاري: (من أحدث)، أي: جدد وابتدع أو أظهر واخترع في أمرنا هذا)، أي: في دين الإسلام، =

البتہ تلقین کے متعلق تفصیل ہے: سکرات کے وقت یہ مسنون ہے؛ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت تلقین کرنے کی اجازت دی ہے، دوسری تلقین دفن کرنے کے بعد ہے، وہ اس طرح کہ میت کو کہے: "یافلان بن فلان! قل: رضیت باللہ ربا و بالإسلام دینا و بمحمد رسولا" تو شرعاً اس کی گنجائش ہے، مگر بہتر نہیں ہے۔[۳] یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص ؓ نے فرمایا کہ: جب میری تدفین سے فارغ ہوجاؤ، تو میری قبر کے پاس اتنی دیر ٹھہرنا، کہ جس میں اونٹ ذبح کرکے، اس کا گوشت تقسیم کیا جاسکے۔ (مسلم شریف)[۴]

=... وعبر عنه بالأمر تنبيها على) أن هذا الدين هو أمرنا الذي نهتم له، ونشتغل به، بحيث لا يخلو عنه شيء من أقوالنا وأفعالنا.... (ماليس منه): كذافي "الصحيحين"، والحميدي و"جامع الأصول" و"شرح السنة" وفي "المشارق" وبعض نسخ المصابيح "ماليس فيه" (فهو)، أي: الذي أحدثه (رد)، أي: مردود عليه.... ـــــــ قال القاضي: المعنى من أحدث في الإسلام رأيا لم يكن له من الكتاب والسنة سند ظاهر، أو خفي ملفوظ، أو مستنبط فهو مردود عليه.... ـــــــ وفي رواية لمسلم: (من عمل عملا) أي من أتى بشيء من الطاعات، أو بشيء من الأعمال الدنيوية، والأخروية، سواء كان محدثا أو سابقا على الأمر، ليس عليه أمرنا، أي: وكان من صفته أنه ليس عليه إذننا بل أتى به على حسب هواه فهو رد. أي: مردود غير مقبول، فهذه الرواية أعم، وهذا الحديث عماد في التمسك بالعروة الوثقى، وأصل في الاعتصام بحبل الله الأعلى، ورد للمحدثات والبدع والهوى. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ١٠١٤هـ): ١/ ٢٢٢، رقم الحديث: ١٤٠، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، ط: دار الفكر-بيروت)

(٣) (قوله ولقن الشهادتين) لقوله-عليه الصلاة والسلام-: "لقنوا موتاكم شهادة أن لا إله إلا الله"، والمراد الذي قرب من الموت، وصورة التلقين أن يقال عنده في حالة النزع جهرا وهو يسمع أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا رسول الله... ولا يقال له قل ويلقن قبل الغرغرة ولا يلح عليه في قولها مخافة أن يضجر فإذا قالها مرة لا يعيدها عليه الملقن إلا أن يتكلم بكلام غيرها قال-عليه الصلاة والسلام-: من كان آخر كلامه لا إله إلا الله دخل الجنة"، وأما تلقين الميت في القبر فمشروع عند أهل السنة؛ لأن الله تعالى يحييه في القبر، وصورته أن يقال: يافلان بن فلان، أو يا عبد الله بن عبد الله، اذكر دينك الذي كنت عليه، وقد رضيت بالله ربا وبالإسلام دينا وبمحمد نبيا. (الجوهرة النيرة: ١/ ١٠١، كتاب الصلاة، باب الجنائز، ط: المطبعة الخيرية ☆رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ١٩٠-١٩١، باب صلاة الجنازة، مطلب في التلقين بعد الموت، ط: دار الفكر-بيروت)

[٤] عن ابن شماسة المهري، قال: حضرنا عمرو بن العاص، وهو في سياقة الموت، يبكي طويلا، وحول وجهه إلى الجدار،... فإذا أنا مت فلا تصحبني نائحة، ولا نار، فإذا دفنتموني فشنوا علي التراب شنا، ثم أقيموا حول قبري قدر ما تنحر جزور ويقسم لحمها، حتى أستأنس بكم، وأنظر ماذا أراجع به رسل ربي. (الصحيح لمسلم: ١/ ٧٦، رقم الحديث: ١٩٢-١٢١، كتاب الإيمان، باب كون الإسلام يهدم ما قبله وكذا الهجرة والحج، ط: ديوبند) =

اس روایت میں غور کیجیے کہ انہوں نے ٹھہرنے کی تو وصیت کی ہے، تلقین کی نہیں؛ لہٰذا دفن کے بعد میت کے لیے طویل دعا کرنا تو جائز ہے، جیسا کہ طحطاوی علی مراقی الفلاح (۳۰۶)[۵] اور شامی (۱/۷۱۷-۸۳۸)[۶] میں ہے، اسی طرح عالم گیری میں ہے کہ: دفن کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کی جاوے اور میت کے لیے دعاء کی جائے، یہ جائز ہے۔ (ج:۱/ص:۱۳۳)[۷] پس تلقین، قراءت، تسبیح، تحمید جائز ہے، لیکن مروجہ مخصوص فاتحہ جائز نہیں۔[۸] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= مزید دیکھیے: حاشية الطحطاوي، ص: ٥٦٠، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، ت: عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية ☆ رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ٢٣٧، باب صلاة الجنائز، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ١/ ١٦٦، كتاب الصلاة، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر و الدفن و النقل من مكان، ط: دار الفكر)

[٥] وكيف لا يفعل مع أنه لا ضرر فيه بل فيه نفع للميت لأنه يستأنس بالذكر على ما ورد في بعض الآثار ففي صحيح مسلم عن عمرو بن العاص قال: "إذا دفنتموني أقيموا عند قبري قدر ما ينحر جزور ويقسم لحمها حتى أستأنس بكم وأنظر ماذا أراجع رسل ربي" وعن عثمان قال كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا فرغ من دفن الميت وقف عليه وقال: "استغفروا الله لأخيكم واسألوا الله له التثبيت فإنه الآن يسئل" رواه أبو داود والبيهقي بإسناد حسن ذكره الحلبي. (حاشية الطحطاوي، ص: ٥٦٠، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، ط: دار الكتب العلمية)

[٦] وجلوس ساعة بعد دفنه لدعاء وقراءة بقدر ما ينحر الجزور ويفرق لحمه. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: وجلوس إلخ) لما في سنن أبي داود "كان النبي - صلى الله عليه وسلم - إذا فرغ من دفن الميت، وقف على قبره، وقال: استغفروا لأخيكم واسألوا الله له التثبيت، فإنه الآن يسأل" وكان ابن عمر يستحب أن يقرأ على القبر بعد الدفن أول سورة البقرة وخاتمتها. وروي أن عمرو بن العاص قال وهو في سياق الموت: إذا أنا مت فلا تصحبني نائحة ولا نار، فإذا دفنتموني فشنوا علي التراب شنا، ثم أقيموا حول قبري قدر ما ينحر جزور، ويقسم لحمها حتى أستأنس بكم وأنظر ماذا أراجع رسل ربي، جوهرة. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ٢٣٧، باب صلاة الجنائز، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر)

[٧] ويستحب إذا دفن الميت أن يجلسوا ساعة عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ينحر جزور ويقسم لحمها، يتلون القرآن ويدعون للميت، كذا في الجوهرة النيرة.ـــــ قراءة القرآن عند القبور عند محمد - رحمه الله تعالى - لا تكره ومشايخنا - رحمهم الله تعالى - أخذوا بقوله وهل ينتفع؟ والمختار أنه ينتفع، هكذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ١/ ١٦٦، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن والنقل من مكان، ط: دار الفكر)

(۸) تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: میت کے گھر قرآن خوانی کا حکم (فتاویٰ فلاحیہ: ۱/ ۴۰۷-۴۰۸، سوال نمبر: ۲۳۷)، قرآن خوانی کے بعد ناشتہ کرانا (ص: ۴۰۹، سوال نمبر: ۲۳۸)

[۲] پیر صاحب کا میت کو ''دنیادار'' بتلا کر قبر پر مٹی ڈالنے سے انکار کرنا

۱۱۴۱- سوال: محلہ کے ایک شخص کا انتقال ہوگیا، جب اس کو قبر میں دفن کے لیے رکھا گیا، تو پیر صاحب نے کہا: میت ''ترک دنیا'' نہیں تھا؛ اس لیے میں اس کو ''مشت خاک'' (مٹی) نہیں دوں گا؛ چناں چہ پیر صاحب نے مٹی نہیں ڈالی، باقی سب لوگوں نے ہاتھ سے مٹی ڈالی، تو سوال یہ ہے کہ ''ترک دنیا'' کا کیا مطلب ہے؟ اور مرنے والا اگر ''ترک دنیا'' نہ ہو، تو ''مشت خاک'' نہ دینے کا حکم صرف پیر صاحب کے لیے ہے، یا تمام حضرات کے لیے؟ واضح رہے کہ پیر صاحب محلہ کی مسجد میں ۴۹ ر سال سے نماز پڑھاتے ہیں، ان کا یہ طریقہ شرعاً کس حد تک درست ہے؟ بیان فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

میت کی تدفین کے وقت جو لوگ حاضر ہوتے ہیں، ان کے لیے مستحب ہے کہ، تین لپ بھر کر مٹی میت کی قبر پر ڈالیں، پہلی بار ڈالتے وقت ''منها خلقناكم'' دوسری بار ''وفيها نعيدكم'' اور تیسر بار ''ومنها نخرجكم تارة اخرى'' پڑھیں۔ (عالم گیری: ۱ / ۱۳۳)[۱]

آپ نے جس شخص کے لیے ''پیر صاحب'' کا لفظ لکھا ہے، وہ پیر تو کیا ہیں، آپ کی تحریر کے مطابق، ''نیک صالح اور دین دار انسان'' بھی معلوم نہیں ہوتے، اسلامی شریعت کے موافق، علماء کے بیان، اور رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات کے مطابق اس کا عمل نہیں ہے۔ علماء لکھتے ہیں کہ مستحب ہے کہ غسل دینے والا دین دار اور قابل اعتماد شخص ہو؛ تا کہ غسل دیتے وقت میت کے اندر کوئی خرابی یا عیب نظر آئے، تو عوام کے سامنے اس کا افشا نہ کرے، اور اگر کوئی اچھی چیز، خوشبو وغیرہ محسوس کرے، تو اس کو بیان کرے، پس میت کا چہرہ کالا ہو جائے، یا اس کے بدن سے بدبو آئے یا اس کی شکل وصورت بدل جائے، تو لوگوں میں اس بات

---

[۱] ويستحب لمن شهد دفن الميت أن يحثو في قبره ثلاث حثيات من التراب بيديه جميعا ويكون من قبل رأس الميت ويقول في الحثية الأولى: منها خلقناكم وفي الثانية: وفيها نعيدكم وفي الثالثة: ومنها نخرجكم تارة أخرى، كذا في الجوهرة النيرة. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱۶۶/۱، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن والنقل من مكان إلى آخر، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲ / ۲۳۷، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر - ديوبند ☆ الجوهرة النيرة: ۱۰۹/۱، كتاب الصلاة، باب الجنائز، ط: المطبعة الخيرية ☆ حاشية الطحطاوي، ص: ۶۱۱، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

کو ظاہر کرنا جائز نہیں، البتہ اگر مرنے والا بدین ہو، اور اعلانیہ گناہوں کا ارتکاب کرتا ہو، تو پھر (عبرت کے لیے) اس کے عیوب کا ظاہر کرنا جائز ہے۔ (عالم گیری: ۱/ ۱۸۲)[۲]

مذکورہ شخص جس کے لیے آپ نے ''پیر صاحب'' کا لفظ لکھا ہے، وہ ذی علم بھی معلوم نہیں ہوتا، کیوں کہ اس کا جو قول آپ نے نقل کیا ہے کہ وہ [میت] ''ترک دنیا نہیں ہے''، وہ عربی زبان کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے، اپنے اس پیر سے ذرا پوچھو کہ عربی لغت میں ''ترک دنیا'' کا کیا مطلب ہے؟ صحیح لفظ ''تارک دنیا نہیں'' ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ شخص دنیا سے بے رغبت نہیں ہے، یعنی دنیا میں وہ بہت مشغول رہتا تھا، کھیتی اور دوکان داری وغیرہ میں اتنا مشغول تھا کہ اس کی وجہ سے نماز وروزہ اور دیگر عبادتوں کی پابندی نہیں کرتا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس امام کو آج اس کی موت کے وقت ان الفاظ کو کہنے کا موقع ملا، زندگی میں کیوں اس کو نصیحت نہیں کی، جب مرحوم بہ قید حیات تھا، اس وقت نصیحت کا موقع تھا اور وہ نصیحت مرحوم کے لیے مفید بھی ہوتی۔[۳] اگر مرحوم نماز وروزہ کا پابند تھا اور کھیتی بھی کرتا تھا، تو اس کے حق میں ''تارک

---

[۲] يستحب أن يكون الغاسل ثقة يستوفي الغسل ويكتم ما يرى من قبيح ويظهر ما يرى من جميل فإن رأى ما يعجبه من تهلل وجهه وطيب رائحته وأشباه ذلك يستحب له أن يحدث به الناس وإن رأى ما يكره من سواد وجهه ونتن رائحته وانقلاب صورته وتغير أعضائه وغير ذلك لم يجز له أن يحدث به أحدا، كذا في الجوهرة النيرة.
فإن كان الميت مبتدعا مظهرا البدعته ورأى الغاسل منه ما يكره فلا بأس بأن يحدث به الناس ليكون زجرا لهم عن البدعة، كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/ ۱۶۲، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۰۲، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، قبيل مطلب في الكفن، ط: دار الفكر)
(۳) عن تميم الداري أن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: ''الدين النصيحة'' قلنا: لمن؟ قال: ''لله ولكتابه ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامتهم''. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۵۴، رقم الحديث: ۹۵- ۵۵، كتاب الإيمان، باب بيان أن الدين النصيحة، ط: ديوبند)

وأما نصيحة العامة: فإرشادهم لمصالحهم في آخرتهم ودنياهم، وكف الأذى عنهم: وتعليم ما جهلوا، وإعانتهم على البر والتقوى، وستر عوراتهم والشفقة عليهم، وأن يحب لهم ما يحب لنفسه من الخير . . . . ومنها: إن النصيحة فرض على الكفاية لازمة على قدر الطاقة إذا علم الناصح أنه يقبل نصحه، ويطاع أمره وأمن على نفسه المكروه، فإن خشي فهو في سعة. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵ھ): ۱/ ۳۲۲، كتاب الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: الدين النصيحة، لله ولرسوله . . . ، ط: دار إحياء التراث العربي)

دنیا نہیں ہے" کہنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ اپنے متعلقین کو چھوڑ کر رہبانیت اختیار کرو۔ (۴) بل کہ اہل وعیال اور متعلقین کے ساتھ مل جل کر رہنا، ان کے حقوق ادا کرنا اور اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنا، اور اس پر عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی آباد کرنا ہی اسلام میں مطلوب ہے، پس تجارت کرنے والے یا کھیتی کرنے والے کو شاغل دنیا کہنا صحیح نہیں؛ کیوں کہ مذکورہ کام کر کے ان کی کفالت بھی ضروری ہے، جن کا نفقہ اس پر لازم ہے؛ لہٰذا اگر اس میں صحیح نیت کے ساتھ کوئی لگتا ہے، تو اس کو دنیادار کہنا قطعاً جائز نہیں۔ (۵) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۴) وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۖ فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ (۵۷-الحدید:۲۷)

وقال: الرهبانية من أفعال العباد لأنها المبالغة في العبادة بالرياضة والانقطاع عن الناس،... للرهبانية معنيان الخوف المفرط مثلا، ويراد في جعلنا في قلوبهم رهبانية والأعمال التعبدية الشاقة كرفض الدنيا وشهواتها من النساء وغيرهن.(روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني- شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م:۱۲۷۰هـ): ۱۹۰/۱۴، سورة الحديد، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية -بيروت)

عن سعد بن مسعود، أن عثمان بن مظعون، أتى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: ائذن لنا في الاختصاء، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ليس منا من خصى ولا اختصى، إن خصاء أمتي الصيام، فقال: يا رسول الله، ائذن لنا في السياحة، فقال: إن سياحة أمتي الجهاد في سبيل الله، قال: يا رسول الله، ائذن لنا في الترهب، فقال: إن ترهب أمتي الجلوس في المساجد انتظار الصلاة.

ويروى: لا رهبانية في الإسلام، وذلك مثل الاختصاء، واعتناق السلاسل، وما أشبه ذلك مما كانت الرهبانية تتكلفه وتبتدعه، وضعت عن هذه الأمة.(شرح السنة-محيي السنة، أبو محمد الحسين بن مسعود بن محمد بن الفراء البغوي الشافعي (م:۵۱۶هـ): ۳۷۰/۲، رقم الحديث: ۴۸۳، كتاب الصلاة، باب فضل القعود في المسجد لانتظار الصلاة، ت: شعيب الأرنؤوط-محمد زهير الشاويش، ط: المكتب الإسلامي-دمشق، بيروت)

(۵) عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: خير الصدقة ما كان عن ظهر غنى، وابدأ بمن تعول. (صحيح البخاري: ۸۰۶/۲، رقم الحديث: ۵۳۵۶، كتاب النفقات، باب وجوب النفقة على الأهل والعيال، ط: البدر-ديوبند)

و في هذا الحديث أحكام ـــــــ الأول: أن حق نفس الرجل يقدم على حق غيره. الثاني: أن نفقة الولد والزوجة فرض بلا خلاف.(عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م:۸۵۵هـ): ۱۵/۲۱، رقم الحديث: ۵۳۵۵، كتاب النفقات، باب: وجوب النفقة على الأهل والعيال، ط: دار إحياء التراث العربي)

[۳] میت کو رات میں دفن کرنا

۱۱۴۲- سوال: اگر رات میں کسی کی موت ہو جائے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تو اس کی نماز جنازہ اور تدفین رات میں جائز ہے یا نہیں؟ یا رات میں ممنوع ہے اور دن میں کرنا ضروری ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً

میت کی تدفین میں جلدی کرنا مستحب ہے؛ اس لیے رات میں تدفین جائز ہے۔ (شامی: ۱/ ۸۴۷، مجمع الأنہر: ۱/ ۱۸۸)[1]

---

(۱) عن أبي أمامة بن سهل بن حنيف أنه أخبره، أن مسكينة مرضت، فأخبر رسول الله صلى الله عليه وسلم بمرضها، وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعود المساكين، ويسأل عنهم، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا ماتت فآذنوني، فأخرج بجنازتها ليلا، وكرهوا أن يوقظوا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فلما أصبح رسول الله صلى الله عليه وسلم أخبر بالذي كان منها، فقال: ألم آمركم أن تؤذنوني بها، قالوا: يا رسول الله، كرهنا أن نوقظك ليلا، فخرج رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى صف بالناس على قبرها، وكبر أربع تكبيرات. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي-أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳ھ): ۴/ ۴۰، رقم الحديث: ۱۹۰۷، كتاب الجنائز، الإذن بالجنازة، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية-حلب ☆ الموطأ- مالك بن أنس بن مالك بن عامر الأصبحي المدني (م: ۱۷۹ھ): ۲/ ۳۱۸، رقم الحديث: ۴۵۸/ ۷۷۴، كتاب الجنائز، ما جاء في التكبير على الجنائز، ت: محمد مصطفى الأعظمي، ط: مؤسسة زايد بن سلطان آل نهيان للأعمال الخيرية والإنسانية-أبو ظبي-الإمارات)

عن علي بن أبي طالب، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال له: "يا علي، ثلاث لا تؤخرها: الصلاة إذا آنت، والجنازة إذا حضرت، والأيم إذا وجدت لها كفوا". (سنن الترمذي: ۱/ ۴۳، رقم الحديث: ۱۷۱، كتاب الصلاة، باب الوقت الأول من الفضل، وراجع رقم الحديث: ۱۰۷۵ ☆ مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۲/ ۱۹۷، رقم الحديث: ۸۲۸، مسند علي بن أبي طالب رضي الله تعالى عنه، ط: الرسالة)

لا يكره الدفن ليلا. (الدر المختار)ــــ قال ابن عابدين: (قوله: ولا يكره الدفن ليلا) والمستحب كونه نهارا شرح المنية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۵، باب صلاة الجنائز، تتمة قطع النبات الرطب والحشيش من المقبرة دون اليابس، مطلب في وضع الجريد ونحو الآس على القبور، ط: دار الفكر)

وفي البرهان ويكره الدفن ليلا بلا عذر لقوله صلى الله عليه وسلم: "لا تدفنوا موتاكم بالليل إلا أن تضطروا" رواه ابن ماجه، وفي الجوهرة: لا بأس بذلك؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم دفن ليلة أربعاء وعثمان وفاطمة و=

علماء نے دن میں تدفین کو مستحب لکھا ہے؛ کیوں کہ اس میں تدفین میں شریک ہونے والوں کے لیے سہولت وآسانی ہوتی ہے، پس اگر رات میں سنت طریقہ پر تدفین کے لیے لوگ جمع ہو جاتے ہوں، تو رات میں تدفین بلا کراہت جائز ہے، خواہ میت مرد ہو یا عورت۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] نومولود کے مرنے پر غسل، کفن، دفن وغیرہ کے احکام

۱۱۴۳- سوال: محترم حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم بمندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات عنایت فرمائیں:۔۔۔(۱) بچہ زندہ پیدا ہو، پھر مرجائے، تو اس کے غسل اور کفن ودفن وغیرہ کے متعلق کیا حکم ہے؟

بچے کے بدن کا نصف سے زائد حصہ اس حال میں خارج ہوا ہو کہ وہ زندہ ہو، تو اسے زندہ شمار کیا جاتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ نصف سے زائد حصہ کسے کہتے ہیں؟

(۲) اگر بچہ زندہ نہ نکلے؛ لیکن اس کے اعضاء بن چکے ہوں، تو کیا حکم ہے؟

(۳) اگر کچھ بھی اعضاء نہ بنے ہوں، تو کیا حکم ہے؟

(۴) بچہ جب مرا ہوا پیدا ہو، تو اس کی نال کو جدا کر کے دفن کیا جائے یا نال کے ساتھ؟

(۵) اگر عورت مرجائے اور بچہ پیٹ میں زندہ ہو، تو کیا کیا جائے؟ اسی طرح برعکس صورت ہو یعنی بچہ مرجائے اور عورت زندہ ہو تو؟ نیز بچہ اور ماں دونوں مرجائے، تو اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامدا ومصلیا:

(۱) بچہ جب زندہ پیدا ہو، پھر مرجائے، تو اس کے لیے سنت کے موافق غسل، کفن، دفن اور نماز جنازہ کا حکم ہے، نصف سے زائد حصہ اس حال میں خارج ہوا ہو کہ وہ زندہ ہو، تب بھی یہی حکم ہے، یعنی اگر سر

=عائشة رضي الله تعالى عنهم دفنوا ليلا، ولكنه بالنهار أفضل، لأنه أمكن اهـ (حاشية الطحطاوي على المراقي- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱هـ) ص:۶۱۳، فصل في حملها و دفنها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ولا يكره الدفن ليلا، والمستحب النهار، وهو قول أهل العلم من فقهاء الأمصار، منهم عقبة بن عامر، وسعيد بن المسيب، وشريح، وعطاء، والثوري، والشافعي، وأحمد، وإسحاق، وكرهه الحسن البصري والظاهرية، لحديث جابر قال: زجر النبي - عَلَيْهِ السَّلَامُ - أن يقبر الرجل بالليل حتى يصلى عليه، إلا أن يضطر إنسان إلى ذلك، رواه مسلم. (البناية شرح الهداية- بدر الدين العيني (م:۸۵۵هـ): ۳/۲۶۱، فصل في الدفن، الدفن ليلا، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

کی طرف سے خارج ہوا (نکلا) ہو، تو سینہ نکلنے تک، اور پیر کی طرف سے خارج ہوا ہو، تو ناف کا حصہ نکلنے تک اگر وہ بہ قید حیات ہے، تو وہ زندہ بچے کے حکم میں ہے۔[1] اور اس کے لیے وہ سب احکام ہوں گے، جو مکمل زندہ پیدا ہونے والے بچے کے ہیں۔ اور زندہ پیدا ہونے سے مراد یہ ہے کہ بچے نے کوئی آواز نکالی ہو، یا کوئی حرکت کی ہو، مثلاً آنکھ جھپکنا وغیرہ۔ (طحطاوی: ۳۲۸، شامی: ۱/ ۸۲۹)[2]

اور زندہ پیدا ہوا یا نہیں؟ اس کے متعلق عادل دایہ، یا بچے کی ماں کی شہادت بھی معتبر ہوگی، پس غسل ونماز کی بابت اس کی شہادت پر عمل کیا جائے گا، اور دینی خبروں میں (جب کہ اس میں الزام نہ ہو) ایک عادل کی گواہی معتبر ہوتی ہے۔ (شامی: ۱/ ۸۲۹)[3]

(۲) بچہ مرا ہوا پیدا ہوا، تو اگر اس کے جسم کے تمام اعضاء بن چکے ہیں، تو اس کو نہلایا جائے، کفنایا جائے، نام رکھا جائے اور قبرستان میں دفن کردیا جائے؛ لیکن نماز نہیں پڑھی جائے گی۔[4] اور نصف اعضاء بنے ہوں (یعنی آدھا دھڑ ہو) یا کوئی ایک عضو بنا ہو، جس کو پہچانا جاسکتا ہو، تو اس کو نہلانے کے متعلق علماء کا

---

(۱) وجد الأكثر من قبل الرجل سرته، ومن قبل الرأس صدره، نهر عن منية المفتي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۲۷، باب صلاة الجنازة، مطلب مهم: إذا قال: إن شتمت فلانا في المسجد، ط: دار الفكر - بيروت ☆ حاشية الطحطاوي، ص: ۵۹۶، باب أحكام الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۲] (ومن ولد فمات يغسل ويصلى عليه) ويرث ويورث ويسمى (إن استهل) ... أي وجد منه ما يدل على حياته بعد خروج أكثره. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله يغسل ويصلى عليه) أي ويكفن، ولم يصرح به لعلمه مما ذكره لأن ستر العورة شرط لصحة الصلاة تأمل... (قوله أي وجد منه ما يدل على حياته) أي من بكاء أو تحريك عضو أو طرف ونحو ذلك بدائع، وهذا معناه في الشرع كما في البحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۲۷، باب صلاة الجنازة، مطلب مهم: إذا قال: إن شتمت فلانا في المسجد، ط: دار الفكر - بيروت ☆ حاشية الطحطاوي، ص: ۵۹۶، باب أحكام الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۳] ولو شهدت القابلة أو الأم على الاستهلال تقبل في حق الغسل والصلاة عليه لأن خبر الواحد في الديانات مقبول إذا كان عدلا. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۲۷، باب صلاة الجنازة، مطلب مهم: إذا قال: إن شتمت فلانا في المسجد، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۰۲، فصل شرائط وجوب الغسل، ط: دار الكتب العلمية)

(۴) (ومن ولد فمات يغسل ويصلى عليه) ويرث ويورث ويسمى (إن استهل) ... (وإلا) يستهل (غسل وسمي) عند الثاني وهو الأصح فيفتى به على خلاف ظاهر الرواية؛ إكراما لبني آدم كما في ملتقى البحار.... (وأدرج في خرقة ودفن ولم يصل عليه). [الدر المختار مع الشامي: ۲/ ۲۲۷-۲۲۸، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة ☆ البحر الرائق مع منحة الخالق: ۲/ ۲۰۲، كتاب الجنائز، الصلاة على الميت في المسجد، ط: دار الكتاب الإسلامي]

اختلاف ہے، بعض نے فرمایا کہ اس کو غسل دیا جائے گا، جب کہ بعض علماء کی رائے ہے کہ اسے غسل نہیں دیا جائے گا۔ شامی اور طحطاوی وغیرہ میں ہے کہ جن علماء نے غسل سے منع کیا ہے، تو ان کی مراد ''غسل مسنون'' ہے، یعنی سنت کے مطابق غسل دینا ضروری نہیں، اور جنھوں نے غسل کا کہا ہے، ان کی مراد صرف پانی بہا دینا ہے اور ایک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دینا ہے، گویا اس مسئلے میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے۔[۵]

خلاصہ یہ کہ مرا ہوا بچہ پیدا ہونے کی صورت میں اگر اس کے کچھ اعضاء بن چکے ہوں، تو پانی بہا کر، نام رکھ کر، ایک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے گا، مسنون غسل اور مسنون کفن کا التزام نہیں کیا جائے گا، نیز نماز بھی نہیں پڑھی جائے گی۔

(۳) آپ نے جو صورت لکھی ہے کہ کوئی عضو نہ بنا ہو، تو وہ یا تو خون ہوگا یا گوشت کا لوتھڑا ہوگا، اس کے لیے غسل، کفن؛ بل کہ دفن کا بھی حکم نہیں ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے، جب کہ حمل کے چار مہینے نہ ہوئے ہوں؛ چار مہینہ کے بعد تو بچے کے اعضاء بن جاتے ہیں اور اس میں روح آجاتی ہے۔[۶] شامی، طحطاوی اسی

(۵) (قوله: وإلا يستهل غسل وسمي) شمل ما تم خلقه، ولا خلاف في غسله وما لم يتم، وفيه خلاف. والمختار أنه يغسل ويلف في خرقة، ولا يصلى عليه كما في المعراج والفتح والخانية والبزازية والظهيرية شرنبلالية. وذكر في شرح المجمع لمصنفه أن الخلاف في الأول، وأن الثاني لا يغسل إجماعا. اهـ ـــــــ واغتر في البحر بنقل الإجماع على أنه لا يغسل، فحكم على ما في الفتح والخلاصة من أن المختار تغسيله بأنه سبق نظرهما إلى الذي تم خلقه أو سهو من الكاتب. واعترضه في النهر بأن ما في الفتح والخلاصة عزاه في المعراج إلى المبسوط والمحيط اهـ وعلمت نقله أيضا عن الكتب المذكورة. وذكر في الأحكام أنه جزم به في عمدة المفتي والفيض والمجموع والمبتغى اهـ فحيث كان هو المذكور في عامة الكتب فالمناسب الحكم بالسهو على ما في شرح المجمع لكن قال في الشرنبلالية: يمكن التوفيق بأن من نفى غسله أراد غسل المراعى فيه وجه السنة، ومن أثبته أراد الغسل في الجملة كصب الماء عليه من غير وضوء، وترتيب لفعله كغسله ابتداء بسدر وحرض. اهـ. قلت: ويؤيده قولهم ويلف في خرقة حيث لم يراعوا في تكفينه السنة فكذا غسله. (رد المحتار على الدر المختار: ۲۲۸/۲، باب صلاة الجنازة، مطلب مهم: إذا قال: إن شتمت فلانا في المسجد، ط: دار الفكر ☆ حاشية الطحطاوي، ص: ۵۹۲، باب أحكام الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۶) قال القاضي عياض ولم يختلف أن نفخ الروح فيه يكون بعد مائة وعشرين يوما وذلك تمام أربعة أشهر ودخوله في الخامس وهذا موجود بالمشاهدة. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۲۹۵/۳، كتاب الحيض، باب مخلقة وغير مخلقة، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت ☆ حاشية النووي على الصحيح لمسلم: ۱۹۱/۱۶، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي في بطن أمه، وكتابة رزقه، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

طرح فقہ کی دیگر کتابیں اور اوران کی شروحات میں ہے کہ جب چار مہینے مکمل ہونے کے بعد حمل ساقط ہوجائے، تو قیامت کے دن اس کو پورا بچہ بنا کر اٹھایا جائے گا اور وہ بچہ اپنے ماں باپ کے حق میں سفارش کرے گا۔(۷) اس لیے اوپر (شق نمبر دو میں) پانی بہانے (نہلانے) کا جو حکم ہے، وہ اسی احترام کے پیش نظر ہے کہ قیامت کے دن اس کو مکمل کر کے اٹھایا جائے گا۔(۸)

پس جس میں روح نہ ڈالی گئی ہو اور اس کی پہچان عموماً اس طرح ہوتی ہے کہ جسم کا کوئی حصہ نہ بنا ہو، تو اس کے لیے پانی بہانے، کفنانے اور دفنانے کا حکم نہیں ہے۔

(۴) نال کے متعلق حکیم الامت حضرت اقدس تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس کا کوئی صریح حکم مجھے نہیں ملا، البتہ فقہ کا مسئلہ ہے کہ میت کے بال اور ناخن کاٹنا مکروہ ہے، اسی طرح ختنہ کرنا بھی جائز نہیں، اس کے اوپر قیاس کر کے کہا جاسکتا ہے کہ نال کو نہیں کاٹا جائے گا۔ (اوپر شق نمبر تین میں بیان کردہ) حضرت علی کی روایت کے بہ موجب جو بچہ ناقص الخلقت پیدا ہوتا ہے، وہ بھی قیامت کے دن اپنے والدین کو، جو جہنم میں جاچکے ہوں گے، سفارش کر کے جنت میں داخل کرائے گا، وہ اپنی نال کے ذریعہ کھینچ کر جہنم سے جنت میں داخل کرے گا، اس لیے بچہ کی نال نہ کاٹنا بہتر ہے، بہتر اس لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، دوسری نال بھی

---

(۷)عن علي، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن السقط ليراغم ربه، إذا أدخل أبويه النار، فيقال: أيها السقط المراغم ربه أدخل أبويك الجنة، فيجرهما بسرره، حتى يدخلهما الجنة". [قال أبو علي: يراغم ربه، يغاضب] (سنن ابن ماجه: ۱/ ۱۱۵، رقم الحديث: ۱۶۰۸، كتاب الجنائز، باب ما جاء فيمن أصيب بسقط، ط: المكتبة الأشرفية- ديوبند ☆الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار- أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵هـ): ۳/ ۳۷، رقم الحديث: ۱۱۸۸۷، كتاب الجنائز، في ثواب الولد يقدمه الرجل، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد- الرياض)

(۸)قوله: "ويحشر ان بان بعض خلقه" هو الذي يقتضيه مذهب أصحابنا لأنه يثبت له حرمة بني آدم بدليل ثبوت الأحكام الشرعية له كاستيلاد وانقضاء عدة نهر وقد قالوا: إن السقط يحيا في الآخرة وترجى شفاعته واستدلوا بما روى أبو عبيدة مرفوعا أن السقط ليقف محبنطئا على باب الجنة فيقول لا أدخل حتى يدخل أبواي وقوله محبنطئا يروى بغير همز وبهمز فعلى الأول معناه المتغضب المستبطيء للشيء وعلى الثاني معناه العظيم البطن المنتفخ يعني يغضب وينتفخ بطنه من الغضب حتى يدخل أبواه الجنة. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ) ص: ۵۹۸، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

پیدا کر سکتے ہیں۔ (امداد الفتاویٰ: ۱/ ۳۹۷)[۹]

(۵) عورت مرجائے اور بچہ پیٹ میں زندہ ہو، تو پیٹ چیر کر (سرجری کراکے) بچہ نکال لیں گے، تاکہ بچہ کی جان بچ جائے، اور برعکس صورت میں یعنی بچہ مرجائے اور عورت زندہ ہو، تو اگر ایسے ہی بچہ کے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو اور عورت کی جان خطرہ میں ہو، تو بچہ کو ٹکڑا کرکے (یا آپریشن کے ذریعہ) کسی طرح نکال لیں گے۔ اور اگر دونوں کی موت ہوگئی ہو، تو پھر بچہ کو پیٹ میں ہی رہنے دیں گے اور ماں کے ساتھ دفن کردیں گے، اب اس کو نہیں نکالیں گے؛ کیوں کہ بلا ضرورت ستر کھولنا حرام ہے، اسی طرح بچہ جو ایک کامل انسان کا حکم رکھتا ہے، اس کے ٹکڑے کرنا انسان کے احترام کے خلاف ہے۔ (طحطاوی: ۳۲۸)[۱۰] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] مرا ہوا بچہ پیدا ہو، تو اس کو قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا؟

۱۱۴۴- سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بچہ اگر ماں کے پیٹ سے مرا ہوا پیدا ہو تو اس کو قبرستان میں دفن نہ کیا جائے؛ بل کہ قبرستان سے باہر کسی الگ جگہ دفن کیا جائے، اس کے متعلق علمائے کرام کیا فرماتے ہیں؟

(اختر اکبر آدم جی)

الجواب حامداً ومصلیاً:

بچہ اگر ماں کے پیٹ ہی سے مرا ہوا پیدا ہو، تو اسے غسل دے کر ایک کپڑے میں لپیٹ کر، قبرستان

---

(۹) تفصیل کے لیے دیکھیے: امداد الفتاویٰ: ۱/ ۳۹۷-۳۹۷، باب الجنائز، حکم قطع سرہ طفل بعد موت، سوال نمبر: ۶۸۶، ط: زکریا- دیوبند)

(۱۰) (حامل ماتت وولدها حي) يضطرب (شق بطنها) من الأيسر (ويخرج ولدها) ولو بالعكس وخيف على الأم قطع وأخرج ولو ميتا وإلا لا كما في كراهة الاختيار. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله من الأيسر) كذا قيده في الدرر، ولينظر وجهه (قوله: ولو بالعكس) بأن مات الولد في بطنها وهي حية (قوله قطع) أي بأن تدخل القابلة يدها في الفرج وتقطعه بآلة في يدها بعد تحقق موته... (قوله: وإلا لا) أي ولو كان حيا لا يجوز تقطيعه لأن موت الأم به موهوم، فلا يجوز قتل آدمي حي لأمر موهوم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۸، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر - بيروت ☆ حاشية الطحطاوي: ص: ۵۹۷، باب أحكام الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، ط: دار الكتب العلمية ☆ فتح القدير: ۲/ ۱۴۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز، قبيل باب الشهيد، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۵/ ۱۳۰، كتاب الاستحسان، ط: دار الكتب العلمية ☆ المحيط البرهاني: ۵/ ۳۸۰، كتاب الاستحسان والكراهية، الفصل الثالث والعشرون فيما يسع من الجراحات في بني آدم، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

ہی میں دفن کیا جائے، جب احترام واکرام انسانیت کی بناء پر اس کے غسل کو راجح قرار دیا گیا ہے، تو اسے اسی وجہ سے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن بھی کیا جائے گا۔ (شامی: ۱/ ۸۳۱، مجمع الانہر: ۱/ ۴۵۳، عالم گیری: ۱/ ۱۲۷)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۲] رشتہ داروں کے انتظار میں تدفین میں تاخیر کرنا کیسا ہے؟

۱۱۴۵- سوال: عموماً ہمارے معاشرے میں ۲۵ یا ۵۰ کلومیٹر، بل کہ ۴۰۰ سے ۵۰۰ کلومیٹر دور سے رشتہ داروں کو تدفین کے لیے بلانے کا رواج ہے، اور بسا اوقات ان کے انتظار میں میت کو ۲۴ گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ رکھنا پڑتا ہے، تو اس طرح میت کو روک کر تدفین کے لیے (رشتہ داروں کو) جمع کرنے کی شریعت میں گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

رشتہ داروں کو اطلاع دے کر بلانے میں مضائقہ نہیں، ان کا حق ہے کہ تدفین میں شریک ہوں؛ لیکن بہت دور سے آنا ضروری نہیں ہے اور دور کے لوگوں کے انتظار میں زیادہ دیر تک میت کو روکے رکھنا بہتر نہیں ہے۔

---

(۱) (قوله: وإلا يستهل غسل وسمي) شمل ما تم خلقه، ولا خلاف في غسله وما لم يتم، وفيه خلاف. والمختار أنه يغسل ويلف في خرقة، ولا يصلى عليه كما في المعراج والفتح والخانية والبزازية والظهيرية شرنبلالية. وذكر في شرح المجمع لمصنفه أن الخلاف في الأول، وأن الثاني لا يغسل إجماعا. اهـ ـــــــــ واغتر في البحر بنقل الإجماع على أنه لا يغسل، فحكم على ما في الفتح والخلاصة من أن المختار تغسيله بأنه سبق نظرهما إلى الذي تم خلقه أو سهو من الكاتب. واعترضه في النهر بأن ما في الفتح والخلاصة عزاه في المعراج إلى المبسوط والمحيط اهـ وعلمت نقله أيضا عن الكتب المذكورة. وذكر في الأحكام أنه جزم به في عمدة المفتي والفيض والمجموع والمبتغى اهـ فحيث كان هو المذكور في عامة الكتب فالمناسب الحكم بالسهو على ما في شرح المجمع لكن قال في الشرنبلالية: يمكن التوفيق بأن من نفى غسله أراد غسل المراعى فيه وجه السنة، ومن أثبته أراد الغسل في الجملة كصب الماء عليه من غير وضوء، وترتيب لفعله كغسله ابتداء بسدر وحرض. اهـ. قلت: ويؤيده قولهم ويلف في خرقة حيث لم يراعوا في تكفينه السنة فكذا غسله. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۲۸، باب صلاة الجنازة، مطلب مهم: إذا قال: إن شتمت فلانا في المسجد، ط: دار الفكر ☆ حاشية الطحطاوي، ص: ۵۹۶، باب أحكام الجنائز، فصل السلطان أحق بصلاته، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

افضل یہ ہے کہ میت کو جلد دفن کر دیا جائے؛ کیوں کہ جلد دفنانے کی تاکید وارد ہوئی ہے؛ لہٰذا پانچ-دس گھنٹے (کہ جس میں بہ سہولت قبر کھودی جاسکے اور کفن وغیرہ کا انتظام کیا جاسکے) سے زیادہ انتظار نہ کیا جائے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۷] میّت کی تدفین میں کس قدر تاخیر کی گنجائش ہے؟

۱۱۳۶-سوال: بعد از انتقال، میّت کو روکے رکھنے میں شریعت کی طرف سے کتنی گنجائش ہے؟ قریبی اعزہ واقارب کی رعایت ضروری ہے؟ اگر ضروری ہے، تو کب تک؟ اور کتنی؟ ہمارے یہاں پندرہ بیس گھنٹے روکے رکھنے کا رواج ہے، کیا یہ درست ہے؟ بیّنوا توجروا۔

---

(۱) عن الحصين بن وحوح، أن طلحة بن البراء، مرض فأتاه النبي صلى الله عليه وسلم يعوده، فقال: إني لا أرى طلحة إلا قد حدث فيه الموت فآذنوني به وعجلوا، فإنه لا ينبغي لجيفة مسلم أن تحبس بين ظهراني أهله. (سنن أبي داود، ص: ۴۵۰، رقم الحديث: ۳۱۵۹، كتاب الجنائز، باب التعجيل بالجنازة وكراهية حبسها، ط: ديوبند)

عن علي بن أبي طالب، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال له: "يا علي، ثلاث لا تؤخرها: الصلاة إذا أتت، والجنازة إذا حضرت، والأيم إذا وجدت لها كفئا". (سنن الترمذي: ۱/۲۰۶، رقم الحديث: ۱۰۷۵، أبواب الجنائز، باب ما جاء في تعجيل الجنازة، ط: ديوبند☆مسند الإمام أحمد بن حنبل (م: ۲۴۱ھ): ۲/۱۹۷، رقم الحديث: ۸۲۸، مسند علي بن أبي طالب رضي الله عنه، ت: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة)

عن عروة، قال: كان ابن الزبير إذا مات له الميت من أهله قال: عجلوا عجلوا أخرجوا أخرجوا، قال: فيخرج أية ساعة كانت. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار - أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵ھ): ۳/۴۷، رقم الحديث: ۱۲۰۰۲، كتاب الجنائز، من كان يرى التعجيل بالميت ولا يجلس، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد - الرياض)

ويعلم به جيرانه وأقرباؤه ويسرع في جهازه. (الدر المختار) ———— قال ابن عابدين: (قوله ويسرع في جهازه) لما رواه أبو داود "عنه - صلى الله عليه وسلم - لما عاد طلحة بن البراء وانصرف قال ما أرى طلحة إلا قد حدث فيه الموت، فإذا مات فآذنوني، حتى أصلي عليه، وعجلوا به، فإنه لا ينبغي لجيفة مسلم أن تحبس بين ظهراني أهله"، والصارف عن وجوب التعجيل الاحتياط للروح الشريفة، فإنه يحتمل الإغماء. وقد قال الأطباء: إن كثيرين ممن يموتون بالسكتة ظاهرا يدفنون أحياء؛ لأنه يعسر إدراك الموت الحقيقي بها إلا على أفاضل الأطباء، فيتعين التأخير فيها إلى ظهور اليقين بنحو التغير، إمداد، وفي الجوهرة: وإن مات فجأة ترك حتى يتيقن بموته. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۱۹۳، باب صلاة الجنائز، قبيل مطلب في القراءة عند الميت، ط: دار الفكر)

الجواب حامداً ومصلیاً:

انتقال کے بعد، جس قدر جلد ممکن ہو، تدفین کر دینی چاہیے۔[۱] بلا وجہ میت کو روکے رکھنا اور پندرہ بیس گھنٹے رشتے داروں کا انتظار کرنا سنت کے خلاف ہے، ہاں اگر قبر تیار نہ ہو سکی ہو، یا موسم خراب ہو، جس کی وجہ سے تاخیر ناگزیر ہو، تو حسب ضرورت تاخیر کی اجازت ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۸] خبر دینے میں قرب وجوار میں سفر اور وقت میں کوئی حد متعین ہے؟

۱۱۴۷- سوال: ہمارے یہاں کسی کے انتقال کے بعد رواج کے مطابق قرب وجوار کے گاؤں میں خبر کر کے ان کو بلایا جاتا ہے، کس قدر دور کے لوگوں کو اطلاع دے کر بلانا چاہیے، اس کی کیا حد ہے؟ اس میں بھی ۸ سے ۱۰ گھنٹے میت کو روکے رکھنا پڑتا ہے، تفصیل مطلوب ہے۔

---

(۱) عن أبي هريرة - رضي الله عنه - عن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: أسرعوا بالجنازة، فإن تك صالحة، فخير تقدمونها، وإن يك سوى ذلك، فشر تضعونه عن رقابكم. (صحيح البخاري: ۱/۱۷۶، رقم الحديث: ۱۳۱۵، كتاب الجنائز، باب السرعة بالجنازة، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/۳۰۶، رقم الحديث: ۵۰-(۹۴۴)، كتاب الجنائز، باب الإسراع بالجنازة، ط: ديوبند)

ويعلم به جيرانه وأقرباؤه ويسرع في جهازه. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويسرع في جهازه) لما رواه أبو داود "عنه - صلى الله عليه وسلم - لما عاد طلحة بن البراء وانصرف قال ما أرى طلحة إلا قد حدث فيه الموت، فإذا مات فآذنوني، حتى أصلي عليه، وعجلوا به، فإنه لا ينبغي لجيفة مسلم أن تحبس بين ظهراني أهله"، والصارف عن وجوب التعجيل الاحتياط للروح الشريفة، فإنه يحتمل الإغماء. وقد قال الأطباء: إن كثيرين ممن يموتون بالسكتة ظاهرا يدفنون أحياء؛ لأنه يعسر إدراك الموت الحقيقي بها إلا على أفاضل الأطباء، فيتعين التأخير فيها إلى ظهور اليقين بنحو التغير، إمداد؛ وفي الجوهرة: وإن مات فجأة ترك حتى يتيقن بموته. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۹۳، باب صلاة الجنائز، قبيل مطلب في القراءة عند الميت، ط: دار الفكر)

(۲) وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ. (۲۲-الحج: ۷۸)

۱- الضرورات تبيح المحظورات. ۲- ما أبيح للضرورة يقدر بقدرها. (الأشباه والنظائر على مذهب أبي حنيفة النعمان - زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بـ"ابن نجيم المصري" (م: ۹۷۰ھ) ص: ۷۳، ت: زكريا عميرات، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

الجواب حامداو مصليا:

وقت اور سفر کی کوئی حد متعین نہیں ہے، قبر تیار ہوتے ہی دفن کر دینا چاہیے۔ (طحطاوی)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

[۹] موت کے وقت میت کے رشتہ داروں کو اطلاع کرنا

۱۱۴۸- سوال: کسی کے انتقال کے وقت اس کے قریبی رشتہ دار لڑکے، لڑکی، بہن، بھائی، ماں باپ وغیرہ- جو ۵۰/ سے ۶۰/ میل دور ہوتے ہیں- کو خبر کر کے بلایا جاتا ہے، اور تدفین کے لیے ان کا انتظار کیا جاتا ہے، بسا اوقات اس کے لیے ۱۵-۲۰ گھنٹے میت کو روکا جاتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

موت ہونے سے قرب و جوار کے گاؤں میں رشتہ داروں کو خبر کرنا جائز ہے، بلکہ مستحب ہے،

---

(۱) عن أبي هريرة -رضي الله عنه- عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: أسرعوا بالجنازة، فإن تك صالحة، فخير تقدمونها، وإن يك سوى ذلك، فشر تضعونه عن رقابكم. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۷۶، رقم الحديث: ۱۳۱۵، كتاب الجنائز، باب السرعة بالجنازة، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۰۶، رقم الحديث: ۵۰-(۹۴۴)، كتاب الجنائز، باب الإسراع بالجنازة، ط: ديوبند)

وقيل: المراد الإسراع بتجهيزها وتعجيل الدفن بعد تيقن موته. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۸/ ۱۱۳، كتاب الجنائز، باب السرعة بالجنازة، تحت رقم الحديث: ۱۳۱۵، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

"ويستحب الإسراع بها" لقوله صلى الله عليه وسلم: "أسرعوا بالجنازة" أي ما دون الخبب كما في رواية ابن مسعود رضي الله عنه "فإن تك صالحة فخير تقدموها إليه وإن تك غير ذلك فشر تضعونه عن رقابكم" وكذا يستحب الإسراع بتجهيزه كله "بلا خبب". (مراقي) ـــــــ قال الطحطاوي (م: ۱۲۳۱هـ): قوله: "وكذا يستحب الإسراع بتجهيزه كله" أي من حين موته فلو جهز الميت صبيحة يوم الجمعة يكره تأخير الصلاة عليه ليصلي عليه الجمع العظيم بعد صلاة الجمعة ولو خافوا فوت الجمعة بسبب دفنه يؤخر الدفن اهـ من السيد. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ص: ۶۰۳، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

مزید تفصیل و تخریج کے لیے دیکھیں عنوان: ''میت کی تدفین میں کس قدر تاخیر کی گنجائش ہے؟'' کا حاشیہ۔

(طحطاوی: ص:۳۰۹)[۱] خود امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب قائم کر کے دو حدیثیں ذکر کی ہیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ نے نجاشی بادشاہ کی وفات کی خبر دی، اور عیدگاہ کی طرف نکل کر نماز ادا کی۔ [۲]

(۲) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: زیدؓ شہید ہو گئے، اور جھنڈا حضرت جعفرؓ نے لیا، وہ بھی شہید ہو گئے، تو جھنڈا حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے لیا، وہ بھی شہید ہو گئے، آپ ﷺ خبر دے رہے تھے صحابہؓ کو، اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، بعد میں حضرت خالدؓ نے جھنڈا اٹھایا، اور ان کے ہاتھوں کام یابی حاصل ہوئی۔ (بخاری: ۱/ ۱۶۷-۱۶۶)[۳]

---

[۱] "ولا بأس باعلام الناس بموته" بل يستحب لتكثير المصلين عليه، لما روى الشيخان أن صلى الله عليه وسلم نعى لأصحابه النجاشي في اليوم الذي مات فيه، وأنه نعى جعفر بن أبي طالب، وزيد بن حارثة، وعبد الله بن رواحة. وقال في النهاية: إن كان عالما أو زاهدا أو ممن يتبرك به فقد استحسن بعض المتأخرين النداء في الأسواق لجنازته، وهو الأصح اهـ. وكثير من المشايخ لم يروا بأسا بأن يؤذن بالجنازة، ليؤدي أقاربه وأصدقاؤه حقه لكن لا على جهة التفخيم والإفراط في المدح. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح- حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹هـ) ص:۲۱۳، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، مدخل، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية ☆ البحر الرائق: ۲/ ۱۹۰، كتاب الجنائز، شروط صلاة الجنازة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۹۳، باب صلاة الجنائز، قبيل مطلب في القراءة عند الميت، ط: دار الفكر)

[۲] عن أبي هريرة رضي الله عنه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نعى النجاشي في اليوم الذي مات فيه خرج إلى المصلى، فصف بهم وكبر أربعا. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۶۷، رقم الحديث: ۱۲۴۵، كتاب الجنائز، باب الرجل ينعى إلى أهل الميت بنفسه، ط: ديوبند)

فيه إباحة النعي، وهو أن ينادى في الناس أن فلانا مات ليشهدوا جنازته، وقال بعض أهل العلم: لا بأس أن يعلم الرجل قرابته وإخوانه، وعن إبراهيم: لا بأس أن يعلم قرابته. وقال شيخنا زين الدين: إعلام أهل الميت وقرابته وأصدقائه استحسنه المحققون والأكثرون من أصحابنا وغيرهم، وذكر صاحب (الحاوي) من أصحابنا وجهين في استحباب الإنذار بالميت وإشاعة موته بالنداء والإعلام، فاستحب ذلك بعضهم للغريب والقريب لما فيه من كثرة المصلين عليه والداعين له، وقال بعضهم: يستحب ذلك للغريب ولا يستحب لغيره. وقال النووي: والمختار استحبابه مطلقا إذا كان مجرد إعلام. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م:۸۵۵هـ): ۸/ ۱۹، كتاب الجنائز، باب الرجل ينعى إلى أهل الميت بنفسه، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

[۳] عن أنس بن مالك رضي الله عنه، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: أخذ الراية زيد فأصيب، ثم أخذها جعفر فأصيب، ثم أخذها عبد الله بن رواحة فأصيب - وإن عيني رسول الله صلى الله عليه وسلم لتذرفان - ثم أخذها خالد بن الوليد من غير إمرة ففتح له. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۶۷، رقم الحديث: ۱۲۴۶، كتاب الجنائز، باب الرجل ينعى إلى أهل الميت بنفسه، ط: ديوبند)

لامع الدراری میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی تقریر میں لکھا ہے: فقط خبر دینا منع نہیں ہے، خبر دینا جائز ہے۔ (جلد: ۲/ ۱۰۸)[۴] خبر دینے کا مقصد بھی صحیح ہے، آدمی کی وفات ہوئی ہے، لین دین کا حساب وکتاب ہو، تو وارثوں کے ساتھ بات کریں، میت کے رشتہ دار ملکیت کے وارث ہوں، تو وہ آکر اپنے مال پر قبضہ کریں، اور ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ میت کے لیے رشتہ دار جمع ہو کر تلاوت نیز تسبیح وتحمید پڑھ کر میت کے لیے ایصالِ ثواب کریں، جنازہ کی نماز پڑھ کر مرحوم کے لیے دعاءِ مغفرت کریں، وغیرہ مقاصدِ صحیحہ ہیں، اس لیے خبر دینا جائز ہے، اس میں متعدد فائدے ہیں۔[۵] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] غیر مسلم کی تجہیز وتکفین میں شرکت

۱۱۴۹- سوال: اگر کسی غیر مسلم کے یہاں کسی کا انتقال ہو جائے، تو وہاں جا کر اختتام تک ان کی آخری رسوم میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کافر خواہ رشتہ دار ہو یا غیر، اس کی تعزیت جائز ہے، غیر مسلم اقرباء کے ساتھ مواسات اور مکارم

---

[۴] إن مجرد الإعلام غير منهي عنه، وإنما ينهى من الإعلام ما كان على حسب الجاهلية وإلا فلا كراهة في مجرد الإعلام الخالي عن شوائب الجهل والجاهلية. (لامع الدراري على جامع البخاري - رشيد أحمد الكنكوهي (م: ۱۳۲۳هـ): ۲/ ۱۰۸، كتاب الجنائز، باب الإذن بالجنازة، ترتيب: يحيى الكاندهلوي، تعليق: زكريا الكاندهلوي، ط: المكتبة الأشرفية - ديوبند)

وفائدة هذه الترجمة الإشارة إلى أن النعي ليس ممنوعا كله وإنما نهي عما كان أهل الجاهلية يصنعونه فكانوا يرسلون من يعلن بخبر موت الميت على أبواب الدور والأسواق. (فتح الباري شرح صحيح البخاري - أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي (م: ۸۵۲هـ): ۳/ ۱۱۶، كتاب الجنائز، باب الرجل ينعى إلى أهل الميت بنفسه، ط: دار المعرفة - بيروت)

[۵] ... لكن في تلك المفسدة مصالح جمة لما يترتب على معرفة ذلك من المبادرة لشهود جنازته وتهيئة أمره والصلاة عليه والدعاء له والاستغفار وتنفيذ وصاياه وما يترتب على ذلك من الأحكام. (فتح الباري: ۳/ ۱۱۷، كتاب الجنائز، باب الرجل ينعى إلى أهل الميت بنفسه، ط: دار المعرفة - بيروت)

قال ابن العربي: يؤخذ من مجموع الأحاديث ثلاث حالات: الأولى إعلام الأهل والأصحاب وأهل الصلاح، فهذا سنة، الثانية دعوة الحفل للمفاخرة، فهذه تكره، الثالثة الإعلام بنوع آخر كالنياحة ونحو ذلك، فهذا يحرم. (حوالہ سابق: ۳/ ۱۱۷)

اخلاق کا برتاؤ بہتر ہے، کیوں کہ یہ ان کی دل جوئی اور اسلام کے قریب لانے کا سبب ہے، البتہ کافر کی زیارتِ قبر اور تجہیز وتکفین میں شرکت میں اختلاف ہے، بعض علماء شافعیہ نے غیر مسلم رشتہ دار کی تجہیز وتکفین اور زیارتِ قبر کی اجازت دی ہے اور بعض نے حرام قرار دیا ہے اور بعض نے مکروہ کہا ہے، جب کہ بعض کی رائے مباح بمعنی جائز غیر مکروہ کی ہے۔

جو حضرات جواز کے قائل ہیں، ان کے نزدیک بھی شرط یہ ہے کہ اس سے مقصود ان کی دل جوئی، تالیفِ قلب، مواسات اور اسلام سے قریب لانا ہو، یا دفعِ مضرت کے لیے ہو، کہ اگر شرکت نہ کی، تو فتنہ اور تکلیف کا باعث ہوگا، نیز ان حالات میں صرف شرکت کی اجازت ہوگی، اگر شرکت وزیارت میں تعظیمِ میت کی غرض ہو، تو پھر حرام ہوگا۔ (تحفۃ المحتاج مع شرح المنہاج۔ جلد ۳ صفحہ ۳۰۰)[۱]

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بلاضرورت کسی کافر کے جنازہ یا تجہیز وتکفین کی رسومات میں از ابتدا تا اختتام، شرکت جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ **"من تشبه بقوم فهو منهم"**[۲] اور **"من كثر سواد**

---

[۱] (ولا بأس باتباع) بالتشديد (المسلم جنازة قريبه الكافر) فلا كراهة فيه خلافا للروياني لخبر أبي داود وغيره بسند حسن، ووقع في المجموع بإسناد ضعيف " أنه - صلى الله عليه وسلم - أمر عليا كرم الله وجهه أن يواري أبا طالب "،قال الإسنوي: ولا دليل فيه؛ لأنه كان يلزمه تجهيزه كمؤنته في حياته، ويرد بأنه كان له أولاد غيره وبفرضه فلا يلزمه تولي ذلك بنفسه، فكان الدليل في توليه له بنفسه، ويجوز له زيارة قبره أيضا وكالقريب زوج ومالك ،قال شارح وجار، واعترض بأن الأوجه تقييده برجاء إسلام أي لنحو قريبه أو خشية فتنة، وأفهم المتن حرمة اتباع المسلم جنازة كافر غير نحو قريب، وبه صرح الشاشي. (تحفة المحتاج في شرح المنهاج-أحمد بن محمد بن علي بن حجر الهيتمي (م: ۹۷۴ھ): ۱۸۷/۳، كتاب الجنائز، فصل في الدفن وما يتبعه، ط:المكتبة التجارية الكبرى بمصر =دار إحياء التراث العربي - بيروت)

وقال الإمام عبد الحميد الشرواني: (قوله ويجوز له إلخ) أي مع الكراهة نهاية ومغني (قوله زيارة قبره) أي قبر قريبه الكافر نهاية (قوله وكالقريب زوج إلخ) مفهومه أنه يحرم عليه ذلك إذا كان غير نحو قريب وهو الموافق لما يأتي عن الشاشي ولو قيل بكراهته هنا كما أن المعتمد كراهة اتباع جنازته لم يكن بعيدا هذا وسيأتي للشارح م ر أن زيارة قبور الكفار مباحة خلافا للماوردي في تحريمها وهو بعمومه شامل للقريب وغيره وقضية التعبير بالإباحة عدم الكراهة إلا أن يراد بها عدم الحرمة ويدل لذلك مقابلته بكلام الماوردي. (حاشية الإمام عبد الحميد الشرواني على تحفة المحتاج: ۱۸۷/۳، كتاب الجنائز، فصل في الدفن وما يتبعه)

(۲) سنن أبي داؤد: ۵۵۹/۲، رقم الحديث: ۴۰۳۱، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة، ط: مكتبة الاتحاد- ديوبند

☆ جامع الأحاديث، رقم: ۲۰۴۷۸، حرف الميم قسم الأقوال، عن ابن عمر وحذيفة، ط: دار الفكر، بيروت.

قوم فهو منهم"[۳] کا مصداق ہے، اگر چہ خود کوئی فعل انجام نہ دیتا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ۔[۴] علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: "یہ آیت گرچہ عبداللہ بن ابی بن سلول (رئیس المنافقین) کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے، لیکن سب ہی کفار کو عام ہے، جیسا کہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔"[۵]

اگر چہ یہ آیت صلاۃ جنازہ اور قبر پر دعا کی ممانعت کے لیے ہے؛ لیکن رسومات کفار اور شرکیہ اعمال کی مجلس میں شرکت ایک مستقل گناہ ہے، ارشاد ربانی ہے: وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۶۸[۶]

معارف القرآن میں اس آیت اور اس کے بعد والی آیت کے "خلاصہ تفسیر" میں ہے:

"اور (اے مخاطب) جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات (اور احکام) میں عیب جوئی کر رہے ہیں، تو ان لوگوں (کے پاس بیٹھنے) سے کنارہ کش ہو جا، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جاویں اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے (یعنی ایسی مجلس میں بیٹھنے کی ممانعت یاد نہ رہے) تو (جب یاد آوے) یاد آنے کے بعد پھر

(۳) جامع الأحاديث - السيوطي (م:۹۱۱ھ): حرف الميم قسم الأقوال، رقم: ۲۳۶۹۹، طبع على نفقة: د حسن عباس زكي.

(۴) ۹-التوبة: ۸۴.

(۵) وهذا حكم عام في كل من عرف نفاقه، وإن كان سبب نزول الآية في عبد الله بن أبي بن سلول رأس المنافقين، كما قال البخاري: حدثنا عبيد بن إسماعيل، عن أبي أسامة، عن عبيد الله، عن نافع، عن ابن عمر قال: لما توفي عبد الله -هو ابن أبي- جاء ابنه عبد الله بن عبد الله إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فسأله أن يعطيه قميصه يكفن فيه أباه، فأعطاه، ثم سأله أن يصلي عليه، فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم ليصلي عليه، فقام عمر فأخذ بثوب رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسول الله، تصلي عليه وقد نهاك ربك أن تصلي عليه؟! فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إنما خيرني الله فقال: {استغفر لهم أو لا تستغفر لهم إن تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم} وسأزيده على السبعين". قال: إنه منافق! قال: فصلى عليه [رسول الله صلى الله عليه وسلم] فأنزل الله، عز وجل، آية: {ولا تصل على أحد منهم مات أبدا ولا تقم على قبره}ـــــ وكذا رواه مسلم عن أبي بكر بن أبي شيبة، عن أبي أسامة حماد بن أسامة، به. (تفسير القرآن العظيم- أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (م: ۷۷۴ھ): ۴/ ۱۹۳، سورة التوبة، رقم الآية: ۸۴، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

(۶) ۶-الأنعام: ۶۸.

ایسے ظالموں کے پاس مت بیٹھ (بل کہ فوراً اٹھ کھڑا ہو) اور (اگر کوئی واقعی دنیوی یا دینی ضرورت ایسی مجلس میں جانے کی ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ) جو لوگ (ممنوعات شرعیہ سے جن میں بلاضرورت ایسی مجلس میں جانا بھی داخل ہے) احتیاط رکھتے ہیں، ان پر ان (طاعنین ومکذبین) کی باز پرس (اور گناہ طعن) کا کوئی اثر نہ پہنچے گا (یعنی بضرورت وہاں جانے والے گنہگار نہ ہوں گے) لیکن ان کے ذمہ (بشرط قدرت) نصیحت کر دینا ہے شاید وہ (طعنے دینے والے) بھی (ان خرافات سے) احتیاط کرنے لگیں (خواہ قبول اسلام کر کے خواہ ان کے لحاظ سے) اور (کچھ مجلس تکذیب کی تخصیص نہیں، بلکہ) ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش رہ جنھوں نے اپنے (اس) دین کو (جس کا ماننا ان کے ذمہ فرض تھا یعنی اسلام کو) لہو ولعب بنا رکھا ہے (کہ اس کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں) اور دنیوی زندگی نے ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے (کہ اس کی لذات میں مشغول ہیں، اور آخرت کے منکر ہیں، اس لیے اس تمسخر کا انجام نظر نہیں آتا) اور (کنارہ کشی وترک تعلقات کے ساتھ ایسے لوگوں کو) اس قرآن کے ذریعہ سے (جس سے یہ تمسخر کر رہے ہیں) نصیحت بھی کرتا رہ تا کہ کوئی شخص اپنے کردار (بد) کے سبب (عذاب میں) اس طرح نہ پھنس جاوے کہ کوئی غیر اللہ نہ اس کا مددگار ہو اور نہ سفارشی ہو۔"(۷)

الغرض تفریح طبع کے لیے یا صرف خوشامد کے لیے یا کسی دنیوی غرض کے لیے ایسی مذکورہ شرکت جائز نہیں ہے۔

ہاں! ایسے اشخاص جو درحقیقت مصالح عامۃ المسلمین کے لیے ممبران پارلیمنٹ منتخب ہو کر جاتے ہیں، یا کسی سرکاری منصب پر فائز ہوتے ہیں، اور قوم کی خدمت کا جذبہ ان میں موجزن ہوتا ہے، ان کو سرکاری طور پر ایسے مواقع پیش آ جائیں کہ غیر مسلموں کی سمادھی پر حاضری وشرکت سے مفر نہ ہو، تو مصالح عامہ اور ان کی مجبوری وضرورت کے پیش نظر صرف شرکت ظاہری، "دل میں نفرت کے ساتھ" جائز ہوگی اور "**الضرورات تبیح المحظورات**"[۸] اور "**الأمور بمقاصدها**"[۹] کے ماتحت گنجائش رہے گی۔(۱۰)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۷) معارف القرآن: ۳/ ۳۶۸، سورۂ انعام۔

[۸] الأشباه والنظائر - ابن نجیم، ص: ۳۷، تحت القاعدة الخامسة: الضرر یزال.

[۹] الأشباه والنظائر: ۲۳، القاعدة الثانية.

(۱۰) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اسی فتاویٰ کی پہلی جلد (ص: ۲۶۷-۲۷۱) کا عنوان: مصلحت کی بنا پر کسی غیر مسلم کی "آخری رسم" میں شرکت موجب کفر ہے؟

[۱۱] خاتون کی قبر میں محرم کا اترنا ضروری نہیں

۱۱۵۰- سوال: ایک خاتون کا انتقال ہوگیا، رشتہ داروں میں شوہر کا چچازاد بھائی، پھوپھی زاد بھائی اور ماموں زاد بھائی ہے، سوال یہ ہے کہ ان کی قبر میں شوہر کے مذکورہ رشتے دار اتر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

بہتر یہ ہے کہ قبر میں خاتون کو اتارنے کے لیے کوئی محرم اترے؛ کیوں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قبر میں میت کو اتارتے وقت کفن کا کچھ حصہ کھل جاتا ہے، اور میت کے جسم پر ہاتھ لگ جاتا ہے، اگر محرم نہ ہو، تو مذکورہ رشتے دار بھی قبر میں اتر سکتے ہیں، بھانجے کا اترنا بہتر ہے، اور اگر غیر محرم رشتہ دار بھی کوئی نہ ہو، تو دین دار اور متقی و پرہیزگار شخص اترے۔ (عالمگیری ج ا ص ۱۰۶)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] جنیو باندھنے اور ہندو کی رسم ادا کرنے والے کی تجہیز و تکفین

۱۱۵۱- سوال: ایک شخص سید عبدالرحمن بن سید علی ایک ہندو خاتون کے ساتھ رہتے تھے، جن سے ناجائز تعلقات تھے، دونوں میاں بیوی کی طرح زندگی گزارتے تھے، ہندوؤں کی ساری رسومات ادا کرتے تھے، جنیو [وہ بٹا ہوا دھاگہ، جسے ہندو لوگ بدھی کی طرح گلے میں ڈالے رہتے ہیں۔ (فیروز اللغات:۴۷۶)] پہنتے تھے، ٹیکہ لگاتے تھے، بیوی کے ساتھ مندر بھی جاتے تھے، ہندوؤں کی طرح جب استنجاء کرتے، تو جنیو کان میں پہن لیتے۔

---

[۱] ويستحب أن يكونوا أقوياء أمناء وصلحاء، كذا في التتارخانية، وذو الرحم المحرم أولى بإدخال المرأة من غيرهم، كذا في الجوهرة النيرة، وكذا ذو الرحم غير المحرم أولى من الأجنبي، فإن لم يكن فلا بأس للأجانب وضعها، كذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي:۱/۱۶۶، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن والنقل من مكان إلى آخر، ط: دار الفكر)

ولا يضر دخول وتر أو شفع في القبر بقدر الكفاية، والسنة الوتر، وأن يكونوا أقرباء، أمناء، صلحاء، وذو الرحم المحرم أولى بإدخال المرأة، ثم ذو الرحم غير المحرم، ثم الصالح من مشايخ جيرانها، ثم الشبان الصلحاء، ولا يدخل أحد من النساء القبر، ولا يخرجهن إلا الرجال، ولو كانوا أجانب؛ لأن مس الأجنبي لها بحائل عند الضرورة جائز في حياتها، فكذا بعد موتها. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح- حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹هـ)، ص:۲۲۵، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ت: نعيم زرزور، ت: المكتبة العصرية)

ان کا انتقال ہوگیا، اب کیا ان کی اسلامی طریقے پر تکفین وتدفین کی جائے یا ہندوانہ رسم ورواج کے مطابق؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر دو گواہ گواہی دیں کہ مرنے والے بت پرستی کرتے تھے یا جنیو وغیرہ باندھتے تھے، تو اس کی شریعتِ اسلامی کے موافق تجہیز وتکفین نہیں کی جائے گی۔[1]

لیکن رشتہ داروں کا ذمہ ہے کہ گڈھا کھود کر اس میں دبا دیں اور دوسرے لوگ مدد کریں۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۱ ص ۲۲۵)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وفي الفتاوى الصغرى: من تقلنس بقلنسوة المجوس أي: لبسها وتشبه بهم فيها، أو خاط خرقة صفراء على العاتق أي وهو من شعارهم أو شد في الوسط خيطا كفر إذا كان متشابها بخيطهم أو ربطهم أو سماه زناراً... ولو شبه نفسه باليهود والنصارى أي صورة أو سيرة على طريق المزاح والهزل أي: ولو على هذا المنوال كفر. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۲۲۷، ۲۲۸، فصل في الكفر صريحا وكناية، ط: ياسر نديم- ديوبند ☆شرح المقاصد في علم الكلام: ۲/ ۲۶۷، دار المعارف النعمانية- باكستان)

فيكفر... بوضع قلنسوة المجوسي على رأسه على الصحيح... ويشد الزنار في وسطه. (البحر الرائق: ۵/ ۱۳۳، باب أحكام المرتدين، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۷۶، كتاب السير، مطلب في موجبات الكفر أنواع، منها: مايتعلق بالإيمان والإسلام، ط: دار الفكر -بيروت ☆مجمع الأنهر: ۱/ ۶۹۸، كتاب السير، باب المرتد، ألفاظ الكفر أنواع، ط: دار إحياء التراث العربي)

[۲] اگر گواہوں کی گواہی سے اس کا کفر ثابت ہوجائے، تو وہ مرتد کے حکم میں ہوگا، جس کی تدفین وتکفین اور غسل کی ممانعت ہے، ہاں ایسے شخص کو ایک گڈھے میں کتے کی مانند دبا دیا جائے:

(قوله ويغسل ولي مسلم الكافر ويكفنه ويدفنه) بذلك أمر علي - رضي الله عنه - أن يفعل بأبيه حين مات... وإنما يغسل (الكافر) غسل الثوب النجس من غير وضوء، ولا بداءة بالميامن، ولا يكون الغسل طهارة له حتى لو حمله إنسان وصلى لم تجز صلاته ويلف في خرقة بلا اعتبار عدد، ولا حنوط، ولا كافور ويحفر له حفيرة من غير مراعاة سنة اللحد... أما المرتد فلا يغسل، ولا يكفن، وإنما يلقى في حفيرة كالكلب، ولا يدفع إلى من انتقل إلى دينهم كما في فتح القدير. (البحر الرائق: ۲/ ۲۰۵، كتاب الصلاة، الصلاة على الميت في المسجد، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆فتح القدير: ۲/ ۱۳۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل في الصلاة على الميت، ط: دار الفكر- بيروت ☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر ☆ خلاصة الفتاوى: ۱/ ۲۲۵، كتاب الصلاة، الفصل الخامس والعشرون في الجنائز، قبيل: الفصل السادس والعشرون في المسجد، ط: باكستان)

[۱۳] تدفین کے وقت باتیں کرنا

۱۱۵۲- سوال: ایسا سنا ہے کہ میت عورت ہو یا مرد، اس کو قبر میں اتارتے وقت جھانکنا (دیکھنا) حرام ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

قبر کے پاس کھڑے رہ کر زور زور سے بولنا، ایک دوسرے سے باتیں کرنا کیسا ہے؟

قبر میں لکڑی اور چٹائی رکھی جاتی ہے، اگر کوئی اسے مناسب طریقے سے نہ رکھے، تو اس کا کیا حکم ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب حامداو مصلیا:

میت مرد اور عورت دونوں ہو سکتے ہیں، قبر میں اتارتے وقت عورت کے لیے پردہ کیا جاتا ہے، تا کہ اجنبی مرد کی نظر نہ پڑے؛ اس لیے اگر میت عورت ہو، تو اس کو دیکھنا ناجائز ہے۔ (۱)

میت مرد کے قابل ستر اعضاء کے علاوہ کے لیے پردہ نہیں ہے، لہٰذا اس کا چہرہ دیکھنا جائز ہے، بہ شرطیکہ تدفین میں کوئی خلل نہ ہو۔ (۲)

(۱ - ۲) وقد روي أنها اغتسلت لما حضرها الموت وتكفنت، وأمرت عليا أن لا يكشفها إذا توفيت، وأن يدرجها في ثيابها كما هي، ويدفنها ليلا. ـــــ وقد ذكرنا في أم سلمى غسلها أيضا. ـــــ والصحيح أن عليا وأسماء غسلاها، والله أعلم. (أسد الغابة في مرفة الصحابة - أبو الحسن علي بن أبي الكرم محمد بن محمد بن عبد الكريم بن عبد الواحد الشيباني الجزري، عز الدين ابن الأثير (م: ٦٣٠هـ): ۲۱۶/۷، رقم: ۷۱۸۳، حرف الفاء، فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم، ت: علي محمد معوض - عادل أحمد عبد الموجود، ط: دار الكتب العلمية)

(ويسجى) أي يغطى (قبرها) ولو خنثى (لا قبره) إلا لعذر كمطر. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: ويسجى قبرها) أي بثوب ونحوه استحبابا حال إدخالها القبر حتى يسوى اللبن على اللحد، كذا في شرح المنية والإمداد. ونقل الخير الرملي أن الزيلعي صرح في كتاب الخنثى أنه على سبيل الوجوب. ـــــ قلت: ويمكن التوفيق بحمله على ما إذا غلب على الظن ظهور شيء من بدنها تأمل (قوله كمطر) أي وبرد وحر وثلج قهستاني، (قوله: عليه) أي على القبر أو على الميت، وهو أقرب لفظا، والأول أقرب معنى. (رد المحتار على الدر المختار: ۲۳۶/۲، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر☆البحر الرائق: ۲۰۹/۲، كتاب الجنائز، الصلاة على الميت، ط: دار الكتاب الإسلامي☆مجمع الأنهر: ۱۸٦/۱، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، سنن حمل الجنازة، ط: دار إحياء التراث العربي)

"ويسجى قبر المرأة بثوب حتى يجعل اللبن على اللحد ولا يسجى قبر الرجل" "لأن مبنى حالهن على الستر =

قبرستان میں میت کو قبر میں اتارتے وقت بھی اگر کسی کا دل نرم نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو یاد نہ کرے، آنکھ سے آنسوں نہ نکلے، تو یہ قساوت قلبی (دل کی سختی) کی علامت ہے۔

قبر میں میت (مرد) کو اتارنے کے بعد دیکھنا اپنی اصل کے اعتبار سے جائز ہے، لیکن اس کے لیے تماشا بنالینا، جھانکنے کے لیے ایک دوسرے پر گرنا، اور منع کرنے کے باجود بھیڑ کا آگے بڑھنا، منع کرنے والے اور اس کا تعاون کرنے والے کی آواز کا بلند ہونا، نیز قبر کے بازو میں رکھی گئی مٹی پر اس طرح کھڑا ہونا، کہ مٹی کے قبر میں گرنے کا احتمال ہو؛ یہ ساری باتیں میت کے لیے تکلیف دہ ہیں؛ اس لیے اس موقع پر میت کی زیارت نہ کرانا ہی بہتر ہے، اگر زیارت کرائی گئی اور لوگوں نے اس کو کھیل تماشہ بنالیا، شوروغل ہونے لگا، تو جس درجے کی خرابی ہوگی، ویسا ہی حکم (یعنی مکروہ یا حرام) ہوگا۔

رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ زندوں کو جس طرح تکلیف ہوتی ہے، اسی طرح مردوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے، اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اس طرح کے رواج سے میت کو تکلیف ہوگی۔ (۳)

میت کو قبر میں رکھنے کے بعد لکڑے اور چٹائی رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ مٹی میت کے بدن پر نہ گرے، جس طرح زندگی کی حالت میں غبار، کیچڑ وغیرہ گرنے کی وجہ سے اس کے رشتہ داروں کو تکلیف ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح میت کو قبر میں اتارنے کے بعد جب تک ہمارے بس میں ہے، لکڑی یا چٹائی وغیرہ رکھ کر میت کے بدن پر مٹی گرنے سے بچائیں، اس کے علاوہ اس عمل کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہے، اس لیے اگر لکڑی یا چٹائی اس طرح رکھ دی گئی کہ مٹی میت کے جسم پر نہیں گرتی، تو مقصد حاصل ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= ومبنى حال الرجال على الانكشاف ". (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۹۲، باب الجنائز، فصل في الدفن، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۶، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر و الدفن، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) عن عائشة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: كسر عظم الميت ككسره حيا. (سنن أبي داود: ۴۵۸، رقم الحديث: ۳۲۰۷، كتاب الجنائز، باب في الحفار يجد العظم هل يتنكب ذلك المكان؟، ط: فيصل - ديوبند)

وتستر عورته بخرقة؛ لأن حرمة النظر إلى العورة باقية بعد الموت قال النبي - صلى الله عليه وسلم -: لا تنظروا إلى فخذ حي ولا ميت. ولهذا لا يباح للأجنبي غسل الأجنبية، دل عليه ما روي عن عائشة أنها قالت كسر عظم الميت ككسره وهو حي ليعلم أن الآدمي محترم حيا وميتا، وحرمة النظر إلى العورة من باب الاحترام. (بدائع الصنائع: ۱/ ۳۰۰، كتاب الصلاة، صلاة الجنازة، فصل بيان كيفية الغسل للميت، ط: دار الكتب العلمية)

[۱۴] شوہر سے علاحدہ رہنے والی کے یہاں گیارہ مہینے بعد پیدا ہونے والی بچی کی تجہیز وتکفین وغیرہ سے متعلق چند مسائل

۱۱۵۳- سوال: ہمارے شہر میں ایک میاں بیوی کے درمیان آپس میں جھگڑا ہوا، جس کی وجہ سے خاتون ڈیڑھ سال سے اپنے شوہر سے علاحدہ رہتی ہے، ان کے پانچ بچے ہیں، اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں خاتون ایک پارسی کے گھر کام کرتی رہی، سات مہینہ پہلے (شوہر سے علاحدگی کے گیارہ مہینہ بعد) اس خاتون کو حمل ظاہر ہوا، اور ہسپتال میں ایک بچی کی پیدائش ہوئی، اسلامی نام رکھا گیا، شوہر نے اپنی بچی ہونے کا انکار کیا، پولس انکوائری بھی ہوئی اور ۷/۲/۹/ ۶۲ء میں آٹھ مہینہ کی عمر پا کر نومولودلڑکی فوت ہوگئی، جب محلہ والوں کو پتہ چلا، تو انہوں نے لڑکی کی تجہیز وتکفین اور جنازے کی نماز سے انکار کر دیا، مزید یہ کہ جماعت کے ذمہ داروں نے اس خاتون کے گھر جانے سے سب کو منع کر دیا، (گویا کہ اس خاتون کا بائیکاٹ کیا گیا) خاتون کے بھائیوں نے بھی منع کر دیا، اس عورت نے بچی کو خود غسل دیا اور قبرستان لے گئی، تو قبرستان والوں نے منع کر دیا، دوسرے قبرستان لے گئی، وہاں بھی منع کر دیا گیا، تو مجبوراً مسان (شمشان، ہندو جہاں اپنے مردے جلاتے ہیں) وہاں لے گئی، قبر کھود کر بہ ذات خود اپنی بچی کو دفن کیا۔ عالم اسلام کے لیے یہ ایک حیرت انگیز واقعہ بن گیا۔ اس سے حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں، جواب مرحمت فرمائیں۔

(۱) نومولود بچی مسلمان شمار ہوگی یا نہیں؟ ــــــــ (۲) بچی کا اسلامی نام- جو ماں نے رکھا تھا- صحیح مانا جائے گا یا نہیں؟ ــــــــ (۳) ایسی بچی کو غسل دینے کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ ــــــــ (۴) اس کی نماز جنازہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ ــــــــ (۵) مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کا کیا حکم ہے؟ ــــــــ (۶) ایسی عورت کے گھر جانے سے روکنے والے گنہ گار ہوں گے یا نہیں؟ ــــــــ (۷) ایک شخص جنازہ کی نماز پڑھانے سے انکار کرے، تو دوسرا پڑھا سکتا ہے یا نہیں؟ ــــــــ (۸) قبرستان میں دفنانا اس کا حق ہے یا نہیں؟ ــــــــ (۹) بچی کی جنازے کی نماز نہیں پڑھی گئی، گنہ گار کون کون شمار کیا جائے گا؟ ــــــــ (۱۰) جنازے کی نماز پڑھنے کے لیے شریعت نے کتنے دن مقرر کیے ہیں؟ ــــــــ (۱۱) خاوند نہ تو ساتھ رکھتا ہے، نہ ہی نان ونفقہ دیتا ہے، تو عورت کو کیا کرنا چاہیے؟ ــــــــ (۱۲) عورت نے مجبوری کی وجہ سے غلط کام کرنے سے انکار نہیں کیا، تو کون سے گناہ کی مرتکب سمجھی جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) شریعت مطہرہ کا قانون ہے کہ ماں باپ میں سے جس کا مذہب اچھا ہوگا، بچہ اس کے تابع ہوگا؛

اس لیے یہ بچی مسلم کہلائے گی۔ (شامی ج۱ ص۶۵۵)[1]

---

[۱] (أو به فأسلم هو أو) أسلم (الصبي وهو عاقل) أي ابن سبع سنين (صلي عليه) لصيرورته مسلما. (الدر المختار)

(قوله: فأسلم هو) أي أحد أبويه ح أي فإن الصبي يصير مسلما لأن الولد يتبع خير الأبوين دينا. ولا فرق بين كون الولد مميزا أو لا كما مر. ونقل الخير الرملي في باب نكاح الكافر قولين، وأن الشلبي أفتى باشتراط عدم التمييز، لكن صرح السرخسي في شرح السير بأن هذا القول خطأ. (رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲/۲۳۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، قبل: مطلب في حمل الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

نوٹ: نومولود کے مسلمان ہونے کی یہ توجیہ محل نظر ہے؛ کیوں کہ جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ نومولود بچی، زنا کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے اور اس کا نسب پارسی سے ثابت ہے اور دین میں وہ ماں کے تابع ہے؛ حالاں کہ اگر اس بچی کی پیدائش علاحدگی (طلاق) کے ۲ رسال کی مدت کے اندر ہوتی، تب بھی اس کو شوہر کی جانب منسوب کیا جاتا، جب کہ یہاں طلاق کا کوئی معاملہ ہی نہیں ہے، بس دونوں جھگڑے کی وجہ سے الگ الگ رہتے ہیں:

(أكثر مدة الحمل سنتان) لخبر عائشة - رضي الله عنها - كما مر في الرضاع، وعند الأئمة الثلاثة أربع سنين (وأقلها ستة أشهر) إجماعا (فيثبت نسب) ولد (معتدة الرجعي) ولو بالأشهر لإياسها بدائع. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/۵۴۰، باب العدة، فصل في ثبوت النسب، ط: دار الفكر - بيروت)

نیز اگر اس (نومولود بچی) کو زنا میں نتیجے میں پیدا ہونے والی قرار دیا جائے، تب بھی ''خیر الابوین'' کے تابع ہونے کے کیا معنیٰ؟ زانی سے نسب ثابت نہیں ہوتا، ایسی صورت میں پیدا ہونے والا بچہ ماں کی جانب منسوب ہوتا ہے، البتہ زانی سے ان کے نکاح کا عدم جواز احتیاط پر مبنی ہے، علامہ شامیؒ کی تفصیلی بحث ملاحظہ فرمائیں:

(قوله والولد يتبع خير الأبوين دينا) هذا يتصور من الطرفين في الإسلام العارض، بأن كانا كافرين فأسلم أو أسلمت ثم جاءت بولد قبل العرض على الآخر، والتفريق أو بعده في مدة يثبت النسب في مثلها أو كان بينهما ولد صغير قبل إسلام أحدهما فإنه بإسلام أحدهما يصير الولد مسلما. وأما في الإسلام الأصلي فلا يتصور إلا أن تكون الأم كتابية والأب مسلما فتح ونهر [تنبيه] ــــــــــــ يشعر التعبير بالأبوين إخراج ولد الزنا. ورأيت في فتاوى الشهاب الشلبي قال: واقعة الفتوى في زماننا: مسلم زنى بنصرانية فأتت بولد فهل يكون مسلما؟ أجاب بعض الشافعية بعدمه وبعضهم بإسلامه. وذكر أن السبكي نص عليه وهو غير ظاهر، فإن الشارع قطع نسب ولد الزنا وبنته من الزنا تحل له عندهم فكيف يكون مسلما. وأفتى قاضي القضاة الحنبلي بإسلامه أيضا، وتوقفت عن الكتابة فإنه وإن كان مقطوع النسب عن أبيه حتى لا يرثه فقد صرحوا عندنا بأن بنته من الزنا لا تحل له، وبأنه لا يدفع زكاته لابنه من الزنا، ولا تقبل شهادته له والذي يقوى عندي أنه لا يحكم بإسلامه على مقتضى مذهبنا، وإنما أثبتوا الأحكام المذكورة احتياطا نظر الحقيقة الجزئية بينهما. اهـ.

قلت: ويظهر لي الحكم بالإسلام للحديث الصحيح "كل مولود يولد على الفطرة حتى يكون أبواه هما اللذان يهودانه أو ينصرانه" فإنهم قالوا إنه جعل اتفاقهما ناقلا له عن الفطرة، فإذا لم يتفقا بقي على أصل الفطرة أو على ما هو =

(۲) اسلامی نام ہی درست مانا جائے گا۔[۲]

(۳) شرع اسلام کے مطابق ہی تجہیز و تکفین ہونی چاہیے تھی۔

(۴) نماز جنازہ بھی پڑھنا چاہیے تھا۔

(۵) ماں یا باپ گناہ کرے، تو وہی گنہ گار کہلائیں گے، سزا بچی کو نہیں ملے گی۔

(۶) بچی کو مسلمانوں کے قبرستان ہی میں دفن کرنا ضروری تھا۔

(۷) جنازے کی نماز فرض کفایہ ہے، ذمہ داروں نے روکا، وہ گنہ گار ہوں گے۔[۳]

=أقرب إليها، حتى لو كان أحدهما مجوسيا والآخر كتابيا فهو كتابي كما يأتي وهنا ليس له أبوان متفقان فيبقى على الفطرة ولأنهم قالوا إن إلحاقه بالمسلم أو بالكتابي أنفع له، ولا شك أن النظر لحقيقة الجزئية أنفع له، وأيضا حيث نظروا للجزئية في تلك المسائل احتياطا فلينظر إليها هنا احتياطا أيضا، فإن الاحتياط بالدين أولى، ولأن الكفر أقبح القبيح فلا ينبغي الحكم به على شخص بدون أمر صريح، ولأنهم قالوا في حرمة بنته من الزنا إن الشرع قطع النسبة إلى الزاني لما فيها من إشاعة الفاحشة فلم يثبت النفقة والإرث لذلك، وهذا لا ينفي النسبة الحقيقية لأن الحقائق لا مرد لها فمن ادعى أنه لا بد من النسبة الشرعية فعليه البيان. (رد المحتار على الدر المختار: ۳/۱۹۶-۱۹۷، كتاب النكاح، باب نكاح الكافر، مطلب الولد يتبع خير الأبوين دينا، ط: دار الفكر-بيروت) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۲] ويظهر لي الحكم بالإسلام للحديث الصحيح "كل مولود يولد على الفطرة حتى يكون أبواه هما اللذان يهودانه أو ينصرانه" فإنهم قالوا إنه جعل اتفاقهما ناقلا له عن الفطرة، فإذا لم يتفقا بقي على أصل الفطرة أو على ما هو أقرب إليها، حتى لو كان أحدهما مجوسيا والآخر كتابيا فهو كتابي كما يأتي وهنا ليس له أبوان متفقان فيبقى على الفطرة ولأنهم قالوا إن إلحاقه بالمسلم أو بالكتابي أنفع له. (حوالہ سابق)

نوٹ: یہ تخریج علی سبیل التدریج ہے، ورنہ بچی کے مسلمان ہونے میں کیا شبہ ہے؟

[۳] (والصلاة عليه)... (فرض كفاية) بالإجماع، فيكفر منكرها لأنه أنكر الإجماع، قنية (كدفنه) وغسله وتجهيزه فإنها فرض كفاية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۰۷، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر-بيروت)

(الصلاة عليه فرض كفاية) بالإجماع حيث يسقط عن الآخرين بأداء البعض وإلا يأثم الكل. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/۱۸۴، كتاب الصلاة، فصل في الصلاة على الميت، ط: دار إحياء التراث العربي)

الصلاة على الجنازة فرض كفاية إذا قام به البعض واحدا كان أو جماعة ذكرا كان أو أنثى سقط عن الباقين وإذا ترك الكل أثموا، هكذا في التتارخانية. ((الفتاوى الهندية: ۱/۱۶۲، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الخامس في الصلاة على الميت)

(۸) پڑھا سکتے ہیں۔

(۹) جو لوگ شریک نہیں ہوئے اور نہ ہی دوسروں کو شریک ہونے دیا، وہ لوگ گنہ گار ہوں گے۔

(۱۰) جب تک مرنے والے کی نعش پھول کر پھٹ نہ جائے، اس وقت تک جنازے کی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ بغیر نماز پڑھے دفن کر دیا تو اس کی مقدار متعین نہیں، فقہاء کرامؒ نے زمین، نعش کا حجم اور موسم کے اعتبار سے تین دن سے تیس دنوں کی مقدار لکھی ہے۔ (شامی: ج ۱ ص ۶۵۲) [۴]

(۱۱) عورت شرعی پنچائت میں شوہر کے نان ونفقہ ادا نہ کرنے کا دعویٰ کرے اور گواہوں سے ثابت کرے، پھر یہ کمیٹی (شرعی پنچائت) شوہر سے بات کرے (نوٹس دے) کہ اگر تم اپنی بیوی اور بچوں کا نان ونفقہ ادا نہیں کروگے، تو بیوی کو تجھ سے جدا کردیں گے، طلاق ہو جائے گی اور عدت کے بعد وہ دوسری شادی کرلے گی، اس کمیٹی میں کم از کم ایک عالم کو رکھنا ضروری ہے۔ اگر طلاق نہ دے، تو کمیٹی کے علاحدگی کے فیصلہ کو حکومت سے رجوع کر کے بھی فیصلہ کروالے، تاکہ قانونی پیچیدگی نہ ہو۔

(۱۲) اللہ سے توبہ کرے، اللہ معاف کرنے والا ہے، دنیا میں دوسری سزا نہیں، ہاں جہاں اسلامی

---

[۴] (وإن دفن) وأهيل عليه التراب (بغير صلاة) أو بها بلا غسل أو ممن لا ولاية له (صلي على قبره) استحسانا (ما لم يغلب على الظن تفسخه) من غير تقدير هو الأصح. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله هو الأصح) لأنه يختلف باختلاف الأوقات حرا وبردا، والميت سمنا، وهزالا، والأمكنة بحر، وقيل يقدر بثلاثة أيام، وقيل عشرة، وقيل شهر ط عن الحموي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۲۴، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، قبيل: مطلب في كراهة صلاة الجنازة في المسجد، ط: دار الفكر-بيروت)

(قال) وإن دفن قبل الصلاة عليها، صلي في القبر عليها، إنما لا يخرج من القبر؛ لأنه قد سلم إلى الله تعالى، وخرج من أيديهم. جاء عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قال: القبر أول منزل من منازل الآخرة. ولكنهم لم يؤدوا حقه بالصلاة عليه، والصلاة على القبر تتأتى، فقد فعله رسول الله - صلى الله عليه وسلم - فلهذا يصلى على القبر ما لم يعلم أنه تفرق؛ لأن المشروع الصلاة على الميت، لا على أعضائه.

وفي الأمالي عن أبي يوسف - رحمه الله تعالى - قال: يصلى عليه إلى ثلاثة أيام، وهكذا ذكره ابن رستم عن محمد رحمهما الله تعالى؛ لأن الصحابة - رضي الله عنهم - كانوا يصلون على رسول الله - صلى الله عليه وسلم - إلى ثلاثة أيام، والصحيح أن هذا ليس بتقدير لازم؛ لأنه يختلف باختلاف الأوقات، في الحر، والبرد، وباختلاف الأمكنة، وباختلاف حال الميت، في السمن، والهزال، والمعتبر فيه أكبر الرأي. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۲/ ۶۹، كتاب الصلاة، باب غسل الميت، دفن الميت قبل الصلاة عليه، ط: دار المعرفة-بيروت)

حکومت ہے، تو قاضی گواہوں کی شہادت پر سزاء شرعی نافذ کرے گا۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] میت کو قبر میں کون اتارے؟

۱۱۵۴- سوال: میت کو قبر میں اتارنے کا حق قبیلہ والوں کو ہی ہے؟ پرایوں کا حق ہے کہ نہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

میت مرد ہو، یا عورت بہتر یہ ہے کہ قریبی محرم رشتے دار قبر میں اتاریں، اگر وہ نہ ہوں، تو دوسرے رشتہ دار اتاریں؛ لیکن رشتہ داروں کی دینی حالت ٹھیک نہ ہو، تو بہتر ہے کہ نیک صالح اجنبی اتاریں۔ (مراقی)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] کثرتِ مصلی کی توقع سے، میت کی تدفین میں تاخیر کرنا

۱۱۵۵- سوال: بسا اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ جمعہ کی صبح کو کسی کا انتقال ہوا، تو گھر والے جمعہ کی نماز کے بعد تک میت کو روکے رکھتے ہیں تاکہ نماز جمعہ کے مصلی زیادہ سے زیادہ نماز جنازہ میں شرکت کریں۔ تو اس طرح میت کی تدفین میں تاخیر کرنا کیسا ہے؟

---

[۱] جس عورت کا شوہر، بیوی کے حقوق سے لاپرواہ ہو، اس کے شرعی حقوق: نان ونفقہ ادا نہ کرتا ہو تو اس عورت کو ضروری ہے کہ وہ ایسے شوہر سے خلع حاصل کرلے؛ لیکن اگر کافی اور حتی الامکان کوشش کے باوجود کوئی صورت نہ بن سکے، تو سخت مجبوری کی حالت میں مالکیہ کے مسلک پر عمل کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ ان کے نزدیک زوجہ متعنت (یعنی بالاقسم کے شوہر سے) کو تفریق کا حق ملتا ہے۔ (الحیلۃ الناجزۃ، ص: ۲۹۲، حکم زوجہ متعنت فی النفقہ، ط: مکتبہ رضی-دیوبند)

[۲] والسنة الوتر، وأن يكونوا أقرباء، أمناء، صلحاء، وذو الرحم المحرم أولى بادخال المرأة، ثم ذو الرحم غير المحرم، ثم الصالح من مشايخ جيرانها، ثم الشبان الصلحاء، ولا يدخل أحد من النساء القبر، ولا يخرجهن إلا الرجال ولو كانوا أجانب؛ لأن مس الأجنبي لها بحائل عند الضرورة جائز في حياتها، فكذا بعد موتها. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح- حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹ھ) ص: ۲۲۵، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

قال الطحطاوي: قوله: "ثم ذو الرحم غير المحرم" المحرم غير ذي الرحم بمصاهرة أو رضاع مقدم عليه قوله: "من مشايخ جيرانها" قيل الشيخ من بلغ الثلاثين إلى الخمسين قوله: "ثم الشبان" هم من لم يبلغ السن المذكور، قوله: "ولا يدخل أحد من النساء القبر" ولا كافر ولو كانا قريبين للميت ذكره ابن أمير حاج. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱ھ) ص: ۶۰۹، كتاب=

الجواب حامداً ومصلیاً:

میت کو مصلی کی کثرت کے ارادے سے گھر میں روکے رکھنا مکروہ ہے، چناں چہ فقہاء نے لکھا ہے:

"ویسرع بها بلا خبب... وكره تأخير صلاته و دفنه ليصلي عليه جمع عظيم بعد صلاة الجمعة) إلا إذا خيف فوتها بسبب دفنه قنية". (الدر المختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] میت کو قبر میں اُتارنے کا طریقہ

۱۱۵۶- سوال: میت کو قبر میں کس طرح اُتارا جائے؟ کیا قبلہ رُخ ہی اُتارنا ضروری ہے؟ یا کسی بھی طریقے سے اتار سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قبلہ رُخ اُتارنا مستحب ہے، جگہ کی تنگی یا کسی عذر کی وجہ سے کسی بھی جانب سے اُتارنا جائز

=الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية)

ويستحب أن يكونوا أقوياء أمناء و صلحاء، كذا في التتارخانية، و ذو الرحم المحرم أولى بإدخال المرأة من غيرهم، كذا في الجوهرة النيرة، و كذا ذو الرحم غير المحرم أولى من الأجنبي، فإن لم يكن فلا بأس للأجانب وضعها، كذا في البحر الرائق، ولا يدخل أحد من النساء القبر، كذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية: ١٦٦/١، كتاب الصلاة، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر و الدفن و النقل من مكان إلى مكان آخر، ط: دار الفكر - بيروت)

[١] الدر المختار مع رد المحتار: ٢٣٢/٢، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر - بيروت.

عن أبي هريرة رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أسرعوا بالجنازة، فإن تك صالحة فخير تقدمونها، وإن يك سوى ذلك، فشر تضعونه عن رقابكم. (صحيح البخاري: ١٧٦/١، رقم الحديث: ١٣١٥، كتاب الجنائز، باب السرعة بالجنازة، ط: البدر - ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ٣٠٦/١، رقم الحديث: ٥٠-(٩٤٤)، كتاب الجنائز، باب الإسراع بالجنازة، ط: المكتبة الأشرفية - ديوبند)

وفي القنية: ولو جهز الميت صبيحة يوم الجمعة يكره تأخير الصلاة و دفنه ليصلي عليه الجمع العظيم بعد صلاة الجمعة، ولو خافوا فوت الجمعة بسبب دفنه يؤخر الدفن. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق - زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بـ'ابن نجيم المصري' (م: ٩٧٠هـ): ٢٠٦/٢، كتاب الجنائز، الصلاة على الميت، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ١٠٧٨هـ): ١٨٦/١، باب صلاة الجنائز، سنن حمل الجنازة، ط: دار إحياء التراث العربي☆ رد المحتار على الدر المختار: ٢٣٢/٢، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر☆ حاشية الطحطاوي ص: ٦٠٢، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۱۸] میّت کو قبر میں کس طرح لٹایا جائے؟

۱۱۵۷- سوال: میّت کو قبر میں کس طرح لٹایا جائے؟ پوری کروٹ دی جائے؟ یا پھر آدھی کروٹ دینا بھی جائز ہے؟ اگر کروٹ ہی نہ دی جائے، تو اس میں کوئی حرج تو نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

کروٹ دینا اور قبلہ کی جانب منہ کرنا مستحب ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] میّت کو قبر میں لٹا کر سر کے نیچے تکیہ کرنا اور دائیں رخسار کو زمین سے لگانا

۱۱۵۸- سوال: میّت کو قبر میں لٹا کر سر کے نیچے تکیہ کرنا اور دائیں گال کو زمین کے ساتھ لگانا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر اس طرح نہ کیا جائے تو اس میں کوئی نقصان تو نہیں ہے؟

---

(۱) ويدخل الميت من قبل القبلة في القبر، وفي بعض الكتب: ويستقبل به القبلة عند إدخاله في القبر يعني توضع الجنازة فوق اللحد من قبل القبلة. (المحيط البرهاني: ۲/۱۹۰، كتاب الصلاة، الفصل الثاني و الثلاثون في الجنائز، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

ويدخل الميت ممايلي القبلة، و ذلك أن يوضع في جانب القبلة من القبر ويحمل الميت منه، ويوضع في اللحد، فيكون الآخذ له مستقبل القبلة حالة الأخذ، كذا في فتح القدير، ويقول واضعه: بسم الله و على ملة رسول الله، كذا في المتون. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۶۶، كتاب الصلاة، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، ط: الفصل السادس في القبر و الدفن و النقل من مكان إلى مكان آخر، ط: دار الفكر - بيروت)

(قوله ويدخل الميت ممايلي القبلة) وهذا إذا لم يخش على القبر أن ينهال أما إذا خشي عليه ذلك فإنه يسل من قبل رأسه لأجل الضرورة. (الجوهرة النيرة- أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/۱۰۹، كتاب الصلاة، باب الجنائز، ط: المطبعة الخيرية ☆ الهداية: ۱/۹۱، كتاب الصلاة، باب الجنائز، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت ☆ مراقي الفلاح، ص: ۲۲۵، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ط: المكتبة العصرية)

(۲) ويوضع في القبر على شقه الأيمن موجهاً إلى القبلة قال عليه السلام: يا علي استقبل به القبلة استقبالاً وضعوه لجنبه ولا تكبوه لوجهه ولا تلقوه على ظهره. (المحيط البرهاني: ۲/۱۹۱، كتاب الصلاة، الفصل الثاني و الثلاثون في الجنائز، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

ويوضع في القبر على جنبه الأيمن مستقبل القبلة، كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۶۶، كتاب الصلاة، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، ط: الفصل السادس في القبر و الدفن و النقل من مكان إلى مكان آخر)

الجواب حامداً ومصلیاً:

ضروری نہیں ہے، قبلہ رُخ کرنا مستحب ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] قبر میں لٹا کر سر کے آگے آیت قرآنی رکھنا؟

۱۱۵۹- سوال: میت کو قبر میں لٹا کر اس کے سر کے آگے کوئی چیز رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً: قرآنی آیات وغیرہ، اگر رکھا جائے، تو اس میں کوئی خرابی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آیتوں کی بے حرمتی ہوگی، لہٰذا جائز نہیں ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] میت کو دفنانے والے لوگوں ہی کا قبر کو بند کرنا اور اس پر مٹی ڈالنا ضروری ہے؟

۱۱۶۰- سوال: کیا یہ ضروری ہے کہ میت کی قبر کو، دفنانے والے حضرات ہی مٹی وغیرہ ڈال کر بند کریں، یا اس بات کی گنجائش ہے کہ قبرستان کے ملازمین سے اس طرح کا کام لیا جائے؟ ان سے یہ کام کرانے میں کوئی حرج تو نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

میت کو دفن کرنا فرضِ کفایہ ہے، لہٰذا دفن کرنے والے حضرات اس کام کو انجام دیں، قبرستان کے

---

(۱) ویوضع في القبر علی شقه الأیمن موجهاً إلی القبلة قال علیه السلام: یا علي استقبل به القبلة استقبالاً وضعوه لجنبه ولا تکبوه لوجهه ولا تلقوه علی ظهره. (المحیط البرهاني: ۱۹۱/۲، کتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، ط: دار الکتب العلمیة-بیروت)

ویوضع في القبر علی جنبه الأیمن مستقبل القبلة، کذا في الخلاصة. (الفتاوی الهندیة: ۱۶۶/۱، کتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، ط: الفصل السادس في القبر والدفن والنقل من مکان إلی مکان آخر، ط: دار الفکر-بیروت ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲۳۶/۲-۲۳۵، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، [مطلب في دفن المیت]، ط: دار الفکر-بیروت)

(۲) علامی شامیؒ نے ایک بحث کے ضمن میں لکھا ہے: وقدمنا قبیل باب المیاه عن الفتح: أنه تکره کتابة القرآن وأسماء الله -تعالی- علی الدراهم، والمحاریب، والجدران، وما یفرش، وما ذاك إلا لاحترامه، وخشیة وطئه، ونحوه مما فیه إهانة، فالمنع هنا بالأولی ما لم یثبت عن المجتهد أو ینقل فیه حدیث ثابت فتأمل. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲۴۷/۲-۲۴۶، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، قبیل: باب الشهید، ط: دار الفکر-بیروت)

ملازمین سے بھی مٹی ڈلوانے کی خدمت لینا جائز ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] عورت کی تدفین کے وقت پردہ کرنا

۱۱۶۱- سوال: عورت کی تدفین کے وقت پردہ کیا جاتا ہے، اگر کسی عورت نے اپنی زندگی میں کبھی پردہ نہ کیا ہو، تو ایسی خاتون کی تدفین کے وقت پردہ کرنا کیسا ہے؟ کیا اس میں شریعت کا مذاق اور استہزاء نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عورت کی قبر کا پردہ کرنا مستحب ہے۔

اپنی زندگی میں عورت نے پردہ نہیں کیا، اس کا گناہ اس کے ذمہ ہے، فی الحال آپ مکلف ہیں، آپ کی ذمہ داری ہے، اس فرق کو سمجھیں۔ (مراقی الفلاح)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) دفن الميت فرض على الكفاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۵، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر و الدفن، ط: دار الفكر)

و كذا غسل الميت و الصلاة عليه و الدفن كل ذلك فرض كفاية، إذا قام به البعض، سقط عن الباقين، و إن امتنعوا من ذلك حتى ضاع ميت بين قوم، مع علمهم بحاله كانوا مشتركين في المأثم. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۳/ ۲۶۳، كتاب الكسب، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۱۱، كتاب الصلاة، فصل بيان فريضة صلاة الجنازة و كيفية فرضها، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

قال في البدائع: وأما بيان كيفية وجوبه فهو واجب على سبيل الكفاية إذا قام به البعض يسقط عن الباقين لحصول المقصود بالبعض كسائر الواجبات على سبيل الكفاية. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۲۳۶، باب الجنائز، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق)

[۲] "و" يستحب "أن يسجى" أي يستر "قبرها" أي المرأة، سترا لها إلى أن يسوى عليها اللحد، "لا" يسجى قبره؛ لأن عليا رضي الله عنه مر بقوم، قد دفنوا ميتا، و بسطوا على قبره ثوبا، فجذبه، و قال: إنما يصنع هذا بالنساء، إلا إذا كان لضرورة: دفع حر، أو مطر، أو ثلج عن الداخلين في القبر، فلا بأس به. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹هـ) ص: ۲۲۶، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۱۹، كتاب الصلاة، فصل في سنة الدفن، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ فتح القدير: ۲/ ۱۳۹، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل في الدفن، ط: دار الفكر - بيروت)

عن عثمان بن عفان، قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم، إذا فرغ من دفن الميت وقف عليه، فقال: استغفروا لأخيكم، وسلوا له بالتثبيت، فإنه الآن يسأل.

(ابوداود: ۲/۴۵۹، حدیث نمبر: ۳۲۲۱، ط: دیوبند)

عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: " إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة: إلا من صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعو له ".

(مسلم شریف: ۲/۴۱، حدیث نمبر: ۱۴-۱۶۳۱، ط: دیوبند)

باب إهداء الثواب للميت

[ایصال ثواب کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب إهداء الثواب للميت

[ایصال ثواب کا بیان]

(اس سلسلے کے اکثر مسائل پہلی جلد (ص: ۵۵۷ تا ۳۹۸) میں سنت وبدعت کے مرکزی عنوان کے تحت آچکے ہیں، یہ باب درحقیقت اس کا تتمہ ہے)

[۱] میّت کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی

۱۱۶۲- سوال: بخدمت گرامی حضرت مولانا مفتی صاحب ادام اللہ ظلکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بعدہ عرض ایں کہ حسب ذیل مسئلہ میں شرعی حکم کیا ہے:

ہمارے یہاں جب کسی کا انتقال ہو جاتا ہے، تو چاہے وہ بالغ ہو یا نابالغ، اس کو دفنانے کے بعد قبرستان ہی میں اعلان کیا جاتا ہے کہ فلاں دن، فلاں مسجد میں میت کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی ہوگی، اب اس میں ایک تو اپنی جانب سے دن متعین کیا جاتا ہے، دیگر اس کا اعلان باقاعدہ قبرستان میں یا مسجد میں یا دونوں جگہ بہ آوازِ بلند ایک شخص کرتا ہے، اور یہ قرآن خوانی اجتماعی التزام سے ہوتی ہے، نیز بعد قرآن خوانی کے اجتماعی طور پر دعا کی جاتی ہے، تو آیا اس طریقے سے قرآن خوانی ''تداعی'' میں داخل ہے یا نہیں؟ نیز حضرت تھانویؒ کے اس فتوے کا کیا مطلب ہے؟

سوال: سال کے اکثر حصوں میں بزرگوں کی ارواح کے ایصالِ ثواب کے لیے لوگوں کو جمع کرنا، بلا کسی خاص انتظام واوقاتِ متعینہ کے قرآن شریف پڑھا جائے، تو جائز ہے، تو اپنے دوست واحباب کو شمولیت کے لیے کہنا کیسا ہے؟

الجواب: یہ تداعی ہے غیر مقصود کے لیے، جو بدعت اور مکروہ ہے۔ (امداد الفتاویٰ)[۱]

نیز خیر القرون میں یہ رواج نہیں پایا جاتا ہے، تو پھر اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تحریر کا حاصل یہ ہے:

ایسے موقعے پر رسم ورواج کی پابندی ہوتی ہے، برادری کا دباؤ ہوتا ہے، دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے، اور شرکت نہ کرنے والوں پر طعن وتشنیع سے گریز نہیں کیا جاتا، لہٰذا بدعت ومکروہ ہے۔

البتہ کوئی مجلس ان امور سے پاک ومنزّہ ہو، دعوتی اہتمام نہ ہو، مجلس میں لوبان واگربتیاں نہ ہوں، روشنی ضرورت سے زائد نہ ہو، تاریخ ودن متعین نہ ہو، اور تیجا نہ ہو، تو گنجائش ہے، [کہ اس میں تداعی نہیں ہے۔] انتقال ہوا اسی رات پڑھا جائے، تاکہ میّت کو ثواب پہنچایا جائے، جائز ہے۔

وفي حاشية الحموي عن الإمام الشعراني: أجمع العلماء سلفا وخلفا على استحباب ذكر الجماعة في المساجد وغيرها إلا أن يشوش جهرهم على نائم أو مصل أو قارئ إلخ. (شامی)[۲]

لہٰذا اگر ان شرائط کا لحاظ نہ کیا جائے، تو گنجائش نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] ایصال ثواب کے لیے میت کے گھر جمع ہونا

۱۱۶۳- سوال: ہمارے یہاں رواج ہے کہ میت کو غسل دینے کے بعد جنازہ کے ارد گرد بیٹھ کر لوگ اس وقت تک قرآن کریم اور تسبیح وغیرہ پڑھتے رہتے ہیں، جب تک جنازہ نہ اٹھایا جائے۔

نیز ایک یا ڈیڑھ مہینہ تک روزانہ میت کے گھر جا کر ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کرتے ہیں، تو شرعاً یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر اس رواج کو بند کر دیا جائے، تو میت کو ثواب سے محروم کرنا لازم آتا ہے؛ کیوں کہ جمع ہو کر جو کچھ پڑھ لیتے ہیں، اگر ان کو اپنے اپنے گھر پڑھنے کو کہا جائے، تو کوئی بھی نہیں پڑھے گا؛

---

[۱] امداد الفتاوی- اشرف علی تھانویؒ (۱۸۶۳- ۱۹۴۳ء): ۱/ ۷۷۴، کتاب الصلاۃ، باب الجنائز، حکم ایصال ثواب بہ تعیین ایام، سوال نمبر: ۶۷۵، ط: زکریا- دیوبند۔

[۲] رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ٦٦٠، كتاب الصلاة، فروع أفضل المساجد، مطلب في رفع الصوت بالذكر، ط: دار الفكر- بيروت.

بل کہ اس امر کا ان کے دلوں میں خیال تک نہیں آئے گا، ایسی صورت میں مذکورہ عمل (قرآن خوانی وغیرہ) درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں ہے، تو منع کرنے پر کیا مردوں کو ثواب سے محروم کرنا لازم نہیں آئے گا؟ تسلی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

میت کو غسل دینے کے بعد اس کے پاس قرآن کریم کی تلاوت کرکے ایصال ثواب کرنا جائز ہے۔[1]

---

(۱) وتكره قراءة القرآن عنده حتى يغسل "تنزيها للقراءة عن نجاسة الحدث بالموت أو الخبث. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ) ص:۲۱۲، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، اعتنى به وراجعه: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية☆الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۹۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر - بيروت)

(وكره قراءة القرآن عنده إلى تمام غسله) عبارة الزيلعي: حتى يغسل وعبارة النهر: قبل غسله. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: وذكر ط أن محل الكراهة إذا كان قريبا منه، أما إذا بعد عنه بالقراءة فلا كراهة. اهـ. ـــــــ قلت: والظاهر أن هذا أيضا إذا لم يكن الميت مسجى بثوب يستر جميع بدنه؛ لأنه لو صلى فوق نجاسة على حائل من ثوب أو حصير، لا يكره فيما يظهر فكذا إذا قرأ عند نجاسة مستورة، وكذا ينبغي تقييد الكراهة بما إذا قرأ جهرا، قال في الخانية: وتكره قراءة القرآن في موضع النجاسة كالمغتسل، والمخرج، والمسلخ، وما أشبه ذلك، وأما في الحمام فإن لم يكن فيه أحد مكشوف العورة، وكان الحمام طاهرا لا بأس بأن يرفع صوته بالقراءة، وإن لم يكن كذلك فإن قرأ في نفسه ولا يرفع صوته فلا بأس به، ولا بأس بالتسبيح، والتهليل، وإن رفع صوته اهـ (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۹۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة عند الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

عن عثمان بن عفان، قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم، إذا فرغ من دفن الميت وقف عليه، فقال: استغفروا لأخيكم، وسلوا له بالتثبيت، فإنه الآن يسأل. (سنن أبي داود: ۲/ ۴۵۹، رقم الحديث: ۳۲۲۱، كتاب الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت الانصراف، ط: ديوبند)

وفي شرح اللباب: ويقرأ من القرآن ما تيسر له من الفاتحة، وأول البقرة، إلى المفلحون، وآية الكرسي - وآمن الرسول - وسورة يس، وتبارك الملك، وسورة التكاثر، والإخلاص، اثني عشر مرة، أو إحدى عشر، أو سبعا، أو ثلاثا، ثم يقول: اللهم أوصل ثواب ما قرأناه إلى فلان أو إليهم. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، كتاب الصلاة، باب الجنائز، مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر - بيروت)

والأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره، صلاة أو صوما أو صدقة أو قراءة قرآن أو ذكرا أو طوافا أو حجا أو عمرة أو غير ذلك، عند أصحابنا للكتاب والسنة، أما الكتاب: فلقوله تعالى: {وقل ربي ارحمهما كما ربياني صغيرا} [الإسراء: ۲۴] وإخباره تعالى عن ملائكته بقوله {ويستغفرون للذين آمنوا} [غافر: ۷] وساق عبارتهم بقوله تعالى {ربنا=

میت کی تدفین کے بعد ایک مہینہ یا سوا مہینے تک آ کر قرآن خوانی کرنا، اس طرح کہ مرد اور عورتیں سب آتی ہوں اور عورتیں بے پردہ نکل کر اجنبی مردوں سے بات کرتی ہوں، نیز سوا مہینے تک پڑھنے کو لازم سمجھا جاتا ہو، جو اس میں شریک نہ ہو، اس کو برا بھلا کہا جاتا ہو؛ تو یہ جائز نہیں ہے، شریعت کے خلاف ہے، ان ناجائز امور کی وجہ سے جائز کام (قرآن پڑھنا اور ایصال ثواب کرنا) بھی ناجائز ہو جاتا ہے، لیکن اگر کوئی مجلس ان خرافات و ناجائز امور سے خالی ہو، تو اجازت ہے، مگر شرط ہے کہ اس کو ضروری نہ سمجھا جائے ورنہ وہ کام جائز نہ رہے گا۔ (۲)

= وسعت كل شيء رحمة وعلما فاغفر للذين تابوا واتبعوا سبيلك} [غافر:۷] إلى قوله {وقهم السيئات} [غافر: ۹]، وأما السنة: فأحاديث كثيرة منها ما في الصحيحين "حين ضحى بالكبشين فجعل أحدهما عن أمته"، وهو مشهور تجوز الزيادة به على الكتاب، ومنها ما رواه أبو داود "اقرءوا على موتاكم سورة يس" وحينئذ فتعين أن لا يكون قوله تعالى: {وأن ليس للإنسان إلا ما سعى} [النجم:۳۹] على ظاهره، وفيه تأويلات أقربها ما اختاره المحقق ابن الهمام أنها مقيدة بما يهبه العامل، يعني ليس للإنسان من سعي غيره نصيب إلا إذا وهبه له فحينئذ يكون له، وأما قوله - عليه السلام -: "لا يصوم أحد عن أحد، ولا يصلي أحد عن أحد". فهو في حق الخروج عن العهدة لا في حق الثواب، فإن من صام أو صلى أو تصدق وجعل ثوابه لغيره من الأموات والأحياء جاز ويصل ثوابها إليهم عند أهل السنة والجماعة كذا في البدائع، وبهذا علم أنه لا فرق بين أن يكون المجعول له ميتا أو حيا. (البحر الرائق: ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، كتاب الصلاة، باب الجنائز، مطلب في القراءة للميت وإهداء ثوابها له، ط: دار الفكر - بيروت ☆ شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور - عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م:۹۱۱هـ): ۱/ ۳۰۲، باب في قراءة القرآن للميت أو على القبر، ت: عبد المجيد طعمه حلبي، ط: دار المعرفة - لبنان، ۱۴۱۷هـ ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳هـ): ۱/ ۲۹۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: ياسر نديم - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۷، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر)

(۲) جب کہ دن، تاریخ اور مہینہ کی تعیین نہ ہو، لیکن فی زمانا احتراز اولیٰ اور احوط ہے؛ کیوں کہ اس کو واجب اور فرض کا درجہ دے دیا گیا ہے، اور اس قسم کی محفل منعقد نہ کرنے والوں اور اس میں شریک نہ ہونے والوں پر لعن وطعن کی بوچھاڑ کی جاتی ہے؛ بل کہ ان کو کافر تک کہنے سے گریز نہیں کیا جاتا ہے، جب کہ کسی امر مباح کو اس کے درجے سے بڑھا دینا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے، شارح بخاری علامہ ابن حجر عسقلانیؒ (م: ۸۵۲ھ) رقم طراز ہیں: قال ابن المنير: فيه أن المندوبات قد تقلب مكروهات إذا رفعت عن رتبتها لأن التيامن مستحب في كل شيء، أي من أمور العبادة، لكن لما خشي ابن مسعود أن يعتقدوا وجوبه أشار إلى كراهته. والله أعلم. (فتح الباري شرح صحيح البخاري: ۲/ ۳۳۸، كتاب الصلاة، باب النفتال والانصراف عن اليمين، ط: دار المعرفة - بيروت) =

میت کو ثواب پہنچانا مستحب ہے، اور خرافات و ناجائز امور کے ساتھ مجلس قرآن خوانی منعقد کرنا ناجائز ہے، اور واضح رہے کہ امر مستحب ومباح کو انجام دینے کے لیے ناجائز چیزوں کا ارتکاب کرنا درست نہیں ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] عورتوں کا جمع ہو کر ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کرنا

۱۱۶۴- سوال: عورتیں جمع ہو کر میت کے لیے قرآن خوانی کر کے اس کو ثواب پہنچا سکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً

شریعت کی حد میں رہ کر عورتوں کو قرآن خوانی کرنا اور ثواب پہنچانا جائز ہے۔ (۲) لیکن بے پردگی کے ساتھ جانا جائز نہیں، حرام ہے۔ (۳)

= وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع... واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الإخلاص .... وأطال في ذالك في المعراج، وقال: وهذه الأفعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها لأنهم لا يريدون بها وجه الله تعالى. (رد المحتار: ۲/ ۲۴۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت☆مراقي الفلاح، ص: ۲۲۸، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ط: المكتبة العصرية- بيروت)

نوٹ: متعلقہ مسئلہ کی تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے فتاویٰ فلاحیہ کی پہلی جلد ص: ۳۷۵ تا ۳۹۷۔

(۱) قاعدة: إذا اجتمع الحلال والحرام أو المحرم والمبيح غلب الحرام والمحرم (ش) [القواعد الفقهية، مندرجہ: قواعد الفقه- محمد عميم الإحسان المجددي البركتي، ص: ۵۵، رقم القاعدة: ۴، ط: صدف پبلی کیشنز، کراچی]

(۲) والأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره، صلاة أو صوما أو صدقة أو قراءة قران أو ذكرا أو طوافا أو حجا أو عمرة أو غير ذلك، عند أصحابنا للكتاب والسنة. (البحر الرائق: ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي☆الهداية: ۱/ ۱۷۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ت: يوسف طلال، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

(۳) أن أم سلمة، حدثته أنها كانت عند رسول الله صلى الله عليه وسلم وميمونة، قالت: فبينا نحن عنده أقبل ابن أم مكتوم، فدخل عليه، وذلك بعد ما أمرنا بالحجاب، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: احتجبا منه، فقلت: يا رسول الله أليس هو أعمى لا يبصرنا ولا يعرفنا؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أفعمياوان أنتما ألستما تبصرانه. (سنن الترمذي: ۲/ ۱۰۶، رقم الحديث: ۲۷۷۸، أبواب الأدب، باب ما جاء في احتجاب النساء من الرجال، ط: ديوبند☆سنن أبي داود: ۲/ ۵۶۸، رقم الحديث: ۴۱۱۲، كتاب اللباس، باب في قوله عز وجل: {وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن}، ط: ديوبند)

دن میں جائیں، رات میں نہ جائیں؛ اس لیے کہ رات میں فتنہ کا اندیشہ ہے، البتہ فتنہ کا دروازہ بند کر کے جائیں، تو گنجائش ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] ایصال ثواب کے لیے ختم قرآن کی مجلس رکھنا

۱۱۶۵- سوال: میت کے ایصال ثواب کے لیے لوگوں میں اعلان کر کے ختم قرآن کی مجلس رکھنا شرعی طور پر کیسا ہے؟

الجواب حامداو مصليا:

ایصال ثواب تو [فی نفسہ] جائز؛ بل کہ مستحب ہے، اوراس کے لیے گھر والے بیٹھ کر قرآن شریف ختم کریں یا بلا دعوت واعلان چند آدمی جمع ہو کر قرآن ختم کریں، جائز ہے۔ (فتاوی رشیدیہ)[1]

[۱] سوال: میت کو ثواب پہنچانا بلا تعین تاریخ کے یعنی تیجا، دسواں، چالیسواں نہ ہو، درست ہے یا نہیں؟

جواب: ثواب میت کو پہنچانا بلا قید تاریخ وغیرہ اگر ہو، تو عین ثواب ہے، اور جب تخصیصات اور التزامات مروجہ ہوں، تو نادرست اور باعث مواخذہ ہو جاتا ہے۔ (فتاوی رشیدیہ: ۱/ ۱۴۱، کتاب العلم، بلا قیود ورسوم ایصال ثواب کرنا، ط: محمد علی کارخانہ اسلامی کتب، اردو بازار، کراچی)

عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: " إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة: إلا من صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعو له". (الصحيح لمسلم: ۲/ ۴۱، رقم الحديث: ۱۴-۱۶۳۱، كتاب الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ط: ديوبند)

عن معقل بن يسار، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: اقرءوا يس على موتاكم. (سنن أبي داود: ۲/ ۴۴۵، رقم الحديث: ۳۱۲۱، كتاب الجنائز، باب القراءة عند الميت، ط: ديوبند)

والأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره، صلاة أو صوما أو صدقة أو قراءة قرآن أو ذكرا أو طوافا أو حجا أو عمرة أو غير ذلك، عند أصحابنا للكتاب والسنة، أما الكتاب: فلقوله تعالى: {وقل ربي ارحمهما كما ربياني صغيرا} [الإسراء: ۲۴]، وإخباره تعالى عن ملائكته بقوله {ويستغفرون للذين آمنوا} [غافر: ۷] وساق عبارتهم بقوله تعالى {ربنا وسعت كل شيء رحمة وعلما فاغفر للذين تابوا واتبعوا سبيلك} [غافر: ۷] إلى قوله {وقهم السيئات} [غافر: ۹]، وأما السنة: فأحاديث كثيرة منها ما في الصحيحين "حين ضحى بالكبشين فجعل أحدهما عن أمته"، وهو مشهور تجوز الزيادة به على الكتاب، ومنها ما رواه أبو داود "اقرءوا على موتاكم سورة يس" وحينئذ فتعين أن لا يكون قوله تعالى: {وأن ليس للإنسان إلا ما سعى} [النجم: ۳۹] على ظاهره، وفيه تأويلات أقربها ما اختاره المحقق ابن الهمام أنها مقيدة بما يهبه العامل، يعني ليس للإنسان من سعي غيره نصيب إلا إذا وهبه له فحينئذ يكون له، وأما قوله - عليه السلام -: "لا يصوم أحد عن أحد، ولا يصلي أحد عن أحد". فهو في حق الخروج =

لیکن ختم قرآن کے لیے اعلان کر کے لوگوں کو جمع کرنا بالخصوص میت کے گھر میں جائز نہیں [کہ اس میں بے شمار مفاسد ہیں] اور شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔(در مختار: ۲/ ۲۴۰)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۵] ایصال ثواب کے لیے صرف سورۂ انعام کی تلاوت کو خاص کرنا

۱۱۶۶- سوال: ہمارے گاؤں میں خوشی کا موقع ہو یا غم کا (کسی کا انتقال ہوا ہو) ایصال ثواب کے لیے سورۂ انعام پڑھی جاتی ہے، کیا یہ حدیث سے ثابت ہے کہ یہی سورت پڑھی جائے، حالاں کہ اس کے سوا بہت سی سورتیں ہیں، جس کی بہت ساری فضیلت وارد ہوئی ہے، اس کے باوجود ان کو نہیں پڑھتے ہیں، آخر

=عن العهدة لا في حق الثواب، فإن من صام أو صلى أو تصدق وجعل ثوابه لغيره من الأموات والأحياء جاز ويصل ثوابها إليهم عند أهل السنة والجماعة كذا في البدائع، وبهذا علم أنه لا فرق بين أن يكون المجعول له ميتا أو حيا. (البحر الرائق: ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، كتاب الصلاة، باب الجنائز، مطلب في القراءة للميت وإهداء ثوابها له، ط: دار الفكر - بيروت ☆ شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور - عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱هـ): ۱/ ۳۰۲، باب في قراءة القرآن للميت أو على القبر، ت: عبد المجيد طعمه حلبي، ط: دار المعرفة - لبنان، ۱۴۱۷هـ ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۲۹۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: ياسر نديم - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۷، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲] وقال أيضا: ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من أهل الميت لأنه شرع في السرور لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة... وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة صورة الأنعام أو الإخلاص...، وهذه الأفعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها؛ لأنهم لا يرون وجه الله تعالى... ولا سيما إذا كان في الورثة صغار أو غائب، مع قطع النظر عما يحصل عند ذلك غالبا من المنكرات الكثيرة كإيقاد الشموع والقناديل التي توجد في الأفراح، وكدق الطبول، والغناء بالأصوات الحسان، واجتماع النساء والمردان، وأخذ الأجرة على الذكر وقراءة القرآن، وغير ذلك مما هو مشاهد في هذه الأزمان، وما كان كذلك فلا شك في حرمته وبطلان الوصية به، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۰-۲۴۱، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت، ط: دار الفكر - بيروت ☆ فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۲/ ۱۴۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز، قبيل باب الشهيد، ط: دار الفكر)

اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر اس کا کہیں ثبوت نہیں ہے، تو مذکور طریقہ کیسا ہوگا؟ کیا میت کو اس کا ثواب پہنچے گا؟ نیز میت کے مال سے دعوت کی جائے، تو جائز ہے یا نہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

قرآن مجید کی تلاوت کر کے اس کا ثواب میت کو پہنچانا بڑے ثواب کا کام ہے اور اس سے میت کو فائدہ ہوتا ہے۔[1]

---

(۱) عن عثمان بن عفان، قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم، إذا فرغ من دفن الميت وقف عليه، فقال: استغفروا لأخيكم، وسلوا له بالتثبيت، فإنه الآن يسأل. (سنن أبي داود: ۲/ ۴۵۹، رقم الحديث: ۳۲۲۱، كتاب الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت الانصراف، ط: ديوبند)

وفي شرح اللباب: ويقرأ من القرآن ما تيسر له من الفاتحة وأول البقرة إلى المفلحون وآية الكرسي - وآمن الرسول - وسورة يس وتبارك الملك وسورة التكاثر والإخلاص اثني عشر مرة أو إحدى عشر أو سبعا أو ثلاثا، ثم يقول: اللهم أوصل ثواب ما قرأناه إلى فلان أو إليهم. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، كتاب الصلاة، باب الجنائز، مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر - بيروت)

والأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره، صلاة أو صوما أو صدقة أو قراءة قرآن أو ذكرا أو طوافا أو حجا أو عمرة أو غير ذلك، عند أصحابنا للكتاب والسنة، أما الكتاب: فلقوله تعالى: {وقل ربي ارحمهما كما ربياني صغيرا} [الإسراء: ۲۴]، وإخباره تعالى عن ملائكته بقوله {ويستغفرون للذين آمنوا} [غافر: ۷] وساق عبارتهم بقوله تعالى {ربنا وسعت كل شيء رحمة وعلما فاغفر للذين تابوا واتبعوا سبيلك} [غافر: ۷] إلى قوله {وقهم السيئات} [غافر: ۹]، وأما السنة: فأحاديث كثيرة منها ما في الصحيحين "حين ضحى بالكبشين فجعل أحدهما عن أمته"، وهو مشهور تجوز الزيادة به على الكتاب، ومنها ما رواه أبو داود "اقرءوا على موتاكم سورة يس" وحينئذ فتعين أن لا يكون قوله تعالى: {وأن ليس للإنسان إلا ما سعى} [النجم: ۳۹] على ظاهره، وفيه تأويلات أقربها ما اختاره المحقق ابن الهمام أنها مقيدة بما يهبه العامل، يعني ليس للإنسان من سعي غيره نصيب إلا إذا وهبه له فحينئذ يكون له، وأما قوله - عليه السلام -: "لا يصوم أحد عن أحد، ولا يصلي أحد عن أحد". فهو في حق الخروج عن العهدة لا في حق الثواب، فإن من صام أو صلى أو تصدق وجعل ثوابه لغيره من الأموات والأحياء جاز ويصل ثوابها إليهم عند أهل السنة والجماعة كذا في البدائع، وبهذا علم أنه لا فرق بين أن يكون المجعول له ميتا أو حيا. (البحر الرائق: ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، كتاب الصلاة، باب الجنائز، مطلب في القراءة للميت وإهداء ثوابها له، ط: دار الفكر - بيروت ☆ شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور - عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱هـ): ۱/ ۳۰۲، باب في قراءة القرآن للميت أو على القبر، ت: عبد المجيد طعمه حلبي، ط: دار المعرفة - لبنان، ۱۴۱۷هـ ☆ الهداية في =

لیکن رسم ورواج کے طریقہ پر قرآن پڑھنا اور اسی کو ضروری سمجھنا، آپ کی تحریر کے مطابق سورۂ انعام ہی پڑھنا اور دعوت کرنا اور اس پر کھانا پینا تقسیم کرنا اور رواج کے طور پر پڑھنے والوں کی دعوت کرنا یہ سب ناجائز امور ہیں۔ اس طرح پڑھنے پڑھانے سے کوئی ثواب نہیں ملے گا اور نہ ہی میت کو بھی کسی قسم کا کوئی فائدہ ہوگا۔ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ قرآن پڑھنے کے لیے چند لوگوں کو جمع کرنا اور ختم پر یا سورۂ انعام یا اخلاص کا ختم کر کے دعوت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ [۲]

کھانے کی دعوت ایسے مال سے کی جائے کہ جس میں یتیم کا حصہ ہے، تو یہ حرام ہے اور کوئی وارث وطن سے دور ہو اور اس کی اجازت کے بغیر مال استعمال کیا جائے تو بھی حرام ہوگا؛ اس لیے بہتر یہی ہے کہ دن متعین کیے بغیر سب لوگ جمع ہو کر بغیر کھائے قرآن پڑھ کر مرحوم کو ایصال ثواب کر دیں۔ [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

[۲] ماں باپ کے انتقال پر بالغ لڑکا لڑکی کا ان کے پاس تلاوت کرنا

۱۱۶۷- سوال: عورت کے انتقال کے بعد اس کا بالغ لڑکا اس کے پاس قرآن شریف پڑھ سکتا ہے؟ اسی طریقے سے مرد کے انتقال کے بعد اس کی بالغ لڑکی اس کے پاس تلاوت کر سکتی ہے؟

= شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳ھ):۱/ ۲۹۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: ياسر نديم -ديوبند☆ الفتاوى الهندية:۱/ ۲۵۷، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة صورة الأنعام أو الإخلاص . . . ، وهذه الأفعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها؛ لأنهم لا يرون وجه الله تعالى . . . ولا سيما إذا كان في الورثة صغار أو غائب، مع قطع النظر عما يحصل عند ذلك غالبا من المنكرات الكثيرة كإيقاد الشموع والقناديل التي توجد في الأفراح، وكدق الطبول، والغناء بالأصوات الحسان، واجتماع النساء والمردان، وأخذ الأجرة على الذكر وقراءة القرآن، وغير ذلك مما هو مشاهد في هذه الأزمان، وما كان كذلك فلا شك في حرمته وبطلان الوصية به، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم. (رد المحتار على الدر المختار:۲/ ۲۴۱-۲۴۰، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت، ط: دار الفكر - بيروت☆ فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م:۸۶۱ھ): ۲/ ۱۴۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز، قبيل باب الشهيد، ط: دار الفكر)

(۳) متعلقہ مسئلہ کی تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے فتاویٰ فلاحیہ کی پہلی جلد ص:۳۷۵ تا ۳۹۷۔

الجواب حامداًو مصلیاً:

میت کو غسل دینے کے بعد اس کے پاس قرآن کریم کی تلاوت کر کے ایصال ثواب کرنا جائز ہے۔[۱] خواہ قرآن کریم کی تلاوت کوئی کرے، خود میت کا لڑکا ہو یا اس کی بڑی [بالغ] لڑکی، فی نفسہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ لڑکی کے لیے پردے کا مکمل اہتمام ضروری ہے؛ کیوں کہ ایسے موقع سے مختلف لوگوں کی آمد ورفت رہتی ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] جمعہ کے بعد مرحوم کے لیے ختم قرآن

۱۱۶۸- سوال: ہمارے گاؤں کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد بہت سی مرتبہ اعلان کیا جاتا ہے کہ فلاں مرحوم کے لیے ختم قرآن ہے، بہت سے لوگ قرآن خوانی کے لیے بیٹھتے ہیں، قرآن کریم پڑھنے کے بعد اجتماعی دعا کی جاتی ہے اور اکثر شیرینی تقسیم کی جاتی ہے، شیرینی لیتے وقت چھوٹے بچے اور بچیاں مسجد میں آجاتی ہیں جن کے شور وغل کی وجہ سے نمازیوں کو خلل ہوتا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداو مصلیا

ختم قرآن کی مذکورہ شکل میں خرابی شیرینی کی وجہ سے ہے کہ اسے لینے کے لیے لڑکے لڑکیاں جمع ہوتی ہیں، جن کے شور وغل سے نمازیوں کو نماز میں خلل ہوتا ہے، اس لیے شیرینی کو بند کرادیں، اور بغیر کسی التزام کے، یعنی دن وتاریخ متعین کیے بغیر، قرآن کریم کا ختم کرائیں، تو اس کی گنجائش؛ بل کہ شریعت میں مطلوب ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے عنوان: ''ایصال ثواب کے لیے میت کے گھر جمع ہونا'' کا حاشیہ نمبر ا۔

(۲) وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ ۚ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۲۴-النور:۳۱)

(۳) عن معاذ بن جبل -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: جنبوا مساجدكم مجانينكم، وصبيانكم، ورفع أصواتكم، وسل سيوفكم، وبيعكم، وشراءكم، وإقامة حدودكم، وخصومتكم، وجمروها يوم جمعكم، واجعلوا مطاهركم على أبوابها. (سنن ابن ماجه، ص:۵۴۰، رقم الحديث:۷۵۰، كتاب المساجد و=

[۸] غیر محرم میّت کے پاس عورتوں کا جمع ہونا

۱۱۶۹- سوال: میّت غیر محرم ہو تو وہاں گاؤں کی پرائی عورتوں کا جمع ہونا جائز ہے؟

الجواب حامداً و مصلیا:

اگر پردہ کے ساتھ گھروں سے آتی ہوں، تو جائز ہے، بلا پردہ آنے کی اجازت نہیں ہے، اگر اس طرح بیٹھے کہ مردوں کی نظر، عورتوں پر پڑتی ہو یا اجنبی مردوں کا وہاں سے آنا جانا لگا رہتا ہو، اور بے پردگی کا اندیشہ ہو، تو ناجائز ہے، شرعی پردے کی رعایت کے ساتھ عورتوں کا آنا جائز ہے۔(۱)

= الجماعات، باب مایکره في المساجد، ط: دیوبند)

والأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره، صلاة أو صوما أو صدقة أو قراءة قرآن أو ذكرا أو طوافا أو حجا أو عمرة أو غير ذلك، عند أصحابنا للكتاب والسنة. (البحر الرائق: ۳/ ۶۳، کتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الهداية: ۱/ ۱۷۸، کتاب الحج، باب الحج عن الغير، ت: يوسف طلال، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

(۱) وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ ۚ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۲۴- النور: ۳۱)

عن عائشة- رضي الله عنه- زوج النبي صلى الله عليه وسلم: أنها كانت إذا مات الميت من أهلها، فاجتمع لذلك النساء، ثم تفرقن إلا أهلها وخاصتها، أمرت ببرمة من تلبينة فطبخت، ثم صنع ثريد فصبت التلبينة عليها، ثم قالت: كلن منها، فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: التلبينة مجمة لفؤاد المريض، تذهب ببعض الحزن. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۱۵، رقم الحديث: ۵۴۱۷، کتاب الأطعمة، باب التلبينة، ط: دیوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۲۲۷، رقم الحديث: ۹۰-۲۲۱۶، کتاب السلام، باب لكل داء دواء واستحباب التداوي، ط: دیوبند)

قال: "ولا يجوز أن ينظر الرجل إلى الأجنبية إلا وجهها وكفيها" لقوله تعالى: {وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا} [النور: ۳۱] قال علي وابن عباس رضي الله عنهما: ما ظهر منها الكحل والخاتم، والمراد موضعهما وهو الوجه والكف، كما أن المراد بالزينة المذكورة موضعها، ... قال: "فإن كان لا يأمن الشهوة لا ينظر إلى وجهها إلا لحاجة" لقوله عليه الصلاة والسلام: "من نظر إلى محاسن امرأة أجنبية عن شهوة صب في عينيه الآنك يوم القيامة" فإذا خاف الشهوة لم ينظر من غير حاجة تحرزا عن المحرم. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر، المرغيناني، (م: ۵۹۳ھ): ۴/ ۳۶۸، کتاب الكراهية، فصل: في الوطء والنظر واللمس، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۱۸، کتاب الكراهية، فصل في النظر والمس، ط: دار الكتاب الإسلامي)

بل کہ تعزیت کی نیت سے جانا سنت ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] دفن کے بعد سر اور پیر کی جانب سورۂ بقرہ کی آیات پڑھنا

۱۱۷۰- سوال: میت کو دفن کرنے کے بعد اس کے سر اور پیر کی سمت میں سورۂ بقرہ کا آخری رکوع پڑھا جاتا ہے، اس سے زیادہ پڑھنا کیسا ہے؟ مثلاً: تین مرتبہ سورۂ اخلاص اور تین مرتبہ سورۂ تکاثر وغیرہ؟

(المستفتی: مولوی ولی فلاحی خانپوری)

الجواب حامداً ومصلیاً:

حدیث پاک سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میت کے سرہانے سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات المفلحون تک اور پاؤں کی جانب سورہ بقرہ کی آخری آیت آمن الرسول سے اخیر تک پڑھتے تھے، اس کے بعد لمبی دعاء کرتے تھے۔ (شامی: ۱/ ۸۴۴)[۲]

---

(۱) عبد الله بن أبي بكر بن محمد بن عمرو بن حزم، يحدث عن أبيه، عن جده، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: ما من مؤمن يعزي أخاه بمصيبة، إلا كساه الله سبحانه من حلل الكرامة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه، ص: ۱۱۵، رقم الحديث: ۱۶۰۱، كتاب الجنائز، باب ما جاء في ثواب من عزى مصابا، ط: ديوبند)

عن عبد الله، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من عزى مصابا فله مثل أجره. (سنن الترمذي: ۱/ ۲۰۵، رقم الحديث: ۱۰۷۳، أبواب الجنائز، باب ما جاء في أجر من عزى مصابا، ط: ديوبند)

في شرح المنية: وتستحب التعزية للرجال والنساء اللاتي لا يفتن؛ لقوله - عليه الصلاة والسلام -: من عزى أخاه بمصيبة كساه الله من حلل الكرامة يوم القيامة، رواه ابن ماجه وقوله - عليه الصلاة والسلام -: من عزى مصابا فله مثل أجره، رواه الترمذي وابن ماجه. (رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲ھ): ۲/ ۲۴۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، فروع في الجنائز، قبيل: مطلب في الثواب على المصيبة، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲] عطاء بن أبي رباح، يقول: سمعت ابن عمر، يقول: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إذا مات أحدكم فلا تحبسوه، وأسرعوا به إلى قبره، وليقرأ عند رأسه بفاتحة الكتاب، وعند رجليه بخاتمة البقرة في قبره. (المعجم الكبير - أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۱۲/ ۴۴۴، رقم الحديث: ۱۳۶۱۳، باب العين، عطاء بن أبي رباح، عن ابن عمر، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية - القاهرة ☆ الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر - أبو بكر أحمد بن محمد بن هارون بن يزيد الخَلَّال البغدادي الحنبلي (م: ۳۱۱ھ)، ص: ۸۸، باب القراءة عند القبور، ت: الدكتور يحيى مراد، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ شعب الإيمان - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۱۱/ ۴۷۱، رقم الحديث: ۸۸۵۴، الصلاة على من مات من أهل القبلة، ت: الدكتور عبد العلي عبد الحميد حامد، ط: مكتبة =

یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ اتنی دیر تک دعا کرتے تھے، جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جا سکے۔ (۲)

اس کے علاوہ سورۂ یٰسین شریف، سورۂ ملک، سورۂ تکاثر، اور سورۂ اخلاص تین، سات یا گیارہ مرتبہ پڑھ کر اس کا ثواب میت کو بخش دے، تو اس کا بڑا اجر ہے؛ میت کو جو کچھ بھی پڑھ کر بخشا جائے گا، اس کا ثواب اس کو ملے گا؛ اس لیے مذکورہ سورتیں پڑھنا بھی جائز ہے۔ (۳)

= الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون مع الدار السلفية ببومباي بالهند)

قد ثبت أنه - عليه الصلاة والسلام - قرأ أول سورة البقرة عند رأس ميت وآخرها عند رجليه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۲، كتاب الصلاة، باب الجنازة، مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر - بيروت)

وكان ابن عمر يستحب أن يقرأ على القبر بعد الدفن أول سورة البقرة وخاتمتها. (المصدر السابق: ۲/ ۲۴۳)

مزید دیکھیے: شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور - جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱ هـ): ۱/ ۱۰۹، ت: عبد المجيد طعمة حلبي، ط: دار المعرفة - لبنان.

(۲) حدیث میں یہ ہے کہ آپ ﷺ دفن کے بعد کچھ دیر موجود رہتے اور دعاء و استغفار کرتے، نیز اس کا صحابہ کو بھی حکم دیتے تھے، جیسا کہ اس روایت میں ہے: عن عثمان بن عفان، قال: كان النبي - صلى الله عليه وسلم - إذا فرغ من دفن الميت، وقف عليه، فقال: استغفروا لأخيكم، وسلوا له بالتثبيت، فإنه الآن يسأل. (سنن أبي داود: ۲/ ۴۵۹، رقم الحديث: ۳۲۲۱، كتاب الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت الانصراف، ط: البدر - ديوبند ☆ السنة - الإمام أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني (م: ۲۴۱هـ): ۲/ ۵۹۸، رقم: ۱۴۲۵، سئل عن عذاب القبر وفتنة القبر، ت: د. محمد سعيد سالم القحطاني، ط: دار ابن القيم - الدمام ☆ إثبات عذاب القبر وسؤال الملكين - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ)، ص: ۱۲۵، رقم الحديث: ۲۱۱ - ۲۱۲، ت: د. شرف محمود القضاة، ط: دار الفرقان - عمان الأردن)

لیکن اونٹ کو ذبح کر کے اس کے گوشت کو تقسیم کرنے کے بقدر آپ ﷺ کا قبر کے پاس دعاء میں مشغول رہنا احقر کو نہیں ملا، ہاں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے اپنے انتقال کے وقت اس کی وصیت فرمائی تھی، طویل حدیث ہے، جزو مقصود ملاحظہ فرمائیں: فإذا دفنتموني فشنوا علي التراب شنا، ثم أقيموا حول قبري قدر ما تنحر جزور ويقسم لحمها، حتى أستأنس بكم، وأنظر ماذا أراجع به رسل ربي. (صحيح المسلم: ۱/ ۷۶، رقم: ۱۹۲ - (۱۲۱)، كتاب الإيمان، باب بيان حكم عمل الكافر إذا أسلم بعده، ط: البدر ديوبند)

(۳) وأخرج أبو محمد السمرقندي في فضائل {قل هو الله أحد} [الإخلاص: ۱] عن علي مرفوعا: من مر على المقابر وقرأ {قل هو الله أحد} [الإخلاص] إحدى عشرة مرة، ثم وهب أجره للأموات، أعطي من الأجر بعدد الأموات، وأخرج أبو القاسم: سعد بن علي الزنجاني في فوائده عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من دخل المقابر، ثم قرأ فاتحة الكتاب، وقل هو الله أحد، وألهكم التكاثر. ثم قال: إني جعلت ثواب ما قرأت من كلامك لأهل المقابر =

البتہ ضروری سمجھنا یا امام کو ان کے پڑھنے پر مجبور کرنا جائز نہیں ،حرام ہے۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم غفرلہ

[۱۰] بعدِ دفن میت کے سرہانے اور پائنتی سورۂ بقرہ کی ابتدائی و آخری آیات پڑھنے کا حکم

۱۱۷۱- سوال: ہمارے یہاں امام صاحب مردوں کی تدفین کے بعد چپکے سے کچھ پڑھ کر، اردو میں لمبی دعا کرتے ہیں، اس کے متعلق ہم نے ان سے کہا کہ تدفین کے بعد سر کی جانب سورۂ بقرہ کی ابتدائی

=من المؤمنين والمؤمنات، كانوا شفعاء له إلى الله تعالى، وأخرج القاضي أبو بكر بن عبد الباقي الأنصاري في مشيخته عن سلمة بن عبيد قال: قال حماد المكي: خرجت ليلة إلى مقابر مكة فوضعت رأسي على قبر فنمت، فرأيت أهل المقابر حلقة حلقة، فقلت: قامت القيامة قالوا: لا، ولكن رجل من إخواننا قرأ: قل هو الله أحد، وجعل ثوابها لنا فنحن نقتسمه منذ سنة، وأخرج عبد العزيز صاحب الخلال بسنده عن أنس: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من دخل المقابر فقرأ سورة يس خفف الله عنهم، وكان له بعدد من فيها حسنات، وقال القرطبي: حديث: اقرءوا على موتاكم يس، هذا يحتمل أن تكون هذه القراءة عند الميت في حال حياته، ويحتمل أن تكون عند قبره، كذا ذكره السيوطي في شرح الصدور. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م:۱۰۱۴هـ): ۱۲۲۸/۳، كتاب الجنائز، باب دفن الميت، رقم الحديث:۱۷۱۷، ط: دار الفكر-بيروت☆عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العينى (م:۸۵۵هـ): ۱۱۸/۳، كتاب الوضوء،''باب'' قبل: باب ما جاء في غسل البول، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

ويقرأ يس، وفي الحديث: من قرأ الإخلاص أحد عشر مرة ثم وهب أجرها للأموات أعطي من الأجر بعدد الأموات. (الدر المختار)ــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويقرأ يس) لما ورد ''من دخل المقابر فقرأ سورة يس خفف الله عنهم يومئذ، وكان له بعدد من فيها حسنات'' بحر. وفي شرح اللباب: ويقرأ من القرآن ما تيسر له من الفاتحة وأول البقرة إلى المفلحون وآية الكرسي - وآمن الرسول - وسورة يس وتبارك الملك وسورة التكاثر والإخلاص اثني عشر مرة أو إحدى عشر أو سبعا أو ثلاثا، ثم يقول: اللهم أوصل ثواب ما قرأناه إلى فلان أو إليهم. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲۴۲/۲، كتاب الصلاة، باب الجنازة، مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر)

(۴) قال الطيبي: ... أن من أصر على أمر مندوب، وجعله عزما، ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال ... وجاء في حديث ابن مسعود - رضي الله تعالى عنه -: " إن الله - عز وجل - يحب أن تؤتى رخصه كما يحب أن تؤتى عزائمه" اهـ. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م:۱۰۱۴هـ): ۷۷۵/۲، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، رقم الحديث:۹۴۶، ط: دار الفكر-بيروت)

آیات اور پاؤں کی جانب سورۂ بقرہ کی آخری آیات پڑھنا مستحب ہے اور یہ طریقہ صحابۂ کرام سے ثابت ہے، اس کے جواب میں امام صاحب کا کہنا ہے کہ تم نے جو کہا ہے کہ میت کے سر اور پیر کی جانب، سورہ بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیت پڑھنا چاہیے، یہ مستحب ہے، جب کہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر دعا مانگنا مسنون ہے، اور سورۂ یٰسین پڑھنا واجب ہے۔

آپ کی کتاب ''سکرات سے فاتحہ تک کی سنن و بدعات'' میں مردوں کی تدفین کے بعد مستحب طریقے کا تو ذکر ہے، لیکن امام صاحب کے بتائے ہوئے واجب اور مسنون طریقے کا کوئی ذکر نہیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا ہمارے امام کا کہنا کہ ''سورۂ فاتحہ پڑھ کر دعا مانگنا مسنون، اور سورۂ یٰسین پڑھنا واجب ہے'' صحیح ہے یا غلط؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

مردے کی تدفین کے بعد ''سکرات سے فاتحہ تک کی سنن وبدعات'' نامی کتاب کے صفحہ ۲۸،۲۹ پر جو کچھ لکھا ہے، اس کو پڑھ کر عمل کیجیے؛ کہ یہ مستحب [عمل] ہے۔ [1]

(۱) اصل کتاب، گجراتی زبان میں تھی، صاحب زادۂ محترم جناب حافظ امجد بیات صاحب نے خصوصی توجہ دی، مولانا ارشد بن مولانا عبدالرزاق فلاحی نے ترجمہ کیا، الحمد للہ یہ کتاب اب ''احکام میت–سکرات سے فاتحہ تک کی سنن اور بدعات'' کے نام سے شائع ہوچکی ہے، اس میں حضرت مفتی صاحبؒ نے لکھا ہے:

میت کو دفن کرنے کے بعد مستحب طریقہ یہ ہے کہ میت کے سرہانے سورۂ بقرہ کی شروع والی آیات ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ تک اور پاؤں کی طرف سورۂ بقرہ کا آخری رکوع پڑھ کر بہ قدر ذبح اونٹ لمبی دعاء کرے، یہ طریقہ صحابہؓ سے ثابت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إذا مات أحدكم فلا تحبسوه، و اسرعوا به إلى قبره، و ليقرأ عند رأسه فاتحة الكتاب، و عند رجليه بخاتمة البقرة. (مشکوۃ شریف، کتاب الجنائز، رقم: ۱۷۱۷، بہ حوالہ بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: میں نے آپ ﷺ سے سنا ہے کہ جب تم میں سے کسی کا انتقال ہو تو تم اس کو روک کر مت رکھو؛ بل کہ جلدی دفن کرو، اور سر کی طرف سورۂ بقرہ کی اول آیات اور پاؤں کی طرف آخر آیات پڑھو۔

حضرت عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ جب ان کی وفات کا وقت آیا تو اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ کو بعض وصیتیں فرمائیں، ان میں سے ایک یہ تھی کی جب تم مجھے دفن کر چکو تو میری قبر کے پاس کھڑے ہو کر اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کرنے کے بقدر دعاء استغفار کرنا۔ (مسلم شریف: ۱/۷۶) ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ ابوداود شریف میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دفن سے فارغ ہو کر ٹھہرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم اپنے بھائی کے لئے دعاء مغفرت کرو، اس کو ابھی قبر میں سوال ہوگا۔ (مرقاۃ شرح مشکوۃ: ۴/۱۳۹) [احکام میت–سکرات سے فاتحہ تک کی سنن وبدعات: ۴۳-۴۴]

آپ کے امام صاحب کا کہنا بالکل غلط ہے، تدفین یا زیارت کے موقع پر سورۂ یٰسین شریف یا کوئی دوسری سورت پڑھنا واجب نہیں ہے؛ بل کہ جب زیارت کے لیے جائے، تو سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص، سورۂ تکاثر اور سورۂ یٰسین پڑھنا مستحب ہے۔ (مرقاۃ شرح مشکوۃ جلد ۴ صفحہ ۸۲)[۲]

امام صاحب جیسے ذمہ دار آدمی کو ایسی غلط بات نہ بتانی چاہیے، آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ قرب قیامت میں بعض لوگ بغیر علم کے دوسروں کو مسئلہ بتائیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (حدیث شریف)[۳]

---

[۲] وأخرج أبو محمد السمرقندي في فضائل {قل هو الله أحد} [الإخلاص:۱] عن علي مرفوعا: من مر على المقابر وقرأ {قل هو الله أحد} [الإخلاص:۱] إحدى عشرة مرة، ثم وهب أجره للأموات، أعطي من الأجر بعدد الأموات، وأخرج أبو القاسم: سعد بن علي الزنجاني في موائده عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من دخل المقابر، ثم قرأ فاتحة الكتاب، وقل هو الله أحد، وألهاكم التكاثر. ثم قال: إني جعلت ثواب ما قرأت من كلامك لأهل المقابر من المؤمنين والمؤمنات، كانوا شفعاء له إلى الله تعالى، وأخرج القاضي أبو بكر بن عبد الباقي الأنصاري في مشيخته عن سلمة بن عبيد قال: قال حماد المكي: خرجت ليلة إلى مقابر مكة فوضعت رأسي على قبر فنمت، فرأيت أهل المقابر حلقة حلقة، فقلت: قامت القيامة قالوا: لا، ولكن رجل من إخواننا قرأ: قل هو الله أحد، وجعل ثوابها لنا فنحن نقتسمه منذ سنة، وأخرج عبد العزيز صاحب الخلال بسنده عن أنس: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من دخل المقابر فقرأ سورة يس خفف الله عنهم، وكان له بعدد من فيها حسنات، وقال القرطبي: حديث: اقرءوا على موتاكم يس، هذا يحتمل أن تكون هذه القراءة عند الميت في حال حياته، ويحتمل أن تكون عند قبره، كذا ذكره السيوطي في شرح الصدور. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۳/۱۲۲۸، كتاب الجنائز، باب دفن الميت، رقم الحديث: ۱۷۱۷، ط: دار الفكر - بيروت ☆ عمدة القاري شرح صحيح البخاري - بدر الدين العينى (م: ۸۵۵ھ): ۳/۱۱۸، كتاب الوضوء، "باب" قبل: باب ما جاء في غسل البول، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

[۳] عن عبد الله بن عمرو بن العاص قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن الله لا يقبض العلم انتزاعا ينتزعه من العباد، ولكن يقبض العلم بقبض العلماء، حتى إذا لم يبق عالما اتخذ الناس رءوسا جهالا، فسئلوا فأفتوا بغير علم، فضلوا وأضلوا. (صحيح البخاري: ۱/۲۰، رقم الحديث: ۱۰۰، كتاب العلم، باب كيف يقبض العلم، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/۳۴۰، رقم الحديث: ۱۳ - ۲۶۷۳، كتاب العلم، باب رفع العلم وقبضه وظهور الجهل والفتن في آخر الزمان، ط: ديوبند)

بخاری شریف (جلد۱، صفحہ ۱۸) [۴] میں ہے کہ علم کم ہو جائے گا اور جہالت عام ہو جائے گی۔

الغرض سورۂ یٰسین کی تلاوت کو واجب ٹھہرانا غلط ہے، قبرستان جا کر پڑھنا مستحب ہے، پڑھیں گے، تو ثواب ملے گا، نہیں پڑھیں گے، تو گناہ نہیں ہوگا، جب کہ آپ کے امام اس کو واجب کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ پڑھنے والے سب گنہ گار ہوں گے، مذہب اسلام میں ایسی تنگی نہیں ہے، اگر واجب ہوتا تو عوام کتنے بڑے بھاری گناہ میں گرفتار ہو جاتے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] تدفین کے بعد قبر پر فاتحہ پڑھنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

۱۱۷۲- سوال: میت کو قبرستان میں لے جانے پر تدفین کے بعد قبر پر فاتحہ پڑھنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

میت کو دفن کرنے کے بعد سر کی جانب "الٓمٓ، ذلك الكتاب لا ريب فيه" سے "هم المفلحون" تک، اور پیروں کی جانب سورۂ بقرہ کی اخیری آیت "آمن الرسول" سے اخیر تک پڑھ کر دیر تک دعا میں مشغول رہنا آپ ﷺ سے ثابت ہے۔ اونٹ کو ذبح کر کے اس کے گوشت کو تقسیم کیا جائے، اتنی دیر تک آپ ﷺ دعاء مانگتے تھے۔ [۱]

---

(۴) عن أنس بن مالك، قال: لأحدثنكم حديثا لا يحدثكم أحد بعدي، سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "من أشراط الساعة: أن يقل العلم، ويظهر الجهل، ويظهر الزنا، وتكثر النساء، ويقل الرجال، حتى يكون لخمسين امرأة القيم الواحد". (صحيح البخاري: ۱/ ۱۸، رقم الحديث: ۸۱، كتاب العلم، باب رفع العلم وظهور الجهل، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۳۴۰، رقم الحديث: ۸-۲۶۷۱، كتاب العلم، باب رفع العلم وقبضه وظهور الجهل والفتن في آخر الزمان، ط: ديوبند)

(۱) حدیث میں یہ ہے کہ آپ ﷺ دفن کے بعد کچھ دیر موجود رہتے اور دعاء واستغفار کرتے، نیز اس کا صحابہ کو بھی حکم دیتے تھے، جیسا کہ اس روایت میں ہے: عن عثمان بن عفان، قال: كان النبي -صلى الله عليه وسلم- إذا فرغ من دفن الميت، وقف عليه، فقال: استغفروا لأخيكم، وسلوا له بالتثبيت، فإنه الآن يسأل. (سنن أبي داود: ۲/ ۴۵۹، رقم الحديث: ۳۲۲۱، كتاب الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت الانصراف، ط: البدر - ديوبند ☆ السنة - الإمام أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني (م: ۲۴۱هـ): ۲/ ۵۹۸، رقم: ۱۴۲۵، سئل عن عذاب القبر وفتنة القبر، ت: د. محمد سعيد سالم القحطاني، ط: دار ابن القيم - الدمام ☆ إثبات عذاب القبر وسؤال الملكين - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ)، ص: ۱۴۵، رقم الحديث: ۲۱۱-۲۱۲، ت: د. شرف محمود القضاة، ط: دار الفرقان - عمان الأردن) =

نوٹ: دفن کرنے کے بعد جو آیت کی تلاوت کرتے ہیں، اُس کو دعا کہتے ہیں، اُس کے لیے فاتحہ کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں ہے، اُس کا معنیٰ الگ ہوتا ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

۱۱۷۳- سوال: قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

چہرہ قبلہ کی طرف کر کے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا [اس طور پر کہ سامنے کوئی قبر نہ ہو] جائز ہے۔[2]

= لیکن اونٹ کو ذبح کر کے اس کے گوشت کو تقسیم کرنے کے بقدر آپ ﷺ کا قبر کے پاس دعاء میں مشغول رہنا احقر کو نہیں ملا، ہاں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے اپنے انتقال کے وقت اس کی وصیت فرمائی تھی، طویل حدیث ہے، جزو مقصود ملاحظہ فرمائیں: فإذا دفنتموني فشنوا علي التراب شنا، ثم أقيموا حول قبري قدر ما تنحر جزور ويقسم لحمها، حتى أستأنس بكم، وأنظر ماذا أراجع به رسل ربي. (صحيح المسلم: ۱/ ۷۶، رقم: ۱۹۲- (۱۲۱)، كتاب الإيمان، باب بيان حكم عمل الكافر إذا أسلم بعده، ط: البدر ديوبند)

تقدم تخريجه تحت عنوان: دفن کے بعد سر اور پیر کی جانب سورۂ بقرہ کی آیات پڑھنا ☆ بعد دفن میت کے سرہانے اور پائتی سورۂ بقرہ کی ابتدائی و آخری آیات پڑھنے کا حکم۔

(۱) اس لیے کہ ''فاتحہ'' کا استعمال اہل بدعت کے یہاں اُس موقع پر ہوتا ہے، جب کہ سامنے کھانا یا مٹھائی رکھی جائے، اگر بتی جلائی جائے اور اُس کے سامنے بیٹھ کر قرآن کریم کی مخصوص سورت یا آیت پڑھی جائے، اور ان سب میں یہ عقیدہ کارفرما ہوتا ہے کہ مردے کی روح گھر میں ہر جمعرات کو آتی ہے، اور صاحب خانہ سے فریاد کرتی ہے، حالاں کہ یہ بات قطعاً غلط ہے، ضابطہ یہ ہے کہ ایک لفظ کے کئی مفہوم ہوں، ایک صحیح اور دوسرا غلط، تو احوط یہ ہے کہ اس لفظ کو استعمال ہی نہ کیا جائے، كما يفهم من قوله تعالى: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا. (۲- البقرة: ۱۰۴)

(۲) بہتر یہ ہے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا نہ مانگی جائے، اس کے بغیر بھی میت کو ثواب پہنچ جاتا ہے، لیکن اگر ہاتھ اٹھا کر ہی دعاء مانگنا ہو، تو قبلہ رو ہو کر دعاء مانگے، جیسا کہ ذیل کی روایت میں ہے:

عن أبي وائل، عن عبد الله، قال: "والله لكأني أرى رسول الله صلى الله عليه وسلم في غزوة تبوك، وهو في قبر عبد الله ذي البجادين وأبو بكر وعمر رضي الله تعالى عنهم، يقول: أدليا مني أخاكما، وأخذه من قبل القبلة حتى أسنده في لحده، ثم خرج النبي صلى الله عليه وسلم وولاهما العمل، فلما فرغ من دفنه استقبل القبلة رافعا يديه يقول: اللهم إني أمسيت عنه راضيا فارض عنه، وكان ذلك ليلا، فوالله لقد رأيتني ولوددت أني مكانه، ولقد أسلمت قبله بخمسة عشر سنة" (حلية الأولياء وطبقات الأصفياء- أبو نعيم أحمد بن عبد الله، الأصبهاني (م: ۴۳۰ھ): ۱/ ۱۲۲، عبد الله ذو البجادين ومنهم الأواه التالي، المتجرد من المعروض الخالي... ، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: فتاویٰ محمودیہ: ۹/ ۱۴۴، ط: مکتبہ شیخ الاسلام- دیوبند۔

قبر کی طرف رخ کر کے دعا مانگنے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ لوگ یہ سمجھیں گے کہ قبر والے سے مانگتا ہے؛ اس لیے قبر کی طرف سے رخ پھیر کر قبلہ رو ہو کر دعا مانگنی چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] قبرستان میں قبر کے سامنے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

۱۱۷۴- سوال: قبرستان میں میت کو دفنانے کے بعد دعا کی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ اس دعا میں ہاتھ اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

میت کو دفنانے کے بعد قبر پر دعا کرنا جائز؛ بل کہ مستحب ہے اور اس دعا میں ہاتھ اٹھانا بھی جائز ہے؛ کیوں کہ دعاء کے آداب میں ہاتھ اٹھانا بھی شامل ہے، حدیث شریف میں بھی قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنے کا ذکر ہے۔ لیکن دعاء کے وقت منہ قبلہ کی طرف رکھنا چاہیے، قبر کی طرف نہیں رکھنا چاہیے۔ (فتاوی رحیمیہ ☆ شامی)[۱]

قبرستان میں زیارت کے لیے گئے ہوں، تو بھی ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے؛ لیکن کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے، جس سے یہ معلوم ہو کہ قبر سے یا قبر والے سے کچھ مراد (منت) مانگی جارہی ہے؛ اس لیے قبلہ رو ہو کر دعاء کی جائے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] دیکھیے: فتاویٰ رحیمیہ: ۷/ ۹۵، کتاب الجنائز، باب ما یتعلق بایصال الثواب، بہ عنوان: تدفین کے بعد مجتمعاً ایصال ثواب کا حکم، ط: دار الاشاعت، کراچی، پاکستان ☆ رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۲۳۷، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجنازۃ، مطلب فی دفن المیت۔

(۲) وفي حديث بن مسعود رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم في قبر عبد الله ذي النجادين الحديث، وفيه فلما فرغ من دفنه استقبل القبلة رافعا يديه، أخرجه أبو عوانة في صحيحه. (فتح الباري شرح صحيح البخاري - أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي (م: ۸۵۲ھ): ۱۱/ ۱۴۴، كتاب الدعوات، باب الدعاء مستقبل القبلة، ط: دار المعرفة - بيروت)

عن عائشة، قالت: كنت إلى جنب النبي صلى الله عليه وسلم ففقدته فاتبعته فإذا هو بالبقيع رافعا يديه يدعو، فقال: يا ابنة أبي بكر، أحسبت أن الله يحيف عليك ورسوله، إن الله ينزل في هذه الليلة النصف من شعبان، فيغفر فيها من الذنوب أكثر من عدد شعر معز كلب. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار - أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵ھ): ۶/ ۱۰۸، رقم الحديث: ۲۹۸۵۸، كتاب الدعاء، ما قالوا في ليلة النصف من شعبان وما يغفر فيها من الذنوب، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد - الرياض)

مزید تفصیل کے لیے "قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا" کے حواشی دیکھیں۔

[۱۴] میت کے لیے ایصال ثواب کا افضل طریقہ اور دعاء میں ہاتھوں کا اٹھانا

۱۱۷۵- سوال: میت کو دفنانے کے بعد قرآن مجید کی کن آیتوں کا پڑھنا افضل ہے؟ نیز اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر دعائے مغفرت کرتے وقت ہاتھ اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: حاجی محمد حسین

الجواب حامداو مصلیا:

دفنِ میت کے بعد سورہ بقرہ کی ابتدائی آیت: الٓمّٓ سے هم المفلحون تک اور پاؤں کی جانب آخری آیت آمن الرسول سے اخیر تک پڑھ کر اس کے لیے دعائے مغفرت کریں؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہی لمبی لمبی دعائیں کیا کرتے تھے، اتنی دیر تک دعاء کرتے تھے، جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جا سکے۔(۱) ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا جائز ہے، مگر چہرہ قبلہ کی جانب کر کے دعاء کرے۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] میت کے دفن کے بعد قبر پر ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا

۱۱۷۶- سوال: کیا میت کو دفن کرنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا ضروری ہے؟ ہاتھ اٹھانے میں کیا فائدہ اور نہ اٹھانے میں کیا نقصان ہے؟ تفصیل سے جواب عطا فرمائیں گے۔ احقر مولوی ولی فلاحی خانپوری

الجواب حامداو مصلیا:

قبرستان میں زیارت قبور کے مقصد کے لیے گیا ہو یا کسی میت کے دفن کے لیے؛ دونوں صورتوں میں دعا کو ضروری سمجھنا بدعت ہے اور ہر بدعت، موجب ضلالت ہے۔(۳)

---

(۱) ''دفن کے بعد سر اور پیر کی جانب سورۂ بقرہ کی آیات پڑھنا'' کے حواشی دیکھیں۔

(۲) ''قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا'' کے حواشی دیکھیں۔

(۳) عن عائشة- رضي الله عنها- قالت: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود ☆ صحيح مسلم: ۲/۷۷، رقم الحديث: ۱۷-(۱۷۱۸)، كتاب الحدود، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور، ط: فيصل- ديوبند)

قال الملا علي القاري: (من أحدث)، أي: جدد وابتدع أو أظهر واخترع (في أمرنا هذا)، أي: في دين الإسلام، ... وعبر عنه بالأمر تنبيها على أن هذا الدين هو أمرنا الذي نهتم له ونشتغل به، بحيث لا يخلو عنه شيء من أقوالنا وأفعالنا. (ما ليس منه): كذا في "الصحيحين، والحميدي و"جامع الأصول" و"شرح السنة" وفي=

البتہ کھڑے ہوکر قبلہ کی جانب اپنا منہ کر کے دعا کرنا مستحب ہے، مسلم شریف میں ہے کہ مدینہ منورہ میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بقیع غرقد میں ہاتھ اٹھا کر دعاء کی تھی۔ (مسلم شریف ۱/ ۳۱۳)[1]

امام نوویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ کھڑے ہوکر، ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا مستحب ہے؛[2] لہٰذا اگر ہاتھ اٹھائے بغیر دعا کرے، تو بھی جائز ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] نمازِ جنازہ کے بعد اور قبر پر دعا مانگنا، اگربتی جلانا اور دفن کے بعد ۴۰/ قدم پر دعا کرنا

۱۱۷۷- سوال: نماز جنازہ کے بعد دعا مانگنا جائز ہے یا نہیں؟ اور قبرستان میں قبر کے اوپر اگربتی جلانا جائز ہے یا نہیں اور مردے کو دفن کرنے کے بعد ۴۰/ قدم پر کھڑے ہوکر مردے کے لیے دعا کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟

=" المشارق " وبعض نسخ المصابيح: ما ليس فيه (فهو) ، أي: الذي أحدثه (رد)، أي: مردود عليه. . . . قال القاضي: المعنى من أحدث في الإسلام رأيا لم يكن له من الكتاب والسنة سند ظاهر أو خفي ملفوظ أو مستنبط فهو مردود عليه. (مرقاة المفاتيح: ۱/ ۲۲۲، رقم الحديث: ۱۴۰، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، ط: دار الفكر- بيروت)

ويكره عند القبر كل ما لم يعهد من السنة. (البحر الرائق: ۲/ ۲۰۱، كتاب الجنائز، قبيل باب الشهيد، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۱] . . . قالت عائشة: ألا أحدثكم عني وعن رسول الله صلى الله عليه وسلم قلنا: بلى، قال: قالت: لما كانت ليلتي التي كان النبي صلى الله عليه وسلم فيها عندي، انقلب فوضع رداءه، وخلع نعليه، فوضعهما عند رجليه، وبسط طرف إزاره على فراشه، فاضطجع، فلم يلبث إلا ريثما ظن أن قد رقدت، فأخذ رداءه رويدا، وانتعل رويدا، وفتح الباب فخرج، ثم أجافه رويدا، فجعلت درعي في رأسي، واختمرت، وتقنعت إزاري، ثم انطلقت على إثره، حتى جاء البقيع فقام، فأطال القيام، ثم رفع يديه ثلاث مرات، ثم انحرف فانحرفت، فأسرع فأسرعت، فهرول فهرولت، فأحضر فأحضرت، فسبقته فدخلت . . . الحديث. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۱۳، كتاب الجنائز، فصل في التسليم على أهل القبور والدعاء والاستغفار لهم، ط: مختار اينڈ كمپني- ديوبند)

[۲] قولها (جاء البقيع، فأطال القيام، ثم رفع يديه ثلاث مرات) فيه استحباب إطالة الدعاء، وتكريره، ورفع اليدين فيه، وفيه أن دعاء القائم أكمل من دعاء الجالس في القبور. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، المعرف بـ شرح النووي-أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ۶۷۶هـ): ۷/ ۴۳، كتاب الجنائز، قوله صلى الله عليه وسلم: اللهم اغفر لأهل بقيع الغرقد، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

الجواب حامداً ومصلياً:

مسلمانوں کو وہی کام کرنا چاہیے، جس کی اصل قرآن کریم اور نبوی تعلیمات میں ہو، رسول اللہ ﷺ کی اطاعت لازم وضروری ہے اور جو شخص رسول اللہ ﷺ کے بتلائے ہوئے راستہ کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرے گا، وہ گمراہ ہو جائے گا۔ (۱)

رسول اللہ ﷺ سے جس چیز کی اصل ثابت نہ ہو، اس کو دین سمجھ کر انجام دینا بدعت ہے۔ (۲)

جنازہ کی نماز کے بعد اور تدفین کے بعد ۴۰ رقدم چل کر دعا مانگنا، رسول اللہ سے ثابت نہیں ہے، لہٰذا جو شخص اس کو ضروری سمجھ کر کرے گا، تو وہ بدعت کا مرتکب ہوگا، واضح رہے کہ نماز جنازہ بجائے خود مستقل دعاء ہے؛ لہٰذا اس کے بعد دعا مانگنا مسنون نہیں ہوگا۔ (۳)

---

(۱) وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ (۳-آل عمران: ۸۵)

(۲) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: (من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد.) متفق عليه.______ قال الملا علي القاري: (من أحدث)، أي: جدد وابتدع أو أظهر واخترع (في أمرنا هذا)، أي: في دين الإسلام،... وعبر عنه بالأمر تنبيها على) أن هذا الدين هو أمرنا الذي نهتم له ونشتغل به بحيث لا يخلو عنه شيء من أقوالنا وأفعالنا.... (ما ليس منه): كذا في "الصحيحين"، والحميدي و "جامع الأصول" و "شرح السنة" وفي "المشارق" وبعض نسخ المصابيح ما ليس فيه (فهو)، أي: الذي أحدثه (رد)، أي: مردود عليه... قال القاضي: المعنى من أحدث في الإسلام رأيا لم يكن له من الكتاب والسنة سند ظاهر أو خفي ملفوظ أو مستنبط فهو مردود عليه. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۱/ ۲۲۲، رقم الحديث: ۱۴۰، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، الفصل الأول، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) ولا يدعو للميت بعد صلاة الجنازة لأنه يشبه الزيادة في صلاة الجنازة. (المصدر السابق: ۳/ ۱۲۱۳، تحت حديث مالك بن هبيرة رضي الله عنه، رقم الحديث: ۱۶۸۷، كتاب الجنائز، باب المشي بالجنازة والصلاة عليها، الفصل الثالث، ط: دار الفكر - بيروت)

ولا يقوم الرجل بالدعاء بعد صلاة الجنازة؛ لأنه قد دعا مرة، لأن أكثر صلاة الجنازة الدعاء. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۰۵، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

میت کے اعمال صالحہ اس کے لیے خوش بو کا درجہ رکھتے ہیں؛ صالح انسان کی روح نکالنے کے لیے جو فرشتہ آتا ہے، وہ خوش بو لے کر آتا ہے۔[۴] اس لیے میت کے لیے اگربتی وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے اور قبر پر اس کا جلانا اسراف اور فضول خرچی کی وجہ سے حرام ہے۔[۵]

اگر ورثاء کے مال سے ہے، تو ان کی اجازت کے بغیر مال خرچ کرنے کا گناہ بھی لازم آئے گا؛ اس لیے ان چیزوں سے اجتناب ضروری ہے، البتہ جن تختوں پر لٹا کر غسل دیتے ہیں، اس کو دھونی دینا اور اس کے کفن کے کپڑوں کو دھونی دینا مسنون ہے۔[۶] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] تدفین کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

۱۱۷۸- سوال: میت کو دفن کرنے کے بعد جو دعا کی جاتی ہے، اس میں ہاتھ اٹھانا چاہیے یا نہیں؟

---

(۴) وذكر ابن الحاج في المدخل أنه ينبغي أن يجتنب ما أحدثه بعضهم من أنهم يأتون بماء الورد فيجعلونه على الميت في قبره فإن ذلك لم يرو عن السلف رضي الله عنهم فهو بدعة، قال ويكفيه من الطيب ما عمل له وهو في البيت فنحن متبعون لا مبتدعون فحيث وقف سلفنا وقفنا اهـ. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:١٢٣١هـ) ، ص:٢٠٨ ، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز ،فصل في حملها و دفنها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۵) عن ابن عباس قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم زائرات القبور، والمتخذين عليها المساجد والسرج. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي- أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ٣٠٣هـ): ٤/ ٩٤، كتاب الجنائز، التغليظ في اتخاذ السرج على القبور، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية- حلب)

(والسرج): جمع سراج، والنهي عن اتخاذ السرج لما فيه من تضييع المال؛ لأنه لا نفع لأحد من السراج، ولأنها من آثار جهنم، وإما للاحتراز عن تعظيم القبور، كالنهي عن اتخاذ القبور مساجد، كذا قاله بعض علمائنا. (مرقاة المفاتيح: ٢/ ٦١٩، كتاب الصلاة، باب المساجد ومواضع الصلاة، رقم الحديث: ٧٤٠، ط: دار الفكر- بيروت)

(۶) وجميع ما يجمر فيه الميت ثلاث: عند خروج روحه لإزالة الرائحة الكريهة وعند غسله وعند تكفينه، ولا يجمر خلفه ولا في القبر؛ لما روي "لا تتبعوا الجنازة بصوت ولا نار". (فتح القدير- كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م:٨٦١هـ): ٢/ ١٠٨، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل في الغسل، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ١٩٥، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر- بيروت)

الجواب حامداو مصلیا:

میت کو دفن کرنے کے بعد ہاتھ اٹھائے بغیر دعا کرنی چاہیے۔[1] اور اگر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنی ہو، تو چہرہ قبلہ کر طرف، اور پشت قبر کی طرف رکھے۔[2] اور قبر کے پاس فاتحہ خوانی کا جو رواج ہے، وہ ناجائز ہے۔ (فتاوی رشیدیہ)[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] ایضاً

۱۱۷۹-سوال: قبرستان میں میت کو دفنانے کے بعد دعا کی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ اس دعا میں ہاتھ اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

میت کو دفنانے کے بعد قبر پر دعا کرنا جائز؛ بل کہ مستحب ہے اور اس دعا میں ہاتھ اٹھانا بھی جائز ہے؛

---

(۱) عن سليمان بن بريدة، عن أبيه، قال: "كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعلمهم إذا خرجوا إلى المقابر، فكان قائلهم يقول - في رواية أبي بكر -: السلام على أهل الديار، - وفي رواية زهير -: السلام عليكم أهل الديار من المؤمنين والمسلمين، وإنا إن شاء الله للاحقون، أسأل الله لنا ولكم العافية". (الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۱۴، رقم الحديث: ۱۰۴-۹۷۵، كتاب الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، فصل في الذهاب إلى زيارة القبور، ط: المكتبة الأشرفية- ديوبند)

عن عائشة، أنها قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم - كلما كان ليلتها من رسول الله صلى الله عليه وسلم - يخرج من آخر الليل إلى البقيع، فيقول: السلام عليكم دار قوم مؤمنين، وأتاكم ما توعدون غدا، مؤجلون، وإنا، إن شاء الله، بكم لاحقون، اللهم، اغفر لأهل بقيع الغرقد. (حوالہ سابق: رقم الحدیث: ۱۰۲-۹۷۴)

عن ابن عباس قال: مر رسول الله صلى الله عليه وسلم بقبور المدينة فأقبل عليهم بوجهه، فقال: السلام عليكم يا أهل القبور، يغفر الله لنا ولكم، أنتم سلفنا، ونحن بالأثر. (سنن الترمذي: ۱/ ۲۰۳، رقم الحديث: ۱۰۵۳، أبواب الجنائز، باب ما يقول الرجل إذا دخل المقابر، ط: ديوبند)

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں عنوان: ''قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا'' ☆ ''میت کے دفن کے بعد قبر پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا''۔

[۳] حضرت مفتی صاحب نے فتاوی رشیدیہ کے حوالے سے یہ تحریر فرمایا ہے کہ فاتحہ خوانی کا رواج ناجائز ہے۔

حالاں کہ ''فتاوی رشیدیہ'' میں سوال وجواب کی تفصیل یوں ہے:

سوال: بعد دفن میت کے چند قدم ہٹ کر فاتحہ وغیرہ پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

جواب: چند قدم ہٹنا اس کی کچھ اصل نہیں، مگر بعد دفن کے اگر ایصال ثواب کے لیے کچھ بخشے تو درست ہے؛ لیکن کلمات تعزیت کہنے درست نہیں۔ (تالیفات رشیدیہ مع فتاوی رشیدیہ: ص ۲۳۳، مطبوعہ، مکتبۃ الحق، ماڈرن ڈیری جوگیشوری)

کیوں کہ دعاء کے آداب میں ہاتھ اٹھانا بھی شامل ہے، حدیث شریف میں بھی قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنے کا ذکر ہے۔ لیکن دعاء کے وقت منہ قبلہ کی طرف رکھنا چاہیے، قبر کی طرف نہیں رکھنا چاہیے۔ [1]

قبرستان میں زیارت کے لیے گئے ہوں، تو بھی ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے؛ لیکن کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے، جس سے یہ معلوم ہو کہ قبر سے یا قبر والے سے کچھ مراد (منت) مانگی جا رہی ہے؛ اس لیے قبلہ رو ہو کر دعا کی جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] نابالغ بچوں کے ایصال ثواب کے لیے نابالغ بچوں کو کھلانا

۱۱۸۰- سوال: ڈیڑھ دو سال کا معصوم بچہ انتقال کر گیا ہو، تو اس کو ایصال ثواب کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ایصال ثواب سے مراد، انتقال کے بعد معصوم بچوں کو کھلانا ہے۔ سوال کی وجہ یہ ہے کہ معصوم بچے کو ایصال ثواب کرنے سے کیا فائدہ، وہ گنہ گار تو ہے نہیں؛ لہٰذا اس کے انتقال کے بعد صرف ایصال ثواب کے لیے معصوم بچوں کو کھانا کھلانا رسم اور بدعت تو نہیں ہوگا؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامدا ومصلیا:

ایصال ثواب کے لیے جو چیز کھلائی جائے، اسے غریبوں کو کھلانا چاہیے۔ معصوم بچے اگر مال دار کے ہوں، تو انہیں کھلانا گویا مال دار کو کھلانا ہے، جس کا ثواب غرباء کو کھلانے جیسا نہیں ہوگا۔ [1]

یہ صحیح ہے کہ نابالغ بچے کو ایصال ثواب کی ضرورت نہیں، نابالغ اولاد کی عبادت کا ثواب اس کے والدین کو ملتا ہے۔ [2] اگر چہ بچوں کو اپنے عمل کے ثواب کی بھی ضرورت نہیں، مگر پھر بھی کوئی ایصال ثواب

---

(۱) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے عنوان: ''تدفین کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا'' کا حاشیہ۔

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: عید میلاد پر ایک واقعہ سے استدلال (فتاویٰ فلاحیہ: ۱/ ۳۹۰) کا حاشیہ نمبر: ۵۔

(۳) نابالغ کو ان کی حسنات کا ثواب ملتا ہے، نہ کہ اس کے والدین کو؛ والدین کو عمدہ تعلیم و تربیت کا ثواب ملتا ہے۔ عام علماء کا قول یہی ہے، البتہ بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ والدین کو بچوں کے علم اور اس نیکی کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، تفصیل کے لیے ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

وقالوا ثواب الطفل للطفل. (الدر المختار) ـــــــــ قال ابن عابدين: (قوله ثواب الطفل للطفل) - {وأن ليس للإنسان إلا ما سعى} [النجم: ۳۹] - وهذا قول عامة مشايخنا وقال بعضهم: ينتفع المرء بعلم ولده بعد موته لما روي عن أنس بن مالك - رضي الله تعالى عنه - أنه قال من جملة ما ينتفع به العبد بعد موته أن يترك ولدا علمه القرآن والعلم فيكون لوالده أجر ذلك من غير أن ينقص من أجر الولد شيئا اهـ جامع الصغار للأسروشني، ويؤيده=

کرے، تو ثواب پہنچ جائے گا۔[۳] جیسا کہ انبیاء و رسل معصوم ہوتے ہیں؛ لیکن کوئی انہیں ایصال ثواب کرے، تو ثواب پہنچتا ہے اور ان کے درجات میں ترقی ہوتی ہے۔[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= قوله - صلى الله عليه وسلم - : إذا مات ابن آدم انقطع عمله إلا من ثلاث" حموي، وتمام الحديث: صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له. وفي الأشباه: وتصح عبادته. واختلفوا في ثوابها والمعتمد أنها له وللمعلم ثواب التعليم، وكذا جميع حسناته اهـ.ـــــــــ أقول: ظاهره أنه قيل إن ثوابها لوالده فلا منافاة بين المعتمد، وبين القول بأنه، ينتفع بعلم ولده على أن ولد المرء من سعيه، لأنه من خير كسبه كما ورد لكنه يشمل البالغ، والخلاف إنما هو في الصغير، وهذا يؤيد ما قلنا من أن مقابل المعتمد هو أن الثواب للأب فقط، وأنه لا منافاة بين القولين السابقين تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ٦/ ٣١-٠ ٣٣، قبيل كتاب إحياء الموات، ط: دار الفكر)

وفي البزازي إذا عمل الصبي حسنات قبل البلوغ فثوابه له لا لأبويه، ولهما ثواب التعليم إن علماه، وقيل ثواب الطاعة له مع أبويه. (لسان الحكام في معرفة الأحكام-أحمد بن محمد بن محمد، أبو الوليد، لسان الدين ابن الشِّحْنَة الثقفي الحلبي الحلبي (م: ۸۸۲هـ) ص: ۳۷۲، الفصل التاسع عشر في الهبة، ط: البابي الحلبي - القاهرة ☆البحر الرائق شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۲۱۲، كتاب الجنائز، باب الشهيد، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح-أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ) ص: ۵۸۷، باب أحكام الجنائز، فصل الصلاة عليه، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية، بيروت-لبنان)

(۳) سائل کا یہ دریافت کرنا کہ بچے معصوم ہوتے ہیں، ان کو ایصال ثواب کرنا بے معنی ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں، لہٰذا معصوم بچے کے لیے ایصال ثواب کے طور پر کھانا کھلانا کہیں رسم و رواج میں داخل تو نہیں ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ فی الجملہ اس ثواب کا اثر بچے پر پڑتا ہے، شہداء احد پر نماز جنازہ پڑھی گئی تھی، حالاں کہ وہ مغفور ہیں، اس کا جواب دیتے ہوئے ابن نجیم مصریؒ نے جو کچھ تفصیل بیان کی ہے، اس سے متعلقہ مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے، تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

وأما الصلاة، فلصلاته - عليه السلام - على حمزة وغيره يوم أحد، ولحديث البخاري: أنه صلى على قتلى أحد بعد ثمان سنين، وما قيل من أنهم أحياء، والحي لا يصلى عليه، فمدفوع بأنه حكم أخروي لا دنيوي، بدليل ثبوت أحكام الموتى لهم من قسمة تركاتهم، وبينونة نسائهم إلى غير ذلك، وما قيل من أنها للاستغفار وهم مغفور لهم، فمنتقض بالنبي والصبي كما في الهداية، وما في فتح القدير من أنه لو اقتصر على النبي لكان أولى، فإن الدعاء في الصلاة على الصبي لأبويه فمدفوع من أن كلامه في نفس الصلاة لا في المدعو له ولأن الصبي ليس بمستغن عن الرحمة فنفس الصلاة عليه رحمة له ونفس الدعاء الوارد لأبويه دعاء له؛ لأنه إذا كان فرطا لأبويه فقد تقدمهما في الخير لا سيما، وقد قالوا إن حسنات الصبي له لا لأبويه، ولهما ثواب التعليم. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۲۱۲، كتاب الجنائز، باب الشهيد، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۴)... وكذا اختلف في إطلاق قول "اجعل ذلك زيادة في شرفه - صلى الله عليه وسلم - فمنع منه شيخ الإسلام=

[۲۰] میت کے ایصالِ ثواب کے لیے حج کروانا

۱۱۸۱- سوال: میری بھانجی کا انتقال ہوگیا ہے اور اس کے والدین، اس کے ایصالِ ثواب کے لیے مجھے حج بدل کے طور پر بھیجنا چاہتے ہیں، تو بھانجی کے نام سے میں حج کس طریقے پر ادا کروں؟ احرام کس طرح باندھا جائے اور نیت کس طرح کی جائے؟ اور اس سے پہلے میں نے کبھی حج نہیں کیا، تو کیا میں اپنی بھانجی کی جانب سے حج بدل کرسکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

سب سے پہلے دیکھا جائے گا کہ اس لڑکی پر (جو آپ کی بھانجی ہے) حج فرض تھا یا نہیں؟ اگر تھا، تو حج بدل میں ایسے شخص کو بھیجنا چاہیے، جس نے اپنا حج ادا کرلیا ہو، اگر کوئی ایسے شخص کو حج بدل کے طور پر بھیجے، جس نے اپنا حج ادا نہیں کیا ہے، تو ایسی صورت میں بھی بھیجنے والے کی جانب سے فریضہ ساقط ہوجائے گا، البتہ یہ بہتر نہیں ہے۔

= البلقيني والحافظ ابن حجر؛ لأنه لم يرد له دليل. وأجاب ابن حجر المكي في الفتاوى الحديثية بأن قوله تعالى {وقل رب زدني علما} [طه: ١١٤] وحديث مسلم "أنه - صلى الله عليه وسلم - كان يقول في دعائه: واجعل الحياة زيادة لي في كل خير" دليل على أن مقامه - صلى الله عليه وسلم - وكماله يقبل الزيادة في العلم والثواب وسائر المراتب والدرجات، وكذا ورد في دعاء رؤية البيت: وزد من شرفه وعظمه واعتمره تشريفا إلخ فيشمل كل الأنبياء، ويدل على أن الدعاء لهم بزيادة الشرف مندوب، وقد استعمله الإمام النووي في خطبتي كتابيه الروضة والمنهاج، وسبقه إليه الحليمي وصاحبه البيهقي. وقد رد على البلقيني وابن حجر شيخ الإسلام القاياتي، ووافقه صاحبه الشرف المناوي، ووافقهما أيضا صاحبهما إمام الحنفية الكمال بن الهمام، بل زاد عليهما بالمبالغة حيث جعل كل ما صح من الكيفيات الواردة في الصلاة عليه - صلى الله عليه وسلم - موجودا في كيفية الدعاء بزيادة الشرف، وهي: اللهم صل أبدا أفضل صلواتك على سيدنا محمد عبدك ونبيك ورسولك محمد وآله وسلم تسليما كثيرا، وزده تشريفا وتكريما، وأنزله المنزل المقرب عندك يوم القيامة اهـ. فانظر كيف جعل طلب هذه الزيادة من الأسباب المقتضية لفضل هذه الكيفية على غيرها من الوارد كصلاة التشهد وغيرها، وهذا تصريح من هذا الإمام المحقق بفضل طلب الزيادة له - صلى الله عليه وسلم - فكيف مع هذا يتوهم أن في ذلك محذورا، ووافقهم أيضا صاحبهم شيخ الإسلام زكريا اهـ ملخصا. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ٢٤٤، باب صلاة الجنازة، مطلب في إهداء ثواب القراءة للنبي صلى الله عليه وسلم، ط: دار الفكر - بيروت)

اور اگر حج لڑکی پر فرض نہیں ہے، تو پھر حج نفل ہوگا اور مرحومہ کو اس کا ثواب پہنچ جائے گا۔ (ان شاء اللہ)[۱]

نوٹ مرحومہ کے والدین کو بتلایا جائے کہ مرحومہ کے لیے ایسا کام کریں، جس میں ثواب زیادہ ہو، محتاج رشتہ دار اور یتیم و مسکین کی مدد زیادتی ثواب کا باعث ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] والأفضل للإنسان إذا أراد أن يحج رجلاً عن نفسه أن يحج رجلاً قد حج عن نفسه؛ لأنه أهدى إلى إقامة الأعمال؛ ولأنه أبعد عن الخلاف، فإن الذي لم يحج عن حجة الإسلام عن نفسه لم تجز حجته عن غيره عند بعض الناس، ومع هذا لو أحج رجلاً لم يحج عن نفسه حجة الإسلام يجوز عندنا، وسقط الحج عن الآمر؛ لأن النبي عليه السلام حين أمر الخثعمية، قال الحج عن أبيها لم يستفسر أنها هل حجت عن نفسها أم لا؟. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني -أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:٦١٦هـ): ٢/ ٤٨٧، كتاب المناسك، الفصل الخامس عشر: في الرجل يحج عن آخر، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆الفتاوى التاتارخانية: ٣/ ٦٤٩، كتاب الحج، الفصل الخامس عشر في الحج عن الغير، ط: زكريا - ديوبند☆ إرشاد الساري إلى مناسك الملا علي القاري،ص:٦٥٠، باب الحج عن الغير☆ الفتاوى الهندية:١/ ٢٥٧، كتاب المناسك، الرابع عشر في الحج في الحج عن الغير، ط: دار الفكر - بيروت☆ المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م:٤٨٣هـ): ٤/ ١٥١، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت وغيره، ط: دار المعرفة- بيروت)

(٢) حج الفرض أولى من طاعة الوالدين بخلاف النفل. بناء الرباط أفضل من حج النفل. واختلف في الصدقة ورجح في البزازية أفضلية الحج لمشقته في المال والبدن جميعا، قال: وبه أفتى أبو حنيفة حين حج وعرف المشقة. (الدر المختار) ـــــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله ورجح في البزازية أفضلية الحج) حيث قال الصدقة أفضل من الحج تطوعا، كذا روي عن الإمام لكنه لما حج وعرف المشقة أفتى بأن الحج أفضل، ومراده أنه لو حج نفلا وأنفق ألفا، فلو تصدق بهذه الألف على المحاويج، فهو أفضل لا أن يكون صدقة فليس أفضل من إنفاق ألف في سبيل الله تعالى، والمشقة في الحج لما كانت عائدة إلى المال والبدن جميعا فضل في المختار على الصدقة. اهـ. قال الرحمتي: والحق التفصيل، فما كانت الحاجة فيه أكثر والمنفعة فيه أشمل فهو الأفضل كما ورد "حجة أفضل من عشر غزوات" وورد عكسه فيحمل على ما كان أنفع، فإذا كان أشجع وأنفع في الحرب فجهاده أفضل من حجه، أو بالعكس فحجه أفضل، وكذا بناء الرباط إن كان محتاجا إليه كان أفضل من الصدقة وحج النفل وإذا كان الفقير مضطرا أو من أهل الصلاح أو من آل بيت النبي - صلى الله عليه وسلم - فقد يكون إكرامه أفضل من حجات وعمر وبناء ربط. ـــــــــــــ كما حكى في المسامرات عن رجل أراد الحج فحمل ألف دينار يتأهب بها فجاءته امرأة في الطريق وقالت له إني من آل بيت النبي - صلى الله عليه وسلم - وبي ضرورة، فأفرغ لها ما معه، فلما رجع حجاج بلده صار كلما لقي رجلا منهم يقول له تقبل الله منك، فتعجب من قولهم، فرأى النبي - صلى الله عليه=

[۲۱] جنازہ کی نماز کے بعد دعا اور ایصال ثواب کی بعض صورتوں کا حکم

۱۱۸۲- سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل کے بارے میں کہ:

ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا بدعت ہے؛ کیوں کہ اس کا ثبوت حدیث وفقہ میں نہیں ہے، نماز جنازہ خود دعا ہے، اس کے بعد دعاء مانگنے میں قباحت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعاء کو نماز کے اندر یا باہر کے ساتھ مقید فرمایا ہو یا اس دعاء سے منع فرمایا ہو، اس کے لیے کتب معتبرہ سے کچھ ثبوت ہے؟ کیوں کہ صحاح ستہ وغیرہ احادیث کی کتاب میں موجود ہے کہ یہ بدعت نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص بدعت پر ثواب سمجھ کر عمل پیرا ہو، تو اس کے لیے شرعا کیا حکم ہے؟

فاتحہ اور ایصال ثواب کے طریقے - جو کہ بدعت حسنہ ہیں اور تطوع اعمال میں شمار ہیں - مباح ہیں یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

نماز جنازہ کے بعد دعاء مانگنا بدعت ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، مولوی صاحب کا فرمانا بالکل صحیح ہے۔[1]

نماز جنازہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنا بدعت ہے۔

=وسلم - في نومه، وقال له: تعجبت من قولهم تقبل الله منك؟ قال نعم يا رسول الله، قال: إن الله خلق ملكا على صورتك حج عنك، وهو يحج عنك إلى يوم القيامة بإكرامك لامرأة مضطرة من آل بيتي، فانظر إلى هذا الإكرام الذي ناله لم ينله بحجات ولا ببناء ربط. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۲۱، كتاب الحج، مطلب في تفضيل الحج على الصدقة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ منحة الخالق على البحر الرائق: ۲/ ۳۳۴، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۱) ولا يدعو للميت بعد صلاة الجنازة؛ لأنه يشبه الزيادة في صلاة الجنازة. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۳/ ۱۲۱۳، كتاب الجنائز، المشي بالجنازة والصلاة عليها، ط: دار الفكر - بيروت)

ولا يقوم الرجل بالدعاء بعد صلاة الجنازة؛ لأنه قد دعا مرة، لأن أكثر صلاة الجنازة الدعاء. (المحيط البرهاني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۰۵، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

فی نفسہ فاتحہ پڑھنا بہت بڑے ثواب کا کام ہے، مگر اس موقع پر لوگوں نے اس کو ضروری اور لازم سمجھ رکھا ہے اور نہ پڑھنے پر اعتراض کرتے ہیں، ان کو برا کہتے ہیں، اور جو چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، ان کو ضروری اور لازم ٹھہرانا ایسا ہے کہ گویا وہ لوگ دین کے ناقص ہونے کے دعوے دار ہیں، تو یہ بدعت حسنہ نہیں ہوگا اور اپنی طرف سے دیگر مذاہب کی دیکھا دیکھی کسی ایسے غیر ثابت شدہ عمل کو انجام دینا جس کا دین محمدی سے کوئی تعلق نہ ہو، سخت جرم ہے۔(۲)

فی نفسہ ایصال ثواب بہت اچھی چیز ہے، خواہ نماز، قرآن شریف اور تسبیح وغیرہ پڑھ کر ہو، یا غرباء کو کھانا، اور کپڑا وغیرہ دے کر، لیکن تیجہ، دسواں، بیسواں اور چالیسواں شرعاً ثابت نہیں ہے، بل کہ انتقال کے بعد، ایصال ثواب جس قدر جلد ممکن ہو، بہتر اور نافع ہے۔(۳)

(۲) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: (من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد.) متفق عليه. ـــــــــ قال الملا علي القاري: (من أحدث)، أي: جدد وابتدع أو أظهر واخترع (في أمرنا هذا)، أي: في دين الإسلام، . . . وعبر عنه بالأمر تنبيها على) أن هذا الدين هو أمرنا الذي نهتم له ونشتغل به بحيث لا يخلو عنه شيء من أقوالنا وأفعالنا. . . . (ما ليس منه): كذا في "الصحيحين"، والحميدي و"جامع الأصول" و"شرح السنة" وفي "المشارق" وبعض نسخ المصابيح ما ليس فيه (فهو)، أي: الذي أحدثه (رد)، أي: مردود عليه. . . قال القاضي: المعنى من أحدث في الإسلام رأيا لم يكن له من الكتاب والسنة سند ظاهر أو خفي ملفوظ أو مستنبط فهو مردود عليه. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۱/ ۲۲۲، رقم الحديث: ۱۴۰، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، الفصل الأول، ط: دار الفكر - بيروت)

قال الطيبي: وفيه أن من أصر على أمر مندوب، وجعله عزما، ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال فكيف من أصر على بدعة أو منكر؟ (المصدر السابق: ۲/ ۷۵۵، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، تحت رقم الحديث: ۹۴۶)

(۳) والأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره، صلاة أو صوما أو صدقة أو قراءة قرآن أو ذكرا أو طوافا أو حجا أو عمرة أو غير ذلك، عند أصحابنا للكتاب والسنة، أما الكتاب: فلقوله تعالى: {وقل ربي ارحمهما كما ربياني صغيرا} [الإسراء: ۲۴]، وإخباره تعالى عن ملائكته بقوله {ويستغفرون للذين آمنوا} [غافر: ۷] وساق عبارتهم بقوله تعالى {ربنا وسعت كل شيء رحمة وعلما فاغفر للذين تابوا واتبعوا سبيلك} [غافر: ۷] إلى قوله {وقهم السيئات} [غافر: ۹]، وأما السنة: فأحاديث كثيرة منها ما في الصحيحين "حين ضحى بالكبشين فجعل أحدهما عن أمته"، وهو مشهور تجوز الزيادة به على الكتاب، ومنها ما رواه أبو داود "اقرءوا على موتاكم سورة يس" وحينئذ فتعين أن لا يكون قوله تعالى: {وأن ليس للإنسان إلا ما سعى} [النجم: ۳۹] على ظاهره، وفيه تأويلات =

اور یہ دسواں وغیرہ جو کچھ ہے، لوگ اسے محض رسم ورواج، ریا و شہرت اور نام ونمود کے لیے کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اعمال کی شرط صحت ایمان واخلاص کو بیان کیا ہے، جب اخلاص ہی نہیں ہوگا تو ثواب کیا ملے گا، اکثر غریب، یتیم بیوہ- جو مستحق ہیں- رہ جاتے ہیں اور غیر مستحق طبقہ اس طرح کی دعوت اڑا لے جاتے ہیں۔ (۴)

ایصال ثواب عموماً میت کے مال سے کیا جاتا ہے، حالاں کہ میت کے انتقال کے بعد اس (مال) سے ورثا کا حق متعلق ہو چکا ہے، اگر ورثاء نابالغ ہیں، تو ان کی اجازت کا اعتبار نہیں، پھر اس مال سے ایصال ثواب کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟ کیوں کہ اگر وہ اجازت دے دیں، تب بھی ان کا مال کھانا حرام ہے، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں: جو یتیم کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ آگ کھاتے ہیں اور اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔ (۵)

میت کو مدد کی فوراً ضرورت ہے، جب کہ ایصال ثواب کا رواج تین دن کے بعد یا چالس دن کے بعد کا ہے، معلوم ہوا کہ اس سے میت کو فائدہ پہنچانا مقصود نہیں ہے؛ بل کہ صرف رواج کی پابندی ہے، جس سے میت کو کچھ ثواب نہیں ملے گا، میت کو ثواب پہنچانا ہو، تو مستحق کو اناج یا نقد روپیہ دیا جائے، اور وہ بھی اپنی کمائی میں سے ہو، اگر میت کے مال میں سے دیا جائے، تو اس شرط کے ساتھ کہ وارث سب کے سب بالغ

=أقربها ما اختاره المحقق ابن الهمام أنها مقيدة بما يهبه العامل، يعني ليس للإنسان من سعي غيره نصيب إلا إذا وهبه له فحينئذ يكون له، وأما قوله -عليه السلام-: "لا يصوم أحد عن أحد، ولا يصلي أحد عن أحد". فهو في حق الخروج عن العهدة لا في حق الثواب، فإن من صام أو صلى أو تصدق وجعل ثوابه لغيره من الأموات والأحياء جاز ويصل ثوابها إليهم عند أهل السنة والجماعة كذا في البدائع، وبهذا علم أنه لا فرق بين أن يكون المجعول له ميتا أو حيا.= (البحر الرائق: ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، كتاب الصلاة، باب الجنائز، مطلب في القراءة للميت وإهداء ثوابها له، ط: دار الفكر - بيروت ☆ شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور - عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱ھ): ۱/ ۳۰۲، باب في قراءة القرآن للميت أو على القبر، ت: عبد المجيد طعمه حلبي، ط: دار المعرفة - لبنان، ۱۴۱۷ھ ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۲۹۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: ياسر نديم - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۷، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۔ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۔ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ۝ (۲۲-الحج: ۳۷)

(۵) إِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۔ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۝ (۴-النساء: ۱۰)

ہوں اور اس بات پر سب بشاشت کے ساتھ راضی ہوں، ایسی صورت میں (ان شاء اللہ) ثواب کی امید ہے۔
کسی کے انتقال کے بعد کھانا پکانا اور دعوتیں کرنا مکروہ ہے، یہ تو خوشی میں ہوتا ہے نہ کہ غم کے موقع سے۔ (شامی)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] فاتحہ کا مقصد اور اس کے کھانے کے مستحق کون ہیں؟

۱۱۸۳- سوال: فاتحہ دینے کا مقصد کیا ہے؟ اور فاتحہ کھانے کے مستحق وحق دار کون ہیں؟ اگر کوئی مستحق وحق دار نہ ہو، تو فاتحہ خوانی قبول ہوگی یا نہیں؟ فاتحہ کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟ کھانے کے بعد بھی جو فاتحہ پڑھا جاتا ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟ فاتحہ خوانی کے وقت اگربتی جلانا اور دھونی دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

صدقہ کے مستحق وحق دار غرباء ہیں۔[2]

---

(۱) ویکرہ اتخاذ الضیافة من الطعام من أهل المیت لأنه شرع في السرور لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة، وروی الإمام أحمد وابن ماجه بإسناد صحیح عن جریر بن عبد الله قال "کنا نعد الاجتماع إلی أهل المیت وصنعهم الطعام من النیاحة". اهـ. وفي البزازیة: ویکره اتخاذ الطعام في الیوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلی القبر في المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة صورة الأنعام أو الإخلاص...، وهذه الأفعال کلها للسمعة والریاء فیحترز عنها؛ لأنهم لا یرون وجه الله تعالی... ولا سیما إذا کان في الورثة صغار أو غائب، مع قطع النظر عما یحصل عند ذلك غالبا من المنکرات الکثیرة کإیقاد الشموع والقنادیل التي توجد في الأفراح، وکدق الطبول، والغناء بالأصوات الحسان، واجتماع النساء والمردان، وأخذ الأجرة علی الذکر وقراءة القرآن، وغیر ذلك مما هو مشاهد في هذه الأزمان، وما کان کذلك فلا شك في حرمته وبطلان الوصیة به، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظیم. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/۲۴۰-۲۴۱، باب صلاة الجنازة، مطلب في کراهة الضیافة من أهل المیت، ط: دار الفکر - بیروت ☆ فتح القدیر - کمال الدین محمد بن عبد الواحد السیواسي المعروف بابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۲/۱۴۲، کتاب الصلاة، باب الجنائز، قبیل باب الشهید، ط: دار الفکر)

(۲) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹-التوبۃ: ۶۰)

واضح رہے کہ یہ حکم صدقات واجبہ کا ہے، اگر ورثا اپنی طرف سے نفل صدقہ کریں، تو غنی بھی کھا سکتے ہیں، البتہ ہبہ کا ثواب ملے گا، کیوں کہ غنی کو صدقہ کرنا درحقیقت ہبہ ہے: لأن الصدقة علی الغني هبة کما أن الهبة للفقیر صدقة. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/۳۵۵، کتاب الزکاة، باب مصرف الزکاة والعشر، قبیل: فروع في مصرف الزکاة، ط: دار الفکر)

دن کی تعیین کے بغیر اناج وغلہ عاقل و بالغ آدمی اپنی کمائی سے کرے، تو جائز ہے۔

میت کے مال میں سے وارثوں کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے۔

فاتحہ کا جو رواج ہے، وہ صحیح نہیں ہے، بدعت ہے۔[1] مذکورہ کھانا رسم کے طور پر کھلایا جاتا ہے، اور اس موقع سے متعدد رسوم کا اہتمام کیا جاتا ہے، جن کی وجہ سے ثواب حاصل نہ ہوگا، بل کہ ارتکاب بدعت کا گناہ ہوگا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] تدفین وایصال ثواب کے چند مسائل

۱۱۸۴- سوال: (۱) میت کو سامنے رکھ کر سورۂ ملک پڑھنا کیسا ہے؟ ـــــ (۲) میت کو دفنانے کے بعد، چالیس قدم واپس آ کر فاتحہ دینا اور قبر کے سرہانے بیٹھ کر تلقین وغیرہ کرنا کیسا ہے؟ ـــــ (۳) صلوۃ جنازہ کے بعد جنازہ اٹھانے سے قبل میت کے لیے دعا کرنا کیسا ہے؟ ـــــ (۴) میت کو کفنانے کے بعد اس کی پیشانی پر کلمہ طیبہ لکھنا کیسا ہے؟ ان سوالات کے مع دلیل جوابات مرحمت فرمائیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) میت پر سکرات کا وقت ہو، تو سورۂ یٰسین اور سورۂ رعد کے پڑھنے کو علماء نے مستحب لکھا ہے۔ (درمختار مع شامی جلد ۱، صفحہ ۷۹۷)[۳]

---

(۱) ... تعریف الشمني لها [البدعة] بأنها ما أحدث على خلاف الحق المتلقى عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - من علم أو عمل أو حال بنوع شبهة واستحسان، وجعل دينا قويما وصراطا مستقيما اهـ فافهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۰-۵۶۱، باب الإمامة، مطلب البدعة خمسة أقسام، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) مسئلے کی مکمل تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے فتاویٰ فلاحیہ (۱/ ۳۷۵-۳۷۸) کا عنوان: "کسی کے مرنے پر مخصوص دنوں میں قرآن خوانی اور دعوت کرنا"۔

[۳] (ويلقن) ... (عنده) قبل الغرغرة .... ويندب قراءة يس والرعد. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: قوله ويندب قراءة يس) لقوله - صلى الله عليه وسلم - "اقرءوا على موتاكم يس"، صححه ابن حبان، وقال المراد به من حضره الموت. وروى أبو داود عن مجالد عن الشعبي قال: كانت الأنصار إذا حضروا قرءوا عند الميت سورة البقرة إلا أن مجالدا مضعف، حلية. (قوله: والرعد) هو استحسان بعض المتأخرين لقول جابر إنها تهون عليه خروج روحه، إمداد. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۹۰-۱۹۱، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، قبيل: مطلب في التلقين بعد الموت، ط: دار الفكر - بيروت)

روح نکل جانے کے بعد جب تک غسل نہ دیا جائے، میت کے قریب بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرنا مکروہ ہے۔[۱] البتہ غسل دینے کے بعد یا بلا غسل میت اس سے دور بیٹھ کر قرآن کریم کی تلاوت جائز ہے (شامی جلد ۱، صفحہ ۷۹۹)[۲]

غسل دینے کے بعد سورۂ ملک پڑھے، تو کوئی حرج نہیں ہے، مگر اس کی کوئی خاص فضیلت نہیں ہے، غسل کے بعد کسی خاص سورت کی تلاوت کا حکم ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا قرآن مجید کی جن سورتوں کو بھی پڑھے، جائز ہے۔

(۲) جنازہ کی نماز کے بعد یا دفن کے بعد فاتحہ پڑھنا اور ان کا تاکید کے ساتھ پڑھنے کو کہنا، احادیث اور خلفاء راشدین کے عمل سے ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا جائز نہیں ہے، بلکہ غیر شرعی غیر مسنون عمل کو، سنت یا ثواب سمجھ کر کرے گا، تو بدعتیوں میں شامل ہو کر گنہ گار ہوگا۔[۳]

---

(۱) ويقرأ عنده القرآن إلى أن يرفع إلى الغسل كما في القهستاني معزيا للنتف. قلت: وليس في النتف إلى الغسل بل إلى أن يرفع فقط، وفسره في البحر برفع الروح. وعبارة الزيلعي وغيره تكره القراءة عنده حتى يغسل، وعلله الشرنبلالي في إمداد الفتاح تنزيها للقرآن عن نجاسة الميت لتنجسه بالموت. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۹۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر-بيروت)

[۲] وذكر ط أن محل الكراهة إذا كان قريبا منه، أما إذا بعد عنه بالقراءة فلا كراهة. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۹۳)

(۳) عن عائشة - رضي الله عنها - قالت: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود ☆صحيح مسلم: ۲/ ۷۷، رقم الحديث: ۱۷-(۱۷۱۸)، كتاب الحدود، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور، ط: فيصل-ديوبند)

قال الملا علي القاري: (من أحدث)، أي: جدد وابتدع أو أظهر واخترع (في أمرنا هذا)، أي: في دين الإسلام، ... وعبر عنه بالأمر تنبيها على أن هذا الدين هو أمرنا الذي نهتم له ونشتغل به، بحيث لا يخلو عنه شيء من أقوالنا وأفعالنا. (ما ليس منه): كذا في "الصحيحين"، والحميدي و"جامع الأصول" و"شرح السنة" وفي "المشارق" وبعض نسخ المصابيح: ما ليس فيه (فهو)، أي: الذي أحدثه (رد)، أي: مردود عليه. ... قال القاضي: المعنى من أحدث في الإسلام رأيا لم يكن له من الكتاب والسنة سند ظاهر أو خفي ملفوظ أو مستنبط فهو مردود عليه. (مرقاة المفاتيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۱/ ۲۲۲، رقم الحديث: ۱۴۰، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، ط: دار الفكر-بيروت) =

اور رہی تلقین تو سکرات کے وقت مسنون ہے؛ اس لیے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تلقین کرنے کی اجازت دی ہے۔[۱]

دفن کے بعد کی تلقین اس طریقہ پر کہ "یافلان بن فلان! قل رضیت باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد رسولا" اس کی بھی گنجائش ہے۔[۲]

مگر بہتر یہ ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جو اپنے لیے وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: جب میری تدفین سے فارغ ہو جاؤ، تو میری قبر کے پاس اتنی مقدار ٹھہرنا کہ اونٹ کو ذبح کر کے اس کے گوشت کو تقسیم کر دیا جائے۔ (مسلم شریف)[۳]

= قال الطيبي:... أن من أصر على أمر مندوب، وجعله عزما، ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال... وجاء في حديث ابن مسعود - رضي الله تعالى عنه -: "إن الله - عز وجل - يحب أن تؤتى رخصه كما يحب أن تؤتى عزائمه" اهـ. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۲/۷۵۵، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، رقم الحديث: ۹۴۶)

(۱) (قوله ولقن الشهادتين) لقوله - عليه الصلاة والسلام - لقنوا موتاكم شهادة أن لا إله إلا الله. والمراد الذي قرب من الموت وصورة التلقين أن يقال عنده في حالة النزع جهرا وهو يسمع أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا رسول الله سميا شهادتين لأنهما شهادة بوحدانية الله وشهادة برسالة محمد - صلى الله عليه وسلم - ولا يقال له قل ويلقن قبل الغرغرة ولا يلح عليه في قولها مخافة أن يضجر فإذا قالها مرة لا يعيدها عليه الملقن إلا أن يتكلم بكلام غيرها، قال - عليه الصلاة والسلام - من كان آخر كلامه لا إله إلا الله دخل الجنة. (الجوهرة النيرة - أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/۱۰۱ - ۱۰۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز، ط: المطبعة الخيرية ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۱۹۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في تلقين المحتضر الشهادة، ط: دار الفكر)

(۲) وأما تلقين الميت في القبر فمشروع عند أهل السنة لأن الله تعالى يحييه في القبر، وصورته أن يقال يا فلان بن فلان أو يا عبد الله بن عبد الله اذكر دينك الذي كنت عليه، وقد رضيت بالله ربا، وبالإسلام دينا، وبمحمد نبيا. (الجوهرة النيرة: ۱/ ۱۰۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۱۹۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في تلقين المحتضر الشهادة)

(۳) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے اپنے انتقال کے وقت اس کی وصیت فرمائی تھی، طویل حدیث ہے، جزو مقصود ملاحظہ فرمائیں: فإذا دفنتموني فشنوا علي التراب شنا، ثم أقيموا حول قبري قدر ما تنحر جزور ويقسم لحمها، حتى أستأنس بكم، وأنظر ماذا أراجع به رسل ربي. (صحيح المسلم: ۱/۷۶، رقم: ۱۹۲- (۱۲۱)، كتاب الإيمان، باب بيان حكم عمل الكافر إذا أسلم بعده، ط: البدر ديوبند)

اس سے معلوم ہوا کہ میت کے لیے طویل دعا کرنا جائز ہے (طحطاوی علی مراقی الفلاح صفحہ ۳۰۶)[1]

اسی طریقے سے عالمگیری میں لکھا ہے کہ دفن کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کی جائے اور میت کے لیے دعا کرے، البتہ مروجہ فاتحہ جائز نہیں ہے، تلاوت قرآن اور تسبیح ودعا کے ذریعے میت کو ایصال ثواب کریں۔[2]

(۳) صورت مسئولہ میں دعا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ احادیث مبارکہ سے ثابت نہیں، نماز جنازہ خود دعا ہے۔[3]

(۴) روشنائی سے لکھنا جائز نہیں، البتہ غسل کے بعد کفن پہناتے وقت، پیشانی پر انگلی کے اشارے سے "**بسم اللہ الرحمن الرحیم**" اور سینہ پر "**لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**" لکھا جائے، تو گنجائش ہے (شامی: ۴۸۰/۱)[4]، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ففي صحيح مسلم عن عمرو بن العاص قال: "إذا دفنتموني أقيموا عند قبري قدر ما ينحر جزور ويقسم لحمها حتى أستأنس بكم وأنظر ماذا أراجع رسل ربي". (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱ھ)، ص: ۵۲۰، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت - لبنان ☆ الجوهرة النيرة: ۱/ ۱۱۰، كتاب الصلاة، باب الجنائز، قبيل باب الشهيد ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۷، كتاب الصلاة، باب الجنائز، مطلب في دفن الميت)

(۲) ويستحب إذا دفن الميت أن يجلسوا ساعة عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ينحر جزور ويقسم لحمها يتلون القرآن ويدعون للميت، كذا في الجوهرة النيرة ـــــــ قراءة القرآن عند القبور عند محمد - رحمه الله تعالى - لا تكره ومشايخنا - رحمهم الله تعالى - أخذوا بقوله، وهل ينتفع؟ والمختار أنه ينتفع، هكذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۶، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن والنقل، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید تفصیل کے لیے عنوان "تدفین کے بعد فاتحہ اور تلقین کا حکم" کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) تفصیل کے لیے "قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا" کے حواشی دیکھیں۔

[۴] نقل بعض المحشين عن فوائد الشرجي أن مما يكتب على جبهة الميت بغير مداد بالأصبع المسبحة - بسم الله الرحمن الرحيم - وعلى الصدر لا إله إلا الله محمد رسول الله، وذلك بعد الغسل قبل التكفين اهـ والله أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۷، باب صلاة الجنازة، مطلب فيما يكتب على كفن الميت، ط: دار الفكر)

تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: میت کے سینے پر آیت کریمہ یا کلمہ طیبہ لکھنا۔

[۲۴] دفن کے بعد قبر پر اذان دینے کی کوئی اصل نہیں

۱۱۸۵- سوال: ہمارے یہاں بریلوی علماء یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ دفن کے بعد قبر کے مردہ پر اذان دینی چاہیے، اپنی معتبر کتب و رسائل کے حوالے بھی دیتے ہیں؛ اس لیے درخواست ہے کہ ہمارے مسلک کی معتبر کتابوں کے حوالے سے بریلوی علماء کے دلائل کے جوابات تفصیلاً تحریر فرمائیں؟

نوٹ:۔ کیا شیطان کا گذر قبر پر ہوتا ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

قبر پر اذان کی حنفیہ کے نزدیک کوئی اصل نہیں، شافعیہ کے نزدیک صرف اس قدر ہے کہ قبر میں رکھنے کے بعد میت کو صرف شہادتین کی تلقین کی جائے، جس طرح موت کے وقت تلقین کی جاتی ہے؛ لیکن حضرت علامہ ابن حجر مکیؒ- جو شافعی مسلک کے مفتی بھی ہیں- نے اس تلقین کو بھی رد کردیا ہے، چناں چہ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے درمختار کی شرح میں فرمایا کہ: ایک قول ضعیف قبر پر اذان دینے کے بارے میں ہے؛ لیکن ابن حجرؒ نے اس کو رد کردیا ہے، بعض آفات کے وقت اذان کہی جاتی ہے، جیسے آگ لگ جائے تو اذان کہی جائے، اسی طرح قبر پر اذان کے بعض حضرات قائل ہیں۔ (شامی صفحہ ۳۸۵ شامی جلد ۲ صفحہ ۱۹۱)[۱]

---

[۱] في الاقتصار علی ما ذكر من الوارد إشارة إلی أنه لا يسن الأذان عند إدخال الميت في قبره كما هو المعتاد الآن، وقد صرح ابن حجر في فتاويه بأنه بدعة. وقال: ومن ظن أنه سنة قياسا على ندبهما للمولود إلحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم يصب. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار-ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲/ ۲۳۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر)

(قوله: لا يسن لغيرها) أي من الصلوات وإلا فيندب للمولود. وفي حاشية البحر الرملي: رأيت في كتب الشافعية أنه قد يسن الأذان لغير الصلاة، كما في أذان المولود، والمهموم، والمصروع، والغضبان، ومن ساء خلقه من إنسان أو بهيمة، وعند مزدحم الجيش، وعند الحريق، قيل وعند إنزال الميت القبر قياسا على أول خروجه للدنيا، لكن رده ابن حجر في شرح العباب. (المصدر السابق: ۱/ ۳۸۵، كتاب الصلاة، باب الأذان، مطلب في المواضع التي يندب لها الأذان في غير الصلاة، ط: دار الفكر ☆منحة الخالق على البحر الرائق: ۱/ ۲۶۹، كتاب الأذان، الجمع بين الصلاتين في وقت بعذر، ط: دار الكتاب الإسلامي)

ان (بریلوی) حضرات نے تلقین کو اذان سے بدل دیا ہے۔ بعض فقہاء سے منقول ہے کہ اس قسم کی تلقین، قبر میں رکھنے کے بعد (مٹی ڈالنے سے قبل) کی جائے، وجہ یہ ہے کہ یہ ایک قسم کا ذکر ہے اور ذکر سے میت کو خاص فائدہ ہوتا ہے، اور میت کو انسیت حاصل ہوتی ہے؛ اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے، تاہم انہوں نے اس کو مستحب اور مسنون نہیں بتلایا ہے۔ (۲)

شیطان کا گذر قبر میں تو کیا ہو سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ اس کا وسوسہ یا اس کے فتنوں کا اثر قبر میں پہنچ سکتا ہے؛ لیکن اس سے کسی مؤمن کے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا، صحیح حدیث شریف میں آیا ہے کہ منکر ونکیر جب قبر میں سوال کریں گے، تو جو مؤمن ہوگا، وہ صحیح جواب دے گا اور جو منافق یا کافر ہوگا، وہ "هاها لاأدري" کہے گا، فرشتے کہیں گے: ہم پہلے ہی سے جانتے تھے کہ تو ایسا ہی جواب دے گا۔

---

(۲) (قوله: ولا يلقن بعد تلحيده) ذكر في المعراج: أنه ظاهر الرواية، ثم قال وفي الخبازية والكافي عن الشيخ الزاهد الصفار: أن هذا على قول المعتزلة؛ لأن الإحياء بعد الموت عندهم مستحيل، أما عند أهل السنة فالحديث أي "لقنوا موتاكم لا إله إلا الله" محمول على حقيقته؛ لأن الله تعالى يحييه على ما جاءت به الآثار، وقد روي عنه - عليه الصلاة والسلام - "أنه أمر بالتلقين بعد الدفن فيقول: يا فلان بن فلان اذكر دينك الذي كنت عليه من شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، وأن الجنة حق، والنار حق، وأن البعث حق، وأن الساعة آتية، لا ريب فيها، وأن الله يبعث من في القبور وأنك رضيت بالله ربا، وبالإسلام دينا، وبمحمد - صلى الله عليه وسلم - نبيا، وبالقرآن إماما، وبالكعبة قبلة، وبالمؤمنين إخوانا. اهـ. وقد أطال في الفتح في تأييد حمل موتاكم في الحديث على حقيقته مع التوفيق بين الأدلة على أن الميت يسمع أو لا كما سيأتي في باب اليمين في الضرب والقتل من كتاب الأيمان؛ لكن قال في شرح المنية: إن الجمهور على أن المراد منه مجازه ثم قال: وإنما لا ينهى عن التلقين بعد الدفن لأنه لا ضرر فيه بل نفع فإن الميت يستأنس بالذكر على ما ورد في الآثار إلخ. ــــــــ قلت: وما في ط عن الزيلعي لم أره فيه وإنما الذي فيه قيل يلقن لظاهر ما رويناه وقيل: لا، وقيل لا يؤمر به ولا ينهى عنه اهـ وظاهر استدلاله للأول اختياره فافهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۹۱/۲، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في التلقين بعد الموت، ط: دار الفكر ☆ حاشية الطحطاوي، ص: ۵۶۰، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، ت: محمد عبد العزيز، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

عن عمرو بن العاص رضي الله عنه قال - وهو في سياق الموت -: فإذا أنا مت فلا تصحبني نائحة، ولا نار، فإذا دفنتموني فشنوا علي التراب شنا، ثم أقيموا حول قبري قدر ما تنحر جزور ويقسم لحمها، حتى أستأنس بكم، وأنظر ماذا أراجع به رسل ربي. (الصحيح لمسلم: ...... رقم الحديث: ۱۹۲ - (۱۲۱)، كتاب الإيمان، باب كون الإسلام يهدم ما قبله وكذا الهجرة والحج، ط: ديوبند)

الغرض ایمان یا کفر پر خاتمے کا فیصلہ تو زندگی کی آخری سانس پر ہوتا ہے، اب اس کے بعد ایمان کی حفاظت کی خاطر یا شیطان کے ایمان پر حملے کے اندیشے سے اذان دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ (بخاری شریف)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا

۱۱۸۶-سوال: ہمارے گاؤں میں تدفین کے بعد قبر پر اذان دینے کی رسم کا کوئی وجود نہ تھا، یہ رسم اہل بدعت میں سے بعضوں نے شروع کی ہے، جب کہ اُن میں سے بھی بعض لوگ اس کام کو پسند نہیں کرتے، ہم نے اُن کے خلاف حجت قائم کرنے کے لیے اُن ہی کے مکتبِ فکر کے ایک مدرسہ (احمد آباد) سے اس مسئلہ کے بارے میں فتویٰ طلب کیا، لیکن فتویٰ میں فقہ کی معتبر کتاب ''ردالمحتار'' کے حوالے سے اذان کی مشروعیت بتائی گئی ہے، اور ولادت پر قیاس کر کے قبر پر اذان کو ثابت کیا ہے، تو آپ سے مؤدبانہ التجا ہے کہ اس باب میں شرعی رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

فتویٰ دینے کے لیے علمِ فقہ، علمِ اصولِ فقہ، علمِ حدیث وغیرہ علوم کا ماہر ہونا ضروری ہے۔[۱]

---

[۲] عن قتادة، عن أنس رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: " العبد إذا وضع في قبره، وتولي وذهب أصحابه حتى إنه ليسمع قرع نعالهم، أتاه ملكان، فأقعداه، فيقولان له: ما كنت تقول في هذا الرجل محمد صلى الله عليه وسلم؟ فيقول: أشهد أنه عبد الله ورسوله، فيقال: انظر إلى مقعدك من النار أبدلك الله به مقعدا من الجنة، قال النبي صلى الله عليه وسلم: " فيراهما جميعا، وأما الكافر - أو المنافق - فيقول: لا أدري، كنت أقول ما يقول الناس، فيقال: لا دريت ولا تليت، ثم يضرب بمطرقة من حديد ضربة بين أذنيه، فيصيح صيحة يسمعها من يليه إلا الثقلين ". (صحيح البخاري:...... رقم الحديث: ۱۳۳۸، كتاب الجنائز، باب: الميت يسمع خفق النعال، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم:...... رقم الحديث: ۷۰-(۲۸۷۰)، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب عرض مقعد الميت من الجنة أو النار عليه، وإثبات عذاب القبر والتعوذ منه، ط: ديوبند)

(۱) امام نوویؒ نے مفتی کے شرائط ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

شرط المفتي كونه مكلفا مسلما ثقة مأمونا متنزها عن أسباب الفسق وخوارم المروءة فقيه النفس سليم الذهن رصين الفكر صحيح التصرف والاستنباط متيقظا. (آداب الفتوى والمفتي والمستفتي-أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ۶۷۶ھ) ص: ۱۹، فصل في شروط المفتي، ت: بسام عبد الوهاب الجابي، ط: دار الفكر - دمشق)

پھر ابن صلاح رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ مفتی کی دو قسم ہے، مفتی مستقل اور مفتی غیر مستقل، مفتی مستقل کی شرائط ان=

دراصل فتویٰ دینے والے اس عالم نے شامی کی عبارت کو سمجھا ہی نہیں، اور اُسے نقل بھی نہیں کیا، جب کہ اس بدعت کے برخلاف دلائل قائم ہیں، حسب ذیل امور پر غور کریں:

(۱) قبر کے اندر اُتارتے وقت اذان دی جائے، یہ ایک معقول بات ہے؛ کیوں کہ جس وقت انسان پیدا ہوتا ہے اور اس دنیا میں آتا ہے، تو اُس وقت اذان دی جاتی ہے، اسی طرح جب اس عالم کو الوداع کہہ کر عالمِ برزخ میں پہنچ رہا ہے، تو اُس وقت اذان دی جائے، (حالاں کہ اس وقت بھی اذان کہنا بدعت ہے، جیسا کہ اس فتویٰ کا آخر کا انداز بتلا رہا ہے اور سابق فتویٰ کی صراحت ہے) جب کہ یہ حضرات تو تدفین کے مکمل ہوجانے کے بعد اذان دیتے ہیں۔[۲]

= الفاظ میں نقل کیا ہے:

قال أبو عمرو ابن الصلاح المفتون قسمان مستقل وغيره:

فالمستقل شرطه مع ما ذكرنا أن يكون قيما بمعرفة أدلة الأحكام الشرعية من الكتاب والسنة والإجماع والقياس وما التحق بها على التفصيل وقد فصلت في كتب الفقه فتيسرت ولله الحمد وأن يكون عالما بما يشترط في الأدلة ووجوه دلالتها وبكيفية اقتباس الأحكام منها وهذا يستفاد من أصول الفقه عارفا من علوم القرآن والحديث والناسخ والمنسوخ والنحو واللغة والتصريف واختلاف العلماء واتفاقهم بالقدر الذي يتمكن معه من الوفاء بشروط الأدلة والاقتباس منها ذا دربة وارتياض في استعمال ذلك عالما بالفقه ضابطا لأمهات مسائله وتفاريعه. (حوالہ سابق، ص: ۲۲، ۲۳، فصل في أقسام المفتين)

اس بعد مفتی غیر مستقل کے چار درجات ذکر کیے ہیں اور اخیر میں لکھا ہے:

هذه أصناف المفتين وهي خمسة وكل صنف منها يشترط فيه حفظ المذهب وفقه النفس فمن تصدى للفتيا وليس بهذه الصفة فقد باء بأمر عظيم. (حوالہ سابق، ص: ۳۱، فصل في بعض مسائل أهلية المفتي)

(۲) في الاقتصار على ما ذكر من الوارد إشارة إلى أنه لا يسن الأذان عند إدخال الميت في قبره كما هو المعتاد الآن، وقد صرح ابن حجر في فتاويه بأنه بدعة. وقال: ومن ظن أنه سنة قياسا على ندبهما للمولود إلحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم يصب. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲/ ۲۳۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر)

(قوله: لا يسن لغيرها) أي من الصلوات وإلا فيندب للمولود. وفي حاشية البحر الرملي: رأيت في كتب الشافعية أنه قد يسن الأذان لغير الصلاة، كما في أذان المولود، والمهموم، والمصروع، والغضبان، ومن ساء خلقه من إنسان أو بهيمة، وعند مزدحم الجيش، وعند الحريق، قيل وعند إنزال الميت القبر قياسا على أول خروجه للدنيا، لكن رده ابن حجر في شرح العباب. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۸۵، كتاب الصلاة، باب الأذان، مطلب في المواضع التي يندب لها الأذان في غير الصلاة، ط: دار الفكر ☆ منحة الخالق على البحر الرائق: ۱/ ۲۶۹، كتاب الأذان، الجمع بين الصلاتين في وقت بعذر، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) حافظ ابن حجر عسقلانی فقہ شافعی کے زبردست فقہاء اور محدثین میں شمار ہوتے ہیں، اُنھوں نے اس کو بھی رد فرمایا ہے، اتنی مشہور بات بھی ان عالم صاحب کو معلوم نہیں، پھر وہ فتویٰ دینے کے لائق ہی کہاں رہے؟[۳]

(۳) ردالمحتار کا جو حوالہ ان مفتی صاحب نے دیا ہے، اُس میں صرف قبر میں اُتارنے کے وقت اذان کا تذکرہ ہے، اور اُس کے ثبوت کے لیے بھی اُنھوں نے کوئی روایت ذکر نہیں فرمائی، علاوہ ازیں دفن کے بعد صرف دعاء کا ذکر ہے، قبر میں اُتارنے کے وقت اذان دینے کا معمول نہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے نہ تعاملِ صحابہؓ سے، لہٰذا یہ امر بھی لائق عمل نہیں ہے۔[۴]

(۴) اُن مفتی صاحب کا اس فعل کو انسان کی ولادت پر قیاس کرنا بھی غلط ہے، ولادت کے موقع پر اذان واقامت حدیث پاک سے ثابت ہے۔[۵] اُس پر موت کو قیاس کیسے کیا جاسکتا ہے؟ یہ قیاس مع الفارق ہے، جو غلط ہے، علاوہ ازیں اُس پر یہ بھی تو اشکال ہوسکتا ہے کہ ولادت کے موقع پر تو اذان واقامت دونوں مسنون ہیں، تو پھر تم قبر پر صرف اذان ہی کیوں دیتے ہو؟ اقامت بھی کیوں نہیں کہتے؟ وہ اس کا کیا جواب

(۳) راجع للتفصيل رقم الحاشية: ١.

(۴) ويكره عند القبر ما لم يعهد من السنة والمعهود منها ليس إلا زيارته والدعاء عنده قائما، كذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ١/١٦٦، كتاب الصلاة، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، فصل في القبر والدفن والنقل، ط: دار الفكر)

ويكره عند القبر كل ما لم يعهد من السنة. (البحر الرائق: ٢/٢٠١، كتاب الجنائز، قبيل باب الشهيد، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۵) عن الحسين بن علي، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من ولد له مولود فأذن في أذنه اليمنى، وأقام في أذنه اليسرى رفعت عنه أم الصبيان" (شعب الإيمان-أحمد بن الحسين بن علي بن موسى الخُسْرَوْجِردي الخراساني، أبو بكر البيهقي (م: ٤٥٨هـ): ١١/١٠٦، رقم الحديث: ٨٢٥٤، حق السادة على المماليك، ت: الدكتور عبد العلي عبد الحميد حامد، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون مع الدار السلفية بيومباي بالهند★عمل اليوم والليلة سلوك النبي مع ربه عز وجل ومعاشرته مع العباد-أحمد بن محمد بن إسحاق بن إبراهيم بن أسباط بن عبد الله بن إبراهيم بن بُدَيح، الدِّيْنَوَرِيُّ، المعروف بـ"ابن السُّنِّي" (م: ٣٦٤هـ) ص: ٥٧٨، رقم الحديث: ٦٢٣، باب ما يعمل بالولد إذا ولد، ت: كوثر البرني، ط: دار القبلة للثقافة الإسلامية ومؤسسة علوم القرآن-جدة/بيروت)

دیں گے؟

صحیح جواب ہمارے پاس ہے کہ ولادت کے موقع پر اذان واقامت کہہ دی گئی، اب صرف نماز باقی تھی، جو نمازِ جنازہ پڑھنے کی وجہ سے مکمل ہوگئی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] تدفین کے بعد قبر پر اذان دینے کا حکم

۱۱۸۷- سوال: ہمارے محلہ کے قبرستان میں عید کے دو یا تین دن بعد رات کو دس بجے ایک میت کی تدفین ہوئی، اُس کے بعد اُس کی قبر پر بالجہر اذان دی گئی، اُس سے قبل ہم نے یہ عمل نہیں کیا تھا، ہاں اس کے بارے سنا ضرور تھا کہ بہت سے لوگ اِس طرح اذان دیتے ہیں، تو اس بارے میں شریعتِ مطہرہ کا حکم کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قبر پر اذان دینا جائز نہیں ہے؛ بدعت ہے، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ میں سے کسی سے یہ عمل ثابت نہیں ہے، جب کہ ان سے بڑھ کر کارِ خیر میں سبقت کرنے والے اُمت میں کوئی نہیں گزرے، اور اُن حضرات سے بڑھ کر اُمت کا کوئی خیر خواہ بھی نہیں، میت کی تدفین کے بعد جو دعائیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، وہی مسنون ہیں اور ثواب کا ذریعہ ہیں، یاد رہے کہ طریق سنت سے ہٹ کر کوئی بھی راستہ اختیار کرنا گمراہی کا باعث ہے، علامہ ابن عابدین شامیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ”میت کو قبر میں اُتارے جانے کے وقت اذان مسنون نہیں ہے۔“ نیز حافظ ابن حجرؒ نے بھی اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ یہ بدعت ہے۔ (شامی: ۲/ ۲۳۵)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) في الاقتصار على ما ذكر من الوارد إشارة إلى أنه لا يسن الأذان عند إدخال الميت في قبره كما هو المعتاد الآن، وقد صرح ابن حجر في فتاويه بأنه بدعة. وقال: ومن ظن أنه سنة قياسا على ندبهما للمولود إلحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم يصب. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار-ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲/ ۲۳۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر)

(قوله: لا يسن لغيرها) أي من الصلوات وإلا فيندب للمولود. وفي حاشية البحر الرملي: رأيت في كتب الشافعية أنه قد يسن الأذان لغير الصلاة، كما في أذان المولود، والمهموم، والمصروع، والغضبان، ومن ساء خلقه من إنسان أو بهيمة، وعند مزدحم الجيش، وعند الحريق، قيل وعند إنزال الميت القبر قياسا على أول خروجه للدنيا، لكن رده ابن حجر في شرح العباب. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۸۵، كتاب الصلاة، باب الأذان، مطلب في المواضع التي يندب لها الأذان في غير الصلاة، ط: دار الفكر ☆ منحة الخالق على البحر الرائق: ۱/ ۲۶۹، =

[۲۷] چالیس قدم پر فاتحہ خوانی

۱۱۸۸- سوال: ہمارے یہاں بھاؤنگر میں یہ رواج ہے کہ میت کو لے جاتے وقت چالیس قدم کے بعد فاتحہ پڑھتے ہیں، اسی طرح مولوی صاحب کو گھر بلا کر، زبردستی فاتحہ پڑھاتے ہیں، تو شرعاً یہ کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

ناجائز ہے، حرام ہے، بجائے ثواب کے گناہ ہوگا۔ (۱)

=كتاب الأذان، الجمع بين الصلاتين في وقت بعذر، ط: دار الكتاب الإسلامي)

ويكره عند القبر ما لم يعهد من السنة والمعهود منها ليس إلا زيارته والدعاء عنده قائما، كذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ١/١٦٦، كتاب الصلاة، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، فصل في القبر والدفن والنقل، ط: دار الفكر)

و يكره عند القبر كل ما لم يعهد من السنة. (البحر الرائق: ٢/٢٠١، كتاب الجنائز، قبيل باب الشهيد، ط: دار الكتاب الإسلامي)

عن عائشة- رضي الله عنها- قالت: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ١/٣٧١، رقم الحديث: ٢٦٩٧، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود ☆صحيح مسلم: ٢/٧٧، رقم الحديث: ١٧-(١٧١٨)، كتاب الحدود، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور، ط: فيصل- ديوبند)

قال الملا علي القاري: (من أحدث)، أي: جدد وابتدع أو أظهر واخترع (في أمرنا هذا)، أي: في دين الإسلام، ... وعبر عنه بالأمر تنبيها على أن هذا الدين هو أمرنا الذي نهتم له ونشتغل به، بحيث لا يخلو عنه شيء من أقوالنا وأفعالنا. (ماليس منه): كذا في "الصحيحين"، والحميدي و"جامع الأصول" و"شرح السنة" وفي "المشارق" وبعض نسخ المصابيح: ما ليس فيه (فهو)، أي: الذي أحدثه (رد)، أي: مردود عليه. ... قال القاضي: المعنى من أحدث في الإسلام رأيا لم يكن له من الكتاب والسنة سند ظاهر أو خفي ملفوظ أو مستنبط فهو مردود عليه. (مرقاة المفاتيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ١٠١٤هـ): ١/٢٢٢، رقم الحديث: ١٤٠، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، ط: دار الفكر- بيروت)

قال الطيبي: ... أن من أصر على أمر مندوب، وجعله عزما، ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال ... وجاء في حديث ابن مسعود- رضي الله تعالى عنه-: "إن الله- عز وجل- يحب أن تؤتى رخصه كما يحب أن تؤتى عزائمه" اهـ. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ٢/٧٧٥، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، رقم الحديث: ٩٤٦)

(١) قال [القاسم بن محمد]: أخبرتني عائشة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من عمل عملا ليس عليه أمرنا فهو رد. (الصحيح لمسلم: ٢/٧٧، رقم الحديث: ١٨-(١٧١٨)، كتاب الحدود، باب نقض الأحكام الباطلة، ورد=

نوٹ: اس سلسلہ میں مشورہ ہے کہ میری ایک کتاب ''سکرات سے فاتحہ تک کی سنن و بدعات'' پڑھیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۲۸] خودکشی کرنے والے کے لیے دعائے مغفرت کرنا

۱۱۸۹-سوال: خودکشی کرنا بڑا گناہ ہے؛ لیکن جس مسلمان نے خودکشی کر لی، تو اس کے لیے دعائے مغفرت یا ایصال ثواب کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

دعائے مغفرت اور ایصال ثواب جائز ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=محدثات الأمور، ط: ديوبند)

ويطيل الصمت إذا اتبع الجنازة ويكره رفع الصوت بالذكر، لما روي عن قيس بن عبادة أنه قال: كان أصحاب رسول الله - صلى الله عليه وسلم - يكرهون رفع الصوت عند ثلاثة: عند القتال، وعند الجنازة، والذكر، ولأنه تشبه بأهل الكتاب فكان مكروها. (بدائع الصنائع: ۱/ ۳۱۰، كتاب الصلاة، فصل بيان عدد من يحمل الجنازة وكيفية حملها، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

وينبغي لمن تبع جنازة أن يطيل الصمت، ويكره رفع الصوت بالذكر، وقراءة القرآن، وغيرهما في الجنازة، والكراهة فيها كراهة تحريم، في فتاوى العصر وعند مجد الأئمة التركماني وقال علاء الدين الناصري: ترك الأولى اهـ ـــــ وفي الظهيرية: فإن أراد أن يذكر الله يذكره في نفسه، لقوله تعالى {إنه لا يحب المعتدين} [الأعراف: ۵۵] أي الجاهرين بالدعاء، وعن إبراهيم أنه كان يكره أن يقول الرجل، وهو يمشي معها استغفروا له غفر الله لكم. (البحر الرائق: ۲/ ۲۰۷، كتاب الجنائز، قبل باب الشهيد، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۲، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الرابع في الصلاة على الميت، ط: دار الفكر)

(۱) والأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره، صلاة أو صوما أو صدقة أو قراءة قرآن أو ذكرا أو طوافا أو حجا أو عمرة أو غير ذلك، عند أصحابنا للكتاب والسنة. (البحر الرائق: ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الهداية: ۱/ ۱۷۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ت: يوسف طلال، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

صرح علماؤنا في باب الحج عن الغير بأن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوما أو صدقة أو غيرها كذا في الهداية، بل في زكاة التتارخانية عن المحيط: الأفضل لمن يتصدق نفلا أن ينوي لجميع المؤمنين والمؤمنات، لأنها تصل إليهم، ولا ينقص من أجره شيء اهـ هو مذهب أهل السنة والجماعة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في القراءة للميت وإهداء ثوابها له، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۷، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر- بيروت)

[۲۹] غیر مسلموں کی دی ہوئی رقم سے ایصال ثواب کرنا

۱۱۹۰- سوال: ایک مسلمان عورت کا انتقال ہوا، اس کے اڑوس پڑوس میں ہندو رہتے ہیں، وہ مرنے والی کی عزت کرتے تھے، اچھے تعلقات تھے، آپسی لین دین بھی تھا، اب ہندو کچھ رقم جمع کر کے مرنے والی کے لڑکوں کو ایصال ثواب کے لیے دے رہے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ورثاء وہ رقم لے سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز رقم لے کر مرنے والی کے ثواب کی نیت سے کسی مدرسہ میں دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

غیر مسلم میت سے تعلق کی بناء پر جو رقم لڑکوں کو دے رہے ہیں، لڑکے اسے قبول کر لیں، تو وہ مالک بن جائیں گے۔ [۱] مالک بننے کے بعد مذکورہ رقم کا غلہ خرید کر غریبوں میں تقسیم کر دیں یا مسجد و مدرسہ میں دے دیں، تو جائز ہے؛ لیکن مالک بننے کے بعد مرحومہ کو اس رقم سے ثواب پہونچائیں گے، تب ہی ثواب پہونچے گا۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] نمازِ جنازہ کے بعد، قبرستان سے باہر نکل کر اور گھر کے دروازے پر فاتحہ پڑھنا

۱۱۹۱- سوال: نمازِ جنازہ کے بعد، قبرستان سے باہر نکل کر اور گھر کے دروازے پر فاتحہ نہ پڑھنے کی کیا وجہ ہے؟ کیا قبرستان کے علاوہ اور کہیں فاتحہ نہیں پڑھ سکتے؟

---

(۱) م: (لأن الملك قد اختلف باختلاف سببه) ش: وذلك لأن اختلاف الأسباب بمنزلة اختلاف الأعيان. وأصله حديث بريرة حيث قال لها النبي - صلى الله عليه وسلم -: "لك صدقة ولنا هدية". (البناية شرح الهداية - محمود بن أحمد بن موسى، الحنفي، بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۷/ ۳۲، كتاب السرقة، باب في بيان ما يقطع فيه السارق وفي بيان ما لا يقطع فيه، سرق عينا فقطع فيها فردها، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) قد تقدم التخريج مرارا عن: البحر الرائق: ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، كتاب الصلاة، باب الجنائز، مطلب في القراءة للميت وإهداء ثوابها له، ط: دار الفكر - بيروت☆ شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور - عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱هـ): ۱/ ۳۰۲، باب في قراءة القرآن للميت أو على القبر، ت: عبد المجيد طعمه حلبي، ط: دار المعرفة - لبنان، ۱۴۱۷هـ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۲۹۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: ياسر نديم - ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۷، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر - بيروت.

الجواب حامداً ومصلیا:

جنازہ کو قبرستان لے جاتے ہوئے تدفین تک، نماز جنازہ کے علاوہ اور کوئی دعاء یا فاتحہ وغیرہ سنت یا مستحب نہیں ہے؛ بلکہ جنازہ کے ساتھ بالجہر کچھ بھی پڑھنا مکروہ ہے۔ (عالمگیری)[۱]

اگر کوئی شخص دعاء یا ایصال ثواب کے لیے کچھ پڑھنا چاہے تو آہستہ پڑھے، نماز جنازہ بھی میت کے لیے ایک دعاء ہی ہے، لہٰذا نماز جنازہ کے بعد بھی کوئی دعاء کرنے ضرورت نہیں۔ (مرقاۃ شرح مشکوۃ)[۲]

---

(۱) وعلى متبعي الجنازة الصمت ويكره لهم رفع الصوت بالذكر وقراءة القرآن، كذا في شرح الطحاوي، فإن أراد أن يذكر الله يذكره في نفسه، كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۲، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الرابع في حمل الجنازة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر)

قال [القاسم بن محمد]: أخبرتني عائشة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من عمل عملا ليس عليه أمرنا فهو رد. (الصحيح لمسلم: ۲/ ۷۷، رقم الحديث: ۱۸ - (۱۷۱۸)، كتاب الحدود، باب نقض الأحكام الباطلة، ورد محدثات الأمور، ط: ديوبند)

ويطيل الصمت إذا اتبع الجنازة ويكره رفع الصوت بالذكر، لما روي عن قيس بن عبادة أنه قال: كان أصحاب رسول الله - صلى الله عليه وسلم - يكرهون رفع الصوت عند ثلاثة: عند القتال، وعند الجنازة، والذكر؛ ولأنه تشبه بأهل الكتاب فكان مكروها. (بدائع الصنائع: ۱/ ۳۱۰، كتاب الصلاة، فصل بيان عدد من يحمل الجنازة وكيفية حملها، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

وينبغي لمن تبع جنازة أن يطيل الصمت، ويكره رفع الصوت بالذكر، وقراءة القرآن، وغيرهما في الجنازة، والكراهة فيها كراهة تحريم، في فتاوى العصر وعند مجد الأئمة التركماني وقال علاء الدين الناصري: ترك الأولى اهـ ــــــ وفي الظهيرية: فإن أراد أن يذكر الله يذكره في نفسه، لقوله تعالى {إنه لا يحب المعتدين} [الأعراف: ۵۵] أي الجاهرين بالدعاء، وعن إبراهيم أنه كان يكره أن يقول الرجل، وهو يمشي معها استغفروا له غفر الله لكم. (البحر الرائق: ۲/ ۲۰۷، كتاب الجنائز، قبل باب الشهيد، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۲، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الرابع في الصلاة على الميت، ط: دار الفكر)

[۲] ولا يدعو للميت بعد صلاة الجنازة لأنه يشبه الزيادة في صلاة الجنازة. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۳/ ۱۲۱۳، كتاب الجنائز، باب المشي في الجنازة والصلاة عليها، الفصل الثالث، تحت حديث: مالك بن هبيرة رضي الله عنه، رقم الحديث: ۱۶۸۷، ط: دار الفكر - بيروت)

ولا يقوم الرجل بالدعاء بعد صلاة الجنازة؛ لأنه قد دعا مرة، لأن أكثر صلاة الجنازة الدعاء. (المحيط =

تدفین کے بعد سورۂ بقرہ کی شروع اور اخیر کی آیتیں پڑھ کر میت کے لیے دعاءِ مغفرت کرنا جائز ہے، اُس کے بعد راستے میں یا گھر پہنچ کر دعاء یا فاتحہ پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں؛ بل کہ یہ بدعت ہے۔ (شامی)[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] جنازہ کے گدّے مسجد میں دینا اور متولیان مسجد کا ان کو کرایہ پر دینا

۱۱۹۲- سوال: ہمارے یہاں میت کے لیے جنازے میں جو گدا، تکیہ اور چادر رکھی جاتی ہے، وہ

=البرهاني- أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مازة البخاري الحنفي (م:۶۱۶هـ):۲/ ۲۰۵، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، ت: عبدالكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۳] عطاء بن أبي رباح، يقول: سمعت ابن عمر، يقول: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إذا مات أحدكم فلا تحبسوه، وأسرعوا به إلى قبره، وليقرأ عند رأسه بفاتحة الكتاب، وعند رجليه بخاتمة البقرة في قبره. (المعجم الكبير- أبو القاسم الطبراني (م:۳۶۰هـ): ۱۲/ ۳۴۴، رقم الحديث: ۱۳۶۱۳، باب العين، عطاء بن أبي رباح، عن ابن عمر، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية- القاهرة☆ الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر- أبو بكر أحمد بن محمد بن هارون بن يزيد الخَلّال البغدادي الحنبلي (م:۳۱۱هـ) ص:۸۸، باب القراءة عند القبور، ت: الدكتور يحيى مراد، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ شعب الإيمان- أبو بكر البيهقي (م:۴۵۸هـ): ۱۱/ ۴۷۱، رقم الحديث: ۸۸۵۴، الصلاة على من مات من أهل القبلة، ت: الدكتور عبد العلي عبد الحميد حامد، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون مع الدار السلفية ببومباي بالهند)

قد ثبت أنه- عليه الصلاة والسلام- قرأ أول سورة البقرة عند رأس ميت وآخرها عند رجليه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۲، كتاب الصلاة، باب الجنازة، مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر- بيروت)

وكان ابن عمر يستحب أن يقرأ على القبر بعد الدفن أول سورة البقرة وخاتمتها. (المصدر السابق: ۲/ ۲۳۷

☆ مزید دیکھیے: شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور- جلال الدين السيوطي (م:۹۱۱هـ): ۱/ ۱۰۹، ت: عبد المجيد طعمة حلبي، ط: دار المعرفة- لبنان.

آپ ﷺ دفن کے بعد کچھ دیر موجود رہتے اور دعاء و استغفار کرتے، نیز اس کا صحابہ کو بھی حکم دیتے تھے، جیسا کہ اس روایت میں ہے: عن عثمان بن عفان، قال: كان النبي -صلى الله عليه وسلم- إذا فرغ من دفن الميت، وقف عليه، فقال: استغفروا لأخيكم، وسلوا له بالتثبيت، فإنه الآن يسأل. (سنن أبي داود: ۲/ ۴۵۹، رقم الحديث: ۳۲۲۱، كتاب الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت الانصراف، ط: البدر- ديوبند☆ السنة- الإمام أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني (م:۲۴۱هـ): ۲/ ۵۹۸، رقم: ۱۳۲۵، سئل عن عذاب القبر وفتنة القبر، ت: د. محمد سعيد سالم القحطاني، ط: دار ابن القيم- الدمام☆ إثبات عذاب القبر وسؤال الملكين- أبو بكر البيهقي (م:۴۵۸هـ)، ص:۱۲۵، رقم الحديث: ۲۱۱- ۲۱۲، ت: د. شرف محمود القضاة، ط: دار الفرقان- عمان الأردن)

ثواب کے لیے مسجد میں رکھ دی جاتی ہے اور جب کوئی جماعت یا مسافر آئے، تو اسے استعمال کرتے ہیں، اور جب مسجد میں نکاح ہوتا ہے، تو ان گدوں کو بچھایا جاتا ہے اور دس روپئے کے حساب سے کرایہ وصول کیا جاتا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح گدے مسجد میں دینا اور متولیان کا ان گدوں سے مسجد کے لیے کرایہ حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جنازہ میں میت کے لیے جو گدا، تکیہ وغیرہ رکھا جاتا ہے، اسے مسجد میں رکھنا بہ چند وجوہ گناہ کا کام ہے، اس سے احتراز لازم ہے:

(۱) مذکورہ گدا وغیرہ میت کے مال میں سے رکھا جاتا ہے، میت کے انتقال کے بعد اس میں تمام ورثاء کا حق ہوتا ہے؛ اس لیے مسجد میں رکھنے کے لیے تمام ورثاء کی اجازت ضروری ہوتی ہے، جس کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔

اگر کوئی وارث نابالغ ہو، تو اس کی اجازت کا شریعت میں اعتبار نہیں، اور اجازت کے بغیر اس کا حق دوسرے کسی جگہ پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔[۱]

(۲) انتقال کے بعد گدا وغیرہ مسجد میں رکھنا غیر شرعی رسم ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر رسم کی وجہ سے رکھتے ہیں؛ لہٰذا اس پر ثواب کیوں کر ملے گا؟[۲]

---

(۱) وفي الخانية: وإن اتخذ ولي الميت طعاما للفقراء كان حسنا إذا كانوا بالغين، وإن كان في الورثة صغير لم يتخذ ذلك من التركة اهـ.(البحر الرائق شرح كنز الدقائق-زين الدين بن إبراهيم بن محمد ، المعروف بابن نجيم المصري(م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۲۰۷، كتاب الجنائز ، الصلاة على الميت، ط: دار الكتاب الإسلامي)

وهذه الأفعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها؛ لأنهم لا يرون وجه الله تعالى . . . ولا سيما إذا كان في الورثة صغار أو غائب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۰-۲۴۱، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت، ط: دار الفكر - بيروت☆فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بـ'ابن الهمام' (م: ۸۶۱هـ): ۲/ ۱۴۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز ، قبيل باب الشهيد، ط: دار الفكر☆الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۴۴، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) عن عائشة - رضي الله عنها - قالت: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس فيه، فهو رد. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۷۱، رقم الحديث: ۲۶۹۷، كتاب الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود ☆صحيح مسلم: ۲/ ۷۷، رقم الحديث: ۱۷-(۱۷۱۸)، كتاب الحدود، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور، ط: فيصل - ديوبند) ≡

البتہ کوئی آدمی اپنے مال میں سے خالص میت کے ایصال ثواب کی نیت سے رکھے، رسم ورواج کی وجہ سے نہ رکھے، یا دوسرے کسی جائز طریقے سے وہ گدے مسجد میں آئے ہوں اور اجارہ کی شرطوں کے ساتھ نکاح خوانی میں گدے استعمال کیے جائیں، تو اس کا کرایہ لے کر مسجد میں استعمال کرنا جائز ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] قرآن خوانی کا ایک طریقہ

۱۱۹۳- سوال: قرآن خوانی میں ایک پارہ پڑھنے میں ایک صفحہ میں پڑھوں اور دوسرا صفحہ میرا ساتھی پڑھے، اس طرح کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامدًا ومصلّیًا:

ایک دوسرے کی اصلاح کے طور پر پڑھ رہے ہیں، کہ ایک کی غلطی دوسرا صحیح کرلے اور دوسرا پہلے کی، تو جائز ہے، لیکن اِس طرح کا رواج ہو اور اُس کو ضروری سمجھا جاتا ہو، تو جائز نہیں ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= قال الملا علي القاري: (من أحدث)، أي: جدد وابتدع أو أظهر واخترع (في أمرنا هذا)، أي: في دين الإسلام، ... وعبر عنه بالأمر تنبيها على أن هذا الدين هو أمرنا الذي نهتم له ونشتغل به، بحيث لا يخلو عنه شيء من أقوالنا وأفعالنا. (ما ليس منه): كذا في "الصحيحين"، والحميدي و"جامع الأصول" و"شرح السنة" وفي "المشارق" وبعض نسخ المصابيح: ما ليس فيه (فهو)، أي: الذي أحدثه (رد)، أي: مردود عليه. ... قال القاضي: المعنى من أحدث في الإسلام رأيا لم يكن له من الكتاب والسنة سند ظاهر أو خفي ملفوظ أو مستنبط فهو مردود عليه. (مرقاة المفاتيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۱/ ۲۲۲، رقم الحديث: ۱۴۰، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة، ط: دار الفكر- بيروت)

قال الطيبي: ... أن من أصر على أمر مندوب، وجعله عزما، ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال ... وجاء في حديث ابن مسعود- رضي الله تعالى عنه -: "إن الله - عز وجل - يحب أن تؤتى رخصه كما يحب أن تؤتى عزائمه" اهـ. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۲/ ۷۷۵، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، رقم الحديث: ۹۴۶)

(۱) قال الطيبي: وفيه أن من أصر على أمر مندوب، وجعله عزما، ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال فكيف من أصر على بدعة أو منكر؟. (مرقاة المفاتيح: ۲/ ۷۵۵، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، ط: دار الفكر- بيروت)

[۳۳] ایصالِ ثواب کے لیے دیے ہوئے کنویں کے پانی کا بیت الخلاء اور غسل خانہ میں استعمال

۱۱۹۴- سوال: ایک آدمی نے اپنے والدین کے ایصال ثواب کے لیے چھوٹا سا کنواں تیار کروایا تھا، جس کا پانی نمکین ہے؛ اس لیے غسل اور بیت الخلاء وغیرہ کے پانی میں استعمال ہوتا ہے، ادھر کچھ دنوں سے پائپ لائن کے ذریعے پانی آنے کا نظم ہوگیا ہے، جس کی بناء پر اس کا استعمال بہت ہی کم ہوگیا ہے، جب کسی وجہ سے پائپ سے پانی نہ آتا ہو، اُسی وقت اُس کا استعمال ہوتا ہے۔

اس صورت حال کی وجہ سے کیا یہ مناسب رہے گا کہ اس کنویں کو پانی کی ٹنکی کے طور پر اس طرح استعمال کیا جائے کہ اُس میں پائپ لائن کا پانی ڈال کر غسل کرنے اور بیت الخلاء کی ضرورت پوری کی جائے، یا اُس کنویں کی جگہ بیت الخلاء بنا دیا جائے؟ دونوں میں سے کون سی شکل اختیار کی جائے؟ ٹنکی میں تبدیل کرنے کی صورت میں ثوابِ جاری حاصل ہوگا یا نہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلّیاً:

دینے والے نے ثوابِ جاری کی نیت سے کنواں جاری کیا ہے، اور کنویں میں پائپ کا پانی ڈالنے کی وجہ سے، وضو، غسل اور استنجاء وغیرہ میں اسے استعمال کیا جاتا ہے، اور بہ وقتِ ضرورت پائپ سے پانی نہ آئے، تو خود کنویں کا پانی استعمال میں لیا جاسکتا ہے، اس لیے کنویں کو اُس کی حالت پر رہنے دیا جائے اور پائپ سے پانی کنویں میں ڈالا جائے، ان شاء اللہ اس صورت میں اُس سے ثوابِ جاری بھی حاصل ہوتا رہے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن أبي هريرة -رضي الله عنه- أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: "إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة: إلا من صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعو له". (الصحيح لمسلم: ۲/۴۱، رقم الحديث: ۱۴-۱۶۳۱، كتاب الوصية، باب مايلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ط: ديوبند)

... ومعناه إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله وانقطع هو عن عمله إلا من ثلاثة أعمال (جارية): يجري نفعها فيدوم أجرها كالوقف في وجوه الخير، وفي الأزهار قال أكثرهم: هي الوقف وشبهه مما يدوم نفعه، وقال بعضهم: هي القناة والعين الجارية المسبلة. (مرقاة المفاتيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۱/۲۸۵، كتاب العلم، تحت رقم الحديث: ۲۰۳، ط: دار الفكر - بيروت)

کنواں جاری کرنے والے کی منشاء کی حتی الامکان رعایت کی جائے گی، کیوں کہ ہمارے فقہاء کا مشہور قول ہے: ''شرط الواقف کنص الشارع''، مجمع الأنہر میں ہے: =

[۳۴] قبر پر قرآن مجید کی تلاوت

۱۱۹۵- سوال: میں اپنی والدہ کے انتقال کے بعد، روزانہ شام کو عصر بعد، قبرستان جاتا ہوں، قرآنِ پاک ساتھ لے کر جاتا ہوں، اور اپنی والدہ کی قبر پر قرآنِ پاک میں دیکھ کر تلاوت کرتا ہوں، اور اُس کا ثواب والدہ اور مدرسوں کو ایصال کرتا ہوں، تو کیا اس طرح قبر پر قرآنِ پاک میں دیکھ کر پڑھنا مکروہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

قرآن شریف دیکھ کر یا زبانی پڑھنا بڑی عبادت ہے، اور قبرستان میں جا کر مخصوص سورتوں کے پڑھنے پر آپ ﷺ نے بڑی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں، سورۂ یٰسین پڑھ کر قبرستان والوں کو ایصال کیا جائے تو مرحومین کے لیے اُس دِن کے عذاب میں تخفیف ہوتی ہے۔[1]

= (وفي الوقف يتبع شرط الواقف) ؛ لأنه كنص الشارع في وجوب الاتباع. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۲/ ۴۰۷- ۳۶۹، كتاب الإجارة، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۱) وأخرج أبو محمد السمرقندي في فضائل {قل هو الله أحد} [الإخلاص: ۱] عن علي مرفوعا: من مر على المقابر وقرأ {قل هو الله أحد} [الإخلاص: ۱] إحدى عشرة مرة، ثم وهب أجره للأموات، أعطي من الأجر بعدد الأموات، وأخرج أبو القاسم: سعد بن علي الزنجاني في موائده عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من دخل المقابر، ثم قرأ فاتحة الكتاب، وقل هو الله أحد، وألهاكم التكاثر. ثم قال: إني جعلت ثواب ما قرأت من كلامك لأهل المقابر من المؤمنين والمؤمنات، كانوا شفعاء له إلى الله تعالى، وأخرج القاضي أبو بكر بن عبد الباقي الأنصاري في مشيخته عن سلمة بن عبيد قال: قال حماد المكي: خرجت ليلة إلى مقابر مكة فوضعت رأسي على قبر فنمت، فرأيت أهل المقابر حلقة حلقة، فقلت: قامت القيامة، قالوا: لا، ولكن رجل من إخواننا قرأ: قل هو الله أحد، وجعل ثوابها لنا فنحن نقتسمه منذ سنة، وأخرج عبد العزيز صاحب الخلال بسنده عن أنس: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من دخل المقابر فقرأ سورة يس خفف الله عنهم، وكان له بعدد من فيها حسنات.

وقال القرطبي: حديث: اقرءوا على موتاكم يس، هذا يحتمل أن تكون هذه القراءة عند الميت في حال حياته، ويحتمل أن تكون عند قبره، كذا ذكره السيوطي في شرح الصدور. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۳/ ۱۲۲۸، كتاب الجنائز، باب دفن الميت، رقم الحديث: ۱۷۱۷، ط: دار الفكر - بيروت ☆ عمدة القاري شرح صحيح البخاري - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۳/ ۱۱۸، كتاب الوضوء، "باب" قيل: باب ما جاء في غسل البول، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۲، كتاب الصلاة، باب الجنازة، مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر)

اس لیے قرآنِ پاک کو ساتھ میں لے کر پڑھنا جائز ہے۔ [1]

البتہ اگر کوئی شخص گھر میں بیٹھ کر بھی قرآنِ پاک پڑھ کر میت کو ثواب پہنچائے گا، تو ان شاء اللہ اُس کا ثواب میت کو ملے گا، خواہ مکان پر پڑھ کر ثواب پہنچائے یا قبر پر جا کر پڑھے۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] میت کے رشتہ داروں کا میت کے گھر سوا ماہ تک بیٹھنے کے لیے جانا

۱۱۹۶- سوال: ہمارے یہاں یہ رواج ہے کہ جس گھر میں کسی کا انتقال ہوا ہو اُس کے ہاں سوا مہینے تک رشتہ دار وغیرہ رات میں بیٹھنے کے لیے جاتے ہیں، کیا شریعت میں اُس کی اجازت ہے؟ نیز عورتیں بھی آ کر تسبیح پڑھتی ہیں اور اُس کا ثواب میت کو پہنچاتی ہیں، کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

چالیس دن تک بیٹھنے کے لیے جانا بے اصل اور ناجائز ہے، نیز ایسے موقع پر عورتیں عام طور پر بلا پردہ جاتی ہیں؛ اس لیے عورتوں کا جانا بھی جائز نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ، صحابۂ کرامؓ اور سلفِ صالحین سے یہ عمل ثابت نہیں ہے، میت کے لیے جنازہ کی نماز کے علاوہ جمع ہونا اور [مروجہ طریقے پر] قرآن پڑھنا یہ سب بدعات ہیں۔ [3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قراءة القرآن عند القبور عند محمد - رحمه الله تعالى - لا تكره، ومشايخنا - رحمهم الله تعالى - أخذوا بقوله، وهل ينتفع؟ والمختار أنه ينتفع، هكذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۶، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن والنقل من مكان إلى مكان، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۱۰، كتاب الجنائز، الصلاة على الميت في المسجد، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) صرح علماؤنا في باب الحج عن الغير بأن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره، صلاة، أو صوما، أو صدقة، أو غيرها، كذا في الهداية؛ بل في زكاة التتارخانية عن المحيط: الأفضل لمن يتصدق نفلا أن ينوي لجميع المؤمنين والمؤمنات؛ لأنها تصل إليهم، ولا ينقص من أجره شيء اهـ هو مذهب أهل السنة والجماعة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في زيارة القبور، ط: دار الفكر - بيروت)

[۳] وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة صورة الأنعام أو الإخلاص ...، وهذه الأفعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها؛ لأنهم لا يرون وجه الله تعالى ... ولا سيما إذا كان في الورثة صغار أو غائب، مع قطع النظر عما يحصل عند ذلك غالبا من المنكرات الكثيرة كإيقاد الشموع والقناديل التي توجد في الأفراح، وكدق الطبول، والغناء بالأصوات الحسان، واجتماع النساء والمردان، وأخذ الأجرة على الذكر وقراءة القرآن، =

[۳۶] میت کے گھر مقرّر دِن میں جا کر تلاوت کرنا اور اُس پر عوض لینا

۱۱۹۷- سوال: جس گھر میں کسی کا انتقال ہوگیا ہو، اس گھر کے ذمہ دار افراد ایک دِن مقرر کر کے لوگوں کو تلاوت کے لیے بلاتے ہیں، اور تلاوت کے بعد کچھ رقم دیتے ہیں، یہ عمل کیسا ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

میت کے گھر تلاوت یعنی قرآنِ پاک پڑھنا اور اُس پر گھر والے کی جانب سے نقد رقم لینا، یا ان کے یہاں کھانا کھانا، حرام ہے، اِس کا ثواب پڑھنے والے کو حاصل نہیں ہوگا، اور جب قاری کو ثواب نہیں ملے گا تو میت کو اُس کا ثواب کیسے پہنچے گا؟ میت کو اِس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔[1] اور میت کے ورثاء میں اگر کوئی نابالغ ہے، تو دیگر ورثاء کو اُس کے مال میں سے خرچ کرنے کا بھی حق نہیں ہے، خرچ کرنے سے گنہگار ہوں گے۔[2] اور وہ یتیم کے مال کو کھانے والے ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے کہ: جو لوگ

=وغير ذلك مما هو مشاهد في هذه الأزمان، وما كان كذلك فلا شك في حرمته وبطلان الوصية به، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۴۱-۲۴۰، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت، ط: دار الفكر - بيروت ☆ فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۲/۱۴۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز، قبيل باب الشهيد، ط: دار الفكر)

(۱) قال تاج الشريعة في شرح الهداية: إن القرآن بالأجرة لا يستحق الثواب لا للميت ولا للقارئ. وقال العيني في شرح الهداية: ويمنع القارئ للدنيا، والآخذ والمعطي آثمان. فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز؛ لأن فيه الأمر بالقراءة وإعطاء الثواب للآمر والقراءة لأجل المال؛ فإذا لم يكن للقارئ ثواب لعدم النية الصحيحة، فأين يصل الثواب إلى المستأجر؟ ولولا الأجرة، ما قرأ أحد لأحد في هذا الزمان؛ بل جعلوا القرآن العظيم مكسبا ووسيلة إلى جمع الدنيا - إنا لله وإنا إليه راجعون - اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/۵۶، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب في الاستئجار على المعاصي، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ... واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة صورة الأنعام أو الإخلاص ...، وهذه الأفعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها؛ لأنهم لا يرون وجه الله تعالى... ولا سيما إذا كان في الورثة صغار أو غائب، مع قطع النظر عما يحصل عند ذلك غالبا من المنكرات الكثيرة كإيقاد الشموع والقناديل التي توجد في الأفراح، وكدق الطبول، والغناء بالأصوات الحسان، واجتماع النساء والمردان، وأخذ الأجرة على الذكر وقراءة القرآن، وغير ذلك مما هو مشاهد في هذه الأزمان، وما كان كذلك فلا شك في حرمته وبطلان الوصية به، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۴۱-۲۴۰، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل =

یتیم بچوں کا مال بہ طریقِ ظلم کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔ (۳)

ایصالِ ثواب کا جائز طریقہ یہی ہے کہ جس دِن میت کا انتقال ہوا اُس دِن مغرب یا عشاء کی نماز کے بعد محلہ کی مسجد میں قرآن خوانی رکھے، اور قرآنِ پاک پڑھ کر اُس کا ثواب میت کو ایصال کر دیا جائے، اور اُس کے لیے دعائے مغفرت کی جائے، اس سے میت کے گھر والے انتظام کی مصیبت اور بے جا فضول خرچی سے بچ جائیں گے، نیز پڑھنے والے اور میت کو بھی اُس کا ثواب ملے گا۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=المیت، ط: دار الفکر - بیروت☆ فتح القدیر - کمال الدین محمد بن عبد الواحد السیواسي المعروف بابن الھمام (م:۸۶۱ھ): ۲/ ۱۴۲، کتاب الصلاۃ، باب الجنائز، قبیل باب الشھید، ط: دار الفکر)

(۳) إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا۝ (۴-النساء:۱۰)

(۴) صرح علماؤنا في باب الحج عن الغیر بأن للإنسان أن یجعل ثواب عملہ لغیرہ صلاۃ أو صوما أو صدقۃ أو غیرھا کذا في الھدایۃ؛ بل في زکاۃ التتارخانیۃ عن المحیط: الأفضل لمن یتصدق نفلا أن ینوي لجمیع المؤمنین والمؤمنات؛ لأنھا تصل إلیھم، ولا ینقص من أجرہ شيء اھـ ھو مذھب أھل السنۃ والجماعۃ. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجنازۃ، مطلب في القراءۃ للمیت وإھداء ثوابھا لہ، ط: دار الفکر☆ الفتاوی الھندیۃ: ۱/ ۲۵۷، کتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغیر، ط: دار الفکر - بیروت☆ البحر الرائق: ۳/ ۶۳، کتاب الحج، باب الحج عن الغیر، ط: دار الکتاب الإسلامي☆ الھدایۃ: ۱/ ۱۷۸، کتاب الحج، باب الحج عن الغیر، ت: یوسف طلال، ط: دار إحیاء التراث العربي - بیروت)

عن عبد الله، عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: من عزی مصابا فله مثل أجره. (ترمذی شریف: ۱/ ۲۰۵، حدیث نمبر: ۱۰۷۳، ط: دیوبند)

قال فی شرح المنیة: وتستحب التعزیة للرجال والنساء اللاتی لا یفتن، لقوله - علیه الصلاة والسلام - :من عزی أخاه بمصیبة کساه الله من حلل الکرامة یوم القیامة. رواه ابن ماجه ،وقوله - علیه الصلاة والسلام -:من عزی مصابا فله مثل أجره. رواه الترمذی وابن ماجه. والتعزیة أن یقول: أعظم الله أجرك، وأحسن عزاءك، وغفر لمیتك. اهـ.

(شامی: ۲/ ۲۴۰، باب صلاۃ الجنائز، ط: دار الفکر - بیروت)

باب التعزیة

[تعزیت کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب التعزیة

[تعزیت کا بیان]

[۱] پردیس میں انتقال پر اعلان کرنا اور میت کے گھر جمع ہونا

۱۱۹۸-سوال: ہمارے یہاں سالوں سے یہ رواج چلا آرہا ہے کہ باہر ملک سے کسی (گاؤں کے رہنے والے) کے انتقال کی خبر آتی ہے، تو اعلان کیا جاتا ہے اور لوگ اس کے گھر جمع ہو کر دعائے مغفرت کرتے ہیں، تو اس طرح کا رواج شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کے سوال میں دو باتیں ہیں: ایک اعلان کرنا۔ دوسرا: میت کے لیے دعائے مغفرت کرنا۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی کے انتقال پر اعلان کرنا جائز ہے، خواہ گاؤں میں انتقال ہوا ہو، یا پردیس میں، امام بخاریؒ نے بخاری جلد: ۱/ ۱۶۶ میں ایک عنوان قائم کیا ہے: "باب الرجل ينعي إلى أهل الميت بنفسه" (یعنی میت کے گھر والوں کو اس کی موت کی خبر خود سے دینے کا بیان)

اس باب کے تحت امام بخاریؒ نے دو حدیثیں بیان کی ہیں: پہلی حدیث: نجاشی بادشاہ کا جب انتقال ہوا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اس کی خبر دی۔ (۱)

دوسری حدیث: غزوۂ موتہ میں جب حضرت زید بن حارثہؓ شہید ہوئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی، اس کے بعد فرمایا: جھنڈا حضرت جعفر نے لیا اور وہ بھی شہید ہو گئے، اس کے بعد حضرت عبد اللہ

(۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نعى النجاشي في اليوم الذي مات فيه خرج إلى المصلى، فصف بهم وكبر أربعا. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۶۷، رقم الحديث: ۱۲۴۵، كتاب الجنائز، باب الرجل ينعي إلى أهل الميت بنفسه، ط: ديوبند)

بن رواحہ نے جھنڈا لیا اور وہ بھی شہید ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک آنکھوں سے (موتی کی طرح) آنسو بہنے لگے ؛ اس کے بعد فرمایا: جھنڈا حضرت خالدؓ نے - ان کو امیر بنائے بغیر - (مسلمانوں کی عزت بچانے کی خاطر) اپنے ہاتھ میں لیا، تو ان کے ہاتھ پر مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ (بخاری شریف: ۱۶۷/۱)[۲]

اس سے یہ ثابت ہوا کہ دیس پردیس سے کسی مسلمان مرد یا عورت کے انتقال کی خبر آئے، تو گاؤں میں اس کی منادی کرانا جائز ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا یہی مسلک ہے، اور امام نوویؒ نے بعض علماء کا قول نقل کیا ہے کہ میت مسافر ہو، تو اس کی خبر دینا مستحب ہے۔ (عمدۃ القاری: ۲۰/۱)[۳]

اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ انتقال کی خبر دینا جائز ہے، البتہ اگر جاہلیت کی مشابہت ہو، تو جائز نہیں ہے۔ (فتح الباری: ۳۵۹/۳)[۴]

اسی بنا پر علامہ ابن العربیؒ لکھتے ہیں: رشتہ دار اور دوستوں کو موت کی خبر دینا سنت ہے، اور مجلس قائم کرنا: اگر فخر کے طور پر ہو، تو مکروہ تحریمی ہے، اور نوحہ کے لیے ہو تو حرام ہے۔ (۵)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ فرماتے ہیں: نفسِ خبر دینے میں تو کوئی ممانعت نہیں ہے؛

---

[۲] عن أنس بن مالك رضي الله عنه، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: أخذ الراية زيد فأصيب، ثم أخذها جعفر فأصيب، ثم أخذها عبد الله بن رواحة فأصيب - وإن عيني رسول الله صلى الله عليه وسلم لتذرفان - ثم أخذها خالد بن الوليد من غير إمرة ففتح له. (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۱۲۴۶)

[۳] فيه إباحة النعي، وهو أن ينادى في الناس أن فلانا مات ليشهدوا جنازته، وقال بعض أهل العلم: لا بأس أن يعلم الرجل قرابته وإخوانه، وعن إبراهيم: لا بأس أن يعلم قرابته. وقال شيخنا زين الدين: إعلام أهل الميت وقرابته وأصدقائه استحسنه المحققون والأكثرون من أصحابنا وغيرهم، وذكر صاحب (الحاوي) من أصحابنا وجهين في استحباب الإنذار بالميت وإشاعة موته بالنداء والإعلام، فاستحب ذلك بعضهم للغريب والقريب لما فيه من كثرة المصلين عليه والداعين له، وقال بعضهم: يستحب ذلك للغريب ولا يستحب لغيره. وقال النووي: والمختار استحبابه مطلقا إذا كان مجرد إعلام. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۱۹/۸، كتاب الجنائز، باب الرجل ينعى إلى أهل الميت بنفسه، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

[۴] وفائدة هذه الترجمة الإشارة إلى أن النعي ليس ممنوعا كله وإنما نهي عما كان أهل الجاهلية يصنعونه فكانوا يرسلون من يعلن بخبر موت الميت على أبواب الدور والأسواق. (فتح الباري شرح صحيح البخاري - ابن حجر العسقلاني (م: ۸۵۲هـ): ۱۱۶/۳، كتاب الجنائز، باب الرجل ينعى إلى أهل الميت بنفسه، ط: دار المعرفة - بيروت)

(۵) قال ابن العربي: يؤخذ من مجموع الأحاديث ثلاث حالات: الأولى إعلام الأهل والأصحاب وأهل الصلاح، فهذا سنة، الثانية دعوة الحفل للمفاخرة، فهذه تكره، الثالثة الإعلام بنوع آخر كالنياحة ونحو ذلك، فهذا يحرم. (حوالہ سابق: ۱۱۷/۳)

لیکن اس میں جاہلیت کی رسمیں ہوں گی، تو ممانعت آجائے گی۔ (لامع الدراری: ۲/ ۱۰۸)[۶]

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فتح الباری کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ: اس اعلان میں بہت سارے فائدے ہیں مثلاً: لوگ جمع ہو کر کفن دفن کا انتظام کریں گے، نیک حضرات اکٹھا ہو کر دعائے مغفرت کریں گے اور میت نے جن کے لیے وصیت کی ہو، ان کے حق میں وصیت نافذ کی جائے گی، اسی طرح دیگر حقوق ثابت کیے جائیں گے، جیسے میت کسی کا وکیل ہو یا اس نے کسی کو وکیل بنایا ہو، تو اس خبر سے وکالت کے بطلان کی اطلاع بھی خود بہ خود ثابت ہوگی۔ (فتح الباری: ۳/ ۳۵۹)[۷]

اس لیے موت کی خبر دینا بلا شبہ جائز ہے، اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ: میت کے گھر لوگ جمع ہو کر دعائے مغفرت کریں اور یہاں ملک میں اس کے جو رشتہ دار ہیں، ان کی تعزیت کریں، یہ نہ صرف یہ کہ درست ہے؛ بلکہ تعزیت کرنا سنت ہے۔ (۸) جیسے پردیس میں باپ کا انتقال ہو گیا اور لڑکا یہاں ہے تو اس لڑکے کی تعزیت میں جانا سنت ہے، اسی طرح لوگوں کو

---

[۶] إن مجرد الإعلام غير منهي عنه، وإنما ينهى من الإعلام ما كان على حسب الجاهلية وإلا فلا كراهة في مجرد الإعلام الخالي عن شوائب الجهل والجاهلية. (لامع الدراري على جامع البخاري- رشيد أحمد الكنكوهي (م: ۱۳۲۳هـ): ۲/ ۱۰۸، كتاب الجنائز، باب الإذن بالجنازة، ترتيب: يحيى الكاندهلوي، تعليق: زكريا الكاندهلوي، ط: المكتبة الأشرفية- ديوبند)

[۷] ... لكن في تلك المفسدة مصالح جمة لما يترتب على معرفة ذلك من المبادرة لشهود جنازته وتهيئة أمره والصلاة عليه والدعاء له والاستغفار وتنفيذ وصاياه وما يترتب على ذلك من الأحكام. (فتح الباري: ۳/ ۱۱۷، كتاب الجنائز، باب الرجل ينعي إلى أهل الميت بنفسه، ط: دار المعرفة- بيروت)

(۸) عن معاذ بن جبل، أنه مات ابن له فكتب إليه رسول الله صلى الله عليه وسلم يعزيه بابنه فكتب إليه: "بسم الله الرحمن الرحيم. من محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى معاذ بن جبل، سلام عليك، فإني أحمد إليك الله الذي لا إله إلا هو. أما بعد، فأعظم الله لك الأجر، وألهمك الصبر، ورزقنا وإياك الشكر، فإن أنفسنا وأموالنا وأهلينا من مواهب الله الهنيئة وعواريه المستودعة، يمتع بها إلى أجل، ويقبضها إلى وقت معلوم، وإنا نسأله الشكر على ما أعطى، والصبر إذا ابتلى، وكان ابنك من مواهب الله الهنيئة وعواريه المستودعة، متعك الله به في غبطة وسرور، وقبضه منك بأجر كثير: الصلاة والرحمة والهدى إن احتسبته، فاصبر، ولا يحبط جزعك أجرك فتندم، واعلم أن الجزع لا يرد ميتا، ولا يدفع حزنا، وما هو نازل فكأن قد والسلام". (المعجم الكبير- أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰هـ): ۲۰/ ۱۵۵، رقم الحديث: ۳۲۴، محمود بن لبيد الأنصاري، عن معاذ، ت: حمدي بن عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة ابن تيمية- القاهرة☆ المعجم الأوسط: ۱/ ۳۳، رقم الحديث: ۸۳، من اسمه أحمد، ت: طارق بن عوض الله بن محمد وعبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين- القاهرة)

عبد الله بن أبي بكر بن محمد بن عمرو بن حزم، يحدث عن أبيه، عن جده، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: ما من مؤمن يعزي أخاه بمصيبة، إلا كساه الله سبحانه من حلل الكرامة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه: ۱/ ۱۱۵، كتاب الجنائز، باب ما جاء في ثواب من عزى مصابا، ط: ديوبند) =

جوں جوں اطلاع ہوتی رہے، میت کے گھر جا کر دعائے مغفرت کرتے رہیں، یہ بھی جائز ہے، جیسا کہ فتح الباری میں لکھا ہے۔ [۹] البتہ آنے والے تمام لوگوں کا انتظار کرنا اور جب گاؤں کے آنے والے تمام افراد جمع ہوجائیں ،اس کے بعد دعائے مغفرت کرنا؛ یہ (پابندی) حدیث سے ثابت نہیں؛ لہٰذا اس سے بچنا چاہیے۔ [۱۰] ہاں لوگ آتے جائیں اور دعاء کر کے واپس ہوجائیں، اس کی گنجائش ہے اور شرعاً یہی مطلوب ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] عورتوں کے لیے میت والے گھر جانا

۱۱۹۹ – سوال: عورتیں میت والے گھر جا سکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عورتیں میت والے گھر جا سکتی ہیں۔ [جب کہ فتنے کا اندیشہ نہ ہو] [۱۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=ولا بأس بنقله قبل دفنه وبالإعلام بموته وبإرثائه بشعر أو غيره. لكن يكره الإفراط في مدحه لا سيما عند جنازته، لحديث "من تعزى بعزاء الجاهلية". وبتعزية أهله وترغيبهم في الصبر. (الدر المختار: ۲/۲۳۹)

قال ابن عابدين: في شرح المنية: وتستحب التعزية للرجال والنساء اللاتي لا يفتن؛ لقوله – عليه الصلاة والسلام – من عزى أخاه بمصيبة كساه الله من حلل الكرامة يوم القيامة، رواه ابن ماجه، وقوله – عليه الصلاة والسلام – من عزى مصابا فله مثل أجره، رواه الترمذي وابن ماجه. والتعزية أن يقول: أعظم الله أجرك، وأحسن عزاءك، وغفر لميتك. اهـ (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۴۰، باب صلاة الجنائز، قبيل: مطلب في الثواب على المصيبة، ط: دار الفكر – بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/۱۶۷، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر، مسائل في التعزية، ط: دار الفكر – بيروت) (۹) حاشیہ نمبر ۷ دیکھیے۔

(۱۰) وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الإخلاص. والحاصل أن اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لأجل الأكل يكره. وفيها من كتاب الاستحسان: وإن اتخذ طعاما للفقراء كان حسنا اهـ وأطال في ذلك في المعراج. وقال: وهذه الأفعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها لأنهم لا يريدون بها وجه الله تعالى. اهـ. (رد المحتار: ۲/۲۴۰–۲۴۱، باب صلاة الجنازة، فروع في الجنازة، مطلب في كراهية الضيافة من أهل الميت)

(۱۱) عبد الله بن أبي بكر بن محمد بن عمرو بن حزم، يحدث عن أبيه، عن جده، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: ما من مؤمن يعزي أخاه بمصيبة، إلا كساه الله سبحانه من حلل الكرامة يوم القيامة. (سنن ابن ماجه: ۱/۱۱۵، رقم الحديث: ۱۶۰۱، كتاب الجنائز، باب ما جاء في ثواب من عزى مصابا، ط: ديوبند)

عن عبد الله، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من عزى مصابا فله مثل أجره. (سنن الترمذي: ۱/۲۰۵، رقم الحديث: ۱۰۷۳، أبواب الجنائز، باب ما جاء في أجر من عزى مصابا، ط: ديوبند)

قال في شرح المنية: وتستحب التعزية للرجال والنساء اللاتي لا يفتن، لقوله – عليه الصلاة والسلام –: من عزى أخاه بمصيبة كساه الله من حلل الكرامة يوم القيامة. رواه ابن ماجه، وقوله – عليه الصلاة والسلام –: من عزى مصابا فله مثل أجره. رواه الترمذي وابن ماجه. والتعزية أن يقول: أعظم الله أجرك، وأحسن عزاءك، وغفر لميتك. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۴۰، باب صلاة الجنائز، قبيل: مطلب في الثواب على المصيبة، ط: دار الفكر)

عن جابر، قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يجصص القبر، وأن يقعد عليه، وأن يبنى عليه.

(مسلم شریف: ۱/ ۳۱۲، حدیث نمبر: ۹۳-۹۷۰، ط: دیوبند)

قال فى الأزهار: النهى عن تجصيص القبور للكراهة، وهو يتناول البناء بذلك وتجصيص وجهه، والنهى فى البناء للكراهة إن كان فى ملكه، وللحرمة فى المقبرة المسبلة، ويجب الهدم وإن كان مسجدا.

(مرقاۃ المفاتیح: ۳/ ۱۲۱۷، دار الفکر، ط: بیروت)

باب ما يتعلق بالزيارة والقبر والمقابر

[زیارت، قبر اور مقابر کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب ما يتعلق بالزيارة والقبر والمقابر

[زیارت، قبر اور مقابر کا بیان]

[۱] قبرستان و مزار پر جانا سنت ہے یا مستحب؟

۱۲۰۰- سوال: دعوت و تبلیغ سے جڑے ہوئے اکثر حضرات مزار پر نہیں جاتے، حالاں کہ قبرستان میں اور ولی اللہ کے مزار پر جانا سنت ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جمعہ کو جنت البقیع تشریف لے جاتے تھے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ قبرستان یا مزار پر جانا سنت ہے یا مستحب؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

قبرستان جانا مستحب ہے۔[1] اور مستحب کام نہ کرنے پر کسی کو لعن طعن یا برا بھلا نہیں کہنا چاہیے، نیز

---

(۱) عن عائشة- رضي الله عنها- أنها قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم - كلما كان ليلتها من رسول الله صلى الله عليه وسلم - يخرج من آخر الليل إلى البقيع، فيقول: السلام عليكم دار قوم مؤمنين، وأتاكم ما توعدون غدا، مؤجلون، وإنا، إن شاء الله، بكم لاحقون، اللهم، اغفر لأهل بقيع الغرقد. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۱۳، رقم الحديث: ۱۰۲-(۹۷۴)، كتاب الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، ط: ديوبند)

قال النووي: وقوله صلى الله عليه وسلم (وإنا إن شاء الله بكم لاحقون) . . . وفي هذا الحديث دليل لاستحباب زيارة القبور والسلام على أهلها والدعاء لهم والترحم عليهم. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، المعروف بـ'شرح النووي على مسلم'- أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ۶۷۶هـ): ۷/ ۴۱، كتاب الجنائز، قوله صلى الله عليه وسلم (السلام عليكم دار قوم مؤمنين)، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

ولا بأس بزيارة القبور والدعاء للأموات إن كانوا مؤمنين من غير وطء القبور لقوله- صلى الله عليه وسلم- إني =

تبلیغی احباب اور جماعت والے جانے سے انکار نہیں کرتے، وہ اپنی دینی مشغولیت کی بناء پر نہیں جا پاتے؛ لہٰذا ان کے نہ جانے پر برا بھلا کہنا جائز نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] زیارت قبر اور ایصال ثواب

۱۲۰۱- سوال: ایک صاحب کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی قبر اطہر پر جاتی تھیں، تو پھر آج کل عورتوں کو ان کے خاوند کی قبروں پر-خواہ قبرستان میں ہو یا اس کے علاوہ کسی اور جگہ- جانے سے کیوں روکا جاتا ہے؟

زید کی تدفین کے بعد اس کے ورثاء برابر صبح وشام، قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے جاتے ہیں، تو تدفین کے بعد وہاں جانا جائز ہے، کیا یہ خصوصیت کا حامل ہے؟

جنازہ کی نماز میں ثناء میں زائد لفظ ''وجل ثناؤك'' کا کیا معنی ہے؟

میت کو دائیں بائیں کندھا دینے کے بعد پھر دوسری مرتبہ باری آئے، تو مذکورہ ترتیب کے مطابق کندھا دیا جائے یا نہیں؟ نیز بسا اوقات مثلاً دائیں جانب کندھا دینے کا موقع ملتا ہے اور بائیں جانب میں نہیں، تو کیا اس میں کوئی حرج ہے؟ صحیح ترتیب کیا ہے؟ بالدلیل مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداومصليا:

جب آپ ﷺ کا انتقال ہوا، اس وقت آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں تھے اور قاعدہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جہاں وفات پاتے ہیں، وہیں پر مدفون ہوتے ہیں۔[2] لہٰذا اس میں

= كنت نهيتكم عن زيارة القبور، ألا فزوروها، ولعمل الأمة من لدن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - إلى يومنا هذا اهـ. ـــــــــ وصرح في المجتبى بأنها مندوبة، وقيل تحرم على النساء، والأصح أن الرخصة ثابتة لهما. (البحر الرائق: ۲/ ۲۱۰، كتاب الجنائز، الصلاة على لميت في المسجد، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۱) ...فإذا نوى تطهير هذه الأشياء يحصل له الثواب فيكون مستحبا، وإذا لم ينو لا يضره ذلك؛ لأن تارك المستحب لا يلام. (البناية شرح الهداية - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۱/ ۲۳۵، كتاب الطهارة، سنن الطهارة، النية في الوضوء، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) عن عائشة، قالت: لما قبض رسول الله - صلى الله عليه وسلم - اختلفوا في دفنه، فقال أبو بكر: سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم شيئا ما نسيته، قال: ما قبض الله نبيا إلا في الموضع الذي يحب أن يدفن فيه، ادفنوه في موضع فراشه. (سنن الترمذي - محمد بن عيسى بن سَوْرة بن موسى بن الضحاك، الترمذي، أبو عيسى (م: ۲۷۹هـ): =

کوئی شک نہیں کہ حضرت عائشہ دن میں ۴۔۵ مرتبہ زیارت کرتی ہوں، بل کہ آپ-رضی اللہ عنہا- حضرت عمر کی وفات تک، بغیر پردہ کے آپ ﷺ کی قبر اطہر پر آتی تھیں؛ کیوں کہ قبر آپ کے حجرہ میں تھی۔ نیز وہ خیر القرون کا زمانہ تھا؛ اس لیے فتنہ وفساد کا اندیشہ، نہ ہونے کے برابر تھا۔

موجودہ زمانے میں بھی عورتیں اس نیت سے جا سکتی ہیں کہ اس سے موت کا ڈر وخوف پیدا ہو۔ سیرت عائشہ میں ہے: "عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ -صلی اللہ علیہ- لعن زوارات القبور"[۱] کہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر جانے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے؛ کیوں کہ عورتوں کے قبر پر جانے کی وجہ سے بہت سارے فتنے پیدا ہوں گے۔"[۲]

اس لیے علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے مکروہ لکھا ہے، خصوصاً موجودہ دور میں بے پردگی کے ساتھ جانا حرام ہے، نیز عرس وغیرہ میں جانے سے بھی بہت سے فتنے جنم لے رہے ہیں۔"[۳]

=۱/ ۱۹۸، رقم الحديث:۱۰۱۸، أبواب الجنائز، باب ما جاء في دفن النبي صلى الله عليه وسلم حيث قبض، ط: ديوبند)

ابن جريج، قال: أخبرني أبي: أن أصحاب النبي -صلى الله عليه وسلم- لم يدروا أين يقبرون النبي صلى الله عليه وسلم، حتى قال أبو بكر -رضي الله عنه-: سمعت رسول الله -صلى الله عليه وسلم- يقول: " لن يقبر نبي إلا حيث يموت ". فأخروا فراشه، وحفروا له تحت فراشه. (مسند الإمام أحمد بن حنبل-أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني (م:۲۴۱هـ): ۱/ ۲۰۶، رقم الحديث: ۲۷، مسند أبي بكر الصديق رضي الله عنه، ت: شعيب الأرنؤوط-عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة)

(۱) عن أبي هريرة -رضي الله عنه-، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم لعن زوارات القبور. (سنن الترمذي: ۱/ ۲۰۳، رقم الحديث: ۱۰۵۶، أبواب الجنائز، باب ما جاء في كراهية زيارة القبور للنساء، ط: ديوبند)

ويكره للنساء زيارة القبور، وهو قول الجمهور، لقوله -عَلَيْهِ السَّلَامُ-: لعن الله زوارات القبور. رواه الترمذي، وقال: حسن صحيح، ورواه ابن ماجه، وأحمد. (البناية شرح الهداية- بدر الدين العينى (م:۸۵۵هـ): ۳/ ۲۶۱، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل في الدفن، الدفن ليلا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆ شرح النووي على مسلم: ۷/ ۴۵، كتاب الجنائز) ——— (۲) وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا. (۲-البقرة:۲۱۹)

(۳) وحاصل الكلام من هذا كله أن زيارة القبور مكروهة للنساء، بل حرام في هذا الزمان، ولا سيما نساء مصر؛ لأن خروجهن على وجه فيه الفساد والفتنة، وإنما رخصت الزيارة لتذكر أمر الآخرة وللاعتبار بمن مضى وللتزهد في الدنيا. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري-محمود بن أحمد بن موسى، الحنفي، بدر الدين العيني (م:۸۵۵هـ): ۸/ ۷۰، كتاب الجنائز، باب زيارة القبور، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: "ایصال ثواب کے لیے میت کے گھر جمع ہونا" کے حواشی۔

میں تو کہتا ہوں کہ یہ (لعنت، درحقیقت) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی تھی، کیوں کہ اس جیسی جگہوں پر اب نہ صرف یہ کہ ناجائز کام ہو رہے ہیں، بل کہ (ان جگہوں پر) شرکیہ افعال تک کا صدور ہو رہا ہے اور اس میں زیادہ تر عورتیں ہی ہوتی ہیں، اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔

۲۔ مرد یا عورت کے انتقال کے بعد ورثاء و رشتہ دار مسلسل دو تین دن صبح و شام جاتے ہیں، اگر لزوم والتزام کے بغیر جائیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (بہ شرطیکہ کہ جانے والے مرد حضرات ہوں)[1]

۳۔ ثناء میں جو زائد الفاظ (وجل ثناؤك) کا معنیٰ ہے کہ تیری شان بلند و بالا ہے۔ (المنجد ص ۱۵۴)

۴۔ جنازہ اٹھانے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جنازہ کو چار شخص اٹھائے اور ہر شخص دس قدم تک اٹھائے اور اٹھانے میں سب سے پہلے دائیں جانب کے اگلے پائے سے ابتدا کرے، پھر اسی جانب والے پچھلے پایہ کو، پھر بائیں جانب والے اگلے پائے کو، پھر اسی طرح اسی جانب کے پچھلے پائے کو اٹھائے۔ یہ مسنون طریقہ ہے؛ لیکن اگر جگہ تنگ ہو یا ازدحام زیادہ ہو، تو دو آدمی بھی اٹھا سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسی سہولت ہو، اسی کے اعتبار سے عمل کریں۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم لعن زوارات القبور، قال أبو عيسى: هذا حديث حسن صحيح، وقد رأى بعض أهل العلم أن هذا كان قبل أن يرخص النبي - صلى الله عليه وسلم - في زيارة القبور، فلما رخص دخل في رخصته الرجال والنساء، وقال بعضهم: إنما كره زيارة القبور للنساء لقلة صبرهن وكثرة جزعهن ". (سنن الترمذي: ۱/ ۲۰۳، رقم الحديث: ۱۰۵٦، أبواب الجنائز، باب ما جاء في كراهية زيارة القبور للنساء، ط: ديوبند)

(۲) (وأن يبدأ) الحامل (فيضع مقدمها) أي مقدم الجنازة (على يمينه ثم) يضع (مؤخرها) على يمينه (ثم) يضع (مقدمها على يساره ثم مؤخرها) على يساره، فيتم الحمل من الجوانب الأربع، وينبغي أن يحملها من كل جانب عشر خطوات؛ لقوله - عليه الصلاة والسلام - من حمل جنازة أربعين خطوة كفرت عنه أربعين كبيرة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/۱۸٦، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنائز، فصل الصلاة على الميت، سنن حمل الجنازة، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۱، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر ☆ المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۲/ ۵٦، كتاب الصلاة، باب حمل الجنازة، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱/ ۳۰۹، كتاب الصلاة، باب بيان عدد من يحمل الجنازة، وكيفية حملها، ط: دار الكتب العلمية)

[۳] قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

۱۲۰۲- سوال: میت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا جائز ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

زیارتِ قبور کا سنت طریقہ یہ ہے کہ پیٹھ قبلہ کی طرف اور چہرہ میت کی طرف ہو۔[1] حدیث پاک اور دینی کتابوں سے زیارت کے وقت ہاتھ اٹھانے کا ثبوت نہیں ملتا۔ (فتاویٰ دارالعلوم: ۵/ ۴۳۴)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] ہندو مسلم سب کو میت کا منہ دکھلانا

۱۲۰۳- سوال: میت کو گھر سے باہر رکھا جاتا ہے اور لوگ اس کا منہ دیکھتے ہیں، دیکھنے والوں میں ہندو مسلم سبھی ہوتے ہیں، تو اس طرح کرنا کیسا ہے؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے، صرف رشتہ داروں کو ہی منہ دکھلانا چاہیے؛ کیوں کہ بعض مرتبہ انسان کا منہ اور آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں، تو بدشکل دکھتا ہے، جس کو دیکھ کر لوگ باتیں بنانے لگتے ہیں؛ لہٰذا سب کو دکھلانا مناسب نہیں، تو اس سلسلہ میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

[مرد] میت کا منہ، مسلم اور غیر مسلم،[3] رشتہ دار اور اجنبی؛ سب کو دکھلانا جائز ہے، البتہ بعض مرتبہ

---

(۱) وإذا أراد زيارة القبور، يستحب له أن يصلي في بيته ركعتين، يقرأ في كل ركعة الفاتحة، وآية الكرسي مرة واحدة، والإخلاص ثلاث مرات، ويجعل ثوابها للميت، يبعث الله تعالى إلى الميت في قبره نورا، ويكتب للمصلي ثوابا كثيرا، ثم لا يشتغل بما لا يعنيه في الطريق، فإذا بلغ المقبرة، يخلع نعليه، ثم يقف مستدبر القبلة، مستقبلا لوجه الميت، ويقول: "السلام عليكم يا أهل القبور، ويغفر الله لنا ولكم، أنتم لنا سلف، ونحن بالأثر، كذا في الغرائب. وإذا أراد الدعاء يقوم مستقبل القبلة، كذا في خزانة الفتاوى. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۵۰، كتاب الكراهية، الباب السادس عشر في زيارة القبور وقراءة القرآن في المقابر، ط: دار الفكر- بيروت)

[۲] کتاب الجنائز، آٹھویں فصل، زیارت قبور اور ایصال ثواب، ۵/ ۴۳۴، ط: دارالعلوم، دیوبند۔

(۳) سوال: اگر مؤمن بندہ مر جائے اور بہ وقت دفن قبرستان کے روبرو غیر مسلم ہندو، عیسائی وغیرہ آ کر تقاضہ کرتے ہیں کہ ہم لوگ اس مردے کے آشنا ہیں، اور یہ مردہ ہمارا دوست تھا، ہمیں مردہ کا چہرہ دکھایا جائے، نہ دیکھنے کی حالت میں شور و شغب کا خوف ہے، تو کیا اس حالت میں قبل از نماز یا بعد از نماز ان غیر مسلموں کو مردہ کا چہرہ دکھانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جائز ہے۔ لیکن اگر زیادہ شر کا اندیشہ نہ ہو، تو انکار کر دیا جائے، کہ یہی احوط ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۹/ ۸۰، ط: دار المعارف- دیوبند)

گناہوں کی نحوست کی وجہ سے انسان کی شکل بدل جاتی ہے، تو چہرہ دکھلانے سے لوگوں میں بدگوئی ہوگی اور خوب باتیں پھیلیں گی، اس لیے ایسی صورت میں نہ دکھلانا بہتر ہے۔ (۱)

علامہ عینیؒ، عمدۃ القاری میں لکھتے ہیں کہ: جو شخص ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے، اس کا چہرہ مرنے پر گدھے جیسا ہوجاتا ہے، اور جو شیعہ، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کا چہرہ بھی بدشکل ہوجاتا ہے۔ (عمدۃ القاری: ۵/ ۲۲) [۲] پس ایسی صورت میں چہرہ نہیں دکھلانا چاہیے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] عورتوں کا قبرستان جانا

۱۲۰۴- سوال: عورتیں قبرستان جاسکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جنازہ کے ساتھ عورتوں کا قبرستان جانا ممنوع ہے۔ (۳)

---

(۱) عن أنس بن مالك، قال: لما قبض إبراهيم ابن النبي صلى الله عليه وسلم، قال لهم النبي صلى الله عليه وسلم: "لاتدرجوه في أكفانه حتى أنظر إليه، فأتاه، فانكب عليه، وبكى. (سنن ابن ماجه: ۱/ ۱۰۶، رقم الحديث: ۱۴۷۵، أبواب الجنائز، باب ما جاء في النظر إلى الميت إذا أدرج في أكفانه، ط: المكتبة الأشرفية- ديوبند)

وينبغي للغاسل ولمن حضر إذا رأى ما يحب الميت ستره أن يستره ولا يحدث به لأنه غيبة وكذا إذا كان عيبا حادثا بالموت كسواد وجه ونحوه مالم يكن مشهورا ببدعة فلا بأس بذكره تحذيرا من بدعته. وإن رأى من أمارات الخير كوضاءة الوجه والتبسم ونحوه استحب إظهاره لكثرة الترحم عليه والحث على مثل عمله الحسن شرح المنية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۰۲، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنائز، قبيل: مطلب في الكفن، ط: دار الفكر- بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۵۹، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر- بيروت)

نوٹ: اس زمانے میں کئی مفاسد پائے جاتے ہیں؛ اس لیے اس کا ترک کرنا ہی بہتر ہے، مثلاً اس کو باعث ثواب سمجھنا، تصویر کشی کرنا، تدفین میں تاخیر کرنا وغیرہ۔ (کفایت المفتی: ۴/ ۶۲، جنائز، ط: زکریا- دیوبند)

[۲] كما وقفنا في بعض الكتب وسمعنا من الثقات أن جماعة من الشيعة الذين يسبون الصحابة قد تحولت صورتهم إلى صورة حمار وخنزير عند موتهم، وكذلك جرى على من عق والديه، وخاطبهما باسم الحمار أو الخنزير أو الكلب؟. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م: ۸۵۵ھ): ۵/ ۲۲۲، كتاب مواقيت الصلاة، باب إثم من رفع رأسه قبل الإمام، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

(۳) عن ابن الحنفية، عن علي، قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم، فإذا نسوة جلوس، فقال: ما يجلسكن؟ قلن: ننتظر الجنازة، قال: هل تغسلن؟ قلن: لا، قال: هل تحملن؟ قلن: لا، قال: هل تدلين فيمن يدلي؟ قلن: لا، قال: =

تنہا عورتوں کا قبرستان جانا جائز ہے؛ لیکن وہاں جا کر بے صبری [جزع وفزع] کرے اور زور زور سے ہائے اور واویلا کرے اور دوسرے رسم ورواج کو انجام دے، تو اس سے بچانے کے لیے ان کو قبرستان جانے سے روکا جائے گا، نیز قبرستان چوں کہ بستی سے دور ہوتے ہیں اور موجودہ زمانے میں وہاں عورتوں کے تنہا جانے میں بہت سے فتنوں کا اندیشہ ہے؛ اس لیے ان [عورتوں] کا جانا ممنوع ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

[۲] میت کے پڑوسیوں یا رشتہ داروں کی طرف سے تدفین میں آنے والے مہمانوں کو کھانا کھلانا

۱۲۰۵- سوال: تدفین میں آنے والے لوگوں کے لیے گاؤں کا کوئی آدمی کھانا کھلانا چاہے، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصليا:

پڑوسیوں اور رشتہ داروں کا میت کے گھر والوں کو اور باہر سے آنے والے مہمانوں کو کھلانا مستحب ہے۔(۱)

=فارجعن مأزورات غير مأجورات. (سنن ابن ماجه، ص: ۱۱۳، رقم الحديث: ۱۵۷۸، كتاب الجنائز، باب ما جاء في اتباع النساء الجنائز، ط: فيصل - ديوبند)

عن معمر، أن عمر، رأى نساء مع جنازة، فقال: ارجعن مأزورات غير مأجورات، فوالله ما تحملن ولا تدفن، يا مؤذيات الأموات ومفتنات الأحياء. (المصنف-أبو بكر عبد الرزاق بن همام بن نافع الحميري اليماني الصنعاني (م: ۲۱۱هـ): ۴۵۶/۳، رقم الحديث: ۶۲۹۹، كتاب الجنائز، باب منع النساء اتباع الجنائز، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، ط: المجلس العلمي - الهند)

ويكره خروجهن تحريما. (الدر المختار) ــــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويكره خروجهن تحريما) لقوله - عليه الصلاة والسلام -: ارجعن مأزورات غير مأجورات. رواه ابن ماجه بسند ضعيف، لكن يعضده المعنى الحادث باختلاف الزمان الذي أشارت إليه عائشة بقولها: لو أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - رأى ما أحدث النساء بعده، لمنعهن كما منعت نساء بني إسرائيل، وهذا في نساء زمانها، فما ظنك بنساء زماننا. وأما ما في الصحيحين: عن أم عطية نهينا عن اتباع الجنائز ولم يعزم علينا. أي أنه نهي تنزيه، فينبغي أن يختص بذلك الزمن حيث كان يباح لهن الخروج للمساجد والأعياد، وتمامه في شرح المنية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲۳۲/۲، باب صلاة الجنازة، مطلب في حمل الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) قال في الفتح ويستحب لجيران أهل الميت والأقرباء الأباعد تهيئة طعام لهم يشبعهم يومهم وليلتهم، لقوله -=

لیکن میت کے گھر والوں کا کھانا کھلانا، دعوت کرنا اور دیگیں پکانا جائز نہیں۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۷] میت کی تجہیز وتکفین کے بعد کھانا کھلانا

۱۲۰۶- سوال: میت کی تجہیز وتکفین اور تدفین سے فراغت کے بعد تجہیز وتکفین میں مصروف افراد کو اور اہل خانہ کو کھانا کھلایا جاتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامدا ومصلیا:

غسل اور کفن دفن میں جو حضرات مشغول تھے، ان کو کھلانا جائز ہے، اسی طرح باہر سے آنے والے

= صلى الله عليه وسلم -: اصنعوا لآل جعفر طعاما فقد جاءهم ما يشغلهم. حسنه الترمذي وصححه الحاكم، ولأنه بر ومعروف، ويلح عليهم في الأكل لأن الحزن يمنعهم من ذلك فيضعفون. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲۴۰/۲، باب صلاة الجنازة، مطلب في الثواب على المصيبة، ط: دار الفكر - بيروت☆فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م:۸۶۱هـ): ۱۴۲/۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز، قبيل باب الشهيد، ط: دار الفكر☆حاشية الطحطاوي، ص: ۶۱۸، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۱) جب کہ مرنے والے کے مال سے دعوت کی جائے۔ ممانعت اور قباحت اس لیے ہے کہ موقع حزن وملال کا ہے نہ کہ خوشی ومسرت کا، کہ دعوت کی جائے، نیز میت کا مال - بعد از مرگ - اس کے وارثوں کا ہو گیا ہے؛ اس لیے قباحت اس وقت اور زیادہ ہو گی، جب کہ ورثاء میں کوئی نابالغ ہو یا کوئی وارث موجود نہ ہو:

وقال أيضا: ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من أهل الميت لأنه شرع في السرور لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة: وروى الإمام أحمد وابن ماجه بإسناد صحيح عن جرير بن عبد الله قال "كنا نعد الاجتماع إلى أهل الميت وصنعهم الطعام من النياحة". اهـ. وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم... ولا سيما إذا كان في الورثة صغار أو غائب، مع قطع النظر عما يحصل عند ذلك غالبا من المنكرات الكثيرة كإيقاد الشموع والقناديل التي توجد في الأفراح، وكدق الطبول، والغناء بالأصوات الحسان، واجتماع النساء والمردان، وأخذ الأجرة على الذكر وقراءة القرآن، وغير ذلك مما هو مشاهد في هذه الأزمان، وما كان كذلك فلا شك في حرمته وبطلان الوصية به، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲۴۰/۲-۲۴۱، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت، ط: دار الفكر - بيروت☆فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م:۸۶۱هـ): ۱۴۲/۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز، قبيل باب الشهيد، ط: دار الفكر)

مہمانوں اور اہل خانہ کے لیے کوئی کھانے کا نظم کرے، تو یہ بھی جائز؛ بل کہ مستحسن ہے؛ البتہ آدمی کے مرنے بعد جو مال (اس کا) موجود ہے، اس مال سے ورثاء کی اجازت کے بغیر کھانا پکانا، کھلانا یا ایصال ثواب کی خاطر صدقہ دینا؛ سب ناجائز ہے، البتہ اس موقع پر دعوت کرنا مشروع نہیں، بدعت ہے، جس کی اجازت شریعت میں نہیں ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] بھاتھی کا کھانا اور فاتحہ پڑھنا اور پڑھانا

۱۲۰۷- سوال: میت والے مکان میں دو دن جو رشتہ داروں کے یہاں سے یا پڑوسیوں کے یہاں سے کھانا آتا ہے (جس کو ہمارے یہاں بھاتھی کہا جاتا ہے) اس کو کھانا اور فاتحہ پڑھنا اور پڑھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

میت کے اعزہ و اقارب کو کھانا پکا کر کھلانا مستحب ہے۔ (۲)

---

(۱) ویکرہ اتخاذ الضیافة من الطعام من أهل المیت لأنه شرع في السرور لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة. روى الإمام أحمد و ابن ماجه بإسناد صحیح عن جریر بن عبد الله قال: کنا نعد الاجتماع إلى أهل المیت و صنعهم الطعام من النیاحة. ویستحب لجیران أهل المیت و الأقرباء الأباعد تهیئة طعام لهم یشبعهم یومهم و لیلتهم لقوله - صلى الله علیه و سلم -: اصنعوا لآل جعفر طعاما فقد جاءهم ما یشغلهم، حسنه الترمذي و صححه الحاکم و لأنه بر و معروف، ویلح علیهم في الأكل لأن الحزن یمنعهم من ذلك فیضعفون، والله أعلم. (فتح القدیر - کمال الدین محمد بن عبد الواحد السیواسي المعروف بابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۲/۱۴۲، کتاب الصلاة، باب الجنائز، قبیل باب الشهید، ط: دار الفکر ☆ رد المحتار علی الدر المختار: ۲/۲۴۰، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في الثواب على المصیبة، ط: دار الفکر - بیروت ☆ حاشیة الطحطاوي ص: ۶۱۸، کتاب الصلاة، باب أحکام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ط: دار الکتب العلمیة - بیروت)

(۲) عن عبد الله بن جعفر، قال: قال رسول الله صلى الله علیه وسلم: اصنعوا لآل جعفر طعاما، فإنه قد أتاهم أمر یشغلهم. (سنن أبي داود ص: ۴۴۷، رقم الحدیث: ۳۱۳۲، کتاب الجنائز، باب صنعة الطعام لأهل المیت، ط: فیصل پبلی کیشنز - دیوبند)

ویستحب لجیران أهل المیت و الأقرباء الأباعد تهیئة طعام لهم یشبعهم یومهم و لیلتهم لقوله - صلى الله علیه و سلم -: اصنعوا لآل جعفر طعاما فقد جاءهم ما یشغلهم، حسنه الترمذي و صححه الحاکم و لأنه بر و معروف، ویلح علیهم في الأكل لأن الحزن یمنعهم من ذلك فیضعفون، والله أعلم. (فتح القدیر - کمال الدین محمد بن عبد =

لیکن فاتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] میت کے مال میں سے کھانے کا انتظام کرنا

۱۲۰۸- سوال: انتقال کی خبر جب قریبی رشتہ داروں کو دی جاتی ہے، تو دوسرے حضرات بھی آتے ہیں، ان کے لیے میت کے گھر والے کھانے کا انتظام کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

مرحوم کے مال سے مہمانوں کے کھانے کا انتظام کرنا جائز نہیں ہے، حرام ہے، مذکورہ مال وارثوں کا حق ہے، اس لیے وارثوں کی اجازت کے بغیر اس کو خرچ کرنا جائز نہیں، وارثوں میں ایک فرد بھی نابالغ ہو تو اس کی اجازت معتبر نہیں ہے، اسی طرح کوئی غائب آدمی ہو، تو اس کی غیر موجودگی میں بھی میت کے مال کو خرچ کرنا جائز نہیں ہے، البتہ غسل اور کفن میں مشغول لوگوں کے لیے کھانا جائز ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م:۸۶۱هـ):۲/۱۴۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز، قبيل باب الشهيد، ط: دار الفكر☆رد المحتار على الدر المختار:۲/۲۴۰، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في الثواب على المصيبة، ط: دار الفكر - بيروت☆حاشية الطحطاوي، ص:۶۱۸، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۱) دفن کرنے کے بعد ایصال ثواب کی خاطر بعض آیات کریمہ کی تلاوت کی جاتی ہے، اُس کو دعا کہتے ہیں، اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، اُس کے لیے فاتحہ کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں ہے، اُس کا معنی الگ ہوتا ہے۔

''فاتحہ'' کا استعمال اہل بدعت کے یہاں اُس موقع پر ہوتا ہے، جب کہ سامنے کھانا یا مٹھائی رکھی جائے، اگربتی جلائی جائے اور اُس کے سامنے بیٹھ کر قرآن کریم کی مخصوص سورت یا آیت پڑھی جائے، اور ان سب میں یہ عقیدہ کارفرما ہوتا ہے کہ مردے کی روح گھر میں ہر جمعرات کو آتی ہے، اور صاحب خانہ سے فریاد کرتی ہے، حالاں کہ یہ بات قطعاً غلط ہے۔———— ضابطہ یہ ہے کہ ایک لفظ کے کئی مفہوم ہوں، ایک صحیح اور دوسرا غلط، تو احوط یہ ہے کہ اس لفظ کو استعمال ہی نہ کیا جائے، كما يفهم من قوله تعالى: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا. (۲-البقرة:۱۰۴)

(۲) وقال أيضا: ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من أهل الميت لأنه شرع في السرور لا في الشرور، وهي بدعة مستقبحة: وروى الإمام أحمد وابن ماجه بإسناد صحيح عن جرير بن عبد الله قال "كنا نعد الاجتماع إلى أهل الميت وصنعهم الطعام من النياحة". اهـ. وفي البزازية: ويكره اتخاذ الطعام في اليوم الأول والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلى القبر في المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم... ولا سيما إذا كان في الورثة صغار أو غائب، مع قطع النظر عما يحصل عند ذلك غالبا من المنكرات الكثيرة كإيقاد الشموع والقناديل التي توجد في الأفراح، وكدق الطبول، والغناء بالأصوات الحسان، واجتماع النساء والمردان، وأخذ الأجرة=

[۱۰] مردہ بچہ کی تدفین قبرستان کے بیچ میں کرنا

۱۲۰۹- سوال: اگر مردہ بچہ پیدا ہو، تو اس کو قبرستان میں دفن کر سکتے ہیں یا نہیں؟ یا قبرستان کے باہر والے حصہ میں دفن کرنا ہوگا، اگر قبرستان میں دفن کیا جائے، تو اس میں کوئی حرج تو نہ ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر بچہ مردہ پیدا ہو، تو نام رکھا جائے، اور غسل دے کر، ایک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے، بہتر یہ ہے کہ قبرستان کے کسی کونہ میں گڑھا کھود کر دفن کر دیں۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=علی الذکر وقراءة القرآن، وغیر ذلك مما هو مشاهد في هذه الأزمان، وما كان كذلك فلا شك في حرمته وبطلان الوصية به، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۴۱-۲۴۰، باب صلاة الجنازة، مطلب في كراهة الضيافة من أهل الميت، ط: دار الفكر - بيروت☆فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۲/ ۱۴۲، كتاب الصلاة، باب الجنائز، قبيل باب الشهيد، ط: دار الفكر)

تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیں "میت کے پڑوسیوں یا رشتہ داروں کی طرف سے تدفین میں آنے والے مہمانوں کو کھانا کھلانا ☆میت کی تجہیز وتکفین کے بعد کھانا کھلانا ☆بھاتھی کا کھانا اور فاتحہ پڑھنا اور پڑھانا" کے حواشی۔

(۱) وإن لم يستهل أدرج في خرقة "كرامة لبني آدم" ولم يصل عليه "لما روينا. ويغسل في غير الظاهر من الرواية لأنه نفس من وجه وهو المختار". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر، الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۹۱، باب الجنائز، فصل في الصلاة على الميت، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

قوله: "وإن لم يستهل" مثله ما إذا استهل فمات قبل خروج أكثره وأما الاستهلال في البطن فغير معتبر بالأولى قوله: "وإن لم يتم خلقه" فيغسل وإن لم يراع فيه السنة وبهذا يجمع بين من أثبت غسله وبين من نفاه فمن أثبته أراد الغسل في الجملة ومن نفاه أراد الغسل المراعي فيه وجه السنة والمتبادر منه أنه ظهر فيه بعض خلق وأما إذا لم يظهر فيه خلق أصلا فالظاهر أنه لا يغسل ولا يسمى لعدم حشره وحرره. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ) ص: ۵۹۸، فصل السلطان أحق بصلاته، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت-لبنان)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: الاختيار لتعليل المختار-ابن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳هـ): ۱/ ۹۵، باب الجنائز، فصل الصلاة على الجنازة، ت: الشيخ محمود أبو دقيقة [من علماء الحنفية ومدرس بكلية أصول الدين سابقا]، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق وحاشية الشِّلْبِيِّ- عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۲۴۳، كيفية=

[۱۱] قبرستان میں پیشگی قبر کھود کر رکھنا

۱۲۱۰- سوال: ایک عالم کا کہنا ہے کہ قبرستان میں پہلے سے قبر کھود کر رکھنا منع ہے، جب کہ ہم نے آٹھ قبریں کھود کر تیار رکھی ہیں، تو اس سلسلہ میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً

اگر قبرستان بڑا ہو اور وقت پر قبر کھودنے والے نہ ملتے ہوں، تو انتظام اور آسانی کے لیے، نیز اس مقصد سے کہ موت کا تصور رہے اور توبہ کی توفیق ہو، پہلے سے قبر کھود کر تیار رکھنا جائز ہے۔ قبر کھودنے کے بعد ضرورت کی وجہ سے، کسی دوسرے مسلمان کو دفن کیا گیا، تو اس میں جھگڑا کرنا جائز نہیں، ہاں اس میت کے مال میں سے اس کے ورثاء کے پاس سے قبر کھودنے کی اجرت وصول کی جاسکتی ہے۔

اگر قبرستان چھوٹا ہو، تو پہلے سے قبر کھودنا اور جگہ متعین کرلینا مکروہ ہے، ہاں اگر قبرستان خود کی ملکیت کا ہو، اسے عام مسلمانوں کے لیے وقف نہ کیا گیا ہو، تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، جائز ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= صلاة الجنازة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق - القاهرة ☆ الجوهرة النيرة - أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبيدي اليمني الحنفي (م: ۸۰۰ھ): ۱/۱۱۰، باب الجنائز، قبيل باب الشهيد، ط: المطبعة الخيرية ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۵۹، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل الثاني في غسل الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

درج ذیل عبارت میں ہے کہ نام رکھا جائے، امام طحاویؒ نے اس قول کو امام ابو یوسفؒ کی جانب منسوب کیا ہے:

(وإن لم يستهل) غسل في المختار. هداية. و (أدرج في خرقة ولم يصل عليه) وكذا يغسل السقط الذي لم يتم خلقه في المختار، كما في الفتح والدراية، ويسمى كما ذكره الطحاوي عن أبي يوسف، كذا في التبيين.

"وإن لم يستهل غسل" وإن لم يتم خلقه "في المختار" لأنه نفس من وجه "وأدرج في خرقة" وسمي "ودفن ولم يصل عليه". (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح - حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹ھ)، ص: ۲۲۲، الصلاة عليه، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

(۱) "وإن دفن في قبر حفر لغيره" من الأحياء بأرض ليست مملوكة لأحد "ضمن قيمة الحفر" وأخذ من تركته وإلا فمن بيت المال أو المسلمين. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱ھ) ص: ۶۱۵، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ فتح القدير: ۲/۱۴۱، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل في الدفن، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۳۸، كتاب الصلاة، باب =

[۱۲] قبرستان میں غیر مذہبی، مستور الحال یا غیر ملکی میت کو دفنانے کا حکم

۱۲۱۱- سوال: یہاں وسط امریکہ میں لبنان، جارڈن، فلسطین وغیرہ کے عرب حضرات بہ غرض تجارت بسے ہوئے ہیں، ان میں بہت سے عیسائی عورتوں سے نکاح کر لیتے ہیں اور یہ نکاح ان کے کلیسا (چرچ) میں کرتے ہیں، اپنی اولاد کے نام بھی عیسائی طریق پر رکھتے ہیں اور ان کا رہن سہن تقریباً عیسائی طرز کا ہوتا ہے، ان کی اولاد اسلامی تعلیمات سے اور وہ خود بھی اسلامی شعائر سے بہت دور رہتے ہیں۔ ادھر وسط امریکہ میں پنامہ شہر میں ہندوستانی افراد؛ خصوصاً گجراتی مسلمان رہتے ہیں، ان کی اپنی ایک الگ سوسائٹی ہے، جس میں نماز کے لیے بڑے ہال اور مساجد ہیں، اور ان کا اپنا ۶۵ رقبروں کے بہ قدر کا ایک چھوٹا سا قبرستان بھی ہے، اس قبرستان کی زمین انہوں نے عیسائیوں سے خریدی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ عرب میں سے اگر کسی کا انتقال ہوتا ہے، تو وہ انڈین مسلموں کے پاس میت کو دفن کرنے کے لیے قبر کی زمین لینے آتے ہیں اور منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہوتے ہیں، تو ایسی صورت میں ان کو قبر کی زمین قیمتاً دینا اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا اور ان کے یا ان کی اولاد کے پیچھے نماز جنازہ پڑھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً:

جو زمین ہندوستانی مسلم سوسائٹی نے قبرستان کے لیے رکھی ہے، وہ ان کی ملکیت ہے اور سوسائٹی نے جن حضرات کو منتظم بنایا ہے، ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ زمین کسی اور کو دے دیں؛ کیوں کہ منتظمین خود اس کے مالک نہیں ہیں؛ بل کہ ان کی حیثیت صرف وکیل کی ہے، اپنے فرض کے خلاف کرنا، ان کے

=صلاة الجنازة، مطلب في دن الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

ومن حفر قبرا لنفسه فلا بأس به ويؤجر عليه، كذا في التتارخانية رجل حفر قبرا فأرادوا دفن ميت آخر فيه إن كانت المقبرة واسعة يكره وإن كانت ضيقة جاز ولكن يضمن ما أنفق صاحبه فيه، كذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۶، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن والنقل من مكان إلى آخر)

ولو حفر قبرا فأراد آخر دفن ميت فيه، إن كانت المقبرة واسعة كره له، لا يحاش المسلم من غير ضرورة، وإن كانت ضيقة جاز ولكن يضمن ما أنفق الأول، وهذا كمن بسط بساطا أو مصلى في مسجد أو مجلس إن كان المكان واسعا كره لغيره أن يزيله وإلا فلا، ومن حفر قبرا لنفسه قبرا فلا بأس به ويؤجر عليه، كذا عمل عمر بن عبد العزيز والربيع بن خيثم وغيرهما ذكره في التاتارخانية. (حلبي كبير، ص: ۵۲۵، الفصل الثامن في مسائل متفرقة من الجنائز، ط: دار الكتاب - ديوبند)

لیے جائز نہیں ہے۔[۱]

لبنان، جارڈن، فلسطین وغیرہ سے آنے والے عرب حضرات، صرف مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے سے اور مسلمانوں جیسا نام رکھنے سے 'مسلمان شمار نہ ہوں گے، جب تک کہ ان کے عقائد اسلام کے موافق نہ ہوں، اسی طرح ان کی اولاد بھی جب تک وحدانیت کی قائل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والی نہ ہو، مسلمان شمار نہ ہوگی۔[۲]

اوران کا نکاح عیسائی عورتوں کے ساتھ - اگر وہ عورتیں واقعتاً مذہب کے اعتبار سے عیسائی ہوں تو - دو عیسائی گواہوں کی موجودگی میں درست ہے۔[۳]

---

(۱) في فتاوى أهل سمرقند: شجرة وقف في دار وقف خربت الدار ليس للمتولي أن يبيع الشجرة ويعمر الدار لكن يكرى الدار ويعمرها ويستعين بالأجر على عمارة الدار لا بالشجرة؛ لأنه إذا باع الشجرة لا تبقى. وإذا أجر الدار تبقى كلها. (المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ٦١٦هـ): ٦/ ١٣٨، كتاب الوقف، الفصل السابع في تصرف القيم في الأوقاف، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ متولی کے لیے ارض موقوفہ کے درخت کو فروخت کرنا جائز نہیں، تو قبرستان کی جگہ کو فروخت کرنا بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگا۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: رد المحتار على الدر المختار: ٤/ ٤٣٢، كتاب الوقف، فصل إجازة الواقف، مطلب استأجر دارا فيها أشجار، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ٥/ ٢٣٣، كتاب الوقف، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ منحة الخالق على البحر الرائق: ٥/ ٢٢١، كتاب الوقف، غرس شجرة ووقفها أو غرس في أرض موقوفة... الخ، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) عن ابن عمر، رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم "بني الإسلام على خمس: شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، وإقام الصلاة، وإيتاء الزكاة، والحج، وصوم رمضان". (صحيح البخاري: ١/ ٦، رقم الحديث: ٨، كتاب الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: بني الإسلام على خمس...، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ١/ ٣٢، رقم الحديث: ٢٠، ٢١ - (١٦)، كتاب الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم بني الإسلام على خمس، ط: ديوبند)

(۳) واعلم أن من اعتقد دينا سماويا وله كتاب منزل كصحف إبراهيم وشيث وزبور داود فهو من أهل الكتاب فتجوز مناكحتهم وأكل ذبائحهم، كذا في (الشرح) وفي (الدراية) الأولى أن لا يفعل ذلك إلا لضرورة وما في (الخانية) من كراهة تزوج الكتابية إذا كانت حربية محمول على التنزيه. (النهر الفائق شرح كنز الدقائق - سراج الدين عمر بن إبراهيم بن نجيم الحنفي (م: ١٠٠٥هـ): ٢/ ١٩٥، كتاب النكاح، فصل في المحرمات، ت: أحمد عزو عناية، ط: دار الكتب العلمية ☆ رد المحتار على الدر المختار: ٣/ ٤٥، كتاب النكاح، فصل في المحرمات، ط: دار الفكر - بيروت ☆ فتح القدير: ٣/ ٢٢٨، كتاب النكاح، فصل في النكاح، ط: دار الفكر - بيروت) =

البتہ اگر عورت صرف نام کی عیسائی ہو اور اپنے اصل مذہب پر قائم نہ ہو، یعنی آسمانی کتاب 'انجیل' اور پیغمبر 'حضرت عیسیٰ علیہ السلام' پر کما حقہ ایمان نہ رکھتی ہو، تو وہ عیسائی کہلانے کے لائق نہیں اور اس کے ساتھ مسلمان کا نکاح جائز نہیں، شریعت نے جس عیسائی عورت کے ساتھ نکاح کی اجازت دی ہے، اس کا صحیح معنیٰ میں عیسائی ہونا ضروری ہے۔ (۲) اگر ایسا نہیں ہے، تو اس عورت کو اور اس کی اولاد کو مسلمانوں کے قبرستان میں

= (وصح نكاح كتابية)، وإن كره تنزيها (مؤمنة بنبي) مرسل (مقرة بكتاب) منزل، وإن اعتقدوا المسيح إلها، وكذا حل ذبيحتهم على المذهب بحر. (الدر المختار)ـــــــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وإن كره تنزيها) أي سواء كانت ذمية أو حربية، فإن صاحب البحر استظهر أن الكراهة في الكتابية الحربية تنزيهية فالذمية أولى. اهـ. . . . ففي الفتح ويجوز تزوج الكتابيات والأولى أن لا يفعل، ولا يأكل ذبيحتهم إلا للضرورة، وتكره الكتابية الحربية إجماعا، لافتتاح باب الفتنة من إمكان التعلق المستدعي للمقام معها في دار الحرب، وتعريض الولد على التخلق بأخلاق أهل الكفر، وعلى الرق، بأن تسبى وهي حبلى فيولد رقيقا، وإن كان مسلما. اهـ.

فقوله: والأولى أن لا يفعل يفيد كراهة التنزيه في غير الحربية، وما بعده يفيد كراهة التحريم في الحربية تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۳/۴۵، كتاب النكاح، فصل في المحرمات، ط: دار الفكر)

قال: "وإن تزوج مسلم ذمية بشهادة ذميين جاز عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله. (الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۸۶، كتاب النكاح، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

(۲) اب رہا یہ معاملہ کہ یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کہنے اور سمجھنے کے لیے کیا یہ شرط ہے کہ وہ صحیح طور پر اصلی تورات و انجیل پر عمل رکھتے ہوں، یا محرف تورات اور انجیل کا اتباع کرنے والے اور عیسیٰ و مریم علیہما السلام کو خدا کا شریک قرار دینے والے بھی اہل کتاب میں داخل ہیں۔ سو قرآن کریم کی بے شمار تصریحات سے واضح ہے کہ اہل کتاب ہونے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہوں اور اس کی اتباع کرنے کے دعوے دار ہوں۔ خواہ وہ اس کے اتباع میں کتنی گمراہیوں میں جا پڑے ہوں۔

قرآن کریم نے جن کو اہل کتاب کا لقب دیا، انھیں کے بارے میں یہ بھی جا بجا ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں: یحرفون الکلم عن مواضعہ. اور یہ بھی فرمایا کہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾. ان حالات وصفات کے باوجود جب قرآن نے ان کو اہل کتاب قرار دیا تو معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ جب تک یہودیت و نصرانیت کو بالکل نہ چھوڑ دیں وہ اہل کتاب میں داخل ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی عقائد فاسدہ اور اعمال سیئہ میں مبتلا ہوں۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں آپ کے کسی عامل یا گورنر نے ایک ایک خط لکھ کر یہ دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات پڑھتے ہیں اور یوم السبت یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم بھی یہود کی طرح کرتے ہیں مگر قیامت پر ان کا ایمان نہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے تحریر فرمایا کہ وہ=

دفن کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگر نکاح کے بعد وہ (عرب) بھی اس عورت کے ساتھ کلیسا جاتا ہو اور عیسائیوں کے طریقے کے مطابق عبادت کرتا ہو، تو وہ ایمان سے نکل گیا اور مرتد شمار ہوگا اور مرتد کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہیں۔ (۵)

= اہل کتاب ہی کا ایک فرقہ سمجھے جائیں گے۔

صرف نام کے یہودی ونصرانی جو درحقیقت دہریے ہیں وہ اس میں داخل نہیں۔

آج کل یورپ کے عیسائی اور یہودیوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنی مردم شماری کے اعتبار سے یہودی یا نصرانی کہلاتے ہیں، مگر درحقیقت وہ خدا کے وجود اور کسی مذہب ہی کے قائل نہیں۔ نہ تورات وانجیل کو خدا کی کتاب مانتے ہیں اور نہ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی وپیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ شخص مردم شماری کے نام کی وجہ سے اہل کتاب کے حکم میں داخل نہیں ہو سکتے۔

نصاریٰ کے بارے میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ان کا ذبیحہ حلال نہیں اس کی وجہ یہ بتلائی کہ یہ لوگ دین نصرانیت میں سے بجز شراب نوشی کے اور کسی چیز کے قائل نہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد یہ ہے کہ (ابن جوزی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ) نصاریٰ بنی تغلب کے ذبائح کو نہ کھاؤ۔ کیوں کہ انہوں نے مذہب نصرانیت میں سے شراب نوشی کے سوا کچھ نہیں لیا۔ امام شافعی نے بھی سند صحیح کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے۔ (تفسیر مظہری: ۳/ ۳۴، سورہ مائدہ)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بنی تغلب کے متعلق یہی معلومات تھیں کہ وہ بے دین ہیں، نصرانی نہیں۔ اگرچہ نصرانی کہلاتے ہیں؛ اس لیے ان کے ذبیحہ سے منع فرمایا۔ جمہور صحابہ وتابعین کی تحقیق یہ تھی کہ یہ بھی عام نصرانیوں کی طرح ہیں، بالکل دین کے منکر نہیں، اس لیے انہوں نے ان کا ذبیحہ بھی حلال قرار دیا۔

وقال جمهور الامة ان ذبيحة كل نصراني حلال سواء كان من بني تغلب او غيرهم و كذلك اليهود. (تفسیر قرطبی: ۶/ ۷۸) ——— اور جمہور امت کہتے ہیں کہ نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے۔ خواہ بنی تغلب میں سے ہو، یا ان کے سوا کسی دوسرے قبیلہ اور جماعت سے ہو، اسی طرح ہر یہودی کا ذبیحہ بھی حلال ہے۔ ——— خلاصہ یہ ہے کہ جن نصرانیوں کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے یا حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی نہیں مانتے۔ وہ اہل کتاب کے حکم میں نہیں۔ (معارف القرآن: ۳/ ۴۸-۴۹، سورہ مائدہ: ۵، ط: نعیمیہ- دیوبند)

(۵) من تقلنس بقلنسوة المجوس، أي لبسها، و تشبه بهم فيها، أو خاط خرقة صفراء على العاتق أي و هو من شعارهم، أو شد في الوسط خيطا كفر، إذا كان متشابها بخيطهم أو ربطهم أو سماه زنارا . . . و لو شد الزنار على وسطه، أو وضع الغل على كتفه فقد كفر، أي إذا لم يكن مكرها في فعله. (شرح الفقه الأكبر، ص: ۲۲۷-۲۲۸، فصل في الكفر صريحا و كناية، ط: ياسر نديم - ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۷۶، كتاب السير، باب في أحكام المرتدين موجبات الكفر أنواع، و منها: مايتعلق بتلقين الكفر و الأمر بالارتداد. الخ، ط: دار الفكر☆ البحر الرائق =

اور اگر وہ مسلمان بھی ہوں؛ لیکن "ہندی مسلم سوسائٹی" اپنے قاعدہ وقانون کے بموجب عمل کرے اوران عرب مسلموں کو (گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے) اجازت نہ دے، تب بھی جائز ہے، اس کی ایک نظیر یہ ہے کہ: محلہ کی مسجد محلہ والوں کے لیے تنگ ہو، تو فقہاء نے لکھا ہے کہ "جائز ہے کہ دوسرے محلہ والوں کو اس میں آنے سے منع کردے"۔[۲] پس جب ہندی مسلمانوں کا قبرستان صرف ۶۰ / یا ۶۵ / قبروں کی گنجائش رکھتا ہے، تو اگر سب کو اجازت دی جائے گی، تو مختصر وقت میں قبرستان ناکافی ہوجائے گا اور دوسری جگہ مہیا کرنے میں تکلیف ہوگی؛ اس لیے منع کرنے میں کوئی حرج نہیں، بل کہ اگر قبرستان میں گنجائش بھی ہو، مگر ان عربوں کے عقائد کی تحقیق میں الجھن اور دشواری ہو، تو اس کی وجہ سے بھی منع کرنے کی گنجائش ہے، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] لحدی قبر افضل ہے

۱۲۱۲- سوال: بیشتر علاقوں میں صندوقی قبریں نہیں بنائی جاتیں؛ بل کہ گڑھا کھود کر ایک جانب میت کے جسم برابر کھودا جاتا ہے، پھر اس میں میت کو رکھ دیا جاتا ہے، اور لکڑی کے تختے یا بانس کے

=شرح کنز الدقائق: ۵/ ۱۳۳، باب أحکام المرتدین، کتاب السیر، ط: دار الکتاب الإسلامي ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقی الأبحر: ۱/ ۶۹۸، ألفاظ الکفر أنواع، باب المرتد، ط: دار إحیاء التراث العربي)

أما المرتد فلا یغسل، ولا یکفن، وإنما یلقی في حفیرة کالکلب، ولا یدفع إلی من انتقل إلی دینهم کما في فتح القدیر. (البحر الرائق مع منحة الخالق: ۲/ ۲۰۵، کتاب الجنائز، الصلاة علی المیت في المسجد، ط: دار الکتاب الإسلامي ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۳۰، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب مهم إذا قال إن شتمت فلانا في المسجد، ط: دار الفکر ☆ فتح القدیر: ۲/ ۱۳۲، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنائز، فصل في الصلاة علی المیت، ط: دار الفکر-بیروت)

(۲) قال التمرتاشي لو ضاق المسجد بأهله لهم أن یمنعوا من لیس من أهله من الصلاة وفي العیني علی الهدایة، ولا یمتنع أن یکون المسجد لعامة المسلمین، ویختص أهله بتدبیره ألا تری أن رسول الله - صلی الله علیه وسلم - أخذ مفاتیح الکعبة من بني شیبة، فأمره الله تعالی أن یردها إلیهم بقوله تعالی {إن الله یأمرکم أن تؤدوا الأمانات إلی أهلها} [النساء: ۵۸]. (البحر الرائق: ۸/ ۴۰۲، کتاب الدیات، باب ما یحدث الرجل في الطریق، فصل في الحائط المائل، ط: دار الکتاب الإسلامي ☆ البنایة شرح الهدایة: ۱۳/ ۴۴۳، کتاب الدیات، باب ما یحدث الرجل في الطریق، کان المسجد للعشیرة فعلق رجل منهم... الخ، ط: دار الکتب العلمیة-بیروت)

ٹکڑے رکھ کر، مٹی سے پاٹ دیا جاتا ہے، کچھ ہی دنوں کے بعد تختے اور بانس سڑ جاتے ہیں، جس کی وجہ سے قبر بیٹھ [دھنس] جاتی ہے، اور گڑھا پڑ جاتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسی قبر بنانا کیسا ہے؟

الجواب حامداو مصليا:

بغیر مجبوری کے صندوقی قبر بنانے کی ضرورت نہیں ہے، گڑھے کی ایک جانب میں کھود کر جو قبر بنائی جاتی ہے، اسے لحدی قبر کہا جاتا ہے، اور وہی افضل ہے۔[1]

---

(۱) عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "اللحد لنا والشق لغيرنا". (سنن أبي داود: ۲/۴۵۸، رقم الحديث: ۳۲۰۸، كتاب الجنائز، باب في اللحد، ط: ديوبند☆سنن الترمذي: ۱/۲۰۲، رقم الحديث: ۱۰۴۵، أبواب الجنائز، باب ما جاء في قول النبي صلى الله عليه وسلم اللحد لنا، والشق لغيرنا، ط: ديوبند☆المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳هـ): ۴/۸۰، رقم الحديث: ۲۰۰۹، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب ☆سنن ابن ماجه، ص: ۱۱۱، رقم الحديث: ۱۴۵۴ و۱۴۵۵، كتاب الجنائز، باب ما جاء في استحباب اللحد، ط: الكتبة الأشرفية - ديوبند)

وأما سنة الحفر فالسنة فيه اللحد عندنا، وعند الشافعي الشق، واحتج أن توارث أهل المدينة الشق دون اللحد، وتوارثهم حجة، ولنا قول النبي: - صلى الله عليه وسلم - اللحد لنا والشق لغيرنا، وفي رواية: اللحد لنا والشق لأهل الكتاب، وروي أن النبي - صلى الله عليه وسلم - لما توفي اختلف الناس أن يشق له، أو يلحد، وكان أبو طلحة الأنصاري لحادا، وأبو عبيدة بن الجراح شاقا، فبعثوا رجلا إلى أبي عبيدة ورجلا إلى أبي طلحة، فقال العباس بن عبد المطلب: اللهم خر لنبيك أحب الأمرين إليك فوجد أبا طلحة من كان بعث إليه، ولم يجد أبا عبيدة من بعث إليه، والعباس - رضي الله عنه - كان مستجاب الدعوة، وأهل المدينة إنما توارثوا الشق؛ لضعف أراضيهم بالبقيع ولهذا اختار أهل بخارى الشق دون اللحد، لتعذر اللحد لرخاوة أراضيهم.

وصفة اللحد أن يحفر القبر، ثم يحفر في جانب القبلة منه حفيرة فيوضع فيه الميت. وصفة الشق أن يحفر حفيرة في وسط القبر، فيوضع فيه الميت ويجعل على اللحد اللبن والقصب لما روي أنه وضع على قبر رسول الله - صلى الله عليه وسلم - طن من قصب.

وروي أنه - صلى الله عليه وسلم - رأى فرجة في قبر، فأخذ مدورة، وناولها الحفار، وقال سد: بها تلك الفرجة فإن الله تعالى يحب من كل صانع أن يحكم صنعته، والمدرة قطعة من اللبن، وروي عن سعيد بن العاص، أنه قال: اجعلوا على قبري اللبن والقصب، كما جعل على قبر رسول الله - صلى الله عليه وسلم - وقبر أبي بكر وقبر عمر؛ ولأن اللبن والقصب لا بد منهما ليمنعا ما يهال من التراب على القبر من الوصول إلى الميت. (بدائع الصنائع: ۱/۳۱۸، فصل سنة الحفر لدفن الميت، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

"ويلحد" في الأرض صلبة من جانب القبلة" ولا يشق" بحفيرة في وسط القبر يوضع فيها الميت "إلا في أرض =

قبر کے دھنس جانے کی صورت میں اسے کھولنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں! اگر اس طرح قبر دھنس جائے کہ میت کے ظاہر ہو جانے یا اس کے اعضائے بدن کو جانور سے نقصان پہنچانے کا اندیشہ ہو، تو کھود کر مٹی ڈال دینا جائز ہے۔ (عالمگیری)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] اگر قبر دھنس جائے، تو اس پر دوبارہ مٹی ڈالنا جائز ہے

۱۲۱۳- سوال: ایک شخص کو دفن کیا گیا، اس کے بعد خوب بارش ہوئی، جس کے نتیجے میں قبر دھنس گئی، تو اس پر نئی مٹی ڈال سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامدا ومصليا:

قبر اگر دھنس جائے، تو اس پر زائد مٹی ڈالنا جائز ہے، تاکہ لوگوں کو معلوم رہے کہ یہ قبر ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= رخوة" فلا بأس به فيها. (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح-حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ):۱/۲۲۵، فصل في حملها ودفنها، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

(ويحفر القبر) وهو مقر الميت طوله على قدر طول الميت وعرضه على قدر نصف طوله وعمقه إلى السرة وقيل إلى الصدر وإن زاد عليه فهو أفضل فلو كان على قدر قامته فهو أحسن (ويلحد) القبر من لحده أو ألحده أي حفر في جانب القبلة من القبر حفيرة يوضع فيها الميت ويجعل كالبيت المسقف؛ لقوله -عليه الصلاة والسلام-: اللحد لنا والشق لغيرنا، والشق أن يحفر حفيرة في وسط القبر فيوضع فيها الميت، وفي التبيين: وإن كانت الأرض رخوة فلا بأس بالشق واتخاذ التابوت ولو من حديد ولكن السنة أن يفترش فيه التراب. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-داماد أفندي (م:۱۰۷۸ھ):۱/۱۸۶، سنن حمل الجنازة، ط: دار إحياء التراث العربي)

[۱] وإذا خربت القبور فلا بأس بتطيينها، كذا في التتارخانية، وهو الأصح وعليه الفتوى، كذا في جواهر الأخلاطي. (الفتاوى الهندية:۱/۱۶۶، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن والنقل من مكان إلى آخر، ط: دار الفكر-بيروت)

وإذا خربت القبور فلا بأس بتطيينها لأن الرسول صلى الله عليه وسلم مر بقبر ابنه إبراهيم فرأى فيه جحرا فسده وقال: "من عمل عملا فليتقنه" (مراقي الفلاح:۱/۲۲۶، فصل في حملها ودفنها)

(۲) وإذا خربت القبور فلا بأس بتطيينها لأن الرسول صلى الله عليه وسلم مر بقبر ابنه إبراهيم فرأى فيه جحرا فسده وقال: "من عمل عملا فليتقنه". (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح-حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي الحنفي (م:۱۰۶۹ھ)، ص:۲۲۶، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية ☆ الفتاوى الهندية:۱/۱۶۶، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن و =

[۱۵] قبر کو دوبارہ استعمال کرنے کے لیے کتنی مدت بعد کھول سکتے ہیں؟

۱۲۱۴- سوال: مرد اور عورت کی قبر دوبارہ استعمال کے لیے کتنی مدت کے بعد کھول سکتے ہیں؟ آب وہوا کے اعتبار سے گجرات میں کتنی مدت بعد کھول سکتے ہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

آب وہوا پر اس کا دارومدار ہے، کم از کم چھ مہینے گذر جائیں اور اطمینان ہو جائے کہ میت کے اعضاء، مٹی میں مل گئے ہوں گے، تو پرانی قبر کو کھود کر دوسرے مردے کی تدفین کی جائے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] ایک قبر میں دوسرے میت کو دفنانے کی مدت

۱۲۱۵- سوال: زید نامی شخص کی بیوی کا چالیس سال پہلے انتقال ہو گیا تھا، اب زید کا انتقال ہوا ہے، تو کیا اس کو اس کی بیوی کی قبر میں دفن کر سکتے ہیں؟ اگر زید کے علاوہ کسی دوسرے غیر محرم کی میت ہو، تو اسے اس قبر میں دفن کر سکتے ہیں یا نہیں؟ منشاء سوال یہ ہے کہ کیا ایک قبر میں دوسری مرتبہ اسی کو دفن کیا جا سکتا ہے، جو غیر محرم ہو، یا کسی کو بھی دفن کیا جا سکتا ہے؟ کسی قبر میں کتنی مدت بعد دوسرے میت کو دفن کر سکتے ہیں؟

=النقل من مكان إلى مكان آخر، ط: دار الفكر - بيروت)

وكان عصام بن يوسف يطوف حول المدينة ويعمر القبور الخربة كما في القهستاني. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - داماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/۱۸۷، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، سنن حمل الجنازة، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۱) ولو بلي الميت وصار ترابا جاز دفن غيره في قبره وزرعه والبناء عليه، كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۶۷، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن والنقل من مكان إلى آخر، ط: زكريا - ديوبند)

قال في الفتح: ولا يحفر قبر لدفن آخر إلا إن بلي الأول فلم يبق له عظم إلا أن لا يوجد فتضم عظام الأول ويجعل بينهما حاجز من تراب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۳۳، باب صلاة الجنائز، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر ★ تكملة البحر الرائق - محمد بن حسين بن علي الطوري الحنفي القادري (م: بعد ۱۱۳۸هـ): ۸/۵۱۸، كتاب الوصايا، باب وصية الذمي، ط: دار الكتاب الإسلامي)

نوٹ: حضرت مفتی صاحب نے کم از کم چھ مہینے کی جو قید لگائی ہے، وہ فقہ کی کسی کتاب میں مصرح نہیں ہے؛ علاقے کی آب وہوا پر اس کا دارومدار ہے، یہ کوئی حتمی مقدار نہیں ہے؛ قبر اگر بوسیدہ ہو جائے اور نعش مٹی بن جائے تو اس میں دوسرے مردے کی تدفین جائز ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر قبر میں پہلے مردے کا بدن مٹی میں مل کر ختم ہو جائے اور مٹی ہو جائے، تو اس کے بعد دوسرے مردے کو اس میں دفن کر سکتے ہیں، اس کی کوئی خاص مدت مقرر نہیں ہے، اگر زمین میں نمکینیت (کھاراپن) غالب ہو تو نعش کچھ ہی مدت میں مٹی بن جاتی ہے، ورنہ مدت لگتی ہے، ۴۰ سال تو طویل مدت ہے، لہٰذا اتنے دنوں کے بعد شوہر کو اس قبر میں دفن کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، نعش کے مٹی ہو جانے کے بعد محرم و غیر محرم کو دفن کرنے کے متعلق کوئی فرق نہیں ہے، دونوں کا حکم یکساں ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۱۷] اولیاء اللہ کے بدن کو بھی قبر کی مٹی نہیں کھاتی

۱۲۱۶- سوال: جس طرح انبیاء اور شہداء کے بدن کو قبر کی مٹی نہیں کھاتی، تو کیا یہ فضیلت اولیاء اللہ کے لیے بھی ثابت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

شہادت کا اصل درجہ تو یہی ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کر دے اور ایسے شہید کے بدن کو قبر کی مٹی نہیں کھاتی۔ (۲) تاہم دوسرے شہداء کے لیے بھی یہ فضیلت ثابت ہو سکتی ہے۔

---

(۱) تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیے "قبر کو دوبارہ استعمال کرنے کے لیے کتنی مدت بعد کھول سکتے ہیں؟" (سابق فتویٰ) کے حواشی۔

(۲) یہ تو منقول ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے جسم مبارک کو قبر کی مٹی نہیں کھاتی، چناں چہ روایت ہے: "قال [النبي صلى الله عليه وسلم]: إن الله عز وجل قد حرم على الأرض أن تأكل أجساد الأنبياء عليهم السلام". (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳ھ): ۹۱/۳، رقم الحديث: ۱۳۷۴، عن أوس بن أوس رضي الله تعالى عنه، كتاب الجمعة، إكثار الصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم يوم الجمعة، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب ☆ سنن ابن ماجه، ص: ۷۶، رقم الحديث: ۱۰۸۵، كتاب إقامة الصلاة و السنة فيها، باب في فضل الجمعة، ط: ديوبند، و انظر رقم: ۱۶۳۶ و ۱۶۳۷، كتاب الجنائز، باب ذكر وفاته ودفنه صلى الله عليه وسلم)

شہداء کے اجسام کو قبر کی مٹی کھاتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں کوئی صریح آیت وحدیث موجود نہیں ہے؛ بعض مشاہدے کی بناء پر بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ شہداء کے اجسام کو بھی قبر کی مٹی نہیں کھاتی، ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ اور ابو الفضل عراقیؒ کی تصریح بالترتیب ملاحظہ فرمائیں:

("وأنا بيت الدود") . . . ولا ينفع في ذلك المكان إلا العمل الصالح، فالقبر صندوق العمل، قيل: يتولد الدود من العفونة، وتأكل الأعضاء ثم يأكل بعضها بعضا، إلى أن تبقى دودة واحدة، فتموت جوعا، واستثنى الأنبياء، والشهداء، والأولياء، والعلماء من ذلك، فقد قال - صلى الله تعالى عليه وسلم -: "إن الله حرم على الأرض أن تأكل =

نیز وہ علماء کرام جو زندگی بھر علم دین کی محنت اور ذکر اللہ میں مشغول رہے، ان کے اور دوسرے اولیاء عظام کے ایسے واقعات منقول ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو بھی علم وذکر کی یہ دولت بلند درجہ تک پہنچ جاتا ہے، انھیں بھی یہ فضیلت حاصل ہوسکتی ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] میت کو دفنانے کے لیے اپنے آبائی وطن لے جانا

۱۲۱۷- سوال: اگر کسی آدمی نے دفنانے کے بارے میں کوئی وصیت نہ کی ہو اور اس کا آبائی

=أجساد الأنبياء"، وقد قال تعالى في حق الشهداء: {ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله أمواتا بل أحياء عند ربهم يرزقون} [آل عمران:١٦٩]، والعلماء العاملون المعبر عنهم بالأولياء مدادهم أفضل من دماء الشهداء. (مرقاة المفاتيح: ٨/ ٣٣٥٣، كتاب الآداب، باب البكاء والخوف، ط: دار الفكر - بيروت)

ملا علی قاری ایک حدیث کے ضمن میں رقم طراز ہیں: ويحصل لبعض ورائهم من الشهداء والأولياء والعلماء الحظ الأوفى بحفظ أبدانهم الظاهرة. (حوالہ سابق: ٣/ ١٠١٧، باب الجمعة، الفصل الثاني)

{الرابعة} كون ابن آدم يأكله التراب عام مخصوص، فإن الأنبياء - عليهم الصلاة والسلام - لا تبلى أجسامهم الكريمة، وقد قال النبي - صلى الله عليه وسلم -: إن الله حرم على الأرض أن تأكل أجساد الأنبياء، واستثنى ابن عبد البر معهم الشهداء، قال وحسبك ما جاء في شهداء أحد وغيرهم، ثم ذكر حديث جابر لما نقل أباه في خلافة معاوية حين أراد إجراء العين التي في أسفل أحد، وقوله: "فأخرجناهم رطابا يتسنون فأصابت المسحاة أصبع رجل منهم فتقطر الدم" واقتصر القاضي عياض على قوله وكثير من الشهداء، فدل على أنه يرى أن بعض الشهداء قد تأكل الأرض جسده، ولعله أشار بذلك إلى المبطون ونحوه من الملحقين بالشهداء، وضم أبو العباس القرطبي إلى الصنفين المؤذن المحتسب لقوله - عليه الصلاة والسلام -: المؤذن المحتسب كالمتشحط في دمه وإن مات لم يدود في قبره. قال وظاهر هذا أن الأرض لا تأكل أجساد المؤذنين المحتسبين، فللحديث تأويلان (أحدهما) قال ابن عبد البر كأنه قال كل من تأكله الأرض فإنه لا تأكل منه عجب الذنب قال: وإذا جاز ألا تأكل الأرض عجب الذنب جاز أن لا تأكل الشهداء. ــــــــ (الثاني) قال القاضي عياض يريد أن جميع الإنسان مما تأكله الأرض وإن كانت لا تأكل أجساما كثيرة كالأنبياء وكثير من الشهداء. (طرح التثريب في شرح التقريب - أبو الفضل زين الدين عبد الرحيم العراقي (م: ٨٠٦هـ): ٣/ ٣٠٨، كتاب الجنائز، باب بلاء الميت إلا عجب الذنب، ط: الطبعة المصرية القديمة = دار إحياء التراث العربي)

لما نقل أن يعقوب الخ ما نصه أن ذلك شرع من قبلنا ولم تتوفر فيه شروط كونه من شرعنا ولأن أجساد الأنبياء عليهم السلام أطيب ما يكون حال الموت كالحياة والشهداء كسعد رضي الله عنه ليسوا كغيرهم ممن جيفتهم أشد نتنا من جيفة البهائم فلا يلحق بهم اهـ. (طحطاوي على المراقي، ص: ٦١٤، فصل في حملها ودفنها، ت: عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

گاؤں یا شہر سے دور انتقال ہو گیا ہو، تو دفنانے کے لیے اپنے باپ دادا کے وطن لے جا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قریب ہو، تو مضائقہ نہیں۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] اگر مرنے والا خواب میں آ کر کہے کہ مجھے دوسری قبر میں منتقل کر دو

۱۲۱۸- سوال: میرے بھائی کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو گیا ہے، اب مجھے مسلسل تین چار دن سے خواب میں مرحوم بھائی کہتے ہیں کہ مجھ سے پہلے اس قبر میں کچھ ایسے مردے دفن ہوئے ہیں، جن کی وجہ سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے؛ لہٰذا مجھے دوسری جگہ منتقل کر دو، تو کیا شریعت میں اس کی گنجائش ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ صورت میں قبر کو کھودنا اور میت کو دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں ہے۔ (رد المحتار) [۲]

---

(۱) (قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قيل مطلقا، وقيل إلى ما دون مدة السفر، وقيده محمد بقدر ميل أو ميلين لأن مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد. قال في النهر عن عقد الفرائد: وهو الظاهر اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۹، باب صلاة الجنائز، مطلب في حمل الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

ويستحب في القتيل والميت دفنه في المكان الذي مات في مقابر أولئك القوم وإن نقل قبل الدفن إلى قدر ميل أو ميلين فلا بأس به، كذا في الخلاصة. ــــــ وكذا لو مات في غير بلده يستحب تركه فإن نقل إلى مصر آخر لا بأس به. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۷، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن والنقل من مكان إلى آخر، ط: دار الفكر - بيروت)

"ويستحب الدفن في" "المقبرة" "محل مات به أو قتل" لما روي عن عائشة رضي الله عنها أنها قالت حين زارت قبر أخيها عبد الرحمن وكان مات بالشام وحمل منها: لو كان الأمر فيك إلي ما نقلتك ولدفنتك حيث مت "فإن نقل قبل الدفن قدر ميل أو ميلين" ونحو ذلك "لا بأس به" لأن المسافة إلى المقابر قد تبلغ هذا المقدار "وكره نقله لأكثر منه" أي أكثر من الميلين كذا في الظهيرية، وقال شمس الأئمة السرخسي: وقول محمد في الكتاب لا بأس أن ينقل الميت قدر ميل أو ميلين بيان أن النقل من بلد إلى بلد مكروه. (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي ص: ۶۱۲ - ۶۱۳، كتاب الجنائز، فصل في حملها ودفنها)

[۲] (ولا يخرج منه) بعد إهالة التراب (إلا) لحق آدمي كـ (أن تكون الأرض مغصوبة أو أخذت بشفعة) ويخير المالك بين إخراجه ومساواته بالأرض كما جاز زرعه والبناء عليه إذا بلي وصار ترابا زيلعي. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله إلا لحق آدمي) احترز عن حق الله تعالى كما إذا دفن بلا غسل أو صلاة أو وضع على غير يمينه أو إلى غير القبلة فإنه لا ينبش عليه بعد إهالة التراب كما مر (قوله كأن تكون الأرض مغصوبة) وكما إذا سقط في =

مرحوم بھائی کی جانب سے مالی صدقہ کر کے ایصال ثواب کیا جائے، اگر ان پر کسی کا حق باقی ہو، تو اس کو ادا کیا جائے یا معاف کرایا جائے، ان شاء اللہ اس طرح کے خواب آنے بند ہو جائیں گے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] قبر پر پھول اور درخت کی سبز شاخ ڈالنا

۱۲۱۹- سوال: قبرستان میں قبر پر پھول، نیم کی ہری ڈالیاں، نیم کے ہرے پتے ڈالے جاتے ہیں، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب تک یہ چیزیں ہری رہیں گی، اس وقت تک قبر میں میت کو عذاب نہیں ہوگا، کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر میت کافر ہو، تو اس پر عذاب واقع ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں بن سکتی، میت مسلمان گنہگار ہو اور عذاب کا مستحق ہو، تو قبرستان کے ہرے درخت اور اس کی شاخیں، عذاب کو نہیں روک سکتیں، ہری گھاس اور درختوں کی تسبیح اور ذکر سے میت کو تھوڑا سا سکون مل سکتا ہے۔ میت نیک ہو تو ذکر سے اسے سکون اور خوشی محسوس ہوتی ہے، گنہگار ہو اور عذاب میں مبتلا ہو، تو جس طرح جلے ہوئے آدمی کو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے، اسی طرح میت کو سکون ملتا ہے، لیکن جلن کم نہیں ہوتی ہے، ہاں کسی آدمی کی دعا اور ایصال ثواب سے اللہ تعالیٰ اس کو دور کر دیتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ دو آدمیوں کو قبر میں عذاب ہو رہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درخت کی دو ٹہنیوں کو لے کر گاڑ دیا اور فرمایا کہ یہ ٹہنیاں ابھی خشک نہ ہونے پائیں گی کہ ان کا عذاب ہلکا ہو جائے گا۔ (بخاری شریف صفحہ ۳۵)[1]

=القبر متاع أو كفن بثوب مغصوب أو دفن معه مال قالوا: ولو كان المال درهما بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۸، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر - بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۷، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر والدفن والنقل من مكان إلى آخر، ط: دار الفكر)

ولو أوصى بأن يحمل بعد موته إلى موضع كذا ويدفن هناك ويبنى هناك رباطا من ثلث ماله فمات ولم يحمل إلى ذلك الموضع قال أبو القاسم: وصيته بالرباط جائزة ووصيته بالحمل باطلة. (الفتاوى الهندية: ۶/ ۹۵، كتاب الوصايا، الباب الثاني في بيان الألفاظ التي تكون وصية والتي لا تكون وصية، ط: دار الفكر)

[۱] عن ابن عباس رضي الله عنهما، مر النبي صلى الله عليه وسلم على قبرين فقال: إنهما ليعذبان وما يعذبان من كبير، ثم قال: بلى، أما أحدهما فكان يسعى بالنميمة، وأما أحدهما فكان لا يستتر من بوله. قال: ثم أخذ عودا رطبا، =

ان کا عذاب، نبی کریم ﷺ کے دست (ہاتھ) مبارک کی برکت اور آپ ﷺ کی تمنا اور بخشش کی دعا سے دور ہوا، ٹہنی آپ ﷺ کے ہاتھ مبارک سے زیادہ بابرکت نہ تھی، آپ ﷺ بخشش کی تمنا کریں اور ٹہنی خشک ہونے تک ہی عذاب ہلکا ہو، تو پھر آپ ﷺ کی تمنا کی کیا قدر؟ لہٰذا حدیث شریف کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کے ہاتھ کی برکت اور آرزو سے عذاب دور ہوگا اور دیر نہیں لگے گی، ٹہنی سوکھنے سے پہلے پہلے عذاب سے نجات مل جائے گی؛ لہٰذا پھول کی چادر اور ہرے پتے ڈالنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی ہرا پودا لگا دے، تو مذکورہ تفصیل کے مطابق تھوڑی راحت کا سبب ہوگا۔ (نووی شرح مسلم)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=فكسره باثنتين، ثم غرز كل واحد منهما على قبر، ثم قال: لعله يخفف عنهما ما لم ييبسا. (صحيح البخاري: ١/ ١٨٣، رقم الحديث: ١٣٧٨، كتاب الجنائز، باب عذاب القبر من الغيبة والبول، ط: ديوبند و انظر أيضا رقم: ٦٠٥٢، باب الغيبة☆ الصحيح لمسلم: ١/ ١٤١، رقم الحديث: ١١١ - ٢٩٢، كتاب الطهارة، باب الدليل على نجاسة البول و وجوب الاستبراء منه، ط: ديوبند)

[۲] وأما وضعه صلى الله عليه وسلم الجريدتين على القبر، فقال العلماء محمول على أنه صلى الله عليه وسلم سأل الشفاعة لهما فأجيبت شفاعته صلى الله عليه وسلم بالتخفيف عنهما إلى أن ييبسا، وقد ذكر مسلم رحمه الله تعالى في آخر الكتاب في الحديث الطويل حديث جابر في صاحبي القبرين فأجيبت شفاعتي أن يرفع ذلك عنهما ما دام القضيبان رطبان. وقيل يحتمل أنه صلى الله عليه وسلم كان يدعو لهما تلك المدة وقيل لكونهما يسبحان ما داما رطبين وليس لليابس تسبيح وهذا مذهب كثيرين أو الأكثرين من المفسرين في قوله تعالى وإن من شيء إلا يسبح بحمده قالوا معناه وإن من شيء حي. . . . وقد ذكر البخاري في صحيحه أن بريدة بن الحصيب الأسلمي الصحابي رضي الله عنه أوصى أن يجعل في قبره جريدتان ففيه أنه رضي الله عنه تبرك بفعل مثل فعل النبي صلى الله عليه وسلم، وقد أنكر الخطابي ما يفعله الناس على القبور من الأخواص ونحوها متعلقين بهذا الحديث، وقال لا أصل له ولا وجه له والله أعلم. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، المعروف بـ شرح النووي على صحيح مسلم - أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ٦٧٦هـ): ١/ ١٤١، رقم الحديث: ١١١ - ٢٩٢، كتاب الطهارة، باب الدليل على نجاسة البول و وجوب الاستبراء منه، ط: ديوبند)

يكره أيضا قطع النبات الرطب والحشيش من المقبرة دون اليابس كما في البحر والدرر وشرح المنية وعلله في الإمداد بأنه ما دام رطبا يسبح الله - تعالى - فيؤنس الميت وتنزل بذكره الرحمة اهـ ونحوه في الخانية.

أقول: ودليله ما ورد في الحديث من وضعه - عليه الصلاة والسلام - الجريدة الخضراء بعد شقها نصفين على القبرين اللذين يعذبان. وتعليله بالتخفيف عنهما ما لم ييبسا: أي يخفف عنهما ببركة تسبيحهما؛ إذ هو أكمل من تسبيح اليابس لما في الأخضر من نوع حياة؛ وعليه فكراهة قطع ذلك، وإن نبت بنفسه ولم يملك لأن فيه تفويت حق=

[۲۱] قبروں پر درخت کی شاخ گاڑنا کیسا ہے؟

۱۲۲۰- سوال: بچوں کی قبر پر مٹی ڈالنے کے بعد، ہری ٹہنی ڈالنا، اس نیت سے کہ جب تک وہ ہری رہے گی، ذکر کرتی رہے گی، کیسا ہے؟ نیز قبر پر پھول ڈالنا کیسا ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

قبر پر ہری ٹہنی یا درخت کی شاخ اس نیت سے گاڑنا جائز ہے کہ وہ جب تک ہری رہے گی، ذکر کرتی رہے گی، قبر پر شاخ گاڑنا آپ ﷺ سے ثابت ہے، البتہ پھول ڈالنے کا ثبوت نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] قبر پر پھول چڑھانا اور دھونی دینا

۱۲۲۱- سوال: قبر کو بند کرنے کے بعد، اس پر پھول چڑھانا اور دھونی دینا چاہیے یا نہیں؟ اگر دیا جائے تو اس میں کوئی خرابی تو نہیں ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

دھونی دینا جائز نہیں ہے۔[2]

=الميت. ويؤخذ من ذلك ومن الحديث ندب وضع ذلك للاتباع، ويقاس عليه ما اعتيد في زماننا من وضع أغصان الآس ونحوه، وصرح بذلك أيضا جماعة من الشافعية، وهذا أولى مما قال بعض المالكية من أن التخفيف عن القبرين إنما حصل ببركة يده الشريفة - صلى الله عليه وسلم - أو دعائه لهما فلا يقاس عليه غيره. وقد ذكر البخاري في صحيحه أن بريدة بن الحصيب - رضي الله عنه - أوصى بأن يجعل في قبره جريدتان، والله تعالى أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في وضع الجريد ونحو الآس على القبور، قبيل باب الشهيد، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: عمدة القاري شرح صحيح البخاري - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵ھ): ۸/ ۸۳- ۱۸۴، باب الجريد على القبر، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت.

(۱) تفصیلی تخریج کے لیے عنوان "قبر پر پھول اور درخت کی سبز شاخ ڈالنا" کے حواشی ملاحظہ کریں۔

(۲) وجميع ما يجمر فيه الميت ثلاث: عند خروج روحه لإزالة الرائحة الكريهة وعند غسله وعند تكفينه، ولا يجمر خلفه ولا في القبر؛ لما روي: لا تتبعوا الجنازة بصوت ولا نار. (فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بـ 'ابن الهمام' (م: ۸۶۱ھ): ۲/ ۱۰۸، باب الجنائز، فصل في الغسل، ط: دار الفكر ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱ھ) ص: ۵۷۹، =

پھول [ہری ٹہنی] کی گنجائش ہے، بہتر نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] مخصوص قبرستان میں دوسروں کو حقِ تدفین دینا اور قبرستان کو ہموار کرنا

۱۲۲۲- سوال: (۱) ہمارے یہاں "قاضی واڑ- بلساڑ" میں ایک کھلی زمین ہے، جس کا استعمال رجسٹر نمبر بی ۳۳۳، تاریخ ۹-۷-۱-۲۴ء کے طریقے پر ہوتا ہے، یہ قبرستان صرف بعض قبیلوں کے ورثاء کے لیے ہے؛ لیکن ہماری "قاضی سنی جماعت" نے اتفاق رائے سے کچھ دوسرے لوگوں کو اس قبرستان میں تدفین کا حق دے دیا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ آئندہ جو شخص قبرستان کے خلاف کوئی کاروائی کرے اور یہ بات ثابت ہو جائے، تو کیا ایسے شخص کو حقِ تدفین سے محروم کیا جا سکتا ہے؟

(۲) قبرستان کی حالت ناگفتہ بہ ہے، اب ہم اس کے اردگرد پکی دیوار بنانا چاہتے ہیں، بعض حصوں میں مٹی کے بیٹھ جانے کی وجہ سے زمین ناہموار ہوگئی ہے، گویا اس کی زمین ہموار کرنا ضروری ہے، قبرستان میں کچھ قبریں پکی ہیں، جو بہت پرانی ہے، تو اس کو شہید کرنے کے بعد زمین کو ہموار کر کے اس کا لیول درست کر سکتے ہیں؟ باہر سے نئی مٹی لا کر پورے قبرستان میں پھیلا سکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) قبرستان اور ہماری جماعت کے تحت تعلیم الدین نامی مدرسے کی زمین خریدنے یا اس پر تعمیری کام کرنے کے لیے کون سی رقم استعمال کر سکتے ہیں؟

(۴) حرام کی کمائی کوئی راضی خوشی سے دے، تو کیا اس کو استعمال کر سکتے ہیں؟ یا اس کے جائز ہونے کے لیے کوئی حیلہ کرنا پڑے گا؟ برائے کرم جواب مرحمت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

= كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆البناية شرح الهداية - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۳/ ۲۰۳، باب الجنائز، فصل في التكفين، ما يجزئ في الكفن بالنسبة للمرأة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۶۱، كتاب الصلاة، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، الفصل الثالث في التكفين، ط: دار الفكر - بيروت☆ البحر الرائق: ۲/ ۱۹۱، كتاب الجنائز، تكفين الميت، ط: دار الكتاب الإسلامي☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۹۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) و قال العيني - رحمه الله تعالى -: إن إلقاء الرياحين ليس بشيء. (فيض الباري: ۲/ ۳۸۹، كتاب الجنائز، باب الجريد على القبر، ط: خضر راہ بک ڈپو - دیوبند)

الجواب حامداومصلیاً:

(۱) اسلام اتحادواتفاق اور صلہ رحمی کی تعلیم دیتا ہے۔[۱]

جہالت کے شیوع اور معاشرتی نظام کے خراب ہونے کی وجہ سے لڑائی جھگڑے تو ہوتے رہیں گے، اگر آپ قبرستان سے ان کے حق تدفین کوختم کریں گے، تو فتنہ وفساد برپا ہوگا اور آپ کو عدالت اور کچہری کے چکر کاٹنے پڑیں گے؛ اس لیے عفوودرگزر کرنا بہتر ہے اور اس طرح کی کاروائی سے دور رہنا ہی دانش مندی کی علامت ہے۔[۲]

ہاں البتہ اگر کوئی ایسا کام کرے، جس سے وقف کی ملکیت ضائع ہورہی ہو، تو متولی حضرات کو ان کا حق تدفین ختم کرنے کی اجازت ہے، بہ شرطیکہ آپ کے قانونی دفعات میں سہولت کے ساتھ اس طرح کی کارروائی کی گنجائش ہو۔[۳]

---

(۱) عن أبي هريرة - رضي الله عنه - أن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: "المؤمن مألف ولا خير فيمن لا يألف ولا يؤلف". رواه أحمد، والبيهقي في "شعب الإيمان". ـــــــــ قال الملا علي القاري: لأن التألف سبب الاعتصام بالله وبحبله وبه يحصل الاجتماع بين المسلمين، وبضده يحصل التفرقة بهم وهو بتوفيق الله وتأليفه، وإليه أشار تعالى بقوله: {واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرقوا واذكروا نعمة الله عليكم إذ كنتم أعداء فألف بين قلوبكم فأصبحتم بنعمته إخوانا} [آل عمران: ۱۰۳]. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۸/۳۱۲۹، رقم الحديث: ۴۹۹۵، كتاب الآداب، باب الشفقة والرحمة على الخلق، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) عن عائشة، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "ألا أدلكم على كرائم الأخلاق في الدنيا والآخرة؟ أن تصل من قطعك، وتعطي من حرمك، وتجاوز عمن ظلمك". (شعب الإيمان - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۱۰/۱۸-۳۱۷، رقم الحديث: ۷۷۲۵،۷۷۲۶، حسن الخلق، فصل في التجاوز و العفو و ترك المكافاة، ط: مكتبة الرشد للنشر و التوزيع بالرياض بالتعاون مع الدار السلفية بومباي بالهند)

(۳) كثير بن عبد الله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي: ۱/۲۵۱، رقم الحديث: ۱۳۵۲، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، ط: ديوبند ☆ سنن أبي داود: ۲/۵۰۶، رقم الحديث: ۳۵۹۴، كتاب الأقضية، باب في الصلح، ط: ديوبند ☆ ورواه البخاري تعليقا تحت باب أجر السمسرة، ج: ۱ ص: ۳۰۳، ط: ديوبند)

أرض لأهل قرية جعلوها مقبرة وأقبروا فيها ثم إن واحدا من أهل القرية بنى فيها بناء لوضع اللبن وآلات القبر =

(۴) قبرستان کی سطح کو برابر کرنا اوراس کے گڈھے کو پر کرنا ثواب کا کام ہے اور متولیان کی ذمہ داری ہے کہ پکی قبروں کو شہید کر کے قبرستان کی زمین کو ہموار کردے۔ البتہ کام کرتے وقت قبروں کے اوپر چلنا میت کی بے حرمتی کا سبب ہے۔ (۴) رسول اللہ کے ارشاد گرامی سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح زندوں کو تکلیف ہوتی ہے، اسی طرح مردوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے؛ لہٰذا قبر کے اوپر انسان کا چلنا یا مشین اور گاڑیوں کا چلانا مکروہ تحریمی ہے؛ لہٰذا پہلے مشین سے مٹی ڈالی جائے، اس کے بعد مزدوروں سے کھڈے پر کروائے جائیں، باہر سے مٹی لاکر قبرستان کی زمین کو ہموار کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہے، شرط یہ ہے کہ میت کا احترام ملحوظ رہے۔ (۵)

=وأجلس فيها من يحفظ المتاع بغير رضا أهل القرية أو رضا بعضهم بذلك قالوا: إن كان في المقبرة سعة بحيث لا يحتاج إلى ذلك المكان فلا بأس به وبعد ما بنى لو احتاجوا إلى ذلك المكان رفع البناء حتى يقبر فيه. كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية-لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۲/ ۴۶۷، كتاب الوقف، الباب الثاني عشر في الرباطات والمقابر والخانات والحياض، ط: دار الفكر)

(۴) عن جابر، قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يجصص القبر، وأن يقعد عليه، وأن يبنى عليه. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۱۲، رقم الحديث: ۹۴-۹۷۰، كتاب الجنائز، باب النهي عن تجصيص القبر والبناء عليه، ط: ديوبند)

قال في الأزهار: النهي عن تجصيص القبور للكراهة، وهو يتناول البناء بذلك وتجصيص وجهه، والنهي في البناء للكراهة إن كان في ملكه، وللحرمة في المقبرة المسبلة، ويجب الهدم وإن كان مسجدا، وقال التوربشتي: يحتمل وجهين: أحدهما: البناء على القبر بالحجارة، وما يجري مجراها، والآخر: أن يضرب عليها خباء ونحوه، وكلاهما منهي لعدم الفائدة فيه. قلت: فيستفاد منه أنه إذا كانت الخيمة لفائدة مثل أن يقعد القراء تحتها فلا تكون منهية. قال ابن الهمام: واختلف في إجلاس القارئين ليقرءوا عند القبر، والمختار عدم الكراهة اهـ. ثم قال التوربشتي: ولأنه من صنيع أهل الجاهلية، أي: كانوا يظللون على الميت إلى سنة. قال: وعن ابن عمر أنه رأى فسطاطا على قبر أخيه عبد الرحمن فقال: انزعه يا غلام، وإنما يظله عمله، وقال بعض الشراح من علمائنا: ولإضاعة المال، وقد أباح السلف البناء على قبر المشايخ والعلماء والمشهورين ليزورهم الناس، ويستريحوا بالجلوس فيه اهـ. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۳/ ۱۲۱۷، رقم الحديث: ۱۶۹۷، كتاب الجنائز، باب دفن الميت، ط: دار الفكر-بيروت)

(۵) عن أبي هريرة- رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لأن يجلس أحدكم على جمرة فتحرق ثيابه، فتخلص إلى جلده، خير له من أن يجلس على قبر. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۱۲، رقم الحديث: ۹۶-۹۷۱، كتاب الجنائز، باب النهي عن تجصيص القبر والبناء عليه، ط: ديوبند)

عن عمرو بن حزم، قال: " رآني رسول الله صلى الله عليه وسلم على قبر فقال: انزل عن القبر، لا تؤذ صاحب =

(۳) موجودہ دور میں نئی تعمیر کرنا، دیوار وغیرہ بنانا جس سے قبرستان کی حفاظت ہو جائے، بہت ضروری ہے۔[۶]

(۴) شریعت کی رو سے جو پیسے حلال ہوں، ان کا استعمال کرنا جائز ہے۔ حرام - یعنی کسی کو دھوکا دیا یا جھوٹ بول کر سامان بیچا، یا اعلیٰ قسم کا مال دکھا کر ادنیٰ مال دیا - کے پیسے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔[۷] اگر سود کے پیسے ہیں، تو بغیر نیت ثواب کے اس کو رفاہ عام کے کاموں میں استعمال کرنا جائز ہے، سرکاری قانون کی خلاف ورزی کرنا اور ٹیکس کی چوری کرنا سرکاری چوری ہے، عزت کے پامال ہونے کا خطرہ ہے؛ لہٰذا اس سے بچنا ضروری ہے۔[۸] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

=القبر، فلا يؤذيك. (شرح معاني الآثار - أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة بن عبد الملك بن سلمة الأزدي الحجري المصري المعروف بـ'الطحاوي' (م:۳۲۱هـ):۱/۵۱۵، رقم الحديث:۲۹۴۴، كتاب الجنائز، باب الجلوس على القبور، ت:محمد زهري النجار - محمد سيد جاد الحق، ط: عالم الكتب☆المستدرك على الصحيحين - أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله بن محمد بن حمدويه بن نُعيم، الضبي الطهماني النيسابوري المعروف بـ'ابن البيع' (م:۴۰۵هـ):۳/۲۸۱، رقم الحديث:۴۵۰۲، كتاب معرفة الصحابة، ذكر عمارة بن حزم الأنصاري رضي الله عنه، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۶) قال في الشرح: وقد اعتاد أهل مصر وضع الأحجار حفظا للقبور عن الإندارس والنبش ولا بأس به. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱هـ) ص:۶۱۱، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها ودفنها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

واليوم اعتادوا التسنيم باللبن صيانة للقبر عن النبش، ورأوا ذلك حسنا. وقال - صلى الله عليه وسلم - ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۳۷، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

(۷) عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مر على صبرة طعام فأدخل يده فيها، فنالت أصابعه بللا فقال: ما هذا يا صاحب الطعام؟ قال أصابته السماء يا رسول الله، قال: أفلا جعلته فوق الطعام كي يراه الناس، من غش فليس مني. (الصحيح لمسلم: ۱/۷۰، رقم الحديث: ۱۰۲، كتاب الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: من غشنا فليس منا، ط: ديوبند)

(۸) إنما يكفر إذا تصدق بالحرام القطعي. (الدر المختار) ———— قال ابن عابدين: (قوله: إذا تصدق بالحرام القطعي) أي مع رجاء الثواب الناشئ عن استحلاله كما مر فافهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۹۲، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، مطلب في التصدق من المال الحرام، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲۴] کیا بڑے قبرستان میں تدفین کی زیادہ فضیلت ہے؟

۱۲۲۳- سوال: میت کو بستی کے بڑے قبرستان میں دفنانے کے بجائے ایک خاندان کے مخصوص چھوٹے قبرستان میں دفنایا جائے، جس میں ۳۰ قبریں ہیں، تو تدفین کی فضیلت میں اس کی وجہ سے کوئی فرق آئے گا؟ کیا بڑے قبرستان میں تدفین کی کچھ زائد فضیلت ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

چھوٹے قبرستان میں بھی تدفین جائز ہے، لیکن میت کو ایسی جگہ دفن کرنا جہاں، نیک لوگوں کی قبریں ہوں، افضل ہے، اگر چھوٹے قبرستان میں نیک لوگ مدفون ہیں، تو وہاں دفن کرنا اولیٰ ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔ (عالمگیری: ۱/۱۶۶)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] باہر سے مٹی لاکر قبر پر ڈالنا، تاکہ قبر تازہ معلوم ہو

۱۲۲۴- سوال: ایک شخص کے انتقال کو دو-تین سال ہوئے، ہم اُن کی قبر کو ٹھیک ٹھاک کرنے کے لیے قبرستان سے باہر کی مٹی لاکر ڈالا کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر تازہ ہے، کیا اس طرح کرنا درست ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً:

قبرستان کے باہر سے مٹی لاکر قبر پر ڈالنا- جس سے رشتہ داروں کو یاد رہے اور اُن کے قریب دوسرے رشتہ داروں کو دفن کیا جاسکے- جائز ہے۔ (عالم گیری)[۲]

---

[۱] والأفضل الدفن في المقبرة التي فيها قبور الصالحين. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۱/۱۶۶، كتاب الصلاة، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر و الدفن و النقل من مكان إلى آخر، ط: دار الفكر)

[۲] وإذا خربت القبور فلا بأس بتطيينها، كذا في التتارخانية، وهو الأصح وعليه الفتوى، كذا في جواهر الأخلاطي. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۶۶، كتاب الصلاة، الباب الحادي و العشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر و الدفن و النقل من مكان إلى آخر، ط: دار الفكر - بيروت)

وفي النوازل لا بأس بتطيينه وفي الغياثية: وعليه الفتوى. "ولا بأس" أيضا "بالكتابة" في حجر صين به القبر ووضع "عليه لئلا يذهب الأثر" فيحترم للعلم بصاحبه "ولا يمتهن" وعن أبي يوسف أنه كره أن يكتب عليه. وإذا خربت القبور فلا بأس بتطيينها لأن الرسول صلى الله عليه وسلم مر بقبر ابنه إبراهيم فرأى فيه جحرا فسده، وقال: =

البتہ قبر ایک بالشت سے بلند نہ کی جائے۔ (عالمگیری ☆ شامی: ۱/ ۸۴۰)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

[۲۶] قبر کی پوری مٹی کو ڈالنا ضروری ہے؟ قبر کی اونچائی کتنی ہونی چاہیے؟

۱۲۲۵- سوال: قبر میں سے جو مٹی نکالی جاتی ہے، سب کو قبر پر ڈالنا ضروری ہے؟ شرعاً قبر کی اونچائی کتنی ہونی چاہیے؟

الجواب حامداو مصلیا:

پوری مٹی کا ڈالنا ضروری نہیں ہے، ایک بالشت یا اس سے کچھ بلند زمین سے اونچی کرنا چاہیے۔ (طحطاوی: ص: ۳۳۶)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

="من عمل عملا فليتقنه". (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح -حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹هـ) ص: ۲۲۶، كتاب الصلاة، أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ط: المكتبة العصرية)

[۱] وتكره الزيادة عليه، من التراب لأنه بمنزلة البناء. (الدر المختار)———— قال ابن عابدين: (قوله لأنه بمنزلة البناء) كذا في البدائع. وظاهره أن الكراهة تحريمية، وهو مقتضى النهي المذكور، لكن نظر صاحب الحلية في هذا التعليل، وقال: وروي عن محمد أنه لا بأس بذلك، ويؤيده ما روى الشافعي وغيره عن جعفر بن محمد عن أبيه، أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - رش على قبر ابنه إبراهيم، ووضع عليه حصباء. وهو مرسل صحيح، فتحمل الكراهة على الزيادة الفاحشة، وعدمها على القليلة المبلغة له مقدار شبر أو ما فوقه قليل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۶، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر -بيروت)

[۲] عن جابر بن عبد الله، أن النبي -صلى الله عليه وسلم- ألحد ونصب عليه اللبن نصبا، ورفع قبره من الأرض نحوا من شبر. (الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان -محمد بن حبان بن أحمد بن حبان بن معاذ بن مَعْبدَ، التميمي، أبو حاتم، الدارمي، البستي (م: ۳۵۴هـ): ۱۴/ ۶۰۲، رقم الحديث: ۶۶۳۵، باب وفاته صلى الله عليه وسلم، ذكر وصف قبر المصطفى صلى الله عليه وسلم وقدر ارتفاعه من الأرض، ترتيب: الأمير علاء الدين علي بن بلبان الفارسي (م: ۷۳۹هـ)، ت: شعيب الأرنؤوط، ط: مؤسسة الرسالة- بيروت)

"ويسنم القبر" ... ويجعله مرتفعا عن الأرض قدر شبر أو أكثر بقليل. (مراقي)———— وقال الطحطاوي: (م: ۱۲۳۱هـ) قوله: "ويسنم القبر" ندبا وقيل وجوبا والأول أولى وهو أن يرفع غير مسطح كذا في المغرب ... وقوله قدر شبر هو ظاهر الرواية، وقيل قدر أربع أصابع، وتباح الزيادة على قدر شبر في رواية كما في القهستاني. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ص: ۶۱۱، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، فصل في حملها و دفنها، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ فتح القدير: ۲/ ۱۳۷، كتاب الصلاة، باب الجنائز، فصل في الدفن، ط: دار الفكر -بيروت)

[۲۷] قبر پر پانی چھڑکنا

۱۲۲۶- سوال: قبر کو بند کرنے کے بعد اس پر پانی چھڑکنے کا کیا سبب ہے؟ اگر پانی نہ ڈالا جائے تو کوئی حرج تو نہیں ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

پانی چھڑکنا مستحب ہے، مقصد یہ ہے کہ قبر کی مٹی جم جائے، نیز پانی رحمت ہے، اس میں نیک فالی ہے، اللہ تعالیٰ میت کے اوپر رحمت کی بارش برساتے ہیں۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) عن جعفر بن محمد، عن أبيه: أن النبي -صلى الله عليه وسلم- رش على قبر ابنه إبراهيم ووضع عليه حصباء. (الرش تفريق الماء والحصباء: الحصى ومعلوم أن إبراهيم مات طفلا لا وزر عليه وإنما يفعل ذلك الرسول تعليما لنا. (مسند الإمام الشافعي (م: ۲۰۴ھ): ۱/ ۲۱۵، رقم الحديث: ۵۹۹، الباب الثالث والعشرون في صلاة الجنائز وأحكامها، ترتيب: محمد عابد السندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆المراسيل- أبو داود سليمان بن الأشعث بن إسحاق الأزدي السجستاني (م: ۲۷۵ھ) ص: ۳۰۴، رقم الحديث: ۴۲۴، ما جاء في الدفن، ت: شعيب الأرناؤوط، ط: مؤسسة الرسالة- بيروت ☆المعجم الأوسط- سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۶/ ۱۸۷، رقم الحديث: ۶۱۴۶، باب الميم، من اسمه: محمد، ت: طارق بن عوض الله بن محمد، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين - القاهرة ☆السنن الكبرى- أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸ھ): ۳/ ۵۷۷، رقم الحديث: ۶۷۴۲، كتاب الجنائز، باب رش الماء على القبر ووضع الحصباء عليه، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆معرفة السنن والآثار- أبو بكر البيهقي: ۵/ ۳۲۹، رقم الحديث: ۷۷۲۲، كتاب الجنائز، باب ما يقال إذا أدخل الميت قبره، ت: عبد المعطي أمين قلعجي، ط: جامعة الدراسات الإسلامية، كراتشي- باكستان ☆شرح السنة- محيي السنة، أبو محمد الحسين بن مسعود بن محمد بن الفراء البغوي الشافعي (م: ۵۱۶ھ): ۵/ ۴۰۱، رقم الحديث: ۱۵۱۵، كتاب الجنائز، باب: بعد باب كيف يؤخذ الميت من شفير القبر، ت: شعيب الأرنؤوط- محمد زهير الشاويش، ط: المكتب الإسلامي- دمشق)

(ولا بأس برش الماء عليه) حفظا لترابه عن الاندراس. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ولا بأس برش الماء عليه) بل ينبغي أن يندب؛ لأنه - صلى الله عليه وسلم - فعله بقبر سعد، كما رواه ابن ماجه، وبقبر ولده إبراهيم، كما رواه أبو داود في مراسيله، وأمر به في قبر عثمان بن مظعون، كما رواه البزار، فانتفى ما عن أبي يوسف من كراهته، لأنه يشبه التطيين حلية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۷، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲۸] میّت کی قبر کی لمبائی اور چوڑائی کی کوئی مقدار متعین ہے؟

۱۲۲۷- سوال: میّت کی قبر کی لمبائی اور چوڑائی کے لیے کوئی ناپ [مقدار] متعین ہے یا نہیں؟ اگر ناپ [مقدار] متعین نہ ہو، تو میّت کو قبر میں سُلانے کے بعد [دیوار سے] لمبائی میں کم سے کم کتنی مقدار کا فاصلہ رکھنا چاہیے؟ اور چوڑائی میں کتنی مقدار؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قبر کی لمبائی اور چوڑائی کی کوئی حد متعین نہیں ہے، میّت کی لمبائی اور چوڑائی کے مطابق قبر کھودی جائے، ہر آدمی کے قد کے مطابق ہونا چاہیے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] میت کے چوبی صندوق میں لوہے کی کیل لگانا

۱۲۲۸- سوال: ہمارے یہاں یعنی ''سینٹ ڈینس'' میں میت کو ایک چوبی بکس میں دفنایا جاتا ہے۔ بکس (صندوق) کے چاروں طرف چوبی تختے ہوتے ہیں اور بیچ میں خالی ہوتا ہے۔ مردے کو دفنایا جائے، تو اس کا جسم زمین سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ اور بکس رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں قبرستان کے بعض حصوں میں ریت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صندوق بنانے کے لیے اس میں کیلیں استعمال ہوتی ہیں اور میں نے سنا ہے کہ کیلیں اندر کی طرف ہوں، تو اس میں حرج ہے، لہٰذا کیلوں کے بارے میں کیا مسئلہ ہے؟ اور کیا بغیر کیلوں کے میت کے لیے تابوت بنایا جاسکتا ہے؟ اس بارے میں ہماری شرعی رہنمائی فرمائیں کہ کیا میخوں سے قباحت لازم آتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زمین میں نمی ہو یا پانی کا حصہ ہو یا- آپ کی تحریر کے مطابق- ریت ہو، یا حکومت کی طرف سے

---

(۱) (وحفر قبره) في غير دار (مقدار نصف قامة) فإن زاد فحسن. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله مقدار نصف قامة إلخ) أو إلى حد الصدر، وإن زاد إلى مقدار قامة، فهو أحسن كما في الذخيرة، فعلم أن الأدنى نصف القامة والأعلى القامة وما بينهما، شرح المنية، وهذا حد العمق، والمقصود منه المبالغة في منع الرائحة ونبش السباع. وفي القهستاني: وطوله على قدر طول الميت، وعرضه على قدر نصف طوله. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۳۴، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر - بيروت☆حاشية الطحطاوي، ص: ۶۰۷، كتاب الصلاة، باب أحكام الجنائز، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆مجمع الأنهر: ۱/ ۱۸۶، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، سنن حمل الجنازة، ط: دار إحياء التراث العربي)

قانوناً تابوت میں دفن کرنا ضروری ہو، تو جائز ہے کہ لاش (میت) کو زمین پر رکھ کر بکس اوپر رکھ دیں۔ فتاوی عالمگیری میں لکھا ہے کہ لوہے کا تابوت بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (ج۔۱ص۔۱۶۲)[۱]

البحر الرائق شرح کنز میں بھی لکھا ہے کہ میت کے لیے لوہے کا بکس رکھنا جائز ہے۔ (ج۔۲ص۔۱۹۴)[۲]

دیگر کتب فقہ میں بھی لوہے لکڑی وغیرہ کے تابوت کے رکھنے کا جواز مذکور ہے۔[۳]

اور عورتوں کے لیے تو بغیر کسی مجبوری کے بھی تابوت رکھنا بہتر لکھا ہے؛ کیوں کہ اس کی وجہ سے قبر میں اتارنے کے وقت ہاتھ نہیں لگے گا۔[۴]

مجمع الانہر ج۔۱ص۱۸۶ پر لکھا ہے کہ ضرورت کی وجہ سے تابوت رکھنا جائز ہے؛ لہٰذا اگر کوئی لوہے

---

[۱] وحكي عن الشيخ الإمام أبي بكر محمد بن الفضل - رحمه الله تعالى - أنه جوز اتخاذ التابوت في بلادنا لرخاوة الأرض، قال: ولو اتخذ تابوت من حديد لا بأس به، لكن ينبغي أن يفرش فيه التراب ويطين الطبقة العليا مما يلي الميت، ويجعل اللبن الخفيف على يمين الميت، وعلى يساره ليصير بمنزلة اللحد. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ١٦٦/١، كتاب الصلاة، الباب الحادي والعشرون في الجنائز، الفصل السادس في القبر، ط: دار الفكر)

[۲] وقيده الإمام السرخسي بأن لا يكون الغالب على الأراضي النز والرخاوة، فإن كان فلا بأس بهما كاتخاذ تابوت من حديد لهذا. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق - زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م: ٩٧٠هـ): ٢٠٩/٢، كتاب الجنائز، الصلاة على الميت في المسجد، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۳) وكان الشيخ الإمام أبو بكر محمد بن الفضل - رحمه الله تعالى - يقول: لا بأس به في ديارنا لرخاوة الأرض وكان يجوز استعمال رفوف الخشب واتخاذ التابوت للميت حتى قالوا: لو اتخذوا تابوتا من حديد لم أر به بأسا في هذه الديار. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ٤٨٣هـ): ٦٢/٢، باب غسل الميت، ط: دار المعرفة - بيروت ☆بدائع الصنائع: ٣١٨/١، بيان وجوب الدفن، فصل في سنة الدفن، ط: دار الكتب العلمية ☆المحيط البرهاني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ٦١٦هـ): ١٩٣/٢، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆الجوهرة النيرة - أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ٨٠٠هـ): ١٠٩/١، باب الجنائز، ط: المطبعة الخيرية)

(۴) وفي المحيط: واستحسن مشايخنا اتخاذ التابوت للنساء، يعني ولو لم تكن الأرض رخوة فإنه أقرب إلى الستر والتحرز عن مسها عند الوضع في القبر. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ٢٣٥/٢، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في دفن الميت، ط: دار الفكر - بيروت)

کی کیلیں تابوت میں استعمال کرے، تو کوئی حرج اور قباحت نہیں ہے۔ اگر میت کو تابوت میں رکھ کر دفنایا جائے تو بہتر یہ ہے کہ اس کے ارد گرد ریت (مٹی) بھر دی جائے۔[1] واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] میّت کو صندوق میں رکھے بغیر دفن کرنا

۱۲۲۹- سوال: میت کو صندوق میں رکھے بغیر دفن کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرامؓ اور تمام اولیاء وعلماء کو صندوق میں رکھے بغیر ہی دفنایا گیا ہے، اس لیے سنت طریقہ بغیر صندوق میں رکھے ہی دفن کرنا ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وفي التبيين: وإن كانت الأرض رخوة فلا بأس بالشق واتخاذ التابوت، ولو من حديد، ولكن السنة أن يفترش فيه التراب. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-داماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۱۸۶/۱، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنائز، سنن حمل الجنائز، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۲) عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اللحد لنا والشق لغيرنا. (سنن أبي داود: ۴۵۸/۲، رقم الحديث: ۳۲۰۸، كتاب الجنائز، باب في اللحد، ط: ديوبند ☆سنن الترمذي: ۲۰۲/۱، رقم الحديث: ۱۰۴۵، أبواب الجنائز، باب ما جاء في قول النبي صلى الله عليه وسلم: اللحد لنا، والشق لغيرنا، ط: ديوبند☆المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي-أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳ھ): ۸۰/۴، رقم الحديث: ۲۰۰۹، كتاب الجنائز، اللحد والشق، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية- حلب ☆سنن ابن ماجه: ......، رقم الحديث: ۱۴۵۴-۱۴۵۵، كتاب الجنائز، باب ما جاء في استحباب اللحد، ط: ديوبند)

وصفة اللحد أن يحفر القبر، ثم يحفر في جانب القبلة منه حفيرة فيوضع فيه الميت وصفة الشق أن يحفر حفيرة في وسط القبر، فيوضع فيه الميت ويجعل على اللحد اللبن والقصب لما روي أنه وضع على قبر رسول الله - صلى الله عليه وسلم - طن من قصب. (بدائع الصنائع: ۳۱۸/۱، كتاب الصلاة، فصل في صلاة الجنازة، سنة الدفن، ط: دار الكتب العلمية ☆المحيط البرهاني: ۱۹۰/۲، كتاب الصلاة، الفصل الثاني والثلاثون في الجنائز، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیں عنوان: ''میت کے چوبی صندوق میں لوہے کی کیل لگانا''۔

عن أبي هريرة ، قال: جاء رجل إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: يا رسول الله ، أرأيت إن جاء رجل يريد أخذ مالي؟ قال: فلا تعطه مالك ، قال: أرأيت إن قاتلني؟ قال: قاتله، قال: أرأيت إن قتلني؟ قال: فأنت شهيد، قال: أرأيت إن قتلته؟ قال:هو في النار.

(مسلم شریف: ۱/۸۱، ایمان، حدیث نمبر: ۱۴۰-۲۲۵، ط: دیوبند)

باب الشهيد

[شہداء کا بیان]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب الشهيد

[شہداء کا بیان]

[۱] کیا گاڑیوں کے حادثے میں مرنے والے شہید ہیں؟

۱۲۳۰- سوال: ابھی ممبئی میں ہوائی جہاز کا ایک حادثہ پیش آیا تھا، جس میں بعض مسلمان بھی تھے تو کیا یہ لوگ شہید کہلائیں گے؟ اسی طرح بسوں اور گاڑیوں کے حادثے میں مرنے والے بھی شہید کہلائیں گے؟

اے وائی پٹیل مارڈ (ممبئی ۶۴)

الجواب حامداومصليا:

شہداء کی متعدد قسمیں ہیں، علامہ سیوطیؒ نے ایسے لوگوں کی تعداد، جن کو قیامت کے دن شہادت کے مرتبہ سے نوازا جائے گا، تیس (۳۰) بتلائی ہے، بعض علمائے کرام نے ان کی تعداد پچاس بتلائی ہے، ان میں سے ایک وہ شخص بھی ہے، جو حادثہ یا ایکسیڈنٹ میں مرجاتا ہے، کہ اس کو بھی شہادت کا رتبہ ملے گا؛ اس لیے جو لوگ گاڑی، بس اور ہوائی جہاز کے حادثے کا شکار ہو کر مرجاتے ہیں، ان کو بھی شہادت کا ثواب ملے گا۔ (شامی)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] . . . وإلا فالمرتث شهيد الآخرة وكذا الجنب ونحوه، ومن قصد العدو فأصاب نفسه، والغريق، والحريق والغريب، والمهدوم عليه، والمبطون والمطعون، والنفساء، والميت ليلة الجمعة، وصاحب ذات الجنب، ومن مات وهو يطلب العلم، وقد عدهم السيوطي نحو الثلاثين. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۵۲)

قال ابن عابدين: أقول: وقد نظمها العلامة الشيخ علي الأجهوري المالكي وشرحها شرحا لطيفا، وذكر نحو =

[۲] قومی فسادات میں مرنے والے مسلمان اخروی شہید ہیں

۱۲۳۱- سوال: کیا قومی فساد میں مرنے والے یا بندوق کی گولی سے اپنی جوان گنوانے والے مسلمان ''شہید'' کہلائیں گے؟ تفصیل سے بتائیں۔

الجواب حامداومصلیا:

جو مسلمان اپنی جان و مال بچانے کے لیے، مسجد و مدرسہ کی حفاظت کے لیے لڑے یا اپنے گھر کی بالکونی (Balconi) میں بیٹھا ہو اور کوئی ظالم گولی مار دے، جس کے نتیجے میں اس کا انتقال ہو جائے، تو وہ شہید ہے، قیامت کے دن اس کو شہید کا درجہ ملے گا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر سوال کیا کہ ایک آدمی میرا مال چھیننا چاہتا ہے، میں کیا کروں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: مال مت دینا، انہوں نے سوال کیا کہ اگر مال نہ دینے کی وجہ سے وہ میرے ساتھ لڑائی جھگڑا کرے اور مجھے جان سے مار ڈالنے کا ارادہ کرے، تو کیا کروں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ اس کا مقابلہ کرو۔ اس شخص نے سوال کیا کہ اگر انہوں نے مجھے قتل کر دیا، تو کیا حکم ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ ایسی صورت میں تم جنت میں جاؤ گے۔ اس نے پھر سوال کیا کہ اگر میں اس کو قتل کر دوں تو؟ رسول اللہ

=الثلاثين أيضا لكنه زاد على ما هنا: من مات بالطاعون كما مر أو بالحرق أو مرابطا . . . ومن صرع عن دابة فمات. ويحتمل أن يكون هو المراد بقوله فيما مر أو بالصرع، . . . وبذلك زادت على الأربعين، وقد عدها بعضهم أكثر من خمسين وذكرها الرحمتي منظومة فراجعه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۵۳، باب الشهيد، مطلب في تعداد الشهداء، ط: دار الفكر - بيروت)

(قوله هو من قتله أهل الحرب أو البغي أو قطاع الطريق أو وجد في المعركة وبه أثر) . . . قيد بكونه مقتولا؛ لأنه لو مات حتف أنفه أو تردى من موضع أو احترق بالنار أو مات تحت هدم أو غرق لا يكون شهيدا أي في حكم الدنيا وإلا فقد ''شهد رسول الله - صلى الله عليه وسلم - للغريق وللحريق والمبطون والغريب بأنهم شهداء'' فينالون ثواب الشهداء كذا في البدائع. (البحر الرائق: ۲/ ۲۱۱، كتاب الصلاة، باب الشهيد، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ بدائع الصنائع: ۱/ ۳۲۲، كتاب الصلاة، فصل في أحكام الشهيد، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور - جلال الدين السيوطي: ۱/ ۲۴۵، فصل فيه فوائد، ط: دار المعرفة - لبنان ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۱۸۸، كتاب الصلاة، باب الشهيد، ط: دار إحياء التراث الإسلامي)

صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ (وہ ظالم، ڈاکو، رہزن) جہنم میں جائے گا۔ (مسلم شریف حصہ اول صفحہ ۸۱)[1]

مذکورہ حدیث سے درج ذیل باتیں ثابت ہوئیں:

(۱) کسی کو ناحق مال نہ دے اور مال کی حفاظت کے لیے مزاحمت اور جھگڑا کرنا پڑے، تو اس سے دریغ نہ کرے، خواہ اس میں جان جانے کا اندیشہ ہو؛ کیوں کہ ایمان کے ساتھ جان و مال اور عزت آبرو کی حفاظت کرنا ضروری ہے، اور اس پر ثواب بھی ملے گا۔

(۲) مال کی حفاظت کرتے ہوئے کسی مسلمان کا قتل ہو جائے، تو شہید ہوگا۔

(۳) امام نوویؒ اور دیگر علماء نے لکھا ہے کہ: شہادت کا مرتبہ آخرت میں ملے گا؛ اس لیے دنیا میں اس پر شہید کے احکام جاری نہیں ہوں گے، اسے غسل دے کر کفن پہنائے۔

الغرض فساد میں مرنے والے یا کسی کے بندوق کی گولی سے ناحق مرنے والے مسلمان کو آخرت میں ان شاء اللہ شہادت کا مرتبہ حاصل ہوگا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] عن أبي هريرة، قال: جاء رجل إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: يا رسول الله، أرأيت إن جاء رجل يريد أخذ مالي؟ قال: فلا تعطه مالك، قال: أرأيت إن قاتلني؟ قال: قاتله، قال: أرأيت إن قتلني؟ قال: فأنت شهيد، قال: أرأيت إن قتلته؟ قال: هو في النار. (الصحيح لمسلم: ۱/۸۱، رقم الحديث: ۲۲۵-۱۴۰، كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من قصد أخذ مال غيره بغير حق، الخ، ط: ديوبند)

(۲) واعلم أن الشهيد ثلاثة أقسام، أحدها المقتول في حرب الكفار بسبب من أسباب القتال، فهذا له حكم الشهداء في ثواب الآخرة، وفي أحكام الدنيا، وهو أنه لا يغسل ولا يصلى عليه، والثاني شهيد في الثواب، دون أحكام الدنيا، وهو المبطون، والمطعون، وصاحب الهدم، ومن قتل دون ماله وغيرهم، ممن جاءت الأحاديث الصحيحة بتسميته شهيدا، فهذا يغسل، ويصلى عليه، وله في الآخرة ثواب الشهداء، ولا يلزم أن يكون مثل ثواب الأول، والثالث من غل في الغنيمة وشبهه ممن وردت الآثار بنفي تسميته شهيدا إذا قتل في حرب الكفار، فهذا له حكم الشهداء في الدنيا، فلا يغسل ولا يصلى عليه، وليس له ثوابهم الكامل في الآخرة، والله أعلم. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج المعروف بـ حاشية النووي على المسلم- أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م:۶۷۶هـ): ۲/۱۶۴، كتاب الإيمان، باب دليل على أن من قصد أخذ مال غيره بغير حق... وأن من قتل دون ماله فهو شهيد، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

كتاب الزكاة

عن السائب بن يزيد، أن عثمان بن عفان رضى الله عنه، كان يقول: هذا شهر زكاتكم، فمن كان عليه دين، فليؤد دينه حتى تحصل أموالكم، فتؤدوا منها الزكاة. قال محمد: وبهذا نأخذ، من كان عليه دين وله مال فليدفع دينه من ماله، فإن بقي بعد ذلك ما تجب فيه الزكاة ففيه زكاة، وتلك مائتا درهم، أو عشرون مثقالا ذهبا فصاعدا، وإن كان الذى بقي أقل من ذلك، بعد ما يدفع من ماله الدين فليست فيه الزكاة، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (موطا امام مالک، بروایۃ محمد بن الحسن الشیبانی المعروف بہ 'موطا امام محمد: ۱/ ۱۱۴، حدیث نمبر: ۳۲۳، کتاب الزکاۃ، باب: زکاۃ المال، ت: عبد الوہاب عبد اللطیف، ط: المکتبۃ العلمیۃ)

باب وجوب الزكاة

[وجوب کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب وجوب الزکاة

[وجوبِ زکاۃ کا بیان]

[۱] زکوۃ کس پر فرض ہوتی ہے اور کون سی چیز پر فرض ہوتی ہے؟

۱۲۳۲- سوال: زکوۃ کس شخص پر فرض ہوتی ہے؟ اور کون سی چیز پر فرض ہوتی ہے؟ اگر کسی شخص نے اپنی اولاد کے مستقبل کا خیال کرتے ہوئے سونے کے زیورات اُن کے لیے جمع کیے ہیں، تو اُن زیورات پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کسی شخص کے پاس اپنی حاجتِ اصلیہ سے زائد اور دین سے فارغ، بہ قدر نصاب مال ہو، تو زکوۃ واجب ہوگی۔ (۱)

کھانے، پینے کا سامان، پہننے کے کپڑے، پیشے کے آلات، سفر کے لیے سواری اور رہنے کا گھر وغیرہ

(۱) "الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول". (الهداية: ۱/ ۱۸۵، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

(وسببه) أي سبب افتراضها (ملك نصاب حولي) نسبة للحول لحولانه عليه (تام) ... (فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد) ... (و) فارغ (عن حاجته الأصلية) لأن المشغول بها كالمعدوم ... (نام ولو تقديرا) [الدر المختار على رد المحتار: ۲/ ۲۵۹ - ۲۶۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر]

حاجاتِ اصلیہ میں شمار ہوتے ہیں، ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ (۲) اور ان کے علاوہ جو زائد مال ہو یا نقدی ہو، جس کی قیمت ساڑھے سات تولہ سونا، یا ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے بہ قدر ہو جائے، تو اُس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (۳)

اگر کسی کے پاس زیورات وغیرہ اتنی ہی مقدار میں ہیں، تو اُن میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (۴)

یا سونا اور چاندی ملا کر دونوں میں سے کسی بھی ایک کا نصاب بہ اعتبار قیمت کے مکمل ہو جاتا ہو، تو اُس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (۵)

اِسی طرح مالِ تجارت اتنا ہو، جو مذکورہ نصاب تک پہنچ جائے، تو اُس میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (۶)

---

(۲) "وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة " لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية أيضا وعلى هذا كتب العلم لأهلها وآلات المحترفين لما قلنا. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ):۱/ ۹۶، كتاب الزكاة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت ☆ الاختيار لتعليل المختار - عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳هـ): ۱/ ۱۰۰، كتاب الزكاة، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي ☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۲۵۳، كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق - القاهرة ☆العناية شرح الهداية- محمد بن محمد بن محمود، أكمل الدين أبو عبد الله ابن الشيخ شمس الدين ابن الشيخ جمال الدين الرومي البابرتي (م:۷۸۶هـ): ۲/ ۱۶۴، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر ☆درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م:۸۸۵هـ) مع حاشية الشرنبلالي: ۱/ ۱۷۳، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆البحر الرائق شرح كنز الدقائق - زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۲۲۲، كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

قال العيني: (وآلات المحترفين لما قلنا) ش: إشارة إلى قوله: لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية، وآلات المحترفين مثل قدور الطباخين والصباغين وقوارير العطارين. وآلات النجارين، وظروف الأمتعة، وفي " الذخيرة" لو اشترى جوالق بعشرة آلاف درهم يؤجرها فلا زكاة فيها. (البناية شرح الهداية- أبو محمد محمود بن أحمد بن موسى بن أحمد بن حسين الغيتابى الحنفى بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۳/ ۳۰۲، كتاب الزكاة، زكاة المدين، قبيل: زكاة المال المضمار والمفقود والمغصوب، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۳-۶) أموال الزكاة أنواع ثلاثة أحدها: الأثمان المطلقة وهي الذهب والفضة، والثاني: أموال التجارة وهي العروض المعدة للتجارة، والثالث: السوائم. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود، =

بشرطیکہ اُس شخص پر قرض اتنا نہ ہو کہ جو اِس نصاب میں کمی کر دے، اگر مذکورہ مال کا مالک اتنا مقروض ہے کہ دین کی ادائیگی کے بعد اُس کے پاس نصاب کے بہ قدر مال نہیں رہتا تو اُس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ (۷)

= الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۱۶/۲، كتاب الزكاة، فصل الأثمان المطلقة وهي الذهب والفضة، ط: دار الكتب العلمية)

الزكاة واجبة في الذهب والفضة... إذا بلغت الفضة مائتي درهم والذهب عشرين مثقالا... ويضم الذهب إلى الفضة، والفضة إلى الذهب، ويكمل إحدى النصابين بالآخر عند علمائنا... يريد به أن يقوم الذهب بالدراهم و ينظر إن بلغ نصابا بالدراهم، تجب فيها الزكاة، وإلا فلا. (الفتاوى التاتار خانية: ۵۸/۳ - ۱۵۴، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في زكاة المال، ط: زكريا - ديوبند)

الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصابا من الورق والذهب كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱۷۹/۱، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر)

" ليس فيما دون مائتي درهم صدقة " لقوله عليه الصلاة والسلام " ليس فيما دون خمس أواق صدقة " والأوقية أربعون درهما " فإذا كانت مائتين وحال عليها الحول ففيها خمسة دراهم " لأنه عليه الصلاة والسلام كتب إلى معاذ رضي الله عنه " أن خذ من كل مائتي درهم خمسة دراهم ومن كل عشرين مثقالا من ذهب نصف مثقال ". (الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱۰۳/۱، باب زكاة المال، فصل في الفضة، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

" الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصابا من الورق أو الذهب " لقوله عليه الصلاة والسلام فيها " يقومها فيؤدي من كل مائتي درهم خمسة دراهم " ولأنها معدة للاستنماء بإعداد العبد فأشبه المعد بإعداد الشرع وتشترط نية التجارة ليثبت الإعداد. ثم قال: " يقومها بما هو أنفع للمساكين " احتياطا لحق الفقراء. (حوالہ سابق: ۱۰۳/۱، باب زكاة المال، فصل في العروض)

(۷) عن السائب بن يزيد، أن عثمان بن عفان رضي الله عنه، كان يقول: هذا شهر زكاتكم، فمن كان عليه دين، فليؤد دينه حتى تحصل أموالكم، فتؤدوا منها الزكاة. قال محمد: وبهذا نأخذ، من كان عليه دين وله مال فليدفع دينه من ماله، فإن بقي بعد ذلك ما تجب فيه الزكاة ففيه زكاة، وتلك مائتا درهم، أو عشرون مثقالا ذهبا فصاعدا، وإن كان الذي بقي أقل من ذلك، بعد ما يدفع من ماله الدين فليست فيه الزكاة، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (موطأ مالك برواية محمد بن الحسن الشيباني المعروف بـ 'موطأ الإمام محمد': ۱۱۴/۱، رقم الحديث: ۳۲۳، كتاب الزكاة، باب: زكاة المال، ت: عبد الوهاب عبد اللطيف، : المكتبة العلمية)

" ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكاة عليه " وقال الشافعي رحمه الله تجب لتحقق السبب وهو ملك نصاب تام ولنا أنه مشغول بحاجته الأصلية فاعتبر معدوما كظماء المستحق بالعطش وثياب البذلة والمهنة " وإن كان ماله أكثر من دينه زكى الفاضل إذا بلغ نصابا " لفراغه عن الحاجة. (الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر بن=

زکوۃ واجب ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ مالِ زکوۃ پر ایک سال مکمل ہو چکا ہو، لہٰذا مال کا مالک بننے کے بعد جب تک سال پورا نہ ہو، زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ [۸]

سونے اور چاندی کے زیورات، حاجتِ اصلیہ میں داخل نہیں ہیں؛ لہٰذا اُن زیورات کا مالک بننے کے بعد جب سال ختم ہوگا، تو اُن میں بھی زکوۃ واجب ہو جائے گی۔ [۹] اگرچہ وہ زیورات اپنی اولاد کے لیے جمع کر رکھے ہوں، یا اُن کی شادی کروانے کے لیے جمع کیے ہوں، حتیٰ کہ وہ زیورات جو عورتیں گھر میں پہنتی ہیں، اُن میں بھی زکوۃ واجب ہوگی۔ [۱۰] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۹۵، أول كتاب الزكاة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

(۸) لا خلاف في أن أصل النصاب وهو النصاب الموجود في أول الحول يشترط له الحول؛ لقول النبي - صلى الله عليه وسلم -: "لا زكاة في مال حتى يحول عليه الحول"؛ ولأن كون المال ناميا شرط وجوب الزكاة لما ذكرنا، والنماء لا يحصل إلا بالاستنماء، ولا بد لذلك من مدة، وأقل مدة يستنمي المال فيها بالتجارة والإسامة عادة الحول. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۳، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية)

(۹ - ۱۰) قال - رحمه الله - (ولو تبرا أو حليا أو آنية) أي ولو كانت الفضة أو الذهب حليا أو غيره تجب فيها الزكاة، وقال الشافعي: لا تجب الزكاة في حلي النساء وخاتم الفضة للرجال؛ لما روى جابر أنه - عليه الصلاة والسلام - قال "ليس في الحلي زكاة"، ولأنه مبتذل في مباح وليس بنام اهـ فشابه ثياب البذلة.

ولنا ما رواه حسين المعلم عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، أن امرأة أتت رسول الله - صلى الله عليه وسلم - وفي يدها ابنة لها وفي يد ابنتها مسكتان غليظتان من ذهب، فقال رسول الله - صلى الله عليه وسلم - أتعطين زكاة هذا، قالت لا، قال أيسرك أن يسورك الله بهما يوم القيامة بسوارين من نار، فخلعتهما، وألقتهما إلى رسول الله - صلى الله عليه وسلم - وقالت: هما لله ولرسوله. قال النووي إسناده حسن.

وقالت عائشة - رضي الله عنها - دخلت على رسول الله - صلى الله عليه وسلم - فرأى في يدي فتخات من ورق، فقال ما هذا يا عائشة، فقلت صنعتهن أتزين لك بهن يا رسول الله فقال أتؤدين زكاتهن، قلت لا أو ما شاء الله، قال حسبك من النار. أخرجه الحاكم في المستدرك، وقال هذا حديث صحيح على شرط الشيخين، وقالت أم سلمة كنت ألبس أوضاحا من ذهب فقلت يا رسول الله أكنز هو فقال ما بلغ أن تؤدي زكاته فزكي فليس بكنز. أخرجه الحاكم في المستدرك، وقال صحيح على شرط البخاري، ورواه أبو داود أيضا، وعموم قوله تعالى: {والذين يكنزون الذهب والفضة} [التوبة: ۳۴] الآية يتناول الحلي. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۲۷۷، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

[۲] جس شخص کے پاس صرف چھ تولہ سونا ہو، اس پر زکوۃ فرض نہیں

۱۲۳۳- سوال: ایک آدمی کے پاس دس تولہ سونا ہے، اس میں دو تولے کا اس نے بیوی کو مالک بنادیا ہے اور دو تولے کا اپنے بیٹوں کو، تو کیا اس پر زکوۃ فرض ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

صورت مسئولہ میں اگر سونے کے علاوہ دوسرا کوئی مال یا نقد روپیہ اس کے پاس نہیں ہے، تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۳] جس میں فقراء کا فائدہ ہو، اس نصاب کا اعتبار ہوگا

۱۲۳۴- سوال: ایک شخص کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا ہے یا یہ دونوں چیزیں ہیں، تو اب ان کی زکوۃ کس طریقہ سے دی جائے؟ الگ سے روپیہ دیا جائے یا اس سونا چاندی کو فروخت کرکے دیا جائے؟ اور آئندہ سال میں اس سونا چاندی پر زکوۃ واجب رہے گی یا نہیں؟ اگر ساڑھے باون تولہ چاندی فروخت کی جائے تو اس کے روپیہ ۲۵۰۰/ہوتے ہیں، اسی طریقہ سے ساڑھے سات تولہ سونا بیچا جائے، تو ۱۹۰۰/روپے ہوتے ہیں، تو اس کی زکوۃ کس طرح ادا کی جائے؟

---

(۱) عن علي رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم ببعض أول هذا الحديث، قال: فإذا كانت لك مائتا درهم، وحال عليها الحول، ففيها خمسة دراهم، وليس عليك شيء - يعني - في الذهب حتى يكون لك عشرون دينارا، فإذا كان لك عشرون دينارا، وحال عليها الحول، ففيها نصف دينار، فما زاد، فبحساب ذلك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۲۱، رقم الحديث: ۱۵۷۳، كتاب الزكاة، باب في زكاة السائمة، ط: مكتبة فيصل - ديوبند)

نصاب الذهب عشرون مثقالا. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: عشرون مثقالا) فما دون ذلك لا زكاة فيه ولو كان نقصانا يسيرا يدخل بين الوزنين؛ لأنه وقع الشك في كمال النصاب فلا حكم بكماله مع الشك بحر عن البدائع. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۹۵، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الهداية: ۱/ ۱۷۸، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، ط: زكريا - ديوبند ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۷۱۷، كتاب الزكاة، مدخل، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

الجواب حامداً و مصلیاً:

چاندی یا سونا ہی دینا زکوٰۃ میں واجب نہیں۔[۱] جس دن سال پورا ہوگیا، اس وقت سونا چاندی کی جو قیمت تھی ۱۵۰۰/ یا ۱۶۰۰، اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرے، اگر سونا چاندی کا چالیس واں حصہ ادا کریں گے اور اس کی وجہ سے آئندہ سال کے لیے چاندی نصاب سے کم ہوجائے گی تو چاندی کے تولہ جتنے ہوں گے وہ، اور جس قدر سونا ہوگا، اس کی قیمت لگا کر چاندی کا تولہ بنائیں گے اور مجموعہ نصاب کو پہنچے گا، تو اس کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، مثلاً چار تولہ چاندی، اور دو تولہ سونا ہو اور دو تولہ سونا کی قیمت ۵۰ تولہ چاندی کے بقدر ہو تب بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؛ کیوں کہ اس صورت میں وہ گویا کہ ۵۴ تولہ چاندی کا مالک ہے۔

سونا چاندی دونوں میں سے کوئی انفراداً مقررہ نصاب کو نہ پہنچے، تو فقراء کا نفع جس میں ہو، اس سے بدلا جائے گا، سونا گراں ہے؛ لہٰذا سونا کو چاندی میں تبدیل کیا جائے گا، یعنی سونے کی قیمت لگا کر چاندی سے بدلنے کی صورت میں زکوٰۃ واجب ہوسکتی ہو، تو وجوب زکوٰۃ کا حکم لگایا جائے گا۔ (شامی، عالم گیری)[۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) "ویجوز دفع القیم في الزکاۃ" عندنا وکذا في الکفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر. (الهدایة: ۱/ ۱۹۲، کتاب الزکاۃ، فصل في الحیل، ط: مکتبہ یاسر ندیم اینڈ کمپنی دیوبند☆ الفتاوی الهندیة: ۱/ ۱۸۱، کتاب الزکاۃ، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفکر)

عن علي رضي الله عنه، عن النبي صلی الله علیه وسلم ببعض أول هذا الحدیث، قال: فإذا کانت لك مائتا درهم، وحال علیها الحول، ففیها خمسة دراهم، ولیس علیك شيء - یعني - في الذهب حتی یکون لك عشرون دینارا، فإذا کان لك عشرون دینارا، وحال علیها الحول، ففیها نصف دینار، فما زاد، فبحساب ذلك، قال: فلا أدري أعلي یقول: فبحساب ذلك، أو رفعه إلی النبي صلی الله علیه وسلم، ولیس في مال زکاۃ حتی یحول علیه الحول. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۲۱، رقم الحدیث: ۱۵۷۳، کتاب الزکاۃ، باب في زکاۃ السائمة، ط: فیصل - دیوبند)

نصاب الذهب عشرون مثقالا. (الدر مع الرد: ۲/ ۲۹۵، کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ المال، ط: دار الفکر)

وفي کل عشرین مثقالا نصف مثقالا. (الفتاوی التاتارخانیة: ۳/ ۱۵۵، کتاب الزکاۃ، الفصل الثاني في زکاۃ المال، ط: زکریا - دیوبند)

[۲] وفي (وقیمة العرض) للتجارة (تضم إلی الثمنین) لأن الکل للتجارة وضعا وجعلا (و) یضم (الذهب إلی الفضة) وعکسه بجامع الثمنیة (قیمة). (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدین: (قوله ویضم إلخ) أي عند الاجتماع . . . وفي البدائع أیضا أن ما ذکر من وجوب الضم إذا لم یکن کل واحد منهما نصابا بأن کان أقل، فلو کان کل منها نصابا تاما بدون زیادة لا یجب الضم؛ بل ینبغي أن یؤدي من کل واحد زکاته، فلو ضم حتی یؤدي کله من =

[۴] استعمالی رکشے پر زکوۃ کا حکم

۱۲۳۵-سوال: ایک شخص اپنے پاس جمع رقم کی زکوۃ ادا کیا کرتا تھا، اب اس نے اس رقم سے رکشہ خرید لیا ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ اب اس رکشہ کی زکوۃ ادا کرنا لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر رکشہ کرایے کے لیے ہے، یعنی اسے خود چلا رہا ہے، یا کرایہ پر دے رکھا ہے، تو اس کا جو کرایہ جمع ہوگا، اس پر شرائط کے موافق زکوۃ ادا کرنی لازم ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الذهب أو الفضة فلابأس به عندنا ، ولكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء رواجا وإلا يؤد من كل منهما ربع عشره (قوله: وعكسه) وهو ضم الفضة إلى الذهب، وكذا يصح العكس في قوله وقيمة العرض تضم إلى الثمنين عند الإمام كما مر عن الزاهدي، وصرح به في المحيط أيضا... (قوله: قيمة) أي من جهة القيمة، فمن له مائة درهم وخمسة مثاقيل قيمتها مائة عليه زكاتها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۰۳، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، قبل: مطلب في وجوب الزكاة في دين المرصد، ط: دار الفكر - بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۹، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب، ط: دار الفكر☆البحر الرائق: ۲/ ۴۰۱-۴۰۰، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: زكريا - ديوبند)

(۱) (ولا في ثياب البدن) المحتاج إليها لدفع الحر والبرد ابن ملك (وأثاث المنزل ودور السكنى ونحوها) وكذا الكتب وإن لم تكن لأهلها إذا لم تنو للتجارة،... وكذلك آلات المحترفين. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وكذلك آلات المحترفين) أي سواء كانت مما لا تستهلك عينه في الانتفاع كالقدوم والمبرد أو تستهلك، لكن هذا منه ما لا يبقى أثر عينه، كصابون وجرض الغسال، ومنه ما يبقى كعصفر وزعفران لصباغ ودهن وعفص لدباغ فلا زكاة في الأولين؛ لأن ما يأخذه من الأجرة بمقابلة العمل. وفي الأخير الزكاة إذا حال عليه الحول لأن المأخوذ بمقابلة العين كما في الفتح. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۵، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر - بيروت)

(ومنها [من شرائط الزكاة] فراغ المال) عن حاجته الأصلية فليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة،... وكذا كتب العلم إن كان من أهله وآلات المحترفين كذا في السراج الوهاج هذا في الآلات التي ينتفع بنفسها، ولا يبقى أثرها في المعمول، وأما إذا كان يبقى أثرها في المعمول كما لو اشترى الصباغ عصفرا أو زعفرانا ليصبغ ثياب الناس بأجر وحال عليه الحول كان عليه الزكاة إذا بلغ نصابا، وكذا كل من ابتاع عينا ليعمل به ويبقى أثره في المعمول كالعفص والدهن لدبغ الجلد فحال عليه الحول كان عليه الزكاة، وإن لم يبق لذلك العين أثر في المعمول كالصابون والحرض لا زكاة فيه كذا في الكفاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۲، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر)=

[۵] اولاد کو ہدیہ کیے ہوئے زیورات کی زکوۃ

۱۲۳۶- سوال: ایک عورت نے اپنے زیورات، اولاد کو، بہ طور ہدیہ دے دیے، ایک لڑکا- جو شادی شدہ ہے- وہ اپنے حصہ میں آئے ہوئے زیورات کی زکوۃ نکالتا ہے، لیکن دوسرا ایک لڑکا اور ایک لڑکی - جو بالغ تو ہیں، مگر ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی ہے- اپنے حصے کی زکاۃ ادا نہیں کرتے، کیا ان کے حصے میں آئے ہوئے زیورات پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی؟ لڑکے کے حصے میں سوا چھ تولہ سونا اور لڑکی کے حصے میں چار تولہ سونا آیا ہے، ہم نے سنا ہے کہ سونے کی زکوۃ ساڑھے سات تولہ سونے پر آتی ہے، تو جب ان دونوں کے حصے میں آئے ہوئے زیورات نصاب کو نہیں پہنچے ہیں، تو زکوۃ ان پر واجب ہوگی؟ یا دونوں کے زیورات ملا کر کل سوا دس تولہ کی زکوۃ ان کی ماں پر واجب ہوگی؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

= "وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة" لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية أيضا وعلى هذا كتب العلم لأهلها وآلات المحترفين لما قلنا. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۹۶، كتاب الزكاة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت ☆ الاختيار لتعليل المختار - عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳ھ): ۱/ ۱۰۰، كتاب الزكاة، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي ☆ تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ھ): ۱/ ۲۵۳، كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق - القاهرة ☆ العناية شرح الهداية- محمد بن محمد بن محمود، أكمل الدين أبو عبد الله ابن الشيخ شمس الدين ابن الشيخ جمال الدين الرومي البابرتي (م: ۷۸۶ھ): ۲/ ۱۶۳، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵ھ) مع حاشية الشرنبلالي: ۱/ ۱۷۳، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق - زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۲/ ۲۲۲، كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

قال العيني: (وآلات المحترفين لما قلنا) ش: إشارة إلى قوله: لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية، وآلات المحترفين مثل قدور الطباخين والصباغين وقوارير العطارين، وآلات النجارين، وظروف الأمتعة، وفي "الذخيرة" لو اشترى جوالق بعشرة آلاف درهم يؤجرها فلا زكاة فيها. (البناية شرح الهداية-أبو محمد محمود بن أحمد بن موسى بن أحمد بن حسين الغيتابى الحنفى بدر الدين العيني (م: ۸۵۵ھ): ۳/ ۳۰۲، كتاب الزكاة، زكاة المدين، قبيل: زكاة المال المضمار والمفقود والمغصوب، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

الجواب حامداً ومصلياً:

سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ سونا ہے۔ (۱) اگر ماں نے اپنی اولاد کو سونے کا مالک بنا کر اس کا قبضہ بھی دے دیا ہے، تو ماں پر اب اس سونے کی زکوۃ واجب نہ ہوگی۔ (۲)

اب جس لڑکے کو سوا چھ تولہ اور لڑکی کو چار تولہ سونا دیا ہے، ان کی حالت دیکھی جائے گی، اگر ان کے پاس سال کے شروع اور آخر میں اس سونے کے ساتھ [حاجت اصلیہ سے زائد] کچھ رقم بھی موجود ہو، تو اس کو چاندی کے نصاب میں تبدیل کیا جائے گا اور اس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے بہ قدر ہو جائے، تو زکوۃ واجب ہوگی۔ (۳)

---

(۱) عن السائب بن يزيد، أن عثمان بن عفان رضي الله عنه، كان يقول: هذا شهر زكاتكم، فمن كان عليه دين، فليؤد دينه حتى تحصل أموالكم، فتؤدوا منها الزكاة. قال محمد: وبهذا نأخذ، من كان عليه دين وله مال فليدفع دينه من ماله، فإن بقي بعد ذلك ما تجب فيه الزكاة ففيه زكاة، وتلك مائتا درهم، أو عشرون مثقالا ذهبا فصاعدا، وإن كان الذي بقي أقل من ذلك، بعد ما يدفع من ماله الدين فليست فيه الزكاة، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (موطأ مالك برواية محمد بن الحسن الشيباني المعروف بـ 'موطأ الإمام محمد': ۱/ ۱۱۲، رقم الحديث: ۳۲۳، كتاب الزكاة، باب: زكاة المال، ت: عبد الوهاب عبد اللطيف، : المكتبة العلمية)

نصاب الذهب عشرون مثقالا. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: عشرون مثقالا) فما دون ذلك لا زكاة فيه ولو كان نقصانا يسيرا يدخل بين الوزنين؛ لأنه وقع الشك في كمال النصاب فلا حكم بكماله مع الشك بحر عن البدائع. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۹۵، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) اس لیے کہ جب اس نے اپنی اولاد کو قبضہ دے دیا، تو اب اس کی ملکیت میں یہ سونا نہیں رہا:

ولا يتم حكم الهبة إلا مقبوضة ويستوي فيه الأجنبي والولد إذا كان بالغا، هكذا في المحيط. والقبض الذي يتعلق به تمام الهبة وثبوت حكمها القبض بإذن المالك. (الفتاوى الهندية: ۴/ ۳۷۷، كتاب الهبة، الباب الثاني فيما يجوز من الهبة وما لا يجوز، ط: دار الفكر - بيروت☆الدر المختار مع رد المحتار: ۵/ ۶۸۸، أول كتاب الهبة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) (وقيمة العرض) للتجارة (تضم إلى الثمنين) لأن الكل للتجارة وضعا وجعلا (و) يضم (الذهب إلى الفضة) وعكسه بجامع الثمنية (قيمة). (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله ويضم إلخ) أي عند الاجتماع. أما عند انفراد أحدهما فلا تعتبر القيمة إجماعا، بدائع؛... وفي البدائع أيضا أن ما ذكر من وجوب الضم إذا لم يكن كل واحد منهما نصابا بأن كان أقل، فلو كان كل منها نصابا تاما بدون زيادة لا يجب الضم؛ بل ينبغي أن يؤدي من كل واحد زكاته، فلو ضم حتى يؤدي كله من الذهب أو الفضة فلا بأس به عندنا، ولكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء رواجا وإلا يؤد من كل منهما ربع عشره (قوله: وعكسه) وهو ضم الفضة إلى الذهب، وكذا يصح العكس=

اور اگر ماں نے اولاد کو ابھی اس سونے کا قبضہ نہیں دیا ہے، تو چوں کہ کل ملا کر سوا دس تولہ سونا اس کے پاس ہو جاتا ہے اور نصاب پورا ہو جاتا ہے، اس لیے زکوۃ ماں پر واجب ہوگی۔ اس میں پھر اگر قرض ہو تو اس کو منہا کر کے حساب کیا جائے گا۔[۱] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] اولاد کو ہدیہ کیے ہوئے زیورات کی زکوۃ کس پر واجب ہوگی؟

۱۲۳۷- سوال: باپ کے پاس پچیس تولہ سونا تھا، اس میں سے اپنے بڑے لڑکے کی شادی کے وقت نو تولہ سونا اس کو دیا، پھر دوسرے لڑکے کو چھ تولہ، پھر تیسرے لڑکے کو پانچ تولہ دیا، اور وہ سب اس پر راضی وخوش ہیں، بڑا لڑکا اور لڑکی جو بیرونِ ملک ہیں، ان کا حصہ ابھی باپ کے پاس ہی ہے، تو ایسی صورت میں سونا کی زکوۃ باپ پر واجب ہوگی؟ اگر زکاۃ باپ کے ذمہ ہے، تو یہ بھی وضاحت سامنے رہے کہ ان کے اوپر دس سے بارہ ہزار کا قرض بھی ہے۔ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ہدیہ وبخشش صحیح ہونے کے لیے قبضہ دینا ضروری ہے، اولاد عاقل بالغ ہیں؛ لہٰذا جو لڑکا اور لڑکی بیرونِ ملک ہے، ان کو یا ان کے وکیل کو جب تک مالکانہ قبضہ نہیں دیا جائے گا، ہدیہ صحیح نہ ہوگا، اور جب ہدیہ صحیح نہ ہوگا، تو اس سونا کا مالک باپ ہی رہے گا، اور اس سونے کی زکوۃ باپ پر واجب ہوگی۔

پس سال گزر جانے پر اس سونے کی قیمت لگائیں، اور جو کچھ قرض ہو اس کو منہا کریں، اس کے بعد اگر نصاب باقی رہتا ہو، تو باقی کی رقم میں سے چالیسواں حصہ نکالنا واجب ہوگا۔[۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

= في قوله وقيمة العرض تضم إلى الثمنين عند الإمام كما مر عن الزاهدي، وصرح به في المحيط أيضا، . . . (قوله: قيمة) أي من جهة القيمة، فمن له مائة درهم وخمسة مثاقيل قيمتها مائة عليه زكاتها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۰۳، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، قبل: مطلب في وجوب الزكاة في دين المرصد، ط: دار الفكر)

(۱) "الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول". (الهداية: ۱/ ۱۸۵، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

(۲) (وتتم) الهبة (بالقبض) الكامل. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: بالقبض الكامل) وكل الموهوب له رجلين بقبض الدار فقبضاها جاز خانية. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/ ۶۹۰، كتاب الهبة، ط: دار الفكر- بيروت)

"الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول". (الهداية: ۱/ ۱۸۵، =

[۷] نابالغ اولاد کو زیورات ہدیہ کرنے پر زکوٰۃ کا حکم

۱۲۳۸-سوال: ایک عورت نے حج میں جانے سے پہلے اپنے پاس موجود ۲۱ر تولہ سونے میں سے پانچ تولہ رکھ کر باقی سونا-اس مقصد سے کہ زندگی کا کیا بھروسہ، نیز اس کی زکوٰۃ نہ دینی پڑے-اپنی تین نابالغ لڑکیوں کو ہدیہ کر دیا اور اپنے رشتہ داروں کے سامنے اس کی وصیت کی اور ان کو اس پر گواہ بنایا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ عورت اپنی بچیوں کو ہدیہ کیے ہوئے زیورات خود پہن سکتی ہے یا نہیں؟ یا بچیوں سے اجازت لینا ضروری ہوگا؟ نیز اس طرح نابالغ کو ہدیہ کر دینا زکوٰۃ سے چھٹکنے (بچنے) کی اسکیم (پلان) نہیں ہے؟ اس سلسلہ میں شریعت کی رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

صورت مسئولہ میں جب زیورات بچیوں کو ہدیہ کر دیا ہے اور اس پر گواہ بنالیا ہے تو یہ ہدیہ صحیح ہے۔[۱] پھر اس کا مدار نیت پر ہے اگر ہدیہ سے بچوں کے ساتھ صلہ رحمی کی نیت ہے تو اس پر ثواب ملے گا۔[۲] اور اگر محض زکوٰۃ سے بچنے کی نیت ہے تو کوئی ثواب نہ ملے گا۔[۳]

=کتاب الزکاۃ، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

"ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكاة عليه"... "وإن كان ماله أكثر من دينه زكى الفاضل إذا بلغ نصابا" لفراغه عن الحاجة. (المصدر السابق: ۱/ ۱۸۶، كتاب الزكاة)

[۱] (وتتم) الهبة (بالقبض) الكامل. (الدر المختار مع رد المحتار: ۵/ ۶۹۰، كتاب الهبة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) علقمة بن وقاص الليثي، يقول: سمعت عمر بن الخطاب رضي الله عنه على المنبر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ مانوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها، أو إلى امرأة ينكحها، فهجرته إلى ماهاجر إليه. (صحيح البخاري: ۱/ ۲، رقم الحديث: ۱، باب بدء الوحي، كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم؟، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۴۰، رقم الحديث: ۱۵۵-۱۹۰۷، كتاب الإمارة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: "إنما الأعمال بالنية"، وأنه يدخل فيه الغزو وغيره من الأعمال، ط: ديوبند)

(۳) بلکہ ایسا کرنا مکروہ ہوگا: قال الخصاف - رحمه الله تعالى - كره بعض أصحابنا - رحمهم الله تعالى - الحيلة في إسقاط الزكاة ورخص فيها بعضهم قال الشيخ الإمام الأجل شمس الأئمة الحلواني - رحمه الله تعالى - الذي كرهها محمد بن الحسن - رحمه الله - والذي رخص فيها أبو يوسف - رحمه الله تعالى - ... ومشايخنا رحمهم الله تعالى أخذوا بقول محمد - رحمه الله تعالى - دفعا للضرر عن الفقراء. (الفتاوى الهندية: ۶/ ۳۹۱، كتاب الحيل، الفصل الثالث في مسائل الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

اور جب ہدیہ صحیح ہوگیا، تو اب ان نابالغ کے زیورات کو استعمال کرنا جائز نہ ہوگا۔[۱] وہ اجازت دیں، تب بھی جائز نہ ہوگا؛ کیوں کہ کسی پر احسان کے معاملہ میں نابالغ کی اجازت معتبر نہیں۔ (درمختار:۵/۱۵۴)[۲]

فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] جس کے پاس صرف پانچ تولہ سونا ہو، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں

۱۲۳۹- سوال: ایک عورت کے پاس صرف پانچ تولہ سونا ہے؛ چاندی، نقد رقم اور زمین وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے، تو اس عورت پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ عورت اگر اپنے نابالغ لڑکے کو اپنا پورا (پانچ تولہ) سونا ہدیہ کردے، تو وہ مال دار کہلائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

سونا اگر ساڑھے سات تولہ ہوگا، تو زکوۃ واجب ہوگی۔[۳]

اس عورت کے پاس پانچ تولہ سونا ہے، اگر نقد رقم پانچ، دس، پندرہ روپیہ بھی ہے [جو عموما ہوا ہی کرتا ہے]، تو وہ [اس نقد رقم کے عوض گویا] ایک تولہ چاندی کی مالک بن گئی، اب اس کے پاس سونا اور چاندی دونوں جمع ہوا، غریب کا نفع اس میں ہے کہ اس پانچ تولہ سونے کو چاندی کے نصاب کی جانب پھیرا جائے اور

---

(۱) ومنها [من حيل إسقاط الزكاة] أن يهبه لطفله قبل التمام بيوم. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: ومنها إلخ) لكن لا يمكنه الرجوع في هذه الهبة، لكنها للذي رحم محرم منه، نعم إن احتاج إليه فله الإنفاق منه على نفسه بالمعروف، والله أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۰۸، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، قبيل: باب العاشر في الزكاة، ط: دار الفكر)

[۲] وشرعا: (منع من نفاذ تصرف قولي) لا فعلي لأن الفعل بعد وقوعه لا يمكن رده فلا يتصور الحجر عنه. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: والحاصل أن المنع من ثبوت حكم التصرف فلا يفيد الملك بالقبض، وفيه أنه لا يشمل سوى العقود الدائرة بين النفع والضر، مع أن القول قد يلغو أصلا كطلاق الصبي، وقد يصح كطلاق العبد فالمناسب في تعريفه ما في الإيضاح بقوله: وفي اصطلاح الفقهاء عبارة عن منع مخصوص بشخص مخصوص عن تصرف مخصوص أو عن نفاذه. وتفصيله أنه منع للرقيق عن نفاذ تصرفه الفعلي الضار وإقراره بالمال في الحال، وللصغير والمجنون عن أصل التصرف القولي إن كان ضررا محضا وعن وصف نفاذه إن كان دائرا بين الضرر والنفع اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۱۴۳، أول كتاب الحجر، ط: دار الفكر - بيروت)

[۳] (نصاب الذهب عشرون مثقالا والفضة مائتا درهم كل عشرة) دراهم (وزن سبعة مثاقيل). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۹۵، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر)

دیکھا جائے، اگر اس ایک تولہ چاندی کے ساتھ کل ملاکر ساڑھے باون تولہ چاندی کو پہنچ جاتا ہے، تو اس پر زکوۃ واجب ہوجائے گی۔ [۱] اور اگر اس کے پاس صرف سونا ہی سونا ہے، نقد رقم بالکل نہیں ہے، یا رقم تو تھی، مگر ابھی اس نے اپنے پاس نہیں رہنے دی، جو بھی [رقم] اس کے پاس آتی تھی، اس کو وہ فوراً ختم کردیتی تھی، صدقہ وخیرات کردیتی تھی، تو اس پر زکوۃ فرض نہیں ہوگی۔ [۲]

چھوٹا لڑکا ہو یا بڑا؛ صرف پانچ تولہ سونا ہونے کی وجہ سے اس پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی؛ کیوں کہ وجوبِ زکاۃ کے لیے مطلوبہ نصاب موجود نہیں ہے۔ [۳]

البتہ جس کے پاس چار پانچ تولہ ہوگا، اس کے لیے سوال کرنا جائز نہیں ہوگا، اسی طریقے سے [جاننے کے باوجود] اس شخص کو زکوۃ دینا بھی جائز نہیں ہوگا [کہ یہ تعاون علی الاثم ہے۔] [۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وفي (وقيمة العرض) للتجارة (تضم إلى الثمنين) لأن الكل للتجارة وضعا وجعلا (و) يضم (الذهب إلى الفضة) وعكسه بجامع الثمنية (قيمة). (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويضم إلخ) أي عند الاجتماع. . . وفي البدائع أيضا أن ماذكر من وجوب الضم إذا لم يكن كل واحد منهما نصابا بأن كان أقل، فلو كان كل منها نصابا تاما بدون زيادة لا يجب الضم؛ بل ينبغي أن يؤدي من كل واحد زكاته، فلو ضم حتى يؤدي كله من الذهب أو الفضة فلا بأس به عندنا، ولكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء رواجا وإلا يؤد من كل منهما ربع عشره (قوله: وعكسه) وهو ضم الفضة إلى الذهب، وكذا يصح العكس في قوله وقيمة العرض تضم إلى الثمنين عند الإمام كما مر عن الزاهدي، وصرح به في المحيط أيضا . . . (قوله: قيمة) أي من جهة القيمة، فمن له مائة درهم وخمسة مثاقيل قيمتها مائة عليه زكاتها. (رد المحتار علي الدر المختار: ۲/ ۳۰۳، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، قبل: مطلب في وجوب الزكاة في دين المرصد، ط: دار الفكر - بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۴۰۱- ۴۰۰، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) پچھلے صفحے کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) عن علي رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم ببعض أول هذا الحديث، قال: فإذا كانت لك مائتا درهم، وحال عليها الحول، ففيها خمسة دراهم، وليس عليك شيء - يعني - في الذهب حتى يكون لك عشرون دينارا، فإذا كان لك عشرون دينارا، وحال عليها الحول، ففيها نصف دينار، فما زاد، فبحساب ذلك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۲۱، رقم الحديث: ۱۵۷۳، كتاب الزكاة، باب في زكاة السائمة، ط: مكتبة فيصل ديوبند)

(۴) مطلب یہ کہ کمال نصاب نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ زکوۃ واجب نہ ہوگی، تاہم جب اس کے پاس پانچ تولہ سونا موجود ہے، جو یوں ہی پڑا ہوا ہے، جس کی قیمت نصاب چاندی کو پہنچ جاتی ہے، تو اس کے لیے سوال کرنا جائز نہیں ہوگا، ممنوع ہوگا، اگر وہ سوال کرے، تو گنہ گار ہوگا، اور اس کے مطالبے پر کوئی اسے (اس کی حالت کو جاننے کے باجود) زکاۃ دے، تو گویا اس کے ناجائز=

[۹] شادی میں بہو کو دیے گئے زیورات – جو عرصہ تک ساس کے قبضہ میں تھے – کی زکوۃ کا حکم

۱۲۴۰ – سوال: شادی کے موقع سے مجھے جو زیورات چڑھائے [دیے] گئے تھے، وہ آج تک

= مطالبہ – جو کہ ممنوع ہے اور گناہ کے زمرے میں آتا ہے – پر تعاون کرنا ہے، جو جائز نہیں؛ کیوں کہ منع کر دینے اور نہ دینے کی صورت میں اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ وہ بلا ضرورت مانگنے سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لے، جب کہ دے دینے کی صورت میں اس کی عادت کو بگاڑتا ہے:

عن قبيصة بن مخارق الهلالي، قال: تحملت حمالة، فأتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم أسأله فيها، فقال: أقم حتى تأتينا الصدقة، فنأمر لك بها، قال: ثم قال: "يا قبيصة إن المسألة لا تحل إلا لأحد ثلاثة رجل، تحمل حمالة، فحلت له المسألة حتى يصيبها، ثم يمسك، ورجل أصابته جائحة اجتاحت ماله، فحلت له المسألة حتى يصيب قواما من عيش - أو قال سدادا من عيش - ورجل أصابته فاقة حتى يقوم ثلاثة من ذوي الحجا من قومه: لقد أصابت فلانا فاقة، فحلت له المسألة حتى يصيب قواما من عيش - أو قال سدادا من عيش - فما سواهن من المسألة يا قبيصة سحتا يأكلها صاحبها سحتا". (الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۳۴، رقم الحديث: ۱۰۹-۱۰۴۴، كتاب الزكاة، باب من تحل له المسألة، ط: دار الفكر - بيروت)

في شرح ابن الملك قالوا: هذا بحث سؤال الزكاة، وأما سؤال صدقة التطوع فمن لا يقدر على كسب؛ لكونه زمنا أو ذا علة أخرى، جاز له السؤال بقدر قوت يومه ولا يدخر، وإن كان قادرا عليه فتركه لاشتغال العلم جازت له الزكاة وصدقة التطوع، فإن تركه لاشتغال صلاة التطوع وصيامه، لا تجوز له الزكاة، ويكره له صدقة التطوع، فإن جلس واحد أو جماعة في بقعة واشتغلوا بالطاعة ورياضة الأنفس وتصفية القلوب يستحب لواحد منهم أن يسأل صدقة التطوع وكسرات الخبز لهم واللباس لأجلهم. (مرقاة المفاتيح: ۴/ ۱۳۰۷-۱۳۰۸، رقم: ۱۸۳۶، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له المسألة ومن تحل له، ط: دار الفكر - بيروت)

(ولا) يحل أن (يسأل) من القوت (من له قوت يومه) بالفعل أو بالقوة كالصحيح المكتسب ويأثم معطيه إن علم بحاله لإعانته على المحرم. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويأثم معطيه إلخ) قال الأكمل في شرح المشارق. ـــــــ وأما الدفع إلى مثل هذا السائل عالما بحاله فحكمه في القياس الإثم به؛ لأنه إعانة على الحرام لكنه يجعل هبة وبالهبة للغني أو لمن لا يكون محتاجا إليه لا يكون آثما اهـ. ـــــــ أي؛ لأن الصدقة على الغني هبة كما أن الهبة للفقير صدقة لكن فيه أن المراد بالغني من يملك نصابا أما الغني بقوت يومه فلا تكون الصدقة عليه هبة بل صدقة فما فر منه وقع فيه أفاده في النهر. . . . ـــــــ قال المقدسي في شرحه: وأنت خبير بأن الظاهر أن مرادهم أن الدفع إلى مثل هذا يدعو إلى السؤال على الوجه المذكور وبالمنع ربما يتوب عن مثل ذلك فليتأمل اهـ (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۵، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، قبيل: فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

میری ساس کے قبضہ میں تھے، ان دنوں ان کی طبیعت ناساز ہے، جس کی وجہ سے بقرعید کے بعد انہوں نے وہ زیورات میرے سپرد کیے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان زیورات کی گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ میرے ذمہ آئے گی یا نہیں، اس سلسلہ میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ہمارے یہاں سسرال والوں کی طرف سے زیورات صرف عاریتاً (استعمال کے لیے) دیے جانے کا رواج ہے، اس میں بہو کو مالک نہیں بنایا جاتا ہے، لہٰذا گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ آپ کے ذمہ نہیں ہے۔

البتہ شادی کے وقت اگر اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ وہ آپ کو بہ طور ہدیہ دیے گئے ہیں، اور وہ نصاب کے بہ قدر ہیں، تو ان کی زکاۃ آپ کے ذمے ہوگی، جب کہ آپ کو قبضہ دے دیا گیا ہو۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] شادی کے موقع پر لڑکی کو دیے جانے والے سونے کی زکوٰۃ کا حکم

۱۲۴۱- سوال: شادی کے موقع پر لڑکے کی جانب سے لڑکی کو سات تولہ سونا دیا گیا تھا اور لڑکی اپنے والدین کے یہاں سے پانچ تولہ سونا لے کر آئی ہے، کل بارہ تولہ سونا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس پورے سونے کا مالک کون کہلائے گا؟ اور اس پورے سونے کی زکوٰۃ کے متعلق کیا حکم ہے؟ اگر سسرال والوں کی جانب سے دیے گئے سات تولے سونے کا مالک شوہر کو قرار دیا جائے، تو پھر دونوں میں ہر ایک کے پاس ساڑھے سات تولے سے کم سونا رہے گا، تو اس صورت میں کیا زکوٰۃ فرض ہو جائے گی؟

عام طور پر رواج یہی ہے کہ شادی کے موقع پر لڑکی کو جو سونا دیا جاتا ہے، وہ صرف پہننے کے لیے، یہی

[۱] لا خلاف في أن أصل النصاب وهو النصاب الموجود في أول الحول يشترط له الحول: لقول النبي - صلى الله عليه وسلم -: "لا زكاة في مال حتى يحول عليه الحول"؛ ولأن كون المال ناميا شرط وجوب الزكاة لما ذكرنا، والنماء لا يحصل إلا بالاستنماء، ولا بد لذلك من مدة، وأقل مدة يستنمى المال فيها بالتجارة والإسامة عادة الحول. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۳، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية)

(وشرطه) أي شرط افتراض أدائها (حولان الحول) وهو في ملكه. (الدر المحتار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۷، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

"الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول". (الهداية: ۱/ ۱۸۵، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

وجہ ہے کہ شوہر اگر چاہے، تو اس کو بیچ بھی سکتا ہے اور اگر خدانہ خواستہ عورت کو طلاق ہوگئی، تو جہیز میں دی ہوئی تمام چیزیں شوہر کو واپس کرنی پڑتی ہے؛ لہٰذا اس صورت میں زکوۃ کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداو مصلیا:

شوہر کی طرف سے زیورات عورت کو صرف پہننے کے لیے ہی دیے جاتے ہیں، عورت کو مالک نہیں بنایا جاتا؛ لہٰذا مالک یا تو شوہر خود ہوگا یا اس کا باپ، جو عورت کے لیے اس کا خسر کہلائے گا، اس صورت میں جو بھی مالک ہو، اگر وہ ان زیورات سمیت مالک نصاب ہوگا، تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔[1]

لڑکی کے باپ نے اس کو جو کچھ زیورات دیے ہیں، اس کا حکم باپ کی نیت پر موقوف رہے گا۔ اگر باپ نے صرف پہننے کے لیے دیے ہیں، تو زکوۃ باپ پر واجب ہوگی اور اگر مالک بنادیا ہے، تو زکوۃ اس لڑکی پر واجب ہوگی؛ اور اگر باپ کے علاوہ کسی اور نے لڑکی کو بخشش دیا ہے، تو اس کی مالک لڑکی رہے گی۔

الغرض صورت مسئولہ میں زکوۃ کا حکم لینے والے اور دینے والے کی نیت پر موقوف رہے گا؛ البتہ بلا کسی نیت کے ہمارے یہاں جو لین دین کا رواج ہے، اس کی مالک عورت نہیں ہوگی؛ کیوں کہ وہ صرف استعمال کے لیے دیا جاتا ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (وشرطه) أي شرط افتراض أدائها (حولان الحول) وهو في ملكه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۷، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

"الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول". (الهداية: ۱/ ۱۸۵، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند☆العناية: ۱/ ۱۵۳، أول كتاب الزكاة☆البناية: ۳/ ۲۸۹، كتاب الزكاة، حكم الزكاة، وشروط وجوبها، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) سمعت عمر بن الخطاب رضي الله عنه على المنبر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها، أو إلى امرأة ينكحها، فهجرته إلى ما هاجر إليه. (صحيح البخاري: ۱/ ۲، رقم الحديث: ۱، كتاب الإيمان، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۴۰، رقم الحديث: ۱۵۵ - ۱۹۰۵، كتاب الإمارة، باب قوله - صلى الله عليه وسلم - إنما الأعمال بالنية، ط: ديوبند)

قاعدة: التعيين بالعرف كالتعيين بالنص (مج) [قواعد الفقه - محمد عميم الإحسان المجددي البركتي، ص: ۷۱، قاعدہ نمبر: ۸۸، ط: الصدف ببلشرز - كراتشي)

قاعدة: الثابت بالعرف كالثابت بالنص (سير) [حوالہ سابق ص: ۷۴، قاعدہ نمبر: ۱۰۱]

[۱] شئے موہوب میں قبضہ نہ دیا ہو، تو اس پر زکوۃ کا حکم

۱۲۴۲- سوال: کچھ رقم میرے پاس جمع ہے، اس کو میں نے اپنے لڑکے کو ہدیہ کر دیا ہے، اس سے لڑکے کا قرض ادا کرنا ہے؛ لیکن حکومتی قانون کی وجہ سے رقم میرے پاس ہے، لڑکے کو ابھی نہیں دے سکتا، اس رقم پر سال گذر گیا ہے، تو اس کی زکوۃ مجھے ادا کرنی ہوگی یا نہیں؟ لڑکے کا جو قرض ہے، اس کو ابھی نہیں بھرا جا سکتا، کیوں کہ اس رقم کا فی الحال قانونی حساب سے میرے پاس رہنا ضروری ہے۔ جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ہدیہ کے تام ہونے کے لیے اس پر [جس کو ہدیہ دیا گیا ہے، اس کا] قبضہ ضروری ہے، جب تک آپ قبضہ نہیں دیں گے، وہ رقم آپ ہی کی شمار ہوگی، اس پر سال پورا ہونے سے اس کی زکوۃ آپ پر واجب ہوگی۔ اگر اس رقم پر سال پورا ہونے سے پہلے لڑکے کا قرض اس کے ذریعہ آپ ادا کر دیں گے، تو زکوۃ واجب نہ ہوگی، اگر سال پورا ہونے کے بعد ادا کریں گے، تو اس کی زکوۃ آپ پر واجب ہوگی۔[۱]

لڑکے کا قرض آپ اس رقم سے قانون کے موجب ادا نہیں کر سکتے، تو آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ کسی سے قرض لے کر لڑکے کا قرض ادا کر دیں، پھر بعد میں اپنا قرض ادا کر دیں، جب آپ پر قرض ہوگا، تو اس کی وجہ سے آپ پر زکوۃ واجب نہ ہوگی۔[۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] ولا يتم حكم الهبة إلا مقبوضة ويستوي فيه الأجنبي والولد إذا كان بالغا، هكذا في المحيط. والقبض الذي يتعلق به تمام الهبة وثبوت حكمها القبض بإذن المالك. (الفتاوى الهندية: ۴/۳۷۷، كتاب الهبة، الباب الثاني فيما يجوز من الهبة وما لا يجوز، ط: دار الفكر - بيروت☆الدر المختار مع رد المحتار: ۵/۶۸۸، أول كتاب الهبة، ط: دار الفكر - بيروت)

(و) شرائط صحتها (في الموهوب أن يكون مقبوضا غير مشاع مميزا غير مشغول)... (وتتم) الهبة (بالقبض) الكامل. (الدر المختار مع رد المحتار: ۵/۶۹۰-۶۸۸، أول كتاب الهبة، ط: دار الفكر - بيروت☆ الفتاوى الهندية: ۴/۳۷۷، كتاب الهبة، الباب الثاني فيما يجوز من الهبة وما لا يجوز، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲] (ومنها الغارم)، وهو من لزمه دين، ولا يملك نصابا فاضلا عن دينه. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

"الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول". (الهداية: ۱/۱۸۵، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند) =

[۱۲] آدھا تولہ سونا اور پانچ سو روپے ہوں، تو زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

۱۲۴۳- سوال: ایک شخص کے پاس آدھا تولہ سونا ہے، اور نقد پانچ سو روپے ہیں، اور کسی قسم کا قرض نہیں ہے، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

فی الحال آدھا تولہ سونے کی چاندی ۵۰ رتولہ آتی ہے، اور پانچ سو روپے کی چاندی ۳۰ رتولہ آتی ہے، توکل ۸۰ رتولہ چاندی ہوگئی، [جو چاندی کے نصاب سے بھی زائد ہے] لہٰذا زکوٰۃ فرض ہوگئی۔ زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے نصاب ساڑھے سات تولہ سونا ہے یا ساڑھے باون تولہ چاندی۔[۱]

اور اگر سونا چاندی دونوں ہوں تو قیمت لگا کر کسی ایک کا نصاب پورا ہوجاتا ہو، تو زکوٰۃ فرض ہوجاتی ہے۔[۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

= (وشرطه) أي شرط افتراض أدائها (حولان الحول) وهو في ملكه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۷، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(فلا زكاة على مكاتب) لعدم الملك التام... (ومديون للعبد بقدر دينه) فيزكي الزائد إن بلغ نصابا. (الدر مع الرد: ۲/ ۲۶۳)

(۱) تجب في كل مائتي درهم خمسة دراهم، وفي كل عشرين مثقال ذهب نصف مثقال ...ثم في كل أربعين درهما درهم. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۸-۱۷۹، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، الفصل الأول في زكاة الذهب والفضة، ط: دار الفكر - بيروت)

(نصاب الذهب عشرون مثقالا والفضة مائتا درهم كل عشرة) دراهم (وزن سبعة مثاقيل). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۹۵، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر)

(۲) وفي (وقيمة العرض) للتجارة (تضم إلى الثمنين) لأن الكل للتجارة وضعا وجعلا (و) يضم (الذهب إلى الفضة) وعكسه بجامع الثمنية (قيمة). (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله ويضم إلخ) أي عند الاجتماع.... وفي البدائع أيضا أن ما ذكر من وجوب الضم إذا لم يكن كل واحد منهما نصابا بأن كان أقل، فلو كان كل منها نصابا تاما بدون زيادة لا يجب الضم، بل ينبغي أن يؤدي من كل واحد زكاته، فلو ضم حتى يؤدي كله من الذهب أو الفضة فلا بأس به عندنا، ولكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء رواجا وإلا يؤد من كل منهما ربع عشره (قوله: وعكسه) وهو ضم الفضة إلى الذهب، وكذا يصح العكس في قوله وقيمة العرض تضم إلى الثمنين عند الإمام كما مر عن الزاهدي، وصرح به في المحيط أيضا... (قوله: قيمة) أي من جهة القيمة، فمن له مائة درهم وخمسة مثاقيل قيمتها مائة عليه زكاتها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۰۳، كتاب الزكاة، باب =

[۱۳] آدھا تولہ سونا اور تھوڑی چاندی ہو، تو زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

۱۲۴۴- سوال: ایک شخص کے پاس آدھا تولہ سونا ہے اور ۵-۶ آنہ چاندی ہے، تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

آدھا تولہ سونے کی قیمت آج کے حساب سے سات سو روپے ہوتے ہیں، سات سو روپے کی چاندی (۱۶/روپے تولہ کے حساب سے) ۴۳/ یا ۴۴/تولہ آئے گی، اس کے بعد ۴-۶ آنہ چاندی ملائیں گے، تب بھی نصاب پورا نہیں ہوگا، لہٰذا صورت مسئولہ اگر اس کے علاوہ حاجت اصلیہ سے زائد اور کوئی دوسرا مال نہ ہو، تو زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔[1] ہاں! اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کے بہ قدر [ضرورت سے زائد مال] ہو جائے، تو سال گذرنے پر زکوۃ فرض ہوتی ہے۔[2] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] سود یا زکوۃ کی رقم کا دوسری رقم کے ساتھ خلط ملط کر لینا

۱۲۴۵- سوال: (۱) بینک میں رکھی ہوئی رقم کا سود، اگر حلال رقم کے ساتھ خلط ملط (گڈمڈ)

= زكاة المال، قبل: مطلب في وجوب الزكاة في دين المرصد، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/ ۴۰۱-۴۰۰، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: زكريا - ديوبند)

(۱) " الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما، وحال عليه الحول ". (الهداية: ۱/ ۱۸۵، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

(۲) ويضم الذهب إلى الفضة، والفضة إلى الذهب ويكمل أحد النصابين بالآخر عند علمائنا رحمهم الله، لحديث بكر بن عبد الله بن الأشج أنه قال: مضت السنة في ضم الذهب إلى الفضة في باب الزكاة، ولأن الذهب والفضة إن كانا مختلفين صورة فهما متفقان معنى من حيث إنه تعلق بهما وجوب الزكاة، وهو وصف لثمنيته، فجاء تكميل أحدهما بالآخر. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۴۱، كتاب الزكاة، الفصل الثالث في بيان مال الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(و) يضم (الذهب إلى الفضة) ... والفضة إلى الذهب، ويكمل إحدى النصابين بالآخر ... وفي الينابيع: يريد به أن يقوم الذهب بالدراهم، وينظر إن بلغ نصابا بالدراهم تجب فيها الزكاة، وإلا فلا. (الفتاوى التاتارخانية: ۲/ ۱۵۸، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في زكاة المال، ط: زكريا - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۹، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۲/ ۱۰۷، كتاب الزكاة، فصل في مقدار الواجب، ط: زكريا - ديوبند)

ہو جائے، تو اس میں کوئی حرج ہے یا نہیں؟

(۲) اسی طرح زکوۃ اور قربانی کی رقم دوسری رقموں کے ساتھ خلط ملط ہو جائے، تو شرعاً اس میں کوئی حرج ونقصان ہے یا نہیں؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

کوئی حرج نہیں۔[۱]

کوئی حرج نہیں؛ البتہ جب غرباء کو ادا کریں، تو زکوۃ کی ادائیگی میں زکوۃ کی نیت کرنا ضروری ہے، مخلوط رقم کو زکوۃ کی نیت کے بغیر دینے سے زکوۃ ادا نہ ہوگی۔[۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] زکوۃ میں قرض کو منہا کیا جائے گا

۱۲۴۶- سوال: زکوۃ، جو فرض ہے، اس میں قرض کو منہا کیا جائے گا یا نہیں؟ مثلاً پانچ ہزار روپے ہوں اور تین ہزار کا قرض ہو، تو پانچ ہزار کی زکوۃ نکالنی ہوگی یا قرض منہا کر کے صرف دو ہزار کی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوۃ واجب ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ مال قرض سے فاضل ہو؛ لہٰذا صورت مسئولہ میں پانچ ہزار روپے میں تین ہزار قرض منہا کر کے باقی بچی ہوئی رقم (یعنی دو ہزار) اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کو پہنچ جاتی ہو، تو صرف اس میں زکوۃ واجب ہوگی، پوری رقم پانچ ہزار پر زکوۃ واجب نہ ہوگی۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) إن الدراهم لاتتعين بالتعيين. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۳۶۴، كتاب الوقف، مطلب في وقف الدراهم والدنانير، ط: دار الفكر)

(۲) (وشرط صحة أدائها نية مقارنة له) أي للأداء (ولو) كانت المقارنة (حكما) ... (أو مقارنة بعزل ما وجب) كله أو بعضه، ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۷-۲۶۸، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر-بيروت☆مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي: ص ۷۱۵، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية ☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۰، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر-بيروت)

(۳) "ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكاة عليه" ... "وإن كان ماله أكثر من دينه زكى الفاضل إذا بلغ نصابا" لفراغه عن الحاجة. (الهداية: ۱/ ۱۸۶، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

[۱۶] کرایہ پر دیے ہوئے مکان اور نئے تعمیر کردہ مکان میں زکوۃ کا حکم

۱۲۴۷- سوال: ہمارا ایک پرانہ مکان ہے، جس کو کرایہ پر دے رکھا ہے، اس کے کرایہ کی کچھ رقم جمع ہے، تو اس پر زکوۃ لازم ہوگی یا نہیں؟ اسی طرح ایک نیا مکان تعمیر ہو رہا ہے، جو تکمیل کے قریب ہے، اس میں ایک دوکان بھی بنائی گئی ہے، تو اس مکان پر زکوۃ آئے گی یا نہیں؟ جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوۃ سونا، چاندی، کرنسی اور مال تجارت اور چراہ گاہ میں چرنے والے جانوروں پر لازم ہوتی ہے۔ (۱)

سونے میں ساڑھے سات تولہ سونا اور چاندی میں ساڑھے باون تولہ چاندی زکوۃ کا نصاب ہے، اگر کسی کے پاس ڈیڑھ تولہ سونا اور دو تولہ چاندی ہو، لیکن دونوں کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کو پہنچ جاتی ہو، تو اس صورت میں بھی زکوۃ واجب ہوگی۔ (۲)

جو مکان یا زمین تجارت کے لیے ہو، اور ان کی قیمت چاندی یا سونے کے نصاب کے بہ قدر ہو جائے، تو اس میں زکوۃ واجب ہوگی۔ (۳)

البتہ اپنی رہائش کا مکان ہو یا کرایہ پر دے رکھا ہو، اس میں زکوۃ واجب نہ ہوگی، خواہ مکان نیا ہو یا پرانا۔ (۴) تاجر حضرات جو مکان اور بنگلوں کی تعمیر تجارت کی غرض سے کرتے ہیں، ان میں تجارت کی نیت

---

(۱) أموال الزكاة أنواع ثلاثة أحدها: الأثمان المطلقة وهي الذهب والفضة، والثاني: أموال التجارة وهي العروض المعدة للتجارة، والثالث: السوائم. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع- علاء الدين، أبو بكر بن مسعود، الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱۶/۲، كتاب الزكاة، فصل الأثمان المطلقة وهي الذهب والفضة، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) الزكاة واجبة في الذهب والفضة... إذا بلغت الفضة مائتي درهم والذهب عشرين مثقالا... ويضم الذهب إلى الفضة، والفضة إلى الذهب، ويكمل إحدى النصابين بالآخر عند علمائنا... يريد به أن يقوم الذهب بالدراهم وينظر إن بلغ نصابا بالدراهم، تجب فيها الزكاة، وإلا فلا. (الفتاوى التاتار خانية: ۵۸/۳- ۱۵۴، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في زكاة المال، ط: زكريا- ديوبند)

(۳) الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصابا من الورق والذهب كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱۷۹/۱، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر)

(۴) " وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة" لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية أيضا. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن =

ہوتی ہے؛اس لیے زکوۃ فرض ہوتی ہے۔

کرایہ پر دیے ہوئے مکان کا کرایہ جمع ہو، (جیسا کہ سوال میں ہے) اور اس جمع شدہ رقم اور مال تجارت وغیرہ ملا کر نصاب کو پہنچ جائے ،تو اس پر زکوۃ فرض ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] بہ نیتِ تجارت خریدی ہوئی زمین پر زکوۃ کا وجوب

۱۲۴۸- سوال: بکر نے ایک زمین بیس ہزار (۲۰،۰۰۰) روپئے میں اس نیت سے خریدی ہے کہ تین یا چار سال بعد جب بھی اُس زمین کی قیمت بڑھے گی، نفع کے ساتھ بیچ دوں گا، تو اس زمین کے بیچے جانے تک کے تمام سالوں کی زکوۃ اُس پر واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

ہر وہ شئے ، جو بہ غرضِ تجارت خریدی گئی ہو، اُس پر زکوۃ واجب ہوگی، لہٰذا زمین، مکان اور کار جیسی چیزیں اگر تجارت کی نیت سے خریدی جائیں، تو اُن میں ہر سال زکوۃ واجب ہوگی، اس لیے صورت مسئولہ میں بکر پر لازم ہے کہ وہ سالہائے گذشتہ کی زکوۃ ادا کرے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۹۶، كتاب الزكاة، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت ☆ الاختيار لتعليل المختار- عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳هـ): ۱/ ۱۰۰، كتاب الزكاة، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي ☆ تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۲۵۳، كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق- القاهرة ☆ العناية شرح الهداية- محمد بن محمد بن محمود، أكمل الدين أبو عبد الله ابن الشيخ شمس الدين ابن الشيخ جمال الدين الرومي البابرتي (م: ۷۸۶هـ): ۲/ ۱۶۴، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام- محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵هـ) مع حاشية الشرنبلالي: ۱/ ۱۷۳، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق- زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۲۲۲، كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۵- ۳۶۳، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۱) " الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما، وحال عليه الحول ". (الهداية: ۱/ ۱۸۵، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند ☆ حاشیہ نمبر (۲) دیکھیں)

(۲) الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصابا من الورق والذهب كذا في الهداية.=

[۱۸] سونے کے ساتھ کچھ رقم ہو، تو چاندی کے نصاب کا اعتبار کیوں کیا جاتا ہے؟

[۱۹] تین چار تولہ سونا کے ساتھ گھر میں ضروری خرچ کی رقم ہو، تو زکوٰۃ واجب ہوگی؟

۱۲۴۹،۵۰- سوال: بعد از تحیہ مسنونہ عرض این کہ حسب ذیل استفتاء کا جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

(۱) ایک آدمی کے پاس نصاب سے کم ، صرف چار پانچ تولہ سونا ہے اور ساتھ میں سودوسو روپے جمع ہیں، تو کیا یہ آدمی صاحب نصاب ہوگا اور زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی؟ واضح رہے کہ سونے کی قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے چاندی کا نصاب پورا ہو جاتا ہے، لیکن وجوب کی صورت میں سوال ہوتا ہے کہ نوٹ کا شمار چاندی میں کیسے کیا جائے، سونا میں ہونا چاہیے، اس وجہ سے کہ نوٹ رسید ہے سونے کی، تب تو سونے کا نصاب پورا نہ ہوگا اور زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہیے۔

نوٹ کی اس وقت شرعی حیثیت کیا ہے؟ براہ کرم واضح فرمائیں۔

(۲) اسی طرح ایک ملازمت پیشہ آدمی نصاب سے کم تین چار تولہ سونے کا یکم محرم کو مالک ہوا اور اسی دن اس کو پانچ سو روپے تنخواہ ملی، جو نفقہ کے لیے ہے اور مہینہ بھر میں ختم ہو جائے گی اور سونا اس کے پاس جمع رہے گا اور تنخواہ ہر ماہ ملتی رہے گی اور ختم ہوتی رہے گی اور اب آئندہ سال یکم محرم کو جس وقت تنخواہ ملے گی اور سال ختم ہوگا، اس وقت طرفین میں نصاب کامل ہو جائے گا، دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا اس صورت میں اس پر زکوٰۃ کا وجوب ہوگا؟ اور جو پیسے نفقہ کے لیے ہے، ان کا بھی شمار نصاب میں ہوگا، یا حاجت اصلیہ میں ہوگا؟ طحطاوی علی مراقی الفلاح اور شامی کی عبارتیں مختلف معلوم ہوتی ہیں؛ لہٰذا مفتی بہ قول سے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

دونوں کتاب کی عبارت حسب ذیل ہیں:

(قوله وفسره ابن ملك) أي فسر المشغول بالحاجة الأصلية ... فإذا كان معه دراهم أمسكها بنية صرفها إلى حاجته الأصلية لا تجب الزكاة فيها إذا حال الحول، وهي عنده، لكن

= (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۹، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر ☆ الهداية: ۱/ ۱۹۵، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، فصل في العروض، ط: ياسر نديم - ديوبند)

اعترضه في البحر بقوله: ويخالفه ما في المعراج في فصل زكاة العروض أن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة، وكذا في البدائع في بحث النماء التقديري. اهـ. (ردالمحتار:۲/۷)[۱]

وقوله وكالنفقة لا زكاة فيها ولو حال عليها الحول قال فيه وهو مخالف لما في المعراج والبدائع أن الزكاة تجب في النقد كيف أمسكه للنفقة أو للنماء اهـ. (طحطاوی علی مراقی الفلاح:۳۹۹)[۲]

فقط والسلام

العبد سلیمان بن اسماعیل لاجپوری کان اللہ لہ

۳ ربیع صفر المظفر ۱۴۰۴ھ چہارشنبہ

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) نوٹ حوالہ ہے، گاہک کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اس پر جتنے عدد لکھے گئے ہیں، ان کا عوض آپ کو مل جائے گا۔ اس نوٹ سے سونا اور چاندی؛ دونوں خریدا جا سکتا ہے۔[۳] لہٰذا روپیہ، سو دو سو، جو بھی ہو، ان سے چاندی کا حساب لگایا جائے گا، اور فقہاء نے تصریح کی ہے کہ سونا چاندی کا نصاب کامل نہ ہو، تو اس صورت میں ''انفع للفقراء'' کے تقاضے کے مطابق مالیت جس نصاب کو بھی پہنچ جائے، زکوۃ واجب ہو جائے گی؛ لہٰذا صورت مسئولہ (پانچ تولہ سونا اور سو دو سو روپے) میں چاندی کا نصاب متحقق ہو جاتا ہے؛ اس لیے زکوۃ فرض ہو جائے گی۔ (عالم گیری:۱/۱۴۳)[۴]

(۲) اس مسئلے میں پائے جانے والے تعارض کو دور کرنے کے لیے علامہ شامیؒ نے اپنی عبارت "فالأولى التوفيق بحمل ما في البدائع وغيرها، على . . . الخ" سے جو تطبیق دی ہے، وہ قابل عمل ہونی چاہیے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مثلاً: کلیم محرم کو دس ہزار روپے کاشت کار یہ سمجھ کر رکھے ہوا ہے کہ اس میں جس

---

[۱] رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۶۲، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر - بيروت.

[۲] حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱ هـ) ص: ۷۱۵، كتاب الزكاة، مدخل، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت.

(۳) جن علماء نے کاغذی نوٹ کو قرض کی سند اور دستاویز مانا ہے ان کے نزدیک ان نوٹوں کے ذریعے سونا چاندی خریدنا جائز نہیں ہے۔ تفصیل ملاحظہ کریں: شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کے فقہی مقالات: ۱/۲۱-۲۳، کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم، ط: زمزم بک ڈپو - دیوبند۔

[۴] ولو ضم أحد النصابين إلى الأخرى حتى يؤدي كله من الذهب أو من الفضة لا بأس به لكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء قدرا ورواجا. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۹، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، الفصل الأول في زكاة الذهب والفضة، ط: دار الفكر - بيروت)

قدرِ ضرورت ہوگی، خرچ کرے گا، اب حولانِ حول کے بعد اس کے پاس مقدارِ نصاب باقی رہ گیا، تو جتنی مقدار باقی ہے، اس پر زکوۃ فرض ہوگی، اور اگر ملازم یکم محرم الحرام کو تین تولہ سونا اور پانچ سو روپے کا مالک ہے؛ لیکن درمیانِ سال مقروض ہو گیا، (اور اس کے پاس بہ ظاہر نصاب کے بہ قدر مال ہے؛ کیوں کہ تنخواہ سال کے آخری دن میں ملی ہے۔) تو حولانِ حول نہیں ہوا، مثلاً اختتامِ سال پر ۵ ۱۴۰ھ کی محرم الحرام کو تنخواہ ملی، مگر دودھ کا قرضہ یا دیگر قرضہ جات اس پر موجود ہیں، تو حولانِ حول مالِ نامی پر نہیں ہوا (پس زکوۃ فرض نہ ہوگی) اور اگر قرض کی ادائیگی کے بعد بھی باقی رہ گیا، تو حولانِ حول پر حوائجِ اصلیہ ضروریہ پر زائد ہونے کی وجہ سے زکوۃ فرض ہوگی۔[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

[1] خلاصہ یہ کہ اگر سال کے دونوں جانب نصاب موجود ہے اور اس ملازم پر کسی قسم کا کوئی بل ادا کرنا یا قرض دینا باقی نہیں ہے، یا کوئی قرض ہے؛ لیکن اسے منہا کرنے کے باوجود نصاب کے بہ قدر مال موجود رہتا ہے، تو اس پر زکاۃ واجب ہوگی، سال کے دونوں جانب نصاب کا موجود ہونا اس بات کی علامت ہے کہ مال حاجتِ اصلیہ سے زائد ہے، یہی صورت مراد ہے "أن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة" جیسی عبارت میں، اور "فإذا كان معه دراهم أمسكها بنية صرفها إلى حاجته الأصلية لا تجب الزكاة فيها الخ" جیسی عبارت کا مصداق وہ صورت ہے جب کہ نصاب کے بہ قدر مال جانبین میں موجود ہو؛ لیکن اس پر کچھ قرض وغیرہ ہو، ایسی صورت میں، گرچہ مال بہ قدر نصاب موجود ہے، لیکن اسے (گذشتہ ایام کے) نفقے کے لیے روک رکھا ہے، لہذا اس پر زکاۃ نہیں ہوگی۔ تفصیل ملاحظہ کریں علامہ شامی کی زبانی:

فإذا كان معه دراهم أمسكها بنية صرفها إلى حاجته الأصلية لا تجب الزكاة فيها إذا حال الحول، وهي عنده، لكن اعترضه في البحر بقوله: ويخالفه ما في المعراج في فصل زكاة العروض أن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة، وكذا في البدائع في بحث النماء التقديري. اهـ.

قلت: وأقره في النهر والشرنبلالية وشرح المقدسي، وسيصرح به الشارح أيضا، ونحوه قوله في السراج سواء أمسكه للتجارة أو غيرها، وكذا قوله في التتارخانية: نوى التجارة أو لا. لكن حيث كان ما قاله ابن ملك موافقا لظاهر عبارات المتون كما علمت، وقال ح إنه الحق، فالأولى التوفيق بحمل ما في البدائع وغيرها، على ما إذا أمسكه لينفق منه كل ما يحتاجه فحال الحول، وقد بقي معه منه نصاب، فإنه يزكي ذلك الباقي، وإن كان قصده الإنفاق منه أيضا في المستقبل لعدم استحقاق صرفه إلى حوائجه الأصلية وقت حولان الحول، بخلاف ما إذا حال الحول، وهو مستحق الصرف إليها، لكن يحتاج إلى الفرق بين هذا، وبين ما حال الحول عليه، وهو محتاج منه إلى أداء دين كفارة أو نذر أو حج، فإنه محتاج إليها أيضا لبراءة ذمته. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۲، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۲۰] تیس سال سے بینک میں تھوڑی تھوڑی جمع کردہ رقم پر زکوٰۃ کا حکم

۱۲۵۱- سوال: میرا ایک بھائی ہے وہ نوکری کرتا ہے اور ہر سال ۲۰؍روپے بچا کر بینک میں جمع کرتا ہے، آج تیس سال ہو گئے اور ۷۰۰ ۲؍روپے اس کے بینک میں جمع ہو گئے ہیں، اب تک اس نے ان پیسوں کی کچھ زکوٰۃ نہیں نکالی ہے، تو اس کے لیے زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟ اس کو ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی یا تیس سال کی، جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر نصاب کے بہ قدر مال تیس سال پہلے سے تھا، تو تیس سال کی زکوٰۃ نکالنا ضروری ہوگا، اگر نصاب اس وقت نہیں تھا، تو جب سے وہ نصاب کا مالک ہوا، اس وقت سے آنے والے تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔[1]

ادا کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ جس سال وہ نصاب کا مالک ہوا، اس وقت اس کے پاس جتنی رقم ہے، اس کا چالیس واں حصہ (ڈھائی فی صد) شمار کرے، آئندہ سال اس میں مزید ایک سال کی تنخواہ جوڑ دے، اور پچھلے سال زکاۃ کے طور پر ادا کی گئی رقم کو منہا کر دے، اسی طرح تیسرے سال اور بعد کے سالوں کا حساب لگالے۔

مثلاً: نو سال کی مدت میں نصاب کے بہ قدر ۲۰۰۰؍روپے جمع ہوئے، تو اس میں سے ڈھائی فی صد (۵۰؍روپے) کو شمار کرے، دسویں سال اس کے پاس زکاۃ کی رقم منہا کرنے کے بعد، ۱۹۵۰؍بچیں گے، اور تنخواہ کے ۲۴۰؍روپے جمع ہوں گے، کل ۲۱۹۰؍کی زکاۃ کا حساب لگائے، جو ۵۴؍روپے ۷۵؍

---

(۱) (و) اعلم أن الديون عند الإمام ثلاثة: قوي، ومتوسط، وضعيف؛ (فتجب) زكاتها إذا تم نصابا وحال الحول، لكن لا فورا؛ بل (عند قبض أربعين درهما من الدين) القوي، كقرض (وبدل مال تجارة). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۰۵، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر)

(ولو كان الدين على مقر مليء أو) على (معسر أو مفلس)... (فوصل إلى ملكه لزم زكاة ما مضى). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۷-۲۶۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

" الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما، وحال عليه الحول ". (الهداية: ۱/ ۱۸۵، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

پیسے ہوتے ہیں، گیارہویں سال اس کے پاس گذشتہ سالوں کی (زکاۃ کی رقم وضع کرنے کے بعد) جمع رقم اور تنخواہ کی رقم، کل ۲۵.۵۷۲۳/ ہوتی ہے، اس کا حساب لگائے اور اسی طرح آئندہ سالوں کا حساب لگائے اور مکمل زکاۃ ادا کرے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] نقد رقم اور نصاب سے زائد سونے پر وجوب زکوۃ کا شرعی حکم

۱۲۵۲-سوال: ہمارے پاس حسب ذیل رقم موجود ہے:

۲۸۷۵/ دو ہزار آٹھ سو پچھتر روپیہ نقد موجود ہے۔

چھ سو تیس روپیہ (۶۳۰) تولہ کے ریٹ کا، اٹھارہ ہزار نو سو (۱۸۹۰۰) روپے کا تیس تولہ سونا موجود ہے۔

تو اس مال پر کتنی زکوۃ واجب ہوگی؟

الجواب حامداومصليا:

نقد رقم اور سونے پر جب سال گذر جائے، تو اس کا چالیسواں حصہ زکوہ میں ادا کرنا فرض ہوگا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] غیر موجود منتشر رقم پر وجوب زکوۃ کا شرعی حکم

۱۲۵۳-سوال: (۱) ایک کھیت کے مالک کے پاس سے ہم نے زمین کرایے پر ۳۲۴۰۰/ بتیس ہزار چار سو روپیہ میں لی ہے۔

(۲) زمین کے مالک کے پاس سے ہمیں ۱۲۲۱/ بارہ سو اکیس روپیہ لینا باقی ہے۔

---

[۱] (وشرطه) أي شرط افتراض أدائها (حولان الحول) وهو في ملكه. (الدر المحتار مع رد المحتار: ۲/۲۶۷، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

وهو ربع عشر نصاب حولي. (حواله سابق: ۲/۲۵۷ بدائع الصنائع: ۲/ ۲۳، كتاب الزكاة، فصل صفة الواجب في أموال التجارة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ص: ۷۱۴، كتاب الزكاة، مدخل، ط: دار الكتب العلمية - بيروت لبنان)

"الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول". (الهداية: ۱/۱۸۵، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

(۳) ہم نے ایک مکان بیچا ہے، جس کے ۱۴۰۰۰ / چودہ ہزار روپیہ لینا ابھی باقی ہے۔

(۴) کلفی کا ایک کارخانہ ہم نے بیچا ہے، جس کے ۱۰۰۰ / ایک ہزار روپیہ لینا باقی ہے۔

(۵) دو کانوں کا مال ہم نے بیچا ہے، جس کے ۶۰۶ / چھ سو چھ روپیہ لینا باقی ہے۔

(۶) ہم نے ایک آدمی کو ۵۵۰ / پانچ سو پچاس روپیہ بہ طور قرض دیے ہیں۔

(۷) حج ادا کرنے کے لیے ہم نے حج کا فارم بھی بھرا ہے، اس کی ٹکٹ کے ۲۰۰۰ / دو ہزار روپے ادا کیے ہیں۔

(۸) بیمہ کمپنی میں ۲۴۸۴ / دو ہزار چار سو چوراسی روپیہ ادا کیے ہیں۔

یہ رقم ہمارے پاس موجود نہیں ہے؛ تو کیا اس رقم کی ہم پر زکوۃ واجب ہوگی؟

الجواب حامداو مصلیا:

جو رقم آپ نے زمین کے کرایے کے لیے دی ہے، اس میں آپ کیا کرتے ہیں، وہ آپ نے تحریر نہیں کیا ہے، آئندہ اس کی تفصیل لکھیں۔

نمبر دو، تین، چار، پانچ، چھ اور آٹھ میں لکھی ہوئی رقم پر زکوۃ واجب ہوگی، چالیسواں حصہ زکوۃ میں دینا پڑے گا، جوں جوں رقم آپ کے پاس آتی رہے، اس کی [سالہائے گذشتہ کی زکوۃ کے ساتھ] زکوۃ ادا کرتے رہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] غیر استعمالی برتن اور پندرہ تولہ زیورات پر زکوۃ کا شرعی حکم

۱۲۵۴- سوال: ایک شخص کے پاس پندرہ تولہ زیور ہے، تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں ہوگی؟ یہ زیورات سال میں ایک دو مرتبہ استعمال میں آتے ہیں۔

---

(۱) (و) اعلم أن الديون عند الإمام ثلاثة: قوي، ومتوسط، وضعيف؛ (فتجب) زكاتها إذا تم نصابا وحال الحول، لكن لا فورا، بل (عند قبض أربعين درهما من الدين) القوي، كقرض (وبدل مال تجارة). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۰۵، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر)

(ولو كان الدين على مقر مليء أو) على (معسر أو مفلس)... (فوصل إلى ملكه لزم زكاة ما مضى). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۸-۲۶۷، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

نیز اس کے پاس پیتل کے بالکل نئے برتن ہیں، ان کو محض شو کے لیے رکھا گیا ہے، جن کو سال بھر میں ایک مرتبہ بھی استعمال نہیں کیا جاتا تخمیناً تین ہزار کے ہوں گے، تو اس کو زکوۃ دینی پڑے گی یا نہیں؟

اس کے پاس دکان میں دس ہزار روپے کا سامان بھی ہے اور آٹھ ہزار کا وہ مقروض بھی ہے، اب قرض کے آٹھ ہزار وضع کر لینے کے بعد اس کے پاس صرف دو ہزار روپے بچتے ہیں، تو کیا اس پر زکوۃ واجب ہوگی؟

اگر کسی آدمی یا عورت نے بھول سے یہ سمجھ لیا کہ زیورات تو استعمال کی چیزوں میں سے ہیں؛ لہٰذا ان پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی؛ اس لیے اس نے زکاۃ ادا نہیں کی، اب معلوم ہوا کہ ان پر بھی زکاۃ ہے، تو کیا اس کے لیے سالہائے گذشتہ کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی؟ اگر ادا نہ کرے تو کیا وہ گنہ گار رہوں گے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامدا ومصليا:

سونے چاندی کے زیورات ہوں یا ان کی ڈلی، استعمال میں آتے ہوں یا استعمال میں نہ آتے ہوں، ہر حال میں ان پر زکوۃ فرض ہے۔ (۱)

---

(۱) قال - رحمه الله - (ولو تبرا أو حليا أو آنية) أي ولو كانت الفضة أو الذهب حليا أو غيره تجب فيها الزكاة، وقال الشافعي: لا تجب الزكاة في حلي النساء وخاتم الفضة للرجال؛ لما روى جابر أنه - عليه الصلاة والسلام - قال "ليس في الحلي زكاة"، ولأنه مبتذل في مباح وليس بنام اهـ فشابه ثياب البذلة.

ولنا ما رواه حسين المعلم عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، أن امرأة أتت رسول الله - صلى الله عليه وسلم - وفي يدها ابنة لها وفي يد ابنتها مسكتان غليظتان من ذهب، فقال رسول الله - صلى الله عليه وسلم - أتعطين زكاة هذا، قالت لا، قال أيسرك أن يسورك الله بهما يوم القيامة بسوارين من نار، فخلعتهما، وألقتهما إلى رسول الله - صلى الله عليه وسلم - وقالت: هما لله ولرسوله. قال النووي إسناده حسن.

وقالت عائشة - رضي الله عنها - دخلت على رسول الله - صلى الله عليه وسلم - فرأى في يدي فتخات من ورق، فقال ما هذا يا عائشة، فقلت صنعتهن أتزين لك بهن يا رسول الله فقال أتؤدين زكاتهن، قلت لا أو ما شاء الله، قال حسبك من النار. أخرجه الحاكم في المستدرك، وقال هذا حديث صحيح على شرط الشيخين، وقالت أم سلمة كنت ألبس أوضاحا من ذهب فقلت يا رسول الله أكنز هو فقال ما بلغ أن تؤدي زكاته فزكي فليس بكنز. أخرجه الحاكم في المستدرك، وقال صحيح على شرط البخاري، ورواه أبو داود أيضا، وعموم قوله تعالى: [والذين يكنزون الذهب والفضة] [التوبة: ۳۴] الآية يتناول الحلي. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ هـ): ۱/ ۲۷۷، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

(وفي تبر الذهب والفضة) وهو غير المضروب منهما. مغرب (وحليهما) سواء كان مباح الاستعمال أو لا =

بازاری قیمت کے مطابق پندرہ تولہ سونے کے زیورات کی قیمت آٹھ ہزار روپیہ اور دکان کا مال دس ہزار روپیہ کا ہے؛ گویا اس کے پاس کل اٹھارہ ہزار ہوئے، قرض کی رقم آٹھ ہزار منہا (وضع) کرنے کے بعد دس ہزار اس کے پاس رہ گئے، [اگر روپیوں میں زکاۃ ادا کرنا چاہتا ہے تو] ان دس ہزار روپیوں کی زکوۃ ادا کرنا ضروری ہوگا۔ (۲)

گذشتہ سالوں کی بھی زکوۃ ادا کرنا ضروری ہوگا۔ (۳)

= (والآنية منهما الزكاة) لأنهما خلقا أثماناً، فتجب زكاتهما كيف كانا. (اللباب في شرح الكتاب- عبد الغني بن طالب بن حمادة بن إبراهيم الغنيمي الدمشقي الميداني الحنفي (م:١٢٩٨هـ):١/ ١٤٨، كتاب الزكاة، باب زكاة الذهب، ت: محمد محيي الدين عبد الحميد، ط: المكتبة العلمية- بيروت- لبنان)

(واللازم)... (في مضروب كل) منهما (ومعموله ولو تبرا أو حليا مطلقا) مباح الاستعمال أو لا ولو للتجمل والنفقة؛ لأنهما خلقا أثمانا فيزكيهما كيف كانا (أو) في (عرض تجارة قيمته نصاب) الجملة صفة عرض وهو هنا ما ليس بنقد.... (ربع عشر). (الدر المختار)ـــــ قال ابن عابدين: (قوله مضروب كل منهما) أي ما جعل دراهم يتعامل بها أو دنانير ط (قوله: ومعموله) أي ما يعمل من نحو حلية سيف أو منطقة أو لجام أو سرج أو الكواكب في المصاحف والأواني وغيرها إذا كانت تخلص بالإذابة بحر (قوله: ولو تبرا) التبر: الذهب والفضة قبل أن يصاغا بحر عن ضياء الحلوم،... (قوله: أو حليا) بضم الحاء وكسرها وتشديد الياء جمع حلي بفتح الحاء وإسكان اللام: ما تتحلى به المرأة من ذهب أو فضة نهر ... (قوله: أو لا) كخاتم الذهب للرجال والأواني مطلقا ولو من فضة (قوله: ولو للتجمل) أي التزين بهما في البيوت من غير استعمال ط (قوله والنفقة) فيه منافاة لقول ابن الملك: إذا كانت مشغولة بحوائجه فلا زكاة فيها كما قدمناه في أول كتاب الزكاة فارجع إليه. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ٢٩٨، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر- بيروت)

(٢) "ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكاة عليه" وقال الشافعي رحمه الله تجب لتحقق السبب وهو ملك نصاب تام ولنا أنه مشغول بحاجته الأصلية فاعتبر معدوما كظماء المستحق بالعطش وثياب البذلة والمهنة" وإن كان ماله أكثر من دينه زكى الفاضل إذا بلغ نصابا" لفراغه عن الحاجة. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:٥٩٣هـ):١/ ٩٥، أول كتاب الزكاة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

(٣) وأجمعوا أنه إذا دفن في الحرز من الدور ونحوها ونسيه ثم تذكر فإنه تجب عليه زكاة ما مضى، وكذلك إذا أودع رجلا معروفا ثم نسيه سنين ثم تذكر فإنه يجب بالإجماع. (تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ٥٤٠هـ):١/ ٢٩٦، كتاب الزكاة، باب زكاة السوائم، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

گھریلو برتنوں اور فرنیچر پر کوئی زکوۃ فرض نہیں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

[۲۴] سونے میں زکوۃ کا نصاب اور دو تین تولہ سونے پر زکوۃ کا حکم

۱۲۵۵-سوال: اگر کسی کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا ہو تو ہی زکوۃ واجب ہوگی یا دو تین تولے پر بھی زکوۃ واجب ہو جائے گی؟ ہمارے یہاں یہ مسئلہ ہر خاص و عام کی زبان پر ہے کہ آج کل تو سونے کا بھاؤ بہت زیادہ ہو گیا ہے، اس لیے دو تین تولے پر بھی زکوۃ فرض ہو جائے گی، تو کیا دو تین تولہ سونے پر زکوۃ فرض ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

اگر کسی کے پاس صرف سونا ہو، تو ساڑھے سات تولہ پر نصاب مکمل ہوگا، اور اگر صرف چاندی ہو، تو ساڑھے باون تولہ پر وہ صاحب نصاب ہوگا، اور حولان حول کے بعد زکوۃ کی ادائیگی لازم ہوگی۔ (۲) ہاں!

---

(۱) " وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة " لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية أيضا. (الهداية في شرح بداية المبتدي: ۱/ ۹۲، أول كتاب الزكاة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۲، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) عن علي رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم ببعض أول هذا الحديث، قال: فإذا كانت لك مائتا درهم، وحال عليها الحول، ففيها خمسة دراهم، وليس عليك شيء - يعني - في الذهب حتى يكون لك عشرون دينارا، فإذا كان لك عشرون دينارا، وحال عليها الحول، ففيها نصف دينار، فما زاد، فبحساب ذلك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۲۱، رقم الحديث: ۱۵۷۳، كتاب الزكاة، باب في زكاة السائمة، ط: مكتبة فيصل ديوبند)

عن السائب بن يزيد، أن عثمان بن عفان رضي الله عنه، كان يقول: هذا شهر زكاتكم، فمن كان عليه دين، فليؤد دينه حتى تحصل أموالكم، فتؤدوا منها الزكاة. قال محمد: وبهذا نأخذ، من كان عليه دين وله مال فليدفع دينه من ماله، فإن بقي بعد ذلك ما تجب فيه الزكاة ففيه زكاة، وتلك مائتا درهم، أو عشرون مثقالا ذهبا فصاعدا، وإن كان الذي بقي أقل من ذلك، بعد ما يدفع من ماله الدين فليست فيه الزكاة، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (موطأ مالك برواية محمد بن الحسن الشيباني المعروف بـ 'موطأ الإمام محمد': ۱/ ۱۱۴، رقم الحديث: ۳۲۳، كتاب الزكاة، باب: زكاة المال، ت: عبد الوهاب عبد اللطيف، : المكتبة العلمية)

نصاب الذهب عشرون مثقالا. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: عشرون مثقالا) فما دون ذلك لا زكاة فيه ولو كان نقصانا يسيرا يدخل بين الوزنين؛ لأنه وقع الشك في كمال النصاب فلا حكم بكماله مع الشك=

کسی کے پاس دو تولہ چاندی اور ایک تولہ سونا ہو، جس کی مجموعی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو، تو اس پر زکوۃ فرض ہو جائے گی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] مال مستفاد کو اصل مال کے ساتھ ملا کر زکوۃ نکالی جائے

۱۲۵۶- سوال: ایک آدمی صاحب نصاب ہے، اس کے پاس سونا، چاندی اور نقد رقم وغیرہ ہے جس کی ہر سال زکوۃ نکالتا ہے، اب ایسے شخص کے پاس (جس کی زکوۃ نکالنے کا وقت ماہ رمضان ہے، یعنی رمضان میں سال پورا ہوتا ہے) رمضان سے دو مہینہ پہلے ایک جائداد بیچنے کی وجہ سے تقریباً پچیس ہزار روپے آئے، تو اس رقم پر ایک سال کے گذرنے کے بعد زکوۃ نکالنی پڑے گی، یا دوسرے مال کی طرح رمضان میں ہی- جب کہ اس پر صرف دو مہینے گذرے ہیں- زکوۃ دینی ہوگی۔

= بحر عن البدائع. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۹۵، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر- بيروت ☆ الهداية: ۱/ ۱۷۸، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، ط: زكريا- ديوبند ☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ص: ۷۱۷، كتاب الزكاة، مدخل، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) (و) يضم (الذهب إلى الفضة) وعكسه بجامع الثمنية (قيمة). (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويضم إلخ) أي عند الاجتماع. . . وفي البدائع أيضا أن ما ذكر من وجوب الضم إذا لم يكن كل واحد منهما نصابا بأن كان أقل، فلو كان كل منها نصابا تاما بدون زيادة لا يجب الضم، بل ينبغي أن يؤدي من كل واحد زكاته، فلو ضم حتى يؤدي كله من الذهب أو الفضة فلا بأس به عندنا، ولكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء رواجا وإلا يؤد من كل منهما ربع عشره (قوله: وعكسه) وهو ضم الفضة إلى الذهب، وكذا يصح العكس في قوله وقيمة العرض تضم إلى الثمنين عند الإمام كما مر عن الزاهدي، وصرح به في المحيط أيضا. . . (قوله: قيمة) أي من جهة القيمة، فمن له مائة درهم وخمسة مثاقيل قيمتها مائة عليه زكاتها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۰۳، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، قبل: مطلب في وجوب الزكاة في دين المرصد، ط: دار الفكر- بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۴۰۱-۴۰۰، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: زكريا- ديوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۹، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، ط: زكريا- ديوبند☆المحيط البرهاني: ۲/ ۲۴۱، كتاب الزكاة، الفصل الثالث بيان مال الزكاة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆العناية شرح الهداية: ۲/ ۲۲۲، كتاب الزكاة، فصل في زكاة العروض، ط: دار الفكر☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ص: ۷۱۷، كتاب الزكاة، مدخل، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆تبيين الحقائق: ۱/ ۲۸۰، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: المطبعة الكبرى الاميرية، بولاق- القاهرة)

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر پہلے سے زکوۃ واجب ہے، اور نصاب کا مالک ہے، تو سال کے پورا ہونے کے درمیان، مال میں جو کچھ اضافہ ہو، اس کو سال کے آخری دن زکوۃ کے حساب میں شمار کر لینا ضروری ہے، چاہے دو مہینہ پہلے ہی اضافہ کیوں نہ ہوا ہو۔

لہٰذا مذکورہ صورت میں جو رقم حاصل ہوئی ہے، اس پر از سرِ نو مستقل سال کے گذرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا، اور سال رواں کے مال زکوۃ میں شمار کرنا ضروری ہوگا۔[1]

ہاں! جو آدمی پہلی مرتبہ نصاب کا مالک ہوا ہو، اس کی رقم پر حولانِ حول (سال گذرنا) شرط ہے۔[2]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] نصاب پر سال گذرنے کے بعد زکوۃ واجب ہوگی

۱۲۵۷- سوال: میں کویت میں رہتا ہوں، دو سال ہوئے کویت سے یہاں آ گیا ہوں، میری ملازمت سرکاری ہے، جس کی وجہ سے وہاں کے قانون کے مطابق دو سال کی ملازمت کی رقم کویت میں میرے اکاؤنٹ میں جمع ہو گئی ہے، وہ رقم مؤرخہ: ۲۳/ ۱/ ۱۹۹۳ء میں جمع ہوئی ہے، رقم ابھی کویت ہی میں ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ اس رقم کی زکوۃ ابھی ادا کرنی ہوگی یا ایک سال بعد؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر آپ پہلے سے صاحب نصاب نہ ہوں، اور مؤرخہ: ۲۳/ ۱/ ۱۹۹۳ء کو آپ کے اکاؤنٹ میں جمع

---

(۱) ومن كان له نصاب فاستفاد في أثناء الحول مالا من جنسه ضمه إلى ماله وزكاه المستفاد من نمائه أو لا وبأي وجه استفاد ضمه سواء كان بميراث أو هبة أو غير ذلك، ولو كان من غير جنسه من كل وجه كالغنم مع الإبل فإنه لا يضم هكذا في الجوهرة النيرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۵، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۰۷، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر)

(۲) ثم إنما يضم المستفاد عندنا إلى أصل المال إذا كان الأصل نصابا فأما إذا كان أقل من النصاب فإنه لا يضم إليه، وإن كان يتكامل به النصاب وينعقد الحول عليهما حال وجود المستفاد؛ لأنه إذا كان أقل من النصاب لم ينعقد الحول على الأصل فكيف ينعقد على المستفاد من طريق التبعية؟. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۴، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۲۰۷، كتاب الزكاة، فصل في زكاة الخيل، نصاب الفضة، ط: دار احياء التراث العربي)

کی گئی رقم نصاب کے برابر ہے، تو ایک سال ختم ہونے کے بعد زکوۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔[1]

لیکن اگر آپ پہلے ہی سے نصاب کے مالک ہیں اور نصاب کے بقدر آپ کے پاس مال ہے، اور آپ مؤرخہ: ۲۳/۱/۱۹۹۳ء کے بعد زکوۃ دے رہے ہیں، تو ۱۹۹۳/۱/۲۳ کو جو رقم آپ کے کھاتے میں جمع ہوئی ہے، وہ دوسرے زکوۃ مال کے ساتھ ملائی جائے گی اور کل مال کی زکوۃ دینی ہوگی، اس پر ازسرنو سال کا گذرنا شرط نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۲۷] تجارت میں حاصل ہونے والی منافع کی رقم پر سال کا گذرنا شرط نہیں

۱۲۵۸- سوال: تجارت میں نقد رقم زیادہ مدّت تک ایک جگہ جمع نہیں رہتی؛ بل کہ گھومتی رہتی ہے، اور اس کا نفع وقتاً فوقتاً حاصل ہوتا رہتا ہے، اب نفع پر سال مکمل ہوا یا نہیں، اس کا حساب بہت مشکل ہو جاتا ہے، تو اس صورت میں زکوۃ کی ادائیگی کا آسان طریقہ کیا ہے؟

---

(۱) لا خلاف في أن أصل النصاب وهو النصاب الموجود في أول الحول يشترط له الحول؛ لقول النبي - صلى الله عليه وسلم -: "لا زكاة في مال حتى يحول عليه الحول"؛ ولأن كون المال ناميا شرط وجوب الزكاة لما ذكرنا، والنماء لا يحصل إلا بالاستنماء، ولا بد لذلك من مدة، وأقل مدة يستنمي المال فيها بالتجارة والإسامة عادة الحول. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۳، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) فأما المستفاد في خلال الحول فهل يشترط له حول على حدة، أو يضم إلى الأصل، فيزكى بحول الأصل؟... و المستفاد في الحول لا يخلو إما أن كان من جنس الأصل، وإما أن كان من خلاف جنسه. ـــــــ فإن كان من خلاف جنسه كالإبل مع البقر والبقر مع الغنم فإنه لا يضم إلى نصاب الأصل بل يستأنف له الحول بلا خلاف وإن كان من جنسه فأما إن كان متفرعا من الأصل أو حاصلا بسببه كالولد والربح، وأما لم يكن متفرعا من الأصل ولا حاصلا بسببه كالمشترى والموروث والموهوب والموصى به فإن كان متفرعا من الأصل أو حاصلا بسببه يضم إلى الأصل ويزكى بحول الأصل بالإجماع. ـــــــ وإن لم يكن متفرعا من الأصل ولا حاصلا بسببه فإنه يضم إلى الأصل عندنا.

....

ثم إنما يضم المستفاد عندنا إلى أصل المال إذا كان الأصل نصابا فأما إذا كان أقل من النصاب فإنه لا يضم إليه، وإن كان يتكامل به النصاب وينعقد الحول عليهما حال وجود المستفاد؛ لأنه إذا كان أقل من النصاب لم ينعقد الحول على الأصل فكيف ينعقد على المستفاد من طريق التبعية؟ (حوالہ سابق: ۲/ ۱۴)

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر نصاب (ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت) کے بہ قدر رقم، شروع سال میں تھی، پھر تاجر تجارت کے ذریعے اس مال میں، پورے سال وقتاً فوقتاً جس قدر نفع حاصل کیا ہو، اصل نصاب کے ساتھ ان تمام (منافع) کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی، دوران سال حاصل ہونے والے نفع پر سال کا گذرنا شرط نہیں ہے، اصل مال پر سال کا گذرنا وجوب زکوۃ کے لیے کافی ہے۔ مثلاً: ۱۴۰۹ھ کی پہلی رمضان کو، تاجر کے پاس ایک لاکھ ڈالر ہیں، اور ۱۴۱۰ھ کی پہلی رمضان المبارک کو سوا لاکھ یا اس سے زائد ڈالر ہیں، تو زکوۃ سوا لاکھ یا اس سے زائد پر فرض ہوگی، ہر مہینے کا نفع علاحدہ کرنا اور علاحدہ علاحدہ سال گذرنے کا اعتبار کرنا جائز نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۲۸] مقروض ہوجانے کی وجہ سے زکوۃ واجب نہ رہی، پھر صاحب نصاب بن گیا، تو ازسرنو سال گذرنے پر زکوۃ واجب ہوگی

۱۲۵۹- سوال: ایک آدمی کے پاس تھوڑا سونا تھا، جس کی وجہ سے زکوۃ فرض تھی، پھر اس آدمی پر اتنا قرضہ ہوگیا، کہ اگر سونا بیچ دیا جائے، تب بھی قرضہ باقی رہتا ہے، اس کے بعد صورت حال بدلی اور اس آدمی کے پاس اتنی رقم آگئی کہ قرضہ ادا کرنے کے بعد بھی رقم بچتی ہے اور سونا بھی ہے، تو اب پوچھنا یہ ہے کہ جب رقم آئی، اسی وقت زکوۃ کی ادائیگی واجب ہوگی، یا سال پورا ہونے کے بعد زکوۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اتنا قرضہ ہوگیا کہ اس پر زکوۃ واجب نہیں رہی، [یعنی ایک سال یا اس سے زائد عرصہ اس حال میں گذرا کہ وہ نصاب کے بہ قدر مال کا مالک نہیں تھا، یا مالک تو تھا؛ لیکن اس پر قرض کی مقدار اتنی زائد تھی کہ اس

---

(۱) ومن كان له نصاب، فاستفاد في أثناء الحول مالا من جنسه، ضمه إلى ماله، وزكاه، المستفاد من نمائه أو لا، وبأي وجه استفاد ضمه، سواء كان بميراث أو هبة أو غير ذلك، ولو كان من غير جنسه من كل وجه كالغنم مع الإبل، فإنه لا يضم هكذا في الجوهرة النيرة. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۵، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۰۷، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر - بيروت)

کو منہا کرنے کے بعد نصاب کے برابر اس کے پاس مال نہیں تھا] اس کے بعد اتنی رقم آئی کہ نصاب کا مالک ہوگیا، تو رقم آنے کے بعد ایک سال گزر جانے پر زکوۃ واجب ہوگی، اس سے پہلے زکوۃ ادا کرنا واجب نہیں ہوگا۔ (فتاوی عالمگیری)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] قابلِ زکوٰۃ اموال میں قرض کو منہا کیا جائے گا

۱۲۶۰- سوال: ایک شخص کے پاس اصل سرمایۂ تجارت، پندرہ ہزار (۱۵۰۰۰) روپے ہیں، وہ اپنی تجارت کو وسعت دینے کے لیے زائد رقم قرض کے طور پر لے کر تجارت کر رہا ہے، تو اب وہ زکوٰۃ نکالنے کے لیے اپنے مال کا حساب کس طرح کرے گا؟ کیا قرض کی وجہ سے اس کی زکوٰۃ میں تخفیف نہیں ہوگی؟

الجواب حامداًومصلیاً:

جتنا قرضہ لیا ہے، اتنی مقدار زکوۃ کے حساب میں کم کردے، مثلاً (۱۰۰۰۰) دس ہزار کا قرض لے کر وہ (۲۵۰۰۰) پچیس ہزار کا سامان تجارت لایا ہے، تو اس پر ۱۵۰۰۰ کے مال کی زکوۃ واجب ہوگی، قرض کی رقم ۱۰۰۰۰/ پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] قرض کو مالِ زکوٰۃ سے وضع کیا جائے گا

۱۲۶۱- سوال: میں ماہِ رمضان المبارک میں اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرتا ہوں، میرے پاس وہ رقم بھی موجود ہے، جو مجھے اپنی بہنوں کو بہ طور حق وراثت ادا کرنی ہے، اور میرے ذمہ وہ رقم قرض ہے، تو اُس

[۱] وإذا كان النصاب كاملا في طرفي الحول فنقصانه فيما بين ذلك لا يسقط الزكاة كذا في الهداية. . . قال أصحابنا - رحمهم الله تعالى -: كل دين له مطالب من جهة العباد يمنع وجوب الزكاة. . . ثم إنما يضم المستفاد عندنا إلى أصل المال إذا كان الأصل نصابا فأما إذا كان أقل فإنه لا يضم إليه، وإن كان يتكامل به النصاب وينعقد الحول عليهما حال وجود النصاب. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۵، كتاب الزكاة ،الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها و شرائطها، ط: دار الفكر☆بدائع الصنائع: ۲/۱۴، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية☆مجمع الأنهر: ۱/۲۰۷، كتاب الزكاة، فصل في زكاة الخيل، نصاب الفضة، ط: دار احياء التراث العربي)

(۲) "ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكاة عليه" . . . "وإن كان ماله أكثر من دينه زكى الفاضل إذا بلغ نصابا" لفراغه عن الحاجة. (الهداية: ۱/۱۸۶، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

کو مالِ زکوۃ سے کم کیا جائے گا یا اُس میں بھی زکوۃ واجب ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

بہنوں کو جو رقم بہ طورِ حق وراثت ادا کرنی باقی ہے، وہ آپ کے ذمہ قرض ہے، لہٰذا قرض کی مقدار وضع (منہا) کرنے کے بعد بقیہ مال پر زکوۃ ادا کی جائے گی، بہ شرطے کہ وضع دین کے بعد نصاب باقی ہو۔ [1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] گھریلوں اشیاء پر زکوۃ کا حکم

۱۲۶۲–سوال: کیا گھر کے اثاثوں یعنی کرسی ٹیبل، چارپائی، سلائی مشین وغیرہ پر زکوۃ واجب ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

رہائشی مکان، یا وہ مکانات جو کرایے پر دینے کے لیے بنائے گئے ہیں، یا کسب معاش کا جو سامان [ذریعہ وآلہ] ہے، جیسے: چکی، سلائی مشین، کاشت کاری کا ٹریکٹر، یا دو تین بیل گاڑیاں وغیرہ، ان پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ [2]

---

[۱] عن السائب بن يزيد، أن عثمان بن عفان رضي الله عنه، كان يقول: هذا شهر زكاتكم، فمن كان عليه دين، فليؤد دينه حتى تحصل أموالكم، فتؤدوا منها الزكاة. قال محمد: وبهذا نأخذ، من كان عليه دين وله مال فليدفع دينه من ماله، فإن بقي بعد ذلك ما تجب فيه الزكاة ففيه زكاة، وتلك مائتا درهم، أو عشرون مثقالا ذهبا فصاعدا، وإن كان الذي بقي أقل من ذلك، بعد ما يدفع من ماله الدين فليست فيه الزكاة، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (موطأ مالك برواية محمد بن الحسن الشيباني المعروف بـ "موطأ الإمام محمد": ١/ ١١٣، رقم الحديث: ٣٢٣، كتاب الزكاة، باب: زكاة المال، ت: عبد الوهاب عبد اللطيف، : المكتبة العلمية)

(۲) "وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة" لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية أيضا وعلى هذا كتب العلم لأهلها وآلات المحترفين لما قلنا. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۹۶، كتاب الزكاة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت ☆ الاختيار لتعليل المختار- عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳ھ): ۱/ ۱۰۰، كتاب الزكاة، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي ☆ تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق- عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ھ): ۱/ ۲۵۳، كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية -بولاق- القاهرة ☆ العناية شرح الهداية- محمد بن محمد بن محمود، أكمل الدين أبو عبد الله ابن الشيخ شمس =

البتہ اس سے جو آمدنی حاصل ہوگی اور وہ نصاب کے برابر ہوگی، تو سال مکمل ہونے پر زکوۃ اس پر واجب ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] مشینری پر زکوۃ کا حکم

گذشتہ پیوستہ

۱۲۶۳- سوال: میرے پاس ایک چکی اور اس کے متعلقات ولوازمات ہیں، جن کی قیمت تقریبا دس ہزار روپے ہوگی، وہ چکی فی الحال مستعمل ہے اور اس کی آمدنی کو میں گھر کی ضروریات میں خرچ کرتا ہوں اور جو رقم بچ جاتی ہے، تو حولان حول کے بعد میں اس کی زکوۃ ادا کر دیتا ہوں؛ لیکن مشینری اور اس کے متعلقات ولوازمات کی زکوۃ ادا نہیں کرتا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مشینری پر زکوۃ واجب ہے۔

الجواب حامداومصليا:

صورت مسئولہ میں مشینری [چکی] اور اس کے متعلقات ولوازمات وغیرہ پر زکوۃ واجب نہ ہوگی۔[2] البتہ اس کی جو آمدنی ہے، اس پر شرائط کے لحاظ سے زکوۃ واجب ہوگی۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الدين ابن الشيخ جمال الدين الرومي البابرتي (م:۷۸٦هـ): ۲/ ۱٦۴، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م:۸۸۵هـ) مع حاشية الشرنبلالي: ۱/ ۱۷۳، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق - زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م:۹۷۰هـ): ۲/ ۲۲۲، كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

قال العيني: (وآلات المحترفين لما قلنا) ش: إشارة إلى قوله: لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية، وآلات المحترفين مثل قدور الطباخين والصباغين وقوارير العطارين. وآلات النجارين، وظروف الأمتعة، وفي "الذخيرة" لو اشترى جوالق بعشرة آلاف درهم يؤجرها فلا زكاة فيها. (البناية شرح الهداية-أبو محمد محمود بن أحمد بن موسى بن أحمد بن حسين الغيتابى الحنفى بدر الدين العيني (م:۸۵۵هـ): ۳/ ۳۰۲، كتاب الزكاة، زكاة المدين، قبيل: زكاة المال المضمار والمفقود والمغصوب، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۱) إذا آجر داره أو عبده بمائتي درهم لا تجب الزكاة مالم يحل الحول بعد القبض، في قول أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - فإن كانت الدار والعبد للتجارة، وقبض أربعين درهما بعد الحول، كان عليه درهم بحكم الحول الماضي قبل القبض؛ لأن أجرة دار التجارة وعبد التجارة بمنزلة ثمن مال التجارة في الصحيح من الرواية. (فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۱/ ۲۵۳، كتاب الزكاة، فصل في مال التجارة، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) گذشتہ سوال کا حاشیہ نمبر ا ملاحظہ فرمائیں۔ (۳) گذشتہ سوال کا حاشیہ نمبر ا ملاحظہ فرمائیں۔

[۳۳] کسی کے پاس بارہ تولہ سونا ہو اور تین تولے کی قیمت کے برابر قرض تو کتنی زکوۃ ادا کرے

۱۲۶۴- سوال: ایک شخص کے پاس بارہ تولہ سونا ہے اور اس کے ذمہ تین تولہ سونے کی قیمت کے برابر قرض ہے، تو اس کو کتنے تولے کی زکوۃ ادا کرنی پڑے گی؟ بارہ تولے کی یا نو تولے کی۔

الجواب حامداومصليا:

قرض منہا کرنے کے بعد، حاجت اصلیہ کے علاوہ جو کچھ بچ جائے، اور اس پر سال گذر جائے، اسی کی زکاۃ لازم ہوتی ہے، صورت مسئولہ میں صرف نو تولے کی زکوۃ ادا کرنی پڑے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۴] رکشا پر زکوۃ

۱۲۶۵- سوال: ایک رکشا میری ملکیت میں ہے، جسے چلا کر اپنی زندگی بسر کرتا ہوں، یومیہ ۵۰ رسے ۱۰۰ روپیہ تک آمدنی ہے، تو کیا مجھ پر زکوۃ فرض ہے؟

---

(۱) عن علي رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم ببعض أول هذا الحديث، قال: فإذا كانت لك مائتا درهم، وحال عليها الحول، ففيها خمسة دراهم، وليس عليك شيء - يعني - في الذهب حتى يكون لك عشرون دينارا، فإذا كان لك عشرون دينارا، وحال عليها الحول، ففيها نصف دينار، فما زاد، فبحساب ذلك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۲۱، رقم الحديث: ۱۵۷۳، كتاب الزكاة، باب في زكاة السائمة، ط: مكتبة فيصل ديوبند)

عن السائب بن يزيد، أن عثمان بن عفان رضي الله عنه، كان يقول: هذا شهر زكاتكم، فمن كان عليه دين، فليؤد دينه حتى تحصل أموالكم، فتؤدوا منها الزكاة. قال محمد: وبهذا نأخذ، من كان عليه دين وله مال فليدفع دينه من ماله، فإن بقي بعد ذلك ما تجب فيه الزكاة ففيه زكاة، وتلك مائتا درهم، أو عشرون مثقالا ذهبا فصاعدا، وإن كان الذي بقي أقل من ذلك، بعد ما يدفع من ماله الدين فليست فيه الزكاة، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (موطأ مالك برواية محمد بن الحسن الشيباني المعروف بـ 'موطأ الإمام محمد': ۱/ ۱۱۲، رقم الحديث: ۳۲۳، كتاب الزكاة، باب: زكاة المال، ت: عبد الوهاب عبد اللطيف، : المكتبة العلمية)

وإن كان ماله أكثر من الدين زكى الفاضل إذا بلغ نصابا لفراغه عن الدين. (تبيين الحقائق: ۱/ ۲۵۵، كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق-القاهرة ☆ اللباب في شرح الكتاب: ۱/ ۱۳۷، كتاب الزكاة، ط: المكتبة العلمية-بيروت ☆ الجوهرة النيرة: ۱/ ۱۱۵، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة، ط: المطبعة الخيرية- بيروت ☆ البناية: ۳/ ۳۰۱، كتاب الزكاة، باب زكاة المديون، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

الجواب حامداً ومصلیاً:

رکشا پر تو زکوۃ واجب نہیں ہے۔[1] لیکن رکشا کی آمدنی میں سے کل خرچہ نکال کر، اور اگر قرضہ ہو، تو اس کو ادا کرنے کے بعد، اتنی رقم آپ کے پاس جمع ہو جائے، جس سے ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جا سکتی ہو، اور اس پر ایک سال گذر جائے، مثلاً پہلی محرم کو اتنی رقم جمع ہوگئی، اب دوسرے سال پہلی محرم کو بھی اتنی ہی رقم یا اس سے زائد رقم موجود ہے، چاہے درمیان سال میں کمی بیشی ہوتی رہی ہو، تو آپ کی رقم پر زکوۃ واجب ہوگی، اور اگر وہ رقم کسی نصاب کے برابر نہیں ہوئی، تو زکوۃ واجب نہ ہوگی۔[2]

اگر رقم کم ہو؛ لیکن ساتھ میں سونے، چاندی کے زیورات ہوں، جن کا مجموعہ کسی نصاب کو پہنچ جائے،

---

(۱) (ولا في ثياب البدن) المحتاج إليها لدفع الحر والبرد ابن ملك (وأثاث المنزل ودور السكنى ونحوها) وكذا الكتب وإن لم تكن لأهلها إذا لم تنو للتجارة، . . . وكذلك آلات المحترفين. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وكذلك آلات المحترفين) أي سواء كانت مما لا تستهلك عينه في الانتفاع كالقدوم والمبرد أو تستهلك، لكن هذا منه ما لا يبقى أثر عينه، كصابون وجرض الغسال، ومنه ما يبقى كعصفر وزعفران لصباغ ودهن وعفص لدباغ فلا زكاة في الأولين؛ لأن ما يأخذه من الأجرة بمقابلة العمل. وفي الأخير الزكاة إذا حال عليه الحول لأن المأخوذ بمقابلة العين كما في الفتح. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۵، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) عن السائب بن يزيد، أن عثمان بن عفان رضي الله عنه، كان يقول: هذا شهر زكاتكم، فمن كان عليه دين، فليؤد دينه حتى تحصل أموالكم، فتؤدوا منها الزكاة. قال محمد: وبهذا نأخذ، من كان عليه دين وله مال فليدفع دينه من ماله، فإن بقي بعد ذلك ما تجب فيه الزكاة ففيه زكاة، وتلك مائتا درهم، أو عشرون مثقالا ذهبا فصاعدا، وإن كان الذي بقي أقل من ذلك، بعد ما يدفع من ماله الدين فليست فيه الزكاة، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (موطأ مالك برواية محمد بن الحسن الشيباني المعروف بـ 'موطأ الإمام محمد': ۱/ ۱۱۴، رقم الحديث: ۳۲۳، كتاب الزكاة، باب: زكاة المال، ت: عبد الوهاب عبد اللطيف، : المكتبة العلمية)

"الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول". (الهداية: ۱/ ۱۸۵، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

ومنها النصاب . . . ولكن هذا الشرط يعتبر في أول الحول وفي آخره لا في خلاله حتى لو انتقص النصاب في أثناء الحول ثم كمل في آخره تجب الزكاة. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۵، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆مجمع الأنهر: ۱/ ۲۰۸، كتاب الزكاة، باب زكاة الذهب والفضة والعروض، ط: دار إحياء التراث العربي)

اوراس پر سال بھی گذر جائے، تو زکوۃ واجب ہوگی۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۳۵] نقود وشیئرز میں زکاۃ

۱۲۶۶-سوال: مرے پاس ۶/تولہ سونا ہے، اور ایک ہزار نقد روپیہ ہے، اور ۶۰۰۰۰/روپیہ کے شیئرز ہیں، سال گزرگیا ہے، توان تمام کی زکوۃ کس طرح نکالی جائے گی؟ سونے کی قیمت اور جمع شدہ شیئرز دونوں کی قیمت کوملاکرزکوۃ ادا کی جائے گی، یا صرف پیسوں اور سونے کی زکوۃ تولہ کے اعتبار سے نکالی جائے گی یا کسی اور طریقہ سے؟

مذکورہ ملکیت کی صورت میں قربانی بھی واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً:

آپ کے پاس جوایک ہزارروپیے ہیں، ان کو چاندی کی جانب پھیرا جائے گا، اور ۶/تولہ سونا ہے، اس کی قیمت نکال کواس کو بھی چاندی کی جانب پھیرا جائے گا، مثال کے طور پر، ایک تولہ چاندی کے (۴۰)

---

(۳) (و) يضم (الذهب إلى الفضة) وعكسه بجامع الثمنية (قيمة). (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويضم إلخ) أي عند الاجتماع... وفي البدائع أيضا أن ما ذكر من وجوب الضم إذا لم يكن كل واحد منهما نصابا بأن كان أقل، فلو كان كل منهما نصابا تاما بدون زيادة لا يجب الضم، بل ينبغي أن يؤدي من كل واحد زكاته، فلو ضم حتى يؤدي كله من الذهب أو الفضة فلا بأس به عندنا، ولكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء رواجا وإلا يؤد من كل منهما ربع عشره (قوله: وعكسه) وهو ضم الفضة إلى الذهب، وكذا يصح العكس في قوله وقيمة العرض تضم إلى الثمنين عند الإمام كما مر عن الزاهدي، وصرح به في المحيط أيضا... (قوله: قيمة) أي من جهة القيمة، فمن له مائة درهم وخمسة مثاقيل قيمتها مائة عليه زكاتها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۰۳، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، قبل: مطلب في وجوب الزكاة في دين المرصد، ط: دار الفكر - بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۲۰۱-۲۰۰، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: زكريا - ديوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۹، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، ط: زكريا - ديوبند☆المحيط البرهاني: ۲/ ۲۴۱، كتاب الزكاة، الفصل الثالث بيان مال الزكاة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆العناية شرح الهداية: ۲/ ۲۲۲، كتاب الزكاة، فصل في زكاة العروض، ط: دار الفكر☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۷۱۷، كتاب الزكاة، مدخل، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆تبيين الحقائق: ۱/ ۲۸۰، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: المطبعة الكبرى الاميرية، بولاق - القاهرة)

روپے ہیں، تو ایک ہزار روپے کے ۲۵ر تولے چاندی ہوں گے۔

۱ر تولہ سونا کی قیمت پندرہ سو روپیہ ہے، تو ۶ر تولہ سونے کے نو ہزار روپے ہوئے، اور نو ہزار روپے کے ۲۲۵ر تولہ چاندی ہوں گے، اس طرح کل ملا کر ۲۵۰ر تولہ چاندی ہوا۔

انفع للفقراء کی خاطر سونے اور نقد پیسوں کو چاندی کی طرف پھیرا گیا ہے؛ اس لیے کہ اگر سونے کی طرف پھیرا جاتا، تو ساڑھے سات تولہ سونا نہ ہو پاتا، حالاں کہ مسئلہ یہ ہے کہ جہاں سونا اور چاندی دونوں جمع ہوں، تو انفع للفقراء کے تقاضے کے مطابق چاندی کی طرف پھیرا جائے گا۔[1]

شیئرز آمدنی کے لیے ہیں، تو آمدنی پر زکوۃ واجب ہوگی۔[2] اور اگر تجارت کے لیے ہیں، تو کل شیئرز

---

(۱) (و) يضم (الذهب إلى الفضة) وعكسه بجامع الثمنية (قيمة). (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويضم إلخ) أي عند الاجتماع. . . . وفي البدائع أيضا أن ما ذكر من وجوب الضم إذا لم يكن كل واحد منهما نصابا بأن كان أقل، فلو كان كل منها نصابا تاما بدون زيادة لا يجب الضم؛ بل ينبغي أن يؤدي من كل واحد زكاته، فلو ضم حتى يؤدي كله من الذهب أو الفضة فلا بأس به عندنا، ولكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء رواجا وإلا يؤد من كل منهما ربع عشره (قوله: وعكسه) وهو ضم الفضة إلى الذهب، وكذا يصح العكس في قوله وقيمة العرض تضم إلى الثمنين عند الإمام كما مر عن الزاهدي، وصرح به في المحيط أيضا. . . (قوله: قيمة) أي من جهة القيمة، فمن له مائة درهم وخمسة مثاقيل قيمتها مائة عليه زكاتها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۰۳، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، قبل: مطلب في وجوب الزكاة في دين المرصد، ط: دار الفكر- بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۴۰۱-۴۰۰، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: زكريا- ديوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۹، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، ط: زكريا- ديوبند☆المحيط البرهاني: ۲/ ۲۴۱، كتاب الزكاة، الفصل الثالث بيان مال الزكاة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆العناية شرح الهداية: ۲/ ۲۲۲، كتاب الزكاة، فصل في زكاة العروض، ط: دار الفكر☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ص: ۷۱۷، كتاب الزكاة، مدخل، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆تبيين الحقائق: ۱/ ۲۸۰، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: المطبعة الكبرى الاميرية، بولاق-القاهرة)

(۲) یعنی شیئرز کا اصل مقصد سالانہ منافع حاصل کرنا ہے، تو اس صورت میں زکاۃ، شیئرز کی مارکیٹ قیمت کے اس حصے پر واجب ہوگی، جو قابل زکاۃ اثاثوں کے مقابلے میں ہوگی، مثلا: شیئرز کی مارکیٹ ویلیو سو روپیہ ہے، جس میں سے ساٹھ روپے بلڈنگ اور مشینری کے مقابل میں ہیں، اور چالیس روپے خام مال، تیار مال اور نقد روپے کے مقابلے میں ہیں، تو اس صورت میں چوں کہ ان شیئرز کے ۴۰ر روپے قابل زکاۃ حصوں کے مقابلے میں ہیں، اس لیے صرف چالیس روپے کی زکاۃ ڈھائی فی صد کے حساب سے ایک روپیہ ہوگی، اور ساٹھ روپے کی زکاۃ واجب نہ ہوگی۔ (دیکھیے، فقہی مقالات: ۱/ ۱۵۵، مضمون نمبر: ۴، شیئرز کی خرید و فروخت، شیئرز پر زکاۃ کا مسئلہ، ط: میمن اسلامک پبلیشرز، کراچی)
=

کی قیمت پر یعنی ۶۰۰۰۰/ پر زکوۃ ہوگی۔[۱]

جس پر زکوۃ واجب ہے، اس پر قربانی بھی واجب ہوگی۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۶] بینک وغیرہ میں جمع شدہ رقم بہ قدرِ نصاب ہو، تو زکوۃ واجب ہوگی

۱۲۶۷- سوال: اگر کسی نے تدریجا موقع بہ موقع بینک میں پیسے جمع کروائے اور چار پانچ سال کی مدت میں وہ رقم اتنی بڑھ گئی کہ اس سے چاندی کا نصاب پورا ہوجاتا ہے، اگر جمع کرانے والا ایسی حالت میں ہو کہ زمین کی پیداوار استعمال نہ کرتا ہو اور مشترکہ گھر میں بیک وقت ملازمت کی وجہ سے رہتا نہ ہو، تو کیا اس جمع شدہ رقم پر- جو نصاب کے بہ قدر ہے- زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ فتاویٰ دارالعلوم[۳] اور

= ولو اشترى قدورا من صفر يمسكها ويؤاجرها لا تجب فيها الزكاة كما لا تجب في بيوت الغلة. (الفتاوى الهندية:۱/ ۱۸۰، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصابا من الورق والذهب كذا في الهداية. . . . ولو أن نخاسا يشتري دواب أو يبيعها فاشترى جلاجل أو مقاود أو براقع فإن كان بيع هذه الأشياء مع الدواب ففيها الزكاة، وإن كانت هذه لحفظ الدواب بها فلا زكاة فيها كذا في الذخيرة. وكذلك العطار لو اشترى القوارير، ولو اشترى جوالق ليؤاجرها من الناس فلا زكاة فيها؛ لأنه اشتراها للغلة لا للمبايعة كذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية:۱/ ۱۸۰-۱۷۹، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر)

(۲) وشرائطها [الأضحية]: الإسلام والإقامة واليسار الذي يتعلق به) وجوب (صدقة الفطر) [الدر المختار]

قال ابن عابدين: (قوله واليسار إلخ) بأن ملك مائتي درهم أو عرضا يساويها غير مسكنه وثياب اللبس أو متاع يحتاجه إلى أن يذبح الأضحية ولو له عقار يستغله فقيل تلزم لو قيمته نصابا. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۱۲، أول كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

(۳) سوال نمبر ۱: جو روپیہ ڈاک خانہ میں تین سال سے جمع ہوں، اس پر زکوۃ کا کیا حکم ہے؟

سوال نمبر ۲: جو روپیہ کسی بینک کو بہ طور قرض دیا گیا ہے، اس پر زکوۃ کا کیا حکم ہے؟

سوال نمبر ۳: جو روپیہ گورنمنٹ کو قرض دیا گیا ہے، اس پر زکوۃ کا کیا حکم ہے؟

سوال نمبر ۴: جو روپیہ لین دین میں لگایا جاتا ہے اور قرض دیا جاتا ہے، اس پر زکوۃ کا حکم ہے؟

جواب: (۱ تا ۴) ان سب صورتوں میں زکوۃ کا حکم یہ ہے کہ بعد وصول ہونے کے سنین گزشتہ کی بھی زکوۃ دینی واجب ہوگی۔ (فتاویٰ دارالعلوم: ۶/ ۳۳- ۱۳۴، سوال نمبر: ۲۰۳- ۲۰۶، کتاب الزکاۃ، سونا، چاندی اور نقد کی زکوۃ، ڈاک خانہ میں جمع شدہ روپے کی زکوۃ وغیرہ، ط: دارالعلوم- دیوبند)

فتاویٰ رحیمیہ [1] میں سرکاری بینک، پوسٹ آفس (ڈاک خانہ) وغیرہ میں جمع شدہ رقم پر زکوۃ کے وجوب کا فتویٰ دیا گیا ہے، وہ کیوں کر؟

الجواب حامدا و مصلیا:

مرد ہو یا عورت، اگر اس کے پاس ضرورت سے زائد مال، چاندی یا سونا میں سے کسی نصاب کو پہنچ جائے، اور اس پر سال گذر جائے، تو زکوۃ واجب ہوگی، خواہ وہ مال میراث میں آیا ہو یا ملازمت کی وجہ سے حاصل ہوا ہو یا کھیتی باڑی کی وجہ سے یا کسی اور ذریعہ سے ہو۔ [2]

فتاویٰ دار العلوم اور فتاویٰ رحیمیہ میں سرکاری بینک اور ڈاک خانے کی رقم پر وجوب زکوٰۃ کے سلسلے میں جو لکھا ہے، وہ بالکل درست ہے۔

اسی طرح کھیتی باڑی، ملازمت، ہدیہ اور تحفہ وتحائف کی مجموعی رقم، نصاب کے بہ قدر ہو جائے، اور

---

(۱) سوال: بینک میں رقم رکھی ہوئی ہے، ایک برس اس پر گذر گیا تو زکوۃ ہے یا نہیں؟

جواب: اگر صاحب نصاب ہے، تو زکوۃ واجب ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۱۷۶/۷، کتاب الزکاۃ، بینک کی جمع شدہ رقم پر سال گذر جائے تو کیا حکم ہے؟ ط: دار الاشاعت-کراچی)

[۲] "الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما و حال عليه الحول". (الهداية: ۱۸۵/۱، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

(وسببه) أي سبب افتراضها (ملك نصاب حولي) نسبة للحول لحولانه عليه (تام) ... (فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد) ... (و) فارغ (عن حاجته الأصلية) لأن المشغول بها كالمعدوم... (نام ولو تقديرا) [الدر المختار على رد المحتار: ۲/۲۵۹ - ۲۶۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر]

أموال الزكاة أنواع ثلاثة أحدها: الأثمان المطلقة وهي الذهب والفضة، والثاني: أموال التجارة وهي العروض المعدة للتجارة، والثالث: السوائم. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود، الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱۶/۲، كتاب الزكاة، فصل الأثمان المطلقة وهي الذهب والفضة، ط: دار الكتب العلمية)

الزكاة واجبة في الذهب والفضة... إذا بلغت الفضة مائتي درهم والذهب عشرين مثقالا... ويضم الذهب إلى الفضة، والفضة إلى الذهب، ويكمل إحدى النصابين بالآخر عند علمائنا... يريد به أن يقوم الذهب بالدراهم و ينظر إن بلغ نصابا بالدراهم، تجب فيها الزكاة، وإلا فلا. (الفتاوى التاتار خانية: ۵۸/۳ - ۱۵۴، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في زكاة المال، ط: زكريا - ديوبند)

الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصابا من الورق والذهب كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱۷۹/۱، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر)

اس پر سال گذر جائے، تو زکوۃ واجب ہو جائے گی، ہاں اگر نصاب سے ذرا بھی کم ہو، تو وجوبِ زکوۃ کا حکم نہیں ہوگا۔ (۱)

اگر مختلف نوعیت کا نصاب ہو، یعنی سونا ایک تولہ اور ۳۰۰ / یا ۴۰۰ روپے ہوں، تو انفع للفقراء کے پیش نظر چاندی کے نصاب کی طرف پھیرا جائے گا، اگر سونا اور نقد رقم کا مجموعہ چاندی کے نصاب کو پہنچ جاتا ہے، تو زکوۃ واجب ہوگی۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۷] زکوۃ کے متعلق چند سوالات

۱۲۶۸- سوال: ہم فی الحال زمبابوے میں مقیم ہیں، ہمیں درج ذیل چند سوالات کے جواب مطلوب ہیں، مہربانی فرما کر جواب مرحمت فرمائیں۔

(۱) ہم لوگ انڈیا یا دوسرے ممالک سے سونا خرید کر زیورات بناتے ہیں اور قیمتِ خرید بہت زیادہ ہوتی ہے، جب کہ قیمتِ فروخت بہت کم ہوتی ہے، گویا جس وقت ہم نے سونا لیا تھا، اس وقت اس کی قیمت زیادہ تھی، اب (استعمال کی وجہ سے) اس کی قیمت کم ہوگئی ہے، تو ہمیں زکوۃ دیتے وقت کون سی قیمت کا اعتبار کرنا چاہیے، قیمتِ خرید کا یا قیمتِ فروخت کا، نیز اس کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، تو ہمیں کس حساب سے زکوۃ ادا کرنی چاہیے؟

(۲) ہم گھر خریدنا چاہتے ہیں، جس کی شدید ضرورت ہے؛ لیکن ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں، جو اس کے لیے کافی ہو سکے، اگر بینک یا کسی دوسرے ذریعے سے قرض حاصل کرتے ہیں، تو رقم سود پر ملتی

---

(۱) "ليس فيما دون مائتي درهم صدقة" لقوله عليه الصلاة والسلام "ليس فيما دون خمس أواق صدقة" والأوقية أربعون درهما" فإذا كانت مائتين وحال عليها الحول ففيها خمسة دراهم" لأنه عليه الصلاة والسلام كتب إلى معاذ رضي الله عنه "أن خذ من كل مائتي درهم خمسة دراهم ومن كل عشرين مثقالا من ذهب نصف مثقال". (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۱۰۳، باب زكاة المال، فصل في الفضة، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

(۲) "الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصابا من الورق أو الذهب" لقوله عليه الصلاة والسلام فيها" يقومها فيؤدي من كل مائتي درهم خمسة دراهم" ولأنها معدة للاستنماء بإعداد العبد فأشبه المعد بإعداد الشرع وتشترط نية التجارة ليثبت الإعداد. ثم قال: "يقومها بما هو أنفع للمساكين" احتياطا لحق الفقراء. (حوالہ سابق: ۱/ ۱۰۳، باب زکاۃ المال، فصل فی العروض)

ہے، تو کیا اس صورت میں، شریعت کی رو سے، ہمارے لیے سود پر پیسہ حاصل کر کے مکان خرید نا جائز ہے ؟

(۳) ہم پر زمبابوے میں زکوۃ فرض ہوئی اور ہمیں اس کو انڈیا میں انڈین کرنسی میں بدل کر دینا ہو، تو کس طرح دیں گے؟ سوال کی وجہ یہ ہے کہ زمبابوے کا ڈالر انڈیا کے روپیہ سے نو گنا زیادہ ہے۔

(۴) ہم زکوۃ کے پیسے انڈین کرنسی میں تبدیل کر کے انڈیا بھیجنا چاہتے ہیں؛ لیکن قانون کے مطابق ہم وہ پیسے نہیں بھیج سکتے، تو کیا ہم غیر قانونی طور پر زیادہ نرخ پر، وہ پیسے بھیج سکتے ہیں؟ مثلاً: قانونا بھیجا جائے، تو دو سو زمبابوے ڈالر کے، سرکاری نرخ کے مطابق، اٹھارہ سو ہندوستانی روپیے ہوں گے، لیکن غیر قانونی طور پر بھیجا جائے، تو دو سو کے صرف نو سو ہندوستانی روپے ملیں گے۔ الغرض اس طرح بھیجنے میں جو کچھ کمی ونقصان آئے، کیا ہم اس کو زکوۃ میں منہا کر سکتے ہیں؟

(۵) کیا ہم للہ پیسے مذکورہ طریقہ سے بھیج سکتے ہیں؟

(۶) فی الحال سال کے شروع میں ہمارے پاس ۱۰۰۰ر ڈالر ہے، اور سال کے اخیر میں وہ بڑھ کر ۵۰۰۰ر (پانچ ہزار) ہو جائیں، تو کیا ہم زکوۃ ۵۰۰۰ (ایک ہزار) کی زکوۃ دیں گے، یا ۱۰۰۰ر کی، واضح رہے کہ ۵۰۰۰ر پر ابھی حولان حول نہیں ہوا ہے۔

(۷) سونا کا بھاؤ ایک حال پر نہیں رہتا، عموماً خریدی مہنگی ہوتی ہے، اور بیچتے وقت اس کی قیمت (استعمال کی وجہ سے) کم ہو جاتی ہے، تو ہم کس کا اعتبار کر کے زکوۃ ادا کریں؟

(۸) ایک شخص قرض دار ہے، لیکن اس کے پاس تھوڑا سونا ہے، تو اب وہ زکوۃ کس طرح ادا کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) زکوۃ کی ادائیگی کے وقت سنار کے پاس جا کر زیورات کی قیمت معلوم کی جائے، وہ جو قیمت بتلائے، اس کے مطابق زکوۃ ادا کی جائے۔[1]

---

(۱) وإن أدى القيمة تعتبر قيمتها يوم الوجوب. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۰، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر)

ولو از دات قيمتها قبل الحول تعتبر قيمتها وقت الوجوب بالإجماع. (الفتاوى التاتارخانية: ۳/۱۷۰، كتاب الزكاة، الفصل الثالث في بيان زكاة عروض التجارة، ط: مكتبة زكريا - ديوبند)

وتعتبر القيمة يوم الوجوب، وقالا يوم الأداء. وفي السوائم يوم الأداء إجماعا، وهو الأصح، ويقوم في البلد =

(۲) اگر جان و مال کی حفاظت کے لیے مسلم علاقہ میں گھر ملتا ہو، تو سود پر رقم لے کر گھر خرید سکتے ہیں؛ لیکن اس کو گناہ سمجھ کر اللہ سے توبہ کرتے رہنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ دلوں کی بات جانتے ہیں۔ (۲)

(۳) جتنے ڈالر پر زکوۃ فرض ہے، اس کا چالیسواں حصہ زکاۃ میں نکالنا ضروری ہے، خواہ وہ چالیسواں حصہ زمبابوے کے ڈالروں سے ادا کریں، یا اس چالیسواں حصہ کے مقابلے میں جو روپے گورنمنٹ کے نرخ کے مطابق ہندوستان میں ملے، ان سے ادائیگی کریں، دونوں صورتیں درست ہیں۔ (۳)

(۴) اس طرح زکاۃ کی ادائیگی میں رقم کی ادائیگی میں جو کمی واقع ہو رہی ہے، اس کو زکوۃ سے منہا نہیں کیا جائے گا، بل کہ سرکاری نرخ کے مطابق جو رقم بنتی ہو، اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔ (۴)

= الذي المال فيه ولو في مفازة ففي أقرب الأمصار إليه، فتح. (الدر المختار: ۲/۸۶-۲۸۵) ـــــــ وقال ابن عابدين: (قوله وهو الأصح) أي كون المعتبر في السوائم يوم الأداء إجماعا هو الأصح فإنه ذكر في البدائع أنه قيل إن المعتبر عنده فيها يوم الوجوب، وقيل يوم الأداء. اهـ ـــــ وفي المحيط: يعتبر يوم الأداء بالإجماع وهو الأصح اهـ فهو تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما، وعليه فاعتبار يوم الأداء يكون متفقا عليه عنده وعندهما (قوله: ويقوم في البلد الذي المال فيه) فلو بعث عبدا للتجارة في بلد آخر يقوم في البلد الذي فيه العبد بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۸۶، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

(۲) وفي القنية والبغية: يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (انتهى)

وفي حاشية الحموي: وذلك نحو أن يقترض عشرة دنانير مثلا ويجعل لربها شيئا معلوما في كل يوم ربحا. (الأشباه والنظائر: ۱/۳۲۷، القاعدة الخامسة: الضرر يزال، ط: فقيه الأمة - ديوبند)

(۳) المال الذي تجب فيه الزكاة أدى زكاته من خلاف جنسه أدى قدر قيمة الواجب إجماعا. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۰، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر)

(۴) اصل میں جس قدر زکاۃ واجب ہو، اتنی مقدار کا مستحق زکوۃ کو مالک بنانا ضروری ہے، مذکورہ صورت میں زمبابوے کے اگر دو سو ڈالر واجب ہوئے، جو سرکاری نرخ کے حساب سے ہندوستانی اٹھارہ سو روپے کے برابر ہیں، اور غیر قانونی طور پر بھیجنے میں مستحق کو صرف نو سو روپے ملے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نو سو روپے ہی فقرا تک پہنچے، نہ کہ اٹھارہ سو، لہٰذا مزید نو سو ہندوستانی روپے بطور زکوۃ نکالنا ضروری ہوگا، اس کی مثال ہمارے یہاں منی آرڈر کے ذریعے پیسے بھیجنے کی ہے، کہ منی آرڈر کی فیس زکوۃ سے منہا نہیں کی جا سکتی، درج ذیل سوال و جواب سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

سوال: زکوۃ کا روپیہ اگر بذریعہ منی آرڈر روانہ کیا جاوے، تو فیس منی آرڈر اس میں سے دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بذریعہ منی آرڈر بھیجنا زکوۃ کے روپے کا، درست ہے، مگر فیس منی آرڈر علاحدہ اپنے پاس سے دینی چاہیے۔

استاذ گرامی، آفتاب فقہ دار العلوم دیوبند کے عظیم مفتی، حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلے کی وضاحت کرتے =

(۵) اللہ میں کوئی خاص عدد متعین نہیں ہوتا۔ (۵)

(۶) ۵۰۰۰/روپے، جو سال کے اخیر میں بچ گئے ہیں، ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (۶)

(۷) جس دن زکوٰۃ ادا کرنی ہو اس دن سنار کے پاس جا کر کرانداز ہ لگا کر اس کے حساب سے ادا کی جائے گی۔ (۷)

(۸) سونا، چاندی اور ضرورت سے زائد نقود کا مجموعہ، دین کو منہا کر کے، اگر بہ قدر نصاب بچ جائے، تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اور قرض کے بہ قدر مالیت منہا کرنے کے بعد باقی مال کا چالیسواں حصہ ادا کرنا لازم

= ہوئے لکھتے ہیں: ''اور یہ مسلّم ہے کہ فیس منی آرڈر، فقراء کو نہیں ملتی؛ اس لیے وہ زکوٰۃ میں شمار نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم۔'' (فتاویٰ دارالعلوم: ۶/ ۳۵-۳۳۴، متفرق مسائل زکوٰۃ، سوال نمبر: ۶۱۱، زکوٰۃ کی رقم بذریعہ ڈاک بھیجنے میں فیس کہاں سے دی جائے، ط: زکریا-دیوبند)

ویقوم في البلد الذي المال فیه ولو في مفازة ففي أقرب الأمصار إلیه ، فتح. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲۸۶/۲، کتاب الزکاة، باب زکاة الغنم، ط: دار الفکر)

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں عنوان ''زامبیا کے ''کوچوں'' کو ہندوستان کے ''روپیوں'' میں تبدیل کر کے زکوٰۃ ادا کرنا''۔

(۵) یستحب أن یتصدق بما تیسر، ولا یستقله، ولا یمتنع من الصدقة به لقلته وحقارته، فإن قلیل الخیر کثیر عند الله تعالی، وما قبله الله تعالی وبارك فیه، فلیس هو بقلیل، قال الله تعالی: ﴿فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یره﴾ [الزلزال]، وفي الصحیحین عن عدي بن حاتم: اتقوا النار ولو بشق تمرة، وفي الصحیحین أیضا عن أبي هریرة: یا نساء المسلمات لا تحقرن جارة أن تهدي لجارتها ولو فرسن شاة، والفرسن من البعیر والشاة کالحافر من غیرهما. وروی النسائي وابن خزیمة وابن حبان عن أبي هریرة: سبق درهم مائة ألف درهم، فقال رجل: وکیف ذاك یا رسول الله؟ قال: رجل له مال کثیر أخذ من عرضه -جانبه- مائة ألف درهم تصدق بها، ورجل لیس له إلا درهمان، فأخذ أحدهما، فتصدق به. (الفقه الإسلامي وأدلته: ۲/ ۹۱۸، الزکاة وأنواعها، الفصل الثالث: صدقة التطوع، سادسا: التصدق بما تیسر، ط: دار الفکر)

(۶) فأما المستفاد في خلال الحول فهل یشترط له حول علی حدة، أو یضم إلی الأصل، فیزکی بحول الأصل؟... والمستفاد في الحول لا یخلو إما أن کان من جنس الأصل، وإما أن کان من خلاف جنسه.——— فإن کان من خلاف جنسه کالإبل مع البقر والبقر مع الغنم فإنه لا یضم إلی نصاب الأصل بل یستأنف له الحول بلا خلاف وإن کان من جنسه فأما إن کان متفرعا من الأصل أو حاصلا بسببه کالولد والربح، وأما لم یکن متفرعا من الأصل ولا حاصلا بسببه کالمشتری والموروث والموهوب والموصی به فإن کان متفرعا من الأصل أو حاصلا بسببه یضم إلی الأصل ویزکی بحول الأصل بالإجماع.——— وإن لم یکن متفرعا من الأصل ولا حاصلا بسببه فإنه یضم إلی الأصل عندنا. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۴، کتاب الزکاة، فصل الشرائط التي ترجع إلی المال، ط: دار الکتب العلمیة)

(۷) حاشیہ نمبر (۱) ملاحظہ کریں۔

ہوگا، اگر قرض وضع کرنے کے بعد نصاب کے بہ قدر مال نہ بچے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ مثلاً: سونے، چاندی اور نقود کا مجموعہ ۵۰۰۰ ؍ رہو، اور ۲۰۰۰ ؍ قرض ہو، تو دو ہزار قرض منہا کر کے، صرف ۳۰۰۰ (تین ہزار) کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔"[1] [نوٹ: جس زمانے میں یہ فتویٰ لکھا گیا ہے، اس زمانے میں شاید دو ہزار روپے نصاب کے بہ قدر رہے ہوں گے، گرچہ یہ مثال ہے؛ لیکن اسی زمانے کے اعتبار سے ہے] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۸] کسی کے پاس سونے کے ساتھ کچھ نقد بھی ہو، تو زکوٰۃ دونوں پر ہوگی یا کسی ایک پر؟

۱۲۶۹- سوال: میرے پاس سات تولہ سونا ہے، اور تیس ہزار روپے نقد ہیں، تو دونوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے یا کسی ایک کی؟ اس باب میں حکمِ شرعی کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

سونے کے نصاب سے آپ کے پاس نصف تولہ سونا کم ہے، لہٰذا سات تولہ سونے کی قیمت بازار سے معلوم کر کے اُس کی قیمت نقد میں ملا کر (سونے اور چاندی میں سے کسی بھی نصاب کے بہ قدر ہو، تو) دونوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے، اور اگر آپ کے پاس چاندی کے بھی زیورات ہوں، تو اس کی قیمت کو بھی شمار کیا جائے گا اور کل مال کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن السائب بن يزيد، أن عثمان بن عفان رضي الله عنه، كان يقول: هذا شهر زكاتكم، فمن كان عليه دين، فليؤد دينه حتى تحصل أموالكم، فتؤدوا منها الزكاة. قال محمد: وبهذا نأخذ، من كان عليه دين وله مال فليدفع دينه من ماله، فإن بقي بعد ذلك ما تجب فيه الزكاة ففيه زكاة، وتلك مائتا درهم، أو عشرون مثقالا ذهبا فصاعدا، وإن كان الذي بقي أقل من ذلك، بعد ما يدفع من ماله الدين فليست فيه الزكاة، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (موطأ مالك برواية محمد بن الحسن الشيباني المعروف بـ 'موطأ الإمام محمد': ۱/ ۱۱۴، رقم الحديث: ۳۲۳، كتاب الزكاة، باب: زكاة المال، ت: عبد الوهاب عبد اللطيف، : المكتبة العلمية)

"ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكاة عليه" وقال الشافعي رحمه الله تجب لتحقق السبب وهو ملك نصاب تام ولنا أنه مشغول بحاجته الأصلية فاعتبر معدوما كظماء المستحق بالعطش وثياب البذلة والمهنة "وإن كان ماله أكثر من دينه زكى الفاضل إذا بلغ نصابا" لفراغه عن الحاجة. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۹۵، أول كتاب الزكاة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

(۲) (قوله: وتضم قيمة العروض إلى الثمنين والذهب إلى الفضة قيمة) أما الأول فلأن الوجوب في الكل باعتبار التجارة، وإن افترقت جهة الإعداد، وأما الثاني فللمجانسة من حيث الثمنية، ومن هذا الوجه صار سببا، وضم إحدى=

[۳۹] کرایہ پردی ہوئی زمین میں، زکوۃ زمین کی قیمت پر واجب ہوگی یا کرایہ پر؟

۱۲۷۰- سوال: (۱) ہم نے اپنے ایک رشتہ دار کے ساتھ حصہ داری میں پولٹری فارم (مرغیوں کے پالنے کا کام) شروع کیا ہے، جس کی زمین میری ملکیت میں ہے، اور میں اپنے حصہ دار سے اُس زمین کا سالانہ کرایہ وصول کرتا ہوں، دریافت یہ کرنا ہے کہ اُس میں زکاۃ، کرایہ پر واجب ہوگی یا زمین کی قیمت پر؟

(۲) پولٹری فارم میں مرغیوں کو رکھنے کے لیے جو تعمیری کام ہوا ہے، اُسے سات سال ہو چکے ہیں، تو زکوۃ میں اُس تعمیر کی قیمت کا حساب کیسے کیا جائے گا؟

(۳) اگر کسی کی دوکان ہے، تو دوکان کی عمارت کی قیمت پر زکوۃ واجب ہوگی یا صرف دوکان کے مالِ تجارت پر؟

(۴) زکوۃ کی رقم میں حیلہ کرکے اُسے مسجد یا مدرسہ میں استعمال کرنا مناسب ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) پولٹری فارم کی زمین، آمدنی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اُس پر زکوۃ نہیں ہے، اس لیے کہ وہ اموالِ تجارت میں نہیں ہے، البتہ اُس زمین کا جو سالانہ کرایہ ہے، مجموعۂ مال میں شمار کرکے اس کی زکوۃ حسب ضابطہ واجب ہوگی، اسی طرح ہر وہ چیز، جو آمدنی حاصل کرنے کا ذریعہ ہو، اور خود فروخت کے لیے نہ ہو، مثلاً: زمین، جس پر دوکان ہے، یا مشین، جس کے ذریعہ کام لیا جاتا ہو، تو اُن پر زکوۃ نہیں ہے، اگر ان اشیاء میں تجارت کی نیت کی ہے، تو زکوۃ واجب ہوگی، اور پولٹری فارم کی زمین میں آپ کی نیت، اُسے بیچنے کی نہیں ہے؛ لہٰذا اُس کی قیمت پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ (۱)

(۲) پولٹری فارم کی تعمیر بھی آمدنی حاصل کرنے کے ذرائع میں داخل ہے، لہٰذا اُس پر بھی زکوۃ

=النقدين إلى الآخر قيمة مذهب الإمام، وعندهما الضم بالأجزاء، وهو رواية عنه، حتى إن من كان له مائة درهم وخمسة مثاقيل ذهب تبلغ قيمتها مائة درهم فعليه الزكاة عنده. (البحر الرائق: ۱/ ۲۰۰-۲۰۱، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: زكريا-ديوبند☆الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۲۳۴، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: زكريا- ديوبند ☆الفتاوى التاتارخانية: ۲/ ۱۸۵، الفصل الثاني في زكاة المال، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۹، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب و الفضة، ط: زكريا-ديوبند☆بدائع الصنائع: ۲/ ۱۰۷، كتاب الزكاة، فصل في مقدار الواجب، ط: زكريا- ديوبند)

(۱) حاشیہ نمبر ۱ اور ۲ ایک ساتھ اگلے صفحہ پر =

واجب نہیں ہوگی۔ (۲)

(۳) دوکان کی عمارت بھی آمدنی حاصل کرنے کا ذرائع میں داخل ہے، اس پر بھی زکوۃ واجب نہیں۔ (۳)

(۴) بغیر کسی مجبوری کے حیلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۰] دانتوں میں استعمال شدہ سونے پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

۱۲۷۱- سوال: دانت بنوانے، دانتوں میں تار بندھوانے یا دانتوں کا خلا پُر کرنے کے لیے

(۱-۲) (ولا في ثياب البدن) المحتاج إليها لدفع الحر والبرد ابن ملك (وأثاث المنزل ودور السكنى ونحوها) وكذا الكتب وإن لم تكن لأهلها إذا لم تنو للتجارة، ... وكذلك آلات المحترفين. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وكذلك آلات المحترفين) أي سواء كانت مما لا تستهلك عينه في الانتفاع كالقدوم والمبرد أو تستهلك، لكن هذا منه ما لا يبقى أثر عينه، كصابون وجرض الغسال، ومنه ما يبقى كعصفر وزعفران لصباغ ودهن وعفص لدباغ فلا زكاة في الأولين، لأن ما يأخذه من الأجرة بمقابلة العمل. وفي الأخير الزكاة إذا حال عليه الحول لأن المأخوذ بمقابلة العين كما في الفتح. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۵، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) إذا آجر داره أو عبده بمائتي درهم لا تجب الزكاة ما لم يحل الحول بعد القبض، في قول أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - فإن كانت الدار والعبد للتجارة، وقبض أربعين درهما بعد الحول، كان عليه درهم بحكم الحول الماضي قبل القبض؛ لأن أجرة دار التجارة وعبد التجارة بمنزلة ثمن مال التجارة في الصحيح من الرواية. (فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۱/ ۲۵۳، كتاب الزكاة، فصل في مال التجارة، ط: زكريا - ديوبند)

(۴) مذهب علمائنا - رحمهم الله تعالى - أن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير أو لإدخال شبهة فيه أو لتمويه باطل فهي مكروهة وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال فهي حسنة، والأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله تعالى {وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث} [ص: ۴۴] وهذا تعليم المخرج لأيوب النبي - عليه وعلى نبينا الصلاة والسلام - عن يمينه التي حلف ليضربن امرأته مائة عود وعامة المشايخ على أن حكمها ليس بمنسوخ وهو الصحيح من المذهب كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۶/ ۳۹۰، كتاب الحيل، الفصل الأول في بيان جواز الحيل، ط: دار الفكر)

استاذِ گرامی، آفتابِ فقہ، دار العلوم دیوبند کے عظیم مفتی، حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی - رحمہ اللہ - اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

حیلہ خواہ مخواہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ زکوۃ کے مصارف متعین ہیں، حیلہ کے بعد جو اصل مستحق ہیں، وہ عملاً محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے حیلہ کی صورت انتہائی مجبوری میں اختیار کرنی چاہیے۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۶/ ۱۹۹، حاشیہ نمبر: ۲، مسائل مصارف زکاۃ، حیلہ کے ذریعے زکاۃ کی رقم تبلیغ میں خرچ کرنا کیسا ہے؟ ط: زکریا - دیوبند) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

سونے کا استعمال کیا گیا ہو، تو اُس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

جس مرد یا عورت نے سونے کے دانت بنوائے ہوں، سونے کا تار لگوایا ہو، یا سونے کے ذریعے دانتوں کے درمیان کا خلا پُر کیا گیا ہو، اگر وہ پہلے سے نصاب کا مالک ہو، یا دانتوں میں لگے ہوئے سونے کو ملا کر وہ مالکِ نصاب بن جاتا ہو، تو اُس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، ایسے شخص کے پاس اگر کچھ چاندی موجود ہے اور دانتوں میں لگے ہوئے سونے کی قیمت اُس چاندی کے ساتھ ملائی جائے، تو وہ نصاب تک پہنچ جاتی ہے، تب بھی اُس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اِسی طرح صرف وہ سونا جو دانتوں میں لگا ہوا ہے، ساڑھے سات تولہ تک پہنچ جائے، تو اُس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، یعنی کسی نے تمام دانت سونے کے بنوا لیے ہوں اور وہ سونا ساڑھے سات تولہ کے برابر ہوگیا، تو اُس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔[1]

سونے کے دانت بنوانا حاجتِ اصلیہ میں داخل نہیں ہے، حاجتِ اصلیہ ایسی حاجت کو کہا جاتا ہے، جس کے بغیر انسان زندہ نہ رہ سکتا ہو، مثلاً کھانے اور پینے کا سامان، رہنے کے لیے گھر، گرمی، سردی اور بارش

---

(۱) عن علي رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم ببعض أول هذا الحديث، قال: فإذا كانت لك مائتا درهم، وحال عليها الحول، ففيها خمسة دراهم، وليس عليك شيء - يعني - في الذهب حتى يكون لك عشرون دينارا، فإذا كان لك عشرون دينارا، وحال عليها الحول، ففيها نصف دينار، فما زاد، فبحساب ذلك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۲۱، رقم الحديث: ۱۵۷۳، كتاب الزكاة، باب في زكاة السائمة، ط: مكتبة فيصل ديوبند)

نصاب الذهب عشرون مثقالا. (الدر مع الرد: ۲/ ۲۹۵، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر)

الزكاة واجبة في الذهب والفضة، مضروبة كانت أو غير مضروبة، نوى التجارة أو، لا إذا بلغت الفضة مائتي درهم، والذهب عشرين مثقالاً، وإذا نقص نقصاناً لا يسير أيدخل بين الوزنين لا تجب الزكاة إن كان كاملاً في حق غيره، هكذا ذكر القدوري في كتابه، وهذا لأن الزكاة إنما تجب على المال، فيعتبر كمال النصاب في حقه، فإذا كان ناقصاً في حقه لا تجب الزكاة. (المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الثالث في بيان مال الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۱۵۴، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: زكريا - ديوبند)

هذا إذا كان له فضة مفردة أو ذهب مفرد ــــــ فأما إذا كان له الصنفان جميعا فإن لم يكن كل واحد منهما نصابا بأن كان له عشرة مثاقيل ومائة درهم فإنه يضم أحدهما إلى الآخر في حق تكميل النصاب عندنا. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۰۶، كتاب الزكاة، فصل في مقدار الواجب، ط: زكريا - ديوبند)

سے بچنے کے لیے کپڑے وغیرہ حاجاتِ اصلیہ میں داخل ہوں گے۔ (رد المحتار: ۲/ ۲۶۲)[۲]

فقہاء کے اختلاف کے پیش نظر عبادات میں احتیاط کے پہلو پر عمل اولیٰ ہے، لہٰذا دانتوں میں لگے ہوئے سونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۲] حوائج اصلیہ کی تشریح یوں کی گئی ہے:

(و) فارغ (عن حاجته الأصلية) لأن المشغول بها كالمعدوم. وفسره ابن ملك بما يدفع عنه الهلاك تحقيقا كثيابه أو تقديرا كدينه. (الدر المختار)ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله وفسره ابن ملك) أي فسر المشغول بالحاجة الأصلية والأولى فسرها، وذلك حيث قال: وهي ما يدفع الهلاك عن الإنسان تحقيقا كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج إليها لدفع الحر أو البرد أو تقديرا كالدين، فإن المديون محتاج إلى قضائه بما في يده من النصاب دفعا عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك وكآلات الحرفة وأثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لأهلها فإن الجهل عندهم كالهلاك، فإذا كان له دراهم مستحقة بصرفها إلى تلك الحوائج صارت كالمعدومة، كما أن الماء المستحق بصرفه إلى العطش كان كالمعدوم وجاز عنده التيمم. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۲، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) حاجت اصلیہ کی جو تشریح کی گئی ہے، اس کی روشنی میں دانتوں میں استعمال شدہ سونے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہیے، علمائے دیوبند کے متعدد فتاویٰ میں بھی یہی ہے کہ زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، چند فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

سوال: اکثر لوگ، دانت سونے کے تاروں سے بندھوا لیتے ہیں، یا کھوکھلے دانت کے اندر سونا بھروا لیتے ہیں، سونے کی ناک بنوا کر چہرے پر لگاتے ہیں، اور یہ ناک بلا حرج جدا بھی ہو سکتی ہے، لیکن دانت میں سے اس طرح سونا جدا نہیں ہو سکتا، سوال یہ ہے کہ آیا صاحب نصاب پر اس سونے میں بھی زکوٰۃ ہوگی؟

جواب: في الدر المختار بعد عد الجزئيات المتعددة التي لا فيها الزكاة ما نصه لعدم النمو في رد المحتار: لأنه غير متمكن من الزيادة، الخ. (۲/ ۱۴) اس تعلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ناک میں تو زکوٰۃ واجب ہے، اور جو سونا دانت میں لگا یا بھرا ہے، اس میں واجب نہیں۔ (امداد الفتاویٰ: ۲/ ۴۹، رقم المسئلۃ: ۷۷، کتاب الزکاۃ والصدقات، سونے کی ناک یا دانتوں پر زکوٰۃ۔ ط: زکریا - دیوبند)

استاذ محترم، فقیہ العصر، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

بعض حالات میں اور بعض خاص مصلحت کے پیش نظر سونے چاندی کے مصنوعی اعضاء کا استعمال کیا جاتا ہے، جیسے: ناک، دانت، کھوکھلے دانتوں کا سونے چاندی سے بھرنا، سونے کے تاروں سے دانت کو باندھنا وغیرہ، ان میں سے بعض کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کو آسانی سے نکالا جا سکتا ہے اور ان کو رکھا ہی اس طرح جاتا ہے کہ ان کو لگایا اور نکالا جا سکے، جب کہ بعض اعضاء میں یہ دھاتیں اس طرح فٹ کی جاتی ہیں کہ ان کو آسانی سے نکالا نہیں جا سکتا، بل کہ وہ مستقل طور پر لگا دی جاتی ہیں۔

جو اعضاء نکالے جا سکتے ہیں، جیسے کہ ناک وغیرہ، ان میں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے زیورات میں زکوٰۃ =

[۴۱] حادثے کی بناء پر ملنے والے سرکاری معاوضہ پر سود وزکوٰۃ کا حکم

۱۲۷۲- سوال: (۱) ایک مرتبہ میرے ساتھ دورانِ سفر حادثہ پیش آیا، جس پر حکومت کی جانب سے ایک رقم بطور فکس ڈپوزٹ کے میرے نام بینک میں جمع کی گئی ہے، اپنے نام پر ہونے کے باوجود میں قانوناً سات سال تک اس رقم کو استعمال نہیں کر سکتا، سات سال کے بعد ہی میں اُس کا حق دار بنوں گا، سات سال تک ضرورت کے باوجود اُسے میں نہیں لے سکتا، بینک کی جانب سے اُس رقم پر ہر چھ مہینے یا سال کے ختم پر کچھ رقم دی جاتی ہے، جس کے بارے میں میرا غالب گمان یہی ہے کہ وہ سود ہی ہوگا، تو میرے لیے اُن پیسوں کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ چوں کہ آپ نے اپنی رضامندی سے بینک میں یہ رقم جمع نہیں کی؛ بل کہ بالجبر آپ کی رقم بینک میں لی گئی ہے؛ لہٰذا اُس پر ملنے والے پیسے آپ کے لیے لینا جائز ہے، کیا از روئے شریعت میرے لیے اُس رقم کو لینا جائز ہے؟

(۲) بینک میں جمع شدہ اِس رقم کی وجہ سے مجھ پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ جب کہ میں صاحب نصاب نہیں ہوں؛ البتہ اللہ کے فضل سے گذر بسر بآسانی ہوجاتا ہے۔

(۳) اگر اِس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہو اور اُس پر ملنے والے پیسے استعمال کرنا جائز نہ ہو، تو اُن پیسوں سے زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

= واجب قرار دی ہے۔ (ہاں، جو فقہاء زیورات میں زکوٰۃ کے عدمِ وجوب کے قائل ہیں، ان کے نزدیک مصنوعی اعضاء میں بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی) اور جو اس طرح نہ ہوں، ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی؛ اس لیے کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مال نامی ہو، یعنی اس میں نشوونما اور بڑھوتری کی گنجائش ہو، اور موجودہ صورت میں ظاہر ہے کہ اس کا کوئی امکان نہیں، دوسرے جب وہ انسان کے جسم کا ایک ایسا عضو بن جائے، جس کو الگ کیا جانا ممکن نہ ہو، تو اب وہ انسان کی بنیادی ضروریات (حاجاتِ اصلیہ) میں داخل ہوگیا، اور ایسی چیزوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ (جدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۰۸- ۲۰۹، زکوٰۃ، سونے چاندی کے مصنوعی اعضاء پر زکوٰۃ، ط: کتب خانہ نعیمیہ- دیوبند)

حضرت مفتی صاحب کے فتویٰ کو اس صورت پر محمول کیا جاسکتا ہے، کہ ایک آدمی نے ناک کی طرح، مکمل دانت سونے کے بنوائے ہوں، اور ناک کی ہی طرح مصنوعی دانت کا نکالنا ممکن ہو، ایسی صورت میں اس کو نصاب میں شمار کیا جائے گا، اور اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جیسا کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے۔

مزید دیکھیے: کتاب المسائل: ۲/ ۱۳۶، دانتوں میں بندھے ہوئے سونے یا چاندی کے تاروں پر زکوٰۃ نہیں، (مستفاد، از: امداد الفتاویٰ: ۲/ ۳۹، ایضاح المسائل: ۱۰۹، مرغوب الفتاویٰ: ۳/ ۳۳۹)، ط: مرکز علمی برائے نشر و تحقیق، مرادآباد۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) صورتِ مذکورہ میں جب حکومت نے وہ رقم آپ کے قبضہ میں دیے بغیر اُسے بینک میں جمع کروا دیا ہے اور قانوناً آپ اُسے اٹھا بھی نہیں سکتے، تو اُس پر سود کے نام سے ملنے والی رقم آپ کے حق میں شرعی اعتبار سے سود شمار نہیں ہوگی، لہٰذا آپ کے لیے اُن پیسوں کا استعمال جائز ہے۔ (کفایت المفتی)[۱]

(۲) اس رقم پر فی الحال زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اور نہ ہی ملنے پر گذرے ہوئے سالوں کی زکاۃ واجب ہوگی۔ (امداد الفتاویٰ: ۲/ ۴۸)[۲]

(۳) بینک کی جانب سے ملنے والے پیسوں کا استعمال جب آپ کے لیے درست ہے، تو آپ اس کے ذریعے زکوٰۃ بھی ادا کر سکتے ہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] جس طرح پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والی اضافی رقم سود نہیں ہے، اسی طرح حادثے کی صورت میں سرکار کی جانب سے دی جانے والی اس رقم پر، ملنے والی اضافی رقم، کو سود نہیں کہا جا سکتا؛ کیوں کہ دونوں صورتوں میں رقم میں اضافہ، اصل رقم کے مالک کے قبضے میں آنے سے پہلے ہوتا ہے، اس لیے اضافہ اور اصل دونوں کو اصل ہی سمجھا جائے گا۔

بینک کے عام سود کی طرح یہ سود نہیں ہوگا؛ کیوں کہ بینک میں رقم اپنے قبضے سے نکال کر جمع کی جاتی ہے، جب کہ یہاں سرے سے اصل مال پر مالک کا قبضہ ہی نہیں ہے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمہ نے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

پراویڈنٹ فنڈ میں نصف رقم عطیہ ہوتی ہے، اور نصف ملازم کی تنخواہ میں سے وضع کی ہوئی ہوتی ہے، چوں کہ وہ بھی ملازم کے قبضے میں آنے سے پہلے وضع کر لی جاتی ہے، اس لیے اس کا سود اور نصف رقم عطیہ کا سود، دونوں مل کر عطیہ کا حکم لے لیتی ہے، اور نصف رقم، وضع شدہ سے زائد جو رقم ملتی ہے، وہ سب عطیہ ہی قرار پاتی ہے۔ بینک کا سود اس سے مختلف ہے، دونوں میں وجہ فرق یہ ہے کہ بینک میں اپنے قبضے سے نکال کر رقم جمع کی جاتی ہے؛ اس لیے اس کا سود حقیقۃً سود ہوتا ہے۔ (کفایت المفتی: ۸/ ۹۵، کتاب الربا، تیسرا باب پراویڈنٹ فنڈ اور بونس اور پنشن، پراویڈنٹ فنڈ اور بینک کے سود میں فرق، ط: زکریا- دیوبند)

[۲] کیوں کہ رقم (جو بینک میں جمع کی گئی ہے) حادثے سے متاثرہ شخص کا قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ملک میں نہیں آئی ہے، اور وجوب زکاۃ کے لیے ملک ضروری ہے، اس لیے اس رقم پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی:

وأما الشرائط التي ترجع إلى المال فمنها: الملك فلا تجب الزكاة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك وهذا؛ لأن في الزكاة تمليكا والتمليك في غير الملك لا يتصور. (بدائع الصنائع: ۲/ ۹، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(وسببه) أي سبب افتراضها (ملك نصاب حولي) [الدر المختار] ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ملك نصاب) فلا زكاة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك، ولا فيما أحرزه العدو بدارهم لأنهم ملكوه =

[۴۲] حج کی نیت سے جمع کردہ رقم پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

۱۲۷۳- سوال: ایک شخص نے حج کی نیت سے اپنے پاس تیس ہزار روپے جمع کیے ہیں، جن میں سے سات ہزار اُس کے قبضہ میں ہیں، اٹھارہ ہزار بہ طور امانت دوسرے شخص کے پاس رکھے ہوئے ہیں اور پانچ ہزار روپے بہ طور قرض دیے ہوئے ہیں، اِس نقد کے علاوہ اُس کے پاس تین تولہ سونا ہے، تو سال گزرنے پر اِس شخص پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ تیس ہزار روپے، جو اُس نے حج کی نیت سے جمع کیے ہیں ،حج کے لیے ناکافی ہیں، تو کیا بہ نیت حج پیسے جمع کرنے کی وجہ سے اُس پر حج فرض ہو جائے گا؟ نیز یہ شخص معذور ہونے کی وجہ سے چل نہیں سکتا، تو کیا وہ اپنی جگہ، ایسے شخص کو حج بدل میں بھیج سکتا ہے، جس پر حج فرض ہے، لیکن اس نے ادا نہیں کیا ہے، یا حج اُس پر فرض ہی نہیں ہے؛ اس لیے حج کو نہیں گیا ہے، حج کے

=بالإحراز عندنا خلافا للشافعي بدائع، ولا فيما دون النصاب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۵۹، كتاب الزكاة، قبيل: مطلب الفرق بين السبب والشرط والعلة، ط: دار الفكر - بيروت)

چوں کہ یہ دین نہیں ہے، کہ وصولی کے بعد گزشتہ سالوں کی زکاۃ واجب ہو، بل کہ حکومت کی جانب سے ایک قسم کا تبرع ہے، جس پر قبضہ کے بعد ہی ملکیت ثابت ہوتی ہے، البتہ صورۃً دین ہے کہ سرکار نے وہ رقم بینک- جو مستقل ادارہ ہے- کو دی ہے، تاہم یہ دین قوی نہیں ہے، اس لیے قبضہ سے پہلے وجوب زکوۃ کی کوئی وجہ نہیں ہے: وجملة الكلام في الديون أنها على ثلاث مراتب في قول أبي حنيفة: دين قوي، ودين ضعيف، ودين وسط كذا قال عامة مشايخنا، أما القوي: فهو الذي وجب بدلا عن مال التجارة كثمن عرض التجارة من ثياب التجارة، وعبيد التجارة، أو غلة مال التجارة ولا خلاف في وجوب الزكاة فيه إلا أنه لا يخاطب بأداء شيء من زكاة ما مضى. . . ـــــــــ وأما الدين الضعيف: فهو الذي وجب له بدلا عن شيء سواء وجب له بغير صنعه كالميراث، أو بصنعه كما لوصية، أو وجب بدلا عما ليس بمال كالمهر، وبدل الخلع، والصلح عن القصاص، وبدل الكتابة ولا زكاة فيه ما لم يقبض كله، ويحول عليه الحول بعد القبض.

وأما الدين الوسط فما وجب له بدلا عن مال ليس للتجارة كثمن عبد الخدمة، وثمن ثياب البذلة والمهنة وفيه روايتان عنه، ذكر في الأصل أنه تجب فيه الزكاة قبل القبض لكن لا يخاطب بالأداء ما لم يقبض مائتي درهم، فإذا قبض مائتي درهم زكى لما مضى، وروى ابن سماعة عن أبي يوسف عن أبي حنيفة أنه لا زكاة فيه حتى يقبض المائتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو أصح الروايتين عنه.

وقال أبو يوسف ومحمد: الديون كلها سواء، وكلها قوية تجب الزكاة فيها قبل القبض إلا الدية على العاقلة ومال الكتابة فإنه لا تجب الزكاة فيها أصلا ما لم تقبض ويحول عليها الحول. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۰، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۰۵-۳۰۶، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر - بيروت)

بجائے عمرہ کروالے، تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

مسئلۂ مذکورہ میں اگر اِس شخص پر کوئی دین نہیں ہے، تو مذکور رقم اور سونا کی وجہ سے زکوۃ ادا کرنی ضروری ہے، خواہ مال خود اُس کے قبضہ میں ہو یا بہ طورِ امانت یا بہ طور قرض کسی کو دے رکھا ہو۔ (البحر الرائق)[۱]

حج کے لیے کافی ہو سکے، اتنی رقم نہیں ہے، نیز ضرورت سے زائد کوئی جائداد وغیرہ بھی نہیں ہے،[۲] تو ایسے شخص پر صرف حج کی نیت سے کچھ مال جمع کرنے کی وجہ سے حج فرض نہیں ہوتا، جب کہ یہ جمع کردہ مال حج کے لیے ناکافی ہو۔[۳]

---

[۱] في معراج الدراية في فصل زكاة العروض أن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة اهـ. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۲۲۲، كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۲، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام-محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا-أو منلا أو المولى-خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۱/ ۱۷۲، أول كتاب الزكاة، ط: دار إحياء الكتب العربية)

(۲) إذا كان له دار يسكنها وعبد يستخدمه وثياب يلبسها، ومتاع يحتاج إليه لا تثبت به الاستطاعة، وفي التجريد إن كان له دار لا يسكنها وعبد لا يستخدمه فعليه أن يبيعه ويحج به، وإن لم يكن له مسكن، ولا شيء من ذلك وعنده دراهم يبلغ بها الحج أو يبلغ ثمن مسكن وخادم وطعام وقوت فعليه الحج فإن جعلها في غير الحج أثم كذا في الخلاصة.ــــــــ وكذا من كان له ثياب لا يمتهنها كان عليه أن يبيع ويحج بثمنها إن كان بثمنها وفاء بالحج. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۷، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر)

(۳) وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (۳-آل عمران: ۹۷)

قال الله تعالى: وللہ علی الناس حج البیت من استطاع إلیہ سبیلا۔ قال أبو بكر: هذا ظاهر في إيجاب فرض الحج على شريطة وجود السبيل إليه، والذي يقتضيه من حكم السبيل أن كل من أمكنه الوصول إلى الحج لزمه ذلك إذ كانت استطاعة السبيل إليه هي إمكان الوصول إليه، كقوله تعالى فهل إلى خروج من سبيل يعني من وصول هل إلى مرد من سبيل يعني من وصول وقد جعل النبي صلى الله عليه وسلم من شرط استطاعة السبيل إليه وجود الزاد والراحلة.ــــــــ وروى... عن علي عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال من ملك زادا وراحلة يبلغه بيت الله ولم يحج فلا عليه أن يموت يهوديا أو نصرانيا.ــــــــ وذلك أن الله تعالى يقول في كتابه وللہ علی الناس حج البیت من استطاع إلیہ سبیلا. (أحكام القرآن-أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م: ۳۷۰هـ): ۲/ ۳۰۷، ۳۰۸،=

البتہ اگر حج کے لیے احرام باندھ لے،[۴] یا حج کی منت مانی ہو تو حج فرض ہو جائے گا،[۵] لیکن اگر گنجائش ہے اور حج کرنے کی وجہ سے مزید تنگی کا اندیشہ نہ ہو، تو حج کرنا بہتر ہے۔

ایسا شخص جس پر حج فرض نہیں ہے، وہ اگر اپنی جانب سے کسی کو حج بدل کے لیے روانہ کرے، تو جائز ہے، پھر حج بدل کے لیے ایسے شخص کو بھیجنا، جس پر حج فرض ہو، اس کے باوجود اس نے حج نہ کیا ہو، مکروہ تحریمی ہے، اور ایسے شخص کو بھیجنا جس پر حج فرض نہیں ہے اور اس نے حج ادا نہیں کیا ہے، بلا کراہت جائز ہے۔[۶]

=باب فرض الحج، آل عمران: ۹۷، ت: محمد صادق القمحاوي، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(ومنها القدرة على الزاد والراحلة) بطريق الملك أو الإجارة دون الإعارة والإباحة سواء كانت الإباحة من جهة من لا منة له عليه كالوالدين والمولودين أو من غيرهم كالأجانب كذا في السراج الوهاج،... وتفسير ملك الزاد والراحلة أن يكون له مال فاضل عن حاجته، وهو ما سوى مسكنه ولبسه وخدمه، وأثاث بيته قدر ما يبلغه إلى مكة ذاهبا وجائيا راكبا لا ماشيا وسوى ما يقضي به ديونه ويمسك لنفقة عياله، ومرمة مسكنه ونحوه إلى وقت انصرافه كذا في محيط السرخسي ويعتبر في نفقته ونفقة عياله الوسط من غير تبذير، ولا تقتير كذا في التبيين والعيال من تلزمه نفقته كذا في البحر الرائق، ولا يترك نفقة لما بعد إيابه في ظاهر الرواية كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۷، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر)

(۴) لو أحرم على ظن أن عليه الحج، ثم ظهر عدمه، فأحصر وصرح اليزدوي وصاحب الكشف أنه لا قضاء عليه، لكن صرح السروجي في الغاية بأن الأصح وجوبه كما لو أفسده بلا إحصار أفاده القاري. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۹۲، كتاب الحج، باب الإحصار، ط: دار الفكر - بيروت)

(۵) الحج كما هو واجب بإيجاب الله تعالى ابتداء على من استجمع شرائط الوجوب وهو حجة الإسلام فقد يجب بإيجاب الله تعالى بناء على وجوب سبب الوجوب من العبد وهو بأن يقول: لله علي حجة وكذا لو قال: علي حجة سواء كان النذر مطلقا أو معلقا بشرط، بأن قال إن فعلت، كذا فلله علي أن أحج حتى يلزمه الوفاء إذا وجد الشرط. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۶۲، كتاب المناسك، الباب السابع عشر في النذر بالحج، ط: دار الفكر - بيروت)

إذا نذر الحج فإنه يصير فرضا أيضا ومن فروعه ما في الخلاصة رجل قال لله علي مائة حجة لزمته كلها، ولو قال أنا أحج لا حج عليه، ولو قال إذا دخلت الدار فأنا أحج يلزمه عند الشرط. (البحر الرائق: ۲/ ۳۳۴، أول كتاب الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي ★ الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۷۳۵، كتاب الأيمان، ط: دار الفكر)

(۶) ثم قال في الفتح بعد ما أطال في الاستدلال: والذي يقتضيه النظر أن حج الصرورة عن غيره إن كان بعد تحقق الوجوب عليه بملك الزاد والراحلة والصحة فهو مكروه كراهة تحريم لأنه يتضيق عليه في أول سني الإمكان فيأثم بتركه، وكذا لو تنفل لنفسه ومع ذلك يصح لأن النهي ليس لعين الحج المفعول بل لغيره وهو الفوات، إذ الموت في سنة غير نادر. اهـ. قال في البحر: والحق أنها تنزيهية على الآمر لقولهم والأفضل إلخ تحريمية على الصرورة=

کسی شخص پر اگر حج فرض نہیں ہے اور اُس نے حج کی نیت کی ہے، پھر اُس نے بجائے حج کے عمرہ کرلیا یا کروالیا تو جائز ہے۔ (۷) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۳] اولاد کی کمائی سے زکوٰۃ وغیرہ کون ادا کرے؟

۱۲۷۴- سوال: میرے تمام لڑکے مختلف جگہ، سرکاری ملازمت کرتے ہیں اور خوش حال ہیں، ان کو جو تنخواہ ملتی ہے، یا کسی اور طریقے سے آمدنی حاصل ہوتی ہے، تو اس کی زکاۃ کون نکالے گا، میں یا میرے لڑکے، نیز صدقۂ فطر اور قربانی کون ادا کرے گا، میں یا وہ؟

= المأمور الذي اجتمعت فيه شروط الحج ولم يحج عن نفسه لأنه آثم بالتأخير اهـ. قلت: وهذا لا ينافي كلام الفتح لأنه في المأمور، ويحمل كلام الشارح على الآمر، فيوافق ما في البحر من أن الكراهة في حقه تنزيهية وإن كانت في حق المأمور تحريمية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۰۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب في حج الصرورة، ط: دار الفكر)

والأفضل للإنسان إذا أراد أن يحج رجلا عن نفسه أن يحج رجلا قد حج عن نفسه، ومع هذا لو أحج رجلا لم يحج عن نفسه حجة الإسلام يجوز عندنا، وسقط الحج عن الآمر، كذا في المحيط، وفي الكرماني: الأفضل أن يكون عالما بطريق الحج وأفعاله، ويكون حرا عاقلا بالغا، كذا في غاية السروجي شرح الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۷، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر)

(العبادات ثلاثة أنواع): مالية محضة كالزكاة، وصدقة الفطر، وبدنية محضة كالصلاة والصوم، ومركبة منهما كالحج. والإنابة تجري في النوع الأول في حالتي الاختيار والاضطرار، ولا تجري في النوع الثاني، وتجري في النوع الثالث عند العجز، كذا في الكافي. (حوالہ سابق)

وإنما شرط عجز المنوب للحج الفرض لا للنفل، كذا في الكنز ففي الحج النفل تجوز النيابة حالة القدرة، لأن باب النفل أوسع، كذا في السراج الوهاج. (حوالہ سابق)

(۷) درج ذیل سوال وجواب سے اس پر روشنی پڑتی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

سوال: ایک بیوہ عورت نے اس ارادے سے اپنا زیور اور کچھ رقم جمع کر کے رکھا تھا کہ زیور کو فروخت کر کے اور رقم مذکور کو ملا کر، جب اس قدر رقم ہو جائے، جو سفرِ حج کے لیے کافی ہو، تو سفرِ حج کروں گی، لیکن کل رقم اس مقدار کو نہ پہنچی، جو سفرِ حج کے لیے کافی ہو، اس لیے اس نے اپنا ارادہ فسخ کر دیا اور اس رقم موجودہ میں سے اپنی ضرورت کے موقع پر کچھ خرچ بھی کرتی رہی، اب وہ بقایا رقم کو اور زیور کو فروخت کر کے اپنے کھانے پینے میں صرف کرسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: وہ روپیہ اس کی ملک ہے، جس کام میں چاہے خرچ کرے، اپنے کھانے پینے اور ہر کام اور ہر ضرورت میں خرچ کرسکتی ہے۔ (کفایت المفتی: ۴/ ۵۲-۵۱ ۳، چھٹا باب، حجِ نفل، حج کی نیت سے جمع کی ہوئی رقم کو خرچ کرنا جائز ہے، ط: زکریا- دیوبند)

الجواب حامداومصليا:

آپ کے لڑکے ملازمت کر کے جو کچھ کماتے ہیں، اس کے مالک وہی ہیں، (۱) لہٰذا بہ قدر نصاب مال ہو، تو زکاۃ، صدقۂ فطر اور قربانی ان کے ذمہ ہی رہے گی اور ان ہی پر فرض ہوگی۔

البتہ وہ اپنی کمائی میں سے جو کچھ آپ کو دیں، وہ رقم آپ کی ہے، آپ اس کے مالک ہیں، اس کے بغیر ان کی ملکیت کے آپ مالک شمار نہیں ہوں گے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۴] والد کو آمدنی کا مالک بنائے، تو زکاۃ وغیرہ کی ذمہ داری والد پر ہوگی

گذشتہ سے پیوستہ

۱۲۷۵- سوال: میری تمام اولاد جو کچھ کماتی ہے، بالفرض وہ پوری کی پوری مجھے دے دے، پھر میں ان کو ان کی ضرورت کے مطابق خرچ کروں اور باقی پیسے اپنے پاس رکھوں، تو زکاۃ اور صدقۂ فطر وغیرہ

---

(۱) عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده، أن رجلا أتى النبي - صلى الله عليه وسلم - فقال: إن لي مالا، وإن والدي يحتاج إلى مالي. قال: "أنت ومالك لوالدك، إن أولادكم من أطيب كسبكم، كلوا من كسب أولادكم. رواه أبو داود، وابن ماجه.______قال ابن الهمام: رواه عن النبي - صلى الله عليه وسلم - جماعة من الصحابة، وقد أخرج أصحاب السنن الأربعة، عن عائشة رضي الله عنها قال - صلى الله عليه وسلم -: "إن أطيب ما أكل الرجل من كسبه وإن ولده من كسبه". وحسنه الترمذي، فإن قيل: هذا يقتضي أن له ملكا ناجزا في ماله. قلنا: نعم لو لم يقيده حديث، رواه الحاكم وصححه والبيهقي عنها مرفوعا، (إن أولادكم هبة يهب لمن يشاء إناثا، ويهب لمن يشاء الذكور، وأموالهم لكم إذا احتجتم إليها) : ومما يقطع بأن الحديث الأول مؤول، أنه تعالى ورث الأب من ابنه السدس مع ولد ولده، فلو كان الكل ملكه لم يكن لغيره شيء مع وجوده. (مرقاة المفاتيح: ۶/ ۹۷- ۲۱۹۶، كتاب النكاح، باب الاستبراء، ط: دار الفكر- بيروت)

(وإن زوج أمة أباه) والأولى وإن زوجها أبوه، لشموله ما إذا كانت الجارية لولده الصغير، فتزوجها الأب، فإن النكاح صحيح، ولا تصير أم ولد له، كما في الخانية، (جاز) النكاح؛ لأنها ملك الغير حقيقة، وقوله - صلى الله تعالى عليه وسلم - "أنت ومالك لأبيك" مجاز؛ لأن ثبوت الملك للأب متروك بالإجماع، كما في المستصفى. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/ ۳۶۸، كتاب النكاح، باب نكاح الرقيق، الإذن في العزل عن الأمة، ط: دار إحياء التراث العربي)

"الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول". (الهداية: ۱/ ۱۸۵، أول كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

کی ذمہ داری کس کی ہوگی؟ اور ادا نہ کرنے پر کون گنہ گار ہوگا؟

الجواب حامداو مصلیا:

اگر لڑکے اپنی تنخواہ کا آپ کو مالک بنا دیتے ہیں، اور آپ اپنی مرضی کے مطابق، حسب ضرورت خرچ کرتے ہیں، اگر رقم نصاب کے بہ قدر آپ کے پاس موجود ہے، تو آپ صاحب نصاب ہیں، سال گذرنے پر آپ کے ذمے زکوۃ کی ادائیگی لازم ہے۔[1] نیز آپ کا اور آپ کے چھوٹے بچوں کا صدقۂ فطر بھی آپ پر واجب ہوگا اور قربانی وغیرہ کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔[2]

کمانے والے لڑکے اگر عاقل و بالغ ہیں، تو ان پر اس صورت میں زکوۃ واجب ہوگی، جب کہ وہ صاحب نصاب ہوں، اگر وہ صاحب نصاب نہیں ہیں، تو ان پر زکوۃ کا وجوب نہیں ہوگا۔[3]

نیز ان کے پاس اگر صدقۂ فطر کا نصاب موجود ہو، تو صدقہ فطر واجب ہوگا اور قربانی لازم ہوگی، ورنہ نہیں۔[4] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۵] کسی کے پاس دس تولہ سونا ہو اور تین تولے کی قیمت کے برابر قرض ہو

۱۲۷۶- سوال: ایک آدمی کے پاس دس تولہ سونا ہے؛ لیکن تین تولہ کی قیمت کے برابر اس پر دوسروں کا قرض بھی ہے، اور دوسری کوئی نقد رقم نہیں ہے، تو اس پر زکوۃ فرض ہوگی یا نہیں؟

---

(۱) "الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما و حال عليه الحول". (الهداية: ۱/ ۱۸۵، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

(۲) وهي [صدقة الفطر] واجبة على الحر المسلم المالك لمقدار النصاب فاضلا عن حوائجه الأصلية كذا في الاختيار شرح المختار، ولا يعتبر فيه وصف النماء ويتعلق بهذا النصاب وجوب الأضحية، ووجوب نفقة الأقارب هكذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۱، كتاب الزكاة، الباب الثامن في صدقة الفطر، ط: دار الفكر)

وتجب عن نفسه وطفله الفقير كذا في الكافي. . . . ولا يؤدي عن زوجته، ولا عن أولاده الكبار، وإن كانوا في عياله، ولو أدى عنهم أو عن زوجته بغير أمرهم، أجزأهم استحسانا، كذا في الهداية. وعليه الفتوى، كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۹۳-۱۹۲، كتاب الزكاة، الباب الثامن في صدقة الفطر، ط: دار الفكر-بيروت)

(۳) (ومنها كون المال نصابا) فلا تجب في أقل منه هكذا في العيني شرح الكنز. (حوالہ سابق: ۱/ ۱۷۲، کتاب الزکاۃ)

(۴) حاشیہ نمبر ۲، دیکھیے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورتِ مسئولہ میں اگر نقد رقم کچھ بھی نہیں ہے، تو اس پر زکوۃ فرض نہیں ہوگی۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

[۴۶] ایضاً

۱۲۷۷- سوال: اگر مذکورہ بالا صورت میں زکوۃ فرض ہو، تو کتنے تولے کی زکوۃ دینی پڑے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ صورت میں زکوۃ فرض نہیں ہے۔

البتہ دس تولہ سونا کے ساتھ کچھ رقم بھی اور تین تولہ سونا کے بہ قدر قرض ہو، تو ایسی صورت میں پورے

---

(۱) عن علي رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم ببعض أول هذا الحديث، قال: فإذا كانت لك مائتا درهم، وحال عليها الحول، ففيها خمسة دراهم، وليس عليك شيء - يعني - في الذهب حتى يكون لك عشرون ديناراً، فإذا كان لك عشرون ديناراً، وحال عليها الحول، ففيها نصف دينار، فما زاد، فبحساب ذلك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۲۱، رقم الحديث: ۱۵۷۳، كتاب الزكاة، باب في زكاة السائمة، ط: مكتبة فيصل ديوبند)

عن السائب بن يزيد، أن عثمان بن عفان رضي الله عنه، كان يقول: هذا شهر زكاتكم، فمن كان عليه دين، فليؤد دينه حتى تحصل أموالكم، فتؤدوا منها الزكاة. قال محمد: وبهذا نأخذ، من كان عليه دين وله مال فليدفع دينه من ماله، فإن بقي بعد ذلك ما تجب فيه الزكاة ففيه زكاة، وتلك مائتا درهم، أو عشرون مثقالاً ذهباً فصاعداً، وإن كان الذي بقي أقل من ذلك، بعد ما يدفع من ماله الدين فليست فيه الزكاة، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (موطأ مالك برواية محمد بن الحسن الشيباني المعروف بـ 'موطأ الإمام محمد': ۱/ ۱۱۴، رقم الحديث: ۳۲۳، كتاب الزكاة، باب: زكاة المال، ت: عبد الوهاب عبد اللطيف، : المكتبة العلمية)

وإن كان ماله أكثر من الدين زكى الفاضل إذا بلغ نصاباً لفراغه عن الدين، وإن كان له نصب يصرف الدين إلى أيسرها قضاء. مثاله: إذا كان له دراهم ودنانير، وعروض للتجارة وسوائم من الإبل، ومن البقر والغنم، وعليه دين فإن كان يستغرق الجميع فلا زكاة عليه، وإن لم يستغرق صرف إلى الدراهم والدنانير أولاً إذ القضاء منهما أيسر؛ لأنه لا يحتاج إلى بيعهما؛ ولأنه لا تتعلق المصلحة بعينهما؛... الخ. (تبيين الحقائق: ۱/ ۲۵۵، كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق-القاهرة☆اللباب في شرح الكتاب: ۱/ ۱۳۷، كتاب الزكاة، ط: المكتبة العلمية-بيروت ☆الجوهرة النيرة: ۱/ ۱۱۵، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة، ط: المطبعة الخيرية-بيروت ☆البناية: ۳/ ۳۰۱، كتاب الزكاة، باب زكاة المديون، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

دس تولے کی بازاری قیمت معلوم کی جائے، اور قرض منہا کرنے کے بعد دیکھا جائے کہ سونا یا چاندی میں سے کسی کے نصاب کے بہ قدر ہے یا نہیں، اگر کسی بھی نصاب کو پہنچ جائے، تو قرض منہا کرنے کے بعد بچی ہوئی کل رقم پر زکوۃ واجب ہوگی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۷] زکوۃ مکان کی آمدنی پر ہے، قیمت پر نہیں

۱۲۷۸- سوال: ایک شخص کے پاس ایک مکان چالیس ہزار ڈالر کا ہے، اور اس نے وہ مکان ماہانہ ۵۰۰ر ڈالر کے کرایہ پر دیا ہے، تو اس مکان کی قیمت پر زکوۃ آئے گی، یا اس کی آمدنی پر زکوۃ واجب ہوگی، آمدنی میں مکان کی اصلاح و مرمت وغیرہ کے لیے ۲۰۰ر ڈالر منہا کر کے زکوۃ واجب ہوگی یا کل آمدنی پر؟ مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مکان پر زکوۃ نہیں ہے؛ بل کہ اس کی آمدنی (کرایہ) پر زکوۃ واجب ہے، آمدنی ہر مہینے کیا ہے اور کیا خرچ ہوا، اس کے حساب کی ضرورت نہیں، جب سال پورا ہوگا تو جو بھی جمع رقم ہوگی [اگر وہ نصاب کے بہ

---

(۱) (و) يضم (الذهب إلى الفضة) وعكسه بجامع الثمنية (قيمة). (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويضم إلخ) أي عند الاجتماع. . . وفي البدائع أيضا أن ما ذكر من وجوب الضم إذا لم يكن كل واحد منهما نصابا بأن كان أقل، فلو كان كل منها نصابا تاما بدون زيادة لا يجب الضم، بل ينبغي أن يؤدي من كل واحد زكاته، فلو ضم حتى يؤدي كله من الذهب أو الفضة فلا بأس به عندنا، ولكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء رواجا وإلا يؤد من كل منهما ربع عشره (قوله: وعكسه) وهو ضم الفضة إلى الذهب، وكذا يصح العكس في قوله وقيمة العرض تضم إلى الثمنين عند الإمام كما مر عن الزاهدي، وصرح به في المحيط أيضا. . . (قوله: قيمة) أي من جهة القيمة، فمن له مائة درهم وخمسة مثاقيل قيمتها مائة عليه زكاتها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۰۳، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، قبل: مطلب في وجوب الزكاة في دين المرصد، ط: دار الفكر- بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۲۰۱-۲۰۰، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: زكريا- ديوبند☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۹، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، ط: زكريا- ديوبند☆المحيط البرهاني: ۲/ ۲۴۱، كتاب الزكاة، الفصل الثالث بيان مال الزكاة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆العناية شرح الهداية: ۲/ ۲۲۲، كتاب الزكاة، فصل في زكاة العروض، ط: دار الفكر☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۷۱۷، كتاب الزكاة، مدخل، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆تبيين الحقائق: ۱/ ۲۸۰، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: المطبعة الكبرى الاميرية، بولاق-القاهرة)

قدر ہے اور اس پر حولان حول ہو چکا ہے، تو] اس کا چالیسواں حصہ زکوۃ میں نکالنا واجب ہوگا۔ (عالم گیری، شامی) [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۸] کمپنی کے شیئرز کی زکوۃ

۱۲۷۹- سوال: ایک عورت کے پاس مختلف کمپنیوں کے کچھ شیئرز ہیں، جن کو تجارت کی حیثیت سے خریدے ہیں، تو کیا ان شیئرز کی زکوۃ واجب ہوگی؟ اور اگر واجب ہوگی، تو کس حساب سے؟ قیمتِ خرید کے حساب سے، یا فی الحال بازار میں جو قیمت چل رہی ہے، اس کے حساب سے؟ فی الحال وہ شیئرز، بازار کی قیمت کے حساب سے ۳۸۰۰ روپے کے ہوتے ہیں، جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ شیئرز (اس کے دوسرے مال کے ساتھ) اگر نصاب کو پہنچ جاتے ہیں، تو ان میں زکوۃ واجب ہوگی۔ زکوۃ ان کی موجودہ بازار کی قیمت کے حساب سے ادا کرنی ہوگی۔

ابھی ان شیئرز کی قیمت ۳۸۰۰/ پہنچ گئی ہے، جو چاندی کے نصاب یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کی (موجودہ) قیمت کے برابر ہے [1] اس لیے ان پر زکوۃ فرض ہوگئی ہے۔ (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

[١] إذا آجر داره أو عبده بمائتي درهم لا تجب الزكاة ما لم يحل الحول بعد القبض في قول أبي حنيفة رحمه الله تعالى، فإن كانت الدار والعبد للتجارة وقبض أربعين درهما بعد الحول كان عليه درهم بحكم الحول الماضي قبل القبض، لأن أجرة دار التجارة وعبد التجارة بمنزلة ثمن مال التجارة في الصحيح من الرواية. (الفتاوى الخانية على هامش الهندية: ١/ ٢٥٣، كتاب الزكاة، فصل في مال التجارة، ط: زكريا-ديوبند)

(فلا زكاة على مكاتب)... (ولا في ثياب البدن)... (وأثاث المنزل ودور السكنى ونحوها) [الدر المختار]

قال ابن عابدين: وقوله ونحوها: أي كثياب البدن الغير المحتاج إليها وكالحوانيت والعقارات. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ٢٦٥، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت)

ولو اشترى قدورا من صفر يمسكها ويؤاجرها لا تجب فيها الزكاة كما لا تجب في بيوت الغلة. (الفتاوى الهندية: ١/ ١٨٠، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، ط: دار الفكر-بيروت)

[١] ساڑھے باون تولہ چاندی کی مذکورہ قیمت فتویٰ لکھنے کے وقت کی ہے۔

(٢) الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصابا من الورق والذهب كذا في الهداية. ويقوم بالمضروبة كذا في التبيين وتعتبر القيمة عند حولان الحول بعد أن تكون قيمتها في ابتداء الحول مائتي درهم من الدراهم الغالب عليها الفضة كذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ١/ ١٧٩، كتاب الزكاة، الباب الثالث في =

[۴۹] پراویڈنٹ فنڈ پر زکوۃ کا حکم

۱۲۸۰- سوال: پراویڈنٹ فنڈ کی رقم (یعنی وہ رقم جو ملازم کی تنخواہ سے وضع کی جاتی ہے اور ملازمت کے خاتمہ پر اسے دی جاتی ہے) جب قبضہ میں آجائے، تو قبضہ میں آنے سے قبل، گذشتہ سالوں کی زکوۃ اس میں واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق مذکورہ جمع شدہ پراویڈنٹ فنڈ پر (گذشتہ سالوں کی) زکوۃ فرض نہیں ہے، جب رقم قبضہ میں آجائے، اس کے بعد اس پر زکوۃ کا حکم آتا ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=زكاة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر)

وإن أدى القيمة تعتبر قيمتها يوم الوجوب. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۰، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر)

ولو ازدادت قيمتها قبل الحول تعتبر قيمتها وقت الوجوب بالإجماع. (الفتاوى التاتارخانية: ۳/۱۷۰، كتاب الزكاة، الفصل الثالث في بيان زكاة عروض التجارة، ط: مكتبة زكريا-ديوبند)

(۱) پی-ایف، درحقیقت ایک قسم کا سرکاری تبرع ہے، جس پر قبضے کے بعد ہی ملکیت ثابت ہوتی ہے اور زکاۃ ملک میں آنے کے بعد ہی واجب ہوتی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ صورۃً دین ہے، تاہم یہ دین قوی نہیں ہے، کہ وصولی کے بعد گزشتہ سالوں کی زکاۃ واجب ہو: وجملة الكلام في الديون أنها على ثلاث مراتب في قول أبي حنيفة: دين قوي، ودين ضعيف، ودين وسط كذا قال عامة مشايخنا، أما القوي: فهو الذي وجب بدلا عن مال التجارة كثمن عرض التجارة من ثياب التجارة، وعبيد التجارة، أو غلة مال التجارة ولا خلاف في وجوب الزكاة فيه إلا أنه لا يخاطب بأداء شيء من زكاة ما مضى ... ـــــــ وأما الدين الضعيف: فهو الذي وجب له بدلا عن شيء سواء وجب له بغير صنعه كالميراث، أو بصنعه كالوصية، أو وجب بدلا عما ليس بمال كالمهر، وبدل الخلع، والصلح عن القصاص، وبدل الكتابة ولا زكاة فيه ما لم يقبض كله، ويحول عليه الحول بعد القبض.

وأما الدين الوسط فما وجب له بدلا عن مال ليس للتجارة كثمن عبد الخدمة، وثمن ثياب البذلة والمهنة وفيه روايتان عنه، ذكر في الأصل أنه تجب فيه الزكاة قبل القبض لكن لا يخاطب بالأداء ما لم يقبض مائتي درهم، فإذا قبض مائتي درهم زكى لما مضى، وروى ابن سماعة عن أبي يوسف عن أبي حنيفة أنه لا زكاة فيه حتى يقبض المائتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو أصح الروايتين عنه.

وقال أبو يوسف ومحمد: الديون كلها سواء، وكلها قوية تجب الزكاة فيها قبل القبض إلا الدية على العاقلة=

[۵۰] پراویڈنٹ فنڈ اور پینشن پر زکوٰۃ کا حکم

۱۲۸۱- سوال: یہاں امریکہ میں جو لوگ اپنا کام کرتے ہیں ان کو بھی کچھ رقم کمائی میں سے نکالنی ہوتی ہے اور وہ ۶۵ / سال کے بعد بطور پینشن ملتی ہے، اگر اس عرصہ میں اس کا انتقال ہوگیا، تو وہ رقم اس کی اولاد کو ملتی ہے اور یہ رقم سرکار کے پاس جمع رہتی ہے، تو اس میں زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ اسی طرح جو لوگ دوسروں کے یہاں نوکری کرتے ہیں، ان کو بھی کچھ رقم جمع کروانی پڑتی ہے، اور وہ بھی ۶۵ / سال کے بعد اس کی فیملی کے حساب سے کچھ زیادتی کے ساتھ ملتی ہے، تو اس میں زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

صورت مسئولہ میں جب کہ جمع شدہ رقم ۶۵ / سال کی عمر کے بعد ملتی ہے، یا مرنے کے بعد فیملی کو ان

=ومال الكتابة فإنه لا تجب الزكاة فيها أصلا ما لم تقبض ويحول عليها الحول. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۰، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۰۵-۳۰۶، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر- بيروت)

فقہ اکیڈمی- انڈیا نے اس موضوع پر منعقد سمینار (۳-۶، جمادی الاولیٰ، ۱۴۱۳ھ= مطابق: ۳۰/ اکتوبر- ۲/ نومبر ۱۹۹۲ء، مقام اعظم گڑھ) میں درج ذیل فیصلہ کیا ہے:

پراویڈنٹ فنڈ (تنخواہ سے لازمی طور پر وضع ہونے والی رقم) جب تک اس پر قبضہ نہ ہوجائے، اس کی زکاۃ واجب نہ ہوگی، جب یہ رقم وصول ہوجائے اور بہ قدر نصاب ہو اور اس پر ایک سال گذر جائے، تو اس کی زکاۃ ادا کرنی ہوگی۔

بعض اوقات کچھ لوگ قانون انکم ٹیکس کی زد سے بچنے یا دیگر مصالح کی خاطر اختیاری طور پر اپنی تنخواہ سے کچھ زائد رقم وضع کرا کر پی ایف (P.F) جمع کراتے ہیں، یہ رقم اگر قدر نصاب کو پہنچ جائے، تو سال بہ سال زکاۃ ادا کرنی پڑے گی۔ اس اختیاری وضع کرائی ہوئی رقم کی حیثیت ودیعت کی ہے، اور مال ودیعت پر زکاۃ واجب ہوتی ہے۔ (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۶۱، عبادتی مسائل، پراویڈنٹ فنڈ پر زکاۃ، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی- انڈیا)

حضرت مفتی سید عبد الرحیم صاحب لاج پوریؒ ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں: جو ۹/ روپے لازماً کٹتے ہیں، اور اس پر جو مزید رقم ملے گی، یہ سب سرکاری انعام ہے، اس پر زکاۃ کا مسئلہ، ملنے اور قبضہ میں آنے کے بعد جاری ہوگا، ملنے سے پہلے نہیں، البتہ جو رقم ماہانہ (اکتالیس روپے) جمع کرنے کی آپ نے اپنی مرضی سے منظوری دی ہے، اس میں زکاۃ کا حکم جاری ہوگا؛ اگرچہ وہ قبضہ میں نہیں ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۷/ ۱۵۲، کتاب الزکاۃ، پروویڈنٹ فنڈ پر زکاۃ نہیں ہے، اپنی مرضی سے رقم کٹوائے، تو اس پر زکاۃ ہے، ط: دار الاشاعت، کراچی، پاکستان)

کی تعداد کے لحاظ سے ملتی ہے، تو اس پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی؛ (۱) کیوں کہ وہ ابھی ملک میں آئی ہی نہیں ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہے، جب کہ تنخواہ سے لی ہوئی رقم جبری ہو، اپنے اختیار سے نہ کٹوائی ہو۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

[۵۱] سرکاری ملازم کی کٹی ہوئی تنخواہ - جو بینک میں جمع ہو - پر وجوب زکوٰۃ کا حکم

۱۲۸۲- سوال: حکومت کی جانب سے ملازم کی تنخواہ میں سے جو کچھ فی صد کاٹ لی جاتی ہے اور بینک میں جمع کی جاتی ہے، تاکہ ریٹائر ہونے کے بعد، اس میں مزید رقم ملا کر ایک بڑی رقم دی جا سکے، دریافت یہ کرنا ہے کہ اُن پیسوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ نیز قربانی کے وجوب کے لیے زکوٰۃ واجب ہونا شرط ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جو رقم آپ کے اختیار کے بغیر حکومت نے کاٹ تنخواہ سے کاٹ لی ہے، اور وہ آپ کے قبضے میں نہیں آئی ہے، اُس کی زکوٰۃ آپ پر لازم نہیں ہے۔ (۳)

اگر آپ صاحب نصاب ہیں تو زکوٰۃ، قربانی اور صدقۃ الفطر تینوں واجب ہوں گے اور قربانی و صدقۃ الفطر کے وجوب کے لیے زکاۃ کا واجب ہونا شرط نہیں ہے، بل کہ کوئی بھی ایسا مال، [خواہ نامی ہو یا نہ ہو] جو حاجت اصلیہ سے زائد ہو اور بہ قدر نصاب ہو، وجوب قربانی کے لیے کافی ہے۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (وسببه) أي سبب افتراضها (ملك نصاب حولي) [الدر المختار] ـــــ قال ابن عابدين: (قوله ملك نصاب) فلا زكاة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك، ولا فيما أحرزه العدو بدارهم لأنهم ملكوه بالإحراز عندنا خلافا للشافعي، بدائع، ولا فيما دون النصاب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۵۹، كتاب الزكاة، قبيل: مطلب الفرق بين السبب والشرط والعلة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲-۳) تفصیل وتخریج کے لیے دیکھیں عنوان: پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ کا حکم۔

(۴) زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر و اضحیہ کے وجوب میں نصاب نامی اور غیر نامی کا فرق ہے، پس اگر کسی کے پاس ضرورت سے زائد کپڑے، برتن، بستر، وغیرہ ہوں اور ان سب کی قیمت نصاب (یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی) کو پہنچ جائے، تو اس پر قربانی واجب ہوگی، مگر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی؛ کیوں کہ زکوٰۃ میں مال کا نامی ہونا شرط ہے: =

[۵۲] زکوٰۃ اور شیئرز کے چند مسائل

۱۲۸۳- سوال: (۱) ایک آدمی کے پاس تین تولہ سونا ہے، اور ۱۰۰۰/ سے ۱۵۰۰/ روپے بھی ہیں، چاندی بالکل نہیں ہے، اور ان پر سال گزر گیا ہے، تو زکاۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

وہ مال، جو اس نے اپنی لڑکی کو دے دیا ہے، اس کی زکاۃ کس پر واجب ہوگی؟

(۲) ایک آدمی کے پاس ۵۰۰۰۰/ روپے ہیں، وہ روپے کاروبار میں استعمال ہوتے ہیں اور ہفتہ یا پندرہ دن میں واپس آتے ہیں، اس طرح سال میں یہ پیسے آتے جاتے رہتے ہیں، نیز اس آدمی پر ۱۵۰۰۰ قرض ہے، تو اس آدمی پر زکاۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اور پورے ۵۰۰۰۰ ہزار پر ہوگی یا قرض وضع کرنے کے بعد، باقی رقم پر ہوگی؟

(۳) اس آدمی نے شیئرز خرید رکھا ہے، اور شیئرز کا ڈیویڈنڈ (Dividend) آتا ہے، اس نے لون (سودی قرض) بھی لے رکھا ہے، جس کا سود ادا کرنا پڑتا ہے، تو اس لون کے سود میں شیئرز کا ڈیویڈنڈ دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

(۱) وجوب زکاۃ کے لیے نصاب یعنی ضرورت سے زائد، ساڑھے باون تولا چاندی، یا ساڑھے سات تولا سونا، یا اس کی قیمت کے بہ قدر مالیت کا ہونا ضروری ہے۔[۱] جو قرض کے علاوہ ہو۔[۲] اور اس پر سال بھی گذر گیا ہو۔[۳]

یا تھوڑا سونا اور تھوڑی چاندی ہو، یا تھوڑے پیسے اور تھوڑا سونا یا چاندی ہو اور ان کو ملانے سے کوئی

= وهي واجبة على الحر المسلم المالك لمقدار النصاب فاضلا عن حوائجه الأصلية كذا في الاختيار شرح المختار، ولا يعتبر فيه وصف النماء ويتعلق بهذا النصاب وجوب الأضحية، ووجوب نفقة الأقارب هكذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۱، كتاب الزكاة، الباب الثامن في صدقة الفطر، ط: دار الفكر)

ومنها كون النصاب ناميا. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۴، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

(۱-۳) (وسببه) أي سبب افتراضها (ملك نصاب حولي) نسبة للحول لحولانه عليه (تام)... (فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد)... (و) فارغ (عن حاجته الأصلية) لأن المشغول بها كالمعدوم... (نام ولو تقديرا) [الدر المختار على رد المحتار: ۲/۲۵۹-۲۶۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر]

بھی ایک نصاب بن جاتا ہو، تو زکاۃ واجب ہوگی۔ (جواہر الفقہ ۱/ ۳۸۴ ☆ فتاویٰ رحیمیہ ۳/ ۵۰)[۴]

آپ کے سوال میں صراحت نہیں ہے کہ کتنی لڑکی کو کتنا سونا اور روپیہ دیا ہے؟ اور قبضہ دیا ہے یا نہیں؟ ان باتوں کو جانے بغیر حتمی جواب نہیں دیا جاسکتا، البتہ آپ یوں سمجھ لیں کہ: اگر آپ نے ہر لڑکی کو ایک تولا سونا اور ۲۰۰ روپے دیے ہوں، جن پر سال بھی گذر گیا ہو، اور لڑکی عاقل و بالغ بھی ہو، تو اس پر بھی زکاۃ فرض ہوجائے گی؛ اس لیے کہ مذکورہ رقم اور سونا کا مجموعہ، چاندی کے نصاب کو پہنچ جاتا ہے۔[۵]

(۲) شریعت کا قاعدہ ہے کہ قرض وضع کرنے کے بعد، بچی ہوئی رقم کسی بھی ایک نصاب کو پہنچ جائے، اور اس پر سال گذر جائے، تو زکاۃ فرض ہوجائے گی؛ لہٰذا مذکورہ سوال میں قرض وضع کرنے کے بعد

---

(۴) سونے کا نصاب زکاۃ ساڑھے سات تولہ ہے اور چاندی کا ساڑھے باون تولہ، چناں چہ اگر کسی کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا ہو، اور ایک سال تک باقی رہے، تو سال گزرنے پر اس کی زکاۃ دینا فرض ہے، اور اگر اس سے کم ہو، تو اس پر زکوۃ فرض نہیں، اور اگر اس سے زائد ہو، تب بھی زکوۃ فرض ہے۔

....

کسی کے پاس نہ تو پوری مقدار سونے کی ہے اور نہ پوری مقدار چاندی کی، بل کہ کچھ سونا، کچھ چاندی ہے، تو اگر دونوں کی قیمت ملا کر ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہوجائے، تو زکاۃ فرض ہے، اور اگر دونوں چیزیں اتنی کم کم ہیں کہ دونوں کی قیمت ملا کر بھی مقدار نصاب کے برابر نہیں ہوتی، تو زکوۃ فرض نہیں۔ (جواہر الفقہ: ۳/ ۲۹-۲۲۵، احکام زکاۃ، ط: زکریا- دیوبند)

مزید دیکھیے: فتاویٰ رحیمیہ: ۷/ ۱۵۳، مسئلہ نمبر: ۱۵۷، ڈیڑھ تولہ سونا اور چار تولہ چاندی ہو، تو زکوۃ واجب ہے یا نہیں؟، کتاب الزکاۃ، ط: دار الاشاعت- کراچی۔

(۵) (و) يضم (الذهب إلى الفضة) وعكسه بجامع الثمنية (قيمة). (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويضم إلخ) أي عند الاجتماع.... وفي البدائع أيضا أن ما ذكر من وجوب الضم إذا لم يكن كل واحد منهما نصابا بأن كان أقل، فلو كان كل منهما نصابا تاما بدون زيادة لا يجب الضم؛ بل ينبغي أن يؤدي من كل واحد زكاته، فلو ضم حتى يؤدي كله من الذهب أو الفضة فلا بأس به عندنا، ولكن يجب أن يكون التقويم بما هو أنفع للفقراء رواجا وإلا يؤد من كل منهما ربع عشره (قوله: وعكسه) وهو ضم الفضة إلى الذهب، وكذا يصح العكس في قوله وقيمة العرض تضم إلى الثمنين عند الإمام كما مر عن الزاهدي، وصرح به في المحيط أيضا... (قوله: قيمة) أي من جهة القيمة، فمن له مائة درهم وخمسة مثاقيل قيمتها مائة عليه زكاتها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۰۳، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، قبل: مطلب في وجوب الزكاة في دين المرصد، ط: دار الفكر- بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/ ۴۰۱- ۴۰۰، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۹، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، ط: زكريا- ديوبند)

۳۵۰۰۰/ ہزار پر زکاۃ نکالنی پڑے گی۔ (عالمگیری، شامی) [۶]

(۳) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے، سود دینے والے، سود کا حساب لکھنے والے اور اس معاملہ میں گواہ بننے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ ہیں (مسلم شریف: ۲۷/۱ ☆ مشکوۃ المصابیح: ۲۴۴) [۷]

اس لیے سودی قرضہ لینا جائز نہیں، جس قدر جلد ممکن ہو، اس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے، تا کہ سودی قرض کی وعید سے حفاظت ہو۔

یہ بھی یاد رہے کہ ہر قسم کے شیئرز خریدنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ فکس ڈیویڈنڈ (متعین منافع) والے شیئرز؛ اس لیے کہ یہ بھی ایک طرح کا سود ہے، اسی طرح حرام کمائی کرنے والی اور حرام اشیاء تیار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز خریدنا بھی جائز نہیں ہے؛ اگر ایسی کمپنی کے شیئرز خریدے گئے ہوں، تو جلد از جلد ان سے نجات حاصل کی جائے۔ [۸]

اگر ایسی کمپنی کے شیئرز خریدے ہوں، جن کا کاروبار سود اور غرر وضرر پر مشتمل نہیں ہے، تو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی جائز ہے اور اس کو اپنی ضرورت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ [۹] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۶) (ومنها الفراغ عن الدين) قال أصحابنا - رحمهم الله تعالى -: كل دين له مطالب من جهة العباد، يمنع وجوب الزكاة، سواء كان الدين للعباد، كالقرض وثمن البيع وضمان المتلفات وأرش الجراحة، وسواء كان الدين من النقود، أو المكيل أو الموزون، أو الثياب أو الحيوان، وجب بخلع أو صلح عن دم عمد، وهو حال أو مؤجل أو لله - تعالى - كدين الزكاة، فإن كان زكاة سائمة، يمنع وجوب الزكاة، بلا خلاف بين أصحابنا - رحمهم الله تعالى - سواء كان ذلك في العين، بأن كان العين قائما أو في الذمة باستهلاك النصاب، وإن كان زكاة الأثمان، وزكاة عروض التجارة، ففيها خلاف بين أصحابنا فعند أبي حنيفة ومحمد - رحمهما الله تعالى - الجواب فيه كالجواب في السوائم. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۲-۱۷۳، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۰، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

(۷) عن جابر - رضي الله عنه - قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (الصحيح لمسلم: ۲/ ۲۷، كتاب المساقات والمزارعة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ط: ديوبند)

(۸ و ۹) شیئرز اور ان کی خرید وفروخت کے موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی کا سمینار جے پور میں مورخہ: ۲۷-۳۰/ جمادی الاولیٰ، ۱۴۱۷ھ، مطابق: ۱۱-۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو منعقد ہوا تھا، جس کی بعض تجویز - جو ہمارے اس مسئلے سے متعلق ہے - درج ذیل ہے:

(۴) جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار حرام ہے، مثلاً شراب وخنزیر کے گوشت کی تجارت یا سودی قرضے دینا وغیرہ، ان کے شیئرز کی =

[۵۳] ۶ ر تولہ سونا اور نقد ۷۵۰۰ ر روپے پر زکوۃ کا حکم

۱۲۸۴-سوال: ایک غریب عورت ہے، پچیس تیس سال سے ایک فیملی اس کی پرورش کر رہی ہے، اس عورت کو مختلف اوقات میں مختلف حضرات زکوٰۃ دیتے رہے، ابھی اس کے پاس ۶ ر تولہ سونا اور ۷۵۰۰ ر روپے نقد جمع ہے، وہ اس میں سے اپنی ضرورت پوری کرتی رہتی ہے، تو اس عورت پر زکوۃ فرض ہوگی یا نہیں؟ اگر فرض ہو، تو زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ کیا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں اس عورت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ ۶ ر تولہ سونے کی قیمت بازار میں سنار کے پاس جو آتی ہو، اس میں نقد رقم ملا کر اس کا چالیس واں حصہ زکوٰۃ کے طور پر نکالنا ضروری ہوگا۔ مثلاً سونے کی قیمت ۸۰۰۰ ر روپے ہوں، تو نقد رقم (۷۵۰۰) کو ملانے کے بعد، کل ۱۵۵۰۰ ر کی زکوٰۃ نکالنا ضروری ہوگا؛ لہٰذا سال پورا ہونے پر (مثلاً: پہلی رمضان کو) جس قدر نقد رقم ہوگی، اس کو سونے کی قیمت کے ساتھ ملائی جائے گی اور کل کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۴] زکوٰۃ، سود اور شیئرز کے پندرہ مسائل

۹۹-۱۲۸۵-سوال: (۱) میں نے بچت کی نیت سے اور انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے ڈاک خانے میں سے ۱۵۰۰۰ ر کے نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ (N.S.C) لیا ہے، جس کی رقم ساڑھے چھ سال بعد

=خرید وفروخت ناجائز ہے۔

(۷) اگر کمپنی کے منافع میں سود بھی شامل ہو، اور اس کی مقدار معلوم ہو، تو شیئر ہولڈر کے لیے منافع میں سے اس کے بہ قدر بلا نیت ثواب صدقہ کر دینا ضروری ہے۔

(۱۰) حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز کی تجارت کرنا درست ہے۔ (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۱۳۵-۱۳۷، معاشی مسائل، شیئرز اور ان کی خرید وفروخت، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی-انڈیا)

(۱) وتضم قيمة العروض إلى الثمنين والذهب إلى الفضة قيمة كذا في الكنز. حتى لو ملك مائة درهم خمسة دنانير قيمتها مائة درهم تجب الزكاة عنده خلافا لهما، ولو ملك مائة درهم وعشرة دنانير أو مائة وخمسين درهما وخمسة دنانير أو خمسة عشر دينارا أو خمسين درهما تضم إجماعا كذا في الكافي. (الفتاوى الهندية: ١/١٧٩، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، ط: دار الفكر-بيروت)

ڈبل ملے گی، تو کیا اسے سود مانا جائے گا؟ اور اگر وہ سود ہو، تو انکم ٹیکس میں دے سکتے ہیں؟

اور اس سال اس رقم پر۔جس سے این ایس سی (نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ) خرید اگیا ہے۔زکوۃ واجب ہوگی؟ یا جب ملے گی، تب واجب ہوگی۔

(۲) گذشتہ سال کا اور اس سال کا انکم ٹیکس تنخواہ سے کٹ گیا ہے، تو بینک سے ملنے والا سود، انکم ٹیکس کے بدلے میں لے کر استعمال کیا جاسکتا ہے، پروفیشنل ٹیکس بھی ہر مہینہ تنخواہ سے وضع کرلیا جاتا ہے، تو کیا اس میں بھی سود کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے؟

(۳) دوسرے آدمی کے بینک کی سود کی رقم انکم ٹیکس میں دی جاسکتی ہے؟

(۴) بینک سے ملنے والا گفٹ لینا کیسا ہے؟

(۵) ہر مہینے تنخواہ میں سے پراویڈنٹ فنڈ کے نام سے جو کچھ رقم وضع کی جاتی ہے اور یہ فنڈ ملازمت کے خاتمے پر واپس دی جاتی ہے، تو اس پر موجودہ سال اور آئندہ سالوں کی زکوۃ واجب ہوگی۔

(۶) ہماری کمپنی میں کام کرنے والوں کی ''کنزیومر سوسائٹی'' ہے، جس میں ہر ماہ ۱۵۰ روپئے وضع کیے جاتے ہیں، اس پر ہم کو لون دیا جاتا ہے، سال کی یہ رقم ۱۸۰۰ ہوجاتی ہے، کیا اس پر زکوۃ واجب ہوگی، یہ رقم ہم کو آخر میں یا سوسائٹی سے استعفاد ینے پر واپس ملتی ہے۔

(۷)(L.I.C) میں رقم جمع کیا ہے، تاکہ اکٹھا رقم حاصل ہو، جس میں ہر پانچ سال بعد کچھ رقم اور معاہدہ کے اختتام پر پوری رقم اضافے کے ساتھ ملے گی، تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی؟

(۸) سود کی رقم کا کسی کمیٹی یا اسکول میں ڈونیشن کے طور پر دینا، یا اسکول میں کمپاؤنڈ بنانا، یا حکومت سے کام کروانے کے لیے رشوت دینا جائز ہے یا نہیں؟

غریب مسلمان کو ضرورت کے وقت علاج ومعالجہ کے لیے دینا، نیز غیر مسلم کو دوا وغیرہ کے لیے دینا کیسا ہے؟ اور کن کن کاموں میں سود کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے؟

(۹) ضرورت مند رشتہ دار یا دوست وغیرہ کو قرض کے طور پر دی ہوئی رقم پر زکوۃ کس کے ذمے واجب ہوگی؟ اور جب وہ رقم ملے گی، تب واجب ہوگی، یا فی الفور؟

اور قرض کی رقم جب وصول ہو اور اس وقت قرضہ ہو، تو کیا کیا جائے؟

(۱۰) فی الحال میرے پاس ساڑے تین تولہ سونا اور تقریبا دس تولہ چاندی ہے، اور تقریباً ۲۰۰۰؍روپے کے ایسے برتن ہیں، جن کا سال میں ایک دو بار استعمال ہوتا ہے، اور بہت سے شوکیس میں رکھنے کے لیے ہی ہیں، جن کا استعمال کبھی نہیں ہوتا، اور پانچ گدے ہیں، جن کا استعمال اس سال نہیں ہوا، تو ان چیزوں پر اس سال زکوۃ واجب ہوگی؟ اور زکوۃ پورے سال میں رمضان المبارک کے پہلے دن واجب ہوگی؟

نوٹ: گذشتہ سال تک ہم مقروض تھے، اسی سال ہم دین سے فارغ ہوئے ہیں۔

(۱۱) اجتماعی نکاح کے وقت اگر کوئی دین دار آدمی، تمام دلہنوں کو مہر ادا کردے، تو اس کا اعتبار ہوگا یا خاوند کو ادا کرنی ہوگی؟

(۱۲) میرے والد کے ذمہ مہر کی رقم کی ادائیگی باقی ہے، اگر میں والد صاحب کو مہر کے پیسے دے دوں اور میرے والد میری والدہ کو دے دیں، تو مہر ادا ہو جائے گی، یا میرے والد کو کما کر ادا کرنی ہوگی؟

(۱۳) میرے دوست نے میرے نام پر شیئرز خریدے تھے، اس وقت اس کی قیمت ۲۲۰ روپے تھی، اور اب صرف ۳۰؍روپے قیمت ہے، تو اس کی زکوۃ کس پر واجب ہوگی؟ اور قیمتِ خرید کا اعتبار ہوگا یا موجودہ قیمت کا؟

(۱۴) ہماری کمپنی نے مکان خریدنے کے لیے قرض دیا تھا، میں اس مکان کو کرائے پر دے دیا ہے، تو اس کی مالیت پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

(۱۵) فریج، الماری، گاڑی، صوفہ وغیرہ ادھار خریدا ہے، جس کی ادائیگی قسطوں پر ہوگی، تو ان قرضوں کی رقم، زکوۃ نکالنے میں وضع کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

(۱) N.S.C میں رکھی ہوئی رقم پر، اختتام مدت پر، جو زیادتی ملتی ہے، وہ سود ہے اور سود کے بڑے نقصانات ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا ہے، اس لیے اس سے حد درجہ اجتناب چاہیے۔ [۱]

(۱) فأما الربا في اللغة: هو الزيادة. يقال: أربى فلان على فلان، أي زاد عليه. ويسمى المكان المرتفع ربوة؛ لزيادة فيه على سائر الأمكنة.

وفي الشريعة: الربا: هو الفضل الخالي عن العوض المشروط في البيع؛ لما بينا: أن البيع الحلال مقابلة مال =

اور سود کسی بھی قسم کا ہو، غریب و مسکین کو بغیر ثواب کی نیت کے دے دینا چاہیے، رفاہ عام، مثلاً عام

=متقوم بمال متقوم، فالفضل الخالي عن العوض إذا دخل في البيع كان ضد ما يقتضيه البيع، فكان حراما شرعا، واشتراطه في البيع مفسد للبيع، كاشتراط الخمر وغيرها.

والدليل على حرمة الربا: الكتاب والسنة. أما الكتاب فقوله تعالى: {وَحَرَّمَ الرِّبٰوا} [البقرة:٢٧٥]

وقد ذكر الله تعالى لآكل الربا خمسا من العقوبات:

(أحدها:) التخبط، قال الله تعالى: {لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ} [البقرة:٢٧٥] قيل: معناه ينتفخ بطنه يوم القيامة، بحيث لا تحمله قدماه، وكلما رام القيام يسقط فيكون بمنزلة الذي أصابه مس من الشيطان، فيصير كالمصروع الذي لا يقدر على أن يقوم. وقد ورد بنحوه أثر عن رسول الله – صلى الله عليه وسلم – أنه قال: يملأ بطنه نارا بقدر ما أكل من الربا. والمراد: أن يفتضح على رءوس الأشهاد. كما أشار إليه رسول الله – صلى الله عليه وسلم – في حديث آخر: أن لواء ينتصب يوم القيامة لآكلة الربا فيجتمعون تحته ثم يساقون إلى النار.

(والثاني): المحق، قال الله تعالى: {يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا} [البقرة:٢٧٦]. والمراد: الهلاك والاستيصال، وقيل: ذهاب البركة والاستمتاع، حتى لا ينتفع هو به ولا ولده بعده. ـــــــــ (والثالث): الحرب. قال الله تعالى: {فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ} [البقرة:٢٧٩]. والمعنى من القراءة بالمد: أعلموا الناس آكلة الربا أنكم حرب الله ورسوله بمنزلة قطاع الطريق. والقراءة بالقصر اعلموا أن آكلة الربا حرب الله ورسوله. ـــــــــ (والرابع): الكفر، قال الله تعالى: {وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ} [البقرة:٢٧٨]. وقال تعالى: {وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ} [البقرة:٢٧٦]. أي: كفار باستحلال الربا أثيم فاجر بأكل الربا. ـــــــــ (والخامس): الخلود في النار. قال الله تعالى: {وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ} [البقرة:٢٧٥]. ـــــــــ والسنة جاءت بتأييد ما قلنا: أن النبي – صلى الله عليه وسلم – قال: آكل درهم واحد من الربا أشد من ثلاث وثلاثين زنية يزنيها الرجل. من نبت لحمه من حرام فالنار أولى به. (المبسوط – محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ٤٨٣هـ): ١٢/ ١٠٩-١٠٩، كتاب البيوع، أنواع الربا، ط: دار المعرفة – بيروت)

وهو في اللغة: الزيادة، ومنه الربوة للمكان الزائد على غيره في الارتفاع. ـــــــــ وفي الشرع: الزيادة المشروطة في العقد، وهذا إنما يكون عند المقابلة بالجنس. ـــــــــ وقيل: الربا في الشرع، عبارة عن عقد فاسد بصفة، سواء كان فيه زيادة أو لم يكن، فإن بيع الدراهم بالدنانير نسيئة ربا، ولا زيادة فيه.

والأصل في تحريمه قوله تعالى: {وأحل الله البيع وحرم الربو} [البقرة:٢٧٥] وقوله: {لا تأكلوا الربو} [آل عمران:١٣٠] والحديث المشهور، وهو قوله – عليه الصلاة والسلام –: الذهب بالذهب مثلا بمثل، وزنا بوزن، يدا بيد، والفضل ربا، والحنطة بالحنطة مثلا بمثل، كيلا بكيل، يدا بيد، والفضل ربا، والشعير بالشعير، مثلا بمثل، كيلا بكيل، يدا بيد، والفضل ربا، والتمر بالتمر، مثلا بمثل، كيلا بكيل، يدا بيد، والفضل ربا، والملح بالملح، مثلا بمثل، كيلا بكيل، يدا بيد، والفضل ربا. (الاختيار لتعليل المختار – عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ٦٨٣هـ): ٢/ ٣٠، كتاب البيوع، باب الربا، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي – القاهرة)

راستہ، اس پر تعمیر کیے جانے والے بیت الخلاء، غسل خانے، اسکول کا کمپاؤنڈ وغیرہ میں خرچ کرنے کی گنجائش ہے، البتہ باقی رہنے والی عمارتوں میں استعمال نہ کرنا زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ اس کو دیکھ کر لوگوں کے دلوں سے آہستہ آہستہ سود کی حرمت نکل جانے کا اندیشہ ہے۔ (۲)

سود کی رقم اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں، البتہ حکومت کے ٹیکسوں سے تنگ آگئے ہوں اور اس کی ادائیگی کے لیے سود کی رقم استعمال کرنے پر مجبور ہوں، تو سرکاری بینکوں سے ملنے والے سود کو، غیر واجبی (ظلمی) ٹیکسوں، مثلاً انکم ٹیکس میں دینے کی گنجائش ہے، بغیر مجبوری کے استعمال نہ کی جائے۔ (۳)

---

(۲) اسلامک فقہ اکیڈمی-انڈیا نے دوسرے فقہی سیمنار (منعقدہ: ۸-۱۱ / جمادی الاولی، ۱۴۱۰ھ، مطابق: ۸ / ۱۱ / دسمبر ۱۹۸۹ء، دہلی) نے درج ذیل قرارداد پاس کی ہے:

۱- بینکوں سے ملنے والی سودی رقم کو بینکوں میں نہ چھوڑا جائے؛ بل کہ اسے نکال کر مندرجہ ذیل مصارف میں خرچ کیا جانا چاہیے:

۲- بینک کے سودی رقم کو بلا نیت ثواب فقراء و مساکین پر خرچ کر دیا جائے، اس پر تمام ارکان کا اتفاق ہے۔

۳- سودی رقم کو مساجد اور اس کے متعلقات پر خرچ نہیں کیا جا سکتا۔

۴- اکثر شرکاء سیمنار کی یہ رائے ہے کہ اس رقم کو صدقات واجبہ کے مصارف کے علاوہ رفاہ عام کے کاموں پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے، بعض حضرات کی رائے میں اس کے مصرف کو فقراء و مساکین تک محدود رکھنا چاہیے۔ (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۱۴۱، معاشی مسائل، بینک انٹرسٹ، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی-انڈیا، سن طباعت: اپریل: ۲۰۰۹ء)

وفي منية المفتي: مات رجل ويعلم الوارث أن أباه كان يكسب من حيث لا يحل، ولكن لا يعلم الطلب بعينه ليرد عليه حل له الإرث، والأفضل أن يتورع ويتصدق بنية خصماء أبيه. اهـ وكذا لا يحل إذا علم عين الغصب مثلا وإن لم يعلم مالكه، لما في البزازية أخذه مورثه رشوة أو ظلما، إن علم ذلك بعينه لا يحل له أخذه، وإلا فله أخذه حكما أما في الديانة فيتصدق به بنية إرضاء الخصماء اهـ.

والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه، وإن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام، ولا يعلم أربابه ولا شيئا منه بعينه حل له حكما، والأحسن ديانة التنزه عنه. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/ ۹۹، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب: رد المشترى فاسدا إلى بائعه فلم يقبله، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ ایک استفتاء کے جواب میں رقم طراز ہیں:

...... بہتر یہ ہے کہ بینک یا ڈاک خانے میں کوئی رقم جمع ہی نہ کی جائے، اگر جمع کر دی ہے، تو فاضل رقم وہاں سے وصول کر کے غرباء کو دے دی جائے، اس نیت سے کہ اللہ پاک اس کے وبال سے محفوظ رکھے، یہی احوط ہے، اگر سرکاری محکمہ سے سود کی رقم حاصل ہوئی، تو اس کو غیر واجبی ٹیکس میں ادا کرنا بھی درست ہے، بل کہ صدقہ سے مقدم ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۶/ ۸۱-۸۲، کتاب البیوع، باب الربا، بینک کے سود کا مصرف، ط: دار المعارف- دیو بند) =

مذکورہ امر میں مشغول اصل سرمایے پر زکوۃ واجب ہوگی، جب مذکورہ رقم قبضے میں آجائے، تو گذشتہ سال کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی، وصول کرنے سے پہلے ادا کردینے سے بھی ادا ہوجائے گی۔[۴]

= مزید دیکھیے: فتاویٰ رحیمیہ: ۹/ ۲۶۲، باب الربا، سودی رقم سے ٹیکس ادا کرنا، ط: دارالاشاعت-کراچی۔

---

(۲) انکم ٹیکس اور پروفیشنر ٹیکس میں دی ہوئی رقم کے بہ قدر، سرکاری بینکوں کے سود میں سے رقم وصول کرکے اپنے استعمال میں لانے کی گنجائش ہے۔ (امداد المفتیین)[۵]

(ویجب رد عین المغصوب) ما لم یتغیر تغیرا فاحشا، مجتبی (فی مکان غصبه) لتفاوت القیم باختلاف الأماکن (ویبرأ بردها ولو بغیر علم المالك)، فی البزازیة: غصب دراهم إنسان من کیسه، ثم ردها فیه بلا علمه بریء، وکذا لو سلمه إلیه بجهة أخری کهبة، أو إیداع، أو شراء، وکذا لو أطعمه فأکله . (الدر المختار علی رد المحتار: ۶/ ۱۸۲، کتاب الغصب، ط: دار الفکر-بیروت)

وشمل الرد حکما ما فی جامع الفصولین: وضع المغصوب بین یدي مالکه بریء، وإن لم یوجد حقیقة القبض. (رد المحتار علی الدر المختار: ۶/ ۱۸۲، کتاب الغصب، مطلب فیما لو هدم حائط، ط: دار الفکر-بیروت)

(۴) (ولو کان الدین علی مقر ملیء... فوصل إلی ملکه لزم زکاة ما مضی). [الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۷-۲۶۶، أول کتاب الزکاة، ط: دار الفکر-بیروت]

[۵] سوال: گورنمنٹ آف انڈیا نے اپنے پرائز بونڈ کے نوٹ جاری کیے ہیں، ان پر بہ حساب چھ فی صد سالانہ سود ملتا ہے، میں گورنمنٹ آف انڈیا کو تقریباً تین ہزار روپیہ سالانہ انکم ٹیکس دیتا ہوں، تو کیا میرے لیے جائز ہوگا کہ میں بونڈ خرید کر اس کا سود اس نیت سے لوں کہ مجھ سے گورنمنٹ یہ رقم انکم ٹیکس، جو شرعاً ایک ناجائز مطالبہ ہے، وصول کرچکی ہے، وہ میں واپس لے رہا ہوں۔

جواب: جس قدر روپیہ گورنمنٹ آپ سے بہ ذریعہ ٹیکس وصول کرتی ہے، اسی قدر روپیہ آپ گورنمنٹ بینک یا دوسرے سرکاری محکمات سے، جس طرح ممکن ہو وصول کرسکتے ہیں، گورنمنٹ اس کا نام سود رکھے یا کچھ اور، آپ اپنا جائز مطالبہ وصول کرنے کی نیت سے لیں، تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، اور آپ کے حق میں سود نہیں ہوگا۔ ایسے مواقع میں فقہاء نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اپنے حق کی مقدار چوری یا غصب کرکے بھی اگر کوئی شخص اپنے مدیون سے وصول کرلے، تو جائز ہے:

قال فی الشامیة فی باب حد السرقة: فإذا ظفر بمال مدیونه له الأخذ دیانة بل له الأخذ من خلاف الجنس علی ما نذکره قریبا، انتهی. (شامی: ۳/ ۹۵، ط: دار الفکر) (امداد المفتیین ۲/ ۷۰۶، کتاب الربا والقمار، ط: دارالاشاعت-کراچی)

قاعدة: الضرر یدفع بقدر الإمکان (مج)———— قاعدة: الضرر یزال (شن) [قواعد الفقه- محمد عمیم الإحسان المجددي البرکتي، ص: ۸۸، قاعدہ نمبر: ۱۶۸ و ۱۶۹، ط: الصدف پبلشرز- کراتشي)

قاعدة: المظلوم له أن یدفع الظلم عن نفسه بما قدر علیه لکن لیس له أن یظلم غیره (سیر) [حوالہ سابق، ص: ۱۲۴، قاعدہ نمبر: ۳۳۲]

---

(۳) سرکاری بینک کا سود اگر اپنا ہو، تو مجبوراً دینے کی گنجائش ہے، دوسرے کا نہ دیا جائے۔ (۶)

(۴) مذکورہ گفٹ لے کر کسی غریب مسلمان کو ثواب کی نیت کے بغیر دے دی جائے۔ (۷)

---

(۵) لازمی [جبری] پراویڈنٹ فنڈ کی رقم جب آدمی کو حاصل ہو اور وہ زکوٰۃ کے نصاب کا مالک ہو اور اس پر اسلامی سال گذر جائے، ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ (۸)

گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ (۹)

---

(۶) حاشیہ نمبر ۳ دیکھیں۔

(۷) بینک میں سود یا ملنے والی کوئی شئے نہیں چھوڑنی چاہیے، کہ اس کا غلط استعمال ہوتا ہے۔

بینک سے ملنے والا انعام ایک قسم کا تبرع ہے؛ اس لیے اس کا استعمال جائز ہونا چاہیے، صاحب فتاویٰ دار العلوم زکریا- ساؤتھ افریقہ، نے لکھا ہے کہ: بینک والوں کا انعام دینا اور اس کا لینا جائز ہے، اس عقد کو عقد تبرع کہتے ہیں، یعنی کسی کے ساتھ مشروط احسان کرنا، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے امداد الاحکام (۳/۳۸۶) میں اس کا جواز تحریر فرمایا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی رائے ورع و تقویٰ پر محمول ہوگی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/۴۰۰، سود کے احکام کا بیان، ط: مجلس البحوث والافتاء، ممبئی)

(۸ و ۹) فقہ اکیڈمی- انڈیا نے اس موضوع پر منعقد سمینار (۳-۶، جمادی الاولیٰ، ۱۴۱۳ھ = مطابق: ۳۰/ اکتوبر- ۲/ نومبر ۱۹۹۲ء، مقام: اعظم گڑھ) میں درج ذیل فیصلہ کیا ہے:

پراویڈنٹ فنڈ (تنخواہ سے لازمی طور پر وضع ہونے والی رقم) جب تک اس پر قبضہ نہ ہو جائے، اس کی زکاۃ واجب نہ ہوگی، جب یہ رقم وصول ہو جائے اور بقدر نصاب ہو اور اس پر ایک سال گذر جائے، تو اس کی زکاۃ ادا کرنی ہوگی۔

بعض اوقات کچھ لوگ قانون انکم ٹیکس کی زد سے بچنے یا دیگر مصالح کی خاطر اختیاری طور پر اپنی تنخواہ سے کچھ زائد رقم وضع کرا کر، پی- ایف (P.F) جمع کراتے ہیں، یہ رقم اگر قدر نصاب کو پہنچ جائے، تو سال بہ سال زکاۃ ادا کرنی پڑے گی۔ اس اختیاری وضع کرائی ہوئی رقم کی حیثیت ودیعت کی ہے، اور مال ودیعت پر زکاۃ واجب ہوتی ہے۔ (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۶۱، عبادتی مسائل، پراویڈنٹ فنڈ پر زکاۃ، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی- انڈیا)

حضرت مفتی سید عبد الرحیم صاحب لاج پوریؒ ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں: جو ۹/ روپے لازماً کٹتے ہیں، اور اس پر جو مزید رقم ملے گی، یہ سب سرکاری انعام ہے، اس پر زکاۃ کا مسئلہ، ملنے اور قبضہ میں آنے کے بعد جاری ہوگا، ملنے سے پہلے نہیں، البتہ جو رقم ماہانہ (اکتالیس روپے) جمع کرنے کی آپ نے اپنی مرضی سے منظوری دی ہے، اس میں زکاۃ کا حکم جاری ہوگا؛ اگرچہ وہ قبضہ میں نہیں ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۷/ ۱۵۲، کتاب الزکاۃ، پروویڈنٹ فنڈ پر زکاۃ نہیں ہے، اپنی مرضی سے رقم کٹوائے، تو اس پر زکاۃ ہے، ط: دار الاشاعت، کراچی، پاکستان) =

---

(۶) مذکورہ سوسائٹی میں جمع رقم پر صاحب نصاب کے ذمہ ہر سال کی زکوۃ واجب ہوگی، رقم وصول ہونے کے بعد زکوۃ ادا کرے، تو ہر سال کی جمع رقم کے حساب کے مطابق، گذشتہ سالوں کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔ (۱۰)

(۷) L.I.C میں سرمایہ کاری جائز نہیں ہے؛ اس پر ملنے والی زیادتی سود ہے اور اصل سرمایہ پر ہر سال زکوۃ واجب ہوگی، اور اگر رقم وصول کرنے کے بعد ادا کرے، تو گذشتہ سالوں کی بھی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔ (۱۱)

---

(۸) سود کی رقم کسی بھی غریب مسلمان کو ثواب کی نیت بغیر دیدی جائے، غریب مسلمان کی دوا، کپڑے یا کسی بھی ضرورت کے لیے دی جاسکتی ہے، رفاہ عام کے کاموں میں، مثلاً: عام راستہ، اس پر تعمیر کیے جانے والے بیت الخلاء، غسل خانے، پانی کی ٹنکی وغیرہ میں استعمال کرنے کی بھی گنجائش ہے؛ لیکن جیسا کہ جواب نمبر:۱ میں وضاحت کی گئی کہ ایسی چیزوں میں اس کا استعمال بہتر نہیں ہے، جو باقی رہنے والی ہو؛ اس لیے کہ اس کی وجہ سے سود کی حرمت دلوں سے نکل جانے کا اندیشہ ہے۔

اسکول کے کمپاؤنڈ میں بھی استعمال کی جاسکتی ہے، ڈونیشن کے طور پر اپنے نام سے دینا جائز نہیں

= وأما الشرائط التي ترجع إلى المال فمنها: الملك، فلا تجب الزكاة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك وهذا، لأن في الزكاة تمليكا والتمليك في غير الملك لا يتصور. (بدائع الصنائع: ۹/۲، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(وسببه) أي سبب افتراضها (ملك نصاب حولي) [الدر المختار] ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ملك نصاب) فلا زكاة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك، ولا فيما أحرزه العدو بدارهم لأنهم ملكوه بالإحراز عندنا خلافا للشافعي بدائع، ولا فيما دون النصاب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲۵۹/۲، كتاب الزكاة، قبيل: مطلب الفرق بين السبب والشرط والعلة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱۰-۱۱) اصل مال پر زکاۃ واجب ہوگی، اصل مال سے جو زائد رقم ہے، وہ سود ہے۔ اصل مال دین قوی ہے، جس میں سالہائے گذشتہ کی زکوۃ بھی واجب ہوتی ہے:

(ولو كان الدين على مقر مليء ...فوصل إلى ملكه لزم زكاة ما مضى). [الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶-۲۶۷، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت]

ہے، اسی طرح سرکاری کام نکالنے کے لیے رشوت کے طور پر دینا بھی جائز نہیں ہے، غیر مسلم کو دوا وغیرہ کے طور پر نہ دی جائے، کہ ان کے مقابلے میں مسلمانوں میں غربت کہیں زیادہ ہے۔ (۱۲)

سود کی رقم ثواب کی نیت کے بغیر دے دی جائے، اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور پاک وحلال مال ہی قبول کرتے ہیں، حرام مال قبول نہیں کرتے، لہٰذا سود کی رقم میں ثواب کی نیت کرنے سے کفر کا اندیشہ ہے، البتہ اگر ثواب کی نیت کے بغیر دیدی جائے، تو شریعت کے حکم پر عمل کرنے کی وجہ سے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرمائیں گے۔

---

(۹) قرض کے طور پر دی گئی رقم کی زکوٰۃ، مال دار قرض خواہ پر ہوگی، مقروض پر اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی؛ کیوں کہ اس کا مالک قرض خواہ (قرض دینے والا) ہے، مقروض نہیں۔ (۱۳)

ہر سال کا حساب الگ الگ کیا جائے گا اور قرض دی ہوئی رقم، قرض خواہ کے جمع شدہ مال میں شمار ہوگی، اگر اس کے ذمہ بھی قرض ہو، تو جمع شدہ مال سے وضع کرنے کے بعد نصاب کے بہ قدر مال باقی رہے،

---

(۱۲) سوال: بینک سے جو سود ملتا ہے، وہ کس کو دیا جائے؟ ایک غیر مسلم ضرورت مند ہے، اس کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: یہ رقم غریب، مسکین محتاج کو دی جاسکتی ہے، اور وہ اپنے کام میں لے سکتا ہے، غریب مسلمان کو فائدہ پہنچانا چاہیے، وہ بہ نسبت غیر مسلم کے زیادہ حق دار ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۹/ ۲۷۹، باب الربا، بینک کا سود غیر مسلم کو دینا، ط: دار الاشاعت- کراچی)

(۱۳) عن عبد الله بن مسعود، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن الله قسم بينكم أخلاقكم، كما قسم بينكم أرزاقكم، . . . ولا يكسب عبد مالا من حرام، فينفق منه فيبارك له فيه، ولا يتصدق به فيقبل منه، ولا يترك خلف ظهره إلا كان زاده إلى النار، إن الله عز وجل لا يمحو السيئ بالسيئ، ولكن يمحو السيئ بالحسن، إن الخبيث لا يمحو الخبيث . (مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۶/ ۱۸۹، رقم الحديث: ۳۶۷۲، ط: الرسالة☆شرح السنة- محيي السنة، أبو محمد الحسين بن مسعود بن محمد بن الفراء البغوي الشافعي (م: ۵۱۶هـ): ۸/ ۱۰، رقم الحديث: ۲۰۳۰، كتاب الحج، باب الكسب وطلب الحلال، ت: شعيب الأرنؤوط- محمد زهير الشاويش، ط: المكتب الإسلامي - دمشق)

والمعنى أن التصدق بالمال الحرام سيئة، ولا يمحو الله الأعمال السيئات بالسيئات، بل قال بعض علمائنا: من تصدق بمال حرام، ورجا الثواب كفر، ولو عرف الفقير ودعا له كفر. (مرقاة المفاتيح: ۵/ ۱۸۹۸، تحت رقم الحديث: ۲۷۷۱، كتاب البيوع، باب الكسب وطلب الحلال، ط: دار الفكر- بيروت)

رجل دفع إلى فقير من المال الحرام شيئا يرجو به الثواب يكفر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۹۲، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، مطلب في التصدق من المال الحرام، ط: دار الفكر)

تو اس کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔

(۲) قرض کی رقم جب وصول ہوگی تو اس کی زکوۃ ادا کرنی ہوگی اور گذشتہ سالوں کی بھی ادا کرنی ہوگی اور اگر وصول کرنے سے پہلے ادا کردے تب بھی ادا ہوجائے گی۔ [۱۴]

---

(۱۰) آپ کی تحریر کردہ اشیاء میں سے سونے اور چاندی پر ہی زکوۃ واجب ہوگی۔ [۱۵] گھر کے برتن اور گدے وجوب زکوۃ کے نصاب میں محسوب نہیں ہوں گے اور ان پر زکوۃ بھی فرض نہیں ہوگی۔ [۱۶] البتہ ضرورت سے زائد برتن، جو سال میں بالکل استعمال نہیں ہوتے، نیز شوکیش میں رکھے ہوئے شو کے برتن وغیرہ صدقۂ فطر اور قربانی کے نصاب میں شمار کیے جائیں گے۔ [۱۷]

---

(۱۴) "الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما و حال عليه الحول". (الهداية: ۱/۱۸۵، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند☆العناية: ۱/۱۵۳، أول كتاب الزكاة☆البناية: ۳/۲۸۹، كتاب الزكاة، حكم الزكاة، وشروط وجوبها، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

"ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكاة عليه"... "وإن كان ماله أكثر من دينه زكى الفاضل إذا بلغ نصابا" لفراغه عن الحاجة. (الهداية: ۱/۱۸۶، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم-دیوبند)

(۱۵) أموال الزكاة أنواع ثلاثة أحدها: الأثمان المطلقة وهي الذهب والفضة، والثاني: أموال التجارة وهي العروض المعدة للتجارة، والثالث: السوائم. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود، الكاساني (م: ۵۸۷هـ): ۲/۱۶، كتاب الزكاة، فصل الأثمان المطلقة وهي الذهب والفضة، ط: دار الكتب العلمية)

(۱۶) (وسببه) أي سبب افتراضها (ملك نصاب حولي) نسبة للحول لحولانه عليه (تام)... (فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد)... (و) فارغ (عن حاجته الأصلية) لأن المشغول بها كالمعدوم... (تام ولو تقديرا) [الدر المختار على رد المحتار: ۲/۲۵۹-۲۶۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر]

"وليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة" لأنها مشغولة بالحاجة الأصلية وليست بنامية أيضا وعلى هذا كتب العلم لأهلها والات المحترفين لما قلنا. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۹۶، كتاب الزكاة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

ومنها كون النصاب تاما. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۴، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

(۱۷) وهي واجبة على الحر المسلم المالك لمقدار النصاب فاضلا عن حوائجه الأصلية كذا في الاختيار شرح المختار، ولا يعتبر فيه وصف النماء ويتعلق بهذا النصاب وجوب الأضحية، ووجوب نفقة الأقارب هكذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۱، كتاب الزكاة، الباب الثامن في صدقة الفطر، ط: دار الفكر)

جب آپ نے قرض کی ادائیگی سے فراغت حاصل کی، اور زکوۃ کے نصاب کے بہ قدر مال کے مالک بنے، اس وقت سے ایک اسلامی سال مکمل گذر جائے، تب زکوۃ فرض ہوگی۔ [18]

زکوۃ کے فرض ہونے میں ماہ رمضان کو کوئی دخل نہیں ہے؛ بل حولان حول کا اعتبار ہے، چاہے جب ہوجائے، لہٰذا اگر کوئی شخص یکم محرم الحرام کو نصاب کا مالک ہوا اور اس پر ایک سال گذر گئے، یعنی دوسرے سال کا ماہ محرم شروع ہوگیا، تو اس پر زکاۃ کی ادائیگی واجب ہوگی، بلا وجہ تاخیر کرنے سے گنہ گار ہوگا۔ [19]

---

(۱۱) مہر دینے والے آدمی نے شوہر کی اجازت سے ان کی بیویوں کا مہر ادا کیا ہو، تو کوئی حرج نہیں؛ کیوں کہ ایک آدمی کا قرض اس کی اجازت سے دوسرا آدمی ادا کرسکتا ہے، مہر بھی شوہر کے ذمہ بیوی کا قرض ہے، لہٰذا دوسرا آدمی اس کی اجازت سے ادا کرسکتا ہے، مہر ذاتی کمائی سے ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔ [20]

---

(١٨) لا خلاف في أن أصل النصاب وهو النصاب الموجود في أول الحول يشترط له الحول: لقول النبي - صلى الله عليه وسلم -: "لا زكاة في مال حتى يحول عليه الحول"؛ ولأن كون المال ناميا شرط وجوب الزكاة لما ذكرنا، والنماء لا يحصل إلا بالاستنماء، ولا بد لذلك من مدة، وأقل مدة يستنمى المال فيها بالتجارة والإسامة عادة الحول. (بدائع الصنائع: ٢/ ١٣، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية)

(وشرطه) أي شرط افتراض أدائها (حولان الحول) وهو في ملكه. (الدر المختار مع رد المحتار: ٢/ ٢٦٧، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(١٩) (وحولها) أي الزكاة (قمري) بحر عن القنية (لا شمسي). [الدر المختار مع رد المحتار: ٢/ ٢٩٥ - ٢٩٤، كتاب الزكاة، قبيل: باب زكاة المال، ط: دار الفكر - بيروت]

وتجب على الفور عند تمام الحول حتى يأثم بتأخيره من غير عذر، وفي رواية الرازي على التراخي حتى يأثم عند الموت، والأول أصح كذا في التهذيب. (الفتاوى الهندية: ١/ ١٧٠، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر - بيروت)

(وافتراضها عمري) أي على التراخي وصححه الباقاني وغيره (وقيل فوري) أي واجب على الفور (وعليه الفتوى) كما في شرح الوهبانية (فيأثم بتأخيرها) بلا عذر. (الدر المختار مع رد المحتار: ٢/ ٢٧١-٢٧٢، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

إذا لم يؤد الزكاة حتى مضى حولان فقد أساء وأثم. (بدائع الصنائع: ٢/ ٣، كتاب الزكاة، فصل كيفية فرضية الزكاة، ط: دار الكتب العلمية)

(٢٠) لو قضى دين الحي إن قضاه بغير أمره يكون متبرعا... وإن قضاه بأمره جاز. (البحر الرائق: ٢/ ٤٢٣، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا - ديوبند)

(۱۲) آپ والد صاحب کو بہ طور خدمت، کوئی رقم ہدیہ کردیں، اور اس رقم سے والد صاحب مہر ادا کریں، تو جائز ہے؛ کیوں کہ وہ رقم کے مالک ہیں، اور اس میں مکمل تصرف کا اختیار رکھتے ہیں۔

(۱۳) شیئرز پر زکاۃ ہے، بشرطے کہ شیئرز ہولڈر کے پاس نصاب کے بہ قدر مال ہو، شیئرز کی مالیت کو بھی اس میں شمار کیا جائے گا۔

اس لیے اگر آپ کو مالک بنانے کے لیے آپ کے نام پر شیئرز خریدے گئے ہیں، تو ان کی زکوۃ آپ پر واجب ہوگی، اور اگر صرف آپ کا نام استعمال کیا گیا ہو، اور اصل مالک آپ کا دوست ہو، تو شیئرز کی زکوۃ آپ کے دوست پر واجب ہوگی۔[۲۱]

---

(۲۱) وأما الشرائط التي ترجع إلى المال فمنها: الملك، فلا تجب الزكاة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك وهذا، لأن في الزكاة تمليكا، والتمليك في غير الملك لا يتصور. (بدائع الصنائع: ۹/۲، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲۲) وتعتبر القيمة يوم الوجوب، وقالا: يوم الأداء. وفي السوائم يوم الأداء إجماعا، وهو الأصح، ويقوم في البلد الذي المال فيه ولو في مفازة ففي أقرب الأمصار إليه فتح. (الدر المختار)ــــــــــــ وقال ابن عابدين: (قوله وهو الأصح) أي كون المعتبر في السوائم يوم الأداء إجماعا هو الأصح، فإنه ذكر في البدائع أنه قيل إن المعتبر عنده فيها يوم الوجوب، وقيل يوم الأداء. اهـ. ــــ وفي المحيط: يعتبر يوم الأداء بالإجماع وهو الأصح اهـ فهو تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما، وعليه فاعتبار يوم الأداء يكون متفقا عليه عنده وعندهما (قوله: ويقوم في البلد الذي المال فيه) فلو بعث عبدا للتجارة في بلد آخر يقوم في البلد الذي فيه العبد بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲۸۶/۲، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

(۲۳) (ومنها فراغ المال) عن حاجته الأصلية، فليس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنازل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة. (الفتاوى الهندية: ۱۷۲/۱، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر)

ولو آجر عبده أو داره بنصاب إن لم يكونا للتجارة لا تجب ما لم يحل الحول بعد القبض في قوله. (البحر الرائق: ۲۲۲/۲، كتاب الزكاة، شروط الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

"وإن اشترى شيئا ونواه للتجارة كان للتجارة لاتصال النية بالعمل". (الهداية: ۱۸۷/۱، أول كتاب الزكاة، ط: ياسر نديم-ديوبند)

الزكاة واجبة في عروض التجارة. (حوالہ سابق: ۱۹۵/۱، کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ المال، فصل فی العروض)

مکان پر یا اس کی قیمت پر تو کسی حال میں زکاۃ نہیں، خواہ رہائشی ہو، یا نہ ہو، ہاں، اگر مکانات کی تجارت کی جاتی ہو، تو بہ حیثیت=

شیئرز کی زکوۃ میں ادائیگی کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔[۲۲]

---

(۱۴) سکونت اختیار کرنے کے لیے، یا کرایہ پر دینے کے لیے خریدے ہوئے مکان پر زکوۃ واجب نہیں ہے، البتہ مکان خریدتے وقت بیچنے کی نیت ہو، تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔[۲۳]

(۱۵) اگر مذکورہ اشیاء قسط وار خریدی ہو اور قسط ایک سال یا زیادہ مدت کی ہو، تو ایک سال کی قسطوں کی رقم، جمع شدہ رقم سے وضع کی جائے گی، اس سے زیادہ قرض وضع نہیں کیا جائے گا۔[۲۴] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

= مال تجارت ہونے کے، ان کی قیمت پر زکاۃ ہوگی۔

اگر خود مکانوں کو بہ نیت تجارت خریدا گیا ہو، تو ان کی قیمت پر زکاۃ ہوگی، ورنہ نہیں۔ (کفایت المفتی: ۴/ ۲۶۴، مسئلہ نمبر: ۳۰۴، کتاب الزکاۃ والصدقات، رہائش سے زائد مکان پر بھی زکاۃ نہیں، ط: زکریا- دیوبند)

[۲۴] وعلى هذا يخرج مهر المرأة فإنه يمنع وجوب الزكاة عندنا معجلا كان أو مؤجلا؛ لأنها إذا طالبته يؤاخذ به، وقال بعض مشايخنا: إن المؤجل لا يمنع؛ لأنه غير مطالب به عادة. (بدائع الصنائع: ۲/ ۶، كتاب الزكاة، فصل شرائط فرضية الزكاة، الشرائط التي ترجع على من عليه المال، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(قوله المؤجل) وقيل المهر المؤجل لا يمنع؛ لأنه غير مطالب به عادة، بخلاف المعجل، وقيل: إن كان الزوج عزم على الأداء، منع، وإلا فلا؛ لأنه لا يعد دينا، بحر عن غاية البيان، وفي القهستاني: والصحيح أن المؤجل غير مانع، كما في الجواهر. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ۱/ ۳۹۱، كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية)

(فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد) سواء كان لله كزكاة وخراج أو للعبد، ولو كفالة أو مؤجلا، ولو صداق زوجته المؤجل للفراق. (الدر المختار) ———— (قوله أو مؤجلا إلخ) عزاه في المعراج إلى شرح الطحاوي، وقال: وعن أبي حنيفة لا يمنع. وقال الصدر الشهيد: لا رواية فيه، ولكل من المنع وعدمه وجه. زاد القهستاني عن الجواهر: والصحيح أنه غير مانع. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۱، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

صورت مسئولہ میں اصولاً تمام قسط کے قرضے کو اصل مال سے منہا کرنا چاہیے؛ لیکن ایسا فتویٰ صادر کیا جائے تو عملاً فقراء محروم ہو جائیں گے؛ کیوں کہ آج کل طویل مدتی قرضے انتہائی کم مقدار میں قابل ادا ہوتے ہیں، ایسی صورت میں مال داروں کو اس رقم کی زکوۃ میں چھوٹ دینا لازم آئے گا، جس میں وہ تصرف کرتے ہیں اور طویل مدت میں اسے ادا کرتے ہیں، استاذ گرامی، فقیہ العصر، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ رقم طراز ہیں:

سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی طرف سے آج کل ترقیاتی اور صنعتی قرضے فراہم کیے جاتے ہیں، طویل مدت میں ان کی ادائیگی مطلوب ہوتی ہے، ان قرضوں کی مقدار تو بہت زیادہ ہوتی ہے؛ لیکن ہر سال ادا طلب قسم بہت معمولی ہوتی ہے، سوال یہ ہے =

[۵۵] کرایہ پر دیا ہوا مکان نصاب میں شمار ہوگا یا نہیں؟

گذشتہ سے پیوستہ

۱۳۰۰- سوال: ہماری کمپنی نے قرض سے گھر خرید کر دیا ہے، جس کی قیمت دو لاکھ تیس ہزار [230000] ہے، میرے والد کا ذاتی مکان ہے؛ میں اپنے والدین کے ہمراہ، فیملی کے ساتھ رہتا ہوں، اور کمپنی کا دیا ہوا مکان کرایہ پر دے رکھا ہے، ہماری کمپنی ہر ماہ کی تنخواہ میں سے مکان کی قسط وضع کر لیتی ہے، تو مجھ پر اس مکان کی وجہ سے زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ نیز صدقۂ فطر اور قربانی کا وجوب ثابت ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

مکان کی قابلِ ادا قسطوں میں سے ایک سال کی قسط کے بہ قدر، زکوۃ واجب ہونے والے اموال

= کہ ایسے قرضے پورے کے پورے منہا کر کے زکوۃ واجب ہوگی یا ہر سال کی مطلوبہ قسط ہی منہا کی جائے گی، اور باقی پورے مال کی زکاۃ ادا کرنی ہوگی؟

فقہاء احناف کے عام اصول کا تقاضہ تو یہی ہے کہ ایسی صورت میں پورے قرض کو منہا کیا جائے، اس کے بعد جو رقم بچ جائے، اس میں زکاۃ واجب ہو؛ لیکن ایسے طویل مدتی دیون کو مستثنیٰ کرنے میں فقراء کو اپنے حق سے محروم ہونا پڑتا ہے، اور صاحب مال کو ایک ایسے مال کی زکاۃ سے چھوٹ مل جاتی ہے، جو اس کے تصرف میں ہے، اور جس کی ادائیگی میں اسے بہت مہلت حاصل ہے، اس لیے ان حالات میں سب سے متوازن، شریعت کی روح و مقصد سے ہم آہنگ اور معتدل رائے یہ ہے کہ ہر سال قرض کی جو قسط ادا کی جاتی ہے، صرف وہی مقدار زکاۃ سے مستثنیٰ ہوں گی، بقیہ پورے مال میں زکاۃ ادا کی جائے گی، اس سلسلے میں فقہاء کے یہاں ایک نظیر بھی موجود ہے، کہ دیر سے ادا کیا جانے والا مہر (مہر مؤجل) منہا کیے بغیر پورے مال میں زکاۃ واجب ہوگی، چناں چہ علامہ کاسانیؒ نقل کرتے ہیں: وقال بعض مشايخنا: إن المؤجل لا يمنع، لأنه غير مطالب به عادة. (ہمارے بعض مشائخ کہتے ہیں کہ ادھار مہر، زکاۃ کی ادائیگی کے لیے مانع نہیں؛ کیوں کہ عام طور سے اس کا مطالبہ نہیں کیا جاتا ہے۔)

خود امام ابوحنیفہؒ سے بھی اس طرح کے اقوال منقول ہیں کہ دین مؤجل یعنی دیر سے قابل ادائیگی قرضے زکاۃ واجب ہونے میں مانع نہیں ہیں، اور علامہ شامی نے نقل کیا ہے کہ یہی قول صحیح ہے۔ (دیکھیے: شامی: ۲/۲۶۱، اول کتاب الزکاۃ، ط: دار الفکر)

[جدید فقہی مسائل: ۱/۱۴۲- ۲۱۳، زکاۃ طویل مدتی دیون کی زکاۃ، ط: نعیمیہ- دیوبند☆ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۳/۱۳۳، کتاب الزکاۃ، وجوب زکاۃ کا بیان، ترقیاتی قرضے مانع زکاۃ نہیں ہے، ط: مجلس البحوث والافتاء، ممبئی]

نوٹ: یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے، جب کہ طویل مدتی قرض ہو، اگر صرف دو تین سال کی مدت میں قرض کا ادا کیا جانا ضروری ہو، تب اس کے مجموعے کو اموال زکاۃ سے منہا کیا جانا چاہیے؛ کیوں کہ اس صورت میں فقراء کے حق کو ضائع کرنا لازم نہیں آتا، اس لیے عام اصول سے عدول کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ——— ہاں اگر اس قرض کو دس گیارہ سال کی مدت میں ادا کرنا ہو، تب وہی حکم ہوگا، جو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا ہے۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

سے وضع کرنے کے بعد، اگر آپ صاحب نصاب باقی رہتے ہیں، تو آپ کو زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔ (۱) اور صدقۂ فطر وقربانی واجب ہونے کے لیے کرایے پر دیا ہوا ضرورت سے زائد مکان بھی محسوب ہوگا۔ (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) "ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكاة عليه" وقال الشافعي رحمه الله تجب لتحقق السبب وهو ملك نصاب تام ولنا أنه مشغول بحاجته الأصلية فاعتبر معدوما كظماء المستحق بالعطش وثياب البذلة والمهنة" وإن كان ماله أكثر من دينه زكى الفاضل إذا بلغ نصابا" لفراغه عن الحاجة. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳ھ):۱/ ۹۵، أول كتاب الزكاة،ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

اگر قابل ادا قسط، کئی سالوں پر محیط ہو، تب تو صرف ایک سال کی قسط کو اموال زکاۃ سے منہا کیا جائے گا، اور اگر ان قسطوں کی ادائیگی کے لیے طویل مدت کی مہلت نہ ہو، تو مکمل قرض کو قابل زکوۃ اموال سے منہا کیا جائے گا، تفصیل کے لیے دیکھیے گذشتہ سوال کا حاشیہ نمبر ۲۴۔

(۲) وإذا كان دار لايسكنها ويؤاجرها أو لا يؤاجرها تعتبر قيمتها في الغناء، وكذا إذا سكنها وفضل شيء عن سكناه، تعتبر قيمة الفاضل في النصاب، ويتعلق بهذا النصاب أحكام وجوب صدقة الفطر والأضحية. (الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۴۵۴، كتاب الصوم، الفصل الثالث عشر في صدقة الفطر، ط: زكريا)

وهي[صدقة الفطر] واجبة على الحر المسلم المالك لمقدار النصاب فاضلا عن حوائجه الأصلية كذا في الاختيار شرح المختار، ولا يعتبر فيه وصف النماء ويتعلق بهذا النصاب وجوب الأضحية، ووجوب نفقة الأقارب هكذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية:۱/ ۱۹۱، كتاب الزكاة، الباب الثامن في صدقة الفطر، ط: دار الفكر)

ويعتبر ما زاد على الدار الواحدة في الغنى. (الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۲۱۵، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

عن علی رضی الله عنه، عن النبی صلی الله علیه وسلم ببعض أول هذا الحديث، قال: فإذا كانت لك مائتا درهم، وحال عليها الحول، ففيها خمسة دراهم، وليس عليك شیء - يعنی - فی الذهب حتی يكون لك عشرون دينارا، فإذا كان لك عشرون دينارا، وحال عليها الحول، ففيها نصف دينار، فما زاد، فبحساب ذلك. (سنن ابی داود: ۱/ ۲۲۱، حدیث نمبر: ۱۵۷۳، کتاب الزکاۃ، باب فی زکاۃ السائمۃ، ط: فیصل دیوبند)

باب الزكاة في الذهب والفضة والفلوس

[سونا، چاندی، اور نوٹ پر زکاۃ]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الزكاة في الذهب والفضة والفلوس

[سونا، چاندی، اور نوٹ پر زکاۃ]

[۱] پورے سونے میں زکوٰۃ ہے یا نصاب سے زائد حصے میں؟

۱۳۰۱- سوال: سونا اگر ساڑھے سات تولہ سے زائد ہو تو زکوٰۃ اس زائد میں واجب ہوگی یا پورے سونے پر؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوٰۃ کا نصاب ساڑھے سات تولہ سونا ہے، جب زکوٰۃ فرض ہوگی، تو تمام سونے کا چالیسواں حصہ نکالنا واجب ہوگا، ایک بھی تولے کی معاف نہیں ہے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تجب في كل مائتي درهم خمسة دراهم، وفي كل عشرين مثقال ذهب نصف مثقال ... ثم في كل أربعين درهما درهم. (الفتاوى الهندية:۱/ ۱۷۸-۱۷۹، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، الفصل الأول في زكاة الذهب والفضة، ط: دار الفكر - بيروت)

وأما مقدار الواجب فيه فربع العشر بحديث عمرو بن حزم وحديث علي - رضي الله عنهما - لأن نصف مثقال من عشرين مثقالا ربع عشره. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۸- ۱۹، كتاب الزكاة، فصل مقدار الواجب في زكاة الذهب، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۲] قرض کی زکوٰۃ واجب ہے

۱۳۰۲- سوال: میرے پاس نقد چونتیس ہزار (۳۴۰۰۰) روپے ہیں اور اپنے ایک بیٹے کو میں نے چھبیس ہزار (۲۶۰۰۰) روپے سال گذشتہ قرض دیے ہیں، قرض کی اس رقم کی واپسی کی پوری امید ہے، تو مجھ پر اس قرض کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جو رقم آپ نے بہ طور قرض دے رکھی ہے اور اس کی واپسی کی بھی امید ہے، تو وہ جب بھی حاصل ہوگی، اس پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (و) اعلم أن الديون عند الإمام ثلاثة: قوي، ومتوسط، وضعيف؛ (فتجب) زكاتها إذا تم نصابا وحال الحول، لكن لا فورا بل (عند قبض أربعين درهما من الدين) القوي كقرض. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳۰۵/۲، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر - بيروت)

وجملة الكلام في الديون أنها على ثلاث مراتب في قول أبي حنيفة: دين قوي، ودين ضعيف، ودين وسط كذا قال عامة مشايخنا أما القوي فهو الذي وجب بدلا عن مال التجارة كثمن عرض التجارة من ثياب التجارة، وعبيد التجارة، أو غلة مال التجارة ولا خلاف في وجوب الزكاة فيه إلا أنه لا يخاطب بأداء شيء من زكاة ما مضى ما لم يقبض أربعين درهما، فكلما قبض أربعين درهما أدى درهما واحدا. ــــــــ وعند أبي يوسف ومحمد كلما قبض شيئا يؤدي زكاته قل المقبوض أو كثر. (بدائع الصنائع: ۱۰/۲، كتاب الزكاة، فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱۹۵/۲، كتاب الزكاة، باب زكاة الحلي، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ تحفة الفقهاء - محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ): ۲۹۳-۲۹۲/۱، كتاب الزكاة، باب زكاة السوائم، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲۲۳/۲، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱۹۵/۱، كتاب الزكاة، شرط وجوب الزكاة، قبيل: شرط صحة أداء الزكاة، ط: دار إحياء التراث العربي)

(ولو كان الدين على مقر مليء)... (فوصل إلى ملكه لزم زكاة ما مضى). [الدر المختار مع رد المحتار: ۲۶۷-۲۶۶/۲، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

تاہم سہولت اس میں ہے کہ آپ ہر سال کی زکاۃ ادا کرتے رہیں، ورنہ قرض کی واپسی کے بعد ایک ساتھ گذرے ہوئے تمام سالوں کی زکاۃ ادا کرنے میں دشواری ہو سکتی ہے۔

[۳] بینک بیلنس کے ساتھ قرض ہو، تو زکوٰۃ کس طرح ادا کی جائے؟

۱۳۰۳- سوال: ایک شخص ڈیڑھ دو ہزار ڈالر کا بینک بیلنس رکھتا ہے؛ لیکن اس کے ذمہ دس بارہ ہزار ڈالر کا قرض ہے اور وہ بینک کا بیلنس قرض میں دینے کا ارادہ رکھتا ہے، نیز اس نے ۸۰۰ رڈالر دوسرے کو قرض بھی دے رکھا ہے، تو ان ۸۰۰ رڈالر کی زکوٰۃ اس کے ذمہ واجب ہوگی یا نہیں، نیز اگر بینک بیلنس قرض میں دینے کا ارادہ نہ ہو، تو اس پر بھی زکوٰۃ آئے گی یا نہیں؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

قرض، منہا کر کے [یعنی وضع کرنے کے بعد، مابقیہ رقم اگر نصاب کے بہ قدر ہو، تو اس کی] زکوٰۃ دینا فرض ہے، پس جب بینک بیلنس سے زیادہ قرض ہے، تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

۸۰۰ رڈالر کسی دوسرے پر قرض ہے، اور ایک ہزار ڈالر بینک میں ہے، گویا اس کے پاس اٹھارہ سو ڈالر ہوئے، حالاں کہ اس پر دس بارہ ہزار ڈالر قرض ہے، ایسی صورت میں اگر سونے چاندی یا اموال زکاۃ میں سے کچھ اور اس قدر نہ ہو، جو ساڑھے باون تولہ چاندی کے بہ قدر ہو جاتی ہو، تو وہ صاحب نصاب نہیں، لہٰذا اس پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) "ومن كان عليه دين يحيط بماله فلا زكاة عليه" . . . "وإن كان ماله أكثر من دينه زكى الفاضل إذا بلغ نصابا" لفراغه عن الحاجة والمراد به دين له مطالب من جهة العباد. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳ھ):۱/ ۹۵، أول كتاب الزكاة،ت: طلال يوسف،ط:دار احياء التراث العربي-بيروت)

(ومن كان عليه دين يحيط بماله) أو يبقى منه دون نصاب (فلا زكاة عليه)؛ لأنه مشغول بحاجته الأصلية فاعتبر معدوماً كالماء المستحق بالعيش. هداية. وإن كان ماله أكثر من الدين زكى الفاضل إذا بلغ نصاباً) لفراغه عن الحاجة(ومن كان عليه دين يحيط بماله) أو يبقى منه دون نصاب (فلا زكاة عليه)؛ لأنه مشغول بحاجته الأصلية فاعتبر معدوماً كالماء المستحق بالعيش. هداية. وإن كان ماله أكثر من الدين زكى الفاضل إذا بلغ نصاباً) لفراغه عن الحاجة. (اللباب في شرح الكتاب- عبد الغني بن طالب بن حمادة بن إبراهيم الغنيمي الدمشقي الميداني الحنفي(م:۱۲۹۸ھ):۱/ ۱۳۷، أول كتاب الزكاة، ت: محمد محيي الدين عبد الحميد،ط: المكتبة العلمية- بيروت☆البناية شرح الهداية- بدر الدين العيني (م:۸۵۵ھ):۳/ ۳۰۱، كتاب الزكاة، زكاة المدين،ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆الجوهرة النيرة-أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م:۸۰۰ھ):۱/ ۱۱۴، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة،ط: المطبعة الخيرية☆العناية شرح الهداية-أكمل=

[۴] زیور کی زکوٰۃ میں کس قیمت کا اعتبار ہوگا؟

۱۳۰۴-سوال: اگر دو تولہ سونے کا زیور اور دس تولہ چاندی کا زیور ہو، تو چاندی کا نصاب بنانے کے لیے جو دو تولہ سونے کا زیور ہے، اس کی قیمت کس طرح لگائی جائے، کیا اس وقت بازار میں سونے کی جو قیمت ہے، اس کا اعتبار کیا جائے، یا جب اس نے خریدا تھا، اس وقت اس کی قیمت کا اعتبار کیا جائے، یا اس وقت اس زیور کو بازار میں لے جاکر معلوم کیا جائے کہ وہ کتنے کا بک سکتا ہے اس قیمت کا اعتبار کیا جائے؟ جو زیور گھر میں اس وقت ہے، بازار میں اگر لے جائیں، تو اس کی قیمت مشکل سے آدھی مل سکے گی، الغرض کس قیمت کا اعتبار کیا جائے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً:

اس وقت بازار میں مذکورہ زیور کی جو قیمت ہوگی، یعنی سنار جو قیمت بتلائے گا، اس کا اعتبار کیا جائے گا:
وتعتبر القيمة يوم الوجوب، وقالا يوم الأداء. وفي السوائم يوم الأداء إجماعا، وهو الأصح، ويقوم في البلد الذي المال فيه ولو في مفازة ففي أقرب الأمصار إليه، فتح. (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] سونے چاندی میں بازاری قیمت کا اعتبار

۱۳۰۵-سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

=الدين، البابرتي (م:۷۸۶ھ): ۲/ ۱۶۰، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

رجل له ألف درهم وعليه ألف درهم، وله دار وخادم لغير التجارة وقيمته عشرة آلاف درهم فلا زكاة عليه؛ لأن الدين مصروف إلى المال الذي في يده، فإنه فاضل عن حاجته معد للتقلب والتصرف، فكان الدين مصروفا إليه، فأما الدار والخادم فمشغولتان بحاجته فلا يصرف الدين إليه. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۳، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر - بيروت)

[۱] الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۸۶، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، ط: دار الفكر - بيروت.

وقال ابن عابدين: (قوله وهو الأصح) أي كون المعتبر في السوائم يوم الأداء إجماعا هو الأصح فإنه ذكر في البدائع أنه قيل إن المعتبر عنده فيها يوم الوجوب، وقيل يوم الأداء. اهـ. ـــــ وفي المحيط: يعتبر يوم الأداء بالإجماع وهو الأصح اهـ فهو تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما، وعليه فاعتبار يوم الأداء يكون متفقا عليه عنده وعندهما (قوله: ويقوم في البلد الذي المال فيه) فلو بعث عبدا للتجارة في بلد آخر يقوم في البلد الذي فيه العبد بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۸۶، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

جب سونا خرید ا گیا، اس وقت اس کی قیمت فی تولہ ١٥٠/روپیہ تھی اور اب ایک تولہ کی قیمت دو ہزار روپیہ ہے، اب کس قیمت کا اعتبار کر کے زکوۃ نکالنی ہوگی اور ایک تولہ پر کتنی زکوۃ ہوگی؟

اور اس سونے میں ایک آنے کے برابر تانبا ملا ہوا ہے، تو تانبے کا وزن کم کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ زیورات کی بازار میں جو قیمت ہوگی، اس کے اعتبار سے زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔[١]

رہ گئی بات تانبا کی، تو اس کی وجہ سے سونا کم کوالٹی [کیرٹ=Carat] کا شمار کیا جائے گا اور اس کی وجہ سے اس کا بھاؤ کم ہوگا۔[٢] اس لیے سونار سے معلوم کر کے اس کے حساب سے چالیسواں حصہ یا اس کی قیمت بہ طور زکوۃ نکالے۔[٣] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[٦] پندرہ اور بیس تولہ کی زکوۃ کا حساب

١٣٠٦-سوال: آج کے حساب سے پندرہ تولہ اور بیس تولہ کی زکوۃ کتنی ہوگی؟

ایم رحمن پٹیل لاجپوری

الجواب حامداً ومصلیاً:

بازار کے بھاؤ سے زکوۃ دینا چاہیے، آپ زیورات بازار میں لے جا کر کسی سونار کے پاس دکھائیں کہ اس کی کیا قیمت ہے؟ اگر بیس تولہ زیور ہے اور ایک تولہ کی قیمت مثلاً: پانچ سو پچیس روپیہ ہے، تو اس

---

[١] (وجاز دفع القيمة في زكاة، وعشر، وخراج، وفطرة، ونذر، وكفارة غير الإعتاق) وتعتبر القيمة يوم الوجوب، وقالا يوم الأداء. وفي السوائم يوم الأداء إجماعا، وهو الأصح. (الدر المختار مع رد المحتار: ٢/٢٨٦-٢٨٥، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم)

(٢) وغالب الفضة والذهب فضة وذهب. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: وغالب الفضة إلخ)؛ لأن الدراهم لا تخلو عن قليل غش؛ لأنها لا تنطبع إلا به فجعلت الغلبة فاصلة، نهر، ومثلها الذهب، (قوله: فضة وذهب) لف ونشر مرتب، أي فتجب زكاتهما لا زكاة العروض وإن أعدهما للتجارة كما أفاده في النهر. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/٣٠٠، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: دار الفكر-بيروت)

(٣) وهو ربع عشر نصاب حولي. (الدر المختار مع رد المحتار: ٢/٢٥٧، أول كتاب الزكاة)

حساب سے بیس تولہ کی قیمت دس ہزار پانچ سو روپیہ ہوئی۔ اب آپ کو دس ہزار پانچ سو روپیہ کی زکوۃ ڈھائی فی صد کے حساب سے دینی ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] چاندی کا نصاب گرام کے اعتبار سے

۱۳۰۷-سوال: سونا چاندی کا نصاب آج کل کے حساب سے کتنے گرام ہوتا ہے؟ اور کتنے روپئے ہوتو نصاب مکمل ہوتا ہے؟

---

(۱) المال الذي تجب فيه الزكاة أدى زكاته من خلاف جنسه أدى قدر قيمة الواجب إجماعا. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۰، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، قبيل: مسائل شتى في الزكاة)

فأما إذا كان مال الزكاة من أموال الربا كالكيلي والوزني فإن أدى ربع عشر النصاب يجوز كيفما كان.

وإن أدى غيره فلا يخلو إما أن أدى زكاته من جنسه أو من خلاف جنسه فإن أدى من خلاف جنسه كما إذا أدى الفضة عن الذهب أو الحنطة عن الشعير فإنه يؤدي قدر قيمة الواجب بلا خلاف. (تحفة الفقهاء-محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ): ۱/ ۳۰۹، كتاب الزكاة، باب من يوضع فيه الصدقة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۲/ ۴۱، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى، ط: دار الكتب العلمية ☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق- فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۲۷۸، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: المطبعة الكبرى الأميرية-بولاق، القاهرة)

(وجاز دفع القيمة في زكاة، وعشر، وخراج، وفطرة، ونذر، وكفارة غير الإعتاق) وتعتبر القيمة يوم الوجوب، وقالا يوم الأداء. وفي السوائم يوم الأداء إجماعا، وهو الأصح، ويقوم في البلد الذي المال فيه ولو في مفازة ففي أقرب الأمصار إليه، فتح. (الدر المختار: ۲/ ۲۸۵-۲۸۶) ـــــــ وقال ابن عابدين: (قوله وهو الأصح) أي كون المعتبر في السوائم يوم الأداء إجماعا هو الأصح فإنه ذكر في البدائع أنه قيل إن المعتبر عنده فيها يوم الوجوب، وقيل يوم الأداء. اهـ. ــــ وفي المحيط: يعتبر يوم الأداء بالإجماع وهو الأصح اهـ فهو تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما، وعليه فاعتبار يوم الأداء يكون متفقا عليه عنده وعندهما (قوله: ويقوم في البلد الذي المال فيه) فلو بعث عبدا للتجارة في بلد آخر يقوم في البلد الذي فيه العبد بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۸۶، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

"ويجوز دفع القيم في الزكاة" عندنا وكذا في الكفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر. (الهداية: ۱/ ۱۹۲، كتاب الزكاة، فصل في الحيل، ط: مکتبہ یاسر ندیم اینڈ کمپنی دیوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۱، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر)

الجواب حامداً ومصلیاً:

چاندی ساڑھے باون تولہ ہو، تو زکوۃ واجب ہوتی ہے، ایک تولہ تقریباً ساڑھے گیارہ گرام کے برابر ہوتا ہے، اس کے اعتبار سے حساب کرلیا جائے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] شوافع کے نزدیک استعمالی زیورات پر زکوۃ کا حکم

۱۳۰۸- سوال: شوافع کے نزدیک پہننے کے زیورات پر زکوۃ ہے یا نہیں؟ اگر ہے، تو اس کی دلیل کیا ہے؟ اور قرآن شریف میں جو مستحقین بتلائے گئے ہیں، کیا ان تمام کو ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر سب کو دینا ضروری ہے تو سب کو ایک ساتھ دینا چاہیے یا الگ الگ؟ اگر کسی کو بعد میں دینا چاہے، تو دے سکتا ہے یا نہیں؟ جواب تفصیلاً دیجیے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

شوافع کے یہاں عورت کے ان زیورات پر، جو عورت کے لیے مخصوص ہیں، جیسے ہار، پازیب، چوڑیاں وغیرہ، ان پر زکوۃ واجب نہیں ہے، جب کہ خود پہنتی ہوں، یا کسی کو پہننے کے لیے عاریت پر دے رکھا ہوں۔[2]

---

(۱) عن علي رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم ببعض أول هذا الحديث، قال: فإذا كانت لك مائتا درهم، وحال عليها الحول، ففيها خمسة دراهم، وليس عليك شيء - يعني - في الذهب حتى يكون لك عشرون دينارا، فإذا كان لك عشرون دينارا، وحال عليها الحول، ففيها نصف دينار، فما زاد، فبحساب ذلك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۲۱، رقم الحديث: ۱۵۷۳، كتاب الزكاة، باب في زكاة السائمة، ط: مكتبة فيصل ديوبند)

موجودہ گرام کے اعتبار سے چاندی کا نصاب، چھ سو بارہ گرام تین سو ساٹھ ملی گرام ہوتا ہے۔ (دیکھیے: الاوزان المحمودۃ، ص: ۱۰۴) جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ چاندی کا نصاب دو سو درہم ہے، جو موجودہ گرام سے ۶۱۲ گرام ۳۶۰ ملی گرام ہوتا ہے، لیکن تولہ کے اعتبار سے اس کے دو طریقے ہیں: اگر ایک تولہ ۱۱ گرام ۶۶۴ ملی گرام ہو، تو ساڑھے باون تولہ چاندی کا نصاب ہوگا۔ اور اگر ایک تولہ برابر دس گرام ہو (جیسا کہ ناخواندہ حضرات اسی کو ایک تولہ سمجھتے ہیں) تو ۶۱ تولہ ۲ گرام ۳۶۰ ملی گرام چاندی کا نصاب بنے گا۔ (ایضاح المسائل، ص: ۱۰۲)

(۲) قال: (وليس في حلي المرأة زكاة إذا كان مما تلبسه أو تعيره) هذا ظاهر المذهب. وروي ذلك عن ابن عمر، وجابر، وأنس، وعائشة، وأسماء - رضي الله عنهم - وبه قال القاسم، والشعبي، وقتادة، ومحمد بن علي، وعمرة، ومالك، والشافعي، وأبو عبيد، وإسحاق، وأبو ثور.... ووجه الأول، ما روى عافية بن أيوب، عن الليث بن سعد، عن أبي الزبير، عن جابر، عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: ليس في الحلي زكاة. ولأنه مرصد لاستعمال مباح، فلم تجب فيه الزكاة، كالعوامل، وثياب القنية. وأما الأحاديث الصحيحة التي احتجوا بها، فلا تتناول محل النزاع. (المغني لابن قدامة-أبو محمد موفق الدين عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة الجماعيلي المقدسي ثم الدمشقي الحنبلي، الشهير بابن قدامة المقدسي (م: ۶۲۰ھ): ۳/ ۴۱، ۴۲، رقم المسئلة: ۱۸۸۵، كتاب الزكاة، باب زكاة الذهب والفضة، مسألة زكاة حلي المرأة، ط: مكتبة القاهرة)

مرد پر مرد کے لیے استعمال میں آنے والے مخصوص زیور پر زکوۃ نہیں ہے، جیسے تلوار کا زیور اور انگوٹھی کا زیور۔[۲]

عورت کے پاس اگر تلوار ہو، جس کے پٹے میں چاندی ہو، تو اس پر زکوۃ واجب ہے، یا مرد پازیب وہار وغیرہ رکھتا ہو، تو اس پر زکوۃ لازم نہیں ہے۔[۳] غرض یہ کہ عورت و مرد کے لیے حلال زیور پر زکوۃ نہیں ہے، خواہ اس کی قیمت جس قدر بھی ہو۔[۴]

استعمالی زیور پر زکوۃ واجب نہ ہونے کے سلسلے میں ان کا استدلال آثار صحابہ سے ہے، حضرت جابرؓ سے مروی ہے: عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: ليس في الحلي زكوة۔ (المغنی لابن قدامہ جلد ۳ صفحہ ۱۲)[۵]

کل اصناف کو دینا واجب ہے، اگر کل موجود نہ ہو، یا ان کو پہنچانا مشکل ہو تو بعض کو دے دینا کافی ہے، الگ الگ دینا جائز ہے، تقدیم وتاخیر بھی جائز ہے۔ (المغنی، جلد ۲، صفحہ ۲۶۹)[۶] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۲) قال: وليس في حلية سيف الرجل ومنطقته وخاتمه زكاة وجملة ذلك أن ما كان مباحا من الحلي، فلا زكاة فيه إذا كان معدا للاستعمال، سواء كان لرجل أو امرأة، لأنه مصروف عن جهة النماء إلى استعمال مباح، فأشبه ثياب البذلة وعوامل الماشية. (حوالہ سابق: ۳/ ۴۵، مسئلہ نمبر: ۱۸۹۳، مسألة ليس في حلية سيف الرجل ومنطقته وخاتمه زكاة)

(۳) وإذا اتخذت المرأة حليا ليس لها اتخاذه، كما إذا اتخذت حلية الرجال كحلية السيف والمنطقة، فهو محرم، وعليها الزكاة، كما لو اتخذ الرجل حلي المرأة... ويباح للنساء من حلي الذهب والفضة والجواهر كل ما جرت عادتهن بلبسه، مثل السوار والخلخال والقرط والخاتم، وما يلبسنه على وجوههن، وفي أعناقهن، وأيديهن، وأرجلهن، وآذانهن وغيره، فأما ما لم تجر عادتهن بلبسه، كالمنطقة وشبهها من حلي الرجال، فهو محرم، وعليها زكاته، كما لو اتخذ الرجل لنفسه حلي المرأة. (حوالہ سابق: ۳/ ۴۴-۴۵، مسئلہ نمبر: ۱۸۹۱، ۱۸۹۲، فصل يباح للنساء من حلي الذهب والفضة والجواهر كل ما جرت عادتهن بلبسه)

(۴) وقليل الحلي وكثيره سواء في الإباحة والزكاة. (حوالہ سابق: ۳/ ۴۳، مسئلہ نمبر: ۱۸۸۶)

(۵) حاشیہ نمبر (۱) دیکھیں۔

عن جابر بن عبد الله - رضي الله عنه - قال: "ليس في الحلي زكاة. (سنن الدارقطني (م: ۳۸۵ھ): ۲/ ۵۰۰، رقم الحديث: ۱۹۵۵، ت: شعيب الارنؤوط، حسن عبد المنعم شلبي، عبد اللطيف حرز الله، أحمد برهوم، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت)

[۶] وقال عكرمة والشافعي: يجب أن يقسم زكاة كل صنف من ماله، على الموجود من الأصناف الستة الذين سهمانهم ثابتة، قسمة على السواء، ثم حصة كل صنف منهم، لا تصرف إلى أقل من ثلاثة منهم، إن وجد منهم ثلاثة أو أكثر فإن لم يجد إلا واحدا، صرف حصة ذلك الصنف إليه. (المغني لابن قدامة ۲/ ۴۹۹، رقم المسئلة: ۱۷۹۳، كتاب الزكاة، باب زكاة الذهب والفضة، مسألة مصارف الزكاة، فصل صرف الزكاة إلى غير من ذكر الله تعالى، ط: مكتبة القاهرة)

عن سالم بن عبد الله، عن أبيه رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: فيما سقت السماء والعيون أو كان عثريا العشر، وما سقي بالنضح نصف العشر.

(بخاری شریف: ۱/۲۰۱، حدیث: ۱۴۸۳، کتاب الزکاۃ، باب العشر فیما یسقی من ماء السماء، وبالماء الجاری، ط: دیوبند)

باب في العشر والخراج

[عشر وخراج کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب في العشر والخراج

[عشر وخراج کا بیان]

[۱] زمین کی پیداوار کی زکوۃ

۱۳۰۹- سوال: ہمارے پاس پچیس بیگہ زمین ہے، جس میں گنّا اور کیلے سینچائی سے ہوتے ہیں اور باقی چیزیں: آم، چیکو وغیرہ بارش کے پانی سے ہوتے ہیں، تو زکوۃ کس کی کتنی دینی ہوگی؟ اور زکوۃ میں اصل پیداوار ہی دینا ہوگا یا اس کی قیمت بھی دے سکتے ہیں؟ اور زکوۃ کے حق دار کون ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اپنی پیداوار میں سے جو کچھ بہ طور زکوۃ دیا جاتا ہے، اس کو ''عشر'' یا ''خراج'' کہا جاتا ہے، بارش کے پانی سے جو کچھ کھیتی یا پھل ہوتے ہیں، اس کا دسواں حصہ دینا ہوگا اور ٹیوب ویل کے پانی سے یا نہر کے پانی سے- جو بہ ذریعۂ مشین پہنچایا جاتا ہو- اگر سینچائی کی جاتی ہو، تو پیداوار کا بیسواں حصہ ادا کرنا ہوگا۔[1]

---

(۱) عن سالم بن عبد الله، عن أبيه رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: فيما سقت السماء والعيون أو كان عثريا العشر، وما سقي بالنضح نصف العشر. (صحيح البخاري: ۲۰۱/۱، رقم الحديث: ۱۴۸۳، كتاب الزكاة، باب العشر فيما يسقى من ماء السماء، وبالماء الجاري، ط: ديوبند)

(و) تجب في (مسقي سماء) أي مطر (وسيح) كنهر (بلا شرط نصاب) راجع للكل (و) بلا شرط (بقاء) وحولان حول... (و) يجب (نصفه في مسقي غرب) أي دلو كبير (ودالية) أي دولاب لكثرة المؤنة... (بلا رفع=

پس خرچ منہا کیے بغیر پیداوار میں سے دسواں یا بیسواں حصہ ادا کرنے کو "عشر" کہا جاتا ہے، اور ادا کرنے میں خواہ پیداوار ادا کی جائے یا اس کی قیمت؛ دونوں جائز ہے۔[۲]

عشر میں عبادت (بندگی) کا پہلو ہے؛ کیوں کہ زمین کی پیداوار کی زکوۃ ہے۔ اور "خراج" ایک ٹیکس ہے، جو مسلم حکومتوں نے غیر مسلموں کو اپنی حکومت میں پناہ دے کر ان کی زمینوں کی پیداوار پر لگایا تھا۔[۳]

=مؤن) أي كلف (الزرع) وبلا إخراج البذر. (الدر مع الرد: ۲/۳۲۶-۳۲۸، كتاب الزكاة، باب العشر)

قال ابن عابدين: (قوله: بلا رفع مؤن) أي يجب العشر في الأول ونصفه في الثاني بلا رفع أجرة العمال ونفقة البقر وكري الأنهار وأجرة الحافظ ونحو ذلك درر، قال في الفتح يعني لا يقال بعدم وجوب العشر في قدر الخارج الذي بمقابلة المؤنة بل يجب العشر في الكل؛ لأنه - عليه الصلاة والسلام - حكم بتفاوت الواجب لتفاوت المؤنة ولو رفعت المؤنة كان الواجب واحدا وهو العشر دائما في الباقي؛ لأنه لم ينزل إلى نصفه إلا للمؤنة والباقي بعد رفع المؤنة لا مؤنة فيه فكان الواجب دائما العشر لكن الواجب قد تفاوت شرعا فعلمنا أنه لم يعتبر شرعا عدم عشر بعض الخارج وهو القدر المساوي للمؤنة أصلا اهـ وتمامه فيه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۲۸، كتاب الزكاة، باب العشر، مطلب مهم في حكم أراضي مصر والشام السلطانية، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) (وجاز دفع القيمة في زكاة وعشر وخراج وفطرة ونذر وكفارة غير الإعتاق) وتعتبر القيمة يوم الوجوب، وقالا يوم الأداء. وفي السوائم يوم الأداء إجماعا، وهو الأصح، ويقوم في البلد الذي المال فيه ولو في مفازة ففي أقرب الأمصار إليه فتح. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۸۵-۲۸۶، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، ط: دار الفكر - بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۱، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، مسائل شتى، ط: زكريا - ديوبند)

(۳) قال: "وكل أرض أسلم أهلها أو فتحت عنوة وقسمت بين الغانمين فهي أرض عشر" لأن الحاجة إلى ابتداء التوظيف على المسلم والعشر أليق به لما فيه من معنى العبادة وكذا هو أخف حيث يتعلق بنفس الخارج.

"وكل أرض فتحت عنوة فأقر أهلها عليها فهي أرض خراج" وكذا إذا صالحهم لأن الحاجة إلى ابتداء التوظيف على الكافر والخراج أليق به. (الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۲/۳۹۹، كتاب السير، باب العشر والخراج، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۶/۳۲، كتاب السير، باب العشر والخراج، ط: دار الفكر ☆تحفة الفقهاء - محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ): ۱/۳۱۹، كتاب الزكاة، باب العشر والخراج، ط: دار الكتب العلمية - بيروت) =

اگر آپ کی زمین وراثتی سلسلہ سے چلی آرہی ہو، تو اس میں عشر ادا کرنا بہتر ہے۔ اور یہ عشر نکالتے رہنا چاہیے؛ کیوں کہ اس کو ادا نہ کرنے کی نحوستیں ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۶/ ۸۹-۱۸۸، امداد الفتاویٰ: ۲/ ۶۰)[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] ہندوستانی زمین کی پیداوار میں عشر کا حکم

۱۳۱۰- سوال: ہماری زمینوں میں جو پیداوار؛ مثلاً: گیہوں، جوار اور جو وغیرہ ہوتے ہیں، ان میں شرعی طور پر جو عشر لازم آتا ہے، کیا اس کا نکالنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

فتاویٰ دار العلوم میں، فتاویٰ شامی اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ہندوستانی زمین

= (أرض العرب)... (وما أسلم أهله) طوعا (أو فتح عنوة وقسم بين جيشنا والبصرة) أيضا بإجماع الصحابة (عشرية) لأنه أليق بالمسلم... (وما فتح عنوة)... (أقر أهله عليه) أو نقل إليه كفار آخر (أو فتح صلحا خراجية) لأنه أليق بالكافر. (الدر المختار) ــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله لأنه أليق بالمسلم) أي لما فيه من معنى العبادة وكذا هو أخف حيث يتعلق بنفس الخارج، وهذا علة لما أسلم أهله أو قسم بين جيشنا،... (قوله لأنه أليق بالكافر) لأنه يشبه الجزية لما فيه من معنى العقوبة ولأن فيه تغليظا حيث يجب وإن لم يزرع بخلاف العشر لتعلقه بعين الخارج لا بالأرض. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۷۷-۱۷۶، كتاب الجهاد، باب العشر والخراج والجزية، مطلب فيما تصير به دار الإسلام دار حرب وبالعكس، ط: دار الفكر-بيروت)

[۴] شامی کی (مذکورہ) عبارت (وما أسلم أهله) طوعا (أو فتح) نقل کرنے کے بعد حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ نے لکھا ہے:

ان عبارات سے چند امور معلوم ہوئے: ایک یہ کہ مسلمان کی اراضی کا اصل وظیفہ عشر ہے۔ دوم یہ کہ اگر بادشاہ عشر نہ لیوے، تو عشر ساقط نہیں ہوتا، بل کہ خود مالک زمین کو عشر نکالنا چاہیے اور فقراء کو دینا چاہیے۔ سوم یہ کہ عشر بھی زکاۃ ہے، پس جب کہ اصل وظیفہ مسلم کا عشر ہے، تو جو اراضی مملوکہ مسلمین ہیں، یا تو اصل میں عشری تھی کہ سلاطین اہل اسلام نے ان کو فتح کر کے مسلمانوں کو دیدی تھی یا ان کا حال سابق کچھ معلوم نہیں، ان دونوں صورتوں میں اس میں عشر لازم ہے۔ اگر در حقیقت کسی زمین میں عشر مقرر ہونا چاہیے [مگر] بادشاہ اسلام یا غیر نے عشر مقرر نہ کیا، اس سے عشر ساقط نہیں ہوتا، اور وہ زمین عشری ہونے سے خارج نہیں ہوتی، اور جب کہ عشر بہ منزلہ زکاۃ ہے، تو جیسا کہ زکاۃ اموال ہر جگہ واجب ہے، بلاد اسلام ہوں یا غیر، اسی طرح عشر بھی ہر جگہ لازم ہوگا، اور واضح ہو کہ زمین عشری سے اگر خراج لے لیا جاوے، تب بھی عند اللہ عشر ساقط نہیں ہوتا؛ لہٰذا صاحب زمین کو عشر نکال کر فقراء کو دینا چاہیے، الحاصل احوط یہی ہے کہ مسلمان اراضی کی پیداوار سے عشر ادا کریں۔ فقط۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۶/ ۸۹-۱۸۸، کتاب الزکاۃ، چھٹا باب عشر، (پیداوار کی زکاۃ) یہاں کی زمین میں عشر ہے یا نہیں؟ سوال نمبر: ۳۰۹، مرتب: مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ، ط: زکریا- دیوبند☆ امداد الفتاویٰ: ۲/ ۵۹-۶۰، کتاب الزکاۃ والصدقات، فصل فی العشر والخراج، اراضی ہند میں عشر وخراج کی تحقیق، سوال نمبر: ۹۷، ط: زکریا- دیوبند)

میں عشر واجب نہیں ہے؛ البتہ اگر کوئی احتیاطاً عشر نکالے تو بہتر ہے، واجب اور فرض نہیں۔ (فتاوی دار العلوم: ۶/ ۱۶۳)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] پیداوار کی زکوۃ میں قرض منہا نہیں کیا جائے گا

۱۳۱۱- سوال: ایک شخص پر سات ہزار روپے کا قرض ہے اور اس کی کھیتی کی پیداوار پانچ ہزار روپے کی ہوئی ہے، تو کیا اس پیداوار کی زکوۃ اس کے ذمہ واجب ہے، یہاں ایک شخص کا یہ کہنا ہے کہ اس پر زکوۃ واجب ہے؛ کیوں کہ پیداوار کی زکوۃ میں قرض کو منہا نہیں کیا جاتا ہے، خواہ کتنا ہی قرض ہو، پیداوار میں سے بیسواں حصہ بہ طور زکوۃ نکالنا ضروری ہے، تو کیا یہ بات صحیح ہے؟ شریعت کی روشنی میں صحیح جواب عنایت فرمائیں۔

---

[۱] اب چند مدت ہوتی ہے کہ شامی جلد ثانی، باب الرکاز میں یہ عبارت نظر پڑی، جو ذیل میں درج ہے اور جس کا حاصل یہ ہے کہ اراضی دار الحرب نہ عشری ہے، نہ خراجی، یہ مسئلہ فقہاء کے نزدیک متفق علیہ اور مسلم معلوم ہوتا ہے، اس عبارت کے دیکھنے کے بعد اس کی اصل معلوم ہوئی، جو حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہ نے مالا بدمنہ میں تحریر فرمایا ہے کہ مسائل عشر اس کتاب میں اس وجہ سے نہیں لکھے گئے کہ یہاں کی زمینیں عشری نہیں ہیں، یا یہاں کی زمینوں پر عشر نہیں ہے، او کما قال۔

الغرض تشریح شامی کے بعد اور تحقیق قاضی صاحب مرحوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب احقر یہ کہنے لگا کہ ہندوستان کی زمینیں عشری نہیں ہیں، بایں ہمہ احتیاط عشر نکالنے میں ہے، وہ عبارت یہ ہے:

[تنبيه] قال في فتح القدير: قيد بالخراجية والعشرية ليخرج الدار فإنه لا شيء فيها لكن ورد عليه الأرض التي لا وظيفة فيها كالمفازة إذ يقضي أنه لا شيء في المأخوذ منها وليس كذلك فالصواب أن لا يجعل ذلك لقصد الاحتراز بل للتنصيص على أن وظيفتها المستمرة لا تمنع مما يوجد فيهما. اهـ. ... وأقول: يمكن الجواب بأن المراد بالعشرية والخراجية ما تكون وظيفتها العشر أو الخراج سواء كانت بيد أحد أو لا فتشمل المفازة وغيرها بدليل ما قدمناه عن الخانية من أن أرض الجبل عشرية فيكون المراد الاحتراز بها عن دار الحرب، ويدل عليه أنه في متن درر البحار عبر بمعدن غير الحرب فعلم أن المراد معدن أرضنا ولهذا قال القهستاني بعد قوله في أرض خراج أو عشر: الأخصر في أرضنا سواء كانت جبلا أو سهلا مواتا أو ملكا. واحترز به عن داره وأرضه وأرض الحرب اهـ. ثم رأيت عين ما قلته في شرح الشيخ إسماعيل حيث قال: ويحتمل أن يكون احترازا عما وجد في دار الحرب فإن أرضها ليست أرض خراج أو عشر الخ... (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۱۹-۳۲۰، كتاب الزكاة، باب الركاز، ط: دار الفكر-بيروت)

(فتاوی دار العلوم: ۶/ ۱۶۳-۱۶۴، کتاب الزکاۃ، الباب السادس فی العشر، ط: دار العلوم دیوبند)

الجواب حامداً ومصلیاً:

زمین دو قسم کی ہوتی ہے، عشری اور خراجی۔[۱] اگر زمین عشری ہو اور آسمان کے پانی سے اس کی سینچائی کی گئی ہو، تو پیداوار کا دسواں حصہ نکالنا ضروری ہے اور اگر کنویں کے پانی سے سینچائی کی گئی ہو، تو پیداوار کا بیسواں حصہ نکالنا لازم ہے اور یہ (دسواں اور بیسوں حصہ) زکوۃ کے حکم میں ہے۔[۲]

وجوب عشر و خراج میں دین مانع نہیں ہے؛ لہٰذا جس نے یہ بتایا ہے کہ زمین کی پیداوار پر ہر حال میں عشر یا خراج واجب ہوگا، خواہ کھیتی کرنے والا قرض دار ہی کیوں نہ ہو، اس کی بات درست ہے اور قرض دار کے ذمہ بھی اس زکوۃ کا ادا کرنا ضروری ہے، اس میں مال کی زکاۃ کی طرح قرض کو منہا نہیں کیا جائے گا۔[۳]

اور خراجی زمین میں، خراج (محصول-ٹیکس) ادا کرنے سے ذمہ بری ہو جائے گا۔[۴]

لیکن ہندوستان کی زمین کے عشری یا خراجی ہونے میں علماء کے مابین اختلاف ہے؛ لہٰذا اس سلسلے

---

(۱) الأرض نوعان: عشرية، و خراجية. (فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۱/ ۲۷۰، كتاب الزكاة، فصل في العشر والخراج، ط: زكريا- ديوبند)

(۲) عن سالم بن عبد الله، عن أبيه رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: فيما سقت السماء والعيون أو كان عثريا العشر، وما سقي بالنضح نصف العشر. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۰۱، رقم الحديث: ۱۴۸۳، كتاب الزكاة، باب العشر فيما يسقى من ماء السماء، وبالماء الجاري، ط: ديوبند)

(و) تجب في (مسقي سماء) أي مطر (وسيح) كنهر (بلا شرط نصاب) راجع للكل (و) بلا شرط (بقاء) وحولان حول... (و) يجب (نصفه في مسقي غرب) أي دلو كبير (ودالية) أي دولاب لكثرة المؤنة... (بلا رفع مؤن) أي كلف (الزرع) وبلا إخراج البذر. (الدر مع الرد: ۲/ ۳۲۸-۳۲۶، كتاب الزكاة، باب العشر)

قال ابن عابدين: (قوله: بلا رفع مؤن) أي يجب العشر في الأول ونصفه في الثاني بلا رفع أجرة العمال ونفقة البقر وكري الأنهار وأجرة الحافظ ونحو ذلك درر (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۲۸، كتاب الزكاة، باب العشر، مطلب مهم في حكم أراضي مصر والشام السلطانية، ط: دار الفكر- بيروت)

(۳) ولا يمنع الدين وجوب عشر وخراج. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۱، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۴) وأما شرائط المحلية فأنواع منها أن تكون الأرض عشرية فإن كانت خراجية يجب فيها الخراج ولا يجب في الخارج منها العشر فالعشر مع الخراج لا يجتمعان في أرض واحدة عندنا. (بدائع الصنائع: ۲/ ۵۷، كتاب الزكاة، فصل شرائط فرضية زكاة الزروع، الشرائط المحلية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

میں کوئی قطعی فتویٰ نہیں دیا جاسکتا ہے، اگر آپ نے یا آپ کے باپ دادا نے وہ زمین غیر مسلم کے پاس سے خریدی ہے، تو وہ خراجی ہے۔ اسی طرح اگر وہ زمین کافر بادشاہ کی طرف سے دی گئی ہو، تو بھی خراجی ہے یا زمین وراثت میں آئی ہو اور آپ کے باپ دادا پہلے غیر مسلم تھے، پھر اسلام میں داخل ہوئے اور اس کا ثبوت موجود ہے، تو بھی زمین خراجی شمار ہوگی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] اجارہ کی زمین میں عشر کا حکم

۱۳۱۲- سوال: ہمارے گاؤں میں مسجد اور مدرسہ کی زمین کو اجارہ (ٹھیکہ) پر دینے کے لیے ہر سال نیلامی ہوتی ہے، اس مرتبہ ہم نے اس زمین کو اجارہ پر لیا ہے، تو اس میں جو پیداوار ہوگی، اس کی زکوۃ کا کیا مسئلہ ہے؟ ہم نے سنا ہے کہ دس من میں ایک من دینا لازم ہے، تو کیا اجارہ کی زمین میں بھی یہی حکم ہے؟ شریعت کی رو سے جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر زمین عشری ہو تو اس کے مالک پر (جب کہ وہ کھیتی کرے) عشر (دسواں حصہ) واجب ہے، بشرطے کہ آسمان کے پانی سے کھیتی پیدا ہوئی ہو، اور اگر نہر کے پانی سے (یا ٹیوب ویل کے پانی سے) سینچائی کی گئی ہو، تو پیداوار کا نصف عشر (بیسواں حصہ) لازم ہے۔ (۲)

اگر کاشت حصہ داری میں کی گئی ہو، تو جو کچھ حصہ طے ہوا ہو، مثلاً نصفا نصفی، یا تہائی دو تہائی

(۱) ''ہندوستانی زمین کی پیداوار میں عشر کا حکم'' کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) عن سالم بن عبد الله، عن أبيه رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: فيما سقت السماء والعيون أو كان عثريا العشر، وما سقي بالنضح نصف العشر. (صحيح البخاري: ۲۰۱/۱، رقم الحديث: ۱۴۸۳، كتاب الزكاة، باب العشر فيما يسقى من ماء السماء، وبالماء الجاري، ط: ديوبند)

(و) تجب في (مسقي سماء) أي مطر (وسيح) كنهر (بلا شرط نصاب) راجع للكل (و) بلا شرط (بقاء) وحولان حول... (و) يجب (نصفه في مسقي غرب) أي دلو كبير (ودالية) أي دولاب لكثرة المؤنة... (بلا رفع مؤن) أي كلف (الزرع) وبلا إخراج البذر. (الدر مع الرد: ۳۲۶/۲-۳۲۸، كتاب الزكاة، باب العشر)

قال ابن عابدين: (قوله: بلا رفع مؤن) أي يجب العشر في الأول ونصفه في الثاني بلا رفع أجرة العمال ونفقة البقر وكري الأنهار وأجرة الحافظ ونحو ذلك درر (رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۸/۲، كتاب الزكاة، باب العشر، مطلب مهم في حكم أراضي مصر والشام السلطانية، ط: دار الفكر-بيروت)

،ہر ایک کو اپنے حصے میں سے (مذکورہ تفصیل کے مطابق) عشر یا نصف عشر نکالنا ہوگا۔ [1] اور اگر زمین اجارہ (ٹھیکہ) پر لی ہو، تو جس نے اجارہ پر لی ہے اور کھیتی کر رہا ہے، اس کے ذمہ عشر یا نصف عشر لازم ہوگا۔ [2] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولو دفعها مزارعة فإما على مذهبهما فالمزارعة جائزة والعشر يجب في الخارج والخارج بينهما فيجب العشر عليهما. (بدائع الصنائع: ۲/۵۶، كتاب الزكاة، في بيان العشر والخراج، فصل شرائط فرضية زكاة الزروع، الشرائط الأهلية، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) دراصل اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ اجارہ کی صورت میں عشر کس پر واجب ہوگا، زمین کے مالک پر یا مستاجر (کرایہ کے طور پر لینے والے) پر، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک موجر (زمین کے مالک) پر عشر واجب ہے، جب کہ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ مستاجر پر عشر واجب ہوگا، اکابر احناف کے درمیان تصحیح میں اختلاف ہے، علامہ شامیؒ نے ایک فیصلہ کن بات لکھی ہے کہ: ""اگر موجر کو اجرت مثل مل جاتی ہے، تب تو اسی پر عشر واجب ہوگا، ورنہ مستاجر پر عشر واجب ہوگا"۔ ان کے زمانے میں اوقاف کی جائداد کو اجرت مثل سے انتہائی کم پر بطور کرایہ لیا جاتا تھا، اس لیے انہوں نے ذکر کیا ہے کہ صاحبین کے قول سے عدول نہ کیا جائے۔ ہمارے دیار میں بھی ایسا ہی ہے کہ زمین کا کرایہ برائے نام ملتا ہے، اس لیے صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا جائے اور عشر کو مستاجر پر واجب قرار دیا جائے، جیسا کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے لکھا ہے، ذیل کی تفصیلی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

والعشر على المؤجر كخراج موظف، وقالا على المستأجر، كمستعير مسلم: وفي الحاوي: وبقولهما نأخذ. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: والعشر على المؤجر) أي لو آجر الأرض العشرية فالعشر عليه من الأجرة كما في التتارخانية وعندهما على المستأجر... (قوله وبقولهما نأخذ) قلت: لكن أفتى بقول الإمام جماعة من المتأخرين كالخير الرملي في فتاواه وكذا تلميذ الشارح الشيخ إسماعيل الحائك مفتي دمشق وقال حتى تفسد الإجارة باشتراط خراجها أو عشرها على المستأجر كما في الأشباه، وكذا حامد أفندي العمادي وقال في فتاواه قلت: عبارة الحاوي القدسي لا تعارض عبارة غيره فإن قاضي خان من أهل الترجيح فإن من عادته تقديم الأظهر والأشهر وقد قدم قول الإمام فكان هو المعتمد وأفتى به غير واحد منهم زكريا أفندي شيخ الإسلام وعطاء الله أفندي شيخ الإسلام، وقد اقتصر عليه في الإسعاف والخصاف. اهـ.

قلت: لكن في زماننا عامة الأوقاف من القرى والمزارع لرضا المستأجر بتحمل غراماتها ومؤنها يستأجرها بدون أجر المثل بحيث لا تفي الأجرة، ولا أضعافها بالعشر أو خراج المقاسمة، فلا ينبغي العدول عن الإفتاء بقولهما في ذلك؛ لأنهم في زماننا يقدرون أجرة المثل بناء على أن الأجرة سالمة لجهة الوقف، ولا شيء عليه من عشر وغيره، أما لو اعتبر دفع العشر من جهة الوقف، وأن المستأجر ليس عليه سوى الأجرة، فإن أجرة المثل تزيد أضعافا كثيرة كما لا يخفى، فإن أمكن أخذ الأجرة كاملة يفتى بقول الإمام وإلا فبقولهما لما يلزم عليه من الضرر الواضح الذي لا يقول به أحد، والله تعالى أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۳۴، كتاب الزكاة، باب العشر، قبيل: مطلب هل يجب العشر على المزارعين في الأراضي السلطانية. ط: دار الفكر - بيروت) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۵] زمین کی پیداوار پر عشر کون نکالے گا؟

۱۳۱۳- سوال: ہم نے ایک کاشت کار کی زمین زراعت کے لیے اجرت پر لی ہے اور ہم نے تین سال تک کی اجرت بھی طے کر دی ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ ان تین سالوں میں اس زمین کی جو پیداوار ہوگی، اس کی زکوۃ کس کے ذمے ہوگی، اصل مالک کے یا ہمارے ذمے؟

الجواب حامداومصلیا:

اگر زمین کی اجرت مکمل طے کی ہوگی، تو زمین کے مالک پر عشر نکالنا ضروری ہوگا، ورنہ مستأجر کو عشر دینا پڑے گا۔ بس شرط یہ ہے کہ زمین عشری ہو۔ (شامی جلد ۲، صفحہ ۵۷)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] عشر نکالنے میں خرچ منہا نہیں کیا جائے گا

۱۳۱۴- سوال: کھیتی کی پیداوار میں عشر یعنی دس میں من میں سے ایک من نکالنا ہے، تو اس میں خرچ کو منہا کر کے نکالنا ہے یا اس کے بغیر؟ یعنی مثلاً اگر ۴۰۰۰ر کی پیداوار ہوئی اور اس پر خرچ ایک ہزار کا ہوا ہو، تو چار ہزار میں سے عشر نکالنا ہوگا یا تین ہزار میں سے؟

الجواب حامداًومصلیاً:

اگر آپ کی زمین عشری ہے- اس کے متعلق قریب کے علماء سے تحقیق کر لینی چاہیے- تو خرچ منہا کیے بغیر کل پیداوار میں سے دسواں حصہ دینا ہوگا، بشرطے کہ بارش کے پانی سے کھیتی ہوئی ہو، اور اگر ٹیوب ویل اور کنویں کے پانی سے سینچائی کی ہو، تو بیسواں حصہ دینا ضروری ہے، یعنی خرچ منہا کیے بغیر عشر نکالنا ہوگا؛ کیوں کہ شریعت نے عشر میں کمی بیشی، خرچ میں کمی بیشی کے اعتبار سے رکھی ہے۔[۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] لو أجر الأرض العشرية فالعشر عليه من الأجرة كما في التتارخانية وعندهما على المستأجر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۳۴، كتاب الزكاة، باب العشر، قبيل: مطلب هل يجب العشر على المزارعين في الأراضي السلطانية. ط: دار الفكر - بيروت)

تفصیل کے لیے گذشتہ سوال بہ عنوان "اجارہ کی زمین میں عشر کا حکم" کا حاشیہ نمبر ۳ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) عن سالم بن عبد الله، عن أبيه رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: فيما سقت السماء والعيون أو كان عثريا العشر، وما سقي بالنضح نصف العشر. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۰۱، رقم الحديث: ۱۴۸۳، كتاب الزكاة، باب العشر فيما يسقى من ماء السماء، وبالماء الجاري، ط: ديوبند)

[۷] عشر نکالنے میں گھر کی ضرورت میں استعمال ہونے والے غلے اور دین کو وضع کیا جائے گا؟

۱۳۱۵- سوال: آج کل کھیتی کرنے میں اچھے خاصے اخراجات ہوتے ہیں، جس کے لیے قرض لینا پڑتا ہے، زمین میں جس قدر پیداوار ہوتی ہے، وہ ہماری ضرورت سے بس اسی قدر زائد ہوتی ہے کہ اس کو بیچ کو ہم قرض ادا کر سکیں اور بعض چھوٹی موٹی ضرورت پوری کر سکیں، تو کیا شرعاً اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ ایسی صورت میں ہم قرض کے بہ قدر پیداوار وضع کر لیں، اور مابقیہ پیداوار میں عشر نکالیں، کیا دین کو حوائج اصلیہ میں شمار کیا جائے گا اور اس کی وجہ سے ہم اس کے بہ قدر پیدار میں عشر نکالنے سے مستثنیٰ ہوں گے؟ یا اسے بھی کھیتی باڑی کا ہی خرچ شمار کیا جائے گا، اور اس کی وجہ سے عشر نکالنے میں کوئی رخصت نہیں ملے گی۔

نیز جس قدر پیداوار ہماری سال بھر کی ضرورت میں مستعمل ہوگی، اسے حوائج اصلیہ میں شمار کر کے عشر سے رخصت حاصل ہوگی یا نہیں؟ مثلاً: اگر پچاس من اناج ہوتا ہے، جس میں سے تیس من گھر کے استعمال کے لیے ہوتا ہے اور باقی بیس من کی قیمت قرض کی ادائیگی سمیت دوسرے کاموں کے لیے ہوتی ہے، تو کیا کل پیداوار میں دسواں یا بیسواں حصہ واجب ہوگا، یا صرف قرض کے بہ قدر منہا ہوگا، یا قرض اور گھر کی ضرورت کے بہ قدر پیدارور منہا ہوگی اور مابقیہ میں عشر کا وجوب ہوگا؟

الجواب حامداو مصلیا:

ہر قسم کے خرچ اور قرض کو وضع کرنے سے پہلے، کل پیداوا میں سے حسب قاعدہ دسواں یا بیسواں

= (و) تجب في (مسقي سماء) أي مطر (وسيح) كنهر (بلا شرط نصاب) راجع للكل (و) بلا شرط (بقاء) وحولان حول... (و) يجب (نصفه في مسقي غرب) أي دلو كبير (ودالية) أي دولاب لكثرة المؤنة... (بلا رفع مؤن) أي كلف (الزرع) وبلا إخراج البذر. (الدر مع الرد: ۲/۳۲۸-۳۲۶، كتاب الزكاة، باب العشر)

قال ابن عابدين: (قوله: بلا رفع مؤن) أي يجب العشر في الأول ونصفه في الثاني بلا رفع أجرة العمال ونفقة البقر وكري الأنهار وأجرة الحافظ ونحو ذلك درر. قال في الفتح يعني لا يقال بعدم وجوب العشر في قدر الخارج الذي بمقابلة المؤنة بل يجب العشر في الكل؛ لأنه - عليه الصلاة والسلام - حكم بتفاوت الواجب لتفاوت المؤنة ولو رفعت المؤنة كان الواجب واحدا وهو العشر دائما في الباقي؛ لأنه لم ينزل إلى نصفه إلا للمؤنة والباقي بعد رفع المؤنة لا مؤنة فيه فكان الواجب دائما العشر لكن الواجب قد تفاوت شرعا فعلمنا أنه لم يعتبر شرعا عدم عشر بعض الخارج وهو القدر المساوي للمؤنة أصلا اهـ وتمامه فيه (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۲۸، كتاب الزكاة، باب العشر، مطلب مهم في حكم أراضي مصر والشام السلطانية، ط: دار الفكر - بيروت ☆ فتح القدير - ابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۲/۲۵۱، كتاب الزكاة، باب زكاة الزروع والثمار، ط: دار الفكر)

حصہ دینا پڑے گا، نہ تو کھیتی پر ہونے والے خرچ کو-خواہ قرض لے کر پورا کیا گیا ہو-وضع کیا جائے گا اور نہ ہی گھر میں سال بھر خرچ ہونے والے اناج کو منہا کیا جائے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۸] زمین کی پیداوار سے عشر نکالنے کا طریقہ

۱۳۱۶-سوال: زمین کی پیداوار میں-اگر ضرورت سے زائد پیداوار ہو-تو پوری پیداوار سے عشر (دسواں حصہ) نکالا جائے گا، یا اپنی ضرورت سے زائد پیداوار سے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عشری زمین کی جو بھی پیداوار ہو، اس پر ہونے والے خرچ کو وضع کیے بغیر پیداوار کا دسواں حصہ دینا ضروری ہے، جب کہ اس کی سینچائی بارش کے پانی سے ہوئی ہو اور بیسواں حصہ دینا ضروری ہے جب کہ اس کی سینچائی اپنے کنویں اور مشین کے پانی سے ہوئی ہو، اور مذکورہ تفصیل کے مطابق عشر یا نصف عشر پوری پیداوار سے دینا ضروری ہے، ایسا نہیں کیا جاسکتا کہ ضرورت کے بہ قدر پیداوار رکھ لیا جائے اور باقی ماندہ سے دسواں یا بیسواں حصہ نکالا جائے، نیز خرچ وغیرہ کچھ بھی وضع نہیں کیا جائے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (بلا رفع مؤن) أي كلف (الزرع) وبلا إخراج البذر. (الدر مع الرد: ۳۲۶-۳۲۸/۲، كتاب الزكاة، باب العشر)

قال ابن عابدين: (قوله: بلا رفع مؤن) أي يجب العشر في الأول ونصفه في الثاني بلا رفع أجرة العمال ونفقة البقر وكري الأنهار وأجرة الحافظ ونحو ذلك درر. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۸/۲، كتاب الزكاة، باب العشر، مطلب مهم في حكم أراضي مصر والشام السلطانية، ط: دار الفكر - بيروت ☆ فتح القدير - ابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۲۵۱/۲، كتاب الزكاة، باب زكاة الزروع والثمار، ط: دار الفكر)

ولا يمنع الدين وجوب عشر وخراج. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲۶۱/۲، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) عن سالم بن عبد الله، عن أبيه رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: فيما سقت السماء والعيون أو كان عثريا العشر، وما سقي بالنضح نصف العشر. (صحيح البخاري: ......، رقم الحديث: ۱۴۸۳، كتاب الزكاة، باب العشر فيما يسقى من ماء السماء، وبالماء الجاري، ط: ديوبند)

(و) تجب في (مسقي سماء) أي مطر (وسيح) كنهر (بلا شرط نصاب) راجع للكل (و) بلا شرط (بقاء) وحولان حول... (و) يجب (نصفه في مسقي غرب) أي دلو كبير (ودالية) أي دولاب لكثرة المؤنة... (بلا رفع مؤن) أي كلف (الزرع) وبلا إخراج البذر. (الدر مع الرد: ۳۲۶-۳۲۸/۲، كتاب الزكاة، باب العشر)

قال ابن عابدين: (قوله: بلا رفع مؤن) أي يجب العشر في الأول ونصفه في الثاني بلا رفع أجرة العمال ونفقة البقر=

[۹] اگر پیداوار کی قیمت گھر میں خرچ ہو جائے؟

۱۳۱۷- سوال: کیلوں کی فصل ایک ساتھ تیار نہیں ہوتی ہے، بل کہ تھوڑی تھوڑی تیار ہوتی ہے اور اس سے رفتہ رفتہ آنے والی رقم تھوڑی تھوڑی، گھر کے خرچ، کھیتی کے خرچ اور قرض وغیرہ کی ادائیگی کے لیے استعمال ہو جاتی ہے اور کوئی خاص رقم نہیں بچتی، تو کیا اس صورت میں بھی کیلوں کی پیداوار پر عشر (دسواں حصہ) نکالنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس طریقہ سے رقم آپ کے پاس آتی رہے، اس میں سے (حسب ضابطہ) دسواں یا بیسواں حصہ ادا کرتے رہیں؛ تاکہ ایک ساتھ ادا کرنا دشوار معلوم نہ ہو۔[1] ہندوستان کی زمین کے عشری یا خراجی ہونے کے سلسلے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے؛ تاہم عشر ادا کرنا بہتر ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] عشر کس پیداوار میں اور کس زمین میں واجب ہے؟

۱۳۱۸- سوال: میں اپنی زمین کی پیداوار کا عشر نکالنا چاہتا ہوں، تو عشر صرف اناج ہی میں ہے یا

= وكري الأنهار وأجرة الحافظ ونحو ذلك درر، قال في الفتح يعني لا يقال بعدم وجوب العشر في قدر الخارج الذي بمقابلة المؤنة بل يجب العشر في الكل؛ لأنه - عليه الصلاة والسلام - حكم بتفاوت الواجب لتفاوت المؤنة ولو رفعت المؤنة كان الواجب واحدا وهو العشر دائما في الباقي؛ لأنه لم ينزل إلى نصفه إلا للمؤنة والباقي بعد رفع المؤنة لا مؤنة فيه فكان الواجب دائما العشر، لكن الواجب قد تفاوت شرعا فعلمنا أنه لم يعتبر شرعا عدم عشر بعض الخارج وهو القدر المساوي للمؤنة أصلا اهـ وتمامه فيه(رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۸/۲، كتاب الزكاة، باب العشر، مطلب مهم في حكم أراضي مصر والشام السلطانية، ط:دار الفكر- بيروت ☆ فتح القدير -ابن الهمام(م:۸۶۱هـ): ۲۵۱/۲، كتاب الزكاة، باب زكاة الزروع والثمار، ط:دار الفكر)

ولا يمنع الدين وجوب عشر وخراج. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲۶۱/۲، أول كتاب الزكاة، ط:دار الفكر-بيروت)

(۱) وجاز دفع القيمة في زكاة وعشر وخراج وفطرة ونذر وكفارة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲۸۶/۲-۲۸۷، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، ط:دار الفكر-بيروت)

(وشرط صحة أدائها نية مقارنة له) ولو حكما أو مقارنة بعذل ما وجب كله أو بعضه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱۸۷/۳-۸۹)

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے فتاویٰ رحیمیہ: ۱۶۳/۷ تا ۱۶۶، کتاب الزکاۃ، باب العشر والخراج، ط: دار الاشاعت، پاکستان۔

ہر پیداوار میں، عشری زمین کسے کہتے ہیں؟ اس کی بھی وضاحت مطلوب ہے، انکلیشور کے مضافات کی زمین عشری کہلائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

زمین کی پیداوار سے دسواں حصہ نکالنے کو عشر کہتے ہیں، جو [عشری] زمین کی ہر طرح کی پیداوار میں واجب ہے۔[۱] انکلیشور کی زمین عشری نہیں ہے، ملاقات ہوگی، تو مزید تفصیل عرض کروں گا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن سالم بن عبد الله، عن أبيه رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: فيما سقت السماء والعيون أو كان عثريا العشر، وما سقي بالنضح نصف العشر. (صحيح البخاري: ۲۰۱/۲، رقم الحديث: ۱۴۸۳، كتاب الزكاة، باب العشر فيما يسقى من ماء السماء، وبالماء الجاري، ط: ديوبند)

عشری زمین کی ہر طرح کی پیدوار میں عشر یا نصف عشر واجب ہے، بس شرط یہ ہے کہ ایسی پیداوار ہو، جن کی کھیتی مقصود ہو:

وأن يكون الخارج منها مما يقصد بزراعته نماء الأرض هكذا في البحر الرائق. فلا عشر في الحطب والحشيش والقصب والطرفاء والسعف؛ لأن الأراضي لا تستنمي بهذه الأشياء بل تفسدها . . . ويجب العشر عند أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - في كل ما تخرجه الأرض من الحنطة والشعير والدخن والأرز، وأصناف الحبوب والبقول والرياحين والأوراد والرطاب وقصب السكر والذريرة والبطيخ والقثاء والخيار والباذنجان والعصفر، وأشباه ذلك مما له ثمرة باقية أو غير باقية قل أو كثر هكذا في فتاوى قاضي خان سواء يسقى بماء السماء أو سيحا يقع في الوسق أو لا يقع هكذا في شرح الطحاوي ويجب في الكتان وبذره؛ لأن كل واحد منهما مقصود كذا في شرح المجمع. ويجب في الجوز واللوز والكمون والكزبرة هكذا في المضمرات. ـــــــــ ويجب العشر في العسل إذا كان في أرض العشر. (الفتاوى الهندية: ۱۸۶/۱، كتاب الزكاة، الباب السادس في زكاة الزرع والثمار، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) اب چند مدت ہوتی ہے کہ شامی جلد ثانی، باب الرکاز میں یہ عبارت نظر پڑی، جو ذیل میں درج ہے اور جس کا حاصل یہ ہے کہ اراضی دار الحرب نہ عشری ہے، نہ خراجی، یہ مسئلہ فقہاء کے نزدیک متفق علیہ اور مسلم معلوم ہوتا ہے، اس عبارت کے دیکھنے کے بعد اس کی اصل معلوم ہوئی، جو حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہ نے مالا بد منہ میں تحریر فرمایا ہے کہ مسائل عشر اس کتاب میں اس وجہ سے نہیں لکھے گئے کہ یہاں کی زمینیں عشری نہیں ہیں، یا یہاں کی زمینوں پر عشر نہیں ہے، اوکما قال۔

الغرض تشریح شامی کے بعد اور تحقیق قاضی صاحب مرحوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب احقر یہ کہنے لگا کہ ہندوستان کی زمینیں عشری نہیں ہیں، بایں ہمہ احتیاط عشر نکالنے میں ہے۔..... (فتاوی دار العلوم: ۶/ ۹۳ - ۱۹۴، کتاب الزکاۃ، الباب السادس فی العشر، ط: دار العلوم دیوبند)

[۱۱] لیموں کی کھیتی پر عشر کا حکم

۱۳۱۹- سوال: ہمارے قصبہ میں تالاب کے کنارے میرا ایک گھر ہے، اس کے آس پاس آدھ بیگہ زمین ہے، اس گھر میں کوئی رہتا نہیں ہے، جس کی بناء پر اس میں دیمک لگ گئی ہے، جس کی صفائی کے لیے ماہانہ ۱۵۰/ (ایک سو پچاس) روپے تنخواہ پر ایک آدمی متعین کیا ہے، جو زمین خالی ہے، اس میں وہ آدمی ہمارے خرچہ سے لیموں کی کھیتی کرتا ہے، تقریباً ۴۵-۴۷ درخت ہیں، پانی کے لیے بھی پورا انتظام ہے، لیموں کی آمدنی دو تین دن میں تین سے پانچ روپیہ تک ہوتی ہے، اب اس کی زکوۃ (عشر) کتنی اور کب نکالنی چاہیے؟

الجواب حامداًومصلیاً:

مذکورہ زمین اگر آپ کے پاس مسلمانوں سے نسل در نسل چلی آرہی ہو، کہ اگلے سب مالکان مسلمان ہوں، کوئی غیر مسلم نہ ہو، اور زمین کی سیرابی کے لیے کا پانی کا انتظام خود کا ہو، کنواں اپنی ملکیت کا ہو، تو جو کچھ کھیتی ہو، اس کا بیسواں حصہ غریبوں کو دے دیں، یعنی ۲۰/ لیموں میں ایک لیموں دینا ضروری ہوگا۔ (۱)

اور اگر زمین کسی بھی زمانہ میں کسی غیر مسلم کے پاس سے حاصل کی گئی ہو، تو عشر واجب نہیں ہوگا، تاہم ہندوستانی زمین میں عشر (حسب ضابطہ، دسواں یا بیسواں حصہ) ادا کردینے میں احتیاط ہے۔ (۲)

مذکورہ صورت میں پانی کے انتظام کا صرفہ، نوکر کی تنخواہ اور دوسرے کسی خرچ کو وضع کیے بغیر، کل کھیتی کا بیسواں حصہ ادا کرنا ہوگا۔ (شامی۔ جلد ۲ صفحہ ۳۲۸) [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن سالم بن عبد الله، عن أبيه رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: فيما سقت السماء والعيون أو كان عثريا العشر، وما سقي بالنضح نصف العشر. (صحيح البخاري: ۲۰۱/۱، رقم الحديث: ۱۴۸۳، كتاب الزكاة، باب العشر فيما يسقى من ماء السماء، وبالماء الجاري، ط: ديوبند)

(۲) ..... تشریح شامی کے بعد اور تحقیق قاضی صاحب مرحوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب احقر (مفتی عزیز الرحمن عثمانی، مفتی اعظم: دار العلوم-دیوبند) یہ کہنے لگا کہ ہندوستان کی زمینیں عشری نہیں ہیں، بایں ہمہ احتیاط عشر نکالنے میں ہے۔..... (فتاوی دار العلوم: ۶/ ۱۶۳-۱۶۲، کتاب الزکاۃ، الباب السادس فی العشر، ط: دار العلوم دیوبند)

[۳] (و) تجب في (مسقي سماء) أي مطر (وسيح) كنهر (بلا شرط نصاب) راجع للكل (و) بلا شرط (بقاء) وحولان حول... (و) يجب (نصفه في مسقي غرب) أي دلو كبير (ودالية) أي دولاب لكثرة المؤنة... (بلا رفع مؤن) أي كلف (الزرع) وبلا إخراج البذر. (الدر مع الرد: ۳۲۶-۳۲۸/۲، كتاب الزكاة، باب العشر) =

[۱۲] ہندوستانی کھیتی پر زکوۃ کا حکم

۱۳۲۰- سوال: کھیتی کی پیداوار پر کتنی زکوۃ نکالنی ہوگی؟ کیا اس میں سے خرچ کم کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً:

ہندوستان کی زمین کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، اس سلسلے میں دو قول ہے:

(۱) ہندوستان کی زمین خراجی ہے؛ اس لیے سرکاری ٹیکس ادا کرنا کافی ہوگا۔ (۲) ہندوستان کی زمین عشری ہے؛ اس لیے اگر اس کو آسمان کے پانی سے سیراب کیا ہے، تو خرچ اور اجرت نکالے بغیر، عشر (دسواں حصہ) نکالنا ہوگا، اور اگر کنویں وغیرہ کے پانی سے سیراب کیا ہے، تو بغیر خرچ و اجرت نکالے نصف عشر (بیسواں حصہ) نکالنا ہوگا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= قال ابن عابدين: (قوله: بلا رفع مؤن) أي يجب العشر في الأول ونصفه في الثاني بلا رفع أجرة العمال ونفقة البقر وكري الأنهار وأجرة الحافظ ونحو ذلك درر (رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۸/۲، كتاب الزكاة، باب العشر، مطلب مهم في حكم أراضي مصر والشام السلطانية، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) اراضیٔ ہند کے سلسلے میں ضابطہ یہ ہے کہ جو زمینیں اس وقت مسلمانوں کی ملک میں ہیں، اور ان کے پاس مسلمانوں ہی سے پہنچی ہیں، إرثاً او شراءاً و هلم جراً، وہ زمینیں عشری ہیں اور جو درمیان میں کوئی کافر مالک ہوگیا تھا، وہ عشری نہ رہی۔ (امداد الفتاویٰ: ۵۹/۲)

تفصیلی تخریج کے لیے اسی باب کے اس طرح کے دوسرے سوالات کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

زياد بن الحارث الصدائی، قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعته، فذكر حديثا طويلا، قال: فأتاه رجل، فقال: أعطني من الصدقة، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله تعالى لم يرض بحكم نبي ولا غيره في الصدقات، حتى حكم فيها هو، فجزأها ثمانية أجزاء، فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقك. (ابوداود: ١/ ٢٣٠، حدیث نمبر: ١٦٣٠، کتاب الزکاۃ، باب من یعطی من الصدقۃ، وحد الغنی، ط: دیوبند)

باب اداء الزکاۃ

[زکاۃ کی ادائیگی کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اداء الزکاۃ

[زکاۃ کی ادائیگی کا بیان]

[۱] شوہر کے مال سے عورت کا اپنی زکوٰۃ تھوڑا تھوڑا کر کے نکالنا

۱۳۲۱- سوال: عورت کو بہ طور جہیز، والدین کی جانب سے شادی کے وقت جو "زیور" ملتے ہیں، ہمارے عرف میں اسے لڑکی کی ملک سمجھا جاتا ہے، لڑکی کا یہ زیور اتنی مقدار میں ہے، جس پر زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے، مگر اس کے پاس زکوٰۃ ادا کرنے کو پیسے نہیں ہیں، اور شوہر کی آمدنی بھی قلیل ہے، وہ نہ تو خود اس زیورات کی زکوٰۃ نکالتا ہے اور نہ عورت کو اتنا جیب خرچ دیتا ہے، جس میں سے وہ اپنی زکوٰۃ ادا کر سکے، البتہ اس نے یہ کہہ رکھا ہے کہ تم کو ہم نے اس کا مالک بنا دیا ہے کہ ہمارے گھر کے مال میں سے سائلین اور فقراء کو روٹی، سالن یا کبھی کوئی کپڑا یا کبھی کبھی روپیہ دو روپیہ اپنے زیور کی زکوٰۃ میں دے سکتی ہو، تو اگر عورت روزمرہ کی اس داد و دہش کو اپنے زیور کی زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت سے دیا کرے اور اس کا حساب رکھے اور اس طرح سال بھر میں جتنی زکوٰۃ واجب ہوتی ہو، اتنی مقدار کسی طرح ادا کر دیا کرے، تو کیا اس کے زیور کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا اس کو پوری زکوٰۃ بیک وقت نکالنی ضروری ہے؟ جوابات مدلل مطلوب ہیں امید ہے کہ زحمت گوارہ فرما کر مدلل جوابات سے نوازیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

پوری زکوٰۃ ایک وقت نکالنا ضروری نہیں ،جس وقت جو کچھ زکوٰۃ کی نیت سے ادا کرے،اس کی قیمت تحریر کرلے،مقدار معین کو رقم پہنچ جائے گی،تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔[1] فقط،واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] زکوٰۃ تھوڑی تھوڑی کرکے ایک مدت تک دیتے رہنا

۱۳۲۲- سوال: کیا زکوٰۃ ایک ہی وقت میں ادا کردینا ضروری ہے یا ایک مدت تک تھوڑی تھوڑی کرکے بھی ادا کی جاسکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب زکوٰۃ فرض ہوجائے تولازماً اس کا ادا کرنا ضروری ہے،اس میں سستی وکاہلی نہیں کرنی چاہیے،البتہ ایک ساتھ،ایک ہی وقت میں ادا کرنا ضروری نہیں،تھوڑا تھوڑا کرکے،جہاں مناسب ہو،دے سکتے ہیں۔[2]

---

(۱)(وشرط صحة أدائها نية مقارنة له) أي للأداء (ولو) كانت المقارنة (حكما) ... (أو مقارنة بعزل ما وجب) كله أو بعضه، ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۸-۲۷۰، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت)

البتہ مستحب یہ ہے کہ اتنی مقدار ایک فقیر ومحتاج کو دیا جائے،کہ اس کے ایک دن کی کھانے پینے کی ضرورت پوری ہوسکے:ندب دفع ما يغنيه يومه عن السؤال، واعتبار حاله من حاجة وعيال. (الدر المختار)——— قال ابن عابدين: (قوله: واعتبار حاله إلخ) أشار إلى أنه ليس المراد دفع ما يغنيه في ذلك عن سؤال القوت فقط، بل عن سؤال جميع ما يحتاجه فيه لنفسه وعياله، وأصل العبارة للشرنبلالي حيث قال قوله وندب دفع ما يغنيه عن سؤال ظاهرة تعلق الإغناء بسؤال القوت، والأوجه أن ينظر إلى ما يقتضيه الحال في كل فقير من عيال وحاجة أخرى كدهن وثوب وكراء منزل وغير ذلك كما في الفتح اهـ وتمامه فيها فافهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۵، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر)

(۲)(وافتراضها عمري) أي على التراخي وصححه الباقاني وغيره (وقيل فوري) أي واجب على الفور (وعليه الفتوى) كما في شرح الوهبانية (فيأثم بتأخيرها) بلا عذر. (الدر المختار)——— قال ابن عابدين: (قوله وافتراضها عمري) قال في البدائع وعليه عامة المشايخ، ففي أي وقت أدى يكون مؤديا للواجب، ويتعين ذلك الوقت للوجوب، وإذا لم يؤد إلى آخر عمره يتضيق عليه الوجوب، حتى لو لم يؤد حتى مات يأثم واستدل الجصاص له بمن عليه الزكاة إذا هلك نصابه بعد تمام الحول والتمكن من الأداء أنه لا يضمن، ولو كانت على الفور يضمن كمن أخر صوم شهر رمضان عن وقته فإن عليه القضاء. (قوله وصححه الباقاني وغيره) نقل تصحيحه في التتارخانية=

البتہ مختلف اوقات میں زکاۃ دے، تو ہر مرتبہ زکاۃ کی ادائیگی کی نیت کرے، الا یہ کہ یک بارگی پوری زکاۃ، بہ نیت زکاۃ، نکال کر علاحدہ کرلے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] وکیلِ زکوۃ کے لیے زکوۃ وصدقات کی رقم زیادہ مدت تک اپنے پاس روکے رکھنا

۱۳۲۳- سوال: زکوۃ وصدقات کی رقم مال داروں نے ادارے کو دی ہے؛ تاکہ ادارے کے ذمے داران اسے مسکین وحاجت مند میں تقسیم کردیں، مگر انہوں نے ۶/۶ سال تک اپنے پاس جمع رکھی ہے، کیا زکوۃ کی رقم اتنی مدت تک روکے رکھنا صحیح ہے؟ کیا اس قدر تاخیر سے زکوۃ ادا کی جائے، تو ادا ہوجائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کسی مسکین آدمی کو زکوۃ کی رقم کا مالک بنا دینا ضروری ہے۔[۲] جب تک ادارہ میں آئی ہوئی رقم

= أيضا.... (قوله فيأثم بتأخيرها إلخ) ظاهره الإثم بالتأخير ولو قل كيوم أو يومين لأنهم فسروا الفور بأول أوقات الإمكان. وقد يقال المراد أن لا يؤخر إلى العام القابل لما في البدائع عن المنتقى بالنون إذا لم يؤد حتى مضى حولان فقد أساء وأثم اهـ فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۷۱-۲۷۲، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

[۱] (وشرط صحة أدائها نية مقارنة له) أي للأداء (ولو) كانت المقارنة (حكما)... (أو مقارنة بعزل ما وجب) كله أو بعضه، ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۸-۲۷۰، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت)

فإذا نوى أن يؤدي الزكاة، ولم يعزل شيئا فجعل يتصدق شيئا فشيئا إلى آخر السنة، ولم تحضره النية لم يجز عن الزكاة كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۱، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر-بيروت)

والأصل اقترانها بالأداء كسائر العبادات إلا أن الدفع يتفرق فيحرج باستحضار النية عند كل دفع فاكتفى بوجودها حالة العزل دفعا للحرج. (البحر الرائق: ۲/ ۳۶۸، كتاب الزكاة، ط: زكريا-ديوبند)

(۲)... الزكاة يجب فيها تمليك المال؛ لأن الإيتاء في قوله تعالى {وآتوا الزكاة} [البقرة: ۴۳] يقتضي التمليك، ولا تتأدى بالإباحة حتى لو كفل يتيما فأنفق عليه ناويا للزكاة لا يجزيه بخلاف الكفارة. ولو كساه تجزيه لوجود التمليك. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۲۵۱-۲۵۲، أول كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية-بولاق، القاهرة ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر-بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب-ديوبند)

مسکین کے ہاتھ میں نہ پہونچ جائے، اس وقت تک زکوۃ ادا نہیں ہوتی۔[1] اسی وجہ سے جہاں تک ہو سکے، زکوۃ کی رقم کو حق داروں تک جلدی پہونچا دینا چاہیے۔ ایک سال تک تو ٹھیک ہے؛ لیکن چھ سال تک رقم کو روکے رکھنا درست نہیں ہے۔[2] البتہ چھ سال کے بعد ادا کرنے سے بھی زکوۃ ادا ہو جائے گی۔[3]

بہتر یہ ہے کہ ایسی زائد رقم کا حیلہ کر لیا جائے، جس کی شکل یہ ہے کہ کسی مسکین کو مالک بنا کر اس کے ہاتھ میں رقم دی جائے، اور ترغیب دیتے ہوئے کہا جائے کہ اس رقم کو اپنی طرف سے ادارہ میں دے دو، تمھیں پوری رقم صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا، نیز اس کو بھی کچھ رقم دے کر خوش کر دیا جائے، ادارہ کا ہی کوئی ہو، تو بہتر ہے۔ (درمختار)[4] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] سال ختم ہونے کے باوجود زکوۃ کی رقم بچ جائے، تو اس کا کیا کرنا چاہیے

۱۳۲۴- سوال: نوجوانوں کی ایک انجمن میں گاؤں کے کچھ لوگوں نے اپنی اپنی زکوۃ کی رقم دی ہے؛ لیکن وہ زکوۃ کی رقم سال بھر میں ختم نہیں ہوئی ہے، تو زکوۃ دینے والوں کی زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ اور زکوۃ کی جو رقم سال پورا ہونے کے بعد بچ جاتی ہو، اس رقم کو کیا کرنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نوجوانوں کی انجمن کے کارکنان کی ذمہ داری یہ ہے کہ زکوۃ کی اس رقم کو اس کے مستحقین تک پہنچا دیں، ان کو جمع نہ رکھیں اور سستی اور لاپرواہی سے کام نہ لیں؛ کیوں کہ وہ جب تک مستحقین تک زکوۃ نہیں پہنچائیں

---

(۱) ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۷۰، كتاب الزكاة، ط: بيروت)

(۲) إذا لم يؤد الزكاة حتى مضى حولان فقد أساء وأثم. (بدائع الصنائع: ۲/۳، كتاب الزكاة، فصل كيفية فرضية الزكاة، ط: دار الكتب العلمية)

(۳) ففي أي وقت أدى يكون مؤديا للواجب، ويتعين ذلك الوقت للوجوب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۷۱، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

[۴] ... الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب، بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۴۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)
وحيلة التكفين بها [الزكاة] التصدق على فقير، ثم هو يكفن فيكون الثواب لهما، وكذا في تعمير المسجد، وتمامه في حيل الأشباه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۷۱، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

گے، زکوۃ دینے والے کی زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ [۱]

البتہ رقم پر سال گذر جائے، اس کے بعد رقم مستحقین تک پہنچائی جائے، تب بھی زکوۃ ادا ہو جائے گی، ادائیگی زکوۃ میں کوئی نقص لازم نہیں آئے گا۔

نوجوانوں کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنی وکالت کا حق صحیح طور پر ادا کرتے اور زکاۃ کی رقم جلد از جلد اس کے مستحقین تک پہنچا دیتے، اگر بلا عذر ادائیگی میں تاخیر کی ہے، تو وہ گنہ گار ہوں گے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] صدقہ کی نیت سے الگ کردہ پیسوں پر زکوۃ کا حکم

۱۳۲۵- سوال: میں اپنی تجارت میں سے تھوڑے تھوڑے پیسے دینی کاموں میں خرچ کرنے کے لیے (مثلاً: مدرسہ، مسجد، یا کسی غریب کو دینے کے لیے) الگ کرتا رہتا ہوں، تو کیا ان الگ کردہ پیسوں پر جب سال گذر جائے، تو زکوۃ واجب ہوگی؟ جب کہ میں نے یہ پیسے صرف مذکورہ کام میں خرچ کی نیت سے ہی الگ کیے ہیں، نہ کہ کسی اور کام میں خرچ کرنے کے لیے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جو رقم مال دار کی ملکیت میں ہو اور اس پر سال گذر جائے، تو زکوۃ فرض ہو جاتی ہے، مذکورہ رقم آپ نے الگ نکالی ہے؛ لیکن اس کو نہ خرچ کیا ہے اور نہ خرچ کرنے کا کسی کو وکیل بنایا ہے، [لہذا وہ رقم آپ کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی] اس رقم کو الگ نکالنے سے آپ مذکورہ مد (کھاتے) میں خرچ کرنے کے مکلف

---

(۱) ولا یخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۷۰، کتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) (وافتراضها عمري) أي على التراخي وصححه الباقاني وغيره (وقيل فوري) أي واجب على الفور (وعليه الفتوى) كما في شرح الوهبانية (فيأثم بتأخيرها) بلا عذر. (الدر المختار) ــــ قال ابن عابدين: (قوله وافتراضها عمري) قال في البدائع وعليه عامة المشايخ، ففي أي وقت أدى يكون مؤديا للواجب، ويتعين ذلك الوقت للوجوب، وإذا لم يؤد إلى آخر عمره يتضيق عليه الوجوب، حتى لو لم يؤد حتى مات يأثم... (قوله وصححه الباقاني وغيره) نقل تصحيحه في التتارخانية أيضا.... (قوله فيأثم بتأخيرها إلخ) ظاهره الإثم بالتأخير ولو قل كيوم أو يومين لأنهم فسروا الفور بأول أوقات الإمكان. وقد يقال المراد أن لا يؤخر إلى العام القابل لما في البدائع عن المنتقى بالنون إذا لم يؤد حتى مضى حولان فقد أساء وأثم اهـ فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۷۱-۲۷۲، کتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

نہیں، آپ نیت بدلنا چاہیں، تو بدل سکتے ہیں؛ کیوں کہ آپ نے صرف دل سے نفل خیرات کی نیت کی ہے، منت نہیں مانی ہے (جس کا تعلق زبان سے ہے) لہٰذا مذکورہ رقم پر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے، اگر دوسرے کسی کو اس رقم کے خرچ کا وکیل بنایا ہوتا، تو پھر اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہوتی۔ اسی مذکورہ رقم سے بھی آپ اس کی زکوٰۃ نکال سکتے ہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] زکوٰۃ کی رقم کو ایک سال سے زائد عرصہ تک روکے رکھنا

۱۳۲۶- سوال: ہمارے یہاں ایک تنظیم ہے، جو نادار، محتاج اور ضرورت مند کے علاج و دوا وغیرہ اخراجات کے لیے رمضان جیسے مواقع میں زکوٰۃ کی رقم کا چندہ جمع کرتی ہے، اس رقم کو تین چار مہینے تک نادار اور محتاج لوگوں پر خرچ کیا جاتا ہے، اگر یہ رقم اتنی مقدار میں جمع ہو جائے کہ دوسرے سال تک چلتی رہے، تو ادائیگی میں اس تاخیر کی وجہ سے اس تنظیم کے منتظمین گنہگار ہوں گے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

زکوٰۃ، مستحق کے قبضہ میں آنے کے بعد ہی ادا ہوتی ہے،[2] اس لیے اُس کی ادائیگی میں بلا وجہ تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔[3]

---

(۱) أن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة، وكذا في البدائع في بحث النماء التقديري. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۲، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر- بيروت)

(وشرطه) أي شرط افتراض أدائها (حولان الحول) وهو في ملكه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۷، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر- بيروت)

إن الدراهم لا تتعين بالتعيين. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۳۶۴، كتاب الوقف، مطلب في وقف الدراهم والدنانير، ط: دار الفكر)

(۲) ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۷۰، كتاب الزكاة)

(۳) وتجب على الفور عند تمام الحول حتى يأثم بتأخيره من غير عذر، وفي رواية الرازي على التراخي حتى يأثم عند الموت، والأول أصح كذا في التهذيب. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۰، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر- بيروت)

(وافتراضها عمري) أي على التراخي وصححه الباقاني وغيره (وقيل فوري) أي واجب على الفور (وعليه الفتوى) كما في شرح الوهبانية (فيأثم بتأخيرها) بلا عذر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۷۱-۲۷۲، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

اگر بلا وجہ ایک سال سے زیادہ تاخیر ہوگی، تو ادائیگی کا وکیل بننے والا شخص گنہگار ہوگا،[1] سوال میں ذکر کردہ تفصیل کے مطابق اگر محتاج لوگوں کی ضرورت کے مطابق خرچ کرنے میں اگر تین یا چار مہینے لگ جاتے ہوں، تو اُس میں کوئی حرج نہیں، لیکن ایک سال سے زائد عرصہ تک نہ روکی جائے، اس دشواری کو دور کرنے کی آسان شکل یہ ہے کہ جن لوگوں نے زکوٰۃ کی رقم پہلے سے دے رکھی ہے، اُن کی رقم علاحدہ رکھی جائے، تاکہ اُسے پہلے خرچ کیا جاسکے، اور بعد میں دینے والوں کی رقم بھی علاحدہ رکھیں، کہ اُسے بعد میں خرچ کریں۔

بہتر تو یہی ہے کہ جب زکوٰۃ کی رقم مذکورہ تنظیم جیسے کسی بھی ادارے میں آئے، تو اُس کا اولاً حیلہ کرلیا جائے، کہ کسی سمجھدار محتاج شخص کو یہ رقم دیتے ہوئے کہا جائے کہ اگر آپ اپنی یہ رقم اِدارے میں دیں گے، تو اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے گا، پھر یہ شخص وہ رقم اِدارے کو دے دے، تو پھر روکے رکھنے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ (درمختار مع الشامی: ۲/۲۷۱)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] ایک سال سے زائد رقم روکے رکھنے والے اِدارے میں زکوٰۃ کی رقم جمع کرنا

۱۳۲۷- سوال: اگر کوئی اِدارہ زکوٰۃ اور چرمِ قربانی کی رقم ایک سال سے زائد عرصہ تک روکے رکھتا ہو، نیز یہ بات زکوٰۃ کی رقم اور چرمِ قربانی کی رقم جمع کروانے والے کو معلوم ہو، تو اُس کے لیے مذکورہ اِدارے میں رقم جمع کروانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر مذکورہ اِدارہ جان بوجھ کر اِس رقم کو روکے رکھتا ہو، اور حیلہ بھی نہ کرتا ہو، تو اُس

---

(۱) إذا لم یؤد الزکاۃ حتی مضی حولان فقد أساء وأثم. (بدائع الصنائع: ۲/ ۳، کتاب الزکاۃ، فصل کیفیۃ فرضیۃ الزکاۃ، ط: دار الکتب العلمیۃ)

[۲] . . . الحیلۃ أن یتصدق علی الفقیر ثم یأمرہ بفعل ہذہ الأشیاء (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدین: (قولہ: أن الحیلۃ) أي في الدفع إلی ہذہ الأشیاء مع صحۃ الزکاۃ. (قولہ ثم یأمرہ إلخ) ویکون لہ ثواب الزکاۃ وللفقیر ثواب ہذہ القرب، بحر. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۳۴۵، کتاب الزکاۃ، باب المصرف، ط: دار الفکر)

وحیلۃ التکفین بہا [الزکاۃ] التصدق علی فقیر، ثم ہو یکفن فیکون الثواب لہما، وکذا في تعمیر المسجد، وتمامہ في حیل الأشباہ. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۷۱، کتاب الزکاۃ، ط: دار الفکر)

میں زیادہ رقم جمع کروانا مناسب نہیں ہے،[۱] ورنہ زکوۃ ادا نہیں ہوگی،[۲] چرمِ قربانی کا بھی یہی حکم ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] زکوۃ کی رقم کئی سال تک جمع کر کے پھر ادا کرنا

۱۳۲۸- سوال: ایک شخص ہر سال زکوۃ نکالتا رہتا ہے، لیکن پوری زکوۃ نہیں نکالتا؛ بل کہ کچھ نکال کر باقی رقم جمع رکھتا ہے، ایسا ہی ہر سال کرتا ہے، سود کی جو رقم اس کے پاس آتی ہے، اس کو بھی جمع کرتا ہے، خود نہیں کھاتا، پھر وہ زکوۃ اور سود کی جمع شدہ رقم جب پانچ دس سال میں کافی مقدار میں ہوجاتی ہے، تو اسے کسی اسپتال، یا مدرسہ، یا اسکول میں استعمال کرتا ہے، سوال یہ ہے کہ یہ جمع کرنے والی صورت بہتر ہے یا ہر سال پوری زکوۃ نکال دینا اور سود کے پیسے آتے ہی بلا نیت ثواب صدقہ کر دینا بہتر ہے؟ جواب عطا فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، زکوۃ ہر سال پوری نکال دینی چاہیے۔[۳] زکوۃ کی رقم سے مسجد، مدرسہ، اسکول وغیرہ تعمیر کرنا درست نہیں، تعمیرات میں زکوۃ استعمال کرنے سے زکوۃ ادا نہ ہوگی۔[۴]

---

[۱] (وكره إعطاء فقير نصابا) أو أكثر (إلا إذا كان) المدفوع إليه (مديونا أو) كان (صاحب عيال) بحيث (لو فرقه عليهم لا يخص كلا) أو لا يفضل بعد دينه (نصاب) فلا يكره فتح. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۵۳، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) جب بھی ادارے کے ذمہ دار مستحقین تک پہنچادیں گے، زکاۃ ادا ہوجائے گی، البتہ سال بھر سے زیادہ روکے رکھنے کی وجہ سے زکوۃ کی ادائیگی میں تاخیر کا گناہ ہوگا:

ففي أي وقت أدى يكون مؤديا للواجب، ويتعين ذلك الوقت للوجوب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۷۱، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

إذا لم يؤد الزكاة حتى مضى حولان فقد أساء وأثم. (بدائع الصنائع: ۲/ ۳، كتاب الزكاة، فصل كيفية فرضية الزكاة، ط: دار الكتب العلمية)

(۳) وتجب على الفور عند تمام الحول حتى يأثم بتأخيره من غير عذر، وفي رواية الرازي على التراخي حتى يأثم عند الموت، والأول أصح كذا في التهذيب. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۰، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر-بيروت)

[۴] (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد و) لا إلى (كفن ميت وقضاء دينه). (الدر المختار) ــــ قال ابن عابدين: (قوله: نحو مسجد) كبناء القناطر والسقايات وإصلاح الطرقات وكري الأنهار والحج والجهاد وكل ما=

اسی طرح سود کی رقم بھی جمع نہیں رکھنی چاہیے، بل کہ جہاں تک ہوسکے، غریبوں کو دے کر اس کو جلد ختم کردینا چاہیے۔(۱) اس سے مدرسہ، باسٹل وغیرہ کی تعمیر ٹھیک نہیں، یعنی گنجائش ہے، مگر بہتر نہیں۔(۲) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

=لا تمليك فيه زيلعي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

ولا يصرف في بناء مسجد، وقنطرة، ولا يقضي بها دين ميت، ولا يعتق عبداً، ولا يكفن ميتا. (المحيط البرهاني - ابن مَازَة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا - ديوبند ☆ الفتاوى التاتار خانية: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا - ديوبند)

(۱) والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/ ۹۹، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالا حراما، ط: دار الفكر - بيروت)

وعلى هذا لو مات مسلم وترك ثمن خمر باعه مسلم لا يحل لورثته كما بسطه الزيلعي. (الدر المختار) ـــــو في حاشية ابن عابدين (م: ۱۲۵۲ھ): وقال في النهاية: قال بعض مشايخنا: كسب المغنية كالمغصوب لم يحل أخذه، وعلى هذا قالوا لو مات الرجل وكسبه من بيع الباذق أو الظلم أو أخذ الرشوة يتورع الورثة، ولا يأخذون منه شيئا وهو أولى بهم ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۸۵، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر)

(۲) اسلامک فقہ اکیڈمی - انڈیا نے دوسرے فقہی سیمینار (منعقدہ: ۸-۱۱/ رجمادی الاولی ۱۴۱۰ھ، مطابق: ۸/ ۱۱/ دسمبر ۱۹۸۹ء، دہلی) میں درج ذیل قرارداد پاس کی ہے:

۱- بینکوں سے ملنے والی سود کی رقم کو بینکوں میں نہ چھوڑا جائے؛ بل کہ اسے نکال کر مندرجہ ذیل مصارف میں خرچ کیا جانا چاہیے:

۲- بینک کے سودی رقم کو بلا نیت ثواب فقراء ومساکین پر خرچ کردیا جائے، اس پر تمام ارکان کا اتفاق ہے۔

۳- سودی رقم کو مساجد اور اس کے متعلقات پر خرچ نہیں کیا جاسکتا۔

۴- اکثر شرکاء سیمینار کی یہ رائے ہے کہ اس رقم کو صدقات واجبہ کے مصارف کے علاوہ رفاہ عام کے کاموں پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے، بعض حضرات کی رائے میں اس کے مصرف کو فقراء ومساکین تک محدود رکھنا چاہیے۔ (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۱۴۱، معاشی مسائل، بینک انٹرسٹ، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی - انڈیا، سن طباعت: اپریل: ۲۰۰۹ء)

[۹] ادارہ کے منتظمین کا اس سال کی زکوٰۃ دوسرے سال استعمال کرنا

۱۳۲۹-سوال: ہمارا ایک ادارہ ہے، جس میں مختلف قسم کی عصری تعلیم کا نظم ہے، اس میں غریبوں کو ڈرائیونگ، ٹیلرنگ، وغیرہ سکھایا جاتا ہے، اس ادارہ میں مختلف طرح کے ہنر سیکھنے اور تعلیم حاصل کرنے والوں کو ماہانہ وظیفہ بھی دیا جاتا ہے، اس میں جو غریب و مستحق ہوتے ہیں، ان کے کھانے پینے اور وظیفہ میں زکوٰۃ کے پیسے پوری امانت داری سے خرچ کیے جاتے ہیں؛ لیکن سوال یہ ہے کہ کبھی زکوٰۃ کی رقم ان غرباء و مستحقین پر خرچ کرنے کے بعد بھی بچ جاتی ہے اور جس سال وہ رقم آئی تھی اسی سال خرچ نہیں ہو پاتی ہے، تو اس طرح دوسرے سال تک زکوٰۃ کی رقم باقی رہنے سے زکوٰۃ کی ادائیگی وغیرہ میں کوئی نقصان تو نہ ہوگا؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوٰۃ دہندہ نے ادارے کے منتظمین کو زکوٰۃ یا صدقۃ الفطر کی رقم دے کر غرباء اور مستحقین تک پہنچانے کا وکیل بنایا ہے، اب ان منتظمین کی ذمہ داری ہے کہ جو واقعی مستحق ہیں، ان تک زکوٰۃ کی یہ رقم امانت داری سے پہنچادیں، آپ کی تحریر کے بہ موجب اہل انتظام اس رقم کو صحیح طریقہ سے مستحقین کے درمیان تقسیم کرتے ہیں، یہ اچھی بات ہے، لیکن ان کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جہاں تک ہوسکے، ہر سال کی زکوٰۃ اسی سال غرباء و مستحقین تک پہنچا کر ختم کردیں، دوسرے سال کے لیے باقی نہ رکھیں، باقی ماندہ رقم کا ان کو کوئی اور انتظام کرنا چاہیے؛ لیکن اگر رقم بچ جاتی ہے، تو اس سے منتظمین گنہ گار نہ ہوں گے؛ کیوں کہ بعض مرتبہ آمدنی، اخراجات سے زیادہ ہوتی ہے اور یہ بات منتظمین کو ابتداءً معلوم نہیں ہوتی کہ اس سال آمدنی کتنی ہوگی، اس لیے رقم بھی بچ جاتی ہے، جس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔

جب بھی مستحقین تک زکوٰۃ کی رقم پہنچ جائے گی، زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، اور اصحاب مال کی ذمہ داری تو اس وقت ادا ہو جاتی ہے، جب وہ منتظمین کو یہ رقم دے کر وکیل بناتے ہیں، وکیل کو دینے سے ان کی ذمہ داری ادا ہو جاتی ہے، البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے سلسلہ میں کامل ذمہ اس وقت ادا ہوتا ہے، جب وکیل اس رقم کو مستحق پر خرچ کردے، جب تک وکیل مستحق پر رقم خرچ نہ کرے، زکوٰۃ کی ادائیگی شمار نہ ہوگی۔[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) إذا دفع الزكاة إلى الفقير لا يتم الدفع مالم يقبضها أو يقبضها للفقير من له ولاية عليه. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت) =

= ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: ولا يخرج عن العهدة بالعزل) فلو ضاعت لا تسقط عنه الزكاة ولو مات كانت ميراثا عنه، بخلاف ما إذا ضاعت في يد الساعي لأن يده كيد الفقراء بحر عن المحيط. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۷۰، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

نوٹ: تعلیمی ادارے میں زکاۃ کی رقم جب منتظم کے پاس جمع ہوتی ہے، تو کیا منتظم زکاۃ دہندہ کا وکیل ہوتا ہے کہ جب تک اسے مستحقین تک نہ پہنچادے، زکاۃ دینے والا بری الذمہ نہیں ہوتا اور اس کی زکاۃ ادا نہیں ہوتی، یا وہ ادارے میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کا وکیل ہوتا ہے کہ اس منتظم کا قبضہ درحقیقت مستحقین زکاۃ کا قبضہ ہے، جس کی وجہ سے فوراً زکاۃ ادا ہو جائے گی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے فتویٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ ادارے کا منتظم، زکاۃ دینے والے کا وکیل ہے، اور وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ ہے، گویا زکاۃ ابھی صاحب مال کے پاس ہی ہے، جب تک اسے وکیل مستحق تک نہیں پہنچادیتا، زکاۃ ادا نہیں ہوگی۔ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے ایک فتویٰ سے اس کی تائید ہوتی ہے، جو درج ذیل ہے:

سوال: ہمارے یہاں ایک قومی ادارہ ہے، جو غریب، یتیم، بیواؤں کی امداد کے لیے قائم کیا گیا ہے اور وہ اپنی خدمات ماشاء اللہ انجام بھی دیتا ہے، اس کی نوعیت یہ ہے کہ ہر سال رمضان المبارک میں زکاۃ، فطرہ اور عید الاضحیٰ کے موقع پر چرم قربانی جمع کرتا ہے اور سال بھر ماہانہ یتیم، بیواؤں کو ایک مقدار مقرر دی جاتی ہے۔ فی الوقت ادارے کے پاس جمع شدہ کئی سال کی کچھ رقم موجود ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح رقم زکاۃ، فطرہ کی جمع کر کے رکھنا درست ہے یا سال بھر مکمل جتنی رقم جمع ہو، صرف کر دی جائے، حکم شریعت سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: زکاۃ، فطرہ دینے والوں نے ادارے کے ذمہ داروں کو وکیل بنایا ہے، کہ ان کی زکاۃ وفطرہ کو صحیح جگہ پر صرف کر دیں، جب تک وہ صرف نہیں کریں گے، زکاۃ، فطرہ کی ادائیگی نہیں ہوگی، ذمہ بری نہیں ہوگا، واجب باقی رہے گا۔ ایسی رقم پر سال بھر گذر جانا اچھا نہیں ہے، اور واجب میں اتنی دیر نہ کی جائے، درمیان میں حوادث کا بھی احتمال رہتا ہے، گذشتہ رقم، جو کچھ باقی ہو، اس کو حسب ضرورت غرباء اور مستحق کو دے دے، فقط، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۹/۵۱۵، کتاب الزکاۃ، باب اداء الزکاۃ، ادارے میں زکاۃ کی رقم سال بھر سے زیادہ پڑے رہنا، سوال نمبر: ۴۶۱۶، ط: دار المعارف-دیوبند)

حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب رحمہ اللہ نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث فرمائی ہے اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تحقیقات کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: میں اس مسئلے میں اسی فیصلے کو تسلیم کرتا ہوں، جو فیصلہ ان سب اکابر کا ہے، یعنی: موجودہ زمانے کے مہتمان مدارس یا ان کے مامور کردہ حضرات، جو چندہ یا زکاۃ وصول کرتے ہیں، وہ بہ حیثیت وکیل فقراء کے وصول ہوتی ہے اور ان کے قبضے میں پہنچتے ہی معطیین زکاۃ کی زکاۃ ادا ہو جاتی ہے۔ (جواہر الفقہ: ۳/۳۲۱، رسالۃ اماطۃ التشکیک فی اناطۃ الزکاۃ بالتملیک، ط: زکریا-دیوبند)

اس تفصیل کا حاصل یہ نکلا کہ منتظم ادارہ، معطیین کا وکیل نہیں بل کہ فقراء و مستحقین کا وکیل ہوتا ہے۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ منتظم، زکاۃ دہندہ اور فقراء؛ ہر دو کے وکیل ہیں، یہی رائے حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ، استاذ =

[۱۰] زکوۃ کی رقم کو سال بھر روکے رکھنے کا حکم

۱۳۳۰-سوال: ایک کمیٹی غرباء کی امداد کے لیے لوگوں سے زکوۃ وصدقات وخیرات وصول کرتی ہے، سوال یہ ہے کہ زکوۃ کی رقم کی ادائیگی کتنی مدت کے اندر کردینا ضروری ہے؟ یہ کمیٹی اسپتال کے غرباء کو دوائیاں فراہم کرتی ہے، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ زکوۃ کی رقم اور دوائیاں آدھے سال تک باقی رہتی ہیں، اور کبھی تو دوسرے سال تک جمع رہتی ہیں۔

الجواب حامداومصلیا:

صاحب نصاب پر حولان حول کے بعد زکوۃ ادا کرنا فرض ہے۔[۱]

زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں؛ اس لیے مال دار آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سال پورا ہوتے ہی اپنی زکوۃ ادا کردے، بلاوجہ تاخیر کرنے سے گنہ گار ہوگا۔[۲]

=گرامی حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم کی ہے اور فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے فتاویٰ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے ان کا یہ فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

''مہتمم مدرسہ کو ارباب اموال نے صراحۃً وکیل بنایا ہے کہ ہمارا مال حسب صواب دید مصارف میں صرف کردیں، غرباء کا بھی وکیل ہے، اس طرح کا طلبہ نے جب اس کے اہتمام کو تسلیم کرلیا تو گویا یہ کہہ دیا کہ آپ ہمارے واسطے ارباب اموال سے زکاۃ وغیرہ وصول کرکے ہماری ضروریات (کھانا، کپڑا وغیرہ میں) صرف کردیں، الخ...... (فتاویٰ محمودیہ: ۹/ ۵۱۴، کتاب الزکاۃ، مہتمم مدرسہ طلبہ کا وکیل ہے یا معطی کا، سوال نمبر: ۴۶۱۴، ط: اشرفی بک ڈپو-دیوبند)

حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کی ایک تحریر اس بابت صریح ہے کہ اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال کے، زکاۃ دہندہ اور مستحقین وآخذین ہردو کے وکیل ہیں، وہ فرماتے ہیں: عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں، مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال کے معطیین اور آخذین ہردو کی طرف سے وکلاء ہیں، لہٰذا نہ اس میں زکاۃ واجب ہوگی اور نہ معطیین واپس لے سکتے ہیں۔ (فتاویٰ اشرفیہ موسوم بہ فتاویٰ امدادیہ قدیم: ۴/ ۲۱۸، بہ حوالہ: نظام الفتاویٰ: ۱/ ۴۲۱، مدارس عربیہ میں آمدہ رقوم اور ان پر زکاۃ کا شرعی حکم، ط: ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی)

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صورت مسئولہ میں منتظم ادارہ کو زکاۃ حوالے کرنے سے ادا ہوجائے گی، خواہ ابھی زکاۃ مستحقین کو نہ پہنچی ہو۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

(۱) "الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول". (الهداية: ۱/ ۱۸۵، أول كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

(۲) (وافتراضها عمري) أي على التراخي وصححه الباقاني وغيره (وقيل فوري) أي واجب على الفور (وعليه=

لیکن زندگی میں جب بھی وہ ادا کرے گا، زکوۃ ادا ہو جائے گی، اور ادا ہی کہلائے گی، صفت قضاء کے ساتھ متصف نہیں ہوگی۔[۳]

جب کمیٹی کے کارکنان لوگوں کی زکوۃ ادا کرنے کے لیے وکیل بنے ہیں یا ان کو وکیل بنایا گیا ہے، تو ان کی ذمہ داری ہے کہ زکوۃ کی رقم کو اس کے مستحقین تک پہنچانے کی کوشش کریں؛ لیکن اس کے مستحقین تک پہنچانے کے بعد جو رقم بچ جائے اور اس کو ذمہ داران دوسرے سال کے بجٹ میں خرچ کریں تو گنہ گار نہیں ہوں گے؛ لیکن مالک خود اپنی زکوۃ ادا کرنے میں ڈھیل کرے، یہاں تک کہ سال پورا ہو جائے، تو وہ گنہ گار ہوگا۔ (شامی: ۲/۱۷)[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] زکوۃ میں قطعی نیت ضروری ہے، زکوۃ کہہ کر دینا ضروری نہیں

۱۳۳۱- سوال: ۱- ایک ضرورت مند شخص میرے پاس قرض لینے آیا، میں نے اس کو اس نیت سے پیسے دیے کہ اگر اس کے پاس دینے کا انتظام ہوگیا، تو یہ قرض ہے اور اگر انتظام نہ ہوسکا، تو یہ زکوۃ ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس طرح زکوۃ دینا شرعاً جائز ہے؟ اگر وہ نہ دے سکا تو میرے ذمہ عائد ہونے والی زکوۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

= الفتوى) كما في شرح الوهبانية (فيأثم بتأخيرها) بلاعذر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۷۱-۲۷۲، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

(۳) ففي أي وقت أدى يكون مؤديا للواجب، ويتعين ذلك الوقت للوجوب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۷۱، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

[۴] (وافتراضها عمري) أي على التراخي وصححه الباقاني وغيره (وقيل فوري) أي واجب على الفور (وعليه الفتوى) كما في شرح الوهبانية (فيأثم بتأخيرها) بلاعذر. (الدر المختار)———— قال ابن عابدين: (قوله وافتراضها عمري) قال في البدائع وعليه عامة المشايخ، ففي أي وقت أدى يكون مؤديا للواجب، ويتعين ذلك الوقت للوجوب، وإذا لم يؤد إلى آخر عمره يتضيق عليه الوجوب، حتى لو لم يؤد حتى مات يأثم... (قوله وصححه الباقاني وغيره) نقل تصحيحه في التتارخانية أيضا.... (قوله فيأثم بتأخيرها إلخ) ظاهره الإثم بالتأخير ولو قل كيوم أو يومين لأنهم فسروا الفور بأول أوقات الإمكان. وقد يقال المراد أن لا يؤخر إلى العام القابل لما في البدائع عن المنتقى بالنون إذا لم يؤد حتى مضى حولان فقد أساء وأثم اهـ فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۷۱-۲۷۲، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

۲- اگر کسی قرضہ مانگنے والے شخص کو زکاۃ دینا ہو، تو کیا اس کو بتانا ضروری ہے کہ یہ زکاۃ ہے، اگر ایسا کہا کہ یہ میری جانب سے ہدیہ اور بخشش ہے، تو کیا اس صورت میں زکاۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوۃ ایک اہم عبادت ہے؛ اس کی ادائیگی کے وقت نیت کرنا ضروری ہے، بغیر نیت کے زکوۃ ادا نہ ہوگی اور نیت قطعیت کے ساتھ ضروری ہے، تردد والی نیت کافی نہیں؛ کیوں کہ نیت میں تردد کا ہونا نیت کی قطعیت کے منافی ہے۔(۱)

قرض مانگنے والا شخص زیادہ غیرت مند ہے، جو مستحق زکاۃ ہونے کے باوجود زکاۃ لینے پر راضی نہیں ہے، اور آپ زکاۃ کی نیت سے دے رہے ہیں، تو دل میں ادائیگی زکاۃ کی نیت کے ساتھ آپ اس کو زبانی یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں یہ ہدیہ اور بخشش دے رہا ہوں، اس طرح بھی زکوۃ ادا ہو جاتی ہے۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (وشرط صحة أدائها نية مقارنة له) أي للأداء (ولو) كانت المقارنة (حكما) ... (أو مقارنة بعزل ما وجب) كله أو بعضه، ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۷-۲۶۸، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۰، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى التارخانية: ۳/ ۱۹۶، كتاب الزكاة، الفصل السابع في أداء الزكاة، والنية فيه، ط: زكريا-ديوبند)

إذا كان في وقت التصدق بحال لو سئل عما إذا تؤدي يمكنه أن يجيب من غير فكرة فذلك يكون نية منه. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۰، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر☆ الفتاوى التارخانية: ۳/ ۱۹۶، كتاب الزكاة، الفصل السابع في أداء الزكاة، والنية فيه، ط: زكريا-ديوبند)

الرابع أن لا يأتي بمناف بين النية، والمنوي... ومن المنافي التردد وعدم الجزم في أصلها وفي الملتقط، وعن محمد رحمه الله فيمن اشترى خادما للخدمة، وهو ينوي إن أصاب ربحا باعه لا زكاة عليه. (الاشباه والنظائر-زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بـ 'ابن نجيم المصري' (م: ۹۷۰هـ) ص: ۲۰۲-۲۰۳، الكلام على النية، ط: مكتبة فقيه الأمة-ديوبند)

(۲) ولم يشترط المصنف - رحمه الله - علم الآخذ بما يأخذه أنه زكاة؛ للإشارة إلى أنه ليس بشرط، وفيه اختلاف والأصح كما في المبتغى والقنية: أن من أعطى مسكينا دراهم، وسماها هبة، أو قرضا، ونوى الزكاة، فإنها تجزئه. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۲۲۸، كتاب الزكاة، شروط أداء الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

ولا يشترط علم الفقير بأنها زكاة على الأصح لما في البحر عن القنية والمجتبى الأصح أن من أعطى مسكينا =

[۱۲] زکوٰۃ کی رقم بستی کے مستحقین کو نہ دے کر دوسری جگہ دینا

۱۳۳۲- سوال: اگر خود کے شہر میں مستحقین زکوٰۃ کافی مقدار میں ہوں تو باہر والوں کو زکوٰۃ دینے کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوٰۃ اپنے رشتہ داروں میں جو فقیر ہوں، اولاً ان کو دیں، یا رشتہ داروں کے علاوہ بستی میں جو فقیر ہوں، ان کو دیں، لیکن اگر کوئی حولان حول سے قبل (پیشگی) زکاۃ ادا کرے، یا اپنی بستی سے باہر دوسرے شہر میں رشتہ دار رہتے ہوں، یا بستی کے علاوہ دوسری جگہ دینے میں دین کا مفاد وابستہ ہو، جیسے مدارس اور دینی ادارے، یا دین کی خدمت کرنے والے مستحق دین داروں کو دیا جائے، جو اس کے بستی کے نہیں ہیں، تو بھی بلا کراہت جائز ہے۔

لیکن کسی معقول و مذکورہ وجوہات کے بغیر بستی سے باہر زکوٰۃ دینا، جب کہ خود اس (زکاۃ دہندہ) کی بستی میں مستحق موجود ہوں، مکروہ ہوگا۔ (طحطاوی: ۳۹۵- عالم گیری: ۱/۱۵۱)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= دراهم وسماها هبة أو قرضا ونوى الزكاة، فإنها تجزئه اهـ. (درر الحكام شرح غرر الأحكام-محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا- أو منلا أو المولى - خسرو (م:۸۸۵هـ):۱/ ۱۷۴، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م:۱۰۷۸هـ):۱/ ۱۹۶، كتاب الزكاة، شرط صحة أداء الزكاة، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ الفتاوى الهندية:۱/ ۱۷۱، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۸، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

[۱] ويكره نقل الزكاة من بلد إلى بلد، إلا أن ينقلها الإنسان إلى قرابته، أو إلى قوم هم أحوج إليها من أهل بلده، ولو نقل إلى غيرهم أجزأه، وإن كان مكروها. وإنما يكره نقل الزكاة إذا كان الإخراج في حينها، بأن أخرجها بعد الحول أما إذا كان الإخراج قبل حينها، فلا بأس بالنقل.

والأفضل في الزكاة والفطر والنذر، الصرف أولا إلى الإخوة والأخوات، ثم إلى أولادهم، ثم إلى الأعمام والعمات ثم إلى أولادهم ثم إلى الأخوال والخالات، ثم إلى أولادهم ثم إلى ذوي الأرحام ثم إلى الجيران، ثم إلى أهل حرفته، ثم إلى أهل مصره أو قريته كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية:۱/ ۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر☆حاشية الطحطاوي على الدر:۱/ ۴۳۰، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: رشيديه- پاكستان ☆مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م:۱۰۷۸هـ):۱/ ۳۳۳، كتاب الزكاة، باب في بيان أحكام المصرف، ط: فقيه الأمة - ديوبند)

[۱۳] زکوۃ کی ادائیگی میں غرباء کا خیال رکھنا ضروری ہے

۱۳۳۳-سوال: رمضان المبارک کا مہینہ آرہا ہے؛ مدرسہ، مکتب، دارالعلوم، دینی وعصری ادارے، اور امدادی رقم تقسیم کرنے والی کمیٹیاں مختلف شہروں اور دیہاتوں میں اپنے سفیر بھیج کر چندہ وصول جمع کرتی ہے، اس چندہ میں عام طور پر زکوۃ کی رقم ہوتی ہے، للہ رقم بہت کم ہوتی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ زکوۃ کے اصل حق دار تو غرباء ہیں اور مشاہدہ ہے کہ ہر بستی میں جو صاحب نصاب حضرات ہوتے ہیں، وہ اپنی زکوۃ اپنی بستی کے مدرسے اور مکتب میں دیتے ہیں، پھر بعد میں دوسرے مکاتب و مدارس میں بھیجتے ہیں اور بستی کے غرباء کو بہت کم مقدار میں زکوۃ کی رقم ملتی ہے۔ الغرض کہنے کا منشاء یہ ہے کہ زکوۃ اسلام کا ایک اہم رکن ہے، جس کے حق دار صرف غرباء ہیں، مدارس والے زکوۃ اڑا لے جاتے ہیں، اور اصل مستحقین کو برائے نام ملتی ہے، تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلياً:

غرباء کا خیال رکھنا ضروری ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن أبي هريرة -رضي الله تعالى عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: والذي بعثني بالحق لا يعذب الله يوم القيامة من رحم اليتيم، ولان له في الكلام، ورحم يتمه وضعفه، ولم يتطاول على جاره بفضل ما آتاه الله، وقال: يا أمة محمد، والذي بعثني بالحق لا يقبل الله يوم القيامة صدقة من رجل وله قرابة محتاجون إلى صدقته، ويصرفها إلى غيرهم، والذي نفسي بيده لا ينظر الله إليه يوم القيامة. (المعجم الأسط: ۸/۳۴۶، رقم الحديث: ۸۸۲۸، باب الميم، من اسمه: مقدام، ط: دار الحرمين - القاهرة)

(و) كره (نقلها إلا إلى قرابة) بل في الظهيرية لا تقبل صدقة الرجل وقرابته محاويج حتى يبدأ بهم فيسد حاجتهم (أو أحوج) أو أصلح أو أورع أو أنفع للمسلمين (أو من دار الحرب إلى دار الإسلام أو إلى طالب علم) وفي المعراج التصدق على العالم الفقير أفضل (أو إلى الزهاد أو كانت معجلة) قبل تمام الحول فلا يكره خلاصة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۵۳-۳۵۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

البتہ واضح رہے کہ مدارس میں بھی نادار طلبہ کے لیے ہی زکوۃ اکٹھا کی جاتی ہے، اس لیے یہ کہنا کہ زکوۃ، اصل حق دار کو نہیں مل پاتی اور مدارس والے اڑا لے جاتے ہیں، غلط فہمی پر مبنی ہے، یہ صحیح ہے کہ مزکی (زکوۃ دہندہ) کی زکوۃ کا ترجیحی بنیاد پر حق دار اس کے غریب رشتے دار ہیں، اس لیے ان کو ایسے موقع پر ضرور یاد رکھنا چاہیے، لیکن دینی مصلحت کی بنیاد پر اگر کوئی مدارس میں زکوۃ دینے کو افضل سمجھتا ہے، تو یہ غلط نہیں؛ بل کہ فقہاء کی تصریح کے عین مطابق ہے۔ (دیکھیے: سوال سابق "زکوۃ کی رقم بستی کے مستحقین کو نہ دے کر دوسری جگہ دینا" کا حاشیہ) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۱۴] مکاتب اور دار العلوم میں زکوۃ کی رقم استعمال کرنا

۱۳۳۴-سوال: موجودہ زمانے میں مدارس، مکاتب اور رفاہی و امدادی کمیٹیوں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، جس کے نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے خطیر رقم کی ضرورت پڑتی ہے، جس کے لیے زکوۃ کی رقم وغیرہ حاصل کی جاتی ہے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ زکوۃ کی رقم غرباء کو ضرور ملنی چاہیے، تو اس کے لیے اسلام میں کیا طریقہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جہاں تک ممکن ہو، مکاتب میں زکوۃ کے پیسے استعمال نہ کیے جائیں، بچوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی ذمہ داری اس کے والدین اور پوری امت اسلمہ کی ہے؛ اس کے لیے للہ رقم نکالنا فرض کفایہ ہے۔

مکاتب میں تو حیلہ کے بغیر زکوۃ کی رقم استعمال بھی نہیں ہو سکتی، دار العلوم- جہاں طلبہ کے کھانے پینے وغیرہ کا انتظام رہتا ہے اور اس میں غریب طلبہ کھاتے ہیں- میں زکوۃ کی رقم غریب طلبہ پر خرچ ہوتی ہے، لیکن مکاتب میں اساتذۂ کرام کی تنخواہ وغیرہ میں خرچ کے لیے حیلہ کرنا اور غرباء کا حق مارنا مناسب نہیں ہے۔[1]

ہاں کوئی بستی ایسی ہو، جہاں للہ رقم سے مکتب چلانے کی کوئی شکل نہ ہو، وہاں کے باشندگان کی مالی حالت اس کی اجازت نہ دیتی ہو، اور دوسرے حضرات للہ رقم سے تعاون نہ کرتے ہوں، تو حیلہ کرکے زکوۃ کی رقم استعمال کرنا جائز ہے، کیوں کہ تعلیم -جس پر ایمان اور دین کی حفاظت کا مدار ہے- اہم ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) جواب کا حاصل یہ ہے اگر زکاۃ دہندہ اسلامی تعلیم کے مطابق زکاۃ نکالے، اپنے غریب رشتے داروں کا خیال رکھے اور دین کی نشر و اشاعت کی خاطر مدارس کی ہر طرح سے مدد کرے، تو ان شاء اللہ ضرورت مند مسلمان کی بھی ضرورت پوری ہوگی اور مدارس و مکاتب کا نظام بھی استحکام کے ساتھ رواں دواں رہے گا۔

(۲) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ، فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ. (۹-التوبۃ:۶۰)

مذهب علمائنا - رحمهم الله تعالى - أن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير أو لإدخال شبهة فيه أو لتمويه باطل فهي مكروهة و كل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال فهي حسنة، و الأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله تعالى {و خذ بيدك ضغثا فاضرب به و لا تحنث} [ص: ۴۴] و هذا تعليم المخرج لأيوب النبي - عليه و على نبينا الصلاة و السلام - عن يمينه التي حلف ليضربن امرأته مائة عود و عامة =

[۱۵] مستحق زکوۃ کو مالک بنائے بغیر اس کے کام میں زکوۃ کی رقم ادا کرنا

۱۳۳۵- سوال: ہندوستان کے کئی دیہاتوں میں بہت سے مسلمان بھائی غریب ہوتے ہیں، ان کی مالی حالت بہت ہی خراب ہوتی ہے، ان دیہاتوں میں واٹر ورکس نامی ادارہ، وہاں کے باشندگان کو ماہانہ فیس لے کر پانی کی ضروریات پوری کرتا ہے، اسی کے مطابق فیس ادا کر کے بجلی کی بھی سہولیات ملتی ہیں، وہاں کے غریب مسلمان اپنی مالی کمزوری کی وجہ سے پانی اور بجلی کا فیس ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا زکوۃ کی رقم سے مذکورہ دونوں فیس کی ادائیگی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور زکوۃ کی رقم سے ادائیگی ممکن ہے تو زکوۃ کی رقم پہلے ان کے ہاتھ میں دے کر ان کو مالک بنانا پڑے گا یا ہم براہ راست اس محکمہ کے ذمہ داروں کو جا کر ادا کر دیں، اور ان کے نام کی رسید کٹوا دیں تو زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ جائز شکل کون سی ہے؟ ہماری طرف سے ڈائریکٹ فیس ادا کرنے کی وجہ سے ان کے استعمال کر لینے کا کوئی خطرہ نہیں رہتا ہے، ورنہ اگر ہم ان کے ہاتھ میں پیسے دے دیں، تو وہ اس کا کسی دوسری جگہ استعمال کر لیں گے اور فیس جوں کی توں باقی رہ جائے گی۔

ابراہیم سعید [یو۔ کے]

الجواب حامداو مصليا:

زکوۃ کی ادائیگی کے لیے مستحق شخص کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے؛ لہٰذا صورت مسئولہ میں ان کو مالک بنائے بغیر ڈائریکٹ ان کے نام کی رسید کٹوا لینے سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ (۱) آپ کی تحریر کے مطابق کہ: ''اگر ہم

=المشايخ على أن حكمها ليس بمنسوخ وهو الصحيح من المذهب كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ٦/ ٣٩٠، كتاب الحيل، الفصل الأول في بيان جواز الحيل، ط: دار الفكر)

استاذ گرامی، آفتاب فقہ، دار العلوم دیوبند کے عظیم مفتی، حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی- رحمہ اللہ- اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

حیلہ خواہ مخواہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ زکوۃ کے مصارف متعین ہیں، حیلہ کے بعد جو اصل مستحق ہیں، وہ عملاً محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے حیلہ کی صورت انتہائی مجبوری میں اختیار کرنی چاہیے۔ (فتاویٰ دار العلوم: ٦/ ١٩٩، حاشیہ نمبر: ٢، مسائل مصارف زکاۃ، حیلہ کے ذریعے زکاۃ کی رقم تبلیغ میں خرچ کرنا کیسا ہے؟ ط: زکریا- دیوبند)

(۱) لأن الزكاة يجب فيها تمليك المال. اهـ... قال في الكشف الكبير في بحث القدرة الميسرة: الزكاة لا تتأدى إلا بتمليك عين متقومة حتى لو أسكن الفقير داره سنة بنية الزكاة لا يجزئه؛ لأن المنفعة ليست بعين متقومة. اهـ. (البحر الرائق: ٢/ ٢٥٢- ٢٥٣، أول كتاب الزكاة، ط: زكريا- ديوبند☆ المحيط البرهاني: ٣/ ٢١٣، كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية☆الدر المختار مع رد المحتار: ٣/ ٢٩١، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا- ديوبند ☆تبيين الحقائق: ٢/ ١١، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

ان کے ہاتھ میں پیسے دے دیں، تو وہ اس کا کسی دوسری جگہ استعمال کرلیں گے اور فیس جوں کی توں باقی رہ جائے گی۔" اگر واقعۃً یہ بات صحیح ہے، تو یہ صورت اپنانے سے بھی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

اولاً بجلی اور پانی کی فیس کی ادائیگی کے لیے ان مستحقینِ زکوٰۃ کو بہ طور قرض رقم دیں اور اس سے یہ تاکید کریں کہ "فیس کی ادائیگی کی رسید میرے حوالہ کریں"۔

قرض کے نام کی رقم، زکوٰۃ کی نیت سے مستحق کو دے کر فوراً ہی اس کے پاس سے قرض کی وصول یابی کا مطالبہ کریں، اس حیلہ سے فیس بھی ادا ہوجائے گی اور آپ کی زکوٰۃ بھی ادا ہوجائے گی۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۲) خلاصہ یہ کہ حیلے کی دو صورتیں ہیں:

(۱) اولاً ان کو قرض دیا جائے اور جب وہ فیس کی ادائیگی کی رسید دکھادیں، تو ان کو قرض کے برابر رقم کا مالک بناکر فوراً ہی وصول کرلیا جائے:

وحيلة الجواز أن يعطي مديونه الفقير زكاته ثم يأخذها عن دينه، . . . وحيلة التكفين بها [الزكاة] التصدق على فقير، ثم هو يكفن فيكون الثواب لهما، وكذا في تعمير المسجد، وتمامه في حيل الأشباه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۷۱، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ ان کو زکاۃ کی رقم، بہ نیت زکاۃ یہ کہہ کردیں کہ میں تمہیں قرض دے رہا ہوں، تاکہ تم اس سے بجلی اور پانی کا بل ادا کرسکو، جاؤ، بل ادا کردو اور اس کی رسید ہمیں دکھاؤ، جب وہ رسید دکھادیں۔ تو آپ کا مطلوب حاصل، کہ بل کی ادائیگی ہوگئی اور ساتھ ہی ساتھ زکاۃ بھی ادا ہوگئی، کیوں کہ زکاۃ کی ادائیگی کی درستگی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ جن کو زکاۃ دی گئی ہے، ان کو بتایا جائے کہ رقم، زکاۃ کی ہے، بل کہ بہ نیت زکاۃ، قرض کی صراحت کے ساتھ دی گئی رقم سے بھی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے:

ولم يشترط المصنف - رحمه الله - علم الآخذ بما يأخذه أنه زكاة؛ للإشارة إلى أنه ليس بشرط، وفيه اختلاف والأصح كما في المبتغى والقنية: أن من أعطى مسكينا دراهم، وسماها هبة، أو قرضا، ونوى الزكاة، فإنها تجزئه. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۲/۲۲۸، كتاب الزكاة، شروط أداء الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

ولا يشترط علم الفقير بأنها زكاة على الأصح لما في البحر عن القنية والمجتبى الأصح أن من أعطى مسكينا دراهم وسماها هبة أو قرضا ونوى الزكاة، فإنها تجزئه اهـ. (درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵ھ): ۱/۱۷۳، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/۱۹۶، كتاب الزكاة، شرط صحة أداء الزكاة، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۱، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۶۸، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

[۱۶] قبضہ دینے سے پہلے طالب علم کی زکوۃ کو کاٹ لینا

۱۳۳۶-سوال: ممبران سورت سوسائٹی نے دوتین سال سے یہ قاعدہ بنا رکھا ہے کہ ہر اسکالر کو ''وہورا سماج''-جوان کا ماہ نامہ ہے-کا خریدار بننا لازم اور ضروری ہے اور مذکورہ قاعدے کے تحت وہ طلبہ کی طے شدہ سالانہ رقم [۲۴۰/روپے، جو زکوۃ کے مد سے ہوتی ہے] سے اس کا چندہ [پانچ روپیہ] وضع کر لیتے ہیں، تو ان کا قبل القبض چندہ وضع کر لینے سے کیا زکوۃ دینے والے کی زکوۃ ادا ہو جائے گی؟ اور ان کا اپنے فائدہ کی خاطر اس طرح کا قاعدہ بنانا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

ارباب سوسائٹی [زکوۃ کی رقم سے] ماہانہ وظیفہ مقرر کرنے کے بعد طالب علم کی رضامندی اور تملیک کے بغیر ''وہورا سماج'' نامی رسالے کی رقم وصول کریں گے تو اس سے زکوۃ دہندہ کی زکوۃ ادا نہیں ہوگی، اور ارباب سوسائٹی زکوۃ کی رقم کو برباد کرنے کے ذمے دار ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں باز پرس فرمائیں گے۔ (۱)

البتہ منتظمین دوسری کوئی شکل اختیار کریں، جو جواز کا درجہ رکھتی ہو، مثلاً: زکوۃ دہندہ کو بتا دیا جائے کہ آپ کی زکوۃ کی بعض رقم سے ہم ماہنامہ بھیجیں گے، اگر وہ منظور کر لیں، تو اسکالر کے لیے سالانہ دوسو پینتیس (۲۳۵) روپیہ اور سال بھر کا پانچ روپیہ کے عوض پرچہ منظور کیا جائے اور اسکالر کو بتایا جائے کہ آپ

---

(۱) (هي) ... (تمليك) ... (جزء مال) خرج المنفعة، ... (عينه الشارع) وهو ربع عشر نصاب حولي خرج النافلة والفطرة (من مسلم فقير) ... وهذا معنى قول الكنز تمليك المال: أي المعهود إخراجه شرعا (مع قطع المنفعة عن المملك من كل وجه) ... (لله تعالى). [الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۵۶-۲۵۸، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت)

عن عبد الله، قال النبي صلى الله عليه وسلم: كلكم راع وكلكم مسئول، فالإمام راع وهو مسئول، والرجل راع على أهله وهو مسئول، والمرأة راعية على بيت زوجها وهي مسئولة، والعبد راع على مال سيده وهو مسئول، ألا فكلكم راع وكلكم مسئول. (صحيح البخاري: ۲/ ۷۷۹، رقم الحديث: ۵۱۸۸، كتاب النكاح، باب: قوا أنفسكم وأهليكم نارا، ط: البدر-ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۲۲، رقم الحديث: ۲۰-(۱۸۲۹)، كتاب الإمارة، باب فضيلة الأمير العادل، وعقوبة الجائر، والحث على الرفق بالرعية، والنهي عن إدخال المشقة عليهم، ط: ديوبند)

إذا دفع الزكاة إلى الفقير لا يتم الدفع ما لم يقبضها أو يقبضها للفقير من له ولاية عليه. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر-بيروت)

کے نام فلاں صاحب کی جانب سے پرچہ جاری کردیا گیا ہے، جس کی قیمت سالانہ پانچ روپے ہوگی اور وہ کمیٹی کے لوگوں نے دینا منظور کیا ہے، نیز دوسو پینتیس روپے نقد مل جائیں گے؛ لہٰذا اس حساب سے جناب کا وظیفہ دوسو چالیس روپے مبلغ منظور ہوا۔

یا کوئی اور اس کا متبادل تلاش کریں، لہٰذا ذمہ دار حضرات، علماء کرام سے مزید رجوع فرمالیں۔[1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] مستحق شخص کا زکوۃ کی رقم لے کر اپنے غیر مسلم نوکر کو تنخواہ دینا

۱۳۳۷-سوال: اگر زکوۃ کا مستحق شخص بیمار ہو جائے اور اس کی خدمت کوئی غیر مسلم شخص کرے، تو وہ مستحق شخص زکوۃ کے پیسوں سے خدمت کرنے والے غیر مسلم کی مزدوری ادا کرسکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس کی وجہ سے زکوۃ دہندہ کی زکوۃ پر کوئی اثر پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

غریب شخص زکاۃ کی رقم حاصل کرنے کے بعد اپنے استعمال میں لاسکتا ہے، اس کے لیے غیر مسلم کو ہدیہ دینا، اس کی دعوت کرنا یا اس کو اپنی خدمت کی مزدوری دینا؛ سب کچھ جائز ہے،[2] تبدل ملک سے احکام

---

(۱) یہ صورت وکالۃً زکوۃ ادا کرنے کی ہے، جس کے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں:

ويجوز التوكيل بالبياعات والأشربة والإجارات والنكاح والطلاق والعتاق والخلع والصلح والإعارة والاستعارة والهبة والصدقة والإيداع وقبض الحقوق والخصومات وتقاضي الديون والرهن والارتهان كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۳/ ۵۶۴، كتاب الوكالة، الباب الأول في معنى الوكالة وركنها وشرطها وألفاظها وحكمها وصفتها، ط: دار الفكر)

(۲) عن عائشة -رضي الله عنها- قالت: كان في بريرة ثلاث سنن: عتقت فخيرت، وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الولاء لمن أعتق، ودخل رسول الله صلى الله عليه وسلم وبرمة على النار، فقرب إليه خبز وأدم من أدم البيت، فقال: ألم أر البرمة، فقيل: لحم تصدق به على بريرة، وأنت لا تأكل الصدقة، قال: هو عليها صدقة، ولنا هدية. (صحيح البخاري: ۲/ ۷۶۳، رقم الحديث: ۵۰۹۷، كتاب النكاح، باب الحرة تحت العبد، ط: ديوبند، وانظر رقم: ۱۴۹۳، كتاب الزكاة، باب الصدقة على موالي أزواج النبي صلى الله عليه وسلم☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۴۹۴، رقم الحديث: ۸-۱۱ (۱۵۰۴)، كتاب الطلاق، باب إنما الولاء لمن أعتق، ط: ديوبند)

(فقال -صلى الله عليه وسلم-: "ألم أر برمة فيها لحم") الاستفهام للتقرير (قالوا: بلى، ولكن ذلك لحم تصدق به على بريرة، وأنت لا تأكل الصدقة، قال: "هو") أي اللحم "عليها" أي على بريرة (صدقة ولنا هدية) قال الطيبي: =

بدل جاتے ہیں، جب مستحق شخص نے اس پر قبضہ کرلیا اور زکاۃ دینے والے کی زکاۃ کی ادائیگی کا عمل مکمل ہوگیا، تو اب اس مال میں زکاۃ کی حیثیت باقی نہیں رہی۔[1] واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] زکوۃ کی رقم مستحق کو دینے کے بعد واپس لے کر کسی کے پاس جمع کر دینا

۱۳۳۸-سوال: ایک شخص نے زکوۃ کے مستحق ایک آدمی کو زکوۃ کی کچھ رقم دی، اس شخص نے اس رقم کو قبول کر کے اس پر اپنا قبضہ بھی کرلیا، قبضے کے بعد زکوۃ دینے والے نے اس رقم کو واپس لے لیا اور یہ کہا کہ یہ پیسے تمہارے ہیں، البتہ اس پیسوں کو میں فلاں شخص کو دیتا ہوں وہ ہر مہینے تم کو تمہاری ضرورت کے بہ قدر مخصوص رقم دیتا رہے گا، مثلاً: پندرہ روپے، تو زکوۃ دینے والا شخص اگر اس طرح کرے تو کیا یہ جائز ہے؟ اور جس شخص کو زکوۃ کی رقم دی گئی ہے، اس کی رضامندی ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصليا:

رقم پر قبضہ کر لینے کے بعد مستحق شخص اس کا مالک بن جائے گا اور جب مستحق شخص اس کا مالک بن گیا، تو اب اس کی رضامندی کے بغیر زکوۃ دینے والے شخص کا اس سے رقم لے کر، کسی دوسرے شخص کے پاس بطور امانت رکھوانا، اور یہ کہنا کہ تم اس فلاں غریب شخص کو ماہانہ پندرہ روپے دیتے رہنا، جائز نہیں ہے، البتہ غریب آدمی اپنی مجبوری کی وجہ سے صبر کرلے اور ماہانہ پندرہ روپے لینے پر اپنی رضامندی ظاہر کردے، تو اس مال دار کی زکوۃ ادا ہوجائے گی۔[2]

= إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ وهو معنى قول ابن الملك: فيحل التصدق على من حرم عليه بطريق الهدية. (مرقاة المفاتيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۴/ ۱۳۰۳، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) ... أن تبدل الملك كتبدل العين. (البحر الرائق: ۲/ ۲۶۴، كتاب الزكاة، باب دفع الزكاة إلى الأب والجد أو الولد وولد، ط: دار الكتاب الإسلامي-بيروت)

(۲) (هي) ... (تمليك) ... (جزء مال) خرج المنفعة، ... (عينه الشارع) وهو ربع عشر نصاب حولي خرج النافلة والفطرة (من مسلم فقير) ... وهذا معنى قول الكنز تمليك المال: أي المعهود إخراجه شرعا (مع قطع المنفعة عن المملك من كل وجه) ... (لله تعالى). [الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۵۶-۲۵۸، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت ☆العناية: ۲/ ۲۶۷، كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقة إليه ومن لا يجوز، ط: دار الفكر ☆البحر الرائق: ۲/ ۲۱۶، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي - بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۱۹۲، أول كتاب الزكاة، ط: دار احياء التراث العربي☆حاشية الطحطاوي: ۱/ ۷۱۴، كتاب الزكاة، مدخل، ط: دار الكتب العلمية ☆تبيين الحقائق: ۱/ ۲۵۲، أول كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الاميرية-بولاق، القاهرة)

البتہ ایسا کرنے کی ایک جائز شکل یہ ہے کہ زکوۃ دہندہ، زکوۃ کی نیت سے غریب کو پیسے دینے کے لیے کسی آدمی کو وکیل بنادے اور اس وکیل کو یہ کہہ دے کہ ہر ماہ میری طرف سے فلاں غریب آدمی کو زکوۃ کے پیسے ادا کرتے رہنا، تو زکوۃ ادا ہو جائے گی اور غریب کی رضامندی بھی ضروری نہیں۔ (۱) واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] زکوۃ، صدقۂ فطر اور سود وغیرہ کی رقم کو غریبوں کے علاج میں استعمال کرنا

۱۳۳۹- سوال: ہم اپنی سوسائٹی کے ماتحت مذہبی، لِلّٰہ، خدمت کے لیے، ایک ساروجنک [عوامی] دواخانہ شروع کرنا چاہتے ہیں، ان شاء اللہ العزیز جلد ہی اس کا افتتاح عمل میں آئے گا، اس کے متعلق ایک استفتاء آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، درخواست ہے کہ جواب دے کر ممنون فرمائیں گے۔

اس دواخانے میں غریبوں کو دوائیوں کے علاوہ دیگر سہولیات بھی فراہم کی جائیں گی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس میں زکوۃ، صدقۂ فطر، لِلّٰہ، بینکوں کا سود اور قربانی کے چمڑوں کی رقم استعمال کر سکتے ہیں اور ان رقموں سے دواخانہ کی تعمیر کر سکتے ہیں؟ عبدالعزیز مسلم ویلفیئر سوسائٹی

الجواب حامداً و مصلیاً:

مسلم ویلفیئر سوسائٹی نے مسلم اور غیر مسلم؛ ہر ایک کو سہولیات فراہم کرنے کے لیے جو دواخانہ شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے، وہ بہت ہی مبارک اور لائق تحسین قدم ہے، اللہ رب العزت کامیابی عطا فرمائے۔ (آمین)

البتہ ارکان سوسائٹی کو جان لینا چاہیے کہ زکوۃ، صدقات واجبہ، صدقۂ فطر، چرم قربانی کی آنے والی رقم اور سود کے پیسوں کا مستحق کوئی غریب مسلمان ہی ہے، نیز اس رقم کا یا رقم سے خریدی ہوئی چیز کا کسی غریب کو مالک بنانا ضروری ہے۔ (۲)

---

(۱) ويجوز التوكيل بالبياعات والأشربة والإجارات والنكاح والطلاق والعتاق والخلع والصلح والإعارة والاستعارة والهبة والصدقة والإيداع وقبض الحقوق والخصومات وتقاضي الديون والرهن والارتهان كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۳/ ۵۶۴، كتاب الوكالة، الباب الأول في معنى الوكالة وركنها وشرطها وألفاظها وحكمها وصفتها، ط: دار الفكر)

(۲) ... الزكاة يجب فيها تمليك المال؛ لأن الإيتاء في قوله تعالى {وآتوا الزكاة} [البقرة: ۴۳] يقتضي التمليك، ولا تتأدى بالإباحة حتى لو كفل يتيما فأنفق عليه ناويا للزكاة لا يجزيه بخلاف الكفارة، ولو كساه تجزيه لوجود التمليك. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ھ): ۱/ ۲۵۱-۵۲، أول كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة ☆ الدر المختار مع =

جب اس دواخانہ سے مال دار وغریب؛ ہر ایک فائدہ اٹھائیں گے، تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ ایسا کیا جاسکتا ہے کہ زکاۃ کی رقم سے دوائیں خریدی جائیں اور اس دوا کے ضرورت مند، غریب کو، اس کا مالک بنادیا جائے۔ تعمیری کام میں زکاۃ کی رقم استعمال نہیں کی جاسکتی۔ (۱)

سود کے متعلق قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں جو سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اس کے پیش نظر مال داروں کے لیے اس سے ہر حال میں اجتناب لازم ہے؛ اور غرباء کو بلا نیت ثواب دی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی مال

= ردالمحتار: ۲/ ۳۴۴، کتاب الزکاة، باب المصرف، ط: دار الفکر - بیروت☆البحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، أول کتاب الزکاة، ط: دار الکتاب - دیوبند☆الفتاوی الهندیة: ۱/ ۱۸۸، کتاب الزکاة، الباب السابع في المصارف، ط: زکریا - دیوبند☆ الفتاوی التاتار خانیة: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، کتاب الزکاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فیه الزکاة، ط: زکریا - دیوبند)

(۱) (لا) یصرف (إلی بناء) نحو (مسجد و) لا إلی (کفن میت وقضاء دینه). (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدین: (قوله: نحو مسجد) کبناء القناطر والسقایات وإصلاح الطرقات وکري الأنهار والحج والجهاد وکل ما لا تملیك فیه زیلعي. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۳۴۴، کتاب الزکاة، باب المصرف، ط: دار الفکر - بیروت ☆تبیین الحقائق: ۲/ ۱۸، أول کتاب الزکاة، ط: دار الکتب العلمیة - بیروت)

ولا یصرف في بناء مسجد، وقنطرة، ولا یقضي بها دین میت، ولا یعتق عبداً، ولا یکفن میتا. (المحیط البرهاني - ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۲/ ۲۸۲، کتاب الزکاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن یوضع فیه الزکاة، ت: عبد الکریم سامي الجندي، ط: دار الکتب العلمیة - بیروت☆الفتاوی الهندیة: ۱/ ۱۸۸، کتاب الزکاة، الباب السابع في المصارف، ط: زکریا - دیوبند☆ الفتاوی التاتار خانیة: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، کتاب الزکاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فیه الزکاة، ط: زکریا - دیوبند)

سودی رقم غرباء و مساکین ہی کو دینا ضروری ہے یا رفاہ عام میں خرچ کیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں اسلامک فقہ اکیڈمی - انڈیا نے دوسرے فقہی سمینار (منعقدہ: ۸-۱۱/ رجمادی الاولی، ۱۴۱۰ھ مطابق: ۸/ ۱۱/ دسمبر ۱۹۸۹ء، دہلی) میں درج ذیل فیصلہ کیا ہے:

۱- بینکوں سے ملنے والی سودی رقم کو بینکوں میں نہ چھوڑا جائے؛ بل کہ اسے نکال کر مندرجہ ذیل مصارف میں خرچ کیا جانا چاہیے:

۲- بینک کے سودی رقم کو بلا نیت ثواب فقراء و مساکین پر خرچ کر دیا جائے، اس پر تمام ارکان کا اتفاق ہے۔

۳- سودی رقم کو مساجد اور اس کے متعلقات پر خرچ نہیں کیا جاسکتا۔

۴- اکثر شرکاء سمینار کی یہ رائے ہے کہ اس رقم کو صدقات واجبہ کے مصارف کے علاوہ رفاہ عام کے کاموں پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے، بعض حضرات کی رائے میں اس کے مصرف کو فقراء و مساکین تک محدود رکھنا چاہیے۔ (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۱۴۱، معاشی مسائل، بینک انٹرسٹ، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی - انڈیا، سن طباعت: اپریل: ۲۰۰۹ء)

دار وغریب؛ ہر ایک کو سود کی رقم دیتا ہے، تو وہ درحقیقت سود کو فروغ دے کر اللہ کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہے۔[۱]

الغرض مذکورہ دواخانے کے تعمیری کام کے لیے زکاۃ اور سودی رقم کے علاوہ صرف للہ رقم استعمال کریں، نیز اس زکاۃ کی رقم سے دوائیاں خرید کر غرباء کو دیں، مال داروں کو دینے سے زکاۃ ادا نہیں ہوگی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] زکوۃ وصدقات سے چلنے والے دواخانے سے مال داروں کے فائدہ اٹھانے کا حیلہ

گذشتہ سے پیوستہ

۱۳۴۰- سوال: ویسے تو یہ دواخانہ [جس کا ذکر گذشتہ سوال میں ہوا] غریبوں اور حاجت مندوں کے لیے ہے؛ البتہ اگر کوئی صاحب حیثیت شخص اس سے فائدہ اٹھائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ جمع ہونے والی زکاۃ وصدقات واجبہ کی رقم سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکے، اس کا انتظام کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

گاؤں سے قریب ہونے کی بناء پر اس دواخانے سے ہر ایک فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، تو اب فائدہ اٹھانے والا ہر شخص زکوۃ، صدقہ، فطرہ اور سود کی رقم استعمال کرنے والا نہ بنے، اس کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

عبدالعزیز (مسلم ویلفیر سوسائٹی)

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکاۃ کی رقم سے لی گئی دوا اور انجکشن کا آپ کسی غریب کو مالک بنا سکتے ہیں،[۲] لیکن ڈاکٹر کی تنخواہ اور

---

(۱) اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (۲-البقرۃ:۲۷۵-۲۷۹)

عن جابر -رضي الله عنه- قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (الصحيح لمسلم: ۲/ ۲۷، رقم الحديث: ۱۰۶-۱۵۹۸، كتاب المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ط: ديوبند)

(۲) سوال سابق کا پہلا حاشیہ دیکھیں۔

عملہ (اسٹاف) کا کسی بھی طریقہ کا خرچ زکوۃ وغیرہ کی رقم سے ادا کرنا جائز نہیں، اس کی وجہ سے زکوۃ دینے والوں کی زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ (۱)

جب اس دواخانے سے مال دار بھی فائدہ اٹھائیں گے اور غیر مسلم بھی دوا لینے کے لیے آئیں گے، تو زکوۃ اور بلا زکوۃ والی دواؤں کا الگ الگ رکھنا دشوار ہوگا۔

اس لیے زکوۃ اور صدقہ وغیرہ کی رقم کا اس دواخانے کے تعمیری کام میں استعمال کرنا تو بالکل جائز نہیں۔ میرے نزدیک اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ للہ رقم مسلم اور غیر مسلم ہر ایک کے پاس سے لے کر اس کا تعمیری کام شروع کر دیا جائے، اور اس دواخانے سے جو بھی بیمار دوا لے جائیں، ان کو بل دیا جائے، اگر علاج کے لیے آنے والا غریب ہو، تو وہ اس بل کو ویلفیئر سوسائٹی میں پیش کرے اور اس کو بل کے مطابق دوا اور پرہیز والی غذا کے مطابق روپے دیے جائیں، ایسی صورت میں زکوۃ بلا شبہ ادا ہو جائے گی؛ کیوں کہ زکاۃ حق دار کو پہنچ رہی ہے۔ (۲)

صاحب مال بھی اس دواخانے سے علاج کرائیں، ان کو بھی بل دیا جائے، جسے وہ دواخانے کو ادا کر کے دوا لے جائیں، دوا وغیرہ کے مناسب دام [نو پروفٹ، نو لاس -No profit No Lass-] رکھے

---

(۱) ولو نوى الزكاة بما يدفع المعلم إلى الخليفة، ولم يستأجره إن كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضا أجزأه، وإلا فلا، وكذا ما يدفعه إلى الخدم من الرجال والنساء في الأعياد وغيرها بنية الزكاة كذا في معراج الدراية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۖ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹- التوبة: ۶۰)

زياد بن الحارث الصدائي، قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعته، فذكر حديثا طويلا، قال: فأتاه رجل، فقال: أعطني من الصدقة، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله تعالى لم يرض بحكم نبي ولا غيره في الصدقات، حتى حكم فيها هو، فجزأها ثمانية أجزاء، فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۳۰، رقم الحديث: ۱۶۳۰، كتاب الزكاة، باب من يعطي من الصدقة، وحد الغنى، ط: ديوبند)

قوله [تعالى]: إنما الصدقات للفقراء الآية تدل على أنه لا حق في الصدقات لأحد إلا لهذه الأصناف الثمانية، وذلك مجمع عليه، وأيضا فلفظة (إنما) تفيد الحصر ويدل عليه وجوه. (مفاتيح الغيب = التفسير الكبير - أبو عبد الله محمد بن عمر، التيمي الرازي الملقب بـ'فخر الدين الرازي' خطيب الري (م: ۶۰۶هـ): ۱۶/ ۸۰، سورة التوبة: ۹، آية: ۶۰، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

جائیں، تا کہ بازار کے ڈاکٹر کی دوا اور عام علاج کے مقابلے میں یہاں علاج سستے ہوں اور ہر خاص و عام اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۲۱] ویلفیئر دواخانے میں ہر ایک کے لیے فیس رکھنے کا شرعی حکم

گذشتہ سے پیوستہ

۱۳۴۱- سوال: کیا ہم ایسا انتظام کر سکتے ہیں کہ للہ کا ایک باکس (Box) رکھ دیں، صاحب حیثیت افراد دواخانے سے فائدہ اٹھانے کے بعد دوا کے زائد پیسے للہ رقم کے باکس میں ڈال دیا کریں، کیا یہ جائز ہے؟

مثلاً: دواخانے میں (دو روپے کی) دوا کی فیس پچاس پیسہ رکھیں، صاحب مال شخص جائے، تو اسے بھی حسب قانون دوا صرف پچاس پیسہ ہی میں ملے، اور ڈاکٹر کے معائنہ کا خرچ اور دوا کی اضافی رقم (ڈیڑھ روپیہ) دواخانے میں رکھے ہوئے باکس (Box) کے اندر ڈال دے۔ کیا یہ صورت جواز کی ہے؟

واضح رہے کہ میری نیت اس دواخانے سے لوگوں کے پاس سے غلط فائدہ اٹھانے کی ہے اور نہ ہی ان کو دھوکہ دینے کی؛ بل کہ نیت صرف اس قدر ہے کہ دوسرے دواخانے میں جانے کے مقابلہ میں اپنے دواخانے میں آئیں۔ عبدالعزیز (مسلم ویلفیئر سوسائٹی)

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کی نیت اچھی ہے کہ اس دواخانے سے ہر طبقے کے لوگ استفادہ کریں اور ہر ایک کو سہولت فراہم کی جائے، یہ ارادہ بہت ہی مبارک ہے؛ لیکن اس میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی کے صحیح ہونے کی جو شرطیں ہیں، وہ آپ کے اس طریقے میں نہیں پائی جاتیں، کیوں کہ زکاۃ کا، مستحق زکاۃ کو مالک بنانا شرط ہے۔[۱]

نیز غیر مستحق کو زکاۃ دینے سے زکاۃ ادا نہیں ہوتی، مذکورہ صورت میں مستحق زکوۃ کو، زکوۃ کا

(۱) ... الزكاة يجب فيها تمليك المال؛ لأن الإيتاء في قوله تعالى {وآتوا الزكاة} [البقرة:۴۳] يقتضي التمليك. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ھ): ۱/ ۲۵۱-۵۲، أول كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة ☆الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت)

مالک نہیں بنایا جارہا ہے، اور غیر مستحق کو زکاۃ کی رقم سے دوا دیے جانے کی تجویز ہے، جو درست نہیں۔ [1]

یہ بات بھی یاد رہے کہ نبوت سے جس قدر زمانہ دور ہوتا جارہا ہے، اسی کے بقدر امانتوں میں خیانتیں بھی ہورہی ہیں، اس لیے ہر مال دار پچاس پیسہ فیس ادا کرنے کے ساتھ ایک روپیہ یا ڈیڑھ روپیہ باکس میں ڈال جائے، یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔

الغرض شرعی نقطۂ نظر سے زکوۃ اور صدقہ کی رقم کا استعمال دواخانے میں مذکورہ طریقے سے کرنا جائز نہیں ہوگا، ہاں اگر غریبوں کا حساب الگ ہو، اور ان کو زکاۃ کی رقم سے دوادی جائے اور مال داروں کا حساب الگ ہو، اور ان کو فیس لے کر دوادی جائے، تو جائز ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] زکوۃ، صدقات اور سود کی رقم دواخانے میں استعمال کرنے کا شرعی حکم

گزشتہ سے پیوستہ

۱۳۴۲- سوال: ہم بارڈولی کے مسلمانوں نے ایک سارو جنک [عوامی] دواخانہ شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے، جس میں غریب اور حاجت مند مسلمان اور غیر مسلم ہر ایک سے معمولی فیس لے کر ان کو دوائی کی سہولیات دینے کا ارادہ ہے؛ لیکن دواخانے کی تعمیر اور اس کے اتنے وسیع نظام کو چلانے کے لیے وافر مقدار میں رقم کی ضرورت پڑے گی، جس کے لیے ہم نے زکوۃ، صدقہ، فطرہ اور سود کی رقم لینے کا ارادہ کیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ رفاہ عام کے کام کے لیے- جس میں غریب مسلمان کے ساتھ ساتھ غیر مسلم لوگ بھی فائدہ اٹھائیں گے- سود کی رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ اس [زکاۃ و خیرات سے چلنے والے] دواخانہ سے اگر کوئی مال دار مسلمان فائدہ اٹھانا چاہے تو اس کو دوسرے دواخانوں اور دوسرے ڈاکٹروں کے برابر فیس لے کر دوادی جاسکتی ہے؟ دواخانہ کی معمولی فیس فی الحال دوا کے ساتھ ہم نے آٹھ آنے یا بارہ آنے اور انجکشن کی فیس ایک روپیہ رکھنے کا ارادہ کیا ہے، دواخانہ کا مقصد صرف یہ ہے کہ غریب طبقے کو کم پیسوں میں مناسب علاج مل جائے اور ان کی

---

(۱) زياد بن الحارث الصدائي، قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعته، فذكر حديثا طويلا، قال: فأتاه رجل، فقال: أعطني من الصدقة، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله تعالى لم يرض بحكم نبي ولا غيره في الصدقات، حتى حكم فيها هو، فجزأها ثمانية أجزاء، فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۳۰، رقم الحديث: ۱۶۳۰، كتاب الزكاة، باب من يعطي من الصدقة، وحد الغنى، ط: ديوبند)

خدمت ہو جائے، تجارت اور نفع کمانا کوئی مقصد نہیں۔ احمد اسماعیل واڑی والا، بارڈولی

الجواب حامداومصلیا:

میں نے اس سوال کا جواب ویلفیئر سوسائٹی کے سیکریٹری کو تفصیل سے لکھ دیا ہے۔

صدقات واجبہ اور زکوۃ کی رقم کا تعمیرات میں استعمال کرنا جائز نہیں۔ [1] زکاۃ اور سود کی رقم سے ڈاکٹر اور نرس کی تنخواہیں کس طرح دی جاسکتی ہے، جائز نہیں، اس رقم کو استعمال کرنے کے لیے غریب سے حیلہ کروائیں، یا اس رقم سے خریدی گئی دوائیاں اور انجکشن الگ سے رکھے جائیں اور صرف مستحقین زکاۃ کو دی جائیں۔ [2]

چندے کی رقم [صدقۂ غیر واجبہ] دیتے ہوئے کسی نے اگر غریب طبقے کی امداد کی صراحت کی ہوگی، تو اس سے مال دار کو فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اس میں چندہ دینے والے کی شرط کی خلاف ورزی ہوگی۔ [3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] زکوۃ کی رقم سے دوائیاں خرید کر غرباء میں تقسیم کرنا

۱۳۴۳-سوال: ویلفیئر سوسائٹی کو ملنے والی زکوۃ کی رقم سے دوائیاں خرید کر غریبوں کو دی جاسکتی ہیں یا نہیں؟

---

(۱) (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد و) لا إلى (كفن ميت وقضاء دينه). (الدر المختار) ــــ قال ابن عابدين: (قوله: نحو مسجد) كبناء القناطر والسقايات وإصلاح الطرقات وكري الأنهار والحج والجهاد وكل ما لا تمليك فيه زيلعي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) ولو نوى الزكاة بما يدفع المعلم إلى الخليفة، ولم يستأجره إن كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضا أجزأه، وإلا فلا، وكذا ما يدفعه إلى الخدم من الرجال والنساء في الأعياد وغيرها بنية الزكاة كذا في معراج الدراية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳)... الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره كما لو أوصى لزيد بكذا ليس للوصي الدفع إلى غيره فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید تفصیل کے لیے اس سلسلے کے سابقہ سوالات دیکھیں۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

جس شخص پر زکوۃ واجب ہے، وہ اپنے مال سے چالیسواں حصہ نکال کر مستحقین کو اس کا مالک بنادے۔[1] خواہ بہ ذات خود مستحقین تک اس کو پہنچا کر مالک بنادے، یا مالک بنانے کے لیے وہ کسی کو اپنا وکیل بنادے؛ کیوں کہ وکیل کا تصرف درحقیقت مؤکل کا تصرف ہوتا ہے۔[2] گویا ویلفیئر سوسائٹی کے ارکان کا تصرف آپ کی جانب سے شمار ہوگا، آپ خود ان کے لیے دوائیاں اور کپڑے وغیرہ خرید کر ان کو مالک بنا سکتے ہیں، تو ویلفیئر سوسائٹی کے کارکنان بھی اس رقم سے دوائی، کپڑا اور اناج وغیرہ خرید کر کسی کو اس کا مالک بنادیں، تو آپ کی زکوۃ ادا ہوجائے گی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ... الزکاۃ یجب فیها تملیك المال؛ لأن الإیتاء في قوله تعالی {وآتوا الزکاة} [البقرة: ۴۳] یقتضي التملیك، ولا تتأدی بالإباحة حتی لو کفل یتیما فأنفق علیه ناویا للزکاة لا یجزیه بخلاف الکفارة، ولو کساه تجزیه لوجود التملیك. (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدین الزیلعي الحنفي (م: ۷۴۳ھ): ۱/ ۲۵۱-۲۵۲، أول کتاب الزکاة، ط: المطبعة الکبری الأمیریة - بولاق، القاهرة ☆الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۴، کتاب الزکاة، باب المصرف، ط: دار الفکر - بیروت☆البحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، أول کتاب الزکاة، ط: دار الکتاب - دیوبند☆الفتاوی الهندیة: ۱/ ۱۸۸، کتاب الزکاة، الباب السابع في المصارف، ط: زکریا - دیوبند ☆ الفتاوی التاتار خانیة: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، کتاب الزکاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فیه الزکاة، ط: زکریا - دیوبند☆مجمع الأنهر: ۱/ ۲۸۴-۲۸۵، أول کتاب الزکاة، ط: فقیه الأمة - دیوبند ☆العنایة شرح الهدایة: ۲/ ۲۶۷، کتاب الزکاة، من یجوز دفع الصدقة إلیه ومن لایجوز، ط: دار الفکر - بیروت ☆در الحکام شرح غرر الأحکام: ۱/ ۱۷۱، کتاب الزکاة، شروط وجوب الزکاة، ط: دار إحیاء الکتب العربیة - بیروت)

(۲) ویجوز التوکیل بالبیاعات والأشربة والإجارات والنکاح والطلاق والعتاق والخلع والصلح والإعارة والاستعارة والهبة والصدقة والإیداع وقبض الحقوق والخصومات وتقاضي الدیون والرهن والارتهان کذا في الذخیرة. (الفتاوی الهندیة: ۳/ ۵۶۳، کتاب الوکالة، الباب الأول في معنی الوکالة ورکنها وشرطها وألفاظها وحکمها وصفتها، ط: دار الفکر)

وللوکیل أن یدفع لولده الفقیر وزوجته لا لنفسه إلا إذا قال ربها: ضعها حیث شئت. (الدر المختار)

وفي الشامیة: ... الوکیل إنما یستفید التصرف من الموکل وقد أمره بالدفع إلی فلان فلا یملك الدفع إلی غیره کما لو أوصی لزید بکذا لیس للوصي الدفع إلی غیره فتأمل. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۲۶۹، کتاب الزکاة، مطلب في زکاة ثمن المبیع وفاء، ط: دار الفکر - بیروت☆ المبسوط: ۲/ ۲۰۳، کتاب الزکاة، باب العشر، ط: دار المعرفة - بیروت ☆البحر الرائق: ۲/ ۲۲۶، کتاب الزکاة، باب المصرف، ط: زکریا - دیوبند)

لو أمر غیره بالدفع عنه جاز. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۲۷۰، أول کتاب الزکاة، ط: دار الفکر☆ الفتاوی التاتار خانیة: ۳/ ۲۲۷، کتاب الزکاة، الفصل التاسع في المسائل المتعلقة بمعطی الزکاة، ط: زکریا - دیوبند)

[۴۴] مستحق شخص کا زکوۃ لے کر کسی دوسرے مستحق کو دینے کا شرعی حکم

۱۳۴۴- سوال: ایک عالم ہیں، جو کسی جگہ ملازمت کرتے ہیں، ان کی تنخواہ (مسجد اور مدرسہ دونوں کی ملا کر) ۱۴۰۰/روپے ہیں، وہ عالم صاحب اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتے ہیں، گاؤں والوں کے کھیتوں میں جب اناج تیار ہوتا ہے، تو خوشی کے طور پر تھوڑی بہت وہ لوگ مدد کر دیتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود بھی ان کو اپنا گھر چلانے میں دقت رہتی ہے، اتنی ساری تکلیف برداشت کرتے ہوئے، اللہ رب العزت کی ذات پر مکمل بھروسہ کر کے اپنا گھر چلایا کرتے ہیں، ان کا دوسرا کوئی کاروبار ہو سکے، (گاؤں کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے) اس کا بھی امکان نہیں ہے، خود بھی کوئی دوسرا ہنر سیکھنے سے مجبور ہیں؛ کیوں کہ فرصت میسر نہیں۔

البتہ رمضان میں لوگ ان کو زکوۃ اور صدقۂ فطر وغیرہ دیتے ہیں، تو وہ اپنی عالمیت کے لحاظ کرتے ہوئے، زکوۃ اور صدقہ ٔفطر کی رقم اپنی ضرورت میں استعمال نہیں کرتے؛ ان رقموں کو لے کر اپنے گاؤں میں موجود مستحق رشتہ داروں کو بھیج دیتے ہیں اور صدقہ و زکاۃ کے طور پر ملنے والے اناج وغیرہ کا بازار میں وزن کروانے کے بعد، اپنے گھر میں استعمال کر لیتے ہیں اور اس کی بازاری قیمت اپنے مستحق رشتہ داروں کو بھیج دیتے ہیں، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اور عالم صاحب کو رکھنے میں کوئی حرج ہے یا نہیں؟ اور یہ زکوۃ اور صدقہ ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

مولوی عبداللہ اسماعیل خان پوری

الجواب حامداً و مصلیاً:

اگر عالم صاحب مقروض ہیں تو وہ زکوۃ لے سکتے ہیں۔(۱)

---

(۱) مستحق زکاۃ ہونے کے لیے مقروض ہونا شرط نہیں ہے؛ بل کہ اتنا ضروری ہے کہ حاجت اصلیہ کے علاوہ کسی بھی طرح کے مال سے نصاب کا مالک نہ ہو، لہٰذا امام صاحب اگر ایسے ہیں، تو ان کے لیے زکاۃ لینا جائز ہے:

فإن كان له فضل عن ذلك تبلغ قيمته مائتي درهم حرم عليه أخذ الصدقة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۷، کتاب الزکاۃ، باب مصرف الزکاۃ و العشر، ط: دار الفکر)

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (۹-التوبۃ: ۶۰)

زياد بن الحارث الصدائي، قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه و سلم فبايعته، فذكر حديثا طويلا، قال: فأتاه رجل، فقال: أعطني من الصدقة، فقال له رسول الله صلى الله عليه و سلم: إن الله تعالى لم يرض بحكم نبي و لا غيره في الصدقات، حتى حكم فيها هو، فجزأها ثمانية أجزاء، فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقك. (سنن أبي داود:=

اپنی طبیعت کو چھوڑ دیں، شرعی طور پر جائز ہے، لینے میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ دین نام ہے آسانی کا؛ نظام دنیا یہی ہے کہ اس میں کوئی غریب ہے تو کوئی امیر۔ (۲)

اگر یہ عالم صاحب مستحق زکوۃ نہیں ہیں، تو وہ دینے والوں سے یہ کہہ دیں کہ میں زکوۃ کا مستحق نہیں ہوں، البتہ میرے رشتہ دار اور متعلقین غریب ہیں؛ اس لیے اگر آپ چاہیں، تو ان زکوۃ وصدقات کو میرے رشتہ داروں تک پہنچانے کا مجھے وکیل بنادیں، میں وکیل بن کر اس زکوۃ اور صدقہ کی رقم کو ان کے مستحقین تک پہنچادوں گا۔ (۳)

جب وہ وکیل بن گئے، تو اب اس رقم کو وہ ان کے مستحقین تک پہنچادیں گے، تو ذمہ داری سے سبک دوش ہوجائیں گے اور ان کی زکوۃ وصدقات بھی ادا ہوجائیں گی؛ البتہ جو اناج ان کے پاس آیا ہے، وہی اناج مستحقین تک پہنچانا پڑے گا، دینے والوں کی اجازت کے بغیر بیچنا یا کسی مستحق کو مالک بنائے بغیر بیچنا جائز نہیں۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= ۱/ ۴۰۳، رقم الحدیث: ۱۹۳۰، کتاب الزکاۃ، باب من یعطي من الصدقۃ، وحد الغنی، ط: دیوبند)

مصرف الزکاۃ... (هو فقیر، وهو من له أدنی شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غیر تام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۳۹، کتاب الزکاۃ، باب المصرف، ط: دار الفکر - بیروت)

(ومنها الغارم)، وهو من لزمه دین، ولا یملك نصابا فاضلا عن دینه،... والدفع إلی من علیه الدین أولی من الدفع إلی الفقیر کذا في المضمرات. (الفتاوی الهندیة: ۱/ ۱۸۸، کتاب الزکاۃ، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفکر - بیروت)

(۲) عن أبي هریرة - رضي الله عنه - عن النبي صلی الله علیه وسلم قال: إن الدین یسر، ولن یشاد الدین أحد إلا غلبه، فسددوا وقاربوا، وأبشروا، واستعینوا بالغدوة والروحة وشيء من الدلجة. (صحیح البخاري: ۱/ ۱۶، رقم الحدیث: ۳۹، کتاب الإیمان، باب: الدین یسر، وقول النبي صلی الله علیه وسلم: أحب الدین إلی الله الحنیفیة السمحة، ط: البدر - دیوبند)

(۳) ویجوز التوکیل بالبیاعات والأشربة والإجارات والنکاح والطلاق والعتاق والخلع والصلح والإعارة والاستعارة والهبة والصدقة والإیداع وقبض الحقوق والخصومات وتقاضي الدیون والرهن والارتهان کذا في الذخیرة. (الفتاوی الهندیة: ۳/ ۵۶۴، کتاب الوکالة، الباب الأول في معنی الوکالة ورکنها وشرطها وألفاظها وحکمها وصفتها، ط: دار الفکر)

(۴) الوکیل إنما یستفید التصرف من الموکل، وقد أمره بالدفع إلی فلان فلا یملك الدفع إلی غیره کما لو أوصی لزید بکذا لیس للوصي الدفع إلی غیره. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۲۶۹، کتاب الزکاۃ)

[۲۵] زکوۃ کی رقم سے حاجت مندوں کا قرض ادا کرنا

۱۳۴۵- سوال: ایک سوسائٹی غریب و نادار کی امداد کے لیے لوگوں سے صدقات وخیرات اور زکاۃ کی رقم چندہ کرتی ہے، کیا وہ انجمن زکوۃ کی رقم سے حاجت مندوں کا قرض ادا کرسکتی ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

زکوۃ کی ادائیگی کی صحت کے لیے کسی غریب، حاجت مند اور مستحق کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے۔[1] اس لیے سوسائٹی کے کارکنان اگر کسی غریب کو مالک بنائے بغیر ازخود اس کی طرف سے زکوۃ ادا کریں، تو تملیک کی شرط نہ پائے جانے کی وجہ سے زکوہ ادا نہیں ہوگی۔

یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ جس آدمی کا قرض ادا کرنا مقصود ہے، اس کو سوسائٹی کے کارکنان کے سامنے بلایا جائے اور زکوۃ کی رقم کا اس کو مالک بنایا جائے، پھر اسی مجلس میں سوسائٹی کا سکریٹری اس سے رقم لے لے اور وکیل بن کے اس کا قرض ادا کردے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱)... الزكاة يجب فيها تمليك المال؛ لأن الإيتاء في قوله تعالى {وآتوا الزكاة} [البقرة: ۴۳] يقتضي التمليك، ولا تتأدى بالإباحة حتى لو كفل يتيما فأنفق عليه ناويا للزكاة لا يجزيه بخلاف الكفارة، ولو كساه تجزيه لوجود التمليك. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۵۲-۲۵۱، أول كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة ☆الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆البحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب - ديوبند)

إذا دفع الزكاة إلى الفقير لا يتم الدفع ما لم يقبضها أو يقبضها للفقير من له ولاية عليه نحو الأب والوصي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) وكذلك يقضي دين مغرم بأمره ويجوز ذلك إذا كان المديون فقيرا؛ لأنه يملكه أولا، ثم يقضي دينه بأمره بملكه. ألا ترى أن من أمر إنسانا بقضاء دينه كان له أن يرجع عليه إذا قضاه ولا يكون ذلك إلا بعد التمليك منه. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۲/ ۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، ط: دار المعرفة - بيروت)

ويجوز التوكيل بالبياعات والأشربة والإجارات والنكاح والطلاق والعتاق والخلع والصلح والإعارة والاستعارة والهبة والصدقة والإيداع وقبض الحقوق والخصومات وتقاضي الديون والرهن والارتهان كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۳/ ۵۶۴، كتاب الوكالة، الباب الأول في معنى الوكالة وركنها وشرطها وألفاظها وحكمها وصفتها، ط: دار الفكر)

[۲۶] زکوۃ کی رقم سے کسی غریب کو کوئی چیز خرید کر دینا

۱۳۴۶- سوال: زکوۃ کی رقم نہ دے کر اس سے ضروریات زندگی کی اشیاء خریدی جائیں اور ان کا مستحقین کو مالک بنا دیا جائے، تو زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامدا و مصلیا:

اس سے زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] ایک ہی شخص کو نصاب کے بہ قدر زکوۃ کا مال دے دینا

۱۳۴۷- سوال: زید ہر سال پندرہ سو روپے زکوۃ نکالتا ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ اگر وہ کسی ایک ہی آدمی کو دے دے، تو اس کی زکوۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

اصل میں عمر، زید کا دوست ہے، صاحب حیثیت تھا، خود بھی زکوۃ نکالتا تھا؛ لیکن کسی حادثے کی وجہ سے اس کی تمام دولت ضائع ہوگئی۔ زید خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ عمر زکوۃ کا مستحق ہے؛ اس لیے زید اپنی زکوۃ کی مکمل رقم، پندرہ سو روپے عمر کو دینا چاہتا ہے، تا کہ وہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے اور اس رقم کے ذریعہ وہ یکسوئی کے ساتھ کاروبار کر سکے، تو کیا زید اپنی زکوۃ کی مکمل رقم پندرہ سو روپے عمر کو دے سکتا ہے؟

الجواب حامدا و مصلیا:

اگر عمر کے ذمہ پندرہ سو روپے کی رقم کے برابر قرض ہے، تو زید کے لیے عمر کو اپنی زکوۃ کی مکمل رقم پندرہ سو روپے (۱۵۰۰) دینا جائز ہے، تا کہ اس کے ذریعے عمر اپنا قرض ادا کر سکے۔ [۲]

---

(۱) ویجزئه أن یعطي من الواجب جنسا آخر من المکیل والموزون أو العروض أو غیر ذلك بقیمته. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۲/ ۲۰۳، کتاب الزکاة، باب العشر، ط: دار المعرفة- بیروت)

(۲) ... هذا إذا لم یکن الفقیر مدیونا فإن کان مدیونا فدفع إلیه مقدار ما لو قضی به دینه لا یبقی له شيء أو یبقی دون المائتین لا بأس به، وکذا لو کان معیلا جاز أن یعطی له مقدار ما لو وزع علی عیاله یصیب کل واحد منهم دون المائتین کذا في فتاوی قاضي خان وندب الإغناء عن السؤال في ذلك الیوم کذا في التبیین. (الفتاوی الهندیة: ۱/ ۱۸۸، کتاب الزکاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفکر- بیروت)

قوله تعالی: (والغارمین) هم الذین رکبهم الدین ولا وفاء عندهم به. (الجامع لأحکام القرآن = تفسیر =

اور اگر قرض نہ ہو، تو کسی غریب کو نصاب، یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت (جو آج کے حساب سے سات سو روپے ہوتے ہیں) سے زیادہ زکوۃ کی رقم دے دینا جائز نہیں ہے، دینے والے کی زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔[1] اسی طرح عمر کو لینا بھی جائز نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= القرطبي- أبو عبد الله محمد بن أحمد ، شمس الدين القرطبي (م:۶۷۱ھ):۸/ ۱۸۳،التوبة:۶۰،ت : أحمد البردوني وإبراهيم أطفيش ،ط: دار الكتب المصرية-القاهرة)

وَالْغارِمِينَ وهم المديونون بالاتفاق. (التفسير المظهري- محمد ثناء الله المظهري (م:۱۲۲۵ھ): ۴/ ۲۳۴، التوبة:۶۰ ،ت: غلام نبي التونسي، ط: مكتبة الرشدية-الباكستان)

ومديون لا يملك نصابا فاضلا عن دينه. (الدر المختار مع رد المحتار:۲/ ۳۴۳، كتاب الزكاة، باب المصرف)

بل کہ دوسرے غرباء کے مقابلے میں مدیون کو زکوۃ دینا، تاکہ وہ قرض کے بوجھ سے نکل سکے، اولیٰ اور افضل ہے:

وفي الظهيرية: الدفع للمديون أولى منه للفقير. (الدر المختار)——— قال ابن عابدين: (قوله: أولى منه للفقير) أي أولى من الدفع للفقير الغير المديون لزيادة احتياجه. (رد المحتار على الدر المختار:۲/ ۳۴۳، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر ،ط: دار الفكر☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح،ص:۷۱۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆تبيين الحقائق:۲/ ۱۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) کسی غیر مقروض کو یک مشت اتنی زکوۃ دینا کہ صاحب نصاب ہو جائے، گرچہ مکروہ ہے، تاہم دینے والے کی زکوۃ کا ادا نہ ہونا قابل غور ہے: درج ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

ويكره أن يدفع إلى رجل مائتي درهم فصاعدا، وإن دفعه جاز كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية:۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف)

مولانا یوسف لدھیانویؒ کا اس سلسلے کا ایک فتویٰ دیکھیں:

سوال: ایک مسئلہ آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں زکوۃ کسی ایک شخص کو دے دیتا ہوں، اور اس کی رقم تقریباً ہزاروں روپے ہوتی ہے، یہ میں اس وجہ سے کرتا ہوں کہ کسی مستحق کا کام پورا ہو جائے، کیا ایسی صورت میں یہ زکوۃ دینا جائز ہے؟

جواب: زکوۃ ادا ہو جائے گی، مگر کسی کو اتنی رقم دے دینا کہ وہ صاحب نصاب ہو جائے، مکروہ ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل:۵/ ۱۴۳، زکوۃ ادا کرنے کا طریقہ، یک مشت کسی ایک کو زکوۃ بہ قدر نصاب دینا، ط: مکتبہ لدھیانوی-کراچی)

(۲) اگر کوئی شخص ایک دن کے نان ونفقہ کا مالک ہو تو اس کے لیے سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے؛ لیکن اگر کوئی اسے زکاۃ کی رقم دے -در آں حالیکہ حاجت اصلیہ سے زائد، نامی یا غیر نامی کسی بھی نصاب کا مالک نہ ہو- تو اس کے لیے زکوۃ کی رقم لینے کی اجازت ہے:

(قوله والفقير من له أدنى شيء) وهو ما دون النصاب، أو قدر نصاب غير نام، وهو مستغرق في الحاجة، =

[۲۸] صدقے کے پیسے دینے کے بجائے خرید کر کوئی دوسری شئے دینا

۱۳۴۸- سوال: مستحق کو صدقے کے پیسے دینے کے بجائے ان پیسوں سے کوئی کپڑا یا کپڑے کے علاوہ دوسری چیز خرید کر دینا جائز ہے یا نہیں؟

حاجی ابراہیم حاجی محمد

الجواب حامداومصلیا:

صدقے کی رقم بھی دے سکتے ہیں اور اس سے خرید کر کوئی دوسری ضرورت کی شئے بھی دے سکتے ہیں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] وکیل کا غیر مستحق کو زکوٰۃ دینا

۱۳۴۹- سوال: صاحب نصاب نے زکوٰۃ کی رقم کسی مدرسے میں دی، اگر مدرسے والوں نے وہ رقم کسی غیر مستحق زکوٰۃ کو دے دی، تو زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً:

مدرسہ میں زکوٰۃ کی رقم دینے کے بعد، بغیر کسی حیلہ کے، اگر وہ رقم غیر مستحق کو دے دی گئی، تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ (درمختار) [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= . . . ويجوز صرف الزكاة لمن لا تحل له المسألة، بعد كونه فقيرا، ولا يخرجه عن الفقر ملك نصب كثيرة غير نامية إذا كانت مستغرقة بالحاجة. (فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد، المعروف بـ"ابن الهمام" (م: ۸۶۱هـ): ۲/۲۶۱، كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقة إليه ومن لا يجوز، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۷، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) ويجزئه أن يعطي من الواجب جنسا آخر من المكيل والموزون أو العروض أو غير ذلك بقيمته. (المبسوط للسرخسي: ۲/۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۵۵، كتاب الزكاة، فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۱، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في العروض، مسائل شتى، ط: دار الفكر ☆ تحفة الملوك: ۱/۱۲۵، فصل في الميت: ط: دار البشائر الإسلامية - بيروت)

[۲] وفي الشامية: . . . الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره كما لو أوصى لزيد بكذا ليس للوصي الدفع إلى غيره فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر - بيروت ☆ المبسوط: ۲/۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، =

[۳۰] زکوۃ کی رقم سے شیئرز خرید کر اس کا نفع غریبوں میں تقسیم کرنا

۱۳۵۰- سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کہتا ہے کہ میرے پاس ایک لاکھ روپئے زکوۃ کے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ان ایک لاکھ روپئے سے بینک کے شیئرز خریدلوں اور اس کی آمدنی ان غریبوں میں تقسیم کروں، جو مستحق زکوۃ ہیں، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً:

اگر نصاب کے بہ قدر کسی کے پاس مال ہو اور اس پر سال گذر جائے، تو بہ عجلت ممکنہ اس کی زکوۃ ادا کرنا واجب ہے، بلا وجہ تاخیر کرنے سے گنہ گار ہوگا۔(۱)

ادائیگی زکوۃ کے لیے رقم کا دیگر مال سے صرف علاحدہ کرلینا کافی نہیں ہے، جب تک غریبوں کے ہاتھ میں نہ پہونچ جائے اور ان کو مالک نہ بنادیا جائے، اس وقت تک زکوۃ ادا نہیں ہوتی اور فرض ذمہ میں باقی رہتا ہے۔(۲)

زکوۃ کی رقم سے بینک کے شیئرز خریدنے اور اس کی آمدنی کو غرباء کے درمیان تقسیم کرنے میں تین

=ط: دار المعرفة-بيروت ☆البحر الرائق: ۴۲۶/۲، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا-ديوبند)

ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲۷۰/۲، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) (وافتراضها عمري) أي على التراخي وصححه الباقاني وغيره (وقيل فوري) أي واجب على الفور (وعليه الفتوى) كما في شرح الوهبانية (فيأثم بتأخيرها) بلاعذر. (الدر المختار) ———— قال ابن عابدين: (قوله وافتراضها عمري) قال في البدائع: وعليه عامة المشايخ، ففي أي وقت أدى يكون مؤديا للواجب، ويتعين ذلك الوقت للوجوب، وإذا لم يؤد إلى آخر عمره يتضيق عليه الوجوب، حتى لو لم يؤد حتى مات يأثم... (قوله وصححه الباقاني وغيره) نقل تصحيحه في التتارخانية أيضا.... (قوله فيأثم بتأخيرها إلخ) ظاهره الإثم بالتأخير ولو قل كيوم أو يومين لأنهم فسروا الفور بأول أوقات الإمكان. وقد يقال المراد أن لا يؤخر إلى العام القابل لما في البدائع عن المنتقى بالنون إذا لم يؤد حتى مضى حولان فقد أساء وأثم اهـ فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۷۱-۲۷۲، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

(۲) ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲۷۰/۲، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت)

خرابیاں لازم آتی ہیں: (۱) زکوۃ کی عدم ادائیگی [۳] (۲) بینک کا تعاون، [۴] اور (۳) بینک سے ملنے والے سود کے لیے رقم کا بینک میں جمع کرنا۔ [۵] یہ تینوں کام گناہ کے کام ہیں؛ لہٰذا ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

---

[۳] یہ صورت درحقیقت استثمار زکوۃ (اموال زکوۃ کی سرمایہ کاری) کی ہے، اس سلسلے میں اسلامک فقہ اکیڈمی-انڈیا کا تیرہواں فقہی سمینار، جامعہ سید احمد شہید، کٹولی میں (بہ تاریخ ۱۸-۲۱ رمحرم الحرام ۱۴۲۲ھ=موافق: ۱۳-۱۶ر اپریل ۲۰۰۱ء) منعقد ہو چکا ہے، اس ناچیز کو بھی اس میں شرکت کی سعادت حاصل رہی ہے، افسوس کہ وہ سمینار حضرت قاضیؒ کی زندگی کا آخری فقہی سمینار ثابت ہوا، اس سمینار کی بعض تجویز اس مسئلے سے متعلق ہے، ملاحظہ فرمائیں:

☆ فقراء و مساکین کو زکاۃ کا جو مال دے دیا، انہیں اس مال پر تمام مالکانہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں؛ اس لیے اگر کسی فقیر و مسکین یا چند فقراء نے زکاۃ لینے کے بعد اس کو استثمار یا تجارت وغیرہ میں لگا دیا، تاکہ زکاۃ کی اس رقم سے آئندہ بھی فائدہ پہنچتا رہے، تو ایسا کرنا جائز ہے، اس سے زکاۃ ادا ہو جائے گی۔

☆ زکوۃ دینے والا شخص یا زکوۃ دینے والوں کی جماعت کی طرف سے زکوۃ میں نکالی ہوئی رقوم کو کسی نفع بخش کاروبار میں لگا دینا، تاکہ مستقبل میں اس کا نفع فقراء و مساکین اور دیگر مستحقین زکاۃ پر تقسیم کی جاتی رہے، جائز نہیں، اس طرح زکاۃ ادا نہیں ہوگی۔ (نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۶۹-۷۰، عباداتی مسائل، اموال زکاۃ کی سرمایہ کاری، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی-انڈیا)

جب جائز کاروبار میں غریب کو مالک بنائے بغیر زکوۃ کی سرمایہ کاری جائز نہیں، کہ اس سے زکاۃ ادا نہیں ہوتی، تو بھلا، ناجائز [بہ قول مفتی صاحبؒ] شیئرز خریدنے اور اس کی آمدنی غرباء میں تقسیم کرنے سے کیسے زکاۃ ادا ہوگی۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۴] بینک کا نظام سود پر مبنی ہے؛ اس لیے اس میں کسی بھی طرح کا تعاون آیت قرآنی "وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۵-المائدۃ:۲)" کے تحت ناجائز ہے۔

[۵] حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۟ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۭ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۵-المائدۃ:۳)

سود کی رقم غرباء و مساکین ہی کو دینا ضروری ہے یا رفاہ عام میں خرچ کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں اسلامک فقہ اکیڈمی-انڈیا نے دوسرے فقہی سمینار (منعقدہ: ۸-۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ، مطابق: ۸/۱۱ر دسمبر ۱۹۸۹ء، دہلی) میں درج ذیل فیصلہ کیا ہے:

۱- بینکوں سے ملنے والی سودی رقم کو بینکوں میں نہ چھوڑا جائے؛ بل کہ اسے نکال کر مندرجہ ذیل مصارف میں خرچ کیا جانا چاہیے:

۲- بینک کے سودی رقم کو بلانیت ثواب فقراء و مساکین پر خرچ کر دیا جائے، اس پر تمام ارکان کا اتفاق ہے۔

۳- سودی رقم کو مساجد اور اس کے متعلقات پر خرچ نہیں کیا جا سکتا۔

۴- اکثر شرکاء سمینار کی یہ رائے ہے کہ اس رقم کو صدقات واجبہ کے مصارف کے علاوہ رفاہ عام کے کاموں پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے، بعض حضرات کی رائے میں اس کے مصرف کو فقراء و مساکین تک محدود رکھنا چاہیے۔ (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۱۴۱، معاشی مسائل، بینک انٹرسٹ، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی-انڈیا، سن طباعت: اپریل ۲۰۰۹ء)

بینک میں حفاظت کی غرض سے یا کسی قانونی رکاوٹ کی بنا پر پیسے رکھنے پڑیں، تو اس کا سود لے کر غریبوں کو بلا نیت ثواب دینے کا حکم ہے۔[۶] لیکن سود حاصل کرنے کے لیے بینک میں پیسے رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔[۷] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] زکوۃ کے پیسوں سے دینی کتابیں خریدنا کیسا ہے

۱۳۵۱–سوال: زکوۃ کے پیسوں سے مدرسے کی دینی کتابیں خرید سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوۃ کے پیسوں سے مدرسے کی کتابیں اگر غریب طلبہ کو دینے کی غرض سے خریدی جائیں، تو جائز ہے، کہ اس میں تملیک کی شرط پائی جاتی ہے، جو ادائے زکوۃ کے لیے شرط ہے۔

البتہ طلبہ کو [عاریتاً] دے کر واپس لینے کی نیت ہو یا وقف کرنی ہو، تو اس میں زکوۃ کی رقم استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔[۸] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۶) اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۔ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۔ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۔ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ۔ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۔ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۝ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ۔ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ۝ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۔ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۝ (۲-البقرۃ: ۲۷۵-۲۷۹)

(۷) عن جابر – رضي الله عنه – قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (الصحيح لمسلم: ۲/ ۲۷، رقم الحديث: ۱۰۶–۱۵۹۸، كتاب المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ط: مختار اینڈ کمپنی – دیوبند)

(۸) لأن الزكاة يجب فيها تمليك المال. اهـ... قال في الكشف الكبير في بحث القدرة الميسرة: الزكاة لا تتأدى إلا بتمليك عين متقومة حتى لو أسكن الفقير داره سنة بنية الزكاة لا يجزئه؛ لأن المنفعة ليست بعين متقومة. اهـ. (البحر الرائق: ۲/ ۲۵۲ – ۲۵۳، أول كتاب الزكاة، ط: زكريا – ديوبند☆ المحيط البرهاني: ۳/ ۲۱۳، كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۲۹۱، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا – ديوبند ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۱۱، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية – بيروت)

" ويجوز دفع القيم في الزكاة " عندنا وكذا في الكفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر. (الهداية: ۱/ ۱۹۲، كتاب الزكاة، فصل في الحيل، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی – دیوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۱، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر)

[۳۲] زکوۃ کی رقم سے کتابیں چھپوانا

۱۳۵۲- سوال: کیا زکوۃ کی رقم کو اسلامی کتابیں چھپوانے میں لگا سکتے ہیں، اگر لگا سکتے ہیں تو ایسی کتابیں سب میں تقسیم کریں یا صرف غریبوں میں؟۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اپنی زکوۃ کی رقم سے کتاب چھپوا سکتے ہیں؛ لیکن کتاب کا غریب کو مالک بنانا ضروری ہے، جتنی قیمت کی کتاب ہوگی، اس قدر زکوۃ ادا ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] زکوۃ کی ادائیگی کے وکیل کا حکم

۱۳۵۳- سوال: جب کوئی شخص اپنی زکوۃ کی رقم دوسرے شخص کو مستحقین تک پہونچانے کی غرض سے دے، تو اس کی کیا ذمہ داری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب کوئی شخص اپنی زکوۃ کی رقم دوسرے شخص کو مستحقین تک پہونچانے کے لیے دے، تو زکوۃ کی رقم پر قبضہ کرنے والے کی پوری ذمہ داری ہے کہ مکمل حفاظت کے ساتھ مستحقین تک اس رقم کو پہنچادے، اگر اس نے حفاظت میں کوتاہی کی اور رقم ضائع ہوگئی، تو وہ ضامن ہوگا۔[2] اسی طرح اپنے کام میں اگر زکوۃ کی رقم کو

---

(۱) ويجزئه أن يعطي من الواجب جنسا آخر من المكيل والموزون أو العروض أو غير ذلك بقيمته. (المبسوط للسرخسي: ۲/ ۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۵، كتاب الزكاة، فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۱، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في العروض، مسائل شتى، ط: دار الفكر ☆ تحفة الملوك: ۱/ ۱۲۵، فصل في الميت: ط: دار البشائر الإسلامية- بيروت)

(۲) المال الذي قبضه الوكيل بالبيع والشراء وإيفاء الدين واستيفائه وقبض العين من جهة الوكالة في حكم الوديعة في يده فإذا تلف بلا تعد ولا تقصير لا يلزم الضمان. (مجلة الأحكام العدلية- لجنة مكونة من عدة علماء وفقهاء في الخلافة العثمانية، ص: ۲۸۴، المادة: ۱۴۶۳، الكتاب الحادي عشر في الوكالة، الباب الثالث: في بيان أحكام الوكالة، الفصل الأول: في بيان أحكام الوكالة العمومية، ت: نجيب هواويني، ط: نور محمد، كارخانه تجارت كتب، آرام باغ، كراتشي)

خرچ کردیا، اور دوسری رقم سے زکوۃ ادا کی، تو ادائیگی زکوۃ میں متبرع ہوگا اور مالک کے مال کا ضامن ہوگا۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۴] غیر مستحق کے لیے زکوۃ بھیجی گئی ہو، تو کیا وہ کسی مستحق کو بہ ذات خود دے سکتا ہے؟

۱۳۵۴- سوال: ایک آدمی نے بیرون ملک سے اپنے ملک میں رشتہ داروں کے لیے زکوۃ کی رقم بھیجی ہے، زکوۃ بھیجنے والے شخص کو معلوم نہیں ہے کہ جس کے لیے زکوۃ کی رقم بھیجی ہے، وہ زکوۃ کا مستحق نہیں ہے، تو جس کے لیے رقم بھیجی گئی ہے، وہ آدمی زکوۃ بھیجنے والے کی اجازت کے بغیر کسی مستحق زکوۃ کو، مالک کی جانب سے زکوۃ دے دے، تو زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ایک آدمی کو زکوۃ کا مستحق سمجھ کر، اس کے لیے زکوۃ کے پیسے بھیجے گئے ہیں؛ لیکن حقیقت میں وہ مستحق نہیں ہے اور رقم بھیجنے والے نے اس کو کسی خاص آدمی کو دینے کا وکیل بھی نہیں بنایا ہے، گویا اسی کو رقم بھیجی ہے، تو ایسی صورت میں بھیجنے والے کی جانب سے کسی مستحق کو زکوۃ دینے سے زکوۃ ادا ہو جائے گی، البتہ

---

[۱] إذا هلكت الوديعة أو طرأ نقصان على قيمتها في حال تعدي المستودع أو تقصيره يلزم الضمان. ــــــ مثلا إذا صرف المستودع النقود المودعة عنده في أمور نفسه واستهلكها أو دفعها لغيره وجعله يستهلكها يضمن. وفي هذه الصورة إذا صرف النقود التي هي أمانة عنده على ذلك الوجه ثم وضع محلها من مال نفسه وضاعت بدون تعديه وتقصيره لا يخلص من الضمان. (حوالہ سابق ص: ۱۵۰، مادہ: ۷۸۷، الكتاب السادس في الأمانات، الباب الثاني في الوديعة، الفصل الثاني: في أحكام الوديعة وضمانها)

ولو خلط زكاة موكليه ضمن وكان متبرعا إلا إذا وكله الفقراء. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ضمن وكان متبرعا) لأنه ملكه بالخلط وصار مؤديا مال نفسه. قال في التتارخانية: إلا إذا وجد الإذن أو أجاز المالكان اهـ. الخ (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء)

البتہ اگر اپنی جیب خاص سے مصرف میں خرچ کردے، تاکہ پھر زکوۃ کی جمع شدہ رقم سے اتنی مقدار لے لےگا، تو درست ہے، زکوۃ ادا ہو جائے گی: ــــــ ولو تصدق بدراهم نفسه أجزأ إن كان على نية الرجوع وكانت دراهم الموكل قائمة. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ولو تصدق إلخ) أي الوكيل بدفع الزكاة إذا أمسك دراهم الموكل ودفع من ماله ليرجع ببدلها في دراهم الموكل صح. بخلاف ما إذا أنفقها أولا على نفسه مثلا ثم دفع من ماله فهو متبرع. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

مالک سے اجازت لے لینا بہتر ہے۔[۱]

لیکن اگر کسی خاص آدمی کو زکوۃ دینے کا ذمہ دار (وکیل) بنایا ہو، تو اس کے علاوہ دوسرے آدمی کو مالک کی اجازت کے بغیر زکوۃ دینا جائز نہیں ہے، اگر زکوۃ دے گا، تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] زکوۃ کی ادائیگی کی نیت کب کرنی چاہیے؟

۱۳۵۵- سوال: وکالۃً زکوۃ کی ادائیگی کی صورت میں نیت کب کرنی چاہیے؟ جب وکیل مستحقین کو زکوۃ ادا کرے، اس وقت نیت کرنی چاہیے، یا اس شخص (وکیل کو) کو دیتے وقت، جو مستحقین کو دے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر مزکی (زکوۃ دہندہ) بہ ذات خود مستحقین کو دیتا ہے، تو دیتے وقت زکوۃ کی نیت ضروری ہے، اور اگر دوسرے کو مستحقین تک پہونچانے کے لیے وکیل بناتا ہے، تو وکیل کو دیتے وقت بھی نیت کر لینا کافی ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) اصل یہ ہے کہ اگر دینے والے نے غور وفکر کے بعد، مصرف سمجھ کر، (غیر مستحق کو) زکوۃ دی ہے، تو اس کی زکوۃ ادا ہو جائے گی، اعادے کی ضرورت نہیں، لیکن جس کو زکوۃ دی گئی ہے، اگر وہ زکوۃ کا مستحق نہیں ہے، تو جب اس کو معلوم ہو جائے کہ یہ زکوۃ کی رقم ہے، تو اس پر بھیجنے والے کی طرف واپس کرنا لازم ہوگا:

(دفع بتحر) لمن يظنه مصرفا (فبان أنه عبده أو مكاتبه أو حربي ولو مستأمنا أعادها... وإن بان غناه أو كونه ذميا أو أنه أبوه أو ابنه أو امرأته أو هاشمي لا) يعيد لأنه أتى بما في وسعه. (الدر المختار)ـــــــ قال ابن عابدين عن القهستاني: وهل يطيب له؟ فيه خلاف، وإذا لم يطب قيل يتصدق وقيل يرد على المعطي. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۲-۳۵۳، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر- بيروت)

احسن الفتاویٰ (۴/ ۲۸۰) میں اس موقع پر لوٹانے کو لازم قرار دیا ہے۔

(۲) وللوكيل أن يدفع لولده الفقير وزوجته لا لنفسه إلا إذا قال: ربها ضعها حيث شئت. (الدر المختار)ـــــ وفي الشامية: الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره كما لو أوصى لزيد بكذا ليس للوصي الدفع إلى غيره فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر- بيروت☆ المبسوط: ۲/ ۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، ط: دار المعرفة- بيروت☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۲۶، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا- ديوبند)

(۳) (وشرط صحة أدائها نية مقارنة له) أي للأداء (ولو) كانت المقارنة (حكما) كما لو دفع بلا نية ثم نوى والمال قائم في يد الفقير، أو نوى عند الدفع للوكيل ثم دفع الوكيل بلا نية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۸، كتاب=

[۳۶] زکوۃ کی رقم روپیوں کی شکل میں دینا ضروری نہیں

۱۳۵۶- سوال: کیا زکوۃ کی رقم کو روپیوں کی شکل میں ہی دینا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

روپے کی زکوۃ روپے کی شکل میں ہی دینا ضروری نہیں ہے، اگر اس رقم سے کوئی دوسری چیز خرید کر دے دی جائے، یا اس رقم کے برابر کوئی سامان اپنے پاس سے ادا کر دیا جائے، تب بھی جائز ہے، زکوۃ ادا ہو جائے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۷] زکوۃ کی ادائیگی کے لیے وکیل بنانا جائز ہے

۱۳۵۷- سوال: زکاۃ کی ادائیگی کے لیے کیا کسی کو بطور واسطہ اپنا سکتے ہیں (وکیل بنا سکتے ہیں) تاکہ وہ مستحقین تک زکوۃ پہنچادے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

ادائیگی زکوۃ کے لیے کسی کو واسطہ (وکیل) بنا سکتے ہیں۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت)

اگر کسی نے زکوۃ کی رقم علاحدہ کرتے وقت نیت کرلی، اور بعد میں اسی سے دیتا رہا تو بھی زکوۃ ادا ہو جائے گی:

والأصل اقترانها بالأداء كسائر العبادات إلا أن الدفع يتفرق فيحرج باستحضار النية عند كل دفع فاكتفي بوجودها حالة العزل دفعا للحرج. (البحر الرائق: ۲/ ۳۶۸، كتاب الزكاة، ط: زكريا-ديوبند)

(۱) ويجزئه أن يعطي من الواجب جنسا آخر من المكيل والموزون أو العروض أو غير ذلك بقيمته. (المبسوط للسرخسي: ۲/ ۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۵، كتاب الزكاة، فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۱، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في العروض، مسائل شتى، ط: دار الفكر☆ تحفة الملوك: ۱/ ۱۲۵، فصل في الميت: ط: دار البشائر الإسلامية-بيروت)

(۲) ويجوز التوكيل بالبياعات والأشربة والإجارات والنكاح والطلاق والعتاق والخلع والصلح والإعارة والاستعارة والهبة والصدقة والإيداع وقبض الحقوق والخصومات وتقاضي الديون والرهن والارتهان كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۳/ ۵۶۴، كتاب الوكالة، الباب الأول في معنى الوكالة وركنها وشرطها وألفاظها وحكمها وصفتها، ط: دار الفكر)

لو أمر غيره بالدفع عنه جاز. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۷۰، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر☆ =

[۳۸] زکوۃ کی رقم سے غریبوں کے لیے مکانات تعمیر کروانا

۱۳۵۸- سوال: کیا زکوۃ کی رقم سے ہم غریبوں کے لیے مکانات بنا سکتے ہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

زکوۃ کی رقم سے مکان بنا کر غریب کو مالک بنا دینا جائز ہے۔[۱] اگر وکیل کو اجازت ہو، تو وکیل کے لیے بھی مکان کی تعمیر کر کے دینا جائز ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۹] زکوۃ کی رقم سے سامان خرید کر غریب کو دینا

۱۳۵۹- سوال: کیا ہم زکوۃ کی رقم سے کوئی سامان خرید کر غریب کو دے سکتے ہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً:

دے سکتے ہیں۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۲۲۷، كتاب الزكاة، الفصل التاسع في المسائل المتعلقة بمعطي الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

لو أمر غيره بأداء الزكاة في حالة الحياة جاز. (المحيط البرهاني: ۳/ ۲۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الحادي عشر الأسباب المسقطة للزكاة، ط: إدارة القرآن- بيروت)

(۱) ويشترط أن يكون الصرف (تمليكا) لا إباحة كمامر (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد و) لا إلى (كفن ميت وقضاء دينه). (الدر المختار مع الرد: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر- بيروت☆تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) لو أمر غيره بالدفع عنه جاز. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۷۰، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۲۲۷، كتاب الزكاة، الفصل التاسع في المسائل المتعلقة بمعطي الزكاة، ط: زكريا- ديوبند) ــــــــــ وفي الشامية: ... الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره كما لو أوصى لزيد بكذا ليس للوصي الدفع إلى غيره فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر- بيروت☆ المبسوط: ۲/ ۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، ط: دار المعرفة- بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۲۲۶، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا- ديوبند)

(۳) ويجزئه أن يعطي من الواجب جنسا آخر من المكيل والموزون أو العروض أو غير ذلك بقيمته. (المبسوط للسرخسي: ۲/ ۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، ط: دار المعرفة- بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۵، كتاب الزكاة، فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر- بيروت☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۱، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في العروض، مسائل شتى، ط: دار الفكر☆ تحفة الملوك: ۱/ ۱۲۵، فصل في الميت: ط: دار البشائر الإسلامية- بيروت)

[۴۰] غریب کے لیے مکان یا سامان خریدنے میں زکوٰۃ کی کتنی رقم لگا سکتے ہیں؟

۱۳۶۰- سوال: اگر ہم مستحقین کو دینے کے لیے زکاۃ کی رقم سے مکان تعمیر کریں یا کوئی سامان خریدیں، تو کتنی مقدار رقم اس میں لگا سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس قدر چاہیں، لگا سکتے ہیں، ویسے ایک مفلس کو یک بارگی اس قدر زکوٰۃ دے دینا کہ وہ، صاحب نصاب ہو جائے، مکروہ ہے، تاہم زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؛ لیکن ضرورت مند کو خواہ کتنی ہی رقم کا مکان دے دے، اس کی وجہ سے وہ صاحب نصاب نہیں ہوگا، کیوں کہ مکان ضرورت زندگی میں سے ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۱] زکوٰۃ کی رقم سے غریب بچوں کی فیس ادا کرنا

۱۳۶۱- سوال: کیا ہم زکوٰۃ کے پیسوں سے غریب کے بچوں کی، بغیر ان کو اطلاع دیے ہوئے، اسکول یا مدرسہ کی فیس ادا کر سکتے ہیں، کیا اس طرح کرنے سے ہماری زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوٰۃ کی ادائیگی کی صحت کے لیے زکوٰۃ کا مستحق کو مالک بنانا ضروری ہے۔[۲]

---

(۱) (وكره إعطاء فقير نصابا) أو أكثر (إلا إذا كان) المدفوع إليه (مديونا أو) كان (صاحب عيال) بحيث (لو فرقه عليهم لا يخص كلا) أو لا يفضل بعد دينه (نصاب) فلا يكره فتح. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۵۳، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۲۲۱، كتاب الزكاة، الفصل الثامن المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا ديوبند)

ويكره أن يدفع إلى رجل مائتي درهم فصاعدا، وإن دفعه جاز كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف)

حضرت مفتی صاحبؒ کے ایک فتویٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ ''بہ یک وقت نصاب سے زیادہ کسی مستحق کو دینے سے، مزکی کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، جو قابل غور ہے، یہاں جو بیان کیا گیا ہے، کتب فقہ وفتاویٰ میں ایسا ہی ہے۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

(۲) ... الزكاة يجب فيها تمليك المال؛ لأن الإيتاء في قوله تعالى {وآتوا الزكاة} [البقرة: ۴۳] يقتضي التمليك، ولا تتأدى بالإباحة حتى لو كفل يتيما فأنفق عليه ناويا للزكاة لا يجزيه بخلاف الكفارة، ولو كساه تجزيه لوجود التمليك. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي =

اس لیے بچوں [۱] کو یا ان کے والی کو زکوۃ کا مالک بنانا ضروری ہے۔ [۲] ان کو دے کر تاکید کی جائے کہ وہ اس سے فیس ادا کردے۔

یا ان کی خواہش پر، ان کا وکیل بن کر خود فیس ادا کردے اور فیس کی ادائیگی میں جو قرض ہوا ہے، زکوۃ کی رقم ان کو دے کر اپنا قرض وصول کرلے۔ [۳]

غریب کی اجازت کے بغیر اس کی فیس ادا کرنے سے زکوۃ ادا نہ ہوگی۔ [۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=(م: ۷۴۳ھ): ۱/ ۲۵۱-۲۵۲، أول كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة ☆الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆البحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب - ديوبند)

(۱) بچوں سے مراد "مراہق" یعنی قریب البلوغ ہے؛ اس لیے کہ غیر مراہق بچوں کو زکاۃ دینے سے زکوۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی، الا یہ کہ اس کی جانب سے اس کا ولی یا وصی قبضہ کرے:

وفي "التمليك" إشارة إلى أنه لا يصرف إلى مجنون وصبي غير مراهق إلا إذا قبض لهما من يجوز له قبضه كالأب والوصي وغيرهما ويصرف إلى مراهق يعقل الأخذ كما في المحيط قهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) إذا دفع الزكاة إلى الفقير لا يتم الدفع ما لم يقبضها أو يقبضها للفقير من له ولاية عليه نحو الأب والوصي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا - ديوبند)

(۳) وأما إذا قضى دين حي فقير فإذا قضى بغير أمره يكون متبرعا ولا يقع عن الزكاة وإن قضى بأمره فإنه يقع عن الزكاة ويصير وكيلا في قبض الصدقة عن الفقير والصرف إلى قضاء دينه فقد وجد التمليك من الفقير فيجوز. (تحفة الفقهاء - محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰ھ): ۱/ ۳۰۷، كتاب الزكاة، باب من يوضع فيه الصدقة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۲/ ۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، ط: دار المعرفة - بيروت)

وحيلة الجواز أن يعطي مديونه الفقير زكاته ثم يأخذها عن دينه،... وحيلة التكفين بها [الزكاة] التصدق على فقير، ثم هو يكفن فيكون الثواب لهما، وكذا في تعمير المسجد، وتمامه في حيل الأشباه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۷۱، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

لأن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب، بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۴) لو قضى دين الحي إن قضاه بغير أمره يكون متبرعا، ولا يجزئه عن الزكاة. (البحر الرائق: ۲/ ۴۲۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا - ديوبند

[۴۲] زکوۃ کی رقم سے غریب کی نابالغ اولاد کے لیے کپڑے خریدنا

۱۳۶۲- سوال: زکوۃ کی رقم سے کسی غریب مستحق کی نابالغ اولاد کو کپڑے خرید کر دے سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

غریب کی نابالغ اولاد کو زکوۃ کی رقم کے کپڑے خرید کر دے سکتے ہیں۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۳] زکوۃ کے وکیل کی بد دیانتی سے موکل کو باخبر کرنا

۱۳۶۳- سوال: فی الحال میرے ۶ ر بھائی بیرون ملک میں ہیں، اور وہاں کی شہریت ان کو حاصل ہو چکی ہے، جن میں سے ۵ ر انگلینڈ میں اور ایک کینیڈا میں ہیں، میں اپنے ۷ ر بھائیوں میں اکیلا ہندوستان میں ہوں۔

میرے مرحوم والدین نے ان کو کھیت اور زیورات بیچ کر پردیس بھیجا تھا، والدین کے انتقال پر تقریباً ۲۰ ر سال کا عرصہ بیت گیا ہے، فی الحال میں اور میرے اہل خانہ (یعنی ۳ ر لڑکیاں اور ایک لڑکا) کو ساؤ گاؤں میں زندگی کی گاڑی کسی طرح چلا رہے ہیں، میرے تمام بھائی ماہ رمضان المبارک میں، زکوۃ کے ذریعے میری مدد کرتے ہیں۔

گزشتہ سال میرے بڑے بھائی نے دوسرے بھائیوں کے پاس سے زکوۃ کی رقم میرے پاس

---

[۱] نابالغ اولاد سے مراد "مراہق" یعنی قریب البلوغ ہے؛ اس لیے کہ غیر مراہق، ناسمجھ کو زکاۃ دینے سے زکوۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی؛ کیوں کہ اس میں تملیک کی شرط نہیں پائی جائے ہوگی، الا یہ کہ اس کی جانب سے اس کا ولی یا وصی قبضہ کرے:

وفي "التمليك" إشارة إلى أنه لا يصرف إلى مجنون وصبي غير مراهق إلا إذا قبض لهما من يجوز له قبضه كالأب والوصي وغيرهما ويصرف إلى مراهق يعقل الأخذ كما في المحيط قهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر - بيروت)

دفع الزكاة إلى صبيان أقاربه برسم عيد أو إلى مبشر أو مهدي الباكورة جاز إلا إذا نص على التعويض. ــــــــ

قال ابن عابدين: (قوله: إلى صبيان أقاربه) أي العقلاء وإلا فلا يصح إلا بالدفع إلى ولي الصغير. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۶، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة و العشر، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا ديوبند)

بھیجنے کے لیے وہیں اکٹھا کر لی، اور میرے او پر وہ رقم نہ بھیج کر، کوساڈ میں رہنے والے میرے ماموں زاد بھائی کے پاس رمضان میں بھیجی تھی، تا کہ وہ اس میں سے ہر مہینہ ۵۰۰؍روپیہ مجھے دیتے رہیں۔

رمضان المبارک میں سحری و افطاری کی ضرورت کے باوجود مکمل رقم میں استعمال نہیں کرسکتا، میرے ماموں زاد بھائی سے اس رقم کے لیتے وقت مجھے یہ احساس ہوتا ہے گویا میں بھیک مانگ رہا ہوں؛ کیوں کہ وہ مجھے سو آدمیوں کی موجودگی میں یہ رقم دیتے ہیں۔

یہ رقم فی الحال مجھ کو تین مہینے سے نہیں مل رہی ہے؛ اس لیے کہ لندن میں قیام پذیر ہمارے بھائی کے مکان کا تعمیری کام یہاں جاری ہے، اور میرے ماموں زاد بھائی کہتے ہیں کہ زکوۃ والی تمہاری رقم میں نے تمہارے بھائی کے مکان کے خرچ میں صرف کر دی ہے، تو اپنے بھائی کو خط لکھ، اب میں تیرے پیسے کے معاملہ میں پڑنا نہیں چاہتا، میں نے اپنے بڑے بھائی کو خط لکھا، تو معلوم ہوا کہ ان کے روپے ابھی بھی ماموں زاد بھائی کے پاس جمع ہیں، اور میرے بھائی نے خط کے جواب میں انہیں ہدایت کی تھی کہ اس میں سے رقم مجھے دی جائے، اس کے باوجود وہ رقم مجھ کو نہیں مل رہی ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا میں اس معاملے کی پوری تفصیل اپنے دوسرے بھائیوں کو دے سکتا ہوں یا نہیں؟ اور اس طرح زکوۃ کی رقم بھجوانے سے میرے دوسرے بھائیوں کی زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوۃ کی جو رقم آپ کے ماموں زاد بھائی کے پاس ہے، اس کو تعمیری کام کاج میں خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ [۱] زکوۃ کی رقم جب تک مستحق کو نہ پہنچ جائے، اس وقت تک زکوۃ ادا نہیں ہوتی۔ (درمختار) [۲]

بڑے بھائی نے اگر غلط نیت سے زکوۃ کی اس رقم کا اس طرح انتظام کیا ہو اور آپ کو پریشان کرنا مقصود ہو، تو یہ نامناسب ہے، جو بھی ہو، دوسرے بھائیوں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیوں کہ رقم سب کی ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ... الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره كما لو أوصى لزيد بكذا ليس للوصي الدفع إلى غيره فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر - بيروت ☆ المبسوط: ۲/۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/۲۴۶، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا - ديوبند)

[۲] ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۷۰، كتاب الزكاة)

[۴۴] زکوۃ کی رقم سے ان حضرات کی تنخواہ ادا کرنا، جو اپنا سارا وقت زکوۃ کی رقم غریبوں تک پہنچانے میں لگاتے ہیں

۱۳۶۴- سوال: کیا ہم زکوۃ کی رقم سے ان لوگوں کی تنخواہ ادا کر سکتے ہیں، جو اپنا سارا وقت ہمارے لیے اس رقم کو غریبوں تک پہونچانے میں خرچ کر دیتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

نہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولو نوى الزكاة بما يدفع المعلم إلى الخليفة، ولم يستأجره إن كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضا أجزأه، وإلا فلا، وكذا ما يدفعه إلى الخدم من الرجال والنساء في الأعياد وغيرها بنية الزكاة كذا في معراج الدراية.
(الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی صاحبؒ نے اس مسئلے کو بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اقتباس طویل ہے، تاہم بہت مفید ہے، ملاحظہ فرمائیں:

تیسرا مصرف الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا، یہاں عاملین سے مراد وہ لوگ ہیں، جو اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات، زکوۃ وعشر وغیرہ لوگوں سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرنے کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں، یہ لوگ چوں کہ اپنے تمام اوقات اس خدمت میں خرچ کرتے ہیں، اس لیے ان کی ضروریات کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہے، قرآن کریم کی اس آیت نے مصارف زکوۃ میں ان کا حصہ رکھ کر یہ متعین کر دیا کہ ان کا حق الخدمت اسی مد زکوۃ سے دیا جائے گا۔

اس میں اصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے زکوۃ وصدقات وصول کرنے کا فریضہ براہ راست رسول کریم ﷺ کے سپرد فرمایا ہے، جس کا ذکر اسی سورت میں آگے آنے والی اس آیت میں ہے (آیت) خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً، یعنی وصول کریں آپ مسلمانوں کے اموال میں سے صدقہ،...... اس آیت کی رو سے مسلمانوں کے امیر پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ زکوۃ وصدقات وصول کرے، اور یہ ظاہر ہے کہ امیر خود اس کام کو پورے ملک میں بغیر اعوان اور مددگاروں کے نہیں کر سکتا، انہی اعوان اور مددگاروں کا ذکر مذکور الصدر آیت میں وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ ———— انہی آیات کی تعمیل میں رسول کریم ﷺ نے بہت سے صحابہ کرام کو صدقات وصول کرنے کے لیے عامل بنا کر مختلف خطوں میں بھیجا ہے، اور آیت مذکورہ کی ہدایت کے موافق زکوۃ ہی کی حاصل شدہ رقم میں سے ان کو حق الخدمت دیا ہے، ان میں وہ حضرات صحابہ بھی شامل ہیں جو اغنیاء تھے۔

....

بیان مذکور سے معلوم ہوا کہ عاملین صدقہ کو جو رقم مد زکوۃ سے دی جاتی ہے وہ بحیثیت صدقہ نہیں؛ بل کہ ان کی خدمت کا معاوضہ ہے، اسی لیے باوجود غنی اور مال دار ہونے کے بھی وہ اس رقم کے مستحق ہیں، اور زکوۃ سے ان کو دینا جائز ہے، اور مصارف زکوۃ کی آٹھ مدات میں سے صرف ایک یہی مد ایسی ہے، جس میں رقم زکوۃ بہ طور معاوضہ خدمت دی جاتی ہے، اور نہ زکوۃ نام ہی اس عطیہ کا ہے جو غریبوں کو بغیر کسی معاوضہ خدمت کے دیا جائے، اور اگر کسی غریب فقیر کو کوئی خدمت لے کر مال زکوۃ دیا گیا تو زکوۃ ادا نہیں =

= ہوئی۔ ــــــ اسی لیے یہاں دوسوال پیدا ہوتے ہیں، اول یہ کہ مال زکوۃ کو معاوضہ خدمت میں کیسے دیا گیا، دوسرے یہ کہ مال دار کے لیے اصلی حیثیت کو سمجھ لیا جائے، وہ یہ ہے کہ یہ حضرات فقراء کے وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ سب جانتے ہیں کہ وکیل کا قبضہ اصل موکل کے قبضہ کے حکم میں ہوتا ہے، اگر کوئی شخص اپنا قرض وصول کرنے کے لئے کسی کو وکیل مختار بنادے، اور قرض دار یہ قرض وکیل کو سپرد کردے تو وکیل کا قبضہ ہوتے ہی قرض دار بری ہوجاتا ہے، تو جب رقم زکوۃ عاملین صدقہ نے فقراء وکیل ہونے کی حیثیت سے وصول کرلی، تو ان کی زکاۃ ادا ہوگئی، اب یہ پوری رقم ان فقراء کی ملک ہے جن کی طرف سے بطور وکیل انہوں نے وصول کی ہے اب جو رقم بطور حق الخدمت کے ان کو دی جاتی ہے، وہ مال داروں کی طرف سے نہیں؛ بلکہ فقراء کی طرف سے ہوئی، اور فقراء کو اس میں ہر طرح کا تصرف کرنے کا اختیار ہے، ان کو یہ بھی حق ہے کہ جب اپنا کام ان لوگوں سے لیتے ہیں تو اپنی رقم میں سے ان کو معاوضہ خدمت دے دیں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ فقراء نے تو ان کو وکیل مختار بنایا نہیں، یہ ان کے وکیل کیسے بن گئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ، جس کو امیر کہا جاتا ہے، وہ قدرتی طور پر منجانب اللہ پورے ملک کے فقراء غرباء کا وکیل ہوتا ہے، کیوں کہ ان سب کی ضروریات کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے، امیر مملکت جس جس کو صدقات کی وصول یابی پر عامل بنادے، وہ سب ان کے نائب کی حیثیت سے فقراء کے وکیل ہوجاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ عاملین صدقہ کو جو کچھ دیا گیا، وہ درحقیقت زکاۃ نہیں دی گئی، بلکہ زکاۃ جن فقراء کا حق ہے، ان کی طرف سے معاوضہ خدمت دیا گیا، جیسے کوئی غریب فقیر کسی کو اپنے مقدمہ کا وکیل بنادے اور اس کا حق الخدمت زکاۃ کے حاصل شدہ مال سے ادا کردے، تو یہاں نہ تو دینے والا بطور زکاۃ کے دے رہا ہے اور نہ لینے والا زکاۃ کی حیثیت سے لے رہا ہے۔

تفصیل مذکور سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات زکوۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لیے وصول کرتے ہیں، ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے کہ زکاۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ دی جاسکے، بلکہ ان کو مدارس اور انجمن کی طرف سے جداگانہ تنخواہ دینا ضروری ہے، زکاۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ نہیں دی جاسکتی، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں؛ بل کہ اصحاب زکاۃ مال داروں کے وکیل ہیں، ان کی طرف سے مال زکاۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے، اسی لیے ان کے قبضہ ہوجانے کے بعد بھی زکاۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی، جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کردیں۔

فقراء کا وکیل نہ ہونا اس لیے ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں، اور امیر المومنین کی ولایت عامہ کی بناء پر جو خود بخود وکالت فقراء حاصل ہوتی ہے، وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لیے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحاب زکاۃ کا وکیل قرار دیا جائے اور جب تک یہ اس مال کو مصرف پر خرچ نہ کردیں، ان کا قبضہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ زکاۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہو۔

اس معاملہ میں عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے، بہت سے ادارے زکاۃ کا فنڈ وصول کرکے اس کو سالہا سال رکھے رہتے ہیں، اور اصحاب زکاۃ سمجھتے ہیں کہ ہماری زکاۃ ادا ہوگئی، حالاں کہ ان کی زکاۃ اس وقت ادا ہوگی، جب ان کی رقم مصارف زکاۃ میں صرف

[۴۵] مرحوم کی جانب سے زکوۃ ادا کرنا

۱۳۶۵-سوال: مرحوم کے ذمے زکوۃ کی ادائیگی باقی رہ گئی ہو، تو ان کے نام سے زکوۃ کی رقم لکھوا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مرحوم کے ذمے زکوۃ کی رقم باقی رہ گئی ہو اور مرحوم نے اس کی ادائیگی کی وصیت کی ہو، اور اس کے مال متروکہ کے تہائی حصے سے ادا ہو سکتی ہو، تو ادا کرنا واجب ہوگا، اور مرحوم کا نام لکھوانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے؛ بل کہ ان کے نام سے ہی لکھوانا بہتر ہے، اگر چہ ادائیگی کا دارومدار نیت ہی پر ہے۔[1]

اگر مرحوم نے وصیت نہ کی ہو، یا تہائی میں سے ادائیگی نہ ہو سکتی ہو، تو وارث پر مرحوم کے [تہائی سے زیادہ] مال سے ادا کرنا واجب نہیں ہے، صرف تہائی مال میں وصیت نافذ کی جائے گی، ہاں! اگر وارث اپنی خوشی سے ادا کرنا چاہے، تو ادا کر سکتا ہے، مرحوم کا نام لکھوائے، تب بھی اس کا مطلب یہی ہوگا کہ مرحوم کے ثواب کے واسطے دے رہا ہے۔ (شامی، ج:۶، ص:۸۶)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

ہو جائے۔ اسی طرح بہت سے لوگ ناواقفیت سے ان لوگوں کو عاملین صدقہ کے حکم میں داخل سمجھ کر زکاۃ ہی کی رقم سے ان کی تنخواہ دیتے ہیں، یہ نہ دینے والوں کے لیے جائز ہے نہ لینے والوں کے لیے۔ (معارف القرآن: ۴/۹۹-۳۹۷، التوبۃ: ۶۰، ط: دارالکتاب-دیوبند)

(۱) وإذا مات من عليه زكاة أو فطرة أو كفارة أو نذر أو حج أو صيام أو صلوات ولم يوص بذلك لم تؤخذ من تركته عندنا إلا أن يتبرع ورثته بذلك وهم من أهل التبرع، فإن امتنعوا لم يجبروا عليه، وإن أوصى بذلك يجوز وينفذ من ثلث ماله. (الجوهرة النيرة- أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِي اليمني الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱/۱۳۵، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، قبيل: كتاب الصوم، ط: المطبعة الخيرية)

[۲] (ثم) تقدم (ديونه التي لها مطالب من جهة العباد) ويقدم دين الصحة على دين المرض ... (وأما دين الله تعالى فإن أوصى به وجب تنفيذه من ثلث الباقي وإلا لا). [الدر المختار] ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله وأما دين الله تعالى إلخ) ... وذلك كالزكاة والكفارات ونحوها، قال الزيلعي: فإنها تسقط بالموت، فلا يلزم الورثة أداؤها، إلا إذا أوصى بها؛ أو تبرعوا بها هم من عندهم، ... (قوله من ثلث الباقي) أي الفاضل عن الحقوق المتقدمة، وعن دين العباد فإنه يقدم لو اجتمع مع دين الله تعالى؛ لأنه تعالى هو الغني، ونحن الفقراء كما في الدر المنتقى. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/۷۶۰، أول كتاب الفرائض، ط: دار الفكر-بيروت)

[۴۶] کسی کے ذمہ زکوٰۃ باقی ہو، اور انتقال ہو جائے، تو اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی یا نہیں؟

۱۳۶۶- سوال: ایک صاحب نصاب کے ذمے زکوۃ کی ادائیگی باقی تھی کہ اس کا انتقال ہو گیا، تو کیا اس کے مال متروکہ میں سے زکوۃ نکالی جائے گی، واضح رہے کہ اس کے ورثاء میں صرف چھوٹے بچے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر کسی کا انتقال ہو جائے اور اس کے ذمے زکوۃ کی ادائیگی باقی ہو، تو اس کے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرنا وارثوں پر ضروری نہیں ہے، اگر وارث تبرع کریں اور وہ اس کے اہل ہوں، تو اچھی بات ہے۔ [مذکورہ صورت میں اگر زکوۃ کی ادائیگی کی وصیت نہ کی گئی ہو، تو چھوٹے ورثاء (جو تبرع کے اہل نہیں ہیں) کی طرف سے زکوٰۃ ادا نہیں کی جائے گی، اگر وہ اجازت دیں، تو بھی اعتبار نہیں ہوگا۔]

ہاں اگر میت نے وصیت کی ہو، تو اس کے مال کے تہائی حصے سے [حسب ضابطہ] ادا کی جائے گی، تہائی مال سے زکوۃ ادا ہو جائے، تو ٹھیک ہے، ورنہ اس سے زائد سے ادا کرنا ورثاء پر واجب نہیں ہے۔ (شامی)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۷] زکوۃ کی رقم سے امام صاحب کو تنخواہ دینا

۱۳۶۷- سوال: ایک مسجد غیر آباد ہے، اس میں نماز نہیں ہو رہی ہے، مسجد کے پاس کوئی محلہ نہیں ہے، اس مسجد کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، تو ایسی مسجد میں کسی مستحق زکوۃ کو مقرر کر کے، زکوۃ کی رقم میں سے تنخواہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے، تو کیا بلا عوض امامت کی ذمہ داری سونپ کر زکوۃ کی رقم سے اس کی نصرت کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

تنخواہ میں زکوۃ کی رقم دینا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ کام کی اجرت میں زکوۃ دینا ناجائز ہے، ہاں اگر

---

[۱] ولو مات فأداها وارثه جاز. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: جاز) في الجوهرة: إذا مات من عليه زكاة أو فطرة أو كفارة أو نذر لم تؤخذ من تركته عندنا إلا أن يتبرع ورثته بذلك وهم من أهل التبرع ولم يجبروا عليه وإن أوصى تنفذ من الثلث. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۹، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، ط: دار الفكر-بيروت)

کوئی آدمی اپنی خوشی سے للہ خدمت کرنے پر رضا مند ہو، اور مستحق زکوٰۃ ہو، تو اس کی زکوٰۃ سے مدد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[1]

لیکن پہلے سے یہ کہنا کہ للہ کام کرو، ہم تمہیں کچھ دیں گے اور نیت پہلے سے زکوۃ کی رقم دینے کی ہو، تو اگر چہ زکوۃ ادا ہو جائے گی، مگر یہ مناسب نہیں ہے، کہ اس میں عوض کا شبہ پیدا ہوتا ہے، ہاں تنخواہ کی ایک مناسب مقدار متعین کر کے کہا جائے کہ ہم تمہاری دوسرے طریقے سے بھی امداد کریں گے اور پھر زکوۃ کے پیسے دیے جائیں، تو مضائقہ نہیں؛ لیکن کام کی مزدوری میں اپنی زکوٰۃ کی رقم مذکورہ طریقے سے دینا مناسب نہیں۔ (درمختار)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۸] صدقات کے ایک مد کی رقم دوسرے مد میں بہ طور قرض لینا

۱۳۶۸- سوال: مکتب و مدرسہ میں زکوٰۃ، للہ وغیرہ مختلف مد (کھاتا) کی رقم ہوتی ہے، اس میں ایک مد کی رقم دوسرے مد میں بہ طور قرض اس نیت سے استعمال کر سکتے ہیں کہ جب اس مد میں رقم آجائے گی تو جہاں سے رقم قرض لی تھی، وہاں بھرپائی کر دی جائے گی۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ایک مد سے دوسرے مد کے لیے رقم قرض لینا جائز ہے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ بخاری شریف کی شرح میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ زکوٰۃ کی رقم قرض لے کر بیت المال کے دوسرے مدوں میں استعمال فرمایا کرتے تھے، پھر جب زکوٰۃ کی رقم آجاتی، تو جس مد میں سے رقم قرض لی تھی، اس کی

---

(۱) بہ شرطے کہ زکوۃ نہ دینے کی صورت میں بھی خدمت کرتا رہے، اور اگر زکوۃ نہ دینے کی صورت میں خدمت ترک کر دے، تو دینا جائز نہیں ہوگا، کہ یہ بدلۂ عمل اور عوض ہے، جو زکوۃ کی رقم سے جائز نہیں: ولو نوى الزكاة بما يدفع المعلم إلى الخليفة، ولم يستأجره إن كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضا أجزأه، وإلا فلا، وكذا ما يدفعه إلى الخدم من الرجال والنساء في الأعياد وغيرها بنية الزكاة كذا في معراج الدراية. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲] ولو دفعها المعلم لخليفته إن كان بحيث يعمل له لو لم يعطه وإلا لا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۳۵۶، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

بھرپائی کردیتے تھے۔ (فیض الباری: ۳/ ۴۲)[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۴۹] ادارے کے مکان کی تعمیر کے لیے زکوۃ کی رقم بہ طور قرض لینا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۳۶۹- سوال: ادارے کا مکان تعمیر ہورہا ہے، اس کے لیے رقم کی ضرورت ہے، تو کیا دو چار مہینوں کے لیے زکوۃ کی رقم قرض کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں؟

الجواب حامداًومصلياً:

زکوۃ کی رقم ادارے کے دوسرے کاموں میں قرض کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، ایسا کرنے سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ (☆☆) اگر ایسا کرلیا ہو، تو زکوۃ کی رقم کے مالک کو اطلاع دینا ضروری ہوگا،

---

[1] عن الأعرج، عن أبي هريرة رضي الله عنه، قال: أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم بالصدقة، فقيل منع ابن جميل، وخالد بن الوليد، وعباس بن عبد المطلب، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: " ما ينقم ابن جميل إلا أنه كان فقيرا، فأغناه الله ورسوله، وأما خالد: فإنكم تظلمون خالدا، قد احتبس أدراعه وأعتده في سبيل الله، وأما العباس بن عبد المطلب، فعم رسول الله صلى الله عليه وسلم فهي عليه صدقة ومثلها معها ". (صحيح البخاري: ۱/ ۱۹۸، رقم الحديث: ۱۴۶۸، كتاب الزكاة، باب قول الله تعالى: {وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله}، ط: ديوبند)

اس حدیث کی تشریح میں ہے: قوله: (وأما العباس) قيل: إن العباس إنما أنكر الزكاة؛ لأنه أحسّ ترفعًا في كلام عمر. أما عمر فإنه كان عمر، لكنّ العباس كان عمّ رسول الله صلى الله عليه وسلّم وإنما عم الرجل صنو أبيه، فكره منه الكلام. ـــــ وحينئذ معنى قوله: (ومثلها معها) إنكم تزعمون أنه ينكر الزكاة، وأنا ضامن له أنه يعطي لكم زكاته مرّتين. وقيل: إنه لم ينكر الزكاة، ولكنه صلى الله عليه وسلّم كان يستوفي منه الزكاة لسنتين، فأنكرها، لأن زكاته كانت دينًا على بيت المال، ثم طلب عمر منه الزكاة. ثم إنهم قالوا: إن النبي صلى الله عليه وسلّم كان يستقرض منه زكاته، ويصرفها في المصارف الأخرى التي كانت على بيت المال. فإذا جاء فيه مالٌ كان يؤدي منه عما صرّفه من الزكاة. ولذا أفتيتُ لأصحاب المدارس أن يصرفوا مالَ الزكاة الذي عندهم في غير مصارفها دَيْنًا عليهم، فإذا جاء عندهم مالٌ في ذلك المصرف يؤدُّوه عما صرّفوه من مال الزكاة. (فيض الباري: ۳/ ۲۱۰، كتاب الزكاة، باب قول الله تعالى: {وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله}، ط: دار إحياء التراث العربي)

(☆☆) "صدقات کے ایک مد کی رقم دوسرے مد میں بہ طور قرض لینا" کے تحت ذکر کیے گئے سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحبؒ نے فیض الباری کے حوالے سے، ایک مد کی رقم دوسرے مد میں بہ طور قرض استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، حضرت تھانویؒ اس سلسلے میں فرماتے ہیں: =

[اگر وہ ضامن بنائے، تو ضمان ادا کرنا ضروری ہوگا، لہٰذا] ان کی اجازت وحکم سے دوسری رقم زکوۃ میں ادا کی جائے گی، ان کی اجازت کے بغیر دی گئی رقم معطی کی جانب سے تبرع ہوگی، جس کا وہ مطالبہ نہیں کرسکتا۔ (عالمگیری جلد ۲ صفحہ ۴۸۱)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۰] زکوۃ اور صدقات کی رقم بہ طور قرض دینا

۱۳۰۷- سوال: ایک شخص کے پاس اپنی اور دوسرے کی زکوۃ اور صدقات کی رقم جمع ہے، اب اس نے جمع شدہ زکوۃ کی رقم سے کچھ روپے ایک غریب انسان کو بغیر سوال کیے دیے اور واپس لینے کی نیت بھی نہیں تھی۔

لیکن اس غریب انسان نے کچھ مدت بعد وہ روپے دینے والے کو لوٹا دیے اور کہا کہ تم نے مجھے (غریبی کی) جس حالت کی بناء پر روپئے دیے تھے، اب وہ حالت باقی نہیں رہی؛ اس لیے میں تمہیں وہ روپئے واپس لوٹاتا ہوں، تو اب اس کا کیا حکم ہے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

زکوۃ وصدقات - خواہ اپنی ہو یا دوسرے کی - جمع کرکے رکھنے کے لیے نہیں ہے۔[۲] اسی طرح

= باذن معطین [قرض دینا] درست ہے، کیوں کہ اموال مذکورہ ہنوز ان کی ملک سے خارج نہیں ہوئے، رہی یہ بات کہ صورت مسئولہ میں اذن معطین دلالۃ ہے یا نہیں؟ یہ ایک واقعہ ہے اور ظاہر یہ ہے کہ [اذن] ہے؛ کیوں کہ چندہ دینے والے جب چندہ دیتے ہیں، تو عادت یہی ہے کہ وہ اس سے اپنا تعلق تصرف منقطع کر دیتے ہیں، اور متولی کو ہر مناسب تصرف کا اختیار دیتے ہیں، اس لیے صورت مسئولہ میں تصرف مذکور جائز ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۲/ ۱۶-۱۷، کتاب الزکاۃ والصدقات، مد زکوۃ سے مدرسے کی دیگر مد میں قرض لینے یا صرف کرنے کا حکم، ط: زکریا- دیوبند)

اور فیض الباری میں ہے:

ولذا أفتيتُ لأصحاب المدارس أن يصرفوا مالَ الزكاة الذي عندهم في غير مصارفها دَيْنا عليهم، فإذا جاء عندهم مالٌ في ذلك المصرف يؤدُّوه عما صَرفُوه من مال الزكاة. (فيض الباری: ۳/ ۲۱۰، كتاب الزكاة، باب قول الله تعالى: {وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله}، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۱) العالم إذا سأل للفقراء أشياء واختلط بعضها ببعض يصير ضامنا لجميع ذلك وإذا أدى صار مؤديا من مال نفسه ويصير ضامنا لهم ولا يجزيهم عن زكاتهم فيجب أن يستأذن الفقير ليأذن له بالقبض فيصير خالطا ماله بماله، كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۴۸۱، كتاب الوقف، الباب الثالث عشر في الأوقاف التي يستغني عنها، ط: زكريا)

(۲) وتجب على الفور عند تمام الحول حتى يأثم بتأخيره من غير عذر، وفي رواية الرازي على التراخي حتى يأثم عند الموت، والأول أصح كذا في التهذيب. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۰، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر- بيروت)

دوسرے کو قرضہ کے طور پر دینے کے لیے بھی نہیں ہے، اگر زکوۃ کی رقم دوسرے نے دی ہے، تو آپ اس میں وکیل ہیں، اس کو دوسرے کو قرضہ کے طور پر دینا جائز نہیں ہے، امانت میں خیانت ہے۔[1]

زکوۃ ایک عبادت ہے، لہٰذا اس میں نیت ضروری ہے اور لازم ہے کہ محتاج و مسکین کو زکوۃ دیتے وقت یا زکوۃ کے پیسے الگ کرتے وقت زکوۃ کی نیت کرے کہ یہ زکوۃ کی رقم ہے۔[2]

بہ نیت زکوۃ، رقم دینے سے مسکین اس کا مالک بن گیا، وہ جس طرح چاہے، خرچ کرے، اس کو حق ہے۔[3] اگر آپ نے وہ رقم زکوۃ کی نیت سے دی تھی، تو واپس لینا جائز نہیں ہے۔ وہ رقم انہیں واپس

---

(۱)... الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره كما لو أوصى لزيد بكذا ليس للوصي الدفع إلى غيره فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر - بيروت☆ المبسوط: ۲/۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، ط: دار المعرفة - بيروت☆ البحر الرائق: ۲/۴۲۶، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا - ديوبند)

''صدقات کے ایک مد کی رقم دوسرے مد میں بہ طور قرض لینا'' کے تحت ذکر کیے گئے سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحبؒ نے علامہ کشمیریؒ کے حوالے سے، ایک مد کی رقم دوسرے مد میں بہ طور قرض استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، حضرت تھانوی کے فتویٰ سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ (دیکھیے: امداد الفتاویٰ: ۲/۱۶-۱۷، کتاب الزکاۃ والصدقات، مد زکوۃ سے مدرسے کی دیگر مد میں قرض لینے یا صرف کرنے کا حکم، ط: زکریا - دیوبند)

تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان: ''صدقات کے ایک مد کی رقم دوسرے مد میں بہ طور قرض لینا'' اور ''ادارے کے مکان کی تعمیر کے لیے زکوۃ کی رقم بہ طور قرض لینا''

(۲) (وشرط صحة أدائها نية مقارنة له) أي للأداء (ولو) كانت المقارنة (حكما)... (أو مقارنة بعزل ما وجب) كله أو بعضه، ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۶۸-۲۷۰، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

فإذا نوى أن يؤدي الزكاة، ولم يعزل شيئا فجعل يتصدق شيئا فشيئا إلى آخر السنة، ولم تحضره النية لم يجز عن الزكاة كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۰، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر - بيروت)

والأصل اقترانها بالأداء كسائر العبادات إلا أن الدفع يتفرق فيحرج باستحضار النية عند كل دفع فاكتفى بوجودها حالة العزل دفعا للحرج. (البحر الرائق: ۲/۳۶۸، كتاب الزكاة، ط: زكريا - ديوبند☆ مراقي الفلاح، ص: ۷۱۵، كتاب الزكاة)

(۳) قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ. (مرقاة المفاتيح - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۴/۱۳۰۳، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر - بيروت)

کردیں؛ لیکن پھر بھی وہ رقم نہ لے، تو اس صورت میں اس کی اجازت سے کسی اور مستحق زکوۃ کو وہ رقم دے دی جائے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۷/۱۸۹)[۱]

اور اگر قرض کے طور پر دی تھی، تو پھر آپ اس کو واپس لے سکتے ہیں۔

آپ نے وہ رقم زکوۃ کی نیت سے دی ہے، تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے آپ کو وہ پیسے ہدیے کے طور پر دیے ہیں؛ اس لیے میں واپس نہیں لے سکتا- یہ رقم نہ لینے کا حیلہ ہے- کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: جو شخص ہدیہ دینے کے بعد واپس لے، تو وہ اس کتے کی طرح ہے، جو قے کرتا ہے، پھر اس کو چاٹتا ہے۔ (بخاری شریف)[۲]

زکوۃ دیتے وقت یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ یہ زکوۃ کا پیسہ ہے؛ بل کہ سامنے والے کا مستحق ہونا ضروری ہے۔[۳] رہی نیت، تو وہ دل کا فعل ہے، دل میں نیت کا ہونا زکوۃ کی ادائیگی کے لیے کافی ہے،

---

[۱] اگر مناسب ہو، تو مقروض (بکر) سے صاف کہہ دیا جائے کہ میں نے رقم دیتے وقت ہی زکوۃ کی نیت کرلی تھی، لہٰذا رقم واپس نہ کرو، اور اس کے باوجود بھی واپس کرنے پر مصر ہو، تو کہہ دیا جائے کہ تم جسے چاہو، دے دو، اور اگر اس کے باوجود بھی وہ شخص یعنی بکر رقم واپس کردے، تو چوں کہ معطی یعنی زید کی نیت کے مطابق اسی وقت زکوۃ ادا ہوگئی ہے، لہٰذا اس کی اجازت لے کر وہ رقم صدقہ کردی جائے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۷/۱۸۹، کتاب الزکاۃ، ایک شخص نے قرض مانگا، زکوۃ کی نیت سے قرض دیا، بعد میں مقروض نے رقم واپس کردی، تو اس رقم کا کیا حکم ہے؟ سوال نمبر: ۲۲۴و۲۲۵، ط: دارالاشاعت- کراچی)

[۲] عن ابن عباس -رضي الله عنهما- قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: ليس لنا مثل السوء، الذي يعود في هبته كالكلب يرجع في قيئه. (صحيح البخاري: ۱/۳۵۷، رقم الحديث: ۲۶۲۲، كتاب الهبة وفضلها والتحريض عليها، باب: لا يحل لأحد أن يرجع في هبته وصدقته، ط: البدر- ديوبند)

(۳) ولم يشترط المصنف -رحمه الله- علم الآخذ بما يأخذه أنه زكاة، للإشارة إلى أنه ليس بشرط، وفيه اختلاف والأصح كما في المبتغى والقنية: أن من أعطى مسكينا دراهم، وسماها هبة، أو قرضا، ونوى الزكاة، فإنها تجزئه. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/۲۲۸، كتاب الزكاة، شروط أداء الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

ولا يشترط علم الفقير بأنها زكاة على الأصح لما في البحر عن القنية والمجتبى الأصح أن من أعطى مسكينا دراهم وسماها هبة أو قرضا ونوى الزكاة، فإنها تجزئه اهـ. (درر الحكام شرح غرر الأحكام- محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا- أو منلا أو المولى- خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۱/۱۷۴، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/۱۹۶، كتاب الزكاة، شرط صحة أداء الزكاة، ط: دار إحياء التراث =

زبان سے تلفظ ضروری نہیں ہے۔[1] اس لیے ہدیہ کہہ کر فقیر کو دینے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

[۵۱] زکوٰۃ وسود کی رقم دیتے وقت نیت کافی ہے

[۵۲] رشوت کا استعمال ذاتی ضروریات میں

[۵۳] سود کی رقم بالارادہ حاصل کر کے غریبوں کو دینا

[۵۴] پی ایف سے ملنے والی رقم کا استعمال جائز ہے؟

۴۷-۱۳۷۰-سوال: (۱) سود یا زکوٰۃ کے پیسے کسی مستحق شخص کو سود یا زکوٰۃ کی صراحت کیے بغیر دینا جائز ہے یا نہیں؟ کیا اس کو بتلانا ضروری ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے یا سود کی ہے؟

(۲) رشوت کے پیسے دلال وغیرہ زبردستی جیب میں یا ٹیبل پر رکھ دیتے ہیں یا گھر آ کر دے جاتے ہیں، تو ایسے پیسے ہم اپنے ذاتی استعمال میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟ اسی طرح کسی بیمار کو ثواب کی نیت سے دوا کے لیے دے سکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) ایک شخص نے کچھ رقم ایک ہندو شخص کو سود پر دے رکھا ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ حاصل شدہ سود، کسی اجنبی کو ثواب کی نیت کے بغیر دے سکتا ہے یا نہیں؟ اور اس کو بتلانا ضروری ہے کہ یہ سود کے پیسے ہیں؟

=العربي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۱، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۶۸، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

(۱) فهي، في اللغة، القصد. . . . وفي الشرع، كما في التلويح: قصد الطاعة والتقرب إلى الله تعالى في إيجاد الفعل. . . . وعرفها القاضي البيضاوي: بأنها شرعا الإرادة المتوجهة نحو الفعل ابتغاء لوجه الله تعالى، وامتثالا لحكمه. ولغة: انبعاث القلب نحو ما يراه موافقا لغرض من جلب نفع أو دفع ضر حالا أو مآلا. (الاشباه والنظائر - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ) ص: ۲۴، ۲۵، القاعده الثانية: الأمور بمقاصدها، في بيان حقيقة النية، ت: الشيخ زكريا عميرات، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

النية بالقلب ولا يقوم اللسان مقامه إلا عند التعذر كما في الشرح. (حوالہ سابق ص: ۱۳۹، الفن الثاني، کتاب الصلاۃ)

(۲) حاشیہ نمبر ۷ دیکھیں۔

(۴) سرکاری پراویڈنٹ فنڈ (P.F) کی سود کی رقم کے سلسلے میں میں نے پڑھا ہے کہ جائز ہے، تو کیا P.F سے ملنے والی رقم ہم اپنی ذات پر استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) اسلامی تعلیمات میں یہ بات ملحوظ ہے کہ امیر وغریب اور حاکم ومحکوم ہر ایک کی عزت محفوظ رہے؛ زکوۃ کا نظام اس لیے ہے کہ مال دار، غریبوں پر حکومت نہ کرے، ان کو ذلیل ورسوا نہ کرے اور ہر ایک کی ضرورت کی تکمیل ہو۔

زکوۃ عبادت ہے، جس کی ادائیگی کی صحت کے لیے نیت ضروری ہے۔[1] اور نیت کا تعلق دل سے ہے لہٰذا دل میں نیت کرنا ضروری ہے، زبان سے کہنا ضروری نہیں ہے۔[2] بل کہ اگر کسی شریف محتاج، زکوۃ کے مستحق - جو زکوۃ لینے سے یک گونہ انکار کرتا ہو - کو زکوۃ کی رقم دیتے وقت، دل سے زکوۃ کا ارادہ کرے اور زبان سے بخشش کی صراحت کرے، تب بھی زکوۃ ادا ہو جائے گی، زبان سے زکوۃ کا تلفظ کرنا ضروری

---

[۱] (وشرط صحة أدائها نية مقارنة له) أي للأداء (ولو) كانت المقارنة (حكما) ... (أو مقارنة بعزل ما وجب) كله أو بعضه، ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۸-۲۷۰، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

فإذا نوى أن يؤدي الزكاة، ولم يعزل شيئا فجعل يتصدق شيئا فشيئا إلى آخر السنة، ولم تحضره النية لم يجز عن الزكاة كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۰، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر - بيروت)

والأصل اقترانها بالأداء كسائر العبادات إلا أن الدفع يتفرق فيحرج باستحضار النية عند كل دفع فاكتفي بوجودها حالة العزل دفعا للحرج. (البحر الرائق: ۲/ ۳۶۸، كتاب الزكاة، ط: زكريا - ديوبند ☆ مراقي الفلاح: ص۷۱۵، كتاب الزكاة)

(۲) فهي، في اللغة، القصد. . . . وفي الشرع، كما في التلويح: قصد الطاعة والتقرب إلى الله تعالى في إيجاد الفعل. . . . وعرفها القاضي البيضاوي: بأنها شرعا الإرادة المتوجهة نحو الفعل ابتغاء لوجه الله تعالى، وامتثالا لحكمه. ولغة: انبعاث القلب نحو ما يراه موافقا لغرض من جلب نفع أو دفع ضر حالا أو مآلا. (الاشباه والنظائر - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ) ص: ۲۴، ۲۵، القاعده الثانية: الأمور بمقاصدها، في بيان حقيقة النية، ت: الشيخ زكريا عميرات، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

النية بالقلب ولا يقوم اللسان مقامه إلا عند التعذر كما في الشرح. (حوالہ سابق ص: ۳۹، الفن الثانی، کتاب الصلاۃ)

نہیں ہے، اسی طرح اس کو بتلانا بھی ضروری نہیں ہے۔ (۳)

البتہ آپ کو اتنا جاننا ضروری ہے کہ آپ جس کو زکوۃ ادا کر رہے ہیں، وہ مستحق زکوۃ ہے، کیوں کہ اگر آپ نے جان بوجھ کر غیر مستحق کو زکوۃ دے دی، تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ (۴)

---

(۲) جب غیر قانونی طور پر کوئی کام نکالنے کے لیے رشوت کے طور پر دیتا ہے، تو اس رقم کا لینا اور

---

(۳) ولم يشترط المصنف - رحمه الله - علم الآخذ بما يأخذه أنه زكاة؛ للإشارة إلى أنه ليس بشرط، وفيه اختلاف والأصح كما في المبتغي والقنية: أن من أعطى مسكينا دراهم، وسماها هبة، أو قرضا، ونوى الزكاة، فإنها تجزئه. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۲/ ۲۲۸، كتاب الزكاة، شروط أداء الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

ولا يشترط علم الفقير بأنها زكاة على الأصح لما في البحر عن القنية والمجتبى الأصح أن من أعطى مسكينا دراهم وسماها هبة أو قرضا ونوى الزكاة، فإنها تجزئه اهـ. (درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵ھ): ۱/ ۱۷۳، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/ ۱۹۶، كتاب الزكاة، شرط صحة أداء الزكاة، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۱، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۸، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

(۴) ولا يجوز دفع الزكاة إلى من يملك نصابا من أي مال كان، لأن الغنى الشرعي مقدر به والشرط أن يكون فاضلا من الحاجة الأصلية. (الهداية) ــــــ قال العيني (م: ۸۵۵ھ): م: (ولا يجوز دفع الزكاة إلى من ملك نصابا من أي مال كان) ش: يعني سواء كان من النقدين أو من العروض أو من السوائم م: (لأن الغنى الشرعي مقدر به) ش: أي بالنصاب م: (والشرط أن يكون فاضلا عن الحاجة الأصلية) ش: أي شرط عدم جواز دفع الزكاة إليه أن يكون النصاب فاضلا عن الحاجة الأصلية. (البناية شرح الهداية: ۳/ ۴۷۶-۴۷۷، كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقات إليه ومن لا يجوز، الحكم لو دفع الزكاة لغير مستحقيها وهو لا يعلم، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

تجب [صدقة الفطر] ... (على كل) حر (مسلم) ... (ذى نصاب فاضل عن حاجته الأصلية) كدينه وحوائج عياله (وإن لم ينم) ... وبه، أى بهذا النصاب (تحرم الصدقة) ... وتجب الأضحية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۵۸-۳۶۰، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۷۱، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۱/ ۱۹۳، كتاب الزكاة، باب على من تجب زكاة الفطر، ط: دار إحياء الكتب العربية)

اپنی ضرورت میں استعمال جائز نہیں ہے۔(۵) ہاں البتہ وہ بہ خوشی کام مکمل ہوجانے کے بعد دیتا ہے، تو جائز ہے۔(۶) اگر رضامندی سے نہیں دیتا، تو ناجائز ہے، مالک کو اس کی رقم واپس کردیں۔(۷) اور جس رشوت کی رقم

---

(۵) عن عبد الله بن عمرو، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي. (سنن أبي داود، ص: ۵۰۴، رقم الحديث: ۳۵۸۰، كتاب الأقضية، باب في كراهية الرشوة، ط: ديوبند☆سنن الترمذي: ۱/ ۲۴۸، رقم الحديث: ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، أبواب الأحكام عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الراشي والمرتشي في الحكم، ط: ديوبند☆سنن ابن ماجه، ص: ۱۶۷، رقم الحديث: ۲۳۱۳، باب التغليظ في الحيف والرشوة، كتاب الأحكام، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، قال: كنت آخذا بزمام ناقة رسول الله صلى الله عليه وسلم في أوسط أيام التشريق، أذود عنه الناس، فقال: "يا أيها الناس، هل تدرون في أي يوم أنتم؟ وفي أي شهر أنتم؟ وفي أي بلد أنتم؟" قالوا: في يوم حرام، وشهر حرام، وبلد حرام، قال: "فإن دماءكم وأموالكم وأعراضكم عليكم حرام، كحرمة يومكم هذا، في شهركم هذا، في بلدكم هذا، إلى يوم تلقونه"، ثم قال: "اسمعوا مني تعيشوا، ألا لا تظلموا، ألا لا تظلموا، ألا لا تظلموا، إنه لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه، ... إلى آخر الحديث. (مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۳۴/ ۲۹۹، رقم الحديث: ۲۰۶۹۵، مسند البصريين، حديث عم أبي حرة الرقاشي، ط: الرسالة)

(وعن عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما... قال: لعن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - الراشي والمرتشي): أي: معطي الرشوة وآخذها، وهي الوصلة إلى الحاجة بالمصانعة، وأصله من الرشاء الذي يتوصل به إلى الماء، قيل: الرشوة ما يعطى لإبطال حق، أو لإحقاق باطل، أما إذا أعطى ليتوصل به إلى حق، أو ليدفع به عن نفسه ظلما فلا بأس به، وكذا الآخذ إذا أخذ ليسعى في إصابة صاحب الحق فلا بأس به، لكن هذا ينبغي أن يكون في غير القضاة والولاة؛ لأن السعي في إصابة الحق إلى مستحقه، ودفع الظالم عن المظلوم واجب عليهم، فلا يجوز لهم الأخذ عليه، كذا ذكره ابن الملك. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي، القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۶/ ۲۴۳۷، رقم الحديث: ۳۷۵۳، كتاب الإمارة والقضاء، باب رزق الولاة وهداياهم، ط: دار الفكر، بيروت - لبنان)

(۶) ولو قضى حاجته بلا شرط ولا طمع فأهدى إليه بعد ذلك فهو حلال لا بأس به وما نقل عن ابن مسعود من كراهته فورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/ ۳۶۲، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية، ط: دار الفكر - بيروت)

(۷) والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/ ۹۹، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالا حراما)

وفي القنية الرشوة يجب ردها ولا تملك وفيها دفع للقاضي أو لغيره سحتا لإصلاح المهم فأصلح ثم ندم يرد ما دفع إليه اهـ. (المصدر السابق: ۵/ ۳۶۲، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية)

کا علم نہ ہو کہ کس نے دیا ہے اور کیوں دیا ہے، اس کو بلا نیت ثواب، کسی غریب کی مدد کے لیے یا دوا دارو کے لیے دینا جائز ہے۔ کسی قسم کی زبردستی کے بغیر کوئی رقم آپ کو دے اور آپ کا دل گواہی دے کہ اس نے بہ خوشی بہ طور بخشش، میرے کام سے خوش ہو کر دیا ہے، تو اس کے استعمال کی اجازت ہے۔ (۸)

---

(۳) سود کے بارے میں بہت سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ (۹) دار الحرب میں بھی امام ابو یوسفؒ اور ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک سود لینا حرام ہے، جائز نہیں ہے۔ (۱۰)

---

(۸) وفي الفتح: ثم الرشوة أربعة أقسام: منها ما هو حرام على الآخذ والمعطي، وهو الرشوة على تقليد القضاء والإمارة. ــــ الثاني: ارتشاء القاضي ليحكم، وهو كذلك ولو القضاء بحق، لأنه واجب عليه. ــــ الثالث: أخذ المال ليسوي أمره عند السلطان دفعا للضرر أو جلبا للنفع، وهو حرام على الآخذ فقط . . . وفي الأقضية قسم الهدية وجعل هذا من أقسامها فقال: حلال من الجانبين كالإهداء للتودد، وحرام منهما كالإهداء ليعينه على الظلم وحرام على الآخذ فقط، وهو أن يهدى ليكف عنه الظلم، والحيلة أن يستأجره إلخ قال: أي في الأقضية هذا إذا كان فيه شرط أما إذا كان بلا شرط لكن يعلم يقينا أنه إنما يهدي ليعينه عند السلطان فمشايخنا على أنه لا بأس به . . . الرابع: مايدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه أو ماله حلال للدافع حرام على الآخذ، لأن دفع الضرر عن المسلم واجب، ولا يجوز أخذ المال ليفعل الواجب، اهـ ما في الفتح ملخصا. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/ ۳۶۲، كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية)

(۹) اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۔ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۔ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۔ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۔ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۞ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۞ (۲-البقرۃ:۲۷۵، ۲۷۶)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۔ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۞ (۲-البقرۃ:۲۷۸، ۲۷۹)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۔ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞ (۳-آل عمران:۱۳۰)

عبد الرحمن بن عبد الله بن مسعود، عن أبيه، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، وموكله وشاهده وكاتبه. (سنن أبي داود، ص:۱/ ۴۷۳، كتاب البيوع، باب في آكل الربا وموكله، ط: فيصل ديوبند)

(۱۰) قال: ولا بين المسلم والحربي في دار الحرب، خلافا لأبي يوسف والشافعي. (الهداية) ــــ قال العيني: م: (قال) ش: أي القدوري - رحمه الله - م: (ولا بين المسلم والحربي في دار الحرب) ش: أي ولا ربا أيضا بين المسلم الذي دخل دار الحرب بأمان وباع درهما بدرهمين، وكذا إذا باع خمرا أو خنزيرا أو ميتة أو قامرهم وأخذ المال كل ذلك يحل له إذا كان في دار الحرب عند أبي حنيفة ومحمد م: (خلافا لأبي يوسف والشافعي) ش: ومالك وأحمد. (البناية شرح الهداية- بدر الدين العيني (م: ۸۵۵ھ): ۸/ ۲۹۹، كتاب البيوع، باب الربا، ط: دار الكتب العلمية)

---

(۴) سرکاری P.F میں جو پیسے سرکار یا کمپنی نے آپ کے اختیار کے بغیر جبرا وضع کرلیا ہے اور آپ کو ریٹائر ہونے کی وجہ سے ملتے ہیں، اس کا لینا جائز ہے، اس کو حکومت کی جانب سے ہدیہ تسلیم کیا گیا ہے؛ کیوں کہ آپ کی تنخواہ سے رقم کے وضع ہونے میں آپ کی مرضی کو دخل نہیں تھا، اس لیے جائز ہے۔ (۱۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۵] زکوۃ اور سود کے پیسے بہ طور قرض کسی کو دینا

۱۳۷۵- سوال: میرے پاس زکوۃ اور سود کی رقم علاحدہ رکھی ہوئی ہے، ایک آدمی کو قرض کی ضرورت ہے، تو کیا میں اس رقم سے اس شخص کو قرض کے طور پر دے سکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوۃ کے پیسے اپنے ہوں اور علاحدہ رکھ دیے گئے ہوں، تو اسے قرض کے طور پر دینے کی اجازت ہے؛ لیکن جب تک وہ پیسے واپس نہ آجائیں اور مستحق تک نہ پہنچا دیے جائیں، اس وقت تک زکوۃ ادا نہیں ہوگی؛ لہٰذا ایسا کرنا مناسب نہیں ہے۔ (۱۲)

---

(۱۱) قال: "ويجوز للمشتري أن يزيد للبائع في الثمن ويجوز للبائع أن يزيد للمشتري في المبيع، ويجوز أن يحط من الثمن ويتعلق الاستحقاق بجميع ذلك" فالزيادة والحط يلتحقان بأصل العقد عندنا. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۳/ ۵۹- ۶۰، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت☆الدر المختار مع رد المحتار: ۵/ ۵۳-۱۵۵، كتاب البيوع، فصل في التصرف في البيع والثمن قبل القبض والزيادة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱۲) اس سلسلے میں اصل یہ ہے کہ جو رقم بہ نیت زکاۃ علاحدہ رکھی گئی ہے، وہ جب تک مستحق تک پہنچ نہ جائے، اس وقت تک ذمہ سے وجوب ساقط نہیں ہوتا، اور زکوۃ ادا نہیں ہوتی، بل کہ وہ [علاحدہ کردہ مال] مالک کی ملکیت ہی میں رہتا ہے، اور وہ اس میں جیسا تصرف کرنا چاہے، کرسکتا ہے، لہٰذا اس مال سے قرض وغیرہ بھی دے سکتا ہے، البتہ قرض وغیرہ دینے کی وجہ سے ادائیگی زکوۃ میں غیر معمولی تاخیر ہوجائے، تو یہ درست نہیں۔

ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: ولا يخرج عن العهدة بالعزل) فلو ضاعت لا تسقط عنه الزكاة ولو مات كانت ميراثا عنه، بخلاف ما إذا ضاعت في يد الساعي لأن يده كيد الفقراء بحر عن المحيط. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۷۰، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن =

اسی طرح سود کے پیسے کسی غریب کو بہ طور قرض دینے میں حرج نہیں۔ (۱)

البتہ مستحق اور حق دار نہ ہو، تو ایسے آدمی کو [بہ طور قرض] دینا ٹھیک نہیں اور ایسے آدمی کے لیے لینا بھی مناسب نہیں۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۶] زکوٰۃ کی رقم مقروض کو دے کر، قرض وصول کرنا

۱۳۷۶- سوال: زید کے پاس اپنی زکوٰۃ وصدقات کی رقم ہے، یا کسی نے زید کو محتاج ومسکین کو دینے کے لیے دیے ہیں، زید سے کسی نے قرض کے طور پر کچھ پیسے لیے تھے؛ لیکن مقروض کی ایسی حالت نہیں ہے کہ وہ قرض ادا کر سکے، زید اس کی حالت دیکھ کر اس کو زکوٰۃ کا مستحق سمجھتا ہے؛ لہٰذا وہ کہتا ہے کہ آپ نے قرض کے طور پر مجھ سے جو رقم لی تھی، میں اس کے عوض اپنے پاس موجود زکوٰۃ کی رقم سے منہا کرتا ہوں یا پورا قرضہ ساقط کرتا ہوں، تو اس طریقے سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

یعنی زید اپنی زکوٰۃ کی رقم یا دوسرے کے دی ہوئی رقم، مذکورہ تفصیل کے مطابق ادا کر کے کہتا ہے کہ تیرے ہاتھ میں رقم نہیں دی جائے گی، صرف زبان سے کہہ کر قرضہ میں سے ساقط کر دے، تو اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوٰۃ کی رقم کا مالک بنائے بغیر، مقروض کے قرضہ کو ساقط کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، بل کہ آپ کچھ روپے (قرض کے بہ قدر یا اس سے زائد، یا اس سے کم، جتنی بھی دینا چاہیں) زکوٰۃ کی نیت سے دے کر

=المبیع وفاء، ط: دار الفکر)

إذا لم یؤد الزکاۃ حتی مضی حولان فقد أساء وأثم. (بدائع الصنائع: ۲/ ۳، کتاب الزکاۃ، فصل کیفیۃ فرضیۃ الزکاۃ، ط: دار الکتب العلمیۃ)

(۱) تاہم غریب کو بجائے قرض دینے کے، بلا نیت ثواب مالک بنا کر دے سے وبال حرمت ختم کرنا چاہیے: لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبہ. (رد المحتار علی الدر المختار: ۶/ ۳۸۵، کتاب الحظر و الإباحۃ، فصل في البیع، ط: دار الفکر)

[۲] وذکر في البزازیۃ ھنا أن من لا یحل لہ أخذ الصدقۃ فالأفضل لہ أن لا یأخذ جائزۃ السلطان. (حوالہ سابق: ۲/ ۲۹۲، کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ الغنم، قبیل: مطلب استحلال المعصیۃ القطعیۃ کفر)

غریب کو مالک بنادیں، پھر آپ اس کے پاس سے قرض کے روپے وصول کرلیں، اس طرح آپ کی زکوۃ بھی ادا ہوجائے گی اور قرض بھی وصول ہوجائے گا۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۷] زکوۃ کے روپئے مصارف زکوٰۃ میں دینا ضروری ہے

۱۳۷۷ - سوال: میرے پاس زکوۃ کے پیسے آئے ہیں، تو کیا میں اس کو ضرورت کے مطابق غریب و ضرورت مند کو، ان کی دوا کے لیے دے سکتا ہوں؟ نیز کیا میں ان پیسوں کا ان کی تکفین وتدفین میں استعمال کرسکتا ہوں؟

الجواب حامدا ومصليا:

زکوۃ کے پیسے- جو آپ کے پاس آئے ہیں- آپ کی ملکیت نہیں ہے؛ بل کہ آپ وکیل ہیں؛ لہذا مؤکل نے جیسا حکم دیا ہے، اسی کے مطابق خرچ کریں، ان کی تصریح کے خلاف نہ کریں۔ [2]

---

(۱) واعلم أن أداء الدين عن الدين، والعين عن العين، وعن الدين يجوز، وأداء الدين عن العين، وعن دين سيقبض لا يجوز. وحيلة الجواز أن يعطي مديونه الفقير زكاته، ثم يأخذها عن دينه. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله واعلم إلخ) المراد بالدين ما كان ثابتا في الذمة من مال الزكاة، وبالعين ما كان قائما في ملكه من نقود وعروض، والقسمة رباعية؛ لأن الزكاة إما أن تكون دينا، أو عينا، والمال المزكي كذلك، لكن الدين إما أن يسقط بالزكاة، أو يبقى مستحق القبض بعدها فتصير خمسة، فيجوز الأداء في ثلاثة: الأولى أداء الدين عن دين سقط بها كما مثل من إبراء الفقير عن كل النصاب. الثانية أداء العين عن العين كنقد حاضر عن نقد أو عرض حاضر. الثالثة أداء العين عن الدين كنقد حاضر عن نصاب دين. وفي صورتين لا يجوز: الأولى أداء الدين عن العين كجعله ما في ذمة مديونه زكاة لماله الحاضر، بخلاف ما إذا أمر فقيرا بقبض دين له على آخر عن زكاة عين عنده فإنه يجوز لأنه عند قبض الفقير يصير عينا فكان عينا عن عين. الثانية أداء دين عن دين سيقبض كما تقدم عن البحر، وهو ما لو أبرأ الفقير عن بعض النصاب ناويا به الأداء عن الباقي وعلله بأن الباقي يصير عينا بالقبض فيصير مؤديا بالدين عن العين. اهـ. ... (قوله وحيلة الجواز) أي فيما إذا كان له دين على معسر، وأراد أن يجعله زكاة عن عين عنده أو عن دين له على آخر سيقبض، (قوله أن يعطي مديونه إلخ) قال في الأشباه: وهو أفضل من غيره أي لأنه يصير وسيلة إلى براءة ذمة المديون. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۷۰-۲۷۱، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۱، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) ... الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره كما لو أوصى لزيد بكذا ليس للوصي الدفع إلى غيره فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر - بيروت ☆ المبسوط: ۲/۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/۲۲۶، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا - ديوبند)

ہاں! اگر مصرف کی تعیین کو آپ کے اختیار اور آپ کی صواب دید پر چھوڑا ہے، تو پھر آپ شریعت کے بیان کیے ہوئے مصارف میں خرچ کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی غریب کے علاج میں بھی مدد کر سکتے ہیں، کہ ان کو دوا خرید کر دے دی جائے، یا رقم کا مالک بنا دیا جائے، تا کہ وہ دوا خرید سکے۔ (۱)

کسی کی تکفین و تدفین میں براہ راست زکوۃ کی رقم استعمال کرنا جائز نہیں ہے، اگر تکفین و تدفین کے لیے کسی نے زکوۃ کی رقم دی، تو اس کی زکوۃ ادا نہ ہوگی؛ کیوں کہ زکوۃ میں تملیک (جس کو زکوۃ دی جارہی ہے اس کو مالک بنانا) ضروری ہے، اور میت مالک نہیں بن سکتا۔ (۲)

اس کا طریقہ یہ ہے کہ میت کے کسی محتاج رشتہ دار کو کفن کا خرچ دے دیا جائے، اور اس کو ترغیب دی جائے کہ تم اسے اس کی تدفین میں خرچ کرو، تمہیں ثواب ملے گا۔

ایسا بھی کیا جا سکتا ہے کہ کسی غریب کو رقم کا مالک بنا دیا جائے، اور کہا جائے کہ تم اس رقم کو تدفین و تکفین کا انتظام کرنے والی فلاں انجمن میں دے دو، تا کہ اس سے فلاں غریب آدمی کی تدفین کا نظم ہو سکے، ان شاء اللہ تمہیں اس کا بڑا ثواب حاصل ہوگا۔

اگر وہ بہ خوشی تدفین و تکفین کا انتظام کرنے والی انجمن کے کارکن دے دیتا ہے، تو مقصود حاصل

---

(۱) وللوكيل أن يدفع لولده الفقير وزوجته لا لنفسه إلا إذا قال ربها: ضعها حيث شئت. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: لولده الفقير) وإذا كان ولدا صغيرا فلا بد من كونه فقيرا أيضا لأن الصغير يعد غنيا بغنى أبيه أفاده ط عن أبي السعود وهذا حيث لم يأمره بالدفع إلى معين. (رد المحتار على الدر المختار: ۲۶۹/۲، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد و) لا إلى (كفن ميت وقضاء دينه). (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: نحو مسجد) كبناء القناطر والسقايات وإصلاح الطرقات وكري الأنهار والحج والجهاد وكل ما لا تمليك فيه زيلعي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

ولا يصرف في بناء مسجد، وقنطرة، ولا يقضي بها دين ميت، ولا يعتق عبداً، ولا يكفن ميتا. (المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا - ديوبند ☆ الفتاوى التاتار خانية: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا - ديوبند)

ہوجائے گا۔[1]

زکوۃ کی رقم کو زیادہ مدت تک بلا وجہ روکے رکھنا درست نہیں ہے، وکلاء گنہ گار ہوں گے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۸] وکیل کا مؤکل کی رقم استعمال کر لینے کے بعد اپنی رقم سے صدقہ ادا کرنا

۱۳۷۸- سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام حسب ذیل مسئلے میں کہ:

زید نے ایک آدمی کو پانچ سو روپے دے کر اس بات کا مکلف بنایا کہ میری طرف سے فلاں ادارے میں اسے ہدیۃً دے دینا، اس آدمی نے رقم ادارہ کو دینے کی بجائے خود استعمال کر لیا۔

ایک یا دو سال کے بعد اس نے مؤکل کی اجازت کے بغیر دینے کا ارادہ کیا، تو کیا اب زید کو اس کی اطلاع دینا یا معافی مانگنا ضروری ہے اور اب ۵۰۰/روپیہ دینا صحیح ہے؟ حالاں کہ ایک دو سال میں چیزوں کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور پیسے کی قوت خرید کم ہوجاتی ہے، اگر یہ شخص ادارے کو ایک دو سال پہلے یہ رقم دیتا، تو اس وقت اس سے کئی چیزیں خریدی جا سکتی تھی، جواب ممکن نہیں ہے، تو کیا اب ۵۰۰/سے زیادہ دینا پڑے گا یا وہی کافی ہوجائے گا؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

مذکورہ صورت میں (جب کہ وکیل نے سرے سے صدقہ ہی نہیں دیا، تو) مؤکل کا صدقہ ادا نہ ہوا، اگر صدقہ واجب ہے، تو مالک کو خبر دینا اور اس کی طرف سے اجازت ملنے کے بعد اپنی رقم سے صدقہ ادا کرنا ضروری ہے، اجازت کے بغیر صدقہ ادا نہ ہوگا، اگر ادا کر دیا، تو متبرع ہوگا اور اس پر ضمان لازم آئے گا۔

---

(۱) وحیلة التکفین بها [الزکاة] التصدق علی فقیر، ثم هو یکفن فیکون الثواب لهما، وکذا في تعمیر المسجد، وتمامه في حیل الأشباه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۷۱، کتاب الزکاة، ط: دار الفکر)

لأن الحیلة أن یتصدق علی الفقیر ثم یأمره بفعل هذه الأشیاء (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدین: (قوله: أن الحیلة) أي في الدفع إلی هذه الأشیاء مع صحة الزکاة. (قوله ثم یأمره إلخ) ویکون له ثواب الزکاة وللفقیر ثواب هذه القرب، بحر. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/۳۴۵، کتاب الزکاة، باب المصرف، ط: دار الفکر)

(۲) إذا لم یؤد الزکاة حتی مضی حولان فقد أساء وأثم. (بدائع الصنائع: ۲/۳، کتاب الزکاة، فصل کیفیة فرضیة الزکاة، ط: دار الکتب العلمیة)

اگر صدقہ غیر واجب ہے، تب بھی مذکورہ صورت میں ایک دو سال گزر گئے ہیں، دلالۃً اذن بھی موجود نہیں ہے؛ اس لیے مالک کو مطلع کرنا اور خبر دینا ضروری ہے؛ کیوں کہ یہ مالک کی طرف سے از سر نو صدقہ کے قائم مقام ہے، ممکن ہے، اب وہ صدقۂ تطوع پر راضی نہ ہو، اور اس کو کوئی اہم ضرورت در پیش ہو۔ (شامی: جلد ۲/ ۲۶۹-۲۷۰)[۱]

۵۰۰/روپئے ہی کافی ہیں۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۹] سال کے پورا ہونے پر زکوٰۃ کس حساب سے کتنی ادا کی جائے؟

۱۳۷۹-سوال: سال کے پورا ہونے پر مال تجارت کی زکوٰۃ کس حساب سے، کتنی ادا کی جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوٰۃ جس مال میں فرض ہوئی ہے، اُس کا چالیسواں حصہ یا اُس مال کی پوری قیمت کا چالیسواں حصہ

---

(۱) ولو خلط زكاة موكليه ضمن وكان متبرعا إلا إذا وكله الفقراء. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ضمن وكان متبرعا) لأنه ملكه بالخلط وصار مؤديا مال نفسه. قال في التتارخانية: إلا إذا وجد الإذن أو أجاز المالكان اهـ. الخ (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء)

ولو تصدق بدراهم نفسه أجزأ إن كان على نية الرجوع وكانت دراهم الموكل قائمة. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله ولو تصدق إلخ) أي الوكيل بدفع الزكاة إذا أمسك دراهم الموكل ودفع من ماله ليرجع ببدلها في دراهم الموكل صح. بخلاف ما إذا أنفقها أولا على نفسه مثلا ثم دفع من ماله فهو متبرع. (حوالہ سابق)

إذا هلكت الوديعة أو طرأ نقصان على قيمتها في حال تعدي المستودع أو تقصيره يلزم الضمان. ــــــ مثلا إذا صرف المستودع النقود المودعة عنده في أمور نفسه واستهلكها أو دفعها لغيره وجعله يستهلكها يضمن. وفي هذه الصورة إذا صرف النقود التي هي أمانة عنده على ذلك الوجه ثم وضع محلها من مال نفسه وضاعت بدون تعديه وتقصيره لا يخلص من الضمان. (مجلة الأحكام العدلية- لجنة مكونة من عدة علماء وفقهاء في الخلافة العثمانية، ص: ۱۵۰، مادہ: ۷۸۷، الكتاب السادس في الأمانات، الباب الثاني في الوديعة، الفصل الثاني: في أحكام الوديعة وضمانها، ت: نجيب هواويني، ط: نور محمد، كارخانه تجارتِ كتب، آرام باغ، كراتشي)

(۲) سوال: زید نے عمر کو سو روپیہ زکوٰۃ کے دیے، کہ ان کو تقسیم کردے، مگر عرصہ دس سال گذر گیا، عمر نے تقسیم نہیں کیے، بل کہ استعمال کر لیے، اب عمر ان کو تقسیم کرنا چاہتا ہے، تو کیا صرف سو روپیہ زکوٰۃ کی نکال دے، یا کچھ جرمانہ وغیرہ بھی ہوگا؟

جواب: عمر کو از خود سو روپیہ دینا کافی نہیں، بل کہ اس کے ذمے ضمان لازم ہے، جو زید پر واپس کرنا ضروری ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۹/ ۴۹۵، کتاب الزکاۃ، باب اداء الزکاۃ، وکیل کا زکوٰۃ دینے میں تاخیر کرنا، ط: دار المعارف- دیوبند)

ادا کرنا ضروری ہے، مثلاً کسی چیز کی قیمت سو روپے ہوں، تو اُس میں ڈھائی روپے بطور زکوۃ ادا کرنے ہوں گے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۰] زامبیا کے "کوچوں" کو ہندوستان کے "روپیوں" میں تبدیل کر کے زکوۃ ادا کرنا

۱۳۸۰-سوال: ایک شخص زامبیا (چپاٹا) میں رہتا ہے، اس کے ذمہ وہاں جو زکوۃ واجب ہوئی ہے، مثلاً ایک ہزار "کوچے"، ہندوستان میں بلیک مارکیٹ (غیر سرکاری) طور پر ان کو بیچ کر یہاں کے روپیوں سے اپنے رشتہ داروں میں زکوۃ ادا کرے، تو اس طرح اس کی زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کوچے جب غیر قانونی طور پر فروخت کیے جاتے ہیں، تو ان کی اصل قیمت سے کبھی ۵۰ رفی صد سے بھی کم قیمت ملتی ہے؛ لہٰذا اس طور پر زکاۃ نکالے، تو زکوۃ کی ادائیگی میں نقص رہے گا، جس قدر ["کوچے" کی اصل قیمت سے] کم قیمت حاصل ہوگی، اتنی زکوۃ اس کے ذمہ میں باقی رہے گی۔[2] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وهو ربع عشر نصاب حولي. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۵۷، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

ويجوز دفع القيم في الزكاة عندنا، وكذا في الكفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر كذا في الهداية. . . . وإذا كان لرجل مائتا قفيز حنطة قيمتها مائتا درهم فصاحبها بالخيار، إن شاء أدى زكاتها من العين، وهي خمسة أقفزة حنطة، وإن شاء أدى زكاتها من القيمة كذا في شرح الطحاوي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۱، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، مسائل شتى في الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) (هي) لغة الطهارة والنماء، وشرعا (تمليك) . . . (جزء مال) خرج المنفعة، . . . (عينه الشارع) وهو ربع عشر نصاب حولي. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۵۷-۲۵۶، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - ديوبند)

وأجمعوا أنه لو أدى من خلاف جنسه اعتبرت القيمة، حتى لو أدى من الذهب ما تبلغ قيمته خمسة دراهم من غير الإناء لم يجز في قولهم لتقوم الجودة عند المقابلة بخلاف الجنس، فإن أدى القيمة وقعت عن القدر المستحق، كذا في المعراج نهر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۹۷، كتاب الزكاة، باب زكاة المال)

المال الذي تجب فيه الزكاة أدى زكاته من خلاف جنسه أدى قدر قيمة الواجب إجماعا. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۰، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، قبيل: مسائل شتى في الزكاة)

فأما إذا كان مال الزكاة من أموال الربا كالكيلي والوزني فإن أدى ربع عشر النصاب يجوز كيفما كان.

وإن أدى غيره فلا يخلو إما أن أدى زكاته من جنسه أو من خلاف جنسه فإن أدى من خلاف جنسه كما إذا أدى الفضة عن الذهب أو الحنطة عن الشعير فإنه يؤدي قدر قيمة الواجب بلا خلاف. ـــــ ولو أدى النقص منها فإنه =

[۶۱] زکوٰۃ کی رقم سے مستحقین کے لیے گھر تعمیر کرنا اور اُن سے اُن گھروں کے انتظامی امور کا خرچ وصول کرنا

۱۳۸۱- سوال: کسی جماعت کا ٹرسٹ زکوٰۃ کی رقم سے مستحقین زکوٰۃ کو ٹرسٹ کی ملکیت والی زمین پر مکانات تعمیر کر کے اُن کو مکانات کا مالک بنا دے، اور اُن کو کلی اختیار دے کہ اگر وہ چاہیں تو اُن گھروں میں تبدیل وترمیم کریں، یا انہیں بیچ دیں، مگر چوں کہ حکومتی دستاویز میں یہ زمین ٹرسٹ کے نام پر بہ طورِ سوسائٹی (رہائش گاہ) درج ہے؛ اس لیے بجلی، پانی اور نالی وغیرہ کا سارا انتظامی ماہانہ یا سالانہ خرچ ٹرسٹ ادا کرتا ہے، تو کیا ان انتظامی امور کا خرچ ٹرسٹ اُن سے وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور کیا اس طرح سے ٹرسٹ کی ملکیت والی زمین پر مکانات تعمیر کر کے مستحقین کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

(۱) اگر ٹرسٹ کی (وقف شدہ) زمین غریبوں کے مکان کی تعمیر کے لیے ہو یا ٹرسٹیوں کو پورا اختیار ہو کہ وہ اس زمین پر مکان تعمیر کرنے کی اجازت دیں تو اس صورت میں غریبوں کے مکان اُس وقف زمین پر تعمیر کرنا جائز ہے، زمین جماعت کی رہے گی اور مکان، جس مستحق کو دیا گیا ہے، وہ اُس کی ملک میں رہے گا۔ (رد المحتار: ۳۹۱/۴)[۱]

=يجب عليه التكميل لأن الجودة في أموال الربا معتبرة متقومة عند المقابلة بخلاف الجنس. (تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ): ۳۰۹/۱، كتاب الزكاة، باب من يوضع فيه الصدقة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع- علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۴۱/۲، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى، ط: دار الكتب العلمية ☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق- فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۲۷۸/۱، كتاب الزكاة، باب زكاة المال، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة)

(وجاز دفع القيمة في زكاة، وعشر، وخراج، وفطرة، ونذر، وكفارة غير الإعتاق) وتعتبر القيمة يوم الوجوب، وقالا يوم الأداء. وفي السوائم يوم الأداء إجماعا، وهو الأصح، ويقوم في البلد الذي المال فيه ولو في مفازة ففي أقرب الأمصار إليه، فتح. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲۸۵-۸۶/۲، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم)

[۱] وفي البزازية: لا يجوز وقف البناء في أرض عارية أو إجارة. (الدر المختار) ــــــ وفي الشامية: وفي البزازية: غرس شجرة ووقفها إن غرسها على أرض مملوكة يجوز وقفها تبعا للأرض، وإن بدون أصلها لا يجوز، =

(۲) ایسی زمین پر زکوۃ کی رقم سے مکان تعمیر کر کے غریبوں کو مالک بنادیا جائے، تو جائز ہے، غریب اُس کا مالک بن جائے گا اور زکوۃ بھی ادا ہو جائے گی، لیکن زکوۃ کی جتنی رقم مکان کے سامان (اینٹ، ریت، سمنٹ وغیرہ) میں خرچ ہوئی ہے، اُسی قدر رقم کی زکوۃ ادا ہوگی، تعمیر کی مزدوری میں جو رقم مزدوروں کو دی گئی ہے، وہ زکوۃ کی ادائیگی میں شمار نہیں ہوگی؛ کیوں کہ وہ رقم غریب کے ہاتھ میں نہیں پہنچتی۔ (درمختار: ۲/ ۲۵۷)[۲]

=وإن كانت في أرض موقوفة إن وقفها على تلك الجهة جاز كما في البناء، وإن وقفها على جهة أخرى فعلى الخلاف المذكور في وقف البناء اهـ. (قوله: أو إجارة) يستثنى منه ما ذكره الخصاف، من أن الأرض إذا كانت متقررة للاحتكار، فإنه يجوز، بحر، قال في الإسعاف: وذكر في أوقاف الخصاف إن وقف حوانيت الأسواق، يجوز إن كانت الأرض بإجارة في أيدي الذين بنوها لا يخرجهم السلطان عنها من قبل أنا رأيناها في أيدي أصحاب البناء توارثوها وتقسم بينهم لا يتعرض لهم السلطان فيها، ولا يزعجهم وإنما له غلة يأخذها منهم وتداولها خلف عن سلف، ومضى عليها الدهور وهي في أيديهم، يتبايعونها ويؤجرونها وتجوز فيها وصاياهم ويهدمون بناءها، ويعيدونه، ويبنون غيره، فكذلك الوقف فيها جائز اهـ وأقره في الفتح وذكر أيضا أنه مخصص لإطلاق قوله أو إجارة وقد علمت وجهه وهو بقاء التأبيد وهو مؤيد لما قلنا من تخصيص الوقف لما إذا كانت الأرض محتكرة. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۹۱/۴، كتاب الوقف، استبدال الوقف و شرطه، مطلب في زيادة أجرة الأرض المحتكرة، ط: دار الفكر)

[۲] (هي) لغة الطهارة والنماء، وشرعا (تمليك) خرج الإباحة، فلو أطعم يتيما ناويا الزكاة لا يجزيه إلا إذا دفع إليه المطعوم كما لو كساه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۵۶-۲۵۷، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت)

... الزكاة يجب فيها تمليك المال؛ لأن الإيتاء في قوله تعالى {وآتوا الزكاة} [البقرة: ۴۳] يقتضي التمليك، ولا تتأدى بالإباحة حتى لو كفل يتيما فأنفق عليه ناويا للزكاة لا يجزيه بخلاف الكفارة، ولو كساه تجزيه لوجود التمليك. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۲۵۱-۲۵۲، أول كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة ☆ البحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب-ديوبند ☆ المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفتاوى التاتار خانية: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۳۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

(۳) مستحقین کو جب مکان کا مالک بنا دیا گیا، تو اب مکانات پر جو کچھ بھی انتظامی خرچ آئے گا، وہ اسی [مالک] کو ادا کرنا ہوگا، ٹرسٹی حضرات صرف منتظم ہیں؛ اس لیے بجلی، پانی اور نالی وغیرہ کا خرچ مالکِ مکان کے ذمہ رہے گا، اگر قانونی مجبوری کی وجہ سے یہ خرچ ٹرسٹی حضرات ادا کرتے ہیں، تو اُن کو حق حاصل ہے کہ وہ اُن مکانات کے مالک سے اس خرچ کو وصول کرلیں۔ (درمختار)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۲] مُزکی کا زکوۃ لینے والے آدمی کی دعوت قبول کرنا اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

۱۳۸۲-سوال: احمد نامی شخص نے زید کو زکوۃ دی، زید نے زکوۃ کے مال پر قبضہ کرنے کے بعد اُسی رقم سے احمد کی دعوت کی، تو احمد کے لیے اُس دعوت کو قبول کرنا اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامدًا ومصلّیا:

احمد کے لیے دعوت کھانا جائز ہے، زید کو زکوۃ دی؛ اس لیے زید اُس کا مالک بن گیا، مالک بننے کے بعد اس کو اختیار ہے کہ کسی مال دار کو یا خود زکوۃ دینے والے کو بخشش دے یا ان کی دعوت کرے، اس کی وجہ سے ادائیگی زکاۃ پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، زکاۃ ادا ہو جائے گی۔

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے کے لیے روٹی اور کوئی معمولی سالن پیش کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: چولہے پر کیا ہے؟ جواب دیا کہ صدقہ کا گوشت ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرے لیے صدقہ ہے اور تم مجھے دوگی، تو میرے لیے ہدیہ ہوگا''۔[۲]

---

[۱] (وعمارة الدار) المستأجرة (وتطيينها وإصلاح الميزاب وما كان من البناء على رب الدار) وكذا كل مايخل بالسكنى... (وإصلاح بئر الماء والبالوعة والمخرج على صاحب الدار) لكن (بلا جبر عليه)؛ لأنه لا يجبر على إصلاح ملكه (فإن فعله المستأجر فهو متبرع). (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۸۰-۷۹، كتاب الإجارة، باب فسخ الإجارة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) عن عائشة -رضي الله عنها- قالت: كان في بريرة ثلاث سنن: عتقت فخيرت، وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الولاء لمن أعتق، ودخل رسول الله صلى الله عليه وسلم وبرمة على النار، فقرب إليه خبز وأدم من أدم البيت، فقال: ألم أر البرمة، فقيل: لحم تصدق به على بريرة، وأنت لا تأكل الصدقة، قال: هو عليها صدقة، ولنا هدية. (صحيح البخاري: ۲/ ۷۶۳، رقم الحديث: ۵۰۹۷، كتاب النكاح، باب الحرة تحت العبد، ط: ديوبند، و انظر رقم: ۱۴۹۳، كتاب الزكاة، باب الصدقة على موالي أزواج النبي صلى الله عليه وسلم☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۴۹۴، رقم الحديث: ۸-۱۱ (۱۵۰۴)، كتاب العتق، باب إنما الولاء لمن أعتق، ط: ديوبند) =

اس سے معلوم ہوا کہ مالک بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں؛ اس لیے احمد کے لیے بھی دعوت کھانا جائز ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۳] روزانہ کے منافع پر زکاۃ ادا کرنا کافی ہے؟
[۶۴] پیشگی زکاۃ ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۸۴، ۱۳۸۳-سوال: ایک تاجر کو اس کی روزانہ کی تجارت میں جتنا منافع ہوتا ہے، اس کے مطابق ایک کوچہ (افریقی کرنسی) پر ایک انگوہ نکالتا ہے، تو اس کی زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟

اس کا کہنا ہے کہ میرے کل مال میں جو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اس سے زائد رقم زکوٰۃ کے طور پر میں اس طرح نکال دیتا ہوں۔

حولان حول سے قبل کوئی زکوٰۃ ادا کرے، تو ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامدًا ومصلّیا:

تجارت کا جو مال بہ طور سرمایہ ہو اور سال میں جو نفع ہوا ہو، ان تمام کا چالیسواں حصہ مستحقِ زکوٰۃ کو بہ نیتِ زکوٰۃ ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، خواہ روزانہ نکالے یا ہفتہ میں یا مہینہ میں یا سال میں؛ بہ ہر صورت زکاۃ ادا ہو جائے گی۔[2]

= (فقال-صلى الله عليه وسلم-: "ألم أر برمة فيها لحم") الاستفهام للتقرير (قالوا: بلى، ولكن ذلك لحم تصدق به على بريرة، وأنت لا تأكل الصدقة، قال: "هو") أي اللحم "عليها" أي على بريرة (صدقة ولنا هدية) قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشيء، ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ وهو معنى قول ابن الملك: فيحل التصدق على من حرم عليه بطريق الهدية. (مرقاة المفاتيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۴/ ۱۳۰۳، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) ... أن تبدل الملك كتبدل العين. (البحر الرائق: ۲/ ۲۶۳، كتاب الزكاة، باب دفع الزكاة إلى الأب والجد أو الولد وولد، ط: دار الكتاب الإسلامي-بيروت)

الفقير إذا أباح للغني عين ما أخذ من الزكاة من الطعام، هل يحل له التناول؟ قال بعض المشائخ: يحل، وإليه مال شيخ الإسلام، الفقير إذا أيسر والصدقات التي أخذها قائمة في يده لا بأس بأن يتناول منها. (الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۱۹۹، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا-ديوبند)

(۲) تجب في كل مائتي درهم خمسة دراهم، وفي كل عشرين مثقال ذهب نصف مثقال ... ثم في كل أربعين=

ایک کوچے کے کتنے انگوے ہوتے ہیں؟ اگر چالیس انگوے ہوتے ہیں، تو ایک انگوہ چالیسواں حصہ ہوگا، اگر کل مال یعنی اصل سرمایہ اور منافع کا چالیسواں حصہ اس طرح [فی کوچہ ایک انگوہ] ادا کر دے، تو دکان کے کل مال کی زکاۃ ادا ہو جائے گی۔

اگر اس کے پاس اس کے علاوہ بھی مال ہو، تو اس کی ادائیگی بھی لازم ہے، الغرض قابل زکاۃ اموال کا چالیسواں حصہ ادا کرنا لازم ہے۔

حولان حول سے قبل کوئی زکاۃ ادا کرے، تو ادا ہو جائے گی، شرط یہ ہے کہ وہ صاحب نصاب ہو۔ (۲)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= درهما درهم. (الفتاوى الهندية: ١/ ١٧٨-١٧٩، كتاب الزكاة، الباب الثالث في زكاة الذهب والفضة والعروض، الفصل الأول في زكاة الذهب والفضة، ط: دار الفكر - بيروت)

وأما مقدار الواجب فيه فربع العشر بحديث عمرو بن حزم وحديث علي - رضي الله عنهما - لأن نصف مثقال من عشرين مثقالا ربع عشره. (بدائع الصنائع: ٢/ ١٨-١٩، كتاب الزكاة، فصل مقدار الواجب في زكاة الذهب، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(٢) ويجوز تعجيل الزكاة بعد ملك النصاب، ولا يجوز قبله كذا في الخلاصة. وإنما يجوز التعجيل بثلاثة شروط، أحدها: أن يكون الحول منعقدا عليه وقت التعجيل. والثاني أن يكون النصاب الذي أدى عنه كاملا في آخر الحول. والثالث أن لا يفوت أصله فيما بين ذلك فإذا كان له النصاب من الذهب أو الفضة أو أموال التجارة أقل من المائتين فعجل الزكاة ثم كمل النصاب أو كانت له مائتا درهم أو عروض للتجارة قيمتها مائتا درهم فتصدق بالخمسة عن الزكاة وانتقص النصاب حتى حال عليه الحول والنصاب ناقص أو كان النصاب كاملا وقت التعجيل ثم هلك جميع المال صار ما عجل به تطوعا هكذا في شرح الطحاوي. (الفتاوى الهندية: ١/ ١٧٦، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، قبيل الباب الثاني، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ٢/ ٥٠)

نوٹ: کیا پیشگی ادا زکاۃ کی صحت کے لیے، بوقت تعجیل سال کا گذرنا ضروری ہے؟ یعنی ایک شخص ۱۴۱۵ھ کے ماہ محرم میں پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنا، اور ۱۴۱۶ھ کے ماہ محرم میں اس نے ۱۴۱۵ھ کی [سال گذشتہ کی] زکاۃ اور ۱۴۱۶ھ کی پیشگی زکاۃ ادا کر دی، تو جائز ہے؛ لیکن اگر وہی شخص ۱۴۱۵ھ کے ماہ صفر میں ہی - جب کہ پہلی مرتبہ صاحب نصاب ہوا ہے - پیشگی زکاۃ ادا کر رہا ہے، تو جائز ہے یا نہیں، عالم گیری کی خط کشیدہ عبارت کی روشنی میں عدم جواز مترشح ہوتا ہے، اور یہی مالکیہ کا مسلک ہے؛ کیوں کہ وقت تعجیل [پیشگی زکاۃ کی ادائیگی کے وقت] حولان حول کا تحقق نہیں ہوا ہے، اور حولان حول کے بغیر وجوب متحقق نہیں ہوتا، اور بلا وجوب ادائیگی معتبر نہیں۔

جب کہ بدائع کی عبارت سے جواز معلوم ہوتا ہے، جس کی وجہ یہ ذکر کی گئی ہے کہ وجوب زکاۃ کے لیے حولان حول شرط نہیں؛ بل =

[۶۵] مقدارِ واجب سے زیادہ رقم دے دی ہو، تو زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

گذشتہ سے پیوستہ

۱۳۸۵- سوال: اس شخص کا کہنا ہے کہ سال کے آخر میں دو لاکھ کے مال کا حساب کیا، حالاں کہ جو رقم ہم نے بہ نیت زکاۃ، یومیہ نکالی ہے، وہ مقدار واجب سے زائد ہوتی ہے، تو ایسی صورت میں ہماری زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ یا پھر پورے سال کا حساب کرنے کے بعد زکوۃ نکالی جائے، تب ہی زکاۃ ادا ہوگی؟ اور ایک ساتھ زکاۃ کی پوری رقم کا نکالنا ضروری ہوگا؟

الجواب حامدًا ومصلیًا:

ایک ساتھ ادا کرے، یا متفرق طور پر، اگر کل مال کا چالیسواں حصہ یا اُس سے زائد بہ نیت زکاۃ مستحق کو مالک بنادے، تو ذمہ داری سے بری ہو جائے گا، اور اگر چالیسویں حصے سے کم کی ادائیگی

= کہ نصاب کے بہ قدر مال کا موجود ہونا کافی ہے، اور اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ وجوب زکاۃ کا سبب حولان حول ہے، تب بھی سبب وجوب کے پائے جانے کے بعد، وجوب سے قبل عبادت کی ادائیگی درست ہے، تفصیلی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

وأما حولان الحول فليس من شرائط جواز أداء الزكاة عند عامة العلماء، وعند مالك من شرائط الجواز فيجوز تعجيل الزكاة عند عامة العلماء خلافا لمالك والكلام في التعجيل في مواضع في بيان أصل الجواز وفي بيان شرائطه وفي بيان حكم المعجل إذا لم يقع زكاة.ـــــــــــ أما الأول فهو على الاختلاف الذي ذكرنا وجه قول مالك أن أداء الزكاة أداء الواجب، وأداء الواجب ولا وجوب لا يتحقق، ولا وجوب قبل الحول، لقول النبي - صلى الله عليه وسلم - لا زكاة في مال حتى يحول عليه الحول «, ولنا ما روي »أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - استسلف من العباس زكاة سنتين« وأدنى درجات فعل النبي - صلى الله عليه وسلم - الجواز.ـــــــــــ وأما قوله إن أداء الزكاة أداء الواجب ولا وجوب قبل حولان الحول فالجواب عنه من وجهين أحدهما ممنوع أنه لا وجوب قبل حولان الحول بل الوجوب ثابت قبله لوجود سبب الوجوب وهو ملك نصاب كامل نام أو فاضل عن الحاجة الأصلية لحصول الغنى به ولوجوب شكر نعمة المال على ما بينا فيما تقدم... الثاني إن سلمنا أنه لا وجوب قبل الحول لكن سبب الوجوب موجود وهو ملك النصاب ويجوز أداء العبادة قبل الوجوب بعد وجود سبب الوجوب كأداء الكفارة بعد الجرح قبل الموت... الخ. (بدائع الصنائع: ۵۱/۲-۵۰، كتاب الزكاة، فصل حولان الحول هل هو من شرائط أداء الزكاة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

صورت مسئولہ میں اگر پہلی مرتبہ نصاب کا مالک ہوا ہو، تو اختلاف سے بچنے کے لیے بہتر یہ ہے کہ پیشگی زکاۃ ادا نہ کرے، تاہم اگر کسی نے پیشگی ادا کردی، تو زکاۃ ادا ہو جائے گی۔

ہورہی ہے، تو ذمہ داری باقی رہے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۲۶] غریب شوہر کا زکوۃ کے پیسوں سے اپنی مال دار بیوی کا علاج کروانا

۱۳۸۶- سوال: بیوی صاحب نصاب ہو اور اس کا شوہر زکوۃ کا مستحق ہو، تو شوہر کے ذمہ بیوی کا علاج واجب ہونے کی وجہ سے شوہر زکوۃ کے پیسے مانگ کر اپنی بیوی کا علاج کرواسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

شوہر پر بیوی کا علاج کرانا واجب نہیں ہے،[2] عورت زکوۃ کے نصاب کی مالک ہو، اس کے باوجود شوہر اگر مستحق زکوۃ ہو، تو شوہر دوسرے کے پاس سے زکوۃ کے پیسے وصول کر کے اپنی مال دار بیوی کا علاج کرواسکتا ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) فإن أدى ربع عشر النصاب يجوز كيفما كان؛ لأنه أدى ما وجب عليه. (بدائع الصنائع: ۲/ ۴۱، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى، ط: دار الكتب العلمية)

سوال سابق کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) ولا يجب الدواء للمرض، ولا أجرة الطبيب، ولا الفصد، ولا الحجامة، كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۴۹، كتاب الطلاق، الباب السابع عشر في النفقات، الفصل الأول في نفقة الزوجة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۵۷۵، كتاب الطلاق، باب النفقة، مطلب لا تجب على الأب نفقة زوجة ابنه الصغير، ط: دار الفكر - بيروت)

[۳] عن عائشة رضي الله عنها، أنها أرادت أن تشتري بريرة للعتق، وأراد مواليها أن يشترطوا ولاءها، فذكرت عائشة للنبي صلى الله عليه وسلم، فقال لها النبي صلى الله عليه وسلم: اشتريها فإنما الولاء لمن أعتق، قالت: وأتي النبي صلى الله عليه وسلم بلحم، فقلت: هذا ما تصدق به على بريرة، فقال: هو لها صدقة، ولنا هدية. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۰۲، رقم الحديث: ۱۴۹۳، كتاب الزكاة، باب الصدقة على موالي أزواج النبي صلى الله عليه وسلم، ط: البدر - ديوبند)

إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه وصار له كسائر ما يملكه ويستكسبه، فله أن يهدي به غيره كما له أن يهدي سائر أمواله بلا فرق. (شرح الطيبي - شرف الدين الحسين بن عبد الله بن محمد الطيبي (م: ۷۴۳هـ): ۵/ ۱۵۰۴، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة - الرياض)

[٦٧] زکوۃ کے وکیل کا زکوۃ کی رقم میں حیلہ کرنا

١٣٨٧- سوال: زید نے بکر کو کچھ روپے دیے، یا کوئی چیز مثلاً: کپڑا وغیرہ دیا اور کہا کہ حیلہ کر کے غریبوں میں تقسیم کر دینا، بکر کہتا ہے کہ میں چوں کہ خود ہی مستحق زکوۃ ہوں؛ لہٰذا دوسروں سے حیلہ کرانے کے بجائے، میں خود اس کا مالک بن کر غریبوں میں تقسیم کر دیتا ہوں، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر مؤکل نے غریبوں میں تقسیم کرنے کی اجازت دی ہے، تو اسے غرباء میں تقسیم کر دے، حیلہ کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ غرباء و مساکین مستحقین زکاۃ ہیں۔

اگر وکیل مستحق زکوۃ ہے، تو اس کو چاہیے کہ مؤکل سے اس مجلس میں ملکیت حاصل کر لے، ورنہ وکیل بننے کے بعد خود اسے حیلہ کر کے لینا (مالک بن جانا) جائز نہ ہوگا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(١) وللوكيل أن يدفع لولده الفقير وزوجته لا لنفسه إلا إذا قال ربها: ضعها حيث شئت. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: وهذا حيث لم يأمره بالدفع إلى معين. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ٢٦٩، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا
وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ
السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾.

(۹-التوبۃ:۶۰)

باب مصارف الزکاۃ

[مصارف زکاۃ کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب مصارف الزكاة

[زکاۃ کے مصارف کا بیان]

[۱] زکوۃ میں حیلہ کرکے موذن واساتذہ کے مکانات بنانا

۱۳۸۸- سوال: زکوۃ کے پیسوں میں حیلہ کر کے موذن یا اساتذہ کی رہائش گاہ کا انتظام کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ المستفتی: رفاعی سجیم

الجواب حامداً ومصلیا:

زکوۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک ضروری ہے، مستحق کو مالک بنائے بغیر زکوۃ ادا نہ ہوگی، لہٰذا زکوۃ کی رقم سے موذن اور اساتذہ کے مکانات بنانا جائز نہیں کہ اس میں تملیک نہیں پائی جاتی ہے، ہاں مکان بنا کر موذن اور اساتذہ کو- جب کہ وہ مستحق زکوۃ ہوں- مالکانہ حیثیت سے دے دیا جائے، تو زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ (۱)

(۱) ويشترط أن يكون الصرف (تمليكا) لا إباحة كمامر (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد و) لا إلى (كفن ميت وقضاء دينه). (الدر المختار مع الرد: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت☆تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

ولا يصرف في بناء مسجد، وقنطرة، ولا يقضي بها دين ميت، ولا يعتق عبداً، ولا يكفن ميتا. (المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا - ديوبند☆ الفتاوى التاتار خانية: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا - ديوبند)

یاد رہے کہ زکوۃ غریبوں کا حق ہے۔ [۲] لہٰذا تنظیم کی انتظامیہ کو چاہیے کہ محنت کر کے لوگوں سے للہ رقم کا چندہ کریں اور محض للہ رقم سے تنظیم و ٹرسٹ کے ذریعے مکانات بنائیں، زکوۃ کے پیسوں میں حیلہ کر کے مکانات بنانے میں غرباء کا حق ضائع کرنا ہے، جب مسجد کی تعمیر کے لیے للہ کی رقم، لاکھوں میں ملتی ہے، تو غریبوں کی بازآبادکاری یا اساتذہ، ائمہ و مؤذنین کے مکانات کی تعمیر کے لیے کیوں نہیں ملے گی؟ اس لیے للہ رقم سے مکانات بنائے جائیں، یہی بہتر ہے۔ [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۲) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ، فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٠﴾ (۹-التوبۃ:۶۰)

زياد بن الحارث الصدائي، قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعته، فذكر حديثا طويلا، قال: فأتاه رجل، فقال: أعطني من الصدقة، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله تعالى لم يرض بحكم نبي ولا غيره في الصدقات، حتى حكم فيها هو، فجزأها ثمانية أجزاء، فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقك. (سنن أبي داود: ١/ ٢٣٠، رقم الحديث: ١٦٣٠، كتاب الزكاة، باب من يعطي من الصدقة، وحد الغنى، ط: ديوبند)

قوله [تعالى]: إنما الصدقات للفقراء الآية... تدل على أنه لا حق في الصدقات لأحد إلا لهذه الأصناف الثمانية، وذلك مجمع عليه، وأيضا فلفظة (إنما) تفيد الحصر ويدل عليه وجوه. (مفاتيح الغيب = التفسير الكبير - أبو عبد الله محمد بن عمر، التيمي الرازي الملقب بـ'فخر الدين الرازي' خطيب الري (م:٦٠٦هـ): ١٦/ ٨٠، سورة التوبة: ٩، آية: ٦٠، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

ثم بين مواضعها التي توضع فيها فقال {إِنَّمَا الصدقات لِلْفُقَرَاءِ والمساكين} قصر جنس الصدقات على الأصناف المعدودة أي هي مختصة بهم لا تتجاوز إلى غيرهم كأنه قيل إنما هي لهم لا لغيرهم كقولك إنما الخلافة لقريش تريد لا تتعداهم ولا تكون لغيرهم. (تفسير النسفي (مدارك التنزيل وحقائق التأويل) - أبو البركات عبد الله بن أحمد بن محمود حافظ الدين النسفي (م:٧١٠هـ): ١/ ٦٨٨، سورة التوبة: ٦٠، ت: يوسف علي بديوي، ط: دار الكلم الطيب - بيروت ☆ جامع البيان في تأويل القرآن - محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي، أبو جعفر الطبري (م:٣١٠هـ): ١٤/ ٣٠٥، سورة التوبة: ٦٠، ت: أحمد محمد شاكر، ط: مؤسسة الرسالة)

(٣) والدليل على جوازه [الحيلة] من الكتاب - قوله تعالى -: {وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث} هذا تعليم المخرج لأيوب - عليه السلام - عن يمينه التي حلف ليضربن زوجته مائة،... وقال - تعالى -: {فلما جهزهم بجهازهم جعل السقاية في رحل أخيه} [يوسف: ٧٠] إلى قوله {ثم استخرجها من وعاء أخيه كذلك كدنا ليوسف} [يوسف: ٧٦] وذلك منه حيلة، وكان هذا حيلة لإمساك أخيه عنده حينئذ ليوقف إخوته على مقصوده....

وأما السنة فما روي: أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قال يوم الأحزاب لعروة بن مسعود في شأن بني قريظة فلعلنا أمرناهم بذلك، فلما قال له عمر - رضي الله عنه - في ذلك قال - عليه السلام -: الحرب خدعة، وكان ذلك منه

[۲] بلا ضرورت حیلہ کرکے زکوۃ کی رقم استعمال کرنا جائز نہیں

۱۳۸۹- سوال: ایک شخص اپنی زکوۃ کی رقم سے، اپنے رشتہ دار کے علاوہ، کسی دوسرے ایسے آدمی کی مدد کرنا چاہتا ہے، جو فی نفسہ زکوۃ کا مستحق تو نہیں ہے، مگر اس کی مالی حالت کمزور ہے، کیا اس کی کوئی سبیل ہے کہ اس کی مدد بھی ہو جائے اور زکوۃ دینے والے کی زکوۃ بھی ادا ہو جائے؛ جیسا کہ سنا گیا ہے کہ زکوۃ کی رقم کا حیلۂ تملیک کرلیا جائے، تو اس کو غیر مستحق زکوۃ بھی استعمال کر سکتا ہے، کیا بات صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو اس کا حیلہ کس طرح کیا جائے؟

الجواب حامداو مصلیا:

زکوہ کی رقم اس کے مستحق کو ملنی چاہیے، جب مذکورہ آدمی زکوۃ کا مستحق ہی نہیں ہے، تو اس کے لیے خواہ مخواہ حیلہ کرنا بہتر نہیں ہے۔ ''حیلہ'' ضرورت کے درجے میں تو جائز ہے، مثلاً: مسجد و مدرسے کی تعمیرات کے لیے زکوۃ کی رقم استعمال کرنا جائز نہیں، مگر دوسری جانب صورت حال یہ ہے کہ مسجد و مدرسے کے لیے مکان کی

اكتساب حيلة ومخرج من الإثم بتقييد الكلام بلعل . . . وهذا تعليم الحيلة والآثار فيه كثيرة، من تأمل أحكام الشرع وجد المعاملات كلها. . . فالحاصل: أن مايتخلص به الرجل من الحرام أو يتوصل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن، وإنما يكره ذلك أن يحتال في حق لرجل حتى يبطله أو في باطل حتى يموهه أو في حق حتى يدخل فيه شبهة فما كان على هذا السبيل فهو مكروه، وما كان على السبيل الذي قلنا أو لا فلا بأس به. (المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۳۰/۱۱-۲۱۰، كتاب الحيل، ط: دار المعرفة-بيروت)

مذهب علمائنا - رحمهم الله تعالى - أن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير أو لإدخال شبهة فيه أو لتمويه باطل فهي مكروهة وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال فهي حسنة، والأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله تعالى {وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث} [ص: ۴۴] وهذا تعليم المخرج لأيوب النبي - عليه وعلى نبينا الصلاة والسلام - عن يمينه التي حلف ليضربن امرأته مائة عود وعامة المشايخ على أن حكمها ليس بمنسوخ وهو الصحيح من المذهب كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۶/ ۳۹۰، كتاب الحيل، الفصل الأول في بيان جواز الحيل، ط: دار الفكر)

استاذ گرامی، آفتاب فقہ، دار العلوم دیو بند کے عظیم مفتی، حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی- رحمہ اللہ- اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

حیلہ خواہ مخواہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ زکوۃ کے مصارف متعین ہیں، حیلہ کے بعد جو اصل مستحق ہیں، وہ عملا محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے حیلہ کی صورت انتہائی مجبوری میں اختیار کرنی چاہیے۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۶/ ۱۹۹، حاشیہ نمبر: ۲، مسائل مصارف زکاۃ، حیلہ کے ذریعے زکاۃ کی رقم تبلیغ میں خرچ کرنا کیسا ہے؟ ط: زکریا- دیو بند) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

سخت ضرورت ہے، اللہ رقم دینے والا کوئی نہیں ہے، تو ایسے نازک حالات میں حیلۂ تملیک کر کے اس رقم کو مذکورہ کاموں کے لیے استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] کسی دین دار محتاج شخص کی مدد کے لیے زکوٰۃ کی رقم میں حیلہ کرنا

۱۳۹۰- سوال: زید ہر سال اپنی زکوٰۃ ادا کرتا ہے، بکر ایک دین دار، دین کی فکر رکھنے والا اور دین کی خدمت کرنے والا محتاج آدمی ہے، اُس کا مکان بہت زیادہ بوسیدہ ہو چکا ہے اور اس وجہ سے اُس میں مرمّت کے لیے زید زکوٰۃ کی رقم کے ذریعہ مدد کرنا چاہتا ہے، اور یہ رقم بکر تک پہنچانے کے لیے وہ عمرو نامی غریب آدمی کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنا کر اُس سے کہے کہ تو یہ رقم بکر کو بہ طورِ ہدیہ بکر کو دے دے، اور عمرو بھی اُسے بہ خوشی دینے کے لیے تیار ہے، تو اس طرح کا حیلہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً ومسلماً...

اگر اس طرح دین کے خدمت گذار محتاج شخص کو مکان کی مرمّت کی ضرورت ہے، تو مذکورہ حیلہ کے ذریعے اُس کی اِمداد کی گنجائش ہے۔ (درمختار)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] زکوٰۃ وصدقہ کی رقم سے طلبہ کی فیس ادا کرنا

۱۳۹۱- سوال: غریب طلبہ- جو فیس بھرنے کی استطاعت نہیں رکھتے ہیں- کو صدقہ اور کفارہ وغیرہ کی رقوم دی جائیں، پھر وہ ناظم صاحب کو فیس کے طور پر ادا کر دیں، تو اس طرح صدقہ وکفارہ ادا ہو جائے

---

(۱) مذهب علمائنا - رحمهم الله تعالى - أن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير أو لإدخال شبهة فيه أو لتمويه باطل فهي مكروهة وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال فهي حسنة، والأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله تعالى {وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث} وهذا تعليم المخرج لأيوب النبي - عليه وعلى نبينا الصلاة والسلام - عن يمينه التي حلف ليضربن امرأته مائة عود وعامة المشايخ على أن حكمها ليس بمنسوخ وهو الصحيح من المذهب كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۶/ ۳۹۰، كتاب الحيل، الفصل الأول في بيان جواز الحيل، ط: دار الفكر)

مزید تفصیل کے لیے ''زکوٰۃ میں حیلہ کر کے مؤذن واساتذہ کے مکانات بنانا'' کا حاشیہ نمبر (۳) دیکھیں۔

[۲]... الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب، بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ غریب طلبہ کو وہ رقم دے دیں اور ان کو اس کا مالک بنادیں۔[۱] پھر چاہے وہ اس رقم سے فیس ادا کریں، کتابیں خریدیں، کرایہ میں استعمال کریں، اپنے اساتذہ کو ہدیہ دیں یا ان کو دعوت کھلائیں؛ سب جائز ہے، اس سے کوئی فرق نہ آئے گا، صدقۂ واجبہ: زکوٰۃ، کفارہ وغیرہ بلاشبہ ادا ہوجائے گا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] صاحب نصاب کو زکوٰۃ دینا

۱۳۹۲- سوال: ایک شخص کے پاس آٹھ تولہ سونا ہے- جو اس کے رشتہ داروں نے اس کی شادی کے موقع پر دیا تھا- لیکن اس کی تنخواہ بہت مختصر ہے، زکوٰۃ ادا کرنے کی اس کے پاس استطاعت نہیں ہے، تو ایسے شخص کو زکوٰۃ کے پیسے دے سکتے ہیں؟ نیز ایسے شخص کی بیوی کو زکاۃ کی رقم دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس شخص کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا، یا اس سے زائد ہو، اور وہ حاجتِ اصلیّہ سے فارغ ہو،

---

(۱) (هي) لغة الطهارة والنماء، وشرعا (تمليك) خرج الإباحة، فلو أطعم يتيما ناويا الزكاة لا يجزيه إلا إذا دفع إليه المطعوم كمالو كساه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۵۶-۲۵۷، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: كان في بريرة ثلاث سنن: عتقت فخيرت، وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الولاء لمن أعتق، ودخل رسول الله صلى الله عليه وسلم وبرمة على النار، فقرب إليه خبز وأدم من أدم البيت، فقال: ألم أر البرمة، فقيل: لحم تصدق به على بريرة، وأنت لا تأكل الصدقة، قال: هو عليها صدقة، ولنا هدية. (صحيح البخاري: ۲/۷۶۳، رقم الحديث: ۵۰۹۷، كتاب النكاح، باب الحرة تحت العبد، ط: ديوبند، وانظر رقم: ۱۴۹۳، كتاب الزكاة، باب الصدقة على موالي أزواج النبي صلى الله عليه وسلم. ☆الصحيح لمسلم: ۱/۴۹۴، رقم الحديث: ۸-۱۱ (۱۵۰۴)، كتاب العتق، باب إنما الولاء لمن أعتق، ط: ديوبند)

(فقال- صلى الله عليه وسلم-: "ألم أر برمة فيها لحم") الاستفهام للتقرير (قالوا: بلى، ولكن ذلك لحم تصدق به على بريرة، وأنت لا تأكل الصدقة، قال: "هو") أي اللحم "عليها" أي على بريرة (صدقة ولنا هدية) قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ وهو معنى قول ابن الملك: فيحل التصدق على من حرم عليه بطريق الهدية. (مرقاة المفاتيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۴/۱۳۰۳، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر- بيروت)

اس کے ذمہ کوئی قرض نہ ہو، تو وہ شرعاً مال دار ہے، جس کو زکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں، اور نہ ہی اس کے لیے لینا جائز ہے۔[1] وہ خود نصاب کا مالک ہے، اگر اس کے مال [سونا] پر حولان حول ہو [سال گذر جائے] تو اس کے لیے زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔[2] البتہ اگر اس کی بیوی کے پاس نصاب کے بہ قدر سونا وغیرہ نہ ہو، تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] بینک میں جمع کردہ زکوٰۃ پر ملنے والے سود کا حکم

۱۳۹۳- سوال: ہمارے یہاں بارڈولی میں ''دی مسلم اسٹوڈنٹس یونین، بارڈولی'' نام کا ایک ادارہ ہے، جو تقریباً ۳۳؍سال سے اپنی خدمت انجام دے رہا ہے، اس میں زکوٰۃ کے روپے کثرت سے آتے ہیں، اس ''زکوٰۃ فنڈ'' کو بینک میں رکھنے کی وجہ سے اس پر ہر سال سود بڑھتا رہتا ہے، تو اس سود کی رقم- جو کہ ایک خطیر رقم ہے- کو کہاں استعمال کرنا چاہیے؟ واضح رہے کہ ہمارا یہ ادارہ غریب اور بیوہ کی کفالت کرتا ہے، اسی طرح اسکول و مدرسہ کے طلبہ کی تعلیمی وداخلہ فیس اور ان کی کتابوں وغیرہ کا انتظام کرتا ہے اور ان کی ہر طرح سے امداد کرتا ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ مذکور سود کی رقم مذکورہ مصارف ہی میں استعمال کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر اس کی اجازت نہیں ہے، تو پھر اس کا مصرف کیا ہے؟ سال رواں کی زکوٰۃ اور مذکورہ [سود کی] کچھ جمع رقم اور اس پر ملنے والا سود کافی مقدار میں ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے ''ٹرسٹ قانون'' کے تحت کچھ رقم کے ضبط ہو جانے کا اندیشہ بھی ہے، اس لیے اس سلسلے میں رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوٰۃ کی رقم کا ایک مصرف دینی ودنیوی تعلیم حاصل کرنے والے غریب طلبہ ہیں، ان کی ماہانہ وداخلہ

---

(۱) (و) لا إلی (غني) يملك قدر نصاب فارغ عن حاجته الأصلية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۷، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) "الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما وحال عليه الحول". (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ) : ۱/ ۱۸۵، أول كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی-دیوبند)

(۳) ويدفع إلى إمرأة غني إذا كانت فقيرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۹، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا-ديوبند)

فیس، اسی طرح ان کی کتابیں، کپڑے، جوتے چپل، چھتری وغیرہ؛ ضروری چیزیں خرید کر ان کو اس کا مالک بنادیا جائے، یا نقد رقم ہی دے دی جائے، جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کرسکیں، تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔ [1]

سود کی رقم بھی اس مصرف میں استعمال کرسکتے ہیں؛ لیکن اس میں ثواب کی نیت درست نہیں، بغیر ثواب کی نیت کے منتظمین، مذکورہ مصرف میں خرچ کردیں، تو اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہوجائیں گے۔ [2]

---

(۱)(هي)... (تمليك) خرج الإباحة،... (جزء مال) خرج المنفعة،... (عينه الشارع) وهو ربع عشر نصاب حولي خرج النافلة والفطرة (من مسلم فقير) ولو معتوها (غير هاشمي ولا مولاه) أي معتقه، وهذا معنى قول الكنز تمليك المال: أي المعهود إخراجه شرعا (مع قطع المنفعة عن المملك من كل وجه) ... (لله تعالى).[الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۵۶-۲۵۸، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر- بيروت)

... أن طالب العلم يجوز له أخذ الزكاة ولو غنيا إذا فرغ نفسه لإفادة العلم واستفادته لعجزه عن الكسب والحاجة داعية إلى ما لا بد منه. (الدر المختار)ـــــــو في حاشية ابن عابدين: وفي المبسوط: لا يجوز دفع الزكاة إلى من يملك نصابا إلا إلى طالب العلم والغازي ومنقطع الحج لقوله - عليه الصلاة والسلام -: يجوز دفع الزكاة لطالب العلم وإن كان له نفقة أربعين سنة. اهـ... والمعنى أن الإنسان يحتاج إلى أشياء لا غنى عنها فحينئذ إذا لم يجز له قبول للزكاة مع عدم اكتسابه أنفق ما عنده ومكث محتاجا فينقطع عن الإفادة والاستفادة فيضعف الدين لعدم من يتحمله... قلت: وهو كذلك. والأوجه تقييده بالفقير، ويكون طلب العلم مرخصا لجواز سؤاله من الزكاة وغيرها وإن كان قادرا على الكسب إذ بدونه لا يحل له السؤال كما سيأتي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۰، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر- بيروت☆البحر الرائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة، قبيل: باب صدقة الفطر، ط: دار الكتاب الإسلامي☆مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۲۰، كتاب الزكاة، باب في بيان أحكام المصرف، ط: دار إحياء التراث العربي☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ)، ص: ۷۲۰، كتاب الزكاة، باب المصرف، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲)والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/ ۹۹، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالا حراما، ط: دار الفكر- بيروت)

وعلى هذا لو مات مسلم وترك ثمن خمر باعه مسلم لا يحل لورثته كما بسطه الزيلعي. (الدر المختار)ـــــــو في حاشية ابن عابدين (م: ۱۲۵۲هـ): وقال في النهاية: قال بعض مشايخنا: كسب المغنية كالمغصوب لم يحل أخذه، وعلى هذا قالوا لو مات الرجل وكسبه من بيع الباذق أو الظلم أو أخذ الرشوة يتورع الورثة، ولا يأخذون منه=

اگر منتظمین اس سلسلہ میں فوری کاروائی نہ کریں اور ان کی سستی کی وجہ سے ادارہ کا کوئی نقصان ہو، تو وہ ذمہ دار و گنہ گار ہوں گے۔ فرزندانِ قوم محتاج تھے، اس کے باوجود ان پر رقم خرچ نہیں کی گئی، یہاں تک کہ رقم کے ضبط ہونے کا خطرہ لاحق ہوگیا، یہ کارکنان کی لاپرواہی کو ظاہر کرتا ہے؛ اس لیے لازم ہے کہ کارکنان اپنی غلطی کی اصلاح کریں اور رقم نکال کر فوراً خرچ کریں، تاکہ رقم ضبط نہ ہو۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] زکوۃ اور سود کی رقم اپنی بہنوں کو دینا

۱۳۹۴-سوال: زید مال دار آدمی ہے، وہ اپنی بالغ غریب بہنوں کو اپنی زکوۃ اور سود کے پیسے ثواب کی نیت کے بغیر دینا چاہے، تو دے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر بہنیں اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہوں،

= شيئا وهو أولى بهم ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۸۵، كتاب الحظر و الإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) عن الحسن، أن عبيد الله بن زياد، عاد معقل بن يسار في مرضه الذي مات فيه، فقال له معقل إني محدثك حديثا سمعته من رسول الله صلى الله عليه وسلم، سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: ما من عبد استرعاه الله رعية، فلم يحطها بنصيحة، إلا لم يجد رائحة الجنة. (صحيح البخاري: ۲/ ۱۰۵۸، رقم الحديث: ۷۱۵۰، كتاب الأحكام، باب من استرعي رعية فلم ينصح، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۸۱، رقم الحديث: ۲۲۷- (۱۴۲)، كتاب الإيمان، باب استحقاق الوالي الغاش لرعيته النار، ط: ديوبند)

عن عائشة - رضي الله عنها - قالت: يقول [رسول الله صلى الله عليه وسلم] في بيتي هذا: اللهم، من ولي من أمر أمتي شيئا فشق عليهم، فاشقق عليه، ومن ولي من أمر أمتي شيئا فرفق بهم، فارفق به. (الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۲۲-۱۲۱، رقم الحديث: ۱۹- (۱۸۲۸)، كتاب الإمارة، باب فضيلة الإمام العادل، وعقوبة الجائر، والحث على الرفق بالرعية، والنهي عن إدخال المشقة عليهم، ط: ديوبند)

عن عبد الله، قال النبي صلى الله عليه وسلم: كلكم راع وكلكم مسئول، فالإمام راع وهو مسئول، والرجل راع على أهله وهو مسئول، والمرأة راعية على بيت زوجها وهي مسئولة، والعبد راع على مال سيده وهو مسئول، ألا فكلكم راع وكلكم مسئول. (صحيح البخاري: ۲/ ۷۷۹، رقم الحديث: ۵۱۸۸، كتاب النكاح، باب: قوا أنفسكم وأهليكم نارا، ط: البدر - ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۲۲، رقم الحديث: ۲۰- (۱۸۲۹)، كتاب الإمارة، باب فضيلة الإمام العادل، وعقوبة الجائر، والحث على الرفق بالرعية، والنهي عن إدخال المشقة عليهم، ط: ديوبند)

والدین غریب ہوں اور اپنا خرچ نہ اٹھا سکتے ہوں، تب بھی ان [بہنوں] کو زکوۃ کی رقم دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

اپنی غریب بہن کو زکوۃ اور [ثواب کی نیت کے بغیر] سود کی رقم دینا جائز ہے۔[1] البتہ غریب بہن کو زکوۃ دے کر اپنے غریب والدین پر خرچ کرنے کے لیے بہن کو حیلہ کے طور پر استعمال کرنا مکروہ ہے۔ (شامی: ۲/ ۸۷)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] اپنی محتاج اولاد کو زکوۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

۱۳۹۵- سوال: اگر اولاد محتاج ہو، شادی شدہ ہو اور علاحدہ رہتی ہو، تو انھیں باپ زکوۃ دے سکتا ہے یا نہیں؟ میری لڑکی کی شادی ہو چکی ہے، داماد تنگ دست ہے، تو کیا میں اسے زکوۃ دے سکتا ہوں؟

الجواب حامدا ومصليا:

اپنی اولاد کو خواہ لڑکا ہو یا لڑکی، شادی شدہ ہو یا غیر شادہ شدہ، زکوۃ نہیں دی جا سکتی، ہاں، البتہ اگر داماد محتاج ہے، تو اسے دینا جائز ہے، لہٰذا زکوۃ کا مالک داماد کو بنائے، نہ کہ اپنی بیٹی کو۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قالوا: الأفضل صرف الصدقة إلى أخواته ذكورا أو إناثا. (مجمع الأنهر: ۱/ ۳۳۳، كتاب الزكاة، باب في بيان أحكام المصرف، ط: فقيه الأمة - ديوبند)

والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/ ۹۹، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالا حراما، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) [فرع] يكره أن يحتال في صرف الزكاة إلى والديه المعسرين بأن تصدق بها على فقير ثم صرفها الفقير إليهما كما في القنية. ــــــــ قال في شرح الوهبانية وهي شهيرة مذكورة في غالب الكتب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۲، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) (ولا) إلى (من بينهما ولاد) ولو مملوكا لفقير. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وإلى من بينهما ولاد) أي بينه وبين المدفوع إليه؛ لأن منافع الأملاك بينهم متصلة فلا يتحقق التمليك على الكمال هداية والولاد بالكسر مصدر ولدت المرأة ولادة وولادا مغرب أي أصله وإن علا كأبويه وأجداده وجداته من قبلهما وفرعه وإن سفل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۶، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر - بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۳۳۱، كتاب الزكاة، باب في بيان أحكام المصارف، ط: فقيه الأمة، ديوبند ☆ النهر الفائق: ۱/ ۳۶۳، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الإيمان - سهارنبور) =

[۹] صاحبِ استطاعت باپ کی بالغ اولاد زکوۃ کی حق دار ہے یا نہیں؟

۱۳۹۶-سوال: ایک بالغ طالبِ علم کے والد کے پاس کرایہ پر دی جانے والی ایک ٹیکسی، رہنے کے مکان کے علاوہ ایک زائد مکان اور بینک میں ساٹھ ہزار روپئے نقد موجود ہیں، ان میں سے کوئی چیز اِس بالغ طالبِ علم کے نام پر دستاویز میں درج نہیں ہے، تو کیا یہ طالبِ علم زکوۃ، صدقہ یا فطرہ لے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر لے تو اُس میں کوئی کراہت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صاحبِ استطاعت شخص کی بالغ کی اولاد اگر خود صاحبِ نصاب نہیں ہے تو وہ زکوہ کے مصارف میں شامل ہے، اُن کو زکوۃ دینا جائز ہے، اگر چہ یہ اولاد اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہو، اُس میں کوئی کراہت نہیں۔ (درمختار مع شامی)[۲]

= (قال) : ولا يعطي زكاته وعشره ولده وولد ولده وأبويه وأجداده وكل من ينسب إلى المؤدي بالولادة، أو ينسب إليه بالولادة، ولا يجوز صرف الزكاة إليه؛ لأن تمام الإيتاء بانقطاع منفعة المؤدي عما أدى والمنافع بين الآباء والأبناء متصلة. قال الله تعالى: {آباؤكم وأبناؤكم لا تدرون أيهم أقرب لكم نفعا فريضة} [النساء: ۱۱] فلم يتم الإيتاء بالصرف إليهم. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۳/۱۱، كتاب الزكاة، باب عشر الأرضين، ط: دار المعرفة-بيروت)

ويجوز دفعها لزوجة أبيه وابنه وزوج ابنته تتارخانية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۴۶، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر-بيروت)

[۲] (و) لا إلى (طفله) بخلاف ولده الكبير. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: ولا إلى طفله) أي الغني فيصرف إلى البالغ ولو ذكرا صحيحا قهستاني، فأفاد أن المراد بالطفل غير البالغ ذكرا كان أو أنثى في عيال أبيه أو لا على الأصح لما عنده أنه يعد غنيا بغناه نهر (قوله: بخلاف ولده الكبير) أي البالغ كما مر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۴۹-۳۵۰، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر)

وأما ولد الغني فإن كان صغيرا لم يجز الدفع إليه وإن كان فقيرا لا مال له؛ لأن الولد الصغير يعد غنيا بغنى أبيه وإن كان كبيرا فقيرا يجوز؛ لأنه لا يعد غنيا بمال أبيه فكان كالأجنبي. (بدائع الصنائع: ۲/۴۷، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى إليه، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

لیکن اگر باپ تمام ضروریات کا کفیل بنا ہوا ہے، اور کسی بھی چیز کی تنگی محسوس نہیں ہونے دیتا، تو ایسی اولاد کے لیے زکوٰۃ سے بچنا اولیٰ اور برکت کا باعث ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] زکوٰۃ کھانے والے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا

۱۳۹۷- سوال: پیش امام زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر لے سکتا ہے یا نہیں؟ اور زکوٰۃ کھانے والے کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر امام مستحق ہے، تو وہ زکوٰۃ یا صدقۃ الفطر لے سکتا ہے، جائز ہے۔[1]

مستحق زکاۃ، اگر زکاۃ لیتا ہو، تو اس کی امامت سے نماز میں کوئی کراہیت نہیں آتی، اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے نماز بلا کراہت ادا ہو جائے گی، بس شرط یہ ہے کہ وہ اس میں امامت کی شرائط پائی جاتی ہوں اور وہ مرتکب کبیرہ نہ ہو اور صغیرہ پر مصر نہ ہو۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن أبي كبشة السلولي، قال: حدثني سهل بن الحنظلية، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول "من سأل الناس عن ظهر غنى، فإنما يستكثر من جمر جهنم. قلت: يا رسول الله، وما ظهر غنى؟ قال أن يعلم أن عند أهله ما يغديهم، أو ما يعشيهم". (شرح معاني الآثار - أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة بن عبد الملك بن سلمة الأزدي الحجري المصري المعروف بالطحاوي (م: ۳۲۱هـ): ۲/ ۲۰، رقم الحديث: ۳۰۲۶، كتاب الزكاة، باب ذي المرة السوي الفقير هل يحل له الصدقة أم لا؟، ت: محمد زهري النجار، محمد سيد جاد الحق، و د. يوسف عبد الرحمن المرعشلي، ط: عالم الكتب)

(۲) مصرف الزكاة... (هو فقير، وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۳۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) الأولى بالإمامة أعلمهم بأحكام الصلاة. هكذا في المضمرات وهو الظاهر. هكذا في البحر الرائق هذا إذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا في التبيين ولم يطعن في دينه. كذا في الكفاية وهكذا في النهاية. ويجتنب الفواحش الظاهرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، الفصل الثاني في بيان من هو أحق بالإمامة، ط: زكريا - ديوبند ☆ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۱/ ۱۵۷، كتاب الصلاة، فصل بيان من هو أحق بالإمامة وأولى بها، ط: دار الكتب العلمية ☆ تحفة الفقهاء - أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو: ۵۴۰هـ): ۱/ ۲۳۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(قوله وفاسق) من الفسق: وهو الخروج عن الاستقامة، ولعل المراد به من يرتكب الكبائر كشارب الخمر، =

[۱۱] جس کے ذمے بینک کا قرض ہو، اس کو زکوٰۃ دینا

۱۳۹۸- سوال: ایک شخص زامبیا میں رہتا ہے، اس کے رشتے دار یہاں ہندوستان میں ہیں، ویسے تو خوش حال ہیں؛ لیکن ان کے ذمہ بینک کا کچھ قرض ہے، تو انہیں اس قرض کی ادائیگی کے لیے وہ شخص زکوٰۃ کی رقم دے سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً:

اگر زامبیا میں رہنے والے شخص کے رشتے دار واقعی زکوٰۃ کے مستحق ہیں، تو ان کو زکوٰۃ دینے میں کوئی حرج نہیں۔(۱) لیکن اگر انہوں نے مثلاً دس ہزار کا قرض لیا ہے اور ان کے پاس زیور یا ضرورت سے زائد اس قدر مال ہے، جو قرض کی ادائیگی کے بعد بھی مقدار نصاب کے برابر ہے، تو ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، ان کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔(۲) ہاں اگر ان کے ذمہ ۲۵/ ہزار کا قرض ہے اور زیورات وغیرہ صرف بارہ ہزار کے ہیں، تو ان کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔(۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=والزاني وآكل الربا ونحو ذلك، كذا في البرجندي إسماعيل. . . . وأما الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بأنه لا يهتم لأمر دينه، وبأن في تقديمه للإمامة تعظيمه، وقد وجب عليهم إهانته شرعا، ولا يخفى أنه إذا كان أعلم من غيره لا تزول العلة، فإنه لا يؤمن أن يصلي بهم بغير طهارة، فهو كالمبتدع تكره إمامته بكل حال، بل مشى في شرح المنية على أن كراهة تقديمه كراهة تحريم لما ذكرنا. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۰، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر- بيروت)

والاصرار على ذلك [أي الذنب الصغير] بمنزلة الكبيرة، فيجب الاحتراز عنه. (نور الأنوار ص: ۱۸۳، باب أقسام السنة، بيان شرط الراوي، ط: مكتبة بلال- ديوبند)

والإصرار على الصغيرة كبيرة. (العناية شرح الهداية- محمد بن محمد بن محمود، أكمل الدين أبو عبد الله ابن الشيخ شمس الدين ابن الشيخ جمال الدين الرومي البابرتي (م: ۷۸۶هـ): ۷/ ۴۲۰، كتاب الشهادات، شهادة أهل الأهواء، ط: دار الفكر ☆ منحة الخالق لابن عابدين على البحر الرائق: ۷/ ۸۶، كتاب الشهادات، باب من تقبل شهادته ومن لا تقبل، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۱) مصرف الزكاة. . . (هو فقير، وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۳۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) (و) لا إلى (غني) يملك قدر نصاب فارغ عن حاجته الأصلية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۷، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر- بيروت)

(۳) (ومنها الغارم)، وهو من لزمه دين، ولا يملك نصابا فاضلا عن دينه. . . . والدفع إلى من عليه الدين أولى من الدفع إلى الفقير كذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف)

[۱۲] زکوۃ کی رقم سے آمد ورفت کا خرچ نکالنا

۱۳۹۹- سوال: زید کا سوال ہے کہ اگر وہ ایک صاحب کی زکوۃ لینے کے لیے بمبئی جائے، تو خرچ اس [زکاۃ کی رقم] میں سے لے سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر زکوۃ دینے والا شخص اپنی زکاۃ کی رقم میں سے دے، تو لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوۃ کی رقم 'غریب، بیوہ وغیرہ- جو مستحقِ زکوۃ ہیں- کو دینے سے ہی ادا ہوگی۔(۱) صاحب مال کا کسی غریب کو ممبئی بلاکر زکوۃ سے کرایہ ادا کرنا، یا منی آرڈر سے رقم بھیج کر اس کی فیس وضع کرنا، جائز نہیں ہے، اس قدر زکوۃ ذمہ میں باقی رہے گی۔(۲) البتہ غریب کو زکوۃ کی رقم دے دے، پھر وہ خواہ کرایہ میں استعمال کرے، یا کسی

---

(۱) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۖ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٠﴾ (۹- التوبۃ: ۶۰)

زياد بن الحارث الصدائي، قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعته، فذكر حديثا طويلا، قال: فأتاه رجل، فقال: أعطني من الصدقة، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله تعالى لم يرض بحكم نبي ولا غيره في الصدقات، حتى حكم فيها هو، فجزأها ثمانية أجزاء، فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقك. (سنن أبي داود: ۱/۲۳۰، رقم الحديث: ۱۶۳۰، كتاب الزكاة، باب من يعطي من الصدقة، وحد الغنى، ط: ديوبند)

قوله [تعالى]: إنما الصدقات للفقراء الآية تدل على أنه لا حق في الصدقات لأحد إلا لهذه الأصناف الثمانية، وذلك مجمع عليه، وأيضا فلفظة (إنما) تفيد الحصر ويدل عليه وجوه. (مفاتيح الغيب = التفسير الكبير- أبو عبد الله محمد بن عمر، التيمي الرازي الملقب بـ'فخر الدين الرازي' خطيب الري (م: ۶۰۶هـ): ۱۶/۸۰، سورة التوبة: ۹، آية: ۶۰، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

مصرف الزكاة... (هو فقير، وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۳۳۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) (هي) لغة الطهارة والنماء، وشرعا (تمليك) خرج الإباحة... (جزء مال) خرج المنفعة... (عينه الشارع) وهو ربع عشر نصاب حولي خرج النافلة والفطرة (من مسلم فقير) ولو معتوها (غير هاشمي ولا مولاه) أي معتقه، ... (مع قطع المنفعة عن المملك من كل وجه) فلا يدفع لأصله وفرعه (لله تعالى). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۵۶-۲۵۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر- بيروت)

ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (المصدر السابق: ۲/۲۷۰، كتاب الزكاة)

سوال: زکوۃ کا روپیہ اگر بذریعہ منی آرڈر روانہ کیا جاوے، تو فیس منی آرڈر اس میں سے دینا جائز ہے یا نہیں؟ =

اور میں، زکوۃ بہ ہر حال ادا ہو جائے گی۔ [۳] اور یہ کہنا بھی ضروری نہیں کہ مثلاً ۵۰۰ رزکوۃ کے اور ۲۰۰ رسفر خرچ کے، بس ۷۰۰ ر روپے زکوۃ کی نیت سے اسے دے دے، زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ [۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= الجواب: بذریعہ منی آرڈر بھیجنا زکوۃ کے روپے کا، درست ہے، مگر فیس منی آرڈر علاحدہ اپنے پاس سے دینی چاہیے۔

استاذ گرامی، آفتاب فقہ دارالعلوم دیوبند کے عظیم مفتی، حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اور یہ مسلّم ہے کہ فیس منی آرڈر، فقراء کو نہیں ملتی؛ اس لیے وہ زکوۃ میں شمار نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم۔'' (فتاوی دار العلوم: ۶/ ۳۵-۳۲۴، متفرق مسائل زکوۃ، سوال نمبر: ۶۱۱: زکوۃ کی رقم بذریعہ ڈاک بھیجنے میں فیس کہاں سے دی جائے، ط: زکریا- دیوبند)

(۳) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: كان في بريرة ثلاث سنن: عتقت فخيرت، وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الولاء لمن أعتق، ودخل رسول الله صلى الله عليه وسلم وبرمة على النار، فقرب إليه خبز وأدم من أدم البيت، فقال: ألم أر البرمة، فقيل: لحم تصدق به على بريرة، وأنت لا تأكل الصدقة، قال: هو عليها صدقة، ولنا هدية. (صحيح البخاري: ۲/ ۷۶۳، رقم الحديث: ۵۰۹۷، كتاب النكاح، باب الحرة تحت العبد، ط: ديوبند، وانظر رقم: ۱۴۹۳، كتاب الزكاة، باب الصدقة على موالي أزواج النبي صلى الله عليه وسلم☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۴۹۴، رقم الحديث: ۸-۱۱(۱۵۰۴)، كتاب العتق، باب إنما الولاء لمن أعتق، ط: ديوبند)

(فقال - صلى الله عليه وسلم -: " ألم أر برمة فيها لحم ") الاستفهام للتقرير (قالوا: بلى، ولكن ذلك لحم تصدق به على بريرة، وأنت لا تأكل الصدقة، قال: " هو ") أي اللحم " عليها " أي على بريرة (صدقة ولنا هدية) قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ وهو معنى قول ابن الملك: فيحل التصدق على من حرم عليه بطريق الهدية. (مرقاة المفاتيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۴/ ۱۳۰۳، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) ولم يشترط المصنف - رحمه الله - علم الآخذ بما يأخذه أنه زكاة، للإشارة إلى أنه ليس بشرط، وفيه اختلاف والأصح كما في المبتغى والقنية: أن من أعطى مسكينا دراهم، وسماها هبة، أو قرضا، ونوى الزكاة، فإنها تجزئه. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۲۲۸، كتاب الزكاة، شروط أداء الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

ولا يشترط علم الفقير بأنها زكاة على الأصح لما في البحر عن القنية والمجتبى الأصح أن من أعطى مسكينا دراهم وسماها هبة أو قرضا ونوى الزكاة، فإنها تجزئه اهـ. (درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۱/ ۱۷۴، كتاب الزكاة، شروط وجوب الزكاة، ط: دار إحياء الكتب العربية☆مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۱۹۶، كتاب الزكاة، شرط صحة أداء الزكاة، ط: دار إحياء التراث العربي☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۱، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۸، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر)

[۱۳] ۲۵/بیگہ زمین کا مالک بھی زکوٰۃ کا مستحق ہوسکتا ہے

۱۴۰۰-سوال: میرے ایک دوست، تبلیغ میں جاتے رہتے ہیں؛ لیکن ان کے ذمہ بہت سارے قرض ہیں، ان کے والد ضرورت مند ہیں، وہ بھی مقروض ہیں، میرے دوست کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے، اس نے مجھے بتایا کہ میں نے اپنے والد کا قرضہ بھی اپنے ذمے لے لیا ہے، یہ کپڑوں کا کاروبار کرتے ہیں اور ان کی ۲۴-۲۵ بیگہ (۱) کے قریب زمین بھی ہے۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ اس کو زکوٰۃ کے پیسے قرض کی بھرپائی [ادائیگی] کے لیے دینا جائز ہے یا نہیں؟ ہم نے جب بھی اس سلسلے میں اس سے بات کی، تو اس نے منع کر دیا اور کہا میں زکوٰۃ نہیں لے سکتا، تو کیا اس کے لیے زکوٰۃ لینے کی شرعاً اجازت نہیں ہے؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کا دوست جب مقروض ہے، خواہ اس کا ذاتی قرضہ ہو، یا اپنے والد کا قرض اس نے اپنے ذمہ لے لیا ہو، (۱) قرض کی ادائیگی کے لیے اسے زکوٰۃ دینا درست ہے، آپ کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، بہ شرطے کہ اس کے پاس اتنی رقم موجود نہ ہوں، جس سے قرض کی ادائیگی کے بعد بہ قدر نصاب باقی رہ جاتا ہو۔ (۲) اور

---

(۱) بیگہ = زمین کی ایک مقدار، چار کنال یا ۸۰/مرلے۔ (فیروز اللغات، ص: ۲۵۷، ب-ی، ط: فیروز اینڈ سنز، لاہور)

(۱) وقد علم مساواة دين الكفالة لسائر الديون، فلا فرق بين شيء منها. (أحكام القرآن - أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م: ۳۷۰ھ): ۳/ ۱۶۳، مطلب: في بيان معنى الفقير والمسكين، ت: عبد السلام محمد علي شاهين، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) قوله تعالى: {والغارمين}؛ قال أبو بكر: لم يختلفوا أنهم المديون، وفي هذا دليل على أنه إذا لم يملك فضلا عن دينه مائتي درهم فإنه فقير تحل له الصدقة؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "أمرت أن آخذ الصدقة من أغنيائكم وأردها في فقرائكم". فحصل لنا بمجموع الآية والخبر أن الغارم فقير، إذ كانت الصدقة لا تعطى إلا الفقراء بقضية قوله صلى الله عليه وسلم: "وأردها في فقرائكم" وهذا يدل أيضا على أنه إذا كان عليه دين يحيط بماله، وله مال كثير أنه لا زكاة عليه، إذ كان فقيرا يجوز له أخذ الصدقة. والآية خاصة في بعض الغارمين دون بعض، وذلك لأنه لو كان له ألف درهم، وعليه دين مائة درهم لم تحل له الزكاة، ولم يجز معطيه إياها وإن كان غارما، فثبت أن المراد الغريم الذي لا يفضل له عما في يده بعد قضاء دينه مقدار مائتي درهم أو ما يساويها، فيجعل المقدار المستحق بالدين مما في يده كأنه في غير ملكه، وما فضل عنه فهو فيه بمنزلة من لا دين عليه. (أحكام القرآن - أحمد بن علي أبو بكر الرازي =

ایسوں کو زکاۃ دینا، بڑے ثواب کا کام ہے اور فقیر کو دینے کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔ (۳)

آپ کے دوست کے پاس ۲۴-۲۵ بیگہ جو زمین ہے، وہ تو اس کا ذریعۂ معاش ہے، اس سے زکوۃ کے استحقاق میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیوں کہ وہ تو ضرورت اصلیہ میں داخل ہے، آپ بس قرض کی ادائیگی کے لیے ان کو زکوۃ دے دیں، آپ کی زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] قرض ادا کرنے کے لیے زکوۃ مانگنا جائز ہے

۱۴۰۱- سوال: ایک شخص ۲۰۰۰ روپے کا مقروض ہے، نوکری کرتا ہے، تنخواہ ۱۵۰ روپے ہے، اور زمین پانچ بیگہ ہے، ایسی حالت میں زکوۃ لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ صورت میں اس شخص کا زکوۃ لینا جائز ہے، بل کہ قرض ادا کرنے کے لیے زکوۃ مانگنا بھی جائز ہے، زکوۃ دہندوں کی زکوۃ بلاشبہ ادا ہو جائے گی، بہ شرطے کہ اس کے پاس مقدار قرض کے علاوہ بہ قدر نصاب مال نہ ہو۔ [1]

=الجصاص الحنفي (م:۳۷۰ھ): ۳/ ۱۶۳-۱۶۴، مطلب: في بيان معنى الفقير و المسكين، ت: عبد السلام محمد علي شاهين، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(ومنها الغارم)، وهو من لزمه دين، ولا يملك نصابا فاضلا عن دينه. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر- بيروت)

(۳) والدفع إلى من عليه الدين أولى من الدفع إلى الفقير كذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف)

(۴) وفيها [التاتارخانية] عن الصغرى: له دار يسكنها لكن تزيد على حاجته بأن لا يسكن الكل يحل له أخذ الصدقة في الصحيح، وفيها سئل محمد عمن له أرض يزرعها أو حانوت يستغلها أو دار غلتها ثلاث آلاف ولا تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة؟ يحل له أخذ الزكاة وإن كانت قيمتها تبلغ ألوفا وعليه الفتوى وعندهما لا يحل اهـ ملخصا. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۸، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، قبيل: مطلب في جهاز المرأة هل تصير به غنية، ط: دار الفكر- بيروت)

[۱] (ومنها الغارم)، وهو من لزمه دين، ولا يملك نصابا فاضلا عن دينه. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر- بيروت)

والدفع إلى من عليه الدين أولى من الدفع إلى الفقير كذا في المضمرات. (المصدر السابق)

زمین ضرورت اصلیہ میں سے ہے؛ اس لیے اس شخص کے صاحب نصاب ہونے میں اس کی قیمت نہیں لگائی جائے گی۔[۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] ۴۰ ربیگہ زمین کا مالک بھی زکوٰۃ کا مستحق ہوسکتا ہے

۱۴۰۲- سوال: ایک شخص ہے، جس کے پاس ۴۰ ربیگہ زمین ہے؛ لیکن فیملی ممبران کی تعداد زیادہ ہے، جس کی وجہ سے زمین کے غلے سے اخراجات پورے نہیں ہوتے، ہر سال قرض ہوتا رہتا ہے، فی الحال قرض بہت زیادہ ذمے میں ہوگیا ہے، زمین کی پیداوار سے گھر کا گزران مشکل سے چلتا ہے، تو ایسی صورت میں وہ قرض کی بھرپائی کے لیے زکوٰۃ کی رقم رشتہ داروں سے- جو دینا چاہتے ہیں- لے سکتا ہے؟ مذکورہ زمین حوائج اصلیہ میں داخل ہے یا نہیں؟ جب کہ اس زمین سے مکمل طور پر گزارہ بھی نہیں ہو رہا ہے۔

اگر اس شخص کے لیے زکوٰۃ کی اجازت نہ ہو، تو اس کی بیوی یا بڑی اولاد جو ساتھ رہتی ہے، اور غریب ہے، زکوٰۃ لے کر گھر کے خرچ میں استعمال کرسکتی ہے یا نہیں؟ امید ہے کہ مفصل جواب مرحمت فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلياً:

کھیتی کی زمین، سونا چاندی (اموال زکوٰۃ) کے حکم میں نہیں ہے، پس کوئی شخص ۴۰-۵۰ بیگہ یا ایکڑ زمین کا مالک ہو، لیکن مقروض ہو، تو وہ زکوٰۃ کا مستحق ہے۔[۱]

---

(۲) (ولا في ثياب البدن) المحتاج إليها لدفع الحر والبرد ابن ملك (وأثاث المنزل ودور السكنى ونحوها) [الدر المختار] ــــــــ قال ابن عابدين: وقوله ونحوها: أي كثياب البدن الغير المحتاج إليها وكالحوانيت والعقارات. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۵-۲۶۴، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر-بيروت)

وفيها [التاتارخانية] سئل محمد عمن له أرض يزرعها أو حانوت يستغلها أو دار غلتها ثلاث آلاف ولا تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة؟ يحل له أخذ الزكاة وإن كانت قيمتها تبلغ ألوفا، وعليه الفتوى وعندهما لا يحل اهـ ملخصا. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۸، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، قبيل: مطلب في جهاز المرأة هل تصير به غنية، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) ولا يجوز دفع الزكاة إلى من يملك نصابا من أي مال كان، لأن الغنى الشرعي مقدر به الشرط أن يكون فاضلا من الحاجة الأصلية. (الهداية) ــــــــ قال العيني (م: ۸۵۵ھ): م: (ولا يجوز دفع الزكاة إلى من ملك نصابا من أي مال كان) ش: يعني سواء كان من النقدين أو من العروض أو من السوائم م: (لأن الغنى الشرعي مقدر به) ش: أي بالنصاب م: (والشرط أن يكون فاضلا عن الحاجة الأصلية) ش: أي شرط عدم جواز دفع الزكاة إليه أن يكون النصاب فاضلا عن الحاجة الأصلية، لأنه إذا كان غير فاضل عن حاجته الأصلية يجوز الدفع إليه، والحاجة =

لہٰذا صورت مسئولہ میں اس شخص کے قرض کی بھرپائی زکوٰۃ کی رقم سے کی جاسکتی ہے، زکوٰۃ دہندہ کی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی اور جو رشتے دار زکوٰۃ وغیرہ سے اس کی مدد کریں گے، ان کو صلہ رحمی کا ثواب بھی ملے گا۔ (۲)

چوں کہ صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص خود ہی مستحق ہے، اس لیے اس کی بیوی یا اولاد کو مالک بنانے کا حیلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] صدقات کی رقم ترجیحی بنیاد پر کہاں خرچ کی جائے؟

۱۴۰۳- سوال: ہمارے گاؤں میں جو مکتب ہے، اس میں صرف ابتدائی تعلیم ہوتی ہے، حفظ کلاس اور فارسی کی کلاس نہیں ہے، آگے پڑھنے کے لیے چھوٹے بچوں کو دور دراز کا سفر کرنا پڑتا ہے، اسکول کی تعلیم سات درجہ تک ہے، کچھ سال پہلے بیرونِ ملک رہنے والے اصحاب خیر نے پیسے جمع کر کے تقریباً ۵۰۰ ۷ ر کا ایک مکان اسکول کے لیے بنا دیا تھا، گاؤں میں دوسری اور سہولیات مثلاً اسپتال، یتیم اور بیوہ کی روزگاری کا کوئی انتظام وغیرہ نہیں ہے، یہاں سے تقریباً دو میل دور چن گاؤں میں ایک ہائی اسکول ہے، جس کی وجہ سے وہاں بس وغیرہ کا اچھا انتظام ہے، وہاں ایک تنظیم کی طرف سے گاؤں کے غریب، یتیم بچوں کو اسکول کی کتابیں مفت دی جاتی ہیں، اس کو دیکھ کر اب کچھ روشن خیال لوگوں نے بھی ہمارے گاؤں میں ہائی

=الأصلية في حق الدراهم والدنانير أن يكون الدين مشغولا بها، وفي غيرها احتياجه إليه في الاستعمال وأحوال المعاش. (البناية شرح الهداية: ۳/۷۷-۴۷۶، كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقات إليه ومن لا يجوز، الحكم لو دفع الزكاة لغير مستحقيها وهو لا يعلم، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

وفيها [التاتارخانية] عن الصغرى: له دار يسكنها لكن تزيد على حاجته بأن لا يسكن الكل يحل له أخذ الصدقة في الصحيح، وفيها سئل محمد عمن له أرض يزرعها أو حانوت يستغلها أو دار غلتها ثلاث آلاف ولا تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة؟ يحل له أخذ الزكاة وإن كانت قيمتها تبلغ ألوفا وعليه الفتوى وعندهما لا يحل اهـ ملخصا. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۴۸، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، قبيل: مطلب في جهاز المرأة هل تصير به غنية، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) عن سلمان بن عامر، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن الصدقة على المسكين صدقة، وعلى ذي الرحم اثنتان صدقة وصلة. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳هـ): ۵/۹۲، رقم الحديث: ۲۵۸۲، كتاب الزكاة، الصدقة على الأقارب، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية-حلب)

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے عنوان ''زکوٰۃ میں حیلہ کر کے موذن واساتذہ کے مکانات بنانا'' کا حاشیہ نمبر: ۳۔

اسکول کھولنے کا ارادہ کیا ہے، جس کے لیے وہ بیرونِ ملک رہنے والے گاؤں کے لوگوں سے چندہ کا ارداہ رکھتے ہیں، تو اب سوال یہ ہے کہ گاؤں کے مذکورہ ضروری کاموں میں کون سا کام پہلے کرنا چاہیے؟

الجواب حامداو مصلیا:

آپ کے گاؤں میں کیا کیا اہم ضرورتیں ہیں؟ وہ ہمیں معلوم نہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں پیسہ خرچ کرنے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود معلوم کرلے کہ اس کو کون سا کام کرانا ضروری ہے، اور کس کام سے بالخصوص غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور محتاجوں اور بالعموم تمام مسلم قوم کا نفع وفائدہ ہے، اس طرح کرنے میں ثواب زیادہ ملے گا۔ [1]

ثواب کی نیت سے ہائی اسکول بنانا اور اس میں انگریزی تعلیم کا نظم کرنے کی گنجائش ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس میں اسلام مخالف تعلیم نہ دی جاتی ہو اور نہ کوئی گناہ کا کام کیا جاتا ہو، ورنہ بجائے ثواب کے اس میں دامے، درمے، سخنے، قدمے کسی بھی طرح امداد کرنے والے گنہ گار ہوں گے۔ [2]

بہتر یہ ہے کہ مذکورہ منصوبہ، دین دار حضرات اپنے ہاتھ میں لیں اور شرعی نظام کے تحت بروئے کار لانے کی کوشش کریں، نیز اس کا خیال رکھیں کہ اسلام کے خلاف اس میں کوئی چیز نہ در آئے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] غریب طلبہ کو فیس کی ادائیگی کے لیے زکوٰۃ کی رقم دینا

۱۴۰۴- سوال: آغاز شوال میں ایک علمی ادارہ کا افتتاح ہونے والا ہے، جس میں دینی وعصری؛

---

(۱) عن ابن مسعود -رضي الله عنه- عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: لا تزول قدم ابن آدم يوم القيامة من عند ربه حتى يسأل عن خمس، عن عمره فيم أفناه، وعن شبابه فيم أبلاه، وماله من أين اكتسبه وفيم أنفقه، وماذا عمل فيما علم. (سنن الترمذی: ۲/ ۶۷، رقم الحديث: ۲۴۱۶ - ۲۴۱۷، أبواب صفة القيامة، باب ماجاء في شأن الحساب و القصاص، ط: فیصل پبلیکیشنز - دیوبند)

عن أنس بن مالك -رضي الله عنه- قال: أتى النبي صلى الله عليه وسلم رجل يستحمله، فلم يجد عنده ما يحمله فدله على آخر فحمله، فأتى النبي صلى الله عليه وسلم فأخبره فقال: إن الدال على الخير كفاعله. (سنن الترمذی: ۲/ ۹۵، رقم الحديث: ۲۶۷۰، أبواب العلم، باب ماجاء الدال على الخير كفاعله، ط: دیوبند)

(۲) وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢﴾. (۵- المائدۃ: ۲)

ہر دو تعلیم کا نظم ہوگا، اس میں تقریباً ۳۰ طلبا سیاہ فام ہیں، جو ٹرم فیس ادا کرنے سے معذور ہیں اور فی ٹرم دو ہزار روپیہ ہوتا ہے، تو کیا یہ طلبا جو غریب ہیں، ان کے اخراجات کے لیے زکوٰۃ کا پیسہ استعمال کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوٰۃ کا شرعاً معنیٰ ہے: "تمليك جزء مال عينه الشارع" (درمختار مع الشامی: ۲/ ۳)[۱] یعنی شریعت کی جانب سے متعین کردہ مال کے ایک حصہ کا مستحق (غریب، فقیر) کو مالک بنانا ہے۔ جو [بالغ] طالب علم غریب وفقیر ہو [یا نابالغ طالب علم کے والد ایسے ہوں] وہ زکوٰۃ کا مستحق ہے۔[۲] علامہ شامیؒ نے فی سبیل اللہ میں تمام طلبہ کو داخل کیا ہے۔ (شامی: ۲/ ۸۴۰)[۳]

---

[۱] (هي) . . . (تمليك) خرج الإباحة، . . . (جزء مال) خرج المنفعة، . . . (عينه الشارع) وهو ربع عشر نصاب حولي خرج النافلة والفطرة (من مسلم فقير) ولو معتوها (غير هاشمي ولا مولاه) أي معتقه، وهذا معنى قول الكنز تمليك المال: أي المعهود إخراجه شرعا (مع قطع المنفعة عن المملك من كل وجه) . . . (لله تعالى). [الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۵۶-۲۵۸، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) (و) لا إلى (غني) يملك قدر نصاب فارغ عن حاجته الأصلية . . . (و) لا إلى (طفله). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۷-۳۴۹، كتاب الزكاة، باب المصرف)

قال ابن عابدين: (قوله: ولا إلى طفله) أي الغني فيصرف إلى البالغ ولو ذكرا صحيحا قهستاني، فأفاد أن المراد بالطفل غير البالغ ذكرا كان أو أنثى في عيال أبيه أو لا على الأصح لما أنه يعد غنيا بغناه نهر. (رد المحتار: ۲/ ۳۴۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت)

[۳] (وفي سبيل الله وهو منقطع الغزاة) وقيل الحاج وقيل طلبة العلم، وفسره في البدائع بجميع القرب. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: وقيل طلبة العلم) كذا في الظهيرية والمرغيناني واستبعده السروجي بأن الآية نزلت وليس هناك قوم يقال لهم طلبة علم قال في الشرنبلالية: واستبعاده بعيد؛ لأن طلب العلم ليس إلا استفادة الأحكام وهل يبلغ طالب رتبة من لازم صحبة النبي - صلى الله عليه وسلم - لتلقي الأحكام عنه كأصحاب الصفة، فالتفسير بطالب العلم وجيه خصوصا، وقد قال في البدائع: في سبيل الله جميع القرب، فيدخل فيه كل من سعى في طاعة الله، وسبيل الخيرات إذا كان محتاجا. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۳، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت)

. . . أن طالب العلم يجوز له أخذ الزكاة ولو غنيا إذا فرغ نفسه لإفادة العلم واستفادته لعجزه عن الكسب والحاجة داعية إلى ما لا بد منه. (الدر المختار) ـــــ وفي حاشية ابن عابدين: وفي المبسوط: لا يجوز دفع الزكاة إلى من يملك نصابا إلا إلى طالب العلم والغازي ومنقطع الحج لقوله - عليه الصلاة والسلام - يجوز دفع الزكاة لطالب العلم وإن كان له نفقة أربعين سنة. اهـ. . . . والمعنى أن الإنسان يحتاج إلى أشياء لا غنى عنها فحينئذ =

لہٰذا آپ کے ادارہ میں دینی وعصری تعلیم حاصل کرنے والے غریب طالب علم کو زکاۃ کی رقم کا مالک بنادیا جائے اور آفس میں ان سے ٹرم فیس کے نام سے وصول کرلیا جائے، اس طرح زکاۃ بھی ادا ہوجائے گی اور وہ اپنی ٹرم فیس بھی بھر سکیں گے، ہر طالب علم سے ہر ماہ اسی طریقہ سے وصول کرلیا کریں، یا سال کی ابتداء میں وصول کرلیا کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] مدارس میں زکوٰۃ وصدقات کی رقم لینا

۱۴۰۵- سوال: مدارس میں صدقات وزکوٰۃ کی رقم لینا کیسا ہے؟

الجواب حامدًا ومصلّیا:

جائز ہے: لیکن مہتمم کا شریعت کے اصول کے مطابق غریب کو مالک بنانا ضروری ہے، مالک بنانے سے زکوٰۃ وصدقات ادا ہوجائیں گے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] سادات کو زکوٰۃ دینے کا حکم

۱۴۰۶- سوال: اگر کوئی سید شخص غریب ہو، تو اس کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامدًا ومصلیاً:

اگر اس سید کا کوئی سہارا نہ ہو، تو گنجائش ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=إذا لم يجز له قبول للزكاة مع عدم اكتسابه أنفق ما عنده ومكث محتاجا فينقطع عن الإفادة والاستفادة فيضعف الدين لعدم من يتحمله... قلت: وهو كذلك. والأوجه تقييد بالفقير، ويكون طلب العلم مرخصا لجواز سؤاله من الزكاة وغيرها وإن كان قادرا على الكسب إذ بدونه لا يحل له السؤال كما سيأتي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۰، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت☆البحر الرائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة، قبيل: باب صدقة الفطر، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۲۰، كتاب الزكاة، باب في بيان أحكام المصرف، ط: دار إحياء التراث العربي☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح-أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ) ص: ۷۲۰، كتاب الزكاة، باب المصرف، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۱) سوال سابق کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) واعلم أن الصدقات النافلة يجوز دفعها إلى آل النبي صلى الله عليه وسلّم وإن تردد ابن الهمام، والزَّيلعي في=

[۲۰] سادات کو زکوۃ دینا

۱۴۰۷- سوال: ہماری قوم سادات کو زکوۃ دینا پسند نہیں کرتی اور ایسا کہا جاتا ہے کہ سادات کو زکوۃ کی رقم دینا جائز نہیں ہے، خود سادات کا بھی یہی خیال ہے کہ ان کے لیے زکوۃ کی رقم لینا جائز نہیں، اس لیے ہمارے یہاں کے سادات کہتے ہیں: ''للہ رقم ہو تو ہی ہمیں دیا کرو''۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ سادت کا مصداق کون ہیں؟ کیا واقعی سادات کو زکاۃ کی رقم نہیں دی جا سکتی؟ اگر ان کی امداد کے لیے دوسری رقم نہ ہو، اور زکوۃ دے دی جائے، تو زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ امید ہے کہ جواب عنایت فرمائیں گے۔

سکریٹری ایجوکیشن [راجپورہ- سورت ۳]

الجواب حامداو مصلیا:

حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما- جو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لڑکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے ہیں- کی اولاد کو ''سید'' کہتے ہیں، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان دونوں نواسہ کے علاوہ

=النافلة أيضًا.

جواز دفع الزكاة لآل النبي صلى الله عليه وسلم عند فقدان الخمس:

ونقل الطحاوي عن أمالي أبي يوسف: أنه جاز دفع الزكاة إلى آل النبي صلى الله عليه وسلّم عند فقدان الخمس، فإنّ في الخمس حقّهم، فإذا لم يوجد، صح صرفها إليهم. وفي "البحر" عن محمد بن شجاع الثّلجي عن أبي حنيفة أيضًا جوازه. وفي "عقد الجيد" أن الرازي أيضًا أفتى بجوازه. قلت: وأخذ الزكاة عندي أسهل من السؤال، فأفتي به أيضًا. (فيض الباري: ۴۲۶/۳، باب ما يذكر في الصدقة للنبي - صلى الله عليه وسلم- وآله، ط: دار إحياء التراث الإسلامي)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے غریبوں کے لیے شریعت نے یہ بدل تجویز کیا ہے کہ مال غنیمت کے خمس (پانچواں حصہ) میں سے ان کو دیا جائے گا؛ لیکن اب چوں کہ مال غنیمت کہاں؛ اس لیے بعض فقہائے کرام کا یہ فتویٰ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے غریبوں کو زکوۃ کی مد میں سے دینا جائز ہے، چناں چہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی حضرت سید مہدی حسن شاہ جہاں پوریؒ اور سرتاج علماء علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا فتویٰ یہی تھا کہ فی زماننا سادات کو زکوۃ دینا جائز ہے؛ کیوں کہ شریعت نے ان کے لیے جو بدل تجویز کیا ہے، وہ اب نہیں رہا، اور مال داروں کا حال یہ ہے کہ وہ واجبی زکوۃ نکال لیں، یہی غنیمت ہے، دوسرے مد کا مال خرچ کرنے والے بہت کم ہیں، پس اگر سادات کو زکوۃ بھی نہیں دیں گے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ سوال کے محتاج ہو جائیں؛ لہٰذا ان کو سوال کی ذلت سے بچانے کے لیے زکوۃ دینا اور ان کا لینا جائز ہے۔ (مستفاد از: تحفۃ الالمعی: ۵۷۴/۲، کتاب الزکاۃ، باب ما جاء في كراهية الصدقة للنبي -صلى الله عليه وسلم- وأهل بيته ومواليه، ط: زمزم پبلیشرز، کراچی)

احادیث کی روشنی میں ان لوگوں کو بھی زکوۃ دینا جائز نہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتہ رکھتے ہیں، یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد، جو حضرت فاطمہؓ کے علاوہ دوسری بیویوں سے ہیں، حضرت عباسؓ کی اولاد، حضرت جعفرؓ کی اولاد، حضرت عقیلؓ کی اولاد اور حارث بن عبدالمطلب کی اولاد۔ ان میں سے کسی کو زکوۃ دینا اور ان کے لیے لینا جائز نہیں۔ (عالمگیری: ۱/۱۵۱، شامی: ۲/۶۶)[۱]

البتہ سادات -جن کے لیے زکوۃ لینا جائز نہیں- کے واسطے دوسرے حقوق بیت المال سے مقرر کیے گئے ہیں؛ لیکن موجودہ زمانے میں ان کے حقوق ادا نہیں کیے جاتے، بیت المال، بادشاہت اور ان کے کارندوں کا نظام ختم ہو گیا ہے؛ اس لیے موجودہ زمانے میں ان کو زکوۃ دینا جائز ہے، زکوۃ دینے والے کی زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ (شامی: ۲/۶۶)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] ولا يدفع إلى بني هاشم، وهم آل علي، وآل عباس، وآل جعفر، وآل عقيل، وآل الحارث بن عبد المطلب، كذا في الهداية. ويجوز الدفع إلى من عداهم من بني هاشم، كذرية أبي لهب؛ لأنهم لم يناصروا النبي -صلى الله عليه وسلم- كذا في السراج الوهاج. هذا في الواجبات كالزكاة والنذر والعشر والكفارة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۹، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر -بيروت)

(و) لا إلى (بني هاشم) إلا من أبطل النص قرابته وهم بنو لهب، فتحل لمن أسلم منهم. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: وبني هاشم إلخ) اعلم أن عبد مناف، وهو الأب الرابع للنبي -صلى الله عليه وسلم- أعقب أربعة وهم: هاشم، والمطلب، ونوفل، وعبد شمس، ثم هاشم أعقب أربعة، انقطع نسل الكل، إلا عبد المطلب، فإنه أعقب اثني عشر تصرف الزكاة إلى أولاد كل إذا كانوا مسلمين فقراء، إلا أولاد عباس، وحارث، وأولاد أبي طالب من علي وجعفر وعقيل، قهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۰، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، مطلب في الحوائج الأصلية، ط: دار الفكر ☆ المحيط البرهاني: ۳/ ۲۱۴، كتاب الزكاة، الفصل الثامن من يوضع فيه الزكاة، ط: مكتبة الرشد- الرياض)

[۲] وروى أبو عصمة عن الإمام أنه يجوز الدفع إلى بني هاشم في زمانه؛ لأن عوضها وهو خمس الخمس لم يصل إليهم لإهمال الناس أمر الغنائم وإيصالها إلى مستحقيها. وإذا لم يصل إليهم العوض عادوا إلى المعوض كذا في البحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۰، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، مطلب في الحوائج الأصلية، ط: دار الفكر ☆ المحيط البرهاني: ۳/ ۲۱۵، كتاب الزكاة، الفصل الثامن من يوضع فيه الزكاة، ط: مكتبة الرشد- الرياض ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۳۳۱، أول كتاب الزكاة، ط: فقيه الأمة- ديوبند)

نوٹ: سادات کو زکوۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں قدیم زمانے سے اختلاف ہے، تاہم اکثر اکابر دیوبند عدم جواز کے قائل ہیں، جن میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مفتی عزیز الرحمٰنؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، =

[۲۱] ایسی سیدہ عورت کو زکوۃ دینا، جس کا شوہر غیر سید ہو

۱۴۰۸- سوال: ایک سیدہ خاتون ہے، جس کی شادی غیر سید سے ہوئی ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ اس کو زکوۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

سیدہ عورت، جس کی شادی غیر سید سے ہوئی ہو، سادات ہی میں سے ہے، اور

= مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، مفتی یوسف لدھیانویؒ، مفتی محمد تقی عثمانی، مفتی خیر محمد جالندھری شامل ہیں، تفصیل کے لیے ان کے فتاوی کی جانب رجوع کریں، اسی بہشتی زیور میں بھی ناجائز لکھا ہوا ہے۔

البتہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور دار العلوم دیوبند کے موجودہ شیخ الحدیث، استاذ محترم حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری دامت برکاتہم موجودہ حالات میں [جب کہ غنیمتیں نہیں رہیں، بیت المال کا نظام ختم ہو گیا اور عام افراد زکاۃ کے علاوہ دوسرے مد سے امداد کرنے پر راضی نہیں ہوتے] جائز قرار دیا ہے۔ فتاویٰ ملاحظہ فرمائیں:

☆ صدقات واجبہ آج کل بھی سادات کو دینا حرام ہے۔ (باقیات فتاویٰ رشیدیہ، ص: ۲۰۴، کتاب الزکاۃ، ط: سہارن پور)

☆ سید کو زکوۃ وعشر کا روپیہ یا غلہ دینا درست نہیں۔ (کفایت المفتی: ۴/ ۲۸۹، سید کو زکوۃ دینا جائز نہیں، ط: زکریا- دیوبند)

☆ وہ روایت [ہاشمی کو زکوۃ دینا جائز ہے، خمس الخمس کے نہ ہونے کے وقت] تو اور ہے ہے، ظاہر مذہب کے مقابلے میں قابل عمل نہیں، ضرورت شدیدہ کے وقت حیلۂ تملیک کے بعد ہاشمی کی خدمت ہو سکتی ہے۔ (امداد الاحکام: ۳/ ۸۹، باب المصارف، ط: زکریا- دیوبند)

☆ حنفیہ کے نزدیک صحیح قول کے مطابق اور ظاہر الروایہ کے مطابق سید کو کسی حال میں زکوۃ دینا درست نہیں ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۶/ ۲۱۲، مصارف زکوۃ، ط: دار العلوم- دیوبند)

☆ سوال: سیدوں کو زکوۃ، عشر، صدقات واجبہ، مثل فطرہ، نذر و نیاز دینی جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جائز نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۹/ ۵۵۱، سادات کو زکوۃ دینا، ط: دار المعارف- دیوبند)

☆ زکوۃ آں حضرت ﷺ کے خاندان کے لیے حلال نہیں۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۵/ ۱۴۴، مصارف زکوۃ، ط: مکتبہ لدھیانوی)

☆ سادات کو زکوۃ نہیں دے سکتے، ہدیہ سے ان کی امداد کیجیے۔ (فتاویٰ عثمانی: ۲/ ۱۴۸، سادات اور ملازم کو زکوۃ دینے کا حکم، ط: نعیمیہ- دیوبند)

☆ بنو عباس کو زکوۃ دینا جائز نہیں، خواہ رشتے دار ہوں۔ [محل غور: مجتبیٰ حسن قاسمی] ان کی دیگر ذرائع سے امداد کی جائے۔ (خیر الفتاویٰ: ۳/ ۴۰۸، باب المصرف، عباسیوں کو زکوۃ دینا جائز نہیں ہے، ط: مکتبۃ الحق- ممبئی)

سادات کو زکوۃ دینا جائز نہیں ہے، البتہ اس کے شوہر کو دے سکتے ہیں۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۲۲] جوا اور چوری سے اپنی ضرورت کی تکمیل کرنے والے سادات کو زکوۃ دینا

۱۴۰۹- سوال: کیا زمانے کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سید حضرات کو زکوۃ دے سکتے ہیں؟

در اصل سادات میں سے بعض ضرورت مند حضرات، مال غنیمت کے ختم ہوجانے اور ہدایا وتحائف کے نہ ملنے کی وجہ سے اپنی ضرورت چوری، جوا وغیرہ حرام کاموں سے پوری کر رہے ہیں، اگر زکوۃ سے ان کی مدد کی جائے، تو شاید وہ چوری اور جوا وغیرہ سے باز رہیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

سید حضرات کو زکوۃ دینا جائز نہیں ہے۔(۱) بعض فقہائے کرام نے اجازت دی

---

[۱] (و) لا إلى (بني هاشم) إلا من أبطل النص قرابته وهم بنو لهب، فتحل لمن أسلم منهم. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: وبني هاشم إلخ) اعلم أن عبد مناف، وهو الأب الرابع للنبي - صلى الله عليه وسلم - أعقب أربعة وهم: هاشم، والمطلب، ونوفل، وعبد شمس، ثم هاشم أعقب أربعة، انقطع نسل الكل، إلا عبد المطلب، فإنه أعقب اثني عشر تصرف الزكاة إلى أولاد كل إذا كانوا مسلمين فقراء، إلا أولاد عباس، وحارث، وأولاد أبي طالب من علي وجعفر وعقيل، قهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۰، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، مطلب في الحوائج الأصلية، ط: دار الفكر ☆ المحيط البرهاني: ۳/ ۲۱۴، كتاب الزكاة، الفصل الثامن من يوضع فيه الزكاة، ط: مكتبة الرشد- الرياض)

(۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه، قال: كان رسول الله - صلى الله عليه وسلم - يؤتى بالتمر عند صرام النخل، فيجيء هذا بتمره، وهذا من تمره حتى يصير عنده كوما من تمر، فجعل الحسن والحسين - رضي الله عنهما - يلعبان بذلك التمر، فأخذ أحدهما تمرة، فجعلها في فيه، فنظر إليه رسول الله - صلى الله عليه وسلم -، فأخرجها من فيه، فقال: أما علمت أن آل محمد صلى الله عليه وسلم لا يأكلون الصدقة. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۰۱، رقم الحديث: ۱۴۸۵، كتاب الزكاة، باب أخذ صدقة التمر عند صرام النخل، وهل يترك الصبي فيمس تمر الصدقة، ط: ديوبند)

عن محمد وهو ابن زياد، سمع أبا هريرة، يقول: أخذ الحسن بن علي تمرة من تمر الصدقة، فجعلها في فيه، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كخ كخ، ارم بها، أما علمت أنا لا نأكل الصدقة؟. وفي رواية: "وقال: أنا لا تحل لنا الصدقة؟" (صحيح البخاري: ۱/ ۲۰۲، رقم الحديث: ۱۴۹۱، كتاب الزكاة، باب ما يذكر في الصدقة للنبي صلى الله عليه وسلم وآله، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۴۴-۳۴۳، رقم الحديث: ۱۶۱-۱۰۶۹، كتاب الزكاة، باب=

ہے۔ (۲) لیکن سوال میں جواز کی جس ''بنیاد'' کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، وہ غیر معقول ہے؛ کیوں کہ چور اور جواری صرف ضرورت پوری کرنے کے لیے چوری نہیں کرتے اور جوا نہیں کھیلتے؛ اس لیے یہ سمجھنا کہ ان کو زکوۃ دینے سے جوے اور سٹے کی عادت چھوٹ جائے گی، غلط ہے۔

ہاں! سادات میں سے کوئی بہت زیادہ محتاج ہوں اور للہ رقم سے اس کی محتاجگی دور کرنے والا کوئی نہ ہو، تو ان کو زکوۃ دینے کی گنجائش ہے؛ لیکن سید حضرات کو حلال روزی کمانی چاہیے اور زکوۃ قبول نہیں کرنی چاہیے۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] جس کی ملکیت میں ۶۰ رتولہ چاندی ہو، اس کو زکوۃ دینے کی صورت کیا ہوگی؟

۱۴۱۰- سوال: ہمارے پڑوس میں ایک بیوہ ہے، اس کے یتیم بچے بھی ہیں، اس عورت کے پاس ۶۰ رتولہ چاندی ہے؛ لیکن مالی حالت بہت کمزور ہے، غربت کا یہ عالم ہے کہ دن میں صرف ایک بار کھانا

= تحريم الزكاة على رسول الله صلى الله عليه وسلم وعلى آله وهم بنو هاشم وبنو المطلب دون غيرهم، واللفظ لمسلم، ط: ديوبند)

(قوله وبني هاشم ومواليهم) أي لا يجوز الدفع لهم، لحديث البخاري "نحن - أهل بيت - لا تحل لنا الصدقة"، ولحديث أبي داود "مولى القوم من أنفسهم، وإنا لا تحل لنا الصدقة". (البحر الرائق: ۲/ ۲۶۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) وروى أبو عصمة عن الإمام أنه يجوز الدفع إلى بني هاشم في زمانه؛ لأن عوضها وهو خمس الخمس لم يصل إليهم لإهمال الناس أمر الغنائم وإيصالها إلى مستحقيها. وإذا لم يصل إليهم العوض عادوا إلى المعوض كذا في البحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۰، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، مطلب في الحوائج الأصلية، ط: دار الفكر ☆ المحيط البرهاني: ۳/ ۲۱۵، كتاب الزكاة، الفصل الثامن من يوضع فيه الزكاة، ط: مكتبة الرشد- الرياض ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۳۳۱، أول كتاب الزكاة، ط: فقيه الأمة- ديوبند)

ونقل الطحاوي عن أمالي أبي يوسف: أنه جاز دفع الزكاة إلى آل النبي صلى الله عليه وسلم عند فقدان الخمس، فإنّ في الخمس حقّهم، فإذا لم يوجد، صح صرفها إليهم. وفي "البحر" عن محمد بن شجاع الثّلجي عن أبي حنيفة أيضا جوازه. وفي "عقد الجيد" أن الرازي أيضا أفتى بجوازه. قلت: وأخذ الزكاة عندي أسهل من السؤال، فأفتي به أيضا. (فيض الباري: ۳/ ۲۲۶، باب ما يذكر في الصدقة للنبي - صلى الله عليه وسلم- وآله، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۳) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: ''سادات کو زکوۃ دینا'' کے حواشی۔

پکتا ہے، وہ زکوٰۃ بھی نہیں لے سکتی؛ کیوں کہ ۶۰ رتولہ چاندی بیچ میں آڑے آتی ہے؛ اس لیے ہم نے اس کو یہ مشورہ دیا کہ تقریباً پندرہ تولہ چاندی بیچ دو، تاکہ تمہارے لیے زکوٰۃ وغیرہ کا انتظام ہو سکے، اس کے لیے زکاۃ لینے کی کیا شکل ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

بیوہ کے پاس جو ۶۰ رتولہ چاندی ہے، اس میں سے یتیم کے کھانے پینے پر خرچ کرنا ضروری ہے، یتیم کو بھوکا مارنا اور تکلیف دینا جائز نہیں۔[1] لہٰذا ۶۰ رتولہ چاندی سے ضروریات پوری کرے، جب اس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی سے کم رہ جائے تو وہ زکوٰۃ کی مستحق ہوگی اور اس کو زکوٰۃ دینا بلا کسی تردد کے جائز ہوگا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] زیورات وزمین کی مالک بیوہ عورت کا بیوہ فنڈ سے قرض ادا کرنا

۱۴۱۱- سوال: خدیجہ اسماعیل راجہ کئی سالوں سے بیوگی کی زندگی گذار رہی ہے، صرف تین بیگھا زمین ہے، لڑکا بھی نہیں ہے، ڈابھیل جامعہ سے پچاس روپیہ کی امداد ملتی ہے، فی الحال دس تولہ زیور ہے، پانچ ہزار روپئے قاری مبین صاحب کا قرض بھی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر میں بیوہ فنڈ میں سے قاری مبین صاحب کا قرض ادا کردوں، تو جائز ہے؟ زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً ومسلماً

غریب ومحتاج کے لیے زکوٰۃ لینا اور اُس کو دینا جائز ہے، کہ یہ اس کا حق ہے، مال دار کو لینا یا دینا جائز

---

(۱) عن أبي هريرة، عن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: خير بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يحسن إليه، وشر بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يساء إليه. (سنن ابن ماجه ص: ۲۶۲، رقم الحديث: ۳۶۷۹، كتاب الأدب، باب حق اليتيم، ط: ديوبند)

والنفقة لكل ذي رحم محرم إذا كان صغيرا فقيرا، أو كانت امرأة بالغة فقيرة، أو كان ذكرا فقيرا زمنا، أو أعمى ويجب ذلك على قدر الميراث ويجبر كذا في الهداية وتعتبر أهلية الإرث لا حقيقته كذا في النقاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۵۶۵-۶۶، كتاب الطلاق، الباب السادس عشر في الحضانة، الفصل الخامس في نفقة ذوي الأرحام، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) ويجوز دفعها إلى من يملك أقل من النصاب، وإن كان صحيحا مكتسبا كذا في الزاهدي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۹، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

نہیں ہے، اس سے دینے والے کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، بیوہ کے پاس زیورات ہیں، جن سے قرض کی ادائیگی کے بعد بھی نصاب کے بقدر یا اُس سے زیادہ رقم بچ جاتی ہے؛ اس لیے اُن کو زکوٰۃ دینا یا اُن کے لیے لینا جائز نہیں ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] مدارس میں مال داروں کے نابالغ بچوں پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا

۱۴۱۲- سوال: زکوٰۃ کی رقم مدارس میں بالعموم خرچ کی جاتی ہے، جب کہ ان میں صاحب استطاعت حضرات کے بچے بھی ہوتے ہیں، جو زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہوتے ہیں، پس اس صورت میں ان طلبہ کے لیے اس کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صاحب استطاعت کے نابالغ بچے زکوٰۃ کا استعمال نہیں کر سکتے ہیں اور نہ تو ان کے استعمال پر زکوٰۃ ادا ہوگی، البتہ ذمہ داران مدارس کی جانب سے حیلۂ تملیک کے بعد، غریب و مال دار؛ ہر قسم کے طلبہ پر اس رقم کو خرچ کیا جا سکتا ہے، اور ہر ایک کے لیے اس کے استعمال کی گنجائش ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹- التوبۃ: ۶۰)

(و) لا إلى (غني) يملك قدر نصاب فارغ عن حاجته الأصلية... (و) لا إلى (طفله). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۹- ۳۴۷، كتاب الزكاة، باب المصرف)

ويجوز دفعها إلى من يملك أقل من النصاب، وإن كان صحيحا مكتسبا كذا في الزاهدي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۹، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) ولا يجوز دفعها إلى ولد الغني الصغير كذا في التبيين. ولو كان كبيرا فقيرا جاز. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۹، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۲/ ۱۵۸، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا - ديوبند)

لأن الصغير يعد غنيا بغنى أبيه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر - بيروت)

لأن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء [أي إلى بناء نحو مسجد و إلى كفن ميت وقضاء دينه] مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب بحر (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

[۲۶] نابالغ لڑکے کا زکوٰۃ وفطرہ کی رقم لینا

۱۴۱۳- سوال: مدرسہ کا ایک لڑکا ہے، جس کی مالی حالت بہتر ہے، تو اُس کے لیے زکوٰۃ وفطرہ کی رقم لینا کیسا ہے؟ مثلاً مدرسے کا ایک لڑکا، دوسرے مال دار لڑکے کو زکوٰۃ وصدقہ کی کوئی چیز دے، تو اُس کے لیے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نابالغ لڑکے، جن کے والد مال دار ہیں، ایسے طالبِ علم کے لیے زکوٰۃ لینا یا اُس کو دینا جائز نہیں ہے۔ ہاں! اگر اُس کے والد غریب ومحتاج ہوں، تو جائز ہے، اور اگر لڑکا بالغ ہے اور غریب ونادار ہے، تو اُس کے لیے بھی زکوٰۃ وصدقہ لینا جائز ہے، اگرچہ اُس بالغ لڑکے کا باپ مال دار ہو، کیوں کہ بعد البلوغ لڑکے کے نفقہ کی ذمہ داری اُس کے باپ پر واجب نہیں ہے اور باپ کے مال دار ہونے کی وجہ سے، شرعاً بچے کو مال دار شمار نہیں کیا جاتا ہے۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] مدارس میں زکوٰۃ کی رقم مدت دراز تک جمع رکھنا مناسب نہیں

[۲۸] زکوٰۃ میں حیلۂ تملیک کا طریقہ

۱۴، ۱۵ ۱۴- سوال: زکوٰۃ کی رقم مدرسہ میں ایک سال سے زائد مدت تک رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟

حیلۂ تملیک کی صورت کیا ہے؟

---

(۱) ولا يجوز دفعها إلى ولد الغني الصغير كذا في التبيين. ولو كان كبيرا فقيرا جاز. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۹، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۲/ ۱۵۸، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا - ديوبند)

(و) لا إلى (طفله) بخلاف ولده الكبير. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله: ولا إلى طفله) أي الغني فيصرف إلى البالغ ولو ذكرا صحيحا قهستاني، فأفاد أن المراد بالطفل غير البالغ ذكرا كان أو أنثى في عيال أبيه أو لا على الأصح لما عنده أنه يعد غنيا بغناه نهر . . . أن الطفل يعد غنيا بغنى أبيه، بخلاف الكبير؛ فإنه لا يعد غنيا بغنى أبيه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۹-۳۵۰، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، مطلب في الحوائج الأصلية، ط: دار الفكر - بيروت)

الجواب حامداً ومصلياً:

مدارس دینیہ کی بنیاد توکل پر ہے اور مال کے جمع کرنے میں فتنے کا اندیشہ ہے؛ اس لیے بہتر یہی ہے کہ زکوۃ کی رقم کو سال بھر میں ہی استعمال میں کرلیا جائے، البتہ ارباب مدارس حیلۂ تملیک میں تراخی نہ کریں۔

حیلۂ تملیک: ۱-کوئی فقیر، مستحق زکوۃ، کسی مال دار سے قرض لے کر مدرسہ میں امداد کرے اور پھر زکوۃ کی رقم اس مقروض کو دے دی جائے، تاکہ وہ مال دار کا قرضہ ادا کردے۔[1]

۲-یا کسی مستحق زکوۃ کو زکوۃ کی رقم کا مالک بنادیا جائے اور وہ اس رقم کو ملکیت کے بعد بہ رضاء ورغبت مدرسہ میں دے دے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] مدرسہ میں زکوۃ کی رقم استعمال کرنے کے لیے حیلہ کرنے کا طریقہ

۱۴۱۶-سوال: مدارس میں زکوۃ کے پیسوں کا جو حیلہ کیا جاتا ہے، اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ اور کیا حیلے کے بعد اس رقم کو کسی بھی کام میں استعمال کرسکتے ہیں؟ مثلاً: آمدنی کے لیے کوئی مکان خریدنا یا مدرسہ ومکتب کے اساتذہ کی تنخواہ وغیرہ امور میں خرچ کرنا؟

الجواب حامداً ومصلياً:

حیلہ کا طریقہ یہ ہے کہ زکوۃ کی رقم کوئی غریب، سمجھدار[3] آدمی کو دے دے، اور یہ کہا جائے کہ آپ

---

(۱) وحيلة الجواز أن يعطي مديونه الفقير زكاته ثم يأخذها عن دينه، . . . وحيلة التكفين بها [الزكاة] التصدق على فقير، ثم هو يكفن فيكون الثواب لهما، وكذا في تعمير المسجد، وتمامه في حيل الأشباه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۷۱، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

(۲) لأن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء [أي إلى بناء نحو مسجد و إلى كفن ميت وقضاء دينه] مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب، بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۴۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۳) سمجھدار کو دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس رقم کا مکمل مالک ومختار سمجھے، اور پھر خود خوش دلی سے، کسی دباؤ کے بغیر وہ رقم یا اس کا کچھ حصہ مدرسہ وغیرہ کو چندہ کے طور پر دے دے، تو اس رقم کو تعمیر وتنخواہ وغیرہ میں خرچ کرنا درست ہوگا؛ لیکن اگر محض بناوٹی حیلہ ہو کہ طلبہ اپنے آپ کو رقم کا مالک نہ سمجھے اور یہ سمجھے کہ یہ رقم بہرحال مدرسے میں دینی ہے، یا دباؤ کے تحت دے دے، تو ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں۔ (دیکھیے: فتاویٰ عثمانی-مفتی محمد تقی عثمانی: ۲/۱۶۱، کتاب الزکاۃ، زکاۃ کی رقم تعمیر مدرسہ پر لگانے کے لیے طلبہ سے تملیک کا صحیح طریقہ، ط: مکتبہ معارف القرآن-کراچی)

اس کے مالک ہیں، اب اگر آپ اپنی جانب سے مدرسہ میں دیں گے، تو صدقے کا ثواب ملے گا، اور کچھ رقم اس کو خوش کرنے کے لیے بھی دے دے۔ (درمختار)[1]

لیکن بغیر مجبوری کے تعمیرات، تنخواہ وغیرہ میں وہ رقم استعمال نہ کرے، ہاں ضرورت ہو، تو جائز ہے اور زکوۃ دینے والے کی زکوۃ بلاشبہ ادا ہو جاتی ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] زکوۃ کی رقم کے حیلہ میں امام یا مؤذن کی تخصیص کی وجہ

۱۴۱۷- سوال: زکوۃ کی رقم کے حیلہ کے متعلق ہم نے ایک مسئلہ آپ کی خدمت میں دریافت کیا تھا، آپ نے اُس کے جواب میں لکھا تھا کہ مسجد کے امام یا مؤذن صاحب کے ذریعے حیلہ کروایا جائے، تو حیلہ کے لیے مؤذن یا امام صاحب ہی کی تخصیص کیوں ہے؟ کیا کسی عام مستحق کے ذریعے حیلہ درست نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مؤذن یا امام کی صراحت اس وجہ سے کی گئی تھی کہ یہ لوگ حیلہ کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے، نیز اُنہیں اپنے منصب کا بھی پاس ولحاظ رہے گا، اگر کسی عام انجان مستحق کو رقم دی گئی اور وہ لے کر چلتا ہو گیا، تو آپ کیا کرلیں گے؟[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] ضرورت مند بستی میں زکوۃ کے پیسے خرچ کرنے کے لیے حیلہ کرنا

۱۴۱۸- سوال: ہمارے پاس آہوا اور ڈانگ نامی غریب اور ضرورت مند بستیوں کے لیے کچھ

---

[۱] وحيلة التكفين بها [الزكاة] التصدق على فقير، ثم هو يكفن فيكون الثواب لهما، وكذا في تعمير المسجد، وتمامه في حيل الأشباه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۷۱، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

لأن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء [أي إلى بناء نحو مسجد و إلى كفن ميت وقضاء دينه] مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب، بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۴۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۲) والحق في النظر أن يقال أن التمليك الذي هو فعل المعطي غير كاف في أداء الزكاة، بل يشترط التمليك وهو اختياري ههنا، فيتوقف على قبول الآخذ، ولم يوجد ههنا، لأنه لم يعلم التمليك أصلاً، فلا يكفي هذا التمليك في أداء الزكاة. (حاشیہ امداد الفتاویٰ: ۲/ ۱۳، کتاب الزکاۃ والصدقات، تحقیق حیلہ تملیک، سوال نمبر: ۲۷، ط: زکریا- دیوبند)

رقم بھیجی گئی ہے، جس میں زکوۃ، صدقہ اور سود کی رقم شامل ہے، اُس میں سے کچھ حصہ ناڈن پیدا نامی بستی کے ضرورت مندلوگوں کو دینا ہے، تو اُس کے لیے زکوۃ کی رقم میں حیلہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اگر واقعی ضرورت مند ہوں، تو وہ مستحق زکوۃ ہیں، ان کو زکوۃ کی رقم دینے کے لیے حیلے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہاں! اگر اس غریب بستی میں ضرورت مند وغیر ضرورت مند دونوں ہوں، اور دونوں کی اس رقم سے مدد کرنی ہو، تو زکوۃ کی رقم کا حیلہ کرنا جائز ہے، بہ طور خاص اگر وہاں کوئی دینی مدرسہ ہو، اور اس کے لیے کوئی للہ رقم نہ مل سکے، تو اُس وقت حیلہ کر سکتے ہیں، تا ہم کوشش یہی کرنی چاہیے کہ حتی الامکان للہ رقم ہی خرچ کی جائے، مسلمانوں پر اپنا دینی فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی بستی میں اپنی للہ رقم سے مدرسہ وغیرہ چلائیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] کیا حیلہ کا طریقہ قرون اولیٰ میں تھا؟

۱۴۱۹- سوال: کیا حیلہ کا طریقہ حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور خلفاء راشدین، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں تھا؟ یہ سلسلہ کس دور میں شروع ہوا؟

الجواب حامداً ومصلیا:

فقہاء کرام نے حیلے کا، جو طریقہ بتایا ہے، وہ جائز ہے اور ضرورت کے وقت اس کو برتا جا سکتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا زمانہ، اس دنیا میں گذرنے والے زمانوں میں سب سے بہترین تھا، صحابۂ کرام دل کے بے انتہا غنی تھے، للہ رقم اس قدر کثرت سے خرچ کرتے تھے کہ زکوۃ کی رقم کے حیلہ کی ضرورت

---

(۱) مذهب علمائنا - رحمهم الله تعالى - أن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير أو لإدخال شبهة فيه أو لتمويه باطل فهي مكروهة وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال فهي حسنة، والأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله تعالى {وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث} وهذا تعليم المخرج لأيوب النبي - عليه وعلى نبينا الصلاة والسلام - عن يمينه التي حلف ليضربن امرأته مائة عود وعامة المشايخ على أن حكمها ليس بمنسوخ وهو الصحيح من المذهب كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۶/ ۳۹۰، كتاب الحيل، الفصل الأول في بيان جواز الحيل، ط: دار الفكر)
مزید تفصیل کے لیے "زکوۃ میں حیلہ کر کے موذن واساتذہ کے مکانات بنانا" کا حاشیہ نمبر (۳) دیکھیں۔

ہی نہیں پڑتی تھی۔

حیلہ کا طریقہ ایک حدیث شریف سے ثابت ہے، ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ حضرت بریرہؓ کے گھر تشریف لے گئے، حضرت بریرہؓ گوشت پکارہی تھیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: اس میں کیا ہے؟ فرمایا گوشت ہے، جو میرے لیے بہ طور صدقہ آیا ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں، وہ تمہارے پاس آ گیا ہے؛ لہٰذا تم اس کی مالک بن گئی ہوں، اب تم مجھے دوگی تو وہ ہدیہ شمار ہوگا۔ (ابوداود شریف کی حدیث شریف کا مفہوم)[۱]

مذکورہ حدیث پاک سے یہ ثابت ہوا کہ غریب کو کسی چیز کا مالک بنا دیا جائے، تو اس کے لیے اس میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے، خود استعمال کرے، یا جسے چاہے دے دے، اور دوسرے کے حق میں اب وہ صدقہ نہیں رہا، اس کے لیے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] مدارس میں زکوٰۃ دینے سے علم دین کی مدد کا بھی ثواب حاصل ہوگا

۱۴۲۰- سوال: مدرسہ میں جو زکوٰۃ دی جاتی ہے اور طلبہ پر خرچ کی جاتی ہے، تو اس میں زکوٰۃ دہندگان کو صرف زکوٰۃ ادا کرنے کا ثواب ملے گا یا طلبہ پر خرچ کرنے اور علم کو زندہ رکھنے کا بھی ثواب حاصل ہوگا؟ یعنی طلبہ پر خرچ کرنے کے متعلق جو بشارتیں اور وعدے ہیں، وہ اس زکوٰۃ ادا کرنے والے کو حاصل ہوں گے یا نہیں؟

---

(۱) عن أنس -رضي الله عنه- أن النبي صلى الله عليه وسلم أتي بلحم، قال: "ما هذا؟"، قالوا: شيء تصدق به على بريرة، فقال: "هو لها صدقة، ولنا هدية". (سنن ابي داود: ۱/ ۲۳۴، رقم الحديث: ۱۶۵۵، كتاب الزكاة، باب الفقير يهدي للغني من الصدقة، ط: ديوبند)

(۲) قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ وهو معنى قول ابن الملك: فيحل التصدق على من حرم عليه بطريق الهدية. (مرقاة المفاتيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۴/ ۱۳۰۳، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر- بيروت) ———— وأما الرجل الذي له جار مسكين، فتصدق على المسكين، فأهداها المسكين إلى غني، فإنما يحل له، لأنه ملكها بالهدية. (الفتاوى التاتار خانية: ۲/ ۲۰۳، كتاب الزكاة، الفصل الثامن بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

الجواب حامداً ومصلیاً:

اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرۃ سے ایک مرفوع حدیث ثابت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خرچ کرنے والوں میں ایک وہ شخص ہے جس نے اللہ کے راستے میں صدقہ کیا؛ ایک وہ ہے جس نے کسی کو ظلم سے آزاد کیا، اور ایک وہ ہے، جس نے کسی غریب کی مدد کی، اور ایک وہ ہے، جس نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا۔ واضح رہے کہ ان میں سب سے افضل وہ شخص ہے، جس نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا۔ (مسلم شریف، بہ حوالہ: مشکوٰۃ المصابیح: ۱۷۰)[۱]

دوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ صدقہ کو قبول کر کے اس کو بڑھاتے رہتے ہیں، جس طرح گھوڑے کے بچہ کو پالا اور بڑا کیا جاتا ہے۔[۲]

ایک روایت میں ہے کہ عمل کا دار ومدار نیت پر ہے۔ نیت کے مطابق جزاء وسزا کا ترتب ہوگا۔[۳]

ان روایت سے معلوم ہوا کہ ہر خیر کے کام میں آدمی کو خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے، دینی علوم

---

[۱] عن أبي هريرة - رضي الله عنه - قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: دينار أنفقته في سبيل الله، ودينار أنفقته في رقبة، ودينار تصدقت به على مسكين، ودينار أنفقته على أهلك، أعظمها أجرا الذي أنفقته على أهلك. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۲۲، رقم الحديث: ۳۹-۹۹۵، كتاب الزكاة، باب فضل النفقة على العيال والمملوك، وإثم من ضيعهم أو حبس نفقتهم عنهم، ط: ديوبند☆مشكاة المصابيح: ۱/ ۱۷۰، كتاب الصلاة، باب أفضل الصدقة، ط: مكتبة رشيدية - سهارن پور)

(۲) عن أبي هريرة رضي الله عنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب، ولا يقبل الله إلا الطيب، وإن الله يتقبلها بيمينه، ثم يربيها لصاحبه، كما يربي أحدكم فلوه، حتى تكون مثل الجبل. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۸۹، رقم الحديث: ۱۴۱۰، كتاب الزكاة، باب الصدقة من كسب طيب، ط: رشيدية، سهارن پور، وانظر رقم: ۷۴۳۰، باب قول الله تعالى: {تعرج الملائكة والروح إليه}☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۲۶، رقم الحديث: ۶۳ و ۶۴ - (۱۰۱۴)، كتاب الزكاة، باب الحث على الصدقة ولو بشق تمرة ... ، ط: ديوبند)

(۳) علقمة بن وقاص الليثي، يقول: سمعت عمر بن الخطاب رضي الله عنه على المنبر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها، أو إلى امرأة ينكحها، فهجرته إلى ما هاجر إليه. (صحيح البخاري: ۱/ ۲، رقم الحديث: ۱، باب بدء الوحي، كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم؟، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۴۰-۱۴۱، رقم الحديث: ۱۵۵- ۱۹۰۷، كتاب الإمارة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: "إنما الأعمال بالنية"، وأنه يدخل فيه الغزو وغيره من الأعمال، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

کی نشر و اشاعت کو امورِ خیر میں اعلیٰ مقام حاصل ہے؛ اس لیے مال داروں کو چاہیے کہ علوم دین کے طالبین کی ضرورت کو بہ طور خاص دھیان میں رکھیں، اور اپنے مال سے ہر ممکن تعاون کریں۔

مسلمان کی نیت دین کی اشاعت اور علم کو پھیلانے وغیرہ کی ہوگی، تو اس نیت کی وجہ سے اس کو ان شاء اللہ علم دین کی مدد والی حدیثوں کا ثواب بھی حاصل ہوگا۔[۴]

البتہ صرف فرض زکوٰۃ ادا کرنے پر بس نہ کریں؛[۵] بل کہ نفلی صدقات بھی کیا کریں اور فرض و نفل صدقہ میں موقع و محل اور نیت کے اعتبار سے ثواب میں کمی بیشی ہوتی رہے گی۔

[۳۴] زکوٰۃ اور سودی رقم سے مسجد کے لیے بیت الخلاء بنانا جائز ہے؟

۱۴۲۱- سوال: بعض لوگ زکوٰۃ اور بینک کی سودی رقم سے مسجد میں بیت الخلاء بنانا چاہتے ہیں، کیا ایسی رقم سے بیت الخلاء بنانا جائز ہے؟ کسی حیلہ سے جائز ہے یا نہیں؟ حیلہ کا طریقہ بھی بتائیں۔

الجواب حامدًا ومصلّیًا:

سود یا زکوٰۃ کی رقم سے بیت الخلاء بنانا جائز نہیں ہے۔[۱] البتہ کوئی غریب آدمی دس پندرہ ہزار کسی

---

(۴) عن أبي هريرة- رضي الله عنه- أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: "إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة: إلا من صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعو له". (الصحيح لمسلم: ۲/ ۴۱، رقم الحديث: ۱۴- (۱۶۳۱)، كتاب الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ط: ديوبند)

(۵) وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ﴿١٩﴾ (۵۱- الذاريات: ۱۹)

عن فاطمة بنت قيس، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن في المال حقا سوى الزكاة. (سنن الترمذي: ۱/ ۱۴۳، رقم الحديث: ۶۶۰، أبواب الزكاة، باب ما جاء أن في المال حقا سوى الزكاة، ط: ديوبند)

قال الكشميري: وأقول: عندي ذخيرة في مسألة الباب مرفوعة منها رواية ابن عمر بسند صحيح قوي، ويؤيد في ما مر في أول الزكاة عن أبي ذر عنه: "إلا من قال هكذا وهكذا فحثى" إلخ، فإن هذا ليس شأن الزكاة الواجبة. (العرف الشذي شرح سنن الترمذي- محمد أنور شاه بن معظم شاه الكشميري (م: ۱۳۵۳ھ): ۲/ ۱۲۷، كتاب الزكاة، باب ما جاء أن في المال حقا سوى الزكاة، تصحيح: الشيخ محمود شاكر، ط: دار التراث العربي- بيروت)

(۱) ادائیگی زکوٰۃ کی صحت کے لیے تملیک شرط ہے، جو بیت الخلا بنوانے میں نہیں پائی جاتی۔

سود کی رقم واجب التصدق ہے؛ لیکن اس میں صدقات واجبہ کی طرح تملیک شرط ہے یا نہیں؟ مشہور اختلافی مسئلہ ہے، مسجد میں اس کا استعمال درست نہیں، رفاہی کام میں خرچ کی جاسکتی ہے، بہتر یہ ہے کہ ایسی چیزوں میں نہ صرف کی جائے، جو باقی رہنے والی ہو، کہ اس کو دیکھ کر لوگوں کے دلوں سے سود کی قباحت و شناعت کم ہوجائے گی۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

مال دار کے پاس سے قرض لے کر بیت الخلاء بنانے کے لیے مسجد کو دے، پھر زکوٰۃ یا سود کی رقم اُس غریب کو دے دی جائے اور اُس سے وہ اپنا قرض ادا کردے، تو اُس سے غریب کو بیت الخلاء بنانے کا ثواب بھی مل جائے گا اور زکوٰۃ بھی ادا ہوجائے گی اور سود کے وبال سے بھی ذمہ فارغ ہوجائے گا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] اسکول میں زکوٰۃ دینا

۱۴۲۲- سوال: ہمارے یہاں کوسمبا میں ایک اسکول میں زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور چمڑے کی رقم کا استعمال اس کی تعمیر، فرنیچر اور طلبہ کے اخراجات وغیرہ میں کیا جاتا ہے، شرعاً اس سلسلہ میں کیا حکم ہے؟ کیا اس طرح مذکورہ رقوم کا استعمال اسکول میں جائز ہے؟ اور زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی؟ جب کہ اسکول میں مال داروں کے بچے بھی پڑھتے ہیں۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی رقم تعمیرات اور فرنیچر میں ڈائرکٹ (حیلہ کے بغیر) استعمال کرنا جائز نہیں، خواہ وہ مسجد و مدرسہ کی تعمیر ہو یا اسکول کی؛ کیوں کہ زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر میں تملیک (غریب کو مالک بنانا) ضروری ہے اور اس طرح استعمال میں تملیک نہیں پائی جاتی ہے، اگر ٹرسٹیان ایسا کرتے ہیں، تو لوگوں کی نہ زکوٰۃ ادا ہوگی اور نہ ہی صدقۃ الفطر ادا ہوگا، جس کی وجہ سے وہ گنہگار ہوں گے۔[۱]

---

(۲) لأن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء [أي إلى بناء نحو مسجد و إلى كفن ميت وقضاء دينه] مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب، بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۱) (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد و) لا إلى (كفن ميت وقضاء دينه). (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: نحو مسجد) كبناء القناطر والسقايات وإصلاح الطرقات وكري الأنهار والحج والجهاد وكل ما لا تمليك فيه، زيلعي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر- بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

ولا يصرف في بناء مسجد، وقنطرة، ولا يقضي بها دين ميت، ولا يعتق عبداً، ولا يكفن ميتا. (المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، =

ہاں بچوں کی ماہانہ ۳۰-۳۵ روپے فیس مقرر کردی جائے، مال داروں کے بچے تو اپنی طرف سے فیس ادا کریں اور جو غریب طلبہ ہیں، ان کو زکوۃ اور صدقہ کی رقم کا مالک بنادیا جائے، اور پھر ان سے فیس ادا کرنے کو کہا جائے، اس طرح وہ رقم وصول کرلی جائے، پھر اس رقم کو چاہے تو ٹرسٹیان تعمیر میں استعمال کریں یا کسی اور چیز میں، اب اس کا استعمال جائز ہوگا۔[۲]

حاصل یہ کہ طلبہ جو غریب ہوں، ان کی فیس یا کتاب یا دیگر ضروریات کے لیے زکوۃ کی رقم کا ان کو مالک بنادیا جائے، تو زکوۃ ادا ہوجائے گی۔

اور قربانی کا چمڑا بیچ دینے کے بعد اس کی رقم کا صدقہ کرنا واجب ہے۔[۳] لہٰذا اس میں بھی مذکورہ طریقے کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الباب السابع في المصارف، ط: زكريا- ديوبند☆ الفتاوى التاتار خانية: ۲۰۸/۳، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

(هي) لغة الطهارة والنماء، وشرعا (تمليك) خرج الإباحة، فلو أطعم يتيما ناويا الزكاة لا يجزيه إلا إذا دفع إليه المطعوم كما لو كساه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲۵۶/۲-۲۵۷، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

(وصدقة الفطر كالزكاة في المصارف). [الدر المختار مع رد المحتار: ۳۶۸/۲، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، ط: دار الفكر- بيروت]

(۲) وحيلة الجواز أن يعطي مديونه الفقير زكاته ثم يأخذها عن دينه، ... وحيلة التكفين بها [الزكاة] التصدق على فقير، ثم هو يكفن فيكون الثواب لهما، وكذا في تعمير المسجد، وتمامه في حيل الأشباه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲۷۱/۲، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

لأن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء [أي إلى بناء نحو مسجد وإلى كفن ميت وقضاء دينه] مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب، بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۴۵/۲، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۳) قربانی کی کھال جب تک مضحی کے پاس ہے، اس کو اختیار ہے کہ خود استعمال کرے، یا کسی (غریب و مال دار) کو دے دے، ہاں! اگر بیچ دیا، تو اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے: (ويتصدق بجلدها أو يعمل منه نحو غربال وجراب) وقربة وسفرة ودلو (أو يبدله بما ينتفع به باقيا) كما مر (لا بمستهلك كخل ولحم ونحوه) كدراهم (فإن) (بيع اللحم أو الجلد به) أي بمستهلك (أو بدراهم) (تصدق بثمنه). [الدر المختار مع رد المحتار: ۳۲۸/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر- بيروت) =

[۳۶] اسکول میں صدقہ دینا ثواب کا ذریعہ ہے یا نہیں؟

۱۴۲۳- سوال: اسکول یا کسی عصری ادارے میں "للہ رقم" تعمیرات کے لیے دی جائے، تو کیا اس میں کوئی ثواب نہیں ملے گا؟ مسلم قوم صرف مسجد اور مدرسہ میں دینے کو ثواب سمجھتی ہے، اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیلی وضاحت مطلوب ہے۔

الجواب حامداً ومصلياً:

قرآن وحدیث میں صدقہ اور خیر خیرات کا حکم دیا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا ہے کہ بعض جگہ دینے سے زیادہ ثواب اور بعض جگہ دینے سے کم ثواب ملتا ہے۔ چناں چہ بخاری شریف: (۱/ ۱۹۷) میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلے کا عنوان قائم کیا ہے اور عنوان میں (تعلیقاً) وہ روایت ذکر کی ہے، جس میں ہے کہ رشتہ دار کو صدقہ اور خیرات کرنے سے دو ثواب حاصل ہوتے ہیں، ایک صدقہ کا اور دوسرا صلہ رحمی کا۔ [۱]

دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک درہم اجنبی پر خرچ کیا، تو ایک ثواب اور رشتہ دار پر خرچ کیا تو دوہرا ثواب ملے گا۔ [۲]

= قال: "ويتصدق بجلدها" لأنه جزء منها "أو يعمل منه آلة تستعمل في البيت" كالنطع والجراب والغربال ونحوها، لأن الانتفاع به غير محرم "ولا بأس بأن يشتري به ما ينتفع بعينه في البيت مع بقائه" استحسانا. . . واللحم بمنزلة الجلد في الصحيح، فلو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بما لا ينتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه، لأن القربة انتقلت إلى بدله. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن، برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۴/ ۳۵۵، كتاب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

(۱) باب الزكاة على الأقارب وقال النبي صلى الله عليه وسلم: له أجران أجر القرابة والصدقة. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۹۷، كتاب الزكاة، ط: ديوبند)

(۲) عن سلمان بن عامر، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن الصدقة على المسكين صدقة، وعلى ذي الرحم اثنتان صدقة وصلة. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي- أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۵/ ۹۲، رقم الحديث: ۲۵۸۲، كتاب الزكاة، الصدقة على الأقارب، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية- حلب ☆ سنن ابن ماجه، رقم الحديث: ۱۸۴۴، كتاب الزكاة، باب فضل الصدقة)

اسی طرح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت ابوطلحہؓ نے اپنا باغ صدقہ کرنے کا ارادہ کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے رشتہ داروں پر صدقہ کرو۔ (۳)

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ صدقہ کس جگہ پر کیا جاتا ہے، اس کے حساب سے ثواب میں کمی بیشی ہوگی، بلکہ علماء نے تو صاف لکھا ہے بعض جگہوں پر خرچ کرنے سے آدمی گنہگار ہوتا ہے، جیسے جو لوگ بھیک مانگنے کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں اور اس کو ایک کاروبار کے طریقہ پر انجام دیتے ہیں، تو ایسے سائلوں کو دینے سے آدمی گنہ گار ہوگا؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: بھلائی اور نیکی کے کام میں مدد کرو اور گناہ وظلم کے کام میں مدد نہ کرو (قرآن شریف، سورۂ مائدہ) (۴)

مذکور آیت سے استدلال کرتے ہوئے الاشباہ کے حوالہ سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: جو فقراء بھیک کی عادت بنالیتے ہیں، ان کو دینا گناہ ہے۔ (۵)

---

(۳) أنس بن مالك رضي الله عنه، يقول: كان أبو طلحة أكثر الأنصار بالمدينة مالا من نخل، وكان أحب أمواله إليه بيرحاء، وكانت مستقبلة المسجد، وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يدخلها ويشرب من ماء فيها طيب، قال أنس: فلما أنزلت هذه الآية: {لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون} [آل عمران: ۹۲] قام أبو طلحة إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسول الله، إن الله تبارك وتعالى يقول: {لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون} وإن أحب أموالي إلي بيرحاء، وإنها صدقة لله، أرجو برها وذخرها عند الله، فضعها يا رسول الله حيث أراك الله، قال: فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: بخ، ذلك مال رابح، ذلك مال رابح، وقد سمعت ما قلت، وإني أرى أن تجعلها في الأقربين. فقال أبو طلحة: أفعل يا رسول الله، فقسمها أبو طلحة في أقاربه وبني عمه. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۹۷، كتاب الزكاة، باب الزكاة على الأقارب وقال النبي صلى الله عليه وسلم: له أجران أجر القرابة والصدقة، ط: ديوبند)

(۴) وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵-المائدة: ۲)

(۵) فتاویٰ رشیدیہ میں احقر کو یہ بات نہیں ملی، البتہ درمختار اور شامی کی درج ذیل بحث سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے:

(ولا) يحل أن (يسأل) من القوت (من له قوت يومه) بالفعل أو بالقوة كالصحيح المكتسب ويأثم معطيه إن علم بحاله لإعانته على المحرم. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويأثم معطيه إلخ) قال الأكمل في شرح المشارق. ــــــ وأما الدفع إلى مثل هذا السائل عالما بحاله فحكمه في القياس الإثم به؛ لأنه إعانة على الحرام لكنه يجعل هبة وبالهبة للغني أو لمن لا يكون محتاجا إليه لا يكون آثما اهـ. ــــــ أي؛ لأن الصدقة على الغني هبة كما أن الهبة للفقير صدقة لكن فيه أن المراد بالغني من يملك نصابا أما الغني بقوت يومه فلا تكون الصدقة عليه هبة بل صدقة فما فر منه وقع فيه أفاده في النهر. . . . ــــــ قال المقدسي في شرحه: وأنت =

ذرا غور کیجئے کہ بے موقع خیرات کرنے سے بجائے ثواب کے گناہ لازم ہوگیا۔ پس اسی طرح قوال، ناٹک اور ناچنے والے کو لانے کے لیے جو چندہ دے گا، وہ گنہگار ہوگا۔

اسی بنا پر مسلمان مسجد، مدرسہ، یتیم خانہ اور دارالعلوم میں رقم دینے کو بڑے ثواب کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور ان میں دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؛ کیوں کہ ان کا مدار قرآن وحدیث پر ہے اور یہ رقم جس مصرف میں خرچ کی جاتی ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کا نام روشن ہوتا ہے، خدا کی بندگی کی جاتی ہے اور اس کی عبادت وبندگی میں یہ رقم معین ومددگار ثابت ہوتی ہے، گویا اس کا سیدھا فائدہ صدقہ کرنے والے کو پہنچ گیا۔

انگلش میڈیم اسکول یا ہائی اسکول کی تعلیم کچھ شرائط کے ساتھ جائز ہے، اگر مذکورہ اسکول میں جانے سے اسلامی تہذیب کا ترک کرنا لازم آتا ہو اور دیگر قوم کی تہذیب وکلچر کو اپنایا جاتا ہو، تو اسکول چلانے والے عنداللہ ماخوذ ہوں گے؛ کیوں کہ وہ گناہ کے کام کا ایک ذریعہ بنے، اگر تعلیم کا مقصد صرف روٹی کا مسئلہ حل کرنا ہے، تب بھی اس میں کوئی ثواب نہ ملے گا، البتہ منتظمین اور طلبہ یہ نیت کریں کہ اس تعلیم کے ذریعہ مستقبل میں قوم کی عائد ہونے والی ذمہ داری کو بہ حسن وخوبی انجام دیں گے اور ڈاکٹری، وانجینیرنگ وغیرہ کے پیشے کے ذریعہ قوم وملت کی خدمت کریں گے اور مسلمانوں کو تمدنی ترقی دیں گے، تو اس ادارہ کے چلانے والے اور اس میں پڑھنے والے ضرور ثواب کے مستحق ہوں گے، بخاری شریف کی پہلی حدیث ہے کہ: ''اعمال کا مدار نیت پر ہے''۔ (۲)

پس جو کام جائز ہیں، اس میں صحیح نیت کرنے سے وہ عبادت بن جاتے ہیں اور بری نیت سے جائز

= خبير بأن الظاهر أن مرادهم أن الدفع إلى مثل هذا يدعو إلى السؤال على الوجه المذكور وبالمنع ربما يتوب عن مثل ذلك فليتأمل اهـ (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۵، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، قبيل: فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) علقمة بن وقاص الليثي، يقول: سمعت عمر بن الخطاب رضي الله عنه على المنبر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها، أو إلى امرأة ينكحها، فهجرته إلى ما هاجر إليه. (صحيح البخاري: ۱/ ۲، رقم الحديث: ۱، باب بدء الوحي، كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم؟، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۴۰-۱۴۱، رقم الحديث: ۱۵۵-۱۹۰۷، كتاب الإمارة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: ''إنما الأعمال بالنية''، وأنه يدخل فيه الغزو وغيره من الأعمال، ط: ديوبند)

کام؛ بل کہ عبادت بھی گناہ بن جاتی ہے۔ پس اسکول و ہائی اسکول اور عصری ادارے صحیح نیت کے ساتھ چلائے جائیں، تو جائز ہے اور اس میں رقم دینا ثواب کا ذریعہ ہوگا اور چلانے والے کو بھی نیت کے موافق ثواب ملے گا۔

پس قوم مسجد، مدرسہ میں خیر خیرات کو جو فرض سمجھتی ہے، وہ ایک اعتبار سے صحیح ہے اور آپ نے جو مصرف بیان کیا، وہ بھی صحیح ہے، اگر صحیح کام کیا جاتا ہے تو اس میں دینا بھی ثواب کا ذریعہ ہوگا، تا کہ مسلمان عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں اور کسی بھی اعتبار سے جاہل نہ رہیں اور ان دینی کاموں میں- جو دنیوی عہدوں کے ساتھ منسلک ہیں- کوئی رکاوٹ نہ آئے، درحقیقت یہ دونوں ہی نظریہ ایمانی غیرت پر مبنی ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۷] زکوۃ کی رقم سے مدرسہ میں پنکھا لگانا

۱۴۲۴- سوال: زکوۃ کے پیسوں سے مدرسہ میں بجلی کا پنکھا لگایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہ لگایا جاسکتا ہو، اور کسی نے عدم واقفیت کی بناء پر لگالیا، تو تلافی کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب حامداًومصلیاً:

زکوۃ کی رقم سے مدرسہ وغیرہ کی تعمیر کرنا یا پنکھا لگانا جائز نہیں، اس میں تملیک نہ پائے جانے کی وجہ سے زکوۃ ادا نہ ہوگی۔[۱] پس صورت مسئولہ میں وہ پنکھا نکال کر کسی فقیر کو مالک بنادیں، پھر وہ فقیر اپنی رضامندی سے مدرسہ میں دے دے، تو یہ صورت جائز ہوگی اور زکوۃ دہندہ کا ذمہ بری ہوجائے گا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولا يجوز أن يبني بالزكاة المسجد، وكذا القناطر والسقايات وإصلاح الطرقات وكري الأنهار والحج والجهاد وكل ما لا تمليك فيه، زيلعي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا- ديوبند☆ المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر- بيروت☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ الفتاوى التاتار خانية: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

(۲) ... الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: =

[۳۸] مدرسہ میں روپیہ دینے کی منت مانی، تو کیا غرباء کو دے سکتے ہیں؟

۱۴۲۵- سوال: ایک شخص نے منت مانی تھی کہ میرا یہ کام پورا ہو جائے تو میں ۱۰۰ر روپے کسی بھی مدرسے میں دے دوں گا، اسی طرح اس نے دوسری بھی منت مانی کہ دوسرا فلاں کام ہو گیا، تو کسی مدرسے میں ۱۰۰ر دوں گا، اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کا دونوں کام پورا ہو گیا، تو اس کو وہ ۲۰۰ر روپے مدرسہ ہی میں دینے ہوں گے یا اپنی بستی کے غرباء کو بھی دے سکتا ہے؟ جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورتِ مسئولہ میں مجموعی ۲۰۰ر روپے منت کے ادا کرنا واجب ہے، البتہ منت کی رقم دینے کے لیے اس نے کسی مدرسے کو متعین نہیں کیا ہے، اس لیے مدرسہ ہی میں دینا ضروری نہیں، غرباء، مساکین اور بیواؤں کو بھی دے سکتے ہیں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۹] کیا یہ سب افراد زکوۃ کے مستحق ہیں؟

۱۴۲۶- سوال: (۱) ایک شخص کے پاس ۱۰ر بیگہ زمین ہے، رہنے کا گھر ہے، دو بیل ہیں، ۶۱۲ر گرام چاندی کی قیمت کے بہ قدر سونا ہے، قرض کچھ نہیں ہے؛ لیکن کھیتی کی آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں، تو کیا وہ شخص زکوۃ لے سکتا ہے؟ ایسا شخص مستحق زکوۃ ہے یا نہیں؟

(۲) اسی طرح ایک شخص کے پاس ۲۰ر بیگہ زمین ہے، رہنے کا گھر ہے، دو بیل ہیں، ۶۱۲ر گرام

=أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء [أي إلى بناء نحو مسجد و إلى كفن ميت و قضاء دينه] مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب، بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۱) (بخلاف) النذر (المعلق) فإنه لا يجوز تعجيله قبل وجود الشرط. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله فإنه لا يجوز تعجيله إلخ) لأن المعلق على شرط لا ينعقد سببا للحال؛ بل عند وجود شرطه، كما تقرر في الأصول، فلو جاز تعجيله لزم وقوعه قبل وجود سببه، فلا يصح، ويظهر من هذا أن المعلق يتعين فيه الزمان بالنظر إلى التعجيل، أما تأخيره فيصح لانعقاد السبب قبله، وكذا يظهر منه أنه لا يتعين فيه المكان والدرهم والفقير؛ لأن التعليق إنما أثر في تأخير السببية فقط، فامتنع التعجيل، أما المكان والدرهم والفقير، فهي باقية على الأصل من عدم التعيين؛ لعدم تأثير التعليق في شيء منها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۳۷، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، مطلب في صوم الست من شوال، ط: دار الفكر- بيروت)

چاندی کی قیمت کے بہ قدر سونا ہے، ایک بھینس ہے، قرض کچھ نہیں ہے، لیکن کھیتی کی آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں، تو کیا وہ شخص زکوۃ لے سکتا ہے یا نہیں؟

(۳) اسی طرح ایک شخص کے پاس ۳۰ ربیگہ زمین ہے، رہنے کا گھر ہے، دو بیل ہیں، ۶۱۲ رگرام چاندی کی قیمت کے بہ قدر سونا ہے، ایک بھینس ہے، قرض کچھ نہیں ہے، لیکن کھیتی کی آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں، تو کیا وہ شخص زکوۃ لے سکتا ہے یا نہیں؟

(۴) اسی طرح ایک شخص کے پاس ۴۰ ربیگہ زمین ہے، رہنے کا گھر ہے، دو بیل ہیں، ۶۱۲ رگرام چاندی کی قیمت کے بہ قدر سونا ہے، ایک بھینس ہے، قرض کچھ نہیں ہے، لیکن کھیتی کی آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں، تو وہ شخص زکوۃ لے سکتا ہے یا نہیں؟

(۵) ایک شخص کی ۳۰۰ رروپے ماہانہ تنخواہ ہے، رہنے کا گھر ہے، ۶۱۲ رگرام چاندی کی قیمت کے بہ قدر سونا ہے، قرض کچھ نہیں ہے، لیکن تنخواہ سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں، تو وہ شخص زکوۃ لے سکتا ہے یا نہیں؟

(۶) اسی طرح ایک شخص کی ۴۰۰ رروپے ماہانہ تنخواہ ہے، رہنے کے لیے کرایہ کا گھر ہے، ۶۱۲ رگرام چاندی کی قیمت کے بہ قدر سونا ہے، قرض کچھ نہیں ہے؛ لیکن تنخواہ سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں، تو وہ شخص زکوۃ لے سکتا ہے یا نہیں؟

(۷) اسی طرح ایک شخص کی ۴۰۰ رروپے ماہانہ تنخواہ ہے، رہنے کے لیے خود کا گھر ہے، ۶۱۲ رگرام چاندی کی قیمت کے بہ قدر سونا ہے، قرض کچھ نہیں ہے؛ لیکن تنخواہ سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں، تو وہ شخص زکوۃ لے سکتا ہے یا نہیں؟

(۸) ایک شخص کی ۵۰۰ رروپے ماہانہ تنخواہ ہے، رہنے کے لیے خود کا گھر ہے، ۶۱۲ رگرام چاندی کی قیمت کے بہ قدر سونا ہے، قرض کچھ نہیں ہے؛ لیکن تنخواہ سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں، تو وہ شخص زکوۃ لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کے سوال میں مختلف الفاظ ہیں: قرض نہیں ہے، تنخواہ اور آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے

نہیں ہوتے ہیں، ۶۱۲ رگرام چاندی کی قیمت کے بہ قدر سونا ہے، یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کے بہ قدر سونا ہے، تو اس سلسلے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ جس شخص کے پاس اتنا مال ہو کہ کوئی ایک نصاب پورا ہو جاتا ہو، تو وہ مال دار کے حکم میں ہے، اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں۔ (عالم گیری)[۱]

پس صورت مسئولہ میں ''سونا'' کے ساتھ گھر میں ایسے برتن ہوں گے، جو سال میں ایک مرتبہ بھی استعمال میں نہ آتے ہوں گے،[۲] تو اس کی قیمت بھی لگائی جائے گی اور سب ملا کر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کو پہنچ جائے اور کچھ قرض بھی نہ ہو، تو فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسا شخص چھوٹے نصاب کا مالک ہے، اس پر صدقۃ الفطر ادا کرنا واجب ہوگا، اسی طرح قربانی بھی واجب ہوگی، اس کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ (مستفاد: درمختار، عالم گیری، البحر الرائق)[۳]

لہٰذا میرے نزدیک مذکورہ تمام صورتوں میں اس شخص کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں چند ضروری باتیں ملاحظہ فرمائیں:

۱- لیکن ''سونا'' نہ ہو، تو تمام آٹھوں صورتوں میں اگر گھر کے اخراجات پورے نہ ہوتے ہوں، تو

---

[۱] لایجوز دفع الزکاة إلی من یملك نصابا أي مال کان دنانیر أو دراهم أو سوائم أو عروضا للتجارة أو لغیر التجارة فاضلا عن حاجته في جمیع السنة هکذا في الزاهدي والشرط أن یکون فاضلا عن حاجته الأصلیة، وهي مسکنه، وأثاث مسکنه وثیابه وخادمه، ومرکبه وسلاحه، ولا یشترط النماء إذ هو شرط وجوب الزکاة لا الحرمان کذا في الکافي. (الفتاوی الهندیة: ۱/ ۱۸۹، کتاب الزکاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفکر)

(۲) اگر سوال میں مذکور، سونا کے علاوہ، ضرورت سے زائد کوئی شئے نہ ہو، حتیٰ کہ کوئی ایسا برتن بھی نہ ہو، جو سال بھر استعمال میں نہ آتا ہو، تب وہ شخص چھوٹے نصاب (جس کی وجہ سے صدقۃ الفطر اور قربانی واجب ہوتی ہے، اور زکاۃ لینا حرام ہو جاتا ہے) کا مالک نہیں شمار کیا جائے گا، اور اس کا حکم دوسرا ہوگا، یعنی اس کے لیے زکاۃ لینا جائز ہوگا۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے سونا کے ساتھ، جس برتن کا ذکر فرمایا ہے [گھر میں ایسے برتن ہوں گے، جو سال میں ایک مرتبہ بھی استعمال میں نہ آتے ہوں گے] عموماً خطہ گجرات میں ایسا ہوتا ہے؛ اس لیے اس کو موجود مان کر حکم بیان کیا ہے۔ مجتبیٰ حسن قاسمی

[۳] تجب [صدقة الفطر] ... (علی کل) حر (مسلم) ... (ذی نصاب فاضل عن حاجته الأصلیة) کدینه وحوائج عیاله (وإن لم ینم) ... وبه، أی بهذا النصاب (تحرم الصدقة) ... وتجب الأضحیة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۵۸-۳۶۰، کتاب الزکاة، باب صدقة الفطر، ط: دار الفکر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۷۱، کتاب الزکاة، باب صدقة الفطر، ط: دار الکتاب الإسلامي)

زکوۃ لینا جائز ہوگا۔ [۴]

۲-کھیتی کے لیے بیل ضرورت میں داخل ہے؛ لہٰذا اگر دو بیلوں کی قیمت ۵۰۰۰۰ روپے ہوگی، تب بھی زکوۃ لینا جائز ہوگا۔ [۵]

۳-اگر سونے کی مالک عورت ہو، تو مذکورہ صورتوں میں شوہر کو زکوۃ دینا جائز ہوگا۔ [بہ شرطے کہ وہ اموال زکاۃ میں کسی اور شئے کے مالک نہ ہوں] [۶]

۴-اسی طرح اگر شوہر اس سونے کا مالک ہو، تو عورت کو زکوۃ لینا جائز ہوگا۔ [۷]

۵-اسی طرح اس کی بالغ اولاد کو بھی دینا جائز ہوگا۔ [۸]

۶-مذکورہ تمام صورتوں میں اگر قرض ذمہ میں آجائے گا (جس سے نصاب ختم ہوجائے) تو زکوۃ لینا جائز ہوگا۔ [۹]

۷-بھینس حاجت اصلیہ میں داخل ہے، اس لیے اس کی قیمت نصاب میں شمار نہیں کی جائے گی۔ [۱۰] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۴، ۵، ۱۰) وكذا لو كان له حوانيت أو دار غلة تساوي ثلاثة الاف درهم وغلتها لا تكفي لقوته وقوت عياله يجوز صرف الزكاة إليه في قول محمد - رحمه الله تعالى -، ولو كان له ضيعة تساوي ثلاثة الاف، ولا تخرج ما يكفي له ولعياله، اختلفوا فيه قال محمد بن مقاتل يجوز له أخذ الزكاة. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۹، كتاب الزكاة، البا السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۶) مصرف الزكاة... (هو فقير، وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: مستغرق في الحاجة) كدار السكنى وعبيد الخدمة وثياب البذلة وآلات الحرفة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۳۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت)

يجوز دفع الزكاة إلى من يملك ما دون النصاب أو قدر نصاب غير تام، وهو مستغرق في الحاجة. (البحر الرائق: ۲/۴۱۹، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة، ط: دار الكتاب - ديوبند ☆ مجمع الأنهر: ۱/۳۲۲، كتاب الزكاة، باب في بيان أحكام المصرف ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۹، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر)

(۷) ويدفع إلى امرأة غني إذا كانت فقيرة. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۹، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف)

(۸) ولا يجوز دفعها إلى ولد الغني الصغير كذا في التبيين. ولو كان كبيرا فقيرا جاز. (المصدر السابق)

(۹) (ومنها الغارم) وهو من لزمه دين ولا يملك نصابا فاضلا عن دينه. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر ☆ الهداية مع فتح القدير: ۲/۱۱۷-۱۸، كتاب الزكاة، ط: رشيديه - پاكستان)

[۴۰] زکوۃ اور سود کی رقم مسافر خانہ کی تعمیر میں استعمال کرنا

۱۴۲۷- سوال: ہمارا ایک ادارہ ہے، جس میں زکوۃ، فطرہ اور سود وغیرہ؛ ہر طرح کی رقم کا ہم چندہ کرتے ہیں، ہمارا اہم مقصد ممبئی میں ایک مسافر خانہ بنانے کا ہے، تو ان پیسوں کو مسافر خانہ بنانے میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ واضح رہے کہ ایک مدرسہ ابھی تیار ہوا ہے، اس کی تعمیر میں زکوۃ کے پیسے لگے ہیں۔ اگر اس کی اجازت نہیں ہے، تو اس سلسلہ میں کوئی حیلہ جواز کا ہو، تو بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اس مقصد کو سہولت و آسانی کے ساتھ پورا فرمائے، آمین۔

زکوۃ اور صدقۃ الفطر کی ادائیگی کے سلسلے میں فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس مال کا غریب و مسکین کو مالک بنانا ضروری ہے، اس کے بغیر زکاۃ و صدقۂ فطر کی ادائیگی درست نہیں ہوگی۔ (درمختار و شامی، عالم گیری، کنز، بحر وغیرہ)[۱]

غریب کو مالک بنائے بغیر اس کو دسترخوان پر بٹھا کر کھلانے سے زکوۃ ادا نہ ہوگی، البتہ اگر غریب کو روٹی اور سالن دے دے اور اس کھانے کا مالک بنا دے، تو زکوۃ ادا ہو جائے گی۔[۲]

اب اگر وہ غریب یہ کھانا کسی مال دار کو کھلائے، تو جائز ہے اور مال دار کے لیے اس کے کھانے میں

---

[۱] ويشترط أن يكون الصرف (تمليكا) لا إباحة كما مر (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد و) لا إلى (كفن ميت وقضاء دينه). (الدر المختار مع الرد: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت☆تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب-ديوبند☆المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا- ديوبند☆الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا-ديوبند)

(۲) (هي) لغة الطهارة والنماء، وشرعا (تمليك) خرج الإباحة، فلو أطعم يتيما ناويا الزكاة لا يجزيه إلا إذا دفع إليه المطعوم كما لو كساه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۵۶-۲۵۷، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب-ديوبند)

کوئی حرج نہیں ہے۔[۳]

ملکیت کی تبدیلی سے احکام میں بھی تبدیلی آتی ہے، حدیث شریف میں ہے کہ حضرت بریرہؓ کے گھر آپ ﷺ تشریف لائے، تو حضرت بریرہؓ نے کھجور سے آپ کی مہمان نوازی کی، آپ ﷺ نے فرمایا: اس ہانڈی میں کیا ہے؟ تو جواب دیا، اس میں گوشت ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا ہمیں اس میں سے نہیں کھلاؤ گی؟ تو حضرت بریرہؓ نے کہا: یہ صدقہ کا گوشت ہے۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''یہ تمہارے لیے صدقہ ہے، مگر (جب تم ہمیں دو گی تو) ہمارے لیے وہ ہدیہ ہوگا'' (حدیث)[۴]

اس لئے اگر کوئی شخص زکوۃ کی رقم مسجد ومدرسہ وغیرہ کی تعمیر میں [ڈائریکٹ] استعمال کرے گا تو

---

(۳) قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ وهو معنى قول ابن الملك: فيحل التصدق على من حرم عليه بطريق الهدية. (مرقاة المفاتيح–علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۴/ ۱۳۰۳، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر – بيروت)

وأما الرجل الذي له جار مسكين، فتصدق على المسكين، فأهداها المسكين إلى غني؛ فإنما يحل له، لأنه ملكها بالهدية. (الفتاوى التاتارخانية: ۲/ ۲۰۳، كتاب الزكاة، الفصل الثامن بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا– ديوبند)

[۴] عن عائشة رضي الله عنها، قالت: كان في بريرة ثلاث سنن: عتقت فخيرت، وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الولاء لمن أعتق، ودخل رسول الله صلى الله عليه وسلم وبرمة على النار، فقرب إليه خبز وأدم من أدم البيت، فقال: ألم أر البرمة، فقيل: لحم تصدق به على بريرة، وأنت لا تأكل الصدقة، قال: هو عليها صدقة، ولنا هدية. (صحيح البخاري: ۲/ ۷۶۳، رقم الحديث: ۵۰۹۷، كتاب النكاح، باب الحرة تحت العبد، ط: ديوبند، وانظر رقم: ۱۴۹۳، كتاب الزكاة، باب الصدقة على موالي أزواج النبي صلى الله عليه وسلم، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۴۹۴، رقم الحديث: ۸–۱۱ (۱۵۰۴)، كتاب العتق، باب إنما الولاء لمن أعتق، ط: ديوبند)

(فقال – صلى الله عليه وسلم –: "ألم أر برمة فيها لحم") الاستفهام للتقرير (قالوا: بلى، ولكن ذلك لحم تصدق به على بريرة، وأنت لا تأكل الصدقة، قال: "هو") أي اللحم "عليها" أي على بريرة (صدقة ولنا هدية) قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ وهو معنى قول ابن الملك: فيحل التصدق على من حرم عليه بطريق الهدية. (مرقاة المفاتيح: ۴/ ۱۳۰۳، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر – بيروت)

جائز نہیں ہے، اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ (۵)

البتہ اگر زکوٰۃ دہندگان نے اہل مدرسہ یا مسافر خانہ بنانے والوں کو اس کا وکیل بنادیا ہے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے اور اس کو کسی جائز کام میں استعمال کرلیں، تو وہ وکیل بن جائیں گے۔ اب وہ کسی غریب کو مسافر خانہ کی اہمیت بتائیں اور وہ غریب کسی مال دار سے اتنی رقم بہ طور قرض لے، پھر مسافر خانہ کی تعمیر میں دے دے، پھر کمیٹی والے اس غریب کو زکوٰۃ کی رقم دے دیں، اور وہ غریب اس سے اپنا قرض ادا کردے تو یہ جائز ہے، اور جواز کا ایک قسم کا حیلہ ہے، اس سے غریب کو صدقہ وخیرات کا ثواب بھی مل جائے گا، اس حیلہ کے بغیر ویسے ہی زکوٰۃ استعمال کرنے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ (۶)

سود کی رقم بھی اس طرح سے حیلہ کرکے استعمال کرنا بہتر ہے۔ (۷) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۵) ويشترط أن يكون الصرف (تمليكا) لا إباحة كمامر (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد و) لا إلى (كفن ميت وقضاء دينه). (الدر المختار مع الرد: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

ولا يصرف في بناء مسجد، وقنطرة، ولا يقضي بها دين ميت، ولا يعتق عبداً، ولا يكفن ميتا. (المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا - ديوبند ☆ الفتاوى التاتار خانية: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا - ديوبند)

(۶) وحيلة الجواز أن يعطي مديونه الفقير زكاته ثم يأخذها عن دينه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۷۱، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

والحيلة لمن أراد ذلك أن يتصدق بمقدار زكاته على فقير، ثم يأمره بعد ذلك بالصرف إلى هذه الوجوه، فيكون لصاحب المال ثواب الصدقة، ولذلك الفقير ثواب هذه القرب. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۳، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع الزكاة فيه، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية، بيروت ☆ الفتاوى التاتار خانية: ۲/ ۲۰۸، كتاب الزكاة، الفصل الثامن بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا - ديوبند)

(۷) سود کی رقم رفاہی کاموں میں استعمال ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اکابر امت کا اختلاف ہے، ایک بڑی جماعت جواز کی طرف گئی ہے، جن میں مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مفتی سید عبد الرحیم لاج پوریؒ، مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، استاذ گرامی مولانا=

[۴۱] طالب علم کو زکوۃ دینا

۱۴۲۸- سوال: سورت سوسائٹی کی جانب سے اکثر طلبہ کو برائے اعانت، ہر مہینہ کچھ مخصوص رقم ملتی ہے اور اس رقم میں زیادہ تر حصہ زکوۃ کا ہوا کرتا ہے، تو کیا طالب علم زکوۃ کی رقم لے سکتا ہے؟

اگر کوئی شخص، کسی طالب علم کو زکوۃ کی رقم دینا چاہے، خواہ وہ [طالب علم] گھر پر کتنا ہی مال دار ہو، تو دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

زکوۃ کی ادائیگی کی صحت کے لیے اصل بات یہ ہے کہ فقیر کو مالک بنا دیا جائے۔ خواہ زکوۃ لینے والا طالب علم ہو یا کوئی دوسرا، تملیک ضروری ہے، تملیک کے بغیر زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔[1] بس شرط یہ ہے کہ وہ زکوۃ کا مستحق ہو۔[2]

=خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم شامل ہیں، جیسا کہ ان کے فتوی سے معلوم ہوتا ہے، حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے اس سلسلے میں بڑی مفصل و محقق بحث فرمائی ہے، دیکھیے: فتاوی عثمانی: ۳/ ۱۲۹-۱۴۰، کتاب البیوع، فصل فی احکام المال الحرام والمخلوط، مال حرام کے تصدق میں تملیک ضروری ہے یا نہیں؟ ط: نعیمیہ- دیوبند۔

(۱) ويشترط أن يكون الصرف (تمليكا) لا إباحة كمامر (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد و) لا إلى (كفن ميت وقضاء دينه). (الدر المختار مع الرد: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر- بيروت☆تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب- ديوبند☆المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا- ديوبند☆ الفتاوى التاتار خانية: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۲۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

(۲) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ، فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾. (۹- التوبة: ۶۰)

زياد بن الحارث الصدائي، قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعته، فذكر حديثا طويلا، قال: فأتاه رجل، فقال: أعطني من الصدقة، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله تعالى لم يرض بحكم نبي ولا غيره في الصدقات، حتى حكم فيها هو، فجزأها ثمانية أجزاء، فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۳۰، رقم الحديث: ۱۶۳۰، كتاب الزكاة، باب من يعطي من الصدقة، وحد الغنى، ط: ديوبند) =

لڑکا بالغ ہوجائے، تو باپ پر اس کے نان ونفقہ اور سکنیٰ وکسوہ کی ذمہ داری لازم نہیں۔[۳] اس بنیاد پر مدارس میں پڑھنے والے بالغ طلبہ کا نان ونفقہ اس کے والد پر لازم نہیں۔[۴] باپ کی مال داری کی وجہ سے

= قوله [تعالى]: إنما الصدقات للفقراء الآية تدل على أنه لا حق في الصدقات لأحد إلا لهذه الأصناف الثمانية، وذلك مجمع عليه، وأيضا فلفظة (إنما) تفيد الحصر ويدل عليه وجوه. (مفاتيح الغيب = التفسير الكبير - أبو عبد الله محمد بن عمر، التيمي الرازي الملقب بـ'فخر الدين الرازي' خطيب الري (م:٦٠٦هـ):١٢/ ٨٠، سورة التوبة: ٩، آية:٦٠، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

ثم بين مواضعها التي توضع فيها فقال {إِنَّمَا الصدقات لِلْفُقَرَاء والمساكين} قصر جنس الصدقات على الأصناف المعدودة أي هي مختصة بهم لا تتجاوز إلى غيرهم كأنه قيل إنما هي لهم لا لغيرهم كقولك إنما الخلافة لقريش تريد لا تتعداهم ولا تكون لغيرهم. (تفسير النسفي (مدارك التنزيل وحقائق التأويل) - أبو البركات عبد الله بن أحمد بن محمود حافظ الدين النسفي (م:٧١٠هـ):١/ ٦٨٨، سورة التوبة:٦٠، ت: يوسف علي بديوي، ط: دار الكلم الطيب - بيروت ☆ جامع البيان في تأويل القرآن - محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي، أبو جعفر الطبري (م:٣١٠هـ): ١٤/ ٣٠٥، سورة التوبة:٦٠، ت: أحمد محمد شاكر، ط: مؤسسة الرسالة)

مصرف الزكاة... (هو فقير، وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار مع رد المحتار: ٢/ ٣٣٩، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت)

(٣) ولا يجب على الأب نفقة الذكور الكبار إلا أن الولد يكون عاجزا عن الكسب لزمانة، أو مرض. (الفتاوى الهندية: ١/ ٥٦٣، كتاب النكاح، الفصل الرابع في نفقة الأولاد: ط: زكريا - ديوبند)

(۴) مدارس میں پڑھنے والے بڑے طلبہ کا نان ونفقہ ان کے والد پر لازم ہے یا نہیں، فقہ کی بعض جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نفقہ بھی لازم ہے، بس شرط یہ ہے کہ وہ کسب وکمائی پر قادر نہ ہوں اور علوم دینیہ کی تحصیل میں مشغول ہوں، درج ذیل صراحت ملاحظہ فرمائیں:

وكذا طلبة العلم إذا كانوا عاجزين عن الكسب لا يهتدون إليه لا تسقط نفقتهم عن آبائهم إذا كانوا مشتغلين بالعلوم الشرعية لا بالخلافيات الركيكة وهذيان الفلاسفة، ولهم رشد، وإلا لا تجب كذا في الوجيز للكردري. (الفتاوى الهندية: ١/ ٥٦٣، كتاب النكاح، الفصل الرابع في نفقة الأولاد: ط: زكريا - ديوبند)

البتہ عمومی عبارات (مثلاً: حاشیہ نمبر ۳ کی عبارت) کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ ان کا نفقہ والدین پر لازم نہیں، اسی بناء پر مدارس میں پڑھنے والے ان طلبہ کے لیے زکاۃ دینے کو جائز قرار دیا گیا ہے، جن کے والد مال دار ہوں؛ کیوں کہ والد کی مال داری سے ان کی اولاد مال دار کے حکم میں نہیں ہوتی۔ حضرت مفتی صاحبؒ اور دیگر مفتیان کرام کی رائے یہی ہے، اور ہمارے یہاں اسی پر فتویٰ ہے:

طلبۂ مدارس "فی سبیل اللہ" کے مصداق ہیں؛ اس وجہ سے بھی ان کے لیے زکاۃ لینا جائز ہے۔ (تفصیل کے لیے شامی کی حاشیہ نمبر ۵ میں درج بحث کے ساتھ ان کتابوں کی جانب رجوع کریں:)

رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ٣٤٠، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق - ابن نجيم المصري (م: ٩٧٠هـ): ٢/ ٢٦٩، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة، قبيل: باب صدقة الفطر، ط: دار الكتاب=

وہ مال دار شمار نہیں ہوں گے، لہٰذا مدرسہ میں پڑھنے والا بالغ طالب علم - جو فی الحال نصاب کی مقدار کا مالک نہیں ہے - خواہ اس کا باپ گھر پر کتنا ہی مال دار کیوں نہ ہو، اس کو زکوۃ دینا اور اس کا لینا جائز ہے، زکوۃ ادا ہوجائے گی۔ (۵) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= الإسلامي ☆مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م:۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۲۰، كتاب الزكاة، باب في بيان أحكام المصرف، ط: دار إحياء التراث العربي ☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱هـ)، ص:۷۲۰، كتاب الزكاة، باب المصرف، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت.

(۵) وأما ولد الغني فإن كان صغيرا لم يجز الدفع إليه وإن كان فقيرا لا مال له؛ لأن الولد الصغير يعد غنيا بغنى أبيه وإن كان كبيرا فقيرا يجوز؛ لأنه لا يعد غنيا بمال أبيه فكان كالأجنبي. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۵۸، كتاب الزكاة، باب المصارف، ط: زكريا - ديوبند ☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۹، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف ☆رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۲۹۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، زكريا - ديوبند ☆الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۲۱۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة ☆المحيط البرهاني: ۳/ ۲۱۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ط: مكتبة الرشد - الرياض)

... أن طالب العلم يجوز له أخذ الزكاة ولو غنيا إذا فرغ نفسه لإفادة العلم واستفادته لعجزه عن الكسب والحاجة داعية إلى ما لا بد منه. (الدر المختار) ـــــــ وفي حاشية ابن عابدين: وفي المبسوط: لا يجوز دفع الزكاة إلى من يملك نصابا إلا إلى طالب العلم والغازي ومنقطع الحج لقوله - عليه الصلاة والسلام -: يجوز دفع الزكاة لطالب العلم وإن كان له نفقة أربعين سنة. اهـ .... والمعنى أن الإنسان يحتاج إلى أشياء لا غنى عنها فحينئذ إذا لم يجز له قبول للزكاة مع عدم اكتسابه أنفق ما عنده ومكث محتاجا فينقطع عن الإفادة والاستفادة فيضعف الدين لعدم من يتحمله... قلت: وهو كذلك. والأوجه تقييد بالفقير، ويكون طلب العلم مرخصا لجواز سؤاله من الزكاة وغيرها وإن كان قادرا على الكسب إذ بدونه لا يحل له السؤال كما سيأتي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۰، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆البحر الرائق - ابن نجيم المصري (م:۹۷۰هـ): ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة، قبيل: باب صدقة الفطر، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م:۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۲۰، كتاب الزكاة، باب في بيان أحكام المصرف، ط: دار إحياء التراث العربي ☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱هـ)، ص:۷۲۰، كتاب الزكاة، باب المصرف، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(و) لا إلى (غني) يملك قدر نصاب فارغ عن حاجته الأصلية... (و) لا إلى (طفله). (الدر المختار مع رد =

[۴۲] زکوۃ اور صدقات کی رقم سے غیر منقولہ جائداد خرید کر آمدنی کو مستحقین پر خرچ کرنا

۱۴۲۹- سوال: ہمارے گاؤں بارڈولی میں ''ستو-یو'' نام کا ایک رجسٹرڈ ٹرسٹ پچھلے ستائیس سال سے کام کر رہا ہے، اس ادارے میں فی الحال زکوۃ، صدقہ، فطرہ اور للہ رقومات جمع ہیں، ادارے کے منتظمین کے پاس مذکورہ مدات کی رقوم آتی ہیں، وہ لوگ حیلہ کر کے بینک میں جمع کروا دیتے ہیں اور پھر حسب ذیل کاموں کے لیے ان کو خرچ کیا جاتا ہے:

(۱) دینی اور عصری طلبہ کی کفالت، ان کے لیے کتابوں کی فراہمی اور اسکولرشپ کا انتظام وغیرہ۔

(۲) مقامی لائبریری میں ہدیہ میں موصول شدہ رقومات کے ذریعہ یومیہ اخبار اور دوسرے رسائل اور میگزن خریدے جاتے ہیں۔

یہ بات آپ کو بھی بہ خوبی معلوم ہے کہ اس دور میں ایک لمبے عرصے سے حکومتی پیمانے پر ٹرسٹ کی جائداد پر سخت چھان بین ہو رہی ہے؛ ہمارے ٹرسٹ پر چھان بین کا قوی امکان ہے، ہمارے پاس جو کچھ رقم فی الحال موجود ہے، اس میں سے ہم لوگ کوئی غیر منقولہ جائداد لے کر اس کی آمدنی کو مذکورہ بالا مقاصد میں خرچ کرنا چاہتے ہیں، تو کیا ہم لوگ اس رقم کے ذریعہ اس طرح کی کوئی ملکیت لے سکتے ہیں؟

احقر از ہلی محمد اشرف عبد الحمید

الجواب حامداو مصلیا:

سب سے پہلے چند اہم اصول لکھتا ہوں، جن سے جواب اچھی طرح حل ہو جائے گا۔

=المحتار: ۲/۳۴۹-۳۴۷، كتاب الزكاة، باب المصرف) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: ولا إلى طفله) أي الغني فيصرف إلى البالغ ولو ذكرا صحيحا، قهستاني، فأفاد أن المراد بالطفل غير البالغ ذكرا كان أو أنثى في عيال أبيه أو لا على الأصح لما أنه يعد غنيا بغناه، نهر. (رد المحتار: ۲/۳۴۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(وفي سبيل الله وهو منقطع الغزاة) وقيل الحاج وقيل طلبة العلم، وفسره في البدائع بجميع القرب. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وقيل طلبة العلم) كذا في الظهيرية والمرغيناني واستبعده السروجي بأن الآية نزلت وليس هناك قوم يقال لهم طلبة علم قال في الشرنبلالية: واستبعاده بعيد؛ لأن طلب العلم ليس إلا استفادة الأحكام وهل يبلغ طالب رتبة من لازم صحبة النبي - صلى الله عليه وسلم - لتلقي الأحكام عنه كأصحاب الصفة، فالتفسير بطالب العلم وجيه خصوصا، وقد قال في البدائع: في سبيل الله جميع القرب، فيدخل فيه كل من سعى في طاعة الله، وسبيل الخيرات إذا كان محتاجا. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۴۳، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) زکوۃ، فطرہ اور صدقۂ واجبہ کی رقم کا کسی غریب کو مالک بنانا ضروری ہے، غریب کو مالک بنائے بغیر انجمن کے اخبار اور لائبریری کی کتابیں خریدنا جائز نہیں۔ (۱)

(۲) مذکورہ رقم دینے والے اصحاب مال حضرات جس نیت سے رقم دیتے ہیں، یا آپ کی تنظیم کے جو مقاصد ہیں، ان میں ہی خرچ کرنا ضروری ہے، ان کے علاوہ دوسرے مقاصد یا نئی اسکیم بنا کر، ان میں رقم خرچ کرنا جائز نہیں۔ (۲)

(۳) کتابیں صرف اگر پڑھنے کے لیے دی ہیں، مالک نہیں بنایا، تو جس قدر رقم سے کتابیں خریدی گئی ہیں، اس قدر زکاۃ کی ادائیگی باقی رہے گی۔ (۳)

(۴) آپ نے حیلہ کی صورت اور اس کا طریقہ نہیں لکھا ہے، جائز طریقہ سے حیلہ ہونا ضروری ہے۔

آپ کی تحریر کے مطابق (سٹو-یو) کے ضابطے کے مطابق روپے خرچ کرنے کے بعد زائد رقم جو بچی ہے، اس کو اگر خرچ نہ کیا جائے، تو سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کی جانب سے پریشانی ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں اس زائد رقم سے کسی غیر منقولہ ملکیت حاصل کر لی جائے اور اس کی آمدنی کو ادارے کے مقاصد

---

(۱)... الزكاة يجب فيها تمليك المال؛ لأن الإيتاء في قوله تعالى {وآتوا الزكاة} [البقرة: ۴۳] يقتضي التمليك، ولا تتأدى بالإباحة حتى لو كفل يتيما فأنفق عليه ناويا للزكاة لا يجزيه بخلاف الكفارة، ولو كساه تجزيه لوجود التمليك. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۵۲-۲۵۱، أول كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة ☆الدر المختار مع الرد: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب - ديوبند☆المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا - ديوبند☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا - ديوبند)

(۲)... الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل، وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره كما لو أوصى لزيد بكذا ليس للوصي الدفع إلى غيره. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) حاشیہ نمبر: (۱) دیکھیں۔

میں خرچ کیا جائے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

البتہ رقم خرچ کرنے میں اصل نمبر (۱) اور (۲) کا خیال رکھیں۔

آپ کے قوانین اور حیلے کے طریقے میرے سامنے نہیں ہیں؛ اس لیے زیادہ لکھنے سے قاصر ہوں، حیلہ کی بہتر صورت یہ ہے کہ آپ کی یونین میں اگر غریب کی مدد کرنا بھی شامل ہو، تو غریب آدمی مال دار کے پاس سے ہزار روپیہ بہ طور قرض لے کر ادارے کو دے، اس کے بعد منتظمین حضرات مذکور پیسوں میں سے ہزار روپیہ غریب کو دے اور قرض دینے والا مال دار شخص فوراً اسی مجلس میں اپنا قرض وصول کرلے۔ (۲)

الغرض غیر منقولہ ملکیت حاصل کرنے کے لیے وقفے وقفے سے مذکورہ حیلہ کرتا رہے۔

غریبوں کی مدد کرنا بھی آپ کے مقاصد میں ہو، تو اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ ایسا نہ ہو کہ گاؤں کے غریب تو بغیر مکان کے زندگی بسر کریں اور آپ حضرات مضبوط غیر منقولہ ملکیت کی فکر میں مشغول ہوں، اگر واقعتاً رقم مقاصد ٹرسٹ کی تکمیل کے بعد بچ جائے، تب اس کو حیلے کے بعد غیر منقولہ جائداد میں منتقل کریں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۳] زکوٰۃ اور صدقے کی رقم کا مدرسے کے تعمیری کام میں استعمال کرنا اور تنخواہ دینا

۱۴۳۰- سوال: چندہ میں زکوٰۃ، صدقہ اور فطرہ کی رقم ملتی ہے، تو کیا اس رقم کو مدرسہ کے تعمیری کاموں میں نیز اساتذہ اور امام کی تنخواہ میں صرف کرسکتے ہیں؟

غلام محمد اسد غانجی

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوٰۃ، فطرہ اور صدقات واجبہ کی رقوم کی ادائیگی کی صحت کے لیے غریب اور فقیر کو مالک بنانا ضروری

---

(۲) وحيلة الجواز أن يعطي مديونه الفقير زكاته ثم يأخذها عن دينه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۷۱، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

والحيلة لمن أراد ذلك أن يتصدق بمقدار زكاته على فقير، ثم يأمره بعد ذلك بالصرف إلى هذه الوجوه، فيكون لصاحب المال ثواب الصدقة، ولذلك الفقير ثواب هذه القُرب. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني- أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۲/ ۲۸۳، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع الزكاة فيه، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۲/ ۲۰۸، كتاب الزكاة، الفصل الثامن بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

ہے۔ [1] مساجد و مدارس کی تعمیر میں رقم لگانے سے تملیک کی شرط نہیں پائی جاتی ؛ اس لیے زکوۃ کی رقم کو مسجد و مدرسہ کے تعمیری کام میں اور ملازمین وائمہ کی تنخواہوں میں استعمال کرنا جائز نہیں ؛ کیوں کہ تنخواہ کام کا معاوضہ ہوتی ہے اور زکوۃ کو کام کے معاوضہ کے طور پر دینا جائز نہیں۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۴۴] زکوۃ اور صدقے کی رقم کا حیلہ کرکے تعمیری کام میں استعمال کرنا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۴۳۱- سوال: زکوۃ، صدقہ اور فطرہ کی رقم اگر آئی ہوئی ہو، تو اس کو کیا کرنا چاہیے، حیلہ کرکے اس کو استعمال کر سکتے ہیں؟ اگر استعمال کر سکتے ہیں تو حیلہ کا طریقہ کیا ہے؟

غلام محمد اسد خانجی

الجواب حامداومصليا:

اولاً دینے والے سے رابطہ کریں اور بتائیں کہ زکوۃ وصدقات کی رقم مسجد و مدرسہ کے تعمیری کام میں استعمال کرنا جائز نہیں ؛ اگر دینے والوں کی طرف سے مناسب جواب نہ ملے، تو پھر منتظمین حضرات اس رقم میں حسب ذیل طریقہ سے حیلہ کر سکتے ہیں۔

جو بھی رقم ہو ؛ مثلاً: پانچ ہزار روپیہ زکوۃ کی رقم ہو، اب کوئی غریب دین دار آدمی مسجد و مدرسہ کے متولی اور منتظم کے پاس سے قرض لے کر مسجد و مدرسہ میں دے، اس کے منتظم مذکورہ پانچ ہزار روپیہ اسی غریب کو زکوۃ

---

(۱) . . . الزكاة يجب فيها تمليك المال؛ لأن الإيتاء في قوله تعالى {واتوا الزكاة} [البقرة:۴۳] يقتضي التمليك، ولا تتأدى بالإباحة حتى لو كفل يتيما فأنفق عليه ناويا للزكاة لا يجزيه بخلاف الكفارة، ولو كساه تجزيه لوجود التمليك. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م:۷۴۳ھ): ۱/ ۵۲-۲۵۱، أول كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة ☆الدر المختار مع الرد: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆البحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب-ديوبند ☆المحيط البرهاني - ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا-ديوبند)

(۲) قد تقدم تخريجه مرارا.

کی نیت سے دے، پھر اسی جگہ پر اپنے پانچ ہزار روپیہ قرض کا بھی مطالبہ کرے، ایسی صورت میں اسے قرض بھی واپس مل جائے گا اور زکوۃ بھی ادا ہو جائے گی، نیز اس دین دار شخص کو مسجد و مدرسہ میں امداد کا ثواب بھی ملے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۵] زکوۃ وغیرہ کی رقم سے مدرسہ کی سالانہ رپورٹ چھپوانا

۱۴۳۲- سوال: زکوۃ، صدقہ، فطرہ اور وہ للہ رقم جو غرباء میں تقسیم کے لیے آتی ہے، اس رقم سے کوئی ادارہ کیا اپنی سالانہ رپورٹ تقریباً ایک ہزار روپیہ خرچ کر کے چھپوا سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر ادارہ اس رقم سے اپنی سالانہ رپورٹ چھپوانا چاہے تو اس کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

ایم رحمن چلیل لاجپوری

الجواب حامداو مصلیا:

زکوۃ، صدقۂ واجبہ اور فطرے کی ادائیگی کی صحت کے لیے کسی غریب کو مالک بنانا ضروری ہے۔[1] اس

---

(۱) وحيلة الجواز أن يعطي مديونه الفقير زكاته ثم يأخذها عن دينه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۷۱، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

والحيلة لمن أراد ذلك أن يتصدق بمقدار زكاته على فقير، ثم يأمره بعد ذلك بالصرف إلى هذه الوجوه، فيكون لصاحب المال ثواب الصدقة، ولذلك الفقير ثواب هذه القرب. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مازة البخاري الحنفي (م:۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۳، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع الزكاة فيه، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۲/ ۲۰۸، كتاب الزكاة، الفصل الثامن بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا-ديوبند)

(۱) لايجوز الزكاة إلا إذا قبضها الفقير أو قبضها من يجوز القبض له، لولايته عليه. (المحيط البرهاني - ابن مازة البخاري الحنفي (م:۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت

... الزكاة يجب فيها تمليك المال؛ لأن الإيتاء في قوله تعالى {وآتوا الزكاة} [البقرة: ۴۳] يقتضي التمليك، ولا تتأدى بالإباحة حتى لو كفل يتيما فأنفق عليه ناويا للزكاة لا يجزيه بخلاف الكفارة، ولو كساه تجزيه لوجود التمليك. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۲۵۱-۵۲، أول كتاب الزكاة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/ ۳۵۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتاب-ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: =

لیے مدرسہ کی سالانہ رپورٹ اس رقم سے حیلہ کیے بغیر چھپوانا جائز نہیں، کہ اس میں تملیک کا تحقق نہیں ہوتا ہے۔ البتہ اگر واقعی ضرورت ہو تو حیلۂ تملیک کے بعد چھپوانے کی اجازت ہوگی۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۶] عبادت خانے کی تعمیر میں زکوۃ کی رقم استعمال کرنا

۱۴۳۳- سوال: نماز پڑھنے کی نیت سے ایک عبادت خانہ کی تعمیر ہوئی تھی،، اس میں بچوں کو پڑھانے کا کام بھی ہوتا ہے، پنج وقتہ نماز بھی ہوتی ہے؛ مگر اس کا محراب نہیں ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ اس کے تعمیری کام میں زکوۃ کی رقم استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

تعمیری کام میں زکوۃ کی رقم استعمال کرنا جائز نہیں، زکوۃ میں تملیک شرط ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس [رقم زکاۃ] پر مستحق کو قبضہ دے دیا جائے؛ اور مذکورہ عمارت، موقوفہ کا مالک کوئی انسان نہیں ہے؛ لہٰذا زکوۃ کی ادائیگی کی شرط تملیک نہیں پائی جائے گی، اس لیے زکاۃ کی رقم اس کے تعمیری کام میں لگانا جائز نہیں۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

=زكريا- ديوبند☆ الفتاوى التاتار خانية: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

(۱) وحيلة التكفين بها التصدق على فقير ثم هو يكفن فيكون الثواب لهما وكذا في تعمير المسجد، وتمامه في حيل الأشباه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۷۱، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) ويشترط أن يكون الصرف (تمليكا) لا إباحة كمامر (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد و) لا إلى (كفن ميت وقضاء دينه). (الدر المختار مع الرد: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر- بيروت☆تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

ولا يصرف في بناء مسجد، وقنطرة، ولا يقضي بها دين ميت، ولا يعتق عبداً، ولا يكفن ميتا. (المحيط البرهاني -ابن مازۃ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۲/ ۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن يوضع فيه الزكاة، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا- ديوبند☆ الفتاوى التاتار خانية: ۳/ ۲۰۸، رقم المسئلة: ۴۱۴۰، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

[۴۷] غریب آدمی کو مکان بنانے کے لیے زکوۃ کی رقم دینا

۱۴۳۴- سوال: موسم باراں میں زیادہ بارش ہونے کی وجہ سے ایک آدمی کا مکان بالکل گر گیا ہے اور اس کی مرمت میں تقریباً پانچ ہزار روپیہ خرچ ہونے کا اندازہ ہے؛ لیکن مکان کے مالک میں اس کی مرمت کرانے کی استطاعت نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کی روزانہ کی آمدنی صرف اتنی ہے، جس سے اس کے گھر والوں کا گذارہ ہو جاتا ہے۔ زمین اس کے پاس صرف دو ایکڑ ہے؛ لیکن کئی سالوں سے پیداوار نہیں ہوتی، ہاں! جو تھوڑی بہت پیداوار ہوتی ہے، اس سے سال کے دوران ہونے والے چھوٹے چھوٹے قرضے ادا کر دیتا ہے، اس سے زیادہ رقم اس کے پاس باقی نہیں رہتی، تو ایسے آدمی کو مکان بنانے کے لیے زکوۃ کی رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟ یا زکوۃ کی رقم کا حیلہ کر کے اس کو یہ رقم دے سکتے ہیں؟

حافظ آدم آچھودی

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ شخص کو زکوۃ کی اتنی رقم دینا، جس سے اس کا مکان تعمیر ہو جائے یا مکان کی مرمت ہو جائے، جائز ہے۔[۱] لیکن بہتر یہ ہے کہ مکان کی تعمیر کے لیے ضروری ساز و سامان تھوڑا تھوڑا خرید کر اس کو دے، یا روزانہ تھوڑی تھوڑی رقم دے دیا کرے کہ جس سے وہ خود مکان کی تعمیر کے لیے ضروری ساز و سامان روزانہ خرید لیا کرے، زکوۃ کے طور پر بڑی رقم یک بارگی نہ دے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (قوله والفقير من له أدنى شيء) وهو ما دون النصاب أو قدر نصاب غير نام وهو مستغرق في الحاجة... ويجوز صرف الزكاة لمن لا تحل له المسألة بعد كونه فقيرا ولا يخرجه عن الفقر ملك نصب كثيرة غير نامية إذا كانت مستغرقة بالحاجة. (فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد، المعروف بـ 'ابن الهمام' (م: ۸۶۱هـ): ۲/۲۶۱، كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقة إليه ومن لا يجوز، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۷، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) يندب دفع ما يغنيه يومه عن السؤال، واعتبار حاله من حاجة وعيال. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: والأوجه أن ينظر إلى ما يقتضيه الحال في كل فقير من عيال وحاجة أخرى كدهن وثوب وكراء منزل وغير ذلك كما في الفتح اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۵۵، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر)

(وكره إعطاء فقير نصابا) أو أكثر (إلا إذا كان) المدفوع إليه (مديونا أو) كان (صاحب عيال) بحيث (لو فرقه عليهم لا يخص كلا) أو لا يفضل بعد دينه (نصاب) فلا يكره، فتح. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۳۵۳، الزكاة)

[۴۸] مصارفِ زکوۃ کیا ہیں اور مدارس میں زکوۃ دینا کیسا ہے؟

۱۴۳۵- سوال: زکوۃ کس کو دینے سے ادا ہوتی ہے؟ زکوۃ کے لیے کس کو مستحق سمجھنا چاہیے؟ اور اس کا معیار کیا ہے؟ گداگر (جن میں اکثر صاحب نصاب ہوتے ہیں، گرچہ ہمیں اس کا علم نہیں ہوتا) ان کو زکوۃ دینے سے زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

مساجد و مدارس میں براہ راست زکوۃ دینے سے زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ اگر ادا ہوجاتی ہے، تو اس کو کس طرح صرف کرنا چاہیے؟ اور اگر ادا نہیں ہوتی ہے، تو مدارس کی چھپی ہوئی رسیدوں میں زکوۃ کے نام سے جو رقم وصول کی جاتی ہے، وہ کیسی ہے؟ زید کہتا ہے کہ اس طرح زکوۃ ادا نہیں ہوتی؛ جب کہ عمر کا کہنا ہے کہ چوں کہ مساجد و مدارس کی رسیدوں سے علمائے کرام زکوۃ وصول کرتے ہیں؛ اس لیے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے، مفصل جواب درکار ہے۔ صالح محمد خان

الجواب حامداو مصلیا:

زکوۃ کے مصارف خود اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں بیان فرمائے ہیں: إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۖ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾ (۹-التوبۃ:۶۰)

ان مستحقین کو اس کا مالک بنا دینے سے زکوۃ ادا ہوجائے گی۔(۱)

چوں کہ تملیک شرط ہے اور مسجد کا مالک کوئی مخصوص انسان نہیں ہوتا ہے؛ لہٰذا مساجد کی تعمیر اور اس کی

---

(۱) سوائے عاملین اور مؤلفۃ القلوب کے، مذکورہ تمام مستحقین، اپنے فقر کی وجہ سے مستحق زکوۃ ہوتے ہیں، لہٰذا جن کے پاس ضرورت سے زائد ساز وسامان بہ قدر نصاب (نامی یا غیر نامی) ہوجائے، تو وہ زکوۃ کے مستحق نہیں ہوں گے، اور اگر نصاب غیر نامی کے برابر نہیں ہے، تو وہ مستحق زکوۃ ہوں گے:

وجميع من يأخذ الصدقة من هذه الأصناف فإنما يأخذ صدقة بالفقر والمؤلفة قلوبهم والعاملون عليها لا يأخذونها صدقة وإنما تحصل الصدقة في يد الإمام للفقراء ثم يعطي الإمام المؤلفة منها لدفع أذيتهم عن الفقراء وسائر المسلمين ويعطيها العاملين عوضا من أعمالهم لا على أنها صدقة عليهم... ولما كان الغني هو الذي ملك مائتي درهم وما دونها لم يكن مالكها غنيا وجب أن يكون داخلا في الفقراء فيجوز له أخذها. (أحكام القرآن-أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م:۳۷۰ھ): ۳/۱۶۵-۱۶۶، مطلب: في أن تعلم العلم أفضل من الجهاد، ت: عبد السلام محمد علي شاهين، ط: دار الكتب العلمية- بيروت) =

صفوں کے خریدنے میں زکوۃ کی رقم استعمال کرنا جائز نہیں، اس سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ (۲)

مدارس میں مختلف مدوں میں رقم صرف کی جاتی ہے، بعض میں زکوۃ استعمال کرنا جائز نہیں، جب کہ بعض میں زکوۃ کا استعمال درست ہے:

مدرسین وملازمین کی تنخواہوں میں زکوۃ کی رقم صرف کرنا جائز نہیں۔ (۳)

نادار طلبہ کو کھانا کھلانے میں - جب کہ ان کو کھانے کا مالک بنادیا جائے - زکاۃ کی رقم استعمال کرنا جائز ہے۔ (۴)

اس لیے مدارس میں زکوۃ دینے سے بلا شبہ زکوۃ ادا ہوجائے گی، بس شرط یہ ہے کہ اس کو زکوۃ کے مصرف میں خرچ کیا جائے۔

تمام طلبہ کو ایک ساتھ بٹھا کر جو کھانا کھلایا جاتا ہے، اس میں تملیک نہیں پائی جاتی؛ بل کہ اباحت ہے، اس وقت ہمارے گجرات کے مدارس میں یہی نظام رائج ہے کہ کچن میں دسترخوان پر بٹھا کر کھانا کھلاتے ہیں، طالب علم جتنا کھانا چاہے، کھا سکتا ہے، لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی، یہ طریقہ اباحت ہے، اگر زکوۃ کی رقم

---

(۲) ولو نوى الزكاة بما يدفع المعلم إلى الخليفة، ولم يستأجره إن كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضا أجزأه، وإلا فلا، وكذا ما يدفعه إلى الخدم من الرجال والنساء في الأعياد وغيرها بنية الزكاة كذا في معراج الدراية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

زکاۃ نام ہے: تمليك المال من فقير مسلم غير هاشمي، ولا مولاه بشرط قطع المنفعة عن المملك من كل وجه لله - تعالى - هذا في الشرع كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۰، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها وشرائطها) ـــــ کسی کو شبہ ہوسکتا ہے کہ عاملین صدقہ کو تو بہ طریق تنخواہ زکوۃ دی گئی ہے، علامہ کاسانی کی "والعاملون عليها" کی بحث کے ضمن میں ذکر کردہ اس عبارت سے یہ شبہ ختم ہوجاتا ہے، وہ فرماتے ہیں: دل أنه إنما يستحق بعمله لكن على سبيل الكفاية له ولأعوانه لا على سبيل الأجرة. (بدائع الصنائع: ۲/ ۴۴، كتاب الزكاة، فصل شرائط ركن الزكاة، الذي يرجع إلى المؤدي إليه، ط: دار الكتب العلمية - بيروت، مستفاد: حاشیۂ نظام الفتاویٰ، محشی: مولانا امتیاز احمد قاسمی)

(۳) ويشترط أن يكون الصرف (تمليكا) لا إباحة كما مر (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد و) لا إلى (كفن ميت وقضاء دينه). (الدر المختار مع الرد: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت☆تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۴) (هي) لغة الطهارة والنماء، وشرعا (تمليك) خرج الإباحة، فلو أطعم يتيما ناويا الزكاة لا يجزيه إلا إذا دفع إليه المطعوم كما لو كساه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۵۶-۲۵۷، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

سے اس طرح کھانا کھلایا جائے، تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔

منتظمین و مہتممین زکوۃ دینے والوں کی طرف سے وکیل ہوتے ہیں، لہٰذا وہ حیلۂ تملیک کر کے اپنی ذمہ داری سے بری ہوجاتے ہیں؛ اس لیے مدارس میں زکوۃ دینے سے زکوۃ ادا ہوجائے گی۔ (۵) بل کہ موجودہ دور میں مدارس میں زکوۃ دینا زیادہ ثواب کا باعث ہے؛ کیوں کہ اس سے غریب کی امداد کے ساتھ دین کی نشر واشاعت کا اہم کام بھی انجام پاتا ہے۔ (۶)

گداگری کا پیشہ اختیار کرنے والوں کو زکوۃ دینا جائز نہیں، حرام ہے۔ (۷)

قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا فتوی ہے کہ ایسے لوگوں کو زکوۃ دینا معصیت اور گناہ کے

---

(۵) وحيلة الجواز أن يعطي مديونه الفقير زكاته ثم يأخذها عن دينه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۷۱، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

والحيلة لمن أراد ذلك أن يتصدق بمقدار زكاته على فقير، ثم يأمره بعد ذلك بالصرف إلى هذه الوجوه، فيكون لصاحب المال ثواب الصدقة، ولذلك الفقير ثواب هذه القُرَب. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني -أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۳، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع الزكاة فيه، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۲/ ۲۰۸، كتاب الزكاة، الفصل الثامن بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

(۶) وفي المعراج التصدق على العالم الفقير أفضل. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: أفضل) أي من الجاهل الفقير قهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۷) (ولا) يحل أن (يسأل) من القوت (من له قوت يومه) بالفعل أو بالقوة كالصحيح المكتسب ويأثم معطيه إن علم بحاله لإعانته على المحرم. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله ويأثم معطيه إلخ) قال الأكمل في شرح المشارق. ـــــ وأما الدفع إلى مثل هذا السائل عالما بحاله فحكمه في القياس الإثم به؛ لأنه إعانة على الحرام لكنه يجعل هبة وبالهبة للغني أو لمن لا يكون محتاجا إليه لا يكون آثما اهـ. ـــــ أي؛ لأن الصدقة على الغني هبة كما أن الهبة للفقير صدقة لكن فيه أن المراد بالغني من يملك نصابا أما الغني بقوت يومه فلا تكون الصدقة عليه هبة بل صدقة فما فر منه وقع فيه أفاده في النهر. . . . ـــــ قال المقدسي في شرحه: وأنت خبير بأن الظاهر أن مرادهم أن الدفع إلى مثل هذا يدعو إلى السؤال على الوجه المذكور وبالمنع ربما يتوب عن مثل ذلك فليتأمل اهـ (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۵، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، قبيل: فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر- بيروت)

کام میں ان کی مدد کرنا ہے؛ لہٰذا فرمان الٰہی: {ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان} کی وجہ سے جائز نہیں۔ (فتاوی رشیدیہ: ۲/۲)[۸]

اس لیے جن لوگوں نے گداگری کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے، ان کو زکوۃ دینا جائز نہیں ہے، اس سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۹] ایسے مسکین کو زکوۃ دینا، جس کے پاس ایک دن کے گذران کا انتظام ہو

۱۴۳۶-سوال: ایک ایسا مسکین ہے، جو تندرست ہے، محنت مزدوری کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ صبح و شام کا کھانا کھا سکے، پھر بھی وہ صراحۃً زکوۃ کا سوال کرتا ہے، تو اُسے زکوۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح دو روپے، پانچ روپے یا دس روپے مختلف فقراء کو بہ طور زکوۃ دیے جاتے ہیں، تو اس طرح زکوۃ ادا کرنا صحیح ہے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

وہ شخص جس کے پاس صبح وشام کھانے کا انتظام ہو، قرض نہ ہو، اور تندرست ہو، تو اُس کے لیے سوال کرنا جائز نہیں ہے، البتہ مانگے بغیر کوئی اُسے دے، تو اُس کے لیے لینا جائز ہے، دینے والے کی زکوۃ بلاشبہ ادا ہو جائے گی۔[۱]

---

[۸] فتاوی رشیدیہ میں احقر کو صراحت کے ساتھ یہ بات نہیں ملی، فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے فتاوی میں ہے:

ایسے لوگوں کو دینے سے زکاۃ ادا نہ ہوگی، اور دینے کا گناہ ہوگا کہ اعانت معصیت ہے۔ (فتاوی محمودیہ: ۹/ ۵۲۴، کتاب الزکاۃ، باب العشر والخراج، زکاۃ وعشر اور مصرف کی تحقیق، ط: دار المعارف- دیوبند)

(۱) عن أبي كبشة السلولي، قال: حدثني سهل بن الحنظلية، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول "من سأل الناس عن ظهر غنى، فإنما يستكثر من جمر جهنم. قلت: يا رسول الله، وما ظهر غنى؟ قال أن يعلم أن عند أهله ما يغديهم، أو ما يعشيهم". (شرح معاني الآثار - أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة بن عبد الملك بن سلمة الأزدي الحجري المصري المعروف بالطحاوي (م: ۳۲۱هـ): ۲/ ۲۰، رقم الحديث: ۳۰۲۶، كتاب الزكاة، باب ذي المرة السوي الفقير هل يحل له الصدقة أم لا؟، ت: محمد زهري النجار، محمد سيد جاد الحق، و د. يوسف عبد الرحمن المرعشلي، ط: عالم الكتب)

(ولا) يحل أن (يسأل) من القوت (من له قوت يومه) بالفعل أو بالقوة كالصحيح المكتسب ويأثم معطيه إن علم بحاله لإعانته على المحرم. (الدر المختار)ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: ولا يحل أن يسأل إلخ) قيد بالسؤال؛ لأن الأخذ بدونه لا يحرم، بحر، وقيد بقوله شيئا من القوت؛ لأن له سؤال ما هو محتاج إليه غير القوت كثوب شرنبلالية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۴-۳۵۵، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، =

ضرورت مند کو کم از کم اتنا دینا چاہیے کہ اس کی ایک دن کی ہر قسم کی ضرورت پوری ہو جائے، صرف دو چار روپے دینا مناسب نہیں ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۰] صدقہ کے مال کا مصرف اور لقطہ کا حکم، مدیون کو لقطہ دینا

۱۴۳۷-سوال: صدقہ کے مال کے حق دار کون لوگ ہیں؟

راستہ میں گری پڑی چیز کو ایک شخص نے اٹھالیا، مالک کو بہت تلاش کیا؛ لیکن نہیں ملا، تو اب اس چیز کا کیا کرے؟

ایک کسان کے پاس پانچ سے دس ایکڑ زمین ہے؛ لیکن مسلسل چار پانچ سالوں سے زمین کی فصلیں برباد ہوگئی ہیں؛ جس کی وجہ سے اس کے ذمہ تقریباً پانچ سات ہزار روپیوں کا قرض ہوگیا ہے، مزدوری کر کے وہ اپنے اہل وعیال کا خرچ پورا کرتا ہے، تو کیا ایسے آدمی کو صدقہ کا مال اور راستہ سے ملی ہوئی چیز دے سکتے ہیں؟

حاجی ابراہیم حاجی محمد

الجواب حامداً ومصلیاً:

صدقات واجبہ کے مستحقین غرباء، مساکین اور فقراء ہیں۔[۱]

= قبيل: فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت☆الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۱۹۸، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا - ديوبند☆البحر الرائق: ۲/ ۴۳۷، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) يندب دفع ما يغنيه يومه عن السؤال، واعتبار حاله من حاجة وعيال. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۵۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ، فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ. (۹-التوبة: ۶۰)

زياد بن الحارث الصدائي، قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعته، فذكر حديثا طويلا، قال: فأتاه رجل، فقال: أعطني من الصدقة، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله تعالى لم يرض بحكم نبي ولا غيره في الصدقات، حتى حكم فيها هو، فجزأها ثمانية أجزاء، فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۳۰، رقم الحديث: ۱۶۳۰، كتاب الزكاة، باب من يعطي من الصدقة، وحد الغنى، ط: ديوبند)

قوله [تعالى]: إنما الصدقات للفقراء الآية تدل على أنه لا حق في الصدقات لأحد إلا لهذه الأصناف الثمانية، =

جو شخص مقروض ہو، اس کو صدقہ کا مال دینا جائز ہے۔ [۲] بل کہ ایسے شخص کی مدد کرنا زیادہ بہتر ہے۔ [۳] اگر یہ مقروض شخص رشتہ دار ہوگا، تو صلہ رحمی کا بھی ثواب ملے گا۔ [۴]

راستہ میں سے مال ملا ہو، تو اولاً اس کے مالک کو تلاش کرنے کی پوری پوری کوشش کی جائے، اگر اس کا مالک مل جاتا ہو، تو اس کی چیز اس کو واپس کردی جائے؛ لیکن اگر تلاش بسیار کے باوجود بھی مالک نہ ملے، تو پھر پانے والا شخص اگر غریب ہے، تو وہ اپنے استعمال میں لاسکتا ہے اور اگر وہ خود غریب نہ ہو، تو کسی غریب اور مستحق شخص کو دے دے۔

سوال میں مذکور کسان کو بھی - جب کہ وہ واقعۃً ضرورت مند ہو - دے سکتے ہیں۔

البتہ لقطہ (راستے میں گری ہوئی شئے) کو خرچ کر لینے کے بعد اگر اس کا اصل مالک مل جائے، تو اس کو

=وذلك مجمع عليه، وأيضا فلفظة (إنما) تفيد الحصر ويدل عليه وجوه. (مفاتيح الغيب = التفسير الكبير - أبو عبد الله محمد بن عمر، التيمي الرازي الملقب بـ'فخر الدين الرازي' خطيب الري (م:۶۰۶هـ):۱۶/ ۸۰، سورة التوبة:۹، آية:۶۰، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(۲) قوله تعالى: (والغارمين) هم الذين ركبهم الدين ولا وفاء عندهم به. (الجامع لأحكام القرآن = تفسير القرطبي - أبو عبد الله محمد بن أحمد، شمس الدين القرطبي (م:۶۷۱هـ):۸/ ۱۸۳، التوبة:۶۰، ت: أحمد البردوني وإبراهيم أطفيش، ط: دار الكتب المصرية - القاهرة)

وَالْغارِمِينَ وهم المديونون بالاتفاق. (التفسير المظهري - محمد ثناء الله المظهري (م:۱۲۲۵هـ): ۴/ ۲۳۳، التوبة:۶۰، ت: غلام نبي التونسي، ط: مكتبة الرشدية - الباكستان)

ومديون لا يملك نصابا فاضلا عن دينه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۳، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۳) وفي الظهيرية: الدفع للمديون أولى منه للفقير. (الدر المختار)ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أولى منه للفقير) أي أولى من الدفع للفقير الغير المديون لزيادة احتياجه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۳، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص:۷۱۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆تبيين الحقائق: ۲/ ۱۲۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۴) عن سلمان بن عامر، عن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال: إن الصدقة على المسكين صدقة، وعلى ذي الرحم اثنتان صدقة وصلة. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م:۳۰۳هـ):۵/ ۹۲، رقم الحديث: ۲۵۸۲، كتاب الزكاة، الصدقة على الأقارب، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

اختیار ہے یا تو خرچ کردہ مال کی اجازت دے دے، اگر وہ اجازت دے دیتا ہے، تو ٹھیک ہے اور اگر اجازت نہ دے اور خرچ کرنے والے کو ضامن بنانا چاہے، تو ضامن بنا سکتا ہے۔ [۵] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۱] دو سو روپیہ ماہوار اور بھینس پالنے والے امام کو زکوۃ دینا

۱۴۳۸- سوال: ایک مسجد کے امام اپنی امامت کے عوض دو سو سے سوا دو سو تک تنخواہ لیتے ہیں اور اپنے گھر پر بھینس وغیرہ بھی پالتے ہیں، تو کیا ان کو زکوۃ دے سکتے ہیں یا نہیں اور وہ پیش امام زکوۃ لے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

زکوۃ کے حق دار غریب اور فقیر مسلمان ہیں۔ [۱] جس امام کے ذمہ قرض ہو اور بھینس وغیرہ پالنے کے

---

(۵) هي مال يوجد في الطريق ولا يعرف له مالك بعينه... وإذا رفع اللقطة يعرفها... ويعرف الملتقط اللقطة في الأسواق والشوارع مدة يغلب على ظنه أن صاحبها لا يطلبها بعد ذلك هو الصحيح، كذا في مجمع البحرين... ثم بعد تعريف المدة المذكورة الملتقط مخير بين أن يحفظها حسبة وبين أن يتصدق بها، فإن جاء صاحبها فأمضى الصدقة يكون له ثوابها، وإن لم يمضها ضمن الملتقط أو المسكين إن شاء لو هلكت في يده فإن ضمن الملتقط لا يرجع على الفقير وإن ضمن الفقير لا يرجع على الملتقط وإن كانت اللقطة في يد الملتقط أو المسكين قائمة أخذها منه، كذا في شرح مجمع البحرين. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۸۹-۲۹۰، أول كتاب اللقطة، ط: زكريا - ديوبند ☆ بدائع الصنائع: ۸/ ۳۳۵، كتاب اللقطة، فصل في بيان ما يصنع باللقطة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(فينتفع) الرافع (بها لو فقيرا وإلا تصدق بها على فقير. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: فينتفع الرافع) أي من رفعها من الأرض: أي التقطها وأتى بالفاء، فدل على أنه إنما ينتفع بها بعد الإشهاد والتعريف إلى أن غلب على ظنه أن صاحبها لا يطلبها، والمراد جواز الانتفاع بها والتصدق، وله إمساكها لصاحبها. وفي الخلاصة له بيعها أيضا وإمساك ثمنها. (رد المحتار على الدر المختار: ۴/ ۲۷۹، كتاب اللقطة، ط: دار الفكر)

(۱) إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَٰكِينِ وَالْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَٰرِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۶۰﴾ (۹-التوبة: ۶۰)

زياد بن الحارث الصدائي، قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعته، فذكر حديثا طويلا، قال: فأتاه رجل، فقال: أعطني من الصدقة، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله تعالى لم يرض بحكم نبي ولا غيره في الصدقات، حتى حكم فيها هو، فجزأها ثمانية أجزاء، فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۳۰، رقم الحديث: ۱۶۳۰، كتاب الزكاة، باب من يعطي من الصدقة، وحد الغنى، ط: ديوبند)

باوجود بھی ان کا اور ان کے اہل وعیال کا خرچ پورا نہ ہو پاتا ہو، تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے۔ (۲) بل کہ غریب جاہل کو زکوٰۃ کی رقم دینے کے بجائے کسی غریب عالم کو زکوٰۃ دینا زیادہ ثواب کا کام ہے۔ (۳)

کیوں کہ غریب عالم کی زکوٰۃ کی رقم سے جب ضرورت کی تکمیل ہو جائے گی، تو قوم کے بچوں کی تعلیم

---

(۲) مستحق زکاۃ ہونے کے لیے مقروض ہونا شرط نہیں ہے؛ بل کہ اتنا ضروری ہے کہ حاجت اصلیہ کے علاوہ کسی بھی طرح کے مال سے نصاب کا مالک نہ ہو، لہٰذا امام صاحب اگر ایسے ہیں، تو ان کے لیے زکاۃ لینا جائز ہے:

فإن كان له فضل عن ذلك تبلغ قيمته مائتي درهم حرم عليه أخذ الصدقة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۷، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر)

مصرف الزكاة... (هو فقير، وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۳۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۵۸، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي - بيروت ☆ اللباب في شرح الكتاب: ۱/ ۱۵۳، كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقة إليه ومن لا يجوز، ط: المكتبة العلمية - بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۱/ ۲۹۶، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق - القاهرة)

(ومنها الغارم)، وهو من لزمه دين، ولا يملك نصابا فاضلا عن دينه. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

البتہ مقروض کو زکوٰۃ دینا اولیٰ ہے:

وفي الظهيرية: الدفع للمديون أولى منه للفقير. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله: أولى منه للفقير) أي أولى من الدفع للفقير الغير المديون لزيادة احتياجه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۳، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۷۱۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۱۲۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

والدفع إلى من عليه الدين أولى من الدفع إلى الفقير كذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۲/ ۳۵، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى إليه، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۳) وفي المعراج التصدق على العالم الفقير أفضل. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله: أفضل) أي من الجاهل الفقير قهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، باب دفع الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي - بيروت ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۷۲۲، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

وتربیت کی طرف زیادہ سکون کے ساتھ توجہ دے سکے گا اور بچوں کی تعلیم کے لیے زیادہ وقت فارغ کر سکے گا، نیز لوگوں کے درمیان تبلیغی کام میں بھی توجہ دے سکے گا؛ اس لیے جو عالم غریب ہو اور اپنے بال بچوں کے ساتھ بہ آسانی گذر بسر نہ کر پاتا ہو، اس کو زکوۃ دینا جائز ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۲] بینک کی سودی رقم اور زکوۃ سے چلنے والے ہسپتال سے امیروں کا فائدہ اٹھانا

۱۴۳۹- سوال: ایسے ہسپتال سے غریبوں کے علاوہ اصحاب مال وثروت بھی فائدہ اٹھانا چاہیں، تو اٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

مال دار مسلمانوں کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۳] زکوۃ کی رقم کا مصرف کیا ہے؟

۱۴۴۰- سوال: ہم کس کو زکوۃ کی رقم دے سکتے ہیں؟

(۱) صدقة الفطر (تجب على حر مسلم)... (له نصاب الزكاة، فاضلا عن حاجته الأصلية وإن لم ينم)... (وبه) أي بهذا النصاب (تحرم الصدقة) (درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۱/ ۱۹۳، كتاب الزكاة، باب على من تجب زكاة الفطر، ط: دار إحياء الكتب العربية)

ولا يجوز دفع الزكاة إلى من يملك نصابا من أي مال كان، لأن الغنى الشرعي مقدر به الشرط أن يكون فاضلا من الحاجة الأصلية. (الهداية) ــــــ قال العيني (م: ۸۵۵هـ): م: (ولا يجوز دفع الزكاة إلى من ملك نصابا من أي مال كان) ش: يعني سواء كان من النقدين أو من العروض أو من السوائم م: (لأن الغنى الشرعي مقدر به) ش: أي بالنصاب م: (والشرط أن يكون فاضلا عن الحاجة الأصلية) ش: أي شرط عدم جواز دفع الزكاة إليه أن يكون النصاب فاضلا عن الحاجة الأصلية، لأنه إذا كان غير فاضل عن حاجته الأصلية يجوز الدفع إليه، والحاجة الأصلية في حق الدراهم والدنانير أن يكون الدين مشغولا بها، وفي غيرها احتياجه إليه في الاستعمال وأحوال المعاش. (البناية شرح الهداية: ۳/ ۴۷۶-۴۷۷، كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقات إليه ومن لا يجوز، الحكم لو دفع الزكاة لغير مستحقيها وهو لا يعلم، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(و) لا إلى (غني) يملك قدر نصاب فارغ عن حاجته الأصلية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۷، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت)

مصرف الزكاة... (هو فقير، وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۳۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت)

الجواب حامداً ومصلیاً:

کسی غریب کو دے دیجیے،(۱) زکاۃ ادا ہو جائے گی، بہ شرطے کہ وہ اصول (باپ، دادا، اوپر تک) اور فروع (بیٹا، پوتا، نیچے تک) میں سے نہ ہو، نیز اپنی بیوی کو بھی زکاۃ دینا جائز نہیں ہے۔ (درمختار) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۴] مصارفِ زکوٰۃ فقراء ومساکین ہیں

۱۴۴۱- سوال: زکوۃ کے پیسوں کا مستحق کون ہے؟ کیا غریب، محتاج، مسلم بھائی، یا مدرسوں کو

---

(۱) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹- التوبۃ: ۶۰)

زياد بن الحارث الصدائي، قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعته، فذكر حديثا طويلا، قال: فأتاه رجل، فقال: أعطني من الصدقة، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله تعالى لم يرض بحكم نبي ولا غيره في الصدقات، حتى حكم فيها هو، فجزأها ثمانية أجزاء، فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقك. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۳۰، رقم الحديث: ۱۶۳۰، كتاب الزكاة، باب من يعطي من الصدقة، وحد الغنى، ط: ديوبند)

مصرف الزكاة... (هو فقير، وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۳۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) (ولا) إلى (من بينهما ولاد) ولو مملوكا لفقير (أو) بينهما (زوجية) ولو مبانة. (الدر المختار)ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وإلى من بينهما ولاد) أي بينه وبين المدفوع إليه؛ لأن منافع الأملاك بينهم متصلة فلا يتحقق التمليك على الكمال، هداية، والولاد بالكسر مصدر ولدت المرأة ولادة وولادا، مغرب، أي أصله وإن علا كأبويه وأجداده وجداته من قبلهما، وفرعه وإن سفل بفتح الفاء من باب طلب... كأولاد الأولاد وشمل الولاد بالنكاح والسفاح فلا يدفع إلى ولده من الزنا ولا من نفاه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۶، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر- بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۴۲۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا- ديوبند)

(قال): ولا يعطي زكاته وعشره ولده وولد ولده وولد ولده وأبويه وأجداده وكل من ينسب إلى المؤدي بالولادة، أو ينسب إليه بالولادة، ولا يجوز صرف الزكاة إليه؛ لأن تمام الإيتاء بانقطاع منفعة المؤدي عما أدى والمنافع بين الآباء والأبناء متصلة. قال الله تعالى: [آباؤكم وأبناؤكم لا تدرون أيهم أقرب لكم نفعا فريضة] [النساء: ۱۱] فلم يتم الإيتاء بالصرف إليهم. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۳/ ۱۱، كتاب الزكاة، باب عشر الأرضين، ط: دار المعرفة- بيروت)

زکوۃ دے سکتے ہیں؟ اسی طرح کسی کا قرض چکانے میں اس رقم سے مدد کر سکتے ہیں؟ نیز زکوۃ کے پیسے کہاں استعمال نہیں کر سکتے اور کہاں استعمال کر سکتے ہیں، برائے کرم اس کی وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداو مصليا:

غریب (یعنی جو شخص کسی بھی قسم کے نصاب کا مالک نہ ہو) کو زکوۃ دینا جائز ہے۔[1] اصول (ماں، باپ) وفروع (لڑکا، لڑکی، پوتے نواسے) کے علاوہ،[2] محتاج بھائی بہن، چچا، خالہ پھوپھی وغیرہ کو زکاۃ دینا جائز ہے۔[3]

---

(١) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ، فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝ (٩-التوبة:٦٠)

زياد بن الحارث الصدائي، قال: أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعته، فذكر حديثا طويلا، قال: فأتاه رجل، فقال: أعطني من الصدقة، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله تعالى لم يرض بحكم نبي ولا غيره في الصدقات، حتى حكم فيها هو، فجزأها ثمانية أجزاء، فإن كنت من تلك الأجزاء أعطيتك حقك. (سنن أبي داود: ٢٣٠/١، رقم الحديث: ١٦٣٠، كتاب الزكاة، باب من يعطي من الصدقة، وحد الغنى، ط: ديوبند)

مصرف الزكاة... (هو فقير، وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار مع رد المحتار: ٣٣٩/٢، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر-بيروت)

(٢) (ولا) إلى (من بينهما ولاد) ولو مملوكا لفقير (أو) بينهما (زوجية) ولو مبانة. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله: وإلى من بينهما ولاد) أي بينه وبين المدفوع إليه؛ لأن منافع الأملاك بينهم متصلة فلا يتحقق التمليك على الكمال، هداية، والولاد بالكسر مصدر ولدت المرأة ولادة وولادا، مغرب، أي أصله وإن علا كأبويه وأجداده وجداته من قبلهما، وفرعه وإن سفل بفتح الفاء من باب طلب... كأولاد الأولاد وشمل الولاد بالنكاح والسفاح فلا يدفع إلى ولده من الزنا ولا من نفاه. (رد المحتار على الدر المختار: ٣٤٦/٢، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر- بيروت☆البحر الرائق: ٤٢٥/٢، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا-ديوبند)

(قال): ولا يعطي زكاته وعشره ولده وولد ولده وأبويه وأجداده وكل من ينسب إلى المؤدي بالولادة، أو ينسب إليه بالولادة، ولا يجوز صرف الزكاة إليه؛ لأن تمام الإيتاء بانقطاع منفعة المؤدي عما أدى والمنافع بين الآباء والأبناء متصلة. قال الله تعالى: [آباؤكم وأبناؤكم لا تدرون أيهم أقرب لكم نفعا فريضة] [النساء:١١] فلم يتم الإيتاء بالصرف إليهم. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ٤٨٣هـ): ١١/٣، كتاب الزكاة، باب عشر الأرضين، ط: دار المعرفة- بيروت)

(٣) والأفضل في الزكاة والفطر والنذر، الصرف أولا إلى الإخوة والأخوات، ثم إلى أولادهم، ثم إلى الأعمام =

مدارس کے نادار طلبہ واساتذہ کو زکوۃ دینا زیادتی ثواب کا باعث ہے۔(۴)

مال دار اور سادات کو زکوۃ نہیں دی جاسکتی۔(۵) ــــــ کافر کو بھی زکوۃ دینا جائز نہیں ہے۔(۶)

مدیون کے دین کی ادائیگی میں بھی اس رقم سے مدد کی جاسکتی ہے، بل کہ عام فقراء کے مقابلے میں مدیون کو دینا زیادہ بہتر ہے۔(۷) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=والعمات ثم إلى أولادهم ثم إلى الأخوال والخالات، ثم إلى أولادهم ثم إلى ذوي الأرحام ثم إلى الجيران، ثم إلى أهل حرفته، ثم إلى أهل مصره أو قريته كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر ☆حاشية الطحطاوي على الدر: ۱/ ۴۳۰، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: رشيديه - پاكستان ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۳۳۳، كتاب الزكاة، باب في بيان أحكام المصرف، ط: فقيه الأمة - ديوبند)

(۴) وفي المعراج التصدق على العالم الفقير أفضل. (الدر المختار) ــــ قال ابن عابدين: (قوله: أفضل) أي من الجاهل الفقير قهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۵) (و) لا إلى (غني) يملك قدر نصاب فارغ عن حاجته الأصلية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۴۷، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت)

ولا يدفع إلى بني هاشم... هذا في الواجبات كالزكاة والنذر والعشر والكفارة. (الهندية: ۱/ ۱۸۹، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر)

(۶) ومنها أن يكون مسلما، فلا يجوز صرف الزكاة إلى الكافر بلا خلاف، لحديث معاذ - رضي الله عنه - "خذها من أغنيائهم وردها في فقرائهم". أمر بوضع الزكاة في فقراء من يؤخذ من أغنيائهم، وهم المسلمون، فلا يجوز وضعها في غيرهم. (بدائع الصنائع: ۲/ ۴۹، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى إليه، ط: دار الكتب العلمية)

(۷) (ومنها الغارم) وهو من لزمه دين ولا يملك نصابا فاضلا عن دينه. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر ☆الهداية مع فتح القدير: ۲/ ۱۸- ۱۱۷، كتاب الزكاة، ط: رشيديه - پاكستان)

وفي الظهيرية: الدفع للمديون أولى منه للفقير. (الدر المختار) ــــ قال ابن عابدين: (قوله: أولى منه للفقير) أي أولى من الدفع للفقير الغير المديون لزيادة احتياجه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۳، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر ☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ص: ۷۱۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆تبيين الحقائق: ۲/ ۱۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۵۵] غیر مسلم کو زکوۃ دینا

۱۴۴۲- سوال: کیا زکوۃ کی رقم غیر مسلم کو دی جاسکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نہیں، جائز نہیں ہے۔ اس سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵٦] اسلام کی دعوت پہنچانے میں زکوۃ کی رقم صرف کرنا

۱۴۴۳- سوال: کیا زکوۃ کی رقم کو اسلام کا پیغام پہنچانے میں یا دعوت کے کام میں خرچ کر سکتے ہیں؟ خواہ مسلمانوں کو نیک اعمال کی طرف بلانا ہو، یا غیر مسلموں کو اسلام کی جانب؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نہیں۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۷] زکوۃ کی رقم سے غریب علاقوں میں مسجد یا مدرسہ تعمیر کرنا

۱۴۴۴- سوال: کیا کوئی شخص زکوۃ کی رقم سے غریب علاقوں میں مدارس یا مساجد کی تعمیر کر سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نہیں۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ومنها أن يكون مسلما، فلايجوز صرف الزكاة إلى الكافر بلا خلاف؛ لحديث معاذ - رضي الله عنه - "خذها من أغنيائهم وردها في فقرائهم". أمر بوضع الزكاة في فقراء من يؤخذ من أغنيائهم، وهم المسلمون، فلايجوز وضعها في غيرهم. (بدائع الصنائع: ۲/ ۴۹، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى إليه، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) إذا دفع الزكاة إلى الفقير لا يتم الدفع ما لم يقبضها أو يقبضها للفقير من له ولاية عليه نحو الأب والوصي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا- ديوبند☆المحيط البرهاني: ۳/ ۲۱۴، كتاب الزكاة، الفصل الثامن)

(۳) (لا) يصرف (إلى بناء) نحو (مسجد و) لا إلى (كفن ميت وقضاء دينه). (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: نحو مسجد) كبناء القناطر والسقايات وإصلاح الطرقات وكري الأنهار والحج والجهاد وكل ما لا تمليك فيه زيلعي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۵۸] زکوۃ کی رقم دور کے ممالک میں بھیجنا

۱۴۴۵- سوال: کیا کوئی زکوۃ کی رقم کو دور کے کسی ملک میں بھیج سکتا ہے؟ جب کہ قریب میں اس کے ملک میں ہی بہت سارے مسلمان محتاج ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر دوسرے ملک میں زیادہ ضرورت مند ہوں، یا دینی ضرورت متقاضی ہو، تو بھیجنا جائز ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۹] زکوۃ کا زیادہ حق دار کون ہے؟

۱۴۴۶- سوال: زکوۃ کے اولین مستحقین کون ہیں؟ محتاج علماء زیادہ حق دار ہیں یا رشتہ دار اور پڑوسی؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس شہر یا بستی کی زکوۃ ہو، اسی شہر اور بستی کے ضرورت مند اُس کے اولین مستحق ہیں، اگر رشتہ دار محتاج ہوں، تو اُنہیں دینے کا ثواب زیادہ ہے، نیز قرب وجوار کے محتاج علماء وطلبہ کو دینا بھی افضل ہے، اگر قرب وجوار کے محتاج لوگوں کی ضروریات پوری ہو جائیں اور دور کے کسی مدرسہ میں ضرورت زیادہ ہو، تو وہاں خرچ کرنا بہتر ہے۔ (عالم گیری)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قال: "ویکره نقل الزکاة من بلد إلی بلد" . . . "إلا أن ینقلها الإنسان إلی قرابته أو إلی قوم هم أحوج من أهل بلده " لما فیه من الصلة أو زیادة دفع الحاجة ولو نقل إلی غیرهم أجزأه وإن کان مکروها لأن المصرف مطلق الفقراء بالنص. (الهدایة: ۱/ ۲۰۸، کتاب الزکاة، باب من یجوز دفع الصدقة إلیه ومن لا یجوز، ط: یاسر ندیم- دیوبند)

[۲] ویکره نقل الزکاة من بلد إلی بلد، إلا أن ینقلها الإنسان إلی قرابته، أو إلی قوم هم أحوج إلیها من أهل بلده، ولو نقل إلی غیرهم أجزأه، وإن کان مکروها. وإنما یکره نقل الزکاة إذا کان الإخراج في حینها، بأن أخرجها بعد الحول أما إذا کان الإخراج قبل حینها، فلا بأس بالنقل.

والأفضل في الزکاة والفطر والنذر، الصرف أولا إلی الإخوة والأخوات، ثم إلی أولادهم، ثم إلی الأعمام والعمات ثم إلی أولادهم ثم إلی الأخوال والخالات، ثم إلی أولادهم ثم إلی ذوي الأرحام ثم إلی الجیران، ثم إلی أهل حرفته، ثم إلی أهل مصره أو قریته کذا في السراج الوهاج. (الفتاوی الهندیة: ۱/ ۱۹۰، کتاب الزکاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفکر ☆ حاشیة الطحطاوي علی الدر: ۱/ ۴۳۰، کتاب الزکاة، باب المصرف، ط:=

[۶۰] زکوۃ کی رقم سے اساتذہ کو تنخواہ دینا

۱۴۴۷- سوال: زکوۃ کی رقم سے مدرسے کے اساتذہ کو تنخواہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً:

زکوۃ کی رقم سے مدرسے کے اساتذہ کو تنخواہ دینا جائز نہیں ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۱] زکوٰۃ کی رقم سے مدرّس کی تنخواہ ادا کرنا

۱۴۴۸- سوال: ہمارے گاؤں ''دھورکا'' میں ''سنی باوا پیر'' نامی مکتب چلتا ہے، جس میں تقریباً ۱۴۰ رلڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کرتے ہیں، آج تک اُس میں صرف ایک ہی مدرّس طلبہ کو پڑھاتے ہیں، جو اُن سب کے لیے ناکافی ہیں، ابھی آٹھ دس دن سے دوسرے مدرّس کو رکھا گیا ہے، لیکن مکتب کی مالی حالت کمزور ہے، تو مکتب کے لیے زکوٰۃ کی رقم کا چندہ کر کے حیلہ کر کے مدرّس کی تنخواہ میں دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلّیاً:

زکوٰۃ کی رقم تنخواہ میں دینا جائز نہیں ہے۔[۲]

لیکن اگر ہر لڑکے کی فیس مقرر کریں، غریب بچوں کو یا اُن کے اولیاء کو زکوٰۃ کی رقم دے کر اُن کو مالک بنایا جائے، اور وہ لوگ مدرسہ میں فیس ادا کریں، تو [بہ طورِ فیس جمع کی گئی] اُس [رقم] سے تنخواہ دینا جائز ہے۔[۳]

=رشيديه - پاكستان ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده،يعرف بداماد أفندي (م:۱۰۷۸هـ): ۱/ ۳۳۳، كتاب الزكاة، باب في بيان أحكام المصرف، ط: فقيه الأمة - ديوبند)

وفي المعراج التصدق على العالم الفقير أفضل. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أفضل) أي من الجاهل الفقير قهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۱) ولو نوى الزكاة بما يدفع المعلم إلى الخليفة، ولم يستأجره إن كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضا أجزأه، وإلا فلا، وكذا ما يدفعه إلى الخدم من الرجال والنساء في الأعياد وغيرها بنية الزكاة كذا في معراج الدراية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) سوال سابق کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) عن عائشة - رضي الله عنها - قالت: كان في بريرة ثلاث سنن: عتقت فخيرت، وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الولاء لمن أعتق، ودخل رسول الله صلى الله عليه وسلم وبرمة على النار، فقرب إليه خبز وأدم من أدم البيت، فقال: ألم أر البرمة، فقيل: لحم تصدق به على بريرة، وأنت لا تأكل الصدقة، قال: هو عليها صدقة، ولنا هدية. =

آپ کس طرح حیلہ کرتے ہیں، لکھ بھیجیں، پھر اُس کا جواب دیا جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۲] علماء کو صدقہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

۱۴۴۹-سوال: کیا صدقہ- خواہ واجب ہو یا نفل- غریب ضرورت مند علماء کو دے سکتے ہیں، جب کہ وہ سید نہ ہوں؟

یہاں صدقہ سے مراد دو چیزیں ہیں: (۱) جس نے واجب قربانی، ایام اضحیہ میں نہ کی ہو، اس جانور کی رقم کا صدقہ۔ (۲) دیگر صدقات۔

الجواب حامداً ومصلياً:

مستحق علماء کو زکوۃ دینا افضل ہے،[۱] اور دیتے وقت زکوۃ کی صراحت کرنا بھی ضروری نہیں ہے۔[۲] کسی بھی قسم کا صدقہ ضرورت مند علماء کو دے سکتے ہیں۔

= (صحيح البخاري: ۲/ ۷۶۳، رقم الحديث: ۵۰۹۷، كتاب النكاح، باب الحرة تحت العبد، ط: ديوبند، و انظر رقم: ۱۴۹۳، كتاب الزكاة، باب الصدقة على موالي أزواج النبي صلى الله عليه وسلم☆الصحيح لمسلم: ۲/ ۴۹۴، رقم الحديث: ۸-۱۱ (۱۵۰۴)، كتاب العتق، باب إنما الولاء لمن أعتق، ط: ديوبند)

(فقال- صلى الله عليه وسلم-: "ألم أر برمة فيها لحم") الاستفهام للتقرير (قالوا: بلى، ولكن ذلك لحم تصدق به على بريرة، وأنت لا تأكل الصدقة، قال: "هو") أي اللحم "عليها" أي على بريرة (صدقة ولنا هدية) قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ وهو معنى قول ابن الملك: فيحل التصدق على من حرم عليه بطريق الهدية. (مرقاة المفاتيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۴/ ۱۳۰۴، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر- بيروت)

... أن تبدل الملك كتبدل العين. (البحر الرائق: ۲/ ۲۶۴، كتاب الزكاة، باب دفع الزكاة إلى الأب والجد أو الولد، ط: دار الكتاب الإسلامي- بيروت)

(۱) وفي المعراج التصدق على العالم الفقير أفضل. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أفضل) أي من الجاهل الفقير قهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۴، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۲) ولم يشترط المصنف- رحمه الله- علم الآخذ بما يأخذه أنه زكاة؛ للإشارة إلى أنه ليس بشرط، وفيه اختلاف والأصح كما في المبتغى والقنية: أن من أعطى مسكينا دراهم، وسماها هبة، أو قرضا، ونوى الزكاة، فإنها تجزئه. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۲/ ۲۲۸، كتاب الزكاة، شروط أداء الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

قربانی کا جانور- جسے قربانی کے ایام میں ذبح نہ کیا گیا ہو- بھی صدقہ کے طور پر علماء کو دینا جائز ہے، قربانی کا جانور نہ لیا ہو، تو اس کی رقم بھی بہ طور صدقہ دے سکتے ہیں، غرضے کہ کسی بھی قسم کا صدقہ، ضرورت مند علماء کو دینا جائز ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۴] زکوۃ اور صدقہ واجب کا مصرف ایک ہی ہے

۱۴۵۰- سوال: کیا زکوۃ اور صدقہ کا مصرف ایک ہی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس کو زکوۃ دینا جائز ہے، اس کو صدقاتِ واجبہ دے سکتے ہیں، دونوں کا مصرف ایک ہی ہے۔[۱]
لیکن جس کو نفلی صدقہ دینا جائز ہے، ضروری نہیں ہے کہ اس کو زکاۃ دینا بھی جائز ہو۔ مثلاً سید، مزکی کے والدین اور اولاد وغیرہ، کہ ان کو زکاۃ دینا جائز نہیں ہے؛ لیکن نفلی صدقہ دے سکتے ہیں۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۳) سوائے عاملین اور مؤلفۃ القلوب کے مذکورہ تمام مستحقین اپنے فقر کی وجہ سے مستحق زکوۃ ہوتے ہیں، لہٰذا جن کے پاس ضرورت سے زائد ساز وسامان، نصاب نامی یا غیر نامی کے برابر نہیں ہے، وہ مستحق زکوۃ ہیں، اور ان کو زکوۃ وصدقات دینا جائز ہے:

وجميع من يأخذ الصدقة من هذه الأصناف فإنما يأخذ صدقة بالفقر والمؤلفة قلوبهم والعاملون عليها لا يأخذونها صدقة وإنما تحصل الصدقة في يد الإمام للفقراء ثم يعطي الإمام المؤلفة منها لدفع أذيتهم عن الفقراء وسائر المسلمين ويعطيها العاملين عوضا من أعمالهم لا على أنها صدقة عليهم... ولما كان الغني هو الذي ملك مائتي درهم وما دونها لم يكن مالكها غنيا وجب أن يكون داخلا في الفقراء، فيجوز له أخذها. (أحكام القرآن-أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م: ۳۷۰هـ): ۳/۱۶۵-۱۶۶، مطلب: في أن تعلم العلم أفضل من الجهاد، ت: عبد السلام محمد علي شاهين، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

قال ابن عابدين: (قوله: أي مصرف الزكاة والعشر)... وهو مصرف أيضا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة كما في القهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۳۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) باب المصرف أي مصرف الزكاة والعشر، وأما خمس المعدن فمصرفه كالغنائم (هو فقير، وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار)ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: أي مصرف الزكاة والعشر)... وهو مصرف أيضا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة كما في القهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۳۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۲) وكما لا يجوز صرف الزكاة إلى الغني، لا يجوز صرف جميع الصدقات المفروضة والواجبة إليه كالعشور=

[۶۴] قبرستان کی چہار دیواری میں زکوٰۃ کی رقم کا استعمال

۱۴۵۱- سوال: ہمارے گاؤں میں ہمارے خاندان کا ایک قبرستان ہے، جس میں ہمارے آباء واجداد مدفون ہیں، اُس قبرستان کے گرد پکی چہار دیواری نہیں ہے، اور قرب وجوار میں غیر مسلمین کی آبادی زیادہ ہے، یہ لوگ اپنے جانور وغیرہ قبرستان میں چرنے کے لیے چھوڑتے ہیں، اور اس وجہ سے وہاں کافی گندگی ہوجاتی ہے، نیز وہاں بدعات وخرافات بھی بہت ہوتی ہیں، اور مستقبل میں اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ اگر اُس کی پکی چہار دیواری نہ ہوئی، تو غیر مسلمین مندر بنا کر قبضہ کرلیں۔

ہماری اقتصادی حالت اِتنی مضبوط نہیں ہے کہ ہم خود اُس کی چہار دیواری کا خرچ برداشت کرسکیں، ہم نے اپنی وسعت کے مطابق، کوشش کر کے کانٹے وغیرہ ڈال کر چہار دیواری قائم کی تھی، لیکن اس کو اُن غیر مسلمین نے کاٹ کر ہٹادیا، تو کیا ہم اس قبرستان کی پکی چہار دیواری کے لیے زکوٰۃ اور للہ رقم لے سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر بستی کے مسلمان اِس چہار دیواری کی تعمیر کے لیے زکوٰۃ کی رقم دیں، تو اُن کی زکوٰۃ ادا ہوگی؟ اور کیا اُن کو اس طرح زکوٰۃ دینے پر کوئی اجر ملے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قبرستان کی چہار دیواری، اُس کی حفاظت کے لیے ضروری ہے، اور محررہ بالا حالات کے پیش نظر از

= والكفارات والنذور وصدقة الفطر لعموم قوله تعالى {إنما الصدقات للفقراء} [التوبة:٦٠] وقول النبي - صلى الله عليه وسلم -: لا تحل الصدقة لغني"؛ ولأن الصدقة مال تمكن فيه الخبث لكونه غسالة الناس لحصول الطهارة لهم به من الذنوب، ولا يجوز الانتفاع بالخبيث إلا عند الحاجة والحاجة للفقير لا للغني.ــــــــــ وأما صدقة التطوع فيجوز صرفها إلى الغني؛ لأنها تجري مجرى الهبة. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م:٥٨٧هـ):٢/٤٧، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى إليه، ط: دار الكتب العلمية)

وعلى هذا يخرج الدفع إلى الوالدين وإن علوا والمولودين وإن سفلوا؛ لأن أحدهما ينتفع بمال الآخر ولا يجوز أن يدفع الرجل الزكاة إلى زوجته بالإجماع، وفي دفع المرأة إلى زوجها اختلاف بين أبي حنيفة وصاحبيه ذكرناه فيما تقدم.... وأما صدقة التطوع فيجوز دفعها إلى هؤلاء والدفع إليهم أولى؛ لأن فيه أجرين أجر الصدقة وأجر الصلة وكونه دفعا إلى نفسه من وجه لا يمنع صدقة التطوع. (حوالہ سابق)

ولا يدفع إلى بني هاشم... هذا في الواجبات كالزكاة والنذر والعشر والكفارة، فأما التطوع فيجوز الصرف إليهم. (الهندية:١/١٨٩، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر)

حد ضروری ہے، جس کے لیے للہ اور سود کی رقم کا استعمال بھی جائز ہے۔[1] قبرستان جس خاندان کا ہے، اگر اُس خاندان کے لوگ محتاج اور مستحقین زکوٰۃ ہوں، تو اُن کے لیے جائز ہے کہ وہ زکوٰۃ کی رقم لے کر قبرستان کی چہار دیواری کے لیے خرچ کردیں، اور اس طرح خرچ کرنے والے مساکین کو وہی اجر ملے گا، جو اپنی رقم کے خرچ کرنے پر ملتا ہے، اس لیے کہ وہ مستحقین زکوٰۃ ہونے کی وجہ سے اُس زکوٰۃ کی رقم کے مالک ہیں۔ (درمختار)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۵] قبرستان کا احاطہ کرنے میں زکوٰۃ اور صدقۂ واجبہ کی رقم صرف کرنا

۱۴۵۲- سوال: ہمارے گاؤں میں مسلمانوں کے متعدد قبرستان ہیں، ان میں سے ایک قبرستان تقریباً ۹/۱ ایکڑ کا ہے، اس کا کئی سال پہلے تار کے ذریعہ احاطہ کیا گیا تھا، جو مرورِ ایام کی نذر ہو چکا ہے، اب چاروں طرف سے کسی قسم کی باؤنڈری نہیں ہے، جس کی وجہ سے مرحومین کی قبروں کی بے حرمتی ہو رہی ہے، فی الحال قبرستان میں جانور چرتے رہتے ہیں، جب کہ بازو میں غیر مسلمین کی آبادی ہے، وہ لوگ قبرستان میں استنجاء کرتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں، شراب پیتے ہیں، آج کے اس پر آشوب دور میں اگر کوئی منع کرے، تو اختلاف

---

(۱) وأما صدقة التطوع فيجوز صرفها إلى الغني؛ لأنها تجري مجرى الهبة. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع- علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۲/ ۴۷، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى إليه، ط: دار الكتب العلمية)

سود کی رقم رفاہی کاموں میں استعمال ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اکابر امت کا اختلاف ہے، ایک بڑی جماعت جواز کی طرف گئی ہے، جن میں مفتی کفایت اللہ دہلوی، مفتی سید عبدالرحیم لاج پوریؒ، مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، استاذ گرامی مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم شامل ہیں، جیسا کہ ان کے فتوی سے معلوم ہوتا ہے، حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے اس سلسلے میں بڑی مفصل و محقق بحث فرمائی ہے، دیکھیے: فتاوی عثمانی: ۳/ ۱۲۹۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے اس فتوی سے معلوم ہوتا ہے کہ رفاہی کام میں سود کی رقم استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

[۲] لأن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب بحر (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ وهو معنى قول ابن الملك: فيحل التصدق على من حرم عليه بطريق الهدية. (مرقاة المفاتيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴ھ): ۴/ ۳۰۳، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر- بيروت)

وانتشار کی فضاء بن جائے گی اور مسلمانوں کا ناقابل تلافی نقصان ہوگا؛ ان تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے قبرستان کے اردگرد "تار" کے ذریعہ احاطہ (کمپاؤنڈ) کرنا ناگزیر ہے، تاکہ کسی قسم کے مائل پیدا نہ ہوں۔

قبرستان کے احاطہ کافی بڑا ہے؛ اس لیے صرفہ بھی کافی ہوگا، ہمارے گاؤں کے مسلمانوں کی معاشی حالت ایسی نہیں ہے کہ تمام مل کر تار کی چہار دیواری قائم کرلیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسی صورت میں قبرستان کے چہار دیواری کے لیے دوسرے گاؤں کے مسلمانوں سے چندہ لے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس چندہ میں مسلمان زکوۃ، صدقہ، للہ اور سود کی رقم دیں، تو ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

موجودہ حالات میں قبرستان کا احاطہ جلد از جلد کرنا بہت ضروری ہے، دیر نہیں کرنی چاہیے، زکوۃ کی رقم استعمال نہیں کرسکتے، [1] ہاں للہ اور سود کی رقم کا استعمال جائز ہے۔ [2] قبرستان کی ضرورت کی تکمیل کے لیے لوگوں سے تعاون کی اپیل کرنا (چندہ کرنا) جائز ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] زکوۃ کے پیسے قبرستان میں استعمال کرنا جائز نہیں

۱۴۵۳- سوال: قبرستان کی چہار دیواری کی تعمیر کے لیے زکوۃ کے پیسے دینا جائز ہے یا نہیں؟ کیا اس سے زکوۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب حامداومصلیا:

زکوۃ کی ادائیگی کے صحیح ہونے کے لیے محتاج وفقیر کو مالک بنانا ضروری ہے، مسجد اور قبرستان کی تعمیر کے لیے دینے میں تملیک نہیں پائی جاتی؛ اس لیے زکوۃ کے پیسے مسجد، اور قبرستان وغیرہ کی تعمیر کرنے میں دینا جائز نہیں ہے۔ [3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولا يجوز أن يبني بالزكاة المسجد، وكذا القناطر والسقايات وإصلاح الطرقات وكري الأنهار والحج والجهاد وكل ما لا تمليك فيه زيلعي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: زكريا-ديوبند)

(۲) تفصیل کے لیے سوال سابق بہ عنوان "قبرستان کی چہار دیواری میں زکوۃ کی رقم کا استعمال" ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) قد تقدم تخريجه عن: الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف)

تفصیل کے لیے عنوان "قبرستان کی چہار دیواری میں زکوۃ کی رقم کا استعمال" اور "قبرستان کا احاطہ کرنے میں زکوۃ اور صدقۂ واجبہ کی رقم صرف کرنا" ملاحظہ فرمائیں۔

[۶۷] مدرسے کے پیسے بہ طور قرض، قبرستان میں استعمال کرنا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۴۵۴- سوال: فی الحال قبرستان کے کام کے لیے پیسوں کی سخت ضرورت ہے، تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ مدرسے کے پیسے بہ طور قرض اس میں استعمال کر لیے جائیں، پھر بعد میں قبرستان کے چندے کے پیسے مدرسہ کے حساب میں جمع کر دیے جائیں؟ اگر اس کی گنجائش نہ ہو، تو کسی حیلہ کی رہنمائی فرمائیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مدرسہ ومسجد کے متولیان جب مدرسہ ومسجد کا حساب الگ رکھتے ہوں، تو ایک کے مدسے بہ طور قرض پیسے لے کر دوسرے مد میں استعمال کرنا جائز ہے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۸] زکوۃ کی رقم کا حیلہ کر کے مسجد کی تعمیر میں استعمال کرنا بہتر نہیں

۱۴۵۵- سوال: ہماری مسجد کا تعمیری کام جاری ہے، اب صورت حال یہ ہے کہ ہمارے پاس للہ رقم نہیں ہے، جس کی بناء پر ہم نے زکوۃ کے پیسے وصول کر کے اس کا شرعی طریقہ سے حیلہ کر لیا ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ اس رقم کو مسجد کی تعمیر میں خرچ کرنا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں ہے، تو ہم نے تو کچھ رقم مسجد میں استعمال کر لی ہے۔ اس کا صحیح حل بیان کیجئے؟

پیسے کی قلت کی بناء پر تعمیری کام بہت دھیرے چل رہا ہے۔

---

(۱) حضرت تھانویؒ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

باذنِ معطین [قرض دینا] درست ہے، کیوں کہ اموال مذکورہ ہنوز ان کی ملک سے خارج نہیں ہوئے، رہی یہ بات کہ صورت مسئولہ میں اذنِ معطین دلالۃً ہے یا نہیں؟ یہ ایک واقعہ ہے اور ظاہر یہ ہے کہ ہے، کیوں کہ چندہ دینے والے جب چندہ دیتے ہیں، تو عادت یہی ہے کہ وہ اس سے اپنا تعلق تصرف منقطع کر دیتے ہیں، اور متولی کو ہر مناسب تصرف کا اختیار دیتے ہیں، اس لیے صورت مسئولہ میں تصرف مذکور جائز ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۲/ ۱۶-۱۷، کتاب الزکاۃ والصدقات، مدِ زکوۃ سے مدرسے کی دیگر مد میں قرض لینے یا صرف کرنے کا حکم، ط: زکریا- دیوبند)

اور فیض الباری میں ہے:

ولذا أفتيتُ لأصحاب المدارس أن يصرفوا مالَ الزكاة الذي عندهم في غير مصارفها دَيْنًا عليهم، فإذا جاء عندهم مالٌ في ذلك المصرف يؤدُّوه عما صرفوه من مال الزكاة. (فيض الباری: ۳/ ۲۱۰، کتاب الزكاة، باب قول الله تعالى: {وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله}، ط: دار إحياء التراث العربي)

الجواب حامداً ومصلياً:

شرعی حیلہ کے بغیر زکوۃ کی رقم مسجد کے تعمیری کام میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔(۱) حیلہ کرنے کے بعد جائز ہے۔(۲) لیکن بہتر صورت یہ ہے کہ مسجد مدرسہ وغیرہ کے تعمیری کام میں زکوۃ کے پیسے حیلہ کرنے کے بعد بھی استعمال نہ کریں؛ کیوں کہ اس میں غرباء کا حق تلف ہوتا ہے۔(۳)

مذکورہ صورت میں مجبوری کی بناء پر جو پیسے حیلہ کر کے استعمال کیے گئے ہیں، وہ جائز ہے، زکوۃ ادا ہوگئی ہے، اگر مستقبل میں للہ رقم میسر نہ ہو، تو زکوۃ کے پیسے حیلہ کر کے استعمال کرنا جائز ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۹] مستحق زکوۃ کا زکوۃ کی رقم سے جیپ [گاڑی] خریدنا

۱۴۵۶- سوال: [۱] مجھے ایک پارٹی زکوۃ کی رقم دینا چاہتی ہے، تو کیا اس رقم سے میں جیپ گاڑی خرید سکتا ہوں؟

---

(۱) قد تقدم تخريجه مرارا عن الدر المختار وتبيين الحقائق وغيرهما من كتب الفقه.

(۲) وحيلة التكفين بها [الزكاة] التصدق على فقير، ثم هو يكفن فيكون الثواب لهما، وكذا في تعمير المسجد، وتمامه في حيل الأشباه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۲۷۱، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

لأن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء [أي إلى بناء نحو مسجد وإلى كفن ميت وقضاء دينه] مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب، بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۴۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۳) وإذا فعله حيلة لدفع الوجوب كأن استبدل نصاب السائمة بآخر أو أخرجه عن ملكه ثم أدخله فيه، قال أبو يوسف لا يكره؛ لأنه امتناع عن الوجوب لا إبطال حق الغير. ــــــ وفي المحيط: أنه الأصح. ــــ وقال محمد: يكره، واختاره الشيخ حميد الدين الضرير؛ لأن فيه إضرارا بالفقراء وإبطال حقهم مالا، وكذا الخلاف في حيلة دفع الشفعة قبل وجوبها. ــــــ وقيل الفتوى في الشفعة على قول أبي يوسف، وفي الزكاة على قول محمد، وهذا تفصيل حسن شرح درر البحار. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۲۸۴، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، ط: دار الفكر - بيروت)

استاذ گرامی، آفتاب فقہ دار العلوم دیوبند کے عظیم مفتی، اور فتاویٰ دار العلوم کے اولین مرتب و محشی حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی- رحمہ اللہ- اس سلسلے میں رقم طراز ہیں: ''حیلہ خواہ مخواہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ زکوۃ کے مصارف متعین ہیں، حیلہ کے بعد جو اصل مستحق ہیں، وہ عملاً محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے حیلہ کی صورت انتہائی مجبوری میں اختیار کرنی چاہیے۔'' (فتاویٰ دار العلوم: ۶/۱۹۹، حاشیہ نمبر: ۴، مسائل مصارف زکاۃ، حیلہ کے ذریعے زکاۃ کی رقم تبلیغ میں خرچ کرنا کیسا ہے؟ ط: زکریا- دیوبند) [مرتب]

[۲] میں خود ڈرائیور ہوں اور زکوۃ کا مستحق ہوں، میری کوئی انکم نہیں ہے، میں نے ایک پارٹی سے پیسے مانگے، تو اس نے کہا کہ ہمارے پاس زکوۃ کے پیسے ہیں، اگر ان پیسوں کے تم شرعاً مستحق ہو، تو ہم تمہیں پیسے دینے کے لیے تیار ہیں، میں ان پیسوں سے جیپ گاڑی خریدنا چاہتا ہوں تو کیا یہ جائز ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

[۱] اگر آپ زکوۃ کے مستحق ہیں، تو رقم لے کر جیپ گاڑی خرید سکتے ہیں۔[۱] لیکن ایک ہی آدمی کو زکوۃ کی اتنی بڑی رقم دینا کہ جس سے وہ صاحب نصاب ہو جائے، مکروہ ہے، البتہ اگر دے دی، تو زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ (درمختار)[۲]

[۲] جائز ہے۔[۳] اور اگر پارٹی زکوۃ کی رقم سے جیپ گاڑی خرید کر آپ کو دے دے تو بھی جائز ہے اور مذکورہ کراہت بھی باقی نہیں رہے گی؛ کیوں کہ جیپ گاڑی دینے کی وجہ سے آپ صاحب نصاب نہیں ہوں گے۔[۴] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ وهو معنى قول ابن الملك: فيحل التصدق على من حرم عليه بطريق الهدية. (مرقاة المفاتيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۳/ ۳۰۳، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر-بيروت)

[۲] (وكره إعطاء فقير نصابا) أو أكثر (إلا إذا كان) المدفوع إليه (مديونا أو) كان (صاحب عيال) بحيث (لو فرقه عليهم لا يخص كلا) أو لا يفضل بعد دينه (نصاب) فلا يكره فتح. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۵۳، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۲۲۱، كتاب الزكاة، الفصل الثامن المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا ديوبند)

ويكره أن يدفع إلى رجل مائتي درهم فصاعدا، وإن دفعه جاز كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۸، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف)

(۳) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ، فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ. (۹-التوبة: ۶۰) ــــــ وانظر رقم الحاشية: ۱.

(۴) کیوں کہ جیپ اس شخص کے لیے حاجت اصلیہ میں شمار کی جائے گی، لہٰذا اس پر وجوب زکاۃ کے سلسلے میں اس کو شمار نہیں کیا جائے گا، درج ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

مصرف الزكاة... (هو فقير، وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: مستغرق في الحاجة) كدار السكنى وعبيد الخدمة وثياب البذلة وآلات الحرفة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۳۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر-بيروت)

[۷۰] زکوۃ کی رقم لینے کے بعد زکوۃ دینے والے کو واپس دینا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۴۵۷- سوال: زکوۃ کے وہ پیسے، جس سے میں گاڑی خرید چکا ہوں، پارٹی کو واپس دینا چاہوں، تو اس سلسلے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب آپ مستحق زکوۃ تھے، اس وقت زکوۃ کی رقم لی، اور گاڑی لے آئے، تو زکوۃ دینے والے کی زکوۃ ادا ہوگئی اور آپ کے اوپر کوئی قرض واجب نہیں ہوا؛ لہٰذا اس رقم کے واپس کرنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔

ہاں! اگر آپ نے یہ دل میں نیت کی ہے کہ ابھی تو میں زکوۃ کی رقم لے رہا ہوں؛ لیکن اللہ میری حالت اچھی کر دے گا، تو میں اتنی رقم کسی دوسرے محتاج کو صدقہ کردوں گا یا دین کے کسی کام میں خرچ کروں گا، تو یہ بہت اچھا ارادہ ہے، اور نیت میں اخلاص ہے، بہر صورت رقم واپس کرنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ (مرقاۃ)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۱] زکوۃ لینے کے لیے حیلہ کرنا

۱۴۵۸- سوال: زکوۃ کی رقم وہ پارٹی حیلہ کر کے دے، تو کیا میں اس کو لے سکتا ہوں؟ اور بعد میں وہ پیسے پارٹی کو واپس کرنا چاہوں تو کیا کروں؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ ان پیسوں کا حیلہ کس طرح کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر آپ مستحق ہیں، تو زکوۃ کی رقم لینے کے لیے حیلہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ (۱) اور مستحق نہیں

---

[۱] قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ وهو معنى قول ابن الملك: فيحل التصدق على من حرم عليه بطريق الهدية. (مرقاة المفاتيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۴/ ۳۰۳، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۱) إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۚ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹- التوبۃ: ۶۰)

مصرف الزكاة... (هو فقير، وهو من له أدنى شيء) أي دون نصاب أو قدر نصاب غير نام مستغرق في الحاجة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۳۹، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر- بيروت)

ہیں، تو وہ رقم کسی غریب کے ہاتھ میں دیکر کہیں کہ اگر یہ رقم آپ فلاں کے کام میں دیں گے، تو آپ کو پوری رقم دینے کا ثواب مل جائے گا، جس غریب کے ہاتھ میں زکاۃ کی رقم حیلہ کے لیے دی جائے، اس کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے جو رقم دی گئی ہے، میں اس کا مالک ہوں، اور خوش دلی سے وہ آپ کو دے دے۔ کسی قسم کے دباؤ کی وجہ سے نہ ہو، ورنہ یہ شرعی حیلہ نہیں ہوگا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۲] شوہر کے لیے زکوۃ لینا جائز ہے، اگر چہ اس کی بیوی صاحب نصاب ہو

۱۴۵۹- سوال: ایک آدمی کی بیوی کے پاس سونا ہے، اس آدمی کی کوئی آمدنی نہیں ہے، اس کی بیوی سونے کی زکوۃ اپنے پاس موجود رقم سے دیتی ہے، اگر کوئی دوسرا آدمی زکوۃ کی رقم اس آدمی کو دے، تو کیا وہ زکوۃ کی رقم لے سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

چاہے بیوی پر زکوۃ واجب ہو، لیکن شوہر غریب ہو، اور کوئی دوسرا آدمی اسے زکوۃ کی رقم دے، تو اس کے لیے لینا جائز ہے۔ (عالم گیری)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۳] جو خاتون زکوۃ کی مستحق نہ ہو، اس کے لیے زکوۃ لینا جائز نہیں

۱۴۶۰- سوال: ایک بیوہ عورت کو اس کے کسی رشتہ دار نے زکوۃ کی رقم بھیجی ہے اور صورت حال یہ ہے کہ عورت کے پاس سونا ہے، جس کی زکوۃ وہ عورت اپنی طرف سے ادا کرتی ہے، تو کیا اس عورت کے لیے زکوۃ کی رقم لینا جائز ہے؟ عورت کی دوسری کوئی آمدنی نہیں ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس عورت پر زکوۃ یا قربانی واجب ہو، (نامی یا غیر نامی نصاب کے بہ قدر مال کی مالک ہو)

---

(۱) لأن الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء [أي إلى بناء نحو مسجد و إلى كفن ميت وقضاء دينه] مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب، بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۴۵/۲، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

[۲] ويجوز دفعها إلى من يملك أقل من النصاب، وإن كان صحيحا مكتسبا كذا في الزاهدي. (الفتاوى الهندية: ۱۸۹/۱، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر- بيروت)

اس کے لیے زکوۃ لینا جائز نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۷۴] زکوۃ کی رقم ادارہ چلانے میں اور ملازمین کی تنخواہوں میں صرف کرنا

۱۴۶۱- سوال: زکوۃ، صدقات کی رقم ادارہ کے نظم ونسق میں اور ملازمین کی تنخواہوں میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس سے زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ اگر ادارہ کے ملازمین کی تنخواہ کا کسی صورت میں نظم نہ ہو سکے، تو کیا اس سلسلے میں زکوۃ کی رقم استعمال کرنے کی کوئی سبیل ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

زکوۃ کی رقم ادارے کے نظم ونسق میں اور ملازمین کی تنخواہوں میں استعمال کرنا جائز نہیں، نظم ونسق میں تملیک نہیں پائی جاتی، حالاں کہ زکوۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک شرط ہے، نیز تنخواہ تو محنت کے عوض میں دی جاتی ہے، جب کہ زکوۃ، غریب ومسکین کا بلا محنت حق ہے۔ (درمختار)[2]

---

(۱) ولا يجوز دفع الزكاة إلى من يملك نصابا من أي مال كان، لأن الغنى الشرعي مقدر به الشرط أن يكون فاضلا من الحاجة الأصلية. (الهداية) ـــــ قال العيني (م:۸۵۵ھ): م: (ولا يجوز دفع الزكاة إلى من ملك نصابا من أي مال كان) ش: يعني سواء كان من النقدين أو من العروض أو من السوائم م: (لأن الغنى الشرعي مقدر به) ش: أي بالنصاب م: (والشرط أن يكون فاضلا عن الحاجة الأصلية) ش: أي شرط عدم جواز دفع الزكاة إليه أن يكون النصاب فاضلا عن الحاجة الأصلية. (البناية شرح الهداية: ۳/ ۴۷۶-۴۷۷، كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقات إليه ومن لا يجوز، الحكم لو دفع الزكاة لغير مستحقيها وهو لا يعلم، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

تجب [صدقة الفطر]... (على كل) حر (مسلم)... (ذی نصاب فاضل عن حاجته الأصلية) كدينه وحوائج عياله (وإن لم ينم)... وبه، أي بهذا النصاب (تحرم الصدقة)... وتجب الأضحية. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۵۸-۳۶۰، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، ط: دار الفكر☆البحر الرائق: ۲/ ۲۷۱، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، ط: دار الكتاب الإسلامي☆درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۱/ ۱۹۳، كتاب الزكاة، باب على من تجب زكاة الفطر، ط: دار إحياء الكتب العربية)

[۲] ولو دفعها المعلم لخليفته إن كان بحيث يعمل له لو لم يعطه وإلا لا. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: وإلا لا) أي؛ لأن المدفوع يكون بمنزلة العوض. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۶، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر)

سخت مجبوری کی حالت میں حیلہ کر کے تنخواہ میں دینا جائز ہے۔ (عالم گیری ☆ درمختار)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۵] گاؤں کی رضا کارانہ تنظیموں میں زکوۃ، صدقہ، فطرہ اور سود کی رقم دینا

۱۴۶۲- سوال: ہمارے گاؤں میں مسلمانوں کی تین رضا کارانہ تنظیمیں کام کر رہی ہیں:

(۱) حکمت کتاب گھر، یہ تنظیم مفت میں دینی کتابیں مطالعہ کے لیے فراہم کرتی ہے۔

(۲) اتحاد ایجوکیشن کمیٹی، یہ تنظیم بچوں کی دنیوی تعلیم وترقی کے لیے کام کرتی ہے۔

(۳) مسجد کمیٹی، جو مسجد میں اگربتی، موم بتی، رومال اور جھاڑو جیسی دیگر اشیاء فراہم کرتی ہے۔

مذکورہ بالا تینوں تنظیموں کے تعاون کے لیے سود، زکوۃ، صدقہ اور فطرہ کی رقم لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ تنظیموں میں زکوۃ، صدقہ یا فطرہ کی رقم دینے سے ادا نہ ہوگی،[۱] البتہ اگر تنظیم کے ذمہ دار حیلہ

---

[۲] مذهب علمائنا - رحمهم الله تعالى - أن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير أو لإدخال شبهة فيه أو لتمويه باطل فهي مكروهة وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال فهي حسنة، والأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله تعالى {وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث} [ص: ۴۴] وهذا تعليم المخرج لأيوب النبي - عليه وعلى نبينا الصلاة والسلام - عن يمينه التي حلف ليضربن امرأته مائة عود وعامة المشايخ على أن حكمها ليس بمنسوخ وهو الصحيح من المذهب كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۶/ ۳۹۰، كتاب الحيل، الفصل الأول في بيان جواز الحيل، ط: دار الفكر)

استاذ گرامی، آفتاب فقہ، دار العلوم دیوبند کے عظیم مفتی، حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی -رحمہ اللہ- اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

حیلہ خواہ مخواہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ زکوۃ کے مصارف متعین ہیں، حیلہ کے بعد جو اصل مستحق ہیں، وہ عملاً محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے حیلہ کی صورت انتہائی مجبوری میں اختیار کرنی چاہیے۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۶/ ۱۹۹، حاشیہ نمبر: ۲، مسائل مصارف زکاۃ، حیلہ کے ذریعے زکاۃ کی رقم تبلیغ میں خرچ کرنا کیسا ہے؟ ط: زکریا- دیوبند) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

... الحيلة أن يتصدق على الفقير ثم يأمره بفعل هذه الأشياء (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب، بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

(۱) کیوں کہ ان تنظیموں کو دینے میں شرط تملیک نہیں پائی جاتی: ـــــ لأن الزكاة يجب فيها تمليك المال. اهـ... قال في الكشف الكبير في بحث القدرة الميسرة: الزكاة لا تتأدى إلا بتمليك عين متقومة حتى لو أسكن الفقير داره سنة=

کی صورت اختیار کریں تو زکوۃ ادا ہو جائے گی، لیکن اس جیسی تنظیموں میں حیلہ کر کے تعاون حاصل کرنے والا گنہگار ہوگا، زکوۃ کی رقم ایسی تنظیموں میں بذریعہ حیلہ وصول کرنے سے فقراء کی حق تلفی ہوتی ہے، لہٰذا ان تنظیموں کے لیے دوسرا کوئی مد قائم کرنا چاہیے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۶] زکوۃ کی رقم سے مدرسہ میں پانی کی موٹر خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز صاحبِ نصاب شخص اُس موٹر کے پانی کو استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟

۱۴۶۳- سوال: کسی شخص نے مدرسہ میں اپنی زکوۃ ادا کی، تو اُن پیسوں کے ذریعہ مدرسہ میں

= بنية الزكاة لا يجزئه، لأن المنفعة ليست بعين متقومة. اهـ. (البحر الرائق: ۲/ ۲۵۲-۲۵۳، أول كتاب الزكاة، ط: زكريا-ديوبند ☆ المحيط البرهاني: ۳/ ۲۱۳، كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۲۹۱، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا- ديوبند ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۱۱، أول كتاب الزكاة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) مذهب علمائنا - رحمهم الله تعالى - أن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير أو لإدخال شبهة فيه أو لتمويه باطل فهي مكروهة وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال فهي حسنة، والأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله تعالى {وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث} [ص: ۴۴] وهذا تعليم المخرج لأيوب النبي - عليه وعلى نبينا الصلاة والسلام - عن يمينه التي حلف ليضربن امرأته مائة عود وعامة المشايخ على أن حكمها ليس بمنسوخ وهو الصحيح من المذهب كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۶/ ۳۹۰، كتاب الحيل، الفصل الأول في بيان جواز الحيل، ط: دار الفكر)

استاذِ گرامی، آفتابِ فقہ، دار العلوم دیوبند کے عظیم مفتی، حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی- رحمہ اللہ- اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

حیلہ خواہ مخواہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ زکوۃ کے مصارف متعین ہیں، حیلہ کے بعد جو اصل مستحق ہیں، وہ عملاً محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے حیلہ کی صورت انتہائی مجبوری میں اختیار کرنی چاہیے۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۶/ ۱۹۹، حاشیہ نمبر: ۲، مسائل مصارف زکاۃ، حیلہ کے ذریعے زکاۃ کی رقم تبلیغ میں خرچ کرنا کیسا ہے؟ ط: زکریا- دیوبند) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

والحيلة لمن أراد ذلك أن يتصدق بمقدار زكاته على فقير، ثم يأمره بعد ذلك بالصرف إلى هذه الوجوه، فيكون لصاحب المال ثواب الصدقة، ولذلك الفقير ثواب هذه القُرَب. (المحيط البرهاني -أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۲۸۳-۲۸۲، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع الزكاة فيه، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۴۵، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: دار الفكر)

پانی کی موٹر خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر موٹر خریدی جائے، تو اُس پانی کا استعمال کوئی صاحب نصاب شخص کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیا:

مدرسہ کے لیے زکوٰۃ کی رقم کے ذریعہ موٹر خریدنا جائز نہیں ہے، اگر خریدی گئی، تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔[1] کسی غریب کو زکوٰۃ کی رقم کا مالک بنانا ضروری ہے۔[2] اسی لیے مدارس میں زکوٰۃ دیتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ ایسے بڑے مدارس میں زکوٰۃ دی جائے، جہاں دور و دراز علاقے کے محتاج طلبہ بہ غرض تعلیم داخل ہوں، اور مدرسہ اُن کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کی کفالت کرتا ہو، تاکہ اُن کو مالک بنایا جائے اور زکوٰۃ صحیح طرح ادا ہوسکے، چھوٹے مدارس، جہاں محتاج بچوں کی اقامت نہ ہو، وہاں تملیک نہیں ہوتی؛ اِس لیے اُن میں زکوٰۃ کے علاوہ دوسری للہ رقم دی جائے، اگر للہ رقم کا انتظام کسی بھی طرح نہ ہوتا ہو تو زکوٰۃ کی رقم لے کر اولاً کسی غریب کو اُس کا مالک بنادیا جائے، پھر وہ اپنی رضامندی سے اگر مدرسہ میں دے دے، تو مدرسہ کے لیے اُس کا استعمال صحیح ہے، جس کو حیلہ کہا جاتا ہے۔[3] اگر اِس طرح کا حیلہ کرکے پانی کی

---

(۱) ولا یصرف في بناء مسجد، وقنطرة، ولا یقضي بها دین میت، ولا یعتق عبداً، ولا یکفن میتا. (المحیط البرهاني - ابن مازۃ البخاري الحنفي (م:٦١٦هـ): ٢/ ٢٨٢، کتاب الزکاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن یوضع فیه الزکاة، ت: عبدالکریم سامي الجندي، ط: دار الکتب العلمیة - بیروت ☆ الفتاوی الهندیة: ١/ ١٨٨، کتاب الزکاة، الباب السابع في المصارف، ط: زکریا - دیوبند ☆ الفتاوی التاتار خانیة: ٣/ ٢٠٨، رقم المسئلة: ٤١٣٠، کتاب الزکاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فیه الزکاة، ط: زکریا - دیوبند)

(۲) . . . الزکاة یجب فیها تملیك المال؛ لأن الإیتاء في قوله تعالی {وآتوا الزکاة} [البقرة: ٤٣] یقتضي التملیك، ولا تتأدی بالإباحة حتی لو کفل یتیما فأنفق علیه ناویا للزکاة لا یجزیه بخلاف الکفارة، ولو کساه تجزیه لوجود التملیك. (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدین الزیلعي الحنفي (م: ٧٤٣هـ): ١/ ٢٥١-٥٢، أول کتاب الزکاة، ط: المطبعة الکبری الأمیریة - بولاق، القاهرة ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ٢/ ٣٤٤، کتاب الزکاة، باب المصرف، ط: دار الفکر - بیروت ☆ البحر الرائق: ٢/ ٣٥٣، أول کتاب الزکاة، ط: دار الکتاب - دیوبند)

(۳) وحیلة الجواز أن یعطي مدیونه الفقیر زکاته ثم یأخذها عن دینه. (الدر المختار مع رد المحتار: ٢/ ٢٧١، کتاب الزکاة، ط: دار الفکر)

والحیلة لمن أراد ذلك أن یتصدق بمقدار زکاته علی فقیر، ثم یأمره بعد ذلك بالصرف إلی هذه الوجوه، فیکون لصاحب المال ثواب الصدقة، ولذلك الفقیر ثواب هذه القُرب. (المحیط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي =

موٹر خریدی گئی ہو تو اُس پانی کا استعمال غریب و امیر؛ ہر شخص کرسکتا ہے، لیکن اس طرح کے حیلہ کی گنجائش صرف بہ حالتِ مجبوری ہے، لہٰذا اُس سے بچنا چاہیے، کیوں کہ اگر اس طرح حیلہ کے ذریعہ مدارس کے ہر قسم کے مد میں زکوٰۃ استعمال ہونے لگے گی، تو غرباء اور مساکین کی حق تلفی ہوگی، اور زکوٰۃ کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۷] متعین کام کے لیے بھیجے گئے پیسے دوسرے مصرف میں استعمال کرنا درست نہیں

۱۴۶۴- سوال: میرے ایک متعلق نے ایک متعین کام کے لیے کچھ رقم بھیجے ہیں، دریافتیہ کرنا ہے کہ کیا جس کام کے لیے پیسے بھیجے گئے ہوں، اسی کام میں استعمال کرنا ضروری ہے یا اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں پیسے لگا سکتے ہیں؟ مثلاً شادی کے لیے پیسے بھیجے گئے ہوں، تو اس کو چھوڑ کر کھیتی باڑی میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

اگر آپ کو پیسوں کا مالک بنا دیا ہے، تو پھر آپ کو اس میں اختیار ہے، جس مصرف میں خرچ کرنا

=برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ):۲/ ۲۸۳، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع الزكاة فيه، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية ☆ الفتاوى التاتار خانية: ۲/ ۲۰۸، كتاب الزكاة، الفصل الثامن بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا-ديوبند)

(۲) مذهب علمائنا - رحمهم الله تعالى - أن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير أو لإدخال شبهة فيه أو لتمويه باطل فهي مكروهة وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال فهي حسنة، والأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله تعالى {وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث} [ص: ۴۴] وهذا تعليم المخرج لأيوب النبي - عليه وعلى نبينا الصلاة والسلام - عن يمينه التي حلف ليضربن امرأته مائة عود وعامة المشايخ على أن حكمها ليس بمنسوخ وهو الصحيح من المذهب كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۶/ ۳۹۰، كتاب الحيل، الفصل الأول في بيان جواز الحيل، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى التاتار خانية: ۱۰/ ۳۱۱، كتاب الحيل، الفصل الأول في بيان جواز الحيل وعدمها، ط: زكريا-ديوبند)

استاذ گرامی، آفتابِ فقہ، دارالعلوم دیوبند کے عظیم مفتی، حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی-رحمہ اللہ- اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

حیلہ خواہ مخواہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ زکوٰۃ کے مصارف متعین ہیں، حیلہ کے بعد جو اصل مستحق ہیں، وہ عملاً محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے حیلہ کی صورت انتہائی مجبوری میں اختیار کرنی چاہیے۔ (فتاویٰ دارالعلوم: ۶/ ۱۹۹، حاشیہ نمبر: ۲، مسائل مصارف زکاۃ، حیلہ کے ذریعے زکاۃ کی رقم تبلیغ میں خرچ کرنا کیسا ہے؟ ط: زکریا-دیوبند) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

چاہیں، کرسکتے ہیں۔[1] ہاں اگر آپ نے شادی کے لیے مانگا ہو، اور انہوں نے شادی کے نام سے ہی دیے ہو، تو پھر دوسرے مصرف میں استعمال کرنا، سامنے والے کو دھوکہ دینا ہے؛ اس لیے وعدہ خلافی ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷۸] زکاۃ کی رقم پر قبضہ کے بعد مستحق کو ہر طرح کا تصرف حاصل ہوتا ہے

۱۴۶۵- سوال: عمر نے زید کو صدقہ اور سود کی رقم دی، اب زید اس سے کسی محتاج طالب علم کو کتابیں خرید کر دینا چاہتا ہے، یا فیس ادا کرنا چاہتا ہے، تو جائز ہے یا نہیں؟ باتفصیل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداومصليا:

اگر زید غریب ہے، مستحق زکاۃ ہے، اور اس کو عمر نے زکاۃ وصدقہ یا سود کی رقم دی ہے، تو وہ [زید] اس کا مالک ہوجائے گا اور اس کے لیے اس میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار رہے گا۔[3]

البتہ حیلہ کے طور پر زید پر کسی قسم کی زبردستی یا زور ڈالنا جائز نہیں ہے؛ لہٰذا زید طلبہ کو کتابیں یا فیس یا دوا وغیرہ اپنی مرضی سے دینا چاہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت بریرہؓ کے پاس صدقہ کا گوشت

---

(۱) قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشيء ملكه فله أن يهدي به إلى غيره اهـ وهو معنى قول ابن الملك: فيحل التصدق على من حرم عليه بطريق الهدية. (مرقاة المفاتيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۴/ ۱۳۰۳، رقم: ۱۸۲۵، كتاب الزكاة، باب من لا تحل له الصدقة، ط: دار الفكر)

... أن تبدل الملك كتبدل العين. (البحر الرائق: ۲/ ۲۶۴، كتاب الزكاة، باب دفع الزكاة إلى الأب والجد أو الولد وولد، ط: دار الكتاب الإسلامي- بيروت)

(۲) عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "آية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا اؤتمن خان". (صحيح البخاري، رقم الحديث: ۳۳، كتاب الإيمان، باب علامة المنافق، وانظر: ۲۶۸۲، كتاب الشهادات، باب من أمر بإنجاز الوعد☆الصحيح لمسلم، رقم: ۱۰۷-۵۹، كتاب الإيمان، باب بيان خصال المنافق)

... الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره كما لو أوصى لزيد بكذا ليس للوصي الدفع إلى غيره فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر- بيروت☆ المبسوط: ۲/ ۲۰۳، كتاب الزكاة، باب العشر، ط: دار المعرفة- بيروت☆البحر الرائق: ۲/ ۴۲۶، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا- ديوبند)

(۳) سوال سابق کا حاشیہ نمبر ۱ دیکھیں۔

آیا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے لیے صدقہ ہے اور ہمیں کھلاؤ گی، تو ہدیہ ہوگا۔ (حدیث)[۲]

معلوم ہوا کہ تبدیل ملک سے احکام بدل جاتے ہیں، عمر نے زید کو صدقے یا سود کے پیسے دیے اور مالک بنادیا، اب زید اس کو مسجد، مدرسہ میں دینا چاہے یا کتابیں خرید کر طلباء کو دے، تو جائز ہے۔

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے: صحیح البخاري: ۲/ ۷۶۳، رقم الحدیث: ۵۰۹۷، کتاب النکاح، باب الحرة تحت العبد، ط: دیوبند، و انظر رقم: ۱۴۹۳، کتاب الزکاة، باب الصدقة علی موالي أزواج النبي صلی اللہ علیه وسلم ☆ الصحیح لمسلم: ۲/ ۴۹۴، رقم الحدیث: ۸-۱۱ (۱۵۰۴)، کتاب العتق، باب إنما الولاء لمن أعتق، ط: دیوبند.

وهي [صدقة الفطر] واجبة على الحر المسلم المالك لمقدار النصاب فاضلا عن حوائجه الأصلية كذا في الاختيار شرح المختار، ولا يعتبر فيه وصف النماء ويتعلق بهذا النصاب وجوب الأضحية، ووجوب نفقة الأقارب هكذا في فتاوى قاضي خان.

(عالم گیری: ۱/ ۱۹۱، کتاب الزکاۃ، الباب الثامن فی صدقۃ الفطر، ط: دار الفکر)

باب صدقة الفطر

[صدقۃ الفطر کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب صدقۃ الفطر

[صدقۃ الفطر کا بیان]

[۱] یتیم پر صدقۃ الفطر کا حکم

۱۴۶۶- سوال: جس یتیم پر زکوٰۃ نکالنا فرض نہیں ہے، تو کیا اس پر صدقۃ الفطر بھی نکالنا واجب نہ ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کے وجوب میں نصاب نامی اور غیر نامی کا فرق ہے، پس اگر اس یتیم کے پاس ضرورت سے زائد کپڑے، برتن، بستر، وغیرہ ہوں اور ان سب کی قیمت نصاب (یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی) کو پہنچ جائے، تو اس پر صدقۃ الفطر واجب ہوگا، مگر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی؛ کیوں کہ زکوٰۃ میں مال نامی (نقد رقم، تجارتی مال، سونا اور چاندی) کو شمار کیا جاتا ہے۔ (شامی)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] تجب... (علی کل) حر (مسلم) ولو صغیرا مجنونا، (ذي نصاب فاضل عن حاجته الأصلية) كدينه وحوائج عياله (وإن لم ينم). [الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۶۰- ۳۵۸، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، ط: دار الفكر ☆الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۴۵۳، كتاب الزكاة، الفصل الثالث في صدقة الفطر، ط: مكتبة زكريا- ديوبند ☆مجمع الانهر: ۱/ ۳۳۴، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، ط: مكتبة فقيه الأمة- ديوبند]

وهي واجبة على الحر المسلم المالك لمقدار النصاب فاضلا عن حوائجه الأصلية كذا في الاختيار شرح المختار، ولا يعتبر فيه وصف النماء ويتعلق بهذا النصاب وجوب الأضحية، ووجوب نفقة الأقارب هكذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۱، كتاب الزكاة، الباب الثامن في صدقة الفطر، ط: دار الفكر)

ومنها كون النصاب ناميا. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۴، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

[۲] زائد کپڑے یا برتن ہوں، تو صدقۃ الفطر اور قربانی واجب ہوگی یا نہیں؟

۱۴۶۷- سوال: ایک شخص کے پاس تین جوڑے سے زائد کپڑے ہیں، نیز ضرورت سے زائد برتن بھی ہیں، جو سال میں صرف دو یا تین مرتبہ کام آتے ہیں، تو اُن پر صدقۃ الفطر اور قربانی واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

تین جوڑے کپڑے، جن میں سے ایک روزانہ گھر میں پہننے کے لیے، ایک گھر سے باہر پہننے کے لیے اور ایک جمعہ یا عیدین وغیرہ کے لیے اور سردی وغیرہ موسم کے کپڑوں کے علاوہ جو زائد کپڑے اور برتن ہوں، جن کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو، تو قربانی واجب ہوگی، اگر مہمانوں کی آمد زیادہ رہتی ہو؛ جس کی وجہ سے برتنوں کا استعمال کئی بار ہوتا ہو، تو برتن حاجتِ اصلیہ شمار ہوں گے، اور اس صورت میں وہ نصاب میں شمار نہیں کیے جائیں گے۔ (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] بڑے مکان کا ضرورت سے زائد آدھا حصہ نصابِ صدقۃ الفطر میں داخل ہوگا یا نہیں؟

۱۴۶۸- سوال: ایک شخص کے پاس بہت بڑا مکان ہے، جس کے اگر دو حصے کیے جائیں، تو ایک حصہ رہائش کے لیے کافی ہو جائے گا، ایسی صورت میں دوسرا حصہ، جو زائد ہے، اُس کی وجہ سے صدقۃ الفطر

---

(۱) وهي [صدقة الفطر] واجبة على الحر المسلم المالك لمقدار النصاب فاضلا عن حوائجه الأصلية كذا في الاختيار شرح المختار، ولا يعتبر فيه وصف النماء ويتعلق بهذا النصاب وجوب الأضحية، ووجوب نفقة الأقارب هكذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۱، كتاب الزكاة، الباب الثامن في صدقة الفطر، ط: دار الفكر)

حوائج اصلیہ کی تشریح یوں کی گئی ہے:

(و) فارغ (عن حاجته الأصلية) لأن المشغول بها كالمعدوم. وفسره ابن ملك بما يدفع عنه الهلاك تحقيقا كثيابه أو تقديرا كدينه. (الدر المختار)ـــــ قال ابن عابدين: (قوله وفسره ابن ملك) أي فسر المشغول بالحاجة الأصلية والأولى فسرها، وذلك حيث قال: وهي ما يدفع الهلاك عن الإنسان تحقيقا كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج إليها لدفع الحر أو البرد أو تقديرا كالدين، فإن المديون محتاج إلى قضائه بما في يده من النصاب دفعا عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك وكآلات الحرفة وأثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لأهلها فإن الجهل عندهم كالهلاك، فإذا كان له دراهم مستحقة بصرفها إلى تلك الحوائج صارت كالمعدومة، كما أن الماء المستحق بصرفه إلى العطش كان كالمعدوم وجاز عنده التيمم. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۲، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر - بيروت)

اور قربانی واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

مکان اگر رہائش ہی کے لیے استعمال ہو رہا ہے، تو خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، نصاب میں داخل نہیں ہوگا، اگر چہ دو حصوں میں سے اُس کا ایک حصہ خالی رہتا ہو، ہاں اگر تعمیر کے وقت ہی سے دو مکان علاحدہ طور پر تعمیر کیے گئے ہوں، جن میں سے ایک رہائش کے طور پر استعمال ہوتا ہو اور دوسرا خالی پڑا رہتا ہو، تو خالی رہنے والا مکان، قربانی وصدقۂ فطر کے نصاب میں شمار کیا جائے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] زکوٰۃ قربانی اور صدقۂ فطر کی قضا

۱۴۶۹- سوال: میں ۱۴ر سال سے تنگ دست ہوں، جس کی وجہ سے زکاۃ، صدقۂ فطر اور قربانی وغیرہ کچھ بھی ادا نہیں کر سکا، حالاں کہ میں زمین وجائداد کا مالک تھا؛ البتہ زمین سے کچھ آمدنی نہیں ہوتی تھی، اب اگر میں گزشتہ سالوں کی زکاۃ، صدقہ فطر اور قربانی ادا کرنا چاہوں، تو اس کی کیا صورت ہوگی، اور وہ ادا ہوں گی یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

وجوب زکوٰۃ کے لیے لازم ہے کہ ضرورت سے زائد نصاب [ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی] کے بہ قدر مال نامی ہو اور اس پر حولان حول ہو گیا ہو۔[2]

---

(۱) ويعتبر ما زاد على الدار الواحدة في الغنى. (الفتاوى التاتارخانية: ۲۱۵/۴، كتاب الزكاة، الفصل الثامن في المسائل المتعلقة بمن توضع فيه الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

و إذا كانت له دار يسكنها تحل له الصدقة، و إن لم تكن الدار جميعا مستحقة بحاجته بأن كان لايسكن الكل و هو الصحيح. (حوالہ سابق)

مزید تفصیل کے لیے "زائد کپڑے یا برتن ہوں، تو صدقۃ الفطر اور قربانی واجب ہوگی یا نہیں؟" کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) "الزكاة واجبة على الحر العاقل البالغ المسلم إذا ملك نصابا ملكا تاما و حال عليه الحول". (الهداية: ۱۸۵/۱، كتاب الزكاة، ط: یاسر ندیم اینڈ کمپنی، دیوبند)

(وسببه) أي سبب افتراضها (ملك نصاب حولي) نسبة للحول لحولانه عليه (تام) ... (فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد) ... (و) فارغ (عن حاجته الأصلية) لأن المشغول بها كالمعدوم ... (نام ولو تقديرا) [الدر المختار على رد المحتار: ۲/۲۵۹ - ۲۶۳، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر] =

اور وجوبِ اضحیہ وصدقۂ فطر کے لیے ضروری ہے کہ نصاب کے بہ قدر ضرورت سے زائد کسی بھی قسم کا مال ہو، یعنی اس کا نامی ہونا شرط نہیں ہے۔(۲)

آپ نے اپنے آپ کو ''تنگ دست'' لکھا ہے، اگر آپ صاحب حیثیت [نصاب] نہیں تھے، فقیر وغریب تھے، تو آپ پر زکاۃ فرض نہیں ہوئی اور صدقۂ فطر اور قربانی کے لیے بھی مطلوبہ رقم [مالیت] نہیں تھی، تو یہ بھی لازم نہیں ہوئی، اور جب سرے سے زکاۃ وصدقۂ فطر اور قربانی لازم نہیں ہوئی، تو گزشتہ سالوں کی قضا کا کوئی مطلب نہیں ہے۔

زمین حاجت اصلیہ میں داخل ہے، کسی کے پاس صرف زمین ہو، اور نصاب کے بہ قدر مال نہ ہو، تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی۔(۳)

البتہ اگر آپ کے پاس اتنی رقم تھی کہ آپ پر قربانی یا صدقۂ فطر واجب تھا، اس کے باوجود آپ نے واجب ادا نہیں کیا، تو آپ پر اپنی طرف سے اور آپ کی نابالغ اولاد کی طرف سے ۱۴ رسال کا صدقۂ فطر ادا کرنا ضروری ہوگا، اسی طرح آپ پر ۱۴ رسال کی قربانی کی قضا لازم ہوگی۔

جس کا طریقہ یہ ہے کہ ۱۴ ربکروں کی قیمت (جو قربانی کے قابل ہوں) صدقہ کردیں،

= ومنها [شرائط وجوب الزكاة] كون النصاب ناميا. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۴، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

الزكاة واجبة في الذهب والفضة... إذا بلغت الفضة مائتي درهم، والذهب عشرين مثقالا... ويضم الذهب إلى الفضة، والفضة إلى الذهب، ويكمل إحدى النصابين بالآخر عند علمائنا... يريد به أن يقوم الذهب بالدراهم وينظر إن بلغ نصابا بالدراهم، تجب فيها الزكاة، وإلا فلا. (الفتاوى التاتار خانية: ۳/ ۱۵۸- ۱۵۴، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في زكاة المال، ط: زكريا- ديوبند)

الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصابا من الورق والذهب كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۹، كتاب الزكاة، الفصل الثاني في العروض، ط: دار الفكر)

(۲) وهي واجبة على الحر المسلم المالك لمقدار النصاب فاضلا عن حوائجه الأصلية كذا في الاختيار شرح المختار، ولا يعتبر فيه وصف النماء، ويتعلق بهذا النصاب وجوب الأضحية، ووجوب نفقة الأقارب هكذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۱، كتاب الزكاة، الباب الثامن في صدقة الفطر، ط: دار الفكر)

(۳) وليس في اليواقيت- وفي المضمرات: وإن كان حليا- والرقيق، والعقار، والثياب زكاة، إلا أن تكون للتجارة. (الفتاوى التاتارخانية- فريد الدين عالم بن العلاء (م: ۷۸۶هـ): ۳/ ۱۷۳، كتاب الزكاة، الفصل الثالث في بيان زكاة عروض التجارة، والمسائل المتعلقة بها، ط: زكريا- ديوبند)

بکروں کی قربانی قضاءً جائز نہیں ہے، قربانی کی قضا بکرے کی قیمت صدقہ کرنے سے ہوتی ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] صدقۂ فطر کی مقدار

۱۴۷۰- سوال: صدقۂ فطر کی صحیح مقدار کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صدقۂ فطر کی مقدار تقریباً پونے دو کلو گیہوں یا گیہوں کا آٹا ہے اور اس کے علاوہ اگر کسی دوسرے اناج سے دیں، تو اس کی دگنی مقدار دینا ہوگا؛ مثلاً: جو یا اس کا آٹا، کھجور و کشمش ایک صاع ادا کرنا ضروری ہوگا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (و) تصدق (بقيمتها غني شراها أو لا) لتعلقها بذمته بشرائها أو لا، فالمراد بالقيمة قيمة شاة تجزي فيها. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله وتصدق بقيمتها غني شراها أو لا) كذا في الهداية وغيرها كالدرر. وتعقبه الشيخ شاهين بأن وجوب التصدق بالقيمة مقيد بما إذا لم يشتر، أما إذا اشترى فهو مخير بين التصدق بالقيمة أو التصدق بها حية كما في الزيلعي أبو السعود.

وأقول: ذكر في البدائع أن الصحيح أن الشاة المشتراة للأضحية إذا لم يضح بها حتى مضى الوقت يتصدق الموسر بعينها حية كالفقير بلا خلاف بين أصحابنا، فإن محمدا قال: وهذا قول أبي حنيفة وأبي يوسف وقولنا اهـ وتمامه فيه، وهو الموافق لما قدمناه أنفا عن غاية البيان، وعلى كل فالظاهر أنه لا يحل له الأكل منها إذا ذبحها، كما لا يجوز له حبس شيء من قيمتها، تأمل. (قوله فالمراد بالقيمة إلخ) بيان لما أجمله المصنف؛ لأن قوله تصدق بقيمتها ظاهر فيما إذا اشتراها لأن قيمتها تعلم، أما إذا لم يشترها فما معنى أنه يتصدق بقيمتها فإنها غير معينة؛ فبين أن المراد إذا لم يشترها قيمة شاة تجزئ في الأضحية كما في الخلاصة وغيرها. قال القهستاني: أو قيمة شاة وسط كما في الزاهدي والنظم وغيرهما. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/۳۲۱، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) عن الحسن، أن ابن عباس خطب بالبصرة فقال: أدوا زكاة صومكم، فجعل الناس ينظر بعضهم إلى بعض، فقال: من هاهنا من أهل المدينة، قوموا إلى إخوانكم فعلموهم فإنهم لا يعلمون، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم فرض صدقة الفطر على الصغير والكبير، والحر والعبد، والذكر والأنثى، نصف صاع من بر، أو صاعا من تمر أو شعير. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۳/۱۹۰، رقم الحديث: ۱۵۸۰، كتاب صلاة العيدين، حث الإمام على الصدقة في الخطبة، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب) =

[۶] درہم ودینار کا وزن

۱۴۷۱- سوال: دینار درہم اور اشرفی کا وزن آج کے زمانہ کے اعتبار سے کتنا ہے؟ کس طرح لگایا جائے؟

الجواب حامداومصلیا:

ایک درہم کا وزن، تین ماشہ ایک رتی اور ایک بٹا پانچ رتی کے برابر ہوتا ہے۔[۱] اور مثقال یعنی ایک دینار کا وزن ساڑھے چار ماشہ ہے۔[۲] اشرفی بعد کی ایجاد ہے؛ اس لیے اس سلسلے میں فقہاء سے بہت کچھ منقول نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] صدقۂ فطر میں مکئی کا دینا اور اس کی مقدار

۱۴۷۲- سوال: ہم اپنے ملک زامبیا میں صدقۂ فطر میں مکئی دے سکتے ہیں یا نہیں؛ کیوں کہ

= (نصف صاع) فاعل یجب (من بر أو دقیقه أو سویقه أو زبیب)... (أو صاع تمر أو شعیر) ولو ردیئا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۶۴، کتاب الزکاۃ، باب صدقة الفطر، ط: دار الفکر-بیروت)

ایک صاع = ۳،۱۴۹،۲۸۰ (تین کلو ایک سو انچاس گرام، دو سو اسی ملی گرام) ہوتا ہے، تو نصف صاع ۱۵۷۴،۶۴۰ (ایک کلو پانچ سو چوہتر گرام، چھ سو چالیس ملی گرام) ہوگا۔ دیکھیے: الاوزان المحمودۃ، ص: ۱۰۵، ط: دار الکتاب-دیوبند☆ امداد الاوزان، ص: ۱۹، ط: ہرسولی-مظفر نگر۔

(۱) اور درہم کے سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ ایک درہم چودہ قیراط کا، اور ایک قیراط پانچ جو کا، تو ایک شرعی درہم ستر جو کا، اور ستر جو تین ماشہ ایک رتی اور ایک رتی کے پانچواں حصے کا [ہوگا]۔

رائج اوزان کے اعتبار سے ایک درہم = تین گرام، ایکسٹھ ملی گرام اور آٹھ میکرو ملی گرام (۳،۰۶۱،۸) کا ہوتا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: الاوزان المحمودۃ، ص: ۶۸-۶۹، الدرھم، ط: دار الکتاب-دیوبند☆ امداد الاوزان، ص: ۱۸، نقشہ بعض فقہی اوزان، ط: حیات الاسلام، ہرسولی، مظفر نگر☆ اوزان شرعیہ، مندرجہ، جواہر الفقہ: ۳/ ۴۱۶، ط: زکریا-دیوبند، نیا نسخہ)

(۲) حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جو خلاصہ دینار کے سلسلے میں بتایا ہے، وہ یہ ہے کہ: ایک دینار [مثقال] بیس قیراط کا ہوتا ہے، اور ایک قیراط پانچ جو کا، لہٰذا ایک دینار سو جو کا ہوا، اور سو جو ساڑھے چار ماشہ کا ہے، ایک ماشہ نو سو بہتر ملی گرام کا ہوتا ہے، تو چار ماشہ تین گرام، آٹھ سو اٹھاسی ملی گرام کا ہوا، اور آدھا ماشہ چار سو چھیاسی ملی گرام، تو مجموعہ ساڑھے چار ماشہ کا چار گرام، تین سو چوہتر ملی گرام ہوا۔ (الاوزان المحمودۃ، ص: ۷۰، الدینار☆ امداد الاوزان، ص: ۱۷، ☆ اوزان شرعیہ، مندرجہ: جواہر الفقہ: ۳/ ۴۱۶، زکریا-دیوبند، نیا نسخہ)

ہمارے یہاں لوگ زیادہ تر مکئی ہی کھاتے ہیں، تو مکئی کا نصاب کیا ہے؟ ہمارے یہاں گیہوں بھی ملتے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

دے سکتے ہیں، اور اس کی مقدار ایک صاع یعنی تقریباً ساڑھے تین کیلو مکئی ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) اگر اشیائے غیر منصوصہ سے صدقۂ فطر ادا کیا جائے، تو قیمت کا اعتبار ہوگا، مقدار کا نہیں:

وما لم ينص عليه كذرة وخبز يعتبر فيه القيمة. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وخبز) عدم جواز دفعه إلا باعتبار القيمة هو الصحيح لعدم ورود النص به فكان كالذرة وغيرها من الحبوب التي لم يرد بها نص وكالأقط بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۶۵، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، قبيل: مطلب في تحرير الصاع والمد والمن والرطل، ط: دار الفكر-بيروت)

لأن الصحيح في الخبز أنه لا يجوز إلا باعتبار القيمة لعدم ورود النص به فكان كالزكاة وكالذرة وغيرها من الحبوب التي لم يرد بها النص، وكالأقط. (البحر الرائق: ۲/ ۲۷۳، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، ط: دار الكتاب الإسلامي)

وأما الأقط فتعتبر فيه القيمة لا يجزئ إلا باعتبار القيمة... لأنه غير منصوص عليه من وجه يوثق به، وجواز ما ليس بمنصوص عليه لا يكون إلا باعتبار القيمة، كسائر الأعيان التي لم يقع التنصيص عليها من النبي - صلى الله عليه وسلم. (بدائع الصنائع: ۲/ ۷۲، ۷۳، كتاب الزكاة، فصل بيان جنس الواجب وقدره وصفة في صدقة الفطر، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

عن أبي هريرة، أنه قال: يا رسول الله، أي الصدقة أفضل؟ قال: جهد المقل، وابدأ بمن تعول.

(سنن ابی داود: ۱/۲۳۶، رقم الحدیث: ۱۶۷۷، کتاب الزکاۃ، ط: فیصل پبلی کیشنز - دیوبند)

باب الصدقات النافلة

[صدقات نافلہ کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الصدقات النافلة

[صدقات نافلہ کا بیان]

[۱] نفلی صدقہ سید کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟

۱۴۷۳-سوال: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف فضائل اعمال میں صدقہ کے فضائل کے تحت لکھا ہے کہ: ایک حدیث پاک میں ہے کہ، صدقہ قبر کی گرمی کو دور کرتا ہے، بلاؤں کو ٹالتا ہے، برائی کے ستر دروازوں کو بند کرتا ہے، اللہ جل شانہ کے غصہ کو دور کرتا ہے اور بری موت سے حفاظت کرتا ہے۔

تو سوال یہ ہے کہ ذکر کردہ صدقہ سے کون سا صدقہ مراد ہے؟

(۱) صدقہ نفل یا واجب، یعنی زکوۃ مراد ہے؟

(۲) یہ (مذکورہ فضائل والا) صدقہ سید کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) اسی طرح مسجد میں دے سکتے ہیں یا نہیں؟

مذکورہ فضائل حاصل کرنے کے لیے مذکورہ بالا مصارف میں دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) واجبی صدقہ (خواہ جس نوعیت کا ہو، نذر کا ہو، زکاۃ ہو، کفارہ کا ہو، یا کسی اور قسم کا) سید کو دینا جائز

نہیں ہے۔[1]

مذکورہ فضائل نفل صدقہ کے ہیں، البتہ صدقات واجبہ میں یہ فائدہ بہ درجہ اولیٰ حاصل ہوگا۔

(۲) سید کو نفلی صدقہ دے سکتے ہیں۔[۲]

(۳) مسجد میں صدقہ واجبہ دینے سے صدقہ ادا نہیں ہوگا، مسجد میں بہ طور وقف تعاون کیا جائے، اس میں بھی بہت فائدے ہیں۔[۳]

ہاں اگر کوئی مسجد میں رہنے والے فقیروں پر صدقہ کرے، تو جائز ہے۔ (شامی: ۳۵۱/۲)[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] عین جانور کا صدقہ افضل ہے یا اس کی قیمت کا؟

۱۴۷۴- سوال: ایک شخص جانور کا صدقہ کرنا چاہتا ہے، تو کیا اس کے لیے جانور خرید کر ذبح کر کے مستحقین کو دینا افضل ہے، یا اس کی رقم دینا افضل ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صدقہ کی فضیلت بہت زیادہ ہے، اگر جانور کی قیمت کا صدقہ کردے، تب بھی مقصد حاصل ہوجاتا

(۱ و ۲) (وجازت التطوعات من الصدقات و) غلة (الأوقاف لهم) أي لبني هاشم، سواء سماهم الواقف أو لا على ما هو الحق كما حققه في الفتح، لكن في السراج وغيره إن سماهم جاز، وإلا لا.

قلت: وجعله محشي الأشباه محمل القولين. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وجازت التطوعات إلخ) قيد بها ليخرج بقية الواجبات كالنذر والعشر والكفارات وجزاء الصيد إلا خمس الركاز فإنه يجوز صرفه إليهم كما في النهر عن السراج (قوله: كما حققه في الفتح) أقول: نقل في البحر عن عدة كتب أن النفل جائز لهم إجماعا وذكر أنه المذهب وأنه لا فرق بين التطوع والوقف كما في المحيط وكافي النسفي، وأن الزيلعي أثبت الخلاف على وجه يشعر بحرمة التطوع عليهم، وقواه في الفتح من جهة الدليل. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۵۱/۲، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۴۳۰/۲، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: زكريا - ديوبند)

(۳) لأن الصدقة للفقراء. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۵۰/۴، كتاب الوقف، مطلب في وقف المرتد والكافر، ط: دار الفكر - بيروت)

[۴] حاشیہ نمبر (۱ و ۳) کی عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

ہے، اور صدقہ کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہے اور صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو دور کرتا ہے، مگر جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کر کے اس کا گوشت غریبوں کو دینے میں زیادہ فضیلت ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کرنے کا ثواب بھی ملے گا، چناں چہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی بھی مہینے میں اللہ کے نام پر جانور ذبح کرو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور لوگوں کو کھلاؤ۔ (ابوداؤد شریف: ۱/۳۹۱)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] کیا صدقۂ نافلہ ضروری ہے اور اس کی مقدار کیا ہے؟

۱۴۷۵- سوال: ایک شخص اسکول میں ماسٹر ہیں، جن کی تنخواہ ماہانہ نو ہزار روپیہ ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی اس تنخواہ سے کتنا صدقہ نکالے؟

الجواب حامداومصلیا:

زکوۃ فرض ہے، صدقۂ فطر اور قربانی واجب ہے، اس کے علاوہ شریعت نے کسی صدقہ کو واجب نہیں کیا ہے، آپ جو صدقہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے دیتے ہیں، اسے صدقۂ نافلہ کہا جاتا ہے، اور صدقۂ نافلہ کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے، آپ اپنی وسعت کے مطابق، جتنا راہ خدا میں دینا چاہیں، دے سکتے ہیں، ثواب کا کام ہے، البتہ بعض حالات میں صدقۂ نافلہ کی حیثیت بڑھ جاتی ہے اور اس کا نکالنا ضروری ہو جاتا ہے، جیسے کوئی بیمار ہے، علاج کی فوراً ضرورت ہے، اگر فوری طور پر علاج نہیں کروایا گیا، تو اس کے مرجانے کا قوی اندیشہ ہے، اور مریض کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ علاج کروا سکے، تو ایسی صورت میں ایسے مریض کی مدد کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔[۲] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] عن أبي قلابة، عن أبي المليح، قال: قال نبيشة: نادى رجل رسول الله صلى الله عليه وسلم إنا كنا نعتر عتيرة في الجاهلية في رجب فما تأمرنا؟ قال: اذبحوا لله في أي شهر كان، وبروا الله عز وجل، وأطعموا. (سنن أبي داود ص: ۳۹۱، كتاب الضحايا، باب في العتيرة، ط: فيصل - ديوبند)

(۲) عن زيد بن أسلم، عن أبيه، قال: سمعت عمر بن الخطاب - رضي الله عنه - يقول: "أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم يوما أن نتصدق، فوافق ذلك مالا عندي، فقلت: اليوم أسبق أبا بكر إن سبقته يوما، فجئت بنصف مالي، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما أبقيت لأهلك؟، قلت: مثله، قال: وأتى أبو بكر رضي الله عنه بكل ما عنده، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما أبقيت لأهلك؟، قال: أبقيت لهم الله ورسوله، قلت: لا أسابقك إلى شيء أبدا. (سنن أبي داود: ۱/۲۳۶، رقم الحديث: ۱۶۷۸، باب في الرخصة في ذلك، بعد: باب الرجل يخرج من ماله، ط: ديوبند☆ سنن الترمذي: ۲/۲۰۸، رقم الحديث: ۳۶۷۵، أبواب المناقب، باب بلا ترجمة، بعد عدة أبواب: باب مناقب أبي بكر الصديق رضي الله عنه واسمه عبد الله بن عثمان ولقبه عتيق، ط: ديوبند) =

[۴] دین دار محتاج مسلمان کا تعاون افضل ہے یا نفلی حج؟

۱۴۷۶- سوال: میں اور میری بیوی بحمد ہ تعالیٰ حج فرض ادا کر چکے ہیں، میرے پاس فی الحال تقریباً ساٹھ ہزار روپئے ہیں، میرا ارادہ تھا کہ اُن روپیوں کے ذریعہ نفل حج کرلوں، لیکن معاً مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میرے گاؤں میں پانچ چھ دین دار مسلمان ایسے ہیں، جو دین کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اور وہ محتاج بھی ہیں، اُن پر قرض بھی ہے، اُن کے مکانات تک گروی رکھے ہوئے ہیں، لہٰذا میں اُن کی مدد میں یہ پیسہ خرچ کروں یا حج نفل کرلوں؟ دونوں میں سے کون سا عمل افضل شمار ہوگا؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

نفلی حج کی بہت فضیلت وارد ہوئی ہے، اور صدقۂ نافلہ سے افضل ہے، لیکن اگر کوئی دین دار مسلمان اچانک بے سہارا ہوجائے، اُس پر کوئی مصیبت آجائے، جس سے اُس کا کوئی ضروری کام رُک گیا ہو، جیسا کہ موجودہ زمانے میں قومی فسادات، سیلاب اور آتش زنی کے حادثات کے دوران اکثر یہ صورت رونما ہوتی

= صدقة التطوع مستحبة في جميع الأوقات، وسنة، بدليل الكتاب والسنة. أما الكتاب: فقوله تعالى: {من ذا الذي يقرض الله قرضا حسنا فيضاعفه له أضعافا كثيرة} [۲-البقرة:۲۴۵] وأمر الله سبحانه بالصدقة في آيات كثيرة.

وأما السنة: فأحاديث عديدة منها قوله صلى الله عليه وسلم: من أطعم جائعا أطعمه الله من ثمار الجنة، ومن سقى مؤمنا على ظمأ، سقاه الله عز وجل يوم القيامة من الرحيق المختوم، ومن كسا مؤمنا عاريا، كساه الله من خضر الجنة.

ومنها قوله عليه السلام: إن العبد إذا تصدق من طيب، تقبلها الله منه، وأخذها بيمينه، فرباها كما يربي مهره أو فصيله، وإن الرجل ليتصدق باللقمة فتربو في يد الله، أو في كف الله، حتى تكون مثل الجبل، فتصدقوا. (الفقه الإسلامي وأدلته: ۲/ ۹۱۵، كتاب الزكاة، الفصل الثالث: صدقة التطوع، ط: دار الفكر - بيروت)

وقد تصبح الصدقة حراما: كأن يعلم أن آخذها يصرفها في معصية. وقد تجب الصدقة: كأن وجد مضطرا، ومعه ما يطعمه فاضلا عن حاجته. (حوالۂ سابق: ۲/ ۹۱۶)

اعلم أن الصدقة تستحب بفاضل عن كفايته وكفاية من يمونه، وإن تصدق بما ينقص مؤنة من يمونه أثم، ومن أراد التصدق بماله كله وهو يعلم من نفسه حسن التوكل والصبر عن المسألة فله ذلك وإلا فلا يجوز، ويكره لمن لا صبر له على الضيق أن ينقص نفقة نفسه عن الكفاية التامة كذا في شرح درر البحار. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۷، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، مطلب: الأفضل على أن ينوي بالصدقة جميع المؤمنين والمؤمنات، ط: دار الفكر - بيروت)

ہے، تو ایسے مواقع میں حج نفل کے بجائے ایسے دین دار مسلمانوں پر خرچ کرنا افضل ہوگا۔ (شامی: ۲/۶۲۱)[1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[ا] واختلف في الصدقة ورجح في البزازية أفضلية الحج لمشقته في المال والبدن جميعا، قال: وبه أفتى أبو حنيفة حين حج وعرف المشقة. (الدر المختار)ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله ورجح في البزازية أفضلية الحج) حيث قال الصدقة أفضل من الحج تطوعا، كذا روي عن الإمام؛ لكنه لما حج وعرف المشقة، أفتى بأن الحج أفضل، ومراده أنه لو حج نفلا وأنفق ألفا فلو تصدق بهذه الألف على المحاويج فهو أفضل لا أن يكون صدقة فليس أفضل من إنفاق ألف في سبيل الله تعالى، والمشقة في الحج لما كانت عائدة إلى المال والبدن جميعا فضل في المختار على الصدقة. اهـ. قال الرحمتي: والحق التفصيل، فما كانت الحاجة فيه أكثر والمنفعة فيه أشمل فهو الأفضل كما ورد "حجة أفضل من عشر غزوات" وورد عكسه فيحمل على ما كان أنفع، فإذا كان أشجع وأنفع في الحرب فجهاده أفضل من حجه، أو بالعكس فحجه أفضل، وكذا بناء الرباط إن كان محتاجا إليه كان أفضل من الصدقة وحج النفل وإذا كان الفقير مضطرا أو من أهل الصلاح أو من آل بيت النبي - صلى الله عليه وسلم - فقد يكون إكرامه أفضل من حجات وعمر وبناء ربط.ـــــــ كما حكى في المسامرات عن رجل أراد الحج فحمل ألف دينار يتأهب بها فجاءته امرأة في الطريق وقالت له إني من آل بيت النبي - صلى الله عليه وسلم - وبي ضرورة، فأفرغ لها ما معه، فلما رجع حجاج بلده صار كلما لقي رجلا منهم يقول له تقبل الله منك، فتعجب من قولهم، فرأى النبي - صلى الله عليه وسلم - في نومه وقال له: تعجبت من قولهم تقبل الله منك؟ قال نعم يا رسول الله؛ قال: إن الله خلق ملكا على صورتك حج عنك؛ وهو يحج عنك إلى يوم القيامة بإكرامك لامرأة مضطرة من آل بيتي؛ فانظر إلى هذا الإكرام الذي ناله لم ينله بحجات ولا ببناء ربط. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۶۲۱، كتاب الحج، باب الهدي، مطلب في تفضيل الحج على الصدقة، ط: دار الفكر - بيروت)

فقالوا حج النفل أفضل من الصدقة. (البحر الرائق)ـــــــ قال الشامي: (قوله: فقالوا حج النفل أفضل من الصدقة) قال الرملي قال المرحوم الشيخ عبد الرحمن العمادي مفتي الشام في مناسكه وإذا حج حجة الإسلام فصدقة التطوع بعد ذلك أفضل من حج التطوع عند محمد والحج أفضل عند أبي يوسف وكان أبو حنيفة - رحمه الله - يقول بقول محمد فلما حج ورأى ما فيه من أنواع المشقات الموجبة لتضاعف الحسنات رجع إلى قول أبي يوسف اهـ.ـــــــ قلت قد يقال إن صدقة التطوع في زماننا أفضل لما يلزم الحاج غالبا من ارتكاب المحظورات ومشاهدته لفواحش المنكرات وشح عامة الناس بالصدقات وتركهم الفقراء والأيتام في حسرات ولا سيما في أيام الغلاء وضيق الأوقات وبتعدي النفع تتضاعف الحسنات ثم رأيت في متفرقات اللباب الجزم بأن الصدقة أفضل منه وقال شارحه القاري أي على ما هو المختار كما في التجنيس ومنية المفتي وغيرهما ولعل تلك الصدقة محمولة على إعطاء الفقير الموصوف بغاية الفاقة أو في حال المجاعة وإلا فالحج مشتمل على النفقة بل وزاد إن الدرهم الذي ينفق في الحج بسبعمائة الخ قلت قد يقال ما ورد محمول على الحج الفرض على أنه لا مانع من =

[۵] مقروض کا اپنی حیثیت سے بڑھ کر صدقہ کر کے رجوع کرنا

۱۴۷۷- سوال: میرے ماموں کا لڑکا ''وانسدا'' میں مقیم ہے، وہاں بستی والوں نے مل کر اپنی حیثیت کے مطابق رقم جمع کر کے مسجد بنانے کا ارادہ کیا، جس وقت مسجد کے لیے چندہ جمع کیا جا رہا تھا، تو اُس میں میرے ماموں کے لڑکے نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر تقریباً بیس یا تیس ہزار روپے کی اینٹ کے خرچ کی ذمہ داری اپنے سر لے لی، حالاں کہ اس کی معاشی حالت انتہائی دگرگوں ہے، اُس کے والد یعنی میرے ماموں چار سال سے مسلسل بیمار ہیں، ہر ماہ اُن کے علاج میں کافی خرچ ہوتا ہے، اور اس وجہ سے تجارت کے سرمایہ میں بھی کافی تنگی کا سامنا ہے، یہاں تک کہ تجارت کے لیے سودی رقم لینی پڑ رہی ہے، تو کیا اس طرح احتیاج کی حالت میں جب کہ سودی رقم لے کر تجارت کرنی پڑ رہی ہو، مسجد کی تعمیر کے لیے اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرنا از روئے شرع صحیح ہے؟ اور اب تک مسجد کی تعمیر کے لیے صرف دو یا تین ہزار روپیوں کی اینٹ لائی گئی ہے، تو کیا بقیہ رقم میں رجوع کا حق رہے گا یا نہیں؟ بیس یا تیس ہزار کی اینٹ کی ذمہ داری۔ جو اُس نے اپنے سر لے رکھی ہے، اُس میں کمی کر کے دس ہزار کی اینٹ دے، تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جو شخص مقروض ہو، اُسے صدقۂ نافلہ میں خرچ کرنے سے پہلے خوب سوچ لینا چاہیے کہ قرض بندے کا حق ہے، جس کا ادا کرنا واجب ہے، اور صدقۂ نافلہ واجب نہیں؛ بل کہ ایک زائد شئے ہے، لہٰذا واجب کی ادائیگی مقدم رہے گی۔ (۱)

= كون الصدقة للمحتاج أعظم أجرا من سبعمائة. (منحة الخالق مع البحر الرائق: ۲/ ۳۳۴، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۱) عن حكيم بن حزام رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: اليد العليا خير من اليد السفلى، وابدأ بمن تعول، وخير الصدقة عن ظهر غنى، ومن يستعفف يعفه الله، ومن يستغن يغنه الله. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۹۲، رقم الحديث: ۱۴۲۷، كتاب الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۳۲، رقم الحديث: ۹۵- ۱۰۳۴، كتاب الزكاة، باب بيان أن اليد العليا خير من اليد السفلى، وأن اليد العليا هي المنفقة وأن السفلى هي الآخذة، ط: ديوبند)

قال الإمام البخاري: ومن تصدق وهو محتاج، أو أهله محتاج، أو عليه دين، فالدين أحق أن يقضى من الصدقة، والعتق والهبة، وهو رد عليه ليس له أن يتلف أموال الناس. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۹۲، كتاب الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى، ط: ديوبند) =

= قال العيني: ومن تصدق وهو محتاج، أو أهله محتاج، أو عليه دين، فالدين أحق أن يقضى من الصدقة والعتق والهبة، وهو رد عليه، ليس له أن يتلف أموال الناس. ــــــــــــــــ هذا كله من الترجمة وقع تفسيرا لقوله: (لا صدقة إلا عن ظهر غنى)، والمعنى أن شرط التصدق أن لا يكون محتاجا ولا أهله محتاجا ولا يكون عليه دين فإذا كان عليه دين فالواجب أن يقضي دينه، وقضاء الدين أحق من الصدقة، والعتق، والهبة، لأن الابتداء بالفرائض قبل النوافل، وليس لأحد إتلاف نفسه وإتلاف أهله وإحياء غيره، وإنما عليه إحياء غيره بعد إحياء نفسه وأهله، إذ هما أوجب عليه من حق سائر الناس.... ومقتضى قوله: (وهو رد عليه) أن يكون الدين المستغرق مانعا من صحة التبرع، لكن هذا ليس على الإطلاق، وإنما يكون مانعا إذا حجر عليه الحاكم، وأما قبل الحجر فلا يمنع، كما تقرر ذلك في موضعه في الفقه، فعلى هذا إما يحمل إطلاق البخاري عليه، أو يكون مذهبه أن الدين المستغرق يمنع مطلقا، ولكن هذا خلاف ما قاله العلماء، حتى إن ابن قدامة وغيره نقلوا الإجماع على أن المنع إنما يكون بعد الحجر. (عمدة القاري- بدر الدين العيني(م: ۸۵۵ھ): ۸/ ۲۹۳، كتاب الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

عن أبي هريرة، أنه قال: يا رسول الله، أي الصدقة أفضل؟ قال: جهد المقل، وابدأ بمن تعول. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۳۶، رقم الحديث: ۱۶۷۷، كتاب الزكاة، باب في الرخصة في ذلك، بعد: باب الرجل يخرج من ماله، ط: فيصل پبلی کیشنز- دیوبند)

(عن أبي هريرة قال: يا رسول الله أي الصدقة أفضل؟ قال: " جهد المقل ") بضم الجيم ويفتح، قال الطيبي: الجهد بالضم الوسع والطاقة وبالفتح المشقة، وقيل: هما لغتان، أي أفضل الصدقة ما يحتمله حال القليل المال، والجمع بينه وبين ما تقدم أن الفضيلة تتفاوت بحسب الأشخاص، وقوة التوكل، وضعف اليقين اهـ، وقيل: المراد بالمقل الغني القلب ليوافق قوله " أفضل الصدقة ما كان عن ظهر غنى "، وقال ابن الملك: أي أفضل الصدقة ما قدر عليه الفقير الصابر على الجوع أن يعطيه، والمراد بالغنى في قوله " أفضل الصدقة ما كان عن ظهر غنى " من لا يصبر على الجوع والشدة، توفيقا بينهما، فمن يصبر فالإعطاء في حقه أفضل، ومن لا يصبر فالأفضل في حقه أن يمسك قوته ثم يتصدق بما فضل اهـ وحاصل ما ذكروه أن تصدق الفقير الغني القلب ولو كان قليلا أفضل من تصدق الغني بكثرة المال ولو كان كثيرا، فهو من أدلة أفضلية الفقير الصابر على الغني الشاكر. (مرقاة المفاتيح: ۴/ ۱۳۵۳، رقم الحديث: ۱۹۳۸، كتاب الزكاة، باب أفضل الصدقة، الفصل الثاني، ط: دار الفكر- بيروت)

اعلم أن الصدقة تستحب بفاضل عن كفايته وكفاية من يمونه، وإن تصدق بما ينقص مؤنة من يمونه أثم، ومن أراد التصدق بماله كله وهو يعلم من نفسه حسن التوكل والصبر عن المسألة فله ذلك وإلا فلا يجوز، ويكره لمن لا صبر له على الضيق أن ينقص نفقة نفسه عن الكفاية التامة كذا في شرح درر البحار. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۷، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، مطلب: الأفضل على أن ينوي بالصدقة جميع المؤمنين والمؤمنات، ط: دار الفكر- بيروت)

موت سے پہلے اُس قرض کی ادائیگی کے لیے کوئی انتظام بھی نہ کیا ہو، تو اُس کے بارے میں احادیث مبارکہ میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

ترمذی شریف کی ایک روایت میں ہے کہ مؤمن کی روح اُس کے قرض کے بدلے میں روک لی جاتی ہے، یعنی مؤمن ایسا نیک ہو، جو جنت کا مستحق بھی ہو، تو اُسے اُس وقت تک جنت میں داخلہ نصیب نہیں ہوتا، جب تک کہ اُس کا قرض ادا نہ کر دیا جائے۔ (۲)

ایک حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی جنازہ حاضر کیا جاتا، تو آپ ﷺ پہلے یہ معلوم کرتے تھے کہ میت کے ذمہ کسی قسم کا قرض تو باقی نہیں ہے؟ اگر قرض باقی ہوتا، تو آپ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرماتے کہ اس میت کی نمازِ جنازہ تم پڑھ لو، پھر کوئی صحابی رضی اللہ عنہ اُس میت کی جانب سے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کرتے تو آپ ﷺ نماز پڑھاتے۔ (۳)

حاصل کلام یہ کہ تجارت کے لیے سودی قرض لینا حرام ہے، (۴) اب اُس حرام میں مبتلا ہو کر صدقۂ نافلہ میں خرچ کرنا درست نہیں۔

اس شخص کی حالت سوال میں تحریر کردہ تفصیل کے مطابق انتہائی اضطرار کی ہے، تو وہ اس رقم کے دینے سے رجوع کر سکتا ہے۔ (۵)

---

(۲) عن أبي هريرة - رضي الله عنه - قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: نفس المؤمن معلقة بدينه حتى يقضى عنه. (سنن الترمذي: ۱/۲۰۶، رقم الحديث: ۱۰۷۸-۱۰۷۹، أبواب الجنائز، باب ما جاء عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: نفس المؤمن معلقة بدينه حتى يقضى عنه، ط: ديوبند☆سنن ابن ماجه، ص: ۱۷۴، رقم الحديث: ۲۴۱۳، كتاب الصدقات، باب التشديد في الدين، ط: ديوبند)

(۳) عن سلمة بن الأكوع رضي الله عنه، أن النبي صلى الله عليه وسلم أتي بجنازة ليصلي عليها، فقال: هل عليه من دين؟، قالوا: لا، فصلى عليه، ثم أتي بجنازة أخرى، فقال: هل عليه من دين؟، قالوا: نعم، قال: صلوا على صاحبكم، قال: أبو قتادة علي دينه يا رسول الله، فصلى عليه. (صحيح البخاري: ۱/۳۰۶، رقم الحديث: ۲۲۹۵، كتاب الكفالة، باب من تكفل عن ميت دينا، فليس له أن يرجع، ط: ديوبند)

(۴) وفي الأشباه: كل قرض جر نفعا حرام. (الدر المختار مع رد المحتار: ۵/۱۶۶، كتاب البيوع، فصل في القرض، ط: دار الفكر - بيروت)

(۵) قاعدة الضرورات تبيح المحظورات. (ش) [قواعد الفقه - محمد عميم الإحسان المجددي البركتي، ص: ۸۹، رقم القاعدة: ۱۷۰، ط: الصدف ببلشرز - كراتشي]

اُس کی انفاق فی سبیل اللہ کی نیت پر بھی اُسے ثواب ضرور ملے گا۔[۲] تاہم مستحب یہی ہے کہ جب انفاق فی سبیل اللہ جیسا ایک نیک عمل ہو چکا ہے، تو اب توکلاً علی اللہ اُس میں رجوع نہ کرے، ہاں، آئندہ اِس بات کا خوب خیال رکھے کہ احتیاج کی حالت میں صدقۂ نافلہ میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہ ہو۔[۷] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۲] مال دار طالبِ علم کا ایصالِ ثواب کی رقم سے خریدی گئی کتاب لینا

۱۴۷۸- سوال: کسی نے بطورِ ایصالِ ثواب کتاب خریدنے کے لیے رقم دی، اُس سے خریدی گئی کتاب مال دار لڑکے کے لیے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامدًا ومصلّیًا:

صدقۂ نافلہ کا لینا مال داروں کے لیے بھی جائز ہے، زکوۃ لینا یا اُس سے خریدی ہوئی چیز لینا مال داروں کے لیے جائز نہیں ہے۔[۱]

---

(۲) علقمة بن وقاص الليثي، يقول: سمعت عمر بن الخطاب رضي الله عنه على المنبر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها، أو إلى امرأة ينكحها، فهجرته إلى ما هاجر إليه. (صحيح البخاري: ۱/ ۲، رقم الحديث: ۱، كتاب الإيمان، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، ط: ديوبند)

(۷) وقوله تعالى- ولا تبطلوا أعمالكم- يحتج به في أن كل من دخل في قربة لا يجوز له الخروج منها قبل إتمامها لما فيه من إبطال عمله نحو الصلاة والصوم والحج وغيره. (أحكام القرآن- أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م: ۳۷۰ھ): ۵/ ۲۷۲، آخر سورة محمد صلى الله عليه وسلم، ت: محمد صادق القمحاوي، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

(۱) " ولا يجوز دفع الزكاة إلى من يملك نصابا من أي مال كان "؛ لأن الغنى الشرعي مقدر به، والشرط أن يكون فاضلا عن الحاجة الأصلية، وإنما النماء شرط الوجوب، " ويجوز دفعها إلى من يملك أقل من ذلك، وإن كان صحيحا مكتسبا "؛ لأنه فقير، والفقراء هم المصارف، ولأن حقيقة الحاجة لا يوقف عليها، فأدير الحكم على دليلها وهو فقد النصاب. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۱۱۲، كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقة إليه ومن لا يجوز، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

ایصال ثواب کے لیے دی گئی رقم للہ ہوتی ہے، اس لیے اس سے خریدی گئی کتابوں کا مال دار لڑکوں کے لیے لینا جائز ہے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

[۷] گھر کے افتتاح کے وقت قریبی رشتہ داروں کو بلانا ضروری نہیں

۱۴۷۹- سوال: اکثر بڑے لوگوں سے یہ بات سنی ہے کہ ''پہلے خویش پھر درویش'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کوئی ہدیہ، صدقہ، زکوۃ کی رقم یا دعوت دینا یا کوئی چیز بھیجنا چاہتے ہو، تو اولاً خویش (ماں، باپ، بھائی، بہن، پھوپھا، پھوپھی اور چچا وغیرہ) کو دو، اس کے بعد غریب کو دو، (خواہ وہ غریب ولی ہو یا کوئی اور) قرآن میں بھی قربی کے نام سے ان کا تذکرہ ہے۔

ایک مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ زید خود اپنے والدین اور بھائی سے علاحدہ رہتا ہے، اس نے اپنا مکان تعمیر کیا ہے اور نیت یہ کی ہے کہ مجھے پانچ دس غرباء وفقراء کو کھلا کر اس مکان کا افتتاح کرنا ہے، تو کیا ایسی دعوت میں سب سے پہلے خویش (قریبی رشتہ دار) والدین، بھائی بہن کو بلانا ضروری ہے؟ واضح رہے کہ اس نے فقراء کو کھلانے کی نیت دل سے کی تھی، زبان سے اس کو ادا نہیں کیا ہے۔

الجواب حامداومصلیا:

''پہلے خویش پھر درویش'' کا شرعی مطلب یہ ہے کہ صدقہ واجبہ مستحق رشتہ داروں کو دینا مستحب

(۲) فأما صدقة التطوع فيجوز صرفها إلى الغني وتحل له وتكون بمنزلة الهبة له. ــــــــ ثم الغني أنواع ثلاثة، أحدها: الغني الذي يتعلق به وجوب الزكاة، وهو أن يملك نصابا من المال الفاضل عن الحاجة، الموصوف بالنماء والزيادة، إما بالأسامة، أو التجارة. ــــــــ والثاني: الغني الذي يتعلق به حرمان الصدقة، ويتعلق به وجوب صدقة الفطر، والأضحية دون وجوب الزكاة، وهو أن يملك من الأموال الفاضلة عن حوائجه ما تبلغ قيمته مائتي درهم بأن كان له ثياب وفرش ودور وحوانيت ودواب زيادة على ما يحتاج إليه للابتذال لا للتجارة والأسامة. . . . ــــــــ والثالث: الغني الذي يحرم به السؤال ولا يحرم الأخذ ولا الدفع من غير سؤال. قال بعضهم: خمسون درهما، وقال عامة العلماء: إذا ملك قوت يومه وما يستر به عورته، فلا يحل له السؤال، فأما إذا لم يكن فلا بأس به، وأما الفقير إذا كان قويا مكتسبا فيحل به أخذ الصدقة، ولا يحل له السؤال. (تحفة الفقهاء-المؤلف: محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ٥٤٠هـ): ١/ ٣٠٠، ٣٠١، كتاب الزكاة، باب من يوضع فيه الصدقة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

ہے؛[۱] لیکن والدین، دادا، دادی، اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کو نہیں دے سکتے۔[۲]

نفلی صدقات اگر رشتہ دار، زیادہ حاجت مند ہوں، تو ان کو دینا افضل ہے، دوسروں کو دینا بھی جائز ہے، گھر کے افتتاح کے وقت نفل صدقہ کے اعتبار سے فقیروں کو کھلانا ہو، تو والدین اور رشتہ داروں کو دعوت دینا ضروری نہیں ہے؛ لیکن ایسے موقع پر ان کو دعوت دینا چاہیے، کہ یہ ان کا حق ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) والأفضل في الزكاة والفطر والنذر، الصرف أولا إلى الإخوة والأخوات، ثم إلى أولادهم، ثم إلى الأعمام والعمات ثم إلى أولادهم ثم إلى الأخوال والخالات، ثم إلى أولادهم، ثم إلى ذوي الأرحام ثم إلى الجيران، ثم إلى أهل حرفته، ثم إلى أهل مصره أو قريته كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر ☆ حاشية الطحطاوي على الدر: ۱/ ۴۳۰، كتاب الزكاة، باب المصرف، ط: رشيديه - پاكستان ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/ ۳۳۳، كتاب الزكاة، باب في بيان أحكام المصرف، ط: فقيه الأمة - ديوبند)

وقيد بأصله وفرعه؛ لأن من سواهم من القرابة يجوز الدفع لهم، وهو أولى لما فيه من الصلة مع الصدقة كالإخوة والأخوات والأعمام والعمات والأخوال والخالات الفقراء، ولهذا قال في الفتاوى الظهيرية: يبدأ في الصدقات بالأقارب ثم الموالي ثم الجيران. (البحر الرائق: ۲/ ۲۶۲، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) لا يجوز الدفع إلى أبيه وجده، وإن علا، ولا إلى ولده وولد ولده، وإن سفل؛ لأن المنفعة لم تنقطع عن الملك من كل وجه. (البحر الرائق: ۲/ ۲۶۲، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۳) وقيد بالصدقة الواجبة؛ لأن صدقة التطوع الأولى دفعها إلى الأصول والفروع كذا في البدائع. (حوالہ سابق)

عن حكيم بن حزام رضى الله عنه. عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: اليد العليا خير من اليد السفلى، وابدأ بمن تعول، وخير الصدقة عن ظهر غنى، ومن يستعفف يعفه الله، ومن يستغن يغنه الله.

(صحيح البخاري: ١/ ١٩٢، رقم الحديث: ١٤٢٧، كتاب الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ١/ ٣٣٢، رقم الحديث: ٩٥-١٠٣٤، كتاب الزكاة، باب بيان أن اليد العليا خير من اليد السفلى، وأن اليد العليا هي المنفقة وأن السفلى هي الآخذة، ط: ديوبند)

متفرقات الزكاة

[زکاۃ کے متفرق مسائل]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

متفرقات الزکاۃ

[زکاۃ کے متفرق مسائل]

[۱] زکوۃ نہ دینے والے کی دنیوی اور اُخروی سزا

۱۴۸۰- سوال: زکوۃ نہ دینے والے شخص کو آخرت میں تو عذاب ہوگا ہی ؛البتہ دنیا میں وہ کن دشواریوں کا سامنا کرے گا؟

ایم رحمن پٹیل لاج پوری

الجواب حامداومصلیا:

قحط سالی کے عذاب میں مبتلا ہوکر غربت کا شکار ہوگا۔ (حدیث پاک)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

[۲] زکوۃ واجب نہ ہونے کے باوجود احتیاطاً زکوۃ نکالنا

۱۴۸۱- سوال: کسی آدمی پر زکوۃ واجب نہ ہو، اس کے باوجود وہ احتیاطاً زکوۃ کی نیت سے کچھ رقم نکال کر اس کے مصرف میں ادا کرتا ہے، تو اس کو ثواب ملے گا یا نہیں؟

عبدالرحمن بلیشوری

[۱] عن عبداللہ بن بریدۃ، عن أبیہ، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مامنع قوم الزکاۃ إلا ابتلاھم اللہ. (المعجم الأوسط: ۵/۲۶، باب العین، من اسمه عبدان، ط: دار الحرمین-القاھرۃ)

الجواب حامداً ومصلیاً:

اس کو ثواب ملے گا، کہ اللہ تعالیٰ نیکوکار کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے ہیں۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] تبلیغی اجتماع کے لیے جمع کی گئی رقم سے بچی ہوئی رقم کا حکم

۱۴۸۲- سوال: ہمارے یہاں تبلیغی اجتماع تھا، جس میں اہل قریہ نے اناج اور نقد رقم سے امداد کی تھی اور دوسرے گاؤں کے باعزت لوگوں نے بھی امداد کی تھی؛ لیکن زیادہ تر چندہ گاؤں کے افراد ہی کا تھا، اجتماع میں خرچ کے بعد تھوڑی سی رقم بچ گئی ہے، تو اس کا کیا کرنا چاہیے؟

اس بچی ہوئی زائد رقم سے ہم لوگ گاؤں میں وقتاً فوقتاً آنے والی تبلیغی جماعت کے کھانا کھانے کے لیے برتن خریدنا چاہتے ہیں، تو یہ صحیح ہے یا نہیں؟ برتن خریدنے کے بعد جو رقم بچتی ہے، اس کو کسی مدرسہ یا مسجد میں دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر دے سکتے ہیں، تو دونوں میں کون سا مصرف زیادہ بہتر ہے؟ اور اگر بچی ہوئی رقم سے نہ برتن خریدنے کی اجازت ہو اور نہ ہی مسجد ومدرسہ میں دینے کی، تو اس رقم کا کیا کرنا چاہیے؟

مولوی ولی فلاحی خانپوری

الجواب حامداً ومصلیاً:

چندہ دینے والے خواہ آپ کے گاؤں کے ہوں یا دوسرے گاؤں کے، انہوں نے تبلیغی جماعت کے ذمہ داروں کو اس رقم کے خرچ کرنے کے لیے وکیل بنایا ہے؛ اس لیے وہ [ذمے دار] حضرات جس صورت کو بہتر سمجھیں، اسے اپنا سکتے ہیں، اس کی ان کو اجازت حاصل ہے۔

تبلیغی جماعت کے لیے برتن خرید لینا زیادہ بہتر ہے، تاکہ جب بھی جماعت گاؤں میں آئے، ان برتنوں میں ان کو کھلایا پلایا جا سکے۔

اس کے علاوہ دوسری ضرورت کی چیزیں بھی خرید سکتے ہیں؛ تاکہ تبلیغی اجتماعات کے موقع پر بھی وہ کام میں آسکیں اور یہی مصرف اچھا ہے؛ کیوں کہ امداد کرنے والوں نے تبلیغی اجتماع ہی کی وجہ سے امداد کی ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ {۹-التوبة: ۱۲۰-۱۲۱}

(۲) ويجوز التوكيل بالبياعات والأشربة والإجارات والنكاح والطلاق والعتاق والخلع والصلح والإعارة =

[۴] خریدے ہوئے گھر میں مدفون سونا ملا، تو وہ کس کا ہوگا؟

۱۴۸۳- سوال: ہمارے ایک ساتھی نے چند سال قبل ایک غیر مسلم سے پرانا مکان خریدا تھا، کچھ لوگوں نے کہا کہ اس گھر میں زمین کے اندر سونا مدفون ہے، جب کھدائی کی گئی، تو واقعۃً سونا ملا، دریافت یہ کرنا ہے کہ وہ سونا کس کا ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً:

اگر مدفون سونا زمین سے ملا ہے اور اس کا مالک معلوم ہے، یا کسی نے اس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کیا ہے اور وہ گواہی سے ثابت کر دیتا ہے، تو سونا اسی مالک کا ہے، اگر کوئی مالک معلوم نہ ہوا، تو جس نے نکالا ہے، اس کا ہوگا، فقط، (شامی جلد ۲، صفحہ ۳۲۲، ہندیہ جلد ۱ صفحہ ۲۷۷)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=والاستعارة والهبة والصدقة والإيداع وقبض الحقوق والخصومات وتقاضي الديون والرهن والارتهان كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۳/ ۵۶۴، كتاب الوكالة، الباب الأول في معنى الوكالة وركنها وشرطها وألفاظها وحكمها وصفتها، ط: دار الفكر)

وللوكيل أن يدفع لولده الفقير وزوجته لا لنفسه إلا إذا قال: ربها ضعها حيث شئت. (الدر المختار)

وفي الشامية: ... الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره كما لو أوصى لزيد بكذا ليس للوصي الدفع إلى غيره فتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۶۹، كتاب الزكاة، مطلب في زكاة ثمن المبيع وفاء، ط: دار الفكر - بيروت)

والأوجه أن ينظر إلى ما يقتضيه الحال في كل فقير من عيال وحاجة أخرى كدهن وثوب وكراء منزل وغير ذلك كما في الفتح اهـ. (رد المحتار: ۲/ ۳۵۵، كتاب الزكاة، فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر)

[۱] أما لو انتقل إليه ببيع أو هبة ووجد فيه ركازا، فقد اختلف الفقهاء في من يكون له الركاز، فذهب جمهور الفقهاء (المالكية والشافعية وأبو حنيفة ومحمد وهي رواية عن أحمد) إلى أنه للمالك الأول أو لوارثه لو كان حيا، لأنه كانت يده على الدار فكانت على ما فيها. قال ابن عابدين نقلا عن البحر: إن الكنز مودع في الأرض فلما ملكها الأول ملك ما فيها، ولا يخرج ما فيها عن ملكه ببيعها كالسمكة في جوفها درة. وذهب أبو حنيفة ومحمد إلى أنه إذا لم يعرف المالك الأول ولا ورثته فيوضع الركاز في بيت المال على الأوجه. ... وقال ابن عابدين: قال أبو يوسف: الباقي للواجد كما في أرض غير مملوكة، وعليه الفتوى، وبه قال أبو ثور. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۳/ ۱۰۶، مادة: ركاز، صادر عن: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية - الكويت، ط، دار السلاسل - الكويت☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۲۲، كتاب الزكاة، باب زكاة الركاز، ط: دار الفكر)

(قوله: وباقيه للمختط له) أي الأخماس الأربعة للذي ملكه الإمام البقعة أول الفتح، وإن كان ميتا فلورثته إن =

[۵] مقروض آدمی کا نفلی صدقہ دینا

۱۴۸۴-سوال: فضائل صدقات کے صفحہ نمبر ۲۰ پر صدقہ دینے پر بے شمار فائدے ذکر کیے گئے ہیں، دریافت یہ کرنا ہے کہ اگر کسی تنگ دست کے ذمے میں قرض ہو، اس کے باوجود صدقے کے فضائل کو حاصل کرنے کے لیے خرچ کرے، تو کیا شرعی اعتبار سے اس کی اجازت ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

پہلے قرض کی ادائیگی فرض ہے، فرض کو چھوڑ کر نفل صدقہ دینا جائز نہیں ہے، قرض کی ادائیگی پر قدرت کے باوجود حق دار کے حق کو روکے رکھنا ظلم ہے۔

عرفوا، وإلا فهو لأقصى مالك للأرض أو لورثته كذا في البدائع وقيل يوضع في بيت المال، ورجحه في فتح القدير، وفي التحفة جعله لبيت المال إن لم يعرف الأقصى وورثته، وهذا كله عندهما، وقال أبو يوسف: إن الباقي للواجد كالمعدن... ومحل الخلاف فيما إذا لم يدعه مالك الأرض فإن ادعى أنه ملكه فالقول قوله اتفاقا كذا في المعراج. (البحر الرائق: ۲/ ۲۵۳، كتاب الزكاة، باب الركاز، ط: دار الكتاب الإسلامي)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر رکاز کا مالک معلوم نہ ہو تو وہ واجد (پانے والے) کا ہوگا۔ لیکن فقہ احناف کی بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ اگر رکاز کا مالک معلوم نہ ہو، تو اسے بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا، عالم گیری میں بھی محیط سرخسی کے حوالے سے ایسا ہی لکھا ہوا ہے، لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے فتویٰ میں پہلے قول کو اختیار فرمایا ہے، جس کی دو وجہ ہوسکتی ہے: (۱) علامہ شامی السراج الوہاج کے حوالے سے اس قول کے بارے میں فرمایا ہے: وعلیہ الفتویٰ، (۲) ہندوستان میں بیت المال کا تصور نہیں ہے: اس لیے واجد کی ہی ملکیت ہوگی:

(قوله: وهذا إن ملكت أرضه) الإشارة إلى قوله وباقيه للمالك، وهذا قولهما وظاهر الهداية وغيرها ترجيحه لكن في السراج وقال أبو يوسف: والباقي للواجد كما في أرض غير مملوكة وعليه الفتوى. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۲۲، كتاب الزكاة، باب زكاة الركاز، ط: دار الفكر)

وإن وجد في أرض مملوكة اتفقوا جميعا على وجوب الخمس فيه واختلفوا في أربعة أخماسه قال أبو حنيفة - رحمه الله تعالى - هي لصاحب الخطة كذا في شرح الطحاوي. وفي الفتاوى العتابية إذا كان صاحب الخطة ذميا فلا شيء له فإن لم يعرف المختط له، ولا ورثته يصرف إلى أقصى مالك في الإسلام يعرف له كذا في التتارخانية أو لورثته كذا في البحر الرائق ناقلا عن البدائع وشرح الطحاوي وإلا يكون لبيت المال كذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۸۵، كتاب الزكاة، الباب الخامس في المعادن والركاز، ط: دار الفكر - بيروت)

اس لیے اولاً واجبی حق کا ادا کرنا ضروری ہے، نفلی صدقہ جائز نہیں ہے۔ (۱)

البتہ قرض اس قدر قلیل ہو کہ اس کو ادا کرنے کی قدرت ہے، تھوڑا کچھ صدقہ کرنے سے قرض کی ادائیگی پر کوئی اثر پڑنے کا اندیشہ نہ ہو تو صدقہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ثواب ملے گا۔

یا قرض ایسا ہو کہ فوراً ادا کرنا ضروری نہ ہو، اور صاحبِ حق کی جانب سے فی الحال تقاضہ کا

---

(۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: مطل الغني ظلم، فإذا أتبع أحدكم على ملي فليتبع. (صحيح البخاري: ۱/ ۳۰۵، رقم الحديث: ۲۲۸۷، ۲۲۸۸، كتاب الحوالات، باب الحوالة، وهل يرجع في الحوالة؟ ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۸، رقم الحديث: ۳۳-۱۵۶۴، كتاب المساقاة، باب تحريم مطل الغني، وصحة الحوالة، واستحباب قبولها إذا أحيل على ملي، ط: ديوبند)

عن حكيم بن حزام رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: اليد العليا خير من اليد السفلى، وابدأ بمن تعول، وخير الصدقة عن ظهر غنى، ومن يستعفف يعفه الله، ومن يستغن يغنه الله. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۹۲، رقم الحديث: ۱۴۲۷، كتاب الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۳۲، رقم الحديث: ۹۵-۱۰۳۴، كتاب الزكاة، باب بيان أن اليد العليا خير من اليد السفلى، وأن اليد العليا هي المنفقة وأن السفلى هي الآخذة، ط: ديوبند)

قال الإمام البخاري: ومن تصدق وهو محتاج، أو أهله محتاج، أو عليه دين، فالدين أحق أن يقضى من الصدقة، والعتق والهبة، وهو رد عليه ليس له أن يتلف أموال الناس. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۹۲، كتاب الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى، ط: ديوبند)

قال العيني: ومن تصدق وهو محتاج، أو أهله محتاج، أو عليه دين، فالدين أحق أن يقضى من الصدقة والعتق والهبة، وهو رد عليه، ليس له أن يتلف أموال الناس. ————— هذا كله من الترجمة وقع تفسيرا لقوله: (لا صدقة إلا عن ظهر غنى)، والمعنى أن شرط التصدق أن لا يكون محتاجا ولا أهله محتاجا ولا يكون عليه دين فإذا كان عليه دين فالواجب أن يقضي دينه، وقضاء الدين أحق من الصدقة، والعتق، والهبة؛ لأن الابتداء بالفرائض قبل النوافل، وليس لأحد إتلاف نفسه وإتلاف أهله وإحياء غيره، وإنما عليه إحياء غيره بعد إحياء نفسه وأهله، إذ هما أوجب عليه من حق سائر الناس. . . . ومقتضى قوله: (وهو رد عليه) أن يكون الدين المستغرق مانعا من صحة التبرع؛ لكن هذا ليس على الإطلاق، وإنما يكون مانعا إذا حجر عليه الحاكم، وأما قبل الحجر فلا يمنع، كما تقرر ذلك في موضعه في الفقه، فعلى هذا إما يحمل إطلاق البخاري عليه، أو يكون مذهبه أن الدين المستغرق يمنع مطلقا، ولكن هذا خلاف ما قاله العلماء، حتى إن ابن قدامة وغيره نقلوا الإجماع على أن المنع إنما يكون بعد الحجر. (عمدة القاري- بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۸/ ۲۹۳، كتاب الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

اندیشہ بھی نہ ہو، تو اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ: احمد ابراہیم بیمات غفرلہ

[۲] مرحوم کے نام سے صدقہ دیتے ہوئے کس کی جانب سے نیت کی جائے؟

۱۴۸۵- سوال: نفل یا واجب صدقہ مرحوم کے نام سے دے سکتے ہیں یا نہیں؟ مدارس کے سفراء حضرات چندہ کے لیے تشریف لاتے ہیں، ان کے پاس رسیدیں ہوتی ہیں، تو چندہ دیتے ہوئے مرحوم کے نام سے صدقہ لکھوا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

نیت کا اعتبار ہوگا، خواہ جس کا نام لکھا یا جائے؛ اس لیے جس کی جانب سے واجب صدقہ ادا کیا

---

(۲) عن أبي هريرة، أنه قال: يا رسول الله، أي الصدقة أفضل؟ قال: جهد المقل، وابدأ بمن تعول. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۳۶، رقم الحديث: ۱۶۷۷، كتاب الزكاة، باب في الرخصة في ذلك، بعد: باب الرجل يخرج من ماله، ط: فيصل پبلی کیشنز - دیوبند)

(عن أبي هريرة قال: يا رسول الله أي الصدقة أفضل؟ قال: " جهد المقل ") بضم الجيم وبفتح، قال الطيبي: الجهد بالضم الوسع والطاقة وبالفتح المشقة، وقيل: هما لغتان، أي أفضل الصدقة ما يحتمله حال القليل المال، والجمع بينه وبين ما تقدم أن الفضيلة تتفاوت بحسب الأشخاص، وقوة التوكل، وضعف اليقين اهـ، وقيل: المراد بالمقل الغني القلب ليوافق قوله " أفضل الصدقة ما كان عن ظهر غنى "، وقال ابن الملك: أي أفضل الصدقة ما قدر عليه الفقير الصابر على الجوع أن يعطيه، والمراد بالغنى في قوله " أفضل الصدقة ما كان عن ظهر غنى " من لا يصبر على الجوع والشدة، توفيقا بينهما، فمن يصبر فالإعطاء في حقه أفضل، ومن لا يصبر فالأفضل في حقه أن يمسك قوته ثم يتصدق بما فضل اهـ وحاصل ما ذكروه أن تصدق الفقير الغني القلب ولو كان قليلا أفضل من تصدق الغني بكثرة المال ولو كان كثيرا، فهو من أدلة أفضلية الفقير الصابر على الغني الشاكر. (مرقاة المفاتيح: ۴/ ۱۳۵۳، رقم الحديث: ۱۹۳۸، كتاب الزكاة، باب أفضل الصدقة، الفصل الثاني، ط: دار الفكر - بيروت)

اعلم أن الصدقة تستحب بفاضل عن كفايته وكفاية من يمونه، وإن تصدق بما ينقص مؤنة من يمونه أثم، ومن أراد التصدق بماله كله وهو يعلم من نفسه حسن التوكل والصبر عن المسألة فله ذلك وإلا فلا يجوز، ويكره لمن لا صبر له على الضيق أن ينقص نفقة نفسه عن الكفاية التامة كذا في شرح درر البحار. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۷، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، مطلب: الأفضل على أن ينوي بالصدقة جميع المؤمنين والمؤمنات، ط: دار الفكر - بيروت)

جارہا ہے، بہتر ہے کہ اس کا نام رسید میں لکھوائیں، مرحوم کی جانب سے ایصال ثوب کے لیے دیا جارہا ہو، تو اس طرح لکھوائیں کہ فلاں مرحوم کے ثواب کے لیے، نفل صدقہ میں مرحوم کا نام لکھنا بھی درست ہے، لیکن اس مطلب دراصل مرحوم کو ثواب پہنچانا ہی ہوگا۔ [۱] الغرض دینے والے کی نیت کا اعتبار ہوگا، رسید بک میں نام کسی کا بھی لکھا ہوا ہو، جس کی جانب سے دینے کی نیت کی ہو، اسی کی جانب سے صدقہ ادا ہوگا۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] بہ قدرِ ضرورت مال رکھ کر باقی کو صدقہ کرنے کی اجازت ہے

۱۴۸۶-سوال: شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ صاحب کی فضائل صدقات کے صفحہ ۸ پر قرآن کی آیت لکھی ہے کہ اللہ تعالی بندے سے قرض مانگتا ہے، اس آیت کو سن کر ایک صحابی نے اپنا باغ - جس میں ۶۰۰/ کھجور کے درخت تھے - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وقف کردیا اور بال بچوں کو، جو اس باغ ہی میں رہتے تھے، باہر سے آواز دی کہ یہ باغ اللہ تعالی کو قرض دے دیا ہے۔ تو اب دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا صحابی کے پاس رہنے اور ذریعۂ معاش کا دوسرا کوئی انتظام تھا یا نہیں؟ کیا آج کے دور میں آدمی کے اوپر اپنے بال بچوں کے لیے ذریعۂ معاش اختیار کرنا واجب ہے؟ تو کیا دوسرا کوئی سبب صحابی کے پاس تھا؟

الجواب حامداً ومصلياً:

شوہر پر اس کی بیوی اور بچوں کا نان ونفقہ واجب ہے، حق واجب کی ادائیگی کے بعد شوہر کو اختیار

---

(۱) وفي التتارخانية عن المحيط: الأفضل لمن يتصدق نفلا أن ينوي لجميع المؤمنين والمؤمنات؛ لأنها تصل إليهم ولا ينقص من أجره شيء اهـ والله تعالى أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۷، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، مطلب: الأفضل على أن ينوي بالصدقة جميع المؤمنين والمؤمنات، ط: دار الفكر)

(۲) اس سلسلے میں اصل یہ ہے کہ مرحوم کے نام نفلی صدقہ دینا، خواہ کسی فقیر کو ہو، یا مدرسے میں، بلاشبہ درست اور باعث اجر وثواب ہے، تاہم وہ صدقات جو دینے والے پر واجب ہیں، جیسے زکوۃ وغیرہ، تو ان میں دوسرے کی نیت کرنا درست نہیں، اس کی وجہ سے فراغ ذمہ حاصل نہیں ہوگا، البتہ اپنی جانب سے ادا کرنے کے بعد اس کا اجر وثواب دوسروں کو ایصال کرسکتے ہیں:

وظاهر إطلاقهم يقتضي أنه لا فرق بين الفرض والنفل فإذا صلى فريضة وجعل ثوابها لغيره فإنه يصح. (البحر الرائق: ۳/ ۶۴، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(قوله: ومن أهل بحج عن أبويه فعين صح)؛ لأنه جعل الثواب للغير، وهو لا يحصل إلا بعد الأداء فالنية قبله لهما لغو فإذا فرغ وجعله لأحدهما أو لهما فإنه يجوز. (حوالہ سابق: ۳/ ۷۴)

ہے کہ وہ اپنا سارا مال خرچ کر دے۔[۱]

حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ضرورت کے بہ قدر مال اپنے پاس رکھ کر باقی کو صدقہ کرنے کی اجازت ہے؛ لیکن اس طرح صدقہ کرنا کہ خود محتاج ہو جائے اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے، بہتر نہیں ہے۔[۲]

مذکورہ قصے میں صحابی کے پاس مال تھا یا نہیں، اس سے بحث نہیں ہے، دوسرے بہت سے صحابہؓ کے کے واقعات میں ہے کہ انہوں نے اپنا سارا مال اللہ کے راستے میں خرچ کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس جو کچھ تھا، غزوہ تبوک کے موقع پر سب لے آئے، نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ گھر میں کیا چھوڑا ہے؟ تو جواب دیا کہ اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے،[۳] الغرض یہ تو صحابۂ کرام کی شان تھی، وہ حضرات یک مشت

[۱] (ومنها) أي من أسباب وجوب النفقة (النسب فتجب على الأب خاصة) لا يشركه أحد فيها (كنفقة أبويه وزوجته) أي كما لا يشركه أحد في نفقتهم (ولو كان) الأب (فقيرا) لقوله تعالى ﴿وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ﴾ [البقرة:۲۳۳] والمولود له هو الأب (لولده) متعلق بقوله تجب (الفقير) حال كونه (صغيرا) حتى لو كان الصغير غنيا فهي في ماله. (درر الحكام شرح غرر الأحكام- محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا- أو منلا أو المولى- خسرو (م:۸۸۵ھ): ۱/ ۴۱۸، كتاب الطلاق، باب النفقة، ط: دار إحياء الكتب العربية)

(۲) عن أبي هريرة- رضي الله عنه- أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: خير الصدقة ما كان عن ظهر غنى، وابدأ بمن تعول. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۰۶، رقم الحديث: ۵۳۵۵، كتاب النفقات، باب وجوب النفقة على الأهل والعيال، ط: البدر- ديوبند)

أبو صالح، قال: حدثني أبو هريرة رضي الله عنه، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: "أفضل الصدقة ما ترك غنى، واليد العليا خير من اليد السفلى، وابدأ بمن تعول". تقول المرأة: إما أن تطعمني، وإما أن تطلقني، ويقول العبد: أطعمني واستعملني، ويقول الابن: أطعمني، إلى من تدعني"، فقالوا: يا أبا هريرة، سمعت هذا من رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ قال: لا، هذا من كيس أبي هريرة. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۵۳۵۴)

(۳) عن زيد بن أسلم، عن أبيه، قال: سمعت عمر بن الخطاب، رضي الله عنه يقول: "أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم يوما أن نتصدق، فوافق ذلك مالا عندي، فقلت: اليوم أسبق أبا بكر إن سبقته يوما، فجئت بنصف مالي، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما أبقيت لأهلك؟، قلت: مثله، قال: وأتى أبو بكر رضي الله عنه بكل ما عنده، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما أبقيت لأهلك؟، قال: أبقيت لهم الله ورسوله، قلت: لا أسابقك إلى شيء أبدا. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۳۶، رقم الحديث: ۱۶۷۸، باب في الرخصة في ذلك، بعد: باب الرجل يخرج من ماله، ط: ديوبند☆ سنن الترمذي: ۲/ ۲۰۸، رقم الحديث: ۳۶۷۵، أبواب المناقب، باب بلا ترجمة، بعد عدة أبواب: باب مناقب أبي بكر الصديق رضي الله عنه واسمه عبد الله بن عثمان ولقبه عتيق، ط: ديوبند)

ایک سال کا مکمل نفقہ اپنی بیویوں کو دے دیتے تھے، تو واجب حق ادا ہو جاتا تھا، پھر پورا مال خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا، اسی طرح ان کے گھر والوں کی بھی یہی شان تھی کہ وہ لوگ خوشی سے اپنے حق سے دست بردار ہونے، ہر طرح کی قربانی دینے، پورا مال اللہ کی راہ اور ضرورت مندوں کی مدد میں خرچ کرنے اور ہر حال میں رضاء بالقضاء کے لیے تیار تھے، ان تمام اوصاف میں پیارے نبی ﷺ ان عملی رہنمائی فرماتے تھے، اور آپ کی ازواج مطہرات کندھے سے کندھا ملا کر آپ ﷺ کا ساتھ دیتی تھیں۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ تین دن کا چاند ہم دیکھ لیتے، پھر بھی ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا، دو ہی چیزوں پر گذارا ہوتا تھا، کھجور اور پانی۔ (۴)

دوسری روایت میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کی وفات ہوئی، اس وقت آپ ﷺ کی زرہ ایک تاجر کے پاس گروی تھی۔ (۵)

متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ جب فتوحات ہوئیں اور مال غنیمت حاصل ہوا، تو آپ ﷺ نے کچھ زمینیں ازواج مطہرات کے خرچ کے لیے رکھی تھیں، اس سے تمام ازواج مطہرات کو، پیداوار کے موقع پر پورے سال کا خرچہ، دے دیتے تھے، تو حق ادا کر دیا جاتا تھا؛ لیکن امہات المؤمنین عمدہ شان والی

---

(۴) عن عائشة رضي الله عنها، أنها قالت لعروة: ابن أختي، إن كنا لننظر إلى الهلال، ثم الهلال، ثلاثة أهلة في شهرين، وما أوقدت في أبيات رسول الله صلى الله عليه وسلم نار، فقلت يا خالة: ما كان يعيشكم؟ قالت: "الأسودان: التمر والماء، إلا أنه قد كان لرسول الله صلى الله عليه وسلم جيران من الأنصار، كانت لهم منائح، وكانوا يمنحون رسول الله صلى الله عليه وسلم من ألبانهم، فيسقينا". (صحيح البخاري: ۱/۳۴۹، رقم الحديث: ۲۵۶۷، كتاب الهبة وفضلها والتحريض عليها، ط: البدر - ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۲/۴۱۰، رقم الحديث: ۲۸- ۲۹۷۲، كتاب الزهد والرقائق، ط: ديوبند)

اس سلسلے کی روایات کے لیے دیکھیں: صحيح البخاري: ۲/ ۹۵۵، رقم الحديث: ۶۴۵۲ تا ۶۴۶۰، كتاب الرقاق، باب: كيف كان عيش النبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه، وتخليهم من الدنيا، ط: البدر - ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۴۰۹، أوائل الزهد والرقائق، رقم الحديث: ۲۹۶۶ تا ۲۹۷۶، ط: ديوبند.

(۵) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم ودرعه مرهونة عند يهودي، بثلاثين صاعا من شعير. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۰۹، رقم الحديث: ۲۹۱۶، كتاب الجهاد والسير، باب ما قيل في درع النبي صلى الله عليه وسلم، والقميص في الحرب، ط: ديوبند)

اور بڑی حوصلہ مند تھیں، وہ سال بھر بچا کر نہیں رکھتی تھیں، پورا اللہ ہی کی راہ میں خرچ کر دیتی تھیں۔ (۶)

تو صحابہ کی شان اور ان کے احوال کو دیکھتے ہوئے ان کے لیے اس طرح کرنے کی اجازت تھی، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بے صبری اور تکلیف سے گھبرا جانے کی کوئی عادت نہ تھی، لہٰذا انہیں اس کی اجازت تھی، آج ایسی ہمتیں نہیں ہیں اور بال بچوں کا حق تو واجب ہے ہی؛ اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔ (۷) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] کنز کا اطلاق کس مال پر ہوتا ہے؟

۱۴۸۷- سوال: فضائل صدقات صفحہ ۱۳۹ پر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ: حضرت ابوذر غفاریؓ بھی انہیں حضرات میں سے ہیں، جن کا مسلک یہ ہے کہ روپیہ پیسہ بالکل رکھنے کی چیز نہیں ہے، ایک درہم جہنم کا ایندھن ہے۔

تو پوچھنا یہ ہے کہ اگر ایک درہم جمع کرنا ایندھن ہے، تو زکوۃ اور حج تو مال کے جمع ہونے پر واجب ہے اور اسلام دولت کا مخالف بھی نہیں ہے، پھر حضرت ابوذر غفاریؓ کے اس جملہ کا کیا مطلب؟

الجواب حامداو مصليا:

کنز: صرف وہ مال کہلاتا ہے، جس کی زکوۃ ادا نہ کی گئی ہو، ایسا مال عذاب الٰہی کا باعث ہے۔ (۱)

---

(۶) عن عمر - رضي الله عنه - قال: كانت أموال بني النضير مما أفاء الله على رسوله، مما لم يوجف عليه المسلمون بخيل ولا ركاب، فكانت للنبي صلى الله عليه وسلم خاصة، فكان ينفق على أهله نفقة سنة، وما بقي يجعله في الكراع والسلاح، عدة في سبيل الله. (الصحيح لمسلم: ۲/۸۹، رقم الحديث: ۴۸-۱۷۵۷، كتاب الجهاد، باب حكم الفيء، ط: مختار اينڈ كمپني - ديوبند)

(۷) اعلم أن الصدقة تستحب بفاضل عن كفايته وكفاية من يمونه، وإن تصدق بما ينقص مؤنة من يمونه أثم، ومن أراد التصدق بماله كله وهو يعلم من نفسه حسن التوكل والصبر عن المسألة فله ذلك وإلا فلا يجوز، ويكره لمن لا صبر له على الضيق أن ينقص نفقة نفسه عن الكفاية التامة كذا في شرح درر البحار. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۵۷، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، مطلب: الأفضل على أن ينوي بالصدقة جميع المؤمنين والمؤمنات، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ. (۹-التوبة: ۳۴)

قال العيني: نزلت هذه الآية في عامة أهل الكتاب والمسلمين، وقيل: بل خاصة بأهل الكتاب، وقيل: بل هو =

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی خاص حالت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تعلیم دی تھی کہ دنیا اور اس کے مال سے بالکل دور رہنا، ان کا عمل اس پر تھا اور وہ کسی بھی قسم کے مال کو جمع کرنے کے مخالف تھے؛ لیکن عام حالات میں یہ کوئی واجب اور ضروری عمل نہ تھا، پھر بھی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سب کے لیے اس کو ضروری سمجھتے تھے، یہ ان کا اپنا نظریہ تھا، جس میں وہ متفرد تھے، دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ مسلک نہیں تھا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= كلام مستأنف في حق من لا يزكي من هذه الأمة، قاله ابن عباس والسدي، وأكثر المفسرين، وسيجيء في تفسير هذه عن البخاري: حدثنا قتيبة حدثنا جرير عن حصين عن زيد بن وهب، قال: مررت على أبي ذر بالربذة فقلت: ما أنزلك هذه الأرض؟ فقال: كنا بالشام فقرأت: ﴿والذين يكنزون الذهب والفضة﴾. الآية، فقال معاوية: ما هذا فينا، ما هذا إلا في أهل الكتاب. قال: قلت: إنها لفينا وفيهم، ورواه ابن جرير، وزاد، فارتفع في ذلك القول بيني وبينه، فكتب إلى عثمان - رضي الله تعالى عنه - يشكوني، فكتب إلي عثمان: أن أقبل إليه. قال: فأقبلت، فلما قدمت المدينة ركبني الناس كأنهم لم يروني يومئذ، فشكوت ذلك إلى عثمان، فقال لي: تنح قريبا. فقلت: والله لن أدع ما كنت أقول. وكان من مذهب أبي ذر تحريم إدخار ما زاد على نفقة العيال، وكان يفتي الناس بذلك ويحثهم عليه ويأمرهم به ويغلظ في خلافه، فنهاه معاوية، رضي الله تعالى عنه، فلم ينته فخشي أن يضره الناس في هذا، فكتب يشكوه إلى أمير المؤمنين عثمان، وأن يأخذوه إليه، فاستقدمه عثمان - رضي الله تعالى عنه - إلى المدينة وأنزله بالربذة وحده، وبها مات في خلافة عثمان، رضي الله تعالى عنه... واعلم أن الكنز المستحق عليه الوعيد كل مال لم تؤد زكاته، وكل مال أديت زكاته فليس بكنز، وإن كان تحت سبع أرضين رواه نافع عن ابن عمر، وروى نحوه عن ابن عباس وجابر وأبي هريرة موقوفا ومرفوعا، وعن عمر بن الخطاب، رضي الله تعالى عنه، أي مال أديت زكاته فليس بكنز، وإن كان مدفونا في الأرض، وأي مال لم تؤد زكاته فهو كنز يكوي به صاحبه وإن كان على وجه الأرض. (عمدة القاري - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۸/۲۴۸-۲۴۹، كتاب الزكاة، باب إثم مانع الزكاة، ط: دار إحياء التراث الإسلامي)

عن ابن عباس - رضي الله عنهما - قال: لما نزلت هذه الآية: ﴿والذين يكنزون الذهب والفضة﴾ [التوبة: ۳۴]، قال: كبر ذلك على المسلمين، فقال عمر رضي الله عنه: أنا أفرج عنكم، فانطلق، فقال: يا نبي الله، إنه كبر على أصحابك هذه الآية، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله لم يفرض الزكاة، إلا ليطيب ما بقي من أموالكم، وإنما فرض المواريث لتكون لمن بعدكم، فكبر عمر، ثم قال له: ألا أخبرك بخير ما يكنز المرء؟ المرأة الصالحة، إذا نظر إليها سرته، وإذا أمرها أطاعته، وإذا غاب عنها حفظته. (سنن أبي داود: ۱/۲۳۵، رقم الحديث: ۱۶۶۴، كتاب الزكاة، باب في حقوق المال، ط: فيصل - ديوبند)

(۲) عن الأحنف بن قيس، قال: جلست إلى ملإ من قريش، فجاء رجل خشن الشعر والثياب والهيئة، حتى قام عليهم فسلم، ثم قال: بشر الكانزين برضف يحمى عليه في نار جهنم، ثم يوضع على حلمة ثدي أحدهم حتى يخرج من =

=نغض كتفه، ويوضع على نغض كتفه حتى يخرج من حلمة ثديه، يتزلزل، ثم ولى، فجلس إلى سارية، وتبعته وجلست إليه وأنا لا أدري من هو؟ فقلت له: لا أرى القوم إلا قد كرهوا الذي قلت، قال: إنهم لا يعقلون شيئا، ــــــــ قال لي خليلي، قال: قلت: من خليلك؟ قال النبي صلى الله عليه وسلم: "يا أبا ذر أتبصر أحدا؟" قال: فنظرت إلى الشمس ما بقي من النهار، وأنا أرى أن رسول الله صلى الله عليه وسلم يرسلني في حاجة له، قلت: نعم، قال: ما أحب أن لي مثل أحد ذهبا، أنفقه كله، إلا ثلاثة دنانير، وإن هؤلاء لا يعقلون، إنما يجمعون الدنيا، لا والله، لا أسألهم دنيا، ولا أستفتيهم عن دين، حتى ألقى الله. (صحيح البخاري: ١/ ١٨٩، رقم الحديث: ١٤٠٧، ١٤٠٨، كتاب الزكاة، باب: ما أدي زكاته فليس بكنز، ط: البدر - ديوبند)

قال ابن حجر: والجمع بين كلام ابن عمر، وحديث أبي ذر أن يحمل حديث أبي ذر على مال تحت يد الشخص لغيره، فلا يجب أن يحبسه عنه أو يكون له لكنه ممن يرجى فضله وتطلب عائدته كالإمام الأعظم فلا يجب أن يدخر عن المحتاجين من رعيته شيئا، ويحمل حديث بن عمر على مال يملكه قد أدى زكاته فهو يحب أن يكون عنده ليصل به قرابته ويستغني به عن مسألة الناس، وكان أبو ذر يحمل الحديث على إطلاقه فلا يرى بادخار شيء أصلا، قال بن عبد البر: وردت عن أبي ذر آثار كثير تدل على أنه كان يذهب إلى أن كل مال مجموع يفضل عن القوت وسداد العيش فهو كنز يذم فاعله وأن آية الوعيد نزلت في ذلك، وخالفه جمهور الصحابة ومن بعدهم، وحملوا الوعيد على مانعي الزكاة... وفي المسند من طريق يعلى بن شداد بن أوس عن أبيه قال: كان أبو ذر يسمع الحديث من رسول الله صلى الله عليه وسلم فيه الشدة ثم يخرج إلى قومه ثم يرخص فيه النبي صلى الله عليه وسلم فلا يسمع الرخصة ويتعلق بالأمر الأول. (فتح الباري شرح صحيح البخاري - أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي (م: ٨٥٢هـ): ٣/ ٢٧٣، كتاب الزكاة، باب ما أدي زكاته فليس بكنز لقول النبي صلى الله عليه وسلم ليس فيما دون خمس أواق صدقة، ط: دار المعرفة - بيروت)

فتاویٰ فلاحیہ

جلد چہارم

از: حضرت مفتی احمد ابراہیم بیمات مدظلہ العالی

سابق شیخ الحدیث وصدر مفتی دار العلوم فلاح دارین ترکیسر گجرات

صدر جمعیۃ علماء ہند گجرات شاخ و بانی دار العلوم مدنی دار التربیت کرمالی

ناشر:

حافظ احمد بن مفتی احمد بیمات صاحب

کینیڈا فون 1905.966.4141

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ.
(۹-التوبہ:۱۲۲)

ترکت فیکم أمرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما: کتاب الله وسنة نبيه. (موطأ إمام مالك)

فتاویٰ فلاحیہ جلد چہارم

دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل اور دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی کے مسند افتاء سے دیے گئے فتاویٰ کا بیش قیمت مجموعہ

از: حضرت مفتی احمد ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ

سابق شیخ الحدیث وصدر مفتی: دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، گجرات،
صدر جمعیۃ علماء ہند، گجرات شاخ، و بانی دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی

مرتب: مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی

استاذ حدیث وفقہ: دارالعلوم اسلامیہ عربیہ، ماٹلی والا، بھروچ، گجرات

ناشر: حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات صاحب

خادم قرآن: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا۔ فون: 905 578 2547

رکن منتظمہ: دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی، بھروچ، گجرات، پن نمبر: 394115

تفصیلات

نام : **فتاویٰ فلاحیہ** جلد چہارم

صاحب فتاویٰ: حضرت مفتی احمد بن ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ

مرتب : مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی

[خادم حدیث وافتا: دار العلوم ماٹلی والا، بھروچ]

ناشر : حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات

(خادم: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا)

بہ اہتمام: دار العلوم فلاح دارین، ترکیسر

سن طباعت: ربیع الاول، ۱۴۳۹ھ، موافق: دسمبر ۲۰۱۷ء

ملنے کے پتے:

1	دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی، انکلیشور، بھروچ، گجرات	02646 274243
2	حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات صاحب، خادم قرآن: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا	905 578 2547
3	مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی، دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ، گجرات	940 951 8452
4	مدنی ویلفیئر ٹرسٹ، کوسمبا، سورت، گجرات	9408 746664
5	ادارہ صدیق، ڈابھیل، ضلع: نوساری، گجرات	09904 886188
6	مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، یوپی	01336 22329
7	جامعہ قاسم العلوم، 3482لورینس ایونیو، E، سیکنڈ فلور، یونٹ: M1H 3E5،208، سکاربورو، کینیڈا	wwwjq.bomco
8	مدرسہ اسلامیہ عربیہ، آزادویل، ساؤتھ افریقہ	114 132786
9	مدرسہ تعلیم الدین، اسپنگو بیچ، ڈربن، ساؤتھ افریقہ	273 19029916
10	مولانا اُسامہ ساچا، 19، انگھم روڈ، تھورن ہل لیس، ویسٹ یارک شائر، یو۔کے	+447712124569
11	مفتی اسعد بن عبد الرزاق پالن پوری، دار العلوم مرکز اسلامی، انکلیشور	9427 640 250
12	جے ایم سی انڈیا پبلشر پرائیویٹ لمیٹیڈ، جھا ہاؤس، ویسٹ نظام الدین	011 24352220

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست فتاویٰ فلاحیہ جلد چہارم

[فہرست:.......... ۳-۳۴]

کتاب الصوم والاعتکاف (۴۵-۲۴۴)

باب رؤیۃ الھلال واختلاف المطالع

[رؤیت ہلال اور اختلاف مطالع کا بیان]

باب وجوب الصوم وشرائطہ (۱۳۲-۱۳۷)

[روزہ کا وجوب اور اس کی شرطیں]

باب مفسدات الصوم (١٤٧-١٣٨)

[مفسدات صوم کا بیان]

باب التسحر والافطار (١٦١-١٤٨)

[سحری وافطار کا بیان]

باب قضاء الصوم وكفارته (۱۶۲-۱۷۹)

[روزے کی قضاء وکفارہ کا بیان]

باب الصوم النفل وغيره (۱۸۰-۱۹۵)

[نفلی روزے کا بیان]

باب التراویح (۱۹۶-۲۰۷)

[تراویح کا بیان]

متفرقات الصوم (۲۰۸-۲۱۳)

[روزہ کے متفرق مسائل]

باب الاعتکاف (۲۱۴-۲۴۴)

[اعتکاف کا بیان]

کتاب الحج (۵۳۴-۲۴۵)

فرضية الحج وشرائطه وأركانه (۳۱۵-۲۴۶)

[حج: فرضیت، شرائط اور ارکان]

باب المواقیت (۳۱۶-۳۲۵)

[میقات کا بیان]

باب الإحرام والتلبية (۳۲۶-۳۴۵)

[احرام اور تلبیہ کا بیان]

باب الطواف والسعي والحلق والقصر (۳۴۶-۳۹۳)

[طواف، سعی اور حلق وقصر کا بیان]

باب الإفراد، والتمتع، والقران (۳۹۹-۳۹۴)

[حج افراد، تمتع اور قران کا بیان]

باب الحج عن الغير (۴۵۷-۴۰۰)

[حج بدل کا بیان]

باب الجنایة (۴۵۸-۴۸۹)

[جنایت کا بیان]

باب العمرۃ (۴۹۰-۵۰۱)

[عمرہ کا بیان]

فصل زیارۃ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم (۵۰۲-۵۰۷)

[روضۂ اقدس اور مدینہ منورہ کی زیارت کا بیان]

باب متفرقات الحج (۵۰۸-۵۳۴)

[حج کے متفرق مسائل]

کتاب الأضحیۃ والعقیقۃ (۵۳۵-۶۴۵)

باب من یجب علیه الأضحیة (۵۳۶-۵۶۹)

[قربانی کا وجوب]

باب في أفضل الضحايا وفيما يجوز منها وما لا يجوز (۵۷۰-٦۰۱)

[قربانی کے لیے افضل اور ناجائز جانور کا بیان]

باب سن الأضحية (۶۰۲-۶۱۳)

[قربانی کے جانور کی عمر کا بیان]

باب أيام الأضحية ومكانها ووقتها وقضائها (۶۱۴-۶۳۳)

[قربانی: ایام، مکان، وقت اور قضاء کا بیان]

باب لحوم الأضاحي (۶۳۴-۶۵۳)

[قربانی کے گوشت کا بیان]

باب في مصرف جلد الأضحية (۶۵۴-۶۷۹)

[قربانی کی کھال کا مصرف]

باب الشركة في الضحايا (۶۸۰-۶۹۵)

[قربانی میں شرکت کا بیان]

باب الأضحية عن الغير (۶۹۶-۷۰۷)

[دوسرے کی جانب سے قربانی]

متفرقات الأضحية (۷۰۸-۷۱۵)

[قربانی کے متفرق مسائل]

باب العقيقة (۷۱۶-۷۴۵)

[عقیقہ کا بیان]

تقریظ وتائید

خلیفہ شیخ الحدیث

حضرت مولانا ومفتی اسماعیل کچھولوی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مفتی: جامعہ حسینیہ، راندیر، سورت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمده و نصلی علی رسوله الكريم، أما بعد!

محترمی ومکرمی جناب حافظ اسجد صاحب

بعد سلام مسنون، امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوگا، آپ کی طرف سے مرسلہ ہدیہ ''فتاویٰ فلاحیہ'' پہلی، دوسری اور تیسری جلد موصول ہوکر موجب منت ہوئی، اللہ جل شانہٗ دارین میں بہت ہی بہتر جزاء خیر نصیب فرمائے۔

حضرت الاستاذ حضرت مولانا مفتی احمد صاحب بیمات -نوراللہ مرقدہ و برد مضجعہ- کے فتاویٰ کی زیارت کر کے بہت ہی زیادہ دلی مسرت وشادمانی ہوئی، حضرت کے اخلاص اور قبولیت ہی کی نشانیوں میں سے میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دنیا سے پردہ کرنے کے باوجود ان کے فیض کو جاری اور ساری رکھا ہے، اور آپ حضرات کے لیے بھی بہت ہی سعادت کی بات ہے کہ آپ لوگوں نے والد کے حق کو ادا کر دیا، بلکہ اچھے طریقے سے اجاگر کیا۔

ظاہر بات ہے کہ فتاویٰ اکثر گجراتی میں ہوں گے، اس کا اتنا بہتر، عمدہ، سلیس اردو میں ترجمہ کرنا اور

سب جوابوں کو فقہ کی کتابوں کے حوالہ جات سے مزین کرنا واقعی بہت اہم اور نازک کام ہے، جو آپ حضرات نے کیا، جب آدمی مخلص ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے معاونین بھی ایسے ہی مہیا کر دیتا ہے۔

طباعت، ترتیب، دیدہ زیبی؛ کسی میں کوئی کمی نہیں، بلکہ فوقیت ہی فوقیت ہے، اللہ تعالیٰ شرف قبولیت سے نوازے، ذخیرۂ آخرت اور صدقہ جاریہ بنائے، آمین۔

اللہ کرے بقیہ حصے اور اچھی طرح اور آسانی کے ساتھ طبع ہو کر ہم لوگوں کے لیے ممد و معاون ہو، والسلام۔

العبد اسماعیل کچھولوی غفرلہ
۲۱ رصفر المظفر ۱۴۳۹ھ
۲۰۱۷/۱۱/۱۱

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

تقریظ وکلمات تحسین

از: حضرت اقدس مولانا ابراہیم پانڈور صاحب دامت برکاتہم

خلیفہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ وخادم خاص حضرت فقیہ الامتؒ

الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی أما بعد.

قرآن کریم نے شریعت سے ناواقف مؤمنین کو اہل ذکر (یعنی قرآن وحدیث اور شریعت مطہرہ کے ماہرین) سے رہبری حاصل کرنے کا حکم فرمایا ہے، تاکہ مرضی الٰہی کے مطابق زندگی گزار کر دارین کی سعادت حاصل ہو سکے، ارشاد ربانی ہے: "فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" (النحل: ۴۳) اِس حکم خداوندی کی تعمیل میں امت مسلمہ ہمیشہ ماہرین شریعت سے پوچھ پوچھ کر زندگی گزارتی رہی ہے، حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم براہ راست حضرت سید المرسلین علیہ الصلاۃ والسلام سے احکام ومسائل دریافت کر کے اُن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گزارتے تھے، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے تابعین عظام، اُن سے تبع تابعین، اُن سے اُن کے بعد والے اِسی طرح بعد میں آنے والے اپنے پیش رو علماء وفقہاء سے مسائل دریافت کر کے عمل کرتے رہے، اور سوال وجواب کا یہ سلسلہ قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک تسلسل کے ساتھ جاری ہے، کچھ پاک طینت سعادت مند نفوس ایسے بھی ہوئے کہ عمل کے ساتھ ساتھ احکامِ شریعت کو بعد والوں کے افادے کی خاطر تحریری شکل میں محفوظ بھی کرتے رہے، اِس طرح فتاویٰ کی شکل میں علوم اسلامی کا

ایک عظیم الشان ذخیرہ امت کے نفع کے لیے وجود میں آتا رہا، اور دنیا اُن سے فیض یاب ہوتی رہی۔

زیر نظر فتاویٰ فلاحیہ بھی اُسی زریں سلسلے کی ایک عظیم کڑی ہے، جو گجرات کے مشہور و معروف با فیض عالم دین، اکابرین دیو بند کے فکروں کے امین، عظیم مصلح و مفکر حضرت مولانا مفتی احمد بیمات صاحبؒ کے علوم و معارف سے بھر پور گجراتی فتاویٰ کے اردو ترجمے کا مجموعہ ہے، جن کی ترتیب، تحقیق، تخریج اور نظر ثانی کا کام باہمت جواں سال فاضل جناب مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی صاحب (استاذ حدیث وفقہ و مفتی دار العلوم ماٹلی والا بھروچ گجرات) بڑی دیدہ ریزی و جانفشانی سے انجام دے رہے ہیں، جس کے لیے موصوف بجا طور پر ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں، کتاب کی عظمت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ: کئی نامی گرامی اکابر علماء و اہم شخصیات؛ جیسے: محقق عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مفکر ملت حضرت مولانا عبد اللہ صاحب کاپودروی، اور مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری وغیرہم نے اپنی تائیدی تحریرات و تقریظات کے ذریعے انتہائی وقیع الفاظ میں حوصلہ بخش انداز میں مرتب موصوف کی سراہنا کرتے ہوئے، صاحب فتاویٰ کی خدمت میں زبردست خراج تحسین پیش کی ہے، بڑی مسرت کی بات ہے کہ: عزیزم حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات صاحب زید مجدہ انتہائی فکر و لگن کے ساتھ اِن فتاویٰ کی نشر و اشاعت کا انتظام کر رہے ہیں، دل سے دعاء کرتا ہوں کہ: حق تعالیٰ شانہ حضرت مفتی احمد بیمات صاحب نور اللہ مرقدہ کے اِس علمی فیض سے امت مسلمہ کو زیادہ سے زیادہ مستفیض فرما کر اُن کے حق میں صدقہ جاریہ بنائے، اور مترجمین، مرتبین، ناشرین اور تمام معاونین کو اپنی شایان شان بہترین بدلہ نصیب فرمائے۔ آمین یارب العٰلمین۔

ابراہیم پانڈور عفی عنہ
وارد حال دہلی
۲ رذی الحجہ ۱۴۳۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین، أما بعد.

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ہی نبوت کا دروازہ بند ہوگیا اور کارِ نبوت کی ذمہ داری علماء امت کے کندھوں پر ڈالی گئی، علماء امت نے اس بارِ گراں کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور ہر زمانے میں اسلام کی مختلف جہات سے خدمت کی، اکابر دیوبند کو اللہ تعالیٰ نے اس اعتبار سے امتیازی شان عطا فرمائی، جنہوں نے دین کی تمام جہت کو، اور دنیا کے ہر خطے اور اسلام کے ہر گوشے کو اپنی خدمت کا میدان بنایا، اور ہر طرح کی جد و جہد اور محنت سے اسلام اور اسلامی تعلیمات کو عام کیا۔

انہیں اکابر میں والد گرامی حضرت مولانا و مفتی احمد ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی تھی، جنہوں نے دین کے مختلف شعبوں کے ذریعے علوم اسلامی کی اشاعت کی ہر ممکن کوشش فرمائی؛ اسی سلسلے کی مضبوط کڑی حضرت والا کی فتاویٰ نویسی کی خدمت ہے، جسے آپ نے طویل عرصے تک دار العلوم فلاح دارین، ترکیسر، جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل اور اپنے قائم کردہ ادارہ دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی، رویدرا میں انجام دیا۔

آپ کے فتاویٰ، مختلف رجسٹروں میں موجود تھے، خدشہ تھا کہ کہیں ضائع نہ ہوجائیں اور امت، حضرت والا کی ایک انتہائی اہم علمی خدمت سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہوجائے، بس اسی جذبے کے تحت اس ناچیز نے والد گرامی کی بیش قیمت متعدد کتابوں کی طباعت کا بیڑا اٹھانے کے ساتھ ساتھ، آپؒ کے فتاویٰ کی نشر و اشاعت کا انتہائی مشکل کام اپنے ذمے لیا، اللہ کے فضل و کرم سے حضرت والد گرامیؒ کے فتاویٰ ’’فتاویٰ فلاحیہ‘‘ کے نام سے اب تک تین جلدوں میں شائع کیے گئے، زیر نظر کتاب ’’فتاویٰ فلاحیہ‘‘ کی چوتھی جلد ہے، جسے علماء اور باذوق قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

یہ جلد سات سو سے زائد صفحات اور ۵۰۰ رسے زائد مسائل پر مشتمل ہے، روزہ، حج اور قربانی وعقیقہ کے مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

پہلی جلد کی طباعت کے بعد بہت سے اکابر علماء اور شائقین نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا، حوصلہ افزا کلمات کہے، اور تمام جلدوں میں اسی معیار کو برقرار رکھنے کی تاکید کی، دوسری اور تیسری جلد میں بھی اس معیار کو برقرار رکھا گیا، اور اس چوتھی جلد میں بھی اس کے معیار سے سمجھوتا نہیں کیا گیا ہے؛ اس لیے توقع ہے کہ ان شاء اللہ اس سے امت کو بڑا فائدہ ہوگا۔

اس موقع پر میں شکر گذار ہوں مشہور عالم دین، والد گرامی کے فیض یافتہ، حضرت مولانا ومفتی اسماعیل کچھولوی صاحب دامت برکاتہم کا، کہ انھوں نے اپنی قیمتی تحریر عنایت فرمائی۔

میں مشکور ہوں، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کے مجاز بیعت اور فقیہ الامت حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ کے خادم خاص حضرت مولانا ابراہیم پانڈور صاحب کا کہ انہوں نے اس کام کی تحسین فرما کر حوصلہ افزائی فرمائی۔

نیز میں ممنون ہوں مرتب فتاویٰ حضرت مفتی مجتبیٰ حسن قاسمی صاحب کا، کہ انھوں نے انتہائی جاں فشانی کے ساتھ فتاویٰ کی ترتیب ونظر ثانی کا کام انجام دیا، اور معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کے لیے ہر طرح کی سعی وکوشش کو بروئے کار لائے، اللہ تعالیٰ انھیں اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے۔

قارئین کے علم میں یہ بات ہوگی کہ والد گرامی کے بیشتر فتاویٰ گجراتی زبان میں تھے، مختلف علماء کے ذریعے ترجمے کرائے گئے، میں ان تمام علماء کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں ان اہل خیر حضرات کا شکریہ ادا نہ ہوں، جنہوں نے اپنی جائز آمدنی اور حلال مال سے ہمارا تعاون فرمایا، اللہ ہر ایک کی جائز تمنا پوری فرمادے اور فتاویٰ فلاحیہ کو مفتی صاحب کی دیگر تصانیف کی طرح شرف قبولیت سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

۲۲ رربیع الاول ۱۴۳۹ھ
موافق: ۱۱ ردسمبر ۲۰۱۷ء

(حافظ) اسجد بن مفتی احمد بیمات
رکن منتظمہ: دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی، بھروچ، گجرات
خادم القرآن: مسجد عمر، ہیملٹن، کینیڈا
e-mail:hafizasjed@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مرتب

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین، أما بعد!

فتاویٰ فلاحیہ کی چوتھی جلد پیش خدمت ہے، شکر گذاری کے اس موقع پر احقر بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہے کہ اس نے اس کم سواد کو "فتاویٰ فلاحیہ" کے اِس اہم علمی سلسلہ کو جاری رکھنے کی توفیق بخشی، ورنہ تو یہ کسی بھی لائق نہیں ہے، دعاء ہے کہ جس نے توفیق بخشی ہے، وہی اسے قبولیت بھی عطا فرمادے، اور بقیہ جلدوں کی تکمیل کی ہمت بھی، **وما ذلك عليه بعزيز.**

"صوم واعتکاف، حج اور قربانی وعقیقہ" سے متعلق ۲۹/ابواب، ساڑھے پانچ سو سے زائد سوال و جواب، اور سات سو پینتالیس [745] صفحات پر مشتمل اس چوتھی جلد کو احقر نے اپنی وسعت کے مطابق خوب سے خوب تر بنانے کی سعی کی ہے، کوشش کی ہے کہ کوئی مسئلہ حوالے کے بغیر نہ رہے، نصوص کے ذکر کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، اور ان تمام امور کا لحاظ کیا گیا ہے، جن سے پہلی، دوسری اور تیسری جلد مزین ہے۔

عام طور پر اکابر علماء کی تحریر وفتاویٰ میں حوالے کا اہتمام نہیں ہوتا تھا یا برائے نام حوالے درج کیے جاتے تھے، کہیں صرف کتاب کے نام پر اکتفا کیا جاتا، تو کہیں عبارت کا مفید مطلب ٹکڑا لکھ دیا جاتا، عموماً یہی طریقہ ان کے عہد میں رائج تھا اور باعث اطمینان بھی، عوام کے لیے عبارت اور حوالے کی ضرورت نہ تھی، اور اہل علم کا اشتغالِ علم، اس درجے کا تھا کہ اشارے سے اصل مسئلے تک پہنچ جاتے تھے۔ ادھر علمی انحطاط آیا اور اشتغال علم کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی، جو اکابر کا حصہ تھی؛ اس لیے حوالے کے طور پر طویل عبارت لکھنے کا رواج چل پڑا، اور آج کی ذرائع مواصلات کی ترقی یافتہ دنیا میں عوام بھی بغیر حوالے کے کسی بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

ناچیز نے اسی کے پیش نظر تفصیلی عبارت، اوراس پر کی گئی علمی بحث کو ذکر کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے، سیاق وسباق کے ساتھ عبارت اس انداز میں نقل کی گئی ہے کہ اصل کتاب کی جانب رجوع کی ضرورت باقی نہ رہے۔ بعض ذہین اور نازک طبیعتوں کے لیے یہ طرز گرچہ باعث کلفت ہے، لیکن احقر کی ذکر کردہ وجہ سے وہ مطمئن ہو جائیں گے، ان سب کے باوجود اگر علم وتحقیق کے راہ رو کو یہ انداز ہضم نہ ہو، تو وہ یہ سوچ کر اس حقیر کو معذور سمجھیں کہ:

وللناس فیما یعشقون مذاھب.

تخریج وتعلیق کا ایک اہم مقصد تسہیل ہے، اس لیے کسی مسئلہ کی متعلقہ عبارت اگر ماقبل میں آگئی ہے، تو صرف پچھلے حوالے کی جانب رجوع کا مشورہ نہیں دیا گیا ہے؛ بل کہ موقع کی مناسبت سے اسے [**بعض مقامات پر**] دوبارہ درج کردیا گیا ہے، اس کی وجہ سے تکرار ضرور پیدا ہوتا ہے، لیکن فی نفسہ اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا سکتا۔

چوتھی جلد پریس کے حوالے کی جارہی ہے، اس موقع پر میرے کرم فرما مفکر ملت، **حضرت مولانا عبد اللہ کاپودروی** دامت برکاتہم سخت علیل ہیں، حضرت والا کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہم جیسے نوجوان فضلاء کے معمولی کام کی بھی بڑی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، جس سے تحریک پاکر آدمی یکسو ہو جاتا ہے، کام میں جی لگتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ کام کیا گیا ہے، اس کی بھی اہمیت ہے، ابھی پچھلے دنوں عیادت کی غرض سے حاضری ہوئی، حضرت والا کی طبیعت ایسی نہیں تھی کہ کوئی بات ہو، بس سلام ودعا پر اکتفا کیا گیا؛ لیکن اس دوران بھی حضرت والا نے پوچھ لیا کہ کام کہاں تک پہنچا، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد صحت کاملہ عطا فرمائے اور ان کا سایہ تادیر امت مسلمہ پر باقی رکھے، آمین۔

میں شکر گذار ہوں دار العلوم اسلامیہ عربیہ، ماٹلی والا کے عالی وقار مہتمم وشیخ الحدیث، **حضرت مولانا اقبال بن محمد ٹنکاروی** دامت برکاتہم کا، جنہوں نے علمی کام کرنے کا انتہائی خوش گوار ماحول فراہم کیا ہے اور موقع بہ موقع فتاویٰ کے بارے میں معلوم کرتے رہتے ہیں کہ کام کس مرحلے میں ہے۔ لکھنے پڑھنے والوں پر یہ مخفی نہیں کہ آج کے ماحول میں-جب کہ علمی ذوق ختم ہوتا جارہا ہے- کسی ادارے کے ذمہ دار اعلیٰ کا، کسی علمی کاز کے بارے میں یہ دریافت کرنا کہ وہ کس مرحلے میں ہے، کام کرنے والے کے لیے کسی اکسیر سے کم نہیں، اس سے ہمت جوان ہوتی ہے اور کام کرنے والوں میں نیا جوش وجذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے، آمین۔

میں ممنون ہوں صاحب نظر عالم دین ومفتی، اکابر کے نور نظر، حضرت شیخ الحدیث کے فیض یافتہ حضرت مفتی اسماعیل کچھولوی دامت برکاتہم (شیخ الحدیث وصدر مفتی: جامعہ حسینیہ-راندیر، سورت) کا، کہ انہوں نے خط لکھ کر حوصلہ افزائی فرمائی، اسی طرح میں ممنون ہوں فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے خادم خاص اور شیخ الحدیثؒ کے مجاز بیعت،

حضرت مولانا ابراہیم پانڈور صاحب دامت برکاتہم کا، کہ انہوں نے کلمات تحسین کے ذریعے حوصلہ افزائی فرمائی۔

نیز ممنون ہوں دار العلوم سعادت دارین، ستپون کے شیخ الحدیث اور مولانا پانڈوور صاحب کے خلیفہ، حضرت مولانا شوکت علی قاسمی بھاگل پوری صاحب کا، کہ وہ مولانا پانڈور صاحب کی قیمتی تحریر کے حصول کا ذریعہ بنے اور فتاویٰ کی ترتیب میں ذاتی طور پر متعدد امور کی جانب نشان دہی فرمائی، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

میں اپنے کرم فرما جناب حافظ اسجد مفتی احمد بیمات صاحب کا دل کی اتھاہ گہرائی سے شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ انہوں نے وقفے وقفے سے کام کا تقاضہ کیا، ان کے خلوص اور پیہم تقاضے کی وجہ سے یہ جلد بھی تمام ہوئی، اللہ تعالیٰ انھیں بہترین بدلہ عطا فرمائے، ان کے اہل خانہ اور بیمات فیملی کو دینی و دنیوی ترقیات سے نوازے، آمین۔

دار العلوم اسلامیہ، بلتھر اروڈ، بلیا، ضلع یوپی کے استاذ، وسیع النظر عالم، میرے رفیق درس حضرت مولانا مفتی شمشیر حیدر صاحب کا تہِ دل سے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر کتاب الاضحیہ والعقیقہ کے بیشتر مسائل کی عمدہ تخریج فرمائی، اللہ تعالیٰ ان کو اس کا اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیشتر فتاویٰ گجراتی زبان میں تھے، مفتی اسعد صاحب پالن پوری (استاذ و مفتی: دار العلوم مرکز اسلامی انکلیشور) کے توسط سے گجرات کے مختلف علماء سے ترجمہ کرایا گیا، پھر ناچیز کو اس کی تخریج و ترتیب کی ذمہ داری سونپی گئی، ناچیز نے نہج متعین کیا اور اسی کے مطابق متعدد ابواب و کتاب کی تخریج، متعدد باصلاحیت علماء و فضلا سے کرائی گئی، جن علماء نے تخریج کا کام انجام دیا ہے، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

[۱] **مفتی اُسامہ قاسمی پالن پوری** (استاذ: جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل) [۲] **مفتی محمد نعمان قاسمی حنفی** (استاذ حدیث: دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی، رویدرا) [۳] **مولانا حسین احمد قاسمی** (استاذ حدیث وادب: دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی) [۴] **مولانا اکرام الحق قاسمی** (سابق استاذ حدیث: دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی) [۵] **مولانا الطاف سنجیواڑہ** (استاذ: دار العلوم، سوجترا) [۶] **مفتی رفیق صاحب** (استاذ: دار العلوم کرمالی وامام وخطیب کرمالی) [شاید ان کے علاوہ اور بھی چند علماء ہوں، جن کا نام رہ گیا ہو]

تخریج کے مرحلے کے بعد، اہم کام تحقیق، نظر ثانی اور پورے فتاویٰ کی زبان میں یکسانیت پیدا کرنے کا تھا، جسے ناچیز اپنی بساط کے مطابق انجام دے رہا ہے، بعض مسائل کی تخریج باقی رہ گئی تھی، طلبہ کی مدد سے ان کی تخریج کرائی جارہی ہے، بس دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو اپنی رضا اور خوش نودی کا باعث بنائے، آمین۔

چوتھی جلد کی تحقیق و تخریج اور تصحیح کے دوران دار العلوم ماٹلی والا کے شعبۂ تخصص فی الفقہ کے طلبہ (مولوی

محمد سلمان بن منور، احمد آبادی ☆ مولوی شاداب بن اسلم، احمد آبادی ☆ مولوی محمد حسین بن عبد القادر، ہمت نگر ☆ مولوی اظہار الحق بن حافظ شبیر احمد، اورنگ آبادی ☆ مولوی سید حذیفہ بن سید ابرار، مہوا ☆ مولوی محمد معاویہ بن مولانا عبد المجید مظاہری، احمد آبادی ☆ مولوی عبد الجبار بن عبد السلام ☆ مولوی صادق بن مولانا عبد الغفار قاسمی، پالن پوری ☆ اور یاسین بن مولانا عبد اللطیف انجار، کچھ) نے حوالہ جات کی تخریج اور پروف ریڈنگ میں تعاون کیا، اللہ تعالیٰ ان میں علمی ذوق پیدا فرمائے، اور مستقبل میں علمی مشغلہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

احقر کے لیے یہ بات بلا شبہ قابل مسرت ہے کہ بعض علماء فتاویٰ کو حرفاً حرفاً پڑھتے ہیں اور ناچیز کی جانب سے درآئی کمی کی نشان دہی فرماتے ہیں، ایسا ہی ایک تفصیلی فون دار القرآن والحدیث، ٹنکاریہ کے استاذ مولانا یعقوب صاحب صغیر ولنوی کا آیا، ان سے ایک مجلس میں ملاقات بھی ہوئی تھی اور انہوں نے ''فتاویٰ فلاحیہ'' کے تعلق سے اپنے گراں قدر تأثر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''مولانا! میں نے مطالعہ کے دوران فتاویٰ فلاحیہ کے بعض مقامات پر علامت ونشانی لگا رکھی ہے کہ جب بھی موقع ملے گا، تو آپ کو اس سے مطلع کروں گا''۔ میں نے کہا کہ ضرور مطلع فرمائیں۔

مولانا نے حسب وعدہ دوسری جلد کے دس بارہ مقامات کی نشان دہی کی، جہاں تقدیم وتاخیر یا اجمال کی وجہ سے بات مکمل واضح نہیں تھی، میں مولانا کا مشکور ہوں اور بتا نہیں سکتا کہ ان کے اس عمل سے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے، ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں اس میں مناسب ترمیم کردی جائے گی، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

اہل ذوق سے درخواست ہے کہ اس میں اگر کوئی غلطی درآئی ہو، تو اسے اس حقیر کی جانب سے سمجھیں اور بلا تکلف مطلع فرمائیں، حقیر ممنون ہوگا۔

مجتبیٰ حسن قاسمی

خادم حدیث وفقہ: دار العلوم اسلامیہ عربیہ، ماٹلی والا، بھروچ

برائے رابطہ: 09409518452

Email: qasmimujtaba@gmail.com

مورخہ: ۲۲/ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

۱۱/دسمبر ۲۰۱۷ء، بہ روز: پیر

کتاب الصوم والاعتکاف

روزے اور اعتکاف کا بیان

عن أبي هريرة رضي الله عنه، يقول: قال النبي -صلى الله عليه وسلم-: أو قال: قال أبو القاسم صلى الله عليه وسلم: صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فإن اغمي عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين. (صحيح البخاري: ۱/۲۵۶، رقم الحديث: ۱۹۰۹، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: إذا رأيتم الهلال فصوموا، وإذا رأيتموه فأفطروا، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/۳۴۷، رقم الحديث: ۱۷-(۱۰۸۱)، كتاب الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، والفطر لرؤية الهلال... الخ، ط: ديوبند)

باب رؤية الهلال واختلاف المطالع

[رؤیت ہلال اور اختلاف مطالع کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب رؤية الهلال واختلاف المطالع

[رؤیت ہلال اور اختلاف مطالع کا بیان]

[۱] ایک ملک میں چاند نظر آنے پر، دوسرے ملک کے لیے صوم و افطار کا حکم

۱۴۸۸- سوال: بعض لوگ ایسا کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالی نے پوری دنیا میں چاند تو ایک ہی پیدا کیا ہے؛ لہٰذا دنیا کے جس کونے میں بھی چاند نظر آجائے، وہاں سے آنے والی خبر کا اعتبار دوسرے لوگوں کو کر لینا چاہیے اور اس کے مطابق رمضان و عید منانا چاہیے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

چاند تو اللہ رب العزت نے ایک ہی پیدا کیا ہے، لیکن اس کے دِکھنے میں اختلاف ہوتا ہے، چناں چہ ایک دن وہ بعض جگہوں پر تو نظر آتا ہے، اور بعض جگہوں پر نظر نہیں آتا، یہ ایک قدرتی اختلاف ہے کہ کسی جگہ ایک دن پہلے نظر آجاتا ہے اور کسی جگہ ایک دن کے بعد، جہاں جب چاند نظر آئے گا، وہاں اسی دن اس کا اعتبار کیا جائے گا۔[1]

(۱) لأن كل قوم مخاطبون بما عندهم وانفصال الهلال عن شعاع الشمس يختلف باختلاف الأقطار كما أن دخول الوقت وخروجه يختلف باختلاف الأقطار حتى إذا زالت الشمس في المشرق لا يلزم منه أن تزول في المغرب، وكذا طلوع الفجر وغروب الشمس بل كلما تحركت الشمس درجة فتلك طلوع فجر لقوم وطلوع=

یہ ایسا ہی ہے، جیسے کہ سورج کے ایک ہونے کے باوجود کسی جگہ فجر کی نماز ادا کی جارہی ہے اور کسی جگہ ظہر کی نماز، تو کسی جگہ عصر اور مغرب کی نماز پڑھی جارہی ہے، چناں چہ سعودی عرب میں صبح صادق ہونے سے ہندوستان اور پاکستان والوں کے لیے فجر کی نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

ٹھیک اسی طریقے سے جہاں چاند نظر آیا ہے، وہاں کے لوگوں کے لیے رمضان اور عید منانا تو جائز ہے اور جہاں چاند نظر نہیں آیا ہے، وہاں کے لوگوں کے لیے اپنے پڑوس والے ملکوں کی خبروں اور گواہی کا اعتبار کرتے ہوئے رمضان اور عید کا منانا جائز ہے؛ البتہ دو ملکوں کے درمیان ایک دن کا فاصلہ ہو، تو وہاں ایک دوسرے کی رؤیت کا اعتبار کرنا درست نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] انگلینڈ میں چاند کا مسئلہ

۱۴۸۹-سوال: انگلینڈ میں پوری دنیا کے لوگ بستے ہیں، جس کی وجہ سے مسائل میں بہ کثرت اختلافات ہوتے ہیں، ان اختلافی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ چاند کا بھی ہے۔

یہاں انگلینڈ والوں کا کہنا یہ ہے کہ سعودی عرب ہمارا مرکز ہے؛ اس لیے اسی کے حساب سے چلنا چاہیے، جب کہ انڈین حضرات کہتے ہیں کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو؛ لیکن مشکل یہ ہے کہ انگلینڈ میں چاند دکھائی نہیں دیتا۔

سن ۱۹۷۷ء میں ''حج'' سنیچر کو ہوا تھا، جس کا اعتبار کرتے ہوئے کچھ حضرات نے دوسرے دن یعنی اتوار کو عید الاضحیٰ منائی تھی، جب کہ اکثر [تقریباً نوے فی صد] حضرات نے منگل کو عید قرباں منائی تھی،

=شمس لآخرين وغروب لبعض ونصف ليل لغيرهم. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م:۷۴۳هـ):۳۲۱/۱، كتاب الصوم، قبيل: باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة★ درر الحكام شرح غرر الأحكام- محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م:۸۸۵هـ):۲۰۱/۱، كتاب الصوم، قبيل: باب موجب الإفساد، ط: دار إحياء الكتب العربية)

(۱) وفي "القدوري" إذا كان بين البلدتين تفاوتاً لا تختلف المطالع لزم حكم إحدى البلدتين حكم البلدة الأخرى، فأما إذا كان تفاوتاً تختلف المطالع لم يلزم إحدى البلدتين حكم البلدة الأخرى. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني -أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶هـ):۳۷۹/۲، كتاب الصوم، الفصل الثاني فيما يتعلق برؤية الهلال، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسی اختلافی صورت میں صحیح کیا ہے؟ شریعت اس سلسلہ میں کیا رہنمائی کرتی ہے؟ یعنی چاند کے مسئلہ میں کس حساب کا اعتبار کرنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: "صوموا الرؤیته وأفطروا الرؤیته" [۱] پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر انگلینڈ میں بادل کی وجہ سے چاند نظر نہ آتا ہو، تو قریبی ممالک مثلاً: مراکش وغیرہ کے چاند کا اعتبار رہوگا۔ [۲] اگر وہاں سے چاند کے متعلق گواہی آجائے یا خبر متواتر سے یقین حاصل ہوجائے کہ چاند ہوگیا ہے، تو اس کے مطابق چاند کا فیصلہ کرلینا جائز ہے۔ [۳] سعودی عرب کے چاند کے حساب سے اہل انگلینڈ کو عید کرنا جائز نہیں۔ [۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه، يقول: قال النبي -صلى الله عليه وسلم-: أو قال: قال أبو القاسم صلى الله عليه وسلم: صوموا الرؤيته وأفطروا الرؤيته، فإن اغمي عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين. (صحيح البخاري: ۲۵۶/۱، رقم الحديث: ۱۹۰۹، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: إذا رأيتم الهلال فصوموا، وإذا رأيتموه فأفطروا، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۳۴۷/۱، رقم الحديث: ۱۷-(۱۰۸۱)، كتاب الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، والفطر لرؤية الهلال... الخ، ط: ديوبند)

(۲) وفي "القدوري" إذا كان بين البلدتين تفاوتاً لا تختلف المطالع لزم حكم إحدى البلدتين حكم البلدة الأخرى، فأما إذا كان تفاوتاً تختلف المطالع لم يلزم إحدى البلدتين حكم البلدة الأخرى. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني -أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۳۷۹/۲، كتاب الصوم، الفصل الثاني فيما يتعلق برؤية الهلال، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۳) وذكر شمس الأئمة الحلواني: أن الصحيح من مذهب أصحابنا رحمهم الله أن الخبر إذا استفاض، وتحقق فيما بين أهل البلدة الأخرى يلزمهم حكم أهل هذه البلدة الأخرى. (المصدر السابق، وانظر: الفتاوى التاتارخانية: ۳۶۶/۳، كتاب الصوم، الفصل: رؤية الهلال، ت: شبير أحمد القاسمي، ط: زكريا- ديوبند☆مجمع الأنهر: ۳۵۰/۱، كتاب الصوم، ط: مكتبة فقيه الأمة- ديوبند☆ رد المحتار على الدر المختار: ۳۵۹/۳، زكريا- ديوبند)

(۴) اس مسئلے کی بنیاد درحقیقت ایک دوسرے مسئلے پر ہے، اور وہ یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا شرعاً اعتبار ہوگا یا نہیں؟

یہ مسئلہ متقدمین ومتاخرین کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے، اس سلسلے میں فقہاء کرام کے تین اقوال ہیں:

۱- امام اعظمؒ سے منقول ہے اور ظاہر الروایہ بھی یہی ہے، نیز بیشتر فقہاء احناف نے اسی کو مفتیٰ بہ قرار دیا ہے کہ اختلاف مطلع کا کوئی اعتبار نہیں۔ [ظاہر ہے کہ اس کو پوری دنیا میں نافذ کرنے میں بڑی مشکلات پیش آئیں گی، اور بدیہیات ومشاہدات کے خلاف بھی ہے]

۲- ہر جگہ اور ہر حال میں اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ [یہ قول بھی قابل عمل نہیں]

بقیہ اگلے صفحہ پر

گذشتہ صفحہ کا:

۳- بلاد قریبہ میں تو اس کا اعتبار نہیں، البتہ بلاد بعیدہ میں معتبر ہے۔ بلاد قریبہ و بعیدہ کا مدار عرف کو قرار دینا چاہیے کہ اکثر بلاد شمالیہ و بلاد جنوبیہ میں اختلافِ مطالع ہوتا ہے، جنوب میں چاند نظر آتا ہے اور شمال میں نظر نہیں آتا۔

اس تیسرے قول کو علامہ زیلعی اور صاحب بدائع نے اختیار کیا ہے۔

علماء دیوبند کی رائے بھی یہی ہے اور اسی کے مطابق ان کا عمل ہے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: ہمارے استاذ محترم حضرت سید محمد انور شاہ کشمیریؒ بھی اسی کی ترجیح کے قائل تھے، اور استاذ محترم مولانا شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم میں اسی قول کو ترجیح دینے کے لیے ایک ایسی چیز کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس پر نظر کرنے کے بعد اس قول کی ترجیح واضح ہو جاتی ہے، خصوصا اس زمانے میں، جب کہ مشرق و مغرب کے فاصلے چند گھنٹوں میں طے ہو رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ قرآن و سنت میں یہ بات منصوص و قطعی ہے کہ کوئی مہینہ انتیس دن سے کم اور تیس دن سے زائد نہیں ہوتا، بلاد بعیدہ اور مشرق و مغرب کے فاصلوں میں اگر اختلاف مطالع کو نظر انداز کر دیا جائے، تو اس نص قطعی کے خلاف یہ لازم آئے گا کہ کسی شہر میں اٹھائیس کو بعید ملک میں اس کی شہادت پہنچ جائے کہ آج وہاں چاند دیکھ لیا گیا ہے، تو اگر اس شہر کو دوسرے کے تابع کیا جائے، تو اس کا مہینہ اٹھائیس کا رہ جائے گا، جو شریعت کے مقرر کردہ حساب سے کم یا زیادہ بن جاتا ہے، جو صحیح نہیں۔

حضرت علامہ عثمانیؒ کی تحقیق سے اس کا فیصلہ بھی ہو گیا کہ بلاد قریبہ اور بلاد بعیدہ میں قرب و بعد کا معیار کیا اور کتنی مسافت ہوگی، وہ یہ ہے کہ جن بلاد میں اتنا فاصلہ ہو کہ ایک جگہ کی رویت کا دوسری جگہ اعتبار کرنے کے نتیجے میں مہینے کے دن اٹھائیس رہ جائیں، یا اکتیس ہو جائیں، وہاں اختلاف مطالع کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور جہاں اس قدر فاصلہ نہ ہو، وہاں نظر انداز کر دیا جائے گا۔ (رؤیت ہلال، ص: ۵۸-۵۹، ط: دار المعارف، کراچی، ملخصا)

علامہ زیلعیؒ نے بڑی تفصیل سے اس مسئلے کو تحریر فرمایا ہے، نیز دلیل دیتے ہوئے ایک حدیث پاک کا ذکر کیا ہے، عبارت طویل ہے، تاہم مفید ہے، اور حضرت مفتی محمد شفیع عثمانیؒ کی ذکر کردہ باتوں کی بنیاد بھی ہے، ان کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

قال - رحمه الله - (ولا عبرة باختلاف المطالع) وقيل يعتبر، ومعناه أنه إذا رأى الهلال أهل بلد، ولم يره أهل بلدة أخرى، يجب أن يصوموا برؤية أولئك كيفما كان على قول من قال لا عبرة باختلاف المطالع، وعلى قول من اعتبره ينظر فإن كان بينهما تقارب بحيث لا تختلف المطالع يجب، وإن كان بحيث تختلف لا يجب، وأكثر المشايخ على أنه لا يعتبر، حتى إذا صام أهل بلدة ثلاثين يوما، وأهل بلدة أخرى تسعة وعشرين يوما، يجب عليهم قضاء يوم.

والأشبه أن يعتبر لأن كل قوم مخاطبون بما عندهم وانفصال الهلال عن شعاع الشمس يختلف باختلاف الأقطار كما أن دخول الوقت وخروجه يختلف باختلاف الأقطار حتى إذا زالت الشمس في المشرق لا يلزم منه أن تزول في المغرب، وكذا طلوع الفجر وغروب الشمس بل كلما تحركت الشمس درجة فتلك طلوع فجر لقوم وطلوع شمس لآخرين وغروب لبعض ونصف ليل لغيرهم.

وروي أن أبا موسى الضرير الفقيه صاحب المختصر قدم الإسكندرية فسئل عمن صعد على منارة =

[۳] رؤیت ہلال: چند مسائل

۱۴۹۰- سوال: (۱) حنفی مسلک میں مطلع کا اختلاف معتبر نہیں لیکن کتنے فاصلہ سے چاند کی خبر و گواہی حاصل ہو، تو رمضان وعید کا چاند تسلیم کر سکتے ہیں؟

(۲) مطلع کا اختلاف طلوع وغروب میں-جس پر نماز کی بنیاد رکھی گئی ہے-معتبر مانا جاتا ہے، اور اسی کے مطابق نماز ادا کی جاتی ہے، کہ کہیں مغرب کی نماز کا وقت ۶ ربجے سے شروع ہوتا ہے تو کہیں ۷ ربجے سے۔

سوال یہ ہے کہ جس طریقہ سے نماز ایک عبادت ہے، اور اس میں اختلاف مطالع کو معتبر مانا گیا ہے،

= الإسكندرية فيرى الشمس بزمان طويل بعدما غربت عندهم في البلد أيحل له أن يفطر فقال لا ويحل لأهل البلد لأن كلا مخاطب بما عنده.

والدليل على اعتبار المطالع ما روي عن كريب أن أم الفضل بعثته إلى معاوية بالشام فقال فقدمت الشام وقضيت حاجتها واستهل علي شهر رمضان وأنا بالشام فرأيت الهلال ليلة الجمعة ثم قدمت المدينة في آخر الشهر فسألني عبد الله بن عباس ثم ذكر الهلال فقال متى رأيتم الهلال فقلت رأيناه ليلة الجمعة فقال أنت رأيته فقلت نعم ورآه الناس وصاموا وصام معاوية فقال لكنا رأيناه ليلة السبت فلا نزال نصوم حتى نكمل ثلاثين أو نراه فقلت أولا نكتفي برؤية معاوية وصيامه فقال لا هكذا أمرنا رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قال في المنتقى رواه الجماعة إلا البخاري وابن ماجه. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ) :۱/۳۲۱، كتاب الصوم، قبيل :باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة★درر الحكام شرح غرر الأحكام- محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (المتوفى:۸۸۵هـ):۱/۲۰۱، كتاب الصوم، قبيل: باب موجب الإفساد، ط: دار إحياء الكتب العربية)

مذکورہ تفصیل سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مکہ معظمہ یا سعودی عرب کی رؤیت صرف انہی علاقوں تک مانی جا سکتی ہے، جہاں اس رؤیت کو تسلیم کر لینے سے ان علاقوں کا مہینہ ۲۹ ردن سے کم یا ۳۰ ردن سے زیادہ کا ماننا لازم نہ آتا ہو، اور مکہ وسعودی عرب سے دور دراز کے وہ علاقے، جہاں مکہ مکرمہ یا سعودی عرب کی رؤیت تسلیم کرنے کی وجہ سے مہینہ میں کمی وبیشی ماننی پڑتی ہو، وہاں مکہ مکرمہ اور سعودی عرب کی رؤیت معتبر نہیں ہوگی، قرآن کریم، سنت نبویہ اور فقہی جزئیات وکلیات کی روشنی میں سعودی عرب کی رؤیت کو ساری دنیا کے لیے معیار قرار دینا، غلط اور نا قابل عمل اور حدیث پاک: "صوموا الرؤيته وأفطروا الرؤيته" کے خلاف ہے۔

شیخ وھبہ زحیلیؒ رقم فرماتے ہیں:

وأجمعوا أنه لا يراعي ذلك في البلدان النائية جدا كالأندلس، والحجاز، وأندونيسا والمغرب العربي. (الفقه الإسلامي وأدلته: ۳/۴۰، دار الفكر)

[مجتبیٰ حسن قاسمی]

اسی طرح روزہ بھی عبادت ہے، تو اس میں بھی اس (اختلاف مطالع) کا اعتبار کیا جانا چاہیے، شرعی اعتبار سے آخر اس میں حرج کیا ہے؟

(۳) آسمان ابر آلود تھا، جس کی وجہ سے رمضان یا عید کا چاند نظر نہیں آیا؛ لیکن بعض گواہی دینے والے موجود ہیں، حالاں کہ وہ عادل نہیں ہیں، بے نمازی ہیں، تو ان کی شہادت معتبر ہوگی یا نہیں؟

(۴) آسمان ابر آلود ہونے کی صورت میں کسی شہر یا کسی دوسری جگہ سے فون کے ذریعہ خبر ملی اور فون پر خبر دینے والا ایک شخص ہے، تو کیا حکم ہے؟

خبر دینے والے کی شناخت نہ ہو، بایں طور کہ ان کی آواز پہچان میں نہ آئے، ایسے ایک دو شخص فون پر گواہی دیں، تو ان کا کیا حکم ہے؟

(۵) مطلع صاف ہے اور معتبر گواہی بھی نہیں ملی؛ لیکن دوسری جگہ سے فون پر خبر ملی کہ ہمارے یہاں کل عید ہے، فون بھی ایک دو آدمیوں کا ہے؛ لیکن فون کرنے والے انجان ہیں، تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ کیا عید کا چاند ثابت مانا جائے گا؟

(۶) فون سے دی ہوئی خبر شہادت کے حکم میں ہے یا خبر کے؟ کیا کسی جگہ سے فون پر خبر ملے کہ "کل ہم روزہ رکھیں گے"، یا "کل ہم عید منائیں گے"، اس طرح کے الفاظ سے ملنے والی خبر کو قبول کر کے رمضان یا عید کا اعلان کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

(۱) حنفی مسلک کے مطابق مشرق کا باشندہ مغرب میں جا کر گواہی دے اور اس میں قبول شہادت کی شرطیں موجود ہوں، تو اس کی گواہی قبول کر لی جائے گی، اس شرط کے ساتھ کہ مہینہ ۲۸ رکا نہ ہونے پائے؛ کیوں کہ اسلامی مہینہ ۲۹ یا ۳۰ کا ہوتا ہے۔[1]

---

[۱] (واختلاف المطالع) ورؤيته نهارا قبل الزوال وبعده (غير معتبر على) ظاهر (المذهب) وعليه أكثر المشايخ وعليه الفتوى بحر عن الخلاصة (فيلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب) إذا ثبت عندهم رؤية أولئك بطريق موجب. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: بطريق موجب) كأن يتحمل اثنان الشهادة أو يشهدا على حكم القاضي أو يستفيض الخبر بخلاف ما إذا أخبر أن أهل بلدة كذا رأوه؛ لأنه حكاية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۹۴، كتاب الصوم، قبيل: باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط: دار الفكر - بيروت ☆ حاشية الطحطاوي، ص: ۶۵۶، كتاب الصوم، فصل فيما يثبت به الهلال، ت: محمد عبد العزيز، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتا وى =

(۲) مطالع کا اختلاف امر مشاہد ہے، کسی جگہ صبح صادق ہے، تو کسی جگہ آفتاب غروب ہو رہا ہوتا ہے، کسی جگہ ظہر کا تو کسی جگہ عصر یا مغرب یا عشاء کا وقت ہوتا ہے، ان باتوں کو معمولی عقل رکھنے والا بھی سمجھتا ہے۔[۲]

نماز ایک عبادت ہے اور اس کے صحیح ہونے کے لیے اور بندہ پر واجب ہونے کے لیے وقت کا ہونا شرط ہے، اس سے پہلے نماز صحیح نہیں ہوگی۔[۳] اسی طرح روزہ کا بندہ کے ذمہ فرض ہونے کے لیے ماہِ رمضان کا ہونا ضروری ہے۔[۴]

ماہ رمضان وشوال کے ثبوت کے لیے شریعت میں کچھ اصول وقانون مقرر ہیں، مثلاً مطلع صاف ہو، تو رمضان وعید ہر دو موقعے کے لیے ''خبر مستفیض'' -یعنی اتنے افراد کا خبر دینا کہ چاند کے ہونے کا یقین ہو جائے- ضروری ہے، اور اگر مطلع صاف نہ ہو، تو ہلال رمضان کے لیے ایک معتبر شخص کی خبر اور ہلال عید کے

=التاتارخانية: ۳/۳۶۶، كتاب الصوم، الفصل الثاني في رؤية الهلال، ط: زكريا- ديوبند☆البحر الرائق: ۲/۲۹۰، كتاب الصوم، بما يثبت شهر رمضان، ط: دار الكتاب الإسلامي☆مجمع الأنهر: ۱/۲۳۹، كتاب الصوم، مايثبت به رمضان، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۲) اعلم أن نفس اختلاف المطالع لا نزاع فيه بمعنى أنه قد يكون بين البلدتين بعد بحيث يطلع الهلال له ليلة كذا في إحدى البلدتين دون الأخرى وكذا مطالع الشمس؛ لأن انفصال الهلال عن شعاع الشمس يختلف باختلاف الأقطار حتى إذا زالت الشمس في المشرق لا يلزم أن تزول في المغرب، وكذا طلوع الفجر وغروب الشمس بل كلما تحركت الشمس درجة فتلك طلوع فجر لقوم وطلوع شمس لآخرين وغروب لبعض ونصف ليل لغيرهم كما في الزيلعي وقدر البعد الذي تختلف فيه المطالع مسيرة شهر فأكثر على ما في القهستاني عن الجواهر. (رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲/۳۹۳، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، مطلب في اختلاف المطالع، ط: دار الفكر -بيروت☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق-عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/۳۲۱، كتاب الصوم، قبيل: باب مايفسد الصوم وما لا يفسده، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة☆درر الحكام شرح غرر الأحكام-محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۱/۲۰۱، كتاب الصوم، قبيل: باب موجب الإفساد في الصوم، ط: دار إحياء الكتب العربية☆مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/۲۳۹، كتاب الصوم، مايثبت به رمضان، قبيل: باب موجب الفساد، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۳) إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ (۴-النساء: ۱۰۳)

(۴) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ. (۲-البقرة: ۱۸۵)

لیے دو معتبر آدمی کی گواہی ضروری ہے۔[۵]

ان تمام صورتوں میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ مہینہ ۲۹/دن سے کم اور ۳۰/دن سے زیادہ کا ہونا لازم نہ آئے، کیوں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی مہینے کے بارے میں فرمایا ہے کہ یا تو ۲۹/کا ہوگا یا ۳۰/کا۔[۶]

نیز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید مناؤ۔[۷]

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بلاد قریبہ میں تو اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں، البتہ بلاد بعیدہ میں معتبر ہے۔ بلاد قریبہ و بعیدہ کا مدار عرف کو قرار دینا چاہیے کہ اکثر بلاد شمالیہ و بلاد جنوبیہ میں اختلافِ مطالع ہوتا ہے، جنوب میں چاند نظر آتا ہے اور شمال میں نظر نہیں آتا۔

اسی قول کو علامہ زیلعی اور صاحب بدائع نے اختیار کیا ہے، علماء دیوبند کی رائے بھی یہی ہے اور اسی کے مطابق ان کا عمل ہے۔[۸]

(۳) فاسق گواہ بننے کے لائق ہے یا نہیں اور اس کی گواہی قابل قبول ہوگی یا نہیں؟ یہ قاضی کی صواب دید پر موقوف ہے، اگر کوئی ایسا شخص ہو، جو ذی وجاہت ہو، معاشرے میں اس کی عزت ہو؛ لیکن اس سے فسق کا کوئی عمل صادر ہوجائے، تو قاضی کے لیے جائز ہے کہ اس کی گواہی قبول کرلے، مثلاً: داڑھی منڈوانے والا، اپنے اس عمل (داڑھی منڈوانے) کی وجہ سے فاسق ہے؛ لیکن ہے وہ امانت دار، کبھی جھوٹ نہیں بولتا، سماج میں عزت و آبرو اور مرتبہ والا ہے، ایسا شخص جب گواہی دے گا اور قاضی اس سے مطمئن ہوگا

---

(۵) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں آنے والا سوال بہ عنوان: ''ریڈیو، تار اور ٹیلی فون وغیرہ کے ذریعہ موصول ہونے والی چاند کی خبریں''

(۶) ابن عمر رضي الله عنهما، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: إنا أمة أمية، لا نكتب ولا نحسب، الشهر هكذا وهكذا، يعني مرة تسعة وعشرين، ومرة ثلاثين. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۵۶، رقم الحديث: ۱۹۱۳، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: لا نكتب ولا نحسب، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۴۷، رقم الحديث: ۱۵-(۱۰۸۰)، كتاب الصوم، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، والفطر لرؤية الهلال، وأنه إذا غم في أوله أو آخره أكملت عدة الشهر ثلاثين يوما، ط: ديوبند)

(۷) عن أبي هريرة رضي الله عنه، يقول: قال النبي -صلى الله عليه وسلم-: أو قال: قال أبو القاسم صلى الله عليه وسلم: صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فإن أغمي عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۵۶، رقم الحديث: ۱۹۰۹، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: إذا رأيتم الهلال فصوموا، وإذا رأيتموه فأفطروا، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۴۷، رقم الحديث: ۱۷-(۱۰۸۱)، كتاب الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، والفطر لرؤية الهلال، ط: ديوبند)

(۸) رؤیت ہلال، ص: ۵۸-۵۹، ط: دار المعارف، کراچی، ملخصاً۔ مزید تفصیل کے لیے سوال سابق ملاحظہ فرمائیں۔

تو گواہی قبول کرسکتا ہے۔[9] ہاں کوئی ایسا ہو، جس کی شکل وصورت شریعت کے مطابق ہے، نماز بھی پڑھتا ہے، حج بھی کر رکھا ہے؛ لیکن شراب پیتا ہے، بے حیائی کے کام کرتا ہے، نشہ آور اشیاء اور شراب کھلم کھلا بیچتا ہے، یا جوا کھیلتا ہے، عوام کے سامنے گالی گلوچ کرتا ہے، تو ایسے شخص کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔[10]

الغرض لوگوں کی نگاہوں سے بچ بچا کر کوئی شراب بیچتا ہو، یا دیگر گناہوں میں ملوث ہو، تو ایسے شخص کو بھی فاسق و فاجر کہا جائے گا؛ اس کو توبہ کرنی چاہیے، البتہ اس کی گواہی قبول کرنے کا قاضی کو اختیار ہے۔

''درمختار'' میں ہے کہ جو شخص چھپ کر گناہ کرتا ہو اور دوسرا شخص اس کو جانتا ہو، تو اس کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کی گواہی دے کر اس کے گناہ کو ظاہر کرے اور اس میں نقص پیدا کرے۔[11]

---

(۹) قال الله تعالى: {يا أيها الذين آمنوا إن جاء كم فاسق بنبإ فتبينوا} [الحجرات:٦] أمر بالتبين، والتثبت لا بالرد حتى إذا غلب على ظنه أنه صادق في الشهادة جاز أن يحكم به وعن أبي يوسف - رحمه الله - أن الفاسق إذا كان وجيها في الناس ذا مروءة تقبل شهادته لعدم تمكن تهمة الكذب في شهادته، لأنه لو جاهته لا يتجاسر أحد على استئجاره لأداء الشهادة ولمروءته يمتنع عن الكذب من غير منفعة له في ذلك. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق- عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ٧٤٣هـ): ٢١٠/٤، كتاب الشهادت، باب ما يشترط للشهادة في ثبوت الولادة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ٥٩٣هـ): ١١٧/٣، كتاب الشهادات، مراتب الشهادات، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ٤٦٦/٣، كتاب الشهادات، الفصل الثاني فيمن لا تقبل شهادته لفسقه، ط: دار الفكر- بيروت)

قال في جامع الفتاوى: وأما شهادة الفاسق، فإن تحرى القاضي الصدق في شهادته تقبل وإلا فلا اهـ فتامل: وفي الفتاوى الحامدية: هذا إذا غلب على ظنه صدقه وهو مما يحفظ درر أول كتاب القضاء، وظاهر قوله وهو مما يحفظ اعتماده اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ٤٦٦/٥، كتاب الشهادات، ط: دار الفكر- بيروت ☆ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع- علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ٥٨٧هـ): ٢٧١/٦، كتاب الشهادة، فصل في شرائط ركن الشهادة، ط: دار الكتب العلمية)

(١٠) ومن يكون معلنا بالفسق فلا مروءة له شرعا فلا يلزم قبول شهادته حتما على وجه لا بد منه. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق: ٢١٠/٤، كتاب الشهادت، باب ما يشترط للشهادة في ثبوت الولادة ☆ الفتاوى الهندية: ٤٦٦/٣، كتاب الشهادات، الفصل الثاني فيمن لا تقبل شهادته لفسقه، ط: دار الفكر- بيروت)

[١١] (وسترها في الحدود أبر) لحديث "من ستر ستر" فالأولى الكتمان إلا لمتهتك، بحر. (الدر المختار مع رد المحتار: ٤٦٤/٥، كتاب الشهادات، ط: دار الفكر- بيروت ★ مجمع الأنهر: ١٨٦/٢، كتاب الشهادات، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ البحر الرائق: ٥٩/٧، كتاب الشهادات، ط: دار الكتاب الإسلامي)

لہٰذا مذکورہ تفصیل کی روشنی میں کہ ایسا فاسق، جو مروت والا ہو، کھلم کھلا گناہ کے کام نہ کرتا ہو، گواہی دے اور قاضی و کمیٹی کے کارکن اس سے مطمئن ہو جائیں، تو اس کی گواہی قبول کرنا جائز ہے۔

(۴) فون پر خبر دی جائے کہ رمضان کا چاند ہو گیا ہے اور سننے والے کو اطمینان ہو جائے، تو خود روزہ رکھ سکتا ہے، البتہ دوسرے لوگوں کو روزہ کا حکم نہیں دے سکتا۔ صورت مسئولہ میں- جب کہ آواز بھی نہیں پہچانی جارہی ہے- جس نے فون پر یہ خبر سنی ہے، اس کے لیے بھی روزہ رکھنا جائز نہیں ہے۔ رمضان سمجھ کر اگلے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ روزہ رکھنے کے لیے چاند کا علم ضروری ہے اور جب آپ اس کو جانتے نہیں، تو اس کی خبر سے آپ کو کیسے یقین حاصل ہوگا۔[۱۲]

(۵) پانچ دس جگہ سے فون کے ذریعے اطلاع آئے کہ چاند ہو گیا ہے، لیکن آپ فون کرنے والے کو نہیں جانتے ہیں، تو عید منانا جائز نہیں ہے۔ ہلالِ عید کے لیے (مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں) دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی، یا شہادت علی الشہادت یا (مطلع صاف ہونے کی صورت میں) خبر مستفیض ضروری ہے۔[۱۳] صورت مسئولہ میں فون سے ہلال عید ثابت نہیں ہوگا، الا یہ کہ اس قدر تواتر سے فون آئے کہ ان کا انکار ممکن نہ ہو۔

(۶) فون سے دی ہوئی خبر ''شہادت'' نہیں ہو سکتی۔ شہادت کے تحقق کے لیے گواہوں کا مجلس میں حاضر ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر گواہی متحقق نہیں ہوگی، خود ہندوستان میں کوئی شخص کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو،

---

(۱۲) قال الشيخ المفتي محمد شفيع -رحمه الله-: إنه لا يلزم لثبوت رمضان الشهادة الشرعية، بل يكفي خبر عدل، الخبر على التلفون معتبر إذا عرف المتكلم، وهو ثقة. (آلات جدیدہ کے شرعی احکام، ص: ۲۰۸، ط: قاسمی کتب خانہ-دیوبند)

حضرت مفتی نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ رقم فرماتے ہیں:

مطلع صاف نہ ہو، اور موقع ہلال رمضان کے ثبوت کا ہو، تو صرف ایک ٹیلی فون بھی اپنے عمل کے لیے کافی ہوگا، مگر دوسروں کو مجبور کرنا یا ان پر زبردستی کرنا درست نہ ہوگا، البتہ ترغیب دے سکتے ہیں۔ (رؤیت ہلال کا شرعی حکم، ص: ۲۵، ط: عظیم بک ڈپو-دیوبند)

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: اور پھر یہ شخص، جو ٹیلی فون پر بول رہا ہے، یہ بھی خوب جانا پہچانا ہو، اور معتبر و متدین شخص ہو، اور اس کی آواز بھی خوب پہچانی جارہی ہو۔ (حوالہ سابق، ص: ۲۴)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: کفایت المفتی: ۴/ ۲۱۶، کتاب الصوم، ط: زکریا-دیوبند ☆ منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/ ۵۰۱، ایفا پبلی کیشنز-نئی دہلی۔

(۱۳) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیں آنے والا سوال بہ عنوان: ''ریڈیو، تار اور ٹیلی فون وغیرہ کے ذریعہ موصول ہونے والی چاند کی خبریں''۔

ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں جا کر ہی اس کو گواہی دینی پڑتی ہے؛ لہٰذا فون کے ذریعے دی ہوئی خبر، گواہی کے حکم میں نہیں ہوگی۔ (۱۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] رؤیتِ ہلال کا مدار اور مملکتِ سعودیہ کا اِس بارے میں طرزِ عمل

۱۴۹۱- سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین اِس مسئلہ میں کہ سعودی عرب میں ہمیشہ سب سے پہلے چاند کی رؤیت ہو جاتی ہے، کبھی اُس کے خلاف نہیں ہوتا، ہمیشہ پوری دنیا سے ایک یا دو دِن پہلے وہاں رویتِ ہلال کا اعلان ہو جاتا ہے، سعودی عرب کی رویت کے بارے میں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ وہاں چاند کو دیکھ کر فیصلہ نہیں کیا جاتا؛ بلکہ (New Moon) قرانِ شمس وقمر ہوتے ہی وہاں رؤیت مان لی جاتی ہے، یا یہ کہ ہمیشہ شہادت ہی پر فیصلہ کرتے ہیں، کبھی عمومی رویت نہیں ہوتی، کبھی قرانِ شمس وقمر کے فوراً بعد رویتِ ہلال کا اعلان ہوتا ہے اور کبھی تو اُس سے پہلے بھی ہو جاتا ہے، قرانِ شمس وقمر کے اوقات سے اِس بات کا پختہ ثبوت ملتا ہے، نیز کئی شہادتیں اِس بات کا ثبوت دیتی ہیں کہ صبح مشرق میں چاند نظر آیا اور اُسی شام سعودی عرب میں رویت کا اعلان ہوا، یا سورج گہن میں ہے اور اُسی وقت سعودی عرب میں رویت کا اعلان ہوا، حالاں کہ یہ ناممکن ہے۔ [سورج گہن کے ثبوت اور سعودی عرب میں اسی دن کے چاند کے اعلان کی تصدیق کی فوٹو کاپی ارسالِ خدمت ہے۔]

سعودی عرب کی رؤیت کے مطابق کبھی چودھویں یا پندرہویں کو بدر نہیں ہوتا؛ بل کہ پندرہویں اور سولھویں کو بدر ہوتا ہے، ہر مشاہدہ کرنے والے کو اِس بات کا بہ خوبی علم ہے، جب کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہاں رؤیتِ ہلال کمیٹی ہے، اور وہ لوگ دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں، تو اب سوال یہ ہے کہ کیا سعودی عرب کی رویت ہم برطانیہ والوں کے لیے حجت ہے؟ رویتِ ہلال کی اطلاع لینے کا شرعی معتبر طریقہ کیا ہے؟ شعبان و رمضان کی آمد قریب ہے؛ اِس لیے جلد جواب مرحمت فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

---

(۱۴) قال الكمال الشهادة لغة إخبار قاطع وفي عرف أهل الشرع إخبار صدق بإثبات حق بلفظ الشهادة في مجلس القضاء. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق-عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۲۰۶/۴، كتاب الشهادة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۴۶۱/۵، كتاب الشهادات، ط: دار الفكر- بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۱۸۵/۲، كتاب الشهادات، ط: دار إحياء التراث العربي)

الجواب حامداً ومصلیا:

رؤیتِ ہلال میں احناف کے یہاں منجمین (ماہرین حساب وہیئت) کے اصول کا اعتبار نہیں ہے، اِس لیے اگر سعودی عرب میں اثباتِ ہلال منجمین کے قواعد کے مطابق ہوتا ہو اور رویت پر دارومدار نہ ہو، تو مملکتِ سعودی عرب کا فیصلہ نا قابل اعتبار ہے۔ (۱)

لیکن اگر رؤیت کی بنا پر اثباتِ ہلال ہوتا ہے اور سعودی عرب کا یہی دعویٰ ہے کہ ہمیشہ اُن کے ہاں رؤیتِ ہلال کی شہادت پر فیصلہ ہوتا ہے، تو اُن کا فیصلہ درست ہے، اور جس قدر اشکالات اصولِ منجمین پر مبنی ہیں، وہ خود نا قابل اعتبار ٹھہریں گے، رہی یہ بات کہ سعودی عرب میں اگر رویتِ ہلال کا اثبات ہوتا ہو، تو دو دِن کا فرق نہیں ہوسکتا، یا وہاں عمومی رؤیت پر فیصلہ نہیں ہوتا، حالاں کہ مطلع صاف ہونے کی صورت میں جمِ غفیر کی شہادت ضروری ہوتی ہے، ایک دو کی شہادت کافی نہیں، یہ دونوں باتیں قطعی نہیں ہیں۔

چنانچہ حضرت اِمام ابو یوسفؒ کا مسلک ہے کہ ۳۰ رشعبان کو زوال سے پہلے قمر کی رؤیت ہو، تو یہ

---

(۱) ولا عبرة بقول المؤقتين، ولو عدولا على المذهب، قال في الوهبانية: وقول أولي التوقيت ليس بموجب، وقيل نعم، والبعض إن كان يكثر. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: ولا عبرة بقول المؤقتين) أي في وجوب الصوم على الناس، بل في المعراج لا يعتبر قولهم بالإجماع، ولا يجوز للمنجم أن يعمل بحساب نفسه، وفي النهر فلا يلزم بقول المؤقتين أنه أي الهلال يكون في السماء ليلة كذا وإن كانوا عدولا في الصحيح كما في الإيضاح وللإمام السبكي الشافعي تأليف مال فيه إلى اعتماد قولهم؛ لأن الحساب قطعي. اهـ. ومثله في شرح الوهبانية. ———— [مطلب ما قاله السبكي من الاعتماد على قول الحساب مردود] قلت ما قاله السبكي رده متأخرو أهل مذهبه، منهم ابن حجر والرملي في شرحي المنهاج. . . ———— والاحتمالات التي ذكرها السبكي بقوله ولأن الشاهد قد يشتبه عليه إلخ لا أثر لها شرعا لإمكان وجودها في غيرها من الشهادات اهـ (قوله: وقيل نعم إلخ) يوهم أنه قيل بأنه موجب للعمل، وليس كذلك بل الخلاف في جواز الاعتماد عليهم، وقد حكى في القنية الأقوال الثلاثة فنقل أولا عن القاضي عبد الجبار، وصاحب جمع العلوم أنه لا بأس بالاعتماد على قولهم، ونقل عن ابن مقاتل أنه كان يسألهم ويعتمد على قولهم إذا اتفق عليه جماعة منهم، ثم نقل عن شرح السرخسي أنه يعيد وعن شمس الأئمة الحلواني: أن الشرط في وجوب الصوم والإفطار الرؤية، ولا يؤخذ فيه بقولهم، ثم نقل عن مجد الأئمة الترجماني أنه اتفق أصحاب أبي حنيفة إلا النادر والشافعي أنه لا اعتماد على قولهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۸۷، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، مطلب لا عبرة بقول المؤقتين في الصوم، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۷، كتاب الصوم، الباب الثاني في رؤية الهلال، ط: دار الفكر)

چاند گذشتہ شب کا مانا جائے گا اور ۳۰ شعبان کو یکم رمضان قرار دیا جائے گا، مثلاً یوم الشک جمعہ کو ہے، اور زوال سے قبل چاند نظر آیا، تو جمعہ کے دِن پہلا روزہ شمار ہوگا، اگرچہ احناف کے ہاں یہ قول مفتیٰ بہ نہیں، طرفین کا قول معمول بہا ہے، اگر کوئی اِمام ابویوسفؒ کے قول پر عمل کرے، تو دیگر ممالک کے مقابلہ میں ہندوستان میں ایک روز مقدم ہوجائے گا، معلوم ہوا کہ اختلافِ اقوال کی بنیاد پر ایک جگہ میں ایک روز کی تقدیم ممکن ہے، تو اہلِ سعودی عرب، اِمام ابویوسفؒ کی روایت کے مطابق رویت کا عمل کریں تو ایک دِن اور بعدِ مسافت اور اختلافِ مطلع کے لحاظ سے دو دِن کا فرق قرین قیاس ہے، اور جب اُن کا دعویٰ ہے کہ وہ رؤیت پر عمل کرتے ہیں، تو اُن کا فیصلہ درست ہے۔ (شامی)[۲]

---

[۲] ورؤيته بالنهار لليلة الآتية مطلقا على المذهب ذكره الحدادي. (الدر المختار)ــــــــــقال ابن عابدين: (قوله: ورؤيته بالنهار لليلة الآتية مطلقا) أي سواء رئي قبل الزوال أو بعده (وقوله على المذهب) : أي الذي هو قول أبي حنيفة ومحمد، قال في البدائع: فلا يكون ذلك اليوم من رمضان عندهما، وقال أبو يوسف: إن كان بعد الزوال فكذلك وإن كان قبله فهو لليلة الماضية ويكون اليوم من رمضان.

وعلى هذا الخلاف هلال شوال فعندهما يكون للمستقبلة مطلقا ويكون اليوم من رمضان، وعنده لو قبل الزوال يكون الماضية ويكون اليوم يوم الفطر؛ لأنه لا يرى قبل الزوال عادة إلا أن يكون لليلتين فيجب في هلال رمضان كون اليوم من رمضان، وفي هلال شوال كونه يوم الفطر، والأصل عندهما أنه لا تعتبر رؤيته نهارا، وإنما العبرة لرؤيته بعد غروب الشمس لقوله - صلى الله عليه وسلم -: صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، أمر بالصوم والفطر بعد الرؤية ففيما قاله أبو يوسف مخالفة النص اهـ ملخصا.

وفي الفتح: أوجب الحديث سبق الرؤية على الصوم والفطر، والمفهوم المتبادر منه الرؤية عند عشية آخر كل شهر عند الصحابة والتابعين ومن بعدهم بخلاف ما قبل الزوال من الثلاثين والمختار قولهما اهـ.

قلت: والحاصل: إذا رئي الهلال يوم الجمعة مثلا قبل الزوال فعند أبي يوسف هو لليلة الماضية بمعنى أنه يعتبر أن الهلال قد وجد في الأفق ليلة الجمعة فغاب، ثم ظهر نهارا فظهوره في النهار في حكم ظهوره في ليلة ثانية من ابتداء الشهر؛ لأنه لو لم يكن قبل ليلة لم يمكن رؤيته نهارا؛ لأنه لا يرى قبل الزوال إلا أن يكون لليلتين، فلا منافاة بين كونه لليلة الماضية وكونه لليلتين؛ لأن النهار صار بمنزلة ليلة ثانية وإذا كان لليلة الماضية يكون يوم الجمعة المذكور أول الشهر، فيجب صومه إن كان رمضان، ويجب فطره إن كان شوالا.

وأما عندهما فلا يكون للماضية مطلقا بل هو للمستقبلة وليس كونه للمستقبلة ثابتا برؤيته نهارا؛ لأنه لا عبرة عندهما برؤيته نهارا وإنما ثبت بإكمال العدة؛ لأن الخلاف على ما صرح به في البدائع والفتح إنما هو في رؤيته يوم الشك وهو يوم الثلاثين من شعبان أو من رمضان. فإذا كان يوم الجمعة المذكور يوم الثلاثين من الشهر ورئي فيه الهلال نهارا فعند أبي يوسف ذلك اليوم أول الشهر وعندهما لا عبرة لهذه الرؤية ويكون أول الشهر يوم السبت=

بلکہ خود احناف کے ہاں روایت ہے کہ مطلع صاف ہونے کی صورت میں بھی دو شاہد کی شہادت سے اثباتِ رؤیت ہوسکتا ہے، اسی طرح ایک ایسا شخص جس نے بلند مقام سے چاند دیکھا ہو اور وہ معتبر و عادل ہو تو اُس کی خبر اثباتِ رمضان کے لیے کافی ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ نے جم غفیر کے بجائے دو شاہد کی روایت کو ترجیح دی ہے، اور حضرت علامہ شامیؒ نے بھی اُسے قابل ترجیح فرمایا ہے۔

چناں چہ فرماتے ہیں کہ لوگ رویتِ ہلال کے سلسلہ میں تکاسل کے عادی ہو گئے ہیں، اِس لیے جمِ غفیر پر مدار مشکل ہو گیا ہے، اِس لیے علامہ علاء الدین حصکفیؒ درِمختار میں فرماتے ہیں کہ قاضی کے ہاں (بصورتِ دعویٰ) دو شاہد رویتِ ہلال کی گواہی دیں اور قاضی فیصلہ کر دے، تو روزہ لازم ہو جائے گا، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں جو کہ البحر الرائق کی مختار روایت بھی ہے کہ اگر رویت کے مطابق فیصلہ کیا، یا قاضی کا مسلک یہی ہو تو روزہ لازم ہو جائے گا۔ (شامی)[٣]

= سواء وجدت هذه الرؤية أو لا؛ لأن الشهر لا يزيد على الثلاثين فلم تفد هذه الرؤية شيئا وحينئذ فقولهم هو لليلة المستقبلة عندهما بيان للواقع، وتصريح بمخالفة القول بأنه للماضية، فلا منافاة حينئذ بين قولهم هو للمستقبلة عندهما وقولهم لا عبرة برؤيته نهارا عندهما. (رد المحتار على الدر المختار: ٣٩٢/٢، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، مطلب في رؤية الهلال نهارا، ط: دار الفكر-بيروت)

[٣] (و) قبل (بلا علة جمع عظيم يقع العلم) الشرعي وهو غلبة الظن (بخبرهم وهو مفوض إلى رأي الإمام من غير تقدير بعدد) على المذهب وعن الإمام أنه يكتفى بشاهدين واختاره في البحر وصحح في الأقضية الاكتفاء بواحد إن جاء من خارج البلد أو كان على مكان مرتفع، واختاره ظهير الدين. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: واختاره في البحر) حيث قال وينبغي العمل على هذه الرواية في زماننا؛ لأن الناس تكاسلت عن ترائي الأهلة فانتفى قولهم مع توجههم طالبين لما توجهوا إليه، فكان التفرد غير ظاهر في الغلط، ثم أيد ذلك بأن ظاهر الولوالجية والظهيرية يدل على أن ظاهر الرواية هو اشتراط العدد لا الجمع العظيم، والعدد يصدق باثنين اهـ وأقره في النهر والمنح ونازعه محشيه الرملي بأن ظاهر المذهب اشتراط الجمع العظيم، فيتعين العمل به لغلبة الفسق والافتراء على الشهر إلخ.

أقول: أنت خبير بأن كثيرا من الأحكام تغيرت لتغير الأزمان، ولو اشترط في زماننا الجمع العظيم لزم أن لا يصوم الناس إلا بعد ليلتين أو ثلاث لما هو مشاهد من تكاسل الناس؛ بل كثيرا ما رأيناهم يشتمون من يشهد بالشهر ويؤذونه وحينئذ فليس في شهادة الاثنين تفرد من بين الجمع الغفير حتى يظهر غلط الشاهد، فانتفت علة ظاهر الرواية فتعين الإفتاء بالرواية الأخرى.

(قوله: وصحح في الأقضية إلخ) هو اسم كتاب واعتمده في الفتاوى الصغرى أيضا وهو قول الطحاوي، =

اور یہ اصول بھی ہے کہ قاضی کے نزدیک مجتہد فیہا یا مختلف فیہا مسائل میں جو روایت راجح ہو، اُس کے مطابق اگر اُس نے فیصلہ کر دیا، تو وہ لازم ہو جائے گا، اُس کا ابطال اور اُس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہوتا۔ (الاشباہ والنظائر)[۴]

اِس لیے سعودی عرب میں با قاعدہ قاضی کا فیصلہ رؤیت کے بارے میں ہو، تو وہ سعودی عرب کے لوگوں کے لیے تو لازم ہے، خواہ جس کسی روایت کے مطابق ہو، جب بحیثیتِ قضاء یہ فیصلہ جائز ٹھہرا، تو ایسے ممالک جن کے ہاں کوئی مستقل رویت نہیں اور اُن کو دوسرے ممالک ہی کی رویت پر اکتفاء کرنا ضروری ہو گیا ہے اور اُن کے لیے قریب میں کوئی رویت کے مسئلہ میں قابل اعتبار ملک نہیں ہے، تو اِس مجبوری کی حالت میں وہ سعودی عرب کی رویت کے مطابق عمل کر سکتے ہیں، کیوں کہ احناف میں متقدمین کے قول کے مطابق اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں ہے۔[۵] اور مراکش کی رویت پر بھی عمل ممکن ہے، جہاں سے اطلاع مل جائے اور جس کی رؤیت سابق ہو، اُس پر عمل کیا جائے گا۔

شرائطِ صحت عمل وصحتِ اثبات:

سعودی عرب یا مراکش سے خبر و شہادت کا کوئی ایسا با قاعدہ انتظام ہو سکتا ہو کہ وقت پر اصول وضوابط کے مطابق شہادت حاصل ہو جائے تو ایسا انتظام کرنا ضروری ہے، اور یہ بہ ظاہر مشکل ہے، تو پھر بہ ذریعۂ ریڈیو

= وأشار إليه الإمام محمد في كتاب الاستحسان من الأصل، لكن في الخلاصة ظاهر الرواية أنه لا فرق بين المصر وخارجه معراج وغيره.

قلت: لكن قال في النهاية عند قوله: ومن رأى هلال رمضان وحده صام إلخ، وفي المبسوط: وإنما يرد الإمام شهادته إذا كانت السماء مصحية، وهو من أهل المصر، فأما إذا كانت متغيمة، أو جاء من خارج المصر، أو كان في موضع مرتفع، فإنه يقبل عندنا. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ٣٨٨/٢، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، مطلب ما قاله السبكي من الاعتماد على قول الحساب مردود، ط: دار الفكر-بيروت)

[۴] ومنها: حكم القاضي في المسائل الاجتهادية لا ينقض، وهو معنى قول أصحابنا في كتاب القضاء: إذا رفع إليه حكم حاكم أمضاه إن لم يخالف الكتاب والسنة والإجماع. (الاشباه والنظائر-ابن نجيم المصري (م:٩٧٠هـ) ص:٩٠، النوع الثاني من القواعد [قواعد كلية يتخرج عليها ما لا ينحصر من الصور الجزئية] القاعدة الأولى: الاجتهاد لا ينقض بالاجتهاد، ط: الشيخ زكريا عميرات، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۵) تفصیل وتخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں عنوان: انگلینڈ میں چاند کا مسئلہ اور اس کا حاشیہ نمبر: (۴)۔

خبر نشر ہو یا شہادت نشر ہو دونوں کی خبر درست ہے، یقین اور ظنِ غالب ہلال کمیٹی کا معتبر ہوگا، اِسی طرح ٹیلی فون سے معتبر آدمی کی آواز پہنچائی جارہی ہے اور یقین یا ظن غالب ہوجاتا ہے، تو اُس پر عمل کرنا جائز ہے۔

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔ (۲) (احسن الفتاویٰ: ۴ر۴۱۶)

[۵] رویتِ ہلال کی تحقیق کے لیے علم فلکیات کا سہارا لینا

۱۴۹۲- سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین و مفتیانِ شرعِ متین مندرجۂ ذیل مسائل کے بارے میں:

(۱) علم ہیئت و فلکیات اور علمِ نجوم سے استفادہ اور تعاون حاصل کرسکتے ہیں یا نہیں؟ تاکہ کوئی شخص چاند کی جھوٹی گواہی دے کر مغالطہ میں نہ ڈال دے، جب کہ آج کل جھوٹی گواہی پیشہ بن چکی ہے، تو علمِ فلکیات کا سہارا لے کر چاند کا صحیح تعین ہوسکے۔

(۲) کیا سعودی عرب کی رؤیت حنفی مسلک کے مطابق پوری اُترتی ہے؟ اور برطانیہ کے حنفی المسلک مسلمانوں کے لیے سعودی عرب کی رویت حجت ہے؟

(۳) کیا سورج گہن کے دِن بھی چاند نظر آسکتا ہے؟ سعودی عرب میں محرم اور رجب میں نظر آیا تھا، ثبوت کے لیے کاغذات اِرسالِ خدمت ہیں۔

(۴) سعودی عربیہ میں ساری دنیا سے پہلے چاند نظر آنے کی کوئی خاص وجہ ہے؟ ہم سے قریب کا ملک مراکش ہے، جہاں باقاعدہ رویت ہوتی ہے، ہمارا مطلع بھی ایک ہے، جب کہ سعودی عرب ہم سے کافی دور ہے، مطلع بھی علاحدہ ہے، تو اِن دونوں جگہوں میں سے ہمیں ہلال کے سلسلہ میں کس کی پیروی کرنی چاہیے؟

---

(۲) سوال: برطانیہ میں ہر وقت ابر رہنے کی وجہ سے رؤیت ہلال ممکن نہیں، تو رمضان وعیدین کا ثبوت کیسے ہوگا؟

جواب: ہلال رمضان کے لیے کسی ایسے ملک کے ریڈیو پر اعتماد کیا جائے، جس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہاں ضوابطِ شرعیہ کے مطابق رؤیت ہلال کا فیصلہ ہوتا ہے، خواہ یہ ملک کتنا ہی بعید کیوں نہ ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ کسی دوسرے علاقہ کے کسی معتبر عالم سے بہ ذریعہ ٹیلی فون معلوم کر کے اس کے مطابق عمل کیا جائے، بہ شرطے کہ آواز کی پہچان یا دوسرے ذرائع سے یہ معلوم ہوجائے کہ ٹیلی فون پر کون بول رہا ہے۔ بندہ نے مسئلہ اختلاف مطالع پر انفرادا، واجتماعا بارہا غور کیا ہے، ہر مرتبہ یہی نتیجہ نکلا کہ عند الاحناف بلاد بعیدہ میں بھی اختلاف مطالع غیر معتبر ہے، اور یہی قول مفتیٰ بہ ہے، ضرورت کے پیش نظر بلاد بعیدہ وقریبہ میں فرق کے قائلین کو بھی وسعت سے کام لینا چاہیے۔ ——— ہلال عیدین سے متعلق خبر مستفیض موصول ہو، تو اس پر عمل کیا جائے، ورنہ تکمیل ثلاثین لازم ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۴ر۴۲۵-۴۲۶، کتاب الصوم، جہاں ہمیشہ ابر کی وجہ سے رؤیت ممکن نہ ہو، ط: دار الاشاعت- دہلی)

الجواب حامداً و مصلیاً:

(۱) علمِ فلکیات سے استفادہ اور استعانت میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن جب علمِ فلکیات کے اصول حجت شرعیہ سے متعارض ہو جائیں، تو حجتِ شرعیہ کے مقابلے میں اُن کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا، شہادت حجتِ شرعیہ ہے، اگر علمِ فلکیات کے اصول، کسی شاہدِ عدل، موافقِ شرع کی شہادت کے خلاف ہوں، تو اُس وقت شہادت ہی کا اعتبار ہوگا، نہ کہ علمِ فلکیات کے اصولوں کا، علامہ سبکیؒ کا قول ہے کہ شہادت ظنی ہے، اور علمِ حساب قطعی ہے، اِس لیے اگر شہادت حسابِ فلکی کے خلاف ہو جائے تو وہ مردود ہوگی، لیکن دیگر علماءِ شافعیہ نے علامہ سبکیؒ کے اِس قول کی تردید فرمائی ہے، نیز فقہاء نے نقل کیا ہے کہ تمام علماءِ احناف اِس بات پر متفق ہیں کہ منجمین کے قول کا اعتماد اِس بارے میں نہیں ہوگا، اگر چہ وہ عادل ہوں۔ (شامی)[۱]

چناں چہ فرماتے ہیں کہ اگر ۲۹ کو طلوعِ شمس سے پہلے مشرق میں چاند نظر آیا، پھر شام کو غروب کے بعد بھی نظر آیا اور شرعی بینہ رؤیت پر قائم ہو گیا تو حاکم کو رؤیت کی بنا پر فیصلہ کرنا ہوگا، جیسا کہ حدیثِ پاک میں منصوص ہے، اور منجمین کے اِس قاعدے کا اعتبار نہیں ہوگا کہ چاند نظر آئے تو اُسی روز شام کو ہلال نہیں ہو سکتا۔ (ج:۲/ ۳۹۳)[۲]

رہی یہ بات کہ آج کل گواہی میں جھوٹ کا احتمال ہوتا ہے، تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ہر زمانہ میں اِس قسم کے حالات رونما ہوتے رہے ہیں، چناں چہ فقہاءِ کرام نے اِس طرح کے احتمالات کا اعتبار نہیں فرمایا ہے، شریعتِ مطہرہ نے شاہدین کی عدالت کو مدار بنایا ہے، اِس قسم کا عقلی احتمال تو ہر قسم کی شہادت کے متعلق نکالا جا سکتا ہے۔

(۲) اگر سعودیہ کے اثباتِ ہلال کا مدار اصولِ حساب و فلکیات پر ہے، تو اُس کا اعتبار نہیں، اور برطانیہ کے مسلمانوں کے لیے اُس پر عمل کرنا جائز نہیں، اگر اُن کا مدار رویت پر ہو تو جائز ہے، جب کہ یہ

---

[۱] سوال سابق کا حاشیہ نمبر (۱) ملاحظہ فرمائیں۔

[۲] أما إذا رئي يوم التاسع و العشرين قبل الشمس ثم رئي ليلة الثلاثين بعد الغروب، و شهدت بينة شرعية بذلك فإن الحاكم يحكم برؤيته ليلا كما هو نص الحديث، و لا يلتفت إلى قول المنجمين إنه لا تمكن رؤيته صباحا ثم مساء في يوم واحد كما قدمناه عن فتاوى الشمس الرملي الشافعي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۹۲، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، مطلب ما قاله السبكي من الاعتماد على قول الحساب مردود، ط: دار الفكر - بيروت)

فیصلۂ رویت بقضاءِ قاضی صادر ہوا ہو۔

(۳) اگر سورج گہن کے دن بھی چاند کے نظر آنے کی گواہی شاہدین عدل نے دی ہے، تو وہ مانی جائے گی، اور اصولِ علمِ فلکیات کا اعتبار اُس وقت نہیں ہوگا۔

(۴) اگر برطانیہ اور مراکش کا مطلع ایک ہو تو عمل مراکش کی رویت کے مطابق ہوگا، مطلع اگر علاحدہ ہے تو جس ملک کی خبر پہلے اور بہ سہولت ملتی ہے تو اُس پر عمل جائز ہوگا۔(۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٦] عید کے چاند کے متعلق ریڈیو کی خبر

۱۴۹۳- سوال: (۱) عید کے چاند کے لیے ریڈیو سے سنی ہوئی خبر کب معتبر ہوگی؟

(۲) آپ کی کتاب، جو چاند کے متعلق ہے، اس کے صفحہ ٦١ پر علامہ رحمتی کا مذہب لکھا ہے کہ ریڈیو سے ۵/ یا ٦/ جگہ کی خبر آئی ہو، تو معتبر مانی جائے گی، دریافت یہ کرنا ہے کہ اس [قول] پر عمل کرنا کیسا ہے؟

(۳) ریڈیو پر مسلمان عورت چاند کی خبر نشر کرے، تو کیا اس کو قبول کیا جا سکتا ہے؟ اس سال عید کے چاند کی خبر احمد آباد سے مسلم لڑکی نے نشر کی ہے، اس کو معتبر مان کر عید کرنا کیسا ہے؟

خبر کو معتبر ماننے اور قبول کرنے والا شخص کہتا ہے کہ میں اس لڑکی کی آواز کو پہچانتا ہوں، خلاصہ یہ کہ اس سال عید کے موقع پر احمد آباد سے جو چاند کی خبر آئی ہے، اس کا اعتبار کر سکتے ہیں یا نہیں؟

مفتی شفیع صاحب کی تصنیف ''آلات جدیدہ کے شرعی احکام'' کے صفحہ ۱۸۸-۱۸۹-۱۹۰ پر ''ہلال کے معاملہ میں آلات جدیدہ کی خبروں کا درجہ'' میں مندرج تفصیل کو دلیل بنا کر عید کے چاند کی خبر، ریڈیو سے، معتبر ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

اگر احمد آباد، بمبئی یا دہلی سے ریڈیو پر خبر دی جا رہی ہے، تو مندرجۂ ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا: (۱) جہاں سے خبر دی جا رہی ہے، وہاں چاند کمیٹی ہے یا نہیں؟ (۲) وہاں کے ذمہ دار حضرات کی علمی لیاقت اور دینی معلومات کیسی ہے؟

(۳) تفصیل وتخریج کے لیے سوال سابق ملاحظہ فرمائیں۔

اگر یہ دونوں باتیں پائی جائیں، تو اس کے بعد لازم ہے کہ ہلال کمیٹی کا صدر یا کوئی ذمہ دار بہ ذات خود، ریڈیو پر آکر یہ فیصلہ سنائے کہ میرا نام فلاں ہے، میں ہلال کمیٹی کا صدر/ ذمہ دار ہوں، ہلال کمیٹی کے سامنے دو تین حضرات نے چاند دیکھنے کی گواہی دی ہے، گواہی کے قبول ہونے کی شرطیں ان میں موجود تھی، اس لیے ہم نے ان کی گواہی کو قبول کیا ہے اور آئندہ کل عید کرنے کا فیصلہ کیا ہے"۔

مذکورہ فیصلہ کو ریڈیو پر سننے کے بعد، سننے والے دو، چار اشخاص اپنے گاؤں کی چاند کمیٹی کے روبرو یا امام کے سامنے اس کو پیش کریں۔ اگر امام صاحب کو شرح صدر ہو، تو عید کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ (۱)

لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ گورنمنٹ نے آج تک ہلال کمیٹی کے ذمہ دار کو بہ ذات خود ریڈیو پر آنے اور اپنی خبر نشر کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہلال کمیٹی کا ذمہ دار کسی کو وکیل بنائے اور وہ مسلمان ہو اور مذکورہ بالا تفصیل کے ساتھ ریڈیو پر خبر دے، تو مذکورہ بالا کاروائی کے بعد ہلال عید کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے، مگر اس کو بھی گورنمنٹ نے قبول نہیں کیا ہے۔

موجودہ دور میں ہلال کمیٹی اور اس کے اندرونی اشخاص کا بھی علم نہیں ہوتا، اور ریڈیو صرف یہ خبر نشر کرتا ہے کہ فلاں جگہ چاند ہو گیا، صرف اس خبر کی بنیاد پر ہلال عید کا فیصلہ صحیح نہیں ہے۔

(۲) میری کتاب میں مذکور عبارت کا مطلب یہ ہے کہ چار، پانچ یا چھ چاند دیکھنے والے افراد بہ ذات خود ریڈیو پر آکر خبر دیں کہ "میں قاسم ہوں، احمد آباد کا باشندہ ہوں، میں نے چاند کا مشاہدہ کیا ہے، اور

---

(۱) جس شہر میں باقاعدہ قاضی یا ہلال کمیٹی نے کسی شہادت پر اطمینان کر کے، عید وغیرہ کا اعلان کر دیا ہو، اس اعلان کو اگر ریڈیو پر نشر کیا جائے، تو جس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے، اس شہر اور اس کے مضافات و دیہات کے لوگوں کو اس ریڈیو کے اعلان پر عید وغیرہ کرنا جائز ہے، شرط یہ ہے کہ ریڈیو کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ چاند کے متعلق مختلف خبریں نشر نہ کرے، صرف وہ فیصلہ نشر کرے، جو اس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے اس کو دیا ہے اور اس کو نشر کرنے میں پوری احتیاط سے کام لے، جن الفاظ میں فیصلہ دیا گیا ہے، وہ الفاظ بعینہ نشر کیے جائیں، جس ریڈیو پر ایسی احتیاط کی پابندی نہ ہو، اس کے اعلان پر عید وغیرہ کرنا کسی کے لیے درست نہیں۔

اور جس طرح ایک شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی کا فیصلہ اس شہر اور اس کے مضافات کے لیے واجب العمل ہے، اسی طرح اگر کوئی قاضی یا مجسٹریٹ یا ہلال کمیٹی پورے ضلع یا صوبہ یا پورے ملک کے لیے ہو، تو اس کا فیصلہ اپنے اپنے حدود ولایت میں واجب العمل ہوگا۔

(آلات جدیدہ کے شرعی احکام، ص: ۱۸۸، باب: ہلال کے معاملہ میں آلات جدیدہ کی خبروں کا درجہ، ط: قاسمی کتب خانہ- دیوبند ☆ جواہر الفقہ: ۵/ ۱۷۷)

میں اس کی خبر دیتا ہوں، مختلف جگہوں سے ایسی پانچ، چھ مختلف افراد کی خبر آئے، تو عید کر سکتے ہیں۔ (٢)

واضح رہے کہ گورنمنٹ نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے اور وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ ریڈیو پر وہ کیا بولے گا، ہمیں اعتماد نہیں ہے، اگر آج مسلمانوں کو ریڈیو پر بولنے کی اجازت دے دیں، تو کل دوسری قوم کا کوئی شخص بھی اجازت طلب کر سکتا ہے؛ اس لیے گورنمنٹ کی دشواری بھی ہم سمجھ سکتے ہیں۔

(٣) احمد آباد کے ریڈیو اسٹیشن سے خبر نشر کرنے والی لڑکی کون ہے، اس کا ہمیں علم نہیں ہے، اس لیے اس کا فیصلہ قابل قبول نہیں ہے۔

اب تو آئے دن ریڈیو میں خبر آتی رہتی ہے کہ احمد آباد میں چاند ہو گیا، دہلی میں چاند ہو گیا، پٹنہ میں چاند ہو گیا، وغیرہ، ایسی خبر کا اعتبار نہیں ہے۔

مثال کے طور پر کوئی کہے کہ ترکیسر میں چاند ہو گیا، کوسمبا میں چاند ہو گیا، ایسی ہی ١٥-٢٠ خبریں آئیں، تو بھی چاند کا ثبوت نہیں ہوگا؛ کیوں کہ خبر دینے والے کی شناخت نہیں ہوتی ہے۔ (٣)

کوسمبا میں ایک مولانا صاحب نے اس طرح کی خبر کو، چاند سے متعلق میری کتاب سے دلیل پکڑ کر، معتبر مانا تھا، جو کہ غلط ہے، تفصیلاً ''کوساڈی'' میں فتوی لکھا گیا ہے، اسے پڑھ کر اور پڑھا کر لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کریں اور لوگوں کو گمراہی و بدعملی سے بچائیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(٢) في الذخيرة قال شمس الأئمة الحلواني: الصحيح من مذهب أصحابنا أن الخبر إذا استفاض وتحقق فيما بين أهل البلدة الأخرى يلزمهم حكم هذه البلدة اهـ ومثله في الشرنبلالية عن المغني. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/٣٩٠، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ٢/٢٩٠، كتاب الصوم، مايثبت به رمضان، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(٣) لو شهد جماعة أن أهل بلدة قد رأوا هلال رمضان قبلكم بيوم فصاموا، وهذا اليوم ثلاثون بحسابهم، ولم ير هؤلاء الهلال لا يباح فطر غد، ولا يترك التراويح في هذه الليلة، لأنهم لم يشهدوا بالرؤية، ولا على شهادة غيرهم، وإنما حكوا رؤية غيرهم. (الفتاوى الهندية: ١/١٩٩، كتاب الصوم، الباب الثاني في رؤية الهلال، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ٢/٢٩١، كتاب الصوم، باب مايفسد الصوم و مالايفسد، ط: دار إحياء التراث العربي ☆مجمع الأنهر: ١/٢٣٩، كتاب الصوم، باب موجب الفساد، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ٢/٣٩٠، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر -بيروت)

[٧] عرفہ کا روزہ کب رکھا جائے؟ اور ہندوستان میں عید کب شمار ہوگی؟

۱۴۹۴- سوال: کھرالو، مؤرخہ: ۲۲/۱۱/۷۷ء
محترمی جناب مفتی صاحب دار العلوم ترکیسر، ضلع سورت،
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین، اس مسئلے میں کہ حج ۹/ذی الحجہ کو منائی جاتی ہے، اور دنیا بھر کے مسلمان اس دن عرفہ کا روزہ رکھتے ہیں، پر امسال حج ۷/ذی الحجہ [ہندوستان کے اعتبار سے] سنیچر کے روز ادا کی گئی، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح نماز، روزہ اور زکات میں اوقات کی پابندی ہے، اور اوقاتِ مکروہہ میں ادا نہیں ہوتے، اسی طرح حج میں بھی ہے یا نہیں؟ یا نویں ذی الحجہ کے بغیر کوئی بھی اگلی پچھلی تاریخ مقرر کر کے حج کی ادائیگی ممکن ہے؟

اس طرح تبدیلیٔ اوقات کی صورت میں فریضہ میں کچھ نقص تو نہ رہ جائے گا؟

اور اگر نقص کا امکان ہو، تو اس وقت حجاجِ کرام کو کیا کرنا چاہیے؟ تقریباً ہر سال تاریخ کا اختلاف ہوتا ہے، یہ جان کر کہ چاند وہاں جلد دکھائی دیا ہو؟ اور یہ ممکن بھی ہے، پر ہمیشہ نہیں، پھر ہندوستان سے عرب کے فاصلے کے حساب سے ایک روز سے زائد کا فرق نہیں ہو سکتا ہے۔

عید، حج کے دوسرے دن منائی جاتی ہے، اب ہمیں [ہندوستان میں] عرفہ اور عید کب منانے چاہئیں، عرفہ حج کا دن ہے، جس دن روزہ رکھا جاتا ہے، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرفہ کا روزہ کب رکھا جائے؟ یہاں [ہندوستان میں] ۹/ذی الحجہ کو حج تو ہو چکا، اور عرفات میں کوئی نہ ہوگا، اور حج تو ختم ہو چکا، تو عرفہ کا روزہ کب رکھا جائے؟ اور عید کب منائی جائے؟ حج کے دوسرے تیسرے روز، یا عرب کے اعتبار سے ۹/ذی الحجہ اور ۱۰/ذی الحجہ کو عرفہ اور عید کی جائے؟

اس طرح حج سے عرفہ کی اور عید کی مناسبت قائم نہیں رہتی، ہونا تو یہ چاہیے کہ حج جب بھی ہو، اس روز عرفہ، اور دوسرے روز دنیا بھر کے مسلمانوں کو عید منانی چاہیے، دنیا کے کسی بھی خطے میں رہتے ہوں، اس زمانے میں حج کی تاریخ کی خبر دینا کوئی مشکل امر نہیں۔ کتابی حوالے سے مدلل جواب مرحمت

فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ خاکسار: صالح محمد خان غفرلہٗ

الجواب حامداً و مصلیاً:

جناب کو غلط فہمی ہو رہی ہے، حرمین شریفین میں من وجہٍ اسلامی نظام ہے، لہٰذا اثباتِ رویتِ ہلال کے لیے قاضی کے پاس گواہی آتی ہے، شاہدوں کے متعلق تحقیق و تفتیش کے بعد فیصلہ کیا جاتا ہے؛ میں ۱۹۷۳ء میں حرم شریف میں موجود تھا، ۲۹ ؍شعبان کو مکہ مکرمہ پہنچا، عشاء سے پہلے عمرہ سے فراغت ہوئی، اور عشاء کی اذان کے بعد رمضان شریف کا اعلان ہوا۔ یہی حال عید کے چاند کے متعلق مدینہ شریف میں ہوا، ۲۹ ؍رمضان کے بعد، ۳۰ ؍رمضان کی رات شروع ہوئی، عشاء کی نماز سے پہلے اعلان ہوا کہ چاند ہو گیا، لہٰذا آئندہ کل عید ہوگی، لہٰذا آپ کو وہم کرنے کی ضرورت نہیں، خواہ حنبلی، مالکی اور اہلِ حدیث علماء حرمین شریفین کے حکام ہوں؛ کیوں کہ ان کے نزدیک بھی وقت سے پہلے ارکانِ حج جائز نہیں ہیں، لاکھوں حجاج کے حج کا معاملہ ہے، لہٰذا وہ لوگ بھی احتیاط برتتے ہیں۔[1]

عموماً ہر ماہ ایک دو دن کا فرق رہتا ہے، ہمارے یہاں اس وقت ۷ ؍ذی الحجہ تھی، اور عرب میں ۹ ؍ذی الحجہ تھی، حج کا ادا ہو جانا، ۹ ؍ذی الحجہ کو وقوفِ عرفہ پر ہوتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الحجح عرفة".[2]

---

(۱) ص (أو أخطأ الحج بعاشر فقط)

ش: يعني أنه إذا أخطأ جماعة أهل الموسم، وهو المراد بالحج فوقفوا في اليوم العاشر، فإن وقوفهم يجزئهم واحترز بقوله: فقط مما إذا أخطأوا ووقفوا في الثامن، فإن وقوفهم لا يجزئهم، وهذا هو المعروف من المذهب، ... وهو قول مالك والليث والأوزاعي وأبي حنيفة وأبي يوسف ومحمد بن الحسن. (مواهب الجليل في شرح مختصر خليل - شمس الدين أبو عبد الله محمد بن محمد بن عبد الرحمن الطرابلسي المغربي، المعروف بالحطاب الرُّعيني المالكي (م: ۹۵۴هـ): ۳/ ۹۵، باب الحج، فرع شرب مسكرا حتى غاب عقله اختيارا او فاته الوقوف بعرفة، ط: دار الفكر)

(۲) عن عبد الرحمن بن يعمر، قال: شهدت رسول الله صلى الله عليه وسلم فأتاه ناس، فسألوه عن الحج؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الحج عرفة، فمن أدرك ليلة عرفة قبل طلوع الفجر من ليلة جمع، فقد تم حجه. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۵/ ۲۵۶، رقم الحديث: ۳۰۱۶، كتاب مناسك الحج، فرض الوقوف بعرفة، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

عن عبد الرحمن بن يعمر، أن ناسا من أهل نجد أتوا رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو بعرفة فسألوه، فأمر مناديا، فنادى: الحج عرفة، من جاء ليلة جمع قبل طلوع الفجر فقد أدرك الحج، أيام منى ثلاثة، فمن تعجل في يومين فلا إثم عليه، ومن تأخر فلا إثم عليه، قال: وزاد يحيى: وأردف رجلا فنادى. (سنن الترمذي: ۱/ ۱۷۸، رقم الحديث: ۸۸۹، أبواب الحج، باب ما جاء فيمن أدرك الإمام بجمع فقد أدرك الحج، ط: ديوبند)

اس دن کو یومِ حج سے تعبیر کرتے ہیں، اس لیے کہ حج کا رکنِ اعظم وقوفِ عرفہ ہے، لہٰذا حجاجِ کرام کو وہاں احکام کی ادائیگی میں تعجیل کرنی چاہیے، اس لیے جس دن وقوفِ عرفہ کا اعلان ہو، ان کے لیے اطاعت ضروری ہے۔

اہلِ ہند کو اپنی رؤیت پر عمل کرنا ہوگا، ہمارے یہاں ۹ر ذی الحجہ جس دن ہے، اس دن روزہ رکھنا ہے، اور دسویں دن عید کرنی ہوگی۔(۱) اہلِ عرب اور حرمین شریفین کی تاریخ ہندوستان والوں کے لیے حجت نہیں، اور اہلِ عرب کی تاریخ کے مطابق ۹ر ذی الحجہ کو روزہ رکھنے سے روزہ رکھنے کا ثواب نہیں ملے گا، اس لیے کہ ہندوستان میں وہ ۷ر یا ۸ر ذی الحجہ کا دن ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ۲۴ر ذی الحجہ ۱۹۷۷ء

[۸] ٹیلی فون کی گواہی کا حکم

۱۴۹۵- سوال: ٹیلیفون پر دی جانے والی گواہی کا کیا حکم ہے؟ کیا اس کا اعتبار کیا جائے گا؟

الجواب حامداومصلیا:

ٹیلیفون پر دی جانے والی گواہی شرعی گواہی کے قائم مقام نہیں ہے؛ لہٰذا اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا؛ کیوں کہ گواہوں کا مجلسِ گواہ میں موجود ہونا ضروری ہے اور یہاں (فون پر گواہی دینے کی صورت میں) گواہ مجلس میں موجود نہیں ہیں۔(۲)

---

(۱) لأن كل قوم مخاطبون بما عندهم وانفصال الهلال عن شعاع الشمس يختلف باختلاف الأقطار كما أن دخول الوقت وخروجه يختلف باختلاف الأقطار حتى إذا زالت الشمس في المشرق لا يلزم منه أن تزول في المغرب، وكذا طلوع الفجر وغروب الشمس بل كلما تحركت الشمس درجة فتلك طلوع فجر لقوم وطلوع شمس لآخرين وغروب لبعض ونصف ليل لغيرهم. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م:۷۴۳هـ) :۱/۳۲۱، كتاب الصوم، قبيل: باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م:۸۸۵هـ):۱/۲۰۱، كتاب الصوم، قبيل: باب موجب الإفساد، ط: دار إحياء الكتب العربية)

(۲) قال الكمال: الشهادة لغة إخبار قاطع، وفي عرف أهل الشرع إخبار صدق بإثبات حق بلفظ الشهادة في مجلس القضاء. (تبيين الحقائق: ۴/۲۰۶، كتاب الشهادة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق)

ولو سمع من وراء الحجاب لا يسعه أن يشهد لاحتمال أن يكون غيره، إذ النغمة تشبه النغمة إلا إذا كان في الداخل وحده ودخل وعلم الشاهد أنه ليس فيه غيره، ثم جلس على المسلك وليس له مسلك غيره فسمع إقرار=

لیکن فون کا شیوع عام ہے؛ اس لیے بعض کڑی شرطوں کے ساتھ اس کی خبر کا اعتبار کیا گیا ہے۔

ٹیلی فون کی خبر کا اعتبار اس وقت کیا جا سکتا ہے؛ جب کہ شہر میں کسی نے بھی چاند نہ دیکھا ہو اور جہاں سے ٹیلی فون کے ذریعہ چاند کی کی خبر آرہی ہے، وہاں مستقل طور پر ہلال کمیٹی بھی قائم ہو، شرعی قاضی بھی ہو اور ان کے سامنے گواہوں نے بہ ذات خود گواہی دی ہو، جس کی بنیاد پر قاضی نے رؤیت کا اعلان کیا۔ اس اعلان کو ٹیلی فون کے ذریعے نقل کیا جائے، یا معتبر آدمی نے بہ ذریعۂ ٹیلی فون رؤیت ہلال کمیٹی کو یہ خبر دی ہو کہ میرے سامنے فلاں فلاں آدمی نے چاند دیکھنے کی بات کہی ہے۔ تو ان صورتوں میں فون کی خبر کو معتبر مانا جائے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] اہلِ کناڈا کے لیے، امریکہ والوں کی خبر معتبر ہے یا نہیں؟

گذشتہ سے پیوستہ

۱۴۹۶- سوال: کناڈا سے قریبی ملک امریکہ ہے، وہاں کے بعض صوبوں میں مسلمان بھی آباد ہیں، تو وہاں سے چاند کی آنے والی خبر کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

کناڈا والوں کے لیے امریکہ سے آنے والی خبر کا اعتبار مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔[2]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= الداخل، ولا يراه؛ لأنه يحصل به العلم. (الفتاوى الهندية: ۳/ ۴۵۲، كتاب الشهادة، الباب الثاني في بيان تحمل الشهادة، ط: دار الفكر- بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۲/ ۱۹۱، كتاب الشهادات، فصل في بيان أنواع ما يتحمله الشاهد، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ تبيين الحقائق: ۴/ ۲۱۴، كتاب الشهادة، فصل مايشترط للشهادة في ثبوت الولادة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق)

(۱) اگر ملک کے مختلف حصوں اور سمتوں سے دس بیس ریڈیو، اور ٹیلی فون و ٹیلی ویژن یا خط وغیرہ کے ذریعے خود چاند دیکھنے والوں کی طرف سے اطمینان بخش خبریں آجائیں، تو ان پر اطمینان کیا جا سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ خبر دینے والے کی طرف سے شناخت پوری ہو جائے اور وہ یہ بیان کریں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے، یا یہ کہ ہمارے سامنے فلاں شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی کے سامنے شہادت پیش ہوئی، اور اس نے شہادت کا اعتبار کر کے چاند ہونے کا فیصلہ کر دیا۔ (آلات جدیدہ کے شرعی احکام- مفتی محمد شفیع صاحبؒ، ص: ۱۸۹، ہلال کے معاملے میں آلات جدیدہ کی خبروں کا درجہ، ط: کتب خانہ قاسمی- دیوبند ☆ رؤیت ہلال، ص: ۵۱، ط: ادارہ ارف التبلیغ، نبیہ منزل- دیوبند)

غور کیجیے! ان تمام صورتوں میں جدید آلات کا اعتبار خبروں میں کیا گیا ہے، شہادت میں نہیں۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

(۲) سوال سابق [ٹیلی فون کی گواہی کا حکم] کا حاشیہ نمبر (۲) ملاحظہ کریں۔

[۱۰] ''کناڈا'' والوں کے لیے ''باربڈوز'' اور ''پناما'' والوں کی گواہی کا اعتبار

گزشتہ سے پیوستہ

۱۴۹۷- سوال: کناڈا سے جنوب میں باربڈوز اور پناما ہے، وہاں سے آنے والی خبر کا اعتبار کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ ان کی گواہی کا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] ''کناڈا'' والوں کے لیے ''انگلینڈ'' اور ''ڈیوزبری'' سے آنے والی خبروں کا اعتبار

گزشتہ سے پیوستہ

۱۴۹۸- سوال: انگلینڈ یا ڈیوزبری مرکز سے آنے والی چاند کی خبر کا اعتبار کناڈا والے کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

انگلینڈ یا ڈیوزبری یا ان کے علاوہ دوسرا کوئی اور ملک ہو، اگر آپ حضرات نے اپنی ہلال کمیٹی کو وہاں کی ہلال کمیٹی سے منسلک کر رکھا ہے، تو وہاں سے آنے والی رمضان اور عید کے چاند کی خبر کا اعتبار کیا جائے گا، بشرطے کہ مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ خبر آئے۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] کناڈا والوں کے لیے ''سعودی عرب'' والوں کی خبروں کا اعتبار کرنا

گزشتہ سے پیوستہ

۱۴۹۹- سوال: سعودی عرب سے آنے والی خبروں کا اعتبار کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر سعودی عرب سے آپ کا ملک اتنی دور ہے کہ چاند کی رؤیت میں ایک دن کا فرق لازم ہے- گویا مطلع مختلف ہے، اور وہاں کی رؤیت کا اعتبار کرنے میں مہینہ ۲۸/ دن یا ۳۱/ کا ہو جاتا ہے- تو وہاں کی چاند کی خبر کا اعتبار کر کے رمضان وعید کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے، اور اگر ایک دن کا فرق نہیں ہے، تو مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ وہاں کی خبر کا اعتبار کیا جائے گا۔(۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱-۲-۳) ''ٹیلی فون کی گواہی کا حکم'' کا حاشیہ (صفحہ سابق کا حاشیہ نمبر:۱) ملاحظہ کریں۔

[۱۳] رمضان اور عید کے چاند کے لیے کتنے آدمیوں کی شہادت ضروری ہے؟

۱۵۰۰-سوال: رمضان اور عید کے چاند کے لیے کتنے اور کیسے آدمیوں کی شہادت قابلِ قبول ہے؟ کیا فون کی خبر و گواہی معتبر ہے؟

الجواب حامداً ومصلّیاً:

رمضان اور عید کے چاند کے ثبوت کے لیے اگر مطلع (آسمان) صاف ہو، تو ایک مرد یا دو عورتوں کی گواہی کافی نہیں ہے، بل کہ خبر دینے والوں کی اتنی تعداد ہونی ضروری ہے کہ اُن کی خبر سننے والے کو چاند کے ہونے کا یقین ہو جائے۔ (۱)

اور اگر مطلع صاف نہ ہو، تو ایک مرد یا عورت رمضان کے چاند کے لیے ہلال کمیٹی کو بتائے کہ ہم نے خود چاند دیکھا ہے، یا ہمارے سامنے بعض لوگوں نے چاند دیکھنے کی شہادت دی ہے، اور اُن لوگوں میں شہادت کی شرائط بھی موجود ہیں، تو ان کی خبر معتبر ہوگی۔ (۲)

(۱) مطلع صاف ہو، تو ایک یا دو ٹیلی فون کی خبر کافی نہیں ہے، بلکہ اتنے لوگوں کی خبر کا ہونا ضروری ہے

---

(۱) قال: "وإذا لم تكن بالسماء علة لم تقبل الشهادة حتى يراه جمع كثير يقع العلم بخبرهم". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۱۹، كتاب الصوم، فصل في رؤية الهلال، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

نعم إذا تواردت أخبار "راديو" متعددة من شتى الجهات، ولا تختلف جهات الأنباء عن البلد الذي لم ير فيه الهلال ببعد يختلف فيه المطلع فيسوغ العمل بهذة الأنباء المرسلة، وتدخل في حد الاستفاضة المفيدة للطمانينة.

(معارف السنن-السيد محمد يوسف بن السيد زكريا الحسيني البنوري (م: ۱۳۹۷هـ): ۵/۳۴۰، كتاب الصوم، باب ما جاء أن الصوم لرؤية الهلال والإفطار له، ط: ايچ، ايم سعيد، كراتشي، الباكستان)

(۲) **وإن كانت السماء متغيمة، فإنه يقبل خبر الواحدة العدل، ذكرا كان أو أنثى، حرا كان أو عبدا، محدودا في القذف أو لا بعد ما تاب وصار عدلا؛ لأن هذا من باب الإخبار دون الشهادة، يلزم الشاهد الصوم فيتعدى إلى غيره؛ لكنه من باب الدين فيشترط فيه العدالة.** (تحفة الفقهاء-محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ): ۱/۳۴۶، كتاب الصوم، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ المحيط البرهاني-ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۵/۲۸۵، كتاب الاستحسان والكراهية، الفصل الأول في العمل بخبر الواحد، ط: دار الكتب العلمية ☆ تبيين الحقائق: ۱/۳۲۱، كتاب الصوم، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق ☆ العناية شرح الهداية: ۱/۳۲۳، فصل في رؤية الهلال، ط: دار الفكر-بيروت)

کہ اُن کا جھوٹ پر متفق ہونا مشکل اور محال ہو، اور عقل بھی اُن کے جھوٹے ہونے کو تسلیم نہ کرے۔ (۱)

(۲) مطلع (آسمان) صاف نہ ہو، تو رمضان کے چاند کے لیے ایک ٹیلی فون کی خبر اپنے عمل کے لیے کافی ہے، دوسرے کو حکم نہیں دے سکتے۔

(۳) بادل کی وجہ سے مطلع صاف نہ ہو اور معاملہ عید وغیرہ کے چاند کا ہو، تو دو گواہ کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر چاند کا ثبوت نہیں ہوگا، اس صورت میں فون کی خبر معتبر نہیں ہوگی، ہاں جہاں سے فون کے ذریعے خبر دی جا رہی ہو، وہاں قاضی یا ہلال کمیٹی کا نمائندہ گواہی لے لے، اور فون کے ذریعے قاضی یا ہلال کمیٹی کو مطلع کر دے، تو ہلال عید ثابت ہو جائے گا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] سعودی عرب میں دیکھے گئے چاند کا ہندوستان میں حکم؟

۱۵۰۱- سوال: سعودی عرب میں ایک دن پہلے چاند نظر آ جاتا ہے؛ تو کیا وہاں کے اعلان کے بعد ہمیں چاند کو ثابت مان لینا جائز ہے، یا ہم کیلنڈر کی تاریخ کا اعتبار کریں؟

الجواب حامداومصلیا:

عربی ممالک میں، بالخصوص سعودی عرب میں چاند دیکھ کر چاند کی تاریخ کا اعلان ہوتا ہے، ثبوت شہر کا شریعت میں مدار بھی یہی ہے، کیلنڈر کی تاریخ مدار نہیں۔ (۳)

---

(۱) قد مر تخريجه مرارا عن الأستاذ الشيخ المفتي نظام الدين رحمه الله وفتاوه المسمى بـ'منتخبات نظام الفتاوى'.

(۲) "ويشترط" في الثبوت "لبقية الأهلة" إذا كان بالسماء علة "شهادة رجلين عدلين أو" شهادة "حر وحرتين غير محدودين في قذف" وإلا فجمع عظيم. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح- حسن بن عمار الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ) ص: ۲۴۳، كتاب الصوم، فصل فيما يثبت به الهلال وفي صوم يوم الشك وغيره، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

قال - رحمه الله - (والأضحى كالفطر) أي هلال الأضحى كهلال الفطر حتى لا يثبت إلا بما يثبت به هلال الفطر؛ لأنه تعلق به حق العباد وهو التوسع بلحوم الأضاحي فصار كالفطر. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق-عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م:۷۴۳ھ): ۳۲۱/۱، كتاب الصوم، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق)

"وهلال الأضحى" في الحكم "كالفطر" فلا بد من نصاب الشهادة مع العلة والجمع العظيم مع الصحو على ظاهر الرواية وهو الأصح لما تعلق به من نفع العباد. (مراقي الفلاح، ص: ۲۴۳)

(۳) عن أبي هريرة رضي الله عنه، يقول: قال النبي -صلى الله عليه وسلم-: أو قال: قال أبو القاسم صلى الله عليه وسلم: صوموا الرؤيته وأفطروا الرؤيته، فإن أغمي عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين. (صحيح البخاري: ۲۵۶/۱، رقم الحديث:=

ہماری ہندوستانی تاریخ کے مقابلہ میں وہاں کی تاریخ کبھی ایک دن اور کبھی دو دن آگے ہوتی ہے، زمین کے گول ہونے کی وجہ سے وہاں چاند کبھی ایک دن پہلے نظر آجاتا ہے؛ اس لیے وہاں دیکھا گیا چاند، ہمارے لیے حجت نہیں ہے، وہاں کی گواہی مطلع مختلف ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے قابل عمل نہیں۔ (۱)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] ۲۸ر رمضان کو شوال کے چاند کی خبر آئے تو؟

۱۵۰۲- سوال: کسی جگہ چاند نظر نہ آئے اور ۲۸ر رمضان کو باہر سے خبر آئے یا شرعی گواہی

= ۱۹۰۹، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: إذا رأيتم الهلال فصوموا، وإذا رأيتموه فأفطروا، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۴۷، رقم الحديث: ۱۷-(۱۰۸۱)، كتاب الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، والفطر لرؤية الهلال... الخ، ط: ديوبند)

(وإذا ثبت في موضع لزم جميع الناس) ولا اعتبار باختلاف المطالع... (وقيل: يختلف باختلاف المطالع). وفي التبيين: والأشبه أن يعتبر هذا القول؛ لأن كل قوم يخاطبون بما عندهم، وانفصال الهلال عن شعاع الشمس يختلف باختلاف الأقطار كما أن دخول الوقت وخروجه يختلف باختلافهما. وقال في الدرر يؤيده ما مر في أول كتاب الصلاة أن صلاة العشاء والوتر لا تجب بفاقد وقتهما. وفي الاختيار: وذكر في فتاوى الحسامية: إذا صام أهل مصر ثلاثين يوما برؤية، وأهل مصر آخر تسعة وعشرين يوما برؤية، فعليهم قضاء يوم إن كان بين المصرين قرب بحيث يتحد المطلع، وإن كان بعد بحيث يختلف لا يلزم أحد المصرين حكم الآخر. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ 'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۳۹، كتاب الصوم، ما يثبت به رمضان، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/ ۳۲۱، أول كتاب الصوم، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۱/ ۲۰۱، كتاب الصوم، قبيل: باب موجب الإفساد في الصوم، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆ رد المحتار: ۲/ ۳۹۳، ط: دار الفكر)

(۱) فأما إذا كانت بعيدة فلا يلزم أحد البلدين حكم الآخر لأن مطالع البلاد عند المسافة الفاحشة تختلف فيعتبر في أهل كل بلد مطالع بلدهم دون البلد الآخر. (بدائع الصنائع: ۲/ ۸۳، كتاب الصوم، فصل شرائط أنواع الصيام، ط: دار الكتب العلمية ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۳۶۵، كتاب الصوم، الفصل: اختلاف المطالع، ط: زكريا - ديوبند ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۱۶۴، كتاب الصوم)

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں عنوان: ''انگلینڈ میں چاند کا مسئلہ''

سے اطلاع پہنچے کہ چاند دیکھا گیا ہے، تو اگلے دن عید کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

شرعاً مہینہ ۲۹ر یا ۳۰ رکا ہی ہوتا ہے، ۲۸ر یا ۳۱ رکا نہیں ہوتا ہے۔ (۱) لہٰذا اگر ۲۸ر رمضان کو چاند کی گواہی آئے، یا باہر سے کوئی خبر آئے، جس کی بناء پر چاند ہونے کا یقین ہو جائے، تو ۲۹ رویں دن عید کی نماز ہوگی، البتہ ۲۸ر دن کے بعد ہی چاند کے ثبوت سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ شروع میں چاند کے سلسلے میں غلطی ہوئی ہے اور رمضان ایک دن تاخیر سے شروع کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے ایک دن کے روزہ کی قضا لازم ہوگی۔ (۲)

اگر ۲۸ر کو شب میں چاند کا شرعی ثبوت نہ ہو، بل کہ یوں ہی اڑتی ہوئی خبر ہو، تو ۲۹ر کو روزہ رکھنا لازم ہوگا اور عید کرنا حرام ہوگا۔

نوٹ: مذکور خبر شریعت کے اصول وقواعد کے موافق ہو، تب ہی اگلے دن عید کرنا درست ہوگا، صرف چار پانچ فون قریب کی جگہوں سے آئے ہوں، تو اس پر مدار رکھتے ہوئے ۲۹ر کو عید کرنا صحیح نہ ہوگا۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ابن عمر رضي الله عنهما، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: إنا أمة أمية، لا نكتب ولا نحسب، الشهر هكذا وهكذا، يعني مرة تسعة وعشرين، ومرة ثلاثين. (صحيح البخاري: ۱/۲۵۶، رقم الحديث: ۱۹۱۳، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: لا نكتب ولا نحسب، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/۳۴۷، رقم الحديث: ۱۵-(۱۰۸۰)، كتاب الصوم، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، والفطر لرؤية الهلال، وأنه إذا غم في أوله أو آخره أكملت عدة الشهر ثلاثين يوما، ط: ديوبند)

(۲) عن الوليد، قال: صمنا على عهد علي رضي الله عنه ثمانية وعشرين يوما، فأمرنا بقضاء يوم. (السنن الكبرى - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۴/۴۲۰، رقم الحديث: ۸۲۰۴، باب الشهر يخرج في حساب الصائمين ثماني وعشرين فيقضون يوما واحدا، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

ولو رأوا هلال شعبان وعدوه ثلاثين يوما، ثم شرعوا في صوم رمضان فلما صاموا ثمانية وعشرين يوما رأوا هلال شوال، فعليهم أن يقضوا يوما واحدا، لأنهم غلطوا بيوم واحد بيقين. (الفتاوى التاتارخانية: ۳/۳۶۴، كتاب الصوم، رؤية الهلال، ط: زكريا ديوبند)

إذا صام أهل مصر شهر رمضان على غير رؤية ثمانية وعشرين يوما ثم رأوا هلال شوال إن عدوا شعبان برؤيته ثلاثين يوما، ولم يروا هلال رمضان قضوا يوما واحدا. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۹، كتاب الصوم، الباب الثاني في رؤية الهلال، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الخانية على هامش الهندية: ۱/۱۹۹، ط: زكريا - ديوبند)

(۳) ثم إنما يلزم الصوم على متأخري الرؤية إذا ثبت عندهم رؤية أولئك بطريق موجب؛ حتى لو شهد جماعة أن أهل بلدة قد رأوا هلال رمضان قبلكم بيوم فصاموا، وهذا اليوم ثلاثون بحسابهم، ولم ير هؤلاء الهلال لا يباح فطر غد، =

[۱۶] رمضان اور عید کے چاند کے ثبوت کے لیے ریڈیو کی خبر کا حکم

۱۵۰۳- سوال: آل انڈیا ریڈیو یا ریڈیو پاکستان سے باضابطہ شرائط کے ساتھ رمضان المبارک اور عید الفطر کے چاند کا اعلان ہوا؛ لیکن ہمارے یہاں کہیں چاند نظر نہیں آیا، ایسی صورت میں ''ترکیسر ہلال کمیٹی'' (گجرات کی ہلال کمیٹی کی جانب سے تسلیم شدہ) اس ریڈیائی خبر کو معتبر مان کر رمضان اور عید کے چاند کا اعلان کر سکتی ہے یا نہیں؟ اور اس کے اس فیصلے کو دوسرے گاؤں اور دیہات والے تسلیم کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

صورت مسئولہ میں ریڈیو کی اطلاع چند شرائط کے ساتھ معتبر مانی جا سکتی ہے:

(۱) جہاں سے یہ خبر نشر ہو رہی ہے، وہ اسلامی ملک ہو اور وہاں کا سربراہ بھی مسلمان ہو۔[۱]

(۲) اگر اسلامی ملک نہ ہو، تو مسلمانوں کا کوئی معتبر اور قابل اعتماد نمائندہ شہادت کے بعد خبر نشر کر رہا ہو۔[۲]

=ولا يترك التراويح في هذه الليلة؛ لأنهم لم يشهدوا بالرؤية، ولا على شهادة غيرهم، وإنما حكوا رؤية غيرهم، ولو شهدوا أن قاضي بلدة كذا شهد عنده اثنان برؤية الهلال في ليلة كذا وقضى بشهادتهما جاز لهذا القاضي أن يحكم بشهادتهما؛ لأن قضاء القاضي حجة وقد شهدوا به كذا في فتح القدير. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۹، كتاب الصوم، الباب الثاني في رؤية الهلال، ط: دار الفكر)

(۱) يَآيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (۴۹-الحجرات: ۶)

والصحيح من هذا كله أنه مفوض إلى رأي الإمام. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۸۸، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، مطلب ما قاله السبكي من الاعتماد على قول الحساب مردود، ط: دار الفكر - بيروت)

حتى لو أخبر رجل عدل القاضي بمجيء رمضان يقبل ويأمر الناس بالصوم يعني في يوم الغيم ولا يشترط لفظ الشهادة وشرائط القضاء. (المصدر السابق: ۲/ ۳۸۹، ☆مجموعة رسائل ابن عابدين: ۱/ ۲۳۴، بہ حوالہ: أحسن الفتاوى: ۴/ ۴۲۱، كتاب الصوم، ط: دار الاشاعت - دهلی)

(۲) عن ابن عباس قال: جاء أعرابي إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: إني رأيت الهلال، قال الحسن في حديثه يعني رمضان، فقال: أتشهد أن لا إله إلا الله، قال: نعم، قال: أتشهد أن محمدا رسول الله؟، قال: نعم، قال: يا بلال، أذن في الناس فليصوموا غدا. (سنن أبي داود: ۱/ ۳۲۰، رقم الحديث: ۲۳۴۰، كتاب الصيام، باب في شهادة الواحد على رؤية هلال رمضان، ط: ديوبند☆ سنن الترمذي: ۱/ ۱۴۸، رقم الحديث: ۶۹۱، أبواب الصوم، باب ما جاء في الصوم بالشهادة، ط: ديوبند☆ المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳هـ): ۴/ ۱۳۲، رقم الحديث: ۲۱۱۳، الصيام، باب قبول شهادة الرجل الواحد=

جہاں سے یہ خبر نشر ہو رہی ہے، ان کا اور آپ کا مطلع ایک ہو، اگر دونوں کا مطلع ایک ہو، تو اس کے ماتحت اضلاع اور صوبہ جات کے لیے یہ خبر معتبر مانی جاسکتی ہے، اور ان کی خبر پر عمل کر سکتے ہیں۔ (۱)

لیکن اگر کسی دوسرے ایسے ملک سے خبر نشر ہو رہی ہے، جہاں کا مطلع آپ کے مطلع سے مختلف ہو، تو اس ملک کا فیصلہ دیگر مقامات اور دیگر صوبہ جات کے لیے معتبر نہ ہوگا۔ (۲)

لہٰذا مذکورہ ہلال کمیٹی [ترکیسر ہلال کمیٹی] چاند کے متعلق اگر کوئی فیصلہ صادر کرے، تو اس کے ماتحت اضلاع اور صوبوں کے لیے اس فیصلے پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] دوسرے ملک کی رویت ہلال کا حکم

۱۵۰۴- سوال: روانڈہ (۳) کے حبشی لوگ، چاند کے تعلق سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی خبروں پر

=على هلال شهر رمضان، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

(ولو كانوا ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة وأفطروا بإخبار عدلين) مع العلة (للضرورة) [الدر المختار]

قال ابن عابدين: (قوله: ببلدة) أي أو قرية قال في السراج: ولو تفرد واحد برؤيته في قرية ليس فيها وال ولم يأت مصرا ليشهد وهو ثقة يصومون بقوله. اهـ. قلت: والظاهر أنه يلزم أهل القرى الصوم بسماع المدافع أو رؤية القناديل من المصر؛ لأنه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل كما صرحوا به واحتمال كون ذلك لغير رمضان بعيد إذ لا يفعل مثل ذلك عادة في ليلة الشك إلا لثبوت رمضان (قوله: لا حاكم فيها) أي لا قاضي ولا والي كما في الفتح. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۸۶، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر)

(۱) وفي القدوري: إذا كان بين البلدتين تفاوتاً لا تختلف المطالع لزم حكم إحدى البلدتين حكم البلدة الأخرى، فأما إذا كان تفاوتاً تختلف المطالع لم يلزم إحدى البلدتين حكم البلدة الأخرى. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني - ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ٦١٦هـ): ۲/۳۷۹، كتاب الصوم، الفصل الثاني فيما يتعلق برؤية الهلال، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/۳٦۵، كتاب الصوم، الفصل: اختلاف المطالع، ط: زكريا - ديوبند)

هذا إذا كانت المسافة بين البلدين قريبة لا تختلف فيها المطالع. (بدائع الصنائع: ۲/۸۳، كتاب الصوم، فصل شرائط أنواع الصيام، ط: دار الكتب العلمية ☆ إعلاء السنن: ۹/۱۱۸-۱۱۹ كتاب الصوم، باب تعليق الصوم برؤية الهلال، إدارة القرآن والعلوم الإسلامية - پاكستان)

(۲) فأما إذا كانت بعيدة فلا يلزم أحد البلدين حكم الآخر لأن مطالع البلاد عند المسافة الفاحشة تختلف فيعتبر في أهل كل بلد مطالع بلدهم دون البلد الآخر. (بدائع الصنائع: ۲/۸۳، كتاب الصوم، فصل شرائط أنواع الصيام، ط: دار الكتب العلمية ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/۳٦۵، كتاب الصوم، الفصل: اختلاف المطالع، ط: زكريا - ديوبند ☆ تبيين الحقائق: ۲/۱٦۴، كتاب الصوم)

(۳) روانڈہ (Rwanda) افریقہ کا ایک ملک، ۱۹٦۲ء میں بلجیم (Belgium) سے آزاد ہوا، راجدھانی کیگالی (Kigali) ہے۔

اعتماد کر کے روزے رکھتے ہیں اور عید بھی مناتے ہیں؟ کیا یہ صحیح ہے؟ کیا ہم ان کی موافقت کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

آپ لوگ جس ملک میں رہتے ہیں، اس کے اڑوس پڑوس میں جو اسلامی ملک واقع ہے، اس کی گواہی اور اعلان پر آپ کے لیے روزے رکھنا اور عید منانا جائز ہے، جس طرح لندن والوں کے لیے مراقش کی خبروں اور گواہی کا اعتبار کر کے عید منانا جائز ہے۔ (۱)

اگر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ آپ کے پڑوس میں واقع ہے اور طلوع وغروب میں ایک گھنٹے سے زیادہ کا فرق نہیں پڑتا، تو وہاں کی ریڈیوں کی خبر کے مطابق عمل کر سکتے ہیں، جب کہ وہ فیصلے کا اعلان کرے۔

اگر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ آپ کے ملک سے زیادہ دور ہے، تو پھر آپ کے لیے وہاں سے آنے والی خبر پر عمل کرنا جائز نہیں، کیوں کہ زیادہ دور ہونے کی وجہ سے بسا اوقات مطلع مختلف ہو جاتا ہے، اور جن دو ملکوں کا مطلع الگ ہو، ان میں سے کسی کے لیے، دوسرے کی رؤیت کا اعتبار نہیں ہوتا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] افریقی ملک کے لوگوں کا ہلال میں سعودی عرب کی پیروی کرنا

۱۵۰۵- سوال: ہمارے یہاں افریقہ میں روانڈا کے مسلمان ہلالِ رمضان وعیدین میں سعودی عرب کی رؤیت کی پیروی کرتے ہیں، لہٰذا اُن کا رمضان ہم سے دو یا تین دِن پہلے شروع ہوتا ہے، اور دو یا تین دِن قبل ہی ختم بھی ہو جاتا ہے، نیز عیدین کی نماز بھی وہ ہم سے دو یا تین دِن قبل پڑھ کر فارغ ہو جاتے ہیں، تو اُن کے لیے سعودی عرب کی پیروی کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اگر رمضان میں چاند دیکھا گیا ہے، تو اُس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے، اب عید کا چاند نظر آیا تو فبہا، ورنہ رمضان کے تیس دِن مکمل کرنے کے بعد عید الفطر منانا چاہیے، اگر چار یا پانچ مہینے سے چاند بالکل

---

(۱) تقدم تخریجه تحت عنوان: انگلینڈ میں چاند کا مسئلہ، سعودی عرب میں دیکھے گئے چاند کا ہندوستان میں حکم؟ رمضان اور عید کے چاند کے ثبوت کے لیے ریڈیو کی خبر کا حکم۔

(۲) و أجمعوا أنه لا يراعي ذلك في البلدان النائية جدا كالأندلس، و الحجاز، و أندونيسا و المغرب العربي. (الفقه الإسلامي و أدلته: ۳/ ۴۰، دار الفكر)

نظر نہ آیا ہو، تب ہی دوسرے ملک کی اطلاع کا اعتبار ہوگا، جو ملک قریب ہو اور وہاں بقضاءِ قاضی رویت کا فیصلہ ہوتا ہو، اُس کی پیروی کی جائے، اگر سعودی عرب نزدیک میں ہے، تو اُس کی پیروی کی جائے، لیکن جہاں تک ممکن ہو، رؤیت ہی کا اعتبار کرنا چاہیے، پھر قریب کے ملک کا، اپنی اٹکل کا اعتبار بالکل نہ کرنا چاہیے، پھر ہمیشہ کسی ایک ہی ملک کی پیروی کرنی چاہیے، کبھی کینیا کی اور کبھی افریقہ کے لوگوں کی پیروی کرنا درست نہیں، کوئی بھی ایک لائحۂ عمل طے کیا جائے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] دو قریبی ملک کی رؤیت، ایک دوسرے کے لیے کافی ہوگی

۱۵۰۶- سوال: ہمارے یہاں نیوزی لینڈ میں رمضان المبارک اور عید الفطر و عید الاضحیٰ کے چاند کے بارے میں مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے ہر سال اختلاف ہوتا ہے۔ یہاں سے جزیرۂ فیجی تقریباً ۱۳۰۰ ر میل کی دوری پر واقع ہے، نیوزی لینڈ اور فیجی انٹرنیشنل ریڈ لائن پر برابر ہے، اب سوال یہ کہ کیا جزیرۂ فیجی کی چاند کمیٹی، چاند کی رؤیت کا فیصلہ کرے، تو اس پر نیوزلینڈ والے عمل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مختلف صحابۂ کرام کو مختلف ممالک کا گورنر بنا کر بھیجا تھا، تو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ: "یسروا ولا تعسروا" یعنی عوام کو ہر ممکن سہولت و آسانی پہنچانے کی کوشش کرنا، اور ان کے لیے مشقت و دشواری کی راہ منتخب نہ کرنا۔ (۲)

---

(۱) قد مر تفصيله و تخريجه مرارا.

(۲) عن أنس بن مالك -رضي الله عنه- عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: يسروا ولا تعسروا، وبشروا، ولا تنفروا. (صحيح البخاري: ۱/۱۶، رقم الحديث: ۶۹، كتاب العلم، باب ما كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولهم بالموعظة والعلم كي لا ينفروا ☆ رقم الحديث: ۶۱۲۵، كتاب الأدب، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: "يسروا ولا تعسروا" وكان يحب التخفيف واليسر على الناس، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۲/۸۲-۸۳، رقم الحديث: ۸-(۱۷۳۴)، كتاب الجهاد والسير، باب تأمير الإمام الأمراء على البعوث، ووصيته إياهم بآداب الغزو وغيرها، واللفظ للبخاري، ط: ديوبند)

وفيه الأمر للولاة بالرفق، وهذا الحديث من جوامع الكلم لاشتماله على خيري الدنيا والآخرة، لأن الدنيا دار الأعمال، والآخرة دار الجزاء، فأمر رسول الله صلى الله عليه وسلم فيما يتعلق بالدنيا بالتسهيل، وفيما يتعلق بالآخرة بالوعد بالخير والإخبار بالسرور تحقيقا لكونه رحمة للعالمين في الدارين. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري-بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۲/۴۷، كتاب العلم، باب ما كان النبي يتخولهم بالموعظة والعلم كي لا ينفروا، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

فقہاء کرام نے مختلف نصوص کے پیش نظر یہ اصل بیان فرمائی ہے: "المشقة تجلب التیسیر" کہ مشقت آسانی کو پیدا کرتی ہے۔ (۱)

ان دو اصول کو سامنے رکھ کر جواب ملاحظہ فرمائیں:

چاند کے سلسلے میں شرعی ضابطہ ہے: "صوموا الرؤیته وافطروا الرؤیته" یعنی چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو۔ (۲)

لیکن یہ اس وقت ہے، جب کہ مطلع بالکل صاف ہو، اگر آسمان ابر یا غبار آلود ہو، تو اس وقت علماء نے رمضان المبارک کے چاند کے سلسلے میں یہ حکم بیان کیا ہے کہ کسی معتبر آدمی کی خبر سے رویت ثابت ہو جائے گی۔ (۳)

چوں کہ آپ ایسی جگہ کے بارے میں مسئلہ دریافت کر رہے ہیں، جہاں مطلع صاف نہیں رہتا ہے اور چاند کے دکھنے کا احتمال ہی نہیں ہے، تو اس سلسلے میں حکم یہ ہے کہ آپ اس ملک سے، جس کا مطلع، آپ کے ملک کے مطلع سے مختلف نہ ہو، رابطہ قائم کر کے اپنے مسئلہ کو حل کریں۔ (۴)

---

(۱) الأشباه و النظائر- زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م:۹۷۰ھ)، ص:۶۴، القاعدة الرابعة، ت: الشيخ زكريا عميرات، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ شرح القواعد الفقهية-أحمد بن الشيخ محمد الزرقا (۱۲۸۵-۱۳۵۷ھ)، ص:۱۵۷، ت: مصطفى أحمد الزرقا، ط: دار القلم- دمشق/سوريا.

(۲) صحيح البخاري: ۱/۲۵۶، رقم الحديث: ۱۹۰۹، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: إذا رأيتم الهلال فصوموا، وإذا رأيتموه فأفطروا، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/۳۴۷، رقم الحديث: ۱۷-(۱۰۸۱)، كتاب الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، والفطر لرؤية الهلال... الخ، ط: ديوبند.

(۳) وإن كانت السماء متغيمة، فإنه يقبل خبر الواحدة العدل، ذكرا كان أو أنثى، حرا كان أو عبدا، محدودا في القذف أو لا بعد ما تاب وصار عدلا؛ لأن هذا من باب الإخبار دون الشهادة، يلزم الشاهد الصوم فيتعدى إلى غيره؛ لكنه من باب الدين فيشترط فيه العدالة. (تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰ھ): ۱/۳۴۶، كتاب الصوم، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ المحيط البرهاني- ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ): ۵/۲۸۵، كتاب الاستحسان والكراهية، الفصل الأول في العمل بخبر الواحد، ط: دار الكتب العلمية ☆ تبيين الحقائق: ۱/۳۲۱، كتاب الصوم، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق ☆ العناية شرح الهداية: ۱/۳۲۳، فصل في رؤية الهلال، ط: دار الفكر- بيروت)

(۴) وفي القدوري: إذا كان بين البلدتين تفاوتاً لا تختلف المطالع لزم حكم إحدى البلدتين حكم البلدة الأخرى، فأما إذا كان تفاوتاً تختلف المطالع لم يلزم إحدى البلدتين حكم البلدة الأخرى. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني- ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ): ۲/۳۷۹، كتاب الصوم، الفصل الثاني فيما يتعلق برؤية الهلال، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الفتاوى التاتار خانية: ۳/۳۶۵، كتاب الصوم، الفصل: اختلاف المطالع، ط: زكريا- ديوبند)

آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ نیوزی لینڈ اور فیجی کا مطلع ایک ہے؛ اس لیے اہل فیجی اور اہل نیوزی لینڈ اپنے یہاں ہلال کمیٹی قائم کریں اور دونوں کمیٹی کے ذمہ داران، آپس میں رابطہ میں رہیں، جب نیوزی لینڈ میں چاند دکھ جائے، تو وہاں کی کمیٹی کے ذمے داران فیجی کی کمیٹی کے ذمے داران کو مطلع کر دیں۔ اس طرح سب ایک ساتھ، رمضان کے روزے ادا کر سکیں گے اور عید منا سکیں گے۔

جب ذمہ داران فون سے رابطہ قائم کریں، تو بہتر ہے کہ ایسا آدمی بات کرے، جن کی آواز دوسرے ملک کی کمیٹی کے ذمے داران پہچانتے ہوں، یہ مزید تقویت کا باعث ہوگا، نیوزی لینڈ والے اہل فیجی کو یہ بھی بتادیں کہ ریڈیو یا ٹی وی پر چاند کی خبر کب نشر کی جائے گی، تاکہ وقت مقررہ پر اس کی سماعت کی جاسکے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] صرف رمضان میں نماز کی پابندی کرنے والے شخص کی گواہی کا حکم

۱۵۰۷- سوال: ایک شخص سال کے گیارہ مہینے نماز کی پابندی نہیں کرتا ہے؛ لیکن رمضان میں بڑی پابندی کرتا ہے، تو کیا ایسے آدمی کی چاند کے معاملے میں گواہی معتبر مانی جائے گی؟

الجواب حامدا ومصليا:

اگر وہ ذی وجاہت ہو اور آپ کو اس کے سچ بولنے کا یقین ہو، تو اس کی بات پر عمل کی گنجائش ہے، اس کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱)... (والعدالة) وهي كون حسنات الرجل أكثر من سيئاته وهي الانزجار عما يعتقده حراما في دينه وهذا يتناول الاجتناب من الكبائر وترك الإصرار على الصغائر. ـــــــ وعن أبي يوسف أن الفاسق إن كان وجيها ذا مروءة تقبل شهادته، والأول أصح إلا أن القاضي لو قضى بشهادة الفاسق يصح عندنا خلافا للشافعي ولنا أن العدالة شرط وجوب العمل بالشهادة لا شرط أهلية الشهادة لأن الفاسق أهل للقضاء والشهادة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، المعروف بـ 'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱۸۸/۲، أول كتاب الشهادة، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۳۷۲/۲، كتاب الشهادات، نصاب الشهادة، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆ البناية شرح الهداية - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۱۱۲/۹، اشترط العدالة في الشهادة ☆ المبسوط - شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱۳۱/۱۶، باب من لاتجوز شهادته، ط: دار المعرفة - بيروت)

[۲۱] فون کے ذریعہ چاند کی اطلاع

۱۵۰۸- سوال: بہ ذریعہ فون چاند کی اطلاع ترکیسر کی ہلال کمیٹی کو پہنچی اور چاند دیکھنے والے نے خود فون پر چاند کی اطلاع دی، ان کی عدالت وصداقت کے متعلق اس بستی کے کچھ لوگوں نے فون پر اپنی گواہی بھی دی، تو کیا اس کی دی گئی خبر معتبر ہوگی یا نہیں؟ نیز فون ریسیو کرنے والے ہلال کمیٹی کے صرف ایک ہی فرد ان ساری کارروائی کو سنتے ہیں، تو کیا صرف ایک فرد کا سننا کافی ہے یا دوسرے کا بھی سننا ضروری ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

فون پر چاند دیکھنے کی اطلاع دینے والا بہ چشم خود دیکھنے کی اطلاع دیتا ہو اور اس خبر دینے والے کو آپ جانتے ہوں، کہ یہ عادل ہے، تو اس کی خبر کا اعتبار کرنا اور ثبوت رمضان کا اعلان کرنا جائز ہے۔ (۱)

اور اگر اس خبر دینے والے کو آپ نہ جانتے ہوں، تو اس کے لیے تزکیہ کی ضرورت پڑے گی اور تزکیہ کرنے کے لیے دو آدمی کا ہونا ضروری ہے۔

واضح رہے کہ ٹیلی فون پر چاند کی خبر دینے والے کے سلسلے میں مذکورہ تفصیل اس وقت ہے، جب کہ وہ یا تو بہ چشم خود چاند دیکھنے کی گواہی دیتا ہو، یا قاضی کے فیصلے کی خبر دیتا ہو، اگر کسی کی سنی سنائی بات کو نقل کرتا

---

(۱) مسئلہ کی پوری تفصیل کے لیے ناچیز کی درج ذیل تحریر ملاحظہ فرمائیں:

”ثبوت ہلال کے معاملے میں دو موقعہ پر خبر کو کافی سمجھا گیا ہے، ایک تو یہ کہ مطلع ابر آلود ہو اور معاملہ رمضان کے چاند کا ہو، اس موقع سے ایک آدمی کی خبر کافی ہوتی ہے؛ اس لیے اس صورت میں کوئی معتبر شخص فون کے ذریعے خبر دے اور اس کی پوری شناخت کر لی گئی ہو، تو یہ خبر ثبوت ہلال کے لیے کافی سمجھی جانی چاہیے۔ دوسرے جب کہ مطلع صاف ہو، تو ”خبر مستفیض“ کی ضرورت پڑتی ہے اور ”خبر مستفیض“ درحقیقت اتنی بڑی جماعت کی خبر ہے، جن کا جھوٹ پر متفق ہونا ناقابل تصور ہو؛ اس لیے اگر ٹیلی فون کے ذریعے اتنی مقدار میں خبریں موصول ہوں کہ جن پر ”خبر مستفیض“ کا اطلاق ہوتا ہے، تو اس سے چاند کا ثبوت ہو جائے گا۔

لیکن اگر مطلع ابر آلود ہو اور معاملہ عید کے چاند کا ہو، تو اس صورت میں ٹیلی فون کی اطلاع سے ہلال عید ثابت نہیں ہوگا کہ اس میں شہادت کی ضرورت پڑتی ہے، جب کہ فون کے ذریعے شہادت نہیں دی جا سکتی، البتہ ایسے موقعے پر یہ تدبیر اختیار کرنی چاہیے کہ مختلف مقامات پر ہلال کمیٹی یا قاضی کے نمائندے بہ ذات خود جا کر گواہی لے لیں اور پھر اس کی اطلاع فون کے ذریعے دے دیں۔“ (اسلام اور جدید ذرائع ابلاغ، ص: ۱۶۲، فون اور ثبوت ہلال، ط: دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

ہو، تو اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، یعنی اس کی بات قابل قبول نہ ہوگی۔ (۲)

ہلال رمضان کے ثبوت کے لیے نہ شہادت کی ضرورت ہے اور نہ حکم حاکم کی؛ بلکہ کسی بھی عادل فرد کا بچشم خود دیکھنے کی خبر دینا کافی ہے، اس کی بات پر عمل کر کے سامع کے لیے روزہ رکھنا ضروری ہوگا۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] مکہ مکرمہ میں مقیم ہندستانی پاکستان کی رویت کا اعتبار کرے یا مقامی اعلان کا؟

۱۵۰۹-سوال: ہندوستان والوں نے، پاکستان والوں سے ایک دن قبل مکہ مکرمہ میں عید قرباں منائی، تو ان کا حج اور قربانی درست ہوگی؟ سوال کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ سعودیہ والے کیلنڈر دیکھ کر چاند کا اعلان کرتے ہیں، چاند دیکھنے کا اہتمام نہیں کرتے، کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

ہندوستان اور پاکستان کی اسلامی تاریخ ایک ہی رہتی ہے، کوئی فرق نہیں، البتہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ہندوستان کے مقابلے میں تاریخ ایک دن آگے ہوتی ہے اور کبھی کبھی دو دن بھی آگے ہوجاتی ہے۔

اس لیے مکہ مکرمہ میں موجود ہندستانی کے لیے لازم ہے کہ وہ وہاں کے اعتبار سے عید منائیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں ان کا عید منانا اور حج وقربانی کرنا؛ سب درست ہے، اس میں شک وشبہ کی کوئی وجہ نہیں۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے علمائے کرام چاند کے متعلق اپنی ذمہ داری صحیح طور پر ادا کر رہے ہیں،

---

(۲)(قوله: بطريق موجب) كأن يتحمل اثنان الشهادة، أو يشهدا على حكم القاضي أو يستفيض الخبر بخلاف ما إذا أخبرا أن أهل بلدة كذا رأوه، لأنه حكاية ح.(رد المحتار على الدر المختار:۲/ ۳۹۴،قبيل:باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده،ط: دار الفكر- بيروت☆حاشية الطحطاوي على المراقي،ص:۶۵۶، فصل فيما يثبت به الهلال و في يوم الشك،ت: محمدعبدالعزيز الخالدي،ط:دار الكتب العلمية☆جواهر الفقه:۵/ ۱۷۷-۱۷۸)

(۳)وإن كانت السماء متغيمة، فإنه يقبل خبر الواحدة العدل، ذكرا كان أو أنثى، حرا كان أو عبدا، محدودا في القذف أو لا، بعد ما تاب وصار عدلا؛ لأن هذا من باب الإخبار دون الشهادة، يلزم الشاهد الصوم فيتعدى إلى غيره؛ لكنه من باب الدين فيشترط فيه العدالة.(تحفة الفقهاء-محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ):۱/ ۳۴۶، كتاب الصوم،ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆المحيط البرهاني-ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶هـ): ۵/ ۲۸۵، كتاب الاستحسان والكراهية، الفصل الأول في العمل بخبر الواحد، ط: دار الكتب العلمية☆ تبيين الحقائق: ۱/ ۳۲۱، كتاب الصوم،ط:المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق☆العناية شرح الهداية:۱/ ۳۲۳،فصل في رؤية الهلال، ط: دار الفكر- بيروت)

دنیوی قانون کے رو سے [صرف کیلنڈر دیکھ کر] وہ حضرات تاریخ کا اعلان نہیں کرتے، اس لیے شک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، گواہی سے چاند ثابت ہو جانے کے بعد ہی وہاں کے قاضی اور حکومت کے ذمہ داران چاند کا فیصلہ کرتے ہیں۔

میں ۱۳۹۳ء میں حج کے لیے گیا تھا، ۲۹ر شعبان کو عصر کے وقت وہاں پہنچا، چاند کا اعلان عشاء کی نماز کے وقت ہوا تھا، اسی طرح مدینہ منورہ میں ۲۹ر رمضان المبارک کو چاند کا اعلان عشاء کی نمازِ فرض و تراویح کے بعد ہوا تھا، اس سے یقینی طور پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ حرمین شریفین کے ذمہ داران، رؤیت ہلال کے شرعی ثبوت کے بعد ہی چاند کا اعلان کرتے ہیں اور طلوع و غروب کے اعتبار سے کبھی ایک دن کا اور کبھی دو دن کا فرق پڑتا ہے۔ (☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] ریڈیو، تار اور ٹیلی فون وغیرہ کے ذریعہ موصول ہونے والی چاند کی خبریں

۱۵۱۰- سوال: ریڈیو، تار، ٹیلی فون اور وہ خطوط جو پوسٹ کے ذریعہ ہمیں موصول ہوتے ہیں، جس میں چاند کے متعلق خبریں ہوتی ہیں، شرعاً اس پر عمل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور عمل کرنے کے لیے کیا شاہدین کا سامنے ہونا ضروری ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

اگر فضاء ابر آلود ہو اور رمضان المبارک کے چاند کے متعلق ایک دین دار شخص خبر دے کہ میں نے چاند دیکھا ہے، خواہ بالمشافہ خبر دے یا خط کے ذریعے، جب کہ آپ لکھنے والے کی تحریر کو اچھی طرح پہچانتے ہیں، [1]

(☆☆☆) تفصیل کے لیے دیکھیے: رؤیت ہلال- مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ (م: ۱۹۷۶ء) باب: عام اسلامی ممالک میں رؤیت ہلال، ط: ادارہ اشرف التبلیغ، نبیہ منزل، دیوبند۔

(۱) قال في خزانة الأكمل: أجاز أبو يوسف ومحمد العمل بالخط في الشاهد والقاضي والراوي إذا رأى خطه ولم يتذكر الحادثة قال في العيون: والفتوى على قولهما إذا تيقن أنه خطه سواء كان في القضاء أو الرواية أو الشهادة على الصك، وإن لم يكن الصك في يد الشاهد، لأن الغلط نادر وأثر التغيير يمكن الاطلاع عليه، وقلما يشتبه الخط من كل وجه فإذا تيقن جاز الاعتماد عليه توسعة على الناس اهـ حموي. (رد المحتار على الدر المختار- ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲ھ): ۵/ ۴۳۷، كتاب القضاء، كتاب القاضي إلى القاضي، مطلب في دفتر البياع والصراف والسمسار، ط: دار الفكر- بيروت)

یا فون کے ذریعے خبر دے، اور آپ اس کی آواز کو جانتے ہیں، (۲) تو اس کی خبر کا اعتبار کر کے روزے رکھنا ضروری ہے؛ کیوں کہ رمضان المبارک کے چاند کے ثبوت کے لیے [جب کہ مطلع صاف نہ ہو] بس یہی خبر کافی ہے، گواہی یا خبر استفاضہ (یعنی اتنی بڑی جماعت چاند دیکھنے کی اطلاع دے، جن کا جھوٹ پر متفق ہوجانا، عادۃً نا قابل تصور ہو) کی ضرورت نہیں ہے۔ (۳)

رمضان کے علاوہ دوسرے گیارہ مہینوں کے چاند کے ثبوت کے لیے گواہی یا خبر مستفیض کی ضرورت پڑے گی، اسی سے چاند کا ثبوت ہوگا، (۴) خواہ دو گواہ بہ نفس نفیس قاضی کے سامنے گواہی دیں، یا کسی کی گواہی

(۲) قلت: والظاهر أنه يلزم أهل القرى الصوم بسماع المدافع أو رؤية القناديل من المصر؛ لأنه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل كما صرحوا به واحتمال كون ذلك لغير رمضان بعيد إذ لا يفعل مثل ذلك عادة في ليلة الشك إلا لثبوت رمضان. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۸۶/۲، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان)

(۳) عن ابن عباس قال: جاء أعرابي إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: إني رأيت الهلال، قال الحسن في حديثه يعني رمضان، فقال: أتشهد أن لا إله إلا الله، قال: نعم، قال: أتشهد أن محمدا رسول الله؟، قال: نعم، قال: يا بلال، أذن في الناس فليصوموا غدا. (سنن أبي داود: ۳۲۰/۱، رقم الحديث: ۲۳۴۰، كتاب الصوم، باب في شهادة الواحد على رؤية هلال رمضان، ط: ديوبند☆ سنن الترمذي: ۱۴۸/۱، رقم الحديث: ۶۹۱، أبواب الصوم، باب ما جاء في الصوم بالشهادة، ط: ديوبند☆ المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳هـ): ۱۳۲/۴، رقم الحديث: ۲۱۱۳، الصيام، باب قبول شهادة الرجل الواحد على هلال شهر رمضان، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

وفيه دليل قبول خبر الواحد كما ترى. (العناية شرح الهداية: ۳۲۳/۲، كتاب الصوم، فصل في رؤية الهلال، ط: دار الفكر ☆ المعتصر من المختصر من مشكل الآثار: ۱۳۹/۱، كتاب الصوم، باب الشهادة الواحد به، ط: عالم الكتاب، بيروت☆ البناية شرح الهداية: ۸/۴، كتاب الصوم، سبب فرضية شهر رمضان، ط: دار الكتب العلمية)

وإن كانت السماء متغيمة، فإنه يقبل خبر الواحدة العدل، ذكرا كان أو أنثى، حرا كان أو عبدا، محدودا في القذف أو لا بعد ما تاب وصار عدلا؛ لأن هذا من باب الإخبار دون الشهادة، يلزم الشاهد الصوم فيتعدى إلى غيره؛ لكنه من باب الدين فيشترط فيه العدالة. (تحفة الفقهاء - محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ): ۳۴۶/۱، كتاب الصوم، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆ المحيط البرهاني - ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲۸۵/۵، كتاب الاستحسان والكراهية، الفصل الأول في العمل بخبر الواحد، ط: دار الكتب العلمية☆ تبيين الحقائق: ۳۲۱/۱، كتاب الصوم، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق☆ العناية شرح الهداية: ۳۲۳/۱، فصل في رؤية الهلال، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) "ويشترط" في الثبوت "لبقية الأهلة" إذا كان بالسماء علة "شهادة رجلين عدلين أو" شهادة "حر وحرتين غير محدودين في قذف" وإلا فجمع عظيم. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - حسن بن عمار الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹هـ) ص: ۲۴۳، كتاب الصوم، فصل فيما يثبت به الهلال وفي صوم يوم الشك وغيره، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

قال - رحمه الله - (والأضحى كالفطر) أي هلال الأضحى كهلال الفطر حتى لا يثبت إلا بما يثبت به هلال =

پر گواہی دی جائے یا قاضی کے فیصلہ پر گواہی دی جائے۔[۵] الغرض مذکورہ کسی طریقہ سے جب تک شرعاً چاند کا ثبوت نہ ہوجائے، اس وقت تک چاند کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔

ریڈیو اور تار ایک طرح کی خبر ہے، مگر اس خبر کا دینے والا کون ہے، مسلم یا غیر مسلم؟ معلوم نہیں؛ اس لیے رمضان کا ثبوت بھی اس خبر سے نہیں ہوگا؛ ہاں اگر ریڈیو پر چاند کی خبر دینے والا شخص ہلال کمیٹی کا کوئی ذمہ دار ہو اور وہ چاند کے ثبوت کا حتمی فیصلہ ریڈیو سے دے رہا ہو، تو اس کے فیصلہ کا اعتبار کر کے چاند کے ثبوت کا اعلان کیا جائے گا۔[۶] ورنہ ریڈیو، ٹیلی گرام یا نامعلوم شخص کی کال؛ محض ایک خبر ہوگی، جس سے چاند کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] گجراتی اخبار میں چاند کی شائع شدہ خبر پر عمل کر کے قربانی کرنا

۱۵۱۱- سوال: دینک ورتمان پتر (گجراتی روزنامہ) میں چاند کے تعلق سے ۲۹/ذی قعدہ کو

=الفطر، لأنه تعلق به حق العباد وهو التوسع بلحوم الأضاحي فصار كالفطر. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق-عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م:۷۴۳هـ): ۳۲۱/۱، كتاب الصوم، ط: المطبعة الكبرى الأميرية-بولاق)

"وهلال الأضحى" في الحكم "كالفطر" فلا بد من نصاب الشهادة مع العلة والجمع العظيم مع الصحو على ظاهر الرواية وهو الأصح لما تعلق به من نفع العباد. (مراقي الفلاح، ص: ۲۴۳)

(۵) (قوله: بطريق موجب) كأن يتحمل اثنان الشهادة، أو يشهدا على حكم القاضي أو يستفيض الخبر بخلاف ما إذا أخبرا أن أهل بلدة كذا رأوه؛ لأنه حكاية ح. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۹۴/۲، قبيل: باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط: دار الفكر- بيروت☆حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ۶۵۶، فصل فيما يثبت به الهلال و في يوم الشك، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية☆جواهر الفقه: ۱۷۷/۵-۱۷۸)

وفي مجموع النوازل: شاهدان شهدا عند قاضي مصر لم ير أهله الهلال على أن قاضي مصر كذا شهد عنده شاهدان برؤية الهلال، وقضى به، ووجد استجماع شرائط صحة الدعوى قضى القاضي بشهادتهما حكاه عن شيخ الإسلام. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶هـ): ۳۷۹/۲، كتاب الصوم، الفصل الثاني فيما يتعلق برؤية الهلال، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆الفتاوى التاتارخانية: ۳۶۶/۳، كتاب الصوم، رؤية الهلال، ط: زكريا-ديوبند)

(۶) نعم إذا تواردت أخبار "راديو" متعددة من شتى الجهات، ولا تختلف جهات الأنباء عن البلد الذي لم ير فيه الهلال ببعد يختلف فيه المطلع فيسوغ العمل بهذه الأنباء المرسلة، وتدخل في حد الاستفاضة المفيدة للطمانينة. (معارف السنن-السيد محمد يوسف بن السيد زكريا الحسيني البنوري (م: ۱۳۹۷هـ): ۳۴۰/۵، كتاب الصوم، باب ما جاء أن الصوم لرؤية الهلال والإفطار له، ط: ايچ، ايم سعيد، كراتشي، الباكستان)

خبر آئی کہ ذی الحجہ کا چاند دیکھا گیا ہے، اس پر اعتماد کرتے ہوئے بعض حضرات نے ذی قعدہ کا مہینہ ۲۹ / یوم کا تسلیم کیا، اور اس کے بعد دسویں دن (۱۰ / ذی الحجہ کو) عید منایا اور اسی دن اپنی قربانی کی، تو ان کی قربانی درست صحیح ہوئی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

مطلع صاف ہو، تو ثبوت ہلال کے لیے خبر مستفیض ضروری ہے اور ''خبر مستفیض'' کا مطلب یہ ہے کہ اتنی بڑی جماعت اطلاع دے، جن کا جھوٹ پر متفق ہو جانا، عادۃً نا قابل تصور ہو اور سننے والے کو اس کا یقین ہو جائے۔ (۱)

مثلاً: پانچ سات آدمیوں نے چاند دیکھنے کی خبر دی، پانچ سات الگ الگ مقام کے ریڈیو اسٹیشنوں سے چاند کی خبر نشر ہوئی، پانچ سات شہر اور گاؤں سے خطوط اور تار موصول ہوئے، پانچ سات جگہوں سے چاند ہونے کی خبر اخبارات کے ذریعہ موصول ہوئیں، تو مذکورہ بیس پچیس خبریں چاند کے متعلق موصول ہوئیں؛ اس لیے سننے والے کو چاند ہونے کا یقین ہو جائے گا اور اس خبر کا اعتبار کر کے عید منانا اور قربانی کرنا جائز ہوگا۔ (۲)

---

(۱) قال: "وإذا لم تكن بالسماء علة لم تقبل الشهادة حتى يراه جمع كثير يقع العلم بخبرهم". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳ھ):۱/۱۱۹، كتاب الصوم، فصل في رؤية الهلال، ت:طلال يوسف، ط:دار احياء التراث العربي-بيروت)

والحق ما روي عن محمد وأبي يوسف أيضا أن العبرة لتواتر الخبر ومجيئه من كل جانب. (فتح القدير-كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بـ'ابن الهمام' (م:۸۶۱ھ):۲/۳۲۴، كتاب الصوم، فصل في رؤية الهلال، ط:دار الفكر)

وفي الفتح والحق ما روي عن محمد وأبي يوسف أيضا أن العبرة لتواتر الخبر ومجيئه من كل جانب حتى لا يتوهم تواطؤهم على الكذب. وفي الزاد وهو الصحيح. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م:۱۰۷۸ھ):۱/۲۳۷، كتاب الصوم، ما يثبت به رمضان، ط: دار إحياء التراث العربي☆حاشية الشِلْبِيِّ على تبيين الحقائق- شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِلْبِيُّ (م:۱۰۲۱ھ):۱/۳۲۱، كتاب الصوم، ط: المطبعة الكبرى الأميرية-بولاق، القاهرة★رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۸۸، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط:دار الفكر)

(۲) نعم إذا تواردت أخبار "راديو" متعددة من شتى الجهات، ولا تختلف جهات الأنباء عن البلد الذي لم ير فيه الهلال ببعد يختلف فيه المطلع فيسوغ العمل بهذه الأنباء المرسلة، وتدخل في حد الاستفاضة المفيدة للطمانينة. (معارف السنن-السيد محمد يوسف بن السيد زكريا الحسيني البنوري (م:۱۳۹۷ھ):۵/۳۴۰، كتاب الصوم، باب ما جاء أن الصوم لرؤية الهلال والإفطار له، ط:ايج، ايم سعيد، كراتشي، الباكستان)

یہاں شکوک وشبہات قائم کرنے کی کوئی وجہ نہیں؛ لیکن ایک دوجگہوں کے اخبارات کی خبروں پر اعتبار کر کے عید منانا اور قربانی کرنا جائز نہیں ہوگا۔ ہاں! اگر یہ خبر، ہلال کمیٹی کا فیصلہ ہو، تو اس کا اعتبار کیا جائے گا اور اس پر عمل کرنا واجب ہوگا۔ (☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] ایک شہر کے اخبار کے ذریعہ شائع شدہ چاند کی خبر کا، دوسرے شہر والوں کے لیے حکم

۱۵۱۲-سوال: احمد آباد، بڑودہ اور سورت وغیرہ شہروں سے نکلنے والے ہفت روزہ اخبارات میں چاند کمیٹی کی طرف سے ذی الحجہ کے انتیسویں چاند کی جو اطلاعات کبھی موصول ہوتی ہیں اور اس چاند کمیٹی میں عالم صاحب بھی ہوتے ہیں، تو کیا یہ شائع شدہ خبر صرف اسی شہر کے لوگوں کے لیے ہوتی ہے یا اس کو پڑھنے والے ہر خطے کے مسلمانوں پر اس کا عمل ضروری ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

ہلال کمیٹی کی کچھ حدود ہوتی ہیں، کوئی ہلال کمیٹی صرف گاؤں کے لیے ہوتی ہے، اس کا فیصلہ اس گاؤں کی حد تک رہے گا، اس گاؤں سے متجاوز نہیں ہوگا، کوئی ہلال کمیٹی تحصیل اور ضلع کے لیے ہوتی ہے، کوئی کمیٹی دو ضلعوں کے لیے؛ مثلاً: سورت اور بلساڑ کی کمیٹی، کوئی کمیٹی اس سے زیادہ ضلعوں کے لیے بھی ہوتی ہے اور کوئی کمیٹی آل انڈیا بھی ہوتی ہے؛ اس لیے جس انداز کی ہلال کمیٹی ہوگی، اس خطے کے لوگوں پر اس کا فیصلہ نافذ ہوگا اور وہاں کے لوگوں پر اس کمیٹی کے فیصلے پر عمل کرنا واجب ہوگا۔ (۱)

(☆☆☆) اس لیے کہ یہ محض اطلاع نہیں ہے، بل کہ ایک فیصلے کا اعلان ہے، جس میں اعلان کرنے والے کی عدالت وغیرہ کی طرف نظر نہیں کی جائے گی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: عبادات اور چند اہم جدید مسائل-مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ، ص: ۲۲ ☆ کفایت المفتی: ۴/ ۲۱۵، کتاب الصوم، ط: زکریا-دیوبند)

(۱) جس شہر میں باقاعدہ قاضی یا ہلال کمیٹی نے کسی شہادت پر اطمینان کر کے، عید وغیرہ کا اعلان کر دیا ہو، اس اعلان کو اگر ریڈیو پر نشر کیا جائے، تو جس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے، اس شہر اور اس کے مضافات و دیہات کے لوگوں کو اس ریڈیو کے اعلان پر عید وغیرہ کرنا جائز ہے، شرط یہ ہے کہ ریڈیو کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ چاند کے متعلق مختلف خبریں نشر نہ کرے، صرف وہ فیصلہ نشر کرے، جو اس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے اس کو دیا ہے اور اس کو نشر کرنے میں پوری احتیاط سے کام لے، جن الفاظ میں فیصلہ دیا گیا ہے، وہ الفاظ بعینہ نشر کیے جائیں، جس ریڈیو پر ایسی احتیاط کی پابندی نہ ہو، اس کے اعلان پر عید وغیرہ کرنا کسی کے لیے درست نہیں۔

اور جس طرح ایک شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی کا فیصلہ اس شہر اور اس کے مضافات کے لیے واجب العمل ہے، اسی طرح اگر کوئی قاضی یا مجسٹریٹ یا ہلال کمیٹی پورے ضلع یا صوبہ یا پورے ملک کے لیے ہو، تو اس کا فیصلہ اپنے اپنے حدود ولایت میں واجب العمل ہوگا۔

(آلات جدیدہ کے شرعی احکام، ص: ۱۸۸، باب: ہلال کے معاملہ میں آلات جدیدہ کی خبروں کا درجہ، ط: قاسمی کتب خانہ-دیوبند ☆ جواہر الفقہ: ۵/ ۱۷۷)

لیکن یہ بات واضح رہے کہ جس جگہ بھی ہلال کمیٹی بنائی جائے، اس میں ایک عالم کا ہونا ضروری ہے، جو احکام شریعت کی روشنی میں لوگوں کی دینی رہنمائی کر سکے، اگر کمیٹی میں تمام لوگ ناواقف اوران پڑھ ہوں گے، تو دینی معلومات کے نہ ہونے کی وجہ سے بروقت کسی بات کا فیصلہ نہیں کر سکیں گے؛ لہٰذا جس جگہ کی ہلال کمیٹی میں کوئی ایک بھی عالم نہ ہو، اس کا فیصلہ معتبر نہیں ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] ثبوتِ ہلال کے لیے کتنے اور کس طرح کے افراد کی خبر وشہادت معتبر ہے؟

۱۵۱۳- سوال: اگر کسی ایک آدمی نے رمضان کا چاند دیکھا، تو کیا اس کی خبر پر روزہ رکھنا ضروری ہے؟

چاند دیکھنے والا شخص ایسا ہو کہ اس کو کسی نے رمضان المبارک میں غیر مسلم کی دکان پر شربت وغیرہ پیتے دیکھا ہو، تو کیا اس کی خبر معتبر ہوگی؟

اگر کسی مرد نے چاند نہ دیکھا ہو، صرف دو عورتوں نے چاند دیکھا ہو، تو کیا ان کی خبر و گواہی معتبر ہوگی؟ جس طرح نکاح میں گواہ کے طور پر ایک مرد اور دو عورتوں کا ہونا ضروری ہے؟ کیا چاند کے معاملہ میں بھی یہی قاعدہ ہے؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداومصليا:

اگر آسمان پر بدلی چھائی ہو، یا غبار وغیرہ ہو، جس کی وجہ سے مطلع صاف نہ ہو، تو رمضان المبارک کے چاند کے ثبوت کے لیے گواہی اور اس کا نصاب شرط نہیں ہے، بس اس قدر کافی ہے کہ ایک عادل مرد رؤیت کی خبر دے دے؛ بل کہ ایک صوم وصلاۃ کی پابند عورت کی خبر بھی کافی ہے۔[1]

---

(۱) عن ابن عباس قال: جاء أعرابي إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: إني رأيت الهلال، قال الحسن في حديثه يعني رمضان، فقال: أتشهد أن لا إله إلا الله، قال: نعم، قال: أتشهد أن محمدا رسول الله؟، قال: نعم، قال: يا بلال، أذن في الناس فليصوموا غدا. (سنن أبي داود: ۱/ ۳۲۰، رقم الحديث: ۲۳۴۰، كتاب الصوم، باب في شهادة الواحد على رؤية هلال رمضان، ط: ديوبند☆ سنن الترمذي: ۱/ ۱۴۸، رقم الحديث: ۶۹۱، أبواب الصوم، باب ما جاء في الصوم بالشهادة، ط: ديوبند☆ المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳هـ): ۴/ ۱۳۲، رقم الحديث: ۲۱۱۳، الصيام، باب قبول شهادة الرجل الواحد على هلال شهر رمضان، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية- حلب)

و فيه دليل قبول خبر الواحد كما ترى. (العناية شرح الهداية: ۲/ ۳۲۳، كتاب الصوم، فصل في رؤية الهلال، ط: دار الفكر ☆ المعتصر من المختصر من مشكل الآثار: ۱/ ۱۳۹، كتاب الصوم، باب الشهادة الواحد به، ط: عالم الكتاب، بيروت☆ البناية=

بادل وغیرہ کی وجہ سے مطلع صاف نہ ہو، تو عید اور دوسرے مہینوں کے ثبوت ہلال کے لیے دو عادل مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے۔

اگر آسمان صاف ہو تو ثبوت ہلال کے لیے ایک دو آدمی کی گواہی کافی نہیں ہے، بل کہ جم غفیر کی خبر [خبر مستفیض] کا ہونا ضروری ہے، جس سے یقین ہو جائے کہ واقعی چاند ہوا ہے اور ثبوت ہلال میں کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہے۔[۲]

رمضان یا عید کے چاند کا مدار جب ایک شخص کی خبر یا دو آدمی کی گواہی پر ہو، [یعنی مطلع ابر آلود ہو اور معاملہ ہلال رمضان کا ہو کہ جس میں ایک شخص کی خبر کافی ہے، یا معاملہ ہلالِ عید الفطر کا ہو، جس میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورت کی گواہی ضروری ہے] تو ان کا ''عادل'' ہونا ضروری ہے۔

جو آدمی بلا عذر رمضان میں روزہ نہ رکھتا ہو اور غیر مسلم کی دکان پر کھاتا پیتا ہو، تو وہ فاسق ہے، اس کی گواہی مقبول نہ ہوگی، اسی طرح روزہ دار نمازی آدمی اگر ایسا ہو کہ بازار میں چلتے پھرتے کھاتا ہو، تو اس کی گواہی بھی درست نہیں ہے۔ (شامی جلد ۲، صفحہ ۳۸۵)[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=شرح الهداية: ۸/۴، كتاب الصوم، سبب فرضية شهر رمضان، ط: دار الكتب العلمية)

وإن كانت السماء متغيمة، فإنه يقبل خبر الواحدة العدل، ذكرا كان أو أنثى، حرا كان أو عبدا، محدودا في القذف أو لا بعد ما تاب وصار عدلا ؛ لأن هذا من باب الإخبار دون الشهادة، يلزم الشاهد الصوم فيتعدى إلى غيره؛ لكنه من باب الدين فيشترط فيه العدالة. (تحفة الفقهاء-محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ): ۱/۳۴۶، كتاب الصوم، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆المحيط البرهاني-ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶هـ): ۲۸۵/۵، كتاب الاستحسان والكراهية، الفصل الأول في العمل بخبر الواحد، ط: دار الكتب العلمية☆ تبيين الحقائق: ۱/۳۲۱، كتاب الصوم، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق☆العناية شرح الهداية: ۱/۳۲۳، فصل في رؤية الهلال، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) "ويشترط" في الثبوت "لبقية الأهلة" إذا كان بالسماء علة "شهادة رجلين عدلين أو" شهادة "حر وحرتين غير محدودين في قذف" وإلا فجمع عظيم. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح- حسن بن عمار الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ) ص: ۲۴۳، كتاب الصوم، فصل فيما يثبت به الهلال وفي صوم يوم الشك وغيره، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

[۳] (قوله: خبر عدل) العدالة ملكة تحمل على ملازمة التقوى، والمروءة. الشرط أدناها وهو ترك الكبائر والإصرار على الصغائر وما يخل بالمروءة ويلزم أن يكون مسلما عاقلا بالغا، بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۸۵/۲، كتاب الصوم، باب سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر☆كتاب التعريفات- الجرجاني: ۱/۱۹۷، الباب الثاني في رؤية الهلال، ط: رشيديه-پاكستان)

[۲۷] رمضان اور عید کے چاند کی رؤیت: اصول وشرائط

۱۵۱۴- سوال: ہلال رمضان وعید کے ثبوت کے لیے کیا اصول ہیں؟ ہلال کے سلسلے میں عورت کی گواہی معتبر ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

رمضان اور عید کے چاند کی گواہی میں، جب کہ مطلع صاف ہو، ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی معتبر نہیں ہوگی؛ بل کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کا خبر دینا ضروری ہے، جن کے جھوٹ پر متفق ہونے کا گمان باقی نہ رہے، شامی میں ہے: **وإن كان ذلك في مصر ولا علة في السماء لم يقبل في ذلك إلا الجماعة اهـ.** (شامی)[1]

ایسی خبر کو اصطلاح فقہ میں ''خبر مستفیض'' کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ خبر دینے والے اتنے افراد ہوں کہ عادۃً ان کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہ ہو۔ (۲)

البتہ مطلع اگر صاف نہ ہو، تو ایک مرد یا ایک عورت کی خبر ثبوت رمضان کے لیے کافی ہوگی؛ لیکن ان کا عاقل، بالغ اور مسلمان ہونا ضروری ہے، خواہ وہ آزاد ہو یا غلام۔ (۳)

---

[۱] رد المحتار على الدر المختار: ۳۸۹/۲، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳۵۵/۳، كتاب الصوم، الفصل: رؤية الهلال، ط: زكريا - ديوبند.

تفصیل کے لیے دیکھیے: سوال سابق (بہ عنوان: ثبوتِ ہلال کے لیے کتنے اور کس طرح کے افراد کی خبر وشہادت معتبر ہے؟) کا حاشیہ نمبر ا۔

(۲) (و) قبل (بلا علة جمع عظيم يقع العلم) الشرعي وهو غلبة الظن (بخبرهم) [الدر المختار] ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وقبل بلا علة) أي إن شرط القبول عند عدم علة في السماء لهلال الصوم أو الفطر أو غيرهما كما في الإمداد... إخبار جمع عظيم فلا يقبل خبر الواحد؛ لأن التفرد من بين الجم الغفير بالرؤية مع توجههم طالبين لما توجه هو إليه مع فرض عدم المانع، وسلامة الإبصار وإن تفاوتت في الحدة ظاهر في غلطه بحر.... (قوله: يقع العلم الشرعي) أي المصطلح عليه في الأصول فيشمل غالب الظن.... (قوله: وهو غلبة الظن)؛ لأنه العلم الموجب للعمل لا العلم بمعنى اليقين نص عليه في المنافع وغاية البيان ابن كمال ومثله في البحر عن الفتح، وكذا في المعراج وقال القهستاني: (معزيا إلى شرح صدر الشريعة) قال: الجمع العظيم جمع يقع العلم بخبرهم ويحكم العقل بعدم تواطئهم على الكذب اهـ. [رد المحتار على الدر المختار: ۳۸۸/۲-۳۸۷، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر]

(۳) قال: " وإذا كان بالسماء علة قبل الإمام شهادة الواحد العدل في رؤية الهلال رجلا كان أو امرأة حرا كان أو =

اور عید کے چاند کے ثبوت کے لیے جب کہ مطلع صاف نہ ہو، دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا گواہی دینا ضروری ہے اور شرط یہ ہے کہ یہ لوگ عاقل بالغ دین دار مسلمان ہوں۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۸] فقہ شافعی میں تنہا عورتوں کی گواہی سے رؤیت ہلال کا ثبوت

۱۵۱۵-سوال: رؤیت ہلال کی گواہی کے لیے ایک بھی مرد نہ ہو، اور تقریباً ۵۰ عورتیں ہوں، تو کیا شوافع کے یہاں ان عورتوں کی گواہی معتبر سمجھی جائے گی؟

نوٹ: فقہ شافعی کے مطابق مسئلے کی وضاحت فرمائیں، مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداو مصليا:

فقہ شافعی میں ثبوت ہلال کے لیے شہادت شرط ہے، مطلع صاف ہو یا ابر آلود ہو اور تنہا عورتوں کی شہادت معتبر نہیں ہے؛ اس لیے مذکورہ صورت میں شافعیہ کے یہاں صرف عورتوں کی گواہی سے رؤیت ثابت نہیں ہوگی۔ (المجموع جلد ۶ صفحہ ۲۸۴) [☆☆☆] فقط، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[۲۹] اگر کسی جگہ چاند نظر نہ آئے، تو اہل قریہ کا تحقیق کے لیے کسی اور جگہ جانا

۱۵۱۶-سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

اگر کسی جگہ کے لوگ عیدین کے چاند کے سلسلہ میں یہ طریقہ اپنا رکھیں کہ مقامی رؤیت ہی کا اعتبار

= عبدا" لأنه أمر ديني فأشبه رواية الأخبار ولهذا لا يختص بلفظة الشهادة وتشترط العدالة لأن قول الفاسق في الديانات غير مقبول. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۱۹، كتاب الصوم، فصل في رؤية الهلال، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۸۹، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر)

(۴) قال: " وإذا كان بالسماء علة لم يقبل في هلال الفطر إلا شهادة رجلين أو رجل وامرأتين " لأنه تعلق به نفع العبد وهو الفطر. (المصادر السابقة)

[☆☆☆] {فرع} قد ذكرنا أن الصحيح من مذهبنا أنه لا تقبل شهادة النساء في هلال رمضان وحكاه ابن المنذر عن الليث والماجشون المالكي ولم يحك عن أحد قبولها. (المجموع شرح المهذب -أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ۶۷۶هـ): ۶/۲۸۴، كتاب الصيام، مسائل تتعلق بنية الصيام، ط: دار الفكر)

ہوگا، خواہ مطلع صاف ہو یا نہ ہو، وہ لوگ قطعاً اس کی زحمت نہ اٹھائیں کہ چاند ۲۹/ کا نہ ہونے کی صورت میں کسی جگہ آدمی بھیجیں اور شہادت حاصل کریں، یا کسی دارالافتاء سے رجوع کریں، ان کاموں کے لیے ان کے پاس نہ فنڈ ہے اور نہ ہی اس پر خرچ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، ہاں اگر خود بخود شہادت دینے والے وہاں آجائیں اور وہ انہیں شرعاً معتبر سمجھ لیں، تو الگ بات ہے۔

اسی طرح وہ لوگ اخبار میں شائع شدہ کسی ہلال کمیٹی (جو ملک کی دوسری ریاست میں واقع ہے) کے اعلان کو بھی نہیں مانتے، تار، ریڈیو، ٹیلی فون نہ خود کر کے معلوم کرتے ہیں اور نہ ان پر آنے والے اعلان کو معتبر جانتے ہیں، بل کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھتے ہیں اور چاند دیکھ کر عید مناتے ہیں، ہاں معتبر شہادت خود شاہدوں کے ذریعہ بلا جستجو کے، خود بخود آجائے اور ان کو اطمینان ہو جائے، تب ضرور مان لیتے ہیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا اس علاقہ کے لوگوں کا یہ طریقہ شرعی تعلیم کے مطابق ہے، یا ان کو چاند کے لیے اطراف و جوانب میں آدمی بھیج کر معلوم کرنا فرض و واجب ہے یا دوسرے علاقے کے اخبارات اور ان میں شائع شدہ فیصلۂ و خبر پر عمل کرنا واجب ہے؟ بینوا، تو جروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر کسی جگہ چاند نظر نہ آئے، تو اہل قریہ پر کسی اور جگہ چاند کی تحقیق کے لیے جانا واجب نہیں ہے؛ لیکن اگر کسی جگہ سے ثبوت رؤیت کی خبر پہنچ جائے، جو موجب ہو، تو اس کو تسلیم کرنا واجب ہوگا، جیسے شہادت یا شہادت علی الشہادت یا کسی معتبر ہلال کمیٹی کی طرف سے فیصلۂ رؤیت کا اعلان قابل اعتماد طور پر ہو جائے، یا چاند کی خبر مستفیض متعدد اطراف سے آئے، جو موجب یقین ہو، تو رؤیت ثابت ہو جائے گی اور اس کا تسلیم کرنا لازم ہوگا، بہ شرطے کہ مطلع ایک ہو، یعنی اس کو ماننے سے مہینہ ۲۸/ دن کا یا ۳۱/ دن کا نہ ہو جائے۔ (ردمختار جلد ۳ صفحہ ۲۹۴)[1]

---

[۱] (فیلزم أهل المشرق برؤیة أهل المغرب) إذا ثبت عندهم رؤیة أولئك بطریق موجب. (الدر المختار)

قال ابن عابدین: (قوله: بطریق موجب) كأن یتحمل اثنان الشهادة أو یشهدا علی حكم القاضي أو یستفیض الخبر بخلاف ما إذا أخبر أن أهل بلدة كذا رأوه، لأنه حكایة. (رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۳۹۴، كتاب الصوم، قبیل :باب ما یفسد الصوم وما لا یفسده، ط: دار الفكر - بیروت ☆ حاشیة الطحطاوي، ص:۶۵۶، كتاب الصوم، فصل فیما یثبت به الهلال، ت: محمد عبد العزیز، ط: دار الكتب العلمیة - بیروت ☆ الفتاوی التاتارخانیة: ۳/ ۳۶۶، كتاب الصوم، الفصل الثاني في رؤیة الهلال، ط: زكریا - دیوبند)

=

ہلال کمیٹی کا فیصلہ بہ ذریعۂ فون اور اخبار بھی معتبر ہے۔ (☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] اِن علاقوں میں روزے کی کیا شکل ہوگی؟

۱۵۱۷- سوال: جن علاقوں میں چھ مہینہ دن اور چھ مہینہ رات رہتی ہے، وہاں روزے کی کیا شکل ہوگی؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ایسی جگہوں پر نمازِ عشاء اور نمازِ فجر کے فرض ہونے کے بارے میں فقہاء کی طویل بحثیں ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ بعض فقہاء وقت کے معدوم ہونے کی وجہ سے نماز کی فرضیت کا انکار کرتے ہیں، جیسے کسی شخص کے اعضاء وضوء میں سے کوئی عضو ہی نہ ہو، یا کٹ گیا ہو، تو اس کے فرائض وضو کم ہوجاتے ہیں، یعنی اس عضو کا وظیفہ ساقط ہوجاتا ہے؛ اسی طرح (نماز کا) وقت ہی نہیں ہے، تو (نماز) فرض بھی نہیں ہوگی۔

دوسرے فقہاء فرماتے ہیں کہ نصوص سے پانچ نمازیں فرض ہیں۔ (۱) اوقات تو سبب وعلامت ہے؛

= حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ رقم فرماتے ہیں:

جس شہر میں باقاعدہ قاضی یا ہلال کمیٹی نے کسی شہادت پر اطمینان کرکے، عید وغیرہ کا اعلان کردیا ہو، اس اعلان کو اگر ریڈیو پر نشر کیا جائے، تو جس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے، اس شہر اور اس کے مضافات ودیہات کے لوگوں کو اس ریڈیو کے اعلان پر عید وغیرہ کرنا جائز ہے، شرط یہ ہے کہ ریڈیو کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ چاند کے متعلق مختلف خبریں نشر نہ کرے، صرف وہ فیصلہ نشر کرے، جو اس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے اس کو دیا ہے اور اس کو نشر کرنے میں پوری احتیاط سے کام لے، جن الفاظ میں فیصلہ دیا گیا ہے، وہ الفاظ بعینہٖ نشر کیے جائیں، جس ریڈیو پر ایسی احتیاط کی پابندی نہ ہو، اس کے اعلان پر عید وغیرہ کرنا کسی کے لیے درست نہیں۔

اور جس طرح ایک شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی کا فیصلہ اس شہر اور اس کے مضافات کے لیے واجب العمل ہے، اسی طرح اگر کوئی قاضی یا مجسٹریٹ یا ہلال کمیٹی پورے ضلع یا صوبہ یا پورے ملک کے لیے ہو، تو اس کا فیصلہ اپنے اپنے حدود ولایت میں واجب العمل ہوگا۔

(آلات جدیدہ کے شرعی احکام، ص:۱۸۸، باب: ہلال کے معاملہ میں آلات جدیدہ کی خبروں کا درجہ، ط: قاسمی کتب خانہ-دیوبند ☆ جواہر الفقہ: ۵/۱۷۷)

(☆☆☆) نعم إذا تواردت أخبار "راديو" متعددة من شتى الجهات، ولا تختلف جهات الأنباء عن البلد الذي لم ير فيه الهلال ببعد يختلف فيه المطلع فيسوغ العمل بهذة الأنباء المرسلة، و تدخل في حد الاستفاضة المفيدة للطمانينة. (معارف السنن-السيد محمد يوسف بن السيد زكريا الحسيني البنوري (م:۱۳۹۷ھ): ۵/۳۴۰، كتاب الصوم، باب ماجاء أن الصوم لرؤية الهلال و الإفطار له، ط: ايچ، ايم سعيد، كراتشي، الباكستان)

(۱) {حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ} الخمس في مواقيتها {وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى} يعني صلاة العصر. (تفسير مقاتل بن سليمان-أبو=

اس لیے پانچ نمازیں فرض ہیں اور ایسے مقامات سے جو ملک قریب ہو، وہاں کے وقت اور فاصلہ کے لحاظ سے نمازیں پڑھی جائیں گی۔ (۲)

=الحسن مقاتل بن سليمان بن بشير الأزدي البلخي (م:۱۵۰هـ): ۲/ ۶۵۰، سورة البقرة، ۲۳۸، ت: عبد الله محمود شحاته، ط: دار إحياء التراث-بيروت)

عن عبادة بن الصامت-رضي الله عنه-قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: خمس صلوات كتبهن الله على العباد، فمن جاء بهن لم يضيع منهن شيئا استخفافا بحقهن، كان له عند الله عهد أن يدخله الجنة، ومن لم يأت بهن فليس له عند الله عهد، إن شاء عذبه، وإن شاء أدخله الجنة. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۰۱، رقم الحديث: ۱۴۲۰، كتاب الصلاة، باب فيمن لم يوتر، ط: ديوبند☆المجتبى من السنن=السنن الصغرى للنسائي-أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۱/ ۲۳۰، رقم الحديث: ۴۶۱، كتاب الصلاة، باب المحافظة على الصلوات الخمس، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية-حلب)

(۲) روي أنه-صلى الله عليه وسلم-ذكر الدجال، قلنا: يا رسول الله وما لبثه في الأرض؟ قال: أربعون يوما، يوم كسنة، ويوم كشهر، ويوم كجمعة، وسائر أيامه كأيامكم، قلنا: يا رسول الله فذلك اليوم الذي كسنة، أتكفينا فيه صلاة يوم؟ قال: لا، اقدروا له قدره. (الصحيح لمسلم: ۲/ ۴۰۱، رقم الحديث: ۱۱۰-(۲۹۳۷)، كتاب الفتن وأشراط الساعة، باب ذكر الدجال وصفته وما معه، ط: ديوبند☆سنن أبي داود: ۲/ ۵۹۳، رقم الحديث: ۴۳۲۱، كتاب الملاحم، باب خروج الدجال، ط: ديوبند)

وفاقد وقتهما كبلغار، فإن فيها يطلع الفجر قبل غروب الشفق في أربعينية الشتاء، مكلف بهما فيقدر لهما. ولا ينوي القضاء لفقد وقت الأداء، به أفتى البرهان الكبير واختاره الكمال، وتبعه ابن الشحنة في ألغازه فصححه، فزعم المصنف أنه المذهب. (وقيل لا) يكلف بهما لعدم سببهما، وبه جزم في الكنز والدرر والملتقى وبه أفتى البقالي، ووافقه الحلواني والمرغيناني ورجحه الشرنبلالي والحلبي، وأوسعا المقال ومنعا ما ذكره الكمال (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۳۶۲-۳۶۳، كتاب الصلاة)

وقال ابن عابدين: هذه المسألة نقلوا فيها الاختلاف بين ثلاثة من مشايخنا وهم: البقالي والحلواني والبرهان الكبير، فأفتى البقالي بعدم الوجوب، وكان الحلواني يفتي بوجوب القضاء، ثم وافق البقالي؛ لما أرسل إليه الحلواني من يسأله عمن أسقط صلاة من الخمس أيكفر؟ فأجاب السائل بقوله: من قطعت يداه أو رجلاه كم فروض وضوئه؟ فقال له: ثلاث، لفوات المحل، قال فكذلك الصلاة، فبلغ الحلواني ذلك فاستحسنه ورجع إلى قول البقالي بعدم الوجوب. وأما البرهان الكبير، فقال بالوجوب، لكن قال في الظهيرية وغيرها: لا ينوي القضاء في الصحيح لفقد وقت الأداء. واعترضه الزيلعي بأن الوجوب بدون السبب لا يعقل، وبأنه إذا لم ينو القضاء يكون أداء ضرورة، وهو أي الأداء فرض الوقت ولم يقل به أحد، إذ لا يبقى وقت العشاء بعد طلوع الفجر إجماعا. اهـ. وأيضا فإن من جملة بلادهم ما يطلع فيها الفجر كما غربت الشمس كما في الزيلعي وغيره، فلم يوجد وقت قبل الفجر يمكن فيه الأداء.

إذا علمت ذلك ظهر لك أن من قال بالوجوب يقول به على سبيل القضاء لا الأداء. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۶۲-۳۶۳، كتاب الصلاة، مطلب في فاقد وقت العشاء كأهل بلغار، ط: دار الفكر-بيروت)

دونوں قول کی تصحیح منقول ہے، علامہ شامی نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے اور یہی صحیح ہے۔ (۳)

روزہ کے بارے میں بھی علامہ شامی نے یہی نقل کیا ہے کہ ''ایسے مقامات پر روزے فرض ہیں''۔
(شامی جلد ۱ صفحہ ۳۶۳)[۴]

فقہاء کرام کے ابحاث تو ایسے مقامات کے لیے ہیں، جہاں عشاء وطلوع فجر کا صرف مسئلہ ہے؛ لیکن ایسے مقامات، جہاں چھ ماہ دن اور چھ ماہ رات رہتی ہے، اس کے حکم کے بارے میں اصل جواب تو یہی ہے کہ زمین کا یہ حصہ غیر مسکون اور غیر آباد ہے، خصوصاً انسانی زندگی وہاں مشکل ہے؛ اس لیے ایسے خطوں کے بارے میں ایسے سوالات و جوابات کی ضرورت ہی نہیں رہتی؛ لیکن اس زمانہ میں مصنوعی مشینری اور وسائل کے تحت ایسے خطہ میں کچھ لوگ قیام پذیر ہوجائیں، تو ان کا حکم کیا ہونا چاہیے، یہ موجودہ عہد کا ایک سوال ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ ایسا ممکن ہے۔

اس لحاظ سے اس قدر تو کہا جاسکتا ہے کہ فقہاء کرام کے بیان کردہ دلائل میں غور وفکر کے بعد فریق ثانی کے دلائل راجح معلوم ہوتے ہیں؛ اس لیے عارضی طور پر جو شخص وہاں عارضی قیام کے لیے گیا ہے، اس پر پانچ نمازیں اور رمضان کے روزے فرض ہیں۔

لیکن ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟ تو بندہ کے خیال میں جو لوگ وہاں پہونچیں گے، وہ وہاں کے باشندے نہیں، نہ وہاں مستقل قیام کرسکتے ہیں؛ اس لیے جہاں سے اور جس ملک سے یہ پہونچے ہیں، اس ملک کے موسم واوقات کا لحاظ ان کے لیے ہوگا، اگر یہ لوگ اپنے ملک سے رمضان میں یا رمضان سے قبل پہنچے ہیں اور اتنے گھنٹہ ان کا قیام اس خطۂ ارضی پر رہنے والا ہے، جتنے گھنٹہ میں ان کے ملک میں رمضان شروع ہوجاتا ہے، تو وہ روزہ کے مکلف ہیں، روزہ ان پر فرض ہے، ملک کے دن رات کے گھنٹوں کا حساب کرکے سحری اور افطار کرتے رہیں گے، نمازیں بھی - اپنے ملک میں پانچوں نمازوں میں جس قدر فاصلہ ہیں، اس قدر فاصلوں

(۳) والحاصل أنهما قولان مصححان، ويتأيد القول بالوجوب بأنه قال به إمام مجتهد، وهو الإمام الشافعي كما نقله في الحلية عن المتولي عنه. (المصدر السابق: ۱/ ۳۶۵، كتاب الصلاة، مطلب في فاقد وقت العشاء كأهل بلغار)

[۴] قال في إمداد الفتاح قلت: وكذلك يقدر لجميع الآجال كالصوم والزكاة والحج والعدة وآجال البيع والسلم والإجارة، وينظر ابتداء اليوم فيقدر كل فصل من الفصول الأربعة بحسب ما يكون كل يوم من الزيادة والنقص كذا في كتب الأئمة الشافعية، ونحن نقول بمثله إذ أصل التقدير مقول به إجماعا في الصلوات اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۶۵، كتاب الصلاة، مطلب في فاقد وقت العشاء كأهل بلغار، قبيل مطلب في طلوع الشمس من مغربها)

سے- پڑھتے رہیں گے۔ [۵] واللہ أعلم بالصواب، وما توفيقي إلا بالله، عليه توكلت وإليه أنيب.

نوٹ: اگر کوئی شخص مسافر ہو، تو اس کے لیے روزہ نہ رکھنے کی گنجائش ہے، بعد میں ان کی قضاء کر لے اور اگر (صورت مسئولہ میں) مقیم ہو، تب بھی عذر شدید درپیش ہے، (کہ اوقات صوم وصلاۃ واضح نہیں) اس لیے قضا کر لے۔ فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] ریڈیو، ٹیلی فون، تار وغیرہ کے ذریعہ چاند کی خبر

۱۵۱۸- سوال: (۱) شعبان کی ۲۹ رتاریخ کو چاند نظر نہیں آیا، ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی کہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں چاند ہو گیا ہے اور آئندہ کل یکم رمضان ہے، تو کیا ریڈیو کی خبر معتبر ہوگی یا نہیں؟

(۲-۳) یا ہمارے ضلع کے کسی گاؤں سے ٹیلی فون یا تار کے ذریعے چاند کی خبر پہنچے، تو کیا اس کو معتبر مان کر روزہ رکھنا چاہیے یا نہیں؟

(۴) رمضان المبارک کی ۲۹ رکا چاند نظر نہیں آیا اور ریڈیو پر یہ خبر نشر ہوئی کہ دہلی، کولکاتا، احمد آباد، بھروچ، وغیرہ شہروں میں چاند ہو گیا ہے، تو اس خبر کو معتبر مان کر عید منانا جائز ہے یا نہیں؟ یا ضلع کے کسی بھی گاؤں سے ٹیلی فون یا تار کے ذریعہ خبر پہنچے کہ چاند ہو گیا ہے، تو کیا اس خبر کو معتبر مان کر عید منانا جائز ہے یا نہیں؟

---

(۵) حضرت مفتی نظام الدینؒ رقم طراز ہیں: جس مقام پر آفتاب چھ مہینے مسلسل غروب رہتا ہے اور چھ مہینے مسلسل طلوع رہتا ہے، اس مقام پر انسانی آبادی مشکل ہے، بہر حال وہاں جو لوگ آباد ہیں، ان کے لیے یہ حکم ہے کہ جس وقت آفتاب غروب ہو، اس وقت سے ہر چوبیس گھنٹے کو گھڑی دیکھ کر، ان کو دن اور رات کا مجموعہ قرار دے کر پانچوں نمازیں جس فصل و انداز سے پڑھتے ہیں، پڑھتے رہیں، حدیث دجال سے بھی اس طرف روشنی ملتی ہے، اور حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

پھر اسی طرح جب چھ ماہ مسلسل طلوع رہے، اس وقت بھی وہی سابق حساب کے اعتبار سے ہر چوبیس گھنٹہ میں شب و روز کی نمازیں اندازہ کے لحاظ سے پڑھتے رہیں، اور اسی طرح حساب سے جب رمضان کا مہینہ آئے، تو اس میں روزہ بھی رکھیں (اسی اعتبار سے) اور جس طرح دنیا کا اپنا ہر کام (سونا، جاگنا، کام کرنا، ڈیوٹی دینا وغیرہ) وقت کے حساب سے کریں گے اسی طرح نماز روزہ بھی حساب سے ادا کریں گے۔ (منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/ ۱۶۲، کتاب الصلاۃ، باب مواقیت الصلاۃ، جہاں چھ ماہ دن، چھ ماہ رات مسلسل رہتی ہو، وہاں کے لوگ روزہ و نماز کس طرح ادا کریں؟ ط: ایفا پبلیکیشنز- دہلی)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی کا سفرنامہ "دنیا مرے آگے" کا ص: ۳۱۰- ۳۱۳، ان مقامات پر نماز کا حکم، ط: مکتبۃ الحق، جوگیشوری- ممبئی۔

(۵) اگر شریعت میں ریڈیو کی خبر معتبر نہیں ہے اور موجودہ زمانہ میں لوگ اس خبر کو معتبر منوانے کے لیے امام صاحب پر زور دیتے ہیں کہ ہم کو تو روزہ یا عید منانا ہے، تو ایسے وقت میں مسجد کے امام صاحب کو کیا کرنا چاہیے؟

الجواب حامدا ومصليا:

(۱) ریڈیو کی خبر کے ذریعے کسی شخص کو چاند کے بارے میں یقین ہوجائے، تو وہ خود روزہ رکھ لے دوسرے کو حکم نہ دے۔[۱]

(۲) جس کے پاس ٹیلی فون سے خبر پہنچی ہو اور ''مخبر'' عادل، دین دار ہو اور ٹیلی فون پر اس طرح خبر دے کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے اور سننے والے کو ظن غالب ہو کہ خبر صحیح ہے، تو خود روزہ رکھ سکتا ہے، لیکن

---

(۱) قال: " ومن رأى هلال رمضان وحده صام وإن لم يقبل الإمام شهادته " لقوله عليه الصلاة والسلام " صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته " وقد رأى ظاهرا وإن أفطر فعليه القضاء دون الكفارة. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/۱۱۹، كتاب الصوم، فصل في رؤية الهلال، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۱/۲۳۸، كتاب الصوم، باب ما يثبت به رمضان، ط: دار حياء التراث العربي- بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۸۴، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر- بيروت)

حضرت مفتی نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ تو صحیح ہے کہ ریڈیو کی خبر یا اعلان شہادت شرعیہ نہیں، لیکن مطلقا ہر حال میں بالکل نا قابل عمل اور نا قابل التفات قرار دے دینا بھی صحیح نہیں، اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ ریڈیو پر آنے والی ہر خبر اور اعلان بالکلیہ صحیح اور درست ہو، کہ اس پر تحقیق و تفتیش کی بھی ضرورت نہ رہے، اور اس پر عمل واجب ہوجائے۔ بل کہ اس میں کچھ تفصیل ہے، کچھ قیود و شرائط ہیں، ان کے ساتھ ریڈیو کا نشریہ و اعلان معتبر، قابل عمل ہوسکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیل سے قیود و شرائط کی وضاحت کی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/۴۹۱-۵۰۰، کتاب الصوم، ریڈیو، ٹیلی فون وغیرہ کے ذریعے اطلاع ہلال کا شرعی حکم، ط: ایفا پبلیکیشنز- نئی دہلی)

نوٹ: موجودہ دور میں [ہمارے یہاں ہندوستان میں] ''ریڈیو'' کسی ہلال کمیٹی کی تحقیق اور فیصلے کو نشر کرتا ہے، مثلا یہ اعلان کرتا ہے کہ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ اور نیپال نے یہ خبر دی ہے کہ رمضان کا چاند ملک کے مختلف حصوں میں دیکھا گیا۔ ذرائع ابلاغ کی کثرت کی وجہ سے اس خبر کی متعدد مواصلاتی نظام سے تصدیق بھی ہوجاتی ہے، تجربہ یہ ہے کہ ریڈیو اس سلسلے کی غلط خبر نشر نہیں کرتا؛ اس لیے اس خبر کے غیر معتبر ہونے اور اس پر بھروسہ نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: رؤیت ہلال کا شرعی حکم، ص: ۲۲، ط: عظیم بک ڈپو- دیو بند ☆ کفایت المفتی: ۴/۲۱۶، کتاب الصوم، ط: زکریا- دیو بند۔

دوسرے کو حکم نہیں کرسکتا۔[۲]

(۳) تار کی خبر قبول نہیں کی جائے گی۔[۳]

(۴) ریڈیو اور ٹیلی فون کی خبر سے عید منانا جائز نہیں ہے، کیوں کہ آسمان کے غبار یا ابر آلود ہونے کی صورت میں عید کے چاند کے ثبوت کے لیے دو مرد کی شہادت یا ایک مرد اور دو عورت کی شہادت یا شہادت علی الشہادت اور مطلع صاف ہونے کی صورت میں خبر مستفیض کی ضرورت ہے، یعنی اتنے آدمی چاند کے ہونے کی خبر دیں، جس سے یقین ہو جائے کہ چاند ہو گیا ہے، تو آپ عید منا سکتے ہیں، لہٰذا ریڈیو یا ٹیلی فون کی دو چند خبر سے عید منانا جائز نہیں ہوگا، ہاں اگر ریڈیو یا ٹیلی فون سے اس کثرت کے ساتھ خبر ملے، جس کا انکار ممکن نہ ہو، تو ایسی صورت میں عید منانا بھی جائز ہوگا، کیوں کہ یہ خبر مستفیض ہے۔[۴]

صرف یہ خبر ملے کہ چاند دیکھا گیا ہے، تو اس صورت میں عید منانا جائز نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ مبہم خبر ہے۔[۵]

---

(۲) قال الشيخ المفتي محمد شفيع - رحمه الله -: إنه لا يلزم لثبوت رمضان الشهادة الشرعية؛ بل يكفي خبر عدل، الخبر على التلفون معتبر إذا عرف المتكلم، وهو ثقة. (آلات جدیدہ کے شرعی احکام، ص: ۲۰۸، ط: قاسمی کتب خانہ - دیوبند)

حضرت مفتی نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ رقم فرماتے ہیں:

مطلع صاف نہ ہو، اور موقع ہلال رمضان کے ثبوت کا ہو، تو صرف ایک ٹیلی فون بھی اپنے عمل کے لیے کافی ہوگا، مگر دوسروں کو مجبور کرنا یا ان پر زبردستی کرنا درست نہ ہوگا، البتہ ترغیب دے سکتے ہیں۔ (رؤیت ہلال کا شرعی حکم، ص: ۲۵، ط: عظیم بک ڈپو - دیوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: کفایت المفتی: ۴/ ۲۱۶، کتاب الصوم، ط: زکریا - دیوبند ☆ منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/ ۵۰۱، ایفا پبلی کیشنز - نئی دہلی۔

(۳) وفي الأشباه: لا يعمل بالخط إلا في مسألة كتاب الأمان ويلحق به البراءات. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله لا يعمل بالخط) عبارة الأشباه لا يعتمد على الخط، ولا يعمل بمكتوب الوقف الذي عليه خطوط القضاة الماضين إلخ قال البيري: المراد من قوله لا يعتمد: أي لا يقضي القاضي بذلك عند المنازعة، لأن الخط مما يزور ويفتعل كما في مختصر الظهيرية. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/ ۴۳۵، كتاب القضاء، مطلب لا يعمل بالخط، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۷/ ۴، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۴) (وشرط للفطر) مع العلة والعدالة (نصاب الشهادة ولفظ أشهد) ... (و) قبل (بلا علة جمع عظيم يقع العلم) الشرعي وهو غلبة الظن (بخبرهم وهو مفوض إلى رأي الإمام من غير تقدير بعدد) على المذهب. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۸۸-۳۸۶، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر - بيروت)

(۵) (قوله: بطريق موجب) كأن يتحمل اثنان الشهادة أو يشهدا على حكم القاضي أو يستفيض الخبر بخلاف ما إذا أخبر أن أهل بلدة كذا رأوه، لأنه حكاية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۹۴، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار=

(۵) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: **لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق**. کہ اللہ کی نافرمانی میں عوام کی بات ماننا جائز نہیں ہے۔(٦)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصول وقانون بتائے ہیں، وہ قیامت تک کے لیے ہیں، ان میں ردوبدل کرنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے، عوام کو چاہیے کہ روزہ اور دیگر عبادات کو اس کے اصول وقواعد پر باقی رہنے دیں اور شریعت اور شرعی تعلیم کو اپنا تابع نہ بنائیں، اس لیے کسی امام کو چاند کے اعلان کرنے پر مجبور نہ کریں اور ائمہ حضرات کو چاہیے کہ دانش مندی سے کام لیتے ہوئے افہام وتفہیم کا طریقہ اختیار کریں اور ثبوت ہلال کے شرعی اصول کے بغیر چاند کے ہونے کا اعلان ہرگز نہ کریں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] چاند کی تحقیق میں ریڈیو کی حیثیت

١٥١٩- سوال: [مقدمہ] امسال رمضان کا چاند دیکھنے، اور اس کے بعد پیش آنے والی الجھن وپریشانی کے متعلق رہنمائی فرمائیں، جس سے مستقبل میں اس طرح کی مصیبت حل کرنے میں آسانی رہے۔

سوال دریافت کرنے سے پہلے میں موجودہ دور کی سائنسی ترقی کے پیش نظر اپنے اس نظریے کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ پاک نے انسان کو فہم وذکا اور عقل وشعور سے مالا مال کیا ہے، جس کی بہ دولت سائنس کی رو سے خوب آگے بڑھ گیا ہے، حتی کہ اس نے چاند پر اپنی کمندیں ڈال دی ہے۔ شریعت کے دائرے میں رہ کر انسان، اللہ کی دی ہوئی فہم ذکا کے سہارے پر نئے آلات کا اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں استعمال کر رہا ہے اور اسے ان جدید وسائل کا استعمال کرنا بھی چاہیے، خواہ وہ شعبہ دین سے تعلق رکھتا ہو یا دنیا سے۔

= الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ١٩٩/١، كتاب الصوم، الباب الثاني في رؤية الهلال، ط: دار الفكر - بيروت ☆ مجمع الأنهر: ٢٣٩/١، كتاب الصوم، باب ما يثبت به رمضان، ط: دار إحياء التراث العربي)

(٦) الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار (المعروف بـ مصنف ابن بي شيبة) - أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ٢٣٥هـ): ٥٤٥/٦، رقم الحديث: ٣٣٧١٧، كتاب الجهاد، في إمام السرية يأمرهم بالمعصية، من قال: لا طاعة له، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد - الرياض.

وأخرجه الإمام أحمد بن حنبل في مسنده، بلفظ: "لا طاعة لمخلوق في معصية الله عز وجل" عن علي وابن مسعود رضي الله عنهما وعن غيرهما. (ر: مسند الإمام أحمد بن حنبل: ٣٣٣/٢، رقم: ١٠٩٤، مسند علي ابن أبي طالب رضي الله عنه ☆ ٣٣٢/٦، رقم: ٣٨٨٩، مسند عبد الله بن مسعود رضي الله عنه، ت: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة)

ہماری تحقیق کے مطابق آج کل ہمارے ملک انڈیا میں اسلامی اعتبار سے خاص کر رمضان وعید کے چاند کے متعلق ''خبر'' مشہور علمائے کرام کے مشورہ اور رائے ہی سے ریڈیو یا ٹی وی وغیرہ پر نشر کی جاتی ہے، آج تک ایسی ایک بھی خبر شائع نہیں ہوئی، جس کی نشر واشاعت، تحقیق کے بعد غلط ثابت ہوئی ہو، اور ''مسلمان عالم'' کے نام سے ریڈیو، ٹی وی پر سے خبر پڑھنے والے کسی ہندو بھائی نے غلط خبر پڑھی ہو۔ اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ چاند کے متعلق ہر کس وناکس غیر شرعی طور پر حتمی اعلان نہیں کروا سکتا ہے۔

انگریزوں کے زمانے میں اور اس کے بعد آزادی کے ابتدائی دور میں اس وقت کی حکومت اور حکومتی ذمہ داران نیز علماءِ اسلام کا ٹیلی کاسٹ سسٹم پر اعتماد نہیں تھا، یہ قابل تسلیم امر ہے؛ لیکن آج حالات الگ ہیں، اپنی قابل تنظیم یا عالم سے معلوم کیے ہوئے احوال واخبار شائع کرنے میں غیر قوم بھی قانون کی پابند ہے، جس کی وجہ سے غلطی کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔

یہ تو صحیح ہے کہ شرعی طور پر بڑے ملک میں یا تمام اسلامی ممالک میں ہمیشہ ایک ساتھ عید کا ہونا، ممکن نہیں ہے؛ لیکن ایک ہی ملک میں یا چھوٹے چھوٹے چند ایسے ممالک میں، جن کا مطلع ایک ہو، موجودہ ذرائع ابلاغ، جیسے کہ ٹی وی، تار، ریڈیو، وغیرہ کی مدد سے اور خاص کر ہندوستان میں کہ جہاں ہم ایک ساتھ تیوہار منا کر غیر مسلموں کے سامنے اپنے اتحاد واتفاق کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں؛ کیوں کر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ کتاب وسنت کے دائرے میں رہ کر پورے ملک میں ایک ساتھ عید ہو۔

دوسری بات یہ کہ امسال رمضان کا چاند انتہائی کوشش کے باوجود مطلع ابر ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آیا، اس کے بعد ریڈیو، فون وغیرہ سے خبر معلوم کرنے کی کوشش کی گئی، تو سب سے پہلے پاکستان ریڈیو سے خبر ملی کے پاکستان میں چاند ہو گیا ہے اور پورے پاکستان میں کل پہلا روزہ ہے۔

میں پاکستان کے متعلق کچھ اپنا نظریہ پیش کر رہا ہوں، آج کے دور میں سعودی عرب کے بعد، مکمل طور پر تو نہیں، لیکن کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ملک اگر کوئی ہے، تو وہ پاکستان ہے، وہاں سے یہ بات ناممکن ہے کہ چاند جیسی اہم خبر غیر شرعی طور پر نشر کی جائے۔

۱۹۵۱ء میں مرادآباد کے ایک اجلاس میں یہ بات بالاتفاق طے ہوئی تھی کہ ہندوپاک کا مطلع ایک ہے، ایک دوسرے ملک کی شرعی گواہی پر ایک دوسرے ملک کے مفتیان کرام کے فیصلے کی بنیاد پر عید منا سکتے ہیں۔

اس کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں سے جدا جدا اوقات پر شائع ہونے والے اخبار میں مختلف جگہوں میں چاند ہونے کی تصدیق کے احوال شائع ہوئے، جس میں سب سے پہلے جامع مسجد دہلی کے شاہی امام بخاری کے نام سے اور آخر کار سوا بارہ بجے مولانا اسعد مدنیؒ کے نام سے چاند ہونے کی گوہی قبول کرنے کے احوال ہم نے سنے، تو ایسے احوال اور پاکستان سے آنے والی خبر سے ہمارا دل مطمئن ہوگیا اور ہمیں یقین ہوگیا کہ چاند ہوگیا ہے، تو ہم نے بھی رمضان کے شروع ہونے کا فیصلہ کرلیا اور ہمارے ساتھ ایک عالم بھی تھے، جو اس فیصلے میں، ہم سے اتفاق رکھتے تھے، ہم نے بمبئی- اس غرض سے کہ وہاں کی خبر صحیح ہوگی- فون کیا، لیکن رات کافی ہوگئی تھی، سب سو چکے تھے؛ اس لیے فون پر بات نہیں ہوسکی۔

ہمارا گاؤں بارڈولی کے قریب، ایک محلہ کی شکل میں آباد ہے، وہاں ایک مسجد ہے، اس وقت زیادہ تر لوگ سو رہے تھے، ہم نے اپنے بڑوں کو بیدار کر کے اپنی تحقیق ان کے سامنے پیش کی، اس کے مطابق امام صاحب سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ رمضان المبارک کا اعلان کرادینا بہتر رہے گا، ایسا کہہ کر ہم نے گھر آ کر تراویح پڑھی، گاؤں میں بھی اعلان کردیا گیا کہ کل پہلا روزہ ہے، چوں کہ رات کی بیداری کی وجہ سے ہم صبح فجر کی نماز کے بعد سو گئے۔

صبح ۱۱ ربجے گاؤں کا ایک قاصد یہ پیغام لایا کہ سورت اور راندیر وغیرہ میں رمضان کا چاند نہ ہونے کی وجہ سے روزہ افطار کروانے کی بات ہورہی ہے، تو ہم نے کہا کہ بھائی! سب مل کر کہنا کہ آپ (مسجد کے امام وغیرہ) ہی نے مشورہ کر کے ہماری بات کی تصدیق کی، اور تراویح پڑھی اور رمضان کا روزہ بھی رکھا؛ لہٰذا ہم افطار نہیں کرسکتے اور اگر سب افطار کرلیں گے، تو بھی ہم افطار کرنے والے نہیں ہیں۔

بارڈولی اسٹیشن علاقہ کے ایک ذمہ دار نے بھی کہا کہ ہم بھی روزہ افطار کرنے والے نہیں ہیں، اور انہوں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد ۱۲:۰۰ بجے گاؤں میں یہ اعلان ہوا کہ روزہ افطار کرلو، جو شخص روزہ رکھے گا، اس کا روزہ حرام ہے، اس اعلان کی وجہ سے گاؤں کے بعض لوگوں نے روزہ افطار کیا اور بعضوں نے افطار نہیں کیا کہ رمضان کا روزہ باقاعدہ رکھا ہے، عید نہیں کہ افطار کرلیں۔ تو اب اس صورت حال میں درج ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) ریڈیو پر اکابر کے نام سے شائع ہونے والی خبروں سے اطمینان اور یقین حاصل ہوا، اس کی وجہ سے ہم نے رمضان المبارک کا روزہ رکھا، تو کیا یہ صحیح ہے یا غلط؟

(۲) جن لوگوں نے رات کو تصدیق کر کے تراویح پڑھی اور روزہ رکھا اور صبح صرف اس خبر پر کہ راندیر وسورت میں رمضان نہیں ہے، روزہ توڑ دیا اور افطار کرلیا اور ''آج روزہ رکھنا حرام ہے، وغیرہ'' کا فتوی دیا، یہ فیصلہ صحیح ہے یا غلط؟ کون سی صورت بہتر ہے، متعین فرمائیں؟

(۳) [اسی سال کے ہلالِ عید کا واقعہ] بمبئی فون سے معلوم کیا اور دہلی کے جامع مسجد کے امام کے نام سے یہ خبر شائع ہوئی کہ چاند نہیں ہوا ہے؛ لیکن رات ۰۰:۱۲ بجے پاکستان ریڈیو سے وہاں کی ہلال کمیٹی کے ذمہ دار نے یہ اعلان کیا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ شرعی شہادت ملنے کی وجہ سے چاند ہو گیا ہے اور کل پورے پاکستان میں عید ہوگی۔

یہ اعلان میں نے ریکارڈ کیا اور اپنے گاؤں کے مولانا کو سنایا، تو انہوں نے شرعی گواہی ہونے کا یقین دلایا، تو اگر ہم یہ ریکارڈ کیا ہوا اعلان آپ کے پاس لے کر آتے، تو کیا آپ اس کے بعد مشورہ کر کے عید کا فیصلہ کرتے یا نہیں؟ جو ریکارڈ اب بھی موجود ہے، کشمیر میں بھی عید پاکستان کے ساتھ ہی منائی گئی۔ (واضح رہے کہ مرادآباد کے اجلاس میں یہ بات طے پائی تھی کہ ریڈیو کی خبر سن کر منتظمین علماء چاند کا اعلان کر سکتے ہیں) تو برائے کرم اس کے متعلق جواب مرحمت فرمائیں۔

(۴) ہمارے یہاں کے ایک متقی پابند صوم وصلاۃ نے ۲۹/دن روزہ رکھا اور گاؤں میں اعلان کے باوجود انہوں نے ابتداءِ رمضان کا روزہ افطار نہیں کیا، پھر پاکستان ریڈیو پر عید کے احوال سنے، اس دن ان کا تیسواں روزہ تھا، انہوں نے عید کی خبر سن کر افطار کرلیا اور سب کے ساتھ عید کی نماز ادا کی، تو کیا اس روزہ کی قضا واجب ہوگی یا نہیں؟

(۵) ایک شخص مکہ سے ہندوستان آیا اور اس نے وہاں (مکہ مکرمہ) یہاں (گجرات) سے دو دن پہلے سے شرعی طور پر روزہ رکھنا شروع کیا تھا، یہاں اگر مکمل ۳۰ روزے ہوں، تو وہ شخص اپنے ۳۰ روزے مکمل کر کے عید کب منائے گا؛ کیوں کہ جب اس کے ۳۰/روزے مکمل ہوں گے، اس وقت تو یہاں سب کے سب روزے سے ہوں گے۔ آنے والے اگر ۵/یا ۱۰/افراد ہوں، تو کیا وہ حجاز کی خبر کے ذریعہ یہاں عید کی نماز ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ یا یہاں سب کے ساتھ روزہ رکھیں گے، اگر یہ بات ہو، تو ان کے ۳۱/یا ۳۲/روزے ہو جائیں گے۔ آخر یہ لوگ کیا کریں؟

(۶) اسی طرح ایک شخص یہاں سے روزہ رکھ کر حجاز جائے، تو اس اعتبار سے جب اس کے ۲۷/یا

۲۸/روزے ہوتے ہیں، اس وقت حجاز میں عید ہوتی ہے، تو کیا اس کے لیے ہندوستان کے مطابق روزہ مکمل کرنا ضروری ہے یا پھر حجاز والوں کے ساتھ عید منا کر بقیہ روزوں کی قضا کرنی چاہیے؟

الجواب حامداو مصلیا:

علماء کرام کا شریعت کے دائرے میں رہ کر جدید آلات و ذرائع ابلاغ سے عبادت کی خاطر فائدہ اٹھانا جائز ہے، اس میں قباحت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

آپ کی تفصیلی تحریر پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ جس طرح دنیوی معاملات میں ریڈیو، ٹی وی اور ٹیلی فون وغیرہ استعمال ہوتے ہیں، اسی طرح دینی مسائل میں بھی آپ ان [ذرائع ابلاغ] کے استعمال کے پرزور حامی اور وکیل ہیں، حالاں کہ یہ غلط ہے؛ کیوں کہ دینی معاملات میں ہر جگہ ان ذرائع سے حکم شرعی ثابت نہیں ہوتے، مثلاً چاند کے ثبوت کے لیے بعض صورتوں میں گواہی لازم ہے، اور ریڈیو، ٹیلی فون اور تار کے ذریعے گواہی نہیں دی جاسکتی۔

مقدمہ میں آپ نے لکھا ہے کہ ریڈیو پر عالم کی بات بلا کم وکاست نشر ہوتی ہے، اس میں ردوبدل نہیں ہوتا ہے، وغیرہ۔

میری معلومات کے مطابق بھارتی حکومت نے ہلال کمیٹی کے ذمہ دار کے ذریعے چاند کے اعلان کی اجازت نہیں دی تھی اور دلیل کے طور پر یوں کہا تھا کہ بھارت سیکولر (غیر مذہبی) حکومت ہے، دوسرے مذہب والے مانگ کریں گے، تو ہم کو ان کی مانگ قبول کرنی پڑے گی۔

اس لیے ملازم (ریڈیو اور ٹی وی کے نیوز ریڈر، جن میں اکثر غیر مسلم ہوتے ہیں) اعلان کریں گے، تو پھر دین کے معاملات میں ان (غیر مسلم) کا اعلان کیسے قبول کیا جاسکتا ہے۔

مرادآباد میں تمام علماء کے اتفاق سے یہ بات طے پائی تھی کہ ہندو پاک کا مطلع ایک ہے، یہ بات صحیح ہے، لیکن اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''ایک دوسرے ملک کی شرعی گواہی پر یا ایک دوسرے ملک کے مفتیان کرام کے فیصلے کی بنیاد پر عید منا سکتے ہیں''۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ اگر پاکستان کی گواہی انڈیا میں شرعی طریقے سے آئے، تو مقبول ہوگی، صرف پاکستان کے ریڈیو کی خبر کی وجہ سے عید منانا جائز نہیں ہوگا، البتہ پاکستان کے ریڈیو کے ذریعہ رمضان کے چاند کی خبر ملے اور کسی کا دل مطمئن ہوجائے، تو اس کے لیے روزہ

رکھنا جائز ہے؛ لیکن عوام کو اس کا حکم دینے کی اجازت نہیں ہے۔ (۱)

نوٹ: مذکورہ جوابات مقدمہ کے ہیں، اب سوالات کے جوابات بالترتیب ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ریڈیو کی خبر کے ذریعہ کسی کو رمضان کے چاند کا یقین ہوجائے، تو وہ خود عمل کرسکتا ہے، دوسروں کو اس کا حکم نہیں کرسکتا۔ (کفایت المفتی) [۲]

لہٰذا پاکستانی ریڈیوں سے آپ کو یقین ہوا، اس لیے آپ کے لیے روزہ رکھنا جائز ہے، لیکن عوام کو بیدار کرکے روزہ رکھنے کے متعلق جو ماحول تیار کیا، وہ مکمل صحیح نہیں ہے، آپ ترغیب دے سکتے ہیں اور بس۔ (۳)

(۲) رات کی خبر کی بنیاد پر جن لوگوں نے تراویح پڑھی، پھر صبح راندیر وسورت کی خبر آئی کہ چاند

---

(۱) لایلزم لثبوت رمضان الشهادة الشرعية؛ بل يكفي خبر عدل، والخبر على التلفون معتبر إذا عرف المتكلم، وهو ثقة۔ (آلات جدیدہ کے شرعی احکام، ص: ۲۰۸، ط: قاسمی کتب خانہ- دیوبند☆ رویت ہلال کا شرعی حکم، ص: ۲۵، ط: عظیم بک ڈپو- دیوبند☆ کفایت المفتی: ۲۱۶/۴، کتاب الصوم، ط: زکریا- دیوبند☆ منتخبات نظام الفتاوی: ۵۰۱/۱، ایفا پبلی کیشنز- نئی دہلی۔

[۲] اگر دوسرے شہر سے کسی شخص کو رمضان کے چاند کی خبر ٹیلی فون پر ملے اور اس کو یقین ہوجائے کہ فلاں شخص کی آواز ہے اور اس میں کوئی شبہ باقی نہ رہے، تو یہ شخص اپنے اس یقین پر اپنے نفس کے لیے عمل کرسکتا ہے، یعنی خود روزہ رکھ سکتا ہے؛ لیکن دوسروں کو نہیں کہہ سکتا کہ تم روزہ رکھو اور نہ عام طور پر رمضان کے ثبوت کا حکم دیا جاسکتا ہے۔ (کفایت المفتی: ۲۱۶/۴، کتاب الصوم، ٹیلی فون کی خبر سے اگر چاند ہونے کا یقین ہوجائے، ط: زکریا- دیوبند)

(۳) قال: "ومن رأى هلال رمضان وحده صام وإن لم يقبل الإمام شهادته" لقوله عليه الصلاة والسلام "صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته" وقد رأى ظاهرا وإن أفطر فعليه القضاء دون الكفارة. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱۱۹/۱، كتاب الصوم، فصل في رؤية الهلال، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۲۳۸/۱، كتاب الصوم، باب ما يثبت به رمضان، ط: دار حياء التراث العربي- بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۳۸۴/۲، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر- بيروت)

حضرت مفتی نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ توصحیح ہے کہ ریڈیو کی خبر یا اعلان شہادت شرعیہ نہیں، لیکن مطلقاً ہر حال میں بالکل نا قابل عمل اور نا قابل التفات قرار دے دینا بھی صحیح نہیں، اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ ریڈیو پر آنے والی ہر خبر اور اعلان بالکلیہ صحیح اور درست ہو، کہ اس پر تحقیق وتفتیش کی بھی ضرورت نہ رہے، اور اس پر عمل واجب ہوجائے۔ بل کہ اس میں کچھ تفصیل ہے، کچھ قیود وشرائط ہیں، ان کے ساتھ ریڈیو کا نشریہ واعلان معتبر، قابل عمل ہوسکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیل سے قیود وشرائط کی وضاحت کی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں:

(منتخبات نظام الفتاوی: ۴۹۱/۱-۵۰۰، کتاب الصوم، ریڈیو، ٹیلی فون وغیرہ کے ذریعے اطلاع ہلال کا شرعی حکم، ط: ایفا پبلیکیشنز- نئی دہلی)

نہیں ہوا ہے، تو انہوں نے روزہ توڑ دیا، ان کا یہ عمل بتلا رہا ہے کہ رات کی چاند والی خبر پر ان کو مکمل یقین نہیں ہے، اور مسئلہ یہ ہے کہ جن کو ریڈیو یا ٹیلی فون پر رمضان کے چاند کی خبر ملے، اور اس پر یقین نہ ہو یا ابتدائی مرحلے میں یقین ہوا ہو اور بعد میں یقین ختم ہو جائے، نیز مقامی کمیٹی نے بھی چاند کا فیصلہ نہ کیا ہو، تو ایسا شخص زوال تک انتظار کرے، اگر کہیں سے حتمی خبر آ جائے، تو روزہ رکھ لے ورنہ افطار کر دے، اگر وہ خواص میں سے ہے، تو گنجائش ہے کہ یوم الشک کا روزہ شعبان کی نیت سے رکھ لے، عوام روزہ نہ رکھے۔ یوم الشک کو رمضان سمجھ کر روزہ رکھنا مکروہ تحریمی ہے، اسی کو شاید حرام کہا گیا ہے، بہر حال یہ تعبیر درست نہیں ہے۔ [۴]

(۳) ہلال عید، ہلال رمضان سے ذرا مختلف ہے، ہلال عید کے لیے تین چیزوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے، ورنہ ہلال (چاند) کا فیصلہ کرنا درست نہ ہوگا۔

اگر مطلع ابر آلود ہو، تو ہلال عید کے ثبوت کے لیے گواہی یا شہادت علی الشہادت ضروری ہے، اور ریڈیو یا ٹیلی فون کے ذریعے گواہی نہیں دی جا سکتی، اور اگر مطلع صاف ہو، تو خبر مستفیض ضروری ہے، یعنی اتنے

---

(۴)"و" "المختار أن "يأمر المفتي العامة" بإظهار النداء "بالتلوم" أي بالانتظار بلا نية صوم في ابتداء "يوم الشك" محافظة على إمكان أداء الفرض بإنشاء النية لظهور الحال في وقتها "ثم" يأمر العامة" بالإفطار إذا ذهب وقت" إنشاء "النية" وهو عند مجيء الضحوة الكبرى "ولم يتبين الحال" حسما لمادة اعتقاد الزيادة. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح- حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ) ص:۲۴۱، كتاب الصوم، فصل فيما يثبت به الهلال وفي صوم يوم الشك وغيره، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية ☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱ھ) ص:۶۴۹، كتاب الصوم، فصل فيما يثبت به الهلال وفي صوم يوم الشك وغيره، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت ☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۸۳، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر- بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۰، كتاب الصوم، الباب الثالث فيما يكره للصائم وما لا يكره، ط: دار الفكر- بيروت)

و كذا يكره لو قال أنا صائم إن كان من رمضان وإلا فعن نفل للتردد. (الدر المختار)ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: مع الكراهة) أي التنزيهية، لأن كراهة التحريم لا تثبت إلا إذا جزم أنه عن رمضان كما أفاده الشارح سابقا ط (قوله: للتردد إلخ) علة للكراهة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۸۳، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر)

(ولا يصام يوم الشك) هو يوم الثلاثين من شعبان... (إلا نفلا) ويكره غيره (ولو صامه لواجب آخر كره) تنزيها ولو جزم أن يكون عن رمضان كره تحريما (ويقع عنه في الأصح إن لم تظهر رمضانيته وإلا) بأن ظهرت (فعنه) لو مقيما (والتنفل فيه أحب) أي أفضل اتفاقا (إن وافق صوما يعتاده)... (وإلا يصومه الخواص ويفطر غيرهم بعد الزوال) به يفتى. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۸۳-۳۸۱، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر- بيروت ★مراقي الفلاح، ص: ۲۴۱، فصل فيما يثبت به الهلال وفي صوم يوم الشك وغيره، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

لوگوں کا چاند کی رویت کی خبر دینا کہ ان سب کے جھوٹ پر متفق ہونے کا خیال پیدا نہ ہو۔ (۵)

صورت مسئولہ میں تینوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہیں پائی گئی؛ اس لیے ہلال عید کا ثبوت نہیں ہوگا، صرف پاکستانی یا کشمیری ریڈیو کی خبر سے عید نہیں منائی جاسکتی۔

(۴) میرے نزدیک صورت مسئولہ میں اگر روزہ رکھ کر افطار کرلیا ہے، تو پھر اس کا کفارہ بھی واجب ہوگا اور اگر روزہ نہیں رکھا ہے، تو صرف قضاء واجب ہوگی؛ کیوں کہ عید کے چاند کے ثبوت کے لیے تین چیزوں میں ایک کا ہونا ضروری ہے: (۱) دو مردوں کی گواہی (۲) شہادت علی الشہادت (۳) جم غفیر کی گواہی۔

صورت مسئولہ میں ان میں سے کوئی صورت نہیں پائی گئی، صرف پاکستان یا کشمیر ریڈیو کی خبر سے روزہ افطار کیا ہے؛ حالاں کہ اس کے لیے افطار کرنا صحیح نہیں تھا، گویا اس نے جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا ہے، اس لیے قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔ (۶)

---

(۵) (قوله: بطريق موجب) كأن يتحمل اثنان الشهادة، أو يشهدا على حكم القاضي أو يستفيض الخبر بخلاف ما إذا أخبرا أن أهل بلدة كذا رأوه؛ لأنه حكاية ح. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۹۲، قبيل: باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط: دار الفكر- بيروت☆حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ۶۵۶، فصل فيما يثبت به الهلال و في يوم الشك، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية☆جواهر الفقه: ۵/ ۱۷۷-۱۷۸)

وفي مجموع النوازل: شاهدان شهدا عند قاضي مصر لم ير أهله الهلال على أن قاضي مصر كذا شهد عنده شاهدان برؤية الهلال، وقضى به، ووجد استجماع شرائط صحة الدعوى قضى القاضي بشهادتهما حكاه عن شيخ الإسلام. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني- ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/ ۳۷۹، كتاب الصوم، الفصل الثاني فيما يتعلق برؤية الهلال، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۳۶۶، كتاب الصوم، رؤية الهلال، ط: زكريا- ديوبند)

(۶) حضرت مفتی صاحب نے خود یہ بات لکھی ہے کہ ان کے نزدیک اگر روزہ رکھ کر افطار کرلیا ہے، تو قضاء و کفارہ دنوں لازم ہوں گے، جس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عام علماء کی رائے اس سلسلے میں الگ ہے، ذیل کی عبارات میں صراحت ہے کہ صرف روزے کی قضاء واجب ہوگی؛ کفارہ نہیں:

(رأى) مكلف (هلال رمضان أو الفطر ورد قوله) بدليل شرعي (صام) مطلقا وجوبا وقيل ندبا (فإن أفطر قضى فقط) فيهما لشبهة الرد. (واختلف) المشايخ لعدم الرواية عن المتقدمين (فيما إذا أفطر قبل الرد) لشهادته (والراجح عدم وجوب الكفارة) وصححه غير واحد لأن ما رآه يحتمل أن يكون خيالا لا هلالا. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله: قضى فقط) أي بلا كفارة (قوله: لشبهة الرد) علة لما تضمنه قوله فقط من عدم لزوم الكفارة أي أن القاضي لما رد قوله بدليل شرعي أورث شبهة وهذه الكفارة تندرئ بالشبهات هداية، ولا يخفى أن=

کوئی یہ نہ کہے کہ اس کو مسئلے کا علم نہیں تھا، اس لیے کہ مسائل سے ناواقف ہونا کوئی عذر نہیں ہے، ہر یک مرد وزن پر ضروری مسائل سیکھنا فرض ہے کہ کیسے حالات میں روزہ افطار کرنا چاہیے۔

افطار کا سبب یہاں موجود نہیں ہے، ضرور عقل کے ذریعہ انہوں نے روزہ افطار کیا ہے؛ اس لیے کفارہ واجب ہوگا؛ کیوں کہ اس دن پورے بھارت میں رمضان کا دن تھا اور اگر روزہ رکھا ہی نہیں ہے، تو پھر قضا واجب ہوگی، کفارہ لازم نہیں ہوگا۔

دنیوی اعتبار سے بھی یہی ہوتا ہے، مثلاً کار چلانے والا قاعدہ قانون کے خلاف گاڑی چلائے گا، تو اس پر سزا عائد ہوگی۔ تاجر ٹیکس وغیرہ بھرنے میں سُستی کرے گا اور انکم ٹیکس والا اس کو پکڑ لے گا، تو اس پر بھی کیس ہوگا، سزا ہوگی، وہاں کوئی عذر نہیں چلتا کہ میں قواعد سے ناواقف تھا، مجھے قاعدہ کا علم نہیں ہے، وغیرہ۔

الغرض جس پر روزہ رکھنا فرض ہے، اس کے لیے عید کے طریقۂ ثبوت اور روزہ وافطار کی بنیادی معلومات حاصل کرنا ضروری تھا؛ لیکن کوتاہی کی وجہ سے شرعی عذر کے بغیر روزہ رکھ کر افطار کیا؛ لہٰذا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔

(۵) ایسے حضرات دیگر افراد کے ساتھ مل کر روزہ رکھیں گے، اور ان کے ساتھ عید منائیں گے۔ انسان جہاں ہے، وہاں کا حکم اس پر لاحق ہوگا، خواہ کیوں نہ ۳۱ر یا ۳۲ر روزے ہو جائیں۔ (۷) یہ میری

=هذه علة لسقوط الكفارة في هلال رمضان.... أما في هلال الفطر فلكونه يوم عيد عنده كما في النهر وغيره وكأنه تركه لظهوره (قوله: قبل الرد لشهادته) وكذا لو لم يشهد عند الإمام وصام ثم أفطر كما في السراج. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۸۵-۳۸۴، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر - بيروت)

ويلتمس هلال شوال في تاسع وعشرين من رمضان فمن رآه وحده لا يفطر أخذا بالاحتياط في العبادة فإن أفطر قضاه، ولا كفارة عليه كذا في الاختيار شرح المختار. رجل رأى هلال الفطر وشهد، ولم تقبل شهادته كان عليه أن يصوم فإن أفطر ذلك اليوم كان عليه القضاء دون الكفارة كذا في فتاوى قاضي خان. ولو شهد هذا الرجل عند صديق له فأكل لا كفارة عليه إن صدقه كذا في فتح القدير.

(۷) وأما صوم رمضان: فوقته شهر رمضان لا يجوز في غيره، فيقع الكلام فيه في موضعين أحدهما: في بيان وقت صوم رمضان، والثاني في بيان ما يعرف به وقته، أما الأول: فوقت صوم رمضان شهر رمضان؛ لقوله تعالى {فمن شهد منكم الشهر فليصمه} [البقرة:۱۸۵] أي: فليصم في الشهر، وقول النبي - صلى الله عليه وسلم - "وصوموا شهركم" أي: في شهركم. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۲/ ۸۰، كتاب الصوم، فصل شرائط أنواع الصيام، ط: دار الكتب العلمية) =

رائے ہے، اس مسئلے میں دوسرے مفتیان کرام سے بھی دریافت کرلیں۔ (۸)

سات آٹھ سال پہلے سعودی عرب سے سہارنپور، چند لوگ انڈیا کے حساب سے ایک دن پہلے روزہ رکھ کر آئے تھے، پھر مسئلہ دریافت کیا گیا، تو وہاں کے علماء نے یہی فتویٰ دیا کہ روزہ رکھنا ضروری ہے۔

(۶) وہ لوگ عوام کے ساتھ مل کر عید منالیں، پھر باقی روزوں کی قضاء کریں گے؛ اس لیے کہ عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ (۹) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= عن أبي هريرة -رضي الله تعالىٰ عنه- أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الصوم يوم تصومون، والفطر يوم تفطرون، والأضحى يوم تضحون. هذا حديث حسن غريب، " وفسر بعض أهل العلم هذا الحديث، فقال: إنما معنى هذا أن الصوم والفطر مع الجماعة وعظم الناس ". (سنن الترمذي: ۱/۱۵۰، رقم الحديث: ۶۹۷، أبواب الصوم، باب ما جاء في أن الفطر يوم تفطرون، والأضحى يوم تضحون، ط: ديوبند)

لو صام رائي هلال رمضان وأكمل العدة لم يفطر إلا مع الإمام لقوله - عليه الصلاة والسلام - "صومكم يوم تصومون وفطركم يوم تفطرون." رواه الترمذي وغيره، والناس لم يفطروا في مثل هذا اليوم فوجب أن لا يفطر، نهر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۸۴، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر-بيروت)

(۸) حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فتویٰ دیتے تھے، حضرت مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے:

"لیکن حضرت والد ماجد (حضرت مفتی اعظم قدس سرہ) کا فتویٰ بھی یہی تھا کہ پاکستان پہنچنے کے بعد یہاں کا اعتبار کرتے ہوئے اکتیس روزے پورے کرے گا، اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ "شھود الشھر" موجب فرضیت صوم ہے، اور "شھود الشھر" ہر علاقے میں وہاں کا معتبر ہے، پاکستان میں چوں کہ "شھر" بھی موجود ہے؛ اس لیے فرضیت صوم اس کے حق میں متحقق ہے، رہی وہ حدیث جس میں "شھر" کے تیس دن ہونے کا ذکر ہے، سو وہ اس بارے میں قطعی الثبوت والدلالۃ نہیں، بل کہ اس میں احتمال موجود ہے اور "فمن شهد منكم الشهر......الآیۃ" کا حکم قرآنی قطعی الثبوت والدلالۃ ہے، مزید یہ کہ احتیاط بھی اسی میں ہے۔

(فتاویٰ عثمانی- مفتی محمد تقی عثمانی: ۲/ ۱۷۶-۱۷۷، کتاب الصوم، سفر کی وجہ سے رمضان اکتیس ہونے کی صورت میں اکتیسواں روزہ بھی فرض ہے، ط: نعیمیہ- دیوبند☆مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: احسن الفتاویٰ: ۴/ ۴۳۳، کتاب الصوم، سفر کی وجہ سے رمضان اکتیس یا اٹھائیس دن کا ہوگیا، ط: دار الاشاعت- دہلی)

(۹) عن الوليد، قال: صمنا على عهد علي رضي الله عنه ثمانية وعشرين يوما، فأمرنا بقضاء يوم. (السنن الكبرى - أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۴/ ۴۲۰، رقم الحديث: ۸۲۰۴، باب الشهر يخرج في حساب الصائمين ثماني وعشرين فيقضون يوما واحدا، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

إذا صام أهل مصر شهر رمضان على غير رؤية ثمانية وعشرين يوما، ثم رأوا هلال شوال إن عدوا شعبان برؤيته ثلاثين يوما، ولم يروا هلال رمضان قضوا يوما واحدا، وإن صاموا تسعا وعشرين يوما ثم رأوا هلال شوال لا قضاء=

[۳۳] سعودی میں ۲۹؍روزے مکمل کرنے کے بعد ہندوستان آنے والے کا حکم

۱۵۲۰- سوال: سعودی میں اگر کسی شخص نے ۲۹؍روزے مکمل کیے، پھر وہ ہندوستان آیا اور یہاں ہندوستان میں ۲۸؍ویں رمضان ہے، تو اُسے ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ روزے رکھنے چاہئیں یا جب کہ دوسرے دِن سعودی میں عید ہو، تو اُس دِن روزہ چھوڑ دینا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

سعودی سے جو شخص یہاں ہندوستان آیا ہو اور سعودی کے چاند کے اعتبار سے اُس کے تیس روزے مکمل ہو چکے ہوں، تب بھی اُسے تنہا عید منانے کی اِجازت نہ ہوگی، اُسے چاہیے کہ وہ دوسرے تمام لوگوں کے ساتھ روزہ رکھے، اگر چہ اُس کے روزوں کی گنتی اکتیس تک پہنچے، اِسی طرح جب کوئی ہندستانی یہاں سے ۲۸؍روزے مکمل کر کے سعودی پہنچے اور وہاں اُس دن ۲۹؍رمضان ہو، پھر دوسرے دِن عید، تو تمام لوگوں کے ساتھ عید کے دِن افطار کر لے اور اُس کا جو ایک روزہ کم ہوا، اُس کی بعد میں قضا کر لے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۴] ایک ملک کے چاند کی خبر دوسرے ملک کے لیے معتبر ہوگی؟

۱۵۲۱- سوال: (۱) ''لوساکا'' میں مطلع صاف ہے، ذرا بھی بادل یا غبار نہیں ہے، ملک کے کسی شہر سے خبر ملی کہ ملاوی میں چاند ہوا ہے، جس کی بناء پر ہم نے رمضان کا اعلان کیا ہے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا محض اس خبر پر رمضان کا اعلان کرنا صحیح ہے؟

(۲) مذکورہ صورت میں اعلان کرنے والا، کمیٹی کا کوئی ذمہ دار یا کوئی عالم نہ ہو، تو کیا حکم ہے؟ اور اگر

= عليهم، فإن عدوا هلال شعبان ثلاثين يوما من غير رؤية هلال شعبان، ثم صاموا رمضان، قضوا يومين، كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۹، كتاب الصوم، الباب الثاني في رؤية الهلال، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۳۶۴، كتاب الصوم، الفصل الثاني: رؤية الهلال، ط: زكريا- ديوبند ☆ کتاب الفتاوی- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ: ۳/ ۴۱۴، اگر ۲۸/ ہی روزے رکھے، ط: نعیمیہ- دیوبند)

(۱) تفصیل وتخریج کے لیے سوال سابق کا حاشیہ نمبر ۷، ۸، اور ۹ ملاحظہ کریں۔

وہ (اعلان کرنے والا) ذمہ دار ہے، تو کیا حکم ہے؟

(۳) مذکورہ بالا پہلی صورت میں کسی دوسرے شہر کا عالم فون پر خبر دے، جب کہ یہاں کا مطلع بالکل صاف ہے، اور کہیں بھی چاند نظر نہیں آیا ہے، تو کیا حکم ہے؟

(۴) اگر دو آدمی گواہی دیں کہ انہوں نے چاند دیکھا ہے؛ لیکن ان میں کوئی بھی عادل اور دین دار نہیں، اور اگر ہے، تو ایک ہی ہے، تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ واضح رہے کہ مطلع صاف ہے۔

(۵) ''زانبیا'' لوساکا سے ۳۰۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے اور ملاوی تقریباً ۴۰۰/میل دور ہے، لوساکا میں مطلع صاف ہونے کے باوجود چاند نظر نہیں آیا، اور بلندی کی سطح پر واقع شہروں میں سے کسی جگہ سے وہاں کے کسی عالم کی فون سے خبر ملے کہ یہاں رمضان کا چاند ہوگیا ہے، تو کیا ان کی خبر کو قبول کر کے رمضان کا فیصلہ کر سکتے ہیں؟ تمام سوالات کے جوابات تفصیل سے عنایت فرمائیں، نوازش ہوگی۔

الجواب حامداو مصليا:

(۱) مذکورہ خبر کی بنیاد پر چاند کے ثبوت کا اعلان کرنا جائز نہیں ہے۔[1]

(۲) ذمہ دار ہو یا غیر ذمہ دار، جس کو بھی خبر کے صحیح ہونے کا یقین ہوجائے، وہ روزہ رکھ سکتا ہے، عوام کو حکم کرنا جائز نہیں۔[2]

---

(۱) قال: "وإذا لم تكن بالسماء علة لم تقبل الشهادة حتى يراه جمع كثير يقع العلم بخبرهم". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۱۹، كتاب الصوم، فصل في رؤية الهلال، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

والحق ما روي عن محمد وأبي يوسف أيضا أن العبرة لتواتر الخبر ومجيئه من كل جانب. (فتح القدير-كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بـ'ابن الهمام' (م: ۸۶۱هـ): ۲/۳۲۴، كتاب الصوم، فصل في رؤية الهلال، ط: دار الفكر)

وفي الفتح والحق ما روي عن محمد وأبي يوسف أيضا أن العبرة لتواتر الخبر ومجيئه من كل جانب حتى لا يتوهم تواطؤهم على الكذب. وفي الزاد وهو الصحيح. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/۲۳۷، كتاب الصوم، ما يثبت به رمضان، ط: دار إحياء التراث العربي ☆حاشية الشِلْبِيّ على تبيين الحقائق- شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِلْبِيّ (م: ۱۰۲۱هـ): ۱/۳۲۱، كتاب الصوم، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۸۸، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر)

(۲) قال الشيخ المفتي محمد شفيع-رحمه الله-: إنه لا يلزم لثبوت رمضان الشهادة الشرعية؛ بل يكفي خبر عدل=

(۳) عالم خبر دے رہا ہو یا جاہل؛ دونوں کا ایک ہی حکم ہے، کہ جن کو اس خبر پر یقین ہو، وہ روزہ رکھ لے؛ لیکن عام اعلان نہ کرے۔ (۳)

(۴) مطلع صاف ہونے کی صورت میں چاند دیکھنے کی کوشش کی گئی؛ لیکن چاند نظر نہیں آیا، تو محض ایک آدمی دو آدمی کی خبر و گواہی سے فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ مطلع کے صاف ہونے کے وقت جم غفیر کی خبر ضروری ہے۔ (۴)

(۵) فون کے ذریعے عالم صاحب جو خبر دے رہے ہیں، اگر اس سے دل مطمئن ہو جائے، تو خود روزہ رکھ سکتے ہیں، عوام کو حکم کرنا جائز نہیں ہے، یہ حکم ہلال رمضان کے لیے ہے۔ (۵)

اگر معاملہ عید کا ہو، تو مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں دو فرد کی گواہی اور مطلع صاف ہونے کی صورت میں خبر مستفیض ضروری ہے، کہ جس سے چاند کا یقین ہو جائے۔ (۶)

دو تین فون کا آجانا کافی نہیں ہے؛ لہٰذا املاوی یا کینیا سے دو تین فون آئے، تو اس کی بنیاد پر عید منانا جائز نہیں ہے، اور اگر غبار یا ابر ہو، تو صرف فون آنے کی صورت میں عید منانا جائز نہیں ہوگا؛ کیوں کہ ایسی

=الخبر علی التلفون معتبر إذا عرف المتکلم، وهو ثقة. (آلات جدیدہ کے شرعی احکام، ص: ۲۰۸، ط: قاسمی کتب خانہ- دیوبند)

حضرت مفتی نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ رقم فرماتے ہیں:

مطلع صاف نہ ہو، اور موقع ہلال رمضان کے ثبوت کا ہو، تو صرف ایک ٹیلی فون بھی اپنے عمل کے لیے کافی ہوگا، مگر دوسروں کو مجبور کرنا یا ان پر زبردستی کرنا درست نہ ہوگا، البتہ ترغیب دے سکتے ہیں۔ (رویت ہلال کا شرعی حکم، ص: ۲۵، ط: عظیم بک ڈپو- دیوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: کفایت المفتی: ۲۱۶/۴، کتاب الصوم، ط: زکریا- دیوبند☆ منتخبات نظام الفتاویٰ: ۵۰۱/۱، ایفا پبلی کیشنز- نئی دہلی۔

(۳) حاشیہ نمبر (۱) اور (۲) ملاحظہ کریں۔

(۴) حاشیہ نمبر (۱) ملاحظہ کریں۔

(۵) قد تقدم تخریجه مرارًا عن: رد المحتار علی الدر لمختار: ۳۹۴/۲، کتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر ☆ والبحر الرائق: ۲۹۰/۲، کتاب الصوم، بما یثبت شهر رمضان، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ و مجمع الأنهر: ۲۳۹/۱، کتاب الصوم، مایثبت به رمضان، ط: دار إحياء التراث العربي.

(۶) (وشرط للفطر) مع العلة والعدالة (نصاب الشهادة ولفظ أشهد) . . . (و) قبل (بلا علة جمع عظيم يقع العلم الشرعي وهو غلبة الظن (بخبرهم وهو مفوض إلى رأي الإمام من غير تقدير بعدد) على المذهب. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۸۶-۳۸۸، کتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر- بيروت)

صورت میں گواہی ضروری ہے، جو فون پر نہیں دی جاسکتی، ہاں اگر اس تواتر سے بہ ذریعۂ ٹیلی فون خبر ملے کہ یہاں کی کمیٹی یا قاضی اور ذمہ داران نے چاند کی گواہی قبول کرلی ہے، تو ایسی صورت میں ''رویت ہلال کمیٹی'' چاند کا اعلان کرسکتی ہے۔ (۷) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] مسئلۂ ہلال: انفرادی اور ریڈیائی خبر

۱۵۲۲- سوال: (۱) اگر غبار یا ابر وغیرہ کی وجہ سے رمضان کا چاند نظر نہیں آیا، اور ایسے دو تین افراد چاند دیکھنے کی شہادت دیتے ہیں، جو دین دار نہیں ہیں، تو کیا ان کی شہادت معتبر مان کر، رمضان المبارک کے شروع ہونے کا اعلان کیا جاسکتا ہے؟

(۲) ابر کی وجہ سے لوساکا میں چاند نظر نہیں آیا؛ لیکن دوسرے شہر سے کوئی شخص فون سے خبر دے، اور وہ مخبر ایک ہی شخص ہے، تو کیا اس کا اعتبار کرکے چاند کا اعلان کرسکتے ہیں؟

(۳) ''لوساکا'' سے ''زامبیا'' ۲۴۰ ر میل دور ہے اور ملک [زامبیا] کا ایک شہر ''چیپاٹا'' ۳۷۵ ر میل ہے، اب ''زامبیا'' سے فون آئے کہ یہاں چاند ہوگیا ہے، جب کہ ملک کے کسی بھی شہر سے کوئی فون نہیں آیا، تو کیا اس طرح ملک کے کسی شہر سے آنے والے فون سے رمضان کا اعلان کرسکتے ہیں؟

(۴) بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوساکا، چیپاٹا وغیرہ میں چاند نظر نہیں آیا؛ لیکن چیپاٹا سے ۱۰۰ ر میل کے فاصلہ پر، وہاں سے فون کے ذریعہ خبر ملتی ہے کہ چاند ہوگیا ہے اور چیپاٹا میں اس کو قبول کرلیتے ہیں، پھر لوساکا میں فون سے خبر ملتی ہے کہ یہاں رمضان ہے اور ہم تراویح پڑھ رہے ہیں، تو کیا ایسی خبر کی بناء پر

---

(۷) چاند کے متعلق اگر باہر سے ٹیلی فون سے خبریں آتی ہیں، تو دیکھا جائے گا کہ خبر دینے والا کن الفاظ میں خبر دے رہا ہے، اگر صرف یہ خبر دے کہ یہاں چاند ہوگیا ہے، یا یہاں بہت سے لوگوں نے چاند دیکھا ہے، تو محض ان خبروں کا کوئی اعتبار نہیں، چاہے کتنی ہی خبریں کیوں نہ ہوں۔

اور اگر خبر دینے والے نے اس طرح خبر دی کہ میں نے چاند دیکھا ہے، یا چاند دیکھنے والے فلاں شخص نے خود مجھ سے بیان کیا ہے، یا یہ کہ یہاں کے قاضی یا رؤیت ہلال کمیٹی یا ذمہ دار اور مفتی نے چاند کی گواہی قبول کرلی ہے، تو ایسی صورت میں اگر اس طرح کے مضمون کے ٹیلی فون اتنی زیادہ تعداد میں آئیں کہ ان سے سچائی کا گمان غالب ہوتا ہو، تو ایسی ٹیلی فون کی خبر کا شرعاً اعتبار کیا جائے گا، اور ان کی روشنی میں کسی دوسرے شہر میں چاند کے ثبوت کا اعلان کرنا قاضی یا رؤیت ہلال کمیٹی وغیرہ کے لیے جائز ہوگا۔ (مستفاد: بوادر النوادر- حضرت تھانویؒ، ص: ۲۱۵-۲۱۶)

رمضان کا اعلان کر سکتے ہیں؟

(۵) یہاں ''لوساکا'' میں بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ چاند نظر نہیں آیا اور قرب وجوار سے شرعی طور پر معتبر گواہی بھی نہیں آئی اور کسی جگہ سے چاند ہونے کی خبر فون پر ملتی ہے کہ فلاں جگہ چاند ہوا ہے، یا نظر آیا ہے، وغیرہ۔ تو کیا ''لوساکا'' کی مقامی کمیٹی یا چاند کمیٹی یا مقامی علماء کو اس کی تصدیق کرنا ضروری ہے؟

واضح رہے کہ یہ تحقیق بھی فون ہی پر کی جاتی ہے، فون پر بہت سی مرتبہ جس سے بات کی جاتی ہے، اس کا نہ کوئی علم ہوتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کسی کمیٹی کا نہ تو وہ فرد ہوتا ہے اور نہ ہی کسی ہلال کمیٹی کا ذمہ دار، ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

الجواب حامداومصلیا:

(۱) بے نمازی کی گواہی - اگر وہ شریف اور عزت والا ہو تو - قبول کی جا سکتی ہے۔[۱]

(۲) مذکورہ خبر تسلیم کرنے کے لائق نہیں ہے؛ کیوں کہ معلوم نہیں ہے کہ چاند کس نے دیکھا؟ دیکھنے والا خود خبر دے اور سامع کو یقین ہو جائے، تو وہ روزہ رکھے، عوام کو حکم دینا صحیح نہیں ہے۔[۲]

(۳) جس نے خبر سنی، اور اس کو خبر کے صحیح ہونے کا یقین ہے، وہ روزہ رکھ سکتا ہے، روزہ رکھنے کا عام

---

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (۴۹-الحجرات:۶)

والصحيح من هذا كله أنه مفوض إلى رأي الإمام. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۸۸/۲، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، مطلب ما قاله السبكي من الاعتماد على قول الحساب مردود، ط: دار الفكر-بيروت)

حتى لو أخبر رجل عدل القاضي بمجيء رمضان يقبل ويأمر الناس بالصوم يعني في يوم الغيم ولا يشترط لفظ الشهادة وشرائط القضاء. (المصدر السابق: ۳۸۹/۲، ☆مجموعة رسائل ابن عابدين: ۲۳۴/۱، بہ حوالہ: أحسن الفتاوی: ۴۲۱/۴، کتاب الصوم، ط: دار الاشاعت-دهلی)

(۲) إنه لا يلزم لثبوت رمضان الشهادة الشرعية، بل يكفي خبر عدل، الخبر على التلفون معتبر إذا عرف المتكلم، وهو ثقة. (آلات جدیدہ کے شرعی احکام، ص: ۲۰۸، ط: قاسمی کتب خانہ-دیوبند)

حضرت مفتی نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ رقم فرماتے ہیں:

مطلع صاف نہ ہو، اور موقع ہلال رمضان کے ثبوت کا ہو، تو صرف ایک ٹیلی فون بھی اپنے عمل کے لیے کافی ہوگا، مگر دوسروں کو مجبور کرنا یا ان پر زبردستی کرنا درست نہ ہوگا، البتہ ترغیب دے سکتے ہیں۔ (رؤیت ہلال کا شرعی حکم، ص: ۲۵، ط: عظیم بک ڈپو-دیوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: کفایت المفتی: ۲۱۶/۴، کتاب الصوم، ط: زکریا-دیوبند☆ منتخبات نظام الفتاویٰ: ۵۰۱/۱، ایفا پبلی کیشنز-نئی دہلی۔

اعلان کروانا درست نہیں ہے۔ [۳] فون کی خبر شہادت کے حکم میں نہیں ہے۔ [۴]

(۴) مذکورہ صورت حال کی بناء پر "لوساکا" والوں کا رمضان کے متعلق فیصلہ لینا شرعی اصول کے خلاف ہے۔ [۵]

(۵) رمضان کے بارے میں خبر سننے والا روزہ رکھ سکتا ہے، عام لوگوں حکم کرنا جائز نہیں ہے، البتہ آٹھ دس فون اس بارے میں آئیں کہ میں نے چاند دیکھا ہے اور سامع اس کی آواز بھی پہچانتا ہو، تو ایسی صورت میں عام اعلان کرنے کی اجازت ہے۔ [۶]

صورت مسئولہ میں تحقیق کرنا ضروری نہیں ہے، کوئی تحقیق کرے گا، تو اس کو اس کا ثواب مل جائے گا، اور یقین ہو جانے پر خود روزہ رکھ سکتا ہے، عام اعلان ایک فون کی خبر سے کرنا جائز نہیں ہے۔ [۷] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۶] مختلف ہلال کمیٹی کے حدود اور ان کے اعلان کی حیثیت

۱۵۲۳- سوال: (۱) اپنے علاقے میں بھروچ، سورت، ترکیسر اور راندیر؛ چاروں جگہ ہلال

---

(۳) حاشیہ نمبر (۲) دیکھیں۔

(۴) (هي) لغة خبر قاطع. وشرعا (إخبار صدق لإثبات حق) فتح. قلت: فإطلاقها على الزور مجاز كإطلاق اليمين على الغموس (بلفظ الشهادة في مجلس القاضي) [الدر المختار مع رد المحتار: ۵/۴۶۱، كتاب الشهادات، ط: دار الفكر- بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۲/۱۸۵، كتاب الشهادات، ط: دار إحياء التراث العربي]

(۵) وفي التبيين ولو سمع من وراء الحجاب لا يسعه أن يشهد لاحتمال أن يكون غيره إذا النغمة تشبه النغمة. . . . وقالوا إذا سمع صوت امرأة من وراء الحجاب لا يجوز أن يشهد عليها إلا إذا كان يرى شخصا وقت الإقرار قال الفقيه أبو الليث إذا أقرت امرأة من وراء حجاب وشهد عنده اثنان أنها فلانة بنت فلان بن فلان لا يجوز لمن سمع إقرارها أن يشهد عليها إلا إذا رأى شخصها حال ما أقرت فحينئذ يجوز أن يشهد على إقرارها برؤية شخصها لا رؤية وجهها. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده،يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۲/۱۹۱، كتاب الشهادات، فصل في بيان أنواع ما يتحمله الشاهد، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ تبيين الحقائق: ۴/۲۱۴، كتاب الشهادات، مايشترط للشهادة في ثبوت الولادة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية-بولاق)

(۶) ملاحظہ کریں عنوان: "ایک ملک کے چاند کی خبر دوسرے ملک کے لیے معتبر ہوگی؟" کا حاشیہ نمبر ۷، مستفاد از بوادر النوادر۔

(۷) مزید تفصیل کے لیے رجوع کریں اسی باب کا عنوان: "اگر کسی جگہ چاند نظر نہ آئے، تو اہل قریہ کا تحقیق کے لیے کسی اور جگہ جانا"۔

کمیٹیاں ہیں، دریافت یہ کرنا ہے کہ ان کے حدود کہاں تک ہیں اور فیصلے پر کس مقام تک عمل کرنا لازم ہے؟

(۲) امسال عید کے چاند کے سلسلے میں گواہی کے خطوط دار العلوم، کنتھاریہ سے جاری کیے گئے تھے اور ان کے اعتبار سے لوگوں نے قربانی کی تھی، دریافت یہ کرنا ہے کہ ان قربانی کا کیا حکم ہے؟ کیا دار العلوم کنتھاریہ سے خطوط جاری ہونے کے بعد بھی، ان گواہوں کے پاس جا کر گواہی لینا ضروری تھا؟

(۳) ہلال کمیٹی کو چاند کی شہادت کے بعد، چاند ہونے کی خبر کن الفاظ میں دینی چاہیے؟

(۴) ایک ہلال کمیٹی کا فیصلہ، دوسری چاند کمیٹی کن شرائط کے ساتھ معتبر مان سکتی ہے؟ اور دوسری کمیٹی کو اس کی خبر کن الفاظ سے دینی چاہیے۔

(۵) فقط پاکستان ریڈیو کی خبر سے رمضان یا عید منانے کا کیا حکم ہے؟ اس کا لحاظ کر کے گاؤں میں رمضان وعید کا اعلان کر سکتے ہیں یا نہیں؟ یہ بات واضح رہے کہ ہند و پاک کا مطلع ایک ہے اور پاکستان میں شرعی قانون کے مطابق ہلال کمیٹی کا فیصلہ اور اعلان ہوتا ہے، تو پھر اعلان معتبر نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟

(۶) چاند کمیٹی اگر یومیہ شائع ہونے والے اخبار میں چاند ہونے کی خبر شائع کرے، تو کیا اس اخبار کی ترسیل جن مقامات تک ہوتی ہے، وہاں کے لوگوں کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری ہے؟

(۷) دہلی، بمبئی، کولکاتا وغیرہ میں عید کے لیے ہونے والے اعلانات ونشریات، یہاں [گجرات] کی چاند کمیٹی کے لیے دلیل بن سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر بن سکتے ہیں، تو کن شرائط کے ساتھ؟ خصوصاً جامع مسجد دہلی کے امام صاحب کا اعلان دلیل بن سکتا ہے یا نہیں؟

برائے کرم ان سوالات کے تفصیلی جوابات عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) سب سے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ یہ کمیٹیاں عوام نے اپنی دینی ضرورت پوری کرنے کے لیے قائم کی ہے، یا عوام کی بے توجہی کی وجہ سے، علماء نے اپنی ذمہ داری سمجھ کر قائم کی ہے، دونوں ہی صورتوں میں کام کرنے کا مقصد کیا طے ہوا ہے؟ اس کے اعتبار سے فیصلوں کے اثرات ان کے متعینہ حدود میں مرتب ہوں گے؛ کیوں کہ مذکورہ مسائل کتاب القضاء کی روشنی میں ہی حل کیے جائیں گے۔

کیوں کہ اگر اسلامی حکومت ہوتی تو قاضی متعین ہوتے، اور ہلال کمیٹی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی،

نیز غیر اسلامی حکومت بھی عہدہ قضا کی ذمہ داری سپرد کرتی، تو بھی اس طرح کے مذکور مسائل کھڑے نہ ہوتے۔ معلوم ہوا کہ کمیٹی کی ضرورت نظامِ قضا کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے، اس لیے یہ کمیٹیاں نظام قضا کی قائم مقام ہوں گی۔ ضرورت کے پیشِ نظر ایک عالم دین بھی قضا کے قائم مقام بن جائے گا۔ (شامی ☆ عمدۃ الرعایۃ)[1]

قضا کے متعلق جو اصول ہیں، اسی کے مطابق ہلال کمیٹی کے مسائل بھی حل کیے جائیں گے، قاضی کبھی صرف ایک شہر کے لیے ہوتا ہے، کبھی تحصیل کے لیے، کبھی ضلع کے لیے اور کبھی قصبہ کے لیے۔ اسی کے اعتبار سے ہلال کمیٹی کی حدود بھی ہوں گی، جب کسی قاضی کو کسی جگہ کے لیے خاص کر دیا جائے، تو اس کی قضا اسی دائرے تک محدود رہے گی، اور اس دائرے سے باہر حکم نہیں؛ بل کہ خبر شمار ہوگی۔ جسے بہ طور حکم دوسرے دائرے میں قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ نافذ۔ (۲)

کتب فقہ میں ہے کہ ایک قاضی پر دوسرے قاضی کی خبروں کو اس کی ولایت حدود کے باہر قبول کرنا لازم نہیں ہے۔ (۳)

---

[۱] والعالم الثقة في بلدة لا حاكم فيه قائم مقامه. (عمدة الرعاية على شرح الوقاية: ۲۴۶/۱، كتاب الصوم، سعيديه- پاكستان)

لأن البلدة لا تخلو عن حاكم شرعي عادة فلا بد من أن يكون صومهم مبنيا على حكم حاكمهم الشرعي. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۹۰/۲، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) إذا قلد السلطان رجلا قضاء بلدة كذا لا يصير قاضيا في سواد تلك البلدة ما لم يقلد قضاء البلدة ونواحيها، وهذا الجواب إنما يستقيم على رواية النوادر؛ لأن - على رواية النوادر - المصر ليس بشرط لنفاذ القضاء.... وإذا قلد السلطان رجلا قضاء يوم يجوز ويتأقت، وإذا قيده بالمكان يجوز، ويتقيد بذلك المكان فعلى هذا لو قيد القاضي إنابة نائبه في مسجد معين لا يكون للنائب أن يقضي في مسجد آخر كذا في الملتقط. (الفتاوى الهندية: ۳۱۵/۳، كتاب أدب القاضي، الباب الخامس في التقليد والعزل، ط: دار الفكر)

(۳) وإنما يقبله المكتوب إليه إذا كان الكاتب على القضاء، حتى لو مات أو عزل أو لم يبق أهلا للقضاء قبل وصول الكتاب لا يقبله لأنه التحق بواحد من الرعايا، ولهذا لا يقبل إخباره قاضيا آخر في غير عمله أو في غير عملهما. (الهداية شرح بداية المبتدي) ـــــــ قال ابن الهمام: (ولهذا لا يقبل إخباره قاضيا آخر) غير المكتوب إليه (في غير عمله أو غير عملهما) ولو كان على قضائه لأنه بالنسبة إلى العمل الآخر كواحد من الرعايا غير أن الكتاب خص من ذلك بالإجماع. (فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۳۸۹/۶ و ۳۸۲/۳-۳۸۱، كتاب أدب القاضي، باب كتاب القاضي إلى القاضي، ط: المكتبة الرشيدية- باكستان ☆ البحر الرائق: ۲/۷، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي وغيره، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الهداية: ۱۰۶/۳، كتاب أدب القاضي، باب كتاب القاضي إلى القاضي، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

حدود قضاء کی طرح ہلال کمیٹی کو اپنی حد مقرر کرنی چاہیے؛ کیوں کہ ہلال کمیٹی کے ممبر اپنی حد میں ذمہ دار ہیں، وہ اگر حد سے باہر اپنے فیصلے کی خبر دے، تو وہ مقبول نہیں ہوگی اور اس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کو افطار کا حکم نہیں دیا جائے گا اور نہ ہی عید منانے کی اجازت ہوگی۔

لہٰذا چاند کمیٹی والوں کو چاہیے کہ مل کر اپنے حدود مقرر کریں اور اسی کے مطابق عوام کی رہنمائی کر کے اپنے وجود کو نافع بنا کر عوام کی خدمت کریں۔

(۲) مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق ان کے حدود میں قربانی جائز ہے۔ البتہ امسال مذکورہ گواہی کے خطوط کے بعد مختلف جگہوں سے گواہی آ گئی تھی، نیز مختلف چاند کمیٹی نے چاند کا فیصلہ کر دیا تھا، اس لیے ان کے حد سے باہر کی گئی قربانی بھی صحیح ہو جائے گی۔(۵)

(۳) ہلال کمیٹی کا ذمہ دار یہ اعلان کرے گا کہ: "ہمارے سامنے [نام لے کر کہ] فلاں فلاں نے، یا مطلقاً کہے کہ شرعی گواہوں نے گواہی دی اور ہم نے ان کی گواہی قبول کر لی، اس اعتبار سے فلاں دن چاند کا ثبوت ہونے کی وجہ سے پہلی تاریخ ہے، اس کا ہم فیصلہ اور اعلان کرتے ہیں۔(۶)

(۴) کتاب القاضی کے شرائط کے مطابق ایک ہلال کمیٹی کا فیصلہ دوسری کمیٹی کے لیے معتبر ہوگا، اور دوسری کمیٹی اپنے اعلان میں اس کی صراحت کرے گی کہ چاند فلاں جگہ دیکھا گیا ہے، اور فلاں ہلال کمیٹی سے اس کی معتبر ذریعے سے تصدیق کر لی گئی ہے۔(۷)

---

[۴] في الخصاف وروي عن محمد أنه قال في مصر فيه قاضيان في كل جانب قاض يكتب أحدهما إلى الآخر كتابا يقبل كتابه، ولو أتى أحدهما إلى صاحبه فأخبره بالحادثة بنفسه لم يقبل قوله لأن في الوجه الأول كان الأول خاطبه في موضع القضاء وفي الثاني خاطبه في غير موضع القضاء. اهـ. (حاشية الشلبي على تبيين الحقائق: ۱۸۶/۴، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي وغيره، ط: المطبعة الكبرى الأميرية-بولاق، القاهرة☆الهداية: ۱۰۶/۳، كتاب أدب القاضي، باب كتاب القاضي إلى القاضي، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

(۵) حاشیہ نمبر (۴) ملاحظہ فرمائیں۔

(۶) حضرت مفتی نظام الدینؒ رقم فرماتے ہیں: اسی طرح بایں الفاظ خبر یا اعلان نشر ہو کہ میں نے خود چاند دیکھا ہے، یا مجھ سے فلاں فلاں (کم از کم دو معتبر و عادل) شخصوں نے خود اپنا چاند دیکھنا بیان کیا ہے، اور ان الفاظ کا نشر کرنے والا شخص معتبر و معلوم ہے اور قرائن شرعیہ سے صحت کا ظن غالب ہو، تو مقامی خبریں بھی طرق موجبہ کے مطابق ہونے کی وجہ سے معتبر ہوگی، اور قابل عمل ہوں گی۔ (رویت ہلال کا شرعی حکم-مفتی نظام الدین [م: ۱۴۲۰ھ]، ص: ۲۰، ط: عظیم بک ڈپو-دیوبند)

(۷) يجب أن يعلم أن كتاب القاضي إلى القاضي صار حجة شرعا في المعاملات بخلاف القياس، لأن الكتاب قد=

(۵) یہ صحیح ہے کہ ہندوپاک کا مطلع ایک ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ مرادآباد میں جمعیۃ العلماء کی کمیٹی نے فیصلہ کیا تھا، جس میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی ہند حضرت مولانا ومفتی کفایت اللہ صاحب موجود تھے کہ ایک ملک کی گواہی دوسرے ملک میں شرعی اصول کے ساتھ پہنچے، تو وہاں کے علماء اس گواہی کے اعتبار سے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ چوں کہ ہندوستان میں پاکستان کی خبر ریڈیو کے ذریعے معلوم ہوتی ہے، جس میں گواہی کی شرط مفقود ہوتی ہے، اس لیے وہاں کے اعلان پر صدفی صد ہلال کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

میرے نزدیک حکم یہ ہے کہ امیر پاکستان بھی ہندوستان کے ریڈیو کے ذریعہ سے اعلان کرے کہ چاند ہوگیا ہے، تو بھی حدود ولایت نہ ہونے کی وجہ سے ان کا فیصلہ صرف خبر کے درجے میں ہوگا۔ (۸)

عید کے علاوہ رمضان وغیرہ کے چاند کے بارے میں ریڈیو کی خبر سے انسان کو یقین ہوجائے، تو پاکستانی ریڈیوں کی خبر سے ہندوستان والوں کے لیے جائز ہوگا کہ خود عمل کرلے، عمومی روزے کے بارے میں حکم دینا واجب نہیں ہے۔ (۹)

(۶) اگر اخبار ہلال کمیٹی کے فیصلہ کو لفظ بہ لفظ نقل کرے، تو اردگرد کے لوگ اس پر عمل کرسکتے ہیں، ورنہ اخبار کی خبر کا اعتبار نہیں ہوگا۔ (۱۰)

= يفتعل ويزور والخط يشبه الخط والخاتم يشبه الخاتم، ولكن جعلناه حجة بالإجماع ولكن إنما يقبله القاضي المكتوب إليه عند وجود شرائطه ومن جملة الشرائط البينة، حتى أن القاضي المكتوب إليه لا يقبل كتاب القاضي ما لم يثبت بالبينة أنه كتاب القاضي. (الفتاوى الهندية: ۳۸۱/۳، كتاب أدب القاضي، الباب الثالث والعشرون في كتاب القاضي إلى القاضي، ط: دار الفكر- بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۱۶۶/۲، كتاب القضاء، فصل في كتاب القاضي، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ حاشية الشلبي على تبيين الحقائق: ۱۸۳/۴، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي وغيره، ط: المطبعة الكبرى الأميرية -بولاق، القاهرة)

(۸) حاشیہ نمبر (۳) ملاحظہ فرمائیں۔

(۹) تقدم تخريجه مرارا.

(۱۰) جس شہر میں باقاعدہ قاضی یا ہلال کمیٹی نے کسی شہادت پر اطمینان کرکے، عید وغیرہ کا اعلان کردیا ہو، اس اعلان کو اگر ریڈیو پر نشر کیا جائے، تو جس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے، اس شہر اور اس کے مضافات ودیہات کے لوگوں کو اس ریڈیو کے اعلان پر عید وغیرہ کرنا جائز ہے، شرط یہ ہے کہ ریڈیو کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ چاند کے متعلق مختلف خبریں نشر نہ کرے، صرف وہ فیصلہ نشر کرے، جو اس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے اس کو دیا ہے اور اس کو نشر کرنے میں پوری احتیاط سے کام لے، جن الفاظ میں فیصلہ دیا گیا ہے، وہ الفاظ بعینہ نشر کیے جائیں، جس ریڈیو پر ایسی احتیاط کی پابندی نہ ہو، اس کے اعلان پر عید وغیرہ کرنا کسی کے لیے درست نہیں۔ =

(۷) ہندوستانی ریڈیو پر جو خبر نشر کی جاتی ہے، وہ محض خبر ہے، اور ان کے خبر دینے کا جو طریقہ ہے، وہ اسلامی شرع کے موافق نہیں ہے، اس لیے قبول کرنے کے لائق نہیں ہے۔

عالم گیری میں ہے:

حتى لو شهد جماعة أن أهل بلدة قد رأوا هلال رمضان قبلكم بيوم فصاموا، وهذا اليوم ثلاثون بحسابهم، ولم ير هؤلاء الهلال لا يباح فطر غد، ولا يترك التراويح في هذه الليلة؛ لأنهم لم يشهدوا بالرؤية، ولا على شهادة غيرهم، وإنما حكوا رؤية غيرهم. (۱/۱۹۱)[۱۱]

ایک جماعت گواہی دے کہ فلاں شہر کے لوگوں نے ہم سے ایک دن قبل رمضان کا چاند دیکھا تھا، آج کا دن ان کے حساب سے ۳۰/ رمضان ہے، تو اِن لوگوں کے لیے اس گواہی کی وجہ سے دوسرے دن، چاند دیکھے بغیر، عید منانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی رات میں تراویح کا ترک کرنا درست ہے؛ اس لیے کہ انہوں نے اپنی رؤیت کی گواہی نہیں دی ہے، اور نہ ہی یہ شہادت علی الشھادت ہے، بل کہ یہ صرف حکایت اور خبر کا بیان ہے، جس سے عید کا چاند ثابت نہیں ہوتا۔ (بل کہ عید کے چاند کے ثبوت کے لیے خبر مستفیض کی ضرورت پڑتی ہے)

اس جزئیہ سے ثابت ہوا کہ متعدد ریڈیو والا اپنے طریقہ کے مطابق خبر دے، تو بھی عید منانا جائز نہیں، جب تک کہ جم غفیر کی خبر نہ آجائے۔

ریڈیو اس طرح اعلان کرے کہ بمبئی جامع مسجد کے شاہی امام نے یا صدر جمعیت علماء ہند مولانا سید اسعد مدنی صاحب نے چاند کے ہونے کا فیصلہ کیا ہے؛ لہٰذا آئندہ کل عید ہوگی، تو بھی محض ریڈیو کے اس اعلان کی وجہ سے عید منانا جائز نہیں ہے۔(۱۲)

= اور جس طرح ایک شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی کا فیصلہ اس شہر اور اس کے مضافات کے لیے واجب العمل ہے، اسی طرح اگر کوئی قاضی یا مجسٹریٹ یا ہلال کمیٹی پورے ضلع یا صوبہ یا پورے ملک کے لیے ہو، تو اس کا فیصلہ اپنے اپنے حدود ولایت میں واجب العمل ہوگا۔

(آلات جدیدہ کے شرعی احکام، ص: ۱۸۸، باب: ہلال کے معاملہ میں آلات جدیدہ کی خبروں کا درجہ، ط: قاسمی کتب خانہ - دیوبند ☆ جواہر الفقہ: ۵/۱۷۷)

[۱۱] الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۹، كتاب الصوم، الباب الثاني في رؤية الهلال، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/۲۹۱، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم و مالا يفسده، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مجمع الأنهر: ۱/۲۳۹، كتاب الصوم، باب موجب الفساد، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۹۴، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر - بيروت.

(۱۲) بخلاف ما إذا أخبر أن أهل بلدة كذا رأوه، لأنه حكاية. (رد المحتار: ۲/۳۹۴، كتاب الصوم، سبب رمضان)

ایک جگہ کا فیصلہ، دوسری جگہ کے لیے خبر کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ریڈیو کے ذریعے نشر کی گئی خبر چوں کہ غیر کے ذریعے نشر کی جاتی ہے، اس لیے اس سے عید کی رؤیت ثابت نہیں ہوگی۔ [۱۳]

ہاں! ہلال کمیٹی کا کوئی ذمے دار، خود ریڈیو کے ذریعہ اعلان کرے، تو اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ جہاں سے اعلان کیا گیا ہے، اس کے قرب و جوار کے لوگ روزہ بھی رکھیں گے اور عید بھی کر سکتے ہیں۔

جس طرح پہلے زمانے میں چاند ہونے کی صورت میں توپ کے گولے ڈاغے جاتے تھے، اور اونچے اونچے مناروں پر لیمپ جلا دیا جاتا تھا، جس کو دیکھ کر ارد گرد کے لوگ روزہ رکھتے اور عید کرتے تھے۔ [۱۴]

اسی طرح ہلال کمیٹی کی حد میں ان کا فیصلہ نافذ ہوگا۔ اور جو علاقہ معلن [اعلان کرنے والے] کی حد سے باہر ہو، وہاں ان کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، اس لیے ضرورت ہے کہ ایسی ہلال کمیٹی بنائی جائے، جس کا فیصلہ پورے ملک میں نافذ ہو سکے، یا ریڈیو کی خبر کو خبر مستفیض کے طور پر نشر کیا جائے، اس طرح کہ چھ سات جگہوں کی خبروں کو ریڈیو کے ذریعہ بیان کیا جائے، ایسی صورت میں ریڈیو کی خبر ''خبر مستفیض'' بن سکتی ہے، جو عمل کے لائق ہے۔

البتہ عوام محض ریڈیو کو سن کر فیصلہ نہ کرے؛ بل کہ اگر ہلال کمیٹی ہو، تو اس کو ریڈیو کے الفاظ سنائے جائیں، یا ہلال کمیٹی نہ ہو، تو گاؤں کے عالم کو سنائے، اس کے بعد جو فیصلہ ہو، اس پر عمل کرے۔

عوام کا خود سن کر اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں کہ جہاں کوئی عالم نہ ہو، وہاں عوام کے دل کی گواہی معتبر نہیں ہے، عالم کے دل کی گواہی اور اسکا فتوی حجت بنے گا۔ (امداد الفتاوی جلد ۲ صفحہ ۹۶) [۱۵]

ہلال کمیٹی کے ذمہ داروں کو حکومت اعلان کرنے کی اجازت نہ دے، تو وہ (حکومت) کسی مسلمان کو

---

(۱۳) حاشیہ نمبر (۱۰) ملاحظہ کریں۔

(۱۴) والظاهر أنه يلزم أهل القرى الصوم بسماع المدافع أو رؤية القناديل من المصر؛ لأنه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل كما صرحوا به واحتمال كون ذلك لغير رمضان بعيد إذ لا يفعل مثل ذلك عادة في ليلة الشك إلا لثبوت رمضان. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۸۶/۲، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر☆ البحر الرائق: ۲۹۱/۲، كتاب الصوم، باب مايفسد الصوم و مالا يفسده، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۱۵] اور جہاں کوئی محقق عالم ہو، وہاں عوام کی دل کی گواہی معتبر نہیں، عالم کے دل کی گواہی اور ان کا فتویٰ حجت ہے، اور عوام کی خود رائی کرنا یا فتویٰ کے خلاف کرنا جائز نہیں۔ (امداد الفتاویٰ: ۹۳/۲، کتاب الصوم والاعتکاف، ط: ادارہ تصنیفات اولیاء، مسجد اولیا، مہرولی - دہلی)

ذمہ دار بنائے، جو ہلال کمیٹی کے فیصلہ کو من وعن ریڈیو پر نشر کرے۔ ایسی صورت میں بھی ریڈیو کا نشریہ عمل کے قابل ہوگا، دینی معاملات میں غیر مسلم کی بات قبول کرنے کے لائق نہیں ہے۔[۱۶]

بخاری صاحب کا اعلان مذکورہ شرائط کے ساتھ نہیں ہوتا، بس ان کی جانب منسوب کیا جاتا ہے، اور خبر نشر کرنے والا کوئی غیر ہوتا ہے؛ اس لیے عمل کے لائق نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۷] ریڈیو کے ذریعہ رویتِ ہلال کی خبر

۱۵۲۴- سوال: اگر دہلی ریڈیو اسٹیشن سے یہ خبر نشر کی جائے کہ آج یہاں جامع مسجد دہلی کے اِمام صاحب کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ رمضان یا عید کا چاند ہو گیا ہے، تو کیا اُس خبر کے سننے کے بعد، اس کا اعتبار کر کے ہندوستان کے تمام مقامات روزہ یا عید منا سکتے ہیں؟ کیا علماء کی مجلس نے اِس قسم کی خبر کو معتبر ماننے کا فیصلہ کیا ہے؟ حالاں کہ اب تک تو معتبر نہیں تھا، ہم نے لکھنؤ اور سہارن پور سے جب یہ فتویٰ معلوم کیا، تو اُنہوں نے لکھا کہ ممکن ہے کہ جمعیت العلماء نے اِس سلسلہ میں حکومت سے مل کر کوئی فیصلہ کیا ہو، لیکن ہمارے علم میں نہیں ہے۔

ایک جگہ سے جواب ہے کہ رویتِ ہلال کمیٹی دہلی کا رُکن ریڈیو سے جب تک خود اعلان نہ کرے، معتبر نہیں ہے۔ دوسری جگہ سے جواب ہے کہ ریڈیو اسٹیشن کا ملازم اگر رویتِ ہلال کمیٹی کی دی ہوئی عبارت پڑھ کر سنائے، تب معتبر ہوگا، ورنہ نہیں۔ آپ جو جواب عنایت فرمائیں، اگر آپ کی رائے یہ ہے کہ اعلان معتبر ہے، تو جواب صراحت کے ساتھ اِن الفاظ میں ہو کہ ''دہلی ریڈیو اسٹیشن کی خبر رویتِ ہلال کے سلسلہ میں اِمام جامع مسجد کے حوالے سے معتبر ہے''۔ ورنہ دوسرے الفاظ میں لوگوں کو مطمئن کرنا دشوار ہے۔

الجواب حامداً ومصلیا:

مسلم حاکم، قاضیٔ شہر، اِمامِ جامع رویتِ ہلال کمیٹی، غرض ذمہ دار اگر رویتِ ہلال کی تحقیق کر کے

---

(۱۶) وقول الفاسق غير مقبول في الديانات فكيف قول الكافر. (البحر الرائق: ۱/۳۸۸، كتاب الصلاة، باب الإمامة، قبيل: باب الحدث في الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۱/۵۹۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة، فروع اقتداء متنفل بمتنفل ومن يرى الوتر واجبا بمن يراه سنة، ط: دار الفكر ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۱/۸۹، كتاب الصلاة، فصل في الإمامة، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆ البناية شرح الهداية - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۲/۳۷۰، كتاب الصلاة، باب في الإمامة، اقتدى بإمام ثم علم أن إمامه محدث، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

شرعی ثبوت کے پائے جانے کے بعد شعبان کی ۲۹ / یا رمضان کی ۲۹ / کو اعلان کرے، یا اپنے آدمی کے ذریعہ اعلان کرائے کہ آج تاریخ فلاں دِن فلاں، جگہ فلاں ثبوتِ رویت ہوگیا ہے، اب اعلان کیا جاتا ہے کہ کل فلاں دِن رمضان المبارک کی پہلی تاریخ ہے، روزہ رکھا جائے، یا شوال کی پہلی تاریخ ہے، عید الفطر کی نماز ادا کی جائے، تو یہ اعلان شرعاً معتبر ہوگا، یعنی جب کہ مطلع صاف ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آیا ہو، تو اُس اعلان کو معتبر تسلیم کرلیا جائے گا۔ (۱)

مگر عوام کو اقدام نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ریڈیو سے جو الفاظ نشر ہوتے ہیں، اُن کو سن کر فوراً ایک کاغذ پر لکھ لیں، پھر اہل علم کے سامنے پیش کریں، یا اہلِ علم کو ریڈیو پر یہ اعلان سنوائیں، تاکہ وہ صحیح رائے قائم کر سکیں، کیوں کہ اکثر اوقات ریڈیو پر شائع ہونے والے الفاظ محض خبر ہوتے ہیں، جن کا حکم یہ نہیں ہوتا، جمعیت العلماء نے اُس کی کوشش کی ہے اور اُس میں کامیابی بھی ہوگئی کہ اہل علم حضرات چاند کے متعلق شرعی دلائل اور بحث کے بعد جس نتیجے پر پہنچیں بصورتِ اعلان ریڈیو نمائندہ کو دے دیں، کہ وہ ہماری طرف سے اُس کو شائع کردیں، چنانچہ وہ نمائندہ اُس کو شائع کر دیتا ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۸] کیلنڈر میں چھپی ہوئی تاریخ سے عید منانا

۱۵۲۵- سوال: ہمارے یہاں کناڈا میں ''ایم - ایس - اے'' نام کی ایک سوسائٹی ہے، اس سوسائٹی کی جانب سے تاریخ کے کیلنڈر چھپتے ہیں، ان میں پیشگی رمضان اور عید کی تاریخوں کی اطلاع کردی جاتی ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ ان کا اعتبار کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

نیز مہینہ، ڈیڑھ مہینے پہلے ہی اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ چاند کی خبر اور رمضان وعید کی تاریخوں کا اعلان کردیا جاتا ہے، تو کیا ان کی خبروں کا اعتبار کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) والعالم الثقة في بلدة لا حاكم فيه قائم مقامه. (عمدة الرعاية على شرح الوقاية: ۱/ ۲۴۶، كتاب الصوم، سعيديه - پاكستان)

لأن البلدة لا تخلو عن حاكم شرعي عادة فلا بد من أن يكون صومهم مبنيا على حكم حاكمهم الشرعي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۹۰، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید دیکھیں: سوال سابق کا حاشیہ نمبر: ۱۰۔

(۲) يجب على المسلمين أن يتفقوا على واحد منهم ويجعلونه واليا. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/ ۳۶۹، كتاب القضاء، مطلب في الاجتهاد وشروطه، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۶/ ۲۹۸، كتاب القضاء، طلب القضاء، ط: دار الكتاب الإسلامي)

الجواب حامداً ومصلیاً:

مختلف کیلنڈرز میں رمضان اور عید سمیت تمام اسلامی مہینوں کی تاریخ چھپی ہوئی ہوتی ہے، وجوب صوم وافطار میں اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

اسی طرح ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ نشر ہونے والی خبروں کا بھی وجوب صوم وافطار میں اعتبار نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ ظن وتخمین پر مبنی ہیں، جب کہ شریعت میں صوم وافطار کا مدار چاند کی رؤیت پر ہے، چاند کے ہونے (یعنی چاند کی پیدائش ووجود) کا اعتبار نہیں ہے۔(۱)

---

(۱) ولا عبرة بقول المؤقتين، ولو عدولا على المذهب، قال في الوهبانية: وقول أولي التوقيت ليس بموجب، وقيل نعم، والبعض إن كان يكثر. (الدر المختار)

علامہ شامیؒ نے مذکورہ عبارت کی شرح کرتے ہوئے بڑی عمدہ بحث کی ہے، جو ذرا طویل ہے، تاہم اہم ہے، ملاحظہ فرمائیں ان کی زبانی:

قال ابن عابدين: (قوله: ولا عبرة بقول المؤقتين) أي في وجوب الصوم على الناس، بل في المعراج لا يعتبر قولهم بالإجماع، ولا يجوز للمنجم أن يعمل بحساب نفسه، وفي النهر فلا يلزم بقول المؤقتين أنه أي الهلال يكون في السماء ليلة كذا وإن كانوا عدولا في الصحيح كما في الإيضاح وللإمام السبكي الشافعي تأليف مال فيه إلى اعتماد قولهم؛ لأن الحساب قطعي. اهـ. ومثله في شرح الوهبانية. ———— [مطلب ما قاله السبكي من الاعتماد على قول الحساب مردود] قلت ما قاله السبكي رده متأخرو أهل مذهبه، منهم ابن حجر والرملي في شرحي المنهاج، وفي فتاوى الشهاب الرملي الكبير الشافعي: سئل عن قول السبكي لو شهدت بينة برؤية الهلال ليلة الثلاثين من الشهر، وقال الحساب بعدم إمكان الرؤية تلك الليلة عمل بقول أهل الحساب؛ لأن الحساب قطعي والشهادة ظنية، وأطال في ذلك فهل يعمل بما قاله أم لا وفيما إذا رئي الهلال نهارا قبل طلوع الشمس يوم التاسع والعشرين من الشهر، وشهدت بينة برؤية هلال رمضان ليلة الثلاثين من شعبان، فهل تقبل الشهادة أم لا؛ لأن الهلال إذا كان الشهر كاملا يغيب ليلتين أو ناقصا يغيب ليلة أو غاب الهلال الليلة الثالثة قبل دخول وقت العشاء؛ لأنه -صلى الله عليه وسلم- كان يصلي العشاء لسقوط القمر الثالثة، هل يعمل بالشهادة أم لا؟.

فأجاب: بأن المعمول به في المسائل الثلاث ما شهدت به البينة؛ لأن الشهادة نزلها الشارع منزلة اليقين وما قاله السبكي مردود، رده عليه جماعة من المتأخرين، وليس في العمل بالبينة مخالفة لصلاته -صلى الله عليه وسلم- ووجه ما قلناه أن الشارع لم يعتمد الحساب، بل ألغاه بالكلية بقوله: نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب الشهر هكذا وهكذا. وقال ابن دقيق العيد: الحساب لا يجوز الاعتماد عليه في الصلاة انتهى.

والاحتمالات التي ذكرها السبكي بقوله ولأن الشاهد قد يشتبه عليه إلخ لا أثر لها شرعا لإمكان وجودها في غيرها من الشهادات اهـ (قوله: وقيل نعم إلخ) يوهم أنه قيل بأنه موجب للعمل، وليس كذلك بل الخلاف في جواز الاعتماد عليهم، وقد حكى في القنية الأقوال الثلاثة فنقل أولا عن القاضي عبد الجبار، وصاحب جمع العلوم أنه لا =

چوں کہ کیلنڈر کی تفصیلات کا اعتبار کرنے کی صورت میں (بعض مرتبہ) خلاف شرع امر کو ماننا پڑتا ہے، اس طور پر کہ اسلامی مہینہ یا تو ۲۹ر کا ہوتا ہے یا ۳۰ر کا؛ لیکن چاند کی رؤیت کے ساتھ، اس (کلینڈر کی تاریخ) کا اعتبار کرنے میں کبھی مہینہ ۲۸ر دن کا ہو جاتا ہے اور کبھی ۳۱ر کا، گرچہ یہ صورت ہمیشہ پیش نہیں آتی، تاہم ایسا ہوتا ہے۔ اسلام نے صوم وافطار کے سلسلے میں چاند کی رؤیت کو بنیاد بنایا ہے، بس اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۹] جنتری کی تاریخ کے مطابق ہلالِ رمضان وعید کی خبر دینا

(سوال سابق اور اس سوال میں تکرار ہے، تاہم بعض نئے فوائد پر مشتمل ہے؛ اس لیے اس سوال کو درج کیا گیا ہے۔ مرتب)

۱۵۲۶- سوال: ٹورنٹو میں M.S.A. نامی ایک سوسائٹی ہے، اُس کی طرف سے شائع کردہ جنتری (کیلنڈر) میں پہلے ہی سے رمضان اور عید کے چاند کی تعیین ہوتی ہے، اور وہ اخبار، ریڈیو اور ٹیلی فون کے ذریعہ ایک ماہ ڈیڑھ ماہ پہلے اُس کو نشر کرتے ہیں، تو اُن کے ذریعہ دی گئی خبر معتبر ہے یا نہیں؟ عام طور پر وہ لوگ سعودی سے آئی ہوئی خبر کو نشر کرتے ہیں، یا وہ خبر امریکہ سے آئی ہوئی ہوتی ہے، تو کیا ہم اُن کے ساتھ

= بأس بالاعتماد على قولهم، ونقل عن ابن مقاتل أنه كان يسألهم ويعتمد على قولهم إذا اتفق عليه جماعة منهم، ثم نقل عن شرح السرخسي أنه يعيد وعن شمس الأئمة الحلواني: أن الشرط في وجوب الصوم والإفطار الرؤية، ولا يؤخذ فيه بقولهم، ثم نقل عن مجد الأئمة الترجماني أنه اتفق أصحاب أبي حنيفة إلا النادر والشافعي أنه لا اعتماد على قولهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۸۷، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، مطلب لا عبرة بقول المؤقتين في الصوم، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۹۷، كتاب الصوم، الباب الثاني في رؤية الهلال، ط: دار الفكر)

(۲) ابن عمر رضي الله عنهما، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: إنا أمة أمية، لا نكتب ولا نحسب، الشهر هكذا وهكذا، يعني مرة تسعة وعشرين، ومرة ثلاثين. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۵۶، رقم الحديث: ۱۹۱۳، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: لا نكتب ولا نحسب، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۴۷، رقم الحديث: ۱۵-(۱۰۸۰)، كتاب الصوم، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، والفطر لرؤية الهلال، وأنه إذا غم في أوله أو آخره أكملت عدة الشهر ثلاثين يوما، ط: ديوبند)

عن أبي هريرة رضي الله عنه، يقول: قال النبي -صلى الله عليه وسلم-: أو قال: قال أبو القاسم صلى الله عليه وسلم: صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فإن أغمي عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۵۶، رقم الحديث: ۱۹۰۹، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: إذا رأيتم الهلال فصوموا، وإذا رأيتموه فأفطروا، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۴۷، رقم الحديث: ۱۷-(۱۰۸۱)، كتاب الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، والفطر لرؤية الهلال... الخ، ط: ديوبند)

متفق ہو سکتے ہیں؟ اُن کی خبر پر ہمارا عمل کرنا صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلّیاً:

M.S.A نامی سوسائٹی ہو یا کوئی اور، اگر وہ شرعی قوانین وضوابط کے مطابق قائم ہو، تو اُس کی خبر قابلِ عمل ہے، جنتری کے حساب سے رمضان یا عید کے چاند کی خبر نشر کرنا، خواہ ایک ڈیڑھ مہینہ پہلے ہو یا ایک دِن پہلے، قابلِ قبول نہیں ہے، اسی طرح ریڈیو یا نیوز پیپر شرعی حجت نہیں ہیں، شریعت میں رؤیتِ ہلال کا اعتبار ہے، چاند ہونے کا اعتبار نہیں ہے۔

اتحاد واتفاق کی تجویز [کہ سعودی یا امریکہ کے ساتھ روزہ رکھا جائے یا عید منائی جائے] اُسی وقت معتبر ہے، جب کہ وہ شریعت کے اصول کے مطابق ہو، شریعت کے خلاف کوئی بات ہو، تو وہ قابل اعتبار نہیں ہے، صورت مسئولہ میں جنتری میں تاریخ کی پیشگی تعیین، شریعت مطہرہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے رؤیتِ ہلال کے اصول کے خلاف ہے، اس لیے اگر چاند کی رؤیت اس تجویز کے موافق ہو جائے، تو عمل کیا جائے گا، ورنہ صرف اس [جنتری] پر اعتماد کر کے روزہ رکھنے اور عید منانے کی گنجائش نہیں ہوگی۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۰] فضائی تعلیمی اِدارے کی طرف سے ملی ہوئی خبر معتبر ہے؟

۱۵۲۷-سوال: یہاں ٹورنٹو میں اوبروسیٹی (فضائی تعلیمی اِدارہ) سے چاند کی خبر ملتی ہے، وہ لائقِ قبول ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلّیاً:

ہلال کے سلسلہ میں جو شرعی شرائط وضوابط ہیں، اُن کی رِعایت کرتے ہوئے قبول کیا جا سکتا ہے، صرف ماہرین فلکیات کی اراء پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، الا یہ کہ ان کی اراء، اسلامی شریعت کے موافق ہو جائے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تفصیل وتخریج کے لیے سوال سابق کی جانب رجوع کریں۔

(۲) عنوان: ''کیلنڈر میں چھپی ہوئی تاریخ سے عید منانا'' کی تخریج وتفصیل ملاحظہ کریں۔

[۴۱] عورتوں کی خبر یا فون کے ذریعہ دی گئی خبر سے عید الفطر کا چاند ثابت ہوگا یا نہیں؟

۱۵۲۸- سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین مسئلہٴ ذیل کے بارے میں؟

۲۹ / رمضان کو شام میں، گاؤں میں کسی مرد کو چاند نظر نہ آیا؛ اس لیے گاؤں کے تمام افراد نے ۳۰ واں روزہ رکھا، صبح نو/ ۹ بجے خبر آئی کہ مجادر گاؤں میں ایک عورت نے چاند دیکھا ہے، اس عورت کو اپنی بات میں پختہ یقین ہے؛ اس لیے اس نے روزہ بھی نہیں رکھا، اور فیروز پورہ میں تین بالغ لڑکیوں نے چاند دیکھا، اور رات میں بمبئ سے فون آیا کہ بمبئ میں چاند ہو گیا ہے، تو چار پانچ علماءِ کرام (جو کانودر گاؤں کے تھے) چاند کی تحقیق کے لیے وہاں پہنچے، کانودر گاؤں والے بمبئ فون سے بات کر رہے تھے، انہوں نے وہاں سے خبر دی کہ یہاں چاند ہو گیا ہے، اور ہم لوگوں نے عید بھی کر لی ہے، اور ہوٹلوں کو کھول دیا ہے، اور ان لوگوں کی آواز کو علماء نے پہچان بھی لیا کہ کون بول رہا ہے۔

پھر یہ علماء چھاپی دار العلوم میں خبر لے کر آئے، اور فیروز پورہ فون کر کے دار العلوم کے مہتمم مولانا ...... کو بلایا، اور مجادر فون کر کے دار العلوم وڈالی کے مہتمم مولانا ......، چھاپی اصلاحی کتب خانہ والے مولانا ...... اور دار العلوم کے مفتی مولانا ...... (جو چھاپی میں ضروری کام کے لیے آئے تھے) بلایا گیا۔ (۱)

کل نو/ ۹ علماء اور تین سمجھ دار لوگوں کو ملا کر ایک کمیٹی بنائی گئی، یہ صرف ایک دن کی چاند کمیٹی اور وقتی کمیٹی بنی، جس کے قاضی دار العلوم کے مہتمم مولانا ...... کو بنایا گیا، ان کو سب حالات و اخبار سنائے، اور پھر انہوں نے کمیٹی کے سب لوگوں سے پوچھا کہ تم لوگوں کو ان خبروں پر اطمینان ہے؟ سب نے جواب دیا کہ ہمیں اطمینان ہے، تو قاضی صاحب نے پانی سے روزہ افطار کیا، اور سب کمیٹی والوں نے بھی روزہ کھول دیا۔

اس مجلس میں خود فلاں صاحب (ایک ملازم) حاضر تھے، جس نے یہ پوری تفصیل چھاپی دار العلوم کے دفتر میں سنی، اور اس کو نوٹ کیا، پھر روزہ افطار کرنے کے بعد قرب و جوار کے گاؤں میں اعلان کیا گیا کہ عید کا چاند ہو گیا ہے، اس لیے سب روزہ افطار کر لیں، تو سب لوگوں نے روزہ افطار کر لیا۔

اس مسئلہ کے بارے میں مجھے اطمینان نہیں ہے، اس لیے مفتیانِ کرام اس بارے میں کیا فرماتے

---

(۱) نام اور مقام کو فرضی تصور کریں، اصلی ناموں کو اس لیے قصداً حذف کر دیا گیا ہے۔

ہیں؟ کیا اس طرح عید کے چاند کا ثبوت ہو جائے گا؟

کیا یہ روزہ، جسے توڑ دیا گیا، اس کی قضاء کرنی ہوگی یا نہیں؟

نیز کفارہ دینا ہوگا یا نہیں؟

خلاصہ کے ساتھ اطمینان بخش جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

عبدالواحد فلاحی

الجواب حامداً ومصلیا:

مذکورہ تفصیل کے مطابق بمبئی سے دو-تین فون آئے، اور عورتوں کی گواہی سے روزہ افطار کیا اور کرایا گیا، یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ عید کے چاند کے ثبوت کے لیے جب مطلع صاف ہو، آسمان ابر آلود نہ ہو، تو ایک جماعت کی خبر کا ہونا ضروری ہے، جو چاند کی رؤیت کی خبر دے، یہ جماعت اتنی تعداد میں ہوں، کہ ان سب کا جھوٹ پر متفق ہونا مشکل ہو، اور ان کی خبر پر مکمل اطمینان ہو جائے، تو عید کا حکم لگایا جاتا ہے۔(۱)

لیکن مطلع ابر آلود ہو، تو دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے عید کے چاند ہونے کا حکم لگانا صحیح ہے۔(۲)

فقہاء کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ عید کے چاند کے بارے میں امورِ اربعہ میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے: (۱) شہادت: دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کا ہونا۔ (جب کہ مطلع ابر آلود ہو)

---

(۱) (وإن لم يكن بالسماء علة) مما ذكرنا (فلا بد في الكل) أي في هلال رمضان والفطر والأضحى (من جمع عظيم) غير مقدر في ظاهر الرواية (يقع العلم بخبرهم) ويحكم العقل بعدم تواطئهم على الكذب، والمراد من العلم هنا ما يوجب العمل، وهو غالب الظن، لا العلم بمعنى اليقين نص اليقين نص عليه في المنافع والغاية. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م:١٠٧٨هـ):١/٢٣٧، كتاب الصوم، ما يثبت به رمضان، ط: دار إحياء التراث العربي ☆الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:٥٩٣هـ):١/١١٩، كتاب الصوم، فصل في رؤية الهلال، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت ☆الدر المختار مع رد المحتار:٢/٣٨٨، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر)

(۲) (و) شرط مع العلة في ظاهر الرواية (في هلال الفطر) أي في شوال (وذي الحجة شهادة حرين أو حر وحرتين). ... (بشرط العدالة) والحرية وعدم الحد في القذف لما فيه من الإلزام (ولفظ الشهادة) لتعلق حق العباد به بخلاف رمضان؛ لأنه حق الشرع. (مجمع الأنهر:١/٢٣٧، كتاب الصوم، ما يثبت به رمضان ★الدر المختار مع رد المحتار:٢/٣٨٨، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان)

(۲) شہادت علی الشہادت ہو۔ (۳) شہادت علی القضاء ہو۔ (۴) خبرِ مستفیض، یعنی ایسی خبر جس کے راوی اتنے ہوں کہ ان کا کذب پر متفق ہونا محال ہو۔[۳]

صورت مسئولہ میں امورِ اربعہ میں سے کوئی بھی ایک متحقق نہیں ہو رہا ہے، فقط دو تین عورتوں کے دیکھنے سے رؤیت ثابت نہ ہوگی؛ اس لیے کہ شہادت میں دو عادل مرد، یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے، صرف عورتوں کی گواہی سے رؤیتِ ہلال کا حکم لگانا صحیح نہیں ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۳/ ۲۳۵)[۴]

آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ فقط عورتوں نے خبر دی ہے، شہادت بھی ان سے نہیں لی گئی، حالاں کہ ہلال کمیٹی کے ذمہ داروں کے سامنے ان کا گواہی دینا ضروری تھا، چاہے ان کی گواہی، شرائطِ شہادت کے عدمِ تحقق کی وجہ سے رد کر دی جاتی۔[۵]

بمبئی سے دو تین فون آئے، یہ گواہی کے درجے میں نہیں ہے، خبر ہے، اور خبر مستفیض کے درجے میں بھی نہیں ہے؛ اس لیے فون کی اس خبر کی وجہ سے چاند ہونے کا حکم لگانا درست نہیں تھا، دو فون آنا، تین لڑکیاں اور ایک عورت کی خبر سب ملا کر بھی خبر مستفیض کے درجہ میں نہیں ہے، اس اعتبار سے ان علماء کا یہ فیصلہ کرنا صحیح نہیں ہے۔(۶) روزہ افطار کرنے والے اور دوسروں کو افطار کرانے والے سب گنہگار ہیں، روزے کی قضا کرنا

---

[۳] (قوله: بطريق موجب) كأن يتحمل اثنان الشهادة، أو يشهدا على حكم القاضي أو يستفيض الخبر بخلاف ما إذا أخبرا أن أهل بلدة كذا رأوه؛ لأنه حكاية ح. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۹۴، قبيل: باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط: دار الفكر- بيروت☆حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ۶۵۶، فصل فيما يثبت به الهلال و في يوم الشك، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية☆جواهر الفقه: ۵/ ۱۷۷-۱۷۸)

[۴] عید الفطر کے چاند میں صرف عورتوں کی گواہی مقبول نہیں ہوگی، خواہ وہ بہت سی ہوں۔ (عمدۃ الفقہ: ۳/ ۱۶۰، کتاب الصوم، مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں شوال کے چاند کا ثبوت، ط: تھانوی-دیوبند)

[۵] (وشرط للفطر) مع العلة والعدالة (نصاب الشهادة ولفظ أشهد)... (ولو كانوا ببلدة لا حاكم فيها صاموا بقول ثقة وأفطروا بإخبار عدلين) مع العلة (للضرورة)... (و) قبل (بلا علة جمع عظيم يقع العلم) الشرعي وهو غلبة الظن (بخبرهم وهو مفوض إلى رأي الإمام من غير تقدير بعدد) على المذهب. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۸۶-۸۸، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر)

(۶) وفي الفتح والحق ما روي عن محمد وأبي يوسف أيضا أن العبرة لتواتر الخبر ومجيئه من كل جانب حتى لا يتوهم تواطؤهم على الكذب.ـــــــ وفي الزاد وهو الصحيح. (مجمع الأنهر: ۱/ ۲۳۷، كتاب الصوم، ما يثبت به رمضان، ط: دار إحياء التراث العربي)

ضروری ہے، جس عورت نے چاند دیکھنے کی خبر دی ہے، اس کے لیے بھی روزہ رکھنا ضروری تھا، افطار جائز نہ تھا، اس نے روزہ نہیں رکھا، یہ اس کی غلطی ہے، اس کو بھی روزے کی قضا کرنا ضروری ہے۔[۷] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۷) ويلتمس هلال شوال في تاسع وعشرين من رمضان فمن رآه وحده لا يفطر أخذا بالاحتياط في العبادة فإن أفطر قضاه، ولا كفارة عليه كذا في الاختيار شرح المختار. رجل رأى هلال الفطر وشهد، ولم تقبل شهادته كان عليه أن يصوم فإن أفطر ذلك اليوم كان عليه القضاء دون الكفارة، كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۸، كتاب الصوم، الباب الثاني في رؤية الهلال، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/۲۸۶، كتاب الصوم، بما يثبت شهر رمضان، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۳۸۴، كتاب الصوم، سبب رمضان، ط: دار الفكر)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ
الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا
اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ
الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ۔ (۲-البقرة:۱۸۵)

باب وجوب الصوم وشرائطه

[روزہ کا وجوب اور اس کی شرطیں]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب وجوب الصوم وشرائطه

[روزہ کا وجوب اور اس کی شرطیں]

[۱] روزے میں زبان سے نیت ضروری ہے یا دل سے کافی ہے؟

۱۵۲۹- سوال: روزے کی نیت زبان سے ادا کرنا ضروری ہے؟ کیا زبان سے نیت کے کلمات ادا کرنا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور ائمہ اربعہ سے ثابت ہے؟ حوالے کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامدا ومصليا:

نیت: نام ہے دل سے کسی کام کے کرنے کا پختہ ارادہ کرنا۔ (۱) لہٰذا اگر کسی نے روزے کا پختہ ارادہ کرلیا ہے، بس کافی ہے، زبان سے بولنا ضروری نہیں؛ البتہ زبان سے بولنا مستحب ضرور ہے۔ بغیر نیت کے روزہ اور دیگر عبادتیں درست نہیں ہوتیں۔ (۲)

---

(۱) والنية: معرفته بقلبه أن يصوم كذا في الخلاصة، ومحيط السرخسي. (الفتاویٰ الهندية: ۱/ ۱۹۵، کتاب الصوم، الباب الأول في تعريفه، وتقسيمه وسببه ووقته وشرطه، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۸۰، کتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۲/ ۸۶، کتاب الصوم، فصل شرائط أنواع الصيام، ط: دار الكتب العلمية ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۷۷، کتاب الصوم، أقسام الصوم، ط: دار الفكر)

(۲) اعلم أن النية شرط في الصوم، وهو أن يعلم بقلبه أنه يصوم، ولا يخلو مسلم عن هذا في ليالي شهر رمضان، وليست النية باللسان شرطا،... ولنا أنه عبادة فلا يجوز إلا بالنية كسائر العبادات، ولقوله - عليه الصلاة والسلام-: "الأعمال بالنيات" ولما مر في الصلاة، ولأن الإمساك قد يكون للعادة أو لعدم الاشتهاء أو للمرض أو =

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زبان سے نیت کرنا ثابت نہیں ہے، مشائخ سے منقول ہے۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] تھوڑی دور کے سفر میں روزہ نہ رکھنے کی گنجائش نہیں

۱۵۳۰- سوال: حالت سفر میں روزہ رکھنے کی اجازت ہے، بہ شرطے کہ وہ سفر، سفر شرعی ہو، یعنی ۸۲ رکلومیٹر کا سفر ہو، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر سفر ۸۲ رکلومیٹر کے اندر ہے، تو کیا روزہ رکھنا ضروری ہوگا؟

الجواب حامداومصلیا:

سفر شرعی ۴۸ رمیل ہے، ۴۸ میل سے کم سفر میں روزہ نہ رکھنے کی گنجائش نہیں ہے، ۸۷ رکلومیٹر پر قصر کا حکم لگتا ہے۔ (۴۸ میل کے ۸۲ رکلومیٹر بنتے ہیں یا ۸۷، اس کی تحقیق کر لی جائے) [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=للرياضة ويكون للعبادة فلا يتعين لها إلا بالنية كالقيام إلى الصلاة، وأداء الخمس إلى الفقير. (الاختيار لتعليل المختار-عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م:۶۸۳هـ): ۱/۱۲۶، أول كتاب الصوم، ت: الشيخ محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي-القاهرة ☆الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳هـ): ۱/۱۲۶، كتاب الصوم، فصل في من كان مريضا في رمضان إلخ، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت ☆العناية: ۲/۳۹۰، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر)

(۳) (قوله: والسنة) أي سنة المشايخ، لا النبي-صلى الله عليه وسلم-لعدم ورود النطق بها عنه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۸۰، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر)

والسنة أن يتلفظ بها كذا في النهر الفائق. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۵، كتاب الصوم، الباب الأول في تعريفه وتقسيمه وسببه، ط: دار الفكر ☆الجوهرة النيرة: ۱/۱۳۶، كتاب الصوم، ط: المطبعة الخيرية)

[۱] فالذي يصير المقيم به مسافرا، نية مدة السفر، والخروج من عمران المصر، فلا بد من اعتبار ثلاثة أشياء: أحدها: مدة السفر، وأقلها غير مقدر عند أصحاب الظواهر، وعند عامة العلماء مقدر، واختلفوا في التقدير قال أصحابنا: مسير ثلاثة أيام سير الإبل ومشي الأقدام وهو المذكور في ظاهر الروايات. وروي عن أبي يوسف يومان وأكثر الثالث، وكذا روى الحسن عن أبي حنيفة وابن سماعة عن محمد، ومن مشايخنا من قدره بخمسة عشر فرسخا وجعل لكل يوم خمس فراسخ، ومنهم من قدره بثلاث مراحل. (بدائع الصنائع: ۱/۹۳، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يصير به المقيم مسافرا، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

نوٹ: ۴۸ رمیل کی مسافت سفر شرعی کے لیے لازم ہے، میل دو طرح کا ہوتا ہے، میل انگریزی اور میل شرعی، میل انگریزی کے حساب سے ۴۸ رمیل کے ۸۷ رکلومیٹر ہوتے ہیں۔ (حضرت مفتی صاحبؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے، ہندوستانی علماء کی بڑی تعداد اسی=

[۳] قید خانہ میں رمضان کے روزے رکھنا

۱۵۳۱-سوال: قید خانہ میں رمضان کے روزوں کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر قید خانہ مسافتِ سفر سے کم مسافت پر واقع ہے، تو رمضان کے روزے رکھنا فرض ہے۔ (۱)

اگر قید خانہ میں سحر وافطار کا نظم نہ ہونے کی وجہ سے، سخت بھوک اور پیاس کی مشقت یا قید خانہ میں سزائے بامشقت کی بنا پر کمزوری کا اندیشہ ہو، تو روزے نہ رکھنا جائز ہے، لیکن بعد میں قضا لازم ہے۔ [۲]

اگر قید خانہ مسافتِ سفر پر واقع ہو اور قیدی کو معلوم ہو کہ اِس قدر مسافت طے کر کے مجھے جانا ہے اور

= کی قائل ہے۔) جب کہ میل شرعی کے حساب سے ۴۸ میل کے ۸۲ رکلومیٹر ہوتے ہیں، احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ ۸۲ رکلومیٹر والا قول اختیار کیا جائے، البتہ اکابر کا عمل ۷۸ رکلومیٹر کا بھی ہے، لہٰذا اس کے مطابق عمل کرنے والوں کو تغلیط نہ کی جائے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: الاوزان المحمودة، ص: ۹۲-۹۴، میل [کی تحقیق]، ط: دار الکتاب- دیوبند) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

(۱) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (۲-البقرة: ۱۸۵)

ترجمہ: (وہ تھوڑے دن) ماہ رمضان ہے، جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے، جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لیے (ذریعۂ) ہدایت ہے اور (دوسرا وصف) واضح الدلالۃ ہے، منجملہ ان (کتب) کے جو (ذریعہ) ہدایت (بھی) ہیں اور (حق وباطل میں) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں، سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو، اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہیے، سو جو شخص بیمار ہو یا سفر میں تو دوسرے ایام کا (اتنا ہی) شمار (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب) ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تمھارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے اور تمھارے ساتھ (احکام وقوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں اور تا کہ تم لوگ (ایام ادا یا قضا کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو (کہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور تا کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی (وثنا) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو (ایک ایسا) طریقہ بتلا دیا (جس سے تم برکات وثمرات صیام رمضان سے محروم نہ رہو گے) اور (عذر سے خاص رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لیے دیدی) تا کہ تم لوگ (اس نعمت آسمانی پر اللہ کا) شکر ادا کیا کرو۔

[۲] (ومنها [من الأعذار المبيحة للفطر] العطش والجوع كذلك) إذا خيف منهما الهلاك أو نقصان العقل كالأمة إذا ضعفت عن العمل وخشيت الهلاك بالصوم، وكذا الذي ذهب به موكل السلطان إلى العمارة في الأيام الحارة إذا خشي الهلاك أو نقصان العقل كذا في فتح القدير. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۷، كتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار التي تبيح الإفطار، ط: دار الفكر)

اُس نے سفر کی نیت بھی کی ہے، تو مسافر کے لیے رمضان کے روزے میں تخفیف ہے، کہ وہ روزہ نہ رکھے اور بعد میں قضا کر لے۔(۳)

اگر قید خانہ میں پندرہ یا اُس سے زائد دِنوں کی اِقامت طے ہے اور قید خانہ کسی بستی میں ہے، یا خود قید خانہ اِتنا بڑا ہے کہ مستقل چھوٹی سی بستی کے قائم مقام ہے، تو پھر یہ شخص مقیم کہلائے گا، اُسے روزہ رکھنا چاہیے۔(۴)

اگر قیدی کو پتہ نہیں ہے کہ قید خانہ میں کتنے دِن تک رہنا ہے، یا اِس قید خانہ سے دوسری کسی جگہ منتقل ہونا ہے یا نہیں، تب بھی وہ مسافر شمار ہوگا، کیوں کہ اِس حالت میں وہ مستقل بالرائے نہیں ہے، بل کہ قید خانہ کے ذمہ داروں کے تابع ہے، بہر حال اگر مسافر ہو یا مشقت ہو، تو روزہ قضا کرنے کی اِجازت ہے۔(۵) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] انگلینڈ میں گرمی کے دِنوں میں روزے کا حکم

۱۵۳۲- سوال: زیادہ گرمی کے دِنوں میں یہاں انگلینڈ میں صبحِ صادق ۲:۲۵ کو ہوتی ہے، اور غروبِ آفتاب ۹:۴۰ کو ہوتا ہے، گویا ۱۹ر گھنٹے سے زائد روزہ کا وقت ہوتا ہے، جو کہ عام ملکوں کے مقابلے میں کافی طویل ہے، تو وہاں روزہ کا کیا حکم ہے؟ کیا روزہ رکھنا ضروری ہے؟ بینوا توجروا۔

(۳-۴) حاشیہ نمبر (۱) ملاحظہ کریں۔

(۵) ولا بد للمسافر من قصد مسافة مقدرة بثلاثة أيام حتى يترخص برخصة المسافرين وإلا لا يترخص أبدا ولو طاف الدنيا جميعها بأن كان طالب آبق أو غريم أو نحو ذلك ويكفي في ذلك القصد غلبة الظن يعني إذا غلب على ظنه أنه يسافر قصر ولا يشترط فيه التيقن، كذا في التبيين .... ولا يزال على حكم السفر حتى ينوي الإقامة في بلدة أو قرية خمسة عشر يوما أو أكثر، كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۳۹، كتاب الصلاة، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: دار الفكر-بيروت)

وكل من كان تبعا لغيره يلزمه طاعته يصير مقيما بإقامته ومسافرا بنيته وخروجه إلى السفر، كذا في محيط السرخسي فيصير الجندي مقيما في الفيافي بنية إقامة الأمير في المصر، كذا في الكافي في نواقض الوضوء الأصل أن من يمكنه الإقامة باختياره يصير مقيما بنية نفسه ومن لا يمكنه الإقامة باختياره لا يصير مقيما بنية نفسه حتى أن المرأة إذا كانت مع زوجها في السفر والرقيق مع مولاه والتلميذ مع أستاذه والأجير مع مستأجره والجندي مع أميره فهؤلاء لا يصيرون مقيمين بنية أنفسهم في ظاهر الرواية، كذا في المحيط. (المصدر السابق: ۱/۱۴۱)

الجواب حامداً ومصليا:

روزہ رکھنا ضروری ہے، ایسے ممالک میں رہنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے علاقہ کے اعتبار سے قوت عطا فرمائی ہے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) والصوم يقوم به[الوقت] ويطول بطوله ويقصر بقصره؛ لأنه معياره.(البحر الرائق شرح كنز الدقائق-زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م:۹۷۰هـ):۱/۲۶۲، كتاب الصلاة،الأوقات المنهي عن الصلاة فيها،ت: دار الكتاب الإسلامي ☆وكذا في كتاب الصوم،۲/۳۱۱،فصل في عوارض الفطر في رمضان)

قال ابن عابدين تحت (قوله حديث الدجال): قال الرملي في شرح المنهاج: ويجري ذلك فيما لو مكثت الشمس عند قوم مدة. اهـ. ح. قال في إمداد الفتاح قلت: وكذلك يقدر لجميع الآجال كالصوم والزكاة والحج والعدة وآجال البيع والسلم والإجارة، وينظر ابتداء اليوم فيقدر كل فصل من الفصول الأربعة بحسب ما يكون كل يوم من الزيادة والنقص كذا في كتب الأئمة الشافعية، ونحن نقول بمثله إذ أصل التقدير مقول به إجماعا في الصلوات اهـ.

....

وفي هذا الحديث أن ليلة طلوعها من مغربها تطول بقدر ثلاث ليال، لكن ذلك لا يعرف إلا بعد مضيها لانبهامها على الناس ،فحينئذ قياس ما مر أنه يلزم قضاء الخمس؛ لأن الزائد ليلتان فيقدران عن يوم وليلة وواجبهما الخمس. اهـ.

....

[تتمة] لم أر من تعرض عندنا لحكم صومهم فيما إذا كان يطلع الفجر عندهم كما تغيب الشمس أو بعده بزمان لا يقدر فيه الصائم على أكل ما يقيم بنيته، ولا يمكن أن يقال بوجوب موالاة الصوم عليهم؛ لأنه يؤدي إلى الهلاك. فإن قلنا بوجوب الصوم يلزم القول بالتقدير، وهل يقدر ليلهم بأقرب البلاد إليهم كما قاله الشافعية هنا أيضا، أم يقدر لهم بما يسع الأكل والشرب، أم يجب عليهم القضاء فقط دون الأداء؟ كل محتمل، فليتأمل. ولا يمكن القول هنا بعدم الوجوب أصلا كالعشاء عند القائل به فيها؛ لأن علة عدم الوجوب فيها عند القائل به عدم السبب، وفي الصوم قد وجد السبب وهو شهود جزء من الشهر وطلوع فجر كل يوم، هذا ما ظهر لي، والله تعالى أعلم. (رد المحتار على الدر المختار:۱/۳۶۵-۳۶۶، كتاب الصلاة،مطلب في فاقد وقت العشاء كأهل بلغار،ط:دار الفكر-بيروت)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: منتخبات نظام الفتاوی-مفتی نظام الدینؒ:۱/۵۷۷، کتاب الصوم، لمبے دنوں میں روزہ وعید کا حکم،ت:مفتی امتیاز احمد قاسمی، ط:ایفا پبلیکیشنز-دہلی ☆احسن الفتاوی:۴/۷۰-۷۱، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ المسافر)

عن أبي هريرة رضي الله عنه، يقول: قال النبي -صلى الله عليه وسلم-: أو قال: قال أبو القاسم صلى الله عليه وسلم: صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فإن اغمي عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين. (صحيح البخاري:۱/۲۵۶، رقم الحديث: ۱۹۰۹، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: إذا رأيتم الهلال فصوموا، وإذا رأيتموه فأفطروا، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم:۱/۳۴۷، رقم الحديث: ۱۷-(۱۰۸۱)، كتاب الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، والفطر لرؤية الهلال... الخ، ط: ديوبند)

باب مفسدات الصوم

[مفسدات صوم کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب مفسدات الصوم

[مفسدات صوم کا بیان]

[۱] چکی کے آٹے کا ناک، منہ یا حلق میں چلے جانا

۱۵۳۳-سوال: آٹا پیسنے والی چکی چلاتے وقت، آٹے کے ذرات ناک میں یا بات کرتے وقت منہ میں چلے جائیں، تو روزہ فاسد ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

چکی سے آٹے کے ذرات اڑ کر ناک، منہ یا حلق میں چلے جائیں، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا؛ کیوں کہ آٹا پیسنے والے کے لیے اس سے احتراز ممکن نہیں ہے۔ (فتاوی عالمگیری، جلد ۱ صفحہ ۲۰۳)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] جنابت کی حالت میں سحری کرنے والے کا روزہ

۱۵۳۴-سوال: ایک شخص نے سحری کے قریب قریب اپنی بیوی کے ساتھ جماع کیا اور غسل کیے

[۱] أو "دخل حلقه "غبار ولو" كان "غبار" دقيق من "الطاحون أو" دخل حلقه "ذباب أو" دخل "أثر الطعم الأدوية فيه" أي في حلقه لأنه لا يمكن الاحتراز عنها فلا يفسد الصوم بدخولها "وهو ذاكر لصومه". (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح- حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ) ص:۲۴۵، كتاب الصوم، باب ما لا يفسد الصوم، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية☆مجمع الأنهر: ۱/۲۴۵، كتاب الصوم، باب موجب الفساد، ط: دار إحياء التراث العربي☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/۹۵، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم، ط: دار الفكر)

بغیر سحری کھالی، صبح صادق اس حال میں ہوئی کہ وہ جنبی ہے، گویا اس نے سحری جنابت کی حالت میں کھائی اور صبح صادق کے بعد غسل کیا، تو اس کا روزہ صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

اگر سحری سے قبل وقت ہو، تو اس کو غسل کر لینا چاہیے اور اگر وقت نہ ہو، تو وضو کر کے سحری کر لے اور سحری کے بعد غسل کرے، اس کا روزہ صحیح ہوجائے گا، صبح صادق کے بعد بھی غسل کرنا جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولا بأس للجنب أن ينام ويعاود أهله قبل أن يتوضأ وإن توضأ فحسن وإن أراد أن يأكل أو يشرب فينبغي أن يتمضمض ويغسل يديه. كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ۱۶/۱، كتاب الطهارة، الباب الثاني في الغسل وفيه ثلاثة فصول، الفصل الثالث في المعاني الموجبة للغسل، ط: دار الفكر- بيروت ☆بدائع الصنائع: ۳۸/۱، فصل: الغسل، ط: دار الكتب العلمية ☆تبيين الحقائق: ۵۷/۱، كتاب الطهارة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية)

عن عروة، وأبي بكر، قالت عائشة رضي الله عنها: كان النبي صلى الله عليه وسلم يدركه الفجر في رمضان من غير حلم، فيغتسل ويصوم. (صحيح البخاري: ۲۵۸/۱، رقم الحديث: ۱۹۳۱، كتاب الصوم، باب اغتسال الصائم، ط: ديوبند ☆الصحيح لمسلم: ۳۵۴/۱، رقم الحديث: ۷۵، ۷۶، ۷۷- (۱۱۰۹)، كتاب الصيام، باب صحة صوم من طلع عليه الفجر وهو جنب، ط: مختار اينڈ كمپنی- ديوبند)

وقد اختلف العلماء فيمن أصبح جنبا وهو يريد الصوم: هل يصح صومه أم لا؟ على سبعة أقوال: الأول: أن الصوم صحيح مطلقا فرضا كان أو تطوعا أخر الغسل عن طلوع الفجر عمدا أو لنوم أو نسيان، لعموم الحديث، وبه قال علي وابن مسعود وزيد بن ثابت وأبو الدرداء وأبو ذر وعبد الله بن عمر وعبد الله بن عباس، رضي الله تعالى عنهم. وقال أبو عمر: إنه الذي عليه جماعة فقهاء الأمصار بالعراق والحجاز أئمة الفتوى بالأمصار، مالك وأبو حنيفة والشافعي والثوري والأوزاعي والليث وأصحابهم وأحمد وإسحاق وأبو ثور وابن علية وأبو عبيدة وداود وابن جرير الطبري وجماعة من أهل الحديث. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العينى (م: ۸۵۵هـ): ۶/۱۱، كتاب الصوم، باب الصائم يصبح جنبا، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

ولا بأس بأن يصبح الرجل جنبا وإن ذلك لا يفسد صومه. (تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ): ۳۶۹/۱، كتاب الصوم، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۵۶/۳، كتاب الصوم، ط: دار المعرفة- بيروت ☆بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع- علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۹۲/۲، كتاب الصوم، فصل أركان الصيام، ط: دار الكتب العلمية ☆الدر المختار مع رد المحتار: ۴۰۰/۲، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط: دار الفكر)

[۴] ایسے مریض کا روزہ، جسے دوا کے بغیر شدید تکلیف ہو

۱۵۳۵- سوال: مجھے ناک میں ہڈی کی تکلیف ہے، جس کی بناء پر زکام رہتا ہے اور ناک بند ہو جاتی ہے، نیز سانس لینے میں بھی تکلیف ہوتی ہے، ڈاکٹری مشورہ کے مطابق دو مرتبہ آپریشن بھی ہوا، اسی طرح بہت سا علاج بھی کیا؛ لیکن ابھی بھی وہی تکلیف ہے، البتہ دوا کے ایک دو قطرے ناک میں ڈالنے سے تکلیف میں کچھ دیر افاقہ ہو جاتا ہے، ایسی حالت میں، میں رمضان کے روزے نہیں رکھ سکتا؛ اس لیے کہ جہاں تک میرے علم میں ہے کہ ناک میں دوا ڈالنے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔ تو کیا ایسی حالت میں روزہ رکھ سکتا ہوں یا اس کا اور کوئی طریقہ ہے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

پانی جیسی دوا ناک میں ڈالنے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، اگر کوئی روزہ کی حالت میں ناک میں دوا ڈال لے، تو اس پر اس کی قضاء واجب ہے، جیسا کہ یہ مسئلہ آپ کے علم میں ہے۔

ایسا ہوسکتا ہے کہ آپ سیال دوا کے بجائے ایسا پاؤڈر استعمال کریں، جو معدہ تک نہ پہنچے، ایسی صورت میں آپ کا روزہ فاسد نہ ہوگا، اس لیے بہتر یہ ہے کہ آپ روزہ رکھیں اور ممکن ہو تو پاؤڈر والی دوا سے کام چلائیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت میرے ذہن میں نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (أو استعط) في أنفه شيئا (أو أقطر في أذنه دهنا أو داوى جائفة أو آمة) فوصل الدواء حقيقة إلى جوفه ودماغه. (الدر المختار) ـــــــــ قال ابن عابدين: (قوله: فوصل الدواء حقيقة) أشار إلى أن ما وقع في ظاهر الرواية من تقييد الإفساد بالدواء الرطب مبني على العادة من أنه يصل وإلا فالمعتبر حقيقة الوصول، حتى لو علم وصول اليابس أفسد أو عدم وصول الطري لم يفسد وإنما الخلاف إذا لم يعلم يقينا فأفسد بالطري حكما بالوصول نظرا إلى العادة ونفياه كذا أفاده في الفتح. ـــــــــ قلت: ولم يقيدوا الاحتقان والاستعاط والإقطار بالوصول إلى الجوف لظهوره فيها وإلا فلا بد منه حتى لو بقي السعوط في الأنف ولم يصل إلى الرأس لا يفطر، ويمكن أن يكون الدواء راجعا إلى الكل تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۰۲، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسد، ط: دار الفكر- بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۱/۲۴۱، كتاب الصوم، باب موجب الفساد، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۰۴، كتاب الصوم، الباب الرابع فيما يفسد وما لا يفسد، النوع الأول ما يوجب القضاء دون الكفارة، ط: دار الفكر ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ)، ص: ۶۷۲، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم ويوجب القضاء، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت) =

[۴] روزہ کی حالت میں گلوکوز چڑھانا

۱۵۳۶- سوال: روزہ کی حالت میں ''مسل'' میں یا ''نس'' میں گلوکوز چڑھانے سے روزہ ٹوٹ

= حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم نے تنفس کے ایسے مریض کے سلسلے میں لکھا ہے، جن کا انہیلر کے استعمال کے بغیر سانس لینا انتہائی دشوار ہو، کہ وہ روزہ بھی رکھے اور صاحب استطاعت ہو تو فدیہ بھی ادا کرتا رہے، کیوں کہ انہیلر کے استعمال سے روزہ کے فاسد ہونے پر مجھے مکمل اطمینان نہیں ہے، سوال وجواب ملاحظہ فرمائیں:

سوال: (۱) زید کی عمر ۶۷ برس ہے، دمہ کا شدید مریض ہے، دن میں تین مرتبہ انہیلر لینے کی ضرورت پیش آتی ہے، رمضان المبارک کی آمد سے پہلے بہت کوشش کی کہ دن میں دو مرتبہ پر اکتفا کروں، لیکن بجائے فائدہ کے نقصان ہوگیا، اور ڈاکٹر نے کہا کہ آپ دو کے بجائے چار دفعہ لیا کریں، ایسی حالت میں میرے لئے روزہ کا کیا حکم ہے؟

(۲) ایک شخص کو دمہ کی شکایت ہے، انہیلر دینے سے پھیپھڑوں کو سکون ملتا ہے، گیس اندر جا کر پھیپھڑوں کو کھولتی ہے، ہر دو گھنٹہ پر انہیلر لینا پڑتا ہے، یہ ناک کے ذریعہ بھی لی جاسکتی ہے، تو کیا روزہ کی حالت میں انہیلر لیا جاسکتا ہے؟

جواب:- انہیلر کے ذریعہ دواء کے اجزاء حلق کے نیچے پہونچتے ہیں، یا یہ گیس میں تبدیل ہو کر حلق سے نیچے جاتی ہے، اس سلسلہ میں مجھے کما حقہ تحقیق نہیں ہے، اور بعض ڈاکٹروں سے گفتگو پر بھی یہ بات واضح نہیں ہوسکی، اس لئے راقم الحروف یہ رائے دیا کرتا ہے کہ انہیلر لیتے ہوئے روزہ رکھ لیا جائے، کہ اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق حکم خداوندی کی اطاعت ہو جائے، اور جو لوگ صاحب استطاعت ہوں وہ فدیہ بھی ادا کردیں، کہ اگر روزہ کافی نہ ہو، تو فدیہ سے اس کمی کی تلافی ہو جائے، جیسے منھ کے راستہ سے کسی چیز کا حلق سے نیچے پہونچانا روزہ کو توڑ دیتا ہے، اسی طرح ناک کے ذریعہ بھی کسی چیز کا پہونچانا روزہ کے لئے مفسد ہے، اس لئے انہیلر کی دونوں صورتوں کا حکم ایک ہی ہے۔ واللہ اعلم

ایک دسرے سوال کے جواب میں حضرت مولانا رقم طراز ہیں:

روزہ کی حالت میں ایسا انجکشن لینے میں کوئی حرج نہیں، جس کی دوا براہِ راست معدہ میں نہیں پہونچتی، بلکہ رگوں یا گوشت کے واسطہ سے جسم کے اندر داخل ہوتی ہے، انہیلر کے بارے میں مجھے جہاں تک علم ہے اس میں دوا سیال صورت میں موجود ہوتی ہے، حلق میں اس دوا کا ذائقہ بھی محسوس ہوتا ہے، ممکن ہے کہ پھیپھڑے میں پہنچ کر وہ گیس بن جاتی ہے، فقہاء کی تصریحات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت روزہ کو فاسد کردیتی ہے، البتہ مجھے اس مسئلہ میں کسی قدر تامل ہے، اس لئے کہ حلق میں ایک نالی نظام تنفس سے متعلق ہے، اور دوسری غذائی نالی ہے، جس سے انسان کھاتا پیتا ہے، تو اگر انہیلر کا اثر تنفس کی نالی سے متعلق ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص انہیلر لئے بغیر دن بھر نہیں رہ سکتا ہو، تو وہ انہیلر لیتے ہوئے روزہ رکھ لے اور احتیاطا ہر روزہ کا فدیہ بھی ادا کرتا جائے، ایک روزہ کا فدیہ ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلانا ہے۔ واللہ اعلم۔ (کتاب الفتاوی: ۳ر ۳۹۳، کتاب الصوم، روزہ کے مفسدات ومکروہات، ط: نعیمیہ- دیوبند)

رقم کے نزدیک صورت مسئولہ میں اگر پاؤڈر کا استعمال ممکن نہ ہو، تو روزہ ترک نہیں کرنا چاہیے، بل کہ انہیلر استعمال کرنے والے کی طرح روزہ رکھے اور صاحب استطاعت ہو، تو فدیہ بھی ادا کرے، کہ یہی اس کے لیے ممکن ہے۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

جائے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

''انجکشن''، مسل میں دیا جائے یانس میں، اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (۱)

لیکن ایسے انجکشن سے روزہ ٹوٹ جائے گا، جس سے ''دوا'' براہ راست پیٹ میں، یا غذا کی نالی میں پہنچے، جیسے گلوکوز چڑھانے میں ہوتا ہے، کہ اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) (أو أدهن أو اكتحل أو احتجم) وإن وجد طعمه في حلقه. (الدر المختار) ــــ قال ابن عابدين: (قوله: وإن وجد طعمه في حلقه) أي طعم الكحل أو الدهن كما في السراج وكذا لو بزق فوجد لونه في الأصح بحر قال في النهر؛ لأن الموجود في حلقه أثر داخل من المسام الذي هو خلل البدن والمفطر إنما هو الداخل من المنافذ للاتفاق على أن من اغتسل في ماء فوجد برده في باطنه أنه لا يفطر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۹۵، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) وما وصل إلى الجوف، أو إلى الدماغ عن المخارق الأصلية، كالأنف والأذن والدبر، بأن استعط أو احتقن أو أقطر في أذنه، فوصل إلى الجوف أو إلى الدماغ فسد صومه، أما إذا وصل إلى الجوف، فلا شك فيه لوجود الأكل من حيث الصورة. وكذا إذا وصل إلى الدماغ؛ لأنه له منفذ إلى الجوف، فكان بمنزلة زاوية من زوايا الجوف.... وأما ما وصل إلى الجوف أو إلى الدماغ عن غير المخارق الأصلية، بأن داوى الجائفة، والآمة، فإن داواها بدواء يابس لا يفسد؛ لأنه لم يصل إلى الجوف ولا إلى الدماغ. (بدائع الصنائع: ۲/ ۹۳، كتاب الصوم، فصل أركان الصيام، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

وما يدخل من مسام البدن من الدهن لا يفطر هكذا في شرح المجمع. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۳، كتاب الصوم، الباب الرابع فيما يفسد وما لا يفسد، النوع الأول ما يوجب القضاء دون الكفارة، ط: دار الفكر-بيروت)

نوٹ: یہ صحیح ہے کہ کھانے پینے کی کوئی چیز یا دوا بہ راہ راست پیٹ (جوف بطن) میں یا غذا کی نالی (جوف دماغ) میں چلی جائے، تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؛ جیسا کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے صراحت فرمائی ہے؛ اور اسی ضمن میں تحریر فرمایا ہے کہ انجکشن خواہ نس میں دیا جائے یا مسل میں، اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

سوال یہ ہے کہ کیا ''گلوکوز چڑھانے'' میں کوئی شئے پیٹ یا غذا کی نالی میں جاتی ہے؟

تحقیقی بات یہ ہے کہ انجکشن سے دوا جوف دماغ یا جوف بطن میں نہیں پہنچتی؛ اس لیے اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، علماء کرام اور مفتیان عظام کی یہی رائے ہے، چناں چہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ رقم فرماتے ہیں:

ڈاکٹروں سے تحقیق کرنے اور تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انجکشن کے ذریعے دوا جوف عروق میں پہنچائی جاتی ہے، اور خون کے ساتھ شرائین یا اوردہ میں اس کا سریان ہوتا ہے، جوف دماغ یا بطن میں دوا نہیں پہنچتی، اور فساد صوم کے لیے مفطر کا جوف دماغ یا جوف بطن میں پہنچانا ضروری ہے، مطلقاً کسی عضو کے جوف میں یا عروق (شرائین واوردہ) کے جوف میں پہنچنا مفسد صوم نہیں، لہٰذا=

[۵] بہ حالت صوم گلوکوز چڑھانا

۱۵۳۷- سوال: حالت صوم میں گلوکوز چڑھانا کیسا ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

جو بھی دوا حالت صوم میں، بہ راہ راست معدہ میں پہنچ جائے یا ان رگوں میں پہنچ جائے، جن کا تعلق معدہ سے ہے، تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے، گلوکوز، جس کو ایسی رگوں میں چڑھایا جاتا ہے، جس سے پانی معدہ میں بھی پہنچ جاتا ہے اور بہر حال جسم کو پانی مل جاتا ہے؛ اس لیے وہ مفسد صوم ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= انجکشن کے ذریعے جو دوا بدن میں پہنچائی جاتی ہے مفسد صوم نہیں۔

اس سلسلے کی طویل بحث کے بعد حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مفسد صوم وہ چیز ہے، جو جوف معدہ یا دماغ میں پہنچ جائے، اور انجکشن کے ذریعے جو دوا پہنچائی جاتی ہے، وہ رگوں کے اندر رہتی ہے، جوف معدہ یا جوف دماغ میں نہیں جاتی؛ اس لیے مفسد نہیں ہے، اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انجکشن سے جس طرح دوا دوسرے اعضاء میں پہنچائی جاتی ہے، اسی طرح دماغ اور معدہ میں بھی پہنچائی جاتی ہے؛ کیوں کہ معدہ اور دماغ میں دوا پہنچنے کی صورت یہ ہے کہ جرم معدہ اور دماغ میں جو شرائین واوردہ (رگیں) ہیں، ان کے اندر دوا پہنچتی ہے، قعرِ معدہ یا جوف دماغ میں نہیں پہنچتی، جو مفسد صوم ہوتی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (جواہر الفقہ: ۴/ ۷۸، روزے میں انجکشن کا شرعی حکم، ط: ادارہ تحقیقات مسائل جدیدہ، اسلامیہ بازار، دیوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: آپ کے مسائل اور ان کا حل- مولانا یوسف لدھیانویؒ: ۴/ ۵۸۲، روزہ دار کا گلوکوز چڑھانا یا انجکشن لگوانا، ط: مکتبہ لدھیانوی- کراچی ☆ کتاب الفتاویٰ- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی: ۳/ ۹۲-۳۹۱، روزہ میں انجکشن اور گلوکوز، ط: نعیمیہ- دیوبند☆ فتاویٰ دینیہ- مفتی اسماعیل کچھولوی: ۳/ ۵۳- ۵۴، کتاب الصوم، ط: سورت ☆ فتاویٰ دار العلوم زکریا- مفتی رضاء الحق: ۳/ ۲۹۰- ۲۹۳، بہ حالت روزہ انجکشن اور گلوکوز کا حکم، ط: زمزم پبلشرز- کراچی ☆ کتاب المسائل- مفتی محمد سلمان منصور پوری: ۲/ ۱۵۴۔

(۱) گلوکوز مفسد صوم ہے یا نہیں؟ تفصیل سوال سابق کے حاشیہ میں ملاحظہ کریں۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کے مفسد صوم ہونے کی دو وجہ لکھی ہے:

۱- دوا معدہ تک پہنچ جاتی ہے۔ (تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ گلوکوز سے دوا معدہ تک نہیں پہنچتی)

۲- جسم کو پانی مل جاتا ہے۔ (یعنی جسم کی پانی کی ضرورت اس سے پوری ہوتی ہے)

صحیح ہے کہ گلوکوز سے جسم کی غذائی اور پانی کی ضرورت پوری ہوتی ہے، لیکن چوں کہ یہ جوف بدن یا جوف معدہ تک نہیں پہنچتی، اس لیے مفسد صوم نہیں، گلوکوز کا محض غذائی یا پانی کی ضرورت کو پورا کرنا مفسد صوم نہیں ہوگا، اسی سلسلے کے استفتاء کے جواب میں فقیہ=

[۶] قوت کا انجکشن۔جس سے دوا براہ راست پیٹ میں نہ پہنچتی ہو۔مفسد صوم نہیں

۱۵۳۸-سوال: جس طرح انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے، کیا اسی طرح طاقت کا انجکشن لینے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

قوت کا انجکشن، جس سے براہ راست پیٹ میں دوا نہ پہنچتی ہو؛ بل کہ گوشت (مسل) میں یا دوسری رگوں میں پہنچتی ہو، مفسد صوم نہیں ہے، ہاں کوئی ایسا انجکشن ہو، جس کے ذریعے دوا براہ راست جوف بطن یا جوف دماغ تک دوا پہنچے، تو وہ مفسد صوم ہے:

(و) الإمساك (عن وصول العين) أي عين كانت، وإن كانت أقل مايدرك من نحو حجر (إلى ما يسمى جوفا)؛ لأن فاعل ذلك لا يسمى ممسكا بخلاف وصول الأثر كالطعم وكالريح بالشم. (تحفة المحتاج)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے متعدد مثالوں سے واضح کیا ہے کہ مفسد صوم وہ شئے ہے، جو جوف دماغ یا جوف بطن میں پہنچ جائے، خواہ وہ غذا و پانی کی ضرورت کو پورا نہ کرے، اگر کوئی شئے رگوں میں جاکر غذائی یا پانی کی ضرورت کو پورا کرتی ہے، لیکن جوف بطن یا جوف دماغ تک نہیں پہنچتی، تو وہ مفسد صوم نہیں، حضرت فقیہ الامتؒ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

کھانا پینا بدیہی ہے، انجکشن کو کھانا پینا نہیں کہا جاتا، رگ کاٹ کر پانی عروق (رگوں) میں پہنچانے سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے، یعنی رگوں کو تر اور سیراب کرنا، وہ فائدہ گو پورا نہ سہی؛ لیکن کافی مقدار میں ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے، اس میں غوطہ لگانے، ایر کنڈیشنڈ میں داخل ہونے، سرو سبز و شاداب مقام پر پہنچ جانے سے بھی حاصل ہوتا ہے، سر اور بدن پر تیل کی مالش سے بھی تیل اندر پہنچتا ہے، اور رگوں میں تراوٹ پیدا ہوتی ہے، اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، شدت گرمی کی وجہ سے کپڑا بھگو کر حالت صوم میں سر پر لپیٹنا حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، ظاہر ہے کہ اس کا مقصد بھی رگوں کو ٹھنڈا کر کے تشنگی کی بے چینی ختم کرنا تھا، جو بہ ظاہر روزے کے مقصد کے خلاف ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۰/۱۴۸، کتاب الصوم، باب ما یفسد الصوم وما لا یفسد، روزہ میں انجکشن، ط: دار المعارف-دیوبند)

[۱] تحفة المحتاج في شرح المنهاج- أحمد بن محمد بن علي بن حجر الهيتمي (م: ۹۷۴هـ): ۳/۴۰۱-۴۰۰، كتاب الصيام، فصل في بيان المفطرات، ط: المكتبة التجارية الكبرى بمصر.

وما وصل إلى الجوف، أو إلى الدماغ عن المخارق الأصلية، كالأنف والأذن والدبر، بأن استعط أو احتقن أو أقطر في أذنه، فوصل إلى الجوف أو إلى الدماغ فسد صومه، أما إذا وصل إلى الجوف، فلا شك فيه لوجود الأكل من حيث الصورة. وكذا إذا وصل إلى الدماغ؛ لأنه له منفذ إلى الجوف، فكان بمنزلة زاوية من زوايا الجوف.... وأما ما=

[۷] گلوکوز چڑھانے سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟

۱۵۳۹- سوال: کیا گلوکوز (کوئی زبان میں، شاید گجراتی زبان میں بھی گلوکوز ہی کہتے ہیں) چڑھانے سے روزہ فاسد ہوجاتا ہے؟[۱]

الجواب حامداً ومصلیاً:

گلوکوز کی بوتل چڑھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؛ کیوں کہ وہ ایسی رگوں میں چڑھائی جاتی ہے کہ پانی (دوا) پیٹ میں پہونچنے والی رگوں میں بھی دوڑتا ہے۔ (تحفۃ المحتاج)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

وصل إلى الجوف أو إلى الدماغ عن غير المخارق الأصلية، بأن داوى الجائفة، والآمة، فإن داواها بدواء يابس لا يفسد؛ لأنه لم يصل إلى الجوف ولا إلى الدماغ. (بدائع الصنائع: ۲/ ۹۳، كتاب الصوم، فصل أركان الصيام، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) سوال کے بین القوسین اور جواب میں ذکر کردہ تحفۃ المحتاج کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال کسی شافعی المسلک نے کیا ہے، نیز اس سے پہلے والے سوال کے جواب میں بھی تحفۃ المحتاج کی عبارت ذکر کی گئی ہے، حالاں کہ حضرت مفتی صاحبؒ کا معمول فقہ حنفی کی کتابوں سے حوالہ نقل کرنے کا ہے، اس لیے ظاہر یہی ہے کہ وہ بھی کسی شافعی المسلک صاحب کا سوال ہے۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

مزید تفصیل کے لیے رجوع کریں سوال بہ عنوان: روزہ کی حالت میں گلوکوز چڑھانا۔

[۲] (و) الإمساك (عن وصول العين) أي عين كانت، وإن كانت أقل ما يدرك من نحو حجر (إلى ما يسمى جوفا)؛ لأن فاعل ذلك لا يسمى ممسكا بخلاف وصول الأثر كالطعم وكالريح بالشم. (تحفة المحتاج في شرح المنهاج- أحمد بن محمد بن علي بن حجر الهيتمي (م: ۹۷۴هـ): ۳/ ۴۰۱- ۴۰۰، كتاب الصيام، فصل في بيان المفطرات، ط: المكتبة التجارية الكبرى بمصر)

(أو أدهن أو اكتحل أو احتجم) وإن وجد طعمه في حلقه. (الدر المختار)ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وإن وجد طعمه في حلقه) أي طعم الكحل أو الدهن كما في السراج وكذا لو بزق فوجد لونه في الأصح بحر قال في النهر؛ لأن الموجود في حلقه أثر داخل من المسام الذي هو خلل البدن والمفطر إنما هو الداخل من المنافذ للاتفاق على أن من اغتسل في ماء فوجد برده في باطنه أنه لا يفطر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۹۵، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط: دار الفكر- بيروت)

گلوکوز چڑھانا مفسد صوم ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں حضرت مفتی بیمات صاحبؒ نے متعدد سوال کے جواب میں یہی لکھا ہے کہ مفسد صوم ہے اور علت یہ بیان کی ہے کہ گلوکوز ایسی رگ میں چڑھائی جاتی ہے، جو دوا کو براہ راست جوف بطن تک پہنچاتی ہے، اگر یہ تحقیق درست ہو (کہ اس کے ذریعے دوا جوف بطن تک پہنچتی ہے) تو جو حکم لگایا گیا ہے، وہی صحیح ہے۔ =

= لیکن ماہرین کی تحقیق یہ ہے کہ گلوکوز چڑھانے میں پانی (دوا) پیٹ تک نہیں پہنچتا، اس لیے یہ مفسد صوم نہیں ہے۔ استاذ محترم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں: گلوکوز چڑھوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

وجہ یہ لکھتے ہیں: انجکشن اور گلوکوز کے ذریعے معدے تک کوئی چیز براہ راست نہیں پہنچتی، بل کہ دوائیں رگوں میں پہنچتی ہیں اور رگوں کے ذریعے پورے جسم میں پھیل جاتی ہیں۔ (کتاب الفتاویٰ: ۳/ ۳۹۲، روزے، انجکشن اور گلوکوز، ط: نعیمیہ- دیوبند ☆ منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/ ۵۴۹، کتاب الصوم، ایفا پبلیکیشنز- نئی دہلی ☆ جدید فقہی مسائل: ۱/ ۸۵، ط: نعیمیہ- دیوبند)

عن سهل بن سعد: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: لا يزال الناس بخير ما عجلوا الفطر. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۶۳، رقم الحديث: ۱۹۵۷، كتاب الصوم، باب تعجيل الإفطار، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۵۰-۳۵۱، رقم الحديث: ۴۸- (۱۰۹۸)، كتاب الصيام، باب فضل السحور وتأكيد استحبابه، واستحباب تأخيره وتعجيل الفطر، ط: ديوبند)

باب التسحر والافطار

[سحری وافطار کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب التسحر والافطار

[سحری وافطار کا بیان]

[۱] سحری کا وقت کب تک رہتا ہے؟

۱۵۴۰- سوال: صبح صادق کے کتنے منٹ قبل تک سحری کھا سکتے ہیں؟ اگر کسی نے صبح صادق تک سحری کی، تو اُس کا روزہ صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آخری وقت میں سحری کھانا مستحب ہے، لیکن اِس قدر تاخیر کر دینا کہ صبح صادق ہو جانے کا شک پیدا ہو جائے یہ مکروہ ہے، اِس لیے اِس بارے میں احتیاط کا حکم ہے، آج کل تقویم پر عمل ہوتا ہے، اگر تقویم میں صبح صادق کا بالکل ٹھیک وقت لکھا گیا ہو، تو اُس سے قبل سحری سے فارغ ہو جانا ضروری ہے، اگر اُس وقت تک سحری کھائی تب بھی جائز ہے۔ (شامی)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] ویستحب السحور وتأخيره. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: ويستحب السحور) لما رواه الجماعة إلا أبا داود عن أنس قال قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: تسحروا فإن في السحور بركة.

قيل المراد بالبركة: حصول التقوي على صوم الغد أو زيادة الثواب. وقوله في النهاية: إنه على حذف مضاف أي في أكل السحور مبني على ضبطه بالضم جمع سحر والأعرف في الرواية الفتح وهو اسم للمأكول في السحر وهو السدس الأخير من الليل كالوضوء بالفتح ما يتوضأ به، وقيل يتعين الضم؛ لأن البركة ونيل الثواب إنما يحصل =

[۲] شرابی کا افطار کرانا

۱۵۴۱- سوال: ایک شخص ایسا ہے، جو ہمیشہ جوا، سٹہ اور شراب وغیرہ کے کاروبار میں مشغول رہتا ہے، کسی قسم کی عبادت نہیں کرتا ہے، وہ کبھی کبھی رمضان المبارک میں افطاری کے لیے پیسے دے کر روزے داروں کو افطار کرواتا ہے، تو اس کی یہ افطاری حلال ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر اس کی ساری آمدنی حرام ہے اور جوا، سٹہ اور شراب وغیرہ کی ہے، تو اس کی افطاری کھانا جائز نہیں۔ (۱)

=بالفعل لا بنفس المأكول، فتح ملخصا.

قال في البحر: ولم أر صريحا في كلامهم أنه يحصل السنة بالماء وحده، وظاهر الحديث يفيده، وهو ما رواه أحمد: السحور كله بركة فلا تدعوه ولو أن يجرع أحدكم جرعة من ماء فإن الله وملائكته يصلون على المتسحرين.

(قوله: وتأخيره)؛ لأن معنى الاستعانة فيه أبلغ، بدائع. ومحل الاستحباب ما إذا لم يشك في بقاء الليل، فإن شك كره الأكل في الصحيح كما في البدائع أيضا. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۱۹/۲، كتاب الصيام، باب ما يفسد الصوم ومالا يفسده، قبيل: فروع في الصوم، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ﴿٩١﴾
(۵-المائدۃ: ۹۰-۹۲)

عن عبد الله بن عمرو، أن نبي الله صلى الله عليه وسلم: نهى عن الخمر والميسر والكوبة والغبيراء، وقال: كل مسكر حرام. قال أبو داود: "قال ابن سلام أبو عبيد: الغبيراء: السكركة تعمل من الذرة، شراب يعمله الحبشة".

(سنن أبي داود: ۵۱۹/۲، رقم الحديث: ۳۶۸۵، كتاب الأشربة، باب النهي عن المسكر، ط: فيصل پبلی کیشنز-دیوبند)

ہندی نسخوں میں قال ابوداود...... الخ موجود نہیں ہے، جب کہ المکتبۃ العصریہ، صیدا، بیروت والے نسخے میں- جو محمد محی الدین عبد الحمید کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے- یہ زیادتی مذکور ہے۔ مجتبیٰ حسن قاسمی)

عن أبي هريرة-رضي الله تعالى عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: رب صائم ليس له من صيامه إلا الجوع، ورب قائم ليس له من قيامه إلا السهر. (سنن ابن ماجه: ۱۲۱/۱، رقم الحديث: ۱۶۹۰، كتاب الصيام، باب ما جاء في الغيبة والرفث للصائم، ط: مختار اينڈ كمپنی-ديوبند)

(رب صائم ليس له من صيامه إلا الجوع) وتمامه عند القضاعي والعطش وهو من يفطر على الحرام أو على لحوم الناس أو من لا يحفظ جوارحه عن الآثام (ورب قائم) أي متهجد (ليس له من قيامه إلا السهر) كالصلاة في دار مغصوبة أو ثوب مغصوب أو رياء وسمعة. (التيسير بشرح الجامع الصغير-زين الدين محمد المدعو بعبد الرؤوف بن تاج العارفين بن علي، الحدادي ثم المناوي القاهري (م: ۱۰۳۱ھ): ۲۹/۲، حرف الراء، ط: مكتبة الإمام الشافعي-الرياض ☆ فيض القدير: ۱۶/۴، حرف الراء)

لیکن اگر حرام آمدنی کے ساتھ اس کی حلال آمدنی بھی ہے اور وہ حلال آمدنی حرام کے مقابلے میں زیادہ ہے، تو اس کی افطاری حلال ہے، اور کھائی جا سکتی ہے۔ (☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] روزہ افطار کرنے میں تاخیر کرنا

۱۵۴۲-سوال: رمضان میں تقویم کے مطابق روزہ افطار کرنا کیسا ہے؟ اس میں بعض لوگ احتیاط کرنے کو کہتے ہیں اور چار پانچ منٹ تاخیر سے اعلان کرنے پر زور دیتے ہیں۔

الجواب حامداً و مصلياً:

شریعت کے احکام کا مدار، ان اصول و قوانین پر ہے، جن کا ثبوت ادلہ شرعیہ: قرآن کریم، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع و قیاس سے ہے، شکوک و شبہات کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ (۱)

(☆☆☆) أهدى إلى رجل شيئا، أو أضافه، إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام، ينبغي أن لا يقبل الهدية، ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل، كذا في الينابيع. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۴۲، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، ط: دار الفكر - بيروت)

لا يجيب دعوة الفاسق المعلن ليعلم أنه غير راض بفسقه، وكذا دعوة من كان غالب ماله من حرام ما لم يخبر أنه حلال وبالعكس يجيب ما لم يتبين عنده أنه حرام، كذا في التمرتاشي.... وفي الروضة يجيب دعوة الفاسق والورع أن لا يجيبه ودعوة الذي أخذ الأرض مزارعة أو يدفعها على هذا، كذا في الوجيز للكردري.

آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل، ولا يأكل ما لم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه، وإن كان غالب ماله حلالا لا بأس بقبول هديته والأكل منها، كذا في الملتقط. (المصدر السابق: ۵/ ۳۴۳ ☆الأشباه والنظائر ص: ۳۰۹، الفن الأول في القواعد الكلية، القاعدة الثانية، ط: ادارة القرآن، كراچی ☆ مجمع الأنهر: ۴/ ۱۸۶، كتاب الكراهية، فصل في الكسب)

(۱) عن أناس من أهل حمص، من أصحاب معاذ بن جبل، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم لما أراد أن يبعث معاذا إلى اليمن قال: كيف تقضي إذا عرض لك قضاء؟، قال: أقضي بكتاب الله، قال: فإن لم تجد في كتاب الله؟، قال: فبسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: فإن لم تجد في سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولا في كتاب الله؟ قال: أجتهد رأيي، ولا آلو فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم صدره، وقال: الحمد لله الذي وفق رسول، رسول الله لما يرضي رسول الله. (سنن أبي داود: ۲/ ۵۰۵، رقم الحديث: ۳۵۹۲، كتاب الأقضية، باب اجتهاد الرأي في القضاء، ط: فيصل - ديوبند ☆سنن الترمذي: ۱/ ۲۴۷، رقم الحديث: ۱۳۲۷، أبواب الأحكام، باب ما جاء في القاضي كيف يقضي، ط: مختار اینڈ کمپنی - دیوبند)

اعلم أن أصول الشرع ثلاثة: الكتاب، والسنة، والإجماع، والأصل الرابع القياس بالمعنى المستنبط من هذه =

افطار کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: {ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيۡلِ ۚ}[۲] روزہ رات تک پورا کرو، یعنی رات آنے سے روزے کا وقت ختم ہوجاتا ہے؛ اس لیے افطار میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے، اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ: میری امت اس وقت تک خیر اور بھلائی پر رہے گی، جب تک کہ مغرب کی نماز جلدی

=الأصول. (أصول الزدوي) ــــــــ قال عبد العزيز البخاري (م: ۷۳۰هـ): والأصول ههنا الأدلة، إذ أصل كل علم ما يستند إليه تحقق ذلك العلم ويرجع فيه إليه ومرجع الأحكام إلى هذه الأدلة، والشرع الإظهار في اللغة، وهو إما بمعنى الشارع... فيكون المعنى أدلة الشارع أي الأدلة التي نصبها الشارع على المشروعات أربعة... أو بمعنى المشروع... فيكون المعنى أدلة المشروع أي الأدلة التي تثبت المشروعات أربعة، ويكون اللام للجنس والمقصود من الإضافة تعظيم المضاف إليه كقولك أستاذي فلان وكقولنا الله إلهنا ومحمد نبينا، أي المشروعات التي تثبت بمثل هذه الأدلة معظمة يلزم رعايتها ويجب تلقيها بالقبول.... ثم قدم الكتاب على الجميع؛ لأنه في الشرع أصل مطلق من كل وجه وبكل اعتبار، وأعقبه بالسنة؛ لأن كونها حجة ثابت بالكتاب كما ستعرف، وأخر الإجماع عنهما لتوقف موجبيته عليهما، ولكن الثلاثة مع تفاوت درجاتها حجج موجبة للأحكام قطعا، ولا تتوقف في إثبات الأحكام على شيء فقدمت على القياس الذي يتوقف في إثبات الحكم على المقيس عليه، ولهذا أفرده بالذكر بقوله والأصل الرابع؛ لأنه لما توقف في إثبات الحكم على المقيس عليه ولم يمكن إثبات الحكم به ابتداء كان فرعا له. (كشف الأسرار شرح أصول البزدوي-عبد العزيز بن أحمد بن محمد، علاء الدين البخاري الحنفي (م: ۷۳۰هـ): ۱/۱۹، أصول الشرع ثلاثة الكتاب والسنة والإجماع، ط: دار الكتاب الإسلامي)

القطب الثاني: في أدلة الأحكام وهي أربعة: الكتاب، والسنة، والإجماع، ودليل العقل المقرر على النفي الأصلي. فأما قول الصحابي وشريعة ما قبلنا فمختلف فيه. الأصل الأول من أصول الأدلة: كتاب الله تعالى واعلم أنا إذا حققنا النظر بان أن أصل الأحكام واحد، وهو قول الله تعالى، إذ قول الرسول - صلى الله عليه وسلم - ليس بحكم ولا ملزم، بل هو مخبر عن الله تعالى أنه حكم بكذا، وكذا فالحكم لله تعالى وحده. والإجماع يدل على السنة، والسنة على حكم الله تعالى. وأما العقل فلا يدل على الأحكام الشرعية بل يدل على نفي الأحكام عند انتفاء السمع، فتسمية العقل أصلا من أصول الأدلة تجوز على ما يأتي تحقيقه. إلا أنا إذا نظرنا إلى ظهور الحكم في حقنا فلا يظهر إلا بقول الرسول - عليه السلام -؛ لأنا لا نسمع الكلام من الله تعالى ولا من جبريل فالكتاب يظهر لنا بقول الرسول - صلى الله عليه وسلم - فإذن إن اعتبرنا المظهر لهذه الأحكام فهو قول الرسول فقط، إذ الإجماع يدل على أنهم استندوا إلى قوله. وإن اعتبرنا السبب الملزم فهو واحد وهو حكم الله تعالى، لكن إذا لم نجرد النظر وجمعنا المدارك صارت الأصول التي يجب النظر فيها أربعة كما سبق. (المستصفى-أبو حامد محمد بن محمد الغزالي الطوسي (م: ۵۰۵هـ)، ص: ۸۰، القطب الثاني في أدلة الأحكام، الأصل الأول من أصول الأدلة كتاب الله تعالى، ت: محمد عبد السلام عبد الشافي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۲] ۲-البقرة: ۱۸۷۔

پڑھے گی اور عشا کی نماز تاخیر سے پڑھے گی۔ (۳)

ہاں! افطار کے وقت بعض حضرات کا نماز کے لیے جلدی کرنا سنت کے خلاف ہے؛ کیوں کہ حدیث میں ہے کہ: جب شام کا کھانا اور عشاء دونوں جمع ہوں، تو کھانے کو مقدم کرو اور کھانے سے فارغ ہو کر نماز پڑھو۔ (۴)

افطار کے وقت کھانے کا شدید تقاضہ ہوتا ہے، اس لیے بہتر ہے کہ پانچ، دس منٹ نماز کو مؤخر کرے اور اتنا کھالے کہ کھانے کی طرف ذہن نہ لگا رہے، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۳) صاحب ہدایہؒ نے ان الفاظ میں یہ روایت نقل کی ہے:

وقال عليه الصلاة والسلام " لا تزال أمتي بخير ما عجلوا المغرب وأخروا العشاء ". (الهداية في شرح بداية المبتدي: ۱/ ۸۳، كتاب الصلاة، باب المواقيت، ط: مختار اينڈ كمپني، ديوبند)

لیکن "الدراية في تخريج أحاديث الهداية" (مطبوعہ علی ہامش الہدایہ: ۱/ ۸۳) میں حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کے بارے میں فرمایا ہے: لم أجده هكذا.

"تعجیل افطار" کی صریح روایت اس طرح منقول ہے:

عن سهل بن سعد: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: لا يزال الناس بخير ما عجلوا الفطر. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۶۳، رقم الحديث: ۱۹۵۷، كتاب الصوم، باب تعجيل الإفطار، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۵۰-۳۵۱، رقم الحديث: ۴۸-(۱۰۹۸)، كتاب الصيام، باب فضل السحور وتأكيد استحبابه، واستحباب تأخيره وتعجيل الفطر، ط: ديوبند)

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يزال الناس بخير ما عجلوا الفطر، عجلوا الفطر؛ فإن اليهود يؤخرون. (سنن ابن ماجه: ۱/ ۱۲۲، رقم الحديث: ۱۶۹۸، كتاب الصيام، باب ما جاء في تعجيل الإفطار، ط: ديوبند)

(۴) عن أنس بن مالك: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا قدم العشاء، فابدءوا به قبل أن تصلوا صلاة المغرب، ولا تعجلوا عن عشائكم. (صحيح البخاري: ۱/ ۹۲، رقم الحديث: ۶۷۲ كتاب الأذان، باب إذا حضر الطعام وأقيمت الصلاة، ط: البدر د-يوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۰۸، رقم الحديث: ۵۵۷، كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب كراهة الصلاة بحضرة الطعام الذي يريد أكله في الحال... الخ، ط: البدر-ديوبند)

عن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا وضع عشاء أحدكم وأقيمت الصلاة، فابدءوا بالعشاء ولا يعجل حتى يفرغ منه. وكان ابن عمر: يوضع له الطعام، وتقام الصلاة، فلا يأتيها حتى يفرغ، وإنه ليسمع قراءة الإمام. (صحيح البخاري: ۱/ ۹۲، رقم الحديث: ۶۷۳، كتاب الأذان، باب إذا حضر الطعام... الخ، ط: ديوبند)

قال أبو الدرداء: من فقه المرء إقباله على حاجته حتى يقبل على صلاته وقلبه فارغ. (صحيح البخاري: ۱/ ۹۲، كتاب الاذان، باب إذا حضر الطعام... الخ، ط: البدر-ديوبند)

[۴] غروبِ آفتاب کے بعد اذان وافطار کا وقت کیا ہے؟

۱۵۴۳- سوال: غروبِ آفتاب کے بعد کتنی دیر میں اذان وافطار ہونے چاہئیں؟ اگر کسی نے غروبِ آفتاب کے بعد فوراً افطار کرلیا تو اُس کا روزہ صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

افطار میں جلدی کرنا مستحب ہے۔ (۱) آفتاب کی ٹکیا پوری طرح چھپ جانے پر افطار جائز ہوتا ہے؛ لیکن اگر آفتاب نظر نہ آرہا ہو، تو کم از کم اطمینان ہوجائے، تب افطار کرے، افطار اذان سے قبل بھی جائز ہے، روزہ صحیح ہوجائے گا۔ (۲)

اذان میں اختیار ہے کہ خواہ غروب ہوتے ہی اذان دے یا کچھ دیر ٹھہر جائے، لیکن مغرب کی نماز میں تعجیل مستحب ومؤکد ہے، زیادہ تاخیر مکروہ ہے، افطار کے لیے چند منٹ کی تاخیر جائز ہے۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن أنس بن مالك: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا قدم العشاء، فابدءوا به قبل أن تصلوا صلاة المغرب، ولاتعجلوا عن عشائكم. (صحيح البخاري: ۱/۹۲، رقم الحديث: ۶۷۲ كتاب الأذان، باب إذا حضر الطعام وأقيمت الصلاة، ط: البدر ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/۲۰۸، رقم الحديث: ۵۵۷، كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب كراهة الصلاة بحضرة الطعام الذي يريد أكله في الحال... الخ، ط: البدر-ديوبند)

عن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا وضع عشاء أحدكم وأقيمت الصلاة، فابدءوا بالعشاء ولا يعجل حتى يفرغ منه. وكان ابن عمر: يوضع له الطعام، وتقام الصلاة، فلا يأتيها حتى يفرغ، وإنه ليسمع قراءة الإمام. (صحيح البخاري: ۱/۹۲، رقم الحديث: ۶۷۳، كتاب الأذان، باب إذا حضر الطعام... الخ، ط: ديوبند)

قال أبو الدرداء: من فقه المرء إقباله على حاجته حتى يقبل على صلاته وقلبه فارغ. (صحيح البخاري: ۱/۹۲، كتاب الاذان، باب إذا حضر الطعام... الخ، ط: البدر-ديوبند)

ويستحب السحور وتأخيره وتعجيل الفطر لحديث: ثلاث من أخلاق المرسلين: تعجيل الإفطار، وتأخير السحور، والسواك. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: وتعجيل الفطر) أي إلا في يوم غيم، ولا يفطر ما لم يغلب على ظنه غروب الشمس وإن أذن المؤذن بحر عن البزازية وفيه عن شرح الجامع لقاضي خان التعجيل المستحب قبل اشتباك النجوم. [تنبيه] قال في الفيض: ومن كان على مكان مرتفع كمنارة إسكندرية لا يفطر ما لم تغرب الشمس عنده ولأهل البلدة الفطر إن غربت عندهم قبله وكذا العبرة في الطلوع في حق صلاة الفجر أو السحور. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۱۹-۴۲۰، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، قبيل: فروع في الصيام، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲-۳) سوال سابق اور اس کا حاشیہ نمبر (۴) ملاحظہ فرمائیں۔

[۵] افطار کے وقت کی دعاء

۱۵۴۴- سوال: روزہ افطار کرتے وقت کون سی دعا مانگنی چاہیے، حدیث سے کیا ثابت ہے؟ ”اللھم إني لك صمتُ وبك آمنتُ الخ“ دعاء کے الفاظ ہیں یا نیت کے؟

الجواب حامداومصلیا:

افطار کے لیے نیت کی ضرورت نہیں، مذکورالفاظ - جو آپ نے لکھے ہیں - نیت کے نہیں ہیں؛ بل کہ دعاءِ افطار کے ہیں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] سحری کے لیے اذان دینا اور ختم سحری کا اعلان مائیک کے ذریعہ کرنا

۱۵۴۵- سوال: سحری کے لیے اذان حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ حوالے کے ساتھ جواب مطلوب ہے، یہ بھی بتائیں کہ ختمِ سحری کا اعلان مائیک کے ذریعے کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اذان دے کر سحری کی اطلاع کی جاتی تھی، مائیک کے ذریعے بھی

---

(۱) عن معاذ بن زهرة، أنه بلغه " أن النبي صلى الله عليه وسلم كان إذا أفطر قال: اللهم لك صمت، وعلى رزقك أفطرت ". (سنن أبي داود: ۱/ ۳۲۲، رقم الحديث: ۲۳۵۸، كتاب الصوم، باب القول عند الإفطار، ط: ديوبند☆ الزهد والرقائق -أبو عبد الرحمن عبد الله بن المبارك بن واضح الحنظلي، التركي ثم المروزي (م: ۱۸۱هـ) ص: ۴۹۵، رقم الحديث: ۱۴۱۰، آخر باب فضل ذكر الله عز وجل، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

ومن السنة أن يقول حين الإفطار اللهم لك صمت وبك آمنت وعليك توكلت وعلى رزقك أفطرت ولصوم الغد من شهر رمضان نويت فاغفر لي ما قدمت وما أخرت. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۴۸، كتاب الصوم، قبيل: فصل بيان وجوه الأعذار المبيحة للإفطار وما يتعلق بها، ط: دار إحياء التراث العربي☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ) ص: ۶۸۳، كتاب الصوم، فيما يكره للصائم وما لا يكره وما يستحب، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت - لبنان☆حاشية الشِّلْبِيِّ مع تبيين الحقائق - شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِّلْبِيُّ (م: ۱۰۲۱ هـ): ۱/ ۳۴۲، كتاب الصوم، فصل في العوارض، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

سحری کی اطلاع کرنا جائز ہے، عدم جواز کوئی وجہ نہیں ہے۔ (بخاری شریف: ۱/ ۲۵۷)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] رمضان میں افطار کے وقت اجتماعی دعا کرنا

۱۵۴۶-سوال: حدیث میں ہے کہ رمضان المبارک میں افطار کے وقت دعاء قبول ہوتی ہے۔[2] لہٰذا اس وقت گھر میں اہل وعیال کے ساتھ اجتماعی طور پر، قبلہ کی طرف رخ کرکے، اس طرح دعا کرنا کہ پیچھے اہل وعیال آمین کہتے رہیں اور دعاء کا طریقہ بھی سیکھتے رہیں، جائز ہے یا نہیں؟

---

[۱]عن عبدالله بن مسعود-رضي الله عنه-عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا يمنعن أحدكم-أو أحدا منكم-أذان بلال من سحوره، فإنه يؤذن-أو ينادي بليل-ليرجع قائمكم، ولينبه نائمكم... الحديث. (صحيح البخاري: ۱/ ۸۷، رقم الحديث: ۶۲۱، كتاب الأذان، باب الأذان قبل الفجر، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۵۰، رقم الحديث: ۹۳-(۱۰۹۳)، كتاب الصيام، باب بيان أن الدخول في الصوم يحصل بطلوع الفجر، وأن له الأكل وغيره حتى يطلع الفجر......، ط: ديوبند)

...وأما الجواب عن أذان بلال الذي كان يؤذن بالليل قبل دخول الوقت فلم يكن ذلك لأجل الصلاة؛ بل إنما كان ذلك لينتبه النائم وليتسحر الصائم، وليرجع الغائب، بين ذلك ما رواه البخاري من حديث ابن مسعود عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: (لا يمنعن أحدكم أو واحدا منكم أذان بلال من سحوره، فإنه يؤذن أو ينادي بليل ليرجع غائبكم ولينتبه نائمك) الحديث على ما يأتي عن قريب إن شاء الله تعالى، وأخرجه مسلم أيضا. وأخرجه الطحاوي من ثلاث طرق، ولفظه: (لا يمنعن أحدكم أذان بلال من سحوره، فإنه ينادي أو يؤذن ليرجع غائبكم ولينتبه نائمكم). الحديث، ومعنى: (ليرجع غائبكم): ليرد غائبكم من الغيبة، ورجع يتعدى بنفسه ولا يتعدى، والرواية المشهورة: (ليرجع قائمكم) من: القيام، ومعناه: ليكمل ويستعجل بقية ورده، ويأتي بوتره قبل الفجر.... ومن أقوى الدلائل على أن أذان بلال لم يكن لأجل الصلاة ما رواه الطحاوي من حديث حماد بن سلمة عن أيوب عن نافع: (عن ابن عمر، رضي الله تعالى عنهما: أن بلالا أذن قبل طلوع الفجر، فأمره النبي صلى الله عليه وسلم، أن يرجع فينادي: ألا إن العبد نام، فرجع فنادى: ألا إن العبد نام). وأخرجه أبو داود أيضا، فهذا ابن عمر روى هذا، والحال أنه روى عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: (إن بلالا ينادي بليل فكلوا واشربوا حتى ينادي ابن ام مكتوم)، فثبت بذلك أن ما كان من ندائه قبل طلوع الفجر لم يكن للصلاة. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري-بدر الدين العينى (م: ۸۵۵هـ): ۵/ ۱۳۰-۱۳۱، كتاب مواقيت الصلاة، باب الأذان بعد الفجر، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت☆رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۳۵۹، كتاب الصلاة، ط: دار الفكر-بيروت☆البناية شرح الهداية: ۲/ ۱۴، كتاب الصلاة، فصل آخر وقت الصلاة، ط: دار الكتب العلمية)

(۲)عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "ثلاثة لا ترد دعوتهم: الصائم حتى يفطر، والإمام العادل، ودعوة المظلوم يرفعها الله فوق الغمام ويفتح لها أبواب السماء ويقول الرب: وعزتي لأنصرنك ولو بعد حين". (سنن الترمذي: ۲/ ۲۰۰، رقم الحديث: ۳۵۹۸، أبواب الدعوات، باب في العفو والعافية، ط: ديوبند)

الجواب حامداً ومصلیاً:

بغیر کسی التزام کے، کبھی کبھار ایسا کرنا [اجتماعی دعاء کرنا] جائز ہے، معمول نہیں بنانا چاہیے، دعاء' در حقیقت انفرادی عمل ہے؛ اس لیے انفراداً دعاء کرنی چاہیے۔ (۱) بہرصورت یعنی اجتماعی دعاء ہو، یا انفرادی، مغرب کی جماعت ترک نہیں ہونی چاہیے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] ختم سحری کے متعلق مفتی کفایت اللہؒ کے ایک فتویٰ کی تحقیق

۱۵۴۷- سوال: ''مغرب اورعشاء کے درمیان کس مہینے میں کتنے وقت کا فاصلہ رہتا ہے؟''

---

(۱) اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿(۷-الاعراف:۵۵)

قال الألوسي: تَضَرُّعاً أي ذوي تضرع أو متضرعين . . . وهو من الضراعة وهي الذل والاستكانة يقال ضرع فلان لفلان إذا ذل له واستكان، وقال الزجاج: التضرع التملق وهو قريب مما قالوا أي ادعوه تذللا، وقيل: التضرع مقابل الخفية. واختاره أبو مسلم أي ادعوه علانية وَخُفْيَةً أي سرا. ـــــــ أخرج ابن المبارك، وابن جرير، وأبو الشيخ عن الحسن قال: لقد كان المسلمون يجتهدون في الدعاء وما يسمع لهم صوت إن كان إلا همسا بينهم وبين ربهم وذلك أنه تعالى يقول: ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَخُفْيَةً وأنه سبحانه ذكر عبدا صالحا فرضي له فعله فقال تعالى: إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا [مریم:۳] وفي رواية عنه أنه قال: بين دعوة السر ودعوة العلانية سبعون ضعفا. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني- شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م:۱۲۷۰ھ): ۳۷۸/۴، سورة الأعراف:۵۵، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں:

یہ طریقہ کہ ایسے وقت اس طرح اجتماعی دعاء کی جائے، حضرت نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ اور فقہاء مجتہدین سے ثابت نہیں، اگر امام صاحب تعلیم کے لیے ایک دو دفعہ دعاء کرادے، پھر روزے دار اپنی اپنی جداگانہ دعاء کرلیا کرے، تو بہتر ہے اور اس اجتماعی دعاء کو ترک کیا جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۲۱۳/۱۰، کتاب الصوم، فصل فی التسحر والافطار، افطار کے وقت اجتماعی دعاء ثابت نہیں ہے، ط: دار المعارف- دیوبند)

استاذ گرامی حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''دعاء اصل میں انفرادی عمل ہے، یہ خدا اور بندے کے درمیان راز و نیاز اور سرگوشی کا درجہ رکھتی ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے ہر چیز خدا سے مانگنے کا حکم دیا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر ایک کی ضرورتیں الگ ہوتی ہیں، بعض ایسی بھی ضرورتیں ہوتی ہیں، جن کا بندہ اپنے مالک کے سامنے ذکر کرتا ہے، وہ کسی اور کے سامنے ان کا ذکر نہیں کرسکتا؛ اسی لیے رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کا عام معمول انفرادی دعاء کا تھا، خاص خاص مواقع پر اجتماعی دعا کی جاتی تھی، جیسے قنوت نازلہ، بارش کے لیے دعاء استسقاء، یا مسلمان کسی خاص آزمائش سے گزر رہے ہوں، تو ان کے لیے دعاء، اس لیے اگر افطار سے پہلے معمول بنائے اور لازم سمجھے بغیر کبھی کبھی اجتماعی دعاء کرلی جائے، تو اس کی گنجائش ہے، لیکن اس کو روزانہ کا معمول نہ بنایا جائے، اور اس پر اصرار نہ کیا جائے اور اسے ضروری نہ سمجھا جائے۔'' (کتاب الفتاویٰ: ۴۲۹/۳، روزے سے متعلق سوالات، سحر وافطار کے احکام، افطار کے وقت اجتماعی دعاء، ط: نعیمیہ- دیوبند)

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے اس کو بیان کرتے ہوئے پورے سال کا ایک نقشہ تیار فرمایا ہے۔ وہ نقشہ فتاویٰ رحیمیہ جلد نمبر تین میں بھی نقل کیا گیا ہے، اس کے نیچے نوٹ کے عنوان کا اضافہ کر کے لکھا گیا ہے کہ اتنا ہی وقت تقریباً اس مہینے کی صبح صادق اور طلوع آفتاب کے درمیان بھی رہتا ہے۔ (☆☆)

سوال یہ ہے کہ یہ ٹائم ٹیبل صرف ہندوستان میں قابل عمل ہے، یا ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اس پر عمل کیا جا سکتا ہے؟ اگر فرق ہو، تو بہ طور خاص موریس کے جزیرے میں کس ماہ میں کیا وقت رہے گا، ضرور تحریر فرمائیں۔

اس وقت مئی ۱۹۸۷ء میں سحری، افطاری اور طلوع آفتاب کا وقت حسب ذیل ہے:

سحری ۵:۱۵ سے لے کر ۵:۲۵ تک۔

افطاری ۵:۴۶ سے کم ہو کر ۵:۳۹ تک۔

طلوع آفتاب ۶:۳۰ کو ہے۔

اوپر ذکر کردہ نقشے کے مطابق سحری کا وقت درست ہے؟ اگر درست نہ ہو، تو آج تک جن لوگوں نے اس نقشے کے مطابق سحری اور افطاری کی، ان کے روزوں کا کیا ہوگا، ان کے روزے صحیح ہوں گے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اللہ رب العزت قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں: رب المشرق والمغرب.(۱)

(☆☆) جس ماہ کی جس تاریخ میں غروب آفتاب اور غروب شفق میں جس قدر فاصلہ رہتا ہے، تقریباً اتنا ہی فاصلہ صبح صادق اور طلوع آفتاب میں بھی ہوتا ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ- مفتی عبد الرحیم لاجپوریؒ (م: ۱۴۲۲ھ): ۱/۸۰، کتاب الصلاۃ، اوقات الصلاۃ، ط: دار الاشاعت، کراچی)

(۱) فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ. (۷۵-المعارج: ۴۰)

ترجمہ: پھر میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی کہ ہم اس پر قادر ہیں۔ (بیان القرآن)

بِرَبِّ الْمَشارِقِ وَ الْمَغارِبِ جمع المشارق والمغارب أما لأن المراد بهما مشرق كل يوم من السنة ومغربه فيكون لكل من الصيف والشتاء مائة وثمانون مشرقا ومغربا. (روح البيان- إسماعيل حقي بن مصطفى الإستانبولي الحنفي الخلوتي، المولى أبو الفداء (م: ۱۱۲۷ھ): ۱۰/۱۷۰، سورة المعارج: (۷۰: ۴۰)، ط: دار الفكر - بيروت★فتح القدير - محمد بن علي بن محمد بن عبد الله الشوكاني اليمني (م: ۱۲۵۰ھ): ۵/ ۳۵۳، سورة المعارج، ط: دار ابن كثير، دار الكلم الطيب - دمشق☆البحر المديد في تفسير القرآن المجيد- أبو العباس أحمد بن محمد بن المهدي بن عجيبة الحسني الأنجري الفاسي الصوفي (م: ۱۲۲۴ھ): ۷/ ۲۷۱، سورة الرحمن، ت: أحمد عبد الله القرشي رسلان، ط: الدكتور حسن عباس زكي - القاهرة)

اس آیت کریمہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ سورج کے طلوع وغروب کی جگہ روزانہ بدلتی رہتی ہے اور سورج کی سمت ہر ملک میں الگ الگ ہے؛ اس لیے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے جو وقت لکھا ہے، وہ دنیا کے تمام ممالک کے لیے نہیں ہے؛ آپ اس کے متعلق مزید ان لوگوں سے معلومات حاصل کیجیے، جو اس علم کے ماہر ہیں، ان کے جواب کی روشنی میں وقت کی تعیین کیجیے۔(۲)

نیز ان سے دریافت کر لینے کے بعد بھی روزے میں احتیاط کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے دس منٹ پہلے ہی سحری بند کی جائے، جاپان نے اس کے متعلق آٹومیٹک گھڑی بنائی ہیں، ان سے بھی مدد لی جاسکتی ہے، تاہم ان سب کے باوجود احتیاطاً دس منٹ پہلے ہی سحری ختم کر لی جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] وقت سے تین چار منٹ پہلے افطار کرنا

۱۵۴۸- سوال: جامعہ اسلامیہ، مقام و پوسٹ: ڈابھیل، ضلع: بلساڑ میں اس سال رمضان المبارک میں افطار کے (اشتہار برائے) ٹائم ٹیبل میں پہلے اور دوسرے روزے کے افطار کا وقت ۷:۱۳ (سات بج کر تیرہ منٹ) اور ۷:۱۴ (سات بج کر چودہ منٹ) درج ہے؛ لیکن ہمارے گاؤں میں ایک معتبر اور مؤقر آدمی کے کہنے کی وجہ سے پہلے روز مغرب کی اذان ۷ ربج کر ۱۰ رمنٹ پر اور دوسرے روز ۷ ربج کر گیارہ منٹ پر ہوئی، اس طرح ٹائم ٹیبل میں درج شدہ وقت سے، پہلے روزے کے دن، تقریباً تین منٹ پہلے اور دوسرے روزے کے دن، تقریباً چار منٹ پہلے اذان ہوئی، اور لوگوں نے اس اذان پر اعتماد کر کے اپنے اپنے روزے افطار کیے، اب اس پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) تمام لوگوں کے روزے صحیح ہوں گے یا نہیں؟

---

(۲) لأن كل قوم مخاطبون بما عندهم وانفصال الهلال عن شعاع الشمس يختلف باختلاف الأقطار كما أن دخول الوقت وخروجه يختلف باختلاف الأقطار حتى إذا زالت الشمس في المشرق لا يلزم منه أن تزول في المغرب، وكذا طلوع الفجر وغروب الشمس بل كلما تحركت الشمس درجة فتلك طلوع فجر لقوم وطلوع شمس لآخرين وغروب لبعض ونصف ليل لغيرهم، وروي أن أبا موسى الضرير الفقيه- صاحب المختصر- قدم الإسكندرية، فسئل عمن صعد على منارة الإسكندرية، فيرى الشمس بزمان طويل بعدما غربت عندهم في البلد أيحل له أن يفطر فقال لا ويحل لأهل البلد لأن كلا مخاطب بما عنده. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق -عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/۳۲۱، كتاب الصوم، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة)

(۲) اس طرح کوئی بھی شخص وقت سے پہلے اذان دینے کا حکم کرسکتا ہے یا نہیں؟

(۳) اگر لوگوں کے روزے صحیح نہ ہوئے ہوں، تو ان کو کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلے میں شریعت کا کیا حکم ہے، ہماری رہنمائی فرمائیں، اللہ اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔

الجواب حامداو مصلیا:

ایک آدمی نے وقت سے تین منٹ پہلے، سات بج کر دس منٹ پر اذان دلوا کر، لوگوں کو اپنے روزے افطار کروائے، جب کہ آپ کی تحریر کے مطابق روزے کے افطار کا وقت ٹائم ٹیبل میں سات بج کر چودہ منٹ درج تھا، تو اس شخص سے مل کر تحقیق کی جائے کہ سات بج کر دس پر غروب آفتاب ہو جاتا ہے یا نہیں؟ یا اس کو معلوم کرنے کے لیے کسی معتبر ٹائم ٹیبل کو دیکھا جائے، اگر معتبر کوئی ٹائم ٹیبل ایسا مل جاتا ہے، جس میں غروب آفتاب کا وقت سات بج کر دس منٹ یا اس سے پہلے کا وقت لکھا ہوا ہے، تو لوگوں کے روزے صحیح ہو جائیں گے؛ تاہم قابل اعتماد کوئی ٹائم ٹیبل نہ ملتا ہو اور وقت سے پہلے روزہ افطار کرنا ثابت ہو جائے، تو لوگوں کو اپنے دو دن کے روزوں کا اعادہ کرنا پڑے گا۔

(۱) جن لوگوں نے اپنے روزے تین چار منٹ پہلے افطار کیے ہیں اور اس وقت اگر صحیح ٹائم ٹیبل کے مطابق، افطار کا وقت نہیں ہوا تھا، تو کسی کا بھی روزہ نہیں ہوگا۔[1]

(۲) وقت سے پہلے لوگوں کو اپنے روزے افطار کروانا اور خود اپنا روزہ وقت سے پہلے افطار کرنا؛ ہر دو امر غلط اور نا جائز ہے۔[2]

جس کو وقت معلوم نہیں تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی واقف کار سے پوچھ لیتا، روزے جیسی

---

(۱) (أو تسحر أو أفطر يظن اليوم) أي الوقت الذي أكل فيه (ليلا و) الحال أن (الفجر طالع و الشمس لم تغرب) لف ونشر ويكفي الشك في الأول ... (قضى) في الصور كلها (فقط) [الدر المختار مع رد المحتار: ۴۰۵/۲، كتاب الصوم، باب ما يفسد الصوم و مالا يفسده، ط: دار الفكر - بيروت☆الهداية شرح بداية المبتدي: ۱۲۶/۱، كتاب الصلاة، باب ما يوجب القضاء والكفارة، فصل في من كان مريضا في رمضان، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق: ۳۴۲/۱، كتاب الصوم، فصل في العوارض، ط: المكتبة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة☆الفتاوى الهندية: ۱۹۴/۱، كتاب الصوم، الباب الأول في تعريفه وتقسيمه، ط: دار الفكر)

(۲) (قوله ووقت الصوم من حين طلوع الفجر الثاني إلى غروب الشمس) لقوله تعالى {وكلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر ثم أتموا الصيام إلى الليل} [البقرة: ۱۸۷]. (الجوهرة النيرة - أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ۸۰۰هـ): ۱۳۸/۱، كتاب الصوم، ط: المطبعة الخيرية)

عظیم عبادت کے لیے خواہ کتنا بڑا اور سمجھ دار آدمی ہی کیوں نہ ہو، محض اس کی بات پر اعتماد کرنا، اور قابل اعتماد ذرائع کو ترک کرنا درست نہیں ہے، بڑے گناہ کا کام ہے؛ ذمہ دار حضرات کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس طرح کی بے احتیاطی کرنے والے کو اپنی ذمہ داری سے بالکل علاحدہ کر دے۔ (۳)

(۳) جنہوں نے وقت سے پہلے افطار کیا ہے، ان کے لیے اپنے دو دن کے روزوں کی قضاء کرنا ضروری ہے۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] افطار کے لیے غیر مسلم سے رقم لینا

۱۵۴۹- سوال: رمضان المبارک میں افطار کے لیے رقم جمع کی جاتی ہے، اور رقم جمع کرنے میں غیر مسلم (چینی لوگ) بھی بلا مطالبہ کے رقم دیتے ہیں، تو افطار کے لیے کسی غیر مسلم سے رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

کوئی بھی غیر مسلم نیکی اور ثواب سمجھ کر کسی دینی کام میں رقم دے اور مستقبل میں اُس رقم لینے کی وجہ سے دینی کام میں کسی خلل کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو، تو اُن کی رقم لینا جائز ہے، اُس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۳) عن الحسن قال: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار (المعروف بـ مصنف ابن بي شيبة) -أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵هـ): ۶/۵۴۵، رقم الحديث: ۳۳۷۱۷، كتاب الجهاد، في إمام السرية يأمرهم بالمعصية، من قال: لا طاعة له، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد- الرياض.

وأخرجه الإمام أحمد بن حنبل في مسنده، بلفظ: "لا طاعة لمخلوق في معصية الله عز وجل" عن علی وابن مسعود رضي الله عنهما وعن غيرهما. (ر: مسند الإمام أحمد بن حنبل: ۲/۳۳۳، رقم: ۱۰۹۴، مسند علي ابن أبي طالب رضي الله عنه ☆۶/۴۳۲، رقم: ۳۸۸۹، مسند عبد الله بن مسعود رضي الله عنه، ت: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة)

(۴) حاشیہ نمبر (۱) ملاحظہ فرمائیں۔

(☆☆) عن أنس بن مالك رضي الله عنه، أن يهودية أتت النبي صلى الله عليه وسلم بشاة مسمومة، فأكل منها، فجيء بها فقيل: ألا نقتلها، قال: لا، فما زلت أعرفها في لهوات رسول الله صلى الله عليه وسلم. (صحيح البخاري: ۱/۳۵۶، رقم الحديث: ۲۶۱۷، كتاب الهبة وفضلها والتحريض عليها، باب قبول الهدية من المشركين، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/۲۲۲، رقم الحديث: ۴۵-(۲۱۹۰)، كتاب السلام، باب السم، ط: ديوبند)

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى
الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ
تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (۲-البقرۃ:۱۸۴)

باب قضاء الصوم وكفارته

[روزے کی قضاء وکفارہ کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب قضاء الصوم وکفارته

[روزے کی قضاء وکفارہ کا بیان]

[۱] روزہ کا فدیہ دینے کے بعد عذر ختم ہو جائے، تو قضا لازم ہے

۱۵۴۴- سوال: ایک شخص رمضان کا روزہ نہیں رکھ سکا، پھر وہ قضا روزہ رکھنے سے عاجز ہو گیا اور اس قضا روزے کا فدیہ ادا کر دیا، فدیہ کی ادائیگی کے بعد وہ دوبارہ روزہ رکھنے پر قادر ہو گیا، تو کیا اس کو قضا روزہ رکھنا پڑے گا، یا روزہ کے بدلے میں دیا گیا فدیہ کافی ہو جائے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

روزے کا فدیہ ادا ہونے کی شرط یہ ہے کہ عذر موت تک باقی رہے، اگر فدیہ ادا کرنے کے بعد مرض زائل ہو جائے، مریض اچھا ہو جائے اور روزہ رکھنے پر قادر ہو جائے، تو اس کے لیے روزہ رکھنا ضروری ہے، روزے کے بدلے میں دیا گیا فدیہ کافی نہیں ہوگا۔ (طحطاوی وعالم گیری)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] وتلزمهما الفدية . . . "لكل يوم نصف صاع من بر أو قيمته، بشرط دوام عجز الفاني والفانية إلى الموت. (مراقی)

قال الطحطاوي: قوله: "بشرط دوام عجز الفاني والفانية" فمن قدر اقضيا. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱ھ) ص:۶۸۸، كتاب الصوم، فصل في العوارض، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

ولو قدر على الصيام بعد ما فدى بطل حكم الفداء الذي فداه حتى يجب عليه الصوم هكذا في النهاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۷، كتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار التي تبيح الإفطار، ط: دار الفكر- بيروت)

[۲] روزے کا فدیہ ان مریضوں کی جانب سے ادا کیا جائے، جن کی صحت کی امید نہ ہو

۱۵۴۵- سوال: میری والدہ محترمہ سخت بیمار ہیں، مرض اس قدر شدید ہے کہ امسال رمضان المبارک میں روزہ رکھنے کی استطاعت نہیں ہے، تو روزہ کا کتنا فدیہ دینا واجب ہے اور یہ فدیہ کس کو دینا چاہیے؟ اگر مرض زائل ہو جائے، تو کیا دوبارہ روزہ رکھنا ہوگا، یا ان روزوں کے عوض دیا گیا فدیہ کفایت کر جائے گا؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

رمضان المبارک کے روزے فرض ہیں، کسی بیماری کی وجہ سے روزہ رکھنا متعذر رہو، یا روزہ رکھنے کی وجہ سے مرض میں اضافے کا اندیشہ ہو، تو روزہ نہ رکھنے کی گنجائش ہے؛ لیکن رمضان المبارک کے بعد، جب بھی تندرست ہو جائے، چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا واجب ہوگی۔[۱] فدیہ دے دینا کافی نہیں ہوگا۔

فدیہ دینا اس آدمی کے لیے کافی ہو جاتا ہے، جو روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو اور اس کی عدم قدرت موت تک دراز ہو، اگر کسی نے روزے کا فدیہ دے دیا، اور بعد میں روزہ رکھنے پر قدرت حاصل ہو گئی، تو روزے کی قضاء کرنا واجب ہوگا اور فدیہ- جو پہلے دیا گیا تھا- کافی نہ ہوگا۔[۲]

---

(۱) {فمن كان منكم مريضا أو على سفر فعدة من أيام أخر} أي: المريض والمسافر لا يصومان في حال المرض والسفر؛ لما في ذلك من المشقة عليهما، بل يفطران ويقضيان بعدة ذلك من أيام أخر. (تفسير القرآن العظيم-أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۱/ ۴۹۸، سورة البقرة: ۱۸۳، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

(أو مريض خاف الزيادة) لمرضه وصحيح خاف المرض، وخادمة خافت الضعف بغلبة الظن بأمارة أو تجربة أو بأخبار طبيب حاذق مسلم مستور... (وقضوا) لزوما (ما قدروا بلا فدية). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۲۳-۴۲۲، كتاب الصوم، فصل في العوارض المبيحة لعدم الصوم، ط: دار الفكر - بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۱/ ۳۳۳، كتاب الصوم، فصل في العوارض، ط: المكتبة الأميرية، بولاق ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۷، كتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار التي تبيح الإفطار، ط: دار الفكر ☆ فتاوی دار العلوم: ۶/ ۴۲۷، پانچواں باب، ط: دار العلوم دیوبند)

(۲) "ويجوز الفطر لشيخ فان وعجوز فانية"... "وتلزمهما الفدية"... "لكل يوم نصف صاع من بر" أو قيمته بشرط دوام عجز الفاني والفانية إلى الموت. (مراقي الفلاح مع الطحطاوي، ص: ۶۸۸، كتاب الصوم، فصل في العوارض، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

ولو قدر على الصيام بعد ما فدى بطل حكم الفداء الذي فداه حتى يجب عليه الصوم هكذا في النهاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۷، كتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار التي تبيح الإفطار، ط: دار الفكر - بيروت)

اگر آپ کی والدہ محترمہ کی حالت واقعتاً ایسی ہے کہ آئندہ روزہ رکھنے پر قدرت کی امید نہیں ہے، تب ہی فدیہ ادا کریں، ورنہ صحت وتندرستی کا انتظار کریں، اور جب اللہ تعالیٰ تندرستی عطا فرمادے، تو ان روزوں کی قضا کرلیں۔ (۱)

ایک فدیہ کی مقدار صدقۂ فطر کی مقدار کے برابر ہے، یعنی ایک روزہ کے عوض میں ۱ رکلو ۶۷۰ رگرام گیہوں دینے ہوں گے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] نماز اور روزے کے فدیہ کی مقدار

۱۵۴۶- سوال: ہمارے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، اب ہم تین بھائی، دو بہن اور والدہ محترمہ ان کے شرعی وارث ہیں، والد صاحب کی عمر ۵۸ سال تھی، ہم لوگ اپنے والد صاحب کی نماز اور روزوں کا فدیہ دینا چاہتے ہیں، تو ہم کو کتنے سالوں کے فدیے دینے ہوں گے، اور ان کی مقدار کیا ہوگی؟ نیز اس میں ورثاء کا اتفاق ضروری ہے یا نہیں؟ مسئلے کے ہر جزء کی وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

والد صاحب نے نماز وروزے کے فدیے کی وصیت کی ہو، تو فدیہ دینا واجب ہے اور کسی وارث کے اتفاق کی ضرورت نہیں، البتہ ملکیت کے تہائی حصے سے جتنا فدیہ ادا ہوسکتا ہو، اتنا ادا کرنا ضروری ہوگا۔ (۳)

---

(۱) المريض إذا تحقق اليأس من الصحة فعليه الفدية لكل يوم من المرض اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۲۷، كتاب الصوم، فصل في العوارض المبيحة لعدم الصوم)

[۲] (يعطى لكل صلاة نصف صاع من بر) كالفطرة (وكذا حكم الوتر) والصوم. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۷۲-۷۳، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، مطلب في إسقاط الصلاة عن الميت، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق مع حاشية ابن عابدين المعروف بـ 'منحة الخالق': ۲/۹۸، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، فصل: سجود السهو في مطلق الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۲۵، كتاب الصلاة، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت، ط: دار الفكر - بيروت)

ایک صاع = ۳،۱۴۹،۲۸۰ (تین کلو ایک سو انچاس گرام، دوسواسی ملی گرام) ہوتا ہے، تو نصف صاع ۱۵۷۴،۶۴۰ (ایک کلو پانچ سو چہتر گرام، چھ سو چالیس ملی گرام) ہوگا۔ (دیکھیے: الاوزان المحمودۃ، ص: ۱۰۵، ط: دار الکتاب - دیوبند ☆ امداد الاوزان، ص: ۱۹، ط: ہرسولی - مظفرنگر)

(۳) (ولو مات وعليه صلوات فائتة وأوصى بالكفارة يعطى لكل صلاة نصف صاع من بر) كالفطرة (وكذا حكم الوتر) والصوم. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۷۲-۷۳، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، مطلب في إسقاط الصلاة عن الميت، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق مع حاشية ابن عابدين المعروف بـ 'منحة الخالق': ۲/۹۸، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، فصل: سجود السهو في مطلق الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۲۵، كتاب الصلاة، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت، ط: دار الفكر - بيروت)

[اگر فدیہ کی مقدار تہائی مال کی مقدار سے زیادہ ہو، تو ان کے مال سے ادا کرنے کے لیے ورثا کی رضامندی ضروری ہوگی۔]

اگر وصیت نہیں کی ہے، تو ورثاء کا اتفاق ضروری ہے، اگر کوئی وارث متفق نہیں ہے، تو اس کو اس کا حصہ دینا ضروری ہے، اس لیے وراثت تقسیم کردی جائے اور ورثاء کو ان کا حصہ دے دیا جائے، اب جو ورثاء اپنے حصے سے، اپنے مورث کا فدیہ صوم وصلاۃ ادا کرنا چاہیں، کریں، وہ [فدیہ ادا کرنے والے وارث] اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے۔[1]

ہر نماز وروزے کا فدیہ نصف صاع[2] گیہوں یا اس کی قیمت ہے، روزانہ کی نمازیں وتر کے ساتھ

(۱) (يعطي لكل صلاة نصف صاع من بر) كالفطرة (وكذا حكم الوتر) والصوم. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله يعطى) بالبناء للمجهول: أي يعطي عنه وليه: أي من له ولاية التصرف في ماله بوصاية أو وراثة فيلزمه ذلك من الثلث إن أوصى، وإلا فلا يلزم الولي ذلك؛ لأنها عبادة فلا بد فيها من الاختيار، فإذا لم يوص فات الشرط فيسقط في حق أحكام الدنيا للتعذر، بخلاف حق العباد؛ فإن الواجب فيه وصوله إلى مستحقه لا غير، ولهذا لو ظفر به الغريم يأخذه بلا قضاء ولا رضا، ويبرأ من عليه الحق بذلك إمداد. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۷۲-۷۳، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، مطلب في إسقاط الصلاة عن الميت، ط: دار الفكر)

اگر مرنے والے نے اپنے روزے یا نماز کے فدیہ کی وصیت نہ کی ہو اور ولی/ وصی یا کسی اور نے، اپنی جانب سے فدیہ صوم وصلاۃ ادا کیا ہو، تو کیا فدیہ، نماز وروزہ کی طرف سے کافی ہو جائے گا، اس سلسلے میں علامہ شامیؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ثم اعلم أنه إذا أوصى بفدية الصوم يحكم بالجواز قطعا؛ لأنه منصوص عليه. وأما إذا لم يوص فتطوع بها الوارث، فقد قال محمد في الزيادات إنه يجزيه إن شاء الله تعالى، فعلق الإجزاء بالمشيئة لعدم النص، وكذا علقه بالمشيئة فيما إذا أوصى بفدية الصلاة؛ لأنهم ألحقوها بالصوم احتياطا لاحتمال كون النص فيه معلولا بالعجز فتشمل العلة الصلاة، وإن لم يكن معلولا تكون الفدية برا مبتدأ يصلح ماحيا للسيئات فكان فيها شبهة، كما إذا لم يوص بفدية الصوم فلذا جزم محمد بالأول ولم يجزم بالأخيرين، فعلم أنه إذا لم يوص بفدية الصلاة فالشبهة أقوى.

واعلم أيضا أن المذكور فيما رأيته من كتب علمائنا فروعا وأصولا إذا لم يوص بفدية الصوم يجوز أن يتبرع عنه وليه. والمتبادر من التقييد بالولي أنه لا يصح من مال الأجنبي. ونظيره ما قالوه فيما إذا أوصى بحجة الفرض فتبرع الوارث بالحج لا يجوز، وإن لم يوص فتبرع الوارث إما بالحج بنفسه أو بالإحجاج عنه رجلا يجزيه. وظاهره أنه لو تبرع غير الوارث لا يجزيه، نعم وقع في شرح نور الإيضاح للشرنبلالي التعبير بالوصي أو الأجنبي فتأمل، وتمام ذلك في آخر رسالتنا المسماة شفاء العليل في بطلان الوصية بالختمات والتهاليل. (حوالہ سابق)

(۲) ایک صاع = ۲۸۰ء۱۴۹ء۳ (تین کلو ایک سو انچاس گرام، دو سو اسی ملی گرام) ہوتا ہے، تو نصف صاع: ۶۴۰ء۵۷۴ء۱ (ایک کلو پانچ سو چہتر گرام، چھ سو چالیس ملی گرام) ہوگا۔ (دیکھیے: الاوزان المحمودۃ، ص:۱۰۵، ط: دار الکتاب- دیوبند☆امداد الاوزان، ص:۱۹، ط: ہرسولی- مظفر نگر)

۶/ رہیں، تو ۶/ فدیے، روزانہ کی نمازوں کے ہوں گے اور ہر روزے کی طرف سے ایک فدیہ ہوگا۔ اب بالغ ہونے کے بعد جتنی نمازیں اور روزے قضاء ہوں گے، ان تمام کا، حساب کر کے فدیہ ادا کرنا ضروری ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] رمضان کے روزوں کا فدیہ

۱۵۴۷- سوال: اگر کوئی شخص رمضان کے روزے نہ رکھ سکے، تو اس کے کفارہ کی صورت کیا ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

اگر کوئی شخص بیماری کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے، تو جب اس کو قوت حاصل ہو جائے، اس وقت قضاء کر لے، اس کے لیے فدیہ دینا جائز نہ ہوگا؛ ہاں اگر وہ مریض صحت یابی کے بعد، روزے کی قضا کیے بغیر وفات پا جائے اور اس نے کفارے کی وصیت کی ہو، تو ہر روزے کے بدلہ صدقۂ فطر کے برابر فدیہ ادا کرنا ضروری ہے، فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

"ومن كان مريضا في رمضان فخاف إن صام ازداد مرضه أفطر وقضى"... "وإذامات المريض أو المسافر وهما على حالهما لم يلزمهما القضاء" لأنهما لم يدركا عدة من أيام أخر "... "ومن مات وعليه قضاء رمضان فأوصى به أطعم عنه وليه لكل مسكينا نصف صاع من بر أو صاعا من تمر أو شعير".[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] نحیف و کمزور اور عمر دراز شخص کے لیے روزہ اور تراویح کا حکم

۱۵۴۸- سوال: (۱) ایک بڑی عمر کے نحیف و کمزور شخص ہیں، چلنا پھرنا برائے نام کرتے ہیں اور

---

(۱) الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۱۲۴، كتاب الصوم، باب موجب القضاء والكفارة، فصل في من كان مريضا في رمضان إلخ، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت.

{فمن كان منكم مريضاً أو على سفر فعدةٌ من أيام أخر} أي: المريض والمسافر لا يصومان في حال المرض والسفر؛ لما في ذلك من المشقة عليهما، بل يفطران ويقضيان بعدة ذلك من أيام أخر. (تفسير القرآن العظيم-أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۱/ ۴۹۸، سورة البقرة: ۱۸۳، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

ضروری کام بھی بہت مشکل سے کر پاتے ہیں اور ان کے بدن میں گرمی کی مقدار بھی بہت زیادہ ہے، رات دن ان کے بدن پر وقفے وقفے سے پانی چھڑکنا پڑتا ہے، تب جا کر ان کو سکون ملتا ہے اور پیاس بھی ان کو بہت لگتی ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ ایسے شخص کے لیے رمضان کا روزہ رکھنا لازم ہے یا نہیں؟ اگر وہ روزہ نہ رکھے، تو ایک روزے کا فدیہ کیا ہوگا؟ اور اس کو کس طرح ادا کرنا ہوگا؟

(۲) مذکورہ ضعیف شخص کے لیے تراویح کا کیا حکم ہے؟ کیوں کہ کھڑے کھڑے تراویح پڑھنا تو ان کی استطاعت میں نہیں ہے اور بیٹھ کر پڑھتے ہیں، تو تھوڑی دیر کے بعد ان کے ناخن اور پیروں میں ناقابل برداشت درد شروع ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں آٹھ رکعت امام کے ساتھ پڑھے اور باقی نماز مذکورہ عذر کی وجہ سے چھوڑ دے، تو کیا اس کی گنجائش ہو سکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) مذکورہ مریض کی کسی ماہر مسلمان ڈاکٹر یا حکیم سے تشخیص کرائی جائے، اگر کوئی مسلمان نہ ہو، تو غیر مسلم قابل اعتماد ڈاکٹر یا وید سے تشخیص کرائی جائے، اگر تشخیص کرنے والا ڈاکٹر یا وید یہ رائے دے کہ روزہ رکھنے سے ان کی موت ہو سکتی ہے، یا کوئی عضو تلف ہو سکتا ہے، یا آنکھ کی بینائی یا کان کی سماعت ختم ہو سکتی ہے، تو ایسی صورت میں ان کے لیے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔[1] روزہ نہ رکھنے کی صورت میں فدیہ صوم

---

(۱) عن أنس بن مالك، رجل من بني عبد الله بن كعب قال: أغارت علينا خيل رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم، فوجدته يتغدى، فقال: ادن فكل، فقلت: إني صائم، فقال: ادن أحدثك عن الصوم، أو الصيام، إن الله تعالى وضع عن المسافر الصوم، وشطر الصلاة، وعن الحامل أو المرضع الصوم أو الصيام .(سنن الترمذي:۱/۱۵۲، رقم الحديث:۷۱۵، أبواب الصوم، باب ما جاء في الرخصة في الإفطار للحبلى والمرضع، ط: فيصل پبلی کیشنز-دیوبند ☆المجتبى من السنن =السنن الصغرى للنسائي(م:۳۰۳ھ):۴/۱۸۱، رقم الحديث: ۲۲۷۷، الصيام، ذكر وضع الصيام عن المسافر، ذكر اختلاف معاوية بن سلام وعلي بن المبارك في هذا الحديث، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية -حلب)

(قوله: وللحامل والمرضع إذا خافتا على الولد أو النفس) أي لهما الفطر دفعا للحرج ولقوله- صلى الله عليه وسلم- إن الله وضع عن المسافر الصوم وشطر الصلاة وعن الحامل والمرضع الصوم. قيد بالخوف بمعنى غلبة الظن بتجربة أو إخبار طبيب حاذق مسلم كما في الفتاوى الظهيرية.(البحر الرائق:۲/۳۰۷، كتاب الصوم، عوارض الفطر في رمضان، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆العناية شرح الهداية:۲/۳۵۰، فصل في العوارض، ط: دار الفكر-بيروت)

(ومنها المرض) المريض إذا خاف على نفسه التلف أو ذهاب عضو يفطر بالإجماع، وإن خاف زيادة العلة=

لازم ہوگا۔ [۲] ہر روزے کا فدیہ صدقۂ فطر کی مقدار یعنی پونے دوکلو گیہوں یا اس کی قیمت ہے۔ [۳]

لیکن اگر ڈاکٹر یا حکیم کی مذکورہ بالا رائے نہیں ہے، صرف بدن میں گرمی ہے، جس کی وجہ سے پیاس لگتی ہے، تو روزہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ملے گی، روزہ رکھنا ضروری ہے۔ [۴] اور توقع ہے کہ روزہ رکھنے سے مذکورہ تکلیف دہ گرمی کی کیفیت بھی (ان شاء اللہ) کم ہوجائے گی۔

(۲) تراویح کی نماز سنت ہے، جس قدر استطاعت ہو، امام صاحب کے ساتھ تراویح

=وامتدادها فكذلك عندنا، وعليه القضاء إذا أفطر كذا في المحيط. ثم معرفة ذلك باجتهاد المريض والاجتهاد غير مجرد الوهم، بل هو غلبة ظن عن أمارة أو تجربة أو بإخبار طبيب مسلم غير ظاهر الفسق، كذا في فتح القدير. والصحيح الذي يخشى أن يمرض بالصوم فهو كالمريض هكذا في التبيين. (الفتاوى الهندية:۱/۲۰۷، كتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار التي تبيح الإفطار، ط: دار الفكر☆الفتاوى التاتارخانية:۳/۴۰۳، كتاب الصوم، الفصل السابع: في الأسباب المبيحة للفطر، ط: زكريا- ديوبند☆تبيين الحقائق:۲/۱۸۹، كتاب الصوم، فصل في العوارض☆ الهداية:۱/۲۲۱، كتاب الصوم☆مراقي الفلاح، ص:۷۳، كتاب الصوم، فصل في العوارض، ط: زكريا- ديوبند)

(۲) عن ابن عباس: أنه كان يقرأ: "على الذين يطوقونه" وهو الشيخ الهم، والمرأة الهمة لا يستطيعان الصيام، ويفطران، ويطعمان لكل يوم مسكينا كل واحد منهما". (المصنف المعروف بـ'مصنف عبد الرزاق'-أبو بكر عبد الرزاق بن همام بن نافع الحميري اليماني الصنعاني (م:۲۱۱هـ): ۴/۲۲۲، رقم الحديث:۷۵۷۷، كتاب الصيام، باب الشيخ الكبير، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، ط: المكتب الإسلامي- بيروت)

ومن أفطر لشيء من العذر، ثم زال العذر فعليه القضاء بعدد الأيام التي يزول عنه العذر فيها. وليس عليه قضاء ما لم يزل العذر عنه فيها، حتى إن المسافر إذا مات في السفر والمريض قبل البرء لا يجب عليهما القضاء، لأن العاجز لا يكلف وإن أدركا بعدد ما فاتهما يلزمهما القضاء وإذا ماتا قبل القضاء يجب عليهما الفدية. والفدية أن يطعم لكل يوم مسكينا بقدر ما يجب في صدقة الفطر. (تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ):۱/۳۵۹، كتاب الصوم، قبيل مسألة النذر، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۳] (كل مسكين كالفطرة) أي من بر أو زبيب نصف صاع ومن تمر وشعير صاع (أو) أطعم (قيمة ذلك) أي أعطى كلا قدر قيمة الفطرة مطعما. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م:۱۰۷۸هـ):۱/۴۳۷، كتاب الطلاق، باب الظهار، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۴) "والخرف المعتبر" لإباحة الفطر طريق معرفته أمران أحدهما "ما كان مستندا" فيه "لغلبة الظن" فإنها بمنزلة اليقين "بتجربة" سابقة والثاني قوله "أو إخبار طبيب" مسلم حاذق عدل عالم بداء كذا في البرهان وقال الكمال مسلم حاذق غير ظاهر الفسق وقيل عدالته شرط. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح- حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹هـ)، ص:۲۵۸، فصل في العوارض، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

ادا کرے۔(۵)

جو رکعت باقی رہ جائے، استطاعت ہونے پر رات میں ادا کر لے، اگر استطاعت نہ ہو، تو اس کے ترک پر کوئی گناہ نہ ہوگا، ہاں بلا عذر سنت کا ترک کرنا گناہ ہے۔(۶) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] غروب آفتاب سے پہلے چاند نظر آنے پر افطار کر لینے کا شرعی حکم

۱۵۴۹- سوال: اس سال عید الفطر کا چاند افطار سے پہلے ہی نظر آ گیا تھا، جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے غروب آفتاب سے پہلے ہی روزہ افطار کر لیا، تو اب کیا کرنا چاہیے؟ غروب آفتاب سے پہلے چاند نظر آنے پر روزہ افطار کر سکتے ہیں؟ ہمارے یہاں ہوا یہ کہ غروب آفتاب سے پہلے چاند نظر آ گیا، تو مائیک پر اس کا اعلان ہوا، بہت سے لوگوں نے بھول سے اس کو اذان سمجھ کر اپنا روزہ افطار کر لیا، تو اب کیا ان کو اپنے روزے کی قضا کرنی پڑے گی؟

الجواب حامداو مصليا:

چاند دکھائی دینا' سورج غروب ہونے کی علامت نہیں ہے، سورج غروب ہونے کے بعد ہی افطار کرنے کا حکم ہے۔(☆☆)

---

(۵) النضر بن شيبان، قال: -قلت لأبي سلمة بن عبد الرحمن، حدثني بشيء سمعته من أبيك، سمعه أبوك من رسول الله صلى الله عليه وسلم، ليس بين أبيك وبين رسول الله صلى الله عليه وسلم أحد في شهر رمضان قال: نعم- حدثني أبي، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله تبارك وتعالى فرض صيام رمضان عليكم وسننت لكم قيامه، فمن صامه وقامه إيمانا واحتسابا خرج من ذنوبه كيوم ولدته أمه. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي (م: ۳۰۳ھ): ۱۵۸/۴، رقم الحديث: ۲۲۱۰، الصيام، ثواب من قام رمضان وصامه إيمانا واحتسابا، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية- حلب)

(۶) إن الجماعة أفضل؛ لأن عمر -رضي الله تعالى عنه- أقامها بالجماعة، بمحضر من كبار الصحابة وخيارهم. (الفتاوى الخانية على هامش الهندية: ۲۳۳/۱، باب التراويح، ط: زكريا- ديوبند)

رجل ترك سنن الصلاة إن لم ير السنن حقا فقد كفر؛ لأنه تركها استخفافا وإن رآها حقا فالصحيح أنه يأثم؛ لأنه جاء الوعيد بالترك. كذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية: ۱۱۲/۱، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، ط: دار الفكر- بيروت ☆ البحر الرائق: ۸۶/۲، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: زكريا- ديوبند)

(☆☆)... بقوله: (ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ) [سورة البقرة: ۱۸۷] لأن الليل غاية لصوم الصائم، إذا بلغه فقد قضى ما =

اس لیے جن حضرات نے سورج غروب ہونے سے پہلے اپنا روزہ افطار کرلیا ہے، ان کو اپنے روزے کی قضا کرنی ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] روزہ: کفارہ، مقدار اور ادائیگی کا طریقہ

۱۵۵۰-سوال: میری والدہ کی عمر تقریباً پچپن سے ساٹھ سال کی ہے، پانچ چھ سال سے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، وہ اکثر بیمار ہی رہتی ہیں، جس کی وجہ تقریباً تین سال کے رمضان کے فرض روزے بھی وہ نہیں رکھ سکی ہیں، نیز مسلمان ڈاکٹروں کا مشورہ بھی ان کے لیے روزہ نہ رکھنے کا ہے، اس عرصہ میں جب ان کی طبیعت اچھی رہتی تھی، تو روزے رکھ لیا کرتی تھی اور جب طبیعت بگڑتی تو روزے نہیں رکھتی تھی۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان روزوں سے آخرت میں چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے شریعت میں کیا کفارہ ہے؟ اور کفارے کی رقم یا اناج کس کو دینا چاہیے؟ پورا کفارہ ایک ہی شخص کو دے سکتے ہیں یا الگ الگ افراد کو دینا ضروری ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

مذکورہ مسئلہ کو شریعت کی اصطلاح میں ''مسئلۂ شیخ فانی یا فانیہ'' کے نام سے بیان کیا جاتا ہے، آپ کی

=عليه. (تفسير الطبري = جامع البيان عن تأويل آي القرآن-محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي، أبو جعفر الطبري (م:۳۱۰ھ): ۱۸۴/۸، القول في تأويل قوله تعالى: وأيديكم إلى المرافق، ت: د. عبد الله بن عبد المحسن التركي، ط: دار هجر للطباعة والنشر والتوزيع والإعلان)

ورؤيته نهارا قبل الزوال وبعده غير معتبر. (الدر المختار)ـــــ قال ابن عابدين: ومعنى عدم اعتبارها أنه لا يثبت بها حكم من وجوب صوم أو فطر فلذا قال في الخانية فلا يصام له ولا يفطر. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۹۳/۲، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، مطلب في رؤية الهلال نهارا، ط: دار الفكر-بيروت)

تفصیل کے لیے دیکھیے: فتاویٰ محمودیہ: ۱۲۸/۱۰، کتاب الصوم، باب رؤیۃ الہلال، ط: مکتبہ شیخ الاسلام-دیوبند۔

(۱) **(أو تسحر أو أفطر يظن اليوم) أي الوقت الذي أكل فيه (ليلا و) الحال أن (الفجر طالع والشمس لم تغرب)... (قضى)... (فقط).** [الدر المختار مع رد المحتار: ۴۰۵/۲، باب ما يفسد الصوم وما لا يفسد، ط: دار الفكر☆درر الحكام شرح غرر الأحكام-محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا- أو منلا أو المولى - خسرو (م:۸۸۵ھ): ۲۰۴/۱، باب موجب الإفساد في الصوم، ط: دار إحياء الكتب العربية☆العناية شرح الهداية: ۳۷۲/۲، كتاب الصوم، فصل في العوارض، ط: دار الفكر☆الجوهرة النيرة: ۱۴۴/۱، كتاب الصوم، ط: المطبعة الخيرية☆ فتاویٰ عثمانی-مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ: ۱۸۷/۲، كتاب الصوم، فصل المسائل المتعلقة بالصوم، ط: نعیمیہ-دیوبند]

والدہ جتنے دنوں کے روزے نہیں رکھ سکی ہے، تو ہر روزے کا ایک فدیہ یعنی "صدقہ فطر کی مقدار" کسی بھی غریب شخص کو- جو زکوۃ کا مستحق ہو- دینا ضروری ہے۔[1]

لہٰذا تین سال کے روزوں کا حساب کر کے ہر روزے کا ایک فدیہ لازم ہوگا اور ایک فقیر کو دس پندرہ دنوں کے روزوں کا ایک ساتھ فدیہ دینے میں کوئی حرج نہیں، ہر دن کے روزے کا فدیہ الگ الگ فقیر کو دینا ضروری اور لازم نہیں ۔[2] نیز ہر فدیہ کے عوض اگر کسی فقیر اور غریب آدمی کو صبح وشام پیٹ بھر کر کھانا کھلانا چاہیں، تو کھلا سکتے ہیں، اس سے بھی فدیہ ادا ہو جائے گا۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱)(ومنها: كبر السن) فالشيخ الفاني الذي لا يقدر على الصيام يفطر ويطعم لكل يوم مسكينا كما يطعم في الكفارة كذا في الهداية. والعجوز مثله كذا في السراج الوهاج. وهو الذي كل يوم في نقص إلى أن يموت كذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۷، كتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار التي تبيح الإفطار، ط: دار الفكر)

(يعطى لكل صلاة نصف صاع من بر) كالفطرة (وكذا حكم الوتر) والصوم. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله نصف صاع من بر) أي أو من دقيقه أو سويقه، أو صاع تمر أو زبيب أو شعير أو قيمته، وهي أفضل عندنا لإسراعها بسد حاجة الفقير إمداد. ثم إن نصف الصاع ربع مد دمشقي من غير تكويم؛ بل قدر مسحه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۷۲-۷۳، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، مطلب في إسقاط الصلاة عن الميت، ط: دار الفكر)

(۲)(وللشيخ الفاني العاجز عن الصوم الفطر ويفدي) وجوبا ولو في أول الشهر وبلا تعدد فقير كالفطرة لو موسرا. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۲۷، كتاب الصوم، فصل في العوارض المبيحة لعدم الصوم، ط: دار الفكر)

"ويجوز إعطاء فدية صلوات" وصيام أيام ونحوها "لواحد" من الفقراء "جملة". (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح-- حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹ھ) ص: ۱۷۱، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية☆حاشية الطحطاوي على المراقي ص: ۴۴۰، كتاب الصلاة، فصل في إسقاط الصلاة والصوم، ت: عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۲۷، كتاب الصوم، فصل في العوارض المبيحة. . .)

يندب دفع ما يغنيه يومه عن السؤال، واعتبار حاله من حاجة وعيال. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: والأوجه أن ينظر إلى ما يقتضيه الحال في كل فقير من عيال وحاجة أخرى كدهن وثوب وكراء منزل وغير ذلك كما في الفتح اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۵، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، فروع في مصرف الزكاة)

(وكره إعطاء فقير نصابا) أو أكثر (إلا إذا كان) المدفوع إليه (مديونا أو) كان (صاحب عيال) بحيث (لو فرقه عليهم لا يخص كلا) أو لا يفضل بعد دينه (نصاب) فلا يكره، فتح. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۵۳، الزكاة)

(۳) وكفارة الإفطار في شهر رمضان إذا عجز عن الإعتاق لفقره وعجز عن الصوم لكبره جاز له أن يطعم ستين مسكينا؛ لأن هذا صار بدلا عن الصيام بالنص كذا في شرح الطحاوي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۷، كتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار التي تبيح الإفطار، ط: دار الفكر- بيروت)

[۸] سفر غیر شرعی میں پیاس کی شدت کی وجہ سے روزہ توڑ دینا

۱۵۵۱- سوال: ایک عورت نے رمضان کا فرض روزہ سفر غیر شرعی میں پیاس کی شدت کی وجہ سے توڑ دیا، تو اس پر صرف قضا واجب ہوگی یا کفارہ بھی لازم ہوگا؟

الجواب حامدا ومصليا:

پیاس کی شدت ایسی ہو کہ ہلاکت کا خوف ہو، یا بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو، تو ایسی صورت میں قضا واجب ہوگی اور اگر ہلاکت یا مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ نہ ہو، تو کفارہ بھی لازم ہوگا۔ مذکورہ صورت میں پیاس سے پریشان ہو کر روزہ افطار کیا ہے، تو کفارہ واجب ہوگا۔[۱]

مرض کی شدت [کہ جس کی وجہ سے روزہ توڑنے کی اجازت ہے] کا فیصلہ ایسے مسلمان ماہر طبیب کے مشورے سے کیا جائے گا، جو روزہ کی حقیقت اور اس کی عظمت سے واقف ہو۔ (فتاوی عالمگیری)[۲]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] چند فدیہ ایک دفعہ، ایک شخص کو دینا

۱۵۵۲- سوال: ایک شخص اپنے ایک سے زائد فدیہ مثلاً پانچ روزے کا فدیہ دو کیلو گیہوں کے

---

(۱) (ومنها العطش والجوع كذلك) إذا خيف منهما الهلاك أو نقصان العقل كالأمة إذا ضعفت عن العمل وخشيت الهلاك بالصوم. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۷، كتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار التي تبيح الإفطار، ط: دار الفكر)

(ومنها المرض) المريض إذا خاف على نفسه التلف أو ذهاب عضو يفطر بالإجماع، وإن خاف زيادة العلة وامتدادها فكذلك عندنا، وعليه القضاء إذا أفطر كذا في المحيط. (المصدر السابق☆الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۴۰۳، كتاب الصوم، ط: زكريا- ديوبند☆تبيين الحقائق: ۲/ ۱۸۹، كتاب الصوم، فصل في العوارض، ط: زكريا- ديوبند☆الهداية: ۱/ ۲۲۱، كتاب الصوم)

[۲] ثم معرفة ذلك باجتهاد المريض والاجتهاد غير مجرد الوهم بل هو غلبة ظن عن أمارة أو تجربة أو بإخبار طبيب مسلم غير ظاهر الفسق كذا في فتح القدير. والصحيح الذي يخشى أن يمرض بالصوم فهو كالمريض هكذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۷، كتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار التي تبيح الإفطار)

قيد بالخوف بمعنى غلبة الظن بتجربة أو إخبار طبيب حاذق مسلم كما في الفتاوى الظهيرية. (البحر الرائق: ۲/ ۳۰۷، كتاب الصوم، فصل في العوارض، ط: الكتاب الإسلامي☆العناية شرح الهداية: ۲/ ۳۵۰، كتاب الصوم، فصل في العوارض، ط: دار الفكر☆مراقي الفلاح، ص: ۱۷۳، كتاب الصوم، فصل في العوارض، ط: زكريا- ديوبند)

حساب سے ایک شخص کو ایک دِن میں دس کیلو گیہوں دے تو پانچ روزہ کا فدیہ ادا ہوا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اِمام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق ایک ہی دِن کا فدیہ ادا ہوگا، اِمام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق ایک سے زائد یعنی جتنے دِنوں کا فدیہ دیا گیا ہو، ادا ہو جائے گا، اور امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق ایک روایت اِمام ابو یوسفؒ سے بھی ثابت ہے۔ (شامی)[1]

فتاویٰ دار العلوم میں لکھا ہے کہ جتنے روزے کا فدیہ ایک فقیر کو دیا ہے، اتنے دن کا ادا ہوگا۔[2]

لیکن احقر کا فتویٰ اِمام صاحبؒ کے قول کے مطابق ایک دِن کے فدیہ کی ادائیگی پر ہے؛ چوں کہ عبادت کی ادائیگی میں احتیاط بہتر ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[١] (وللشيخ الفاني العاجز عن الصوم الفطر ويفدي) وجوبا ولو في أول الشهر وبلا تعدد فقير كالفطرة لو موسرا وإلا فيستغفر الله هذا إذا كان الصوم أصلا بنفسه وخوطب بأدائه. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله وبلا تعدد فقير) أي بخلاف نحو كفارة اليمين للنص فيها على التعدد، فلو أعطى هنا مسكينا صاعا عن يومين جاز، لكن في البحر عن القنية أنه عن أبي يوسف فيه روايتين، وعند أبي حنيفة لا يجزيه كما في كفارة اليمين، وعن أبي يوسف لو أعطى نصف صاع من بر عن يوم واحد لمساكين يجوز، قال الحسن وبه نأخذ اهـ ومثله في القهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ٤٢٧، كتاب الصوم، فصل في العوارض المبيحة لعدم الصوم، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق - زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م: ٩٧٠هـ): ٢/ ٣٠٩، كتاب الصوم، فصل في عوارض الفطر في رمضان، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(٢) کفارہ میں تو ایک محتاج کو ایک دن میں زیادہ دینے سے ایک دن کا فدیہ ادا ہوتا ہے، مثلاً: قسم کے کفارے میں دس مسکینوں یا روزہ کے کفارہ میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا دینے کا حکم ہے، تو ان میں اگر ایک فقیر کو ایک دن میں زیادہ مقدار دے گا، تو ایک دن کا ہوگا، زیادہ محسوب نہ ہوگا، اور شیخ فانی - جس کو رمضان کے روزوں کا فدیہ دینا درست ہے - اس میں اگر ایک محتاج کو کئی روزوں کا فدیہ دے دیوے، تو ادا ہو جاتا ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ٦/ ٤٥٠، مسائل کفارہ، فدیۂ صوم میں ایک ماہ ایک فقیر کو کھانا دیا جائے اور بقیہ ایام کا ایک دفعہ دے دیا جائے، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟، ط: زکریا - دیوبند)

(٣) وأبو حنيفة - رحمه الله تعالى - يقول: الأخذ بالاحتياط في العبادات أصل. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ٤٨٣هـ): ١/ ٢٤٦، كتاب الصلاة، اقتداء المسافر بالمقيم، ط: دار المعرفة - بيروت)

[الأصل] الاحتياط في باب العبادات واجب.

قال الشيخ وهبة الزحيلي توضيحا لهذا الأصل: الاحتياط يعني الأخذ بالثقة، والتأكد من الشيء للاطمئنان له، والقاعدة المستقرة في العبادات وجوب أدائها بكمالها، لتبرأ الذمة منها، فإن طرأ شك أو تردد في أدائها كاملة، أو =

[۱۰] کفارۂ صوم کب واجب ہوگا؟

۱۵۵۳- سوال: میں نے یہ سنا ہے کہ بیماری اور مجبوری کی وجہ سے کوئی روزہ نہ رکھ سکے، تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے، جس کو طاقت نہ ہو، تو جتنے لوگوں کو ہو سکے، کھلا وے اور استغفار کرتا رہے، اس طرح کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ بات صحیح ہے؟

میرے پاس جتنی رقم ہے، اسے ہوٹل میں مسکینوں کو کھلانے کے لیے بہ طورِ کفارہ دے سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ نے جو سنا ہے، وہ غلط ہے، یا سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔

بیماری یا کوئی عذر کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا، تو جب اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے، اس کی قضا کریں، جتنے روزے رہ گئے ہیں، سب کے بدلے ایک ایک روزہ ہے۔ (۱)

=في أداء بعض أركانها، فيجب على المكلف الأخذ والعمل بما هو أوثق وأحوط في دينه، لأن ذمته مشغولة بالعبادة المطلوبة يقيناً، فيجب أن تؤدى العبادة على وجه اليقين أو غلبة الظن لتبرأ الذمة، لأن الذمة إذا شغلت بيقين فلا تبرأ إلا بيقين مثله، لذلك كان الاحتياط في باب العبادات واجباً، سواء كان بالأداء أم بالقضاء، وهذا ما أكده السرخسي الحنفي رحمه الله تعالى. (القواعد الفقهية وتطبيقاتها في المذاهب الأربعة- د. محمد مصطفى الزحيلي (عميد كلية الشريعة والدراسات الإسلامية- جامعة الشارقة سابقا): ۱/ ۵۹۹، الباب الثالث: القواعد الكلية في المذهب الحنفي، رقم القاعدة: ۱۱۷، ط: دار الفكر- دمشق)

(۱) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (۲-البقرة: ۱۸۴)

{فمن كان منكم مريضا أو على سفر فعدة من أيام أخر} أي: المريض والمسافر لا يصومان في حال المرض والسفر، لما في ذلك من المشقة عليهما، بل يفطران ويقضيان بعدة ذلك من أيام أخر. (تفسير القرآن العظيم-أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۱/ ۴۹۸، سورة البقرة: ۱۸۳، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

(أو مريض خاف الزيادة) لمرضه وصحيح خاف المرض، وخادمة خافت الضعف بغلبة الظن بأمارة أو تجربة أو بأخبار طبيب حاذق مسلم مستور... (وقضوا) لزوما (ما قدروا بلا فدية). (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۲۳-۴۲۲، كتاب الصوم، فصل في العوارض المبيحة لعدم الصوم، ط: دار الفكر- بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۱/ ۳۳۳، كتاب الصوم، فصل في العوارض، ط: المكتبة الأميرية، بولاق ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۷، كتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار التي تبيح الإفطار، ط: دار الفكر ☆ فتاوی دار العلوم: ۶/ ۴۲۷، پانچواں باب، ط: دار العلوم دیوبند)

اگر کوئی شخص روزہ رکھنے کے بعد، اس کو توڑ دے، تو اس پر کفارہ واجب ہوتا ہے، جس کی ادائیگی کی ایک شکل مسلسل ساٹھ روزے رکھنا ہے۔ (☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] عمر بھر ہر مہینے میں ایک روزہ رکھنے کی نذر مانی ہو، پھر نہ رکھ سکے تو کفارہ کیسے ادا کرے؟

۱۵۵۴- سوال: ایک عورت نے عمر بھر ہر مہینے میں ایک روزہ رکھنے کی نیت کی، لیکن بعد میں پیرانہ سالی اور ضعف کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ پا رہی ہیں، تو ہر روزے کا کفارہ کتنے روپئے ادا کرے؟ اور کیا یہ کفارہ کسی ایک ہی فقیر کو دینا ضروری ہے، یا دو فقیروں میں آدھا آدھا تقسیم کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

مذکورہ عورت نے اگر اپنے الفاظ کے ذریعہ منت کا ارادہ کیا ہے، تو اُس کے لیے ضروری ہے کہ ہر روزے کے کفارے میں ایک مسکین کو صبح وشام پیٹ بھر کر کھلا دے، ورنہ اُسے صدقۃ الفطر کے مطابق ۴/ رطل غلہ دے دے۔ (۱)

اور ایک کفارہ کسی ایک ہی مسکین کو دینا ضروری ہے، ایک کفارہ دو مسکین میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری: ۱/ ۵۱۴) [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد ابراہیم بیات غفرلہ

(☆☆) "ولو أكل أو شرب ما يتغذى به أو ما يداوى به فعليه القضاء والكفارة". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۱۲۲، كتاب الصوم، باب ما يوجب القضاء والكفارة، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۵، كتاب الصوم، الباب الرابع فيما يفسد وما لا يفسد، النوع الثاني ما يوجب القضاء والكفارة، ط: دار الفكر)

(۱) إذا نذر أن يصوم كل خميس يأتي عليه فأفطر خميسا واحدا فعليه قضاؤه كذا في المحيط. ولو أخر القضاء حتى صار شيخا فانيا أو كان النذر بصيام الأبد فعجز لذلك أو باشتغاله بالمعيشة لكون صناعته شاقة فله أن يفطر ويطعم لكل يوم مسكينا على ما تقدم. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۹، كتاب الصوم، الباب السادس في النذر، ط: دار الفكر)

[۲] لو غدى ستين وعشى ستين غيرهم لا يجزيه إلا أن يعيد على أحد الستينين منهم غداء وعشاء كذا في التبيين، والمستحب أن يكون الغداء والعشاء بخبز وإدام كذا في شرح النقاية لأبي المكارم. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۹، كتاب الطلاق، الباب العاشر في الكفارة، ط: دار الفكر)

[۱۲] روزے کی منت ماننے والے کی جانب سے اُس کے رشتہ دار روزہ رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟

۱۵۵۵- سوال: ہمارے گاؤں میں ایک شخص نے یہ منت مانی کہ میرا فلاں کام ہو جائے گا، تو میں ایک مہینے کے روزے رکھوں گا، پھر وہ کام ہو گیا، لیکن اب یہ شخص روزے نہیں رکھتا، حتی کہ نوجوان ہونے کے باوجود رمضان کے روزے بھی نہیں رکھتا، اُس کے بعض رشتہ دار اِس بات پر تیار ہیں کہ اگر اُس کی جانب سے کسی اور کا روزہ رکھنا صحیح ہو، تو وہ رشتہ دار اُس کی جانب سے روزہ رکھ لیں، تو کیا اِس طرح کرنا صحیح ہے؟ بہ صورتِ دیگر فدیہ کی کیا شکل رہے گی؟

الجواب حامداً ومصلیا:

منت ماننے والے کا خود روزہ رکھنا ضروری ہے۔ (۱) اُس کی جانب سے رشتہ داروں کا روزہ رکھنا صحیح نہیں ہے۔ (۲)

فدیہ دینے کی گنجائش اُسی شکل میں ہے، جب کہ کسی ماہر، مسلمان، دین دار طبیب نے تاکید کی ہو کہ روزہ رکھنے کی وجہ سے ہلاکت یا کسی عضو کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے، یا کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے، تو اِن صورتوں میں ہر روزہ کے لیے فدیہ ادا کرنا صحیح ہے، جس کی شکل یہ ہے کہ تیس روزے کے لیے کسی ایک فقیر کو تیس دِن تک صبح وشام کھانا کھلا دے، یا تیس فقراء کو ایک دِن صبح وشام کھانا کھلا دے، دوسری

---

(۱) "إذا نذر شيئا" من القربات "لزمه الوفاء به" لقوله تعالى: {وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ} [الحج:29] وقوله صلى الله عليه وسلم: "من نذر أن يطيع الله فليطعه ومن نذر أن يعصي الله فلا يعصه" رواه البخاري، والإجماع على وجوب الإيفاء به وبه استدل القائلون بافتراضه. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح-حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ) ص:۲۶۱، كتاب الصوم، باب مايلزم الوفاء به من منذور الصوم والصلاة وغيرهما، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

(۲) عن عطاء بن أبي رباح، عن ابن عباس، قال: لا يصلي أحد عن أحد، ولا يصوم أحد عن أحد ولكن يطعم عنه مكان كل يوم مدا من حنطة. (السنن الكبرى-أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م:۳۰۳ھ): ۲۵۷/۳، رقم الحديث: ۲۹۳۰، كتاب الصيام، صوم الحي عن الميت وذكر اختلاف الناقلين للخبر في ذلك، ت: حسن عبد المنعم شلبي، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)

ولا يجوز صوم أحد عن أحد حي أو ميت في كفارة أو غيرها كذا في المبسوط لشمس الأئمة السرخسي. (الفتاوى الهندية: ۲/۶۴، كتاب الأيمان، الفصل الثاني في الكفارة، ط: دار الفكر☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۲۵، كتاب الصوم، فصل في العوارض المبيحة لعدم الصوم، ط: دار الفكر)

صورت یہ ہے کہ ہر روزہ کے فدیہ کے طور پر صدقۃ الفطر کے برابر صدقہ کرے، لہٰذا تیس فدیہ کے تیس صدقات ادا کرے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۳] (وللشيخ الفاني العاجز عن الصوم الفطر ويفدي) وجوبا ولو في أول الشهر وبلا تعدد فقير كالفطرة لو موسرا وإلا فيستغفر الله هذا إذا كان الصوم أصلا بنفسه وخوطب بأدائه، حتى لو لزمه الصوم لكفارة يمين أو قتل ثم عجز لم تجز الفدية. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله وللشيخ الفاني) أي الذي فنيت قوته أو أشرف على الفناء، ولذا عرفوه بأنه الذي كل يوم في نقص إلى أن يموت نهر، ومثله ما في القهستاني عن الكرماني: المريض إذا تحقق اليأس من الصحة فعليه الفدية لكل يوم من المرض اهـ وكذا ما في البحر لو نذر صوم الأبد فضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعيشة له أن يطعم ويفطر لأنه استيقن أنه لا يقدر على القضاء (قوله العاجز عن الصوم) أي عجزا مستمرا كما يأتي، أما لو لم يقدر عليه لشدة الحر كان له أن يفطر ويقضيه في الشتاء فتح (قوله ويفدي وجوبا) لأن عذره ليس بعرضي للزوال حتى يصير إلى القضاء فوجبت الفدية نهر، ثم عبارة الكنز وهو يفدي إشارة إلى أنه ليس على غيره الفداء لأن نحو المرض والسفر في عرضة الزوال فيجب القضاء وعند العجز بالموت تجب الوصية بالفدية.

(قوله ولو في أول الشهر) أي يخير بين دفعها في أوله وآخره كما في البحر (قوله وبلا تعدد فقير) أي بخلاف نحو كفارة اليمين للنص فيها على التعدد، فلو أعطى هنا مسكينا صاعا عن يومين جاز لكن في البحر عن القنية أن عن أبي يوسف فيه روايتين وعند أبي حنيفة لا يجزيه كما في كفارة اليمين، وعن أبي يوسف لو أعطى نصف صاع من بر عن يوم واحد لمساكين يجوز، قال الحسن: وبه نأخذ اهـ ومثله في القهستاني (قوله لو موسرا) قيد لقوله يفدي وجوبا . . . (قوله هذا) أي وجوب الفدية على الشيخ الفاني ونحوه (قوله أصلا بنفسه) كرمضان وقضائه والنذر كما مر فيمن نذر صوم الأبد، وكذا لو نذر صوما معينا فلم يصم حتى صار فانيا جازت له الفدية بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۲۷، كتاب الصوم، فصل في العوارض المبيحة لعدم الصوم، ط: دار الفكر - بيروت)

عن ابن عباس رضي الله عنهما، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قدم المدينة فوجد اليهود صياما، يوم عاشوراء، فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما هذا اليوم الذي تصومونه؟ فقالوا: هذا يوم عظيم، أنجى الله فيه موسى وقومه، وغرق فرعون وقومه، فصامه موسى شكرا، فنحن نصومه، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: فنحن أحق وأولى بموسى منكم، فصامه رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأمر بصيامه.

(صحيح البخاري: ۱/۲۸۱، رقم الحديث: ۳۳۹۷، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى: {وهل أتك حديث موسى} [طٰہٰ:۹] {وكلم الله موسى تكليما}، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/۳۵۹، رقم الحديث: ۱۲۸-(۱۱۳۰)، كتاب الصيام، باب صوم يوم عاشوراء، ط: ديوبند، واللفظ لمسلم)

باب الصوم النفل وغيره

[نفلی روزے کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الصوم النفل وغیرہ

[نفلی روزے کا بیان]

[۱] تنہا عاشورہ کا روزہ رکھنا جائز ہے

۱۵۵۶- سوال: عاشورہ کے روزہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اس میں تم یہود کی مخالفت کرو یعنی یہود ایک روزہ رکھتے ہیں لہٰذا تم دو روزے رکھو یعنی نو اور دس تاریخ یا دس اور گیارہ تاریخ کا روزہ رکھو، تو سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تنہا عاشورہ کا روزہ رکھے، تو اس میں کوئی کراہیت ہے یا نہیں؟

''خطبۂ موعظت'' میں عاشورہ کے فضائل سے قبل محرم کا جو خطبہ ہے، اس میں لکھا ہے کہ ہمارے فقہاء احناف کا بھی یہی مسلک ہے کہ تنہا عاشورہ کا روزہ رکھنا مکروہ ہے، آپ شریعت کی رو سے تحقیقی جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

مستفتی: یعقوب سورتی

الجواب حامداً ومصلیاً:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دسویں محرم (عاشورہ) کا روزہ رکھا تھا۔ (۱)

---

(۱) عن ابن عباس رضي الله عنهما، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قدم المدينة فوجد اليهود صياما، يوم عاشوراء، فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما هذا اليوم الذي تصومونه؟ فقالوا: هذا يوم عظيم، أنجى الله فيه موسى وقومه، وغرق فرعون وقومه، فصامه موسى شكرا، فنحن نصومه، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: فنحن أحق=

بدائع الصنائع میں لکھا ہے کہ فقط دسویں کا روزہ رکھنا مکروہ نہیں ہے۔ (۲)

البتہ سب سے افضل وبہتر یہ ہے کہ نو دس اور گیارہ (۹-۱۰-۱۱) تین دن کے روزے رکھے جائیں۔ (۳) اور درمیانی راہ یہ ہے کہ نو، دس (۹-۱۰) یا دس، گیارہ (۱۰-۱۱) کا روزہ رکھے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے قبل ارشاد فرمایا تھا کہ یہود کی مخالفت کرتے ہوئے دس تاریخ سے پہلے یا بعد میں بھی روزہ رکھ لیا کرو۔ (۴)

= وأولى بموسى منكم، فصامه رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأمر بصيامه. (صحيح البخاري: ۴۸۱/۱، رقم الحديث: ۳۳۹۷، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى: {وهل أتاك حديث موسى} [طه: ۹] {وكلم الله موسى تكليما}، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۳۵۹/۱، رقم الحديث: ۱۲۸-(۱۱۳۰)، كتاب الصيام، باب صوم يوم عاشوراء، ط: ديوبند، واللفظ لمسلم)

(۲) وكره بعضهم صوم يوم عاشوراء وحده لمكان التشبه باليهود، ولم يكرهه عامتهم؛ لأنه من الأيام الفاضلة، فيستحب استدراك فضيلتها بالصوم. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ۷۹/۲، كتاب الصوم، فصل شرائط أنواع الصيام، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۳) عن ابن عباس، رضي الله عنهما، عن رسول الله- صلى الله عليه وسلم- أنه قال في صوم عاشوراء: صوموه وخالفوا فيه اليهود، وصوموا قبله يوما، وبعده يوما. (مسند البزار المنشور باسم البحر الزخار-أبو بكر أحمد بن عمرو بن عبد الخالق بن خلاد بن عبيد الله العتكي المعروف بـ'البزار' (م: ۲۹۲هـ): ۳۹۹/۱۱، رقم الحديث: ۵۲۳۸، مسند ابن عباس رضي الله عنهما، ط: مكتبة العلوم والحكم- المدينة المنورة ☆ الفوائد، المعروف بـ 'فوائد تمام'- أبو القاسم تمام بن محمد بن عبد الله بن جعفر، البجلي الرازي ثم الدمشقي (م: ۴۱۴هـ): ۴۷/۱، رقم الحديث: ۹۴، ت: حمدي عبد المجيد السلفي، ط: مكتبة الرشد - الرياض ☆ السنن الكبرى- أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۴۷۵/۴، رقم الحديث: ۸۴۰۶، كتاب الصيام، باب صوم يوم التاسع، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ شعب الإيمان- أبو بكر البيهقي: ۳۳۰/۵، رقم الحديث: ۳۵۱۱، الصيام، صوم التاسع مع العاشر، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون مع الدار السلفية ببومباي بالهند)

(۴) عبد الله بن عباس رضي الله عنهما، يقول: حين صام رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم عاشوراء وأمر بصيامه قالوا: يا رسول الله إنه يوم تعظمه اليهود والنصارى، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: فإذا كان العام المقبل إن شاء الله صمنا اليوم التاسع، قال: فلم يأت العام المقبل، حتى توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم. (الصحيح لمسلم: ۳۵۹/۱، رقم الحديث: ۱۳۳-(۱۱۳۴)، كتاب الصيام، باب صوم يوم عاشوراء، ط: ديوبند)

"وأما" القسم الثالث وهو "المسنون فهو صوم عاشوراء" فإنه يكفر السنة الماضية "مع" صوم "التاسع" لصومه صلى الله عليه وسلم العاشر وقال: "لئن بقيت إلى قابل لأصومن التاسع". (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹هـ) ص: ۲۳۵، كتاب الصوم، فصل في صفة الصوم وتقسيمه، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية ☆ الفتاوى الهندية: ۲۰۲/۱، كتاب الصوم، المرغوبات من الصيام، قبيل الباب الرابع، ط: دار الفكر ☆ فتح القدير: ۲۵۹/۴، كتاب الصوم)

پس تنہا عاشورہ کا روزہ مکروہ نہیں ہے، اور آپ نے سوال میں جو حوالہ بیان کیا ہے، اس میں کراہت سے مراد کراہت تنزیہی ہے، جو مستحب کے مقابل میں ہے؛ اس لیے جو حضرات تنہا عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں ان پر نکیر نہیں کرنی چاہیے۔ (☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] محرم کا روزہ نو-دس، یا دس-گیارہ کو؟

۱۵۵۷- سوال: محرم الحرام کے کتنے روزے رکھنا مستحب ہے؟ اور کون سی تاریخ کو رکھیں، آیا نویں یا دسویں کو یا دسویں اور گیارہویں محرم کو؟ کتاب کے حوالے کے ساتھ جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

عاشورہ کے موقع پر دو روزے رکھنا مستحب ہے، تا کہ یہود کی مشابہت لازم نہ آئے، یہود فقط دسویں محرم الحرام کا روزہ رکھتے ہیں، ہم ۹-۱۰ یا ۱۰-۱۱ کا روزہ رکھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: صوموا التاسع والعاشر وخالفوا الیہود. (ترمذی شریف: ۱/ ۱۴۲)[۱] لیکن اگر صرف دسویں کا روزہ رکھ لے، تب بھی ثواب مل جائے گا۔ (۲) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

(☆☆☆) حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ کریں۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں: ہمارے زمانے میں چوں کہ یہود ونصاریٰ وغیرہ یوم عاشورہ (دسویں محرم) کو روزہ نہیں رکھتے؛ بل کہ ان کا کوئی کام بھی قمری مہینوں کے حساب سے نہیں ہوتا، اس لیے اب کسی اشتراک اور تشابہ کا سوال ہی نہیں رہا، لہٰذا فی زماننا رفع تشابہ کے لیے نویں یا گیارہویں کا روزہ رکھنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔ واللہ اعلم۔ (معارف الحدیث-محمد منظور نعمانی (م:)۴/ ۳۸۷، کتاب الصوم، یوم عاشورہ کا روزہ اور اس کی تاریخی اہمیت، ط: دارالاشاعت-کراچی)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں: فی زمانہ-جب کہ یہود اس دن روزہ نہیں رکھتے-خیال ہوتا ہے کہ صرف ۱۰/ محرم کو بھی روزہ رکھ لیا جائے، تو قباحت نہیں، ہاں احتیاط دو روزے رکھنے میں ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۳/ ۴۴۸، نفل روزے، ط: نعیمیہ-دیوبند)

[۱] عن ابن عباس قال: أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم بصوم عاشوراء يوم العاشر. قال ابو عيسى: حديث ابن عباس حسن صحيح، واختلف أهل العلم في يوم عاشوراء، فقال بعضهم: يوم التاسع، وقال بعضهم: يوم العاشر"، وروي عن ابن عباس أنه قال: صوموا التاسع والعاشر وخالفوا اليهود. (سنن الترمذي: ۱/ ۱۵۸، رقم الحديث: ۷۵۵، أبواب الصوم، باب ما جاء عاشوراء أي يوم هو، ط: فيصل پبلی کیشنز-ديوبند)

(۲) عبد الله بن عباس رضي الله عنهما، يقول: حين صام رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم عاشوراء وأمر بصيامه =

[۳] یوم الشک کا روزہ

۱۵۵۸- سوال: آسمان کے غبار آلود ہونے کی وجہ سے رمضان کا چاند ہمارے مطلع پر نظر نہیں آیا اور قرب و جوار کے علاقوں سے بھی کوئی خبر نہیں آئی، اس کے باوجود دہلی کے جامع مسجد کے شاہی امام عبداللہ بخاری صاحب کی ریڈیو کے ذریعہ شائع ہونے والی چاند کی خبر کی وجہ سے، بعض اہل قریہ نے دوسرے دن، یہ سوچ کر روزہ رکھا کہ اگر واقعی چاند کی اطلاع ہوگی تو رمضان کا روزہ، ورنہ نفلی روزہ ہوگا۔

بعد میں خبر شائع ہوئی کہ یقینی طور پر شہادت دی گئی ہے کہ پہلا روزہ ۲۳ر تاریخ کو ہوا ہے۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ جن لوگوں نے اس دن یعنی ۲۳ر تاریخ کو روزہ نہیں رکھا، کیا ان کو عید کے بعد ایک روزہ قضا کرنا پڑے گا؟

جن لوگوں نے شاہی امام عبداللہ بخاری صاحب کی جانب سے ریڈیو پر نشر کی گئی خبر سن کر روزہ رکھا ہے، ان کے روزے کا شرعی اعتبار سے کیا حکم ہے؟

ہمارے گاؤں کے ایک شخص نے پاکستان سے یا دہلی سے شائع ہونے والی خبر پر مذکورہ نیت (کہ

=قالوا: يا رسول الله إنه يوم تعظمه اليهود والنصارى فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: فإذا كان العام المقبل إن شاء الله صمنا اليوم التاسع. قال: فلم يأت العام المقبل، حتى توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۵۹، رقم الحديث: ۱۳۳- (۱۱۳۴) كتاب الصيام، باب صوم يوم عاشوراء، ط: ديوبند)

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں علامہ تورپشتی کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

قال التوربشتي: قيل: أريد بذلك أن يضم إليه يوما آخر، فيكون هديه مخالفا لأهل الكتاب، وهذا هو الوجه، لأنه وقع موقع الجواب لقولهم إنه يوم يعظمه اليهود، وروي عن ابن عباس أنه قال: صوموا التاسع والعاشر، وخالفوا اليهود، وإليه ذهب الشافعي، وبعضهم إلى أن المستحب صوم التاسع فقط، وقال ابن الهمام: يستحب صوم يوم عاشوراء، ويستحب أن يصوم قبله يوما أو بعده يوما، فإن أفرده فهو مكروه للتشبه باليهود اهـ وروى أحمد خبر "صوموا يوم عاشوراء، وخالفوا اليهود، وصوموا قبله يوما وبعده يوما" وظاهره أن الواو بمعنى أو، لأن المخالفة تحصل بأحدهما، وأخذ الشافعي بظاهر الحديث فيجمعون بين الثلاثة، والله أعلم. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح- علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۴/ ۱۴۱۲، رقم الحديث: ۲۰۴۱، كتاب الصوم، باب صيام التطوع، الفصل الأول، ط: دار الفكر- بيروت)

تفصیلی تخریج کے لیے ''سوالِ سابق'' ملاحظہ فرمائیں۔

خبر صحیح ہوئی، تو رمضان کا روزہ، ورنہ نفلی روزہ) کے ساتھ روزہ رکھا اور اس کے گھر کے دیگر افراد نے بھی اسی طرح کی نیت کے ساتھ روزہ رکھا، تو جن لوگوں نے روزہ رکھا ہے، ان کے حق میں یہ رمضان المبارک کا روزہ ہوگا یا ان کو بھی قضا کرنی پڑے گی؟ بینوا تو جروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

یوم الشک کو ممکن ہے کہ تیسویں شعبان ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یکم رمضان ہو۔

یوم الشک کے سلسلے میں عوام کے لیے حکم ہے کہ وہ زوال تک کھانے پینے سے احتراز کرے اور چاند کی خبر کا انتظار کرے، پھر کوئی خبر نہ آئے تو افطار کرلے اور اگر خبر و شہادت آجائے تو روزے کی نیت کر کے روزہ مکمل کرے۔ (۱)

یوم الشک میں اس نیت کے ساتھ روزہ رکھنا مکروہ ہے کہ اگر رمضان کا دن ہو، تو رمضان کا روزہ، ورنہ نفلی روزہ؛ کیوں کہ نیت میں تردد ہے۔ (۲)

اس کے باوجود اگر کوئی اس طرح روزہ رکھ لے، اور شہادت سے اس دن کا یکم رمضان ہونا ثابت ہوجائے، تو وہ روزہ رمضان کا ہوگا، بعد میں اس کے لیے یکم رمضان کا روزہ قضاء کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (شامی) [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) "و" المختار أن "يأمر المفتي العامة" بإظهار النداء "بالتلوم" أي بالانتظار بلا نية صوم في ابتداء "يوم الشك" محافظة على إمكان أداء الفرض بإنشاء النية لظهور الحال في وقتها "ثم" يأمر العامة "بالإفطار إذا ذهب وقت" إنشاء "النية" وهو عند مجيء الضحوة الكبرى "ولم يتبين الحال" حسما لمادة اعتقاد الزيادة. (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح-حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م:۱۰۶۹ھ) ص:۲۴۱، كتاب الصوم، فصل فيما يثبت به الهلال وفي صوم يوم الشك وغيره، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية☆حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح-أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م:۱۲۳۱ھ) ص:۶۴۹، كتاب الصوم، فصل فيما يثبت به الهلال وفي صوم يوم الشك وغيره، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۸۳، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر-بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۰۰، كتاب الصوم، الباب الثالث فيما يكره للصائم وما لا يكره، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) وكذا يكره لو قال أنا صائم إن كان من رمضان وإلا فعن نفل للتردد. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: مع الكراهة) أي التنزيهية، لأن كراهة التحريم لا تثبت إلا إذا جزم أنه عن رمضان كما أفاده الشارح سابقا ط (قوله: للتردد إلخ) علة للكراهة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۸۳، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر)

[۳] (ولا يصام يوم الشك) هو يوم الثلاثين من شعبان... (إلا نفلا) ويكره غيره (ولو صامه لواجب آخر كره) تنزيها=

[۴] یوم الشک میں رمضان کی گواہی آئے تو "رمضان کا، ورنہ نفل روزہ" کی نیت سے روزہ رکھنا

۱۵۵۹- سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اور مفتیانِ کرام اس مسئلہ میں:

آسمان ابر آلود ہونے کی وجہ سے رمضان المبارک کا چاند نہ دکھائی دے، تو ایک مسلمان اس نیت سے روزہ رکھ سکتا ہے کہ "کسی جگہ سے چاند کی گواہی آئے گی تو رمضان کا روزہ، ورنہ نفلی روزہ"۔

الجواب حامداً ومصلیا:

اس طرح کی نیت سے روزہ رکھنا مکروہ ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] یوم الشک میں روزہ رکھنا مکروہ ہے یا حرام؟

۱۵۶۰- سوال: شریعت میں یوم الشک میں روزہ رکھنا ممنوع اور مکروہ ہے، ایسا پڑھنے میں آیا ہے، لیکن ایک آدمی اپنی رائے اور خیال کے مطابق حرام کہتا ہے، توصحیح کیا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

شک کے دن رمضان کی نیت سے روزہ رکھنا مکروہ ہے، اہل کتاب: نصاریٰ اور یہود کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے، وہ لوگ روزہ شروع ہونے سے پہلے ہی روزہ رکھتے تھے، اسی طریقے سے رافضی اور شیعہ عقائد والوں کے ساتھ بھی مشابہت ہے، اس سبب سے اس کو مکروہِ تحریمی کہا گیا ہے، حرام کہنے والے کا مقصد کراہتِ تحریمی بتانا ہے۔[1]

=ولو جزم أن يكون عن رمضان كره تحريما (ويقع عنه في الأصح إن لم تظهر رمضانيته وإلا) بأن ظهرت (فعنه) لو مقيما (والتنفل فيه أحب) أي أفضل اتفاقا (إن وافق صوما يعتاده)... (وإلا يصومه الخواص ويفطر غيرهم بعد الزوال) به يفتى. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۸۳-۳۸۱، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر - بيروت ☆مراقي الفلاح، ص: ۲۴۱، فصل فيما يثبت به الهلال وفي صوم يوم الشك وغيره، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

(۱) وكذا يكره لو قال أنا صائم إن كان من رمضان وإلا فعن نفل للتردد. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: مع الكراهة) أي التنزيهية؛ لأن كراهة التحريم لا تثبت إلا إذا جزم أنه عن رمضان كما أفاده الشارح سابقا ط (قوله: للتردد إلخ) علة للكراهة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۸۳، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، ط: دار الفكر)

(۱) (وكره صومه) أي صوم يوم الشك ناويا (عن رمضان) لتشبهه بأهل الكتاب (أو عن واجب آخر) لكن الثاني في الكراهة دون الأول لعدم التشبه بأهل الكتاب. ـــــــ (وكذا) يكره (إن نوى) مترددا بأنه (إن كان) يوم الشك=

شک کے دن روزہ رکھنا اس وقت مکروہ ہے جب کہ اس دن روزہ رکھنے کا معمول نہ ہو، اگر کوئی مرد یا عورت جمعرات یا جمعہ کا روزہ رکھتے ہیں، اور یوم الشک جمعہ کے دن آ گیا، تو ان کے لیے روزہ رکھنا جائز ہے، کیوں کہ ان کو جمعرات و جمعہ کے نفل روزہ رکھنے کی عادت اور معمول ہے، اس لیے جس آدمی کو نفل روزہ کی عادت ہو اور اس دن میں یوم الشک واقع ہو، تو اس کے لیے روزہ رکھنا جائز ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] نصف شعبان کا روزہ مسنون ہے یا نہیں؟

۱۵۶۱- سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین و مفتیانِ شرعِ متین اِس مسئلہ میں کہ عرصۂ دراز سے یہ مشہور ہے کہ نصف شعبان کو روزہ رکھنا مسنون ہے، بزرگوں کی تصانیف میں بھی یہ بات مرقوم ہے، اِس کے مسنون ہونے کو ابن ماجہ کی ایک روایت سے ثابت کیا گیا ہے، روایت یہ ہے:

حدثنا الحسن بن علي الخلال قال: حدثنا عبد الرزاق قال: أنبأنا ابن أبي سبرة، عن إبراهيم بن محمد، عن معاوية بن عبد الله بن جعفر، عن أبيه، عن علي بن أبي طالب، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إذا كانت ليلة النصف من شعبان، فقوموا ليلها وصوموا نهارها، فإن الله ينزل فيها لغروب الشمس إلى سماء الدنيا، فيقول: ألا من مستغفر لي، فأغفر له، ألا مسترزق فأرزقه، ألا مبتلى فأعافيه، ألا كذا ألا كذا،

=(رمضان فعنه وإلا فعن نفل أو عن واجب آخر)

....

(وصح في الكل) أي من قوله وكره صومه إلى قوله واجب آخر (عن رمضان إن ثبت) أي إن ظهر أن ذلك اليوم من رمضان صح لوجود أصل النية. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۳۵، كتاب الصوم، مايثبت به رمضان، ط: دار إحياء التراث العربي)

[۲] (والتنفل فيه أحب) أي أفضل اتفاقا (إن وافق صوما يعتاده)... (وإلا يصومه الخواص ويفطر غيرهم بعد الزوال) به يفتى. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: إن وافق صوما يعتاده) كما لو كان عادته أن يصوم يوم الخميس أو الاثنين فوافق ذلك يوم الشك سراج وهل تثبت العادة بمرة كما في الحيض تردد فيه بعض الشافعية. قلت: الظاهر نعم إذا فعل ذلك مرة وعزم على فعل مثله بعدها فوافق يوم الشك؛ لأن الاعتياد يشعر بالتكرار، لأنه من العود مرة بعد أخرى وبالعزم المذكور يحصل العود حكما أما بدونه فلا تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۸۱-۳۸۲، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، مبحث في صوم يوم الشك، ط: دار الفكر - بيروت ☆ مراقي الفلاح، ص: ۲۴۱، فصل فيما يثبت به الهلال وفي صوم يوم الشك وغيره، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

حتی یطلع الفجر". (سنن ابن ماجه)[۱]

ابن ماجہ کی اِس روایت کے علاوہ "صوموا نهارها" کا مضمون کسی اور روایت میں نہیں ملتا، مذکورہ روایت میں ایک راوی "ابن سبرہ" ہیں، اِس راوی کے بارے میں علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں:

أبو بكر بن عبد الله [ق] بن أبي سبرة المدني القاضي الفقيه.ـــ عن الأعرج، وعطاء بن أبي رباح.ـــ وعنه عبد الرزاق، وأبو عاصم، وجماعة.ـــ ضعفه البخاري،وغيره.ـــ يضع الحديث.ـــ وقال أبو داود: كان مفتي أهل المدينة.ـــ وروى عباس عن ابن معين، قال: قدم ههنا فاجتمعوا عليه فقال: عندي سبعون ألف حديث، إن أخذتم عني كما أخذ عن ابن جريج وإلا فلا.ـــ وقال النسائي: متروك.ـــ قلت: ولي قضاء العراق، وبعد وفاته ولي القضاء أبو يوسف.ـــ وهو أبو بكر بن عبد الله بن محمد ابن أحد البدريين أبي سبرة بن أبي رهم العامري.ـــ وقال ابن معين: ليس حديثه بشيء. (ميزان الاعتدال)[۲]

اِس تذکرہ کو رقم فرمانے کے بعد علامہ ذہبیؒ نے حدیثِ مذکور کو ذکر کیا ہے، جیسا کہ اُن کی عادت ہے کہ کسی راوی پر کلام کے بعد اُن کی ضعیف احادیث کو ذکر فرماتے ہیں۔

حافظ منذریؒ نے اِس حدیث کو الترغیب والترہیب میں یوں ذکر کیا ہے:

وروي عن علي رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال إذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها وصوموا يومها... الحديث. [رواه ابن ماجه](۳)

علامہ منذریؒ فرماتے ہیں:

إذا كان في الإسناد من قيل فيه كذاب، أو وضاع، أو متهم، أو مجمع على تركه أو ضعفه، أو ذاهب

[۱] ج:۱،ص:۹۹، رقم الحديث:۱۳۸۸، كتاب إقامة الصلاة، والسنة فيها، باب ما جاء في ليلة النصف من شعبان.

[۲] ميزان الاعتدال في نقد الرجال- شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايماز الذهبي (م: ۷۴۸هـ): ۴/ ۵۰۴، باب الكنى، ترجمة: أبو بكر بن عبد الله [ق] بن أبي سبرة المدني القاضي الفقيه. رقم: ۱۰۰۲۴، ت: علي محمد البجاوي، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر- بيروت.

(۳) الترغيب والترهيب من الحديث الشريف- -عبد العظيم بن عبد القوي بن عبد الله، أبو محمد، زكي الدين المنذري (م:۶۵۶هـ): ۲/ ۷۴، رقم الحديث: ۱۵۵۰، كتاب الصوم الترغيب في الصوم مطلقا وما جاء في فضله وفضل دعاء الصائم، ت: إبراهيم شمس الدين، ط: دار الكتب العلمية- بيروت.

الحديث، أو هالك، أو ساقط، أو ليس بشيىء، أو ضعيف جدا، أو ضعيف فقط، أو لم أر فيه توثيقا بحيث لا يتطرق إليه احتمال التحسين، صدرته بلفظة روي، ولا أذكر ذلك الراوي، ولا ما قيل فيه البتة، فيكون الإسناد الضعيف دلالتان، تصديره بلفظة روي، وإهمال الكلام عليه في آخره. (الترغيب والترهيب)[۴]

حدیثِ ضعیف کی دوعلامتیں- جوعلامہ منذریؒ نے بیان کیں- وہ دونوں زیر بحث حدیث میں موجود ہیں، اِس بحث سے اتنی بات ثابت ہوئی کہ نصف شعبان کے روزے کی حدیث ضعیف ہے، پھر جب اُس کی سند میں ایسا راوی ہے جس کو متروک اور 'كان يضع الحديث' وغیرہ کہا گیا ہے، اور جس حدیث کے متعلق 'ليس بشيىء' کہا گیا ہے، تو معلوم ہوا کہ مذکور حدیث میں ضعف معمولی نہیں ہے؛ بل کہ ضعفِ شدید ہے، پھر تعددِ طرق یا اور کسی ذریعہ سے اِس ضعف کا انجبار بھی نہیں ہوا ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ حضرات محدثین فضائل کے باب میں ضعیف حدیث سے استدلال کرتے ہیں، اور اُس پر عمل کی اِجازت دیتے ہیں، البتہ یہ اِجازت مطلق نہیں؛ بلکہ اُس کو علماء نے مختلف شرائط کے ساتھ مشروط کیا ہے، اِن شرائط کو درِمختار میں بیان فرمایا گیا ہے:

شرط العمل بالحديث الضعيف عدم شدة ضعفه، وأن يدخل تحت أصل عام، وأن لا يعتقد سنية ذلك الحديث. (الدر المختار)[۵]

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:

وذكر شيخ الإسلام له ثلاثة شروط: أحدها: أن يكون الضعف غير شديد، فيخرج من انفرد من الكذابين والمتهمين بالكذب، ومن فحش غلطه، نقل العلائي الاتفاق عليه.ــــ الثاني: أن يندرج تحت

---

[۴] الترغيب والترهيب من الحديث الشريف: ۱/ ۴۰، مقدمة المؤلف وذكر خطته، ت: محمد محي الدين عبد الحميد، ط: مطبعة السعادة-مصر.

[۵] قال ابن عابدين: (قوله: في فضائل الأعمال) أي لأجل تحصيل الفضيلة المترتبة على الأعمال. قال ابن حجر في شرح الأربعين: لأنه إن كان صحيحا في نفس الأمر فقد أعطي حقه من العمل، وإلا لم يترتب على العمل به مفسدة تحليل ولا تحريم ولا ضياع حق للغير، وفي حديث ضعيف "من بلغه عني ثواب عمل فعمله حصل له أجره وإن لم أكن قلته" أو كما قال. اهـ. ط. قال الأسيوطي: ويعمل به أيضا في الأحكام إذا كان فيه احتياط. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۱۲۸، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، ط: دار الفكر)

أصل معمول به. ـــــــــ الثالث: أن لا يعتقد عند العمل به ثبوته، بل يعتقد الاحتياط. (تدریب الراوی)[٦]

اس بات کو علامہ عبدالحی لکھنویؒ یوں بیان فرماتے ہیں:

فالحق في هذا المقام: أنه إذا لم يثبت ندب شيء أو جوازه بخصوصه بحديث صحيح، و ورد بذلك حديث ضعيف، ليس شديد الضعف، يثبت استحبابه، و جوازه به بشرط أن يكون مندرجا تحت أصل شرعي، و لا يكون مناقضا للأصول الشرعية، و الأدلة الصحيحة. (الأجوبة الفاضلة،ص:٥٥،ت: عبد الفتاح أبو غدة،ط: مكتبه المطبوعات الإسلامية-حلب)

دریافت یہ کرنا ہے کہ ابن ماجہ کی مذکورہ روایت کے علاوہ کوئی اور قابل استدلال حدیث میں اِس مضمون کا ہونا آپ کے علم میں ہو، جس سے یہ ساری بحث یہیں ختم ہو جائے، تو آپ ضرور مطلع فرمائیں، البتہ اگر کوئی اور حدیث نہ ملتی ہو، تو مذکور بحث کے پیش نظر:

(۱) نصف شعبان کے روزے کو مسنون کہنا صحیح ہے یا نہیں؟

(۲) نیز نصف شعبان کا روزہ سنت سمجھ کر رکھنا کیسا ہے؟

مہربانی فرما کر جلد از جلد جواب مرحمت فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزاءِ خیر عطا فرمائے اور سعادتِ دارین سے نوازے، فقط والسلام۔

بندہ: محمد الیاس غفرلہ

الجواب حامداً ومصلیا:

نصف شعبان کے روزے کو فقہاء میں سے کسی نے مسنون قرار نہیں دیا اور نہ محدثین اُسے مسنون کہتے ہیں، نہ ہی علماءِ سلف اُسے مسنون کہتے ہیں۔

خود ابن ماجہؒ نے اس روایت کو-جس کی بنیاد پر سائل نے تفصیلی بحث کی ہے-ابواب الصوم میں ذکر نہیں کیا، جہاں اُنہوں نے مسنون و مستحب روزوں کا بیان فرمایا ہے، غور کیجیے! اُس میں کہیں بھی نصف شعبان کے روزے کا تذکرہ ابن ماجہؒ نے نہیں کیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے ذھن میں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ موجود ہے؛ اِس لیے اُس کو اُنہوں نے قیامِ لیل کے ابواب میں ذکر کیا ہے، جس سے یہی بتانا ہے کہ یہ

[٦] تدريب الراوي في شرح تقريب النواوي-عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م:٩١١هـ): ١/ ٣٥١، قبيل: النوع الثالث والعشرون صفة من تقبل روايته ومن ترد. . . ،ت: أبو قتيبة نظر محمد الفاريابي، ط: دار طيبة.

روزہ مسنون نہیں ہے۔

اِس زمانہ میں یہ بحث کوئی نئی نہیں ہے، شاید سائل کے پیش نظر عوام کا اِس روزے پر عمل ہے، تو عوام اِس قسم کے فرق سے قاصر ہیں، ان کو تو بس اتنا معلوم ہونا کافی ہے کہ ۱۵ ر شعبان کو روزہ رکھیں، تو ثواب ملے گا، بس وہ تو حصول ثواب کے لیے روزہ رکھتے ہیں۔ علماء میں سے کوئی بھی اُسے مسنون نہیں سمجھتے، اگر عوام مسنون وغیرہ کی اصطلاحات سے واقف ہوں اور مسنون سمجھ کر یہ روزہ رکھتے ہوں، تو صراحت کر دینی چاہیے کہ صرف نصف شعبان کی حیثیت سے اُسے مسنون سمجھ کر روزہ نہ رکھیں۔

اگر منشاءِ سوال یہ ہے کہ جناب نبیٔ اکرم ﷺ نے نصف شعبان کا روزہ نہیں رکھا؛ اِس لیے نہیں رکھنا چاہیے، یا عوام کو اِس روزے سے منع کرنا چاہیے، تو اِس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ بات مشکل ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے نصف شعبان کا روزہ نہیں رکھا؛ بل کہ اغلب ہے کہ آپ ﷺ نے روزہ رکھا ہے، اِس لیے کہ وہ صحیح روایات، جن میں آپ ﷺ کے پورے شعبان میں روزہ رکھنے کا تذکرہ ہے، (''سائل'' صاحب علم ہیں؛ اِس لیے اِن روایات کی طرف اشارہ کافی ہے) تو کیا آپ ﷺ شعبان کے اکثر ایام میں روزہ رہ کر، نصف شعبان کے روزے کو ترک فرما دیتے تھے؟ اور ہمیشہ ترک فرماتے رہے؟ ایسا نہیں ہے؛ بل کہ آپ ﷺ نے روزہ رکھا ہے، اور وہ روایات، جن میں شعبان کے نصفِ اخیر میں روزہ رکھنے کی ممانعت ہے، پندرہ شعبان کے بعد سے شروع ہوتی ہے، پندرہ کا روزہ رکھنا ممانعت میں شامل نہیں ہے۔

اِس لیے عوام پندرہ شعبان کا روزہ رکھتے ہوں، تو اُنہیں منع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اِس لیے بھی کہ اجتماعی طور پر روزہ رکھنے میں کوئی ریاء متصور نہیں، روزہ کم از کم مباح ہے؛ بلکہ کسی نہ کسی درجہ میں اُس کا مندوب ہونا اور استحباب معلوم ہو رہا ہے۔

چناں چہ حدیثِ شدید الضعف پر عمل کے مندوب نہ ہونے کی بحث میں علامہ حصکفیؒ نے فرمایا ہے کہ اگر وہ عمل قاعدۂ عام کے ماتحت آجاتا ہو، تو اُس کی اباحت یا ندب میں کوئی مانع نہیں ہے۔ (شامی: ۱/۱۲۸)[۱]

---

[۱] قال محقق الشافعية الرملي: فيعمل به في فضائل الأعمال وإن أنكره النووي. [فائدة] ـــــ شرط العمل بالحديث الضعيف عدم شدة ضعفه، وأن يدخل تحت أصل عام، وأن لا يعتقد سنية ذلك الحديث. ـــــ وأما الموضوع فلا يجوز العمل به بحال ولا روايته، إلا إذا قرن ببيانه. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: قلت: مقتضى عملهم بهذا الحديث أنه ليس شديد الضعف فطرقه ترقيه إلى الحسن (قوله: وأن لا يعتقد سنية ذلك=

شعبان میں خصلتِ مذکورہ کے عام قاعدہ کے تحت نصف شعبان کا روزہ بھی اِس فضیلت میں داخل ہوجاتا ہے۔

جیسے مذکورہ بحث میں پہلے معلوم ہوا کہ ابن ماجہ نے شاید مذکور روزہ کی عدم سنیت کی جانب اشارہ کرنے کے لیے حدیثِ صوم کو ابواب الصوم کے بجائے ابواب قیام اللیل میں ذکر فرمایا ہے، تو غالباً ایسی ہی حکمت کے پیش نظر اِمام ترمذیؒ نے (جن کی روایت میں صوم کا تذکرہ نہیں ہے) لیلۃ نصف شعبان کے قیام کی روایت کو، ابواب الصوم کے وسط میں بیان فرمایا، حالاں کہ اِن ابواب سے کوئی مناسبت باب اور روایت میں بہ ظاہر نہیں ہے، اور یہ بھی مدنظر رہنا چاہیے کہ اِمام ترمذیؒ اپنی سنن میں 'باب كراهية الصوم في النصف الباقي من شعبان' کے بعد 'باب ما جاء في ليلة النصف من شعبان' کو لا رہے ہیں، جس سے اِس بات کی طرف اِشارہ ملتا ہے کہ نصف شعبان کا کوئی روزہ ہے، ورنہ روایت و باب کو معا بیان کرنے کی کوئی وجہ مناسبت نہیں ہے، قیامِ لیل کا اثبات یا نفی تو ابوابِ قیام اللیل میں ہوسکتی ہے، غالباً اِمام ترمذیؒ کا اشارہ اِس طرف ہے کہ اگر چہ روایات میں صوم کا تذکرہ نہیں؛ لیکن بعض ضعیف روایات، قاعدۂ عامہ اور لیلۃ النصف من شعبان کی جو فضیلت مسلم ہے، اُس کا تقاضہ ہے کہ یوم النصف من شعبان بھی کوئی فضیلت رکھتا ہے، اور عمل کا تقاضہ یہ ہے کہ قیامِ لیل اور صوم النہار کا عمل ساتھ ساتھ رہے، بہر حال یہ اشارہ اِس بات کی طرف ہو یا اُن کی ترتیب ابواب سے ہم اشارۃً یہ بات سمجھ سکتے ہیں۔

نصف شعبان کے روزے کے استحباب کے بارے میں گجرات کے قدیم، متبحر عالم حضرت مولانا عبدالحی صاحب کفلیتویؒ نے اپنی کتاب ''الجواہر الزواہر'' میں ایک دوسرے انداز سے استدلال فرمایا ہے کہ بیہقی کی روایت میں مذکور ہے: "وفيها ترفع أعمالهم"(۲) کہ نصف شعبان میں بندوں کے اعمال اللہ

= الحديث) أي سنية العمل به. وعبارة السيوطي في شرح التقريب: الثالث أن لا يعتقد عند العمل به ثبوته بل يعتقد الاحتياط، وقيل: لا يجوز العمل به مطلقا، وقيل: يجوز مطلقا. اهـ. . . (قوله: بحال) أي ولو في فضائل الأعمال. قال ط أي حيث كان مخالفا لقواعد الشريعة، وأما لو كان داخلا في أصل عام فلا مانع منه لا لجعله حديثا بل لدخوله تحت الأصل العام اهـ تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۱۲۸، كتاب الطهارة، سنن الوضوء، مطلب في بيان ارتقاء الحديث الضعيف إلى مرتبة الحسن، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) طویل حدیث کا جزء ہے، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرماتے ہیں: هل تدرين ما في هذه الليلة؟ قالت: ما فيها يا رسول الله؟ فقال: فيها أن يكتب كل مولود من مولود بني آدم في هذه السنة، وفيها أن يكتب كل هالك من بني آدم في هذه السنة، وفيها ترفع أعمالهم، وفيها تنزل أرزاقهم، فقالت: يا رسول الله: ما من أحد يدخل الجنة إلا =

تعالیٰ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔ (یعنی اللہ عز وجل کے سامنے پیش ہوتے ہیں) اور دوسری روایات میں آیا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ آپ شعبان میں اِس قدر روزے کیوں رکھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ شعبان ایسا مہینہ ہے کہ لوگ رمضان اور رجب کے بیچ میں اِس سے غافل رہتے ہیں، اور یہ ایسا مہینہ ہے کہ اُس میں رب العالمین کے روبرو بندوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں اور مجھے یہ پسند ہے کہ میرا عمل اللہ تعالیٰ کے حضور اِس حالت میں پیش ہو کہ میں روزہ دار ہوں۔[۳] علامہؒ فرماتے ہیں کہ اِس وجہ سے نصف شعبان کا روزہ مستحب ہے، یہ علامہ موصوفؒ کی طویل بحث کا خلاصہ ہے۔ (الجواہر الزواہر: ۱/ ۵۷۸)[۴]

اِس بحث سے اِس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شعبان میں روزہ رکھنا رفعِ اعمال کی وجہ سے ہے، نسائی شریف کی روایت میں جس رفعِ اعمال کا تذکرہ ہے، لیلۃ النصف میں وہی رفعِ عمل مراد

=برحمة الله؟قال: ما من أحد يدخل الجنة إلا برحمة الله قلت: ولا أنت يا رسول الله؟ فوضع يده على هامته فقال: ولا أنا إلا أن يتغمدني الله منه برحمة، يقولها ثلاث مرات. (الدعوات الكبير - أحمد بن الحسين بن علي بن موسى الخُسْرَوْجِردي الخراساني، أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۲/ ۱۴۵، رقم الحديث: ۵۳۰، باب القول والدعاء ليلة البراءة، ت: بدر بن عبد الله البدر، ط: غراس للنشر والتوزيع - الكويت ☆ فضائل الأوقات للبيهقي، ص: ۱۲۶، رقم الحديث: ۲۶، باب في فضل ليلة النصف من شعبان، ت: عدنان عبد الرحمن مجيد القيسي، ط: مكتبة المنارة - مكة المكرمة)

(۳) عن أبي هريرة، عن أسامة بن زيد، قال: قلت: يا رسول الله إني أراك تصوم في شهر ما لا أراك تصوم في شهر مثل ما تصوم فيه، قال: "أي شهر؟"، قلت: شعبان، قال: "شعبان بين رجب وشهر رمضان، يغفل الناس عنه، يرفع فيه أعمال العباد، فأحب أن لا يرفع عملي إلا وأنا صائم". (شعب الإيمان - أبو بكر البيهقي: ۵/ ۳۵۲، رقم الحديث: ۳۵۴۰، الصيام، صوم شعبان، ت: د. عبد العلي عبد الحميد حامد، ط:: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون مع الدار السلفية ببومباي بالهند)

وقال البيهقي: رواه عنه أيضا ابن أبي أويس، عن أبي سعيد المقبري، عن أسامة بن زيد، قال: كان يصوم رسول الله صلى الله عليه وسلم فيسرد الأيام لا يكاد يفطر، ويفطر فيسرد الأيام لا يكاد يصوم، قال: وكان يصوم من كل جمعة يومين لا يكاد يدعهما إن كان من صيامه الذي يصوم وإن لم يكونا منه، وكان أكثر ما يصوم فيه من الشهور شعبان، قال: فقلت له: يا رسول الله رأيتك تصوم يومين من كل جمعة إن كان من صيامك وإن لم يكونا منه؟، قال: "أي يومين؟"، فقلت: الاثنين والخميس، قال: "ذاك يومان يعرض فيهما الأعمال على رب العالمين فأنا أحب أن يعرض عملي وأنا صائم"، قال: قلت: رأيتك تصوم في شعبان ما لا تصوم في غيره من الشهور؟، قال: "ذاك شهر يغفل الناس عنه بين رجب ورمضان، وفيه ترفع الأعمال لرب العالمين فأنا أحب أن يرفع عملي وأنا صائم". (المصدر السابق: ۵/ ۳۵۳)

[۴] کتاب نہیں مل سکی۔

ہے، اور وہ نصف شعبان میں ممکن ہوتا ہے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر شعبان میں خاص رفعِ عمل کی تلاش میں روزہ رکھتے تھے، یہ امر قابلِ غور ہے، احتمال ضرور ہے کہ رفعِ اعمال سے لیلۃ النصف کا رفع مراد ہے، البتہ محدثین کرامؒ نے نسائی شریف کی روایت : "وهو شهر ترفع فيه الأعمال إلى رب العالمين"[۵] کی جو توجیہات پیش کی ہیں، پوری طرح علامہ موصوفؒ کی توجیہ سے میل نہیں کھا رہی ہے۔

یہ ضرور ثابت ہوا کہ علامہ عبدالحیؒ نصف شعبان کے روزہ کی فضیلت کے قائل ہیں، فتاویٰ دارالعلوم میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ نے بھی نصف شعبان کے روزے کو مستحب لکھا ہے، حضرت شیخ المشائخ علامہ رشید احمد گنگوہیؒ نے فرمایا ہے کہ ۲۷ رجب کا روزہ (جس کا وہ مقام نہیں جو نصف شعبان کے روزے کا ثابت ہے) رکھنا جائز لکھا ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ: ۱/ ۴۳۳ ☆ فتاویٰ دارالعلوم: ۶/ ۵۰۰)[۶]

اِس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ شعبان کی پندرہویں کے روزے کا مسنون ہونا محتمل ہے، کم از کم استحباب، ورنہ اباحت ثابت ہے؛ اِس لیے روزہ رکھنا چاہیے، کسی کو منع نہ کرنا چاہیے، ہاں، مسنون قطعی نہ سمجھے، البتہ احیاءِ لیلۃ النصف - جو ثابت ہے - اُس کے لیے مساجد میں اجتماع اور اہتمام بدعت ہے، اِس سے روکنا چاہیے، روزہ رکھنے میں قباحت نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۵) أسامة بن زيد، قال: قلت: يا رسول الله، لم أرك تصوم شهرا من الشهور ما تصوم من شعبان، قال: ذلك شهر يغفل الناس عنه بين رجب و رمضان، وهو شهر ترفع فيه الأعمال إلى رب العالمين، فأحب أن يرفع عملي و أنا صائم. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳ھ): ۴/ ۲۰۱، رقم الحديث: ۲۳۵۷، الصيام، صوم النبي صلى الله عليه وسلم بأبي هو وأمي، وذكر اختلاف الناقلين للخبر في ذلك، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

(۶) ماہ شعبان میں کسی تاریخ اور دن کا روزہ فرض اور واجب نہیں ہے، اور تیرہ شعبان کے روزے کی کوئی خاص فضیلت حدیث شریف سے ثابت نہیں ہے، البتہ یہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ شعبان کی پندرہوں شب کو بیدار رہ کر عبادت میں مشغول رہو، اور پندرہوں تاریخ کا روزہ رکھو، پس پندرہویں تاریخ شعبان کا روزہ مستحب ہے۔ اگر کوئی رکھے تو ثواب ہے اور نہ رکھے تو کچھ حرج نہیں ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم: ۶/ ۵۰۰، نواں باب، متفرقات، شعبان میں کون سا روزہ ضروری ہے، ط: زکریا - دیوبند)

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ .(۲-البقرة:۴۱)

عن سليمان بن بريدة، عن أبيه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من قرأ القرآن يتأكل به الناس، جاء يوم القيامة ووجهه عظم ليس عليه لحم". (شعب الإيمان- أبو بكر البيهقي (م:۴۵۸ھ): ۴/ ۱۹۵، رقم الحديث: ۲۳۸۴، تعظيم القرآن، فصل في ترك قراءة القرآن في المساجد والأسواق ليعطى وليستأكل به، ت: الدكتور عبد العلي عبد الحميد حامد، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض)

باب التراويح

[تراویح کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب التراویح

[تراویح کا بیان]

نوٹ: باب التراویح کے مرکزی عنوان سے حضرت مفتی صاحبؒ کے متعدد فتاویٰ "فتاویٰ فلاحیہ کی دوسری جلد" میں شائع ہو چکے ہیں، اس باب کے بعض فتاویٰ ہمیں کتاب الصوم کی فائل میں ملے ہیں، جسے یہاں درج کیا جاتا ہے، ہو سکتا ہے کہ بعض فتاویٰ بہ ظاہر مکرر معلوم ہوں، لیکن درحقیقت وہ کسی نہ کسی نئے فوائد پر مشتمل ہیں، مثلاً اجرت علی التراویح کے بعض مسائل۔
[مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۱] سولہ سال کی عمر والے حافظ قرآن کے پیچھے تراویح

۱۵۶۲- سوال: ایک طالب علم ہے، جس کی عمر سولہ سال ہے، گذشتہ مرتبہ مفتی احمد بیمات صاحب سے فتویٰ پوچھا تھا، تو جواب میں حضرت نے فرمایا تھا کہ اس طالبِ علم کے پیچھے فرض، وتر واجب اور تراویح پڑھنا "عمر کے اعتبار سے" جائز ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں متولی صاحب سے تین مہینہ پہلے درخواست کی تھی کہ یہ بچہ تراویح پڑھائے گا، اس کے بعد تقریباً تین مرتبہ یاددہانی کی گئی، تو جواب دیا کہ ٹھیک ہے۔

گذشتہ رمضان کا چاند پورے تیس دن پر ہوا، تیسویں دن کی صبح کو معلوم ہوا کہ متولی صاحب منع کرنے والے ہیں، متولی صاحب کی اطلاع سے پہلے اس کے والد صاحب نے منع کرنے کی وجہ دریافت کی، تو انہوں نے کہا کہ لڑکا بہ اعتبار عمر چھوٹا ہے، کم سن ہے۔ لہٰذا فوراً اُتر کیسر جا کر فتویٰ لیا گیا، حضرت مفتی صاحب نے فتویٰ دیا کہ بالغ لڑکے کے لیے تروایح، فرض اور وتر وغیرہ پڑھانا جائز ہے، لڑکا سولہ سال کا ہے، اس لیے تراویح پڑھا سکتا ہے۔

جب یہ بات متولی کو بتائی گئی، تو اس نے کہا کہ وہ نماز کی پابندی نہیں کرتا ہے؛ اس لیے تراویح نہیں

پڑھا سکتا، مطلب یہ کہ متولی صاحب کی پہلی دلیل فیل ہوگئی، تو دوسری دلیل لے آئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض بہانہ ہے۔

وہ لڑکا فی الحال تراج مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتا ہے، جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ نمازوں کا اہتمام کرتا ہوگا، اور اگر فرض کرلیا جائے کہ اس نے بعض نمازیں چھوڑ دی ہو، تو کیا اس کے پیچھے تراویح صحیح نہ ہونے کا حکم لگایا جاسکتا ہے؟ شریعت کا اس سلسلے میں کیا حکم ہے؟

نیز ایک مرتبہ متولی صاحب کے کہنے پر اس لڑکے کو امامت کے لیے آگے کیا گیا، تو پہلی صف سے تین آدمی نکل کر چلے گئے، جس کی وجہ سے لوگوں میں فتنہ ہوا، تو ان حضرات کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

امامت کی ذمہ داری حوالہ کرنے سے قبل چند باتوں کا جاننا ضروری ہے، فقہائے کرام کی بیان کردہ شرطیں پائی جائیں، تو امامت کی ذمہ داری سپرد کرنا صحیح ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نماز پڑھانے والا بالغ ہو یعنی بلوغ کی علامت اس میں پائی جائے یا کم از کم پندرہ سال کا ہو۔[1] نابالغ کو ذمہ داری سپرد کرنا صحیح نہیں ہے؛ سنت و وتر کوئی نماز اس کے پیچھے صحیح نہیں ہوتی۔[۲]

اگر بہت سارے اشخاص تراویح یا امامت کرانا چاہتے ہوں، تو جو شخص مسائل کو زیادہ جانتا ہو، اسے امام بنایا جائے، اور اگر تمام امیدوار مسائل کو زیادہ جاننے والے ہوں، تو جو شخص قرآن کا زیادہ حافظ ہو، اس کو

[۱](بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال) والأصل هو الإنزال (والجارية بالاحتلام والحيض والحبل)... (فإن لم يوجد فيهما) شيء (فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتى) لقصر أعمار أهل زماننا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/۱۵۳، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۵/۶۱، كتاب الحجر، الباب الثاني في الحجر للفساد، الفصل الثاني في معرفة حد البلوغ، ط: دار الفكر)

(۲) وإمامة الصبي المراهق لصبيان مثله يجوز. كذا في الخلاصة وعلى قول أئمة بلخ يصح الاقتداء بالصبيان في التراويح والسنن المطلقة. كذا في فتاوى قاضي خان المختار أنه لا يجوز في الصلوات كلها. كذا في الهداية وهو الأصح. هكذا في المحيط وهو قول العامة وهو ظاهر الرواية. هكذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۱/۸۵، كتاب الصلاة، الباب الخامس في الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۱/۵۷۶، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر - بيروت)

امام بنایا جائے گا اور اگر تمام حضرات کو قرآن یاد ہو، تو جو شخص بہ اعتبار عمر بڑا ہو، اس کو ذمہ داری سپرد کی جائے گی، اگر تمام لوگ عمر میں برابر ہوں، تو دین داری اور تقوی کا لحاظ کیا جائے گا، اس لحاظ سے مذکورہ طالب علم سے زیادہ عمر کے طالب علم کو- جو مسائل زیادہ جانتا ہے- اگر ذمہ داری سپرد کی گئی ہے، تو آپ کا اعتراض کرنا صحیح نہیں ہے۔ (۳)

متولی صاحب، مسائل سے ناواقفیت کی بنیاد پر، تسلی بخش جواب نہ دے سکے اور اس [سولہ سالہ] بچے کے تراویح نہ پڑھانے کی شرعی وجہ نہیں بتا سکے، اس سلسلے میں ان پر کوئی الزام نہیں۔

البتہ انہوں نے غلطی یہ کی کہ وعدہ کرلیا اور اسے پورا نہ کر سکے، اگر پہلے ہی وضاحت کر دیتے، تو وہ لڑکا کسی دوسری جگہ اپنا بندوبست کر لیتا، یہ بڑی غلطی ہے۔

اسی طرح اگر مذکورہ طالب علم سے کم عمر کو، یا کم مسائل جاننے والے کو امام بنایا، تو یہ بھی غلطی ہے۔

اور جو تین شخص صف کو چھوڑ کر نکل گئے ہیں اور فتنہ پیدا کیا، وہ بھی بڑے گناہ گار ہیں ؛ کیوں کہ امام فاسق وفاجر ہو، پھر بھی اس کے پیچھے جماعت سے نماز پڑھنے سے جماعت کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے، جہالت کی وجہ سے صف سے باہر نکل گئے اور فتنہ پیدا کر کے امرِ حرام کا ارتکاب کیا۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۳)(والأحق بالإمامة) تقديما بل نصبا مجمع الأنهر (الأعلم بأحكام الصلاة) فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة، وحفظه قدر فرض، وقيل واجب، وقيل سنة (ثم الأحسن تلاوة) وتجويدا (للقراءة، ثم الأورع) أي الأكثر اتقاء للشبهات. والتقوى: اتقاء المحرمات (ثم الأسن) أي الأقدم إسلاما، فيقدم شاب على شيخ أسلم، وقالوا: يقدم الأقدم ورعا. وفي النهر عن الزاد: وعليه يقاس سائر الخصال، فيقال: يقدم أقدمهم علما ونحوه، وحينئذ فقلما يحتاج للقرعة (ثم الأحسن خلقا) بالضم ألفة بالناس (ثم الأحسن وجها) أي أكثرهم تهجدا، زاد في الزاد: ثم أصبحهم: أي أسمحهم وجها، ثم أكثرهم حسبا (ثم الأشرف نسبا) زاد في البرهان: ثم الأحسن صوتا. وفي الأشباه قبيل ثمن المثل: ثم الأحسن زوجة. ثم الأكثر مالا، ثم الأكثر جاها (ثم الأنظف ثوبا) ثم الأكبر رأسا والأصغر عضوا، ثم المقيم على المسافر، ثم الحر الأصلي على العتيق. ثم المتيمم عن حدث على المتيمم عن جنابة.ـــــــ [فائدة] لا يقدم أحد في التزاحم إلا بمرجح، ومنه السبق إلى الدرس والإفتاء والدعوى، فإن استووا في المجيء أقرع بينهم اهـ.(الدر المختار مع رد المحتار :۱/۵۸-۵۵۷، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر ☆البحر الرائق:۱/۳۶۸، كتاب الصلاة، الأحق بالإمامةفي الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ الهداية:۱/۵۷، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۴) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الصلاة المكتوبة واجبة خلف كل مسلم برا كان أو =

[۲] تراویح میں کم عمر کی امامت

۱۵۶۳- سوال: ہمارے گاؤں میں ۱۵، ۱۶ سال کے دو بچے تراویح پڑھاتے ہیں، کیا ان کا تراویح پڑھانا صحیح ہے؟ اور اگر وہ نماز پڑھائیں، تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

احناف کے نزدیک امام کا بالغ ہونا ضروری ہے، نابالغ امامت کا اہل نہیں ہے۔ (۱)

بلوغت کی عمر لڑکے کے لیے کم از کم ۱۲ سال ہے، ۱۲ سال سے پہلے لڑکا بالغ نہیں ہوسکتا، اور اگر بلوغت کی نشانی احتلام وغیرہ ظاہر نہ ہو، تو ۱۵ سال کی عمر میں لڑکے کے لیے بلوغت کا حکم لگا دیا جائے گا، چاہے احتلام ہو یا نہ ہو، اس کو بلوغ بالسن کہا جاتا ہے؛ اس لیے لڑکے کے ۱۵ سال ختم ہو گئے ہوں، تو اس کا فرض، واجب اور تراویح میں امام بننا جائز ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=فاجرا وإن عمل الكبائر. (سنن أبي داود: ۱/ ۳۴۳، رقم الحديث: ۲۵۳۳، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، ط: البدر - ديوبند ☆سنن الدار قطني (م: ۳۸۵ھ): ۲/ ۴۰۴، باب صفة من تجوز الصلاة معه، والصلاة عليه، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت)

ويكره تنزيها إمامة... فاسق. (الدر المختار) ———— فإن أمكن الصلاة خلف غيرهم فهو أفضل وإلا فالاقتداء أولى من الانفراد. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۵۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر)

وفي النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق أو مبتدع نال فضل الجماعة. (الدر المختار) ———— قال ابن عابدين: (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال كما ينال خلف تقي ورع. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۵۶۲، كتاب الصلاة، باب الإمامة)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: حاشية الشِّلْبِيِّ مع تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِّلْبِيُّ (م: ۱۰۲۱ھ): ۱/ ۱۳۴ - ۱۳۵، كتاب الصلاة، الأحق بالإمامة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة ☆البناية شرح الهداية - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵): ۲/ ۳۳۳، باب في الإمامة، إمامة العبد والفاسق والأعمى وولد الزنا، ط: دار الكتب العلمية - بيروت.

(۱) سوال سابق کا حاشیہ نمبر (۲) دیکھیں۔

(۲) بلوغ الغلام بالاحتلام أو الإحبال أو الإنزال، والجارية بالاحتلام، أو الحيض أو الحبل، كذا في المختار. والسن الذي يحكم ببلوغ الغلام والجارية إذا انتهيا إليه خمس عشرة سنة عند أبي يوسف ومحمد - رحمهما الله تعالى - وهو رواية عن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - وعليه الفتوى،... وأدنى مدة البلوغ بالاحتلام ونحوه في حق الغلام اثنتا عشرة سنة، وفي الجارية تسع سنين، ولا يحكم بالبلوغ إن ادعى وهو ما دون اثنتي عشرة سنة في الغلام،=

[۳] تراویح پر اجرت لینا

۱۵۶۴-سوال: اگر کوئی حافظ قرآن، رمضان المبارک میں تراویح پڑھائے، اور وہاں کے لوگ اس کو یہ کہیں کہ ہم آپ کو تین سو روپئے دے رہے ہیں، اس میں سے آپ اپنے کھانے پینے کا انتظام بھی کرلیں، اور اسی میں سے آپ کی تراویح کا ہدیہ بھی ہو جائے گا، تو کیا ایسی رقم لے کر تراویح پڑھانا جائز ہے؟

احقر سعید احمد محمد سیدات

الجواب حامدا ومصلیا:

تراویح پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ (۱)

اس کی جائز صورت یہ ہے کہ حافظ صاحب معاملہ اس طرح طے کریں کہ رمضان میں ایک نماز مثلا مغرب کی نماز پڑھاؤں گا، اور اجرت تین سو روپئے لوں گا، کھلانے کی ذمہ داری گاؤں والوں کی نہیں رہے گی، ایسی صورت میں خشک تنخواہ تین سو روپئے دے دینا جائز ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= وتسع سنين في الجارية، كذا في المعدن. (الفتاوى الهندية: ۶۱/۵، كتاب الحجر، الباب الثاني في الحجر للفساد، الفصل الثاني في معرفة حد البلوغ، ط: دار الفكر ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۱۵۳/۶، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، ط: دار الفكر)

(۱) وقال الله تعالى: وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ. (۲-البقرة: ۴۱)

(۲) عن سليمان بن بريدة، عن أبيه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من قرأ القرآن يتأكل به الناس، جاء يوم القيامة ووجهه عظم ليس عليه لحم". (شعب الإيمان - أحمد بن الحسين بن علي بن موسى الخُسْرَوْجِردي الخراساني، أبو بكر البيهقي (م: ۴۵۸هـ): ۱۹۵/۴، رقم الحديث: ۲۳۸۴، تعظيم القرآن، فصل في ترك قراءة القرآن في المساجد والأسواق ليعطى وليستأكل به، ت: الدكتور عبد العلي عبد الحميد حامد، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض، بالتعاون مع الدار السلفية ببومباي بالهند ☆ الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار - أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵هـ): ۱۶۸/۲، رقم الحديث: ۷۷۴۱، كتاب صلاة التطوع، والإمامة، [باب] في الرجل يقوم بالناس في رمضان فيعطى، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد - الرياض ☆ معجم ابن الأعرابي - أبو سعيد بن الأعرابي أحمد بن محمد بن زياد بن بشر بن درهم البصري الصوفي (م: ۳۴۰هـ): ۲۰/۲، رقم الحديث: ۸۰۵، ت: عبد المحسن بن إبراهيم بن أحمد الحسيني، ط: دار ابن الجوزي، المملكة العربية السعودية)

(۲) (و) لا لأجل الطاعات مثل (الأذان والحج والإمامة وتعليم القرآن والفقه) ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والإمامة والأذان. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: قال في الهداية: وبعض مشايخنا=

[۴] تراویح پڑھانے کی اُجرت لینا

۱۵۶۵- سوال: رمضان میں تراویح پڑھانے کے بعد بطورِ ہدیہ جو رقم دی جاتی ہے اُس کا لینا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

تراویح پڑھانے کے لیے اُجرت لینا جائز نہیں ہے،

بہتر یہ ہے کہ تراویح پڑھانے والا ٹرسٹی کے ساتھ بات کر کے ایک دو نماز پڑھانے کی ذمہ داری لے لے اور اس کی اُجرت طے کرے، لیکن تراویح فی سبیل اللہ پڑھائے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] تراویح کی اُجرت

۱۵۶۶- سوال: تراویح کی رقم لوگ خوشی سے دیتے ہیں، اُس کو لینا کیسا ہے؟ اور تراویح سے پہلے طے کرنا کہ میں اِتنی رقم لوں گا، یہ صحیح ہے یا نہیں؟ یہاں ایک عالمِ باعمل کہتے ہیں کہ تراویح پر پیسہ لینا قرآن شریف بیچنے کے برابر ہے، اور اُس پر اُجرت لینا بالکل جائز نہیں ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

بہ خوشی دیتے ہوں، تو لینے کی گنجائش ہے؛ لیکن پہلے سے شرط کرنا کہ اِتنی رقم دیں گے، تو تراویح پڑھاؤں گا، حرام ہے، رقم لینا جائز نہیں ہے۔

حیلہ یہ ہے کہ حافظ جی یوں کہہ دے کہ میں بچوں کو روزانہ دو گھنٹے پڑھاؤں گا، اور دو سو روپیہ لوں گا،

= -رحمهم الله تعالى- استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم لظهور التواني في الأمور الدينية، ففي الامتناع تضييع حفظ القرآن وعليه الفتوى اهـ. (ردالمحتار على الدر المختار: ٥٥/٦، كتاب الإجارة، مطلب في الاستئجار على الطاعات، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) فالحاصل: أن مايتخلص به الرجل من الحرام أو يتوصل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن، وإنما يكره ذلك أن يحتال في حق لرجل حتى يبطله أو في باطل حتى يموهه أو في حق حتى يدخل فيه شبهة فما كان على هذا السبيل فهو مكروه، وما كان على السبيل الذي قلنا أولا فلا بأس به. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۲۱۰/۳۰، كتاب الحيل، ط: دار المعرفة- بيروت)

مزید تفصیل کے لیے سوال سابق دیکھیں۔

تو یہ جائز ہے، بچوں کو پڑھانے پر تنخواہ لینا جائز ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] تراویح کے بعد دعا مانگنا

۱۵۶۷- سوال: تراویح کی بیسویں رکعت کے بعد دعا کا کیا حکم ہے؟ آیا حدیث سے ثابت ہے؟ نیز دعا نہ مانگنے پر امام تراویح کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والوں کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداو مصليا:

بیسویں رکعت پر دعا مانگنا جائز ہے، انکار صحیح نہیں۔ (۲)

جائز کام پر امام کو مجبور کرنا جائز نہیں۔ (۳)

نزاع، جھگڑا اور تنقیص حرام ہے؛ لہٰذا جائز کام پر اصرار یا ترک پر اصرار، لزوم ووجوب سمجھتے ہوئے جائز نہیں۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

---

(۱) تفصیل وتخریج گذر چکی۔

(۲) (يجلس) ندبا (بين كل أربعة بقدرها وكذا بين الخامسة والوتر) ويخيرون بين تسبيح وقراءة وسكوت وصلاة فرادى. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۴۶، كتاب الصلاة، باب الوتر و النوافل، ط: دار الفكر- بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۱/۱۱۵، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، ط: دار الفكر☆ البحر الرائق: ۲/۷۴، كتاب الصلاة، صلاة التراويح، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ بدائع الصنائع: ۱/۲۹۰، كتاب الصلاة، فصل: صلاة التطوع، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆ فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۴/۲۷۱، فصل رابع، مسائل تراویح، ط: دار العلوم- دیوبند)

(۳) قال الطيبي: وفيه أن من أصر على أمر مندوب، وجعله عزما، ولم يعمل بالرخصة فقد أصاب منه الشيطان من الإضلال. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۲/۷۵۵، رقم الحديث: ۹۴۶، كتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، ط: دار الفكر، بيروت-لبنان)

(۴) عن ابن عمر قال: صعد رسول الله صلى الله عليه وسلم المنبر فنادى بصوت رفيع، فقال: "يا معشر من أسلم بلسانه ولم يفض الإيمان إلى قلبه، لا تؤذوا المسلمين، ولا تعيروهم، ولا تتبعوا عوراتهم، فإنه من تتبع عورة أخيه المسلم تتبع الله عورته، ومن تتبع الله عورته يفضحه، ولو في جوف رحله" قال: ونظر ابن عمر يوما إلى البيت أو إلى الكعبة فقال: ما أعظمك وأعظم حرمتك، والمؤمن أعظم حرمة عند الله منك. (سنن الترمذي: ۲/۲۳، رقم الحديث: ۲۰۳۲، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في تعظيم المؤمن، ط: ديوبند)

[۷] حافظ قرآن کا تراویح کی اجرت مسجد میں دے دینا

۱۵۶۸- سوال: الحمد للہ میرا لڑکا حافظ قرآن ہے اور اس سال ہماری بستی کی مسجد (محلہ کی مسجد) میں تراویح کی چار رکعت پڑھاتا ہے، ارادہ فی سبیل اللہ تراویح پڑھانے کا ہے، ہمارے یہاں حافظوں کو چندہ کر کے ۲۷ رمضان کو بہ طور ہدیہ کچھ رقم عنایت کی جاتی ہے، تو کیا ہم وہ رقم لے کر مسجد میں دے سکتے ہیں ؟ یا کسی غریب کو وہ رقم دے سکتے ہیں؟ بالتفصیل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامدا و مصليا:

تراویح کی اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ [1] لوگوں کو مسئلہ اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے پھر بھی اگر لوگ اپنی خوشی سے دے جائیں، تو رقم لینا جائز ہوگا، متولی یا ٹرسٹی چندہ کر کے دیں، تو جائز نہیں ہے۔ [2]

اگر جائز طریقہ سے وہ رقم آئی ہے تو مسجد میں دینا جائز ہے، اگر ناجائز طریقہ سے ملی ہے، تو مسجد میں دینا صحیح نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] عشاء پڑھے بغیر تراویح و وتر پڑھ لینا

۱۵۶۹- سوال: ایک شخص رمضان المبارک میں عشاء اور تراویح ادا کرنے مسجد میں پہنچا، اس نے

---

(۱) وقد أطنب في رده صاحب تبيين المحارم مستندا إلى النقول الصريحة، فمن جملة كلامه قال تاج الشريعة في شرح الهداية: إن القرآن بالأجرة لا يستحق الثواب لا للميت ولا للقارئ. وقال العيني في شرح الهداية: ويمنع القارئ للدنيا، والآخذ والمعطي آثمان. فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز؛ لأن فيه الأمر بالقراءة وإعطاء الثواب للآمر والقراءة لأجل المال؛ فإذا لم يكن للقارئ ثواب لعدم النية الصحيحة فأين يصل الثواب إلى المستأجر ولولا الأجرة ما قرأ أحد لأحد في هذا الزمان بل جعلوا القرآن العظيم مكسبا ووسيلة إلى جمع الدنيا - إنا لله وإنا إليه راجعون - اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۵۶/۶، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب في الاستئجار على المعاصي، ط: دار الفكر)

مزید تفصیل وتخریج کے لیے ملاحظہ کریں عنوان: تراویح پر اجرت لینا ☆ تراویح پڑھانے کی اُجرت لینا۔

(۲) کیوں کہ اس میں بہت سارے مفاسد لازم آتے ہیں۔ مثلاً: چندہ دہندہ خوشی سے دینا نہیں چاہتا، لیکن معزز لوگوں کی موجودگی میں انکار کرنا اس کے لیے بھاری پڑتا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: إنه لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه. (مسند احمد: ۲۹۹/۳۴، حدیث نمبر: ۲۰۶۹۵، ابوحرہ الرقاشی عن عمہ، ط: الرسالہ ☆ مسند ابو یعلی الموصلی: ۱۴۰/۳، حدیث: ۱۵۷۰، ت: حسین سلیم اسد، ط: دار المامون)

دیکھا کہ نمازِ عشاء ہو چکی ہے، تو وہ وضو کر کے عشاء کی نماز پڑھے بغیر، تراویح میں شریک ہو گیا، وتر کی نماز بھی باجماعت پڑھی، سوال یہ ہے کہ تراویح اور وتر پڑھنے کے بعد عشاء کی فرض نماز کو ادا کرے، تو درست ہے یا نہیں؟

فرض [عشاء] سے پہلے پڑھی گئی تراویح اور وتر ادا ہوئی یا نہیں؟

اور اگر ایسا اتفاق ہو جائے، تو اس کی صحیح ترتیب کیا ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

تراویح کا وقت عشاء کی فرض نماز کی ادائیگی کے بعد ہے؛ لہٰذا جس شخص نے بغیر فرض پڑھے تراویح ادا کی، تو وہ صحیح نہیں ہوئی، تراویح اور وتر کو فرض [عشاء] کے بعد پڑھنا ضروری ہے۔ (کتب فقہ)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] اگر تراویح کی دو رکعت پر سلام پھیرے بغیر کھڑا ہو جائے؟

۱۵۷۰- سوال: تراویح کی نماز میں امام دو رکعت ادا کر کے تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا اور چوتھی رکعت بھی ادا کی اور اخیر میں سجدۂ سہو کیا، تو میرے علم کے مطابق پہلی دو رکعت تراویح کی ہو گی اور بعد کی دو رکعت نفل، کیا یہ صحیح ہے؟

---

[۱] والصحيح أن وقتها ما بعد العشاء إلى طلوع الفجر قبل الوتر وبعده، حتى لو تبين أن العشاء صلاها بلا طهارة دون التراويح والوتر، أعاد التراويح مع العشاء دون الوتر؛ لأنها تبع للعشاء هذا عند أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - فإن الوتر غير تابع للعشاء في الوقت عنده، والتقديم إنما وجب لأجل الترتيب وذلك يسقط بعذر النسيان فيصح إذا أدى قبل العشاء بالنسيان بخلاف التراويح فإن وقتها بعد أداء العشاء فلا يعتد بما أدي قبل العشاء. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۵، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، ط: دار الفكر)

(ووقتها بعد صلاة العشاء) إلى الفجر (قبل الوتر وبعده) في الأصح، فلو فاته بعضها وقام الإمام إلى الوتر أوتر معه ثم صلى ما فاته. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله بعد صلاة العشاء) قدر لفظ صلاة إشارة إلى أن المراد بالعشاء الصلاة لا وقتها، وإلى ما في النهر من أن المراد ما بعد الخروج منها حتى لو بنى التراويح عليها لا يصح، وهو الأصح. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۳، كتاب الصلاة، باب الوتر و النوافل، ط: دار الفكر ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۱۳۶، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ البحر الرائق: ۲/ ۷۱، كتاب الصلاة، صلاة التراويح، ط: دار الكتاب الإسلامي)

الجواب حامداومصلیا:

آپ کا سمجھنا صحیح ہے، دو رکعت تراویح اور دو نفل ہوگی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] شبینہ ثابت نہیں

۱۵۷۱- سوال: بعض جگہوں پر رمضان المبارک میں شبینہ تراویح ہوتی ہے، یعنی ایک شب کی تراویح میں پورا قرآن پڑھا جاتا ہے، یہ صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

علماء، مشائخ اور اولیاء سے ثابت نہیں ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فلو فعلها بتسليمة، فإن قعد لكل شفع صحت بكراهة وإلا نابت عن شفع واحد به يفتى. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله به يفتى) لم أر من صرح بهذا اللفظ هنا، وإنما صرح به في النهر عن الزاهدي فيما لو صلى أربعا بتسليمة وقعدة واحدة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الفكر ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۱۳۶، كتاب الصلاة، فصل في التراويح، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۱۸، كتاب الصلاة، الباب التاسع في النوافل، فصل في التراويح، ط: دار الفكر ☆ فتاوی دار العلوم دیوبند: ۴/ ۲۶۲، مسائل تراویح، ط: دار العلوم-دیوبند)

(۲) (ويترك الدعوات) ويجتنب المنكرات هذرمة القراءة، وترك تعوذ وتسمية، وطمأنينة، وتسبيح، واستراحة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۷، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، ط: دار الفكر-بيروت)

سوال: ایک زمانہ میں ایک شب میں چند آدمی مل کر قرآن شریف ختم کرتے ہیں جس کا نام شبینہ رکھا ہے اور اس میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں آیا یہ فعل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یا کسی صحابیؓ نے یا کسی امامؒ نے کیا ہے یا نہیں اور ایک شب میں قرآن شریف ختم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ المستفتی نمبر ۱۲۵۱ عبد الجبار (دہلی) ۲۴ رمضان ۱۳۵۵ھ ۹ دسمبر ۱۹۳۶ء

جواب: ایک رات میں قرآن شریف ختم کرنا اس شخص کے لئے جائز ہے جو خود اپنے ذوق وشوق سے پڑھے اور اس کے دل میں اول سے آخر تک کوئی وسوسہ بے رغبتی کا نہ آوے لیکن شبینہ کا یہ رواج جو عام طور پر مساجد میں کیا جاتا ہے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں تھا' نہ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں' نہ مجتہدین سلفؒ سے یہ منقول کہ انہوں نے عام طور پر جماعت کے ساتھ ایک رات میں قرآن مجید ختم کرنے کا امر فرمایا ہو یا خود شبینہ کیا ہو اور تجربہ شاہد ہے کہ ان شبینوں میں بہت سے مکروہات و محرمات کا ارتکاب ہوتا ہے، ان وجوہ کی بناء پر شبینہ مروجہ کوئی اچھی اور ثواب کی بات نہیں ہے؛ بل کہ بسا اوقات کرنے والے مواخذہ دار ہی ہوجاتے ہیں۔ واللہ الموفق۔ محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

(کفایت المفتی: ۳/ ۴۰۲، کتاب الصلاۃ، نماز تراویح، مروجہ شبینہ کا حکم، ط: زکریا-دیوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب الفتاوی: ۲/ ۴۰۶، نماز سے متعلق سوالات، نماز تراویح کا بیان، یک شبی اور سہ شبینہ۔

عن الحسن، أن ابن عباس خطب بالبصرة فقال: أدوا زكاة صومكم، فجعل الناس ينظر بعضهم إلى بعض، فقال: من هاهنا من أهل المدينة، قوموا إلى إخوانكم فعلموهم فإنهم لا يعلمون، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم فرض صدقة الفطر على الصغير والكبير، والحر والعبد، والذكر والأنثى، نصف صاع من بر، أو صاعا من تمر أو شعير. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي-أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳ھ): ۳/۱۹۰، رقم الحديث: ۱۵۸۰، كتاب صلاة العيدين، حث الإمام على الصدقة في الخطبة، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية-حلب)

متفرقات الصوم

[روزہ کے متفرق مسائل]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

متفرقات الصوم

[روزہ کے متفرق مسائل]

[١] نماز اور روزوں کا فدیہ

١٥٧٢- سوال: ایک شخص کے ذمہ ١٩ رمہینہ کی (٣٤٢٠) نمازیں اور ایک مہینے کے روزے باقی ہیں، تو ان کا کتنا فدیہ دینا چاہیے؟

الجواب حامدا ومصليا:

روزانہ کی پانچ نماز اور ایک وتر کی نماز اس طرح کل چھ نمازوں کا فدیہ دینا ہوگا اور روزوں کا بھی یہی فدیہ ہے کہ ہر روزے کے بدلے ایک فدیہ دینا ہوگا۔ (درمختار)[1]

[١] (يعطى لكل صلاة نصف صاع من بر) كالفطرة (وكذا حكم الوتر) والصوم. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله نصف صاع من بر) أي أو من دقيقه أو سويقه، أو صاع تمر أو زبيب أو شعير أو قيمته، وهي أفضل عندنا لإسراعها بسد حاجة الفقير إمداد. ثم إن نصف الصاع ربع مد دمشقي من غير تكويم، بل قدر مسحه. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ٧٢-٧٣، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، مطلب في إسقاط الصلاة عن الميت، ط: دار الفكر☆البحر الرائق مع حاشية ابن عابدين المعروف بـ 'منحة الخالق': ٢/ ٩٨، كتاب الصلاة، باب قضاء الفوائت، فصل: سجود السهو في مطلق الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ١/ ١٢٥، كتاب الصلاة، الباب الحادي عشر في قضاء الفوائت، ط: دار الفكر-بيروت)

ایک فدیہ میں اتنے گیہوں دیے جائیں، جتنے صدقہ فطر میں دیے جاتے ہیں؛ لہٰذا ایک فدیہ میں ایک کلو، سات سو چھیاسٹھ گرام (۱رکلو اور ۷۶۶ گرام)[۲] گیہوں دے دے۔ گیہوں کی مذکورہ قیمت دے یا خود گیہوں دے، دونوں جائز ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] رمضان المبارک کا ٹائم ٹیبل چھپوانا

۱۵۷۳- **سوال:** آج کل بہت سے لوگ یا بہت سے تاجر رمضان المبارک کا ٹائم ٹیبل (Time Table) چھپوا کر اپنے مرحومین کے ایصال ثواب کے لیے تقسیم کرتے ہیں، جس میں مسنون دعائیں لکھی ہوتی ہیں، لوگ ادھر اُدھر اسے پھینک دیتے ہیں، جس سے اس کی بڑی بے ادبی ہوتی ہے، اس لیے دریافت یہ کرنا ہے کہ رمضان المبارک کا ٹائم ٹیبل چھپوانا کیسا ہے؟

الجواب حامدا و مصليا:

ایصال ثواب کی غرض سے ایسے ٹائم ٹیبل چھپوانا جائز؛ بل کہ بہتر ہے، البتہ شہرت اور نام و نمود سے اجتناب کرنا چاہیے۔

کوئی بھی ٹائم ٹیبل ہو، اگر اس میں قرآنی آیات و احادیث ہوں، تو اس کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھنا

---

(۲) عن الحسن، أن ابن عباس خطب بالبصرة فقال: أدوا زكاة صومكم، فجعل الناس ينظر بعضهم إلى بعض، فقال: من هاهنا من أهل المدينة، قوموا إلى إخوانكم فعلموهم فإنهم لا يعلمون، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم فرض صدقة الفطر على الصغير والكبير، والحر والعبد، والذكر والأنثى، نصف صاع من بر، أو صاعا من تمر أو شعير. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳ھ): ۳/۱۹۰، رقم الحديث: ۱۵۸۰، كتاب صلاة العيدين، حث الإمام على الصدقة في الخطبة، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب)

(نصف صاع) فاعل يجب (من بر أو دقيقه أو سويقه أو زبيب)... (أو صاع تمر أو شعير) ولو رديئا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۶۴، كتاب الزكاة، باب صدقة الفطر، ط: دار الفكر - بيروت)

ایک صاع = ۳۱۴۹ء۲۸۰ (تین کلو ایک سو انچاس گرام، دو سو اسی ملی گرام) ہوتا ہے، تو نصف صاع ۱۵۷۴ء۶۴۰ (ایک کلو پانچ سو چہتر گرام، چھ سو چالیس ملی گرام) ہوگا۔ (دیکھیے: الاوزان المحمودة، ص: ۱۰۵، ط: دار الکتاب - دیوبند☆ امداد الاوزان، ص: ۱۹، ط: ہرسولی - مظفر نگر)

ضروری ہے، جو بے ادبی کرے گا، وبال اس کے سر ہوگا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] رمضان میں حیض روکنے والی دواؤں کا استعمال

۱۵۷۴- سوال: آج کل ایک ایسی دوا ایجاد ہوئی ہے کہ اگر عورت اس کا استعمال کرے، تو اس کا حیض رک جاتا ہے، عورتیں اس دوا کو رمضان المبارک میں اس مقصد سے بہ کثرت استعمال کرتی ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ رمضان کی خیر وبرکت حاصل کریں اور کثرت سے عبادت کرسکیں اور روزہ قضاء نہ ہو۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا ایسی دوا کا استعمال کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

اگر اس دوا سے کسی خطرناک بیماری کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اسی طرح یہ دوا حیض کو دائمی طور پر بند نہ کرتی ہو، تو بہ قدرِ ضرورت اس کا استعمال جائز ہے اور رمضان میں روزے فوت نہ ہوجائیں اور زیادہ سے زیادہ عبادت کا موقع ملے، اس نیت سے ایسی دوا کا استعمال کرنا جائز ہے؛ بل کہ آج کے دور میں چوں کہ بہت سی عورتیں رمضان کے روزوں کی قضاء کرنے میں سستی سے کام لیتی ہیں؛ اس لیے ایسی خواتین کے لیے بہتر ہے کہ رمضان المبارک میں اس دوا کا استعمال کرلے، تاکہ روزے قضاء نہ ہوں۔[2]

---

(۱) عن عمر بن عبد العزيز، أن النبي صلى الله عليه وسلم مر على كتاب على الأرض فقال: لفتى معه: ما هذا؟ قال: بسم الله قال: لعن الله من فعل هذا، ولا تضعوا اسم الله إلا في موضعه. قال: فرأيت عمر بن عبد العزيز رأى ابنا له كتب ذكر الله في الحائط فضربه. (المراسيل-أبو داود سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو الأزدي السِّجِستاني (م: ۲۷۵ھ)، ص: ۳۴۲، رقم الحديث: ۴۹۹، باب في الكتاب ملقى في الطريق، ت: شعيب الأرناؤوط، ت: مؤسسة الرسالة-بيروت)

ولو كتب القرآن على الحيطان والجدران بعضهم قالوا: يرجى أن يجوز، وبعضهم كرهوا ذلك مخافة السقوط تحت أقدام الناس، كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۲۳، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد والقبلة والمصحف وما كتب فيه شيء من القرآن، ط: دار الفكر)

(۲) حیض ایسی چیز نہیں کہ اس کا جاری رہنا ضروری ہو، جس طرح مطلقہ عورت-جس کا حیض رک گیا ہو-اپنی عدت پوری کرنے کے لیے علاج کراسکتی ہے، اور ایسی دوا استعمال کرسکتی ہے، جس سے حیض جاری ہوجائے، اسی طرح مصلحت کی بناء پر عارضی طور پر اس کو روکنے لیے بھی دوا استعمال کرسکتی ہے، اس میں عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے، ہاں حیض کا جاری ہونا قانون فطرت ہے، جس کے خلاف کرنے سے نقصان ہوسکتا ہے؛ اس لیے زیادہ دنوں تک حیض کو مصنوعی طور پر روکنا صحت پر منفی اثر ڈالے گا، جس سے احتیاط لازم ہے۔ =

اگرایسی دوا کے استعمال سے حمل ٹھہرنے میں تاخیر ہوتی ہو،تواس کواستعمال کرنے سے پہلے عورت کو اپنے شوہر سے اجازت لے لینی چاہیے، بغیر اجازت کے اس کا استعمال نہ کرے۔فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] رمضان اور حج کے دنوں میں مانع حیض دوا کا استعمال

۱۵۷۵-سوال: عورتوں کے لیے حیض کا آنا قانون فطرت ہے، اس کو ایسی دوا سے روکنا،جس کی گرمی سے بیماری پیدا ہونے کا اندیشہ ہواوراس بیماری کی وجہ سے عبادت میں زیادہ خلل پیدا ہونے کا خوف ہواوراس کے مقابلہ میں اگرعورت اس دوا کا استعمال نہ کرے،تو حیض کی مدت میں عبادت میں زیادہ خلل نہ آئے،توکیاایسی دوا کا استعمال کرنا جائز ہے،جس سے وقتی طور پر حیض نہ آئے؟

الجواب حامداومصلیا:

اگراس دواء سے کوئی بیماری ہوتی ہو یا پھرحمل کی صلاحیت بالکل ہی ختم ہوجاتی ہو،تواس کا استعمال جائزنہیں،ہاں اگر رمضان المبارک کے روزوں میں کوئی خاص خلل نہیں ہوتا ہے،تواس دواء کا استعمال کرنا

= مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم رقم طراز ہیں:

سنا ہے کہ بعض خواتین رمضان المبارک کے روزے مکمل کرنے کے لئے میڈیکل گولیاں کھالیتی ہیں، کیاایسا کرنا درست ہے؟

جواب: خواتین کو ماہواری کا آنا قانون فطرت کے مطابق ہے، اوراسے مصنوعی طریقہ پر روکنا غیر فطری امر ہے، اور جو چیزیں فطرت کے عام اصول کے خلاف کی جاتی ہیں، وہ عام طور پر صحت کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں، اس لیے اس سے احتراز کرنا چاہئے، اور بعد میں روزہ کی قضا کرلینی چاہئے، عورتیں چوں کہ اس معاملہ میں معذور ہیں، اس لیے امید ہے کہ رمضان کے بعد روزہ رکھنے کا ان کو اسی قدر ثواب ہوگا جو رمضان میں رکھنے کا ہوتا ہے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ زیادہ اجر کی مستحق ہوں، کیوں کہ رمضان المبارک کے ماحول میں سبھوں کے ساتھ مل کر روزہ رکھنا آسان ہوتا ہے، اور عام دنوں میں تنہا روزہ رکھنا نسبتاً دشوار، اور جو کام اللہ کے حکم سے ادا کیا جائے اوراس میں زیادہ مشقت ہو، اس میں زیادہ اجروثواب کی توقع ہے۔

تاہم اگر کوئی عورت ماہواری شروع ہونے سے پہلے ہی سے دواء کا استعمال شروع کردے اور خون جاری ہی نہ ہو، تو اس نے جن دنوں روزہ رکھا ہے، وہ درست ہوجائے گا، اگر خون شروع ہوچکا اور پھر اس نے دوا کھا کر خون کو روک لیا، تو میرا خیال ہے کہ اس دن سے اس کے معمول کے ایام تک، اور کوئی عادت مقرر نہ ہو، تو تین دنوں تک جو حیض کی کم سے کم مدت ہے، وہ حائضہ ہی تصور کی جائے گی اور ان دنوں کا روزہ درست نہیں ہوگا، نیز اس کی قضا واجب ہوگی: "والحائض إذا احبست الدم عن الورد لا يخرج من أن يكون حائضا بخلاف صاحب الجرح". (خلاصة الفتاوى، ۱:۱/۲۳۱، كتاب الحيض) [کتاب الفتاویٰ: ۴۲۱/۳، کتاب الصوم، روزہ، مختلف مسائل، روزہ کے لیے مانع حیض ادویہ کا استعمال، ط: نعیمیہ-دیوبند]

جائز ہے؛ کیوں کہ اس کے استعمال سے روزوں پر کوئی اثر نہیں ہوگا، جیسا کہ حج کے موقع پر طواف زیارت کا وقت چلا جائے اور گھر واپس آنے کی تاریخ تک پاکی حاصل نہ ہو، تو ایسی دوا کا استعمال کر لینا بہتر ہوگا اور رمضان کی اصل فرض عبادت روزہ ہے، وہ ادا ہو جائے اور دوسری کوئی نفل عبادتوں میں کچھ خلل واقع ہو جائے تو حرج نہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] ماہِ رمضان میں حیض کو بند رکھنے کے لیے دوا کا استعمال

۱۵۷۶- سوال: ہمارے یہاں سعودی (ریاض) میں بعض عورتیں رمضان میں اپنے حیض کو روکنے کے لیے کچھ گولیاں کھالیتی ہیں، تاکہ حیض نہ آئے اور رمضان کے روزوں کی قضا نہ کرنی پڑے، تو اِس باب میں حکمِ شرعی کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

عارضی طور پر حیض بند کرنے کے لیے اگر کوئی دوا استعمال کی جائے اور اُس سے تولد کی قوت پر کوئی اثر نہ ہوتا ہو، تو جائز ہے، بل کہ رمضان المبارک کے مہینے میں وقتی طور پر حیض بند کرنے کے لیے استعمال کرلے، تو بہتر ہے؛ اِس لیے کہ رمضان کے روزوں کی قضا دوسرے دِنوں میں عورتوں کو بڑی مشکل معلوم ہوتی ہے، یہاں تک کہ بعض عورتیں تو قضا ہی نہیں کرتیں، البتہ اگر اِس قسم کی کسی دوائی سے تولد کی قوت ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو، تو اُس کا استعمال جائز نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تفصیل وتخریج کے لیے سوال سابق کی جانب رجوع کریں۔

(۲) تخریج وتفصیل گذر چکی۔

عن عائشة رضي الله عنها - زوج النبي صلى الله عليه وسلم -: أن النبي صلى الله عليه وسلم، كان يعتكف العشر الأواخر من رمضان حتى توفاه الله، ثم اعتكف أزواجه من بعده. (صحيح البخاري: ۱/۲۷۱، رقم الحديث: ۲۰۲٦، كتاب الاعتكاف، باب الاعتكاف في العشر الأواخر، والاعتكاف في المساجد كلها، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/۳۷۱، رقم الحديث: ۵-(۱۱۷۲)، كتاب الاعتكاف، باب اعتكاف العشر الأواخر من رمضان، ط: ديوبند)

باب الاعتكاف

[اعتکاف کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الاعتکاف

[اعتکاف کا بیان]

[۱] اعتکاف کی تعریف

۱۵۷۷-سوال: اعتکاف کسے کہتے ہیں؟

الجواب حامدا ومصلیا:

اعتکاف کا لغوی معنیٰ ''رکنا'' ہے۔

اور اصطلاحِ شرع میں اعتکاف کہتے ہیں، ایسی مسجد میں اللہ کے لیے، عبادت کی نیت سے رکنا، جہاں پنج وقتہ نماز ہوتی ہو۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) وهو في اللغة الإقامة على الشيء، ولزومه، وحبس النفس عليه، ومنه قوله تعالى {ما هذه التماثيل التي أنتم لها عاكفون} [الأنبياء:۵۲] وقوله تعالى {يعكفون على أصنام لهم} [الأعراف:۱۳۸] وفي الشريعة: هو الإقامة في المسجد واللبث فيه، مع الصوم والنية، قال الله تعالى {أن طهرا بيتي للطائفين والعاكفين} [البقرة:۱۲۵] والمعنى اللغوي فيه موجود مع زيادة وصف. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق- عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م:۷۴۳ھ): ۱/ ۳۴۷، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة☆مراقي الفلاح، ص: ۲۶۴، باب الاعتكاف، ط: المكتبة العصرية☆درر الحكام شرح غرر الأحكام- محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا- أو منلا أو المولى- خسرو (م:۸۸۵ھ): ۱/ ۲۱۲، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار إحياء الكتب العربية☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۴۰، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر- بيروت☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۰، الباب السابع في الاعتكاف، ط: دار الفكر)

[۲] اعتکاف کہاں کرنا بہتر ہے؟

۱۵۷۸- سوال: اعتکاف اپنے گاؤں میں اور اپنے محلے کی مسجد میں کرنا بہتر ہے یا گاؤں سے دس بارہ کیلومیٹر دور جا کر کرنا بہتر ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

نبی کریم ﷺ نے آخری عشرے کا اعتکاف کیا ہے اور آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی ازواج مطہرات اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا معمول رہا ہے؛ اس لیے رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کیا جائے اور یہ سنت کفایہ ہے۔(۱)

---

(۱) عن عائشة رضي الله عنها - زوج النبي صلى الله عليه وسلم -: أن النبي صلى الله عليه وسلم، كان يعتكف العشر الأواخر من رمضان حتى توفاه الله، ثم اعتكف أزواجه من بعده. (صحيح البخاري: ۱/۲۷۱، رقم الحديث: ۲۰۲۶، كتاب الاعتكاف، باب الاعتكاف في العشر الأواخر، والاعتكاف في المساجد كلها، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۱/۳۷۱، رقم الحديث: ۵-(۱۱۷۲)، كتاب الاعتكاف، باب اعتكاف العشر الأواخر من رمضان، ط: ديوبند)

(وسنة مؤكدة في العشر الأخير من رمضان) أي سنة كفاية كما في البرهان وغيره لاقترانها بعدم الإنكار على من لم يفعله من الصحابة. (الدر المختار)ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله أي سنة كفاية) نظيرها إقامة التراويح بالجماعة فإذا قام بها البعض سقط الطلب عن الباقين فلم يأثموا بالمواظبة على ترك بلا عذر، ولو كان سنة عين لأثموا بترك السنة المؤكدة إثما دون إثم ترك الواجب كما مر بيانه في كتاب الطهارة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۴۲، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر-بيروت)

سنت مؤکدہ علی الکفایہ کو اگر تمام افراد ترک کردیں، تو سب ترک سنت کے گنہ گار ہوں گے؛ اس لیے اگر کوئی محلے کی مسجد میں اعتکاف کرنے والا نہ ہو، تو محلے کی مسجد میں ہی اعتکاف کرنا چاہیے:

(قوله والجماعة فيها سنة على الكفاية إلخ) أفاد أن أصل التراويح سنة عين، فلو تركها واحد كره، بخلاف صلاتها بالجماعة فإنها سنة كفاية، فلو تركها الكل أساءوا؛ أما لو تخلف عنها رجل من أفراد الناس وصلى في بيته فقد ترك الفضيلة، وإن صلى أحد في البيت بالجماعة لم ينالوا فضل جماعة المسجد وهكذا في المكتوبات كما في المنية وهل المراد أنها سنة كفاية لأهل كل مسجد من البلدة أو مسجد واحد منها أو من المحلة؟ ظاهر كلام الشارح الأول. واستظهر ط الثاني. ويظهر لي الثالث، لقول المنية: حتى لو ترك أهل محلة كلهم الجماعة فقد تركوا السنة وأساءوا. اهـ.

وظاهر كلامهم هنا أن المسنون كفاية إقامتها بالجماعة في المسجد، حتى لو أقاموها جماعة في بيوتهم ولم تقم في المسجد أثم الكل، وما قدمناه عن المنية فهو في حق البعض المختلف عنها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۵، كتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل، مطلب في القادر بقدرة غيره)

انسان پر اپنے گاؤں اور محلے کا حق ہوتا ہے؛ اس لیے اگر کوئی گاؤں یا محلے کی مسجد میں اعتکاف کرنے والا نہ ہو، تو وہ اپنی مسجد میں اعتکاف کرے، تاکہ پورا گاؤں ایک سنت کے چھوڑنے کے گناہ سے بچ جائے؛ ہاں! اگر اپنے گاؤں کی مسجد میں اعتکاف کرنے والے دوسرے حضرات موجود ہوں اور دس بارہ کیلو میٹر کی دوری پر کوئی اللہ کا نیک بندہ ہو، اور اس کی صحبت سے فائدہ پہنچنے کی امید بھی ہو، تو دور جا کر اعتکاف کرنے کا ثواب ملے گا اور اللہ کے نیک بندے کی صحبت حاصل کرنے کی نیت سے جانے میں ثواب میں مزید اضافہ ہوگا؛ اللہ کے نیک بندے کی صحبت بہتر ہے سو سالہ بے ریا عبادت کے مقابلے میں، صحبت اولیاء بہ از عبادت صد سالہ بے ریا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] اعتکاف کی حالت میں مسجد کے اوٹلے پر بیٹھ کر کھانا کھانا

۱۵۷۹- سوال: میں نے ایسا سنا ہے کہ بشری تقاضے یعنی پیشاب پائخانے کے لیے معتکف مسجد سے باہر جا سکتا ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا کھانا مسجد کے اوٹلے (☆☆☆) پر بیٹھ کر کھا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

مسجد کا صحن اگر مسجد کی شرعی حدود میں داخل نہیں ہے، تو [صحن میں بنے ہوئے] اوٹلے پر بلا ضرورت نکلنے سے اعتکاف ٹوٹ جائے گا، مسجد کے اندر کھانا کھانے کی اجازت ہے، اس لیے صحن میں بنے ہوئے اوٹلے پر [اگر صحن مسجد شرعی کی حد میں نہ ہو] کھانا کھانے سے اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔[1]

(☆☆☆) مسجد کے صحن میں دیوار سے لگ کر بیٹھنے کے لیے بنائی گئی ''نشست گاہ'' کو گجراتی زبان میں ''اوٹلا'' کہتے ہیں، راقم سطور نے رویدرا (ضلع بھروچ) کی مسجد میں اس مقصد سے بنائی گئی نشست گاہ کو دیکھا ہے، جو مسجد میں داخل ہوتے وقت، بائیں جانب کی دیوار سے متصل ہے۔

(۱) (وأما مفسداته) فمنها الخروج من المسجد فلا يخرج المعتكف من معتكفه ليلا و نهارا إلا بعذر، وإن خرج من غير عذر ساعة فسد اعتكافه في قول أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - كذا في المحيط. سواء كان الخروج عامدا أو ناسيا هكذا في فتاوى قاضي خان. . . . ـــــــ (ومن الأعذار الخروج للغائط والبول، وأداء الجمعة) فإذا خرج لبول أو غائط لا بأس بأن يدخل بيته ويرجع إلى المسجد كما فرغ من الوضوء، ولو مكث في بيته فسد اعتكافه، وإن كان ساعة عند أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - كذا في المحيط . . . ـــــــ وإن كان خرج لحاجة الإنسان له أن يمشي على التؤدة كذا في النهاية، وهكذا في العناية. ـــــــ وأما الأكل والشرب =

پیشاب پاخانہ کی مثال دینا درست نہیں ہے؛ کیوں کہ مسجد میں پیشاب پاخانے کی نہ اجازت ہے اور نہ وہاں کوئی جگہ ہوتی ہے؛ نیز اندر پیشاب کرنے سے مسجد کی بے حرمتی ہوگی؛ لیکن کھانا کھانے سے مسجد کی بے حرمتی لازم نہیں آئے گی؛ اس لیے جن چیزوں کا کھانا جائز ہے، وہ مسجد میں کھائے اور جن کی ممانعت ہے، اس سے اجتناب کرے؛ مثلاً: پیاز، لہسن اور دوسری بدبودار چیزیں مسجد میں نہ کھائے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] مسنون اعتکاف میں غسل جنابت کے علاوہ کوئی اور غسل کرنا

۱۵۸۰- سوال: رمضان شریف کے سنت اعتکاف میں غسل جنابت (جو کہ ضروری ہے) کے علاوہ کوئی اور غسل کرنے میں کیا کوئی حرج ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اعتکاف کی حالت میں فرض غسل کے علاوہ ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے یا جمعہ کے مسنون غسل

=والنوم فيكون في معتكفه، لأنه يمكنه قضاء هذه الحاجة في المسجد فلا ضرورة في الخروج كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۲، كتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۱/۲۵۷، كتاب الصوم، الصوم شرط في الاعتكاف الواجب، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۴۴، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر)

(۲) عن جابر - رضي الله تعالى عنه - قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم، عن أكل البصل والكراث. فغلبتنا الحاجة، فأكلنا منها، فقال: من أكل من هذه الشجرة المنتنة، فلا يقربن مسجدنا، فإن الملائكة تأذى، مما يتأذى منه الإنس. (الصحيح لمسلم: ۱/۲۰۹، رقم الحديث: ۷۲-(۵۶۳)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب نهي من أكل ثوما أو بصلا أو كراثا أو نحوها، ط: ديوبند ☆ وانظر صحيح البخاري: ۱/۱۱۸، رقم الحديث: ۸۵۳ تا ۸۵۶، كتاب الأذان، باب ما جاء في الثوم النيء والبصل والكراث، ط: ديوبند)

وأكل نحو ثوم، ويمنع منه. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله وأكل نحو ثوم) أي كبصل ونحوه مما له رائحة كريهة للحديث الصحيح في النهي عن قربان آكل الثوم والبصل المسجد. قال الإمام العيني في شرحه على صحيح البخاري قلت: علة النهي أذى الملائكة وأذى المسلمين ولا يختص بمسجده - عليه الصلاة والسلام -، بل الكل سواء لرواية مساجدنا بالجمع، خلافا لمن شذ ويلحق بما نص عليه في الحديث كل ما له رائحة كريهة مأكولا أو غيره، وإنما خص الثوم هنا بالذكر وفي غيره أيضا بالبصل والكراث لكثرة أكلهم لها. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۶۶۱، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، مطلب في الغرس في المسجد، ط: دار الفكر)

کے لیے نکلنے سے اعتکاف فاسد ہو جائے گا، البتہ کوئی پیشاب پاخانہ کی نیت سے نکلا اور غسل کے لیے پانی تیار تھا اور اس نے غسل کرلیا، تو جائز ہے، مستقلاً غسل کی نیت سے نکلنا جائز نہیں ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] معتکف کے لیے غسل جنابت کے علاوہ دوسرا غسل کرنے کا حکم

۱۵۸۱- سوال: دس روز یا ایک مہینے کے سنت مؤکدہ یا واجب یا نفل اعتکاف میں معتکف جنابت کے غسل کے علاوہ دوسرا کوئی غسل [غسل مسنون یا ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل] کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر جنابت کے غسل کے علاوہ دوسرا کوئی غسل نہیں کرسکتا، تو اس میں شریعت کی کون سی مصلحت ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

معتکف کے لیے غسل جنابت کے علاوہ دوسرا کوئی غسل کرنا جائز نہیں، غسل کی نیت سے باہر نکلے گا، تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا؛ البتہ اگر کوئی شخص مستحب یا سنت غسل کرنا چاہتا ہے، تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنے کسی دوست یا ملازم کے ذریعہ غسل خانے میں پانی اور غسل کی تمام لوازمات رکھوا دے، اس کے بعد وہ حوائج بشریہ (پیشاب و پاخانہ) سے فارغ ہو جائے، پھر غسل کرلے،؛ البتہ پیشاب پاخانے کا محض بہانہ بنانا جائز نہیں۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فتاویٰ فلاحیہ کی دوسری جلد، ص:۸۷ میں "الدر المختار مع رد المحتار: ۳/۳۵-۴۳۴، کتاب الصوم، باب الاعتکاف، ط: زکریا، دیوبند☆ "الفتاوی الهندية: ۱/۲۱۲، کتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: زکریا- دیوبند" اور البحر الرائق: ۲/۵۲۷، کتاب الصوم، باب الاعتکاف" کے حوالے سے تفصیلی تخریج گذر چکی ہے۔

نیز وہاں اشعۃ اللمعات، کتاب المسائل اور احسن الفتاویٰ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک "غسل-خواہ مسنون ہو یا واجب- کے لیے مسجد سے نکلنا، اعتکاف کو فاسد نہیں کرتا"۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: فتاویٰ فلاحیہ: ۲/۸۷، کتاب الطہارت، اعتکاف کی حالت میں غسلِ جمعہ کا حکم۔

(۲) فتاویٰ فلاحیہ کی دوسری جلد، ص:۸۷ دیکھیں۔

نوٹ: سوال میں غسل مسنون وغیرہ کے عدم جواز کی مصلحت دریافت کی گئی ہے، اس سلسلے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی درج ذیل تحریر سے رہنمائی ملتی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

لفظ اعتکاف عکف سے نکلا ہے، جس کے معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں، چوں کہ معتکف جب کہ روزہ دار بھی ہو تمام حوائجِ دنیویہ و اغراضِ نفسانیہ سے اپنے کو بہ قصدِ عبادتِ الٰہی مسجد میں روک کر کے، اس کے در پر اپنے کو گرا دیتا ہے، اس لیے اس فعل کا نام اعتکاف ہوا اور وہ مسنون بھی ہے۔ چناں چہ بروایت ابی بن کعبؓ "ابن ماجہ" میں ہے کہ آں حضرت ﷺ رمضان کے عشرۂ اخیر=

[۶] مسجد سے متصل غسل خانے میں غسل جنابت کے علاوہ دوسرا غسل کرنا

۱۵۸۲- سوال: ہماری مسجد میں ایک دروازہ ہے، پہلے جوتے وچپل نکالنے کی جگہ ہے، اس کے بعد تھوڑی کھلی جگہ ہے، اس جگہ کو پہلے ذمے داران نے مسجد میں شامل کرنے کا ارادہ کیا تھا، اس جگہ کے ساتھ پانی کی ٹنکی اور وضو کے لیے نل ہے، اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا غسل خانہ بھی ہے، پھر طہارت خانہ، تو اس غسل خانہ میں جنابت کے غسل کے علاوہ دوسرا کوئی غسل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

جب غسل خانہ مسجد میں شامل نہیں ہے، تو اس میں بھی معتکف کا سنت یا نفل غسل کرنے کے لیے نکلنا جائز نہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] غسل کے عادی یا کھجلی والے معتکف کے لیے غسلِ غیر واجب کا حکم

۱۵۸۳- سوال: معتکف روزانہ یا دو چار دن میں غسل کرنے کا عادی ہے، اس کے بدن سے پسینے کی بدبو پھوٹ رہی ہو اور بدن میں کھجلی ہو رہی ہو، تو وہ مسجد کے غسل خانے میں غسل کر سکتا ہے یا نہیں؟

= میں اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے۔

پس روزہ عاشقانہ رنگ میں ایک تصویری زبان کی دعا والحاح ہے اور اعتکاف عاشق کا دروازۂ معشوق پر اپنے آپ کو بحالتِ تضرع وزاری پیش کرنا ہے، گویا معتکف اپنے آپ کو درگاہِ الٰہی میں ایسا مقید کرتا ہے جیسا کہ ایک الحاح کنندہ سائل کسی کے دروازہ پر معتکف ہو جاتا ہے اور اپنی حاجت ومراد حاصل ہوئے بغیر نہیں ہٹتا، یا یہ کہ عاشق زار کی طرح اپنے معشوق کے دروازے پر بھوکا پیاسا بن کر اور دنیا کی تمام حوائج واغراض سے فارغ ولا ابالی ہو کر محض جلوۂ محبوب ومعشوق کے لیے اس کے دروازے پر معتکف ہو جاتا ہے اور جب تک اس کا معشوق اس کو اپنا منہ نہ دکھائے اس کے در سے نہیں ہٹتا اور اس کے شوق میں ساری لذات کو چھوڑ کر اس کے در پر آ کر سر رکھ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعتکاف خانۂ خدا یعنی مسجد کے بغیر کہیں جائز نہیں، کیوں کہ عاشق طالب دیدار کو اپنے معشوق کے دروازے ہی پر گرنا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ بحالت اعتکاف معتکف کو رات میں بھی اپنی عورت سے مباشرت کرنی جائز نہیں، کیوں کہ صادق عاشق کو ان باتوں کا کہاں خیال رہتا ہے۔ اور یہ کہ ماہِ رمضان کے عشرۂ آخری میں لیلۃ القدر کا ظہور روایات میں مذکور ہے، وہ ایسی ہی تجلی ہے جس کا اصلی ظہور ایسے ہی عاشق پر ہوتا ہے۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں: ۲/۱۰۹، کتاب الصوم، ماہِ رمضان کے عشرۂ اخیر میں مسجد کے اندر معتکف ہونے کی وجہ، ط: مکتبہ عمر فاروق-کراچی)

(۱) تقدم تخریجہ وتفصیلہ۔

اور اگر مسجد میں غسل خانہ نہ ہو تو وہ اپنے گھر جا کر غسل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

غسل جنابت کے علاوہ کسی دوسرے غسل کے لیے مستقلاً نہ نکلے، پہلے غسل خانہ میں غسل کے سارے لوازمات کا انتظام کروالے، اور جب بشری تقاضے کی تکمیل کے لیے جائے، تو ضمناً غسل کر لے، اس پر عمل کرنے سے ان شاء اللہ معتکف کی پریشانی دور ہو جائے گی۔ (۱)

اگر مسجد میں غسل خانہ نہیں ہے، تو جنابت کے غسل کے لیے گھر جائے؛ (۲) لیکن غسل مسنون و مباح کے لیے گھر جانا جائز نہیں، جب وضوخانہ میں کوئی موجود نہ ہو، اس وقت بشری تقاضے کی تکمیل کے بعد وہیں غسل کر لے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] مسجد کے اندر بدن پر گیلے کپڑے پھیرنا

۱۵۸۴- سوال: جماعت خانہ میں معتکف ایک ڈول میں گرم پانی لے لے، اور اس میں کپڑے بھگو کر اپنے بدن پر پھیرے، تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

گنجائش تو ہے، بہتر نہیں؛ (۳) حیلہ کر کے غسل کر لے، اس طریقہ کو اپنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تخریج و تفصیل گذر چکی ہے۔

(۲) (وحرم عليه) أي على المعتكف اعتكافا واجبا... (الخروج إلا لحاجة الإنسان) طبيعية كبول وغائط وغسل لو احتلم ولا يمكنه الاغتسال في المسجد كذا في النهر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۴۴۴-۴۴۵، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر)

ثم إن أمكنه الاغتسال في المسجد من غير أن يتلوث المسجد فلا بأس به، وإلا فيخرج ويغتسل ويعود إلى المسجد. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۳، كتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: زكريا- ديوبند☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۴۵، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر☆بدائع الصنائع: ۲/۱۱۶، كتاب الاعتكاف، ركن الاعتكاف، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆تبيين الحقائق: ۱/۳۵۱، كتاب الصوم، اعتكاف المرأة، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق)

(۳) کہ اس میں تلویث مسجد کا اندیشہ ہے اور اس عمل کی کوئی ضرورت نہیں، غسل کرنے کا عادی ہو، تو اپنے کسی خادم کے ذریعے غسل خانے میں غسل کے لوازمات کا انتظام کرالے، اور جب بشری تقاضہ ہو، تو اس سے فراغت کے بعد ضمناً غسل کر لے، ان شاء اللہ اعتکاف پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔ (تفصیل و تخریج کے لیے گذرے ہوئے سوالات دیکھیں) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۹] مسجد کی بالائی منزل میں اعتکاف

۱۵۸۵- سوال: ہمارے گاؤں کی مسجد کی بالائی منزل کی تعمیر کا کام جاری ہے، ان شاء اللہ رمضان المبارک تک اس کی تکمیل ہو جائے گی، دریافت یہ کرنا ہے کہ رمضان میں بالاخانہ میں اعتکاف کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ مسجد میں اور بالاخانہ کے اجر و ثواب میں فرق ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً

مسجد کے تہ خانہ سے لے کر عرش تک کا تمام حصہ مسجد کے حکم میں ہے؛ اس لیے اگر کوئی شخص تہ خانہ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے، یا تنہائی حاصل کرنے کے لیے مسجد کے بالاخانہ میں اعتکاف کرے، تو اس کا اعتکاف صحیح ہے، تہہ خانہ ہو یا بالاخانہ؛ دونوں کے اعتکاف کا ثواب برابر ملے گا، اگر مسجد کے تہ خانہ میں صف پوری ہو کر بالاخانہ میں بھی صفیں ہوتی ہوں، تو بالاخانہ ہی میں نماز پڑھے تاکہ بغیر ضرورت کے مسجد سے نکلنا لازم نہ آئے؛ اس لیے کہ بالاخانہ سے اترنے کا زینہ مسجد سے باہر ہوتا ہے، ہاں اگر زینہ اندرون مسجد ہو، تو ہر حال میں نیچے کی منزل میں آکر جماعت میں شرکت کی جاسکتی ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] بہ حالتِ اعتکاف بیوی کو بلا کر مسجد میں بات کرنا

۱۵۸۶- سوال: اعتکاف میں جماعت خانہ سے باہر، صحن میں یا وضو خانہ میں اپنی بیوی کو بلا سکتے ہیں؟ اس سے اعتکاف میں کوئی نقصان تو نہ ہوگا، یا اعتکاف ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

شرعی یا طبعی ضرورت کے بغیر معتکف کا اپنی اعتکاف کی جگہ سے باہر نکلنا جائز نہیں، ضرورت کے بغیر نکلے گا، تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔[2]

---

(۱) (و) كره تحريما (الوطء فوقه، والبول والتغوط) لأنه مسجد إلى عنان السماء. (الدر المختار) ــــ وقال ابن عابدين: (قوله إلى عنان السماء) بفتح العين، وكذا إلى تحت الثرى كما في البيري عن الإسبيجابي. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۵۶، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، مطلب في أحكام المسجد، ط: دار الفكر)

(۲) (وحرم عليه) أي على المعتكف اعتكافا واجبا... (الخروج إلا لحاجة الإنسان) طبيعية كبول وغائط وغسل لو احتلم ولا يمكنه الاغتسال في المسجد، كذا في النهر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۳۵-۴۳۴، كتاب الصوم، باب=

بیوی کو- جب کہ وہ پاک ہو؛ حیض یا نفاس کی حالت میں نہ ہو- مسجد میں بلانا اور اس سے بات کرنا جائز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ اعتکاف کی حالت میں بات کی ہے۔ (مشکل الآثار، حدیث: ۴۱۰۰)[1]

=الاعتكاف، ط: زكريا-ديوبند☆ مزید دیکھیے: الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۲، كتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: زكريا-ديوبند ☆البحر الرائق: ۲/ ۵۲۷، كتاب الصوم، باب الاعتكاف)

"فإن خرج ساعة بلا عذر" معتبر "فسد الواجب". (مراقي الفلاح شرح متن نور الإيضاح-حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹هـ) ص: ۲۶۶، باب الاعتكاف، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

[1] عن عائشة قالت: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: ناوليني الخمرة من المسجد، قالت فقلت: إني حائض، فقال: إن حيضتك ليست في يدك. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۱۴۳، رقم الحديث: ۱۱-(۲۹۸)، كتاب الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها وترجيله وطهارة سؤرها والاتكاء في حجرها وقراءة القرآن فيه، ط: ديوبند)

وقولها: "من المسجد"، قال القاضي عياض -رحمه الله تعالى- معناه أن النبي صلى الله عليه وسلم قال لها ذلك من المسجد، أي وهو في المسجد، لتناوله إياها من خارج المسجد، لا أن النبي صلى الله عليه وسلم أمرها أن تخرجها له من المسجد؛ لأنه صلى الله عليه وسلم كان في المسجد معتكفا، وكانت عائشة في حجرتها وهي حائض؛ لقوله صلى الله عليه وسلم: إن حيضتك ليست في يدك، فإنما خافت من إدخال يدها المسجد، ولو كان أمرها بدخول المسجد لم يكن لتخصيص اليد معنى، والله أعلم. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، المعروف بـ 'حاشية النووي على مسلم'- أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م: ۶۷۶هـ): ۳/ ۲۱۰، كتاب الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها وترجيله... الخ، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

قوله: "من المسجد" متعلق بقوله: "قال" لا بقوله: "ناوليني"، ولا "بالخمرة"، والمعنى: أنه-عليه السلام- قال ذلك لها وهو في المسجد لتناوله إياها من خارج المسجد، لا أن النبي-عليه السلام- أمرها أن تخرجها له من المسجد؛ لأنه-عليه السلام- كان في المسجد معتكفاً، وكانت عائشة في حجرتها وهي حائض. (شرح سنن أبي داود-بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۲/ ۲۱، كتاب الطهارة، باب: الحائض تناول شيئاً لمن كان في المسجد، ت: أبو المنذر خالد بن إبراهيم المصري، ط: مكتبة الرشد-الرياض)

واضح رہے کہ "من المسجد" "قال" سے متعلق ہے، یہ بات بعض علماء کی ہے، ورنہ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ "ناولینی" سے متعلق ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: عون المعبود شرح سنن أبي داود- محمد أشرف بن أمير بن علي بن حيدر، أبو عبد الرحمن، شرف الحق، الصديقي، العظيم آبادي (م: ۱۳۲۹هـ): ۱/ ۳۰۴، باب الحائض تناول أي تأخذ شيئا، ط: دار الكتب العلمية-بيروت.

وأما التكلم بما لا مأثم فيه فلقوله تعالى {يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وقولوا قولا سديدا} [الأحزاب: ۷۰] قيل في بعض وجوه التأويل: أي صدقا وصوابا لا كذبا ولا فحشا.

وقد روي أن رسول الله- صلى الله عليه وسلم- كان يتحدث مع أصحابه ونسائه- رضي الله عنهم- وهو معتكف=

معتکف جب بشری تقاضہ [پیشاب و پاخانہ] کے لیے نکلے، تو اس وقت بھی چلتے چلتے بات کر سکتا ہے۔ (بدائع)[۱] لیکن مختصر وقت میں بات پوری نہ ہو، تو عورت کو مسجد میں یا مسجد کی کھڑکی پر بلا کر بات کر لی جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] اعتکاف کی حالت میں گھر سے کھانا لے کر آنے والے سے بات کرنا

۱۵۸۷- سوال: اعتکاف کی حالت میں کھانا گھر سے مزدور لے کر آتا ہے، تو کیا اس کے ساتھ بیٹھ کر دنیوی باتیں کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

دنیوی کاموں میں سے ضروری کام؛ مثلاً: کاشت کار کے لیے کاشت کے سلسلے کی ضروری باتیں اور تاجر کے لیے تجارت کے متعلق ضروری ہدایات دینے کی گنجائش ہے، بلا وجہ، وقت گذاری کے لیے باتیں نہ کی جائیں۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= في المسجد.(بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م:۵۸۷هـ):۲/۱۱۷، كتاب الاعتكاف، فصل ركن الاعتكاف، ط:دار الكتب العلمية)

ولا يتكلم بما فيه إثم، فإن النبي -صلى الله عليه وسلم- كان يتحدث مع الناس في اعتكافه.(الفتاوى التاتارخانية: ۳/۴۴۸، كتاب الصوم، الفصل: الاعتكاف، ط: زكريا-ديوبند)

[۱] وما روي عن النبي -صلى الله عليه وسلم- من الرخصة في عيادة المريض وصلاة الجنازة، فقد قال أبو يوسف: ذلك محمول عندنا على الاعتكاف الذي يتطوع به من غير إيجاب فله أن يخرج متى شاء ويجوز أن تحمل الرخصة على ما إذا كان خرج المعتكف لوجه مباح كحاجة الإنسان أو للجمعة، ثم عاد مريضا أو صلى على جنازة من غير أن كان خروجه لذلك قصدا وذلك جائز.(بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع:۲/۱۱۴، كتاب الاعتكاف، فصل ركن الاعتكاف)

(۲) وأكل المعتكف وشربه ونومه وعقده البيع لما يحتاجه لنفسه أو عياله في المسجد، وكره إحضار المبيع فيه وكره عقد ما كان للتجارة.(مراقي الفلاح،ص:۲۶۶، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط:المكتبة العصرية☆الدر المختار مع رد المحتار:۲/۴۴۸، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط:دار الفكر-بيروت)

وأما التكلم بما لا مأثم فيه فلقوله تعالى {يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وقولوا قولا سديدا} [الأحزاب:۷۰] قيل في بعض وجوه التأويل: أي صدقا وصوابا لا كذبا ولا فحشا.

وقد روي أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- كان يتحدث مع أصحابه ونسائه -رضي الله عنهم- وهو معتكف في المسجد.(بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م:۵۸۷هـ):۲/۱۱۷،=

[۱۲] اعتکاف کی حالت میں بیڑی پینے کے لیے مسجد سے باہر نکلنا

۱۵۸۸- سوال: بعض لوگ اعتکاف کی حالت میں بلا ضرورت باہر نکلتے ہیں؛ مثلاً: بیڑی پینے کے لیے مستقل طور پر دس منٹ باہر ضائع کر دیتے ہیں، باہر بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

الجواب حامداو مصليا:

معتکف اپنی شرعی اور طبعی ضروریات کے بغیر اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی مسجد سے باہر نکلے گا، تو اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔ (۱)

شرعی ضرورت سے مراد جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے جامع مسجد جانا ہے، جب کہ طبعی ضروریات درج ذیل ہیں: پیشاب و پاخانہ کے لیے جانا، البتہ ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً مسجد میں واپس آجائے۔

اس لیے اگر کوئی محض بیڑی پینے کے لیے مسجد سے باہر نکلے گا، تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔ (۲)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=كتاب الاعتكاف، فصل ركن الاعتكاف، ط: دار الكتب العلمية)

ولا يتكلم بما فيه إثم، فإن النبي -صلى الله عليه وسلم- كان يتحدث مع الناس في اعتكافه. (الفتاوى التاتارخانية: ۴۲۸/۳، كتاب الصوم، الفصل: الاعتكاف، ط: زكريا-ديوبند)

(۱) (وأما مفسداته) فمنها الخروج من المسجد فلا يخرج المعتكف من معتكفه ليلا ونهارا إلا بعذر، وإن خرج من غير عذر ساعة فسد اعتكافه في قول أبي حنيفة -رحمه الله تعالى- كذا في المحيط. سواء كان الخروج عامدا أو ناسيا هكذا في فتاوى قاضي خان....

(ومن الأعذار الخروج للغائط والبول، وأداء الجمعة) فإذا خرج لبول أو غائط لا بأس بأن يدخل بيته ويرجع إلى المسجد كما فرغ من الوضوء، ولو مكث في بيته فسد اعتكافه، وإن كان ساعة عند أبي حنيفة -رحمه الله تعالى- كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۲۱۲/۱، كتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: زكريا- ديوبند ☆ البحر الرائق: ۵۲۷/۲، كتاب الصوم، باب الاعتكاف ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۳/۳۵-۴۳۴، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: زكريا)

"فإن خرج ساعة بلا عذر" معتبر "فسد الواجب". (مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح - حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹هـ)، ص: ۲۶۶، باب الاعتكاف، ت: نعيم زرزور، ط: المكتبة العصرية)

(۲) عن جابر -رضي الله عنه- قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم، عن أكل البصل والكراث، فغلبتنا الحاجة، فأكلنا منها، فقال: من أكل من هذه الشجرة المنتنة، فلا يقربن مسجدنا، فإن الملائكة تأذى، مما يتأذى منه الإنس. (متفق عليه، اللفظ لمسلم: ۲۰۹/۱، رقم الحديث: ۷۲-(۵۶۳-۵۶۶)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب نهي من أكل ثوما أو بصلا أو كراثا أو نحوها، ط: ديوبند ☆ وانظر صحيح البخاري: ۱۱۸/۱، رقم الحديث: ۸۵۳ تا ۸۵۶، كتاب الأذان، باب ما جاء في الثوم النيء والبصل والكراث، ط: ديوبند)

=

[۱۳] معتکف کا بیڑی وسگریٹ پینے کے لیے مسجد سے باہر جانا

۱۵۸۹- سوال: معتکف بیڑی اور سگریٹ پینے کا عادی ہے، وہ اپنی اس عادت کو پورا کرنے کے لیے مسجد سے باہر جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

محض بیڑی وسگریٹ پینے کی نیت سے نکلنے کی وجہ سے اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا، بشری تقاضے کے لیے جائے، تو اپنی اس عادت کو پورا کرلے۔[۱] (لیکن اعتکاف کی حالت میں عادت سے مغلوب ہوکر سگریٹ پینا، اعتکاف کی روح کے منافی ہے، جو معتکف کو زیب نہیں دیتا) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] کھانے کے لیے جماعت خانے سے باہر جانا

۱۵۹۰- سوال: اعتکاف کی حالت میں کھانا کھانے کے لیے جماعت خانے سے باہر جانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

معتکف کے لیے لازم ہے کہ وہ مسجد میں کھائے پیئے، مسجد ہی میں افطار کرے، مسجد سے باہر اگر وہ

= وأكل نحو ثوم، ويمنع منه. (الدر المختار)ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله وأكل نحو ثوم) أي كبصل ونحوه مما له رائحة كريهة للحديث الصحيح في النهي عن قربان آكل الثوم والبصل المسجد. قال الإمام العيني في شرحه على صحيح البخاري قلت: علة النهي أذى الملائكة وأذى المسلمين ولا يختص بمسجده -عليه الصلاة والسلام-، بل الكل سواء لرواية مساجدنا بالجمع، خلافا لمن شذ ويلحق بما نص عليه في الحديث كل ما له رائحة كريهة مأكولا أو غيره، وإنما خص الثوم هنا بالذكر وفي غيره أيضا بالبصل والكراث لكثرة أكلهم لها، وكذلك ألحق بعضهم بذلك من بفيه بخر أو به جرح له رائحة. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/۶۶۱، كتاب الصلاة، باب مايفسد الصلاة ومايكره فيها، فروع أفضل المساجد، ط: دار الفكر)

صرف بیڑی وسگریٹ پینے کے لیے مسجد سے باہر نکلنا درست نہیں ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: فتاویٰ حقانیہ: ۴/۲۰۴ اور فتاوی دار العلوم: ۶/۵۰۵) البتہ کسی شرعی یا طبعی ضرورت سے نکلے اور راستے میں بیڑی وغیرہ کا ستعال کرلے، وضوء اور مسواک وغیرہ سے منہ خوب صاف کرلے، بدبودار منہ لے کر مسجد میں نہ آئے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۰/۲۴۷-۲۴۶، معتکف کا بیڑی وسگریٹ پینا، ط: مکتبہ شیخ الاسلام- دیوبند)

[۱] تفصیل وتخریج کے لیے سوال سابق کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

افطار کرے گا، یا کھانا کھانے کے لیے نکلے گا، تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا، ہاں مسجد کا صحن اور اس کا برآمدہ اگر مسجد میں داخل ہے، تو اس میں آنے سے اعتکاف نہیں ٹوٹے گا اور اگر صحن و برآمدہ، مسجد میں داخل نہیں ہے، تو وہاں آنا مفسدِ اعتکاف ہوگا۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] اعتکاف کی حالت میں ملازمین کو کام سپرد کرنا

۱۵۹۱- سوال: بعض لوگ اعتکاف کی حالت میں اپنے نوکروں اور ملازمین کو بلا کر جماعت خانے سے باہر ان کو سارے کام سپرد کرتے ہیں؛ حالاں کہ ان کے گھروں پر کھیتی باڑی کا کام کاج سنبھالنے والے دوسرے افراد بھی ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

الجواب حامداومصليا:

مسجد کی کھڑکی اور دروازے پر کھڑے ہو کر رشتے دار و متعلقین اور عزیز و اقارب سے ضروری باتیں کرنا، اور اپنے ملازمین اور نوکروں کو ہدایات جاری کرنا جائز ہے، اس سے اعتکاف پر کوئی حرج

---

(۱) عن عائشة-رضي الله عنها- قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم، إذا اعتكف، يدني إلي رأسه فأرجله، وكان لا يدخل البيت إلا لحاجة الإنسان. (الصحيح لمسلم: ۱/۱۴۲، رقم الحديث: ۶-(۲۹۷)، كتاب الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها وترجيله، ط: ديوبند ☆ سنن أبي داود: ۱/۳۳۴، رقم الحديث: ۲۴۶۷، كتاب الصوم، باب المعتكف يدخل البيت لحاجته، ط: ديوبند)

عن عائشة، أنها قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا اعتكف، يدني إلي رأسه فأرجله، وكان لا يدخل البيت إلا لحاجة الإنسان، قال محمد: وبهذا نأخذ، لا يخرج الرجل إذا اعتكف إلا للغائط، أو البول، وأما الطعام، والشراب فيكون في معتكفه، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (موطأ مالك برواية محمد بن الحسن الشيباني-مالك بن أنس بن مالك بن عامر الأصبحي المدني (م: ۱۷۹هـ) المعروف بـ 'موطأ الإمام محمد': ۱/۱۳۱، رقم الحديث: ۳۷۷، أبواب الصيام، باب: الاعتكاف، ت: عبد الوهاب عبد اللطيف، ط: المكتبة العلمية)

اگر معتکف کے گھر سے کوئی کھانا لانے والا نہ ہو، تو اجازت ہے کہ معتکف جا کر کھا لے، کہ یہ بھی حوائج ضروریہ میں داخل ہے:

(قوله: وأكله وشربه ونومه ومبايعته فيه) يعني يفعل المعتكف هذه الأشياء في المسجد فإن خرج لأجلها بطل اعتكافه، لأنه لا ضرورة إلى الخروج حيث جازت فيه... وقيل يخرج بعد الغروب وللأكل والشرب. اهـ. وينبغي حمله على ما إذا لم يجد من يأتي له به فحينئذ يكون من الحوائج الضرورية كالبول والغائط. (البحر الرائق: ۲/۳۲۶، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مراقي الفلاح، ص: ۲۶۶، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: المكتبة العصرية)

لازم نہیں آئے گا۔[۱] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] اعتکاف کی حالت میں گھر سے گرم پانی منگوا کر غسل جنابت کرنا

۱۵۹۲- سوال: بعض لوگ غسل جنابت کے لیے مستقل طور پر گھر سے گرم پانی منگواتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟ کیا اعتکاف میں اس قسم کے تکلف کی اجازت ہے؟

کیا غسل جمعہ کے لیے اس کی اجازت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر ٹھنڈے پانی کا استعمال نقصان دہ ہو، تو غسل جنابت کے لیے گھر سے گرم پانی منگوانا جائز ہے۔[۲]

اگر کوئی شخص جمعہ کے غسل کے لیے مسجد سے باہر نکلے، تو اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا؛ البتہ ایسا کرسکتا ہے کہ گرم پانی کا غسل خانہ میں انتظام کرکے، پیشاب و پاخانہ کی ضرورت کے لیے مسجد سے باہر جائے اور فراغت کے بعد بہ عجلت ممکنہ جمعہ کا غسل کرلے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن علي بن الحسين، أن صفية بنت حيي زوج النبي صلى الله عليه وسلم، أخبرته: أنها جاءت رسول الله صلى الله عليه وسلم تزوره، وهو معتكف في المسجد، في العشر الغوابر من رمضان، فتحدثت عنده ساعة من العشاء، ثم قامت تنقلب، فقام معها النبي صلى الله عليه وسلم يقلبها، ... الحديث. (صحيح البخاري: ۲/ ۹۱۸، رقم الحديث: ۶۲۱۹، كتاب الأدب، باب التكبير والتسبيح عند التعجب، ط: ديوبند)

قوله: "وأما التكلم بغير خير فلايجوز لغير المعتكف" أي فالمعتكف أولى ورد في الحديث رحم الله أمر أتكلم فغنم أو سكت فسلم فيكره التكلم إلا بخير قال في النهر والظاهر أن المباح عند الحاجة إليه خير لا عند عدمها اهـ.

(حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ۷۰۵، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۵۰، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر - بيروت☆ البحر الرائق: ۲/ ۳۲۷، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) غسل میں گرم پانی کا استعمال امر مباح ہے؛ بل کہ میت کے لیے افضل ہے، خواہ اس کے بدن پر میل کچیل ہو یا نہ ہو، اس لیے گھر سے گرم پانی منگوانے میں حرج کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۳) ''اعتکاف کی حالت میں بیڑی پینے کے لیے مسجد سے باہر نکلنا'' کا حاشیہ نمبر (۱) ملاحظہ فرمائیں۔

فتاویٰ فلاحیہ کی دوسری جلد، ص: ۸۷ میں ''الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۴۳۵-۴۳۴، کتاب الصوم، باب الاعتکاف، ط: زکریا، دیوبند☆ ''الفتاوی الھندیۃ: ۱/ ۲۱۲، کتاب الصوم، الباب السابع في الاعتکاف، ط: زکریا- دیوبند'' اور البحر الرائق: ۲/ ۵۲۷، کتاب الصوم، باب الاعتکاف'' کے حوالے سے تفصیلی تخریج گذر چکی ہے۔ نیز وہاں اشعۃ اللمعات، کتاب المسائل اور احسن الفتاویٰ کے=

[۱۷] اعتکاف کی حالت میں مسجد میں حجام کو بلوا کر بال کٹوانا

۱۵۹۳- سوال: بعض لوگ اعتکاف کی حالت میں حجام (نائی) کو بلوا کر اپنے بال کٹواتے ہیں ،کیا اعتکاف کی حالت میں ایسا کرنے سے اعتکاف صحیح ہوگا؟ اور اگر اعتکاف صحیح نہ ہوتا ہو، تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ اور اس کے احکام کیا ہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

مسجد کی صفائی کا خیال رکھتے ہوئے نماز کے اوقات کے علاوہ میں اگر بال بنوائے، تو جائز ہے۔(۱)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] بہ حالتِ اعتکاف جماعت خانہ سے باہر باتیں کرنا

۱۵۹۴- سوال: ہماری مسجد میں دو تین آدمی اعتکاف میں بیٹھے ہیں، یہ لوگ جماعت خانہ سے باہر کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں، تو دنیوی باتوں میں مشغول ہوتے ہیں، یا وضوء کرنے یا باہر بیڑی پینے کے لیے جاتے ہیں تو اپنے خدام اور ملازمین کو کام سپرد کرتے ہیں، تو اعتکاف میں باتیں کرنا یا کام سپرد کرنا کیسا ہے؟

= حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک "غسل -خواہ مسنون ہو یا واجب- کے لیے مسجد سے نکلنا، اعتکاف کو فاسد نہیں کرتا"۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: فتاویٰ فلاحیہ: ۲/ ۸۷، کتاب الطہارت، اعتکاف کی حالت میں غسلِ جمعہ کا حکم۔

(۱) قوله: "وأكل المعتكف الخ" وله غسل رأسه في المسجد إذا لم يلوثه بالماء المستعمل فإن كان بحيث يتلوث يمنع منه، لأن تنظيف المسجد واجب... بخلاف غير المعتكف فإنه يكره له التوضؤ في المسجد ولو في إناء إلا أن يكون في موضع أعد لذلك لا يصلي فيه وفي الفتح خصال لا تنبغي في المسجد لا يتخذ طريقا ولا يشهر فيه سلاح ولا يقبض فيه بقوس ولا ينثر فيه نبل ولا يمر فيه بلحم نيء ولا يضرب فيه حد ولا يتخذ سوقا رواه ابن ماجه في السنن عنه صلى الله عليه وسلم. (حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ۷۰۳، كتاب الصلاة، باب الاعتكاف، ت: عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۴۵، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر- بيروت)

مفتی رشید احمد لدھیانوی رقم فرماتے ہیں:

اپنی حجامت خود بنانا جائز ہے، حجام سے بنوانے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ بدون عوض کام کرتا ہے، تو مسجد کے اندر جائز ہے، اور اگر بالعوض ہے، تو معتکف مسجد کے اندر رہے، مگر حجام مسجد سے باہر بیٹھ کر حجامت بنائے، مسجد کے اندر اجرت سے کام کرنا جائز نہیں۔ (احسن الفتاویٰ: ۴/ ۵۱۶، کتاب الصوم، باب الاعتکاف، ط: دار الاشاعت، دھلی)

الجواب حامداً ومصلیاً:

معتکف بلاضرورت دینی یا دنیوی غرض سے مسجد سے باہر نکلے گا تو اعتکاف فاسد ہوجائے گا، کھانے کے لیے باہر جائے یا بیڑی پینے کے لیے مسجد سے باہر ایک دو منٹ کے لیے بھی نکلے، تو اعتکاف فاسد ہوجائے گا، اِسی طرح مزدور اور خدام کو مسجد سے باہر جا کر حکم کرے گا، تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔[1]

البتہ مسجد میں بیٹھ کر کھانا جائز ہے، اس کے لیے باہر نہ نکلے۔[۲]

وضوء یا پیشاب و پاخانہ کے لیے معتکف باہر نکلے اور کچھ باتیں خدام کو بتادے، تو جائز ہے۔ اِسی طرح مسلمان مزدوروں کو مسجد میں بلا کر ضروری باتیں بتادے یا غیر مسلم مزدور و ملازم کو مسجد سے باہر کھڑا کر کے، خود مسجد میں رہ کر حکم دے، تو اعتکاف نہیں ٹوٹے گا۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (وأما مفسداته) فمنها الخروج من المسجد فلا يخرج المعتكف من معتكفه ليلا ونهارا إلا بعذر، وإن خرج من غير عذر ساعة فسد اعتكافه في قول أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - كذا في المحيط. سواء كان الخروج عامدا أو ناسيا هكذا في فتاوى قاضي خان....

(ومن الأعذار الخروج للغائط والبول، وأداء الجمعة) فإذا خرج لبول أو غائط لا بأس بأن يدخل بيته ويرجع إلى المسجد كما فرغ من الوضوء، ولو مكث في بيته فسد اعتكافه، وإن كان ساعة عند أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۲، كتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: زكريا- ديوبند ☆ البحر الرائق: ۲/۵۲۷، كتاب الصوم، باب الاعتكاف ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۳/۴۳۵-۴۳۴، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: زكريا)

(۲) عن عائشة، أنها قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا اعتكف، يدني إلي رأسه فأرجله، وكان لا يدخل البيت إلا لحاجة الإنسان، قال محمد: وبهذا نأخذ، لا يخرج الرجل إذا اعتكف إلا للغائط، أو البول، وأما الطعام، والشراب فيكون في معتكفه، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله. (موطأ مالك برواية محمد بن الحسن الشيباني - مالك بن أنس بن مالك بن عامر الأصبحي المدني (م: ۱۷۹ھ) المعروف بـ 'موطأ الإمام محمد': ۱/۱۳۱، رقم الحديث: ۳۷۷، أبواب الصيام، باب: الاعتكاف، ت: عبد الوهاب عبد اللطيف، ط: المكتبة العلمية)

وأما الأكل والشرب والنوم فيكون في معتكفه، لأنه يمكنه قضاء هذه الحاجة في المسجد فلا ضرورة في الخروج كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۲، كتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/۳۲۶، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۴۴، ط: دار الفكر)

(۳) قوله: "وأما التكلم بغير خير فلا يجوز لغير المعتكف" أي فالمعتكف أولى ورد في الحديث رحم الله أمر أتكلم فغنم أو سكت فسلم فيكره التكلم إلا بخير قال في النهر والظاهر أن المباح عند الحاجة إليه خير لا عند عدمها اهـ. (حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ۷۰۵، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الدر المختار مع رد =

[۱۹] معتکف کا بال کٹوانے کے لیے مسجد کے چبوترے پر جانا

۱۵۹۵- سوال: معتکف حالت اعتکاف میں مسجد کے چبوترے پر جا کر بال کٹوا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر چبوترہ مسجد کی شرعی حدود میں داخل ہے اور معتکف اس چبوترے والے حصے میں بیٹھا ہوا ہے، اور سر باہر نکال کر بال کٹوا رہا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جائز ہے؛ البتہ بال کٹوانے کے لیے مسجد سے باہر نکلنا جائز نہیں۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] نابالغ اور اعتکاف

۱۵۹۶- سوال: نابالغ بچوں کا اعتکاف میں بیٹھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر یہ نابالغ بچہ مسجد کا احترام برقرار رکھ سکے اور اس کے مسجد میں اعتکاف کرنے سے کسی قسم کے کوئی فتنے کا اندیشہ نہ ہو، تو جائز ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=المحتار:۲/۴۵۰، کتاب الصوم، باب الاعتکاف، ط: دار الفکر - بیروت☆ البحر الرائق:۲/۳۲۷، کتاب الصوم، باب الاعتکاف، ط: دار الکتاب الإسلامي)

وقد روي أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - كان يتحدث مع أصحابه ونسائه - رضي الله عنهم - وهو معتكف في المسجد. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م:۵۸۷هـ):۲/۱۱۷، كتاب الاعتكاف، فصل ركن الاعتكاف، ط: دار الكتب العلمية)

لو خرج لحاجة الإنسان، ثم ذهب لعيادة المريض أو لصلاة الجنازة من غير أن يكون لذلك قصد، جاز. (البحر الرائق:۲/۳۲۵، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ رد المحتار على الدر المختار:۲/۴۴۵، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر☆ بدائع الصنائع:۲/۱۱۴، كتاب الصوم، فصل ركن الاعتكاف، ط: دار الكتب العلمية)

(۱) سابق سوال کا حاشیہ ملاحظہ کریں۔

(۲) وأما البلوغ: فليس بشرط لصحة الاعتكاف فيصح من الصبي العاقل؛ لأنه من أهل العبادة، كما يصح منه صوم التطوع. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م:۵۸۷هـ):۲/۱۰۸، كتاب الاعتكاف، فصل شرائط صحة الاعتكاف، ط: دار الكتب العلمية☆ البحر الرائق:۲/۳۲۲، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ الفتاوى الهندية:۱/۲۱۱، كتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: دار الفكر☆ رد المحتار على الدر المختار:۲/۴۴۰، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر) =

[۲۱] بلا ضرورت، معتکف کا مسجد سے باہر نکل جانے کا شرعی حکم

۱۵۹۷- سوال: اعتکاف کی حالت میں اگر کوئی شخص بھول کر، مسجد سے باہر نکل جائے، تو کیا اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا؟ اگر اس کا اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے، تو اس پر کتنے دن کے اعتکاف کی قضا واجب ہوگی، دس دنوں کی یا صرف ایک ہی دن کی؟

مولوی محمد حسن اوگھرادار

الجواب حامدا ومصليا:

اعتکاف کی حالت آدمی کے لیے مُذَکِّر ہے، یعنی اس کو یاد دلانے والی ہے کہ تم اعتکاف کی حالت میں ہو، لہٰذا معتکف اگر شرعی اور طبعی ضرورت کے بغیر تھوڑی دیر کے لیے بھی مسجد سے باہر نکل جائے، تو اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔(۱)

صرف ایک ہی دن کے اعتکاف کی قضا واجب ہوگی، نہ کہ دس دن کی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] معتکف کا اپنے کسی رشتہ دار و متعلق کے جنازے میں حاضر ہونا

۱۵۹۸- سوال: معتکف کے کسی قریبی رشتہ دار بالخصوص اس کے والدین میں سے کسی کا یا ان

= مسجد کا احترام واجب ہے، اسی وجہ سے حضرت مفتی صاحب نے بچہ کے لیے مسجد میں جوازِ اعتکاف کی یہ شرط بیان کی ہے کہ وہ مسجد کے احترام کو ملحوظ رکھے، مذکورہ بالا عبارت کے لفظ ''من الصبي العاقل'' سے بھی اسے سمجھا جاسکتا ہے۔[مجتبیٰ حسن قاسمی]

(۱)(وأما مفسداته) فمنها الخروج من المسجد فلا يخرج المعتكف من معتكفه ليلا ونهارا إلا بعذر، وإن خرج من غير عذر ساعة فسد اعتكافه في قول أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - كذا في المحيط. سواء كان الخروج عامدا أو ناسيا هكذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۲، كتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: زكريا- ديوبند ☆ البحر الرائق: ۲/ ۵۲۷، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الكتاب الإسلامي☆الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۴۳۵-۴۳۴، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: زكريا)

(۲)...وعلى كل فيظهر من بحث ابن الهمام لزوم الاعتكاف المسنون بالشروع وإن لزوم قضاء جميعه أو باقيه مخرج على قول أبي يوسف أما على قول غيره فيقضي اليوم الذي أفسده لاستقلال كل يوم بنفسه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۴۵-۴۴۴، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر- بيروت)

وفي الظهيرية: عن أبي حنيفة - رحمه الله - أنه يلزمه يوما. (الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۴۴۷، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: زكريا- ديوبند)

کے علاوہ کسی دوسرے قریبی تعلق رکھنے والے کا انتقال ہوجائے، تو وہ اس کے مکان پر میت کے پاس جا کر بیٹھ سکتا ہے یا نہیں؟ نیز اس کی نمازِ جنازہ میں شرکت کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

جائز نہیں ہے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] معتکف کا اذان دینا

۱۵۹۹- سوال: معتکف اذان دے سکتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) عن عائشة - رضي الله عنها - قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم يمر بالمريض، وهو معتكف، فيمر كما هو، ولا يعرج يسأل عنه. (سنن أبي داود: ۱/۳۳۵، رقم الحديث: ۲۴۷۲، كتاب الصوم، باب المعتكف يعود المريض، ط: ديوبند☆و انظر: سنن ابن ماجه، ص: ۱۲۷، رقم الحديث: ۱۷۷۶، ۱۷۷۷، كتاب الصيام، باب في المعتكف يعود المريض، ويشهد الجنائز، ط: البدر - ديوبند)

وعند الأئمة الأربعة إذا خرج لقضاء الحاجة واتفق له عيادة المريض والصلاة على الميت فلم ينحرف عن الطريق، ولم يقف أكثر من قدر الصلاة لم يبطل الاعتكاف، وإلا بطل. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۴/۱۴۵۰، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر)

قوله: "بلا عذر معتبر" أي في عدم الفساد فلو خرج لجنازة محرمة أو زوجته فسد لأنه وإن كان عذرا إلا أنه لم يعتبر في عدم الفساد. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح - أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ)، ص: ۷۰۳، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

ولو خرج لجنازة يفسد اعتكافه، وكذا لصلاتها. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۳، كتاب الصوم، مسائل في الاعتكاف، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۴۵، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر - بيروت)

مفتی رشید احمدؒ رقم طراز ہیں:

البتہ قضائے حاجت جیسی ضرورت کے لیے نکلنے پر دیکھا کہ راستے ہی میں نماز جنازہ شروع ہورہی ہے، تو اس میں شریک ہوسکتا ہے، نماز سے قبل انتظار اور نماز کے بعد وہاں ٹھہرنا جائز نہیں، اسی طرح قضائے حاجت کے لیے اپنے راستے پر چلتے چلتے، عیادت کرسکتا ہے، عیادت اور نماز جنازہ کے لیے راستے سے کسی جانب مڑنا یا ٹھہرنا جائز نہیں ہے۔ (احسن الفتاوی: ۴/۵۰۹، کتاب الصوم، باب الاعتکاف، معتکف کا نماز جنازہ یا عیادت کے لیے نکلنا، ط: دار الاشاعت - دھلی)

ويجوز أن تحمل الرخصة على ما إذا كان خرج المعتكف لوجه مباح كحاجة الإنسان أو للجمعة، ثم عاد مريضا أو صلى على جنازة من غير أن كان خروجه لذلك قصدا وذلك جائز. (بدائع الصنائع: ۲/۱۱۴، كتاب الاعتكاف، فصل ركن الاعتكاف، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/۳۲۵، كتاب الصوم، باب الاعتكاف)

الجواب حامداومصلیا:

معتکف مسجد سے باہر نکلے گا،تو اس کا اعتکاف فاسد ہوجائے گا؛البتہ اس کے لیے مسجد کے کسی گوشہ سے یا مسجد کے زینے سے-جب کہ زینہ مسجد کی شرعی حدود میں داخل ہو-چھت پر چڑھ کر اذان دینا جائز ہے۔ (۱) فقط،واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] بیماری کی وجہ سے اعتکاف کی حالت میں چار پائی پر سونا

۱۶۰۰-سوال: ایک شخص نے اعتکاف کیا،پھر وہ بیمار ہوگیا اور سونے کے لیے مسجد میں چار پائی لے گیا،تو اس کے لیے اعتکاف کی حالت میں چار پائی پر سونا جائز ہے یا نہیں؟

مولوی عبداللہ جھانجھی

الجواب حامداومصلیا:

اعتکاف کا معنیٰ ہے: اللہ کے لیے اس کے گھر میں رکنا،رمضان المبارک کے آخری دس روز کا اعتکاف سنت مؤکدہ ہے؛اس لیے سونے کے لیے بستر وغیرہ لے جانا جائز ہے اور ضرورت ہو،تو چار پائی بھی

---

(۱) معتکف کے لیے بہ ہر صورت (خواہ مسجد کا زینہ مسجد کی شرعی حد سے باہر ہو یا اندر،اور وہ باضابطہ مؤذن ہو یا نہ ہو) اذان دینے کے لیے مسجد سے باہر نکلنا جائز ہے،اس سے اعتکاف پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا،فتویٰ اسی پر ہے،البتہ حضرت مفتی صاحبؒ نے جو قید لگائی ہے،کہ مسجد کے گوشے سے اذان دے یا چھت پر چڑھ کر اذان دے،تو اس کا خیال رکھے کہ زینہ مسجد کی شرعی حد سے باہر نہ ہو،وہ احتیاط پر مبنی ہے،اور ایک قول یہی ہے،ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

ولو صعد المئذنة لم يفسد اعتكافه بلا خلاف وإن كان باب المئذنة خارج المسجد.(بدائع الصنائع:۲/۱۱۵، كتاب الاعتكاف،فصل ركن الاعتكاف،ط:دار الكتب العلمية)

(وحرم عليه)...(الخروج إلا لحاجة الإنسان) طبيعية كبول وغائط وغسل لو احتلم ولا يمكنه الاغتسال في المسجد كذا في النهر (أو) شرعية كعيد وأذان لو مؤذنا وباب المنارة خارج المسجد.(الدر المختار)

قال ابن عابدين:(قوله لو مؤذنا) هذا قول ضعيف، والصحيح أنه لا فرق بين المؤذن وغيره كما في البحر والإمداد ح (قوله وباب المنارة خارج المسجد) أما إذا كان داخله فكذلك بالأولى قال في البحر: وصعود المئذنة إن كان بابها في المسجد لا يفسد وإلا فكذلك في ظاهر الرواية اهـ.(رد المحتار على الدر المختار:۲/۴۴۵، كتاب الصوم، باب الاعتكاف،ط: دار الفكر☆المحيط البرهاني:۲/۴۰۶، كتاب الصوم، الفصل الثاني عشر في الاعتكاف، ت:عبد الكريم الجندي،ط:دار الكتب العلمية-بيروت☆البحر الرائق:۲/۳۲۶، كتاب الصوم، باب الاعتكاف،ط:دار الكتاب الإسلامي)

لے جانا اور اس پر سونا بھی جائز ہے؛ البتہ نمازیوں کو تکلیف نہ ہو اور صفوں میں خلل نہ ہو، اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] اعتکاف کی حالت میں اخبار کا مطالعہ

۱۷۰۱- سوال: اعتکاف کی حالت میں جماعت خانے میں ''ٹائمس آف انڈیا''، ''گجرات مترٗ'' اور ''الجمعیۃ'' وغیرہ اخبار پڑھنا اور شیئرز وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

اعتکاف کی حقیقت' دنیا ترک کر کے، اللہ رب العزت کی چوکھٹ پر بیٹھ جانا ہے۔[۲] اس لیے ضرورت کے مطابق تو جائز ہے؛[۳] لیکن اس عمل کی حوصلہ افزائی نہیں کی جائے گی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن ابن عمر، عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم أنه کان إذا اعتكف طرح له فراشه، أو يوضع له سريره وراء أسطوانة التوبة. (سنن ابن ماجه، ص: ۱/ ۱۲۷، رقم الحديث: ۱۷۷۴، کتاب الصيام، باب في المعتكف يلزم مكانا من المسجد، ط: ديوبند☆ صحيح ابن خزيمة- أبو بكر محمد بن إسحاق بن خزيمة بن المغيرة بن صالح بن بكر السلمي النيسابوري (م: ۳۱۱ھ): ۳/ ۳۵۰، کتاب الصيام، باب الافتراش في المسجد، ووضع السرر فيه للاعتكاف، ت: د. محمد مصطفى الأعظمي، ط: المكتب الإسلامي- بيروت☆ المعجم الأوسط- أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۸/ ۹۴، باب الميم، من بقية من أول اسمه ميم من اسمه موسى، ت: طارق بن عوض الله بن محمد، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين- القاهرة)

(۲) وفي الاعتكاف تفريغ القلب عن أمور الدنيا، وتسليم النفس إلى بارئها، والتحصن بحصن حصين، وملازمة بيت الله تعالى. (قال) عطاء: مثل المعتكف كمثل رجل له حاجة إلى عظيم، فيجلس على بابه، ويقول: لا أبرح حتى تقضي حاجتي، والمعتكف يجلس في بيت الله تعالى، ويقول: لا أبرح حتى يغفر لي فهو أشرف الأعمال إذا كان عن إخلاص. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۳/ ۱۱۵، کتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار المعرفة- بيروت☆ البحر الرائق: ۲/ ۳۲۲، کتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ مراقي الفلاح، ص: ۲۶۸، کتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: المكتبة العصرية☆ تبيين الحقائق: ۱/ ۳۴۸، کتاب الصوم، باب الاعتكاف، المطبعة الأميرية، بولاق☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۲، کتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: دار الفكر- بيروت)

(۳) قال: ولا يتكلم إلا بخير، ويكره له الصمت؛ لأن صوم الصمت ليس بقربة في شريعتنا لكنه يتجانب ما يكون مأثما. (الهداية) ـــــــ قال العيني: (ويكره له الصمت) أي ترك التحدث مع الناس، قال الإمام حميد الدين الضرير: إنما يكره الصمت إذا اعتقده قربة، أما إذا لم يعتقده قربة فلا يكره.

(لكنه يتجانب ما يكون مأثما) متصل بقوله: يكره له الصمت، يعني يتحدث بما شاء بعد أن لا يكون في كلامه مأثم، والمأثم بمعنى الإثم. (البناية شرح الهداية- بدر الدين العيني (م: ۸۵۵ھ): ۴/ ۱۳۲، باب الاعتكاف، ما يجوز للمعتكف، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[٢٦] ١-معتکف کا کھانا کھا کر برتن مسجد ہی میں چھوڑ دینا

[٢٧] ٢-امام مسجد کی موجودگی میں غیر امام کا امامت کے لیے اصرار کرنا

١٦٠٢،٠٣-سوال: (١) بعض معتکف، بسا اوقات افطار کر کے، اور کھانا وغیرہ کھا کر برتن، دسترخوان پر، جماعت خانے ہی میں چھوڑ دیتے ہیں اور صبح فجر کی نماز تک پڑے رہتے ہیں، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

(٢) متعدد علمائے کرام اور امام مسجد کی موجودگی کے باوجود، ایک دین دار شخص نماز پڑھاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں جب حاضر رہوں گا، تو خود ہی نماز پڑھاؤں گا اور امام کو نماز پڑھانے سے روکتا ہے، کیا اس کا یہ عمل درست ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

(١) مذکورہ عمل غیر مناسب اور قابل اصلاح ہے، کھانے کے بعد برتن اٹھالینا چاہیے، جماعت خانہ میں برتن چھوڑے رہنا، مسجد کی نظافت و صفائی کے خلاف ہے۔ (١)

---

(١) وَعَهِدْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَٰعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلْعَٰكِفِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ ۞. (٢-البقرة: ١٢٥)

عن عائشة-رضي الله تعالى عنها- قالت: أمر رسول الله- صلى الله عليه وسلم- ببناء المساجد في الدور، وأن تنظف وتطيب. (سنن أبي داود: ١/ ٦٦، رقم الحديث: ٤٥٥، كتاب الصلاة، باب اتخاذ المساجد في الدور، ط: ديوبند)

عن سمرة، أنه كتب إلى ابنه: أما بعد فإن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يأمرنا بالمساجد أن نصنعها في ديارنا، ونصلح صنعتها ونطهرها. (المصدر السابق، رقم الحديث: ٤٥٦)

عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: عرضت علي أجور أمتي حتى القذاة يخرجها الرجل من المسجد، وعرضت علي ذنوب أمتي، فلم أر ذنبا أعظم من سورة من القرآن أو آية أوتيها رجل ثم نسيها. (المصدر السابق، رقم الحديث: ٤٦١، كتاب الصلاة، باب في كنس المسجد)

... إذا حصل الأجر لمن يخرج القذاة من المسجد، فالذي يكنسه ويزيل ترابه وغباره، وينظفه عن الأقذار والأوساخ بالطريق الأولى أن يحصل له أجور كثيرة. (شرح سنن أبي داود- بدر الدين العيني (م: ٨٥٥هـ): ٢/ ٣٦٩، ت: أبو المنذر خالد بن إبراهيم المصري، ط: مكتبة الرشد - الرياض ☆ فتح الباري لابن رجب: ٣/ ٣٥٢، باب كنس المسجد و التقاط الخرق و القذى و العيدان، ط: مكتبة الغرباء الأثرية، المدينة المنورة ☆ نيل الأوطار: ٢/ ١٧٧، باب كنس المسجد وتطييبها، ت: عصام الدين، ط: دار الحديث: مصر)

(۲) مذکورہ عمل جائز نہیں، حدیث کی خلاف ورزی ہے، امامت کا حق امام ہی کو ہے، امام صاحب کی اجازت کے بغیر امامت کرنا درست نہیں ہے۔ (☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۸] مسجد میں ٹوپی، کرتا اور پتلون وغیرہ لٹکانا

۱۶۰۴- سوال: ٹوپی، کرتا، پتلون اور ازار وغیرہ مسجد کے جماعت خانے میں اس طور پر لٹکانا، کہ عام لوگوں کی اس پر نظر پڑتی ہو، کیسا ہے؟ نیز مسجد میں جگہ جگہ برتن پڑے رہتے ہیں، کیا یہ مسجد کی شایان شان ہے؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامدا ومصليا:

مسجد اللہ رب العزت کا گھر ہے، اس کا ادب ملحوظ رکھنا اور اس کی صفائی وستھرائی کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ (۱) کسی بھی آدمی کا اس طرح بے حرمتی کے ساتھ مسجد کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے، صرف معتکف

(☆☆☆) عن أبي عطية، رجل منهم قال: كان مالك بن الحويرث يأتينا في مصلانا يتحدث، فحضرت الصلاة يوما، فقلنا له: تقدم، فقال: ليتقدم بعضكم حتى أحدثكم لم لا أتقدم، سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من زار قوما فلا يؤمهم، وليؤمهم رجل منهم: " هذا حديث حسن صحيح، والعمل على هذا عند أكثر أهل العلم من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم وغيرهم قالوا: صاحب المنزل أحق بالإمامة من الزائر.

... قال: " وكذلك في المسجد، لا يصلي بهم في المسجد إذا زارهم، يقول: يصلي بهم رجل منهم ". (سنن الترمذي: ۱/ ۸۲، رقم الحديث: ۳۵۶، أبواب الصلاة، باب ما جاء فيمن زار قوما فلا يصل بهم، ط: ديوبند)

عن أوس بن ضمعج، قال: سمعت أبا مسعود الأنصاري، يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يؤم القوم أقرؤهم لكتاب الله، فإن كانوا في القراءة سواء، فأعلمهم بالسنة، فإن كانوا في السنة سواء، فأقدمهم هجرة، فإن كانوا في الهجرة سواء، فأكبرهم سنا، ولا يؤم الرجل في سلطانه، ولا يجلس على تكرمته في بيته إلا بإذنه. (المصدر السابق: ۱/ ۵۵، أبواب الصلاة، باب من أحق بالإمامة)

وقيد في السراج الوهاج تقديم الأعلم بغير الإمام الراتب، وأما الإمام الراتب فهو أحق من غيره، وإن كان غيره أفقه منه. (البحر الرائق: ۱/ ۳۶۸، كتاب الصلاة، باب الإمامة، فصل الأحق بالإمامة في الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۱۰۷، كتاب الصلاة، أولى الناس بالإمامة، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ۵۰۹، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۱) وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿١٢٥﴾. (۲- البقرة: ۱۲۵)

عن عائشة، قالت: أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم ببناء المساجد في الدور وأن تنظف وتطيب. (سنن أبي داود: ۱/ ۶۶، رقم الحديث: ۴۵۵، كتاب الصلاة، باب اتخاذ المساجد في الدور، ط: ديوبند) =

کے لیے بعض مخصوص کاموں کی اجازت دی گئی ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] آخری عشرے کے اعتکاف کی نیت کس طرح کریں؟

۱۶۰۵-سوال: رمضان کے آخری عشرے کے اعتکاف کی نیت روزانہ الگ الگ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کیا الگ الگ نیت کرنے سے اعتکاف مسنون کا ثواب نہیں ملے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداو مصلیا:

رمضان کے آخری عشرہ یعنی دس دن کا اعتکاف سنت مؤکدہ (علی الکفایہ) ہے، (۲) اس کے لیے

= عن سمرة، أنه كتب إلى ابنه: أما بعد فإن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يأمرنا بالمساجد أن نصنعها في ديارنا، ونصلح صنعتها ونطهرها. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۴۵۶)

(۱) وأما الأكل والشرب والنوم فيكون في معتكفه؛ لأنه يمكنه قضاء هذه الحاجة في المسجد فلا ضرورة في الخروج كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۲، كتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: دار الفكر - بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۲۵۷، كتاب الصوم، الصوم شرط في الاعتكاف الواجب، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۴۳، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الفكر)

عن جابر - رضي الله تعالى عنه - قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم، عن أكل البصل والكراث، فغلبتنا الحاجة، فأكلنا منها، فقال: من أكل من هذه الشجرة المنتنة، فلا يقربن مسجدنا، فإن الملائكة تأذى، مما يتأذى منه الإنس. (الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۰۹، رقم الحديث: ۷۲-(۵۶۳)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب نهي من أكل ثوما أو بصلا أو كراثا أو نحوها، ط: ديوبند ☆ وانظر صحيح البخاري: ۱/ ۱۱۸، رقم الحديث: ۸۵۳ تا ۸۵۶، كتاب الأذان، باب ما جاء في الثوم الني والبصل والكراث، ط: ديوبند)

وأكل نحو ثوم، ويمنع منه. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله وأكل نحو ثوم) أي كبصل ونحوه مما له رائحة كريهة للحديث الصحيح في النهي عن قربان أكل الثوم والبصل المسجد. قال الإمام العيني في شرحه على صحيح البخاري قلت: علة النهي أذى الملائكة وأذى المسلمين ولا يختص بمسجده - عليه الصلاة والسلام -، بل الكل سواء لرواية مساجدنا بالجمع، خلافا لمن شذ ويلحق بما نص عليه في الحديث كل ما له رائحة كريهة مأكولا أو غيره، وإنما خص الثوم هنا بالذكر وفي غيره أيضا بالبصل والكراث لكثرة أكلهم لها. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۶۱، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، مطلب في الغرس في المسجد، ط: دار الفكر)

(۲) والاعتكاف على ثلاثة أقسام واجب في المنذور وسنة كفاية مؤكدة في العشر الأخير من رمضان ومستحب فيما سواه. (نور الإيضاح مع المراقي حسن بن عمار بن علي الشرنبلالي المصري الحنفي (م: ۱۰۶۹ھ)، ص: ۲۶۵، باب الاعتكاف، ط: المكتبة العصرية)

بیسویں روزے کو غروب آفتاب سے پہلے مسجد پہنچ جانا ضروری ہے۔ [1]

''معتکف'' دس روز کے اعتکاف کی نیت ایک ساتھ کرے گا، تو اعتکافِ مسنون کا ثواب ملے گا، اور روزانہ الگ الگ نیت کرنے کی صورت میں اعتکافِ مسنون کا ثواب نہیں ملے گا؛ بل کہ وہ نفلی اعتکاف ہوگا اور سنت ادا نہیں ہوگی۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] اعتکاف کی حالت میں صرف لنگی، بنیان اور ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا

۱۶۰۶-سوال: اعتکاف کی حالت میں صرف لنگی، بنیان اور ٹوپی پہن کر مسجد کے جماعت خانے میں نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

مرد کے لیے اس کے بدن کے جن حصوں (اعضاء) کا چھپانا فرض ہے، اگر وہ حصے چھپ گئے ہوں، تو نماز ہوجاتی ہے؛ اس لیے صورت مسئولہ میں نماز ہوجائے گی۔ [3] البتہ اس حالت میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

---

(۱) عن عائشة رضي الله عنها، قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم، إذا أراد أن يعتكف صلى الفجر، ثم دخل معتكفه۔۔۔ الحديث. (الصحيح لمسلم: ۱/۳۷۱، رقم الحديث: ۶-(۱۱۷۲)، أول كتاب الاعتكاف، ط: ديوبند)

قوله (إذا أراد أن يعتكف صلى الفجر ثم دخل معتكفه) احتج به من يقول يبدأ بالاعتكاف من أول النهار وبه قال الأوزاعي والثوري والليث في أحد قوليه وقال مالك وأبو حنيفة والشافعي وأحمد يدخل فيه قبل غروب الشمس إذا أراد اعتكاف شهر أو اعتكاف عشر وأولوا الحديث على أنه دخل المعتكف وانقطع فيه وتخلى بنفسه بعد صلاته الصبح لا أن ذلك وقت ابتداء الاعتكاف بل كان من قبل المغرب معتكفا لابثا في جملة المسجد فلما صلى الصبح انفرد. (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج=المعروف بـ حاشية النووي- أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م:۶۷۶ھ):۸/۶۹-۶۸، أول كتاب الاعتكاف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت☆مرقاة المفاتيح: ۴/۳۲۹، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، الفصل الثاني، ط: المكتبة الأشرفية- ديوبند ☆ بذل المجهود: ۸/۶۹۲، رقم الحديث: ۲۴۶۴، باب الاعتكاف، ط: دار البشائر الإسلامية)

(۲) حکیم الامت حضرت تھانویؒ اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں:

سنت بہ قید عشر ہے، جب قید نہیں مقید نہیں، اور وہی سنت تھا، پس سنت نہیں، اور جزِ سنت، بحال انفراد کے لیے جزوسنت بحالت اجتماع مع سائر الاجزاء کے حکم میں ہونا لازم نہیں اور نہ ثابت۔ (امداد الفتاویٰ: ۲/۱۵۴، باب الاعتکاف، سوال نمبر: ۲۲۷، بعض جزئیات متعلق اعتکاف، ط: زکریا-دیوبند)

(۳) (ومنها) ستر العورة لقوله تعالى: {يابني آدم خذوا زينتكم عند كل مسجد وكلوا} [الأعراف: ۳۱]، قيل في التأويل: =

جن کپڑوں کو پہن کر محلے والوں سے اور اپنے دوست واحباب سے ملنے میں شرم محسوس ہوتی ہو، ایسے کپڑوں کو پہن کر نماز کے لیے آنا کراہت سے خالی نہیں۔ (☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب

[۳۱] معتکف کا اپنی بیوی سے بات کرنا

۱۶۰۷- سوال: ''معتکف'' اپنی بیوی کے ساتھ بات کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیا:

معتکف کی بیوی اگر مسجد میں آئے یا مسجد کی کھڑکی کے پاس موجود ہو، اور معتکف بات کرے، تو اس کی اجازت ہے۔ امام بخاریؒ نے باضابطہ اس سلسلے میں باب قائم فرمایا ہے: ''عورت کا اپنے شوہر سے ملاقات کرنا، [شوہر کے] اعتکاف کی حالت میں''(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتکاف کی حالت میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کی ہے، حضرت صفیہؓ سے بات چیت میں وقت ہوگیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُنہیں گھر پہنچا کر اور بشری تقاضے سے فارغ ہوکر آئے۔ (بخاری شریف: ۱/ ۲۷۳)[۲]

(☆☆) (و) كره ... صلاته في ثياب بذلة يلبسها في بيته و مهنة أي خدمة، إن له غيرها وإلا لا. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله وصلاته في ثياب بذلة) بكسر الباء الموحدة وسكون الذال المعجمة: الخدمة والابتذال، وعطف المهنة عليها عطف تفسير؛ وهي بفتح الميم وكسرها مع سكون الهاء، وأنكر الأصمعي الكسر حلية. قال في البحر: وفسرها في شرح الوقاية بما يلبسه في بيته ولا يذهب به إلى الأكابر والظاهر أن الكراهة تنزيهية. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۱/ ۶۴۱-۶۴۰، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها، ط: دار الفكر- بيروت ☆ مراقي الفلاح، ص: ۱۳۱، كتاب الصلاة، فصل في المكروهات، ط: المكتبة العصرية ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۰۷، كتاب الصلاة، الفصل الثاني فيما يكره في الصلاة وما لا يكره، ط: دار الفكر)

(۱) باب زيارة المرأة زوجها في اعتكافه. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۷۳، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: ديوبند)

[۲] عن علي بن الحسين رضي الله عنهما، أن صفية، زوج النبي صلى الله عليه وسلم أخبرته ح وحدثنا عبد الله بن محمد، حدثنا هشام بن يوسف، أخبرنا معمر، عن الزهري، عن علي بن الحسين: كان النبي صلى الله عليه وسلم في المسجد وعنده أزواجه فرحن، فقال لصفية بنت حيي لا تعجلي حتى أنصرف معك، وكان بيتها في دار أسامة، فخرج النبي صلى الله عليه وسلم معها، فلقيه رجلان من الأنصار فنظرا إلى النبي صلى الله عليه وسلم، ثم أجازا، وقال لهما النبي صلى الله عليه وسلم: "تعاليا إنها صفية بنت حيي"، قالا: سبحان الله يا رسول الله، قال: "إن الشيطان يجري =

اِس لیے ضروری دنیوی باتیں یا دینی مشورہ یا دینی باتیں کرنا جائز ہے۔

عمدۃ القاری (۱۱/ ۱۵۲) میں مذکورہ بالا حدیث کی تفصیل میں ہے کہ اِس [حدیث] سے ذیل کے چند مسائل ثابت ہوتے ہیں:

(۱) ضروری دینی یا دنیوی کام کے لیے عورت رات کے وقت گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔

(۲) عورت اپنے شوہر اگر اعتکاف کی حالت میں ہو تو ملاقات کے لیے جاسکتی ہے۔

(۳) معتکف اپنی بیوی کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر بات کرسکتا ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] اعتکاف کی حالت میں ٹیوشن پڑھانا

۱۶۰۸- سوال: اعتکاف کی حالت میں ٹیوشن[۲] پڑھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اُجرت کے ساتھ مسجد میں پڑھانا مکروہ ہے؛ لہٰذا اعتکاف کی حالت میں ٹیوشن پڑھانا مکروہ ہوگا۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] معتکف کے لیے رات بھر مسجد کی لائٹ اور پنکھے چلانا

۱۶۰۹- سوال: معتکف کے لیے پوری رات مسجد کی لائٹ اور پنکھے چالو رکھنا کیسا ہے؟

=من الإنسان مجری الدم، وإني خشیت أن یلقي في أنفسکما شیئا". (صحیح البخاري:۱/ ۲۷۳، رقم الحدیث:۲۰۳۸، کتاب الاعتکاف، باب ھل یدرأ المعتکف عن نفسه، ط: دیوبند)

(۱) وفیه: إباحة خلوة المعتکف بالزوجة. وفیه: إباحة زیارة المرأة للمعتکف. . . . وفیه: جواز خروج المرأة لیلا. (عمدة القاري شرح صحیح البخاري- بدر الدین العیني (م:۸۵۵ھ):۱۱/ ۱۵۲، کتاب الاعتکاف، باب ھل یخرج المعتکف لحوائجه إلی باب المسجد، ط: دار إحیاء التراث العربي- بیروت)

(۲) گھر پر پڑھائی، اسکول کی باقاعدہ پڑھائی کے علاوہ پڑھائی۔ (فیروز اللغات، ص:۴۳۵، مادہ: ٹ-ی، ط: فیروز اینڈ سنز، کراچی)

(۳) ویکره کل عمل من عمل الدنیا في المسجد، ولو جلس المعلم في المسجد والوراق یکتب، فإن کان المعلم یعلم للحسبة والوراق یکتب لنفسه فلا بأس به؛ لأنه قربة، وإن کان بالأجرة یکره إلا أن یقع لھما الضرورة، کذا في محیط السرخسي. (الفتاوی الھندیة:۵/ ۳۲۱، کتاب الکراھیة، الباب الخامس في آداب المسجد والقبلة والمصحف وما کتب فیه شيء من القرآن، ط: دار الفکر)

الجواب حامداومصليا:

معتکف مسجد کا حق ادا کرنے کی غرض سے مسجد میں رکا ہوا ہے؛ اس لیے جائز ہے، کوئی حرج نہیں ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۴] مفسدات اعتکاف

۱۶۱۰- سوال: رمضان کا اعتکاف اور نفلی اعتکاف کن وجوہات کی بنا پر ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداومصليا:

دینی، طبعی اور فطری حاجت (پیشاب، پاخانہ، غسل کی حاجت) کے بغیر معتکف مسجد سے نکلے گا، تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] مسجد میں چلتے پھرتے ذکر کرنا

۱۶۱۱- سوال: کوئی شخص مسجد کے جماعت خانہ میں ہو، اور اللہ کا ذکر چلتے چلتے کرے، کیا یہ جائز ہے؟ یا رمضان المبارک میں اعتکاف میں بیٹھا معتکف تھک جائے اور مسجد میں چہل قدمی کرنے لگے اور ساتھ ساتھ ذکر بھی کرے، تو کیا اس کی اجازت ہے؟

الجواب حامداومصليا:

ذکر کے لیے کسی خاص مقام کی شرط نہیں ہے، جہاں چاہے، ذکر کر سکتا ہے؛ اس لیے کوئی مسجد میں

---

(۱) ولا يجوز أن يترك فيه كل الليل إلا في موضع جرت العادة فيه بذلك كمسجد بيت المقدس ومسجد النبي -صلى الله عليه وسلم- والمسجد الحرام، أو شرط الواقف تركه فيه كل الليل كما جرت العادة به في زماننا، كذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۴۵۹، كتاب الوقف، الباب الحادي عشر في المسجد، الفصل الثاني في الوقف، وتصرف القيم وغيره في مال الوقف عليه، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۵/ ۲۷۰، آخر كتاب الوقف، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۲] (وأما مفسداته) فمنها الخروج من المسجد فلا يخرج المعتكف من معتكفه ليلا ونهارا إلا بعذر، وإن خرج من غير عذر ساعة فسد اعتكافه في قول أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - كذا في المحيط. سواء كان الخروج عامدا أو ناسيا هكذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۲، كتاب الصوم، الباب السابع في الاعتكاف، ط: زكريا- ديوبند ☆ البحر الرائق: ۲/ ۳۲۷، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۴۳۵-۴۳۴، كتاب الصوم، باب الاعتكاف، ط: زكريا)

ہو، اور کسی ضرورت یا طبعی تقاضے کی وجہ سے مسجد کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے آمد ورفت کر رہا ہو، اور ساتھ ساتھ ذکر بھی کرے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

معتکف کے لیے شرعی یا طبعی ضرورت کے بغیر مسجد سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے، اس سے اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے؛ مسجد میں گھومتے ہوئے کوئی ذکر کرے، تو جائز ہے۔ (۱)

البتہ بلا وجہ مسجد میں تفریح کرنے سے احتراز کرنا چاہیے، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۶] معتکف کا وضوء کرنے کے لیے جماعت خانہ سے باہر نکلنا

۱۶۱۲- سوال: معتکف شخص اگر نفل نماز یا تلاوتِ قرآن پاک کے لیے وضوء کرنا چاہے اور وضوء خانہ مسجد کے جماعت خانہ سے باہر ہے، تو کیا اُسے اِس بات کی گنجائش ہے کہ وضوء کرنے کے لیے باہر نکلے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

نفل عبادت کے وضوء کے لیے جماعت خانہ سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے، فرض نماز کے لیے وضوء کرنا یا استنجاء کے لیے نکلنا اور اُس کے بعد وضوء کرنا جائز ہے، استنجاء کے لیے نکلنے کے بعد اگر پانی تیار ہے، تو غسل بھی کر سکتا ہے؛ لیکن کسی نفل عبادت کے لیے وضوء اور غسلِ جمعہ کے لیے نکلنا جائز نہیں ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۷] والدین کی اطاعت اور محلے کی مسجد میں اعتکاف

۱۶۱۳- سوال: (۱) ہمارے محلہ میں الم تر کی تراویح ہوتی ہے، ہمارے محلہ کا ایک مسلم بھائی دوسرے محلہ میں پورے قرآن کی تراویح سننے کی غرض سے جاتا ہے، اس نے رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کی نیت کی ہے، اس کے والدین یہ کہتے ہیں کہ تمہیں اپنے محلے کی مسجد میں اعتکاف کرنا ہے۔

---

(۱) لا يخرج المعتكف اعتكافا واجبا من مسجده إلا لضرورة مطلقة، لحديث عائشة "كان - عليه السلام - لا يخرج من معتكفه إلا لحاجة الإنسان" ولأنه معلوم وقوعها ولا بد من الخروج في بعضها فيصير الخروج لها مستثنى. (البحر الرائق: ۲/۳۲۵، كتاب الصلاة، باب الاعتكاف، ط: دار الكتاب الإسلامي)

معتکف، جس مسجد میں معتکف ہے، اس تمام مسجد میں جس جگہ چاہے، رہ سکتا ہے، سو سکتا ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۶/۵۰۳، باب الاعتکاف، ط: دار العلوم-کراچی)

(۲) تخریج گذر چکی۔

سوال یہ ہے کہ یہ شخص اپنے محلہ کی مسجد میں - جہاں الم تر کی تراویح ہوتی ہے - اعتکاف کرے، یا جس مسجد میں وہ تراویح پڑھتا ہے، اس میں اعتکاف کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

محلے کی مسجد - جس میں الم ترکیف والی تراویح ہوتی ہے - میں اعتکاف کرے اور وہیں تراویح پڑھ لے؛ کیوں کہ والدین نے اسی مسجد میں اعتکاف کی اجازت دی ہے، تراویح میں مکمل قرآن سننا گرچہ سنت ہے؛ لیکن اس کی ادائیگی کے لیے والدین کی بات نہ مان کر ان کو تکلیف پہنچانا صحیح نہیں ہے۔

نیز اس اعتکاف کی وجہ سے افطاری یا سحری کا انتظام والدین، بھائی، بھتیجا، پوتا وغیرہ کو کرنا پڑے گا، اور محلے کی مسجد میں قریب ہونے کی وجہ سے انتظام میں سہولت ہوتی ہے، اس لیے والدین کا کہنا مانے اور محلے کی مسجد میں اعتکاف کرے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن المغيرة بن شعبة، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: "إن الله حرم عليكم: عقوق الأمهات، ووأد البنات، ومنع وهات، وكره لكم قيل وقال، وكثرة السؤال، وإضاعة المال". (صحيح البخاري: ۱/۳۲۴، رقم الحديث: ۲۴۰۸، كتاب في الاستقراض وأداء الديون والحجر والتفليس، باب ما ينهى عن إضاعة المال، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/۷۵، رقم الحديث: ۱۲-(۵۹۳)، كتاب الأقضية، باب النهي عن كثرة المسائل من غير حاجة، والنهي عن منع وهات... الخ، ط: ديوبند)

وقال الشيخ تقي الدين السبكي: إن ضابط العقوق إيذاؤهما بأي نوع كان من أنواع الأذى. قل أو كثر، نهيا عنه أو لم ينهيا أو يخالفهما فيما يأمران أو ينهيان بشرط انتفاء المعصية في الكل، وحكى قول الغزالي: أن أكثر العلماء على وجوب طاعتهما في الشبهات، ووافقهما عليه، وحكى قول الطرطوسي من المالكية: أنهما إذا نهياه عن سنية راتبة المرة بعد المرة أطاعهما، وإن كان ذلك على الدوام فلا طاعة لهما فيه لما فيه من إماتة الشرع، ووافقه على ذلك أيضا. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۲۲/۸۶، كتاب الأدب، باب عقوق الوالدين من الكبائر، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت ☆ فتح الباري شرح صحيح البخاري - أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي (م: ۸۵۲هـ): ۱۰/۴۰۶، كتاب الأدب، باب قوله عقوق الوالدين، ط: دار المعرفة - بيروت)

والعقوق بضم العين المهملة مشتق من العق وهو القطع والمراد به صدور ما يتأذى به الوالد من ولده من قول أو فعل إلا في شرك أو معصية ما لم يتعنت الوالد وضبطه بن عطية بوجوب طاعتهما في المباحات فعلا وتركا واستحبابها في المندوبات وفروض الكفاية كذلك. (فتح الباري شرح صحيح البخاري - أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي (م: ۸۵۲هـ): ۱۰/۴۰۶، كتاب الأدب، باب قوله عقوق الوالدين، ط: دار المعرفة - بيروت)

کتاب الحج

حج کا بیان

عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: ”لا تسافر المرأة إلا مع ذي محرم، ولا يدخل عليها رجل إلا ومعها محرم“، فقال رجل: يا رسول الله، إني أريد أن أخرج في جيش كذا و كذا، وامرأتي تريد الحج، فقال: ”اخرج معها“. (صحيح البخاري: ۱/۲۵۰، رقم الحديث: ۱۸۶۲، كتاب المناسك، باب حج النساء، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/۴۳۴، رقم الحديث: ۴۲۴-(۱۳۴۱)، كتاب الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، ط: ديوبند)

فرضية الحج وشرائطه وأركانه

[حج: فرضیت، شرائط اور ارکان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرضية الحج وشرائطه وأركانه

[حج: فرضیت، شرائط اور ارکان]

[۱] حج کب فرض ہوتا ہے؟

۱۶۱۴- سوال: کسی شخص پر حج کب فرض ہوتا ہے، فرضیتِ حج کی کتنی شرطیں ہیں؟ شرائط کی تفصیلی وضاحت کے ساتھ رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداومصليا:

درج ذیل سات شرائط موجود ہونے سے کسی پر حج فرض ہوتا ہے، ان میں ایک بھی شرط موجود نہ ہو، تو حج فرض نہیں ہوگا۔[1] وہ سات شرائط یہ ہیں:

(۱) اسلام، (۲) حج فرض ہونے کے متعلق علم ہونا، (۳) عاقل ہونا، (۴) بالغ ہونا، (۵) آزاد ہونا، (٦) استطاعت وقدرت کا ہونا اور (۷) حج کا وقت ہونا۔[2]

---

(۱) باب شرائط الحج، وهي أربعة أنواع، وهي التي إذا وجدت بتمامها وجب الحج عليه، وإلا فلا. (غنية الناسك في بغية المناسك: محمد حسن شاه المهاجر المكي، ص: ۱۱، باب شرائط الحج، ط: یادگار شیخ، سہارن پور☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملاعلي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۴۲، باب شرائط الوجوب، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

(۲) (قوله على مسلم إلخ) شروع في بيان شروط الحج وجعلها في اللباب أربعة أنواع. الأول: شروط الوجوب وهي التي إذا وجدت بتمامها وجب الحج وإلا فلا وهي سبعة: الإسلام، والعلم بالوجوب لمن في دار الحرب،=

پہلی شرط: ''اسلام'' ہے، لہٰذا حج صرف مسلمان پر فرض ہے، کافر، یہودی، نصرانی اور مجوسی پر فرض نہیں ہے۔ (۳)

دوسری شرط: ''حج کا علم ہونا'' یعنی اگر کوئی شخص دار الحرب میں رہتا ہو اور اس نے اسلام قبول کر لیا ہو؛ لیکن حج کے فرض ہونے کے متعلق اس کو علم نہیں ہو سکا، تو اس پر حج فرض نہیں ہوا، اگر اس حال میں اس کا انتقال ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، ان شاء اللہ۔ (۴)

البتہ اگر کوئی شخص دار الاسلام، یا دار الامن میں رہتا ہے، یا دار الحرب میں رہتا ہے؛ لیکن دو آدمی نے اس کو حج کے فرض ہونے کے متعلق مسئلہ بتا دیا ہے، تو اس پر حج فرض ہو جائے گا، دار الاسلام میں رہ کر مسئلہ نہ جاننا عذر نہیں؛ بل کہ حج نہ کرنے کے گناہ کے ساتھ مسئلہ نہ جاننے کا گناہ بھی لازم ہوگا۔ (۵)

=والبلوغ، والعقل، والحرية، والاستطاعة، والوقت، أي القدرة في أشهر الحج، أو في وقت خروج أهل بلده على ما يأتي. (رد المحتار على الدر المختار-ابن عابدين الشامي(م: ۱۲۵۲ھ): ۲/ ۴۵۸، كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق-ابن نجيم المصري(م: ۹۷۰ھ): ۲/ ۵۳۹، كتاب الحج، زكريا-ديوبند)

(۳) الأول الإسلام، فلايجب على كافر مستطيع. (غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۱۱، باب شرائط الحج ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا على القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۴۲، باب شرائط الوجوب، المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(۴) وقوله أو بإخبار عدل إلخ هذا لمن أسلم في دار الحرب، فلايجب عليه قبل العلم بالوجوب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵۹، كتاب الحج، ط: دار الفكر-بيروت)

ويشترط العلم بفرضية الحج لمن أسلم بدار الحرب. (مراقي الفلاح مع الطحطاوي، ص: ۷۲۸، أول كتاب الحج، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

والعلم المذكور يثبت لمن في دار الإسلام بمجرد الوجود فيها سواء علم بالفرضية، أو لم يعلم ولا فرق في ذلك بين أن يكون نشأ على الإسلام فيها، أو لا فيكون ذلك علما حكميا ولمن في دار الحرب بإخبار رجلين أو رجل وامرأتين، ولو مستورين أو واحد عدل. (البحر الرائق-ابن نجيم المصري(م: ۹۷۰ھ): ۲/ ۳۳۱، كتاب الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۸، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر)

(۵) عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: طلب العلم فريضة على كل مسلم، وواضع العلم عند غير أهله كمقلد الخنازير الجوهر واللؤلؤ والذهب. (سنن ابن ماجه، ص: ۱/ ۲۰، رقم الحديث: ۲۲۴، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ط: المكتبة الأشرفية-ديوبند)

وطلب العلم فريضة، قال -عليه الصلاة والسلام-: "طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة". وهو =

تیسری اور چوتھی شرط: "عاقل اور بالغ ہونا" لہٰذا پاگل اور بچہ پر حج فرض نہیں ہوگا، اگر یہ دونوں حج کریں گے، تو حج فرض کی طرف سے ان کے لیے کفایت نہیں کرے گا۔ (۶)

پانچویں شرط: "آزاد ہونا" لہٰذا غلام اور باندی پر حج فرض نہیں ہے، غلام اگر اپنے آقا کی اجازت سے بھی حج کرلے، تو حج فرض ادا نہیں ہوگا، آزاد ہونے کے بعد اگر استطاعت ہوگی، تو دوبارہ حج کرنا لازم ہوگا۔ (۷)

چھٹی شرط: "قدرت واستطاعت کا ہونا"۔ چناں چہ جو لوگ مکہ سے دور رہتے ہیں، ان کے پاس اس قدر رقم کا ہونا ضروری ہے کہ مکہ جاسکے اور واپس آسکے، یہ بھی ضروری ہے کہ وہاں جا کر کھانے پینے اور مکان سے متعلق ضروری اخراجات نیز گھر سے نکلنے اور واپس آنے تک اہل وعیال کے نفقہ کا انتظام ہو، اگر ایسا ہے، تو اس پر حج فرض ہوگا، البتہ بہ قدر کفایت رقم ضروری ہے، بلا ضرورت عیش وعشرت نیز ہدیے اور تحفے کے لیے رقم کا ہونا حج کی فرضیت کے لیے شرط نہیں ہے، اس کے بہ غیر بھی حج فرض ہوجائے گا۔ (۸)

=أقسام: فرض، وهو مقدار ما يحتاج إليه لإقامة الفرائض، ومعرفة الحق من الباطل، والحلال من الحرام، وهو محمل الحديث. (الاختيار لتعليل المختار- عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م:۶۸۳هـ): ۱۷۱/۴، كتاب الكراهية، فصل في الكسب، ت: الشيخ محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي-القاهرة)

(۶) فمنها: البلوغ، ومنها العقل، فلا حج على الصبي، والمجنون؛ لأنه لا خطاب عليهما فلا يلزمهما الحج، حتى لو حجا، ثم بلغ الصبي، وأفاق المجنون، فعليهما حجة الإسلام، وما فعله الصبي قبل البلوغ يكون تطوعا. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م:۵۸۷هـ): ۱۲۰/۲، كتاب الحج، فصل شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية☆رد المحتار على الدر المختار: ۴۵۶/۳، كتاب الحج، ط: زكريا-ديوبند)

(۷) ومنها الحرية فلا حج على المملوك لما روي عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: "أيما عبد حج عشر حجج فعليه حجة الإسلام إذا أعتق"، ولأن الله تعالى شرط الاستطاعة لوجوب الحج بقوله تعالى: {ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا} [آل عمران: ۹۷]، ولا استطاعة بدون ملك الزاد، والراحلة لما نذكر إن شاء الله تعالى، ولا ملك للعبد؛ لأنه مملوك فلا يكون مالكا بالإذن فلم يوجد شرط الوجوب، وسواء أذن له المولى بالحج أو لا؛ لأنه لا يصير مالكا إلا بالإذن فلم يجب الحج عليه فيكون ما حج في حال الرق تطوعا. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع-علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م:۵۸۷هـ): ۱۲۰/۲، كتاب الحج، فصل شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية☆الفتاوى الهندية: ۲۱۷/۱، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه)

(۸) وأما تفسير الزاد، والراحلة فهو أن يملك من المال مقدار ما يبلغه إلى مكة ذاهبا، وجائيا، راكبا لا ماشيا، بنفقة وسط لا إسراف فيها، ولا تقتير فاضلا عن مسكنه، وخادمه، وفرسه، وسلاحه، وثيابه، وأثاثه، ونفقة عياله، وخدمه، وكسوتهم، وقضاء ديونه. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ۱۲۲/۲، كتاب الحج، فصل شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية☆فتح القدير-ابن الهمام (م:۸۶۱هـ): ۴۱۶/۲، كتاب الحج، ط: زكريا-ديوبند)

ہاں شرط یہ ہے کہ مال ضرورت سے زائد ہو، کسان کے پاس بیل گاڑی ضرورت میں داخل ہے، اسی طرح عالم کے پاس کتابیں ضرورت میں شمار ہوں گی۔[۹]

ساتویں شرط: "حج کا وقت ہونا"۔ حج فرض ہونے کے لیے ساتویں شرط یہ ہے کہ حج کا وقت ہو، اسی وقت میں (استطاعت ہونے سے) حج فرض ہوگا؛ لہٰذا ایک شخص کے پاس رمضان المبارک کی ۲۱ /تاریخ کو ستر ہزار روپے کسی نے ہدیہ دیا اور یہ رقم سفر حج نیز بال بچوں کے خرچ کے لیے شرط نمبر ۶ /کی وضاحت کے موافق کافی ہے؛ لیکن اس شخص کا ۲۸ /رمضان کو انتقال ہوگیا، تو اس پر حج فرض نہیں ہوگا۔[۱۰] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] پہلے قرض کی ادائیگی یا حج کی ادائیگی؟

۱۶۱۵- سوال: دو بھائی ہیں، ان میں ایک بھائی انڈیا میں رہتا ہے اور ایک سعودیہ میں، دونوں بھائیوں کے ذمہ کچھ قرض ہے؛ لیکن وہ حج ادا کرنا چاہتے ہیں، سعودیہ میں رہنے والے بھائی پر ۶۰۰۰ / روپے کا قرض ہے اور حج اس کا ۳۰۰۰ /ریں میں ہوتا ہے، اب حج کے ایام قریب آگئے ہیں، تو ان دونوں بھائی کو حج کرنا چاہیے یا پہلے قرض ادا کرنا چاہیے؟ اگر قرض کی ادائیگی سے قبل حج کریں، تو ان کے حج کی قبولیت و ثواب میں کوئی نقصان تو نہیں آئے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

ذمہ میں قرض ہونے کی وجہ سے حج ادا کرنا فرض نہیں ہوا؛ لیکن اس کے باوجود حج کیا جائے، تو حج

---

[۹] (فضلت)... (عن حوائجه الأصلية) كأثاث المنزل وآلات المحترفين وكالكتب لأهل العلم والمسكن. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ) :۲۶۱/۱، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي)

[۱۰] (وأما وقته فأشهر معلومات) والأشهر المعلومات شوال وذو القعدة وعشر ذي الحجة. (الفتاوى الهندية: ۲۱۶/۱، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر)

ثم ما ذكر من الشرائط لوجوب الحج من الزاد والراحلة وغير ذلك يعتبر وجودها وقت خروج أهل بلده إلى مكة حتى لو ملك الزاد والراحلة في أول السنة قبل أشهر الحج وقبل أن يخرج أهل بلده إلى مكة فهو في سعة من صرف ذلك إلى حيث أحب، وإذا صرف ماله ثم خرج أهل بلده لا يجب عليه الحج. (المصدر السابق: ۲۱۹/۱)

ادا ہو جاتا ہے، جو بھائی سعودیہ میں رہتا ہے، اس کے لیے حج ادا کر لینا بہتر ہے، اور جو انڈیا میں رہتا ہے، اس کے لیے قرض ادا کرنا بہتر ہے، تاہم دونوں ہی بھائی اگر حج ادا کرلیں، تو حج ادا ہو جائے گا، مگر حج کے بعد تاکیداً قرض ادا کرنا ضروری ہے۔ (☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] مقروض کا حج

۱۶۱۶- سوال: "مسائل حج"(۱) صفحہ نمبر: ۳۳ پر حج فرض ہونے کی شرائط کے تحت، شرط نمبر: ۵ کے ضمن میں لکھا ہے کہ حج فرض ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ حج کرنے والا آزاد ہو۔(۲)

یہاں یوکے (انگلینڈ) والے بینک سے سودی قرض لیتے ہیں اور اپنے ذمے قرض باقی رکھتے ہیں، ادا نہیں کرتے، نیز عورتوں کے زیورات بینکوں میں رکھ کر سود پر پیسے لیتے ہیں اور حج کے لیے جاتے ہیں۔

قرض کی عدم ادائیگی میں ان کی اس سوچ کو دخل ہے کہ اگر ہم قرض ادا کریں گے، تو ہماری حکومت ہم سے زیادہ ٹیکس وصول کرے گی، اس وجہ سے اپنے سر پر قرض رکھتے ہیں اور حج کے لیے جاتے ہیں، تو اس کا کیا حکم ہے؟ ایک طرف تو حکومت کی طرف سے ملنے والی ہر قسم کی سہولیات سے ہر طرح کا فائدہ بھی اٹھانا ہے اور ٹیکس کی ادائیگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ذمہ میں قرض باقی رکھنا ہے، حکومت کی

(☆☆) وإن كان في ماله وفاء بالدين يقضي الدين، ولا يحج، ويكره الخروج إلى الغزو والحج لمن عليه الدين وإن لم يكن عنده مال ما لم يقض دينه إلا بإذن الغرماء. (فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۱/ ۲۱۳، كتاب الحج، فصل في المقطعات، ط: زكريا- ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۲۱، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵۶، كتاب الحج، مطلب فيمن حج بمال الحرام، ط: دار الفكر)

یہی فتویٰ ہے قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا، تفصیل کے لیے دیکھیں: زبدۃ المناسک مع عمدۃ المناسک: ۱/ ۳۸، ضروری مسائل مفیدہ، ط: الجمعیۃ پریس، دہلی۔

(۱) یہ کتاب گجراتی زبان میں تھی، صاحب زادۂ محترم حافظ اسجد بیمات صاحب کی خصوصی توجہ سے، ان کے زیر اہتمام بہ زبان اردو شائع ہو چکی ہے، مولانا و مفتی اسامہ صاحب پالن پوری نے اس کتاب کو اردو کا جامہ پہنایا ہے، ناچیز کو بھی اس کی نوک و پلک سنوارنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

(۲) پانچویں شرط آزاد ہونا: پس غلام اور باندی پر حج فرض نہیں ہے، غلام اگر اپنے آقا کی اجازت سے حج کر لے، تو بھی حج فرض ادا نہیں ہوگا، آزاد ہونے کے بعد اگر استطاعت ہوگی، تو دوبارہ حج کرنا لازم ہوگا۔ (مسائل حج- مفتی احمد بیماتؒ، ص: ۴۱، ط: مدنی دار التربیت- کرمالی)

طرف سے ملنے والی سہولیات حسب ذیل ہیں:

(۱) کوئی معذور ہو، تو اس کی مکمل کفالت کرنا۔ (۲) بیمار ہونے کی صورت میں انشورنس دینا۔ (۳) طبی اور ڈاکٹری فیس دینا۔ (۴) دوائی ایک ٹائم کی مارشلینگ۔ [؟] (۵) ہسپتال میں ہر طرح کی فیس۔ (۶) ایک بچے کے پیچھے ایک پاؤنڈ سے ڈیڑھ پاؤنڈ کا الاؤنس۔ (۷) ولادت کی فیس۔ (۸) چھوٹے بچے کے لیے پلم (بچے کے گھومنے کے لیے چھوٹی گاڑی)

ان کے علاوہ برٹش حکومت، بلاتفریق مذہب وملت، ہر طرح کی سہولیات، جو وہاں کے قانون کے مطابق پبلک کو ملنی چاہیے، دیتی ہے، جیسا کہ افریقہ وغیرہ میں دیا جاتا ہے، اتنی ساری سہولیات ملنے کے باوجود بھی لوگ ٹیکس سے بچنے کے لیے قرض ادا نہیں کرتے ہیں اور حج پر حج کرتے ہیں، تو ان کا حج صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداومصليا:

آزاد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پچھلے زمانے میں غلامی کا رواج تھا، جنگوں میں قیدی بنا کر لائے جانے والے مرد کو "غلام" عورت کو "باندی" کہا جاتا تھا۔[۱]

حج کی فرضیت کے لیے لازم ہے کہ انسان آزاد ہو، غلام یا باندی نہ ہو۔[۲]

سوال میں ذکر کردہ تفصیل کے مطابق بعض افراد بینک سے محض دکھلاوے کے لیے اور ٹیکس سے بچنے کے لیے سودی قرض لیتے ہیں اور یو کے حکومت کو دھوکہ دیتے ہیں، اس کی وجہ سے وہ گنہ گار تو ضرور ہوں گے؛ مگر ان کا حج فرض ادا ہو جائے گا؛ کیوں کہ یہ شخص غلام نہیں ہیں۔

---

(۱) غلام: زرخرید نوکر، بندہ، ملازم۔ (فیروز اللغات، ص: ۹۱۵)

باندی: [ہ-ا-مث]، لونڈی، کنیز، چھوکری۔ (حوالہ سابق، ص: ۱۷۴)

[۲] عن ابن عباس قال: احفظوا عني، ولا تقولوا قال ابن عباس، أيما عبد حج به أهله، ثم أعتق، فعليه الحج، وأيما صبي حج به أهله صبيا ثم أدرك، فعليه حجة الرجل... الحديث. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار المعروف بـ"مصنف ابن أبي شيبة"-أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵ھ): ۳/۳۵۵، رقم الحديث: ۱۴۸۷۵، كتاب الحج، في الصبي والعبد والأعرابي يحج، ط: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد-الرياض)

(الخامس: الحرية) أي الأصلية أو العارضية، وشرط الوجوب والوقوع عن الفرض لا الجواز اتفاقا، (فلا حج على مملوك). (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۵۳-۵۴، باب شرائط الحج، ط: المكتبة الإمدادية)

جیسے داڑھی کاٹنا یا منڈوانا گناہ ہے؛ البتہ ایسا شخص نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، تو اس کی نماز اور اس کے روزے ادا ہو جاتے ہیں، اسی طرح سے سود پر کوئی رقم لی اور کاروبار کیا، تو اس کا حج فرض ادا ہو جائے گا۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] ضرورت سے زائد مکان یا زمین ہو، تو حج فرض ہوگا یا نہیں؟

۱۶۱۷- سوال: اگر کسی شخص کے پاس ضرورت سے زائد مکان، زمین اور دیگر آلات ہوں کہ: اگر ان کو فروخت کیا جائے، تو حج کے ضروری اخراجات کی تکمیل ہو سکتی ہے، تو کیا ایسے شخص کو انہیں فروخت کر کے حج کرنا ضروری ہے، یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

مذکورہ بالا صورت حال میں اس شخص پر حج فرض ہو گیا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ زمین، مکان، آلات، کتابیں اور اس طرح کی دوسری چیزوں کو بیچ کر حج میں جائے۔ (☆☆☆) واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] حج کی استطاعت میں مدینہ کے اخراجات داخل نہیں ہیں

۱۶۱۸- سوال: کسی شخص کے پاس صرف اتنی رقم ہے کہ مکہ مکرمہ جا سکتا ہے، مدینہ منورہ جانے

---

(۳) ويجتهد في تحصيل نفقة حلال، فإنه لا يقبل الحج بالنفقة الحرام، مع أنه يسقط الفرض معها وإن كانت مغصوبة. ولا تنافي بين سقوطه، وعدم قبوله، فلا يثاب لعدم القبول، ولا يعاقب في الآخرة عقاب تارك الحج. (فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م:۸۶۱هـ): ۲/ ۴۰۷، كتاب الحج، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۲۰، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۳۳۲، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(وقدرة زاد وراحلة)... وفي القهستاني وفيه إشارة إلى أنه لا يجب بالمال الحرام لكن لو حج به جاز؛ لأن المعاصي لا تمنع الطاعات فإذا آت بها لا يقال إنها غير مقبولة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بـ 'شيخي زاده'، يعرف بـ 'داماد أفندي' (م:۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۶۱، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي)

(☆☆☆) وذكر ابن شجاع أنه إذا كانت له دار لا يسكنها، ولا يؤاجرها، ومتاع لا يمتهنه، وعبد لا يستخدمه، وجب عليه أن يبيعه، ويحج به. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: ۲/ ۱۲۳، كتاب الحج، فصل شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۲۳، باب شرائط الحج، السادس: الاستطاعة، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

کے لیے اس کے پاس روپے نہیں ہیں، تو کیا ایسے شخص پر حج فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مدینہ آنے جانے کا خرچ ضرورت میں شامل نہیں ہے، بلاشبہ مدینہ منورہ کی حاضری عظیم نعمت ہے اور اس میں بے انتہاء ثواب ہے، پس جس کی استطاعت ہو، اسے جانا چاہیے؛ لیکن یہ ضروری خرچ میں شامل نہیں ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا خرچ نہ ہو، تب بھی حج فرض ہو جاتا ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٦] سودی رقم سے حج کرنا

۱۶۱۹- سوال: ایک شخص کی تجارت کافی نفع بخش ہے، اس میں اتنا پیسہ انویسٹ ہے کہ اس کے گھر کے تمام افراد حج کر سکیں؛ لیکن پیسے چار مہینے کے بعد وصول ہو سکتے ہیں، تو کیا یہ لوگ دوسرے غیر مسلم یا مسلمان کے پاس سے سودی رقم یا ادھار لے کر حج کا انتظام کر سکتے ہیں؟ تین سال پہلے ہی حج فرض ہو چکا ہے۔

الجواب حامداً ومصلّیاً:

سودی رقم سے حج میں جانا جائز نہیں ہے، مسلم یا کسی بھی غیر مسلم سے قرض لے سکتے ہیں، حج تین

---

(۱) وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا. (۳-آل عمران:۹۷)

قال الله تعالى: ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا. قال أبو بكر هذا ظاهر في إيجاب فرض الحج على شريطة وجود السبيل إليه، والذي يقتضيه من حكم السبيل أن كل من أمكنه الوصول إلى الحج لزمه ذلك إذ كانت استطاعة السبيل إليه هي إمكان الوصول إليه ... وقد جعل النبي صلى الله عليه وسلم من شرط استطاعة السبيل إليه، وجود الزاد والراحلة.

وروى أبو إسحاق عن الحارث عن علي عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: من ملك زادا وراحلة يبلغه بيت الله ولم يحج فلا عليه أن يموت يهوديا أو نصرانيا.

وذلك أن الله تعالى يقول في كتابه: ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا.

وروى إبراهيم ابن يزيد الجوزي عن محمد بن عباد عن ابن عمر قال: سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن قوله عز وجل: ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا. قال السبيل إلى الحج الزاد والراحلة. (أحكام القرآن-أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م: ٣٧٠هـ): ٣٠٨/٢، باب فرض الحج، آل عمران: ٩٧، ت: محمد صادق القمحاوي، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

سال قبل فرض ہوچکا ہے، تو جلد از جلد اس فریضہ کی ادائیگی کی سعادت حاصل کرلینی چاہیے [۱]۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] ایام حج میں جو شخص محض عمرہ کی نیت سے مکہ میں داخل ہو، تو اس پر حج فرض ہوگا یا نہیں؟

۱۶۲۰- سوال: ایام حج میں کوئی شخص صرف عمرہ کی نیت سے مکہ میں داخل ہوا ہو، تو اس پر حج فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

حج فرض ہونے کے لیے سواری کے ساتھ زادِراہ (کھانے پینے کے اخراجات) پر استطاعت بھی ضروری ہے۔ اور فقیر کو بھی مکہ مکرمہ پہنچنے سے پہلے میقات سے عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ میں داخل ہونا ضروری ہے، پس جب عمرہ کا احرام باندھ کر جو بھی شخص بیت اللہ شریف کے سامنے حاضر ہوگیا اور حج کے ایام (شوال سے ذی الحجہ کی دس تاریخ تک) موجود ہے اور کھانے پینے اور رہنے کا خرچ بھی اس کے پاس ہے، تو تمام علماء کے نزدیک اس پر حج فرض ہوجاتا ہے۔ (زبدۃ المناسک: ۱/ ۱۴) [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ویجتهد في تحصيل نفقة حلال، فإنه لا يقبل الحج بالنفقة الحرام مع أنه يسقط الفرض معها وإن كانت مغصوبة. ولا تنافي بين سقوطه وعدم قبوله فلا يثاب لعدم القبول ولا يعاقب في الآخرة عقاب تارك الحج. (فتح القدير- كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۲/ ۴۰۷، أول كتاب الحج، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵۶، كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۲۰، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۳۳۲، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۲] جس فقیر کے پاس نہ راہ خرچ ہے، نہ سواری کے لیے کرایہ کی قدرت ہے، تو اس پر حج کرنا فرض نہیں ہے، مگر شوق ومحبت کی وجہ سے گھر سے حج کی نیت کرکے نکلا، جب میقات پر پہنچا، تو اس پر حج یا عمرہ کا احرام لازم ہوجائے گا، پھر جب مکہ مکرمہ آکر داخل ہوا، اور کعبۃ اللہ شریف میں آپہنچا، تو اس پر فرضیت حج متعین ہوجائے گی بالاتفاق، اگر احرام باندھ کے آیا ہو، یا بغیر احرام کے آیا ہو، لیکن اس فقیر پر یہ فرضیت حج بالاتفاق تب ہوگی، جب اشہر حج میں آکر، کعبۃ اللہ شریف میں پہنچا ہو، اور ایام حج کا خرچہ کھانے کا بھی رکھتا ہو، اور عرفات پر پیادہ جانے کی قدرت بھی رکھتا ہو۔ (زبدۃ المناسک: ۱/ ۱۴، مسئلہ ضروری، مسکین کے متعلق، ط: الجمعیۃ پریس- دہلی)

الحج لا يجب على الفقير، إنما المراد به الآفاقي قبل وصوله إلى الميقات، فإنه حينئذ إذا أراد دخول الحرم يجب عليه إحرام أحد النسكين، وبدخوله إلى مكة ووصوله إلى الكعبة تعين عليه فرضية الحج، سواء أحرم به أم لا. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري- الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ)، ص: ۵۷، باب شرائط الحج، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة)

[۸] اگر کسی کے پاس صرف زادو راحلہ کے بہ قدر مال ہو

۱۶۲۱- سوال: ایک شخص پر کسی قسم کا قرض نہیں ہے، بیس ہزار روپئے تجارت میں لگے ہوئے ہیں، اس رقم کے علاوہ اس کے پاس دوسری کوئی رقم یا سونا چاندی وغیرہ نہیں ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ اس شخص پر حج فرض ہوا یا نہیں؟ اگر یہ حج کرنے جائے تو دکان کا سارا مال بیچنا پڑے گا، اس کے لیے کیا حکم ہے؟ کیا یہ =/20,000 روپیے اس کی ضرورت اصلیہ میں شمار ہوں گے یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصلیا:

صورت مسئولہ میں اس شخص پر حج فرض نہیں ہوگا، کیوں کہ بیس ہزار کی پونجی سے اس کی یومیہ ضرورت پوری ہوتی ہے، گویا اس کا یہ مال ضرورت اصلیہ میں داخل ہے، کیوں کہ اگر بیس ہزار روپیہ کاروبار سے نکال لے، تو اس کی تجارت ختم ہوجائے گی، اور آئندہ کی ضرورت پوری نہیں ہوسکے گی؛ اس لیے ایسے تاجر پر حج فرض نہیں ہے، لیکن جب وہ چالیس ہزار کا مالک بن جائے، تو حج فرض ہوجائے گا؛ کیوں کہ ۲۰ ہزار سے تجارت کر سکتا ہے، جو گذران کے لیے کافی ہے، الغرض مذکورہ صورت میں حج فرض نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] حج کی ادائیگی سے متعلق شرائط

۱۶۲۲- سوال: حج کی ادائیگی سے متعلق کتنی شرائط ہیں، تفصیل کے ساتھ جواب دیجیے، کیا حج ادا

---

(۱) (فضلت) ... (عن حوائجه الأصلية) كأثاث المنزل وآلات المحترفين وكالكتب لأهل العلم والمسكن. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ 'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸ھ) :۱/۲۶۱، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي)

ونصاب الوجوب ملك مال يبلغه إلى مكة ذاهبا وجائيا، راكبا في جميع السفر لا ماشيا بنفقة متوسطة فاضلا عن مسكنه ... وآلات حِرَفه ... ونفقة من عليه نفقته وكسوته ... إلى حين عوده. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۵۷-۵۹، باب شرائط الحج، الشرط السادس: الاستطاعة، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة ☆ الهداية: ۱/۱۳۲، كتاب الحج، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث الإسلامي ☆ اللباب في شرح الكتاب: ۱/۱۷۸، كتاب الحج، ت: محمد محي الدين عبد الحميد، ط: المكتبة العلمية - بيروت ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۴۹۹، كتاب الحج، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۷، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته، ط: دار الفكر - بيروت)

کرنے کے لیے تمام شرائط کا ایک ساتھ پایا جانا ضروری ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

حج کی ادائیگی کی درج ذیل شرائط ہیں، ادائیگی حج سے متعلق ان شرائط کا بہ یک وقت پایا جانا ضروری ہے:

(۱) تندرستی، (۲) قید میں نہ ہونا، نیز بادشاہ یا سرکار کی طرف سے کسی قسم کی رکاوٹ کا نہ ہونا۔[1] اور (۳) راستہ کا پرامن ہونا یعنی: راستہ میں لڑائی نہ ہو اور نہ ڈکیتی کا اندیشہ ہو۔[2]

مذکورہ تینوں شرطیں مرد وعورت دونوں کے لیے ہیں، باقی دو شرطیں صرف عورتوں کے لیے ہیں:

(۴) عورت کے ساتھ محرم کا ہونا اور (۵) عورت کا عدت میں نہ ہونا۔[3]

پہلی شرط: ''تندرستی''۔ اس شرط کے لحاظ سے اندھے، لنگڑے، لولے اور لنجے شخص پر بھی حج فرض ہوجاتا ہے؛ لیکن ایسے شخص کے لیے بہ ذات خود حج کے لیے جانا دشوار ہو، تو کسی اور کو حج میں بھیج کر حج بدل کرانے سے حج فرض ادا ہوجاتا ہے۔[4]

دوسری شرط: ''قید میں نہ ہونا''۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کے قانون کے لحاظ سے لوگوں کو

---

(۱) (صحیح) البدن (بصیر) غیر محبوس وخائف من سلطان یمنع منه. (الدر المختار مع رد المحتار - علاء الدين الحصكفي (م: ۱۰۸۸ھ): ۲/ ۴۵۹، كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت ☆ بدائع الصنائع - الكاساني (م: ۵۸۷ھ): ۲/ ۲۹۵، كتاب الحج، شرائط فرضية الحج، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) (قوله مع أمن الطريق) أي وقت خروج أهل بلده وإن كان مخيفا في غيره بحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۳، كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) (قوله ومع زوج أو محرم) هذا وقوله ومع عدم عدة عليها شرطان مختصان بالمرأة فلذا قال لامرأة وما قبلهما من الشروط مشترك والمحرم من لا يجوز له مناكحتها على التأبيد بقرابة أو رضاع أو صهرية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۴، كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴-۵) (صحیح) البدن (بصیر) غیر محبوس وخائف من سلطان یمنع منه. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله صحيح البدن) أي سالم عن الآفات المانعة عن القيام بما لا بد منه في السفر، فلا يجب على مقعد ومفلوج وشيخ كبير لا يثبت على الراحلة بنفسه وأعمى، وإن وجد قائدا، ومحبوس، وخائف من سلطان لا بأنفسهم، ولا بالنيابة في ظاهر المذهب عن الإمام وهو رواية عنهما وظاهر الرواية عنهما وجوب الإحجاج عليهم، ويجزيهم إن دام العجز وإن زال أعادوا بأنفسهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵۹، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

منظوری دی جاتی ہے، اگر کسی کو منظوری نہیں ملی اور اس کا انتقال ہوگیا، تو مرنے سے قبل، اس پر وصیت لازم ہے، پھر حج کرنے سے اس کا ذمہ بری ہوجائے گا۔(۵)

تیسری شرط: ''راستہ کا پر امن ہونا''۔ اس شرط کی رو سے اگر حج کی تمام شرائط کسی میں موجود ہیں؛ لیکن راستہ میں لڑائی جاری ہے اور جس راستہ سے جانا چاہتا ہے، وہاں خطرہ ہے، تو حج میں جانا ضروری نہیں ہے؛ لیکن خطرہ ٹلنے پر فوراً حج کرنا لازم ہوگا اور اگر لڑائی جاری ہی رہے اور اندیشہ ہو کہ لڑائی ختم ہونے تک وہ شخص زندہ نہیں رہے گا، تو اسے حج بدل کی وصیت کرنا ضروری ہوگا۔ اور امن کے ہونے نہ ہونے کا اعتبار فساد ونقصان کی قلت وکثرت سے ہوگا، یعنی: اگر زیادہ تر جہازوں (اسٹیمروں) کو ڈبو دیا جاتا ہو یا ختم کر دیا جاتا ہو، تو اس صورت کو ''امن کا نہ ہونا'' شمار کیا جائے گا۔(۶)

چوتھی شرط: ''عورت کے ساتھ محرم کا ہونا''۔ لہٰذا ضروری ہوگا کہ عورت کے ساتھ اس کا شوہر یا دین دار محرم (جس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہوتا ہے) ہو۔ بہنوئی، پھوپھا، اور خالو محارم ابدیہ میں سے نہیں ہیں۔ اگر عورت کے ساتھ سفر میں جانے کے لیے اس کا شوہر یا محارم میں سے کوئی نہ ہو، تو اس کے لیے حج میں جانا جائز نہیں ہے، اگر جائے گی، تو گنہ گار ہوگی۔(۷)

---

(۵) صفحہ سابق پر دیکھیں۔

(۶) (قوله مع أمن الطريق) أي وقت خروج أهل بلده وإن كان مخيفا في غيره بحر وقدمنا عن اللباب أنه من شروط وجوب الأداء وفي شرحه أنه الأصح ورجحه في الفتح، وروي عن الإمام أنه شرط وجوب فعلى الأول تجب الوصية به إذا مات قبل أمن الطريق أما بعده فتجب اتفاقا بحر (قوله بغلبة السلامة) كذا اختاره الفقيه أبو الليث وعليه الاعتماد.ــــــــ واختلف في سقوطه إذا لم يكن بد من ركوب البحر فقيل: يسقط وقال الكرماني: إن كان الغالب فيه السلامة من موضع جرت العادة بركوبه يجب وإلا فلا وهو الأصح بحر قال في الفتح: والذي يظهر أنه يعتبر مع غلبة السلامة عدم غلبة الخوف، حتى لو غلب لوقوع النهب والغلبة من المحاربين مرارا أو سمعوا أن طائفة تعرضت للطريق، ولها شوكة والناس يستضعفون أنفسهم عنهم لا يجب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۳، كتاب الحج، مطلب في قولهم يقدم حق العبد على حق الشرع، ط: دار الفكر- بيروت ☆ غنية الناسك، ص: ۲۸، فصل شرائط وجوب الأداء، الثالث، ط: یادگار شیخ- سہارن پور)

(۷) (و) مع وجود (زوج أو محرم) الذي حرم عليه نكاحها أبدا بقرابة أو رضاع أو صهارة مسلما أو عبدا أو كافرا فلا ينضم الزوج ولذلك ذكره (للمرأة) الشابة والعجوز بعدما كانت خالية عن العدة أية عدة كانت وظاهره أن المحرم شرط الوجوب.ــــــــ وفي الإصلاح وهو الصحيح لكن في الجوهرة أن الصحيح أي المحرم أنه من =

پانچویں شرط: "عورت کا عدت میں نہ ہونا"۔ عورت کے اوپر یہ بھی لازم ہے کہ وہ عدت میں نہ ہو، اگر عدت میں ہوگی، تو اس پر حج ادا کرنا لازم نہیں، خواہ عدت شوہر کے وفات کی ہو، یا نکاح ٹوٹنے سے ہو یا طلاق کی بنا پر ہو، عدت کی حالت میں جائے گی تو گنہ گار ہوگی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] محرم کا خرچہ عورت کے ذمے ہے

۱۶۲۳- سوال: سفر حج میں عورت کے ساتھ محرم کا ہونا شرط ہے، سوال یہ ہے کہ محرم کا خرچہ کس پر ہے، خود اس پر، یا اس عورت پر، جس کے ساتھ وہ جا رہا ہے؟

اگر عورت کے خرچ برداشت کرنے کے باوجود، کوئی محرم ساتھ جانے کے لیے آمادہ نہ ہو، تو عورت اس صورت میں کیا کرے گی؟

الجواب حامداومصليا:

محرم- جو ساتھ ہوگا- اس کا خرچ عورت دے گی۔ (۲)

=شرائط الأداء حتى يجب الإيصاء به (إن كان بينها) أي بين مكان المرأة.ـــــــ (وبين مكة مسافة سفر) أي مسافة ثلاثة أيام ولياليها؛ لأنه لو كان أقل منها يجوز بلا محرم.ـــــــ (ولا تحج) المرأة (بلا أحدهما) أي الزوج أو المحرم. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۲۶۲/۱، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۴۶۴/۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

(۱) والثاني: أن لا تكون معتدة عن طلاق أو وفاة؛ لأن الله تعالى نهى المعتدات بقوله عز وجل: {لا تخرجوهن من بيوتهن ولا يخرجن} [الطلاق:1]. وروي عن عبد الله بن عمر - رضي الله عنه - أنه رد المعتدات من ذي الحليفة.ـــــــ وروي عن عبد الله بن مسعود - رضي الله عنه - أنه ردهن من الجحفة.ـــــــ ولأن الحج يمكن أداؤه في وقت آخر فأما العدة فإنها إنما يجب قضاؤها في هذا الوقت خاصة فكان الجمع بين الأمرين أولى. (بدائع الصنائع: ۱۴۲/۲، كتاب الحج، فصل: شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۴۶۶/۳، كتاب الحج، ط: زكريا- ديوبند)

(۲) (و) مع (زوج أو محرم) ولو عبدا أو ذميا أو برضاع (بالغ) قيد لهما كما في النهر بحثا (عاقل والمراهق كبالغ) جوهرة... (مع) وجوب النفقة لمحرمها (عليها) لأنه محبوس (عليها) لامرأة حرة ولو عجوزا في سفر. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله مع وجوب النفقة إلخ) أي فيشترط أن تكون قادرة على نفقتها ونفقته (قوله لمحرمها) قيد به لأنه لو خرج معها زوجها فلا نفقة له عليها بل هي لها عليه النفقة... (قوله لأنه محبوس عليها) أي حبس نفسه لأجلها ومن حبس نفسه لغيره فنفقته عليه. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۶۴/۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت ☆ ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر: ۳۸۷/۱، ط: مكتبة فقيه الأمة- ديوبند)

اگر عورت کے خرچ دینے کے باوجود کوئی ساتھ جانے کے لیے تیار نہ ہو، تو عورت پر لازم ہے کہ حج میں جانے سے رک جائے اور وصیت کرے کہ میرے مرنے کے بعد کسی کو بھیج کر میری جانب سے حج کرا دیا جائے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] تمام قسم کے محرم کے ساتھ حج میں جانا جائز ہے

۱۶۲۴-سوال: (۱) محرم کئی طرح کے ہوتے ہیں: نسبی، دودھ کے رشتے کی وجہ سے، سسرالی رشتے کی وجہ سے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا عورت حج کے لیے ان تینوں قسم کے محارم میں سے کسی کے ساتھ بھی جا سکتی ہے، یا اس میں کچھ تفصیل ہے؟

(۲) نیز محرم اگر نابالغ یا پاگل ہو، تو عورت اس کے ہم راہ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے جا سکتی ہے یا نہیں؟ بینوا، توجروا۔

---

(۱) ''خاتون کے لیے محرم کا ہونا'' وجوب حج کے لیے شرط ہے یا وجوب ادا کے لیے، اگر وجوب حج کے لیے شرط ہو، اور محرم میسر نہ ہو، تو اس پر قریب المرگ حج بدل کی وصیت کرنا لازم نہیں ہے، اور اگر وجوب ادا کے لیے شرط ہو، تو ایسی صورت میں قریب المرگ وصیت کرنا لازم ہوگا۔

اس مسئلے میں فقہاء کا اختلاف ہے، دو رائے ہے اور ہر دو رائے کی ترجیح و تصحیح منقول ہے، بعض فرماتے ہیں کہ ''خاتون کے لیے محرم کا ہونا'' وجوب حج کے لیے شرط ہے، جب کہ بعض اسے وجوب ادا کے لیے شرط قرار دیتے ہیں، احتیاط اسی دوسرے قول میں ہے، اسی لیے صورت مسئولہ میں اکابر دیوبند سمیت، حضرت مفتی صاحب کا فتویٰ ہے کہ اس کے لیے قریب المرگ وصیت کرنا لازم ہے، ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

ثم تكلموا أن أمن الطريق وسلامة البدن - على قول أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - ووجود المحرم للمرأة شرط لوجوب الحج أم لأدائه، بعضهم جعلوها شرطا للوجوب وبعضهم شرطا للأداء، وهو الصحيح وثمرة الخلاف فيما إذا مات قبل الحج فعلى قول الأولين لا تلزمه الوصية وعلى قول الآخرين تلزمه كذا في النهاية. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۹، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر - بيروت)

وظاهره أن المحرم شرط الوجوب. ــــــــــ وفي الإصلاح وهو الصحيح لكن في الجوهرة أن الصحيح أي المحرم أنه من شرائط الأداء حتى يجب الإيصاء به. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - داماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/۲۶۲، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۶۴، كتاب الحج، ط: دار الفكر) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

الجواب حامداومصلیا:

محرمیت کا تعلق خواہ نسب کی وجہ سے ہو، جیسے: باپ، بھائی، چچا، بھتیجا اور بھانجا وغیرہ، یا دودھ کے رشتہ کی وجہ سے ہو، جیسے: رضاعی باپ، رضاعی بھائی وغیرہ، یا سسرالی رشتے کی وجہ سے ہو، جیسے: داماد، خسر وغیرہ، ان سب کے ساتھ عورت کے لیے حج میں جانا جائز ہے۔ (۱)

لیکن موجودہ دور فتنہ، فساد، بے دینی اور بے حیائی کا ہے؛ اس لیے سسرالی یا رضاعی محارم کے ساتھ حج میں جانا مناسب نہیں۔ (۲)

یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جوان ساس کو اپنے داماد سے پردہ کرنا چاہیے۔ (۳)

(۲) آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ محرم کا عاقل و بالغ ہونا ضروری ہے؛ لہٰذا نابالغ اور پاگل ایسا محرم نہیں ہے، جس کے ساتھ حج کیا جاسکے۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] جس بیوہ کے پاس محرم نہ ہو، وہ کیا کرے؟

۱۶۲۵- سوال: (۱) ایک عورت بیوہ ہے، اس کے پاس کسی قسم کا کوئی اور محرم بھی نہیں ہے، اور اس کے پاس اتنا پیسہ ہے، جس سے حج فرض ہوجایا کرتا ہے، تو کیا محض حج میں جانے کے واسطے اسے نکاح کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

---

(۱) ثم صفة المحرم أن يكون ممن لا يجوز له نكاحها على التأبيد إما بالقرابة، أو الرضاع، أو الصهرية؛ لأن الحرمة المؤبدة تزيل التهمة في الخلوة. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۲۴، كتاب الحج، فصل: شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية)

(و) مع وجود (زوج أو محرم) الذي حرم عليه نكاحها أبدا بقرابة، أو رضاع، أو صهارة، مسلما، أو عبدا، أو كافرا. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - داماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/ ۲۶۲، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۴، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

(۲-۳) ولهذا قالوا: إن المحرم إذا لم يكن مأمونا عليه لم يجز لها أن تسافر معه. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۲۴، كتاب الحج، فصل: شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية)

نقل السيد أبو السعود عن نفقات البزازية لا تسافر بأخيها رضاعا في زماننا اهـ أي لغلبة الفساد. ـــــ قلت: ويؤيده كراهة الخلوة بها كالصهرة الشابة فينبغي استثناء الصهرة الشابة هنا أيضا لأن السفر كالخلوة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۴، كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) وينبغي أن يشترط في الزوج ما يشترط في المحرم، وقد اشترط في المحرم العقل والبلوغ. (المصدر السابق)

(۲) اور اگر وہ بہ غیر محرم کے ہی حج کو چلی گئی، تو اس کا حج ادا ہوا یا نہیں، بینوا، توجروا۔

الجواب حامدا ومصلیا:

(۱) بیوہ عورت کو اگر کوئی محرم میسر نہ ہو، تو محض حج میں جانے کے لیے شادی کرنا ضروری نہیں۔[۱]

(۲) عورت محرم کے بہ غیر حج میں جائے گی، تو حج تو ادا ہو جائے گا؛ لیکن وہ گنہ گار ہوگی۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] ۶۰-۷۰ سالہ بوڑھی عورت کے لیے محرم کا ہونا شرط ہے یا نہیں؟

۱۶۲۶- سوال: محرم کے سفر حج میں ساتھ ہونے کی شرط صرف جوان عورتوں کے لیے ہے، یا بوڑھی عورتوں کے لیے بھی؟

یہ بھی بتائیں کہ کیا کوئی عورت محرم کو اپنے ساتھ حج میں جانے پر مجبور کر سکتی ہے؟

---

(۱) وإذا لم يكن لها زوج ولا محرم لا يجب عليها أن تتزوج ليذهب معها. (تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو: ۵۴۰ھ): ۱/ ۳۸۷، كتاب المناسك، مسألة الحج، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

وهل يلزمها التزوج؟ (الدر المختار: ۲/ ۴۶۴) ——— قال ابن عابدين: قلت: لكن جزم في اللباب بأنه لا يجب عليها التزوج مع أنه مشى على جعل المحرم أو الزوج شرط أداء ورجح هذا في الجوهرة وابن أمير حاج في المناسك كما قاله المصنف في منحه قال: ووجهه أنه لا يحصل غرضها بالتزوج لأن الزوج له أن يمتنع من الخروج معها، بعد أن يملكها، ولا تقدر على الخلاص منه وربما لا يوافقها فتتضرر منه بخلاف المحرم، فإنه إن وافقها أنفقت عليه وإن امتنع أمسكت نفقتها وتركت الحج اهـ فافهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۵، كتاب الحج، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۹، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر)

(۲) عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: "لا تسافر المرأة إلا مع ذي محرم، ولا يدخل عليها رجل إلا ومعها محرم"، فقال رجل: يا رسول الله، إني أريد أن أخرج في جيش كذا وكذا، وامرأتي تريد الحج، فقال: "اخرج معها". (صحيح البخاري: ۱/ ۲۵۰، رقم الحديث: ۱۸۶۲، كتاب المناسك، باب حج النساء، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۴۳۴، رقم الحديث: ۴۲۴- (۱۳۴۱)، كتاب الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، ط: ديوبند)

ولو حجت بلا محرم جاز مع الكراهة. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله مع الكراهة) أي التحريمية للنهي في حديث الصحيحين "لا تسافر امرأة ثلاثا إلا ومعها محرم" زاد مسلم في رواية "أو زوج". (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۵، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

الجواب حامداومصلیا:

(۱) اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ مکہ مکرمہ سے دور رہنے والی عورت کے لیے محرم کا ہونا ضروری ہے، خواہ وہ [عورت] جوان ہو یا بوڑھی۔ (۱)

محرم یا شوہر کے ساتھ سفر کی شرط اور مقصد اصلی اثناء سفر میں ابتلاء معصیت اور فتنہ سے حفاظت ہے؛ لہٰذا بوڑھی عورت، جس میں ابتلاء معصیت اور فتنہ کا خطرہ نہ ہو، اس کا غیر محرم کے ساتھ سفر حج میں جانا جائز ہے۔ چناں چہ فتنہ کا خطرہ نہ ہونے کی وجہ سے حضرت تھانوی قدس سرہ نے بھی بوڑھی عورت کے لیے گنجائش نقل فرمائی ہے؛ اس لیے محرم یا شوہر کی معیت کی شرط سے ساٹھ، ستر سالہ عورت مستثنیٰ ہوگی، مگر بوڑھی، کم زور عورت کی خدمت وسہارے کے لیے کسی کا ساتھ میں ہونا ضروری ہے۔ (۲)

---

(۱) ویستوي الجواب بین أن تکون المرأة شابة أو عجوزا في اشتراط المحرم لأنها عورة أیضا ـــــ هذا إذا کان بینها وبین مکة مدة السفر وهي ثلاثة أیام ولیالیها فأما إذا کان دون مدة السفر فإنه لا یشترط المحرم. (تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بکر علاء الدین السمرقندي (م: نحو: ۵۴۰هـ): ۳۸۸/۱، کتاب المناسك، مسألة الحج، ط: دار الکتب العلمیة-بیروت)

(۲) وفي کتب الحنفیة عامة عدم جواز السفر الا مع محرم. ـــــ قلت (إمام العصر الشیخ محمد أنور الکشمیري): ویجوز عندی مع غیر محرم أیضا بشرط الاعتماد والأمن من الفتنة، وقد وجدت له مادة کثیرة في الأحادیث، أما في الفقه، فهو من مسائل الفتن. (فیض الباري شرح صحیح البخاري-الشیخ محمد أنور الکشمیري: ۱۴۹/۳، کتاب تقصیر الصلاة، باب في کم یقصر الصلاة، في ذیل رقم: ۱۰۸۸، ت: أحمد عزو عنایة، ط: دار الضیاء- کویت)

قال المحشي (الشیخ محمد بدر عالم المیرتهی): منها أمر النبي -صلی الله علیه وسلم- أبا العاص أن یرسل زینب -رضي الله عنها- مع رجل لم یکن لها محرما. ومجيء عائشة -رضي الله عنها- في قصة إفك. (المصدر السابق)

امداد الفتاوی میں ہے:

سوال: سفر مرأة کے لیے محرم کا شرط ہونا فقہاء کہتے ہیں، شابہ وعجوزہ کی تعمیم بھی کتب فقہ میں مصرح ہے، فتح پور میں شاہ لطف رسول صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ جناب نے فرمایا کہ عجوزہ کے لیے ضروری نہیں ہے، اس کو سندا مکرر مراجعت کتب فقہ کی گئی، شامی، فتح القدیر، البحر الرائق، عالم گیری؛ سب میں عجوز کی تصریح ہے، اگر جزئی نظر اقدس سے گزری ہو، اطلاع سے عزت افزائی فرمائی جائے۔

جواب: في الدر المختار: أما العجوز التي لا تشتهی فلا بأس بمصافحتها ومس یدها إذا أمن، ومتی جاز المس جاز سفره بها ویخلو إذا أمن علیه وعلیها وإلا لا. اهـ وتکلم فیه صاحب رد المحتار بشيء. ج: ۵، ص: ۳۶۲، میں نے شاید درمختار کے اسی جزئیہ پر کہا ہوگا، گو اچھی طرح یاد نہیں، بہر حال گنجائش ضرور ہے۔ (۱۲ رصفر ۱۳۳۰ھ) [امداد الفتاوی- مولانا اشرف علی تھانوی: ۲۰۱/۴، عورتوں کے پردے اور نظر ولمس وغیرہ کے احکام، بوڑھی عورت کے لیے سفر بلا محرم کے جواز، ط: کریا- دیوبند ☆ مزید دیکھیے: انوار مناسک، ص ۱۷۷، بہ حوالہ: مسائل حج- مفتی احمد بیمات، ص: ۵۱، ترجمہ: مفتی اسامہ پالن پوری، ناشر: حافظ اسجد بن مفتی احمد بیمات، دار العلوم- کرمالی]

(٢) عورت محرم کو ساتھ لے جانے کے لیے مجبور نہیں کر سکتی ہے۔(☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[١٤] عورت کا کسی غیر محرم کے ساتھ سفرِ حج میں جانا

١٦٢٧- سوال: بوڑھی بیوہ عورت کا غیر محرم رشتہ دار کے ساتھ سفر حج میں جانا جائز ہے یا نہیں، جامعہ حسینیہ سے ایک فتویٰ صادر ہوا ہے، جس میں یہ بات ہے کہ بوڑھی عورت بھی سفر حج میں بغیر محرم کے نہیں جائے گی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس سلسلے میں شریعت کی کیا رہنمائی ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب حامدا ومصليا:

آپ کا سوال تاریخ: ٢٠/٧/١٩٨٩ء کو ملا، اس کو پڑھا، اور جواب جو جامعہ حسینیہ سے تاریخ: ٢٩/٧/١٩٨٩ء کو دیا گیا ہے، وہ بھی پڑھا، جواب صحیح ہے۔

عورت: جوان، ادھیڑ یا بوڑھی کسی بھی عمر کی ہو، سفرِ حج یا دیگر کسی بھی سفر میں، جو اڑتالیس میل کی مسافت کا ہو، اُس کے لیے محرم رشتہ دار کے بغیر جانا جائز نہیں؛ لہٰذا سوال میں مذکورہ بیوہ کے غیر محرم رشتہ داروں کے ساتھ بھی جانا جائز نہیں ہے۔(١)

اگر بغیر محرم کے سفرِ حج کیا، تو اگرچہ حجِ فرض ادا ہو جائے گا؛ لیکن بغیر محرم کے سفر کا گناہ لازم ہوگا۔(٢)

واضح رہے کہ جس طرح حرم شریف میں نیکیوں کا اجر زیادہ ہے، اسی طرح گناہوں کا وبال بھی زیادہ ہوگا؛[٣] لہٰذا مذکورہ عورت کے لیے بہتر یہی ہے کہ حقیقی بھتیجے یا بھانجے وغیرہ محرم رشتہ داروں کے ساتھ حج میں جائے،

(☆☆☆) فإن امتنع الزوج أو المحرم عن الخروج لا يجبران على الخروج. (بدائع الصنائع: ٢/ ١٢٣، كتاب الحج، فصل: شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية)

(١) عن ابن عمر رضي الله عنهما: أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا تسافر المرأة ثلاثة أيام إلا مع ذي محرم. (صحيح البخاري: ١/ ١٤٧، رقم الحديث: ١٠٨٦، كتاب الجمعة، أبواب تقصير الصلاة، باب: في كم يقصر الصلاة، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ١/ ٤٣٣، رقم الحديث: ٤١٣-(١٣٣٨)، كتاب الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، ط: ديوبند)

تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے: غیر محرم کے ساتھ عورت کا سفر حج کرنے کا شرعی حکم۔

(٢) ولو حجت بلا محرم جاز مع الكراهة. (الدر المختار مع رد المحتار: ٢/ ٤٦٥، كتاب الحج، ط: دار الفكر- بيروت ☆الجوهرة النيرة: ١/ ١٥٠، كتاب الحج، المطبعة الخيرية ☆ حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ٧٢٨، كتاب الحج، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[٣] عن مجاهد يقول: رأيت عبد الله بن عمرو بن العاص بعرفة، ومنزله في الحل، ومصلاه في الحرم، فقيل له: لم=

اگر محرم رشتہ دار نہ ہوں، تو تین دین دار آدمیوں کو بلا کر اپنی جانب سے حج بدل کی وصیت کر دے، اور حج کی پوری رقم ان کے حوالے کر کے بینک میں جمع کروا دے، مذکورہ عورت کی وفات کے بعد اُس کی جانب سے حجِ بدل کروانے سے اُس کا حجِ فرض ادا ہو جائے گا، اور حکمِ شرعی کی اتباع کی وجہ سے غیر محرم کے ساتھ سفرِ حج کے مقابلہ میں ثواب بھی زیادہ ملے گا۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] غیر محرم کے ساتھ سفر حج کا شرعی حکم

۱۶۲۸- سوال: ہمارے پہچان والوں میں ایک ہندہ نامی عورت ہے، وہ سال رواں حج کے لیے جانا چاہتی ہے، ان کے ساتھ کوئی محرم مرد نہیں ہے؛ البتہ لندن سے اس کی بہن اور اس کے بہنوئی حج کے لیے آنے والے ہیں، یہ تمام افراد مل کر حج کے ارکان ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا وہ خاتون یہاں (گجرات، انڈیا) سے محرم کے بغیر حج کے سفر پر جا سکتی ہے؟ اگر وہ حج کے سفر پر جا سکتی ہے، تو اس کا طریقہ کیا ہوگا؟

اگر اس کے ساتھ مکہ یا ریاض میں اس کی بہن اور اس کے بہنوئی ملنے والے ہوں، تو یہاں سے یہ

=تفعل هذا؟ فقال: لأن العمل فيه أفضل، و الخطيئة أعظم فيه. (المصنف- أبو بكر عبد الرزاق بن همام بن نافع الحميري اليماني الصنعاني (م:۲۱۱هـ): ۲۷/۵-۲۸، رقم الحديث: ۸۸۷۰، كتاب المناسك، باب الخطيئة في الحرم و البيت المعمور، ت: حبيب الرحمن الأعظمي، ط: المكتب الإسلامي- بيروت)

إسماعيل بن أمية: أن عمر بن الخطاب قال: لأن أخطئ سبعين خطيئة بركبة أحب إلي من أن أخطئ خطيئة واحدة بمكة. (المصدر السابق: ۲۸/۵، رقم الحديث: ۸۸۷۱)

و قد قال بعض العلماء: إن السيئات تضاعف بها كما تضاعف الحسنات. (البحر العميق-أبو البقاء، محمد بن أحمد بن محمد بن الضياء المكي الحنفي (م: ۸۵۴هـ): ۱۳۵/۱، الباب الأول في الفضائل، فصل في حكم الجوار بمكة ط: مؤسسة الريان- المكتبة المكية)

(۴) و إن مات عن وصية لا يسقط الحج عنه، و يجب أن يحج عنه، لأن الوصية بالحج قد صحت، و إذا حج عنه يجوز عند استجماع شرائط الجواز، و هي نية الحج عنه، و أن يكون الحج بمال الموصي... الخ. (بدائع الصنائع: ۲۲۲/۲، كتاب الحج، قبيل: فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۲۵۸/۱، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر- بيروت)

إن أوصى بالإحجاج عنه يحج عنه و يسقط به عنه الفرض، و إن لم يوص به أثم. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري- الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ) ص: ۶۰۸، باب الفوات، حكم فوات الحج عن العمر، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة)

عورت تنہا سفر کر سکتی ہے یا نہیں؟ اور اس کا بہنوئی اس کا محرم بن سکتا ہے یا نہیں؟ یہاں کے محارم مالی اعتبار سے کمزور ہیں؛ اس لیے وہ عورت ان کے ساتھ سفر حج میں نہیں جا سکتی؛ لندن کے محرم یعنی اپنی بہن اور اپنے بہنوئی کے ساتھ حج کرنا چاہتی ہے، امید ہے کہ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں گے۔ احمد محمد جسات

الجواب حامدا ومصلیا:

محرم کے بغیر عورت کا (شرعی) سفر کرنا جائز نہیں، بہنوئی محرم میں داخل نہیں ہے؛ کیوں کہ اپنی بیوی کے انتقال کے بعد یا اس کی علاحدگی وطلاق اور عدت گزر جانے کے بعد، اس کی بہن یعنی اپنی سالی سے نکاح کرنا جائز ہے؛ اس لیے بہنوئی کے ساتھ سفر میں جانا جائز نہیں۔ (۱)

اس کے جواز کی ایک صورت یہ ہے کہ اپنے کسی مال دار محرم کے ساتھ سفر کرے یا کسی غریب محرم کے سفر کا وہ عورت خرچ برداشت کرے اور اس کو اپنے ساتھ حج کے سفر میں ساتھ لے جائے۔ (۲)

---

(۱) عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: "لا تسافر المرأة إلا مع ذي محرم، ولا يدخل عليها رجل إلا ومعها محرم"، فقال رجل: يا رسول الله، إني أريد أن أخرج في جيش كذا وكذا، وامرأتي تريد الحج، فقال: "اخرج معها". (صحيح البخاري: ۱/۲۵۰، رقم الحديث: ۱۸۶۲، كتاب الحج، باب حج النساء، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/۴۳۴، رقم الحديث: ۴۲۴-(۱۳۴۱)، كتاب الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، ط: ديوبند)

المحرمات المؤبدة اثنتان وعشرون سبع بالنسب وهن المذكورات في قوله تعالى {حرمت عليكم أمهاتكم} [النساء: ۲۳] إلى قوله تعالى {وبنات الأخت} [النساء: ۲۳] وأربع بالصهر وهن أمهات النساء والربائب وحليلة الابن ومنكوحة الأب فهذه إحدى عشرة ومثلهن بالرضاع، والمحرمات المؤقتة سبع: الجمع بين الأختين وتزويج الخامسة وعنده أربع وتزويج الأمة على الحرة وتزويج الأربع في عدة الموطوءة بشبهة وكذا تزويج أختها وأمة الرجل إذا كاتبها والمشركة على المؤمن كذا في المنثور. اهـ. مستصفى. (حاشية الشِلْبِيّ مع تبيين الحقائق- شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِلْبِيّ (م: ۱۰۲۱هـ): ۲/۱۰۱، كتاب النكاح، فصل في المحرمات، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق)

ثم صفة المحرم أن يكون ممن لا يجوز له نكاحها على التأبيد إما بالقرابة، أو الرضاع، أو الصهرية، لأن الحرمة المؤبدة تزيل التهمة في الخلوة. (بدائع الصنائع: ۲/۱۲۴، كتاب الحج، فصل: شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) (مع) وجوب النفقة لمحرمها (عليها) لأنه محبوس (عليها) لامرأة حرة ولو عجوزا في سفر. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله مع وجوب النفقة إلخ) أي فيشترط أن تكون قادرة على نفقتها ونفقته (قوله لمحرمها) قيد به، لأنه لو خرج معها زوجها فلا نفقة له عليها بل هي لها عليه النفقة... (قوله لأنه محبوس عليها) أي حبس نفسه لأجلها ومن حبس نفسه لغيره فنفقته عليه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۶۴، كتاب الحج، ط: دار الفكر- بيروت ☆ ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر: ۱/۳۸۷، ط: مكتبة فقيه الأمة- ديوبند)

لیکن اگر محرم غریب ہے اور وہ عورت اس غریب محرم کا خرچ برداشت کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی، تو اس کو تنہا حج کے سفر میں جانا جائز نہیں؛ کیوں کہ ایسی صورت میں عورت پر حج ادا کرنا لازم نہیں، حج ادا کرنے کے لیے ساتھ میں محرم کا ہونا ضروری ہے۔[۳] البتہ عورت کے ذمہ حج کی فرضیت ثابت ہو جائے گی؛ لیکن ادا کرنا واجب نہیں ہوگا؛ اس لیے وصیت کرنا ضروری ہوگا، زندگی میں محرم کے ساتھ نہ جا سکتی ہو، تو وصیت کرے گی کہ میرے انتقال کے بعد حج بدل کیا جائے، حج نہ کرنے سے وہ عورت گنہ گار نہ ہوگی؛ البتہ وصیت بھی نہ کرے، تو گنہ گار ہوگی۔ (عالمگیری وشامی)[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] لڑکا یا لڑکی کے خسر کے ساتھ عورت کا سفر حج میں جانا

۱۶۲۹- سوال: محترم حضرت مفتی صاحب! سوال یہ ہے کہ کوئی عورت اپنے لڑکے یا لڑکی کے خسر کے ساتھ حج میں جا سکتی ہے یا نہیں؟ یعنی لڑکے یا لڑکی کا خسر اس کا محرم بن سکتا ہے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

عورت کے ساتھ سفر میں ایسے محرم کا ہونا ضروری ہے، جس سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو، اور وہ

---

(۳) وأما الذي يخص النساء فشرطان: أحدهما أن يكون معها زوجها أو محرم لها فإن لم يوجد أحدهما لا يجب عليها الحج. وهذا عندنا، . . . (إلى قوله): أن المحرم أو الزوج من ضرورات حجها بمنزلة الزاد، والراحلة إذ لا يمكنها الحج بدونه كما لا يمكنها الحج بدون الزاد، والراحلة. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۲۳، كتاب الحج، فصل شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري- الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۷۶، باب شرائط الحج، النوع الثاني: شرائط الأداء، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۴، كتاب الحج، ط: دار الفكر- بيروت)

[۴] والنوع الثاني: شروط الأداء وهي التي إن وجدت بتمامها مع شروط الوجوب، وجب أداؤه بنفسه، وإن فقد بعضها مع تحقق شروط الوجوب، فلا يجب الأداء بل عليه الإحجاج أو الإيصاء عند الموت وهي خمسة: سلامة البدن، وأمن الطريق وعدم الحبس، والمحرم أو الزوج للمرأة وعدم العدة لها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵۸، كتاب الحج، ط: دار الفكر- بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۸، كتاب المناسك الباب الأول في تفسير الحج، ط: دار الفكر- بيروت ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري- الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۶۱۱، باب الحج عن الغير)

إن أوصى بالإحجاج عنه يحج عنه ويسقط به عنه الفرض، وإن لم يوص به أثم. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري- الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۲۰۸، باب الفوات، حكم فوات الحج عن العمر)

تین طرح کے رشتے ہیں: نسبی رشتہ، جیسے: باپ، دادا، لڑکا، پوتا، ماں، چچا، بھتیجا [پھوپھی کے لیے، نہ کہ چچی کے لیے۔ مرتب]، بھانجا۔ اور دودھ کا رشتہ، جیسے: دودھ شریک بھائی وغیرہ اور سسرالی رشتہ، جیسے: داماد، خسر وغیرہ۔[1]

یہی وجہ ہے کہ سالی کا بہنوئی کے ساتھ سفر کرنا جائز نہیں؛ کیوں کہ سالی بہنوئی پر ہمیشہ کے لیے حرام نہیں، بہن کی طلاق یا انتقال کے بعد، بہنوئی سے اس کا نکاح جائز ہے۔[2]

اور آپ نے جو صورت لکھی ہے، اس میں لڑکے کا خسر ہو یا لڑکی کا خسر، اس سے نکاح کرنا اس لڑکے اور لڑکی کی ماں کا جائز ہے، وہ اس پر حرام نہیں ہے، لہٰذا اس کے ساتھ سفر کرنا جائز نہ ہوگا، اگر عورت اس کے ساتھ سفر کرے گی، تو غیر محرم کے ساتھ سفر کرنے کا گناہ لازم ہوگا، البتہ حج ادا ہو جائے گا۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (الرابع) أي من شرائط الأداء في خصوص حق النساء (المحرم الأمين) وهو كل رجل مأمون عاقل مناكحتها حرام عليه بالتأبيد، سواء كان بالقرابة أو الرضاعة أو الصهرية، بنكاح أو سفاح، في الأصح. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۷۶، باب شرائط الحج، النوع الثاني: شرائط الأداء، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة☆ الفتاوى الهندية: ۲۱۹/۱، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضية، ط: دار الفكر-بيروت☆مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-داماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۲۶۲/۱، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي☆ رد المحتار على الدر المختار: ۴۶۴/۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

(۲) المحرمات المؤبدة اثنتان وعشرون، سبع بالنسب وهن المذكورات في قوله تعالى {حرمت عليكم أمهتكم} [النساء: ۲۳] إلى قوله تعالى {وبنات الأخت} [النساء: ۲۳] وأربع بالصهر وهن أمهات النساء والربائب وحليلة الابن ومنكوحة الأب؛ فهذه إحدى عشرة، ومثلهن بالرضاع، والمحرمات المؤقتة سبع الجمع بين الأختين. (حاشية الشِلْبِيِّ على تبيين الحقائق-شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِلْبِيُّ (م: ۱۰۲۱ھ): ۱۰۱/۲، كتاب النكاح، فصل في المحرمات، ط: المطبعة الكبرى الأميرية-بولاق، القاهرة)

"ولا يجمع بين أختين نكاحا ولا يملك يمين وطأ" لقوله تعالى: {وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ} [النساء: ۲۳] ولقوله عليه الصلاة والسلام "من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يجمعن ماءه في رحم أختين". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱۸۷/۱، كتاب النكاح، فصل في بيان المحرمات، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

(۳) ولو حجت بلا محرم جاز مع الكراهة. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله مع الكراهة) أي التحريمية للنهي في حديث الصحيحين "لا تسافر امرأة ثلاثا إلا ومعها محرم" زاد مسلم في رواية "أو زوج". (رد المحتار على الدر المختار: ۴۶۵/۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

[۱۷] کیا میری سالی حج کے سفر میں جدہ تک میرے ساتھ جا سکتی ہے؟

۱۶۳۰- سوال: اس سال میرا حج کرنے کا ارادہ ہے، میرے اس ارادے کو جان کر میری سالی بھی تیار ہوئی ہے، اور وہ میرے ساتھ حج کے لیے جانا چاہتی ہے، تو کیا وہ میرے ساتھ حج کے سفر میں جدہ تک جا سکتی ہے؟ جدہ میں میری سالی کا لڑکا ہے، وہ اس کے ساتھ وہاں حج کے لیے جائے گا۔

الجواب حامداو مصلیا:

حج میں جانے کے لیے عورت کے ساتھ محرم کا ہونا ضروری ہے، آپ کی تحریر کے مطابق اگر آپ کی سالی آپ کے ساتھ سفر کے لیے جانا چاہتی ہے، چوں کہ آپ اس کے لیے غیر محرم ہیں، اس لیے جدہ تک بھی وہ آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی، بغیر محرم کے سفر کرنے کا گناہ لازم آئے گا، تاہم حج ادا ہو جائے گا: **ولا تحج بلا أحدهما فإن حجت جاز مع الكراهة.** (مجمع الانہر: ۱/ ۲۶۲)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] نابینا عورت کا ولی نہ ہونے کی وجہ سے دوسری عورت کے ساتھ حج میں جانا

۱۶۳۱- سوال: ایک عورت دونوں آنکھ سے معذور ہے، اس کا کوئی والی اور سرپرست نہیں ہے، بحمد اللہ مالدار ہے اور حج بیت اللہ کا ارادہ رکھتی ہے، دوسری ایک عورت اس کی خدمت کرتی ہے، اس کی شادی بھی ہو گئی ہے، یہ دوسری عورت نیک، صالح، نمازی اور دین دار ہے۔

نابینا عورت اپنے حج کا ارادہ رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ دوسری عورت، جو اس کے یہاں خدمت کرتی ہے، اس کو اپنے خرچ سے حج کے لیے لے جائے، سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس کا حج عند اللہ قبول ہوگا یا نہیں؟ کیوں کہ مردوں میں اس کا کوئی ولی اور سرپرست نہیں ہے۔ بینوا توجروا۔

---

(۱) (ولا تحج) المرأة (بلا أحدهما) أي الزوج أو المحرم. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ 'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۶۲، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي)

ولو حجت بلا محرم جاز مع الكراهة. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله مع الكراهة) أي التحريمية للنهي في حديث الصحيحين "لا تسافر امرأة ثلاثا إلا ومعها محرم" زاد مسلم في رواية "أو زوج". (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۵، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

الجواب حامداً ومصلیاً:

کسی بھی مسلم عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے سفر شرعی کے لیے کسی محرم کو اپنے ساتھ لے جائے، محرم وہ شخص ہے، جس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکاح کرنا حرام ہو، محرم کے بغیر سفر کرنے سے عورت گنہ گار ہوگی۔ (۱)

حج گرچہ ایک عظیم الشان عبادت ہے، مگر محرم کی شرط نہ پائے جانے کی وجہ سے اس سے اس عبادت کا وجوب ساقط ہوجائے گا، اس کے باوجود بھی اگر وہ محرم کے بغیر حج کے لیے جائے گی، تو حج فرض ذمے سے ساقط ہوجائے گا، تاہم وہ گنہ گار ہوگی، نیز ساتھ میں دوسری عورت کو بھی بغیر اس کے محرم کے لے جانے کا گناہ ہوگا۔ (۲)

ان حالات میں اس عورت کے لیے ضروری ہے کہ اپنے کسی محرم کے ساتھ حج کرے، محرم کے نہ ہونے کی صورت میں دو گواہوں کی موجودگی میں اپنا ایک وصیت نامہ لکھ دے کہ میرے انتقال کے بعد میرے مال میں سے میری طرف سے حج بدل کیا جائے اور اس کے لیے رقم بھی اپنے مال میں سے الگ کردے، اس کے انتقال کے بعد جب اس کی طرف سے حج بدل کیا جائے گا، تو اس کا پورا پورا ثواب اس کو مل جائے گا۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن ابن عمر رضي الله عنهما: أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا تسافر المرأة ثلاثة أيام إلا مع ذي محرم. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۴۷، رقم الحديث: ۱۰۸۶، كتاب الجمعة، أبواب تقصير الصلاة، باب: في كم يقصر الصلاة، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۴۳۲-۴۳۳، رقم الحديث: ۴۱۳-(۱۳۳۸)، كتاب الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، ط: ديوبند)

تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے: غیر محرم کے ساتھ عورت کا سفر حج کرنے کا شرعی حکم۔

ومنها المحرم للمرأة، شابة كانت أو عجوزة... والمحرم الزوج ومن لا يجوز مناكحتها على التأبيد بقرابة أو رضاع أو مصاهرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۹، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضية، ط: دار الفكر- بيروت)

ثم صفة المحرم أن يكون ممن لا يجوز له نكاحها على التأبيد إما بالقرابة، أو الرضاع، أو الصهرية؛ لأن الحرمة المؤبدة تزيل التهمة في الخلوة. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۲۴، كتاب الحج، فصل: شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللهَ إِنَّ اللهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ. (۵-المائدة: ۲)

ولو حجت بلا محرم جاز مع الكراهة. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله مع الكراهة) أي التحريمية للنهي في حديث الصحيحين "لا تسافر امرأة ثلاثا إلا ومعها محرم" زاد مسلم في رواية "أو زوج". (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۵، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

(۳) وإن مات عن وصية لا يسقط الحج عنه، ويجب أن يحج عنه؛ لأن الوصية بالحج قد صحت، وإذا حج عنه يجوز عند استجماع شرائط الجواز، وهي نية الحج عنه، وأن يكون الحج بمال الموصي... الخ. (بدائع الصنائع: ۲/ ۲۲۲، كتاب الحج، قبيل: فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۸، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر- بيروت)

=

[۱۹] عورت کا' عورتوں کے قافلے کے ساتھ حج میں جانا

۱۶۳۲- سوال: ایک عورت ہے، جس پر حج فرض ہے؛ لیکن اس کے پاس کوئی محرم نہیں ہے، البتہ اس کے علاقے کی بہت سی عورتیں حج کے لیے جارہی ہیں، تو اب دریافت یہ کرنا ہے کہ: کیا یہ عورت، اُن عورتوں کے ساتھ حج کے لیے جاسکتی ہے، گنہ گار تو نہیں ہوگی؟

الجواب حامداومصليا:

عورتوں کی جماعت کے ساتھ کوئی عورت بہ غیر محرم کے حج میں جانا چاہے، تو یہ جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ عورتوں کی جماعت یا گروپ کا ہونا، عورت کو محرم سے مستغنی نہیں کرتا ہے، اس صورت میں بہ غیر محرم کے جانا حرام اور ناجائز ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= والنوع الثاني: شروط الأداء وهي التي إن وجدت بتمامها مع شروط الوجوب، وجب أداؤه بنفسه، وإن فقد بعضها مع تحقق شروط الوجوب، فلا يجب الأداء بل عليه الإحجاج أو الإيصاء عند الموت وهي خمسة: سلامة البدن، وأمن الطريق وعدم الحبس، والمحرم أو الزوج للمرأة وعدم العدة لها. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۵۸/۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۶۱۱، باب الحج عن الغير)

إن أوصى بالإحجاج عنه يحج عنه ويسقط به عنه الفرض، وإن لم يوص به أثم. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۶۰۸، باب الفوات، حكم فوات الحج عن العمر)

(۱) عن ابن عباس، أنه قال: جاء رجل إلى المدينة، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: أين نزلت؟، قال: على فلانة، قال: أغلقت عليك بابها لا تحجن امرأة إلا ومعها ذو محرم. (سنن الدارقطني-أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي بن مسعود بن النعمان بن دينار البغدادي الدارقطني (م: ۳۸۵ھ): ۲۲۷/۳، رقم الحديث: ۲۴۴۰، كتاب الحج، ت: شعيب الارنؤوط، وغيره، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)

قال الكاساني: (ولنا) ما روي عن ابن عباس - رضي الله عنه - عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: ألا لا تحجن امرأة إلا ومعها محرم، وعن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: لا تسافر امرأة ثلاثة أيام إلا ومعها محرم أو زوج.ــــــــ ولأنها إذا لم يكن معها زوج، ولا محرم لا يؤمن عليها إذ النساء لحم على وضم إلا ما ذب عنه، ولهذا لا يجوز لها الخروج وحدها.ــــــــ والخوف عند اجتماعهن أكثر، ولهذا حرمت الخلوة بالأجنبية، وإن كان معها امرأة أخرى، والآية لا تتناول النساء حال عدم الزوج، والمحرم معها؛ لأن المرأة لا تقدر على الركوب، والنزول بنفسها فتحتاج إلى من يركبها، وينزلها، ولا يجوز ذلك لغير الزوج، والمحرم فلم تكن مستطيعة في هذه الحالة فلا يتناولها النص. (بدائع الصنائع: ۱۲۳/۲، كتاب الحج، فصل: شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية)

[۲۰] سفرِ حج کے لیے بیوی کا اپنے شوہر سے اِجازت لینا ضروری ہے یا نہیں؟

۱۶۳۳- سوال: جناب مولانا و مفتی بیمات صاحب!

میرے شوہر سات سال سے بیرونِ ملک ہیں، وہاں جانے سے چار ماہ قبل آپسی جھگڑے کی وجہ سے میں اپنے والدین کے گھر آ گئی تھی، شوہر کو گئے سات سال ہوئے ہیں؛ لیکن اُن کا کوئی خط نہیں آیا ہے، اور ہمارے دو لڑکے ہیں، اُن کے لیے کوئی خرچ بھی نہیں بھیجا ہے، اِس سال میرا اپنے بھائی کے ساتھ حج ادا کرنے کا اِرادہ ہے، تو مجھے اپنے شوہر سے خط کے ذریعہ اِجازت لینا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر خط کا جواب نہ آئے تو میں کیا کروں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

عورت پر اگر حج فرض ہو گیا ہے، تو شوہر کی اِجازت کے بغیر بھی اپنے کسی محرم رشتہ دار مثلاً بھائی وغیرہ کے ساتھ وہ حج کے لیے جا سکتی ہے، اگر شوہر سے اِجازت لی گئی اور اُس نے منع کر دیا ہو، تب بھی وہ اپنے بھائی یا محرم رشتہ دار کے ساتھ حج میں جانا چاہے، تو شرعاً اس کی اجازت ہے۔

اگر حج فرض نہ ہو، تو شوہر کی اِجازت کے بغیر جانا جائز نہیں ہے۔ (مجمع الانہر، عالمگیری، بدائع الصنائع)[۱]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (وتحج) المرأة (معه) أي المحرم (حجة الإسلام) أي الحج الفرض (بغير إذن زوجها) وقت خروج أهل بلدها أو قبله بيوم أو يومين وليس له منعها عن حجة الإسلام، وله منعها عن كل حج سواها كما قال رشيد الدين في المناسك. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده, يعرف بداماد أفندي (م:۱۰۷۸ھ): ۱/ ۲۶۳، كتاب الحج، واجب الحج، ط: دار إحياء التراث العربي)

وعند وجود المحرم كان عليها أن تحج حجة الإسلام، وإن لم يأذن لها زوجها، وفي النافلة لا تخرج بغير إذن الزوج. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۹، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر)

ولو كان معها محرم، فلها أن تخرج مع المحرم في الحجة الفريضة، من غير إذن زوجها عندنا. وعند الشافعي ليس لها أن تخرج بغير إذن زوجها، وجه قوله أن في الخروج تفويت حقه المستحق عليها، وهو: الاستمتاع بها، فلا تملك ذلك من غير رضاه.ـــــــ (ولنا) : أنها إذا وجدت محرما، فقد استطاعت إلى حج البيت سبيلا؛ لأنها قدرت على الركوب، والنزول وأمنت المخاوف؛ لأن المحرم يصونها، وأما قوله: " إن حق الزوج في الاستمتاع يفوت بالخروج إلى الحج "، فنقول: منافعها مستثناة عن ملك الزوج في الفرائض كما في الصلوات =

[۲۱] اگر محرم کے ساتھ سفر میں سابق شوہر بھی ہو؟

۱۶۳۴- سوال: مطلقہ عورت اپنے بڑے لڑکے کے ساتھ حج کے لیے جارہی ہے؛ لیکن ساتھ میں طلاق دینے والا اس کا سابق شوہر بھی ہے، تو کیا یہ سفر جائز ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

بڑا لڑکا اگر عاقل و بالغ ہے، تو جانا جائز ہے، کوئی حرج نہیں ہے، کیوں کہ بیٹا، اس کے لیے محرم ہے اور محرم کے ساتھ حج میں جانا جائز ہے،[۱] البتہ عورت کا پہلے شوہر سے پردہ کرنا ضروری ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] چچی کا بھتیجے کے ساتھ سفر حج میں جانا

۱۶۳۵- سوال: (۱) ابراہیم داؤجی کے لڑکے یوسف ابراہیم اپنی والدہ کے ساتھ حج میں

=الخمس، وصوم رمضان، ونحو ذلك حتى لو أرادت الخروج إلى حجة التطوع، فللزوج أن يمنعها كما في صلاة التطوع. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع- علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۲/۱۲۴، كتاب الحج، فصل شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية)

(۱) مسئلے کہ تخریج وتفصیل متعدد مرتبہ گذر چکی۔

(۲) کہ اب دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں؛ لہٰذا پردہ کرنا لازم ہوگا:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۞. (۳۳-الأحزاب: ۵۹)

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ۞ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ ... القرآن. (۲۴-النور: ۳۰-۳۱)

إذا طلقها ثلاثا أو واحدة بائنة وليس له إلا بيت واحد فينبغي له أن يجعل بينه وبينها حجابا حتى لا تقع الخلوة بينه وبين الأجنبية، فإن كان فاسقا يخاف عليها منه فإنها تخرج وتسكن منزلا آخر، وإن خرج الزوج وتركها فهو أولى، وإن أراد القاضي أن يجعل معها امرأة ثقة تقدر على الحيلولة فهو حسن كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/۵۳۵، كتاب الطلاق، باب الحداد، ط: دار الفكر)

جارہے ہیں، اُن کے ساتھ اُن کی حقیقی دو چچی -جن کی عمر ستر سال ہے- جانا چاہتی ہیں، تو یہ دونوں اپنے حقیقی بھتیجے کے ساتھ حج میں جاسکتی ہیں یا نہیں؟

(۲) اگر اِس وقت حج کے لیے دونوں نہ جائیں، تو مستقبل میں عمر کی زیادتی اور کمزوری کی وجہ سے اس بات کا امکان ہے کہ وہ دونوں حج ہی سے محروم ہو جائیں اور فرض حج کی ذمہ داری سر پر باقی رہ جائے، حاجی یوسف ابراہیم -جو اپنی ماں کو بھی اپنے ساتھ لے جارہے ہیں- وہ شرع کے پابند، پرہیزگار، خداترس اور نیک آدمی ہیں، تو وہ دونوں حقیقی چچی [یعنی چچا کی بیوی] کو حج میں لے جاسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیا:

عورت کے لیے غیر محرم (جس کے ساتھ نکاح جائز ہو) کے ساتھ سفر میں جانا جائز نہیں ہے، خاص طور پر حج جیسے مبارک سفر کے لیے بڑے احتیاط کی ضرورت ہے۔ (۱)

خاتون کے لیے حج کی ادائیگی کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ سفر میں محرم یا شوہر ہو، لہٰذا یوسف ابراہیم کی دونوں چچی کے لیے حکم شرع ہے کہ وہ محرم کے بغیر نہ جائیں، یوسف ابراہیم ان کے لیے محرم نہیں ہے۔ (۲)

رہ گئی یہ بات کہ اگر ابھی وہ دونوں حج کے لیے نہیں جاسکیں گی، تو اس بات کا امکان ہے کہ وہ زندگی میں حج ہی نہ کرسکیں، یہ عذر شریعت میں معتبر نہیں ہے، کیوں کہ کسی خاتون پر حج کا ادا کرنا اس وقت لازم ہوتا ہے، جب کہ اس کے ساتھ محرم ہو، اگر محرم غریب ہو، تو اسے (اگر استطاعت ہو تو) اپنے خرچ ونفقہ سے حج کے لیے لے جائے، اور اگر محرم موجود نہ ہو (یا موجود ہو، لیکن غریب ہو اور اس کا خرچ برداشت کرنے کی خاتون

---

(۱) عن ابن عمر رضي الله عنهما: أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا تسافر المرأة ثلاثة أيام إلا مع ذي محرم. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۴۷، رقم الحديث: ۱۰۸۶، كتاب الجمعة، أبواب تقصير الصلاة، باب: في كم يقصر الصلاة، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۴۳۳، رقم الحديث: ۴۱۳-(۱۳۳۸)، كتاب الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، ط: ديوبند)

تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے: غیر محرم کے ساتھ عورت کا سفر حج کرنے کا شرعی حکم۔

(۲) ومنها المحرم للمرأة، شابة كانت أو عجوزة... والمحرم الزوج ومن لا يجوز مناكحتها على التأبيد بقرابة أو رضاع أو مصاهرة. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۹، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضية، ط: دار الفكر-بيروت)

ثم صفة المحرم أن يكون ممن لا يجوز له نكاحها على التأبيد إما بالقرابة، أو الرضاع، أو الصهرية؛ لأن الحرمة المؤبدة تزيل التهمة في الخلوة. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۲۴، كتاب الحج، فصل: شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية)

میں استطاعت نہ ہو) تو وصیت لکھ دے کہ میرے مرنے کے بعد میرے ترکہ سے حج بدل کرایا جائے۔ (۳)

اس لیے یوسف ابراہیم کی دونوں چچی یہ وصیت تیار رکھیں کہ میرے مرنے کے بعد کسی کو حج بدل کے لیے بھیج دیا جائے، اِس طرح وصیت لکھنے سے دونوں اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جائیں گی اور حج فرض کا ثواب بھی ملے گا۔ (۴)

یوسف ابراہیم اِن دونوں عورتوں کا حقیقی بھتیجا نہیں ہے، شرعاً آپس میں اُن کا نکاح جائز ہے، اگر دونوں چچی یوسف کی حقیقی خالہ ہوتیں، تو حج کے لیے یوسف کے ساتھ اُن کا جانا جائز ہوتا، اس لیے اگر وہ

---

(۳) ثم تكلموا أن أمن الطريق وسلامة البدن - على قول أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - ووجود المحرم للمرأة شرط لوجوب الحج أم لأدائه، بعضهم جعلوها شرطا للوجوب وبعضهم شرطا للأداء، وهو الصحيح وثمرة الخلاف فيما إذا مات قبل الحج فعلى قول الأولين لا تلزمه الوصية وعلى قول الآخرين تلزمه كذا في النهاية. (الفتاوى الهندية: ۲۱۹/۱، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر - بيروت)

وظاهره أن المحرم شرط الوجوب. ــــــــ وفي الإصلاح وهو الصحيح لكن في الجوهرة أن الصحيح أي المحرم أنه من شرائط الأداء حتى يجب الإيصاء به. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - داماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۲۶۲/۱، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۴۶۴/۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

قال ابن عابدين: (قوله مع وجوب النفقة إلخ) أي فيشترط أن تكون قادرة على نفقتها ونفقته. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۶۴/۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر ☆ ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر: ۳۸۷/۱، ط: مكتبة فقيه الأمة - ديوبند)

(۴) وإن مات عن وصية لا يسقط الحج عنه، ويجب أن يحج عنه؛ لأن الوصية بالحج قد صحت، وإذا حج عنه يجوز عند استجماع شرائط الجواز، وهي نية الحج عنه، وأن يكون الحج بمال الموصي... الخ. (بدائع الصنائع: ۲۲۲/۲، كتاب الحج، قبيل: فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۲۵۸/۱، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر - بيروت)

والنوع الثاني: شروط الأداء وهي التي إن وجدت بتمامها مع شروط الوجوب، وجب أداؤه بنفسه، وإن فقد بعضها مع تحقق شروط الوجوب، فلا يجب الأداء بل عليه الإحجاج أو الإيصاء عند الموت وهي خمسة: سلامة البدن، وأمن الطريق وعدم الحبس، والمحرم أو الزوج للمرأة وعدم العدة لها. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۵۸/۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۶۱۱، باب الحج عن الغير)

إن أوصى بالإحجاج عنه يحج عنه ويسقط به عنه الفرض، وإن لم يوص به أثم. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۶۰۸، باب الفوات، حكم فوات الحج عن العمر)

دونوں یوسف ابراہیم- جو کہ ان کے لیے غیر محرم ہے- کے ساتھ جائیں گی، تو گناہ ہوگا، لیکن حج فرض ادا ہو جائے گا۔(☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] خاتون اور سفر

۱۶۳۶- سوال: میری ایک بیوہ بہن ہندوستان میں ہے، میرا ارادہ ہے کہ میں اُس کو اپنے یہاں انگلینڈ بلاؤں، اور یہاں سے اُس کا ارادہ ہو، تو اپنے ساتھ امسال حج کے لیے لے جاؤں، بہن کی حالت اتنی اچھی نہیں ہے کہ وہ اپنے خرچ سے حج کر سکے، تو ایسی حالت میں وہ اکیلی انگلینڈ آ جائے اور یہاں سے ہم دونوں حج کے لیے جائیں تو شرعاً اُس کی اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

عورت کا بغیر محرم کے سفر کرنا جائز نہیں ہے، خواہ وہ سفر حج کا ہو یا غیر حج کا۔ بغیر محرم کے سفر کرے گی، تو گنہگار ہوگی، البتہ وہ انگلینڈ آ جائے اور آپ حج ادا کرنے کے لیے اسے ساتھ لے جائیں، تو بلا کراہت حج ادا ہو جائے گا، آپ بھائی ہیں؛ اِس لیے آپ کے ساتھ حج کے سفر سے وہ گنہگار نہیں ہوگی۔(۱)

میرا مشورہ یہ ہے کہ جب اُس پر حج فرض نہیں ہے، تو بلا وجہ انگلینڈ تک تنہا سفر کرنے کا گناہ کیوں اپنے سر مول لے، آپ اُس پر حج کے لیے جو خرچ کرنا چاہتے ہیں، وہ انڈیا بھیج دیں، تاکہ وہ یہیں رہتے ہوئے عزت کے ساتھ زندگی گذار سکے، اور اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلا کر آپ کے لیے صدقۂ جاریہ بنے۔(۲)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(☆☆☆) و لو حجت بلا محرم جاز مع الكراهة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۶۵، كتاب الحج، ط: دار الفكر- بيروت ☆الجوهرة النيرة: ۱/ ۱۵۰، كتاب الحج، المطبعة الخيرية☆ حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ۷۲۸، كتاب الحج، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۱) عن أبي سعيد، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تسافر المرأة سفر ثلاثة أيام، فصاعدا، إلا مع أبيها أو أخيها، أو ابنها، أو زوجها، أو ذي محرم. (سنن ابن ماجه: ۲/ ۲۰۸، رقم الحديث: ۲۸۹۸، أبواب المناسك، باب المرأة، تحج بغير ولي، ط: ديوبند)

(۲) الصدقة أفضل من الحج تطوعا، كذا روي عن الإمام لكنه لما حج، وعرف المشقة، أفتى بأن الحج أفضل، ومراده أنه لو حج نفلا وأنفق ألفا، فلو تصدق بهذه الألف على المحاويج فهو أفضل، لا أن يكون صدقة فليس أفضل من إنفاق ألف في سبيل الله تعالى، والمشقة في الحج لما كانت عائدة إلى المال والبدن جميعا فضل في المختار على=

[۲۴] عدت کی حالت میں حج میں جانا صحیح نہیں

۱۶۳۷- سوال: ایک خاتون کے ذمے حج فرض ہے، حج کا مہینہ بھی آگیا ہے؛ لیکن وہ عدت میں ہے، تو اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس خاتون کے لیے حج میں جانا ضروری ہے، اگر نہیں گئی، تو گنہ گار تو نہیں ہوگی؟

الجواب حامداومصلیا:

عورت پر حج ادا کرنا اس وقت لازم ہوتا ہے، جب کہ دیگر شرائط کے ساتھ یہ شرط بھی پائی جائے کہ وہ عدت میں نہ ہو، اگر عدت میں ہوگی، تو اس پر حج ادا کرنا لازم نہیں، خواہ عدت شوہر کے وفات کی ہو، یا نکاح ٹوٹنے سے ہو، یا طلاق کی بنا پر ہو؛ اس حالت میں حج میں نہ جانے سے وہ گنہ گار نہیں ہوگی؛ بل کہ اس کے برعکس اگر عدت کی حالت میں جائے گی، تو گنہ گار ہوگی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] خاتون کا خالہ زاد اور پھوپھی زاد بھائیوں کے ساتھ حج کے لیے جانا

۱۶۳۸- سوال: ایک عورت حج کا اِرادہ رکھتی ہے، اُس کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے، نیز دیگر محارم مثل بھائی اور بھانجا وغیرہ بھی بیرون میں رہتے ہیں، اس خاتون کے پاس نہیں ہیں، اور نہ ہی اُن کے آنے کی کوئی اُمید ہے، ایسی صورت میں وہ اپنے دیگر رشتہ دار، مثلاً وہ بھتیجے یا بھانجے، جو اُس کی پھوپھی زاد یا خالہ زاد بھائیوں کے لڑکے ہیں، اُن کے ساتھ حج ادا کرنے کے لیے جائے، تو جائز ہے یا نہیں؟ حج ادا ہوگا یا نہیں؟

=الصدقة. اهـ. ـــــ قال الرحمتي: والحق التفصيل، فما كانت الحاجة فيه أكثر والمنفعة فيه أشمل فهو الأفضل كما ورد "حجة أفضل من عشر غزوات" وورد عكسه، فيحمل على ما كان أنفع، فإذا كان أشجع وأنفع في الحرب، فجهاده أفضل من حجه، أو بالعكس فحجه أفضل، وكذا بناء الرباط إن كان محتاجا إليه كان أفضل من الصدقة وحج النفل، وإذا كان الفقير مضطرا أو من أهل الصلاح أو من آل بيت النبي -صلى الله عليه وسلم- فقد يكون إكرامه أفضل من حجات وعمر وبناء ربط. (رد المحتار على الدر المختار: ۶۲۱/۲، كتاب الحج، فروع في الحج، مطلب في تفضيل الحج على الصدقة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) والثاني: أن لا تكون معتدة عن طلاق أو وفاة؛ لأن الله تعالى نهى المعتدات بقوله عز وجل: {لا تخرجوهن من بيوتهن ولا يخرجن} [الطلاق:۱]. وروي عن عبد الله بن عمر -رضي الله عنه- أنه رد المعتدات من ذي الحليفة. ـــــ وروي عن عبد الله بن مسعود -رضي الله عنه- أنه ردهن من الجحفة. ـــــ ولأن الحج يمكن أداؤه في وقت آخر فأما العدة فإنها إنما يجب قضاؤها في هذا الوقت خاصة فكان الجمع بين الأمرين أولى. (بدائع الصنائع: ۱۴۲/۲، كتاب الحج، فصل: شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۴۶۶/۳، كتاب الحج، ط: زكريا-ديوبند)

الجواب حامداً ومصلیا:

عورت جوان ہو یا بوڑھی، حج میں جانے کے لیے اُس کے ساتھ شوہر یا ایسے محرم کا ہونا ضروری ہے، جس کے ساتھ اُس کا نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو، محرم نسبی ہو، حقیقی بھائی، بھتیجا، بھانجا یا رضاعی بھائی (دودھ شریک بھائی) یا سسرالی رشتہ دار ہو، مثلاً: سسر، ان کے ساتھ حج کے لیے جاسکتی ہے۔

اُن کے علاوہ جن کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے، مثلاً: پھوپھی زاد، چچازاد اور خالہ زاد بھائی یا اُن کی اولاد، ان کے ساتھ حج میں جانا جائز نہیں ہے، یہ ایسے رشتے دار ہیں، جن کے ساتھ نکاح حرام نہیں ہے۔ (مجمع الانہر، عالمگیری، شامی)[۱]

غیر محرم کے ساتھ حج میں جانا جائز نہ ہونے کے باوجود اگر کوئی غیر محرم کے ساتھ چلی جائے، اور حج کرلے، تو حج ہوجائے گا، البتہ غیر محرم کے ساتھ سفر کرنے کا گناہ ہوگا۔ (مجمع الانہر: ۱/ ۲۶۲)[۲] ایسی صورت میں حج کی ادائیگی کراہتِ تحریمی کے ساتھ ہوگی۔ (شامی: ۲/ ۴۶۴)[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] (و) مع وجود (زوج أو محرم) الذي حرم عليه نكاحها أبدا بقرابة أو رضاع أو صهارة مسلما أو عبدا أو كافرا فلا ينضم الزوج ولذلك ذكره (للمرأة) الشابة والعجوز بعدما كانت خالية عن العدة أية عدة كانت وظاهره أن المحرم شرط الوجوب. ـــــــ وفي الإصلاح وهو الصحيح لكن في الجوهرة أن الصحيح أي المحرم أنه من شرائط الأداء حتى يجب الإيصاء به (إن كان بينها) أي بين مكان المرأة. ـــــــ (وبين مكة مسافة سفر) أي مسافة ثلاثة أيام ولياليها؛ لأنه لو كان أقل منها يجوز بلا محرم. ـــــــ (ولا تحج) المرأة (بلا أحدهما) أي الزوج أو المحرم. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھـ): ۱/ ۲۶۲، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۹، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج...، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۴، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

المحرمات المؤبدة اثنتان وعشرون سبع بالنسب وهن المذكورات في قوله تعالى {حرمت عليكم أمهاتكم} [النساء: ۲۳] إلى قوله تعالى {وبنات الأخت} [النساء: ۲۳] وأربع بالصهر وهن أمهات النساء والربائب وحليلة الابن ومنكوحة الأب فهذه إحدى عشرة ومثلهن بالرضاع، والمحرمات المؤقتة سبع: الجمع بين الأختين وتزويج الخامسة وعنده أربع وتزويج الأمة على الحرة وتزويج الأربع في عدة الموطوءة بشبهة وكذا تزويج أختها وأمة الرجل إذا كاتبها والمشركة على المؤمن كذا في المنثور. اهـ. مستصفى. (حاشية الشِلْبِيّ مع تبيين الحقائق - شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِلْبِيُّ (م: ۱۰۲۱ھـ): ۲/ ۱۰۱، كتاب النكاح، فصل في المحرمات، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق)

[۲-۳] ولو حجت بلا محرم جاز مع الكراهة. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله مع الكراهة) أي =

[۲۶] عورت کا خالہ زاد بھائی یا اُن کی اولاد کے ساتھ حج کے لیے جانا

۱۶۳۹- سوال: عورت اپنے حج فرض کی ادائیگی کے لیے ماموں زاد یا پھوپھی زاد بھائی یا اُن کی اولاد کے ساتھ جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جاسکتی اور اُس کے ذمہ حج فرض ہے، تو وہ کیا کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

غیر محرم کے ساتھ سفر کرنا جائز نہیں ہے، خواہ وہ سفر حج کا ہو یا کہیں اور کا۔ کسی عورت کے لیے اس کا ماموں زاد بھائی، یا پھوپھی زاد بھائی محرم نہیں ہوتا، کیوں کہ اس کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے؛ اس لیے ان رشتے داروں کے ساتھ (محرم کے بغیر) حج کے سفر پر جانا جائز نہیں۔ حج فرض ادا کرنے کے لیے اپنے محرم رشتہ دار کے ساتھ جائے، اگر محرم حج کے لیے جانے کی پوزیشن میں نہ ہو، تو عورت [اگر استطاعت ہو تو] اپنے خرچ سے اپنے ساتھ لے جائے۔ (۱)

اور اگر اِس کا بھی موقع میسر نہ ہو، تو عورت اپنے پاس وصیت لکھ کر تیار رکھے کہ میرے ذمہ حج فرض تھا؛ لیکن محرم نہ ہونے کی وجہ سے میں حج ادا نہیں کر سکی ہوں، اِس لیے میرے انتقال کے بعد کسی کو میری جانب سے حج بدل کے لیے بھیج دیں، ورثاء کے حج بدل ادا کرنے سے عورت بری الذمہ ہو جائے گی۔ (۲)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] پہلے حج یا لڑکی کی شادی کا انتظام؟

۱۶۴۰- سوال: ایک شخص کے پاس اپنی ضروریات سے زائد اتنی رقم ہے، جس سے بہ آسانی حج کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اس کو اپنی لڑکی کی شادی کرنی ہے اور اپنے نوجوان لڑکے کے لیے کوئی دکان وغیرہ بنوانی ہے، لڑکی کی شادی میں برادری یا علاقائی رواج کے تحت جہیز وغیرہ بھی کافی مقدار میں دینا پڑتا ہے، ورنہ لڑکی کی شادی کفو میں ہونا دشوار ہے پھر جب کہ سارا علاقہ جہیز اور دوسرے رواج میں مبتلا ہے، تو تنہا اس کے لیے

=التحريمية للنهي في حديث الصحيحين "لا تسافر امرأة ثلاثا إلا ومعها محرم" زاد مسلم في رواية "أو زوج".

(رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۵، كتاب الحج، ط: دار الفكر ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ 'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۶۲، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۱-۲) قد تقدم مرارا.

اپنے یہاں سے اس رسم کو ختم کرنا بھی دشوار ہے۔ ورنہ لڑکی کی شادی نہیں ہوسکتی، تو کیا ایسی شکل میں حج میں جانا ضروری ہے، یا لڑکی کی شادی میں جہیز وغیرہ میں اس پیسہ کو صرف کرنا ضروری ہے؟ اسی طرح بالغ لڑکے کو کاروبار کے لیے روپیہ دینا ضروری ہے یا اس پیسہ کو حج میں خرچ کرنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) تحریر کردہ صورتوں میں حج کرنا فرض ہوگا، لڑکی کی شادی کی رسومات اور کاروبار کی ابتدا، مقدم نہیں ہے: **مقتضاه تقديم الحج على التزوج وإن كان واجباً عند التوقان وهو صريح مافي العناية.** (شامی)[۱] **إذا وجد مايحج به وقد قصد التزوج يحج به ولا يتزوج؛ لأن الحج فريضة أوجبها الله تعالى على عبده.** (عالم گیری)[۲]

اسلام غیر شرعی رسوم کو مٹانے کے لیے آیا ہے، لہٰذا ان رسومات کی وجہ سے حج میں توقف اور ٹال مٹول کرنا جائز نہیں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔ یکم رجنوری ۱۹۷۹ء

[۲۸] حج ادا کرنے سے پہلے عمرہ کے لیے جانا

۱۶۴۱- سوال: اگر کوئی شخص حج ادا کیے بغیر عمرہ میں جائے تو کیا حکم ہے؟ کیا اس پر حج فرض ہوجاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مسلمان کی شان یہ ہونی چاہیے کہ پہلے حج ادا کرے، پھر عمرہ میں جاتا رہے، لیکن اگر کوئی پہلے عمرہ میں گیا، تب بھی اس کا عمرہ ادا ہوجائے گا اور غریب ہے، تو عمرہ میں جانے سے اس پر حج بھی فرض نہ ہوگا، البتہ

---

[۱] ردالمحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۲، كتاب الحج، دار الفكر- بيروت.

[۲] الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۷، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۳، كتاب الحج، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۴۷۳، كتاب الحج، الفصل الأول في بيان شرائط الوجوب، رقم: ۴۸۸۲، ط: زكريا- ديوبند)

عن ابن عباس، عن الفضل، أو أحدهما عن الآخر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " من أراد الحج فليتعجل، فإنه قد يمرض المريض، وتضل الضالة، وتعرض الحاجة ".(مسند الإمام أحمد بن حنبل (م: ۲۴۱هـ): ۳/ ۳۳۳، رقم الحديث: ۱۸۳۴، ت: شعيب الأرنؤوط- عادل مرشد، وآخرون، ط: مؤسسة الرسالة)

من كان عنده مال ويريد الزواج، لكن أدركه الحج قبل الزواج، فيحج أولاً.(فقه العبادات على المذهب الحنفي، ص: ۱۷۹، كتاب الحج، تعريف الحج وشروطه)

اگر وہ حج کے دنوں میں مکہ میں ہو، تو پھر اس پر حج فرض ہوجائے گا، اس وقت حج کرنا ضروری ہے، ورنہ حج ذمہ میں باقی رہے گا: . . . أن الفقير إذا وصل إلى المواقيت صار حكمه حكم أهل مكة، فيجب عليه وإن لم يقدر على الراحلة. (فتح القدیر)[1] اور مال دار پر تو پہلے ہی سے حج فرض ہے اس کو تو ہر حال میں حج ادا کرنا ضروری ہے۔[2] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] حج کے صحیح ہونے کی شرطیں

۱۶۴۲- سوال: مفتی صاحب! سلام مسنون کے بعد، مجھ پر حج فرض ہے، آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ حج کے صحیح اور درست ہونے کی کتنی شرطیں ہیں؟ ذرا تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائیں، کرم ہوگا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

حج کے صحیح ہونے کی نو [۹] شرطیں ہیں: (۱) اسلام، (۲) احرام: لہٰذا بغیر احرام کے حج صحیح نہ ہوگا۔ (۳) حج کا وقت ہونا، یعنی: حج کے ارکان کو ان کے وقت میں ادا کرنا۔ (۴) جگہ کا ہونا، یعنی: ہر رکن کو اس کے مقام وجگہ میں کرنا، جیسے: طواف مسجد حرام میں، وقوف عرفہ عرفات کے میدان میں اور وقوف مزدلفہ مزدلفہ کے میدان میں اور رمی منیٰ میں۔ اسی طرح تمام امور کو شریعت کی بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق اس کی جگہ میں انجام دینا۔ (۵-۶) ہر کام کی پہچان اور عقل کا ہونا۔ (۷) وقوف عرفات سے پہلے جماع سے بچنا، لہٰذا اگر وقوف سے پہلے جماع کرلیا، تو حج فاسد ہوجائے گا، آئندہ سال اس کی قضاء لازم ہوگی۔ (۸) حج کے امور خواہ شرائط میں سے ہوں یا واجبات میں سے یا ارکان میں سے، خود ہی کرنا، دوسرے سے کرانا جائز نہیں ہے۔ (۹) جس سال احرام باندھے، اسی سال حج کرنا۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] فتح القدير: ۲/۴۱۹، كتاب الحج، مقدمة يكره الخروج إلى الحج إذا كره أحد أبويه، ط: دار الفكر.

(۲) وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا. (۳-آل عمران: ۹۷) ـــــ عن جابر بن عبد الله، قال: "لما نزلت هذه الآية {وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا} [آل عمران: ۹۷] قام رجل، فقال: يا رسول الله ما السبيل؟ قال: الزاد والراحلة. (سنن الدارقطني - أبو الحسن علي بن عمر البغدادي الدارقطني (م: ۳۸۵هـ): ۳/۲۱۳، رقم الحديث: ۲۴۱۳، كتاب الحج، ت: شعيب الارنؤوط، وجماعة من العلماء، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت)

(۳) النوع الثالث: شرائط صحة الأداء وهي تسعة: الإسلام والإحرام، والزمان، والمكان، والتمييز، والعقل ومباشرة الأفعال إلا بعذر وعدم الجماع والأداء من عام الإحرام. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۵۸، كتاب الحج، ط: دار الفكر ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ) ص: ۸۴، شرائط صحة الأداء، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

[۳۰] ۱- پھوپھی ساس کے ساتھ محرم بن کر حج میں جانا

[۳۱] ۲- حج کا سارا خرچ دوسرا شخص اٹھائے، تو فرض حج ادا ہوگا یا نہیں؟

۱۶۴۳- سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ان دو مسئلوں میں کہ:

(۱) میری ایک سگی پھوپھی ساس ہے، وہ حج بیت اللہ جانا چاہتی ہے اور ساتھ میں محرم کے طور پر وہ مجھے لے جانا چاہتی ہے، تو کیا میں ان کے ساتھ حج میں جا سکتا ہو اور ان کے لیے محرم بن سکتا ہوں؟

(۲) مذکور بات ہو جانے کے بعد میرے والد محترم کہتے ہیں کہ اگر وہ تمہیں حج میں لے جاتی ہے تو میں تمہاری بیوی کا ٹکٹ خرچ دوں گا، جس سے دونوں میاں بیوی کا حج ہو جائے، تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟ دونوں سوالوں کا مفصل جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

(۱) عورت ایسے شخص کے ساتھ حج میں جا سکتی ہے، جس سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو، جیسے حقیقی بھائی، چچا، بھتیجا، بھانجا، ماموں، دودھ شریک بھائی، اسی طرح سسرالی رشتوں میں وہ لوگ جن سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہوتا ہے جیسے داماد وغیرہ۔[۱]

پھوپھی ساس سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام نہیں ہے؛ بل کہ اس وقت تک حرام ہے، جب تک اس کی بھتیجی نکاح میں ہے۔ [کیوں کہ بھتیجی کے انتقال یا طلاق کے بعد اس کی پھوپھی سے نکاح جائز ہے، گویا پھوپھی ساس سے نکاح کی حرمت مؤقت [وقتی] ہے۔ مرتب] لہٰذا پھوپھی ساس کے ساتھ سفر حج میں محرم بن

---

[۱] (و) مع وجود (زوج أو محرم) الذي حرم عليه نكاحها أبدا بقرابة، أو رضاع، أو صهارة، مسلما، أو عبدا، أو كافرا. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - داماد أفندي (م:۱۰۷۸ھ): ۱/ ۲۶۲، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۴، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

(ومنها المحرم للمرأة) شابة كانت أو عجوزا إذا كانت بينها وبين مكة مسيرة ثلاثة أيام هكذا في المحيط، وإن كان أقل من ذلك حجت بغير محرم كذا في البدائع والمحرم الزوج، ومن لا يجوز مناكحتها على التأبيد بقرابة أو رضاع أو مصاهرة كذا في الخلاصة ويشترط أن يكون مأمونا عاقلا بالغا حرا كان أو عبدا كافرا كان أو مسلما هكذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۹- ۲۱۸، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر - بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۴-۶، أول كتاب الحج، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

کر آپ کا جانا جائز نہیں۔ (عالم گیری)[1]

(۲) خسر ابا اپنی بہو کو حج کے لیے رقم دیتے ہیں اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ حج میں جاتی ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس کا فرض حج ادا ہو جائے گا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] شوہر کے بھانجے کے بیٹے کے ساتھ عورت کا سفرِ حج میں جانا

۱۶۴۴- سوال: مرحوم محمد قاسم داؤجی کی اہلیہ مرحوم کے بھانجے کے لڑکے کے ساتھ سفرِ حج میں جا سکتی ہے یا نہیں؟ اِس کے متعلق حکمِ شرعی کیا ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

عورت کے لیے کسی بھی قسم کا سفر شرعی کرنا، جس کی مقدار اڑتالیس میل ہے، اپنے ذی رحم محرم رشتہ دار کے علاوہ، کسی اجنبی کے ساتھ یا تنہا جائز نہیں ہے۔(۳)

---

[۱] والأصل أن كل امرأتين لو صورنا إحداهما من أي جانب ذكرا، لم يجز النكاح بينهما برضاع أو نسب لم يجز الجمع بينهما هكذا في المحيط. فلا يجوز الجمع بين امرأة وعمتها نسبا أو رضاعا، وخالتها كذلك ونحوها. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۷۷، كتاب النكاح، الباب الثالث في بيان المحرمات، القسم الرابع المحرمات بالجمع، ط: دار الفكر- بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۲/۲۶۲، كتاب النكاح، فصل أنواع الجمع بين ذوات المحارم، منه جمع في النكاح، ط: دار الكتب العلمية)

[۲] (ومنها القدرة على الزاد والراحلة) بطريق الملك أو الإجارة دون الإعارة والإباحة سواء كانت الإباحة من جهة من لا منة له عليه كالوالدين والمولودين أو من غيرهم كالأجانب كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۷، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر- بيروت ☆ البحر الرائق: ۲/۳۳۷، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۳) عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: لا تسافر المرأة إلا مع ذي محرم، ولا يدخل عليها رجل إلا ومعها محرم، فقال رجل: يا رسول الله إني أريد أن أخرج في جيش كذا وكذا، وامرأتي تريد الحج، فقال: اخرج معها. (صحيح البخاري: ۱/۲۵۰، رقم الحديث: ۱۸۶۲، كتاب المناسك، أبواب العمرة، باب حج النساء، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/۴۳۳، رقم الحديث: ۴۲۴- (۱۳۴۱)، كتاب الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، ط: ديوبند)

(ومنها المحرم للمرأة) شابة كانت أو عجوزا إذا كانت بينها وبين مكة مسيرة ثلاثة أيام هكذا في المحيط، وإن كان أقل من ذلك حجت بغير محرم كذا في البدائع والمحرم الزوج، ومن لا يجوز مناكحتها على التأبيد بقرابة أو رضاع أو مصاهرة كذا في الخلاصة ويشترط أن يكون مأمونا عاقلا بالغا حرا كان أو عبدا كافرا كان أو مسلما هكذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۹- ۲۱۸، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر- بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۲/۴-۶، أول كتاب الحج، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة)

ذی رحم محرم اُسے کہیں گے، جس کے ساتھ عورت کا دائمی طور پر نکاح کرنا حرام ہو، خواہ وہ رضاعی، نسبی یا سسرالی رشتہ دار ہو۔ (شامی: ۲/ ۴۶۴، ہدایہ: ۱/ ۲۱۳، عالمگیری: ۱/ ۳۱۸)[1]

مرحوم کے بھانجے یا اُن کے بیٹے کا اِس عورت کے ساتھ کیا رشتہ ہے، اُس کی تفصیل سوال میں مذکور نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ اگر اِس بیوہ اور اُس کے درمیان نکاح صحیح ہوتا ہو، تو اُس کے ساتھ سفر کرنا جائز نہیں ہے، ورنہ جائز ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] بھتیجی اور بھتیجی کے شوہر کی معیت میں عورت کا سفرِ حج میں جانا

۱۶۴۵- سوال: میں ایک بیوہ عورت ہوں، اللہ تعالیٰ کے فضل سے میری اقتصادی حالت اِتنی اچھی ہے کہ میں اپنی بھتیجی اور اُس کے شوہر کو اپنے ساتھ سفرِ حج میں لے جا سکوں، اور اُن کا خرچ بھی میں ہی اٹھالوں گی، تو کیا شریعت مجھے اِس بات کی اِجازت دیتی ہے کہ میں اُن کے ساتھ سفرِ حج میں جا سکوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عورت کے لیے کوئی بھی سفر شرعی، جس کی مقدار اڑتالیس میل ہو، اپنے ذی رحم محرم رشتہ دار کے علاوہ اور کسی کے ساتھ یا تنہا جائز نہیں ہے، ذی رحم محرم اُسے کہیں گے، جس کے ساتھ عورت کا دائمی طور پر نکاح کرنا حرام ہو، خواہ وہ رضاعی، نسبی یا سسرالی رشتہ دار ہو۔ (۱)

اور آپ کا بھتیجی کے شوہر کے ساتھ نکاح فی الحال تو بھتیجی کی وجہ سے نہیں ہو سکتا، لیکن اگر بھتیجی ان کے نکاح میں نہ ہو، تو نکاح درست ہے؛ لہٰذا آپ کا اُن کے ساتھ حج کے سفر میں جانا جائز نہیں ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۴] بھانجے یا اس کے لڑکے کے ساتھ خاتون کا سفرِ حج

۱۶۴۶- سوال: عورت اپنے بھانجے یا بھانجے کے لڑکے یا بھانجے کے لڑکے کی بیوی کے ساتھ

---

[۱] والمحرم من لا يجوز له مناكحتها على التأبيد بقرابة أو رضاع أو صهرية كما في التحفة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۴، كتاب الحج، مطلب في قولهم يقدم حق العبد على حق الشرع، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۹- ۲۱۸، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر - بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۴-۶، أول كتاب الحج، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

(۲-۳) سوال سابق کا حاشیہ نمبر: ۱ (صفحہ سابق کا حاشیہ نمبر: ۳) ملاحظہ فرمائیں۔

حج کے سفر میں جاسکتی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ صورت میں حقیقی بھانجا یا بھانجے کا لڑکا حقیقی خالہ کے لیے محرم ہے اور حقیقی خالہ یا باپ کی حقیقی خالہ کے ساتھ ہمیشہ نکاح حرام ہے؛ لہٰذا مذکور حقیقی بھانجا یا اس کے لڑکے کے ساتھ سفر پر خاتون جاسکتی ہے، البتہ بھانجے کے لڑکے کی بیوی کے ساتھ حج پر نہیں جاسکتی، کیوں کہ اس صورت میں کوئی مرد محرم نہیں ہے، اور محرم کے بغیر حج کے لیے جانا ممنوع ہے۔ (عالمگیری)[☆☆☆] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] نفلی حج کے لیے کوئی عورت غیر محرم کے ساتھ جاسکتی ہے یا نہیں؟

۱۶۴۷- سوال: ایک عورت نے حج فرض کرلیا ہے؛ لیکن اُسے حج ادا کرنے کا بے حد شوق ہے، تو اپنے محرم کے علاوہ کسی اور کے ساتھ حج کے لیے جاسکتی ہے یا نہیں؟ گنہ گار ہوگی یا نہیں؟ حج ادا کرنے سے حج مقبول ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس طرح حج فرض کے لیے عورت کا بغیر محرم کے سفر کرنا جائز نہیں ہے، اِسی طرح نفلی حج میں بھی بغیر محرم کے عورت کا جانا جائز نہیں ہے۔ (۱) اور نفل حج کے لیے تو شوہر کی موجودگی میں اُس کی اِجازت لینا بھی ضروری ہے، شوہر کی اِجازت کے بغیر حج نفل میں جانے سے عورت گنہگار ہوگی۔ (۲)

حج نفل کرنے کا بڑا ثواب ہے، لیکن ملکی حالات اور مجبور لوگوں کی ضروریات کے پیش نظر مدارس ومساجد

(☆☆☆) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ. (۴-النساء: ۲۳)

(القسم الأول المحرمات بالنسب). وهن الأمهات والبنات والأخوات والعمات والخالات وبنات الأخ وبنات الأخت فهن محرمات نكاحا ووطئا ودواعيه على التأبيد... وأما الخالات فخالته لأب وأم وخالته لأب وخالته لأم وخالات آبائه وأمهاته. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۷۳، كتاب النكاح، الباب الثالث في بيان المحرمات، القسم الأول المحرمات بالنسب، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) قد تقدم مرارا.

(۲) وليس له منعها عن حجة الإسلام، وله منعها عن كل حج سواها. (مجمع الأنهر: ۱/ ۲۶۳، كتاب الحج، واجب الحج، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ المبسوط للسرخسي: ۴/ ۱۶۵، كتاب المناسك، دار المعرفة-بيروت)

میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور ان میں مال خرچ کرنا زیادہ ثواب کا باعث ہوگا۔(☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۶] ایام حج کے علاوہ میں مکہ جانے سے حج فرض نہیں ہوتا

۱۶۴۸- سوال: تجارت کے لیے یا تبلیغی جماعت میں یا عمرہ کے لیے کوئی شخص مکہ جائے، تو کیا اس پر حج فرض ہوجاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب کسی (آفاقی) شخص کو مکہ میں جانے کا ارادہ ہو، تو حنفی مسلک کے موافق اس پر احرام باندھنا ضروری ہوجاتا ہے، خواہ حج کا قصد ہو یا تجارت کا یا کسی اور کا، احرام ہر حال میں ضروری ہے۔ (عالم گیری)[1]

لیکن حج کا حکم یہ ہے کہ: حج کے دنوں میں مکہ میں موجود ہو، (اور اس نے پہلے حج فرض ادا نہ کیا ہو) تو اس پر حج فرض ہوجاتا ہے، حج کے ایام نہ ہوں، تو (محض مکہ میں ہونے سے) اس پر حج فرض نہ ہوگا، پس حج کی فرضیت کے لیے حج کے ایام کا ہونا ضروری ہے: {وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ

(☆☆☆) قلت: قد يقال إن صدقة التطوع في زماننا أفضل؛ لما يلزم الحاج غالبا من ارتكاب المحظورات ومشاهدته لفواحش المنكرات وشح عامة الناس بالصدقات وتركهم الفقراء والأيتام في حسرات، ولا سيما في أيام الغلاء وضيق الأوقات وبتعدي النفع تتضاعف الحسنات. ـــــــ ثم رأيت في متفرقات اللباب الجزم بأن الصدقة أفضل منه، وقال شارحه القاري أي على ما هو المختار كما في التجنيس ومنية المفتي وغيرهما، ولعل تلك الصدقة محمولة على إعطاء الفقير الموصوف بغاية الفاقة أو في حال المجاعة، وإلا فالحج مشتمل على النفقة؛ بل وزاد إن الدرهم الذي ينفق في الحج بسبعمائة إلخ، قلت: قد يقال ما ورد محمول على الحج الفرض على أنه لا مانع من كون الصدقة للمحتاج أعظم أجرا من سبعمائة. (منحة الخالق على البحر الرائق-ابن عابدين (م:۱۲۵۲ھ): ۲/۳۳۴، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي☆المحيط البرهاني: ۲/۴۹۵، كتاب المناسك، الفصل العشرون في المتفرقات، ت: عبدالكريم السامي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۱] ولا يجوز للآفاقي أن يدخل مكة بغير إحرام نوى النسك أو لا ولو دخلها فعليه حجة أو عمرة كذا في محيط السرخسي في باب دخول مكة بغير إحرام. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۲۱، كتاب المناسك، الباب الثاني في المواقيت، ط: دار الفكر ☆عمدة القاري- بدر الدين العيني (م:۸۵۵ھ): ۱۰/۲۰۵، كتاب الحج، باب دخول الحرم و مكة بغير إحرام، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/۵۲-۵۵۱، كتاب الحج، الفصل الرابع في بيان مواقيت الإحرام، ط: زكريا- ديوبند☆ بدائع الصنائع: ۲/۱۶۴، كتاب الحج، فصل بيان مكان الإحرام، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾[1]

لہٰذا اگر کوئی شخص مکہ میں ہو اور حج کے ایام آنے سے پہلے وہاں سے نکل جائے، یعنی حرمِ مکہ چھوڑ دے، تو حج فرض نہ ہوگا۔ (فتح القدیر)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۷] ایامِ حج: کب سے کب تک؟

۱۶۴۹- سوال: ایامِ حج کب سے شروع ہوتے ہیں اور وہ کتنے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

پہلی شوال سے ذی الحجہ کی دس تاریخ تک ایامِ حج ہیں۔ (احکام القرآن)[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] ۳-آل عمران: ۹۷۔

(قوله: والوقت) قال الرملي سيذكره أيضا في شرائط الصحة، ولا شك أن من لم يدرك وقت الحج لم يجب عليه وأنه لا يصح إلا في وقته المخصوص فكان شرطا للوجوب وشرطا للصحة تأمل اهـ.

وفي لباب المناسك: السابع الوقت وهو أشهر الحج أو وقت خروج أهل بلده إن كانوا يخرجون قبلها فلا يجب إلا على القادر فيها أو في وقت خروجهم فإن ملكه أي المال قبل الوقت فله صرفه حيث شاء ولا حج عليه وإن ملكه فيه فليس له صرفه إلى غير الحج فلو صرفه لم يسقط الوجوب عنه. (منحة الخالق على البحر الرائق: ۳۳۱/۲، كتاب الحج، قبيل: واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۲] ... أن الفقير إذا وصل إلى المواقيت صار حكمه حكم أهل مكة، فيجب عليه وإن لم يقدر على الراحلة. (فتح القدير: ۴۱۹/۲، كتاب الحج، مقدمة يكره الخروج إلى الحج إذا كره أحد أبويه، ط: دار الفكر)

[۳] قوله تعالى [الحج أشهر معلومات] قال أبو بكر قد اختلف السلف في أشهر الحج ما هي فروي عن ابن عباس وابن عمر والحسن وعطاء ومجاهد أنها شوال وذو القعدة وعشر من ذي الحجة وروى عن عبد الله ابن مسعود أنها شوال وذو القعدة وذو الحجة وروي عن ابن عباس وابن عمر في راوية أخرى مثله وكذلك روي عن عطاء ومجاهد وقال قائلون وجائز أن لا يكون ذلك اختلافا في الحقيقة وأن يكون مراد من قال وذو الحجة أنه بعضه لأن الحج لا محالة إنما هو في بعض الأشهر لا في جميعها لأنه لا خلاف أنه ليس يبقى بعد أيام منى شيء من مناسك الحج. (أحكام القرآن- أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م: ۳۷۰هـ): ۳۷۳/۱، قبيل: باب الإحرام بالحج قبل أشهر الحج، ت: محمد صادق القمحاوي، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت ☆ جلالین، ص: ۲۹، سورۃ البقرۃ، ط: مکتبہ ملت- دیوبند)

(وأما وقته فأشهر معلومات) والأشهر المعلومات شوال وذو القعدة وعشر ذي الحجة. (الفتاوى الهندية: ۲۱۶/۱، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر)

[۳۸] کیا حج بدل کرنے والے پر کعبہ کی زیارت سے اپنا حج فرض ہوجاتا ہے؟

۱۶۵۰- سوال: حج بدل کرنے والے پر کعبہ شریف کی زیارت کرنے سے حج فرض ہوتا ہے یا نہیں؟ اور اس میں امیر وغریب میں کوئی فرق ہے یا دونوں کا حکم یکساں ہے۔

الجواب حامداً ومصلياً:

مال دار پر تو حج فرض ہی ہے؛ لیکن فقیر جب حج بدل کے لیے جائے گا، تو ایام حج میں بیت اللہ کی زیارت سے اس پر بھی حج فرض ہوجائے گا، البتہ بعض علماء کے نزدیک اس پر حج فرض نہیں ہوتا ہے؛ کیوں کہ وہ اپنی استطاعت سے نہیں آیا ہے، بل کہ دوسرے کے بھیجنے پر آیا ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (ويجوز إحجاج الصرورة) بالصاد المهملة الذي لم يحج... ولكن يجب عليه عند رؤية الكعبة الحج لنفسه وعليه أن يتوقف إلى عام قابل ويحج لنفسه، أو أن يحج بعد عوده إلى أهله بماله وإن فقيرا فليحفظ والناس عنها غافلون. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م:۱۰۷۸هـ): ۳۰۸/۱، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ البحر الرائق: ۷۳/۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۶۰۳/۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر-بيروت)

أقول [قائله ابن عابدين رحمه الله]: وفي هذا الكلام بحث إن لم يوجد نقل صريح؛ لأنه حج بقدرة الغير لا بقدرة نفسه، وماله، وإذا أتم الحج يمضي أشهر الحج فإنها شوال وذو القعدة، وعشر ذي الحجة فكيف يجب عليه المكث حتى تأتي أشهره فإذا كان فقيرا أو له عائلة في بلده يجب عليه المكث إلى السنة الآتية بلا نفقة مع تركه عياله يحتاج إلى نقل صريح في ذلك فتأمل.ـــــــ ثم بعد ذلك رأيت بخط بعض الفضلاء ناقلا عن مجمع الأنهر على ملتقى الأبحر ما صورته: ويجوز إحجاج الصرورة، ولكن يجب عليه عند رؤية الكعبة الحج لنفسه، وعليه أن يتوقف إلى عام قابل ويحج لنفسه أو أن يحج بعد عودة أهله بماله، وإن فقيرا فلتحفظ والناس عنها غافلون وصرح علي القاري في شرح مناسكه الكبير بأنه بوصوله لمكة وجب عليه الحج. اهـ ـــــــ وفي نهج النحاة لابن حمزة هذه المسألة من كلام حسن فلتراجع. اهـ ما رأيته في الحامدية. ـــــــ ورأيت في بعض حواشي الدر المختار أنه أفتى بعدم وجوب الحج عليه مولانا العارف بالله تعالى الشيخ عبد الغني النابلسي لتلبسه بالإحرام عن الغير ووجود الحرج المرفوع لو أقام إلى قابل، وألف في ذلك رسالة، وأفتى بخلافه مولانا السيد أحمد بادشاه في رسالة له ويدل له قول منلا علي القاري في شرحه لو حج الفقير نفلا يجب. (منحة الخالق على البحر الرائق: ۷۳/۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، قبيل: باب الهدي، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۳۹] ۱- بچے کا حج

[۴۰] ۲- بلوغ کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مدت

۱۶۵۱- سوال: حضرت مفتی صاحب! میرا لڑکا محمد غوری سعودیہ میں رہتا ہے، وہ اس سال وہاں سے حج کرنا چاہتا ہے، اس کی عمر ۱۸/ سے ۱۹/ سال ہے، تو اس کا حج صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے، تو حج فرض ادا ہوگا یا نفل؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

لڑکے کے بالغ ہونے کی کم از کم عمر بارہ، اور لڑکی کے لیے نو سال ہے، جو اس کی علامات سے ظاہر ہوتا ہے، البتہ لڑکا یا لڑکی ضعیف و کمزور ہو، اور بلوغ کی کوئی علامت نہ پائی جائے، تو علماء نے بلوغ کی زیادہ سے زیادہ مدت دونوں ہی کے لیے ۱۵/ سال مقرر کی ہے۔(۱)

پندرہ سال کے بعد جو لڑکا یا لڑکی حج کرے اور فرض کی نیت سے کرے، تو حج فرض ادا ہو جاتا ہے، لہٰذا آپ کا لڑکا بھی اگر فرض کی نیت سے حج کرے گا، تو اس کا فرض حج ادا ہو جائے گا۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) بلوغ الغلام بالاحتلام أو الإحبال أو الإنزال، والجارية بالاحتلام ،أو الحيض أو الحبل، كذا في المختار. والسن الذي يحكم ببلوغ الغلام والجارية إذا انتهيا إليه خمس عشرة سنة عند أبي يوسف ومحمد - رحمهما الله تعالى - وهو رواية عن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - وعليه الفتوى،... وأدنى مدة البلوغ بالاحتلام ونحوه في حق الغلام اثنتا عشرة سنة، وفي الجارية تسع سنين، ولا يحكم بالبلوغ إن ادعى وهو ما دون اثنتي عشرة سنة في الغلام، وتسع سنين في الجارية، كذا في المعدن. (الفتاوى الهندية: ۶۱/۵، كتاب الحجر، الباب الثاني في الحجر للفساد، الفصل الثاني في معرفة حد البلوغ، ط: دار الفكر ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۱۵۳/۶، كتاب الحجر، فصل بلوغ الغلام بالاحتلام، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۱۷۲/۷، كتاب الحجر والحبس، فصل في بيان ما يرفع الحجر، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) (ومنها البلوغ) فلا يجب على الصبي كذا في فتاوى قاضي خان، ولو أن الصبي حج إذا قبل البلوغ فلا يكون ذلك عن حجة الإسلام، ويكون تطوعا، ولو أحرم ثم بلغ قبل الوقوف بعرفة إن مضى على إحرامه يكون تطوعا، وإن جدد التلبية أو استأنف الإحرام بعد الإدراك ثم وقف بعرفة يكون عن حجة الإسلام بالإجماع كذا في شرح الطحاوي،... ولو جاوز الميقات بغير إحرام ثم احتلم بمكة، وأحرم من مكة أجزأه عن حجة الإسلام، ولم يكن عليه لمجاوزة الميقات بغير إحرام شيء كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۲۱۷/۱، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر)

ثم بلغ بالسن، فإن جدد إحرامها و نوى بها الفرض يقع عنه وإلا فلا. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۶۶/۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

[۴۱] حج کے لیے بلیک میں باہر کے ڈالر یا رین سے ٹکٹ خریدنا

۱۶۵۲- سوال: یہاں کی سرکار حج کے لیے اس ملک کی کرنسی سے ٹکٹ نہیں دیتی ہے، اگر حج میں جانا ہو، تو باہر کے ڈالر یا رین سے ٹکٹ لینا پڑتا ہے اور سرکار رین اور ڈالر کو معتدل بھاؤ میں نہیں دیتی ہے، تو کیا بلیک میں رین یا ڈالر کو حاصل کر کے حج کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً

اگر حج فرض ہو گیا ہے، تو اپنی رقم سے حج ادا کرنا ضروری ہے، اگر گورنمنٹ رقم نہ دے، تب بھی کسی طرح پیسے حاصل کر کے حج ادا کرنا ضروری ہے، اس صورت میں شریعت کی رو سے آپ گنہ گار نہ ہوں گے؛ البتہ سرکاری قانون کی اگر خلاف ورزی ہو رہی ہو، تو عزت اور آبرو کی حفاظت کا خیال رکھیں۔ (۱)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۲] حکومت کی جانب سے بڑھاپے اور بے روزگاری پر دی گئی رقم کے ذریعہ مرحومین کی جانب سے حج بدل ادا کرنا

۱۶۵۳- سوال: ایک شخص یہاں سے انگلینڈ گیا، اور وہیں اُس کو قانوناً اقامت کا حق حاصل ہو گیا، پھر وہاں کی حکومت کی جانب سے اُس کو بڑھاپے اور بے روزگاری (ذریعۂ معاش نہ ہونا) کی وجہ سے ماہانہ کچھ رقم دی جاتی تھی، اِس شخص کو چوں کہ اُس کے لڑکوں نے انگلینڈ بلایا تھا، اِس لیے وہی اُس کے تمام اِخراجات اٹھاتے تھے، لہٰذا حکومت کی جانب سے بطورِ امداد ملی ہوئی رقم اُنھوں نے جمع کر رکھی تھی، اور یہ شخص اپنا فرض حج ادا کر چکا ہے، اب اِس رقم کے ذریعہ وہ اپنے مرحومین کی جانب سے حج بدل ادا کرنا چاہتا ہے، تو

(۱) امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ کے نزدیک ایک فلس کا دو فلس سے تبادلہ اس لیے ناجائز تھا کہ وہ آپس میں بالکل برابر اور ہم مثل تھے، جس کی بناء پر تبادلہ کے وقت ایک سکہ بغیر عوض کے خالی رہ جاتا تھا، لیکن مختلف ممالک میں کرنسیاں مختلف الاجناس ہونے کی بناء پر ہم مثل اور برابر نہ رہیں، اس لیے ان کے درمیان کمی زیادتی کے ساتھ تبادلے کے وقت کرنسی کے کسی حصے کو خالی عن العوض نہیں کہا جائے گا، اور جب خالی عن العوض نہیں، تو کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ بھی جائز ہے، لہٰذا ایک سعودی ریال کا تبادلہ ایک سے زائد پاکستانی روپیوں سے کرنا جائز ہے۔ (جواہر الفقہ: ۴/ ۳۴۷، مختلف ممالک کے کرنسی نوٹوں کا آپس میں تبادلہ، ط: ادارہ تحقیقات مسائل جدیدہ، ط: اسلامیہ بازار، جامع مسجد- دیوبند)

کیا شرعاً مرحومین کی جانب سے حج بدل کے لیے اِن پیسوں کو خرچ کرنے کی گنجائش ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

حکومت کی جانب سے جو رقم قانوناً بہ طورِ امداد دی جاتی ہو، تو اُس کا لینا جائز ہے، بہ شرطیکہ اُس مدد کے حاصل کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا نہ لیا گیا ہو، اور جب اِس امداد کا لینا جائز ہے، تو اُس کے ذریعہ حج بدل کرنا بھی صحیح ہوگا؛ لیکن اگر حکومتی امداد حاصل کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لے کر خود کو بے روزگار ثابت کیا گیا ہو، تو ایسی رقم کا لینا حرام ہوگا۔[۱] اور اُس حرام رقم کے ذریعہ حج جیسی عظیم عبادت صحیح نہیں ہوگی، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: اللہ تعالیٰ پاک ہے، اور پاک مال کو ہی قبول فرماتا ہے۔[۲] اور ترمذی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے، اور پاک چیز کو پسند فرماتا ہے۔[۳]

---

(۱) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا. (۴-النساء:۲۹)

قوله {عن تراض منكم} أي: بطيبة نفس كل واحد على الوجه المشروع. (اللباب في علوم الكتاب- أبو حفص سراج الدين عمر بن علي بن عادل الحنبلي الدمشقي النعماني (م:۷۷۵هـ):۳۳۸/۶، سورة النساء، ۲۹، ت: عادل أحمد عبد الموجود وعلي محمد معوض، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

الرابع: إن النصوص تدل على أن مال الإنسان معصوم [وأنه] لا سبيل لأحد أن يأخذه منه، قال -تعالى-: {لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم} [النساء:۲۹]

وقال عليه الصلاة والسلام: "كل امرئ أحق بكسبه"، وقال: "حرمة مال المسلم كحرمة دمه"، وقال: "لا يحل مال امرئ مسلم إلا عن طيب نفس". (المصدر السابق:۵۶۳/۶، النساء، ۹۲)

(۲) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "أيها الناس، إن الله طيب لا يقبل إلا طيبا، وإن الله أمر المؤمنين بما أمر به المرسلين، فقال: {يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ} [المؤمنون:۵۱] وقال: {يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ} [البقرة:۱۷۲] ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر، يمد يديه إلى السماء، يا رب، يا رب، ومطعمه حرام، ومشربه حرام، وملبسه حرام، وغذي بالحرام، فأنى يستجاب لذلك؟". (الصحيح لمسلم:۳۲۶/۱، رقم الحديث:۶۵-(۱۰۱۵)، كتاب الزكاة، باب بيان أن اسم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف، ط: البدر-ديوبند)

(۳) عن صالح بن أبي حسان، قال: سمعت سعيد بن المسيب، يقول: إن الله طيب يحب الطيب، نظيف يحب النظافة، كريم يحب الكرم، جواد يحب الجود، فنظفوا -أراه قال- أفنيتكم ولا تشبهوا باليهود. قال: فذكرت ذلك لمهاجر بن مسمار، فقال: حدثنيه عامر بن سعد بن أبي وقاص، عن أبيه، عن النبي صلى الله عليه وسلم مثله، إلا أنه قال: نظفوا أفنيتكم. (سنن الترمذي:۱۰۷/۲، رقم الحديث:۲۷۹۹، أبواب الأدب، باب ما جاء في النظافة، ط: فيصل، ديوبند)

لہٰذا حرام مال خرچ کر کے ثواب کی اُمید رکھنے سے ایمان کا خطرہ ہے۔ (☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

[۴۳] ضبطِ ولادت کا آپریشن کروانے کے بعد عورت کا حج وعمرہ صحیح ہوگا یا نہیں؟

۱۶۵۴- سوال: ہم نے سنا ہے کہ جس عورت نے ضبطِ ولادت کا آپریشن کروایا ہو، وہ حج یا عمرہ میں نہیں جاسکتی، کیا شرعاً یہ مسئلہ صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

بغیر کسی عذرِ معقول کے، ضبطِ ولادت کا آپریشن کروانا گناہ کا کام ہے، اگر یہ گناہ کسی سے سرزد ہو گیا ہے، تو اُسے توبہ واستغفار کرنا چاہیے۔ (۱) ایسی عورت اگر حج وعمرہ کرے گی، تو ادا ہو جائیں گے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

[۴۴] برتھ کنٹرول کا آپریشن کرانے والی عورت کا حج

۱۶۵۵- سوال: بیوی نے شوہر کی اجازت سے نس بندی کا آپریشن کرایا، پھر وہ حج کے لیے گئی، تو کیا

(☆☆☆) رجل دفع إلى فقير من المال الحرام شيئا يرجو به الثواب يكفر.... (قوله: إذا تصدق بالحرام القطعي) أي مع رجاء الثواب الناشئ عن استحلاله كما مر فافهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۹۲، كتاب الزكاة، باب زكاة الغنم، مطلب في التصدق من المال الحرام، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) وَلَا تَقْتُلُوٓا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيرًا. (۱۷-بنی اسرائیل: ۳۱)

عن عبد الله رضي الله عنه، قال: "كنا نغزو مع النبي صلى الله عليه وسلم وليس معنا نساء، فقلنا: ألا نختصي؟ فنهانا عن ذلك، فرخص لنا بعد ذلك أن نتزوج المرأة بالثوب" ثم قرأ {يا أيها الذين آمنوا لا تحرموا طيبات ما أحل الله لكم} [المائدة: ۸۷]. (صحيح البخاري: ۲/ ۶۶۴، رقم الحديث: ۴۶۱۵، كتاب تفسير القرآن، باب قوله: {يا أيها الذين آمنوا لا تحرموا طيبات ما أحل الله لكم}، ط: ديوبند، وانظر رقم: ۵۰۷۵، كتاب النكاح، باب ما يكره من التبتل والخصاء، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۴۵۰، رقم الحديث: ۱۱-(۱۴۰۴)، كتاب النكاح، باب نكاح المتعة، وبيان أنه أبيح، ثم نسخ، ثم أبيح، ثم نسخ، واستقر تحريمه إلى يوم القيامة، ط: ديوبند)

خصاء بني آدم حرام بالاتفاق. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۵۷، كتاب الكراهية، الباب التاسع عشر في الختان والخصاء وحلق المرأة شعرها ووصلها شعر غيرها، ط: دار الفكر)

(۲) لأن المعاصي لا تمنع الطاعات فإذا أتى بها لا يقال إنها غير مقبولة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۶۱، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي)

اس کا حج صحیح ہوگا؟ اور کیا شوہر کا حج بھی درست ہوگا، حالاں کہ اس نے بہ رضا و رغبت اپنی بیوی کا آپریشن کروایا ہے؟

الجواب حامداو مصليا:

عورت کا آپریشن چاہے شوہر کی رضامندی سے ہو یا اس کی رضامندی کے بغیر، حج کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلا ضرورت شدیدہ نس بندی کا آپریشن ایک الگ گناہ ہے، جس کے لیے توبہ واستغفار لازم ہے، البتہ حج ایک مستقل عبادت ہے، جس کا ''اہل'' گنہ گار بھی ہوتا ہے؛ لہٰذا شوہر اور بیوی دونوں کا حج ادا ہو جائے گا۔ نس بندی کرانے کی وجہ سے حج کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۵] قرض لے کر نفلی حج ادا کرنا

۱۶۵۶- سوال: اللہ کے فضل سے میں نے ۱۹۸۴ء میں فرض حج ادا کیا تھا، لیکن میری بیوی نے اب تک حج نہیں کیا، اب اُس کو اپنے والد کی جانب سے بہ طورِ وراثت اِتنی رقم ملی ہے، جس کی وجہ سے اُس پر حج فرض ہے، لیکن وہ میرے علاوہ کسی اور کے ساتھ حج میں جانے کے لیے تیار نہیں ہے، اور مجھ پر فی الحال ایک لاکھ بیس ہزار روپئے کا قرض ہے، جو میں نے اپنے والد صاحب کے پاس سے لیا تھا، میری دیگر جائداد میں تقریباً تین یا چار لاکھ کا ایک مکان ہے، جو میں نے کرایہ پر دینے یا بیچنے کے لیے تعمیر کیا تھا، پندرہ یا سترہ بیگھا کھیتی کی زمین اور کچھ قابل رہائش کھلی زمین ہے، میں اپنی بیوی کی رقم سے اپنا نفلی حج ادا کرنا نہیں چاہتا، اس لیے میں نے والد صاحب سے قرض لیا ہے، کیا یہ درست ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً و مصليا:

ایسا مقروض شخص، جس کے قرض کا تقاضہ کرنے والا تقاضہ کر رہا ہو، اُسے قرض ادا کیے بغیر نفل حج کرنے کی اِجازت نہیں ہے۔(۲) لیکن اگر قرض دینے والے کا کوئی تقاضہ نہ ہو، جیسا کہ صورتِ مذکورہ میں

---

(۱) سوال سابق بہ عنوان ''ضبطِ ولادت کا آپریشن کروانے کے بعد عورت کا حج و عمرہ صحیح ہوگا یا نہیں؟'' کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) وإن كان في ماله وفاء بالدين، يقضي الدين ولا يحج، ويكره الخروج إلى الغزو والحج لمن عليه الدين. (قاضي خان على هامش الهندية: ۱/ ۳۱۳، كتاب الحج، فصل في المقطعات، ط: زكريا- ديوبند ☆ الهداية: ۱/ ۲۲۱، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج، ط: زكريا- ديوبند)

و كذا يكره بلا إذن دائنه و كفيله والظاهر أنها تحريمية لإطلاقهم الكراهة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۷۱، كتاب الحج، سنن وآداب الحج، ط: دار الفكر- بيروت)

آپ نے والد صاحب کے پاس سے قرض لیا ہے، یا مقروض کے پاس قرض کی ادائیگی کا انتظام ہو، جیسا کہ آپ کے پاس ہے، تو نفل حج ادا کرنے کی گنجائش ہے، نیز اپنی بیوی کے ساتھ جانے میں یک گونہ ضرورت بھی ہے، اس وجہ سے آپ کے لیے قرض لے کر نفل حج ادا کرنا جائز ہے۔(☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۶] ذمہ میں قرض ہونے کے باوجود ہدیے کی رقم سے حج ادا کرنا

۱۶۵۷- سوال: ایک لڑکا اپنے والد کو آٹھ دس ہزار روپیہ کا مالک بنا کر حج فرض ادا کرنے کا حکم دے رہا ہے؛ مگر دوسری جانب باپ کے ذمہ سوسائٹی اور دیگر لوگوں کا تقریباً سات آٹھ ہزار روپیوں کا قرض ہے، تو ایسی صورت میں باپ کو اس رقم کے ذریعہ پہلے اپنا قرض ادا کرنا بہتر ہے یا حج کرنا؟ اگر وہ حج ادا کرے تو حج فرض ادا ہوگا یا نفل؟

احقر: احمد داوجی دیسائی (صوفی)

الجواب حامداومصلیا:

لڑکے کو اپنے والد کا ادب ملحوظ رکھنا چاہیے؛ باپ کو حکم کرنا مناسب نہیں۔(۱) لڑکا اپنے باپ کو حج ادا

(☆☆☆) وقالوا لو لم يحج حتى أتلف ماله وسعه أن يستقرض ويحج، ولو غير قادر على وفائه ويرجى أن لا يؤاخذه الله بذلك، أي لو ناويا وفاء إذا قدر كما قيده في الظهيرية. (الدر المختار) ــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله وسعه أن يستقرض إلخ) أي جاز له ذلك وقيل يلزمه الاستقراض كما في لباب المناسك، قال منلا علي القاري في شرحه عليه، وهو رواية عن أبي يوسف وضعفه ظاهر؛ فإن تحمل حقوق الله تعالى أخف من ثقل حقوق العباد اهـ.

قلت: وهذا يرد على القول الأول أيضا إن كان المراد بقوله ولو غير قادر على وفائه أن يعلم أنه ليس له جهة وفاء أصلا أما لو علم أنه غير قادر في الحال وغلب على ظنه أنه لو اجتهد قدر على الوفاء فلا يرد. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۵۷/۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص: ۷۲۸، كتاب الحج، مدخل، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۲۱۶/۱، كتاب الحج، ط: دار إحياء الكتب العربية)

(۲) وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ﴿۲۴﴾ (۱۷-الاسراء: ۲۳)

قال مجاهد: {وقضى} يعني: وصى، وكذا قرأ أبي بن كعب، وعبد الله بن مسعود، والضحاك بن مزاحم: "ووصى ربك ألا تعبدوا إلا إياه" ولهذا قرن بعبادته بر الوالدين فقال: {وبالوالدين إحسانا} أي: وأمر بالوالدين إحسانا، كما قال في الآية الأخرى: {أن اشكر لي ولوالديك إلي المصير} [لقمان: ۱۴].

وقوله: {إما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف} أي: لا تسمعهما قولا سيئا، حتى ولا التأفيف الذي هو أدنى مراتب القول السيئ {ولا تنهرهما} أي: ولا يصدر منك إليهما فعل قبيح، كما قال عطاء بن أبي رباح في=

کرنے کی غرض سے آٹھ دس ہزار روپیہ کا مالک بنا رہا ہے، تو باپ اس کا مالک بن جائے گا، مالک بن جانے کے بعد حج فرض ہونے کی شرائط میں یہ ہے کہ آدمی پر قرض نہ ہو اور آمد و رفت کا ضروری خرچ موجود ہو، نیز حج میں پوری مدت قیام کا اپنے بال بچوں کے لیے بھی خرچ موجود ہو؛ اب باپ کو دس ہزار روپیہ کا مالک بنانے کے بعد ان میں سے سات ہزار روپیہ سے اپنا قرض ادا کرے گا، تو صرف تین ہزار روپے بچیں گے، جن سے یقیناً حج کے سفر میں آمد و رفت کا خرچ پورا نہیں ہوگا؛ اس لیے باپ پر حج فرض نہیں ہوگا۔[۲] نیز قرض کی ادائیگی حج سے پہلے ضروری ہے؛ اس لیے لڑکے کا اپنے باپ کو حج ادا کرنے کی تاکید کرنا درست نہیں؛ بل کہ لڑکے کے لیے ضروری ہے کہ باپ کو پہلے اپنے قرض سے خلاصی دلائے۔ (شامی)[۳] پھر حج کی ادائیگی کے لیے درخواست کرے؛ لیکن قرض کے باوجود اگر حج ادا کرے گا، تو حج فرض ادا ہو جائے گا۔[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= قوله: {ولا تنهرهما} أي: لا تنفض يدك علي والديك.ــــــــــــــــ ولما نهاه عن القول القبيح والفعل القبيح، أمره بالقول الحسن والفعل الحسن فقال: {وقل لهما قولا كريما} أي: لينا طيبا حسنا بتأدب وتوقير وتعظيم.

{واخفض لهما جناح الذل من الرحمة} أي: تواضع لهما بفعلك {وقل رب ارحمهما} أي: في كبرهما وعند وفاتهما {كما ربياني صغيرا}. (تفسير القرآن العظيم-أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۵/ ۶۴، سورة الإسراء: ۲۴، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: رغم أنفه، ثم رغم أنفه، ثم رغم أنفه، قيل: من؟ يا رسول الله قال: من أدرك والديه عند الكبر، أحدهما أو كليهما، ثم لم يدخل الجنة. (الصحيح لمسلم: ۲/ ۳۱۴، رقم الحديث: ۹، ۱۰ (۲۵۵۱)، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل صلة أصدقاء الأب والأم ونحوهما، ط: ديوبند)

(۲) ولو وهب الأب لابنه مالا يحج به لم يجب قبوله لأن شرائط الوجوب لا يجب تحصيلها وهذا منها باتفاق الفقهاء خلافا للأصوليين. (الدر المختار)ــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله ولو وهب الأب لابنه إلخ) وكذا عكسه وحيث لا يجب قبوله مع أنه لا يمن أحدهما على الآخر يعلم حكم الأجنبي بالأولى ومراده إفادة أن القادر على الزاد والراحلة لا بد فيها من الملك دون الإباحة والعارية كما قدمناه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۱، كتاب الحج، مطلب فيمن حج بمال حرام، ط: دار الفكر-بيروت)

[۳] (فضلا عما لا بد منه) كما مر في الزكاة. (الدر المختار)ــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله كما مر في الزكاة) أي من بيان ما لا بد منه من الحوائج الأصلية كفرسه وسلاحه وثيابه وعبيد خدمته وآلات حرفته وأثاثه وقضاء ديونه وأصدقته ولو مؤجلة كما في اللباب وغيره والمراد قضاء ديون العباد ولذا قال في اللباب أيضا وإن وجد مالا وعليه حج وزكاة يحج به قيل إلا أن يكون المال من جنس ما تجب فيه الزكاة فيصرف إليها. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۱، كتاب الحج، مطلب فيمن حج بمال حرام، ط: دار الفكر-بيروت)

(۴) وله أن يحج وعليه دين لا وفاء له، وإن كان في ماله وفاء بالدين يقضي الدين ولا يحج، ويكره الخروج إلى الغزو=

[۴۷] حج کے لیے دی گئی رقم سے قرض ادا کرنا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۶۵۸- سوال: لڑکے نے باپ کو آٹھ نو ہزار روپیہ کا صرف اور صرف حج ادا کرنے کے لئے مالک بنایا ہے اور اس نے اپنے باپ سے یہ کہا ہے کہ قرض کا معاملہ آپ جانیں؛ میں تو آپ کو یہ رقم صرف حج ادا کرنے ہی کے لیے دے رہا ہوں، تو ان حالات میں کیا باپ پر حج فرض ہو جائے گا؟ احقر احمد داوجی دیسائی (صوفی)

الجواب حامداومصلیا:

ضرورت کے وقت باپ اپنے بیٹے کے مال کو اپنے مصرف میں لاسکتا ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: **أنت و مالك لأبيك.** (الحدیث)[۱] تم اور تمہارا مال؛ دونوں تمہارے باپ کے لیے ہیں۔

لڑکا، باپ کو حج کی نیت سے جس رقم کا مالک بنائے گا، باپ اس کا مالک بن جائے گا؛ اس کے بعد باپ کے لیے مذکورہ رقم کا حج کے لیے خرچ کرنا ضروری نہیں، قرض کی ادائیگی کے لیے بھی استعمال کرے تو جائز ہوگا۔[۲]

=و الحج لمن عليه الدين، و إن لم يكن عنده مال مالم يقض دينه إلا بإذن الغرماء. (قاضي خان على هامش الهندية: ۱/۱۳۱، كتاب الحج، فصل في المقطعات، ط: زكريا - ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۲۱، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۵۶، كتاب الحج، مطلب فيمن حج بمال حرام، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) مکمل روایت اس طرح ہے:

عن جابر بن عبد الله، أن رجلا قال: يا رسول الله إن لي مالا و ولدا، و إن أبي يريد أن يجتاح مالي، فقال: أنت و مالك لأبيك. (سنن ابن ماجة: ۲/۱۶۵، رقم الحديث: ۲۲۹۱، أبواب التجارات، باب ما للرجل من مال ولده، و رواه عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، برقم: ۲۲۹۲، ط: ديوبند☆ سنن أبي داود: ۲/۴۹۸، رقم الحديث: ۳۵۳۰، كتاب البيوع، باب في الرجل يأكل من مال ولده، عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، ط: ديوبند)

(۲) لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲ھ): ۴/۵۰۲، أول كتاب البيوع، و انظر: ۵/۵۱، باب البيع الفاسد، مطلب: تعريف المال، ط: دار الفكر - بيروت)

و الحاصل أن القياس في جنس هذه المسائل أن يفعل المالك ما بدا له مطلقا لأنه متصرف في خالص ملكه. (المصدر السابق: ۵/۴۴۸، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي، مسائل متفرقة، مطلب: اقتسموا دارا و أراد كل منهم فتح باب لهم ذلك☆ فتح القدير: ۷/۳۲۶، كتاب أدب القاضي، باب التحكيم، مسائل شتى من كتاب القضاء، ط: دار الفكر - بيروت)

اور ذمہ میں قرض ہونے کی وجہ سے حج فرض بھی نہیں ہوگا۔ (☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۸] حج فرض چھوڑ کر محض عمرہ کرنے والے کا شرعی حکم

۱۶۵۹- سوال: حج کی ادائیگی سے قبل عمرہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ میں نے ایسا پڑھا ہے کہ امت محمدی کے آزاد فرد پر، جب کہ وہ صاحب نصاب ہو اور زاد و راحلہ پر قادر ہو، حج فرض عین ہو جاتا ہے، جب کہ عمرہ نفلی عمل و عبادت ہے۔

آج کل بعض مسلمان بھٹکتے بھٹکتے مکہ مکرمہ پہنچ جاتے ہیں، موسم حج کے آنے میں کچھ وقت رہتا ہے، تو وہ لوگ صرف عمرہ کر کے واپس آ جاتے ہیں اور حج کرنے کی کوئی پرواہ نہیں کرتے ہیں، ایسے لوگوں کا کیا حکم ہے؟ امید ہے کہ جواب عنایت فرما کر ممنون کریں گے۔

الجواب حامداومصليا:

حج اور عمرہ دونوں مستقل عبادت ہیں، عمرہ سنت مؤکدہ ہے، کوئی مکہ مکرمہ پہنچ جائے، خواہ غریب ہو یا مال دار، اس پر حج فرض ہو جائے گا؛ [بہ شرطیکہ کوئی مانع موجود نہ ہو، اور موسم حج کو اس نے مکہ مکرمہ میں پا لیا ہو] البتہ وہ صرف عمرہ کر کے واپس چلا جائے گا، تو اس کا عمرہ ادا ہو جائے گا، مگر حج ادا کیے بغیر واپس چلے جانے کی وجہ سے وہ گنہ گار ہوگا۔ (۱)

ایک مسلمان کی شان تو یہی بات ہے کہ وہ فضول خرچی سے اپنے آپ کو بچائے، البتہ گھومتے

(☆☆☆) ويكره الخروج إلى الغزو و الحج لمن عليه الدين، و إن لم يكن عنده مال مالم يقض دينه إلا بإذن الغرماء. (قاضي خان على هامش الهندية: ۱/۱۳۱، كتاب الحج، فصل في المقطعات، ط: زكريا - ديوبند☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۲۱، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۵۶، كتاب الحج، مطل فيمن حج بمال حرام، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) (قوله: ومن دخل مكة بغير إحرام ثم خرج من عامه) حاصل الأحكام الكائنة هنا أربعة. أحدها: أنه لا يجوز؛ للآفاقي دخول مكة بغير إحرام. ثانيها: أن من دخلها بلا إحرام يجب عليه إما حجة أو عمرة... ثالثها: أنه إذا خرج من عامه ذلك إلى الميقات وحج حجة الإسلام سقط ما وجب عليه بدخول مكة بلا إحرام. رابعها: أنه إذا خرج بعد مضي تلك السنة لا يسقط. (فتح القدير: ۳/۱۱۱، كتاب الحج، باب مجاوزة الوقت بغير إحرام، ط: دار الفكر - بيروت☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/۵۲-۵۵۱، كتاب الحج، الفصل الرابع في بيان مواقيت الإحرام، ط: زكريا - ديوبند)

پھرتے بھی اگر عمرہ کرلے گا، تو عمرہ ادا ہوجائے گا، بھیدوں کا جاننے والا خدائے برحق ہے، ہمارے لیے کسی سے بدگمان ہونا درست نہیں، ہر مومن کے متعلق اچھا خیال رکھنے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے اور قرآن مجید میں بھی بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۹] وجوب حج میں بالغ لڑکا مستقل بالذات ہے

۱۶۶۰- سوال: زید عاقل و بالغ ہے اور وہ سعودی عرب میں رہتا ہے، ہندوستان میں اس کے والدین رہتے ہیں، ان کی مالی حیثیت اچھی نہیں ہے، جس کی وجہ سے انہوں نے حج نہیں کیا ہے، فی الحال کوئی آثار بھی نظر نہیں آرہے ہیں کہ مستقبل قریب میں وہ صاحب استطاعت ہوجائیں اور حج کرسکیں، ادھر بیٹے زید کے پاس حج کی رقم کا نظم ہوچکا ہے، اس نے اپنے حج کرنے کی منظوری ہندوستان میں موجود اپنے والدین سے حاصل کرلی ہے اور والدین نے بھی اس کو بہ خوشی حج کرنے کی اجازت دے دی ہے، لہٰذا زید حج کے لیے جارہا ہے، تو یہ اس کا حج فرض کہلائے گا یا نفل؟ نیز بالغ اولاد حج، زکوۃ، فطرے اور قربانی کے باب میں مستقل ہیں یا اپنے والدین کے تابع؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

جب بچہ بالغ ہوجائے، تو وہ مستقل بالذات ہوجاتا ہے، اس لیے شریعت کی طرف سے عائد ہونے والی ذمے داری اسے خود ادا کرنی پڑتی ہے، ورنہ شرعا اس سے باز پرس ہوگی، مثلاً فرض نماز ادا نہ کرے، تو شرعا وہ خود جواب دہ ہوگا، روزہ نہ رکھے، تو اس کی جواب دہی و ذمہ داری خود اس کے کندھے پر ہوگی، ہاں جب تک بچہ ہے، بالغ نہیں ہوا، اس وقت تک وہ احکام شرع کا مکلف نہیں ہے۔ (۱)

(☆☆☆) يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾. (۴۹-الحجرات: ۱۲)

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- عن النبي -صلى الله عليه وسلم- قال: إياكم والظن، فإن الظن أكذب الحديث، ولا تحسسوا، ولا تجسسوا، ولا تحاسدوا، ولا تدابروا، ولا تباغضوا، وكونوا عباد الله إخوانا. (صحيح البخاري: ۸۹۶/۲، رقم الحديث: ۶۰۶۴، كتاب الأدب، باب ما ينهى عن التحاسد والتدابر، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۳۱۶/۲، رقم الحديث: ۲۸-(۲۵۶۳)، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم الظن، والتجسس، والتنافس، والتناجش ونحوها، ط: ديوبند)

(۱) عن علي -رضي الله عنه-، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: " رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتى يستيقظ، =

صورت مسئولہ میں حج، زکوۃ، صدقۂ فطر اور قربانی وغیرہ کی مکمل ذمہ داری اسی [زید] کے سر ہوگی، جب کہ وہ صاحب استطاعت ہو؛ لہٰذا زید نے جو حج کا ارادہ کیا ہے، وہ اسی کی طرف سے کہلائے گا، اس میں والدین کی اجازت ضروری نہیں ہے، بشرطیکہ والدین کو اس کی خدمت کی ضرورت نہ ہو۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۰] حج میں تجارت کرنے کا حکم

۱۶۶۱- سوال: ایک شخص فرض حج کے لیے بیت اللہ کے سفر پر جارہا ہے اور ساتھ میں تجارت کا مال بھی وہاں فروخت کرنے کے لیے لے جانا چاہتا ہے اور وہاں سے بہ غرض تجارت، کوئی مال خرید کر لانا چاہتا ہے، تو کیا اس کی اجازت ہے؟

=وعن الصبي حتى يحتلم، وعن المجنون حتى يعقل". (سنن أبي داود: ۲/ ۶۰۲، رقم الحديث: ۴۴۰۳، كتاب الحدود، باب في المجنون يسرق أو يصيب حدا، ط: ديوبند☆سنن الترمذي: ۱/ ۲۶۳، رقم الحديث: ۱۴۲۳، أبواب الحدود عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء فيمن لا يجب عليه الحد، ط: ديوبند☆ المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي- أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۶/ ۱۵۶، رقم الحديث: ۳۴۳۲، كتاب الطلاق، باب: من لا يقع طلاقه من الأزواج، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب☆سنن ابن ماجه: ۱/ ۱۴۷، رقم الحديث: ۲۰۴۱، كتاب الطلاق، باب طلاق المعتوه والصغير والنائم، عن عائشة رضي الله عنها، ط: ديوبند)

(۲) حج الفرض أولى من طاعة الوالدين، بخلاف النفل. (الدر المختار)ـــــــــ قال ابن عابدين: (قوله حج الفرض أولى من طاعة الوالدين) لأنه لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق سبحانه وتعالى لكن هذا إذا لم يضيعا بسفره لما قدمه أول الحج أنه يكره بلا إذن ممن يجب استئذانه أي كأحد الأبوين المحتاج إلى خدمته، وقدمنا أن الأجداد والجدات كالأبوين عند فقدهما (قوله بخلاف النفل) أي فإن طاعتهما أولى منه مطلقا كما قدمناه عن البحر عن الملتقط. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۲۰-۶۲۱، كتاب الحج، باب الهدي، فروع في الحج، قبيل: مطلب في تفضيل الحج على الصدقة، ط: دار الفكر☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۳۱۲، كتاب الحج، مسائل منثورة في كتاب الحج، ط: دار إحياء التراث العربي☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۲۱، كتاب المناسك، الباب الثالث في الإحرام، ط: دار الفكر - بيروت)

يكره الخروج إلى الحج إذا كره أحد أبويه وهو محتاج إلى خدمته، لا إن كان مستغنيا. (فتح القدير: ۲/ ۴۰۷، كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت)

وفي الخانية: ولو أراد الخروج إلى الحج وكره ذلك قالوا إن استغنى الأب عن خدمته فلا بأس، وإلا فلا يسعه الخروج. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۴۰۸، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر)

الجواب حامداومصلیا:

اگر سفر کا مقصد خالص تجارت ہے، اس طور پر کہ اگر تجارت نہ ہوتی تو یہ سفر ہی نہ کرتا، تو ایسی نیت سے حج کرنا بہت ہی برا اور ثواب سے محرومی کا سبب ہے اور اس صورت میں تجارت میں برکت نہیں ہوگی، اگر چہ حج کا فریضہ ذمے سے ساقط ہو جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حج ہی کی نیت سے سفر کر رہا ہے، اس طور پر کہ اگر سامان تجارت نہ بھی ہوتا، تب بھی اس سفر پر ضرور جاتا، تو اس صورت میں اگر پہلے سے نیت کر رکھی ہے کہ مکہ میں تجارت بھی کروں گا، تو یہ سفر حج کا تو ہے، مگر خالص نہیں ہے؛ چناں چہ اس صورت میں حج اور تجارت دونوں جائز ہے، مگر اخلاص کے خلاف ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ تجارت کی پہلے سے کوئی نیت نہیں تھی، مگر کسی چیز کی قیمت زیادہ مل رہی تھی، تو اسے فروخت کر دیا اور کوئی چیز سستی مل رہی تھی، تو اسے خرید لیا، تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اخلاص کے خلاف بھی نہیں، البتہ اگر بہ غرض تجارت نہ کوئی چیز لے جائے اور نہ لائے، یہ اخلاص کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ (تفسیر بیان القرآن: ۱/۱۳۰، تجارت در حج و وقوف عرفات ومزدلفہ، سورۂ بقرۃ، آیت نمبر: ۱۹۸) [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝. (۲-البقرۃ: ۱۹۸)

اس آیت ذیل میں حضرت تھانویؒ رقم طراز ہیں:

اگر مقصود اصلی حج سے تجارت ہی ہے، یا حج اور تجارت دونوں مساوی درجے میں ہیں، تو بے شک اخلاص کے خلاف ہے، اور حج کا ثواب کم ہو جائے گا، اور اگر اصلی مقصود حج ہے، اس طور پر کہ اگر سامان تجارت کا نہ رہے، تب بھی حج کو ضرور جائے، اور تجارت محض تابع ہے، تو اخلاص کے خلاف نہیں، بل کہ اگر اس کے ساتھ یہ نیت ہو کہ تجارت کے نفع سے حج میں اعانت ہوگی، تو اور اوپر سے تجارت میں ثواب ملے گا۔ (بیان القرآن- مولانا اشرف علی تھانوی (م: ۱۳۶۲ھ): ۱/۱۱۵، تجارت در حج و وقوف عرفات ومزدلفہ، ط: اشرفی بک ڈپو- دیوبند)

وقالوا أيضا إن من نوى الحج والتجارة لا ثواب له إن كانت نية التجارة غالبة أو مساوية. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/۴۲۵، كتاب الحظر والإباحة، ط: فصل في البيع، فرع: يكره إعطاء سائل المسجد، ط: دار الفكر- بيروت)

وبالجملة فهذه الآية نزلت ردا على من يقول: لا حج للتجار والأجراء والجمالين. ــــــــ والرواية الثالثة: أن عكاظ ومجنة وذا المجاز كانوا يتجرون في أيام الموسم فيها، وكانت معايشهم منها، فلما جاء الإسلام كرهوا أن يتجروا في الحج بغير إذن، فسألوا رسول الله صلى الله عليه وسلم فنزلت هذه الآية. ــــــــ والرواية الرابعة: قال مجاهد: إنهم كانوا لا يتبايعون في الجاهلية بعرفة ولا منى، فنزلت هذه الآية. ــــــــ إذا ثبت صحة هذا القول =

[۵۱] تجارت کی غرض سے حج کرنا

۱۶۶۲- سوال: تجارت وکاروبار کے لیے حج کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جائز نہیں، حرام ہے، حج جیسے مقدس عمل اور مسلم قوم کی صاف ستھری شبیہ کو بدنام کرنے کے مترادف ہے، اس مقصد سے سفرِ حج پر جانے والا سخت گنہ گار ہوگا، بغیر اخلاص کے حج قبول نہیں ہوتا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=فنقول: أكثر الذاهبين إلى هذا القول حملوا الآية على التجارة في أيام الحج. . . .

المسألة الثالثة: اتفقوا على أن التجارة إذا أوقعت نقصانا في الطاعة لم تكن مباحة، أما إن لم توقع نقصانا ألبتة فيها فهي من المباحات التي الأولى تركها؛ لقوله تعالى: وما أمروا إلا ليعبدوا الله مخلصين له الدين[البينة:5] والإخلاص أن لا يكون له حامل على الفعل سوى كونه عبادة، ـــــ وقال عليه السلام حكاية عن الله تعالى: أنا أغنى الأغنياء عن الشرك، من عمل عملا أشرك فيه غيري تركته وشركه. ـــــ والحاصل أن الإذن في هذه التجارة جار مجرى الرخص. (مفاتيح الغيب = التفسير الكبير - أبو عبد الله محمد بن عمر بن الحسن، التيمي الرازي الملقب بفخر الدين الرازي خطيب الري (م:۶۰۶هـ): ۵/ ۳۲۳-۳۲۴، سورة البقرة، رقم الآية: ۱۹۸، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

قال الله عقيب ذكر الحج، والتزود له: {ليس عليكم جناح أن تبتغوا فضلا من ربكم} يعني المخاطبين بأول الآية وهم المأمورون بالتزود للحج، وأباح لهم التجارة فيه، وروى أبو يوسف عن العلاء بن السائب عن أبي أمامة قال: قلت لابن عمر: إني رجل أكري الإبل إلى مكة أفيجزي من حجتي؟ قال: ألست تلبي فتقف وترمي الجمار؟ قلت: بلى. قال: سأل رجل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن مثل ما سألتني، فلم يجبه حتى أنزل الله هذه الآية: {ليس عليكم جناح أن تبتغوا فضلا من ربكم} فقال: "أنتم حاج". وقال عمرو بن دينار: قال ابن عباس: كانت ذو المجاز وعكاظ متجرا للناس في الجاهلية، فلما كان الإسلام تركوا حتى نزلت: {ليس عليكم جناح أن تبتغوا فضلا من ربكم} في مواسم الحج. وروى سعيد بن جبير عن ابن عباس قال: أتاني رجل فقال: إني آجرت نفسي من قوم على أن أخدمهم ويحجون بي، فهل لي من حج؟ فقال ابن عباس: هذا من الذين قال الله تعالى: {لهم نصيب مما كسبوا} [البقرة:202] وروي نحو ذلك عن جماعة من التابعين، منهم الحسن وعطاء ومجاهد وقتادة. (أحكام القرآن - أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م:۳۷۰هـ): ۱/ ۳۷۴، باب التجارة في الحج، ت: عبد السلام محمد علي شاهين، ط: دار الكتب العلمية)

(۱) مفتی صاحبؒ کے بیان کردہ مسئلہ کو اس صورت پر محمول کیا جائے گا کہ ''ایک شخص کا مقصود حج سے صرف تجارت ہو، کہ لوگ حاجی ہونے کی وجہ سے اعتماد کرنے لگیں گے، یا حج کے موقع پر بڑے تجار سے ملاقات ہوگی اور تجارت کو فروغ ملے گا، عبادت اور فرض کی ادائیگی نہ ہو''، ظاہر ہے کہ ایسی نیت سے حج کرنا درست نہیں، اگر کوئی کرلے، تو ارکان کی ادائیگی کی وجہ سے چاہے حج درست ہوجائے؛ لیکن اللہ کے یہاں اس کا عمل شاید قبولیت حاصل نہ کرسکے۔ ورنہ اصل مسئلہ وہ ہے، جسے سوال سابق میں=

[۵۲] حج کا سفر اور تجارت

۱۶۶۳-سوال: شہر کے بہت سے اہل ثروت، بہ غرض تجارت مال لینے کے لیے حج کے سفر پر جاتے ہیں، بعض اس غرض سے دس دس مرتبہ حج کر چکے ہیں، لیکن ان کے رکوع اور سجدہ میں بالکل سکون واطمینان نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ اس قدر جلد رکوع اور سجدہ کرتے ہیں، شاید تین مرتبہ درست طریقے سے سبحان اللہ بھی نہیں پڑھ پاتے ہوں گے، ایسے لوگوں کو دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے، بھلا ان کا حج کس طرح درست ہوگا؟ امید ہے کہ آپ بتائیں گے کہ ان حضرات کا حج ہوگا یا نہیں؟ اگر کوئی ہر سال تجارت کی غرض سے حج کرے، تو کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

کون شخص حج، صدقہ وخیرات، اور نماز و دیگر عبادت کو نمائش و دکھلاوے کی خاطر، تجارت کو فروغ دینے کے لیے یا شہرت حاصل کرنے کے لیے ادا کر رہا ہے، اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، جو ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے، آپ کا کسی پر حکم لگانا جائز نہیں ہے۔[۱]

البتہ آپ کا یہ لکھنا کہ بہ غرض تجارت حج میں جانا جائز ہے یا نہیں، تو یاد رکھیں! امام بخاریؒ نے سب سے پہلی حدیث "إنما الأعمال بالنيات"[۲] بیان فرمائی ہے، جس کا مطلب ہے کہ اعمال کا دارومدار نیت

= بیان کیا گیا ہے: عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " قال الله تبارك وتعالى: أنا أغنى الشركاء عن الشرك، من عمل عملا أشرك فيه معي غيري، تركته وشركه ". (الصحيح لمسلم: ۲/۴۱۱، رقم الحديث: ۴۶-(۲۹۸۵)، كتاب الزهد، باب تحريم الرياء، ط: ديوبند)

المسألة الثالثة: اتفقوا على أن التجارة إذا أوقعت نقصانا في الطاعة لم تكن مباحة، أما إن لم توقع نقصانا ألبتة فيها فهي من المباحات التي الأولى تركها، لقوله تعالى: وما أمروا إلا ليعبدوا الله مخلصين له الدين [البينة:5] والإخلاص أن لا يكون له حامل على الفعل سوى كونه عبادة. (مفاتيح الغيب = التفسير الكبير - أبو عبد الله محمد بن عمر بن الحسن، التيمي الرازي الملقب بفخر الدين الرازي خطيب الري (م: ۶۰۶ھ): ۵/۳۲۳-۳۲۴، سورة البقرة، رقم الآية: ۱۹۸، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(۱) وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْأَرْضِ ۖ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝۳ (۶-الأنعام: ۳)

(۲) علقمة بن وقاص الليثي، يقول: سمعت عمر بن الخطاب رضي الله عنه على المنبر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها، أو إلى امرأة ينكحها، فهجرته إلى ما هاجر إليه. (صحيح البخاري: ۱/۲، رقم الحديث: ۱، كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم؟، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/۱۴۰-۱۴۱، رقم الحديث: ۱۵۵-(۱۹۰۷)، كتاب الإمارة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: إنما الأعمال بالنية، وأنه يدخل فيه الغزو وغيره من الأعمال، ط: ديوبند)

پر ہے، جیسی نیت ہوگی، ویسی ہی عمل کی مقبولیت ہوگی، اب آپ خود سوچ لیں، اگر مقصد محض تجارت ہی ہو، تو حج کا ثواب کہاں سے ملے گا، ہاں حج کے ارادے سے کوئی جائے اور ضرورت کی چیزیں بھی خرید لائے، تو کوئی حرج نہیں۔ (☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۴] رشوت دے کر حج کا فارم منظور کروانا

۱۶۶۴- سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام درج ذیل مسئلہ میں کہ:

ایک شخص ممبئی کا رہنے والا ہے، اور اس پر حج فرض ہے؛ لیکن ممبئی سے بحری جہاز کے لیے حاجیوں کی ہونے والی قرعہ اندازی میں اس کا فارم منظور نہیں ہوا، اس کو چاہیے تھا کہ ہوائی جہاز سے چلا جاتا، ہوائی جہاز سے جانے والے کم ہوتے ہیں، اس لیے بہ سہولت اس کا فارمِ حج منظور ہو جاتا؛ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بل کہ اس نے دوسرے صوبہ سے رشوت دے کر اور دوسروں کا حق تلف کر کے فارم منظور کروایا ہے، تو کیا اس طرح سے فارم منظور کروانا جائز ہے؟ اگر اس طرح کوئی سفر حج میں جائے، تو وہ اپنے فریضہ سے بری الذمہ ہوگا یا نہیں؟ براۓ کرم مفصل اور مدلل جواب عنایت فرمائیں، کرم ہوگا۔

الجواب حامداومصلیا:

اگر ہوائی جہاز سے جانے کی قدرت نہیں ہے اور بحری جہاز سے ٹکٹ مل نہیں سکا، تو امسال جانا ضروری نہیں ہے، آئندہ سال جائے۔ (۱) اُسی سال بحری جہاز سے جانے کے لیے رشوت دینا جائز نہیں ہے،

(☆☆) مسئلے کی مکمل تفصیل وتخریج کے لیے رجوع کریں عنوان ''حج میں تجارت کرنے کا حکم'' اور اس کے حواشی۔

(۱) وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا. (۳-آل عمران:۹۷)

قال اللہ تعالی: وللہ على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا. قال أبو بكر هذا ظاهر في إيجاب فرض الحج على شريطة وجود السبيل إليه، والذي يقتضيه من حكم السبيل أن كل من أمكنه الوصول إلى الحج لزمه ذلك إذ كانت استطاعة السبيل إليه هي إمكان الوصول إليه . . . وقد جعل النبي صلى اللہ عليه وسلم من شرط استطاعة السبيل إليه، وجود الزاد والراحلة.ـــــــ وروى أبو إسحاق عن الحارث عن علي عن النبي صلى اللہ عليه وسلم أنه قال: من ملك زادا وراحلة يبلغه بيت اللہ ولم يحج فلا عليه أن يموت يهوديا أو نصرانيا.ـــــــ وذلك أن اللہ تعالى يقول في كتابه: وللہ على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا.ـــــــ وروى إبراهيم ابن يزيد الجوزي عن محمد بن عباد عن ابن عمر قال: سئل رسول اللہ صلى اللہ عليه وسلم عن قوله عز وجل: وللہ على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا. قال السبيل إلى الحج الزاد والراحلة. (أحكام القرآن-أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م: ۳۷۰هـ): ۲/۳۰۸، باب فرض الحج، آل عمران: ۹۷، ت: محمد صادق القمحاوي، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

خود رشوت دینا ناجائز ہے، اگر اس میں دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہو، تو اس کی قباحت مزید بڑھ جاتی ہے۔[۲]

اگر کوئی اس طرح حج کے لیے گیا، تو سخت گنہ گار ہوگا؛ اس کا یہ فعل ناجائز ہے؛ لیکن اس کے ذمے سے حج کا فریضہ ساقط ہو جائے گا اور اس کا حج درست ہوگا۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۴] قرض کی رقم سے حج کرنا

۱۶۶۵- سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ذیل کے مسئلہ کے بارے میں کہ:

سو آدمی مل کر مہینے کی مقررہ تاریخ پر [ہر نفر پانچ سو روپئے کے حساب سے] جمع کرتے ہیں، ہر ایک آدمی کے نام کا قرعہ بنایا جاتا ہے، پھر قرعہ اندازی کے بعد جس کا نام نکلتا ہے، اس کو جمع شدہ رقم دے دی جاتی ہے، مثلاً پہلی مرتبہ زید کا نام نکلا، تو اس کو کل رقم دے دی جائے گی اور اس کے نام کا قرعہ نہیں ڈالا جائے گا، اسی طرح آئندہ ماہ بھی بقیہ آدمیوں کے نام کا قرعہ ڈالا جاتا ہے اور مذکورہ رقم قرعہ اندازی میں جس کا نام نکلے اسے دے دیا جاتا ہے اور اس کا نام فہرست سے کم ہوتا رہتا ہے، اس طرح ہر ایک آدمی کو جب تک اپنی حاصل شدہ رقم کی پوری ادائیگی نہ ہو، پانچ پانچ سو روپئے ہر مہینہ ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔

---

(۲) عن عبد الله بن عمرو، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي. (سنن أبي داود: ۲/ ۵۰۴، رقم الحديث: ۳۵۸۰، كتاب القضاء، باب في كراهية الرشوة، ط: ديوبند☆سنن الترمذي: ۱/ ۲۴۸، رقم الحديث: ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، أبواب الأحكام، باب ما جاء في الراشي والمرتشي في الحكم، ط: ديوبند☆سنن ابن ماجه: ۲/ ۱۶۷، رقم الحديث: ۲۳۱۳، كتاب الأحكام، باب التغليظ في الحيف والرشوة، ط: ديوبند)

قالوا: بذل المال لدفع الظلم عن نفسه وماله لا يكون رشوة في حقه وبذل المال لاستخراج حق له على آخر يكون رشوة. (الفتاوى الهندية: ۶/ ۱۵۰، كتاب الوصايا، الباب التاسع في الوصي ومايملكه، ط: دار الفكر- بيروت)

(۳) (وقدرة زاد وراحلة)... وفي القهستاني وفيه إشارة إلى أنه لا يجب بالمال الحرام لكن لو حج به جاز؛ لأن المعاصي لا تمنع الطاعات فإذا أتى بها لا يقال إنها غير مقبولة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بـ 'شيخي زاده'، يعرف بـ 'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۶۱، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي)

ولا تنافي بين سقوطه، وعدم قبوله، فلا يثاب لعدم القبول، ولا يعاقب في الآخرة عقاب تارك الحج. (فتح القدير- كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۲/ ۴۰۷، كتاب الحج، ط: دار الفكر☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۲۰، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج، ط: دار الفكر☆ البحر الرائق: ۲/ ۳۳۲، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ ہر ایک آدمی کو طے شدہ رقم مل جایا کرتی ہے اور ہر شخص کی جانب سے حاصل شدہ پوری رقم کی ادائیگی بھی ہو جاتی ہے، مذکورہ صورت پر ہر شریک راضی ہوتا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ مثلاً زید کو پہلے ہی مہینے پچاس ہزار روپئے مل گئے، حالاں کہ اس کے ۵۰۰/روپے ہی جمع ہوئے ہیں، تو ان پیسوں سے زید حج کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر کر سکتا ہے، تو اس کے ذمے سے فریضۂ حج ساقط ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

یہ باہمی تعاون کی صورت ہے اور جس شخص کو یہ رقم ملتی ہے، اس کو بہ طور قرض ملتی ہے، جس کی باری دیر سے آتی ہے، وہ اس تاخیر پر اپنی رضامندی ظاہر کر چکا ہے؛ اس لیے اس رقم سے حج کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ اس رقم سے اس پر حج فرض نہیں ہوتا ہے، تاہم اپنے حج فرض کی نیت سے حج کرے گا، تو فریضہ حج ساقط ہو جائے گا۔[1] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۵] جس مریض کی صحت یابی کی امید نہ ہو، اس کی طرف سے حج بدل کرنا

۱۶۶۶- سوال: میری ایک بہن ہے، طویل عرصہ سے بیمار ہے، بہت کم چل پھر سکتی ہے؛ وہ اس لائق نہیں ہے کہ خود سے حج کے لیے جا سکے، کیا اس کی طرف سے حج بدل درست ہے؟

میری بہن کے پاس زیور ہے، کیا اس کی وجہ سے اس پر حج فرض ہوگا۔

الجواب حامداومصلیا:

اگر کمزوری اور بیماری ایسی ہو کہ زندگی میں صحت کی اور حج کے قابل ہونے کی کوئی امید باقی نہ رہے، تو ایسے عاجز ومعذور کی طرف سے حج بدل جائز ہے، اگر حج بدل کے بعد آپ کی بہن کو خود سے حج کی ادائیگی

---

[۱] (و الفقير) أي الحقيقي و هو من ليس له مال (و من بمعناه) أي كمن له مال لكنه مستغرق بالديون, أو بحقوق المسلمين (إذا حج سقط عنه الفرض إن نواه أو اطلق النية حتى لو استغنى بعد ذلك لا يجب على ثانيا) [مناسك الملا علي القاري مع حاشية إرشاد الساري، ص:۸۸، باب شرائط الحج، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة☆ مجمع الأنهر: ۲۶۰/۱، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي☆ منحة الخالق على البحر الرائق: ۳۳۵/۲، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي]

پر قدرت حاصل ہوگئی، تو دوبارہ حج کرنا ضروری ہوگا۔[1]

زیورات خود آپ کی بہن کی ملکیت میں ہوں اور ان پر کوئی قرض نہ ہو، نیز بیماری میں خرچ کرنے کی بھی اس کو کوئی ضرورت نہ ہو، گویا رقم ضرورت سے زائد ہو، اور اس کی مالیت اس قدر ہو کہ سفر حج کا پورا خرچ نکل آئے، تو ایسی صورت میں حج فرض ہوجاتا ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۶] گناہ میں مبتلا شخص سے قطع تعلق کرنا اور اسی حالت میں حج ادا کرنا

۱۶۶۷- سوال: میرا ایک بھائی ہے، ان پر حج فرض ہو چکا ہے، وہ اس سال حج کرنے جائیں گے؛ لیکن آج سے تین چار ماہ قبل انہوں نے اپنے دوسرے نمبر کے لڑکے کی شادی کی، معاشرہ کے بعض رسم و رواج کے سبب ان سے، ان کا بڑا لڑکا، والدین، تین بھائی اور بہن و بہنوئی ان سے ناراض ہوگئے ہیں، اور نکاح میں بھی حاضر نہیں رہے، (یعنی آکر چلے گئے)

میرے بڑے بھائی -جو حج پر جانے والے ہیں- کا ناراض خاندان والوں سے خط و کتابت، گفتگو

(۱) (العبادة المالية) كزكاة وكفارة (تقبل النيابة) عن المكلف (مطلقا) عند القدرة والعجز... (والبدنية كصلاة وصوم (لا) تقبلها (مطلقا، والمركبة منهما) كحج الفرض (تقبل النيابة عند العجز فقط) لكن (بشرط دوام العجز إلى الموت) لأنه فرض العمر حتى تلزم الإعادة بزوال العذر. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۵۹۸-۵۹۷، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۳/ ۶۵، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۱/ ۳۰۹، كتاب الحج، فصل في الحج عن الميت، ط: زكريا- ديوبند)

(۲) وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا. (۳-آل عمران: ۹۷)

قال الله تعالى: ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا. قال أبو بكر هذا ظاهر في إيجاب فرض الحج على شريطة وجود السبيل إليه، والذي يقتضيه من حكم السبيل أن كل من أمكنه الوصول إلى الحج لزمه ذلك إذ كانت استطاعة السبيل إليه هي إمكان الوصول إليه ... وقد جعل النبي صلى الله عليه وسلم من شرط استطاعة السبيل إليه، وجود الزاد والراحلة. ــــــ وروى أبو إسحاق عن الحارث عن علي عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: من ملك زادا وراحلة يبلغه بيت الله ولم يحج فلا عليه أن يموت يهوديا أو نصرانيا. ــــــ وذلك أن الله تعالى يقول في كتابه: ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا. ــــــ وروى إبراهيم ابن يزيد الجوزي عن محمد بن عباد عن ابن عمر قال: سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن قوله عز وجل: ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا. قال السبيل إلى الحج الزاد والراحلة. (أحكام القرآن-أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص الحنفي (م: ۳۷۰هـ): ۲/ ۳۰۸، باب فرض الحج، آل عمران: ۹۷، ت: محمد صادق القمحاوي، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

اور آمد ورفت کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، اب اگر خود رشتہ دار کی ملاقات کے لیے جاتے ہیں، یا والدین سے معافی تلافی کرتے ہیں، تو عزت داؤ پر لگتی ہے، ویسے ان میں سے کوئی بے حرمتی تو نہیں کرے گا؛ لیکن ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی عزت گھٹ جائے گی۔

والدین ۸۰-۸۵ سال کی عمر کو پہنچ چکے ہیں، جن کا گذارہ لڑکے کا تعاون اور ۳ر۱ ایکڑ زمین ہے۔ زمین کی آمدنی نہ ہونے کے برابر ہے۔اصل گذارہ تو لڑکے کے تعاون سے ہوتا ہے، جب سے میرے بڑے بھائی کی اپنے والدین سے لاتعلقی ہوئی ہے۔تب سے انہوں نے اپنی ماہانہ امداد بھی بند کردی ہے؛ اس لیے والدین کی ناراضگی کچھ زیادہ ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اسی حالت میں- جب کہ خاندان والوں سے قطع تعلق ہے- میرے بھائی حج میں چلے جائیں، تو حج قبول ہوگا یا نہیں؟ امید ہے کہ جواب سے سرفراز فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

الجواب حامداو مصلیا:

اگر کوئی والدین یا رشتہ دار کے ساتھ تعلق اور بات چیت اس وجہ سے بند کردے، کہ سامنے والا گناہ میں مبتلا ہے، تو جائز ہے، تعلق توڑنے والا گنہ گار نہیں ہوگا؛ بل کہ گناہ کرنے والے کے ساتھ تعلق توڑنا ضروری ہے، معاشرہ کی ناجائز رسومات اور بے حیائی کے کام میں ساتھ دینا ناجائز اور حرام ہے: **فلا تقعد بعد الذکر مع القوم الظالمین.** [۱] نصیحت کرنے کے بعد ظالم قوم کے ساتھ مت بیٹھنا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے لڑکے کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنائی کہ اگر عورتیں مسجد میں جانے کی اجازت مانگیں، تو مت روکنا، ان کے فرزند نے کہا کہ: ''میں تو اجازت نہیں دوں گا''، اس پر حضرت عبداللہؓ نہایت خفا ہوئے، اور اپنے بیٹے سے لاتعلق ہو گئے۔ (ابن ماجہ) [۲]

---

(۱) وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَاِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۝۶۸. (۶-الأنعام:۶۸)

ترجمہ: اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے، جو ہماری آیات میں عیب جوئی کر رہے ہیں، تو ان لوگوں سے کنارہ کش ہوجا؛ یہاں تک کہ وہ کوئی اور بات میں لگ جائیں اور اگر تجھ کو شیطان بھلادے، تو یاد آنے کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس مت بیٹھ۔ (بیان القرآن، آیت نمبر:۶۸)

(۲) عن ابن عمر، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا تمنعوا إماء الله أن يصلين في المسجد، فقال ابن له: إنا لنمنعهن، فقال: فغضب غضبا شديدا، وقال: أحدثك عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وتقول: إنا لنمنعهن؟. (سنن ابن ماجه: ۱/ ۳، رقم الحديث: ۱۶، افتتاح الكتاب في الإيمان وفضائل الصحابة والعلم، باب تعظيم حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم، والتغليظ على من عارضه، ط: ديوبند)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مغفلؓ نے اپنے بھتیجے کو کنکری پھینکنے سے روکا، ان کے بھتیجے نے پھر سے کنکری پھینکنا شروع کیا، تو انہوں نے فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنا رہا ہوں اور تم اس پر عمل نہیں کر رہے ہو، بالآخر لاتعلق ہو گئے اور بات چیت بند کر دی۔ (۳)

حضرت عائشہؓ نے اپنے بھانجے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ سے ایک دینی معاملے کی خاطر بات نہ کرنے کی قسم کھالی۔ (حدیث) [۴]

اس لیے گناہ کرنے والے سے تعلق توڑنا جائز ہے؛ لیکن والدین امداد کے مستحق ہوں، تو امداد کرنا ضروری ہے، جس کی صراحت حدیث میں آئی ہے۔ (۵)

---

(۳) عن سعيد بن جبير، عن عبد الله بن مغفل، أنه كان جالسا إلى جنبه ابن أخ له، فخذف، فنهاه، وقال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عنها وقال: إنها لا تصيد صيدا، ولا تنكي عدوا، وإنها تكسر السن، وتفقأ العين، قال: فعاد ابن أخيه يخذف فقال: أحدثك أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عنها، ثم عدت تخذف، لا أكلمك أبدا. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۲۳، رقم الحديث: ۵۴۷۹، كتاب الذبائح والصيد، باب الخذف والبندقة ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۵۲، رقم الحديث: ۵۶-(۱۹۵۴)، كتاب الصيد والذبائح وما يؤكل من الحيوان، باب إباحة ما يستعان به على الاصطياد والعدو، وكراهة الخذف، ط:: ديوبند☆سنن ابن ماجه: ۱/ ۳، رقم الحديث: ۱۷، افتتاح الكتاب في الإيمان وفضائل الصحابة والعلم، باب تعظيم حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم، والتغليظ على من عارضه، واللفظ لابن ماجه، ط: ديوبند)

[۴] عن عروة بن الزبير، قال: كان عبد الله بن الزبير أحب البشر إلى عائشة بعد النبي صلى الله عليه وسلم وأبي بكر، وكان أبر الناس بها، وكانت لا تمسك شيئا مما جاءها من رزق الله إلا تصدقت، فقال ابن الزبير: ينبغي أن يؤخذ على يديها، فقالت: أيؤخذ على يدي، علي نذر إن كلمته، فاستشفع إليها برجال من قريش، وبأخوال رسول الله صلى الله عليه وسلم خاصة فامتنعت، فقال له الزهريون أخوال النبي صلى الله عليه وسلم، منهم عبد الرحمن بن الأسود بن عبد يغوث، والمسور بن مخرمة: إذا استأذنا فاقتحم الحجاب، ففعل فأرسل إليها بعشر رقاب فأعتقتهم، ثم لم تزل تعتقهم حتى بلغت أربعين، فقالت: وددت أني جعلت حين حلفت عملا أعمله فأفرغ منه. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۹۷، رقم الحديث: ۳۵۰۵، كتاب المناقب، باب مناقب قريش، ط: ديوبند)

(۵) "وعلى الرجل أن ينفق على أبويه وأجداده وجداته إذا كانوا فقراء وإن خالفوه في دينه" أما الأبوان فلقوله تعالى: ﴿وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفاً﴾ [لقمان: من الآية 15] نزلت الآية في الأبوين الكافرين، وليس من المعروف أن يعيش في نعم الله تعالى ويتركهما يموتان جوعا، وأما الأجداد والجدات؛ فلأنهم من الآباء والأمهات، ولهذا يقوم الجد مقام الأب عند عدمه، ولأنهم سببوا الإحياء فاستوجبوا عليه الإحياء بمنزلة الأبوين، وشرط الفقر؛ لأنه لو كان ذا مال فإيجاب نفقته في ماله أولى من إيجابها في مال غيره، ولا يمنع ذلك باختلاف الدين لما تلونا. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۲/ ۲۹۲، باب النفقة، فصل: على الرجل أن =

عزت وذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہتا ہے، عزت سے نوازتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے، ذلیل ورسوا کردیتا ہے۔[۶]

معاشرے کی ظاہری عزت کی پرواہ کیے بغیر احکام شرع کی انجام دہی لازم ہے، دنیا میں ناک نہیں کٹتی، اس لیے آپ کے بھائی [اس یقین کے بعد کہ شاید اب ناراض رشتے دار احکام شرع کی پابندی کریں گے اور رسم ورواج سے اجتناب کریں گے] شرعی تقاضے کے مطابق دوری ختم کرلیں، تو اس سے بے عزتی نہیں ہوگی، بل کہ مزید عزت بڑھ جائے گی، نیز والدین کو بھی چاہیے کہ ناجائز کام چھوڑ دے اور رسم ورواج سے اجتناب کرے۔

ان سب کے باوجود اگر واقعی آپ کے بھائی خطا پر ہوں، اور اختلاف کو ختم کیے بغیر حج کو چلے جائیں، تب بھی ذمہ سے حج ساقط ہوجائے گا۔[۷] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۷] سعودی میں مقیم عجمیوں کے لیے پانچ سال کے اندر دوسرا حج کرنا

۱۲۶۸- سوال: سعودیہ میں مقیم عجمیوں کے لیے حکومت نے یہ قانون بنایا ہے کہ ایک مرتبہ کوئی

=ينفق على أبويه. . .، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۴/ ۳۰، كتاب النفقة، فصل في نفقة الأقارب، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الجوهرة النيرة: ۲/ ۸۳، كتاب النفقات، ط: المطبعة الخيرية)

(۶) ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾. (۳-آل عمران: ۲۶)

(اے محمد (ﷺ)) آپ (اللہ تعالیٰ سے) یوں کہیے کہ اے اللہ! مالک تمام ملک کے، آپ ملک جس کو چاہیں دے دیتے ہیں اور جس سے چاہے، ملک لے لیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں غالب کردیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں پست کردیتے ہیں، آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی، بلاشبہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ (ترجمہ: بیان القرآن-حضرت تھانویؒ)

(۷) لأن المعاصي لا تمنع الطاعات فإذا أتى بها لا يقال إنها غير مقبولة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بـ 'شيخي زاده'، يعرف بـ 'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۶۱، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي)

ولا تنافي بين سقوطه، وعدم قبوله، فلا يثاب لعدم القبول، ولا يعاقب في الآخرة عقاب تارك الحج. (فتح القدير-كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م: ۸۶۱هـ): ۲/ ۴۰۷، كتاب الحج، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۲۰، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۳۳۲، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[مقیم عجمی] حج کرلے، تو وہ پانچ سال تک حج نہیں کرسکتا، دریافت یہ کرنا ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی عجمی پانچ سال کے اندر دوسری مرتبہ حج کرے، تو کیا حکم ہے؟ واضح رہے کہ حکومت سعودی کے قانون کی خلاف ورزی کرکے کوئی دوسری مرتبہ حج کرتے ہوئے پکڑا جائے، تو خروج لگے گا، (یعنی اس کا اقامہ کالعدم قرار پائے گا اور اسے واپس اپنے وطن بھیج دیا جائے گا) لیکن تجربہ ہے کہ کوئی گرفت میں نہیں آتا ہے، الغرض اس صورت حال کے باوجود دوبارہ حج کرنے کی شرعاً گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں اگر کچھ نقصان نہ ہوتا ہو، تو حج کرنے کی گنجائش ہے، کہ **لا طاعة لمخلوق في معصية.**(1) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵۸] جب باپ اپنے پیسوں سے حج کرائے، تو بیٹے کا حج فرض ادا ہوگا؟

۱۶۶۹- سوال: ایک آدمی کے پانچ لڑکے ہیں، ملکیت مشترک ہے، سب بھائی ساتھ میں رہتے ہیں اور سب بھائیوں کی اولاد بھی ہے اور سب کی مالی حالت بھی اچھی ہے؛ چناں چہ ایسی حالت میں جب کہ ملکیت مشترک ہے، والد صاحب اپنے لڑکوں کو پیسے دے کر حج کرا رہے ہیں، تو کیا ان لڑکوں کا حج فرض ادا ہو جائے گا یا جب ملکیت اپنے قبضہ میں آئے گی، اس وقت از سر نو حج فرض ادا کرنا ہوگا؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

باپ کے ہدیۃً مال دینے سے لڑکے اس کے مالک ہوجائیں گے؛ لہٰذا اس رقم سے فرض حج ادا

---

(1) عن الحسن، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار-أبو بكر بن أبي شيبة(م:۲۳۵هـ):۵۴۵/۶، رقم الحديث:۳۳۷۱۷، كتاب الجهاد، في إمام السرية يأمرهم بالمعصية، من قال: لا طاعة له، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد-الرياض)

عن علي، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث جيشا، وأمر عليهم رجلا، فأوقد نارا، فقال: ادخلوها. فأراد ناس أن يدخلوها، وقال آخرون: إنما فررنا منها. فذكر ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال للذين أرادوا أن يدخلوها: "لو دخلتموها لم تزالوا فيها إلى يوم القيامة" وقال للآخرين قولا حسنا، وقال: "لا طاعة في معصية الله، إنما الطاعة في المعروف". (مسند الإمام أحمد بن حنبل:۱۲۸/۲، رقم الحديث:۷۲۴، مسند علي بن أبي طالب رضي الله عنه)

عن علي، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: "لا طاعة لمخلوق في معصية الله عز وجل. (مسند الإمام أحمد بن حنبل:۳۳۳/۲، رقم الحديث:۱۰۹۵، مسند علي بن أبي طالب رضي الله عنه)

ہوجائے گا۔[۱] بعد میں ادائیگی کی ضرورت نہیں ہوگی۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

[۵۹] معاش کی خاطر سعودی میں مقیم شخص کا حج وعمرہ

۱۶۷۰- سوال: (۱) ایک شخص یہاں [گجرات، انڈیا] سے رزق کی تلاش میں سعودی عرب گیا ہوا ہے، وہ حج کے ایام میں وہیں سے حج ادا کرے، تو فرض حج ادا ہوگا یا نہیں؟

(۲) وہ آدمی ہر جمعرات یا جمعہ کو عمرہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، تو اس کا عمرہ ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

(۱) مکہ یا جدہ میں بہ غرض ملازمت مقیم ہندوستانی وہیں سے حج کرے، تو اس کا حج فرض ادا ہوجائے گا، اس میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں ہے۔[۳]

---

(۱) عن مروان بن الحكم، أنه قال: قال عمر بن الخطاب رضي الله تعالى عنه: "من وهب هبة لصلة رحم، أو على وجه صدقة، فإنه لا يرجع فيها، ومن وهب هبة يرى أنه إنما أراد بها الثواب، فهو على هبته، يرجع فيها إن لم يرض منها.

قال محمد: وبهذا نأخذ، من وهب هبة لذي رحم محرم، أو على وجه صدقة، فقبضها الموهوب له، فليس للواهب أن يرجع فيها، ومن وهب هبة لغير ذي رحم محرم وقبضها فله أن يرجع فيها، إن لم يثب منها، أو يزد خيرا في يده، أو يخرج من ملكه إلى ملك غيره. وهو قول أبي حنيفة، والعامة من فقهائنا. (موطأ مالك برواية محمد بن الحسن الشيباني [المعروف بموطأ الإمام محمد] -مالك بن أنس بن مالك بن عامر الأصبحي المدني (م: ۱۷۹ھ) ص: ۲۸۴، رقم الحديث: ۸۰۵، كتاب البيوع في التجارات، باب: الهبة، والصدقة، ت: عبد الوهاب عبد اللطيف، ط: المكتبة العلمية)

لأنه ملكه بطريق الهبة، وفي أسباب الملك: الغني والفقير سواء كالبيع وغيره-.... وهو معنى ما روي عن عمر -رضي الله عنه-: من وهب هبة لصلة رحم، أو على وجه الصدقة لم يكن له أن يرجع فيها. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۱۲/ ۹۳-۹۴، كتاب الهبة، باب العطية، ط: دار المعرفة- بيروت)

(۲) (قوله إذا قدروا على الزاد) بنفقة وسط لا إسراف فيها ولا تقتير (والراحلة) أي بطريق الملك أو الإجارة دون الإعارة. (فتح القدير: ۲/ ۴۱۰، كتاب الحج، ط: دار الفكر- بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۷، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته....، ط: دار الفكر ☆ الجوهرة النيرة: ۱/ ۱۴۹، كتاب الحج، ط: المطبعة الخيرية ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵۹، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

(۳) "الحج لا يجب على الفقير" إنما المراد به الآفاقي قبل وصوله إلى الميقات، ... وبدخوله إلى مكة ووصوله إلى الكعبة تعين عليه فرضية الحج، سواء أحرم به أم لا. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري، ص: ۵۷، باب شرائط الحج، النوع الأول: شرائط الوجوب، السادس: الاستطاعة، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۰۴، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب في حج الصرورة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) جمعرات، جمعہ یا کسی دن عمرہ کرے عمرہ صحیح ہوگا، البتہ جو حضرات میقات کے اندر رہتے ہیں، ان لوگوں کو حج کے دنوں میں عمرہ نہیں کرنا چاہیے، اگر حج کرنے کا ارادہ ہو، تو پہلی شوال سے ۱۲ر ذی الحجہ تک عمرہ نہ کریں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶۰] حج کے اِرادے سے جمع کردہ رقم کو دوسرے مصرف میں استعمال کرنا

۱۶۷۱- سوال: میرے پاس اپنی کمائی کے تیرہ سو روپئے جمع ہیں، جو اِس لیے جمع کیے تھے تاکہ اپنی والدہ کو اُن روپیوں سے حج کراؤں گا؛ لیکن والدہ ضعیفی اور کمزوری اور آنکھ سے کم دِکھائی دینے کی وجہ سے حج میں جانے سے انکار کرتی ہیں، تو اِس رقم کو میں اپنے ذاتی استعمال میں یا تجارت میں لگا سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیا:

اگر آپ کی والدہ کے پاس کسی وقت حج فرض ہونے کے بہ قدر رقم موجود تھی اور حج ادا نہیں کیا تھا، تو حج فرض، ضعیفی کی وجہ سے ساقط نہیں ہوگا؛ بل کہ آپ کی والدہ کے لیے حج بدل کے طور پر کسی اور کو بھیج کر حج

[۱] (والعمرة) في العمر (مرة سنة مؤكدة) على المذهب ... (وجازت في كل السنة) وندبت في رمضان (وكرهت) تحريما (يوم عرفة وأربعة بعدها) أي كره إنشاؤها بالإحرام حتى يلزمه دم وإن رفضها لا أداؤها فيها بالإحرام السابق. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۷۲-۴۷۳، كتاب الحج، ط: دار الفكر ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۲۶۵، كتاب الحج، حكم العمرة، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۳۷، كتاب المناسك، الباب السادس في العمرة، ط: دار الفكر)

(ويكره فعلها في أشهر الحج لأهل مكة، ومن بمعناهم) أي من المقيمين، ومن في داخل الميقات لأن الغالب عليهم أن يحجوا في سنتهم، فيكونوا متمتعين، وهم عن التمتع ممنوعون، وإلا فلا منع للمكي عن العمرة المفردة في أشهر الحج، إذا لم يحج في تلك السنة. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۶۵۶، باب العمرة، فصل في وقتها، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

مکی اور ان حضرات کے لیے، جو مکی کے حکم میں ہیں، "ایامِ حج" [شوال تا ختمِ ایام حج] میں عمرہ کرنا کیسا ہے؟ صاحب فتح القدیر علامہ کمال الدین، ابن الہمامؒ نے ان کے لیے عمرہ کو مکروہ لکھا ہے، خواہ ان کا اس سال حج کا ارادہ ہو، یا نہ ہو۔ حضرت مفتی بیمات صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہی ہے، جب کہ دیگر علماء فرماتے ہیں کہ حج کے صرف پانچ ایام میں ایسے مکی کے لیے عمرہ مکروہ ہے، جو اس سال حج کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یہی رائے اکثر علماء کی ہے، علامہ شامیؒ نے علامہ ابن الہمام کے شاگرد، علامہ قاسم بن قطلوبغا کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ مکی کے لیے عمرہ کی کراہت کا قول ہمارے کسی امام؛ بل کہ ائمہ اربعہ کا نہیں ہے، گویا انہوں نے اس قول کو ابن الہمام کا تفرد قرار دیا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے: الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۷۳، كتاب الحج، مطلب في أحكام العمرة، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

کروانا فرض ہے۔[1] آپ نے اپنی کمائی کے تیرہ سو روپئے والدہ کو حج کرانے کے اِرادے سے جمع کیے ہیں، اُن کو اُس رقم کا مالک نہیں بنایا ہے، اور اِتنی رقم سے اِس زمانے میں حج ہو بھی نہیں سکتا، اور والدہ حج کرنے سے انکار کرتی ہیں، تو اُس رقم کو آپ اپنی تجارت میں یا اور کسی کام میں استعمال کر سکتے ہیں۔[2] البتہ اگر آپ کے پاس زیادہ رقم کا انتظام ہے اور خود حج کر چکے ہیں اور والدہ نے فرض حج ادا نہیں کیا ہے، تو اُن کی طرف سے حج بدل ادا کرنا کارِ ثواب ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (وأما إن وجدها وهو صحيح، ثم طرأ عليه العذر، فالاتفاق) أي اتفاق الروايات، أو اتفاق العلماء (على الوجوب) أي وجوب الحج (عليه) أي في ماله، (فيجب عليه الإحجاج) أي في الحال، أو الإيصاء في المآل. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۷۲، باب شرائط الحج، النوع الثالث: شرائط الأداء، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة☆ بدائع الصنائع: ۱۲۴/۲، كتاب الحج، فصل: شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (رد المحتار على الدر المختار-ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲ھ): ۵۰۲/۴، أول كتاب البيوع، و انظر: ۵۱/۵، باب البيع الفاسد، مطلب: تعريف المال، ط: دار الفكر-بيروت)

و الحاصل أن القياس في جنس هذه المسائل أن يفعل المالك ما بدا له مطلقا لأنه متصرف في خالص ملكه. (المصدر السابق: ۴۴۸/۵، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي، مسائل متفرقة، مطلب: اقتسموا دارا و أراد كل منهم فتح باب لهم ذلك ☆ فتح القدير: ۳۲۶/۷، كتاب أدب القاضي، باب التحكيم، مسائل شتى من كتاب القضاء، ط: دار الفكر-بيروت)

(۳) عن جابر بن عبد الله، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حج عن أبيه وأمه، فقد قضى عنه حجته و كان له فضل عشر حجج. (سنن الدارقطني- أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي بن مسعود ،البغدادي الدارقطني (م: ۳۸۵ھ): ۳۰۰/۳، رقم الحديث: ۲۶۱۰، كتاب الحج، باب المواقيت، ت: شعيب الارنؤوط، وجماعة من العلماء، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت)

عن ابن عباس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حج عن والديه، أو قضى عنهما مغرما بعثه الله يوم القيامة مع الأبرار. (المعجم الأوسط-سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۱۱/۸، رقم الحديث: ۷۸۰۰، باب الميم، باب من اسمه محمود، ت: طارق بن عوض الله، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين-القاهرة ☆ الترغيب في فضائل الأعمال وثواب ذلك- أبو حفص عمر بن أحمد بن عثمان ،البغدادي المعروف بـ ابن شاهين (م: ۳۸۵ھ)، ص: ۹۴، رقم الحديث: ۳۰۳، باب مختصر من كتابي كتاب بر الوالدين وما فيه من الفضل و الندب على ذلك، ت: محمد حسن محمد حسن إسماعيل، ط: دار الكتب العلمية، بيروت ☆ سنن الدارقطني: ۲۹۹/۳، رقم الحديث: ۲۶۰۸، كتاب الحج، باب المواقيت)

و من مات و عليه فرض الحج و لم يوص به، لم يلزم الوارث أن يحج عنه، و إن أحب أن يحج عنه حجّ، و أرجو أن يجزيه إن شاء الله تعالى. (الفتاوى التاتارخانية: ۶۶۷/۳، كتاب الحج، الفصل السادس عشر في الوصية بالحج، ط: زكريا-ديوبند ☆ بدائع الصنائع: ۲۲۱/۲، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية ☆ الفتاوى الهندية: ۲۵۸/۱، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر-بيروت)

[۶۱] غیر مستطیع بیت اللہ پہنچ کر ارکانِ حج ادا کرلے، تو حج فرض ادا ہوجائے گا

۱۶۷۲- سوال: میری بیوی پر حج فرض نہیں ہے؛ لیکن بیٹے کے ساتھ حج ادا کرنا چاہتی ہے، ایسا طریقہ بتائیں کہ حجِ فرض ادا ہوجائے، اور مستقبل میں وہ مال کی مالک بنے، تو بھی اس پر حج فرض نہ ہو، فی الحال وہ اس قدر مال کی مالک نہیں ہے کہ اس پر حج فرض ہوجائے، کیا میں ایسا کروں کہ اپنی بیوی اور اس بیٹے کو -/20,000 (بیس ہزار) ڈالر [جو کہ حج میں خرچ ہوں گے] کا مالک بنادوں؟ تاکہ وہ مال دار ہوجائیں، اور حج فرض ادا ہوجائے، لیکن کیا اس صورت میں دوسرے وارث کو بھی اتنا ہی دینا ہوگا؟ واضح رہے کہ ان دونوں کے علاوہ میرا ایک بیٹا سلیم ہے، جس کو دو تین سال میں حج پر بھیجنے کا ارادہ ہے، اور کوئی دوسرا وارث نہیں ہے۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

جب کوئی غریب و نادار بیت اللہ پہنچ جائے، حج کا احرام باندھ لے، اور ارکانِ حج ادا کرلے، تو فرض حج ادا ہوجائے گا، آپ کی بیوی خواہ اپنے طور پر حج کی استطاعت نہ رکھتی ہو، آپ خرچ دے کر انہیں بیت اللہ روانہ کریں گے، اور وہ حج کرے گی، تو اس کا حج فرض ادا ہوجائے گا۔ دوبارہ- مال کی مالک بننے کے بعد- حج کرنا لازم نہیں ہوگا۔[۱]

آپ ایسا کرسکتے ہیں کہ دس- دس ہزار ڈالر کا مالک اپنی بیوی اور بیٹے کو بنادیں، وہ خود مستطیع ہوجائیں گے، اور حج فرض ادا کرلیں گے۔

آپ اپنی بیوی اور بیٹے کو حج کے لیے جس رقم کا مالک بنارہے ہیں، اتنی ہی رقم دوسرے وارث یعنی بیٹے سلیم کو دینا ضروری نہیں ہے، ہاں، آپ اس کو اس بات کا یقین دلادیں کہ ''دو، تین سال میں تمہیں بھی حج کے لیے بھیجنے والا ہوں''، ایسی صورت میں کسی کا کوئی حق ساقط نہیں ہوگا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولو حج الفقير ثم استغنى لم يحج ثانيا؛ لأن شرط الوجوب التمكن من الوصول إلى موضع الأداء ألا ترى أن المال لا يشترط في حق المكي. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م:۱۰۷۸ھ): ۱/۲۶۰، كتاب الحج، قبيل: شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۲) چوں کہ اس صورت میں کسی وارث کو محروم کرنا یا اس کا حق دوسرے کو دینا لازم نہیں آتا، یہ تو تعاون علی العبادۃ کی شکل ہے، رہ گئی فقہاء کرام کی وہ بات کہ اپنے بچوں میں عدل اختیار کرنا چاہیے، تو یہاں عدل کے تقاضے کے خلاف بھی کوئی بات نہیں ہے؛ کیوں کہ بیٹے سلیم کو آئندہ حج پر بھیجنے کا ارادہ ہے، اور ایسا ہوسکتا ہے کہ حالات کے تقاضے کے اعتبار سے بعض کو ابھی بھیجا جائے اور بعض کو بعد میں۔

{والميقات: الوقت المضروب للفعل. والموضع، يقال: هذا} ميقات أهل الشام، للموضع الذي يحرمون منه، وفي الحديث (أنه وقت لأهل المدينة ذا الحليفة). و (ميقات الحاج: موضع إحرامهم) وعبارة النهاية: ومواضع الإحرام: مواقيت الحاج، والهلال، ميقات الشهر، ونحو ذلك كذلك.ــــــ وتقول: {وقته فهو موقوت، إذا بين للفعل} وقتا يفعل فيه. (تاج العروس من جواهر القاموس-محمّد بن محمّد بن عبد الرزّاق الحسيني، أبو الفيض، الملقب بـ مرتضى، الزَّبيدي(م:١٢٠٥هـ):٥/ ١٣٣، مادة: وقت، ت: مجموعة من المحققين، ط: دار الهداية)

باب المواقیت

[میقات کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب المواقیت

[میقات کا بیان]

[١] میقات کا مطلب اور ہندوستانیوں کی میقات

١٦٧٣-سوال: میقات کسے کہتے ہیں اور ہندوستان سے حج میں جانے والوں کے میقات کا نام کیا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

مقررہ وقت اور معین جگہ کو میقات کہا جاتا ہے۔ (١) جواہر الفقہ میں ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش والوں کا میقات ہوائی جہاز کے سفر میں قرن المنازل اور ذات عرق ہے، اس سے پہلے احرام باندھ

---

(١) {والميقات: الوقت المضروب للفعل. والموضع، يقال: هذا} ميقات أهل الشام، للموضع الذي يحرمون منه، وفي الحديث (أنه وقت لأهل المدينة ذا الحليفة). و(ميقات الحاج: موضع إحرامهم) وعبارة النهاية: ومواضع الإحرام: مواقيت الحاج، والهلال، ميقات الشهر، ونحو ذلك كذلك.———وتقول: {وقته فهو موقوت، إذا بين للفعل} وقتا يفعل فيه. (تاج العروس من جواهر القاموس-محمّد بن محمّد بن عبد الرزّاق الحسيني، أبو الفيض، الملقب بـ مرتضى، الزَّبيدي (م:١٢٠٥هـ): ٥/ ١٣٣، مادة: وقت، ت: مجموعة من المحققين، ط: دار الهداية)

المواقيت جمع ميقات وهو الوقت المعين استعير للمكان المعين كما في الفتح. (حاشية حسن بن عمار الشرنبلالي على درر الحكام شرح غرر الأحكام (م:١٠٦٩هـ): ١/ ٢١٨، كتاب الحج، مواقيت الإحرام، ط: دار إحياء الكتب العربية)

لینا ضروری ہے، اگر کسی نے نہیں باندھا اور جہاز میقات کی حدود میں داخل ہو گیا، تو دم واجب ہوگا؛ لیکن جدہ پہنچنے کے بعد پھر اس نے وہاں سے احرام باندھ لیا، تو واجب شدہ دم ساقط ہو جائے گا؛ کیوں کہ راجح قول کے مطابق جدہ میقات ہے، اور ایک میقات سے گذرنے کے بعد دوسرے میقات سے احرام باندھ لیا جائے، تو دم ساقط ہو جائے گا۔[۱] البتہ قصداً ایسا کرنا یعنی: اپنے میقات سے احرام کو مؤخر کرنا سخت گناہ ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] مدینہ سے جدہ لوٹنے والے تاجر پر عمرہ ضروری ہے؟

۱۶۷۴- سوال: جو حضرات ہندوستان سے کسب معاش کے لیے سعودی عرب جاتے ہیں، پھر مدینہ جاتے ہیں، اور کچھ روز قیام کے بعد جدہ واپس آتے ہیں، تو ایسے لوگ مدینہ سے لوٹتے وقت مکہ مکرمہ عمرہ کر کے آئیں یا پھر سیدھے جدہ آجائیں اور عمرہ نہ کریں، کیا عمرہ نہ کرنے میں کوئی حرج ہے، یا عمرہ کرنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جدہ، مدینہ، طائف، ریاض وغیرہ ممالک میں تجارت یا نوکری وغیرہ کی غرض سے جانے والے حضرات پر حج یا عمرہ واجب نہیں ہوگا، البتہ مکہ مکرمہ جانے کے ارادہ سے پہونچے اور حج کے ایام ہو، تو بیت اللہ پر نگاہ پڑتے ہی حج فرض ہو جائے گا،[۳] اور اگر مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے ارادہ سے آیا ہے اور ایام حج نہیں ہے، تو بغیر احرام کے داخلہ ممنوع ہے؛ نیز عمرہ کرنا ضروری ہے؛ لہٰذا عمرہ کرے، صورت مسئولہ میں مدینہ سے جدہ آنے والے پر عمرہ واجب نہیں ہوگا۔[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: مواقیت احرام اوران کے مسائل، مندرجہ: جواھر الفقہ: ۱/ ۴۷۴، ہندو پاکستان اور مشرقی ممالک سے آنے والوں کا میقات، ط: مکتبہ تفسیر القرآن، عارف کمپنی، جامع مسجد- دیوبند)

(۲) (وحرم تأخير الإحرام عنها) كلها (لمن) أي لآفاقي (قصد دخول مكة) يعني الحرم (ولو لحاجة) غير الحج ... (لا) يحرم (التقديم) للإحرام (عليها) بل هو الأفضل. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۷۷، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

(۳) ... أن الفقير إذا وصل إلى المواقيت صار حكمه حكم أهل مكة، فيجب عليه وإن لم يقدر على الراحلة. (فتح القدير: ۲/ ۴۱۹، كتاب الحج، مقدمة يكره الخروج إلى الحج إذا كره أحد أبويه، ط: دار الفكر)

(۴) ولا يجوز للآفاقي أن يدخل مكة بغير إحرام نوى النسك أو لا ولو دخلها فعليه حجة أو عمرة كذا في محيط السرخسي في باب دخول مكة بغير إحرام. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۲۱، كتاب المناسك، الباب الثاني في مواقيت الإحرام، ط: دار الفكر)

[۳] ۱- اہل جدہ احرام کہاں سے باندھیں؟
[۴] ۲- آفاقی، حلی اور حرمی کے احرام کے متعلق تفصیل

۱۶۷۵- سوال: ایک شخص جدہ میں رہتا ہے اور جدہ حدود حرم سے باہر اور میقات کے اندر ہے، یعنی حل میں داخل ہے، تو وہ شخص حج کا احرام کہاں سے باندھے؟ اگر اپنے گھر یعنی جدہ سے نہ باندھے اور مکہ جا کر احرام باندھے، تو اس کے حج میں کوئی نقصان تو نہ آئے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جدہ میں رہنے والا خواہ وہاں کا اصلی رہائشی ہو، یا تجارت و نوکری کے لیے آیا ہو، یا اپنے کسی رشتہ دار سے ملنے کے لیے آیا ہو، سب کا حکم ''اہل حل'' کا ہے، انہیں ''داخل میقات، خارج من حدود حرم'' کہا جاتا ہے، ان کا حکم یہ ہے کہ عام حالات میں تو مکہ مکرمہ بغیر احرام کے جا سکتے ہیں، مثلاً جمعہ پڑھنے کے لیے، یا کسی سے ملنے کے لیے، یا تجارت کے لیے، یا کسی اور غرض سے جانا ہو، تو بغیر احرام کے جانے میں حرج نہیں، البتہ عمرہ و حج کی نیت ہو، تو حرم کی حد میں داخل ہونے سے پہلے احرام باندھ لینا ضروری ہے اور جدہ سے احرام باندھنا افضل و مستحب ہے، اس بات کو فقہاء نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: **(وقته) أي وقت الاحرام لأهل داخلها للحج أو العمرة (الحل) بالكسر وهو ما بين المواقيت والحرم.** (مجمع الانہر: ۱/۲۶۶)[1]

یعنی جو لوگ میقات کے اندر اور حرم سے باہر رہتے ہیں ان کی میقات حل ہے وہ حرم کی حد میں داخل ہونے سے پہلے جہاں سے چاہے احرام باندھ سکتے ہیں شامی ہندیہ وغیرہ کتب فقہ میں ایسا ہی لکھا ہے۔

---

[۱] متعلقہ مسئلہ کی مکمل عبارت یوں ہے:

(ويحل لمن هو داخلها) المواقيت (دخول مكة) لحاجة لا للنسك (غير محرم)؛ لأن في إيجاب الإحرام عليه في كل مرة حرجا، لأنه يكثر دخوله لحوائجه فصار كالمكي بخلاف ما إذا دخل للحج (ووقته) أي وقت الإحرام لأهل داخلها للحج أو العمرة (الحل) بالكسر وهو ما بين المواقيت والحرم لا الحل الذي هو خارج الحرم والحرم حد في حقه كالميقات فلا يدخل الحرم إذا أراد أحدهما إلا محرما. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م:۱۰۷۸ھ):۱/۲۶۶، كتاب الحج، موقيت الحج، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ البحر الرائق: ۲/۳۴۳، كتاب الحج، ميقات المكي إذا أراد الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۲۱، كتاب المناسك، الباب الثاني في الميقات، ط: دار الفكر)

علامہ شامیؒ نے بعض علماء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب اہل حل کے لیے یہ حکم ہے، تو- چوں کہ جدہ حل میں ہے؛ اس لیے- جدہ کہ رہائشی کو جب حج یا عمرہ کرنا ہو، تو بلا احرام کے حدود حرم میں داخل ہونا جائز نہیں، ورنہ دم واجب ہوگا، البتہ حج کرنے والا شخص جب عرفات کے میدان میں جا کر تلبیہ پڑھ لے گا اور وہاں سے تلبیہ پڑھتا ہوا مزدلفہ اور منی میں آئے گا، تو حرم کی جو بے حرمتی ہوئی تھی (تلبیہ کہتے ہوئے اول حل کی طرف جانے کی وجہ سے) اس کی تلافی ہو جائے گی اور دم ساقط ہو جائے گا۔ (شامی)[۲]

اور عالم گیری میں ہے کہ داخل میقات یعنی حلی بغیر احرام کے مکہ میں داخل نہ ہو اور جو لوگ حرم میں یا مکہ مکرمہ میں رہتے ہیں ان کے لیے حج کا احرام مکہ ہی سے باندھنا جائز ہے، اور عمرہ کا احرام وہ تنعیم یا جعرانہ جا کر باندھیں گے۔ (عالم گیری: ۱/۸۰)[۳]

احرام کے سلسلہ میں تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ:

---

[۲] (وحل لأهل داخلها) يعني لكل من وجد في داخل المواقيت (دخول مكة غير محرم) ما لم يرد نسكا للحرج كما لو جاوزها حطابو مكة فهذا (ميقاته الحل) الذي بين المواقيت والحرم ــــ (و) الميقات (لمن بمكة) يعني من بداخل الحرم (للحج الحرم وللعمرة الحل) ليتحقق نوع سفر. (الدر المختار) ــــ قال ابن عابدين: (قوله ما لم يرد نسكا) أما إن أراده وجب عليه الإحرام قبل دخوله أرض الحرم فميقاته كل الحل إلى الحرم فتح.

وعن هذا قال القطبي في منسكه ومما يجب التيقظ له سكان جدة بالجيم، وأهل حدة بالمهملة، وأهل الأودية القريبة من مكة فإنهم غالبا يأتون مكة في سادس أو سابع ذي الحجة بلا إحرام، ويحرمون للحج من مكة فعليهم دم لمجاوزة الميقات بلا إحرام، لكن بعد توجههم إلى عرفة ينبغي سقوطه عنهم بوصولهم إلى أول الحل ملبين إلا أن يقال إن هذا لا يعد عودا إلى الميقات لعدم قصدهم العود لتلافي ما لزمهم بالمجاوزة بل قصدوا التوجه إلى عرفة. اهـ. ــــ وقال القاضي محمد عيد في شرح منسكه والظاهر السقوط لأن العود إلى الميقات مع التلبية مسقط لدم المجاوزة وإن لم يقصده لحصول المقصود وهو التعظيم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۷۸، كتاب الحج، مطلب في المواقيت، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/۳۴۳، كتاب الحج، ميقات المكي إذا أراد الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۳] ووقت المكي للإحرام بالحج الحرم، وللعمرة الحل كذا في الكافي، فيخرج الذي يريد العمرة إلى الحل من أي جانب شاء كذا في المحيط والتنعيم أفضل كذا في الهداية. . . . ومن كان داخل الميقات كالبستاني له أن يدخل مكة لحاجة بلا إحرام إلا إذا أراد النسك فالنسك لا يتأدى إلا بالإحرام، ولا حرج فيه كذا في الكافي، وكذلك المكي إذا خرج إلى الحل للاحتطاب أو الاحتشاش ثم دخل مكة يباح له الدخول بغير إحرام، وكذلك الآفاقي إذا صار من أهل البستان كذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۲۱، كتاب المناسك، الباب الثاني في المواقيت، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) آفاقی کا حج وعمرہ کے لیے میقات سے احرام باندھنا ضروری ہے۔ (۴)

(۲) داخل میقات (حلی) کا گھر سے احرام باندھنا مستحب ہے۔ (۵)

(۳) داخل میقات کا حرم کی حد میں داخل ہونے سے پہلے احرام باندھ لینا ضروری ہے۔ (۶)

(۴) داخل میقات بغیر احرام کے حج کی نیت سے حرم میں داخل ہوگیا اور مکہ جا کر اس نے احرام باندھا تو جب عرفات میں جا کر تلبیہ پڑھے گا، تو اس پر جو دم واجب ہوا تھا، وہ ساقط ہو جائے گا۔ (۷)

(۵) اور وہی شخص جب عمرہ کے لیے نکلے گا، تو حرم میں بنا احرام کے داخل ہونے سے اس پر دم واجب ہوگا۔ (۸)

---

(۴) لا يصلح لأحد كان منزله من وراء الميقات إلى الأمصار أن يدخل مكة إلا بالإحرام، فإن لم يفعل أساء ولا شيء عليه عند الشافعي وأبي ثور، وعند أبي حنيفة: عليه حجة أو عمرة. (عمدة القاري- بدر الدين العيني (م:۸۵۵ھ): ۲۰۵/۱۰، كتاب الحج، باب دخول الحرم و مكة بغير إحرام، ط: دار إحياء التراث العربي☆ الفتاوى التاتارخانية: ۵۲/۳-۵۵۱، كتاب الحج، الفصل الرابع في بيان مواقيت الإحرام، ط: زكريا- ديوبند☆ بدائع الصنائع: ۱۶۴/۲، كتاب الحج، فصل بيان مكان الإحرام، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۵) أما إذا قصدوه وجب عليهم الإحرام قبل دخولهم أرض الحرم فميقاتهم كل الحل إلى الحرم، فهم في سعة من دارهم إلى الحرم وما عجلوه من دارهم فهو أفضل. (فتح القدير: ۴۲۷/۲، كتاب الحج، قبيل: باب الإحرام، ط: دار الفكر)

(۶) (قوله ما لم يرد نسكا) أما إن أراده وجب عليه الإحرام قبل دخوله أرض الحرم فميقاته كل الحل إلى الحرم فتح. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۷۸/۲، كتاب الحج، مطلب في المواقيت، ط: دار الفكر☆ الهداية: ۱۳۴/۱، كتاب الحج، فصل في المواقيت التي لا يجوز أن يجاوزها الإنسان إلا محرما، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث الإسلامي)

(۷) ينبغي أن يسقط عنهم دم المجاوزة بوصولهم إلى أول الحل ملبين؛ لأنه عود منهم إلى ميقاتهم مع الإحرام والتلبية وذلك مسقط لدم المجاوزة. (منحة الخالق على البحر الرائق- ابن عابدين (م:۱۲۵۲ھ): ۳۴۳/۲، كتاب الحج، مواقيت الإحرام، ميقات المكي إذا أراد الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۸) وأما الصنف الثاني فميقاتهم للحج أو العمرة دويرة أهلهم أو حيث شاءوا من الحل الذي بين دويرة أهلهم وبين الحرم لقوله عز وجل: {وأتموا الحج والعمرة لله} [البقرة:۱۹۶] روينا عن علي، وابن مسعود - رضي الله عنهما - أنهما قالا حين سئلا عن هذه الآية: إتمامهما أن تحرم بهما من دويرة أهلك، فلا يجوز لهم أن يجاوزوا ميقاتهم للحج أو العمرة إلا محرمين، والحل الذي بين دويرة أهلهم وبين الحرم كشيء واحد، فيجوز إحرامهم إلى آخر أجزاء الحل كما يجوز إحرام الآفاقي من دويرة أهله إلى آخر أجزاء ميقاته، فلو جاوز أحد منهم ميقاته يريد الحج أو العمرة فدخل الحرم من غير إحرام فعليه دم. (بدائع الصنائع: ۱۶۶/۲، كتاب الحج، فصل بيان مكان الإحرام، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۶) آفاقی یا حلی جب مکہ میں کچھ دن پہلے تجارت وغیرہ کی غرض سے آکر مقیم ہوں، تو وہ مکی کے حکم میں ہیں، مکہ سے احرام باندھنا ان کا جائز ہے۔[۹]

(۷) جدہ میں رہنے والے حضرات کے لیے مشورہ ہے کہ حیلہ بہانہ کئے بغیر حج جیسی اہم عبادت کو - جو سال میں صرف ایک بار ادا کی جاتی ہے- بغیر شک وشبہ کے ادا کرتے ہوئے جدہ ہی سے احرام باندھ لیں یہی احتیاط کا تقاضہ ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] جدہ سے حج کرنے اور بیرون سے حج کرنے میں ثواب میں کوئی فرق آتا ہے؟

۱۶۷۶- سوال: یہاں جدہ میں ہندو پاک وغیرہ سے آکر بسنے والے لوگوں کے حج کا ثواب اپنے ملک سے خرچ کرکے آنے والے لوگوں سے کم ہوگا؟ یا ثواب میں دونوں مساوی ہوں گے؟ یہاں ایک بھائی کا کہنا ہے کہ جو حجاج اپنے ملک سے پیسے خرچ کرکے آتے ہیں، ان کا ثواب ہم سے زیادہ ہوگا، وہ اصلی حج کرتے ہیں، تو اس سلسلہ میں شریعت کیا کہتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

جدہ اور سعودیہ کے رہنے والے، خواہ وہاں کے اصل باشندے ہوں یا ہندو پاک وغیرہ سے آکر بسے ہوئے ہوں، بڑے خوش نصیب لوگ ہیں، ہر سال وہ حج کرتے ہیں اور ہر جمعہ کو اللہ تعالیٰ کے پاک گھر "کعبۃ اللہ" کی زیارت کرتے ہیں اور میقات وحل میں رہنے سے ان پر میقات وحل کے احکام بھی جاری ونافذ ہوتے ہیں۔

اور رہی بات حج کے ثواب کی، تو حدیث شریف میں ہے: "إنما الاعمال بالنيات"[☆☆☆] کہ

(۹) (و الآفاقي أو الحلي إذا دخل مكة أو الحرم فهو وقته) أي فالحرم صار ميقاته. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۱۱۸، فصل: و قد يتغير الميقات بتغير الحال، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة ☆ البحر الرائق: ۲/ ۳۴۴، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۷۸، كتاب الحج، مطلب في المواقيت، ط: دار الفكر-بيروت)

[☆☆☆] علقمة بن وقاص الليثي، يقول: سمعت عمر بن الخطاب رضي الله عنه على المنبر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها، أو إلى امرأة ينكحها، فهجرته إلى ما هاجر إليه. (صحيح البخاري: ۱/ ۲، رقم الحديث: ۱، باب بدء الوحي، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۴۱-۱۴۰، رقم الحديث: ۱۵۵- (۱۹۰۷)، كتاب الإمارة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: "إنما الأعمال بالنية" وأنه يدخل فيه الغزو وغيره من الأعمال، ط: ديوبند)

اعمال کا مدار نیتوں پر ہے، فرض حج کا ارادہ ہو یا نفلی حج کا، ثواب پورے پورا ملے گا، دنیا کے آخری کونے سے آنے والے شخص کا ارادہ بھی حج کا ہے اور سفر خواہ دریائی ہو یا ہوائی ہو، مقصود تک پہنچنے کا ایک ذریعہ وسبب ہے، اسی طرح سفر کے لیے پیسے خرچ کرنا بھی ایک سبب ہے، اصل مقصد نہیں، البتہ مسبب سبب کے بغیر وجود میں نہیں آتا، سبب کا ہونا بھی ضروری ہے؛ اس لیے اس کا ثواب ضرور ملے گا، باقی نفس حج کے ثواب میں خواہ آدمی کہیں سے حج کرے، کوئی فرق نہیں پڑتا، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ جو ایسی مقدس جگہ میں رہتے تھے، ان کے حج کے ثواب میں کوئی کمی رہے گی! لہٰذا اس بھائی کا اصلی اور نقلی کا فرق کرنا غلط ہے، نفس حج کا ثواب تو سب کو برابر ملے گا، ہاں سفر کے خرچ اور تکلیف کی وجہ سے دور سے آنے والوں کو اس حیثیت سے زیادہ ثواب ملے، تو وہ الگ بات ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] مکہ میں بغیر احرام کے داخل ہونا

۱۶۷۷- سوال: محترم حضرت مفتی صاحب! عرض یہ ہے کہ ہمیں ایجنٹ نے بتایا تھا کہ ہم مدینہ منورہ جارہے ہیں؛ اس لیے ہم نے احرام نہیں باندھا تھا؛ لیکن کفیل ہمیں پہلے مکہ مکرمہ لے گیا، تو ہم مکہ میں

---

(۱) عن أبي موسى، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: أعظم الناس أجرا في الصلاة أبعدهم، فأبعدهم ممشى والذي ينتظر الصلاة حتى يصليها مع الإمام أعظم أجرا من الذي يصلي، ثم ينام. (صحيح البخاري: ۱/ ۹۰، رقم الحديث: ۶۵۱، كتاب الصلاة، باب فضل صلاة الفجر في جماعة، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۲۳۵، رقم الحديث: ۲۷۷- (۶۶۲)، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب فضل كثرة الخطا إلى المساجد، ط: ديوبند)

أن سبب أعظمية الأجر في الصلاة هو: بعد الممشى، وهو المسافة، وذلك لوجود المشقة فيه. وقد علم أن أفضل الأعمال أحمزها، فكل صلاة توجد فيها المشقة من حيث بعد الممشى فهي أعظم أجرا وأفضل من الصلاة التي لا يوجد فيها ذلك. (عمدة القاري: ۵/ ۱۶۹، كتاب الصلاة، باب فضل صلاة الفجر في جماعة، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

التقديم أفضل إذا كان يملك نفسه أن لا يقع في محظور؛ لأن المشقة فيه أكثر فكان أكثر ثوابا؛ لأن الأجر بقدر التعب. (البحر الرائق: ۲/ ۳۴۳، كتاب الحج، ميقات المكي إذا أراد الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

وإنما كان التقديم على المواقيت أفضل لأنه أكثر تعظيما وأوفر مشقة والأجر على قدر المشقة ولذا كانوا يستحبون الإحرام بهما من الأماكن القاصية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۷۸، كتاب الحج، مطلب في المواقيت، ط: دار الفكر- بيروت ☆ فتح القدير: ۲/ ۴۲۸، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

اس حال میں داخل ہوئے کہ ہمارا احرام نہیں تھا، اور ہم اس سلسلے میں مجبور تھے اور عمرہ بھی ہم نے دیر سے کیا ہے، تو اس سلسلہ میں کیا حکم ہے؟

دوسری بات یہ کہ عمرہ ہم نے شب عید میں کیا ہے، تو کیا اسی سال ہم پر حج لازم ہوگا؟ اور یہ سب قرض لے کر میں نے کیا ہے، میرے پاس گنجائش نہیں ہے، تو کیا قرض کی حالت میں حج ادا ہوگا یا نہیں؟ اور کون سا حج ادا ہوگا؟ ـــــــــــ اگر والدین قرض کو اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، تو پھر کون سا حج ادا ہوگا؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

صورت مسئولہ میں آپ بغیر احرام کے مکہ میں داخل ہوئے؛ اس لیے دم لازم ہوگا۔ [1] اگر فی الحال آپ کے پاس دم ادا کرنے کی گنجائش نہیں ہے، تو اس میں گنجائش تک تاخیر کرنا بھی جائز ہے۔

اسی سال آپ حج ادا کر سکتے ہیں، اور قرض ہونے سے حج میں کوئی نقصان نہ آئے گا، فرض حج کی نیت کریں گے، تو حج فرض ادا ہو جائے گا۔ [2] اور ماں باپ' قرض کی ذمہ داری لیتے ہیں، تو ان کا احسان ہے، ان کے لیے ضروری نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولا يجوز للآفاقي أن يدخل مكة بغير إحرام نوى النسك أو لا ولو دخلها فعليه حجة أو عمرة كذا في محيط السرخسي في باب دخول مكة بغير إحرام. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۲۱، كتاب المناسك، الباب الثاني في مواقيت الإحرام، ط: دار الفكر)

(۲) کیوں کہ فقیر، غیر مستطیع بھی ایام حج میں مکہ مکرمہ پہنچ جائے، تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے، اور جس نیت سے حج کرے، معتبر مانا جاتا ہے:ـــــــ ... أن الفقير إذا وصل إلى المواقيت صار حكمه حكم أهل مكة، فيجب عليه وإن لم يقدر على الراحلة. (فتح القدير: ۲/۴۱۹، كتاب الحج، مقدمة يكره الخروج إلى الحج إذا كره أحد أبويه، ط: دار الفكر)

عن ابن عمر، أن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: إحرام المرأة في وجهها وإحرام الرجل في رأسه. (سنن الدارقطني (م: ۳۸۵ھ): ۳/ ۳۶۳، رقم الحديث: ۲۷۶۱، كتا الحج، باب المواقيت، ت: شعيب الارنؤوط، وجماعة من العلماء، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت-لبنان)

باب الإحرام والتلبية

[احرام اور تلبیہ کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الإحرام والتلبية

[احرام اور تلبیہ کا بیان]

[۱] احرام باندھنے کا طریقہ

۱۶۷۸-سوال: ہم پوری فیملی ممبئ سے حج کے لیے جانا چاہتے ہیں، اس سلسلے میں آپ ہماری رہنمائی فرمائیں اور بتائیں کہ احرام باندھنے کا کیا طریقہ ہے؟ اور اس وقت کے سنت اور مستحب اعمال کیا ہیں؟ عورت اور مرد کے احرام میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

جب میقات سے یا میقات آنے سے پہلے ممبئ ہی سے (یا جہاں سے بھی آپ کی فلائٹ ہو۔) احرام باندھنے کا ارادہ ہو، تو بال صاف کرلیں یعنی: سر کے بال منڈا لیں یا کتروالیں، اسی طرح بغل اور زیر ناف کے بال بھی صاف کرلیں، ہاتھ اور پیروں کے ناخن بھی تراش لیں۔ اس موقعہ سے اگر بیوی ساتھ ہو، تو صحبت کرنا مستحب ہے، اس کے بعد احرام کی نیت سے غسل کرلیں۔ (۱)

(۱) وإذا أراد الإحرام اغتسل أو توضأ والغسل أفضل إلا أن هذا الغسل للتنظيف حتى تؤمر به الحائض كذا في الهداية. ويستحب في حق النفساء والصبي ويستحب كمال التنظيف من قص الأظفار والشارب وحلق الإبطين والعانة والرأس لمن اعتاده من الرجال أو أراده وإلا فتسريحه وإزالة الشعث والوسخ عنه، وعن بدنه بغسله =

اگر غسل کا انتظام نہ ہو، تو وضو کرلیں پھر سلے ہوئے کپڑے، پیروں کے موزے سر کی ٹوپی وغیرہ تمام چیزیں اتار کر دو چادر اس طرح اوڑھ لیں کہ ایک کو لنگی کی طرح گرہ لگا کر باندھیں اور دوسری سے اوپر کا بدن ڈھانک لیں، اس کے بعد عطر یا کوئی خوش بو ہو، تو اس کو لگالیں۔ (یہ حکم مردوں کے لیے ہے، عورتیں عام حالت میں جو کپڑے پہنتی ہیں، وہی پہنیں گی اور خوش بو بھی نہیں لگائیں گی) اس کے بعد دو رکعت نماز سر ڈھانک کر پڑھیں اور سلام پھیرتے ہی سر سے ٹوپی اتار کر سر کھول دیں، اور اسی جگہ سے حج یا عمرہ کی نیت کریں۔ نیت سے مراد دل سے پختہ ارادہ کرنا ہے اور زبان سے بولنا مستحب ہے۔ نیت کے بعد تین بار کچھ بلند آواز سے یہ الفاظ کہے: **لبيك اللهم لبيك، لبيك لا شريك لك، لبيك إن الحمد و النعمة لك و الملك، لا شريك لك.** اس کے بعد درود شریف پڑھ کر جو دعا مانگنی ہو، وہ مانگے، اس طرح آپ کا احرام مکمل ہو گیا۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=بالخطمي والأشنان ونحوهما، ومن المستحب عند إرادة الإحرام جماع زوجته أو جاريته إن كانت معه ولا مانع من الجماع فإنه من السنة، هكذا في البحر الرائق. (الفتاوی الهندية: ۱/ ۲۲۲، كتاب المناسك، الباب الثالث في الإحرام، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) ويستحب لمن أراد الإحرام أن يقص شاربه وأظفاره، ثم يغتسل أو يتوضأ، والغسل أفضل، فقد صح "أن رسول الله -عليه السلام- اغتسل"، وهذا الاغتسال للنظافة، وليس بواجب، ويلبس ثوبين جديدين أو غسيلين إزار ورداء؛ لأنه منهي عن لبس المخيط، ولا بد من ستر العورة مما يحصل به دفع الحر والبرد، ــــــــ وإذا لبس إزار ورداء، فقد حصل ستر العورة ودفع الحر والبرد، وقد صح برواية جابر وأبي بريدة رضي الله عنهما "أن رسول الله عليه السلام أحرم ولبس إزاراً ورداء"، غير أن الجديد أفضل لقوله عليه السلام لأبي ذر "تزين لعبادة ربك"، وبالإزار يحصل ستر العورة، ويدهن شاربه؛ لأن الغالب من أحوال أهل الحجاز الحرارة والنتونة والدهن يزيل ذلك، ويتطيب بأي طيب شاء في المشهور، وروي عن محمد أنه لا يتطيب بطيب تبقى عينه بعد الإحرام بأن يلطخ رأسه أو جبهته بالغالية أو المسك. ــــــــ والصحيح ما ذكر في المشهور لحديث عائشة رضي الله عنها، فإنها قالت: "كنت أطيب رسول الله -عليه السلام- لإحرامه قبل أن يحرم"؛ لأن الحج أمر مهم، ومن قصد أمراً مهماً يطلب التيسير من الله تعالى، ثم يلبي في دبر صلاته، وإن شاء بعدما يستوي بعيره، والأفضل أن يلبي بعد صلاته، ثم يصلي ركعتين، ويقرأ فيها بما شاء. ــــــــ ثم إذا فرغ من صلاته يطلب من الله التيسير، فيدعو: "اللهم، إني أريد الحج، فيسره لي وتقبله مني" من قبل أن يزور بالبيت ذكرت الطيب مطلقاً من غير فصل.

وصفة التلبية أن يقول: لبيك اللهم لبيك لبيك لا شريك لك لبيك إن الحمد والنعمة لك والملك لا شريك لك.

(المحيط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي=

[۲] احرام باندھتے وقت فرض یا نفل کی صراحت کرنا بھول گیا

۱۶۷۹- سوال: مفتی صاحب! مجھ پر حج فرض ہے، میں نے احرام باندھتے وقت فرض یا نفل کا لفظ نہیں کہا تھا، تو میرے متعلق کیا حکم ہے؟ میرا کون سا حج ہوگا، ابھی تک میں نے حج فرض ادا نہیں کیا ہے۔

الجواب حامداومصليا:

حج کا احرام باندھتے وقت اگر آپ نے فرض یا نفل کی تعیین نہیں کی ہے، اور آپ نے اب تک حج فرض ادا نہیں کیا ہے، تو آپ کا ''حج فرض'' ہی ادا ہوگا۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] مکہ مکرمہ سے جدہ جانے والا جب دوبارہ مکہ آئے، تو احرام باندھ کر آئے گا؟

۱۶۸۰- سوال: میں اس سال حج کے لیے جانے والا ہوں، ممبئی سے احرام باندھ کر مکہ مکرمہ جاؤں گا، مکہ مکرمہ میں چار پانچ دن ٹھہر کر واپس جدہ اپنے ایک رشتہ دار سے ملاقات کے لیے آنے کا ارادہ ہے، وہاں دو دن ٹھہروں گا، تو کیا وہاں سے واپسی کے موقع پر میرے لیے دوبارہ احرام باندھنا ضروری ہوگا؟ بعض جہلاء کو دیکھا گیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں کچھ دن ٹھہر کر شاپنگ کے لیے دوبارہ جدہ آتے ہیں، اپنے کام کاج سے جب وہ فارغ ہوتے ہیں تو بغیر احرام کے مکہ مکرمہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور ان کی عمرہ کی کوئی نیت نہیں ہوتی ہے، صرف خرید وفروخت کی نیت ہوتی ہے، تو کیا ان کے لیے احرام ضروری ہے یا نہیں؟

=(م:۶۱۲ھ): ۲/ ۲۲۲، كتاب المناسك، الفصل الثالث: في تعليم أعمال الحج، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۴۸۶، كتاب الحج، تعليم أعمال الحج، ط: زكريا- ديوبند☆ رد المحتار على الدر المختار: ۳/ ۴۸۸ وبعدها، كتاب الحج، فصل في الإحرام و . . . ، ط: زكريا- ديوبند☆ نور الايضاح- حسن بن عمار الشرنبلالي، ص: ۱۶۸، فصل في كيفية تركيب أفعال الحج، ط: المكتبة اليوسفية-غجرات)

(۱) ولو أطلق نية الحج صرف للفرض ولو عين نفلا فنفل وإن لم يكن حج الفرض، شرنبلالية عن الفتح. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله ولو أطلق نية الحج) بأن نوى الحج ولم يعين فرضا ولا نفلا. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۸۶، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، ط: دار الفكر)

لو أطلق نية الحج بأن أحرم بحجة ولم يعين فرضا ولا نفلا صح إحرامه للحج، وصرف إلى الفرض استحسانا على المذهب. (غنية الناسك، ص: ۱۰۱، مطلب في إبهام النية وإطلاقها، ط: یادگار شیخ، سہارن پور☆ البحر الرائق: ۲/ ۵۶۴، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا- ديوبند)

الجواب حامداً ومصلیاً:

جدہ سے مکہ مکرمہ واپس آنے والے کے لیے دوبارہ احرام ضروری نہیں ہے، احرام کے بغیر بھی مکہ مکرمہ آسکتا ہے۔[۱]

اللہ تعالیٰ آپ کے عمرے کو قبول فرمائے اور ایمان پر استقامت عطاء فرمائے، وہاں کے مقامات مقدسہ میں جب دعاء کریں، تو ہمیں بھی یاد رکھیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] تلبیہ کے بغیر احرام کا آغاز

۱۶۸۱- سوال: ایک شخص نے احرام کی نیت تو کی؛ لیکن تلبیہ نہیں پڑھی، تو اس کا احرام شروع ہوا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

احرام کی نیت کے ساتھ تلبیہ یا اس کے قائم مقام: ذکر، سوق ہدی، یا تقلید بدنہ (حج کی قربانی کے جانور پر علامت لگانا) کا ہونا ضروری ہے، محض نیت سے احرام شروع نہ ہوگا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن ابن عباس قال "لا يدخل أحد مكة بغير إحرام إلا الحطابين والعمالين وأهل منافعها. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار-أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م:۲۳۵ھ): ۲۰۹/۳، رقم الحديث: ۱۳۵۱۷، كتاب الحج، من كره أن يدخل مكة بغير إحرام، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد - الرياض☆ التلخيص الحبير في تخريج أحاديث الرافعي الكبير - أبو الفضل أحمد بن علي بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلاني (م:۸۵۲ھ): ۵۲۸/۲، رقم: ۱۰۰۸، كتاب الحج، باب دخول مكة وبقية أعمال الحج إلى آخرها، ط: دار الكتب العلمية)

(دخل كوفي) أي آفاقي (البستان) أي مكانا من الحل داخل الميقات (لحاجة) قصدها ولو عند المجاوزة على ما مر، ونية مدة الإقامة ليست بشرط على المذهب (له دخول مكة غير محرم ووقته البستان ولا شيء عليه) لأنه التحق بأهله كما مر، وهذه حيلة لآفاقي يريد دخول مكة بلا إحرام. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۸۲-۵۸۱، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، مطلب لا يجب الضمان بكسر آلات اللهو، ط: دار الفكر - بيروت ☆البحر الرائق: ۳۴۲/۲، كتاب الحج، مواقيت الإحرام، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۲] (وأما شرطه فالنية) حتى لا يصير محرما بالتلبية بدون نية الإحرام كذا في محيط السرخسي، ولا يصير شارعا بمجرد النية ما لم يأت بالتلبية أو ما يقوم مقامها من الذكر أو سوق الهدي أو تقليد البدنة كذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية: ۲۲۲/۱، كتاب المناسك، الباب الثالث في الإحرام، ط: دار الفكر - بيروت)

والحاصل أن اقتران النية بخصوص التلبية ليس بشرط بل هو السنة وإنما الشرط اقترانها بأي ذكر كان وإذا لبى فلابد أن تكون باللسان. قال في اللباب: فلو ذكرها بقلبه لم يعتد بها. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۸۳/۲، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، ط: دار الفكر - بيروت)

[۵] گونگا کے تلبیہ پڑھنے کا طریقہ

۱۶۸۲- سوال: تلبیہ زبان سے پڑھنا ضروری ہے یا پھر دل دل میں بھی پڑھ سکتے ہیں، ایک شخص گونگا ہے، وہ کس طرح تلبیہ کے الفاظ ادا کرے گا؟

الجواب حامداومصلیا:

تلبیہ زبان سے پڑھنا شرط ہے، دل دل میں پڑھنا صحیح نہیں ہے۔(۱) گونگے شخص کو چاہیے کہ وہ زبان کو حرکت دے، اگر چہ وہ بول نہ سکتا ہو۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] تلبیہ پڑھنے میں مرد وعورت کے درمیان فرق

۱۶۸۳- سوال: (۱) تلبیہ کب تک پڑھنا ضروری ہے؟

(۲) کیا مرد وعورت کے تلبیہ پڑھنے میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

(۱) حاجی شیطان کو کنکری مارتے ہی (یعنی: دسویں ذوالحجہ) کو اور عمرہ کرنے والا طواف کرتے ہی تلبیہ پڑھنا بند کردے۔(۳)

---

(۱) سوال سابق ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) والأخرس يلزمه تحريك لسانه، وقيل لا بل يستحب اهـ ومال شارحه إلى الثاني لأن الأصح أنه لا يلزمه التحريك في القراءة للصلاة فهذا أولى، لأن الحج أوسع ولأن القراءة فرض قطعي متفق عليه بخلاف التلبية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۸۳، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) يقطع التلبية مع أول حصاة يرمي بها جمرة العقبة، لما روى أسامة بن زيد، والفضل بن عباس: أن النبي - صلى الله عليه وسلم - قطع التلبية عند أول حصاة رمى بها جمرة العقبة، وكان أسامة رديف رسول الله - صلى الله عليه وسلم - من عرفات إلى مزدلفة، والفضل كان رديفه من مزدلفة إلى منى.ـــــــ وروي أن ابن عباس سئل عن ذلك فقال: أخبرني أخي الفضل "أن النبي - صلى الله عليه وسلم - قطع التلبية عند أول حصاة رمى بها جمرة العقبة"، وكان رديف رسول الله - صلى الله عليه وسلم -، ... فأما المحرم بالعمرة المفردة فإنه يقطع التلبية إذا استلم الحجر. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷ھ): ۲/ ۱۵۶، كتاب الحج، فصل بيان سنن الحج وبيان الترتيب في أفعاله، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) مرد و عورت کے تلبیہ پڑھنے میں فرق یہ ہے کہ مرد تو بلند آواز سے تلبیہ کے الفاظ پڑھے گا، مگر عورتیں آہستہ آواز سے پڑھیں گی، ان کا بلند آواز سے پڑھنا ممنوع ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] ممنوعات احرام

۱۲۸۴- سوال: مجھے حج کے لیے جانا ہے، میں نے علماء سے سنا ہے کہ حالت احرام میں بہت سی چیزیں ممنوع ہیں؛ اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ احرام کی حالت میں جن چیزوں کی ممانعت ہے، انہیں ذرا تفصیل کے ساتھ بتائیں، مہربانی ہوگی۔

الجواب حامدا ومصليا:

احرام باندھنے کے بعد درج ذیل چیزیں ممنوع ہو جاتی ہیں:

(۱) بیوی کے ساتھ جماع یا دواعی جماع مثلاً: شہوت کے ساتھ چھونا یا بوسہ لینا وغیرہ، (۲) ساتھیوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنا، (۳) خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا یا ان کی طرف رہنمائی کرنا، یا شکار میں کسی طرح کی مدد کرنا، (۴) کسی پرندہ کے پر کاٹ دینا، یا کتر دینا یا اس کا انڈا توڑ دینا، جوئی مارنا یا جوئی کو دھوپ میں ڈالنا، یا جوؤں والا کپڑا جوؤں کو مارنے کے لیے دھوپ میں رکھنا، یا ان چیزوں کی طرف دوسروں کی رہنمائی کرنا، (۵) خوش بو لگانا، ناخن تراشنا اور بال کٹانا، (۶) مرد کا سر ڈھانکنا، (۷) مرد کا سلے ہوئے کپڑے پہننا، (۸) جوتے اور چپل ایسے پہننا کہ جس سے پیروں میں ابھری ہوئی ہڈی چھپ جائے، اور (۹) مرد و عورت دونوں کے لیے چہرے پر کپڑا رکھنا۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) والمرأة لا ترفع صوتها بالتلبية. (الفتاوى السراجية-سراج الدين أبو محمد علي بن عثمان التيمي الأوسي الحنفي (م:۵۶۹ھ)، ۱۷۷، كتاب الحج، باب ترتيب أفعال الحج، ط: زكريا-ديوبند)

(۱) اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰاُولِي الْاَلْبَابِ. (۲-البقرة:۱۹۷)

عن ابن عمر، قال: "الرفث: الجماع، والفسوق: ما أصيب من معاصي الله من صيد وغيره، والجدال: السباب والمنازعة. (المستدرك على الصحيحين-أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله بن محمد بن حمدويه بن نُعيم بن الحكم الضبي الطهماني النيسابوري المعروف بابن البيع (م:۴۰۵ھ): ۲/ ۳۰۳، رقم الحديث: ۳۰۹۴، كتاب التفسير، من سورة البقرة، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

الجناية: هنا ما تكون حرمته بسبب الإحرام أو الحرم، وقد يجب بها دمان أو دم أو صوم أو صدقة. (الدر المختار) =

[٨] مکروہاتِ احرام

١٦٨٥- سوال: گرامی قدر حضرت مفتی صاحب!

مکروہاتِ احرام کیا کیا ہیں؟ تفصیل سے واضح فرمائیں۔

الجواب حامداومصليا:

درج ذیل چیزیں احرام کی حالت میں مکروہ ہیں:

(١) بدن کا میل نکالنا، یا بدن کو صابن سے دھونا۔[١] (٢) سر میں یا ڈاڑھی میں کنگھی کرنا یا ان کو اس طرح کھجلانا کہ بال ٹوٹنے یا جوں کے گرنے کا اندیشہ ہو، بال نہ ٹوٹے اور جوں ہو، تو نہ گرے اس طرح آہستہ سے کھجلانا جائز ہے۔[٢] (٣) ڈاڑھی میں خلال کرنا، اگر کرنا ہو، تو اس طرح کرے کہ بال نہ ٹوٹے۔[٣] (٤)

= (قوله بسبب الإحرام أو الحرم) حاصل الأول سبعة نظمها الشيخ قطب الدين بقوله:

محرم الإحرام يا من يدري		إزالة الشعر وقص الظفر
واللبس والوطء مع الدواعي		والطيب والدهن وصيد البر

زاد في البحر ثامنا وهو ترك واجب من واجبات الحج. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/ ٥٤٣، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر)

فليتق الرفث والفسوق والجدال، ولا يلبس قميصا ولا سراويل، ولا عمامة، ولا قلنسوة، ولا قباء، ولا خفين، ولا يحلق شيئا من شعر رأسه وجسده ولا يلبس ثوبا معصفرا ونحوه، ولا يغطي رأسه ولا وجهه، ولا يتطيب، ولا يغسل رأسه ولا لحيته بالخطمي، ولا يدهن، ولا يقتل صيد البر، ولا يشير إليه، ولا يدل عليه... ولا يكسر بيض الصيد، ولا يقطع شجر الحرم. (المختار مع تعليل الاختيار- عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ٦٨٣هـ): ١/ ١٤٥، كتاب الحج، فصل ما يستحب فعله لمن أراد أن يحرم، ت: الشيخ محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة ☆غنية الناسك في بغية المناسك- محمد حسن شاه المهاجر المكي، ص: ١٠٨- ١١٣، كتاب الحج، فصل في محرمات الإحرام ومحظوراته، ط: مکتبہ یادگار شیخ -سہارن پور☆ كنز الدقائق مع البحر الرائق: ٢/ ٥٦٥، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا- ديوبند☆مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر: ١/ ٣٩٧-٣٩٨، كتاب الحج، مكتبة فقيه الامة- ديوبند)

[١-٢-٣] ولا يغسل رأسه ولا لحيته بالخطمي ولا يحك رأسه، وإذا حك فليرفق بحكه خوفا من تناثر الشعر وقتل القمل وهو ممنوع، وإن لم يكن على رأسه شعر أو أذى فلا بأس بالحك الشديد، كذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية: ١/ ٢٢٤، كتاب المناسك، الباب الرابع فيما يفعله المحرم بعد الإحرام، ط: دار الفكر)

خوش بو کو چھونا یا سونگھنا یا خوش بو والے کی دکان پر خوش بو سونگھنے کی نیت سے بیٹھنا، ہاں بلا ارادہ خوش بو آجائے، تو اس میں حرج نہیں۔[☆] (۵) ناک یا منہ کو کپڑے سے ڈھانکنا، ہاتھ رکھنے میں حرج نہیں۔[☆☆] (۶) خوش بو والا کھانا۔ جو پکا یا نہ گیا ہو۔[☆☆☆] (۷) لنگی کے دونوں کناروں کو آگے سے سینا، البتہ اگر کوئی شخص ستر چھپانے کی غرض سے سیتا ہے، تو جائز ہے؛ تاہم بہتر نہیں ہے۔[☆☆☆☆] واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] مباحات احرام

۱۶۸۶- سوال: احرام کی حالت میں کون کون سی چیزیں مباح ہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

درج ذیل امور محرم کے لیے مباح ہیں:

(۱) میل دور کیے اور خوش بو والا صابن لگائے بہ غیر، ضرورت کی بنا پر گرم یا ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا۔[۱] (۲) پکایا ہوا خوش بو دار کھانا' کھانا۔[۲] (۳) تکیہ پر سر رکھنا۔[۳] (۴) پانی میں غوطہ لگانا، کپڑے

[☆] ولا يمس طيبا بيده، وإن كان لا يقصد به التطيب، كذا في فتاوى قاضي خان. (المصدر السابق)

[☆☆] ويتقي ستر الرأس والوجه ولا يغطي فاه ولا ذقنه ولا عارضه، ولا بأس بأن يضع يده على أنفه كذا في البحر الرائق. (المصدر السابق)

[☆☆☆] ولو كان الطيب في طعام طبخ وتغير فلا شيء على المحرم في أكله سواء كان توجد رائحته أو لا، كذا في البدائع.ـــــــ وإن خلطه بما يؤكل بلا طبخ فإن كان مغلوبا فلا شيء عليه غير أنه إن وجدت معه الرائحة كره. (الفتاوى الهندية: ۲۴۱/۱، كتاب المناسك، الباب الثامن في الجنايات، الفصل الأول فيما يجب بالتطيب والتدهن، ط: دار الفكر)

[☆☆☆☆] والحرام من لبس المخيط هو اللبس المعتاد حتى لو اتزر بالقميص والسراويل أو وضع القباء على كتفه وأدخل منكبيه ولا يدخل يديه لا بأس به، كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۲۲۴/۱، كتاب المناسك، الباب الرابع فيما يفعله المحرم بعد الإحرام، ط: دار الفكر)

[۱] وأجمعوا أنه لو غسله بالحرض أو بالصابون أو بالماء القراح فلا شيء عليه ذكره في شرح الطحاوي. اهـ. أتقاني. (حاشية الشِّلْبِيّ مع تبيين الحقائق - شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِّلْبِيّ (م: ۱۰۲۱ هـ): ۵۳/۲، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: المطبعة الكبرى الأميرية ☆ البناية شرح الهداية- بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۱۸۹/۴، كتاب الحج، باب الإحرام، ما يباح للمحرم، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۵۹۲/۳، كتاب الحج، الفصل الخامس فيما يحرم على المحرم بسبب إحرامه و مالا يحرم، نوع منه في الدهن و التطيب الخ، ت: المفتي شبير أحمد القاسمي، ط: زكريا- ديوبند)

نوٹ: اگلا حاشیہ اگلے صفحہ پر:

دھونا، اسی طرح انگوٹھی پہننا۔[۴] (۵) پیسوں کی حفاظت کے لیے پٹہ (جس میں جیب ہوتا ہے) پہننا جائز ہے۔[۵] (۶) گھر میں بیٹھنا، خیمہ میں داخل ہونا، چھتری اوڑھنا، کسی سایہ میں بیٹھنا۔[۶] (۷) آئینہ دیکھنا، مسواک کرنا، دانت نکلوانا، ٹوٹے ہوئے ناخن کو الگ کرنا، بے غیر خوش بو والا سرمہ لگانا، پھنسی پھوڑنا، زخم صاف کرنا، انجکشن لگوانا۔[۷] (۸) تکلیف دینے والے جانور، جیسے: سانپ، بچھو، کھٹمل، چیچڑی، مکھی وغیرہ کو مارنا۔[۸] (۹) ایسا تمباکو والا پان، جس میں الائچی، لونگ یا اور کوئی خوش بو کی چیز نہ ہو، کھانا۔[۹] (۱۰) ہاتھ یا پاؤں وغیرہ کے پھٹن میں تیل یا مرہم جس میں خوش بو نہ ہو لگانا۔[۱۰] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۲] ولو كان الطيب في طعام طبخ وتغير فلا شيء على المحرم في أكله سواء كان توجد رائحته أو لا، كذا في البدائع.
(الفتاوى الهندية: ١/ ٢٤١، كتاب المناسك، الباب الثامن في الجنايات، الفصل الأول فيما يجب بالتطيب والتدهن، ط: دار الفكر)

[۳] غنیۃ الناسک، ص: ۲۵۴، ط: یادگار شیخ، سہارن پور۔

[۴] ويجوز للمحرم أن يكتحل بما لا طيب فيه . . . ويختتن ويلبس الخاتم. (فتح القدير- كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م: ٨٦١هـ): ٢/ ٤٤٤، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: دار الفكر)

[۵] ولا بأس بشد الهميان أو المنطقة للمحرم سواء كان في الهميان نفقته أو نفقة غيره، وسواء كان شد المنطقة بالإبريسم أو بالسيور هكذا في البدائع والسراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ١/ ٢٢٤، كتاب المناسك، الباب الرابع فيما يفعله المحرم بعد الإحرام، ط: دار الفكر)

[۶] ولا بأس بأن يستظل بالبيت والمحمل كذا في الكافي ولا بأس بأن يستظل بالفسطاط، كذا في فتاوى قاضي خان، وكذا لو دخل تحت ستر الكعبة حتى غطاه والستر لا يصيب رأسه ولا وجهه لا بأس به، فإن كان يصيب رأسه أو وجهه كره ذلك لمكان التغطية، كذا في المحيط. (المصدر السابق)

[۷] ولا بأس للمحرم أن يحتجم أو يفتصد أو يجبر الكسر أو يختتن، كذا في فتاوى قاضي خان. (المصدر السابق)

[۸] ولا شيء في قتل الكلب العقور والذئب والحدأة والغراب الأبقع وهو ما يأكل الجيف أما ما تأكل الزرع فهو صيد، ولا شيء في الحية والعقرب والفأرة والزنبور والنمل والسرطان والذباب والبق والبعوض والبرغوث والقراد والسلحفاة ولا شيء في هوام الأرض كالقنفذ والخنفساء، كذا في فتاوى قاضي خان وكذا الحلم والوازع وصياح الليل، كذا في السراج الوهاج والضبع والثعلب الذي لا يبتدئ بالأذى غالبا فله قتله ولا شيء عليه، كذا في غاية السروجي. (الفتاوى الهندية: ١/ ٢٥٢، كتاب المناسك، الباب التاسع في الصيد، ط: دار الفكر)

[۹] حاشیہ نمبر (۲) ملاحظہ فرمائیں۔

[۱۰] ونوع ليس بطيب بنفسه ولا فيه معنى الطيب، ولا يصير طيبا بوجه كالشحم فسواء أكل أو ادهن به أو جعل في شقاق الرجل لا تجب الكفارة. ـــــــ ونوع ليس بطيب بنفسه لكنه أصل الطيب، يستعمل على وجه الطيب، ويستعمل على وجه الإدام كالزيت والشيرج، فيعتبر فيه الاستعمال، فإن استعمل استعمال الأدهان في البدن يعطى=

[۱۰] عمرہ کا احرام باندھنے والا سعی کے بعد کیا کرے؟

۱۶۸۷- سوال: جس شخص نے عمرہ کا احرام باندھا تھا، وہ صفا اور مروہ کی سعی کے بعد کیا کرے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صرف عمرہ یا حج تمتع کا احرام باندھنے والا صفا اور مروہ کی سعی سے جب فارغ ہو جائے، تو اس کے لیے پورے سر کے بال استرے یا ریزر سے منڈوانا، یا قینچی سے کتروانا واجب ہے، البتہ منڈوانا سنت ہے، گو کتروانا بھی جائز ہے، خیال رہے کہ یہ حکم مردوں کے لیے ہے۔ (۱) عورتوں کے لیے قصر (کتروانا) ضروری ہے، ان کے لیے منڈوانا جائز نہیں ہے۔ حلق یا قصر کے بعد عمرہ مکمل ہو گیا اور حج تمتع کرنے والے کا بھی عمرہ مکمل ہو گیا، اب احرام کی پابندیاں ختم ہو گئیں۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=له حكم الطيب، وإن استعمل في مأكول أو شقاق رجل لا يعطى له حكم الطيب كالشحم. (بدائع الصنائع: ۱۹۱/۲، كتاب الحج، فصل تطيب المحرم، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆الفتاوى الهندية: ۲۴۰/۱، كتاب المناسك، الباب الثامن في الجنايات، الفصل الأول فيما يجب بالتطيب والتدهن، ط: دار الفكر- بيروت)

(۱) عن نافع، أن عبد الله، قال: حلق رسول الله صلى الله عليه وسلم وحلق طائفة من أصحابه، وقصر بعضهم، قال عبد الله: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: رحم الله المحلقين، مرة أو مرتين، ثم قال: والمقصرين. (الصحيح لمسلم: ۴۲۰/۱، رقم الحديث: ۳۱۶-(۱۳۰۱)، كتاب الحج، باب تفضيل الحلق على التقصير وجواز التقصير، ط: ديوبند)

وأما مقدار الواجب، فأما الحلق فالأفضل حلق جميع الرأس؛ لقوله عز وجل {محلقين رءوسكم} [الفتح: ۲۷]، والرأس اسم للجميع. (بدائع الصنائع-الكاساني (م: ۵۸۷ھ): ۱۴۱/۲، كتاب الحج، فصل مقدار واجب الحلق والتقصير، ط: دار الكتب العلمية☆رد المحتار على الدر المختار: ۵۱۵/۲-۵۱۶، كتاب الحج، باب الإحرام وصفة المفرد، مطلب في رمي جمرة العقبة)

(۲) عن علي-رضي الله عنه- قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن تحلق المرأة رأسها._____ عن عائشة -رضي الله عنها- أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى أن تحلق المرأة رأسها._____ والعمل على هذا عند أهل العلم لا يرون على المرأة حلقا، ويرون أن عليها التقصير. (سنن الترمذي: ۱۸۲/۱، رقم الحديث: ۹۱۴ و ۹۱۵، أبواب الحج، باب ما جاء في كراهية الحلق للنساء، ط: ديوبند)

ولا حلق على المرأة لما روي عن ابن عباس - رضي الله عنه - عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: ليس على النساء حلق، وإنما عليهن تقصير، وروت عائشة - رضي الله عنها - أن النبي - صلى الله عليه وسلم - نهى المرأة أن تحلق رأسها، ولأن الحلق في النساء مثلة، ولهذا لم تفعله واحدة من نساء رسول الله - صلى الله عليه وسلم - ولكنها تقصر. (بدائع الصنائع: ۱۴۱/۲، كتاب الحج، فصل في أحكام الحلق والتقصير، ط: دار الكتب العلمية☆غنية الناسك في بغية المناسك- محمد حسن شاه المهاجر المكي، ص: ۲۲۵، فصل في الحلق والقصر، ط: مکتبہ یادگار شیخ -سہارن پور☆رد المحتار على الدر المختار: ۵۱۵/۲، كتاب الحج، باب الإحرام وصفة المفرد، مطلب في رمي جمرة العقبة)

[۱۱] حج میں پہنے ہوئے احرام کے کپڑے کا استعمال

۱۶۸۸- سوال: محترم المقام حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

بعد سلام مسنون! کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام اِس مسئلے میں کہ میرے والد صاحب حج کو گئے تھے، وہاں سے احرام لے کر آئے ہیں، تو احرام کے اس کپڑے کا خود ان کے لیے استعمال کرنا یا اُس میں سے بچوں کے کپڑے بنانا جائز ہے یا نہیں؟ یا کسی غریب ومسکین کو صدقہ کرنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

احرام کا کپڑا خود حاجی استعمال کرے، یا بچوں کے لیے کپڑے بنوائے، یا صدقہ کرے، تینوں جائز ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] بہ حالتِ احرام عورتوں کے لیے چہرہ کھلا رکھنے کی حکمت

۱۶۸۹- سوال: دین اِسلام میں عورتوں کے لیے پردے کا حکم تاکیدی ہے، جب کہ حج اور عمرہ کے دوران عورتوں کے لیے چہرہ کھلا رکھنے کا حکم ہے، علاوہ ازیں بعض عورتیں مدینہ منوّرہ میں بھی بے پردہ ہوتی ہیں، تو اُس کی حکمت کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''عورتوں کا احرام اُن کا چہرہ ہے''۔[۲] یعنی بہ حالتِ احرام

---

(۱) چوں کہ احرام کا کپڑا ان کی ملکیت ہے، اور آدمی اپنی ملکیت میں ہر جائز تصرف کا مجاز ہے:

لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/۵۱، باب البيع الفاسد، مطلب في تعريف المال، ط: دار الفكر)

والحاصل أن القياس في جنس هذه المسائل أن يفعل المالك ما بدا له مطلقا لأنه متصرف في خالص ملكه. (المصدر السابق: ۵/۴۴۸، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي، ط: مسائل متفرقة، مطلب اقتسموا دارا وأراد كل منهم فتح باب لهم ذلك، ط: دار الفكر ☆ فتح القدير: ۷/۳۲۶، كتاب أدب القاضي، باب التحكيم، مسائل شتى من كتاب القضاء، ط: دار الفكر)

(۲) عن ابن عمر، أن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: إحرام المرأة في وجهها وإحرام الرجل في رأسه. (سنن الدارقطني - أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي بن مسعود بن النعمان بن دينار البغدادي الدارقطني (م: ۳۸۵ھ): ۳/۳۶۳، رقم =

عورتوں کو اپنا چہرہ کھلا رکھنا ضروری ہے، تمام احکام کی اصل حکمت صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے، حاجی یا معتمر اللہ تعالیٰ کا عاشق بندہ ہوتا ہے، لہٰذا اُس میں اُن کا امتحان ہے کہ بندہ اللہ کے عشق میں مخلوق سے بے پرواہ ہوتا ہے یا نہیں؟(۲) البتہ حج کے بعد عمومی احوال میں عورتوں کا بے پردہ رہنا سخت گناہ کا کام ہے۔(۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] احرام باندھنے کے بعد محرم کا خوشبودار شربت پینا

۱۶۹۰- سوال: بمبئی سے ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے بعد احرام کی حالت میں ہوائی جہاز میں شربت پیش کیا جاتا ہے، جس میں ایسنس [☆☆☆] کی خوش بو ہوتی ہے؛ اِس لیے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ احرام پہننے کے بعد خوش بودار چیز کا کھانا یا پینا جائز نہیں ہے، لہٰذا وہ نہیں پیتے، جب کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شربت میں کوئی حرج نہیں ہے، اور وہ لوگ پی لیتے ہیں، اِس کے متعلق حکمِ شرعی کیا ہے؟

=الحديث:۲۷۶۱، كتا الحج، باب المواقيت، ت: شعيب الارنؤوط،و جماعة من العلماء، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت - لبنان☆ السنن الكبرى- أبو بكر البيهقي (م:۴۵۸هـ):۵/ ۴۷، رقم الحديث:۹۰۴۸،روي موقوفا، كتاب الحج، باب المرأة لا تنتقب في إحرامها ولا تلبس القفازين، ت: محمد عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆معرفة السنن والآثار للبيهقي:۷/ ۱۳۹، رقم الحديث:۹۵۸۶، كتاب المناسك، باب تلبية المرأة وإحرامها، روى موقوفا على ابن عمر، ت: عبد المعطي أمين قلعجي،ط: جامعة الدراسات الإسلامية، كراتشي- باكستان)

(۲) السابعة: نهي المرأة عن التنقب والقفازين يدل على أن حكم إحرام المرأة يتعلق بوجهها وكفيها. والسر في ذلك، وفي تحريم المخيط وغيره مما ذكر - والله أعلم - مخالفة العادة، والخروج من المألوف لإشعار النفس بأمرين:ـــــ أحدهما: الخروج عن الدنيا، والتذكر للبس الأكفان عند نزع المخيط.ـــــ والثاني: تنبيه النفس على التلبس بهذه العبادة العظيمة بالخروج عن معتادها وذلك موجب للإقبال عليها، والمحافظة على قوانينها وأركانها، وشروطها وآدابها. والله أعلم. (إحكام الإحكام شرح عمدة الأحكام-ابن دقيق العيد (م:۷۰۲هـ):۲/ ۵۲، رقم الحديث: ۲۱۴، كتاب الحج، باب مايلبس المحرم من الثياب، مسئلة إحرام المرأة، ط: مطبعة السنة المحمدية)

(۳) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صنفان من أهل النار لم أرهما، قوم معهم سياط كأذناب البقر يضربون بها الناس، ونساء كاسيات عاريات مميلات مائلات، رءوسهن كأسنمة البخت المائلة، لا يدخلن الجنة، ولا يجدن ريحها، وإن ريحها ليوجد من مسيرة كذا وكذا. (الصحيح لمسلم:۲/ ۲۰۵، كتاب اللباس والزينة، باب النساء الكاسيات العاريات المائلات المميلات، ط: ديوبند)

(☆☆☆) Essence، ایک قسم کی خوش بو، جسے شربت وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں، اور پرفیوم میں بھی ڈالتے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

شربت اور اُس کے علاوہ دیگر مشروبات کا پینا حالتِ احرام میں جائز ہے، البتہ خوش بودار چیز پکائے بغیر کھانا مکروہ ہے، مثلاً الائچی، تج یا لونگ وغیرہ کچے کھانا مکروہ ہے، لیکن اگر اِن چیزوں کو ڈال کر کوئی چیز پکائی گئی ہے، تو اُس کو کھانا جائز ہے۔ (معلم الحجاج، ص: ۱۲۸ تا ۱۳۰)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] دسویں ذی الحجہ کو مناسک کی ادائیگی کے بعد بیوی کے ساتھ جماع کب درست ہے؟

۱۶۹۱- سوال: دسویں ذی الحجہ کو قربانی کے بعد حلق اور غسل کر کے مکہ پہنچ کر طوافِ زیارت کرلیا، تو اب بیوی کے ساتھ جماع کے لیے دوبارہ غسل کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

دسویں ذی الحجہ کو طوافِ زیارت کے بعد بیوی کے ساتھ جماع حلال ہے، طواف کے بعد غسل کرنا ضروری نہیں ہے۔ (بدائع الصنائع)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] احرام کی چادر دھونے کا حکم

۱۶۹۲- سوال: قارن اور مفرد کے کئی دنوں تک احرام میں رہنے کی وجہ سے ان کے احرام کی لنگی اور چادر گندی اور میلی ہوجاتی ہے، اور بسا اوقات بدن کے پسینہ کی بدبو آنے لگتی ہے، دریافت یہ کرنا ہے

---

[۱] ولو كان الطيب في طعام طبخ وتغير، فلا شيء على المحرم في أكله، سواء كان يوجد ريحه أو لا؛ لأن الطيب صار مستهلكا في الطعام بالطبخ، وإن كان لم يطبخ يكره إذا كان ريحه يوجد منه ولا شيء عليه، لأن الطعام غالب عليه، فكان الطيب مغمورا مستهلكا فيه، وإن أكل عين الطيب غير مخلوط بالطعام فعليه الدم إذا كان كثيرا. (بدائع الصنائع: ۱۹۱/۲، كتاب الحج، فصل تطيب المحرم، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ معلم الحجاج، ص: ۱۱۴، مکروہات احرام، ط: دار الکتاب - دیوبند)

[۲] ولو جامع بعد ما طاف طواف الزيارة كله أو أكثره، فلا شيء عليه لأنه قد حل له النساء فلم يبق له الإحرام رأسا إلا إذا طاف طواف الزيارة قبل الحلق والتقصير، فعليه شاتان لبقاء الإحرام لهما جميعا. (بدائع الصنائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۲۱۹/۲، كتاب الحج، فصل بيان ما يفسد الحج، ط: دار الكتب العلمية ☆ المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱۱۹/۴، كتاب المناسك، باب الجماع للمحرم، ط: دار المعرفة - بيروت)

کہ قارن اور مفرد غسل کر کے چادر دھو سکتا ہے یا نہیں؟ نیز احرام کی چادر کو بدل سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

میلے کپڑے دھونا جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں؛ البتہ میل دور کرنے کی نیت ہونی چاہیے، محرم کے لیے غسل کرنا جائز ہے؛ البتہ صابن لگانا اور میل دور کرنے کے لیے بدن کو ملنا مکروہ ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] ستر کھل جانے کے اندیشہ سے احرام کی لنگی کا منہ جوڑ لینا

۱۶۹۳- سوال: اگر ستر کھل جانے کا اندیشہ ہو، تو قارن اور مفرد دوسری لنگیوں کی طرح سل کر احرام کی لنگی پہن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

اگر کشف عورت (ستر کھلنے) کا واقعی اندیشہ ہو، تو احرام کی لنگی کو سل کر پہننے کی گنجائش ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (وغسل الثوب) أي للطهارة أو النظافة، لا لقصد قتل القمل و الزينة. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع إرشاد الساري، ص:۱۷۲، فصل في مباحاته)

(ويجوز له) أي للمحرم (الاغتسال ودخول الحمام) بحيث لا يزيل الوسخ. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ 'داماد أفندي' (م:۱۰۷۸ھ): ۱/۲۶۹، كتاب الحج، فصل بيان الإحرام، ط: دار إحياء التراث العربي)

[ومن مكروهات الإحرام] ... إزالة التفث) أي الوسخ و الدرن ... (وغسل الرأس و اللحية والجسد) أي سائر البدن (بالسدر و نحوه) كالأشنان و الدلوك و الصابون. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع إرشاد الساري، ص:۱۶۹، باب الإحرام، فصل في مكروهات الإحرام☆الهداية: ۱/۱۳۶، كتاب الحج، باب الإحرام، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي☆الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۴۹۰، كتاب الحج، فصل في الإحرام، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) (قوله والبس إزارا ورداء جديدين أو غسيلين)؛ لأنه - عليه السلام - لبسهما هو وأصحابه كما رواه مسلم ولأنه ممنوع عن لبس المخيط ولا بد من ستر العورة ودفع الحر والبرد، وذلك فيما عيناه والإزار من السرة إلى ما تحت الركبة يذكر ويؤنث كما في ضياء العلوم، والرداء على الظهر والكتفين والصدر ويشده فوق السرة، وإن غرز طرفيه في إزاره فلا بأس به ولو خلله بخلال أو مسلة أو شده على نفسه بحبل أساء ولا شيء عليه. (البحر الرائق =

[۱۷] احرام کی چادر کے دونوں کناروں کو سی کر تہبند کی طرح بنالینا

۱۶۹۴- سوال: احرام کی وہ چادر، جس کو ہم تہبند کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اس کے دونوں کناروں کو سلوالیا جائے، تو کیا احرام کی حالت میں اس کو پہن سکتے ہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

تہبند کے دونوں کنارے سل کر تہبند جیسی شکل بنالینا جائز ہے؛ لیکن احرام کی چادر کو بغیر سلے پہننا افضل ہے۔[۱]

اس سلسلے میں اصل یہ ہے کہ ہر وہ کپڑا، جس کو سلنے کی وجہ سے بدن کے موافق ہوجائے، اس کو پہننا جائز نہیں ہے۔[۲] چوں کہ تہبند کو سلنے سے وہ بدن کی ہیئت کے مطابق نہیں ہوتا ہے؛ لہٰذا اس کا پہننا ممنوع نہیں ہوگا؛[۳] لیکن افضل طریقہ چادر کو کھلا چھوڑ دینا ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=شرح كنز الدقائق-ابن نجيم المصري (م:۹۷۰هـ):۳۴۵/۲، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية:۲۲۲/۱، كتاب المناسك، الباب الثالث في الإحرام، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع:۱۸۵/۲، كتاب الحج، فصل في محظورات الإحرام، ط: دار الكتب العلمية)

مفتی محمد سعید مظاہریؒ لکھتے ہیں:

تہبند کے دونوں پلوں کو آگے سے سینا مکروہ ہے، اگر کسی نے ستر عورت کی حفاظت کی وجہ سے سی لیا، تو دم واجب نہ ہوگا۔ (معلم الحجاج، ص: ۱۱۴، مکروہات احرام، ط: دارالکتاب-دیوبند)

(۱) سوال سابق کی تخریج ملاحظہ کریں۔

(۲) (ولبس قميص وسراويل) أي كل معمول على قدر بدن أو بعضه كزردية وبرنس. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله أي كل معمول إلخ) أشار به إلى أن المراد المنع عن لبس المخيط وإنما خص المذكورات لذكرها في الحديث، وفي البحر عن مناسك ابن أمير حاج الحلبي: أن ضابطه لبس كل شيء معمول على قدر البدن أو بعضه بحيث يحيط به بخياطة أو تلزيق بعضه ببعض أو غيرهما ويستمسك عليه بنفس لبس مثله إلا المكعب. اهـ. قلت: فخرج ما خيط بعضه ببعض لا بحيث يحيط بالبدن مثل المرقعة فلا بأس بلبسه. (رد المحتار على الدر المختار:۴۸۹/۲، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب فيما يحرم بالإحرام وما لا يحرم، ط: دار الفكر)

وحقيقة لبس المخيط أن يحصل بواسطة الخياطة اشتمال على البدن واستمساك. (البحر الرائق: ۷/۳، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۳) احرام کے تہبند کے دونوں کناروں کو سل دیا جائے، تو وہ ان کپڑوں میں شامل ہوجاتا ہے، جن کو پہننے کی محرم کو ممانعت ہے، یہ=

[۱۸] محرم کا بہ وجہ عذر کان اور آنکھ پر کپڑے کی پٹی باندھنا

۱۶۹۵- سوال: اگر کوئی محرم بیمار یا معذور ہو اور طبیعت کی خرابی کی وجہ سے صرف کان یا آنکھ پر دوڈھائی انچ کی کپڑے کی پٹی باندھنا چاہے تو باندھ سکتا ہے یا نہیں؟ آنکھ پر اس لیے پٹی باندھنے کی ضرورت یوں ہے کہ جب تک آنکھ پر پٹی نہیں باندھتا ہے، اس وقت تک اسے نیند نہیں آتی۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

بہ حالت مجبوری آنکھوں پر پٹی باندھنا جائز ہے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= دوسری بات ہے کہ اگر کوئی اس کے باوجود پہن لے، تو اس پر دم واجب نہیں ہوگا، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں:

فقہاء نے اس سلسلے میں ایک مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص چادر کو تہہ بند بنالے، تو اس کے دونوں کھلے ہوئے کناروں کو رسی یا کسی اور چیز سے گرہ لگانا اور باندھنا نہیں چاہیے، لیکن ایسا کر ہی لے، تو اس کی وجہ سے دم یا صدقہ واجب نہیں، چناں چہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

بخلاف الرداء، فإنه إذا اتزر به لا ينبغي أن يعقده بحبل أو غيره، ومع هذا لو فعل لا شيء عليه، لأنه لم يلبسه لبس المخيط لعدم الاشتمال. (البحر الرائق: ۳/ ۷، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: دار الكتاب الإسلامي) [کتاب الفتاوی: ۴/ ۳۱، ط: نعیمیہ-دیوبند]

حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاج پوریؒ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

ستر کھلنے کا اندیشہ ہو، تو احرام کی چادر سی لینے کی گنجائش ہے، بلا ضرورت سینا مکروہ ہے، غنیۃ الناسک میں ہے:

"وعقد الازار والرداء بأن يربط طرف أحدهما بطرفه الآخر" أن يخلله بخلال أو يشده بحبل ونحوه. (غنية الناسك، ص: ۷۴، فصل في مكروهات الإحرام ومحظوراته التي لا جزاء فيها سوى الكراهة) [فتاوی رحیمیہ: ۸/ ۷۵، کتاب الحج، مسئلہ نمبر: ۷۲، احرام کی چادر لنگی کی طرح سینا، ط: دار الاشاعت، کراچی]

(۱) (قال) ولا تغط رأسك، ولا وجهك، وعلى قول الشافعي - رحمه الله تعالى - لا بأس للرجل أن يغطي وجهه، ولا يغطي رأسه، والمرأة تغطي رأسها لا وجهها، واستدل بقوله - صلى الله عليه وسلم - إحرام الرجل في رأسه وإحرام المرأة في وجهها.____ (ولنا) حديث الأعرابي حين وقصت به ناقته في أخافيق جرزان، وهو محرم فقال - صلى الله عليه وسلم - لا تخمروا رأسه ووجهه، وفي هذا تنصيص على أن المحرم لا يغطي رأسه ووجهه، ورخص رسول الله - صلى الله عليه وسلم - لعثمان - رضي الله عنه - حين اشتكت عينه في حال الإحرام أن يغطي وجهه، فتخصيصه حالة الضرورة بالرخصة دليل على أن المحرم منهي عن تغطية الوجه. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۴/ ۷، كتاب المناسك، ط: دار المعرفة - بيروت)

[۱۹] حالت احرام میں انڈرویئر کا استعمال

۱۶۹۶- سوال: ایک شخص کو گولی کی شکایت (انتفاخ الخصیتین) ہے، جس کی بنا پر وہ چڈی (Under Wear) پہننے پر مجبور ہے، ورنہ مرض کی زیادتی کا قوی اندیشہ ہے

اب سوال یہ ہے کہ یہ شخص حالتِ احرام میں چڈی کا استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ جیسے پاسپورٹ اور پیسہ وغیرہ کی حفاظت کے خاطر ہمیانی کا استعمال کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی حفظانِ صحت اور ازدیادِ مرض سے بچنے کی خاطر چڈی کے استعمال کی گنجائش ہے یا نہیں؟ فقہاء کی عبارت کی روشنی میں لکھیں۔

الجواب حامداو مصليا

جناب والا کا قیاس اور دیگر مسائل کے مطالعہ کے بعد احقر کی رائے یہ ہے کہ وہ شخص، جس کو انتفاخ الخصیتین کا مرض ہو، اور چڈی استعمال نہ کرنے کی صورت میں از دیاد مرض کا اندیشہ ہو، وہ چڈی کے بجائے لنگوٹ کا استعمال کرے، کہ اس میں ضرورت بھی پوری ہوجائے گی اور سلے ہوئے کپڑے کا پہننا بھی لازم نہیں آئے گا، جس کے استعمال کی حالت احرام میں اجازت نہیں ہے۔

اس مسئلے [چڈی پہننا] کی صریح عبارت کا ملنا مشکل ہے، تاہم اس کی ایک نظیر زبدۃ المناسک صفحہ ۸۵، ۸۶ کا ایک مسئلہ ہے کہ ''مرد سردی کی وجہ سے اگر ہاتھ پر چھوٹا رومال، یا بڑا رومال لپیٹ لے، تو جائز ہے، مگر اس کے لیے دستانہ، چمڑے، روئی یا سوتی کے موزے کا پہننا ممنوع ہے۔''[۱]

اس لیے چڈی کے بجائے لنگوٹ کا استعمال کیا جائے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] عمرہ یا حج کے احرام سے نکلنے کا طریقہ

۱۶۹۷- سوال: حج اور عمرہ سے حلال ہونے کا طریقہ کیا ہے؟

---

(۱) مرد کو اپنے ہاتھوں میں دستانہ، مخیط چرمی، خواہ کپڑے کے، ہاتھوں کی وضع پر بنے ہوئے، پہننا بھی حرام ہے، مگر کپڑے سے، جیسا رومال وغیرہ، لپیٹ لے، یا ڈھانک لے، تو مباح ہے۔ (زبدۃ المناسک، مع عمدۃ المناسک: ۱/ ۸۵-۸۶، الجمعیۃ پریس، دہلی)

(۲) وحقيقة لبس المخيط أن يحصل بواسطة الخياطة اشتمال على البدن واستمساك. (البحر الرائق: ۳/ ۷، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: دار الكتاب الإسلامي)

الجواب حامدا ومصليا:

بیت اللہ کا طواف، صفا ومروہ کی سعی کی ادائیگی کے بعد حلق یا قصر کرانے سے عمرہ کرنے والا حلال ہوجائے گا۔ (۱)

حج کا احرام باندھنے والا حج کے ارکان ادا کرنے کے بعد دسویں ذی الحجہ کے دن جمرۂ عقبیٰ کی رمی اور اگر متمتع یا قارن ہو، تو ذبح کرکے حلق یا قصر کرانے سے حلال ہوجائے گا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فإذا فرغ من السعي، فإن كان محرما بالعمرة، ولم يسق الهدي يحلق أو يقصر فيحل؛ لأن أفعال العمرة هي الطواف والسعي فإذا أتى بهما لم يبق عليه شيء من أفعال العمرة فيحتاج إلى الخروج منها بالتحلل، وذلك بالحلق أو التقصير كالتسليم في باب الصلاة،... فإذا حلق أو قصر حل له جميع محظورات الإحرام. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۴۹، كتاب الحج، فصل في بيان سنن الحج وبيان الترتيب، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۷۲، كتاب الحج، مطلب في أحكام العمرة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) فإذا فرغ من هذا الرمي لا يقف، وينصرف إلى رحله، فإن كان منفردا بالحج يحلق أو يقصر، والحلق أفضل... ولا ذبح عليه، وإن كان قارنا أو متمتعا يجب عليه أن يذبح ويحلق ويقدم الذبح على الحلق لقوله تعالى: {ويذكروا اسم الله في أيام معلومات على ما رزقهم من بهيمة الأنعام فكلوا منها وأطعموا البائس الفقير} [الحج:28] {ثم ليقضوا تفثهم} [الحج:29] رتب قضاء التفث، وهو الحلق على الذبح.____ وروي عن النبي - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: أول نسكنا في يومنا هذا الرمي ثم الذبح ثم الحلق.____ وروي عنه - صلى الله عليه وسلم - أنه رمى ثم ذبح ثم دعا بالحلاق...____ فإذا حلق الحاج أو قصر حل له كل شيء حظر عليه الإحرام إلا النساء عند عامة العلماء...

فإذا طاف طواف الزيارة كله أو أكثره حل له النساء أيضا؛ لأنه قد خرج من العبادة، وما بقي عليه شيء من أركانها، والأصل أن في الحج إحلالين: الإحلال الأول بالحلق أو بالتقصير ويحل به كل شيء إلا النساء، والإحلال الثاني بطواف الزيارة، ويحل به النساء أيضا. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۵۸، كتاب الحج، فصل في بيان سنن الحج وبيان الترتيب، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ المبسوط للسرخسي: ۴/ ۶۴، كتاب المناسك، باب رمي الجمار، ط: دار المعرفة- بيروت)

عن ابن عباس قال: الطواف بالبيت صلاة، ولكن الله أحل فيه المنطق، فمن نطق فلا ينطق إلا بخير. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار المعروف بـ'مصنف ابن أبي شيبة'-أبو بكر بن أبي شيبة (م:۲۳۵هـ): ۳/۱۳۷، رقم الحديث: ۱۲۸۰۸، كتاب الحج، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد-الرياض)

عن أبي سعيد، أنه كان يأمر بنيه إذا طافوا أن لا يلغوا في طوافهم، ولا يعصوا خلسة، ولا يكلموا أحدا حتى يقضوا طوافهم إن استطاعوا. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۱۲۸۰۹)

باب الطواف والسعي والحلق والقصر

[طواف، سعی اور حلق وقصر کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الطواف والسعي والحلق والقصر

[طواف، سعی اور حلق وقصر کا بیان]

[۱] طواف کا معنی اور اس کے لیے نیت کا شرط ہونا

۱۶۹۸- سوال: طواف کسے کہتے ہیں، طواف کے لیے نیت کرنا ضروری ہے یا نہیں، اور نیت کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

طواف کے معنی کسی چیز کے گرد گھومنا ہے، نیت کر کے بیت اللہ کے گرد سات چکر لگانے کو طواف کہا جاتا ہے، ایک چکر کو "شوط" کہا جاتا ہے۔ (۱)

طواف کے لیے نیت فرض ہے، بہ غیر نیت کے جس قدر بھی چکر لگائے جائیں، وہ طواف نہ ہوگا۔ (۲)

---

(۱) الطواف: هو الدوران حول الكعبة أربعة أشواط أو أكثر إلى تمام السبعة كيف ما حصل. (غنية الناسك في بغية المناسك- محمد حسن شاه المهاجر المكي،ص:۳۹، باب في ماهية الطواف وأنواعه وأركانه وشرائطه وسائر أحكامه، ط: یادگار شیخ، سہارن پور)

(۲) وأما شرطه وواجباته فشرطه النية، وهو أصل النية دون التعيين حتى لو لم ينو أصلا بأن طاف هاربا من سبع أو طالبا لغريم لم يجز. (بدائع الصنائع:۱۲۸/۲، كتاب الحج، فصل شرط وواجبات طواف الزيارة، ط: دار الكتب العلمية☆ الجوهرة النيرة- أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م:۸۰۰هـ) :۱۵۹/۱، كتاب الحج، ط: المطبعة الخيرية☆ رد المحتار على الدر المختار:۴۳۸/۱، كتاب الصلاة، فروع في النية، ط: دار الفكر- بيروت)

طواف کی نیت کرتے ہوئے اس طرح کہے: اے اللہ! میں طواف کرتا ہوں، تو اس کو میرے لیے آسان فرما اور قبول فرما۔ (☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] استلام کا مطلب اور اس کا طریقہ

۱۶۹۹- سوال: استلام کسے کہتے ہیں، اور اس کا طریقہ کیا ہے۔؟

الجواب حامداومصلیا:

استلام کا معنیٰ حجر اسود کو بوسہ دینا، یا ہاتھ سے چھونا ہے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ حجر اسود پر اس طرح رکھے، جیسے سجدے میں زمین پر رکھتے ہیں، پھر اپنا منہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھ کر ادب کے ساتھ بوسہ دے، اگر ہجوم کی وجہ سے بوسہ نہ دے سکے، تو اپنی ہتھیلی حجر اسود کو مس کرے اور اس ہتھیلی کو بوسہ دے، اگر بھیڑ کی وجہ سے ہاتھ لگانا بھی ممکن نہ ہو، تو حجر اسود کے سامنے دونوں ہاتھ کندھوں یا کانوں کے برابر اٹھا کر یہ خیال کرے کہ میں ان ہاتھوں کو حجر اسود پر رکھ رہا ہوں، پھر دونوں ہتھیلیوں کو بوسہ دے دے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] اضطباع اور رمل کا مطلب اور ان کا وقت

۱۷۰۰- سوال: اضطباع اور رمل کا کیا مطلب ہے؟

(☆☆) لأن النية عمل القلب لا عمل اللسان لكن يستحب أن يقول بلسانه ما نوى بقلبه فيقول: اللهم إني أريد كذا فيسره لي، وتقبله مني لما ذكرنا في بيان سنن الحج. (بدائع الصنائع: ۲/۱۶۱، كتاب الحج، فصل بيان ما يصير به محرما، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) والاستلام أن يضع يديه على الحجر الأسود ويقبله لفعله - عليه السلام - الثابت في الصحيحين وإن لم يقدر وضع يديه وقبلهما أو إحداهما فإن لم يقدر أمس الحجر شيئا كالعرجون ونحوه، وقبله لرواية مسلم وإن عجز عن ذلك للزحمة استقبله ورفع يديه حذاء أذنيه، وجعل باطنهما نحو الحجر مشيرا بهما إليه وظاهرهما نحو وجهه هكذا المأثور . . . وقول القوام الكاكي الأولى أن لا يسجد عندنا ضعيف، وهذا التقبيل المسنون إنما يكون بوضع الشفتين من غير تصويت كما ذكره الحلبي في مناسكه. (البحر الرائق: ۲/۳۵۱، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: دار الكتب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۹۳، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في دخول مكة، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۲۵، كتاب المناسك، الباب الخامس في كيفية أداء الحج، ط: دار الفكر- بيروت)

یہ دونوں عمل کب کیے جاتے ہیں، اور کون لوگ کریں گے؟

الجواب حامداومصلیا:

''اضطباع'' کہتے ہیں: دائیں بغل سے چادر نکال کر بائیں کندھے پر ڈالنا، اور ''رمل'' یہ ہے کہ: کندھے ہلا کر اس طرح چلنا، جیسے پہلوان اکھاڑے میں چلتا ہے۔

یہ دونوں عمل اس طواف میں کیے جاتے ہیں، جس کے بعد سعی کرنی ہے۔

رمل صرف طواف کے پہلے تین چکروں میں ہی سنت ہے۔ (۱)

یہ دونوں کام مردوں کے لیے سنت ہیں، عورتوں کے لیے نہیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] معذور شخص رمل ترک کرسکتا ہے؟

۱۷۰۱- سوال: ایک شخص کم زور اور بیمار ہے، رمل کرنے کی استطاعت نہیں ہے، تو کیا اس کے

(۱-۲) عن ابن يعلى، عن يعلى، قال: طاف النبي صلى الله عليه وسلم مضطبعا ببرد أخضر. (سنن أبي داود: ۱/۲۵۹، رقم الحديث: ۱۸۸۳، كتاب المناسك، باب الاضطباع في الطواف، ط: ديوبند)

عن ابن عباس، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم وأصحابه اعتمروا من الجعرانة فرملوا بالبيت وجعلوا أرديتهم تحت آباطهم قد قذفوها على عواتقهم اليسرى. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۱۸۸۴)

عن نافع، عن ابن عمر رضي الله عنهما، قال: رمل رسول الله صلى الله عليه وسلم من الحجر إلى الحجر ثلاثا، ومشى أربعا. (الصحيح لمسلم: ۱/۴۱۱، رقم الحديث: ۲۳۳ - (۱۲۶۲)، كتاب الحج، باب استحباب الرمل في الطواف والعمرة، وفي الطواف الأول في الحج، ط: ديوبند)

(قال) يرمل في الثلاثة الأول في كل شوط منها من الحجر الأسود إلى الحجر الأسود فالحاصل أن كل طواف بعده سعي فالرمل في الثلاثة الأول منها سنة، وكل طواف ليس بعده سعي فلا رمل فيه، والرمل هو الاضطباع، وهز الكتفين، وهو أن يدخل أحد جانبي ردائه تحت إبطه، ويلقيه على المنكب الآخر، ويهز الكتفين في مشيه كالمبارز الذي يتبختر بين الصفين. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۴/۱۰، أول كتاب المناسك، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۲/۱۴۷، كتاب الحج، فصل بيان سنن الحج وبيان الترتيب في أفعاله، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۳۸، كتاب الحج، باب الإحرام، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ البحر الرائق- ابن نجيم المصري: (م: ۹۷۰هـ): ۲/۵۸۷، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۲۶، كتاب المناسك، الباب الخامس في كيفية أداء الحج، ط: دار الفكر- بيروت)

حج میں کوئی نقص تو پیدا نہیں ہوگا؟

الجواب حامداومصلیا:

اگر کوئی شخص کم زوری یا بیماری کی وجہ سے رمل نہ کر سکے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔(☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] طواف کی اقسام اور چند اصطلاحی الفاظ کی وضاحت

۱۷۰۲- سوال: حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم!

حج کی سعادت سے بہرہ ور ہونے کا موقع مل رہا ہے، اس موقع سے تربیتی کیمپ میں شرکت کا موقع ملا، جہاں بعض اصطلاحی الفاظ سننے کو ملے، لیکن اس کی حقیقت سمجھ میں نہیں آئی، آپ سے درخواست ہے کہ ان کی حقیقت واضح فرمادیں:

طواف، مطاف اور شوط کسے کہتے ہیں اور طواف کی کتنی اقسام ہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

طواف کے معنی کسی چیز کے گرد گھومنا ہے، نیت کر کے بیت اللہ کے گرد سات چکر لگانے کو طواف کہا جاتا ہے۔ طواف کرنے کی جگہ کو مطاف کہا جاتا ہے۔ بیت اللہ کا ایک چکر ایک ''شوط'' کہلاتا ہے۔[1]

(☆☆) ولو رمل في الكل لا شيء عليه، ويكره تنزيها لترك سنة المشي، وكذا لو مشى في الكل إلا إذا تعذر لمرض أو تعسر لكبر أو غيره. (غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۱۳۲، فصل في الأخذ في الطواف وكيفية أدائه، ط: مكتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(۱) الطواف لغة: الدوران حول الشيء، يقال: طاف حول الكعبة وبها يطوف طوفا وطوفانا بفتحتين، والمطاف: موضع الطواف. ـــــــ وتطوف وطوف: بمعنى طاف، ومنه قوله تعالى: {إن الصفا والمروة من شعائر الله فمن حج البيت أو اعتمر فلا جناح عليه أن يطوف بهما}. ـــــــ وفي الاصطلاح: الطواف: هو الدوران حول البيت الحرام. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۹/۱۲۰، مادہ: طواف، صادر عن: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية- الكويت)

الطواف: هو الدوران حول الكعبة أربعة أشواط أو أكثر إلى تمام السبعة كيف ما حصل. (غنية الناسك في بغية المناسك- محمد حسن شاه المهاجر المكي، ص: ۱۳۹، باب في ماهية الطواف وأنواعه وأركانه وشرائطه وسائر أحكامه، ط: يادگار شیخ)

شوط: شوط الشيء: لغة في شيطه. والشوط: الجري مرة إلى غاية، والجمع أشواط، ... شاط يشوط شوطا شوطا إذا عدا شوطا إلى غاية، وقد عدا شوطا أي طلقا. ابن الأعرابي: شوط الرجل إذا طال سفره. ... وفي حديث الطواف: رمل ثلاثة أشواط، هي جمع شوط، والمراد به المرة الواحدة من الطواف حول البيت، وهو في الأصل مسافة من=

طواف کی درج ذیل سات قسمیں ہیں:[۲]

(۱) طواف قدوم: آفاقی کا حج کا احرام باندھ کر مسجد حرام میں آکر طواف کرنا ''طواف قدوم'' کہلاتا ہے، یہ طواف سنت ہے۔[۳] (۲) طواف زیارت: یہ حج کا رکن ہے، اس کا وقت دسویں ذی الحجہ سے بارہویں ذی الحجہ تک ہے۔[۴] (۳) طواف وداع: جب بیت اللہ سے رخصت ہوکر اپنے وطن واپس آتے ہیں، اس وقت یہ طواف کیا جاتا ہے، یہ طواف واجب ہے، البتہ حیض والی عورت پر یہ طواف واجب نہیں ہے، وہ صرف باہر سے بیت اللہ کی زیارت کرلے۔[۵] (۴) طواف عمرہ: یہ وہ طواف ہے، جو عمرہ کا احرام

=الأرض يعدوها الفرس كالميدان ونحوه. (لسان العرب- محمد بن مكرم بن على، أبو الفضل، جمال الدين ابن منظور الأنصاري الرويفعى الإفريقى (م:۷۱۱ھ): ۷/۳۳۷، حرف الطاء المهملة، فصل الشين المعجمة، ط: دار صادر-بيروت)

[۲] أنواع الطواف: ــــــ يتنوع الطواف بحسب سبب مشروعيته إلى سبعة أنواع، وهي:

طواف القدوم، طواف الزيارة، طواف الوداع، طواف العمرة، طواف النذر، طواف تحية المسجد الحرام، طواف التطوع. كذا عدها الحنفية والمالكية والحنابلة. (لباب المناسك للسندي وشرحه للقاري "المسلك المتقسط شرح المنسك المتوسط" مطبعة مصطفى محمد ص:۹۶-۹۷، بہ حوالہ: الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۹/۱۲۱، مادہ: طواف، صادر عن: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية-الكويت)

[۳] (وطاف بالبيت طواف القدوم ويسن) هذا الطواف (للآفاقي) لأنه القادم. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله طواف القدوم) يسمى أيضا طواف التحية، وطواف اللقاء، وطواف أول عهد بالبيت، وطواف إحداث العهد بالبيت، وطواف الوارد والورود، شرح اللباب.

ويقع هذا الطواف للقدوم من المفرد بالحج وإن لم ينو كونه للقدوم أو نوى غيره؛ لأنه وقع في محله، قال في اللباب: ثم إن كان المحرم مفردا بالحج وقع طوافه هذا للقدوم وإن كان مفردا بالعمرة أو متمتعا أو قارنا وقع عن طواف العمرة نواه له أو لغيره وعلى القارن أن يطوف طوافا آخر للقدوم اهـ أي استحبابا بعد فراغه عن سعي العمرة قاري. وفي اللباب: وأول وقته حين دخوله مكة وآخره من وقوفه بعرفة فإذا وقف فقد فات وقته، وإن لم يقف فإلى طلوع فجر النحر (قوله للآفاقي) أي لا غير فتح فلا يسن للمكي ولا لأهل المواقيت ومن دونها إلى مكة سراج وشرح اللباب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۹۴، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، ط: دار الفكر-بيروت)

هو سنة للآفاقي المفر بالحج، و القارن و لو دخل قبل الأشهر. (غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۱۳۷، فصل في أحكام طواف القدوم، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

[۴] وطاف للفرض في يومه ذلك وهو الأفضل، وإلا في الثاني و الثالث وليلتاهما منهما... الخ. (غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۲۲۹، باب طواف الزيادة)

[۵] (ثم) إذا أراد السفر (طاف للصدر) أي الوداع (سبعة أشواط بلا رمل وسعي، وهو واجب إلا على أهل مكة)=

باندھ کر کیا جاتا ہے، یہ عمرہ کا رکن ہے۔[۶] (۵) طواف نذر: وہ طواف جو منت ماننے کی وجہ سے واجب ہوا ہو۔[۷] (۶) طواف تحیہ: مسجد حرام میں داخلہ پر جو طواف کیا جاتا ہے، اسے ''طواف تحیہ'' کہتے ہیں، یہ طواف مستحب ہے۔[۸] (۷) طواف نفل: یہ ہر وقت کیا جا سکتا ہے، البتہ اگر جماعت ہو رہی ہو، یا خطبہ جاری ہو، تو اس وقت طواف کرنا جائز نہیں۔[۹] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] صحت طواف کی شرائط

۱۷۰۳- سوال: طواف کامل طور پر ادا ہو، اس کے لیے کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے؟

=ومن في حكمهم فلا يجب بل يندب كمن مكث بعده،... (وحيضها لا يمنع) نسكا (إلا الطواف) ولا شيء عليها بتأخيره إذا لم تطهر إلا بعد أيام النحر، فلو طهرت فيها بقدر أكثر الطواف لزمها الدم بتأخيره لباب (وهو بعد حصول ركنيه يسقط طواف الصدر) ومثله النفاس. (الدر المختار: ۲/ ۵۲۳-۵۲۸) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله لا يمنع نسكا) أي شيئا من أعمال الحج (قوله إلا الطواف) فهو حرام من وجهين دخولها المسجد وترك واجب الطهارة.... (قوله وهو) أي الحيض بعد حصول ركنيه: أي ركني الحج،... (قوله يسقط طواف الصدر) أي يسقط وجوبه عنها كما قدمناه ولا دم عليها كما في اللباب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۲۸، كتاب الحج، مطلب في طواف الزيارة، ط: دار الفكر)

[۶] طواف العمرة: وهو ركن فيها، وأول وقته بعد الإحرام بالعمرة، ولا آخر له. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۹/ ۱۲۱، مادہ: طواف، صادر عن: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية-الكويت)

[۷] طواف النذر: وهو واجب ولا يختص بوقت إذا لم يعين الناذر في نذره للطواف وقت. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۹/ ۱۲۳، مادہ: طواف، صادر عن: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية-الكويت)

وطواف النذر منجزا و معلقا وهو واجب. (غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۱۴۰، فصل في ماهية الطواف وأنواعه وأحكامه، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

[۸] طواف تحية المسجد الحرام: و هو مستحب لكل من دخل المسجد الحرام. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۹/ ۱۲۳، مادہ: طواف، صادر عن: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية-الكويت ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۱۴۰، فصل في ماهية الطواف وأنواعه وأحكامه، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

[۹] طواف التطوع غير طواف التحية، فلا يختص بزمان دون زمان.... ولا ينبغي له أن يتطوع ويكون عليه غيره من سائر الفروض. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۹/ ۱۲۳، مادہ: طواف، صادر عن: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية-الكويت)

(الطواف عند الخطبة وإقامة المكتوبة) فإن ابتداء الطواف حينئذ مكروه...، الخ. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۲۳۴، فصل في مكروهاته، ط: المكتبة الإمدادية)

تفصیل سے واضح فرمائیں۔

الجواب حامداومصلیا:

درج ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے، تو ان شاء اللہ طواف کامل طور پر ادا ہو جائے گا، ان میں سے بعض طواف کے لیے شرط ہے، بعض واجب اور بعض مسنون، اس لیے تمام امور کا خاص خیال رکھا جائے:

(۱) باوضو ہونا[۱] (۲) ستر کا چھپانا۔[۲] (۳) بدن اور کپڑے کا پاک ہونا۔[۳] (۴) پیدل طواف کرنا جب کہ اس کی استطاعت ہو۔[۴] (۵) طواف میں حطیم کو بھی شامل کرنا۔[۵] (۶) حجر اسود سے طواف شروع کرنا۔[۶] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] سعی کی تعریف، طریقہ اور اس کا وقت

۱۷۰۴- سوال: سعی کسے کہتے ہیں، اس کا طریقہ کیا ہے، یہ کہاں اور کس وقت کی جاتی ہے؟

---

[۱] فأما الطهارة عن الحدث، والجنابة، والحيض، والنفاس فليست بشرط لجواز الطواف، وليست بفرض عندنا بل واجبة حتى يجوز الطواف بدونها. (بدائع الصنائع: ۱۲۹/۲، كتاب الحج، فصل شرط وواجبات طواف الزيارة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۲] وأما ستر العورة فهو مثل الطهارة عن الحدث، والجنابة أي إنه ليس بشرط الجواز، وليس بفرض لكنه، واجب عندنا حتى لو طاف عريانا فعليه الإعادة ما دام بمكة فإن رجع إلى أهله فعليه الدم. (المصدر السابق)

[۳] فأما الطهارة عن النجس فليست من شرائط الجواز بالإجماع فلا يفترض تحصيلها، ولا تجب أيضا لكنه سنة حتى لو طاف، وعلى ثوبه نجاسة أكثر من قدر الدرهم جاز، ولا يلزمه شيء إلا أنه يكره. (المصدر السابق)

[۴] ومن واجبات الطواف أن يطوف ماشيا لا راكبا إلا من عذر حتى لو طاف راكبا من غير عذر فعليه الإعادة ما دام بمكة، وإن عاد إلى أهله يلزمه الدم. (المصدر السابق: ۱۳۰/۲)

[۵] فإذا طاف في داخل الحطيم فقد ترك الطواف ببعض البيت، والمفروض هو الطواف بكل البيت، لقوله تعالى {وليطوفوا بالبيت العتيق} [الحج: ۲۹]، والأفضل أن يعيد الطواف كله مراعاة للترتيب فإن أعاد على الحجر خاصة أجزأه؛ لأن المتروك هو لا غير فاستدركه، ولو لم يعد حتى عاد إلى أهله يجب عليه الدم؛ لأن الحطيم ربع البيت فقد ترك من طوافه ربعه. (المصدر السابق: ۱۳۲/۲، فصل مكان الطواف)

[۶] فأما الابتداء من الحجر الأسود فليس بشرط من شرائط جوازه بل هو سنة في ظاهر الرواية حتى لو افتتح من غير عذر أجزأه مع الكراهة لقوله تعالى {وليطوفوا بالبيت العتيق} [الحج: ۲۹]، مطلقا عن شرط الابتداء بالحجر الأسود إلا أنه لو لم يبدأ يكره؛ لأنه ترك السنة. (المصدر السابق: ۱۳۰/۲، فصل شرط وواجبات طواف الزيارة)

الجواب حامدا ومصلیا:

سعی کا معنی ہے: دوڑنا، شریعت کی اصطلاح میں صفا ومروہ کے درمیان مخصوص طریقے سے سات چکر لگانے کا نام سعی ہے۔[۱] سعی کا وقت طواف کرنے کے فورا بعد ہے، طواف سے پہلے سعی درست نہیں ہے، اگر طواف سے پہلے کوئی سعی کر لے گا، تو اس سعی کا اعادہ واجب ہے۔[۲] سعی کا طریقہ یہ ہے کہ:

سب سے پہلے صفا پر اس قدر چڑھے کہ بیت اللہ شریف نظر آئے،[۳] پھر سعی کی نیت کرے، نیت کرنا سنت ہے، دل میں نیت کر لینا کافی ہے، البتہ زبان سے بھی نیت کے الفاظ کہنا مستحب ہے۔[۴]

نیت اس طرح کرے: اے اللہ میں سعی کا ارادہ کرتا ہوں اور صفا مروہ کے سات چکر تیرے ہی لیے لگاتا ہوں، تو اس کو قبول فرما اور میرے لیے آسان فرما۔

اس طرح نیت کر کے دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھائے، جیسے نماز میں تحریمہ کے وقت اٹھایا جاتا ہے، اس کے بعد "اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ" بلند آواز سے پڑھے اور نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ دعا مانگے کہ یہ جگہ دعا کی قبولیت کی ہے۔[۵]

---

(۱) السعي لغة: من سعى يسعى سعيا، أي: قصد أو عمل أو مشى أو عدا، ويستعمل كثيرا في المشي.ــــــ وو ردت المادة في القرآن بما يفيد معنى الجد في المشي، كقوله تعالى في صلاة الجمعة: {فاسعوا إلى ذكر الله وذروا البيع}، وقال تعالى: {وجاء من أقصى المدينة رجل يسعى قال يا قوم اتبعوا المرسلين}.

والسعي في الاصطلاح: قطع المسافة الكائنة بين الصفا والمروة سبع مرات ذهابا وإيابا بعد طواف في نسك حج أو عمرة. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۹/۱۱، ماده: سعي، صادر عن: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية-الكويت)

(۲) ...أن السعي بعد الطواف فلو عكس أعاد السعي، لأنه تبع له، وصرح في المحيط بأن تقديم الطواف شرط لصحة السعي، وبه علم أن تأخير السعي واجب، وإلى أنه لا يجب بعده فورا، والسنة الاتصال به بحر، فإن أخر لعذر أو ليستريح من تعبه، فلا بأس وإلا فقد أساء ولا شيء عليه، لباب. (رد المحتار على الدر المختار: ۵۰۰/۲، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في السعي بين الصفا والمروة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۳) (فصعد الصفا) بحيث يرى الكعبة من الباب. (الدر المختار مع رد المحتار: ۵۰۰/۲)

(۴) لأن النية عمل القلب لا عمل اللسان لكن يستحب أن يقول بلسانه ما نوى بقلبه فيقول: اللهم إني أريد كذا فيسره لي، وتقبله مني لما ذكرنا في بيان سنن الحج. (بدائع الصنائع: ۱۶۱/۲، كتاب الحج، فصل بيان ما يصير به محرما، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۵] (واستقبل البيت وكبر وهلل وصلى على النبي صلى الله عليه وسلم) بصوت مرتفع، خانية (ورفع يديه) نحو السماء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۵۰۰/۲ ☆ كنز الدقائق مع البحر الرائق: ۵۸۱/۲، كتاب الحج، ط: زكريا-ديوبند)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ اکبر تین بار اور " لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وهو على كل شيء قدير " ایک مرتبہ پڑھ کر دعا کی تھی۔ (٦)

صفا پر دعا مانگ کر مروہ کی طرف چلے۔ صفا اور مروہ کے درمیان بھی اللہ تعالی کی طرف دھیان و توجہ کر کے زبان اور دل سے دعا مانگتا رہے۔ (٧)

صفا سے ستر یا اسی فٹ پر ہرا ستون ہے (اور رات میں ہری لائٹ جلتی ہے) وہاں سے دوسرے ہرے ستون تک مردوں کو دوڑنا سنت ہے، اس کے بعد اپنی میانہ رفتار سے چلے، مروہ پر چڑھ کر بیت اللہ کی داہنی جانب تھوڑا مڑ کر اس طرح دعا کرے، جیسا کہ صفا پر ہاتھ اٹھا کر تکبیر کے ساتھ دعا کی تھی، جب صفا سے شروع کر کے مروہ پر پہنچا، تو ایک چکر پورا ہو گیا۔ مروہ سے اتر کر صفا پر جانے کے لیے پہلے چکر میں جو عمل کیا تھا، اسی طرح عمل کرے، بل کہ ساتوں چکر اسی طرح لگاتار ہے۔ (٨) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(٦) وفي حديث طويل قال: ثم رجع إلى البيت فاستلم الركن، ثم خرج من الباب إلى الصفا، فلما دنا من الصفا قرأ ﴿إن الصفا والمروة من شعائر الله﴾ [البقرة:١٥٨]، نبدأ بما بدأ الله به، فبدأ بالصفا فرقي عليه حتى رأى البيت فكبر الله ووحده وقال: لا إله إلا الله، وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد، يحيي ويميت وهو على كل شيء قدير، لا إله إلا الله وحده أنجز وعده، ونصر عبده، وهزم الأحزاب وحده، ثم دعا بين ذلك، وقال: مثل هذا ثلاث مرات. (سنن أبي داود: ١/٢٦٢، رقم الحديث: ١٩٠٥، كتاب المناسك، باب صفة حجة النبي صلى الله عليه وسلم، عن جابر بن عبد الله رضي الله تعالى عنه، ط: فيصل پبلی کیشنز، دیوبند)

(٧) (قوله ثم اهبط نحو المروة ساعيا بين الميلين الأخضرين وافعل عليها فعلك على الصفا) أي على المروة من الصعود والتكبير والتهليل والصلاة والدعاء. (البحر الرائق - ابن نجيم المصري (م: ٩٧٠هـ): ٢/٣٥٨، كتاب الحج، باب الإحرام، الاغتسال ودخول الحمام للمحرم، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(٨) (ثم مشى نحو المروة ساعيا بين الميلين الأخضرين) المتخذين في جدار المسجد (وصعد عليها وفعل ما فعله على الصفا يفعل هكذا سبعا يبدأ بالصفا ويختم) الشوط السابع (بالمروة) فلو بدأ بالمروة لم يعتد بالأول هو الأصح. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله ثم مشى نحو المروة) قال في اللباب: ثم يهبط نحو المروة ساعيا ذاكرا ماشيا على هينته، حتى إذا كان دون الميل المعلق في ركن المسجد قيل بنحو ستة أذرع سعى سعيا شديدا في بطن الوادي حتى يجاوز الميلين ثم يمشي على هينته حتى يأتي المروة، ويستحب أن يكون السعي بين الميلين فوق الرمل دون العدو، وهو في كل شوط أي بخلاف الرمل في الطواف فإنه مختص بالثلاثة الأول... (قوله وصعد عليها) أي باعتبار الزمن الأول أما الآن فمن وقف على الدرجة الأولى، بل على أرضها يصدق أنه طلع عليها شرح اللباب (قوله وفعل ما فعله على الصفا) أي من الاستقبال بأن يميل إلى يمينه أدنى ميل ليتوجه إلى البيت، وإلا =

[۸] بغیر احرام کے سعی کرنا

۱۷۰۵- سوال: اگر کوئی شخص اپنے حج کی سعی سات ذی الحجہ کو احرام کے بغیر کرے، تو اس کی سعی کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ اگر سعی کا اعتبار نہ ہو، تو اس کو دم دینا پڑے گا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیا:

سعی کا وقت احرام کے بعد ہے، اگر کوئی شخص بغیر احرام کے سعی کرے گا، تو اس پر دم واجب ہوگا؛ کیوں کہ "احرام" سعی کے لیے شرط ہے اور شرط کے بغیر مشروط کا تحقق نہیں ہوتا ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] ویل چیئر پر بیٹھ کر سعی کرنا

۱۷۰۶- سوال: پیدل سعی کرنا ضروری ہے، یا ویل چیئر [پہیے والی کرسی] پر بیٹھ کر بھی سعی کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

پیدل سعی کرنا ضروری ہے، البتہ عذر ہو، جیسا کہ مرض کی وجہ سے چلنے کی استطاعت نہیں ہے، تو ویل چیئر [پہیے والی کرسی] پر بیٹھ کر سعی کرنا جائز ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=فالبيت لا يبدو اليوم لحجبه بالبنيان، ومن التكبير والذكر والدعاء المشتمل على الصلاة والثناء، شرح اللباب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۰۱، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في السعي بين الصفا والمروة، ط: دار الفكر-بيروت ☆ كنز الدقائق: ۲/۵۸۲-۵۸۳، ط: كتاب الحج، ط: زكريا-ديوبند)

[۱] (الثالث تقديم الإحرام عليه) أي إحرام حج أو عمرة، (فلو سعى قبله) أي قبل الإحرام ولو بعد طواف (لم يجز) لأن السعي من واجبات الحج، و الإحرام شرط، والواجب و الركن وغيرهما لا يصح بدون الشرط، (و أما وجود الإحرام حالة السعي فإن كان سعي الحج و قد سعى الحج فيشترط وجوده، وإن للحج بعده) أي بعد الوقوف (فلا يشترط) أي وجود الإحرام. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع إرشاد الساري، ص: ۲۴۷، باب السعي بين الصفا والمروة، فصل في شرائط صحة السعي، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(۲) وأما ركنه فكينونته بين الصفا، والمروة، سواء كان بفعل نفسه أو بفعل غيره عند عجزه عن السعي بنفسه بأن كان مغمى عليه، أو مريضا فسعى به محمولا أو سعى راكبا لحصوله كائنا بين الصفا، والمروة، وإن كان قادرا على المشي بنفسه فحمل أو ركب يلزمه الدم؛ لأن السعي بنفسه عند القدرة على المشي، واجب فإذا تركه فقد ترك الواجب من غير عذر فيلزمه الدم كما لو ترك المشي في الطواف من غير عذر. (بدائع الصنائع: ۲/۱۳۴، كتاب الحج، فصل ركن السعي، ط: دار الكتب العلمية ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۱۲۴، باب السعي بين الصفا و المروة، فصل في الواجبات، ط: مكتبه يادگار شيخ، سهارن پور)

[۱۰] اگر طواف قدوم کے بعد سعی کی ہو، تو طواف زیارت کے بعد کی سعی کی ضرورت نہیں

۱۷۰۷- سوال: بعض حضرات قران کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ پہونچے، طواف کیا، مقام ابراہیم کے پاس نفل نماز ادا کی، زم زم کا پانی پیا، صفا و مروہ کی سعی کی، پھر منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں قیام کیا، منیٰ آکر ۱۰/ذی الحجہ کو بڑے شیطان کو کنکری ماری، اس کے بعد قربانی کی، پھر حلق کے بعد غسل کیا اور کپڑے پہن کر طواف زیارت کی ادائیگی سے فراغت حاصل کی؛ لیکن طواف زیارت کے بعد صفا و مروہ کی سعی نہیں کی، تو اس سلسلے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

قارن جب مکہ مکرمہ پہونچے، تو عمرہ کا طواف اور سعی کرے، (ابھی حلق وقصر نہ کرائے) اس کے بعد حج کے لیے طواف قدوم اور سعی کرنے کا ارادہ ہو، تو رمل اور اضطباع بھی کرے اور صفا و مروہ کی سعی کر لے۔[1]

صورت مسئولہ میں طواف قدوم کے بعد صفا و مروہ کی سعی کر لی گئی ہے؛ اس لیے طواف زیارت کے

---

(۱) "فإذا دخل مكة ابتدأ فطاف بالبيت سبعة أشواط يرمل في الثلاث الأول منها، ويسعى بعدها بين الصفا والمروة وهذه أفعال العمرة ثم يبدأ بأفعال الحج فيطوف طواف القدوم سبعة أشواط ويسعى بعده... ولا يحلق بين العمرة والحج، لأن ذلك جناية على إحرام الحج وإنما يحلق في يوم النحر كما يحلق المفرد ويتحلل بالحلق عندنا لا بالذبح كما يتحلل المفرد. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/۱۵۱، كتاب الحج، باب القران، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

(قال) يرمل في الثلاثة الأول في كل شوط منها من الحجر الأسود إلى الحجر الأسود، فالحاصل أن كل طواف بعده سعي فالرمل في الثلاثة الأول منها سنة، وكل طواف ليس بعده سعي فلا رمل فيه، والرمل هو الاضطباع، وهز الكتفين، وهو أن يدخل أحد جانبي ردائه تحت إبطه، ويلقيه على المنكب الآخر، ويهز الكتفين في مشيه كالمبارز الذي يتبختر بين الصفين. (المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۴/۱۰، أول كتاب المناسك، ط: دار المعرفة-بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۲/۱۴۷، كتاب الحج، فصل بيان سنن الحج وبيان الترتيب في أفعاله، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/۱۳۸، كتاب الحج، باب الإحرام، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت ☆ البحر الرائق-ابن نجيم المصري: (م: ۹۷۰ھ): ۲/۵۸۷، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا-ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۲۶، كتاب المناسك، الباب الخامس في كيفية أداء الحج، ط: دار الفكر-بيروت)

بعد سعی کرنا ضروری نہیں ہے، ان کی سعی ادا ہوگئی۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] طواف قدوم کے بعد اگر سعی کرلی، تو دوبارہ سعی کرنے کی ضرورت نہیں

گزشتہ سے پیوستہ

۱۷۰۸- سوال: کچھ حاجی خیمہ میں مولانا سے مسائل معلوم کررہے تھے، اتنے میں ہم لوگ بھی پہونچ گئے اور مولانا سے پوچھا کہ ہم نے حج قران کی نیت کی ہے، جب مکہ آئے تو طواف وسعی سب کچھ کیا، مگر طواف زیارت کرنے گئے تو سعی نہیں کی، ہم نے صحیح کیا یا غلط؟ تو مولانا نے کہا: واپس جاؤ، اور سعی کرو، ہم نے طواف وداع کرنے کے بعد سعی کی، تو کیا ہماری سعی درست ہوئی یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

آپ حضرات نے طواف قدوم کے ساتھ سعی کی تھی، اس لیے طواف زیارت کے بعد سعی کی ضرورت نہیں تھی، مولانا نے جو دوسری مرتبہ سعی کرنے کے متعلق کہا، وہ درست نہیں ہے۔ (☆☆) ہاں! جن لوگوں نے طواف قدوم کے ساتھ سعی نہیں کی، اور انہوں نے اب سعی کی، تو سعی ادا ہوگئی، مگر تاخیر کی وجہ سے ایک قسم کی کراہیت پیدا ہوگئی۔ (☆☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۲) فإن كان قد سعى بين الصفا والمروة عقيب طواف القدوم لم يرمل في هذا الطواف ولا سعي عليه وإن كان لم يقدم السعي، رمل في هذا الطواف وسعى بعده"؛ لأن السعي لم يشرع إلا مرة، والرمل ما شرع إلا مرة في طواف بعده سعي. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۱۳۸، كتاب الحج، باب الإحرام، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

(☆☆) سوال سابق بر عنوان "اگر طواف قدوم کے بعد سعی کی ہو تو طواف زیارت کے بعد کی سعی کی ضرورت نہیں" کا حاشیہ نمبر (۲) ملاحظہ کریں۔

(☆☆☆) (إذا فرغ من الطواف) أي الطواف الذي بعده سعي (فالسنة أن يخرج للسعي على فوره) أي ساعته من غير تأخير (فإن أخره لعذر) أي لضرورة (أو ليستريح) أي ليحصل له الراحة و تعود إليه القوة (فلا بأس به) أي لا يكون مسيئا (وإن أخره لغير عذر) أي من استراحة وغيرها (فقد أساء) لتركه الموالاة التي هي سنة بين الطواف و السعي (ولا شيء عليه) أي من الجزاء بالدم أو الصدقة. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملاعلي القاري (م: ۱۰۱۴هـ) ص: ۲۴۱، باب السعي بين الصفا والمروة، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

وصرح في المحيط بأن تقديم الطواف شرط لصحة السعي، وبه علم أن تأخير السعي واجب، وإلى أنه لا يجب بعده فورا، والسنة الاتصال به بحر، فإن أخر لعذر أو ليستريح من تعبه، فلا بأس وإلا فقد أساء ولا شيء عليه، لباب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۰۰، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في السعي بين الصفا والمروة، ط: دار الفكر-بيروت)

[۱۲] عورتوں کے بال کاٹنے کا طریقہ

۱۷۰۹- سوال: عورتیں کس طرح بال کاٹیں گی، کیا عورت کو بھی حلق اور قصر دونوں کا اختیار ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

عورت کے لیے بال کاٹنے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے بال کے تین حصے کر کے ایک حصہ داہنی طرف، دوسرا حصہ بائیں طرف اور تیسرا حصہ پیچھے کی جانب کرے، پھر ہر ایک حصے میں سے ایک ایک پور کے بہ قدر بال خود کاٹ لے، یا کسی محرم سے کٹوالے۔ عورتوں کے لیے قصر (کتروانا) ضروری ہے، ان کے لیے حلق (منڈوانا) جائز نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] جس کے بال چھوٹے ہوں، وہ کیا کرے؟

۱۷۱۰- سوال: مرد کو حلق اور قصر کے درمیان اختیار ہے؛ لیکن اگر کسی آدمی کے بال

---

(۱) (ثم) بعد الرمي (ذبح إن شاء) لأنه مفرد (ثم قصر) بأن يأخذ من كل شعره قدر الأنملة وجوبا وتقصير الكل مندوب والربع واجب. (الدر المختار) ـــــــــ قال ابن عابدين: (قوله بأن يأخذ إلخ) قال في البحر: والمراد بالتقصير أن يأخذ الرجل والمرأة من رءوس شعر ربع الرأس مقدار الأنملة كذا ذكره الزيلعي، ومراده أن يأخذ من كل شعرة مقدار الأنملة كما صرح به في المحيط. وفي البدائع قالوا: يجب أن يزيد في التقصير على قدر الأنملة حتى يستوفي قدر الأنملة من كل شعرة برأسه لأن أطراف الشعر غير متساوية عادة.

قال الحلبي في مناسكه وهو حسن اهـ وفي الشرنبلالية: يظهر لي أن المراد بكل شعرة أي من شعر الربع على وجه اللزوم ومن الكل على سبيل الأولوية فلا مخالفة في الأجزاء لأن الربع كالكل كما في الحلق اهـ فقول الشارح من كل شعرة أي من الربع لا من الكل وإلا ناقض ما بعده، وقوله: وجوبا قيد لقدر الأنملة فلا يتكرر مع قوله: والربع واجب والأنملة بفتح الهمزة والميم وضم الميم لغة مشهورة، ومن خطأ راويها فقد أخطأ واحدة الأنامل بحر. وفي تهذيب اللغات للنووي الأنامل أطراف الأصابع. وقال أبو عمر الشيباني والسجستاني والجري لكل أصبع ثلاث أنملات. (رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين (م: ۱۲۵۲ هـ): ۲/۵۱۵-۵۱۶، كتاب الحج، مطلب في رمي جمرة العقبة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ بدائع الصنائع - الكاساني (م: ۵۸۷هـ): ۲/۱۴۱، كتاب الحج، فصل مقدار واجب الحلق والتقصير، ط: دار الكتب العلمية ☆ البحر الرائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/۶۰۶، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا - ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۲۲۶، فصل في الحلق، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

انتہائی چھوٹے ہیں، تو وہ کیا کرے؟

الجواب حامداومصلیا:

اگر بال ایک پور سے بھی چھوٹے ہیں، تو پھر استرا پھیرنا (یعنی حلق کرنا) ہی ضروری ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] بال صفا پاؤڈر، یا صابن سے بال کو زائل کرنا

۱۱۷۱- سوال: اگر کوئی حاجی قینچی سے حلق کرنے کے بہ جائے، بال صفا پاؤڈر یا صابن کے ذریعے بال کو زائل کرے، تو کافی ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

جی ہاں بال صفا پاؤڈر یا صابن کے ذریعے بالوں کو دور کردینے سے بھی واجب ادا ہوجاتا ہے؛[۲] البتہ استرے سے بال صاف کرنا مستحب ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ومتى تعذر أحدهما لعارض تعين الآخر فلو لبده بصمغ بحيث تعذر التقصير تعين الحلق بحر. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله فلو لبده إلخ) مثال لتعذر التقصير ومثله ما لو كان الشعر قصيرا فيتعين الحلق، وكذا لو كان معقوصا أو مضفورا كما عزي إلى المبسوط. (رد المحتار على الدر المختار-ابن عابدين (م: ۱۲۵۲ھ): ۵۱۶/۲، كتاب الحج، مطلب في رمي جمرة العقبة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۶۰۶/۲، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا - ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۲۲۷، فصل في الحلق، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(۲) ولو أزاله بنحو نورة جاز. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله بنحو نورة) كحلق ونتف. (رد المحتار على الدر المختار-ابن عابدين (م: ۱۲۵۲ھ): ۵۱۶/۲، كتاب الحج، مطلب في رمي جمرة العقبة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ بدائع الصنائع- الكاساني (م: ۵۸۷ھ): ۱۴۱/۲، كتاب الحج، فصل مقدار واجب الحلق والتقصير، ط: دار الكتب العلمية ☆ البحر الرائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۶۰۶/۲، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا - ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۲۲۶، فصل في الحلق، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور ☆ الفتاوى الهندية: ۲۳۱/۱، كتاب المناسك، الباب الخامس في كيفية أداء الحج، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) والإزالة لا تختص بالموسى بل بأي آلة كانت أو بالنورة، والمستحب الحلق بالموسى؛ لأن السنة وردت به. (البحر الرائق: ۳۷۲/۲، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۲۲۶، فصل في الحلق، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

[۱۵] 'بال کتروانا یا حلق کرانا' حرم میں لازم ہے؟

۱۷۱۲- سوال: جدہ کا رہنے والا ایک شخص عمرہ کے لیے گیا، عمرہ کے ارکان سے فراغت کے بعد حلق کرانے بیٹھا؛ لیکن چوتھائی سر کا ہی قصر کرواسکا؛ اس لیے کہ وہاں کافی بھیڑ تھی، اس کے بعد وہ اپنے مقام جدہ آ گیا، اور پورے سر کا قصر کروایا، تو کیا حرم میں ہی پورے سر کا قصر کروانا ضروری ہے؟ مذکورہ صورت میں دم واجب ہوگا یا نہیں؟ اگر ہوگا، تو اس کا طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

چوتھائی سر کے بال کٹانا یا حلق کرانا [مونڈانا] واجب ہے، پورے سر کا حلق کروانا مسنون ہے؛ اس لیے جب چوتھائی سر کے بال کٹوا لیے، تو واجب ادا ہوگیا؛ لہٰذا دم واجب نہیں ہوگا۔[۱] البتہ یاد رہے کہ منیٰ میں بال کٹانا یا مونڈانا سنت ہے اور حرم کی حد میں واجب ہے، اس لیے اگر حرم کی حد سے باہر نکل کر حلق یا قصر کرائے گا تو دم واجب ہوگا، صورت مسئولہ میں حدودِ حرم میں قصر کروایا گیا ہے؛

---

[۱] (و السنة حلق جميع الرأس، أو تقصير جميعه، وإن اقتصر على الربع جاز مع الكراهة)، لتركه السنة، و الاكتفاء بمجرد الواجب، (و هو) أي الربع (أقل الواجب في الحلق) و كذا في التقصير. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۳۲۲-۳۲۳، باب مناسك منى، فصل في الحلق و التقصير، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة☆رد المحتار على الدر المختار: ۵۱۶/۲، كتاب الحج، مطلب في رمي العقبة، ط: دار الفكر-بيروت)

(قال:) الحلق أفضل من التقصير؛ لما روينا من الأثر فيه، و لأن المأمور به بعد الذبح قضاء التفث، قال الله تعالى: {ثم ليقضوا تفثهم} [الحج: 29]، وهو في الحلق أتم، و التقصير فيه بعض الحلق، فلهذا كان الحلق أفضل، و التقصير يجزي، وهو أن يأخذ شيئا من أطراف شعره، ... و التقصير قائم مقام الحلق في حكم التحلل، فإذا فعل ذلك في أحد جانبي رأسه أجزأه بمنزلة ما لو حلق نصف رأسه، و كذلك إن فعله في أقل من النصف، و كان بقدر الثلث أو الربع فكذلك يجزئه؛ لأن كل حكم تعلق بالرأس فالربع منه ينزل منزلة الكمال كالمسح بالرأس، و لكنه مسيء في الاكتفاء بهذا المقدار؛ لأن النبي - صلى الله عليه وسلم - حلق جميع رأسه، و أمرنا بالاقتداء به، فما كان أقرب إلى موافقة فعله فهو أفضل؛ و لأنه إنما يفعل هذا ضنة منه بشعره، و فيما هو نسك تكره الضنة فيه بالمال و النفس فكيف بالشعر. (المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۷۰/۴، كتاب المناسك، باب الحلق، ط: دار المعرفة-بيروت)

لہٰذا دم واجب نہیں ہوگا۔ (زبدۃ المناسک جلد ۱، صفحہ ۱۷۱/۱۷۲) [☆☆] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] حج یا عمرہ میں بال کٹوانے کی مقدار

گذشتہ سے پیوستہ

۱۷۱۳- سوال: عمرہ کرنے کے بعد قصر الشعر یعنی بال کے کٹوانے کی کم از کم مقدار کتنی ہے؟ بہت سے لوگ یوں کرتے ہیں کہ عمرہ کرنے کے بعد سر کے بال بعض جگہ سے قینچی سے بال کاٹ لیتے ہیں اور بہت سے لوگ بالوں کو انتہائی چھوٹا کرواتے ہیں، یعنی ایک انچ یا اس سے بھی کم، نصف انچ بال کٹواتے ہیں، دریافت یہ کرنا ہے کہ شرعی اعتبار سے کتنے بال کٹوائے جائیں؟

الجواب حامداومصلیا:

پورے سر کے ایک چوتھائی کے برابر بال کٹوانا (خواہ حلق ہو یا قصر) واجب ہے، لیکن مکروہ ہے۔ [۱]
حج یا عمرہ کے بعد سر کے بال منڈوانا (حلق کرانا)، قصر کرانے کے مقابلے میں زیادہ ثواب کا کام ہے۔ [۲]

[☆☆] (ولو حلق في الحل) أي في غير الحرم الشامل لمنى وغيرها، مع كونه سنة في منى (أو أخره عن أيام النحر فعليه دم، سواء كان مفردا أو غيره). (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۵۰۶، باب الجنايات و أنواعها، النوع الخامس الجنايات في أفعال الحج، فصل في الجناية في الذبح و الحلق، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(۱) وأما مقدار الواجب، فأما الحلق فالأفضل حلق جميع الرأس لقوله عز وجل {محلقين رءوسكم} [الفتح: 27]، والرأس اسم للجميع. ـــــــ وكذا روي أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- حلق جميع رأسه؛ فإنه روي أنه رمى ثم ذبح ثم دعا بالحلاق فأشار إلى شقه الأيمن فحلقه، وفرق شعره بين الناس، ثم أشار إلى الأيسر فحلقه وأعطاه لأم سليم. ـــــــ وروي أنه قال -صلى الله عليه وسلم- أول نسكنا في يومنا هذا الرمي ثم الذبح، ثم الحلق.

والحلق المطلق يقع على حلق جميع الرأس، ولو حلق بعض الرأس، فإن حلق أقل من الربع لم يجزه، وإن حلق ربع الرأس أجزأه، ويكره. ـــــــ أما الجواز فلأن ربع الرأس يقوم مقام كله في القرب المتعلقة بالرأس كمسح ربع الرأس في باب الوضوء. ـــــــ وأما الكراهة فلأن المسنون هو حلق جميع الرأس لما ذكرنا، وترك المسنون مكروه. (بدائع الصنائع: ۱۴۱/۲، كتاب الحج، فصل مقدار واجب الحلق والتقصير، ط: دار الكتب العلمية)

مزید تفصیل کے لیے سوال سابق (بعنوان: بال کتروانا یا حلق کرانا حرم میں لازم ہے؟) کا حاشیہ نمبر (۱) ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اللهم اغفر للمحلقين، قالوا: وللمقصرين، قال: اللهم اغفر للمحلقين، قالوا: وللمقصرين، قالها ثلاثا، قال: وللمقصرين. (صحيح البخاري: ۲۳۳/۱، رقم الحديث: ۱۷۲۸، كتاب الحج، باب الحلق والتقصير عند الإحلال، ط: ديوبند ☆الصحيح لمسلم: ۴۲۰/۱، رقم الحديث: ۳۲۰-(۱۳۰۲)، كتاب الحج، باب تفضيل الحلق على التقصير وجواز التقصير، ط: ديوبند) =

اگر کسی کو قصر کروانا ہو، تو انگلی کے پورے سے کچھ زیادہ بال کٹوائے؛ کیوں کہ سر میں چھوٹے بڑے بال ہوں گے، تو سب برابر ہو جائیں گے۔ (☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] حج یا عمرہ میں سر کے بال کس قدر کٹوائے؟

گزشتہ سے پیوستہ

۱۷۱۴- سوال: حج یا عمرہ سے حلال ہوتے وقت سر کے بال کاٹنے کا شرعی حکم کیا ہے؟ کتنے بال کاٹیں جائیں؟ کیا حلق کرانا ضروری ہے، یا بال کے کچھ حصے کٹوانا کافی ہے؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداو مصليا:

احرام چاہے وہ حج کا ہو یا عمرہ کا، حلال ہونے کے لیے [چوتھائی سر کا] حلقیا قصر لازم و واجب ہے، البتہ حلق کرانا مسنون ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کروانے والوں کے متعلق تین مرتبہ "اللھم ارحم المحلقین" کے الفاظ سے رحم کی دعا فرمائی، جب کہ مقصرین (قصر کروانے والوں) کے لیے صرف چوتھی مرتبہ دعا فرمائی۔ (بخاری شریف جلد ۱ صفحہ ۲۳۳)[۱]

اس وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ حلق، قصر کے مقابلے میں افضل ہے، پورے سر کو منڈوانا مسنون ہے، چوتھائی سر کا حلق کرانا واجب ہے، اگر قصر کروانا ہو، تو بال کو، انگلی کے پور کے برابر قصر کروائے، چوں کہ بال چھوٹے بڑے ہوتے ہیں؛ اس لیے ایک پور سے کچھ زائد کاٹنا بہتر ہے۔ (شامی، عالمگیری)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= والحلق أفضل من التقصير؛ لأن الله تعالى بدأ به في كتابه في قوله {محلقين رءوسكم ومقصرين} [الفتح: 27] وقال {ولا تحلقوا رءوسكم حتى يبلغ الهدى محله} [البقرة: 196] فهذا بيان أنه ينبغي أن يتحلل بالحلق. وقال رسول الله - صلى الله عليه وسلم - رحم الله المحلقين فقيل: والمقصرين فقال: رحم الله المحلقين حتى قال في الرابعة: والمقصرين، فقدظاهر في هذا الدعاء ثلاث مرات للمحلقين فدل أنه أفضل. (المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۴/۲۱، كتاب المناسك، قبيل: باب القران، ط: دار المعرفة-بيروت)

(☆☆) يجب أن يزيد في التقصير على قدر الأنملة؛ لأن الواجب هذا القدر من أطراف جميع الشعر، وأطراف جميع الشعر لا يتساوى طولها عادة بل تتفاوت فلو قصر قدر الأنملة لا يصير مستوفيا قدر الأنملة من جميع الشعر بل من بعضه فوجب أن يزيد عليه حتى يستيقن باستيفاء قدر الواجب فيخرج عن العهدة بيقين. (بدائع الصنائع: ۲/۱۴۱، كتاب الحج، فصل مقدار واجب الحلق والتقصير، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۱-۲] سوال سابق بہ عنوان "حج یا عمرہ میں بال کٹوانے کی مقدار" کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

[۱۸] مکروہات طواف

۱۷۱۵- سوال: وہ امور جو طواف کے دوران مکروہ ہیں، کیا ہیں؟

الجواب حامدا ومصلیا:

درج ذیل چیزیں دوران طواف مکروہ ہیں:

(۱) بلاضرورت طواف میں بات کرنا۔[۱] ــــــــــ (۲) خرید وفروخت یا اس سے متعلق کوئی

---

[۱] عن ابن عباس قال: الطواف بالبيت صلاة، ولكن الله أحل فيه المنطق، فمن نطق فلا ينطق إلا بخير. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار المعروف بـ 'مصنف ابن أبي شيبة'- أبو بكر بن أبي شيبة (م:۲۳۵ھ): ۱۳۷/۳، رقم الحديث: ۱۲۸۰۸، كتاب الحج، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد-الرياض)

عن أبي سعيد، أنه كان يأمر بنيه إذا طافوا أن لا يلغوا في طوافهم، ولا يعصوا اخلسة، ولا يكلموا أحدا حتى يقضوا طوافهم إن استطاعوا. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۱۲۸۰۹)

عن عطاء قال: طفت وراء ابن عمر، وابن عباس، فلم أسمع أحدا منهما يتكلم في الطواف. (المصدر السابق، رقم: ۱۲۸۱۰)

عن ابن عباس قال: الطواف بالبيت صلاة، فأقلوا الكلام فيه. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۱۲۸۱۱)

عن نافع قال: طفت مع طاوس، فلم يسمعه يبدأ إنسانا بالكلام إلا أن يكلمه فيجيبه. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۱۲۸۱۲)

قال طاوس: إني لأعدها غنيمة أن أطوف بالبيت أسبوعا لا يكلمني أحد. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۱۲۸۱۳)

عن الشيباني، قال: كنت أطوف مع سعيد بن جبير وهو يحدثني. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۱۲۸۱۴، من رخص في الكلام في الطواف)

عن مغيرة قال: كان شريح يطوف بالبيت، فسأله رجل فأفتاه. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۱۲۸۱۵)

عن عبد الملك بن أبي سليمان قال: رأيت سعيد بن جبير يطوف بالبيت يحدث أصحابه ويفتي. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۱۲۸۱۶)

قال: كان مجاهد، وسعيد بن جبير، وعلي بن عبد الله بن العباس، والحسين بن الحسن، وأبو جعفر يتكلمون وهم يطوفون بالبيت، وبين الصفا والمروة. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۱۲۸۱۷)

ويكره إنشاد الشعر، والتحدث في الطواف، لما روي عن النبي -صلى الله عليه وسلم- أنه قال: الطواف بالبيت صلاة فأقلوا فيه الكلام. ــــــ وروي أنه قال -صلى الله عليه وسلم- فمن نطق فيه فلا ينطق إلا بخير، ولأن ذلك يشغله عن الدعاء. (بدائع الصنائع: ۱۳۱/۲، كتاب الحج، فصل شرط وواجبات طواف الزيارة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۱۶۳، فصل في الواجبات، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور☆البحر الرائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۵۷۷/۲، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا-ديوبند)

بات کرنا۔[۲] ـــــــــ (۳) بلند آواز سے دعا کرنا یا قرآن شریف پڑھنا کہ جس سے نماز پڑھنے والوں کو خلل ہو۔[۳] ـــــــــ (۴) ناپاک کپڑے میں طواف کرنا۔[۴] ـــــــــ (۵) رمل اور اضطباع کو بلا عذر چھوڑ دینا۔[۵] ـــــــــ (۶) حجر اسود کے استلام کو بلا عذر چھوڑ دینا۔[۶] ـــــــــ (۷) طواف

---

[۲] ويكره الحديث في البيع والشراء في الطواف والسعي كذا في التتارخانية. (الفتاوى الهندية:۱/۲۲۷، كتاب المناسك، الباب الخامس في كيفية أداء الحج، ط: دار الفكر- بيروت☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص:۱۲۳، فصل في الواجبات، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

[۳] ويكره أن يرفع صوته بالقرآن؛ لأنه يتأذى به غيره لما يشغله ذلك عن الدعاء، ولا بأس بأن يقرأ القرآن في نفسه. (بدائع الصنائع:۲/۱۳۱، كتاب الحج، فصل شرط وواجبات طواف الزيارة، ط: دار الكتب العلمية☆ البحر الرائق:۲/۵۷۷، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا- ديوبند☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص:۱۲۳، فصل في الواجبات، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

[۴] فأما الطهارة عن النجس فليست من شرائط الجواز بالإجماع فلا يفترض تحصيلها، ولا تجب أيضا لكنه سنة حتى لو طاف، وعلى ثوبه نجاسة أكثر من قدر الدرهم جاز، ولا يلزمه شيء إلا أنه يكره. (بدائع الصنائع:۲/۱۲۹، كتاب الحج، فصل شرط وواجبات طواف الزيارة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ البحر الرائق:۲/۵۷۶-۵۷۷، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا- ديوبند☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص:۱۲۳، فصل في الواجبات، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

[۵] (ورمل) أي مشي بسرعة مع تقارب الخطى وهز كتفيه (في الثلاث الأول) استنانا (فقط) فلو تركه أو نسيه ولو في الثلاثة لم يرمل في الباقي. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله ورمل) أي في كل طواف بعده سعي وإلا فلا كالاضطباع، بدائع... (قوله ولو في الثلاثة إلخ) قال في الفتح ولو مشى شوطا لم تذكر لا يرمل إلا في شوطين وإن لم يذكر في الثلاثة لا يرمل بعد ذلك اهـ أي لأن ترك الرمل في الأربعة سنة، فلو رمل فيها كان تاركا للسنتين وترك إحداهما أسهل بحر، ولو رمل في الكل لا يلزمه شيء ولوالجية، وينبغي أن يكره تنزيها لمخالفة السنة، بحر. (رد المحتار على الدر المختار:۲/۴۹۸، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف القدوم، ط: دار الفكر☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص:۱۳۲، فصل في الأخذ في الطواف وكيفية أدائه، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

[۶] عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: طاف النبي صلى الله عليه وسلم بالبيت على بعير، كلما أتى الركن أشار إليه بشيء كان عنده وكبر. (صحيح البخاري:۱/۲۱۹، رقم الحديث:۱۶۱۳، كتاب الحج، باب التكبير عند الركن، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم:۱/۴۱۳، رقم الحديث: ۲۵۳-(۱۲۷۲)، كتاب الحج، باب جواز الطواف على بعير وغيره، واستلام الحجر بمحجن ونحوه للراكب، ط: ديوبند)

(وكلما مر بالحجر فعل ما ذكر) من الاستلام . (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله من الاستلام) فهو سنة بين كل شوطين كما في غاية البيان. وذكر في المحيط والولوالجية: أنه في الابتداء والانتهاء سنة، وفيما بين ذلك أدب بحر ووفق في شرح اللباب بأنه في الطرفين آكد مما بينهما قال وكذا يسن بين الطواف والسعي اهـ وفي الهداية وإن لم يستطع الاستلام استقبل وكبر وهلل. (رد المحتار على الدر المختار:۲/۴۹۸، كتاب الحج، فصل في=

کے چکروں میں بہت زیادہ تاخیر کرنا (یعنی بلا عذر خوب آہستہ چلنا یا وقفہ وقفہ سے چلنا)۔ [۷] ـــــــ (۸) مسلسل دو طواف اس طرح کرنا کہ درمیان میں دوگانہ طواف نہ پڑھنا۔ البتہ اگر مکروہ وقت ہو، تو ایک ساتھ کئی طواف اکٹھا کر لینا، پھر صحیح وقت میں ان کی نمازیں ادا کر لینا جائز ہے۔ [۸] ـــــــ (۹) طواف میں استلام کے وقت دونوں ہاتھوں کو تکبیر تحریمہ کے وقت جس طرح اٹھاتے ہیں، اس طرح نہ اٹھانا، تکبیر کہتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھانا سنت اور اس کے خلاف کرنا مکروہ ہے۔ [۹] ـــــــ (۱۰) خطبہ یا فرض نماز ہو رہی ہو اس وقت طواف کرنا۔ [۱۰] ـــــــ (۱۱) طواف کے دوران کوئی چیز کھانا، بعض علماء نے

=الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف القدوم، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۱۴۷/۲، كتاب الحج، فصل بيان سنن الحج وبيان الترتيب في أفعاله، ط: دار الكتب العلمية)

[۷] (قوله وقف) وفي شرح الطحاوي يمشي حتى يجد الرمل وهو الأظهر لأن وقوفه مخالف للسنة، قاري على النقاية، وفي شرحه على اللباب: لأن الموالاة بين الأشواط وأجزاء الطواف سنة متفق عليها؛ بل قيل واجبة، فلا يتركها لسنة مختلف فيها. اهـ. قلت: ينبغي التفصيل جمعا بين القولين بأنه إن كانت الزحمة قبل الشروع وقف لأن المبادرة إلى الطواف مستحبة فيتركها لسنة الرمل المؤكدة وإن حصلت في الأثناء فلا يقف لئلا تفوت الموالاة.
(رد المحتار على الدر المختار: ۴۹۸/۲، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف القدوم، ط: دار الفكر)

[۸] (وختم الطواف باستلام الحجر استنانا ثم صلى شفعا) في وقت مباح (يجب) بالجيم على الصحيح (بعد كل أسبوع). [الدر المختار] ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله في وقت مباح) قيد للصلاة فقط فتكره في وقت الكراهة بخلاف الطواف، والسنة الموالاة بينهما وبين الطواف، فيكره تأخيرها عنه إلا في وقت مكروه... (قوله على الصحيح) وقيل يسن، قهستاني (قوله بعد كل أسبوع) أي على التراخي ما لم يرد أن يطوف أسبوعا آخر، فعلى الفور بحر. وفي السراج يكره عندهما الجمع بين أسبوعين أو أكثر بلا صلاة بينهما وإن انصرف عن وتر.... والخلاف في غير وقت الكراهة أما فيه فلا يكره إجماعا ويؤخر الصلاة إلى وقت مباح. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۹۹/۲، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف القدوم، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۵۸۰، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا - ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۱۹۲، باب دخول مكة وحرمها زادها الله شرفا وتعظيما، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

ويصلي لكل أسبوع ركعتين في الوقت الذي يباح فيه التطوع كذا في شرح الطحاوي ويكره له الجمع بين الأسبوعين بغير صلاة بينهما في قول أبي حنيفة ومحمد - رحمهما الله تعالى - سواء انصرف عن شفع أو وتر كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ۲۲۷/۱، كتاب المناسك، الباب الخامس في كيفية أداء الحج، ط: دار الفكر - بيروت)

[۹] معلم الحجاج، ص ۱۳۰۔

[۱۰] ولو أقيمت الصلاة والرجل يطوف أو يسعى يترك الطواف والسعي ويصلي ثم يبني بعد الفراغ من الصلاة، وإذا=

پینے کو بھی مکروہ لکھا ہے، خواہ پانی ہو یا شربت یا کولڈرنک وغیرہ۔[۱۱] ــــــــ (۱۲) پیشاب یا پاخانے کے تقاضے کے وقت طواف کرنا۔[۱۲] ــــــــ (۱۳) سخت بھوک یا غصہ کی حالت میں طواف کرنا۔[۱۳] ــــــــ (۱۴) طواف کی حالت میں نماز کی طرح ہاتھ باندھنا۔[۱۴] ــــــــ (۱۵) کولہے، کوکھ یا گرد پر ہاتھ رکھ کر طواف کرنا۔[۱۵] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] طواف کے چکروں میں شک ہوجائے، تو کیا کرے؟

۱۷۱۶-سوال: چند لوگوں کی ایک جماعت طواف کر رہی تھی، کہ زید کو طواف کے چکروں میں شک ہوگیا کہ: کتنے ہوئے ہیں، تو اب وہ کیا کرے؟

الجواب حامداومصلیا:

شک کی صورت میں اگر ساتھ میں طواف کرنے والوں میں سے کوئی ایک دین دار شخص بتلائے کہ اتنے چکر ہوئے ہیں، تو اس کی بات پر عمل کرنا مستحب ہے؛ لیکن اگر یہ اطلاع دو دین دار شخص دے، تو ان کی بات پر عمل کرنا واجب ہے۔

=أقيمت الجنازة خرج من سعيه إليها فإذا فرغ وعاد يبني على ما كان، هكذا في فتح القدير. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۲۷، كتاب المناسك، الباب الخامس في كيفية أداء الحج، ط: دار الفكر-بيروت)

(الطواف عند الخطبة) أي مطلقا لأشعاره بالإعراض ولو كان ساكتا (وإقامة المكتوبة) فإن ابتداء الطواف حينئذ مكروه. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ)، ۲۳۴، فصل في مكروهاته، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

[۱۱] وجاز فيهما أكل وبيع وإفتاء وقراءة لكن الذكر أفضل منها. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله وجاز فيهما أكل وبيع) المصرح به في اللباب كراهة البيع فيهما وكراهة الأكل في الطواف لا السعي، ومثل البيع الشراء وعد الشرب فيهما من المباحات. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۹۷، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف القدوم، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/۵۷۷، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا-ديوبند)

[۱۲-۱۳] و الطواف وهو يدافع البول أو الغائط، أو وهو شديد التوقان إلى الأكل، ونحو ذلك مما يشغله عن الحضور في العبادة، كما يكره في الصلاة. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۹/۱۴۱، مادة: طواف، مكروهات الطواف، ط: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية-الكويت)

[۱۴] معلم الحجاج، ص: ۱۳۰۔

[۱۵] حوالہ سابق۔

اور کوئی بتانے والا نہ ہو، تو طواف رکن میں شک ہو جائے، تو سات چکر پھر سے لگائے اور نئے سرے سے طواف کرے، اگر طواف واجب میں شک ہو جائے، تو جس چکر کے متعلق شک ہو، بس اسی کو دہرائے، طواف سنت یا نفل میں شک ہو جائے، تو جس طرف زیادہ خیال ہو، اس کو اختیار کرے، یعنی غالب گمان پر عمل کرے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] طواف کے لیے کسی کو اجرت پر متعین کرنا

۱۷۱۷- سوال: ایک شخص معذور، یا نہایت ضعیف ہے، از خود طواف نہیں کرسکتا ہے، اس نے ایک شخص کو کرایہ پر طے کیا ہے کہ: اس کو ویل چیئر یا سائیکل پر طواف کرائے، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے، اس کی اجرت لینے دینے میں شرعا کوئی حرج تو نہیں ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

مریضوں اور معذوروں کا ویل چیئر اور سائیکل پر بیٹھ کر طواف کرنا صحیح ہے۔[2] اور کسی کو اس کام کے

---

(۱) لو شك في عدد الأشواط في طواف الركن أعاده ولا يبني على غالب ظنه، بخلاف الصلاة، وقيل إذا كان يكثر ذلك يتحرى، ولو أخبره عدل بعدد يستحب أن يأخذ بقوله، ولو أخبره عدلان وجب العمل بقولهما لباب. قال شارحه ومفهومه أنه لو شك في أشواط غير الركن لا يعيده بل يبني على غلبة ظنه؛ لأن غير الفرض على التوسعة والظاهر أن الواجب في حكم الركن لأنه فرض عملي. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۹۷، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف القدوم، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۵۷۷، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا- ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۱۳۲، فصل في الأخذ في الطواف و كيفية أدائه، ط: مكتبہ يادگار شيخ، سہارن پور)

وفصل الحنفية في الشك في عدد الأشواط بين طواف الفرض والواجب وغيره: أما طواف الفرض كالعمرة والزيارة والواجب كالوداع فقالوا: لو شك في عدد الأشواط فيه أعاده، ولا يبني على غالب ظنه، بخلاف الصلاة، ولعل الفرق بينهما كثرة الصلوات المكتوبة وندرة الطواف.

أما غير طواف الفرض والواجب وهو النفل فإنه إذا شك فيه يتحرى، ويبني على غالب ظنه، ويبني على الأقل المتيقن في أصله. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۹/ ۱۲۵، مادة: طواف، الشك في عدد الأشواط، ط: وزارة الأوقاف و الشئون الإسلامية- الكويت)

(۲) وأما ركنه فحصوله كائنا حول البيت سواء كان بفعل نفسه أو بفعل غيره، وسواء كان عاجزا عن الطواف بنفسه فطاف به غيره بأمره أو بغير أمره، أو كان قادرا على الطواف بنفسه فحمله غيره بأمره أو بغير أمره غير أنه إن كان عاجزا أجزأه، ولا شيء عليه، وإن كان قادرا أجزأه، ولكن يلزمه الدم، أما الجواز فلأن الفرض حصوله كائنا حول=

لیے اجارہ پر طے کرنا کہ وہ اس کو ویل چیئر یا سائیکل پر بیٹھا کر طواف کرائے، تو جائز ہے، اس کی اجرت لینے اور دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بلا عذر سائیکل، ویل چیئر وغیرہ پر طواف کرے گا، تو دم واجب ہوگا، ساتھ میں گنہ گار بھی ہوگا۔ (☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] رمی: مفہوم، وقت اور طریقہ

۱۷۱۸- سوال: رمی کسے کہتے ہیں، اس کا وقت اور طریقہ کیا ہے۔؟

الجواب حامداومصلیا:

''رمی'' جمرہ پر کنکر مارنے کو کہتے ہیں۔ (۱) دسویں تاریخ کو فقط ایک ہی جمرہ کی رمی کرنا واجب ہے، گیارہویں اور بارہویں تاریخ کو تینوں جمرات کی رمی کرنا واجب ہے، اگر تیرہویں کی صبح صادق تک منیٰ میں ٹھہر گیا، تو اس دن بھی تینوں جمرات کی رمی کرنا واجب ہے۔ (۲)

=البيت، وقد حصل.

وأما لزوم الدم فلتركه الواجب، وهو الشيء بنفسه مع القدرة عليه فدخله نقص فيجب جبره بالدم كما إذا طاف راكبا أو زحفا، وهو قادر على المشي، وإذا كان عاجزا عن المشي لا يلزمه شيء؛ لأنه لم يترك الواجب إذ لا وجوب مع العجز. (بدائع الصنائع: ۱۳۴/۲، كتاب الحج، فصل ركن طواف الزيارة، ط: دار الكتب العلمية)

(☆☆)(و) لا لأجل الطاعات مثل (الأذان والحج والإمامة وتعليم القرآن والفقه) ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والإمامة والأذان. (الدر المختار مع رد المحتار: ۵۶/۶، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، ط: دار الفكر ☆ لسان الحكام في معرفة الأحكام- أحمد بن محمد بن محمد، أبو الوليد، لسان الدين ابن الشِّحْنَة الثقفي الحلبي الحلبي (م: ۸۸۲هـ)، ص: ۳۶۶، الفصل الثامن عشر في الاجارة، ط: البابي الحلبي - القاهرة ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام- محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا- أو منلا أو المولى- خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۲۳۳/۲، كتاب الإجارة، باب ما يفسد الإجارة، ط: دار إحياء الكتب العربية)

(۱) وأما تفسير رمي الجمار، فرمي الجمار في اللغة: هو القذف بالأحجار الصغار، وهي الحصى، إذ الجمار جمع جمرة، والجمرة هي الحجر الصغير، وهي الحصاة، وفي عرف الشرع: هو القذف بالحصى في زمان مخصوص، ومكان مخصوص، وعدد مخصوص. (بدائع الصنائع: ۱۳۷/۲، كتاب الحج، فصل تفسير رمي الجمار، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) وأما مكان الرمي ففي يوم النحر عند جمرة العقبة، وفي الأيام الأخر عند ثلاثة مواضع: عند الجمرة الأولى، والوسطى، والعقبة. (بدائع الصنائع: ۱۳۸/۲، كتاب الحج، فصل مكان رمي الجمار، ط: دار الكتب العلمية)

أنه في اليوم الأول يرمي جمرة العقبة لا غير، وفي بقية الأيام يرميها يبدأ بالأولى ثم بالوسطى ثم بجمرة العقبة كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۲۳۴/۱، كتاب المناسك، الباب الخامس في كيفية أداء الحج، مواضع رمي الجمار، ط: دار الفكر ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۲۳۳، باب الرمي، فصل في أيام الرمي، ط: مكتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

رمی کا طریقہ یہ ہے کہ: سب سے پہلے جمرۂ اولیٰ کی جڑ میں سات کنکریاں مارکر ایک طرف لوگوں سے کچھ دور ہٹ جائے اور قبلہ رو ہوکر دعا مانگے۔

جمرۂ اولیٰ سے فارغ ہوکر جمرۂ وسطیٰ پر آئے، یہاں بھی سات کنکریاں مارکر لوگوں سے ایک طرف ہوکر دعا مانگے۔

اس کے بعد جمرۂ عقبہ کی رمی کرے، جمرۂ عقبہ کی رمی کے بعد ٹھہرنا اور دعا مانگنا حدیث سے ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا رمی کے بعد یہاں سے فوراً روانہ ہوجائے۔(۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۳) عن عائشة، قالت: أفاض رسول الله صلى الله عليه وسلم من آخر يومه حين صلى الظهر، ثم رجع إلى منى، فمكث بها ليالي أيام التشريق يرمي الجمرة، إذا زالت الشمس كل جمرة بسبع حصيات، يكبر مع كل حصاة، ويقف عند الأولى، والثانية فيطيل القيام، ويتضرع، ويرمي الثالثة ولا يقف عندها. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۷۱، رقم الحديث: ۱۹۷۳، كتاب المناسك، باب في رمي الجمار، ط: ديوبند)

وفي الأيام الأخر عند ثلاثة مواضع: عند الجمرة الأولى، والوسطى، والعقبة، ويعتبر في ذلك كله مكان وقوع الجمرة لا مكان الرمي حتى لو رماها من مكان بعيد فوقعت الحصاة عند الجمرة أجزأه، وإن لم تقع عنده لم تجزها إلا إذا وقعت بقرب منها؛ لأن ما يقرب من ذلك المكان كان في حكمه لكونه تبعا له... فإن ترك الترتيب في اليوم الثاني فبدأ بجمرة العقبة فرماها ثم بالوسطى ثم بالتي تلي المسجد ثم ذكر ذلك في يومه؛ فإنه ينبغي أن يعيد الوسطى وجمرة العقبة، وإن لم يعد أجزأه، ولا يعيد الجمرة الأولى، أما إعادة الوسطى وجمرة العقبة فلتركه الترتيب، فإنه مسنون؛ لأن النبي - صلى الله عليه وسلم - رتب فإذا ترك المسنون تستحب الإعادة. (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۳۸-۱۳۹، كتاب الحج، فصل بيان حكم رمي الجمار إذا تأخر عن وقته، ط: دار الكتب العلمية)

بخلاف اليوم الأول، وهو يوم النحر إذا ترك الجمرة فيه، وهو سبع حصيات أنه يلزمه دم عنده؛ لأن سبع حصيات كل، وظيفة اليوم الأول فكان تركه بمنزلة ترك كل، وظيفة اليوم الثاني والثالث، وذلك أحد وعشرون حصاة. (المصدر السابق: ۲/ ۱۳۹☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۴۷، كتاب الحج، الفصل الخامس، ط: دار الفكر☆الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۵۲۹، كتاب الحج، الفصل الثالث، ط: زكريا-ديوبند)

ثم الأصل أن كل رمي بعده رمي يقف بعده لأنه في وسط العبادة فيأتي بالدعاء فيه وكل رمي ليس بعده رمي لا يقف لأن العبادة قد انتهت ولهذا لا يقف بعد جمرة العقبة في يوم النحر أيضا. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/ ۱۴۶، كتاب الحج، باب الإحرام، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

[۲۲] رمی جمرہ میں نیابت اور نائب کے رمی کرنے کا طریقہ

۱۷۱۹- سوال: ایک شخص کثرت ازدحام کی وجہ سے خود رمی کرنے نہیں جاتا ہے؛ بل کہ کسی مسٹنڈے، صحت مند آدمی کو اپنا نائب بناتا ہے، تو کیا یہ صحیح ہے، اگر صحیح ہے تو نائب کا اُس کی طرف سے رمی کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مرد، عورت، ضعیف اور مریض سب کا بہ ذات خود رمی کرنا ضروری ہے، دوسرے کو نائب بنانا جائز نہیں ہے۔(۱)

ہاں عذر شرعی کی وجہ سے نائب بنانا جائز ہے، مثلاً: آدمی اتنا بیمار ہو کہ بیٹھ کر نماز پڑھنا اس کے لیے جائز ہو، یا مرض کی وجہ سے جمرہ تک پہنچنے میں شدید تکلیف ہو اور مرض بڑھ جانے کا قوی اندیشہ ہو، یا پیدل چلنے کی استطاعت نہ ہو اور سواری بھی میسر نہ ہو، تو ایسا شخص رمی میں دوسرے کو نائب بنا سکتا ہے۔(۲)

نائب کے لیے رمی کا طریقہ یہ ہے کہ: وہ پہلے خود اپنی طرف سے تینوں جمروں کی رمی کر لے، اس کے بعد معذور کی طرف سے رمی کرے، اسی طرح دوسرے اور تیسرے شخص کی، جس قدر لوگوں کا نائب ہو، یکے بعد دیگرے کرتا رہے؛ لیکن اس طرح رمی کرنا کہ پہلے اپنی طرف سے ایک کنکری پھینکے، پھر معذور کی طرف سے پھینکے، یہ مکروہ ہے۔(۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] رمی کے بعض مسائل

۱۷۲۰- سوال: جب رمی کا دن آیا، تو ہم نے دس ذی الحجہ کو بڑے شیطان کو کنکریاں ماریں، اور گیارہویں ذی الحجہ کو درمیانی، بڑے، اور چھوٹے شیطان کو بالترتیب کنکری مار کر چلے آئے اور تیسرے دن

---

(۱) السادس: أن یرمي بنفسه فلا تجوز النیابة فیه عند القدرة. (غنیة الناسك، ص: ۲۴۳، فصل في شرائط الرمي، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

والرجل والمرأة في الرمي سواء إلا أن رمیها في اللیل أفضل فلا تجوز النیابة عن المرأة بغیر عذر. (حوالہ سابق)

(۲) وتجوز عند العذر فلو رمی عن مریض بأمره أو مغمی علیه ولو بغیر أمره أو صبي أو معتوه أو مجنون جاز. (حوالہ سابق)

(۳) والأولی أن یرمي السبعة أولا عن نفسه، ثم عن غیره. (حوالہ سابق)

ولو رمی بحصاتین إحداهما عن نفسه والأخری من غیره جاز ویکره. (حوالہ سابق)

یعنی بارہ ذی الحجہ کو کنکری مارنے سے پہلے مولانا سے رمی کے متعلق پوچھا، تو مولانا نے بتایا کہ: جاؤ چھوٹے شیطان کو چودہ کنکری مارو، (یعنی سات کنکری گذشتہ کل کی اور سات آج کی)، اور پھر درمیانی اور بڑے شیطان کو کنکری مارنا۔ ہم نے ایسا ہی کیا، تو کیا حنفی مسلک کے مطابق ہماری رمی صحیح ہوئی؟ خیمہ میں بیٹھے ہوئے انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش کے علماء گیارہویں کو ترتیب وار کنکری نہ مارنے کی وجہ سے، قضا، اور دم واجب ہونے کو بتلا رہے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کو ترتیب سے رمی کرنا سنت ہے، پہلے چھوٹے (جمرۂ اولیٰ) پھر درمیانی (جمرۂ وسطی) پھر بڑے پتھر (جمرۂ عقبہ) پر رمی کرنا مسنون ہے؛ آپ حضرات نے رمی خلاف سنت ادا کی ہے، اس کے باوجود ادا ہوگئی۔ [۱] بارہویں کو وہ شخص قضاء کرے، جس نے گیارہویں کو رمی نہ کی ہو۔ [۲] خلاف سنت امر پر دم واجب نہیں ہوتا، مولانا صاحب نے آپ کو غلط مسئلہ بتایا ہے۔ [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (وإذا كان اليوم الثاني) أي من أيام النحر... (رمى الجمار الثلاثة)... (ويبدأ بالجمرة الأولى) أي وجوبا وهو الأحوط، أو سنة وعليه الأكثر، ... (ثم يأتي الجمرة الوسطى، فيصنع عندها كما صنع عند الأولى)... ثم يأتي الجمرة القصوى وهي جمرة العقبة). (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۳۴۰-۳۴۲، باب رمي الجمار وأحكامه، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(۲) (فلو بدأ بجمرة العقبة ثم بالوسطى ثم بالأولى... ثم تذكر ذلك في يومه فإنه يعيد الوسطى والعقبة حتما) أي وجوبا عند البعض (أو سنة) مؤكدة عند الأكثر، وكذا لو ترك الأولى ورمى الأخريين، فإنه يرمي الأولى ويستقبل الباقية) أي ويأتي بالوسطى والعقبة وجوبا أو سنة. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملاعلي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۳۵۲، باب رمي الجمار وأحكامه، فصل في أحكام الرمي وشرائطه وواجباته)

(۳) تینوں جمرات کی رمی میں ترتیب کی کیا حیثیت ہے، بعض علماء کی رائے ہے کہ ترتیب واجب ہے، جب کہ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ جمرات ثلاثہ کے درمیان ترتیب واجب نہیں، پہلا قول احتیاط پر مبنی ہے، جب کہ اکثر علماء نے دوسرے قول کو اختیار کیا ہے۔

خیمہ میں موجود متعدد علماء نے جو وجوب دم کی بات کہی ہے، وہ پہلے قول پر مبنی ہے، کہ رمی میں جمرات کے درمیان ترتیب واجب ہے اور ترک واجب پر دم آتا ہے۔ جب کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اکثر علماء کے قول کے مطابق ''کہ رمی میں ترتیب واجب نہیں ہے''، خیمے میں موجود علماء کے قول کی تغلیط کی ہے، تفصیل کے لیے ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں، لباب اور اس ملا علی قاریؒ کی شرح میں رمی کی شرائط کی تفصیل کے ذیل میں یہ عبارت ہے:

(العاشر: الترتيب في رمي الجمار على قول بعض) ففي ''المبسوط'' للسرخسي: فإن بدأ في اليوم الثاني بجمرة العقبة فرماها، ثم بالجمرة الوسطى، ثم بالتي تلي المسجد، ثم ذكر ذلك في يومه، يعيد على الجمرة =

[۲۴] رمیٔ جمار سے قبل منیٰ چھوڑ دینے کی وجہ سے دم واجب ہوگا یا نہیں؟

۱۷۲۱-سوال: ہمارے ایک رشتہ دار اِس سال حج کو گئے تھے، اُن کے ساتھ اِس طرح کا واقعہ پیش آیا ہے کہ ایامِ حج میں قیامِ منیٰ کے دِنوں میں سے ایک دن جمعہ تھا، وہ جمعہ کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ چلے گئے، گویا شیطان کو کنکریاں مارنے سے پہلے منیٰ سے رخصت ہوگئے، البتہ جمعہ کی ادائیگی کے بعد فوراً آکر انہوں نے کنکریاں ماری، تو کیا گیارہویں ذی الحجہ کو رمی سے پہلے، منیٰ سے چلے جانے کی وجہ سے اُن پر کسی طرح کا دم واجب ہوگا؟ حالاں کہ انہوں نے بعدِ جمعہ، واپس آکر رمی کی ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

امسال (۱۹۷۴ء) گیارہویں ذی الحجہ کو جمعہ کا دن تھا، رمی کا وقتِ مسنون گیارہویں ذی الحجہ کو زوالِ شمس کے بعد سے غروبِ شمس تک رہتا ہے، اِس لیے کوئی شخص مکہ مکرمہ طوافِ زیارت یا ادائیگیٔ جمعہ کے لیے گیا، اور واپس آکر اس نے غروبِ شمس سے قبل رمی کرلی، تو اُس نے خلافِ شرع کوئی کام نہیں کیا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں حاجی صاحب کے حج میں کوئی خرابی نہیں آئی۔

صورتِ مسئولہ میں جمعہ کی ادائیگی کے بعد فوراً آکر غروبِ شمس سے پہلے رمی جمار کی گئی ہے، گویا وقتِ مسنون میں رمی کی گئی ہے، اس لیے سنت طریقہ کے مطابق عمل ہوا ہے، اِس میں کوئی دم واجب نہیں ہوگا، البتہ رات میں مردوں کے لیے رمی کرنا مکروہ ہے، لیکن دم واجب نہیں ہوگا، اور عورتوں کے لیے ازدحام

=الوسطى، وجمرة العقبة، لأنه نسك شرع مرتبا في هذا اليوم، فما سبق أوانه لا يعتد به، فكان رمي الجمرة الأولى بمنزلة الافتتاح للجمرة الوسطى، والوسطى بمنزلة الافتتاح لجمرة العقبة فما أدى قبل وجود مفتاحه، لا يكون معتدا به كمن سجد قبل الركوع أو سعى قبل الطواف بالبيت فالمعتد من رميه هنا الجمرة الأولى فلهذا يعيد على الوسطى كمن سجد قبل الركوع أو سعى قبل الطواف بالبيت فالمعتد من رميه هنا الجمرة الأولى فلهذا يعيد على الوسطى، وعلى جمرة العقبة. انتهى. وهو صريح في إفادة هذا المعنى.

(والأكثر على أنه سنة) كما صرح به صاحب "البدائع" والكرماني و"المحيط" و"فتاوى السراجية". وقال ابن الهمام: والذي يقي عندي استنان الترتيب، لا تعيينه. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م:۱۰۱۴ھ) ص:۳۵۲، باب رمي الجمار و أحكامه، فصل في أحكام الرمي و شرائطه و واجباته، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

کی وجہ سے رات میں بھی رمی کرنا مکروہ نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٢٥] أيضاً

گذشتہ سے پیوستہ

١٧٢٢- سوال: (متعلق بالا) اگر دم واجب ہوتا ہے، جیسا کہ بعض علماء فرما رہے ہیں، تو مذکورہ شخص اِس وقت اپنے وطن ''ری یونین'' میں آچکے ہیں، تو وہ دم کس جگہ ادا کریں؟ اگر دم واجب نہ ہو، تو اِس غلطی کی وجہ سے اُسے کیا کرنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اوپر ذکر کردہ تفصیل کے مطابق دم بالکل واجب نہیں ہے، ارکانِ حج میں کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے؛ اِس لیے اگر کوئی شخص وجوبِ دم کی بات کہہ رہا ہے، تو وہ غلط مسئلہ بتا رہا ہے، اندازے سے جواب دے رہا ہے، تو گنہ گار ہوگا، یہ بڑی جسارت کی بات ہے کہ آدمی بغیر علم حاصل کیے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کرنے لگے؛ اِس لیے مسئلہ بتانے میں بڑے احتیاط کی ضرورت ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٢٦] حج میں عورتوں کے مخصوص مسائل

١٧٢٣- سوال: حج میں عورتوں کے وہ مسائل، جو مردوں سے مختلف ہیں، کیا ہیں؟

---

(١) (والوقت المسنون في اليومين يمتد من الزوال إلى غروب الشمس، و من الغروب إلى طوع الفجر وقت مكروه) أي اتفاقا... (ولو لم يرم يوم النحر) أي اليوم الأول (أو الثاني أو الثالث رماه في الليلة المقبلة) أي الآتية لكل من الأيام الماضية (ولا شيء عليه سوى الإساءة) لتركه السنة (إن لم يكن بعذر) أي ضرورة. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط-الملا علي القاري (م: ١٠١٤هـ) ص: ٣٣٩-٣٤٠، باب رمي الجمار و أحكامه، فصل في وقت الرمي، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

السادس: أن يرمي بنفسه فلا تجوز النيابة فيه عند القدرة..............

و الرجل و المرأة في الرمي سواء إلا أن رميها في الليل أفضل فلا تجوز النيابة عن المرأة بغير عذر. (غنية الناسك، ص: ٢٤٣، فصل في شرائط الرمي، ط: مكتبہ يادگار شيخ، سہارن پور)

(٢) فالمفروض على المفتي و القاضي التثبت في الجواب وعدم المجازفة فيهما، خوفا من الافتراء على الله بتحريم حلال و ضده، و يحرم اتباع الهوى و التشهي و الميل إلى المال، الذي هو الداهية الكبرى، المصيبة العظمى، فإن ذلك أمر عظيم، لا يتجاسر عليه إلا كل جاهل شقي. (شرح عقود رسم المفتي- ابن عابدين (م: ١٢٥٢هـ) ص: ٥٨، طبقات الفقهاء، ط: زكريا-ديوبند)

الجواب حامداومصلیا:

عورتوں کے وہ احکام، جو مردوں سے جدا ہیں، درج ذیل ہیں:

(۱) عورتوں کے لیے رمل اور اضطباع جائز نہیں ہے۔[۱] (۲) صفا اور مروہ کی سعی میں عورتوں کے لیے میلین اخضرین کے درمیان دوڑنا سنت نہیں ہے۔[۲] (۳) عورتوں کا بلند آواز سے تلبیہ پڑھنا ممنوع ہے؛ کیوں کہ اجنبی مرد تک اس کی آواز پہنچے گی، جو جائز نہیں ہے، صرف اس قدر آواز سے پڑھے کہ خود سن لے۔[۳] (۴) عورتیں احرام کی حالت میں بھی سلا ہوا کپڑا پہنیں گی۔[۴] (۵) خواتین کے لیے سر کے بال منڈوانا حرام ہے، صرف بال کتروائے گی۔[۵] (۶) حیض ونفاس کی حالت میں عورت کسی قسم کا طواف نہیں کرسکتی اور ایسی حالت میں مسجد میں آنا بھی جائز نہیں ہے۔[۶] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱-۲] (ولا ترمل) ولا تضطبع (ولا تسعى بين الميلين). [الدر المختار] ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله ولا ترمل إلخ) لأن أصل مشروعيته لإظهار الجلد وهو للرجال ولأنه يخل بالستر، وكذا السعي: أي الهرولة بين الميلين في السعي والاضطباع سنة الرمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۲۸، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف القدوم، ط: دار الفكر☆المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۲۷/۱۷۲، كتاب الوصايا، باب الوصية في الحج، ط: دار المعرفة- بيروت☆الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۴۹، كتاب الحج، باب الإحرام، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت☆ البحر الرائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/۶۲۲، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا- ديوبند)

[۳-۴-۵] "ولا ترفع صوتها بالتلبية" لما فيه من الفتنة"... ولا تحلق ولكن تقصر "لما روي أن النبي عليه الصلاة والسلام نهى النساء عن الحلق وأمرهن بالتقصير ولأن حلق الشعر في حقها مثله كحلق اللحية في حق الرجل وتلبس من المخيط ما بدا لها؛ لأن في لبس غير المخيط كشف العورة. (الهداية في شرح بداية المبتدي: ۱/۱۴۹، كتاب الحج، باب الإحرام، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ البحر الرائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/۶۲۲-۶۲۱، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا- ديوبند☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۲۸، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف القدوم، ط: دار الفكر☆المبسوط- شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۲۷/۱۷۲، كتاب الوصايا، باب الوصية في الحج، ط: دار المعرفة- بيروت)

[۶] (وحيضها لا يمنع) نسكا (إلا الطواف) [الدر المختار] ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله لا يمنع نسكا) أي شيئا من أعمال الحج (قوله إلا الطواف) فهو حرام من وجهين دخولها المسجد وترك واجب الطهارة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۲۸، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف القدوم، قبيل باب القران هو أفضل) =

[۲۷] طواف زیارت کا وقت

۱۷۲۴- سوال: طواف زیارت کی حج میں کیا حیثیت ہے، اور اس کا وقت کب تک ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

طواف زیارت حج کا عظیم رکن ہے، اس کا وقت دسویں تاریخ کی صبح صادق سے بارہویں کی سورج غروب ہونے تک رہتا ہے، مگر دسویں کو اس طواف کی ادائیگی مستحب ہے؛ لہٰذا دسویں ذی الحجہ کو رمی، قربانی پھر حلق کر کے طواف زیارت کرنا چاہیے۔ بارہویں تاریخ کے بعد اس طواف کا کرنا مکروہ تحریمی ہے، اس سے دم واجب ہوتا ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۸] حائضہ کا ۱۲ر تاریخ کے بعد طواف زیارت کرنا

۱۷۲۵- سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ: ایک خاتون کو ۱۰/۱۱/۱۲ تینوں

= والمرأة في جميع ذلك كالرجل، غير أنها لا تكشف رأسها، وتكشف وجهها، ولا ترفع صوتها بالتلبية، ولا ترمل في الطواف، ولا تسعى بين الميلين، ولا تحلق رأسها، ولكن تقصر. ــــــــــ قال الشارح: [عبد الغني بن طالب بن حمادة بن إبراهيم الغنيمي الدمشقي الميداني الحنفي (م:۱۲۹۸ھ)]: (والمرأة في جميع ذلك) المار (كالرجل) لعموم الخطاب (غير أنها لا تكشف رأسها) : لأنها عورة (وتكشف وجهها) ولو سدلت شيئاً عليه وجافته عنه جاز؛ لأنه بمنزلة الاستظلال بالمحمل (ولا ترفع صوتها بالتلبية) بل تسمع نفسها دفعا للفتنة (ولا ترمل في الطواف) ولا تضطبع، ولا تسعى بين الميلين (ولا تحلق رأسها، ولكن تقصر) من ربع شعرها كما مر، وتلبس المخيط والخفين. (اللباب في شرح الكتاب: ۱/ ۱۹۵، كتاب الحج، قبيل باب القران، ت: محمد محيي الدين عبد الحميد، ط: المكتبة العلمية، بيروت-لبنان)

(۱) وطواف الزيارة ركن الحج، وهو الحج الأكبر في تأويل قوله تعالى ﴿وأذان من الله ورسوله إلى الناس يوم الحج الأكبر﴾ [التوبة: ۳] ووقته أيام النحر فلا ينبغي أن يؤخره عن أيام النحر، والأفضل أداؤه في أول أيام النحر كالتضحية لقوله - صلى الله عليه وسلم -: أيام النحر ثلاثة أفضلها أولها. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۴/ ۲۲، كتاب المناسك، ط: دار المعرفة-بيروت)

(و) طواف الزيارة (أول وقته بعد طلوع الفجر يوم النحر وهو فيه) أي الطواف في يوم النحر الأول (أفضل ويمتد) وقته إلى آخر العمر (وحل له النساء) بالحلق السابق، حتى لو طاف قبل الحلق لم يحل له شيء، . . . (فإن أخره عنها) أي أيام النحر ولياليها منها (كره) تحريما (ووجب دم) لترك الواجب. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۵۱۸-۵۱۹، كتاب الحج، مطلب في طواف الزيارة، ط: دار الفكر)

تاریخ میں- جو طواف زیارت کا وقت ہے- ماہواری جاری ہے، وہ بارہ تاریخ کے بعد پاک ہوئی، اب وہ طواف زیارت کرنا چاہتی ہے، کرسکتی ہے یا نہیں، اس پر دم واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

اگر عورت حیض یا نفاس کی وجہ سے بارہویں تاریخ کے بعد طواف زیارت کررہی ہے، تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، اس پر دم واجب نہیں ہوگا۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] طواف وداع اور حائضہ خاتون

۱۷۲۶- سوال: طواف وداع کن لوگوں پر واجب ہے؟

اس کا وقت کیا ہے؟ اگر کسی عورت کو طواف وداع کے وقت ماہواری جاری ہو، تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

طواف وداع میقات سے باہر رہنے والوں پر واجب ہے۔

اس کا وقت 'طواف زیارت کے بعد ہے، جب مکہ مکرمہ سے واپسی کا ارادہ ہوتا ہے، اس وقت بیت اللہ کا وداعی طواف کیا جاتا ہے۔ (۲)

اگر کسی عورت کو حیض آگیا ہو اور اس کا شوہر یا محرم- جس کے ساتھ اس نے سفر کیا ہے- روانہ ہورہا

---

[۱] (وحيضها لا يمنع) نسكا (إلا الطواف) ولا شيء عليها بتأخيره إذا لم تطهر إلا بعد أيام النحر. [الدر المختار]

قال ابن عابدين: (قوله لا يمنع نسكا) أي شيئا من أعمال الحج (قوله إلا الطواف) فهو حرام من وجهين دخولها المسجد وترك واجب الطهارة. (رد المحتار: ۵۲۸/۲، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف القدوم، قبيل باب القران هو أفضل، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) (ثم) إذا أراد السفر (طاف للصدر) أي الوداع (سبعة أشواط بلا رمل وسعي، وهو واجب إلا على أهل مكة ومن في حكمهم. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ثم إذا أراد السفر) أتى بثم وما بعدها إشارة إلى ما في النهر وغيره من أن أول وقته بعد طواف الزيارة إذا كان على عزم السفر . . . (قوله إلا على أهل مكة) أفاد وجوبه على كل حاج آفاقي مفرد أو متمتع أو قارن بشرط كونه مدركا مكلفا غير معذور فلا يجب على المكي، ولا على المعتمر مطلقا، وفائت الحج والمحصر والمجنون والصبي والحائض والنفساء كما في اللباب وغيره (قوله ومن في حكمهم) أي ممن كان داخل المواقيت، وكذا من نوى الاستيطان قبل حل النفر. (رد المحتار على الدر المختار: ۵۲۳/۲، كتاب الحج، مطلب في طواف الزيارة، ط: دار الفكر☆ البحر الرائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۶۲۲-۶۲۱، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا- ديوبند☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۲۴۷، باب طواف الصدر، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

ہو، تو ایسی صورت میں عورت کے ذمے یہ طواف واجب نہیں ہے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

[۳۰] طواف وداع کے بعد مکہ میں ٹھہرنے والے کا حکم

۱۷۲۷- سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے مکہ مکرمہ سے روانہ ہونے کا پختہ اردہ کرلیا، طواف وداع سے بھی فارغ ہوگیا؛ لیکن اچانک اسے کسی کام کی وجہ سے مزید کچھ ایام مکہ میں ٹھہرنا پڑ گیا، تو کیا اب واپسی کے وقت دوبارہ اس کے لیے طواف وداع کرنا واجب ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

طواف وداع کرنے کے بعد کسی وجہ سے مکہ مکرمہ میں ٹھہرنا ہوگیا ہو، تو پھر جب رخصت ہونے کا ارادہ ہو، اس وقت دوبارہ طواف کرنا مستحب ہے، واجب نہیں۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (وهو بعد حصول ركنيه يسقط طواف الصدر) ومثله النفاس. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله وهو) أي الحيض بعد حصول ركنيه: أي ركني الحج، وهو وإن كان فيه تشتيت الضمائر لكنه ظاهر (قوله يسقط طواف الصدر) أي يسقط وجوبه عنها كما قدمناه ولا دم عليها كما في اللباب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۲۳، كتاب الحج، مطلب في طواف الزيارة، ط: دار الفكر☆ البحر الرائق-ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/ ۲۲-۶۲۱، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا- ديوبند)

(وإن حاضت بعد) الوقوف و (طواف الزيارة سقط عنها طواف الصدر ولا شيء عليها لتركه) أي ترك طواف الصدر ولم يأمرهن بإقامة شيء مقامه كما يسقط عمن أقام بمكة؛ لأنه على من يصدر من مكة فإن أقام قبل أن يحل النفر الأول سقط عنه طواف الصدر بالاتفاق. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/ ۲۸۶، كتاب الحج، فصل المسائل التي تتعلق بالوقوف وأحوال النساء وأحوال البدن وتقليدها، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۲) (ثم) إذا أراد السفر (طاف للصدر) أي الوداع (سبعة أشواط بلا رمل وسعي، وهو واجب إلا على أهل مكة) ومن في حكمهم فلا يجب بل يندب كمن مكث بعده. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ثم إذا أراد السفر) أتى بثم وما بعدها إشارة إلى ما في النهر وغيره من أن أول وقته بعد طواف الزيارة إذا كان على عزم السفر، حتى لو طاف كذلك ثم أطال الإقامة بمكة ولم يتخذها دارا جاز طوافه ولا آخر له وهو مقيم، بل لو أقام عاما لا ينوي الإقامة فله أن يطوف، ويقع أداء، نعم المستحب إيقاعه عند إرادة السفر. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۲۳، كتاب الحج، مطلب في طواف الصدر، ط: دار الفكر)

وأما وقته [طواف الصدر] فقد روي عن أبي حنيفة أنه قال ينبغي للإنسان إذا أراد السفر أن يطوف طواف الصدر =

[۳۱] طواف وداع کیے بغیر واپس ہونے کا حکم

۱۷۲۸- سوال: ایک شخص جلدی جلدی میں طواف وداع کیے بہ غیر ہی مکہ سے روانہ ہوگیا، میقات کی حدود سے نکلنے کے بعد اس کو کسی نے بتایا کہ: تم نے طواف وداع نہیں کیا ہے؛ اس لیے تمہارے ذمے دم واجب ہوگیا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہماری شرعی رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں کہ کیا اس شخص کا یہ کہنا کہ "تم پر دم واجب ہوگیا ہے" صحیح ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

جو [غیر مکی یا ایسا شخص، جو میقات کے اندر رہتا ہو] شخص طواف وداع کیے بہ غیر مکہ سے روانہ ہوگیا ہو تو جب تک وہ میقات سے نہ نکلے، واپس لوٹ کر طواف کرنا اس کے لیے واجب ہے، اس میں احرام کی شرط نہیں ہے، اور اگر میقات سے نکل گیا ہے، جیسا کہ آپ کے سوال میں مذکور ہے، تو اب اس پر دو کام میں سے کوئی ایک ضروری ہے: یا تو دم ادا کرے، یعنی: جانور بھیج کر یا کسی کو حکم کر کے حرم کے احاطے میں ایک بکرا ذبح کروادے، یا احرام باندھ کر مکہ واپس جائے اور عمرہ کر کے پھر طواف وداع کرلے، اور اس صورت میں جو طواف وداع میں تاخیر ہوئی ہے، اس سے دم واجب نہ ہوگا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=حين يريد أن ينفر، وهذا بيان الوقت المستحب لا بيان أصل الوقت، ويجوز في أيام النحر، وبعدها، ويكون أداء لا قضاء، حتى لو طاف طواف الصدر، ثم أطال الإقامة بمكة، ولم ينو الإقامة بها، ولم يتخذها دارا جاز طوافه، وإن أقام سنة بعد الطواف إلا أن الأفضل أن يكون طوافه عند الصدر لما قلنا، ولا يلزمه شيء بالتأخير عن أيام النحر بالإجماع.

(بدائع الصنائع: ۲/ ۱۴۳، كتاب الحج، فصل وقت طواف الصدر، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) (ثم) إذا أراد السفر (طاف للصدر) أي الوداع (سبعة أشواط بلا رمل وسعي، وهو واجب إلا على أهل مكة). [الدر المختار] ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله وهو واجب) فلو نفر ولم يطف وجب عليه الرجوع ليطوف ما لم يجاوز الميقات فيخير بين إراقة الدم والرجوع بإحرام جديد بعمرة مبتدئا بطوافها ثم بالصدر، ولا شيء عليه لتأخيره، والأول أولى تيسيرا عليه ونفعا للفقراء نهر ولباب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۲۳، كتاب الحج، مطلب في طواف الصدر، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۶۱۴، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا- ديوبند)

فإن نفر ولم يطف يجب عليه أن يرجع، ويطوف ما لم يجاوز الميقات؛ لأنه ترك طوافا واجبا، وأمكنه أن يأتي به من غير الحاجة إلى تجديد الإحرام فيجب عليه أن يرجع، ويأتي به، وإن جاوز الميقات لا يجب عليه الرجوع؛ لأنه لا يمكنه الرجوع إلا بالتزام عمرة بالتزام إحرامها ثم إذا أراد أن يمضي مضى، وعليه دم، وإن أراد أن يرجع أحرم بعمرة=

[۳۲] طوافِ وداع کے درمیان عورت کو حیض آجائے، تو کیا کرے؟

۱۷۲۹- سوال: حج بیت اللہ سے وطن واپسی سے پہلے طواف کے درمیان میری اہلیہ کو حیض آگیا، تو اب کیا کیا جائے؟ اپنے وطن پہنچ کر جانور قربان کرنا ہوگا یا مکہ میں؟ اور کون سے جانور کی قربانی واجب ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

وطن واپسی کے وقت طوافِ وداع کے درمیان اگر حیض آگیا اور پاک ہونے کے بعد عورت نے اُس طواف کو دہرا لیا، تو کوئی چیز واجب نہیں ہوگی، اگر طواف دہرائے بغیر وطن واپس آگئی، تو ایک چھوٹے جانور (بکری) کی قربانی واجب ہے۔[1] اور اُسے حدودِ حرم میں ذبح کرنا ضروری ہے، وطن میں قربانی کی گئی تو نا کافی ہوگی۔[2] اُس کا آسان راستہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مکہ مکرمہ جارہا ہو، تو اُسے قربانی کا ذمے دار بنا دے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=ثم رجع، وإذا رجع يبتدئ بطواف العمرة ثم بطواف الصدر، ولا شيء عليه لتأخيره عن مكانه، وقالوا: الأولى أن لا يرجع، ويريق دما مكان الطواف، لأن هذا أنفع للفقراء، وأيسر عليه لما فيه من دفع مشقة السفر، وضرر التزام الإحرام، والله أعلم. (بدائع الصنائع: ۱۴۳/۲، كتاب الحج، فصل مكان طواف الصدر، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) (أو طاف للقدوم) لوجوبه بالشروع (أو للصدر جنبا) أو حائضا (أو للفرض محدثا ولو جنبا فبدنة إن) لم يعده. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله لوجوبه بالشروع) أشار إلى أن الحكم كذلك في كل طواف هو تطوع، فيجب الدم لو طافه جنبا، والصدقة لو محدثا كما في الشرنبلالية عن الزيلعي. . . . (قوله إن لم يعده) أي الطواف الشامل للقدوم والصدر والفرض، فإن أعاده فلا شيء عليه فإنه متى طاف أي طواف مع أي حدث ثم أعاده سقط موجبه. اهـ. . . . وإن طاف للزيارة محدثا وللصدر طاهرا، فإن حصل الصدر في النحر انتقل إلى الزيارة، ثم إن طاف للصدر ثانيا فلا شيء عليه وإلا فعليه دم لتركه. (رد المحتار على الدر المختار: ۵۵۱-۵۵۲/۲، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر- بيروت ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع ارشاد الساري، ص: ۴۹۶، ۴۹۷، باب الجنايات وأنواعها، الجناية في أفعال الحج، ط: الكمتبة الإمدادية- مكة المكرمة ☆ الفقه الإسلامي وأدلته: ۲۹۴/۳، ثالثا: الجناية التي توجب دما واحدا، ط: الهدى انٹرنیشنل- دیوبند)

(۲) عن جابر، قال: ثم قال النبي صلى الله عليه وسلم: قد نحرت ها هنا ومنى كلها منحر، ووقف بعرفة فقال: قد وقفت ها هنا وعرفة كلها موقف، ووقف بالمزدلفة فقال: قد وقفت ها هنا ومزدلفة كلها موقف. (سنن أبي داود: ۲۴۶/۱، رقم الحديث: ۱۹۰۷، كتاب المناسك، باب صفة حجة النبي صلى الله عليه وسلم، ط: ديوبند)

قال "ولا يجوز ذبح الهدايا إلا في الحرم" لقوله تعالى في جزاء الصيد: ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدة: ۹۵] فصار أصلا=

[۳۳] حائضہ عورت کا حرمِ مکی و مدنی میں داخلہ اور طواف وسعی کا حکم

۱۷۳۰- سوال: حائضہ عورت حرمِ مکی یا مسجدِ نبوی میں داخل ہوسکتی ہے یا نہیں؟ نیز طواف وسعی کے بارے میں اُس کے لیے حکمِ شرعی کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

حائضہ عورت دوسری مساجد کی طرح مسجدِ حرام اور مسجدِ نبوی میں بھی داخل نہیں ہوسکتی؛ (۱) اِس لیے حالتِ حیض میں طواف ممنوع ہے، بقیہ ارکان حالتِ حیض میں ادا کرسکتی ہے، سعی بین الصفا والمروہ بھی کرسکتی ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۴] ایامِ حج میں احرام کے بعد حیض شروع ہوا، تو کیا حکم ہے؟

۱۷۳۱- سوال: اگر کسی عورت کو ایامِ حج میں احرام کے بعد حیض شروع ہوجائے، تو وہ کیا کرے؟

=في كل دم هو كفارة ولأن الهدي اسم لما يهدى إلى مكان ومكانه الحرم قال عليه الصلاة والسلام " منى كلها منحر وفجاج مكة كلها منحر ". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۸۱، كتاب الحج، باب الهدي، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت★البحر الرائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۳/۱۲۸، كتاب الحج، باب الهدي، ط: زكريا - ديوبند☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۳۳۸، فصل في شرائط كفاراتها الثلاث، مطلب في شرائط جواز الدم، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(۱) القاسم بن محمد، يقول: سمعت عائشة تقول: خرجنا لا نرى إلا الحج، فلما كنا بسرف حضت، فدخل علي رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا أبكي، قال: ما لك أنفست؟. قلت: نعم، قال: إن هذا أمر كتبه الله على بنات آدم، فاقضي ما يقضي الحاج، غير أن لا تطوفي بالبيت. قالت: وضحى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن نسائه بالبقر. (صحيح البخاري: ۱/ ۴۳، رقم الحديث: ۲۹۴، كتاب الحيض، باب كيف كان بدء الحيض وقول النبي صلى الله عليه وسلم: هذا شيء كتبه الله على بنات آدم، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/۳۸۸، رقم الحديث: ۱۱۹- (۱۲۱۱)، كتاب الحج، باب بيان وجوه الإحرام، وأنه يجوز إفراد الحج والتمتع والقران... الخ، ط: ديوبند)

ومنها أنها لا تطوف بالبيت ؛لقوله - صلى الله عليه وسلم - لعائشة - رضي الله عنها - حين حاضت بسرف: اصنعي جميع ما يصنع الحاج غير أن لا تطوفي بالبيت. ـــــــ ومنها أن لا تدخل المسجد؛ لأن ما بها من الأذى أغلظ من الجنابة والجنب ممنوع من دخول المسجد فكذلك الحائض، وهذا؛ لأن المسجد مكان الصلاة فمن ليس من أهل أداء الصلاة ممنوع من دخوله. (المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۳/ ۵۳- ۱۵۲، كتاب الحيض و النفاس، فصل الأحكام التي تتعلق بالحيض، ط: دار المعرفة - بيروت☆ المحيط البرهاني: ۱/۲۱۷، كتاب الطهارة، الفصل الثامن في الحيض، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

الجواب حامداً ومصلیا:

''حیض'' صرف طوافِ کعبہ سے مانع ہے، لہٰذا احرام سے پہلے یا اُس کے بعد حیض آ گیا، تو طواف کے علاوہ بقیہ ارکان کو ادا کرتی رہے، مثلاً، وقوفِ عرفہ اور وقوفِ مزدلفہ وغیرہ تمام ارکان ادا کرسکتی ہے، اِن ارکان سے قبل طواف نہ کرے۔ (۱) اِن تمام مناسک کے بعد (اگر حیض سے پاک ہوگئی ہو، تو) دسویں ذی الحجہ کو طوافِ زیارت کرلے، اگر ایامِ نحر ختم ہونے تک پاک نہ ہوئی ہو، تو بارہویں ذی الحجہ کی شام تک انتظار کرے، اگر غروبِ آفتاب سے قبل پاک ہوگئی، تو طواف کرلے۔

اگر بارہ ذی الحجہ کی شام (غروب) سے پہلے پاک ہوگئی اور اِس قدر وقت باقی ہے کہ بہ عجلت غسل کر کے طواف کے چار چکر لگانا ممکن ہو، تو اُس پر لازم ہے کہ طواف کرلے، اور اگر اُس نے اِتنا وقت ملنے کے باوجود تاخیر کی اور طواف نہیں کیا، تو ایک قربانی (بکری) لازم ہوگی، اِسی طرح یوم النحر کو قربانی کے بعد اُس کو اِتنا وقت ملا کہ وہ طواف کرسکتی تھی؛ مگر جان بوجھ کر تاخیر کی اور حیض آ گیا، تو اُس صورت میں بھی دم لازم ہوگا۔ (۲) اگر قصداً تاخیر نہیں کی؛ بل کہ حیض پہلے سے جاری تھا، یا اچانک جاری ہوگیا اور پورے تین دِن ایامِ نحر کے گزر گئے؛ مگر حیض بند نہیں ہوا، تو جب بند ہو جائے، تب طواف کرے گی، اِس صورت میں کوئی دم لازم نہیں ہوگا۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) سوال سابق بہ عنوان: ''حائضہ عورت کا حرمِ مکی اور مسجدِ نبوی میں داخلہ اور طواف وسعی کا حکم'' کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) أن الحائض إذا طهرت في آخر أيام النحر، فإن أمكنها الطواف قبل الغروب ولم تفعل فعليها دم للتأخير، وإن لم يمكنها طواف أربعة أشواط فلا شيء عليها ولو حاضت بعدما قدرت على الطواف فلم تطف حتى مضى الوقت لزمها الدم؛ لأنها مقصرة بتفريطها، وفي الظهيرية: وليالي أيام النحر منها. (البحر الرائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۲/ ۳۷۴، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: دار الكتب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۱۹، كتاب الحج، مطلب في طواف الزيارة، ط: دار الفكر- بيروت ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع إرشاد الساري، ص: ۳۹۵، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة ☆ فتح القدير: ۳/ ۶۲، كتاب الحج، باب الجنايات، فصل: طاف طواف القدوم محدثا، ط: دار الفكر- بيروت)

(۳) إن المرأة إذا حاضت أو نفست قبل أيام النحر، فطهرت بعد مضيها، فلاشيء عليها. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع إرشاد الساري، ص: ۴۹۶ ☆ فتح القدير: ۳/ ۶۲، كتاب الحج، باب الجنايات، فصل: طاف طواف القدوم محدثا، ط: دار الفكر- بيروت ☆ منحة الخالق على البحر الرائق: ۲/ ۳۹۸، كتاب الحج، باب التمتع، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۱۹، مطلب في طواف الزيارة)

[۳۵] مکہ پہنچنے کے بعد حیض شروع ہو جائے تو عورت کیا کرے؟

۱۷۳۲- سوال: ایک عورت صرف عمرہ ادا کرنے کی نیت سے مکہ پہنچی اور حیض شروع ہو گیا، تو اب وہ عمرہ کے ارکان کیسے ادا کرے گی؟ نیز اگر وہ حج بھی کرنا چاہتی ہے، تو کس طرح حج کے ارکان کو انجام دے گی۔

الجواب حامداً ومصلیا:

عمرہ کا احرام باندھنے والی عورت اگر آٹھویں ذی الحجہ سے قبل حیض سے پاک ہو جائے، تو عمرہ ادا کرے، اگر قران اور عمرہ کرنے کی غرض سے آئی ہو اور مناسکِ حج تک اُس کو عمرہ کے لیے طواف کرنے کا موقع نہ ملا ہو، تو حج کے مناسک شروع کر دے، اور حیض سے فراغت اور حج کے ارکان سے فراغت کے بعد عمرہ کی قضا کرے، مقامِ تنعیم سے احرام باندھ لینا کافی ہوگا۔ (درِمختار)[۱]

حج کے ایام کے علاوہ دیگر ایام میں عمرہ کرنے والی کو اگر حیض آ گیا، تو اُس کو پاک ہونے تک ٹھہرنا ہوگا، اور اگر حالتِ حیض میں طواف کرے گی، تو عمرہ درست ہو جائے گا؛ لیکن سخت گنہگار ہوگی، نیز دم (بکری) لازم ہوگا۔ (شامی)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۶] حج کے دنوں میں عورت کو حیض آ گیا

۱۷۳۳- سوال: حج کا مہینہ چل رہا ہو، اور کوئی عورت حج کے لیے رختِ سفر باندھے، اور جس دن وہاں [مکہ مکرمہ] پہونچے، اسی دن حیض شروع ہو جائے، تو ایسی حالت میں وہ کیا کرے گی؟ کیا اس کے لیے نماز معاف ہے؟ حج کے ایام میں وہ کیا طریقہ اختیار کرے گی؟ جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

---

[۱] (فإن وقف) القارن بعرفة (قبل) أكثر طواف (العمرة بطلت) عمرته،... (وقضيت) بشروعه فيها. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله وقضيت) أي بعد أيام التشريق شرح اللباب، وتقدم أن المكروه إنشاء العمرة في هذه الأيام لا فعلها فيها بإحرام سابق تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۵۳۵/۲، كتاب الحج، باب القران، ط: دار الفكر-بيروت)

[۲] ولو طاف للعمرة كله أو أكثره أو أقله ولو شوطا جنبا أو حائضا أو نفساء أو محدثا فعليه شاة. (المصدر السابق: ۵۵۱/۲، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: دار الفكر ☆ فتح القدير: ۵۵/۳، كتاب الحج، باب الجنايات، فصل: طاف طواف القدوم محدثا، ط: دار الفكر-بيروت)

الجواب حامدا ومصلیا:

عورت کو احرام کے بعد حیض آجائے، تو وہ طواف اور نماز کے علاوہ حج کے باقی ارکان ادا کرے گی، پہنچتے ہی حیض آگیا اور عمرہ کا احرام تھا، تو رک جائے حیض ختم ہونے کے بعد عمرہ کرے، احرام کی حالت جاری رہے گی، اگر ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ آجائے، تو وہ منیٰ جائے گی، حیض کی حالت میں منیٰ میں جانے میں کوئی حرج نہیں ہے، حائضہ سے نماز معاف ہے، وقوف عرفہ، وقوف مزدلفہ، رمی جمار، قربانی وغیرہ حالت حیض میں جائز ہے، فرض طواف پاک ہونے کے بعد کرے گی، حیض کی وجہ سے حج سے قبل عمرہ نہ کر پائی ہو، تو حج کے بعد عمرہ کی قضا کرے گی۔ (درمختار)[1]، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۷] حیض کی حالت میں طوافِ زیارت کا حکم

۱۷۳۴- سوال: حیض کی حالت میں طوافِ زیارت کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

حیض کی حالت میں طوافِ زیارت جائز نہیں ہے، بل کہ پاک ہونے کے بعد ادا کرے، اُس پر

[۱] وفي حديث جابر بن عبد الله رضي الله عنهما: "وأن عائشة حاضت، فنسكت المناسك كلها، غير أنها لم تطف بالبيت، قال: فلما طهرت وطافت قالت: يا رسول الله، أتنطلقون بعمرة وحجة، وأنطلق بالحج؟ فأمر عبد الرحمن بن أبي بكر أن يخرج معها إلى التنعيم، فاعتمرت بعد الحج في ذي الحجة. (صحيح البخاري: ۲۳۹/۱-۲۴۰، رقم الحديث: ۱۷۸۵، كتاب الحج، باب عمرة التنعيم، ط: ديوبند)

عن عائشة رضي الله عنها، أنها أهلت بعمرة، فقدمت ولم تطف بالبيت حتى حاضت، فنسكت المناسك كلها، وقد أهلت بالحج، فقال لها النبي صلى الله عليه وسلم: يوم النفر يسعك طوافك لحجك وعمرتك، فأبت، فبعث بها مع عبد الرحمن إلى التنعيم، فاعتمرت بعد الحج. (الصحيح لمسلم: ۳۹۰/۱، رقم الحديث: ۱۳۲-(۱۲۱۱)، كتاب الحج، باب بيان وجوه الإحرام، وأنه... الخ، ط: ديوبند)

(وحيضها لا يمنع) نسكا (إلا الطواف) ولا شيء عليها بتأخيره إذا لم تطهر إلا بعد أيام النحر، فلو طهرت فيها بقدر أكثر الطواف لزمها الدم بتأخيره لباب. (الدر المختار مع رد المحتار: ۵۲۸/۲، كتاب الحج، قبيل: باب القران، ط: دار الفكر-بيروت)

إن المرأة إذا حاضت أو نفست قبل أيام النحر فطهرت بعد مضيها، فلاشيء عليها. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۴۹۶، باب الجنايات و أنواعها، النوع الخامس الجنايات في أفعال الحج، فصل في حكم الجنايات في طواف الزيارة، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

کوئی دم واجب نہیں ہوگا، اور اگر حالتِ حیض میں طواف زیارت کرلیا، تو وہ عورت سخت گنہگار ہوگی، اور ایک بدنہ (بڑے جانور) کی قربانی لازم ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۸] حیض کی حالت میں طوافِ وداع کا کیا حکم ہے؟

۱۷۳۵- سوال: حیض کی حالت میں طوافِ وداع کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

حیض سے پاک ہونے کے بعد طوافِ وداع کرے، اگر مکہ سے روانگی کا وقت ہوگیا ہے، تو حائضہ کے لیے طوافِ وداع معاف ہے۔ (ہدایہ)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۹] حائضہ عورت طواف زیارت پاک ہونے کے بعد ادا کرے

۱۷۳۶- سوال: حکم یہ ہے کہ حائضہ عورت، بہ حالت حیض طواف زیارت نہیں کرسکتی، تو رکن حج کی ادائیگی کے بغیر اس کے حج کا کیا حکم ہے؟ آخر وہ کیا کرے؟ پاک ہونے کے بعد طواف زیارت کرے؟ ایام حج کے بعد اگر طواف کرے، تو صحیح ہوگا یا پھر آئندہ سال ادا کرنا پڑے گا؟ کیا تاخیر کی صورت میں دم لازم آئے گا؟ طواف وداع کے وقت اگر حیض آجائے، تو عورت کیا کرے؟

براہ کرم مذکورہ سوالات کے جوابات مرحمت فرمائیں۔

---

(۱) ولو طاف للزيارة جنبا أو حائضا أو نفساء كله أو أكثره فعليه بدنة، ويقع معتدا به في حق التحلل ويصير عاصيا. (مناسك الملا علي القاري مع حاشية إرشاد الساري، ص:۴۸۸، باب الجنايات وأنواعها، النوع الخامس الجنايات في أفعال الحج، فصل في حكم الجنايات في طواف الزيارة، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۵۵۱-۵۵۲، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر - بيروت☆ البحر الرائق: ۳/ ۱۰، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۲] "فإن حاضت بعد الوقوف وطواف الزيارة انصرفت من مكة ولا شيء عليها لطواف الصدر؛ لأنه عليه الصلاة والسلام رخص للنساء الحيض في ترك طواف الصدر". (الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۱۵۶، كتاب الحج، باب التمتع، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ البحر الرائق: ۳/ ۶۰، كتاب الحج، باب الإحصار في الحج أو العمرة، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۲۳، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف الصدر، ط: دار الفكر - بيروت)

الجواب حامداً ومصلیا:

طواف زیارت فرض ہے؛ لیکن حیض ونفاس کی حالت میں طواف درست نہیں ہوگا؛ لہٰذا حیض ونفاس سے پاک ہوکر طواف زیارت کرے گی، اور تاخیر کی وجہ سے عورت کے حج میں کوئی نقصان نہیں آئے گا؛ کیوں کہ مذکورہ چیز (حیض ونفاس) اللہ کی جانب سے ہے، یعنی سماوی عذر ہے، حالت حیض میں طواف زیارت نہ کرے، ورنہ دم لازم ہوگا۔(۱) دو تین دن انتظار کرے، جب حیض منقطع ہوجائے، تب طواف کرے۔(۲)

البتہ طواف وداع کے لیے پاک ہونے تک انتظار کرنا ضروری نہیں ہے، اگر مکہ مکرمہ سے جانے کا وقت آجائے، تو طواف وداع کیے بغیر چلی جائے، حیض کی وجہ سے عورت کے ذمہ سے طواف وداع ساقط ہوجائے گا اور حج میں کوئی نقصان نہیں آئے گا۔(۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولو طاف للزيارة جنبا أو حائضا أو نفساء كله أو أكثره فعليه بدنة، ويقع معتدا به في حق التحلل ويصير عاصيا. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۴۸۸، باب الجنايات و أنواعها، النوع الخامس الجنايات في أفعال الحج، فصل في حكم الجنايات في طواف الزيارة، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۵۵۲-۵۵۱، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۳/ ۱۰، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) واضح رہے کہ طواف زیارت کا وقت دسویں ذی الحجہ سے بارہویں ذی الحجہ تک ہے، اگر کوئی بارہویں ذی الحجہ کے بعد طواف زیارت کرے گا، تو دم لازم ہوگا؛ لیکن اگر کسی عورت کو حیض آجائے، اور ۱۲/ ذی الحجہ تک منقطع نہ ہو، تو اس کے حق میں تاخیر موجب دم نہیں ہے، حیض سے پاک ہونے کے بعد طواف کرے گی، ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

(و) طواف الزيارة (أول وقته بعد طلوع الفجر يوم النحر وهو فيه) أي الطواف في يوم النحر الأول (أفضل ويمتد) وقته إلى آخر العمر... (فإن أخره عنها) أي أيام النحر ولياليها منها (كره) تحريما (ووجب دم) لترك الواجب، وهذا عند الإمكان، فلو طهرت الحائض إن قدر أربعة أشواط ولم تفعل لزم دم وإلا لا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۵۱۸-۵۱۹، كتاب الحج، مطلب في طواف الزيارة، ط: دار الفكر - بيروت)

(وحيضها لا يمنع) نسكا (إلا الطواف) ولا شيء عليها بتأخيره إذا لم تطهر إلا بعد أيام النحر، فلو طهرت فيها بقدر أكثر الطواف لزمها الدم بتأخيره لباب. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۵۲۸، كتاب الحج، قبيل: باب القران)

إن المرأة إذا حاضت أو نفست قبل أيام النحر فطهرت بعد مضيها، فلاشيء عليها. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۴۹۶، باب الجنايات و أنواعها، النوع الخامس الجنايات في أفعال الحج، فصل في حكم الجنايات في طواف الزيارة، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

(۳) "فإن حاضت بعد الوقوف وطواف الزيارة انصرفت من مكة ولا شيء عليها لطواف الصدر؛ لأنه عليه الصلاة والسلام رخص للنساء الحيض في ترك طواف الصدر". (الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر بن عبد الجليل =

[۴۰] طواف زیارت سے پہلے کسی خاتون کو حیض شروع ہو جائے تو وہ کیا کرے؟

۱۷۳۷-سوال: طواف زیارت حج کا رکن ہے، حج کے دنوں میں ایک عورت کے حیض کے ایام شروع ہو گئے، اگر وہ حج کے ایام کے بعد پاک ہوتی ہے، تو طواف زیارت کب کرے گی؟ اور اگر حج کے ایام کے بعد فوراً ہوائی جہاز کا سفر ہو، اور اس سے پہلے حیض منقطع نہ ہو، تو اس کو کیا کرنا چاہیے؟

الجواب حامداومصلیا:

''طواف زیارت'' ایام نحر میں کرنا ضروری ہے؛ لیکن عورت حالت حیض میں ہو اور ایام نحر [۱۰-۱۲ ذی الحجہ] میں حیض منقطع نہ ہو، تو ایام نحر کے بعد جب بھی وہ پاک ہو جائے، طواف زیارت کر لے اور اس پر اس تاخیر کی وجہ سے کوئی دم واجب نہ ہوگا۔[۱]

اگر ایام نحر میں پاک نہ ہو سکی اور پاک ہونے سے پہلے ہی واپسی کا ہوائی جہاز ہے، تو اسے رد کر دے اور دوسرے جہاز سے جائے، اگر حالت حیض میں طواف کرے گی، تو گنہ گار ہوگی، مگر وطن جانے کی اجازت ہوگی اور ایک اونٹ کی قربانی واجب ہوگی، اور حج ادا ہو جائے گا۔[۲]

= الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱/۱۵۶، كتاب الحج، باب التمتع، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ البحر الرائق: ۳/۲۰، كتاب الحج، باب الإحصار في الحج أو العمرة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۲۳، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف الصدر، ط: دار الفكر - بيروت)

[۱] (وحيضها لا يمنع) نسكا (إلا الطواف) ولا شيء عليها بتأخيره إذا لم تطهر إلا بعد أيام النحر، فلو طهرت فيها بقدر أكثر الطواف لزمها الدم بتأخيره لباب. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۵۲۸، كتاب الحج، قبيل: باب القران)

إن المرأة إذا حاضت أو نفست قبل أيام النحر فطهرت بعد مضيها، فلاشيء عليها. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۴۹۶، باب الجنايات و أنواعها، النوع الخامس الجنايات في أفعال الحج، فصل في حكم الجنايات في طواف الزيارة، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

(۲) ولو طاف للزيارة جنبا أو حائضا أو نفساء كله أو أكثره، فعليه بدنة، ويقع معتدا به في حق التحلل، ويصير عاصيا، وعليه أن يعيد طاهرا احتما، فإن عاد سقطت عنه البدنة. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۴۸۸، باب الجنايات و أنواعها، النوع الخامس الجنايات في أفعال الحج، فصل في حكم الجنايات في طواف الزيارة، ط: المكتبة الإمدادية ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۵۵۱-۵۵۲، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۳/۱۰، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

اگر طواف زیارت کیے بغیر عورت روانہ ہوجائے، تو واپس آکر طواف زیارت کرنا ضروری ہے، ورنہ مرد کے لیے حلال نہ ہوگی۔[۳]

واپس آکر طواف زیارت کرنے کے لیے کوئی مدت متعین نہیں ہے، زندگی میں جب بھی ممکن ہو، واپس آئے اور طواف زیارت کرلے۔[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۱] حائضہ کے لیے طواف زیارت کا حکم

۱۷۳۸-سوال: حج کے ارکان میں ایک رکن طوافِ زیارت ہے، جس کی ادائیگی کے لیے پاک ہونا ضروری ہے، اب ایک عورت کو- جو حج میں ہے- طوافِ زیارت سے پہلے حیض شروع ہوگیا۔ جو ۵ سے ۶ دن تک جاری رہے گا۔ ان ایام میں حیض کی عادت اس عورت کے لیے ہمیشہ سے ہے۔ اس عورت کا ان ہی دنوں میں وطن واپسی کی ٹکٹ ہے، جس کو بدلا نہیں جاسکتا، ایسی صورت میں طوافِ زیارت کس طرح ادا کرنا چاہیے؟

الجواب حامداومصلیا:

طوافِ زیارت کے بغیر عورت حلال نہیں ہوگی۔ ۵-۶-۷ جتنے دن بھی حیض کے ہیں، جب ختم ہوجائیں، تب طوافِ زیارت کرے، ٹکٹ تبدیل کروالے۔

جو عبادت زندگی میں ایک مرتبہ کی جاتی ہے، جس کے لیے ہزاروں خرچ ہوتے ہیں، ٹکٹ کی بکنگ کے وقت ہی اس کا خیال رکھے، ۷-۸ دن مؤخر کردے؛ کیوں کہ حیض آنے کا وقت- عادت کے باوجود- آگے پیچھے ہوسکتا ہے؛ اس لیے بکنگ کے لیے احتیاطاً- جن کے ساتھ جوان عورتیں ہوں- ۷ تا ۸ دن مؤخر

---

(۳) ولو لم يطف أصلا لا يحل له النساء وإن طال ومضت سنون بإجماع. (رد المحتار على الدر المختار: ۵۱۸/۲، كتاب الحج، فصل في صفة الإحرام وصفة المفرد، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۲۳۲/۱، كتاب المناسك، الباب الخامس في كيفية أداء الحج، ط: دار الفكر ☆ الهداية: ۱۴۲/۱، كتاب الحج، فصل ومن طاف طواف القدوم محدثا، ط: دار إحياء التراث الإسلامي)

[۴] (و) طواف الزيارة (أول وقته بعد طلوع الفجر يوم النحر وهو فيه) أي الطواف في يوم النحر الأول (أفضل ويمتد) وقته إلى آخر العمر... (فإن أخره عنها) أي أيام النحر ولياليها منها (كره) تحريما (ووجب دم) لترك الواجب، وهذا عند الإمكان، فلو طهرت الحائض إن قدر أربعة أشواط ولم تفعل لزم دم وإلا لا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۵۱۸/۲-۵۱۹، كتاب الحج، مطلب في طواف الزيارة، ط: دار الفكر-بيروت)

کرائے، کہ طوافِ زیارت کر کے واپس آ سکے۔ البتہ طوافِ وداع حیض والی عورت سے معاف ہو جاتا ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۲] مکی اور بیت اللہ کا طواف

۱۷۳۹- سوال: رمضان کے بعد مکہ میں اکثر جمعہ کے دن بہت بھیڑ ہوتی ہے، جس کی بناء پر بیت اللہ کا طواف کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، اس لیے میں صرف نماز پڑھ کر چلا جاتا ہوں، طواف نہیں کرتا، تو کیا طواف نہ کرنے کی بناء پر دم واجب ہوگا؟ یا بعد میں طواف کا اعادہ کرنا پڑے گا۔

الجواب حامدا ومصليا:

میقات کے اندر رہنے والوں کے لیے بیت اللہ کا طواف، تحیۃ المسجد کے قائم مقام ہے؛ لہٰذا یہ طواف سنت ہے اور ترک سنت کی بناء پر احناف کے نزدیک دم واجب نہیں ہوتا، اگر آپ مسجد حرام میں طواف کی نیت سے جائیں، تو طواف کیجئے اور نماز کی نیت ہو، تو نماز ادا کیجیے۔ (۲)

(۱) قد تقدم تخريجه تحت عنوان: حج کے دنوں میں عورت کو حیض آ گیا ☆ حائضہ عورت طواف زیارت سے پاک ہونے کے بعد ادا کرے ☆ طواف زیارت سے پہلے کسی خاتون کو حیض شروع ہو جائے تو وہ کیا کرے؟

(۲) (السادس: طواف التحية، وهو مستحب لكل من دخل المسجد) أي المسجد الحرام، (إلا إذا كان عليه غيره) أي من الأطوفة (فيقوم هو) أي ذلك الغير (مقامه) أي ينوب منابه، ويدخل في ضمنه (كالمعتمر) أعم من أن يكون متمتعا أو لا، فإنه طواف فرض العمرة، ويندرج فيه طواف تحية المسجد، لما ارتفع به طواف القدوم الذي هو أقوى من طواف تحية المسجد، و كذا إذا دخل المسجد من عليه فرض أو غيره فصلى ذلك؛ فإنه قام مقام صلاة تحية المسجد، و ذلك لأن تحية هذا المسجد الشريف بخصوصه هو الطواف، إلا إذا كان له مانع فحينئذ يصلي تحية المسجد إن لم يكن وقت كراهية الصلاة. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۲۰۲، باب أنواع الأطوفة وأحكامها، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(ثم) ابتدأ بالطواف، لأنه تحية البيت ما لم يخف فوت المكتوبة أو جماعتها أو الوتر أو سنة راتبة. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله ثم ابتدأ بالطواف) فإن كان حلالا فطواف التحية أو محرما بالحج فطواف القدوم، وهذا إذا دخل قبل النحر، فإن دخل فيه أغنى طواف الفرض عن التحية أو بالعمرة فطوافها ولا طواف قدوم لها كذا في الفتح نهر... (قوله لأنه تحية البيت) أي لمن أراد الطواف، بخلاف من لم يرده وأراد أن يجلس فلا يجلس حتى يصلي ركعتين تحية المسجد إلا أن يكون الوقت مكروها للصلاة شرح اللباب للقاري، وفي شرحه على النقاية فإن لم يكن محرما فطواف تحية المسجد إلا أن يكون الوقت مكروها وليس معناه أن من لم يطف لا يصلي تحية المسجد كما فهمه بعض العوام. اهـ.

قلت: لكن قولهم تحية هذا المسجد الطواف يفيد أنه لو صلى ولم يطف لا يحصل التحية إلا أن يخص بترك الطواف بلا عذر فمع العذر تحصل التحية بالصلاة ثم رأيت في شرح اللباب أيضا ما يدل على ذلك حيث قال في=

الغرض بھیڑ کی وجہ سے طواف نہ کیا، تو دم واجب نہیں ہوگا، مکہ مکرمہ کے رہنے والوں کے لیے بہتر یہ ہے کہ حج کے ایام میں نفلی طواف نہ کرے، آفاقی یعنی میقات کے باہر سے آنے والوں کے لیے حرم کو خالی کردے، تاکہ وہ آسانی کے ساتھ طواف کرسکیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۳] طواف کے بعد جماعت شروع ہوجائے، تو طواف کی دو رکعت کب پڑھے؟

۱۷۴۰- سوال: ایک شخص احرام باندھ کر عصر کی نماز سے پہلے حرم شریف پہنچا اور طواف کرنے لگا، ابھی طواف مکمل ہی ہوا تھا کہ عصر کی جماعت شروع ہوگئی، جس کی وجہ سے طواف کی دو رکعت نہیں پڑھ سکا، تو جماعت کے بعد طواف کی دو رکعت پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہ پڑھ سکتا ہو، تو اس کے لیے [طواف کی دو رکعت نماز پڑھے بغیر] سعی کرنے کی گنجائش ہے یا مغرب تک انتظار کرے اور مغرب بعد سعی کر کے طواف کی دو رکعت پڑھے؟

الجواب حامدا ومصليا:

عصر کی نماز سے پہلے طواف مکمل ہوا کہ عصر کی نماز کے لیے اقامت کہی گئی، تو عصر کی نماز میں شامل ہونا ضروری ہے، چوں کہ عصر کی نماز کے بعد احناف کے نزدیک کوئی سنن یا نوافل نہیں ہے؛ اس لیے عصر بعد سعی کر لے اور مغرب کی فرض نماز کے بعد سنت سے پہلے طواف کی دو رکعت ادا کرلے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= قلت: لكن قولهم تحية هذا المسجد الطواف يفيد أنه لو صلى ولم يطف لا يحصل التحية إلا أن يخص بترك الطواف بلا عذر فمع العذر تحصل التحية بالصلاة ثم رأيت في شرح اللباب أيضا ما يدل على ذلك حيث قال في موضع آخر إن تحية هذا المسجد بخصوصه هو الطواف إلا إذا كان له مانع فيصلي تحية المسجد إن لم يكن وقت كراهة. اهـ. (قوله ما لم يخف إلخ) أي فيقدم كل ذلك على الطواف أي طواف التحية وغيرها لباب وشرحه، ثم يطوف بحر وهذا يفيد أن هذه الصلوات لا تحصل بها التحية مع أنها تحصل في بقية المساجد، وليس ذلك إلا لأن تحيته هي الطواف دون الصلاة، بخلاف باقي المساجد، ولهذا قال بعض العلماء: إن الفرق من وجهين: أحدهما: أن الصلاة جنس فناب بعضها مناب بعض، وليس الطواف من جنسها، والثاني: أن صلاة الفرض في المسجد تحية المسجد والطواف تحية البيت لا تحية المسجد. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۹۳- ۴۹۲، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في دخول مكة، ط: دار الفكر ☆ حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ۳۹۴، كتاب الصلاة، فصل في تحية المسجد، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) (والسنة الموالاة بينها وبين الطواف) أي فراغه إن لم يكن وقت الكراهة، وإلا فيصلي بعد فرض المغرب، قبل السنة، إن كان في الوقت سعة. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط- الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ) ص: ۲۱۹، باب أنواع الأطوفة وأحكامها، فصل في ركعتي الطواف، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة)

[۴۴] طواف اور دعاء

۱۷۴۱- سوال: حج اور عمرہ میں طواف کے ہر چکر کی مستقل دعاء بتائی جاتی ہے، ساتوں چکر کی الگ دعاء ہے، جدہ سے مکہ معظّمہ پہنچنے کے بعد ایک مرتبہ طواف اور سعی معلّم الحجاج یا اس کے نمائندے کرواتے ہیں، اُس وقت وہ جیپ میں بیٹھ کر طواف کرتے ہیں اور دعاء پڑھواتے ہیں، اُس میں پریشانی یہ ہوتی ہے کہ پیچھے کے لوگ ٹھیک سے اُس دعاء کو سن نہیں پاتے، بسا اوقات پیچھے کے لوگ غلط بھی پڑھ لیتے ہیں، بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر دعاء نہ سنائی دے، تو اُس کی جگہ تیسرا کلمۂ تمجید پڑھ لیا جائے تو وہ بھی کافی ہے، مزید یہ کہ بہت سے لوگ طواف کے دوران کتاب ساتھ رکھ کر اُس میں سے پڑھتے ہیں، تو کیا ہر چکر کی متعین دعاء پڑھنا ضروری ہے؟ یا تیسرا کلمہ پڑھنا کافی ہوجائے گا؟ اگر زبانی یاد نہ ہو تو کتاب ساتھ میں رکھ سکتے ہیں؟ یا زبانی یاد کرنا ضروری ہے؟ اِس باب میں حکمِ شرعی کے متعلق رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

طواف کے چکر کے دوران دعاء کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔(۱)

---

(۱) عن عبد الله بن السائب، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ما بين الركنين ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة، وقنا عذاب النار. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۶۰، رقم الحديث: ۱۸۹۲، كتاب المناسك، باب الدعاء في الطواف، ط: فيصل پبليكيشنز- ديوبند)

ابن هشام، يسأل عطاء بن أبي رباح عن الركن اليماني، وهو يطوف بالبيت، فقال عطاء: حدثني أبو هريرة أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: " وكل به سبعون ملكا، فمن قال: اللهم إني أسألك العفو والعافية في الدنيا والآخرة، ربنا آتنا في الدنيا حسنة، وفي الآخرة حسنة، وقنا عذاب النار، قالوا: آمين " فلما بلغ الركن الأسود، قال يا أبا محمد ما بلغك في هذا الركن الأسود؟ فقال عطاء: حدثني أبو هريرة، أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من فاوضه، فإنما يفاوض يد الرحمن، قال له ابن هشام: يا أبا محمد فالطواف؟ قال عطاء: حدثني أبو هريرة، أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من طاف بالبيت سبعا ولا يتكلم، إلا بسبحان الله والحمد لله، ولا إله إلا الله، والله أكبر، ولا حول ولا قوة، إلا بالله، محيت عنه عشر سيئات، وكتبت له عشر حسنات، ورفع له بها عشرة درجات، ومن طاف، فتكلم وهو في تلك الحال، خاض في الرحمة برجليه، كخائض الماء برجليه. (سنن ابن ماجه: ۲/ ۲۱۲، رقم الحديث: ۲۹۵۷، أبواب المناسك، باب فضل الطواف، ط: ديوبند)

والمعروف في الطواف إنما هو مجرد ذكر الله روى ابن ماجه عن أبي هريرة أنه سمع النبي - صلى الله عليه وسلم - يقول: من طاف بالبيت سبعا ولم يتكلم إلا بسبحان الله والحمد لله ولا إله إلا الله والله أكبر ولا حول ولا قوة إلا بالله=

دعاء جس زبان میں مانگی جائے، جائز ہے، عربی زبان ہی میں ضروری نہیں ہے۔ (۲)

معلمین کے نمائندے اس قدر جلد جلدی پڑھاتے ہوں کہ صاف سمجھ میں نہ آتی ہو، تو صرف کلمہ پڑھتے رہنا یا گجراتی اور اُردو زبان میں دعاء مانگنا بھی جائز ہے، بہتر ہے کہ دوران طواف نبی کریم ﷺ سے منقول دعاؤں کے پڑھنے کا اہتمام کرے اور قرآن کریم کی تلاوت نہ کرے۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=محيت عنه عشر سيئات و كتبت له عشر حسنات ورفع له بها عشر درجات. (البحر الرائق: ۲/ ۳۵۴، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: دار الكتاب الإسلامي)

وفي رسالة الحسن البصري التي أرسلها إلى أهل مكة أن الدعاء هناك يستجاب في خمسة عشر موضعا في الطواف وعند الملتزم وتحت الميزاب وفي البيت وعند زمزم . . . الخ. (المصدر السابق: ۲/ ۳۷۸، كتاب الحج، قبل باب القران)

(۲) ولا يسقط الوجوب ما لم يقرأ الفاتحة وسورة بها [بالعربية]، وبقية الأذكار تتأدى بالعربية وغيرها سواء لما مر أن الذكر لا يتقيد بلسان دون لسان و حصول المطلوب منه لا يتوقف على العربية بخلاف القرأة، فإنها مطلوبة بقيدها لقوله تعالى: فاقرأوا ما تيسر من القرآن. . . . فلو سبح في الصلاة بالفارسية أو دعا أو أثنى على الله تعالى أو تعوذ أو هلل أو تشهد أو صلى على النبي صلى الله عليه وسلم بالفارسية يصح عند أبي حنيفة، كما في رد المحتار (۱/ ۵۰۴) لأن هذه كلها من قبل الأذكار وهو حاصل بأي لفظ كان وبأي لسان كان. (إعلاء السنن - ظفر أحمد العثماني (م: ۱۳۹۴هـ): ۴/ ۱۳۱، أبواب القراءة، ط: إدارة القران والعلوم الإسلامية - كراتشي)

(۳) المصلي لا يدعو بما يحضره من الدعاء، بل ينبغي أن يدعو في صلاته بدعاء محفوظ؛ لأنه يخاف أن يجري على لسانه ما يشبه كلام الناس، فتفسد به صلاته؛ أما في غير حالة الصلاة ينبغي أن يدعو بما يحضره، ولا يستظهر الدعاء؛ لأن حفظ الدعاء يذهب برقة القلب. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۵/ ۳۱۳، كتاب الاستحسان والكراهية، الفصل الرابع في الصلاة، والتسبيح، وقراءة القرآن، والذكر، والدعاء......، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۱/ ۵۱، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۲/ ۱۸۳، كتاب الصلاة، الفصل الثالث: كيفية الصلاة، ت: المفتي شبير أحمد القاسمي، ط: زكريا - ديوبند)

وجاز فيهما أكل وبيع وإفتاء وقراءة لكن الذكر أفضل منها وفي منسك النووي الذكر المأثور أفضل وأما غير المأثور فالقراءة أفضل فليراجع. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله لكن الذكر أفضل منها) أي من القراءة في الطواف، وهذا ما نقله في الفتح عن التجنيس، وقال وفي الكافي للحاكم الذي هو جميع كلام محمد يكره أن يرفع صوته بالقراءة فيه ولا بأس بقراءته في نفسه، وفي المنتقى عن أبي حنيفة لا ينبغي للرجل أن يقرأ في طوافه ولا بأس بذكر الله تعالى، ولا ينبو ما ذكره في التجنيس عما ذكره الحاكم لأن لا بأس في الأكثر لخلاف=

=الأولى اهـ أي ومن غير الأكثر قول المنتقى، ولا بأس بذكر الله تعالى.

ثم قال في الفتح: والحاصل أن هدي النبي - صلى الله عليه وسلم - هو الأفضل، ولم يثبت عنه في الطواف قراءة بل الذكر وهو المتوارث من السلف والمجمع عليه فكان أولى. اهـ. (قوله فليراجع) أقول: الحاصل من هذه النقول التي ذكرناها آنفا أن القراءة خلاف الأولى وأن الذكر أفضل منها مأثورا أولا كما هو مقتضى الإطلاق إلا أن يراد به الكامل وهو المأثور فيوافق ما نقله الشارح عن النووي، واستحسنه في شرح اللباب، لكن كون القراءة أفضل من غير المأثور ينبو عنه قول المنتقى: لا ينبغي أن يقرأ في طوافه، فإنه يشعر بالمنع عن القراءة تنزيها والظاهر عدم المنع عن ذكر غير مأثور يدل عليه ما أسلفناه عن الهداية من أن محمدا - رحمه الله - لم يعين في الأصل لمشاهد الحج شيئا من الدعوات لأن التوقيت يذهب بالرقة وإن تبرك بالمنقول منها فحسن اهـ وهذا يفيد أن المراد بالذكر هنا مطلقه كما هو قضية إطلاقهم على خلاف ما فصله النووي فليتأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۹۷، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف القدوم، ط: دار الفكر ☆البحر الرائق: ۲/ ۳۶۰، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: دار الكتاب الإسلامي)

القران في حق الآفاقي أفضل من التمتع والإفراد، والتمتع في حقه أفضل من الإفراد، وهذا هو المذكور في ظاهر الرواية، هكذا في المحيط.

وليس لأهل مكة تمتع ولا قران، وإنما لهم الإفراد خاصة، كذا في الهداية وكذلك أهل المواقيت ومن دونها إلى مكة في حكم أهل مكة كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۳۹، كتاب المناسك، الباب السابع في القران والتمتع، ط: دار الفكر ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۳۶۰، باب القران، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

باب الإفراد، والتمتع، والقران

[حج افراد، تمتع اور قران کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الإفراد، والتمتع، والقران

[حج افراد، تمتع اور قران کا بیان]

[۱] حج کی قسمیں

۱۷۴۲- سوال: میں حج کا ارادہ رکھتا ہوں، علماء سے سنا تھا کہ حج کی متعدد قسمیں ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ اگر حج کی متعدد قسمیں ہیں، تو واضح فرمادیں کہ کون کون سی اور کتنی ہیں، اور امام اعظمؒ کے نزدیک کون سی قسم افضل اور ثواب کے اعتبار سے بڑھی ہوئی ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

حج کی تین قسمیں ہیں: (۱) حج کے ایام میں ایک ہی احرام سے حج اور عمرہ دونوں کی ایک ساتھ نیت کرنا، فقہاء کی اصطلاح میں ''قران'' کہلاتا ہے۔ مسلک حنفی میں اس کا ثواب سب سے زیادہ ہے۔[۱]

(۲) ''تمتع'': حج کی دوسری قسم تمتع ہے، اس کا مطلب ہے: حج کے ایام میں عمرہ کا احرام باندھ کر

[۱] (القران أن يهل) الإهلال رفع الصوت بالتكبير (بحج وعمرة معا) قال في الكنز، وهو أن يهل بالعمرة والحج من الميقات... إلخ. (درر الحكام شرح غرر الأحكام-محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م:۸۸۵هـ): ۱/۲۳۴، كتاب الحج، باب القران والتمتع، ط: دار إحياء الكتب العربية)

ارکان عمرہ ادا کر کے حلال ہو جانا، اس کے بعد ساتویں یا آٹھویں ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھنا۔ مسلک حنفی میں ثواب کے اعتبار سے یہ دوسرے درجے پر ہے۔[۲]

(۳) حج کی تیسری قسم "حج افراد" ہے، یعنی حج کے ایام میں میقات سے صرف حج کا احرام باندھنا۔[۳]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] آفاقی کا حجِ افراد کے ساتھ مرحوم کی طرف سے عمرہ کرنا

۱۷۴۳- سوال: میں سعودی عرب کے ریاض شہر میں رہتا ہوں، میں نے اپنے ایک مرحوم رشتہ

---

[۲] [التمتع] وهو أفضل من الإفراد. وصفته: أن يحرم بعمرة في أشهر الحج، ويطوف ويسعى، ويحلق أو يقصر وقد حل، ثم يحرم بالحج يوم التروية، وقبله أفضل، ويفعل كالمفرد، ويرمل ويسعى، وعليه دم التمتع. (المختار)

وفي شرحه الاختيار: وهو الجمع بين أفعال العمرة والحج في أشهر الحج في سنة واحدة بإحرامين بتقديم أفعال العمرة من غير أن يلم بأهله إلماما صحيحا، حتى لو أحرم قبل أشهر الحج وأتى بأفعال العمرة في أشهر الحج كان متمتعا، ولو طاف طواف العمرة قبل أشهر الحج أو أكثره لم يكن متمتعا، والإلمام الصحيح أن يعود إلى أهله بعد أفعال العمرة حلالا. (الاختيار لتعليل المختار- عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳هـ): ۱/۱۵۸، كتاب الحج، باب التمتع، ت: الشيخ محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي- القاهرة)

[۳] الإفراد أي إفراد كل واحد من الحج والعمرة بإحرام على حدة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۲۹، كتاب الحج، باب القران، ط: دار الفكر- بيروت)

(باب القران)... (والكلام هنا في فصول) أحدها في تفسير القران والتمتع والإفراد: "فالقران" هو الجمع بين الحج والعمرة بأن يحرم بهما أو يحرم بالحج بعد إحرام العمرة قبل أداء الأعمال من قولهم قرن الشيء إذا جمع بينهما، و"التمتع" هو الترفق بأداء النسكين في سفر واحد من غير أن يلم بينهما بأهله إلماما صحيحا، "والإفراد" بالحج أن يحج أولا، ثم يعتمر بعد الفراغ من الحج أو يؤدي كل نسك في السفر على حدة أو يكون أداء العمرة في غير أشهر الحج.ـــــــ [فصل: الأفضل من أنواع الحج]ـــــــ (والفصل الثاني) في بيان الأفضل: فعندنا الأفضل هو القران، ثم بعده التمتع. (المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۴/۲۵، كتاب المناسك، باب القران، ط: دار المعرفة- بيروت ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۵۰، كتاب الحج، باب القران، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت ☆ البحر الرائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۲/۶۲۵، كتاب الحج، باب القران، ۲/۶۳۶، باب التمتع، ط: زكريا- ديوبند)

دار کی طرف سے عمرہ کی نیت کی تھی، میں نے وہ عمرہ ذی الحجہ کے مہینے میں کیا اور اسی سال ۸/ ذی الحجہ کو اپنا حج بھی کیا، یہ حج، حج افراد تھا، تو اس طرح حج کے ساتھ مرحوم کی طرف سے عمرہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ میں نے میقات سے پہلے عمرہ کا احرام باندھا تھا، پھر عمرہ کے بعد ۸/ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھا، تو اس طرح شرعاً یہ صحیح ہوا یا نہیں؟ نیز یہ بھی بتلائیں کہ کسی مرحوم کی طرف سے محض عمرہ کی نیت کرنے سے عمرہ واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ مفصل بیان فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

صرف ارادہ کرنے سے عمرہ واجب نہیں ہوتا ہے، اسی طرح حج افراد کی محض نیت سے وہ حج واجب نہیں ہوتا ہے۔ (۱)

صورت مسئولہ میں آپ کے آفاقی ہونے کی وجہ سے آپ کا حج، حج تمتع ہوا، پس جس کی طرف سے عمرہ کیا ہے، اس کا عمرہ ہوگیا اور آپ کا حج بھی صحیح ہوگیا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) أما الأول: فركن النذر هو الصيغة الدالة عليه وهو قوله: "لله عز شأنه علي كذا، أو علي كذا، أو هذا هدي، أو صدقة، أو مالي صدقة، أو ما أملك صدقة، ونحو ذلك. (بدائع الصنائع: ۸۱/۵، كتاب النذر، بيان ركن النذر وشرائطه، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ثم الحج كما هو واجب بإيجاب الله تعالى ابتداء على من استجمع شرائط الوجوب - وهو حجة الإسلام - فقد يجب بإيجاب الله تعالى لكن بناؤه على وجود سبب الوجوب من العبد وهو النذر بأن يقول لله علي حجة؛ لأن النذر من أسباب الوجوب في العبادات والقرب المقصودة، قال النبي - صلى الله عليه وسلم -: من نذر أن يطيع الله فليطعه، وكذا لو قال علي حجة فهذا ـــــــــ وقوله: لله علي حجة سواء؛ لأن الحج لا يكون إلا لله تعالى، وسواء كان النذر مطلقا أو معلقا بشرط بأن قال: إن فعلت كذا فلله علي أن أحج حتى يلزمه الوفاء به إذا وجد الشرط. (بدائع الصنائع: ۲/ ۲۲۳، كتاب الحج، فصل سبب وجوب الحج، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

وركنه عند الحنفية: هو الصيغة الدالة مثل قول الشخص لله علي كذا، أو علي كذا، أو علي نذر، أو هذا هدي. (الفقه الإسلامي وأدلته: ۴۷۰/۳، الباب السادس: الأيمان والنذور والكفارات، الفصل الثاني: النذور، ط: الهدیٰ انٹرنیشنل-دیوبند)

(۲) والتمتع: هو الترفق بأداء النسكين في سفر واحد، من غير أن يلم بينهما بأهله إلماما صحيحا، والإفراد بالحج: أن يحج أولا، ثم يعتمر بعد الفراغ من الحج، أو يؤدي كل نسك في السفر على حدة، أو يكون أداء العمرة في غير أشهر الحج. (المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۲۵/۴، كتاب المناسك، باب القران، ط: دار المعرفة - بيروت ☆المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري -الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۸۴، شرائط صحة الأداء، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

[۳] حج افراد کس کے لیے بہتر ہے؟

۱۷۴۴- سوال: حج افراد صرف مکہ کے مقیم ہی کر سکتے ہیں، یا سعودی عرب کے کسی بھی شہر کے مقیم کر سکتے ہیں؟ کیوں کہ یہاں ریاض وغیرہ میں کام کرنے والوں کو صرف سات آٹھ دن کی ہی چھٹی ملتی ہے؛ اس لیے وہ مکہ کے مقیم نہیں بن سکتے ہیں، اس کے متعلق وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

دنیا کا کوئی بھی مسلمان حج افراد کر سکتا ہے۔ (معلم الحجاج)[1]

البتہ افضلیت کے متعلق علماء میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک میقات سے باہر رہنے والے کے لیے حج قران کرنا بہتر ہے؛ لہٰذا وہ میقات سے حج اور عمرہ دونوں کا ساتھ میں احرام باندھے۔[2] اور میقات سے اندر رہنے والے کے لیے حج کے دنوں میں عمرہ کرنا مکروہ ہے؛ اس لیے وہ حج افراد کرے گا؛ لیکن میقات سے باہر رہنے والا حج کے دنوں میں ایک عمرہ کر سکتا ہے، لہٰذا آپ کا عمرہ صحیح ہوگا۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] مفرد بالحج کے لیے طواف قدوم حکم

۱۷۴۵- سوال: مفرد بالحج کے لیے طواف قدوم کرنا کیسا ہے؟ اور کیا اس کے لیے صفا ومروہ کی

---

[۱] آفاقی شخص کو اختیار ہے کہ حج کی تینوں قسموں میں سے جس کا جی چاہے، احرام باندھے، لیکن مکہ مکرمہ کے رہنے والوں کو قران اور تمتع منع ہے۔ (معلم الحجاج، ص:۹۹، اقسام حج، ط: دار الکتاب-دیوبند)

(۲) القران في حق الآفاقي أفضل من التمتع والإفراد، والتمتع في حقه أفضل من الإفراد، وهذا هو المذكور في ظاهر الرواية، هكذا في المحيط. ــــــ وليس لأهل مكة تمتع ولا قران، وإنما لهم الإفراد خاصة، كذا في الهداية وكذلك أهل المواقيت ومن دونها إلى مكة في حكم أهل مكة كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ۲۳۹/۱، كتاب المناسك، الباب السابع في القران والتمتع، ط: دار الفكر ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري -الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص:۳۶۰، باب القران، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(۳) ويكره فعلها في أشهر الحج لأهل مكة ومن بمعناهم. (ارشاد الساری، ص:۶۵۶)

مسئلے کی تخریج وتفصیل "ایام حج میں نفل عمرہ جائز ہے یا نہیں؟" کے تحت گذر چکی ہے۔

سعی ضروری ہے؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

مفرد بالحج کے لیے ''طواف قدوم'' مسنون ہے، جب مفرد بالحج مکہ مکرمہ پہنچ کر طواف کرے گا، تو اس کا یہ طواف 'طواف قدوم ہوگا، خواہ وہ طواف قدوم کی نیت کرے یا نہ کرے، اگر نفل کی نیت کرے، تب بھی طواف قدوم ہی ہوگا۔ (۱)

مفرد بالحج کے لیے حج کے احرام میں ایک سعی واجب ہے؛ لیکن طواف قدوم کے بعد ضروری نہیں ہے، اگر طواف قدوم کے بعد سعی نہیں کی، تو طواف زیارت کے بعد کرنا ضروری ہوگا اور اگر طواف قدوم کے بعد ہی سعی کر لی ہو، تو طواف زیارت کے بعد سعی کرنا واجب نہیں ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ''ثم إن كان المحرم مفردا بالحج، وقع طوافه هذا للقدوم'' أي ولو نوى غيره؛ لأنه وقع في محله و هو سنة للآفاقي. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملاعلي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۱۹۸، باب دخول مكة، فصل في صفة الشروع في الطواف، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۴۹۲، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المحرم، ط: دار الفكر)

(۲) ... أن السعي بعد الطواف فلو عكس أعاد السعي لأنه تبع له، وصرح في المحيط بأن تقديم الطواف شرط لصحة السعي، وبه علم أن تأخير السعي واجب وإلى أنه لا يجب بعده فورا، والسنة الاتصال به، بحر، فإن أخر لعذر أو ليستريح من تعبه، فلا بأس وإلا فقد أساء ولا شيء عليه، لباب. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۰۰، كتاب الحج، فصل في الإحرام وصفة المفرد، مطلب في طواف القدوم، ط: دار الفكر - بيروت ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملاعلي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۲۵۰، باب السعي بين الصفا و المروة، فصل في شرائط صحة السعي، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: جاءت امرأة من خثعم عام حجة الوداع، قالت: يا رسول الله إن فريضة الله على عباده في الحج أدركت أبي شيخا كبيرا لا يستطيع أن يستوي على الراحلة فهل يقضي عنه أن أحج عنه؟ قال: **نعم**. (صحيح البخاري:۱/۲۵۰، رقم الحديث:۱۸۵۴، ۱۸۵۵، كتاب الحج، باب الحج عمن لا يستطيع الثبوت على الراحلة، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم:۱/۴۳۱، رقم الحديث:۴۰۷-(۱۳۳۴، ۱۳۳۵)، كتاب الحج، باب الحج عن العاجز لزمانة وهرم ونحوهما، أو للموت، ط: ديوبند)

باب الحج عن الغير

[حج بدل کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الحج عن الغیر

[حج بدل کا بیان]

[۱] حج بدل: مفہوم اور شرائط

۱۷۴۶-سوال: حج بدل کسے کہتے ہیں، اور حج بدل کے لیے کسی کو بھیجنے کی شرط کیا ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

جس شخص پر حج فرض ہو گیا ہو، اور حج کا وقت بھی اسے مل گیا ہو؛ لیکن اس وقت حج ادا نہ کر سکا ہو اور فی الحال اس میں حج ادا کرنے کی بالکل استطاعت نہ ہو، یا ایسے مرض میں مبتلا ہو گیا کہ جس سے افاقہ کی بالکل امید نہیں ہے، جیسے لقوہ ہو گیا یا اندھا ہو گیا، یعنی: سفر کرنے کی اس میں استطاعت نہ رہی ہو، تو ایسے شخص کے ذمے فرض ہوتا ہے کہ: اپنی طرف سے کسی کو بھیج کر حج کرائے، یا وصیت کرے کہ: میرے مرنے کے بعد میرے مال میں سے حج کرایا جائے، اسی کا نام حج بدل ہے۔(۱)

---

(۱)عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: جاءت امرأة من خثعم عام حجة الوداع، قالت: يا رسول الله إن فريضة الله على عباده في الحج أدركت أبي شيخا كبيرا لا يستطيع أن يستوي على الراحلة فهل يقضي عنه أن أحج عنه؟ قال: نعم.(صحيح البخاري:۱/ ۲۵۰، رقم الحديث: ۱۸۵۴، ۱۸۵۵، كتاب الحج، باب الحج عمن لا يستطيع الثبوت على الراحلة، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم:۱/ ۴۳۱، رقم الحديث: ۴۰۷-(۱۳۳۴، ۱۳۳۵)، كتاب الحج، باب الحج عن العاجز لزمانة وهرم ونحوهما، أو للموت، ط: ديوبند)
=

حج بدل کی شرط یہ ہے کہ: وہ بیماری موت تک برقرار رہے، اگر حج بدل کروانے کے بعد مریض میں اتنی استطاعت آگئی کہ: سفر کرسکتا ہے، تو پھر دوبارہ اس پر لازم ہوگا کہ: بہ ذات خود حج کرے۔(۲) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] حج بدل میں جانے والا اگر اپنے فرض حج کی نیت کرلے؟

۱۷۴۷- سوال: کسی شخص پر حج فرض ہو اور وہ دوسرے کے حج بدل میں جارہا ہو، اور ساتھ میں اپنے فرض حج کی نیت بھی کرلے، تو اس کا فرض حج ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

حج صرف ایک کا ادا ہوگا، دونوں کا نہیں؛ لہٰذا حج بدل کرنے والے کے لیے اپنے حج کی نیت کرنا

= والمراد بالصحة صحة الجوارح فلا يجب أداء الحج على مقعد ولا على زمن ولا مفلوج ولا مقطوع الرجلين ولا على المريض والشيخ الذي لا يثبت بنفسه على الراحلة والأعمى والمجبوس والخائف من السلطان الذي يمنع الناس من الخروج إلى الحج لا يجب عليهم الحج بأنفسهم ولا الإحجاج عنهم إن قدروا على ذلك هذا ظاهر المذهب عن أبي حنيفة وهو رواية عنهما.

وظاهر الرواية عنهما أنه يجب عليهم الإحجاج فإن أحجوا أجزأهم ما دام العجز مستمرا بهم فإن زال فعليهم الإعادة بأنفسهم وظاهر ما في التحفة اختياره فإنه اقتصر عليه وكذا الإسبيجابي وقواه المحقق في فتح القدير ومشى على أن الصحة من شرائط وجوب الأداء فالحاصل أنها من شرائط الوجوب عنده ومن شرائط وجوب الأداء عندهما وفائدة الخلاف تظهر في وجوب الإحجاج كما ذكرنا في وجوب الإيصاء ومحل الخلاف فيما إذا لم يقدر على الحج وهو صحيح أما إن قدر عليه وهو صحيح ثم زالت الصحة قبل أن يخرج إلى الحج فإنه يتقرر دينا في ذمته فيجب عليه الإحجاج اتفاقا. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م:۹۷۰ھ):۳۳۵/۲، أول كتاب الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م:۸۶۱ھ):۴۱۵/۲، كتاب الحج، ط:دار الفكر)

(۲) قال: (ولا يجوز إلا عن الميت، أو عن العاجز بنفسه عجزا مستمرا إلى الموت) ولا يجوز عن القادر؛ لأن الحج عبادة بدنية وجبت للابتلاء، فلا تجري فيها النيابة، . . . ويشترط دوام العجز إلى الموت كالفدية أيضا، لأنه متى قدر وجب عليه بنفسه. (الاختيار لتعليل المختار - عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م:۶۸۳ھ):۱۷۰/۱، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة ☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - فخر الدين الزيلعي الحنفي (م:۷۴۳ھ):۸۵/۲، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق ☆غنية الناسك، ص:۴۱۶، فصل في شرائط النيابة في الحج الفرض، ط: یادگار شیخ، سہارن پور)

جائز نہیں ہے۔ (۱) اگر وہ اپنے حج کی نیت کرے گا، تو حج بدل ادا نہ ہوگا اور سارا خرچ بھیجنے والے کو واپس کرنا لازم ہوگا۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] حج بدل میں تمتع کا حکم

۱۷۴۸- سوال: جس شخص کو حج بدل کرنے کے لیے بھیجا جارہا ہے، وہ احرام باندھتے وقت حج کی کون سی قسم کا احرام باندھے گا؟ کیا اس کے لیے حج تمتع کرنے کی اجازت ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداو مصلیا:

حج بدل کرنے والا بھیجنے والے کی اجازت کے بہ غیر، بالاتفاق تمتع نہیں کرسکتا ہے۔ (۳) البتہ اگر بھیجنے والے نے اس کو اختیار دیا ہو کہ: آپ جس حج کا بھی چاہیں، احرام باندھ سکتے ہیں، تو حج افراد اور حج قران کا احرام باندھنے میں تو کوئی حرج نہیں؛ لیکن حج تمتع کے سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے، بعض علماء آمر کی اجازت کے باوجود حج تمتع کو ناجائز کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: بھیجنے والے کا حج ادا نہ ہوگا۔ یہی رائے ملا علی قاریؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۴) اور مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ (۵) کی ہے۔ (۶)

---

(۱) الخامس عشر: أن يحرم بحجة واحدة، فلو أهل بحجة عن الآمر ثم بأخرى عن نفسه لم يجز إلا إن رفض الثانية. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۶۰۱، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب في الفرق بين العبادة والقربة والطاعة، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۵۷، كتاب المناسك، الحج عن الغير، ط: دار الفكر)

[۲] (وينوي النائب عنه) حتى لو نوى عن نفسه وقع عنه وضمن النفقة (فيقول لبيك بحجة عن فلان) عند الإحرام بعد الركعتين. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸ھ): ۱/۳۰۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ البحر الرائق: ۳/۶۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۳) کیوں کہ اس صورت میں آمر کے حکم کی خلاف ورزی لازم آتی ہے۔ (مرتب)

(۴) ساتویں: میقات آمر سے احرام حج کا باندھے اور مخالفت آمر کے حکم کی نہ کرے، پس اگر آمر نے حج کو کہا، اور مامور نے تمتع کردیا، تو ضمان دیوے گا، اور حج مامور کا ہوئے گا، نہ آمر کا۔ علی ہذا جو افراد کی جگہ قران کردیا، تو مخالف ہوگیا، اور روپیہ واپس دیوے گا، مگر جو آمر نے اجازت دی ہو، کہ قران کردینا، تو درست ہے، مگر دم قران اپنے مال سے دیوے، آمر کے مال سے درست نہیں، اور تمتع کرنا کسی حال میں درست نہیں، اگرچہ آمر نے اذن دیا ہو، کیوں کہ میقات آمر سے حج نہ ہوئے گا، مگر جو تمتع اذن آمر سے کیا ہے، تو ضمان نہیں آتا، گو حج آمر کا ادا بھی نہیں ہوتا۔ (تالیفات رشیدیہ، ص: ۶۴۷، رسالہ: زبدۃ المناسک، ط: مکتبۃ الحق- جوگیشوری، ممبئی) [بقیہ اگلے صفحہ پر]

تاہم بہت سے علماء نے مجبوری کی بناء پر اس صورت میں تمتع کو جائز کہا ہے، یعنی: سخت مجبوری میں حج تمتع کرے گا، تو جائز ہوگا اور ان شاء اللہ قبول ہونے کی امید ہے۔ (۷) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۵) میری رائے حج عن الغیر میں تمتع کے جواز کی نہیں ہے، اور جو عبارتیں آپ نے تمتع کے استدلال جواز میں لکھی ہیں اور جو عبارتیں اس قسم کی اور پائی جاتی ہیں میرے نزدیک اس مدعا کے لیے مفید نہیں ہیں۔ (فتاویٰ مظاہر علوم المعروف بہ فتاویٰ خلیلیہ، ص:......، کتاب الحج، حج بدل میں تمتع کا عدم جواز، ط:......)

(۶) اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حج بدل میں حج آمر کے میقات سے ہونا چاہیے، اور اس صورت میں حج، آمر کے میقات سے نہیں ہوتا، اس لیے حج تمتع درست نہ ہونا چاہیے، علامہ شامیؒ نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے، آپ بھی ان کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

(قوله إلا لمأمور بالحج للمخالفة) ذكره في البحر بحثا بقوله: وينبغي أن لا تجوز هذه الحيلة للمأمور بالحج لأنه حينئذ لم يكن سفره للحج ولأنه مأمور بحجة آفاقية وإذا دخل مكة بغير إحرام صارت حجته مكية فكان مخالفا، وهذه المسألة يكثر وقوعها فيمن يسافر في البحر الملح وهو مأمور بالحج ويكون ذلك في وسط السنة فهل له أن يقصد البندر المعروف بجدة ليدخل مكة بغير إحرام حتى لا يطول الإحرام عليه لو أحرم بالحج فإن المأمور بالحج ليس له أن يحرم بالعمرة اهـ.

أي لأنه إذا اعتمر ثم أحرم بالحج من مكة يصير مخالفا في قولهم كما في التتارخانية عن المحيط، وهل مخالفته لكونه جعل سفره لغير الحج المأمور به، أو لكونه لم يجعل حجته آفاقية.

وعلى الثاني لو اعتمر أو فعل الحيلة بأن قصد البندر، ثم دخل مكة ثم خرج وقت الحج إلى الميقات فأحرم منه لم يكن مخالفا لأن حجته صارت آفاقية أما على الأول فهو مخالف ويحتمل أن المخالفة لكل من العلتين كما يفيده أول عبارة البحر المذكورة فتتحقق المخالفة بالعلة الأولى لكن ذكر العلامة القاري في بعض رسائله مسألة اضطرب فيها فقهاء عصره وهي: أن الآفاقي الحاج عن الغير إذا جاوز الميقات بلا إحرام للحج، ثم عاد إلى الميقات، وأحرم هل يصح عن الآمر قيل: لا، وقيل نعم، ومال هو إلى الثاني قال: وأفتى به الشيخ قطب الدين، وشيخنا سنان الرومي في منسكه، والشيخ علي المقدسي.

قلت: وهذا يفيد جواز الحيلة المذكورة له إذا عاد إلى الميقات، وأحرم، والجواب عن قوله لأن سفره حينئذ لم يكن للحج أنه إذا قصد البندر عند المجاوزة ليقيم به أياما لبيع أو شراء مثلا ثم يدخل مكة لم يخرج عن أن يكون سفره للحج كما لو قصد مكانا آخر في طريقه ثم النقلة عنه والله تعالى أعلم فافهم.

وأما لو أحرم بالحج من الميقات وأقام بمكة حراما فإنه لا يحتاج إلى هذه الحيلة لكنه يكره تقديم الإحرام على أشهر الحج أي يحرم كما قدمناه قبيل أحكام العمرة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۷۷، كتاب الحج، مطلب في المواقيت، ط: دار الفكر-بيروت)

(۷) اگرچہ من حیث الدلیل رجحان اس کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج بدل میں آمر کی اجازت سے قران اور تمتع دونوں جائز ہوں، اور فقہاء متاخرین نے صاحب لباب اور اس کے حاشیہ حباب وغیرہ میں اسی کو اختیار بھی کیا ہے، مگر ملا علی قاری اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ کا=

[۴] حج بدل کا طریقہ

۱۷۴۹- سوال: میں حج بدل میں جانا چاہتا ہوں، تو مجھے احرام کہاں سے اور کتنے دن پہلے باندھنا چاہیے؟ اگر جہاز سے سیدھے مدینہ لے جایا گیا، تو کیا مدینہ جا کر احرام باندھ سکتا ہوں؛ کیوں کہ حکومت کبھی مکہ تو کبھی مدینہ لے جاتی ہے اور میں مدینہ شریف پہلے جانا چاہتا ہوں؛ اس لیے اگر مدینہ چلا گیا، تو لمبے عرصہ تک احرام باقی رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے، نیز حج بدل میں صحیح طریقہ کیا ہے؟ کیسے اور کس طرح یہ حج ادا کرنا چاہیے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

حج بدل میں اگر آپ اپنے والد یا بھائی کی طرف سے جا رہے ہیں اور مرحوم نے وصیت نہیں کی ہے، آپ خود ان کی طرف سے تبرعاً حج کر رہے ہیں، تو حج تمتع کر لیجیے، یعنی پہلے عمرہ کا احرام باندھیے اور عمرہ کر کے احرام کھول دیجیے، پھر حج کے دنوں میں حج کا احرام باندھ کر حج کر لیجیے، اس طرح حج ادا ہو جائے گا، اس میں احرام باقی رکھنے کی کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ (۱)

=فتویٰ اس سے مختلف ہے، وہ تمتع کو بہ اذن آمر بھی جائز نہیں قرار دیتے۔

معاملہ ادائے فرض کا نازک ہے، اس لیے احتیاط لازم ہے، جہاں تک ممکن ہو، حج بدل میں افراد یا قران کیا جائے، تمتع نہ کریں؛ لیکن اس زمانے میں حج وعمرہ کرنے میں عام آدمی آزاد نہیں، کہ جب اور جس وقت چاہیں، جا سکیں، اور طول احرام سے بچنے کے لیے ایام حج کے بالکل قریب سفر کریں، ہر طرف حکومتوں کی پابندیاں شدید ہیں، اس لیے اگر کسی حج بدل کرنے والے کو وقت سے زیادہ پہلے جانے کی مجبوری ہو، اور احرام طویل میں واجبات احرام کی پابندی مشکل نظر آئے، تو اس کے لیے تمتع کر لینے کی بھی گنجائش ہے۔ (جواہر الفقہ: ۱/ ۵۱۶، حج بدل میں قران اور تمتع، [منیح الخیر فی الحج عن الغیر]، ط: مکتبہ تفسیر القرآن-جامع مسجد، دیوبند)

مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور صاحب احسن الفتاویٰ حضرت مولانا ومفتی رشید احمدؒ نے بھی جواز کی بات کہی ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: کفایت المفتی: ۴/ ۳۴۵، کتاب الحج والزیارۃ، حج بدل، حج کے بارے میں ایک تفصیلی فتویٰ، ط: زکریا- دیوبند☆احسن الفتاوی: ۴/ ۵۲۳، حج بدل میں تمتع وقران کا حکم، ط: دار الاشاعت- دہلی)

(۱) "التمتع أفضل من الإفراد عندنا" . . . "وصفته أن يبتدئ من الميقات في أشهر الحج فيحرم بالعمرة ويدخل مكة فيطوف لها ويسعى ويحلق أو يقصر وقد حل من عمرته" . . . قال: "ويقيم بمكة حلالا" لأنه حل من العمرة. قال: "فإذا كان يوم التروية أحرم بالحج من المسجد" والشرط أن يحرم من الحرم أما المسجد فليس بلازم وهذا لأنه في معنى المكي وميقات المكي في الحج الحرم على ما بينا" وفعل ما يفعله الحاج المفرد" لأنه مؤد للحج. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): =

لیکن اگر مرحوم کی طرف سے حج بدل کی وصیت کی گئی ہے اور آپ ان کے پیسوں سے جارہے ہیں، تو آپ کو میقات سے، بجائے عمرہ کے، حج کا احرام باندھنا ہوگا، یعنی حج افراد کرنا ہوگا، مگر یہ کہ مرحوم کی طرف سے حج تمتع کی اجازت ہو، تو عمرہ کا احرام باندھ کر حج تمتع کیا جاسکتا ہے، البتہ اجازت کے باوجود حج تمتع بہتر نہیں؛ کیوں کہ بعض علماء کے نزدیک حج بدل میں حج تمتع مطلقاً جائز نہیں، خواہ میت کی طرف سے اجازت ہو یا نہ ہو۔ (معلم الحج: ۳۰۷)[۲]

اور آپ جو سیدھے مدینہ شریف جانا چاہتے ہیں اور وہاں کے میقات سے حج کا احرام باندھنا چاہتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے، اپنی راحت کی خاطر حج میں بھیجنے والے کا حج خراب نہیں کرنا چاہیے۔[۳]

حج بدل میں جانے والے کو چاہیے کہ سب سے آخری جہاز میں میقات سے احرام باندھ کر مکہ جاکر

=۱/۱۵۳، کتاب الحج، باب التمتع، ت: طلال یوسف، ط: دار احیاء التراث العربي - بیروت ☆ تبیین الحقائق: ۲/۴۵، کتاب الحج، باب التمتع، ط: المطبعة الکبری الأمیریة - بولاق)

[۲] آمر کی مخالفت نہ کرنا: اگر آمر نے افراد یعنی صرف حج کا حکم کیا تھا، اور مامور نے تمتع کیا، تو مخالف ہوگا، اور ضمان واجب ہوگا، اور حج مامور کا ہوگا۔ اسی طرح اگر قران کیا، تو بھی مخالف ہوگا، اور ضمان دینا ہوگا۔

البتہ قران آمر کی اجازت سے کرنا جائز ہے، دم قران اپنے پاس سے دینا ہوگا، آمر کے روپیے سے دینا جائز نہیں، اور تمتع کرنا اجازت سے بھی جائز نہیں، اگر اجازت سے تمتع کرے گا، تو گو مامور پر ضمان نہ ہوگا، لیکن آمر کا حج ادا نہ ہوگا۔ (معلم الحجاج، ص: ۲۸۴، حج بدل کے شرائط [۱۵]، از ص: ۲۸۱ تا ۲۸۶، ط: دار الکتاب - دیوبند)

اس کے حاشیہ میں ہے: حج بدل کرنے والے کو آمر کی بلا اجازت تمتع کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں؛ لیکن اگر آمر تمتع کی اجازت دے دے، تو بعض علماء جائز کہتے ہیں، مگر محققین کی رائے یہی ہے، حج بدل والے کو آمر کی اجازت سے بھی تمتع کرنا جائز نہیں۔ اگر تمتع اجازت سے کرے گا، تو گو ضمان نہ ہوگا، لیکن آمر کا حج ادا نہ ہوگا۔ [حوالہ سابق]

یہی قول ہے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا، دیکھیے: زبدۃ المناسک مع عمدۃ المناسک: ۲/۱۵۷، ط: الجمعیۃ پریس - دہلی ☆ احسن الفتاوی ۴/۵۲۳، کتاب الحج، حج بدل میں تمتع وقران کا حکم، ط: دار الاشاعت - دہلی ☆ کفایت المفتی: ۴/۳۴۵، ۳۴۶، کتاب الحج، حج کے بارے میں ایک تفصیلی فتویٰ، ط: زکریا - دیوبند ☆ فتاویٰ عثمانی: ۲/۲۲۲، کتاب الحج، حج بدل میں تمتع کا احرام، ط: کتب خانہ نعیمیہ - دیوبند۔

(ودم القران) والتمتع (والجناية على الحاج) إن أذن له الآمر بالقران والتمتع وإلا فيصير مخالفا فيضمن.

(الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۶۱۰، کتاب الحج، مطلب في الفرق بين العبادة والقربة والطاعة، ط: دار الفکر - بیروت)

مزید تفصیل کے لیے سوال سابق بہ عنوان "حج بدل میں تمتع کا حکم" ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) حاشیہ معلم الحجاج، ص: ۲۸۵، حج بدل کے شرائط، ط: دار الکتاب - دیوبند

سیدھا حج ادا کرے، اس میں کسی مضائقہ اور احرام کی طوالت کی پریشانی کے بغیر حج ادا ہو جائے گا، اس کے بعد مکہ یا مدینہ میں جتنا ٹھہرنا ہو، ٹھہر سکتا ہے، حج بدل میں وصیت کی گئی ہے، تو یہی سب سے بہتر طریقہ ہے یعنی آخری جہاز میں جاتے ہوئے میقات سے احرام باندھنا اور حج ادا کرنا۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] حج بدل کرنے والے کا آمر کی رضامندی سے حج تمتع کرنا

۱۷۵۰-سوال: (۱) حج بدل کرنے والا اپنے بھیجنے والے کی رضامندی سے "حج تمتع" کرسکتا ہے یا نہیں؟

(۲) حج کی تینوں قسموں میں سے حج بدل میں کون سی صورت بہتر ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

(۱-۲) بھیجنے والے کی اجازت سے جانے والا حج تمتع کرسکتا ہے، لیکن بہتر نہیں ہے۔[۲] حج بدل

---

(۱) کوشش اسی کی ہونی چاہیے، تاہم اب صورت حال تبدیل ہو چکی ہے، اور حج کے سفر کا آغاز و اختتام، حاجی کے اختیار میں نہیں رہتا؛ اس لیے اگر حج بدل کرنے والا کوئی شخص حج افراد کے بجائے، بہ اجازت آمر، حج تمتع کرلے، تو ان شاء اللہ آمر کی جانب سے حج ہو جائے گا۔ (تفصیل کے لیے سوال سابق کا حاشیہ نمبر:۵ [ترتیب میں حاشیہ نمبر:۷] ملاحظہ فرمائیں)

[۲] (وينبغي للآمر أن يفوض الأمر إلى المأمور فيقول: حجي عني) أي بهذا (كيف شئت مفردا أو قارنا أو متمتعا) فيه أن هذا القيد سهو ظاهر، إذ التفويض المذكور في كلام المشائخ مقيد بالإفراد، والقران لا غير، ففي الكبير: قال الشيخ الإمام أبو بكر محمد بن الفضل: إذا أمر غيره أن يحج عنه ينبغي أن يفوض الأمر إلى المأمور فيقول: حجي عني بهذا كيف شئت، إن شئت حجة وإن شئت فاقرن، والباقي من المال وصية له، لكي لا يضيق الأمر على الحاج ولا يجب عليه الرد إلى الورثة، انتهى كلامه.

وقد سبق أيضا أن من شرط الحج عن الغير أن يكون ميقاتيا آفاقيا، وتقرر أن بالعمرة ينتهي سفره إليها ويكون حجه مكيا، وأما ما في قاضي خان من التخيير بحجة أو عمرة وحجة، أو بالقران فلا دلالة على جواز التمتع، إذ الواو لا يفيد الترتيب، فيحمل على حج وعمرة بأن يحج أولا عنه ثم بعمرة له أيضا، فتدبر؛ فإنه موضع خطر. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط)

في إرشاد الساري: (قوله: أن هذا القيد سهو ظاهر) في شرح هذا الكتاب: ولا يخفى أن هذا سهو منه؛ لأن الميت لو أمره بالتمتع فتمتع المأمور صح، ولا يكون مخالفا بلا خلاف بين الأئمة الأسلاف، فتدبر كذا في الحباب. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع إرشاد الساري، ص:۶۴۷، ۶۴۸، فصل في النفقة، ص:۶۴۳، ت: طلحة بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

کے لیے جانے والا شخص آخری جہاز سے جائے اور صرف حج ہی کا احرام باندھے، یہ اس کے لیے بہتر ہے، اس میں اس کو زیادہ دنوں تک احرام میں نہیں رہنا پڑے گا، حج بدل کرنے والے کے لیے مفرد بالحج کا ہونا سب سے بہتر ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] حج بدل میں تمتع کرنا

۱۷۵۱- سوال: آپ نے اپنی کتاب "مسائل حج" میں صفحہ نمبر ۱۹۹ پر حج بدل میں تمتع کرنے کے متعلق لکھا ہے کہ "حج بدل کے طور پر جو شخص بھیج رہا ہے، اس کی اجازت سے بھی تمتع کرنا جائز نہیں ہے، بھیجنے والے نے تمتع کی اجازت دی ہے، تو تمتع کرنے والے پر کوئی مالی تاوان لازم نہیں ہوگا؛ لیکن بھیجنے والے کا حج ادا نہیں ہوگا، تو آپ سے سوال یہ ہے کہ تمتع کون سے حج بدل میں جائز نہیں، حج بدل کی حسب ذیل چند صورتیں یہ ہیں:

(۱) ایک مال دار نے -جس پر حج فرض تھا، مگر وہ اپنی زندگی میں کسی وجہ سے اپنا حج ادا نہیں کر سکا- اپنے ورثہ کو وصیت کی تھی کہ میرے انتقال کے بعد میرا حج بدل کروا دینا۔

(۲) ایک آدمی پر اس کی زندگی میں حج فرض نہیں تھا؛ لیکن اس کے ورثاء نے اس کے انتقال کے بعد کسی کو اس کی طرف سے حج بدل کے لیے بھیجا۔

(۳) ایک آدمی پر اس کی زندگی میں حج فرض تھا؛ لیکن نہ تو وہ اپنا حج کر سکا اور نہ وصیت کر سکا؛ تاہم اس کے ورثاء نے اس کے تہائی مال میں سے کسی کو حج بدل کے لیے بھیجا، تو مذکورہ تینوں صورتوں میں سے کون سی صورت میں حج بدل میں تمتع کرنا جائز نہیں ہے؟ محمد یوسف بلیسر یا، نواپور

---

[۱] (العاشر: أن يحرم من الميقات) أي من ميقات الآمر ليشمل المكي وغيره، (فلو اعتمر وقد أمره بالحج ثم حج من عامه من مكة لا يجوز و يضمن) أي في قولهم جميعا و لايجوز ذلك عن حجة الإسلام؛ لأنه مأمور بحجة ميقاتية، كذا في الكبير. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط، ص: ۶۲۲)

و في إرشاد الساري: و هو أن من شرائط صحة الحج عن الغير أن لا ينتهي سفره إلى عمرة، وهو على نوعين متفق عليه و مختلف فيه، فالأول أن يحرم بعمرة مفردة، و هذا الحكم أعم من أن يكون إنشاءها من الميقات أو مما دونه أو مما فوقه. (إرشاد الساري مع المسلك المتقسط في المنسك المتوسط، ص: ۶۲۳، فصل في شرائط جواز الإحجاج)

مسئلے کی مکمل تفصیل وتخریج کے لیے عنوان "حج بدل میں تمتع کا حکم" اور "حج بدل کا طریقہ" کی تفصیل وحواشی ملاحظہ فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

پہلی صورت میں تمتع جائز نہیں ہے۔ [۱] دوسری اور تیسری صورت میں ورثاء میت کے حق میں متبرع (تبرع اور احسان کرنے والے) ہیں؛ اس لیے اس میں حج تمتع جائز ہے۔

البتہ جب ورثاء ہزاروں روپے خرچ کر کے میت کی طرف سے کسی کو حج بدل کے لیے بھیج رہے ہیں، تو جانے والے کو آخری ہوائی جہاز سے بھیجیں اور اس کو اس بات کی تاکید کر دیں کہ میقات سے اپنا احرام باندھے؛ کیوں کہ جب آخری ہوائی جہاز سے جائے گا، تو صرف چھ سات دن ہی احرام میں رہنا پڑے گا یا ان سے بھی کم؛ البتہ آپ کی تحریر کردہ دوسری اور تیسری صورت میں، بھیجنے والے کی اجازت سے تمتع کرنا جائز ہے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] والدین کا حج باقی ہو، اور ساس کی طرف سے حج بدل کرے

۱۷۵۲- سوال: ایک شخص سعودی عرب میں رہتا ہے، اس نے اپنا حج کر لیا ہے، اب وہ اپنی مرحوم ساس کی طرف سے حج ادا کرنا چاہتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ خود اس کے والدین- جو بہ قید حیات ہیں اور یہاں ہندوستان میں رہتے ہیں- نے حج نہیں کیا ہے، اور ان کی اتنی مالی استطاعت بھی نہیں ہے کہ وہ حج کر سکیں، جب کہ لڑکا سعودیہ میں اچھے خاصے پیسے کماتا ہے۔

تو اس صورت میں اس شخص کا اپنی ساس کی طرف سے حج کرنا کیسا ہے؟ کیا اس کی مرحوم ساس کی طرف سے حج ادا ہوگا یا نہیں؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں داماد کا اپنی ساس کی طرف سے حج بدل کرنا صحیح ہے، یہ حج ادا ہو جائے گا، البتہ اپنے آباء واجداد اور امہات میں سے جن لوگوں نے باوجود حج فرض ہونے کے حج ادا نہیں کیا تھا، ان کی طرف سے حج کرے گا، تو اس میں ثواب زیادہ حاصل ہوگا۔ [۳]

---

(۱) پچھلے سوالوں میں تفصیل وتخریج گذر چکی ہے۔

(۲) کیوں کہ یہ ورثاء کی جانب سے تبرع اور احسان ہے، جس میں احرام کا میقاتی ہونا ضروری نہیں۔

(۳) عن جابر بن عبد اللہ، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من حج عن أبیہ وأمہ فقد قضی عنہ حجتہ وکان لہ=

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''کوئی شخص کافر پڑوسی سے حسن سلوک کرے، تو ایک ثواب اور مسلمان پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرے، تو دو ثواب اور مسلمان رشتہ دار پڑوسی سے حسن سلوک کرے، تو اس میں تین ثواب ہیں: ۱- پڑوسی کا، ۲-مسلمان ہونے کا، ۳-رشتہ داری کا۔ (بخاری شریف)[1]

لہذا بہتر یہی کہ پہلے اپنے بلا واسطہ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے اور جن پر حج فرض تھا اور انتقال کر گئے (یا موجود ہیں لیکن بڑھاپے یا مرض کی وجہ سے چلنے پھرنے کی استطاعت نہیں ہے) ان کی طرف سے حج بدل کرے۔ اگر ایسی کوئی صورت نہ ہو، تو پھر ساس کی طرف سے- جب کہ اس پر حج فرض ہو اور بغیر ادا کئے انتقال کر گئی ہو- حج بدل کر لے، کہ اس سے ایک مسلمان کا فرض ادا ہو جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] نفلی حج کا ثواب مرحومین کو پہنچانا بہتر ہے یا زندہ رشتہ داروں کو؟

۱۷۵۳- سوال: الحمد للہ میں نے حج فرض ادا کرلیا ہے، اب نفلی حج کرنا چاہتا ہوں، تو اس کا

=فضل عشر حجج. (سنن الدارقطني- أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي بن مسعود بن النعمان بن دينار البغدادي الدارقطني (م:۳۸۵هـ): ۳/ ۳۰۰، رقم الحديث: ۲۶۱۰، كتاب الحج، باب المواقيت، ت: شعيب الارنؤوط، و جماعة من العلماء، ط: مؤسسة الرسالة- بيروت)

عن عبدالعزيز بن عبدالله بن عمر، عن أبيه، عن جده قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من حج عن والديه بعد وفاتهما كتب له عتق من النار، وكان للمحجوج عنهما أجر حجة تامة من غير أن ينقص من أجورهما شيء". (شعب الإيمان-أحمد بن الحسين بن علي بن موسى الخُسْرَوْجِردي الخراساني، أبو بكر البيهقي (م:۴۵۸هـ): ۱۰/ ۳۰۴، رقم الحديث: ۷۵۳۴، بر الوالدين، فصل في حفظ حق الوالدين بعد موتهما، ت: د. عبد العلي عبد الحميد حامد، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض بالتعاون مع الدار السلفية ببومباي بالهند)

ذكر العلامة نوح عن مناسك القاضي: حج الإنسان عن غيره أفضل من حجه عن نفسه، بعد أن أدى فرض الحج لأن نفعه متعد، وهو أفضل من القاصر اهـ تأمل. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۰۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب الفرق بين العبادة و القربة، و الطاعة، ط: دار الفكر- بيروت)

[۱] قال ابن حجر: وقد وردت الإشارة إلى ما ذكرته في حديث مرفوع أخرجه الطبراني من حديث جابر رفعه: الجيران ثلاثة جار له حق وهو المشرك له حق الجوار وجار له حقان وهو المسلم له حق الجوار وحق الإسلام وجار له ثلاثة حقوق مسلم له رحم له حق الجوار والإسلام والرحم. (فتح الباري شرح صحيح البخاري-أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي (م:۸۵۲هـ): ۱۰/ ۴۴۲، كتاب الأدب، باب الوصاءة بالجار، تحت رقم: ۶۰۱۴-۶۰۱۵، ط: دار المعرفة- بيروت)

ثواب مرحومین کو پہنچانا بہتر ہے یا زندہ رشتہ داروں کو؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مرحوم: ماں باپ اور دادا، دادی، جن کے ذمہ حج فرض تھا، اور انہوں نے حج ادا نہیں کیا، ان کی طرف سے حج بدل کرنا زیادہ ثواب کا کام ہے۔[۱]

اگر انہوں نے حج کر لیا تھا، تو دوسرے مرحوم قرابت داروں کی طرف سے حج بدل کرنا چاہیے، زندہ اشخاص کے لیے تو حج کے بہت سے مواقع ہیں، اس لیے ترجیحی بنیاد پر وفات پا چکے رشتے داروں کے لیے حج بدل کرنا چاہیے، البتہ سب سے پہلے اپنے حج فرض کی ادائیگی کو لازم سمجھنا چاہیے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱)عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حج عن أبويه أو قضى عنهما مغرما بعث يوم القيامة مع الأبرار. (سنن الدارقطني - أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي بن مسعود بن النعمان بن دينار البغدادي الدارقطني (م:۳۸۵هـ): ۲۹۹/۳، رقم الحديث: ۲۶۰۸، كتاب الحج، باب المواقيت، ت: شعيب الارنؤوط، وجماعة من العلماء، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)

عن زيد بن أرقم، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا حج الرجل عن والديه تقبل منه ومنهما واستبشرت أرواحهما في السماء وكتب عند الله تعالى برا. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۲۶۰۷)

عن جابر بن عبد الله، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حج عن أبيه وأمه فقد قضى عنه حجته وكان له فضل عشر حجج. (المصدر السابق: ۳۰۰/۳، رقم الحديث: ۲۶۱۰)

اعلم أن فعل الولد ذلك مندوب إليه جدا. لما أخرج الدارقطني عن ابن عباس - رضي الله تعالى عنهما - عنه - صلى الله عليه وسلم - لمن حج عن أبويه أو قضى عنهما مغرما بعث يوم القيامة مع الأبرار. وأخرج أيضا عن جابر أنه -عليه الصلاة والسلام- قال: من حج عن أبيه وأمه فقد قضى عنه حجته وكان له فضل عشر حجج. وأخرج أيضا عن زيد بن أرقم قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: إذا حج الرجل عن والديه تقبل منه ومنهما واستبشرت أرواحهما وكتب عند الله برا" .اهـ. (فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بـ'ابن الهمام' (م:۸۶۱هـ): ۱۵۹/۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۶۰۹/۲، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب في الفرق بين العبادة والقربة والطاعة، ط: دار الفكر)

(۲)عن ابن عباس، أن النبي صلى الله عليه وسلم سمع رجلا يقول: لبيك عن شبرمة، قال: من شبرمة؟ قال: أخ لي - أو قريب لي - قال: حججت عن نفسك؟ قال: لا، قال: حج عن نفسك ثم حج عن شبرمة. (سنن أبي داود: ۲۵۲/۱، رقم الحديث: ۱۸۱۱، كتاب المناسك، باب الرجل يحج عن غيره، ط: ديوبند ☆ سنن ابن ماجه: ۲۰۸/۲، رقم الحديث: ۲۹۰۳، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت، ط: ديوبند)

[۹] کناڈا میں رہنے والے معذور شخص کا ہندوستان سے حج بدل کرانا

۱۷۵۴-سوال: کناڈا میں ہمارے ایک بھائی رہتے ہیں، جن پر حج فرض ہوگیا ہے، مگر انہیں لقوہ لگ گیا ہے، داہنا ہاتھ اور بایاں پیر سوکھ گیا ہے، چلنا پھرنا' اٹھنا بیٹھنا مشکل ہے، یہاں تک کہ کپڑے پہننے میں دوسروں کے محتاج ہیں؛ بل کہ بستر پر سونے کے لیے بھی جب تک دوسرا شخص ان کا پیر اٹھا کر چارپائی پر نہ رکھے، نہیں سو پاتے ہیں، یہی حال کار میں بیٹھتے وقت ہوتا ہے، تو ایسی صورت حال میں اگر ان کے لیے حج بدل کا حکم ہو، تو وہ حج بدل کناڈا ہی سے کروایا جائے، یا انڈیا سے بھی کروایا جاسکتا ہے، اگر اس میں گنجائش ہو تو سوال یہ ہے کہ کناڈا سے تو لوگ ہوائی جہاز سے حج کے لیے جاتے ہیں، جبکہ کہ انڈیا سے اکثر پانی کے جہاز سے جاتے ہیں، تو اس سے کوئی فرق تو نہ آئے گا؟ مفصل جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

صورت مسئولہ میں چوں کہ مرض ایسا ہے، جس کے ٹھیک ہونے کی آئندہ امید نہیں ہے، لہٰذا ایسا مریض حج بدل کرواسکتا ہے۔[۱] پھر اس میں مریض کو اختیار ہے کہ وہ حج بدل کے لیے کسی کو کناڈا سے بھیجے یا ہندوستان سے بھیجے، حجِ فرض ادا ہوجائے گا۔ (زبدۃ المناسک: ۲/ ۱۵۳)[۲]

---

(۱) وإن كان عجزا لا يرجى زواله كالزمانة والعمي، جاز أن يامر غيره بالحج. (فتاوی قاضي خان علی هامش الهندية: ۱/ ۳۰۹، كتاب الحج، فصل في الحج عن الميت، ط: زكريا- ديوبند☆ الفتاوی التاتارخانية: ۳/ ۶۴۸، كتاب الحج، الحج عن الغير، رقم المسئلة: ۵۲۴۵، ت: المفتي شبير أحمد القاسمي، ط: زكريا- ديوبند☆ البحر الرائق: ۳/ ۶۵، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۲] اگر میت یا مریض نے خود حکم کیا تھا، کہ میرے وطن کے سوا فلاں جگہ سے حج کرایا جائے، تو جائز ہے۔ (زبدۃ المناسک مع عمدۃ المناسک: ۲/ ۱۵۳، ط: الجمعیۃ پریس- دہلی)

وأما ما يرجع إلى تعيين الوطن، فلا يخلو من أن يكون له وطن واحد أو أوطان، فإن اتحد تعين. ومن فروعه ما عن محمد في خراساني أدركه الموت بمكة فأوصى أن يحج عنه يحج عنه من خراسان، وما عن أبي يوسف في مكي قدم إلى الري فحضره الموت فأوصى أن يحج عنه يحج عنه من مكة. ——— أما لو أوصى أن يقرن عنه فإنه حينئذ يقرن عنه من الري، لأنه لا قران لأهل مكة فيحمل عليه من حيث هو، وإن كانت له أوطان في بلدان يحج عنه من أقربها إلى مكة، ولو عين مكانا جاز منه اتفاقا، وكذا إذا عين مكانا مات فيه. (فتح القدير- ابن الهمام: (م: ۸۶۱هـ): ۳/ ۵۷-۱۵۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۰۴، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر) =

اسی طرح اگر وصیت کرے کہ میرے مرنے کے بعد ہندوستان سے حج بدل کروایا جائے، تو یہ بھی جائز ہے، البتہ اگر مطلق وصیت کی اور انتقال ہوگیا، تو اب کناڈا ہی سے حج بدل کرانا ضروری ہوگا؛ لیکن جب تک حیات ہیں انڈیا سے حج بدل کرا سکتے ہیں، اس میں انہیں اختیار ہے۔(۱) اور بہتر یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو حج بدل میں بھیجے، جس نے پہلے اپنا حج کرلیا ہو۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] حج بدل جدہ سے کرانا

۱۷۵۵- سوال: مرحوم کی طرف سے حج بدل جدہ سے کرا سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر مرحوم نے وصیت کی ہے، تو ایک تہائی مال میں سے ہندوستان ہی سے حج بدل کے لیے جانا یا کسی کو بھیجنا ضروری ہوگا۔(۳)

= وإن أوصى أن يحج عنه من موضع كذا من غير بلده، يحج عنه من ثلث ماله من ذلك الموضع الذي بين، قرب من مكة أو بعد عنها وما فضل في يد الحاج عن الميت بعد النفقة في ذهابه ورجوعه فإنه يرده على الورثة لا يسعه أن يأخذ شيئا مما فضل هكذا في البدائع. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۹، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية، ط: دار الفكر)

(۱) ولو أحج عنه من غير وطنه مع إمكان الإحجاج من وطنه من ثلث ماله فإن الوصي يكون ضامنا ويكون الحج له ويحج عن الميت ثانيا إلا إذا كان المكان الذي أحج منه قريبا إلى وطنه من حيث يبلغ إليه ويرجع إلى وطنه قبل الليل فحينئذ لا يكون ضامنا ولو أحج عنه من موضع وفضل عنه من ثلث ماله وتبين أنه كان يبلغ أبعد منه، فإن الوصي يكون ضامنا ويحج عنه من حيث يبلغ إلا إذا كان الفضل يسيرا من زاد وكسوة فلا يكون مخالفا ويرد الفضل على الورثة، كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۹، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية، ط: دار الفكر)

(۲) عن ابن عباس، أن النبي صلى الله عليه وسلم سمع رجلا يقول: لبيك عن شبرمة، قال: من شبرمة؟ قال: أخ لي - أو قريب لي - قال: حججت عن نفسك؟ قال: لا، قال: حج عن نفسك ثم حج عن شبرمة. (سنن أبي داود: ۱/ ۲۵۲، رقم الحديث: ۱۸۱۱، كتاب المناسك، باب الرجل يحج عن غيره، ط: ديوبند ☆ سنن ابن ماجه: ۲/ ۲۰۸، رقم الحديث: ۲۹۰۳، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت، ط: ديوبند)

(۳) إذا أوصى بأن يحج عنه، وهو في منزله، إن بين مكاناً، يحج عنه من ذلك المكان بالإجماع، وإن لم يبين مكاناً يحج عنه من وطنه عند علمائنا رحمهم الله، لأن الوصية بالإحجاج أمر بإقامة غيره مقام نفسه في الحج، فإنما ينصرف مطلق هذا الأمر إلى ما كان واجباً على المنوب عنه، والواجب على المنوب عنه الحج من وطنه، حتى لا يجب عليه ما لم يملك من الزاد والراحلة قدر ما يحمله من وطنه إلى مكة ويرده إلى بلده، وهذا إذا كان ثلث ماله يكفي للحج من =

اور اگر وصیت نہیں کی ہے، مگر لڑکا یا بھائی وغیرہ اپنی طرف سے حج کرتا ہے اور ثواب بخش دیتا ہے، یا مرحوم کی طرف سے احرام باندھ کر ان کی طرف سے حج کرتا ہے، تو اس میں ہندوستان سے حج کرنا ضروری نہیں، جدہ، بل کہ مکہ مکرمہ سے بھی حج کیا جا سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، اور اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ مرحوم کے ذمہ میں موجود فریضہ ادا ہو جائے گا:

(فإن فسر المال) أو المكان (فالأمر عليه) أي على ما فسره (وإلا فيحج) عنه (من بلده) قياسا لا استحسانا فليحفظ، فلو أحج الوصي عنه من غيره لم يصح (إن وفى به) أي بالحج من بلده (ثلثه) وإن لم يف فمن حيث يبلغ استحسانا. (درمختار)[۱]

وفي الشامية: وإن لم يوص به فتبرع الوارث عنه بالإحجاج أو الحج بنفسه، قال أبو حنيفة يجزيه إن شاء الله تعالى؛ لقوله - صلى الله عليه وسلم - للخثعمية أرأيت لو كان على أبيك دين، الحديث انتهى. (شامی)[۲]　　فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

=وطنه، فأما إذا كان لا يكفي لذلك، فإنه يحج عنه من حيث يمكن الإحجاج عنه. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ): ۲/ ۴۸۲، كتاب المناسك، الفصل السادس عشر: في الوصية بالحج، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۶۵۶، كتاب الحج، الفصل السادس عشر: في الوصية بالحج، ط: زكريا- ديوبند)

[۲] الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۶۰۴-۶۰۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر- بيروت.

[۳] رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۰۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب في الفرق بين العبادة والقربة والطاعة، ط: دار الفكر- بيروت.

وكذا في تبيين الحقائق: ۲/ ۸۵، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: المكتبة الكبرى الأميرية- بولاق.

عن عبد الله بن عباس، عن الفضل بن عباس، أن امرأة من خثعم، قالت: يا رسول الله، إن أبي أدركته فريضة الله في الحج وهو شيخ كبير لا يستطيع أن يستوي على ظهر البعير، قال: حجي عنه. (سنن الترمذي: ۱/ ۱۸۵، رقم الحديث: ۹۲۸، أبواب الحج، باب ما جاء في الحج عن الشيخ الكبير، والميت، ط: ديوبند)

وفي كل منهما لا يخلو إما إن أطلق الوصية أو عين المال والمكان فإن أوصى بأن يحج عنه، وأطلق يحج عنه من ثلث ماله؛ لأنه بمنزلة التبرعات فإن بلغ ثلثه أن يحج عنه من بلده وجب الإحجاج من بلده؛ لأن الواجب عليه الحج من بلده الذي يسكنه. (البحر الرائق: ۳/ ۷۱، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۱۱] ۱- والدہ کی زندگی میں ان کی طرف سے حج بدل کرنا

[۱۲] ۲- اس شخص کا حج بدل میں جانا، جس نے خود حج نہ کیا ہو

۱۷۵۶- سوال: میری والدہ پر حج فرض ہو چکا ہے، مگر وہ بہت ضعیف ہو چکی ہیں، صرف گھر میں چلنا پھرنا رہتا ہے، محلہ میں یا باہر کہیں جانا ہو، تو بیل گاڑی یا رکشہ کے بغیر نہیں جا سکتی ہیں اور اپنے ساتھ کسی محرم کو لے جانے کی اس میں استطاعت نہیں ہے، تو ایسی صورت حال میں والدہ کی طرف سے میں خود حج بدل میں جا سکتا ہوں یا نہیں؟ جب کہ مجھ پر حج فرض نہیں ہوا ہے اور نہ میں نے اس سے پہلے کوئی حج کیا ہے، شریعت کی جو ہدایت ہو، وہ تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کی والدہ کے ساتھ کسی محرم کا جانا ضروری ہے، اگر محرم کا خرچ ان کے پاس نہیں ہے، تو حج نہ کرنے سے ان کو کوئی گناہ نہ ہوگا، بس صرف وصیت لکھ دے کہ میرے مرنے کے بعد اس مال سے حج بدل کر دیا جائے، تو جب حج بدل کر دیا جائے گا، ان کا حج ادا ہو جائے گا۔[۱]

[۱] (و) مع (زوج أو محرم) ولو عبدا أو ذميا أو برضاع (بالغ) قيد لهما كما في النهر بحثا (عاقل والمراهق كبالغ) جوهرة... (مع) وجوب النفقة لمحرمها (عليها) لأنه محبوس (عليها) لامرأة حرة ولو عجوزا في سفر. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله مع وجوب النفقة إلخ) أي فيشترط أن تكون قادرة على نفقتها ونفقته (قوله لمحرمها) قيد به لأنه لو خرج معها زوجها فلا نفقة له عليها بل هي لها عليه النفقة... (قوله لأنه محبوس عليها) أي حبس نفسه لأجلها ومن حبس نفسه لغيره فنفقته عليه. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۶۴، كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت☆ ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر: ۱/ ۳۸۷، ط: مكتبة فقيه الأمة - ديوبند)

ثم تكلموا أن أمن الطريق وسلامة البدن - على قول أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - ووجود المحرم للمرأة شرط لوجوب الحج أم لأدائه، بعضهم جعلوها شرطا للوجوب وبعضهم شرطا للأداء، وهو الصحيح، وثمرة الخلاف فيما إذا مات قبل الحج فعلى قول الأولين لا تلزمه الوصية، وعلى قول الآخرين تلزمه كذا في النهاية. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۹، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر - بيروت)

وإن مات عن وصية لا يسقط الحج عنه، ويجب أن يحج عنه، لأن الوصية بالحج قد صحت، وإذا حج عنه يجوز عند استجماع شرائط الجواز. (بدائع الصنائع: ۲/ ۲۲۲، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۸، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر - بيروت)

لیکن سوال میں آپ نے ذکر کیا ہے کہ میری والدہ کو گھر میں چلنے پھرنے کے علاوہ، محلہ میں یا دوسری جگہ جانا مشکل ہے، (یعنی دوسروں کی مدد کی محتاج ہے) تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ حج میں (بہ ذات خود جانے کے لیے) بدن کی تندرستی وسلامتی ضروری ہے، جب آپ کی والدہ محلہ میں بھی جانے کے لیے بیل گاڑی یا رکشہ کی محتاج ہے، تو ایسی صورت میں حج فرض ہو جانے کے سبب وہ کسی اور کو اپنی طرف سے حج میں بھیج سکتی ہیں۔ (شامی ☆ بدائع الصنائع)[۲]

البتہ مذکور ضعف وکمزوری موت تک پایا جانا ضروری ہے، اگر موت سے پہلے تندرستی لوٹ آئی تو وہ حج بدل کافی نہ ہوگا، پھر سے ان کو حج کرنا ضروری ہوگا۔[۳]

اور سوال میں مذکور ہے کہ آپ نے خود حج نہیں کیا ہے، تو حج بدل میں ایسے شخص کو بھیجنا چاہیے، جس

---

[۲] والنوع الثاني: شروط الأداء وهي التي إن وجدت بتمامها مع شروط الوجوب، وجب أداؤه بنفسه، وإن فقد بعضها مع تحقق شروط الوجوب، فلا يجب الأداء بل عليه الإحجاج أو الإيصاء عند الموت وهي خمسة: سلامة البدن، وأمن الطريق وعدم الحبس، والمحرم أو الزوج للمرأة وعدم العدة لها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵۸، أول كتاب الحج، ط: دار الفكر- بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۲/ ۲۱۳، كتاب الحج، فصل نبات الحرم، ط: دار الكتب العلمية ☆ إرشاد الساري إلى مناسك الملا علي القاري، ص: ۷۰، باب شرائط الحج، النوع الثاني: شرائط الأداء، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۸، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته... الخ، ط: دار الفكر- بيروت)

(۳) الثاني: العجز المستدام من وقت الإحجاج إلى وقت الموت، أي فإن زال قبل الموت لم يجز حج غيره عنه فرضا. (إرشاد الساري إلى مناسك الملا علي القاري، ص: ۶۱۲، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة ☆ البحر الرائق: ۳/ ۶۵، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۸، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر- بيروت)

قال: (ولا يجوز إلا عن الميت، أو عن العاجز بنفسه عجزا مستمرا إلى الموت) ولا يجوز عن القادر، لأن الحج عبادة بدنية وجبت للابتلاء، فلا تجري فيها النيابة،... ويشترط دوام العجز إلى الموت كالفدية أيضا، لأنه متى قدر وجب عليه بنفسه. (الاختيار لتعليل المختار- عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳ھ): ۱/ ۱۷۰، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة ☆ تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق- فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ھ): ۲/ ۸۵، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق ☆ غنية الناسك، ص: ۴۱۶، فصل في شرائط النيابة في الحج الفرض، ط: یادگار شیخ، سہارن پور ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۶۴۸، كتاب الحج، الحج عن الغير، ط: زكريا- ديوبند)

نے خود حج کرلیا ہو، تاہم اگر آپ جاتے ہیں تو - اگر چہ حج فرض ادا نہیں کیا ہے - اس کی گنجائش ہے، حج بدل صحیح ہوجائے گا۔(۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] ورثاء کا اپنے والد کی جانب سے کسی کو حج بدل میں بھیجنا

۱۷۵۷- سوال: (الف) میرے والد صاحب جناب احمد بن یوسف داؤجی کی وفات کو نو مہینے ہوئے، اُن کی جانب سے ہم اپنے بھائی اشرف بن احمد داؤجی کو حج بدل کے لیے بھیجنا چاہتے ہیں اور گھر میں ہماری دو جوان بہنیں بھی ہیں، تو اِس حج بدل کے متعلق حکمِ شرعی کیا ہے؟

(ب) میرا ایک پھوپھی زاد بھائی لندن میں مقیم ہے، جو اپنی خوشی سے میری والدہ اور بھائی کے لیے سفرِ حج کا خرچ اٹھانا چاہتا ہے، تو اُس کے خرچ سے جاسکتے ہیں، یا مجھ پر پورا خرچ کرنا لازم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(الف) اگر آپ کے والد صاحب نے حج بدل کے لیے وصیت کی ہے تو اُسے پورا کرنا ضروری

---

(۴) والأفضل للإنسان إذا أراد أن يحج رجلاً عن نفسه أن يحج رجلاً قد حج عن نفسه؛ لأنه أهدى إلى إقامة الأعمال، ولأنه أبعد عن الخلاف، فإن الذي لم يحج عن حجة الإسلام عن نفسه لم تجز حجته عن غيره عند بعض الناس، ومع هذا لو أحج رجلاً لم يحج عن نفسه حجة الإسلام يجوز عندنا، وسقط الحج عن الآمر؛ لأن النبي عليه السلام حين أمر الخثعمية، قال: الحج عن أبيها لم يستفسر أنها هل حجت عن نفسها أم لا؟. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ):۲/۴۷۸، كتاب المناسك، الفصل الخامس عشر: في الرجل يحج عن آخر، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆الأصل المعروف بالمبسوط-أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني (م:۱۸۹ھ):۲/۵۰۴، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت وغيره، ت: أبو الوفا الأفغاني، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية-كراتشي☆المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م:۴۸۳ھ):۴/۱۵۱، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت وغيره، ط: دار المعرفة-بيروت☆تحفة الفقهاء-محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰ھ):۱/۴۲۹، كتاب المناسك، مسائل الأمر بالحج، ط: دار الكتب العلمية-بيروت☆الفتاوى التاتارخانية:۳/۶۴۹، كتاب الحج، الفصل الخامس عشر: في الحج عن الغير، ط: زكريا-ديوبند☆الفتاوى الهندية:۱/۲۵۷، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر☆المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م:۱۰۱۴ھ)، ص:۶۵۰، باب الحج عن الغير، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

ہے، ورنہ آپ گنہگار ہوں گے۔[۱] اور اگر وصیت نہیں کی ہے؛ لیکن تمام ورثاء عاقل و بالغ ہوں، کوئی بھی نابالغ نہ ہو، تو تمام کی رضامندی سے کسی ایک کو حج بدل میں بھیجنا ثواب کا کام ہے،[۲] ان شاء اللہ آپ کے والد صاحب کی جانب سے فرضِ حج ادا ہو جائے گا۔[۳]

آپ کی والدہ محترمہ کو، آپ کے والدِ مرحوم کے ترکہ سے جو آٹھواں حصہ ملا ہے، یا تو اُن میں سے حج کا خرچ نکالیں یا آپ عاقل و بالغ ورثاء خرچ اٹھالیں، دونوں شکلوں میں والدہ کا فرض حج ادا ہو جائے گا۔

(ب) آپ کا پھوپھی زاد بھائی اپنی خوشی سے آپ کا اور آپ کی والدہ کے حج کا خرچ اٹھالے، تو جائز ہے۔[۴] بہتر یہ ہے کہ وہ سفر کے اخراجات کا تمہیں مالک بنادے، پھر تم اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کرتے رہو، اِس سے حج بدل اور والدہ دونوں کا حج ادا کرنا جائز ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وإن مات عن وصية لا يسقط الحج عنه، ويجب أن يحج عنه، لأن الوصية بالحج قد صحت، وإذا حج عنه يجوز عند استجماع شرائط الجواز. (بدائع الصنائع: ۲/۲۲۲، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۵۸، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) فإن أجازت الورثة وهم كبار، جاز، وإن لم يجيزوا، لا يجوز. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۵۹، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر)

(۳) قال الكرماني: فلو مات رجل وعليه فرض الحج سقط فرض الحج عنه عندنا إلا أن يوصي بأن يحج عنه من ثلث ماله فتجبر الورثة على ذلك، وإن لم يوص لم يجبروا على ذلك... ثم عندنا إذا مات بعد فرض الحج، ولم يوص فحج رجل عن الميت من غير وصية أو تبرع الورثة بذلك فحج عن أبيه أو أمه حجة الإسلام من غير وصية أوصى بها الميت قال أبو حنيفة: يجزئه ذلك إن شاء الله تعالى. (حاشية الشلبي على تبيين الحقائق-شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِّلْبِيُّ (م: ۱۰۲۱هـ): ۲/۸۵، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: المطبعة الكبرى الأميرية-بولاق، القاهرة ☆ المحيط البرهاني -أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/۴۸۷، كتاب المناسك، الفصل السادس عشر: في الوصية بالحج، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۴) (قوله إذا قدروا على الزاد) بنفقة وسط لا إسراف فيها ولا تقتير (والراحلة) أي بطريق الملك أو الإجارة دون الإعارة، والإباحة في الوقت الذي قدمنا ذكره. ولو وهب له مال ليحج به لا يجب عليه قبوله سواء كان الواهب ممن تعتبر منته كالأجانب، أو لا تعتبر كالأبوين والمولودين. (فتح القدير-كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بـ'ابن الهمام' (م: ۸۶۱هـ): ۲/۴۱۰، كتاب الحج، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۷، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج وفرضيته ووقته وشرائطه وأركانه، ط: دار الفكر-بيروت)

[۱۴] حج بدل کے لیے رکھے ہوئے سونے سے، امین کسی کو حج بدل میں بھیجے یا میت کے ورثاء؟

۱۷۵۸- سوال: ایک شخص سات سال قبل انتقال کر گیا، اُس نے مرنے سے پہلے اپنی جانب سے حج بدل کے خرچ کے لیے ایک آدمی کے پاس سولہ تولہ سونا بہ طورِ امانت رکھا تھا، اگر یہ امین مرحوم کی وصیت کے مطابق اُس سونے کو حج بدل کے لیے خرچ نہ کرے اور نہ ہی اِس بارے میں میت کے ورثاء کے ساتھ کوئی مشورہ کرے، تو اِس شخص کے بارے میں حکمِ شرعی کیا ہے؟

امانت رکھنے والا مذکورہ شخص اپنی چاہت کے مطابق میت کی جانب سے کسی شخص کو حج بدل کے لیے بھیج سکتا ہے یا نہیں؟ امانت رکھنے والا شخص بہ ذاتِ خود حج بدل میں جائے یا وہ کسی اور کو بھیج دے، اور یہ بات مرحوم کے ورثاء کو قبول نہ ہو تو حج بدل ادا ہوگا یا نہیں؟

مرحوم کے دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں، اِن میں سے کن کی رضامندی ضروری ہے؟ اگر مذکورہ امانت دار شخص عمر رسیدہ ہے، اور مرحوم کی وصیت پر عمل کیے بغیر مر گیا، تو اُس کا کیا حکم ہے؟

مرحوم کے دونوں بیٹوں نے حج ادا نہیں کیا ہے، تو کیا اُن کے دونوں بیٹوں میں سے کوئی ایک حج بدل میں جا سکتا ہے یا نہیں؟

امانت رکھنے والے شخص کا یوں کہنا کہ وارث حج بدل ادا نہیں کر سکتا، کیا از روئے شرع صحیح ہے؟

مرحوم کے ورثاء خود ہی حج بدل کا انتظام کرنے پر آمادہ ہیں، تو کیا وہ اِس شخص کے پاس رکھی ہوئی امانت کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامدا ومصليا:

مذکورہ مسئلہ میں مرحوم کی وصیت کے مطابق اُس کی جانب سے حج بدل میں کسی کو بھیجنا فرض ہے۔[1] اور جس قدر ہو سکے، اُس میں جلدی کی جائے، میت نے جس شخص کو حج بدل کے خرچ کے لیے امانت سپرد کیا ہے، وہ خود بھی حج بدل کے لیے جا سکتا ہے اور اپنے علاوہ کسی اور کو بھی بھیج سکتا ہے، حج بدل ادا کروانے کا ذمہ

---

(۱) وإن مات عن وصية لا يسقط الحج عنه، ويجب أن يحج عنه، لأن الوصية بالحج قد صحت، وإذا حج عنه يجوز عند استجماع شرائط الجواز. (بدائع الصنائع: ۲/۲۲۲، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۱/۲۵۸، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر- بيروت)

دار خود امانت رکھنے والا شخص ہے۔ [۲] اگر بلا سبب قصداً تاخیر کرے گا تو وہ گنہگار ہوگا، چوں کہ یہ شخص خود ذمہ دار ہے؛ اِس لیے اُسے ورثاء سے اِس بارے میں اِجازت لینے کی، یا مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں، تاہم مشورہ کرنا بہتر ہے۔

مرحوم کی جانب سے مذکورہ امانت کے ذریعہ حج بدل کی وصیت کی گئی ہے، تو وصیت میت کے ترکہ کے ایک تہائی حصہ میں سے نافذ ہوگی، اُس سے زیادہ میں نہیں، اگر حج بدل کا خرچ کل ترکہ کے ایک تہائی حصے سے زیادہ ہے، تو پھر ورثاء کی رضامندی ضروری ہے، اگر تمام ورثاء رضامند ہوں، تو حج بدل کی ادائیگی لازم ہوگی، ورنہ نہیں۔ [۳]

امانت رکھے ہوئے سولہ تولہ سونے کے علاوہ مرحوم کا کوئی اور مال نہیں ہے، تو یہی کل مال سمجھا جائے گا، اور ایک تہائی یعنی سوا پانچ تولہ سونے کے ذریعہ حج بدل صحیح ہوگا، اور بقیہ سونے کے حق دار مرحوم کے ورثاء ہوں گے، اور اِس امانت کے علاوہ اور بھی ترکہ ہے، تو حج بدل کے بعد جو کچھ بھی بچے، وہ تمام ورثاء کا حق ہوگا۔ [۴]

(۲) وللوصي أن يحج بنفسه إلا أن يأمره بالدفع أو يكون وارثا ولم تجز البقية. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله وللوصي أن يحج إلخ) قال في فتح القدير: ولا يجوز الاستئجار على الطاعات، وعن هذا قلنا لو أوصى أن يحج عنه ولم يزد على ذلك كان للوصي أن يحج عنه بنفسه إلا أن يكون وارثا، أو دفعه لوارث ليحج فإنه لا يجوز إلا أن تجيز الورثة وهم كبار؛ لأن هذا كالتبرع بالمال فلا يصح للوارث إلا بإجازة الباقين؛ ولو قال الميت للوصي ادفع المال لمن يحج عني لم يجز له أن يحج بنفسه مطلقا. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۱۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب العمل على القياس دون الاستحسان هنا، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) من أوصى بأكثر من ثلث ماله لم يجز في الفضل على الثلث إلا أن يجيزه الورثة بعد موته وهم كبار؛ لأن حقهم تعلق بماله بمرضه ولكن الشرع جعل الثلث محلا لوصية الموصي ليتدارك به ما فرط في حياته فما زاد على ذلك إذا أوصى به، فقد قصد الإضرار بورثته بإسقاط حقهم عما تعلق حقهم به وإيثار الأجنبي على من آثره الشرع، وهو الوارث فللوارث أن يرد عليه قصده بأن يأبى الإجازة ولا معتبر بإجازته في حياة الموصي عندنا. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۲۷/ ۱۵۴ - ۱۵۳، كتاب الوصايا، ط: دار المعرفة - بيروت☆ الهداية: ۴/ ۵۱۳، كتاب الوصايا، باب في صفة الوصية ما يجوز من ذلك، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۶۵۱، كتاب الوصايا، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) وما فضل في يد الحاج عن الميت بعد النفقة في ذهابه ورجوعه فإنه يرده على الورثة لا يسعه أن يأخذ شيئا مما فضل؛ لأن النفقة لا تصير ملكا للحاج بالإحجاج، وإنما ينفق قدر ما يحتاج إليه في ذهابه وإيابه على حكم ملك الميت؛ لأنه لو ملك إنما يملك بالاستئجار، والاستئجار على الطاعات لا يجوز عندنا فكان الفاضل ملك الورثة =

حج بدل کے لیے مرحوم نے بہ ذاتِ خود کسی شخص کی تعیین نہیں کی ہے، لہٰذا کوئی بھی شخص اُس کی جانب سے حج بدل ادا کرسکتا ہے، وارث بھی حج بدل کے لیے جاسکتا ہے، لیکن اِس بارے میں اختیار اُسی کا ہوگا جسے اِس امانت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، ورثاء کو اُن کے موروثی حق کے علاوہ کوئی چیز امانت دار کے پاس سے مانگنے کا حق نہیں ہے۔

حج بدل کے لیے مستحب یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو بھیجا جائے جس نے اپنا حج فرض ادا کرلیا ہو، کوئی ایسا شخص جس پر حج فرض نہیں ہے، تو وہ بھی حج بدل ادا کرسکتا ہے، لیکن یہ بہتر نہیں، اور ایسا شخص جس پر حج فرض ہوگیا ہو، اس کے باوجود اُس نے اپنا حج ادا نہ کیا ہو، اُس کا حج بدل میں جانا مکروہ ہے، لیکن پھر بھی اگر اس نے مرحوم کی جانب سے حج بدل ادا کیا، تو حج ادا ہوجائے گا۔ (۵) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=فيجب عليه رده إليهم. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع- علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م:۵۸۷ھ): ۲/ ۲۲۳، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، قبيل: فصل سبب وجوب الحج، ط: دار الكتب العلمية ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۹، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر- بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۸۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، فصل: المأمور بالحج له أن ينفق على نفسه، ط: المكتبة الكبرى الأميرية- بولاق)

(۵) والأفضل للإنسان إذا أراد أن يحج رجلاً عن نفسه أن يحج رجلاً قد حج عن نفسه؛ لأنه أهدى إلى إقامة الأعمال، ولأنه أبعد عن الخلاف، فإن الذي لم يحج عن حجة الإسلام عن نفسه لم تجز حجته عن غيره عند بعض الناس، ومع هذا لو أحج رجلاً لم يحج عن نفسه حجة الإسلام يجوز عندنا، وسقط الحج عن الآمر؛ لأن النبي عليه السلام حين أمر الخثعمية، قال: الحج عن أبيها لم يستفسر أنها هل حجت عن نفسها أم لا؟. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني- أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ): ۲/ ۴۷۸، كتاب المناسك، الفصل الخامس عشر: في الرجل يحج عن آخر، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الأصل المعروف بالمبسوط- أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني (م:۱۸۹ھ): ۲/ ۵۰۴، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت وغيره، ت: أبو الوفا الأفغاني، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية- كراتشي ☆ المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۴/ ۱۵۱، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت وغيره، ط: دار المعرفة- بيروت ☆ تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰ھ): ۱/ ۴۲۹، كتاب المناسك، مسائل الأمر بالحج، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۶۴۹، كتاب الحج، الفصل الخامس عشر: في الحج عن الغير، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۷، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۶۵۰، باب الحج عن الغير، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة)

[۱۵] عورت، مرد کی جانب سے حج بدل ادا کرسکتی ہے یا نہیں؟

۱۷۵۹- سوال: کوئی عورت کسی مرد کی جانب سے حج بدل ادا کرسکتی ہے؟ اسی طرح بیوی اپنے شوہر کی جانب سے کسی محرم کے ساتھ سفر حج کو روانہ ہو، تو جائز ہے؟ یا کوئی اجنبی عورت کسی اجنبی مرد کی جانب سے حج ادا کرسکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

مرد کی جانب سے حج بدل کے لیے اُس کی بیوی یا اجنبی عورت جا سکتی ہے۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] حج بدل کی ایک شکل

۱۷۶۰- سوال: ہمارے ایک دوست سعودیہ عربیہ میں رہتے ہیں، ان پر حج فرض ہو چکا ہے اور ان کے مرحوم والد صاحب پر بھی حج فرض تھا، البتہ انہوں نے کسی خاص وجہ سے اپنا حج نہیں کیا تھا، اب اس آدمی کو کیا پہلے اپنا حج ادا کرنا چاہیے یا اپنے والد کی جانب سے حج بدل، اگر اس نے پہلے والد صاحب کی طرف سے حج بدل ادا کیا، تو والد کی جانب سے ذمہ ساقط ہوگا یا نہیں؟

---

[۱] (لكنه يشترط) لصحة النيابة (أهلية المأمور لصحة الأفعال) ثم فرع عليه بقوله (فجاز حج الصرورة) بمهملة: من لم يحج (والمرأة) ولو أمة (والعبد وغيره) كالمراهق وغيرهم أولى لعدم الخلاف. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: وعلل في الفتح الكراهة في المرأة بما في المبسوط من أن حجها أنقص؛ إذ لا رمل عليها، ولا سعي في بطن الوادي، ولا رفع صوت بالتلبية، ولا حلق. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۰۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب في الفرق بين العبادة والعادة، ط: دار الفكر)

... وسواء كان رجلا أو امرأة إلا أنه يكره إحجاج المرأة، لكنه يجوز، أما الجواز فلحديث الخثعمية. ــــ وأما الكراهة فلأنه يدخل في حجها ضرب نقصان؛ لأن المرأة لا تستوفي سنن الحج فإنها لا ترمل في الطواف وفي السعي بين الصفا والمروة ولا تحلق. (بدائع الصنائع: ۲/ ۲۱۳، كتاب الحج، فصل نبات الحرم، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ المبسوط-شمس الأئمة السرخسي: ۴/ ۱۵۵، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت وغيره، ط: دار المعرفة- بيروت)

البتہ کسی مرد کا، کسی خاتون کو حج بدل کے طور پر بھیجنا غیر اولیٰ/ مکروہ ہے۔

الجواب حامداومصلیا:

آپ کا دوست اولاً اپنا فرض حج ادا کرے۔[1] اس کے بعد اپنے والد صاحب کی جانب سے حج بدل کرے، یا اپنا حج فرض خود ادا کرے اور کسی نیک اور معتمد آدمی کو- جو حج کر چکا ہو- رقم دے اور اس کے ذریعہ والد صاحب کی طرف سے حج بدل کروالے، اپنا فرض حج ادا کیے بغیر والد صاحب کی جانب حج بدل کرنا مکروہ ہوگا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ﴿ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا﴾ (آل عمران:۹۷)

عن أنس بن مالك، قال: نهينا أن نسأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن شيء، فكان يعجبنا أن يجيء الرجل من أهل البادية العاقل، فيسأله، ونحن نسمع، فجاء رجل من أهل البادية، فقال: يا محمد، أتانا رسولك فزعم لنا أنك تزعم أن الله أرسلك،... (وفيه) قال: وزعم رسولك أن علينا حج البيت من استطاع إليه سبيلا، قال: صدق، قال: ثم ولى، قال: والذي بعثك بالحق، لا أزيد عليهن، ولا أنقص منهن، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: لئن صدق ليدخلن الجنة. (الصحيح لمسلم:۱/۳۰-۳۱، رقم الحديث: ۱۰-(۱۲)، كتاب الإيمان، باب السوال عن أركان الإسلام، ط: ديوبند)

(۲) عن عبد الله بن عباس رضي الله عنهما، قال: كان الفضل رديف رسول الله صلى الله عليه وسلم، فجاءت امرأة من خثعم، فجعل الفضل ينظر إليها وتنظر إليه، وجعل النبي صلى الله عليه وسلم، يصرف وجه الفضل إلى الشق الآخر، فقالت: يا رسول الله إن فريضة الله على عباده في الحج أدركت أبي شيخا كبيرا، لا يثبت على الراحلة، أفأحج عنه؟ قال: نعم، وذلك في حجة الوداع. (صحيح البخاري:۱/۲۰۵، رقم الحديث: ۱۵۱۳، أول كتاب المناسك، باب وجوب الحج وفضله، ط: ديوبند)

قال في الفتح بعد ما أطال في الاستدلال: والذي يقتضيه النظر أن حج الصرورة عن غيره إن كان بعد تحقق الوجوب عليه بملك الزاد والراحلة والصحة فهو مكروه كراهة تحريم لأنه يتضيق عليه في أول سني الإمكان فيأثم بتركه، وكذا لو تنفل لنفسه ومع ذلك يصح لأن النهي ليس لعين الحج المفعول بل لغيره وهو الفوات، إذ الموت في سنة غير نادر. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار:۲/۶۰۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب في حج الصرورة، ط: دار الفكر)

وسواء كان الحاج قد حج عن نفسه، أو كان صرورة أنه يجوز في الحالين جميعا إلا أن الأفضل أن يكون قد حج عن نفسه... ولنا حديث الخثعمية "أن النبي - صلى الله عليه وسلم - قال لها حجي عن أبيك، ولم يستفسر أنها كانت حجت عن نفسها أو كانت صرورة. ولو كان الحكم يختلف لاستفسر؛ ولأن الأداء عن نفسه لم يجب في وقت معين فالوقت كما يصلح لحجه عن نفسه يصلح لحجه عن غيره، فإذا عينه لحجه عن غيره وقع عنه؛... إلا أن الأفضل أن يكون قد حج عن نفسه؛ لأنه بالحج عن غيره يصير تاركا إسقاط الفرض عن نفسه، فيتمكن في هذا الإحجاج ضرب كراهة، ولأنه إذا كان حج مرة كان أعرف بالمناسك. (بدائع الصنائع:۲/۲۱۳، كتاب الحج، فصل نبات الحرم، ط: دار الكتب العلمية)

[۱۷] اگر تہائی مال حج کے لیے ناکافی ہو، تو؟

۱۷۶۱- سوال: ایک شخص پر حج فرض تھا، مرتے وقت وصیت بھی کی؛ لیکن مرحوم کے ایک تہائی مال میں اتنی رقم نہیں ہے کہ اس سے اس کا حج بدل ادا کیا جا سکے، تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟ محمد یوسف بلیسریا، نواپور

الجواب حامداً ومصلیاً:

ایک تہائی مال کے ذریعہ جہاں سے بھی حج ہو سکتا ہے، وہاں سے حج کروایا جائے؛ خواہ جدہ سے ہو یا جدہ سے بھی نزدیک کسی اور علاقے سے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] عدم وصیت کی صورت میں ورثاء کا حج نہ کرنا

۱۷۶۲- سوال: مرنے والے کے متروکہ مال میں ایک تہائی رقم اتنی ہے کہ اس کے ذریعہ مرنے والا کا حج بدل ادا کیا جا سکتا ہے؛ لیکن مرنے والے نے اپنے حج کے متعلق کوئی وصیت نہیں کی ہے اور ورثاء کسی کو حج کے لیے نہیں بھیج رہے ہیں، تو کیا وہ [ورثاء] گنہ گار ہوں گے؟ بینوا توجروا۔ محمد یوسف بلیسریا، نواپور

الجواب حامداً ومصلیاً:

بسا اوقات انسان، دنیا کی محبت میں گرفتار ہو کر فرائض و واجبات سے غافل ہو جاتا ہے، جس کا اثر آنے والی [آخرت کی] زندگی میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے مال سے نوازا تھا، پھر بھی اس نے حج فرض ادا نہیں کیا، اور نہ ہی وصیت کی؛ اس لیے گنہ گار ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کو اپنی غلطی کی سزا بھگتنی پڑے۔ (۲)

---

(۱) قال محمد - رحمه الله - يحج عن الميت من بلده إذا بلغت النفقة، وإلا فمن حيث بلغ. (البحر الرائق: ۳/۷۰، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي)

الحادي عشر أن يحج عنه من وطنه إن اتسع الثلث وإلا فمن حيث يبلغ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۶۰۰، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب شروط الحج عن الغير، ط: دار الفكر - بيروت ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع إرشاد الساري، ص: ۶۴۰، باب الحج عن الغير، فصل لو أوصى بالحج يحج عنه من ثلث المال، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/۶۵۶، كتاب الحج، الفصل السادس عشر في الوصية بالحج، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) من عليه الحج إذا مات قبل أدائه فلا يخلو إما إن مات من غير وصية، وإما إن مات عن وصية، فإن مات من غير وصية يأثم بلا خلاف.... فإن لم يوص به حتى مات أثم بتفويته الفرض عن وقته مع إمكان الأداء في الجملة فيأثم =

جب اس نے حج کی وصیت نہیں کی ہے، تو ورثاء پر واجب اور ضروری نہیں ہے کہ وہ ان کی جانب سے حج کرائیں، اگر ورثاء مرحوم کے حج کے لیے کسی کو بھیج رہے ہیں، تو توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے حق میں قبول فرمالے، اور وہ دار و گیر سے بچ جائے، تاہم یہ ورثاء پر واجب نہیں، اگر وہ ایسا کرتے ہیں، تو ان کی جانب سے تبرع اور احسان ہوگا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] ایک عورت کا دوسری مرحومہ عورت کی جانب سے حج بدل کرنا

۱۷۶۳-سوال: ایک مرحومہ عورت کی طرف سے ایک نیک عورت کو حج بدل کے لیے بھیجا جارہا ہے اور حج بدل کے لیے جانے والی عورت کا شوہر بھی اس کے ساتھ اپنا حج ادا کرنے جائے، تو شوہر کا اپنا حج اور اس عورت کا دوسری مرحومہ عورت کی جانب سے حج بدل ادا کرنا صحیح ہوگا یا نہیں؟　　یو-ای-دادابھائی

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں کہ ایک عورت دوسری مرحومہ عورت کی طرف سے حج بدل کرے اور اس کا شوہر

=لكن يسقط عنه في حق أحكام الدنيا عندنا حتى لا يلزم الوارث الحج عنه من تركته؛ لأنه عبادة، والعبادات تسقط بموت من عليه سواء كانت بدنية أو مالية في حق أحكام الدنيا عندنا. (بدائع الصنائع: ۲۲۱/۲، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ المحيط البرهاني في الفقه النعماني: ۴۸۷/۲، كتاب المناسك، الفصل السادس عشر في الوصية بالحج، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ) ص: ۶۰۸، باب الفوات، حكم فوات الحج عن العمر، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

(۱) عن ابن عباس رضي الله عنهما، أن امرأة من جهينة، جاءت إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فقالت: إن أمي نذرت أن تحج فلم تحج حتى ماتت، أفأحج عنها؟ قال: نعم حجي عنها، أرأيت لو كان على أمك دين أكنت قاضية؟ اقضوا الله فالله أحق بالوفاء. (صحيح البخاري: ۱/۲۴۹-۲۵۰، رقم الحديث: ۱۸۵۲، كتاب جزاء الصيد، باب الحج والنذور عن الميت، والرجل يحج عن المرأة، ط: ديوبند)

ومن مات وعليه فرض الحج ولم يوص به، لم يلزم الوارث أن يحج عنه، وإن أحب أن يحج عنه حج، وأرجو أن يجزيه إن شاء الله تعالى. (الفتاوى التاتارخانية: ۶۶۷/۳، كتاب الحج، الفصل السادس عشر في الوصية بالحج، ط: زكريا - ديوبند ☆ بدائع الصنائع: ۲۲۱/۲، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۲۵۸/۱، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر - بيروت)

اس کے ساتھ رہے اور اپنا حج کرے، تو دونوں کا حج ہو جائے گا۔[۱] البتہ عورت حج بدل کے لیے جا رہی ہے، تو حج بدل کی شرائط کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہوگا، مثلاً حج بدل کے لیے جانے والی عورت نے اگر اپنا فرض حج ادا نہیں کیا ہے، تو اس کو حج بدل کے لیے نہ جانا چاہیے،[۲] نیز مرنے والی عورت نے اگر حج بدل کے لیے

---

(۱) (ویجوز إحجاج المرأة) بإذن زوج لها و وجود محرم معها (مع الكراهة). فيه أنه لا يظهر وجه الكراهة لا سيما في إحجاج المرأة عن المرأة، فإن الظاهر أن يكون أولى و أنسب و يدل عليه إطلاق "الفتاویٰ السراجية" حيث قال سواء كان عبدا أو أمة من غير ذكر امرأة. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۶۴۰-۶۳۹، باب الحج عن الغير، جواز إحجاج المرأة و العبد و الأمة، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة)

صاحب بدائع نے رقم فرمایا ہے کہ عورتوں کو حج بدل کے لیے بھیجنا جائز تو ہے، البتہ مکروہ ہے، کراہت کی علت یہ بیان فرمائی ہے کہ عورتوں کے حج میں [مردوں کے مقابلے میں] یک گونہ نقص رہتا ہے، کہ وہ طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی میں رمل نہیں کر سکتی، اور نہ ہی وہ حلق کرا سکتی ہے، ان کی تحریر ملاحظہ فرمائیں:

وسواء كان رجلا أو امرأة إلا أنه يكره إحجاج المرأة، لكنه يجوز، أما الجواز فلحديث الخثعمية. وأما الكراهة فلأنه يدخل في حجها ضرب نقصان؛ لأن المرأة لا تستوفي سنن الحج؛ فإنها لا ترمل في الطواف، وفي السعي بين الصفا والمروة، ولا تحلق. (بدائع الصنائع: ۲/ ۲۱۳، كتاب الحج، فصل نبات الحرم، ط: دار الكتب العلمية)

ناچیز مرتب عرض کرتا ہے کہ کراہت کی جو وجہ علامہ کاسانیؒ نے ذکر فرمائی ہے، یہ اس صورت میں متحقق ہوگی، جب کہ کوئی خاتون، کسی مرد کی جانب سے حج کرے، لیکن اگر وہ کسی خاتون کا حج بدل کر رہی ہے، تو پھر کراہت کی مذکورہ وجہ متحقق نہیں ہوگی۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

(۲) والأفضل للإنسان إذا أراد أن يحج رجلاً عن نفسه أن يحج رجلاً قد حج عن نفسه؛ لأنه أهدى إلى إقامة الأعمال؛ ولأنه أبعد عن الخلاف، فإن الذي لم يحج عن حجة الإسلام عن نفسه لم تجز حجته عن غيره عند بعض الناس، ومع هذا لو أحج رجلاً لم يحج عن نفسه حجة الإسلام يجوز عندنا، وسقط الحج عن الآمر؛ لأن النبي عليه السلام حين أمر الخثعمية، قال: الحج عن أبيها، لم يستفسر أنها هل حجت عن نفسها أم لا؟. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۲/ ۴۷۸، كتاب المناسك، الفصل الخامس عشر: في الرجل يحج عن آخر، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۴/ ۱۵۱، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت وغيره، أوصى أن يحج عنه بألف درهم فبلغت حججا، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۶۴۹، كتاب الحج، الفصل الخامس عشر: في الرجل يحج عن آخر، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۷، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر- بيروت)

وصیت کی ہو، تو میقات سے حج کا احرام باندھنا ضروری ہے؛(۳) الغرض حج بدل کے لیے جانے والی عورت کے لیے حج بدل کے شرائط کا خیال رکھنا ضروری ہے۔(۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] ۱- دوسرے کی جانب سے حج کرتے وقت نیت کیا کرنی چاہیے؟

[۲۱] ۲- حج بدل میں احرام کا طریقہ

۱۷۶۴- سوال: میرا برادر نسبتی (سالا) سعودی عرب میں نوکری کرتا ہے، وہاں اقامت کے دوران اس نے دو حج ادا کیے ہیں، اب تیسری مرتبہ اپنے مرحوم چچا کی جانب سے حج کرنا چاہتا ہے، تو نیت کیا کرے؟ حضرت والا سے درخواست ہے کہ احرام کا طریقہ بھی بیان فرمائیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

غسل اور لوازمات غسل (ناخن تراشنا، موئے زیر ناف صاف کرنا، میل کچیل خوب اچھی طرح دور کرنا) سے فراغت حاصل کرے، اگر شادی شدہ ہو، تو غسل سے پہلے وظیفۂ زوجیت ادا کرے، پھر احرام کی چادر باندھ کر سب سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے، پھر تلبیہ پڑھے، پھر حج یا عمرہ- جس کی ادائیگی مطلوب ہے- کی نیت کرے۔(۱)

---

(۳) (العاشر أن يحرم من الميقات) أي من ميقات الآمر، ليشمل المكي وغيره، (فلو اعتمر وقد أمره بالحج ثم حج من عامه من مكة لا يجوز). [المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع إرشاد الساري، ص: ۶۲۲، باب الحج عن الغير، فصل في شرائط جواز الإحجاج، وهي عشرون، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة☆البحر الرائق: ۶۶/۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي]

(۱) حج بدل کی تفصیلی شرائط کے لیے رجوع کریں: درمختار کی عبارت: (لكنه يشترط) لصحة النيابة (أهلية المأمور لصحة الأفعال) ثم فرع عليه بقوله (فجاز حج الصرورة) بمهملة: من لم يحج (والمرأة) ولو أمة (والعبد وغيره كالمراهق وغيرهم أولى لعدم الخلاف" کے ذیل میں کی گئی علامہ شامی کی مکمل بحث کی جانب۔ (رد المحتار على الدر المختار: ۶۰۳/۲، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب في الفرق بين العبادة والعادة، ط: دار الفكر)

(۲) (وأما شرطه فالنية) حتى لا يصير محرما بالتلبية بدون نية الإحرام كذا في محيط السرخسي، ولا يصير شارعا بمجرد النية ما لم يأت بالتلبية أو ما يقوم مقامها من الذكر أو سوق الهدي أو تقليد البدنة كذا في المضمرات.

وإذا أراد الإحرام اغتسل أو توضأ والغسل أفضل إلا أن هذا الغسل للتنظيف حتى تؤمر به الحائض كذا في الهداية. ويستحب في حق النفساء والصبي ويستحب كمال التنظيف من قص الأظفار والشارب وحلق الإبطين=

نیت کرتے وقت دل سے پختہ ارادہ کرے، بہتر ہے کہ زبان سے بھی کہے کہ: اے اللہ! میں اپنے چچا (جو نام ہو، اسے ذکر کرے) کی جانب سے حج یا عمرہ کا احرام باندھتا ہوں، تو اس کو میرے لیے آسان فرما اس کو قبول فرما، ہر وقت چچا کا نام لینا ضروری نہیں ہے، صرف نیت کے وقت نام لے لے، کافی ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] حج بدل اپنے بھانجے سے کروانا

۱۷۶۵- سوال: خالہ اپنے بھانجے کو محرم کے طور پر اپنے ساتھ حج کے لیے لے جاتی ہے اور لڑکا کسی قسم کی نوکری یا تجارت نہیں کرتا ہے، تو لڑکے کا حج فرض ادا ہوگا یا نفل؟ اور اگر خالہ لڑکے کا پورا خرچہ ہدیہ کے طور پر دیدے تو کیا فرض حج ادا ہو جائے گا؟

خالہ اپنے بھانجے کو اپنے شوہر کے حج بدل کے طور پر لے جائے، تو یہ درست ہے یا نہیں؟ اور حج بدل کی نیت سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ شوہر نے حج بدل کی وصیت نہیں کی ہے۔

=والعانة والرأس لمن اعتاده من الرجال أو أراده وإلا فتسريحه وإزالة الشعث والوسخ عنه، وعن بدنه بغسله بالخطمي والأشنان ونحوهما، ومن المستحب عند إرادة الإحرام جماع زوجته أو جاريته إن كانت معه ولا مانع من الجماع فإنه من السنة، هكذا في البحر الرائق.

وينزع المخيط والخف ويلبس ثوبين إزارا ورداء جديدين أو غسيلين، والجديد أفضل، كذا في فتاوى قاضي خان ولو لبس ثوبا واحدا يستر عورته، جاز كذا في الاختيار شرح المختار، والإزار من السرة إلى ما تحت الركبة والرداء على الظهر والكتفين، والصدر ويشده فوق السرة وإن غرز طرفيه في إزاره فلا بأس به ولو خلله بخلال أو مسلة أو شده على نفسه بحبل أساء ولا شيء عليه كذا في البحر الرائق. ويدخل الرداء تحت يمينه ويلقيه على كتفه اليسرى، ويبقي كتفه الأيمن مكشوفا كذا في خزانة المفتين. . . . ـــــــــــــ ثم يصلي ركعتين ويقرأ فيهما بما شاء. . . ، ثم إذا فرغ من صلاته يطلب من الله التيسير ويدعو: اللهم إني أريد الحج فيسره لي وتقبله مني، كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۲۲، كتاب المناسك، الباب الثالث في الإحرام، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) التاسع نية المحجوج عنه عند الإحرام، وهي أن يقول بلسانه -وهو الأفضل-: أحرمت عن فلان أو لبيك عن فلان وإن شاء اكتفى بنية القلب. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۶۲۲، باب الحج عن الغير، فصل في شرائط جواز الإحجاج، وهي عشرون، التاسع النية عن المحجوج عنه عند الإحرام، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: مكة المكرمة☆ بدائع الصنائع: ۲/ ۲۱۳، كتاب الحج، فصل نبات الحرم، ط: دار الكتب العلمية ☆البحر الرائق: ۳/ ۶۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي)

الجواب حامداومصلیا:

(۱) خالہ اپنے بھانجے کو- جو کہ صاحب نصاب اور حج پر بذاتہٖ قادر نہیں ہے- حج کے لیے لے جائے اور وہ بھانجا فرض حج کا احرام باندھے، تو فرض حج ادا ہوگا، خواہ خالہ اپنے بھانجے کو خرچہ کا مالک بنائے یا نہ بنائے، اگر وہ مکہ مکرمہ پہنچ گیا ہے، تو اس پر حج فرض ہوگا۔[1]

(۲) اگر شوہر پر حج فرض تھا اور حج ادا کروانے کی وصیت بھی کی ہے، تو جس نے فرض حج ادا نہیں کیا ہے، اس سے حج بدل کروانا مکروہ ہے؛ کیوں کہ حج بدل میں حج میقاتی ہونا ضروری ہے، یعنی میقات سے حج کا احرام باندھنا ضروری ہے اور یہ شخص عمرہ کا احرام باندھے گا؛ جو بعض علماء کے نزدیک جائز نہیں ہے، لیکن صورت مسئولہ میں، جب کہ شوہر نے وصیت نہیں کی ہے، عورت' شوہر کے لیے حج بدل کے طور پر اپنے بھانجے کو لے جائے، تو اس میں حرج کی کوئی وجہ نہیں ہے، حج ادا ہو جائے گا، ایسی صورت میں حج بدل کا میقاتی ہونا ضروری نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) "الحج لا يجب على الفقير" إنما المراد به الآفاقي قبل وصوله إلى الميقات. ــــــــ وبدخوله إلى مكة ووصوله إلى الكعبة تعين عليه فرضية الحج، سواء أحرم به أم لا. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ) ص: ۵۷، باب شرائط الحج، النوع الأول: شرائط الوجوب...، الشرط السادس، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة ☆فتح القدير: ۴۱۹/۲، كتاب الحج، مقدمة: يكره الخروج إلى الحج، ط: دار الفكر- بيروت ☆رد المحتار على الدر المختار: ۴۶۰/۲، كتاب الحج، مطلب في حج الصرورة، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) والأفضل للإنسان إذا أراد أن يحج رجلاً عن نفسه أن يحج رجلاً قد حج عن نفسه؛ لأنه أهدى إلى إقامة الأعمال، ولأنه أبعد عن الخلاف، فإن الذي لم يحج عن حجة الإسلام عن نفسه لم تجز حجته عن غيره عند بعض الناس، ومع هذا لو أحج رجلاً لم يحج عن نفسه حجة الإسلام يجوز عندنا، وسقط الحج عن الآمر؛ لأن النبي عليه السلام حين أمر الخثعمية، قال: الحج عن أبيها لم يستفسر أنها هل حجت عن نفسها أم لا؟. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۴۷۸/۲، كتاب المناسك، الفصل الخامس عشر: في الرجل يحج عن آخر، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆الأصل المعروف بالمبسوط-أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني (م: ۱۸۹هـ): ۵۰۴/۲، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت وغيره، ت: أبو الوفا الأفغاني، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية- كراتشي ☆المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱۵۱/۴، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت وغيره، ط: دار المعرفة- بيروت ☆تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ): ۴۲۹/۱، كتاب المناسك، مسائل الأمر بالحج، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆الفتاوى التاتارخانية: ۶۴۹/۳، كتاب الحج، الفصل الخامس عشر: في الحج عن الغير، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۲۵۷/۱، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر ☆ إرشاد الساري إلى =

[۲۳] والدہ کی طرف سے حج بدل کی نیت کر کے معذور ہو جانا

۱۷۶۶- سوال: میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، انتقال کے برسوں بعد میں نے دل میں یہ نیت کی تھی کہ میں اپنی والدہ کی طرف سے حج کروں گا، میں نے اپنا حج تو ادا کر لیا؛ لیکن فی الحال میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؛ لہٰذا میں والدہ کی جانب سے حج کے لیے نہیں جا سکتا، تو اب میں کیا کروں؟ کیا میں ایصال ثواب کے لیے کوئی اور صورت اختیار کروں، جس سے حق ادا ہو جائے، یا پھر کسی اور کو حج بدل کے لیے بھیجوں؟ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم سے امید ہے کہ وضاحت فرمائیں گے۔

الجواب حامداومصلیا:

اگر آپ نے فقط دل میں ہی نیت کی تھی، زبان سے کچھ نہیں کہا تھا، صرف اس بات کا ارادہ کیا تھا کہ والدہ کی طرف سے حج کروں گا، تو اگر والدہ پر حج فرض تھا اور انہوں نے اپنی زندگی میں حج نہیں کیا تھا اور نہ ہی وصیت کی تھی، تو بہتر ہے کہ ان کی جانب سے حج کروالیں۔(۱) اور اگر حج فرض نہیں تھا، تو پھر کوئی ایسا کام

=مناسك الملا علي القاري، ص:۶۵۰، باب الحج عن الغير، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة)

عن ابن عباس رضي الله عنهما، أن امرأة من جهينة، جاءت إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فقالت: إن أمي نذرت أن تحج فلم تحج حتى ماتت، أفأحج عنها؟ قال: نعم حجي عنها، أرأيت لو كان على أمك دين أكنت قاضية؟ اقضوا الله فالله أحق بالوفاء. (صحيح البخاري:۱/۲۴۹-۲۵۰، رقم الحديث: ۱۸۵۲، كتاب جزاء الصيد، باب الحج والنذور عن الميت، والرجل يحج عن المرأة، ط: ديوبند)

ومن مات وعليه فرض الحج ولم يوص به، لم يلزم الوارث أن يحج عنه، وإن أحب أن يحج عنه حج، وأرجو أن يجزيه إن شاء الله تعالى. (الفتاوى التاتارخانية: ۳/۶۶۷، كتاب الحج، الفصل السادس عشر في الوصية بالحج، ط: زكريا- ديوبند ☆ بدائع الصنائع: ۲/۲۲۱، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۵۸، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر- بيروت)

(۱) عن جابر بن عبد الله، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حج عن أبيه وأمه، فقد قضى عنه حجته وكان له فضل عشر حجج. (سنن الدارقطني- أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي بن مسعود بن النعمان بن دينار البغدادي الدارقطني (م: ۳۸۵هـ): ۳/۳۰۰، رقم الحديث: ۲۶۱۰، كتاب الحج، باب المواقيت، ت: شعيب الارنؤوط، وجماعة من العلماء، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت- لبنان)

عن ابن عباس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حج عن والديه، أو قضى عنهما مغرما بعثه الله يوم القيامة مع الأبرار. (المعجم الأوسط- سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰هـ) =

کریں جس سے والدہ کو ہمیشہ ثواب پہنچتا رہے، مثلاً کسی مدرسہ یا مسجد میں کوئی چیز بنوادیں یا رقم دے کر صدقہ جاریہ کا ثواب حاصل کریں۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] وصی کے ذمہ میت کے وطن سے حج بدل کروانا ضروری ہے

۱۷۶۷- سوال: ایک شخص نے وصیت کی کہ میرے پیسوں سے حج کروالینا، دریافت یہ کرنا ہے کہ وصی جدہ میں مقیم کسی شخص سے حج بدل کرواسکتا ہے یا نہیں؟ یا پھر یہاں [کرمالی، گجرات، ہندوستان] سے کسی شخص کو بھیجنا پڑے گا؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامدا ومصليا:

میت پر اگر حج فرض تھا اور اس نے وصیت کر کے ایک شخص کو حج کی رقم دے کر وکیل بنایا ہے، تو میت کی جہاں وفات ہوئی ہے، وہیں سے حج کروانا ضروری ہے، یا ایسی جگہ سے کہ جہاں سے انسان صبح جا کر شام کو واپس آجائے، مثلاً عمروڈا، کوسمبا، کیم یا بھروچ سے آپ حج بدل کے لیے بھیجیں گے، تو حج ادا ہوگا اور اگر بمبئی سے بھیجا، تو جائز نہیں ہے۔[۲] اسی طرح کسی کو جدہ سے بھیجیں گے، تب بھی میت کی جانب سے حج ادا نہیں ہوگا،

=: ۱۱/۸، رقم الحديث: ۷۸۰۰، باب الميم، باب من اسمه محمود، ت: طارق بن عوض الله، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين - القاهرة ☆الترغيب في فضائل الأعمال وثواب ذلك- أبو حفص عمر بن أحمد بن عثمان، البغدادي المعروف بـ ابن شاهين (م: ۳۸۵هـ) ص: ۹۴، رقم الحديث: ۳۰۳، باب مختصر من كتابي كتاب بر الوالدين وما فيه من الفضل والندب على ذلك، ت: محمد حسن محمد حسن إسماعيل، ط: دار الكتب العلمية، بيروت ☆سنن الدارقطني: ۲۹۹/۳، رقم الحديث: ۲۶۰۸، كتاب الحج، باب المواقيت)

ومن مات وعليه فرض الحج ولم يوص به، لم يلزم الوارث أن يحج عنه، وإن أحب أن يحج عنه حجّ، وأرجو أن يجزيه إن شاء الله تعالى. (الفتاوى التاتارخانية: ۶۶۷/۳، كتاب الحج، الفصل السادس عشر في الوصية بالحج، ط: زكريا- ديوبند ☆بدائع الصنائع: ۲۲۱/۲، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية☆الفتاوى الهندية: ۲۵۸/۱، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر- بيروت)

(۱) عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: "إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة: إلا من صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعو له". (الصحيح لمسلم: ۴۱/۲، رقم الحديث: ۱۴-(۱۶۳۱)، كتاب الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ط: ديوبند)

(۲) ويحج عنه من بلده الذي يسكنه؛ لأن الحج مفروض عليه من بلده فمطلق الوصية ينصرف إليه، ولهذا قال=

وکیل-جس کو رقم سپرد کیا گیا ہے-گنہ گار ہوگا اور اگر جدہ سے بھیجا تو جو خرچ ہوا ہے، وہ وکیل کو دینا پڑے گا اور دوبارہ وطن سے کسی کو حج کے لیے بھیجنا لازم ہوگا۔ (زبدۃ المناسک جلد دوم صفحہ ۱۵۳)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] حج بدل: مرنے والے کے مقام سے ضروری ہے؟

۱۷۶۸-سوال: ایک آدمی نے اپنے حج کی وصیت کی، اس کے ورثاء دوسرے آدمی کو حج کے لیے بھیجنا چاہتے ہیں، حج بدل کے لیے جانے والا شخص اپنے ملک سے جدہ جاتا ہے اور وہاں مقیم ہو جاتا ہے، پھر حج کے دنوں میں احرام باندھ کر مرحوم کے لیے حج بدل کرتا ہے، تو اس طرح کرنا جائز ہے؟ نیز جانے والے آدمی کے لیے اپنے ملک سے احرام باندھنا چاہیے یا نہیں؟ اور کس کے حج کا احرام باندھے؟

الجواب حامدا ومصليا:

صورت مسئولہ میں جب مرحوم نے حج بدل کی وصیت کی ہے، تو حج بدل میں جانے والے آدمی کے لیے جدہ میں ٹھہرنے کی نیت سے جانا جائز نہیں، اس کا سفر ہندوستان سے مکہ شریف کا ہونا ضروری ہے اور حج افراد کا احرام باندھے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= محمد: - رحمه الله - روى ابن رستم عنه في خراساني أدركه الموت بمكة فأوصى أن يحج عنه من خراسان، وروى هشام عن أبي يوسف في مكي قدم الري فحضره الموت فأوصى أن يحج عنه حج عنه من مكة. (بدائع الصنائع: ۲/ ۲۲۲، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

وإذا أوصى بالحج، فإنه يحج عنه من بلده؛ لأنه لو عزم على الخروج بنفسه للحج كان يخرج من بلده ويتجهز لسفر الحج من بلده، فكذلك إذا أوصى به بعد موته فالظاهر أن مقصوده تجهيز من يحج عنه من بلده، وإن مات في الطريق، فإن كان خرج للتجارة، فإنه يحج عنه من بلده أيضا، وإن خرج هو يريد الحج فمات في الطريق يحج عنه من حيث مات. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۲۷/ ۱۷۳، كتاب الوصايا، باب الوصية في الحج، ط: دار المعرفة-بيروت)

[۱] زبدۃ المناسک: ۲/ ۱۵۳، ط: الجمعیۃ پریس-دہلی۔

(قوله فلو أحج الوصي عنه من غيره) أي من غير بلده فيما إذا وجب الإحجاج من بلده لم يصح ويضمن ويكون الحج له ويحج عن الميت ثانيا لأنه خالف إلا أن يكون ذلك المكان قريبا من بلده بحيث يبلغ إليه ويرجع إلى الوطن قبل الليل كما في اللباب والبحر. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۰۵، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب العمل على القياس دون الاستحسان هنا، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) قد تقدم تخريجه.

[۲۶] مفرد کے لیے قربانی کا حکم

۱۷۶۹- سوال: ایک شخص جدہ میں مقیم ہے، اور اپنی مرحوم نانی کی جانب سے نفلی حج کرنا چاہتا ہے، تو حج کی قربانی اپنے وطن (گجرات، انڈیا) میں کرسکتا ہے، یا پھر مکہ میں ہی کرنی پڑے گی؟ اگر یہاں (گجرات میں) کرے، تو کوئی حرج لازم آئے گا؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

حج کی قربانی سے کیا مراد ہے؟ بالتفصیل لکھیں، تو جواب دیا جائے گا۔

نوٹ: جدہ میں رہنے والا شخص حج افراد کرے گا، حج تمتع نہیں، لہٰذا اس پر دم تمتع لازم نہیں آئے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] نفلی حج وعمرہ

۱۷۷۰- سوال: ایک شخص جدہ میں مقیم ہے، اس سے انڈیا میں مقیم شخص نے اپنی دادی کی جانب سے حج کرنے کے لیے کہا ہے، نہ تو ان کی دادی پر حج فرض تھا، اور نہ ہی انہوں نے وصیت کی تھی، یہ نفلی حج ہوگا، تو جدہ میں مقیم شخص کے لیے اس کے ادا کرنے کا طریقہ کیا ہوگا، وضاحت کی درخواست ہے۔

نوٹ: حج افراد کا ارادہ ہے اور انڈیا میں حج کی قربانی کا ارادہ ہے، تو کیا یہ درست ہے؟

ایک شخص زندہ ہے، اس کے نام کا عمرہ (نفل) جدہ سے کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اور نفل طواف کرسکتے ہیں یا نہیں، مثلاً: ماں باپ زندہ ہیں، انہوں نے بفضل اللہ حج وعمرہ کرلیا ہے، اس کے باوجود ان کی جانب

---

(۱) (والمكي ومن في حكمه يفرد فقط) ولو قرن أو تمتع جاز وأساء، وعليه دم جبر. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله ولو قرن أو تمتع جاز وأساء إلخ) أي صح مع الكراهة للنهي عنه، وهذا ما مشى عليه في التحفة وغاية البيان والعناية والسراج وشرح الإسبيجابي على مختصر الطحاوي. [و فيه بحث طويل ، فليراجع ثمه. مجتبى حسن القاسمي] (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۳۹، كتاب الحج، باب التمتع، ط: دار الفكر - بيروت☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۱/۲۳۶، كتاب الحج، باب القران والتمتع، ط: دار إحياء التراث العربي☆ فتح القدير: ۳/۱۲، كتاب الحج، باب التمتع، ط: دار الفكر - بيروت)

سے نفلی عمرہ وطواف کرنے کا ارادہ ہے، تو کیا یہ جائز ہے؟ بینوا تو جروا۔

الجواب حامداو مصلیا:

آپ، اپنے دوست کی دادی کی جانب سے حج نفل کرنا چاہتے ہیں، تو احرام باندھتے وقت اس کی نیت کریں، کہ میں فلاں کی جانب سے حج کرتا ہوں، زبان سے کہنا مستحب ہے، صرف دل سے ارادہ کر لینا بھی کافی ہے۔ احرام کے بعد جو ارکان ادا کرنے ہیں، ان کو ادا کرتے رہیں، ان کی ادائیگی کے وقت نیت کی ضرورت نہیں ہے، نیت صرف میقات پر کرنا ہے۔(۱)

چوں کہ آپ جدہ میں ہیں یعنی آپ میقات کے اندر ہے؛ لہٰذا آپ کو صرف حج کا احرام باندھنا ہے۔ اور حج افراد میں قربانی واجب نہیں ہوتی، تمتع وقران میں دم شکر واجب ہے؛ لہٰذا مذکورصورت میں قربانی کو واجب سمجھنا جائز نہیں ہے؛ ہاں اگر ثواب کی نیت سے انڈیا میں قربانی کراتے ہوں، تو اس کا ثواب مل جائے گا۔(۲)

زندہ اسی طرح مردہ دونوں ہی کی طرف سے جتنے چاہیں، عمرہ وطواف نفل کی نیت سے کر سکتے ہیں، ثواب پہنچ جائے گا، عمرہ کرتے وقت نیت کرو یا کرنے کے بعد، بہر صورت ثواب پہنچ جائے گا۔(۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱)التاسع نية المحجوج عنه عند الإحرام، وهي أن يقول بلسانه -وهو الأفضل-: أحرمت عن فلان أو لبيك عن فلان و إن شاء اكتفي بنية القلب.(المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري(م:۱۰۱۴ھ)ص:۶۲۲، باب الحج عن الغير، فصل في شرائط جواز الإحجاج، وهي عشرون، التاسع النية عن المحجوج عنه عند الإحرام، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: مكة المكرمة☆ بدائع الصنائع:۲/ ۲۱۳، كتاب الحج، فصل نبات الحرم، ط: دار الكتب العلمية☆ البحر الرائق:۳/ ۶۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲)"ويجب" أي إجماعا"على القارن والمتمتع هدي شكرا لما وفقه الله تبارك وتعالى للجمع بين النسكين في أشهر الحج بسفر واحد".(المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م:۱۰۱۴ھ)ص:۳۶۸، باب القران، فصل في هدي القارن والمتمتع، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: مكة المكرمة)

وفي الخانية: ويجب الدم على القارن و المتمتع شكرا لما أنعم الله تعالى عليه بتيسير الجمع بين العبادتين. (الفتاوى الخانية- فخر الدين حسن بن منصور الأوزجندي(م:۵۹۲ھـ):۱/ ۳۰۴، كتاب الحج، فصل في التمتع، ط: كوئٹه، مثل زكريا-ديوبند☆ الفتاوى الهندية:۱/ ۲۳۹، كتاب المناسك، الباب السابع في القران والتمتع، ط: دار الفكر-بيروت)

(۳)عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: "إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة: إلا من =

[۲۸] حج افراد، تمتع اور قران میں دم [قربانی] کا وجوب

۱۷۷۱- سوال: ایک شخص مرحوم کی جانب سے حج بدل، اس کی وصیت کے بغیر اپنی طرف سے کررہا ہے، وہ جدہ میں مقیم ہے، اور مرحوم کا وارث یا رشتے دار نہیں ہے، تو کیا اس کا جدہ سے حج کرنا مرحوم کی جانب سے کفایت کرجائے گا؟ اور اس حج کی قربانی کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اپنے وطن [گجرات، انڈیا] میں کی، تو ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداومصليا:

وصیت کے بغیر اگر وہ اپنی طرف سے جدہ سے حج بدل کرے، تو ان شاء اللہ فرض حج ادا ہوجائے گا۔ (۱)

=صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعو له ".(الصحيح لمسلم:۲/۴۱، رقم الحديث:۱۴-(۱۶۳۱)، كتاب الوصية، باب مايلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ط: ديوبند)

الأصل في هذا الباب أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة، أو صوما، أو صدقة، أو غيرها، عند أهل السنة والجماعة، لما روي عن النبي عليه الصلاة والسلام: أنه ضحى بكبشين أملحين، أحدهما عن نفسه، والآخر عن أمته، ممن أقر بوحدانية الله تعالى، وشهد له بالبلاغ جعل تضحية إحدى الشاتين لأمته.(الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ):۱/۱۷۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت☆البحر الرائق:۳/۶۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي☆بدائع الصنائع:۲/۲۱۲، كتاب الحج، فصل نبات الحرم، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۱) جن کی جانب سے حج بدل کیا جائے، اگر انہوں نے وصیت کی ہو، تو ان کے حج فرض کی طرف سے کفایت کرے گا، اور اگر وصیت نہ کی ہو، اور وارث اپنی طرف سے تبرعا حج کرے یا کرائے، تب بھی امام ابوحنیفہؒ کی صراحت کے مطابق حج فرض کی جانب سے ان شاء اللہ کافی ہوگا، البتہ اگر اجنبی تبرعا حج کرے، تو حج فرض کی طرف سے کفایت کرے گا یا نہیں؟ روایت اس سلسلے میں موجود نہیں ہے، بعض اصول کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اس صورت میں بھی ان شاء اللہ حج فرض کی جانب سے کفایت کرے گا، تاہم متاخرین کی روایت یا یوں کہیے کہ عبارت مختلف ہے، ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

(وبشرط الأمر به) أي بالحج عنه (فلايجوز حج الغير بغير إذنه إلا إذا حج) أو أحج (الوارث عن مورثه) [الدر المختار]

قال ابن عابدين: (قوله إلا إذا حج أو أحج الوارث) أي فيجزئه إن شاء الله تعالى كما في البدائع واللباب، وهذا إذا لم يوص المورث، ... ثم اعلم أن التقييد بالوارث يفهم منه أن الأجنبي يخالفه وإلا لزم إلغاء هذا الشرط من أصله، والعجب أنه في اللباب ذكر هذا الشرط وعمم شارحه الوارث وغيره من أهل التبرع.

وعبارة اللباب وشرحه هكذا: (الرابع الأمر) أي بالحج (فلايجوز حج غيره بغير أمره إن أوصى به)... (وإن=

اس پر دم تمتع واجب نہیں ہے؛ کیوں کہ مکہ اور اس کے اطراف میں رہنے والے کو صرف حج کا احرام باندھنا ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] چلنے پھرنے سے عاجز ہونے والے کا اپنی زندگی میں حج بدل کروانا

۱۷۷۲- سوال: میری والدہ صاحبہ پر حج فرض ہے؛ لیکن ابھی تک ادا نہیں کر سکی ہے، اب ضعیف اور کمزوری اس قدر لاحق ہوگئی ہے کہ حج کی ادائیگی کی طاقت نہیں رہی، نیز کسی مددگار محرم کو ساتھ لے جانے پر بھی قادر نہیں ہے، بس اتنے پیسے ہیں کہ خود اپنا حج کر سکے۔

=لم يوص به) أي بالإحجاج (فتبرع عنه الوارث) وكذا من هم أهل التبرع (فحج) أي الوارث ونحوه (بنفسه) أي عنه (أو أحج عنه غيره جاز) والمعنى جاز عن حجة الإسلام إن شاء الله تعالى كما قاله في الكبير. وحاصله أن ما سبق يحكم بجوازه ألبتة، وهذا مقيد بالمشيئة. ففي مناسك السروجي: لو مات رجل بعد وجوب الحج ولم يوص به فحج رجل عنه أو حج عن أبيه أو أمه عن حجة الإسلام من غير وصية، قال أبو حنيفة: يجزيه إن شاء الله، وبعد الوصية يجزيه من غير المشيئة، اهـ ثم أعاد في شرح اللباب المسألة في محل آخر، وقال: فلو حج عنه الوارث أو أجنبي يجزيه وتسقط عنه حجة الإسلام إن شاء الله تعالى لأنه إيصال للثواب، وهو لا يختص بأحد من قريب أو بعيد على ما صرح به الكرماني والسروجي اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۹۹، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب في الفرق بين العبادة والقربة والطاعة، ط: دار الفكر-بيروت)

(قوله أوصى بحج إلخ) قيد بالوصية لأنه لو كان لم يوص فتبرع عنه الوارث بالحج أو الإحجاج يصح كما قدمه المصنف: أي يصح عن الميت عن حجة الإسلام إن شاء الله تعالى كما قدمناه. ونقل ط عن الولوالجية أن التعليق بالمشيئة على القبول لا على الجواز، وقدمنا أيضا عن شرح اللباب أن الوارث غير قيد، فإذا لم يوص يجزئه تبرع الوارث والأجنبي عنه. (المصدر السابق: ۲/۶۰۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب العمل على القياس دون الاستحسان هنا ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري- الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ)، ص: ۶۱۳-۶۱۴، باب الحج عن الغير، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة)

(۲) (والمكي ومن في حكمه يفرد فقط) ولو قرن أو تمتع جاز وأساء، وعليه دم جبر. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ولو قرن أو تمتع جاز وأساء إلخ) أي صح مع الكراهة للنهي عنه، وهذا ما مشى عليه في التحفة وغاية البيان والعناية والسراج وشرح الإسبيجابي على مختصر الطحاوي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۳۹، كتاب الحج، باب التمتع، ط: دار الفكر- بيروت ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۱/۲۳۶، كتاب الحج، باب القران والتمتع، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ فتح القدير: ۳/۱۶، كتاب الحج، باب التمتع، ط: دار الفكر-بيروت)

گھر کے اندر تو چل پھر لیتی ہے؛ لیکن ایک محلہ سے دوسرے محلہ تک چل کر جانے کی قدرت نہیں ہے، اسی طرح دوسرے گاؤں جانا ہو، تو اگر گاڑی وغیرہ ہے، تو جا سکتی ہے، ورنہ نہیں، غرضیکہ چلنے پھرنے پر قدرت نہیں رہی، ایسی حالت میں وہ اپنے بیٹے کو حج بدل کے لیے بھیجنا چاہتی ہے، تو کیا ان کی حیات میں اس طرح حج بدل کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداومصليا:

(۱) سفر اگر لمبا ہو، یعنی ۴۸ر میل کی دوری کا ہو، تو خاتون کے ساتھ محرم کا ہونا ضروری ہے، سفر حج کافی لمبا سفر ہے، اس لیے بغیر محرم کے آپ کی والدہ کے لیے حج میں جانا درست نہیں، محرم کو لے جانے کا خرچ نہیں ہے؛ لہٰذا آپ کی والدہ حج نہیں کرے گی، تو گنہگار نہ ہوگی، وصیت لکھ دے کہ میں مرجاؤں، تو میری جانب سے حج بدل ادا کرلیا جائے۔[۱]

(۲) آپ کی والدہ اس قدر کمزور اور ضعیف ہوگئی ہیں کہ سفر حج پر قدرت نہیں رکھتیں، فقہاء نے لکھا ہے کہ حج کی ادائیگی کے لیے بدن کی سلامتی اور تندرستی کا ہونا ضروری ہے، آپ کی والدہ دوسرے محلہ تک جانے میں گاڑی کی محتاج ہے یا دوسرے کی مدد کی محتاج ہے؛ لہٰذا اگر اس پر حج فرض ہے، [جیسا کہ آپ نے لکھا ہے] تو زندگی میں ہی دوسرے کو حج بدل کے لیے بھیج سکتی ہے۔ (شامی جلد ۲ صفحہ ۱۹۵، فتاویٰ عالم گیری)[۲]

---

(۱) قد مر تخريجه غير مرة.

[۲] (صحيح) البدن (بصير) غير محبوس وخائف من سلطان يمنع منه. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله صحيح البدن) أي سالم عن الآفات المانعة عن القيام بما لا بد منه في السفر، فلا يجب على مقعد ومفلوج وشيخ كبير لا يثبت على الراحلة بنفسه وأعمى، وإن وجد قائدا، ومحبوس، وخائف من سلطان لا بأنفسهم، ولا بالنيابة في ظاهر المذهب عن الإمام وهو رواية عنهما وظاهر الرواية عنهما وجوب الإحجاج عليهم، ويجزيهم إن دام العجز وإن زال أعادوا بأنفسهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵۹، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

والنوع الثاني: شروط الأداء وهي التي إن وجدت بتمامها مع شروط الوجوب، وجب أداؤه بنفسه، وإن فقد بعضها مع تحقق شروط الوجوب، فلا يجب الأداء بل عليه الإحجاج أو الإيصاء عند الموت وهي خمسة: سلامة البدن، وأمن الطريق وعدم الحبس، والمحرم أو الزوج للمرأة وعدم العدة لها. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵۸، أول كتاب الحج، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۸، كتاب المناسك الباب الأول في تفسير الحج، ط: دار الفكر - بيروت ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۶۱۱، باب الحج عن الغير)

شرط یہ ہے کہ کمزوری وضعف یعنی عذر مرتے دم تک باقی رہے، اگر تندرستی عود کر آئی، تو دوبارہ آپ کی والدہ کو حج کے لیے جانا پڑے گا۔(۳)

مذکورصورت میں حج بدل کے لیے ایسے شخص کو بھیجا جائے، جس نے اپنا حج کرلیا ہو، اس کے باوجود اگر آپ نے اپنا حج فرض ادانہیں کیا ہے اور حج بدل کریں گے، تب بھی حج ہوجائے گا، البتہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔(۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] نابالغ بچوں کے حج وعمرہ کا طریقہ

[۳۱] احرام کی چادروں پر بچوں کی نجاست لگ جائے، تو کیا کرے؟

۱۷۷۳- سوال: میں حج کے لیے جارہی ہوں، اپنے ساتھ، اپنے دونوں بچوں کو بھی لے جارہی ہوں، میرا بڑا لڑکا تین سال کا ہے اور دوسرا لڑکا ایک سال کا۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ ان دونوں کے حج وعمرہ کا احرام باندھنا ہوگا یا نہیں؟ اور احرام کس طرح باندھنا پڑے گا؟ عام کپڑوں میں یا مرد کی طرح دو چادروں میں۔

میرے دونوں لڑکوں کے حج وعمرہ کی اور طواف کی نیت کس کے ذمہ ہوگی اور کس طرح ہوگی؟ ـــــــ لڑکوں کی جانب سے قربانی کرنی ہوگی یا نہیں؟ نیز ان کے احرام کی نماز الگ سے پڑھنی ہوگی یا ایک ہی نماز میں نیت کافی ہوگی؟ ـــــــ طواف کے بعد دو رکعت الگ الگ پڑھنی ہوگی، یا دو رکعت میں دونوں کی

---

(۳) قال: (ولا يجوز إلا عن الميت، أو عن العاجز بنفسه عجزا مستمرا إلى الموت) ولا يجوز عن القادر، لأن الحج عبادة بدنية وجبت للابتلاء، فلا تجري فيها النيابة، ... ويشترط دوام العجز إلى الموت كالفدية أيضا، لأنه متى قدر وجب عليه بنفسه. (الاختيار لتعليل المختار-عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳هـ): ۱/۱۷۰، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة ☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق- فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۲/۸۵، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق ☆ غنية الناسك، ص: ۲۱۶، فصل في شرائط النيابة في الحج الفرض، ط: یادگار شیخ، سہارن پور☆المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ) ص: ۶۱۲، باب الحج عن الغير، فصل في شرائط جواز الإحجاج، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(۴) قد مر تخريجه مرارا.

نیت کافی ہے؟ ـــــــــ ایک ہی طواف دونوں کے لیے کفایت کر جائے گا، یا دونوں کی طرف سے الگ الگ طواف کرنے ہوں گے۔ ـــــــــ عمرہ کے بعد حج کے لیے احرام باندھنا ہوگا یا نہیں؟ اور اگر باندھے تو کس طرح؟ اور نیت کیسی کرنی ہوگی؟ اور قربانی کرنی ہوگی یا نہیں؟

جب میں احرام کے کپڑے پہنے رہوں اور میرے بچہ کی کوئی ناپاکی اس میں لگ جائے تو حالت احرام میں دوسرے کپڑے بدل سکتی ہوں یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

آپ کے لڑکے - جن میں سے ایک کی عمر ۳/سال اور ایک کی صرف ۱/سال ہے - ابھی کچھ سمجھنے کے قابل نہیں ہیں؛ لہٰذا سب سے پہلے آپ نماز اور تلبیہ پڑھ کر نیت کر کے عمرہ یا حج کا احرام باندھ لیجیے، اس کے بعد بغیر نماز پڑھے بچوں کو احرام کی تہبند والی چادر، تہبند کی طرح لپیٹ دیجیے اور بدن کے اوپر کپڑا اڈال دیجیے، اس کے بعد دونوں لڑکوں کی جانب سے الگ الگ احرام کی نیت کیجیے اور تلبیہ پڑھیے، جب اتنا کریں گے، تو دونوں لڑکوں کا احرام شروع ہو جائے گا۔

مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد ایک لڑکے کو اٹھا کر یا چلا کر طواف، عمرہ اور صفا مروہ کی سعی کر لیں، دونوں کا حلق کرالیں، عمرادا ہو جائے گا۔

اسی طرح حج کے لیے ان کے والد صاحب کے اپنے فرزندوں کی جانب سے حج کی نیت کرنے اور تلبیہ پڑھنے سے حج کا احرام شروع ہو جائے گا، منیٰ، عرفات، مزدلفہ میں ٹھہرنے سے واجب اور فرض ادا ہو جائے گا، کنکریا تو والد صاحب مارے یا تین سال کے بچے سے شرطوں کے مطابق مروائے، واجب دونوں صورتوں میں ادا ہو جائے گا۔ (۱)

---

(۱) عن ابن عباس، عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم لقي ركبا بالروحاء، فقال: من القوم؟، قالوا: المسلمون، فقالوا: من أنت؟ قال: رسول الله، فرفعت إليه امرأة صبيا، فقالت: ألهذا حج؟ قال: نعم، ولك أجر. (الصحيح لمسلم: ۱/۴۳۱-۴۳۲، رقم الحديث: ۴۰۹-(۱۳۳۶)، كتاب الحج، باب صحة حج الصبي وأجر من حج به، ط: ديوبند)

عن جابر، قال: حججنا مع رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم، ومعنا النساء والصبيان، فلبينا عن الصبيان، ورمينا عنهم. (سنن ابن ماجة: ۲/۲۱۸، رقم الحديث: ۳۰۳۸، كتاب المناسك، باب الرمي عن الصبيان، ط: ديوبند☆ سنن الترمذي: ۱/۱۸۵، رقم الحديث: ۹۲۷، أبواب الحج، "باب" بعد: باب ماجاء في حج الصبي، ط: ديوبند)

(وأما غير المميز) أي من الصغار (فلا تصح منه المباشرة) أي مباشرة الإحرام، والطواف مما يحتاج إلى نيته؛=

ممنوعاتِ احرام کی قبیل سے کوئی فعل بچوں سے سرزد ہو جائے، تو نہ دم واجب ہوگا، نہ صدقہ۔ (۲)

=لكن يصح منه ما لاتعلق للنية به كالوقوفين (و كذا المجنون، و تصح) أي المباشرة (من وليهما) أي بأن ينوي عنهما، و ينوب عنهما فيما عجزا عن مباشرته كالسعي، و الرمي، و كذا فيما لا يصح لهما مباشرته كالطواف. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۸۵-۸۶، باب شرائط الحج، النوع الثالث: شرائط صحة الأداء، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

(قال) والصبي الذي يحج به أبوه يقضي المناسك ويرمي الجمار؛ لأنه يأتي به للتخلق حتى يتيسر له بعد البلوغ فيؤمر به بمثل ما يؤمر به البالغ، وإن ترك الرمي لم يكن عليه شيء، وكذلك المجنون يحرم عنه أبوه؛ لأن فعلهما للتخلق فلا يكون واجبا إذ ليس للأب عليهما ولاية الإيجاب فيما لا منفعة لهما فيه عاجلا، ولهذا لا يجب الدم بترك الرمي عليهما، وهو معتبر بالكفارات لا يجب شيء منها على الصبي، والمجنون عندنا، والأصل في جواز الرمي هكذا ما روي عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - أن امرأة رفعت صبيا من هودجها إليه فقالت: ألهذا حج، فقال: نعم، ولك أجره، فدل ذلك على أنه يجوز للأب أن يحرم عن ولده الصغير، والمجنون بمنزلة الصغير، والله أعلم بالصواب. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۴/۶۹، كتاب المناسك، باب رمي الجمار، ط: دار المعرفة - بيروت)

والخلاصة: إن كل ما أمكن الصبي فعله بنفسه، لزمه فعله، ولا ينوب غيره عنه، كالوقوف والمبيت بمزدلفة ونحوهما، وما عجز عنه، عمله الولي عنه. (الفقه الإسلامي و أدلته: ۳/۹۰-۹۱، الباب الخامس: الحج و العمرة، المبحث الثاني: شروط الحج و العمرة، المطلب الأول: إحجاج الصغير و المجنون، ط: مكتبة تهانوي - ديوبند☆البحر الرائق: ۲/۳۸۰، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: دار الكتاب الإسلامي☆رد المحتار على الدر المختار: ۲/۴۶۷، كتاب الحج، ط: دار الفكر)

(۲) ثم إنهما [الصبي و المجنون] لا يؤخذان بترك الواجبات و ارتكاب المحظورات. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۸۶، باب شرائط الحج، النوع الثالث: شرائط صحة الأداء، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

(ولا يصح من غيره) أي من غير الصبي المميز (الأداء) أي مباشرة الأفعال (و الا الإحرام) على ما في البدائع من أنه لا يجوز أداؤه الحج بنفسه... (بل يصحان من وليه له) أي نيابة عنه، (فيحرم عنه من كان أقرب إليه) أي في النسب (فلو اجتمع والد، وأخ يحرم له الوالد) على ما في "فتاوى قاضي خان" والظاهر أنه شرط الأولوية، وهذا كله مبني على انعقاده نفلا؛ لكن في "شرح المجمع" وعندنا إذا أهل الصبي أو وليه لم ينعقد فرضا و لا نفلا، و في "الهداية" ما يدل انعقاده نفلا، ثم قال صاحب الهداية: و اختلف المتأخرون، فمنع بعضهم انعقاده أصلا، و قيل ينعقد ويكون حج تمرين و اعتياد، انتهى.

ويمكن الجمع بأنه لا ينعقد انعقادا مُلزما، وينعقد نفلا غير ملزم، لأنه غير مكلف، ففائدته التعود بعمل الخير و يتفرع عليه أنه لو لم يفعل شيئا من المأمورات أو ارتكب شيئا من المحظورات لا يجب عليه شيء من القضاء و الكفارات. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۱۵۸، باب الإحرام، فصل في إحرام الصبي، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

طواف کے بعد کی دو رکعت نہ بچوں پر واجب ہے نہ والد پر، اسی طرح قربانی بھی بچوں کی جانب سے نہیں ہے۔ (۳) صرف ارکان میں والد صاحب نیابت کریں گے۔

دونوں بچوں کی جانب سے احرام، تلبیہ اور طواف الگ الگ کرنا ہوگا۔

(۲) حالت احرام میں مرد یا عورت کے کپڑوں پر ناپاکی لگ جائے، تو اس کو دھونا بھی کافی ہے اور بدلنا بھی جائز ہے۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] وارث کے سامنے کسی کو حج پر بھیجنے کا 'اظہار خیال' وصیت نہیں

۱۷۷۴- سوال: ایک آدمی نے اپنی زندگی میں اپنے لڑکے کے ساتھ بات چیت کے درمیان یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مجھے فلاں آدمی کو حج کے لیے بھیجنا ہے؛ لیکن اسی اثنا میں ان کی وفات ہوگئی، ان کی وفات کے وقت حج کے لیے پیسے بھی موجود تھے؛ لیکن ورثاء میں ان کے لڑکوں نے پیسے ضائع کردیے، اب لڑکوں کو یہ خیال آیا کہ والد صاحب کا حج بدل کرانا چاہیے؛ اس لیے انہوں نے زمین بیچ کر پیسے جمع کیے ہیں، اور باپ کی جانب سے حج بدل کرانا چاہتے ہیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ مرحوم کا لڑکے کے سامنے یہ خیال ظاہر کرنا کہ ''فلاں آدمی کو حج کے لیے بھیجنا ہے'' وصیت شمار ہوگا یا نہیں؟ اگر وصیت ہو، تو حج بدل کرنے والا کس نیت سے احرام باندھے، قران، تمتع یا افراد کی نیت سے؟ حج تمتع کی نیت سے مرحوم کے حق میں حج کرائے، تو درست ہے یا نہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامدا ومصليا:

انسان کا اپنے لڑکے کے سامنے یہ خیال ظاہر کرنا کہ ''مجھے حج کے لیے فلاں آدمی کو بھیجنا ہے'' وصیت

---

(۳) (ولو طاف بصبي) أي غير مميز (لا يصلي عنه) ركعتي الطواف؛ لأنه لا تصح النيابة عندنا في العبادة من الصوم و الصلاة كما حقق في إسقاطهما. (مناسك الملا علي القاري مع حاشية إرشاد الساري، ص: ۲۲۲، باب أنواع الأطوفة، فصل في إحرام الصبي، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

و شرائط وجوبه: القدرة عليه، و صحة القران، و التمتع، والعقل، والبلوغ ... الخ. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۳۶۹، باب القران، فصل في هدي القارن و المتمتع)

(۴) (و غسل الثوب) أي للطهارة أو النظافة لا لقصد قتل القملة و الزينة. (المصدر السابق، ص: ۱۷۲، باب الإحرام، فصل في مباحات الإحرام)

میں شمار نہیں ہوگا؛ اس لیے ورثاء کے لیے مرحوم کی جانب سے حج کرانا واجب نہیں۔ (۱)

آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کے اوپر حج فرض تھا، اور مرحوم نے اس کو ادا نہیں کیا، گویا غفلت سے کام لیا، نیز حج بدل کے لیے وصیت بھی نہیں کی؛ اس لیے اس معاملے میں مرحوم گنہ گار ہوگا۔ (۲) ایسی صورت میں اولاد اپنے والد کی طرف سے حج بدل کے لیے کوئی آدمی بھیجے یا خود کوئی لڑکا جائے اور میقات سے والد کے نام کا احرام باندھے، تو مرحوم کا حج فرض ادا ہو جائے گا، اور ورثاء کی جانب سے تبرع اور احسان ہوگا۔ (۳)

---

(۱) ثم إن الوصية في اللغة اسم بمعنى المصدر هو التوصية، ومنه قوله تعالى {حين الوصية} [المائدة: 106] ثم سمي الموصى به وصية، ومنه قوله تعالى {من بعد وصية توصون بها} [النساء: 12] وفي الشريعة: تمليك مضاف إلى مابعد الموت بطريق التبرع، سواء كان ذلك في الأعيان أو في المنافع، كذا في عامة الشروح.

قال بعض المتأخرين: ثم الوصية والتوصية وكذا الإيصاء في اللغة: طلب فعل من غيره ليفعله في غيبته حال حياته أو بعد وفاته. وفي الشريعة: تمليك مضاف إلى ما بعد الموت على سبيل التبرع عينا كان أو منفعة. (فتح القدير: ۴۱۱/۱۰، كتاب الوصايا، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق: ۱۸۲/۶، كتاب الوصايا، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق ☆العناية شرح الهداية - محمد بن محمد بن محمود، أكمل الدين البابرتي (م: ۷۸۶هـ): ۴۱۲/۱۰، كتاب الوصايا، باب في صفة الوصية، ط: دار الفكر)

(۲) ومن مات وعليه فرض الحج ولم يوص به، لم يلزم الوارث أن يحج عنه، وإن أحب أن يحج عنه حجّ، وأرجو أن يجزيه إن شاء الله تعالى. (الفتاوى التاتارخانية: ۶۶۷/۳، كتاب الحج، الفصل السادس عشر في الوصية بالحج، ط: زكريا- ديوبند ☆ بدائع الصنائع: ۲۲۱/۲، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية ☆ الفتاوى الهندية: ۲۵۸/۱، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حج عن أبويه أو قضى عنهما مغرما بعث يوم القيامة مع الأبرار. (سنن الدارقطني - أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي بن مسعود بن النعمان بن دينار البغدادي الدارقطني (م: ۳۸۵هـ): ۲۹۹/۳، رقم الحديث: ۲۶۰۸، كتاب الحج، باب المواقيت، ت: شعيب الارنؤوط، وجماعة من العلماء، ط: مؤسسة الرسالة - بيروت)

عن زيد بن أرقم، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا حج الرجل عن والديه تقبل منه ومنهما واستبشرت أرواحهما في السماء وكتب عند الله تعالى برا. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۲۶۰۷)

عن جابر بن عبد الله، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حج عن أبيه وأمه فقد قضى عنه حجته وكان له فضل عشر حجج. (المصدر السابق: ۳۰۰/۳، رقم الحديث: ۲۶۱۰)

اعلم أن فعل الولد ذلك مندوب إليه جدا. لما أخرج الدارقطني عن ابن عباس - رضي الله تعالى عنهما - عنه -=

مرحوم نے حج کی وصیت نہیں کی تھی؛ اس لیے ان کی جانب سے حج کرنے والا، میقات سے جس نیت سے احرام باندھنا چاہے، باندھ سکتا ہے، یعنی حج قران وتمتع اور افراد ہر ایک کی گنجائش ہے۔[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] کبرسنی اور کمزوری کی بناء پر حج بدل میں کسی کو بھیجنا

۱۷۷۵-سوال: ایک شخص کی مالی حالت اچھی ہے اور اس پر حج فرض ہے؛ لیکن کبرسنی اور کمزوری کی بناء پر خود حج ادا نہیں کرسکتا، تو وہ شخص اپنی لڑکی کو حج بدل کے لیے بھیج سکتا ہے یا نہیں؟ اس آدمی کو ایک ہی لڑکی ہے، لڑکا نہیں ہے، نیز ان کی لڑکی نے گذشتہ سال -جو کہ سعودی میں ملازم ہے- اپنا حج ادا کرلیا ہے، اس سال ویزا لے کر وہ حج بدل کرسکتی ہے؟ نیز حج کا خرچ کتنا ذمے میں ہوگا؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداومصليا:

بیماری ایسی ہو کہ وہ لاچار اور مجبور ہو دوسرے کے سہارے کے بغیر چل پھر نہ سکتا ہو، تو حج بدل کرانے کی اجازت ہے، البتہ کمزوری ختم ہوجائے اور وہ شخص خود حج پر قادر ہوجائے، تو اس کے لیے دوبارہ حج

=صلى الله عليه وسلم-لمن حج عن أبويه أو قضى عنهما مغرما بعث يوم القيامة مع الأبرار. وأخرج أيضا عن جابر أنه -عليه الصلاة والسلام- قال: من حج عن أبيه وأمه فقد قضى عنه حجته وكان له فضل عشر حجج. وأخرج أيضا عن زيد بن أرقم قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: إذا حج الرجل عن والديه تقبل منه ومنهما واستبشرت أرواحهما وكتب عند الله برا" .اهـ.(فتح القدير-كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بـ'ابن الهمام' (م:٨٦١هـ): ١٥٩/٣، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر رد المحتار على الدر المختار:٦٠٩/٢، كتاب الحج،باب الحج عن الغير، مطلب في الفرق بين العبادة والقربة والطاعة، ط:دار الفكر)

وإن لم يوص به فتبرع الوارث عنه بالإحجاج أو الحج بنفسه، قال أبو حنيفة يجزيه إن شاء الله تعالى ؛لقوله - صلى الله عليه وسلم - للخثعمية أرأيت لو كان على أبيك دين، الحديث انتهى.(رد المحتار على الدر المختار:٦٠٨/٢، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب في الفرق بين العبادة والقربة والطاعة، ط: دار الفكر - بيروت☆تبيين الحقائق:٨٥/٢، كتاب الحج،باب الحج عن الغير،ط:المكتبة الكبرى الأميرية-بولاق)

(٤)الرابع عشر عدم المخالفة، فلو أمره بالإفراد فقرن أو تمتع ولو للميت لم يقع عنه ويضمن النفقة . . .وهذه الشرائط كلها في الحج الفرض، وأما النفل فلا يشترط فيه شيء منها: إلا الإسلام والعقل.(رد المحتار على الدر المختار:٦٠٠/٢-٦٠١، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب شروط الحج عن الغير عشرون، ط:دار الفكر-بيروت)

کرنا لازم ہوگا۔[1]

حج کے لیے آنے جانے کا کرایہ، مکان کا کرایہ، منیٰ و عرفات اور مزدلفہ جانے کا مکمل خرچ، نیز کھانے پینے کا مکمل خرچ، حج بدل میں بھیجنے والے کے لیے دینا ضروری ہے۔[2] نیز میقات سے حج کا احرام باندھنا ضروری ہے،[3] اور اگر بھیجنے والے نے تمتع کی اجازت دی ہے، تو تمتع کا احرام باندھنا جائز ہے؛ لیکن بہتر

---

(۱) الثاني: العجز المستدام من وقت الإحجاج إلى وقت الموت، أي فإن زال قبل الموت لم يجز حج غيره عنه فرضا.... وإن زال عذره... أي بزوال حبسه أو برئه من مرضه ونحوه قبل الموت في وقت يمكنه أی يؤديه بنفسه وجب عليه الأداء بنفسه أي المباشرة بفعله وظهرت نفلية الأولى. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملاعلي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۶۱۲-۶۱۳، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة ☆ البحر الرائق: ۳/۶۵، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۵۸، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر)

قال: (ولا يجوز إلا عن الميت، أو عن العاجز بنفسه عجزا مستمرا إلى الموت) ولا يجوز عن القادر؛ لأن الحج عبادة بدنية وجبت للابتلاء، فلا تجري فيها النيابة،... ويشترط دوام العجز إلى الموت كالفدية أيضا؛ لأنه متى قدر وجب عليه بنفسه. (الاختيار لتعليل المختار - عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳ھ): ۱/۱۷۰، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة ☆ تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ھ): ۲/۸۵، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق ☆ غنية الناسك ص: ۳۱۶، فصل في شرائط النيابة في الحج الفرض، ط: یادگار شیخ، سہارن پور ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/۶۴۸، كتاب الحج، الحج عن الغير، ط: زكريا - ديوبند)

[۲] (فصل في النفقة) أي حكم إنفاق الحاج المأمور، (المراد من النفقة: ما يحتاج إليه من طعام وإدام) ومنه اللحم (وشراب وثياب في الطريق، ومركوب) أي بإجارة أو اشتراء (وثوبي إحرام) أي إزار ورداء، (واستئجار منزل) أي يأوي إليه، (ومحمل وقربة وإداوة) أي ظرف ماء ونحوه، (وسائر الآلات) أي مما لا يستغني عنها في الطريق.

(وكذا دهن السراج) ... (وما يغسل به ثيابه) أي من الصابون والأشنان، وكذا ما يغسل به رأسه من نحو الخطمي والسدر... (وأجرة الحارس ... والحلاق ودخول الحمام) أي أجرته... (كل ذلك بالمعروف) أي بالتوسط والاقتصاد من غير تبذير وتقتير. [المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۶۴۳-۶۴۴، باب الحج عن الغير، فصل في نفقة المأمور بالحج، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة ☆ فتح القدير: ۳/۱۴۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر - بيروت]

[۳] (العاشر أن يحرم من الميقات) أي من ميقات الآمر، ليشمل المكي وغيره، (فلو اعتمر وقد أمره بالحج ثم حج من عامه من مكة لا يجوز... ويضمن) أي في قولهم جميعا، ولا يجوز ذلك عن حجة الإسلام؛ لأنه مأمور بحجة ميقاتية. [المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۶۲۲، باب الحج عن الغير، فصل في شرائط جواز الإحجاج، وهي عشرون، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة ☆ البحر الرائق: ۳/۶۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي]

نہیں، اگر حج پر بھیجنے والے نے تمتع کی اجازت دی ہو، تو بعض علماء تمتع کی اجازت دیتے ہیں؛ اس لیے حج بدل میں قران اور تمتع سب کی اجازت لے لے۔ [۴] حج کے بعد قانون کے مطابق آنے کی تاریخ متعین ہو اور اس سے زیادہ رہائش اختیار کرے، تو بھیجنے والے کی رقم میں سے خرچ کرنا جائز نہیں، بھیجنے والے کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں سے خرچ کرنا جائز نہیں، نیز بھیجنے والے کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے صدقہ کرنا یا کسی کی دعوت کرنا بھی جائز نہیں۔ [۵]

صورت مسئولہ میں باپ اگر کمزوری کی بناء پر چلنے پھرنے پر قادر نہ ہو اور سفر کرنے سے معذور ہو، تو لڑکی کو محرم کے ساتھ حج بدل کے لیے بھیجنا جائز ہے، باپ کا حج فرض ادا ہو جائے گا؛ لیکن کسی مرد کو بھیجنا بہتر ہے۔ [۶]

عورت کے لیے بغیر محرم کے سفر کرنا جائز نہیں، اس لیے لڑکی اگر محرم کے بغیر سفر کرے گی، تو گنہ گار ہوگی؛ لیکن باپ کا حج فرض ادا ہو جائے گا۔ [۷]

لڑکی کے لیے باپ کے حج کی نیت کرنا ضروری ہے، اگر باپ کے حج کی نیت نہیں کی، تو باپ کا حج ادا نہ ہوگا۔ [۸] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۴) قد مر تخريجه وتفصيله مرارا.

[۵] (ولا يصرف الدنانير إلا لحاجة) أي ضرورة تدعو إلى ذلك... (ولا يدعو) أي المأمور (إلى طعامه) أي أحدا؛ إذ ليس له التبرع ولا التطوع، ولذا قال: (ولا يتصدق) أي من طعامه أو غيره على أحد من الفقراء (ولا يقرض) أي أحدا... (وإن وسع عليه الآمر) وهو الموصى أو الوصي (الأمر) أي أمر المصروف (فله أن يفعل ذلك). [المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۶۴۳ - ۶۴۴، باب الحج عن الغير، فصل في نفقة المأمور بالحج، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة☆فتح القدير: ۳/۱۴۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر - بيروت]

[۶] (ويجوز إحجاج المرأة) بإذن زوج لها و وجود محرم معها (مع الكراهة). (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۶۴۰ - ۶۳۹، باب الحج عن الغير، جواز إحجاج المرأة والعبد والأمة، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

وسواء كان رجلا أو امرأة إلا أنه يكره إحجاج المرأة، لكنه يجوز أما الجواز فلحديث الخثعمية. وأما الكراهة فلأنه يدخل في حجها ضرب نقصان؛ لأن المرأة لا تستوفي سنن الحج، فإنها لا ترمل في الطواف، وفي السعي بين الصفا والمروة، ولا تحلق. (بدائع الصنائع: ۲/۲۱۳، كتاب الحج، فصل نبات الحرم، ط: دار الكتب العلمية)

(۷) قد مر تخريجه مرارا.

(۸) التاسع نية المحجوج عنه عند الإحرام، وهي أن يقول بلسانه - وهو الأفضل -: أحرمت عن فلان أو لبيك عن=

[۳۴] معذور خاتون اور حج بدل

۱۷۷۶- سوال: ایک خاتون کی عمر تقریباً ۶۵ سال ہے، وہ صاحب مال ہے، ان کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہے؛ لیکن وہ پاؤں سے معذور ہے، چلنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے، زیادہ نہیں چل پاتی، پاؤں کا آپریشن بھی کیا گیا تھا؛ لیکن چلنے پھرنے کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، اسے جوڑوں کا درد بھی ہے، جسے ''گٹھیا'' کہا جاتا ہے، اس کی وجہ سے بھی پاؤں میں درد ہوتا ہے۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ ایسی صورت میں وہ اپنے شوہر یا اپنے دونوں لڑکوں میں سے کسی ایک کو (جس نے اپنا حج فرض ادا نہیں کیا ہے) حج بدل کے لیے بھیج سکتی ہے؟ اگر نہیں، تو ان کو کسی محرم کے ساتھ جانا ضروری ہوگا، شرعی حکم کیا ہے؟ واضح فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

ادائیگی حج کے لیے تندرستی ضروری ہے؛ اس لیے جو مرد یا عورت بیمار ہے، یا عمر کی اس منزل پر ہے کہ دوسرے کی مدد کے بغیر سواری پر چڑھ نہیں سکتے، تو وہ دوسروں کو حج بدل کے لیے بھیج سکتے ہیں۔ (شامی جلد ۲ صفحہ ۹۴، عالمگیری جلد ۱ صفحہ ۱۷۳)[1]

=فلان و إن شاء اكتفى بنية القلب. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۶۲۲، باب الحج عن الغير، فصل في شرائط جواز الإحجاج، و هي عشرون، التاسع النية عن المحجوج عنه عند الإحرام، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: مكة المكرمة ☆ بدائع الصنائع: ۲/ ۲۱۳، كتاب الحج، فصل نبات الحرم، ط: دار الكتب العلمية ☆ البحر الرائق: ۳/ ۶۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۱] (قوله صحيح البدن) أي سالم عن الآفات المانعة عن القيام بما لا بد منه في السفر، فلا يجب على مقعد و مفلوج وشيخ كبير لا يثبت على الراحلة بنفسه وأعمى، وإن وجد قائدا، ... وجوب الإحجاج عليهم، ويجزيهم إن دام العجز وإن زال أعادوا بأنفسهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۵۹، كتاب الحج، مطلب فيمن حج بمال حرام، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۸، كتاب المناسك، الباب الأول في تفسير الحج و فرضيته...، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۲/ ۳۳۵، أول كتاب الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ فتح القدير - كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسي المعروف بابن الهمام (م: ۸۶۱ھ): ۲/ ۴۱۵، كتاب الحج، ط: دار الفكر ☆ بدائع الصنائع: ۲/ ۱۲۲، كتاب الحج، فصل شرائط فرضية الحج، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

تفصیلی تخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں: ''حج بدل: مفہوم اور شرائط'' کا حاشیہ نمبر (۱)۔

اسی طرح کسی کو لقوہ کا مرض ہو، اور بیماری اس حد تک ہو کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ از خود جانا ممکن نہ ہو، یا دونوں پاؤں کٹ گئے ہوں، یا دونوں ہاتھ یا دونوں پاؤں اور ایک ہاتھ کٹ گیا ہو، تو ایسے معذور دوسروں کو حج بدل کے لیے بھیج سکتے ہیں۔

مذکورہ عورت کو اگر چلنے کی طاقت ہے، زینہ پر چڑھنے اور اترنے کی طاقت ہے، تو دوسرے کو حج بدل کے لیے بھیجنا جائز نہیں ہے، اور اس کے لیے محرم کے بغیر سفر کرنا جائز نہیں، اگر کوئی مال دار محرم از خود نہ جاتا ہو، اور غریب محرم جانے کے لیے تیار ہو، تو اس کا خرچ برداشت کرنا ہوگا۔ (۲)

لیکن اگر اس خاتون میں چلنے پھرنے کی سکت نہیں ہے، تو وہ کسی سے حج بدل کرواسکتی ہے۔ حج بدل کے لیے ایسے آدمی کو بھیجا جائے، جس نے اپنا حج فرض ادا کرلیا ہو، اگر ادا نہیں کیا ہے، تو اس کو بھیجنا بہتر نہیں ہے، اس کے باوجود حج ادا ہو جائے گا۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] حج بدل اور نیت

۱۷۷۷- سوال: ہمارے ایک ساتھی نے پچھلے سال حج کیا، جس میں انہوں نے والدہ کے حج کی نیت کی، اور قربانی وطن آکر کی، اور اس سال پھر حج کو گئے، تو کسی مولانا نے مسئلہ بتایا کہ گذشتہ سال جو حج آپ نے کیا تھا، وہ آپ کی جانب سے ادا ہوا، اس سال آپ اپنی والدہ کی جانب سے حج کریں، انہوں نے اس سال بھی قربانی وطن آکر کی، تو شریعت کی رو سے ان کا حج درست ہوا یا نہیں؟

---

(۲) ... من شرائط وجوب الحج عليها في حقها المحرم عندنا، ثم يشترط أن تملك قدر نفقة المحرم؛ لأن المحرم إذا كان يخرج معها فنفقته في مالها إلا في رواية عن محمد - رحمه الله تعالى - يقول: نفقة المحرم في ماله؛ لأنه غير مجبر على الخروج، فإذا تبرع به لم يستوجب بتبرعه النفقة عليها، ولكن في ظاهر الرواية هي لا تتوسل إلى الحج إلا بنفقة المحرم كما لا تتوسل إلى الحج إلا بنفقتها، فكما يشترط لوجوب الحج عليها ملك الزاد والراحلة ويجعل ذلك شرطا لنفسها، فكذلك للمحرم الذي يخرج معها يجعل ذلك شرطا. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۴/ ۱۶۳، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت و غيره، استأجر رجلا ليحج عنه، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۲۶۲، كتاب الحج، شروط الحج، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ۷۲۸، كتاب الحج، مدخل، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۳) تقدم تخريجه مرارا.

قربانی کا کیا حکم ہوگا، کیا اس کا حدودِ حرم میں کرنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

آپ کے ساتھی نے سال گذشتہ جس کی نیت سے حج کیا، اسی کی جانب سے ادا ہوا، والدہ کی جانب سے حج کیا تھا، تو والدہ کا حج ادا ہو گیا۔

اس سال انہوں نے جس کے حج کی نیت کی، اسی کا حج ادا ہوگا، جن مولانا صاحب نے آپ کو مسئلہ بتلایا کہ پہلے سال والدہ کی نیت کرنے کے باجود تمہارا حج ہو گیا، وہ غلط ہے۔ (۱)

قربانی اگر حجِ تمتع یا قران کی وجہ سے کی گئی، تو حرم شریف میں کرنی ضروری تھی، وطن کی قربانی کافی نہیں ہوگی، (۲) لیکن اگر صرف حج کا احرام تھا، اور مکہ مکرمہ میں پندرہ دن سے کم قیام رہا، تو قربانی واجب نہیں ہوئی، نہ وطن میں اور نہ حرم میں۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۶] معلم الحجاج سے حج بدل کروانا

۱۷۷۸- سوال: (۱) ایک شخص کا انتقال ہوا، اس کے لڑکے اپنے باپ کی طرف سے مکہ سے کسی

---

(۱) التاسع نية المحجوج عنه عند الإحرام، وهي أن يقول بلسانه -وهو الأفضل-: أحرمت عن فلان أو لبيك عن فلان وإن شاء اكتفى بنية القلب. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط-الملا علي القاري مع حاشية إرشاد الساري- (م:۱۰۱۴هـ) ص:۶۲۲، باب الحج عن الغير، فصل في شرائط جواز الإحجاج، وهي عشرون، التاسع النية عن المحجوج عنه عند الإحرام، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: مكة المكرمة ☆ البحر الرائق: ۳/۶۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي)

ولأن الأداء عن نفسه لم يجب في وقت معين فالوقت كما يصلح لحجه عن نفسه يصلح لحجه عن غيره، فإذا عينه لحجه عن غيره وقع عنه. (بدائع الصنائع: ۲/ ۲۱۳، كتاب الحج، فصل نبات الحرم، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) راجع للتخريج والتفصيل عنوان المسئلة: "دم جنایت کا حرم میں ادا کرنا ضروری ہے"۔

(۳) ...فإن كان منفردا بالحج يحلق أو يقصر، والحلق أفضل... ولا ذبح عليه، وإن كان قارنا أو متمتعا يجب عليه أن يذبح ويحلق ويقدم الذبح على الحلق لقوله تعالى: {ويذكروا اسم الله في أيام معلومات على ما رزقهم من بهيمة الأنعام فكلوا منها وأطعموا البائس الفقير} [الحج:28] {ثم ليقضوا تفثهم} [الحج:29] رتب قضاء التفث، وهو الحلق على الذبح. وروي عن النبي -صلى الله عليه وسلم- أنه قال: أول نسكنا في يومنا هذا الرمي ثم الذبح ثم الحلق. وروي عنه -صلى الله عليه وسلم- أنه رمى ثم ذبح ثم دعا بالحلاق. (بدائع الصنائع: ۲/۱۵۸، كتاب الحج، فصل في بيان سنن الحج وبيان الترتيب، ط: دار الكتب العلمية ☆ المبسوط للسرخسي: ۴/ ۶۴، كتاب المناسك، باب رمي الجمار، ط: دار المعرفة-بيروت)

عالم یا معلم کے ذریعہ حج بدل کرائیں، تو اُس سے حج ادا ہوگا یا نہیں؟ یا یہیں [بھروچ، گجرات، انڈیا] سے کسی متقی عالم کو بھیجنا ضروری ہے؟

(۲) حج بدل کے لیے کون جا سکتا ہے؟ شریعت میں اُس کے لیے کیا شرائط ہیں؟ کیا حج بدل میں کوئی جائے، تو اُس پر حج فرض ہو جاتا ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً

میت نے انتقال سے پہلے وصیت کی ہو کہ مجھ پر حج فرض ہے، اور میں اب تک ادا نہیں کر سکا ہوں، تہائی مال میں سے تم لوگ وطن سے حج کے لیے کسی کو بھیج دینا، تو وطن سے ہی بھیجنا ضروری ہے، مکہ مکرمہ سے کسی آدمی کو بھیجنے سے حج فرض ادا نہیں ہوگا، اگر ایسا کیا گیا، تو لڑکے گنہگار ہوں گے۔ (۱) اگر وصیت نہیں کی ہے، تب بھی مستحب ہے کہ کوئی بالغ لڑکا یا دو تین لڑکے مل کر خرچ جمع کر کے کسی کو حج بدل کے لیے بھیج دیں۔ (۲)

سوال میں جو صورت آپ نے لکھی ہے، وہ ٹھیک نہیں ہے، زبدۃ المناسک (جلد دوم صفحہ نمبر: ۱۵۴) میں لکھا ہے کہ معلم حضرات چند لوگوں سے رقم لے کر ایک حج کرتے ہیں، اور سب کو ثواب بخشتے ہیں، اُس سے حج فرض ادا نہیں ہوگا، اِس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے وطن سے ہی کسی عالم کو بھیج کر میت کی طرف سے حج فرض ادا کریں۔ (۳)

---

(۱) (فإن فسر المال) أو المكان (فالأمر عليه) أي على ما فسره (وإلا فيحج) عنه (من بلده) قياسا لا استحسانا فليحفظ، فلو أحج الوصي عنه من غيره لم يصح (إن وفى به) أي بالحج من بلده (ثلثه) وإن لم يف فمن حيث يبلغ استحسانا. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۶۰۴-۶۰۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر-بيروت)

وفي كل منهما لا يخلو إما إن أطلق الوصية أو عين المال والمكان فإن أوصى بأن يحج عنه، وأطلق، يحج عنه من ثلث ماله، لأنه بمنزلة التبرعات فإن بلغ ثلثه أن يحج عنه من بلده وجب الإحجاج من بلده، لأن الواجب عليه الحج من بلده الذي يسكنه. (البحر الرائق: ۳/ ۷۱، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) وإن لم يوص به فتبرع الوارث عنه بالإحجاج أو الحج بنفسه، قال أبو حنيفة يجزيه إن شاء الله تعالى ؛لقوله - صلى الله عليه وسلم - للخثعمية أرأيت لو كان على أبيك دين، الحديث... انتهى. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۰۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، مطلب في الفرق بين العبادة والقربة والطاعة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۸۵، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: المكتبة الكبرى الأميرية-بولاق)

(۳) وہاں کے معلمین کی معرفت حج نہ کرایا جائے؛ کیوں کہ ان پر بھروسہ نہیں ہوتا، وہ چند آدمیوں کی طرف سے روپیہ وصول کر کے کراتے ہیں، سنا گیا ہے کہ ایک شخص سے حج کرا کے، سب کو فقط ثواب بخش دیتے ہیں، واللہ اعلم، کہاں تک یہ سچ ہے، لہٰذا کسی معتمد، =

(۲) حج بدل میں ایسے آدمی کو بھیجنا چاہیے، جس نے اپنا حج فرض ادا کرلیا ہو، اگر کسی نے حج نہیں کیا ہے، اُس کو حج کے لیے بھیجا تو بھی حج ادا ہو جائے گا، مگر ایسے آدمی کو بھیجنا اچھا نہیں ہے، مکروہِ تنزیہی ہے۔(۴)

البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک ایسے آدمی کو حج بدل میں بھیجنا جائز نہیں ہے، جس نے حج فرض ادا نہیں کیا ہے، اُن کے نزدیک اِس صورت میں حج بالکل ادا ہی نہیں ہوگا؛ لہٰذا اختلافِ ائمہ سے بچتے ہوئے ایسے شخص کو-جس نے حج ادا نہیں کیا ہے- نہ بھیجا جائے۔(۵) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= نیک صالح سے حج کرایا جائے، اور خرچہ کے لیے روپیہ وسعت سے مناسب دیے جائیں۔ (زبدۃ المناسک: ۲/ ۱۵۵-۱۵۴، دوسرے کی نیابت سے حج کرانے کی شرطیں، ط: الجمعیۃ پریس- دہلی)

(والأفضل إحجاج الحر العالم بالمناسك) أي العامل بعلمه في تلك المسائل. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط-الملا علي القاري مع حاشية إرشاد الساري-(م: ۱۰۱۴هـ) ص: ۶۲۲، باب الحج عن الغير، جواز إحجاج المرأة والعبد والأمة، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: مكة المكرمة ☆ فتح القدير: ۱۵۱/۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر-بيروت)

(۴) والأفضل للإنسان إذا أراد أن يحج رجلاً عن نفسه أن يحج رجلاً قد حج عن نفسه؛ لأنه أهدى إلى إقامة الأعمال، ولأنه أبعد عن الخلاف، فإن الذي لم يحج عن حجة الإسلام عن نفسه لم تجز حجته عن غيره عند بعض الناس، ومع هذا لو أحج رجلاً لم يحج عن نفسه حجة الإسلام يجوز عندنا، وسقط الحج عن الآمر؛ لأن النبي عليه السلام حين أمر الخثعمية، قال: الحج عن أبيها لم يستفسر أنها هل حجت عن نفسها أم لا؟. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۴۷۸/۲، كتاب المناسك، الفصل الخامس عشر: في الرجل يحج عن آخر، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الأصل المعروف بالمبسوط-أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني (م: ۱۸۹هـ): ۵۰۴/۲، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت وغيره، ت: أبو الوفا الأفغاني، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية- كراتشي ☆ المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱۵۱/۴، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت وغيره، ط: دار المعرفة- بيروت ☆ تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ): ۴۲۹/۱، كتاب المناسك، مسائل الأمر بالحج، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۶۴۹/۳، كتاب الحج، الفصل الخامس عشر: في الحج عن الغير، ط: زكريا- ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۲۵۷/۱، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ) ص: ۶۵۰، باب الحج عن الغير، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(۵) وقال الشافعي: لا يجوز حج الصرورة عن غيره، ويقع حجه عن نفسه، ويضمن النفقة. (بدائع الصنائع: ۲۱۳/۲، كتاب الحج، فصل نبات الحرم، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۳۷] والدین اور بیویوں اور اپنی جانب سے حج بدل کروانا

۱۷۷۹- سوال: میری عمر ۷۵ سال ہے، اور میری بیوی- جو بہ قید حیات ہے- کی عمر ۶۵ سال ہے، ہم دونوں تقریباً ۸، ۱۰ سال سے بیمار ہیں اور بغیر سہارے کے اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہے، میری پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا، اس سے ایک لڑکا اور دوسری بیوی سے تین لڑکے ہیں، ماشاء اللہ سبھی سرکاری ملازم اور خوش حال ہیں، میری صرف ایک لڑکی ہے، جس کی عمر ۳۸/ سال ہے اور وہ کنواری ہے، ہماری خدمت کرتی ہے۔

میرے والدین پر ان کی جائداد کے اعتبار سے حج فرض ہوگیا تھا؛ اس لیے کہ وہ ۱۵/ ایکڑ زمین کے مالک تھے؛ لیکن کسی وجہ سے حج نہیں کر سکے اور اس دنیا سے رخصت ہوگئے، اب میرے حالات ساز گار ہوئے تو میں بھی اس قابل نہیں رہا کہ حج کے لیے خود جا سکوں؛ لہٰذا میں اپنی طرف سے، اپنی دونوں بیویوں کی طرف سے اور اپنے والدین کی طرف سے حج بدل کرانا چاہتا ہوں، اس کی کیا صورت ہوگی، شرعی اعتبار سے ایسا کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ اپنی طرف سے، والدین اور دونوں بیویوں کی طرف سے حج بدل کرانا چاہتے ہیں، یہ مبارک سوچ ہے، حج بدل کرالیں، ان شاء اللہ ثواب سے نوازے جائیں گے۔ (۱)

---

(۱) عن جابر بن عبد الله، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حج عن أبيه وأمه، فقد قضى عنه حجته وكان له فضل عشر حجج. (سنن الدارقطني- أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي بن مسعود بن النعمان بن دينار البغدادي الدارقطني (م: ۳۸۵ھ): ۳/ ۳۰۰، رقم الحديث: ۲۶۱۰، كتاب الحج، باب المواقيت، ت: شعيب الارنؤوط، وجماعة من العلماء، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت- لبنان)

عن ابن عباس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من حج عن والديه، أو قضى عنهما مغرما بعثه الله يوم القيامة مع الأبرار. (المعجم الأوسط- سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰ھ): ۸/ ۱۱، رقم الحديث: ۷۸۰۰، باب الميم، باب من اسمه محمود، ت: طارق بن عوض الله، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين - القاهرة ☆ الترغيب في فضائل الأعمال وثواب ذلك- أبو حفص عمر بن أحمد بن عثمان، البغدادي المعروف بـ ابن شاهين (م: ۳۸۵ھ) ص: ۹۴، رقم الحديث: ۳۰۳، باب مختصر من كتابي كتاب بر الوالدين وما فيه من الفضل والندب على ذلك، ت: محمد حسن محمد حسن إسماعيل، ط: دار الكتب العلمية، بيروت ☆ سنن الدارقطني: ۳/ ۲۹۹، رقم الحديث: ۲۶۰۸، كتاب الحج، باب المواقيت)

=

اگر آپ کسی کی مدد اور سہارے کے بغیر سفر نہیں کر سکتے، تو آپ کسی دوسرے کو حج بدل کے لیے بھیج سکتے ہیں، آپ کی والدہ اور دونوں بیویوں کا انتقال ہو گیا ہو یا دوسرے کے سہارے بغیر سفر نہ کر سکتے ہوں، تو ان کے حج بدل میں بھی دوسروں کو بھیج سکتے ہیں۔[۲]

البتہ اگر آپ کی والدہ اور دونوں بیویوں کے پاس اتنا مال نہیں تھا کہ ان پر حج فرض ہو جائے، تو حج بدل میں بھیجنا ضروری نہیں ہے، تاہم ہر مسلمان کی خواہش ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد اسے ثواب ملتا رہے؛ لہٰذا جن پر حج فرض نہیں تھا، ان کے لیے صدقہ جاریہ کے طور پر بہ قدر استطاعت چھوٹا مدرسہ، چھوٹی مسجد یا بورنگ یا کسی دار العلوم کا کوئی ضروری کام کرا دیں، یہ زیادہ بہتر رہے گا اور مرحوم کو اس کا ہمیشہ ثواب ملتا رہے گا۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= ومن مات وعليه فرض الحج ولم يوص به، لم يلزم الوارث أن يحج عنه، وإن أحب أن يحج عنه حج، وأرجو أن يجزيه إن شاء الله تعالى. (الفتاوى التاتارخانية: ۶۶۷/۳، كتاب الحج، الفصل السادس عشر في الوصية بالحج، ط: زكريا- ديوبند ☆ بدائع الصنائع: ۲۲۱/۲، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية ☆ الفتاوى الهندية: ۲۵۸/۱، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) والنوع الثاني: شروط الأداء وهي التي إن وجدت بتمامها مع شروط الوجوب، وجب أداؤه بنفسه، وإن فقد بعضها مع تحقق شروط الوجوب، فلا يجب الأداء بل عليه الإحجاج أو الإيصاء عند الموت وهي خمسة: سلامة البدن، وأمن الطريق وعدم الحبس، والمحرم أو الزوج للمرأة وعدم العدة لها. (رد المحتار على الدر المختار: ۴۵۸/۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر- بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۲۵۸/۱، كتاب المناسك الباب الأول في تفسير الحج، ط: دار الفكر- بيروت ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط- الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ) ص: ۶۱۱، باب الحج عن الغير)

(۳) عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: "إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة: إلا من صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعو له". (الصحيح لمسلم: ۴۱/۱، رقم الحديث: ۱۴-(۱۶۳۱)، كتاب الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، ط: ديوبند)

قال الرحمتي: والحق التفصيل، فما كانت الحاجة فيه أكثر والمنفعة فيه أشمل فهو الأفضل كما ورد "حجة أفضل من عشر غزوات" وورد عكسه، فيحمل على ما كان أنفع، فإذا كان أشجع وأنفع في الحرب، فجهاده أفضل من حجه، أو بالعكس فحجه أفضل، وكذا بناء الرباط إن كان محتاجا إليه كان أفضل من الصدقة وحج النفل، وإذا كان الفقير مضطرا أو من أهل الصلاح أو من آل بيت النبي - صلى الله عليه وسلم - فقد يكون إكرامه أفضل من حجات وعمر وبناء ربط. (رد المحتار على الدر المختار: ۶۲۱/۲، كتاب الحج، فروع في الحج، مطلب في تفضيل الحج على الصدقة، ط: دار الفكر- بيروت)

[۳۸] حج بدل کے لیے زمین بیچنا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۷۸۰- سوال: میری زمین وجائداد وافر مقدار میں ہے، البتہ اس [زمین] کے علاوہ نقد رقم کچھ نہیں ہے، مجھ پر حج فرض ہو چکا ہے، تو کیا میں اپنی زمین فروخت کر کے حج بدل کرواسکتا ہوں۔

الجواب حامداومصلیا:

جب آپ پر حج فرض ہو چکا ہے، اور ادائیگی نہیں کر سکے ہیں، اب رقم نہیں ہے، تو حج بدل کرانے کے لیے زمین جائداد اور ملکیت کا بیچنا ضروری ہے، ورنہ بڑے گنہ گار ہوں گے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۹] حج بدل کرنے والے کے اہل وعیال کا نفقہ

گذشتہ سے پیوستہ

۱۷۸۱- سوال: حج بدل کے لیے جس شخص کو بھیجا جائے، اس کے سفر کے تمام اخراجات میرے ذمہ ہوں گے؛ لیکن اس کے لوٹ کر آنے تک اس کی سرپرستی میں رہنے والوں کے نان ونفقے کی ذمہ داری کس کی ہوگی؟

الجواب حامداومصلیا:

گھر کے لوگوں کی ذمہ داری بھیجنے والوں کی نہیں ہے؛ جس کو آپ بھیج رہے ہیں، اسی کے تمام اخراجات کی ذمے داری آپ پر ہے۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وإن كان له مسكن فاضل أو عبد أو متاع أو كتب أو ثياب أو أرض أو كرم أو حوانيت أو نحو ذلك مما لا يحتاج إليها يجب بيعها إن كان به وفاء بالحج. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري(م:۱۰۱۴ھ) ص:۶۰-۶۱، باب شرائط الحج، ت:محمد طلحه بلال منيار، ط:المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(۲) (فصل في النفقة) أي حكم إنفاق الحاج المأمور، (المراد من النفقة: ما يحتاج إليه من طعام وإدام) ومنه اللحم (وشراب وثياب في الطريق، ومركوب) أي بإجارة أو اشتراء (وثوبي إحرام) أي إزار ورداء، (واستئجار منزل) أي يأوي إليه، (ومحمل وقربة وإداوة) أي ظرف ماء ونحوه، (وسائر الآلات) أي مما لا يستغني عنها في الطريق.

(وكذا دهن السراج) ... (وما يغسل به ثيابه) أي من الصابون والأشنان، وكذا ما يغسل به رأسه من نحو الخطمي والسدر... (وأجرة الحارس ... والحلاق ودخول الحمام) أي أجرته... (كل ذلك بالمعروف) =

[۴۰] اگر حج کے ارکان کی ادائیگی سے قبل حج بدل کرنے والے کا انتقال ہوجائے؟

گذشتہ سے پیوستہ

۱۷۸۲- سوال: سفرِ حج شروع کرنے کے بعد حج کے ارکان کی ادائیگی سے قبل حج بدل کرنے والے کا انتقال ہوجائے تو حج ادا ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

حج کے ارکان ادا کرنے سے پہلے حج بدل کرنے والے کا انتقال ہوجائے، تو حج بدل [حج فرض] ادا نہیں ہوگا۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۱] حج بدل کرنے والے کا انتقال ہوجائے تو اس کے اہل وعیال کی ذمہ داری بھیجنے والے پر ہوگی؟

گذشتہ سے پیوستہ

۱۷۸۳- سوال: حج ادا کرنے کے بعد راستہ میں یا مدینہ یا مکہ مکرمہ میں حج بدل کرنے والے کا انتقال ہوجائے، تو اس کی زیر کفالت رہنے والوں کے نان نفقہ کا ذمہ دار کون ہوگا؟ نقد روپیہ دینے ہوں گے، تو کتنے دینے ہوں گے، اور کب تک؟

=أي بالتوسط والاقتصاد من غير تبذير وتقتير. ......

(ولا يصرف الدنانير إلا لحاجة) أي ضرورة تدعو إلى ذلك... (ولا يدعو) أي المأمور (إلى طعامه) أي أحدا؛ إذ ليس له التبرع ولا التطوع، ولذا قال: (ولا يتصدق) أي من طعامه أو غيره على أحد من الفقراء (ولا يقرض) أي أحدا... (وإن وسع عليه الآمر) وهو الموصى أو الوصي (الأمر) أي أمر المصروف (فله أن يفعل ذلك). [المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ)، ص: ۶۴۳ - ۶۴۴، باب الحج عن الغير، فصل في نفقة المأمور بالحج، ت: محمد طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة☆فتح القدير: ۱۴۸/۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الفكر-بيروت]

(۱) قال - رحمه الله - (فإن مات في طريقه يحج عنه من منزله بثلث ما بقي) ـــــــ ومعنى المسألة أنه إذا أوصى شخص بأن يحج عنه فأحجوا عنه فمات الحاج في طريق الحج يحج عنه من منزله بثلث ما بقي من ماله... وهذا عند أبي حنيفة وقالا: يحج عنه من حيث مات الأول. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق- عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۸۷/۲، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق☆ البحر الرائق: ۷۱/۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي)

الجواب حامداً ومصلیاً:

ہر آدمی کی موت اس کے وقت پر آنے والی ہے؛ لہٰذا کسی کا سفر حج میں انتقال ہو جائے، تو اس کی وجہ سے بھیجنے والا اس کے اہل وعیال کے خرچ کا ضامن نہیں ہوگا، اور خرچ دینا فرض نہیں ہوگا۔[۱] البتہ کوئی آدمی مدد کرے اور فی سبیل اللہ یتیموں کی ذمہ داری لے لے، تو بڑے ثواب کا کام ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴۲] حج بدل کرنے والے کا گناہ اسی کے ذمہ ہوگا

گذشتہ سے پیوستہ

۱۷۸۴-سوال: ایک شخص قابل اعتماد ہے، اس لیے اسے حج بدل کے لیے روانہ کیا گیا؛ لیکن وہ کوئی گناہ کرے یا سونا چاندی خرید لائے یا حکومت کی جانب سے منع کی گئی اشیاء خرید لائے، تو وبال کس کے سر ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

حج بدل کرانے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ نیک، صالح، مسائل حج سے واقف ایسے شخص کو بھیجے، جس نے اپنا حج کر لیا ہو۔[۳]

---

(۱) ''حج بدل کرنے والے کے اہل وعیال کا نفقہ'' کا حاشیہ ملاحظہ کریں۔

(۲) عن سهل بن سعد، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أنا وكافل اليتيم في الجنة هكذا، وقال بإصبعيه السبابة والوسطى. (صحيح البخاري: ۸۸۸/۲، رقم الحديث: ۶۰۰۵، كتاب الأدب، باب فضل من يعول يتيما، ط: ديوبند)

عن ابن عباس، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من قبض يتيما من بين المسلمين إلى طعامه وشرابه أدخله الله الجنة البتة إلا أن يعمل ذنبا لا يغفر له. (سنن الترمذي: ۱۳/۲، رقم الحديث: ۱۹۱۷، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في رحمة اليتيم وكفالته، ط: ديوبند)

(۳) والأولى أن يحج رجلا عالما بالمناسك قد حج عن نفسه وهو حر؛ لأنه أبعد عن الخلاف، وأقدر على المناسك من السعي والهرولة وكشف الرأس والحلق. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۸۸/۲، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، فصل: المأمور بالحج، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق

☆المبسوط للسرخسي: ۱۵۱/۴، كتاب المناسك، باب الحج عن الميت وغيره، أوصى رجل أن يحج عنه، ط: دار المعرفة - بيروت

☆المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ) ص: ۶۴۰، باب الحج عن الغير، جواز إحجاج المرأة والعبد والأمة، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

جس شخص کو حج کے لیے بھیجا گیا، وہ حرم شریف میں گناہ کا ارتکاب کرے، یا حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کرے، تو بھیجنے والا گنہ گار نہیں ہوگا اور گرفت میں آنے کی صورت میں جرمانہ ادا کرنے کی ذمہ داری بھی بھیجنے والے پر نہیں ہوگی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ﴿۳۸﴾ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ﴿۳۹﴾ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ﴿۴۰﴾. (۵۳-النجم: ۳۸-۴۰)
معنى الآية: أنه لا تحمل نفس حمل نفس أخرى، أي لا تؤخذ نفس بإثم غيرها. (اللباب في علوم الكتاب-أبو حفص سراج الدين عمر بن علي بن عادل الحنبلي الدمشقي النعماني (م: ۷۷۵هـ): ۱۸/ ۲۰۲، سورة النجم، ت: عادل أحمد عبد الموجود علي محمد معوض، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ التفسير المظهري - المظهري، محمد ثناء الله (م: ۱۲۲۵هـ): ۹/ ۱۲۵، سورة النجم، ت: غلام نبي التونسي، ط: مكتبة الرشدية - الباكستان)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ. (۵-المائدۃ:۹۵)

باب الجناية

[جنایت کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الجنایة

[جنایت کا بیان]

[۱] جنایت: مفہوم و اقسام

۱۷۸۵- سوال: میرا حج کا ارادہ ہے، سنا ہے کہ حج میں جنایت کرنے سے دم واجب ہوجاتا ہے؛ بل کہ بسا اوقات حج بھی فاسد ہوجاتا ہے؛ لہٰذا حضرت والا سے درخواست ہے کہ: میرے درج ذیل سوالات کے تفصیلی جوابات مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں! سوال یہ ہے:

''جنایت'' کسے کہتے ہیں؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ احرام کی جنایات کتنی ہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

حرم میں یا احرام کی حالت میں، جن امور سے منع کیا گیا ہے، ان کے ارتکاب کو ''جنایت'' کہا جاتا ہے۔(۱) ـــــــ جنایت کی دو قسمیں ہیں: (۱) جنایت احرام: یعنی جو امور احرام کی حالت میں

(۱) الجناية في اللغة الذنب والجرم، وهو في الأصل مصدر جنى، ثم أريد به اسم المفعول، قال الجرجاني: الجناية كل فعل محظور يتضمن ضررا على النفس أو غيرها، . . . والجناية . . . أطلقها بعض الفقهاء على كل فعل ثبتت حرمته بسبب الإحرام أو الحرم. فقالوا: جنايات الإحرام، والمراد بها كل فعل ليس للمحرم أو الحاج أن يفعله وعبر عنها جمهور الفقهاء بممنوعات الإحرام أو محظوراته، أو محرمات الإحرام، والحرم. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۱۶/۵۹، مادة: ''جناية''، ط: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية-الكويت)

ممنوع ہیں، ان کے خلاف کرنا۔ (۲) جنایت حج: یعنی حج کے جو واجبات ہیں، ان کو ترک کردینا یا ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا۔

احرام کی جنایت آٹھ ہیں: (۱) مردوں کا سلے ہوئے کپڑے پہننا۔ (۲) مردوں کا سر اور چہرہ ڈھانکنا۔ (۳) خوش بو لگانا۔ (۴) بدن کے کسی بھی عضو کے بال دور کرنا۔ (۵) ناخن تراشنا۔ (۶) بدن کی جوں مارنا یا اس کو بدن سے علاحدہ کرنا۔ (۷) جماع کرنا، یا شہوت کے ساتھ بوسہ دینا، یا شہوت سے عورت کو پکڑ کر دبانا۔ (۸) خشکی کے جانور کا شکار کرنا۔[۲]

حج کی مبارک اور مقبولیت کے اوقات میں احقر کو بھی یاد فرمائیں۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۲) اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ. (۲-البقرة:۱۹۷)

عن ابن عمر، قال: "الرفث: الجماع، والفسوق: ما أصيب من معاصي الله من صيد وغيره، والجدال: السباب والمنازعة. (المستدرك على الصحيحين-أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله بن محمد بن حمدويه بن نعيم بن الحكم الضبي الطهماني النيسابوري المعروف بابن البيع (م:۴۰۵ھ): ۲/ ۳۰۳، رقم الحديث: ۳۰۹۴، كتاب التفسير، من سورة البقرة، ت: مصطفى عبد القادر عطا، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

الجناية: هنا ما تكون حرمته بسبب الإحرام أو الحرم، وقد يجب بها دمان أو دم أو صوم أو صدقة. (الدر المختار)

(قوله بسبب الإحرام أو الحرم) حاصل الأول سبعة نظمها الشيخ قطب الدين بقوله:

محرم الإحرام يا من يدري		إزالة الشعر وقص الظفر
واللبس والوطء مع الدواعي		والطيب والدهن وصيد البر

زاد في البحر ثامنا وهو ترك واجب من واجبات الحج. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۴۳، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر)

فليتق الرفث والفسوق والجدال، ولا يلبس قميصا ولا سراويل، ولا عمامة، ولا قلنسوة، ولا قباء، ولا خفين، ولا يحلق شيئا من شعر رأسه وجسده ولا يلبس ثوبا معصفرا ونحوه، ولا يغطي رأسه ولا وجهه، ولا يتطيب، ولا يغسل رأسه ولا لحيته بالخطمي، ولا يدهن، ولا يقتل صيد البر، ولا يشير إليه، ولا يدل عليه... ولا يكسر بيض الصيد، ولا يقطع شجر الحرم. (المختار مع تعليل الاختيار - عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳ھ): ۱/ ۱۴۵، كتاب الحج، فصل ما يستحب فعله لمن أراد أن يحرم، ت: الشيخ محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة ☆غنية الناسك في بغية المناسك- محمد حسن شاه المهاجر المكي، ص: ۱۰۸- ۱۱۳، كتاب الحج، فصل في محرمات الإحرام ومحظوراته، ط: مکتبہ یادگار شیخ -سہارن پور☆كنز الدقائق مع البحر الرائق: ۲/ ۵۶۵، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: زكريا-ديوبند☆مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر: ۱/ ۳۹۷-۳۹۸، كتاب الحج، ط: مكتبة فقيه الامة-ديوبند)

[۲] طواف وداع صرف آفاقی پر لازم ہے

۱۷۸۶- سوال: ہم دو بھائی جدہ میں کام کرتے ہیں، حج میں ہم نے طواف وداع نہیں کیا، اور احرام کھول کر سیدھے جدہ چلے گئے، پھر پتہ چلنے پر واپس احرام باندھے بغیر ہی طواف وداع کیا، تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ کیا اس کی وجہ سے دم واجب ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً:

طواف وداع اس حاجی پر واجب ہے، جو آفاقی ہو، یعنی میقات سے باہر کا رہنے والا ہو۔ جو حجاج کرام حرم کی حدود میں رہتے ہیں، یا حل میں؛ میقات سے اندر رہتے ہیں، ان پر طواف وداع واجب نہیں ہے؛ لہٰذا آپ چوں کہ جدہ میں رہتے ہیں اور جدہ میقات سے اندر کا حصہ ہے، اس لیے آپ کے ذمہ طواف وداع واجب نہیں ہے، اس لیے صورت مسئولہ میں کوئی دم لازم نہ ہوگا۔ (1) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] چند اصطلاحی الفاظ کی وضاحت

۱۷۸۷- سوال: حضرت مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

---

(۱) وأما شرائطه [طواف الصدر] فبعضها شرائط الوجوب، وبعضها شرائط الجواز.

أما شرائط الوجوب فمنها أن يكون من أهل الآفاق فليس على أهل مكة، ولا من كان منزله داخل المواقيت إلى مكة طواف الصدر إذا حجوا؛ لأن هذا الطواف إنما وجب توديعا للبيت، ولهذا يسمى طواف الوداع، ويسمى طواف الصدر لوجوده عند صدور الحجاج ورجوعهم إلى وطنهم، وهذا لا يوجد في أهل مكة؛ لأنهم في وطنهم، وأهل داخل المواقيت في حكم أهل مكة، فلا يجب عليهم كما لا يجب على أهل مكة، وقال أبو يوسف أحب إلي أن يطوف المكي طواف الصدر؛ لأنه وضع لختم أفعال الحج، وهذا المعنى يوجد في أهل مكة. (بدائع الصنائع: ۱۴۲/۲، كتاب الحج، فصل شرائط وجوب طواف الصدر، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰ھ): ۴۱۰/۱، كتاب المناسك، باب الإحرام، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۳۵/۴، كتاب المناسك، باب الطواف، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح- أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱ھ)، ص: ۷۳۷، كتاب الحج، فصل في كيفية ترتيب أفعال الحج، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۲۹۸/۱، كتاب الحج، الواجبات التي يجب بها الدم، ط: زكريا- ديوبند)

سلام مسنون کے بعد۔

سفر حج کے دوران درج ذیل الفاظ سننے میں آئے، جن کا معنی اور مطلب مجھے معلوم نہیں ہے، آپ سے درخواست ہے کہ اس کی وضاحت فرما کر میری راحت کا سامان مہیا فرمائیں۔ الفاظ یہ ہیں: (۱) دم، (۲) بدنہ اور (۳) صدقہ۔

الجواب حامداومصلیا:

آپ نے بڑی اہم بات پوچھی ہے، یہ حج کے اصطلاحی الفاظ ہیں، جن سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔

دم: سے مراد بکرا، دنبہ اور مینڈھے کو ذبح کرنا ہے، یا بڑے جانور: گائے، بھینس وغیرہ میں سے ساتواں حصہ قربان کرنا ہے، اس جانور میں ان تمام شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، جو قربانی کے جانور میں ضروری ہے۔ (۱)

بدنہ: اس لفظ سے مراد بڑا جانور: گائے، بھینس اور اونٹ ہے۔ جہاں بدنہ واجب ہوتا ہے، وہاں اس کے کل حصہ کا قربان کرنا واجب ہوتا ہے، ساتواں حصہ کافی نہیں ہوتا۔ بدنہ صرف دو مقام پر واجب ہوتا ہے۔ (۱) حیض، نفاس یا جنابت کی حالت میں طواف زیارت کرنے میں۔ (۲) وقوف عرفہ کے بعد حلق سے پہلے عورت سے جماع کر لینے میں۔ (۲)

---

(۱) الدم بالتخفيف، هو ذلك السائل الأحمر الذي يجري في عروق الحيوانات، وعليه تقوم الحياة.

واستعمله الفقهاء بهذا المعنى، وكذلك عبروا به عن القصاص والهدي في قولهم: مستحق الدم (يعني ولي القصاص) وقولهم: يلزمه دم. كما أطلقوه على ماتراه المرأة في الحيض، والاستحاضة، والنفاس أيضا. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۵/۲۱، مادة: "الدم"، ط: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية-الكويت)

(۲) "ولا يجوز في الهدايا إلا ما جاز في الضحايا" لأنه قربة تعلقت بإراقة الدم كالأضحية فيتخصصان بمحل واحد "والشاة جائزة في كل شيء إلا في موضعين: من طاف طواف الزيارة جنبا، ومن جامع بعد الوقوف بعرفة، فإنه لا يجوز فيهما إلا البدنة". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱۸۱/۱، كتاب الحج، باب الهدي، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۲۶۱/۱، كتاب المناسك، الباب السادس عشر في الهدي، ط: دار الفكر ☆ غنية الناسك، ص: ۳۰۹، باب الجنايات، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(البدن) جمع بدنة (من الإبل والبقر) والهدى منهما ومن الغنم. (درر الحكام شرح غرر الأحكام- محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا- أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۲۳۳/۱، كتاب الحج، باب المواقيت، قبيل: باب القران والتمتع، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۵۲۸/۲، كتاب الحج، قبيل: باب القران، ط: دار الفكر)

صدقہ: حج کے مسائل بیان کرنے کے دوران جہاں بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے، وہاں پر عام طور پر صدقۂ فطر کے بہ قدر گیہوں یا اس کی قیمت صدقہ کرنا مراد ہوتا ہے۔ البتہ بعض دفعہ صدقہ میں ایک مشت گیہوں یا روٹی کا ٹکڑا یا پنیر دینا بھی کافی ہوتا ہے، جیسے: جوں اور ٹڈی کے مارنے میں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] کامل وناقص جنایت کی مراد اور اس کی جزاء

۱۷۸۸- سوال: کامل جنایت اور ناقص جنایت کسے کہتے ہیں، ان کے ارتکاب کی صورت میں جزاء کے طور پر کیا شئے واجب ہوتی ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

بدن کے کسی بڑے عضو: سر، ڈاڑھی، ہتھیلی یا ران وغیرہ پر یا پورے بدن پر بلا عذر خوش بو لگانا، خواہ خوش بو تھوڑی ہی دیر کے لیے لگائی جائے، یہ تمام صورتیں کامل جنایت کہلاتی ہیں، اس میں دم واجب ہوتا ہے۔ (۲)

---

(۱) "وكل صدقة في الإحرام غير مقدرة فهي نصف صاع من بر إلا ما يجب بقتل القملة والجرادة" هكذا روي عن أبي يوسف رحمه الله. (الهداية في شرح بداية المبتدي: ۱/۱۵۷، كتاب الحج، باب الجنايات، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت ☆غنية الناسك، ص:۳۰۹، باب الجنايات، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(۲) "وإذا تطيب المحرم فعليه الكفارة فإن طيب عضوا كاملا فما زاد فعليه دم" وذلك مثل الرأس والساق والفخذ وما اشبه ذلك لأن الجناية تتكامل بتكامل الارتفاق وذلك في العضو الكامل فيترتب عليه كمال الموجب" وإن طيب أقل من عضو فعليه الصدقة " لقصور الجناية. (الهداية في شرح بداية المبتدي: ۱/۱۵۷-۱۵۲، كتاب الحج، باب الجنايات، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت☆)

(اعلم) بأن المحرم ممنوع من استعمال الدهن والطيب لقوله- صلى الله عليه وسلم- الحاج، الشعث التفل، وقال: يأتون شعثا غبرا من كل فج عميق. واستعمال الدهن والطيب يزيل هذا الوصف وما يكون صفة العبادة يكره إزالته إلا أن في ظاهر الرواية قال: إن استعمل الطيب في عضو كامل يلزمه الدم، وقد فسره هشام عن محمد- رحمهما الله تعالى- قال: كالفخذ والساق ونحوهما.

وإن استعمله فيما دون ذلك فعليه الصدقة وعلى قول محمد- رحمه الله تعالى- بحصته من الدم. وقال الشعبي - رحمه الله تعالى-: القليل والكثير من الطيب سواء في وجوب الدم به؛ لأن رائحة الطيب توجد منه سواء استعمل القليل أو الكثير، ولكنا نقول: الجزاء إنما يجب بحسب الجناية، وإنما تتكامل الجناية بما هو مقصود من قضاء التفث، والمعتاد استعمال الطيب في عضو كامل فتم به جنايته وفيما دون ذلك في جنايته نقصان فيكفيها نقصان الصدقة. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۴/۱۲۲، كتاب المناسك، باب الدهن والطيب، ط: دار المعرفة- بيروت)

اور کسی چھوٹے عضو، مثلا: کان، آنکھ، مونچھ یا انگلی وغیرہ پر یا بڑے عضو کے تھوڑے سے حصے پر بلا عذر خوش بو لگائی، تو یہ جنایت ناقص کہلائے گی، اس میں صدقۂ فطر کے بہ قدر صدقہ ادا کرنا واجب ہے، اور اگر عذر و لاچاری میں یہ جنایت کی ہے، تو اس کو اختیار ہے کہ صدقۂ فطر کے بہ قدر صدقہ ادا کرے، یا تین روزے رکھے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] حجر اسود پر خوش بو لگی ہو تو بوسہ دینا جائز نہیں

۱۷۸۹- سوال: حجر اسود کے اوپر خوش بو لگی ہو، اس کا بوسہ لیتے وقت قوی اندیشہ ہے کہ منہ یا ہاتھ پر لگ جائے گی، تو کیا اس صورت حال میں بوسہ دینا جائز ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

حجر اسود کے اوپر اگر خوش بو لگی ہوئی ہو، تو محرم کو اس کا بوسہ دینا جائز نہیں ہے؛ لیکن اگر محرم نے اس حال میں بوسہ دے دیا اور خوش بو اس کے منہ اور ہاتھ پر لگ گئی، تو اگر خوش بو زیادہ لگی ہے، تو دم واجب ہوگا اور اگر تھوڑی لگی ہو، تو صدقہ واجب ہوگا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) وكذا قال ابن الكمال: إن المراد الاحتراز عن العضو الصغير مثل الأنف والأذن لما عرفت أن من اعتبر في حد الكثرة العضو الكامل قيده بالكبير اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۴۵، كتاب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر)

(وإن طيب أو حلق) أو لبس (بعذر) خير إن شاء (ذبح) في الحرم (أو تصدق بثلاثة أصوع طعام على ستة مساكين) أين شاء (أو صام ثلاثة أيام) ولو متفرقة. (الدر المختار) ——— قال ابن عابدين: (قوله بعذر) قيد للثلاثة وليست الثلاثة قيدا، فإن جميع محظورات الإحرام إذا كان بعذر ففيه الخيارات الثلاثة كما في المحيط قهستاني، وأما ترك شيء من الواجبات بعذر فإنه لا شيء فيه على ما مر أول الباب عن اللباب، وفيه: ومن الأعذار الحمى والبرد والجرح والقرح والصدع والشقيقة والقمل، ولا يشترط دوام العلة ولا أداؤها إلى التلف بل وجودها مع تعب ومشقة يبيح ذلك، وأما الخطأ والنسيان والإغماء والإكراه والنوم وعدم القدرة على الكفارة فليست بأعذار في حق التخيير، ولو ارتكب المحظور بغير عذر فواجبه الدم عينا، أو الصدقة فلا يجوز عن الدم طعام ولا صيام، ولا عن الصدقة صيام؛ فإن تعذر عليه ذلك بقي في ذمته. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۵۷، كتاب الجنايات في الحج)

(۲) وإذا استلم الركن فأصاب فمه أو يده خلوف كثير فعليه دم وإن كان قليلا فعليه طعام. (الأصل المعروف بالمبسوط - أبو عبد الله محمد بن الحسن بن فرقد الشيباني (م:۱۸۹هـ): ۲/۴۷۸، كتاب المناسك، باب الدهن والطيب، ت: أبو الوفا الأفغاني، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية - كراتشي)

وإن استلم الركن فأصاب فمه أو يده خلوق كثير فعليه دم، وإن كان قليلا فعليه صدقة إذ لا فرق بين أن يكون =

[۶] کھانے میں خوش بو استعمال کرنا

۱۷۹۰- سوال: کھانے میں خوش بو استعمال کرنے کی کیا تفصیل ہے، اور اس میں کون سی جزاء واجب ہوتی ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

آپ کے سوال کا جواب بڑا تفصیل طلب ہے، اختصار کے ساتھ جواب یہ ہے کہ: خوش بو کو اگر کھانے میں ملا کر پکا دیا گیا ہو، تو اس میں کوئی جزاء واجب نہیں ہوگی، اگرچہ خوش بو کافی مقدار میں ہو اور کھانے سے خوش بو پھوٹ رہی ہو۔

کھانا پکا لینے کے بعد اگر خوش بو کسی چیز، مثلاً: چائے یا ترکاری میں ڈالی جائے، تو بھی اس سے کچھ واجب نہ ہوگا، البتہ اگر اس صورت میں لونگ، الائچی اور گرم مصالحہ وغیرہ کی خوش بو کھانے کے اندر سے پھوٹ رہی ہو، تو پھر کھانا مکروہ ہے۔

اگر خوش بو ملا کر کھانا پکایا نہیں گیا ہے تو اگر زیادہ مقدار میں کھایا اور خوش بو اس میں غالب ہے تو دم واجب ہوگا اور اگر کم کھایا، تو صدقہ واجب ہوگا، خواہ اس میں سے خوش بو نہ آتی ہو۔ چٹنی، اچار وغیرہ میں خوش بو پکائے بغیر ملائی جاتی ہے؛ لہٰذا اگر اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے چند دفعہ کھایا تو دم واجب ہوگا۔

ایسے کھانے میں جو پکایا نہیں گیا ہے، اس میں خوش بو ملائی گئی اور وہ خوش بو کھانے کے مقابلے میں کم ہے یعنی کھانے کی چیز مقدار میں غالب اور خوش بو مغلوب ہے، تو کوئی چیز واجب نہ ہوگی، تاہم اس کا کھانا مکروہ ہے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الخلوق التزق به من الركن أو من موضع آخر. (المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م:۴۸۳ھ): ۴/۱۲۴، كتاب المناسك، باب الدهن و الطيب، قبيل: اكتحال المحرم، ط: دار المعرفة-بيروت☆درر الحكام شرح غرر الأحكام-محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا- أو منلا أو المولى- خسرو (م:۸۸۵ھ): ۱/۲۳۹، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار إحياء الكتب العربية☆ البحر الرائق-ابن نجيم المصري (م:۹۷۰ھ): ۳/۵، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: زكريا - ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۳۱۳، الفصل الأول في الطيب، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور☆ بدائع الصنائع: ۲/۱۹۱، كتاب الحج، محظورات الإحرام، فصل تطيب المحرم، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) وإن استعمل في مأكول أو شقاق رجل لا يعطى له حكم الطيب كالشحم، ولو كان الطيب في طعام طبخ وتغير،=

[۷] پان میں خوش بودار تمباکو کھانا

۱۷۹۱- سوال: میں حج کرنے کے لیے جارہا ہوں، مجھے پان کھانے کی عادت ہے، پان میں خوش بو والا تمباکو بھی کھاتا ہوں، اب آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ: کیا احرام کی حالت میں خوش والا تمباکو ڈال کر پان کھاسکتا ہوں؟

الجواب حامداو مصليا:

پان میں خوش بو والا تمباکو اور الائچی وغیرہ کھانا مکروہ ہے، فقہ کے بعض الفاظ کے بہ موجب اس سے دم بھی واجب ہوتا ہے، لہٰذا اس میں احتیاط کی سخت ضرورت ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= فلا شيء على المحرم في أكله، سواء كان يوجد ريحه أو لا؛ لأن الطيب صار مستهلكا في الطعام بالطبخ، وإن كان لم يطبخ يكره إذا كان ريحه يوجد منه ولا شيء عليه؛ لأن الطعام غالب عليه، فكان الطيب مغمورا مستهلكا فيه، وإن أكل عين الطيب غير مخلوط بالطعام فعليه الدم إذا كان كثيرا. (بدائع الصنائع: ۱۹۱/۲، كتاب الحج، محظورات الإحرام، فصل تطيب المحرم، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ولو جعله في طعام قد طبخ فلا شيء فيه وإن لم يطبخ وكان مغلوبا كره أكله كشم طيب وتفاح. (الدر المختار: ۵۴۶/۲)

قال ابن عابدين: اعلم أن خلط الطيب بغيره على وجوه لأنه إما أن يخلط بطعام مطبوخ أو لا، ففي الأول لا حكم للطيب سواء كان غالبا أم مغلوبا، وفي الثاني الحكم للغلبة، إن غلب الطيب وجب الدم، وإن لم تظهر رائحته كما في الفتح، وإلا فلا شيء عليه غير أنه إذا وجدت معه الرائحة كره، وإن خلط بمشروب فالحكم فيه للطيب سواء غلب غيره أم لا، غير أنه في غلبة الطيب يجب الدم، وفي غلبة الغير تجب الصدقة إلا أن يشرب مرارا فيجب الدم. (رد المحتار على الدر المختار: ۵۴۷/۲، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۲۴۱/۱، كتاب المناسك، الباب الثامن في الجنايات، ط: دار الفكر-بيروت ☆ الفتاوى التاتارخانية- فريد الدين عالم بن العلاء (م:۷۸٦هـ): ۵۹۱/۳، كتاب الحج، نوع منه في الدهن والتطيب والخضاب، ط: زكريا- ديوبند☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص:۳۱۷-۳۱۸، باب الجنايات، مطلب في أكل الطيب وشربه، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(۱) الطيب كل شيء له رائحة مستلذة ويعده العقلاء طيبا كذا في السراج الوهاج... ولو كان الطيب في طعام طبخ وتغير فلا شيء على المحرم في أكله، سواء كان توجد رائحته أو لا، كذا في البدائع. وإن خلطه بما يؤكل بلا طبخ فإن كان مغلوبا فلا شيء عليه، غير أنه إن وجدت معه الرائحة كره، وإن كان غالبا وجب الجزاء ولو خلطه بما يشرب فإن كان غالبا فدم، وإلا فصدقة إلا أن يشرب مرارا فيجب دم، هكذا في النهر الفائق. (الفتاوى الهندية: ۲۴۰/۱-۲۴۱، كتاب المناسك، الباب الثامن في الجنايات، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۵۴۷/۲، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى التاتارخانية- فريد الدين عالم بن العلاء (م:۷۸٦هـ): ۵۹۱/۳، كتاب الحج، نوع منه في الدهن والتطيب والخضاب، ط: زكريا- ديوبند☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص:۳۱۷-۳۱۸، باب الجنايات، مطلب في أكل الطيب وشربه، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

[۸] غربت کی وجہ سے دم ساقط نہیں ہوتا ہے

۱۷۹۲- سوال: ایک شخص پر کسی جنایت کی وجہ سے دم واجب ہوا؛ لیکن اس کے پاس اتنا مال نہیں ہے کہ وہ اسے ادا کر سکے، تو کیا معافی کی کوئی شکل ہے؟ براہ کرم جلدی جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامدا ومصليا:

نادار و مفلس شخص، جس کے اندر دم ادا کرنے کی استطاعت نہیں ہے، اس سے دم ساقط نہ ہوگا۔ (۱) جب بھی اس کو مال میسر ہو، وہ دم ادا کرے، یہ حکم اس وقت ہے جب اس نے بلا عذر جنایت کی ہو۔ عذر سے اگر کوئی جنایت کی ہو، تو اس میں تین امور: دم، روزہ اور صدقہ میں سے کوئی ایک کرلے گا، تو واجب ادا ہو جائے گا۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] دم کا حدود حرم میں ذبح کرنا ضروری ہے

۱۷۹۳- سوال: مجھ پر کسی جنایت کی وجہ سے دم واجب ہے؛ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ وطن واپس جا کر دم ادا کروں، تو کیا یہ جائز ہے؟ دوسری بات یہ معلوم کرنا ہے کہ دم کا گوشت کن کو دیا جائے، کیا جانی [جنایت کرنے والا] کا خود کھانا اور دیگر اہل وعیال اور مال دار کو کھلانا جائز ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

جن صورتوں میں دم واجب ہے، اس کو حرم کی حدود میں ذبح کرنا ضروری ہے، حرم سے باہر ذبح کرنا

---

(۱) ولو ارتكب المحظور بغير عذر فواجبه الدم عينا، أو الصدقة فلا يجوز عن الدم طعام ولا صيام، ولا عن الصدقة صيام؛ فإن تعذر عليه ذلك بقي في ذمته. اهـ.______ وما في الظهيرية من أنه إن عجز عن الدم صام ثلاثة أيام ضعيف كما في البحر. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۵۷، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) "وإن تطيب أو لبس مخيطا أو حلق من عذر فهو مخير إن شاء ذبح شاة وإن شاء تصدق على ستة مساكين بثلاثة أصوع من الطعام وإن شاء صام ثلاثة أيام" لقوله تعالى: ﴿فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ﴾ [البقرة: ۱۹۶] وكلمة أو للتخيير، وقد فسرها رسول الله عليه الصلاة والسلام بما ذكرنا، والآية نزلت في المعذور. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۱۵۹، كتاب الحج، باب الجنايات، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۴۳، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۳/ ۲۲، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: زكريا- ديوبند)

جائز نہیں ہے۔ (۱) دم کا گوشت فقراء کو صدقہ کرنا ضروری ہے، خود کھانا یا مال دار کو کھلانا جائز نہیں ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] احرام کی حالت میں خوش بو والے مشروبات کا استعمال

۱۷۹۴- سوال: حضرت مفتی صاحب! مد فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

احرام کی حالت میں روح افزا کا شربت، سوڈا، لیمن وغیرہ پی سکتے ہیں یا نہیں؟ میں حج کے لیے جا رہا ہوں اور گرمی شدید ہے، ذرا تفصیل سے تحریر فرمادیں کہ کن کن مشروبات کا پینا محرم کے لیے جائز ہے اور کن کا نہیں؟

---

(۱) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ أَوْ عَدْلُ ذَٰلِكَ صِيَامًا لِيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ ۗ عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ ۚ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللَّهُ مِنْهُ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ. (۵- المائدة: ۹۵)

عن جابر، قال: ثم قال النبي صلى الله عليه وسلم: قد نحرت ها هنا ومنى كلها منحر، ووقف بعرفة فقال: قد وقفت ها هنا وعرفة كلها موقف، ووقف بالمزدلفة فقال: قد وقفت ها هنا ومزدلفة كلها موقف. (سنن أبي داود: ۲۴۶/۱، رقم الحديث: ۱۹۰۷، كتاب المناسك، باب صفة حجة النبي صلى الله عليه وسلم، ط: ديوبند)

قال "ولا يجوز ذبح الهدايا إلا في الحرم" لقوله تعالى في جزاء الصيد: ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدة: ۹۵] فصار أصلا في كل دم هو كفارة ولأن الهدي اسم لما يهدى إلى مكان ومكانه الحرم قال عليه الصلاة والسلام "منى كلها منحر وفجاج مكة كلها منحر". (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱۸۱/۱، كتاب الحج، باب الهدي، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ البحر الرائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۱۲۸/۳، كتاب الحج، باب الهدي، ط: زكريا- ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۳۳۸، فصل في شرائط كفاراتها الثلاث، مطلب في شرائط جواز الدم، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(۲) (ويأكل) استحبابا (من هدي التطوع) إذا بلغ محله (والمتعة والقران)... (لا) يأكل (من غيرها)؛ لأنها دماء كفارات... (وخص ذبح هدي المتعة والقران بأيام النحر دون غيرهما) أي يجوز ذبح بقية الهدايا في أي وقت شاء... (و) خص (الكل بالحرم)... (ويجوز أن يتصدق به) أي الهدي (على فقير الحرم وغيره) من الفقراء المستحقين. وقال الشافعي يختص به. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۳۰۰/۱، كتاب الحج، باب الهدي، ط: دار إحياء التراث العربي)

الجواب حامداً ومصلیاً:

ٹھنڈے مشروبات، مثلاً: سوڈا، لیمن، شربت وغیرہ میں اگر خوش بو نہیں ہے، تو حالت احرام میں اس کا پینا جائز ہے۔ اور اگر اس میں خوش بو ملی ہوئی ہے، تو اگر خوش بو غالب ہے، تو صدقہ واجب ہوگا؛ لیکن اگر ایک ہی مجلس میں بار بار ایسی خوش بو والی چیز پی لی، تو اس سے دم واجب ہوگا۔ (☆☆) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] ۱-عمرہ کرنے والے کا حدود حرم سے باہر بال کٹوانا

[۱۲] ۲-دم جنایت کا مقام اور اس کے گوشت کا حکم

۱۷۹۵-سوال: ایک شخص عمرہ کے لیے گیا، اس نے عمرہ تو کرلیا؛ لیکن ازدحام کی وجہ سے اس نے حرم کے حدود میں بال نہیں کٹوائے، بل کہ جدہ میں جاکر بال کٹوائے، تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟ کیا اس پر دم واجب ہوگا؟ اگر واجب ہے، تو یہ دم کہاں ادا کرنا ہوگا، حرم کی حدود میں؟ یا انڈیا میں بھی ادا کر سکتے ہیں؟ اس دم کا گوشت عزیز واقارب اور مال دار کو دے سکتے ہیں؟ مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

حج یا عمرہ کے ارکان سے فراغت کے بعد حدود حرم ہی میں بالوں کو منڈانا یا کتروانا واجب ہے، حدود حرم سے باہر حل میں مثلاً: جدہ وغیرہ جاکر بال کٹوانے سے ترک واجب کا ارتکاب لازم آئے گا، جس کی وجہ سے دم واجب ہوتا ہے، پس صورت مسئولہ میں اس شخص پر دم واجب ہے۔(۱)

(☆☆) وإن خلط بمشروب فالحكم فيه للطيب سواء غلب غيره أم لا، غير أنه في غلبة الطيب يجب الدم، وفي غلبة الغير تجب الصدقة إلا أن يشرب مرارا فيجب الدم. (رد المحتار على الدر المختار: ۵۴۷/۲، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۲۴۱/۱، كتاب المناسك، الباب الثامن في الجنايات، ط: دار الفكر- بيروت ☆ النهر الفائق- سراج الدين، عمر بن إبراهيم، ابن نجيم الحنفي (م: ۱۰۰۵ھ): ۱۱۷/۲، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: دار الإيمان- سهارن فور)

وإن خلطه بمشروب كالهيل والقرنفل بالقهوة، فالحكم للطيب مائعا كان أو جامدا، فإن الطيب غالبا يجب دم إن شرب كثيرا وإلا فصدقة، وإن كان مغلوبا فصدقة إلا أن يشربه مرارا فدم إن اتحد المجلس وإن لا، فلكل مرة صدقة. (غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۳۱۸، باب الجنايات، مطلب في أكل الطيب وشربه، ط: مكتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(۱) ومن اعتمر فخرج من الحرم وقصر فعليه دم عند أبي حنيفة ومحمد -رحمهما الله تعالى- وقال أبو يوسف -رحمه الله- لا شيء عليه، .... والتقصير والحلق في العمرة غير موقت بالزمان بالإجماع؛ لأن أصل العمرة لا =

اور یہ دم حدودِ حرم میں ہی ادا کرنا واجب ہے، حرم کے علاوہ اپنے وطن یا جدہ وغیرہ میں ادا کرنا کافی نہ ہوگا۔ (۲) اس دم کے لیے چھوٹا جانور ذبح کرے، بڑے جانور میں ایک حصہ رکھنا بھی جائز ہے۔ اور دم کے جانور میں وہ سب شرائط کا ہونا ضروری ہے، جو قربانی کی صحت کے لیے ہیں۔ (۳)

اس دم کو "دم جنایت" کہا جاتا ہے، اس کا گوشت فقراء ہی کو دینا ضروری ہے، خود کھانا، یا مال داروں کو دینا جائز نہیں۔ (۴) اگر کسی ایک فقیر کو بھی دے دیا اور اس کو اس کا مالک بنا دیا، تو یہ جائز ہے، ذمہ بری ہوجائے گا۔ (۵) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=يتوقت به بخلاف المكان لأنه موقت به.———— قال: "فإن لم يقصر حتى رجع وقصر فلا شيء عليه في قولهم جميعا" معناه إذا خرج المعتمر ثم عاد لأنه أتى به في مكانه فلا يلزمه ضمانه". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۶۴، كتاب الحج، باب الجنايات، فصل: ومن طاف طواف القدوم محدثا فعليه صدقة، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۵۴، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر-بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۲/۱۴۱، كتاب الحج، فصل بيان زمان ومكان الحلق والتقصير، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) عن جابر، قال: ثم قال النبي صلى الله عليه وسلم: قد نحرت ها هنا، ومنى كلها منحر، ووقف بعرفة فقال: قد وقفت ها هنا وعرفة كلها موقف، ووقف بالمزدلفة فقال: قد وقفت ها هنا، ومزدلفة كلها موقف. (سنن أبي داود: ۱/۲۶۶، رقم الحديث: ۱۹۰۷، كتاب المناسك، باب صفة حجة النبي صلى الله عليه وسلم، ط: ديوبند)

قال "ولا يجوز ذبح الهدايا إلا في الحرم" لقوله تعالى في جزاء الصيد: ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدة: ۹۵] فصار أصلا في كل دم هو كفارة، ولأن الهدي اسم لما يهدى إلى مكان، ومكانه الحرم، قال عليه الصلاة والسلام: "منى كلها منحر وفجاج مكة كلها منحر". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۸۱، كتاب الحج، باب الهدي، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ البحر الرائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۳/۱۲۸، كتاب الحج، باب الهدي، ط: زكريا- ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۳۳۸، فصل في شرائط كفاراتها الثلاث، مطلب في شرائط جواز الدم، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(۳) "ولا يجوز في الهدايا إلا ما جاز في الضحايا"؛ لأنه قربة تعلقت بإراقة الدم كالأضحية فيتخصصان بمحل واحد "والشاة جائزة في كل شيء إلا في موضعين: من طاف طواف الزيارة جنبا، ومن جامع بعد الوقوف بعرفة، فإنه لا يجوز فيهما إلا البدنة". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۸۱، كتاب الحج، باب الهدي، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۶۱، كتاب المناسك، الباب السادس عشر في الهدي، ط: دار الفكر ☆ غنية الناسك، ص: ۳۰۹، باب الجنايات، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(۴) (ويأكل) استحبابا (من هدي التطوع) إذا بلغ محله (والمتعة والقران)... [بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر]

[۱۴۳] دم جنایت کا حرم میں ادا کرنا ضروری ہے

۱۷۹۶- سوال: حج کی جنایات میں جو دم واجب ہوتا ہے، اس دم کا حرم شریف میں ادا کرنا ضروری ہے، یا کوئی شخص اپنے وطن میں آ کر بھی ادا کر سکتا ہے؟

(۱) آپ کی کتاب ''مسائل حج'' [گجراتی ایڈیشن] کے صفحہ نمبر ۱۴۲ ر پر فائدہ نمبر ۳ر[1] کی عبارت کے اطلاق سے کسی نے یہ مطلب نکالا کہ جنایت کا دم کہیں بھی ادا کیا جا سکتا ہے، یہ دم حرم میں ادا کرنا ضروری نہیں ہے، تو اس سلسلہ میں کیا حکم ہے؟ اگر کسی نے وطن میں دم ادا کر دیا، تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟ بینوا، وتوجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

اس دم کا حرم شریف میں ادا کرنا ضروری ہے، دوسری جگہ یہ دم ادا کرنے سے وہ معتبر نہ ہوگا، اگر وطن

[بقیہ پچھلے صفحہ کا] (لا) يأكل (من غيرها)؛ لأنها دماء كفارات... (وخص ذبح هدي المتعة والقران بأيام النحر دون غيرهما) أي يجوز ذبح بقية الهدايا في أي وقت شاء... (و) خص (الكل بالحرم)... (ويجوز أن يتصدق به) أي الهدي (على فقير الحرم وغيره) من الفقراء المستحقين. وقال الشافعي يختص به. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م:۱۰۷۸هـ):۱/۳۰۰، كتاب الحج، باب الهدي، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۵) ولو أكله بعد ذبحه غرمه ويجوز التصدق بكل لحمه أو بما غرمه من قيمة أكله على مسكين واحد، بحر. (رد المحتار على الدر المختار:۲/۵۴۶، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر-بيروت)

[حواشی صفحہ ہٰذا]

۱] مسائل حج کے اردو ایڈیشن میں یہ مسئلہ اس طرح ہے:

فائدہ (۳): جنایت کی جزاء فوراً ادا کرنا ضروری نہیں، موت سے پہلے تک ادا کرنا ضروری ہے، اگر ادا نہیں کر سکا، تو اس کی وصیت کرنا لازم ہے، اگر وصیت نہیں کی، اور ورثاء نے اپنے مورث کی طرف سے تبرعاً ادا کر دیا، تو ان شاء اللہ ادا ہو جائے گی۔ (مسائل حج، ص:۱۶۷، جنایت کا بیان، ط: دارالعلوم مدنی دارالتربیت، کرمالی)

مذکورہ مسئلہ کے اطلاق سے قاری کو دھوکہ ہوا کہ دم کی جزاء موت تک ادا کی جا سکتی ہے، خواہ کہیں بھی کی جائے، حالاں کہ اس مسئلہ میں صرف اس کا بیان ہے کہ جزاء کب تک ادا کی جا سکتی ہے، کہاں ادا کی جائے گی؟ اس کی تفصیل نہیں ہے، اس کی تفصیل مسائل حج کے ص:۱۸۷، پر موجود ہے۔ [مرتب]

آ گئے ہیں، تو کسی کو وکیل بنا کر حرم میں ادا کرنا ضروری ہے۔ (ہدایہ☆ مسائل حج)[1]

(۲) صفحہ ۱۵۳/ پر اس کی تفصیل موجود ہے۔[2] اگر پوری کتاب پڑھ لیتے، تو شاید اطلاق سے جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے، وہ نہ ہوتی۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] مسواک کے لیے ٹہنی توڑنے پر ثابت شدہ جنایت وطن میں ادا کرنا

۱۷۹۷- سوال: مزدلفہ میں اگر کسی نے مسواک بنانے کے لیے درخت کی ٹہنی توڑی، اس کے بعد اس کو علم ہوا کہ یہ جائز نہیں ہے، تو اس پر دم واجب ہوگا یا نہیں؟ اور یہ دم اپنے وطن میں آ کر ادا کرے، تو درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

اگر اس جنایت میں جانور ذبح کرنا ہو، تو حرم میں ذبح کرنا ضروری ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] جنایت میں واجب شدہ صدقہ وطن میں آ کر ادا کرنا

۱۷۹۸- سوال: جنایت میں جو صدقہ واجب ہوتا ہے، اس کو حرم میں ادا کرنا ضروری ہے، یا بعد میں دوسری جگہ بھی ادا کیا جا سکتا ہے؟

---

[۱] قال "ولا يجوز ذبح الهدايا إلا في الحرم" لقوله تعالى في جزاء الصيد: ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدة:۹۵] فصار أصلا في كل دم هو كفارة، ولأن الهدي اسم لما يهدى إلى مكان، ومكانه الحرم. قال عليه الصلاة والسلام: "منى كلها منحر وفجاج مكة كلها منحر". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۸۱، كتاب الحج، باب الهدي، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت☆ البحر الرائق- ابن نجيم المصري(م:۹۷۰هـ): ۳/۱۲۸، كتاب الحج، باب الهدي، ط: زكريا- ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص:۳۳۸، فصل في شرائط كفاراتها الثلاث، مطلب في شرائط جواز الدم، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

[۲] مسئلہ نمبر ۵۴۵: جن صورتوں میں دم واجب ہے، اس دم کو حرم کی حدود میں ذبح کرنا ضروری ہے، حرم سے باہر ذبح کرنا جائز نہیں۔ (مسائل حج، ص:۱۸۷، رمی کی جنایات، ط: دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی)

(۳) تقدم تخريجه وتفصيله غير مرة.

ولا يجوز اتخاذ المساويك من أراك الحرم وسائر أشجاره إذا كان أخضر اهـ. (منحة الخالق على البحر الرائق: ۲/۴۷، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، فصل قتل محرم صيدا أو دل عليه من قتله، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۶۴، كتاب الحج، الباب السابع عشر في النذر بالحج، ط: دار الفكر - بيروت)

الجواب حامداً ومصلیاً:

''صدقہ'' حرم میں ادا کرنا ضروری نہیں ہے، اپنے وطن میں بھی دیا جا سکتا ہے۔ (ہدیہ:۱/۲۶۰)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] کیا دم کی قربانی وطن میں کر سکتے ہیں، کیوں کہ حرم میں فقراء میسر نہیں ہوتے؟

۱۷۹۹- سوال: دم کی قربانی میں مسئلہ یہ ہے کہ اس کا گوشت غریبوں کو دینا چاہیے، تو حاجی اکثر اجنبی اور حرم کی مکمل صورت حال سے ناواقف ہوتے ہیں، تو ان کے لیے وہاں غریبوں کا تلاش کرنا بہت مشکل ہے اور غرباء ملتے بھی نہیں ہیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں فراخی رکھی ہے اور اگر ہو بھی، تو اجنبی آدمی کے لیے کسی غریب کا پہچاننا بہت مشکل ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسی صورت میں حاجی اپنے وطن میں قربانی کر سکتا ہے؟ اور اگر حرم میں کرنا ضروری ہے، تو پھر اس گوشت کو وہاں کس طرح تقسیم کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

یہ دم وطن میں ادا کرنا جائز نہیں ہے، اور اصل چیز، جانور کا ذبح کرنا ہے، غرباء کو تلاش کرنا ضروری نہیں ہے، آپ جس کام کو مشکل سمجھتے ہیں، حقیقت میں ایسا نہیں ہے، غرباء، حرم شریف کے سامنے ہی نظر آتے ہیں، اور اگر بالفرض وہ موجود نہ ہوں، تو مقامی کسی شخص سے بات کر کے جانور ذبح کر کے گوشت اس کے حوالہ کر دیں، الغرض! کسی بھی صورت میں دم کا جانور حرم شریف کے علاوہ میں ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] أما الصدقة قربة معقولة في كل زمان ومكان. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۲۶۰، كتاب الحج، باب الجنايات، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

ولا تختص الصدقة بزمان ولا مكان. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري- الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ)، ص: ۵۶۵، أحكام الصدقة، وشرائط جوازها، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة)

[۲] (ويختص) أي جواز ذبحه (بالمكان وهو الحرم) فلا يجوز ذبحه في غيره أصلا. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري- الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ)، ص: ۳۶۹، باب القران، فصل في هدي القارن والمتمتع، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة☆الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۱۸۱، كتاب الحج، باب الهدي، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت★البحر الرائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۳/ ۱۲۸، كتاب الحج، باب الهدي، ط: زكريا- ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۳۳۸، فصل في شرائط كفاراتها الثلاث، مطلب في شرائط جواز الدم، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

[۱۷] عقیقہ یا قربانی کے جانور میں دم جنایت کا حصہ رکھنا

۱۸۰۰- سوال: عقیقہ یا قربانی کے جانور میں دم کا حصہ رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیا:

مستحب یہ ہے کہ قربانی کے جانور میں شرکاء، قربانی ہی کے ہوں، اگر اس میں دم احصار، دم تمتع، دم جنایت وغیرہ کے شرکاء ہوں، تو بھی جائز ہے۔ (شامی ☆ عالم گیری)[1]

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ: اگر قربانی کے جانور میں دم جنایت کا حصہ ہو، تو قربانی کرنے والے کے لیے بھی گوشت کا صدقہ کرنا ضروری ہے۔ (شامی: ۵/ ۲۸۵)[2] البتہ اگر اپنے اپنے حصے کو تقسیم کردے، تو قربانی کرنے والے کے لیے اپنے حصے کا صدقہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] محض تقصیرات کے توہم پر تلافی کے لیے دم ادا کرنا

۱۸۰۱- سوال: کسی حاجی کو معین طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ اس سے کون سی جنایت ہوئی ہے

---

[۱] فصح اشتراك ستة في بدنة شريت لقربة، وإن اختلفت أجناسها. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله وإن اختلفت أجناسها) في الفتح عن الأصل والمبسوط: كل من وجب عليه من المناسك جاز أن يشارك ستة نفر قد وجبت الدماء عليهم وإن اختلفت أجناسها من دم متعة وإحصار وجزاء صيد وغير ذلك، ولو كان الكل من جنس واحد كان أحب إلي. اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۱۵، كتاب الحج، باب الهدي، ط: دار الفكر - بيروت)

قلت: وفي أضحية القهستاني: لو ذبح سبعة عن أضحية، ومتعة، وقران، وإحصار، وجزاء الصيد، أو الحلق، والعقيقة والتطوع؛ فإنه يصح في ظاهر الأصول. وعن أبي يوسف الأفضل أن تكون من جنس واحد، فلو كانوا متفرقين وكل واحد متقرب جاز. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۴۳، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج)

ولو أرادوا القربة - الأضحية أو غيرها من القرب - أجزأهم، سواء كانت القربة واجبة أو تطوعا، أو وجب على البعض دون البعض، وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت، بأن أراد بعضهم الأضحية، وبعضهم جزاء الصيد، وبعضهم هدي الإحصار، وبعضهم كفارة عن شيء أصابه في إحرامه، وبعضهم هدي التطوع، وبعضهم دم المتعة أو القران، وهذا قول أصحابنا الثلاثة رحمهم الله تعالى، وكذلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل، كذا ذكر محمد - رحمه الله تعالى - في نوادر الضحايا. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۴، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ط: دار الفكر - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۵/ ۷۰، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۲] لم أظفر به.

محض یہ سمجھ کر کہ مجھ سے کوئی نہ کوئی غلطی ہوئی ہوگی، وہ دم دینا چاہتا ہے تو دم دے سکتا ہے یا نہیں؟ تا کہ اس کی وہ غلطی اللہ تعالیٰ معاف فرمادے، ایسی صورت میں بکرا ذبح کرے یا کسی بڑے جانور میں حصہ رکھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

احکام اسلام کا مدار نیت پر ہے، شک کی وجہ سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا ہے؛(۱) اس لیے ایسا دم دینا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر اس گوشت سے کوئی فائدہ اٹھانے والا نہ ہو، تو وہ برباد ہوگا، جس کی وجہ سے یہ دم ادا کرنا اسراف میں داخل ہو جائے گا اور یہ جائز نہیں۔(۲)

بہتر یہ ہے کہ جانور ذبح کرنے کی بجائے نقد رقم غرباء پر صدقہ کر دے، تا کہ وہ اپنی ضرورت پوری کر سکیں اور آپ کو اس کا ثواب بھی مل جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] حاجی اپنی قربانی کہاں کرے؟

۱۸۰۲- سوال: تقریباً ڈیڑھ سال سے ایک شخص عرب ملک میں ملازمت کرتا ہے، اب اس کے

---

(۱) قاعدة: اليقين لا يزول بالشك. (قواعد الفقه، ص: ۱۴۳، رقم: ۴۲۱، ط: الصدف- كراتشي)

(۲) كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ (۶- الأنعام: ۱۴۳)

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ (۱۷- الإسراء: ۲۶-۲۷)

عن المغيرة بن شعبة، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: "إن الله حرم عليكم: عقوق الأمهات، ووأد البنات، ومنع وهات، وكره لكم قيل وقال، وكثرة السؤال، وإضاعة المال". (صحيح البخاري: ۱/ ۳۲۴، رقم الحديث: ۲۴۰۸، كتاب في الاستقراض وأداء الديون والحجر والتفليس، باب ما ينهى عن إضاعة المال ☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۷۵، رقم الحديث: ۱۲-(۵۹۳)، كتاب الأقضية، باب النهي عن كثرة المسائل من غير حاجة... ، ط: ديوبند)

وإضاعة المال صرفه في غير وجهه، وقيل: إنفاقه في غير طاعة الله تعالى، والإسراف والتبذير. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۱۲/ ۲۴۶، باب ما ينهى عن إضاعة المال... الخ، ط: دار إحياء التراث العربي)

قوله: (وإضاعة المال)، هو رواية الكشميهني وفي رواية غيره: (إضاعة الأموال)، وهو أن يتركه من غير حفظ له فيضيع، أو يتركه حتى يفسد، أو يرميه إذا كان يسيرا كبرا عن تناوله، أو بأن يرضى بالغبن، أو ينفقه في البناء واللباس والمطعم بإسراف، أو ينفقه في المعاصي، أو يسلمه لخائن أو مبذر... الخ. (المصدر السابق: ۹/ ۶۱، باب قول الله تعالى: لا يسئلون الناس إلحافا)

سیٹھ (کفیل) نے اس کو حج کرنے کی اجازت دی ہے؛ لیکن حجاج کرام کو قربانی کا جانور بڑا مہنگا ملتا ہے، بڑے جانور کی قیمت دو ہزار ریال اور چھوٹے جانور کی قیمت پانچ سو یا چھ سو ریال ہے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا حاجی کو اپنی قربانی اپنے وطن میں کرنے کی اجازت ہے یا وہیں منیٰ میں کرنا لازم ہے؟ قاسم جی آدم جی، دڑھال

الجواب حامداً ومصلیاً:

حاجی ایام حج میں اگر مقیم ہو، اس طور پر کہ پندرہ دن سے زیادہ وہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہے یا پندرہ دن ہو چکے ہیں، تو اس پر قربانی واجب ہوگی، جس کو اپنے وطن میں بھی کر سکتا ہے۔

ہاں پندرہ دن مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کی نیت نہ ہو، یعنی وہ مسافر ہو، تو اس پر قربانی واجب نہیں ہے۔[۱]

البتہ جو قربانی حج قران یا حج تمتع کی وجہ سے واجب ہوئی ہے، اس کو منیٰ ہی میں کرنا واجب ہے، اپنے وطن میں جائز نہیں۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] رمی جمار اور قربانی کے درمیان ترتیب

۱۸۰۳-سوال: حضرت مفتی صاحب! جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ انتظامی سہولت کے

[۱] (وإنما تجب) التضحية ... (على حر)؛ فلا تجب على العبد، (مسلم)؛ فلا تجب على الكافر، (مقيم) فلا تجب على المسافر؛ لقول علي - رضي الله تعالى عنه - ليس على مسافر جمعة ولا أضحية، ... ويستوي فيه المقيم بالمصر والقوي والبوادي، (موسر)؛ لأن العبادة لا تجب إلا على القادر، وهو الغني دون الفقير، ومقداره ما تجب فيه صدقة الفطر. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ 'داماد أفندي' (م:۱۰۷۸ھ): ۵۱۶/۲، كتاب الأضحية، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ البحر الرائق: ۱۹۷/۸، كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ بدائع الصنائع: ۶۳/۵، كتاب الأضحية، فصل شرائط وجوب الأضحية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الدر المختار مع رد المحتار: ۳۱۲/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر ☆ الجوهرة النيرة: ۱۸۶/۲، كتاب الأضحية، حكم الأضحية، ط: المطبعة الخيرية)

(۲) قال "ولا يجوز ذبح الهدايا، إلا في الحرم" لقوله تعالى في جزاء الصيد: ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدة:۹۵] فصار أصلا في كل دم هو كفارة، ولأن الهدي اسم لما يهدى إلى مكان، ومكانه الحرم، قال عليه الصلاة والسلام: "منى كلها منحر، وفجاج مكة كلها منحر". (الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱۸۱/۱، كتاب الحج، باب الهدي، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ البحر الرائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۱۲۸/۳، كتاب الحج، باب الهدي، ط: زكريا - ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۳۳۸، فصل في شرائط كفاراتها الثلاث، مطلب في شرائط جواز الدم، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

پیشِ نظر حجاج کے پاس سے قربانی کی رقم سعودی حکومت پیشگی وصول کر لیتی ہے، حجاجِ کرام اِس رقم کو جمع کرواتے وقت قربانی کا وقت بھی لکھواتے ہیں، مثلاً دس ذی الحجہ کو صبح ۱۱ بجے ہماری جانب سے قربانی کرنی ہے، اب عام طور پر مزدلفہ سے واپسی میں کسی وجہ سے منیٰ پہنچنے اور رمی جمار کرنے میں تاخیر ہوتی ہے، اِس صورت میں جن لوگوں نے قربانی کی رقم جمع کرواکر قربانی کا وقت طے کر دیا ہوتا ہے، اُن کی جانب سے رمی سے قبل بھی قربانی ہو جاتی ہے، تو کیا اِس صورت میں مسلکِ حنفی کے مطابق دم واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

حج کے افعال میں رمی، ذبح اور حلق تینوں کے درمیان ترتیب واجب ہے، اور ترتیب کے ترک کی صورت میں حضرت امام ابوحنیفہ اور اِمام زفر رحمہما اللہ کے نزدیک دم (قربانی) واجب ہوتی ہے، اور حج کی جنایت (قصور) کے بارے میں یہ اصول ہے کہ جنایت خواہ قصداً ہوئی ہو یا بھول کر، جبراً ہوئی ہو یا اختیاراً، خود سے جنایت صادر ہوئی ہو یا دوسرے کو حکم دینے کی وجہ سے اُس نے کی ہو، ہر حال میں دم واجب ہوتا ہے، اِس لیے مذکورہ صورت میں، جب کہ قربانی کا ذمہ دار جس شخص کو ٹھہرایا ہے اُس نے رمی اور حلق سے پہلے قربانی کر دی تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق دم لازم ہوگا۔[1]

لیکن اِس سے بچنا ممکن بھی ہے، کہ وکیل کو احتیاطاً قربانی کے لیے آخری وقت ہی بتانا چاہیے، رمی کا وقتِ مباح اصحابِ عذر کے لیے دسویں ذی الحجہ (یوم النحر) کی شام اور اُس کے بعد آنے والی رات گیارہویں کی صبح صادق سے قبل تک رہتا ہے، اور قربانی دوسرے روز ہو سکتی ہے، دمِ قران و تمتع تین دِنوں کے اندر ادا کیا تو جائز ہے، اِس لیے حقیقت میں کوئی ایسا عذر متحقق نہیں ہو رہا ہے کہ امامِ اعظمؒ کے مسلک سے ہٹا جائے، فی الواقع عذر متحقق ہو، تب بھی دم لازم ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔

رہی یہ بات کہ ایسے مواقع میں صاحبینؒ کے مسلک کو اختیار کیا جائے یا نہیں؟ تو اُس کی قطعاً اِس مسئلہ میں ضرورت نہیں ہے، اور نہ علماءِ احناف میں سے کسی نے اِس مسئلہ میں صاحبینؒ کے مسلک کو راجح قرار

(۱) وعلى هذا: من قدم نسكا على نسك كأن حلق قبل الرمي أو نحر القارن قبل الرمي أو حلق قبل الذبح فعليه دم عند أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - وعندهما لا يلزمه الدم بالتقديم، والتأخير، ... وهذا لأن مراعاة الوقت في الأركان واجب كمراعاة المكان.... وترك الواجب في الحج يوجب الجبر بالدم. (المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۴/ ۴۱-۴۲، كتاب المناسك، باب الطواف، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ الهداية: ۱/ ۱۶۴، كتاب الحج، باب الجنايات، فصل: ومن طاف طواف القدوم... الخ، ط: دار إحياء التراث العربي)

دیا ہے؛ اِس لیے کہ اِمام صاحبؒ کے مسلک کی بنیاد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت پر ہے کہ:

عن ابن عباس قال: من قدم شيئا من حجه أو أخره، فليهرق لذلك دما. (مصنف ابن ابی شیبہ) [۲]

اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مسلک بھی ہے۔ نیز احصار کے بارے میں نص قرآنی بھی ہے:

"وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ". (۳)

اور اپنے سروں کو اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ قربانی اپنے موقع پر نہ پہنچ جاوے (اور وہ موقع حرم ہے کہ کسی کے ہاتھ وہاں جانور بھیج دیا جائے) (ترجمہ بیان القرآن)

چناں چہ مُحْصَر پر بھی دم لازم ہوگا، اگر چہ وہ کسی عذر کی بنا پر قربانی سے پہلے حلق کرالے۔ [۴] اِسی

[۲] الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار، المعروف بـ'مصنف ابن أبي شيبة'- أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م:۲۳۵هـ): ۳/۳۶۲، رقم الحديث: ۱۴۹۵۸، كتاب الحج، في الرجل يحلق قبل أن يذبح، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد - الرياض ☆شرح معاني الآثار - أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة بن عبد الملك بن سلمة الأزدي الحجري المصري المعروف بالطحاوي (م:۳۲۱هـ): ۲/۲۳۸، رقم الحديث: ۴۰۸۱، كتاب مناسك الحج، باب من قدم من حجه نسكا قبل نسك، ت: محمد زهري النجار - محمد سيد جاد الحق، ط: عالم الكتب)

(۳) ۲-البقرة: ۱۹۶.

[۴] عن عبيد الله، حدثني نافع، أن عبد الله بن عبد الله، وسالم بن عبد الله، كلما عبد الله حين نزل الحجاج لقتال ابن الزبير، قالا: لا يضرك أن لا تحج العام، فإنا نخشى أن يكون بين الناس قتال يحال بينك وبين البيت، قال: "فإن حيل بيني وبينه فعلت كما فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا معه، حين حالت كفار قريش بينه وبين البيت، أشهدكم أني قد أوجبت عمرة، فانطلق حتى أتى ذا الحليفة فلبى بالعمرة، ثم قال: إن خلي سبيلي قضيت عمرتي، وإن حيل بيني وبينه فعلت كما فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا معه، ثم تلا: {لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة} [الأحزاب: 21]، ثم سار حتى إذا كان بظهر البيداء قال: ما أمرهما إلا واحد، إن حيل بيني وبين العمرة حيل بيني وبين الحج، أشهدكم أني قد أوجبت حجة مع عمرة، فانطلق حتى ابتاع بقديد هديا، ثم طاف لهما طوافا واحدا بالبيت وبين الصفا والمروة، ثم لم يحل منهما حتى حل منهما بحجة يوم النحر ".(الصحيح لمسلم: ۱/۴۰۴، رقم الحديث: ۱۸۱-(۱۲۳۰)، كتاب الحج، باب جواز التحلل بالإحصار، ط: ديوبند)

(وإذا أحصر المحرم بعدو أو أصابه مرض فمنعه من المضي جاز له التحلل)... وإذا جاز له التحلل (يقال له ابعث شاة تذبح في الحرم، وواعد من تبعثه بيوم بعينه يذبح فيه، ثم تحلل). [الهداية]

قال ابن الهمام [م: ۸۸۱هـ]: وقوله ثم تحلل يفيد أنه لا يتحلل قبله حتى لو ظن المحصر أن الهدي قد ذبح في يوم المواعدة ففعل من محظورات الإحرام ثم ظهر عدم الذبح إذ ذاك كان عليه موجب الجناية. (فتح القدير: ۳/۱۲۶، كتاب الحج، باب الإحصار، ط: دار الفكر - بيروت)

طرح قارن و متمتع بھی قربانی سے پہلے حلق نہیں کرواسکتے ، بہر حال! حلق کو مؤخر کرنا ہوگا، اور حلق کے بغیر حلال نہیں ہوسکے گا۔

افعالِ حج سے فراغت پر حلق (سر منڈوانا یا کترِوانا) یہ بھی ایک فعل حج (عبادت) ہے؛ لیکن یہ اگر قربانی یا رمی سے پہلے ہوجائے، تو جنایت بن جاتا ہے؛ کیوں کہ احرام کے درمیان میں آجاتا ہے، اِس لیے دم لازم ہے۔[۵]

حضرت اِمامِ اعظمؒ کا مسلک اصول پر مکمل منطبق اور حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت پر مبنی ہے۔

حضرات صاحبینؒ اور دیگر ائمہ نے جس روایت سے استدلال کیا ہے، جس میں قربانی سے پہلے رمی یا حلق کے متعلق دریافت کیا گیا، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ارکان ادا کرتے رہو، کوئی حرج نہیں ہے:

"فما سئل عن شيء قدم أو أخر، إلا قال: افعل، ولا حرج".[۶]

اس کی توضیح یہ ہے کہ مذکورہ روایت اگر مفرد کے بارے میں ہے، تو سائل مفرد تھا، جس پر قربانی واجب نہیں؛ اِس لیے کہ مفرد کے ذمہ قربانی، رمی اور حلق کے درمیان ترتیب لازم نہیں ہے، اور اگر یہ حکم قارِن

---

[۵] (ولو حلق المفرد أو غيره) أي من القارن والمتمتع (قبل الرمي، أو القارن أو المتمتع) أي أو حلقا (قبل الذبح أو ذبحا قبل الرمي، فعليه دم) أو واحدة في المسئلة الأولى، و دمان عند أبي حنيفة في المسائل الباقية، دم للقران و التمتع، و دم للتحلل قبل الذبح وترك الترتيب الواجب عنده، وعندهما عليه دم للقران و التمتع. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۵۰۷، باب الجنايات و أنواعها، النوع الخامس: الجنايات في أفعال الحج، فصل في ترك الترتيب بين أفعال الحج، ت: محمد طلحة بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة ☆ بدائع الصنائع: ۵۸/۲، كتاب الحج، فصل بيان سنن الحج و بيان الترتيب، ط: دار الكتب العلمية)

(۶) مکمل روایت اس طرح ہے:

عن عبد الله بن عمرو بن العاص، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم وقف في حجة الوداع بمنى للناس يسألونه، فجاءه رجل فقال: لم أشعر فحلقت قبل أن أذبح؟ فقال: "اذبح ولا حرج" فجاء آخر، فقال: لم أشعر فنحرت قبل أن أرمي؟ قال: "ارم ولا حرج" فما سئل النبي صلى الله عليه وسلم عن شيء قدم ولا أخر إلا قال: "افعل ولا حرج".

(صحيح البخاري: ۱۸/۱، رقم الحديث: ۸۳، كتاب العلم، باب الفتيا وهو واقف على الدابة وغيرها، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۴۲۱/۱، رقم الحديث: ۳۲۷-(۱۳۰۶)، كتاب الحج، باب جواز تقديم الذبح على الرمي، والحلق على الذبح و على الرمي و تقديم الطواف عليها كلها، ط: ديوبند)

و متمتع کے لیے ہو، تو مطلب یہ ہے کہ ایسا ہو گیا ہے، تو ہونے دو، دم لازم نہیں، خلاصہ یہ کہ یہ روایت قارن و متمتع کے لیے ترتیب کے فوت ہونے کی صورت میں، دم لازم نہ ہونے پر صریح نہیں ہے؛ کیوں کہ مذکورہ روایت کے راویوں میں خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مسلک ہے کہ حج کے افعال میں تقدیم و تاخیر سے دم لازم آتا ہے، معلوم ہوا کہ "لاحرج" سے صرف گناہ کی نفی ہے۔[۷] اسی وجہ سے دیگر ائمہ کی مستدل روایت، دم لازم نہ ہونے کے بارے میں نص نہیں ہے، محتمل ہے، اس لیے کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ ارشادِ گرامی مفرد کے بارے میں ہے، دم کے وجوب یا عدمِ وجوب پر نص نہیں ہے، اس لیے ایسی محتمل روایت کی بنیاد پر حضرت امامِ اعظمؒ کے مسلک کو، جو اصول اور استناد سے مؤید ہے، ترک کرنے کی ضرورت و جواز معلوم نہیں ہوتا۔ (مبسوطِ سرخسی: ۴/۴۲☆ شامی: ۲/۵۴۳☆ بدائع الصنائع: ۲/۱۳۲، ۲/۱۷۸)[۸] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] عمرہ کے بعد حلق یا قصر کے لیے کس قدر بال کٹوانا ضروری ہے؟

۱۸۰۴- سوال: میرا ایک دوست کراچی میں رہتا ہے، اُس نے عمرہ کے لیے احرام باندھ کر سعی اور طواف کیا، پھر حلق یا قصر کروانے کے بجائے وہاں چند لوگوں کو دیکھ کر، لاعلمی کی وجہ سے، اُس نے بھی دونوں کانوں کی جانب سے کچھ بال کتروائے، پھر جب اُسے پتہ چلا کہ حلق یا قصر کروانا ضروری ہے، تو اُس نے دوبارہ احرام باندھ کر عمرہ کر کے قصر کروایا، اب سوال یہ ہے کہ کیا عمرہ میں حلق یا قصر کروانا ضروری ہے؟

---

(۷) ثم أجاب أبو حنيفة عن حديث الباب ونحوه: أن المراد بالحرج المنفي هو الإثم، ولا يستلزم ذلك نفي الفدية. وقال الطحاوي: هذا ابن عباس أحد من روى عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه: ما سئل يومئذ عن شيء قدم ولا أخر من أمر الحج إلا قال: لا حرج: فلم يكن معنى ذلك عنده على الإباحة في تقديم ما قدموا، ولا تأخير ما أخروا، مما ذكرنا أن فيه الدم، ولكن معنى ذلك عنده: على أن الذي فعلوه في حجة النبي صلى الله عليه وسلم كان على الجهل بالحكم فيه، كيف هو فعذرهم لجهلهم وأمرهم في المستأنف أن يتعلموا مناسكه. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري-بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۱۰/۵۹، كتاب الحج، باب الذبح قبل الحلق، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت☆ فتح القدير: ۳/۶۳، كتاب الحج، باب الجنايات، فصل طاف طواف القدوم محدثا، ط: دار الفكر☆ المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۴/۴۱-۴۲، كتاب المناسك، باب الطواف، ط: دار المعرفة - بيروت☆ بدائع الصنائع: ۲/۱۳۲، كتاب الحج، فصل زمان طواف الزيارة، ط: دار الكتب العلمية)

[۸] قدمر الكلام بجميع تفاصيله و كتبه المذكورة.

مذکورہ شخص جس نے غلطی کر کے دوبارہ عمرہ ادا کیا تو کیا وہ اپنے پہلے عمرہ سے حلال سمجھا جائے گا یا نہیں؟ دوسری دفعہ اُس کا احرام باندھنا صحیح ہوا یا نہیں؟ اور کیا دم واجب ہوگا؟ کراچی میں رہتے ہوئے دم ادا کرنے کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اِس شخص کے دونوں عمرے صحیح ہوئے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

احرام سے حلال ہونے کے لیے سر کے چوتھائی حصے کے بال کتروانا کافی ہے، اور قصر کی کم از کم حد یہ ہے کہ ایک انگلی کے ایک پورے کے بقدر چوتھائی سر کے بال کتروائے؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں جب کہ دونوں کانوں کی جانب سے بال کتروائے ہیں، تو اب دیکھ لیا جائے کہ دونوں جانب سے ایک پورے کے بہ قدر چوتھائی سر کی مقدار ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر چوتھائی سر کی مقدار ہو گئی ہے، تو یہ قصر کافی ہے۔[1] اور وہ شخص حلال ہو جائے گا، دونوں عمرے صحیح ہوں گے اور کوئی دم واجب نہیں ہوگا۔

اور اگر اتنی مقدار میں قصر نہیں کیا ہے، تو پہلا عمرہ دوسرے عمرے کے ساتھ مل گیا ہے، لیکن چوں کہ پہلے عمرہ کے طواف اور سعی کے بعد دوسرا عمرہ شروع کیا ہے؛ لہٰذا دونوں عمرے تو صحیح ادا ہو جائیں گے؛ لیکن دونوں عمرہ کے اختلاط کی وجہ سے بطورِ دم ایک بکری واجب ہوگی، پہلے عمرے میں کم بال کتروانے پر کوئی دم واجب نہیں ہوگا، دوسرے عمرہ کے بعد جو قصر کروایا ہے، اُس کے ذریعہ وہ دونوں عمرہ سے حلال سمجھا جائے گا، دونوں عمرہ صحیح ہیں؛ لیکن جان بوجھ کر ایک عمرہ کو دوسرے میں ملا دینا مکروہِ تحریمی ہے۔[2]

---

(۱) والتقصير قائم مقام الحلق في حكم التحلل، فإذا فعل ذلك في أحد جانبي رأسه أجزأه بمنزلة ما لو حلق نصف رأسه، وكذلك إن فعله في أقل من النصف، وكان بقدر الثلث أو الربع فكذلك يجزئه؛ لأن كل حكم تعلق بالرأس فالربع منه ينزل منزلة الكمال كالمسح بالرأس، ولكنه مسيء في الاكتفاء بهذا المقدار. (المبسوط-محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م:۴۸۳هـ): ۴/۷۰، كتاب المناسك، باب الحلق، ط: دار المعرفة- بيروت☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۱۶، كتاب الحج، مطلب في رمي جمرة العقبة، ط: دار الفكر- بيروت☆حاشية الشلبي على تبيين الحقائق: ۲/۳۲، كتاب الحج، باب الإحرام، ط: المطبعة الكبرى الأميرية-القاهرة)

(۲) "ومن فرغ من عمرته إلا التقصير فأحرم بأخرى فعليه دم لإحرامه قبل الوقت" "لأنه جمع بين إحرامي العمرة، وهذا مكروه، فيلزمه الدم، وهو دم جبر وكفارة. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳هـ): ۱/۱۷۴، كتاب الحج، باب إضافة الإحرام إلى الإحرام، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت ☆ تبيين الحقائق: ۲/۷۵، كتاب الحج، باب إضافة الإحرام إلى الإحرام، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري(م:۱۰۱۴ھ) ص: ۴۱۴، باب الجمع بين النسكين المتحدين. . . ، فصل في الجمع بين العمرتين، ت: محمد طلحة بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/۵۸۷، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر- بيروت)

اب پہلے عمرہ کے بعد قصر میں جو غلطی کی ہے (بال نا کافی مقدار میں کٹروائے) پھر دوسرے عمرہ سے قبل اپنے آپ کو حلال سمجھنے کی وجہ سے جتنے کام خلافِ احرام کیے ہوں اُن کی وجہ سے ایک بکری بطورِ دم واجب ہوگی، اِس طرح دو بکریاں بطورِ دم کے واجب ہوگی، پہلا دم دو احرام کو جمع کرنے کی وجہ سے اور دوسرا دم احرام کے خلاف کام کرنے کی وجہ سے۔[۱]

دونوں دم کی ادائیگی حدودِ حرم میں ضروری ہے، اگر کوئی مکہ جارہا ہو، تو اُسے یا اور کسی کو بھی مکہ میں اِس بات کا وکیل بنادیا جائے کہ وہ اُس کی جانب سے حدودِ حرم میں دو دم ادا کردے، تو تب بھی کافی ہوجائے گا، اور دم ادا ہوجائے گا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] طواف الوداع اور تینوں جمرات کی رمی کے ترک پر کیا حکم ہے؟

۱۸۰۵- سوال: میں ۱۹۸۲ء میں حج کے لیے گیا تھا، مگر جس ٹور سے گیا تھا، اُس ٹور کے ذمہ داروں نے بہت جلد بازی کی؛ جس کی وجہ سے طوافِ وداع کا موقع نہیں مل سکا، نیز ایامِ نحر میں تینوں جمرات کی رمی بھی چھوٹ گئی، صرف پہلے دِن جمرۂ عقبہ کی رمی کی تھی، اب اِس کا کفارہ کیسے ادا کرنا ہوگا؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

طوافِ زیارت کے بعد کوئی نفل طواف یا طوافِ وداع نہیں کیا، تو ایک دم کی قیمت مکہ مکرمہ روانہ کرنا ہوگا، وہاں گوشت تقسیم کردیا جائے گا، یہ بھی شکل ہے کہ دوبارہ مکہ مکرمہ جائے اور ارکانِ عمرہ ادا کرکے طوافِ وداع کرلے؛ مگر دم بھیجنا بہتر ہے، غریبوں کا فائدہ اُسی میں ہے، نیز گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کو رمی نہیں کی؛ اِس لیے دوسرا دم بھی لازم ہوگا، لہٰذا آپ پر کل دو دم واجب ہوں گے: ایک طوافِ وداع کے ترک کا اور دوسرا رمی جمارِ ثلاثہ کے ترک کا۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (و إن حلق للأولی قبل الفراغ من الثانية لزمه دم آخر) أي للجناية علی الثانية إتفاقا (و لو بعده، لا) [المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۴۱۴، باب الجمع بين النسكين المتحدين...، فصل في الجمع بين العمرتين، ت: محمد طلحة بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة☆ رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۵۸۷، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر-بيروت]

(۲) عنوان "دم جنایت کا حرم میں ادا کرنا ضروری ہے" کا حاشیہ ملاحظہ کریں۔

[۳] (و من ترك طواف الصدر كله أو أكثره، فعليه شاة) أي لترك الواجب. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع=

[۴۳] مکہ پہنچ کر طواف وسعی کیے بغیر بیماری کی وجہ سے احرام کھول دیا

۱۸۰۶- سوال: ایک شخص حج کی نیت سے مکہ مکرمہ کا سفر شروع کرتا ہے، جدہ پہنچ کر حج کا احرام باندھتا ہے اور مکہ کی طرف روانہ ہوجاتا ہے، وہاں پہنچتے ہی اس کی طبیعت خراب ہوجاتی ہے اور طواف وسعی کیے بغیر احرام کھول دیتا ہے، پھر ارکان حج ادا کرتا ہے، تو ایسے شخص کا حج صحیح ہوگا یا نہیں؟ طواف وسعی نہ کرنے کی وجہ سے کیا اس پر دم وغیرہ لازم آئے گا یا نہیں؟ اگر وہاں اس نے دم نہیں دیا، تو وطن آکر اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداو مصلیا:

عمرہ کے لیے احرام باندھنے کے بعد بیماری کی وجہ سے اس نے احرام کھول دیا، تو حلال ہونے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ اولاً دنبہ ذبح کر کے گوشت غرباء میں تقسیم کردے، اس کے بعد حلال ہوجائے اور صحت یابی کے بعد عمرہ کی قضا کرے اور ایام حج میں حج ادا کرے؛ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ (۱)

=حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري(م: ۱۰۱۴ھ) ،ص: ۴۹۶، باب الجنايات و أنواعها، النوع الخامس الجنايات في أفعال الحج، فصل في الجناية في طواف الصدر، ت: طلحة بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة☆فتح القدير: ۵۶/۳، كتاب الحج، فصل طاف طواف القدوم محدثا، ط: دار الفكر-بيروت)

ولو ترك رمي يوم من أيام النحر كله أو أكثره... فعليه دم. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري(م: ۱۰۱۴ھ) ،ص: ۵۰۷، فصل في الجنايات في رمي الجمرات☆الهداية: ۱۶۳/۱، كتاب الحج، فصل ومن طاف طواف القدوم محدثا، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

وإنما يتعدد الجزاء بتعدد الجنايات إذا لم ينو الرفض. (رد المحتار على الدر المختار: ۵۵۳/۲، كتاب الحج، باب الجنايات في الحج، ط: دار الفكر)

قال في البحر: الواجب أحد شيئين إما الشاة أو الإعادة والإعادة هي الأصل ما دام بمكة ليكون الجابر من جنس المجبور، فهي أفضل من الدم. وأما إذا رجع إلى أهله، ففي الحدث اتفقوا على أن بعث الشاة أفضل من الرجوع. وفي الجنابة اختار في الهداية أن الرجوع أفضل لما ذكرنا. واختار في المحيط أن البعث أفضل لمنفعة الفقراء. (المصدر السابق: ۵۵۱/۲)

(۱) فسدت عمرته فيمضي فيها ويقضيها وعليه شاة. (الهداية: ۱۶۱/۱، كتاب الحج، باب الجنايات، فصل: فإن نظر إلى فرج إمرأته بشهوة، ط: دار إحياء التراث العربي☆المبسوط للسرخسي: ۴۵/۴، كتاب المناسك، باب الطواف، ط: دار المعرفة-بيروت☆الفتاوى الهندية: ۲۴۵/۱، كتاب المناسك، الباب الثامن في الجنايات، الفصل الخامس في الطواف، ط: دار الفكر)

سوال میں مذکور تفصیل کے مطابق حج ادا ہو گیا[(۱)] اور عمرہ کی قضا واجب ہوگی، دم حرم شریف میں دینا پڑے گا، یہاں (وطن) میں دم ادا نہیں ہوگا۔[(۲)] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] محرم کے بالوں کا جھڑنا

۱۸۰۷-سوال: اگر کسی آدمی کے بال جھڑتے ہوں اور لمبی مدت تک احرام میں رہنے کی وجہ سے بال بڑے ہو گئے ہوں اور وضو و غسل اور سر پر مسح کرتے وقت دو چار بال گر جاتے ہوں، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداو مصليا:

احرام کی حالت میں جن امور کی انجام دہی لازم وضروری ہو؛ مثلاً: فرض غسل، فرض وضو اور فرض مسح وغیرہ، ان امور کے انجام دینے کی وجہ سے اگر بال جھڑتے ہوں، تو ہر تین بال پر ایک مٹھی گیہوں صدقہ کرے، البتہ احرام کی حالت میں جن امور کی انجام دہی لازم وواجب نہیں، ان کے ارتکاب میں بال گرتے ہوں، تو ہر بال پر روٹی کا ٹکڑا اور ہر تین بال پر صدقہ فطر کے برابر اناج دینا ضروری ہوگا۔[(۳)] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (وحكم الواجبات لزوم الجزاء) أي الدم (بترك واحد منها وجواز الحج) أي حجه معه. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۱۰۱، باب فرائض الحج وواجباته، فصل في واجبات الحج، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(۲) تفصیلی تخریج کے لیے دیکھیے عنوان: "دم کا حدود حرم میں ذبح کرنا ضروری ہے"۔

(۳) اگر بال بہ ذات خود گرے، تو کوئی چیز واجب نہیں ہوگی، ہاں اگر محرم کے کسی فعل کی وجہ سے گرے، تو پھر اس پر جزا لازم آئے گی:

فصل في سقوط الشعر: لا يخفى أن الشعر إذا سقط بنفسه لا محذور فيه، لاحتمال قلعه قبل إحرامه وسقوطه بغير فعله، ولعلهم أرادوا أنه إذا سقط بسبب فعل المحرم بأن أحس به وأدركه فحينئذ يلزمه الجزاء الذي ذكروه.

(المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ)، ص: ۴۶۴، النوع الثالث في الحلق وإزالة الشعر، وقلم الأظفار، فصل في سقوط الشعر، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

اگر وضوء یا غسل یا داڑھی اور سر کھجلانے کی وجہ سے بال گر جائیں، تو ہر بال پر ایک مٹھی اناج، یا روٹی کا ٹکڑا یا کھجور صدقہ کیا جائے؛ لیکن اگر گرنے والے بال سر یا داڑھی کے بال کے دسویں حصے کی مقدار کو پہنچ جائیں، تو دم واجب ہوگا۔

اور اگر کسی مرض کی وجہ سے بال گر جائیں، تو محرم پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی:

ولو سقط من رأسه أو من لحيته ثلاث شعرات عند الوضوء أو غيره أي حين مسه وحكه... فعليه كف من طعام كما روي عن محمد... أو كسرة أي من خبز أو تمرة لكل شعرة. (المصدر السابق) =

[۲۵] حج میں واقع ہونے والی غلطی کی تلافی

۱۸۰۸- سوال: بیرون ملک کے ایک آدمی سے حج کے ارکان وافعال میں کچھ بھول ہوگئی؛ لیکن کیا بھول ہوئی، اس کو یاد نہیں ہے، دوسرے آدمی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ شیطان کو پتھر مارنے کے سلسلے میں کوئی غلطی ہوگئی تھی، اس کے صدقے میں گھر والوں کو کھلانا اور دوسرے وسعت والے لوگوں کو کھلانا کیسا ہے؟ جواب تفصیل کے ساتھ دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

حج میں غلطی ہوجائے، تو اس کی تلافی قربانی اور صدقہ وغیرہ کے ذریعے ممکن ہے، بعض غلطی پر گناہ نہیں ہوتا، اور بعض غلطی کے ارتکاب میں حاجی گنہ گار بھی ہوتا ہے، اگر کوئی جنایت جان بوجھ کر ہوئی ہو، تو حاجی

= وفي الحاوي عن المنتقى عن محمد -رحمه الله تعالى-: وإن كان الساقط مقدر العشر من شعر الرأس أو اللحية فعليه دم. (المصدر السابق)

ولو تناثر شعره بالمرض فلا شيء عليه، فإنه ليس باختياره وكسبه. (المصدر السابق)

حضرت مفتی صاحبؒ نے یہاں جو فرق بیان کیا ہے (یہی تفصیل آپؒ کی کتاب "مسائل حج" [ص:۱۷۷] میں بھی موجود ہے) کہ: "**اگر محرم کے ان امور کی انجام دہی میں بال گرجائیں، جن کا انجام دینا اس کے لیے ضروری ہے، تو ہر تین بال پر ایک مٹھی صدقہ، اور اگر ان امور کی انجام دہی میں بال گرجائیں، جن کا انجام دینا محرم کے لیے لازم نہیں ہے، تو ہر تین بال پر صدقہ فطر کے برابر اناج کا صدقہ واجب ہوگا**" حقیر کو تلاش بسیار کے باوجود اس فرق کے تعلق سے کوئی حوالہ نہیں مل سکا، اس مسئلے میں ویسے بھی فتاویٰ کی کتابوں میں اختلاف روایت یا یوں کہیے کہ اختلاف عبارت موجود ہے، جس کی طرف ملا علی قاریؒ نے "فإنه موضع زلل" کے ذریعے اشارہ فرمایا ہے، ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

(ولو سقط من رأسه أو من لحيته ثلاث شعرات عند الوضوء أو غيره) أي حين مسه وحكه، وفيه إيماء إلى ما قدمناه (فعليه كف من طعام) كما روي عن محمد على إطلاقه من غير قيد لكل شعرة (أو كسرة) أي من خبز (أو تمرة لكل شعرة.) ويخالفه ما في قاضي خان: وإن أخذ المحرم من شاربه أو من رأسه أو مسح لحيته فانتثر منها شعر يطعم مسكينا. وفي البدائع: ولو أخذ شيئا من رأسه أو لحيته أو لمس شيئا من ذلك فانتثر منه شعرة فعليه صدقة، وكذا ذكر التمرتاشي، وقيل: لو مس لحيته فوقعت منها شعرة أو شعرتان تصدق بتمرة أو تمرتين، كذا في الكبير بصيغة التمريض، فينافي ما اختاره هنا، فتأمل فإنه موضع زلل. (مناسك الملا علي القاري مع حاشية إرشاد الساري، ص: ۴۶۴، النوع الثالث في الحلق وإزالة الشعر، وقلم الأظفار، فصل في سقوط الشعر، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

گنہ گار ہوگا، ورنہ گناہ لازم نہیں آئے گا۔ (۱)

حج میں جب کوئی جنایت اور بھول کرے، اور اس میں دمِ جنایت یعنی جانور ذبح کرنا ضروری ہو، تو اس جانور کو حرم میں ذبح کرنا ضروری ہے، حرم کے علاوہ افریقہ یا ہندوستان میں ذبح کرنے سے نقصان کی تلافی نہیں ہوگی، جانور ذبح کر کے غریب اور مسکین لوگوں کو کھلانا ضروری ہے، غریب رشتہ دار حرم میں ہوں، تو ان کو کھلانا بھی جائز ہے۔ (۲) تفصیل آپ نے لکھی نہیں ہے کہ حتمی طور پر کیا غلطی ہوئی ہے اور اس غلطی میں جانور واجب ہے یا غلہ؛ اس لیے مزید کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] محصر بالحج والعمرۃ، دم احصار کس جگہ ادا کرے؟

[باب الاحصار]

۱۸۰۹- سوال: ایک شخص بیت اللہ کے لیے گھر سے روانہ ہوا، ممبئی میں اس نے حج اور عمرہ کی نیت کر

---

(۱) المحرم إذا جنى عمدا بلا عذر يجب عليه الجزاء و الإثم، وإن جنى بغير عمد أو بعذر فعليه الجزاء دون الإثم، ولا بد من التوبة على كل حال. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط مع حاشية إرشاد الساري، ص:۴۲۱-۴۲۲، باب الجنايات، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(۲) عن جابر، قال: ثم قال النبي صلى الله عليه وسلم: قد نحرت ها هنا ومنى كلها منحر، ووقف بعرفة فقال: قد وقفت ها هنا وعرفة كلها موقف، ووقف بالمزدلفة فقال: قد وقفت ها هنا ومزدلفة كلها موقف. (سنن أبي داود: ۲۶۶/۱، رقم الحديث: ۱۹۰۷، كتاب المناسك، باب صفة حجة النبي صلى الله عليه وسلم، ط: ديوبند)

قال "ولا يجوز ذبح الهدايا إلا في الحرم" لقوله تعالى في جزاء الصيد: ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدة: ۹۵] فصار أصلا في كل دم هو كفارة ولأن الهدي اسم لما يهدى إلى مكان ومكانه الحرم قال عليه الصلاة والسلام "منى كلها منحر وفجاج مكة كلها منحر". (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۱۸۱/۱، كتاب الحج، باب الهدي، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ★ البحر الرائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ): ۱۲۸/۳، كتاب الحج، باب الهدي، ط: زكريا - ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۳۳۸، فصل في شرائط كفاراتها الثلاث، مطلب في شرائط جواز الدم، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(ويأكل) استحبابا (من هدي التطوع) إذا بلغ محله (والمتعة والقران)... (لا) يأكل (من غيرها)؛ لأنها دماء كفارات... (وخص ذبح هدي المتعة والقران بأيام النحر دون غيرهما) أي يجوز ذبح بقية الهدايا في أي وقت شاء... (و) خص (الكل بالحرم)... (ويجوز أن يتصدق به) أي الهدي (على فقير الحرم وغيره) من الفقراء المستحقين. وقال الشافعي يختص به. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۳۰۰/۱، كتاب الحج، باب الهدي، ط: دار إحياء التراث العربي)

کے احرام باندھ لیا، پھر اچانک حکومت کی جانب سے اسے روک دیا گیا، تو اب وہ کیا کرے؟ احرام کہاں کھولے؟ قربانی [دم احصار] کہاں کرے؟ کوئی ایسا شخص بھی نہیں ہے کہ منیٰ میں اس کی جانب سے قربانی کردے۔

الجواب حامداو مصلیا:

صلح حدیبیہ کے موقع سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام کی جماعت کے ساتھ مقام حدیبیہ میں روک دیے گئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم دم احصار ادا فرما کر حلال ہو گئے؛ [۱] اس لیے حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ محصر حل میں بھی، بل کہ اسے جہاں روک دیا گیا، اسی جگہ دم ادا کر کے حلال ہو جائے۔ [۲] جب کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ محصر دم یا اس کی قیمت حرم جانے والے کی معرفت بھیجے، اور تاریخ ذبح کی طے کردے، جب اس کی قربانی [دم احصار] حرم میں متعینہ تاریخ کو ذبح ہو جائے، تب یہ شخص حلال ہوگا۔ [۳]

مگر زبدۃ المناسک صفحہ ۱۳۳ ج ۲ پر لکھا ہے کہ موجودہ حالات میں اگر ایسی صورت پیش آجاوے

---

(۱) عن ابن عمر رضي الله عنهما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم خرج معتمرا، فحال كفار قريش بينه وبين البيت، فنحر هديه وحلق رأسه بالحديبية، وقاضاهم على أن يعتمر العام المقبل، ولا يحمل سلاحا عليهم إلا سيوفا، ولا يقيم بها إلا ما أحبوا، فاعتمر من العام المقبل، فدخلها كما كان صالحهم، فلما أن أقام بها ثلاثا، أمروه أن يخرج فخرج.
(صحيح البخاري: ۶۱۰/۲، رقم الحديث: ۴۲۵۲، كتاب المغازي، باب عمرة القضاء، ط: ديوبند)

(۲) وأما القسم الثاني: وهو أن ينحرها في الحل ويفرقها في الحل، فهذا غير مجزئ إجماعا، إلا دم الإحصار؛ فإنه يجزئه نحره في الموضع الذي أحصر فيه؛ لأنه موضع تحلله. (الحاوي الكبير في فقه مذهب الإمام الشافعي [وهو شرح مختصر المزني] -أبو الحسن علي بن محمد بن محمد بن حبيب البصري البغدادي، الشهير بالماوردي (م: ۴۵۰هـ): ۲۲۹/۴، باب دخول مكة، مسألة: قال الشافعي رضي الله عنه: "ولا يكون الطعام والهدي إلا بمكة..."، ت: علي محمد معوض - عادل أحمد عبد الموجود، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۳) مذهب أبي حنيفة أن دم الإحصار يتوقت بالحرم وهو المكان. (عمدة القاري: ۱۴۸/۱۰، كتاب الحج، باب النحر قبل الحلق في الحصر، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

وإذا لم يتحلل إلا بالهدي، وأراد التحلل يجب أن يبعث الهدي، أو ثمنه ليشترى به الهدي فيذبح عنه، ويجب أن يواعدهم يوما معلوما يذبح فيه؛ فيحل بعد الذبح، ولا يحل قبله، بل يحرم عليه، كما يحرم على المحرم غير المحصر، فلا يحلق رأسه، ولا يفعل شيئا من محظورات الإحرام حتى يكون اليوم الذي واعدهم فيه، ويعلم أن هديه قد ذبح؛ لقوله تعالى {ولا تحلقوا رءوسكم حتى يبلغ الهدي محله} [البقرة:196] حتى لو فعل شيئا من محظورات الإحرام قبل ذبح الهدي، يجب عليه ما يجب على المحرم إذا لم يكن محصرا. (بدائع الصنائع: ۱۷۸/۲، كتاب الحج، حكم الإحصار، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

کہ کسی انسان کا ملنا مشکل ہو جائے، جو حرم جانے والا ہو، یا جنگ کے حالات پیش آجائیں یا موجودہ سال ۱۹۸۴ء میں سعودی گورنمنٹ نے متعینہ تاریخ کے بعد مسافرین کا داخلہ ممنوع قرار دیا ہو اور احرام باندھ لیا گیا، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہی شخص نہیں جاسکتا، تو دوسرا کہاں سے جاسکتا ہے؟ ایسی مجبوری کی حالت میں اس کی گنجائش ہوگی کہ امام شافعیؒ کے مسلک پر عمل کر کے مفرد بالحج ایک دم اور قارن دو دم ذبح کر کے حلال ہو جائے۔ (۴)

لہٰذا سوال میں تحریر کردہ صورت میں ''محرم بالحج والعمرۃ'' مجبوری کی وجہ سے ممبئی یا اپنے وطن سورت ولساڈ میں دم ذبح کروائے، اور حلال ہو جائے۔ (معلم الحجاج)[۵] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۴) اگر محصر کو ایسا آدمی نہ مل سکے، جس کے ہاتھ ہدی بھیج کر حرم میں ذبح کرائے، تو اس صورت میں محصر کو بہت ہی مشکل پیش آئے گی، اس تنگی کو رفع کرنے کے لیے ذیل کی عبارات سے گنجائش ہوسکتی ہے:

صاحب زبدۃ المناسک، عین الہدایہ کی عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں کہ اس قول کے موافق جس کسی کو آدمی میسر نہ ہو، تو اس کو جائز ہوگا کہ مقام احصار میں ذبح کر دے، اور شک نہیں کہ اگر لے جانا ممکن نہ ہو، یا آدمی میسر نہ ہو، تو اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہے، انتہی۔

ہمارے نزدیک تو ضرورت اور تنگی کی وجہ سے گنجائش نکلی، اور امام شافعیؒ کے مذہب میں تو مطلق جواز ہے: (فيذبح عنه في الحرم) خلافا للشافعي، جوز ذبحه حيث أحصر ولو في الحل، كما قدر في محله. (شرح اللباب، ص: ۲۷۶)

پس اس توافق سے بھی وسعت ہوئی، واللہ اعلم۔

الرابع: لا يجوز ذبح دم الإحصار إلا في الحرم عندنا في الحج، والعمرة. وقال أبو بكر الرازي - رحمه الله - في "أحكام القرآن": هو قول ابن مسعود، وابن عباس إن قدر عليه، وعطاء، وطاووس، ومجاهد، والحسن البصري، وإبراهيم النخعي، وسفيان الثوري. وقال الشافعي - رحمه الله -، ومالك - رحمه الله -، وأحمد - رحمه الله - في العمرة يذبح هديه حيث أحصر، وعن أحمد - رحمه الله - في الحج روايتان، أحدهما: أنه يختص بيوم النحر. (البناية شرح الهداية - بدر الدين العينى (م: ۸۵۵ھ): ۴/۳۳۶، كتاب الحج، باب الإحصار، ما يتحقق به الإحصار، ط: دار الكتب العلمية)

(۵) معلم الحجاج، ص: ۲۷۵، حاشیہ نمبر ۱، احصار یعنی دشمن یا درندہ یا مرض کی وجہ سے حج سے رک جانا، محصر کا حکم، ط: دار الکتاب - دیوبند۔

عن عطاء، عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: لما رجع النبي صلى الله عليه وسلم من حجته قال لأم سنان الأنصارية: ما منعك من الحج؟، قالت: أبو فلان، تعني زوجها، كان له ناضحان حج على أحدهما، والآخر يسقي أرضا لنا، قال: فإن عمرة في رمضان تقضي حجة أو حجة معي. (صحيح البخاري:١/ ٢٥٠، رقم الحديث: ١٨٦٣، كتاب الحج، باب حج النساء، ط: ديوبند ☆الصحيح لمسلم:١/ ٤٠٩، رقم الحديث: ٢٢٢-(١٢٥٦)، كتاب الحج، باب فضل العمرة في رمضان، ط: ديوبند)

باب العمرة

[عمرہ کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب العمرة

[عمرہ کا بیان]

[۱] عمرہ کا طریقہ اور اس کے متعلقات

۱۸۱۰-سوال: الحمد للہ حج کے متعلق تو ہمیں کافی کچھ علم ہے؛ لیکن عمرہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا، یہ عمرہ کون سی عبادت ہے اور اس کا طریقہ کیا ہے؟ تفصیلاً بیان فرما کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

''عمرہ'' زندگی میں ایک بار سنت مؤکدہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: {وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ}[۱] عمرہ کا کوئی وقت معین نہیں پورے سال میں کبھی بھی کر سکتے ہیں۔[۲]

---

[۱] ۲-البقرۃ:۱۹۶۔

[۲] (والعمرة) في العمر (مرة سنة مؤكدة) على المذهب... (وجازت في كل السنة). [الدر المختار] ــــــ قال ابن عابدين: (قوله والعمرة في العمر مرة سنة مؤكدة) أي إذا أتى بها مرة فقد أقام السنة غير مقيد بوقت غير ما ثبت النهي عنها فيه إلا أنها في رمضان أفضل هذا إذا أفردها فلا ينافيه أن القران أفضل لأن ذلك أمر يرجع إلى الحج لا العمرة. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۴۷۳-۴۷۲، كتاب الحج، مطلب أحكام العمرة، ط: دار الفكر ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۲۶۵، كتاب الحج، حكم العمرة، ط: دار إحياء التراث العربي)

البتہ ذی الحجہ کے پانچ دن: ۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳ تاریخ کو عمرہ کرنا مکروہ تحریمی ہے، اس میں فقط عمرہ کی نیت سے احرام باندھنا جائز نہیں؛ کیوں کہ وہ حج کے مخصوص ایام ہیں؛ لیکن اگر کوئی حج قران کرتا ہے، یعنی حج کے احرام کے ساتھ عمرہ کا بھی احرام باندھتا ہے، تو اس کے لیے ان ایام میں بھی اجازت ہے۔[۳]

مکی یعنی مکہ مکرمہ کے رہائشی کے لیے حج کے مکمل دنوں [یکم شوال تا ۱۳/ ذی الحجہ] میں عمرہ کرنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے گھر کے رہائشی اور باشندے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ باہر سے آنے والوں کو موقع دیں اور ان دنوں عمرہ سے توقف کر کے ان کے لیے کچھ قربانی پیش کریں۔[۴]

---

[۳] (وكرهت) تحريما (يوم عرفة وأربعة بعدها) أي كره إنشاؤها بالإحرام حتى يلزمه دم وإن رفضها لا أداؤها فيها بالإحرام السابق. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۷۳، كتاب الحج، مطلب في أحكام العمرة، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۳۷، كتاب الحج، الباب السادس في العمرة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۲۶۵، كتاب الحج، حكم العمرة، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۸۲، كتاب الحج، العمرة حكمها وأركانها، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة)

(۴) مکی اور ان حضرات کے لیے، جو مکی کے حکم میں ہیں، ''ایام حج'' [شوال تا ختم ایام حج] میں عمرہ کرنا کیسا ہے؟ صاحب فتح القدیر علامہ کمال الدین، ابن الہمامؒ نے ان کے لیے عمرہ کو مکروہ لکھا ہے، خواہ ان کا اس سال حج کا ارادہ ہو، یا نہ ہو۔ حضرت مفتی بیات صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہی ہے، جب کہ دیگر علماء فرماتے ہیں کہ حج کے صرف پانچ ایام میں ایسے مکی کے لیے عمرہ مکروہ ہے، جو اس سال حج کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یہی رائے اکثر علماء کی ہے، اس سلسلے میں حضرت مفتی صاحبؒ کے یہاں ایک تفصیلی استفتاء بھی موصول ہوا تھا، جس میں انہوں نے اپنی رائے کی وضاحت کی ہے اور اپنی دلیل بھی تحریر کی ہے، استفتاء اور جواب آئندہ صفحات میں درج ہوں گے، ذیل میں علامہ شامیؒ کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں، جس میں علامہ شامیؒ نے علامہ ابن الہمام کے شاگرد، علامہ قاسم بن قطلو بغا کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ مکی کے لیے عمرہ کی کراہت کا قول ہمارے کسی امام؛ بل کہ ائمہ اربعہ کا نہیں ہے، گویا انہوں نے اس قول کو ابن الہمام کا تفرد قرار دیا ہے:

يزاد على الأيام الخمسة ما في اللباب وغيره من كراهة فعلها في أشهر الحج لأهل مكة، ومن بمعناهم أي من المقيمين، ومن في داخل الميقات؛ لأن الغالب عليهم أن يحجوا في سنتهم، فيكونوا متمتعين، وهم عن التمتع ممنوعون، وإلا فلا منع للمكي عن العمرة المفردة في أشهر الحج، إذا لم يحج في تلك السنة، ومن خالف فعليه البيان شرح اللباب، ومثله في البحر، وهو رد على ما اختاره في الفتح من كراهتها للمكي، وإن لم يحج ونقل عن القاضي عيد في شرح المنسك أن ما في الفتح قال العلامة قاسم: إنه ليس بمذهب لعلمائنا ولا للأئمة الأربعة، ولا خلاف في عدم كراهتها لأهل مكة. اهـ. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۷۳، كتاب الحج، مطلب في أحكام العمرة، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي)

رمضان شریف میں عمرہ کا بہت ثواب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: رمضان شریف میں عمرہ کا ثواب حج کے برابر ہے۔ دوسری حدیث میں ہے اس کو اتنا ثواب ملے گا، گویا اس نے میرے ساتھ حج کیا۔ (شامی: ۲/۱۵۱)[۵]

عمرہ کا طریقہ: میقات سے احرام باندھ کر شریعت کے بتاہوئے مخصوص طریقہ کے مطابق، بیت اللہ کا طواف اور صفا ومروہ کی سعی کرے، اس کے بعد بال منڈوا کر (یا انگلی کے ایک پور کے بہ قدر کٹوا کر) احرام کھول دے۔ (شامی: ۲/۱۵۱)[۶]

---

[۵] عن عطاء، قال: سمعت ابن عباس رضي الله عنهما، يخبرنا يقول: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم- لامرأة من الأنصار، -سماها ابن عباس فنسيت اسمها-: ما منعك أن تحججين معنا؟، قالت: كان لنا ناضح، فركبه أبو فلان وابنه، لزوجها وابنها، وترك ناضحا ننضح عليه، قال: فإذا كان رمضان اعتمري فيه، فإن عمرة في رمضان حجة، أو نحوا مما قال. (صحيح البخاري: ۱/۲۳۹، رقم الحديث: ۱۷۸۲، كتاب الحج، باب عمرة في رمضان، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/۴۰۹، رقم الحديث: ۲۲۱-(۱۲۵۶)، كتاب الحج، باب فضل العمرة في رمضان، ط: ديوبند)

عن عطاء، عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: لما رجع النبي صلى الله عليه وسلم من حجته قال لأم سنان الأنصارية: ما منعك من الحج؟، قالت: أبو فلان، تعني زوجها، كان له ناضحان حج على أحدهما، والآخر يسقي أرضا لنا، قال: فإن عمرة في رمضان تقضي حجة أو حجة معي. (صحيح البخاري: ۱/۲۵۰، رقم الحديث: ۱۸۶۳، كتاب الحج، باب حج النساء، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/۴۰۹، رقم الحديث: ۲۲۲-(۱۲۵۶)، كتاب الحج، باب فضل العمرة في رمضان، ط: ديوبند)

دوسری روایت میں "أو حجة معي" کا اضافہ ہے، اسی وجہ سے اس روایت کو نقل کیا گیا ہے۔

(قوله وندبت في رمضان) أي إذا أفردها كما مر عن الفتح ثم الندب باعتبار الزمان لأنها باعتبار ذاتها سنة مؤكدة أو واجبة كما مر أي أنها فيه أفضل منها في غيره واستدل له في الفتح بما عن ابن عباس عمرة في رمضان تعدل حجة وفي طريق لمسلم تقتضي حجة أو حجة معي قال وكان السلف رحمنا الله تعالى بهم يسمونها الحج الأصغر وقد اعتمر -صلى الله عليه وسلم- أربع عمرات كلهن بعد الهجرة في ذي القعدة على ما هو الحق وتمامه فيه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۴۷۳، كتاب الحج، مطلب في أحكام العمرة، ط: دار الفكر)

[۶] (وهي إحرام وطواف وسعي) وحلق أو تقصير فالإحرام شرط، ومعظم الطواف ركن وغيرهما واجب هو المختار ويفعل فيها كفعل الحاج. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله ويفعل فيها كفعل الحاج) قال في اللباب وأحكام إحرامها كإحرام الحج من جميع الوجوه وكذا حكم فرائضها وواجباتها وسننها ومحرماتها ومفسدها ومكروهاتها وإحصارها وجمعها أي بين عمرتين، وإضافتها أي إلى غيرها في النية ورفضها كحكمها في الحج: وهي لا تخالفه إلا في أمور منها أنها ليست بفرض وأنها لا وقت لها معين؛ ولا تفوت وليس فيها وقوف بعرفة=

پس عمرہ کے چار افعال ہیں: ۱- احرام ۲- بیت اللہ کا طواف ۳- صفا مروہ کی سعی ۴- حلق یا قصر کرنا۔ ان میں احرام عمرہ کی شرط ہے، بیت اللہ کا طواف رکن ہے، اور سعی وحلق اس کے واجبات میں سے ہے۔(۱) (زیادہ تفصیل کے لیے کتاب: "مسائل حج" کو دیکھنا چاہیے)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] ایام حج میں نفلی عمرہ جائز ہے یا نہیں؟

۱۸۱۱- سوال: آپ کی کتاب "مسائل حج" (گجراتی ایڈیشن) پڑھی، ماشاء اللہ بہت مفید ہے (جزاکم اللہ خیراً) پڑھتے پڑھتے صفحہ ۹۶-۹۷[۳] پر یہ مسئلہ نظر سے گزرا کہ حج کے ایام میں متمتع حاجی، حج کے عمرہ کے سوا "نفل عمرہ" نہیں کرسکتا ہے اور ہندوستانی حاجی مکی کے حکم میں ہوتا ہے اور مکی کو ایام حج میں عمرہ کرنا جائز نہیں۔

جب کہ فتاویٰ رحیمیہ اردو جلد دو صفحہ ۲۷ کے ایک سوال کے جواب میں- جس کا عنوان ہے: "ایام

ولا مزدلفة ولا رمي فيها ولا جمع أي بين صلاتين ولا خطبة ولا طواف قدوم ولا صدر ولا تجب بدنة بإفسادها ولا بطوافها جنبا أي بل شاة وأن ميقاتها الحل لجميع الناس بخلاف الحج فإن ميقاته للمكي الحرم. اهـ. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۷۳، كتاب الحج، مطلب في أحكام العمرة، ط: دار الفكر)

(۱) وهي في الشرع زيارة البيت والسعي بين الصفا والمروة على صفة مخصوصة وهي أن تكون مع الإحرام، هكذا في محيط السرخسي... (وأما ركنها) فالطواف. ____ (وأما واجباتها) فالسعي بين الصفا والمروة والحلق أو التقصير كذا في محيط السرخسي. ____ (وأما شرائطها) فشرائط الحج إلا الوقت هكذا في البدائع. ____ (وأما سننها وآدابها) فما هو سنن الحج وآدابه إلى الفراغ من السعي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۳۷، كتاب المناسك، الباب السادس في العمرة، ط: دار الفكر مجمع الأنهر: ۱/ ۳۰۷، كتاب الحج، باب الإحصار والفوات، قبيل: باب الحج عن الغير، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ تبيين الحقائق: ۲/ ۸۲، كتاب الحج، العمرة حكمها وأركانها، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة)

[۲] دیکھیے، ص: ۱۱۴، مسئلہ نمبر: ۳۲۳، رمضان شریف میں عمرہ کرنے کا بیان، ط: دار العلوم مدنی دار التربیت، کرمالی۔

یہ کتاب پہلے گجراتی زبان میں تھی، اب الحمد للہ "مسائل حج" کے نام سے صاحب زادۂ محترم حافظ اسجد بیمات صاحب کے زیر اہتمام، اردو زبان میں شائع ہوچکی ہے، مترجم: مولانا و مفتی اسامہ پالن پوری۔

[۳] مسائل حج اردو ایڈیشن میں یہ مسئلہ ان الفاظ کے ساتھ رقم ہے:

مسئلہ نمبر ۴۱۰: حج کے مہینوں میں ایک عمرہ کر لینے کے بعد دوسرا عمرہ کرنا مکروہ ہے، یہ حکم اس کے لیے ہے، جو حج کا ارادہ رکھتا ہو، لیکن جو صرف عمرہ کی نیت سے آیا ہو، اس کے لیے متعدد عمرہ کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ (مسائل حج- مفتی بیماتؒ، ص: ۱۴۴، ط: کرمالی)

حج میں عمرہ کرنا"-لکھا ہے، کہ:"ایام حج میں متمتع آفاقی کے لیے یوم عرفہ، یوم نحر اور ایام تشریق کے علاوہ ایام میں نفل عمرہ جائز ہے اور جاہل معلم ان ایام میں لوگوں کو عمرہ سے روکتے ہیں، یہ غلط ہے، غریب ناواقف حجاج ایسی عبادات سے محروم رہتے ہیں، جس کو وہ لوگ اپنے وطن میں نہیں کر سکتے، وہ ایک بڑی عبادت سے محروم رہتے ہیں"۔ (۱)

تو اس طرح "مسائل حج" کے مسئلہ میں اور "فتاویٰ رحیمیہ" کے مسئلہ میں صاف تضاد ہے، جس سے حجاج کرام کے لیے ایک الجھن پیدا ہو سکتی ہیں، ہمارے یہاں دیولہ سے ۱۱ر حجاج روانہ ہو گئے ہیں، اور ۴ر حجاج ۴-۹-۱۹۸۳ء میں سے جانے والے ہیں؛ اس لیے جلد جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

مستفتی: یوسف دیولہ
۲۹-۸-۱۹۸۳ء

الجواب حامداًومصلیاً:

مذکور مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے، زبدۃ المناسک کے مصنف حضرت مولانا شیر محمد صاحب-جن کے متعلق حضرت مولانا بدر عالم صاحب فرماتے ہیں کہ مسائل حج میں ان کو میں امام مانتا ہوں- نے اپنی کتاب میں دوسری جلد کے صفحہ ۱۹ر سے صفحہ ۲۴ر تک اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے، اسے ملاحظہ فرمائیں۔ [۲]

---

(۱) ایام حج (۹ر ذی الحجہ سے لے کر ۱۳ر ذی الحجہ تک) میں عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ کرنا مکروہ تحریمی ہے، چھٹی نہ ملنے کا عذر معتبر نہیں ہے، معلم الحجاج میں ہے:

عمرہ تمام سال میں کرنا جائز ہے، صرف پانچ روز (۹ر ذی الحجہ سے ۱۳ر ذی الحجہ تک) میں عمرہ کا احرام باندھنا مکروہ تحریمی ہے، اگر ان ایام میں احرام نہیں باندھا، بل کہ پہلے سے احرام بندھا ہوا تھا، تو پھر مکروہ نہیں، لیکن اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ ان پانچ روز کے بعد عمرہ کرے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۸ر ۱۴۴، کتاب الحج، باب العمرۃ، ایام حج میں عمرہ کرنا، ط: دار الاشاعت-کراچی ☆ معلم الحجاج، ص: ۲۲۱، مسائل تمتع، متمتع ایک عمرہ کے بعد دوسرا عمرہ حج سے پہلے کر سکتا ہے، ط: دار الکتاب- دیوبند)

[۲] متمتع آفاقی، جب مکہ مکرمہ میں آکر عمرہ کر کے حلال ہو، اور وہاں رہے، تو حج سے پہلے مکہ مکرمہ سے نفلی عمرہ کرے، تو اس کے لیے جائز ہے یا نہ؟ ——— اس میں اختلاف ہے، رحمت اللہ سندھی نے مناسک المتوسط میں لکھا ہے کہ "یہ معتمر حج سے پہلے دوسرا عمرہ نہ کرے، اور ملا علی قاری نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ "یہ صحیح نہیں ہے"؛ کیوں کہ اس کی بنیاد اس پر ہے کہ مکی کو مفرد عمرہ بھی اشہر حج میں ممنوع ہے، جیسا کہ ابن الہمام کا مذہب ہے۔ چوں کہ ملا رحمت اللہ ان کے تلمیذ ہیں، اس لیے ان کی اتباع کی وجہ سے مکروہ فرمایا ہو۔ حالاں کہ مکی کو تمتع وقران ممنوع ہے، اور یہ متمتع آفاقی ہے، اس کو عمرہ کرنا منع نہیں، بل کہ تکرار عمروں کا اس کو جائز ہے، کیوں کہ یہ مستقل عبادت ہے، مثل طواف کے، انتہی۔......

جو آفاقی اشہر حج میں میقات سے احرام عمرہ کا باندھ کر ادا کرتا ہے، باوجود اس کے کہ اس سال میں حج بھی کرے گا، تو اس کو=

اس کا حاصل یہ ہے کہ مکی ہو یا آفاقی، ایام حج میں جو شخص مکہ میں قیام کرلے، اس کو ایک بار عمرہ کرنے کے بعد دوسری بار عمرہ نہیں کرنا چاہیے، البتہ جو شخص عمرہ کرکے مدینہ شریف چلا جائے، تو اس کو وہاں سے حج کا احرام باندھ کر آنا بہتر ہے؛ لیکن اس کے لیے عمرہ کا احرام باندھ کر آنا بھی جائز ہے۔

اسی بنا پر میں نے اپنی کتاب میں مذکورہ کتاب کے حوالہ سے لکھا ہے اور لوگوں کا عمل بھی آج اسی پر ہے، رہا سوال عمرہ جیسی عبادت سے محرومی کا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ طواف ہمیشہ کرنے کی اجازت ہے اور طواف بھی ایک عبادت ہے، پس جس قدر چاہے طواف کرے؛ لیکن عمرہ ایک سے زیادہ کرنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ حج کے ایام میں صرف حج کی اجازت ہونی چاہیے، حج کے اکرام و تعظیم کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ایام حج کو صرف ارکان حج کے لیے ہی خاص کردیا جائے، البتہ آنے والوں کی مجبوری ولاچاری کے پیش نظر ایک عمرہ کی اجازت دے دی گئی ہے، تاکہ عمرہ کرکے احرام کھول سکے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: زبدۃ المناسک مع عمدۃ المناسک: ۲/۱۹-۲۴، مطبوعہ: الجمعیۃ پریس، دہلی) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] حج سے پہلے نفلی عمرہ کرنا

۱۸۱۲- سوال: حج سے پہلے نفل عمرہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟ آپ کی کتاب: ''مسائل حج'' صفحہ نمبر:

= دونوں عبادتیں حج اور عمرہ ایک سال میں جمع کرنا مشروع و جائز ہے، بخلاف مکی اور جو مکی کے حکم میں ہوگیا ہو اور یہ آفاقی جب عمرہ سے حلال ہوکر مکہ میں رہا، تو بعض احکام میں اب مکی کا حکم رکھتا ہے، اب اگر اس کے بعد حج سے پہلے دوسرا عمرہ کرے گا، باوجود اس کے کہ اس سال حج بھی کرے گا، تو اب یہ دوسرا عمرہ اشہر حج میں کرنا اس لیے ممنوع ہوگا کہ اس نے مکہ والوں کے حکم میں ہوکر اشہر حج میں، باوجود حج کا ارادہ رکھتے ہوئے عمرہ کیا ہے، پس اس کو مفرد عمرہ نہ کہا جائے گا، اگرچہ اس سے صحیح تمتع بھی منعقد نہ ہوا ہو، کیوں کہ اس کا تمتع تو پہلے عمرہ سے بہ طریق مشروع میقات آفاقی سے منعقد ہوچکا ہے۔ اور ثانی عمرہ کو مکی ہوکر اشہر حج میں کرنے کی نیت رکھتے ہوئے کیا ہے، تو صورتاً متمتع ہوا۔

گویا مکی ہوکر اشہر حج میں عمرہ اور حج دو عبادتوں کو جمع کیا، پس اس ثانی عمرہ کو مفردہ قرار دے کر اشہر حج میں مفردہ عمرہ کرنے کو عدم جواز والی روایت پر مبنی کرنا بعید از قیاس ہے، اگرچہ صاحب اللباب اپنے استاذ ابن الہمام کی اتباع کی وجہ سے مفرد عمرہ کو اشہر حج میں ممنوع جانتے ہوں، اور غالب یہی ہے، ملا علی قاریؒ نے اسی وجہ سے اس کی ممانعت کو اس پر مبنی جان کر تعاقب کیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (زبدۃ المناسک مع عمدۃ المناسک، ۲/۱۹-۲۰، تحقیق اس مسئلے کہ کہ آیا یہ متمتع آفاقی ...... الخ، ط: الجمعیۃ پریس- دہلی ☆ مناسک الملا علی القاری مع حاشیہ ارشاد الساری، ص: ۶۵۵، باب العمرۃ، فصل فی وقتھا، ت: محمد طلحہ بلال منیار، ط: المکتبۃ الامدادیہ، مکہ مکرمہ ☆ بدائع الصنائع: ۲/۱۶۹، کتاب الحج، فصل بیان ما یحرم بہ المحرمون، ط: دار الکتب العلمیہ - بیروت)

۹۶، ۹۷ اور مسئلہ نمبر: ۳۲۲، ۳۲۳ پر آپ نے لکھا ہے کہ ''نفل عمرہ کرنا جائز نہیں ہے'' جب کہ حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب کی کتاب ''فتاوی رحیمیہ'' کی پانچویں جلد میں حضرت نے خود لکھا ہے کہ نفلی عمرہ کرنا جائز ہے تو دونوں مسئلوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، تفصیل سے جواب مطلوب ہے۔ آپ کا خادم: محمد اعظم

الجواب حامداً ومصلیا:

نفلی عمرہ کرنا جائز ہے، دراصل مسئلہ نمبر: ۳۲۲ میں ایک جملہ چھوٹ گیا ہے، پورا مسئلہ یوں ہے: ''عید کا چاند دیکھنے کے بعد حنفی مکی کے لیے عمرہ کرنا جائز نہیں ہے''۔

البتہ اس مسئلہ میں کہ ''ایام حج میں مکی کے لیے عمرہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟'' علمائے کرام کا اختلاف ہے؛ میں نے ناجائز لکھا ہے، جب کہ دیگر کتابوں میں جائز لکھا ہوا ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] سعودی میں مقیم حضرات کے لیے اشہر حج میں عمرہ کرنا

۱۸۱۳- سوال: سعودی میں جو لوگ مقیم ہیں، ان کے متعلق ایسا سننے میں آیا ہے کہ رمضان کے بعد [اشہر حج] وہ (مقیم) عمرہ نہیں کر سکتے، اگر عمرہ کریں گے، تو حج کرنا ضروری ہوگا، اگر حج نہیں کرے گا، تو قربانی کرنا ضروری ہوگا۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا یہ بات (جو ہم نے سن رکھی ہے) صحیح ہے؟ سعودی میں مقیم شخص اشہر حج میں عمرہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر عمرہ کرنے کے بعد حج بدل یا حج افراد کر لے یا رمضان کے بعد مقیم نے صرف عمرہ کیا ہو، تو اس کے لیے قربانی کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

مذکورہ مسئلہ میں مکی [مکہ مکرمہ کا رہنے والے] اور میقاتی [یعنی میقات کے اندر رہنے والا] اگر حج کا ارادہ رکھتے ہوں، تو ان کے لیے عمرہ کرنا جائز نہیں ہے۔[2] اس لیے کہ میقاتی کے لیے تمتع اور قران جائز نہیں ہے، بناء بریں مکی یا میقاتی ایام حج میں عمرہ کرنے کے بعد حج کریں گے، تو ان پر دم جنایت لازم ہوگا۔[3]

---

(۱) قد تقدم تخریجہ تحت عنوان: ''ایام حج میں نفلی عمرہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟''۔

(۲) ویکرہ فعلها في أشهر الحج لأهل مكة و من بمعناهم، أي من المقيمين و من في داخل الميقات. (مناسك الملا علي القاري مع حاشية إرشاد الساري، ص: ٦٥٦، باب العمرة، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة ☆ بدائع الصنائع: ۱۶۹/۲، كتاب الحج، بيان مايحرم به المحرمون، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۳) (والمكي ومن في حكمه يفرد فقط) ولو قرن أو تمتع جاز وأساء، وعليه دم جبر. (الدر المختار) =

اگر کوئی سعودی میقات کے باہر کا رہنے والا ہے، تو اس کے لیے تمتع و قران جائز ہے اور جائز تمتع اور قران والوں کے ذمہ دم شکر واجب ہوگا۔[۱] تمام سعودی کے لیے یکساں حکم نہیں ہے۔

مکی یعنی مکہ مکرمہ کے رہائشی کے لیے حج کے مکمل دنوں [یکم شوال تا ۱۳ رذی الحجہ] میں عمرہ کرنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے گھر کے رہائشی اور باشندے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ باہر سے آنے والوں کو موقع دیں اور ان دنوں میں عمرہ سے توقف کر کے ان کے لیے کچھ قربانی پیش کریں۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] تجارت کی غرض سے جانے والے کے لیے عمرے کا شرعی حکم

۱۸۱۴- سوال: میں نے حج فرض ادا کرلیا ہے، اب تجارت کے لیے دبئی اور جدہ جانا چاہتا ہوں؛ تو میں صرف عمرہ کرلوں اور حج نہ کروں، تو اس کی گنجائش ہے یا نہیں؟

= قال ابن عابدين: (قوله ولو قرن أو تمتع جاز وأساء إلخ) أي صح مع الكراهة للنهي عنه، وهذا ما مشي عليه في التحفة وغاية البيان والعناية والسراج وشرح الإسبيجابي على مختصر الطحاوي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۳۹، كتاب الحج، باب التمتع، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الهداية: ۱/ ۱۵۵، كتاب الحج، باب التمتع، ت: طلال يوسف، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت ☆ اللباب في شرح الكتاب - عبد الغني بن طالب بن حمادة بن إبراهيم الغنيمي الدمشقي الميداني الحنفي (م: ۱۲۹۸هـ): ۱/ ۲۰۰، كتاب الحج، باب التمتع، ت: محمد محيي الدين عبد الحميد، ط: المكتبة العلمية - بيروت)

(۳) ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾. (۲- البقرة: ۱۹۶)

ويجب الدم على القارن والمتمتع شكرا لما أنعم الله تعالى عليه بتيسير الجمع بين العبادتين. (قاضي خان على هامش الهندية: ۱/ ۳۰۴، كتاب الحج، فصل في التمتع، ط: زكريا - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۳۹، كتاب المناسك، الباب السابع في القران والتمتع، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفقه الإسلامي وأدلته: ۳/ ۲۶۲، الباب الخامس: باب الحج والعمرة، المبحث الثامن: ثالثا كيفية القران، ط: مكتبة تهانوي - ديوبند ☆ مناسك الملا علي القاري مع حاشية إرشاد الساري، ص: ۳۶۸، باب القران، فصل في هدي القارن والمتمتع، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

(۴) مکی اور ان حضرات کے لیے، جو مکی کے حکم میں ہیں، ''ایام حج'' [شوال تا ختم ایام حج] میں عمرہ کرنا کیسا ہے؟ صاحب فتح القدیر علامہ کمال الدین، ابن الہمامؒ نے ان کے لیے عمرہ کو مکروہ لکھا ہے، خواہ ان کا اس سال حج کا ارادہ ہو، یا نہ ہو۔ حضرت مفتی بیمات صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہی ہے، جب کہ دیگر علماء فرماتے ہیں کہ حج کے صرف پانچ ایام میں ایسے مکی کے لیے عمرہ مکروہ ہے، جو اس سال حج کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یہی رائے اکثر علماء کی ہے، علامہ شامیؒ نے علامہ ابن الہمام کے شاگرد، علامہ قاسم بن قطلو بغا کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ مکی کے لیے عمرہ کی کراہت کا قول ہمارے کسی امام؛ بل کہ ائمہ اربعہ کا نہیں ہے، گویا انہوں نے اس قول کو ابن الہمام کا تفرد قرار دیا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے: الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۷۳، كتاب الحج، مطلب في أحكام العمرة، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

الجواب حامدا ومصلیا:

عمرہ کرنا سنت مؤکدہ ہے، پورا سال اس کا وقت ہے، صرف حج کے پانچ دنوں (ذی الحجہ کی نو، دس، گیارہ، بارہ اور تیرہ تاریخ) میں صرف عمرہ کرنا مکروہ تحریمی ہے۔[1] اس لیے آپ ان دنوں کے علاوہ میں اگر مکہ مکرمہ جارہے ہیں، تو عمرے کا احرام باندھ کر جائیں اور عمرہ کر کے اپنے وطن واپس لوٹیں، یا تجارت کے لیے کسی اور ملک کا رخ کریں؛ کیوں کہ مکہ مکرمہ کی عظمت واحترام کی خاطر وہاں بغیر احرام کے داخل ہونا جائز نہیں، اس لیے بغیر احرام کے مکہ مکرمہ جانا جائز نہیں۔[2]

رہی بات حج فرض کی، سو آپ نے اسے ادا کرلیا ہے؛ اس لیے آپ پر حج فرض نہیں ہوگا۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] (والعمرة) في العمر (مرة سنة مؤكدة) على المذهب ... (وجازت في كل السنة) وندبت في رمضان (وكرهت) تحريما (يوم عرفة وأربعة بعدها) أي كره إنشاؤها بالإحرام حتى يلزمه دم وإن رفضها لا أداؤها فيها بالإحرام السابق. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۴۷۳-۴۷۲، كتاب الحج، ط: دار الفكر ☆ مجمع الأنهر: ۱/ ۲۶۵، كتاب الحج، حكم العمرة، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۳۷، كتاب المناسك، الباب السادس في العمرة، ط: دار الفكر)

(۲) ولا يجوز للآفاقي أن يدخل مكة بغير إحرام نوى النسك أو لا ولو دخلها فعليه حجة أو عمرة كذا في محيط السرخسي في باب دخول مكة بغير إحرام. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۲۱، كتاب المناسك، الباب الثاني في المواقيت، ط: دار الفكر ☆ عمدة القاري: ۱۰/ ۲۰۵، كتاب الحج، باب دخول الحرم ومكة بغير إحرام، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۲/ ۱۶۴، كتاب الحج، فصل بيان مكان الإحرام، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۵۵۱، كتاب الحج، الفصل الرابع في بيان مواقيت الإحرام، ط: زكريا - ديوبند)

(۳) البتہ آفاقی کے دخول مکہ کی وجہ سے عمرہ یا حج کرنا ضروری ہوتا ہے، اس لیے عمرہ کرنا لازم ہوگا، خود حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی کتاب "مسائل حج" میں اس کی صراحت کی ہے، حضرتؒ رقم طراز ہیں:

آفاقی، یعنی میقات سے باہر رہنے والا، مکہ مکرمہ میں پانچوں میقاتوں میں سے کسی بھی میقات سے گذرے گا، تو اس پر حج یا عمرہ کرنا لازم ہوجائے گا، انتہی۔

ثم إذا دخل الآفاقي مكة بغير إحرام، وهو لا يريد الحج، ولا العمر، فعليه لدخول مكة إما حجة وإما عمرة، فإن أحرم بالحج أو العمرة من غير أن يرجع إلى الميقات فعليه دم لترك حق الميقات، وإن عاد إلى الميقات وأحرم وهذا على وجهين: إن أحرم بحجة الإسلام أو عمرة عما لزمه خرج عن العهدة، وإن أحرم بحجة الإسلام أو عمرة كانت عليه إن كان ذلك في عامه أجزأه عما لزمه لدخول ملة بغير إحرام استحسانا. (الفتاوى التاتارخانية: ۳/ ۵۲-۵۵۱، كتاب الحج، الفصل الرابع في بيان مواقيت الإحرام، ط: زكريا - ديوبند)

[مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۶] کیا عمرہ حج کے ارکان میں شامل ہے؟

۱۸۱۵- سوال: ''عمرہ'' حج کے ارکان میں شامل ہے یا الگ ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

''عمرہ'' ایک مستقل عبادت ہے؛ لہٰذا اس کے ارکان الگ ادا کرنے پڑیں گے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وهي في الشرع زيارة البيت والسعي بين الصفا والمروة على صفة مخصوصة وهي أن تكون مع الإحرام، هكذا في محيط السرخسي... (وأما ركنها) فالطواف. ـــــــــ (وأما واجباتها) فالسعي بين الصفا والمروة والحلق أو التقصير كذا في محيط السرخسي. ـــــــــ (وأما شرائطها) فشرائط الحج إلا الوقت هكذا في البدائع. ـــــــــ (وأما سننها وآدابها) فما هو سنن الحج وآدابه إلى الفراغ من السعي. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۳۷، كتاب المناسك، الباب السادس في العمرة، ط: دار الفكر مجمع الأنهر: ۱/ ۳۰۷، كتاب الحج، باب الإحصار والفوات، قبيل: باب الحج عن الغير، ط: دار إحياء التراث العربي☆تبيين الحقائق: ۲/ ۸۲، كتاب الحج، العمرة حكمها وأركانها، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة)

ثم يأتي القبر الكريم، فيستدبر القبلة، ويستقبل جدار القبر، ويبعد من رأس القبر نحو أربعة أذرع، ويقف ناظرا إلى أسفل، خاشعا، فارغ القلب من علائق الدنيا، مستحضرا قلبه جلالة موقفه صلى الله عليه وسلم، ثم يسلم ولا يرفع صوته، فيقول: (السلام عليك يا رسول الله، السلام عليك يا نبي الله، السلام عليك ياخيرة الله، السلام عليك يا خير خلق الله، السلام عليك يا حبيب الله، السلام عليك يا نذير... ـــــــ ثم يتأخر نحو يمينه إلى الشرق قدر ذراع، فيسلم على أبي بكر رضي الله عنه، فيقول: (السلام عليك يا أبا بكر صفي رسول الله، وثانيه في الغار، جزاك الله عن أمة نبيه صلى الله عليه وسلم خيرا). ـــــــ ثم يتأخر نحو اليمين قدر ذراع، فيسلم على عمر رضي الله عنه، فيقول: (السلام عليك يا عمر، أعز الله بك الإسلام، جزاك الله عن أمة محمد صلى الله عليه وسلم خيرا).

(الفقه الإسلامي و أدلته: ۳/۳۳۹-۳۴۰، الباب الخامس: الحج و العمرة، الفصل الثاني: خصائص الحرمين، المبحث الثاني: حرم المدينة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط - الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴ھ) ص: ۷۱۵-۷۱۹، باب زيارة سيد المرسلين - صلى الله عليه وسلم -، فصل في آداب السلام على رسول الله صلى الله عليه وسلم و الصالحين، ت: محمد طلحة بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

فصل زيارة النبى صلى الله عليه وسلم

[روضۂ اقدس اور مدینہ منورہ کی زیارت کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فصل زیارۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

[روضۂ اقدس اور مدینہ منورہ کی زیارت کا بیان]

[۱] مسجدِ نبوی کے آٹھ ستونوں میں سے کہاں نماز اور کہاں دعاء کی جائے؟

۱۸۱۶- سوال: مسجدِ نبوی میں آٹھ ستون ہیں، اُن میں سے کس ستون کے پاس نماز پڑھی جائے؟ اور کون سے ستون کے پاس دعاء کی جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دونوں خلفاءِ راشدینؓ پر صلوٰۃ وسلام سے فراغت کے بعد استوانۂ ابی لبابہؓ کے پاس آکر نفل پڑھ کے دعاء کرے، پھر منبر کے پاس دعاء کرے، پھر استوانۂ حنانہ کے پاس دعاء کرے، اِن دوستونوں پر دعاء مستحب ہے، اِن کے علاوہ اور بھی متبرک جگہیں ہیں؛ لیکن اُن میں دعاء مستحب نہیں، تاہم اگر کوئی دعاء کرلے تو کوئی حرج بھی نہیں۔ (طحطاوی علی مراقی الفلاح: ۱/ ۴۰۸)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] ثم يأتي أسطوانة أبي لبابة التي ربط بها نفسه حتى تاب الله عليه، وهي بين قبره والمنبر، ويصلي ما شاء نفلا، ويتوب إلى الله، ويدعو بما شاء، ويأتي الروضة، ويصلي ما شاء، ويدعو بما أحب، ويكثر من التسبيح والتهليل والثناء والاستغفار، ثم يأتي المنبر فيضع يده على الرمانة التي كانت به تبركا بأثر الرسول صلى الله عليه وسلم ومكان يده الشريفة إذا خطب لينال بركته صلى الله عليه وسلم ويصلي عليه، ويسأل الله ما شاء، ثم يأتي الأسطوانة الحنانة، وهي التي فيها بقية الجذع الذي حن إلى النبي صلى الله عليه وسلم حين تركه، وخطب على المنبر؛ حتى نزل =

[۲] استوانۂ وفود پر اِس نیت سے تلاوت کرنا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنا رہا ہوں

۱۸۱۷- سوال: استوانۂ وقوف،[۱] جو چوکور شکل میں ایک اونچی جگہ بنی ہوئی ہے، اُس پر بہت سے لوگ بیٹھ کر تلاوت کرتے ہیں، اگر کوئی شخص وہاں بیٹھ کر اِس نیت سے تلاوت کرے کہ میں حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سبق سنا رہا ہوں، تو کیا اِس نیت سے تلاوت کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

اِس نیت سے تلاوت کرنا ثابت نہیں ہے، بل کہ اگر زور سے [بلند آواز میں] تلاوت کی گئی، تو دیگر نمازیوں کو خلل ہوگا، جس سے اجتناب ضروری ہے۔

جو چیز ثابت نہیں ہے، اُسے مسنون سمجھ کر نہ کیا جائے، کہ اس سے بدعت کے دروازے کھلتے ہیں۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=فاحتضنه فسكن، ويتبرك بما بقي من الآثار النبوية، والأماكن الشريفة، ويجتهد في إحياء الليالي مدة إقامته، واغتنام مشاهدة الحضرة النبوية، وزيارته في عموم الأوقات. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح-أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي (م: ۱۲۳۱هـ) ص: ۷۵۰، كتاب الحج، فصل في زيارة النبي صلى الله عليه وسلم، ت: محمد عبد العزيز الخالدي، ط: دار الكتب العلمية بيروت-لبنان)

[۱] ''اسطوانہ وقوف'' کا علم نہ ہو سکا، خیال ہوتا ہے کہ ''اسطوانہ وفود'' مراد ہے، جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تشریف رکھتے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ اس اسطوانہ کے پاس مختلف علاقے سے آنے والے وفد سے ملاقات کرتے تھے، اس لیے اسے ''اسطوانہ وفود'' کہا جانے لگا:

وأسطوانة الوفود... كان صلى الله عليه وسلم وسراة الصحابة أي أفاضلهم وأشرافهم (يجلسون عندها) ولعل إضافتها إلى الوفود لأنه-صلى الله عليه وسلم- كان يقعد عندها لملاقاتهم وقضاء مقصوداتهم. (مناسك الملا علي القاري مع حاشية إرشاد الساري، ص: ۷۲۸، ۷۲۹، باب زيارة سيد المرسلين -صلى الله عليه وسلم-، فصل في آداب المجاورة في المدينة المنورة، الأساطين الفاضلة، ت: محمد طلحة بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(۲) قال الشافعي رحمه الله: ما أحدث مما يخالف الكتاب أو السنة أو الأثر أو الإجماع فهو ضلالة، وما أحدث من الخير مما لا يخالف شيئا من ذلك فليس بمذموم... قال النووي: البدعة كل شيء عمل على غير مثال سبق، وفي الشرع إحداث ما لم يكن في عهد رسول الله - صلى الله عليه وسلم. (مرقاة المفاتيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۱/ ۲۲۴، تحت رقم الحديث: ۱۴۱، ط: دار الفكر-بيروت)

[۳] روضۂ اقدس کی کون سی جالی کے پاس قبرِ اطہر ہے؟

۱۸۱۸- سوال: روضۂ اقدس کی تین جالیاں ہیں، اُن میں سے کونسی جالی کے پیچھے قبر اطہر ہے؟ اور کونسی جالیوں کے پیچھے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی قبریں ہیں؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

پہلی جالی کے پیچھے حضورِ پاک ﷺ، دوسری جالی کے پیچھے حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ، اور تیسری جالی کے پیچھے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی قبریں ہیں۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] مدینہ منوّرہ کی زمین پر سر کے بل چلنے کا مطلب

۱۸۱۹- سوال: مدینہ شریف کی زیارت کے تذکرہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ مدینہ شریف کی زمین پر سر کے بل چلنا چاہیے، تو یہاں سر کے بل چلنے سے کیا مراد ہے؟ برائے کرم تشریح فرمائیں۔

گذارش: مکہ مکرمہ سے بہت سے حجاجِ کرام ''مومیائی'' نامی ایک دوا خرید کر لاتے ہیں، جس کی تاثیر گرم بتائی جاتی ہے، اور یہ دوائی ایک حلال پرندے کے جزء سے تیار ہوتی ہے، تو اُس پرندے کا

(۱) ثم يأتي القبر الكريم، فيستدبر القبلة، ويستقبل جدار القبر، ويبعد من رأس القبر نحو أربعة أذرع، ويقف ناظرا إلى أسفل، خاشعا، فارغ القلب من علائق الدنيا، مستحضر اقلبه جلالة موقفه صلى الله عليه وسلم، ثم يسلم ولا يرفع صوته، فيقول: (السلام عليك يا رسول الله، السلام عليك يا نبي الله، السلام عليك يا خيرة الله، السلام عليك يا خير خلق الله، السلام عليك يا حبيب الله، السلام عليك يا نذير . . . ــــــــ ثم يتأخر نحو يمينه إلى الشرق قدر ذراع، فيسلم على أبي بكر رضي الله عنه، فيقول: (السلام عليك يا أبا بكر صفي رسول الله، وثانيه في الغار، جزاك الله عن أمة نبيه صلى الله عليه وسلم خيرا) . ــــــــ ثم يتأخر نحو اليمين قدر ذراع، فيسلم على عمر رضي الله عنه، فيقول: (السلام عليك يا عمر، أعز الله بك الإسلام، جزاك الله عن أمة محمد صلى الله عليه وسلم خيرا) . [الفقه الإسلامي و أدلته: ۳/۳۳۹-۳۴۰، الباب الخامس: الحج و العمرة، الفصل الثاني: خصائص الحرمين، المبحث الثاني: حرم المدينة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ مناسك الملا علي القاري مع حاشية إرشاد الساري، ص:۷۱۵-۷۱۹، باب زيارة سيد المرسلين -صلى الله عليه وسلم-، فصل في آداب السلام على رسول الله صلى الله عليه وسلم و الصالحين، ت: محمد طلحة بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة]

اُردو یا عربی نام کیا ہے؟ برائے کرم رہنمائی فرمائیں، تاکہ ہم یہاں بھی اُسے تلاش کر سکیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

سر کے بل چلنے کا لغوی معنیٰ ظاہر ہے یعنی ''سر کو زمین پر رکھ کر چلنا''؛ لیکن یہاں یہ معنیٰ لغوی مراد نہیں ہے، بل کہ یہ ایک محاورہ ہے، جس کے معنی ہیں: نہایت ادب واحترام کے ساتھ چلنا، جیسے اُردو زبان میں کہا جاتا ہے: قربان ہوجانا، یعنی اپنی مرضی کو ختم کر کے تابع ہوجانا۔[1]

اردو زبان میں اُس پرندے کو مومیاء کہتے ہیں۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] حج کی صحت' مدینہ منورہ کی کی زیارت پر موقوف نہیں

۱۸۲۰- سوال: بیرون کا باشندہ، مکہ شریف میں رہنے والا، اگر حج کے علاوہ دوسرے دنوں میں مدینہ شریف جا کر زیارت کر کے آیا ہے، تو حج کے بعد بھی اس کے لیے مدینہ شریف جانا لازم ہے؟ اگر نہیں جائے تو گنہ گار ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیا:

مدینہ شریف کی عبادت، مستقل عبادت ہے، حج کی صحت اس پر موقوف نہیں؛ اس لیے چاہے وہ مکہ کا باشندہ ہو یا ہندوستان، یورپ کا ہو یا افریقہ کا، حج کر لے، اگر وہ مدینہ شریف نہیں جاسکا، تب بھی اس کا حج صحیح ہوجائے گا۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) سر کے بل: سر کے سہارے، (۲) نہایت ادب سے، بڑی عزت سے۔ (فیروز اللغات کلاں، ص: ۷۹۲، جدید اڈیشن، ط: ادبی دنیا، جامع مسجد، دہلی)

(۲) مومیائی- مومیاء: نام ایک شئے کا ہے، جسے بہ طور دوا کے استعمال کرتے ہیں، اور یہ سیاہ رنگ کی ہوتی ہے۔ (لغات کشوری، ص: ۵۱۴، باب میم، فصل میم مع واؤ، ط: دار الاشاعت کراچی- پاکستان)

(۳) وزيارة قبره مندوبة، بل قيل واجبة لمن له سعة. (الدر المختار) ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله مندوبة) أي بإجماع المسلمين كما في اللباب. (رد المحتار على الدر المختار: ۶۲۶/۲، كتاب الحج، فروع في الحج، حرم المدينة ومكة، ط: دار الفكر- بيروت ☆ فتح القدير: ۱۷۹/۳، كتاب الحج، مسائل منثورة، ط: دار الفكر- بيروت ☆ مناسك الملا علي القاري مع حاشية إرشاد الساري، ص: ۷۰۹، باب الحج عن الغير، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة ☆ فتاوى دار العلوم: ۵۸۰/۶، زيارت مدينه، ط: دار العلوم- ديوبند)

عن علي -رضي الله تعالى عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " من ملك زادا وراحلة تبلغه إلى بيت الله ولم يحج فلا عليه أن يموت يهوديا، أو نصرانيا، وذلك أن الله يقول في كتابه: {ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا} ". [آل عمران: ۹۷] (سنن الترمذي: ۱/ ۱۶۷، رقم الحديث: ۸۱۲، أبواب الحج، باب ما جاء في التغليظ في ترك الحج)

باب متفرقات الحج

[حج کے متفرق مسائل]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب متفرقات الحج

[حج کے متفرق مسائل]

[۱] فرض حج کی ادائیگی سے قبل عمرہ کرنا

۱۸۲۱-سوال: میں اور میری والدہ نے اب تک حج ادا نہیں کیا ہے، اور ہم عمرہ کے لیے جانا چاہتے ہیں، تو فرض حج باقی ہوتے ہوئے ہمارا عمرہ ادا ہوگا؟ یا پہلے فرض حج ادا کرنے کے بعد عمرہ کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

حج کی ادائیگی سے پہلے آپ کا عمرہ ادا کرنا جائز ہے، لیکن اگر آپ پر حج فرض ہے، تو بلا کسی عذر کے اُس کی ادائیگی میں تاخیر نہ کریں، کیوں کہ اِس بارے سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اِس لیے پہلے حج ادا کرنا بہتر ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) عن علي قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من ملك زادا وراحلة تبلغه إلى بيت الله ولم يحج فلا عليه أن يموت يهوديا، أو نصرانيا، وذلك أن الله يقول في كتابه: {ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا} [آل عمران: ۹۷]

(سنن الترمذي: ۱/۱۶۷، رقم الحديث: ۸۱۲، أبواب الحج، باب ما جاء في التغليظ في ترك الحج، ط: ديوبند)

وأما كونه على الفور، فهو قول أبي يوسف وأصح الروايتين عن أبي حنيفة، وعند محمد يجب على التراخي والتعجيل أفضل كذا في الخلاصة، وتحقيقه أن الأمر إنما هو طلب المأمور به ولا دلالة له على الفور ولا على =

[۲] پہلے والد کا حج بدل یا بھائی کے قرض کی ادائیگی؟

۱۸۲۲- سوال: ہم کل چھ بھائی ہیں: دو انڈیا میں، دو انگلینڈ میں، ایک سعودیہ میں اور ایک زامبیا میں رہتے ہیں، ہمارے والد کا انتقال آج سے ۳۴/سال قبل ہوا تھا، انہوں نے کوئی حج نہیں کیا ہے، ان پر حج فرض تھا یا نہیں؟ ہمیں معلوم نہیں۔ اب باہر رہنے والے بھائیوں نے مل کر یہ طے کیا ہے کہ والد کی طرف سے حج بدل کیا جائے اور اس کا خرچ وہ سب مل کر اٹھائیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ انڈیا میں جو دو بھائی رہتے ہیں، ان کو کسی وجہ سے قرض ہو گیا ہے، دوسرے بھائی بھی ان کی وقتاً فوقتاً تھوڑی تھوڑی مدد کرتے رہتے ہیں، لیکن فی الحال ان کا قرض کچھ زیادہ ہو گیا ہے، تو اب ان مقروض بھائیوں کا قرض پہلے ادا کیا جائے یا والد صاحب کی طرف سے حج بدل کیا جائے؟ اس سلسلہ میں آپ جناب سے شریعت کی صحیح رہنمائی چاہتے ہیں، امید ہے کہ جواب دے کر مشکور فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کے سوال میں دو باتیں ہیں:

(۱) والد کی طرف سے حج کی ادائیگی، (۲) بھائی کا قرض ادا کرنا۔ تو جاننا چاہیے کہ آج سے ۳۴/سال قبل عموماً جہالت کی وجہ سے حج فرض ہونے کے باوجود بھی لوگ حج نہیں کیا کرتے تھے، اس لیے زیادہ امکان ہے کہ آپ کے والد پر حج فرض ہو گیا ہو، اور والد کا حق مقدم ہے پس اپنی رضامندی سے کسی بھی بھائی کو یا سب کو مل کر ان کی طرف سے حج کروانا چاہیے۔(۱)

=التراخي فأخذ به محمد وقواه بأنه -عليه السلام- حج سنة عشر وفرضية الحج كانت سنة تسع فبعث أبا بكر حج بالناس فيها ولم يحج هو إلى القابلة.

وأما أبو حنيفة وأبو يوسف فقالا: الاحتياط في تعيين أول سني الإمكان؛ لأن الحج له وقت معين في السنة والموت في سنة غير نادر فتأخيره بعد التمكن في وقته تعريض له على الفوات فلا يجوز وبهذا حصل الجواب عن تأخيره -عليه الصلاة والسلام- إذ لا يتحقق في حقه تعريض الفوات وهو الموجب للفور؛ لأنه كان يعلم أنه يعيش حتى يحج ويعلم الناس مناسكهم تكميلا للتبليغ وبهذا التقرير علم أن الفورية ظنية؛ لأن دليل الاحتياط ظني ومقتضاه الوجوب فإذا أخره وأداه بعد ذلك وقع أداء ويأثم بالتأخير لترك الواجب. (البحر الرائق: ۲/۳۳۳، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[نوٹ: حاشیہ نمبر: (۱) اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں]

اگر باہر رہنے والے تمام بھائی مل کر خرچ اٹھاتے ہیں اور مقروض بھائیوں کے پاس سے کچھ نہیں لیا جاتا ہے تو ان مقروض بھائیوں کو اس سلسلہ میں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے؛ کیوں کہ ان کے پاس سے کچھ رقم نہیں لی گئی ہے، اور اگر وہ بھی ساتھ دیتے ہیں اور کچھ رقم دیتے ہیں، تو اس کی اجازت ہے۔

مقروض و غریب بھائیوں کی جانب سے مدد نہ آئے، اور صاحب مال حج بدل کرائے، یہ زیادہ بہتر ہے، اس میں زیادہ ثواب ہے۔ حج بدل کرانے کے بعد بھی غریب بھائیوں کی مدد کی جائے اور ان کا خیال رکھا جائے، کہ یہ ضروری ہے۔ البتہ یہاں ملک (انڈیا) میں رہنے والے بھائیوں کو بھی چاہیے کہ اپنی حالت بدلنے کی خود بھی کوشش کریں، سودی نظام کا سہارا لے کر اور غلط راستہ اپنا کر یہاں بیٹھے موج و مستی نہ کریں (جیسا کہ بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں اور باہر کے رشتہ داروں سے امید لگائے رہتے ہیں) اگر وہ یہاں صحیح طریقہ سے رہتے ہوں اور مالی مشکلات کو دور کرنے کے لیے کوشاں ہو، لیکن کامیابی نہ ملتی ہو، تو بلاشبہ ان کی مدد کرنے میں بھی بہت بڑا ثواب ہے۔[۲] لیکن والد کا حق بھائیوں سے زیادہ ہے، اس کا خیال رکھا جائے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن ابن عباس رضي الله عنهما، أن امرأة من جهينة، جاءت إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فقالت: إن أمي نذرت أن تحج فلم تحج حتى ماتت، أفأحج عنها؟ قال: نعم حجي عنها، أرأيت لو كان على أمك دين أكنت قاضية؟ اقضوا الله فالله أحق بالوفاء. (صحيح البخاري: ۱/۲۴۹-۲۵۰، رقم الحديث: ۱۸۵۲، كتاب الحج، باب الحج والنذور عن الميت، والرجل يحج عن المرأة، ط: ديوبند)

...أن من مات، وعليه فرض الحج، ولم يوص به لم يلزم الوارث أن يحج عنه، وإن أحب أن يحج عنه حج، وأرجو أن يجزئه إن شاء الله، هكذا ذكر القدوري في شرحه؛ لأن رسول الله عليه السلام شبه ديون الله تعالى بديون العباد في الحج في حديث الخثعمية، ثم في ديون العباد من قضى دين غيره بغير أمره يجوز، ولكن موقوفاً على مشيئة رب الدين، فكذا في دين الله تعالى. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲/۴۸۷، كتاب المناسك، الفصل السادس عشر: في الوصية بالحج، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتاوى التاتارخانية: ۳/۶۶۷، كتاب الحج، الفصل السادس عشر: في الوصية بالحج، ط: زكريا - ديوبند ☆ بدائع الصنائع: ۲/۲۲۱، كتاب الحج، فصل بيان حكم فوات الحج عن العمرة، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۲۵۸، كتاب المناسك، الباب الخامس عشر في الوصية بالحج، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من نفس عن مؤمن كربة من كرب الدنيا، نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة، ومن يسر على معسر، يسر الله عليه في الدنيا والآخرة، ومن ستر مسلما، ستره الله في الدنيا والآخرة، والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه، ... الحديث. (الصحيح لمسلم: ۲/۳۴۵، رقم الحديث: ۳۸-(۲۶۹۹)، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر، ط: ديوبند)

[۳] اہل جدہ حج میں مسافر شرعی نہیں ہوتے ہیں

۱۸۲۳- سوال: یہاں جدہ سے مکہ مکرمہ ۷۳ ر کلومیٹر ہے اور وہاں سے عرفات ۱۳ ر کلومیٹر ہے، اور مذکور ۷۳ ر کلومیٹر کا فاصلہ جدہ شہر کے وسط سے حرم تک کا ہے، جب کہ جدہ میونسپلٹی کی آخری حد سے مکہ مکرمہ کی پہلی حد تک کا فاصلہ صرف ۴۰ ر کلومیٹر ہے، تو ایسی صورت میں اہل جدہ جب حج میں جائیں، تو نماز میں قصر کریں یا اتمام؟ واضح رہے کہ مذکور فاصلہ کلومیٹر ہی کے ذریعے بیان کیا گیا ہے میل کے ذریعے نہیں، پس مسافر بننے کے لیے سفر شرعی کی تحدید میں گھر سے منزل مقصود تک کا فاصلہ شمار ہوگا یا جدہ کی آبادی ختم ہونے سے مکہ کی آبادی شروع ہونے تک کا فاصلہ معتبر ہوگا یا جدہ کی میونسپلٹی کی حد سے مکہ کی میونسی پلٹی کی حد شروع ہونے تک کا فاصلہ گننے میں آئے گا؟ تسلی بخش جواب عنات فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

سفر شرعی کے لیے شہر کی آبادی جہاں سے ختم ہوتی ہے، وہاں سے (آخری مقصود شہر کی حد شروع ہونے تک) ۴۸ ر میل یا ۷۷ ر کلومیٹر ہونا ضروری ہے۔ پس اہل جدہ (مکہ یا عرفات جانے سے) مسافر شمار نہ ہوں گے، ان پر نماز میں اتمام لازم ہے، کیوں کہ جدہ سے حج کی نیت سے نکلنے والا شخص مکہ ہوتے ہوئے منیٰ اور عرفات کا سفر کرے گا، تب بھی یہ سفر ۷۷ ر کلومیٹر کا نہیں ہوتا ہے، پس وہ مسافر شرعی نہ ہوگا، اس کے ذمہ پوری نماز لازم ہوگی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) إذا جاوز المقيم عمران مصره قاصدا مسيرة ثلاثة أيام و لياليها . . . يلزمه قصر الصلاة. (قاضي خان مع الهندية: ۱/۱۶۴، باب صلاة المسافر، ط: زكريا - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/۱۳۹، الباب الخامس عشر في صلاة المسافر، ط: زكريا- ديوبند ☆ البحر الرائق: ۱/۲۲۶، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر، ط: زكريا- ديوبند)

واضح رہے کہ مسافت سفر کا آغاز کہاں سے ہوگا؟ اس موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی- انڈیا کا باضابطہ سمینار منعقد ہو چکا ہے۔ اس سمینار کا ایک سوال یہی تھا کہ ''ایسا شخص جو ایسے مقام کا سفر کر رہا ہو، جو شہر کی انتہائی حدود سے تو ۴۸ ر میل کے فاصلے پر نہ ہو، لیکن اس کے گھر کے پاس سے ۴۸ ر میل کا فاصلہ ہو، تو وہ قصر کرے گا یا اتمام؟

عارض مسئلہ نے لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں مقالہ نگار کی دو طرح کی آراء ہیں، ۲۳ ر مقالہ نگار حضرات تو اس حق میں ہیں کہ ایسا شخص اتمام کرے گا، جب کہ ۲۱ ر حضرات اس صورت میں قصر کے قائل ہیں۔ (مسافت سفر کا آغاز- ایک اہم شرعی مسئلہ، ص: ۴۱- ۴۲، مسافت سفر کا شمار کہاں سے ہوگا؟ عارض: مفتی حبیب اللہ قاسمی، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی- انڈیا)

فقہ اکیڈمی انڈیا کا [سترہواں] فقہی سمینار، دار العلوم علی متقی، برہان پور (ایم- پی) میں منعقد ہو چکا ہے، جس کا فیصلہ- جو مذکورہ=

[۴] حج میں اور ہندوستان میں عیدالاضحیٰ کی تاریخ میں فرق کیوں ہے؟

۱۸۲۴-سوال: حج ۸ر یا۹ر ذی الحجہ کو ہوتا ہے، اپنے یہاں عیدالاضحیٰ کے ایک یا دو دن پہلے، تو اس کی کیا وجہ ہے؟ مفصل بیان فرمائیں۔ سال رواں میں جمعہ کو حج ہوا اور اتوار کو عیدالاضحیٰ ہوئی دو دن کا فرق رہا! غیر مسلم کہتے ہیں کہ تمہارے یہاں تہواروں میں اتحاد نہیں ہے، اتنا فرق کیوں رہتا ہے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مسائل حج اور بعض حقائق سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات انسان مختلف قسم کے سوالات سے پریشان ہوجاتا ہے۔

مسلمانوں کے عید و بقرعید کا مدار چاند کی رؤیت پر ہے۔(۱) اور مشرق و مغرب کے طویل فاصلے کی بناء پر چاند کی رؤیت مختلف ملک میں مختلف وقت میں ہوسکتی ہے، جس کی وجہ سے مشرق و مغرب اور شمال

=مسئلہ سے متعلق ہے- درج ذیل ہے:

۳- چھوٹے شہروں میں مسافت شرعی کا حساب اس جگہ سے ہوگا، جہاں شہر ختم ہوا ہے، یعنی شہر ختم ہونے کے بعد ۴۸ر میل سفر کیا جائے، تبھی وہ مسافر ہوگا۔

۴- بڑے شہروں میں- جن کی آبادی میلوں تک پھیل گئی ہے- مسافت شرعی کا شمار کس مقام سے ہوگا؟ اس میں دو نقاط نظر ہیں: زیادہ حضرات کی رائے ہے کہ جہاں شہر ختم ہوتا ہے، وہیں سے ۴۸ر میل کی مسافت شمار کی جائے گی۔ [**حضرت مفتی بیمات صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بھی یہی رائے ہے۔ مجتبیٰ حسن قاسمی**] دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ جس محلہ سے سفر شروع ہوا ہے، وہیں سے مسافت سفر کا شمار ہوگا، البتہ اس پر سبھوں کا اتفاق ہے کہ نماز میں قصر کا حکم شہر سے باہر نکلنے کے بعد ہی شروع ہوگا، اور اسی طرح واپس ہوتے وقت شہر میں داخل ہونے سے پہلے پہلے تک ہی قصر کرنا درست ہوگا۔ (مسافت سفر کا آغاز- ایک اہم شرعی مسئلہ، ص: ۲۴، اکیڈمی کا فیصلہ، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی- انڈیا)

(۱) عن أبي هريرة رضي الله عنه، يقول: قال النبي -صلى الله عليه وسلم-: أو قال: قال أبو القاسم صلى الله عليه وسلم: صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فإن غبي عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين. (صحيح البخاري: ۱/۲۵۶، رقم الحديث: ۱۹۰۹، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: إذا رأيتم الهلال فصوموا، وإذا رأيتموه فأفطروا، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۱/۳۴۷، رقم الحديث: ۱۷-(۱۰۸۱)، كتاب الصيام، باب وجوب صوم رمضان لرؤية الهلال، والفطر لرؤية الهلال... الخ، ط: ديوبند)

وجنوب کے باشندے اس سلسلہ میں ایک دو دن آگے پیچھے رہتے ہیں، ہندوستان میں سورج طلوع ہوتا ہے، تو بار بڈوز اور کناڈا وغیرہ میں پچھلی تاریخ کا سورج غروب ہوتا ہے، ہندوستان والے جس وقت عید کی خوشیاں مناتے ہیں، کناڈا اور بار بڈوز والے نیند میں مست ہوتے ہیں، پس تاریخ کا فرق یہاں بھی ہو گیا۔(۲)

حجاج کے لیے سب سے اہم وعظیم رکن وقوف عرفہ ہے، جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حج تو وقوف عرفہ ہے''۔(۳)

اس حدیث کی بناء پر ''یوم عرفہ'' یعنی ۹/ذی الحجہ کو ''حج کا دن'' کہا جاتا ہے؛ لہٰذا جہاں اخبارات اور رسائل میں ہم نے پڑھا کہ ۱۹۸۳ء میں جمعہ کو حج ہوا، اس کا مطلب ہے کہ حجاج نے حج کا سب سے اہم و عظیم رکن یعنی ''وقوف عرفہ'' جمعہ کو کیا، اس لحاظ سے سعودی عرب ہم سے صرف ایک ہی دن آگے تھا، ۱۹۸۳ء میں ہمارے یہاں ۸/ذی الحجہ تھی اور عربستان میں ۹/ذی الحجہ تھی، پس دو دن نہیں؛ بل کہ ایک ہی دن وہ ہم

---

(۲) اعلم أن نفس اختلاف المطالع لا نزاع فيه بمعنى أنه قد يكون بين البلدتين بعد بحيث يطلع الهلال له ليلة كذا في إحدى البلدتين دون الأخرى وكذا مطالع الشمس؛ لأن انفصال الهلال عن شعاع الشمس يختلف باختلاف الأقطار حتى إذا زالت الشمس في المشرق لا يلزم أن تزول في المغرب، وكذا طلوع الفجر وغروب الشمس بل كلما تحركت الشمس درجة فتلك طلوع فجر لقوم وطلوع شمس لآخرين وغروب لبعض ونصف ليل لغيرهم كما في الزيلعي وقدر البعد الذي تختلف فيه المطالع مسيرة شهر فأكثر على ما في القهستاني عن الجواهر. (رد المحتار على الدر المختار- ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲/۳۹۳، كتاب الصوم، سبب صوم رمضان، مطلب في اختلاف المطالع، ط: دار الفكر-بيروت☆تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق-عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۱/۳۲۱، كتاب الصوم، قبيل: باب ما يفسد الصوم وما لا يفسده، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة☆درر الحكام شرح غرر الأحكام-محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ۸۸۵هـ): ۱/۲۰۱، كتاب الصوم، قبيل: باب موجب الإفساد في الصوم، ط: دار إحياء الكتب العربية☆مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/۲۳۹، كتاب الصوم، ما يثبت به رمضان، قبيل: باب موجب الفساد، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۳) عن عبد الرحمن بن يعمر، قال: شهدت رسول الله صلى الله عليه وسلم فأتاه ناس، فسألوه عن الحج؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الحج عرفة، فمن أدرك ليلة عرفة قبل طلوع الفجر من ليلة جمع، فقد تم حجه. (المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي-أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۵/۲۵۶، رقم الحديث: ۳۰۱۶، كتاب مناسك الحج، فرض الوقوف بعرفة، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية-حلب)

سے تاریخ میں آگے تھے، اور ایک دن تو (جائے وقوع کے اعتبار سے) آگے رہنے ہی والے ہیں۔ (☆☆)

امید ہے کہ جواب سے اطمینان ہو جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] حاجی مسافر ہوتا ہے، پھر اس پر قربانی کیوں ہے؟

۱۸۲۵- سوال: حاجی مسافر ہوتا ہے، اور مسافر پر قربانی واجب نہیں ہوتی ہے، جب کہ حجاج قربانی بھی کرتے ہیں۔ آخر کیوں؟ امید ہے کہ اس سلسلے میں پیدا ہونے والے شک کو دور فرما کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً

ہر حاجی مسافر نہیں ہوتا ہے، بعض وہ ہوتے ہیں، جو ۱۵؍ دن یا اس سے زائد مکہ مکرمہ میں رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں، [۱] ایسے حاجی مسافر نہیں ہیں، وہ مقیم ہیں، ان پر قربانی واجب ہوگی، البتہ جو حاجی مکہ میں

(☆☆) [تنبيه] يفهم من كلامهم في كتاب الحج أن اختلاف المطالع فيه معتبر فلا يلزمهم شيء لو ظهر أنه رئي في بلدة أخرى قبلهم بيوم وهل يقال كذلك في حق الأضحية لغير الحجاج؟ لم أره والظاهر نعم؛ لأن اختلاف المطالع إنما لم يعتبر في الصوم لتعلقه بمطلق الرؤية، وهذا بخلاف الأضحية فالظاهر أنها كأوقات الصلوات يلزم كل قوم العمل بما عندهم فتجزئ الأضحية في اليوم الثالث عشر وإن كان على رؤيا غيرهم هو الرابع عشر والله أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۹۲-۳۹۳، كتاب الصوم، قبيل: باب مايفسد الصوم ومالا يفسده، مطلب في اختلاف المطالع، ط: دار الفكر)

[۱] (من خرج من عمارة موضع إقامته) من جانب خروجه وإن لم يجاوز من الجانب الآخر.... (قاصدا)... (مسيرة ثلاثة أيام ولياليها)... (بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة) حتى لو أسرع فوصل في يومين قصر، ... (صلى الفرض الرباعي ركعتين)... (ولو) كان (عاصيا بسفره)... (حتى يدخل موضع مقامه) إن سار مدة السفر، وإلا فيتم بمجرد نية العود... (أو ينوي)... (إقامة نصف شهر) حقيقة أو حكما... (فيقصر إن نوى) الاقامة (في أقل منه) أي في نصف شهر (أو) نوى (فيه لكن في غير صالح) أو كنحو جزيرة أو نوى فيه لكن (بموضعين مستقلين كمكة ومنى) فلو دخل الحاج مكة أيام العشر لم تصح نيته لأنه يخرج إلى منى وعرفة فصار كنية الإقامة في غير موضعها وبعد عوده من منى تصح، كما لو نوى مبيته بأحدهما أو كان أحدهما تبعا للآخر بحيث تجب الجمعة على ساكنه للاتحاد حكما. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۲۱-۱۲۶)

قال ابن عابدين: (قوله فلو دخل إلخ) هو ضد مسألة دخول الحاج الشام؛ فإنه يصير مقيما حكما، وإن لم ينو الإقامة، وهذا مسافر حكما، وإن نوى الإقامة لعدم انقضاء سفره ما دام عازما على الخروج قبل خمسة عشر يوما أفاده الرحمتي. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۱۲۶، كتاب الصلاة، باب المسافر، ط: دار الفكر ☆ البحر الرائق: ۲/ ۲۲۵ تا ۲۳۱، باب المسافر، ط: دار الكتاب-ديوبند)

=

۱۵/دن ٹھہرنے کی نیت نہ کریں، پہلی ذی الحجہ کو مکہ میں پہنچیں، اور ۱۳/ یا ۱۴/ذی الحجہ کو مدینہ شریف جانے کا ارادہ رکھتے ہوں، تو وہ مسافر ہیں، جن پر قربانی واجب نہیں ہے۔ (۲)

واضح رہے کہ مذکور قربانی (جو کہ عید الاضحیٰ کی قربانی ہے) اپنے وطن ممبئی، سورت وغیرہ بھی کر سکتا ہے، البتہ تمتع یا قران کی جو قربانی ہے (جس کو حج کی قربانی کہتے ہیں) اس کا حرم شریف میں ہی کرنا واجب ہے۔ (۳) اور یہ قربانی خواہ مسافر ہو یا مقیم ہر ایک پر لازم ہے۔ (۴) حج تمتع اور حج قران والی قربانی سے آپ کو شبہ ہوا کہ تمام حاجی قربانی کرتے ہیں، حالاں کہ سب پر واجب نہیں، امید ہے کہ مذکورہ تفصیل سے اشکال رفع ہو جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= وذكر في كتاب المناسك أن الحاج إذا دخل مكة في أيام العشر ونوى الإقامة خمسة عشر يوما أو دخل قبل أيام العشر لكن بقي إلى يوم التروية أقل من خمسة عشر يوما ونوى الإقامة لا يصح؛ لأنه لا بد له من الخروج إلى عرفات فلا تتحقق نية إقامته خمسة عشر يوما فلا يصح. (بدائع الصنائع: ۹۸/۱، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يصير المسافر به مقيما، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) (وإنما تجب) التضحية دون الأضحية... (على حر) فلا تجب على العبد (مسلم) فلا تجب على الكافر (مقيم) فلا تجب على المسافر لقول علي - رضي الله تعالى عنه - ليس على مسافر جمعة ولا أضحية... ويستوي فيه المقيم بالمصر والقوي والبوادي (موسر)؛ لأن العبادة لا تجب إلا على القادر وهو الغني دون الفقير ومقداره ما تجب فيه صدقة الفطر. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۵۱۶/۲، كتاب الأضحية، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ البحر الرائق: ۱۹۷/۸، كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ بدائع الصنائع: ۶۳/۵، كتاب الأضحية، فصل في شرائط وجوب الأضحية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۳) عن جابر، قال: ثم قال النبي صلى الله عليه وسلم: قد نحرت ها هنا ومنى كلها منحر، ووقف بعرفة فقال: قد وقفت ها هنا وعرفة كلها موقف، ووقف بالمزدلفة فقال: قد وقفت ها هنا ومزدلفة كلها موقف. (سنن أبي داود: ۲۶۶/۱، رقم الحديث: ۱۹۰۷، كتاب المناسك، باب صفة حجة النبي صلى الله عليه وسلم، ط: ديوبند)

قال "ولا يجوز ذبح الهدايا إلا في الحرم" لقوله تعالى في جزاء الصيد: ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدة: ۹۵] فصار أصلا في كل دم هو كفارة ولأن الهدي اسم لما يهدى إلى مكان ومكانه الحرم قال عليه الصلاة والسلام "منى كلها منحر وفجاج مكة كلها منحر". (الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱۸۱/۱، كتاب الحج، باب الهدي، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ البحر الرائق - ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۱۲۸/۳، كتاب الحج، باب الهدي، ط: زكريا - ديوبند ☆ غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۳۳۸، فصل في شرائط كفاراتها الثلاث، مطلب في شرائط جواز الدم، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(۴) ﴿فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾. (۲- البقرة: ۱۹۶) =

[۶] ۱-میت کی طرف سے حج کے لیے رقم الگ کر کے استعمال کر لینا اور سعودیہ سے حج کرانا
[۷] ۲-ترکہ کی جمع رقم پر زکوٰۃ کا حکم

۱۸۲۶-سوال: ۱۹۸۰ء میں ہم نے اپنے خسر کی وراثت میں تہائی حصہ-جس کی کل رقم پندرہ ہزار ہوتی ہے-الگ نکال کر ان کی طرف سے حج کرنے کے لیے بینک میں جمع کرادی، اس رقم کا سود آتا رہتا ہے۔

ہمارے ایک ہم زلف کا لڑکا سعودی عرب میں رہتا ہے، تو کیا یہ جائز ہے کہ وہ لڑکا ہمارے خسر یعنی اپنے نانا کی طرف سے وہاں سے حج کر لے اور یہ رقم یہاں سب لڑکیاں اور ان کی ماں آپس میں تقسیم کر لیں؟ کیوں کہ ان کو یہاں ایک مسافر خانہ میں تعاون کرنا ہے، تو کیا وہ ایسا کر سکتی ہیں؟ اسی طرح یہ رقم جواب تک بینک میں جمع رہی، اس کی گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً

آپ کے خسر نے حج کے متعلق وصیت نہیں کی ہے؛ بل کہ لڑکیوں اور ان کی ماں نے اپنی خوشی سے حج کے لیے ترکہ میں سے ۱۵۰۰۰/ الگ کیے تھے، لیکن سوال کے انداز سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کی ساس اور ان کی لڑکیوں کی نیت خراب ہوگئی ہے اور ان میں سے کوئی اب انڈیا سے ''جمع شدہ رقم'' سے حج کرانے کے لیے تیار نہیں ہے، بل کہ جدہ سے حج کرانا چاہتے ہیں، اس وجہ سے آپ کی بیوی وغیرہ وہ تہائی مال واپس لینا چاہتی ہیں، شرعاً ان کو یہ مال لینے کا حق ہے، وہ لے سکتی ہیں؛ کیوں کہ وہ اس مال کی شرائط کے تحت مالک ہیں؛ اس لیے وہ اس رقم کو لے کر مسافر خانہ میں بھی لگا سکتی ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (۱)

= اتفق العلماء على أن المتمتع والقارن يلزمهما إذا أحرما بالحج و العمرة في أشهر الحج في عام واحد الهدي... و دم القران و التمتع دم شكر لقوله تعالى: ﴿فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾. (الفقه الإسلامي و أدلته: ۳/ ۲۶۲، الباب الخامس: باب الحج و العمرة، المبحث الثامن: ثالثا كيفية القران، ط: الهدی انٹرنیشنل، دیوبند)

(يجب) أي إجماعا (على القارن و المتمتع هدي) شكرا لما وفقه الله تبارك و تعالى للجمع بين النسكين في أشهر الحج بسفر واحد. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط-الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ)، ص: ۳۶۸، باب القران، فصل في هدي القارن و المتمتع، ت: طلحه بلال منيار، ط: المكتبة الإمدادية-مكة المكرمة)

(۱) لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/ ۵۱، باب البيع الفاسد، مطلب في تعريف المال، ط: دار الفكر)

=

اور جہاں تک زکوۃ کا سوال ہے، تو اس رقم کی گذشتہ سالوں کی زکوۃ آپ کی بیوی وغیرہ- جو اس مال کی اصل مالک ہیں- کے ذمہ ادا کرنا ضروری ہے[۲] اور اس پر سود کی جو رقم آئی ہے، وہ غرباء کو بغیر ثواب کی نیت کے دے دینا ضروری ہے۔[۳] فقط، اللہ اعلم بالصواب۔

[۸] قانونی مجبوری کی وجہ سے سفرِ حج کے لیے اصل نام بدل کر پاسپورٹ بنوانا

۱۸۲۷- سوال: ایک شخص حج کے سفر کا ارادہ رکھتا ہے؛ لیکن اُس کے لیے پاسپورٹ بنوانے میں کچھ قانونی پریشانیاں حائل ہیں، جن کے پیش نظر وہ شخص اپنا اصل نام بدل کر پاسپورٹ بنوا کر حج میں جانے کا رادہ رکھتا ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ یہ جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً اصل نام اسماعیل ہے، اور وہ اُسے بدل کر محمد اسماعیل کر دے، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

حج فرض ہو، اور حکومت کی قانونی دشواری ایسی ہو کہ نام بدلنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ ہو، تو نام

= والحاصل أن القياس في جنس هذه المسائل أن يفعل المالك ما بدا له مطلقا لأنه متصرف في خالص ملكه. (المصدر السابق: ۴۴۸/۵، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي، ط: مسائل متفرقة، مطلب اقتسموا دارا وأراد كل منهم فتح باب لهم ذلك، ط: دار الفكر ☆ فتح القدير: ۳۲۶/۷، كتاب أدب القاضي، باب التحكيم، مسائل شتى من كتاب القضاء، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) إذا أمسكه لينفق منه كل ما يحتاجه فحال الحول، وقد بقي معه منه نصاب فإنه يزكي ذلك الباقي، وإن كان قصده الإنفاق منه أيضا في المستقبل لعدم استحقاق صرفه إلى حوائجه الأصلية وقت حولان الحول. (رد المحتار على الدر المختار: ۲۶۲/۲، أول كتاب الزكاة، ط: دار الفكر)

(۳) والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه. (رد المحتار على الدر المختار: ۹۹/۵، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالا حراما، ط: دار الفكر)

وعلى هذا لو مات مسلم وترك ثمن خمر باعه مسلم لا يحل لورثته كما بسطه الزيلعي. (الدر المختار) ــــــ وفي حاشية ابن عابدين (م: ۱۲۵۲ هـ): وقال في النهاية: قال بعض مشايخنا: كسب المغنية كالمغصوب لم يحل أخذه، وعلى هذا قالوا لو مات الرجل وكسبه من بيع الباذق أو الظلم أو أخذ الرشوة يتورع الورثة، ولا يأخذون منه شيئا وهو أولى بهم ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۸۵/۶، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر-بيروت)

اِس طرح بدلا جائے کہ وہ جھوٹ شمار نہ ہو، مثلاً: اسماعیل کی جگہ محمد اسماعیل کر دے، [جیسا کہ سوال میں لکھا گیا ہے] تو گنجائش ہے، یا نام کی جگہ کنیت استعمال کرے، مثلاً مذکور شخص کے لڑکے کا نام ابراہیم ہے، تو یہ شخص اپنا نام ابو ابراہیم لکھوا کر پاسپورٹ بنائے، اس [عمل] کا شمار جھوٹ میں نہیں ہوگا اور حج فرض بھی ادا ہو جائے گا۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] قارن اور مفرد کا، اپنے ساتھی کے کپڑے دھونا

۱۸۲۸- سوال: قارن یا مفرد اپنے کسی بیمار اور معذور ساتھی کے کپڑے دھو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

محرم کے لیے سفر کے بیمار اور کمزور رفقاء کے کپڑے دھونا جائز ہے۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] نفلی حج کرنے والے کو رقم دینا بہتر ہے یا صدقہ وخیرات کرنا؟

۱۸۲۹- سوال: ایک شخص غریب ہے، زکوۃ کا مستحق ہے، اس کو ایک صاحبِ مال اپنے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے لے جانا چاہتے ہیں، غریب- جس پر حج فرض نہیں ہے- کو حج کے لیے لے جانے میں ۳۵ سے ۴۰ ہزار کا خرچ ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ اتنے روپئے کسی غریب، یتیم کی شادی میں یا کسی کے قرض کی ادائیگی میں یا مساجد ومدارس میں دینا زیادہ بہتر ہے یا غریب کو حج کروانا؟

---

(۱) قاعدة: الضرورات تبيح المحظورات (شن). (قواعد الفقه- محمد عميم الإحسان المجددي البركتي، ص:۸۹، رقم: ۱۷۰، ط: الصدف ببلشرز- كراتشي☆شرح القواعد الفقهية- أحمد بن الشيخ محمد الزرقا (۱۲۸۵-۱۳۵۷ھ)، ص:۱۸۵، القاعدة العشرون، ت: مصطفى أحمد الزرقا، ط: دار القلم- دمشق/سوريا)

قال ابن عابدين: (قوله: ويوري) التورية أن يظهر خلاف ما أضمر في قلبه أتقاني. قال في العناية فجاز أن يراد بها هنا اطمئنان القلب وأن يراد الإتيان بلفظ يحتمل معنيين اهـ وفيه أنه قد يكره على السجود للصنم أو الصليب ولا لفظ فالظاهر أنها إضمار خلاف ما أظهر من قول أو فعل؛ لأنها بمعنى الإخفاء فهي من عمل القلب تأمل. (قوله: ثم إن ورى لا يكفر) كما إذا أكره على السجود للصليب أو سب محمد- صلى الله تعالى عليه وسلم- ففعل وقال نويت به الصلاة لله تعالى، ومحمدا آخر غير النبي. (رد المحتار على الدر المختار: ۱۴۲/۶، كتاب الإكراه، ط: دار الفكر- بيروت☆ العناية شرح الهداية: ۲۴۱/۹، كتاب الإكراه، فصل من أكره على أن يأكل الميتة...، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝ (۵- المائدة:۲)

الجواب حامداومصلیا:

حج نفل میں لے جانے کے مقابلے میں اتنی رقم کسی غریب، بیوہ، یتیم، سخت حاجت مند کی ضرورت میں خرچ کرنا افضل ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] حج کرنے والے کو حاجی کہنا کیسا ہے؟

۱۸۳۰-سوال: بکر حج بیت اللہ کر کے آیا ہے، لہٰذا زید بکر کو حاجی صاحب کہہ کر پکارتا ہے، تو

---

(۱) اصل مسئلہ یہ ہے کہ ضرورت کا لحاظ کیا جائے گا، جس مد میں خرچ کی ضرورت زیادہ ہو، اس مد میں خرچ کرنا زیادہ افضل ہے، دوسرے کو حج نفل کرانے کے مقابلے میں بیوہ، یتیم اور مسکین وحاجب مند کی ضروت پوری کرنا یقیناً زیادہ اہم ہے؛ اس لیے حضرت مفتی صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ان افراد کی ضرورت پوری کرنا زیادہ افضل ہے، پوری تفصیل درج ذیل عبارت میں ملاحظہ فرمائیں:

بناء الرباط أفضل من حج النفل، واختلف في الصدقة ورجح في البزازية أفضلية الحج لمشقته في المال والبدن جميعا، قال: وبه أفتى أبو حنيفة حين حج وعرف المشقة. (الدر المختار)—— قال ابن عابدين: (قوله ورجح في البزازية أفضلية الحج) حيث قال: الصدقة أفضل من الحج تطوعا، كذا روي عن الإمام لكنه لما حج وعرف المشقة أفتى بأن الحج أفضل، ومراده أنه لو حج نفلا وأنفق ألفا فلو تصدق بهذه الألف على المحاويج فهو أفضل لا أن يكون صدقة فليس أفضل من إنفاق ألف في سبيل الله تعالى، والمشقة في الحج لما كانت عائدة إلى المال والبدن جميعا فضل في المختار على الصدقة. اهـ.

قال الرحمتي: والحق التفصيل، فما كانت الحاجة فيه أكثر والمنفعة فيه أشمل فهو الأفضل كما ورد "حجة أفضل من عشر غزوات" وورد عكسه فيحمل على ما كان أنفع، فإذا كان أشجع وأنفع في الحرب فجهاده أفضل من حجه، أو بالعكس فحجه أفضل، وكذا بناء الرباط إن كان محتاجا إليه كان أفضل من الصدقة وحج النفل وإذا كان الفقير مضطرا أو من أهل الصلاح أو من آل بيت النبي - صلى الله عليه وسلم - فقد يكون إكرامه أفضل من حجات وعمر وبناء ربط.

كما حكى في المسامرات عن رجل أراد الحج فحمل ألف دينار يتأهب بها فجاءته امرأة في الطريق وقالت له إني من آل بيت النبي - صلى الله عليه وسلم - وبي ضرورة فأفرغ لها ما معه، فلما رجع حجاج بلده صار كلما لقي رجلا منهم يقول له تقبل الله منك، فتعجب من قولهم، فرأى النبي - صلى الله عليه وسلم - في نومه وقال له: تعجبت من قولهم تقبل الله منك؟ قال نعم يا رسول الله؛ قال: إن الله خلق ملكا على صورتك حج عنك؛ وهو يحج عنك إلى يوم القيامة بإكرامك لامرأة مضطرة من آل بيتي؛ فانظر إلى هذا الإكرام الذي ناله لم ينله بحجات ولا ببناء ربط. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۲۱، كتاب الحج، فروع في الحج، مطلب في تفضيل الحج على الصدقة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ منحة الخالق على البحر الرائق: ۲/ ۳۳۴، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي)

بکر کہتا ہے کہ مجھے حاجی صاحب مت کہو، میرا نام لے کر پکارو، تو مجھے خوشی ہوگی۔

سوال یہ کہ حاجی صاحب کہنا کیسا ہے؟ کیوں کہ اتباعِ سنت کے مطابق دیکھا جائے تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نام سے پہلے یہ لفظ دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا، اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

حاجی صاحب کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر ''بکر'' تواضع کی وجہ سے حاجی صاحب کہنے سے منع کرتا ہے، تو ٹھیک ہے، اگر یوں سمجھ کر منع کرتا ہے کہ جائز نہیں، تو ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔

''حج'' اللہ رب العزت کی ایک بڑی نعمت ہے، ہر ایک کو نہیں ملتی، اگر کسی کو ملی ہے اور دوسرے لوگ عزت و اکرام کی وجہ سے حاجی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں، تو کوئی حرج نہیں جیسا کہ مولانا وغیرہ کہہ کر عزت دی جاتی ہے۔

صحابہؓ کی نیکیاں اور دوسرے کمالات ایسے تھے کہ ان کے لیے حج بڑے اہم کاموں میں شمار کیے جانے کے لائق نہیں تھا؛ لہٰذا انہیں حاجی کہہ کر بلانے کی ضرورت نہیں تھی، اسی طرح آج کل جن لوگوں کو حج کرنے میں کوئی قربانی دینی نہیں پڑتی، ان کو بھی ایسا لقب نہیں دیا جاتا، مثلاً: آج کل جو لوگ مکہ مکرمہ میں ہی رہتے ہیں، تو حج وطواف وغیرہ ان کے لیے ایسا ہی ہے، جیسا کہ نماز و روزہ کی عبادت، لیکن جو لوگ دور دراز ملک سے حج کرنے کے لیے جاتے ہیں، ان کی قربانی ہمہ جہت ہے کہ مال اور وقت قربانی کے ساتھ سفر کی تکلیف بھی برداشت کرنی پڑتی ہے؛ اس لیے انہیں حاجی کہہ کر پکارا جاتا ہے، ہاں خود اپنے آپ کو حاجی نہ کہنا چاہیے؛ کیوں کہ اس میں ایک طرح سے نیکی کی تشہیر ہے، جس میں ریاکاری کا قوی اندیشہ ہے۔ (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ○الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ○الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ○وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ○.(۱۰۷-الماعون:۴-۷)

﴿الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاؤُوْنَ﴾ الناس فيعملون حيث يروا الناس، ويرونهم طلبا للثناء عليهم. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني-شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م:۱۲۷۰هـ): ۱۵/ ۴۷۵، سورة الماعون، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

عن سلمة، قال: سمعت جندبا، يقول: قال النبي صلى الله عليه وسلم، ولم أسمع أحدا يقول قال النبي صلى الله عليه وسلم غيره، فدنوت منه، فسمعته يقول: قال النبي صلى الله عليه وسلم: من سمع سمع الله به، ومن يرائي يرائي الله=

[۱۲] ضبط ولادت کا آپریشن کرانے والی کا حج کرنا

۱۸۳۱- سوال: شوہر و بیوی نے حج کا ارادہ کیا، ایک مسئلہ بیچ میں آکر کھڑا ہوا، وہ یہ کہ بیوی کا نس بندی کا آپریشن کروالیا، تو کیا ایسی حالت میں اس کو حج کی اجازت ہے؟ اگر نہیں ہے، تو کیا کرے، کیا دوبارہ آپریشن کروا کے رحم کو ولادت کے قابل بنانا ضروری ہے؟ کیا حج ہر طرح کے گناہوں کو دھو دیتا ہے؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

بلا ضرورت شدیدہ نس بندی کا آپریشن کرانا گناہ کا کام ہے، جس سے اجتناب لازم ہے، اگر کسی نے اس گناہ کا ارتکاب کرلیا، تو اس پر توبہ و استغفار لازم ہے، اگر دوبارہ آپریشن کر کے رحم کو ولادت کے قابل کر کے بنایا جا سکتا ہو، تو بنالے، ورنہ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتا ہے، جب کہ ندامت ہو۔(۱)

ایسی خاتون کے لیے حج کرنے کی ممانعت نہیں ہے، خوشی سے حج کرے، حج تو گناہوں کو معاف کرنے کے لیے ہی ہوتا ہے، جب آدمی حج کرتا ہے، تو گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو جاتا ہے، جیسے بچہ پیدائش کے وقت گناہوں سے پاک صاف ہوتا ہے۔(۲)

=به. (صحيح البخاري: ۹۶۲/۲، رقم الحديث: ۶۴۹۹، كتاب الرقاق، باب الرياء والسمعة، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۴۱۲/۲، رقم الحديث: ۴۸-(۲۹۸۷)، كتاب الزهد، باب تحريم الرياء، ط: ديوبند)

(قال: قال النبي - صلى الله تعالى عليه وسلم -: "من سمع") بتشديد الميم، أي: من عمل عملا للسمعة بأن نوه بعمله وشهره ليسمع الناس به ويمتدحوه ("سمع الله به") بتشديد الميم أيضا، أي: شهره الله بين أهل العرصات وفضحه على رءوس الأشهاد. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۳۳۳۲/۸، رقم: ۵۳۱۶، كتاب الآداب، باب الرياء والسمعة، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) والتوبة ترك الذنب على أحد الأوجه، وفي الشرع: ترك الذنب لقبحه، والندم على فعله، والعزم على عدم العود، ورد المظلمة إن كانت، أو طلب البراءة من صاحبها... وقال القرطبي في المفهم: اختلفت عبارات المشايخ فيها، فقائل يقول: إنها الندم، وآخر يقول: إنها العزم على أن لا يعود، وآخر يقول الإقلاع عن الذنب، ومنهم من يجمع بين الأمور الثلاثة، وهو أكملها. (فتح الباري شرح صحيح البخاري-أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي (م: ۸۵۲هـ): ۱۰۳/۱۱، تحت رقم الحديث: ۶۳۰۷، كتاب الاستئذان، باب التوبة، ط: دار المعرفة - بيروت ☆ عمدة القاري: ۲۷۹/۲۲، كتاب الاستئذان، باب التوبة، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۲) أبو هريرة رضي الله عنه، قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: من حج لله فلم يرفث، ولم يفسق، رجع كيوم ولدته أمه. (صحيح البخاري: ۲۰۶/۱، رقم الحديث: ۱۵۲۱، كتاب الحج، باب فضل الحج المبرور، ط: ديوبند)

ہاں! حقوق العباد معاف نہیں ہوتے، حج سے بھی معاف نہیں ہوتے، کسی کا مال ذمہ میں باقی ہے، کسی کو گالی دی ہے، کسی کو ستایا ہے، کسی کی غیبت کی ہے اور بہتان والزام لگایا ہے، تو اس سے معافی مانگنا اور معاف کرانا ضروری ہے، جب تک معاف نہ کروالیا جائے اور حق دار کو حق نہ پہونچا دیا جائے، معاف نہیں ہو گا۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

[۱۳] مردہ کی جانب سے طواف کرنا

۱۸۳۲-سوال: مردہ کی طرف سے صرف طواف کرنا جائز ہے یا نہیں؟

---

(۳) (في حديث طويل قال عمرو بن العاص:) فلما جعل الله الإسلام في قلبي أتيت النبي صلى الله عليه وسلم، فقلت: ابسط يمينك فلأبايعك، فبسط يمينه، قال: فقبضت يدي، قال: ما لك يا عمرو؟ قال: قلت: أردت أن أشترط، قال: تشترط بماذا؟ قلت: أن يغفر لي، قال: أما علمت أن الإسلام يهدم ما كان قبله؟ وأن الهجرة تهدم ما كان قبلها؟ وأن الحج يهدم ما كان قبله؟. (الصحيح لمسلم: ۱/۷۶، رقم الحديث: ۱۹۲-(۱۲۱)، كتاب الإيمان، باب كون الإسلام يهدم ما قبله وكذا الهجرة والحج، ط: ديوبند)

قال الشيخ التوربشتي من أئمتنا رحمهم الله: الإسلام يهدم ما كان قبله مطلقا مظلمة كانت أو غيرها، صغيرة أو كبيرة، وأما الهجرة والحج فإنهما لا يكفران المظالم، ولا يقطع فيهما بغفران الكبائر التي بين العبد ومولاه، فيحمل الحديث على هدمهما الصغيرة المتقدمة، ويحتمل هدمهما الكبائر التي تتعلق بحقوق العباد بشرط التوبة. عرفنا ذلك من أصول الدين فرددنا المجمل إلى المفصل، وعليه اتفاق الشارحين. وقال بعض علمائنا: يمحو الإسلام ما كان قبله من كفر وعصيان، وما ترتب عليهما من العقوبات التي هي حقوق الله، وأما حقوق العباد فلا تسقط بالحج والهجرة إجماعا، ولا بالإسلام لو كان المسلم ذميا، سواء كان الحق عليه ماليا أو غير مالي كالقصاص، أو كان المسلم حربيا وكان الحق ماليا بالاستقراض أو الشراء، وكان المال غير الخمر. وقال ابن حجر: الحج يهدم ما قبله مما وقع قبله وبعد الإسلام ما عدا المظالم، لكن بشرط ما ذكر في حديث: (من حج فلم يرفث، ولم يفسق خرج من ذنوبه كيوم ولدته أمه) مع ذلك فالذي عليه أهل السنة كما نقله غير واحد من الأئمة كالنووي وعياض أن محل ذلك في غير التبعات، بل الكبائر، إذ لا يكفرها إلا التوبة، وعبارة بعض الشارحين حقوق المالية لا تنهدم بالهجرة والحج، وفي الإسلام خلاف، وأما حقوق العباد فلا تسقط بالهجرة والحج إجماعا اهـ. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۱/۱۰۲، كتاب الإيمان، تحت رقم الحديث: ۲۸، ط: دار الفكر-بيروت)

الجواب حامداً ومصلیاً

مردہ کی طرف سے زندہ آدمی بدنی، مالی عبادت کرکے ثواب پہنچا سکتا ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] زندہ آدمی کو حج، عمرہ کا ثواب پہنچانا

۱۸۳۳- سوال: زندہ کی طرف سے عمرہ یا فقط طواف کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً

مرحوم کو ثواب پہنچتا ہے؛ اس لیے حج، عمرہ یا فقط طواف کرکے ثواب پہنچانا جائز ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] ۱- حج کا فلسفہ

[۱۶] ۲- بھابھی کو حج پر لے جانا

۱۸۳۴- سوال: امسال میرا حج کا ارادہ ہے، (ان شاء اللہ) میرے ساتھ میری بیوی، والدہ اور میرے مرحوم بھائی کی بیوہ یعنی میری بھابھی جانے والی ہے۔ میری بھابھی کی تین لڑکیاں ہیں اور تینوں کی شادی

(۱) والأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوما أو صدقة أو قراءة قرآن أو ذكرا أو طوافا أو حجا أو عمرة أو غير ذلك عند أصحابنا للكتاب والسنة. (البحر الرائق شرح كنز الدقائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۶۳/۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مزید دیکھیے: حاشية الطحطاوي، ص ۶۲۲، كتاب الجنائز، فصل في زيارة القبور ☆ رد المحتار: ۲۴۳/۲، باب صلاة الجنائز، مطلب في زيارة القبور ☆ الهداية: ۲۷۶/۱، كتاب الحج، باب الحج في الغير، ط: مكتبة الاتحاد- ديوبند)

(۲) اعلم أن الأصل في هذا أن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره من الأموات والأحياء حجا أو صلاة أو صوما أو صدقة أو غيرها كتلاوة القرآن وسائر الأذكار، فإذا فعل شيئا من هذا وجعل ثوابه لغيره جاز بلا شبهة، ويصل إليه عند أهل السنة والجماعة. (المسلك المتقسط في المنسك المتوسط- الملا علي القاري (م: ۱۰۱۴هـ)، ص: ۶۰۹، باب الحج عن الغير، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية- مكة المكرمة ☆ البحر الرائق شرح كنز الدقائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۶۳/۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ حاشية الطحطاوي، ص ۶۲۲، كتاب الجنائز، فصل في زيارة القبور ☆ رد المحتار: ۲۴۳/۲، باب صلاة الجنائز، مطلب في زيارة القبور ☆ الهداية: ۲۷۶/۱، كتاب الحج، باب الحج في الغير، ط: مكتبة الاتحاد- ديوبند)

ہو چکی ہے، کوئی لڑکا نہیں ہے، میری بھابھی کا ایک بھائی ہے، جس کا اس سال حج کرنے کا ارادہ نہیں ہے، ہمارا یہ نفلی حج ہوگا، دریافت یہ کرنا ہے کہ میں اپنی بھابھی، بیوی اور ماں کو لے کر حج کے لیے جا سکتا ہوں یا نہیں؟

میرا، فیملی کے ساتھ بار بار نفلی حج کرنا شریعت کی نگاہ میں کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

حج فرض ہو یا نفل، عظیم عبادت ہے اور عبادت میں جان اسی وقت پیدا ہوگی، جب کہ اسے، اس کی شرطوں کے مطابق ادا کیا جائے، آپ، اپنی بھابھی کے لیے غیر محرم ہیں؛ اس لیے ان کا، آپ کے ساتھ سفر کرنا جائز نہیں ہے، واضح رہے کہ حج فرض میں جب اس کی اجازت نہیں ہے، تو حج نفل میں بدرجہ اولیٰ ممانعت ہوگی؛ الغرض، آپ کا، اپنی بھابھی کو ساتھ لے جانا جائز نہیں ہے۔(۱)

اب میں آپ کا دھیان ایک اہم امر کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں:

آپ چار یا پانچ آدمی نفل حج کے لیے جائیں گے، جس میں سوا لاکھ روپئے خرچ ہوں گے اور امید ہے کہ ثواب انگنت ملے گا، لیکن ایک مسلمان جب کوئی نفلی عبادت کرے، تو اسے سوچنا چاہیے کہ میں اپنی رقم کس مد و مصرف میں صرف کروں گا، تو مجھے زیادہ سے زیادہ ثواب ملے گا؟

بخاری اور مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ مجھے کوئی کام ایسا بتائیں، جس کا ثواب زیادہ ہو، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔(۲)

اسی سوال کا کسی دوسرے کو جواب دیتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کہ کھانا کھلاؤ اور سلام کرو، چاہے آپ اسے پہچانتے ہوں یا نہ پہچانتے ہوں۔(۳)

---

(۱)عن ابن عمر رضي الله عنهما: أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا تسافر المرأة ثلاثة أيام إلا مع ذي محرم. (صحيح البخاري:۱/۱۴۷، رقم الحديث:۱۰۸۶، كتاب الجمعة، أبواب تقصير الصلاة، باب: في كم يقصر الصلاة، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم:۱/۴۳۳، رقم الحديث:۴۱۳-(۱۳۳۸)، كتاب الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، ط: ديوبند)

تفصیلی تخریج گذر چکی ہے۔

(۲)عن أبي بردة، عن أبي موسى رضي الله عنه، قال: قالوا يا رسول الله، أي الإسلام أفضل؟ قال: من سلم المسلمون من لسانه، ويده. (صحيح البخاري:۱/۶، رقم الحديث:۱۱، كتاب الإيمان، باب: أي الإسلام أفضل؟، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/۴۸، رقم الحديث:۶۶-(۴۲)، كتاب الإيمان، باب بيان تفاضل الإسلام، وأي أموره أفضل، ط: ديوبند)

(۳)عن عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما، أن رجلا سأل النبي صلى الله عليه وسلم: أي الإسلام خير؟ قال: تطعم =

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کو تو یہ جواب دیا کہ کسی کو تکلیف مت پہنچاؤ اور اسی طرح کا سوال کرنے والے دوسرے سائل کو جواب دیا کہ غریبوں کو کھانا کھلانا زیادہ ثواب کا کام ہے۔ یہ دونوں جواب الگ الگ کیوں ہیں؟ اس کے متعدد جوابات دیے گئے ہیں، بہتر جواب یہ ہے کہ جب صحابۂ کرام کی تنگ دستی کا زمانہ تھا، رہائش، کپڑے اور کھانے پینے کے سلسلے میں بڑی تنگی تھی، اور اکثر صحابہ اس سلسلے میں تکلیف اور سامنا کرتے رہتے تھے، تو ایسے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھانا کھلاؤ اور ضرورت مندوں کی حاجت پوری کرو۔

جب تنگ دستی ختم ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے وسعت و فراخی سے نوازا، تو اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زبان یا ہاتھ سے کسی کو تکلیف اور ایذاء مت پہنچاؤ۔

خلاصہ یہ ہے کہ حال کے تقاضے کے مطابق مال خرچ کرنا چاہیے، تا کہ زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب مل سکے۔ موجودہ زمانے میں بہ کثرت نفلی حج کرنے والے سوچیں کہ قوم کے لاکھوں بچے مساجد، مدارس اور دین سے کافی دور ہیں، لاکھوں نوجوان تعلیم کے فقدان کی وجہ سے دین اور شعار دین سے نکل رہے ہیں، جھونپڑ پٹی اور بنجر علاقوں میں رہنے والوں کی اولاد کو کوئی کلمہ پڑھانے والا نہیں ہے، اگر نفلی حج پر خرچ کی جانے والی رقم سے دو چھوٹے دینی مدرسے بن جائیں گے، تو حالات کے تقاضے کے مطابق اور زیادہ ثواب ملے گا، ان شاء اللہ۔ (۴)

= الطعام، وتقرأ السلام على من عرفت ومن لم تعرف. (صحيح البخاري: ۱/۶، رقم الحديث: ۱۲، كتاب الإيمان، باب: إطعام الطعام من الإسلام، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/۴۸، رقم الحديث: ۶۳-(۳۹)، كتاب الإيمان، باب بيان تفاضل الإسلام، وأي أموره أفضل، ط: ديوبند)

(۴) (قوله ورجح في البزازية أفضلية الحج) حيث قال: الصدقة أفضل من الحج تطوعا، كذا روي عن الإمام لكنه لما حج، وعرف المشقة، أفتى بأن الحج أفضل، ومراده أنه لو حج نفلا وأنفق ألفا، فلو تصدق بهذه الألف على المحاويج فهو أفضل، لا أن يكون صدقة فليس أفضل من إنفاق ألف في سبيل الله تعالى، والمشقة في الحج لما كانت عائدة إلى المال والبدن جميعا فضل في المختار على الصدقة. اهـ.

قال الرحمتي: والحق التفصيل، فما كانت الحاجة فيه أكثر والمنفعة فيه أشمل فهو الأفضل كما ورد "حجة أفضل من عشر غزوات" وورد عكسه، فيحمل على ما كان أنفع، فإذا كان أشجع وأنفع في الحرب، فجهاده أفضل من حجه، أو بالعكس فحجه أفضل، وكذا بناء الرباط إن كان محتاجا إليه كان أفضل من الصدقة وحج النفل، وإذا كان الفقير مضطرا أو من أهل الصلاح أو من آل بيت النبي - صلى الله عليه وسلم - فقد يكون إكرامه أفضل من =

ہاں اگر اللہ کا کوئی نیک بندہ اس نیت سے نفلی حج کرے کہ میں عربستان کے ان لوگوں کو صحیح باتیں بتاؤں گا اور دعوت وتبلیغ اور وعظ ونصیحت کروں گا، جو یہود ونصاری کے رنگ میں رنگ چکے ہیں اور اپنی تہذیب وکلچر کو چھوڑ کر ان کی تہذیب اور کلچر اپنا چکے ہیں اور دین اور شعار دین سے کوسوں دور ہیں، تو اس میں زیادہ ثواب ملے گا۔

حج کا ایک فلسفہ یہ بھی ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں سے سمجھ دار، ہوش منداور باشعور افراد آ کر یکجا ہوں

=حجات وعمر وبناء ربط.

كما حكي في المسامرات عن رجل أراد الحج فحمل ألف دينار يتأهب بها، فجاءته امرأة في الطريق، وقالت له: إني من آل بيت النبي - صلى الله عليه وسلم - وبي ضرورة فأفرغ لها ما معه، فلما رجع حجاج بلده صار كلما لقي رجلا منهم يقول له تقبل الله منك، فتعجب من قولهم، فرأى النبي - صلى الله عليه وسلم - في نومه، وقال له: تعجبت من قولهم تقبل الله منك؟ قال نعم يا رسول الله، قال: إن الله خلق ملكا على صورتك حج عنك، وهو يحج عنك إلى يوم القيامة بإكرامك لامرأة مضطرة من آل بيتي؛ فانظر إلى هذا الإكرام الذي ناله لم ينله بحجات ولا ببناء ربط. (رد المحتار على الدر المختار: ۶۲۱/۲، كتاب الحج، فروع في الحج، مطلب في تفضيل الحج على الصدقة، ط: دار الفكر-بيروت)

وعند الشافعية أن الحج لا يوصف بالنفلية بل المرة الأولى فرض عين وما زاد ففرض كفاية؛ لأن من فروض الكفاية أن يحج البيت كل عام ولم أره لأئمتنا بل صرحوا بالنفلية فقالوا حج النفل أفضل من الصدقة. (البحر الرائق)

قال ابن عابدين: (قوله: فقالوا حج النفل أفضل من الصدقة) قال الرملي: قال المرحوم الشيخ عبد الرحمن العمادي مفتي الشام في مناسكه: وإذا حج حجة الإسلام فصدقة التطوع بعد ذلك أفضل من حج التطوع عند محمد، والحج أفضل عند أبي يوسف، وكان أبو حنيفة - رحمه الله - يقول بقول محمد، فلما حج ورأى ما فيه من أنواع المشقات الموجبة لتضاعف الحسنات رجع إلى قول أبي يوسف اهـ.

قلت: قد يقال إن صدقة التطوع في زماننا أفضل؛ لما يلزم الحاج غالبا من ارتكاب المحظورات ومشاهدته لفواحش المنكرات وشح عامة الناس بالصدقات وتركهم الفقراء والأيتام في حسرات، ولا سيما في أيام الغلاء وضيق الأوقات وبتعدي النفع تتضاعف الحسنات. ـــــــــ ثم رأيت في متفرقات اللباب الجزم بأن الصدقة أفضل منه، وقال شارحه القاري أي على ما هو المختار كما في التجنيس ومنية المفتي وغيرهما، ولعل تلك الصدقة محمولة على إعطاء الفقير الموصوف بغاية الفاقة أو في حال المجاعة، وإلا فالحج مشتمل على النفقة؛ بل وزاد إن الدرهم الذي ينفق في الحج بسبعمائة إلخ، قلت: قد يقال ما ورد محمول على الحج الفرض على أنه لا مانع من كون الصدقة للمحتاج أعظم أجرا من سبعمائة. (منحة الخالق على البحر الرائق-ابن عابدين (م: ۱۲۵۲ھ): ۲/ ۳۳۴، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ المحيط البرهاني: ۲/ ۴۹۵، كتاب المناسك، الفصل العشرون في المتفرقات، ت: عبد الكريم السامي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

اور اپنے خطے کے دینی احوال وکوائف سے امت کو واقف کرائیں، تاکہ وہ جان لیں کہ ہم ایک دوسروں کے لیے دینی اور دنیوی اعتبار سے کتنے اور کس طرح مددگار ہو سکتے ہیں، ملی مفاد کے لیے کیسی اسکیمیں کارگر ہوں گی، اور کس طرح کے نئے پروگرام بنانے میں امت کا مفاد ہے۔ کاش حج کرنے والا طبقہ اس جانب اپنی توجہ مبذول کرتا، اس کے بجائے یہ ہو رہا ہے کہ آج کل مسلمانوں نے نفلی حج کو سیر وتفریح کا ذریعہ بنالیا ہے، اللہ تعالیٰ صحیح سوچ عطا فرمائے۔ (۵) امید ہے کہ آپ اس بارے میں غور فرمائیں گے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] نفل حج ادا کرنا افضل ہے یا دینی اُمور میں رقم خرچ کرنا؟

۱۸۳۵- سوال: کچھ لوگ ہر سال حج کے لیے جاتے ہیں، دریافت یہ کرنا ہے کہ حج نفل ادا کرنا زیادہ افضل ہے، یا حج نفل کے بجائے مکاتب، مدارس کی امداد اور دینی کتابیں چھپوا کر دینی امور میں رقم خرچ کرنا افضل ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مسلمانوں کا جان ومال اللہ کے راستہ میں خرچ ہونا چاہیے، اور وہ راستے اور راہیں مختلف ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری تفصیل سے رہنمائی فرمائی ہے کہ انسان کو اپنی انمول جان اور بیش قیمت مال کہاں کہاں خرچ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے رہنما اصول کی روشنی میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ فرض حج ادا کر لینے کے بعد، نفلی حج میں جانے کے مقابلے میں موجودہ زمانہ میں، ان دینی امور میں مال خرچ کرنا زیادہ

---

(۵) المصالح المرعیة في الحج أمور: منها تعظیم البیت، فإنه من شعائر الله، وتعظیمه هو تعظیم الله تعالی.

ومنها تحقیق معنی العرضة، فإن لکل دولة أو ملة اجتماعا یتوارده الأقاصي والأداني لیعرف فیه بعضهم بعضا، ویستفیدوا أحکام الملة، ویعظموا شعائرها، والحج عرضة المسلمین وظهور شوکتهم واجتماع جنودهم وتنویه ملتهم، وهو قول الله تعالی: {وإذ جعلنا البیت مثابة للناس وأمنا}. (حجة الله البالغة- أحمد بن عبد الرحیم بن الشهید وجیه الدین، المعروف بـ "الشاه ولي الله الدهلوي" (م: ۱۱۷۶ھ): ۲/ ۸۷، من أبواب الحج، ت: السید سابق، ط: دار الجیل، بیروت- لبنان)

نوٹ: شاہ ولی اللہؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ"، استاذ گرامی قدر حضرت مولانا ومفتی سعید احمد پالن پوری دامت برکاتہم (شیخ الحدیث: دار العلوم، دیوبند) کی عمدہ تحقیق کے ساتھ مکتبہ حجاز- دیوبند سے شائع ہوگئی ہے، اس نسخے میں مذکورہ عبارت ج: ۲، ص: ۱۶۰، پر ملاحظہ فرمائیں۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

ثواب رکھتا ہے، جن سے لوگ بڑا فائدہ اٹھاتے ہیں۔[1]

عمدۃ القاری، شرحِ بخاری شریف میں آں حضرت ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ جس شخص نے فرض حج ادا نہ کیا ہو، اُس کے لیے چالیس جہاد میں شریک ہونے سے **افضل** فرض حج ادا کرنا ہے، اور جس نے فرض حج ادا کرلیا ہو، تو اُس کے لیے جہاد میں جانا چالیس حج ادا کرنے سے **افضل** ہے۔ (جلد:۱/۱۸۹)[۲]

اِسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آکر ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! اسلام میں کون سا کام **افضل** ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ وہ **مسلمان** جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے لوگ **محفوظ** ہوں۔ (بخاری شریف:۱/۶)[۳]

---

(۱) قلت: قد يقال إن صدقة التطوع في زماننا أفضل، لما يلزم الحاج غالبا من ارتكاب المحظورات ومشاهدته لفواحش المنكرات وشح عامة الناس بالصدقات وتركهم الفقراء والأيتام في حسرات، ولا سيما في أيام الغلاء وضيق الأوقات وبتعدي النفع تتضاعف الحسنات.ــــــ ثم رأيت في متفرقات اللباب الجزم بأن الصدقة أفضل منه، وقال شارحه القاري أي على ماهو المختار كما في التجنيس ومنية المفتي وغيرهما، ولعل تلك الصدقة محمولة على إعطاء الفقير الموصوف بغاية الفاقة أو في حال المجاعة، وإلا فالحج مشتمل على النفقة، بل وزاد إن الدرهم الذي ينفق في الحج بسبعمائة إلخ، قلت: قد يقال ما ورد محمول على الحج الفرض على أنه لا مانع من كون الصدقة للمحتاج أعظم أجرا من سبعمائة. (منحة الخالق على البحر الرائق-ابن عابدين (م:۱۲۵۲هـ): ۲/۳۳۴، كتاب الحج، واجبات الحج، ط: دار الكتاب الإسلامي☆المحيط البرهاني: ۲/۴۹۵، كتاب المناسك، الفصل العشرون في المتفرقات، ت: عبد الكريم السامي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

تفصیلی تخریج کے لیے سوال سابق کا حاشیہ نمبر (۴) ملاحظہ فرمائیں۔

[۲] روي أنه، عليه السلام، قال: حجة لمن يحج افضل من أربعين غزوة، وغزوة لمن حج أفضل من أربعين حجة. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري-أبو محمد محمود بن أحمد بن موسى بن أحمد بن حسين الغيتابى الحنفى بدر الدين العينى (م:۸۵۵هـ): ۱/۱۸۹، كتاب الإيمان، باب من قال: إن الإيمان هو العمل......، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

عن مكحول، أنه كان يحدثهم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال: حجة لمن لم يحج خير له من عشر غزوات أو تسع غزوات، وغزوة بعد حجة خير من عشر حجات أو تسع. (المراسيل-أبو داود سليمان بن الأشعث بن إسحاق، الأزدي السِجِستاني (م:۲۷۵هـ) ص: ۲۳۳، رقم الحديث: ۳۰۳، باب في فضل الجهاد، ت: شعيب الأرناؤوط، ط: مؤسسة الرسالة-بيروت)

عن مكحول، قال: أكثر المستأذنون إلى الحج رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم غزوة تبوك، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: غزوة لمن قد حج أفضل من أربعين حجة. (المصدر السابق، رقم الحديث: ۳۰۴)

[۳] عن أبي بردة، عن أبي موسى رضي الله عنه، قال: قالوا يا رسول الله، أي الإسلام أفضل؟ قال: من سلم المسلمون =

اور دوسری روایت میں اِس طرح کے اور ایک صحابیؓ کے سوال کے جواب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کھانا کھلاؤ، اور ہر مسلمان کو سلام کرو، خواہ اُسے پہچانتے ہوں یا نہ پہچانتے ہوں۔ (بخاری:۱/۶)[۴]

علماءِ محدثین نے اِن دونوں حدیثوں کے ضمن میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں صحابیؓ کے ایک ہی طرح کے سوال کے جواب الگ الگ کیوں دیے؟ محدثین کرام نے مختلف توجیہات کی ہیں، اِمام نوویؒ شارح مسلم شریف، جلد:۱، صفحہ:۶۳ میں اور علامہ عینیؒ شارح بخاری شریف جلد:۱، صفحہ:۱۸۹/ میں لکھتے ہیں:

(۱) سائل کے بدل جانے کی وجہ سے جواب بدل گیا، کہ سائل میں جو ضرورت نظر آئی، اُس کے مطابق جواب دیا گیا۔[۵]

(۲) مجلس میں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے، اُن کی دینی ضرورت کے مطابق جواب دیا گیا۔[۶]

(۳) جس کام میں نفع زیادہ ہو وہ کام افضل ہوگا، جیسے کہ جہاد کا نفع عام مخلوق کو ہوتا ہے اور حج کا فائدہ حاجی کی ذات تک محدود رہتا ہے۔[۷]

=من لسانه، ويده. (صحيح البخاري:۱/۶، رقم الحديث:۱۱، كتاب الإيمان، باب: أي الإسلام أفضل؟، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم:۱/۴۸، رقم الحديث:۶۶-(۴۲)، كتاب الايمان، باب بيان تفاضل الإسلام، وأي أموره أفضل، ط: ديوبند)

[۴] عن عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما، أن رجلا سأل النبي صلى الله عليه وسلم: أي الإسلام خير؟ قال: تطعم الطعام، وتقرأ السلام على من عرفت ومن لم تعرف. (صحيح البخاري:۱/۶، رقم الحديث:۱۲، كتاب الايمان، باب: إطعام الطعام من الإسلام، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم:۱/۴۸، رقم الحديث:۶۳-(۳۹)، كتاب الايمان، باب بيان تفاضل الإسلام، وأي أموره أفضل، ط: ديوبند)

(۵) قلت: الحاصل أن اختلاف الأجوبة، في هذه الأحاديث لاختلاف الأحوال. (عمدة القاري:۱/۱۸۹، كتاب الايمان، باب من قال: إن الإيمان هو العمل......، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

(۶) أجاب القاضي عياض، فقال: أعلم كل قوم بما لهم إليه حاجة، وترك ما لم تدعهم إليه حاجة، أو ترك ما تقدم علم السائل إليه أو علمه بما لم يكمله من دعائم الإسلام ولا بلغه عمله. (المصدر السابق☆ شرح النووي على مسلم:۲/۷۷، كتاب الإيمان، باب بيان كون الإيمان بالله تعالى أفضل الأعمال، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت)

(۷) فالجهاد أولى بالتحريض والتقديم من الحج لما في الجهاد من المصلحة العامة للمسلمين مع أنه متعين متضيق في هذا الحال بخلاف الحج والله أعلم. (شرح النووي على مسلم:۲/۷۷، كتاب الايمان، باب بيان كون الإيمان بالله تعالى أفضل الأعمال، ط: دار إحياء التراث العربي-بيروت☆ عمدة القاري:۱/۱۸۹، كتاب الايمان)

(۴) زمانہ اور وقت کے اعتبار سے الگ الگ جواب دیا، جب ہجرت کر کے مدینہ آئے، تو تنگی اور فقر کا وقت تھا، مہاجرین کی مالی حالت کمزور تھی، اِس لیے اُس وقت کھانا کھلانے کو افضل فرمایا، اور جن کو کھانا کھلائے اُس کے ساتھ محبت کا سلوک کرے، اُس کو ذلیل و رسوا نہ کرنے کا حکم فرمایا، اور جب وسعت و فراخی کے دروازے کھل گئے، ہر شخص کے پاس مالی فراوانی ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق مال چوں کہ تمام خرابیوں کی اصل ہے، اِس لیے فرمایا کہ اپنی زبان اور ہاتھ سے لوگوں کو تکلیف دینے سے بچتے رہو۔ (۸)

اِسی طرح نفل حج ادا کرنا کارِ ثواب ہے، لیکن جاہل اور ان پڑھ لوگ حرمین شریفین جا کر لوگوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے، لہٰذا اُن کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے مال کو مکاتب، مدارس اور تبلیغی کاموں میں خرچ کر کے جو طلباء اُس سے تعلیم حاصل کریں گے وہ حرمین شریفین کی خدمت کرنے والے اور آباد کرنے والے

---

(۸) قلت: الحاصل أن اختلاف الأجوبة، في هذه الأحاديث لاختلاف الأحوال، ولهذا سقط ذكر الصلاة والزكاة والصيام في هذا الحديث المذكور في هذا الباب، ولا شك أن الثلاث مقدمات على الحج والجهاد، ويقال: إنه قد يقال: خير الأشياء كذا، ولا يراد أنه خير من جميع الوجوه في جميع الأحوال والاشخاص، بل في حال دون حال، فإن قيل: كيف قدم الجهاد على الحج، مع أن الحج من أركان الاسلام، والجهاد فرض كفاية؟ يقال: إنما قدمه للاحتياج إليه أول الإسلام، ومحاربة الأعداء، ويقال: إن الجهاد قد يتعين كسائر فروض الكفاية، وإذا لم يتعين لم يقع الا فرض كفاية، وأما الحج فالواجب منه حجة واحدة، وما زاد نفل فإن قابلت واجب الحج بمتعين الجهاد، كان الجهاد أفضل لهذا الحديث، ولأنه شارك الحج في الفرضية، وزاد بكونه نفعا متعديا إلى سائر الأمة، وبكونه ذبا عن بيضة الإسلام. (عمدة القاري: ۱/ ۱۸۹، كتاب الإيمان، باب من قال: إن الإيمان هو العمل......، ط: دار إحياء التراث العربي)

(قوله ورجح في البزازية أفضلية الحج) حيث قال: الصدقة أفضل من الحج تطوعا، كذا روي عن الإمام لكنه لما حج، وعرف المشقة، أفتى بأن الحج أفضل، ومراده أنه لو حج نفلا وأنفق ألفا، فلو تصدق بهذه الألف على المحاويج فهو أفضل، لا أن يكون صدقة فليس أفضل من إنفاق ألف في سبيل الله تعالى، والمشقة في الحج لما كانت عائدة إلى المال والبدن جميعا فضل في المختار على الصدقة. اهـ.

قال الرحمتي: والحق التفصيل، فما كانت الحاجة فيه أكثر والمنفعة فيه أشمل فهو الأفضل كما ورد "حجة أفضل من عشر غزوات" وورد عكسه، فيحمل على ما كان أنفع، فإذا كان أشجع وأنفع في الحرب، فجهاده أفضل من حجه، أو بالعكس فحجه أفضل، وكذا بناء الرباط إن كان محتاجا إليه كان أفضل من الصدقة وحج النفل، وإذا كان الفقير مضطرا أو من أهل الصلاح أو من آل بيت النبي - صلى الله عليه وسلم - فقد يكون إكرامه أفضل من حجات وعمر وبناء ربط. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۶۲۱، كتاب الحج، فروع في الحج، مطلب في تفضيل الحج على الصدقة، ط: دار الفكر - بيروت)

بنیں گے، اِس زمانہ میں مکاتب، مدارس اور خانقاہیں ویران ہو رہی ہیں، اور اِن مصارف میں مال خرچ کرنے والے آئے دِن کم ہو رہے ہیں، البتہ جو علماءِ کرام نفل حج میں جا کر دنیوی لوگوں سے مل کر اُن تک دینی علوم و احکام پہنچانے کے اِرادے سے نفل حج میں جائیں، تو اُن کا نفل حج ادا کرنا افضل ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] حجر اسود کون بادشاہ اپنے ساتھ مکہ مکرمہ سے لے گیا تھا

۱۸۳۶- سوال: ایسا سنا ہے کہ حجر اسود کبھی ٹوٹ گیا تھا، تین ٹکڑے ہو گئے تھے، ایک بادشاہ نے چاندی کے ذریعہ سے جوڑ دیا تھا، کس کے زمانہ میں ایسا ہوا تھا؟

الجواب حامدا و مصلیا:

حجر اسود کو قرامطہ ۳۱۷ھ میں اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گئے تھے اور ٹھیک بائیس سال کے بعد ۳۳۹ھ میں واپس کیا۔ (۱) ممکن ہے اس وقت حجرِ اسود کو کوئی نقصان پہنچا ہو، تاریخ میں اس واقعہ پر نقصان کا ذکر نہیں ہے، بہر حال اگر ایسا ہوا تو بعید از قیاس نہیں ہے؛ لیکن ٹوٹنا محقق نہیں ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) سنة تسع و ثلاثين و ثلاثمائة

في هذه السنة، رد القرامطة الحجر الأسود الى مكة، و كان بجكم قد بذل لهم ان ردوه خمسين الف دينار، فلم يجيبوه، و كان بين قلعه و رده اثنتان و عشرون سنه. (تاريخ الطبري = تاريخ الرسل و الملوك - محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي، أبو جعفر الطبري (م: ۳۱۰ھ): ۱۱/۳۷، سنة تسع و ثلاثين و ثلاثمائة، ط: دار التراث - بيروت)

(۲) قال الذهبي في " العبر " في سنة ثلاث عشرة و أربعمائة: تقدم بعض الباطنية من البصريين فضرب الحجر الأسود بدبوس فقتلوه في الحال. قال محمد بن علي بن عبد الرحمن العلوي: قام فضرب الحجر ثلاث ضربات. قال: إلى متى يعبد الحجر؟ و لا محمد و لا علي فيمنعني محمد مما أفعله، فإني اليوم أهدم هذا البيت. فالتفاه أكثر الحاضرين و كان أن يفلت، و كان أحمر أشقر جسيما طويلان و كان على باب المسجد عشرة فوارس ينصرونه فاحتسب رجل و وجأه بخنجر، ثم تكاثروا عليه فهلك وأحرق، وقتل جماعة ممن اتهم بمعاونته و اختبط الوفد، و مال الناس على ركب البصريين بالنهب، و تخشن وجه الحجر و تساقط منه شظايا يسيرة و تشقق، و ظهر مكسره أسمر يضرب إلى صفرة محببا مثل الخشخاش، فأقام الحجر على ذلك يومين ثم إن بني شيبة جمعوا الفتات و عجنوه بالمسك و اللك و حشوا الشقوق و طلوها بطلاء من ذلك فهو بين لمن تأمله. و ذكر ابن الأثير: أن هذه الحادثة كانت في سنة أربع عشرة و أربعمائة. و ذكر المسبحي: أن نافع بن محمد الخزاعي دخل الكعبة فيمن دخلها للنظر إلى الحجر الأسود لما كان في الكعبة بعد رد القرامطة له، و أنه تأمل الحجر الأسود فإذا السواد في =

[۱۹] زم زم کا پانی پینے کا طریقہ

۱۸۳۷- سوال: زم زم کا پانی پینے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زم زم کا پانی کھڑے ہوکر، قبلہ رخ کر کے پیٹ بھر کر چند سانسوں میں پینا چاہیے، اگر ممکن ہوتو اپنے بدن چہرے اور سر پر بھی بہانا چاہیے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] حرم مکی و مدنی میں افضل کون؟

۱۸۳۸- سوال: کیا ایسا کہہ سکتے ہیں کہ مدینہ منورہ کی سرزمین، بیت اللہ کی سرزمین سے زیادہ محترم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ کی زمین سے افضل ہے، اور بیت اللہ شریف بھی افضل ہے، مگر مدینہ منورہ

=رأسه، دون سائره وسائره أبيض، قال: وكان مقدار طوله فيما حررت مقدار عظم الذراع، أو كالذراع المقبوضة الأصابع، والسواد في وجهه غير ماض في سائره جميعه. انتهى. وما ذكره العلوي في صفة نوى الحجر يخالف هذا. وقيل في طوله أكثر مما ذكره الخزاعي. ومن آياته: حفظ الله له من الضياع منذ أهبط إلى الأرض مع ما وقع من الأمور المقتضية لذهابه كالطوفان، ودفن بني إياد، وكما وقع من جرهم وغيرهم كما قدمناه. ومنها: أنه لما حمل إلى هجر هلك تحته أربعون جملا. فلما أعيد حمل على قعود أعجف فسمن كما قدمناه. وقيل: هلك تحته ثلاثمائة بعير. وقيل: خمسمائة. ومنها: أنه يطفو على الماء إذا وضع فيه ولا يرسخ. ومنها: أنه لا يسخن من النار، ذكر هاتين الآيتين ابن أبي الدم في "الفرق الإسلامية" فيما حكاه عنه ابن شاكر الكتبي المؤرخ، ونقل ذلك عن بعض المحدثين ورفعه إلى النبي صلى الله عليه وسلم وهذه صفة المسجد الحرام والكعبة المشرفة زادها الله تعالى شرفا وتعظيما. (تاريخ مكة المشرفة والمسجد الحرام والمدينة الشريفة والقبر الشريف- محمد بن أحمد بن الضياء محمد القرشي العمري المكي الحنفي، بهاء الدين أبو البقاء، المعروف بابن الضياء (م: ۸۵۴ھ) ص: ۱۷۸، فصل: ذكر آيات البيت الحرام زاده الله تشريفا وتعظيما، ت: علاء إبراهيم، أيمن نصر، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۱) (قوله شرب من ماء زمزم) أي قائما، مستقبلا القبلة، متضلعا منه، متنفسا فيه، مرارا، ناظرا في كل مرة إلى البيت، ماسحا به وجهه ورأسه وجسده، صابا منه على جسده، إن أمكن، كما في البحر وغيره. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۵۲۳، كتاب الحج، فصل في صفة إحرام المفرد، مطلب في طواف الزيارة، ط: دار الفكر ☆ مراقي الفلاح، ص: ۲۷۶، كتاب الحج، مدخل، تعريفه، ط: المكتبة العصرية)

کی زمین کا وہ حصہ، جو روضہ اقدس میں آپ ﷺ کے جسد اطہر کے ساتھ متصل ہے، وہ بیت اللہ شریف سے بھی افضل ہے؛ اس لیے علی الاطلاق یہ نہیں کہنا چاہیے کہ حرم مکی کو حرم مدنی پر فضیلت حاصل ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) ومكة أفضل منها على الراجح إلا ما ضم أعضاءه - عليه الصلاة والسلام - فإنه أفضل مطلقا حتى من الكعبة والعرش والكرسي. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: وفي آخر اللباب وشرحه: أجمعوا على أن أفضل البلاد مكة والمدينة زادهما الله تعالى شرفا وتعظيما. واختلفوا أيهما أفضل، فقيل: مكة، وهو مذهب الأئمة الثلاثة والمروي عن بعض الصحابة، وقيل المدينة، وهو قول بعض المالكية والشافعية، قيل وهو المروي عن بعض الصحابة. ولعل هذا مخصوص بحياته - صلى الله عليه وسلم - أو بالنسبة إلى المهاجرين من مكة، وقيل بالتسوية بينهما. وهو قول مجهول لا منقول ولا معقول. [مطلب في تفضيل قبره المكرم صلى الله عليه وسلم]

(قوله إلا إلخ) قال في اللباب: والخلاف فيما عدا موضع القبر المقدس، فما ضم أعضاءه الشريفة، فهو أفضل بقاع الأرض بالإجماع. اهـ. قال شارحه: وكذا أي الخلاف في غير البيت: فإن الكعبة أفضل من المدينة ما عدا الضريح الأقدس وكذا الضريح أفضل من المسجد الحرام. وقد نقل القاضي عياض وغيره الإجماع على تفضيله حتى على الكعبة، وأن الخلاف فيما عداه. ونقل عن ابن عقيل الحنبلي أن تلك البقعة أفضل من العرش، وقد وافقه السادة البكريون على ذلك. وقد صرح التاج الفاكهي بتفضيل الأرض على السموات لحلوله - صلى الله عليه وسلم - بها، وحكاه بعضهم على الأكثرين لخلق الأنبياء منها ودفنهم فيها، وقال النووي: الجمهور على تفضيل السماء على الأرض، فينبغي أن يستثنى منها مواضع ضم أعضاء الأنبياء للجمع بين أقوال العلماء. (رد المحتار على الدر المختار: ٢/٦٢٦، كتاب الحج، فروع في الحج، حرم المدينة ومكة، مطلب في تفضيل مكة على المدينة، ط: دار الفكر - بيروت ☆ المسلك المتقسط في المنسك المتوسط - الملا علي القاري (م: ١٠١٤هـ)، ص: ٧٤٦، ٧٤٧، باب زيارة سيد المرسلين، فصل في تفضيل بين مكة والمدينة، ت: محمد طلحة بلال أحمد منيار، ط: المكتبة الإمدادية - مكة المكرمة)

كتاب الأضحية والعقيقة

قربانی اور عقیقے کا بیان

عن عائشة، أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قال: ما عمل آدمي من عمل يوم النحر أحب إلى الله من إهراق الدم، إنه ليأتي يوم القيامة بقرونها وأشعارها وأظلافها، وأن الدم ليقع من الله بمكان قبل أن يقع من الأرض، فطيبوا بها نفسا. (سنن الترمذي: ۱/۲۷۵، رقم الحديث: ۱۴۹۳، أبواب الأضاحي، باب ما جاء في فضل الأضحية، ط: ديوبند)

باب من يجب عليه الأضحية

[قربانی کا وجوب]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب من يجب عليه الأضحية

[قربانی کا وجوب]

[۱] شریعت میں مال دار اور غریب کسے کہا جاتا ہے؟

۱۸۳۹- سوال: شریعت میں مال دار اور غریب کسے کہتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس شخص کے پاس زندگی کی لازمی ضروریات کے علاوہ اتنا سامان یا اس کی قیمت ہو، جو ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے مساوی ہو، تو وہ شخص شریعت کی نظر میں مال دار ہے اور اس پر صدقہ فطر اور قربانی واجب ہے۔

لازمی ضروریات کی چیزوں میں رہنے کا گھر، پہننے کے کپڑے (تین جوڑے) استعمالی برتن اور ضروری فرنیچر اسی طرح ایک سائیکل یا اسکوٹر داخل ہے۔

اور غریب وہ شخص کہلائے گا، جس کے پاس اس سے کم مال ہو۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) والموسر في ظاهر الرواية من له مائتا درهم أو عشرون دينارا أو شيء يبلغ ذلك سوى مسكنه ومتاع مسكنه ومركوبه وخادمه في حاجته التي لا يستغني عنها، فأما ما عدا ذلك من سائمة أو رقيق أو خيل أو متاع لتجارة أو غيرها فإنه يعتد به من يساره. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۲، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر)

[۲] موجودہ دور کے حساب سے نقد رقم کتنی ہو، تو قربانی واجب ہوگی؟

۱۸۴۰- سوال: موجودہ دور کے حساب سے کتنی رقم نقد ہو تو قربانی واجب ہوتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

کسی بھی وقت میں نقد رقم، ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو، تو اُس کی وجہ سے قربانی واجب ہوجائے گی۔ (ردالمحتار علی الدر المختار: ۶/ ۳۱۲)[1] واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] قربانی کس پر واجب ہوتی ہے؟ صاحبِ نصاب کسے کہتے ہیں؟

۱۸۴۱- سوال: قربانی کس شخص پر واجب ہوجاتی ہے؟ اور صاحبِ نصاب کسے کہتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

جس شخص کے پاس اپنی حاجتِ اصلیہ اور قرض کے علاوہ اِتنا مال ہو کہ جس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہوجاتی ہے اور عیدالاضحیٰ کی صبح صادق کے وقت وہ اِس مال کا مالک ہے، تو اُس پر قربانی واجب ہوگی اور ایسے شخص کو شریعتِ مطہرہ کی اصطلاح میں صاحبِ نصاب کہا جاتا ہے، قربانی کے وجوب کے لیے مال پر سال گزرنے کی شرط نہیں ہے، اور نہ ہی یہ لازم ہے کہ وہ مال نامی ہو۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] وشرائطها: الإسلام والإقامة واليسار الذي يتعلق به) وجوب (صدقة الفطر)[الدر المختار]ـــــــ وفي الشامية: (قوله واليسار إلخ) بأن ملك مائتي درهم أو عرضا يساويها غير مسكنه وثياب اللبس أو متاع يحتاجه إلى أن يذبح الأضحية. (ردالمحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۱۲، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

(۲) واضح رہے کہ زکوۃ اور قربانی کے نصاب میں یہ بات قدرے مشترک ہے کہ آدمی ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا یا اس کے بہ قدر اتنے مال کا مالک ہو، جو اس کی ضرورت اصلیہ سے زائد ہو، فرق صرف اتنا ہے کہ زکوۃ واجب ہونے کے لیے اس مال کا نامی ہونا اور اس پر سال کا گذرنا شرط ہے، جب کہ قربانی اور صدقۃ الفطر کے واجب ہونے کے لیے نہ تو مال کا نامی ہونا شرط ہے اور نہ ہی اس پر حولان حول (سال کا گذرنا) شرط ہے۔ لہٰذا وہ کپڑے، جو ضرورت سے زائد ہوں؛ لیکن تجارت کے لیے نہ ہوں اور ان کی قیمت نصاب زکوۃ کو پہنچتی ہو، تو اس صورت میں صدقۃ الفطر اور قربانی واجب ہوگی؛ لیکن زکوۃ واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ یہ مال نامی نہیں ہے: =

[۴] والدین فارغ البال ہوں اور کاروبار لڑکوں کے ہاتھ میں ہو تو قربانی کس کے ذمے ہوگی؟

۱۸۴۲- سوال: ماں باپ بوڑھے ہیں، کام کاج سے فارغ ہیں، لڑکے سارا کاروبار کرتے ہیں اور وہی اس کا حساب رکھتے ہیں، تو ایسی صورت میں گھر کے ان بڑے بوڑھوں کی طرف سے قربانی کرنا چاہیے یا ان لڑکوں کی طرف سے، جو کاروبار سنبھال رہے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جن کے ذمہ صدقۂ فطر واجب ہو، ان پر قربانی واجب ہے، بڑے بوڑھے جو کام کاج سے فارغ زندگی گزار رہے ہیں، اگر ان کے پاس نصاب (ساڑھے باون تولہ چاندی) کے بہ قدر رقم یا مال (ضرورت سے زائد) ہو، تو ان کے ذمہ قربانی ادا کرنا واجب ہے، جو لڑکے کاروبار کرتے ہیں، ان کے پاس بھی صدقۂ فطر واجب ہونے کے بہ قدر رقم ہوگی، تو [ان پر بھی] قربانی واجب ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= ثم لا بد من معرفة حد الغنى فنقول الغنى أنواع ثلاثة: غنى تجب به الزكاة، وغنى يحرم به أخذ الصدقة وقبولها ولا تجب به الزكاة، وغنى يحرم به السؤال ولا يحرم به الأخذ أما الغنى الذي تجب به الزكاة فهو أن يملك نصابا من المال النامي الفاضل عن الحاجة الأصلية.

وأما الغنى الذي يحرم به أخذ الصدقة وقبولها فهو الذي تجب به صدقة الفطر والأضحية وهو أن يملك من الأموال التي لا تجب فيها الزكاة ما يفضل عن حاجته وتبلغ قيمة الفاضل مائتي درهم من الثياب والفرش والدور والحوانيت والدواب والخدم زيادة على ما يحتاج إليه كل ذلك للابتذال والاستعمال لا للتجارة والإسامة، فإذا فضل من ذلك ما يبلغ قيمته مائتي درهم وجب عليه صدقة الفطر والأضحية وحرم عليه أخذ الصدقة. (بدائع الصنائع: ۴۸/۲، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى إليه، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۱] (وأما) (شرائط الوجوب): منها اليسار وهو ما يتعلق به وجوب صدقة الفطر دون ما يتعلق به وجوب الزكاة (الفتاوى الهندية: ۲۹۲/۵، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر)

وشرط وجوبها اليسار عند أصحابنا رحمهم الله، والموسر في ظاهر الرواية من له مائتا درهم، أو عشرون ديناراً، أو شيء يبلغ ذلك سوى مسكنه ومتاع مسكنه ومتاعه ومركوبه وخادمه في حاجته التي لا يستغني عنها. (المحيط البرهاني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۸۵/۶، كتاب الأضحية، الفصل الأول في بيان وجوب الأضحية ومن لا تجب عليه، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆رد المحتار على الدر المختار: ۳۱۲/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر- بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۲۹۲/۵، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر)

[۵] ''قربانی'' گھر کے کسی ایک فرد پر واجب ہوگی یا تمام کنبہ پر؟

۱۸۴۳- سوال: قربانی گھر کے ایک فرد پر واجب ہوگی یا پورے کنبہ پر؟ مثلاً کسی گھر میں باپ، تین لڑکے اور بیوی ہے، تو تمام افراد پر قربانی واجب ہوگی یا صرف باپ پر؟ یہ جواب بدعتی ماحول میں بھیجنا ہے، لہٰذا جلد جواب روانہ فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

دیگر عرض یہ کہ میرے دو نواسے ہیں، جن میں سے ایک کا نام آصف ہے، گھر میں بہت طوفان [شرارت] کرتا ہے، ایک دوسرے پر کنکری پھینکتا ہے، دوسرے نواسے کا نام عرفان ہے، وہ بھی گھر اور مدرسہ میں بہت پریشان کرتا ہے، تو دونوں کے لیے تعویذ بھی بنا دیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

جس شخص کے پاس عید الاضحیٰ کی صبحِ صادق کے وقت اپنی حاجاتِ اصلیہ سے فارغ اتنا مال ہو کہ اُس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہے، تو اُس پر قربانی واجب ہے۔[1] بیوی یا بچوں کی جانب سے گھر کے ذمہ دار شخص پر قربانی واجب نہیں ہوگی۔

البتہ اگر بیوی یا بچوں کے پاس اُن کا خود کا مال حاجاتِ اصلیّہ سے فارغ ہو اور نصاب کے بہ قدر ہو، تو اُن پر اپنی علاحدہ قربانی واجب ہوگی۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] والد کی موجودگی میں قربانی کس پر واجب ہوگی؟

۱۸۴۴- سوال: والد بوڑھے ہیں، کام کاج سے فارغ ہو چکے ہیں، لڑکے سارا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں، زکوٰۃ بھی وہی ادا کرتے ہیں، تو قربانی ان لڑکوں کے ذمہ آئے گی یا بوڑھے باپ کے ذمہ، جن

---

(۱) ومنها الغنى لما روي عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: "من وجد سعة فليضح"، شرط - عليه الصلاة والسلام - السعة، وهي الغنى، ... وهو أن يكون في ملكه مائتا درهم أو عشرون دينارا أو شيء تبلغ قيمته ذلك سوى مسكنه وما يتأثث به وكسوته وخادمه وفرسه وسلاحه وما لا يستغني عنه وهو نصاب صدقة الفطر.

(بدائع الصنائع: ۵/ ۶۴، كتاب التضحية، فصل في شرائط وجوب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) وليس على الرجل أن يضحي عن أولاده الكبار وامرأته إلا بإذنه. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۳، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر)

کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔

الجواب حامدا ومصليا:

جو نصاب کے بہ قدر مال کا مالک ہو، اسی کے ذمے حسب شرع زکوۃ، قربانی اور صدقۃ الفطر واجب ہے، صورت مسئولہ میں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ملکیت لڑکوں کی ہے، اگر ایسا ہے، تو قربانی انہیں پر واجب ہوگی۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] نصاب کا مالک نہیں، مگر چند ماہ کی تنخواہ باقی ہے، تو قربانی کا حکم

۱۸۴۵- سوال: ایک شخص نصاب کا مالک نہیں ہے، مگر اس کی تین مہینے کی تنخواہ مجموعی طور پر ۱۸۰۰/روپے باقی تھی، اور دن ایام نحر کے چل رہے تھے، تو اس شخص کے اوپر قربانی واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

۱۸۰۰/روپے ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو، یا گھر میں (موجود) استعمال نہ ہونے والی چیزوں کو اس کے ساتھ ملانے سے نصاب پورا ہوجاتا ہو اور کوئی قرض نہ ہو، (یعنی اتنا قرض نہ ہو، جس کو منہا کرنے کے بعد نصاب نہ رہتا ہو) تو اس پر قربانی واجب ہوگی۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

---

(۱) سوال سابق کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) (قوله واليسار إلخ) بأن ملك مائتي درهم أو عرضا يساويها غير مسكنه وثياب اللبس أو متاع يحتاجه إلى أن يذبح الأضحية، ... فإن وجب له في أيامها نصاب تلزم، وصاحب الثياب الأربعة لو ساوى الرابع نصابا غنى، وثلاثة فلا؛ لأن أحدها للبذلة والآخر للمهنة والثالث للجمع والوفد والأعياد، والمرأة موسرة بالمعجل لو الزوج مليا وبالمؤجل لا، وبدار تسكنها مع الزوج إن قدر على الإسكان.

له مال كثير غائب في يد مضاربه أو شريكه ومعه من الحجرين أو متاع البيت ما يضحي به تلزم. (تكملة رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۱۲، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر- بيروت)

(وأما) (شرائط الوجوب): منها اليسار وهو ما يتعلق به وجوب صدقة الفطر دون ما يتعلق به وجوب الزكاة، ... والموسر في ظاهر الرواية من له مائتا درهم، أو عشرون دينارا، أو شيء يبلغ ذلك سوى مسكنه، ومتاع مسكنه، ومركوبه، وخادمه في حاجته التي لا يستغني عنها. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۲، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر- بيروت)

[۸] جس کے پاس صرف سات تولہ سونا ہے، اس پر قربانی کا وجوب

۱۸۴۶- سوال: ایک شخص کے پاس صرف سات تولہ سونا ہے، اس کے علاوہ نقد رقم، مال تجارت اور ضرورت سے زیادہ مال واسباب بھی نہیں ہے، تو کیا اس پر قربانی واجب ہوگی؟

الجواب حامداومصلیا:

صورت مسئولہ میں اگر قرضہ نہیں ہے، تو چوں کہ سات تولہ سونا، ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت سے زیادہ ہے؛ لہٰذا اس پر قربانی واجب ہوگی۔ (بدائع)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] مشترکہ مکان مالکان پر قربانی کا وجوب

۱۸۴۷- سوال: زید کے پاس نصاب کے بہ قدر مال نہیں ہے، یعنی نہ سونے چاندی کا نصاب ہے، نہ مال تجارت ہے اور نہ وہ نقد رقم کا مالک ہے، ضرورت اصلیہ سے زائد سامان بھی نہیں ہے، البتہ اپنی ملکیت کے مکان کے علاوہ ایک اور مکان ہے، جو پانچ بھائیوں کے درمیان مشترک ہے اور ابھی تک تقسیم بھی نہیں کیا گیا ہے، زید کے ذمہ ۲۵ ر ہزار کا قرضہ ہے، تو کیا اس صورت میں زید پر قربانی واجب ہوگی؟

الجواب حامداومصلیا:

مذکورہ صورت میں ۲۵ ر ہزار یا جتنا قرضہ ہے، اس کو وضع [منہا] کرنے کے بعد زید کے حصے میں جتنی ملکیت کا [مشترکہ] مکان آتا ہے، اس کی قیمت اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے بہ قدر ہو جاتی

---

[۱] ومنها الغنى لما روي عن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - أنه قال: "من وجد سعة فليضح"، شرط - عليه الصلاة والسلام - السعة، وهي الغنى، ولأنا أوجبناها بمطلق المال ومن الجائز أن يستغرق الواجب جميع ماله فيؤدي إلى الحرج، فلابد من اعتبار الغنى، وهو أن يكون في ملكه مائتا درهم أو عشرون دينارا أو شيء تبلغ قيمته ذلك سوى مسكنه وما يتأثث به وكسوته وخادمه وفرسه وسلاحه وما لا يستغني عنه وهو نصاب صدقة الفطر.

(بدائع الصنائع: ۵/ ۶۴، کتاب التضحية، فصل في شرائط وجوب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية)

نوٹ: اگر سات تولہ سونا کے علاوہ کوئی مالیت نہ ہو، تو اس پر قربانی واجب نہیں ہوگی، چوں کہ عموماً سونا کے علاوہ لوگوں کے پاس کچھ پیسہ، یا معمولی چاندی یا بہ طور خاص گجرات میں ضرورت سے زائد برتن ہوتے ہی ہیں، خیال ہوتا ہے کہ اسی وجہ سے حضرت مفتی صاحبؒ نے سات تولہ سونا کی صورت میں وجوب اضحیہ کا فتویٰ دیا ہوگا۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

ہے، تو زید پر قربانی واجب ہے، زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ (درمختار و شامی)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] اپنی قربانی نہ کر کے مرحومین کی طرف سے قربانی کرنا

۱۸۴۸- سوال: میرے پاس تین بکرے ہیں، میں اس سال ان کے ذریعہ اپنے رشتہ داروں میں سے تین مرحومین کی طرف سے قربانی کرنا چاہتا ہوں، تو سوال یہ ہے کہ مرحومین کی طرف سے قربانی کرنے میں زندوں کی طرف سے بھی قربانی کرنا ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

سب سے پہلے یہ لازم وضروری ہے کہ آدمی اپنا فرض وواجب حق ادا کرے، اس کے بعد اگر گنجائش ہو تو پھر نفل حق ادا کرے، قربانی کے واجب ہونے کے لیے وہی شرطیں ہیں، جو صدقۃ الفطر کے وجوب کے لیے ہیں، اگر آپ پر قربانی واجب ہوگئی ہے، تو پہلے آپ اپنی طرف سے قربانی کریں، جو ضروری ہے،[۲] پھر گنجائش ہو، تو مرحومین کی طرف سے کریں اور اگر آپ پر قربانی واجب نہیں، تو اپنی طرف سے کیے بغیر بھی مرحومین کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

---

[۱] وشرائطها: الإسلام والإقامة واليسار الذي يتعلق به) وجوب (صدقة الفطر).[الدر المختار] ــــــ وفي الشامية: (قوله واليسار إلخ) بأن ملك مائتي درهم أو عرضا يساويها غير مسكنه وثياب اللبس أو متاع يحتاجه إلى أن يذبح الأضحية ولو له عقار يستغله فقيل تلزم لو قيمته نصابا، وقيل لو يدخل منه قوت سنة تلزم، وقيل قوت شهر، فمتى فضل نصاب تلزمه. ولو العقار وقفا، فإن وجب له في أيامها نصاب تلزم. (رد المحتار على الدر المختار: ٣١٢/٦، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

(۲) تجب على حر مسلم موسر مقيم عن نفسه. (كنز) ــــــ قال ابن نجيم: وقوله: عن نفسه لأنه أصل في الوجوب عليه. (البحر الرائق مع كنز الدقائق: ١٩٧/٨-١٩٨، أول: كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي)

وباليسار لأنها لا تجب إلا على القادر وهو الغني دون الفقير ومقداره مقدار ما تجب فيه صدقة الفطر. (المصدر السابق)

(۳) [فرع] من ضحى عن الميت، يصنع كما يصنع في أضحية نفسه من التصدق، والأكل، والأجر للميت والملك للذابح. (رد المحتار على الدر المختار: ٣٢٦/٦، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر-بيروت)

إذا ضحى رجل عن أبويه بغير أمرهما و تصدق به، جاز؛ لأن ملكه له و إنما للميت ثواب الذبح و الصدقة. (فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ٣٥٤/٣، كتاب الأضحية، فصل فيما يجوز في الضحايا وما لا يجوز، ط: زكريا-ديوبند)

[۱۱] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کی محض نیت سے قربانی واجب نہ ہوگی

۱۸۴۹-سوال: محترم حضرت مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ عرض یہ ہے کہ میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کی نیت کی ہے، جب کہ میری اپنی قربانی اب تک نہیں ہوئی ہے، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس میں بکرے کی بجائے گائے کی قربانی درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

محض قربانی کی نیت سے قربانی واجب نہیں ہوتی، جب تک (زبان سے) منت نہ مانی جائے،(۱) اگر آپ نے زبان سے مثلاً یہ کہا ہو کہ ''میرا فلاں کام ہوگیا، تو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایصال ثواب کے لیے ایک بکرے کی قربانی کروں گا'' یا مطلقا کہا ہو کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ایصال ثواب کے لیے مجھ پر ایک قربانی ہے، تو منت ہوگئی اور قربانی واجب ہوگئی؛ لیکن جب تک یہ الفاظ نہ کہے جائیں، قربانی واجب نہ ہوگی، اگر بکرے کی منت نہیں مانی ہے، تو گائے کی قربانی میں کوئی حرج نہیں ہے کر سکتے ہیں۔(۲)

اور اگر آپ صاحب نصاب ہیں، تو آپ پر بھی قربانی واجب ہوگی، اور منت بھی مانی ہے، تو پھر دو

---

(۱) محض ارادے کی وجہ سے قربانی لازم نہیں ہوگی، حتی کہ اگر کسی مال دار نے بہ وقت شراء قربانی کی نیت کی ہو، تب بھی وہ جانور قربانی کے لیے متعین نہیں ہوتا ہے، ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

وهل تتعين الأضحية بالنية؟ قالوا: إن كان فقيرا وقد اشتراها بنيتها تعينت (و في حاشية الحموي: قوله: تعينت الخ، بشرط أن يتلفظ الفقير بلسانه، وأما إذا لم يتلفظ فلا تتعين. انتهى) فليس له بيعها، وإن كان غنيا لم تتعين، والصحيح أنها تتعين مطلقا. ـــــــ و في حاشية الحموي: قوله: "و الصحيح الخ" قيل لا يلزم إذا نوى أن يضحي ولم يتلفظ وقت الشراء لها لو كان المشتري غنيا لا تجب باتفاق الروايات، فله بيعها، وإن كان فقيرا ذكر في الشافعي: أنها تتعين بالنية وعند الجمهور: لا، إلا أن يقول بلسانه علي أن أضحي بها. (الأشباه والنظائر مع حاشية الحموي: ۱/۹۰، الأولى: لا ثواب إلا بالنية، ت: المفتي محمد يوسف التاؤلوي، ط: مكتبة فقيه الأمة-ديوبند)

(۲) أجمع أصحابنا رحمهم الله: أن الشاة تصير واجبة الأضحية بالنذر بأن قال: لله علي أن أضحي هذه الشاة، وأجمعوا على أنها لا تصير واجبة الأضحية بمجرد النية، بأن نوى أن يضحي هذه الشاة ولم يذكر بلسانه نيته. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني- أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶ھ): ۶/۸۷، كتاب الأضحية، الفصل الثاني في وجوب الأضحية بالنذر، وما هو في معناه، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

قربانیاں واجب ہوں گی، ایک آپ کی اور ایک منت کی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] دمِ تمتع ادا کرنے سے واجب قربانی ادا ہوگی یا نہیں؟

۱۸۵۰- سوال: میرے رشتہ دار حرمین سے آئے ہیں، ہر سال وطن میں واجب قربانی ادا کرتے تھے، اِس سال حج کے لیے آئے، تو مکہ میں دمِ تمتع ادا کیا، واجب قربانی ادا نہیں کی، تو کیا اب اُن کو واجب قربانی کے بقدر رقم خیرات کرنا ضروری ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر وہ مکہ میں ایام قربانی میں مقیم تھے، تو ان پر دمِ تمتع کے علاوہ قربانی واجب ہوگی۔

اگر انہوں نے واجب قربانی ادا نہیں کی، اور ایام نحر ختم ہوگئے، تو قربانی کے جانور یعنی ایک بکرے کی قیمت صدقہ کرنا ضروری ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] ایام اضحیہ گزرنے کے بعد قربانی کا حکم

۱۸۵۱- سوال: میرے ایک رشتہ دار جرمن سے آئے ہوئے تھے، وہ ہر سال اپنے وطن میں اپنی واجب قربانی کرواتے تھے، اس سال وہ حج کے لیے گئے اور انہوں نے حج کے دمِ تمتع کی قربانی کی؛ لیکن اپنی واجب قربانی نہیں کی، تو کیا اب ایام اضحیہ گزر جانے کے بعد ان کو اپنی واجب قربانی کا صدقہ کرنا پڑے

---

(۱) ولو نذر أن يضحي بشاة - وذلك في أيام النحر - وهو موسر فعليه أن يضحي بشاتين عندنا، شاة لأجل النذر وشاة بإيجاب الشرع ابتداء إلا إذا عنى به الإخبار عن الواجب عليه بإيجاب الشرع ابتداء فلا يلزمه إلا التضحية بشاة واحدة. (بدائع الصنائع: ۶۳/۵، كتاب التضحية، صفة التضحية، قبيل: فصل في شرائط وجوب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۲) "ولو لم يضح حتى مضت أيام النحر إن كان أوجب على نفسه أو كان فقيرا وقد اشترى الأضحية تصدق بها حية وإن كان غنيا تصدق بقيمة شاة اشترى أو لم يشتر" لأنها واجبة على الغني. (الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۳۵۸/۴، كتاب الأضحية، على من تجب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲۰۰/۸، كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۱/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر - بيروت)

گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں اپنی واجب قربانی کی طرف سے ایک بکرے کی قیمت کا صدقہ کرنا ضروری ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] حاجی پر عید الاضحیٰ کی قربانی

۱۸۵۲- سوال: کیا ہندوستان سے حج کے لیے جانے والے پر ہندوستان اور مکہ مکرمہ؛ ہر دو جگہ قربانی کرنا ضروری ہے؟ حاجی صاحب نے اگر قربانی مکہ مکرمہ میں تو کی، مگر ہندوستان میں ان کے نام کی قربانی

---

(۱) ولو لم يضح حتى مضت أيام النحر فقد فاته الذبح، فإن كان أوجب على نفسه شاة بعينها بأن قال: لله علي أن أضحي بهذه الشاة، سواء كان الموجب فقيرا أو غنيا، أو كان المضحي فقيرا وقد اشترى شاة بنية الأضحية فلم يفعل حتى مضت أيام النحر تصدق بها حية، وإن كان من لم يضح غنيا ولم يوجب على نفسه شاة بعينها تصدق بقيمة شاة اشترى أو لم يشتري، كذا في العتابية. (الفتاوى الهندية: ۵/۲۹۶، كتاب الأضحية، الباب الرابع فيما يتعلق بالمكان والزمان، ط: دار الفكر)

حاجی پر عید الاضحیٰ کی قربانی واجب ہونے کے سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ [حاجی] ۸/ ذی الحجہ سے پندرہ دن پہلے مکہ مکرمہ پہنچ جائے اور اقامت کی نیت کر لے، تو مقیم ہوگا، اس پر عید الاضحیٰ والی قربانی واجب ہوگی، اور اگر وہ کسی وجہ سے قربانی نہیں کر سکا، تو پھر اسے بعد میں بکرے کی قیمت صدقہ کرنا ہوگا:

ولا تشترط الإقامة في جميع الوقت حتى لو كان مسافرا في أول الوقت ثم أقام في آخره تجب عليه. (بدائع الصنائع: ۵/ ۶۳، كتاب التضحية، فصل في شرائط وجوب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية☆الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۲، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر)

وإن كان من لم يضح غنيا ولم يوجب على نفسه شاة بعينها تصدق بقيمة شاة اشترى أو لم يشتري، كذا في العتابية. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۶، كتاب الأضحية، الباب الرابع فيما يتعلق بالمكان والزمان، ط: دار الفكر)

اور اگر حاجی مسافر ہے، یعنی مکہ مکرمہ ۸/ ذی الحجہ سے پندرہ دن پہلے نہیں پہنچا، تو اس پر مال دار ہونے کی وجہ سے واجب ہونے والی قربانی ساقط ہو جائے گی، یعنی عید الاضحیٰ والی قربانی واجب نہیں ہے، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

وذكر في الأصل وقال: ولا تجب الأضحية على الحاج؛ وأراد بالحاج المسافر فأما أهل مكة فتجب عليهم الأضحية وإن حجوا. (بدائع الصنائع: ۵/ ۶۳، كتاب التضحية، فصل في شرائط وجوب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية)

واللہ اعلم بالصواب۔ [مجتبیٰ حسن قاسمی]

نہیں ہوئی، تو اس کا کیا حکم ہے؟ اگر عقیقہ کے جانور میں اس کا حصہ رکھ لیا جائے، تو اس کا گوشت کون کھا سکتا ہے؟ کیا اس کا گوشت تبلیغی اجتماع میں استعمال کر سکتے ہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

حج کی قربانی الگ ہے، اور عید الاضحیٰ کی قربانی الگ ہے، حاجی پر حج قران یا حج تمتع کے شکر کے طور پر یا جنایت کی وجہ سے جو قربانی واجب ہوتی ہے، اسے حدود حرم (منیٰ) میں ذبح کرنا ضروری ہے، حدود حرم سے باہر ذبح کرنے سے واجب ادا نہیں ہوگا۔(۱)

اور وہ قربانی، جو صاحب استطاعت مقیم پر واجب ہوتی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ حاجی مقیم ہو، یعنی مکہ مکرمہ میں پندرہ دن قیام کا ارادہ ہو، تو اس پر قربانی کرنا واجب ہے،(۲) اور اس قربانی کے کرنے میں حاجی کو اختیار ہے کہ اسے حدود حرم میں کرے یا اپنے وطن میں کرے۔

اگر کسی وجہ سے قربانی کے دنوں میں عید الاضحیٰ والی قربانی نہیں کر سکا، تو اگر جانور خرید چکا ہے، تو اسی کو

---

(۱)عن جابر، قال: ثم قال النبي صلى الله عليه وسلم: قد نحرت ها هنا ومنى كلها منحر، ووقف بعرفة فقال: قد وقفت ها هنا وعرفة كلها موقف، ووقف بالمزدلفة فقال: قد وقفت ها هنا ومزدلفة كلها موقف.(سنن أبي داود: ۱/۲۶۶، رقم الحديث: ۱۹۰۷، كتاب المناسك، باب صفة حجة النبي صلى الله عليه وسلم، ط: ديوبند)

قال "ولا يجوز ذبح الهدايا إلا في الحرم" لقوله تعالى في جزاء الصيد: ﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾ [المائدة: ۹۵] فصار أصلا في كل دم هو كفارة ولأن الهدي اسم لما يهدى إلى مكان ومكانه الحرم قال عليه الصلاة والسلام "منى كلها منحر وفجاج مكة كلها منحر". (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۸۱، كتاب الحج، باب الهدي، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت★البحر الرائق- ابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ): ۳/۱۲۸، كتاب الحج، باب الهدي، ط: زكريا- ديوبند☆غنية الناسك في بغية المناسك، ص: ۳۳۸، فصل في شرائط كفاراتها الثلاث، مطلب في شرائط جواز الدم، ط: مکتبہ یادگار شیخ، سہارن پور)

(ويأكل) استحبابا (من هدي التطوع) إذا بلغ محله (والمتعة والقران)... (لا) يأكل (من غيرها)؛ لأنها دماء كفارات... (وخص ذبح هدي المتعة والقران بأيام النحر دون غيرهما) أي يجوز ذبح بقية الهدايا في أي وقت شاء... (و) خص (الكل بالحرم). (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۱/۳۰۰، كتاب الحج، باب الهدي، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۲) ولا تشترط الإقامة في جميع الوقت حتى لو كان مسافرا في أول الوقت ثم أقام في آخره تجب عليه. (بدائع الصنائع: ۵/۶۳، كتاب التضحية، فصل في شرائط وجوب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية☆الفتاوى الهندية: ۵/۲۹۲، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر)

صدقہ کردے اور اگر جانور نہیں خریدا ہے تو ایک جانور کی قیمت یا ایک جانور کا صدقہ کردے۔ (۳)

عقیقہ کے جانور میں ایام قربانی کے علاوہ دوسرے دنوں میں قربانی کا حصہ رکھنا درست نہیں ہے۔ ہاں قربانی کے دنوں میں بڑے جانور میں قربانی اور عقیقہ دونوں کے حصے رکھنا درست ہے۔ (۴)

جس کی طرف سے قربانی کی گئی ہے یا عقیقہ کیا گیا ہے، اس کی صراحتاً یا دلالۃً اجازت سے اس کے حصے کے بہ قدر گوشت تبلیغی اجتماع میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (۵)

اگر حاجی عید سے پندرہ دن پہلے مکہ مکرمہ نہیں پہنچا، یا پندرہ دن پہلے پہنچا، لیکن مکہ مکرمہ میں مسلسل پندرہ دن ٹھہرنے کا ارادہ نہیں ہے، مدینہ منورہ یا کسی اور جگہ جانے کا ارادہ ہے، تو گویا وہ حاجی عید سے پہلے مسافر ہے، لہٰذا اس پر عید کی قربانی واجب نہیں ہے۔ (۶) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] غریب آدمی کا قربانی کی نیت سے جانور خریدنا

۱۸۵۳- سوال: بہشتی زیور حصہ: ۳، صفحہ: ۴۱، مسئلہ نمبر: ۳۳، میں ''قربانی کے بیان میں'' لکھا ہے کہ کسی شخص پر اگر قربانی واجب نہیں تھی؛ لیکن اس نے قربانی کی نیت سے کوئی جانور خریدا، تو اس پر اس جانور کی قربانی واجب ہو گئی۔ (☆☆☆) دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا یہ حکم پورے سال کے لیے ہے یا صرف

---

(۳) "ولو لم يضح حتى مضت أيام النحر إن كان أوجب على نفسه أو كان فقيرا وقد اشترى الأضحية تصدق بها حية وإن كان غنيا تصدق بقيمة شاة اشترى أو لم يشتر" لأنها واجبة على الغني. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۳۵۸/۴، كتاب الأضحية، على من تجب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت☆ البحر الرائق: ۲۰۰/۸، كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۱/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) عقیقہ کے باب میں اس کی تفصیلی تخریج آئے گی۔

(۵) ويهب منها ما شاء للغني والفقير والمسلم والذمي، كذا في الغياثية.ـــــــ ولو تصدق بالكل جاز، ولو حبس الكل لنفسه جاز. (الفتاوى الهندية: ۳۰۰/۵، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر)

(۶) وذكر في الأصل وقال: ولا تجب الأضحية على الحاج؛ وأراد بالحاج المسافر فأما أهل مكة فتجب عليهم الأضحية وإن حجوا. (بدائع الصنائع: ۶۳/۵، كتاب التضحية، فصل في شرائط وجوب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية)

(☆☆☆) کسی پر قربانی واجب نہیں تھی، لیکن اس نے قربانی کی نیت سے جانور خرید لیا، تو اب اس جانور کی قربانی واجب ہو گئی۔ (بہشتی زیور، حصہ سوم، ص: ۳۵، مسئلہ نمبر: ۳۳، قربانی کا بیان، باب: ۱۹، ط: امدادیہ لائبریری، چوک بازار، ڈھاکہ)

ایام نحر میں قربانی کی نیت سے جانور خریدنے کے ساتھ خاص ہے؟

غریب آدمی - کہ جس پر قربانی واجب نہ تھی - اس نے اگر ایام نحر میں قربانی کی نیت سے کوئی جانور خریدا، یا خود اس کے پاس اس کا ذاتی کوئی جانور تھا، اور اس نے اس کی قربانی کی نیت کرلی؛ تو بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ایام نحر میں اگر کسی غریب آدمی نے قربانی کی نیت سے کوئی جانور خریدا، یا اس کے پاس اس کا ذاتی کوئی جانور تھا، اور اس نے اس جانور میں ایام نحر میں قربانی کی نیت کی، تو اس پر قربانی واجب ہو جائے گی، ہاں! دوسرے دنوں میں اگر یہ غریب آدمی کہ جس پر قربانی واجب نہیں ہے، قربانی کی نیت سے کوئی جانور خریدے یا اس نے اپنے ذاتی جانور میں قربانی کی نیت کرلی، تو اس پر قربانی واجب نہیں ہوگی، کیا یہ بات صحیح ہے۔

ایام نحر کسے کہتے ہیں؟ اس کی بھی وضاحت فرمادیں۔

اقبال احمد شیر پوری (ماٹلی والا مدرسہ)

الجواب حامداً ومصلياً:

غریب آدمی اگر قربانی کی نیت سے کوئی جانور خریدے گا، تو اس پر قربانی واجب ہو جائے گی؛ کیوں کہ غریب آدمی کا قربانی کے لیے جانور خریدنا منت ماننے کے مترادف ہے؛ بدائع الصنائع میں لکھا ہے کہ ''غریب آدمی کا قربانی کی نیت سے کسی جانور کو خریدنا یہ منت ماننے کے مترادف ہے''۔ (بدائع الصنائع: ۶۲/۵)[۱]

عالمگیری میں لکھا ہے کہ ''قربانی دو طرح کی ہوتی ہے: واجب اور نفل، قربانی مال دار پر واجب ہے؛ اگر کسی غریب نے بھی اس کی منت مانی، تو اس پر بھی واجب ہو جائے گی؛ غریب آدمی نے قربانی کی نیت سے اگر کوئی جانور خریدا ہے، تو اس پر اسی جانور کی قربانی کرنا ضروری ہوگا، اسی وجہ سے فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر غریب آدمی نے کوئی عیب دار جانور خریدا، تو اسی جانور سے غریب کی قربانی ادا ہو جائے گی، مال دار نے قربانی کی نیت سے کوئی جانور خریدا، اس کے بعد اس نے اس جانور کو بیچنے کا ارادہ کیا، تو اس کے لیے بیچنا جائز ہے؛ لیکن غریب کے لیے قربانی کی نیت سے خریدا ہوا جانور بیچنا جائز نہیں ہے۔ (عالمگیری: ۱۹۶/۶، ۱۹۷)[۲]

---

[۱] لأن الشراء للأضحية من الفقير كالنذر بالتضحية. (بدائع الصنائع: ۶۸/۵، کتاب التضحية، فصل في أنواع كيفية الوجوب، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۲] (وأما) (صفة التضحية): فالتضحية نوعان واجب وتطوع. والواجب منها أنواع: منها ما يجب على الغني والفقير، ومنها ما يجب على الفقير دون الغني، ومنها ما يجب على الغني دون الفقير. أما الذي يجب على الغني والفقير فالمنذور به بأن قال: لله علي أن أضحي شاة أو بدنة أو هذه الشاة أو هذه البدنة، وكذلك لو قال ذلك وهو =

ایسا غریب آدمی، جس کی ملکیت میں کوئی جانور پہلے سے ہو، یا اس نے جانور یوں ہی خریدا ہو، بعد میں وہ اس جانور کی قربانی کرنے کا ارادہ کرے، تو محض ارادہ کر لینے سے اس جانور کی قربانی اس کے ذمے واجب نہیں ہوگی۔ (۳)

=معسر، ثم أيسر في أيام النحر فعليه أن يضحي شاتين؛ لأنه لم يكن وقت النذر أضحية واجبة عليه فلا يحتمل الإخبار فيحمل على الحقيقة الشرعية، فوجب عليه أضحية بنذره وأخرى بإيجاب الشرع. . . وأما الذي يجب على الفقير دون الغني فالمشترى للأضحية إذا كان المشتري فقيرا، بأن اشترى فقير شاة ينوي أن يضحي بها، وإن كان غنيا لا تجب عليه بشراء شيء، . . وأما الذي يجب على الغني دون الفقير فما يجب من غير نذر ولا شراء للأضحية بل شكرا لنعمة الحياة وإحياء لميراث الخليل حين أمره الله بذبح الكبش في هذه الأيام، كذا في البدائع. (الفتاوى الهندية:٥/٢٩١-٢٩٢، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر)

قال الكرماني في مناسكه، وإذا اشترى شاة يريد أضحية في ضميره ففي ظاهر المذهب لا تصير أضحية حتى يوجبها بلسانه لكن المذهب والفتوى على أن ينظر إن كان المشتري غنيا لا يصير واجبا في الروايات كلها؛ لأنها واجبة في ذمته فلا يحتاج إلى التعيين، وإن كان فقيرا ففي ظاهر الرواية يجب أن يتعين بالعقد فإن وهب له أو تصدق عليه فنوى بقلبه لا تصير أضحية بالإجماع؛ لأن العقد لا يصلح للتعين في الإيجاب، وكذا لو كانت الشاة عنده فأضمر بقلبه الأضحية لا تصير أضحية بالإجماع. (حاشية الشلبي على تبيين الحقائق-شهاب الدين أحمد بن محمد بن أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِّلْبِيُّ (م:١٠٢١ھ):٦/٥، كتاب الأضحية، من تجب عليه الأضحية، ط: المطبعة الكبرى الأميرية-بولاق، القاهرة)

(٣) ولو ملك إنسان شاة فنوى أن يضحي بها، أو اشترى شاة ولم ينو الأضحية وقت الشراء ثم نوى بعد ذلك أن يضحي بها لا تجب عليه سواء كان غنيا أو فقيرا. (حوالہ سابق:٥/٢٩١)

ولو اشترى شاة للأضحية، ثم باعها واشترى أخرى في أيام النحر فهذا على وجوه ثلاثة. (الأول): إذا اشترى شاة ينوي بها الأضحية. (والثاني): أن يشتري بغير نية الأضحية، ثم نوى الأضحية. (والثالث): أن يشتري بغير نية الأضحية، ثم يوجب بلسانه أن يضحي بها فيقول: لله علي أن أضحي بها عامنا هذا، ففي الوجه الأول في ظاهر الرواية لا تصير أضحية ما لم يوجبها بلسانه، وعن أبي يوسف - رحمه الله تعالى - عن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى -: أنه تصير أضحية بمجرد النية كما لو أوجبها بلسانه وبه أخذ أبو يوسف - رحمه الله تعالى - وبعض المتأخرين.

وعن محمد - رحمه الله تعالى - في المنتقى: إذا اشترى شاة ليضحي بها وأضمر نية التضحية عند الشراء تصير أضحية كما نوى. فإن سافر قبل أيام النحر باعها وسقطت عنه الأضحية بالمسافرة، وأما الثاني إذا اشترى شاة بغير نية الأضحية، ثم نوى الأضحية بعد الشراء لم يذكر هذا في ظاهر الرواية، وروى الحسن عن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - أنها لا تصير أضحية حتى لو باعها يجوز بيعها وبه نأخذ، فأما إذا اشترى شاة، ثم أوجبها أضحية بلسانه وهو الوجه الثالث تصير أضحية في قولهم، كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية:٥/٢٩٣، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر ☆ فتاوى قاضي خان على هامش الهندية:٣/٣٤٦، كتاب الأضحية، ط: زكريا-ديوبند)

اس لیے بہشتی زیور کا مسئلہ اپنی جگہ پر درست ہے، چناں چہ غریب آدمی نے قربانی کی نیت سے ایام نحر یعنی: ۱۰-۱۱-۱۲ ذی الحجہ کو کوئی جانور خریدا، یا اس سے پہلے تو اس غریب پر قربانی واجب ہو جائے گی اور جانور کو بیچنا جائز نہیں ہوگا۔[1] واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] غائب آدمی کی طرف سے اس کی اجازت کے بغیر قربانی میں حصہ رکھنے کا شرعی حکم

گذشتہ سے پیوستہ

۱۸۵۴- سوال: اسی طریقہ سے بہشتی زیور حصہ: ۳ صفحہ: ۴۲، مسئلہ نمبر ۳۸ پر قربانی کے بیان میں لکھا ہے کہ مثلاً: کوئی شخص یہاں موجود نہیں ہے اور کسی دوسرے آدمی نے اس کی اجازت کے بغیر اس کی طرف سے قربانی کر دی، تو یہ قربانی صحیح نہیں ہوگی، نیز کسی جانور میں کسی غائب آدمی کی طرف سے اس کی اجازت کے بغیر اگر اس کا حصہ رکھ لیا، تو دوسرے حصے داروں کی قربانی بھی صحیح نہیں ہوگی؛[2] تو اس مسئلہ کا وضاحت کے ساتھ جواب دیں گے کہ دوسرے حصے داروں کی قربانی کیوں صحیح نہیں ہوگی؟ حالاں کہ ہم پر ہر سال افریقہ، انگلینڈ وغیرہ سے قربانی کے لیے خطوط آتے ہیں اور ان کی طرف سے قربانی کی بھی جاتی ہے اور اس کے خط کا آنا ہی اس کی طرف سے اجازت کے قائم مقام ہوتا ہے؛ اس لیے ان کی قربانی ہو جاتی ہے، یہ ہمارا ماننا ہے، مگر حضرت مفتی صاحب! بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کا خط نہیں آتا، اس کے باوجود ان کا حصہ رکھا جاتا ہے، یہ سمجھ کر کہ ہر سال ان کا خط آتا ہے، بعد میں اس کی اجازت کا خط آجائے گا، اور اس کے پاس سے رقم وصول کر لیں گے؛ تو اس غائب آدمی کا حصہ اس کی اجازت کے بغیر رکھا گیا، تو کیا دوسرے حصے داروں کی قربانی صحیح ہوگی یا نہیں؟

اقبال احمد شیر پوری (ماٹلی والا مدرسہ)

---

(۱) شراء الفقير قبل أيام النحر (یوم قرباں سے قبل کسی غریب کا قربانی کا جانور خریدنا) موجب قربانی ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے، احوط موجب ہونا ہے۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے: احسن الفتاوی: ۷/ ۵۲۹-۵۳۰، کتاب الاضحیۃ والعقیقۃ، شراء الفقیر قبل ایام النحر بھی موجب ہے؟، ط: ایچ ایم سعید کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی]

(۲) اگر کوئی شخص یہاں موجود نہیں، اور دوسرے شخص نے اس کی طرف سے، بغیر اس کے امر کے، قربانی کر دی تو یہ قربانی صحیح نہیں ہوئی، اور اگر کسی جانور میں کسی غائب کا حصہ بدون اس کے امر کے تجویز کر لیا، تو اور حصے داروں کی قربانی بھی صحیح نہیں ہوگی۔ (بہشتی زیور، حصہ سوم، ص: ۳۶، مسئلہ نمبر: ۳۸، قربانی کا بیان، باب: ۱۹، ط: امدادیہ لائبریری، چوک بازار، ڈھاکہ)

الجواب حامداو مصلیا:

بہشتی زیور میں ذکر کردہ مسئلہ اس شخص سے متعلق ہے، جس پر قربانی واجب ہے، کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی طرف سے قربانی کرنا جائز نہ ہوگا؛ کیوں کہ قربانی عبادت ہے اور عبادت کی صحت کے لیے نیت ضروری ہے؛ اس لیے خود جانور ذبح کرے یا ذبح کرنے کے لیے کسی کو وکیل بنائے، لہٰذا جس مالدار کے اوپر قربانی واجب ہے، اس کی اجازت کے بغیر، اس کی جانب سے قربانی کی گئی، تو قربانی ادا نہیں ہوگی، اور جب ایک حصے کی قربانی صحیح نہیں ہوئی، تو بقیہ حصے داروں کی قربانی بھی صحیح نہیں ہوگی۔(۱)

نفل قربانی کسی غریب آدمی کی طرف سے کی گئی یا اس قربانی کا ثواب اس کو بخش دیا گیا، تو یہ جائز ہے؛(۲) کیوں کہ یہ قربانی واجب نہیں ہے، بل کہ نفل ہے، جس کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

بیرون ممالک میں رہنے والے بھائیوں پر قربانی اگر واجب ہو، اور ان کا خط آپ تک نہیں پہنچا اور آپ نے ان کی طرف سے واجب قربانی کی نیت سے بڑے جانور کو ذبح کر دیا، تو دوسرے کسی بھی حصے دار کی قربانی درست نہیں ہوگی۔ (عالمگیری: ۶/ ۱۹۷)[۳]

تمام حصے داروں کے لیے لازم ہے کہ وہ ثواب حاصل کرنے کی نیت کرے، کوئی ایک حصے دار بھی محض گوشت کھانے کی نیت کرے گا، تو کسی ایک کی بھی قربانی صحیح نہیں ہوگی۔ (عالمگیری، بدائع)[۴]

---

(۱) ولو ضحى ببدنة عن نفسه وعرسه وأولاده، ليس هذا في ظاهر الرواية، وقال الحسن بن زياد في كتاب الأضحية: إن كان أولاده صغارا جاز عنه وعنهم جميعا في قول أبي حنيفة وأبي يوسف - رحمهما الله تعالى -، وإن كانوا كبارا إن فعل بأمرهم جاز عن الكل في قول أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالى، وإن فعل بغير أمرهم أو بغير أمر بعضهم، لا تجوز عنه ولا عنهم في قولهم جميعا، لأن نصيب من لم يأمر صار لحما فصار الكل لحما. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۲، كتاب الأضحية، الباب السابع في التضحية عن الغير وفي التضحية بشاة الغير عن نفسه، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) لأن الأضحية من الغير عرفت قربة؛ لأنه - صلى الله عليه وسلم - ضحى عن أمته. (تكملة البحر الرائق: ۸/ ۲۰۲، كتاب الأضحية، الأضحية من الإبل والبقر والغنم، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۳] حاشیہ نمبر (۱) ملاحظہ فرمائیں۔

[۴] لا يشارك المضحي فيما يحتمل الشركة من لا يريد القربة رأسا، فإن شارك لم يجز عن الأضحية، وكذا هذا في سائر القرب إذا شارك المتقرب من لا يريد القربة لم تجز عن القربة. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۴، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ط: دار الفكر - بيروت ☆ بدائع الصنائع: ۵/ ۷۱، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

بیرون ملک رہنے والے بھائیوں کے خطوط ہر سال آنے کا گرچہ معمول ہو؛ مگر خط آنے سے پہلے ان کی طرف سے قربانی کرنا جائز نہیں ؛ کیوں کہ جب ان کا خط آیا، تو انہوں نے آپ کو اپنی قربانی کرنے کا وکیل بنا دیا، اس لیے آپ کا وکیل بننا صحیح ہو گیا؛ لیکن خط آنے سے پہلے اس کی طرف سے وکیل بن کر قربانی کر دینے سے آپ کی وکالت صحیح نہیں ہوگی، مثلاً: آپ کو اپنے استاذ نے دو تین مرتبہ کوئی چیز خریدنے کے لیے وکیل بنایا اور آپ نے استاذ کی طرف سے وکیل بن کر وہ چیز خرید بھی لی؛ اب کسی موقع پر آپ وکیل بنائے بغیر اپنے استاذ کی طرف سے کوئی چیز خرید لیں، یہ سمجھ کر کہ ہر مرتبہ استاذ مجھے وکیل بناتے تھے، اس مرتبہ بھی میں ان کی طرف سے وکیل بن کر ان کے لیے چیز خرید لوں، تو آپ کا یہ عمل درست نہیں ہوگا، اور خریدی ہوئی چیز خود آپ کی شمار ہوگی، نہ کہ آپ کے استاذ کی۔

الغرض سامنے والے کی اجازت وحکم اور رضامندی کے بغیر قربانی جائز نہیں ہوگی، نیز یہ حکم واجب قربانی کے لیے ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] قربانی کے جانور کا دودھ استعمال کرنے کا شرعی حکم

گذشتہ سے پیوستہ

۱۸۵۵- سوال: اگر کوئی آدمی - خواہ غریب ہو یا مال دار - قربانی کے لیے جانور خریدے اور وہ جانور دودھ دینے والا ہو، تو اس کا دودھ یہ شخص استعمال کر سکتا ہے؟ بعض لوگ اس میں بھی ایام نحر کی شرط لگاتے ہیں کہ ایام نحر میں اس کا دودھ استعمال نہیں کر سکتے ہیں، دوسرے دنوں میں استعمال کر سکتے ہیں اور بھیڑ و دنبہ ہو تو ایام نحر سے پہلے اس کا اون [اس کے بال] بھی کاٹ سکتے ہیں، اس سلسلے میں اصل مسئلہ کیا ہے؟

اقبال احمد شیر پوری (ماٹلی والا مدرسہ)

الجواب حامداً و مصلیاً:

جب جانور کو قربانی کی نیت سے خرید لیا، تو خواہ مال دار ہو یا غریب، اس جانور سے کسی بھی طرح کا فائدہ اٹھانا اس کے لیے جائز نہیں ہے، اگر قربانی کا جانور دودھ والا ہو، تو اس کے تھنوں میں بار بار ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کیا جائے، یہاں تک کہ اس کے تھنوں سے دودھ آنا بند ہو جائے، اور اگر دودھ نکال لیا ہے، تو اسے فقراء ومساکین کو صدقہ کر دے اور اگر خود استعمال کر لیا ہے، تو بازار کی قیمت کے بہ قدر رقم صدقہ

کردے، یہی حکم اس کے اون اور بالوں کا بھی ہے۔ (عالمگیری:۶/۲۰۶)[۱]

کیوں کہ قربانی کی نیت سے جانور خریدنے کی وجہ سے اس کے ہر ہر جز کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کی نیت کرلی ہے؛ اس لیے اس کے کسی بھی حصے کو اپنے کام میں لانا جائز نہیں؛ خواہ جانور کو ایام نحر میں خریدا ہو یا اس سے پہلے، اور خریدنے والا خواہ مال دار ہو یا غریب؛ ہر ایک کے لیے یہی حکم ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] غریب آدمی کی قربانی کے جانور کا گم ہوجانا

۱۸۵۶- سوال: ایک غریب آدمی نے قربانی کی نیت سے جانور خریدا، پھر وہ جانور گم ہوگیا، تو اس نے دوسرا جانور خریدا، پھر وہ پہلے والا جانور بھی مل گیا، تو غریب کے لیے دونوں جانوروں کی قربانی کرنا واجب ہے، اور اگر ایسا واقعہ کسی مال دار کے ساتھ پیش آئے، تو اس کے لیے فقط ایک ہی جانور کی قربانی کرنا واجب ہے، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اسی طرح بڑا جانور خریدتے وقت اگر کسی غریب آدمی کی نیت کسی کے شریک کرنے کی نہ تھی؛ لیکن بعد میں اس نے دوسروں کو شریک کرلیا، اگر ایام نحر باقی ہے، تو ان تمام حصوں کی قربانی اس کو پھر سے کرنی پڑے گی، جتنے حصے داروں کو اس نے شریک کیا ہے۔ اور اگر ایام نحر ختم ہو گئے ہیں، تو ان حصوں کے پیسوں

---

[۱] وإن كان في ضرعها لبن ويخاف ينضح ضرعها بالماء البارد، فإن تقلص وإلا حلب وتصدق، ويكره ركوبها واستعمالها كما في الهدي، فإن فعل فنقصها فعليه التصدق بما نقص، وإن آجرها تصدق بأجرها. (الفتاوى الهندية: ۳۰۱/۵، كتاب الأضحية، الباب السادس في بيان مايستحب في الأضحية والانتفاع بها، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) ولو اشترى شاة للأضحية يكره أن يحلبها أو يجز صوفها فينتفع به؛ لأنه عينها للقربة فلا يحل له الانتفاع بجزء من أجزائها قبل إقامة القربة بها، كما لا يحل له الانتفاع بلحمها إذا ذبحها قبل وقتها، ومن المشايخ من قال: هذا في الشاة المنذور بها بعينها من المعسر والموسر، وفي الشاة المشتراة للأضحية من المعسر، فأما المشتراة من الموسر للأضحية فلا بأس أن يحلبها ويجز صوفها، كذا في البدائع. والصحيح أن الموسر والمعسر في حلبها وجز صوفها سواء هكذا في الغياثية. ولو حلب اللبن من الأضحية قبل الذبح أو جز صوفها يتصدق به، ولا ينتفع به، كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية: ۳۰۱/۵، كتاب الأضحية، الباب السادس في بيان ما يستحب في الأضحية والانتفاع بها، ط: دار الفكر-بيروت)

کا صدقہ کرنا واجب ہوگا؛ جب کہ اگر مالدار آدمی ایسا کرے، تو اس کے لیے درست ہے اور غریب آدمی کو اتنی رقم صدقہ کرنی پڑتی ہے، اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ اس کا بھی وضاحت کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں۔

اقبال احمد شیر پوری (ماٹلی والا مدرسہ)

الجواب حامداًومصلیاً:

جب غریب آدمی نے قربانی کی نیت سے کوئی جانور خریدا، تو اس پر اس جانور کی قربانی واجب ہوگئی اور چوں کہ نیت پورے جانور کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کی تھی؛ اس لیے اس میں کسی دوسرے کو حصے دار بنانا جائز نہیں ہے؛ اگر جانور خریدنے کے بعد اس میں کسی دوسرے کو حصہ دیا ہے، تو اس حصے کی جو بھی قیمت ہوگی، اس کا صدقہ کر دینا ضروری ہوگا؛ البتہ خریدتے وقت ہی حصے دار بنانے کی نیت تھی، تو یہ جائز ہے۔ (۱)

اسی طرح جب غریب نے جانور کو خرید کر اس کی قربانی اپنے اوپر واجب کر لی، تو وہ جانور قربانی کے لیے متعین ہوگیا، اب اگر قربانی کرنے سے پہلے وہ جانور گم ہوگیا، اور اس کی جگہ اس نے دوسرا جانور خریدا، (حالاں کہ ایسا کرنا اس کے لیے ضروری نہیں تھا) تو گویا اس نے اس (دوسرے جانور) کی قربانی بھی اپنے

---

(۱) مال دار کا حکم اس کے برخلاف ہے، چوں کہ شریعت کی جانب سے ان پر پہلے ہی سے قربانی واجب ہے، اس لیے جانور خریدنے کی وجہ سے اس پر الگ سے کوئی چیز واجب نہیں ہوگی، الا یہ کہ وہ خود ہی جانور خریدنے سے پہلے اپنی زبان سے پورے جانور کو ذبح کرنا اپنے اوپر متعین کر لے، اس صورت میں مال دار کا حکم بھی غریب جیسا ہی ہوگا، یعنی خریدنے کے بعد دوسروں کو شریک کرنا درست نہیں ہوگا، البتہ مال دار کے لیے بہتر ہے کہ جانور خریدنے سے پہلے ہی دیگر شرکاء کو متعین کر لے:

ولو اشترى رجل بقرة يريد أن يضحي بها ثم أشرك فيها بعد ذلك قال هشام: سألت أبا يوسف فأخبرني أن أبا حنيفة - رحمه الله - قال: أكره ذلك ويجزيهم أن يذبحوها عنهم، قال: وكذلك قول أبي يوسف، قال: قلت لأبي يوسف ومن نيته أن يشرك فيها؟ قال: لا أحفظ عن أبي حنيفة - رحمه الله - فيها شيئا، ولكن لا أرى بذلك بأسا، وقال في الأصل: قال أرأيت في رجل اشترى بقرة يريد أن يضحي بها عن نفسه، فأشرك فيها بعد ذلك ولم يشركهم حتى اشتراها فأتاه إنسان بعد ذلك فأشركه حتى استكمل؛ يعني أنه صار سابعهم هل يجزي عنهم؟ قال: نعم استحسن وإن فعل ذلك قبل أن يشتريها كان أحسن، وهذا محمول على الغني إذا اشترى بقرة لأضحيته، لأنها لم تتعين لوجوب التضحية بها وإنما يقيمها عند الذبح مقام ما يجب عليه أو واجب عليه فيخرج عن عهدة الواجب بالفعل فيما يقيمه فيه فيجوز اشتراكهم فيها وذبحهم إلا أنه يكره، لأنه لما اشتراها ليضحي بها فقد وعد وعدا، فيكره أن يخلف الوعد، فأما إذا كان فقيرا فلا يجوز له أن يشرك فيها؛ لأنه أوجبها على نفسه بالشراء للأضحية فتعينت للوجوب فلا يسقط عنه ما أوجبه على نفسه. (بدائع الصنائع: ۵/۷۲، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

اوپر لازم کرلی، اب اگر پہلے والا جانور مل گیا، تو اس پر دونوں جانوروں کی قربانی واجب ہوگی؛ جب کہ مال دار پر شریعت نے قربانی لازم کی ہے، اس کے جانور خریدنے سے الگ سے کوئی چیز واجب نہیں ہوئی، اب اگر خریدا ہوا جانور غائب ہوگیا، تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ دوسرا جانور ذبح کرے، اس نے دوسرا جانور خریدلیا، اب اگر وہ پہلے والا جانور مل بھی گیا، تب بھی اس پر ایک ہی جانور کی قربانی واجب ہوگی، نہ کہ دونوں کی؛ کیوں کہ دونوں کو قربانی کے لیے اس نے متعین نہیں کیا ہے۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] مرحومین اور زندہ رشتہ داروں کی طرف سے قربانی کرنا اور خود اپنی قربانی نہ کرنا

۱۸۵۷- سوال: میرا ارادہ یہ ہے کہ میں اپنے مرحومین، اور خاندان کے زندہ افراد؛ مثلاً: بھائی بہن اور اپنی اولاد کی طرف سے قربانی کروں؛ مجھے اپنی طرف سے قربانی کرنے کا ارادہ نہیں ہے، تو کیا اس طرح کرنا صحیح ہے؟ علمائے کرام اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

اگر آپ صاحب نصاب ہیں، تو آپ کے اوپر خود اپنی طرف سے قربانی واجب ہے، مرحومین

---

(۲) خلاصہ یہ کہ غریب پر از روئے شرع قربانی لازم نہیں ہے، اس پر اس وقت قربانی لازم ہوتی ہے، جب کہ وہ اس کے لیے جانور خریدے، یہی وجہ ہے کہ اس پر اسی جانور کا قربان کرنا لازم ہے، خواہ اس میں عیب پیدا ہوجائے، جب کہ مال دار کے لیے ایسا نہیں ہے۔

جب غریب کی قربانی کا جانور گم ہوگیا، تو اس پر دوسرا جانور خرید کر قربان کرنا لازم نہیں تھا، لیکن جب اس نے دوسرا جانور خریدا، تو گویا اس نے اپنے اوپر دوسرا جانور قربان کرنا لازم کیا، اس لیے پہلا والا جانور مل جائے، تب بھی دونوں کی قربانی لازم ہوگی، کہ دونوں اس کی جانب سے قربانی کے لیے متعین ہے، جب کہ مال دار کی طرف سے تعیین نہیں ہے؛ اس لیے اس پر صرف ایک کی قربانی لازم ہوگی:

"وهذا" الذي ذكرنا "إذا كانت هذه العيوب قائمة وقت الشراء، ولو اشتراها سليمة ثم تعيبت بعيب مانع، إن كان غنيا عليه غيرها، وإن فقيرا تجزئه هذه" لأن الوجوب على الغني بالشرع ابتداء، لا بالشراء، فلم تتعين به، وعلى الفقير بشرائه بنية الأضحية فتعينت، ولا يجب عليه ضمان نقصانه كما في نصاب الزكاة، وعن هذا الأصل قالوا: إذا ماتت المشتراة للتضحية، على الموسر مكانها أخرى ولا شيء على الفقير، ولو ضلت أو سرقت فاشترى أخرى ثم ظهرت الأولى في أيام النحر على الموسر ذبح إحداهما وعلى الفقير ذبحهما. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۴/۳۵۹، كتاب الأضحية، ط: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

اور اپنے رشتہ داروں کی طرف سے قربانی کرنے سے آپ کی اپنی واجب قربانی ادا نہیں ہوگی؛ البتہ اگر جانور بڑا ہو، تو آپ اپنی طرف سے ایک حصہ رکھ کر، بقیہ چھ حصے مرحومین اور دیگر رشتہ داروں کی طرف سے قربانی کر سکتے ہیں، نیز وہ رشتے دار، جن کی طرف سے آپ قربانی کرنا چاہتے ہیں، اگر ان پر قربانی واجب ہے، تو اس صورت میں ان کی طرف سے قربانی کرنے میں، ان کی اجازت ووکالت ضروری ہے، ان کی اجازت و وکالت کے بغیر کسی حصے دار کی قربانی درست نہیں ہوگی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] ایام قربانی سے قبل بہ نیت قربانی جانور خریدنے سے اس جانور کی قربانی واجب نہیں ہوتی

۱۸۵۸- سوال: ایک شخص نے اس گمان سے قربانی کے جانور میں حصہ رکھ لیا کہ اس پر قربانی واجب ہے، پھر عید الاضحیٰ سے آٹھ دن پہلے پتہ چلا کہ اس پر قربانی واجب نہیں ہے، تو کیا وہ اپنا حصہ رد کروا سکتا ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

قربانی کے ایام سے پہلے جس شخص نے قربانی کے جانور میں اپنا حصہ رکھ لیا، یا جانور خرید لیا، تو اس پر اس جانور کی قربانی واجب نہیں ہے، چاہے وہ غریب ہو، وہ جانور بدل بھی سکتا ہے اور رد بھی کر سکتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں قربانی کا حصہ رد ہو سکتا ہے؛ کیوں کہ ابھی عید الاضحیٰ آنے میں آٹھ دن باقی ہے؛ البتہ مستحب یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ قربانی کی نیت کر چکا ہے، تو قربانی رد (کینسل) نہ کرے اور اگر غریب آدمی نے (جس پر قربانی واجب نہیں) قربانی کے دنوں میں قربانی کا جانور خرید لیا، تو اس کی قربانی لازم ہوگئی، وہ اسے رد نہیں کر سکتا۔ (شامی جلد ۶، صفحہ ۳۲۱) [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولو ضحى ببدنة عن نفسه وعرسه وأولاده، ليس هذا في ظاهر الرواية، وقال الحسن بن زياد في كتاب الأضحية: إن كان أولاده صغارا اجاز عنه وعنهم جميعا في قول أبي حنيفة وأبي يوسف - رحمهما الله تعالى -، وإن كانوا كبارا إن فعل بأمرهم جاز عن الكل في قول أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالى، وإن فعل بغير أمرهم أو بغير أمر بعضهم، لا تجوز عنه ولا عنهم في قولهم جميعا؛ لأن نصيب من لم يأمر صار لحما فصار الكل لحما. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۲، كتاب الأضحية، الباب السابع في التضحية عن الغير وفي التضحية بشاة الغير عن نفسه، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲] وفقير)... (شراها لها) لوجوبها عليه بذلك حتى يمتنع عليه بيعها. (الدر المختار) ——— و في الشامية: (قوله لوجوبها عليه بذلك) أي بالشراء، وهذا ظاهر الرواية لأن شراءه لها يجري مجرى الإيجاب، وهو النذر بالتضحية عرفا كما في البدائع. ووقع في التتارخانية التعبير بقوله شراها لها أيام النحر، وظاهره أنه لو شراها لها قبلها لا تجب، ولم أره صريحا فليراجع. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۲۱، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر) =

[۲۱] قربانی کرنے والے کا سات حصہ داروں کی نیت کرنا اور وکیل کے سامنے اظہار نہ کرنا

۱۸۵۹- سوال: بکر لندن میں ہے انڈیا میں رہنے والے اپنے بھائی کو کہا کہ ایک بڑا جانور خرید کر قربانی کر دینا کس کے کتنے حصے ہیں، اس کی میں نے نیت کر لی ہے، کیا اس صورت میں قربانی صحیح ہو جائے گی؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

انڈیا میں رہنے والا بھائی وکیل ہے، مؤکل نے نیت کر لی ہے، لہٰذا قربانی ہو جائے گی۔ (۱) وکیل کے سامنے نام ظاہر کرنا ضروری نہیں ہے، لیکن جس پر قربانی واجب ہے، اس کی رضامندی کے بغیر قربانی ادا نہیں ہوتی ہے؛ اس لیے جس پر قربانی واجب ہے، اس کی نیت بھی ضروری ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= وأما الذي يجب على الفقير دون الغني فالمشترى للأضحية إذا كان المشتري فقيرا، بأن اشترى فقير شاة ينوي أن يضحي بها. (الفتاوى الهندية: ۲۹۱/۵، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسيرها وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها وفي بيان من تجب عليه ومن لا تجب، ط: دار الفكر - بيروت)

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے مجموعہ فتاویٰ ''فتاویٰ محمودیہ'' کا ایک سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

سوال: جو شخص غریب ہے، کیا صرف جانور خریدنے سے اس کے ذمے قربانی واجب ہو جاتی ہے؟

جواب: اگر وہ قربانی کے دنوں میں قربانی کی نیت سے جانور خریدے گا، تب اس کے ذمے قربانی واجب ہوگی۔ فقط، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۳۱۵/۱۷، سوال نمبر: ۸۳۸۵، کتاب الاضحیۃ، باب من یجب علیہ الاضحیۃ ومن لا یجب، جانور خریدنے سے قربانی کا وجوب، ط: اشرفی بک ڈپو - دیوبند)

شراء الفقير قبل أيام النحر (یوم قرباں سے قبل کسی غریب کا قربانی کا جانور خریدنا) موجب قربانی ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے، احوط موجب ہونا ہے۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے: احسن الفتاویٰ: ۵۲۹/۷-۵۳۰، کتاب الاضحیۃ والعقیقۃ، شراء الفقیر قبل ایام النحر بھی موجب ہے؟، ط: ایچ ایم سعید کمپنی، ادب منزل، پاکستان چوک، کراچی]

(۱) وأما الضحايا: فلا بد فيها من النية. (الاشباه والنظائر - ابن نجيم مصري (م: ۹۷۰ھ) ص: ۸۹، الفن الأول في القواعد الكلية، القاعدة الأولى: لا ثواب إلا بالنية، ت: المفتى محمد يوسف التاؤلوي، ط: مكتبة فقيه الأمة - ديوبند)

والأصل اقترانها بالأداء كسائر العبادات إلا أن الدفع يتفرق فيحرج باستحضار النية عند كل دفع فاكتفى بوجودها حالة العزل دفعا للحرج. (البحر الرائق: ۳۶۸/۲، كتاب الزكاة، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) ذكر في فتاوى أبي الليث - رحمه الله تعالى - إذا ضحى بشاة نفسه عن غيره بأمر ذلك الغير أو بغير أمره لا تجوز؛ لأنه لا يمكن تجويز التضحية عن الغير إلا بإثبات الملك لذلك الغير في الشاة، ولن يثبت الملك له في الشاة إلا بالقبض، ولم يوجد قبض الآمر هاهنا لا بنفسه ولا بنائبه، كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۳۰۲/۵، كتاب الأضحية، الباب السابع في التضحية عن الغير، وفي التضحية بشاة الغير عن نفسه، ط: دار الفكر)

[۲۲] بہ نیت قربانی ہرن خریدنے سے قربانی کا وجوب

۱۸۶۰- سوال: ایک غریب شخص نے ناواقفیت کی بناء پر قربانی کے لیے بجائے بکرا کے، ایک ہرن خرید لیا، پھر بعد میں پتہ چلا کہ وحشی جانور کی قربانی جائز نہیں ہے، تو کیا اس کو بیچ کر، اس کی جگہ دوسرے جانور کی قربانی واجب ہوگی؟ اور اگر فروخت کرنے کے بعد اتنی قیمت نہیں آئی کہ اس سے بکرا خریدے یا بڑے جانور میں ساتواں حصہ لے سکے، تو کیا کیا جائے؟ اور اگر فروخت ہی نہیں ہوتا ہے، تو کیا صورت ہوگی؟ اس کے پاس قربانی کے دوسرے پیسے ہوں، تو کیا قربانی واجب ہو جائے گی اور اگر نہ ہو، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

ہرن خریدنے والا اگر صاحب نصاب نہیں ہے، تو اس کے ذمے قربانی واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ قربانی کی نیت سے اہلی جانور (پالتو جانور، جس کی قربانی جائز ہے) کے خریدنے سے غریب پر قربانی لازم ہوتی ہے، اور یہاں یہ صورت نہیں پائی گئی۔

اور اگر صاحب نصاب ہے، یعنی اس کی ملک میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا یا اتنی قیمت کی کوئی اور شئے حاجت اصلیہ سے زائد ہے، تو اس پر قربانی واجب ہوگی، چاہے ہرن فروخت ہو یا نہ ہو۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] نبی کریم ﷺ کی جانب سے قربانی کے لیے جانور خرید کر اپنی قربانی کرنا

۱۸۶۱- سوال: ایک شخص مال دار اور صاحب نصاب ہے، اس نے جہالت و ناواقفیت کی وجہ سے جانور خرید کر یہ نیت کی کہ حضور ﷺ کے نام کی قربانی کروں گا، پھر مسئلہ معلوم ہوا کہ خود اس پر قربانی کرنا واجب ہے، تو کیا وہ نیت بدل کر واجب قربانی کرے اور حضور ﷺ کی قربانی کو چھوڑ دے یا یہ جانور

(۱) (وأما) (شرائط الوجوب): منها اليسار وهو ما يتعلق به وجوب صدقة الفطر دون ما يتعلق به وجوب الزكاة، ... والموسر في ظاهر الرواية من له مائتا درهم، أو عشرون دينارا، أو شيء يبلغ ذلك سوى مسكنه، ومتاع مسكنه، ومركوبه، وخادمه في حاجته التي لا يستغني عنها. (الفتاوى الهندية: ۲۹۲/۵، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر-بيروت)

حضور ﷺ کے لیے رکھے اور اپنے لیے نیا جانور خریدے؟ واضح رہے کہ فی الحال اتنی گنجائش نہیں کہ وہ دوسرا جانور خرید سکے۔ یا ایسا کرے کہ اس سال اپنی جانب سے قربانی کرے اور آئندہ سال اگر وسعت ہو، تو حضور ﷺ کے نام کی قربانی کرے؟ خلاصہ یہ ہے کہ کیا حضور ﷺ کی جانب سے قربانی کرنا اس پر واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

مال دار یعنی صاحب نصاب پر اپنی طرف سے قربانی کرنا واجب اور ضروری ہے، اس کو ترک کرنے کی گنجائش نہیں ہے، مذکورہ جانور محض دل میں نیت کرنے سے حضور مقبول ﷺ کی طرف سے قربانی کے لیے متعین نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اگر وسعت دی ہے، تو حضرت رسول مقبول ﷺ کی طرف سے بھی قربانی دے، یہ قربانی نفل ہوگی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] کسی پیر کے کہنے پر قربانی میں جانور کو ذبح کرنے کے بجائے اُس کی قیمت، یا زندہ جانور دینا اور قربانی کے جانور کا خون پینا کیسا ہے؟

۱۸۶۰- سوال: بعد سلام، عرض ہے کہ مندرجۂ ذیل سوال کا جواب دے کر ممنون فرمائیں!

---

(۱) وأما الذي يجب على الفقير دون الغني فالمشترى للأضحية إذا كان المشتري فقيرا، بأن اشترى فقير شاة ينوي أن يضحي بها، وإن كان غنيا لا تجب عليه بشراء شيء، ولو ملك إنسان شاة فنوى أن يضحي بها، أو اشترى شاة ولم ينو الأضحية وقت الشراء ثم نوى بعد ذلك أن يضحي بها لا تجب عليه سواء كان غنيا أو فقيرا. (الفتاوى الهندية: ۲۹۱/۵، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر-بيروت)

قال الكرماني في مناسكه: وإذا اشترى شاة يريد أضحية في ضميره ففي ظاهر المذهب لا تصير أضحية حتى يوجبها بلسانه لكن المذهب والفتوى على أن ينظر إن كان المشتري غنيا لا يصير واجبا في الروايات كلها؛ لأنها واجبة في ذمته فلا يحتاج إلى التعيين، وإن كان فقيرا ففي ظاهر الرواية يجب أن يتعين بالعقد فإن وهب له أو تصدق عليه فنوى بقلبه لا تصير أضحية بالإجماع؛ لأن العقد لا يصلح للتعين في الإيجاب، وكذا لو كانت الشاة عنده فأضمر بقلبه الأضحية لا تصير أضحية بالإجماع. (حاشية الشلبي على تبيين الحقائق-شهاب الدين أحمد بن محمد أحمد بن يونس بن إسماعيل بن يونس الشِّلْبِيُّ (م: ۱۰۲۱ هـ): ۵/۶، كتاب الأضحية، من تجب عليه الأضحية، ط: المطبعة الكبرى الأميرية-بولاق، القاهرة)

(۱) بہت سے پیر اپنے مریدین سے کہتے ہیں کہ قربانی کی قیمت یا قربانی کا جانور بلا ذبح کیے، زندہ دے دینے سے بھی قربانی ادا ہو جاتی ہے۔

(۲) جو مرید اپنے یہاں خود جانور ذبح کرتے ہیں، اُن کو پیر صاحب کہتے ہیں کہ قربانی کے جانور کا خون پینا مبارک عمل ہے۔

(۳) پیر صاحب مریدین سے جانوروں کی کھال لیتے ہیں اور فروخت کر کے قیمت اپنے ذاتی استعمال میں لاتے ہیں، کیا پیر صاحب کو کھال دے سکتے ہیں؟ اور پیر صاحب کی باتوں پر عمل کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

قربانی کے دِنوں میں قربانی کا جانور ذبح کرنا ضروری ہے، جانور یا جانور کی قیمت دینے سے قربانی ادا نہیں ہوگی، قربانی کے دِنوں میں جانور ذبح کرنے پر جو ثواب ملتا ہے اور اللہ کی رضامندی حاصل ہوتی ہے وہ ثواب ہزاروں یا لاکھوں روپے کا صدقہ کر دینے سے بھی حاصل نہیں ہوگا، اِس لیے کہ غلام کا کام اپنے آقا کی فرماں برداری کرنا ہے، قربانی کے دِنوں میں قربانی کرنے سے اللہ کے حکم کی بجا آوری ہوگی اور اُس پر ثواب ملے گا، نقد روپیہ دینے سے حکم کی بجا آوری نہیں ہوگی، لہٰذا جانور دینے سے یا جانور کی قیمت کا صدقہ کرنے سے قربانی کا ثواب نہیں ملے گا۔[1] دنیا میں ایک سیٹھ اپنے ملازم سے پانی طلب کرے اور ملازم شربت یا دودھ وکولڈ ڈرنک دے، تو ظاہر سی بات ہے کہ سیٹھ ناراض ہو جائے گا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ قربانی کے دِنوں میں اللہ کا حکم جانور کی قربانی کرنے کا ہے، لہٰذا نقد روپے یا جانور پیر کو دینے سے گناہ ہوگا اور قربانی بھی ادا نہیں ہوگی، غلط مسائل بتانے والا آدمی فاسق و فاجر اور گنہگار ہے، ایسے جاہل آدمی کو پیر بنانا جائز نہیں ہے، حرام ہے، ایسا آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق گمراہ کرنے والوں میں سے ہے، قیامت کے قریب ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو

---

(۱) عن عائشة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ما عمل آدمي من عمل يوم النحر أحب إلى الله من إهراق الدم، إنه ليأتي يوم القيامة بقرونها وأشعارها وأظلافها، وأن الدم ليقع من الله بمكان قبل أن يقع من الأرض، فطيبوا بها نفسا.

(سنن الترمذي: ۱/ ۲۷۵، رقم الحديث: ۱۴۹۳، أبواب الأضاحي، باب ما جاء في فضل الأضحية، ط: ديوبند)

ومنها أنه لا يقوم غيرها مقامها في الوقت، حتى لو تصدق بعين الشاة أو قيمتها في الوقت لا يجزئه عن الأضحية.

(الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۳-۲۹۴، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها)

بھی گمراہ کریں گے۔"(۲)

ایسے آدمی کو پیر بنانا جائز نہیں ہے، جو اپنا پیٹ پالنے کے لیے لوگوں کو غلط مسائل بتاتا ہے، ایسے شخص کے ساتھ تعلقات رکھنا بھی جائز نہیں ہے۔

(۲) دمِ سائل [بہتا ہوا خون] پینا حرام ہے، قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ...الآية"(۳)

ترجمہ: تم پر حرام کیے گئے ہیں مردار، اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور کہ غیر اللہ کے نام زد کردیا گیا ہو۔

لہٰذا خون پینا حرام ہے، اور جو شخص قرآن کی حرام کردہ چیزوں کی حلت کا جان بوجھ کر فتویٰ دے، اُس کا ایمان جاتا رہتا ہے اور وہ کافر ہو جاتا ہے، ایسے کافر کے ہاتھوں بیعت ہونا اور اُس کو پیر بنانا حرام ہے۔(۴)

(۳) پیر کو کھال دینا جائز ہے، لیکن ایسا شخص جس کے عقائد صحیح نہ ہوں، لوگوں کو گمراہ کرتا ہو، اپنا پیٹ پالنے کے لیے لوگوں کو غلط باتیں بتاتا ہو، اسلامی عقائد اور مسائل سے ناواقف ہو، ایسے شخص کو پیر بنانا حرام ہے، جو اُس کا ساتھ دے گا، وہ گنہگار ہوگا، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ②"(۵)

---

(۲) عن عبد الله بن عمرو بن العاص قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن الله لا يقبض العلم انتزاعا ينتزعه من العباد، ولكن يقبض العلم بقبض العلماء، حتى إذا لم يبق عالما اتخذ الناس رءوسا جهالا، فسئلوا فأفتوا بغير علم، فضلوا وأضلوا. (صحيح البخاري: ۱/۲۰، رقم الحديث: ۱۰۰، كتاب العلم، باب: كيف يقبض العلم، ط: ديوبند ☆ الصحيح لمسلم: ۲/۳۴۰، رقم الحديث: ۱۳-(۲۶۷۳)، كتاب العلم، باب رفع العلم وقبضه وظهور الجهل والفتن في آخر الزمان، ط: ديوبند)

(۳) ۵-المائدة: ۳.

(۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۸۷. (۵-المائدة: ۸۷)

ولا نكفر أحدا من أهل القبلة بذنب ما لم يستحله. ــــــــــ قال الألباني تعليقا عليه: قلت: يعني استحلالا قلبيا اعتقاديا وإلا فكل مذنب مستحل لذنبه عمليا أي مرتكب له ولذلك فلابد من التفريق بين المستحل اعتقادا فهو كافر إجماعا وبين المستحل عملا لا اعتقادا فهو مذنب يستحق العذاب اللائق به إلا أن يغفر الله له ثم ينجيه إيمانه. (عقيدة الطحاوي - أبو جعفر أحمد بن محمد بن سلامة بن عبد الملك بن سلمة الأزدي الحجري المصري المعروف بالطحاوي (م: ۳۲۱ھ) ص: ۶۰، رقم: ۵۷، ت: محمد ناصر الدين الألباني، ط: المكتب الإسلامي - بيروت)

(۵) ۵-المائدة: ۲.

نیک کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ وظلم کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو؛ لہٰذا ایسے غلط عقیدہ آدمی کا ساتھ دینا اور اُس کو کھال دینا جائز نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] نماز نہ پڑھنے والے کی قربانی قبول ہوگی یا نہیں؟

۱۸۶۳- سوال: ''فضائلِ نماز'' (شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی مشہور کتاب) میں ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ: مسلمان نماز نہ پڑھے، تو اُسے ۱۵ر قسم کے عذاب ہوں گے، جن میں سے پانچ دنیا میں ہوں گے، اِن پانچ میں ایک وعید یہ بھی ہے کہ نماز کے بغیر آدمی کا کوئی بھی عمل قابلِ قبول نہیں ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ بالکل نماز نہیں پڑھتے اور عید کے دِن قربانی کرتے ہیں، تو کیا اُن کا یہ عمل قبول ہوگا؟

الجواب حامداومصلیا:

قربانی، زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر وغیرہ دیگر فرائض وواجبات [اگر حدود وقیود اور شرائط وارکان کا لحاظ کرکے انجام دیے ہوں، تو] ادا ہوجائیں گے، یعنی دنیا میں اس کا ذمہ بری ہوجائے گا، البتہ قبول کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] عقیقہ کیے بغیر قربانی کرنے کا حکم

۱۸۶۴- سوال: ایک شخص کا عقیقہ نہ کیا گیا ہو اور وہ قربانی کرے، تو کیا اس کی قربانی ہوجائے گی؟

الجواب حامداومصلیا:

عقیقہ مستحب ہے،[۲] عقیقہ کیے بغیر بھی کوئی اپنی قربانی کرے، تو ہوجائے گی، اس میں شک کی کوئی وجہ نہیں ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (وأما) (حکمها): فالخروج عن عهدة الواجب في الدنیا والوصول إلی الثواب بفضل الله تعالی في العقبی، کذا في الغیاثیة. (الفتاوی الهندیة: ۵/ ۲۹۲، کتاب الأضحیة، الباب الأول في تفسیر الأضحیة ورکنها وصفتها...، ط: دار الفکر)

(۲) وإنما أخذ أصحابنا الحنفیة في ذلك بقول الجمهور، وقالوا باستحباب العقیقة. (إعلاء السنن: ۱۷/ ۱۱۳، کتاب الذبائح، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامیة، کراتشي)

(۳) من لم یعق عنه أجزأته أضحیته. (المصدر السابق: ۱۷/ ۱۲۶-۱۲۷، کتاب الذبائح)

[۲۷] چھوٹے بچے اور مجنون پر قربانی واجب ہے یا نہیں؟

۱۸۶۵-سوال: ایسے چھوٹے بچے اور مجنون، جو صاحب نصاب ہوں، ان پر قربانی واجب ہے یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

وجوب قربانی کی شرائط میں سے عقل وبلوغ ہے؛ لہٰذا چھوٹے بچے اور مجنون پر قربانی واجب نہیں ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

---

(۱) قربانی کے وجوب کے لیے ''عقل وبلوغ'' شرط ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں علماء احناف کے درمیان اختلاف ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بلوغ وعقل قربانی کے شرائط وجوب میں سے نہیں ہے؛ لہٰذا ان دونوں حضرات کے نزدیک بچے اور مجنون اگر مال دار ہوں، تو ان پر قربانی واجب ہوگی، اور ان کے باپ اور وصی کے لیے ان کی طرف سے قربانی کرنا لازم ہوگا، اگر باپ یا وصی نے قربانی نہیں کی، تو بلوغ وافاقے کے بعد ان دونوں پر اس قربانی کا ضمان دینا لازم ہوگا۔ اگر ان کے باپ نے ان کے مال سے ان کی طرف سے قربانی کردی، تو ضامن نہیں ہوگا۔ جب کہ حضرت امام محمد اور امام زفرؒ عقل وبلوغ کو شرائط وجوب میں گردانتے ہیں؛ لہٰذا باپ اگر اپنے بچے یا مجنون بیٹے کی جانب سے اسی کے مال سے قربانی کردے، تو باپ پر اس مال کا ضمان لازم آئے گا۔ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ بعض متاخرین احناف نے لکھا ہے کہ قربانی کے مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، بل کہ تمام کا اتفاق ہے کہ بچے اور مجنون کے مال میں قربانی واجب نہیں ہوگی۔ صاحب بدائع نے اس مسئلے میں اتفاق نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے؛ بل کہ صحیح یہی ہے کہ اس مسئلے میں بھی ویسا ہی اختلاف ہے، جیسا کہ صدقۂ فطر کے مسئلے میں ہے:

وأما البلوغ والعقل فليسا من شرائط الوجوب في قول أبي حنيفة وأبي يوسف، وعند محمد وزفر هما من شرائط الوجوب، حتى تجب الأضحية في مال الصبي والمجنون إذا كانا موسرين عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله؛ حتى لو ضحى الأب أو الصبي من مالهما لا يضمن عندهما، وعند محمد وزفر رحمهما الله يضمن، وهو على الاختلاف الذي ذكرنا في صدقة الفطر والحج ذكرت هنالك، ومن المتأخرين من قال لا خلاف بينهم في الأضحية أنها لا تجب في مالهما؛ لأن القربة في الأضحية هي إراقة الدم، وأنها إتلاف ولا سبيل إلى إتلاف مال الصغير، والتصدق باللحم تطوع ولا يجوز ذلك في مال الصغير، والصغير في العادة لا يقدر على أن يأكل جميع اللحم، ولا يجوز بيعه ولا سبيل للوجوب رأسا، والصحيح أنه على الاختلاف، وتجب الأضحية عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله ولا يتصدق باللحم لما قلنا لكن يأكل منها الصغير ويدخر له قدر حاجته، ويبتاع بالباقي ما ينتفع بعينه، كابتياع البالغ بجلد الأضحية ما ينتفع بعينه. (بدائع الصنائع: ۶۴/۵، كتاب التضحية، فصل في شرائط وجوب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

اسی اختلاف کی وجہ سے استاذ محترم، فقیہ عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم رقم طراز ہیں: =

[۲۸] چھوٹے بچے کی جانب سے باپ کا قربانی کرنا

۱۸۶۶- سوال: اگر بچے پر قربانی واجب نہیں ہے اور باپ ادا کرنا چاہے، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس طریقے سے چھوٹے بچے پر قربانی واجب نہیں ہے، لڑکے کے باپ پر بھی لڑکے کی قربانی واجب نہیں ہے؛ لیکن اگر باپ بچے کی جانب سے نفل قربانی ادا کرنا چاہے، تو ادا ہو جائے گی۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] نابالغ بچے کے مال میں سے کی گئی قربانی کے گوشت کا حکم

۱۸۶۷- سوال: نابالغ بچے کے مال میں سے قربانی ادا کی ہو، تو گوشت کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اِس گوشت کو تقسیم کرنا جائز نہیں ہے، بچے کا باپ اُسے خشک کر کے رہنے دے، یا گوشت کو بیچ کر بچے کے لیے کپڑے، موزے وغیرہ خرید لے۔ (۲)

یہ حکم اُس وقت ہے جب کہ بچے کے مال میں سے قربانی کی ہو، اگر باپ نے اپنے مال میں سے قربانی کی ہے تو اُس کا حکم عام قربانی کی طرح ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= قربانی ایک عبادت ہے، اور شریعت عبادتیں بالغوں پر واجب قرار دیتی ہے، نہ کہ نابالغوں پر، اسی لیے نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ بچہ پر واجب نہیں، یہی حکم قربانی کا بھی ہے، کہ قول صحیح کے مطابق نابالغ پر قربانی واجب نہیں ہوگی، البتہ اگر ولی ایسے نابالغ بچوں کی طرف سے اپنے مال میں سے قربانی کر دے تو بہتر اور قرین احتیاط ہے، چناں چہ مشہور فقیہ قاضی فخر الدین اوز جندیؒ فرماتے ہیں: "وفي الكافي الأصح أنه لا يجب ذلك... وليس للأب أن يفعله من مال الصغير". (فتاوی قاضی خان: ۳/ ۳۴۶، نیز دیکھیے: البحر الرائق :۸/ ۱۷۴، الفتاوی الہندیۃ: ۵/ ۲۹۳) [کتاب الفتاوی: ۴/ ۱۳۲، قربانی اور عقیقہ سے متعلق سوالات، کیا نابالغ پر قربانی واجب ہے؟ ط: نعیمیہ- دیوبند]

(۱) سوال سابق کا حاشیہ ملاحظہ کریں۔

(۲) ثم فرع على القول الأول بقوله (وأكل منه الطفل) وادخر له قدر حاجته (وما بقي يبدل بما ينتفع) الصغير (بعينه) كثوب وخف لا بما يستهلك كخبز ونحوه ابن كمال. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۳۱۷، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

... يأكل منها الصغير ويدخر له قدر حاجته، ويبتاع بالباقي ما ينتفع بعينه، كابتياع البالغ بجلد الأضحية ما ينتفع بعينه. (بدائع الصنائع: ۵/ ۶۴، كتاب التضحية، فصل في شرائط وجوب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۳۰] باپ نے چھوٹے بچے کی قربانی اپنے مال سے کی ہو، تو اُس کے گوشت کا حکم

۱۸۶۸- سوال: باپ نے بچے کی طرف سے قربانی کی ہو، لیکن اپنے مال کا استعمال کیا ہو، تو اُس کے گوشت کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

باپ اپنی قربانی کا ثواب بچے کو عطا کرے، یا بچے کی طرف سے قربانی کرے، اُس کا حکم وہی ہے جو باپ کا اپنی قربانی کا ہے، اُس کے تین حصے کر کے ایک حصہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے، دوسرا حصہ رشتہ داروں کے لیے اور ایک حصہ فقراء کے درمیان تقسیم کر دے، یا پورا گوشت اپنے استعمال میں لے۔[۱]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] قربانی کا جانور مر جانے پر صاحب نصاب کے لیے حکم

۱۸۶۹- سوال: ایک خاتون ہے، جس پر حج یا زکوۃ فرض نہیں ہے، اس کے پاس دو بکرے

---

(۱) وإن تبرع بها عنه له الأكل لأنه يقع على ملك الذابح والثواب للميت. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/۳۳۵، كتاب الأضحية، فروع: لون أضحيته-عليه الصلاة والسلام-سوداء، ط: دار الفكر-بيروت)

والأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة، أو صوما، أو صدقة، أو قراءة قرآن، أو ذكرا، أو طوافا، أو حجا، أو عمرة، أو غير ذلك عند أصحابنا للكتاب والسنة، أما الكتاب فلقوله تعالى {وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا} [الاسراء:24]، وإخباره تعالى عن ملائكته بقوله {ويستغفرون للذين آمنوا} [غافر:7] وساق عبارتهم بقوله تعالى {ربنا وسعت كل شيء رحمة وعلما فاغفر للذين تابوا واتبعوا سبيلك} [غافر:7] إلى قوله {وقهم السيئات} [غافر:9]، وأما السنة فأحاديث كثيرة منها ما في الصحيحين، حين ضحى بالكبشين فجعل أحدهما عن أمته، ... فإن من صام، أو صلى، أو تصدق، وجعل ثوابه لغيره من الأموات والأحياء جاز، ويصل ثوابها إليهم عند أهل السنة والجماعة كذا في البدائع، وبهذا علم أنه لا فرق بين أن يكون المجعول له ميتا أو حيا. (البحر الرائق: ۳/۶۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي-المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/۱۷۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ الاختيار لتعليل المختار-ابن مودود الموصلي (م: ۶۸۳هـ): ۴/۱۶۹، كتاب الكراهية، فصل في الكلام، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي-القاهرة)

إذا ضحى رجل عن أبويه بغير أمرهما وتصدق به جاز؛ لأن اللحم ملكه، وإنما للميت ثواب الذبح والصدقة. (فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۳/۳۵۲، كتاب الأضحية، قبيل: فصل في العيوب ما يمنع الأضحية وما لا يمنع، ط: زكريا-ديوبند)

تھے، اس نے ارادہ کیا کہ ایک بکرے کی قربانی کرے؛ لیکن وہ مر گیا، دوسرا بکرا خریدنے کی طاقت نہیں ،شریعت کا کیا حکم ہے، کیا اس پر قربانی کرنا واجب ہوگا؟

الجواب حامداو مصلیا:

بکرا ذاتی تھا، اس کی قربانی کا ارادہ تھا؛ لیکن مر گیا، تو دوسرا بکرا خرید کر قربانی کرنا واجب نہیں۔

(عالمگیری: ۵/ ۱۱۱ ☆ شامی: ۵/ ۲۸)[1]

جاننا چاہیے کہ جس پر صدقہ فطر واجب ہے، اس پر قربانی واجب ہے، یعنی ضرورت سے زائد ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کا جو شخص مالک ہو، اس پر قربانی واجب ہے، چاہے مال کے نامی نہ ہونے کی وجہ سے یا حولان حول کی وجہ سے اس پر زکوۃ فرض نہ ہو۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

---

[۱] ولو ملك إنسان شاة فنوى أن يضحي بها، أو اشترى شاة ولم ينو الأضحية وقت الشراء ثم نوى بعد ذلك أن يضحي بها لا تجب عليه سواء كان غنيا أو فقيرا. (الفتاوى الهندية: ۲۹۱/۵، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسيرها وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها وفي بيان من تجب عليه ومن لا تجب، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) واضح رہے کہ زکوۃ اور قربانی کے نصاب میں یہ بات قدرے مشترک ہے کہ آدمی ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا یا اس کے بہ قدر اتنے مال کا مالک ہو، جو اس کی ضرورت اصلیہ سے زائد ہو، فرق صرف اتنا ہے کہ زکوۃ واجب ہونے کے لیے اس مال کا نامی ہونا اور اس پر سال کا گذرنا شرط ہے، جب کہ قربانی اور صدقۃ الفطر کے واجب ہونے کے لیے نہ تو مال کا نامی ہونا شرط ہے اور نہ ہی اس پر حولان حول (سال کا گذرنا) شرط ہے۔ لہٰذا وہ کپڑے جو ضرورت سے زائد ہوں؛ لیکن تجارت کے لیے نہ ہوں اور ان کی قیمت نصاب زکوۃ کو پہنچتی ہو، تو اس صورت میں صدقۃ الفطر اور قربانی واجب ہوگی؛ لیکن زکوۃ واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ یہ مال نامی نہیں ہے:

ثم لا بد من معرفة حد الغنى فنقول الغنى أنواع ثلاثة: غنى تجب به الزكاة، وغنى يحرم به أخذ الصدقة وقبولها ولا تجب به الزكاة، وغنى يحرم به السؤال ولا يحرم به الأخذ أما الغنى الذي تجب به الزكاة فهو أن يملك نصابا من المال النامي الفاضل عن الحاجة الأصلية.

وأما الغنى الذي يحرم به أخذ الصدقة وقبولها فهو الذي تجب به صدقة الفطر والأضحية وهو أن يملك من الأموال التي لا تجب فيها الزكاة ما يفضل عن حاجته وتبلغ قيمة الفاضل مائتي درهم من الثياب والفرش والدور والحوانيت والدواب والخدم زيادة على ما يحتاج إليه كل ذلك للابتذال والاستعمال لا للتجارة والإسامة، فإذا فضل من ذلك ما يبلغ قيمته مائتي درهم وجب عليه صدقة الفطر والأضحية وحرم عليه أخذ الصدقة. (بدائع الصنائع: ۴۸/۲، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى إليه، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۳۲] کھیت کی قیمت نصاب کے برابر ہو، تو قربانی واجب ہوگی

۱۸۷۰- سوال: ایک شخص کے پاس اِتنا بڑا کھیت ہے، جو نصاب کی قیمت کو پہنچ جاتا ہے، تو کیا اِس کھیت کی وجہ سے اُس پر قربانی واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا

کھیت کی پیداوار میں سے گھر کے تمام افراد کے سالانہ گذر بسر کے بعد بقیہ رقم اگر نصاب کے بقدر ہوجاتی ہے، تو قربانی واجب ہوگی، مثلاً اگر کھیت دس بیگھا کا ہے، جن میں سے چھ بیگھا کی پیداوار سالانہ گذر بسر کے لیے کافی ہوجاتی ہے، تو بقیہ چار بیگھا کی پیداوار کی قیمت اگر نصاب تک پہنچ جاتی ہے، تو قربانی واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] قربانی کا جانور خریدنے کے لیے روانہ کی ہوئی مشترک رقم کا ہلاک ہوجانا

۱۸۷۱- سوال: گذشتہ سال قربانی کے موقع پر ہم چند دوستوں نے مل کر چار بڑے جانوروں کی رقم لندن سے ہندوستان بذریعۂ رجسٹری ایک دار العلوم میں روانہ کی تھی، لیکن اتفاق سے وہ رقم راستہ ہی میں چوری ہوگئی اور دار العلوم تک نہیں پہنچ سکی، اِس رقم کے ذریعہ جو چار بڑے جانور خریدے جانے والے تھے، اُن میں بعض حصے واجب اور بعض نفل قربانی کے تھے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اِس سال ہمیں دو بارہ اُسی قربانی کی قضا کرنی ہوگی؟ یا اِسی قدر رقم غرباء کو صدقہ کردیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

صورتِ مسئولہ میں قربانی کی رقم جانوروں کے خریدے جانے سے پہلے چوری ہوگئی، تو اب جن

---

(۱) وإن كان له عقار ومستغلات ملك اختلف المشايخ المتأخرون - رحمهم الله تعالى - فالزعفراني والفقيه علي الرازي اعتبرا قيمتها، وأبو علي الدقاق وغيره اعتبروا الدخل، واختلفوا فيما بينهم، قال أبو علي الدقاق: إن كان يدخل له من ذلك قوت سنة فعليه الأضحية، ومنهم من قال: قوت شهر، ومتى فضل من ذلك قدر مائتي درهم فصاعدا فعليه الأضحية. (الفتاوى الهندية: ۵/۲۹۲، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر)

لوگوں پر قربانی واجب تھی، اُن کے لیے اپنی قربانی کی قیمت کا صدقہ کرنا ضروری ہے، قربانی کی قضاء نہیں، دوسرے سال اگر قربانی ادا کرے گا، تو نفل شمار ہوگی، اور پہلے سال والی قربانی کی جانب سے کفایت نہیں کرے گی۔

اور جن لوگوں کے قربانی میں نفلی حصے تھے، اُن پر کوئی صدقہ واجب نہیں ہے، اگر اپنی نیت کے لحاظ سے صدقہ کردیں تو کارِثواب ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔ (درمختار: ۳۲۱/۶)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] وكذا لو ماتت فعلى الغني غيرها لا الفقير. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳۲۵/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

ولو لم يضح حتى مضت أيام النحر فقد فاته الذبح، فإن كان أوجب على نفسه شاة بعينها بأن قال: لله علي أن أضحي بهذه الشاة، سواء كان الموجب فقيرا أو غنيا، أو كان المضحي فقيرا وقد اشترى شاة بنية الأضحية فلم يفعل حتى مضت أيام النحر تصدق بها حية، وإن كان من لم يضح غنيا ولم يوجب على نفسه شاة بعينها تصدق بقيمة شاة اشترى أو لم يشتري، كذا في العتابية. (الفتاوى الهندية: ۲۹۶/۵، كتاب الأضحية، الباب الرابع فيما يتعلق بالمكان والزمان، ط: دار الفكر)

ومنها أنها تقضى إذا فاتت عن وقتها، ثم قضاؤها قد يكون بالتصدق بعين الشاة حية، وقد يكون بالتصدق بقيمة الشاة، فإن كان قد أوجب التضحية على نفسه بشاة بعينها فلم يضحها حتى مضت أيام النحر فيتصدق بعينها حية سواء كان موسرا أو معسرا، وكذا إذا اشترى شاة ليضحي بها فلم يضح حتى مضى الوقت. (الفتاوى الهندية: ۲۹۴/۵، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر)

فإن لم يفعل ذلك حتى جاء أيام النحر من العام القابل فضحى بها عن العام الماضي لم يجز. (المصدر السابق: ۲۹۷/۵، الباب الرابع فيما يتعلق بالمكان والزمان)

عن بلال بن أبي الدرداء، عن أبيه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم " ضحى بكبشين جذعين خصيين - أو قال: موجوءين - ". (مسند ابن أبي شيبة- أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵ھ): ۱/۵۱، رقم الحديث: ۴۱، مسند خزيمة بن ثابت، ت: عادل بن يوسف العزازي و أحمد بن فريد المزيدي، ط: دار الوطن- الرياض)

عن أبي سلمة، عن عائشة، أو أبي هريرة: "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ضحى بكبشين سمينين عظيمين أملحين أقرنين موجيين". (مسند أحمد بن حنبل: ۴۱/۴۹۷، رقم الحديث: ۲۵۰۴۶، مسند النساء، مسند الصديقة عائشة بنت الصديق رضي الله عنها، ط: الرسالة- بيروت)

باب في أفضل الضحايا وفيما يجوز منها و ما لا يجوز

[قربانی کے لیے افضل اور ناجائز جانور کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب في أفضل الضحايا وفيما يجوز منها و ما لا يجوز

[قربانی کے لیے افضل اور ناجائز جانور کا بیان]

[ا] قربانی میں کون سا جانور ذبح کرنا افضل ہے؟

۱۸۷۲- سوال: قربانی میں کون سا جانور ذبح کرنا چاہیے؟ بکرے کا ثواب زیادہ ہے یا گائے کا؟ درخواست ہے کہ تفصیل سے وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

گائے اور بکرے دونوں میں اگر بکرے کی قیمت زیادہ ہے، تو بکرے کی قربانی کرنے میں زیادہ ثواب ملے گا؛ مثلاً: گائے کی قیمت اگر تین سو پچیس روپیہ (۳۲۵) ہے اور بکرے کی قیمت تین سو تیس روپیہ (۳۳۰) ہے، تو بکرے کی قربانی میں زیادہ ثواب ملے گا اور اگر دونوں کی قیمت برابر ہے، تو بکرے کی قربانی میں زیادہ ثواب ملے گا؛ کیوں کہ اس کا گوشت گائے کے گوشت کے مقابلہ میں زیادہ اچھا ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ گوشت اور قیمت دونوں برابر ہوں، تو جس کا گوشت زیادہ اچھا ہو، اس کی قربانی

میں زیادہ ثواب ملے گا؛ ورنہ جس جانور کی قیمت زیادہ ہوگی، اس کی قربانی میں زیادہ ثواب ملے گا۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

[۲] قربانی کے جانور کی پسلی کا ٹوٹ جانا

۱۸۷۳- سوال: قربانی کے جانور کی پسلی ٹوٹ گئی؛ لیکن اس میں کوئی نقص معلوم نہیں ہو رہا ہے، تو کیا اس کی قربانی صحیح ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامدا ومصلیا:

جانور چلنے پر قادر ہو، اور گھاس چارا کھاتا ہو، تو اس کی قربانی جائز ہے، کوئی حرج نہیں ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

[۳] کان کٹے ہوئے بکرے کو ٹانکیں لے کر جوڑ دیا گیا، تو اس کو قربان کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

۱۸۷۴- سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ:

ہمارے پاس قربانی کا ایک بکرا ہے، جس کا ایک کان دو پوروں کے بقدر کٹ گیا ہے، ڈاکٹر کے

---

(۱) البقرة أفضل من الشاة في الأضحية إذا استويا في القيمة؛ لأنها أعظم وأكبر، والشاة أفضل من سبع البقرة، وإذا استويا في القيمة، واللحم؛ لأن الشاة أفضل من سبع البقرة، وإن استويا في القيمة، واللحم؛ لأن لحم الشاة أطيب، وإن كان سبع البقرة أكثر لحماً، فسبع البقرة أفضل، والأصل في هذا أنهما إذا استويا في اللحم والقيمة فأطيبهما لحماً أفضل، وإذا اختلفا في القيمة واللحم، والفاضل أولى. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶هـ):۶/ ۹۳، كتاب الأضحية، الفصل الخامس في بيان ما يجوز في الضحايا وما لا يجوز... الخ، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆رد المحتار على الدر المختار:۶/ ۳۲۲، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر- بيروت☆ الفتاوى الهندية:۵/ ۲۹۹، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر- بيروت ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام-محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا- أو منلا أو المولى-خسرو (م:۸۸۵هـ):۱/ ۲۶۹، كتاب الأضحية، مايصح للأضحية، ط: دار إحياء الكتب العربية)

(۲) وأما الذي يرجع إلى محل التضحية فنوعان: أحدهما: سلامة المحل عن العيوب الفاحشة؛ فلا تجوز العمياء ولا العوراء البين عورها والعرجاء البين عرجها وهي التي لا تقدر تمشي برجلها إلى المنسك... الخ. (بدائع الصنائع: ۵/ ۷۵، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

پاس لے گئے، تو انہوں نے تین ٹانکیں لے کر اس کو جوڑ دیا ہے، اب بالکل صحیح معلوم ہو رہا ہے، اس میں کوئی عیب نظر نہیں آرہا ہے؛ لیکن اس کے دونوں کان اتنے بڑے ہیں کہ آنکھیں ڈھک جاتی ہیں، تو کیا ایسے بکرے کی قربانی شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قربانی کا جانور ایسا پسند کرنا چاہیے، جس میں کسی قسم کا کوئی عیب نہ ہو، نہ چھوٹا نہ بڑا، جانور خوب صورت بھی ہو۔ (۱) البتہ کم عیب ہو، تو قربانی درست ہوگی اور عیب فاحش ہو، تو قربانی درست نہیں ہوگی، کس عضو کا ایک تہائی ضائع ہونا جانا 'عیب قلیل' ہے، لہٰذا اگر ایک تہائی کان کٹ گیا ہے، یا اس سے کم کٹا ہے، تو اس کی قربانی درست ہے، صورت مسئولہ میں کٹا ہوا کان سی دیا گیا ہے اور جڑ بھی گیا ہے، تو اس کی قربانی جائز ہے۔ (۲)

کان بڑے ہونے سے آنکھیں ڈھک جاتی ہیں، تو اس سے قربانی میں کوئی حرج نہ آئے گا، البتہ مستحب ہے کہ جانور ایسا ہونا چاہیے، جس میں کسی قسم کا عیب نہ ہو، اور وہ خوب صورت ہو۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

---

(۱) (وأما) الذي يرجع إلى الأضحية فالمستحب أن يكون أسمنها وأحسنها وأعظمها. (بدائع الصنائع: ۸۰/۵، كتاب التضحية، فصل في بيان ما يستحب قبل التضحية وبعدها وما يكره، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) (وأما صفته): فهو أن يكون سليما من العيوب الفاحشة، كذا في البدائع.... ولا تجوز العمياء والعوراء البين عورها، والعرجاء البين عرجها وهي التي لا تقدر أن تمشي برجلها إلى المنسك، والمريضة البين مرضها، ومقطوعة الأذنين والألية والذنب بالكلية، والتي لا أذن لها في الخلقة، وتجزئ السكاء وهي صغيرة الأذن فلا تجوز مقطوعة إحدى الأذنين بكمالها والتي لها إذن واحدة خلقة، ولو ذهب بعض هذه الأعضاء دون بعض من الأذن والألية والذنب والعين، ذكر في الجامع الصغير: إن كان الذاهب كثيرا يمنع جواز التضحية، وإن كان يسيرا لا يمنع، واختلف أصحابنا بين القليل والكثير فعن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - أربع روايات، وروى محمد - رحمه الله تعالى - عنه في الأصل وفي الجامع أنه إذا كان ذهب الثلث أو أقل جاز، وإن كان أكثر لا يجوز، والصحيح أن الثلث وما دونه قليل وما زاد عليه كثير، وعليه الفتوى، كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۲۹۷/۵، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر - بيروت☆تكملة رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۵/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

ويجوز السكاء في قول أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - وهي صغيرة الأذنين، بعد أن يسمى أذنا. (فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۳۵۳/۳، كتاب الأضحية، فصل في العيوب ما يمنع الأضحية وما لا يمنع، ط: زكريا - ديوبند)

[۴] لنگڑے دنبے کی قربانی

۱۸۷۵- سوال: ایک دنبہ قربانی کے لیے خریدا گیا، خریدنے کے بعد پاؤں میں شاید موچ آ گیا، یا کانٹا چبھ گیا، یا چوٹ لگ گئی، اب وہ زمین پر پاؤں نہیں رکھ پاتا ہے، تو کیا ایسے دنبے کی قربانی جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

وہ جانور، جو دائمی طور پر لنگڑا ہو اور زمین پر پاؤں بالکل نہ رکھتا ہو، اس کی قربانی جائز نہیں کانٹا چبھنے یا معمولی زخم آنے کی وجہ سے پیر میں صرف اس قدر لنگ پیدا ہو گیا ہو کہ پیر زمین پر رکھ کر، جھک کر چلتا ہو، تو ایسے جانور کی قربانی جائز ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] ایسے بکرے کی قربانی، جس کے پیر میں لنگ ہو

۱۸۷۶- سوال: میرے پاس قربانی کا جانور ہے، پچھلے پاؤں سے لنگڑا (ٹنج) ہے، لیکن اس پیر پر بل دے کر چلتا ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ گجراتی زبان میں ٹنج ایک قسم کی بیماری ہے، جس میں جانور لنگڑا کر چلتا ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورہ جانور کی قربانی جائز ہے، کوئی حرج نہیں ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] جس جانور کے خصیے نہ ہوں، اس کی قربانی کا حکم

۱۸۷۷- سوال: جس جانور کے ایک خصیہ کا معمولی حصہ رہ گیا ہو اور اکثر حصہ خشک ہو گیا ہو، گویا خصی کیے ہوئے جانور جیسا ہو گیا ہو، تو کیا اس کی قربانی جائز ہے؟

---

(۱) والعرجاء التي تمشي بثلاث قوائم و لا تضع الرابعة على الأرض لا، وإن كانت تضعها وضعا ضعيفا إلا أنها تتمايل مع ذلك يجوز. (الفتاوى البزازية على هامش الهندية: ۶/ ۲۹۳، كتاب الأضحية، الباب الخامس في عيوبها، ط: زكريا بك ڈپو- دیوبند)

[۲] (قوله والعرجاء) أي التي لا يمكنها المشي برجلها العرجاء إنما تمشي بثلاث قوائم، حتى لو كانت تضع الرابعة على الأرض وتستعين بها جاز عناية. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۲۳، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

الجواب حامدا ومصلیا:

ایک خصیہ [گولی] نہ ہو یا دونوں نہ ہو، بہ ہر صورت قربانی جائز ہے۔ (ہدایہ)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] جس جانور کے آنکھ میں پھوڑا ہو، اس کی قربانی کا حکم

۱۸۷۸- سوال: جس جانور کی آنکھ میں پھوڑا ہو، کیا اس کی قربانی جائز ہے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

آنکھ میں پھوڑا ہو، مگر آنکھ کی بینائی مکمل ہو، متاثر نہ ہوئی ہو، تو قربانی جائز ہے اور اگر ایک تہائی بینائی ختم ہوگئی ہو، تو جائز نہیں ہے، بینائی معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو آنکھ تندرست ہے، اسے کھلا رکھا جائے اور پھوڑے والی آنکھ پر پٹی باندھ کر بند کردیا جائے، پھر چارہ دکھایا جائے، اگر تندرست آنکھ سے مثلاً تیس فٹ کی دوری سے چارہ دیکھ لیتا ہے، تو اب تندرست آنکھ پر پٹی باندھ دی جائے اور عیب دار آنکھ کھول دی جائے، پھر چارہ دکھایا جائے، اگر پھوڑے والی آنکھ سے اکیس یا بائیس فٹ کی دوری سے چارہ دیکھ لیتا ہے، تو اس کی قربانی درست ہے اور اگر بیس فٹ کی دوری سے نہیں دیکھ پاتا، تو یہ علامت ہے کہ اس کی ایک تہائی سے زائد بینائی ختم ہوگئی ہے، اس لیے اس کی قربانی جائز نہیں ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) عن بلال بن أبي الدرداء، عن أبيه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم "ضحى بكبشين جذعين خصيين - أو قال: موجوءين -". (مسند ابن أبي شيبة- أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م:۲۳۵هـ): ۵۱/۱، رقم الحديث:۴۱، مسند خزيمة بن ثابت، ت: عادل بن يوسف العزازي وأحمد بن فريد المزيدي، ط: دار الوطن - الرياض)

عن أبي سلمة، عن عائشة، أو أبي هريرة: "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ضحى بكبشين سمينين عظيمين أملحين أقرنين موجيين. (مسند أحمد بن حنبل: ۲۹۷/۴۱، رقم الحديث: ۲۵۰۴۶، مسند النساء، مسند الصديقة عائشة بنت الصديق رضي الله عنها، ط: الرسالة- بيروت)

قال: "ويجوز أن يضحي بالجماء"... "والخصي" لأن لحمها أطيب وقد صح "أن النبي صلى الله عليه وسلم ضحى بكبشين أملحين موجوءين". (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر، الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳هـ): ۳۵۹/۴، كتاب الأضحية، على من تجب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۲۹۹/۵، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر)

(۲) وإنما يعرف ذهاب قدر النصف أو الثلث من العين بأن تشد العين المعيبة بعد أن لا تعتلف الشاة يوما أو يومين، ثم يقرب العلف إليها قليلا قليلا، فإذا رأته من موضع أعلم ذلك الموضع، ثم تشد عينها الصحيحة ويقرب العلف إلى=

[۸] جس جانور کا ایک تھن بڑا اور دوسرا چھوٹا ہو، اس کی قربانی کرنا

۱۸۷۹- سوال: اگر قربانی کے جانور کا ایک تھن ایک بڑا اور ایک چھوٹا ہو، یا کسی جانور مثلا بکرا، دنبہ، بھینس یا بھینسا وغیرہ کے پیدائشی سینگ یا کان نہ ہو، تو قربانی میں کوئی حرج ہوگا؟

الجواب حامداومصلیا:

ایک تھن بڑا اور ایک تھن چھوٹا ہو، تو کوئی حرج نہیں ہے۔ (۱) دنبہ، بکرا، بھینسا وغیرہ جانور کے اگر پیدائشی سینگ نہ ہو، تو اس کی قربانی جائز ہے، (۲) لیکن اگر ایک کان یا دونوں کان نہ ہوں، تو اس کی قربانی جائز نہیں ہے، ہاں چھوٹے کان والے جانور کی قربانی جائز ہے۔ (درمختار) [۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الشاة قليلا قليلا، حتى إذا رأته من مكان أعلم ذلك المكان، ثم يقدر ما بين العلامة الأولى والثانية من المسافة، فإن كانت المسافة بينهما الثلث فقد ذهب الثلث وبقي الثلثان، وإن كان نصفا فقد ذهب النصف وبقي النصف، كذا في الكافي. (الفتاوى الهندية: ۲۹۸/۵، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۴/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) وفي الظهيرية: ولا بأس بالجداء، وهي الصغيرة الأطباء جمع طبي: وهو الضرع. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۴/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) وتجزي الجماء وهي التي لا قرن لها خلقة، وكذا مكسورة القرن تجزي لما روي أن سيدنا عليا-رضي الله عنه- سئل عن القرن فقال: لا يضرك، أمرنا رسول الله- صلى الله عليه وسلم- أن نستشرف العين والأذن. وروي أن رجلا من همذان جاء إلى سيدنا علي - رضي الله عنه - فقال: يا أمير المؤمنين البقرة عن كم؟ قال: عن سبعة، ثم قال: مكسورة القرن؟ قال: لا ضير، ثم قال: عرجاء؟ فقال: إذا بلغت المنسك، ثم قال سيدنا علي - كرم الله وجهه -: أمرنا رسول الله - صلى الله عليه وسلم - أن نستشرف العين والأذن. (بدائع الصنائع: ۷۶/۵، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(قوله ويضحي بالجماء) هي التي لا قرن لها خلقة وكذا العظماء التي ذهب بعض قرنها بالكسر أو غيره. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۳/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر-بيروت)

قال- رحمه الله-: (ويضحي بالجماء) التي لا قرن لها يعني خلقة لأن القرن لا يتعلق به مقصود وكذا مكسورة القرن بل أولى. (تكملة البحر الرائق: ۲۰۰/۸، كتاب الأضحية، الأضحية بالجماء، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۳] (ولا) (بالهتماء) التي لا أسنان لها... (والسكاء) التي لا أذن لها خلقة، فلو لها أذن صغيرة خلقة أجزأت، زيلعي. (الدر المختار) ــــــــ وفي الشامية: (قوله التي لا أذن لها خلقة) قال في البدائع: ولا تجوز مقطوعة إحدى الأذنين بكمالها والتي لها أذن واحدة خلقة اهـ (قوله فلو لها أذن صغيرة خلقة أجزأت) وهذه تسمى صمعاء=

[۹] جرسی جانور کی قربانی

۱۸۸۰-سوال: جرسی جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ سوال کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی قربانی جائز نہیں ہے۔

جرسی جانور کا تعارف: نر جانور کے منی کو انجکشن میں لے کر اس کو مادہ کے رحم میں ٹپکایا جاتا ہے، پھر اس سے بچہ پیدا ہوتا ہے، دوسری بات یہ کہ جس طرح بیل کو کوہان ہوتی ہے، جرسی جانور کو کوہان نہیں ہوتی ہے۔

الجواب حامداو مصلیا:

جرسی جانور کی قربانی کے تعلق سے فقہاء نے لکھا ہے کہ جنگلی بیل اگر پالتو گائے کے ساتھ جفتی کرے اور اس سے بچہ پیدا ہو، تو اس کی قربانی جائز ہے، اسی طرح جنگلی نر، بکری کے ساتھ جفتی کرے اور اس سے بچہ پیدا ہو، تو اس کی قربانی جائز ہے؛ کیوں کہ بچہ ماں کے تابع ہوتا ہے، لہٰذا اگر مادہ جنگلی نہ ہو، بل کہ پالتو ہو اور اس سے بچہ پیدا ہوا ہو، تو وہ بھی پالتو کے حکم میں ہوگا، جس کی قربانی جائز ہے اور اگر اس کے برعکس ہو جفتی کرنے والا بکرا یا بیل پالتو ہو اور مادہ جنگلی ہو، تو اس کے بچہ کی قربانی جائز نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=بمهملتين كما في القاموس .(رد المحتار على الدر المختار: ٣٢٣/٦، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر- بيروت☆بدائع الصنائع:٧٦/٥، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆ الفتاوى الهندية:٢٩٧/٥، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل الإقامة، ط: دار الفكر)

(١) وفي المتولد منهما تعتبر الأم، وكذا في حق الحل تعتبر الأم.(تبيين الحقائق)—— قال الشلبي:(قوله: وفي المتولد منهما تعتبر الأم) قال الأتقاني قال في خلاصة الفتاوى، ولو نزا كلب على شاة فولدت قال عامة المشايخ: لا يجوز، وقال الإمام الخيزاخزي: إن كان يشبه الأم يجوز، ولو نزا شاة على ظبي قال الإمام الخيزاخزي: إن كان يشبه الأب يجوز، ولو نزا ظبي على شاة، قال عامة المشايخ: يجوز، وقال الإمام الخيزاخزي: العبرة للمشابهة كذا في الخلاصة. اهـ. وكتب ما نصه فإن كانت أهلية يجوز، وإلا فلا حتى لو أن بقرة أهلية نزا عليها ثور وحش فولدت ولدا فإنه يجوز أن يضحي به، وإن كانت البقرة وحشية والثور أهليا لم يجز؛ لأن الأصل في المتولد الأم؛ لأنه ينفصل عن الأم، وهو حيوان متقوم تتعلق به الأحكام، وليس ينفصل من الأب إلا ماء مهينا لا خطر له، ولا يتعلق به حكم، وقيل إذا نزا ظبي على شاة أهلية فأولدت شاة يجوز التضحية بها، وإن ولدت ظبيا لا يجوز، وقيل إن ولدت الرمكة من حمار وحش حمارا لا يؤكل، وإن ولدت فرسا فحكمه حكم الفرس. اهـ بدائع. (حاشية الشلبي مع تبيين الحقائق:٧/٦، كتاب الأضحية، مما تكون الأضحية، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة⋆ الفتاوى الهندية:٢٩٧/٥، كتاب الأضحية، الباب الخامس، ط: دار الفكر-بيروت)

[۱۰] جانور کو خصی کرنا اور اس کی قربانی کرنا

۱۸۸۱-سوال: جانور کی خصی کرنا کیسا ہے؟ اور خصی جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ ایک صاحب کا کہنا ہے کہ قدرت کی دی ہوئی چیز کو ہم کیوں کاٹیں اور ہمیں اس کے چھیننے کا حق نہیں ہے، کیا ان کی یہ بات درست ہے؟

الجواب حامداومصلیا:

جانور کو خصی کرنا جائز ہے،(۱) اور اس کی قربانی بھی درست ہے،(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خصی جانور کی قربانی کرنا ثابت ہے؛(۳) لہٰذا جانور کو خصی کرنے میں کوئی عیب اور کراہت نہیں ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۱۳۰/۶)[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱)(و) جاز (خصاء البهائم) حتى الهرة، وأما خصاء الآدمي فحرام قيل والفرس وقيدوه بالمنفعة وإلا فحرام. (الدر المختار)ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله وجاز خصاء البهائم)... وهو نزع الخصية، ...(قوله قيل والفرس) ذكر شمس الأئمة الحلواني أنه لا بأس به عند أصحابنا، وذكر شيخ الإسلام أنه حرام، (قوله وقيدوه) أي جواز خصاء البهائم بالمنفعة وهي إرادة سمنها أو منعها عن العض بخلاف بني آدم، فإنه يراد به المعاصي فيحرم أفاده الأتقاني عن الطحاوي. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۸۸/۶، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر)

(۲) قال: "ويجوز أن يضحي بالجماء"... "والخصي" "لأن لحمها أطيب وقد صح "أن النبي صلى الله عليه وسلم ضحى بكبشين أملحين موجوءين". (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر، المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۳۵۹/۴، كتاب الأضحية، على من تجب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

والخصي أفضل من الفحل؛ لأنه أطيب لحما، كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۲۹۹/۵، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر)

(۳) عن بلال بن أبي الدرداء، عن أبيه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم "ضحى بكبشين جذعين خصيين - أو قال: موجوءين -". (مسند ابن أبي شيبة- أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵هـ): ۵۱/۱، رقم الحديث: ۴۱، مسند خزيمة بن ثابت، ت: عادل بن يوسف العزازي وأحمد بن فريد المزيدي، ط: دار الوطن- الرياض)

عن أبي سلمة، عن عائشة، أو أبي هريرة: "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ضحى بكبشين سمينين عظيمين أملحين أقرنين موجيين. (مسند أحمد بن حنبل: ۴۹۷/۴۱، رقم الحديث: ۲۵۰۴۶، مسند النساء، مسند الصديقة عائشة بنت الصديق رضي الله عنها، ط: الرسالة- بيروت)

[۴] آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خصی دنبے کی قربانی کی ہے، خصی ہونا عیب نہیں ہے، اس سے گوشت میں کمی نہیں آتی، نیز خصی فربہ ہوتا ہے، اور اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۵۰/۱۰، سوال نمبر: ۶۸، کتاب الاضحیہ، خصی بکرے کی قربانی کا کیا حکم ہے؟، ط: دار الاشاعت، کراچی)

[۱۱] خنثیٰ مشکل کی قربانی درست نہیں ہے

۱۸۸۲- سوال: ایک آدمی نے ایسے جانور کی قربانی کی، جو باہر سے گائے معلوم ہوتا ہے اور اندر بیل ہے، تو کیا قربانی جائز ہوگی، اب اگر نہیں ہوسکتی تو اس کے عوض دوسری عید پر دوسرے جانور کی قربانی کر سکتے ہیں یا پھر دوسری بقرعید آنے سے پہلے کسی دن قربانی کی جائے؟ اور اس جانور میں جن لوگوں نے حصہ لیا ہے، ان کا نام یاد نہیں ہے، تو کس طرح کی نیت کی جائے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

مذکور جانور کو عربی میں خنثیٰ مشکل کہتے ہیں، یعنی جس میں مذکر مؤنث دونوں کی علامتیں موجود ہوں، ایسے جانور کی قربانی درست نہیں ہے۔ (۱) لہٰذا جتنے لوگوں کی قربانی اس جانور میں کی گئی تھی، کسی کی ادا نہیں ہوئی، ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے ہر ایک کی جانب سے ایک ایک بکرے کی قیمت صدقہ کرنا ضروری ہے۔ (۲)

آئندہ سال قربانی کرنے سے گزشتہ سال کی قربانی کی ذمہ داری ادا نہ ہوگی۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] قربانی کے لیے ہدیہ دی گئی رقم سے جانور خرید کر قربان کرنا

۱۸۸۳- سوال: مجھ پر قربانی واجب ہے اور میں ہر سال اپنی قربانی کرتا ہوں؛ لیکن اس سال میرے ایک رشتہ دار نے- جو بیرون ملک رہتے ہیں- قربانی کے پیسے بھجوائے اور کہا کہ ان پیسوں سے اپنی قربانی

---

(۱) لا تجوز التضحية بالشاة الخنثى؛ لأن لحمها لا ينضج. (الفتاوى الهندية: ۵/۲۹۹، كتاب الذبائح، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر)

(۲) ومنها أنها تقضى إذا فاتت عن وقتها، ثم قضاؤها قد يكون بالتصدق بعين الشاة حية، وقد يكون بالتصدق بقيمة الشاة، فإن كان قد أوجب التضحية على نفسه بشاة بعينها فلم يضحها حتى مضت أيام النحر فيتصدق بعينها حية سواء كان موسرا أو معسرا، وكذا إذا اشترى شاة ليضحي بها فلم يضح حتى مضى الوقت. (الفتاوى الهندية: ۵/۲۹۴، كتاب الأضحية، قبيل: الباب الثاني في وجوب الأضحية بالنذر وما هو في معناه، ط: دار الفكر ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۶/۳۲۱، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر- بيروت)

(۳) فإن لم يفعل ذلك حتى جاء أيام النحر من العام القابل فضحى بها عن العام الماضي لم يجز. (الفتاوى الهندية: ۵/۲۹۷، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر)

کرلینا، تو اس رشتہ دار کے بھیجے ہوئے پیسوں سے قربانی کرلینا میرے لیے کافی ہوگا یا مجھ پر دو قربانی لازم ہوں گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

آپ کے رشتے دار نے جب آپ کو رقم ہدیہ کی، تو آپ اس کے مالک بن گئے، مالک بن جانے کے بعد جب اس رقم سے جانور خرید کر اپنی قربانی کریں گے، تو قربانی ادا ہوجائے گی، اب دوسری قربانی کرنا لازم نہیں ہے؛ کیوں کہ واجب ذمہ سے ادا ہوگیا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] داغے ہوئے جانور کی قربانی کا حکم

۱۸۸۴- سوال: قربانی کے ایک جانور کو دائیں اور بائیں جانب داغا گیا ہے، باقی سب سلامت ہے، کوئی عیب ونقص نہیں ہے، اس کی قربانی صحیح ہے یا نہیں؟ کتنا داغا گیا ہو، تو قربانی صحیح نہیں ہوگی، مطلع فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب جانور کے صرف چمڑے کو داغا گیا ہے، تو اس کی قربانی جائز ہے، جب کہ کوئی اور عیب نہ ہو۔ (شامی ۵/ ۲۸۴)[۲]

قربانی کے جانور کے عیب کے بارے میں تفصیلات زیادہ ہیں، بعض عیوب جواز اضحیہ سے مانع ہے اور بعض مانع نہیں ہے، حسب ضرورت عیب بتا کر مسئلہ پوچھ لیں، ان شاء اللہ العزیز جواب دے دیا جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) أما أصل الحكم، فهو ثبوت الملك للموهوب له في الموهوب من غير عوض؛ لأن الهبة تمليك العين من غير عوض، فكان حكمها ملك الموهوب من غير عوض. (بدائع الصنائع: ۱۲۷/۶، كتاب الهبة، فصل في حكم الهبة، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ولو وهب لرجل شاة فضحى بها الموهوب له أجزأته عن الأضحية لأنه ملكها بالهبة والقبض فصار كما لو ملكها بالشراء. (بدائع الصنائع: ۷۷/۵، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۲] تجوز التضحية بالمجبوب العاجز عن الجماع، والتي بها سعال، والعاجزة عن الولادة لكبر سنها، والتي لها كي. (ردالمحتار على الدر المختار: ۳۲۵/۶، كتاب الأضحية)

والمستحب أن يكون سليما عن العيوب الظاهرة، فما جوز ههنا جوز مع الكراهة كما في المضمرات. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۳/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر-بيروت)

[۱۴] کان میں معمولی عیب والے بکرے کی قربانی کا حکم

۱۸۸۵- سوال: ایک بکرے کا کان بیچ سے سیدھا پھٹا ہوا ہے؛ لیکن بدن سے جڑا ہوا ہے، ایسے بکرے کی قربانی جائز ہے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

ایسے بکرے کی قربانی جائز ہے۔ (شامی)[۱] البتہ خلاف مستحب (خلاف اولیٰ) ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] جس جانور کو کتے نے کاٹا ہو، اس کی قربانی

۱۸۸۶- سوال: ہمارے یہاں لوگ دنبہ اور بکریاں پالتے ہیں اور کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بکریوں کو کتے کاٹ لیتے ہیں اور زخمی کر دیتے ہیں، اگر کتے کے کاٹے یا زخمی کیے ہوئے جانور کے زندہ رہنے کی امید نہ ہو، تو اس کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر زخم اچھا ہو جائے تو اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کا گوشت کھانا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصلیا:

گوشت کھانا جائز ہے [جب کہ طبی طور پر کوئی نقصان نہ ہو] اور اچھا ہونے کے بعد قربانی بھی جائز

---

[۱] لو ذهب بعض الأذن أو الألية أو الذنب أو العين. ذكر في الجامع الصغير إن كان كثيرا يمنع، وإن يسيرا لا يمنع. واختلف أصحابنا في الفاصل بين القليل والكثير، فعن أبي حنيفة أربع روايات. روى محمد عنه في الأصل والجامع الصغير أن المانع ذهاب أكثر من الثلث، وعنه أنه الثلث، وعنه أنه الربع، وعنه أن يكون الذاهب أقل من الباقي أو مثله اهـ بالمعنى والأولى هي ظاهر الرواية، وصححها في الخانية حيث قال: والصحيح أنه الثلث، وما دونه قليل، وما زاد عليه كثير وعليه الفتوى اهـ ومشى عليها في مختصر الوقاية والإصلاح. والرابعة هي قولهما قال في الهداية. وقالا: إذا بقي الأكثر من النصف أجزأه، وهو اختيار الفقيه أبي الليث، وقال أبو يوسف: أخبرت بقولي أبا حنيفة فقال قولي هو قولك، قيل هو رجوع منه إلى قول أبي يوسف، وقيل معناه قولي قريب من قولك. (رد المحتار على الدر المختار: ٦/ ٣٢٣-٣٢٤، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

(۲) والمستحب أن يكون سليما عن العيوب الظاهرة، فما جوز ههنا جوز مع الكراهة كما في المضمرات. (رد المحتار على الدر المختار: ٦/ ٣٢٣، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر- بيروت)

ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] کن بکری کی قربانی کا حکم

۱۸۸۷- سوال: ایک مخصوص قسم کی بکری جو کن بکری کہلاتی ہے، اُس میں مادہ کی علامت ہوتی ہے، عام بکریوں سے وہ کچھ الگ نظر آتی ہے، اُس میں نر کی کوئی علامت نہیں ہوتی، کافی فربہ، قد وقامت میں دیگر بکریوں سے بڑی اور زیادہ گوشت والی ہوتی ہے، اُس کا گوشت جلد گل جاتا ہے اور لذیذ ہوتا ہے، یہ بکری بچہ نہیں دیتی، اور نہ نر بکرا اُس سے جفتی کرتا ہے، ہنود اُسے پوجتے ہیں، اُسے وہ لوگ کاٹتے اور کھاتے نہیں ہیں، کچھ مسلمان اُس کی قربانی کرتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے، تو ایسی بکری کو بہ طور قربانی ذبح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

بانجھ بکری کی قربانی جائز ہے، مذکورہ بکری بھی اگر از نوعِ غنم ہو اور وحشی جانوروں میں سے نہ ہو، تو اُس کی قربانی جائز ہے، بشرطیکہ اُس کا گوشت گل جاتا ہو اور کھانے کے لائق ہو۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(درِمختار علی الشامی: ۶/ ۳۴۵)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] قربانی کا جانور کم عمر کا ثابت ہوا پھر دوسرا جانور کم قیمت میں خریدا تو؟

۱۸۸۸- سوال: ایک جانور ۱۰۵۰ر کی قیمت میں قربانی کے لیے خریدا، پھر معلوم ہوا کہ ابھی یہ جانور قربانی کی عمر کا نہیں ہے، تو اب اس کے بدلہ میں ۸۰۰ر روپے میں دوسرا جانور خریدا، تو کیا اس صورت میں بھی زائد رقم کا صدقہ کرنا واجب ہوگا؟ جب کہ وہ پہلا جانور قربانی کے لائق نہیں تھا۔ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورتِ مسئولہ میں جب جانور ۱۰۵۰ر میں قربانی ہی کی نیت سے خریدا، لیکن قربانی کی عمر نہ ہونے

---

(۱) والمستحب أن يكون سليما عن العيوب الظاهرة. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۲۳، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر-بيروت)

[۲] تجوز التضحية بالمجبوب العاجز عن الجماع، والتي بها سعال، والعاجزة عن الولادة لكبر سنها. (رد المحتار مع رد المحتار: ۶/ ۳۲۵، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

سے اس کی قربانی نہیں کی، اور اس کے بدلہ میں ۸۰۰؍روپے میں دوسرا جانور خریدا، تو زائد رقم ۲۵۰؍کا صدقہ کردینے سے ذمہ بری ہوجائے گا اور اس صدقہ سے قربانی کامل وصحیح طریقہ سے ادا ہوجائے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] قربانی کے جانور کی قیمت میں سے بچی ہوئی رقم کو رفاہِ عام میں خرچ کرنا

۱۸۸۹- سوال: ایک شخص کے پاس انگلینڈ سے قربانی ادا کرنے کے لیے کسی نے بارہ سو روپئے

(۱) قال (وإذا اشترى أضحية، ثم باعها فاشترى مثلها فلا بأس بذلك)؛ لأن بنفس الشراء لا تتعين الأضحية قبل أن يوجبها، وبعد الإيجاب يجوز بيعها في قول أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله ويكره، وفي قول أبي يوسف - رحمه الله - لا يجوز لتعلق حق الله تعالى بعينها، ولكنهما يقولان تعلق حق الله تعالى بها لا يزيل ملكه عنها، ولا يعجزه عن تسليمها وجواز البيع باعتبار الملك والقدرة على التسليم ألا ترى أنا نجوز بيع مال الزكاة لهذا.______ والأصل فيه ما روي أن النبي - عليه الصلاة والسلام - دفع دينارا إلى حكيم بن حزام - رضي الله عنه - ليشتري له شاة للأضحية فاشترى شاة، ثم باعها بدينارين، ثم اشترى شاة بدينار، وجاء بالشاة والدينار إلى رسول الله - صلى الله عليه وسلم - فأخبره بذلك. فقال - صلى الله عليه وسلم - بارك الله في صفقتك، أما الشاة فضح بها وأما الدينار فتصدق به. فقد جوز رسول الله - صلى الله عليه وسلم - بيعه بعدما اشتراها للأضحية.

وإن كانت الثانية شرا من الأولى، وقد كان أوجب الأولى فتصدق بالفضل فيما بين القيمتين، أما جواز الثانية عن الأضحية فلاستجماع شرائط الجواز، وأما التصدق فإنه لما أوجب الأولى فقد جعل ذلك القدر من ماله لله تعالى فلا يكون له أن يستفضل شيئا منه لنفسه فيتصدق بفضل القيمة كما أمر رسول الله - صلى الله عليه وسلم - حكيم بن حزام - رضي الله عنه - بالتصدق بالدينار.

ومن أصحابنا - رحمهم الله - من قال هذا إذا كان فقيرا، أما إذا كان غنيا ممن يجب عليه الأضحية فليس عليه أن يتصدق بفضل القيمة؛ لأن في حق الغني الوجوب عليه بإيجاب الشرع، فلا يتعين بتعيينه في هذا المحل، ألا ترى أنها لو هلكت بقيت الأضحية عليه. فإذا كان ما يضحي به محلا صالحا لم يلزمه شيء آخر، وأما الفقير فليس عليه أضحية شرعا، وإنما لزمه بالتزامه في هذا المحل بعينه، ولهذا لو هلكت لم يلزمه شيء آخر. فإذا استفضل لنفسه شيئا مما التزمه كان عليه أن يتصدق به.

قال الشيخ الإمام والأصح عندي أن الجواب فيهما سواء، لأن الأضحية، وإن كانت واجبة على الغني في ذمته فهو متمكن من تعيين الواجب في محل فيتعين بتعيينه في هذا المحل من حيث قدر المالية، لأنه تعيين مقيد، وإن كان لا يتعين من حيث فراغ الذمة. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳ھ): ۱۲/ ۱۳، كتاب الذبائح، باب الأضحية، أول وقت الأضحية، ط: دار المعرفة - بيروت)

بھیجے، پھر اِس شخص کو قربانی کا جانور نو سو روپئے میں مل گیا، اور تین سو روپئے بچ گئے، اب اِس بچی ہوئی رقم کے ذریعہ یہ شخص عام گزرگاہ پر ٹیوب لائٹ لگوانا چاہتا ہے، تو کیا یہ جائز ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً:

قربانی کے لیے جتنی رقم دی گئی تھی، اُس پوری رقم کا جانور خریدنا چاہیے تھا، ہاں، اگر رقم بھیجنے والے نے اُس رقم میں جانور کو پالنے کا خرچ بھی شامل کیا ہو، تو کل رقم میں سے پالنے کے خرچ کی مقدار علاحدہ کر کے بقیہ رقم سے جانور خریدنا چاہیے، مذکورہ صورت میں قربانی کے بعد جو تین سو روپئے بچ گئے ہیں، اُس کا استعمال رقم بھیجنے والے کے منشا کے مطابق کرنا ضروری ہے، اگر وہ واپس مانگے، تو واپس کرنا ضروری ہے، البتہ اگر رقم بھیجنے والے نے اختیار دیا ہو، تو اُس رقم کو رفاہِ عام میں استعمال کر سکتے ہیں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] بکروں کے ریوڑ میں دوسرے کا بکرا آ گیا اور مالک کا پتہ نہیں ہے، تو؟

۱۸۹۰-سوال: محترم حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہمارے گاؤں میں عید الاضحیٰ کے موقع پر اطراف و جوانب سے بکرے لائے جاتے ہیں، اس مرتبہ یہ واقعہ ہوا کہ بکروں کے جتھے میں ایک ایسا بکرا بھی راستہ میں ساتھ لگ گیا، جو ہم نے خریدا نہیں تھا، اب

---

(۱) اگر پوری رقم جانور خریدنے کے لیے دی گئی تھی، اور مؤکل کا منشا بھی یہی تھا کہ مکمل بارہ سو روپیے کے جانور لیے جائیں، اور وکیل نے اس میں سے تین سو روپیے بچا لیے، تو اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے، لیکن مؤکل نے اندازے سے ایک رقم بھیجی ہو، جیسا کہ یہاں علاقہ گجرات میں رواج ہے، پھر مناسب جانور لے لیا ہو اور اس کی قربانی کی ہو، تو جائز ہے، بقیہ رقم کی اطلاع دے دے اور مؤکل کے حسب منشاء اس کا استعمال کرے، اگر وہ وکیل کی رائے پر چھوڑ دے کہ آپ جہاں چاہیں، بچی ہوئی رقم کا استعمال کریں، تو پھر اس سے رفاہ عام کی خاطر ٹیوب لائٹ لگانا جائز ہوگا:

عن حكيم بن حزام رضي الله تعالى عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أعطاه دينارا يشتري له به أضحية، فاشتراها فأتاه رجل فأربحه فباعه، فأتى النبي صلى الله عليه وسلم بدينار وأضحية، فقال: يا رسول الله، اشتريت لك أضحية ثم بعت وربحت دينارا، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: بارك الله لك في تجارتك، وفي صفقتك، فضحى بالشاة، وتصدق بالدينار. [حلية الأولياء وطبقات الأصفياء- أبو نعيم أحمد بن عبد الله بن أحمد بن إسحاق بن موسى بن مهران الأصبهاني (م: ۴۳۰هـ): ۵/۶۷، حبيب بن أبي ثابت قال الشيخ رحمه الله تعالى: ومنهم المتعبد المنفاق...، ط: السعادة - بجوار محافظة مصر]

مزید تفصیل کے لیے سوال سابق (بہ عنوان: قربانی کا جانور کم عمر کا ثابت ہوا پھر دوسرا جانور کم قیمت میں خریدا تو؟) کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

معلوم نہیں اس بکرے کا مالک کون ہے؟ اخبار وغیرہ میں بھی ہم نے اس کا اشتہار دیا، مگر مالک کا کوئی سراغ نہیں لگا، اب اس بکرے کے متعلق کیا حکم ہے؟ کیا اس کو بیچ کر روپے غریبوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں؟ یا وہ روپے کسی امین شخص کے پاس امانت رکھوائے جائیں اور مالک کا پتہ لگنے پر اسے دیے دیا جائے؛ کیوں کہ بکرے کو ایسے ہی باقی رکھنے میں اس کے گھاس چارہ پر خرچ لگتا ہے، نیز اس کی حفاظت میں بھی کئی طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں، اسی طرح اگر اس کو ذبح کر کے غرباء ومساکین کی دعوت کی جائے، تو یہ درست ہے یا نہیں؟ نیز اس بکرے کو شادی وغیرہ کی دعوت کے لیے یا قربانی کے لیے کوئی خریدنا چاہے، تو خرید سکتا ہے یا نہیں؟ غرض شرعاً اس کے متعلق جو بھی احکامات ہوں، مفصل بیان فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

شریعت میں ایسے جانور کو "لقطہ" کہا جاتا ہے، صورت مسئولہ میں جس شخص نے بھی مذکورہ بکرے کی حفاظت کی ہے اور اس کے حکم کے موافق اخبار وغیرہ میں اشتہار دے کر اس کے مالک کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، اس نے نیک اور ثواب کا کام کیا ہے اور وہ گویا اطلاع کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگیا ہے، اب آگے حکم یہ ہے کہ اگر وہ شخص (جس کے پاس وہ بکرا ہے) غریب ومحتاج ہے، تو اس بکرے کو بیچ کر خود اس کی قیمت استعمال کرسکتا ہے، یہ اس کے لیے جائز ہے۔

اور اگر مال دار ہے، تو بکرا بیچنے کے بعد ابھی مزید (احتیاطاً) تین چار مہینے تک مالک کا انتظار کرے، اگر مالک آجائے، تو خرچ کی رقم منہا کر کے اس کو وہ روپے دے دے، اور اگر اب بھی مالک نہ آئے، تو وہ رقم کسی غریب کو صدقہ کردے، ذمہ بری ہوجائے گا، لیکن صدقہ کے بعد مالک آگیا، تو اس [مالک] کو اختیار ہوگا کہ وہ اس صدقہ پر راضی ہوجائے اور صدقہ کرنے والا کو بری کردے یا صدقہ کرنے والے سے بکرے کی قیمت وصول کرے؛ کیوں کہ اگر مالک صدقہ پر راضی نہیں ہوتا ہے اور بکرے کی قیمت کا مطالبہ کرتا ہے، تو صدقہ کرنے والا اس کا ضامن ہوتا ہے، اور اس کے ذمہ قیمت ادا کرنا ضروری ہے، لیکن پوری قیمت نہیں؛ بل کہ اپنا خرچ منہا کر کے بقیہ رقم اس کو دے گا۔ (۱)

(۱) (هي) -اللقطة-: اسم وضع للمال الملتقط، عيني. وشرعا مال يوجد ضائعا، ابن كمال. وفي التتارخانية عن المضمرات: مال يوجد ولا يعرف مالكه، وليس بمباح كمال الحربي. وفي المحيط (رفع شيء ضائع للحفظ على غير لا للتمليك)... (ندب رفعها لصاحبها) إن أمن على نفسه تعريفها، وإلا فالترك أولى. وفي البدائع وإن أخذها لنفسه حرم، لأنها كالغصب (ووجب) أي فرض فتح وغيره (عند خوف ضياعها) كما مر؛ لأن لمال المسلم حرمة =

جب اس بکرے کو بیچا جائے اور کوئی اسے دعوت کے لیے یا قربانی کے لیے خریدنا چاہے، تو شرعاً اس کی اجازت ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، مگر اس کی قیمت کے متعلق وہی حکم ہوگا، جو اوپر بیان ہوا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] راستے میں ملے ہوئے جانور کی قربانی

۱۸۹۱- سوال: ہمارے گاؤں ولن کے قریب ہائی وے نمبر ۸ سے ایک شخص کو دنبہ کا ایک بچہ ملا، جس وقت ملا، اس وقت اس کے پاؤں میں چوٹ کے آثار تھے، جس کی وجہ سے لنگڑا کر چل رہا تھا، اب وہ اچھا ہو گیا ہے۔ اس کی معذوری کو دیکھ کر ایسا خیال ہوتا تھا کہ شاید اس کے مالک نے ہی اس کو چھوڑ دیا ہوگا، اب وہ شخص جس نے اس کی دیکھ ریکھ کی ہے، اس کی قربانی کرنا چاہتا ہے، تو کیا اس کی قربانی درست ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلياً:

مذکورہ طریقہ سے ملی ہوئی شئ شریعت کی اصطلاح میں ''لقطہ'' کہلاتی ہے، ایک مدت تک اس کا اعلان کیا جائے، اگر اس مدت کے اندر اس کا مالک آجائے اور ثابت کر دے کہ یہ مال میرا ہے، تو خرچ وصول کر کے اصلِ شئ اس کو سپرد کرنا ضروری ہے اور اگر مالک نہ آئے، تو جس کو جانور ملا ہے، اگر وہ مستحق زکاۃ

=كما لنفسه، فلو تركها حتى ضاعت أثم، ... (فإن أشهد عليه) بأنه أخذه ليرده على ربه ويكفيه أن يقول من سمعتموه ينشد لقطة فدلوه علي (وعرف) أي نادى عليها حيث وجدها، وفي الجامع (إلى أن علم أن صاحبها لا يطلبها أو أنها تفسد إن بقيت كالأطعمة) والثمار (كانت أمانة) لم تضمن بلا تعد فلو لم يشهد مع التمكن منه أو لم يعرفها ضمن إن أنكر ربها أخذه للرد وقبل الثاني قوله بيمينه وبه نأخذ حاوي، وأقره المصنف وغيره (ولو من الحرم أو قليلة أو كثيرة) فلا فرق بين مكان ومكان ولقطة ولقطة (فينتفع) الرافع (بها لو فقيرا وإلا تصدق بها على فقير)[الدر المختار]ــــــــــقال ابن عابدين: (قوله: فينتفع الرافع) أي من رفعها من الأرض: أي التقطها وأتى بالفاء، فدل على أنه إنما ينتفع بها بعد الإشهاد والتعريف إلى أن غلب على ظنه أن صاحبها لا يطلبها، والمراد جواز الانتفاع بها والتصدق، وله إمساكها لصاحبها. وفي الخلاصة له بيعها أيضا وإمساك ثمنها ثم إذا جاء ربها ليس له نقض البيع لو بأمر القاضي، وإلا فلو قائمة له إبطاله، وإن هلكت، فإن شاء ضمن البائع وعند ذلك ينفذ بيعه في ظاهر الرواية وله دفعها للقاضي فيتصدق بها أو يقرضها من مليء أو يدفعها مضاربة والظاهر أن له البيع أيضا. وفي الحاوي القدسي الدفع إلى القاضي أجود ليفعل الأصلح. وفي المجتبى: التصدق بها في زماننا أولى، وينبغي التفصيل بين من يغلب على الظن ورعه وعدمه نهر ملخصا. (رد المحتار على الدر المختار: ۲۷۹/۴، كتاب اللقطة، ط: دار الفكر-بيروت)

ہے، تو وہ خود اس کو بیچ کر اس کی قیمت استعمال کرسکتا ہے۔ اور اگر وہ صاحب ثروت ہے، تو ایک مدت کے بعد [جس میں یقین ہوجائے کہ اب مالک اس کو تلاش نہیں کررہا ہوگا] کسی محتاج کو بہ طور صدقہ اس کا مالک بنادے؛ لیکن اگر مالک آجائے تو گواہ وثبوت کے بعد لینے والے کو پوری تفصیل سنائی جائے اور مالک اس کے پاس سے وہ جانور لے لے اور لینے والے پر کسی قسم کا ضمان بھی واجب نہیں ہوگا۔ اگر وہ جانور اب موجود نہیں ہے، اور مالک کہتا ہے کہ مجھے اپنا جانور یا اس کی قیمت چاہیے، تو اس شخص کے لیے بازاری قیمت کے اعتبار سے قیمت ادا کرنا ضروری ہے، جس نے اسے بہ غرض حفاظت اٹھایا تھا، البتہ اسے صدقہ کا ثواب مل جائے گا۔ (۱)

نوٹ: اگر اس جانور کو بہ غرض حفاظت اٹھانے والا اس کی قربانی کرنا چاہے، تو جائز ہے، بہ شرطے کہ اس کی بازاری قیمت کا صدقہ کردے، فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

[۲۱] جانور خرید کر قربانی کے دن تک نگرانی کی ذمہ داری بائع کے حوالے کرنا

۱۸۹۲- سوال: ایک شخص نے ایام قربانی سے چند دنوں قبل قربانی کا جانور ایک سو پچانوے (۱۹۵) روپے میں اس شرط کے ساتھ خریدا کہ عید کے دن یا اس کی صبح تک بائع اس جانور کو اپنے پاس ہی رکھے، اور اس کے چارے پانی کا انتظام بھی بائع اپنے پاس سے کرتا رہے، تو کیا ایسے شرط کے ساتھ خریدے ہوئے جانور کی قربانی درست ہے؟

---

(۱) وإذا رفع اللقطة يعرفها فيقول: التقطت لقطة، أو وجدت ضالة، أو عندي شيء فمن سمعتموه يطلب دلوه علي، كذا في فتاوى قاضي خان. ويعرف الملتقط اللقطة في الأسواق والشوارع مدة يغلب على ظنه أن صاحبها لا يطلبها بعد ذلك هو الصحيح، كذا في مجمع البحرين، ولقطة الحل والحرم سواء، كذا في خزانة المفتين، ثم بعد تعريف المدة المذكورة الملتقط مخير بين أن يحفظها حسبة وبين أن يتصدق بها فإن جاء صاحبها فأمضى الصدقة يكون له ثوابها وإن لم يمضها ضمن الملتقط أو المسكين إن شاء لو هلكت في يده فإن ضمن الملتقط لا يرجع على الفقير وإن ضمن الفقير لا يرجع على الملتقط وإن كانت اللقطة في يد الملتقط أو المسكين قائمة أخذها منه، كذا في شرح مجمع البحرين. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۹۰، كتاب اللقطة، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید تفصیل وتخریج کے لیے سوال سابق کی جانب رجوع کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

بائع یا مشتری کا عقد بیع کے وقت کوئی ایسی شرط لگانا، جس میں متعاقدین میں سے کسی کا فائدہ ہو، اور وہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہو، جائز نہیں، ایسی شرط شرطِ فاسد ہے۔ (الجوہرۃ النیرۃ: ۱/۲۰۵)[1]

ایسی شرط سے بیع فاسد ہوجاتی ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ خریدار اس خرید وفروخت کے معاملے کو ختم کردے۔[2] پھر جانور کے مالک کی رضامندی سے ازسرنو معاملہ کرکے ایک سو اسی (۱۸۰) روپے میں [یا جو رقم دونوں کی رضامندی سے طے ہوجائے] جانور خریدے۔ اس کے بعد الگ سے دوسرا معاملہ کرے، کہ قربانی کے جتنے دن باقی ہوں، اسے شمار کرکے اس کی اجرت طے کردے اور بائع کے پاس جانور کو رہنے دے، اس طرح بیع اور قربانی درست ہوجائے گی۔[3]

---

[۱] قوله: (ومن اشترى ثوبا على أن يقطعه البائع ويخيطه قميصا، أو قباء، أو نعلا على أن يحذوها، أو يشركها فالبيع فاسد) معنى يحذوها يقطعها من الجلد ويعملها؛ لأن هذا شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحدهما. (الجوهرة النيرة-أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م:۸۰۰ھـ):۱/۲۰۴، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، ط:المطبعة الخيرية)

(ولو) كان البيع (بشرط لا يقتضيه العقد وفيه نفع لأحد المتعاقدين) أي البائع والمشتري (أو لمبيع يستحق النفع بأن يكون آدميا (فهو) أي هذا البيع (فاسد) لما فيه من زيادة عرية عن العوض فيكون ربا وكل عقد شرط فيه الربا يكون فاسدا. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م:۱۰۷۸ھـ):۲/۶۲، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، بيع الملامسة والمنابذة وإلقاء الحجر، ط:دار إحياء التراث العربي)

(۲) ثم إن الملك وإن كان يثبت في البيع الفاسد عند اتصال القبض به عندنا إلا أن هذا الملك يستحق النقض إعداماً للفساد، ولأن إعدام الفساد واجب حقاً للشرع. (المحيط البرهاني:۶/۴۲۱، كتاب البيع، الفصل الثامن: في بيان أحكام الشراء الفاسد والتصرف في المملوك بالعقد الفاسد، ط:دار الكتب العلمية-بيروت)

وفي الزيادات: إذا قبض المشتري المبيع في البيع الفاسد من غير إذن البائع ونهيه فإن قبضه في المجلس، يصح القبض استحسانا، ويثبت الملك فيه للمشتري، ... وإذا أذن له بالقبض فقبض في المجلس أو بعد الافتراق عن المجلس صح قبضه ويثبت الملك قياسا واستحسانا، إلا أن هذا الملك يستحق النقض، ويكره للمشتري أن يتصرف فيما اشترى شراء فاسدا بتمليك، أو انتفاع؛ لكن مع هذا لو تصرف فيه تصرفا نفذ تصرفه. (الفتاوى الهندية:۳/۱۴۷، كتاب البيوع، الباب الحادي عشر في أحكام البيع الغير جائز، ط:دار الفكر)

(۳) ولو اشتراه ثانيا أو عاد إليه بسبب مبتدإ، لا يعود الفسخ؛ لأن الملك اختلف لاختلاف السبب فكان اختلاف الملكين بمنزلة اختلاف العقدين. (بدائع الصنائع:۵/۳۰۱، كتاب البيوع، خيار الرؤية، ط:دار الكتب العلمية-بيروت)

اگر پہلے والا معاملہ ختم کیے بغیر قربانی کردی جائے، تو گرچہ قربانی ادا ہوجائے گی؛ لیکن پہلی قیمت -جسے شریعت کی اصطلاح میں ثمن کہتے ہیں- بائع کو رد کرنی پڑے گی، اور -امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے مطابق- جس دن قربانی کی ہے، اس دن کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ (مجمع الانہر: ۲/۶۶)[۱]

اس لیے اس طرح کی شرط کے ساتھ خریدنے والوں کے لیے لازم ہے کہ جلد ہی معاملہ (بیع) ختم کرلے اور مالک کی اجازت سے ازسرنو مذکورہ تفصیل کے مطابق دوسرا معاملہ کرلے، تاکہ قربانی میں کسی قسم کا خلل نہ ہو۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] ایک آدمی کی طرف سے پوری گائے کی قربانی

۱۸۹۳- سوال: ایک آدمی اپنی قربانی کرنا چاہتا ہے، وہ ہر سال اپنی قربانی کیا کرتا ہے، اس سال وہ پوری گائے کی قربانی کرنا چاہتا ہے اور پوری گائے کے حصے وہ اپنے ہی لیے رکھنا چاہتا ہے، تو کیا اس کو پورے ساتوں حصے کا ثواب ملے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب ایک شخص نے ایک گائے کی قربانی کی، تو پوری گائے اس کی واجب قربانی کی طرف سے ادا ہوجائے گی۔ (عالمگیری: ۶/۲۰۱)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۳] (ولزمه) أي المشتري ... (لهلاكه) أي وقت هلاك المبيع في يد المشتري (مثله) أي المبيع (حقيقة) أي صورة ومعنى في ذوات الأمثال كالكيلي والوزني (أو) مثله (معنى كالقيمة في القيمي) كالحيوان والعرض وفيه إشارة إلى أن المبيع لو كان موجودا رد بعينه، وإلى أن العبرة للقيمة يوم القبض، وإلى أنه ملكه بقيمته ولو ازدادت قيمته في يده فأتلفه لم يتغير كالغصب. وعند محمد يوم الاستهلاك لأنه بالإتلاف يتقرر عليه قيمته فتعتبر قيمته.

(بدائع الصنائع: ۲/۶۶، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، فصل في قبض المشتري المبيع بيعا باطلا بإذن بائعه، ط: دار إحياء التراث العربي)

وفي نوادر هشام: قال: سألت محمداً عن رجل اشترى من آخر غلاماً شراء فاسداً وقبضه، ثم باعه واستهلكه، قال: أخبرني أن أبا حنيفة وأبا يوسف رحمهما الله قال: عليه قيمته يوم قبض، وقال محمد فيما أظن: قيمته يوم استهلكه. (المحيط البرهاني: ۶/۴۲۱، كتاب البيع، الفصل الثامن: في بيان أحكام الشراء الفاسد والتصرف في المملوك بالعقد الفاسد، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۱] قال الشيخ الإمام أبو بكر محمد بن الفضل البدنة أفضل؛ لأنها أكثر لحما من الشاة وما قالوا: إن البدنة يكون بعضها نفلا فليس كذلك بل إذا نحرت عن واحد كان كلها فرضا، وشبهه بالقراءة في الصلاة لو اقتصر على ما تجوز به الصلاة جاز، ولو زاد عليه يكون الكل فرضا. (الفتاوى الهندية: ۵/۲۹۹، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب)

[۲۳] سات بکروں کے پیسوں سے ایک گائے خرید کر قربانی کرنا

۱۸۹۴- سوال: ایک جگہ سے سات بکروں کی قربانی کے پیسے آئے ہیں؛ لیکن اس رقم سے سات بکرے خریدنا، ممکن نہیں ہے، اب زیادہ دن بھی نہیں بچے ہیں کہ قربانی کروانے والے سے پوچھ سکیں، تو ایسی صورت میں ایک گائے خرید کر اس کی قربانی کردیں، تو جائز ہوگا یا نہیں؟ ایک گائے خریدنے کے بعد بھی رقم اتنی بچ جائے گی کہ اس سے ایک دوسری گائے خریدی جاسکے، تو دوسری گائے خرید کر اس کی انہی لوگوں کی طرف سے قربانی کرسکتے ہیں یا نہیں؛ جب کہ پہلی گائے کی قربانی تو واجب ہوگی اور دوسری ان کی طرف سے نفل، یا ایسا کیا جائے کہ ایک گائے تین کی جانب سے اور ایک گائے چار کی جانب سے کی جائے، ایسا کرنا صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب انہوں نے بکرے کی قربانی کے لیے رقم دی ہے، تو آپ بکرے کی قربانی کے لیے وکیل بنائے گئے ہیں اور وکیل کو اپنے مؤکل کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔[۱] اگر بھیجی گئی رقم سے بکرا خریدنا ممکن نہ ہو، تو آپ اپنے مؤکل کو اطلاع کریں، اطلاع کرنے میں اگر قربانی کے ایام گزر جائیں تو بعد میں بکرا خرید کر اس کا صدقہ کردیا جائے، یا اس کی قیمت کا صدقہ کردیا جائے، ذمہ داری ادا ہوجائے گی۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] مؤکل کے لیے قربانی کے جانور کی تعیین اور پیشگی رقم بھیجنا

۱۸۹۵- سوال: ایک آدمی نے کسی کو وکیل بنا کر یہ کہا کہ آپ میری طرف سے قربانی کردیں

---

(۱) وإن وكل إنسانا بأن يشتري له ضأنا فاشترى معزا أو كان على العكس لا يلزم الآمر، كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۳۰۶/۵، كتاب الأضحية، الباب التاسع في المتفرقات، ط: دار الفكر - بيروت ☆ البحر الرائق: ۳۳۸/۸، كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب - ديوبند)

(۲) ومنها أنها تقضى إذا فاتت عن وقتها، ثم قضاؤها قد يكون بالتصدق بعين الشاة حية، وقد يكون بالتصدق بقيمة الشاة، فإن كان قد أوجب التضحية على نفسه بشاة بعينها فلم يضحها حتى مضت أيام النحر فيتصدق بعينها حية سواء كان موسرا أو معسرا، وكذا إذا اشترى شاة ليضحي بها فلم يضح حتى مضى الوقت. (الفتاوى الهندية: ۲۹۴/۵، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر - بيروت ☆ المحيط البرهاني: ۹۱/۶، كتاب الأضحية، الفصل الرابع فيما يتعلق بالمكان والزمان، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

اور کہنے والے نے نہ کوئی جانور کی تعیین کی اور نہ ہی اس کی قیمت کی، آج کل لوگ اپنی قربانی کے لیے اپنے رشتے داروں کو یا اپنے دوست واحباب اور متعلقین کو کہہ دیتے ہیں کہ میری جانب سے ایک قربانی کردینا؛ لیکن وہ نہ تو جانور کی تعیین کرتے ہیں اور نہ پہلے کوئی رقم بھیجتے ہیں؛ بل کہ قربانی کے بعد وہ رقم بھیجتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا قربانی صحیح ہونے کے لیے قربانی کے جانور کی تعیین کرنا اور پہلے سے رقم بھیجنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

''کس جانور کی قربانی کے لیے وکیل بنایا گیا ہے'' اس کی تعیین ضروری ہے؛ یعنی بکرے کی قربانی ہوگی یا گائے وغیرہ کی،[۱] قیمت کی تعیین پہلے سے ضروری نہیں ہے؛ البتہ اگر مقدار کی تعیین ہوگی، تو اس سے زیادہ قیمت والا جانور خریدنا جائز نہیں ہوگا، اگر کسی نے ایسا کیا، تو مؤکل کی قربانی ادا نہیں ہوگی۔[۲]

مؤکل کی قربانی کے صحیح ہونے کے لیے رقم کا پیشگی دینا ضروری نہیں ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) قال - رحمه الله - (وبشراء ثوب أو دابة لا وإن سمى ثمنا) يعني لو وكله بشراء دابة أو ثوب لا يصح التوكيل وإن بين ثمنه؛ لأن هذه جهالة في الجنس فلا يتمكن الوكيل من الامتثال لتفاحش الجهالة؛ لأن ما من نوع يشتريه الوكيل من أنواع ذلك الجنس إلا ويمكن الموكل أن يقول: إني عنيت خلافه. ـــــــ والأمر بما لا يمكن الامتثال به باطل فتخلص لنا من جميع ما ذكرنا أن الجهالة إذا كانت في الجنس لا تجوز الوكالة به مطلقا، وإن كانت في النوع تجوز مطلقا وإن كانت ما بينهما بأن كانت أنواعا، فإن ذكر الثمن أو النوع جازت والتحق بالثاني، وإن لم يبين التحق بالأول فلم تجز. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ھ): ۲۵۹/۴، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

وبشراء ثوب أو دابة لا يصح وإن سمى ثمنا، وهذا كله إذا لم يكن فيه دلالة على العموم، فإن قال: ابتع لي ما رأيت جازت الوكالة؛ لأنه فوض الأمر إلى رأيه. كذا في التبيين، وكذا لو قال: اشتر لي بألف ثيابا أو دواب أو أشياء أو ما شئت أو ما رأيت أو أدنى شيء حضرك أو ما يوجد أو ما يتفق صح، وكذا لو قال: اشتر لي ولم يزد عليه بألف أو بع أو اجعل ألفا من مالك بضاعة؛ لأنه تفويض كذا في الكافي وكذا إذا قال: أي ثوب شئت أو أي دابة شئت أو ما يسر لك من الثياب والدواب صح هكذا في البدائع. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۵۷۳/۳، كتاب الوكالة، الباب الثاني في التوكيل بالشراء، ط: دار الفكر)

(۲) فإن سمى له ثمنا فزاد على ذلك الثمن لم يلزم الآمر. (حاشية الشلبي مع تبيين الحقائق: ۲۵۸/۴، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

(۳) وكذا لو قال: اشتر لي بألف أو بع جازت الوكالة ويصير مستقرضا للألف منه ويصير البائع قابضا للآمر أولا بحكم القرض ثم يصير قابضا لنفسه. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳ھ): ۲۵۹/۴، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

[۲۵] دوسرے کی جانب سے وکیل بن کر قربانی کرنا

۱۸۹۶- سوال: لندن سے یعقوب نے اپنے بھائی کو خط لکھا کہ ایک بڑا جانور خرید لے، پھر سات حصے کے نام لکھوائے، اسی کے مطابق یعقوب کے بھائی نے قربانی کی، یعقوب نے ابھی پیسے نہیں بھیجے ہیں، تو قربانی ہوئی یا نہیں؟ اور صرف یعقوب نیت کر لے، اس کا بھائی نیت نہ کرے، تو بھی قربانی درست ہوگی یا نہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامدا ومصلیا:

یعقوب نے دوسرے ملک سے اپنے بھائی کو خط لکھ کر قربانی کرنے کا وکیل بنایا کہ آپ بڑا جانور خرید کر قربانی کر دیں، رقم عنقریب مل جائے گی، وکیل [بھائی] نے جانور خرید کر یعقوب کی جانب سے قربانی کر دی، تو قربانی ہو جائے گی۔[1] وکیل کو نیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ان کو تو یعقوب کی جانب سے وکیل بن کر قربانی کرنا ہے، لہٰذا قربانی درست ہوگی، اور ایسا سمجھا جائے گا کہ وکیل نے موکل کو قرضہ دے دے کر اس پیسے سے اس کے لیے جانور خریدا اور پھر اس کی جانب سے قربان کر دیا، اس میں عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۶] باہر سے قربانی کرنے کا خط آیا؛ لیکن نہ جانور کی تعیین ہے اور نہ رقم کی

۱۸۹۷- سوال: بیرون ملک سے میرے نام میرے ایک رشتے دار کا ایک خط آیا کہ میری جانب سے ایک قربانی کر دینا؛ لیکن اس میں نہ تو رقم کی وضاحت ہے اور نہ ہی اس بات کی صراحت ہے کہ کون سے جانور کی قربانی کرنی ہے، تو اب ہم کسی بھی جانور کی قربانی کریں گے کیا ان کی طرف سے قربانی ادا ہو جائے

---

(۱) ومنها أنه تجري فيها النيابة فيجوز للإنسان أن يضحي بنفسه أو بغيره بإذنه؛ لأنها قربة تتعلق بالمال فتجري فيها النيابة سواء كان المأذون مسلما أو كتابيا. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۳، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) وكذا لو قال: اشتر لي بألف أو بع جازت الوكالة ويصير مستقرضا للألف منه ويصير البائع قابضا للآمر أولا بحكم القرض ثم يصير قابضا لنفسه. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق - فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ۷۴۳هـ): ۴/ ۲۵۹، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة)

گی یا نہیں؟ اور رقم بھیجنے کی بھی کوئی صراحت خط میں نہیں کی ہے، اس کے باوجود ہم اس کی جانب سے قربانی کر دیں تو کیا قربانی ادا ہوگی یا نہیں؟ اور بعد میں ہمیں ان کے پاس سے رقم منگوانے کا کوئی حق ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جانور کی تعیین ضروری ہے، یعنی بکرے کی قربانی یا گائے وغیرہ کی۔ (۱) جب انہوں نے آپ کو اپنی قربانی کا وکیل بنا دیا اور آپ ان کی جانب سے قربانی کریں گے، تو ان کی قربانی ادا ہو جائے گی اور بعد میں آپ کو ان سے قربانی کی رقم کے مطالبے کا حق ہوگا۔ (۲)

ہاں! اگر انہوں نے آپ کو قربانی کا وکیل نہیں بنایا تھا اور آپ نے ان کی جانب سے قربانی کر دی تو نہ ان کی قربانی صحیح ہوگی اور نہ آپ ان سے رقم وصول کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] گھر کے پلے ہوئے جانور کی قربانی، جب کہ اس میں کسی کا حصہ نہ ہو

۱۸۹۸- سوال: ایک بکرا ہے، جس کی دیکھ ریکھ گھر کے لوگوں نے کی ہے، نیز اس کے بچے کی بھی دیکھ بھال کی ہے اور اس میں کسی اور کا کوئی حصہ نہیں ہے، تو کیا اس کی قربانی کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

گھر والوں میں سے جو بھی اس جانور کا مالک ہوگا، اس کی طرف سے قربانی صحیح ہوگی، دوسروں کی طرف سے صحیح نہیں ہوگی، الا یہ کہ جانور کا مالک اس [دوسرے] کو بہ خوشی مالک بنا دے۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ''مؤکل کے لیے قربانی کے جانور کی تعیین اور پیشگی رقم بھیجنا'' کا حاشیہ نمبر (۱) ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) (قوله: فالأفضل أن يستعين بغيره إلخ)، ولأنها قربة مالية والنيابة في الماليات جائزة كما في الزكاة. اهـ. غاية. (حاشية الشلبي مع تبيين الحقائق: ٦/٩، كتاب الأضحية، يذبح المضحي بيده، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة)

وروي عنهما أيضا أن الرجل إذا كان في مصر وأهله في مصر آخر فكتب إليهم ليضحوا عنه، فإنه يعتبر مكان التضحية. (الفتاوى الهندية: ٥/٢٩٦، كتاب الأضحية، الباب الرابع فيما يتعلق بالمكان والزمان، ط: دار الفكر- بيروت)

(۳) ذكر في فتاوى أبي الليث - رحمه الله تعالى - إذا ضحى بشاة نفسه عن غيره بأمر ذلك الغير أو بغير أمره لا تجوز؛ لأنه لا يمكن تجويز التضحية عن الغير إلا بإثبات الملك لذلك الغير في الشاة، ولن يثبت الملك له في الشاة إلا بالقبض، ولم يوجد قبض الآمر هاهنا لا بنفسه ولا بنائبه، كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ٥/٣٠٢، كتاب الأضحية، الباب السابع في التضحية عن الغير وفي التضحية بشاة الغير عن نفسه، ط: دار الفكر- بيروت)

(۴) والثاني ملك المحل، وهو أن يكون المضحى ملك من عليه الأضحية، فإن لم يكن لا تجوز؛ لأن التضحية قربة ولا قربة في الذبح بملك الغير بغير إذنه. (بدائع الصنائع: ٥/٧٦، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

[۲۸] قربانی کے جانور کے چارہ کے برتن کا صدقہ

۱۸۹۹- سوال: قربانی کے جانور کو جس برتن میں ہم گھاس پانی دیا کرتے تھے، اس کو بھی صدقہ کرنے کے متعلق کتابوں میں پڑھا ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

قربانی کے جانور کی رسی، اسی طرح گرمی سردی سے بچاؤ کے لیے اس کے جسم پر اوڑھایا جانے والا کپڑا یا ٹاٹ وغیرہ، اسی طرح اس کے گلے میں چمڑے یا پلاسٹک کی باندھی جانے والی پٹی، اس کے منہ پر پہنائی جانے والی ناتھ اور ناک کی لگام وغیرہ سب کو صدقہ کر دینا چاہیے۔ (شامی: ۵/ ۲۰۹)[۱]

برتن کو صدقہ کرنے کے استحباب کے متعلق میری نظر سے کوئی جزئیہ نہیں گزرا ہے، آپ کتاب اور صفحہ کا حوالہ مجھے بھیج دیں، غور کر کے بتاؤں گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۹] گائے کی قربانی پر پابندی لگی ہو تو کیا حکم ہے؟

۱۹۰۰- سوال: اگر کوئی حکومت قانون بنا کر گائے کی قربانی بند کرا دے تو کیا یہ اسلام میں مداخلت ہے یا نہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

گائے کو ایک جماعت مقدس جانور سمجھ کر اس کے اجزاء کو موجب برکت سمجھتی ہے؛ جب کہ اسلام میں ماکول اللحم جانور سب برابر ہے؛ لہٰذا جس ملک میں ہم رہتے ہیں، گائے کے ذبیحہ کو علماء کرام نے شعار اسلام قرار دیا ہے، جیسا کہ مجموعۂ فتاوی عبدالحی صفحہ ۳۰۷، کتاب الاضحیہ والعقیقہ کے تحت مذکور ہے۔[۲] اور

---

[۱] (قوله ويتصدق بجلدها) وكذا بجلالها وقلائدها، فإنه يستحب إذا أوجب بقرة أن يجللها ويقلدها، وإذا ذبحها تصدق بذلك كما في التتارخانية. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۲۸، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

ويستحب أن يربط الأضحية قبل أيام النحر بأيام، وأن يقلدها، ويجللها، وأن يسوقها إلى المنسك سوقا جميلا لا عنيفا، وأن لا يجر برجلها إلى المذبح، كذا في البدائع. وإذا ذبحها تصدق بجلالها وقلائدها، كذا في السراجية. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۰، كتاب الأضحية، الباب السادس في بيان ما يستحب في الأضحية والانتفاع بها، ط: دار الفكر)

(۲) آٹھ سوال پر مشتمل ایک استفتاء مجموعۃ الفتاوی میں موجود ہے، جس کا سوال نمبر ۶ مسئلہ بالا سے متعلق ہے، آپ سوال وجواب ملاحظہ فرمائیں:=

شعار اسلام کے خلاف کسی حکومت کا قانون بنانا' مداخلت فی الدین ہے؛ لہٰذا حتی الامکان مسلمان قانونی چارہ جوئی کرتے ہوئے اس طرح کا زہریلا قانون بننے سے روکنے کی کوشش کرے، اور اگر کسی جگہ قانون بن جائے، تو وہاں اس کو ختم کرنے کی سعی کرے، یہ مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے؛ لیکن مسلمان گائے کی قربانی کر کے فتنہ وفساد یا مالی نقصانات سے حتی الامکان پرہیز کرے اور جہاں بہ سہولت گائے ذبح کی جاسکتی ہو، وہاں گائے ذبح کرنے سے اجتناب نہ کرے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] انجکشن کے ذریعہ سوّر کے مادۂ منویہ سے پیدا شدہ گائے کے گوشت، دودھ اور اس کی قربانی کا حکم

۱۹۰۱- سوال: انجکشن کے ذریعہ کسی سوّر کے مادۂ منویہ کو گائے کے رحم میں پہنچایا جاتا ہے، پھر اُس سے بچھڑے یا گائے کا تولّد ہوتا ہے، تو ایسے بچھڑے یا گائے کے گوشت اور دودھ کا حکمِ شرعی کیا ہے؟ نیز ایسے جانور کی قربانی درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

= سوال ششم: اگر قربانی بقر نکند آیا فتورے بدین اسلام راہ می باید یا نہ، قربانی گاؤ یا استعمال لحمش از ارکان دین است وفرض و واجب یا چہ؟ ـــــــ جواب: بہ قربانی کردن گاؤ باعث فتورے نیست، لیکن بخیال عظمتش وعدم جوازش وحلتش اگر ترک قربانی آں خواہد کرد، البتہ در اسلام ...... فتورے خواہد شد۔ (مجموعۃ الفتاوی مع خلاصۃ الفتاویٰ-عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی (م: ۱۳۰۴ھ): ۳۱۱/۴، کتاب الاضحیہ، ط: اشرفیہ-دیوبند)

(۲) حضرت مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمۃ ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں:

قربانی ایک بڑا اسلامی عمل ہے، اگر آج گائے کی قربانی بند کردی جائے، تو بہت سے غریب مسلمان ایسے بھی ہیں، جو بالکل قربانی ہی نہ کرسکیں گے؛ کیوں کہ گائے کا ساتواں حصہ دو ڈیڑھ روپے میں حاصل ہوسکتا ہے، بخلاف بکرے بھیڑ کے، کہ اس میں چار پانچ روپے صرف کرنے پڑتے ہیں، پھر ان کے اس امر شرعی کو ادا نہ کرسکنے کا عذاب کس کی گردن پر ہوگا اس میں شک نہیں کہ بالخصوص گائے کی قربانی کرنا کوئی فرض واجب نہیں ہے؛ لیکن اس موقع پر جب کہ ہندو تعصباً گائے کی قربانی سے مانع ہوں، ان کے اس کہنے کو نہ ماننا اور گائے کی قربانی کرتے رہنا واجب ہے، نہ اس وجہ سے کہ گائے کی قربانی واجب ہے؛ بل کہ اس وجہ سے کہ ہندوؤں کے کہنے سے کسی مباح شرعی کو چھوڑ دینا ناجائز ہے، جب کہ اس کے ترک میں ہتک اسلام بھی ہوتی ہو، جو لوگ کہ ہندوؤں کے ساتھ ان کے اس قسم کے مشورے میں شریک ہوں، وہ گناہ گار ہوں گے ان لوگوں کو توبہ کرنا چاہیے اور اپنے اس خیال سے باز آنا چاہیے، ان لوگوں کے پیچھے نماز مکروہ ہوگی، کسی جگہ اور خصوصاً مکہ معظمہ میں اس قسم کے قانون جاری ہونے کا ہمیں علم نہیں ہوا اور اگر جاری بھی ہوا ہے، تاہم خلاف شرع ہونے کی وجہ سے ناقابل حجت ہے۔ واللہ اعلم۔ (کفایت المفتی: ۱۸۸/۸-۱۸۹، کتاب الاضحیۃ والذبیحۃ، مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ ملکر گائے کی قربانی رکوانا صحیح نہیں، ط: زکریا-دیوبند)

الجواب حامداومصلیا:

ایسی گائے اور بچھڑے کا گوشت اور دودھ استعمال کرنا جائز ہے، اُس کی قربانی بھی جائز ہے، کسی بھی جانور کے حرام یا حلال ہونے میں مادہ کا اعتبار ہوتا ہے، اگر مادہ حلال ہے تو اُس سے پیدا ہونے والا بچہ بھی حلال ہے، فقہاءِ کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی وحشی بھیڑیے نے بکری کے ساتھ جفتی کی، جس کے نتیجے میں بکری کو بچہ پیدا ہوا، تو اُس کی قربانی جائز ہے، اِسی طرح اگر کتے نے بکری کے ساتھ جفتی کی اور اُس سے بچہ پیدا ہوا اور بچہ کا سر کتے جیسا ہے؛ لیکن وہ گھاس اور چارہ کھاتا ہے، تو اُس کے سر کے علاوہ دیگر حصوں کا گوشت کھانا جائز ہے، لیکن اُس کی قربانی درست نہیں ہے، اِس لیے کہ قربانی میں ایسا جانور ہونا ضروری ہے جس کا کھایا جانے والا ہر عضو صحیح سالم ہو اور اُس میں کوئی عیب نہ ہو۔[1]

سوال میں ذکر کردہ گائے اور بچھڑا شکل وصورت میں مکمل گائے جیسے ہی معلوم ہوتے ہیں، البتہ صرف آواز میں فرق ہوتا ہے، لہٰذا اُن کے گوشت اور دودھ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۱] جانور کو ذبح کرنے کے بعد، جلد ٹھنڈا کرنے کے لیے سینہ میں چھری چلانا

۱۹۰۲- سوال: جانور کو ذبح کرنے کے بعد اُسے جلد ٹھنڈا کرنے کے لیے بہت سے لوگ سینہ کی

---

(۱) وفي المتولد منهما تعتبر الأم، وكذا في حق الحل تعتبر الأم. (تبيين الحقائق) ـــــ قال الشلبي: (قوله: وفي المتولد منهما تعتبر الأم) قال الأتقاني قال في خلاصة الفتاوى، ولو نزا كلب على شاة فولدت قال عامة المشايخ: لا يجوز، وقال الإمام الخيزاخزي: إن كان يشبه الأم يجوز، ولو نزا شاة على ظبي قال الإمام الخيزاخزي: إن كان يشبه الأب يجوز، ولو نزا ظبي على شاة، قال عامة المشايخ: يجوز، وقال الإمام الخيزاخزي: العبرة للمشابهة كذا في الخلاصة. اهـ. وكتب ما نصه فإن كانت أهلية يجوز، وإلا فلا حتى لو أن بقرة أهلية نزا عليها ثور وحش فولدت ولدا فإنه يجوز أن يضحي به، وإن كانت البقرة وحشية والثور أهليا لم يجز؛ لأن الأصل في المتولد الأم؛ لأنه ينفصل عن الأم، وهو حيوان متقوم تتعلق به الأحكام، وليس ينفصل من الأب إلا ماء مهينا لا خطر له، ولا يتعلق به حكم، وقيل إذا نزا ظبي على شاة أهلية فأولدت شاة يجوز التضحية بها، وإن ولدت ظبيا لا يجوز، وقيل إن ولدت الرمكة من حمار وحش حمارا لا يؤكل، وإن ولدت فرسا فحكمه حكم الفرس. اهـ بدائع. (حاشية الشلبي مع تبيين الحقائق: ۶/۷، كتاب الأضحية، مما تكون الأضحية، ط: المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، القاهرة * الفتاوى الهندية: ۵/۲۹۷، كتاب الأضحية، الباب الخامس، ط: دار الفكر - بيروت)

جانب سے کچھ کھال اُتار کر [سینہ میں] چھری چلاتے ہیں، جس سے جانور کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ حرکت میں آجاتا ہے، تو ذبح کرنے کے بعد اِس طرح کرنا کہ جس سے جانور کو تکلیف ہوتی ہو جائز ہے یا نہیں؟ کیا اس سے قربانی پر کوئی فرق پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جانور کو ذبح کرنے کے بعد کوئی ایسا عمل نہ کرنا چاہیے، جس سے اُس کو مزید تکلیف ہوتی ہو، ذبح کرنے کے بعد روح قبض ہونے سے پہلے جس طرح بدن کے دیگر حصوں سے کھال اُتارنا مکروہ ہے، اِسی طرح روح قبض ہونے سے پہلے سینہ کی جانب سے بھی کھال نکالنا مکروہ ہے، لیکن اگر ایسا کیا گیا، تو جانور کی حلت یا قربانی کی ادائیگی میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوگا۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] جس جانور سے فائدہ حاصل کیا گیا ہو، اس کی قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۱۹۰۳- سوال: محترم مفتی صاحب! آپ کا بھیجا ہوا ہدیہ مل گیا، جزاکم اللہ تعالیٰ، آپ کی دعا سے گھر میں سب کی طبیعت اچھی ہے، اور سب سلام کہہ رہے ہیں!

آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے، یہاں ایک آدمی کے پاس گائے ہے، اور اس سے دو تین مرتبہ ولادت کے بعد کا دودھ دوہا ہے، اب وہ اس جانور کی قربانی کرنا چاہتا ہے، تو فائدہ اٹھائی ہوئی گائے کی قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قربانی کے جواز کی شرائط اگر گائے میں موجود ہیں، آنکھ، کان، زبان وغیرہ اعضاء اس کے صحیح سالم ہیں، اس میں کوئی عیب نہیں ہے، تو اس گائے کی قربانی کرنا بلا کراہت جائز ہے، پہلے اگر دودھ نکالا ہے، تو اس سے قربانی میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ويكره له بعد الذبح قبل أن تبرد أن ينخعها أيضا وهو أن ينحرها حتى يبلغ النخاع وأن يسلخها قبل أن تبرد؛ لأن فيه زيادة إيلام لا حاجة إليها، فإن نخع أو سلخ قبل أن تبرد فلا بأس بأكلها لوجود الذبح بشرائطه. (بدائع الصنائع: ۶۰/۵، كتاب الذبائح والصيود، قبيل: فصل في بيان ما يحرم أكله من أجزاء الحيوان المأكول، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۲۸۷/۵، كتاب الذبائح، الباب الأول في ركن الذبح وشرائطه وحكمه وأنواعه، ط: دار الفكر)

(۲) (وأما صفته): فهو أن يكون سليما من العيوب الفاحشة، كذا في البدائع. (الفتاوى الهندية: ۲۹۷/۵، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر)

[۳۳۳] ۱- اگر قربانی کا جانور حاملہ نکلے تو؟

[۳۳۴] ۲- قربانی میں عقیقہ کا حصہ رکھ سکتے ہیں؟

۱۹۰۴- سوال: ایک آدمی نے قربانی کے لیے گائے رکھی، اس کو معلوم نہیں تھا کہ گائے حاملہ ہے، جب قربانی کی تو اس کو ذبح کرنے پر اس میں سے مردہ بچہ نکلا، تو اس نے گائے کی قربانی کے بعد مردہ بچے کی بھی قربانی کی تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۲) قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ رکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

گائے، بکری، اونٹنی اور بھینس وغیرہ کو ذبح کرنے پر اس میں سے اگر مردہ بچہ نکلے، تو امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق اس کا کھانا حرام ہے، اگر زندہ نکلے، تو اس کو ذبح کر کے کھانا جائز ہے؛ اس لیے مذکورہ مردہ بچے کو ذبح کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، اس بچے کا کھانا حرام ہے، البتہ گائے کی قربانی صحیح ہو جائے گی، کیوں کہ قربانی کرنے والے کو اس کا گابھن (حاملہ) ہونا معلوم ہی نہ تھا۔ (مجمع الانہر: ۲/ ۵۱۲)[1]

---

[۱] (ولا يحل الجنين بذكورة أمه أشعر أو لا) حتى لو نحر ناقة أو ذبح بقرة أو شاة فخرج من بطنها جنين ميت لم تؤكل عند الإمام وزفر وحسن بن زياد؛ لأنه مستقل في حياته فيشترط فيه ذكوة استقلالية (وقالا يحل إن تم خلقه) لقوله-عليه الصلاة والسلام- ذكاة الجنين ذكاة أمه، وبه قالت الأئمة الثلاثة. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م:۱۰۷۸ھ): ۲/ ۵۱۲، كتاب الذبائح، قبيل: فصل فيما يحل أكله ومالا يحل، ط: دار إحياء التراث العربي)

قال: "ومن نحر ناقة أو ذبح بقرة فوجد في بطنها جنينا ميتا لم يؤكل أشعر أو لم يشعر" وهذا عند أبي حنيفة. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م:۵۹۳ھ): ۴/ ۳۵۱، كتاب الذبائح، قبيل: فصل: فيما يحل أكله ومالا يحل، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي- بيروت)

نوٹ: اگر کسی جانور کا گابھن ہونا پہلے سے معلوم ہو، تو اس کی قربانی مکروہ ہوگی:

شاة أو بقرة أشرفت على الولادة قالوا يكره ذبحها؛ لأن فيه تضييع الولد، وهذا قول أبي حنيفة- رحمه الله تعالى - لأن عنده الجنين لا يتذكى بذكاة الأم، كذا في فتاوى قاضي خان. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۸۷، كتاب الذبائح، الباب الأول في ركن الذبح وشرائطه وحكمه وأنواعه، ط: دار الفكر)

(۲) قربانی کے جانور میں ۱-۲-۳، جتنے حصے عقیقہ کے رکھنا چاہیں، رکھ سکتے ہیں۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

[۳۵] قربانی کا جانور بدلنا

۱۹۰۵- سوال: میں نے قربانی کے لیے ایک گائے خریدی، عید سے چار دن پہلے مجھے خیال آیا کہ اس گائے سے فتنہ اور جھگڑا ہوگا؛ اس لیے کہ ہمارے علاقہ میں گائے کی قربانی ہی نہیں کی جاتی اور اگر کی جاتی ہے تو بہت چھپ چھپا کر ذبح کرنا ہوتا ہے، تو میں نے اس کے بدلے میں بھینسا کی قربانی کی، تو قربانی ادا ہوئی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

مالدار آدمی قربانی کا جانور خریدنے کے بعد بھی بدل سکتا ہے؛ اس لیے مذکورہ صورت میں قربانی صحیح ہوگی؛ لیکن گائے کے بیچنے کے بعد اتنی رقم آئی کہ بھینسا خریدا جاسکے یا کم آئی تو کوئی حرج نہیں، ہاں اگر بھینسے کی قیمت سے زیادہ آئی، تو اس [زیادتی] کا صدقہ کرنا ضروری ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۶] قربانی کے لیے متعین جانور کی جگہ دوسرا جانور ذبح کرنا

۱۹۰۶- سوال: عمر نے قربانی کے لیے ایک بڑا جانور خرید کر زید کو دیا، تاکہ وہ قربانی کر کے

---

(۱) وشمل ما لو كانت القربة واجبة على الكل أو البعض، اتفقت جهاتها أو لا: كأضحية وإحصار وجزاء صيد وحلق ومتعة وقران ...؛ لأن المقصود من الكل القربة، وكذا لو أراد بعضهم العقيقة عن ولد قد ولد له من قبل؛ لأن ذلك جهة التقرب بالشكر على نعمة الولد، ذكره محمد. (ردالمحتار على الدر المختار: ۶/۳۲۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) رجل اشترى شاة للأضحية وأوجبها بلسانه، ثم اشترى أخرى جاز له بيع الأولى في قول أبي حنيفة ومحمد- رحمهما الله تعالى-، وإن كانت الثانية شرا من الأولى، وذبح الثانية، فإنه يتصدق بفضل ما بين القيمتين؛ لأنه لما أوجب الأولى بلسانه فقد جعل مقدار مالية الأولى لله تعالى، فلا يكون له أن يستفضل لنفسه شيئا، ولهذا يلزمه التصدق بالفضل قال بعض مشايخنا: هذا إذا كان الرجل فقيرا، فإن كان غنيا فليس عليه أن يتصدق بفضل القيمة، قال الإمام شمس الأئمة السرخسي: الصحيح أن الجواب فيهما على السواء، يلزمه التصدق بالفضل غنيا كان أو فقيرا؛ لأن الأضحية وإن كانت واجبة على الغني في الذمة، فإنما يتعين المحل بتعيينه، فتعين هذا المحل بقدر المالية؛ لأن التعيين يفيد في ذلك. (الفتاوى الهندية: ۵/۲۹۴، كتاب الأضحية، الباب الثاني في وجوب الأضحية بالنذر وما هو في معناه، ط: دار الفكر)

گاؤں والوں میں تقسیم کردے، اب ہوا یوں کہ کچھ دنوں بعد [عید قرباں کے بعد] عمر کا زید کے گاؤں جانا ہوا، تو اس نے زید کو دیا ہوا اپنا قربانی کا جانور زید کے آنگن میں بندھا ہوا دیکھا، اسے حیرت ہوئی، اس نے پوچھا کہ یہ جانور ابھی تک یہاں کیوں ہے؟ تو زید نے جواب دیا کہ آپ کا جانور میرے لڑکے کو پسند آ گیا، تو ہم نے یہ جانور رکھ لیا اور اس کی جگہ دوسرے جانور کی قربانی کردی، تو کیا اس طرح کی گئی قربانی درست ہے؟ اور صاحب قربانی (عمر) سے قربانی کا ذمہ ساقط ہوا یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

قربانی درست نہیں ہوئی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) کیوں کہ زید کو، مؤکل [عمر] نے اپنے جانور کی قربانی کرنے کا وکیل بنایا تھا، اور اس نے مؤکل کے جانور کے علاوہ، دوسرے جانور کی قربانی کی، جب کہ اس کی اجازت اس نے مؤکل سے حاصل نہیں، تو یہ ایسا ہی ہوگیا، گویا کہ وکیل نے مؤکل کی جانب سے بلا اجازت کسی جانور کی قربانی کی، اور مسئلہ ہے کہ صاحب قربانی کی اجازت کے بغیر کوئی قربانی کرے، تو ادا نہیں ہوگی:

ذکر في فتاوی أبي اللیث - رحمه الله تعالی - إذا ضحی بشاة نفسه عن غیره بأمر ذلك الغیر أو بغیر أمره لا تجوز؛ لأنه لا یمکن تجویز التضحیة عن الغیر إلا بإثبات الملك لذلك الغیر في الشاة، ولن یثبت الملك له في الشاة إلا بالقبض، ولم یوجد قبض الآمر هاهنا لا بنفسه ولا بنائبه، کذا في الذخیرة. (الفتاوی الهندیة: ۳۰۲/۵، کتاب الأضحیة، الباب السابع في التضحیة عن الغیر وفي التضحیة بشاة الغیر عن نفسه، ط: دار الفکر - بیروت)

عن جابر -رضي الله عنه-، قال: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم-: لا تذبحوا إلا مسنة، إلا أن يعسر عليكم، فتذبحوا جذعة من الضأن.

(الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۵۵، رقم الحديث: ۱۳- (۱۹۶۳)، كتاب الأضاحي، باب سن الأضحية، ط: ديوبند)

باب سن الأضحية

[قربانی کے جانور کی عمر کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب سن الأضحية

[قربانی کے جانور کی عمر کا بیان]

[۱] قربانی کے جانور کی عمر اور علامتی دانت

۱۹۰۷- سوال: ایک غیر مسلم کے پاس سے ہم نے قربانی کا بکرا خریدا، گھر لانے کے بعد کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ بکرا سال بھر کا نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کے علامتی دانت نہیں نکلے ہیں؛ جب کہ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ بہت سے بکروں کے یہ دانت سوا سال کے بعد بھی نکلتے ہیں، اور جس غیر مسلم مالک سے ہم نے یہ بکرا خریدا ہے، اس نے ہمیں سال سے اوپر کا بتلایا ہے اور دیکھنے میں بھی جسامت کے اعتبار سے یہ بکرا سال بھر کا معلوم ہوتا ہے، تو اس سلسلہ میں شرعاً کیا حکم ہے؟ اس بکرے کی قربانی جائز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قربانی کے جانور کے متعلق حدیث شریف میں دو لفظ آئے ہیں: "ثني"[1] جس کا معنی ہے: 'دانت

---

(۱) عن عاصم بن كليب، عن أبيه قال: كنا في سفر فحضر الأضحى، فجعل الرجل منا يشتري المسنة بالجذعتين والثلاثة، فقال لنا رجل، من مزينة: كنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في سفر، فحضر هذا اليوم، فجعل الرجل يطلب المسنة بالجذعتين والثلاثة، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إن الجذع يوفي مما يوفي منه الثني".
(المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي - أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳ھ): ۷/۲۱۹، رقم الحديث: ۴۳۸۳، كتاب الضحايا، المسنة والجذعة، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية - حلب) =

والا ہونا' کیوں کہ جانور کے نیچے کے دانت دیکھے جاتے ہیں، اور دوسرا لفظ ہے: ''مسنة''(۲) جس کا معنی دانت والا اور عمر والا دونوں ہوتا ہے۔

لہٰذا بکرا ایک سال کا، گائے، بھینس ۲ر سال کی اور اونٹ کم از کم ۴ر سال کا اور ایک روایت کے مطابق ۵ر سال کا ہونا ضروری ہے؛ لیکن دنبہ ۷-۸ مہینہ کا ہو، اور سال بھر کا معلوم ہوتا ہو، تو اس کی قربانی جائز ہے، باقی جانوروں میں ایک دن بھی کم ہو، تو قربانی جائز نہیں، مذکور عمر کا مکمل ہونا ضروری ہے اور اس سے

(و) الثنية: (الناقة الطاعنة في السادسة.ـــــ (والبعير ثني) . . . . (و) الثنية: (الفرس الداخلة في الرابعة، والشاة في الثالثة، كالبقرة) .ـــــ وفي الصحاح: الثني الذي يلقي} ثنيته، ويكون ذلك في الظلف والحافر في السنة الثالثة، وفي الخف في السنة السادسة.ـــــ وفي المحكم: الثني من الإبل الذي يلقي ثنيته وذلك في السادسة، ومن الغنم الداخل في السنة الثانية تيسا كان أو كبشا.ـــــ وفي التهذيب: البعير إذا استكمل الخامسة وطعن في السادسة فهو {ثني، وهو أدنى مايجوز من سن الإبل في الأضاحي، وكذلك من البقر والمعزى، فأما الضأن فيجوز منها الجذع في الأضاحي، وإنما سمي البعير} ثنيا لأنه ألقى ثنيته.ـــــ قال ابن الأعرابي: ليس قبل الثني اسم يسمى ولا بعد البازل اسم يسمى.ـــــ وقيل: كل ما سقطت ثنيته من غير الإنسان ثني، والظبي ثني بعد الإجذاع.ـــــ وقال ابن الأثير: الثنية من الغنم ما دخل في الثالثة، ومن البقر كذلك، ومن الإبل في السادسة، والذكر ثني، وعلى مذهب أحمد ما دخل من المعز في الثانية، ومن البقر في الثالثة. "ـــــ وقال ابن الأعرابي: في الفرس إذا استتم الثالثة ودخل في الرابعة ثني. (تاج العروس من جواهر القاموس- محمّد بن محمّد بن عبد الرزّاق الحسيني، أبو الفيض، الملقب بمرتضى، الزَّبيدي (م:١٢٠٥هـ): ٣٧/ ٢٩٧، (فصل الثاء) المثلثة مع الواو والياء، ثني، ت: مجموعة من المحققين، ط: دار الهداية☆لسان العرب- محمد بن مكرم بن على، أبو الفضل، جمال الدين ابن منظور الأنصاري الرويفعى الإفريقى (م:١١٧هـ): ١٤/ ١٢٣، فصل الثاء المثلثة، ط: دار صادر- بيروت)

(٢) عن جابر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تذبحوا إلا مسنة، إلا أن يعسر عليكم، فتذبحوا جذعة من الضأن. (الصحيح لمسلم: ٢/ ١٥٥، رقم الحديث: ١٣- (١٩٦٣)، كتاب الأضاحي، باب سن الأضحية، ط: ديوبند)

والبقرة والشاة يقع عليهما اسم {المسن، إذا أثنيا، فإذا سقطت ثنيتهما بعد طلوعها فقد أسنت، وليس معنى} إسنانها كبرها كالرجل، ولكن معناه طلوع ثنيتها، وتثني البقرة في السنة الثالثة، وكذلك المعزى تثني في الثالثة، ثم تكون رباعية في الثالثة، ثم سدسا في الخامسة، ثم سالغا في السادسة، وكذلك البقر في جميع ذلك.

وقال الأزهري: وأدنى الأسنان: الإثناء، وهو أن تنبت ثنيتاها، وأقصاها في الإبل: البزول، وفي البقر والغنم السلوغ. (تاج العروس من جواهر القاموس- محمّد بن محمّد بن عبد الرزّاق الحسيني، أبو الفيض، الملقّب بمرتضى، الزَّبيدي (م:١٢٠٥هـ): ٣٥/ ٢٣٤، سنن، ت: مجموعة من المحققين، ط: دار الهداية☆المصباح المنير في غريب الشرح الكبير- أحمد بن محمد بن علي الفيومي ثم الحموي، أبو العباس (م: نحو ٧٧٠هـ): ١/ ٢٩١، مادة: س ن ي، ط: المكتبة العلمية- بيروت)

زیادہ عمر ہو، تو بہتر ہے۔ (بدائع الصنائع: ۷۱/۵ ☆ شامی: ۲۸۱/۵)[۳]

البتہ قدرت خداوندی یہ ہے کہ بعض جانوروں کی عمر پوری ہوجانے کے باوجود بھی دانت نہیں نکلتے ہیں، پس عمر کی تعیین میں دانت کا ہونا ضروری نہیں، اگر آپ کو جانور کی عمر کے متعلق علم ویقین ہو یا کوئی دین دار مسلمان اس کے متعلق خبر دے، تو بنا دانت والے جانور کی بھی قربانی جائز ہے۔[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

---

[۳] (وأما) معاني هذه الأسماء فقد ذكر القدوري - رحمه الله - أن الفقهاء قالوا: الجذع من الغنم ابن ستة أشهر والثني منه ابن سنة، والجذع من البقر ابن سنة والثني ابن سنتين، والجذع من الإبل ابن أربع سنين والثني منها ابن خمس، وذكر القاضي في شرحه مختصر الطحاوي في الثني من الإبل ما تم له أربع سنين وطعن في الخامسة، وذكر الزعفراني في الأضاحي: الجذع ابن ثمانية أشهر أو تسعة أشهر، والثني من الشاة والمعز ما تم له حول وطعن في السنة الثانية، ومن البقر ما تم له حولان وطعن في السنة الثالثة، ومن الإبل ما تم له خمس سنين وطعن في السنة السادسة، وتقدير هذه الأسنان بما قلنا لمنع النقصان لا لمنع الزيادة، حتى لو ضحى بأقل من ذلك سنا لا يجوز ولو ضحى بأكثر من ذلك سنا يجوز ويكون أفضل. (بدائع الصنائع: ۷۰/۵، كتاب التضحية، فصل في محل إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۲/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر - بيروت)

(۴) قال: "ويقبل في المعاملات قول الفاسق، ولا يقبل في الديانات إلا قول العدل". ووجه الفرق أن المعاملات يكثر وجودها فيما بين أجناس الناس، فلو شرطنا شرطا زائدا يؤدي إلى الحرج فيقبل قول الواحد فيها عدلا كان أو فاسقا كافرا أو مسلما عبدا أو حرا ذكرا أو أنثى دفعا للحرج. أما الديانات فلا يكثر وقوعها حسب وقوع المعاملات فجاز أن يشترط فيها زيادة شرط، فلا يقبل فيها إلا قول المسلم العدل؛ لأن الفاسق متهم والكافر لا يلتزم الحكم فليس له أن يلزم المسلم، بخلاف المعاملات؛ لأن الكافر لا يمكنه المقام في ديارنا إلا بالمعاملة. ولا يتهيأ له المعاملة إلا بعد قبول قوله فيها فكان فيه ضرورة، ولا يقبل فيها قول المستور في ظاهر الرواية. وعن أبي حنيفة أنه يقبل قوله فيها جريا على مذهبه أنه يجوز القضاء به، وفي ظاهر الرواية هو والفاسق فيه سواء حتى يعتبر فيهما أكبر الرأي. ــــــــ قال: "ويقبل فيها قول العبد والحر والأمة إذا كانوا عدولا"؛ لأن عند العدالة الصدق راجح والقبول لرجحانه. فمن المعاملات ما ذكرناه، ومنها التوكيل. ومن الديانات الإخبار بنجاسة الماء حتى إذا أخبره مسلم مرضي لم يتوضأ به ويتيمم. (الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۳۶۴/۴-۳۶۵، كتاب الكراهية، فصل: في الأكل والشرب، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ المحيط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۲۹۳/۵، كتاب الاستحسان والكراهية، الفصل الأول في العمل بخبر الواحد، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۲] بغیر دانت والے جانور کی قربانی

۱۹۰۸- سوال: ایک جانور ایسا ہے، جس کی عمر تقریباً ڈھائی سال ہے، لیکن اسے دانت نہیں ہیں، کیا اس کی قربانی جائز ہے؟

نوٹ: بہشتی ثمر کے دوسرے حصے میں یہ مسئلہ ہے کہ جس جانور کے دانت نہ ہوں، اس کی قربانی جائز نہیں ہے اور اگر دانت تو نکلے ہوں؛ لیکن بعد میں گر گئے ہوں، اور جتنے گرے ہوں، اس سے زائد باقی ہوں، تو جائز ہے، ورنہ جائز نہیں ہے۔[۱] سوال یہ ہے کہ کیا اس مسئلے سے استدلال درست ہے، یا یہ مسئلہ بڑی عمر کے جانوروں کے لیے ہے؟ جواب تحریر فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً و مصلیاً:

دانتوں کے ذریعے جانوروں کے عمر کی پہچان ہوتی ہے، دو دانت والا بکرا، بکری یا مینڈھا ایک سال سے کم کا، اسی طرح گائے وبھینس دو سال سے کم کی نہیں ہوتی۔ ہاں ایسا ہوسکتا ہے کہ بکرا بکری سال بھر کا ہوجائے یا گائے وبھینس دو سال کی ہوجائے اور اسے دانت نہ نکلے ہوں۔

چوں کہ قربانی درست ہونے کے لیے جانوروں کے مقررہ عمر کا پورا ہونا ضروری ہے، اس لیے دانتوں کو عمر مکمل ہونے کے لیے بہ طور علامت قرار دیا گیا ہے، اگر کسی جانور کے بارے میں متعینہ عمر کے پورا ہونے کا یقینی علم ہو، اور اس کے دانت نہ نکلے ہوں، تو اس کی قربانی میں کوئی حرج نہیں ہے۔[۲]

(۱) جس جانور کے بالکل دانت نہ ہوں، اس کی قربانی درست نہیں اور اگر کچھ دانت گر گئے؛ لیکن جتنے گرے ہیں، اس سے زیادہ باقی ہیں، تو اس کی قربانی درست ہے۔ (بہشتی ثمر- مولانا عیسیٰ صاحب: ۲/۴۹، ط: امدادیہ- دیوبند)

(۲) اس سلسلے میں ایک تفصیلی سوال اور جواب ''کفایت المفتی'' میں منقول ہے، ملاحظہ فرمائیں:

(سوال) قربانی کے جانوروں کی عمر، جن کا ادنیٰ درجہ دو دانت والا ہے، ان سے شمار ہوگی یا کہ سالوں سے، اگر سالوں سے شمار کی جائے تو سوالات مندرجہ ذیل کا کیا جواب ہوگا۔

(۱) کسی صحیح حدیث میں جانوروں کی عمر سنین سے بیان نہیں کی گئی ہے؛ بل کہ احادیث میں لفظ ثنایا' مسنہ وارد ہے، ثنایا کے معنی باتفاق لغت ''دو دانت'' کے ہیں؛ کیوں کہ قربانی کے جانوروں کے نچلے دانت شمار کیے جاتے ہیں اور مسنہ ماخوذ از سن ہے اور کتب لغت میں اس کے دو معنی مذکور ہیں، دانت اور سال؛ لیکن حدیث: لاتذبحوا الا مسنة (صحیح مسلم شریف، کتاب الاضاحی، باب من الاضحیة: ۲/۱۵۵، ط: قدیمی) دانت والا معنی متعین ہیں؛ کیوں کہ حدیث مسلم شریف میں ضحوا بالثنایا۔ (صحیح مسلم شریف، کتاب الاضاحی، باب من الاضحیة، ۲/۱۵۵، ط: قدیمی) موجود ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ تم دو دانت والے جانور کی قربانی کرو اور قربانی کے جانور کی یہ عمر کم=

=از کم ہے اگر اس سے زائد ہو تو افضل ہے۔

دوسری دلیل اشعۃ اللمعات باب الاضحیہ میں شاہ صاحب تحت حدیث لاتذبحوا الامسنۃ وجہ تسمیہ مسنہ آنست کہ وی می انداز دو دندان پیش را کہ آں را ثنایا گویند دریں عمر" عبارت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ فقہائے کرام نے جو عمر قربانی کے جانوروں کی بیان کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جانور اس عمر میں دو دانت والے ہو جاتے ہیں، مثلاً گائے کی عمر فقہائے کرام بیان فرماتے ہیں کہ تیسرے سال میں اس کا پاؤں ہو، تو جب گائے کا پاؤں تیسرے سال میں ہوگا، تو اس میں دو دانت والی ہو جاتی ہے، کوئی چند دن پہلے اور کوئی چند دن پیچھے؛ کیوں کہ خلقت خدا کے اوپر کسی کو احاطہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں عبارت مذکورہ سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ مسنہ کے مصداق وہ جانور ہیں، جنہوں نے دو دانت اگلے ڈال دیئے ہوں، تو جس جانور نے دو دانت ڈال دیئے ہوں، جب وہ ثنایا کا مصداق نہیں ہوتا، تو اس کی قربانی بھی جائز نہیں؛ کیوں کہ قربانی کے لیے کم از کم ثنایا ضرور چاہیے: **كما قال النبي صلى الله عليه وسلم: ضحوا بالثنايا. رواه مسلم.** (اشعۃ اللمعات، باب الاضحیہ، ۱/۶۰۸، ط: وکٹوریہ، سکھر)

(۲) قربانی کے جانور کا ثنایا ہونا، یہ فقہائے کرام کے خلاف بھی نہیں، کیوں کہ مثلاً گائے تیسرے سال میں دو دانتی ہو جاتی ہے، خواہ جس دن ہو، اگر خلاف ہے تو کس دلیل سے ہے؟

(۳) اگر دو گائیں ایک شخص کے پاس موجود ہیں، قد و جسم کے لحاظ سے برابر ہیں، ایک دو دانتی ہے اور دوسری کے بھی دو سال مکمل گزر گئے، لیکن ابھی تک دو دانتی نہیں ہوئی، اب خریدنے والے کو دونوں کی عمر کا صحیح علم نہیں ہے، وہ کون سی گائے قربانی کے لیے خرید سکتا ہے اگر دونوں خرید سکتا ہے تو کس دلیل سے؟

(۴) جب احادیث صحیحہ سے ثابت ہو گیا کہ قربانی کے لی جانور کا دو دانت والا ہونا ضروری ہے تو اب اگر فقہائے کرام کی عبارت کا مصداق یہ لیا جائے کہ اگر مثلاً گائے پر دو سال گزر گئے ہیں، خواہ وہ دانت نہ ڈالے اس کی قربانی جائز ہے، تو یہ خلاف حدیث ہوگا اگر نہیں تو کس دلیل سے؟

(۵) کیا ثنایا ثنی کی جمع ہے؟ اگر جمع ہے تو اس کا معنی لغوی ثنایا کے معنی لغوی کے خلاف ہے۔

(۶) سن اپنے معنی دانت اور سال میں مشترک ہے یا حقیقت مجاز؟

(۷) کسی حدیث صحیح یا قول فقیہ مفتی بہ سے ثابت کریں کہ قربانی کے لیے اگر جانور ثنایا نہ ہو، تب بھی اس کی قربانی جائز ہے بغیر جذع من الضان کے۔ [المستفتی نمبر ۲۸۱۰ حکیم مولوی محمد شریف ضلع گوجرانوالہ ۸ ذیقعدہ ۷۱؁ھ ۳۱ جولائی ۱۹۵۲؁ء]

(جواب) قربانی کے لیے جانوروں کی عمریں متعین ہیں، بکری بکرا ایک سال کا ہو، اور گائے دو سال کی۔ چوں کہ اکثری حالات میں جانوروں کی صحیح عمر معلوم نہیں ہوتی؛ اس لیے ان کے دانتوں کو عمر معلوم کرنے کا اور اس پر عمل کرنے کا احتیاطاً حکم دیا گیا ہے۔ دانتوں کی علامت ایسی ہے کہ اس میں کم عمر کا جانور نہیں آسکتا، ہاں زیادہ عمر کا جانور آجائے تو ممکن ہے، اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پس اگر کسی شخص کے گھر بکرا ذی الحجہ کی پہلی تاریخ کو پیدا ہوا اور اسی کے گھر پرورش پاتا رہا، تو آئندہ ذی الحجہ کی دس تاریخ کو وہ ایک سال نو دن کا ہوگا، اب اگر اس کے پکے دانت نہ نکلے ہوں، تب بھی وہ اس کی قربانی کرسکتا ہے؛ کیوں کہ اس کی عمر یقیناً=

چوں کہ آپ کا جانور ڈھائی سال کا ہے، اس لیے اس کی قربانی کے جواز میں شبہ نہ کریں۔

بغیر دانت کے جانور کے متعلق (عالمگیری جلد ۵ صفحہ ۱۱۴، بدائع الصنائع جلد ۵ صفحہ ۷۵) میں لکھا ہے کہ جانور کے دانت نہ ہو؛ لیکن وہ چارہ چرتا ہو، تو اس کی قربانی جائز ہے، عالمگیری میں اس کو اصح کہا گیا ہے۔(۳)

رہ گئی بات بہشتی ثمر کی، تو اس مسئلے کے دو جزء ہیں، پہلے جزء میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر کسی جانور کے دانت نہ نکلے ہوں، تو اس کی قربانی درست نہیں ہے، کیوں کہ شریعت کی طرف سے متعینہ عمر کی تکمیل نہیں ہوئی ہے۔ اور دوسرے جزء میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر کسی جانور کے دانت تو نکلے ہوں، لیکن درازیٔ عمر کی وجہ سے گر گئے ہوں، تو دیکھا جائے کہ گرنے والے دانت کم ہیں یا زیادہ، اگر کم ہیں، تو اس کی قربانی درست ہوگی، ورنہ نہیں۔ یہ مسئلہ عالم گیری میں ذکر کیے گئے اصح قول کے برخلاف ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

= ایک سال کی پوری ہوکر آٹھ نو روز زائد کی ہوچکی ہے؛ لیکن وہ یہ حکم نہیں دے سکتا کہ بے دانت کا ہر بکرا قربانی کیا جاسکتا ہے، خواہ اس کی عمر کا یکسالہ ہونے کا یقین ہو یا نہ ہو، بس میرے خیال میں یہ بات صحیح ہے مسنہ کے معنی دانت والے اور سال بھر والے دونوں ہوسکتے ہیں۔ لیکن سال بھر کا ہونا کسی بکرے کا جس کی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو یا مشتبہ ہو بغیر دو دانتوں کے معلوم نہیں ہوسکتا، اس لیے عام حکم یہی دینا مناسب تھا اور وہی دیا گیا۔ واللہ اعلم محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ دہلی۔ (کفایت المفتی-مفتی کفایت اللہ (م: ۱۳۷۲ھ): ۲۱۶/۸-۲۱۷، کتاب الاضحیۃ والذبیحۃ، فصل دہم: قربانی کے جانوروں کی عمر، ط: زکریا-دیوبند)

عن جابر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تذبحوا إلا مسنة، إلا أن يعسر عليكم، فتذبحوا جذعة من الضأن. (الصحيح لمسلم: ۱۵۵/۲، رقم الحديث: ۱۳-(۱۹۶۳)، كتاب الأضاحي، باب سن الأضحية، ط: ديوبند)

والبقرة والشاة يقع عليهما اسم {المسن، إذا أثنيا، فإذا سقطت ثنيتهما بعد طلوعها فقد أسنت، وليس معنى} إسنانها كبرها كالرجل، ولكن معناه طلوع ثنيتها، وتثني البقرة في السنة الثالثة، وكذلك المعزى تثني في الثالثة، ثم تكون رباعية في الثالثة، ثم سدسا في الخامسة، ثم سالغا في السادسة، وكذلك البقر في جميع ذلك.

وقال الأزهري: وأدنى الأسنان: الإثناء، وهو أن تنبت ثنيتاها، وأقصاها في الإبل: البزول، وفي البقر والغنم السلوغ. (تاج العروس من جواهر القاموس- محمّد بن محمّد بن عبد الرزّاق الحسيني، أبو الفيض، الملقّب بمرتضى، الزَّبيدي (م: ۱۲۰۵هـ): ۲۳۴/۳۵، سن، ت: مجموعة من المحققين، ط: دار الهداية☆المصباح المنير في غريب الشرح الكبير-أحمد بن محمد بن علي الفيومي ثم الحموي، أبو العباس (م: نحو ۷۷۰هـ): ۲۹۱/۱، مادة: س ن ي، ط: المكتبة العلمية-بيروت)

(۳) وأما الهتماء-وهي التي لا أسنان لها-فإن كانت ترعى وتعتلف جازت وإلا فلا، كذا في البدائع. وهو الصحيح، كذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية: ۲۹۸/۵، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب)

[۳] جس گائے کے دو دانت گر گئے ہوں، اس کی قربانی کا حکم

۱۹۰۹-سوال: گائے کی قربانی کرنی ہو، تو اُس کے کتنے دانت ہونے ضروری ہیں؟ کچھ دانت گر گئے ہوں تو اُس کا کیا حکم ہے؟ ہم نے قربانی کے لیے ایک گائے خریدی ہے، جس کے چھ دانت ہیں، دو گر گئے ہیں، ایسی گائے کی قربانی کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قربانی کی صحت کے لیے جانور کی عمر کو دیکھا جاتا ہے، نہ کہ اس کے دانت کو، دانت تو عمر کے لیے صرف علامت ہے، اونٹ پانچ سال کا ہو، گائے، بھینسا دو سالہ اور بکرا یا بکری ایک سال کے ہونے ضروری ہیں، اِس سے کم عمر والے جانور کی قربانی کرنا صحیح نہیں ہے۔(1)

---

(1) عن جابر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تذبحوا إلا مسنة، إلا أن يعسر عليكم، فتذبحوا جذعة من الضأن. (الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۵۵، رقم الحديث: ۱۳- (۱۹۶۳)، كتاب الأضاحي، باب سن الأضحية، ط: ديوبند)

والبقرة والشاة يقع عليهما اسم {المسن، إذا أثنيا، فإذا سقطت ثنيتهما بعد طلوعها فقد أسنت، وليس معنى} إسنانها كبرها كالرجل، ولكن معناه طلوع ثنيتها، وتثني البقرة في السنة الثالثة، وكذلك المعزى تثني في الثالثة، ثم تكون رباعية في الثالثة، ثم سدسا في الخامسة، ثم سالغا في السادسة، وكذلك البقر في جميع ذلك.

وقال الأزهري: وأدنى الأسنان: الإثناء، وهو أن تنبت ثنيتاها، وأقصاها في الإبل: البزول، وفي البقر والغنم السلوغ. (تاج العروس من جواهر القاموس- محمّد بن محمّد بن عبد الرزّاق الحسيني، أبو الفيض، الملقّب بمرتضى، الزَّبيدي (م: ۱۲۰۵هـ): ۳۵/ ۲۳۴، سنن، ت: مجموعة من المحققين، ط: دار الهداية☆المصباح المنير في غريب الشرح الكبير-أحمد بن محمد بن علي الفيومي ثم الحموي، أبو العباس (م: نحو ۷۷۰هـ): ۱/ ۲۹۱، مادة: س ن ي، ط: المكتبة العلمية- بيروت)

(وأما) معاني هذه الأسماء فقد ذكر القدوري - رحمه الله - أن الفقهاء قالوا: الجذع من الغنم ابن ستة أشهر والثني منه ابن سنة، والجذع من البقر ابن سنة والثني ابن سنتين، والجذع من الإبل ابن أربع سنين والثني منها ابن خمس، وذكر القاضي في شرحه مختصر الطحاوي في الثني من الإبل ما تم له أربع سنين وطعن في الخامسة، وذكر الزعفراني في الأضاحي: الجذع ابن ثمانية أشهر أو تسعة أشهر، والثني من الشاة والمعز ما تم له حول وطعن في السنة الثانية، ومن البقر ما تم له حولان وطعن في السنة الثالثة، ومن الإبل ما تم له خمس سنين وطعن في السنة السادسة، وتقدير هذه الأسنان بما قلنا لمنع النقصان لا لمنع الزيادة، حتى لو ضحى بأقل من ذلك سنا لا يجوز ولو ضحى بأكثر من ذلك سنا يجوز ويكون أفضل. (بدائع الصنائع: ۵/ ۷۰، كتاب التضحية، فصل في محل إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت☆تكملة رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۲۲، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر- بيروت)

دانتوں سے عمر کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن دانت گر گئے ہوں اور اکثر دانت موجود ہوں، جن سے جانور پیٹ بھر کر چر سکتا ہو، اور دانت گر جانے کی وجہ سے اُسے گھاس چرنے اور کھانے میں خلل واقع نہیں ہوتا ہے، تو ایسے جانور کی قربانی جائز ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] گزشتہ بقرعید میں پیدا ہونے والے بکرے کی امسال قربانی کرنا

۱۹۱۰- سوال: محترم حضرت مفتی صاحب! اس سوال کا جواب عنایت فرمائیں کہ: سال گزشتہ بقرعید میں یعنی ۱۰-۱۱ ذی الحجہ میں پیدا ہونے والے بکرے کی اس سال بقرعید میں قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

احتیاط بہتر ہے، حضرت مولانا مفتی اسماعیل بسم اللہؒ کا فتویٰ یہ تھا کہ دس ذی الحجہ میں بکرے کی پیدائش سے (اگلے سال دس ذی الحجہ تک) سال پورا نہیں ہوتا ہے؛ لہٰذا اس کی قربانی جائز نہیں۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۲) وأما الهتماء- وهي التي لا أسنان لها- فإن كانت ترعى وتعتلف جازت وإلا فلا، كذا في البدائع. وهو الصحيح، كذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۸، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب)

(۱) اصل یہ ہے کہ اگر بکرا مکمل ایک سال کا ہوجائے اور دوسرے سال میں داخل ہوجائے، اس طور پر کہ ۱۰/ ذی الحجہ کو پیدا ہوا، تو آئندہ سال ۱۱/ ذی الحجہ کو اس کی قربانی بلاشبہ درست ہوگی:

والثني من الشاة والمعز ما تم له حول وطعن في السنة الثانية، ومن البقر ما تم له حولان وطعن في السنة الثالثة، ومن الإبل ما تم له خمس سنين وطعن في السنة السادسة، وتقدير هذه الأسنان بما قلنا لمنع النقصان لا لمنع الزيادة، حتى لو ضحى بأقل من ذلك سنا لا يجوز ولو ضحى بأكثر من ذلك سنا يجوز ويكون أفضل. (بدائع الصنائع: ۵/ ۷۰، كتاب التضحية، فصل في محل إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۷، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر - بيروت)

البتہ احتیاطاً علماء کرام نے لکھا ہے کہ ایسے بکرے کو چھوڑ کر دوسرا بکرا تجویز کرلیا جائے، تو بہتر ہے، حضرت مفتی صاحبؒ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، اور حضرت مفتی اسماعیل بسم اللہؒ کے فتویٰ کا حوالہ دیا ہے، مفتی گجرات حضرت مولانا سید عبدالرحیم لاج پوریؒ نے بھی یہی بات لکھی ہے، ملاحظہ ہو فتاویٰ رحیمیہ کا ایک سوال وجواب:

سوال: جو بکرا گزشتہ سال عید کے روز پیدا ہوا ہو، اس سال اس کی قربانی کرسکتے ہیں؟

الجواب: اس بکرے کی قربانی امسال عید کے دوسرے دن کرسکتے ہیں، قربانی ادا ہوجائے گی، اگر احتیاطاً اس کو چھوڑ کر دوسرا بکرا تجویز کرلیا جائے، تو بہتر ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۱۰/ ۵۱، کتاب الاضحیۃ، عید کے دن سال پورا ہو رہا ہے، کیا اس کی قربانی کی جاسکتی ہے، ط: دارالاشاعت- کراچی)

[۵] قربانی کے دنوں میں پیدا شدہ جانور کی اگلے سال قربانی جائز ہے یا نہیں؟

۱۹۱۱- سوال: بعد سلام گذارش یہ ہے کہ چھوٹے جانور مثلاً: بکرا، بکری، مینڈھا، دنبہ وغیرہ عید الاضحیٰ کے دنوں میں ۱۰-۱۱-۱۲ تاریخ کو پیدا ہوئے ہوں، اسی طریقے سے بڑا جانور ان دنوں میں پیدا ہوا ہو، اور دونوں قسم کے جانور عید کی نماز سے پہلے پیدا ہوئے ہوں، تو اگلے سال وہ ۱۰ تاریخ کو پیدا ہونے والا جانور ۱۱ اور ۱۲ تاریخ کو ایک یا دو سال کا کہلائے گا یا نہیں؟ اور اس کی قربانی درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

چاند کے اعتبار سے سال کے کل تین سو چوّن (۳۵۴) دن، آٹھ (۸) گھنٹے، اور اکتالیس (۴۱) منٹ ہوتے ہیں۔

سورج کے اعتبار سے گیارہ دن زیادہ ہوتے ہیں، یا گیارہ (۱۱) دن، پانچ (۵) گھنٹے اور پچپن (۵۵) منٹ زیادہ ہوتے ہیں۔[۱] اس اعتبار سے جب ۱۰-۱۱-۱۲ ذوالحجہ میں پیدا ہوا، اور ہر مہینہ کو ۳۰/ دن کا شمار کیا جائے، تو سال پورا نہ ہوگا؛ اس لیے ایسے جانور کی قربانی نہیں کرنی چاہیے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

[۶] ایک سال میں ایک دن کم عمر والے بکرے کی قربانی

۱۹۱۲- سوال: میرے دوست کے یہاں ایک بکرا ہے، جو ذی الحجہ کی چودہویں تاریخ کو پیدا

---

(۱) السنة تتنوع إلى سنة شمسية: وهي التي تعتمد في بدايتها ونهايتها على حركة الشمس، قال زكريا الأنصاري: وعدد أيامها ثلاث مائة وخمسة وستون يوما، وربع يوم إلا جزءا من ثلاث مائة جزء من يوم، وإلى سنة قمرية: وهي التي تعتمد على ظهور الهلال واختفائه في بداية الشهر ونهايته.

قال زكريا الأنصاري: وعدد أيامها كما قال صاحب المهذب وغيره: ثلاث مائة وأربعة وخمسون يوما وخمس يوم وسدسه. فالسنة الشمسية تتفق مع السنة القمرية في عدد الشهور وتختلف معها في عدد الأيام فتزيد أيامها على أيام السنة القمرية بأحد عشر يوما وجزء من واحد وعشرين جزءا من اليوم. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۵/۲۶۰، مادة: سنة، أنواع السنة، ط: وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية - الكويت)

(۲) سوال سابق (بہ عنوان: گزشتہ بقرعید میں پیدا ہونے والے بکرے کی امسال قربانی کرنا) کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

ہوا تھا، یعنی عید ختم ہونے کے ایک دن بعد، سوال یہ ہے کہ کیا اس [رواں] سال اس کی قربانی ہوسکتی ہے یانہیں؟ اگر عید کے تیسرے دن بھی قربانی کریں، تب بھی سال ختم ہونے میں ایک دن باقی رہ جاتا ہے، دیکھنے میں جانور ایک سال کا لگتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیا:

بکرا یا بکری کی قربانی کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی عمر مکمل ایک سال ہو، آپ کی تحریر کے مطابق چودہ ذی الحجہ کو بکرا پیدا ہوا ہے، لہٰذا اس کی عمر ایک سال پوری نہیں ہوئی؛ اس لیے اس بکرے کی اس سال قربانی صحیح نہیں ہوگی۔ (بدائع، عالم گیری) [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] والثني من الشاة والمعز ما تم له حول وطعن في السنة الثانية، ومن البقر ما تم له حولان وطعن في السنة الثالثة، ومن الإبل ما تم له خمس سنين وطعن في السنة السادسة، وتقدير هذه الأسنان بما قلنا لمنع النقصان لا لمنع الزيادة؛ حتى لو ضحى بأقل من ذلك سنا لا يجوز ولو ضحى بأكثر من ذلك سنا يجوز ويكون أفضل. (بدائع الصنائع: ۵/۷۰، كتاب التضحية، فصل في محل إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت☆ الفتاوى الهندية: ۵/۲۹۷، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر - بيروت)

جندب بن سفيان البجلي، قال: شهدت النبي -صلى الله عليه وسلم- يوم النحر، فقال: من ذبح قبل أن يصلي فليعد مكانها أخرى، ومن لم يذبح فليذبح.

(صحيح البخاري: ۲/ ۸۳۴، رقم الحديث: ۵۵۶۲، كتاب الأضاحي، باب من ذبح قبل الصلاة أعاد، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۵۳، رقم الحديث: ۲-(۱۹۶۰)، كتاب الأضاحي، باب وقتها، ط: ديوبند)

باب أيام الأضحية ومكانها ووقتها وقضائها

[قربانی: ایام، مکان، وقت اور قضاء کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب أيام الأضحية ومكانها ووقتها وقضائها

[قربانی: ایام، مکان، وقت اور قضاء کا بیان]

[ا] قربانی کے ایام

۱۹۱۳- سوال: بقرعید کے کتنے دن ہیں؟ تین دن یا ساڑھے تین دن؟

الجواب حامداومصلیا:

قربانی کے تین دن ہیں؛ دسویں، گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ۔

۱۲/ رویں ذی الحجہ کو غروب شمس سے پہلے قربانی کر سکتے ہیں، اس کے بعد قربانی کرنا درست نہیں ہے، اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قربانی کے ساڑھے تین دن نہیں ہیں، تین دن [بارہویں] کے بعد قربانی کی، تو ادا نہیں ہوگی۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وقت الأضحية ثلاثة أيام: العاشر، والحادي عشر، والثاني عشر، أولها أفضلها وآخرها أدونها، ويجوز في نهارها وليلها، بعد طلوع الفجر من يوم النحر إلى غروب الشمس من اليوم الثاني عشر، إلا أنه يكره الذبح في الليل.
(الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۵، كتاب الأضحية، الباب الثالث في وقت الأضحية، ط: دار الفكر)

[۲] قربانی کا آخری دن ختم ہونے سے پانچ یا دس منٹ پہلے جانور ذبح کرنا

۱۹۱۴- سوال: بقرعید کے موقع پر قربانی کا آخری دن ختم ہونے سے پانچ یا دس منٹ پہلے قربانی کے جانور کو ذبح کیا جائے اور پھر گوشت تقسیم کیا جائے، تو قربانی صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قربانی ادا ہوجائے گی، بس قربانی کا وقت ہونا ضروری ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] ۱- سعودیہ میں رہنے والے شخص کا یہاں انڈیا میں قربانی کرنا

[۴] ۲- نابالغ کی قربانی کا حکم

۱۹۱۵- سوال: ایک شخص سعودی عرب میں رہتا ہے اس نے حج فرض ادا کرلیا ہے اور دوسری دفعہ حج میں جانا چاہتا ہے، اور اس نے اپنی عید الاضحیٰ کی واجب قربانی یہاں انڈیا میں رکھی ہے تو کیا مکہ میں بھی اس کو واجب قربانی ادا کرنی ہوگی؟

نیز وہ شخص اپنی فیملی کے ساتھ حج میں جا رہا ہے، اس کے ساتھ ایک چھوٹی چھ سال کی بچی بھی ہے، بیوی اور اس بچی کی واجب قربانی بھی یہاں انڈیا میں رکھی گئی ہے، تو مکہ میں ان کی قربانی کے متعلق کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عید الاضحیٰ کی واجب قربانی ادا کرنے کے لیے کوئی جگہ متعین نہیں ہے، انگلینڈ، کناڈا اور امریکہ میں رہنے والا شخص یہاں انڈیا میں قربانی کرسکتا ہے، لہٰذا سعودیہ میں رہنے والے کا انڈیا میں قربانی کرنا جائز ہے۔[۲]

---

(۱) وقت الأضحية ثلاثة أيام: العاشر، والحادي عشر، والثاني عشر، أولها أفضلها وآخرها أدونها، ويجوز في نهارها وليلها، بعد طلوع الفجر من يوم النحر إلى غروب الشمس من اليوم الثاني عشر، إلا أنه يكره الذبح في الليل.
(الفتاوى الهندية: ۲۹۵/۵، كتاب الأضحية، الباب الثالث في وقت الأضحية، ط: دار الفكر)

(۲) وروي عنهما أيضا أن الرجل إذا كان في مصر، وأهله في مصر آخر، فكتب إليهم ليضحوا عنه، فإنه يعتبر مكان التضحية، فينبغي أن يضحوا عنه بعد فراغ الإمام من صلاته في المصر الذي يضحى عنه فيه. (الفتاوى الهندية: ۲۹۶/۵، كتاب الأضحية، الباب الرابع فيما يتعلق بالمكان والزمان، ط: دار الفكر-بيروت★المحيط البرهاني: ۹۱/۶، كتاب الأضحية، الفصل الرابع، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(اور یہ قربانی اسے کافی ہوگی، الگ سے دوسری کرنے کی ضرورت نہیں)

اور عورت کی قربانی بھی -جیسا کہ اوپر ذکر ہوا- یہاں انڈیا میں ادا ہو جائے گی۔

البتہ چھ سال کی بچی کی قربانی میں یہ تفصیل ہے کہ اگر خود اس بچی کے مال سے قربانی کی گئی ہے، تو سارا گوشت صدقہ کرنا ضروری ہے، اور اگر باپ نے اپنے مال سے کی ہے، تو اس میں صدقہ ضروری نہیں۔ [1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] حاجی کی قربانی: چند اہم مسائل

١٩١٦- سوال: ہمارے گاؤں ''کوساڑی'' سے ایک صاحب حج کے لیے گئے ہیں، ان کی

---

(١) واضح رہے کہ اولاد صغار پر قربانی کے وجوب وعدم وجوب کے سلسلے میں کتبِ فقہ وفتاویٰ کی تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ پر قربانی واجب نہیں ہے، اور ولی کی طرف سے ان کے مال سے قربانی کرنا جائز نہیں ہے، چناں چہ علامہ محمد بن حسین طوری حنفی (م:١١٢٨ھ تقریباً) متعدد اقوال ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: **وفي الكافي: الأصح أنه لا يجب ذلك وليس للأب أن يفعله من مال الصغير.** (تكملة البحر الرائق:٨/١٩٨، أول كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي☆تبيين الحقائق-فخر الدين الزيلعي(م:٧٤٣هـ):٦/٣، كتاب الأضحية، ط: المطبعة الكبرى الأميرية)

صاحب فتاویٰ حضرت مفتی احمد بیماتؒ نے بھی لکھا ہے کہ قربانی اپنی طرف سے واجب ہے، چھوٹے بچوں کی طرف سے واجب نہیں ہے۔ (قربانی: فضائل ومسائل-مفتی احمد بیماتؒ (م:٢٠٠٤ء)، ص:٩٩، ط: حافظ اسجد بیمات، مدنی دار التربیت، کرمالی)

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (م:١٤١٧ھ) فرماتے ہیں کہ ظاہر الروایۃ میں اولاد صغیر کی طرف سے قربانی واجب نہیں ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:١٧/٣١٤، ط: دار المعارف-دیوبند)

عصر حاضر کے مشہور فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں: البتہ اگر ولی ایسے نابالغ بچوں کی طرف سے اپنے مال سے قربانی کردے، تو بہتر اور قرین احتیاط ہے۔ (کتاب الفتاویٰ:٤/٣٢، ط: زمزم پبلیشرز-کراچی)

گجرات کے مشہور فقیہ حضرت مفتی سید عبد الرحیم لاج پوریؒ (م:١٤٢٢ھ) نے نابالغ لڑکوں کی طرف سے قربانی کرنے کو مستحب لکھا ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ:١٠/٣٠، دار الاشاعت-کراچی)

چوں کہ اس باب میں اکابر احناف سے روایات مختلف ہیں؛ اس لیے معتدل اور احتیاط پر مبنی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی ولی نابالغ کے مال سے اس کی طرف سے قربانی کردے، تو ولی کے لیے اس میں سے کھانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی صدقہ کرنا جائز ہے، خود نابالغ جتنا چاہے کھائے، بقیہ گوشت کے عوض کپڑا وغیرہ جیسی کوئی چیز نابالغ کے لیے لی جاسکتی ہے: **قال القدوري في شرحه: والصحيح أن يقال بأنه يضحي عنه، ويأكل الصبي منه ما يمكنه، ويباع بالباقي ما ينتفع بعينه.** (المحيط البرهاني-برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مازة البخاري(م:٦١٦هـ):٦/٨٦، كتاب الأضحية، الفصل الأول، دار الكتب العلمية-بيروت)

عیدالاضحیٰ کی قربانی یہیں گاؤں میں ان کے رشتہ دار کرلیں، تو ان حاجی صاحب کی قربانی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور اس طرح کرنے سے ان کا حج ادا ہوگا یا نہیں؟ مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

اگر ان حاجی صاحب نے اپنے رشتہ داروں کو اس کی اجازت دی ہے، تو قربانی ادا ہوجائے گی اور حج میں کوئی نقصان نہ آئے گا۔[1] مگر اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل مسائل سمجھنا ضروری ہے:

۱-قربانی ایک عبادت ہے؛ لہٰذا اس میں نیت ضروری ہے۔(۲)

۲-واجب قربانی جس کے ذمہ ہے، اس کی اجازت کے بغیر، اس کی جانب سے کوئی دوسرا قربانی کرے، تو واجب ادا نہ ہوگا۔[۳]

۳-بڑے جانور میں واجب قربانی دوسرے کی طرف سے بلا اجازت کی جائے گی، تو سب شرکاء کی قربانی باطل ہوگی، اور سب کو ازسرنو قربانی کرنی ہوگی۔(۴)

۴-قربانی کے ایام میں ۹/ذی الحجہ سے پہلے مکہ مکرمہ میں ۱۵/دن ٹھہرنے کی نیت ہو، تو مقیم بن

---

(۱) (ومنها) أنه تجزئ فيها النيابة، فيجوز للإنسان أن يضحي بنفسه، وبغيره بإذنه؛ لأنها قربة تتعلق بالمال، فتجزئ فيها النيابة، كأداء الزكاة وصدقة الفطر، ولأن كل أحد لا يقدر على مباشرة الذبح بنفسه خصوصا النساء، فلو لم تجز الاستنابة لأدى إلى الحرج. (بدائع الصنائع:۶۷/۵، كتاب التضحية، فصل في أنواع كيفية الوجوب، ط:دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) أما الذي يرجع إلى من عليه التضحية فمنها: نية الأضحية لا تجزي الأضحية بدونها؛ لأن الذبح قد يكون للحم وقد يكون للقربة والفعل لا يقع قربة بدون النية. (بدائع الصنائع:۷۱/۵، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط:دار الكتب العلمية-بيروت)

[۳] (ومنها) إذن صاحب الأضحية بالذبح إما نصا أو دلالة إذا كان الذابح غيره، فإن لم يوجد لا يجوز؛ لأن الأصل فيما يعمله الإنسان أن يقع للعامل، وإنما يقع لغيره بإذنه وأمره، فإذا لم يوجد لا يقع له. (بدائع الصنائع:۷۳/۵، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط:دار الكتب العلمية-بيروت)

(۴) وإن فعل بغير أمرهم أو بغير أمر بعضهم لا يجوز، لا عنه و لا عنهم في قولهم جميعا؛ لأن نصيب من لم يأمر صار لحما فكان الكل لحما. (فتاوى قاضي خان على هامش الهندية:۳۵۰/۳، كتاب الأضحية، فصل فيما يجوز في الضحايا و ما لا يجوز، ط:زكريا-ديوبند)

جانے کی وجہ سے اس پر قربانی واجب ہوگی، ورنہ اس پر قربانی واجب نہیں ہوگی۔ (۵)

۵-اور مذکورہ قربانی کا مکہ مکرمہ ہی میں کرنا ضروری نہیں ہے۔ (کہیں بھی کی جاسکتی ہے) (۶)

۶-اگر اپنے وطن میں کسی کو کہے اور وہ قربانی کردے، تو قربانی ادا ہوجائے گی اور حج میں کوئی نقصان نہ آئے گا۔ (۷)

۷-لیکن قارن اور متمتع پر جو قربانی واجب ہے (یعنی حج کی قربانی) وہ حرم میں ہی کرنا ضروری ہے۔ [۸] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] حاجی دورانِ حج اپنے ملک میں قربانی کرائے یا مکہ میں قربانی کرے؟

۱۹۱۷-سوال: ایک شخص عرب ملک میں ملازمت کرتا ہے، اِس سال اُس کے مالک نے حج کی اِجازت دی ہے، لیکن حاجیوں کو قربانی کے لیے جو جانور ملتا ہے، وہ انتہائی گراں قیمت میں ملتا ہے، تو حاجی اپنے ملک میں قربانی کراسکتا ہے، یا وہیں قربانی کرنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

حاجی حج کے دِنوں میں مقیم ہو، اس طور پر کہ حج سے قبل مکہ مکرمہ میں ۱۵/ دِن رہنے کا ارادہ ہو، یا

---

(۵) وأما بيان ما يصير المسافر به مقيما: فالمسافر يصير مقيما بوجود الإقامة، والإقامة تثبت بأربعة أشياء: أحدها: صريح نية الإقامة، وهو أن ينوي الإقامة خمسة عشر يوما في مكان واحد صالح للإقامة فلا بد من أربعة أشياء: نية الإقامة، ونية مدة الإقامة، واتحاد المكان، وصلاحيته للإقامة. (بدائع الصنائع: ۹۷/۱، كتاب الصلاة، فصل بيان ما يصير المسافر به مقيما، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۶-۷) وروي عنهما أيضا أن الرجل إذا كان في مصر، وأهله في مصر آخر، فكتب إليهم ليضحوا عنه، فإنه يعتبر مكان التضحية، فينبغي أن يضحوا عنه بعد فراغ الإمام من صلاته في المصر الذي يضحى عنه فيه. (الفتاوى الهندية: ۲۹۶/۵، كتاب الأضحية، الباب الرابع فيما يتعلق بالمكان والزمان، ط: دار الفكر-بيروت☆المحيط البرهاني: ۹۱/۶، كتاب الأضحية، الفصل الرابع، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

[۸] (وخص ذبح هدي المتعة والقران بأيام النحر دون غيرهما) أي يجوز ذبح بقية الهدايا في أي وقت شاء... (و) خص (الكل بالحرم)... (ويجوز أن يتصدق به) أي الهدي (على فقير الحرم وغيره) من الفقراء المستحقين. وقال الشافعي يختص به. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۳۰۰/۱، كتاب الحج، باب الهدي، ط: دار إحياء التراث العربي)

۱۵؍ دِن ہو گئے ہوں، تو ان پر صاحب نصاب ہونے کی وجہ قربانی واجب ہوگی، اور یہ قربانی وطن میں بھی کی جاسکتی ہے، لیکن ۱۵؍ دِن مکہ میں نہ رہے اور نہ ۱۵؍ دِن رہنے کا اِرادہ ہو، تو مسافر ہونے کی وجہ سے قربانی واجب نہ ہوگی،[۱] البتہ تمتع اور قران کے احرام کی وجہ سے جو قربانی واجب ہوگی، اُس کو منیٰ میں کرنا ضروری ہے، اُس کو وطن میں کرنا جائز نہیں ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] چھوٹے گاؤں میں، جہاں عید کی نماز ہوتی ہو، نماز سے پہلے قربانی کرنا

۱۹۱۸- سوال: محترم حضرت مفتی صاحب! ہمارے گاؤں ''مہوتج'' میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی ہے؛ لیکن عیدین کی نماز ہوتی ہے اور لوگ باقاعدہ یہ نماز پڑھنے کے لیے آتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر بہت سے لوگ صبح صادق کے بعد اور عید کی نماز پڑھنے سے پہلے جانور ذبح کر لیتے ہیں، تو ان کی یہ قربانی - جب کہ گاؤں میں عید کی نماز ہوتی ہے- نماز سے پہلے درست ہے یا نہیں؟ امید ہے کہ جواب دے کر ممنون فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

چھوٹے گاؤں میں عید کی نماز واجب نہیں، اسی طرح جمعہ بھی جائز نہیں،[۳] ایسے گاؤں میں صبح صادق کے بعد قربانی جائز ہے، جو لوگ گاؤں میں عید کی نماز نہیں پڑھتے ہیں، وہ صبح صادق کے بعد قربانی کر سکتے ہیں، اور جو لوگ عید کی نماز سے پہلے قربانی کرتے ہیں اور عید کی نماز بھی گاؤں میں پڑھتے ہیں، حالاں کہ وہاں عید کی نماز واجب نہیں، تو وہ جان بوجھ کر گناہ کا کام کرتے ہیں؛ کیوں کہ وہ حقیقۃً نفل نماز ہوگی

---

(۱) سوال سابق کا حاشیہ نمبر ۵ ملاحظہ کریں۔

(۲) سوال سابق کا حاشیہ نمبر ۸ ملاحظہ کریں۔

[۳] (ويشترط لصحتها) سبعة أشياء: الأول: (المصر، وهو ما لا يسع أكبر مساجده أهله المكلفين بها) وعليه فتوى أكثر الفقهاء، مجتبى؛ لظهور التواني في الأحكام. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله وعليه فتوى أكثر الفقهاء إلخ) وقال أبو شجاع: هذا أحسن ما قيل فيه. وفي الولوالجية، وهو صحيح، بحر، وعليه مشى في الوقاية ومتن المختار وشرحه وقدمه في متن الدرر على القول الآخر وظاهره ترجيحه وأيده صدر الشريعة بقوله لظهور التواني في أحكام الشرع سيما في إقامة الحدود في الأمصار. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۳۷، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر - بيروت)

اور جماعت کے ساتھ نفل پڑھنا مکروہ ہے؛ لیکن وہ جائز سمجھ کر نماز پڑھتے ہیں؛ اس لیے ایسے لوگوں کی نماز سے پہلے کی گئی قربانی جائز نہ ہوگی۔ (١) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٨] کوئی شہری اپنی قربانی کا جانور دیہات بھیج دے تو اس کے لیے وہاں حاضری ضروری نہیں

١٩١٩- سوال: جن دیہاتوں میں عید کی نماز نہیں ہوتی، وہاں شہری آدمی عید کے دن صبح صادق کے بعد قربانی کے لیے اپنا جانور بھیج دے، تو کیا قربانی کرنے والے کا قربانی کی جگہ (دیہات) میں حاضر رہنا ضروری ہے؟ اور شہری آدمی اس طرح کی قربانی کرے، تو جائز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداو مصليا:

قربانی کرنے والے کا وہاں حاضر رہنا ضروری نہیں، وہ شہر میں ہو اور اس کی قربانی مذکور صورت کے مطابق دیہات میں کی جائے تو جائز ہے۔ (٢) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(١) جندب بن سفيان البجلي، قال: شهدت النبي صلى الله عليه وسلم يوم النحر، فقال: من ذبح قبل أن يصلي فليعد مكانها أخرى، ومن لم يذبح فليذبح. (صحيح البخاري: ٢/ ٨٣٤، رقم الحديث: ٥٥٦٢، كتاب الأضاحي، باب من ذبح قبل الصلاة أعاد، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ٢/ ١٥٣، رقم الحديث: ٢-(١٩٦٠)، كتاب الأضاحي، باب وقتها، ط: ديوبند)

قال: "ووقت الأضحية يدخل بطلوع الفجر من يوم النحر، إلا أنه لا يجوز لأهل الأمصار الذبح حتى يصلي الإمام العيد، فأما أهل السواد فيذبحون بعد الفجر". والأصل فيه قوله عليه الصلاة والسلام: "من ذبح شاة قبل الصلاة فليعد ذبيحته، ومن ذبح بعد الصلاة فقد تم نسكه وأصاب سنة المسلمين". وقال عليه الصلاة والسلام: "إن أول نسكنا في هذا اليوم الصلاة ثم الأضحية" غير أن هذا الشرط في حق من عليه الصلاة، وهو المصري دون أهل السواد؛ لأن التأخير لاحتمال التشاغل به عن الصلاة، ولا معنى للتأخير في حق القروي ولا صلاة عليه. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ٥٩٣هـ): ٤/ ٣٥٧، كتاب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

(٢) والمعتبر مكان الأضحية لا مكان من عليه، فحيلة مصري أراد التعجيل أن يخرجها لخارج المصر، فيضحي بها إذا طلع الفجر مجتبى. (الدر المختار)——— وفي الشامية: (قوله والمعتبر مكان الأضحية إلخ) فلو كانت في السواد والمضحي في المصر جازت قبل الصلاة، وفي العكس لم تجز قهستاني (قوله أن يخرجها) أي يأمر بإخراجها (قوله لخارج المصر) أي إلى ما يباح فيه القصر قهستاني وزيلعي. (رد المحتار على الدر المختار: ٦/ ٣١٩، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر-بيروت)

فإن كان هو في المصر والشاة في الرستاق أو في موضع لا يصلى فيه وقد كان أمر أن يضحوا عنه فضحوا بها بعد=

[۹] جہاں عید کی نماز نہیں ہوتی ہے، وہاں فجر سے پہلے قربانی کرنا

۱۹۲۰-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ:

جن گاؤں میں جمعہ اور عیدین کی نماز نہیں ہوتی ہے، وہاں عید الاضحیٰ میں قربانی کرنا صبح صادق کے بعد کب جائز ہے؟ کیا فجر کی نماز سے پہلے بھی کر سکتے ہیں یا فجر کے بعد کرنا ضروری ہوگا؟ اسی طرح جس چھوٹے گاؤں میں عیدین کی نماز ہوتی ہو، جیسے ہمارے ورٹھی گاؤں میں جمعہ اور عیدین؛ دونوں نمازیں ہوتی ہیں اور دو چار افراد کے سوا سب عید کی نماز پڑھتے ہیں، تو اس گاؤں میں عید کی نماز سے پہلے قربانی جائز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

چھوٹے گاؤں میں جمعہ کی نماز جائز نہیں اور عید کی نماز واجب نہیں، پس اگر وہاں کے لوگ عید کی نماز نہ پڑھتے ہوں یا پڑھتے ہوں؛ لیکن کچھ لوگ نہ پڑھتے ہوں، تو جو عید کی نماز نہیں پڑھتے ہیں، ان کے لیے صبح صادق کے بعد قربانی کرنا جائز ہے۔(۱)

=طلوع الفجر قبل صلاة العيد فإنها تجزيه، وعلى عكسه لو كان هو في الرستاق والشاة في المصر وقد أمر من يضحي عنه فضحوا بها قبل صلاة العيد فإنها لا تجزيه وإنما يعتبر في هذا مكان الشاة لا مكان من عليه، هكذا ذكر محمد -عليه الرحمة- في النوادر وقال: إنما أنظر إلى محل الذبح ولا أنظر إلى موضع المذبوح عنه، وهكذا روى الحسن عن أبي يوسف -رحمه الله-: يعتبر المكان الذي يكون فيه الذبح ولا يعتبر المكان الذي يكون فيه المذبوح عنه، وإنما كان كذلك؛ لأن الذبح هو القربة فيعتبر مكان فعلها لا مكان المفعول عنه. (بدائع الصنائع: ۷۴/۵، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية)

والمعتبر في ذلك مكان الأضحية حتى لو كانت في السواد، والمضحي في المصر يجوز كما انشق الفجر، وفي العكس لا يجوز إلا بعد الصلاة وحيلة المصري إذا أراد التعجيل أن يبعث بها إلى خارج المصر في موضع للمسافر أن يقصر فيضحي فيه كما طلع الفجر ؛لأن وقتها من طلوع الفجر. (تكملة البحر الرائق: ۲۰۰/۸، كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۱) قال -رحمه الله-: (ولا يذبح مصري قبل الصلاة وذبح غيره) يعني لا يجوز لأهل المصر أن يذبحوا الأضحية قبل أن يصلوا صلاة العيد، ويجوز لأهل القرى والبادية أن يذبحوا بعد صلاة الفجر قبل أن يصلي الإمام صلاة العيد، والأصل في ذلك قوله -صلى الله عليه وسلم-: من ذبح قبل صلاة الإمام فليعد ذبيحته، ومن ذبح بعد صلاة الإمام فقد=

البتہ علماء نے لکھا ہے کہ رات میں قربانی کرنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ اندھیرے میں ممکن ہے کہ کوئی رگ کاٹنے میں رہ جائے؛ لہٰذا چھوٹے گاؤں میں اگر لوگ عید کی نماز نہ پڑھتے ہوں، تو (وہ صبح صادق کے فوراً بعد قربانی نہ کریں) فجر کی نماز کے بعد قربانی کرنا بہتر ہے، تاکہ روشنی میں جانور اچھی طرح ذبح ہوسکے اور رگوں کے کٹنے کے متعلق کوئی شبہ نہ رہے اور جو لوگ عید کی نماز پڑھتے ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ عید کی نماز کے بعد ہی قربانی کریں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] جن دیہاتوں میں جمعہ نہیں ہوتی، وہاں قربانی نماز فجر سے پہلے کی جائے یا بعد میں؟

۱۹۲۱- سوال: ہمارے گاؤں میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی ہے، عید کی نماز کے لیے ہم موسالی جاتے ہیں، تو ہم اپنے گاؤں میں قربانی کب کریں؟ صبح صادق کے بعد یا فجر کی نماز کے بعد؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جن چھوٹے گاؤں میں جمعہ وعید کی نماز صحیح نہیں ہوتی ہے، وہاں دسویں ذی الحجہ کے دن صبح صادق کے بعد قربانی جائز ہے۔

لیکن اندھیرے میں قربانی کرنا مکروہ ہے؛ اس لیے فجر کی نماز باجماعت ادا کر لینے کے بعد قربانی کرنا بہتر ہے، تاکہ قربانی کرنے میں فجر کی نماز باجماعت چھوٹ نہ جائے اور روشنی بھی ہو جائے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=تم نسكه وأصاب سنة المسلمين. قال صاحب النهاية: هذا يشير إلى ما ذكر في المبسوط، حيث قال: لا يجزيه لعدم الشرط، لا لعدم الوقت، وقال -عليه الصلاة والسلام-: أول نسكنا في هذا اليوم الصلاة، ثم الأضحية، وهذا ظاهر في حق من عليه الصلاة فبقي غيره على الأصل فيذبح بعد طلوع الفجر. (تكملة البحر الرائق: ۱۹۹/۸، كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆تكملة رد المحتار على الدر المختار: ۳۱۸/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر - بيروت)

(۱) ويجوز الذبح في لياليها إلا أنه يكره لاحتمال الغلط في الظلمة. (تكملة البحر الرائق: ۲۰۰/۸، كتاب الأضحية، قبيل بيان: الأضحية بالجماء، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆الهداية في شرح بداية المبتدي- المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۳۵۷/۴، كتاب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

ويكره التضحية والذبح في الليالي. (فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۳۴۵/۳، كتاب الأضحية، فصل في صفة الأضحية ووقت وجوبها ومن تجب عليه، ط: زكريا - ديوبند)

(۲) سوال سابق کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

[۱۱] ایک محلے کی مسجد میں عید کی نماز کے بعد دوسرے محلے والوں کا قربانی کرنا

۱۹۲۲-سوال: شہر میں بہت سی مساجد ہوتی ہیں، بارش کے موسم میں ان میں عید کی نماز ہوتی ہے، کسی ایک محلے کی مسجد میں اگر صبح جلدی نماز ہوگئی، تو دوسرے محلے میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے اپنی قربانی کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ یا پھر ان کو اپنے محلے کی مسجد میں نماز ادا کر کے ہی قربانی کرنا ضروری ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس کسی نے نمازِ عید ادا کرلی، تو اس کی قربانی صحیح ہوجائے گی، خواہ اس نے اپنے محلے کی مسجد میں نماز ادا کی ہو، یا کسی دوسرے محلے کی مسجد میں، اسی طرح سے جس محلے کی مسجد میں نماز ہوگئی ہے اور اس محلے کے کسی آدمی نے نماز نہیں پڑھی ہے، تو اس کی بھی قربانی صحیح ہوجائے گی۔

لیکن جس محلے میں نماز بالکل نہیں ہوئی ہے اور اس محلے والوں نے کسی دوسری مسجد میں بھی نماز نہیں پڑھی ہے، تو ان کی قربانی صحیح نہیں ہوگی۔ (عالم گیری: ۶/ ۱۹۸)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] إذا استخلف الإمام من يصلي بالضعفة في المسجد الجامع، وخرج بنفسه إلى الجبانة مع الأقوياء، فضحى رجل بعد ما انصرف أهل المسجد قبل أن يصلي أهل الجبانة، القياس أن لا تجوز، وفي الاستحسان تجوز إن ضحى بعد ما فرغ أهل الجبانة قبل أهل المسجد، قيل في هذه الصورة: يجوز قياسا واستحسانا، وقيل: القياس والاستحسان فيهما واحد، قال شمس الأئمة الحلواني - رحمه الله تعالى -: هذا إذا ضحى رجل من الفريق الذي صلى، فأما إذا ضحى رجل من الفريق الذي لم يصل فلم تجز أضحيته قياسا واستحسانا، وفي الأضاحي للزعفراني إذا ضحى رجل من الناحية التي صلى فيها أو من الناحية الأخرى جاز كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۵، كتاب الأضحية، الباب الثالث في وقت الأضحية، ط: دار الفكر - بيروت)

نوٹ: متعدد کتب فتاویٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی قربانی بھی درست ہوجائے گی، جن کے محلے میں ابھی نماز نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسرے محلے میں جا کر نماز سے فارغ ہوئے ہیں، فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ رقم فرماتے ہیں:

شہر میں کسی ایک جگہ بھی نماز عید ہوچکی ہو، تو قربانی درست ہے۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۷/ ۴۵۵، باب فی ایام الاضحیۃ ووقتھا وقضائھا، ط: دار المعارف - دیوبند)

مفتی گجرات حضرت مفتی عبدالرحیم لاج پوریؒ رقم ایک سوال کے جواب میں رقم فرماتے ہیں:

شہر کی کسی مسجد میں معتبر لوگوں نے نماز عید ادا کی ہے، تو دوسرے لوگوں کی قربانی بھی ادا ہوجائے گی، مگر احتیاط اس میں ہے کہ عید گاہ کی نماز کے بعد قربانی کرے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۱۰/ ۳۹، کتاب الاضحیہ، شہر کی کسی مسجد میں عید کی نماز ہوجانے کے بعد قربانی کرنا، ط: دارالاشاعت - کراچی) =

[۱۲] کیا وہ شخص زوال کے بعد قربانی کرے، جس کی نمازِ عیدالاضحیٰ فوت ہوگئی؟

۱۹۲۳- سوال: ایک معتبر عالم کا قول ہے کہ جس شخص نے عیدالاضحیٰ کی نماز نہ پڑھی ہو یا اس کی عید الاضحیٰ کی نماز چھوٹ گئی ہو، تو ایسا آدمی اس دن زوال (عید کی نماز کا وقت ختم ہونے) کے بعد قربانی کرے۔

اسی طرح اگر قصاب (قصائی) نے بھی عید کی نماز نہیں پڑھی، تو وہ کسی دوسرے کی قربانی کے جانور کے گلے پر چھری نہیں پھیر سکتا، دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا یہ دونوں باتیں از روئے شرع درست ہیں؟

الجواب حامدا ومصليا:

سوال میں مذکور دونوں مسئلے غلط ہیں، جس جگہ عیدالاضحیٰ کی نماز ہوتی ہو، وہاں عید کی نماز کے بعد قربانی جائز ہے۔ اگر مالک (صاحب قربانی) یا قصائی نے نماز نہ پڑھی ہو، تو وہ گناہگار ہوں گے؛ لیکن ان کی قربانی ہو جائے گی۔ اور قصائی کا ذبح کرنا بھی جائز ہے، خواہ اس نے نماز نہ پڑھی ہو۔[1] اور عالم کا آپ نے جو قول

= سوال: ایک گھر میں چند آدمیوں کی جانب سے قربانی ہوتی ہے، آیا ایک شخص نماز عید پڑھ کے سب کی جانب سے قربانی کر سکتا ہے، اور اگر نماز کسی نے بھی نہیں پڑھی، مگر شہر کی کسی مسجد میں عید کی نماز ہوگئی ہو، اس صورت میں بغیر نماز پڑھے قربانی کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: في الدر المختار: وأول وقتها إلى قوله بعد سبق صلاة عيد و لو قبل الخطبة، لكن بعدها أحب. في رد المحتار: ولو ضحى بعد ما صلى أهل المسجد ولم يصل أهل الجبانة اجزأه استحسانا؛ لأنها صلاة معتبرة حتى لو اكتفوا بها اجزأتهم، وكذا عكسه. [ج:۵،ص:۳۱۰]

اس سے ثابت ہوا کہ خود مضحی کا نماز عید سے فارغ ہونا شرط نہیں ہے جواز اضحیہ کی، بل کہ مسجد یا عیدگاہ میں نماز ہو چکنا کافی ہے؛ اس لیے سوال کی دونوں صورتوں میں قربانی جائز ہوگئی۔ (امداد الفتاویٰ: ۳/۵۹۷، کتاب الذبائح والاضحیۃ وغیرہ، کافی بودن نماز عیداضحیٰ درجائے برائے حلت قربانی، ط: زکریا- دیوبند)

ایک سوال کے جواب میں استاذ محترم، فقیہ عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ رقم طراز ہیں:

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر قربانی کرنے والا شخص نماز ادا کرنے کے بعد ہی قربانی کرے، بل کہ جس شہر یا قصبے میں قربانی کی جا رہی ہے، اگر اس میں کسی بھی ایک جگہ بقرعید کی نماز ادا کی جا چکی ہے، تو گو ابھی دوسری مسجدوں میں نماز نہیں ہوئی ہو، پھر بھی قربانی کی جا سکتی ہے، اور پہلی نماز کے بعد کچھ ایسے لوگوں کے جانور کی قربانی کر دی گئی، جو خود ابھی نماز سے فارغ نہیں ہوئے ہیں، تب بھی قربانی صحیح ہو جائے گی، محیط برہانی میں ہے:

إذا ضحى رجل من الناحية التي صلى فيها أو من الناحية الأخرى جاز. (المحيط البرهاني: ۸/۴۶۲، وقت الأضحية)

(کتاب الفتاویٰ: ۶/۳۱-۳۲، قربانی وعقیقہ سے متعلق مسائل، نماز سے پہلے قربانی، ط: نعیمیہ- دیوبند)

(۱) سوال سابق کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

بیان کیا ہے، وہ دراصل اس طرح ہوگا کہ اگر پوری بستی نے عید کی نماز نہ پڑھی ہو، تو اب زوال تک قربانی نہیں ہوسکتی۔ [۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] چھوٹے گاؤں میں عیدین کی نماز اور قربانی کا حکم

۱۹۲۴- سوال: (۱) چھوٹے گاؤں میں عیدین کی نماز جائز ہے یا نہیں؟

(۲) کیا عید الاضحیٰ کی نماز سے قبل اور فجر کی نماز کے بعد قربانی جائز ہے یا نہیں؟

(۳) میت کو غسل دینے والا، غسل کے وقت خود کلی واستنشاق کرلے، تو کیا مردہ کے غسل کی طرف سے کفایت کر جائے گا اور اس کی نماز جنازہ پڑھنا درست ہوگا؟

الجواب حامدا ومصليا:

(۱) چھوٹے گاؤں میں جمعہ وعید کی نماز درست نہیں ہے۔ [۲]

(۲) چھوٹے گاؤں میں قربانی ۱۰/ ذی الحجہ کی صبح صادق سے کر سکتے ہیں، البتہ غلس کے بجائے اسفار میں کرے، تو افضل ہے۔ [۳]

---

(۱) إذا ترك الصلاة يوم النحر بعذر أو بغير عذر لا تجوز الأضحية حتى تزول الشمس وتجوز الأضحية في الغد وبعد الغد قبل الصلاة، لأنه فات وقت الصلاة بزوال الشمس في اليوم الأول والصلاة في الغد تقع قضاء، كذا في محيط السرخسي. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۵، كتاب الأضحية، الباب الثالث في وقت الأضحية، ط: دار الفكر)

[۲] (ويشترط لصحتها) سبعة أشياء: الأول: (المصر وهو ما لا يسع أكبر مساجده أهله المكلفين بها) وعليه فتوى أكثر الفقهاء، مجتبى؛ لظهور التواني في الأحكام. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۱۳۷، كتاب الصلاة، باب الجمعة، ط: دار الفكر-بيروت)

وفي القنية: صلاة العيد في القرى تكره تحريما أي لأنه اشتغال بما لا يصح لأن المصر شرط الصحة. (المصدر السابق: ۲/ ۱۶۷، كتاب الصلاة، باب العيدين)

[۳] (وأول وقتها) (بعد الصلاة إن ذبح في مصر) ... (وبعد طلوع فجر يوم النحر إن ذبح في غيره) وآخره قبيل غروب يوم الثالث.... والمعتبر مكان الأضحية لا مكان من عليه. (الدر المختار) ——— وفي الشامية: (قوله إن ذبح في غيره) أي غير المصر شامل لأهل البوادي، وقد قال قاضي خان: فأما أهل السواد والقرى والرباطات عندنا يجوز لهم التضحية بعد طلوع الفجر... (قوله والمعتبر مكان الأضحية إلخ) فلو كانت في السواد والمضحي في المصر جازت قبل الصلاة، وفي العكس لم تجز قهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۱۸، كتاب الأضحية) =

(۳) غسل کروانے والے کا خود مضمضہ واستنشاق کرنا' میت کے مضمضہ واستنشاق کی طرف سے کفایت نہیں کرے گا، ویسے میت کے لیے مضمضہ واستنشاق بھی ضروری نہیں ہے، صرف روئی یا باریک کپڑا پانی میں بھگو کر میت کے دانت، منہ اور ناک میں پھیر دے، اور اگر ایسا نہیں کیا، تو بھی غسل ہو جائے گا اور نماز میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ میت کو غسل دینے والے کا غسل دینے کے بعد غسل کر لینا مستحب ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] ایامِ قربانی کے ختم ہونے پر قربانی کے جانور کا کیا کیا جائے؟

۱۹۲۵- سوال: قربانی کے لیے خریدی ہوئی گائے کی غیروں سے لڑائی جھگڑے کی وجہ سے، قربانی کے دنوں میں، قربانی نہ ہوسکی، تو اب اس جانور کو کیا کریں؟ اگر اس کو ذبح کریں، تو اس کا گوشت سب لوگ کھا سکتے ہیں یا صرف صدقات وزکوٰۃ کے حق داروں کو کھلایا جائے؟ اس صورت میں قربانی کا ثواب

= قال - رحمه الله -: (ولا يذبح مصري قبل الصلاة وذبح غيره) يعني لا يجوز لأهل المصر أن يذبحوا الأضحية قبل أن يصلوا صلاة العيد، ويجوز لأهل القرى والبادية أن يذبحوا بعد صلاة الفجر قبل أن يصلي الإمام صلاة العيد، والأصل في ذلك قوله: - صلى الله عليه وسلم - من ذبح قبل صلاة الإمام فليعد ذبيحته، ومن ذبح بعد صلاة الإمام فقد تم نسكه وأصاب سنة المسلمين، قال صاحب النهاية: هذا يشير إلى ما ذكر في المبسوط حيث قال: لا يجزيه لعدم الشرط لا لعدم الوقت، وقال - عليه الصلاة والسلام -: أول نسكنا في هذا اليوم الصلاة، ثم الأضحية، وهذا ظاهر في حق من عليه الصلاة فبقي غيره على الأصل فيذبح بعد طلوع الفجر. (تكملة البحر الرائق: ١٩٩/٨، كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي)

ويجوز في نهارها وليلها بعد طلوع الفجر من يوم النحر إلى غروب الشمس من اليوم الثاني عشر، إلا أنه يكره الذبح في الليل، ... والوقت المستحب للتضحية في حق أهل السواد بعد طلوع الشمس، وفي حق أهل المصر بعد الخطبة، كذا في الظهيرية. (الفتاوى الهندية: ٢٩٥/٥، كتاب الأضحية، الباب الثالث في وقت الأضحية، ط: دار الفكر)

[۱] (قوله ولا يمضمضوه ولا ينشقوه) لأنهما لا يتأتيان من الميت لأن المضمضة أن يدير الماء في فيه ثم يمجه والاستنشاق أن يجذب الماء بنفسه إلى خياشيمه ثم يرسله وقال بعضهم يجعل الغاسل على أصبعه خرقة رقيقة ويدخل أصبعه في فم الميت ويمسح بها أسنانه ولهاته وشفتيه، قال الحلواني: وعليه عمل الناس اليوم. (الجوهرة النيرة- أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفي (م: ٨٠٠هـ): ١٠٣/١، كتاب الصلاة، باب الجنائز، ط: المطبعة الخيرية)

ويندب الاغتسال... عند الفراغ من حجامة وغسل ميت. (مراقي الفلاح، ص: ٤٦، ط: دار الكتب العلمية)

حاصل ہوگا یا نہیں؟ اگر ذبح نہ کریں تو اس جانور کو آئندہ سال تک رکھ سکتے ہیں یا اس کو بیچ دیں؟ نیز قربانی اور عقیقہ دونوں کی نیت کی ہو تو کیا کیا جائے؟ جانور بیچنے کی صورت میں پیسے غریبوں کو دے دیے جائیں یا خود رکھ لیں، شرعی مسئلہ کی وضاحت مطلوب ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ایامِ قربانی ختم ہوجانے پر پورے زندہ جانور کو غریبوں میں صدقہ کردے، یا جتنی قیمت میں جانور کو خریدا ہے، اتنی قیمت غریبوں میں صدقہ کردے، قربانی کی ذمہ داری ادا ہوجائے گی۔ (شامی: ۲۸۲/۵، بدائع الصنائع: ۹۸/۵)[۱]

اگر جانور کو ذبح کرے تو گوشت غریبوں کو صدقہ کرنا ضروری ہے، مال داروں کو دینا جائز نہیں ہے، لیکن اس صورت میں جانور کی قیمت میں ذبح کرنے سے جو قیمت کم ہوگی، اس کا صدقہ کرنا بھی ضروری ہے، مثلاً: جانور کی قیمت سات سو (۷۰۰) روپئے ہیں، اور گوشت اور منڈی پایا وغیرہ کی بازاری قیمت چھ سو (۶۰۰) روپئے ہوئی، تو سو (۱۰۰) روپئے کا صدقہ کرنا ضروری ہے؛ اس لیے بہتر یہ ہے کہ زندہ جانور غریبوں کو صدقہ کردے، یا جو قیمتِ خرید ہے، اسے صدقہ کردے، عقیقہ اس صورت میں ادا نہ ہوگا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱-۲] ثم قضاؤها قد يكون بالتصدق بعين الشاة حية وقد يكون بالتصدق بقيمة الشاة؛ فإن كان أوجب التضحية على نفسه بشاة بعينها فلم يضحها حتى مضت أيام النحر يتصدق بعينها حية؛ لأن الأصل في الأموال التقرب بالتصدق بها لا بالإتلاف وهو الإراقة إلا أنه نقل إلى الإراقة مقيدا في وقت مخصوص حتى يحل تناول لحمه للمالك والأجنبي والغني والفقير؛ لكون الناس أضياف الله - عز شأنه - في هذا الوقت، فإذا مضى الوقت عاد الحكم إلى الأصل، وهو التصدق بعين الشاة سواء كان موسرا أو معسرا لما قلنا.

وكذلك المعسر إذا اشترى شاة ليضحي بها فلم يضح حتى مضى الوقت؛ لأن الشراء للأضحية من الفقير كالنذر بالتضحية وأما الموسر إذا اشترى شاة للأضحية فكذلك الجواب، ومن المشايخ من قال هذا الجواب في المعسر؛ لأن الشاة المشتراة للأضحية من المعسر تتعين للأضحية، فأما من الموسر فلا تتعين بدليل أنه يجوز له التضحية بشاة أخرى في الوقت مع بقاء الأولى وتسقط عنه الأضحية، والصحيح أنها تتعين من الموسر أيضا بلا خلاف بين أصحابنا، فإن محمدا - رحمه الله - ذكر عقيب جواب المسألة، وهذا قول أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله وقولنا. . . . ـــــــــ وإن كان لم يوجب على نفسه ولا اشترى وهو موسر حتى مضت أيام النحر تصدق بقيمة شاة تجوز في الأضحية؛ لأنه إذا لم يوجب ولم يشتر لم يتعين شيء للأضحية وإنما الواجب عليه إراقة دم شاة فإذا مضى الوقت قبل أن يذبح - ولا سبيل إلى التقرب بالإراقة بعد خروج الوقت لما قلنا - انتقل =

[۱۵] ایامِ نحر کے ختم ہونے کے بعد قربانی کے جانور کی قیمت کا کیا حکم ہے؟

۱۹۲۶- سوال: ہمیں ایک رشتہ دار کی جانب سے ڈرافٹ کے ساتھ ایک خط ملا، جس میں لکھا گیا ہے کہ ایک بڑا جانور خرید کر چھ حصے ہماری جانب سے اور ایک حصہ میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت کے ساتھ قربانی کرلیں، یہ خط ہمیں اُس وقت ملا جب کہ قربانی کے ایام ختم ہو چکے ہیں، اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اِس مسئلہ میں شرعی رہنمائی فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیا

قربانی کی عبادت میں اصل چیز إراقة الدم یعنی خون بہانا ہے، لیکن اگر کسی وجہ سے قربانی کے ایام میں کوئی شخص قربانی ادا نہیں کرسکا، حالاں کہ قربانی کا جانور خرید لیا تھا، تو اب اُس کا حکم یہ ہے کہ وہ قربانی کا جانور زندہ ہونے کی حالت میں کسی غریب کو صدقہ کردے، اور اگر جانور بھی نہیں خرید سکا تھا کہ قربانی کے ایام ختم ہو گئے، تو اِس صورت میں قربانی کے جانور کی قیمت کا صدقہ کردینے سے واجب قربانی سے سبک دوش ہو جائے گا، سوال میں مذکورہ صورت میں چوں کہ قیمت دیر سے وصول ہوئی؛ اِس لیے قربانی ادا نہیں ہوسکی، اور خط لکھنے والے نے بڑے جانور کی صراحت کی ہے؛ لہٰذا ایک بڑے جانور کی قیمت کا صدقہ کرنا ضروری ہے، اور صدقہ کیے جانے سے وہ واجب قربانی سے سبک دوش ہو جائیں گے۔ (درمختار، ردالمحتار: ۳۲۱/۶)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=الواجب من الإراقة والعين أيضا لعدم التعيين إلى القيمة وهو قيمة شاة يجوز ذبحها في الأضحية ... ـــــــ ولو وجب عليه التصدق بعين الشاة فلم يتصدق ولكن ذبحها يتصدق بلحمها ويجزيه ذلك إن لم ينقصها الذبح وإن نقصها يتصدق باللحم وقيمة النقصان، ولا يحل له أن يأكل منها وإن أكل منها شيئا غرم قيمته ويتصدق بها. (بدائع الصنائع: ۶۸/۵، كتاب التضحية، فصل في أنواع كيفية الوجوب، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۱/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

[۱] (ولو) (تركت التضحية ومضت أيامها) (تصدق بها حية ناذر) فاعل تصدق (لمعينة). [الدر المختار]

وفي الشامية: (قوله ومضت أيامها إلخ) قيد به لما في النهاية: إذا وجبت بإيجابه صريحا أو بالشراء لها، فإن تصدق بعينها في أيامها فعليه مثلها مكانها؛ لأن الواجب عليه الإراقة وإنما ينتقل إلى الصدقة إذا وقع اليأس عن التضحية بمضي أيامها، وإن لم يشتر مثلها حتى مضت أيامها تصدق بقيمتها؛ لأن الإراقة إنما عرفت قربة في زمان مخصوص ولا تجزيه الصدقة الأولى عما يلزمه بعد لأنها قبل سبب الوجوب اهـ. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۰/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

[۱۶] ایام نحر میں قربانی ادا نہیں ہوسکی، تو کیا حکم ہے؟

۱۹۲۷- سوال: ایام نحر کے دوران ایک شخص پر اُس کے رشتہ دار کا انگلینڈ سے فون آیا کہ وہ اُس کے نام پر قربانی کا جانور خرید کر ذبح کرے، لیکن جانور نہیں مل سکا، اِس وجہ سے قربانی ادا نہیں ہوسکی، تو اب کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

فون کرنے والے شخص پر قربانی واجب تھی، اور ادا نہیں ہوسکی، تو قربانی کے جانور کی قیمت کا غرباء کے درمیان صدقہ کرنا ضروری ہے، اگر جانور خرید چکے ہیں، تو زندہ جانور صدقہ کردیں۔ (درمختار مع شامی: ۳۲۱/۶)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] اسلامک ایسوسی ایشن کی طرف سے قربانی کا گوشت غرباء تک پہچانا

۱۹۲۸- سوال: مکہ مکرمہ میں اسلامک ایسوسی ایشن (Association) نے قربانی کا گوشت پیک کرکے دنیا کے ہر ایک ملک کے غرباء وفقراء تک پہنچانے کا انتظام کیا ہے؛ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی قربانی کے پیسے اس اکیڈمی کو دے دے اور ارکان حج ادا کرکے حلق کروالے، تو کیا اس کی قربانی اور حلق کرانا درست ہوگا؟ اس انجمن نے تین لاکھ جانور خرید کر ان کی قربانی کا انتظام کیا ہے، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قربانی خود کرنی چاہیے؛ کیوں کہ اسلامک ایسوسی ایشن والے قربانی کب کرتے ہیں، اس کا ہمیں حتمی علم نہیں ہوتا۔

الجواب حامداومصلیا:

حج کی قربانی کے لیے آپ کا کسی کو وکیل بنانا جائز ہے، حکومت کے انتظام کے مطابق وکیل بنانا جائز ہے؛[۲] لیکن آپ کو قربانی کے مقررہ وقت میں ادائیگی کے حوالے سے شک ہو، تو خود قربانی کریں، آپ جس کو

---

[۱] سوال سابق کا حاشیہ ملاحظہ کریں۔

[۲] (ومنها) أنه تجزئ فيها النيابة، فيجوز للإنسان أن يضحي بنفسه، وبغيره بإذنه؛ لأنها قربة تتعلق بالمال، فتجزئ فيها النيابة، كأداء الزكاة وصدقة الفطر، ولأن كل أحد لا يقدر على مباشرة الذبح بنفسه خصوصا النساء، فلو لم تجز الاستنابة، لأدى إلى الحرج. (بدائع الصنائع: ٦٧/٥، كتاب التضحية، فصل في أنواع كيفية الوجوب، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

وکیل بنارہے ہیں، اس سے حلال ہونے اور قربانی کرنے کا وقت متعین کرلیں؛ کیوں کہ احناف کے نزدیک حلق کروانے کا حکم قربانی کے بعد ہے؛ اگر قربانی سے پہلے حلق کروایا، تو دم واجب ہوگا؛ اسی لیے سہولت و آسانی اور احتیاط اسی میں ہے کہ حاجی بہ ذات خود قربانی کرے۔ گزشتہ سال ریاض سے میرے بھتیجے ایوب آدم بیمات نے لکھا تھا کہ انہوں نے ایسوسی ایشن والے کو قربانی کا چیک [ٹوکن] دیا تھا، بعد میں وہ واپس آگیا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی قربانی نہیں ہوئی؛ اب وہ بیچارہ پریشان ہے؛ اس لیے بہتر یہی ہے کہ بہ ذات خود قربانی کرے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] قربانی کا جانور خریدنے کے بعد گم ہوجائے تو کیا حکم ہے؟

۱۹۲۹- سوال: ایک شخص صاحب نصاب ہے، اس پر قربانی واجب ہے، اُس نے قربانی کا جانور خریدا، پھر یہ جانور گم ہوگیا اور قربانی کے ایام گزر جانے کے باوجود نہ مل سکا، تو کیا یہ شخص قربانی سے سبک دوش ہوجائے گا؟ یا دوسرا جانور خرید کر اُس کی قربانی ادا کرنا ضروری ہے؟ اُس کے برخلاف ایک غریب آدمی کا قربانی کی نیت سے خریدا ہوا جانور گم ہوجائے، تو اُس کے لیے کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جس شخص پر قربانی واجب ہو اور اُس کا خریدا ہوا جانور گم ہوجائے، تو اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسرا جانور خرید کر قربانی ادا کرے، اگر قربانی کے ایام ختم ہوگئے ہوں، تو اُسے چاہیے کہ وہ جانور کی قیمت کا صدقہ کرے، اور اگر کسی شخص پر قربانی واجب نہیں تھی، اور اُس کا خریدا ہوا جانور گم ہوگیا، تو دوسرا خریدنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔ (درمختار مع شامی: ۳۲۵/۶)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] ایام قربانی گذر جانے کے بعد قربانی کی رقم آئے تو؟

۱۹۳۰- سوال: میرے پاس بیرون ملک سے ایام قربانی گزر جانے کے بعد قربانی کی رقم

---

[۱] (ولو) (اشتراها سليمة ثم تعيبت بعيب مانع) كما مر (فعليه إقامة غيرها مقامها إن) كان (غنيا، وإن) كان (فقيرا أجزأه ذلك) وكذا لو كانت معيبة وقت الشراء لعدم وجوبها عليه بخلاف الغني، ولا يضر تعيبها من اضطرابها عند الذبح وكذا لو ماتت فعلى الغني غيرها لا الفقير ولو ضلت أو سرقت فشرى أخرى فظهرت فعلى الغني إحداهما وعلى الفقير كلاهما، شمني.. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳۲۵/۶-۳۲۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

آئی، تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟ اور اس رقم کو کس کام میں استعمال کرنا چاہیے؟

الجواب حامداومصلیا:

جس پر قربانی واجب ہو اور قربانی کے دنوں میں وہ قربانی نہ کر سکے، اور قربانی کا جانور بھی نہ خریدا ہو، تو ایک قربانی کے قابل بکرا جتنی قیمت میں آسکتا ہو، اتنی قیمت صدقہ کرنا واجب ہے؛ لہٰذا رقم بھیجنے والے سے دریافت کر لیجیے اور جتنی واجب قربانی کا آرڈر و حکم تھا، اتنے بکروں کی قیمت صدقہ کر دیجیے، ان کی ذمہ داری ادا ہو جائے گی، اگر رقم کم پڑتی ہو، تو رقم بھیجنے والے کو اولا اطلاع دے دیجیے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] ایام قربانی میں، قربانی نہیں ہو سکی، تو ایک بکرے کی قیمت صدقہ کرنا ضروری ہے

۱۹۳۱- سوال: میری بیوی کینیڈا میں تھی، اس نے قربانی کرنے کے متعلق کہا تھا؛ لیکن قربانی نہیں ہو سکی، اس سلسلے میں کیا کیا جائے؟

الجواب حامداومصلیا:

واجب قربانی نہ ہو سکی، تو جس قدر قربانی نہیں ہوئی ہے، اتنے بکرے کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے، اگر صرف آپ کی اہلیہ ہی کی قربانی تھی، تو ایک بکرے کا صدقہ کرنا ضروری ہے۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وإن كان من لم يضح غنيا ولم يوجب على نفسه شاة بعينها تصدق بقيمة شاة اشترى أو لم يشتري، كذا في العتابية. (الفتاوى الهندية: ۲۹۶/۵، كتاب الأضحية، الباب الرابع فيما يتعلق بالمكان والزمان، ط: دار الفكر)

"ولو لم يضح حتى مضت أيام النحر إن كان أوجب على نفسه أو كان فقيرا وقد اشترى الأضحية تصدق بها حية وإن كان غنيا تصدق بقيمة شاة اشترى أو لم يشتر" لأنها واجبة على الغني. (الهداية في شرح بداية المبتدي- علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۳۵۸/۴، كتاب الأضحية، على من تجب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ البحر الرائق: ۲۰۰/۸، كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۱/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر- بيروت)

(۲) سوال سابق کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

عن سلمة بن الأكوع، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: من ضحى منكم فلا يصبحن بعد ثالثة وبقي في بيته منه شيء، فلما كان العام المقبل، قالوا: يا رسول الله، نفعل كما فعلنا عام الماضي؟ قال: كلوا وأطعموا وادخروا، فإن ذلك العام كان بالناس جهد، فأردت أن تعينوا فيها. (صحيح البخاري: ۲/ ۸۳۵، رقم الحديث: ۵۵۶۹، كتاب الأضاحي، باب مايؤكل من لحوم الأضاحي ومايتزود منها، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۲/ ۱۵۹، رقم الحديث: ۳۴-(۱۹۷۴)، كتاب الأضاحي، باب بيان ما كان من النهي عن أكل لحوم الأضاحي بعد ثلاث في أول الإسلام، وبيان نسخه وإباحته إلى متى شاء، ط: ديوبند)

باب لحوم الأضاحي

[قربانی کے گوشت کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب لحوم الأضاحي

[قربانی کے گوشت کا بیان]

[۱] قربانی کے گوشت کو حصے داروں کے درمیان کمی بیشی کے ساتھ تقسیم کرنا

۱۹۳۲- سوال: قربانی میں حصوں کو کمی بیشی کے ساتھ تقسیم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

قربانی کے گوشت کو کمی بیشی کے ساتھ تقسیم کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ کمی بیشی کے ساتھ تقسیم کی صورت میں جو زیادتی دوسرے کے پاس ہوگی، وہ سود کے حکم میں ہوگی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ويقسم اللحم وزنا لا جزافا إلا إذا ضم معه الأكارع أو الجلد) صرفا للجنس لخلاف جنسه. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله لا جزافا) لأن القسمة فيها معنى المبادلة، ولو حلل بعضهم بعضا قال في البدائع: أما عدم جواز القسمة مجازفة فلأن فيها معنى التمليك واللحم من أموال الربا فلا يجوز تمليكه مجازفة. ـــــــ وأما عدم جواز التحليل؛ فلأن الربا لا يحتمل الحل بالتحليل، ولأنه في معنى الهبة وهبة المشاع فيما يحتمل القسمة لا تصح اهـ، . . . (قوله إلا إذا ضم معه إلخ) بأن يكون مع أحدهما بعض اللحم مع الأكارع ومع الآخر البعض مع البعض مع الجلد، عناية. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۱۷-۳۱۸، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر - بيروت)

[۲] قربانی کے گوشت کی تقسیم

گذشتہ سے پیوستہ

۱۹۳۳- سوال: قربانی کے بڑے جانور کے سات حصے ہو سکتے ہیں، اس اعتبار سے الگ الگ آدمیوں نے قربانی کا بڑا جانور خرید لیا، تو کیا ہر ایک کا حصہ وزن کر کے الگ کرنا ضروری ہے؟ اسی طرح تقسیم کے وقت گردہ، کلیجی، تلی، سری وغیرہ ہر ہر عضو کے سات سات حصے کرنا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

ہر عضو کے حصے کرنا ضروری نہیں، وزن کر کے برابر برابر تقسیم کرنا واجب ہے اور اگر تمام شرکاء کلیجی وغیرہ میں حصہ مانگتے ہوں، تو تمام کو حصہ دینا ضروری ہے، وزن میں کمی بیشی درست نہیں، ہاں اگر کوئی سری کوئی پایا اور کوئی چمڑا لے جائے، تو کمی بیشی جائز ہے۔ (درمختار)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] قربانی کے گوشت کو سُکھانا

۱۹۳۴- سوال: قربانی کے گوشت کو سکھانا کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیا:

مستحب ہے کہ قربانی کرنے والا گوشت کے تین حصے کرے، ایک حصہ اپنے گھر والوں کے لیے رکھے، ایک حصہ دوست واحباب اور اعزہ واقارب کو دے اور ایک حصہ غرباء میں تقسیم کرے، اگر کسی کی فیملی بڑی ہو اور ضرورت کی وجہ سے پورا گوشت خود رکھ لے، تو یہ بھی جائز ہے، اسی طرح ایک تہائی حصہ میں سے کچھ سکھائے یا پورا گوشت سکھائے، سب جائز ہے۔ (مجمع الانہر)[۲]

---

[۱] سوال سابق کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

[۲] عن سلمة بن الأكوع، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: من ضحى منكم فلا يصبحن بعد ثالثة وبقي في بيته منه شيء، فلما كان العام المقبل، قالوا: يا رسول الله، نفعل كما فعلنا عام الماضي؟ قال: كلوا وأطعموا وادخروا، فإن ذلك العام كان بالناس جهد، فأردت أن تعينوا فيها. (صحيح البخاري: ۸۳۵/۲، رقم الحديث: ۵۵۶۹، كتاب الأضاحي، باب مايؤكل من لحوم الأضاحي وما يتزود منها، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱۵۹/۲، رقم الحديث: ۳۴-(۱۹۷۴)، كتاب الأضاحي، باب بيان ما كان من النهي عن أكل لحوم الأضاحي بعد ثلاث في أول الإسلام، وبيان نسخه وإباحته إلى متى شاء، ط: ديوبند)

عن عبد الله بن بريدة، عن أبيه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: نهيتكم عن زيارة القبور، فزوروها، =

یہ حکم واجب قربانی کا ہے، اگر کسی نے منت مان کر اپنے اوپر قربانی واجب کی ہو، تو اُس کے پورے گوشت کو صدقہ کرنا ضروری ہے، اس میں سے مال داروں کو دینا جائز نہیں ہے۔ [1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] قربانی کا گوشت زیادہ مقدار میں جمع ہو جائے تو کیا کرے؟

۱۹۳۵- سوال: قربانی کا گوشت زیادہ مقدار میں جمع ہو جائے، تو کیا کیا جائے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

اُس کی قدر کرتے ہوئے اُسے سکھا کر خود استعمال کریں، یا قریب کی مسلم آبادی کے غریب لوگوں کے ہاں بھیج دیں، کہ ہر مسلمان اُس دِن اللہ تعالیٰ کی دعوت میں شریک بن سکے۔ [2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=ونهيتكم عن لحوم الأضاحي فوق ثلاث، فأمسكوا ما بدا لكم، ونهيتكم عن النبيذ إلا في سقاء، فاشربوا في الأسقية كلها، ولا تشربوا مسكرا. (الصحيح لمسلم: ۱۵۹/۲، رقم الحديث: ۳۷-(۱۹۷۷)، كتاب الأضاحي، باب بيان ما كان من النهي عن أكل لحوم الأضاحي بعد ثلاث في أول الإسلام، وبيان نسخه وإباحته إلى متى شاء، ط: ديوبند)

عن جابر، عن النبي صلى الله عليه وسلم، أنه نهى عن أكل لحوم الضحايا بعد ثلاث، ثم قال بعد: كلوا، وتزودوا، وادخروا. (الصحيح لمسلم: ۱۵۸/۲، رقم الحديث: ۲۹-(۱۹۷۲)، كتاب الأضاحي، باب بيان ما كان من النهي عن أكل لحوم الأضاحي بعد ثلاث في أول الإسلام، وبيان نسخه وإباحته إلى متى شاء، ط: ديوبند)

(ويأكل من لحم أضحيته ويطعم من شاء من غني وفقير) لما روي أنه - عليه الصلاة والسلام - نهى عن أكل لحوم الضحايا بعد ثلاث، ثم قال كلوا وتزودوا وادخروا. والنصوص كثيرة، وعليه إجماع الأمة، (وندب أن لا تنقص الصدقة عن الثلث)؛ لأن الجهات ثلاث: الأكل، والإدخال، والتصدق ... (وتركه) أي وندب ترك التصدق (لذي عيال توسعة عليهم) أي على العيال. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۵۲۱/۲، كتاب الأضحية، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۱) قال - رحمه الله -: (وندب أن لا ينقص الصدقة من الثلث) لأن الجهات ثلاثة: الإطعام والأكل والادخار لما روينا ولقوله تعالى {وأطعموا القانع والمعتر} [الحج: ۳۶] أي السائل والمتعرض للسؤال، فانقسم عليه أثلاثا وهذا في الأضحية الواجبة والسنة سواء، ... وإذا لم تكن واجبة، وإنما وجبت بالنذر فليس لصاحبها أن يأكل منها شيئا ولا أن يطعم غيره من الأغنياء، سواء كان الناذر غنيا، أو فقيرا لأن سبيلها التصدق وليس للمتصدق أن يأكل من صدقته ولا أن يطعم الأغنياء. (تكملة البحر الرائق - محمد بن حسين بن علي الطوري الحنفي القادري (م: بعد ۱۱۳۸ھ): ۲۰۳/۸، كتاب الأضحية، الأكل من لحم الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۲) ويستحب أن يأكل من أضحيته ويطعم منها غيره، والأفضل أن يتصدق بالثلث ويتخذ الثلث ضيافة لأقاربه وأصدقائه، ويدخر الثلث، ويطعم الغني والفقير جميعا، كذا في البدائع. ويهب منها ما شاء للغني والفقير والمسلم والذمي، كذا في الغياثية. ولو تصدق بالكل جاز، ولو حبس الكل لنفسه جاز. (الفتاوى الهندية: ۳۰۰/۵، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر - بيروت)

[۵] قربانی کا گوشت دوسرے گاؤں بھیجنا

۱۹۳۶- سوال: قربانی کا گوشت دوسرے گاؤں بھیجنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

دوسرے گاؤں میں [جہاں گوشت بھیجنے کا ارادہ ہو] رشتہ داری ہو، یا غربت ہو، تو وہاں گوشت بھیجنا بڑے ثواب کا کام ہے؛ اِس لیے کہ قربانی کا ایک تہائی حصہ رشتہ داروں کو اور ایک تہائی غرباء کو دینا مستحب ہے، اگر دوسرے گاؤں میں ضرورت نہ ہو، رشتہ داروں کے ہاں خود قربانی ہے، اور اپنے گاؤں میں غرباء زیادہ ہیں اور اُن کو گوشت کی ضرورت ہے، تو گاؤں ہی میں دینا کارِ ثواب ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] قربانی کا گوشت بیچنا

۱۹۳۷- سوال: قربانی کا گوشت بیچنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قربانی کرنے والے کے لیے گوشت کو ایسی چیز کے بدلہ میں بیچنا، جو باقی رہنے والی ہو اور باقی رہتے ہوئے اس سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہو، جائز ہے۔

اگر روپیہ و پیسہ کے عوض فروخت کرے، تو اُس رقم کا صدقہ کرنا واجب ہے؛ اِس لیے بیچنا درست ہے، البتہ اس سے حاصل ہونے والی رقم کا کسی فقیر پر صدقہ کرنا ضروری ہے۔ (درمختار: ۵/ ۲۰۰، مجمع الانہر: ۲/ ۵۲۱)[۲]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) والأفضل أن يتصدق بالثلث ويتخذ الثلث ضيافة لأقربائه وأصدقائه ويدخر الثلث. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۲۸، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر☆ حاشية الشرنبلالي مع درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۱/ ۲۷۱، كتاب الأضحية، مايصح للأضحية، ط: دار إحياء الكتب العربية★الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۰، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر)

[۲] (ويتصدق بجلدها أو يعمل منه نحو غربال وجراب) وقربة وسفرة ودلو (أو يبدله بما ينتفع به باقيا) كما مر (لا بمستهلك كخل ولحم ونحوه) كدراهم (فإن) (بيع اللحم أو الجلد به) أي بمستهلك (أو بدراهم) (تصدق بثمنه) ومفاده صحة البيع مع الكراهة، وعن الثاني باطل؛ لأنه كالوقف، مجتبى. (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۳۲۸، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر) =

[۷] قربانی کے جانور کی ہڈیاں بیچنا

۱۹۳۸-سوال: عموماً ہمارے یہاں قربانی کی ہڈیوں کو دفن کر دیا جاتا ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ کہ کیا کسی انجمن یا کمیٹی والوں کے لیے جائز ہے کہ ان ہڈیوں کو بیچ کر پیسے حاصل کریں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

بیچ سکتے ہیں، اور انجمن اور کمیٹی والے کو چاہیے کہ ان پیسوں کو غرباء ومساکین پر خرچ کریں۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیات غفرلہ

= (ويتصدق بجلدها) لكونه جزءا منها (أو يعمله آلة كجراب أو خف أو فرو) لأن الانتفاع به ليس بحرام (أو يشتري به) أي بالجلد (ما ينتفع به مع بقائه) أي بقاء ما ينتفع به استحسانا (كغربال ونحوه)؛ لأن للبدل حكم المبدل (لا ما يستهلك) أي لا يشتري به ما لا ينتفع به إلا بعد الاستهلاك (كخل وشبهه) ولا يبيعه بالدراهم لينفق الدراهم على نفسه وعياله، والمعنى أنه لا يتصرف على قصد التمول، واللحم بمنزلة الجلد في الصحيح؛ حتى لا يبيعه بما لا ينتفع به إلا بعد الاستهلاك (فإن بدل اللحم أو الجلد به) أي بما ينتفع بالاستهلاك جاز و (يتصدق به) لانتقال القربة إلى البدل. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر-عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م:۱۰۷۸هـ): ۵۲۱/۲، كتاب الأضحية، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۱) ولو باع ذلك أو باع لحمها فإنه يجوز بيعه ولا ينقض البيع في جواب ظاهر الرواية لكن يتصدق بالثمن. (تحفة الفقهاء- محمد بن أحمد بن أبي أحمد، أبو بكر علاء الدين السمرقندي (م: نحو ۵۴۰هـ): ۸۸/۳، كتاب الأضحية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ولا يحل بيع شحمها وأطرافها ورأسها وصوفها ووبرها وشعرها ولبنها الذي يحلبه منها بعد ذبحها بشيء، لا يمكن الانتفاع به إلا باستهلاك عينه من الدراهم والدنانير والمأكولات والمشروبات، ولا أن يعطي أجر الجزار والذابح منها، فإن باع شيئا من ذلك بما ذكرنا نفذ عند أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى، وعند أبي يوسف - رحمه الله تعالى - لا ينفذ، ويتصدق بثمنه، كذا في البدائع. (الفتاوى الهندية: ۳۰۱/۵، كتاب الأضحية، الباب السادس في بيان ما يستحب في الأضحية والانتفاع بها، ط: دار الفكر-بيروت)

فإن باعه بشيء من النقود يتصدق به، لأن وقت القربة قد فات فيتصدق به، كذا رواه محمد. (الاختيار لتعليل المختار-عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳هـ): ۲۰/۵، كتاب الأضحية، ت: الشيخ محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي-القاهرة)

[۸] قربانی کا گوشت کافر کو دینا

۱۹۳۹- سوال: قربانی کا گوشت کافر کو دیا جاسکتا ہے؟ قربانی کا گوشت کس حکم میں ہے؟ یعنی زکوۃ، نفلی صدقہ یا کسی اور حکم میں؟ حوالہ کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلياً:

قربانی کا گوشت کافر ویہودی کو دینا جائز ہے قربانی واجب ہے، گوشت کا تقسیم کرنا واجب نہیں، پس قربانی کا گوشت زکوۃ کے حکم میں نہیں ہے، بل کہ نفلی صدقہ کے حکم میں ہے؛ لہٰذا کافر کو بھی دینا جائز ہے۔ (۱) فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] قربانی کا گوشت اور غیر مسلم

۱۹۴۰- سوال: قربانی کا گوشت کسی غیر مسلم کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً: ایک شخص ہمارے یہاں پہرے داری کا کام انجام دیتا ہے، اس کو قربانی کا گوشت دینا کیسا ہے؟

الجواب حامداومصليا:

غیر مسلم کو قربانی کا گوشت دینا جائز ہے، (۲) مگر معاوضہ خدمت کے طور پر نہ دیا جائے، (۳) البتہ وہ قربانی، جس کا گوشت واجب التصدق ہے، اس کا گوشت غیر مسلم کو نہ دیا جائے۔ (۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ويهب منها ما شاء للغني والفقير والمسلم والذمي، كذا في الغياثية. (الفتاوى الهندية: ۳۰۰/۵، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر - بيروت)

ومباح له أن يطعم منها الغني والكافر، وأن يهدي منها إن شاء. (إعلاء السنن: ۲۶۰/۱۷، باب التصدق بلحوم الأضاحي، ط: إدارة القران، كراتشي)

(۲) سوال سابق کا حاشیہ نمبر (۱) ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) قال - رحمه الله -: (ولا يعطي أجرة الجزار منها شيئا) والنهي عنه نهي عن البيع لأنه في معنى البيع؛ لأنه يأخذه بمقابلة عمله فصار معاوضة كالبيع. (البحر الرائق: ۲۰۳/۸، كتاب الأضحية، أجرة الجزار هل تأخذ من الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۴) إن وجبت بالنذر فليس لصاحبها أن يأكل منها شيئا، ولا أن يطعم غيره من الأغنياء سواء كان الناذر غنيا أو فقيرا؛ لأن سبيلها التصدق، وليس للمتصدق أن يأكل صدقته، ولا أن يطعم الأغنياء، كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۳۰۰/۵، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر - بيروت) =

[۱۰] قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دینا

۱۹۴۱- سوال: قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دینا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

غیر مسلم ذمی کو دینا جائز ہے، حربی کو دینا جائز نہیں ہے؛ اِس لیے ہندوستان کے غیر مسلم کو دینا جائز نہیں ہے، یہ حکم قربانی کرنے والے کا ہے، لیکن جس شخص کے پاس دوسرے کی جانب سے گوشت آیا ہو وہ اگر غیر مسلم کو دے تو جائز ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= (ولا) تدفع (إلى ذمي) لحديث معاذ (وجاز) دفع (غيرها وغير العشر) والخراج (إليه) أي الذمي ولو واجبا كنذر وكفارة وفطرة خلافا للثاني وبقوله يفتي حاوي القدسي. (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله: خلافا للثاني) حيث قال إن دفع سائر الصدقات الواجبة إليه لا يجوز اعتبارا بالزكاة، وصرح في الهداية وغيرها بأن هذه رواية عن الثاني، وظاهره أن قوله المشهور كقولهما (قوله: وبقوله يفتي) الذي في حاشية الخير الرملي عن الحاوي وبقوله نأخذ. ـــــ قلت: لكن كلام الهداية وغيرها يفيد ترجيح قولهما وعليه المتون. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۳۵۲، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر-بيروت)

(۱) حضرت مفتی صاحب نے اس سے پہلے ذکر کیے گئے اپنے فتویٰ میں مطلقاً غیر مسلم کو قربانی کا گوشت دیے جانے کی بات لکھی ہے، "ذمی کافر" یا حربی کافر کا کوئی فرق بیان نہیں کیا ہے، جب کہ اس فتویٰ میں فرق کیا ہے، اور دونوں کا حکم علاحدہ بیان کیا ہے، حالاں کہ اکابر دیوبند کے فتاویٰ سابق میں ذکر کیے گئے فتویٰ کے موافق ہے کہ کافر کو قربانی کا گوشت دینا جائز ہے، ذیل کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں:

سوال: قربانی اور عقیقہ کا گوشت غیر مسلموں کو دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا: جس قربانی کا گوشت صدقہ کرنا واجب ہے، جیسے نذر، اس کا گوشت غیر مسلم کو نہ دیا جائے، اور عام قربانی کا گوشت اور عقیقے کا گوشت غیر مسلم حربی کو بھی دینا درست ہے۔ فقط، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ حررہ العبد محمود عفی عنہ، دار العلوم دیوبند

الجواب صحیح: بندہ نظام الدین عفی عنہ، دار العلوم، دیوبند

(فتاویٰ محمودیہ: ۱۷/ ۴۳۵، سوال نمبر: ۸۴۸۸، قربانی اور عقیقہ کا گوشت غیر مسلم کو دینا، ط: دار المعارف-دیوبند)

اس فتویٰ میں باضابطہ "حربی کافر" کی صراحت اور استاذ محترم حضرت مفتی نظام الدین اعظمیؒ کی تائید موجود ہے۔

استاذ محترم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم رقم طراز ہیں:

جواب: غیر مسلموں کو قربانی کا گوشت دینا جائز اور درست ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں اس طرح کا سلوک کرنا مستحب اور مستحسن ہے، اس سے اجنبیت کم ہوگی، اُنس بڑھے گا، اور ان کو احساس ہوگا کہ مسلمان مذہبی طور پر اتنے فراخ دل اور سیر چشم ہیں کہ اپنی خوشیوں میں غیر مسلم بھائیوں کو بھی شریک کرتے ہیں۔ (کتاب الفتاویٰ: ۴/ ۱۵۰، کتاب الاضحیہ، قربانی کا گوشت اور چرم غیر مسلموں کو دینا، ط: نعیمیہ-دیوبند)

[۱۱] قربانی کے جانور کی اوجھڑی شرکاء کی اجازت سے کافر کو دینا

۱۹۴۲- سوال: (۱) قربانی کے جانور میں چار پانچ آدمی شریک ہوں، اور اس کی اوجھڑی کسی آدمی یا کسی شخص (جو کافر ہوتا ہے) کو دینے کے سلسلے میں سب متفق ہوں، تو دے سکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) اگر کوئی شریک اس وقت موجود نہ ہو اور اس کا وکیل اس کی طرف سے اجازت دے دے، تو یہ معتبر ہے یا نہیں؟ شریعت کا حکم بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) جائز ہے۔[۱]

(۲) اصیل اجازت دے یا [اصیل کی مرضی سے] وکیل اجازت دے، دونوں صورتیں جائز ہیں۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] قربانی کا گوشت کافر کو شہرت کے لیے دینا

۱۹۴۳- سوال: قربانی کا گوشت محض اپنی شہرت کے لیے کسی کافر کو دینا کیسا ہے؟ محتاج اور غریب کو برائے نام دے کر باقی پورا گوشت کسی کافر سیٹھ کو دے دینا کیسا ہے؟

---

[۱] (وصح) (اشتراك ستة في بدنة شريت لأضحية... استحسانا وذا) أي الاشتراك (قبل الشراء أحب، ويقسم اللحم وزنا لا جزافا إلا إذا ضم معه الأكارع أو الجلد). (الدر المختار) ـــــ قال ابن عابدين: (قوله ويقسم اللحم) انظر هل هذه القسمة متعينة أو لا، حتى لو اشترى لنفسه ولزوجته وأولاده الكبار بدنة ولم يقسموها تجزيهم أو لا، والظاهر أنها لا تشترط لأن المقصود منها الإراقة وقد حصلت. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/۳۱۷، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر بيروت)

ومباح له أن يطعم منها الغني والكافر، وأن يهدي منها إن شاء. (إعلاء السنن: ۱۷/۲۶۰، باب التصدق بلحوم الأضاحي، ط: إدارة القران، كراتشي)

(۲) ويجوز [التوكيل] بالنكاح والخلع والصلح عن دم العمد والكتابة والإعتاق على مال والصلح على إنكار، لأنه يملك هذه التصرفات بنفسه فيملك تفويضها إلى غيره، وتجوز الهبة والصدقة والإعارة والإيداع والرهن والاستعارة والاستيهاب والارتهان. (بدائع الصنائع: ۶/۲۳، كتاب الوكالة، فصل في شرائط الوكالة، ط: دار الكتب العلمية)

الجواب حامدا ومصلیا:

قربانی کا گوشت نام ونمود اور اپنی شہرت کے لیے کسی کو بھی دیا جائے، خواہ وہ مسلم ہو یا کافر، حرام ہے، البتہ نام ونمود مقصود نہ ہو، تو غیر مسلم اور کافر؛ دونوں کو دینا جائز ہے؛ لیکن بہتر یہ ہے کہ گوشت کے تین حصے کیے جائیں: ایک حصہ اپنے بال بچوں کے لیے، ایک حصہ دوست واحباب اور اپنے متعلقین کے لیے اور ایک حصہ مسلم غرباء کے لیے۔ مسلم غرباء کو چھوڑ کر غیر مسلموں کو زیادہ گوشت دینا بہتر نہیں۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] نکاح یا رخصتی کی دعوت میں عقیقہ کرنا

۱۹۴۴- سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ:

---

(۱) يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿(۲-البقرۃ:۲۶۴)

[عن أبي هريرة قال:] سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "إن أول الناس يقضى يوم القيامة عليه رجل استشهد، فأتي به فعرفه نعمه فعرفها، قال: فما عملت فيها؟ قال: قاتلت فيك حتى استشهدت، قال: كذبت، ولكنك قاتلت لأن يقال: جريء، فقد قيل، ثم أمر به فسحب على وجهه حتى ألقي في النار، ورجل تعلم العلم، وعلمه وقرأ القرآن، فأتي به فعرفه نعمه فعرفها، قال: فما عملت فيها؟ قال: تعلمت العلم، وعلمته وقرأت فيك القرآن، قال: كذبت، ولكنك تعلمت العلم ليقال: عالم، وقرأت القرآن ليقال: هو قارئ، فقد قيل، ثم أمر به فسحب على وجهه حتى ألقي في النار، ورجل وسع الله عليه، وأعطاه من أصناف المال كله، فأتي به فعرفه نعمه فعرفها، قال: فما عملت فيها؟ قال: ما تركت من سبيل تحب أن ينفق فيها إلا أنفقت فيها لك، قال: كذبت، ولكنك فعلت ليقال: هو جواد، فقد قيل، ثم أمر به فسحب على وجهه، ثم ألقي في النار". (الصحيح لمسلم:۲/۱۴۰، رقم الحديث: ۱۵۲-(۱۹۰۵)، كتاب الإمارة، باب من قاتل للرياء والسمعة استحق النار، ط: ديوبند)

ويستحب أن يأكل من أضحيته ويطعم منها غيره، والأفضل أن يتصدق بالثلث ويتخذ الثلث ضيافة لأقاربه وأصدقائه، ويدخر الثلث، ويطعم الغني والفقير جميعا، كذا في البدائع. ويهب منها ما شاء للغني والفقير والمسلم والذمي، كذا في الغياثية. (الفتاوى الهندية:۵/۳۰۰، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر-بيروت)

وللمضحي أن يهب كل ذلك أو يتصدق به أو يهديه لغني أو فقير مسلم أو كافر. (إعلاء السنن:۱۷/۲۵۸، كتاب الأضاحي، بيع جلد الأضحية، ط: إدارة القران، كراتشي)

ایک شخص کے یہاں نکاح یا رخصتی کا موقع تھا، جس میں اس نے مختلف لوگوں کو دعوت دے رکھی تھی، اس موقع سے آنے والے مہمانوں کو کھلانے کے لیے عقیقہ کا جانور ذبح کیا، اور اس کا گوشت کھلا دیا، یہاں رواج کے موافق آنے والے دعوت کے بعد کچھ رقم یا برتن وغیرہ لازمی طور پر دیتے ہیں، گویا یہ دعوت اور کھانے کا عوض ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جو شخص نہیں آتا، وہ کچھ نہیں دیتا، تو اس طرح عقیقہ کا گوشت نکاح یا رخصتی کے موقع پر دعوت میں کھلانا کیسا ہے؟ عقیقہ درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عقیقہ کا گوشت خود بھی کھا سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں، البتہ اس کو بیچنے کی اجازت نہیں ہے۔[1]

مذکورہ رواج کی وجہ سے عقیقہ کا گوشت شادی یا رخصتی کے موقع پر دعوت میں کھلانا جائز نہیں ہے۔ اس رسم ورواج کو لوگ قرض کی طرح سمجھتے ہیں؛ بل کہ جس کے گھر دعوت دیتے ہیں، اس کے مراسم وحالات دیکھ کر دعوت دیتے ہیں، یعنی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے موقع پر دعوت کرے گا یا نہیں، نیز اس موقع سے کچھ گفٹ دے گا یا نہیں، اس طرح کی دعوت کو قرض سمجھا جاتا ہے، لہٰذا اس ''قرض وصولی'' کی دعوت میں عقیقہ کا گوشت کھلانا جائز نہیں۔[2]

اس کے باوجود اگر کسی نے ایسے موقع پر عقیقہ کا گوشت کھلا دیا، تو اتنے گوشت کی قیمت غرباء پر صدقہ کرنا ضروری ہے، مثلاً اگر ایک من گوشت اس دعوت میں کھلایا ہے، تو ایک من گوشت کی قیمت غرباء ومساکین پر صدقہ کرنا ضروری ہے، صدقہ کرنے سے عقیقہ صحیح ہوجائے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) و بالجملة هي كالأضحية في أكثر الأحكام عندهم. (إعلاء السنن-ظفر أحمد العثماني (م: ۱۳۹۴ھ): ۱۷/۱۱۷، كتاب الذبائح، باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط: إدارة القران- كراتشي)

حضرت مولانا ومفتی سید عبد الرحیم لاج پوری رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں:

عقیقے کا گوشت بلا کسی عوض مفت کھلانا چاہیے، شادی کی تقریب میں چوں کہ کھانا کھلا نا چڑھاوا (دیوار) لیا جاتا ہے، اس لیے عوض اور بدلہ کا شبہ ہوتا ہے؛ لہٰذا بچنا چاہیے، ہاں ناشتہ وغیرہ کی دعوت میں-جس میں چڑھاوا لینے کا دستور نہیں ہے-کھلانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، شادی کی دعوت میں عقیقے کا گوشت کھلانے کا رواج یعنی دستور ہوجانے میں ایک خرابی یہ بھی ہے کی استحباب کی رعایت نہ ہوگی، مستحب یہ ہے کہ ساتویں روز عقیقہ ہو، اور تیسرا حصہ غرباء کو دیا جائے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۱۰/۶۱-۶۲، باب العقیقہ، شادی کی دعوت میں عقیقے کا گوشت استعمال کرنا، ط: دار الاشاعت-کراچی ☆ فتاویٰ دینیہ-مفتی اسماعیل کچھولوی دامت برکاتہم: ۴/۷۴، شادی میں عقیقہ کی دعوت، ط: جامعہ حسینیہ-راندیر، سورت، گجرات)

(۲) وفي الدر المنتقى عن الظهيرية: وعمل الجلد جرابا وأجره لم يجز وعليه التصدق بالأجرة. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/۳۲۹، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر-بيروت)

[۱۴] شادی کی دعوت میں عقیقہ کرنا

۱۹۴۵- سوال: ہمارے یہاں بلیشور میں قاسم بھائی نے اپنے لڑکے کی شادی کی دعوت میں عقیقہ کی نیت سے ایک گائے ذبح کی اور اس میں نہ کوئی حصہ الگ کیا اور نہ اس کا گوشت غریبوں میں تقسیم کیا؛ بل کہ پوری گائے عقیقہ میں ذبح کی اور اس کا گوشت بھی مہمانوں کو کھلا دیا، نیز دعوت میں آنے والے مہمانوں سے رسماً جو ہدیہ تحفہ لیا جاتا ہے، اسے بھی وصول کیا، تو ایسی صورت میں مذکور عقیقہ صحیح ہوا یا نہیں؟ جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً:

عقیقہ کا مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد عنایت کی ہے، اس کی شکر میں، اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بکرا، بکری وغیرہ ذبح کرے، یا بڑے جانور میں حصہ رکھے، اور گوشت رشتہ داروں اور غریبوں میں تقسیم کر دے، خود بھی استعمال کرے۔ (۱)

رہی بات شادی کے موقع پر مہمانوں کو عقیقہ کا گوشت کھلانے کی، تو اس میں تفصیل ہے کہ اگر عقیقہ کرنے والا آنے والے مہمانوں سے رسمی ہدیہ وتحفہ نہیں لیتا ہے، تو جائز ہے اور عقیقہ ادا ہو جائے گا، لیکن اگر دعوت میں آنے والوں سے ہدیہ وتحفہ وصول کرتا ہے، تو اس کا مطلب (عرفاً یہ ہے کہ) اس نے جو کچھ اپنے رشتہ دار اور متعلقین کی شادیوں میں ہدیہ دیا تھا، اس کا قرض وصول کر رہا ہے اور اسی مقصد سے گویا اس نے یہ کھانے پینے کی دعوت کی ہے؛ لہٰذا اس کا عقیقہ ادا نہ ہوگا، الا یہ کہ جس قدر عقیقے کا گوشت دعوت میں کھلایا ہے، اس کی قیمت غرباء میں تقسیم کر دے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) العقيقة تطوع إن شاء فعلها، وإن شاء لم يفعل، وهي أن يذبح شاة إذا أتى على الولد سبعة أيام، وعند الشافعي سنة، ثم إذا أراد أن يعق عن الولد، فإنه يذبح عن الغلام شاتين وعن الجارية شاة؛ لأنه إنما شرع للسرور بالمولود، وهو بالغلام أكثر، ولو ذبح عن الغلام شاة، وعن الجارية شاة جاز؛ لأن النبي - صلى الله عليه وسلم - عق عن الحسن والحسين كبشا كبشا، ولا يكون فيه دون الجذع من الضأن والثني من المعز ولا يكون فيه إلا السليمة من العيوب؛ لأنه إراقة دم شرعا كالأضحية ولو قدم يوم الذبح قبل يوم السابع أو أخره عنه جاز إلا أن يوم السابع أفضل والمستحب أن يفصل لحمها ولا يكسر عظمها تفاؤلا بسلامة أعضاء الولد ويأكل ويطعم ويتصدق. اهـ. (العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية-ابن عابدين، الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲ھ): ۲/ ۲۱۲، كتاب الذبائح، العقيقة، ط: دار المعرفة)

(۲) علقمة بن وقاص الليثي، يقول: سمعت عمر بن الخطاب رضي الله عنه على المنبر قال: سمعت رسول الله صلى=

[۱۵] شادی کی دعوت اور عقیقہ

۱۹۴۶- سوال: ایک شخص کی عقیقہ کی گائے ہے، اس نے اپنے دوست سے کہا، تو میرے عقیقہ کی اس گائے کو اپنی شادی کی دعوت میں لوگوں کو کھلانے کے لیے ذبح کر دینا، تو کیا شادی کی دعوت میں عقیقہ کر سکتے ہیں؟ اور اس موقع پر دعوت میں آنے والوں کی طرف سے رسماً جو کچھ دیا جاتا ہے، اس کو لینے سے عقیقہ میں کوئی نقصان تو نہ آئے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں عقیقہ اس وقت تک ادا نہ ہوگا، جب تک دعوت کھانے والوں کی طرف سے رسماً دی ہوئی چیزوں کا صدقہ نہ کر دیا جائے؛ کیوں کہ اس صورت میں عقیقہ کے گوشت کو بیچنا یا "قرض وصولی" میں دعوت کھلانا لازم آتا ہے، جو جائز نہیں۔[1] اگر ان رسمی ہدایا کو قبول نہ کریں یا منع کرنے کے باوجود رشتہ داروں یا متعلقین نے زبردستی دیا تو عقیقہ ادا ہو جائے گا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] عقیقے کا گوشت شادی میں مہمانوں کو کھلانا اور ہدیہ لینا

۱۹۴۷- سوال: ایک آدمی اپنے لڑکے کا عقیقہ کر کے اس کا گوشت اپنی لڑکی کی شادی میں

= الله عليه وسلم يقول: إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها، أو إلى امرأة ينكحها، فهجرته إلى ما هاجر إليه. (صحيح البخاري: ۱/۲، رقم الحديث: ۱، كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم؟، ط: ديوبند☆الصحيح لمسلم: ۲/۱۴۰-۱۴۱، رقم الحديث: ۱۵۵-(۱۹۰۷)، كتاب الإمارة، باب قوله صلى الله عليه وسلم: إنما الأعمال بالنية، وأنه يدخل فيه الغزو وغيره من الأعمال، ط: ديوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیں سوال سابق بعنوان "نکاح یا رخصتی کی دعوت میں عقیقہ کرنا"۔

[۱] (ولا يعطى أجر الجزار منها) لأنه كبيع. (الدر المختار) ــــــ (قوله لأنه كبيع) لأن كلا منهما معاوضة، لأنه إنما يعطي الجزار بمقابلة جزره، والبيع مكروه، فكذا ما في معناه، كفاية. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/۳۲۸-۳۲۹، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

مزید تفصیل وتخریج کے لیے ملاحظہ فرمائیں سوال سابق کے حواشی۔

(۲) القاعدة الثانية: الأمور بمقاصدها. (الاشباه والنظائر- زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م: ۹۷۰ھ)، ص: ۲۳، القاعدة الثانية، ت: الشيخ زكريا عميرات، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

مہمانوں کو کھلا سکتا ہے یا نہیں؟ نیز اس دعوت میں شرکت کرنے والے مہمانوں سے رسم ورواج کے مطابق پیسے لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ اور لڑکی کو بھی اپنے رشتے دار اور دوست احباب کی جانب سے ملنے والا ہدیے اور تحائف لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

عقیقہ کر کے اس کا گوشت شادی کی دعوت میں کھلانا جائز ہے،[1] بشرطیکہ رسم ورواج کے مطابق کاپی لے کر کوئی پیسے وصول کرنے کے لیے علی الاعلان نہ بیٹھا ہو، اگر علی الاعلان کاپی لے کر کسی کو بٹھایا گیا ہے اور وہ آنے والے مہمانوں کی طرف سے ملنے والے پیسوں کو وصول کرتا ہے، تو یہ عمل گوشت بیچنے کے مترادف ہے؛ لہٰذا اس سے عقیقہ ادا نہیں ہوگا، نیز سات طرح کی دعوتیں سنت ہیں، ان میں ایک دعوت شادی بیاہ اور خوشی کے موقع کی دعوت بھی ہے، اس میں مہمانوں اور دوست احباب کو کھلانا سنت ہے؛ لہٰذا کاپی لے کر کسی کو پیسے وصول کرنے کے لیے مستقل طور پر بٹھانا درحقیقت دعوت کے کھانے کا معاوضہ لینے کے برابر ہے؛ لہٰذا پیسے وصول کرنا بہتر نہیں ہے؛ ہاں! کاپی کا کوئی خاص اہتمام کیے بغیر اگر آنے والے مہمان اپنی خوشی سے لڑکی کو یا اس کے باپ کو بہ طور امداد دیں، تو لینا جائز ہے، کوئی حرج نہیں ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] ۱- قربانی کے دِنوں میں عقیقہ درست ہے یا نہیں؟
[۱۸] ۲- عقیقہ کے لیے بڑا جانور ضروری ہے یا بکرا کافی ہے؟
[۱۹] ۳- عقیقہ کے جانور کا گوشت شادی میں کھلایا گیا تو عقیقہ صحیح ہوگا؟

۱۹۴۸- سوال: قربانی کے تین دِنوں میں عقیقہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

عقیقہ کا جانور کیسا ہونا چاہیے؟ بڑا یا چھوٹا؟ بکرے کے ذریعہ عقیقہ کیا جائے تو درست ہے یا نہیں؟

شادی میں عقیقہ کے جانور کا گوشت کھلایا جائے تو عقیقہ درست ہوگا یا نہیں؟ جب کہ شادی کی تقریب

---

(۱) بل العقيقة شرعت عند سرور حادث و تجدد نعمة فأشبهت الذبيحة في الوليمةولا نزاع في جوازهاولا استحبابها. (إعلاء السنن- ظفر أحمد العثماني (م: ۱۳۹۴ھ): ۱۷/ ۱۲۲، كتاب الذبائح، باب العقيقة، ط: إدارة القران- كراتشي)

(۲) تفصیل کے لیے سابقہ سوالات کے جوابات وحواشی ملاحظہ فرمائیں۔

میں ہمارے یہاں دعوت میں تشریف لانے والے مہمانوں سے پیسے بھی وصول کیے جاتے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

قربانی کے تینوں دِنوں کے درمیان عقیقہ جائز ہے۔[۱]

عقیقہ میں بڑا جانور بھی جائز ہے، اُس میں عقیقہ کے حصوں کے علاوہ دیگر حصے قربانی کے بھی کیے جاسکتے ہیں۔[۲]

شادی میں دعوتِ ولیمہ میں عقیقہ کا گوشت کھلانا جائز ہے، اگرچہ اُس پر پیسے وصول کیے جاتے ہوں۔ (ردالمحتار: ۳۳۶/۶)[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ووقتها بعد تمام الولادة إلى البلوغ، فلا يجزئ قبلها، وذبحها في اليوم السابع يسن، والأولى فعلها صدر النهار عند طلوع الشمس بعد وقت الكراهة للتبرك بالبكور... ويسن أن يعق عن نفسه من بلغ ولم يعق عنه. (العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية-ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲/ ۲۱۳، كتاب الذبائح، العقيقة، ط: دار المعرفة)

[۳-۲] يستحب لمن ولد له ولد أن يسميه يوم أسبوعه ويحلق رأسه ويتصدق عند الأئمة الثلاثة بزنة شعره فضة أو ذهبا ثم يعق عند الحلق عقيقة إباحة على ما في الجامع المحبوبي، أو تطوعا على ما في شرح الطحاوي، وهي شاة تصلح للأضحية، تذبح للذكر والأنثى، سواء فرق لحمها نيئا أو طبخه بحموضة أو بدونها مع كسر عظمها أو لا واتخاذ دعوة أو لا، وبه قال مالك. وسنها الشافعي وأحمد سنة مؤكدة شاتان عن الغلام وشاة عن الجارية، غرر الأفكار ملخصا، والله تعالى أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۳۶/۶، كتاب الأضحية، خاتمة: يستحب لمن ولد له ولد، قبيل: كتاب الحظر والإباحة، ط: دار الفكر-بيروت)

(ولا يباع من لحمها شيء ولا جلدها) قال الباجي: لأنه بعد الذبح لا يبقى فيها من معنى الملك أكثر من الانتفاع بها، والتصدق، فأما أن يجوز له بعد أن نسك بها أن يبيع شيئا منها فلا، انتهى. (أوجز المسالك: ۱۹۶/۱۰، كتاب العقيقة، باب العمل في العقيقة، تحت رقم: ۱۰۵۰/ ۷، ط: دار القلم-دمشق)

اس فتویٰ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ولیمہ کی دعوت میں عقیقہ کا گوشت کھلایا جاسکتا ہے، خواہ اس موقع سے پیسے وصول کیے جاتے ہوں۔ حضرت مفتی صاحب کا یہ فتویٰ ان کے دیگر فتاویٰ سے مختلف ہے، اصل بات یہ ہے کہ ولیمہ کی دعوت میں اگر عقیقہ کا گوشت کھلایا جائے، تو نفس عقیقہ کی ادائیگی میں شبہ نہیں ہے، البتہ دعوت میں شرکت کرنے والے حضرات چوں کہ رسم کی بنیاد پر پیسے دیتے ہیں، تو ایسا لگتا ہے کہ شاید دعوت اس کا بدل ہے، گویا گوشت کے بیچنے کا شبہ ہوتا ہے، اس وجہ سے مفتی صاحبؒ نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ جتنا گوشت ولیمہ میں کھلایا گیا، اس کے بہ قدر رقم کا صدقہ کردے، تو عقیقہ میں نقص نہیں رہے گا۔ دیکھیے اس سلسلے کے تمام سوالات وجوابات: بہ عنوان: [نکاح یا رخصتی کی دعوت میں عقیقہ کرنا☆ شادی کی دعوت میں عقیقہ کرنا☆ شادی کی دعوت اور عقیقہ☆ عقیقے کا گوشت شادی میں مہمانوں کو کھلانا اور ہدیہ لینا] [مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۲۰] عقیقہ کا گوشت تبلیغی اجتماع میں پیسے لے کر کھلانا

۱۹۴۹- سوال: بعض علاقے میں عقیقہ کا گوشت تبلیغی اجتماع میں کھلایا جاتا ہے اور اس کھانے پر ٹکٹ لگتا ہے، بغیر ٹکٹ کے وہ کھانا کوئی نہیں کھا سکتا اور یہ تاویل کی جاتی ہے کہ پیسے تو مرچ مصالحے وغیرہ کے لیے جاتے ہیں، تو کیا یہ بحکم شرع درست ہے؟

الجواب حامداو مصلیا:

عقیقہ کا گوشت تبلیغی اجتماع کے لیے بنایا جائے، تو گوشت یا اس کے ساتھ ملائے گئے مصالحے کی قیمت نہیں لی جاسکتی؛ کیوں کہ مصالحہ، غیر مبیع کے ساتھ مخلوط ہے اور مجہول بھی، البتہ اگر روٹی یا چائے ناشتہ وغیرہ کی قیمت اس کے برابر لی جائے، تو جائز ہے۔ (بحروشامی)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] عقیقہ کا گوشت تبلیغی اجتماع میں کھلانا ہو تو کیا کیا جائے؟

۱۹۵۰- سوال: ہمارے علاقے میں تبلیغی اجتماع منعقد ہونے والا ہے، جس میں شرکت کرنے والوں کے لیے کھانے کے پاس (ٹکٹ) کی قیمت تین روپے رکھی گئی ہے، اجتماع کے خرچ کو بہت سے لوگ مشترکہ طور پر اپنے ذمہ لیتے ہیں، مثلاً بعض حضرات کی جانب سے چاول کا انتظام ہوتا ہے، بعض کی جانب سے روٹی وغیرہ کا، بعض نقد ادا کر کے امداد کرتے ہیں، تو اگر کوئی شخص اجتماع کے کھانے میں عقیقہ کا گوشت دے، تو اس کو پکا کر کھلانا کیسا ہے؟ جب کہ پاس (ٹکٹ) کے تین روپئے ہر ایک سے وصول کیے جائیں گے۔

---

[۱] واللحم بمنزلة الجلد في الصحيح، فلا يبيعه بما لا ينتفع به إلا بعد الاستهلاك، ولو باعها بالدراهم ليتصدق بها جاز؛ لأنه قربة كالتصدق بالجلد واللحم، وقوله: -عليه الصلاة والسلام- من باع جلد أضحيته فلا أضحية له، يفيد كراهية البيع، وأما البيع فجائز لوجود الملك والقدرة على التسليم. (تكملة البحر الرائق شرح كنز الدقائق-محمد بن حسين، الطوري الحنفي القادري (م: بعد ۱۱۳۸هـ): ۸/۲۰۳، كتاب الأضحية، الأكل من لحم الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي

☆ردالمحتار على الدر المختار: ۶/۳۲۸، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

(ولا يباع من لحمها شيء ولا جلدها) قال الباجي: لأنه بعد الذبح لا يبقى فيها من معنى الملك أكثر من الانتفاع بها، والتصدق، فأما أن يجوز له بعد أن نسك بها أن يبيع شيئا منها فلا، انتهى. (أوجز المسالك: ۱۰/۱۹۶، كتاب العقيقة، باب العمل في العقيقة، تحت رقم: ۷/۱۰۵۰، ط: دار القلم-دمشق)

الجواب حامداومصلیا:

عقیقہ کا گوشت دینے والے شخص کو چاہیے کہ اولاً وہ کسی کو گوشت کا مالک بنادے، اس کے بعد یہ صورت ہوسکتی ہے کہ مالک بننے والا شخص اجتماع کے منتظمین و ذمہ داروں کو یہ گوشت بطورِ ہدیہ دے دے، اس صورت میں ٹکٹ کے ساتھ کھلانا بھی جائز ہے، اور تملیک فی سبیل اللہ ہونے کی وجہ سے عقیقہ بھی ادا ہوجائے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] تبلیغی اجتماع میں عقیقہ کا گوشت کھلانا

۱۹۵۱- سوال: ہمارے یہاں ایک آدمی اپنے لڑکے کا عقیقہ کرنا چاہتا ہے، حسن اتفاق کہ گاؤں میں تبلیغی اجتماع ہونا ہے، وہ چاہتا ہے کہ عقیقہ کا دو بکرا لے لے یا بڑے جانور میں دو حصہ لے لے، اور اس کا گوشت تبلیغی اجتماع میں شریک لوگوں کو کھلادے، تو کیا اس طرح عقیقہ کا گوشت کھلانے سے عقیقہ ہوجائے گا؟

سوال کی وجہ یہ ہے کہ اجتماع میں آنے والوں سے کھانا کے لیے پاس ٹکٹ کے طور پر روپیہ دو روپیہ وصول کیے جاتے ہیں، تو کیا اس طرح کھلانے کی صورت میں عقیقہ ہوجائے گا؟ اگر نہیں، تو اس کو جائز بنانے کا کیا حیلہ ہے؟ بیان فرمائیں۔

الجواب حامداومصلیا:

بڑے جانور میں دو حصے عقیقے کے رکھنا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ پورا جانور قربانی کا ہو یا ولیمہ کا ہو یا عقیقہ کا ہو، اگر دو حصے عقیقے کے ہوں اور باقی ۵ حصے بیچنے کے لیے، تو ایسی صورت میں عقیقہ ادا نہیں ہوگا۔[2]

---

(١) وللغني أن يشتري الصدقة الواجبة من الفقير ويأكلها، وكذا لو وهبها له، لما علم أن تبدل الملك كتبدل العين فلو أباحها له، ولم يملكها منه، ذكر أبو المعين النسفي أنه لا يحل تناوله للغني. (البحر الرائق: ٢/ ٢٦٣، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(٢) لا يشارك المضحي فيما يحتمل الشركة من لا يريد القربة رأسا، فإن شارك لم يجز عن الأضحية، وكذا هذا في سائر القرب إذا شارك المتقرب من لا يريد القربة لم تجز عن القربة، ولو أرادوا القربة - الأضحية أو غيرها من القرب - أجزأهم سواء كانت القربة واجبة أو تطوعا أو وجب على البعض دون البعض، وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت، بأن أراد بعضهم الأضحية، وبعضهم جزاء الصيد، وبعضهم هدي الإحصار، وبعضهم كفارة عن شيء أصابه في إحرامه، وبعضهم هدي التطوع، وبعضهم دم المتعة أو القران، وهذا قول أصحابنا الثلاثة رحمهم الله =

تبلیغی اجتماع میں عقیقہ کا گوشت کھلانے کا جائز طریقہ یہ ہے کہ عقیقہ کا جانور ذبح کر کے گوشت کا مالک کسی کو بنادے، مالک بننے کے بعد وہ آدمی منتظم کو ہدیہ دے دے، اس صورت میں گوشت کے اوپر رقم لینا جائز ہے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ عقیقہ کرنے والا اور منتظم مصالحہ، تیل، مرچ، لکڑے کے پیسے دے کر گوشت پکائے، اب ٹکٹ صرف چاول روٹی نان کی لے اور ترکاری [گوشت] فی سبیل اللہ (ہدیہ) دے دے، پھر اس میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ گوشت فلاں وقت میں مفت کھلایا جائے گا، قیمت فقط چاول یا روٹی کی رکھے، چاول کی اصل قیمت ڈیڑھ یا دو روپیہ اصل کے برابر رکھے، اور ترکاری [گوشت] کی رقم نہ لی جائے، تو عقیقہ ادا ہو جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] عقیقہ کے جانور کا گوشت شادی میں کھلانا

١٩٥٢- سوال: میرے یہاں میری دختر کی شادی ہے، معاشرے کے رسم ورواج کے مطابق دوست واحباب اور رشتہ داروں کے لیے خورد ونوش کا انتظام کیا ہے، اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ میرے بعض بچوں کا عقیقہ باقی ہے، تو کیا میں عقیقہ کے جانور کا گوشت شادی میں کھلا سکتا ہوں؟ واضح رہے کہ عام دستور کے مطابق شادی میں بہوار (لین دین) کے لیے ایک ٹیبل رکھا جاتا ہے، تو کیا بہوار کی رقم لینے سے از روئے شرع میرے عقیقہ میں کوئی قباحت پیدا ہوگی یا نہیں؟ شریعت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

میں ایک کنکر سے دو پرندے کا شکار کرنا چاہتا ہوں؛ لہٰذا وضاحت کے ساتھ جواب لکھیں۔ آپ بھی ڈ ہرا قوم کے ایک فرد ہونے کی وجہ سے ڈ ہرا سماج کے رسم ورواج سے بہ خوبی واقف ہوں گے؛ اس لیے آپ سے اس طرح کا فتویٰ پوچھ رہا ہوں۔

الجواب حامداومصلیا:

عقیقہ کے متعلق فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد ساتویں دن جانور ذبح کر کے

=تعالی، وكذلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل، كذا ذكر محمد - رحمه الله تعالى - في نوادر الضحايا، ولم يذكر ما إذا أراد أحدهم الوليمة، وهي ضيافة التزويج، وينبغي أن يجوز. (الفتاوى الهندية: ٥/ ٣٠٤، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید تفصیل وتنقیح کے لیے "عقیقہ کا گوشت تبلیغی اجتماع میں پیسے لے کر کھلانا" کا جواب، حاشیہ کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں۔

ضیافت و مہمانی کرنا سنت ہے۔ (عالمگیری: ۵/۳۶۲)[1]

ضیافت و مہمانی کا مطلب ہوتا ہے دوست واحباب اور رشتہ داروں کو بلا کر بغیر معاوضہ لیے کھانا کھلانا۔ اور شادی میں بہوار یعنی معاوضہ لیا جاتا ہے، آپ کی تحریر کے مطابق ٹیبل رکھ کر ایک لکھنے والے کو بٹھایا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ بہوار کھانے کا عوض اور بدلہ ہے۔ یا بہوار قرض ہے، جو رشتہ داروں کی اولاد کی شادی میں ہدیہ اور تحفہ کے نام سے دیا تھا اور اب اسے وصول کرنے کے لیے دعوت کی گئی ہے؛ لہٰذا عقیقہ ادا نہیں ہوگا۔ ہاں اگر بہوار کی وصولی کے لیے نوٹ بک یا ٹیبل نہ رکھا جائے، کوئی اپنی خوشی سے یوں ہی دے دے، تو ایسی دعوت میں عقیقہ کا گوشت کھلانے سے عقیقہ میں کوئی نقص پیدا نہ ہوگا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] العقيقة عن الغلام وعن الجارية وهي ذبح شاة في سابع الولادة وضيافة الناس. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۶۲، كتاب الكراهية، الباب الثاني والعشرون في تسمية الأولاد وكناهم والعقيقة، ط: دار الفكر - بيروت)

مزید تفصیل کے لیے سابقہ سوالات کی جانب رجوع فرمائیں۔

ويتصدق بجلدها أو يعمل منه نحو غربال وجراب، ولا بأس بأن يشتري به ما ينتفع بعينه مع بقائه استحسانا...، ولا يشتري به ما لا ينتفع به إلا بعد الاستهلاك نحو اللحم والطعام، ولا يبيعه بالدراهم لينفق الدراهم على نفسه وعياله، واللحم بمنزلة الجلد في الصحيح؛ حتى لا يبيعه بما لا ينتفع به إلا بعد الاستهلاك. ولو باعها بالدراهم ليتصدق بها جاز؛ لأنه قربة كالتصدق، كذا في التبيين. وهكذا في الهداية والكافي. (الفتاوى الهندية:٥/٣٠١، كتاب الأضحية، الباب السادس في بيان ما يستحب في الأضحية والانتفاع بها، ط: دار الفكر-بيروت)

باب في مصرف جلد الأضحية

[قربانی کی کھال کا مصرف]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب في مصرف جلد الأضحية

[قربانی کی کھال کا مصرف]

[ا] قربانی کے چمڑے کی رقم کا حکم

۱۹۵۳- سوال: ہمارے گاؤں میں قربانی کے چمڑے بیچ کر جو قیمت موصول ہوئی ہے، اس سے کرسیاں وغیرہ خریدنے کا ارادہ ہے، تاکہ شادی وغیرہ کے موقع سے لوگ نیچے بیٹھنے کے بجائے کرسی پر بیٹھیں؛ اسی طرح پانی کے دو بڑے ٹب خریدنے کا بھی ارادہ ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا قربانی کی رقم سے ان دونوں چیزوں کا خریدنا ہمارے لیے جائز ہے؟

یہ بھی واضح فرمائیں کہ قربانی کے چمڑے کی رقم کہاں استعمال کی جاسکتی ہے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

قربانی کرنے والا قربانی کے جانور کا چمڑا خود استعمال کرنا چاہے، تو کرسکتا ہے؛ لیکن اگر اس کو بیچ دیا، تو اس سے حاصل ہونے والی رقم کا حکم زکوۃ کی طرح ہے کہ جس طرح زکوۃ کی رقم غریب کو دے کر اس کو مالک بنانے سے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے، اسی طرح مذکورہ رقم کسی غریب، یتیم، بیوہ، یا طالب علم کو دینے یا کتابیں

خرید کر دینے یا ان کی فیس ادا کرنے سے ذمہ داری سے سبک دوش ہو جائیں گے۔

اس رقم سے گاؤں کے لیے برتن اور کرسیاں خرید نا جائز نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] چرم قربانی کی رقم کا مصرف وہی ہے، جو زکوٰۃ کا ہے

۱۹۵۴-سوال: میرے پاس قربانی کے چمڑے کی کچھ رقم ہے، اگر میں اس رقم سے کپڑے وغیرہ خرید کر غریبوں میں تقسیم کر دوں، تو صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس رقم کا صحیح مصرف کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً:

چرم قربانی کو بیچنے سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، وہ واجب التصدق ہے اور اس کا مصرف وہی ہے، جو زکوٰۃ کا ہے۔[2] ـــــــ صورت مسئولہ میں کپڑے وغیرہ خرید کر غرباء کو دینا جائز ہے، اس سے آپ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں گے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ويتصدق بثمنه، لأن القربة ذهبت عنه فيتصدق به ولأنه استفاده بسبب محظور وهو البيع فلا يخلو عن خبث فكان سبيله التصدق وله أن ينتفع بجلد أضحيته في بيته بأن يجعله سقاء أو فروا أو غير ذلك، لما روي عن سيدتنا عائشة - رضي الله عنها - أنها اتخذت من جلد أضحيتها سقاء ولأنه يجوز الانتفاع بلحمها فكذا بجلدها. (بدائع الصنائع: ۸۱/۵، كتاب التضحية، فصل في بيان ما يستحب قبل التضحية وبعدها وما يكره، قبيل: كتاب النذر، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) ولا بأس ببيعه بالدراهم ليتصدق بها، وليس له أن يبيعها بالدراهم لينفقه على نفسه، ولو فعل ذلك تصدق بثمنها. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد ،ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ): ۹۵/۶، كتاب الأضحية، الفصل السادس الانتفاع بالأضحية، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

ولا يبيعه بالدراهم لينفق الدراهم على نفسه، وعياله، والمعنى فيه أنه لا يتصرف على قصد التمول. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق-عثمان بن علي بن محجن البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م:۷۴۳ھ): ۸/۶، كتاب الأضحية، كيفية التصرف في لحم الأضحية، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة ★العناية شرح الهداية- محمد بن محمد بن محمود، أكمل الدين، الرومي البابرتي (م:۷۸۶ھ): ۵۱۸/۹، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر ☆مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م:۱۰۷۸ھ): ۵۲۱/۲، كتاب الأضحية، ط: دار إحياء التراث العربي)

(۳) ولو باعها بالدراهم ليتصدق بها جاز لأنه قربة كالتصدق بالجلد واللحم. (تكملة البحر الرائق: ۲۰۳/۸، كتاب الأضحية، قبيل: أجرة الجزار هل تأخذ من الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي)

[۳] چرم قربانی کی رقم طلبہ کو دینا بہتر ہے یا یتیم و بیوہ کو؟

۱۹۵۵- سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قربانی کے چمڑے کی رقم غریب طلبہ کے اسکالرشپ میں دینا بہتر ہے، یا گاؤں کے غریب و یتیم اور بیوہ کو؟ جواب دے کر مہربانی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

قربانی کے چمڑے کو بیچنے کے بعد اس رقم کا حکم زکوۃ کا ہوجاتا ہے، اور زکوۃ کی رقم کہاں خرچ کرنا بہتر ہے، اس کے متعلق عالمگیری میں لکھا ہے کہ فقیر عالم کو دینا جاہل فقیر کو دینے سے بہتر ہے۔ (عالمگیری:۱/۱۵۰)[1]

فقہ کی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عام مسئلہ تو یہی ہے کہ زکوۃ کی رقم دوسرے شہروں کے فقیروں کو دینا مکروہ ہے، البتہ اگر دوسرے شہر میں- جہاں مزکی (زکات دینے والا) زکات دینا چاہتا ہے- دین دار مسلمان ہیں، اور ان کو دینے سے دین کا مفاد وابستہ ہے، یا کوئی مصلحت متقاضی ہے، تو اس صورت میں ایک شہر کی زکات کو دوسرے شہر منتقل کرنے میں کوئی کراہت نہیں۔[2] لہٰذا صورت مسئولہ میں وہ رقم طلبہ کے اسکالرشپ میں دینا اور ان کے کپڑے اور دوا علاج کے لیے دینا بہتر ہے۔

لیکن اگر آپ کی تنظیم کی طرف سے مصارف معین ہوں، تو آپ چمڑے دینے والے کی طرف سے وکیل ہے؛ لہٰذا اس صورت میں تنظیم کے اصول کے خلاف کرنا جائز نہ ہوگا، اصول و دفعات کے موافق اس رقم کو تقسیم کرنا ضروری ہے؛ کیوں کہ آپ کی تنظیم کو اس کے منشورات کی وجہ سے تعاون حاصل ہوتا ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] التصدق على الفقير العالم أفضل من التصدق على الجاهل كذا في الزاهدي. (الفتاوى الهندية:۱/۱۸۷، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط:دار الفكر-بيروت)

(۲) ويكره نقل الزكاة من بلد إلى بلد إلا أن ينقلها الإنسان إلى قرابته أو إلى قوم هم أحوج إليها من أهل بلده، ولو نقل إلى غيرهم أجزأه، وإن كان مكروها. (الفتاوى الهندية:۱/۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط:دار الفكر-بيروت ☆الدر المختار مع رد المحتار:۲/۳۵۳، كتاب الزكاة، قبل: فروع في مصرف الزكاة، ط: دار الفكر ☆الهداية في شرح بداية المبتدي:۱/۱۱۲، كتاب الزكاة، باب من يجوز دفع الصدقة إليه ومن لا يجوز، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

(۳) عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الصلح جائز بين المسلمين. زاد أحمد: إلا صلحا أحل حراما، أو حرم حلالا. وزاد سليمان بن داود: وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المسلمون على شروطهم. (سنن أبي داود:۲/۵۰۵-۵۰۶، رقم الحديث:۳۵۹۴، كتاب القضاء، باب في الصلح، ط: ديوبند) =

[۴] چرم قربانی کی قیمت کا سوسائٹی کی تعمیر و مرمت میں استعمال

۱۹۵٦- سوال: ہمارے یہاں ایک مسلم سوسائٹی ہے، یہ سوسائٹی ہر عید الاضحیٰ کے موقع پر یہ اعلان کرتی ہے کہ ''تمام لوگوں سے درخواست ہے کہ چرم قربانی یہاں سوسائٹی ہی میں جمع کریں''، اس کے بعد سوسائٹی ان چمڑوں کو بیچ کر اس سے حاصل شدہ رقم سے کرسیاں وغیرہ خریدتی ہے اوران کرسیوں کو خوشی وغمی کے موقع پر غریب و مال دار سبھی کو کرایہ کے طور پر دیتی ہے اوراس کرایہ کی آمدنی جمع کرکے سوسائٹی کی تعمیر و مرمت وغیرہ میں استعمال کرتی ہے، تو آپ والا سے سوال یہ ہے کہ اس طرح کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

جب چمڑے کو سوسائٹی کے کارکنان نے بیچ دیا، تو وہ رقم زکوٰۃ کے حکم میں ہوگئی، جس کا صدقہ کرنا واجب ہے، یعنی یہ رقم کسی غریب ومسکین کو مالکانہ حیثیت سے دینا ضروری ہے، اور جب تک غریب کو اس کا مالک نہیں بنایا جائے گا، ذمہ داری ادا نہ ہوگی، لہٰذا اہل سوسائٹی کا اس رقم سے کرسیاں وغیرہ خرید کر کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے، اس میں تملیک نہیں پائی جاتی ہے۔ (١)

= المال الذي قبضه الوكيل بالبيع والشراء وإيفاء الدين واستيفائه وقبض العين من جهة الوكالة في حكم الوديعة في يده فإذا تلف بلا تعد ولا تقصير لا يلزم الضمان. والمال الذي في يد الرسول من جهة الرسالة أيضا في حكم الوديعة. (مجلة الأحكام العدلية- لجنة مكونة من عدة علماء وفقهاء في الخلافة العثمانية،ص: ٢٨٤-٢٨٥،المادة: ١٤٦٣، الباب الثالث: في بيان أحكام الوكالة، الفصل الأول: في بيان أحكام الوكالة العمومية، ت: نجيب هواويني، ط: نور محمد، كارخانه تجارتِ كتب، آرام باغ، كراتشي)

(١) ولا بأس ببيعه بالدراهم ليتصدق بها، وليس له أن يبيعها بالدراهم لينفقه على نفسه، ولو فعل ذلك تصدق بثمنها. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد ،ا بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:٦١٦هـ): ٩٥/٦، كتاب الأضحية، الفصل السادس الانتفاع بالأضحية، ت: عبدالكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ولا يبيعه بالدراهم لينفق الدراهم على نفسه، وعياله، والمعنى فيه أنه لا يتصرف على قصد التمول. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق-عثمان بن علي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م: ٧٤٣هـ): ٨/٦، كتاب الأضحية، كيفية التصرف في لحم الأضحية، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة ☆ العناية شرح الهداية-محمد بن محمد بن محمود، أكمل الدين، الرومي البابرتي (م: ٧٨٦هـ): ٥١٨/٩، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر ☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م: ١٠٧٨هـ): ٥٢١/٢، كتاب الأضحية، ط: دار إحياء التراث العربي)

ہاں یہ کر سکتے ہیں کہ کسی غریب کو ان کرسیوں کا مالک بنادیں، پھر وہ غریب اپنی خوشی سے سوسائٹی کو ہدیہ کر دے، کہ یہ صورت جائز ہے۔(١) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٥] چرم قربانی مزدوری میں دینا

۱۹۵۷- سوال: ایک شخص نے بکرے کی قربانی کی، بکرے کو ذبح کرنے کے لیے اس نے اپنے چچازاد بھائی کو مزدوری پر طے کیا، مزدوری آس پاس کے گاؤں میں بیس، بائیس روپیہ چلتی ہے، مگر اس نے مزدوری صرف پانچ روپیہ دی اور ساتھ میں بکرے کا چمڑا دے دیا، جب اس کو کہا گیا تو اس نے کہا میں نے ساتھ میں للہ چمڑا بھی دیا ہے؛ اس لیے اتنی مزدوری کافی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ لینے والا شخص غریب نہیں ہے، بلکہ خود اس پر زکوۃ، فطرہ اور قربانی واجب ہے، تو اب اس نے جو چمڑا لے لیا ہے، اس کا کیا کرے، اس کو بیچ کر پیسے استعمال کر سکتا ہے؟ اور اس دینے والے شخص کی قربانی ادا ہوگی یا نہیں؟ تفصیل سے جواب عطا فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

مزدوری میں چمڑا دینا جائز نہیں، اگر دے گا، تو اس کی قیمت کے بقدر رقم صدقہ کرنا اس پر لازم ہوگا، ورنہ اس کی قربانی اتنی ناقص رہے گی،(٢) البتہ مزدور خود راضی خوشی سے اپنی مزدوری پانچ، چھ روپیہ لے لے، تو جائز ہے، اس کو یہ حق ہے کہ کسی سے سو روپیہ مزدوری طے کرے، تو کسی سے پچاس روپیہ، اور کسی سے پچیس

---

(١) وقدمنا أن الحيلة أن يتصدق على الفقير، ثم يأمره بفعل هذه الأشياء، وهل له أن يخالف أمره؟ لم أره، والظاهر نعم. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب بحر وفي التعبير بثم إشارة إلى أنه لو أمره أولا لا يجزئ؛ لأنه يكون وكيلا عنه في ذلك وفيه نظر؛ لأن المعتبر نية الدافع ولذا جازت وإن سماها قرضا أو هبة في الأصح كما قدمناه فافهم. (رد المحتار على الدر المختار: ٣/٣٤٥، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر)

(٢) (ولا يعطى أجر الجزار منها) لأنه كبيع، واستفيدت من قوله-عليه الصلاة والسلام- "من باع جلد أضحيته فلا أضحية له" هداية.... فإن فعل تصدق بالأجرة حاوي الفتاوى لأنه التزم إقامة القربة بجميع أجزائها. (الدر المختار) ــــــ قال ابن عابدين: (قوله لأنه كبيع) لأن كلا منهما معاوضة لأنه إنما يعطى الجزار بمقابلة جزره والبيع مكروه فكذا ما في معناه، كفاية.... وقوله فإن فعل تصدق بالأجرة: أي فيما لو آجرها. (تكملة رد المحتار على الدر المختار: ٦/٣٢٩، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر- بيروت)

روپیہ،[1] پس اس اعتبار سے قربانی صحیح ہوجائے گی۔

چمڑا مال دار اور غریب ہر ایک کو دے سکتے ہیں، گوشت کا بھی یہی حکم ہے۔[2] البتہ چمڑا اور گوشت کو مزدوری میں دینا جائز نہیں، اسی طرح اگر چمڑا بیچ دیا، تو اب اس کی قیمت صرف فقیر کو دینا ہوگا، مالدار کو دینا جائز نہیں،[3] البتہ اگر مالدار کو نفس چمڑا دیا ہو، تو وہ [مال دار] اس [کھال] کو بیچ کر رقم اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔[4] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(١) والأصل فيه: أن ما يصلح أن يكون ثمناً في البياعات يصلح أن يكون أجرة في الإجارات، وما لا يصلح أن يكون ثمناً في البياعات لا يصلح أجرة في الإجارات إلا المنفعة، فإنها تصلح أجرة إذا اختلف الجنس ولا تصلح ثمناً، وإنما اعتبرنا الإجارة بالبيع؛ لأن الإجارة بيع كسائر البياعات، إلا أن سائر البياعات ترد على العين، والإجارة ترد على المنفعة. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني- أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:٦١٦هـ): ٣٩٨/٧، كتاب الإجارات، قبيل: الفصل الثاني: في بيان أنه متى يجب الأجر، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية)

(٢)... فثبت بمجموع الكتاب العزيز والسنة أن المستحب ما قلنا ولأنه يوم ضيافة الله - عز وجل - بلحوم القرابين فيندب إشراك الكل فيها، ويطعم الفقير والغني جميعا لكون الكل أضياف الله تعالى - عز شأنه - في هذه الأيام وله أن يهبه منهما جميعا، ولو تصدق بالكل جاز، ولو حبس الكل لنفسه جاز؛ لأن القربة في الإراقة. (بدائع الصنائع: ٨١/٥، كتاب التضحية، قبيل: كتاب النذر، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ تكملة البحر الرائق: ٢٠٣/٨، كتاب الأضحية، الأكل من لحم الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي)

واللحم بمنزلة الجلد في الصحيح. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م:١٠٧٨هـ): ٥٢١/٢، كتاب الأضحية، ط: دار إحياء التراث العربي☆ تكملة البحر الرائق: ٢٠٣/٨، كتاب الأضحية، قبيل: أجرة الجزار هل تأخذ من الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(٣) ولا بأس ببيعه بالدراهم ليتصدق بها، وليس له أن يبيعها بالدراهم لينفقه على نفسه، ولو فعل ذلك تصدق بثمنها. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد، ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:٦١٦هـ): ٩٥/٦، كتاب الأضحية، الفصل السادس الانتفاع بالأضحية، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ولا يبيعه بالدراهم لينفق الدراهم على نفسه، وعياله، والمعنى فيه أنه لا يتصرف على قصد التمول. (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق-عثمان بن علي البارعي، فخر الدين الزيلعي الحنفي (م:٧٤٣هـ): ٨/٦، كتاب الأضحية، كيفية التصرف في لحم الأضحية، ط: المطبعة الكبرى الأميرية- بولاق، القاهرة☆ العناية شرح الهداية-محمد بن محمد بن محمود، أكمل الدين، الرومي البابرتي (م:٧٨٦هـ): ٥١٨/٩، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر☆ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر- عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بـ'داماد أفندي' (م:١٠٧٨هـ): ٥٢١/٢، كتاب الأضحية، ط: دار إحياء التراث العربي)

(٤) وله أن يهبه منهما جميعا، ولو تصدق بالكل جاز ولو حبس الكل لنفسه جاز؛ لأن القربة في الإراقة. (بدائع الصنائع: ٨١/٥، كتاب التضحية، قبيل: كتاب النذر، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ تكملة البحر الرائق: ٢٠٣/٨، كتاب الأضحية، الأكل من لحم الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي)

=

[٦] میت کے کفن دفن میں چرم قربانی کی رقم کا استعمال

١٩٥٨- سوال: قربانی کے چمڑے یہاں انجمن میں دیے جاتے ہیں، انجمن کی جانب سے مردوں کے کفن دفن کا انتظام کیا جاتا ہے، انجمن کے ذمے داران ان چمڑوں کو بیچ کر حاصل ہونے والی رقم کا کفن دفن میں استعمال کرتے ہیں، ایک حافظ صاحب کا کہنا ہے کہ چمڑوں کی رقم کا اس انجمن میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ میت مالک نہیں بن سکتی، اور اس میں مالک بنانا ضروری ہے۔

الجواب حامداً ومصلياً:

حافظ صاحب کا کہنا صحیح ہے، چرم قربانی کو بیچ کر جو رقم حاصل ہوگی، اس کا حکم زکوٰۃ کی طرح ہے، اور اس میں مالک بنانا ضروری ہے، لہٰذا کفن دفن میں اس رقم کا استعمال جائز نہ ہوگا، منتظمین گنہگار ہوں گے۔[1]

البتہ غریبوں کے کفن دفن کے لیے انجمن کے ذمے داران، مرحومین کے غریب رشتہ دار کو اس [رقم] کا مالک بنادیں اور وہ رشتہ دار اپنی رضامندی سے اس میت کے کفن میں وہ رقم استعمال کریں، تو جائز ہے، اسی طرح قبر کھودنے کی مزدوری میں بھی ایسا کیا جاسکتا ہے، یعنی مرحوم کے کسی غریب رشتہ دار کو اس کا مالک بنایا جائے اور وہ قبر کھودنے والے کو اپنی طرف سے اس کی مزدوری ادا کردے، اس طرح کرنے سے منتظمین کی ذمہ داری ادا ہوجائے گی۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

= لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (رد المحتار على الدر المختار- ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ١٢٥٢هـ): ٥٠٢/٤، أول كتاب البيوع، وانظر: ٥١/٥، باب البيع الفاسد، مطلب: تعريف المال، ط: دار الفكر- بيروت)

والحاصل أن القياس في جنس هذه المسائل أن يفعل المالك ما بدأ له مطلقا؛ لأنه متصرف في خالص ملكه. (المصدر السابق: ٤٤٨/٥، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي، مسائل متفرقة، مطلب: اقتسموا دارا وأراد كل منهم فتح باب لهم ذلك ☆ فتح القدير: ٣٢٦/٧، كتاب أدب القاضي، باب التحكيم، مسائل شتى من كتاب القضاء، ط: دار الفكر- بيروت)

(١) ويتصدق بجلدها أو يعمل منه نحو غربال وجراب، ولا بأس بأن يشتري به ما ينتفع بعينه مع بقائه استحسانا...، ولا يشتري به ما لا ينتفع به إلا بعد الاستهلاك نحو اللحم والطعام، ولا يبيعه بالدراهم لينفق الدراهم على نفسه وعياله، واللحم بمنزلة الجلد في الصحيح؛ حتى لا يبيعه بما لا ينتفع به إلا بعد الاستهلاك. ولو باعها بالدراهم ليتصدق بها جاز؛ لأنه قربة كالتصدق، كذا في التبيين. وهكذا في الهداية والكافي. (الفتاوى الهندية: ٣٠١/٥، كتاب الأضحية، الباب السادس في بيان ما يستحب في الأضحية والانتفاع بها، ط: دار الفكر- بيروت)

(٢) وقدمنا أن الحيلة أن يتصدق على الفقير، ثم يأمره بفعل هذه الأشياء، وهل له أن يخالف أمره؟ لم أره، والظاهر =

[۷] چرم قربانی کی رقم مسجد میں استعمال کرنا

۱۹۵۹- سوال: ایک جماعت نے قربانی کے چمڑے کی رقم جمع کی ہے، ان کے یہاں مسجد پر کچھ قرض ہے اور متولی حضرات مسجد کا خرچ پورا نہیں کر سکتے ہیں، تو مسجد کے کام کے لیے جمع شدہ چمڑے کی رقم دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً

قربانی کا چمڑا قربانی کرنے والے کے لیے استعمال کرنا جائز ہے، البتہ بیچنے کے بعد اس کی رقم زکوٰۃ کے حکم میں ہوجاتی ہے؛ اس لیے غریبوں کو مالک بنانا ضروری ہے؛[۱] لہٰذا وہ رقم بلا واسطہ (ڈائریکٹ) مسجد میں دینا جائز نہیں ہے، کسی غریب کو مالک بنادے پھر وہ مسجد میں دے سکتا ہے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] قربانی کا چمڑا مسجد، مدرسہ یا مدرس کی تنخواہ میں دینا

۱۹۶۰- سوال: قربانی کے چمڑے مسجد ومدرسہ میں دینا جائز ہے؟ نیز بتائیں کہ مدرسہ کے

=نعم. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب بحر وفي التعبير بثم إشارة إلى أنه لو أمره أولا لا يجزئ؛ لأنه يكون وكيلا عنه في ذلك وفيه نظر، لأن المعتبر نية الدافع ولذا جازت وإن سماها قرضا أو هبة في الأصح كما قدمناه فافهم. (رد المحتار على الدر المختار: ٣/٣٤٥، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر)

(١) ولا بأس ببيعه بالدراهم ليتصدق بها، وليس له أن يبيعها بالدراهم لينفقه على نفسه، ولو فعل ذلك تصدق بثمنها. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:٦١٦هـ): ٦/٩٥، كتاب الأضحية، الفصل السادس الانتفاع بالأضحية، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(٢) ولا ينبغي له أن يصرف ذلك العشر إلى عمارة الرباط وإنما يصرف إلى الفقراء لا غير ولو صرف إلى المحتاجين ثم إنهم أنفقوا في عمارة الرباط جاز ويكون ذلك حسنا. (البحر الرائق: ٥/٢٧٥، قبيل: كتاب البيع، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆مجمع الضمانات-أبو محمد غانم بن محمد البغدادي الحنفي (م:١٠٣٠هـ)، ٣٢٥، باب في الوقف، ط: دار الكتاب الإسلامي☆ الفتاوى الهندية: ٢/٤٧٢، كتاب الوقف، الباب الثاني عشر في الرباطات والمقابر والخانات والحياض، ط: دار الفكر-بيروت☆ فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ٣/٣١٥، ط: زكريا-ديوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیں "چرم قربانی کی قیمت کا سوسائٹی کی تعمیر ومرمت میں استعمال" کا حاشیہ نمبر ۲۔

مدرسین کی تنخواہوں میں اس کی رقم کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ سال گذشتہ کی قربانی کے جانوروں کی رقم ابھی جمع ہے، اس رقم کے ذریعہ مسجد کے لیے پانی کی موٹر خرید سکتے ہیں یا نہیں؟ مسجد کے مؤذن یا کسی اور غریب کو یہ چمڑے دینا بہتر ہے یا مسجد و مدرسہ میں؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً:

قربانی کے چمڑے کو اگر فروخت کر دیا جائے، تو اس سے حاصل شدہ رقم کا ان لوگوں کو مالک بنانا ضروری ہے، جو زکوۃ کے مستحق ہیں؛ اس لیے مسجد و مدرسہ، امام و مؤذن اور مدرس کی تنخواہ میں دینا جائز نہیں ہے، دینے والے متولیان گنہ گار ہوں گے، چمڑا خود استعمال کرنا بھی جائز ہے اور غرباء کو دینا بھی جائز ہے؛ نیز اس کو بیچ کر کسی غریب کو قرآن مجید اور دینی کتابیں خرید کر دینا بھی جائز ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] چرم قربانی اور اس سے حاصل ہونے والی رقم کا شرعی حکم

۱۹۶۱- سوال: کوئی قربانی کے جانور کا چمڑا مسجد و مدرسہ میں دے اور متولی صاحب اس کو بیچ کر حاصل ہونے والی رقم کو مسجد کے کاموں میں استعمال کرے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر مسجد کے کاموں میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، تو پھر حاصل ہونے والی رقم کو کہاں خرچ کرنا چاہیے؟ کیا کفن دفن میں استعمال کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

چرم قربانی کو بیچ کر اس کی قیمت مسجد میں استعمال کرنا جائز نہیں، چرم کو بیچنے کے بعد اس سے حاصل

---

(۱) ولا بأس ببيعه بالدراهم ليتصدق بها، وليس له أن يبيعها بالدراهم لينفقه على نفسه، ولو فعل ذلك تصدق بثمنها. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد ،ابن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:٦١٦هـ): ٩٥/٦، كتاب الأضحية، الفصل السادس الانتفاع بالأضحية، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(والصدقة كالهبة) بجامع التبرع، وحينئذ (لا تصح غير مقبوضة). [الدر المختار مع رد المحتار: ٧٠٩/٥، كتاب الهبة، باب الرجوع في الهبة، فصل في مسائل متفرقة، ط: دار الفكر]

(قوله: أي مصرف الزكاة والعشر)... وهو مصرف أيضا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة كما في القهستاني. (رد المحتار على الدر المختار: ٣٩٩/٢، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر)

ولو نوى الزكاة بما يدفع المعلم إلى الخليفة، ولم يستأجره إن كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضا أجزأه، وإلا فلا، وكذا ما يدفعه إلى الخدم من الرجال والنساء في الأعياد وغيرها بنية الزكاة كذا في معراج الدراية. (الفتاوى الهندية: ١٩٠/١، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر- بيروت)

ہونے والی رقم کا حکم زکوۃ کی رقم کی طرح ہے، کسی غریب اور فقیر کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے، متولیان اور ٹرسٹیان وکیل ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگ اس رقم کو ایسے کاموں میں لگائیں، جس سے ان کی ذمہ داری ادا ہو جائے، غریب طلبہ کو کتابیں اور قرآن مجید وغیرہ خرید کر، مالک بنا دینے سے ذمہ داری ادا ہو جائے گی۔[1]

اس رقم کو کفن دفن کے لیے بھی استعمال کرنا جائز نہیں، ہاں! ایسا کیا جا سکتا ہے کہ یہ رقم کسی غریب کو دے دی جائے اور اسے تلقین وترغیب دی جائے کہ اس کو فلاں کے کفن دفن کے لیے دے دو، تمہیں بے انتہا ثواب ملے گا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] قربانی کی کھال کی رقم کا صدقہ کب کرے؟

۱۹۶۲- سوال: چرم قربانی کو بیچ کر قربانی کے دنوں میں آئی ہوئی رقم ہی کا صدقہ کرنا ضروری ہے یا بعد میں بھی صدقہ کیا گیا تو جائز ہے؟

الجواب حامدا ومصليا:

چمڑا بیچ کر اس کی قیمت کا صدقہ کرنا ضروری ہے؛ البتہ قربانی کے دنوں ہی میں اس کا صدقہ کرنا ضروری نہیں ہے، جب بھی صدقہ کرے گا، واجب ذمہ سے ادا ہو جائے گا؛ لیکن بہتر یہ ہے کہ جلد از جلد اس کا صدقہ کر دیا جائے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولا بأس ببيعه بالدراهم ليتصدق بها، وليس له أن يبيعها بالدراهم لينفقه على نفسه، ولو فعل ذلك تصدق بثمنها. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:٦١٦هـ): ٩٥/٦، كتاب الأضحية، الفصل السادس الانتفاع بالأضحية، ت: عبدالكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(قوله: أي مصرف الزكاة والعشر)... وهو مصرف أيضا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة كما في القهستاني. (ردالمحتار على الدر المختار: ٣٩٩/٢، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر)

(۲) قد تقدم تخريجه عن: ردالمحتار على الدر المختار: ٣٤٥/٣، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر.

(۳) ولو باعها بالدراهم ليتصدق بها جاز؛ لأنه قربة كالتصدق بالجلد واللحم. (تكملة البحر الرائق: ٢٠٣/٨، كتاب الأضحية، قبيل: أجرة الجزار هل تأخذ من الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ٣٠١/٥، كتاب الأضحية، الباب السادس في بيان ما يستحب في الأضحية والانتفاع بها، ط: داالفكر)

(۳) ولو باعها بالدراهم ليتصدق بها جاز؛ لأنه قربة كالتصدق بالجلد واللحم. (تكملة البحر الرائق: ٢٠٣/٨، كتاب الأضحية، قبيل: أجرة الجزار هل تأخذ من الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ٣٠١/٥، كتاب الأضحية، الباب السادس في بيان ما يستحب في الأضحية والانتفاع بها، ط: داالفكر)

[۱۱] قربانی کے چمڑے کی رقم مصارف زکوۃ کے علاوہ میں استعمال کرنا

۱۹۶۳- سوال: قربانی کے چمڑے کی قیمت قبرستان کی چہار دیواری بنانے میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامدا ومصليا:

قربانی کے جانور کے چمڑے کا استعمال، قربانی کرنے والا خود کر سکتا ہے، مال دار یا محتاج جس کو بھی دے جائز ہے، البتہ اس کو بیچ دے، تو حاصل ہونے والی رقم کا حکم زکوۃ کے پیسوں کا ہے؛ اس لیے اس کو بیچنے سے جو رقم حاصل ہوگی، اس کو مصرف زکوۃ میں خرچ کرنا ضروری ہے، قبرستان کی چہار دیواری، مسجد، مدرسہ میں استعمال جائز نہیں ہے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۲] زکوۃ اور قربانی کے چمڑوں کی رقم مدرسین کی تنخواہ میں دینا

۱۹۶۴- سوال: (۱) ہمارے گاؤں کے مدرسہ میں مدرس حضرات کی تنخواہ کے لیے زکوۃ کے پیسے استعمال کرنے پڑتے ہیں، تو کیا اب ہم قربانی کے چمڑے کے پیسوں کو تنخواہ میں استعمال کر سکتے ہیں؟

(۲) قربانی کے چمڑے کے پیسوں سے مدرسہ کے گدے بنا سکتے ہیں یا نہیں؟

---

(۱) ويجوز الانتفاع بجلد الأضحية، وهدي المتعة والتطوع بأن يتخذها فروا أو بساطاً، ... وله أن يشتري به متاع البيت كالغربال، والمنخل، والفرو، والكساء، والخف، وكذلك له أن يشتري به ثوبا يلبسه، ولا يشتري به الخل، وكذلك لا يشتري به اللحم، ولا بأس ببيعه بالدراهم ليتصدق بها، وليس له أن يبيعها بالدراهم لينفقه على نفسه، ولو فعل ذلك تصدق بثمنها. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد ،ا بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:٦١٦هـ): ٦/٩٥، كتاب الأضحية، الفصل السادس الانتفاع بالأضحية، ت:عبد الكريم سامي الجندي،ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆تبيين الحقائق:٦/٨، كتاب الأضحية، ط:المطبعة الكبرى الأميرية-بولاق،القاهرة☆مجمع الأنهر: ٤/١٧٤، كتاب الأضحية،ط:دار الكتب العلمية-بيروت)

(قوله: أي مصرف الزكاة والعشر)... وهو مصرف أيضا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة كما في القهستاني. (ردالمحتار على الدر المختار: ٢/٣٩٩، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر)

الجواب حامدا ومصلیا:

(۱) قربانی کے چمڑے کا مالک خود چمڑا بیچے یا کسی انجمن کو دے پھر وہ بیچ دے، بہر صورت اس کے پیسوں کا حکم زکوۃ کے پیسوں کی طرح ہے، مذکور رقم سے مدرس کی تنخواہ ادا کرنا جائز نہیں ہے؛ لہٰذا گاؤں کے لوگ، گاؤں کی زکوۃ لے کر تنخواہ دیتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے۔(۱)

(۲) قربانی کی رقم سے گدے بنا کر مسجد و مدرسہ میں دینا جائز نہیں ہے، مذکورہ رقم سے غرباء کو کپڑے، کتابیں، تعلیمی اخراجات اور اسکول فیس میں دینا جائز ہے۔ ایسا بھی کیا جاسکتا ہے کہ گاؤں کے پڑھنے والے تمام طالب علم اور طالبات کے لیے ماہانہ فیس مقرر کردی جائے اور غرباء کے لڑکوں کو زکوۃ یا چمڑے کی رقم دے دی جائے، آپ ذمہ داری سے بری ہوجائیں گے۔(۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] چرمِ قربانی کی رقم سے مسجد کے بیت الخلاء اور غسل خانہ میں پتھر لگانا

۱۹۶۵- سوال: ہمارے یہاں مسجد کے ایک کمرہ میں جہاں بیت الخلاء اور غسل خانہ ہے، اُس کے آدھے حصے میں پتھر (ٹائلس) نہیں ہے، ہم گاؤں والوں نے اُس کے لیے قربانی کی کھال جمع کی ہے، اُس رقم سے مذکورہ جگہ میں پتھر لگائیں گے، تو اُس رقم کو مذکورہ کام میں استعمال کر سکتے ہیں؟

الجواب حامدا ومصلیا:

قربانی کی کھال بیچنے کے بعد حاصل ہونے والی رقم کا حکم زکوۃ، صدقۂ فطر اور صدقۂ واجبہ جیسا

---

(۱) ولو نوى الزكاة بما يدفع المعلم إلى الخليفة، ولم يستأجره إن كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضا أجزأه، وإلا فلا، وكذا ما يدفعه إلى الخدم من الرجال والنساء في الأعياد وغيرها بنية الزكاة كذا في معراج الدراية. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) فلو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بما لا ينتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه؛ لأن القربة انتقلت إلى بدله. (الهداية: ۴/۳۶۰، كتاب الأضحية، على من تجب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

وقدمنا أن الحيلة أن يتصدق على الفقير، ثم يأمره بفعل هذه الأشياء، وهل له أن يخالف أمره؟ لم أره، والظاهر نعم. (الدر المختار) ـــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب بحر وفي التعبير بثم إشارة إلى أنه لو أمره أولا لا يجزئ؛ لأنه يكون وكيلا عنه في ذلك وفيه نظر؛ لأن المعتبر نية الدافع ولذا جازت وإن سماها قرضا أو هبة في الأصح كما قدمناه فافهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۳/۳۴۵، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، ط: دار الفكر)

ہوجاتا ہے، کہ کسی غریب کو اُس کی قیمت کا مالک بنانا ضروری ہے؛ اس لیے اس رقم سے مسجد کے بیت الخلاء یا غسل خانہ میں ٹائلس (پتھر) لگوانا درست نہیں۔[1]

اِس کام کے لیے جائز طریقہ یہ ہے کہ کوئی غریب شخص کسی مالدار کے پاس سے کچھ رقم قرض لے کر اسے پتھر لگانے کے لیے متولی کو للہ دے دے، پھر متولی مذکورہ کھال کی قیمت کا اِس قرض دار غریب کو مالک بنادے، وہ غریب آدمی اِس رقم کے ذریعہ اپنا قرض ادا کردے، تو اِس سے غریب کو پتھر بٹھانے کا ثواب مل جائے گا اور اُس کا قرض بھی ادا ہوجائے گا۔[2] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۴] قربانی کی کھال کا مصرف

۱۹۶۶- سوال: ہمارے یہاں پہلے قربانی کی کھال لوگ خود فروخت کرتے تھے، اور اس سے حاصل ہونے والی رقم جسے دینا چاہتے، دے دیتے تھے، بعد میں مشورہ کر کے تمام کھالوں کو یکجا کر کے اس کی نیلامی کرنے لگے، جس سے رقم زیادہ حاصل ہونے لگی اور اِس رقم کو غریبوں میں تقسیم کرنے لگے، پھر لوگوں نے طے کیا کہ رقم کو ایسی جگہ استعمال کیا جائے، جس سے دائمی ثواب حاصل ہو اور وہ صدقۂ جاریہ بنے، کچھ لوگوں نے کہا کہ کسی دارالعلوم میں رقم دی جائے، یا اُس سے کوئی دینی وتبلیغی لٹریچر چھپوایا جائے اور دین کی اِشاعت کی جائے، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اُس سے غریب اور بیوہ عورتوں کی مدد کی جائے، یا اسکول میں پڑھنے والے غریب بچوں کو اُس کے ذریعہ اسکالرشپ دی جائے، اِن تمام صورتوں میں شرعاً سب سے اولیٰ کیا ہے؟ یہ رقم باہر کسی مدرسہ یا دارالعلوم میں دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ کس جگہ دینے سے زیادہ ثواب حاصل ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداومصلیا:

چرمِ قربانی کو قربانی کرنے والا خود اپنے استعمال میں لینا چاہے، تو بھی جائز ہے، لیکن جب اُسے بیچ دیا جائے، تو اُس کا حکم زکوۃ کی رقم جیسا ہے، اِس لیے زکوۃ کے جو حقدار ہیں، اُن کو اُس رقم کا مالک بنانا ضروری ہے، زیادہ ثواب کے لیے گاؤں کے غریب بچے، جو دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اُن کے لیے کپڑے اور ضروری چیزیں خرید کر اُنہیں مالک بنائیے، کہ وہ عالم ہو کر دین کی خدمت کرسکیں، اُس سے فیض

(۱-۲) سوال سابق کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

جاری رہے گا، اِسی طرح گاؤں کے اسکولی طلبہ پر خرچ کریں، یا دینی کتابیں خرید کر غریبوں کو اُس کا مالک بنادیں، ذمہ داری ختم ہوجائے گی۔ مسجد اور لٹریچر کی طباعت میں اس رقم کا شرعی حیلہ کے بغیر استعمال درست نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[١٥] قربانی کی کھال مسجد یا مدرسہ میں دینا

١٩٦٧- سوال: قربانی کھال کا مصرف کیا ہے؟ مسجد میں اُس کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟ دینی مدارس میں اُسے دے سکتے ہیں یا نہیں؟ بالتفصیل تحریر فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

قربانی کے جانور کی کھال کو مالک خود استعمال کرسکتا ہے، یا جسے چاہے مالک بنا سکتا ہے، مگر کھال کو فروخت کرنے کے بعد وصول شدہ قیمت کا حکم زکوٰۃ کا ہے، کہ اُس کو مصارفِ زکوٰۃ ہی میں ادا کرسکتا ہے، لہٰذا فروخت کرنے کے بعد مدارس میں طلبہ پر خرچ کر سکتے ہیں، اُس سے وصول شدہ قیمت کو مساجد میں خرچ نہیں کرسکتے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[١٦] بستی کی بنائی ہوئی تنظیم کا لوگوں کی ناگواری کے باوجود چرمِ قربانی وصول کرنا

١٩٦٨- سوال: ہمارے گاؤں میں اہلِ سنت والجماعت کی جانب سے ایک تنظیم بنائی گئی ہے، اُس نے یہ اعلان جاری کیا ہے کہ گاؤں کے سارے لوگ تمام چرمِ قربانی ایک متعین شخص کو مالک بنا کر گاؤں کی اِس تنظیم کو دیں گے، اگر قربانی کے جانور کا مالک اِس پر راضی نہ ہو اور اُسے صرف اِس قانون کی وجہ سے مجبوراً اپنا چرمِ قربانی دینا پڑے، تو کیا یہ جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

شریعت مطہرہ کے احکام کی پابندی تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر لازم ہے، خواہ کوئی فردِ واحد ہو یا تنظیم ہو، کوئی بھی شریعت کے خلاف خودساختہ قانون پر عمل نہیں کرسکتا، لہٰذا بہ حکمِ شریعت ہر مسلمان کے لیے

---

(١) متعدد مرتبہ اس کی تخریج گذر چکی ہے۔
(٢) تفصیل وتخریج گذر چکی ہے۔

گنجائش ہے کہ اگر چاہے تو قربانی کے جانور کا چمڑہ خود استعمال کرے یا کسی غریب کو دے یا بیچ کر اُس کی قیمت کسی محتاج کو دے۔ (۱) تینوں صورتیں جائز ہیں، لہٰذا مذکور تنظیم کی جانب سے جبراً چمڑہ وصول کرنا جائز نہیں ہے، اگر گاؤں کے لوگ بہ برضاء ورغبت چرمِ قربانی تنظیم کو دیں تو تنظیم کے لیے اُس کا انتظام کرنا جائز ہے، لیکن کسی کی ناگواری کے باوجود اُس سے لینا حرام ہے، بعض جگہوں پر یہاں تک سنا گیا ہے کہ نہ دینے والے پر مالی جرمانہ عائد کیا جاتا ہے، یہ بالکل حرام ہے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۷] قربانی کی کھال کی رقم کا حیلہ کر کے اُس سے اُستاذ کی تنخواہ دینا

۱۹۶۹- سوال: ہمارے گاؤں میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کی قربانی ہوتی ہے، اُس کی کھالوں کو گاؤں والے بطورِ صدقہ گاؤں کی کمیٹی کو دے دیتے ہیں، کمیٹی والے اُسے فروخت کر کے اُس کی رقم چھ سال سے غریب اور ضرورت مند لوگوں کو دیتے تھے، لیکن اِس وقت اُن پیسوں کا حیلہ کر کے گاؤں کے مدرسہ کے ایک اُستاذ کی تنخواہ میں اُسے دیا جاتا ہے، کیا اِس طرح کا حیلہ کرنے سے محتاج اور ضرورت مند لوگوں کا حق ضائع نہیں ہوتا؟ اگر حق ضائع ہوتا ہے تو حیلہ کر کے اُسے اُستاذ کی تنخواہ کے طور پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

حیلہ کر کے مدرسہ کے اُستاذ کی تنخواہ میں استعمال کرنے سے ٹرسٹیوں کی ذمہ داری ادا ہو جائے گی،

---

(۱) ويتصدق بجلدها أو يعمل منه نحو غربال وجراب، ولا بأس بأن يشتري به ماينتفع بعينه مع بقائه استحسانا...، ولا يشتري به ما لا ينتفع به إلا بعد الاستهلاك نحو اللحم والطعام، ولا يبيعه بالدراهم لينفق الدراهم على نفسه وعياله، واللحم بمنزلة الجلد في الصحيح؛ حتى لا يبيعه بما لا ينتفع به إلا بعد الاستهلاك. ولو باعها بالدراهم ليتصدق بها جاز؛ لأنه قربة كالتصدق، كذا في التبيين. وهكذا في الهداية والكافي. (الفتاوى الهندية: ۳۰۱/۵، كتاب الأضحية، الباب السادس في بيان مايستحب في الأضحية والانتفاع بها، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) لأن الملك مامن شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (رد المحتار على الدر المختار-ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۵۰۲/۴، أول كتاب البيوع، وانظر: ۵۱/۵، باب البيع الفاسد، مطلب: تعريف المال، ط: دار الفكر-بيروت)

والحاصل أن القياس في جنس هذه المسائل أن يفعل المالك ما بدأ له مطلقا؛ لأنه متصرف في خالص ملكه. (المصدر السابق: ۴۴۸/۵، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي، مسائل متفرقة، مطلب: اقتسموا دارا وأراد كل منهم فتح باب لهم ذلك ☆ فتح القدير: ۳۲۶/۷، كتاب أدب القاضي، باب التحكيم، مسائل شتى من كتاب القضاء، ط: دار الفكر)

اور کھال دینے والے کی قربانی بھی صحیح ہو جائے گی، لیکن کھال فروخت کرنے کے بعد اُس رقم کے صحیح حقدار یتیم، بیوہ اور غریب ہیں، اُن کو محروم رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۸] قربانی کی کھال اُجرت میں دینا

۱۹۷۰- سوال: قربانی کی کھال قصاب کو پسند آئی، تو وہ اُسے دے دی اور اُجرت نہیں دی، بعد میں قصاب نے کھال کو فروخت کر کے رقم اپنے استعمال میں لے لی، پھر قربانی کرنے والے نے اُس کھال کے بدلے میں رقم مسجد کے متولی کو دی، اِس طرح کے عمل سے قربانی صحیح ہوئی یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں ہوئی تو اُس

(۱) والدليل على جوازه [الحيلة] من الكتاب - قوله تعالى -: {وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث} هذا تعليم المخرج لأيوب - عليه السلام - عن يمينه التي حلف ليضربن زوجته مائة، ... وقال - تعالى -: {فلما جهزهم بجهازهم جعل السقاية في رحل أخيه} [يوسف: ٧٠] إلى قوله {ثم استخرجها من وعاء أخيه كذلك كدنا ليوسف} [يوسف: ٧٦] وذلك منه حيلة، وكان هذا حيلة لإمساك أخيه عنده حينئذ ليوقف إخوته على مقصوده . . . .

وأما السنة فما روي: أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - قال يوم الأحزاب لعروة بن مسعود في شأن بني قريظة فلعلنا أمرناهم بذلك، فلما قال له عمر - رضي الله عنه - في ذلك قال - عليه السلام -: الحرب خدعة، وكان ذلك منه اكتساب حيلة ومخرج من الإثم بتقييد الكلام بلعل ... وهذا تعليم الحيلة والآثار فيه كثيرة، من تأمل أحكام الشرع وجد المعاملات كلها . . . فالحاصل: أن ما يتخلص به الرجل من الحرام أو يتوصل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن، وإنما يكره ذلك أن يحتال في حق لرجل حتى يبطله أو في باطل حتى يموهه أو في حق حتى يدخل فيه شبهة فما كان على هذا السبيل فهو مكروه، وما كان على السبيل الذي قلنا أولا فلا بأس به. (المبسوط - محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ٤٨٣هـ): ٣٠/٢١٠-٢١١، كتاب الحيل، ط: دار المعرفة - بيروت)

مذهب علمائنا - رحمهم الله تعالى - أن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير أو لإدخال شبهة فيه أو لتمويه باطل فهي مكروهة وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال فهي حسنة، والأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله تعالى {وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث} [ص: ٤٤] وهذا تعليم المخرج لأيوب النبي - عليه وعلى نبينا الصلاة والسلام - عن يمينه التي حلف ليضربن امرأته مائة عود وعامة المشايخ على أن حكمها ليس بمنسوخ وهو الصحيح من المذهب كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية - لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ٦/٣٩٠، كتاب الحيل، الفصل الأول في بيان جواز الحيل، ط: دار الفكر)

استاذِ گرامی، آفتاب فقہ، دار العلوم دیوبند کے عظیم مفتی، حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی - رحمہ اللہ - اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"حیلہ" خواہ مخواہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ زکوٰۃ کے مصارف متعین ہیں، حیلہ کے بعد جو اصل مستحق ہیں، وہ عملاً محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے حیلہ کی صورت انتہائی مجبوری میں اختیار کرنی چاہیے۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۶/۱۹۹، حاشیہ نمبر: ۲، مسائل مصارف زکاۃ، حیلہ کے ذریعے زکاۃ کی رقم تبلیغ میں خرچ کرنا کیسا ہے؟ ط: زکریا - دیوبند)

[مجتبیٰ حسن قاسمی]

کے صحیح کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قربانی کی کھال اُجرت میں دینا جائز نہیں ہے، اُجرت الگ سے دینا ضروری ہے، جب کھال اجرت میں دے دی، تو اس کے بہ قدر قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ (۱)

سوال میں مذکور ہے کہ بعد میں کھال کی رقم مسجد کے متولی کو دی، تو واضح رہے کہ اُس رقم کا استعمال مسجد میں جائز نہیں ہے، کھال بیچنے کے بعد اُس کی رقم کا حکم زکوٰۃ جیسا ہے، زکوٰۃ کے مستحق کسی غریب یا بیوہ کو اُس کا مالک بنانا ضروری ہے، اِس رقم کو مدرسہ کے غریب بچوں کی کتابیں، قرآنِ پاک وغیرہ خرید کر دینے سے بھی ذمہ داری پوری ہو جائے گی، یا غریبوں میں اُس رقم کو تقسیم کر دے، ورنہ قربانی ناقص رہے گی۔ (۲)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] قصاب کو بہ طورِ اُجرت قربانی کی کھال دینا

۱۹۷۱- سوال: گاؤں میں قربانی کی کھالیں فقیر کو دی جاتی ہیں، تو اُن کو مزدوری کے پیسے دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

فقیر قصائی (جانور ذبح کرنے والے اور صفائی کرنے والے) کو کھال اُجرت کے طور پر دینا جائز نہیں ہے۔ (مجمع الانہر: ۲/ ۵۲۲ ☆ شامی: ۵/ ۲۸۷)[۳]

اگر اُجرت میں کھال دے دی ہے، تو کھال کی قیمت کے بقدر رقم قربانی کرنے والے کے ذمہ صدقہ کرنا واجب ہے۔ (ہدایہ: ۴/ ۴۵۰)[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(۱-۲) تفصیل وتخریج گذر چکی ہے۔

[۳] وفي التنوير ولا يعطى أجر الجزار منها. (مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر -عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸ھ): ۲/ ۵۲۲، كتاب الأضحية، ط: دار إحياء التراث العربي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۲۸-۳۲۹، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الهداية: ۴/ ۳۶۱، كتاب الأضحية، ط: دار إحياء التراث العربي)

[۴] فلو باع الجلد أو اللحم بالدراهم أو بما لا ينتفع به إلا بعد استهلاكه تصدق بثمنه؛ لأن القربة انتقلت إلى بدله. (الهداية في شرح بداية المبتدي -علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۴/ ۳۶۰، كتاب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت)

[۲۰] اُجرت دینے کے بعد قصاب کو قربانی کی کھال دینا

۱۹۷۲- سوال: فقیر (جانور کو ذبح کرنے والا) کو اُس کی اُجرت دینے کے بعد کھال دینا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا:

قصاب کو اُس کی اُجرت دینے کے بعد کھال دے دینا جائز ہے۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] چرمِ قربانی کا صحیح مصرف کیا ہے؟

۱۹۷۳- سوال: ہر سال گاؤں میں تقریباً پندرہ، بیس قربانیاں ہوتی ہیں، قربانی کے جانوروں کی کھالوں کے لیے گاؤں میں یہ رواج ہے کہ ذبح کرنے والے شاہ [فقیر] کو وہ کھالیں مفت میں دے دی جاتی ہیں، اور الگ سے اُن کے ذبح کی اُجرت بھی دی جاتی ہے، حالاں کہ اُن کی مالی حالت کافی اچھی ہے، اُن کے پاس دو بھینس اور پانچ بیگھا زمین ہے، ایسی صورت میں اُن کھالوں کی رقم سے اچھی کتابیں خرید کر کتب خانہ کھولا جائے، جس سے لوگ عمدہ کتابیں پڑھ کر کچھ دینی علم حاصل کریں گے، یا مدرسہ کے بچوں کے لیے بیٹھنے کا اچھا انتظام نہیں ہے، سردی کے موسم میں بچے کانپتے ہیں، تو کھالوں کی رقم سے کتابیں یا مدرسہ کی ضروری اشیاء خریدی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ گاؤں کے لوگ مفت میں کھالیں دے دیتے ہیں، تو اُس کی وجہ سے قربانی میں کوئی حرج تو نہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیا:

قربانی کے جانور کی کھال خود مالک استعمال کرے یا کسی کو بغیر قیمت لیے ہوئے صدقہ کردے، جائز ہے، اگر ذبح کرنے والے کو بغیر اُجرت کے دے دے، تو بھی جائز ہے۔(۲)

لیکن قربانی کرنے والا جب کھال کو بیچ دے تو آنے والی رقم کا حکم زکوۃ کے حکم میں ہے، زکوۃ کے حق داروں کو مالک بنانا ضروری ہے۔(۳)

(۱) قال: "ويأكل من لحم الأضحية ويطعم الأغنياء والفقراء ويدخر"... قال: "ويتصدق بجلدها"... واللحم بمنزلة الجلد في الصحيح. (الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳ھ): ۴/۳۶۰، كتاب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

(۲-۳) تفصیل وتخریج گذر چکی۔

مدرسہ کے لیے ایسی رقم کے ذریعہ کتابیں خریدنا جائز نہیں ہے، البتہ قربانی کرنے والے نے رقم کا مالک کسی غریب کو بنادیا اور غریب شخص خرید کر کتابیں مسجد و مدرسہ میں دے تو جائز ہے، اِسی طریقہ سے کھال کو فروخت کر کے اُس سے چٹائیاں خریدنا بھی جائز نہیں ہے، لیکن قرآنِ پاک یا کتابیں خرید کر ایسے غریب بچوں کو دی ہیں جو زکوٰۃ کے حق دار ہیں تو جائز ہے، کھال بیچنے کے بعد حاصل ہونے والی رقم کا حکم زکوٰۃ کا ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] قربانی کی کھال کی رقم سے قبرستان کی چہار دیواری بنانا

۱۹۷۴-سوال: میرے پاس قربانی کی کھال کی رقم ہے، جس کو میں نے غریب اور محتاج لوگوں کو دے کر حیلہ کیا ہے، اور اُن سے اِجازت لی ہے کہ میں اُس رقم کو جس کام میں استعمال کرنا چاہوں کروں، میرا اِرادہ اِس رقم سے یہ ہے کہ قبرستان کی چہار دیواری کروں، تاکہ کوئی جانور اُس میں داخل نہ ہو، تو کیا اِس رقم کو اُس کام میں استعمال کرسکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قربانی کے چمڑے کو جب تک آدمی فروخت نہ کرے، قربانی کرنے والا مالک اُسے اپنے کام میں لاسکتا ہے، بیچنے کے بعد اُس رقم کا حکم زکوٰۃ کا ہے، غریب فقیر مسلمان کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے، جب آپ نے غریب مسلمان کو قربانی کی کھال کا مالک بنادیا اور غریب مسلمان نے اُس رقم کو آپ کی تحریر کے مطابق قبرستان کی چہار دیواری کے لیے دے دیا، تو اُس کام میں اُس کا استعمال کرنا جائز ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تفصیل وتخریج گذر چکی۔

(۲) ولا ينبغي له أن يصرف ذلك العشر إلى عمارة الرباط وإنما يصرف إلى الفقراء لا غير ولو صرف إلى المحتاجين ثم إنهم أنفقوا في عمارة الرباط جاز ويكون ذلك حسنا. (البحر الرائق: ۲۷۵/۵، قبيل: كتاب البيع، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مجمع الضمانات - أبو محمد غانم بن محمد البغدادي الحنفي (م: ۱۰۳۰ هـ)، ۳۲۵، باب في الوقف، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ۴۷۲/۲، كتاب الوقف، الباب الثاني عشر في الرباطات والمقابر والخانات والحياض، ط: دار الفكر - بيروت ☆ فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۳۱۵/۳، ط: زكريا - ديوبند)

وقدمنا أن الحيلة أن يتصدق على الفقير، ثم يأمره بفعل هذه الأشياء، وهل له أن يخالف أمره؟ لم أره، والظاهر =

[۲۳] چرمِ قربانی کی رقم سے قبرستان کے باڑے بنانا

۱۹۷۵- سوال: قربانی کا چمڑا بیچ کر حاصل ہونے والی رقم کا قبرستان کے چاروں طرف باڑ بنانے میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ مسئلہ مفصل اور مدلل باحوالہ بیان کر کے ممنون ومشکور فرمائیں۔

الجواب حامداومصلیا:

قربانی کرنے والا، اپنی قربانی کا چمڑا خود استعمال کر سکتا ہے؛ البتہ چمڑے کو بیچنے کے بعد جو رقم آئے گی اس کا حکم زکوۃ جیسا ہے؛ اس لیے اس کو غریبوں کو مالک بنانا ضروری ہے، غریب کو مالک بنائے بغیر قبرستان کی باڑی [باؤنڈری] بنانے میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر قبرستان کی باؤنڈری کے لیے رقم کا کسی طور پر انتظام نہ ہو سکے، تو اس رقم کو حیلۂ شرعی کے بعد اس مصرف میں استعمال کر سکتے ہیں، یعنی کسی غریب کو اس رقم کا مالک بنا دیں، پھر اسے ترغیب دیں کہ تم اپنی طرف سے قبرستان کی باؤنڈری کروا دو، اللہ بڑا اجر دے گا، اس طرح حیلہ کر کے قبرستان کی چہار دیواری کی تعمیر ہو سکتی ہے۔[1]

آپ کے لیے اس قدر جواب کافی ہے، مفصل اور مدلل سمجھنے کے لیے مدرسہ میں داخلہ لے کر پڑھیں، یا مسئلہ سمجھنے کے لیے وقت نکال کر، سفر کر کے ایک دن آپ میرے مہمان بنیں؛ محض ایک کارڈ میں اس سے زیادہ تفصیلی جواب کی گنجائش نہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=نعم. (الدر المختار) ــــــــــ قال ابن عابدين: (قوله: أن الحيلة) أي في الدفع إلى هذه الأشياء مع صحة الزكاة. (قوله ثم يأمره إلخ) ويكون له ثواب الزكاة وللفقير ثواب هذه القرب بحر وفي التعبير بثم إشارة إلى أنه لو أمره أولا لا يجزئ؛ لأنه يكون وكيلا عنه في ذلك وفيه نظر؛ لأن المعتبر نية الدافع ولذا جازت وإن سماها قرضا أو هبة في الأصح كما قدمناه فافهم. (رد المحتار على الدر المختار: ۳/۳۴۵، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر)

لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲ھ): ۴/۵۰۲، أول كتاب البيوع، وانظر: ۵/۵۱، باب البيع الفاسد، مطلب: تعريف المال، ط: دار الفكر-بيروت)

والحاصل أن القياس في جنس هذه المسائل أن يفعل المالك ما بدا له مطلقا؛ لأنه متصرف في خالص ملكه. (المصدر السابق: ۵/۴۴۸، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي، مسائل متفرقة، مطلب: اقتسموا دارا وأراد كل منهم فتح باب لهم ذلك ☆ فتح القدير: ۷/۳۲۶، كتاب أدب القاضي، باب التحكيم، مسائل شتى من كتاب القضاء، ط: دار الفكر)

(۱) سوال سابق کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

[۲۴] قربانی کی کھال مدرسہ میں دینا

۱۹۷۶- سوال: ہمارے یہاں انجمن اسلام ہے، اس کی کوئی ذاتی آمدنی نہیں ہے، چندہ کے ذریعہ مدرسہ کو چلایا جاتا ہے، اسی طرح مسلمان غریب بچوں کے اسکول اور مکتب کی کتابیں اور مدرّسین کی تنخواہوں کے لیے ہر سال قربانی کی کھال وصول کی جاتی ہے اور اسے فروخت کر کے ضروریات کی تکمیل کی جاتی ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طریقے سے قربانی کی کھال مدرسہ میں دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

ضروری نوٹ: ہمارے یہاں اہلِ بدعت کے کچھ فتنہ پسند لوگ، اس مقصد سے کہ "انجمنِ اسلام" میں کھال نہ پہنچنے پائے، پرچہ چھپوا کر تقسیم کرتے ہیں، اور مکاتب کے مدرسہ کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں، یہاں جماعتی حضرات بہت کم ہیں، اور نہایت غریب ہیں، جن سے مکتب کا خرچ پورا نہیں کیا جاسکتا ہے، اس مجبوری کی وجہ سے کھال کی رقم استعمال کی جاتی ہے، میرا خیال ترغیب کے ایک پرچہ چھپوانے کا ہے، اس لیے ترتیب وار، حوالے کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں۔

مولانا اشرف راندیری صاحب سے میں نے ایک سوال کیا تھا کہ: ہم چندہ مکتب کے لیے کرتے ہیں، ہمارے یہاں اس طرح کی مجبوری ہے، تبلیغی جماعت کے لوگ بہت کم ہیں، اور جو ہیں وہ انتہائی غریب ہیں، مدرّسین کا خرچ پورا نہیں ہو پاتا، تو اس مجبوری کی وجہ سے زکوۃ لے سکتے ہیں یا نہیں؟ لوگ للّٰہ رقم بہت کم دیتے ہیں۔

تو مولانا نے جواب دیا تھا کہ: اگر ایسی سخت مجبوری ہو، تو لے سکتے ہیں، تو میرا منشا یہ ہے کہ ایسی سخت مجبوری میں قربانی کی کھال لے لی جائیں، تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصليا:

قربانی کی کھال انجمن میں دینا، یا اس کو فروخت کر کے غریب بچوں کی کتابیں خریدنے یا دوسری ضروریات میں خرچ کرنا جائز ہے، کھال فروخت کرنے کے بعد حاصل شدہ رقم کا حکم ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوۃ کی رقم کا ہے، غریبوں کو مالک بنانا ضروری ہے، ان کو مالک بنائے بغیر کسی کام میں لانا جائز نہیں۔ (۱) مدرّسین

---

(۱) (فإن) (بيع اللحم أو الجلد به) أي بمستهلك (أو بدراهم) (تصدق بثمنه) ومفاده صحة البيع مع الكراهة، وعن الثاني باطل؛ لأنه كالوقف، مجتبى. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳۲۸/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۳۶۰/۴، كتاب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

کی تنخواہوں میں مذکورہ رقم کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے، [۲] اور اس رقم سے خریدی گئی کتابوں کا بھی غریب و غرباء کو مالک بنانا ضروری ہے، اگر اس رقم سے کتاب اس مقصد سے لی گئی ہو کہ ایک سال کے لیے استعمال کرنے کو دی جائے، پھر اس کو واپس جمع کرا لیا جائے، تو ارکانِ انجمن کی ذمہ داری ادا نہ ہوگی، کتاب کا مالک بنانا ضروری ہے، مالک بننے کے بعد وہ خود اپنی خوشی سے جمع کرا دیتے ہیں، تو اہل انجمن کی ذمہ داری ادا ہو جائے گی۔ [۳]

مولانا اشرف راندیریؒ نے جو بات بتلائی ہے، اسے پوری تفصیل سے لکھا جائے، تو اس کا جواب دیا جائے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] چرمِ قربانی کی رقم ایک سال سے زائد عرصہ تک روکے رکھنا

۱۹۷۷- سوال: محتاجوں اور ناداروں کے تعاون کے لیے قائم کردہ کوئی اِدارہ اگر چرمِ قربانی کی رقم جمع کر کے اُسے ایک سال سے زائد عرصہ تک روکے رکھے، تو قربانی کرنے والوں کی قربانی ادا ہوگی یا نہیں؟ اگر رفاہ عام کے لیے اس رقم کا استعمال کرنا ضروری ہو، تو کیوں کر حیلہ کیا جائے؟

---

(۲) ولو نوى الزكاة بما يدفع المعلم إلى الخليفة، ولم يستأجره إن كان الخليفة بحال لو لم يدفعه يعلم الصبيان أيضا أجزأه، وإلا فلا، وكذا ما يدفعه إلى الخدم من الرجال والنساء في الأعياد وغيرها بنية الزكاة كذا في معراج الدراية.
(الفتاوى الهندية: ۱/۱۹۰، كتاب الزكاة، الباب السابع في المصارف، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) ولا ينبغي له أن يصرف ذلك العشر إلى عمارة الرباط وإنما يصرف إلى الفقراء لا غير ولو صرف إلى المحتاجين ثم إنهم أنفقوا في عمارة الرباط جاز ويكون ذلك حسنا. (البحر الرائق: ۵/۲۷۵، قبيل: كتاب البيع، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مجمع الضمانات - أبو محمد غانم بن محمد البغدادي الحنفي (م: ۱۰۳۰ھ)، ۳۲۵، باب في الوقف، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ۲/۴۷۲، كتاب الوقف، الباب الثاني عشر في الرباطات والمقابر والخانات والحياض، ط: دار الفكر - بيروت ☆ فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۳/۳۱۵، ط: زكريا - ديوبند)

لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (رد المحتار على الدر المختار - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲ھ): ۴/۵۰۲، أول كتاب البيوع، وانظر: ۵/۵۱، باب البيع الفاسد، مطلب: تعريف المال، ط: دار الفكر - بيروت)

والحاصل أن القياس في جنس هذه المسائل أن يفعل المالك ما بدأ له مطلقا، لأنه متصرف في خالص ملكه. (المصدر السابق: ۵/۴۴۸، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي، مسائل متفرقة، مطلب: اقتسموا دارا وأراد كل منهم فتح باب لهم ذلك ☆ فتح القدير: ۷/۳۲۶، كتاب أدب القاضي، باب التحكيم، مسائل شتى من كتاب القضاء، ط: دار الفكر)

الجواب حامداً ومصلیاً:

چرمِ قربانی کی رقم روکے رکھنے سے قربانی کی ادائیگی میں کوئی اثر نہیں پڑے گا؛ لیکن بلا وجہ اُس کی رقم کو روکے رکھنا جائز نہیں ہے کہ اس کا حکم زکاۃ جیسا ہے۔ (١)

اگر رفاہِ عام کے لیے اس رقم کو استعمال کرنا ناگزیر ہو، تو اُس کے لیے حیلہ کی وہی شکل اختیار کر سکتے ہیں، جو زکوۃ کی رقم کے لیے بیان کی گئی ہے۔ (٢) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٢٦] چرمِ قربانی مدرسہ میں دینا اور مدرسہ سے ان کا حساب لینا

١٩٧٨- سوال: چرمِ قربانی لوگ مدرسہ کی شوریٰ کے حوالے کر دیتے ہیں، وہ لوگ اُن کھالوں پر قبضہ کر کے اُنہیں بیچ کر اُن کی حاصل شدہ قیمت مدرسین کی تنخواہ اور مدرسہ کے دیگر اخراجات میں خرچ کرتے

(١) (والافتراضها عمري) أي على التراخي وصححه الباقاني وغيره (وقيل فوري) أي واجب على الفور (وعليه الفتوى) كمافي شرح الوهبانية (فيأثم بتأخيرها) بلاعذر. (الدر المختار مع رد المحتار: ٢/٢٧٠-٢٧١، كتاب الزكاة)

سوال: ہمارے یہاں ایک قومی ادارہ ہے، جو غریب، یتیم، بیواؤں کی امداد کے لیے قائم کیا گیا ہے اور وہ اپنی خدمات ماشاء اللہ انجام بھی دیتا ہے، اس کی نوعیت یہ ہے کہ ہر سال رمضان المبارک میں زکاۃ، فطرہ اور عید الاضحیٰ کے موقع پر چرمِ قربانی جمع کرتا ہے اور سال بھر ماہانہ یتیم، بیواؤں کو ایک مقدار مقرر دی جاتی ہے۔ فی الوقت ادارے کے پاس جمع شدہ کئی سال کی کچھ رقم موجود ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح رقم زکاۃ، فطرہ کی جمع کر کے رکھنا درست ہے یا سال بھر مکمل جتنی رقم جمع ہو، صرف کر دی جائے، حکمِ شریعت سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: زکاۃ، فطرہ دینے والوں نے ادارے کے ذمہ داروں کو وکیل بنایا ہے، کہ ان کی زکاۃ وفطرہ کو صحیح جگہ پر صرف کر دیں، جب تک وہ صرف نہیں کریں گے، زکاۃ، فطرہ کی ادائیگی نہیں ہوگی، ذمہ بری نہیں ہوگا، واجب باقی رہے گا۔ ایسی رقم پر سال بھر گذر جانا اچھا نہیں ہے، اور واجب میں اتنی دیر نہ کی جائے، درمیان میں حوادث کا بھی احتمال رہتا ہے، گذشتہ رقم، جو کچھ باقی ہو، اس کو حسبِ ضرورت غرباء اور مستحق کو دے دے، فقط، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ محمودیہ: ٩/٥١٥، کتاب الزکاۃ، باب اداء الزکاۃ، ادارے میں زکاۃ کی رقم سال بھر سے زیادہ پڑے رہنا، سوال نمبر: ٤٦١٦، ط: دار المعارف - دیوبند)

(٢) إذا أراد أن يكفن ميتا عن زكاة ماله لا يجوز (والحيلة فيه أن يتصدق بها على فقير من أهل الميت)، ثم هو يكفن به الميت فيكون له ثواب الصدقة ولأهل الميت ثواب التكفين، وكذلك في جميع أبواب البر التي لا يقع بها التمليك كعمارة المساجد وبناء القناطر والرباطات لا يجوز صرف الزكاة إلى هذه الوجوه.

(والحيلة أن يتصدق بمقدار زكاته) على فقير، ثم يأمره بعد ذلك بالصرف إلى هذه الوجوه فيكون للمتصدق ثواب الصدقة ولذلك الفقير ثواب بناء المسجد والقنطرة. (الفتاوى الهندية: ٦/٣٩٢، كتاب الحيل، الفصل الثالث في مسائل الزكاة، ط: دار الفكر)

ہیں، تو کیا پوری بستی یا چند لوگوں کی کھالیں اُن کو دینا جائز ہے؟ اُن کا اُن کھالوں کو بیچ کر حاصل ہونے والی رقم کا مدرسہ میں صرف کرنا جائز ہے؟ جب کہ اُس مدرسہ میں بہت سے اغنیاء کے بچے بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں، کھال مدرسہ کے منتظمین کے حوالے کرنے کے بعد، کھال دینے والے بستی کے لوگ اُن سے اُن کھالوں کا حساب پوچھ سکتے ہیں یا نہیں؟ کھالوں کے حساب میں اطمینان نہ ہونے پر اُن سے لڑائی کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

صاحبِ قربانی کے لیے خود کھال کا استعمال کرنا جائز ہے، تاہم اگر اس نے بیچ دی ہے، تو اُس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔(۱) ضرورت کے وقت حیلۂ تملیک کے بعد مسجد و مدرسہ میں اُس کا صرف کرنا جائز ہے، اگر کھالیں مدرسہ میں دینی ہے، تو اُس کی صورت یہ ہے کہ چند آدمیوں کو کھالیں ہبہ کر دی جائیں، اور وہ لوگ اُنہیں بیچ کر قیمت مدرسہ میں دے دیں۔(۲) کھالیں خواہ پوری بستی کی ہوں اور سینکڑوں کی تعداد میں ہوں؛ لیکن جب مالکین کی رضا سے دو تین آدمیوں کو ہبہ کی جائیں، تو جائز ہے۔(۳)

دوسری صورت یہ ہے کہ مدرسہ کے بعض محتاج طلبہ کی جانب سے کچھ لوگ اُن کے وکیل بن کر کھالیں وصول کر لیں اور پھر اُنہیں بیچ کر قیمت مدرسہ میں دے دیں، بہر صورت مدرسہ میں کھال ہبہ یا صدقہ کرنے کے بعد کھال دینے والوں کو حساب و کتاب معلوم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، کیوں کہ موہوب لہٗ

---

(۱) (فإن) (بيع اللحم أو الجلد به) أي بمستهلك (أو بدراهم) (تصدق بثمنه) ومفاده صحة البيع مع الكراهة، وعن الثاني باطل؛ لأنه كالوقف، مجتبى. (الدر المختار مع رد المحتار: ٣٢٨/٦، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي-علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ٥٩٣هـ): ٣٦٠/٤، كتاب الأضحية، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي-بيروت)

(۲) ولا ينبغي له أن يصرف ذلك العشر إلى عمارة الرباط وإنما يصرف إلى الفقراء لا غير ولو صرف إلى المحتاجين ثم إنهم أنفقوا في عمارة الرباط جاز ويكون ذلك حسنا. (البحر الرائق: ٢٧٥/٥، قبيل: كتاب البيع، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ مجمع الضمانات-أبو محمد غانم بن محمد البغدادي الحنفي (م: ١٠٣٠هـ)، ٣٢٥، باب في الوقف، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الفتاوى الهندية: ٤٧٢/٢، كتاب الوقف، الباب الثاني عشر في الرباطات والمقابر والخانات والحياض، ط: دار الفكر-بيروت ☆ فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ٣١٥/٣، ط: زكريا-ديوبند)

(۳) وله أن يهبه منهما جميعا، ولو تصدق بالكل جاز ولو حبس الكل لنفسه جاز؛ لأن القربة في الإراقة. (بدائع الصنائع: ٨١/٥، كتاب التضحية، قبيل: كتاب النذر، ط: دار الكتب العلمية-بيروت ☆ تكملة البحر الرائق: ٢٠٣/٨، كتاب الأضحية، الأكل من لحم الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي)

جب مالک بن گیا، تو وہ اُس میں تصرف کا مختار ہے۔[۴] البتہ مدرسہ کے ذمہ داروں کو حساب و کتاب کا حق رہے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] چرمِ قربانی کی قیمت کے ذریعہ کنٹرول کا اناج خرید کر مستحقین کو دینا

۱۹۷۹- سوال: ہمارے گاؤں میں چرمِ قربانی کی قیمت کے ذریعہ اناج خرید کر مستحقین کو دیا جاتا ہے، اور یہ نظم اِس وجہ سے کیا گیا ہے کہ نقد دینے میں اُس کا غلط استعمال زیادہ ہوتا ہے؛ اِس اناج کی خریداری زیادہ مقدار میں بڑے پیانہ پر ہوتی ہے، اِس لیے بازار کی عام قیمت کے مقابلہ میں کچھ کم قیمت میں ملتا ہے، لیکن اگر ہم اِسی اناج کو کنٹرول [راشن کی سرکاری دوکان] سے خریدیں تو اور بھی کم قیمت میں مل سکتا ہے؛ لیکن چوں کہ کنٹرول والے دوسرے راشن کارڈ والے مستحقین کی حق تلفی کر کے اناج سستے دام میں بیچتے ہیں؛ اِس لیے ہم آپ سے اِس کے متعلق رہنمائی طلب کرتے ہیں کہ کیا اِس صورت میں ہمارے لیے کنٹرول سے اناج خریدنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر کنٹرول کے تاجر راشن کارڈ والے اصل مستحقین کو محروم کر کے بیچتے ہیں اور آپ کو اِس حق تلفی کا یقین ہے، تو اُن سے خریدنا جائز نہیں ہے، ہاں اگر کسی جگہ کے لوگ کنٹرول سے اناج نہیں خریدتے اور اِس وجہ سے وہاں اناج پڑا رہتا ہے؛ اِس لیے کنٹرول والے اُسے بیچ دیں، [گویا کسی کی حق تلفی نہ ہو] تو اُسے خریدنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۴) لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص. (رد المحتار على الدر المختار- ابن عابدين (م: ۱۲۵۲ھ): ۵۰۲/۴، أول كتاب البيوع، وانظر: ۵۱/۵، باب البيع الفاسد، مطلب: تعريف المال، ط: دار الفكر- بيروت)

والحاصل أن القياس في جنس هذه المسائل أن يفعل المالك ما بدا له مطلقا؛ لأنه متصرف في خالص ملكه. (المصدر السابق: ۴۴۸/۵، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي، مسائل متفرقة، مطلب: اقتسموا دارا وأراد كل منهم فتح باب لهم ذلك ☆فتح القدير: ۳۲۶/۷، كتاب أدب القاضي، باب التحكيم، مسائل شتى من كتاب القضاء، ط: دار الفكر)

(۱) راشن کارڈ، حکومت کی جانب سے غریب کو ملنے والا رعایتی ''حق'' ہے، جس کے ذریعے کارڈ ہولڈر کو راشن (شکر اور تیل وغیرہ) خریدنے کا اختیار رہتا ہے، اس کے حق کو متاثر کرنا، یک گونہ حق تلفی اور ظلم ہے؛ اس لیے اگر یقین ہو کہ کنٹرول (سرکاری راشن کی دکان) سے غلہ خریدنے میں راشن کارڈ ہولڈر کا حق متاثر ہوگا، تو کنٹرول کے تاجر سے غلہ خریدنا جائز نہیں ہوگا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٢٩﴾. (۴-النساء: ۲۹)

عن جابر بن عبد الله -رضي الله عنه-، قال: شهدت مع رسول الله -صلى الله عليه وسلم- الأضحى بالمصلى، فلما قضى خطبته نزل من منبره وأتي بكبش فذبحه رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده، وقال: بسم الله، والله أكبر، هذا عني، وعمن لم يضح من أمتي. (سنن أبي داود: ١/٣٨٨، رقم الحديث: ٢٨١٠، كتاب الضحايا، باب في الشاة يضحى بها عن جماعة، ط: ديوبند)

باب الشركة في الضحايا

[قربانی میں شرکت کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الشركة في الضحايا

[قربانی میں شرکت کا بیان]

[١] بکرے کی نیت کی، پھر بڑے جانور میں حصہ لے لیا تو؟

١٩٨٠- سوال: ایک شخص پر قربانی واجب ہے، اس نے بکرا خریدنے کا ارادہ کیا تھا، مگر اس سال بکرے کی زیادہ قیمت ہے، جس کی وجہ سے وہ بڑے جانور میں ایک حصہ لینا چاہتا ہے، تو یہ درست ہے یا نہیں؟ یا بکرے کی نیت کرنے کی وجہ سے بکرا ہی خریدنا ضروری ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلياً:

بڑے جانور میں ایک حصہ لینے سے بھی قربانی ادا ہو جائے گی، کیوں کہ اصل میں ایک قربانی کرنا واجب ہے، خواہ بکرے کی کرے، یا بڑے جانور کی، یا بڑے جانور میں حصہ رکھے؛ سب جائز ہے؛ لہٰذا اگر بڑے جانور میں ایک حصہ قربانی کا رکھ لیا جائے، تو واجب ادا ہو جائے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

(١) يجب أن يعلم أن الشاة لا تجزئ إلا عن واحد، وإن كانت عظيمة، والبقر والبعير يجزي عن سبعة إذا كانوا يريدون به وجه الله تعالى، والتقدير بالسبع يمنع الزيادة، ولا يمنع النقصان، كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ٥/ ٣٠٤، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ط: دار الفكر-بيروت)

إن ذبح البقرة من سبعة بنية القربة بمنزلة ذبح شاة، لأن جواز ذبح البقرة من سبعة من حيث إن البقرة أقيمت =

[۲] بڑے جانور کی قربانی میں کسی شریک کا صدقہ کی نیت کرنا

۱۹۸۱- سوال: قربانی کے جانور میں سات مختلف حصے ہیں، کسی حصہ کا صدقہ کی نیت کرنا درست ہے، یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مستحب یہ ہے کہ قربانی کے جانور میں تمام شرکاء کی نیت قربانی کی ہو، لیکن اگر کوئی قربانی کے علاوہ دیگر قربت (عبادت) کی نیت کرتا ہے، تو اس کی بھی گنجائش ہے، جیسے: عقیقہ، دم تمتع، دم قران، دم احصار، یا نفل صدقہ کی کوئی نیت کرتا ہے تو یہ بھی درست ہے۔

بل کہ اگر شرکاء میں سے کوئی نکاح کے ولیمہ کی نیت کرتا ہے، کہ اس گوشت سے نکاح کی دعوت کھلاؤں گا، تو اس کی بھی گنجائش ہے؛ کیوں کہ یہ بھی عبادت کی نیت ہے، البتہ مطلق گوشت کھانے یا کھلانے کی نیت سے شرکت جائز نہیں، اگر کسی نے ایسا کیا، تو شرکاء میں سے کسی کی قربانی جائز نہ ہوگی۔ (عالم گیری☆بدائع الصنائع)[1]

=مقام سبع شياه، وإراقة دمها أقيمت مقام سبع إراقات. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني-أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:۶۱۶ھ):۹۹/۶، كتاب الأضحية، الفصل الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ت: عبدالكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

محض ارادے کی وجہ سے اس پر بکرا قربان کرنا لازم نہیں ہے، حتی کہ اگر کسی مال دار نے بہ وقت شراء قربانی کی نیت کی ہو، تب بھی وہ جانور قربانی کے لیے متعین نہیں ہوتا ہے، ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

وهل تتعين الأضحية بالنية؟ قالوا: إن كان فقيرا وقد اشتراها بنيتها تعينت (و في حاشية الحموي: قوله: تعينت الخ، بشرط أن يتلفظ الفقير بلسانه، وأما إذا لم يتلفظ فلا تتعين. انتهى) فليس له بيعها، وإن كان غنيا لم تتعين، والصحيح (و في حاشية الحموي: قوله: "و الصحيح الخ" قيل لا يلزم إذا نوى أن يضحي ولم يتلفظ وقت الشراء لها لو كان المشتري غنيا لا تجب باتفاق الروايات، فله بيعها، وإن كان فقيرا ذكر في الشافي: أنها تتعين بالنية و عند الجمهور: لا، إلا أن قول بلسانه علي أن أضحي بها) أنها تتعين مطلقا. (الأشباه والنظائر مع حاشية الحموي: ۹۰/۱، الأولى: لا ثواب إلا بالنية، ت: المفتي محمد يوسف التاؤلوي، ط: مكتبة فقيه الأمة-ديوبند)

[۱] لا يشارك المضحي فيما يحتمل الشركة من لا يريد القربة رأسا، فإن شارك لم يجز عن الأضحية، و كذا هذا في سائر القرب إذا شارك المتقرب من لا يريد القربة لم تجز عن القربة، ولو أرادوا القربة - الأضحية أو غيرها من القرب - أجزأهم سواء كانت القربة واجبة أو تطوعا، أو وجب على البعض دون البعض، وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت، بأن أراد بعضهم الأضحية، وبعضهم جزاء الصيد، وبعضهم هدي الإحصار، وبعضهم كفارة عن=

لہٰذا اگر آپ کی مراد صدقہ سے نفلی قربانی ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، بڑے جانور میں ایک حصہ نفلی قربانی کے لیے بھی رکھ سکتے ہیں۔ اور مالدار پر ایک حصہ یا ایک چھوٹا جانور قربان کرنا واجب ہے، لیکن اگر ایک سے زیادہ ۳-۴-۵-۶ بلکہ تنہا بڑا جانور قربان کرتا ہے، تو جائز ہے، بل کہ ثواب کا کام ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں ۱۰۰/ اونٹوں کی قربانی کی تھی، (۲) پس قربانی کے ایام میں صدقۂ نافلہ نفل قربانی میں شامل ہوجائے گا، اور قربانی کے ایام میں قربانی ہی کی نیت سے ذبح کرنے میں زیادہ ثواب ہے۔ (۳)

اور اگر صدقہ سے آپ کی مراد واجب صدقہ: منت وغیرہ ہے، تو نیت کیسے اور کس طرح کی ہے؟ اس کی تفصیل لکھیے، ان شاء اللہ جواب دیا جائے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] قربانی میں شریک کا بہ وقت ذبح اپنی حاضری کی شرط سے متعلق ایک تحقیقی مسئلہ

۱۹۸۲- سوال: مکرم ومحترم جناب مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

=شيء أصابه في إحرامه، وبعضهم هدي التطوع، وبعضهم دم المتعة أو القران، وهذا قول أصحابنا الثلاثة- رحمهم الله تعالى-، وكذلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل، كذا ذكر محمد - رحمه الله تعالى - في نوادر الضحايا، ولم يذكر ما إذا أراد أحدهم الوليمة وهي ضيافة التزويج وينبغي أن يجوز. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۴، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ط: دار الفكر - بيروت☆بدائع الصنائع: ۵/ ۷۱، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) . . . مجاهدا، يقول: حدثني ابن أبي ليلى، أن عليا رضي الله عنه حدثه قال: أهدى النبي صلى الله عليه وسلم مائة بدنة، فأمرني بلحومها، فقسمتها ثم أمرني بجلالها فقسمتها، ثم بجلودها فقسمتها. (صحيح البخاري: ۱/ ۲۳۲، رقم الحديث: ۱۷۱۸، كتاب الحج، باب: يتصدق بجلال البدن، ط: ديوبند)

(۳) عن عائشة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ما عمل آدمي من عمل يوم النحر أحب إلى الله من إهراق الدم، إنه ليأتي يوم القيامة بقرونها وأشعارها وأظلافها، وأن الدم ليقع من الله بمكان قبل أن يقع من الأرض، فطيبوا بها نفسا. (سنن الترمذي: ۱/ ۲۷۵، رقم الحديث: ۱۴۹۳، أبواب الأضاحي، باب ما جاء في فضل الأضحية، ط: ديوبند☆ سنن ابن ماجه: ۱/ ۲۲۶، رقم الحديث: ۳۱۲۶، كتاب الأضاحي، باب ثواب الأضحية، ط: ديوبند)

قال (والأضحية أحب إلي من التصدق بمثل ثمنها) والمراد في أيام النحر؛ لأن الواجب التقرب بإراقة الدم، ولا يحصل ذلك بالتصدق بالقيمة. (المبسوط- محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي (م: ۴۸۳هـ): ۱۲/ ۱۳، كتاب الذبائح، باب الأضحية، أول وقت الأضحية، ط: دار المعرفة - بيروت)

درخواست ہے کہ ایک مسئلہ درپیش ہے، جس کی طرف توجہ منعطف فرما کر نقلاً یا عقلاً (قیاساً) تحقیق فرمادیں:

واقعہ: قربانی کے شرکاء میں سے ایک شریک نے کہا تھا کہ میری غیبوبت میں جانور ذبح نہ کیا جائے، جب ذبح کریں، تو مجھے بلا کر میری حاضری میں ذبح کریں، چناں چہ دسویں ذی الحجہ کو ذبح کے لیے اسے بلایا گیا، تو وہ گھر میں نہیں تھا، شرکاء نے توقف کر کے گیارہویں ذی الحجہ کو ذبح کرنا چاہا، تو پھر اس کو بلایا، معلوم ہوا کہ وہ گاؤں سے باہر کہیں گیا ہوا ہے، بالآخر شرکاء نے جانور ذبح کر ڈالا، بعد ازیں بارہویں ذی الحجہ کو شام کے وقت وہ آ گیا۔

فقہ میں جزئیات کا احاطہ مشکل بل کہ مستبعد ہے، تاہم فقہائے امت نے حتی الوسع کثیر تعداد میں جزئیات محتملہ بڑی حد تک محنت کر کے قلم بند کیے ہیں، مگر چوں کہ واقعہ مذکورہ کی نوعیت ایک ایسی عجیب وغریب ہے کہ شاید ہی کتب فقہ میں مذکور ہو۔

اصول وقیاس: از روئے قیاس اگر چہ شرکاء میں سے کسی ایک کے سکوت اور غیبوبت کو دلالۃً اجازت پر محمول کیا جاسکتا تھا، مگر چوں کہ اس غائب شریک کی جانب سے پہلے ہی سے صراحۃً ممانعت ہے، لہٰذا اس کی طرف سے بلا اجازت ذبح کیے گئے جانور کی قربانی صحیح نہیں ہونی چاہیے، اور جب ایک شریک کی قربانی صحیح نہیں ہوئی، تو کسی کی بھی قربانی صحیح نہیں ہونی چاہیے۔

ضمان: قربانی کے درست نہ ہونے کی صورت میں اب تصدق بالقیمت واجب ہو، تو بہ ظاہر کہا جاسکتا ہے کہ اس شریک کی وجہ سے دوسروں کی قربانی درست نہیں ہوئی ہے، اس لیے وہ دوسروں کو ضمان ادا کرے، مگر شرکاء نے چوں کہ عجلت کی اور ایام نحر کے اختتام تک توقف اور انتظار نہ کیا؛ اس لیے ضمان عائد نہ ہونا چاہیے، البتہ پورے توقف کے بعد بھی وہ شخص حاضر نہ ہوتا، تب ضمان عائد ہوسکتا ہے۔ اسی طرح بالعکس شرکاء نے عدم توقف تام [عجلت] سے کام لیا؛ اس لیے ذبیحہ بے کار رہا، تو شرکاء، اس شخص کو ضمان ادا کریں گے یا نہیں؟

پس ذیل میں کچھ نظریہ کی طرف توجہ مبذول کر کے استصواب مطلوب ہے: ۱- ذبیحہ بے کار رہا، ۲- شرکاء اس شخص کو ضمان ادا کریں، ۳- تصدق بالقیمت واجب ہو، امید ہے غور وفکر کر کے تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں اضحیہ کو قربانی کی نیت سے خریدا گیا، یا خریدنے کے بعد زبان سے نیت کی گئی، ان دونوں صورتوں میں مذکورہ جانور، قربانی کا شمار ہوگا اور تمام شرکاء کی قربانی ہو جائے گی۔

(۱) وعن محمد - رحمه الله تعالى - في المنتقى: إذا اشترى شاة ليضحي بها وأضمر نية التضحية عند الشراء تصير أضحية كما نوى. (عالم گیری: ۵/۱۱۲)[1]

فأما إذا اشترى شاة، ثم أوجبها أضحية بلسانه - وهو الوجه الثالث - تصير أضحية في قولهم، كذا في فتاوى قاضي خان. (عالم گیری: ۵/۱۱۳)[2]

(۲) ولو ذبح أضحية غيره عن المالك بغير أمره صريحا يقع عن المالك، ولا ضمان على الذابح استحسانا. (عالم گیری ۵/۱۱۵)[3]

معلوم ہوا کہ شریک نے شرکاء سے مشورہ کر کے کسی جانور میں کوئی متعین حصہ خریدا، تو وہ حصہ قربانی کے لیے متعین ہو گیا، جہاں تک بات ہے اضحیۂ غیر کو اس کی اجازت کے بغیر ذبح کرنے کی، تو واضح رہے کہ جزئیہ ثانی [غیر کی قربانی، مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کی، تو استحسانا ضمان لازم نہیں آئے گا] کی روشنی میں استحساناً ذابح پر کوئی ضمان نہیں آئے گا؛ اس لیے کہ اضحیہ کو تو ذبح کرنا ہی تھا، ذابح نے مالک کی اعانت کی کہ اس کے اضحیہ کو ذبح کر دیا؛ لہٰذا ضمان ذابح پر لازم نہیں آئے گا۔(۴)

---

[۱] الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۵/۲۹۴، كتاب الأضحية، الباب الثاني في وجوب الأضحية بالنذر وما هو في معناه، ط: دار الفكر.

[۲] المصدر السابق.

[۳] الفتاوى الهندية- لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي: ۵/۳۰۲، كتاب الأضحية، الباب السابع في التضحية عن الغير وفي التضحية بشاة الغير عن نفسه، ط: دار الفكر.

(۴) قلت: وفي أوائل القاعدة الأولى من الأشباه: لو شراها بنية الأضحية فذبحها غيره بلا إذنه، فإن أخذها مذبوحة ولم يضمنه أجزأته، وإن ضمنه لا تجزئه، وهذا إذا ذبحها عن نفسه. أما إذا ذبحها عن مالكها فلا ضمان عليه اهـ فراجعه. (الدر المختار)ــــــ قال ابن عابدين: (قوله أما إذا ذبحها إلخ) قال في الشرنبلالية عن منية المفتي: وإذا ذبح أضحية الغير ناويا مالكها بغير أمره جاز ولا ضمان عليه اهـ وهذا استحسان لوجود الإذن دلالة كما في البدائع.... أي للاكتفاء بالنية عند الشراء فتعينت لها... واستفيد منه أنه لو كانت غير معينة لا تجزي وضمن. قال في الخانية: اشترى خمس شياه في أيام الأضحية، وأراد أن يضحي بواحدة منها، إلا أنه لم يعينها فذبح=

قیاس کا تقاضہ ہے کہ ذابح کو ضمان ادا کرنا چاہیے، مگر استحسان کو ترجیح دی گئی ہے؛ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر چہ شریک حاضر نہیں، مگر جب شرکاء نے مذکورہ شریک کو حصہ دار بنا کر اضحیہ میں سہیم (شریک) بنالیا اور شریک صاحب حصہ بن گیا، اور شرکت خود شرکاء کے لیے اجازت ہے، اور فقہ کا جزئیہ نمبر ۲ رملا، کہ مالک کی صراحتاً اجازت کے بغیر اضحیہ کو کسی فضولی نے ذبح کر دیا، تو اصل مالک کی طرف سے قربانی صحیح ہوگئی؛ لہٰذا ضمان کا مسئلہ لازم نہیں آئے گا۔

اور آپ نے جس پر قیاس کیا ہے، وہ مضحی (قربانی کرنے والے) کی اجازت کے بغیر، اس کی واجب قربانی، کرنے کے متعلق ہے، جہاں نہ نیت ہے اور نہ ہی قربانی کا جانور متعین ہے، جب کہ صورت مسئولہ میں اضحیہ متعین ہے، نیت اضحیہ موجود ہے، فقط وقت کی اجازت مطلوب ہے، شرکاء نے وقت کی اجازت کی رعایت شریک سے حاصل نہیں کی ہے، مگر قربانی کی نیت بوجہ اشتراء کے موجود ہے؛ لہٰذا مالک کی طرف سے قربانی صحیح ہوجائے گی اور کسی پر ضمان لازم نہیں آئے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] بڑے جانور میں بعض حصے قربانی کے اور بعض حصے عقیقے کے

۱۹۸۳-سوال: ہم نے قربانی کے لیے بڑا جانور خریدا ہے، جس میں سات حصے ہوتے ہیں، اس میں پانچ حصے قربانی کے ہیں اور دو حصے عقیقے کے، تو قربانی اور عقیقہ دونوں صحیح ہوں گے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ رکھنا جائز ہے، جب کہ مقصد محض رضائے الٰہی ہو۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

=رجل واحدة منها يوم الأضحى بنية صاحبها بلا أمره ضمن اهـ. (تكملة رد المحتار على الدر المختار: ٣٣٠/٦، كتاب الأضحية، قبيل: فروع: لون أضحيته - عليه الصلاة والسلام - سوداء، ط: دار الفكر - بيروت ☆ درر الحكام شرح غرر الأحكام - محمد بن فرامرز بن علي الشهير بملا - أو منلا أو المولى - خسرو (م: ٨٨٥هـ): ٢٧١/١، كتاب الأضحية، ما يصح للأضحية، ط: دار إحياء الكتب العربية ☆ مجمع الضمانات - أبو محمد غانم بن محمد البغدادي الحنفي (م: ١٠٣٠هـ) ص: ٩، باب مسائل الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي)

(۱) لا يشارك المضحي فيما يحتمل الشركة من لا يريد القربة رأسا، فإن شارك لم يجز عن الأضحية، ... ولو أرادوا القربة - الأضحية أو غيرها من القرب - أجزأهم سواء كانت القربة واجبة، أو تطوعا، أو وجب على البعض =

[٥] بڑے جانور میں کچھ حصے قربانی اور کچھ حصے عقیقے کے رکھنا

۱۹۸۴- سوال: قربانی کے بڑے جانور، مثلاً: گائے، بھینس، اونٹ اور کٹڑا وغیرہ، جس میں سات حصے ہوتے ہیں، ان میں اگر پانچ حصے قربانی کے اور دو حصے عقیقے کے رکھے جائیں، اور عقیقے کے گوشت کو بھی تقسیم کر دیا جائے، تو قربانی اور عقیقہ صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

صورت مسئولہ میں بڑے جانور (جن کے سات حصے ہو سکتے ہیں) ان میں قربانی اور عقیقے دونوں کے حصے رکھنا جائز ہے، کچھ حصے قربانی کے اور کچھ حصے عقیقے کے، البتہ لازم ہے کہ کل ملا کر سات حصوں سے زیادہ نہ ہوں۔[١] قربانی یا عقیقہ کی صحت اس کے گوشت کی تقسیم پر موقوف نہیں ہے، اگر کسی نے بالکل ہی گوشت تقسیم نہیں کیا اور اپنے گھر والوں کے لیے رکھ لیا، تو کوئی گناہ نہ ہوگا۔[٢] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٦] قربانی کے جانور میں دو حصے عقیقہ کے رکھنا

۱۹۸۵- سوال: قربانی کے لیے ایک بڑا جانور ہے، اُس میں پانچ حصے قربانی کے ہیں اور دو حصے عقیقہ کے طور پر ہیں، پورے گوشت کو تقسیم کرنے کا ارادہ ہے، تو ایسی صورت میں عقیقہ اور قربانی ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اونٹ، بھینس اور گائے جیسے بڑے جانوروں میں قربانی اور عقیقہ کے حصے رکھنا جائز ہے، ۳/ یا ۴/

=دون البعض، وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت، بأن أراد بعضهم الأضحية، وبعضهم جزاء الصيد، وبعضهم هدي الإحصار، وبعضهم كفارة عن شيء أصابه في إحرامه، وبعضهم هدي التطوع، وبعضهم دم المتعة أو القران، وهذا قول أصحابنا الثلاثة رحمهم الله تعالى، وكذلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل، كذا ذكر محمد - رحمه الله تعالى - في نوادر الضحايا. (الفتاوى الهندية: ٣٠٤/٥، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ط: دار الفكر-بيروت ☆ رد المحتار على الدر المختار: ٣٢٦/٦، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر-بيروت)

(١) سوال سابق کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

(٢) ولو تصدق بالكل جاز، ولو حبس الكل لنفسه جاز، وله أن يدخر الكل لنفسه فوق ثلاثة أيام إلا أن إطعامها والتصدق بها أفضل إلا أن يكون الرجل ذا عيال وغير موسع الحال؛ فإن الأفضل له حينئذ أن يدعه لعياله ويوسع عليهم به، كذا في البدائع. (الفتاوى الهندية: ٣٠٠/٥، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر)

حصے قربانی کے ہوں، اور دوسرے حصے عقیقہ کے ہوں، تو جائز ہے، بس شرط یہ ہے کہ کوئی حصہ ساتویں حصے سے کم نہ ہو۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] ایک قربانی کا ثواب ایک سے زائد لوگوں کو پہنچانا

۱۹۸۶- سوال: تین مسئلے دریافت کرنے ہیں:

(۱) ایک شخص نے ایک بکرے کی قربانی یا ایک بڑے جانور میں ایک حصہ رکھا اور اس کا ثواب اس نے ایک سے زائد لوگوں پہنچایا، تو کیا قربانی صحیح ہوگی یا نہیں؟

(۲) ایک سے زائد آدمیوں نے مل کر تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کیے، اس کا ایک بکرا خریدا یا ایک بڑے جانور کے سات حصوں میں سے ایک حصہ خریدا اور اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے قربانی کی، تو یہ صورت صحیح ہوگی یا نہیں؟

(۳) ایک سے زائد لوگوں نے کچھ رقم جمع کی اور اس کا ایک بکرا یا ایک بڑے جانور کا ایک حصہ خریدا اور اس کی ایک سے زائد لوگوں کی طرف سے قربانی کی، یا ایک سے زائد لوگوں کے لیے ایصال ثواب کیا، تو قربانی صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

پہلی صورت میں قربانی درست ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں ایک ہی آدمی اپنی جانب سے قربانی کر کے ایک سے زائد لوگوں کو اس کا ثواب پہنچا رہا ہے، جس طرح حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دنبہ اپنی جانب سے قربان کر کے اس کا ثواب اپنی پوری امت کو پہنچایا تھا۔[2]

---

(۱) سابقہ سوالات کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) عن جابر بن عبد الله، قال: شهدت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم الأضحى بالمصلى، فلما قضى خطبته نزل من منبره وأتي بكبش فذبحه رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده، وقال: بسم الله، والله أكبر، هذا عني، وعمن لم يضح من أمتي. (سنن أبي داود: ۱/۳۸۸، رقم الحديث: ۲۸۱۰، كتاب الضحايا، باب في الشاة يضحى بها عن جماعة، ط: ديوبند)

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے اس حدیث کی تشریح فرماتے ہوئے لکھا ہے:

و بالجملة فأبو حنيفة و من وافقه إنما يقولون بعدم وقوع شاة عن إثنتين فصاعدا، و لا يقولون بعدم جواز هبة ثوابها لأكثر من واحد. (إعلاء السنن: ۱۷/۲۱۴، كتاب الأضاحي، باب التضحية بالشاة وتشريك الغير في الثواب و إيثاره له به، ط: إدارة القران، كراتشي)

دوسری صورت بھی جائز ہے؛ کیوں کہ اس میں ایک سے زائد افراد مل کر، ایک آدمی کی جانب سے قربانی کر رہے ہیں۔

تیسری صورت میں قربانی جائز نہیں ہوگی؛ کیوں کہ اس میں متعدد افراد کی قربانی ایک حصے کی جارہی ہے، حالاں کہ ایک حصے میں صرف ایک آدمی کی ہی قربانی ہوسکتی ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[٨] جانور ذبح کرتے وقت ہر حصہ دار کے نام کے لینے کا حکم

١٩٨٧- سوال: قربانی کا ایک بڑا جانور ہے، جس کے حصے دار متعین ہیں، اور وہ سب باہر (بیرون ملک) رہتے ہیں، تو اس [جانور] کی قربانی کرتے وقت ہر حصہ دار کا نام لینا ضروری ہے یا نہیں؟ نیز قربانی کرتے وقت، دعاء پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر دعاء زبانی یاد نہ ہو، تو ذبح کرتے وقت کیا پڑھنا چاہیے؟

الجواب حامدا ومصليا:

بہتر یہ ہے کہ قربانی کرنے والا اپنے ہاتھ سے قربانی کے جانور کو ذبح کرے، اگر یہ ممکن نہ ہو، تو قربانی کے وقت خود موجود رہے اور دعا پڑھے۔[2]

---

(١) قلت: التضحية عن الغير تحتمل وجهين: أحدهما أن يكون المضحي هو الغير ويكون المباشر نائبا عنه، ومثل هذه التضحية لا يجوز بشاة واحدة عن أكثر من واحد عند أبي حنيفة وأصحابه، لما دل الدليل على أن الشاة الواحدة لا تجزيء إلا عن واحد.

والثاني أن يكون المضحي هو المباشر ويشرك غيره في الثواب أو يهديه له، ومثل هذه التضحية لا يمنعه أبو حنيفة وأصحابه لا لواحد، ولا لأكثر. (إعلاء السنن: ١٧/٢١١-٢١٢، كتاب الأضاحي، باب التضحية بالشاة وتشريك الغير في الثواب وإيثاره له به، ط: إدارة القران، كراتشي)

(٢) عن أبي قلابة، عن أنس، -وذكر الحديث-، قال: "ونحر النبي صلى الله عليه وسلم بيده سبع بدن قياما، وضحى بالمدينة كبشين أملحين أقرنين" مختصرا. (صحيح البخاري: ١/٢٣١، رقم الحديث: ١٧١٢، كتاب الحج، باب من نحر هديه بيده، ط: ديوبند)

فالأفضل أن يذبح بنفسه إن قدر عليه لأنه قربة فمباشرتها بنفسه أفضل من توليتها غيره كسائر القربات... ويستحب أن يحضر الذبح لما روي عن سيدنا علي - رضي الله عنه - أن النبي - عليه الصلاة والسلام - قال لسيدتنا فاطمة - رضي الله عنها - يا فاطمة بنت محمد قومي فاشهدي ضحيتك؛ فإنه يغفر لك بأول قطرة تقطر من دمها مغفرة لكل ذنب أما إنه يجاء بدمها ولحمها فيوضع في ميزانك وسبعون ضعفا، فقال أبو سعيد الخدري - رضي الله عنه - يا=

صورتِ مسئولہ میں ہر حصے دار کا نام لینا ضروری نہیں ہے؛ مطلق ذبح سے سب کی قربانی درست ہو جائے گی۔[۲]

ذبح کرنے والے کا ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے، یاد ہونے کے باوجود قصداً بسم اللہ ترک کر دے، تو ذبیحہ حرام ہوگا، بھول سے چھوٹ جائے، تو ذبیحہ حلال ہے۔[۳]

قربانی کی دعاء کا پڑھنا ضروری نہیں ہے، پڑھ لے، تو بہتر ہے۔[۴] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۹] بڑے جانور میں کسی شریک کا حصہ ساتویں حصے سے کم ہو تو قربانی جائز نہیں

۱۹۸۸- سوال: میرے بیٹے نے پردیس سے قربانی کرنے کے لیے تین بڑے جانور کے پیسے بھیجے ہیں، شرعی اعتبار سے ایک جانور کے سات حصے ہوتے ہیں، اس میں ایک حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھا جاتا ہے، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ تینوں جانوروں میں صرف ایک حصہ رکھنا کافی ہوگا یا پھر ہر جانور میں الگ الگ، ایک ایک حصہ رکھنا پڑے گا؟ بینوا، توجروا۔

=نبي الله هذا لآل محمد خاصة فإنهم أصل لما خصوا به من الخير أم لآل محمد وللمسلمين عامة فقال: هذا لآل محمد خاصة وللمسلمين عامة.

وفي حديث عمران بن حصين - رضي الله عنه - قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: يا فاطمة قومي فاشهدي أضحيتك، فإنه يغفر لك بأول قطرة تقطر من دمها كل ذنب عملتيه، وقولي إن صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين لا شريك له. (بدائع الصنائع: ۷۹/۵، كتاب التضحية، فصل في بيان ما يستحب قبل التضحية وبعدها وما يكره، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۲) ذبح المشتراة لها بلا نية الأضحية جازت اكتفاء بالنية عند الشراء، كذا في الوجيز للكردري. (الفتاوى الهندية: ۲۹۴/۵، كتاب الأضحية، الباب الثاني في وجوب الأضحية بالنذر وما هو في معناه، ط: دار الفكر)

(۳) (ومنها) التسمية حالة الذكر عندنا. (بدائع الصنائع: ۴۶/۵، كتاب الذبائح والصيود، فصل في بيان شرط حل الأكل في الحيوان المأكول، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ولا تحل ذبيحة تارك التسمية عمدا، وإن تركها ناسيا تحل. (الفتاوى الهندية: ۲۸۸/۵، كتاب الذبائح، الباب الأول في ركن الذبح وشرائطه وحكمه وأنواعه، ط: دار الفكر)

(۴) ويستحب أن يكون الذابح حال الذبح متوجها إلى القبلة... وأن يدعو، فيقول: اللهم منك ولك صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين لا شريك له وبذلك أمرت وأنا من المسلمين. (بدائع الصنائع: ۷۹/۵، كتاب التضحية، فصل في بيان ما يستحب قبل التضحية وبعدها وما يكره، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

الجواب حامداً و مصلیاً:

ہر جانور میں ایک حصہ رکھنے کا اگر مطلب یہ ہو کہ جانور کے سات شرکاء میں سے، ہر آدمی کا حصہ کم کر دیا جائے اور نبی کریم ﷺ کا ساتواں حصہ رکھا جائے، گویا ایک جانور میں کل آٹھ شریک ہو جائیں، اس طرح قربانی درست نہیں ہے، کیوں کہ کسی بھی شریک کا حصہ، ساتویں حصہ سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ مذکورہ صورت میں تمام شرکاء کے حصے کم ہو گئے۔ (۱)

ہاں اگر یہ مطلب ہو کہ تین جانوروں میں سے کسی ایک جانور میں پورا ساتواں حصہ نبی کریم ﷺ کے لیے رکھا جائے، اور دیگر چھ یا پانچ شرکاء میں سے کسی کا حصہ ساتویں حصے سے کم نہ ہو، تو یہ جائز ہے۔ (۲)

تینوں جانور میں سے ہر ایک میں یا کسی ایک میں، نبی کریم ﷺ کے لیے حصہ رکھنا لازم وضروری نہیں ہے، یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ بڑے جانور کی قربانی اسی وقت درست ہوگی، جب کہ نبی پاک ﷺ کا اس میں حصہ رکھا جائے، تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے، البتہ ایک صاحب ایمان کے لیے بہتر ہے کہ استطاعت ہو تو نبی کریم ﷺ کی طرف سے بھی قربانی کرے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، نبی کریم ﷺ کی جانب سے قربانی کیا کرتے تھے۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وإذا كان الشركاء في البدنة أو البقرة ثمانية لم يجزهم؛ لأن نصيب أحدهم أقل من السبع، وكذلك إذا كان الشركاء أقل من الثمانية إلا أن نصيب أحدهم أقل من السبع، بأن مات الرجل وترك امرأة وابنا وبقرة فضحى بها يوم العيد لم يجز؛ لأن نصيب المرأة أقل من السبع فلم يجز في نصيبها ولم يجز في نصيب الابن أيضا، كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۵، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ط: دار الفكر - بيروت)

(۲) يجب أن يعلم أن الشاة لا تجزئ إلا عن واحد، وإن كانت عظيمة، والبقر والبعير يجزي عن سبعة إذا كانوا يريدون به وجه الله تعالى، والتقدير بالسبع يمنع الزيادة، ولا يمنع النقصان، كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۴، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ط: دار الفكر - بيروت)

(۳) عن حنش، قال: رأيت عليا يضحي بكبشين فقلت له: ما هذا؟ فقال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم أوصاني أن أضحي عنه فأنا أضحي عنه. (سنن أبي داود: ۱/ ۳۸۵، رقم الحديث: ۲۷۹۰، كتاب الضحايا، باب الأضحية عن الميت، ط: ديوبند)

ولما ثبت أنه - صلى الله تعالى عليه وسلم - أوصى عليا - رضي الله تعالى عنه - بأن يضحي عنه، وذلك دليل حبه - صلى الله تعالى عليه وسلم - التضحية عنه - صلى الله تعالى عليه وسلم -، فينبغي لمن وجد سعة أن يضحي عن حبيبه ونبيه - صلى الله تعالى عليه وسلم - كل عام ولو بشاة أو بسبع بقرة. (إعلاء السنن: ۱۷/ ۲۷۲، كتاب الأضاحي، باب التضحية عن الميت، ط: إدارة القرآن - كراتشي)

=

[۱۰] قربانی کے ایک مسئلہ کا صحیح مطلب

۱۹۸۹- سوال: درج ذیل مسئلہ کا صحیح مطلب سمجھائیں، اور درج ذیل مطالب میں سے کون سا مطلب صحیح ہے اور کون سا غلط، اس کی تعیین فرمائیں:

مسئلہ یہ ہے کہ: گائے بھینس اور اونٹ میں سات آدمی شریک ہو کر قربانی کریں، تو درست ہے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ کسی کا حصہ ساتویں حصے سے کم نہ ہو، اگر کسی کا حصہ ساتویں حصہ سے کم ہوگا، تو قربانی درست نہ ہوگی، نہ اس کی، جس کا حصہ مکمل [کم از ساتواں حصہ] ہے، اور نہ اس کی، جس کا حصہ ساتویں حصے سے کم ہے، اس مسئلے میں جو یہ بات ہے کہ کسی کا حصہ ساتویں حصے سے کم نہ ہو، اس کا کیا مطلب ہے؟

(۱) زید کا کہنا ہے کہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ساتویں حصہ سے کسی کا حصہ کم نہ ہو، یعنی سب کے پیسے برابر ہونے چاہئیں، مثلاً قربانی کا جانور ۷۰۰۰ روپیہ کا ہے، تو ہر ایک کے حصہ میں ۱۰۰۰ روپیہ آنے چاہئیں، اس مقدار سے کم یا زیادہ کسی کے حصے میں ہوگا، تو کسی کی قربانی ادا نہ ہوگی۔

(۲) عمرو کا کہنا یہ ہے کہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ساتویں حصہ سے کسی کا حصہ کم نہ ہو، مثلاً ۳۵ کلو کا جانور ہو، تو ہر ایک کے حصہ میں ۵ کلو گوشت جانا چاہیے، ورنہ کسی کی بھی قربانی صحیح نہ ہوگی۔

(۳) بکر کا کہنا ہے کہ ساتویں حصہ سے کسی کا حصہ کم نہ ہو، مثلاً ایک جانور میں ۸ افراد شریک ہیں، اس طور پر کہ ساتویں اور آٹھویں آدمی کا آدھا آدھا حصہ ہے، تو ان دونوں آدمیوں کا حصہ ساتویں حصے سے کم ہوا، یا مثلاً ایک جانور آٹھ آدمیوں کے درمیان برابر مشترک ہے، تو سب کے حصے ساتویں حصہ سے کم ہوئے؛ لہٰذا کسی کی بھی قربانی صحیح نہ ہوگی۔

(۴) خالد کی رائے [جو درحقیقت محاکمہ ہے] یہ ہے کہ زید [پہلے مطلب کا قائل] کا کہنا غلط ہے؛ کیوں کہ مذکورہ مسئلہ میں مصنف نے پیسہ میں کمی بیشی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، اس مسئلہ اور بیان کردہ مسئلہ؛

= وختم ابن السراج عنه - صلى الله عليه وسلم - أكثر من عشرة آلاف ختمة، وضحى عنه مثل ذلك. اهـ....
قلت: وقول علمائنا له أن يجعل ثواب عمله لغيره يدخل فيه النبي - صلى الله عليه وسلم - فإنه أحق بذلك حيث أنقذنا من الضلالة، ففي ذلك نوع شكر وإسداء جميل له، والكامل قابل لزيادة الكمال. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۴، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب في إهداء ثواب القراءة للنبي صلى الله عليه وسلم، ط: دار الفكر)

دونوں میں کوئی تعلق نہیں ہے، دونوں مسئلے بالکل الگ الگ ہیں، اسی طرح عمرو کا بیان کیا ہوا مطلب بھی غلط ہے؛ کیوں کہ گوشت کے برابر حصہ کرنے کے بارے میں بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔

تو اب مسئلہ کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ساتوں آدمیوں کے حصے پورے اور مکمل ہونے چاہئیں، اس سے کم حصے نہ ہونے چاہئیں؛ لہٰذا ساتویں حصہ سے کسی کا بھی حصہ کم ہوگا، تو کسی کی قربانی صحیح نہ ہوگی، اس مطلب کے مطابق (۳) بکر کا کہنا کچھ صحیح ہے؛ لیکن اس میں آٹھ حصے فرض کرنے پڑتے ہیں اور مسئلہ میں سات کی شرکت کے متعلق گفتگو ہے اور آٹھ کی شرکت کا مسئلہ آگے بیان کیا گیا ہے؛ لہٰذا سب سے زیادہ صحیح مطلب وہی ہے، جس کو صاحب عنایہ نے پیش کیا ہے کہ میت نے ایک لڑکا اور بیوی کو چھوڑا اور ترکہ میں ایک گائے ہے، اب یہ دونوں وارث گائے کی قربانی کریں، تو کسی کی قربانی درست نہیں ہوگی؛ کیوں کہ بیوی کا آٹھواں حصہ یعنی ساتویں حصہ سے کم ہے۔

اب خالد پر زید، عمرو اور بکر اعتراض کرتے ہیں کہ خالد کا مطلب بالکل غلط ہے، وجہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ میراث کے متعلق ہے، اس کو قربانی کے مسئلہ کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ تو خالد نے جواب دیا کہ میں اپنا مسئلہ بیان نہیں کرتا، بل کہ صاحب عنایہ نے اس مثال کو پیش کیا ہے اور وہ بھی قربانی کی ہی ہے۔

انتہائی ادب کے ساتھ درخواست ہے کہ ان چار آدمیوں میں سے کس کا مطلب صحیح اور درست ہے اس کی دلائل کے ساتھ وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداو مصلیا:

نمبر ۳/ اور ۴/ کے قائلین کا بیان کردہ مطلب درست ہے، فقہاء کرام نے صراحۃً لکھا ہے کہ بڑے جانور جیسا کہ گائے بھینس اور اونٹ میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں، کسی ایک کا بھی ساتویں حصہ سے کم ہو گا تو کسی کی بھی قربانی درست نہیں ہوگی، مذکور قاعدے کے مطابق نمبر (۳) میں جو مثال دی ہے وہ صحیح ہے، نمبر (۴) میں جو مثال پیش کی ہے، اس کو خلاصۃ الفتاوی حصہ ۴ صفحہ ۳۱۵ پر بیان کیا گیا ہے؛ لہٰذا دونوں مطلب صحیح ہے۔ نمبر ۴ کے مسئلہ کو میراث کے مسئلہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، شوہر کی موت کی وجہ سے عورت گائے کے آٹھویں حصہ کی مالک ہے اس وجہ سے قربانی صحیح نہیں ہوگی۔

نمبر ۳/ کے مطابق ساتواں اور آٹھواں فریق، ساتویں حصہ سے کم کا مالک ہے، اس وجہ سے قربانی

درست نہ ہوگی، مذکورہ مسئلہ کو خلاصۃ الفتاوی، حصہ ۴، صفحہ ۳۱۵ پر [۱] اور بدائع الصنائع حصہ ۵، صفحہ ۷۱ پر [۲] قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے:

(۱) ساتویں حصہ سے کسی ایک کا بھی کم حصہ نہ ہونا چاہئے۔

(۲) ساتویں حصہ سے زائد ہو یعنی ۴، ۵، ۶ آدمی مل کر اونٹ کی قربانی کریں، تو جائز ہے۔

(۳) پانچ آدمی مل کر سات اونٹ کی قربانی کریں، تو جائز ہے۔

(۴) سات آدمی مل کر سات اونٹ کی قربانی کریں، تو جائز ہے۔

(۵) آٹھ آدمی مل کر ایک اونٹ کی قربانی کریں، تو جائز نہیں ہے۔

(۶) آٹھ آدمی مل کر سات گائے کی قربانی کریں، تو جائز نہیں ہے۔ اس پر صاحب بدائع الصنائع دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر گائے میں ہر آدمی کا حصہ ساتویں حصے سے کم ہوگا؛ لہٰذا ایسی صورت میں کسی کی قربانی نہیں ہوگی۔

(۷) کچھ آدمیوں نے سات گائے مل کر خریدی۔ (ہر گائے میں دس شرکاء ہیں) تو بھی قربانی جائز

---

(۱) والتقدير بالسبع يمنع الزيادة، ولا يمنع النقصان؛ حتى لو كانت الشركاء في البدنة أو البقرة ثمانية لم يجزهم، ولو كانوا أقل من ثمانية إلا نصيب واحد منهم أقل من السبع لا يجوز أيضا، بيانه: مات الرجل و ترك إمرأة و ابنا و بقرة، فضحيا بها لا يجوز. (خلاصة الفتاویٰ- طاهر بن عبد الرشيد البخاري: ۳۱۵/۴، الفصل الرابع فيما يجوز الأضحية وفيما لا يجوز، ط: المكتبة الأشرفية- ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۳۰۵/۵، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ط: دار الفكر)

[۲] ولا شك في جواز بدنة أو بقرة عن أقل من سبعة بأن اشترك اثنان أو ثلاثة أو أربعة أو خمسة أو ستة في بدنة أو بقرة؛ لأنه لما جاز السبع فالزيادة أولى، وسواء اتفقت الأنصباء في القدر أو اختلفت؛ بأن يكون لأحدهم النصف وللآخر الثلث ولآخر السدس بعد أن لا ينقص عن السبع ولو اشترك سبعة في خمس بقرات أو في أكثر فذبحوها أجزأهم؛ لأن لكل واحد منهم في كل بقرة سبعها، ولو ضحوا ببقرة واحدة أجزأهم فالأكثر أولى ولو اشترك ثمانية في سبع بقرات لم يجزهم؛ لأن كل بقرة بينهم على ثمانية أسهم فيكون لكل واحد منهم أنقص من السبع، وكذلك إذا كانوا عشرة أو أكثر فهو على هذا.

ولو اشترك ثمانية في ثمانية من البقر فضحوا بها لم تجزهم؛ لأن كل بقرة تكون بينهم على ثمانية أسهم، وكذلك إذا كان البقر أكثر لم تجزهم. (بدائع الصنائع: ۷۱/۵، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

نہیں ہے، کسی کی بھی قربانی ادا نہیں ہوگی۔

(۸) اسی طرح آٹھ آدمی آٹھ گائے خریدیں (ہر گائے میں آٹھ شرکاء) تو کسی کی بھی قربانی ادا نہ ہوگی؛ کیوں کہ ہر گائے میں ہر ایک کا حصہ ساتویں حصے سے کم ہوگا؛ لہٰذا درست نہیں ہے۔ (بدائع الصنائع: جلد:۵، صفحہ ۷۱)[۲]

نمبر ایک (۱) کا کہنا بھی درست ہوسکتا ہے، اس طور پر کہ ۷۰۰۰/روپیہ کے جانور میں ۷/شرکاء ہیں، اور کسی کا بھی ۱۰۰۰/روپیہ سے کم کا حصہ نہیں ہے، تو گویا ایک جانور میں سات شریک ہوئے، اور کسی کا حصہ ساتویں حصے سے کم نہیں ہوا، تو قربانی درست ہوگی، لیکن یہ قاعدہ بعض صورتوں میں ٹوٹ سکتا ہے، مثلاً ۵۰۰ روپیہ میں دوسرے آدمیوں کو بھی شریک کرنے کی نیت سے زید نے ایک جانور خریدا، چھ آدمیوں کے پاس سے ۱۰۰، ۱۰۰ روپیہ وصول کیے، ساتواں شریک زید کا استاذ ہے۔ ان کے پاس سے ۱۰۰ سے کم رقم وصول کی یا ۱۰۰ روپیہ طے کر کے ۷۵ روپیہ وصول کئے اور ۲۵ روپیہ امداد کے طور پر نہیں لیے، تو ۷۵ روپیہ لینے کے باوجود قربانی درست ہے، رقم کا برابر ہونا ضروری نہیں ہے، ساتواں حصہ ہونا ضروری ہے، ساتویں حصہ سے زائد رقم ہو، تو جائز ہے، مثلاً پانچ آدمی مل کر قربانی کریں، تو درست ہے۔

بہر حال نمبر (۱) کا مطلب درست نہیں ہے نمبر دو پر عمرو کا کہنا بالکل صحیح نہیں ہے، اس کا تعلق شریک کے مابین گوشت کی تقسیم سے ہے، کہ اندازے سے گوشت تقسیم کرنا درست نہیں ہے، اگر تقسیم کریں گے، تو قربانی تو درست ہو جائے گی، لیکن اٹکل سے گوشت تقسیم کرنا درست نہیں ہے۔ (خلاصۃ الفتاوی جلد ۵ صفحہ ۳۱۵)

شامی، عالمگیری، وغیرہ کتابوں میں لکھا ہے کہ شرکاء کا اٹکل (اندازہ) سے گوشت کی تقسیم کرنا درست نہیں ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۳) ويقسم اللحم وزنا لا جزافا إلا إذا ضم معه الأكارع أو الجلد) صرفا للجنس لخلاف جنسه. (الدر المختار)

قال ابن عابدين: (قوله لا جزافا) لأن القسمة فيها معنى المبادلة، ولو حلل بعضهم بعضا قال في البدائع: أما عدم جواز القسمة مجازفة فلأن فيها معنى التمليك واللحم من أموال الربا فلا يجوز تمليكه مجازفة.______ وأما عدم جواز التحليل؛ فلأن الربا لا يحتمل الحل بالتحليل، ولأنه في معنى الهبة وهبة المشاع فيما يحتمل القسمة لا تصح اهـ... (قوله إلا إذا ضم معه إلخ) بأن يكون مع أحدهما بعض اللحم مع الأكارع ومع الآخر البعض مع البعض مع الجلد عناية. (رد المحتار على الدر المختار: ٦/ ٣١٧- ٣١٨، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر - بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ٥/ ٣٠٦، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ط: دار الفكر)

عن جابر بن عبد الله - رضي الله عنه - ، قال: شهدت مع رسول الله - صلى الله عليه وسلم - الأضحى بالمصلى، فلما قضى خطبته نزل من منبره، وأتي بكبش فذبحه رسول الله - صلى الله عليه وسلم - بيده، وقال: بسم الله، والله أكبر، هذا عني، وعمن لم يضح من أمتي. (سنن أبي داود: ۳۸۸/۲، رقم الحديث: ۲۸۱۰، كتاب الضحايا، باب في الشاة يضحى بها عن جماعة، ط: ديوبند☆سنن الترمذي: ۲۷۸/۱، رقم الحديث: ۱۵۲۱، أبواب الأضاحي، باب بلا عنوان، قبل باب من العقيقة، ط: ديوبند)

باب الأضحية عن الغير

[دوسرے کی جانب سے قربانی]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب الأضحية عن الغير

[دوسرے کی جانب سے قربانی]

[أ] مرحومین کے نام کی قربانی کرنا اور اپنی قربانی نہ کرنا

۱۹۹۰- سوال: میں الحمد للہ صاحب نصاب ہوں، اپنی طرف سے قربانی نہ کر کے اپنے مرحومین کی طرف سے قربانی کرتا ہوں، سوال یہ ہے کہ میں مرحومین کی طرف سے قربانی کرنے کے باوجود مجھے اپنی جانب سے بھی قربانی کرنی ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

قربانی صاحب مال پر واجب ہے، چوں کہ آپ صاحب نصاب ہیں، اس لیے آپ پر اپنی طرف سے قربانی کرنا واجب ہے، مرحومین کی طرف سے قربانی کرنے کی وجہ سے آپ کی واجب قربانی ادا نہیں ہوگی، آپ کو اپنی قربانی اپنی نیت سے ادا کرنی پڑے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) تجب عن نفسه؛ لأنه اصل في الوجوب عليه. على مابيناه. (الهداية: ۴/۴۴۴، كتاب الأضحية، ط: مكتبه رحمانيه لاهور ☆البحر الرائق: ۸/۳۱۹، كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب - ديوبند)

[۲] حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے اور میت کی جانب سے قربانی کرنا

۱۹۹۱- سوال: کیا حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے اور میت کی جانب سے قربانی کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: میت کی جانب سے قربانی ادا نہیں ہوگی، جیسا کہ المجموع میں ہے:

لو ضحى عن غيره بغير إذنه لم يقع عنه (وأما) التضحية عن الميت فقد أطلق أبو الحسن العبادي جوازها لأنها ضرب من الصدقة والصدقة تصح عن الميت وتنفعه وتصل إليه بالإجماع.

وقال صاحب العدة والبغوي لا تصح التضحية عن الميت إلا أن يوصي بها وبه قطع الرافعي في المجرد والله أعلم. (۲۲۲/۸)[۱]

فتح الوھاب میں مذکور ہے:

"ولا تضحية لأحد عن آخر بغير إذنه ولو "كان" ميتا" كسائر العبادات بخلاف ما إذا أذن له كالزكاة وصورته في الميت أن يوصي بها. (۱۸۹/۲)[۲]

اور مصباح [منہاج] الطالبین وعمدۃ المفتین میں بھی ہے:

ولا تضحية عن الغير بغير إذنه ولا عن ميت إن لم يوص بها. (۱۳۱)[۳]

نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے بھی قربانی نہیں کر سکتے، کوتاہ علم کی رائے کے مطابق کتبِ شافعیہ میں اِس بارے میں کوئی صراحت منقول نہیں ہے، مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے قربانی ادا ہو جاتی ہے، اور اُن لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں، لیکن کوتاہ علم کی رائے یہ ہے کہ حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام اگرچہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں، لیکن غیر کی جانب

---

[۱] المجموع شرح المهذب - أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م:۶۷۶ھ):۴۰۶/۸، باب الأضحية، ط: دار الفكر.

[۲] فتح الوهاب بشرح منهج الطلاب - زكريا بن محمد بن أحمد بن زكريا الأنصاري، زين الدين أبو يحيى السنيكي (م:۹۲۶ھ): ۲/ ۲۳۳، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر للطباعة والنشر.

[۳] منهاج الطالبين وعمدة المفتين في الفقه - أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي (م:۶۷۶ھ)،ص: ۳۲۱، كتاب الأضحية، ت: عوض قاسم أحمد عوض، ط: دار الفكر.

سے قربانی کے صحیح ہونے کے لیے اُس کی اِجازت ضروری ہے، جیسا کہ کتبِ شافعیہ میں "بغیر إذنه" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، تو ظاہری بات ہے کہ اِجازت کا تعلق تو زندہ لوگوں کے ساتھ ہے، اور انبیاءِ کرام علیہم السلام زندہ تو ہیں، لیکن اُن کی اِجازت معلوم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، تو پھر اُن کی جانب سے قربانی کیسے درست ہوگی؟

البتہ کوتاہ علم کی رائے کے مطابق حضورِ پاک ﷺ کی جانب سے بالخصوص قربانی ادا ہو جائے گی، اور دلیل اُس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عمل ہے، کتاب الحاوی للفتاویٰ میں یہ عبارت منقول ہے:

الجواب: قال الإمام أحمد في مسنده: ثنا أسود بن عامر قال: ثنا شريك عن أبي الحسناء، عن أبي الحكم، عن حنش، عن علي بن أبي طالب - رضي الله عنه - قال: أمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أضحي عنه، فأنا أضحي عنه أبدا، وقال ابن أبي الدنيا في كتاب الأضاحي: حدثنا أبو بكر بن أبي شيبة، ثنا شريك عن أبي الحسناء، عن الحكم، عن حنش، عن علي قال: أمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أضحي عنه بكبش، فأنا أحب أن أفعله، وقال أبو داود في سننه: ثنا عثمان بن أبي شيبة، ثنا شريك عن أبي الحسناء، عن الحكم، عن حنش قال: رأيت عليا يضحي بكبشين، فقلت له: ما هذا؟ فقال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم أوصاني أن أضحي عنه، فأنا أضحي عنه.

وقال الترمذي في جامعه، وابن أبي الدنيا معا، ثنا محمد بن عبيد المحاربي الكوفي، ثنا شريك عن أبي الحسناء، عن الحكم، عن حنش، عن علي أنه كان يضحي بكبشين، أحدهما عن النبي صلى الله عليه وسلم، والآخر عن نفسه، فقيل له: فقال: أمرني به - يعني النبي صلى الله عليه وسلم - فلا أدعه أبدا.

قال الترمذي: هذا حديث غريب، لا نعرفه إلا من حديث شريك انتهى، وقد نص على هذه المسألة بخصوصها من المالكية القاضي أبو بكر بن العربي في الأحوذي، ومن أصحابنا الشافعية أبو الحسن العبادي، والقفال في فتاويه، وجزم القفال بأنه لا يجوز للمضحي أن يأكل منها شيئا، وكذا قال ابن العربي: وعلله بأن الذابح لم يتقرب بها عن نفسه، وإنما تقرب بها عن غيره، فلم يجز له أن يأكل من حق الغير شيئا، وكذا نقله الترمذي في جامعه عن ابن المبارك قال: فإن ضحى فلا يأكل منها شيئا، ويتصدق بها كلها، قال البلقيني في تصحيح المنهاج: حديث علي إن صح محمول على أنه

خصوصية للنبي صلى الله عليه وسلم. (۱/۳۲۰)[1]

مذکور جواب صحیح ہو تو دستخط فرمائیں، ورنہ آپ کے نزدیک جو حکم صحیح ہو، اُس کی جانب مدلل و مفصل رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

احناف کے یہاں بہ نیتِ قربت قربانی جائز ہے، خواہ وصیت یا اذن ہو یا نہ ہو؛[2] اِس لیے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کی جانب سے ایک مستقل قربانی فرمائی ہے، حالاں کہ اُمت کے بہت سے افراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ ہی میں فوت ہو چکے تھے۔[3]

شوافع کے نزدیک بلا وصیت و اذن جائز نہیں ہے، حضرت علیؓ والی روایت کو شوافع وصیت پر محمول کرتے ہیں، اِس صورت میں جواز صرف حضرت علیؓ کے لیے مخصوص ہوگا، اور اگر اذنِ آمر پر محمول کریں، تو شوافع کے مسلک کے مطابق اذن کے ساتھ قربانی درست رہے گی۔[4] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] الحاوي للفتاوي-عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م:۹۱۱ھ):۱/۲۹۲- ۲۹۳، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر للطباعة والنشر-بيروت۔

اس جواب کا سوال یوں مذکور ہے:

مسألة: وردت من المغرب، فيما ذكره الشيخ أبو عبد الله البلالي في "مختصر الإحياء" حيث قال في كتاب الأضحية: وتتأكد الأضحية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، وقد بحثنا عن هذا الفرع في كتب السادة المالكية، فما وجدنا ما يثلج الصدر، ويزيل اللبس، فكتبنا لكم فيه لتبينوا لنا أصله من السنة. (حوالہ سابق:۱/۲۹۲)

(۲) وذكر في الأصل إذا اشترك سبعة في بدنة فمات أحدهم قبل الذبح فرضي ورثته أن يذبح عن الميت جاز استحسانا والقياس أن لا يجوز.... ———— (وجه) الاستحسان أن الموت لا يمنع التقرب عن الميت بدليل أنه يجوز أن يتصدق عنه ويحج عنه، وقد صح أن رسول الله - صلى الله عليه وسلم - ضحى بكبشين أحدهما عن نفسه والآخر عمن لا يذبح من أمته - وإن كان منهم من قد مات قبل أن يذبح - فدل أن الميت يجوز أن يتقرب عنه فإذا ذبح عنه صار نصيبه للقربة فلا يمنع جواز ذبح الباقين. (بدائع الصنائع:۵/۷۲، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

(۳) عن جابر بن عبد الله، قال: شهدت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم الأضحى بالمصلى، فلما قضى خطبته نزل من منبره وأتي بكبش فذبحه رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده، وقال: بسم الله، والله أكبر، هذا عني، وعمن لم يضح من أمتي. (سنن أبي داود:۲/۳۸۸، رقم الحديث:۲۸۱۰، كتاب الضحايا، باب في الشاة يضحى بها عن جماعة، ط: ديوبند ☆ سنن الترمذي:۱/۲۷۸، رقم الحديث:۱۵۲۱، أبواب الأضاحي، باب بلا عنوان، قبل باب من العقيقة، ط: ديوبند)

(۴) جیسا کہ سوال کی مستدل عبارت سے واضح ہے۔

[۳] مرحومین کی طرف سے قربانی

۱۹۹۲-سوال: مرحومین کی طرف سے یعنی مرحوم والد یا کسی رشتہ دار کی طرف سے قربانی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مرحوم کی طرف سے قربانی جائز ہے اور یہ نفل قربانی شمار ہوگی، مرحوم کو اس کا ثواب پہنچے گا۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] ایک جانور میں متعدد مرحومین کی نیت کرنا

۱۹۹۳-سوال: ایک ہی جانور: بکرا، مینڈھا، یا بھینسا وغیرہ میں متعدد مرحومین کی طرف سے قربانی کی نیت درست ہے یا نہیں؟ اور اگر زندوں کی طرف سے ہو، تو ایک بکرے میں کتنوں کی گنجائش ہو سکتی ہے؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

ایک مینڈھے اور بکرے کی قربانی سے ۱۵-۲۵-۵۰، افراد کو ثواب پہنچانا جائز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قربانی کر کے تمام امت کو ثواب پہنچایا تھا؛ لہٰذا آپ اپنے تمام مرحوم رشتہ دار و متعلقین کو ایک قربانی کے ذریعہ ثواب پہنچا سکتے ہیں اور یہ نفلی قربانی ہوگی۔(۲)

---

(۱) وإن تبرع بها عنه له الأكل لأنه يقع على ملك الذابح والثواب للميت. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۳۵/۶، كتاب الأضحية، فروع: لون أضحيته-عليه الصلاة والسلام-سوداء، ط: دار الفكر-بيروت)

(۲) عن عائشة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أمر بكبش أقرن يطأ في سواد، ويبرك في سواد، وينظر في سواد، فأتي به ليضحي به، فقال لها: يا عائشة، هلمي المدية، ثم قال: اشحذيها بحجر، ففعلت: ثم أخذها، وأخذ الكبش فأضجعه، ثم ذبحه، ثم قال: باسم الله، اللهم تقبل من محمد، وآل محمد، ومن أمة محمد، ثم ضحى به. (الصحيح لمسلم: ۱۵۶/۲، رقم الحديث: ۱۹-(۱۹۶۷)، كتاب الأضاحي، باب استحباب الضحية، وذبحها مباشرة بلا توكيل... الخ، ط: ديوبند)

عن جابر بن عبد الله، قال: شهدت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم الأضحى بالمصلى، فلما قضى خطبته نزل من منبره وأتي بكبش فذبحه رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده، وقال: بسم الله، والله أكبر، هذا عني، وعمن لم يضح من أمتي. (سنن أبي داود: ۳۸۸/۲، رقم الحديث: ۲۸۱۰، كتاب الضحايا، باب في الشاة يضحى بها عن جماعة، ط: ديوبند) =

اور زندوں کی طرف سے ایک بکرے میں ایک ہی کی قربانی ادا ہوسکتی ہے، دو شریک ہوں گے، تو ایک کی بھی قربانی ادا نہ ہوگی۔(۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] مرحومین کی طرف سے قربانی کرنا

۱۹۹۴-سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ذیل کے مسئلہ میں:

زید مال دار نہیں ہے؛ لیکن کمائی وغیرہ اچھی ہے، کسی بات کی کوئی خاص تکلیف نہیں ہے، زید نے عیدالاضحیٰ پر قربانی کا بکرا خریدا اور اس بکرے کو اپنے مرحوم والدین کے ثواب کے لیے ان کی طرف سے قربان کیا، تو کیا زید کے مرحوم والدین کو ثواب مل جائے گا اور ایسی قربانی صحیح ہے کہ نہیں؟ یا زید کو اپنے مرحوم والدین کے ثواب کے لیے دوسرا بکرا خریدنا پڑے گا، جب کہ زید صاحب نصاب نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

زید نے قربانی کا جانور خریدا، اس میں تفصیل یہ ہوگی کہ اپنے لیے خریدا تھا یا والدین کے لیے؟ اگر والدین کے لیے خریدا تھا، تو جس کے لیے خریدا تھا اس کے لیے قربانی کر دی، ان کو اس کا ثواب مل جائے گا۔(۲)

= عن عائشة، أو عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان إذا أراد أن يضحي، اشترى كبشين عظيمين، سمينين، أقرنين، أملحين موجوئين، فذبح أحدهما عن أمته، لمن شهد لله، بالتوحيد، وشهد له بالبلاغ، وذبح الآخر عن محمد، وعن آل محمد صلى الله عليه وسلم. (سنن ابن ماجه: ۱/ ۲۲۵-۲۲۶، رقم الحديث: ۳۱۲۲، كتاب الأضاحي، باب أضاحي رسول الله صلى الله عليه وسلم، ط: ديوبند)

(۱) وأما قدره فلا يجوز الشاة والمعز إلا عن واحد وإن كانت عظيمة سمينة تساوي شاتين مما يجوز أن يضحى بهما؛ لأن القياس في الإبل والبقر أن لا يجوز فيهما الاشتراك؛ لأن القربة في هذا الباب إراقة الدم وأنها لا تحتمل التجزئة؛ لأنها ذبح واحد وإنما عرفنا جواز ذلك بالخبر فبقي الأمر في الغنم على أصل القياس. (بدائع الصنائع: ۵/ ۷۰، كتاب التضحية، فصل في محل إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆ الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۷، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر)

(۲) والأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة، أو صوما، أو صدقة، أو قراءة قرآن، أو ذكرا، أو طوافا، أو حجا، أو عمرة، أو غير ذلك عند أصحابنا للكتاب والسنة، أما الكتاب فلقوله تعالى {وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا} [الاسراء:24]، وإخباره تعالى عن ملائكته بقوله {ويستغفرون للذين آمنوا} [غافر:7] وساق عبارتهم بقوله تعالى {ربنا وسعت كل شيء رحمة وعلما فاغفر للذين تابوا واتبعوا سبيلك} [غافر:7] إلى قوله {وقهم السيئات} [غافر:9]، وأما السنة فأحاديث كثيرة منها ما في الصحيحين، حين ضحى بالكبشين فجعل أحدهما عن أمته، ... ومنها ما رواه أبو داود: =

لیکن اگر زید نے اپنے لیے خریدا تھا، حالاں کہ وہ صاحب نصاب نہیں ہے، تو قربانی کا جانور خریدنے سے اس پر قربانی واجب ہوگئی۔[۱] اور جب اس نے اپنی طرف سے قربانی نہیں کی، تو اپنے ذمہ سے سبک دوش ہونے کے لیے زید پر لازم ہے کہ جو جانور خریدا تھا، اس کی قیمت صدقہ کردے۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] ایصال ثواب کے لیے نفل قربانی

۱۹۹۵- سوال: کیا نفل قربانی کر کے والدین ودیگر مرحومین کو ثواب پہنچا سکتے ہیں؟ سوال کا منشا یہ ہے کہ کیا ایک قربانی کر کے اس کا ثواب متعدد لوگوں کو پہنچایا جا سکتا ہے؟ بینوا، توجروا۔

=اقرءوا علی موتاکم سورة يس، وحينئذ فتعين أن لا يكون قوله تعالى: {وأن ليس للإنسان إلا ما سعى} [النجم:39] على ظاهره، وفيه تأويلات أقربها ما اختاره المحقق ابن الهمام أنها مقيدة بما يهبه العامل يعني ليس للإنسان من سعي غيره نصيب إلا إذا وهبه له فحينئذ يكون له، وأما قوله - عليه السلام -: لا يصوم أحد عن أحد، ولا يصلي أحد عن أحد. فهو في حق الخروج عن العهدة لا في حق الثواب، فإن من صام، أو صلى، أو تصدق، وجعل ثوابه لغيره من الأموات والأحياء جاز، ويصل ثوابها إليهم عند أهل السنة والجماعة كذا في البدائع، وبهذا علم أنه لا فرق بين أن يكون المجعول له ميتا أو حيا. (البحر الرائق: ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي- المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۱۷۸، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ت: طلال يوسف، ط: دار احياء التراث العربي - بيروت ☆ الاختيار لتعليل المختار- ابن مودود الموصلي (م: ۶۸۳هـ): ۴/ ۱۷۹، كتاب الكراهية، فصل في الكلام، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة)

إذا ضحى رجل عن أبويه بغير أمرهما وتصدق به جاز؛ لأن اللحم ملكه، وإنما للميت ثواب الذبح والصدقة. (فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۳/ ۳۵۲، كتاب الأضحية، قبيل: فصل في العيوب ما يمنع الأضحية وما لا يمنع، ط: زكريا- ديوبند)

(۱) (قوله وإن فقير أجزأه ذلك) لأنها إنما تعينت بالشراء في حقه. (تكملة رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۲۵، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

وأما الذي يجب على الفقير دون الغني فالمشتري للأضحية إذا كان المشتري فقيرا بأن اشترى فقير شاة ينوي أن يضحي بها. (بدائع الصنائع: ۵/ ۶۲، كتاب التضحية، صفة التضحية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) ومنها أنها تقضى إذا فاتت عن وقتها، ثم قضاؤها قد يكون بالتصدق بعين الشاة حية، وقد يكون بالتصدق بقيمة الشاة، فإن كان قد أوجب التضحية على نفسه بشاة بعينها فلم يضحها حتى مضت أيام النحر فيتصدق بعينها حية سواء كان موسرا أو معسرا، وكذا إذا اشترى شاة ليضحي بها فلم يضح حتى مضى الوقت. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۴، كتاب الأضحية، قبيل: الباب الثاني في وجوب الأضحية بالنذر وما هو في معناه، ط: دار الفكر)

الجواب حامداو مصلیا:

نفل قربانی جب میت کوثواب پہنچانے کے لیے کی جاتی ہے،توقربانی کا مالک ہی،قربانی کرنے والا ہی شمار کیا جاتا ہے اور وہ قربانی مالک کی ہی شمار ہوتی ہے، ہاں جس کے لیےثواب کی نیت کی ہے،اس کوثواب مل جائے گا،یعنی ایک آدمی ایک بکرے کی قربانی کر کے اس کا ثواب متعدد افراد کو پہنچایا جاسکتا ہے، یہ بلا شبہ جائز ہے؛ لہٰذا نفل قربانی کر کے اس کا ثواب والدین کو پہنچاسکتے ہیں۔ (قاضی خاں: جلد ۳ صفحہ ۳۵۱)[1]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] والد کی طرف سے ان کی اجازت کے بغیر قربانی کرنا

۱۹۹۶-سوال: حضرت مفتی صاحب! تین اہم سوال خدمت میں پیش کررہا ہوں، امید ہے کہ جواب سے نوازیں گے:

(۱) میں اپنے والد سے الگ رہتا ہوں، میرا ارادہ والدین کی طرف سے قربانی کرنے کا ہے؛ لیکن میرے والد انکار کررہے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ میں اپنی قربانی خود ہی کروں گا،تو کیا میں ان کی طرف سے قربانی کرسکتا ہوں؟

(۲) میں نے اب تک اپنی قربانی ادانہیں کی ہے،تو کیا والدین کی طرف سے قربانی کیے بغیر میں اپنی قربانی کرسکتا ہوں؟

(۳) میری لڑکی کا ایک بکرا ہے، میں اسے قربان کرسکتا ہوں؟

الجواب حامداو مصلیا:

(۱) آپ کے والد کے اوپر اگر قربانی واجب ہے، اور وہ اپنی طرف سے قربانی کرنے کی اجازت

---

[۱] إذا ضحی رجل عن أبویه بغیر أمرهما و تصدق به جاز؛ لأن اللحم ملكه، وإنما للمیت ثواب الذبح و الصدقة.
(فتاوی قاضي خان علی هامش الهندية: ۳/ ۳۵۲، كتاب الأضحية، قبيل: فصل في العيوب ما يمنع الأضحية وما لا يمنع، ط: زكريا- ديوبند)

وإن تبرع بها عنه له الأكل لأنه يقع على ملك الذابح و الثواب للميت. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۳۵، كتاب الأضحية، فروع: لون أضحيته- عليه الصلاة والسلام- سوداء، ط: دار الفكر- بيروت)

مزید تفصیلات کے لیے سوال سابق کا حاشیہ نمبر: ۱ (ترتیب میں حاشیہ نمبر: ۲) ملاحظہ فرمائیں۔

نہیں دے رہے ہیں، تو آپ کے لیے ان کی طرف سے قربانی کرنا درست نہیں ہوگا، ان کے انکار کے باوجود اگر آپ کسی بڑے جانور میں، دیگر شرکاء کے ساتھ، ان کی طرف سے بھی قربانی کی نیت کر لیتے ہیں، تو پھر کسی بھی شریک کی قربانی درست نہیں ہوگی۔ (۱)

وجہ یہ ہے کہ قربانی عبادت ہے، اور عبادت کے لیے نیت کا ہونا ضروری ہے، اس لیے قربانی وہ کرے، جس پر لازم ہے یا وہ کرے، جس کو وکیل بنایا گیا ہے، تاکہ اصیل کی نیت قربانی کا تحقق ہو سکے۔ (۲)

جب آپ کے والد- جن پر قربانی واجب ہے- اپنی قربانی سے آپ کو منع کر رہے ہیں، تو گویا آپ کے ذریعے کی گئی قربانی میں ان کی نیت نہیں پائی گئی، اس لیے قربانی کیوں کر درست ہوگی؟

یہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ زکاۃ، کہ مزکی یا تو خود ادا کرے، یا کسی کو وکیل بنائے، تب ہی زکاۃ ادا ہوگی، کیوں کہ زکاۃ ایسی عبادت ہے، جس میں نیت شرط ہے۔ (۳)

---

(۱) وإن فعل بغير أمرهم أو بغير أمر بعضهم لا تجوز عنه ولا عنهم في قولهم جميعا؛ لأن نصيب من لم يأمر صار لحما فصار الكل لحما. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۲، كتاب الأضحية، الباب السابع في التضحية عن الغير وفي التضحية بشاة الغير عن نفسه، ط: دار الفكر ☆ فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۳/ ۳۵۰، كتاب الأضحية، فصل فيما يجوز في الضحايا و ما لا يجوز، ط: زکریا بک ڈپو- دیوبند)

(۲) وأما الضحايا: فلا بد فيها من النية. (الاشباه والنظائر- ابن نجيم مصري (م: ۹۷۰ھ)، ص: ۸۹، الفن الأول في القواعد الكلية، القاعدة الأولى: لا ثواب إلا بالنية، ت: المفتي محمد يوسف التاؤلوي، ط: مكتبة فقيه الأمة- ديوبند)

(۳) (وشرط صحة أدائها نية مقارنة له) أي للأداء (ولو) كانت المقارنة (حكما) ... (أو مقارنة بعزل ما وجب) كله أو بعضه، ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۲۶۸-۲۷۰، كتاب الزكاة، ط: دار الفكر- بيروت)

فإذا نوى أن يؤدي الزكاة، ولم يعزل شيئا فجعل يتصدق شيئا فشيئا إلى آخر السنة، ولم تحضره النية لم يجز عن الزكاة كذا في التبيين. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۰، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسير الزكاة وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر)

والأصل اقترانها بالأداء كسائر العبادات إلا أن الدفع يتفرق فيحرج باستحضار النية عند كل دفع فاكتفى بوجودها حالة العزل دفعا للحرج. (البحر الرائق: ۲/ ۳۶۸، كتاب الزكاة، ط: زكريا- ديوبند)

إذا كان في وقت التصدق بحال لو سئل عما إذا تؤدي يمكنه أن يجيب من غير فكرة فذلك يكون نية منه. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۷۰، كتاب الزكاة، الباب الأول في تفسيرها وصفتها وشرائطها، ط: دار الفكر ☆ الفتاوى التارخانية: ۳/ ۱۹۶، كتاب الزكاة، الفصل السابع في أداء الزكاة، والنية فيه، ط: زكريا- ديوبند)

ہاں اگر آپ اپنے والدین کی طرف سے نفلی قربانی کرنا چاہتے ہیں، تو پھر اجازت کی ضرورت نہیں ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مینڈھا ذبح کیا اور اس کا ثواب پوری امت کو پہنچایا۔ آپ بھی قربانی کر کے اس کا ثواب اپنے والدین کو پہنچا سکتے ہیں۔[۴]

(۲) اگر آپ صاحب نصاب ہیں، تو آپ پر اپنی طرف سے قربانی کرنا واجب ہے، آپ اپنی قربانی ضرور کریں، آپ کی قربانی کی صحت کے لیے، آپ کا والد کی طرف سے قربانی کرنا ضروری نہیں ہے۔[۵]

(۳) اگر آپ کی لڑکی چھوٹی (نابالغہ) ہے، تو اس صورت میں اس بکرے کی مناسب قیمت ادا کر کے آپ قربانی کر سکتے ہیں، قیمت ادا کیے بغیر قربانی کرنا درست نہیں ہوگا، اور لڑکی اگر بالغہ ہے، وہ بہ خوشی آپ کو بکرا قربانی کے لیے دے رہی ہے، تو آپ اس بکرے کی قربانی کر سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں، اگر وہ بہ خوشی اجازت نہ دے، تو پھر آپ کے لیے اس بکرے کی قربانی کرنا جائز نہیں ہوگا۔[۶] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۴) عن جابر بن عبد الله، قال: شهدت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم الأضحى بالمصلى، فلما قضى خطبته نزل من منبره وأتي بكبش فذبحه رسول الله صلى الله عليه وسلم بيده، وقال: بسم الله، والله أكبر، هذا عني، وعمن لم يضح من أمتي. (سنن أبي داود: ۲/۳۸۸، رقم الحديث: ۲۸۱۰، كتاب الضحايا، باب في الشاة يضحى بها عن جماعة، ط: ديوبند)

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے اس حدیث کی تشریح فرماتے ہوئے لکھا ہے:

و بالجملة فأبو حنيفة و من وافقه إنما يقولون بعدم وقوع شاة عن إثنتين فصاعدا، و لا يقولون بعدم جواز هبة ثوابها لأكثر من واحد. (إعلاء السنن: ۱۷/ ۲۱۴، كتاب الأضاحي، باب التضحية بالشاة و تشريك الغير في الثواب و إيثاره له به، ط: إدارة القران، كراتشي)

(۵) أما صفتها فهي واجبة في ظاهر الرواية على الرجل والمرأة المقيم في الأمصار دون المسافر. (فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۳/ ۳۴۴، كتاب الأضحية، فصل في صفة الأضحية، ووقت وجوبها ومن تجب عليها، ط: زكريا - ديوبند)

(وأما) (شرائط الوجوب): منها اليسار وهو ما يتعلق به وجوب صدقة الفطر دون ما يتعلق به وجوب الزكاة. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۲، كتاب الأضحية، الباب الأول في تفسير الأضحية وركنها وصفتها وشرائطها وحكمها، ط: دار الفكر)

(۶) والثاني ملك المحل، وهو أن يكون المضحى ملك من عليه الأضحية، فإن لم يكن لا تجوز لأن التضحية قربة ولا قربة في الذبح بملك الغير بغير إذنه، وعلى هذا يخرج ما إذا اغتصب شاة إنسان فضحى بها عن نفسه أنه لا تجزيه لعدم الملك ولا عن صاحبها لعدم الإذن. (بدائع الصنائع: ۵/ ۷۶، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۸] استطاعت کے باوجود باپ کا، اپنے لڑکے کے پیسوں سے قربانی کرنا

۱۹۹۷- سوال: ایک لڑکا صاحب مال ہے، اس نے اپنے والد کو رقم بھیجی اور لکھا کہ اس سے قربانی کے لیے جانور خرید لیں اور ۴ر حصے ہماری فیملی کی طرف سے، ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے، ایک حصہ آپ اپنی طرف سے اور ایک حصہ میری والدہ کی طرف سے قربانی کر لیں، اس کی والدہ صاحب نصاب نہیں ہے، لیکن اس کے والد صاحب نصاب ہیں، تو سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں لڑکے کی اس رقم سے اس کے والد اور والدہ کی قربانی ادا ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکورصورت میں والدین کی قربانی ادا ہو جائے گی؛ کیوں کہ رقم بھیج کر ماں باپ کو اس کی اطلاع کردی ہے، باپ پر اگر چہ قربانی واجب ہے؛ لیکن وہ جب لڑکے کی رقم بہ خوشی منظور کر کے قربانی کرے گا، تو اس کی قربانی ادا ہو جائے گی، اسی طرح ماں کی بھی قربانی ادا ہو جائے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) ولو وهب لرجل شاة فضحى بها الموهوب له أجزأته عن الأضحية لأنه ملكها بالهبة والقبض فصار كما لو ملكها بالشراء. (بدائع الصنائع: ۵/۷۷، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت ☆الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۳، كتاب الأضحية، الباب السابع في التضحية عن الغير وفي التضحية بشاة الغير عن نفسه، ط: دار الفكر- ديوبند)

لأن التضحية قربة ولا قربة في الذبح بملك الغير بغير إذنه، وعلى هذا يخرج ما إذا اغتصب شاة إنسان فضحى بها عن نفسه أنه لا تجزيه لعدم الملك ولا عن صاحبها لعدم الإذن. (بدائع الصنائع: ۵/۷٦، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(هي) لغة اسم لما يذبح أيام الأضحى،من تسمية الشيء باسم وقته. وشرعا (ذبح حيوان مخصوص بنية القربة في وقت مخصوص.

(الدر المختار مع رد المحتار: ٦/ ٣١٢، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

متفرقات الأضحية

[قربانی کے متفرق مسائل]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

متفرقات الأضحية

[قربانی کے متفرق مسائل]

[۱] حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی اور چھری کے متعلق سوال

۱۹۹۸- سوال: اس وقت ایک اہم سوال کی تحقیق جاری ہے، جس کا مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا ہے، بخاری شریف کے حوالے سے جواب دینے کی کوشش کیجیے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری رکھی تھی، اس وقت کے قربانی کی تفصیل کسی بھی کتاب میں نہیں ملتی ہے کہ اللہ رب العزت نے حضرت کی چھری کے نیچے ایک دنبہ ملک مقرب کے ذریعہ بھیج دیا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دنبے کو قربان کیا تھا، اس کے متعلق مکمل تفصیل بخاری شریف میں موجود ہے یا نہیں؟

اصل دنبہ چھری کے نیچے آ گیا ہو اور اسی دنبے کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کیا ہو، اس پر کوئی مضبوط دلیل کا ہونا ضروری ہے؛ کیوں کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ چھری حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر چلی تھی، اس وقت اللہ رب العزت نے ان کی قربانی کو قبول کیا تھا، ان کی جگہ پر دنبہ ذبح نہیں ہوا تھا، یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟

دوسری بات چھری کی ہے کہ وہ چھری کہاں گئی؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس چھری کو پھینک دیا اور وہ چھری سیدھی سمندر میں جاکر گری اور اس نے مچھلیوں کو ذبح کیا، اسی وجہ سے سمندر کی مردہ مچھلیوں کو کھانا جائز ہے، بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس چھری کو وہاں رکھے ہوئے ایک پتھر پر پھینکی تھی اور اس نے پتھر کے ٹکڑے کردیے، تو کیا اس کے متعلق بخاری شریف میں کوئی تفصیل موجود ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

مذکور تحریر کوئی اہم سوال نہیں ہے، اس کا تعلق نہ تو کسی عقیدے سے ہے اور نہ تو حلال وحرام سے، اس لیے یہ کوئی ضروری سوال نہیں ہے، بل کہ بیکار اور لایعنی سوال ہے۔

ہر بات کے ثبوت کے لیے بخاری شریف کا حوالہ ضروری نہیں ہے، اس کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابوں سے بھی علم حاصل ہوتا ہے۔

آپ کی تحقیق اور چھان بین سے جو نتیجہ برآمد ہو، مجھے بھی اس سے مطلع کیجیے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کام حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری چلانا تھا، لیکن کیا گردن پر چھری پھیری گئی یا نہیں؟ اس کے متعلق حضرات مفسرین کے دو اقوال ہیں:

(۱) چھری حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر پھیری گئی تھی۔

(۲) چھری پھیرنے کا ارادہ کیا تھا کہ آواز آئی اے ابراہیم! تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: لبیک اللہ اکبر، جب فرشتے نے اس کو سنا تو کہا: اللہ اکبر، دنبے نے بھی کہا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی کہا۔

پہلے قول کے مطابق چھری حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر چلی، مگر اس سے رگیں اور ان کی چمڑی نہیں کٹی، تو اس چھری کو وہیں چھوڑ دیا گیا، کوشش جاری تھی کہ ان کی جگہ پر ایک دنبہ لایا گیا اور اس کو ذبح کیا گیا۔ (روح المعانی: پارہ: ۲۳/۱۷۱، قرطبی: ۱۵/۱۰۳)[۱]

---

[۱] وهل أمر عليه السلام الشفرة على حلقه أم لا قولان، ذهب إلى الثاني منهما كثير من الأجلة، وقد أخرج الإمام أحمد عن ابن عباس أنه عليه السلام لما أخذ الشفرة وأراد أن يذبحه نودي من خلفه أن يا إبراهيم قد صدقت الرؤيا، وأخرج هو وابن جرير وابن أبي حاتم والطبراني وابن مردويه والبيهقي في شعب الإيمان عنه أنه عالج قميصه ليخلعه=

دریافت کی گئی بیشتر باتیں بیکار ہیں اور اس سے دین و دنیا کو کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے، اصل مقصد

=فنودي بذلك.ـــــــــ وأخرج ابن المنذر والحاكم وصححه من طريق مجاهد عنه أيضا فلما أدخل يده ليذبحه فلم يحمل المدية حتى نودي أن يا إبراهيم قد صدقت الرؤيا فأمسك يده.ـــــــــ وأخرج عبد بن حميد وغيره من مجاهد فلما أدخل يده ليذبحه نودي أن يا إبراهيم قد صدقت الرؤيا فأمسك يده ورفع رأسه فرأى الكبش ينحط إليه حتى وقع عليه فذبحه.ـــــــــ وفي رواية أخرى عنه أخرجها عبد بن حميد أيضا وابن المنذر أنه أمرّ السكين فانقلبت.

وإلى عدم الإمرار ذهبت اليهود أيضا لما في توراتهم مد إبراهيم يده فأخذ السكين فقال له ملاك الله من السماء قائلا: يا إبراهيم يا إبراهيم قال: لبيك قال: لا تمد يدك إلى الغلام ولا تصنع به شيئا، وذهب إلى الأول طائفة فمنهم من قال: إنه أمرها ولم تقطع مع عدم المانع؛ لأن القطع بخلق الله تعالى فيها أو عندها عادة، وقد لا يخلق سبحانه، ومنهم من قال: أنه أمرها ولم تقطع لمانع،ـــــــــ فقد أخرج سعيد بن منصور وابن المنذر عن عطاء بن يسار أنه عليه السلام قام إليه بالشفرة فبرك عليه فجعل الله تعالى ما بين لبته إلى منحره نحاسا لا تؤثر فيه الشفرة.ـــــــــ وأخرج ابن جرير وابن أبي حاتم عن السدي أنه عليه السلام جر السكين على حلقه فلم ينحر وضرب الله تعالى على حلقه صفيحة من نحاس.ـــــــــ وأخرج الخطيب في تالي التلخيص عن فضيل بن عياض قال: أضجعه ووضع الشفرة فقلبها جبريل عليه السلام.ـــــــــ وأخرج الحاكم بسند فيه الواقدي عن عطاء أنه نحر في حلقه فإذا هو قد نحر في نحاس فشحذ الشفرة مرتين أو ثلاثا بالحجر.ـــــــــ وضعف جميع ذلك. وقيل إنه عليه السلام ذبح لكن كان كلما قطع موضعا من الحلق أوصله الله تعالى، وزعموا ورود ذلك في بعض الأخبار ولا يكاد يصح. (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني- شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني الألوسي (م:۱۲۷۰ھ): ۱۲/۲۱۵، ۳۷-سورة الصافات: ۹۹-۱۳۲، ت: علي عبد الباري عطية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

وقد اختلف الناس في وقوع هذا الأمر وهي: الثالثة- فقال أهل السنة: إن نفس الذبح لم يقع، وإنما وقع الأمر بالذبح قبل أن يقع الذبح، ولو وقع لم يتصور رفعه، فكان هذا من باب النسخ قبل الفعل؛ لأنه لو حصل الفراغ من امتثال الأمر بالذبح ما تحقق الفداء. وقوله تعالى: "قد صدقت الرؤيا": أي حققت ما نبهناك عليه، وفعلت ما أمكنك ثم امتنعت لما منعناك. هذا أصح ما قيل به في هذا الباب. وقالت طائفة: ليس هذا مما ينسخ بوجه؛ لأن معنى ذبحت الشيء قطعته. واستدل على هذا بقول مجاهد: قال إسحاق لإبراهيم لا تنظر إلي فترحمني، ولكن اجعل وجهي إلى الأرض، فأخذ إبراهيم السكين فأمرها على حلقه فانقلبت. فقال له ما لك؟ قال: انقلبت السكين. قال اطعني بها طعنا. وقال بعضهم: كان كلما قطع جزءا التأم. وقالت طائفة: وجد حلقه نحاسا أو مغشى بنحاس، وكان كلما أراد قطعا وجد منعا. وهذا كله جائز في القدرة الإلهية. لكنه يفتقر إلى نقل صحيح، فإنه أمر لا يدرك بالنظر وإنما طريقه الخبر. ولو كان قد جرى ذلك لبينه الله تعالى تعظيما لرتبة إسماعيل وإبراهيم صلوات الله عليهما، وكان أولى بالبيان من الفداء. (الجامع لأحكام القرآن = تفسير القرطبي- أبو عبد الله محمد بن أحمد بن أبي بكر، الأنصاري الخزرجي شمس الدين القرطبي (م: ۶۷۱ھ): ۱۵/۱۰۲-۱۰۳، سورة الصافات، ت: أحمد البردوني وإبراهيم أطفيش، ط: دار الكتب المصرية-القاهرة) =

قربانی کا یہ ہے کہ وقت آنے پر اپنی جان و مال اور بال بچوں کی قربانی بھی پیش کریں، یہ سوال کہ وہ چھری کیسی تھی؟ کتنے انچ کی تھی؟ وہ چھری کہاں گئی؟ چھری تانبے کی تھی یا پیتل کی؟ یہ سب سوالات بیکار اور لایعنی ہیں واقعے کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، ایسے بیجا سوالات سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے اور ضروری کاموں میں اپنا وقت لگانا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے وقت کی قدر و قیمت نصیب فرمائے اور دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، آمین۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] جس پر صدقۂ فطر اور قربانی واجب ہو، اس کے لیے زکوۃ لینا جائز نہیں ہے

۱۹۹۹- سوال: جس شخص کے پاس نصاب کے بہ قدر مال نہیں ہے، یعنی نقد رقم، تجارت کا سامان، زیور، سونا، چاندی کچھ بھی نہیں ہے؛ لیکن ضرورت سے زائد گھر کے استعمال کا سامان ہے، جس کی قیمت نصاب کے برابر ہو جاتی ہے، میں نے سنا ہے کہ ایسے آدمی پر صدقۂ فطر اور قربانی واجب ہے، لیکن وہ زکوۃ نہیں لے سکتا، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداومصليا:

یہ صحیح ہے کہ جس شخص پر صدقہ فطر اور قربانی واجب ہو، وہ کوئی بھی واجب صدقہ اور زکوۃ نہیں لے

= وفي الخبر: إن الذبيح قال لإبراهيم عليه السلام حين أراد ذبحه: يا أبت اشدد رباطي حتى لا أضطرب، واكفف ثيابك لئلا ينتضح عليها شي من دمي فتراه أمي فتحزن، وأسرع مر السكين على حلقي ليكون الموت أهون علي واقذفني للوجه، لئلا تنظر إلى وجهي فترحمني، ولئلا أنظر إلى الشفرة فأجزع، وإذا أتيت إلى أمي فأقرئها مني السلام. فلما جر إبراهيم عليه السلام السكين ضرب الله عليه صفيحة من نحاس، فلم تعمل السكين شيئا، ثم ضرب به على جبينه وحز في قفاه فلم تعمل السكين شيئا، فذلك قوله تعالى: "وتله للجبين" كذلك قال ابن عباس: معناه كبه على وجهه فنودي "يا إبراهيم قد صدقت الرؤيا" فالتفت فإذا بكبش، ذكره المهدوي. وقد تقدمت الإشارة إلى عدم صحته، وأن المعنى لما اعتقد الوجوب وتهيأ للعمل، هذا بهيئة لا لذبح، وهذا بصورة المذبوح، أعطيا محلا للذبح فداء ولم يكن هناك مر سكين. (المصدر السابق: ۱۵/ ۱۰۴-۱۰۵)

(۲) وقال: {والذين هم عن اللغو معرضون} أي: عن الباطل، وهو يشمل: الشرك - كما قاله بعضهم- والمعاصي - كما قاله آخرون- وما لا فائدة فيه من الأقوال والأفعال، كما قال تعالى: {وإذا مروا باللغو مروا كراما} [الفرقان:72]. قال قتادة: أتاهم والله من أمر الله ما وقذهم عن ذلك. (تفسير القرآن العظيم المعروف بتفسير ابن كثير- أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (م: ۷۷۴هـ): ۵/ ۴۶۲، المؤمنون: ۳، ت: سامي بن محمد سلامة، ط: دار طيبة للنشر والتوزيع)

سکتا، اس کے لیے زکوۃ لینا ناجائز ہے۔ [۱]

ہاں اگر کوئی شخص ایسا ہو، جس کے پاس گھر کے استعمالی سامان کے علاوہ، نصاب کے بہ قدر مال نہیں ہے، گذر بسر کے لیے کوئی ذریعۂ آمدنی بھی نہیں ہے، تو وہ شخص حاجت مند ہے، اس پر صدقۂ فطر اور قربانی واجب نہیں ہے، اس کے لیے زکات لینا درست ہے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] اللہ تعالیٰ کی جانب سے جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

۲۰۰۰-سوال: میری ایک شخص کے ساتھ اِس مسئلہ میں بحث ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قربانی ادا ہوسکتی ہے یا نہیں؟ تو اُس نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ایسی قربانی نہیں ہوسکتی، اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں ہے، اِس بارے میں حکمِ شرعی کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیا

قربانی کا اصل مقصد یہ ہے کہ بندہ اپنی شانِ عبدیت کے اظہار اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور

(۱) وأما الغنى الذي يحرم به أخذ الصدقة وقبولها فهو الذي تجب به صدقة الفطر والأضحية وهو أن يملك من الأموال التي لا تجب فيها الزكاة ما يفضل عن حاجته وتبلغ قيمة الفاضل مائتي درهم من الثياب والفرش والدور والحوانيت والدواب والخدم زيادة على ما يحتاج إليه كل ذلك للابتذال والاستعمال لا للتجارة والإسامة، فإذا فضل من ذلك ما يبلغ قيمته مائتي درهم وجب عليه صدقة الفطر والأضحية وحرم عليه أخذ الصدقة. (بدائع الصنائع: ۲/۴۸، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى إليه، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۲) وذكر في الفتاوى فيمن له حوانيت ودور للغلة لكن غلتها لا تكفيه وعياله أنه فقير ويحل له أخذ الصدقة عند محمد، وعند أبي يوسف لا يحل وكذا لو له كرم لا تكفيه غلته، ولو عنده طعام للقوت يساوي مائتي درهم، فإن كان كفاية شهر يحل أو كفاية سنة، قيل لا تحل، وقيل يحل؛ لأنه يستحق الصرف إلى الكفاية فيلحق بالعدم، وقد ادخر -عليه الصلاة والسلام- لنسائه قوت سنة، ولو له كسوة الشتاء وهو لا يحتاج إليها في الصيف يحل ذكر هذه الجملة في الفتاوى. اهـ۔ـــــــ وظاهر تعليله للقول الثاني في مسألة الطعام اعتماده.ـــــ وفي التتارخانية عن التهذيب أنه الصحيح وفيها عن الصغرى له دار يسكنها لكن تزيد على حاجته بأن لا يسكن الكل يحل له أخذ الصدقة في الصحيح وفيها سئل محمد عمن له أرض يزرعها أو حانوت يستغلها أو دار غلتها ثلاث آلاف ولا تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة؟ يحل له أخذ الزكاة وإن كانت قيمتها تبلغ ألوفا وعليه الفتوى وعندهما لا يحل اهـ ملخصا. (رد المحتار على الدر المختار: ۲/۳۴۸، كتاب الزكاة، باب مصرف الزكاة والعشر، قبيل: مطلب في جهاز المرأة هل تصير به غنية، ط: دار الفكر)

رضا جوئی کے لیے اُس کے نام پر اپنی محبوب سے محبوب چیز قربان کردے، اِسی وجہ سے جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کیا جاتا ہے، کہ اُس کا مالکِ حقیقی وہی ہے، اور وہی تمام تر عظمتوں کا حامل ہے، لہٰذا اُس کے نام کے بغیر کوئی جانور حلال نہیں ہوسکتا، جب قربانی کی حقیقت میں شانِ عبدیت کا اظہار ہی بنیادی پہلو ہے تو قربانی ہمیشہ بندے ہی کی جانب سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کی جائے گی، اللہ تعالیٰ کی ذات جمیع مخلوقات اور کائنات سے بے نیاز ہے، اُس کو کسی کو خوش کرنے کی ضرورت نہیں، وہ ذات لایسئل عما یفعل ہے، یعنی اُس سے بڑھ کر کوئی نہیں جو اُس سے اُس کے فیصلوں کے بارے میں سوال کرنے والا ہو، لہٰذا اللہ تعالیٰ کو کسی کے سامنے قربانی پیش کرنی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا قربانی ہمیشہ بندے کی جانب سے اللہ کے نام پر ہوگی، نہ کہ اللہ کی جانب سے اللہ کے نام پر۔ (درمختار)[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۴] رشتہ داروں کی حق تلفی کرنے والے کی قربانی ادا ہوگی یا نہیں؟

۲۰۰۱-سوال: ایک شخص نے اپنے بھائی اور چچا کی زمین اُن کو اطلاع کیے بغیر بیچ کر قیمت پر ناجائز قبضہ کرلیا، اور اپنے چچا کے ایک پاگل لڑکے کو صرف دو وقت کا کھانا دیتا ہے، نیز اِس شخص نے اپنے چچا

---

[۱] (هي) لغة اسم لما يذبح أيام الأضحى، من تسمية الشيء باسم وقته. وشرعا (ذبح حيوان مخصوص بنية القربة في وقت مخصوص. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳۱۲/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

وهو [الأضحية] بضم الهمزة وكسرها: اسم لما يذبح أيام النحر بنية القربة لله - تعالى -، وكذلك الضحية بفتح الضاد وكسرها، ويقال أيضا أضحاة، قال - عليه الصلاة والسلام -: على أهل كل بيت في كل عام أضحاة وعتيرة. فالأضحاة ما يذبح أيام النحر، والعتيرة شاة كانت تذبح للصنم في رجب نسخت وبقيت الأضحية، وهي من أضحى يضحي إذا دخل في الضحى؛ لأنها تذبح وقت الضحى، فسمي الواجب باسم وقته كصدقة الفطر والصلوات الخمس. (الاختيار لتعليل المختار - عبد الله بن محمود بن مودود الموصلي البلدحي، مجد الدين أبو الفضل الحنفي (م: ۶۸۳هـ): ۱۶/۵، كتاب الأضحية، ت: محمود أبو دقيقة، ط: مطبعة الحلبي - القاهرة)

قربانی میں جو حصہ اللہ تعالیٰ کے نام کا یا اللہ کے واسطے رکھا جاتا ہے، تو وہ قربانی کرنے والے ہی کا حصہ شمار کیا جائے گا؛ اس لیے کہ جو قربانی اپنی طرف سے یا دوسرے کی طرف سے کی جاتی ہے، وہ اللہ کے لیے ہی ہوتی ہے، اس لیے ایسی نیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کو کسی کے ایصالِ ثواب کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، مخلوق کے لیے ایصالِ ثواب کی نیت کرسکتے ہیں، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ رکھا جائے، تو صحیح ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قربانی کا ثواب بھی ملے گا، واللہ اعلم۔ (فتاویٰ دینیہ - مفتی اسماعیل کچھولوی: ۴۰۰/۴-۴۰۱، کتاب الاضحیہ، مشترک قربانی، ط: جامعہ حسینیہ - راندیر)

زاد بھائی کی زمین بھی ناحق طور پر اپنے نام کرلی، اور خود ہی اُس میں ناجائز تصرف کررہا ہے، اب یہ شخص اِتنی حق تلفی کے بعد قربانی ادا کرے، تو اُس کی قربانی ادا ہوگی یا نہیں؟ اِس قربانی کے موقع پر اُس نے اپنے بھائی یا چچا کو بلایا تک نہیں، نیز بھائی اور چچا نے اُس قربانی کا گوشت بھی نہیں لیا، تو کیا قربانی کے گوشت کو قبول نہ کرنے میں کوئی گناہ ہے؟ جب تمام لوگ کسی شخص کے متعلق یہ بات جانتے ہوں کہ اُس نے دوسروں کے حقوق برباد کرکے اُن کی جائداد پر ناجائز قبضہ کررکھا ہے، تو اُس کی قربانی کا گوشت کھاسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

حرام مال سے قربانی ادا کرنا جائز نہیں ہے، حدیث پاک میں اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ: اللہ تعالیٰ پاکیزہ چیز ہی قبول فرماتے ہیں۔ (بخاری، مسلم وترمذی شریف)[1]

جس شخص کے متعلق ہمیں یقین ہو کہ اُس نے اِتنی حق تلفی کی ہے کہ اُس کا اکثر مال حرام ہے، تو اُس کی دعوت میں شریک ہونا ممنوع ہے۔ (فتاویٰ عالم گیری: ۵/ ۳۴۳)[2]

قربانی اگر حلال مال سے کی گئی ہو، تو اُس کا گوشت قبول کرنا مسنون ہے، اور اُسے رد کرنا مکروہ ہے، ہاں، اگر حرام مال سے قربانی کی گئی ہے، تو اُس کے گوشت کو رد کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (عالم گیری: ۵/ ۳۴۲)[3]

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] عن أبي هريرة رضي الله عنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب، ولا يقبل الله إلا الطيب، وإن الله يتقبلها بيمينه، ثم يربيها لصاحبه، كما يربي أحدكم فلوه، حتى تكون مثل الجبل. (صحيح البخاري: ۱/ ۱۸۹، رقم الحديث: ۱۴۱۰، كتاب الزكاة، باب الصدقة من كسب طيب، ط: ديوبند☆ الصحيح لمسلم: ۱/ ۳۲۶، رقم الحديث: ۶۳ -(۱۰۱۴)، كتاب الزكاة، باب بيان أن اسم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف، ط: ديوبند ☆سنن الترمذي: ۱/ ۱۴۴، رقم الحديث: ۶۶۱، أبواب الزكاة، باب ما جاء في فضل الصدقة، ط: ديوبند)

[۲] أهدى إلى رجل شيئا، أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال، فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية، ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل، كذا في الينابيع. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۴۲، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، ط: دار الفكر)

[۳] آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل، ولا يأكل ما لم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه، وإن كان غالب ماله حلالا لا بأس بقبول هديته والأكل منها، كذا في الملتقط. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۴۳، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، ط: دار الفكر)

عن الحسن، عن سمرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الغلام مرتهن بعقيقته يذبح عنه يوم السابع، ويسمى، ويحلق رأسه.

(سنن الترمذي: ۱/ ۲۷۸، رقم الحديث: ۱۵۲۲، أبواب الأضاحي، باب بلا عنوان، من العقيقة، ط: ديوبند)

باب العقيقة

[عقیقہ کا بیان]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب العقیقة

[عقیقہ کا بیان]

[۱] عقیقہ کب کرے؟

۲۰۰۲- سوال: ساتویں روز اگر کوئی شخص عقیقہ نہ کرسکے اور بعد میں اپنی استطاعت کے مطابق کرے، تب بھی درست ہے، فتاوی دار العلوم جلد نمبر آٹھ میں میرے مطالعے میں یہ مسئلہ گزرا ہے کہ ساتویں روز عقیقہ کرنا مستحب ہے، پھر بعد میں جب کبھی کرے گا، مستحب ادا نہ ہوگا، کیا یہ بات صحیح ہے؟ اگر یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے، تو پھر- جب کہ استحباب کی ادائیگی نہیں ہوگی- بعد میں عقیقہ کرنے کا کیا فائدہ ہوگا؟

الجواب حامدا ومصلیا:

عقیقہ ساتویں روز مستحب ہے، اگر ساتویں روز عقیقہ نہ کرسکے، تو چودہویں روز، اگر چودہویں روز طاقت نہ ہو، تو اکیسویں روز ادا کرے؛ الغرض ساتویں روز ادا کرنے سے مستحب ادا ہوگا؛ البتہ ساتواں روز چھوٹ جانے کی صورت میں استحباب تو چھوٹے گا؛ لیکن نفس عقیقہ ادا ہوجائے گا۔ (۱)

---

(۱) عن ابن عباس قال: سبعة من السنة في الصبي يوم السابع: يسمى، ويختن، ويماط عنه الأذى، وتثقب أذنه، ويعق عنه، ويحلق رأسه، ويلطخ بدم عقيقته، ويتصدق بوزن شعره في رأسه ذهبا أو فضة. (المعجم الأوسط-سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني (م:٣٦٠هـ): ١/١٧٦، رقم الحديث: ٥٥٨، باب الألف، من اسمه أحمد، ت: طارق بن عوض الله بن محمد، عبد المحسن بن إبراهيم الحسيني، ط: دار الحرمين-القاهرة) =

نوٹ: اس مسئلے کی مزید وضاحت کے لیے میری کتاب ''اولاد کے حقوق ماں باپ پر'' مطالعہ کیجیے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲] اولاد کی پیدائش سے پہلے عقیقہ درست نہیں

۲۰۰۳- سوال: میرے دو لڑکے ہیں، ان کے عقیقہ کے لیے ایک بڑے جانور میں دو دو حصہ کر کے چار حصے کرنے کے بعد باقی تین حصے بچتے ہیں، ان میں آئندہ مستقبل میں پیدا ہونے والی اولاد کے عقیقہ کی نیت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس طرح پیشگی عقیقہ جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً:

دونوں لڑکوں کے عقیقہ کی نیت سے بڑا جانور گائے، بھینس وغیرہ ذبح کرنے سے دونوں کا عقیقہ ادا ہو جائے گا۔ (۲) لیکن جو اولاد پیدا نہیں ہوئی ہیں، ان کی طرف سے پیشگی عقیقہ ادا نہ ہوگا۔ (۳) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔　　　　کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

[۳] عقیقہ کا کوئی واجب وقت نہیں ہے

۲۰۰۴- سوال: بچہ کی پیدائش کے ۷/دن یا ۱۴/دن یا ۲۱/دن کے بعد عقیقہ کرنا مستحب ہے، اس کے بعد عقیقہ کرنے سے ثواب حاصل نہ ہوگا، یہ بات سننے میں آئی ہے، دریافت یہ کرنا ہے کہ یہ صحیح ہے یا غلط؟

= وفي الحديث المذكور أيضا أنها إن لم تذبح في السابع ذبحت في الرابع عشر، وإلا ففي الحادي والعشرين، ثم هكذا في الأسابيع. (إعلاء السنن-ظفر أحمد العثماني (م: ۱۳۹۴ھ): ۱۱۷/۱۷، كتاب الذبائح، فائدة، بعد: باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط: إدارة القران- كراتشي)

(۱) بحمد اللہ یہ کتاب صاحب زادہ محترم جناب حافظ اسجد بیمات کے زیر اہتمام اردو زبان میں شائع ہو چکی ہے۔

(۲) ولو ذبح بدنة أو بقرة عن سبعة أولاد أو اشترك فيها جماعة جاز، سواء أرادوا كلهم العقيقة، أو أراد بعضهم العقيقة و بعضهم اللحم كما في الأضحية. (شرح المهذب: ۲۹/۸) ـــــ قلت: مذهبنا في الأضحية بطلانها بإرادة بعضهم اللحم، فليكن كذلك في العقيقة. (إعلاء السنن-ظفر أحمد العثماني (م: ۱۳۹۴ھ): ۱۱۹/۱۷، كتاب الذبائح، فائدة، بعد: باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط: إدارة القران- كراتشي)

(۳) فلو ذبحها بعد السابع أو قبله و بعد الولادة، أجزأه، وإن ذبحها قبل الولادة لم تجزه بلا خلاف؛ بل تكون شاة لحم. (المصدر السابق: ۱۱۸/۱۷)

الجواب حامداً ومصلياً:

عقیقہ کرنا سنت ہے اور جب بھی عقیقہ کیا جائے گا، عقیقہ ادا ہو جائے گا۔ (۱) البتہ ساتویں دن عقیقہ کرنا اور نومولود کے سر کے بال منڈانا، نام رکھنا، اور ختنہ کرنا مستحب ہے۔ (۲) اگر عقیقہ کی استطاعت نہیں ہے، تو اس سے پہلے بھی بچہ کا نام رکھا جاسکتا ہے اور ساتویں دن محض بال منڈانے اور ختنہ کرنے سے بھی ایک حد تک سنت پر عمل ہو جائے گا۔ (۳)

ساتویں دن عقیقہ کرنا واجب نہیں ہے، (۴) مستحب ہے، پس جب بھی عقیقہ کیا جائے گا، ادا ہو جائے گا، البتہ استحبابی عمل کا خاص ثواب نہیں ملے گا۔ فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وفي الحديث المذكور أيضا أنها إن لم تذبح في السابع ذبحت في الرابع عشر، وإلا ففي الحادي والعشرين، ثم هكذا في الأسابيع. (إعلاء السنن - ظفر أحمد العثماني (م: ۱۳۹۴هـ): ۱۷/ ۱۱۷، كتاب الذبائح، فائدة، بعد: باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط: إدارة القران - كراتشي)

ووقتها بعد تمام الولادة إلى البلوغ، فلا يجزئ قبلها، وذبحها في اليوم السابع يسن، والأولى فعلها صدر النهار عند طلوع الشمس بعد وقت الكراهة للتبرك بالبكور... ويسن أن يعق عن نفسه من بلغ ولم يعق عنه. (العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲/ ۲۱۳، كتاب الذبائح، العقيقة، ط: دار المعرفة)

(۲) قلت: فيه حديث عن ابن عباس قال: سبعة من السنة في الصبي يوم السابع، يسمى، ويختن ويماط عنه الأذى، وتثقب أذنه، ويعق عنه، ويحلق رأسه، ويلطخ بدم عقيقة، ويتصدق بوزن شعره في رأسه ذهبا أو فضة. رواه الطبراني في الأوسط، ورجاله ثقات. مجمع الزوائد: ۴/ ۵۹. (إعلاء السنن - ظفر أحمد العثماني (م: ۱۳۹۴هـ): ۱۷/ ۱۱۹، كتاب الذبائح، فائدة، بعد: باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط: إدارة القران - كراتشي)

(۳) قال المهلب: وتسمية المولود حين يولد وبعد ذلك بليلة وليلتين وما شاء إذا لم ينو الأب العقيقة عند يوم سابعه جائز وإن أراد أن ينسك عنه، فالسنة أن يؤخر تسميته إلى يوم النسك، وهو السابع. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري - بدر الدين العيني (م: ۸۵۵هـ): ۲۱/ ۸۸، كتاب العقيقة، باب: إماطة الأذى عن الصبي في العقيقة، ط: دار إحياء التراث العربي - بيروت)

(۴) ويفهم من رواية النسفي أيضا أن العقيقة غير واجبة. (عمدة القاري: ۲۱/ ۸۳، كتاب العقيقة، باب: تسمية المولود غداة يولد لمن يعق عنه وتحنيكه)

يستحب لمن ولد له ولد أن يسميه يوم أسبوعه ويحلق رأسه ويتصدق عند الأئمة الثلاثة بزنة شعره فضة أو ذهبا ثم يعق عند الحلق عقيقة إباحة على ما في الجامع المحبوبي، أو تطوعا على ما في شرح الطحاوي، وهي شاة تصلح =

[۴] عقیقہ: مدت اور جانور کی تعداد

۲۰۰۵-سوال: اس وقت میری عمر تقریباً تیس سال ہے؛ لیکن اب تک میرا عقیقہ نہیں ہوا ہے، اب میں اپنا عقیقہ کرنا چاہتا ہوں، تو کیا اس میں کوئی حرج ہے؟

نیز عقیقے میں ایک بکرا کافی ہے یا دو بکرے ضروری ہیں؟ نیز ان بکروں کا گوشت شادی میں مہمانوں کو کھلایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

میری ولادت جمعہ کے دن ہوئی ہے، تو مجھے عقیقہ کب کرنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عقیقہ کرنا مستحب ہے، فرض یا واجب نہیں ہے۔[۱] اس کا اصلی وقت پیدائش کے ساتویں دن ہے، اگر ساتویں دن عقیقہ نہیں کر سکے، تو چودھویں یا اکیسویں دن کر لے، اس کے بعد جب بھی عقیقہ کیا جائے، تو ساتویں دن کا لحاظ کر لینا بہتر ہے۔[۲]

اگر آپ اپنا عقیقہ کرنا چاہتے ہیں، تو کر سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں، بل کہ کسی نہ کسی درجے میں

=للأضحية، تذبح للذكر والأنثى، سواء فرق لحمها نيئا أو طبخه بحموضة أو بدونها مع كسر عظمها أو لا واتخاذ دعوة أو لا، وبه قال مالك. وسنها الشافعي وأحمد سنة مؤكدة شاتان عن الغلام وشاة عن الجارية، غرر الأفكار ملخصا، والله تعالى أعلم.(رد المحتار على الدر المختار:٣٣٦/٦، كتاب الأضحية، خاتمة: يستحب لمن ولد له ولد، قبيل: كتاب الحظر والإباحة، ط:دار الفكر-بيروت)

العقيقة تطوع إن شاء فعلها، وإن شاء لم يفعل وهي أن يذبح شاة إذا أتى على الولد سبعة أيام. (العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية-ابن عابدين، الدمشقي الحنفي(م:١٢٥٢هـ):٢١٢/٢، كتاب الذبائح، العقيقة، ط:دار المعرفة)

(١)ثم اتفق جمهور العلماء و عامة المسلمين على استحبابه، فأخذوا به و أفتوا بالاستحباب.(إعلاء السنن-ظفر أحمد العثماني(م:١٣٩٤هـ):١١٤/١٧، كتاب الذبائح، باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط:إدارة القران-كراتشي)

(٢)... أنها إن لم تذبح في السابع ذبحت في الرابع عشر، و إلا ففي الحادي و العشرين، ثم هكذا في الأسابيع. (إعلاء السنن-ظفر أحمد العثماني(م:١٣٩٤هـ):١١٧/١٧، كتاب الذبائح، فائدة، بعد: باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط:إدارة القران-كراتشي)

بعد ولادت ہفتم روز یا چہاردہم یا بست ویکم وبہمیں حساب، یا بعد ہفت ماہ یا ہفت سال عقیقہ باید کرد، والغرض رعایت عدد ہفت بہتر است۔ (مالابد منہ،ص:۱۷۴،ط:سب رنگ کتاب گھر-دہلی)

مطلوب ہے۔(۳)

ایک بکرے سے بھی عقیقہ درست ہوجائے گا؛ لیکن دو بکروں کا ہونا بہتر ہے۔(۴)

شادی کی دعوت میں عقیقہ کا گوشت کھلانا جائز ہے؛(۵) البتہ دعوت میں اگر شادی بیاہ کے رسم ورواج کے مطابق، آنے والے مہمانوں سے ہدیہ وتحفہ وصول کرنا مقصود ہو، اور اس کے لیے ٹیبل لگا کر کسی کو رقم وصول کرنے کے لیے بیٹھایا جائے، تو اس صورت میں عقیقہ ادا نہیں ہوگا۔(۶)

آپ کی ولادت جمعہ کو ہوئی ہے، ساتویں دن کا لحاظ کرتے ہوئے آپ کے لیے جمعرات کو عقیقہ کرنا بہتر ہے۔(۷) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۵] عقیقہ کا جانور کیسا ہونا چاہیے؟

۲۰۰۶-سوال: کیا عقیقہ کے جانور میں چھوٹے موٹے عیب ہوں، تو اس کو ذبح کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

---

(۳) عن محمد بن سيرين قال: لو أعلم أني لم يعق عني لعققت عن نفسي. (أوجز المسالك: ۱۰/ ۱۷۹، كتاب العقيقة، ط: دار القلم-دمشق)

وعن الحسن البصري إذا لم يعق عنك فعق عن نفسك وإن كنت رجلا. (إعلاء السنن: ۱۷/ ۱۲۱)

(۴) عن علي بن أبي طالب قال: عق رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الحسن بشاة، وقال: يا فاطمة، احلقي رأسه، وتصدقي بزنة شعره فضة، قال: فوزنته فكان وزنه درهما أو بعض درهم. (سنن الترمذي: ۱/ ۲۷۸، رقم الحديث: ۱۵۱۹، أبواب الأضاحي، باب العقيقة بشاة، ط: ديوبند)

في شرح السنة: اختلفوا في التسوية بين الغلام والجارية، ... وذهب قوم إلى التسوية بينهما عن كل واحد بشاة واحدة لهذا الحديث، وعن ابن عمر - رضي الله عنهما: كان يعق عن ولده بشاة الذكور والإناث، ومثله عروة بن الزبير، وهو قول مالك. وذهب جماعة إلى أنه يذبح عن الغلام بشاتين، وعن الجارية بشاة. قلت: ... وأما الغلام فيحتمل أن يكون أقل الندب في حقه عقيقة واحدة، وكماله ثنتان ... الخ. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري: ۷/ ۲۶۸۹، تحت رقم الحديث: ۴۱۵۴، كتاب الصيد والذبائح، باب العقيقة، ط: دار الفكر، بيروت)

(۵) ولو دعا إليها قوما جاز. (إعلاء السنن: ۱۷/ ۱۲۰)

(۶) والفعل لا يقع قربة بدون النية. (بدائع الصنائع: ۵/ ۷۱، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية)

(۷) تفصیل کے لیے دیکھیے: قاسمی بہشتی زیور، تیسرا حصہ، ص: ۴۳، ط: دار الکتاب-دیوبند۔

الجواب حامداً ومصلياً:

جس جانور کی قربانی جائز ہے، وہی عقیقہ میں جائز ہے، پس عقیقہ کے جانور میں ان ہی اوصاف وعمر کا لحاظ کیا جائے گا، جن کا قربانی کے جانور میں کیا جاتا ہے: وهي شاة تصلح للأضحية. (شامی ۹:۴۸۵)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۶] عقیقہ کے جانور کی عمر

۲۰۰۷-سوال: بعد التسلیم عرض این کہ ہمارے یہاں ایک آدمی دو سال پہلے ایک بھینس لایا، اس کے ساتھ چھ یا سات دن کا کٹرا [بھینس کا بچہ] تھا، بھینس عید الاضحیٰ سے سات دن قبل لائے تھے۔ گویا اس کٹرا کو دو سال ہو گئے ہیں، اب وہ شخص اپنے بچوں کے عقیقہ کا ارادہ رکھتا ہے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ اس کٹرے کو عقیقہ میں اِس سال عید سے قبل ذبح کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

عقیقہ کے جانور کے لیے وہی عمر شرط ہے، جو قربانی کے لیے ہے، اور بھینس وکٹرے کی قربانی اس وقت ہو سکتی ہے، جب کہ وہ کم از کم دو سال کا ہو۔[۲]

سوال مذکور تفصیل کے مطابق اس کٹرے کی عمر اس وقت دو سال ہو چکی ہے، اس لیے بلا شک وشبہ اس کو عقیقہ میں ذبح کیا جا سکتا ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۷] عقیقے کے جانور کی عمر کتنی ہونی چاہیے؟

۲۰۰۸-سوال: عقیقہ کے لیے جانور کتنے سال کا ہونا چاہیے؟ اور بکرے کا کیا حکم ہے؟

---

(۱) رد المحتار على الدر المختار: ۶/۳۳۶، كتاب الأضحية، خاتمة: يستحب لمن ولد له ولد، قبيل: كتاب الحظر والإباحة، ط: دار الفكر-بيروت.

لا يجزئ في العقيقة إلا ما يجزئ في الأضحية... ولا يجزئ فيه إلا السليم من العيوب. (إعلاء السنن-ظفر أحمد العثماني (م: ۱۳۹۴ھ): ۱۷/۱۱۷، كتاب الذبائح، باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط: إدارة القران- كراتشي ☆ مالابد منہ-قاضی ثناء اللہ عثمانی (م: ۱۲۲۵ھ) ص: ۱۷۳، ط: امدادیہ-دیوبند)

(۲-۳) سوال سابق کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

قربانی کے لیے جانور کی جتنی عمر ضروری ہے، وہی عمر عقیقے کے جانور کے لیے بھی ہے۔[۱] واللہ اعلم بالصواب۔

[۸] ۱-عقیقہ میں لڑکے کی طرف سے ایک بکرا بھی کافی ہے

[۹] ۲-دو بکرے الگ الگ جگہوں پر اور الگ الگ دنوں میں بھی ذبح کرنا جائز ہے

۲۰۰۹-سوال: عقیقہ میں لڑکے کی طرف سے دو بکرے ذبح کرنا واجب ہے، تو دونوں بکرے ایک ہی جگہ ذبح کرنا ضروری ہے یا دونوں الگ الگ جگہوں (یعنی الگ الگ گاؤں یا شہر میں) یا الگ الگ دنوں میں بھی ذبح کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

لڑکے کے عقیقے میں دو بکرے ذبح کرنا واجب نہیں، مستحب ہے، ایک بکرا ذبح کرنے سے بھی (یک گونہ) سنت ادا ہو جائے گی۔[۲]

---

(۱) و قال ابن رشد: أما سن هذا النسك و صفته ، فسن الضحايا و صفتها و لا أعلم في هذا خلافا في المذهب و لا خارجا منه. (أوجز المسالك: ۱۰/۱۹۶، كتاب العقيقة، ط: دار القلم-دمشق)

(۲) حدیث پاک میں لڑکوں کی جانب دو بکرا ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جب کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت کے مطابق خود حضرت حسنؓ کا عقیقہ آپ ﷺ نے ایک بکرے سے کیا ہے؛ البتہ مسند ابو یعلی الموصلی (۸/۱۷، حدیث نمبر: ۴۵۲۱، مسند عائشہؓ) کی روایت ہے کہ حضرت حسنؓ وحضرت حسینؓ دونوں کا عقیقہ آپ ﷺ نے دو دو بکرے سے کیا۔ الغرض روایات مختلف ہیں؛ اور حکم وجوبی نہیں ہے؛ اس لیے لڑکے کا عقیقہ ایک بکرا سے کرے یا دو سے، جائز ہے، البتہ بہتر دو بکرے کرنا ہے، ذیل میں دونوں قسم کی روایت ملاحظہ فرمائیں:

عن محمد بن علي بن الحسين، عن علي بن أبي طالب قال: عق رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الحسن بشاة، وقال: يا فاطمة، احلقي رأسه، وتصدقي بزنة شعره فضة، قال: فوزنته فكان وزنه درهما أو بعض درهم. (سنن الترمذي: ۱/۲۷۸، رقم الحديث: ۱۵۱۹، أبواب الأضاحي، باب العقيقة بشاة، ط: ديوبند☆الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار المعروف بـ مصنف ابن أبي شيبة-أبو بكر بن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان بن خواستي العبسي (م: ۲۳۵هـ): ۵/۱۱۳، رقم الحديث: ۲۴۲۳۴، كتاب العقيقة، في العقيقة من رآها، ت: كمال يوسف الحوت، ط: مكتبة الرشد-الرياض)

عن أم كرز، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: عن الغلام شاتان، وعن الجارية شاة لا يضركم ذكرانا كن أم=

دو بکرے الگ الگ جگہوں پر اور الگ الگ دنوں میں ذبح کرنا بھی جائز ہے، ایک ہی جگہ ذبح کرنا ضروری نہیں، اپنی مرضی کے موافق جہاں بھی ذبح کریں گے، سنت ادا ہو جائے گی۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۰] لڑکے کے عقیقے میں ایک بکرا اور ایک بکری کی قربانی کرنا

۲۰۱۰-سوال: لڑکے کے عقیقے میں ایک بکرا اور ایک بکری -جو گابھن نہ ہو- کا ذبح کرنا درست

=إناثا. (المجتبى من السنن=السنن الصغرى للنسائي-أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (م: ۳۰۳هـ): ۱۶۵/۷، رقم الحديث: ۴۲۱۸، كتاب العقيقة، كم يعق عن الجارية، ت: عبد الفتاح أبو غدة، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية-حلب ☆سنن أبي داود: ۳۹۲/۲، رقم الحديث: ۲۸۳۵، كتاب الضحايا، باب في العقيقة، ط: ديوبند☆سنن الترمذي: ۲۷۸/۱، رقم الحديث: ۱۵۱۶، أبواب الأضاحي، باب الأذان في أذن المولود، ط: ديوبند)

(عن علي بن أبي طالب - رضي الله عنهم - قال: عق رسول الله - صلى الله عليه وسلم -) : أي ذبح (عن الحسن بشاة).... في شرح السنة: اختلفوا في التسوية بين الغلام والجارية، وكان الحسن وقتادة لا يندبان على الجارية عقيقة، وذهب قوم إلى التسوية بينهما عن كل واحد بشاة واحدة لهذا الحديث، وعن ابن عمر - رضي الله عنهما: كان يعق عن ولده بشاة الذكور والإناث، ومثله عروة بن الزبير، وهو قول مالك. وذهب جماعة إلى أنه يذبح عن الغلام بشاتين، وعن الجارية بشاة. قلت: أما نفي العقيقة عن الجارية فغير مستفاد من الأحاديث، وأما الغلام فيحتمل أن يكون أقل الندب في حقه عقيقة واحدة، وكماله ثنتان، والحديث يحتمل أنه لبيان الجواز في الاكتفاء بالأقل، أو دلالة على أنه لا يلزم من ذبح الشاتين أن يكون في يوم السابع. فيمكن أنه ذبح عنه في يوم الولادة كبشا وفي السابع كبشا، وبه يحصل الجمع بين الروايات، أو عق النبي - صلى الله عليه وسلم - من عنده كبشا. وأمر عليا أو فاطمة بكبش آخر، فنسب إليه - صلى الله عليه وسلم - أنه عق كبشا على الحقيقة وكبشين مجازا، والله أعلم. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۲۶۸۹/۷، تحت رقم الحديث: ۴۱۵۴، كتاب الصيد والذبائح، باب العقيقة، ط: دار الفكر-بيروت)

ثم إذا أراد أن يعق عن الولد، فإنه يذبح عن الغلام شاتين وعن الجارية شاة؛ لأنه إنما شرع للسرور بالمولود وهو بالغلام أكثر ولو ذبح عن الغلام شاة وعن الجارية شاة جاز؛ لأن النبي - صلى الله عليه وسلم - عق عن الحسن والحسين كبشا كبشا. (العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية-ابن عابدين، الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲۱۲/۲، كتاب الذبائح، العقيقة، ط: دار المعرفة)

(۱) فيمكن أنه ذبح عنه في يوم الولادة كبشا وفي السابع كبشا. (مرقاة المفاتيح: ۲۶۸۹/۷، تحت رقم الحديث: ۴۱۵۴، كتاب الصيد والذبائح، باب العقيقة، ط: دار الفكر-بيروت)

ہے یا نہیں؟ یعنی ایک بکری نے ایک ساتھ دو بچے دیے، جن میں سے ایک نر ہے اور ایک مادہ، دریافت یہ کرنا ہے کہ عقیقے میں ان دونوں میں سے ہر ایک کا ذبح کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

نر یا مادہ کی کوئی تعیین نہیں ہے، ہر ایک سے عقیقہ درست ہو جائے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۱] لڑکے کے عقیقے میں ایک بکرے کی قربانی

۲۰۱۱-سوال: لڑکے کے لیے دو بکرے چاہیے، مگر کوئی شخص ایک ہی بکرے سے عقیقہ کرے، تو کیا حکم ہے؟ اس کا عقیقہ معتبر ہو گا یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

ایک بکرے سے بھی عقیقہ کا استحباب ادا ہو جائے گا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) لا يجزئ في العقيقة إلا ما يجزئ في الأضحية. (إعلاء السنن-ظفر أحمد العثماني (م: ۱۳۹۴ھ): ۱۷/۱۱۷، كتاب الذبائح، باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط: إدارة القران- كراتشي ☆ مالابدمنہ-قاضی ثناءاللہ عثمانی (م: ۱۲۲۵ھ)، ص: ۱۷۳، ط: امدادیہ-دیوبند)

وقال ابن رشد: أما سن هذا النسك و صفته، فسن الضحايا و صفتها و لا أعلم في هذا خلافا في المذهب و لا خارجا منه. (أوجز المسالك: ۱۰/۱۹۶، كتاب العقيقة، ط: دار القلم-دمشق)

(۲) عن علي بن أبي طالب قال: عق رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الحسن بشاة، وقال: يا فاطمة، احلقي رأسه، وتصدقي بزنة شعره فضة، قال: فوزنته فكان وزنه درهما أو بعض درهم. (سنن الترمذي: ۱/۲۷۸، رقم الحديث: ۱۵۱۹، أبواب الأضاحي، باب العقيقة بشاة، ط: ديوبند)

في شرح السنة: اختلفوا في التسوية بين الغلام والجارية، وكان الحسن وقتادة لا يندبان على الجارية عقيقة، وذهب قوم إلى التسوية بينهما عن كل واحد بشاة واحدة لهذا الحديث، وعن ابن عمر - رضي الله عنهما: كان يعق عن ولده بشاة الذكور والإناث، ومثله عروة بن الزبير، وهو قول مالك. وذهب جماعة إلى أنه يذبح عن الغلام بشاتين، وعن الجارية بشاة. قلت: أما نفي العقيقة عن الجارية فغير مستفاد من الأحاديث، وأما الغلام فيحتمل أن يكون أقل الندب في حقه عقيقة واحدة، وكماله ثنتان... الخ. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح-علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري: ۷/۲۶۸۹، تحت رقم الحديث: ۴۱۵۴، كتاب الصيد والذبائح، باب العقيقة، ط: دار الفكر، بيروت-لبنان)

[۱۲] عقیقہ کے جانور میں چوٹ یا زخم کا نشان ہو تو؟

۲۰۱۲-سوال: عقیقہ کے جانور میں کوئی عیب ہو، مثلاً کوئی عضو کٹا ہوا ہو، یا زخمی ہو، یا بدن پر مار کا نشان ہو، تو عقیقہ درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر تمام اعضاء پیر، دم، سینگ، کان، زبان وغیرہ سلامت ہیں، اور صرف زخم یا مار کا نشان ہے، تو کوئی حرج نہیں، عقیقہ درست ہے۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۳] بچے کے والدین اور عقیقہ کا گوشت

۲۰۱۳-سوال: عقیقہ کا گوشت بچہ کے والدین کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کے استعمال کا صحیح طریقہ کیا ہے، رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

عقیقہ کا گوشت بچے کے والدین کھا سکتے ہیں، اس گوشت کو کچا بھی تقسیم کر سکتے ہیں اور پکا کر بھی، نیز پکا کر اس کی دعوت بھی کر سکتے ہیں، چناں چہ شامی میں ہے: سواء فرق لحمها نيئا أو طبخه بحموضة أو بدونها مع كسر عظمها أو لا واتخاذ دعوة أو لا. (شامی: ۲۹۳/۵)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) (ويضحي بالجماء والخصي والثولاء) أي المجنونة (إذا لم يمنعها من السوم والرعي) (،وإن منعها لا) تجوز التضحية بها (والجرباء السمينة) فلو مهزولة لم يجز؛ لأن الجرب في اللحم نقص. (الدر المختار)ـــــ قال ابن عابدين: (قوله فلو مهزولة إلخ) قال في الخانية: وتجوز بالثولاء والجرباء السمينتين، فلو مهزولتين لا تنقي لا يجوز إذا ذهب مخ عظمها، فإن كانت مهزولة فيها بعض الشحم جاز، يروى ذلك عن محمد اهـ .... قال القهستاني: واعلم أن الكل لا يخلو عن عيب، والمستحب أن يكون سليما عن العيوب الظاهرة، فما جوز ههنا جوز مع الكراهة كما في المضمرات. (در المحتار على الدر المختار: ۳۲۳/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر-بيروت)

وأما صفته فهي أن يكون سليما عن العيوب الفاحشة. (بدائع الصنائع: ۷۱/۵، كتاب التضحية، فصل في محل إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية-ديوبند)

(۲) رد المحتار على الدر المختار: ۳۳۶/۶، كتاب الأضحية، خاتمة: يستحب لمن ولد له ولد، قبيل: كتاب الحظر والإباحة، ط: دار الفكر-بيروت.

ولو دعا إليها قوما جاز، ولو فرق بعضها و دعا ناسا إلى بعضها جاز، ويستحب أن يأكل منها ويتصدق ويهدي، كما في الأضحية. (إعلاء السنن-ظفر أحمد العثماني (م: ۱۳۹۴هـ): ۱۲۰/۱۷، كتاب الذبائح، فائدة، بعد: باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط: إدارة القران- كراتشي)

[۱۴] نابالغ کی طرف سے قربانی میں اس کے عقیقہ کی نیت کرنا

۲۰۱۴-سوال: ایک شخص نے اپنے ایک نابالغ پوتے کی طرف سے قربانی کرنے کے لیے جانور خریدا، یہ جانور اس نے اپنے پیسوں سے خریدا تھا، بچے کے باپ کا اس میں کوئی حصہ نہیں تھا، تو کیا اس طرح دادا کا اپنے نابالغ پوتے کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے؟ بہشتی زیور میں لکھا ہوا ہے کہ یہ قربانی نفل شمار ہوگی، دو تین شخصوں سے پوچھا تو ان کا بھی کہنا ہے کہ اگر قربانی کی جائے، تو ثواب ملے گا، لیکن ہوا یہ کہ اس شخص نے اسی شش و پنج میں وہ قربانی نہیں کی اور اب وہ اس جانور سے اپنے اس پوتے کا عقیقہ کرنا چاہتا ہے، تو کیا ایسا کرسکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اگر وہ شخص خود صاحب نصاب ہے، تو اس پر اپنی قربانی واجب ہے، اسی طرح اگر اپنے پوتے کی جانب سے قربانی کرنے کی منت مانی ہو، تو اپنی قربانی کے علاوہ پوتے کی جانب سے بھی قربانی واجب ہے، اس طرح اس کے لیے دو قربانی لازم ہوگی۔ (۱)

اگر پوتے کی طرف سے قربانی کے لیے جانور خریدا اور کوئی منت نہیں مانی، اور نہ ہی زبان سے متعین کیا، تو قربانی لازم نہیں ہوگی؛ (۲) لہٰذا قربانی کی جگہ عقیقہ کرنا چاہے، تو جائز ہے، عقیقہ کرسکتا ہے، البتہ صورت

---

(۱) أجمع أصحابنا رحمهم الله: أن الشاة تصير واجبة الأضحية بالنذر بأن قال: لله علي أن أضحي هذه الشاة، وأجمعوا على أنها لا تصير واجبة الأضحية بمجرد النية، بأن نوى أن يضحي هذه الشاة ولم يذكر بلسانه نيته. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني - أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م:٦١٦هـ):٦/٨٧، كتاب الأضحية، الفصل الثاني في وجوب الأضحية بالنذر، وما هو في معناه، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ولو نذر أن يضحي بشاة - وذلك في أيام النحر - وهو موسر فعليه أن يضحي بشاتين عندنا؛ شاة لأجل النذر، وشاة بإيجاب الشرع ابتداء إلا إذا عنى به الإخبار عن الواجب عليه بإيجاب الشرع ابتداء فلا يلزمه إلا التضحية بشاة واحدة. (بدائع الصنائع:٥/٦٣، كتاب التضحية، صفة التضحية، قبيل: فصل في شرائط وجوب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية)

(۲) محض ارادے کی وجہ سے قربانی لازم نہیں ہوگی، حتی کہ اگر کسی مال دار نے بہ وقت شراء قربانی کی نیت کی ہو، تب بھی وہ جانور قربانی کے لیے متعین نہیں ہوتا ہے، ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

وهل تتعين الأضحية بالنية؟ قالوا: إن كان فقيرا وقد اشتراها بنيتها تعينت (وفي حاشية الحموي: قوله: تعينت الخ، بشرط أن يتلفظ الفقير بلسانه، وأما إذا لم يتلفظ فلا تتعين. انتهى) فليس له بيعها، وإن كان غنيا لم تتعين، =

مسئولہ میں قربانی کرنا بہتر تھا، اس طور پر کہ پوتے کی طرف سے قربانی کرتا اور اسی میں عقیقہ کی نیت کر لیتا، تو اس کا عقیقہ بھی ادا ہو جاتا، اور ذمہ سے بری ہو جاتا؛ کیوں کہ نابالغ پر قربانی واجب نہیں ہے اور عقیقہ بھی اس کے لیے واجب نہیں، تو اس بنا پر کہ نوافل میں تداخل کی گنجائش ہے، نیت کی وجہ سے عقیقہ وقربانی دونوں ادا ہو جائیں گے۔(۳) جیسا کہ مسجد میں جاتے ہی نماز سے قبل سنن کی ادائیگی سے، تحیۃ المسجد اور سنت؛ دونوں کا ثواب ملتا ہے۔(۴) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۵] غربت کی وجہ سے باپ اولاد کا عقیقہ نہ کر سکے اور اولاد خود اپنا عقیقہ کرے، تو کیا حکم ہے؟

۲۰۱۵- سوال: ایک زمانے میں، میں بہت ہی غریب تھا، غربت کی وجہ سے میرے والدین نے میرا عقیقہ نہیں کیا، آج اللہ رب العزت کے فضل سے میں صاحب مال ہوں، قربانی کر سکتا ہوں، وہ عقیقہ، جو میرے والدین اپنی غربت وافلاس کی وجہ سے نہیں کر سکے ہیں، اگر آج میں اپنی طرف سے کروں، تو کیا وہ ادا ہوگا یا نہیں؟ اس وقت گھر کے اصل فرد کی حیثیت سے میں ہوں، میں ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے اگر اپنے بھائی بہنوں کا اور اپنی بیوی کے عقیقے کروں، تو کیا شرعاً اس کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

جب آپ اپنی طرف سے اور اپنے بھائی بہن کی طرف سے قربانی کرر ہے ہیں، تو اب الگ سے ان کی طرف سے یا اپنی طرف سے عقیقہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔(۳)

=والصحيح أنها تتعين مطلقا.____ و في حاشية الحموي: قوله :"و الصحيح الخ" قيل لا يلزم إذا نوى أن يضحي و لم يتلفظ وقت الشراء لها لو كان المشتري غنيا لا تجب باتفاق الروايات، فله بيعها، وإن كان فقير اذكر في الشافي: أنها تتعين بالنية و عند الجمهور: لا، إلا أن قول بلسانه علي أن أضحي بها. (الأشباه و النظائر مع حاشية الحموي: ۱/ ۹۰، الأولى: لا ثواب إلا بالنية، ت: المفتي محمد يوسف التاؤلوي، ط: مكتبة فقيه الأمة- ديوبند)

(۱-۲) القاعدة الثامنة: إذا اجتمع أمران من جنس واحد، ولم يختلف مقصودهما دخل أحدهما في الآخر غالبا، فمن فروعها: إذا اجتمع حدث وجنابة، أو جنابة وحيض كفى الغسل الواحد. . . . ومنها لو دخل المسجد، وصلى الفرض أو الراتبة دخلت فيه التحية. (الاشباه والنظائر- زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م: ۹۷۰هـ)، ص: ۱۱۲، القاعدة الثامنة، ت: الشيخ زكريا عميرات، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

(۳) مزید تفصیل وتخریج کے لیے سابق سوال اور اس کے حواشی ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ قربانی سے پہلے کے تمام ذبیحے منسوخ کردیے گئے ہیں۔[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۶] بڑے جانور کے چھ حصوں میں قربانی اور ایک حصہ میں عقیقہ کرنا

۲۰۱۶-سوال: قربانی کے لیے بڑا جانور؛ مثلاً: کٹرا خرید رکھا ہے، اس میں چھ قربانی اور ایک عقیقہ رکھنے کا ارادہ ہے، تو کیا قربانی اور عقیقہ دونوں ایک ساتھ ادا ہوجائیں گے؟

الجواب حامدا ومصلیا:

بڑے جانور کے سات حصوں میں بعض حصے قربانی کے اور بعض عقیقہ یا کسی اور قربت کی نیت سے ہوں، تو اس میں کوئی حرج نہیں، جائز ہے۔ (عالمگیری)[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وإنا نقول إنها كانت ثم نسخت بدم الأضحية بحديث سيدتنا عائشة، - رضي الله عنها - وكذا روي عن سيدنا علي - رضي الله عنه - أنه قال: نسخت الأضحية كل دم كان قبلها، والعقيقة كانت قبلها كالعتيرة. (بدائع الصنائع: ۵/۶۹، كتاب التضحية، قبيل: فصل في محل إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

ومنها أن وجوبها نسخ كل ذبح كان قبلها من العقيقة والرجبية والعتيرة، كذا في البدائع والله أعلم. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۲۹۴، كتاب الأضحية، قبيل: الباب الثاني في وجوب الأضحية بالنذر وماهو في معناه، ط: دار الفكر)

وقال العيني في شرح البخاري: في قوله صلى الله عليه وسلم "مع الغلام عقيقة" حجة على أنه لا يعق عن الكبير، وعليه أئمة الفتوى بالأمصار. (أوجز المسالك- محمد زكريا الكاندهلوي المدني (م: ۱۴۰۲ھ): ۱۰/۱۷۹، كتاب العقيقة، ط: دار القلم-دمشق)

نوٹ: بچہ یا بچی کی طرف سے عقیقہ کرنا مستحب ہے، اس کا اصلی وقت پیدائش کے ساتویں دن ہے، اگر ساتویں دن نہ کرسکیں، تو ۱۴/ رویں دن یا ۲۱/ رویں دن عقیقہ کریں، ورنہ جب بھی عقیقہ کریں، تو ساتویں دن کا لحاظ کرلینا بہتر ہے، چناں چہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بعد ولادت ہفتم روز یا چہاردہم یا بست ویکم وہمیں حساب، یا بعد ہفت ماہ یا ہفت سال عقیقہ باید کرد، والغرض رعایت عدد ہفت بہتر است۔ (مالابدمنہ، ص: ۱۲۴، ط: سب رنگ کتاب گھر-دہلی)

اگر کسی کا بچپن میں عقیقہ نہ کیا گیا ہو، تو بڑے ہونے کے بعد بھی عقیقہ کیا جاسکتا ہے، مگر فضیلت استحباب حاصل نہیں ہوگی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اوجز المسالک، کتاب العقیقہ، ط: دار القلم-دمشق ☆ اعلاء السنن، کتاب الذبائح، باب العقیقہ، ج: ۱۷، ط: ادارۃ القرآن-کراچی) [مجتبیٰ حسن قاسمی]

[۲] ولو أرادوا القربة - الأضحية أو غيرها من القرب - أجزأهم سواء كانت القربة واجبة أو تطوعا أو وجب على =

[۱۷] قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ رکھنا

۲۰۱۷- سوال: قربانی کے بڑے جانور میں بعض حصے قربانی کے اور بعض حصے عقیقے کے رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز قربانی کے جو تین دن ہیں ان دنوں میں اگر عقیقہ کرنا چاہیں، تو کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیا:

قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ رکھنا جائز ہے، کوئی حرج نہیں ہے، [۱] نیز قربانی کے دنوں میں عقیقہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

=البعض دون البعض، وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت بأن أراد بعضهم الأضحية وبعضهم جزاء الصيد وبعضهم هدي الإحصار وبعضهم كفارة عن شيء أصابه في إحرامه وبعضهم هدي التطوع وبعضهم دم المتعة أو القران وهذا قول أصحابنا الثلاثة رحمهم الله تعالى، وكذلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل، كذا ذكر محمد - رحمه الله تعالى - في نوادر الضحايا. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۴، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ط: دار الفكر)

وكذلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل؛ لأن ذلك جهة التقرب إلى الله تعالى - عز شأنه - بالشكر على ما أنعم عليه من الولد، كذا ذكر محمد - رحمه الله - في نوادر الضحايا. (بدائع الصنائع: ۵/ ۷۲، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

(۱) سوال سابق کا حاشیہ ملاحظہ کریں۔

(۲) چوں کہ اس کا حتمی وقت مقرر نہیں ہے اور ایام قربانی میں عقیقہ سے مانع کوئی چیز نہیں ہے؛ اس لیے ان ایام میں عقیقہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے:

وفي الحديث المذكور أيضا أنها إن لم تذبح في السابع ذبحت في الرابع عشر، وإلا ففي الحادي والعشرين، ثم هكذا في الأسابيع. (إعلاء السنن - ظفر أحمد العثماني (م: ۱۳۹۴هـ): ۱۷/ ۱۱۷، كتاب الذبائح، فائدة، بعد: باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط: إدارة القرآن - كراتشي)

ووقتها بعد تمام الولادة إلى البلوغ، فلا يجزئ قبلها، وذبحها في اليوم السابع يسن، والأولى فعلها صدر النهار عند طلوع الشمس بعد وقت الكراهة للتبرك بالبكور... ويسن أن يعق عن نفسه من بلغ ولم يعق عنه. (العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية - ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲/ ۲۱۳، كتاب الذبائح، العقيقة، ط: دار المعرفة)

[۱۸] بچے کی طرف سے عقیقہ کون کرے؟

۲۰۱۸- سوال: عقیقہ کس پر ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عقیقہ واجب اور ضروری نہیں ہے، مستحب ہے، جس کے ذمے بچے کا نفقہ ہو، اسی کو عقیقہ کرنا چاہیے، اگر باپ کے پاس عقیقہ کی گنجائش نہ ہو، اور ماں اپنی طرف سے کرنے کی خواہش رکھتی ہو، تو وہ کرسکتی ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۱۹] باپ کے علاوہ اور کوئی رشتہ دار اولاد کا عقیقہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

۲۰۱۹- سوال: ہماری لڑکی کا ایک لڑکا ہے، جو ایک سال کا تھا تب سے اپنی ماں کے ساتھ ہمارے گھر میں رہتا ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ اُس کے باپ نے اُس کا عقیقہ کیا ہے یا نہیں، تو کیا ہم اُس کا عقیقہ کرسکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اولاد کا عقیقہ والدین کے لیے سنت ہے، اور اُس کے بہت سے فضائل ہیں، والدین کے علاوہ دوسرا کوئی رشتہ دار مثلاً نانا یا ماموں وغیرہ عقیقہ کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں، جائز ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰] عقیقہ: فائدہ ونقصان

۲۰۲۰- سوال: عقیقہ کرنے سے کیا فائدہ ہوگا؟ اور اگر کوئی نہ کرے، تو اس سے کیا نقصان ہوگا؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

عقیقے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت کی نعمت کا شکر ادا ہو، بچہ آفات اور بلاؤں سے محفوظ رہے

---

(۱) بر ہر کسے کہ نفقہ مولود واجب باشد، ورا او ہم از مال خود باید کرد نہ از مال مولود، ورنہ ضامن خواہد شد، اگر پدرش محتاج باشد مادرش عقیقہ نماید اگر میسر باشد۔ (مالا بدمنہ، ص: ۱۷۲، ط: سب رنگ کتاب گھر- دہلی)

(۲) سوال سابق کا حاشیہ ملاحظہ کریں۔

اور قیامت کے روز یہی بچہ سفارش کرے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۱] مولود کے بالوں کا حلق کر کے اس کے ہم وزن چاندی یا اس کی رقم کس کو دی جائے؟

۲۰۲۱-سوال: ساتویں روز نومولود کے بال کٹوا کر اس کے وزن کے برابر چاندی یا اس کی قیمت کس کو دی جائے؟ بھائی بہن غریب ہیں، ان کو دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص چاندی یا اس کے وزن کے برابر قیمت صدقہ نہ کرے، تو کیا حکم ہے؟ کوئی گناہ لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

یہ نفلی صدقہ ہے، بھائی، بہن، غریب و مال دار؛ کسی کو بھی دیا جا سکتا ہے۔[2] اگر نومولود کے باپ کی مالی حالت بہتر نہ ہو، اور وہ کسی کو کچھ نہ دے، تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔[3] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۲] نومولود کے کاٹے جانے والے بالوں کا حکم

۲۰۲۲-سوال: نومولود کا ٹے جانے والے بالوں کا کیا حکم ہے؟ کیا انہیں دفن کر دیا جائے؟

---

(۱) عن الحسن، عن سمرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الغلام مرتهن بعقيقته يذبح عنه يوم السابع، ويسمى، ويحلق رأسه. (سنن الترمذي: ۱/۲۷۸، رقم الحديث: ۱۵۲۲، أبواب الأضاحي، باب بلاعنوان، من العقيقة، ط: ديوبند)

قال الملا علي القاري [م: ۱۰۱۴هـ]: (قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم - "الغلام مرتهن"): بضم الميم وفتح الهاء أي مرهون بعقيقته: يعني أنه محبوس سلامته عن الآفات بها أو إنه كالشيء المرهون لا يتم الاستمتاع به دون أن يقابل بها؛ لأنه نعمة من الله على والديه، فلا بد لهما من الشكر عليه، وقيل: معناه أنه معلق شفاعته لهما لا يشفع لهما إن مات طفلا ولم يعق عنه. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري: ۷/۲۶۸۷، تحت رقم الحديث: ۴۱۵۳، كتاب الصيد والذبائح، باب العقيقة، ط: دار الفكر، بيروت - لبنان)

(۲) وأما صدقة التطوع فيجوز صرفها إلى الغني؛ لأنها تجري مجرى الهبة. (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع - علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي (م: ۵۸۷هـ): ۲/۴۷، كتاب الزكاة، فصل الذي يرجع إلى المؤدى إليه، ط: دار الكتب العلمية)

(۳) قال ابو عمر بن عبد البر: أهل العلم يستحبون ما فعلته فاطمة مع العقيقة أو دونها. قال الباجي: فعلها رضي الله عنها هذا حسن لمن فعله وليس ذلك بلازم، قاله القاضي أبو محمد، وقال الشيخ أبو القاسم تفريعه ليس على الناس التصدق بشعر المولود ذهبا أو ورقا، فمن فعله فلا بأس به، . . . ومعناه والله أعلم أنه ليس بلازم ولا بأمر مشروع، ومن فعل ذلك ابتداء أمن غير أن يرى ذلك لازما فلا نكير فيه؛ بل هو فعل بر. (أوجز المسالك إلى موطا مالك - محمد زكريا الكاندهلوي (م: ۱۴۰۲هـ): ۱۰/۱۵۸، كتاب العقيقة، باب ماجاء في العقيقة، العمل في العقيقة، ط: دار القلم - دمشق)

الجواب حامداو مصلیا:

نومولود کے عقیقہ کے موقع پر کاٹے جانے والے بالوں کو دفن کردینا مستحب ہے، نیز زندگی میں جب بھی کوئی مرد بال کٹوائے، ان کا بھی دفن کرنا مستحب ہے۔ (۱) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۳] عقیقے کی صحت کے لیے بالوں کو جمع رکھنا ضروری ہے؟

۲۰۲۳-سوال: باپ نے عقیقہ کرنے کی نیت سے بچے کے بال کٹوا کر ان کو اپنے پاس رکھ لیا؛ لیکن بعض وجوہات کی بنیاد پر عقیقہ نہ ہوسکا اور باپ کا انتقال ہوگیا، اب وہ لڑکا جوان ہوا تو وہ ان بالوں کا کیا کرے؟ کیا اس کو عقیقہ کرنا پڑے گا؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداو مصلیا:

عقیقے کی صحت کے لیے بالوں کا رکھنا ضروری نہیں ہے، ان بالوں کو دفن کردیا جائے۔ (۲) فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۴] عقیقہ کرنا اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی کا صدقہ ایک ساتھ ضروری ہے؟

۲۰۲۴-سوال: عقیقہ کرنا اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی کا صدقہ کرنا؛ دونوں ایک ساتھ ضروری ہے یا دونوں میں تقدیم وتاخیر کی اجازت ہے، اس طور پر کہ پہلے بال کٹوا کر اس کے ہم وزن چاندی کا

---

(۱) فإذا قلم أطفاره أو جز شعره ينبغي أن يدفن ذلك الظفر والشعر المجزوز فإن رمى به فلا بأس وإن ألقاه في الكنيف أو في المغتسل يكره ذلك، لأن ذلك يورث داء كذا في فتاوى قاضي خان.———يدفن أربعة الظفر والشعر وخرقة الحيض والدم كذا في الفتاوى العتابية. (الفتاوى الهندية:۵/۳۵۸، كتاب الكراهية، الباب التاسع عشر في الختان والخصاء وحلق المرأة شعرها ووصلها شعر غيرها، ط: دار الفكر-بيروت ☆رد المحتار على الدر المختار:۶/۴۰۵، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر)

(۲) ويدفن أربعة الظفر والشعر وخرقة الحيض والدم، عتابية. (رد المحتار على الدر المختار:۶/۴۰۵، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: دار الفكر)

فإذا قلم أطفاره أو جز شعره ينبغي أن يدفن ذلك الظفر والشعر المجزوز. (الفتاوى الهندية:۵/۳۵۸، كتاب الكراهية، الباب التاسع عشر في الختان والخصاء وحلق المرأة شعرها ووصلها شعر غيرها، ط: دار الفكر-بيروت)

وموونا خن أوراد فن نمايد۔ (مالابد منہ، ص:۱۷۴، رسالہ احکام عقیقہ، ط: امدادیہ-دیوبند)

صدقہ کر دیا جائے اور بعد میں عقیقہ کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

بچے کی ولادت کے ساتویں روز بال کٹوانا، نام رکھنا، عقیقہ کرنا اور ختنہ کرنا سنت ہے، اگر فی الحال عقیقے کی استطاعت اور طاقت نہ ہو، تو بعد میں عقیقہ کیا جاسکتا ہے، تقدیم وتاخیر کی صورت میں کوئی گناہ لازم نہیں آئے گا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۵] گھر کے جانور پر قربانی کی نیت کرنے سے وہ متعین نہیں ہوتا

۲۰۲۵-سوال: ایک آدمی کی بھینس نے بچہ دیا،، اس وقت اس نے یہ نیت کی تھی کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا، تو میں اس کی قربانی کروں گا؛ لیکن جب بچہ بڑا ہوگیا، تو اب وہ اس سے عقیقہ کرنا چاہتا ہے، تو کیا اس کے لیے ایسا کرنا درست ہے؟ یا اسی جانور کی قربانی کرنی ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

اس جانور کا عقیقہ کرسکتا ہے، ایسا جانور، جو پہلے سے ملکیت میں ہو، اس کی قربانی کی نیت کر لینے سے وہ قربانی کے لیے متعین نہیں ہوجاتا ہے؛ لہٰذا اسی جانور کی قربانی لازم نہیں ہوگی، اگر وہ صاحب نصاب ہے، تو اسے دوسرے جانور کی قربانی کرنی ہوگی۔ (شامی واشباہ)[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) يستحب لمن ولد له ولد أن يسميه يوم أسبوعه، ويحلق رأسه، ويتصدق عند الأئمة الثلاثة بزنة شعره فضة أو ذهبا، ثم يعق عند الحلق عقيقة، إباحة على ما في الجامع المحبوبي، أو تطوعا على ما في شرح الطحاوي، وهي شاة تصلح للأضحية، تذبح للذكر والأنثى، سواء فرق لحمها نيئا أو طبخه بحموضة أو بدونها مع كسر عظمها أو لا واتخاذ دعوة أو لا، وبه قال مالك. وسنها الشافعي وأحمد سنة مؤكدة شاتان عن الغلام وشاة عن الجارية، غرر الأفكار ملخصا، والله تعالى أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۳۶/۶، كتاب الأضحية، خاتمة: يستحب لمن ولد له ولد، قبيل: كتاب الحظر والإباحة، ط: دار الفكر-بيروت ☆أوجز المسالك: ۱۶۹/۱۰، كتاب العقيقة، ط: دار القلم-دمشق)

العقيقة تطوع إن شاء فعلها، وإن شاء لم يفعل وهي أن يذبح شاة إذا أتى على الولد سبعة أيام. (العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية-ابن عابدين، الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲۱۲/۲، كتاب الذبائح، العقيقة، ط: دار المعرفة)

[۲] فلو كانت في ملكه فنوى أن يضحي بها أو اشتراها ولم ينو الأضحية وقت الشراء ثم نوى بعد ذلك لا يجب، لأن النية لم تقارن الشراء فلا تعتبر بدائع. (رد المحتار على الدر المختار: ۳۲۱/۶، كتاب الأضحية، ط: دار الفكر)

وهل تتعين الأضحية بالنية؟ قالوا: إن كان فقيرا وقد اشتراها بنيتها تعينت (وفي حاشية الحموي: قوله: تعينت=

[۲۶] عقیقہ کے وکیل نے دوسرے شخص کو وکیل بنایا تو عقیقہ ادا ہوگا یا نہیں؟

[کتاب الوکالۃ]

۲۰۲۶-سوال: زید نے خالد کو عقیقہ کے لیے روپیہ دیے کہ میری طرف سے عقیقہ کرا دینا یا سلیم کی طرف سے کرا دینا، اب خالد وہ روپیہ قصاب کو دے کر صاحب عقیقہ کے نام کی وضاحت کیے بغیر یہ کہتا ہے کہ بھائی! دو جانور کا عقیقہ کر کے گوشت مدرسہ میں بھیج دینا، جب کہ صاحب عقیقہ زید نے خالد کو عقیقہ کا وکیل بناتے ہوئے نام کی بھی صراحت کر دی تھی، مگر خالد نے قصاب کے سامنے اس نام کا ذکر نہیں کیا، بل کہ یہ کہا کہ عقیقہ کر کے گوشت بھیج دینا، تو کیا اس صورت میں عقیقہ درست ہو جائے گا؟

الجواب حامداو مصلیا:

زید نے خالد کو عقیقہ کے لیے روپیہ دیا، تو خالد زید کی طرف سے عقیقہ کا جانور خرید نے اور ذبح کرنے کا وکیل ہو گیا، پھر جب خالد نے قصاب کو روپیہ دے دیا، تو قصاب وکیل کا وکیل ہوا، اب اگر خالد کو زید نے دوسرے کو وکیل بنانے کی اجازت بہ صراحت دے رکھی تھی، یا پورا اختیار دے دیا تھا (اور یہی ظاہر ہے) تب قصاب کو وکیل بنانا جائز ہوا؛ کیوں کہ رقم متعین ہے، قصاب نے اسی رقم کا جانور لے کر اپنے مؤکل

= الخ، بشرط أن يتلفظ الفقير بلسانه، وأما إذا لم يتلفظ فلا تتعين. انتهى) فليس له بيعها، وإن كان غنيا لم تتعين، والصحيح أنها تتعين مطلقا.______ وفي حاشية الحموي: قوله: "والصحيح الخ" قيل لا يلزم إذا نوى أن يضحي ولم يتلفظ وقت الشراء لها لو كان المشتري غنيا لا تجب باتفاق الروايات، فله بيعها، وإن كان فقيرا ذكر في الشافي: أنها تتعين بالنية وعند الجمهور: لا، إلا أن يقول بلسانه علي أن أضحي بها. (الأشباه والنظائر مع حاشية الحموي: ۱/ ۹۰، الأولى: لا ثواب إلا بالنية، ت: المفتي محمد يوسف التاؤلوي، ط: مكتبة فقيه الأمة-ديوبند)

أجمع أصحابنا رحمهم الله: أن الشاة تصير واجبة الأضحية بالنذر بأن قال: لله علي أن أضحي هذه الشاة، وأجمعوا على أنها لا تصير واجبة الأضحية بمجرد النية، بأن نوى أن يضحي هذه الشاة ولم يذكر بلسانه نيته. (المحيط البرهاني في الفقه النعماني- أبو المعالي برهان الدين محمود بن أحمد بن عبد العزيز بن عمر بن مَازَةَ البخاري الحنفي (م: ۶۱۶هـ): ۶/ ۸۷، كتاب الأضحية، الفصل الثاني في وجوب الأضحية بالنذر، وما هو في معناه، ت: عبد الكريم سامي الجندي، ط: دار الكتب العلمية-بيروت)

وباليسار؛ لأنها لا تجب إلا على القادر وهو الغني دون الفقير ومقداره مقدار ما تجب فيه صدقة الفطر. (تكملة البحر الرائق: ۸/ ۱۹۸، كتاب الأضحية، ط: دار الكتاب الإسلامي)

کی طرف سے ذبح کر دیا اور قصاب کے مؤکل (خالد) نے اسی کی نیت کر رکھی ہے، جس کی طرف سے عقیقہ کیا جانا ہے، اور وکیل کا فعل مؤکل کی طرف منسوب ہوتا ہے؛ اس لیے قصاب کا ذبح، خالد کے فعل کی طرف منسوب ہو کر عقیقہ درست ہو جائے گا۔

اگر خالد کو زید کی طرف سے کسی دوسرے کو وکیل بنانے کی اجازت نہیں ہے، تو اجازت کے بغیر قصاب کو عقیقہ کا جانور خریدنے کا وکیل بنانا درست نہیں ہے اور خالد کی اجازت پر موقوف رہے گا، اگر جانور ذبح کر دیا، تو عقیقہ درست نہیں ہوگا، خالد ضامن ہوگا دوبارہ اجازت لے کر عقیقہ کرنا ہوگا۔ (شامی، جلد: ۵، صفحہ: ۵۲۷)[۱] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۷] ۱- قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ
[۲۸] ۲- اطلاع کیے بغیر دوسرے کا عقیقہ کرنا

۲۰۲۷- سوال: بیرون ملک میں مقیم ایک شخص نے اپنے بھانجے یا بھتیجے کا عقیقہ اپنے ملک میں کیا، اور بہن اور بہنوئی کو اس کی اطلاع نہیں دی اور اجازت بھی نہیں لی، پھر بعد میں ان کو خط لکھ کر خبر دی، تو کیا عقیقہ درست ہوگا؟ قربانی کے لیے اصیل کی اجازت ضروری ہے، تو کیا عقیقہ کے لیے بھی ان کی اجازت ضروری ہے؟ یا بغیر اجازت حاصل کیے ہوئے عقیقہ صحیح ہو جائے گا؟

---

[۱] (الوكيل لا يوكل إلا بإذن آمره) لوجود الرضا (إلا) إذا وكله (في دفع زكاة) فوكل آخر ثم دفع الأخير جاز ولا يتوقف، بخلاف شراء الأضحية، أضحية الخانية. [الدر المختار] ــــــــ قال ابن عابدين: (قوله بخلاف شراء الأضحية) فلو وكل غيره بشرائها فوكل الوكيل غيره ثم وثم فاشترى الأخير يكون موقوفا على إجازة الأول، إن أجاز جاز وإلا فلا بحر عن الخانية. (رد المحتار على الدر المختار: ۵/۵۲۷، كتاب الوكالة، فصل لا يعقد وكيل البيع والشراء، ط: دار الفكر-بيروت)

ليس لمن وكل بأمر أن يوكل به غيره إلا أن يكون الموكل قد أذنه بذلك وقال له: اعمل برأيك إذ للوكيل حينئذ أن يوكل غيره، وفي هذه الصورة يكون الذي وكله الوكيل وكيلا للموكل، ولا يكون وكيلا لذلك الوكيل. حتى أنه لا ينعزل الوكيل الثاني بعزل الوكيل الأول أو بوفاته. (مجلة الأحكام العدلية-لجنة مكونة من عدة علماء وفقهاء في الخلافة العثمانية، ص: ۲۸۵، المادة: ۱۴۶۶، الكتاب الحادي عشر: في الوكالة، الباب الثالث: في بيان أحكام الوكالة، الفصل الأول: في بيان أحكام الوكالة العمومية، ت: نجيب هواويني، ط: نور محمد، كارخانه تجارتِ كتب، آرام باغ، كراتشي)

قربانی کے جانور میں دو حصے عقیقہ کے رکھے جائیں تو یہ درست ہے یا نہیں؟ بینوا، توجروا۔

الجواب حامداو مصلیا:

صورت مسئولہ میں عقیقہ درست ہو جائے گا، قربانی پر عقیقہ کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے؛ اس لیے کہ واجب قربانی اصیل کی اجازت کے بغیر صحیح نہیں ہوتی، لیکن نفلی قربانی تو اصیل کی اجازت کے بغیر بھی صحیح ہو جاتی ہے، اور عقیقہ واجب تو ہے نہیں، وہ مستحب یعنی نفل ہے؛ اس لیے اس کو نفلی قربانی پر قیاس کیا جائے گا۔[1]

قربانی کے جانور میں عقیقہ کے حصے رکھنا درست ہے۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: احمد بن ابراہیم بیمات غفرلہ

---

(۱) ذكر في فتاوى أبي الليث - رحمه الله تعالى - إذا ضحى بشاة نفسه عن غيره بأمر ذلك الغير أو بغير أمره لا تجوز؛ لأنه لا يمكن تجويز التضحية عن الغير إلا بإثبات الملك لذلك الغير في الشاة، ولن يثبت الملك له في الشاة إلا بالقبض، ولم يوجد قبض الآمر هاهنا لا بنفسه ولا بنائبه، كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۲، كتاب الأضحية، الباب السابع في التضحية عن الغير، وفي التضحية بشاة الغير عن نفسه، ط: دار الفكر)

والأصل فيه أن الإنسان له أن يجعل ثواب عمله لغيره، صلاة أو صوما أو صدقة أو قراءة قرآن أو ذكرا أو طوافا أو حجا أو عمرة أو غير ذلك، عند أصحابنا للكتاب والسنة. (البحر الرائق: ۳/ ۶۳، كتاب الحج، باب الجنايات، ط: دار الكتاب الإسلامي ☆ رد المحتار على الدر المختار: ۲/ ۲۴۳، كتاب الصلاة، باب الجنائز، مطلب في القراءة للميت وإهداء ثوابها له، ط: دار الفكر - بيروت ☆ شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور - عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي (م: ۹۱۱هـ): ۱/ ۳۰۲، باب في قراءة القرآن للميت أو على القبر، ت: عبد المجيد طعمه حلبي، ط: دار المعرفة - لبنان، ۱۴۱۷هـ ☆ الهداية في شرح بداية المبتدي - علي بن أبي بكر المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين (م: ۵۹۳هـ): ۱/ ۲۹۶، كتاب الحج، باب الحج عن الغير، ط: ياسر نديم - ديوبند ☆ الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۷، كتاب المناسك، الباب الرابع عشر في الحج عن الغير، ط: دار الفكر - بيروت)

العقيقة تطوع إن شاء فعلها، وإن شاء لم يفعل وهي أن يذبح شاة إذا أتى على الولد سبعة أيام. (العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية - ابن عابدين، الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲هـ): ۲/ ۲۱۲، كتاب الذبائح، العقيقة، ط: دار المعرفة)

(۲) ولو أرادوا القربة - الأضحية أو غيرها من القرب - أجزأهم سواء كانت القربة واجبة أو تطوعا أو وجب على البعض دون البعض، وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت بأن أراد بعضهم الأضحية وبعضهم جزاء الصيد ... وكذلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل، كذا ذكر محمد - رحمه الله تعالى - في نوادر الضحايا. (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۰۴، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا، ط: دار الفكر)

وكذلك إن أراد بعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل؛ لأن ذلك جهة التقرب إلى الله تعالى - عز شأنه - بالشكر على ما أنعم عليه من الولد، كذا ذكر محمد - رحمه الله - في نوادر الضحايا. (بدائع الصنائع: ۵/ ۷۲، كتاب التضحية، فصل في شرائط جواز إقامة الواجب في الأضحية، ط: دار الكتب العلمية - بيروت)

[۲۹] متوفی بچوں کی جانب سے عقیقہ

۲۰۲۸- سوال: متوفی بچوں کی جانب سے اس کا باپ بعد میں عقیقہ کرے، تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداو مصلیا:

باپ کی ذمہ داری ہے کہ بچہ کی ولادت کے ساتویں دن عقیقہ کرے، حدیث میں آیا ہے کہ جب تک بچے کا عقیقہ نہیں کیا جاتا، اس وقت تک وہ گروی رہتا ہے۔[1]

جس طرح مالک کوئی چیز گروی رکھتا ہے، تو وہ اس شئے مرہون سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اسی طرح جس بچہ کی طرف سے عقیقہ نہیں کیا گیا، اور اس کا انتقال ہو گیا، تو ماں باپ اس کی سفارش سے بھی محروم رہیں گے؛[2] لہٰذا جن بچوں کا انتقال ہو گیا ہے، ان کی جانب سے عقیقہ کرنا سنت ہے۔[3] فقط واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۰] بچے کا عقیقہ بیرونِ ملک میں جائز ہے یا نہیں؟

۲۰۲۹- سوال: بچے جس ملک میں وہ پیدا ہوا ہے، وہیں اس کا عقیقہ کرنا ضروری ہے یا کسی بھی

---

(۱) عن سمرة بن جندب، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: كل غلام رهينة بعقيقته، تذبح عنه يوم سابعه، ويحلق، ويسمى. (سنن أبي داود: ۲/۳۹۲، رقم الحديث: ۲۸۳۸، كتاب الضحايا، باب في العقيقة، ط: ديوبند)

(۲) اگر کسی بچے کا عقیقہ نہ کیا جائے، اور اس کا انتقال ہو جائے، تو وہ اپنے والدین کے حق میں شفاعت کرے گا یا نہیں؟ امام احمدؒ سے منقول ہے کہ وہ شفاعت نہیں کرے گا۔ (فتح الباری: ۹/۵۹۴، کتاب العقیقہ، باب اماطۃ الاذیٰ عن الصبی فی العقیقہ، ط: دار المعرفۃ- بیروت) لیکن فقہاء احناف سے اس سلسلے میں صراحت کے ساتھ کوئی بات منقول نہیں ہے، ملا علی قاریؒ نے "الغلام مرتهن" کے ضمن میں بصیغۂ "قیل" لکھا ہے اگر بچے کا عقیقہ نہ کیا گیا ہو، تو وہ اپنے والدین کی شفاعت نہیں کر سکے گا: وقيل: معناه أنه معلق شفاعته لهما لا يشفع لهما إن مات طفلا ولم يعق عنه. (مرقاۃ: ۷/۲۶۸۷، تحت الرقم: ۴۱۵۳، کتاب الصید والذبائح، باب العقیقہ، ط: دار الفکر، بیروت)

لیکن فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

حنفیہ کے نزدیک عقیقہ واجب نہیں کہ اس کے ترک پر شفاعت سے محرومی ہو، شفاعت، سقط (ناتمام بچہ، جس کا اسقاط ہو جائے) بھی کرے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۷/۵۳۲-۵۳۳، کتاب العقیقہ، جس بچہ کا عقیقہ نہیں ہوا، کیا وہ شفاعت کرے گا؟ سوال نمبر: ۸۵۷۸، ط: زکریا- دیوبند)

حقیر کے نزدیک یہ رائے قرین قیاس اور موافق روایت ہے۔ مجتبیٰ حسن قاسمی [خادم حدیث وفقہ: دار العلوم، ماٹلی والا]

(۳) ولو مات قبل السابع استحبت العقيقة عندنا. (إعلاء السنن: ۱۷/۱۲۶، كتاب الذبائح، باب أفضلية الشاة في العقيقة، ط: إدارة القران- كراتشي)

ملک میں اُس کا عقیقہ کر سکتے ہیں؟ اِس کے متعلق سنت طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداومصليا:

بچے کی پیدائش کے ساتویں دِن عقیقہ مستحب ہے، اگر ساتویں دِن عقیقہ نہ کر سکے، تو پھر چودہویں دِن یا اکیسویں دِن بھی کر سکتے ہیں، پھر اُس کے بعد کبھی بھی عقیقہ کرنا درست ہے؛ لیکن عقیقہ کی سنتِ خاصہ کی فضیلت حاصل نہیں ہوگی، ساتویں دِن بچے کا نام رکھے، اور بال منڈوائے، پھر بال کے ہم وزن، سونا یا چاندی کا صدقہ کرے، پھر ایسا جانور ذبح کرے، جس میں قربانی کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں، لڑکے کی جانب سے دو بکرے اور لڑکی کی جانب سے ایک بکرا کافی ہوگا، اگر کسی کی اتنی طاقت نہیں ہے، تو لڑکے کی جانب سے ایک بکرا بھی کافی ہے، اگر بڑے جانور کے ایک یا دو حصوں میں عقیقہ کی نیت کر لی، تب بھی کافی ہے، عقیقہ کی جگہ کے متعلق بہتر تو یہی ہے کہ بچے کی جائے پیدائش ہی پر عقیقہ کیا جائے، تاہم بیرونِ ملک یا کسی اور جگہ عقیقہ کرنا بھی درست ہے۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) وفي الحديث المذكور أيضا أنها إن لم تذبح في السابع ذبحت في الرابع عشر، وإلا ففي الحادي والعشرين، ثم هكذا في الأسابيع. (إعلاء السنن-ظفر أحمد العثماني (م: ١٣٩٤هـ): ١١٧/١٧، كتاب الذبائح، فائدة، بعد: باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط: إدارة القران- كراتشي)

ووقتها بعد تمام الولادة إلى البلوغ، فلا يجزئ قبلها، وذبحها في اليوم السابع يسن، والأولى فعلها صدر النهار عند طلوع الشمس بعد وقت الكراهة للتبرك بالبكور... ويسن أن يعق عن نفسه من بلغ ولم يعق عنه. (العقود الدرية في تنقيح الفتاوى الحامدية-ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي (م: ١٢٥٢هـ): ٢/ ٢١٣، كتاب الذبائح، العقيقة، ط: دار المعرفة)

قلت: فيه حديث عن ابن عباس قال: سبعة من السنة في الصبي يوم السابع، يسمى، ويختن ويماط عنه الأذى، وتثقب أذنه، ويعق عنه، ويحلق رأسه، ويلطخ بدم عقيقة، ويتصدق بوزن شعره في رأسه ذهبا أو فضة. رواه الطبراني في الأوسط، ورجاله ثقات. مجمع الزوائد: ٥٩/٤. (إعلاء السنن-ظفر أحمد العثماني (م: ١٣٩٤هـ): ١١٩/١٧، كتاب الذبائح، فائدة، بعد: باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط: إدارة القران- كراتشي)

قال المهلب: وتسمية المولود حين يولد وبعد ذلك بليلة وليلتين وما شاء إذا لم ينو الأب العقيقة عند يوم سابعه جائز وإن أراد أن ينسك عنه، فالسنة أن يؤخر تسميته إلى يوم النسك، وهو السابع. (عمدة القاري شرح صحيح البخاري- بدر الدين العيني (م: ٨٥٥هـ): ٨٨/٢١، كتاب العقيقة، باب: إماطة الأذى عن الصبي في العقيقة، ط: دار إحياء التراث العربي- بيروت)

ويفهم من رواية النسفي أيضا أن العقيقة غير واجبة. (عمدة القاري: ٨٣/٢١، كتاب العقيقة، باب: تسمية المولود غداة=

[۳۱] عقیقہ یا قربانی کی نیت سے جانور خریدا، پھر وہ مر گیا، تو کیا حکم ہے؟

۲۰۳۰-سوال: میں نے عید الاضحیٰ کے دن عقیقہ اور قربانی کرنے کی نیت سے ایک جانور (بقرہ) خریدا؛ لیکن اتفاقاً ہوا یہ کہ وہ جانور عید الاضحیٰ کے اگلے دن ہی کٹ کر مر گیا، تو اب کیا کیا جائے؟ اس کی قیمت ایک ہزار کے قریب تھی۔

الجواب حامداً ومصلیاً:

عقیقہ کی نیت سے خریدے گئے جانور کا ہی عقیقہ کرنا ضروری نہیں ہے، ساتویں دن عقیقہ کرنا مسنون یا مستحب ہے، اگر ساتویں دن ممکن نہ ہو، تو چودھویں دن یا اکیسویں دن عقیقہ کرے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے، تو جب میسر ہو، ساتویں دن کا خیال کر کے کر لے۔ قربانی کی طرح' عقیقہ کی نیت سے خریدے گئے جانور کے مر جانے اور وقت گذر جانے سے اس کی قیمت کا صدقہ کرنا کافی نہیں ہوتا، جانور مر گیا ہے، اور ابھی حالات اچھے نہیں ہیں، تو جب میسر ہو، اگر لڑکا ہو تو دو بکرا اور اگر لڑکی ہو، تو ایک بکرا ذبح کر لے، اور لڑکے کے عقیقہ میں ایک ہی بکرا کیا، تب بھی عقیقہ ادا ہو جائے گا۔[1]

رہ گئی بات قربانی کی، اگر قربانی کے ایام میں جانور نہیں خریدا اور قربانی کے ایام گزر گئے، تو اس صورت میں ایک بکرے کی قیمت صدقہ کر دے اور اگر جانور خرید لیا ہے؛ لیکن کسی عارض کی بنیاد پر اس کی قربانی نہیں کر سکا، تو بعد میں قربانی کے جانور کو صدقہ کرنا ضروری ہے۔

=یولد لمن یعق عنه وتحنیکه)

یستحب لمن ولد له ولد أن یسمیه یوم أسبوعه ویحلق رأسه ویتصدق عند الأئمة الثلاثة بزنة شعره فضة أو ذهبا ثم یعق عند الحلق عقیقة إباحة علی ما في الجامع المحبوبي، أو تطوعا علی ما في شرح الطحاوي، وهي شاة تصلح للأضحیة، تذبح للذکر والأنثی، سواء فرق لحمها نیئا أو طبخه بحموضة أو بدونها مع کسر عظمها أو لا واتخاذ دعوة أو لا، وبه قال مالك. وسنها الشافعي وأحمد سنة مؤکدة شاتان عن الغلام وشاة عن الجاریة، غرر الأفکار ملخصا، والله تعالی أعلم. (رد المحتار علی الدر المختار: ۶/۳۳۶، کتاب الأضحیة، خاتمة: یستحب لمن ولد له ولد، قبیل: کتاب الحظر والإباحة، ط: دار الفکر - بیروت)

العقیقة تطوع إن شاء فعلها، وإن شاء لم یفعل وهي أن یذبح شاة إذا أتی علی الولد سبعة أیام. (العقود الدریة في تنقیح الفتاوی الحامدیة - ابن عابدین، الدمشقي الحنفي (م: ۱۲۵۲ھ): ۲/۲۱۲، کتاب الذبائح، العقیقة، ط: دار المعرفة)

(۱) تقدم مرارا.

صورتِ مسئولہ میں اگر قربانی اور عقیقہ دونوں کے لیے جانور کیا گیا تھا، اور جانور ہلاک ہوگیا، تو قربانی ذمہ میں واجب رہے گی، وقت رہتے ہوئے قربانی ادا کرلے، اگر کسی وجہ سے نہیں کرسکا، تو ایک بکرے کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہوگا۔[1] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۲] بچہ- جو مردہ پیدا ہوا ہو- اُس کے لیے عقیقہ کرنا کیسا ہے؟

۲۰۳۱- سوال: اگر کسی عورت کو وضع حمل کے وقت ہی مرا ہوا بچہ یا بچی پیدا ہوئی، تو اُس کے لیے عقیقہ کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

عقیقہ کرنا چاہیے، کیوں کہ قیامت کے دِن مرا ہوا بچہ بھی ماں باپ کے لیے سفارش کرے گا۔[2] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۳] عقیقہ: چند مسائل

۲۰۳۲- سوال: (۱) لڑکے کے لیے عقیقہ میں کتنے بکرے ضروری ہیں؟

(۲) کتنی عمر کے ہونے چاہئیں؟

(۳) قربانی کے بڑے جانور گائے یا بھینس میں عقیقہ کا حصہ لینا چاہے، تو کیا یہ صحیح ہے یا نہیں اور اس میں کتنے حصے ہوسکتے ہیں؟

(۴) ساتویں دِن عقیقہ مستحب ہے، اُس کے بعد کب تک؟

الجواب حامداً ومصلیاً:

(۱) لڑکے کے عقیقہ میں اگر دو بکرے ہوں، تو کمالِ مستحب ہے، اگر ایک ہو، تب بھی استحباب ادا ہوجائے گا:

---

(۱) تقدم مراراً.

(۲) عن علي، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " إن السقط ليراغم ربه، إذا أدخل أبويه النار، فيقال: أيها السقط المراغم ربه أدخل أبويك الجنة، فيجرهما بسرره، حتى يدخلهما الجنة ". قال أبو علي: يراغم ربه، يغاضب. (سنن ابن ماجه: ۱/ ۱۱۵، رقم الحديث: ۱۶۰۸، كتاب الجنائز، باب ما جاء فيمن أصيب بسقط، ط: ديوبند)

و أما الغلام فيحتمل أن يكون أقل الندب في حقه عقيقة واحدة، و كماله ثنتان. (مرقاة)[۱]

اِمام شافعیؒ اور اِمام احمدؒ کے نزدیک دو بکرے کا ہونا سنتِ مؤکدہ ہے۔ (شامی: ۵/ ۲۹۲)[۲]

(۲) کم از کم ایک سال کا بکرا ہونا چاہیے۔ (۳)

(۳) قربانی کے جانور میں سات حصے ہو سکتے ہیں، خواہ تمام شرکاء کی نیت قربانی کی ہو یا بعض کی قربانی کی اور بعض کی عقیقہ کی، البتہ لوجہ اللہ، رضاءِ مولیٰ مقصود ہونی چاہیے، کسی بھی شریک کی نیت گوشت کھانے کی ہوگی تو قربانی اور عقیقہ درست نہیں ہوگا۔ (مجمع الانہر)[۴]

(۴) ساتویں دِن مستحب ہے، اگر ساتویں دِن کسی عارض کی وجہ سے نہیں کر سکا، تو جب بھی قدرت ہو، تو عقیقہ کرے، البتہ قربانی کر لینے سے عقیقہ ساقط ہو جائے گا، یعنی ایک کا دوسرے میں تداخل ہو جائے گا۔ (۵)

فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۷/ ۲۶۸۹، تحت الرقم: ۴۱۵۴، كتاب الصيد و الذبائح، باب العقيقة، ط: دار الفكر، بيروت.

[۲] وسنها الشافعي و أحمد سنة مؤكدة شاتان عن الغلام و شاة عن الجارية، غرر الأفكار ملخصا، و الله تعالى أعلم. (رد المحتار على الدر المختار: ۶/ ۳۳۶، كتاب الأضحية، خاتمة: يستحب لمن ولد له ولد، قبيل: كتاب الحظر و الإباحة، ط: دار الفكر)

(۳) وهي شاة تصلح للأضحية. (المصدر السابق)

[۴] (وهي) أي الأضحية (شاة) تجوز من فرد فقط (أو بدنة) تجوز من واحد أيضا (أو سبع) بضم السين بمعنى واحد من السبع (بدنة) بيان للقدر الواجب، و القياس أن لا تجوز البدنة إلا عن واحد؛ لأن الإراقة واحدة وهي القربة و القربة لا تتجزأ إلا أنا تركناه بالأثر وهو ما روي عن جابر - رضي الله تعالى عنه - أنه قال نحرنا مع رسول الله - صلى الله تعالى عليه وسلم - البقرة عن سبعة و البدنة عن سبعة. و لا نص في الشاة فيبقى على أصل القياس، ثم أراد تفسير قوله أو سبع بدنة، فقال (بأن اشترك) المضحي (مع ستة في بقرة أو بعير و كل) واحد منهم (يريد القربة وهو) أي كل واحد منهم (من أهلها) أي أهل القربة بكونهم مسلمين (ولم ينقص نصيب أحدهما عن سبع) ثم فرعه فقال (فلو أراد أحدهم بنصيبه اللحم أو كان كافرا أو نصيبه) أي نصيب أحدهم (أقل من سبع لا يجوز عن واحد منهم). [مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر - عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده، يعرف بداماد أفندي (م: ۱۰۷۸هـ): ۲/ ۵۱۷، كتاب الأضحية، ط: دار إحياء التراث العربي]

(۵) عن ابن عباس قال: سبعة من السنة في الصبي يوم السابع: يسمى، ويختن، ويماط عنه الأذى، وتثقب أذنه، ويعق عنه، ويحلق رأسه ويلطخ بدم عقيقته ويتصدق بوزن شعره في رأسه ذهبا أو فضة. (المعجم الأوسط - أبو القاسم الطبراني (م: ۳۶۰هـ): ۱/ ۱۷۶، رقم الحديث: ۵۵۸، باب الألف، من اسمه أحمد، ت: طارق بن عوض الله و غيره، ط: دار الحرمين - القاهرة) =

[۴۴] بچپن میں وفات پانے والی ایسی اولاد، جن کا عقیقہ نہ کیا گیا ہو، کیا وہ والدین کے لیے شفاعت کریں گی؟

۲۰۴۳-سوال: دیوبند کے ایک بہت بڑے عالم نے اپنی مجلس میں یہ بات کہی کہ چھوٹے بچے، جو بچپن میں مرجاتے ہیں قیامت میں والدین کی سفارش کریں گے، مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ بچے سفارش کریں گے جن کا عقیقہ کیا گیا ہو، اگر عقیقہ نہ کیا گیا تو وہ بچے سفارش نہیں کریں گے، کیا یہ کسی کتاب میں موجود ہے؟ یا حدیث میں کہیں مذکور ہے؟ تحریر فرمائیں۔

اُن سے جب پوچھا گیا کہ یہ مضمون کس کتاب میں ہے؟ تو اُنہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے اساتذہ اور بزرگان سے ایسا ہی سنا ہے اور وہ اساتذہ انتقال کر گئے ہیں، اُن کی بھی تحقیق فرما کر جواب دیں، یہ واقعہ ایک عالم کے ساتھ پیش آیا ہے، اور وہ اِس وجہ سے بہت پریشان ہیں، اِسی وجہ سے میں نے یہ سوال لکھا ہے، برائے مہربانی پوری تحقیق فرما کر جلد از جلد جواب دیں۔

الجواب حامداً ومصلیا:

احقر کی بھی یہی رائے ہے کہ پیدا ہونے کے بعد جس بچے کا انتقال ہو گیا ہو، اس کا عقیقہ کرنا مسنون ہے۔(۱) فقہاء مطلقاً تحریر فرماتے ہیں کہ جس کے ہاں بچہ پیدا ہو، وہ عقیقہ کرے، نیز نبی کریم ﷺ کا ارشاد

= وفي الحديث المذكور أيضا أنها إن لم تذبح في السابع ذبحت في الرابع عشر، وإلا ففي الحادي والعشرين، ثم هكذا في الأسابيع. (إعلاء السنن-ظفر أحمد العثماني(م:۱۳۹۴ھ):۱۱۷/۱۷، كتاب الذبائح، فائدة، بعد: باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط:إدارة القران-كراتشي)

القاعدة الثامنة: إذا اجتمع أمران من جنس واحد، ولم يختلف مقصودهما دخل أحدهما في الآخر غالبا، فمن فروعها: إذا اجتمع حدث وجنابة، أو جنابة وحيض كفى الغسل الواحد.... ومنها لو دخل المسجد، وصلى الفرض أو الراتبة دخلت فيه التحية. (الاشباه والنظائر- زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري (م:۹۷۰ھ)، ص:۱۱۲، القاعدة الثامنة، ت: الشيخ زكريا عميرات، ط: دار الكتب العلمية- بيروت)

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: ”نابالغ کی طرف سے قربانی میں اس کے عقیقہ کی نیت کرنا“

(۱) ولو مات المولود قبل السابع استحبت العقيقة عندنا. (إعلاء السنن-ظفر أحمد العثماني(م:۱۳۹۴ھ):۱۲۶/۱۷، كتاب الذبائح، فائدة، بعد: باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط:إدارة القران- كراتشي)

ہے کہ بچہ عقیقہ کے ساتھ گروی ہوتا ہے۔ چناں چہ حضرت سمرہ بن جندب نقل فرماتے ہیں:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الغلام مرتهن بعقيقته يذبح عنه يوم السابع، ويسمى، ويحلق رأسه.[۱]

"مرتهن" کا ایک ترجمہ ہے، گروی رکھی ہوئی چیز، جس سے فی الحال نفع نہ حاصل ہو سکے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ بچے کا جب تک عقیقہ نہ کیا جائے، والدین کو اس سے نفع نہیں پہنچے گا، یعنی شفاعت کا حق عقیقہ کے بعد ملے گا۔ ــــــــ نیز واضح رہے کہ اولاد اللہ کی نعمت ہے، جب تک عقیقہ نہیں کرو گے، شکر تام نہیں ہوگا، لہٰذا وفات شدہ اولاد کا عقیقہ کرنا مسنون ہوگا۔[۲] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

[۳۵] عقیقہ کے گوشت کی ذخیرہ اندوزی

۲۰۳۴- سوال: ایک شخص عقیقہ کر کے گوشت خود اپنے گھر میں حد سے زیادہ رکھتا ہے، تو اس کا یہ عمل جائز ہے یا نہیں؟ اور اس میں سے وہ کھا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصليا:

مستحب یہ ہے کہ گوشت کو تین حصوں میں تقسیم کر کے، اس کا ایک حصہ فقراء و مساکین پر صدقہ کرے، ایک تہائی اپنے دوستوں اور مہمانوں کو کھلائے اور ایک تہائی اپنے بال بچوں کے لیے رہنے دے، اگر گھر کے افراد زیادہ ہوں، یا یوں ہی مکمل گوشت اپنے پاس رکھ کر استعمال کرے اور کسی کو نہ دے، تو بھی جائز ہے۔[۳] فقط، واللہ اعلم بالصواب۔

---

(۱) سنن الترمذي: ۱/۲۷۸، رقم الحديث: ۱۵۲۲، أبواب الأضاحي، باب من العقيقة، ط: ديوبند.

(۲) (قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم - "الغلام مرتهن"): بضم الميم وفتح الهاء أي مرهون بعقيقته: يعني أنه محبوس سلامته عن الآفات بها أو إنه كالشيء المرهون لا يتم الاستمتاع به دون أن يقابل بها لأنه نعمة من الله على والديه، فلا بد لهما من الشكر عليه، وقيل: معناه أنه معلق شفاعته لهما لا يشفع لهما إن مات طفلا ولم يعق عنه. (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح - علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري (م: ۱۰۱۴هـ): ۷/۲۶۸۷-۲۶۸۸، تحت الرقم: ۴۱۵۳، كتاب الصيد والذبائح، باب العقيقة، ط: دار الفكر، بيروت)

(۳) وبالجملة هي كالأضحية في أكثر الأحكام عندهم. (إعلاء السنن - ظفر أحمد العثماني (م: ۱۳۹۴هـ): ۱۷/۱۱۷، كتاب الذبائح، باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة، ط: إدارة القران - كراتشي)

= وإنه يستحب الأكل منها و الإطعام و التصدق كما في الأضحية، فما اشتهر على ألسنة العوام أن أصول المولود لا يأكلون منها لا أصل له. (إعلاء السنن: ۱۱۸/۱۷، كتاب الذبائح، باب أفضلية ذبح الشاة في العقيقة)

ويستحب أن يأكل من أضحيته ويطعم منها غيره، والأفضل أن يتصدق بالثلث ويتخذ الثلث ضيافة لأقاربه وأصدقائه، ويدخر الثلث، ويطعم الغني والفقير جميعا، كذا في البدائع. ويهب منها ما شاء للغني والفقير والمسلم والذمي، كذا في الغياثية.

ولو تصدق بالكل جاز، ولو حبس الكل لنفسه جاز، وله أن يدخر الكل لنفسه فوق ثلاثة أيام إلا أن إطعامها والتصدق بها أفضل إلا أن يكون الرجل ذا عيال وغير موسع الحال؛ فإن الأفضل له حينئذ أن يدعه لعياله ويوسع عليهم به، كذا في البدائع. (الفتاوى الهندية: ۳۰۰/۵، كتاب الأضحية، الباب الخامس في بيان محل إقامة الواجب، ط: دار الفكر)

دارالعلوم مدنی دارالتربیت - خدمات کے آئینے میں

بانی : حضرت مفتی احمد ابراہیم بیمات رحمۃ اللہ علیہ

سرپرست اول : فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

سن تاسیس : ۱۹۹۰ء

مدنی دارالتربیت کے سالہائے خدمات : ۲۷ رسال

ان ۲۷ رسالہ خدمت کے نتیجے میں:

۵،۲۲۶ رطلباء نے حفظ کلام اللہ کا شرف حاصل کیا۔

۱۲،۸۹ رطلباء نے درس نظامی کی تکمیل کی۔

۳۰۶ رطلباء نے تجوید بطریق حفص کی تکمیل کی۔

۱۶ رقراء کرام نے قراءت سبعہ کی سند حاصل کی۔

۵۴ رعلماء نے افتاء کا کورس مکمل کیا۔

میدان عمل کے ان نتائج کی انجام دہی کے لیے بحمداللہ ۳۳ رعلماء کرام موجود ہیں۔

تعداد کمرہ جات مدرسہ : ۱۸ رکمرہ اساتذہ اور صاف صفائی کے لیے۔

کل اساتذہ : ۵۲

مہتمم : جناب مولانا محمود بن مفتی احمد بیمات صاحب

مکمل پتہ : دارالعلوم مدنی دارالتربیت کرمالی، دوابا پاولی، تعلقہ انکلیشور،
ضلع بھروچ، گجرات، انڈیا۔

نوٹ: فتاوی فلاحیہ کو ترتیب دے کر ایم ایم پی میں مفتی جبرئیل صاحب نے اپلوڈ کر دیا ہے جسے مذکورہ لنک پر پڑھ
یا حاصل کیا جا سکتا ہے، پی ڈی ایف اور ورڈ دونوں فارمیٹ کی سہولت موجود ہے:

http://www.elmedeen.com/cat-722

Publisher